

مست قلندر
INDIA'S GREAT URDU MONTHLY
فی کاپی ۴ر
سالانہ تین روپیہ
READ BY MILLIONS
MAST
QALANDAR
ستمبر ۱۹۴۱ء



MADHURI

تار کا پتہ
مستقلندر
لاہور

ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری

۲۵۸۵
رجسٹرڈ ایل نمبر

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند
بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہا ست
خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

جلد ۲۵
خوش باش دمی کہ زندگانی این است
نمبر ۶

مست قلندر لاہور

بمبئی
لاہور

اُردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیر الاشاعت ماہوار رسالہ

اُن زندہ دل انسانوں کیلئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کرلیا ہے یعنی خوش رہنے اور دوسروں کو خوش کرنے میں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے قول یا فعل سے کسی کی دل آزاری نہیں کرتے۔ جن کا مذہب ہے خدا کے ہر ایک بندے سے بلا امتیاز رنگ و قومیت محبت کرنا۔

قیمت فی پرچہ
چار آنے

ایڈیٹر
ڈاکٹر پرتھی سنگھ

سالانہ چندہ
تین روپے

امرتسر الیکٹرک پریس امرتسر میں باہتمام ... پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ مست قلندر وشنو لین گوالمنڈی لاہور سے شائع ہوا

طبی جواہر پارے — بے بدل رنگین افسانے — **فہرست مضامین** ستمبر ۱۹۴۱ء — دلگداز آپ بیتیاں — ہنگامہ خیز نظمیں

ہندوستان بھر میں اپنی قسم کا واحد رسالہ جسے ہندو اور مسلمان امیر اور غریب عورت اور مرد بچیاں اور بچے دلچسپی اور ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ...

آپ سے!

آپ مست قلندر کے مربی ہیں، حبیب ہیں۔ اسلئے آنکھوں سے دور رہتے ہوئے بھی میرے دل سے قریب ہیں۔ بھلا آپ سے بڑھ کر مست قلندر کا دلی ہمدرد اور سچا بہی خواہ اور کون ہو سکتا ہے۔ لہٰذا مست قلندر کی بہبودی اور ترقی کے خیال سے ذیل کے سوالات آپ سے پوچھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اپنے نمبر خریداری کا حوالہ دیتے ہوئے جلد از جلد جواب سے مطلع فرمائیے گا۔

۱۔ مست قلندر میں شائع ہونیوالی کون چیزیں آپکو پسند ہیں اور کون ناپسند؟ ۲۔ مست قلندر میں آپ کس چیز کی کمی محسوس کر رہے ہیں؟ اس چیز کا نام بتائیے جسے آپ کے خیال میں اگر مست قلندر کی فہرست میں شامل کر لیا جائے تو یہ کامیابی کے میدان میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کر سکتا ہے ۳۔ کیا آپکو مست قلندر کے خلاف کوئی شکایت ہے؟ اگر ہے تو کیا؟ اس کارکن کا نام چاہئے وہ کوئی ہو، بلا روک ٹوک لکھئے۔ ۴۔ اتنے سالوں سے آپ برابر مست قلندر کو دیکھ رہے ہیں، اس میں کی کون چیز آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوئی ہے۔ آپ کیوں اس کی جانب کھنچے جا رہے ہیں؟ آپ نے مست قلندر سے کیا سیکھا اور کون سا سبق حاصل کیا ہے؟ ۵۔ مست قلندر کی ذات سے آپکی وہ کونسی توقعات ہیں جو ابھی تک شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکیں۔ ان کو تفصیلاً لکھئے ——— ان سب باتوں کے جواب میں ایک جلد "تحفۂ محبت" ——— راقم الحروف کی بالکل نئی تصنیف مفت آپکی نذر کی جائیگی ؎

آپکی چشم عنایات سے کچھ دور نہیں — کہ سر دوست بکرم یونہی ہے سلامت

آپ کا صادق ... پریمی سنگھ

مست قلندر کی ڈائری

مست قلندر کے نادہند ایجنٹ: — آجکل جبکہ کاغذ اور چھپائی کے نرخ بے حد گراں ہو گئے ہیں اور ایک چیز نقد داموں پر ملتی ہے، مست قلندر کے ان ایجنٹوں کی ستم ظریفی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہو گئی ہے جو اپنے سابقہ حساب کو کلیۃً بیباق نہ کرتے ہوئے تھوڑی تھوڑی رقم متعدد تقاضوں کے بعد بھیجنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم ایسے تمام ایجنٹوں کو فرداً فرداً مطلع کر چکے ہیں مگر کچھ شنوائی نہیں ہوئی۔ اسلئے اب آخری بار بذریعہ نوٹس ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ ۱۵ ستمبر سے پہلے پہلے اپنی واجب الادا رقومات دفتر میں بھیج دیں نہیں تو مجبوراً ان کی سپلائی بند کر کے کسی دوسرے مقامی ایجنٹ کو چانس دیا جائیگا۔ اور پھر ان کے تمام گلے شکوے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

ڈاک کے ڈاکو۔ یا ڈاکخانہ کے وہ مفت خورے کارکن جو مست قلندر کو مال مفت سمجھ کر لوٹ کھسوٹ کر پڑھنے کی علت میں گرفتار ہیں اپنی حرکت سے باز نہ آئینگے۔ اور آپکو کبھی کبھار پرچہ نہ ملنے کی شکایت ہوتی ہی رہیگی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ادارہ پر اپنا عتاب نازل کریں اور اپنے محبوب ترین مست قلندر سے بدظن ہو جائیں۔ کسی ماہ کا پرچہ اگر نہ ملے تو اسکی اطلاع اس مہینہ کی دس تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے ورنہ ڈر ہے کہ کہیں آپ مطلوبہ پرچہ کے مطالعہ سے محروم نہ رہ جائیں۔ کیونکہ کاغذ کی حد سے زیادہ گرانی کی باعث فاضل کاپیاں بہت کم ہی چھپوائی جاتی ہیں۔ دس تاریخ سے قبل آپکا خط ملے گا تو دوسری کاپی فوراً ارسال کر دی جائیگی لیکن پہلی مرتبہ بھیجا ہوا پرچہ گم ہو جانے کی صورت میں مقامی صوبہ کے پوسٹ ماسٹر جنرل کو بھی شکایت لکھیں تاکہ محکمہ ڈاک کی طرف سے دوبارہ اس بیہودگی کا اعادہ نہ ہو سکے۔

ماہر القادری کے محبت بھرے خطوط نے مست قلندر کے اوراق میں مسلسل شائع ہو کر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جو خراج تحسین وصول کیا تھا، اُسے ناظرین کرام بھولے نہ ہونگے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب یہ نادر تصنیف جلد ہی کتابی صورت میں شائع ہونیوالی ہے۔ کتاب کے شروع میں حضرت ماہر القادری کی تازہ تصویر ہوگی اور اوپر خوبصورت سنہری جلد۔ قیمت صرف عہ فی جلد مقرر کی جا رہی ہے۔ لیکن جو صاحب چھپنے سے پہلے آرڈر بھجوا دینگے۔ ان سے ۸ فی جلد چارج کیا جائیگا۔

دور ساغر۔ مست قلندری دنیا کے مقبول عام اور ہر دلعزیز شاعر حضرت ساغر نظامی اوجینی کا یہ اچھوتا مجموعۂ کلام بھی جلد ہی مکمل ہونے والا ہے۔ دور ساغر باغ ادب کے سدا بہار پھولوں کا ایک ایسا شاندار گلدستہ ہوگا جسکی بھینی بھینی اور فرحت بخش خوشبو نہ صرف موجودہ نسل کو ہی نہیں بلکہ آنیوالی نسلوں کے دل و دماغ کو معطر کرتی رہیگی اور ان کے روحانی ذوق کی سیری کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ قیمت صرف عمر (ادارہ)

وفا نا آشنا سے!

از جناب سردار جلیل شیرکوٹی

اُجڑے ہوئے دیار میں کیا تم نہ آؤ گی؟
ہاں اس بھری بہار میں کیا تم نہ آؤ گی؟
میرے کبھی کنار میں کیا تم نہ آؤ گی؟
کیا تم نہ آؤ گی، کبھی کیا تم نہ آؤ گی؟
شاید پسِ فنا بھی نہ آنسو بہاؤ گی!

سب وعدہ ہائے عشق و محبت بھلا دیے
لفظِ "نہیں" نے تیرِ عداوت چلا دیے
تم نے چراغ محفل الفت بجھا دیے
کیا تم نہ آؤ گی، کبھی کیا تم نہ آؤ گی؟
شاید پسِ فنا بھی نہ آنسو بہاؤ گی!

دن جا رہے ہیں چند ہی دن میں بہار کے
مدھم سے ہو چلے ہیں سرود آبشار کے
تم آؤ؟ لوٹ آئینگے پھر دن بہار کے
کیا تم نہ آؤ گی، کبھی کیا تم نہ آؤ گی؟
شاید پسِ فنا بھی نہ آنسو بہاؤ گی!

ناکامیوں نے گھیر لیا ہے کچھ اس طرح
بادل فلک پہ گھر کے چلے آئیں جس طرح
اور اس پہ تیری یاد ستاتی ہے بے طرح
کیا تم نہ آؤ گی، کبھی کیا تم نہ آؤ گی؟
شاید پسِ فنا بھی نہ آنسو بہاؤ گی!

ہے رخصت بہار خزاں آ رہی ہے اب
ناکامیوں کی کالی گھٹا چھا رہی ہے اب
رہ رہ کے تیری یاد مجھے آ رہی ہے اب
کیا تم نہ آؤ گی، کبھی کیا تم نہ آؤ گی؟
شاید پسِ فنا بھی نہ آنسو بہاؤ گی!

پھر اودی اودی نیلی گھٹائیں نہ آئیں گی
اب لوٹ کر یہ مست ہوائیں نہ آئیں گی
بوندوں کی دھیمی دھیمی صدائیں نہ آئیں گی
کیا تم نہ آؤ گی، کبھی کیا تم نہ آؤ گی؟
شاید پسِ فنا بھی نہ آنسو بہاؤ گی!

میں اور تمکو دل سے بھلا دوں نہیں نہیں
یعنی چراغ عشق بجھا دوں نہیں نہیں
خود خرمن حیات جلا دوں نہیں نہیں
کیا تم نہ آؤ گی، کبھی کیا تم نہ آؤ گی؟
شاید پسِ فنا بھی نہ آنسو بہاؤ گی!

آنا پڑیگا تم کو تصور میں بار بار
داماں صبر و ہوش و تحمل ہے تار تار
اور دل تمہارے ہجر میں بے چین و بیقرار
کیا تم نہ آؤ گی، کبھی کیا تم نہ آؤ گی؟
شاید پسِ فنا بھی نہ آنسو بہاؤ گی!

روتا ہے زار زار تمہارے لئے جلیل
بہنے کو ہے یہاں پہ نیا آج رود نیل
بیکار ہے تمام تمہاری یہ قال و قیل
کیا تم نہ آؤ گی، کبھی کیا تم نہ آؤ گی؟
شاید پسِ فنا بھی نہ آنسو بہاؤ گی!

(ختم)

مست قلندر لاہور

جلد ۲۵ ــ ماہ ستمبر ۱۹۴۱ء ــ نمبر ۶

پپیہا!

(خاص) مست قلندر کیلئے

از جناب انجم قریشی

۱

پپیہے او پپیہے ہمنوا و مونس و ہمدم
سنائے جا سنائے جا یونہی نغمات غم پیہم
یہ جیون گیت کن میٹھے سُروں میں گا رہا ہے تو
فضا میں بجلیوں کی لہر سی دوڑا رہا ہے تو
یہ کس کا قصۂ درد و الم دہرا رہا ہے تو
تری لَے سے ہوا جاتا ہے میرا اور ہی عالم

۲

فضا مدہوش ہے پودوں کی رنگت دھانی ہے
شباب آیا ہے پھولوں پر تو کلیوں پہ جوانی ہے
مگر تیری زباں پر آج بھی پُرغم کہانی ہے
بتا تو کر رہا ہے کس کے ارمانوں کا تو ماتم

۳

پپیہے او پپیہے تو بھی شاید غم کا مارا ہے
مری طرح کلیجہ تیرا بھی کیا پارا پارا ہے
ترے دل میں بھی کوئی عشق نے نشتر اتارا ہے
تری بیتابیٔ دل ہے کہ ہے سیماب کا عالم

۴

ترے مدھم سُروں سے جھوم اُٹھا ہر پتہ جنگل کا
تو کوئی سازِ خوش آواز ہے اس جانِ محفل کا
یا کوئی گھنگرو ہے اس حریفِ دل کی چھاگل کا
صدائیں جس سے پیہم آ رہی ہیں چھم چھما چھم چھم

۵

اِدھر آ دوست تجھکو رونقِ خانہ بناؤں گا
بنوں گا خود بھی اور تجھکو بھی دیوانہ بناؤں گا
ترے اِن مست گیتوں کا اک افسانہ بناؤں گا
کروں گا گلستانِ دہر کی رنگینیاں برہم

چاہیئے انسان کو دنیا میں رہنا اس طرح! جس طرح تالاب کے پانی میں رہتا ہے کنول

مجھے پنجاب دکھانے والا مرد

جس کو میں نے ہر فن میں ... اس مردِ حق کو دیکھا تھا مگر اب تک سمجھنے کی کوشش کے بعد بھی نہ سمجھ سکی

مشہور طوائف زہرہ جان کی آپ بیتی

ہم سب دریا کے کنارے بیٹھے تھے۔ ایک لہر اُبھرتی دوسری اُسے دبا دیتی۔ پھر خود بھی نیچ دیکھتی۔ موجیں ایک دوسرے کو پامال کرتی اور پامال ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ دریا نام تھا اس لامتناہی سلسلہ کا۔ بلبلا سر اُٹھاتا، دبلا جاتا۔ اپنی سطح سے اُبھرتا ٹھکرا دیا جاتا۔ آنکھ بند کر کے اُٹھتا آنکھ کھلتے ہی اپنے کو غرقِ آب پاتا۔ خیرہ سر سرنگشتہ ہوتا۔ بادِ غرور اُبھرتی حقیقت چشم کشائی کرتی۔ ہوا ساتھ نہ دیتی۔ پانی کا پانی رہ جاتا۔

باتیں ہو رہی تھیں۔ کڑھائی چڑھی تھی سنکر گرم گرم پکوان لا رہے تھے۔ ایک صاحب چٹنی سالن کی طرح کھا رہے تھے۔ میں بھی اُن کی اس مردانہ جرأت پر جھوٹی حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ اب اُنہوں نے پوری پوری مرچیں چباتی شروع کر دیں۔ جس طرح بھانمتی چیز غائب کر کے تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ بھی ہر مرچ کھا جانے کے بعد ہماری جانب اُلو کی طرح دیکھتے تھے۔ مجھ پر اپنی برداشت کا سکہ جما رہے تھے۔ اس بیوقوف میں اتنی برداشت نہ تھی کہ جذبۂ خود نمائی کو دبا سکتا۔ مرچیں تو طوطا بھی کھا لیتا ہے۔

ایک بیچ پر خودی کا مظاہرہ کر رہے تھے رکابیوں پر رکابیاں صاف کرتے چلے جاتے۔ ساتھ کے ساتھ یہ بھی اعلان فرماتے تھے کہ چاہنے والی بیوی نے اچھی طرح پیٹ بھر کر بھیجا تھا اور کہہ دیا تھا کہ سب کے سامنے زیادہ نہ کھانا، نظر لگ جائیگی۔ اللہ تمہارے اکلوتے ارنے بھینسے کو نظرِ بد سے بچائے۔ لیکن بہن دوزخ شکم بھرنے سے کام نہیں بنیگا۔ اگر ہو سکے مردِ بھر سکو تو بھرو۔ جو کام نہ تمہارے بس کا ہے نہ میرے۔

ایک نے کہا، کاظم صاحب نہیں آئے۔ دوسرا بولا وعدہ تو کیا تھا۔ پر آج کل انہیں فرصت کم ہے۔ دن بھر کام میں رُندھے رہتے ہیں۔ کئی کتابیں شروع کر رکھی ہیں۔ پر صاحب لکھتا غضب کا ہے۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ کیا طبیعت کی باگیں موڑی ہیں۔ خوش وقت رنگین انسان جو ہر گھنٹہ گھر خون میں رہنے والا، اب اُدھر کا رُخ بھی نہیں کرتا۔ میز ہے اور وہ جب جا کر دیکھو بیٹھا کام کر رہا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے اس کی صحت پر بھی اثر پڑتا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا خیال کرو چار پانچ گھنٹے اکھاڑے میں ورزش کرنے والا انسان جو یکلخت اس کی طرف سے ہاتھ اُٹھالے تو آپ سے آپ صحت خراب ہوگی۔

میں نے پوچھا کوئی ایڈیٹر ہیں۔ جواب ملا نہیں کتابیں لکھتا ہے مصنف ہے۔ پر ظالم نے جو کام کیا حد کو پہنچا دیا۔ ورزش کی تو وہ ایسی کی۔ آپ لوگوں سے شوق کیا تو کوئی کسر نہ چھوڑا۔ ہے حسن کا پکا۔ جدھر لگ گیا لگ گیا۔ میں نے کہا کسی رنگ میں پڑ کے بھی نہیں ہو گئے ورنہ ساری دُھنیں بھول جاتے۔ ایک مضراب کی چوٹ ساری عمر آس دیتی رہتی ہے کسی چکاری سے واسطہ ہی نہیں پڑا، نہیں تو ساری چوکڑی بھول جاتے۔

ایک نے کہا یادش بخیر وہ چلے آتے ہیں

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

باتیں سُنکر دل میں خواہشِ دیدار پیدا ہو گئی آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو ایک متوسط قد و قامت کا انسان آتا نظر آیا۔ قریب آیا تو خط و خال ظاہر ہوئے۔ آنکھیں خوبصورت تھیں منہ چھوٹا لیکن نقش و نگار سے فراست ٹپکتی۔ چال میں بغیر تصنع کے دلیری۔ جوں جوں قریب آتا گیا چہرہ پر مسکراہٹ کھیلتی گئی۔ لیکن حاضی بھان کا اتنا یہ کچھ اس طرح جھلک رہا تھا جیسے موتی میں نمی میری طرف نگہ غلط انداز ڈالی اور آنکھیں بچا لیں

عام دستور کے خلاف ہے۔ لوگ میری طرف گھورا کرتے ہیں۔ یہ اپنے دوستوں سے متوجہ ہوا۔ دیر میں آنے کی معافی چاہی اپنا مجبوری و معذوری کیا۔ ایک نے شکایت کی کہ اب تو جناب کی صورت ہی نظر نہیں آتی۔ نہایت سادگی سے جواب دیا بندہ نواز اگر شیو کرنے کی لعنت نازل نہ ہو تو شاید میں خود بھی اپنی صورت کو ترسوں۔ عجب جاذب انسان ہے۔ سب اس کی جانب رجوع ہوگئے۔ میں پس منظر میں رہ گئی۔ ایسا کم ہوتا ہے دل میں رشک و حسد پیدا ہوا۔ آخرکار وہ میری طرف ملتفت ہوا تو سب نگاہیں بھی ادھر پھریں۔ بولا جناب اس وقت آپ ہی کا ذکر خیر فرما رہے تھے۔ ایک نے کہا جی ہاں یہی وہ زہرہ ہیں جن کے ہم سب مشتری ہیں۔ ایک ادائے خاص سے جواب دیا، کیا عرض کروں، مجھے تو آپ بنات النعش معلوم ہوتے ہیں۔ میں جلی تو بیٹھی ہی تھی فوراً کہہ اٹھی۔ کہیں غالب کا یہ شعر نہ صادق آجائے

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردہ میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

جواب ملا۔ رات ہونے دیجئے۔

وہ محفل پر چھایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں اپنے کو کچھ چھوٹا محسوس کر رہی تھی۔ تفوق قائم رکھنے کیلئے بولی اور جناب مریخ ہیں۔ جواب ملا جی نہیں عطارد، دبیر فلک۔

دماغ ہاتھ پیر ڈالے دیتا تھا۔ رشک کچھ کچوکے دے رہا تھا میں نے کہا، سیاہی درکار ہے۔ بولا جی نہیں روشنائی۔ میں نے کہا ماشاء اللہ آسمان پر دماغ ہے۔ جواب دیا قرین زہرہ بھی تو ہوں۔ اس فقرے کے ساتھ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ میں آپ کا حریف نہیں ہوں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صلح و آشتی کرلیں۔ بس بہت ہوچکی۔

میں نہ شکست ماننے کی عادی، نہ ہتھیار ڈالنے کی خوگر۔ اور پھر اتنوں کے سامنے پسپائی کا اعتراف۔ دل نہ مانا۔ ایک صاحب بولے کیوں بی زہرہ آج ملا ہے سیر کو سوا سیر۔ ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ اور اکثر احباب انہیں دھجی سیٹھ کہتے تھے۔ میں نے جواب دیا جناب کو سیر سوا سیر سے کیا کام۔ آپ تو گز سوا گز کی فکر کیجئے کہیں اپنا نقصان نہ بھول جائیں

اسوقت مجھے سب برے لگ رہے تھے دل چاہتا تھا کہ کاظم ہو اور میں ہوں اور ساری عمر اس سے ضلع جگت لڑائی ہوا کرے۔ حتیٰ کہ ہرا دوں۔

ان بزاز صاحب کو خود تو جواب بن نہ پڑا۔ کاظم کی آڑ ڈھونڈھی۔ بولے بھئی کاظم میاں یہ ابھی ابھی آپ کے آنے سے پہلے فرما رہی تھیں ان کو کسی آہو چشم سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ ورنہ ساری چوکڑی بھول جاتے۔ وہ تو شمشیر عریاں تیار ہی رہتا تھا۔ بولا، یہ وحشی سدا رام کر گیا رام نہ ہوا۔ میں بھی تلی بیٹھی تھی۔ بولی، پالا پڑے تو پتہ چلے۔ جواب ملا، یہ روگ کبھی پالا نہیں۔ میں نے کہا، پالا چھوڑ کر بھاگ جائیے گا۔ اللہ رے دماغ۔ فقرے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ جواب دیا، کیا عرض کروں، بہت سے گرگوں پر اسی امید میں پالا پڑ گیا۔ دماغ نے ساتھ دینا چھوڑ دیا۔ زبان بولنے سے رہ گئی۔ عقل جواب دے گئی۔ حاضر جوابی رخصت لے گئی۔ میں لاجواب ہوکر رہ گئی۔

دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ یہ سب باتوں میں مصروف تھے۔ ادھر ادھر کے ذکر اذکار کرتے رہے۔ میں ایک طرف کسی از کار رفتہ لیڈر کی طرح بیٹھی تھی۔ کاظم نے میری جانب دیکھا اور کہا، آپ کیوں چپ ہیں۔ اس مرتبہ پھر اس کی پرمعنی آنکھوں میں صلح کا پیغام تھا۔ میں نے جواب دیا آپ کی باتیں سن رہی ہوں۔ کہنے لگا ہم مردوں کی روکھی پھیکی باتوں میں آپ کو کیا مزا آئے گا۔

ایک اور صاحب بولے ہاں صاحب باتیں تو ان کی ہوتی ہیں، چکنی چپڑی۔ روئے سخن میری طرف تھا۔ جواب دینا لازم۔ میں نے کہا۔ کیوں روغن قاز مل رہے ہو۔

کاظم بولا یقین جانیئے آپ سے مل کر بہت دل خوش ہوا۔ میں نے کہا، کیوں روغن قاز مل رہے ہو۔

کاظم بولا یقین جانیئے آپ سے مل کر بہت دل خوش ہوا۔ میں نے ایسی حاضر جواب صاحبہ آج تک نہیں دیکھی تھیں۔

اتنے میں ایک نے کاظم سے پوچھا آج کل کیا کر رہے ہو۔ بولا لکھ لکھا رہا ہوں۔ ایک عادت سی ہوگئی ہے۔ سینہ قرطاس سیاہ کرتا ہی رہتا ہوں۔ میرا جذبہ انتقام نہ مانا۔ فقرہ سوجھ گیا۔ اور میں نے کہہ دیا۔ آخر یہ سیاہ کاری کس لئے۔ مسکراتے ہوئے جواب دیا محترمہ مہر سیاہی سے کام لیتی ہے۔ تو نام چھوڑ جاتی ہے۔

مجھے جواب بن نہ پڑا۔

کاظم ایک غوطے کی سی حالت میں دریا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ اس محویت سے کیا دیکھا جا رہا ہے۔ بغیر میری طرف دیکھے دریا پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ شکاری جال ڈالے بنسیاں ڈالے کانٹے چھوڑے بیٹھے ہیں۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ پھنسی ہوئی مچھلی اپنی دوسری بہنوں کے لئے لاسہ بن جاتی ہے ان کو پھنسانے کے کام آتی ہے۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ قابو شدہ مچھلی بے پروائی سے پتیلے میں ڈال دی جاتی ہے۔ اور نئی پھانسنے کا اہتمام شروع ہو جاتا ہے۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آزمودہ کار چارہ کھاتی ہے۔ کانٹا بچا جاتی ہے۔ یہاں شکاری گرہ کا کھوتا ہے۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ مچھلی پانی میں رہتی ہے۔ پھر بھی بدبودار ہے۔ حالانکہ پانی کا کام بدبو دور کرنا ہے۔ فطرت کی خرابی فطرت دور نہیں کر سکتی۔

ہم جو مچھلی کھا رہے ہیں اس میں بساند نہیں۔ عقل انسانی طبعی خامیوں کو بھی دور کر سکتی ہے۔

میں یہ بام مچھلی دیکھ رہا ہوں۔ بہاؤ کے خلاف جا رہی ہے۔ رفتار زمانہ سے ٹکرا رہی ہے۔ بیچ دریا میں اس کیلئے جگہ نہیں۔ ایک طرف پھینک دی گئی ہے۔ منجمد علم کا شفاف روح پرور پانی اس کی قسمت کا نہیں۔ کنار آب گندے میں پڑی ہے۔

اپنے سماج کے خلاف جا رہی ہے۔ بلا حدی باہر کر دی گئی ہے۔ ابھرتی ہے۔ دبا دی جاتی ہے۔ آگے بڑھتی ہے دھکیل دی جاتی ہے۔ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ حیات ایک مسلسل تصادم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی دنیا دو گز گندا پانی ہے۔ اسی حلقے میں گاہ آگے جاتی ہے گاہ پیچھے آتی ہے۔ لہریں مسلسل اور منظم ہیں۔ یہ تن تنہا، طاقت، استقامت نہیں رکھتی۔ ٹکرا ٹکرا کر مر جاتی ہے۔

میں ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے منظر عام پر مجھے عریاں کر دیا گیا ہو۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایکسرے (X - Ray) کے فوٹو میں اپنے جسم کے کیڑے دیکھ رہی ہوں۔ اس ماہر جراح نے سینہ شق کر کے میرا دل مجھے دکھا دیا تھا اور اس کے بدنما داغ ایک ایک کر کے گنا رہا تھا۔

آج مجھے اپنے سامنے ایک اور مکروہ زہرہ آ رہی تھی۔ وہ گاہ مجھ میں سما جاتی گاہ سامنے جا کھڑی ہوتی۔ میری طبیعت اس سے نفور تھی۔ میں اس کا قریب آنا پسند نہ کرتی تھی۔ لیکن بے بس تھی۔ وہ جب چاہتی مجھ میں پیوست ہو جاتی تھی۔

مجھے کاظم کی صورت بری لگ رہی تھی۔ مجھے یہ پردہ اٹھا دینے والا ہاتھ برا لگ رہا تھا۔ مجھے یہ جادوگر برا لگ رہا تھا جس نے میری ہم ذات کو میرے روبرو لا کھڑا کیا۔ مجھے دنیا کی ہر چیز بری لگ رہی تھی۔ شاید میں آج اپنے کو خود بری لگ رہی تھی۔

اب ہم سب اپنی موٹروں کی طرف چلے۔ کاظم خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ راستہ میں یہ جھگڑا ملا تھا کہ میں موٹر میں بیٹھوں۔ اکثر نے کاظم کی کار تجویز کی۔ پر اس نے خود نہ کہا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ درخواست کرے اور میں انکار کروں۔ میں اس سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ اسے ٹھکرانا چاہتی تھی۔ رنج پہنچانا چاہتی تھی۔ جذبہ انتقام نے مجھے اندھا کر رکھا تھا۔ اور میں اس امید میں اس کار کے پاس جا کھڑی ہوئی کہ شاید وہ اپنے برابر کی سیٹ کا دروازہ کھولے اور میں انکار کر دوں۔ لیکن یہ کاظم سے بعید تھا۔ اس نے نہایت تپاک سے پیچھے کی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اور جلد باز آنے والوں کیلئے جگہ چھوڑ دی۔ اب ہر شخص اس موٹر میں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ بر خود غلط کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

میں چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح امید انتقام میں بل کھا رہی تھی۔ موقع کی متلاشی، وقت کی منتظر، احساس شکست سینے میں ڈنک مار رہا تھا۔ میں زخم لگانے والے ہاتھ کے قریب پہنچ جاتی تھی۔ ڈنک لگانے کا موقع ہاتھ سے نہ جائے۔

مجھے زہر انتقام چڑھ رہا تھا۔ مجھے کوئی طاقت کاظم کے قریب کھینچ رہی تھی۔ یقیناً یہ نفرت تھی جس کی کشش محبت سے سخت ہوتی ہے۔

میں کاظم کی سیٹ پر ہاتھ رکھ کر ذرا آگے کو سرکی۔ میری انگلیاں اس کی پیٹھ کو چھو گئیں۔ وہ غیر محسوس طریقے پر ذرا آگے کو ہو گیا۔ جیسے میں کوڑھن تھی اور قابل نفرت۔

انگلیاں خزاں زدہ شاخوں کی طرح جھک کر رہ گئیں۔ ہاتھ کچھ اس طرح ناکام شرمسار واپس آیا جیسے فلاکت زدہ بالو ـــــ (No Vacancy) سن کر یا کوئی بوالہوس میرے منہ سے نہیں سن کر۔

ایک صاحب نے گانے کی فرمائش کی۔ میں نے انکار کیا۔ انہوں نے اصرار۔ سچ یہ ہے کہ اس درخواست نہ کرنے والے کی درخواست کا انتظار تھا۔

ایک اور جن کو اپنی موسیقی دانی پر بڑا ناز تھا اور مجھے اس راگ میں لانا چاہتے تھے۔ بولے ہم کو تو پکا گانا پسند ہے۔ کوئی ٹھمری ہو جائے۔ ایک خام کار نے غزل کی فرمائش کی۔ کہنے لگے۔ وہ ہاتھی چنگھاڑ سرفرازی جیسی ایک آنکھ اچھی نہیں لگتی۔ ان دونوں میں بحث ہونے لگی۔

میں نے کاظم کی کمر پر ہاتھ رکھا اور کہا جناب ہمہ داں صاحب کا اس معاملہ میں کیا خیال ہے۔ بولا یہ ہیچمداں انصاف کی کہے گا چونکہ خیر سے نورجہاں کا ہاتھ جہانگیر کی پشت پر رکھا ہے۔ سب کی نگاہیں میرے ہاتھ پر تھیں۔ اور وہ کچھ مفلوج سا ہو گیا تھا۔

کاظم اگر تجھ سے بدلہ نہ لیا تو میرا بھی نام زہرہ نہیں، جو ذلتی ہوں تو تجھے نچا سکا کہ

…سے انڈر والی بھی کہتے ہیں۔

چھوڑوں گی۔ تو نے میرا ہاتھ جھٹکا ہے میں تیرا دست طلب ٹھکراؤں گی۔

بچے کے فقرہ میں کمی کچھ چوٹے بولے کیوں بھئی کاظم بیاں کیوں بند ہو گئے۔ بتاؤ نہ دھرپت خیال اچھا یا غزل ٹھمری، دادرا۔ کاظم نے جواب دیا۔ صاحب بات یہ ہے کہ جس طرح شعر کو الفاظ وزن اور معنی پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح راگ کو سُر تال اور لَے پر۔ سُر مترادف ہے الفاظ کے تال، وزن کے ہم وزن اور لَے کے ہم معنی جس طرح بے معنی شعر دل و دماغ پر اثر نہیں کر سکتا بعینہ بے رس راگ جذبات پر مضراب زنی نہیں کرتا۔ دل و دماغ کو نہیں چھیڑ سکتا۔ دورِ انحطاط میں بیچارا گانا محض تال کی کاٹ کا نام ہے اور بس جس میں قطعاً کوئی لطف نہیں۔ غزل میں کم از کم اتنی تو گنجائش ہے کہ اگر حسن مزا نہیں دیتی تو شعر کے معنی لطف دے جاتے ہیں۔

بات مدلل تھی۔ میں جواب دے نہ سکی اپنے سب ہتھیار آزمانے چاہ رہی تھی۔ اب کی فرمائش پر یہ غزل شروع کی ؎

اس بزم میں بہ رد بخش پہ یہ ہو گئی
ہم سے بھی ایک لغزش مستانہ ہو گئی
یا تھی وہی نگاہ کہ تھی چارہ ساز دل
یا اب وہی نظر کہ بیگانہ ہو گئی
کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور
جس پر نثار ہستی پروانہ ہو گئی
صد شکر کچھ تو اُن سے ہوئی آج گفتگو
یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہو گئی
اللہ رے اشکباری شمع شب فراق
جو صبح ہوتے ہوتے اک افسانہ ہو گئی
حیرت کے شغکدہ میں خوشی کا گذر کہاں
ہم آ گئے تو رونق کاشانہ ہو گئی

کاظم پر عجیب کیفیت طاری تھی معلوم ہوتا تھا کہ ہر شعر ایک جامِ شراب ہے جو اس مست کو مست تر بنا رہا ہے۔ غلافی آنکھوں پر خمار چھایا خون چہرہ پر چڑھ آیا جھومتا تھا اور داد دیتا تھا۔ ایک ایک شعر دس دس دفعہ گوایا۔ ہر مرتبہ نئی ادا سے درخواست کرتا۔ مجھے اس کا ایک ایک فقرہ یاد ہے۔ ایک ایک جملہ یاد ہے۔ ایک ایک حرف یاد ہے نہ صرف یہ بلکہ وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ وہ ادا میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ خردمند لڑکھڑا رہا تھا۔ ہوشیار مست ہوا جا رہا تھا۔ ہاروت زہرہ کے جال میں آتا نظر آ رہا تھا۔ دامانِ زلیخا دستِ یوسف کھینچ رہا تھا ہوسنگار اپنا رنگ جما رہا تھا سرور کی بارش میں پاک دامن تر دامنی کی طرف آ رہا تھا۔ ع مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش بود۔ عقل کا پجاری حواس سے عاری ہوتا جا رہا تھا مجھ اپنی ساقی گری پر ناز تھا۔ دو آتشہ اور سہ آتشہ پلا رہی تھی۔ راگ راگنی کا مینہ برس رہی تھی۔ زیر و بم سے توازنِ دماغی تہ و بالا کر رہی تھی مست تھی اور مست بنا رہی تھی۔ کاظم کو اپنا کمال دکھا رہی تھی۔ کاظم پر چھا رہی تھی۔ کاظم کو نیچا دکھا رہی تھی۔ خمار کامیابی نے مست کر دیا۔ اور میں مستانہ وار گاتی رہی۔

افسوس ہر چیز کی انتہا ہے۔ ہر نگاہ کے آگے حدِ نگاہ ہے۔ ہم آبادی میں سے ہو کر گزر رہے تھے۔ گانا بند کرنا پڑا طلسم ٹوٹ گیا نشہ اتر گیا۔ امیدیں ڈھے گئیں۔ فرزانہ جو عقل و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ پھر اپنے مقام پر نظر آیا۔

ونڈ سکرین پر جو پیچھے کا ٹریفک دیکھنے کے لئے جو شیشہ لگا تھا اس میں ہم دونوں کی نگاہیں اکثر چار ہو جاتی تھیں کبھی وہ نظر بچا لیتا کبھی میں۔ یہ آنکھ مچولی ہو رہی تھی سب نے کاظم سے کچھ سنانے کو کہا۔ ظالم نے یہ شعر گایا ؎

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

(چمنستان)

ہنسو اور موٹے ہو جاؤ

ماسٹر صاحب۔ (لڑکے سے) بتاؤ! اگر گائے روزانہ دو سیر دودھ دیتی ہے تو تمہارا باپ دو دن میں کتنا دودھ فروخت کریگا؟
لڑکا۔ آٹھ سیر۔
ماسٹر۔ افسوس کہ تم حساب سے بالکل ناواقف ہو۔
لڑکا۔ اور آپ دودھ بیچنے کے طریقے سے بالکل ناواقف ہیں۔

دو صاحب ریل پر سفر کر رہے تھے۔ ایک نے کہا "ہمارے ملک میں ریل گاڑی اتنی تیز چلتی ہے کہ تار کے کھمبے اور درخت نزدیک نزدیک نظر آتے ہیں" دوسرے نے کہا "یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں ایک مرتبہ اپنے ملک کی ریل گاڑی پر بیٹھا تھا۔ راستہ میں ادھر کو کھیت، تالاب اور اینٹوں کی بھٹی تھی۔ مگر مجھے مل ملا کر دال نظر آئی۔"

بچہ۔ ابا جان! جنگ کس طرح ہوتی ہے؟
باپ۔ فرض کرو کہ روس اور جاپان...... جملہ ختم ہونے سے پہلے ماں آگئی اور اس نے غصہ میں بھر کر کہا:۔
"تم میرے بچے کو جنگ کی تعلیم نہ دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا"
لڑکا۔ بس اب جی میں سمجھ گیا کہ جنگ کس طرح ہوتی ہے۔

ایک سیٹھ جی بیمار پڑے۔ انہوں نے منیم جی کو بلا کر پوچھا "ڈاکٹر کو بلانے میں کتنا خرچ ہوگا؟"
منیم۔ "بتیس ۳۲ روپے"
سیٹھ۔ اور مرنے میں کیا خرچ بیٹھے گا؟
منیم۔ (حساب جوڑ کر) چھ روپے کی لکڑی، چار روپے کا کفن، دو روپے کا عطر، پان وغیرہ۔ کل بارہ روپے۔
سیٹھ۔ تب مجھے مرنا منظور ہے۔

اس نے دکان میں داخل ہو کر کہا:۔ "مجھے اپنی ساس کیلئے سنکھیا کی ضرورت ہے۔"
دوا فروش نے پوچھا۔ "آپ کسی ڈاکٹر کا نسخہ بھی لائے ہیں؟"
اس نے جواب دیا "ڈاکٹر کے نسخہ کی کیا ضرورت ہے میرے پاس اپنی ساس کا فوٹو موجود ہے۔"

ایک بہت بڑی تجارتی فرم کا قابل منیجر مر گیا۔ کالج سے نکلا ہوا نوجوان جو اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ قابل سمجھتا تھا۔ اور جس کا باپ فرم کے مالک کا دوست تھا۔ یہ جگہ حاصل کرنے کیلئے بیچین ہو گیا اور پروپرائٹر کے پاس جا کر غرورانہ لہجہ میں بولا۔ اگر میں آپ کے منیجر کی جگہ لے لوں تو کیا قباحت ہے؟
پروپرائٹر نے مسکرا کر جواب دیا۔ مجھے بہت خوشی ہوگی بشرطیکہ قبرستان کا مجاور اسے منظور کر لے۔

ڈاکٹر نے پبلشر کی دوکان میں داخل ہو کر کہا۔
"جناب من! آپ نے جو کھانا پکانے کے طریقوں پر کتاب شائع کی ہے۔ وہ نہایت عمدہ ہے۔ میں اس قدر مفید کتاب کی اشاعت پر آپ کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔"
پبلشر نے خوش ہو کر پوچھا۔ کیا آپ نے اس کے کسی طریقے کی آزمائش کی تھی؟
ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ جی نہیں۔ لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے میری تیار کردہ بدہضمی دور کرنے والی گولیاں زیادہ فروخت ہونے لگی ہیں۔

باہر سے آواز آئی۔ مکان کی روشنی بند کر دو۔ اس نے اندر سے پوچھا کیا بات ہے؟ آواز آئی "ہوائی حملے کی وارننگ" اس نے جواب دیا۔ میں اس وقت بستر سے نہیں اٹھ سکتا بیٹری کمبل میں ڈال دو۔

ناظرین! خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ورنہ عدم تعمیل ارشاد کی شکایت معاف۔

پروازِ خیال

(از جناب عابد انصاری اصلاحی لکھنوی)

زندگی رشکِ زندگانی ہے
آپ کی جب سے مہربانی ہے

فطرتاً مجھ سے بدگمانی ہے
عادتاً اور سرگرانی ہے

فطرتِ دل میں ہو گئی تغیر
ذوقِ پابندِ نغمہ خوانی ہے

الحذر اے خیالِ ذوقِ گناہ
ابھی بے لوث زندگانی ہے

عرضِ عشقِ نیاز خو توبہ
شرم سے حسن پانی پانی ہے

میری دنیا کے آپ ہیں خورشید
میرے دل کی یہی زبانی ہے

عشق مجبور و ناتواں میرا
حسن مغرورِ نوجوانی ہے

محو ہوتی ہے دل سے یادِ وطن
شامِ غربت عجب سہانی ہے

عشق اور حسن کا مآل نہ پوچھ
ایک باقی ہے ایک فانی ہے

اے خوشا جلوہ ریزیاں کہ فضا
زعفرانی ہے ارغوانی ہے

حسنِ فطرت نکھر گیا عابد
رشکِ جنت ریاضِ فانی ہے

مجبوری

(از: جناب عروج زیدی بدایونی)

ممکن ہے کیف بار گھٹاؤں کو چھوڑ دوں
ممکن ہے دلفریب فضاؤں کو چھوڑ دوں
ممکن ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو چھوڑ دوں
لیکن ترا فراق گوارا نہیں مجھے

رمز آشنائے عشق ہوں مجھ کو ہے اعتبار
عیش اور انبساط کا غم ہے مآلِ کار
ہر شے پہ اقتدار ہے، ہر شے پہ اختیار
لیکن ترا فراق گوارا نہیں مجھے

قصرِ تعینات کو ڈھانا بھی سہل ہے
سرمایۂ حیات لُٹانا بھی سہل ہے
خنجر گلے پہ اپنے چلانا بھی سہل ہے
لیکن ترا فراق گوارا نہیں مجھے

کون و مکاں کو چھوڑنا دشوار کچھ نہیں
دُنیا سے منہ کو موڑنا دشوار کچھ نہیں
رشتہ قضا سے جوڑنا دشوار کچھ نہیں
لیکن ترا فراق گوارا نہیں مجھے

کیا دعوتِ نظارہ شبابِ بہار دے
دیکھوں تو جب کہ چین دلِ بیقرار دے
راضی ہوں اس پہ تو مجھے گولی سی مار دے
لیکن ترا فراق گوارا نہیں مجھے

ایک نہایت ہی بلند پایہ معیاری افسانہ

مرقعِ محبت

از جناب محمد احسن بی اے علیگ

"فتنۂ روزگار میں امن ہی کیا قرار کیا"

جاوید چونک پڑا۔ کتاب الگ کر کے بولا۔

"جمال! تم نے شروع کیا وہی حوصلہ شکن اشعار، وہی ٹھنڈی سانسیں، آخر یہ کیا ہے؟"

جمال:- جاوید! شاعری بھی ایک نعمت ہے اور میری زندگی کا تو ایک عنصر بنکر رہ گئی ہے۔ جس طرح ایک غوطہ زن سمندر کی گہرائیوں تک پہونچکر دُرِ نایاب نکال لاتا ہے اسی طرح شاعر بھی اپنے دل کی گہرائیوں تک پہونچ جاتا ہے اور اپنے جذبات ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ مختلف اشعار مختلف جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ میرے جذبات کی ترجمانی وہی اشعار کرتے ہیں جو میرے ہونٹوں پر ہمہ وقت کھیلتے رہتے ہیں......"

جاوید:- تم تو لکچر ہی دینے لگے۔ یہ تو بتاؤ آخر تمہارے خیالات ہمت افزا کیوں نہیں ہیں؟"

جمال:- (تلخ مسکراہٹ کے ساتھ) "میرے خیالات ہمت افزا کیوں نہیں ہیں! میں نے غم میں حسرت کو پالیا ہے جاوید!

جاوید:- تم ایک معمہ ہوتے جارہے ہو۔ آخر بتاؤ نا بات کیا ہے؟"

جمال:- یہ ایک راز ہے جو ہمیشہ راز ہی رہے گا۔ اس معمہ کو حل کرنیکی کوشش نہ کرو۔"

جاوید:- میں اس معمہ کو حل کرونگا۔ میرے جمال! اچھے جمال بتاؤ نا بات کیا ہے شاید میں تمہارے کام آسکوں۔"

جمال:- "کام آسکیں اوہ رے! میاں یہاں تو خود درد کو اچھا کرتا ہوں۔ خود کار ہوا کرتا ہوں۔ مگر وہ گیا۔ وہ راز، اگر تمہیں بقدر اصرار ہے تو مجھے بھی انکار نہیں۔ مگر یاد رکھو جاوید یہ راز تمہارا بھی راز رہیگا!"

یہ کہکر جمال نے میز کی دراز سے ایک لفافہ نکالا اور جاوید کے حوالے کردیا۔

جمال:- لو ایسے اس کو پڑھلو۔ ممکن ہے تم میری زندگی کے ان چند رومانی لمحوں کے متعلق کچھ سوچ سکو جو اسے سنگ گزرے ہیں۔"

جاوید:- کس کے ساتھ؟"

جمال:- زیبا کے ساتھ!"

جاوید نے خط کھولا اور پر اشتیاق نظروں سے دیکھنے لگا۔

"برگشتہ جمال!

یاد ہے، ہاں یاد ہے وہ چاندنی رات جب ہم گھر سے باہر سرو کے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے۔ ہمارا کوئی دیکھنے والا نہ تھا، سوا اُس چاند کے جو ہم کو اور تم کو یوں دیکھ کر اپنے برق ریز تبسم سے دنیا کو منور کر رہا تھا۔ ہاں تم بھی تو مسکرا رہی تھیں۔ تمہارا روشن چہرہ تھا اور میرا سینہ، میرے ہاتھ تمہاری گردن میں حمائل تھے اور تمہارے نازک ہاتھ میرے کوٹ کے بٹن سے کھیلنے میں مشغول۔ میں تمہاری سانس کی گرمی محسوس کر رہا تھا اور میری سانس بھی ضائع نہیں جارہی تھی۔ میرے سرد کپکپاتے ہونٹ اکثر تمہارے نازک سُرخ ہونٹوں سے پیوست ہو جاتے تھے۔ کتنا دلآویز تھا وہ لمحہ، ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے اور گردش لیل و نہار سے دُور ایک مقناطیسی کشش تھی۔ جو مجھے تمہاری طرف کھینچے لئے جارہی تھی اور دو روحوں کو پیغام اتحاد دے رہی تھی۔

یہ سب کچھ تو تھا۔ مگر سچ بتاؤ زیبا کیا واقعی تم کو مجھ سے محبت تھی، یا تم صرف میرے جذبات سے کھیل رہی تھیں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں تمہارے ہاتھوں میں کھلونا ہو رہا ہوں۔

واسطہ دیتا ہوں میں تمہیں اس رات کی یکجائی کا۔ خدارا مجھے نہ ٹھکراؤ۔ اگر نباہ نہ کرنا تھا تو آخر اس لگاؤ کے اظہار کے کیا معنی؟ کہاں تو وہ وارفتگی اور کہاں یہ بے نیازی متعدد خطوط کا جواب صرف ایک جملہ! وہ بھی کتنا تلخ "مرد مثل ایک بھونرے کے ہے جو ایک پھول کا رس چوس کر دوسرے پر جا بیٹھتا ہے"! کتنا غلط ہے تمہارا خیال، اور وہ بھی میرے متعلق۔ زیبا! میں تو ایک کھلونا ہوں تمہارے ہاتھوں میں۔

زیبا! میری اچھی زیبا! کیا تمہیں مجھے رنج پہونچا کر خوشی ہوتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو

ستا لو جتنا جی چاہے۔ مگر میں تم سے کاہے کا گلا کروں۔ قصور تو میرا ہی ہے۔ آخر میں آگ سے کھیلا ہی کیوں؟

آہ جمال! تو نے دہکتے ہوئے انگارے کو پھول سمجھا تھا ؎

تو پھونک ڈال چمن ہی کو آشیانۂ گل
کہ جلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

تمہارا الم نصیب جمال

خط پڑھ کر جاوید بہت متاثر ہوا۔

جاوید: "جمال! مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے۔ آخر اس بلا میں تم سا دانشمند شخص کیسے گرفتار ہو گیا؟"

جمال: "سنو جاوید! میری داستانِ غم۔ وہ بہت بھولی بھالی تھی۔ وہ بہت معصوم تھی۔ خوبصورت تو نہیں کہی جا سکتی تھی مگر ایک جاذبیت کی مالک تھی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ اس کی سادگی کیوپڈ کے تیر کا کام کر رہی ہے۔ اس کی بھولی بھالی باتیں، اس کا خاموش تبسم، اس کی میگسار آنکھوں کا تکلم ہر کے دل میں بھی اپنی جگہ پیدا کر لیتا تھا۔ وہ جوانی کی طوفان انگیز وادی کے منہ پر کھڑی ہوئی کسی رہبر کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اپنے سے بھی بے خبر تھی اور گرد و پیش سے بھی۔ ...آہ! یہ میں ہی تھا جس نے اس کو خود آگاہی کا سبق دیا...... مجھے کیا معلوم تھا کہ میں ہی وہ رہبر ہوں گا جس کی منتظر وہ کھڑی ہے"

جاوید: "قطع کلام معاف! یہ تو بتاؤ وہ تھی کون؟"

جمال: "وہ میرے والد کے دوست کی لڑکی تھی۔ ہاں سنو! میری وارفتگی سے اس میں وہ آن آگئی جو عورت کی خود آگاہی کا ثبوت ہے۔ معصوم اور بھولی بھالی تو وہ اب بھی تھی۔ مگر عورتوں کی فطرت کے خلاف وہ کیسے جا سکتی تھی۔ میں اس کا پرستار تھا اور اس کا پجاری، اور وہ بھی شاید مجھ کو چاہتی تھی۔ ادھر ایک والہانہ جذبہ تھا اور ادھر ایک المعنی لگاؤ۔ میں گھنٹوں اس سے باتیں کیا کرتا تھا اور وہ سنتی رہتی تھی۔ کبھی نہیں اکتاتی تھی۔ جاوید! اب معصوم امنگیں دلداری کے جھولوں میں جھول رہی تھیں۔

جنوری کی ایک خوشگوار شام تھی۔ سردی ابھی خاصی پڑ رہی تھی۔ میں اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اف! وہ بری طرح میری ہر رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ سردی اپنا اثر سب پہ کر رہی تھی۔ مگر میں اس کی زد سے بہت دور تھا۔ میری رگوں میں ابلتے خون کی نہریں بہہ رہی تھیں کنپٹیاں اس بری طرح سے بھڑک رہی تھیں کہ گمان غالب ہوتا تھا کہیں پھٹ کر نکل آئیں گی۔ دل بھی اپنا کام بڑی سرعت سے کر رہا تھا۔

ادھر بھی رنگ دوسرا تھا نہ جانے کیوں آج ان کا چہرہ دہکتے ہوئے انگارے کی طرح ہو رہا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے انگلیاں مرتعش، ہم دونوں خاموش تھے، نظریں نیچی تھیں۔ کبھی کبھی دزدیدہ نگاہی کی البتہ مشق ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اپنے ناخنوں کو کرید رہی تھی۔

"جمال صاحب!" میں چونک پڑا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔

"جی!" میں نے کہا۔

"آپ خاموش کیوں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"خاموش کہاں ہوں" میں نے جواب دیا۔

"تو شاید میں ہی بہری ہوں" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میری گردن ندامت سے جھک گئی۔

"اچھا ایک بات پوچھوں؟" اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔

"پوچھیے!"

"بتائیے گا نا؟"

"ضرور بتاؤں گا!"

"اگر کوئی لڑکی کسی شادی شدہ آدمی سے محبت کرے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"بے وقوف کہوں گا" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا میں بیوقوف ہوں" وہ جھینپ گئی۔

"میں نے نہیں سمجھا۔ آپ کا مطلب کیا ہے؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"اتنے انجان نہ بنو جمال!" اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"زیبا! تم نے اس کا انجام نہیں سوچا ہے شاید۔ میں شادی شدہ ہوں" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

"خوب سوچ لیا ہے جمال! محبت کسی چیز کی پابند نہیں ہے محبت آزاد ہے اور محبت کرنے والا بھی۔ سچ پوچھو تو جمال! میں شادی کو محبت کی موت سمجھتی ہوں"

اس کے اس جواب سے میرے جسم میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں نے کہا۔

"زیبا! عرصہ سے میں بھی تمہاری محبت میں مبتلا تھا۔ مگر کس منہ سے اظہار کرتا"

وہ اشارہ کر کے کہنے لگی "اس منہ سے"

کتنی شوخ تھی وہ ...... میں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ تڑپ کر آزاد ہو گئی۔ پرے بیٹھ کر کہنے لگی:

"بڑے ویسے ہیں آپ"

"کیسے؟"

"ویسے ہی!"

"آخر بتاؤ کیسا ہوں؟"

"بہت خراب"

میں ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی بے ساختہ اور دلکش تھی۔

موٹر کی آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ اس کے والد آ گئے۔ وہ مجھے پہونچانے باہر آئی۔ پھر وہی ہوا جو تم نے میرے خط میں پڑھا۔

میں اس کے وہاں اکثر جاتا تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ اُس کے گھر والے میرے ساتھ اس کے مخلص برتاؤ کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ مجبوراً مجھے آمد و رفت کم کرنی پڑی۔

ایک روز معلوم ہوا زیبا لکھنؤ پڑھنے چلی گئی اور بغیر مجھے اطلاع کئے ہوئے۔ یہ تھا وہ خیال جو مجھے مارے ڈال رہا تھا۔

میں نے زیبا کو متعدد خطوط کئے شروع میں تو جواب ہی سے محروم رہا۔ عرصۂ دراز کے بعد زیبا کا لکھا ہوا ایک لفافہ ملا۔ چاک کر کے دیکھا تو کاغذ کے پرزے پر یہ جملہ لکھا نظر آیا۔ "مرد مثل ایک بھونرے کے ہے جو ایک پھول کا رس چوس کر دوسرے پھول پر جا بیٹھتا ہے۔" یہ تھا میرے خط کا جواب۔ کیا تم اسے دلشکن نہ کہو گے جاوید؟ اتنے اختلاط کے بعد یہ تبدیلی! میں عورت کی فطرت سمجھنے سے اب تک قاصر رہا جاوید!

یہ میرا آخری خط ہے۔ اس کے جواب کا انتظار ہے۔ میری دُنیا اندھیری ہو گئی ہے جاوید! میں تو جیتے جی مر چکا ہوں۔ اگر زیبا نے تسلی بخش جواب دیا تو میں کہیں بہت دور چلا جاؤں گا۔ پھر اگر کبھی وہ مجھے تلاش بھی کرے گی تو نہ پا سکے گی۔"

خط کو گئے ہوئے آج ایک ہفتہ ہو گیا مگر کوئی جواب نہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جمال کو کس قدر مایوسی ہو گی۔ جاوید بھی پاس ہی متفکر بیٹھا تھا۔

"خط لے جاؤ" کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔ جمال دیوانہ وار دروازے کی طرف لپکا اور خط پا کر چلا اُٹھا۔ "آ گیا! آ گیا اُس کا خط!"

لفافہ چاک کر کے دونوں دوست خط کی عبارت کی طرف رجوع ہوئے۔ حسب ذیل تحریر تھی:——

"اچھے جمال! سلام شوق۔ خط کا شکریہ۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ یہی نا کہ محبت کا جواب محبت سے دیا جائے تو تم یقین کر لو کہ میں تم کو چاہتی ہوں اور تم سے محبت بھی کرتی ہوں۔ تمہیں یہ معلوم کر کے خوش ہونا چاہئے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ صرف یہ بات تمہیں خوش نہ کر سکے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ کاہے کا؟ محبت کے دو مختلف تخیل کا۔ جمال! میں تمہیں محبت کے اعلیٰ ترین تخیل کا حامل سمجھتی تھی۔ مگر اب معلوم ہوا کہ تمہاری محبت میں زیادہ حصہ نفسانیت کا ہے۔ اس سے مجھے انکار نہیں کہ محبت ایک حد تک نفس کی گود میں کھیلتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ مقررہ حد سے تجاوز کر کے محبت کو موت کے غار میں دھکیلنا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک لڑکا دوسرے لڑکے سے اتنی وارفتگی اور دیوانگی سے محبت نہیں کر سکتا جتنا کہ ایک لڑکی سے۔ کہو نا! محبت کی ایک جُزو جنسی کشش بھی ہے اور یہ انسان کی نفسی فطرت ہے کہ وہ صنف نازک کی طرف رجوع ہو۔

خوبصورتی بھی محبت کی دُنیا میں اچھا کھیل کھیلتی ہے۔ آخر کسی مرد کو ایک کریہ المنظر عورت سے کیوں نہیں محبت ہو جاتی؟ عاشق کو معشوق کی جو چیزیں پسند ہیں وہ اس کے بال، اُس کی آنکھیں، اس کے ہونٹ، اس کی کمر، توبہ! یعنی محبت اندھی ہوتی ہے، گونگی اور بہری بھی، نہ جانے کتنے علوم نے یہ کہیں کہہ دیا۔ حقیقتوں کا مقابلہ کرو جمال! دوسری دنیا میں نہ پہنچ جاؤ۔ ان سب باتوں پر غور کر کے میں اس نتیجہ پر پہونچی ہوں کہ محبت نام ہے پاکیزگی کی حد سے گزر کر آسودگی سے بچتے رہنے کا۔ میں پاکیزگی کی حد سے تو گزر ہی چکی اب آسودگی سے بچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

یاد ہے! ہاں یاد ہے، وہ چاندنی رات اور سب کچھ، مگر جمال! وہ میرا آغاز محبت تھا...... اب تکمیل محبت تک پہونچ چکی ہوں۔ کھری بات سب کو بُری معلوم ہوتی ہے۔ سُنو اور غور سے سُنو جمال! تم تکمیل آرزو کے خواہاں ہو اور میں تکمیل محبت کی۔ تکمیل آرزو اور تکمیل محبت میں بہت فرق ہے۔

تم خود اپنے معیار پر بھی تو پورے نہیں اُترتے۔ تم نے مجھ سے خود کہا تھا۔ محبت نام ہے ایک ہستی کے دوسری ہستی میں جذب ہو جانے کا، مٹ جانے کا، فنا ہو جانے کا۔ یہاں تک کہ ایک جان دو قالب ہو جائے اور دوئی کی بو بھی باقی نہ رہے۔ تمہارا قول ہے تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور بے انتہا۔ تم مجھ میں جذب ہو گئے ہو نا جمال! یہی معراج محبت ہے، پھر اب کاہے کی آرزو؟

جمال تم نے میرے احساسات کو یہ ظاہر کر کے کہ تم میرے مادی وجود کیلئے اس حد تک بے قرار ہو ٹھیس لگا دی۔ رہنے دو مجھے میری محبت کی دُنیا میں۔ یہاں اندھے، گونگے، نہیں بستے، اور نہ یہاں اندھے جذبات کی آندھیاں چلتی ہیں۔

تمہاری دل شکستہ زیبا"

خط پڑھ کر جمال کا بُرا حال ہو گیا۔ وہ رو رہا تھا اور بُری طرح۔ جاوید پر تو گویا سکتہ طاری ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو ایک مبہم لرزتی ہوئی آواز اس کے کانوں تک

فن موسیقی

از جناب
امداد علی مضطر
میرٹھی

سب سے پہلے انسانی فطرت نے جن چیزوں کو ایجاد کیا ان میں سے ایک موسیقی بھی ہے۔ یہ ایک فطرتی امر ہے کہ جن الفاظ کو انسان زیادہ جوش و خروش یا زوردار طریقہ پر ظاہر کرنا چاہتا ہے تو ان کو ادا کرتے وقت قدرتاً لے، سُر یا ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح گانے کی ابتدا ہوئی۔ سب سے زیادہ جس کام میں انسان انہماک یا جوش ظاہر کرتا ہے وہ یا تو عبادت ہے یا عشق و محبت۔ اس لئے موسیقی کا آغاز عبادت یا محبت سے ہوا۔ ہندوستان میں اس کی ابتدا برہمنوں سے ہوئی جو عبادت کرتے یا کراتے وقت مورتیوں کے سامنے بھجن گاتے تھے۔ کنھیا جی کے جنم نے ان کی محبت اور عشق کو عبادت میں تبدیل کر دیا۔ اولاً برہمن صرف گیت یعنی سیدھے سادے گانے گایا کرتے تھے جن کا اصلی فن سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد مصری، بابلی اور ایرانی شوقین مزاج حضرات نے اس فن کی بنیاد ڈالی۔ قدرتاً ہر صدا بلند ہونے، پھیلنے اور کسی حد تک پہونچنے پر تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان تبدیلیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان لوگوں نے سات سُر ایجاد کئے اور انہیں سات سُروں پر اس فن کو تقسیم کر دیا۔

ہندوستان میں موسیقی کو اس طرح رائج کیا گیا کہ تین قسم کے گانے بنائے گئے۔ ایک تو وہ جو برہمنوں نے اپنی ہی واسطے مخصوص رکھے دوسرے وہ جو شادی بیاہ یا دیگر خوشی کے موقعوں پر گائے جاتے تھے۔ اور تیسرے راگ صرف غم و الم کے وقت کے واسطے تھے۔ اس قسم کے راگ کا نام "بروگ" رکھا گیا۔ علاوہ ازیں دیگر راگوں کے نام بھیروں۔ سرس راگ بھیرویں پنچ۔ کالنگڑا۔ سوہنی۔ پیلو وغیرہ ہیں۔ رفتہ رفتہ جب برہمنوں کو راجاؤں کے درباروں میں ان کی تعریفیں پڑھنے کا اتفاق ہونے لگا تو انہوں نے دیگر راگ بنائے جن سے دربار میں مناسب ہنگامہ جلال پیدا کیا جاتا۔ ان راگوں کے نام درباری۔ شاہانہ۔ تلکوس وغیرہ ہیں۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے ابن مسیح نے اس فن کو مکمل کیا۔ اس کے بعد جب عراق میں عباسی دربار قائم ہوا تو فارسی اور عربی موسیقی سے ملا کر ایک نیا اور مکمل فن ایجاد ہوا جس کا نام غنا رکھا گیا۔ اور یہ اسقدر مقبول ہوا کہ تمام عالم اسلام میں پھیل گیا۔ مسلمان جب یہاں آئے تو اسی فن کو ساتھ لائے اور انہیں کی یادگار آج تک قوال موجود ہیں۔ ان گویوں کے آلات طرب بربط۔ رباب۔ چنگ۔ تیرو اور شہنائی تھے۔

نوآمدہ مسلمان ہندوستانی موسیقی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکے۔ چونکہ یہاں اس فن نے اسقدر باضابطگی اور پختگی اختیار کر لی تھی۔ کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ناممکن تھا۔ ہاں عجمی قوالوں نے ہندوستان کی موسیقی پر کچھ اثر ضرور ڈالا۔ اور اسوقت سے ان کے کچھ راگ ہندی موسیقی میں شامل کر لئے گئے۔ چنانچہ خیال کیا جاتا ہے کہ ضلع۔ درباری۔ شاہانہ ذیلف وغیرہ عجمی راگ ہیں اور ہندوستانی فن غنا میں شامل ہو گئے ہیں۔

سنا ہے کہ ستار امیر خسروؒ کی ایجاد ہے ممکن ہے کہ یہ بات کسی حد تک درست نہ ہو مگر یہ چیز تو مسلم الثبوت ہے کہ ستار کی بہت سی دُھنیں انہیں کی ایجاد کردہ ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امیر خسرو نے اس فن کو کس درجہ ترقی دی۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صوفیہ نے موسیقی کی طرف کافی توجہ دی اور جو صحبتیں عراق و عجم کے زاہدان سلف میں عبادت کی شان سے قائم ہوتی تھیں۔ ان کا اثر ہندوستان تک پہونچا۔ اور یہاں بھی ویسی ہی صحبتیں قائم ہونے لگیں۔

شاہی درباروں میں سرور و نشاط کے لئے جو گویے مقرر ہوتے ان کا افسر اعلیٰ خاص طور پر عجمی ہوتا تھا۔ محمد تغلق کے عہد میں سب سے بڑا درباری گویا امیر شمس الدین تبریزی تھا۔

متھرا۔ بنارس اور اجودھیا ہندو موسیقی کے مرکز خیال کئے جاتے تھے۔ ان مقامات پر مذہبی عنصر اعظم ہونے کی وجہ سے یہ فن ہمیشہ ترقی پاتا رہا۔ جونپور کے شرقی تاجداروں میں سے سلطان حسین شرقی کو گانے کا بہت شوق

تھا۔ اور اُس نے اِس فن میں اتنی دستگاہ حاصل کی تھی کہ اس کا شمار استادانِ فن میں ہونے لگا تھا اور چونکہ بنارس اور اجودھیا اس کی قلمرو میں شامل تھے۔ اسلئے اس نے اس فن کو نمایاں ترقی دی۔

فنِ موسیقی کا سب سے بڑا قدردان شہنشاہ اکبر ثابت ہوا۔ اس کی قدردانی کی یہ ایک ادنیٰ مثال ہے کہ اس نے اپنے وقت کے مشہور گویے تانسین کو اپنے "نورتن" میں شامل کرلیا تھا۔ اکبر کی قدردانی سے ہی ہندی موسیقی کو روز بروز عروج حاصل ہوتا رہا۔ اکبر کے بعد بھی ہر دربار میں اسی نسل کے گویے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے اور آج تک اس خاندان کے لوگ خود کو دربارِ مغلیہ سے وابستہ تصور کرتے ہیں۔ یہ خیال بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ اسی نسل کے ذریعہ ہندوؤں کا یہ فن مسلمانوں تک پہونچا۔ چنانچہ اب بھی باکمال استادانِ فنِ موسیقی میں سے زیادہ تر مسلمان ہیں۔

شاہجہان بادشاہ کے عہد میں اس فن کے متعلق ایک کتاب لکھی گئی جس کا نام "شمس الاصوات" تھا۔ اس کے بعد اکبر ثانی کے زمانہ میں میرزا خاں نے کتاب "تحفۃ الہند" تصنیف کی جس میں علاوہ فنِ موسیقی پر سیر حاصل معلومات کے دیگر فنون مثلاً جوتش۔ اندھل سامدرک۔ سرود وغیرہ فنوں پر بھی کافی بحث کی گئی تھی۔

نواب شجاع الدولہ نے اس فن کی بہت قدر کی اور اسی وجہ سے تمام ہندوستان کے استادانِ فنِ موسیقی لکھنؤ میں جمع ہو گئے بنارس اور اجودھیا کے موسیقی کے پرانے مدارس یہاں قائم تھے ہی۔ ان میں تان سین کے مستند اسکول کے اساتذہ بھی شامل ہو گئے اور یہاں سے موسیقی کا ایک نیا دور نرالی شان کیساتھ شروع ہوا۔

نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانہ حکومت میں اصول النغمات الآصفیہ لکھی گئی۔ جو فارسی میں تھی۔ کہتے ہیں کہ علم موسیقی پر اس سے بہتر کوئی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب میں ہندوستانی فنِ موسیقی کے تمام مدارج کو بڑی وضاحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ اُسی زمانہ میں ایک شخص امید اللہ خاں کوکب اس فن کے مستند استاد اور کلکتہ میں ہندوستانی موسیقی کے مشہور پروفیسر تھے۔

غازی الدین حیدر کے عہد میں اس فن کا ایک کامل استاد شخص لکھنؤ میں موجود تھا۔ اس کا نام حیدری خاں تھا۔ ان حضرت کے دماغ میں کچھ فتور تھا جس کی وجہ سے لوگ انہیں "سِڑی حیدری خاں" کہتے تھے لیکن اس سِڑی پن کے باوجود موسیقی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ غازی الدین کو حیدری خاں کا گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے بہت ہی کوشش کی کہ حیدری خاں کو درباری گویوں میں شامل کرلیں۔ مگر وہ کس کے پابند ہونے والے تھے۔ دماغ تو ان کا قطعی آزاد تھا ہی وہ خود بھی بالکل آزاد منش تھے۔ البتہ کبھی کبھی غازی الدین کے کئی کئی مرتبہ بلوانے پر محل شاہی میں آکر بادشاہ کو محظوظ کر دیتے تھے۔ ان کے گانے کا یہ عالم تھا کہ جب بادشاہ کے سامنے گاتے تو بادشاہ کو وجد آجاتا تھا۔ اور وہ پے در پے فرمائشیں کرتے رہتے تھے لیکن دو چار چیزیں کہنے کے بعد حیدری خاں اپنی سنک میں اٹھ کر چل دیتے اور پھر کسی کے روکنے سے نہ رکتے۔ حیدری خاں کا معمول تھا کہ جب محل میں آتے تو فوراً پوریاں اور بالائی کھانے کی فرمائش کرتے اور جس قدر خود کھاتے اسی مقدار میں اپنی اہلیہ کیلئے ساتھ لے آتے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ غازی الدین حیدر نے حیدری خاں کو بلوایا۔ جس وقت وہ آئے تو بادشاہ سلامت شراب ناب کے ساغر چڑھا رہے تھے۔ جب انہیں نشہ کافی ہوگیا۔ تو حیدری خاں سے گانے کی فرمائش کی لیکن آج خدا جانے بادشاہ کس رنگ میں تھے۔ حیدری خاں سے فرمایا: "دیکھو آج میں تمہارا گانا سنکر صرف خوش ہونا نہیں چاہتا۔ مگر آج تم نے مجھے اپنے گانے سے رُلا نہ دیا تو میں تم کو قتل کرا دوں گا۔" حیدری خاں سِڑی تو تھے مگر جان سب کو پیاری ہوتی ہے قتل کا نام سنتے ہی مارے خوف کے کانپ گئے اور خاموش ہوکر بادشاہ کی طرف رحم آلود نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ چند منٹ کے توقف کے بعد گانا شروع کیا۔ اور اسقدر جوش و خروش کے ساتھ گایا کہ بادشاہ کے روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ یوں کہئے خدا کو جان بچانی منظور تھی۔

جب انہوں نے گانا اور بادشاہ نے رونا ختم کیا تو بادشاہ حیدری خاں سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا: "حیدری بولو کیا مانگتے ہو"۔ حیدری خاں نے جان بچتے ہوئے دیکھ کر بادشاہ سے تین مرتبہ قول لے کر کہا: "حضور بس یہ چاہتا ہوں کہ آئندہ غلام کو کبھی نہ بلایا جائے"۔ بادشاہ یہ سنکر مسکرائے اور کافی انعام دے کر ان کو رخصت کیا۔

اب نشہ زندگی اُتر چکا ہے ساقی
پیمانۂ عمر بھر چکا ہے ساقی
کرتی ہے نگاہِ مست بیخود کس کو
آپے سے کوئی گزر چکا ہے ساقی

ماہر فریدی

شیلا کے نام!

از جناب آثر مچھلی شہری

تم نے دل توڑا ـــــ تم نے ایک مجبور کا صبر لوٹ لیا۔ ہر ایک محبت نہیں کر سکتا۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو ـــــ میں نے تم پر اعتبار کیا ـــــ میں نے تم سے سچی محبت کی۔ میں نے تم کو اپنا سمجھا۔

تم نے مجھے دھوکا دیا ـــــ جتنے تمہیں آج تک ملے ہونگے سب اپنی اپنی غرض سے۔

ـــــ مجھے بتاؤ ـــــ

میں نے تم سے کیا چاہا ـــــ میں نے تم سے کیا مانگا ـــــ میں نے تم پر کب نگاہ غلط انداز ڈالی ـــــ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ـــــ میں نے تم کو کب دھوکا دیا۔

پھر کیوں ـــــ تم نے مجھ سے بے وفائی کی۔

تم بے وفا ہو ـــــ تم سنگدل ہو ـــــ تمہاری آنکھوں میں رس نہیں تھا۔ زہر میں بجھایا پانی ـــــ میں نے امرت جانا ـــــ بڑی بھول ہوئی ـــــ

ـــــ میرا صبر لوٹ کے ـــــ مجھے دھوکا دے کے ـــــ مجھے مجبور کر کے ـــــ مجھے رونا چھوڑ کے ـــــ مجھ سے بیوفائی کر کے ـــــ مجھے جینے جی زہر دے کے ـــــ تم بھی بھل بھول نہیں سکتیں ـــــ

تمہاری زندگی گلاب کے پھول کی طرح تو ہوگی ـــــ مگر اس کے کانٹے دل میں چبھا کریں گے ـــــ تم ایک ایسے ہمدرد سے الگ ہو رہی ہو کہ اگر زندگی بھر ماتم کرو تو بھی کم ہے۔

محبت وہ آگ ہے جو بجھانے سے اور بھڑکتی ہے ـــــ مگر تم کو مجھ سے محبت کہاں تھی۔ تم مجھے دھوکا دے رہی تھیں ـــــ بالآخر ـــــ!! میں اپنی مرضی کے خلاف تمہیں لکھ رہا ہوں۔ کم بخت بار غم ممکن ہے اس صورت میں کچھ ہلکا ہو سکے ـــــ آج مجھے اپنی تنہائی کا احساس بے انتہا ہو رہا ہے ـــــ ڈرتا ہوں کہیں کائنات کی ہر چیز سے مجھے نفرت نہ ہو جائے ـــــ مجھے جواب نہیں چاہئے ـــــ مجھے کچھ نہیں چاہئے ـــــ

ـــــ دور افتادہ "شاہد"

آخری رات

از جناب عبید فتحپوری

برمن جفا ز بخت بد آمد وگرنہ یار
حاشا کہ رسم جور و طریق ستم نداشت

آج کئی دن سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ پانی برس رہا تھا۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ بارش کی وجہ سے سردی پورے شباب پر تھی۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم میں تیر بنکر پیوست ہوئی جا رہی ہے۔ ہاتھ پیر ٹھٹھرے جا رہے تھے۔ بوجہ بارش معلوم ہوتا تھا کہ رات کافی بھیگ چکی ہے۔ ہوا کی سنسناہٹ اور درختوں کے پتوں کے ہلنے کی آواز کے سوا ہر چیز خاموش تھی ——— خوفناک سناٹا ——— بھیانک تاریکی ——— ڈراؤنی رات ——— البتہ ایک گوشہ سے برق رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ جو اپنی طلائی روشنی سے تاریکی دور کر دیتی تھی اور بادل کی گرجدار آواز خاموش فضا میں ایک تلاطم پیدا کر دیتی تھی۔

قریب گھنٹے نے ۱۱ بجائے ——— میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وقت گذر رہا تھا اور دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل سینے سے نکلا جا رہا ہے۔ مجھے کسی کا انتظار تھا۔ آنکھ در پر اور کان آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ ایک ایک منٹ مثل ایک ایک گھنٹہ کے گذر رہا تھا ——— اُف انتظار کی گھڑیاں۔ ٹھیک ۱۱ بجے آنے کو کہا تھا۔ نہ آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

شاید رات کی تاریکی ——— فضا کی خاموشی ——— دل ہلا دینے والی گرج ——— بجلی کی چمک ——— ان سب چیزوں نے اس پر خوف طاری کر دیا ہو ——— خفیف آہٹ ہوئی ——— میں چونک گیا۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کھڑکی کی زنجیر ہل رہی ہے ———

ہوا کا ایک جھونکا آیا جس سے شمع لرز گئی۔ ابر [illegible] رواں رہا تھا۔ پیروں کی چاپ معلوم ہوئی میں کھڑا ہو گیا۔ برق نے دور سے جھانکا ——— اسی روشنی میں کسی کا متبسم چہرہ دکھلائی دیا۔ میں قریب گیا ——— بادل ایک بار پھر گرجا۔ اپنی مہیب ناک آواز سے چونکا دیا ——— یہ معلوم ہوا کہ آسمان پھٹ پڑا۔ وہ سہم کر میری آغوش میں گری اور سمٹ کر رہ گئی۔

عضو عضو سے جوانی ٹپک رہی تھی حسن پھوٹا پڑتا تھا۔ آنکھیں حیا سے جھکی ہوئی تھیں۔ خوف سے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے ——— اس نے ایک مرتبہ آنکھیں کھولیں ——— ہلکی سی انگڑائی لی اور سر میرے شانے پر رکھتے ہوئے ایک دلکش آواز کے ساتھ کہا۔ آپ کو بہت انتظار کرنا پڑا۔ اس کی مترنم آواز میرے کانوں میں گونج گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ صدہا بربط کے تار ایک ساتھ فضا میں بلند ہو گئے۔

میں نے کہا۔ خدا کیلئے مجھ پر رحم کھاؤ میری آرزوؤں کو پامال نہ ہونے دو۔ مجھ ستم رسیدہ پر مظالم کی بارش نہ کرو۔ اب مجھ میں تاب نہیں کہ انتظار کی گھڑیاں گنا کروں۔ بغیر تمہارے میری زندگی بے کیف ہے۔ کیا مجھے تم اپنا نہیں بنا سکتی ہو؟ میرا رنج خوشی سے اور بیقراری سکون سے نہیں بدل سکتی ہو؟ اور کیا اس اجڑی دنیا کو اپنے دم سے آباد نہیں کر سکتی ہو؟ میں مستقل سکون۔ مستقل راحت چاہتا ہوں۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر کو میری آغوش میں چھپاتے ہوئے کہا کہ سب کچھ کر سکتی ہوں۔ پیارے اسلم اگر تم چاہو ——— تم آزاد مرد۔ میں مجبور عورت ——— تم با اختیار میں بے اختیار ——— تم چاہو تو ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ کیا تم سمجھے ہو کہ میری زندگی پر کیف پر بہار ہے۔ نہیں میری چاندنی بغیر تمہارے جاڑوں کی سی چاندنی ہے۔

میں مجبور ہوں لاچار ہوں۔ اپنے سے کچھ نہیں کر سکتی۔ زبان بھی نہیں ہلا سکتی۔ تھوڑے وقفہ کے بعد اس نے کہا کہ آج شاید یہ آخری رات ہے۔ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ سسکیوں نے زبان روک دی۔ الجھے الجھے فقرے لبوں پر آ کر رہ گئے۔

میرا سر چکرانے لگا ——— پیر لڑکھڑائے ——— دیوار کا سہارا لیکر میز پر سر رکھدیا۔ مجھ پر ایک غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ جسم سنسنا رہا تھا مجھے نہیں معلوم کہ اس حالت میں میں کتنی دیر رہا۔

میز پر سے جب سر اٹھایا تو وہ نہ تھی۔ پانی برس چکا تھا کہیں کہیں پر تارے جھلملا رہے تھے۔ چاند اپنی روشنی سے دنیا کے ذرہ ذرہ کو تابانی

عشق و رومان کی دلکش رنگینیوں سے لبریز

سہیلی کے خطوط

ایک معرکہ آرا بلند پایہ دلکش معاشرتی شاہکار

از جناب مولانا ابو محمد امام الدین رامنگری

پہلا خط

بنارس اسٹیشن گنج - ۲۸ دسمبر ۱۹۴۰ء

پیاری کرشنا!

تم تو میرے خیالات سے اچھی طرح واقف ہو، میں اکثر کہا کرتی تھی کہ مجھے مرد کی لونڈی بنکر رہنا پسند نہیں، میں شادی نہ کروں گی۔ اپنی روزی خود کماؤں گی اور آزاد زندگی گزاروں گی۔ اسلئے میں نے اسکول میں نوکری کی۔

تمہیں یہ بھی معلوم ہے کرشنا کہ جہاں میں آزادی کی اسقدر حامی تھی وہاں عورتوں کی آج کل کی جنسی آزادی اور بے راہ روی کی سخت مخالف بھی تھی اور میں آج بھی اپنے دل کا جائزہ لیتی ہوں تو اسے اس گندے اور غلط جذبے سے یکسر خالی پاتی ہوں پھر بھی نہ جانے جوانی کا تقاضا تھا یا کیا کہ میں ایک نوجوان کو دیکھ کر اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکی اور اس سے وابستہ ہو گئی۔ اس "وابستہ" کے لفظ سے کچھ اور نہ سمجھ لینا کرشنا میں نے ان سے باقاعدہ شادی کر لی وہ بھی کچھ ایسے ویسے نہیں ہیں۔ ایک شریف اور اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

مرد عورتوں پر کہاں تک اعتماد کرتے ہیں بتانے کی ضرورت نہیں، میرے پتی دیو بھی تو آخر مرد ہی ہیں۔ ایک روز انہوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ تم اسکول کی ملازمت چھوڑ دو اور میری ہی آمدنی میں گذر کرنے کی کوشش کرو۔

میں نے بھی انہی کی طرح محبت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ جب تک ہماری مالی حالت بہتر نہیں ہو جاتی، اس لگی ہوئی نوکری کا چھوڑنا مناسب نہیں۔ یہ مکان جس میں ہم لوگ رہتے ہیں ہماری حیثیت کے لائق نہیں ہے۔ ہمارا معیار معاشرت اس سے کہیں بلند ہونا چاہیے جو اس وقت ہے۔ جب تک آپ کی آمدنی کافی نہیں ہو جاتی مجھے کام کرنے دیجئے۔ اس کے بعد میں خود نوکری چھوڑ دوں گی۔

وہ بولے ـــــ مجھے اونچی معاشرت کی حرص نہیں۔ مان لیا کہ یہ گھر ہماری حیثیت کے لائق نہیں ہے لیکن تمہارے ساتھ میں اسے بھی سورگ سے کم نہیں سمجھتا، جہاں تم ہو وہ جھونپڑا بھی ہو تو میرے لئے راج محل ہے

وفور محبت سے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں لیکن میری بدبختی تھی نہ جانے کیا کہ مجھ پر اُن کی پیار بھری باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوا میں نے خشک لہجے میں کہا۔ آپ کو اونچی معاشرت کی حرص نہ ہو لیکن مجھے تو ہے۔ آپ بڑے گھر کے آدمی ہیں۔ آپ کو کسی بات کی تمنا نہیں ہے۔ لیکن میرے دل کی تو کوئی آرزو نہیں نکلی، میں تو اچھا کھانا چاہتی ہوں اچھا پہننا چاہتی ہوں۔ اچھے گھر میں شاندار زندگی گذارنی چاہتی ہوں۔

اُن کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ انہوں نے اداس ہو کر کہا۔ میں خود غرض نہیں ہوں اوشی! میں تمہیں خوش اور مطمئن دیکھنا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتا ہوں۔ لیکن ازدواجی معاملے میں ذرا میں قدامت پسند واقع ہوا ہوں۔ میں چاہتا ہوں میری شریک زندگی میرے سہارے ہو۔ میں اسے دنیا کے نشیب و فراز میں ٹھوکریں کھانے کیلئے چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ میں اسے ایک نازک کلی سمجھتا ہوں جسے حوادث کے طوفان کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی سخت سے سخت نقصان پہونچا سکتا ہے"

میں گھبرا کر درمیان ہی میں بول اٹھی ـــــ آپ اس قدر پُر تکلف اور پیچدار پیرایہ کیوں استعمال کر رہے ہیں؟ صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپکی بیوی محض آپ کی پرستار ہو۔ وہ آپ کے سوا دنیا کی کسی چیز کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ اس کی آرزو، اس کی تمنا، اس کا جذبہ اس کا شوق، اس کی خواہش، اس کی پسند جو کچھ ہو آپ کی ذات ہو۔

وہ کچھ جھینپ گئے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے۔ کاش تم میرے جذبات و خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرتیں اوشی!

میں نے ان کے زانو پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

میں آپ کے جذبات و خیالات کی قدر کرتی ہوں مجھے ایک سال اور کام کر لینے دیجئے۔ اس عرصہ میں آپ کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو جائیگا اور میں بھی کچھ رقم پس انداز کر لوں گی۔ پھر میں خود نوکری چھوڑ دونگی۔

اس میں شک نہیں کرشنا کہ وہ مجھے دل سے پیار کرتے ہیں۔ وہ تا امکان مجھے کسی طرح رنج پہونچانا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی خواہشوں کی تکمیل کیلئے بڑی حد تک آزاد ہوں۔ میں نے ایک دوسرا شاندار مکان کرایہ پر لے لیا ہے۔ میرا اسکول کی نوکری بھی کر رہی ہوں، اور اپنی ازدواجی زندگی کی طرف سے بھی پورے طور پر خوش اور مطمئن ہوں۔

میرے ساتھ پتی دیو کی محبت اور شیفتگی روز بروز ترقی کرتی جارہی ہے۔ صبح کے ہنستے ہوئے سورج سے جس طرح نوخیز کلی کھل جاتی ہے ان کے نرمل پریم سے میرے دل کی کلی بھی کھل گئی ہے۔ آجکل میری زندگی کی بسنت کے دن ہیں میں روزانہ اسکول سے واپس آتے ہوئے اپنے استعمال کی کوئی نہ کوئی چیز ساری وغیرہ لاتی ہوں جسے دیکھ کر وہ اظہار مسرت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ میری بڑی تمنا ہے اروشی کہ میں کسی روز خود اس لائق ہو جاؤں کہ تمہارے لئے اسی طرح روز نئی نئی چیزیں لایا کروں۔

ان کے الفاظ سے ظاہر ہے کرشنا کہ میری ملازمت کے بارے میں ان کے خیالات جو پہلے تھے وہی اب بھی ہیں۔ وہ میرا اور وقت کا لحاظ کر کے خاموش ہو گئے ہیں۔

کبھی کبھی وہم سا ہونے لگتا ہے کہ میری سکول کی نوکری اور اس پر پتی دیو کے اختلاف کے باوجود میرا اصرار میرے لئے مضرت رساں اور مصیبت ناک ثابت نہ ہو۔

تمہاری سہیلی اروشی

دُوسرا خط

بنارس۔ اشیشر گنج ۱۰ جنوری ۴۱ء

بہن کرشنا! پیار! تمہارا محبت نامہ ملا۔ تم نے مجھے مبارکباد دی ہے کہ مجھ کو اب محبت کرنے والا شوہر ملا۔ میں بھی اس کیلئے اپنے کو قابل مبارکباد سمجھتی ہوں۔ لیکن دیکھتی ہوں کرشنا ایسا اچھا پتی پاکر بھی میری قسمت میں خوشی اور سکھ نہیں لکھا ہے۔

تمہیں یاد ہوگا میں نے پچھلے خط میں اس وہم کا اظہار کیا تھا کہ اسکول کی ملازمت میرے نقصان اور مصیبت کا باعث نہ ہو۔ اب میں دیکھتی ہوں اس کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

ہوا یہ کہ ایک روز میرے پتی دیو مجھے لینے سکول چلے گئے۔ وہاں میں نے اپنے پرنسپل سے ان کا تعارف کرایا۔ پرنسپل صاحب کی عمر تو پچاس سال کی ہے لیکن وہ اتنے توانا و تندرست ہیں کہ تیس برس کے جوان معلوم ہوتے ہیں۔

شام کو پتی دیو نے کھانا کھاتے کھاتے یکایک کہا۔ تمہارے پرنسپل تو بہت اچھے ہیں۔

میں نے کہا۔ ہاں، ہیں تو اچھے۔

اور خوبصورت بھی ہیں! انہوں نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔

"وہ شادی شدہ ہیں کنوارے؟" انہوں نے پوچھا۔

"انہوں نے شادی ہی نہیں کی۔ انہیں عورتوں سے طبعاً نفرت ہے"

"کسی مرد کو عورت سے طبعاً نفرت نہیں ہوتی" انہوں نے اپنے لہجے پر زور دیکر کہا۔

"وہ بھی تو مرد ہی ہیں، پھر انہیں عورتوں سے کیوں نفرت ہے؟"

"کون جانے کہ یہ ان کا محض مکر و فریب ہے یا کوئی عارضی جذبہ؟" انہوں نے ایک حقارت آمیز نفرت سے کہا۔

وہ کھانے کی میز سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھی اور ان کے ہاتھ سے اخبار چھینتی ہوئی بولی۔ آپ جوان ہو کر پچاس برس کے بڈھے سے حسد کرتے ہیں۔ ان بیچارے نے تو خیر و عافیت کے سوا کبھی مجھ سے بات تک نہیں کی۔ میں انہیں اپنے باپ کے مثل سمجھتی ہوں۔

بات تو ختم ہو گئی کرشنا لیکن اس روز سے ہمارے ازدواجی رشتے میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔ اس کا پتہ مجھے اس کے بعد ایک واقعہ سے چلا۔

میں ایک روز شام کو ذرا دیر کر کے سکول سے گھر آئی اور لگی کھانا پکانے کا بندوبست کرنے تو پتی دیو بولے۔ کھانا نہ پکے گا۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔ کیوں؟

کہنے لگے۔ ماں کے ہاں سے نوکر آیا تھا۔ کہہ گیا ہے۔ آج ہم وہیں کھانا کھائیں گے۔

میرے ساس سسر بنارس ہی میں رہتے ہیں لیکن ایک ساتھ رہنے سے ساس سے جھگڑا بکھیڑا نہ ہو اس لئے میں نے پتی دیو کو علیحدہ رہنے پر رضا مند کر لیا تھا۔

آج رات کو ہم نے ساس ہی کے ہاں کھانا کھایا۔ پتی دیو نے کھانا کھاتے ہوئے کھانے کی تعریفوں کے پل باندھ دئے۔

ماں بولیں۔ کھانا میں نے نہیں جمنا نے پکایا ہے۔

پتی دیو نے کہا۔ جمنا تو بہت اچھا کھانا پکاتی ہے۔

میں جمنا کو جانتی تھی۔ وہ میری ساس کی پڑوس میں رہتی تھی، اس کے باپ ماں بہت غریب تھے۔ وہ دیکھنے میں تو زیادہ خوبصورت نہیں تھی مگر طبیعت کی نرم اور میٹھی تھی۔

اس روز کے بعد سے ہم کئی بار اپنی ساس کے

ہاں کھانا کھانے لگتے ہیں۔
جمنا کو دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں وہم سا ہوتا ہے کرشنا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبت کے جس رشتے نے مجھے اور پتی دیو کو ایک میں باندھ رکھا تھا وہ رفتہ رفتہ ڈھیلا ہوتا جا رہا ہے۔

تمہاری ——— اروشی

تیسرا خط

بنارس لشیشر گنج۔ ۲۵ مارچ ۱۹۸۱ء

کرشنا! نمستے، ایک مہینے سے زیادہ عرصہ ہوا کہ میں نے تمہیں خط نہیں لکھا۔ کیا اچھا ہوتا کہ میں اپنے عہد پر قائم رہتی اور شادی نہ کرتی۔ مجھے اپنی اس عہد شکنی کا عجب عجب طرح سے خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ میں نہیں جانتی میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ لیکن مجھے اپنا مستقبل خوشگوار نظر نہیں آتا۔ میری ازدواجی زندگی روز بروز زہرناک ہوتی جا رہی ہے۔ تم نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ مجھے وہی کرنا چاہئے جس سے پتی دیو خوش اور مطمئن رہیں۔ بے شک میری بھلائی اسی میں ہے لیکن کچھ واقعات ایسے پیش آتے جا رہے ہیں جو ہم دونوں کے درمیان کی کھائی کو خلیج بناتے جا رہے ہیں۔

اب ہم مستقل طور پر ساس کے ہاں کھانا کھانے لگے ہیں۔ مجھے کھانا پکانے سے فرصت مل گئی ہے اس لئے اب میں سکول کے کاموں میں اور دلچسپی لینے لگی ہوں۔ سالانہ رپورٹ تیار کرنی تھی۔ اسلئے ایک روز مجھے سکول ہی رات کے دس بج گئے۔

پرنسپل نے میرے پاس آ کر کہا۔ اُروشی! تمہیں بہت دیر ہو گئی ہے۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہے، چلو میں تمہارے گھر پہنچا دونگا۔

پرنسپل سے سکول کے کمرے سے باہر تنہائی میں ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ پرنسپل نے مجھے اتنی دیر کام میں لگائے رکھنے کیلئے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ تم اتنی دیر تک سکول کا کام کرتی رہ جاتی ہو جس سے تمہاری گھریلو زندگی پر یقیناً بے جا بار پڑتا ہوگا۔

میں بولی۔ نہیں، نہیں، مجھے گھریلو زندگی سے زیادہ اسکول کے کاموں میں دلچسپی ہوتی ہے۔

میرے جواب سے صاف ظاہر تھا کہ میں اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں ہوں اور میں جہاں تک محسوس کر سکی نہ جانے کیوں پرنسپل کو میرے اس جواب سے خوشی سی ہوئی۔

موٹر سے اتر کر ساس جی کے گھر میں قدم رکھتے ہی میں نے جو سین دیکھا کرشنا، اس کا مجھ پر کیا اثر ہوا میں اسے کیونکر بتاؤں۔ تم عورت ہو میری حالت کا خود اندازہ کر سکتی ہو جمنا ستار بجا رہی تھی اور پتی دیو گنگنا رہے تھے۔ دونوں پر مستی و بے خودی سی طاری تھی دونوں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے معلوم ہوتے تھے

کھانا کھا کر گھر واپس آنے کے بعد میں نے کہا — آپ کی دلچسپیوں میں خلل انداز ہو کر میں نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔

انہوں نے میرے کلیجے میں زہر آلود تیر پیوست کر دیا۔ کیا تم اپنے خوش رو اور ذی وجاہت پرنسپل کے ساتھ کچھ دیر اور گذارنا چاہتی تھیں؟

میرا کلیجہ پگھل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔ انہوں نے نرم ہو کر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ہم ایک دوسرے سے بتدریج دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو عجب نہیں کہ ہم ایک روز ایک دوسرے کیلئے بالکل غیر بن جائیں۔ مجھے تم سے ملنے کے لئے پرنسپل سے ملتجی ہونا پڑتا ہے۔ تمہارا اسکول سے گھر آنا بھی اس کی اجازت اور مرضی پر موقوف ہے۔ جب یہ حالت ہو تو ایک عورت اپنی معاشرتی زندگی کی ذمہ داریاں کو کیونکر پورا کر سکتی ہے؟ .....

میں درمیان میں بول اٹھی۔ لیکن جو پرائی لڑکی کے ساتھ بیٹھ کر گانے بجانے کا لطف اُٹھائے وہ بھی تو ازدواجی زندگی کے حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا؟

"اس کا الزام بھی تمہارے ہی سر ہے" — انہوں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

میں باہر سے تھکا ہارا گھر واپس آتا ہوں۔ اس وقت میری روح ایک محبت اور پیار کرنے والی ہستی کیلئے بیقرار ہوتی ہے تاکہ میں اسے محبت اور پیار کر کے اپنی تھکن اور درماندگی کو بھول جاؤں۔ اس کے علاوہ میں مرد ہوں میرے اندر یہ جذبہ بھی موجود ہے کہ میری بیوی میرے زیر اثر ہو۔ میرے اختیار واقتدار میں رہے لیکن تم سے نہ میرے جذبۂ محبت کی تسکین ہوتی ہے اور نہ میرے جذبۂ اختیار و حکومت کی۔ ان کے اس جواب پر میں کچھ نہ بولی۔

مجھ سے اور پتی دیو سے ایسی بحث و گفتگو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی کرشنا۔ میں نے محسوس کیا کہ جمنا کے بارے میں اس طرح کھلے لفظوں میں طعن و تشنیع کر کے میں نے بڑی غلطی کی۔

تمہاری سہیلی
اروشی

چوتھا خط

بنارس لشیشر گنج، ۱۲ اپریل ۱۹۸۱ء

کرشنا! پیار۔

گنگا اور جمنا دو طرف سے آ کر پریاگ میں مل جاتی ہیں، اور وہاں سے پھر دونوں دو

دھاراؤں میں بہہ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں۔ میرا اور پتی دیو کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہو رہا ہے۔ وہ ہماری زندگی کا سنگم تھا جب ہم ایک دوسرے سے وابستہ ہوئے تھے۔ لیکن اب ہمیں حالات برابر ایک دوسرے سے الگ کرتے جا رہے ہیں۔

میں ایک روز اسکول سے دیر میں آئی۔ ان کا ارادہ مجھے لے کر کہیں جانے کا تھا۔ میں نے کہا۔ میں تو بہت تھکی ہوں۔ مجھے آرام کرنے دیجئے۔

وہ بگڑ کر بولے۔ میں تو تھکی ہوں۔ میں تو تھکی ہوں، تم ہمیشہ یہی رونا روتی رہتی ہو۔

مجھ سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ میں بھی ان کی شعلہ ریز آنکھوں سے آنکھیں ملا کر آگ اگلنے لگی۔ مجھے دن رات کام کرتے کرتے مرنا پڑتا ہے۔ اسلئے اگر ہر وقت تھکی رہتی ہوں تو اس میں جھوٹ کیا ہے؟ تم خود تو اتنا کماتے نہیں کہ میں اپنی خواہش کے مطابق پہن کھا سکوں اچھے مکان میں رہ سکوں اور میں خود اس کیلئے جان کھپاتی ہوں تو بجائے حوصلہ افزائی کے میری دل شکنی کرتے ہو۔

وہ میرے شانوں کو پکڑ کر غضبناک لہجے میں بولے۔ تمہاری یہ ساری بکواس محض لغو اور لایعنی ہے۔ شاندار بلڈنگ اور زری و ریشم کے کپڑوں کے بل چکانے بھر بے شک میری آمدنی نہیں ہے لیکن جس طرح کی زندگی ہزاروں اور لاکھوں شریف اور بھلے آدمی گذار رہے ہیں۔ ویسی زندگی کیلئے میری آمدنی کافی ہے تمہیں کون کہتا ہے کہ تم رات دن کام کر کے جان دو؟ میں نے تو سو بار کہا تم نوکری چھوڑ آؤ۔ لیکن تمہیں تو کروفر اور شان و شوکت سے رہنے کا خبط ہو گیا ہے۔ اور تم تو نمود و نمائش کی دیوانی ہو رہی ہو۔

میں غصے سے سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ اور زخم خوردہ ناگنی کی طرح پھنپھکار رہی تھی لیکن میرا ضمیر ان کی ایک ایک کی تصدیق کر رہا تھا کرشنا!

وہ مجھے چھوڑ کر اپنے کمرے میں گئے اور کچھ کپڑے لے کر باہر جانے لگے۔

میں نے پوچھا۔ کہاں جا رہے ہیں؟

بولے۔ اب میں یہاں نہیں رہونگا۔

میں ان کا راستہ روک کر ان کے پیروں پر گر پڑی اُنہوں نے مجھے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ میں رو رہی تھی۔ اُنہوں نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ واقعی تم تھکی ہوئی تھیں۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی میں بہت بُرا آدمی ہوں۔

یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر تک کسی گہرے خیال میں غرق رہے پھر بولے۔ یہ سب ہمارا طرز معاشرت کا فساد ہے۔ ہم بہت غلط راستے پر جا رہے ہیں اگر ہم نے بہت جلد اپنا راستہ درست نہ کر لیا تو ہم کہیں سے کہیں پہونچ جائینگے میں تم سے محبت کرتا ہوں اسلئے محبت ہی کے نام پر تم سے کہتا ہوں کہ اسکول کی نوکری چھوڑ دو۔ دیکھو ابھی ہم میں اتنی صلاحیت باقی ہے کہ ہم اپنے نیک و بد کو سمجھ رہے ہیں۔ لیکن اسوقت ہم نے اس صلاحیت سے کام نہ لیا تو ایک وقت آئیگا جب ہم سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہ جائینگے

پتی دیو کے اس پریم اور خلوص بھرے الفاظ کا مجھ پر بہت اثر ہوا کرشنا، میں نے ان کے کندھے پر سر رکھ کر عہد کیا۔ میں تین مہینے کے اندر نوکری چھوڑ دوں گی۔ اس درمیان میرے تمام بل ادا ہو جائیں گے۔ میں یہ بھی عہد کرتی ہوں کہ اب سے نہایت سادہ زندگی گذاروں گی۔

چند روز تک میں نے اس عہد کی پابندی بھی لیکن ایک روز نظم و ضبط کا یہ بند پھر ٹوٹ گیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن ایک ساری والا میرے مکان پر آیا۔ ایک عرصے سے مجھے ایک خاص "پرنٹ" کی تلاش تھی۔ اتفاق سے وہ اس کے پاس نکل آئی۔ میں اس ساری کے شوق کو دبا نہ سکی۔ میں نے اسے پہن کر اپنے کو قد آدم آئینے میں دیکھا کرشنا۔ میں کیا بتاؤں اس ساری نے میرے حسن و جمال میں کس طرح چار چاند لگا دیئے۔ میں خود اپنے آپ پر نچھاور ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا میری آنکھوں کی کشش میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے میرے چہرے میں ایک خاص دل آویزی پیدا ہو گئی ہے۔ میرے عضو عضو سے حسن پھوٹا پڑ رہا ہے میں خوبی و خوشنمائی کا مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔

اس اعلیٰ درجہ کی نفیس اور دیدہ زیب ریشمی پھولدار ساری کی قیمت سو روپے تھی میں نے سوچا اتنی اچھی ساری جلدی کہاں ملتی ہے۔ لے لو۔ جہاں تین مہینے اسکول میں کام کرنا ہے تین مہینے اور سہی۔

پتی دیو کے آنے پر میں نے بڑی خوشی سے انہیں وہ ساری اور بتایا کہ کسی طرح تین مہینے اور کام کر کے اس کا بل چکا دیا جائیگا۔

میری بات سُن کر ان کے چہرے پر ایک افسردگی سی طاری ہو گئی۔ وہ ایک عجیب خشک نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جذبات کے اُٹھتے ہوئے طوفان کو بزور دبانے کی کوشش کر رہے ہیں میں سہمی جا رہی تھی۔ اگر وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے کرشنا، تو میرا دل بھی ہلکا ہو جاتا لیکن انہوں نے جیسے بہت مشکل سے اتنا کہا۔ جب تم اپنے عہد کو ایک ساری پر قربان کر سکتی ہو تو میرا تم سے

کچھ کہنا عبث ہے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کرشنا، کہ جب انسان غلط روی کا عادی ہو جاتا ہے تو سیدھی راہ چلنے کے باوجود اس کے قدم بے اختیار غلط راستے پر پڑ جاتے ہیں۔ اپنی حالت تو مجھے یہی تجربہ ہوا۔ دوسروں کی نسبت میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ خیال کہاں تک درست ہے؟

تمہاری سہیلی ۔۔۔ اروشی

پانچواں خط

بنارس اشیشر گنج، ۴ مئی ۱۹۴۱ء

کرشنا! نمستے!

میں اس قدر پڑھ لکھ کر بھی اس سے ناواقف تھی کرشنا، کہ کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں کا نتیجہ بھی نہایت دور رس اور ہولناک ہوتا ہے۔ میں نے اپنے شوق اور پسند کی نہ جانے کتنی چیزیں خود خریدی تھیں۔ ایک ساری بھی خرید لی لیکن اگر میں جانتی کہ وہ ساری میری تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی تو اُسے کیوں خریدتی؟

مگر نہیں، میں نے اس روز بھی اپنے کو دھوکہ دیا جس روز ساری خریدی اور آج پھر اپنے کو دھوکہ دے رہی ہوں، اور اپنے ساتھ تمہیں بھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میرے پتی دیو کسی قیمت پر بھی میری سکول کی نوکری کو پسند نہیں کرتے۔ اس لئے مآل اندیشی کا تقاضا تھا کہ میں تین مہینے کی بجائے دو ہی مہینے میں نوکری چھوڑ دیتی لیکن ساری کیلئے میں نے وہ مدت دگنی کر دی۔

ایسی حالت میں ان کا میری طرف سے مایوس اور دلبرداشتہ ہو جانا ایک فطری امر تھا چنانچہ اس روز سے وہ ایک گھر میں رہ کر بھی اجنبی سے رہنے لگے۔ میرے پہلو میں بھی دل تھا۔ میں اس حالت کو کب تک برداشت کرتی؟ میں انس و محبت کیلئے بیقرار ہو گئی۔

پرنسپل کے طرز عمل میں میرے لئے تسکین و تسلی کا کافی سامان موجود تھا، میں ان کی جانب مائل ہو گئی۔ وہ اور میرے ساتھ مزید توجہ اور مہربانی سے پیش آنے لگے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کرشنا، کہ میں عفت و حیا کی حدود سے تجاوز کر گئی یا پرنسپل کے طرز عمل میں کسی غلط اقدام کا اشارہ پایا جاتا تھا۔

اس طرح کی کوئی نازیبا بات نہ تھی، پھر بھی آج مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دو اجنبی مرد و عورت کا حد سے زیادہ ربط و ضبط کسی طرح مناسب نہیں۔ اور تنہائی میں تو دونوں کو ہرگز نہ جانا چاہئے ورنہ دونوں اپنے کیرکٹر کے کتنے ہی پختہ ہوں اور دونوں کے تعلقات و مراسم میں کتنی ہی بے لوثی و پاکیزگی ہو لیکن ایک نہ ایک روز وہ تباہی کے غار میں گر کر رہیں گے۔

اب تمہیں وہ واقعہ لکھتی ہوں کرشنا، جس نے میری بدنصیبی اور بربادی پر آخری مہر لگا دی۔ جس روز میرے سکول کا سالانہ جلسہ تھا اسی روز اتفاق سے پتی دیو کے بنک کا بھی سالانہ جلسہ تھا۔ صبح کے ناشتے کے بعد پتی دیو مجھے ساتھ لے کر بنک کے جلسے میں جانا چاہتے تھے کہ پرنسپل مجھے اسکول کے جلسے میں لے جانے کیلئے آ گئے۔ پتی دیو نے پورا ناشتہ بھی نہیں کیا اور چپ چاپ گھر سے نکل گئے۔

میں جس وقت اسکول کے جلسے سے فارغ ہوئی رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے۔ پرنسپل نے پھر اپنی کار پر چلنے کیلئے ضد کی۔ میں تھکی تو تھی ہی، کار کے نرم نرم گدے پر نیم دراز سی بیٹھ گئی۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اس غنودگی میں ایسا معلوم ہوا کسی نے میرا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ اس طرح سونے میں مجھے ایک عجیب کیف و سرور حاصل ہو رہا تھا۔ اپنی اضطراب انگیز اور پراگندہ زندگی میں بہت دنوں مجھے ایسا لطف و سکون نصیب نہیں ہوا تھا۔

میرے دروازے پر کار کھڑی کر کے پرنسپل نے مجھے ہاتھ کے سہارے سے نیچے اتارا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی وحشت ہوئی کہ مکان اندھیرا تھا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ پتی دیو ابھی تک گھر واپس نہیں آئے تھے۔ پرنسپل نے میری صورت سے میری حالت کا اندازہ کر لیا۔ وہ بڑی ہمدردی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اندر جانے کے لئے نمسکار کر کے دونوں ہاتھ جوڑے۔

اُنہوں نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی نرمی سے کہا۔ "تم مجھے بہت غمگین نظر آتی ہو اروشی! کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

میں نے اشک آلود آنکھوں سے پرنسپل کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا کرشنا، اُسے لکھتے ہوئے میں شرم و ندامت سے زمین میں گڑی جا رہی ہوں۔ اور غم سے میرا سینہ شق ہوا جا رہا ہے۔

پرنسپل نے مجھے اپنے دونوں بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ میں تڑپ کر دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ پاس ہی سوئچ تھا میں نے روشنی کر دی۔ اس روشنی میں کیا دیکھتی ہوں۔ پتی دیو کھڑے ہیں اور ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں۔

"میری کوئی خطا نہیں ہے۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔" یہ کہتی ہوئی دوڑ کر میں ان کے قدموں پر گر پڑی۔ اُنہوں نے ایک ٹھوکر مار کر مجھے الگ کر دیا اور اپنا سامان لے کر گھر سے نکل گئے مجھے کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ جی میں آیا دوڑ کر ان کا راستہ روک لوں۔ لیکن میں تو

ٹیلیفون نمبر 4555

ڈاکٹر این آر شرما موجد

پی سی سہگل (لوبن چند سہگل) کے متعلق حقیقت

پی سی سہگل موجد ڈائمنڈ کلوریم آئی ڈراپ کی حیثیت ایک فاضل مجسٹریٹ مسٹر بی۔ اے قریشی اسکوائر آئی سی ایس

ناظرین کو معلوم ہوگا کہ کچھ عرصہ ہوا میں نے عوام کو خبردار کرتے ہوئے اخبارات میں لکھا تھا کہ میری ایجاد کردہ آنکھوں کی اکسیر موسومہ پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کی غیر فانی شہرت کو دیکھ کر کئی نقالوں کے منہ میں پانی بھر آیا ہے۔ اور انہوں نے میری دوا سے ملتے جلتے نام کی ادویات تیار کرکے پبلک کو گمراہ کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔ اس مضمون میں لوبن چند سہگل المعروف ڈاکٹر پی سی سہگل جو کہ پہلے میری ملازمت میں رہ چکا تھا اور میری ملازمت سے پہلے پیشہ درزی کیا کرتا تھا۔ جو تنگدستی کی حالت میں میرے پاس بغرض حصول روزگار آیا تھا کے متعلق خاص طور پہ ذکر کیا تھا کہ وہ خود کو ڈاکٹر پی سی سہگل ظاہر کرکے عوام کو گمراہ کر رہا ہے۔ عوام کو اس سے خبردار رہنا چاہئے۔

چنانچہ اس مضمون کی بنا پر اسی لوبن چند سہگل المعروف ڈاکٹر پی سی سہگل نے عدالت میں مجھ پر ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دیا جس کا فیصلہ عدالت مذکور نے ۱۸ جولائی ۱۹۴۱ء کو سنا دیا ہے۔ اس فیصلہ کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ عوام سے میری درخواست ہے کہ اس فیصلہ کو غور سے پڑھیں۔ اور آئندہ ایسے نقالوں سے خبردار رہیں۔ میں یہ پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ میری اس دوائی کا نسخہ سوائے میرے کسی دوسرے کو معلوم نہیں۔ اگر کوئی شخص مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرے۔ تو آپ اعتبار نہ کریں۔

فخریہ اعلان! میں نہایت فخر سے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ میری اس دوا کے استعمال سے آنکھوں کے ہزاروں مریض شفایاب ہوئے ہیں۔ اور اس کے متعلق ہزاروں سرٹیفکیٹ و خطوط دفتر میں موجود ہیں جو

پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ

یہ اکسیر خالص ہندوستانی جڑی بوٹیوں اور بیش قیمت ادویات کا مرکب ہے اور سوائے پیدائشی اندھے آنکھوں کی پھٹ جانا۔ جالا۔ پھولا۔ ککرے۔ پڑبال۔ ہائی ہائی اوپیا۔ مائی اوپیا ہر قسم (عینک لگانے کی عادت) آنکھ سے پانی کامیابی کے ساتھ شفا دیتی ہے۔ اگر اچھی آنکھوں میں بھی ہفتہ میں ایک دو بار ڈالی جائے تو تا عمر کبھی آنکھوں میں

قیمتیں سپیشل پوٹینسی ۔/۱۲/۱۱ نارمل پوٹینسی بڑی شیشی ۔/۴/۴ چھوٹی شیشی ۔/۴/۲ علاوہ محصول ڈاک و خرچہ پیکنگ

لوکل ایجنٹس: — میسرز بیلی رام اینڈ برادس انارکلی لاہور۔ میسرز ڈاکٹر کشن چند اینڈ

ٹیلیفون نمبر ۵۵۵۴

ڈاکٹر این آر شرما موجد پرل کلوریم آئی ڈراپ مالک پرل فارمیسی

اپنے شہر کے مشہور

جادوگر کی ڈائری

ایک ماہر ہپناٹسٹ کیلئے دُنیا کا کون کام مشکل ہے۔

فن ہپناٹزم کے جن حقائق کو سائنس کی مدد سے بھی نہیں سمجھا جا سکتا جو فوق الفطرت ظہورات ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں جو باتیں دنیا والوں کو ناممکن العمل دکھائی دے رہی ہیں جن کراماتوں کی تاویل انسانی عقل کرنے سے قاصر رہی ہے وہ سب ایک ماہر ہپناٹسٹ کیلئے ممکن ہیں۔ عورت، مرد، بڈھا، جوان الغرض دُنیا کا ہر ایک انسان خداوند کریم کی طرف سے اس دولت لازوال کا امین بنکر پیدا ہوا ہے۔ یہ جُدا بات ہے کہ اپنی جہالت کے باعث جیتے جی کوئی شخص اس گنج نایاب کی کھوج اپنے خانۂ دل میں کر سکے لیکن یہ خفیہ طاقت ہے سب کے پاس اور ہر کوئی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کیسے؟ یہ جاننے کیلئے "جادوگر کی ڈائری" کا از اوّل تا آخر نہایت غور سے مطالعہ کیجئے گا۔ (ایڈیٹر)

سیلانی دماغ

(مسلسل)

ہمارا دماغ اس عالمگیر اور کائناتی دماغ کا صرف ایک حصہ ہے جس کی اصل خدا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ "وہ قوت جو کائنات میں ہمارے چاروں طرف ظہور پذیر نظر آتی ہے دراصل وہی قوت ہے جو کہ ہمارے اندر شعور و ہوش کی صورت اختیار کر کے ظاہر ہوتی ہے۔"

پروفیسر میکڈانلڈ نے اپنے بیان کو مشاہدۂ چشم سے شروع کرتے ہوئے کہ "انسان کی آنکھ اس کی پیدائش سے بیشتر ہی مکمل ہو چکی ہوتی ہے۔" اور یہ امر واضح کیا گیا ہے کہ انسان کا دماغ چند غیر مرئی اور ناقابل تشریح ہم آہنگ اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔

یہ اثرات کہاں سے آتے ہیں؟ کیا وہ اس دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں جس میں وقت اور مقام کا کوئی وجود نہیں؟ ——— کیا وہ دُنیا ——— "کائناتی دماغ" کی سلطنت ہے؟

نیند میں چلنے پھرنے والوں کے واقعات ——— جن میں سے ایک کی مثال بیشتر بیان کی جا چکی ہے ——— اور دارُوئے بیہوشی کے اثر سے بیہوش ہونے والوں کے حالات پوری پوری طرح اس امر کو ثابت کر دیتے ہیں کہ فی الحال تحت الشعوری اور شعوری دماغ ایک دوسرے سے ہمیشہ وابستہ نہیں رہتے۔ اسلئے کم از کم اس چیز کا امکان ہو سکتا ہے کہ تحت الشعوری دماغ جسم کیلئے ایک خارجی اثر کی حیثیت رکھتا ہے اور شعوری دماغ کو صرف چند مخصوص حالتوں میں متاثر کرتا ہے۔ حیاتیات کا علم بس اسی حد تک تشریح کر سکتا ہے۔

ہپناٹزم کا علم ہمیں اپنی تحقیق میں اور آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔

مثال کے طور پر لاسلکی کے ٹیلیگراف کو لیجئے۔ اس جگہ ہم کو ایک ایسی قوت ملتی ہے جو تمام دنیا میں چاروں طرف رواں دواں ہے لیکن جب تک یہ قوت کسی ایسے آلہ سے متصادم نہیں ہوتی جو اس کو قبول کرنے کے واسطے خاص طور پر بنایا گیا ہو۔ اس وقت تک یہ قوت کوئی مرئی یا نظر آنے والے اثرات پیدا نہیں کرتی۔

کیا یہی بات شعوری دماغ پر صادق نہیں آ سکتی؟ ——— کیا یہ ممکن نہیں کہ شعوری دماغ ایک خاص طور پر بنایا ہوا آلہ ہو جو کہ "کائناتی دماغ" کے پیغامات کو قبول کر سکتا ہے؟

آپ اس قوت کو خواہ تحت الشعوری دماغ کہیں یا کائناتی دماغ یا پھر خود روح سے تعبیر کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہپناٹزم نے اس قوت کو اتنی بڑی حد تک بے نقاب کر دیا، کہ آج تک کسی نے نہ کیا تھا۔ آخر کار وہ وقت نزدیک آ رہا ہے جب ہم اس قوت کا مشاہدہ و معائنہ کر سکیں گے۔ ممکن ہے کہ ہم اپنی اس تحقیق میں ایک ایسی طاقت کو دریافت کر سکیں جو خود موت پر بھی حاوی ہو۔

مگر آہ ——— کتنا امید افزا ہے یہ خیال کہ انسان خود اپنی روح کے تقاضوں کے بموجب فعل و عمل کرنے کے قابل ہو سکے گا؟

میری زندگی کے انتہائی المناک واقعات میں سے ایک سنئے۔ یہ واقعہ تحت الشعوری دماغ کی اس قوت کی ایک اور مثال ہے کہ عامل ہپناٹزم کے حکم پر یہ دماغ دور دراز فاصلوں پر محیط

ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہی سابقہ یہ واقعہ ان لوگوں کی بدگمانیوں کو بھی رفع کرتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ایک لڑکا اور اس کا باپ خیلاتی اور جذباتی ہم آہنگی کے مالک ہوتے ہیں اور اسلئے متذکرہ سابقہ واقعہ کو ثبوت میں قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

اس موجودہ واقعہ میں ہپناٹزم کے معمول نے کبھی اس شخص کا نام بھی نہ سُنا تھا جسکی تلاش کیلئے اسے حکم دیا گیا۔ وہ دونوں بالکل اجنبی تھے۔ ایک روز میرے کمرے میں ایک شخص آیا جسکو میں اس قصے کیلئے جونس کے نام سے پکاروں گا۔

"میں اپنی بیوی کی غرض سے آیا ہوں" اس نے کہا۔

اتنا کہکر وہ کچھ دیر خاموش رہا اور جب تک وہ خود کو سنبھالنے میں منتظر رہا۔

وہ سوسائٹی میں ایک کافی مشہور شخص تھا اور میں جانتا تھا کہ اس کی بیوی جو اپنی مہمان نوازی اور خوبصورتی کیلئے مشہور تھی۔ بہت دنوں سے بیمار تھی۔

آخرکار وہ بولا "اس کی اعضا کی قوت حرکت سلب ہو گئی ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ اس کا یہ مرض لاعلاج ہے۔ اُسے شکار میں ایک حادثہ پیش آیا تھا جس کا یہ نتیجہ ہوا ہے۔ میں یورپ کے بہترین ڈاکٹروں کو اسے دکھا چکا ہوں مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکے۔ آجکل وہ ڈاکٹر ...... کے زیر علاج ہے" (یہ نام ایک ایسے ڈاکٹر کا تھا جو اپنے زمانہ کا مشہور ترین ڈاکٹر تھا)

"تو آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "میں ایک معمولی ڈاکٹر ——— ایک ماہر اعصاب ہوں ——— جادوگر نہیں ہوں"

"بالکل یہی بات ہے" اس نے کہا "میں اس کے دماغ کی صحت چاہتا ہوں۔ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے وہ بے انتہا اذیت میں ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر اُسے کچھ سکون ——— کچھ مسرت مل سکتی ——— سمجھے آپ؟"

جونس کا مکان کچھ زیادہ دور نہ تھا اور میں نصف گھنٹے میں اس کی بیوی کی چارپائی تک پہنچ گیا۔ بیماری بھی اس خاتون کے حسن وجمال کو نہ مٹا سکی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر سکون و آرام کی وجہ سے نہیں ——— اس کی صورت سے یہ جھلکتا ہے ——— ہر خط وخال سے انتہائی مایوسانہ غم والم کا اظہار ہوتا تھا۔

میں آگے جھکا اور اس کے دُبلے پتلے اور شفاف ہاتھوں کو دیکھا جو کہ بستر پر پڑے ہوئے تشنج کی صورت میں اینٹھ رہے تھے۔

"تم یہ چیز کیوں کھاتی ہو؟" میں نے اکیدم پوچھا "کیا چیز؟"

"تم تو جانتی ہی ہو کہ میرا کیا مطلب ہے" میں نے جواب دیا۔ "یہی کوکین یا اور کوئی چیز ——— یہ چیز تمہیں ہلاک کر رہی ہے"

"آہ ——— آپ غلطی پر ہیں" اس نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب مجھے کوکین جیسی کوئی چیز نہیں دیتے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ وہ ایسا کریں۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتی ——— میں مرنا چاہتی ہوں۔ اور اس طرح ایک بار پھر مسرور ہونا چاہتی ہوں ——— خواہ تھوڑی دیر کیلئے ہی سہی"

مجھے احساس تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ لیکن میں اُسے ثابت نہ کر سکتا تھا۔ جو علامات میں نے دیکھی تھیں وہ اسقدر کافی نہ تھیں کہ اس معاملہ کو اور آگے بڑھایا جاتا۔ شاید اگر میں نے پہلی مرتبہ اسے اسقدر نہ دیکھا ہوتا تو مجھے ایسا شبہ نہ ہوتا۔ باینہمہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرا خیال صحیح تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ان دردانگیز الفاظ میں کوئی شے اس قدر ناقابل یقین حد تک اثر انگیز تھی کہ بے اختیار مجھے یہ خواہش ہوئی کہ اُسے حقیقت دکھا دوں۔

"مجھے اتنی اجازت دیجئے کہ آپ پر نیند طاری کروں" میں نے درخواست کی۔ "آپکے اندر ابھی تک ایک شے ایسی باقی ہے جو خوشی کے بغیر مسرور رہنا جانتی ہے ——— ایک ایسی شے جو آپ کے اندر جینے کی آرزو پیدا کر دیگی۔ اگر آپ مجھے اجازت دیدینگی تو میں آپ کو نیند میں ڈبوکر یہ شے آپ کو تلاش کر کے دکھا دونگا"

مگر اس نے انکار کر دیا ——— اور اگرچہ میں اگلے دن اور اس کے بعد کئی دن تک آتا رہا لیکن وہ کبھی راضی نہ ہوئی۔

اسی زمانے میں ایک روز ڈاکٹر ...... میرے پاس آیا جو اس کا معالج تھا۔ اس نے منشیات کی بابت میرا خیال وشبہ سُنا تھا۔ اُس نے انکار کے طور پر اپنے شانے ہلا کر کہا ——— "یہ ناممکن ہے۔ اُسے یہ منشیات حاصل ہی کیسے ہو سکتی ہیں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا" میں نے کہا "لیکن مجھے یہ پختہ یقین ہے کہ وہ خود کو ہلاک کر رہی ہے"

ہم نے اس مسئلہ پر کچھ دیر تک گفتگو کی۔

اس کے بعد میں نے ایک شخص کو بلایا جس پر میں اکثر ہپناٹزم کے تجربات کیا کرتا تھا۔ بہت جلدی وہ نیند میں ڈوب گیا۔

"اب ہم دیکھیں گے کہ حقیقت کیا ہے" میں نے کہا اور اس کے بعد خوابیدہ معمول سے مخاطب ہو کر بولا ——— "جاؤ۔ مسز جونس کے مکان میں اس کے کمرے میں جاؤ اور جو کچھ نظر آئے مجھے بتاؤ"

اُس نے فوراً جواب دیا ——— "وہ وہاں نہیں ہے۔ چارپائی خالی ہے"

میں نے اور ڈاکٹر نے خاموشی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخرکار میں نے معمول سے کہا "پھر وہ کہاں ہے؟ اسے تلاش کرو"

"وہ ایک برابر والے کمرے میں ہے ——— اپنی

خلوت گاہ میں"۔

"وہ وہاں کیا کر رہی ہے؟ جو کچھ تم دیکھتے ہو سب ہمیں بتاؤ"۔

"وہ ایک چھوٹے کوچ پر لیٹی ہے۔ ایک مرد اس کے پاس ہے۔ وہ اس کے اوپر جھکا ہوا ہے اور ایک چھوٹی سی سبز بوتل میں سے کوئی چیز اسے دے رہا ہے"۔

دس منٹ بعد ہی ہم نے جونس کے مکان پر پہونچکر گھنٹی بجائی اور کسی تکلف کے مسز جونس کے کمرے میں پہونچ گئے۔ وہ اپنی چارپائی پر موجود تھی ـــــ خوابیدہ!!

ایک ساعت کیلئے میں بدحواس ہوگیا۔

ڈاکٹر مسکرایا۔ اور بولا ـــــ "آپ کے جاسوس نے غلط خبر دی ہے"۔

اس کے طنزیہ لہجے سے مجھے اذیت ہوئی۔

"ٹھہرو" میں نے کہا اور مریضہ کی طرف متوجہ ہوکر جو کہ اب بیدار ہو رہی تھی یا محض بیدار ہونے کا بہانہ کر رہی تھی دریافت کیا ـــــ "کیا آپ بہت دیر سے اس جگہ موجود ہیں؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں؟ ـــ میں سو رہی تھی۔

"اور وہ دوسرا کمرہ ....؟"

ہاں ہاں ـــ میں وہاں گئی تھی۔ میرے اعصاب کی مالش کرنے والا آیا تھا۔ وہ اب چلا گیا ہے"۔

میں فوراً ٹیلیفون پر پہونچا اور اس شخص کو مکان واپس بلایا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو بالکل متین و سنجیدہ تھا لیکن میں اس وقت کسی قسم کے تکلفات گوارا نہ کر سکتا تھا۔

"ادھر آؤ" میں نے دروازہ محفوظ کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس خاتون کو کتنے عرصہ سے جانتے ہو؟"

اس نے لیت و لعل کیا اور مسز جونس کی طرف دیکھا جس کی دہشت زدہ نظریں اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی تھیں۔

"نہیں" میں نے اس کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "نہیں ـــ مجھے اس خاتون نے کچھ بھی نہیں بتلایا ہے۔ لیکن میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ابھی نصف گھنٹہ پہلے تم وہاں خلوتگاہ میں ان کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ یہ کوچ پر لیٹی تھیں اور تم ایک چھوٹی سی سبز بوتل سے ان کو کچھ دے رہے تھے۔ تمہیں اسوقت دیکھا جا رہا تھا"۔

اس کے بعد سب کچھ آسان ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ خود مسز جونس ہی نے اس شخص کو مجبور کیا تھا۔ ایک پُر سرور و پُر لطف زندگی کے بعد جو وہ اتنی طویل مدت تک بسر کر چکی تھی اُسے اپنی بیماری ایک ناقابل برداشت مصیبت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے مسرت کو ہر ایک قیمت پر خرید لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور اُسکی پیہم درخواست و اصرار پر آخر کار یہ شخص اس حرکت پر آمادہ ہوگیا تھا۔

آہ غریب عورت!! ـــــ کاش اُسے حقیقت معلوم ہوتی!! ـــــ اگر وہ صرف چند منٹ کیلئے خود کو میرے حوالے کر دیتی تو اُسے وہ مسرت حاصل ہو جاتی جس کیلئے وہ اس بُری طرح تڑپ رہی تھی۔ جینے کی ایک نئی آرزو کے ساتھ جو کہ اس مسرت کے ذریعہ اسے ملجاتی اُسے دماغ کی مزید طاقت بھی حاصل ہو جاتی ـــــ اُسے ایک نیا ارادہ اور عزم نصیب ہو جاتا جو ڈاکٹر کی دواؤں کے ساتھ مل کر اُسے شفا دیدیتا اور اُسے اسکی وہ زندگی پھر واپس دلا دیتا جو اُس سے اسقدر جلدی چھین لی گئی تھی!! ـــــ یہ سب کچھ میرا قیاس ہے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ



مرتبہ ـــــ جناب شاہین مسرور قمر بی اے (بہاولنگر)

۱۔ جو لوگ اپنے خلقی فائدے کیلئے تھوڑی سی تکلیف نہیں اُٹھا سکتے ان کیلئے دنیا میں ذلت اور نکبت کے سوا کچھ نہیں دھرا۔ ۲۔ بیوفاؤں سے محبت نہ ہو تو محبت میں مزہ ہی کیا ہے۔ شکوہ شکایت بیتابی اور بیقراری ہی تو محبت کے مزے ہیں۔ ۳۔ زندگی کی تکمیل کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے ڈگری کی نہیں۔ ہماری ڈگری ہے ہمارا اخلاق۔ ہماری سیرت ہمارا لطف حیات۔ ہمارا جوش عمل۔ اگر یہ ڈگری نہیں ملی۔ اگر ہمارا ضمیر بیدار نہیں ہوا تو حروف تہجی کے دم چھلے بیسود ہیں۔ ۴۔ غلطی ہو یا بھول صرف محبت کی نگاہیں ہی اُسے نظر انداز کر سکتی ہیں۔ بچہ چلنے سے پیشتر بار بار ٹھوکریں کھا کر گرتا ہے۔ مگر ماں اُسے حوصلہ دیکر اُٹھاتی ہے۔ ۵۔ بیکاری ایک ایسی غذا ہے جس سے انسان دوگنا ہو جاتا ہے۔ ۶۔ دنیا میں ایک جال ہے۔ انسان کشمکش میں ہی پیدا ہوتا ہے اور اسی میں ختم ہو جاتا ہے۔ ۷۔ لوگ کہتے ہیں کہ وقت کی پرواز بہت تیز ہے لیکن یہ کسی عاشق سے جاکر پوچھیے کہ وقت کس طرح کٹتا ہے۔ ۸۔ دولت اور بیری حرص و ہوس کو زیادہ کرتی ہیں۔ ۹۔ جوانی کا عمر سے اتنا ہی تعلق ہے۔ جتنا مذہب کا اخلاق سے۔ روپے کا ایمانداری سے۔ حسن کا آرائش سے۔ ۱۰۔ جتنی دور بکری کی آواز جاتی ہے۔ اتنی دور دیوتا نہیں آتے۔ ۱۱۔ کوئی بھی خود دار شخص یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی خستہ حالی دوسروں کے لئے مایۂ تفریح ہو۔ ۱۲۔ دست نگری سے بڑی مصیبت بدنصیبی کے بھی خزانے میں نہیں ہے۔ ۱۳۔ بزدل لوگوں میں سچائی بھی گونگی ہو جاتی ہے۔ وہی سیمنٹ جو اینٹ پر چڑھ کر پتھر بن جاتا ہے۔ اگر مٹی پر چڑھا دیا جائے تو مٹی ہو جائے گا ✦ ✦ ✦ ✦

ایک دردانگیز افسانہ

شبنم

از حضرت موج رفیقی علیگ

چاندنی رات نے شہر کے کوچوں اور سڑکوں کو منور کر دیا تھا۔ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی تھی۔ دنیا والے پھولے نہیں سما رہے تھے چونکہ ان کے دل میں امنگیں اور مسرتیں ابھر آئی تھیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ مسکرا اُٹھا تھا لیکن اندھی دنیا کے رہنے والے بچارے اندھے انسان چاند کی کیف باریوں سے کیا مسرت اندوز ہو سکتے ہیں۔ وہ بچارے کیا سمجھیں چاند کیا ہے۔ وہ کیا جانیں چاندنی کیسی ہوتی ہے۔

"تم راستہ دیکھ کے نہیں چلتے؟"

"اگر آنکھیں ہوتیں تو کاہے کو ـــــ اور تمہیں راستہ نہیں دکھتا؟"

"میرے بھی اگر آنکھیں ہوتیں تو ـــــ"

"تم اندھے ہو بابا؟"

"ہاں بالکل اندھا۔"

"میں بھی اندھی ہوں۔ مجھے ذرا نہیں دکھتا" اور پھر وہ گہرا سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

اس کے بعد یہ بڈھا فقیر اور وہ اندھی لڑکی ساتھ ساتھ بازار میں، کوچوں میں اور گلیوں میں بھیک مانگتے نظر آئے۔ اندھی شبنم ایک ٹیڑھی ہوئی لکڑی کے سہارے بڈھے کی انگلیوں کو ہاتھ میں دبائے راستے سے گزرتی۔ بڈھے کو شبنم سے اُنس ہو گیا تھا اور وہ بھی بڈھے فقیر کو اپنا سمجھنے لگی تھی۔

"تیری کیا عمر ہے ری؟"

"یہی کوئی پندرہ برس کی باباجی۔"

"پندرہ برس؟"

"ہاں ـــــ اور تمہاری؟"

"میں بہت بوڑھا ہوں بیٹی۔ مجھے اپنی عمر کا دھیان نہیں ـــــ اور پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔ اور اس کی ویران اور بے نور آنکھیں تر ہو گئیں۔ اس کی پروین بھی پندرہ برس ہی کی ہوگی۔ اس نے پروین کو بڑے چاؤ سے پرورش کیا تھا لیکن اف! ننھی پروین کس حیرت سے بڈھے باپ سے ہمیشہ کے دامن کشاں ہو گئی۔ جمنا کی موجیں اب بھی اس بڈھے کو پروین کا پیغام پہونچانے کیلئے بیتاب ہیں۔ اب بھی جمنا پروین کی روح کو تھپکیاں دے رہی ہے لیکن وہ ہے کہ بڈھے باپ سے ملنے کو بیقرار ہے اور مچلتی ہے۔

شبنم اور یہ بڈھا فقیر شہر سے اور آبادی سے دور ایک غیر معروف اور اجڑے ہوئے قبرستان کے ایک تنگ تاریک گوشے میں رہتے اور اسی گوشے کو اپنا گھر سمجھتے۔ بھیک مانگ کر جو کچھ مل جاتا دونوں محبت اور پریم سے کھا کر سو رہتے۔ شبنم بڈھے کے پتلے پتلے اور لانبے ہاتھوں کی انگلیوں کو اپنے ہاتھ میں دبا لیتی اور رات کو کچھ دیر تک دونوں دل بہلاؤ کی باتیں کرتے۔

شبنم پوچھتی ـــــ بابا گلاب کا پھول کیسا ہوتا ہے؟

بڈھا کہتا ـــــ گلاب کئی رنگ کے ہوتے ہیں پیلا، سرخ، سفید۔

"بابا تم نے دنیا دیکھی ہے؟"

"دیکھی ہے بیٹی"

"بابا کیسی ہے دُنیا؟"

"بہت بُری بیٹی۔"

"تمہیں دُنیا اچھی نہیں لگی بابا؟"

"ہاں بیٹی دنیا سے میں نفرت کرتا ہوں دنیا میں بُرے بُرے آدمی رہتے ہیں چالاک فریبی، جواری، شراب خور، دغاباز۔"

"ایں بابا؟"

"ہاں بیٹی دنیا بڑی مطلب پرست ہے" اور اس کے دل میں نفرت کا ایک شعلہ بیدار ہو اُٹھتا اور پھر خود بخود سرد ہو جاتا۔ وہ پوچھتی "بابا تم اندھے کیسے ہوئے؟"

"بیٹی یہ مت پوچھ" اور وہ ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو جاتا۔ شبنم بھی چپ ہو جاتی۔

قبرستان کا ایک گوشہ کھلا ہوا تھا۔ اس میں بارش سے بچاؤ کے لئے کوئی سہارا نہ تھا۔ چنانچہ جب رات کو بارش آ جاتی تو شبنم بڈھے فقیر کی انگلی پکڑ کر ایک ٹیڑھی سی لکڑی کے سہارے سنبھل سنبھل کر ڈرتے ڈرتے کسی ایسی جگہ لے جاتی جہاں وہ بارش کے پانی سے تر ہونے سے بچ سکیں۔ یہ دونوں تاریک دُنیا میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے اور اُن پر رات کی تاریکیاں، پیڑوں کی سائیں سائیں اور ماحول کی ویرانی اپنا

ذرا اثر نہ کرتی۔

سرما کی ایک رات تھی بے حد سرد، سنسان اور طویل ------ بڈھا کانپ رہا تھا۔ اس کے جسم پر بجز ایک کرتے کے اور کچھ نہ تھا۔ شبنم بھی سردی محسوس کر رہی تھی۔ مگر بڈھے سے کم کیونکہ وہ جوان تھی اور اس کے خون میں گرمی تھی مفلس انسانوں پر اتنا بھی تو نہ تھا کہ سوکھی ہڈی کھال کے واسطے ایک دیا سلائی مہیا کر لیتے اور اس طرح کچھ گرمی حاصل کرتے۔ بڈھے کو شبنم کا خیال تھا۔ وہ بچاری سردی سے کانپتی ہوگی اس نے کروٹ لے کر اُسے اپنے آغوش میں دبا لیا "بیٹی بڑی سردی ہے" اس نے اپنی شکستہ آواز میں کہا۔ اور پھر اُس نے محسوس کیا جیسے کوئی جانور اس کی پیشانی چاٹنے لگا ہو۔ چونکہ یہ آغوش پر مصیبت زدہ کُتے کا تھا جو سردی سے کانپ رہا تھا اور ان دونوں کی جائے پناہ میں شرکت کر کے تھوڑا سکون حاصل کرنا چاہتا تھا۔ قدرت بھی اندھوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہے بڈھے نے اپنے آغوش میں شبنم کو اور زور سے دبا لیا اور جب اسے یہ احساس ہو گیا کہ یہ آغوش شبنم کا نہیں تب کروٹ بدلی اور ایک آہ سرد بھری اور اپنی آنکھوں کو کوسا۔

قبرستان کے اسی گوشے میں ایک مرتبہ شبنم بیمار ہو گئی۔ اکثر دن میں اس کا بخار بڑھ جاتا۔ اور اس کا دماغی توازن درست نہ رہتا اور لگتی بڈھے کو ڈانٹنے۔ بڈھا سٹپٹا جاتا وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شبنم کی صورت دیکھ لے۔ کاش اُسے کھوئی ہوئی بینائی کچھ وقت مل جاتی۔ وہ اپنی کمزور آنکھوں کے پلکوں پھٹپھٹاتا۔ اس کی زندگی چند لمحات کیلئے اس کی حیران آنکھوں کے پپوٹوں میں سمٹ آتی لیکن بے سود۔ وہ شبنم کا بیمار چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا وہ اپنا کمزور اور سوکھا ہوا ہاتھ شبنم کی پیشانی پر ٹٹول ٹٹول کر پھیرتا۔ شبنم جھلا اٹھتی اور اس کا ہاتھ علیحدہ پٹک دیتی۔

وہ پوچھتا ------ کیسی طبیعت ہے بیٹی؟ اور پھر دونوں کی اندھی آنکھیں تر ہو جاتیں اور جب شبنم کے گالوں کو بڈھا نم محسوس کرتا تو اس کے دل پر چوٹ لگتی اور ایک آہ نکل جاتی۔ "روتی ہے بیٹی؟" یہ کہہ کر وہ اپنے پر ضبط کرتا۔ چونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے گھبرانے سے مریضہ کے دکھ میں اضافہ ہوگا۔ شبنم کا بخار جب اور بڑھ جاتا تو وہ پاگل سی ہو اٹھتی۔ وہ بیٹھ جاتی اور بیٹھنے کے بعد بھاگنے کی کوشش کرتی۔ بڈھا گھبرا جاتا اور اپنے ضعیف ہاتھوں سے اُسے پکڑ لیتا۔ کہا جاتی ہے بیٹی؟ اس جملے میں اس کے دل کی دھڑکنیں پوشیدہ ہوتیں۔

وہ اپنے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھاتا۔ "یا خدا مجھ پر رحم" لیکن یہ ہاتھ خود بخود گر جاتے۔ جیسے ان میں خون کا دورہ بند ہو گیا ہو چونکہ وہ یاس نامرادی کی حد کو پہنچ چکا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کی دعاؤں میں اتنا اثر کہاں کہ قبول ہو سکیں۔

اس کا جذبۂ محبت و ہمدردی جو کل انسانیت کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھا شبنم کے لئے وقف ہو چکا تھا شبنم ہی ایک ایسا ننھا وجود تھی جس میں اس کی ساری امیدیں اور مسرتیں سمٹ آئی تھیں۔ اور جب یہ تھا تو بڈھا شبنم کو کیونکر تکلیف میں دیکھ سکتا تھا شبنم کی بیماری کی وجہ سے پروین کی یاد بھی تازہ ہو آئی تھی۔ اور اس کی ویران آنکھیں سوج کر سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ شبنم کی بیماری کے کربیہ انجام پر بھی غور کرتا اور اس کی آنکھوں میں مایوسی و نا امیدی کا گہرا سایہ لینے لگتی لیکن یہ مایوسی مایوسی ثابت ہوئی شبنم کی حالت یک بیک سنبھلنی شروع ہوئی اور اس کی زندگی کی دھندلی تصویر پر مسکراہٹ بیدار ہو اٹھی۔

دونوں شہر کی ایک شاہراہ سے گذر رہے تھے بڈھے کی سوکھی ہوئی انگلی شبنم پکڑے ہوئے تھی۔ اور ایک مُڑی ہوئی لکڑی کے سہارے راستہ طے کر رہی تھی۔ یکایک آواز سنائی دی ہٹ ری ہٹ اندھی ------ راستے سے ہٹ ------ اگر ان کے آنکھیں ہوتیں تو دیکھتے کہ بکریوں اور بکروں کا ایک گلہ چلا آرہا ہے۔ کچھ بکریاں شبنم کے پاس سے لگیں۔ کچھ کے پیر اندھے کے پیروں پر پڑے۔ کچھ کے سینگ شبنم کے گھٹنوں سے لگے اور اسی گھبراہٹ میں بڈھے کی انگلی شبنم کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اور پھر ------ اور پھر وہ دونوں بچھڑ گئے۔ اور دونوں کے راستے جداگانہ تھے۔ شہر کے کوچوں اور گلیوں میں اب وہ بھیک مانگتے نظر نہیں آتے۔

مستی و قلندری

تمام یورپ جنگ و جدل کا جہنم زار بنا ہوا ہے پھر بھی اہل یورپ کی مستی و قلندری نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ اس سلسلے میں ہم امریکہ کے اخبار "لائف" کے کچھ اقتباسات قارئین مستی و قلندری کی نذر کرتے ہیں۔

"یورپ میں جنگ کی آگ شعلہ زن ہے لیکن بجائے اس کے کہ یورپ والوں کی سرمستیوں اور عیش پرستیوں میں اس سے کمی واقع ہوتی اس میں اور ترقی ہو گئی ہے۔ میدان جنگ سے لوٹتے ہوئے سپاہی تفریحی کھیلوں میں دل کھول کر حصہ لیتے ہیں۔

شاہ کی فوج آئرلینڈ میں اتر آئے کوئی پروا نہیں۔ ڈبلن کی گھوڑ دوڑ ضرور ہوگی اور اس میں پانچ روز تک لاکھوں آدمی حصہ لینگے۔ روما میں قیامت برپا ہے لیکن رومانیہ کے دیہاتی باشندوں میں ناچ رنگ کی وہی گرم بازاری ہے جو جنگ سے پہلے تھی۔"

اور آگے چل کر لکھتا ہے:—

"آئرلینڈ کے دیہاتی اس بے فکری سے شرابیں پیتے ہیں۔ بولون کی گھنی جھاڑیوں میں آج بھی پریمیوں کا ملاپ ہوتا ہے اور میدان جنگ کے قریب سمندری ساحلوں پر ہزاروں آدمی روزانہ رنگ رلیاں منانے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔"

یہ ہے یورپ کی مستی و قلندری کا حال، خاص خاص ملکوں کے حالات ملاحظہ ہوں۔

~~~

فرانس پر کیا گذری آپ کو معلوم ہے، فرانسیسیوں کے دارالسلطنت اور ان کی سرمستیوں اور عیش پرستیوں کے مرکز پیرس پر نازی علم لہرا رہا ہے لیکن اس پیرس میں اہل فرانس کی مستی و قلندری کا کیا حال ہے۔ اس کی نسبت "لائف" کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔—

"پیرس میں آج باریک جالیدار کپڑوں میں برہنہ نازنینیں بازاروں میں پھرتی ہیں اور اسٹیجوں پر ناچتی ہیں۔"

اور آگے چل کر لکھتا ہے:—

"پیرس کی لڑکیاں سائیکل کے پیچھے شراب کی بوتلیں باندھ کر ہوا خوری کو نکلتی ہیں۔"

کہئے داد نہ دیجئے گا اہل پیرس کی اس مستی و قلندری کی؟

~~~

مختلف قوموں کے رسم و رواج کے متعلق آپ نے بہت کچھ ملاحظہ فرمایا ہوگا لیکن آج رواجی مستی و قلندری کا ایک تازہ نمونہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ابھی صرف ایک سال کا عرصہ ہوا ہے "نیو گنی" کے جنگلوں میں ایک قوم کا پتہ لگا ہے۔ اس قوم میں شادی کا یہ طریقہ مقرر ہے کہ پہاڑ کے دامن میں ایک طرف نوجوان مرد جمع ہوتے ہیں، اور دوسری طرف کنواری لڑکیاں، جو سر سے پاؤں تک برہنہ ہوتی ہیں۔ "گھاس کا ایک کپڑا" صرف ان کی ستر کی پردہ پوشی کرتا رہتا ہے شکم اور سینہ وغیرہ بالکل عریاں، نوجوان مرد ان لڑکیوں کے جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے کیلئے عجیب عجیب طرح کی حرکتیں کرتے ہیں اور عشقیہ گانے گاتے ہیں جس لڑکی کے دل میں ازدواجی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے وہ سامنے کی پہاڑی پر چڑھ جاتی ہے اور وہاں اپنے من چاہے نوجوان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اگر نوجوان اس سے شادی کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دے تو دونوں گاؤں میں واپس آجاتے ہیں اور شوہر بیوی بن جاتے ہیں۔

ہندوستان میں بھی پہلے "سوئمبر" ہوتا تھا لڑکیاں خود شوہر کا انتخاب کرتی تھیں نیو گنی کی "نو دریافت" قوم کا یہ سوئمبر ہے۔

~~~

ہندی کے ایک ماہنامہ رسالے میں بہت سے لوگ اپنے جنسی اور ازدواجی مسائل لکھ کر اس کے ایڈیٹر سے ان کا حل دریافت کرتے ہیں۔ مستی و قلندری کے سلسلے میں ان میں سے بعض مسائل اور ان کے حل کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

ایک مہاشے کسی اسکول میں پڑھتے تھے ان کے ماسٹر صاحب نے اپنی پتری کی شادی ان سے کر دی، لیکن صورت حال یہ تھی کہ محترمہ دیوی جی کو شادی سے پہلے ہی اپنی کلاس کے ایک نوجوان سے عشق ہو گیا تھا لیکن ان کے پتا جی نے ان کے جذبات کی پروا نہ کی، اور یہ دیکھ کر دیوی جی کے عاشق سے ان کا مجوزہ داماد زیادہ دولتمند اور خوشحال ہے، دیوی جی کی شادی اس سے کر دی، اب آپ اسے دیوی جی اور مہاشے جی کی حماقت سمجھئے یا خوش فہمی۔ دیوی جی نے مہاشے جی سے قسم لے لی کہ شوہر بیوی زندگی بھر بھائی بہن کی حیثیت سے رہینگے۔ اور
~~~

مہاشے جی نے ایسی نا قلانہ قسم کھا بھی لی۔ نتیجہ یہ ہے کہ شوہر بیوی ہو کر یہ جوڑا بھائی بہن کی زندگی گزار رہا ہے۔

شادی کے وقت دیوی جی ساتویں کلاس میں تھیں۔ تین سال بعد مہاشے دوسرے شہر میں جانے لگے تو دیوی جی مچل گئیں کہ وہ تو پہلے میٹرک کرینگی۔ اور میٹرک کے بعد کالج میں داخل ہونے پر اڑ گئیں۔ اب حالت یہ ہے کہ دیوی جی الگ سنیاسن کی سی زندگی گزار رہی ہیں اور مہاشے جی جدا زندگی سے بیزار ہو رہے ہیں اور چارہ کار کے طور پر چاہتے ہیں کہ دیوی جی کو کسی دوسرے بانکے سجیلے گبرو کے سپرد کر دیں۔

یہ تو ہے ان مہاشے جی کا مسئلہ آپ یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ ان کو اس مسئلے کا حل کیا بتایا گیا؟ نسخہ برائے ہدایت آپ بھی پڑھئے ممکن ہے کسی وقت آپکو اس سے فائدہ پہنچے۔ ایسی حکمت اور دانائی کی باتیں ہر شخص کے دماغ میں ذرا مشکل سے آسکتی ہیں

حل کا خلاصہ یہ ہے:—

اگر مہاشے کو تحقیق ہو جائے کہ دیوی جی کو اپنے عاشق سے محبت باقی نہیں رہی تو مہاشے جی قسم کو "گنگا برد" کر کے خود دیوی جی کے دل پر دھاوا بول دیں۔ اور اگر ابھی تک دیوی جی کو اپنے عاشق سے عشق ہو تو انصاف یہی ہے کہ دونوں کے معاشقے میں خلل انداز نہ ہوں۔ اور کوئی قانونی دقت نہ ہو تو دیوی جی کو طلاق دیدیں۔ اور اگر طلاق دینا بھی ممکن نہ ہو، اور دیوی جی اپنے عاشق کے عشق سے دست بردار بھی نہ ہوں تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ دیوی جی کو اپنے عاشق سے ملنے جلنے کی آزادی دیدی جائے۔

کہئے کتنا معقول اور شریفانہ حل ہے؟ اس واقعہ سے لڑکوں اور لڑکیوں کی مشترکہ تعلیم کی افادیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مشترکہ تعلیم کے مخالفین کو اس مفید واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

~~~~~~~~

ایک مہاشے کی الجھن ملاحظہ ہو:—

مہاشے جی کے گھر میں ماں باپ ہیں اور ایک سولہ سال کی بیوہ بہن ہے۔ جب سے مہاشے جی کی شادی ہوئی ہے اور ان کی بیوی گھر آئی ہے۔ ان کی بیوہ بہن کا جنسی جذبہ بیدار اور مشتعل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے گھر میں ایک عجیب کشمکش اور بے چینی پھیل گئی ہے مہاشے جی کو ازدواجی زندگی کا لطف اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اب بیچارے سخت پریشان ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بھی ازدواجی زندگی کی خوشیوں کو بھی بہن کی ہوگی کے نرک کنڈ میں جھونک دیں یا اپنی شریمتی جی کو لے کر کہیں الگ اپنا سورگ بسائیں۔

ان مہاشے جی کے مسئلے کا حل یہ بتایا گیا ہے کہ مہاشے جی کی ازدواجی زندگی کو دیکھ کر ان کی نوجوان بیوہ بہن کا اس سے متاثر ہونا اور ان کی شریمتی جی سے حسد کرنا ایک فطری امر ہے لہٰذا باپ ماں کو سمجھا کر اور وہ رضامند نہ ہوں تو بیوہ کو آمادہ کر کے اسکی شادی کر دیجئے۔

حل تو بالکل سیدھا سادہ ہے لیکن کسے معلوم کہ رسم و رواج کی مجبوریاں اس حل کے مطابق عمل بھی کرنے دینگی یا نہیں؟

~~~~~~~~

فلم "پتر لیکھا" کے متعلق بنگال اور پنجاب وغیرہ کے متعدد فلمی اخبارات سخت ہنگامہ برپا کر چکے ہیں کہ وہ حد درجہ شرمناک اور عریاں فلم ہے۔ اس کے متعلق بمبئی کا ایک فلمی پرچہ لکھتا ہے "پتر لیکھا" تمام و کمال نفسیات پر مشتمل ہے۔ اور ڈائرکٹ کیدار ناتھ شرما نے افسانہ کے لحاظ سے اس عمدگی سے اور خوش اسلوبی کے ساتھ ڈائرکشن کی خوبیاں پیش کی ہیں کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ البتہ بعض جگہ مخرب اخلاق اور حیا سوز مناظر کا بھی نظارہ کرنا پڑتا ہے؟

آخر میں لکھتا ہے ــــــ "غرض ہماری نظر میں "چتر لیکھا" ایک ایسی فلم ہے جسے دیکھ کر ناظرین کوفت محسوس نہ کرینگے"!

مدیر "مستی و قلندری" گذارش کرتا ہے کہ جس فلم میں مخرب اخلاق اور حیا سوز مناظر کا نظارہ کرنا پڑے اسے دیکھ کر جو بندہ کوفت محسوس کرے، اُسے فلم دیکھنے کا حق ہی کونسا ہے؟

~~~~~~~~

مست قلندر کے منی آرڈر

چونکہ بنک میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اسلئے ترسیل زر کرتے ہوئے کوپن پر اپنا مکمل پتہ رقم منی آرڈر نیز مختصر تفصیلات ضرور لکھ دیا کیجئے۔ (منیجر)

آپ کا خریداری نمبر

دفتر کیلئے بہت اہمیت رکھتا ہے جب کبھی آپ پرچہ نہ پہنچنے یا پتہ تبدیل کرانے کے لئے دفتر کو لکھیں تو اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل کی جائیگی۔ (منیجر)

پتہ کی تبدیلی کی اطلاع

کم از کم ایک ہفتہ پہلے دفتر میں پہنچ جانی چاہئے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو مقامی ڈاکخانہ کو ہدایت کر دی جائے کہ وہ آپ کا رسالہ آپکے نئے پتہ پر بھیج دے۔ مست قلندر ہر ماہ کی یکم
~~~~~~~~

دُنیا جہان کی دلچسپ خبریں!

ایک عجیب و غریب ایجاد

امریکہ میں یوں تو آئے دن بہت سی چیزیں پیٹنٹ کرائی جاتی ہیں لیکن حال ہی میں شیر کے شکار کا خاص لباس بھی پیٹنٹ کرایا گیا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک پورے لباس پر ہزارہا نوکدار کیلیں لگی ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود اس لباس کا وزن پچیس پونڈ سے زیادہ نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر شکاری حملہ بھی کر دے تو اس کو مطلق ضرر نہیں پہنچیگا بلکہ خود وہ زخمی ہو جائیگا۔

پینتالیس روپے میں شوہر

نیوگنی کے ایک مقام جزیرہ نیو برٹن میں شوہر عموماً پینتالیس روپے یا تین پونڈ میں خریدے جاتے ہیں۔ وہاں لڑکیوں کی شادی بارہ تیرہ سال کی عمر میں کی جاتی ہے۔ شوہر کے انتخاب کا حق پورے طور پر لڑکی کے چچا کو ہوتا ہے جو اپنی صوابدید پر جس کسی کو چاہے اپنا بھتیجی داماد بنا لیتا ہے۔

غافل مسافر

بیان کیا جاتا ہے کہ صوبہ کیوبک کے ایک مقام ونبرگ کے ریلوے اسٹیشن پر سیموئل جیمس گاڑی کا انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ گاڑی آئی اور چلی بھی گئی لیکن وہ سوتا ہی رہا۔ بیدار ہونے کے بعد جیمس نے دیکھا کہ نہ صرف اس کے بازو دھرا ہوا سگریٹ کیس، سوٹ کیس اور بستر ہی غائب ہے بلکہ سر پر کی ٹوپی، پہنا ہوا کوٹ اور بندھے ہوئے جوتے بھی پاؤں سے لاپتہ ہیں۔ افسوس ہے کہ چور بھی کسی قدر غافل ہی نکلا ورنہ صاحب بہادر کی پتلون بھی آسانی سے ہوا ہو سکتی تھی۔

عاشق زار

یوگوسلاویہ کے ایک مزدور کی شادی اسکی منظور نظر ایلا رکینیو سے ہونے والی تھی شادی کی پوری تیاریاں ہو چکی تھیں لیکن صرف دو روز پہلے ایلا یکایک بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے بہتیری کوشش کی لیکن آخر کار وہ خوبصورت لڑکی موت کا شکار ہو گئی۔ ایلا کے مرتے ہی جوزف پاگل ہو گیا۔ اور یہ کہتے ہوئے مارا مارا پھرنے لگا کہ "ایلا سے کل میری شادی ہو جائیگی میں اس کا شوہر ہو جاؤں گا اور وہ میری بیوی بنے گی، پھر تو ہم دونوں ہنسی خوشی سے بسر کرینگے۔" ڈاکٹروں کو اس کے علاج کی کوئی تدبیر سجھائی نہیں دی۔ اس لئے انہوں نے ایک اہم نفسیاتی پہلو اختیار کیا۔ چنانچہ ان کے مشورے کے مطابق گرجا میں پوری رسومات کے ساتھ مُردہ لڑکی سے جوزف کی شادی کر دی گئی اور شادی کے بعد ہی جوزف کا جنون جاتا رہا۔

عاشق ناشاد

رومانیہ کے ایک طالب علم آسکر اسمتھ کو روزٹ نامی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ لیکن آسکر کو فضول خرچ اور بے سرمایہ ہونے کی وجہ سے روزٹ نے پانچویں دفعہ بھی جواب دیدیا۔

اس کے بعد آسکر نے دل میں ٹھان لی کہ وہ روزٹ کیلئے پیسے جمع کریگا۔ اسلئے اس نے اس روز سے چاندی کے سکے نگلنا شروع کئے۔ بہرحال ضرورت کے بعد جو بھی بچت ہوتی وہ اس کے پیٹ کی تجوری میں داخل ہو جاتی ایک روز آسکر روزٹ کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ یکایک اس نے درد درد کہتے ہوئے چیخنا شروع کیا اور ساتھ ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ دواخانے میں جب لاشعاعی تصویر لی گئی تو پیٹ میں سکے پائے گئے۔ چنانچہ آپریشن کے ذریعے ڈاکٹروں نے بیس پونڈ کے قریب چاندی کے سکے نکالے جب روزٹ کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے بجائے ستائش کے ملامت کی۔ اس واقعہ کے بعد سے آسکر نے روزٹ سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ پیٹ میں نہیں بلکہ مکان کے کسی محفوظ حصے میں بچی ہوئی رقم جمع کریگا۔

جب اس کو اس محفوظ رقم میں سے کچھ خرچ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس منحوس خیال پر لعنت بھیج کر اس نے پوری رقم روزٹ کے پاس امانتاً رکھوا دی لیکن کچھ عرصہ بعد اس کو معلوم ہوا کہ روزٹ اپنے ایک سابقہ عاشق کے ساتھ مع رقم گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔

مچھلیوں کی بارش

کلکتہ میں رہنے والے ایک کسان نے امرت بازار پتریکا کو اس بات کی اطلاع دی کہ اس کا مکان شہر کے کونے پر واقع ہے جس کے بازو ایک بڑا گڑھا ہے جس میں سوائے بارش کے زمانے کے کسی وقت بھی پانی نہیں رہتا۔ اس واقعے سے ایک روز پہلے اس گڑھے میں پانی کا ایک قطرہ تک نہ تھا لیکن

یکایک بارش ہوئی اور دیکھا گیا کہ اس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ مچھلیاں فضا کا شکار ہو گئی تھیں جو بارش کے ساتھ برس پڑیں۔

۲۵۶ سالہ بڈھا

حال ہی میں چین سے خبر آئی ہے کہ لی چنگ یون نے جو تمام دنیا کا سب سے زیادہ طویل العمر انسان تھا، ۲۵۶ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ شخص جو ایک کاشتکار اور جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا اور اب ایک مدت دراز سے اپنا وقت محض خوش اور عبادت میں صرف کر رہا تھا خود اپنی روایت کے مطابق ۱۶۷۷ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے اہل وطن بھی اس روایت کی تصدیق کرتے ہیں۔ تین سال ہوئے ایک خاص وفد کا بیان ہے کہ وہ ایک تندرست اور زندہ دل شخص تھا جس کی عمر بظاہر ساٹھ اور ستر سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنی غیر معمولی طویل عمر کی وجہ یہ بیان کی کہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں جبکہ وہ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں پہاڑوں پر گھومتا پھرتا تھا اتفاق سے ایک بزرگ سے ایک نادر بوٹی ہاتھ آ گئی۔ جسے اس نے کھا لیا اور اسی کے اثر سے اس کی اتنی عمر بڑھ گئی۔ ناگپور میں ایک شخص سیدی استاد نامی ابھی موجود ہے جس کی عمر صوبجات متوسط کے افسر مردم شماری کی رائے میں ۱۳۰ سال ہے۔ اگرچہ خود ناگپور کے لوگ اسکو ۱۵۰ سال کا بتاتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا کی وبا تک اسکی صحت نہایت عمدہ تھی۔ لیکن اس کے بعد سے اس کے دانت ٹوٹ گئے اور بال سفید ہو گئے ہیں۔ سیدی استاد جس کا باپ افغان اور ماں عرب تھی، ایک زمانہ میں گائکواڑ بڑودہ کے دربار کا مشہور پہلوان تھا اور ۱۸۵۰ء میں اپنے فن کے شباب میں تھا۔ اس کا بیان ہے کہ میسور کی لڑائی اور سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو کی وفات ۱۷۹۹ء اسے یاد ہے۔ سیدی ہی کی عمر کے قریب امریکہ کے مشہور جان شیل کی بھی عمر تھی جو چند سال قبل ۱۳۴ برس زندہ رہ کر مرا ہے معلوم ہوا ہے کہ اسکی پیدائش ۱۷۸۸ء کی ہے۔

ایک ہزار میل فی گھنٹہ

جامعہ کنٹکی واقع امریکہ میں ہوائی جہاز کا ایک نیا تجربہ خانہ کھولا گیا ہے جس میں جہاز کی رفتار سے متعلق ماہر انجنیئر تحقیقاتی کام کر رہے ہیں۔ اس جامعہ کے پندرہ مشہور انجنیئر ایک پوشیدہ آلہ کے ذریعے اس مخصوص تحقیقات میں منہمک ہیں۔ اور رات دن اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ہوائی جہاز کی رفتار زیادہ سے زیادہ ہو۔ موجودہ اصولوں پر کام کرنے کے بعد ان انجنیئروں نے اس بات کا اندازہ لگایا ہے کہ قریب میں رفتار چھ سو میل فی گھنٹہ تک پہونچ جائیگی ساتھ ہی ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جب چھ سو میل کی رفتار سے کوئی جہاز اڑ سکتا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہزار میل تک اس کی رفتار کو بڑھایا جا سکے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ بندوق کی گولیاں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ چلائی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود آدمی کو ان پر قابو حاصل ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ جہازوں کی رفتار پر ہم قدرت حاصل نہ کر سکیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے موجودہ خیالات اور اصولوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہوئے ایجاد کا کوئی ایک نیا راستہ اختیار کریں۔

سہیلی کے خطوط

(بقیہ صفحہ ۲۳)

پابند تھی۔ مجھے جھوٹے سے بھی ان کو برا کہنا اسلئے مجھے اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں جہاں پڑی تھی، بے جان سی پڑی رہی۔

اس روز سے پتی دیو کے درشن نہیں ہوئے۔ سنتی ہوں جب سے شادی کر کے کہیں باہر چلے گئے۔ میری ویران زندگی کے آباد ہونے کی اب کوئی امید باقی نہیں رہی۔

میں نے تم سے کوئی بات چھپا نہیں رکھی بہن میں اپنا قصور تسلیم کرتی ہوں۔ مرد عورتوں کی علیحدہ انفرادیت اور شخصیت کو پسند نہیں کرتے۔ اسلئے پتی دیو کو گوارا نہیں تھا کہ میں اسکول کی نوکری کروں، اگر میں اپنی ازدواجی زندگی کی فلاح و بہبود چاہتی تھی تو مجھے لازم تھا کہ ان کے جذبات کا لحاظ کرتی۔ ان کے کہنے کے مطابق سکول کی ملازمت چھوڑ دیتی۔ ان کے سہارے زندگی گذارتی۔ میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ میں نے بڑا قصور کیا لیکن میں پوچھتی ہوں کہ کیا یہ میرا ایسا ناقابل عفو جرم تھا کہ انہوں نے مجھے ہمیشہ کے لئے تیاگ دیا اور میری زندگی ہی برباد کر دی۔

لیکن میں یہ کس سے پوچھ رہی ہوں؟ جن سے پوچھنا تھا وہ ہیں کہاں؟ اگر مردوں کے سماج سے پوچھوں تو اس کے نزدیک عورت کو مرد کے کسی طرز عمل کے متعلق پوچھنے کا حق ہی کہاں ہے؟

کاش، میں اپنے شادی نہ کرنے کے عہد پر قائم رہتی۔

تمہاری بدنصیب سہیلی ۔۔۔ اروقی

پیاری ننھی

از جناب اسد جمیل شعریا

اری سرد پانی کی ننھی سی ندی — بہے جا یونہی میری پیاری بہے جا
رہِ عشق میں تو سمندر کی جانب — اُڑاتی ہوئی نیلی ساری بہے جا

نچاتی ہوئی میٹھے پانی کی لہریں — لڑاتی ہوئی بلبلوں کو بہے جا
پئے خود نمائی اک آئینۂ حسن — دکھاتی ہوئی تو کنول کو بہے جا

بناتی ہوئی مرغزاروں کو سیمیں — لٹاتی ہوئی یونہی گوہر بہے جا
درختوں کے سایہ میں مل کر ہوا سے — سریلی صداؤں کے دلبر بہے جا

پلاتی ہوئی لالہ و گل کو امرت — اداؤں سے اے فخرِ گلشن بہے جا
نچھاور یونہی ذرہ ذرہ پہ ہو کر — دکھاتی ہوئی اپنا جوبن بہے جا

سُناتی ہوئی راگ تنہائیوں کو — یونہی اپنی آزادیوں سے بہے جا
دباتی ہوئی جوشِ ریگِ رواں کو — مگر دور آبادیوں سے بہے جا

یونہی مست ہو کر یونہی کھلکھلا کر — جہاں کے تھپیڑے سہے جا بہے جا
نہ لانا کبھی لب پہ حرفِ شکایت — تحمل کی دیوی بہے جا بہے جا

شرابیں

از جناب ساغر چشتی اوجین

رنگا رنگ شرابیں ہیں آنکھوں کے پیمانوں میں
جیسے رکھے ہوں چن چن کر گلدستے گلدانوں میں
بدلی اٹھی مینہ برسا جان پڑی بے جانوں میں
فرش زمرد بچھنے لگا دنیا کے ویرانوں میں
اس نے مست نظر سے جب محفل میں ہشیاروں کی
جس کو دیکھا چیخ اٹھا ہم بھی ہیں دیوانوں میں
ذہن و نظر سب آوارہ، رہتے ہیں یوں تیرے بغیر
خودرو ننھے پھولوں کے جیسے ہوں ویرانوں میں
دیکھ ارے کوتاہ نظر، دیکھ اُجالا سورج کا
جیسا ہے آبادی میں، ویسا ہی ویرانوں میں
خلق و مروت ہمدردی، جامِ توکل اے ساغر
یہ سب چیزیں عنقا ہیں دہر کے عشرت خانوں میں

طبِ جدید کے کرشمے

ڈاکٹر میکفڈن کے قلم سے

کیا آپ بڈھے ہوتے جا رہے ہیں؟

آئیے، بڑھاپے پر قابو پانے کا راز آپ کے گوش گذار کیا جائے!

ڈاکٹر سٹیفن سمتھ امریکہ کے ایک نامی طبیب ہیں ان کی عمر ۸۴ سال کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اس کے باوجود ان میں شباب کی سی چستی اور خوش باشی پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی کی ناہموار سڑک کو اس بڑھاپے میں بھی ہمیشہ پُر امید نظروں سے دیکھتے ہیں۔

پچھلے دنوں ان سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کی اس حیرت انگیز پھرتی اور تندرستی کا کیا راز ہے؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ایک دفعہ ایک بڈھی عورت بغرض علاج میرے پاس آئی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے اس کے اعضا ہر وقت کانپتے رہتے تھے۔ میری صحت دیکھ کر وہ متعجبانہ کہنے لگی کہ اس عمر میں آپ ایسی اچھی صحت کس طرح قائم رکھے چلے جاتے ہیں؟ اس کو میں نے جواب دیا کہ میں بڈھے آدمیوں سے بہت زیادہ میل جول نہیں رکھتا بلکہ جہاں تک ممکن ہے ان سے بات چیت بھی نہیں کرتا۔ فقط جوانوں سے میل جول رکھتا ہوں یہی میری جوانی کا راز ہے۔

نوجوانوں سے میل جول

اس پر رائے زنی کرتے ہوئے ایک اور صاحب مسٹر جان ہنڈرسن لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے تجربہ سے بھی یہی طریقہ نکالا ہے جو سٹیفن سمتھ نے اخذ کیا تھا۔ میں ہمیشہ زندگی کو صحت اور پُر امید نظروں سے دیکھتا ہوں اور زیادہ تر میرا وقت نوجوانوں میں بسر ہوتا ہے نہ میرے ہاضمہ میں فتور ہے نہ جگر میں خرابی نہ جوڑوں میں درد ہے اور یہ سب خوبیاں میں نے نوجوانوں کے میل ملاپ سے حاصل کی ہیں۔

مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ جو شخص بڑھاپے میں اپنی عمر کے لوگوں سے زیادہ میل جول رکھنے کی بجائے نوجوانوں کے ساتھ اختلاط رکھیگا اس کی صحت بھی اچھی رہے گی اور وہ عمر بھی لمبی حاصل کریگا۔ اور ہاضمہ کی خرابی اور دوسری تکلیف کا تو میرے خیال میں بہترین علاج یہ ہے کہ اپنی زندگی کا وقت زیادہ تر نوجوانوں میں بسر کیا جائے۔ لیکن نوجوانوں کے ساتھ میل جول رکھنے کا مطلب اتنا ہی نہیں کہ آپ بازار میں چلتے چلتے کسی نوجوان سے علیک سلیک کر لیں۔ بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ کا وقت بہت زیادہ تر نوجوانوں میں ہی ہو۔ محض نمائش سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ قدرت اپنے اندر یہ عجیب کی غیر معمولی قابلیت رکھتی ہے کہ کون شخص کون آدمی کسی کام کو حقیقی دلچسپی کے ساتھ کرتا ہے اور کون صرف نمائش کیلئے کرتا ہے اس کی بہترین مثال کتوں میں ہی ہے جو فوراً اپنی عقل حیوانی کے ذریعے معلوم کر لیتے ہیں کہ کس شخص کو ان سے درحقیقت محبت ہے اور کس کو نہیں۔ اب یہ امر واقعہ ہے کہ اگر کوئی شخص درحقیقت کتوں سے متنفر ہو تو وہ چاہے لاکھ سیٹیاں بجائے کتا اس سے میل جول رکھنا پسند نہ کریگا۔ البتہ جس شخص کو کتوں سے خاص محبت ہے اس کو کتے بھی فوراً پہچان لیتے ہیں۔

بڑھاپے کا خیال ہی دل سے نکال دو

بس بڈھے کا میل ملاپ نوجوانوں کے ساتھ ایسا ہونا چاہئے گویا وہ انہی میں سے ایک ہے۔ بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے وقت کا بیشتر حصہ انہی کی صحبت میں بسر کریں ان کے ساتھ سیر کرنے جائیں، انہیں اپنے گھر میں بلائیں، اپنے باغ کے پھول اور کتابیں ان کو دکھلائیں اور ان کی گفتگو میں گہری دلچسپی لیں۔ یہ نہ ہونا چاہئے کہ آپ نے ظاہراً ان سے ہمدردی کی لیکن پیٹھ پیچھے اس طرح کہہ دیا آجکل کے نوجوان تو بالکل گدھے ہیں۔

اگر آپ نے درحقیقت ایسا کیا تو زندگی کے متعلق آپ کے نقطۂ نظر میں فوراً تبدیلی ہونے لگے گی۔ آپ کو ہر وقت دلچسپی کے سامان دکھائی دینے لگیں گے۔ آپ کو زندگی کے معاملات سے گہری دلچسپی ہو جائے گی۔ اور جسے آپ پہلے کارزارِ ہستی کا ناہموار میدان خیال کرتے تھے وہ آپ کے بدلے ہوئے خیالات کی وجہ سے ایک خطۂ گلزار کی صورت اختیار کرے گا۔

اور کیا آپ جانتے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ جس عمر تک آپ پہنچ چکے ہیں آپ اسی پر رک جائیں گے۔ اگر آپ کی عمر پچاس یا ستر

نسوانی درد و بیچارگی سے لبریز ایک تڑپا دینے والا "افسانہ"

ناکام تمنا

از جناب
عارف عباسی
صاحب

وہ شرمائی اور سمٹی ہوئی بیٹھی تھی ـــــ نئی دلہن بھی سسرال والوں کیلئے ایک دلچسپ تماشہ سے کم نہیں ہے اور اس تماشہ کے دیکھنے والوں میں ننھی ننھی بچیاں اور بچے۔ نوجوان شوخ لڑکیاں۔ جوان، ادھیڑ اور ضعیف عورتیں سبھی تو شامل ہوتے ہیں ـــــ

ان سب کے بیچ میں دلہن ایک اجنبی کی طرح کھوئی ہوئی سی بیٹھی تھی ـــــ شہر کی شاعر فطرت لڑکی کی قسمت دیہات کے اس سب سے زیادہ متمول انسان سے وابستہ کی گئی تھی جس کے یہاں روپوں پیسوں۔ زیورات اور ضروریات زندگی سے متعلق تمام چیزوں کی موجودگی ہی نہیں بلکہ افراط تھی ـــــ مگر دولت اور سامان تعیش کی فراوانی کے باوجود دلہن کا غنچۂ دل کھل نہ سکا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا کہ آخر کیوں اسے دولت کے انبار اور زیورات کے ڈھیر کے نیچے دفن کر دیا گیا ہے؟

غلام آباد ہندوستان کی بدنصیب عورت تو اس "کیوں" کا مطلب جانتے ہوئے بھی اس غریب طلسم سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ازدواجی زندگی طرفین کی خوشی اور پسند کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک خالص تجارتی معاملہ ہے۔ جہاں روپوں اور سونے کے انباروں کے سامنے عیوب و محاسن ہم پلہ ہوں۔ جہاں دولت کی فراوانی ہی لڑکی کی خوش قسمتی کی معراج سمجھی جاتی ہو۔ جہاں مرد، بوڑھا، لولا اور لنگڑا ہی کیوں نہ ہو۔ صرف دولت کے طفیل میں وہ شہر کی حسین ترین عورت کو اپنا شریک زندگی بنا سکتا ہے۔ وہاں عورت کے دل کی دھڑکن سننے والے کان اور اس کے فطری جذبات کے ہم آہنگ ساز کہاں سے آئیں۔ مجروح انسانیت کیلئے فضائے سازگار کہاں سے پیدا ہو ـــــ

دلہن کی آنکھوں کے سامنے اس کی زندگی کے اس دور کا نقشہ تھا جسے طفلی کہتے ہیں۔ سہیلیوں کے ساتھ گڑیوں کا کھیلنا۔ آنکھ مچولی۔ گود بھاند۔ گڑیوں کی شادی بیاہ۔ یکے بعد دیگرے تمام واقعات اسے یاد آ رہے تھے۔ اس وقت اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جبکہ اسے انہی بے جان گڑیوں کی طرح ایک اجنبی گڈے کے ساتھ جسے شاید کبھی اس نے پہلے دیکھا بھی نہیں ہے بیاہ دیا جائیگا۔ بچپن کے معصوم اور پرکیف ایام کی یاد نے اس کی آنکھوں میں اداسی کے رنگ کو اور بھی گہرا کر دیا۔ اسے وہ زمانہ بھی یاد آ رہا تھا جب والدین کے لاڈ پیار کے درمیان اس نے پڑھنا شروع کیا اور اسکول جانے لگی ـــــ زمانہ گذرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے سینے کے ایک ہلکے سے ابھار نے اسے اسکی زندگی کے ایک نئے دور کی اطلاع دی۔ وہ پہلی بار اپنے نسوانی احساسات سے روشناس ہوئی ـــــ زمانہ کی رفتار کو کون روک سکتا ہے؟ دن گذرتے گئے ـــــ چودہ پندرہ برس کا مچلتا شباب ـــــ لچکتی جوانی ـــــ اس کے جذبات کی سنسان دنیا میں ایک ہلکا سا تموج پیدا ہو گیا ـــــ اب اس کا دل جغرافیہ اور تواریخ کی درسی کتابوں سے نکل کر ان کتابوں میں جا پھنسا تھا جن میں محبت اور عشق کے عریاں جذباتی افسانے درج ہوتے ـــــ ایسی ہی رومانی کتابوں میں اس کے بیتاب جذبات کو سامان تسکین میسر آیا۔ اسکول جاتے وقت، راستہ میں ایک ہی جگہ کھڑے رہنے والے لڑکے کو بار بار دیکھ کر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اسی کی راہ دیکھا کرتا ہے۔ اکثر تنہائی میں وہ اس کے متعلق سوچتی اور اس کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم رقص کرنے لگتا ـــــ ایک روز تو وہ اسقدر از خود رفتہ ہو گئی کہ جب اس کے پاس سے گذری تو بے ساختہ مسکرا پڑی ـــــ وہ دن اسے آج بھی یاد تھا اور شاید کبھی نہ بھول سکے۔ بارش ہو کر بند ہو چکی تھی۔ فضا میں رنگینیاں رقصاں تھیں۔ بہار آب رحمت سے دھل کر نکھر چکی تھی لڑکا بجلی کے کھمبے کے قریب مقررہ جگہ پر کھڑا تھا۔ اپنے آنچل کو خود فراموشی کے عالم میں کندھوں پر ڈالتی ہوئی وہ اس کے پاس سے گذر گئی۔ اسے یہ بھی پتہ نہ چل سکا۔ کہ اس کی کتاب کب اور کہاں گر گئی۔ لڑکے نے پاس آ کر کہا: "شاید آپکی کتاب گر گئی ہے؟ آپ ہی کی ہے یہ کتاب؟" کملا نے مڑ کر دیکھا۔ لڑکے کی آواز میں ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی جو اس کے جذبات کی ترجمان تھی ـــــ شرماتے ہوئے اس نے کتاب لے لی اور مسکرا دی ـــــ

ایک عاشق نواز تبسم اپنے اندر شکریہ کے ہزاروں الفاظ پوشیدہ رکھتا ہے ——

اس روز کے بعد پھر وہ لڑکا وہاں کبھی دکھائی نہیں دیا —— ممکن ہے اس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ دل کی قیمت پوری پوری مل چکی ہے۔ اور زندگی بسر کرنے کا سہارا ہاتھ آ گیا ہے۔

کملا خیالات کی رو میں بہی چلی جا رہی تھی کہ بھڑکیلی پوشاکیں پہنے ہوئے چند عورتیں اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کا سب سے مٹ چکا تھا۔ چہرے پر جھریوں نے جالی بنا دی تھی سب سے زیادہ بدصورت سب سے آگے تھی۔ اس نے اپنی بدصورتی چھپانے کیلئے اور عورتوں کی بہ نسبت زیادہ بھڑکیلی پوشاک پہن رکھی تھی کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کہا "اے ہے اتنی گرمی ہے کہ میرا دم گھٹا جا رہا ہے" اور اپنے جاپانی ریشم کے آنچل سے پسینہ پونچھنے لگی۔

دوسری بولی "رام جانے کیسی سڑتی گرمی پڑ رہی ہے۔ دلہن کو دیکھو کیسی بھنچی بھنچائی بیٹھی ہوئی ہے۔ ابھی پچھلے سال جب للو پیدا ہوا تھا تب بھی یہی حالت تھی —— مجھے تو زچہ خانے میں گیارہ دن کاٹنے مشکل ہو گئے" اور اس نے ماتھے کی بندی کو چمکاتے ہوئے پسینہ پونچھ ڈالا ——

تیسری جس کے چہرے کا رنگ صاف تھا اور دوسروں سے زیادہ موٹی تھی بولی "ارے تم تو گیارہ دن ہی میں ہار گئیں۔ یہاں تو گیارہ بچے پیدا ہوئے اور بھگوان کی مرضی کہ سب کے سب گرمیوں ہی میں پیدا ہوئے —— میں تو بس پھنک کر رہ گئی"

"ارے سچ! کیا سب کے سب گرمیوں ہی میں ہوئے؟" کالی بدصورت عورت نے اپنی ہنسلی ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا میں تم سے جھوٹ کہتی ہوں؟ رام قسم" ——

بہن بچے تو سبھی کے ہوتے ہیں۔ رام کی دیا سے میرے بھی پانچ بچے ہوئے مگر تمہاری طرح سب گرمیوں میں نہیں ہوئے۔ میری روپا تو بھری برسات میں پیدا ہوئی۔ ادھر وہ پیدا ہوئی۔ ادھر چھت نے ٹپکنا شروع کیا۔ رام جانے جو رات بھر آنکھ لگی ہو۔ میرا تو سونا حرام ہو گیا

ایک جوان لڑکی نے جو کملا کے پاس بیٹھی تھی اکتا کر کہا "اب چھوڑو بھی اس تذکرہ کو بچے گننے آئی ہو یا دلہن دیکھنے؟" —— اور آٹھ بچوں کی ماں نے ہاتھ اٹکاتے ہوئے کہا۔ "اے لو۔ بہو نہیں دیکھنے آئیں تو کیا جھک مارنے آئے ہیں؟" —— اور سب زمین پر بیٹھ گئیں۔

کالی اور بدصورت عورت نے دلہن کا گھونگٹ الٹ کر چہرہ دیکھتے ہوئے کہا "ارے ہو کتنی خوبصورت ہے کیشو کے تو بھاگ کھل گئے"

راموکی ماں "

"کیسا چاند سا مکھڑا پایا ہے۔ سچ کہو بہن کیشو کے تو بھاگ کھل گئے" موٹی عورت نے دلہن کے ماتھے پر جھومر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"سچ کہتی ہو بہن۔ کیشو کو تو چاند کا ٹکڑا مل گیا۔ رام دونوں کو سکھی رکھیں" —— روپا کی ماں نے کہا۔

—— کملا نے سوچا۔ اور میرے بھاگ؟ ——

روپا کی ماں بولی "گہنا تو دیکھو —— کتنا اچھا لگتا ہے! جھومر بھی۔ کڑے بھی" اور اس نے کملا کی چوڑیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اور کیا نہیں اچھا لگتا بیچاری کو؟"

راموکی ماں نے آواز میں ہمدردی پیدا کرتے ہوئے کہا "پرماتما بیچاری کے سہاگ کو سلامت رکھے" اور بدقت تمام اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک طرف دیکھ کر بولی "لاے شام ہونے آئی اور تم نے اسے صبح سے یونہی بیٹھا ل رکھا ہے۔ جاؤ اسے آرام کرنے دو"

اور پھر وہ سب چلی گئیں۔

کملا نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔

جوان لڑکی نے چھوٹی چھوٹی بچیوں کو کمرے سے باہر بھیجتے ہوئے دلہن سے کہا "اب تم آرام کرو۔ ذرا لیٹ جانا۔ اب میں بھی جاتی ہوں" —— یہ کہکر وہ چلی گئی۔

کملا نے اپنے سر سے آنچل ہٹا لیا —— اس کے حسین ماتھے پر سنہرا جھومر عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ مانگ میں سیندور کی ایک گہری لال لکیر تھی —— اس کے سہاگ کی نشانی —— اس نے اپنی غم آگیں نگاہوں سے اپنے ہاتھوں میں لگی ہوئی سرخ مہندی کو دیکھا اور خیالات کے گہرے سمندر میں غوطے کھانے لگی —— اسے یاد آ رہا تھا کہ جب راتیں سرد اور اندھیری ہوتیں اور باہر سنسناتی ہوئی ہواؤں سے فراق کے نغمے ابلتے۔ اسوقت اس کے جذبات میں ایک ہلچل پیدا ہو جاتی۔ کروٹیں بدلتی ہوئی اکثر راتوں کو اس نے سوچا تھا کہ کسی دن اس کے ہاتھوں میں بھی مہندی لگے گی۔ مانگ میں سیندور بھرا جائیگا اور وہ سسرال جائیگی۔ سسرال کا خیال آتے ہی وہ شرما جاتی۔ خوش بھی ہوتی اور ایک موہوم سا خوف بھی پیدا ہوتا —— سسرال —— ہرکیش —— کملا کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور خیالات کے سمندر میں مدوجزر پیدا ہو جاتا —— آنے والے پرکیف ایام کے خیال سے اس کا حسین چہرہ چمک اٹھتا۔

غریب ہرکیش —— ایک رومانی لڑکا تھا —— اور کملا رومان پرست —— اس نے ایک جذباتی دل پایا تھا جو تصورات سے ہمیشہ آباد رہتا —— ایک لڑکا اور ایک لڑکی، یا دو نوجوان دل، جن کی محبت

کا رشتہ اسوقت قائم ہوا جب دونوں کو طفلی محبت کے معصوم گہوارے میں جھلا رہی تھی۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ جذبات بھی بدلتے گئے۔ آخر کار ایک روز ہرلش نے دھڑکتے ہوئے دل سے وہ بات کہدی جسے سنکر کملا نے اپنی گردن جھکالی۔ اور انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی ـــــ عورت ان لمحات کو جن میں اس سے اظہار محبت کیا گیا ہو کبھی نہیں بھول سکتی ـــــ کملا کو وہ دن یاد آرہا تھا۔ کتنا حسین پس منظر تھا۔ چاندنی رات میں دور ایک ہرن بھاگتا چلا جارہا تھا۔ درختوں کے سلسلے تاریکی کا ایک بھیانک منظر پیش کررہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ محبت کا دیوتا کیوپڈ اپنے ہاتھوں میں پھولوں کی بنی ہوئی محبت کی کمان لئے ہوئے کھڑا مسکرارہا ہے ـــــ اس وقت ہرلش نے دھیرے سے اس سے کہا تھا ـــ کملا ـــ محبت کا تیر کتنا دلدوز ہوتا ہے؟ ـــــ

بس یہی ان کی محبت کا آغاز تھا۔ اور اس روز کے بعد سے کملا کی بے چینیاں بڑھتی گئیں۔ جذبات میں فراوانی ہوتی گئی اور تمناؤں میں وسعت! مگر تمنائیں کس کی پوری ہوتی ہیں؟ نطق انسانی کا سب سے زیادہ مہمل لفظ ـــ جو تمنائیں پوری ہوجائیں وہ تمنائیں نہیں ـــــ جس زخم کی بخیہ گری ہوسکے وہ شمشیر محبت کا زخم نہیں ہے۔ پھر کملا کی تمنائیں کیونکر پوری ہوتیں اور اس کا زخم کیونکر مندمل ہوتا۔

کملا کو وہ دلخراش منظر یاد آرہا تھا جب وہ ہرلش، ستم نصیب ہرلش سے آخری بار ملی۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور آنکھیں دلی غم کی ترجمانی کررہی تھیں۔ چہرہ آرزوؤں کی بربادی کا حسرتناک مرقع پیش کررہا تھا۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کملا سے کہا تھا ـــ

"کملا آج تم مجھ سے ہمیشہ کیلئے چھینی جارہی ہو" اُس کی آواز میں اس پرندہ کی طرح مایوسی تھی جو عین موسم بہار میں قوت پرواز سے محروم کردیا گیا ہو ـــــ

شادی ہونے کے ہفتوں پہلے سے کملا نے رونا شروع کردیا تھا ـــ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہوگیا تھا ـــ اپنے خیالات اور ارمانوں کی دنیا اُجڑتے دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا ـــ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا جاتا، اُس کی وحشت اور پریشانی بڑھتی ہی جاتی ـــ آخر کار وہ دن آہی گیا جس روز دولت کی قربانگاہ پر اپنے ہی عزیزوں کے ہاتھوں اسکی قربانی ہونا مقدر ہوچکا تھا ـــ

اس دن گھر میں ایک چہل پہل مچی ہوئی تھی ـــ عورتیں رنگ برنگ کے عطر کیلئے کپڑے پہنے ہوئے ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔ کملا کی طرح اور بھی بہت سی لڑکیوں نے ہاتھوں میں مہندی لگا رکھی تھی ـــ نوجوان لڑکیاں اور کملا کی سہیلیاں اُسے ایک منٹ کیلئے بھی چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھیں ـــ

دوپہر کو شادی کا چڑھاوا آیا۔ بھاری بھاری سونے کے زیورات۔ اور قیمتی کپڑوں کو دیکھ کر عورتوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر تمام مہمانوں میں بجلی کی طرح دوڑ گئی کہ پچاس تولے سونے کا زیور آیا ہے۔

عورتیں زیورات کو ہاتھ میں لیکر دیکھتیں اور کملا کی قسمت پر رشک کرتیں۔ انہی زیورات میں سیندور کی ڈبیا بھی تھی ـــ عورتوں نے سیندور لے کر کملا کی مانگ میں بھر دیا۔ عمدہ عمدہ کپڑے اور قیمتی زیورات اُسے پہنائے گئے۔ مگر کملا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنا بند نہ ہوا۔

وہ جگہ جہاں شادی کی رسومات انجام پانے والی تھیں۔ عمدہ عمدہ رنگ برنگ کے برقی قمقموں سے سجائی گئی تھی ـــ شہنائیوں کے شور میں، پنڈتوں نے مقدس وید کے منتروں کو پڑھتے ہوئے کملا کا ہاتھ کیشو کے ہاتھ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دیدیا ـــ کملا کو اپنا سر چکراتا ہوا معلوم ہوا ـــ اور ـــ وہ غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی ـــ شہنائیوں کی آواز میں اُسے اپنی زندگی کا نوحہ سنائی دے رہا تھا ـــ وہی آواز جو دوسروں کے لئے نغمۂ شادی تھی اس کیلئے نوحۂ غم تھی ـــ

بارات منڈوہ سے واپس چلی گئی۔ دوسرے دن رخصتی ہونے والی تھی ـــ

رخصتی والے دن اس نے صبح ہی سے رونا شروع کردیا تھا۔ شیلا نے جو اس کی ہمراز سہیلی تھی۔ گلوگرفتہ آواز میں اس سے کہا "کملا نہ رو، دیکھ تو رو رہی ہے اور میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔ دیوانی تو سمجھتی ہے کہ رونے سے تیرا غم کم ہوجائیگا ـــ تو اپنے آنسوؤں کو مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کر"

کملا نے سر اُٹھایا اور شیلا کو اس نگاہ سے دیکھا جس میں کرب غم کی ہزاروں خاموش بجلیاں پوشیدہ تھیں ـــ اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ جو اس کے دلی جذبات کی ناکام ترجمان تھی ـــ شاید وہ شیلا کو بتانے کی کوشش کررہی تھی کہ غم تھمتے تھمتے تھمیگا آنسو رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

"تم یاد رکھنا شیلا۔ تمہاری کملا اب شاید زندگی میں کبھی نہ ہنسیگی ـــ آج اس کی آرزوؤں کا خون ہوگیا ہے۔ وہ نامرادی کے اس غار میں دھکیل دی گئی ہے جہاں سے مرکر ہی چھٹکارا ہوگا ـــ کاش تم میری حالت کو سمجھتیں ـــ جس کے سامنے تاریکی کے سوا کچھ نہ ہو اس سے ہنسنے کی توقع ـــ مجھے لوہے کے کارخانہ میں جھونک دیا

گیا ہے " ـــ کملا نے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہ نکلا ـــ

عورتوں نے رخصتی کا گیت گایا ـــ گیت میں چھپے ہوئے درد کے اثر سے ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ـــ فرض سے سبکدوشی کی خوشی اور جدائی کے غم کے ملے جلے احساس کے ساتھ اہل خاندان نے کملا کو رخصت کیا۔ کملا ایک شکستہ دل۔ ناکام تن۔ اور قلب کو برما دینے والے آنسوؤں کے ساتھ سسرال روانہ ہوئی ـــ

سسرال میں صبح سے شام تک گاؤں والی عورتوں کے سامنے نمائش کرانے کے بعد کملا کو اس کے کمرۂ خواب میں پہونچا دیا گیا ـــ تھوڑی ہی دیر میں کمرہ کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور بند ہو گیا۔ اٹھارہ برس کی کملا کیا یہ بھی نہ جانتی کہ کمرے کے دروازہ کا کھلنا اور بند ہونا کس کی آمد کی اطلاع دے رہا ہے ـــ خوف اور اجنبیت کے احساس نے اسے لرزہ براندام کر دیا اور وہ سمٹ کر بیٹھ گئی ـــ کچھ ہی دیر کے بعد کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "کیا یونہی بیٹھی رہو گی؟" ـــ کملا کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی شخص اپنے الفاظ میں نرمی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ یہ کیشو تھا ـــ

کیشو نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "دیکھو ایشور کی مرضی ہے کہ ہم دونوں اتنے نزدیک ہو جائیں کہ ہمارے بیچ میں کوئی پردہ باقی نہ رہے" ـــ کملا چپ تھی ـــ "اچھا اگر تم دیوتاؤں کا کہنا نہیں مانتی ہو" کیشو نے کہنا شروع کیا: "اور اتنے نزدیک آنا نہیں چاہتی ہو تو میرے دل کی رانی مجھے اپنی حسین صورت ہی دکھا دو" ـــ

کملا سمٹ گئی۔ اور اپنا سر جھکا لیا ـــ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ـــ

"اتنا ظلم تو نہ کرنا چاہئے ـــ بڑے بوڑھوں نے کہا ہے کہ ظلم کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا ـــ میں نے سنا ہے کہ تم حد درجہ حسین ہو ـــ بھابی کہہ رہی تھیں کہ تمہاری آنکھیں دو میٹھی جھیلیں ہیں جن میں انسان ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے ـــ مسکراتے وقت تمہارے پنکھڑیوں ایسے نازک ہونٹوں سے امرت کی بوندیں ٹپکتی ہیں" ـــ کیشو کہتا گیا ـــ "تم اپنے اس ریشمی آنچل میں چھپی ہوئی ایسی معلوم ہوتی ہو ـــ جیسے بادلوں میں چودھویں کا چاند ـــ یہ گھونگھٹ ہٹا لو میری رانی" ـــ

مگر رانی نے اپنا گھونگھٹ ہٹانے کی بجائے اسے اپنی حسین اور ملائم انگلیوں سے اور مضبوط پکڑ لیا۔ کیشو کے اس حسن طلب میں کملا کو ایک انداز محسوس ہوا گویا وہ کملا کے رخ زیبا کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے اپنا لوٹ دو کا خزانہ نچھاور کر سکتا ہے ـــ

"ـــ مگر کملا؟" ـــ کیشو نے اپنے الفاظ میں اثر پیدا کرتے ہوئے کہا: "یہ پردہ کب تک رہیگا؟ ـــ تم کو تو پوری زندگی میرے ساتھ بسر کرنی ہے" ـــ

کملا ـــ شاید ـــ ابھی رونمائی کیلئے تیار نہ تھی۔

"دیکھو حسن دکھانے کی چیز ہے ـــ چھپانے کی نہیں ـــ اچھا ـــ اگر تم اپنا چہرہ نہیں دکھاتی ہو تو میری ہی شکل دیکھ لو" ـــ یہ کہکر کیشو نے اس کا گھونگھٹ سرکا دیا ـــ

مگر کملا کیشو کے چہرہ کو نہ دیکھ سکی کیونکہ اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا ـــ صرف کملا کا کھلا ہوا سر اور اس کے سہاگ کی نشانی ـــ سیندور کی لال لکیر دکھائی دے رہی تھی ـــ

دھیرے دھیرے کیشو نے کملا کی کمر کے گرد اپنی باہیں ڈالدیں اور اسے گدگدانا شروع کیا۔ آج اسے اس لذت کا احساس ہو رہا تھا جس سے وہ اس وقت تک نا آشنا تھا۔

"منہ اٹھاؤ میری رانی" ـــ اس نے ناٹک کے انداز میں کہا۔

کملا نے آہستہ سے اپنا حسین چہرہ اوپر کو اٹھایا! اس نے کیشو کے چہرہ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی ـــ اور ـــ اس کے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔

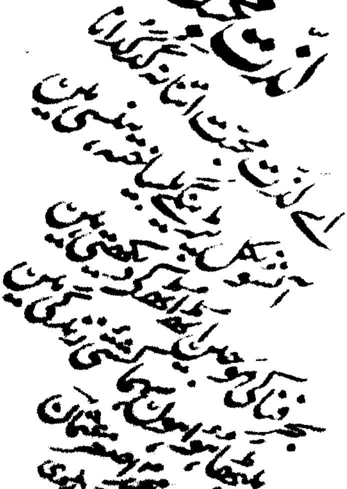
کیشو کا چہرہ لوہے کی طرح سیاہ تھا جس پر چیچک کے گہرے بدنما نشانات تھے۔

پرکاش کو کھونے کے بعد جو تھوڑی سی امید باقی رہ گئی تھی وہ بھی آج مٹ گئی۔ اس کے منہ سے ایک دلسوز آہ نکلی۔ حجلۂ عروسی اس کی آرزوؤں کا مدفن دکھائی دے رہا تھا ـــ

بسنتی ہوائیں ایک مرادِ زندگی کا ماتم کر رہی تھیں ـــ دور تک کھیتوں میں سیاہی پھیلی ہوئی تھی ـــ کچی سڑک پر جس کے دونوں طرف اونچے اونچے درختوں کی قطاریں تھیں، کوئی گاتا ہوا جا رہا تھا ؎

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

~~~~~~~~~~~~


~~~~~~~~~~~~

سوزِ حیات
(آخری قسط)

آنسوؤں اور غم میں ڈوبا ہوا دردناک افسانہ

از ادیبِ انقلاب ملک سلمان الارشد فاروقی

زندگی میں ایک دفعہ بہار آئی تھی مگر سماج کے اقبالو نے اس بہار کو خزاں کی صورت دے دی۔ دل کی گرم جوش ولولے سرد ہو گئے البتہ ان کے حسن کی برق پاش تجلیوں سے دل ہنوز معمور ہے اسلئے اس داستانِ حیات کو انہی کے نام سے معنون کرنے کی جرأت کرتا ہوں شاید اس طرح میں سکون محسوس کر سکوں۔ (سلمان الارشد)

زندگی! ـــــ مصائب کا ایک طوفان ہے۔ اور محبت ایک ایسا دریا جس کی گہرائی کی کوئی حد نہیں۔ اور جب ان دونوں کا امتزاج ہوتا ہے تو بس اللہ کی پناہ! ـــــ اسی کلیہ کے ماتحت مجھکو اور ریحانہ کو سماجی انسانوں نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ کس کو امید تھی کہ ہماری محبتوں کا یہ سرسبز و شاداب شجر اس قدر جلدی خزاں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو جائیگا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ آخر اسی ذلیل و مطلب پرست دنیا کے فرد کہنے کو تو یہ کوئی بات نہیں۔ مگر تکلیف دہ امر ہے۔ قدرت نے جن دو ہم مذاق ہستیوں کو یکجا کر دیا تھا۔ ظالم اور کٹھور انسانوں نے ان دونوں کو جدا کر دیا۔

جنوری ۱۹۳۷ء کو جی آئی پی ریلوے نے رعایتی ٹکٹ جاری کئے اور محمود منزل والی خالہ نے ان سے فائدہ اٹھایا۔ اور مع خاندان جھانسی پہنچ گئیں۔ اتفاق کہئے یا بدقسمتی۔ ان دنوں زنانہ اسکول میں تعطیلات تھیں اسلئے میرے خطوط اسکول ماسٹرنی کی معرفت کے بجائے انکے ہی گھر پہ جاتے تھے۔ اور ان میں وہی مضمون ہوتا تھا۔ جو دنیا کی نظر میں گناہ ہے۔ اس زمانہ میں خطوط کی زیادتی کا یہ عالم تھا کہ دو خط میں ان کو صبح شام لکھتا تھا۔ اور دو وہ مجھے۔ خالہ نے جب خطوط کی زیادتی دیکھی تو ظفر سے استفسار کیا کہ ان خطوں کو تم نے بھی کبھی دیکھا ہے کہ ان میں کیا لکھا ہوتا ہے۔ ظفر نے کہا کہ میں نے کبھی اس پر توجہ نہیں کی۔ خالہ نے کہا کہ کل جو خط آئے تو اس کو کھول کر ضرور پڑھنا۔ تاکہ معلوم ہو کہ آجکل یہ دونوں محبت کی کس منزل میں جادہ پیمائی کر رہے ہیں۔ ظفر نے اس سے اتفاق کیا۔ ان دنوں میری اور ریحانہ کی بحث چھڑی ہوئی تھی کہ "محبت کیا ہے"؟ ـــ محبت عورت ہی سے کیوں ہوتی ہے؟" ـــ اور مجھ سے ہی محبت کیوں ہے؟" ـــ چنانچہ اسکے جوابات میں نے مدلل طریقے سے دیئے تھے اور یہی خط میرا پکڑا گیا۔ یوں تو خط کا مضمون کچھ نہ تھا۔ مگر یہ لوگ اس کو پڑھکر بید برافروختہ ہوئے۔ بھلا سماجی انسان محبت کو کیسے گوارہ کر سکتے ہیں۔ ان کی نظر میں تو یہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔ اور اسکی سزا انکی دنیا میں صرف یہ ہے کہ ایسی عورت کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ خط چاک کیا گیا۔ اور اسکو سنایا گیا۔

از بھوپال ۱۲ جنوری ۱۹۳۷ء

سلامِ شوق!

ابھی میں یہ گنگنا رہا تھا ـــــ کہ

یہ کون آیا مرے خیالوں میں پھر سراپا حیات بنکر
محبتوں کے سرور میں چور، پیکرِ التفات بن کر

کرنیکل پوسٹ میں نے تمہارا خط دیا۔ لبس پڑھکر اس قدر ہنسی آئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اور تمکو مجبوراً نہایت معصوم اور بھولی سمجھنا پڑا۔ حالانکہ تم اپنے کو بڑا قابل سمجھتی ہو۔ تمہاری سوالات حسب ذیل ہیں۔

(۱) "محبت کیا ہے"؟

(۲) "محبت عورت ہی سے کیوں کیجاتی ہے"؟

(۳) "میرا معیارِ حسن کیا ہے"؟

(۴) "میں نے تم سے کیوں محبت کی"؟ ـــ کیا کوئی اور لڑکی محبت کرنے کے قابل نہیں تھی؟

ریحانہ سوالات کرنے میں تم اس قدر جلد باز ہو کر یہ بھی نہیں سوچتیں کہ تم پوچھ کیا رہی ہو۔ اور اس کا مقصد کیا ہے۔ سوالات بہت دلچسپ ہیں۔ اگر نہیں بتاتا ہوں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ۔ سوال حل کے لئے دنیا کے چند مشہور ادیبوں کی آراء لکھ رہا ہوں۔ آخر میں نے اپنی رائے بھی لکھدی ہے۔ مگر وہ کب قابلِ قبول ہوگی۔ ہاں تو تم نے دو دن سوچنے میں ضائع کر دیئے۔ کہ محبت ہے کیا؟ دیکھو خفا نہ ہونا بحث طویل ہے مگر اس میں میرا کیا قصور۔ جوابات ہی ایسے ہیں کہ خط طویل ہو گیا ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اچھا دیکھو جوابات سمجھنے کی کوشش کرنا تاکہ پھر یہ سوالات نہ کر سکو۔ محبت کے بارے میں دنیا کے مشہور ادبا کہتے ہیں کہ

(۱) "محبت انسانیت کا دوسرا نام ہے! (بدھ)

(۲) محبت کا نزول آسمان سے ہوتا ہے اور یہ آسمان ہی پر صعود کرتی ہے۔ محبت دراصل پاکیزگی کا ایک غیر فانی شعلہ ہے۔ (والٹر اسکاٹ)

(۳) محبت روحوں کے ملاپ کا نام ہے (ٹالسٹائی)

(۴) محبت ایک آرزو ہے ـــ مستقل رنگینی اور دلکشی (ٹیگور؟ سن)

(۵) حقیقی اور غیر فانی جذبۂ خلوص کا نام محبت ہے (ملٹن)

(۶) محبت ایک لازوال جذبہ ہے۔ جو انسان کی فطرت میں راسخ ہو جاتا ہے۔ ایک مرد

ایک عورت سے اور ایک عورت ایک مرد سے صرف ایک مرتبہ ہمیشہ کیلئے خلوص برتتے ہیں اور اسی کو ہم محبت کے نام سے منسوب کرتے ہیں (سلمان) محبت عورت سے کیوں کی جاتی ہے ؟

(۱) عورت ایک پھول ہے جس کو اپنی خوشبو اور رنگینی سے ہمارے دل کو پُر انبساط بنانے کیلئے قدرت نے پیدا کیا ہے (ماخوذ شاعر آگرہ)

(۲) عورت اگر مرد کی ہمسفر نہ ہو تو ممکن نہیں کہ مرد منزل مقصود تک پہنچ سکے (ماخوذ نقاد)

(۳) عورت ایک ایسا طلسم حیرت افزا ہے جو اپنی پیچیدگیوں میں گم ہے۔ یا ایک ایسا خزانہ ہے جو دولت سے متمتع ہونے والوں کی تلاش میں ہے۔ یا آب شیریں کی ایک ایسی موج ہے جو خشک حلقوم اور پیاسے لب و دہن کو ڈھونڈتی رہتی ہے

حسین ریحانہ! یہی وجہ ہے کہ مجھکو تم سے یعنی عورت سے محبت ہے۔!!

تمہارا تیسرا سوال بہت ہی عجیب و غریب ہے۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اسکا جواب دوں یا نہ دوں ــــ مگر پھر خیال آیا کہ جواب دے ہی دوں۔ سنئے۔ میرا معیار حسن جو کچھ ہے آپ خود سمجھ سکتی ہیں۔ مگر خیر ـــ آپ ہیں اور شائد آپ کے پاس آئینہ بھی ہوگا۔ ذرا تکلیف کر کے دیکھ لیجئے تو آپ کو بھی معلوم ہو جائیگا کہ میرا معیار حسن کیا ہے !!

اب آپ کا سوال یہ کہ ان دل صاحب نے تم ہی کو کیوں پسند کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بندۂ حسن دل بنا اس میں مراقبہ و کریا کیوں ہے غضب کی دلکشی صورت دلنواز میں میں آج کل بیحد پریشان ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میری صحت خراب ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ صرف تمہاری یاد کا [illegible]

تمہارے بغیر دل اداس رہتا ہے۔ اور اس کا اثر جسم پر بھی ہے۔ اسی لئے لوگوں نے یہ باور کر لیا ہے کہ میں بیمار ہوں آج کل کچھ لکھا بھی نہیں جاتا کیونکہ ــ

یہی دو شغل ہیں میرے غم تنہائی میں !
کبھی روتا ہوں کبھی محو دعا ہوں میں

روح سہیل! دل کی مسلسل خلش اور جگر کے پیہم درد نے مجھے غم آگین تصویر بنا دیا ہے۔ میری زندگی کا درخشاں ستارہ تم ہی ہو میری ہر آرزو کا مدعا تم ہو۔ تمہارے بغیر میری دنیا نامکمل ہے۔ کاش تم آزاد دنیا میں پیدا ہوئے ہوتے۔ دل تو چاہتا ہے کہ اور بہت کچھ لکھوں مگر خط طویل ہو گیا ہے اس لئے ختم کرتا ہوں تیرے خیال سے تیرا ارمان ہے، تو ہے مجھے یہ زیست کا ہوش کہاں کہ کیا ہوں میں

تمہارا ناشاد
سہیل رومانی

خادم علی صاحب نے خط پڑھ کر ریحانہ کو آواز دی وہ فوراً باپ کے سامنے آئی ـــ خالہ، بھائی، ماں، باپ سب کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ ریحانہ کو اس وقت کی کچھ خبر نہیں تھی اس لئے وہ بری طرح گھبرا رہی تھی۔ مولانا نے ایک ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا

رجو! تمہارے پاس یہ خط کیسے آتے ہیں ؟

ریحانہ نے مستقل مزاجی سے جواب دیا۔ سہیل صاحب کے !

محمود منزل والی خالہ نے ڈانٹ کر پوچھا۔ وہ تیرا کون ہے ؟

دوست! ریحانہ کی آواز میں ارتعاش تھا

دوست! دوست! بلقیس اور مولانا نے ایک ساتھ کہا۔

جی ہاں دوست! ـــ ریحانہ نے مسکرا کر کہا۔

جیتی ہوئی تیرے اوپر بدنام ہو ! مولانا کے منہ سے ارے غصہ کے جھاگ نکل رہے تھے۔

ریحانہ کانپ رہی تھی!

وہ تم کو خط میں کیا لکھتا ہے۔ ظفر نے سوال کیا۔

اس سوال کا جواب ریحانہ کے پاس نہیں تھا اس لئے وہ چپ رہی۔

بولو جواب دو۔ اب خاموش کیوں ہو گئیں محمود منزل والی خالہ نے طنز سے پوچھا۔

وہ مجھے ـــ وہ مجھے۔ الفاظ ریحانہ کے گلے میں اٹک کر رہ گئے

وہ مجھے ـــ وہ مجھے کیا کہہ رہی ہے صاف کیوں نہیں کہتی۔ مولانا نے گرج کر کہا۔

ـــ ایک خاموشی تھی سب کے جواب میں!

چڑیل لے دیکھ! اپنے دوست نہیں بلکہ آشنا کا خط۔ بدکار کاش تو پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ تاکہ آج اس ذلت کا سامنا تو نہیں ہوتا ـــ خط ریحانہ کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ وہ مع خط کے اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ آنسو! لطیف آنسو! ماضی کی یاد اور مستقبل کی فکر پر سے چھڑکاؤ کئے جا رہے تھے ـــ شام کو دو بجے خالہ اور ظفر اس کے کمرے میں داخل ہوئے، رجو!

جی۔ ریحانہ نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔

لکھو یہ خط سہیل کو لکھو اور دوسرا سہیل کی ماں کے نام۔

ایک بیکس و بے بس سماج کی ستائی ہوئی ماں باپ کی ٹھکرائی ہوئی لڑکی مجبور تھی۔ اس حکم کے ماننے پر ـــ ریحانہ خط کے مسودہ پڑھ کر کانپ گئی۔ اس کے ضمیر کے خلاف اس کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ لکھے۔ متواتر غم و غصہ نے اس کا دماغ اس وقت معطل کر دیا تھا۔ اس لئے اس نے لکھا۔

جمعرات کا دن تھا میں کالج سے جلدی واپس آگیا تھا۔ کھانا کھا کر ٹینس کھیلنے میں میں جارہا تھا کہ والدہ نے پکارا۔ سہیل حاضر ہوا۔ میں والدہ کے پاس ان کے کمرے میں پہونچا۔

سہیل۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم اس طرح مجھے اور اپنے باپ کو دوسروں کے سامنے شرمندہ اور رسوا کرو گے۔ والدہ نے صندوق کھولتے ہوئے کہا۔

میں نے گھبرا کر کہا۔ کیا ہوا اماں۔ کیونکہ مجھے کچھ علم نہ تھا — یہ دیکھو۔ یہ کہکر والدہ نے مجھے دو خط دیئے۔

ریحانہ کی طرز تحریر پہچان کر میں گھبرا گیا۔ کہ اماں کے پاس میرے پرائیویٹ خطوط کیسے! میں نے بیتابی سے خطوط کو لیا — پہلا خط میرے نام تھا۔

رنگیلے!

مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم اس قدر ذلیل حرکت کے مرتکب ہوگے۔ تم کو کیا حق تھا کہ مجھے محبت آمیز خطوط لکھو۔ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں آخر تم کیوں میری زندگی کو برباد کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری اس ذلیل حرکت کو کبھی معاف نہیں کرونگی۔ آئندہ سے مجھے خط لکھنے کی جرأت نہ کرنا ورنہ تمہارے لئے سخت مضر ہوگا۔ اور تم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ "ریحانہ"

خط پڑھکر میں سکتے میں آگیا۔ ریحانہ کا خط! یہ کیسے ممکن ہے۔ ناممکن! جلدی سے میں نے والدہ والا خط پڑھا۔

خالہ! تسلیم!

مجھے بیحد رنج ہے کہ برادرم سہیل نے مجھ کو ایسا ذلیل خط لکھا۔ ان کو مجھ سے عشق کرنیکا آخر کیا حق تھا۔ یہاں! ابا۔ محمود منزل والی خالہ کو اور والدہ کے سامنے مجھ کو شرمندہ ہونا پڑا۔ انکو سمجھا دیجئے کہ آئندہ ایسی گندی اور ذلیل حرکت کے مرتکب نہ ہوں۔ انہوں نے میرے خلوص اور اعتماد سے غلط فائدہ اٹھایا بہرحال آپ اور خالو ان کو سمجھا دیں۔ ان کے حق میں بہتر ہوگا۔

اگر میرے سرتاج مجیب الدین صاحب کو معلوم ہوگیا تو وہ ان کو جان سے مار ڈالیں گے۔

سب کو سلام۔

آپکی بھانجی "ریحانہ"

خطوط پڑھنے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ شرم کے مارے میں گڑا جاتا تھا۔ والدہ سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہیں تھی۔ یکایک والدہ نے کہا سہیل خطوط دو روز سے آئے ہوئے رکھے ہیں۔ اور تمہارے والد نے بھی ان کو دیکھ لیا ہے اور ان کو بھی اس سے دلی اذیت ہے۔ والد کا نام سنکر میری وحشت میں اور اضافہ ہوگیا اور میں بغیر کچھ کہے سنے گھر سے چلا آیا۔ اس ارادہ سے کہ میں والدین کو عمر بھر منہ نہیں دکھاؤنگا — راستہ میں میرا عزیز دوست فاروق مل گیا۔

سہیل کہاں جارہے ہو!

دور — دنیا سے بہت دور!

ارے کیا وحشت ہے۔ فاروق نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

فاروق! میری آواز حلق میں اٹک کر رہگئی۔ البتہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ارے رو رہے ہو، چلو میرے ساتھ چلو۔

گھر جاکر میں نے فاروق کو سب کچھ بتادیا اور اپنا ارادہ ظاہر کیا — فاروق کی ہمدردی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اور میرا غم کم ہوگیا۔ دو دن گذر گئے۔ میں گھر نہیں گیا —

تیسرے دن میں اور فاروق ایک ضروری کام سے بازار جارہے تھے۔ جب جعفری سٹور کے پاس سے میں گذرا تو مالک جعفری سٹور نے پکارا ارے بھئی سہیل! کل شام سے تمہارا ایک لفافہ رکھا ہے۔ میں نے لاپروائی سے لفافہ لیا اور کچھ آگے جاکر بغیر پڑھے خط کو چاک کرنا چاہا کہ فاروق نے کہا — کیا کر رہے ہو۔

دنیا کی ذلیل ترین ہستی اور جفاکار لڑکی کا خط چاک کر رہا ہوں۔

ارے بھائی کم از کم پڑھ تو لو کیا لکھا ہے۔ فاروق کے کہنے پر میں نے چاک کیا۔

مانک چوک جھانسی۔

میرے اچھے سہیل!

خفا نہ ہو۔ خدا کے لئے خط پڑھو۔ سمجھ لو میری مجبوریوں پر غور کرو۔ میری بیکسی پر آنسو بہاؤ۔ اگر تم خفا ہوجاؤ گے تو میرا کون رہیگا — دل کے مالک! محمود منزل والی خالہ آئی ہوئی تھیں ان کے سامنے انکے کہنے پر آپ کا خط پکڑا گیا۔ اور سب کو سنایا گیا۔ مجھے لعنت وملامت کی گئی۔ میرے دل پر تیز نشتر چلائے گئے۔ مجھ سے زبردستی — خدا کی قسم زبردستی! — عزیز سہیل — تمہاری جان کی قسم زبردستی میری مرضی کے خلاف مجھ سے خطوط لکھوائے گئے۔ خدا کی قسم میرا کوئی قصور نہیں۔ للہ میری غلطی کو معاف کردو۔ خدا کیلئے میری اس خطا کو بخش دو۔ کیا اپنی لونڈی کی ایک غلطی معاف نہیں کروگے۔ تم کو میری قسم اللہ کیواسطے اس سے درگذر کرو۔ اچھے سہیل تم خط نہ لکھنا۔ البتہ میں خط برابر روانہ کرتی رہونگی

مرتے دم تک صرف تمہاری

"ریحانہ"

خط پڑھکر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــ فاروق کا غنچۂ دل کھل گیا۔

ــــــ ــــــ

ایک ہفتہ گذر گیا۔ مگر میں گھر نہ پہنچ سکا۔ آخر کار والدہ نے فاروق کو بلایا۔ اور نتیجہ میں فاروق مجھے گھر پہنچا آئے۔ ریحانہ کے خط برابر آتے رہے۔ جس میں اپنی تکالیف اور مصائب کا اظہار کرتی تھیں۔ دو دفعہ میرا بھائی سلطان ان کے پاس گیا۔ اور اس سے انھوں نے کہا کہ عنقریب وہ گھر چھوڑ دیں گی۔ کیونکہ اب ان میں ظلم وستم سہنے کی طاقت نہیں ہے۔ جون ۱۹۲۹ء کو ان کا گھر سے آخری خط آیا جس میں گھر چھوڑنے کی وجہ ظاہر کی تھی۔

"دنیائے دل کے مالک"

لاکھوں سلام!

چار روز ہوئے مجیب الدین جن کو سماج نے زبردستی میری مرضی کے خلاف میرا شوہر بنا دیا ہے۔ تشریف لائے تھے۔ اُن کی آمد کی خبر سنکر میں نے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا۔ دس بجے دن کو والدہ نے ان کی خواہش پر ان کو گھر میں بلایا تاکہ وہ سب کے سامنے گفتگو کر سکیں۔ ان کی گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ میں نے جو کچھ کیا اس کا مجھے احساس ہے۔ اور میں شرمندہ ہوں اور آئندہ کے لئے حلف اٹھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ اس پر والدہ نے کہا کہ اب میں اپنی لڑکی کو جان بوجھ کر تباہی کے غار میں نہیں دھکیل سکتی۔ اس پر انھوں نے نہایت لجاجت سے کہا کہ مجھے یہ منظور ہے کہ یہیں رہیں اور میں ان کو ۳۰ روپیہ ماہوار خرچ دینے کو تیار ہونگا۔ ظفر نے اس رقم سے اختلاف کیا۔ آخر پچاس روپیہ ماہوار پر گھر والے راضی ہو گئے۔ اور والدہ نے مجھ سے کہا کہ اب میں ان کے سامنے آ جاؤں اور پردہ نہ کروں مگر میں نے سختی سے کہدیا کہ میں پچاس روپیہ ماہوار پر اپنے جسم کو فروخت نہیں کر سکتی۔ اور اپکی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ اس لئے اب میں ان کو شوہر کی حیثیت سے کسی حالت میں بھی قبول نہیں کر سکتی ہوں۔ وہ یہ سنکر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ میں انکو راضی کر لونگا۔ اور ۲۸ جون کو آؤنگا ـــ پجاری! گھر والے راضی ہیں۔ کوئی میری مدد پر آمادہ نہیں اور اب ماں، باپ، بھائی سب ان کے طرفدار ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں اپنا جسم اس بدطینت انسان کے حوالہ کر دوں۔ مگر یہ ناممکن ہے۔ اس لئے میں نے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور ۲۶ کی شام کو میں یہ گھر ہمیشہ کیلئے چھوڑ دونگی۔ خدا کیلئے میرے اس اقدام سے آپ اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھئے گا میں یکم جولائی کو آپ کو خط لکھوں گی۔ یہ ارادہ اس لئے اتنی دیر میں ظاہر کیا ہے کہ کہیں آپ میرے پائے استقلال کو نہ ڈگمگا دیں۔ بہرحال جبتک یہ خط آپ کو ملیگا میں اس سموم فضا سے اسوقت تک نکل چکی ہونگی۔ صبر کر کے میرے دوسرے خط کا انتظار کیجئے آپ کو مطلق پریشان ہونیکی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کو اپنی ریحانہ پر اعتماد ہے اس لئے اس اعتماد کو زائل نہ کیجئے البتہ اس کا میں یقین دلاتی ہوں کہ میں جیسی پاکدامن گھر سے جا رہی ہوں ایسی ہی پاکدامن آپ کو ملونگی۔

مرتے دم تک صرف آپ کی

ریحانہ جبین ناز

اس خط کو پڑھکر میں بیہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ والدہ اور بھائی پاس کھڑے ہیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو رقص کر رہے تھے اور خط والدہ کے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا۔

ـــــ ـــــ

دو جولائی کی شام گذر گئی تین تاریخ سے چار ہوئی۔ مگر خط نہیں آیا۔ میں نے گھبرا کر چاہا کہ انکی تلاش میں روانہ ہو جاؤں اور پانچ تاریخ سفر کیلئے مقرر کر لی صبح سامان اکٹھا کر رہا تھا کہ ڈاکئے نے خط لا کر دیا۔

از ـــــــ

پجاری!

اپنی پجارن کا سلام قبول کرو! گھبرا رہے ہو۔ آنسو بہا رہے ہو ـــ سنو غور سے سنو تمہاری پجارن نے رہائی حاصل کر لی ـــ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ اور اس زہریلی فضا سے نکل آئی ہے جہاں کی فضا اس کیلئے زہر قاتل کی حیثیت سے کم نہیں تھی۔ پجاری اگر تم کو واقعی اپنی پجارن سے محبت ہے تو تین سال تک اس کا انتظار کرو۔ اس کا پروگرام بہت بلند ہے۔ اس کے پیش نظر ایک بہت بڑا لائحہ عمل ہے۔ ایسا لائحہ عمل جو اس کو دنیا میں کامیاب کریگا۔ جب مسرت اس کی غلام ہوگی۔ جب وہ خود اپنے پیروں پر کھڑی ہوگی۔ جب وہ کسی کی دست نگر نہ ہوگی ـــ پجاری بیتاب ہوگا کہ آخر وہ کیا پروگرام ہے۔ مگر نہیں اس کے لئے تین سال تک انتظار کرنا پڑیگا۔ اگر پجاری واقعی پرستش کرتا ہے۔ اگر حقیقتاً اس کا جذبہ صادق ہے تو وہ انتظار کرے اور وہ یقیناً انتظار کریگا۔ یہ وقت اس کے امتحان کا ہے پجارن کو آشا ہے کہ وہ ضرور اس امتحان میں کامیاب ہوگا ـــ کیوں پجاری؟ کیا اپنی پجارن کی آشا کا پالن نہیں کروگے۔ نہیں نہیں ضرور کروگے۔ پجاری تو پجارن کو دیوی کہتا ہے بھلا پھر وہ اپنی دیوی کی آشاؤں کی نگری کو کیسے ڈھا دیگا ـــ ارے پجاری کو ڈر ہے کہ تین سال میں کہیں دیوی ناپاک نہ ہو جائے نہیں نہیں پجاری! ایسا وقت آنے سے پہلے پجارن اپنے جیون کو ختم کر دیگی مطمئن رہو!

پجاری کا جی دھڑک رہا ہے کہ اگر ان تین سالوں میں پجارن کبھی کسی مصیبت میں مبتلا ہوئی تو اس کو کیسے معلوم ہوگا ——— ۔

گھبراؤ نہیں پجاری! اگر ایسا ہوا تو۔ پجارن تم کو ضرور اطلاع دیگی۔ کیونکہ تمہارے علاوہ اور اس کا ہے ہی کون! ——— بس پجاری اب تو کوئی بات نہیں۔ اچھا تین سال پجارن کی تصویر کی پرستش کرو۔ پجارن جا رہی ہے ——— پھر آنسو! ——— ارے پجاری تمہارے آنسوؤں سے پجارن کو تکلیف ہوتی ہے ——— اس کے من میں آگ لگ جاتی ہے۔ پجاری ایشور کے لئے آنسو نہ بہاؤ۔ اور ہاں پجاری ——— اپنی پجارن کے لئے زندہ رہنے کی کوشش کرو۔ کہیں جیون ختم نہ کر لینا۔ ورنہ پجارن کا بھی جیون ختم ہو جائیگا۔ اور پجاری کبھی اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی پجارن کا جیون ختم ہو۔ اچھا بس! اب دیر ہو رہی ہے پجاری یہ خط ریل میں ڈالا جا رہا ہے۔ اور جس جنکشن پر ڈالا جا رہا ہے۔ وہاں سے پجارن کا گاڑی ٹل رہی ہے ——— اس لئے تلاش فضول ہے!

ہمیشہ اپنے پجاری کے چرنوں کی داسی

ور ریحانہ"

آہ خط کیا تھا۔ اشکوں کا بہتا ہوا دریا تھا۔ شعلوں کی لپٹیں تھیں۔ جن سے کہ دل جل گیا۔ تلاش بیکار تھی۔ اور سعی لاحاصل! ———

ایک سال گذر گیا۔ ماں باپ بھائی۔ نے مشہور کر دیا کہ ریحانہ کا انتقال ہو گیا۔ مجیب الدین صبر کر کے بیٹھ رہے ——— ماں! اس جدائی کو گوارا نہیں کر سکی۔ اور اس جگہ چلی گئی ——— جہاں احساس ہی باقی نہیں رہتا۔ اور اپنی یادگار۔ ایک تودۂ خاک کی صورت میں چھوڑ گئی ہے جس کے قریب ایک جامن کا درخت نکل رہا ہے ———

دوسرا سال بھی گذر رہا ہے مگر ریحانہ کے خط کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ لوگوں نے اسے ذرا بھی کر دیا ہے صرف اس کی چھوٹی بہن ثریا کبھی کبھی اس کی یاد میں آنسو بہا لیا کرتی ہے۔ اور اس کے علاوہ وہ بیچاری کر بھی کیا سکتی ہے۔ البتہ میری زندگی ختم ہو چکی ہے۔ ماں باپ میرے غم سے متاثر ہو کر شادی کا مشورہ دیتے ہیں مگر میں یہ کہکر چپ ہو جاتا ہوں کہ کاش میں اس قابل ہوتا۔ لیکن دل تو اسو برابر برس رہا ہے ——— اور برستا رہیگا ——— زندگی گذر رہی ہے مگر اس طرح کہ

شعر

یوں زندگی گذار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

آخری رات (بقیہ صفحہ ۱۸)

بخش رہا تھا۔ ہوا ابر کے سیاہ گھوڑے آسمان پر دوڑا رہی تھی جس سے چاند کبھی کبھی چھپ جاتا تھا۔

دور، بہت دور، ایک ستارہ چمک رہا تھا۔ آسمان کے کنارے سے ہلکا ہلکا نور بلند ہو رہا تھا جس سے ستارہ کی روشنی مدھم ہو رہی تھی۔ اب وہ مجھ سے دور! بہت دور! کوسوں دور ہے!!!

جیسے افق کا ستارہ اب غور کرنے سے بھی نہیں دکھلائی دیتا۔ اسی طرح اس کو میری آنکھیں تلاش کرتی ہیں ——— مگر بے سود ——— ناکام کوشش ———

میں بااختیار ہوں ——— میں مجبور نہیں۔ مگر آہ۔ بااختیار ہوتے ہوئے بھی مجبور ہوں ——— لاچار ہوں۔

وہ آئے بھی اور گئے بھی کیسے نظر ابتک سمائے ہیں
یہ مل رہے ہیں وہ ملکر بچھڑے یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

طب جدید کے کرشمے

(بقیہ صفحہ ۴۰)

سال کی ہے تو اس میں ایک سال کا مزید اضافہ نہ ہوگا۔ آپ کے جسم اور روح کی تازگی برقرار رہے گی۔ اور آپ کو سچ مچ معلوم ہونے لگیگا کہ عہد شباب کی تازگی از سر نو آپ کی رگوں میں آنے لگی ہے۔ فی الحقیقت آپ دنیاوی معاملات سے اسقدر دلچسپی لینے لگیں گے کہ جو باتیں پیشتر آپ کیلئے موجب پریشانی تھیں وہی باعث انبساط ہونے لگیں گی۔ زندگی آپ کیلئے ایک ارمان عظیم کا درجہ حاصل کرے گی اور آپ کو ان خیالات کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہ رہے گی جن کی بدولت انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ میں بڈھا ہوتا جا رہا ہوں ممکن ہے شروع شروع میں آپ کو ایسا معلوم ہو کہ نوجوانوں کے ساتھ آپ کے میل جول کی کوششیں لاحاصل ہیں اور آپ ان کے مساوی کسی حال میں نہ ہونگے تاہم اس کی تردید بہت جلد عملی تجربہ سے ہونے لگیگی اور آپ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہونگے کہ جسے آپ پیشتر ایک احمقانہ فعل تصور کرتے تھے وہ درحقیقت فلسفہ کی ایک گہری رمز ہے۔

اس منزل پر پہنچنے کے بعد آپ کو خود بخود معلوم ہونے لگے گا کہ آپ نے پیشتر نوجوانوں کے مزاج کو سمجھا ہی نہیں تھا نہ کبھی ان سے ویسی محبت کی تھی جیسی کرنی چاہئے۔

یہ سب فرضی باتیں نہیں بلکہ آزمائی ہوئی حقیقتیں ہیں اور آپ کو لازم ہے کہ نتیجے کے بارہ میں کامل یقین رکھتے ہوئے ان پر عمل کریں

اپنا مکمل علاج مفت کرائیے!

[illegible]

زعفرانی گولیاں

[illegible]

طلائی بیر بہوٹی

[illegible]

سمندری

[illegible]

ORUSACK غروسک

[illegible]

امساکو زون

[illegible]

عنبریون

یہ معجون نہایت خوشبودار اور لذیذ ہے اور اس قدر مقوی باہ ہے کہ یہی خوراک سے کمزور سے کمزور آدمی اگر گیا گذرا کا رفتہ نامرد بھی اپنے اندر جوانی کا یقین کرنے لگ جاتا ہے بچپن کی خرابی یا بڑھاپے کی وجہ سے طاقت کمزور ہو گئی ہو تو اس دوا کا مکمل کورس استعمال کرنے سے بلا شک طاقت پیدا ہو جائیگی۔ یہ دوا بہت مقوی اور ممسک ہے۔

۴۰ روز کی دوا (۴۰ تولے) قیمت ۴ روپے ۱۲ محصول

۲۰ روز کی دوا (۲۰ تولے) قیمت ۲ روپے ۸ محصول

منیجر رحیم فارمیسی پوسٹ بکس ۳۴ لاہور

معجون بوزیدان

اگر آپ بچپن کی غلط کاریوں یا جوانی کی بے اعتدالیوں سے مردانہ طاقت ضایع کر چکے ہیں یا بڑھاپے کے سبب انتشاری سرت سے محروم ہیں تحریک بالکل نہیں ہوتی یا بہت کم ہوتی ہے کئی کئی روز کے بعد خیال آتا ہے بعد فراغت کمزوری کمر درد اور تکان ہو جاتی ہے تو معجون بوزیدان استعمال کرکے جوانی کی اجڑی ہوئی بستی پھر سے آباد کیجئے۔ یہ وہ دوائی ہے جو ستر اسی سال کے بڈھوں میں بھی جوانی کا شعلہ پیدا کرکے شادی پر مجبور کر دیتی ہے غیر شادی شدہ اصحاب ہرگز استعمال نہ کریں۔ اگر جوانی کے ولولے اور شباب کی امنگیں سرد پڑ گئی ہیں ایام جوانی ایک بھولا ہوا افسانہ بن چکے ہیں اور آپ کی آرزو ہے کہ وہی دن دوبارہ آجائیں وہی طاقت اور وہی دم خم حاصل ہو تو معجون بوزیدان مکمل کورس استعمال کرکے شباب جاودان کے مالک بن جائیے۔ یہ معجون نہایت مفرح مقوی باد و قلب اور خوشنما ذائقہ ہے معدہ اور جگر کی اصلاح کرکے خون پیدا کرتی ہے بھوک لگاتی ہے قبض دور کرتی ہے گردہ و مثانہ کو طاقت دیکر بار بار پیشاب آنے کو روکتی ہے سرعت انزال کو دور کرتی ہے اس کے استعمال کرنے والے کے گھر میں ہمیشہ اولاد نرینہ پیدا ہوتی ہے۔ قیمت مکمل کورس ۵۰ دن کی دوا پانچ روپے پانچ آنے محصول ۱۵ آنے۔ نصف کورس ۲۵ دن کی دوا دو روپے تیرہ آنے محصول ۱۱ آنے۔ نمونہ دس دن کی دوا قیمت ایک روپیہ ۵ محصول ڈاک ۵ آنے

ستاوین

پیشاب اور پاخانہ کے وقت پہلے یا بعد سفید قطرہ نکلتا ہو عورت کو دیکھ کر عورت کے ساتھ بیٹھتے ہی عورت کا خیال آتے ہی لیس دار رطوبت نکلنی ہو پھرتے پیشاب کا قطرہ نکلتا ہو اختلام ہفتہ میں ایک بار ہو یا روزانہ ہو یا ایک رات میں کئی کئی دفعہ کوئی خیال نہ ہو بغیر کسی خیال کے۔ رکاوٹ کم ہوتی ہو یا بالکل نہ ہوتی ہو یعنی سرعت انزال کا عارضہ ہو منی پانی سے پتلی ہوگئی ہو ستاوین کی پہلی خوراک سے تمام شکایات دور ہو جائیں گی مکمل کورس ۱۰ دن استعمال کرکے عمر بھر کیلئے جریان۔ احتلام اور سرعت انزال سے نجات حاصل کر لیجئے۔ مکمل کورس کی قیمت دو روپے دس آنے (یعنی دو آنہ روزانہ) محصول ڈاک معاف۔ اپنا حال لکھیں۔

امساکریم

امساک کی خارجی دوا ہے جو ممسک اور مقوی ہے جن لوگوں کا خیال ہے کہ امساک کی دوائیوں میں افیم ہوتی ہے وہ وقت مقررہ پر استعمال کرکے اس کا کرشمہ دیکھیں کہ عمر بھر کی بیکار فریقین کو عمر بھر فراموش نہ ہوگی بلکہ ہمیشہ اسی چیز کا تقاضا رہیگا قیمت فی شیشی [illegible]

ٹائیگر کریم

اگر خاص قت پوشیدہ جسم میں نرمی آجانے سے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے تو ٹائیگر کریم استعمال کیجئے لگاتے ہی جذب ہو کر بجلی کی سی طاقت پیدا کرتی ہے فولاد کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ [illegible] چربی ریچھ کی چربی اور [illegible] ادویات سے تیار شدہ ہے ٹائیگر کریم کو چند روز متواتر استعمال کرنے سے بچپن کی غلط کاریوں یا بڑھاپے کی وجہ سے نرمی۔ کمزوری۔ پتلا پن ٹیڑھا پن چھوٹا پن یا رگوں کا پھول جانا وغیرہ پوشیدہ جسم کی تمام خرابیاں بالکل دور ہو کر کمزور سے کمزور اور گیا گذرا کار رفتہ نامرد بھی فخر مرد بن جاتا ہے۔ نرمی اور درازی کی بہترین دوا ہے۔ قیمت فی شیشی ۲ تولہ دو روپے آٹھ آنے ایک تولہ والی شیشی ایک روپیہ چار آنے محصول ڈاک [illegible]

مسکولین

کی گولی جب تک منہ میں رہیگی خیرت [illegible] برقرار رہیگی

جب مطلب ہو گولی کو نکال دیں پہلے سے زیادہ طاقت پیدا ہو جائیگی اور کمزوری و تکان بالکل نہ ہوگی ۱۲ گولیوں کی قیمت تین روپے ۶ گولیاں ایک روپیہ ۱۲ آنے محصول ڈاک معاف۔ ایک گولی ۵ آنے کے ٹکٹ بھیج کر منگوا لیجئے

ملنے کا پتہ: حکیم ابو الضیاء شیخو پوریہ ۸۵ سرکلر روڈ لاہور

مفت
بالکل مفت



چھ فیر والا
مانند اصلی
امریکن پستول
نیا ماڈل ۱۹۴۱ء

اس پستول کی خوبیاں بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ مگر پھر بھی آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ یہ پستول امریکہ کے مقابلہ پر حال ہی میں تیار کروائے گئے ہیں جس میں یہ خوبی رکھی گئی ہے کہ اصل پستول کی مانند اس میں کارتوس رکھنے کی چرخی بنی ہوئی ہے اور اس کے اندر خانہ بنا ہوا ہے۔ اس خانہ میں چھ شارٹ کارتوس آجاتے ہیں کھٹکا دبانے سے چرخی خود بخود گھومتی ہے اور شارٹ کارتوس کی اس زور سے آواز آتی ہے کہ خود چھوڑنے والا بھی حیران ہو جاتا ہے۔ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے اس پستول سے بہتر اس وقت کوئی ریوالور نہیں ہے۔ اس میں ½ انچ شارٹ کارتوس چلتے ہیں۔ اس پستول کا وزن تقریباً ۱۵ اونس ہے لمبائی قریباً ۷ انچ چور، ڈاکو، اور جنگلی جانور مثلاً شیر، چیتا، ہرن وغیرہ اس کی آواز سنکر اور شکل ہی دیکھکر بھاگ جاتے ہیں بوقت ضرورت حفاظت جان و مال کے لئے بہت ہی عمدہ چیز ہے۔ مانند اصلی پستول ہندوستان میں صرف ہم سے ملیگا۔ قیمت نمبر ۷۷۷ بمعہ ۲۵ شارٹ کارتوس صرف چار روپیہ آٹھ آنے نمبر ۸۸۸۸ عمدہ کوالٹی اصلی فولاد کا بنا ہوا بمعہ ۴۵ شارٹ کارتوس رعایتی قیمت صرف پانچ روپے تیرہ آنے (۵/۱۳) نمبر ۹۹۹۹ سپیشل درجہ خاص نیو ماڈل بمعہ ۵۵ کارتوس قیمت چھ روپیہ بارہ آنے فالتو شارٹ کارتوس ایک ہزار کی رعایتی قیمت تین روپے پستول کے لئے خوبصورت پیٹی و خول ایک روپیہ بارہ آنے (۱/۱۲) پستول کیلئے تیل بارہ آنے۔ اس پستول کو مشہور کرنے کیلئے ہر پستول کے ساتھ ایک تولہ سونا پیرس نیو گولڈ اور ایک عدد اصلی فونٹین پین بمعہ ۱۴ کیرٹ رولڈ گولڈ نب کے بالکل مفت بھیجا جاتا ہے۔ یہ سونا دیکھنے میں بالکل اصلی سونے کے مانند معلوم ہوتا ہے۔ اور ہوشیار سے ہوشیار صراف بھی مشکل سے پہچان کر سکتا ہے کسوٹی پر اصلی سونے کا دیتا ہے۔ اس سے ہر قسم کے زیورات تیار ہو سکتے ہیں **ضروری نوٹ**۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دیجاتی ہے۔ دو پستول اکٹھے منگوانے والے خریدار کو محصولڈاک بالکل معاف اور دو تولہ سونا اور دو عدد اصلی فونٹین پن مفت انعام۔

ملنے کا پتہ: **میسرز امریکن پستول کمپنی پی، او بکس ۲۷ (M.K.L) امرتسر پنجاب**

شعرائے مست قلندر

غزل

از جناب عبد القدیر فرد لکھنوی

اپنی خودی مٹا کر جب تیری جستجو کی — کچھ بھی نہ تھی حقیقت تفریق ما و تو کی
یادش بخیر دل بھی شاید یہیں کہیں تھا — سینے میں رہ گئی ہے اک بوند سی لہو کی
مایوسی نظر میں اک داستاں تھی پنہاں — خاموش گو زباں تھی آنکھوں نے گفتگو کی
اپنی نظر سے پوچھو دل کا مرے فسانہ — کر دیں گی خود نگاہیں تفسیر آرزو کی
سرگوشیاں ہیں دل سے انداز بیخودی میں — آواز آ رہی ہے کانوں میں گفتگو کی
ساحل میں ہر طرح کی آسائشیں مسلّم — کچھ بات ہی جدا ہے امواج تند خو کی
یہ آستیں کے دھبے مشکل سے چھٹ سکیں گے — افسانہ بن چکی ہے سرخی مرے لہو کی
بہ قوت تخیل یہ جوشش تصور — تخلیق کر رہا ہوں دنیائے رنگ و بو کی
ہم بھی نہ کہہ سکیں گے تم بھی نہ سن سکو گے — پُر درد ہے کہانی برباد آرزو کی
ایسے میں میکشی سے کرتے ہو فرد توبہ — کرنیں ہیں چاندنی کی موجیں ہیں آبجو کی

غزل

از جناب مفتون احمد وحدت انصاری (میرٹھ)

دست طلب میں خواہش دنیا لئے ہوئے — پھرتا ہوں میں گدائی کا کاسا لئے ہوئے
دنیا تو تنگ ہو گئی اب جاؤں میں کہاں — اللہ یہ ہجوم تمنا لئے ہوئے
رنج و ملال، یاس و قلق، درد و اضطراب — جاؤں گا اپنے ساتھ میں کیا کیا لئے ہوئے
ساقی تری بلا کو ضرورت ہو جام کی — تو ہے نظر میں مستی صہبا لئے ہوئے
توبہ کسی کی آج نہ ٹوٹے تو ہے غضب — وہ آ رہے ہیں ساغر و مینا لئے ہوئے
وحدت ہمارے دل کو وہ اس طرح لے گئے — جاتا ہو جیسے کوئی کھلونا لئے ہوئے

کل رات کو

از جناب آثر مچھلی شہری

لگ گئی تھی ٹھیس کوئی ناگہاں کل رات کو — دل مرا تھا ناز بردار فغاں کل رات کو
کیوں وہ ہوتے مجھ سے آخر بدگماں کل رات کو — میرے اُن کے تھی محبت درمیاں کل رات کو
ہنس رہا تھا حسن خوابیدہ کو احساس شباب — عشق بھی کچھ ہو رہا تھا بدگماں کل رات کو
تھی زمیں ساکت، ہوا ساکت، فضا نغمہ سرا — رک گئی تھی گردش کون و مکاں کل رات کو
ہو رہا تھا موت سے آپس میں کچھ راز و نیاز — لے رہی تھی زندگی انگڑائیاں کل رات کو
آہ پروانوں کا عبرتناک انجام اُف نہ پوچھ — پھر گئی آنکھوں میں تصویر جہاں کل رات کو
میری آنکھوں میں سمٹ کر آ گئی تھی کائنات — شاید مقصود تھا جلوہ کناں کل رات کو
رقص میں زہرا تھی شاید مشتری نغمہ نواز — آسماں پہ بج رہی تھیں چوڑیاں کل رات کو
جیسے درد عشق کی تشہیر خود اک موت ہے — کر رہا تھا کیسی باتیں راز داں کل رات کو
ٹوٹتے جاتے تھے تارے ڈوبتا جاتا تھا دل — کون تھا حسرت زدہ محو فغاں کل رات کو

عشق کچھ پہلے سے تھا بیزار درد زندگی
حسن بھی تھا کسقدر دامن کشاں کل رات کو
اے اثرؔ شاید فریب آرزو ہے زندگی
کھل رہے ہیں بھید اسرار جہاں کل رات کو

روداد دل

ازجناب [illegible]

آنکھوں کو اشکبار کیا ہائے کیا کیا
افشائے حسن یار کیا ہائے کیا کیا
رسوا ہوئیں حریم محبت کی بجلیاں
دامن کو تار تار کیا ہائے کیا کیا
اللہ رے جذبہ ہائے محبت کی سادگی
قاتل پہ اعتبار کیا ہائے کیا کیا
کہتے ہیں جس کو دشمن ایمان و آگہی
اس بے وفا کو پیار کیا ہائے کیا کیا
فطرت بدل ہی دیگی کسی دن نظام حسن
فطرت پہ اعتبار کیا ہائے کیا کیا
رو رو کے صبح و شام کا دامن بھگو دیا
سودائے زلف یار کیا ہائے کیا کیا
حد یقین وعدۂ فردا نہ پوچھئے!
محشر کا انتظار کیا ہائے کیا کیا
رسم و طریق عشق کا کیا پوچھنا نشاط
دنیا پہ اعتبار کیا ہائے کیا کیا

اسیر آرزو

ازجناب [illegible]

کیا دلفریبیاں ہیں دنیائے رنگ و بو کی
رنگین ہیں فضائیں امید و آرزو کی
عمر عزیز کھوئی بے سود جستجو کی
تھی میرے دل میں پنہاں تصویر ماہ رو کی
پھر اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں
یا دشمن تجھ حسن کی نا غم آرزو کی
وہ بیخودی کا منظر تھا دیکھنے کے قابل
گم گشتۂ وفا نے جب اپنی جستجو کی
میں عشق ہوں مکمل، فریاد ہوں مسلسل
میں درد ہوں سراپا تصویر آرزو کی
راہ طلب میں خود ہی اپنے ہیں بے خبر سے
اے بیکرتغافل اپنی بھی جستجو کی؟
دشت جنوں میں کانٹے اب کیوں الجھ رہے ہیں
ہے تار تار داماں حاجت نہیں رفو کی
جو مجھکو ڈھونڈھتا تھا اب خود کو ڈھونڈھتا ہے
یہ حد آخری ہے سودائے جستجو کی
کیا جانے کیا کشش ہے جس سمت دیکھتا ہوں
تصویر کھینچتا ہوں اک جان آرزو کی
آہوں کے ہیں شرارے انگارے آنسوؤں کے
تن من جلا رہی ہے یاد ایک شعلہ رو کی
پایا تجھی کو تیری راہ طلب میں مٹ کر
دی داد جستجو نے کچھ ایسی جستجو کی
تجھ زخم بھر چلے تھے تسکین ہو رہی تھی
پھر چھڑ گئیں کمانیں اس چشم تند خو کی
دل کی شکستگی ہی آئینہ دار الفت
تصویر ہے ادا کی تشکیل آرزو کی
پامال کرنے والا، برباد کرنے والا
اب پوچھتا ہے مجھ سے کیوں میری آرزو کی؟
حرص و ہوا کے بندے ارماں ہی کیوں ہوا ہیں
ہر سانس عارضی ہے دنیائے رنگ و بو کی
اس کی عزیزؔ اب ہیں بدلی ہوئی نگاہیں
امید کس سے ہو اب ناکام آرزو کی

[illegible]

ازجناب سید [illegible] صاحب [illegible] لکھنوی

وہ آرہے ہیں حسن کی دنیا لئے ہوئے
ہر اک قدم پہ محشر برپا لئے ہوئے
طوفان غم نے اشکوں کی صورت کی اختیار
قطرے ہیں اپنی گود میں دریا لئے ہوئے
شاید شراب نے مدہوش کر دیا
وہ چل رہے ہیں میرا سہارا لئے ہوئے
آنکھوں میں اشک بال پریشاں رخ پہ گرد
پھرتا ہوں در بدر ترا سودا لئے ہوئے
ہر رنگ کے ہیں دامن گلچیں میں یوں تو پھول
ہر پھول ہے مگر ترا نقشہ لئے ہوئے

گھنگھور گھٹائیں وہ ملاقات کا عالم
پھر یاد دلاتا ہے یہ برسات کا عالم
وہ جلوۂ رنگیں کے حجابات کا عالم
بے تابیٔ نظارہ وہ جذبات کا عالم

نظم

وہ بربطِ فطرت پہ محبت کے ترانے
وہ کیف میں ڈوبا ہوا نغمات کا عالم

بیتاب نگاہوں میں وہ کھوئے ہوئے جلوے
معصوم محبت کی کرامات کا عالم

خاموش فضا اور وہ مجبوریٔ الفت
اک قہر ہے عاشق کیلئے رات کا عالم

اوراقِ محبت پہ نمایاں ہے ابھی تک
جذبِ دلِ نومید کی بہتات کا عالم

وہ چاندنی راتوں میں تری صہبا نوازی
وہ محفلِ انجم کی ضیا رات کا عالم

از جناب عبدالرحمن صاحب [illegible]

جذبات

احساسِ عشق سے ہی مری جان عذاب میں
کیا روگ لگ گیا مجھے عہدِ شباب میں

او بیکرِ شباب ذرا منہ اٹھا کے دیکھ
دلِ اضطرابِ شوق سے ہے کس عذاب میں

کھلتا نہیں کسی پہ مرے دل کا مدعا
کیا پیچ پڑ گیا مری قسمت کے باب میں

بس بس رلائیے نہ مجھے آپ چھیڑ کے
طوفان بلا کا ہے مری چشمِ پرآب میں

ناکام ہیں وہ عشق میں جو کامیاب ہیں
لکھا انہوں نے یہ مرے خط کے جواب میں

اک لطفِ خاص ہے کہ میسر ہے رات دن
ان کو حجاب اور مجھے اضطراب میں

از جناب محمد صدیق صاحب [illegible]

پرواز

یہ ادائے خرام و مستیٔ ناز
گردشِ ماہ بھی ہے با انداز

کب لبھائے انہیں مری آواز
ساز بھی ہے تو اک شکستہ ساز

نگہِ غور سے نہ دیکھ مجھے
یوں کھلے گا نہ میرے دل کا راز

دل کا انجام دیکھئے کیا ہو
ہو رہا ہے شباب کا آغاز

میری ہستی کو کر دیا سرشار
حسنِ رنگیں ہو تیری عمر دراز

قیدِ ارض و سما کی کیا اس میں
کب ہے مجبور ہمتِ پرواز

ہائے یہ کیا ہوا زمانے میں
ایک بھی آج ذی شعور نہیں

اور اک سعیٔ ہمتِ پرواز
تیری منزل فلک سے دور نہیں

ذرہ ذرہ ہے غیرتِ خورشید
لیکن آنکھوں میں تیری نور نہیں

حالتِ بزمِ میکشاں ہے عجب
اب وہ بادہ نہیں سرور نہیں

از جناب امیر احمد صاحب [illegible]

نظم

حسن ادا و ناز ہے عشق [illegible] ہے
ذوق ہی جب نہ ہو کلیم جلوۂ ناز کیسے ہو؟

کیف نواز کیوں ہو دل، خشک ہے لحنِ حیات
سوز ہی جب نصیب ہو سوز میں ساز کیسے ہو؟

گر ہی گیا جو گر گیا نظروں پہ چڑھ کے ایک بار
تنگیوں میں نشیب کو فرخ فراز کیسے ہو؟

لغزشِ بیکراں ہی جب شانِ گناہ گار ہے
میرا بھی پھر بغیر سہو فرض نماز کیسے ہو؟

سچ ہے کہ مدتوں سے ہے اس کا مذاقِ غزنوی
اپنے نصیب میں مگر زورِ ایاز کیسے ہو؟

زیست کی مدتیں ہوں اور آپکا انتظار ہو
اور میں یہی دعا کروں عمر دراز کیسے ہو؟

ہائے نمازِ زیست میں سجدۂ عشق ہو گیا!!
اب یہی محویت ہے تو پوری نماز کیسے ہو؟

جان گیا خدا کو میں واسطۂ بتاں سے دل
ہائے حقیقتوں میں اب لطفِ مجاز کیسے ہو؟

از جناب دل [illegible]

میرے پسندیدہ اشعار

از جناب احسن علوی (دیوریا)

ترا وصال بڑی چیز ہے، مگر اے دوست —— وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا —— (فراق گورکھپوری)

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا —— ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا —— (عزیز لکھنوی)

ماسوا عشق ہر اک چیز ہے عصیاں اعجاز —— زندگی دے تو خدا دے اسی معصوم کے ساتھ —— (اعجاز الہ آبادی)

رموزِ عذرِ جفا تک خیال جا نہ سکا —— میں چپ رہا تو بُرا ماننے کی بات نہیں —— (فراق گورکھپوری)

ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام —— ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود —— (اقبال رح)

قفسِ اسیری چمن ہی تک ہوئے سیرِ گل —— اب قفس میں رات دن رونا تڑپنا رہ گیا —— (اثر مچھلی شہری)

سنبھل سکے تو سنبھالو حیات کی کشتی —— خدا کو دیکھ چکے جو رنا خدا معلوم —— (اعجاز الہ آبادی)

للہ اب نہ سازِ محبت کو چھیڑیئے —— میں صبر کر چکا ہوں مجھے صبر آ گیا —— (اثر مچھلی شہری)

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر —— جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں —— (جگر مرادآبادی)

ان کی جانب نہ دیکھنا احسن —— لے رہا ہے شباب انگڑائی —— (احسن علوی)

مزاحیہ

ایڈیٹر کا شب نامچہ

از جناب کوثر چاندپوری

۹ بجے رات سے پہلے مجھے کبھی گھر آنا نصیب نہیں ہوتا۔ یہ بات نہیں کہ کام کی کثرت اس کا سبب ہوتی ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ادھر اُدھر کے بےفکرے ایڈیٹر جن کے دفتروں میں سرے سے کوئی کام ہی نہیں ہوتا چپڑاسی پر خریداروں کے پتے لکھنے کے بعد آٹھ بجتے ہی اپنے اپنے ادارت خانوں سے اُٹھ کر میرے پاس آ جاتے ہیں اور حقہ، پان، چائے وغیرہ کا دور شروع ہو جاتا ہے اس طرح دن بھر کی کوفت تو ضرور رفع ہو جاتی ہے مگر رات کی دلچسپیوں میں اسی نسبت سے کمی واقع ہو جاتی ہے۔ بیگم جن کا میں صرف شوہر ہی نہیں ہوں، عاشق بھی ہوں میرے انتظار میں پریشان ہو جاتی ہے اُسے میرے پہونچنے تک بناسپتی گھی سے پکے ہوئے کھانے کو کئی کئی مرتبہ گرم کرنا پڑتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ چولھے کے پاس پہونچکر آتش مزاج بن جاتی ہیں۔ چند بار ایسا ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ نیاز مند مدیر کی خیریت نہیں۔ بیگم سر شام ہی سے میری پذیرائی کے انتظامات شروع کر دیتی ہیں اور جب وہ بیوی کا ملبوس اُتار کر صحیح معنوں میں بیگم بن جاتی ہیں تو یہ انتظار اور شدید ہو جاتا ہے۔ آپ شاید عورت کی اس فطرت سے واقف نہ ہوں مگر میں ضرور جانتا ہوں کہ وہ جب اچھا کھاتی ہے تو دوسروں کی نگاہوں سے مخفی رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور جب اچھا پہنتی ہے تو اُسے دعوتِ نظر اور ضیافتِ جذبات کی تمنا ستانے لگتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اُسے کوئی دیکھے۔ عصمت اس دعوت اور تمنا کو محدود کر کے شوہر کی ذات پر ختم کر دیتی ہے اور خدا بجائے بےعصمتی کی بےحیائی سے وہ اس دائرہ کو حد سے زیادہ وسیع بنا دیتی ہے غرض ۹ بجتے بجتے بیگم صاحبہ انتظار کا مجسمہ بن جایا کرتی ہیں بلکہ اکثر اوقات دروازے کے قریب ہی آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور پیروں کی آہٹ پر کان لگائے رہتی ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میں جذباتی آدمی ہوں، رومانیت کے عناصر بے چین بھی کم و بیش میری خلقت میں شامل ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جذبات رومانی ہیولیٰ ہی کا ایک نتیجہ حسین ہیں۔ رومانیت نہ ہو تو جذبات کی گرمی بھی پیدا نہیں ہوا کرتی باوجود اس کے بعض راتیں مجھ پر ایسی گذری ہیں کہ میں دفتر سے اتنا بدحواس آیا ہوں کہ بیگم صاحبہ کی رومانیت خیز تیاری اور ان کے شباب انگیز حسن نے میرے اوپر کوئی اثر نہیں کیا اور دفتر کے افکار نے محبت کے جذبات کو بیدار ہونے بلکہ کروٹ لینے تک کا موقعہ نہیں دیا۔ جب سے گرانی شروع ہوئی ہے یہ جنون اکثر میرے سر پر سوار رہتا ہے جب تک دفتر میں بیٹھا رہتا ہوں۔ انہیں الجھنوں سے واسطہ رہتا ہے۔ ایک طرف سے ایک صاحب آ کر کہتے ہیں روشنائی ختم ہو رہی ہے اور کاپی کا کاغذ بھی نہیں رہا۔ دوسری طرف سے جناب منیجر صاحب آ کر فرماتے ہیں۔ کاغذ قطعی نہیں رہا۔ آج شام تک کاغذ مہیا نہ ہوا تو کل کا اخبار شائع نہ ہو سکیگا۔ اور کاغذ کے متعلق ہندوستان کا ہر ایڈیٹر خواہ اس کا تعلق حشرات الارض کی قسم کے ایڈیٹروں سے ہو یا ترقی یافتہ مدیران محترم سے اچھی طرح جانتا ہے کہ بازار کی وسعتیں اس سے تقریباً خالی ہیں اور ساری ضروریات کا انتظام تو میں کر دیتا ہوں مگر کاغذ کا مسئلہ ایسا اُلجھ جاتا ہے کہ اس الجھن کو گھر تک ساتھ لانے پر مجبور ہو جاتا ہوں گھنٹوں بازار میں گھومنے پر بھی اچھا اور حسب دلخواہ کاغذ نہیں ملتا اور یکدم کاروبار کے بیٹھ جانے کا اندیشہ سوہان روح ہو جاتا ہے جب اس حالت میں گھر آتا ہوں تو اکثر بیگم صاحبہ سے اچھی طرح باتیں بھی نہیں کر سکتا سیدھا اپنے کمرے میں جا کر ستیہ گرہ شروع کر دیتا ہوں نہ کھاتا ہوں نہ پیتا ہوں نہ سوتا ہوں نہ بات کرتا ہوں۔ اسوقت بھی اس دیوانگی میں مبتلا گھر پہونچا۔ رات ذرا اندھیری تھی ایک ہاتھ میں بیٹری لئے شہر کی اس بدنصیب گلی کو جس کیلئے اربابِ بلدیہ کی نگاہِ التفات مقسوم ہی نہ ہوئی تھی، طے کر کے گھر کے دروازے کے سامنے آیا تو بیٹری کی چمک اور پاؤں کی آہٹ نے میرے آنے کا اعلان کر دیا۔ بیگم فوراً دروازے پر آ کھڑی ہوئیں

میں چوکھٹ تک پہونچا بھی نہ تھا کہ دروازہ کھل گیا اور صرف دروازہ ہی نہیں بلکہ ذرا دیر کیلئے میرے دل کی کلی بھی کھل گئی۔ بیگم گلاب کے تازہ پھول کی طرح متبسم ہوکر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ آج تو بڑی دیر کردی؟

جی ہاں کاغذ نہیں ملتا بازار میں بڑی مصیبت ہے۔

پھر اب کیا ہوگا؟

کیا بتاؤں بیگم، یہ لڑائی ایک آفت ہے۔ ہٹلر برطانیہ سے نہیں بلکہ براہ راست مجھ سے لڑ رہا ہے!

پھر کورے لٹھے پر اخبار چھاپنا شروع کردیجئے نا انہوں نے مسکراکر فرمایا۔

اخبار تو کورے لٹھے پر کیا چھپیگا البتہ یہ ممکن ہے کہ کپڑے کی گرانی کے باعث آپکو کورے لٹھے کی شلواریں پہننا پڑیں۔

میں تو کبھی نہ پہنوں گی۔ انہوں نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

عریاں رہنے کے مقابلہ میں تو شاید آپ اس کا پہننا گوارا کرلیں گی؟

ہاں نوبت یہاں تک پہونچگئی تو مجبوری ہے

اچھا کھانا تو کھالیجئے۔

کھانا؟ ـــــ بیگم کاغذ کی کوئی تدبیر بتلاؤ کاش کھانے کی طرح کاغذ بھی ہمارے باورچی خانہ میں تیار ہوجایا کرتا۔ اگر ایسا نہ ہوسکے تو کھانا تو چھوڑنا چاہئے!

یہ مصیبت یوں ہی قائم رہی تو مجھے تو دنیا بھی چھوڑنا پڑیگی!

سمجھیں آپ؟

نہیں یہ بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ آئے۔ ـــــ دنیا میں تو آخر میں بھی شامل ہوں مبالغہ نہ سمجھئے تو میری دنیا ہی آپ ہیں۔

گویا آپ مجھے بھی چھوڑ دینگے؟

لیکن یہ نوبت اس وقت آئیگی جب خود میں ہی نہ رہوں گا۔ اچھا بیگم کاغذ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

میری رائے کاغذ کے معاملہ میں تو کوئی وزن نہیں رکھتی البتہ سونا، چاندی، نیز اصلی اور نقلی سونے کے متعلق آپ پوچھنا چاہیں تو میں عرض کروں!

مذاق رہنے دو بیگم، میں کاغذ کے متعلق سوچ رہا ہوں اور ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا ابھی اگلی اشاعت کے مضامین بھی تو مکمل اور مرتب نہیں ہوئے۔ غضب ہوگیا، میں نے افتتاحیہ بھی نہیں لکھا۔ اچھا بس رہنے دیجئے یہاں اس دفتر کے کھولنے کی کیا ضرورت ہے آپ دن بھر کیا کرتے رہتے ہیں جو یہاں آکر یہ باتیں یاد آیا کرتی ہیں آپ کو، رات ان باتوں پر غور کرنے کیلئے نہیں ہے، رات تو آرام کی خاطر بنائی ہے قدرت نے!

لیکن ایڈیٹر قدرت کے ان قوانین کا پابند نہیں ہوا کرتا۔ اس حد تک تو میں آپکے خیال سے بالکل متفق ہوں کہ رات کو آرام کرنا چاہیئے مگر اس کو کیا کروں کہ آرام کا وقت ہی نہیں۔ جو وقت بیوی کے حصے میں آنا چاہیئے تھا اس پر کاتب اور منیجر نے قبضہ کرلیا، اس سے بھی کچھ بچا تو دفتر کی ضروریات اس پر قابض ہوگئیں۔ بہتر صورت تو یہ تھی کہ ایڈیٹر کیلئے شادی ہی ممنوع قرار دیدی جاتی یا عورتوں میں کتابت اور منیجری کی اہلیت پیدا ہوجاتی۔

جس دن دنیا میں یہ انقلاب ہوگیا اسی دن آپکو اخبار بند کردینا پڑیگا۔ پھر میں آپکو اخبار نہ نکالنے دوں گی۔

اچھا تو کاغذ کے متعلق ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ اگر ہم اخبار کی تقطیع ذرا کم کردیں تو تمہاری یہ فکر کچھ نہ کچھ ہلکی ہوجائیگی۔

میں کہتی ہوں گھر میں اس قسم کی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟

آپ مطمئن رہیں بیگم۔ میں گھر بنانے کی باتیں کررہا ہوں گھر اجاڑنے کی نہیں۔ بات یہ ہے کہ آجکل کاغذ خدا کی قسم بیوی سے بھی زیادہ گراں ہوگیا ہے۔

اونہہ جانے بھی دیجئے اس کاغذ کو!

بیگم کام کیونکر چلیگا پھر ہمارا، بات یہ ہے کہ میں نہ تو دواخانہ کھول سکتا ہوں، نہ مطب کرسکتا ہوں، وکالت اور مختاری کی اہلیت بھی میرے اندر نہیں بس ایڈیٹری میرے نصیب میں لکھی ہے اور یہ بغیر کاغذ کے چل نہیں سکتی۔

جب بیگم نے دیکھا کہ مجھے کاغذ خبط ہوگیا ہے تو وہ منہ لپیٹ کر پلنگ پر جا پڑیں گویا ہم سے خفا ہوگئیں اسوقت ان کی ناراضی کی کوئی اہمیت نہ تھی، میرے دماغ پر اس سے زیادہ اہم باتوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ میں نے اخبار کی کاپی پڑھنے کی نیت سے اٹھائی اور لیمپ کی روشنی تیز کرکے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس سے فارغ ہوا تو افتتاحیہ لکھنے لگا۔ آج کا افتتاحیہ بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کے بعد ذرا کمر سیدھی کرنے کو لیٹا تو معلوم نہیں کس وقت مجھے نیند آگئی۔ سوتے ہی یہ معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑے میدان میں کاغذ کے سینکڑوں انبار لگے ہوئے ہیں۔ ہر انبار پر کسی نہ کسی ایڈیٹر کا نام لکھا ہے، ایک پر میرے نام کی بھی چٹ چسپاں تھی۔ اسی وقت آسمان سے ایک بم گرا، اور کاغذ میں آگ لگ گئی۔ میرا کاغذ بھی آگ کے شعلوں کی زد میں آگیا۔ میں شور مچاتا ہوا اٹھ بیٹھا ـــــ دیکھنا میرے کاغذ کو بچانا! کہیں جل نہ جائے! بیگم میری آواز سنکر دوڑی

اِس کے پڑھنے سے ہر شخص کو فائدہ ہوگا

ایک ضروری اور مفید اعلان

یہ تو دنیا سمجھ چکی ہے کہ اسوقت سچ اور جھوٹ میں امتیاز مشکل ہوگیا ہے۔ کیونکہ عام ملک میں اشتہاری ادویات کی طرف سے بدظنی پھیل گئی ہے مگر آپ کو یقین دلانے اور سچ ثابت کرنے کا ذریعہ سوائے اشتہار کے اور کوئی نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس زبردست اعلان کے ذریعہ مطلع کرنا چاہتے ہیں اگر آپ بدظن ہو چکے ہیں اور اشتہاری ادویات استعمال کرنے کا عہد کر چکے ہیں تو آخری مرتبہ ہماری صداقت و ضرور آزمائیں اور مندرجہ ذیل ادویات کو استعمال کر کے ہماری نیک نامی کا باعث بنیں۔ خدا شاہد ہے آپ کے سامنے جواہرات کوڑیوں کے مول پیش کئے جا رہے ہیں ان ادویات میں آپ کی جوانی کو قائم رکھنے کا راز پوشیدہ ہے۔ اور ان کو رعایتی قیمت میں صرف شہرت اور نیکنامی کی غرض سے پیش کیا جا رہا ہے۔ استعمال فرمائیے اور دعا دیجئے ہمیشہ یاد کیجئے۔ اگر آرام نہ ہوگا تو قیمت واپس ہوگی۔

مقوی طلاء ﴿ یہ مفید اور مقوی طلاء ہے اسکے چند قطرے سستی ناطاقتی کمزوری اور شرمندگی کو دور کرنے میں اکسیری اثر دکھائیں گے۔ یہ لاجواب طلاء ان بیش بہا ادویات سے مرکب ہے۔ یہ انسانی زندگی کو کامیابی کے ساتھ بسر کرنے کی دعوت دیتا ہے اس طلاء کے استعمال سے فوراً اثر ہوتا ہے۔ خواہ کیسی ہی خرابی پیدا ہوگئی ہو چند دن کی مالش سے حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوگی اور حالت بدل جائیگی مردہ اور سوئی ہوئی رگوں میں برقی لہریں دوڑتی نظر آئیں گی۔ رگوں کا پھول جانا۔ خواہش کا کم ہو جانا دور ہو کر ناکارہ آدمی کو قابل فخر مرد بنا دیگا شباب کی مردہ کلی میں جان پڑ جائے گی۔ آپ ہر روز مالش کے بعد عجیب طاقت محسوس کریں گے۔ اس سے بہتر طلاء آپکو دنیا بھر میں کہیں بھی نہیں مل سکتا ہمیشہ کے لئے مردانہ کمزوری دور ہو کر نئی طاقت اور نئی جوانی کا جوش پیدا کر دیگا۔ یہ طلاء ہزارہا مایوس دلوں میں زندہ اثری کا سکہ بٹھا چکا ہے۔ ایک شیشی ایک مریض کے لئے کافی ہوتی ہے۔ قیمت فی شیشی تین روپے۔ رعایتی دو روپے۔ محصول ڈاک آٹھ آنہ الگ۔

جِرْیانین ﴿ آہ! آج لاکھوں انسان ہیں جو جریان جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہیں مگر وہ اپنا صحیح علاج نہیں کر سکتے۔ وہ غیر مفید ادویات استعمال کر کے اپنی صحت اور بھی برباد کر لیتے ہیں۔ ہم جریان کے مرض کو دور کرنے کی بڑی عجیب اور حیرت انگیز دوا پیش کر رہے ہیں اسکے استعمال سے سر چکرانا۔ دل دھڑکنا۔ دماغ کی کمزوری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا۔ مادہ کا پتلا ہو جانا۔ پیشاب کے پہلے یا بعد قطرہ کا گرنا۔ قبتر شرمندگی اٹھانا بیٹھنا خواہش کا ختم ہو جانا وغیرہ یہ سب سخت جریان کی علامات ہیں مگران سب شکایتوں کو جریانین دوا تمام عمر کیلئے دور کر دیتی ہے جریان کے مرض کو دور کرنے میں ہمارا چیلنج ہے کہ جو کوئی اس سے بہتر دوا ثابت کر دے تو اسکو ایک سو روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اس ڈنکہ کی چوٹ کے اعلان پر غور کیجئے اور اس دوا سے فائدہ اٹھائیے آپکی کایا پلٹ جائیگی زندگی بدل جائے گی۔ چہرہ گلنار ہو کر جوانی کی امنگیں پیدا ہونگی مادہ میں اولاد کی قابلیت پیدا ہو جائے گی۔ اس دوا نے غضب کر دیا ہے کہ مردہ دل انسانوں کو چند روز میں ہوشیار کر دیتی ہے۔ قیمت فی شیشی تین روپے رعایتی دو روپے۔ ڈاک خرچ علاوہ۔

خوشوقتی ﴿ ہمارا دعویٰ ہے کہ امساک کی اس سے بہتر دوا کہیں نہیں ہے تمام مضر صحت اجزاء سے پاک ہے مگر امساک پیدا کرنے میں کمال ہی کر دیتی ہے تیر کا نشانہ خطا کر جائے مگر اس دوا کا اثر خالی نہ جائے۔ لاکھوں انسانوں نے اس دوا کی تائید کی ہے اور روزانہ قائل ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ واقعی امساک کے لئے خوشوقتی سے بہتر کوئی دوا نہیں ہے۔ شرمندگی اور خجالت سے بچانے میں یہ دوا بڑا کام دیتی ہے۔ قیمت فی شیشی رعایتی دو روپے (نوٹ :۔ اوپر کی تینوں ادویات منگانے پر محصولڈاک معاف ہوگا علیحدہ علیحدہ یا ایک ہی دوا کی بارہ شیشیاں طلب کرنے پر ایک عدد مالش محل آرم مفت)

منگانے کا پتہ :۔ **سعید برادرس اینڈ کو کلاں محل نمبر ۲۱ دہلی**

کون جیتا؟

از جناب مسٹر فیروز [illegible]

شام کا وقت تھا ٹھنڈی فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ اور میں شہر کی ہنگامہ خیزیوں سے دور، دور دریا کنارے پُرکیف اور دلفریب نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ایڈن گارڈن پہنچ کر میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا، بملا نے یہیں مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا ——— انتظار کی گھڑیاں ہمیشہ کٹھن اور طویل ہوتی ہیں۔ وقت گزارنے کے لئے حضرت ظفر زبیری کی نظم "ابھی آجا اے آنے والے" گنگنانے لگا۔

باغ کے دلفریب نظاروں اور ٹھنڈی ہوا کے لطیف جھونکوں نے مجھے کچھ ایسا بیخود کیا کہ رفتہ رفتہ میری آواز بلند ہونے لگی بلو اب میں یہ ایک ہی مصرع " آ بھی جا اے آنے والے " بار بار دہرا رہا تھا۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ باغ کا ہر ایک پرندہ، حتیٰ کہ درخت اور پتے بھی میرا ساتھ دے رہے تھے۔ جیسے سب کسی کے انتظار میں بیقرار ہو کر کہہ رہے ہوں: " آ بھی جا اے آنے والے " ——— یکایک ایک پہچانی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا: " بابو ایک پیسہ ——— میرا بچہ بھوکا ہے " ——— میں اس سے زیادہ نہ سن سکا، نہ بھکارن کہہ سکی۔ ہماری نظریں ملیں۔ ماضی کے دھندلے نقوش کچھ نمایاں ہوئے اور میری حالت ٹھیک ویسی ہو گئی جیسی کسی مجرم کی جیل سے بھاگ کر دوبارہ پکڑے جانے پر ہوتی ہے۔ ستارہ اور اس کا بچہ ! میں نے محسوس کیا۔

جیسے سورج کی ڈھلی ہوئی کرنیں دفعتاً آگ برسانے لگی ہوں۔ ہوا کی سیٹیاں، پتوں کی تالیاں اور پرندوں کی آوازیں سب مل کر میرا مذاق اڑا رہی ہوں۔ میں نے بمشکل اپنی جھکی ہوئی پلکوں کو اوپر اُٹھایا ——— ستارہ آنکھیں نیچی کئے۔ ہونٹ دانتوں تلے دبائے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔ اور بچہ اس کے ہاتھوں سے پھسلا جا رہا تھا۔ جیسے مجھے پہچان کر میری طرف آنے کی کوشش کر رہا ہو۔

آخرکار میں نے بمشکل اپنے حواس پر قابو پا کر کہا: " ستارہ ! تم ؟ .... " اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اور اس نے زخمی شیرنی کی طرح بپھرے ہوئے انداز سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: " اے ریا و جفا کے پتلے اختر میں ہی ہوں اور وہ یہ وہ جیتی جاگتی لعنت ہے جو تمہارے چار دن کے جھوٹے پیار نے، میری تباہیوں اور بربادیوں کو مکمل کرنے کیلئے مجھے سونپ دی۔" اور اس نے اپنے ناتوان اور لرزتے ہوئے ہاتھوں کو آگے بڑھا کر چیتھڑوں میں لپٹا ہوا پھول سا بچہ مجھے دکھایا ———

"آہ ظالم ! تو نے مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا۔ ماں باپ سے جدا کیا، وطن سے بے وطن کیا، میری عصمت لوٹ لی۔ اور پھر میرے پاس جو کچھ تھا لے کر چلدیا۔" میں نے بولنا چاہا لیکن میری قوت گویائی جیسے سلب ہو چکی تھی اور باوجود دل میں ایک طوفان سا ہونے کے زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا، ستارہ کہتی رہی۔ " کیا یہی تھی وہ پاک محبت جس کے افسانے تو مجھے ہر روز سنایا کرتا تھا، افسوس میں نے آنکھیں بند کر کے تجھ پر بھروسہ کیا، مجھے کیا معلوم تھا کہ تم مردوں کی محبت ایک رنگین دھوکہ ہے محبت کے نقاب میں لپٹی ہوئی نفس پرستی، شرافت کے لباس میں ملبوس انتہائی کمینگی ——— کاش ! میں دنیا بھر کو بتا سکتی، راستے پر چلا چلا کر کہہ سکتی کہ تم انسان نہیں، شیطان ہو ——— انسانی روپ میں خونخوار بھیڑیے ہو، عصمت کے ڈاکو ہو، انسانیت کے ماتھے پر بدنما داغ ہو، ——— مگر افسوس میں اپنے آپ کو چھپانے پر مجبور ہوں، اس بچے اور والدین کا خیال مجھے ایسا کرنے سے روکتا ہے ——— لعنت ہے تمہاری گناہ بھری زندگی پر ——— لعنت ہے تمہارے ناپاک وجود پر ———"

جوش انتقام میں نہ جانے ستارہ کیا کیا کہتی رہی، میں نے کئی دفعہ بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکا۔ بے حس و حرکت سرنگوں بیٹھا رہا جیسے سنگ مرمر کا کوئی بُت ہو۔ ستارہ نے جو کچھ کہا، تلخ ضرور تھا مگر حقیقت تھی اور حقیقت کے سامنے کون زبان ہلا سکتا ہے ؟

میں خدا جانے کب تک اسی طرح بیٹھا رہتا کہ بچے کے رونے کی آواز نے مجھے چونکا دیا، دیکھا تو بچہ میرے پاس بنچ پر پڑا تھا۔ اور ستارہ غائب ——— میں

گھبرا گیا۔ دل سینے کے اندر بیٹھ سا گیا۔ جیسے کسی نے اس پر منوں بوجھ لاد دیا ہو ـــــ میں نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا، مُردوں جیسے سفید چہرے کیساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے بملا میری طرف آرہی تھی، مگر میں اس وقت ہوش میں تھا میری سوئی ہوئی غیرت و شرافت دفعتاً جاگ اُٹھی تھی۔ میں ستارہ، ستارہ چلاتا گھاٹ کی طرف دوڑا، دور بہت دور، ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد روشنی میں ستارہ دریا کی سمت جاتی نظر آئی ـــــ میں بے تحاشا چند پل گھاٹ کی طرف دوڑا مگر جیسے ہی ٹھیک پر پہنچا۔ ستارہ نے اپنے آپ کو لہروں کے سپرد کر دیا ـــــ موجیں ناچنے لگیں، دریا میں بھنور سے پڑنے لگے، پھر چند بلبلے نمودار ہوئے۔ اور غائب ہو گئے۔

دوسرے ہی لمحہ سطح ہموار تھی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں اس پر رقص کر رہی تھیں"

ایڈیٹر کا شب نامچہ (بقیہ صفحہ ۶۲)

ہوئی آئیں۔ اور بولیں۔ خدا کیلئے تم اتنی فکر نہ کرو۔ سوتے میں بھی کاغذی کاغذ کی رٹ لگا رہے ہو، اچھا منہ دھو کر کھانا کھا لیجئے کھانا یا کاغذ ـــــ بیگم کیا کھاؤں؟

یا اللہ یہ آپ کو ہو کیا گیا؟

غرض آج کی رات کچھ ایسی بدمزگی سے بسر ہوئی کہ نیند بھی پوری نہ ہوئی۔ جب سویا کاغذ کے متعلق کوئی نہ کوئی پریشان خواب دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔ خدا خدا کرکے صبح صادق کے وقت آنکھ لگی اور اس وقت کھلی جب سورج اچھی طرح پھیل چکا تھا اور منیجر صاحب ایک اچھے کاغذ کا نمونہ لئے دروازے پر

زندہ جادوگری کے کرشمے!

آخر چھپ گئی وہ کتاب جس کی دنیا والوں کو تلاش تھی جس میں قدیم ہندو یوگیوں کے سینہ بسینہ منتقل ہونے والے خفیہ جادو کے سربمہر رازوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ وہی نادر کتاب ہے جس میں کا ایک ایک راز لاکھ لاکھ روپیہ کو بھی سستا ہے مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ تین مہینوں میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔ چھ ہفتوں میں دوسرا اور اب تیسرا چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے مختصر فہرست ملاحظہ ہو۔

۱- بیمار کو صرف سانس کی تبدیلی سے راضی کر دینا۔ ۲- اپنی یا دوسروں کی موت کا حال جان لینا۔ ۳- راہ چلتے آدمی سے آنکھ لڑا کر ہمخیال بنا لینا۔ ۴- اعجاز محبت یا حسینوں کو اپنی محبت میں مبتلا کرنے کی نہایت ہی آسان اور چٹکی بجاتے میں حل ہونیوالی ترکیبیں ۵- جیو ... کے قدرتی طاقت حاصل کرکے سو سال تک جوان اور تندرست بنے رہنا ۶- صرف ایک ترکیب سے بیوی کو اپنی الفت میں اسیر کرکے اس قدر بیخود بنا دینا کہ اسے سوائے تمہارے سب طرف تاریکی دکھائی دینے لگے گی۔ ۷- لڑکی لڑکے کی پیدائش حسب مرضی کرنا۔ ۸- حاکم افسر یا سنگدل دشمن کو تسخیر کرکے اپنا کام نکال لینا۔ ۹- ایک ایسا طریق اختیار کرنا جس کی بدولت ہر جگہ عزت ہو۔ ۱۰- بیتے ہوئے اور آئندہ ہونے والے واقعات کو قبل از وقت جان لینے کے مختلف طریقے۔ ۱۱- ہندو یوگی کس طریق سے پیشینگوئی کرتے تھے۔ سائل کے سوالوں کے صحیح جواب دینے کے مختلف طریقے۔ ۱۲- سانس کے ذریعہ سے سخت سے سخت اور مہلک امراض کو آناً فاناً رفع کر دینے کا راز وغیرہ وغیرہ غرضیکہ کتاب مذکور کی مکمل تعریف کیلئے ۲ صفحات بھی تھوڑے ہیں، باوجود ان خوبیوں کے پورے کورس کی قیمت صرف ۲ روپے محصول ڈاک سمیت رکھی گئی ہے جملہ مضامین نہایت ہی آسان اور عام فہم ہیں۔ عامل ہونے کیلئے کسی قسم کی محنت یا مشقت جھیلنا نہیں پڑتی۔ صرف کورس مذکور کے مطالعہ سے ہی سب رازوں سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ہمراہ اس بات کی حلفیہ تحریر آنی چاہیے کہ آپ ان میں بتلائے ہوئے رازوں سے ناجائز فائدہ نہیں اُٹھائیں گے۔ اشتہار کے خلاف ایک بات بھی ثابت ہو تو آپکو اختیار ہے کہ مست قلندر میں شکایت لکھئے ہمیں کوئی گلہ نہ ہوگا۔ ملنے کا پتہ:- یونیورسل ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس ۱۵ لاہور

پرل کلوریم آئی ڈراپ (رجسٹرڈ)

ڈاکٹر این۔ آر شرما کی مشہور و معروف ایجاد پرل کلوریم ہندوستان کے کونے کونے میں قابل رشک شہرت حاصل کر چکی ہے۔ اس دوائی کو ہزاروں مریضوں نے استعمال کیا اور مفید پایا۔ پرل کلوریم کی بڑھتی ہوئی شہرت کو دیکھ کر بعض نام نہاد ڈاکٹروں نے اسکی نقل اتارنا شروع کر دی۔ جب ڈاکٹر شرما کی طرف سے عوام کو مطلع کرنے کیلئے اطلاع دی گئی تو ایک شخص لوہاں چند ... نامی المعروف ڈاکٹر ڈی سی ہگل نے ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کیلئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ عدالت میں مقدمہ چلا۔ آخر کار عدالت نے ڈاکٹر این آر شرما کو حق بجانب قرار دیکر مقدمہ کا فیصلہ ان کے حق میں دیدیا۔ ہماری رائے میں مسٹر بی۔ اے قریشی بیرسٹر درجہ اول مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے ایک نقال کے مقدمہ کو خارج کرکے ایک ایسے فعل کی

روک تھام کر دی جس سے بہت سے لوگوں کو ... نقصان

بھابی کا بول

ایک نہایت دلچسپ اور رنگین افسانہ

مشہور ادیبہ شریمتی کنوانتی تارا دیوی کے قلم سے

بی اے پاس کرنے کے بعد مہیش نے بمبئی چھوڑ دیا اور اپنے گھر لوٹ آیا۔ اس کے باپ اور ماں مر چکے تھے۔ مگر اس کے بھائی اور بھابی نے کبھی مہیش کو یہ کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ وہ جو چاہتا کرتا اسے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ وہ اپنی ننھی بھتیجی سوبرن کو بہت پیار کرتا تھا۔ ہر وقت اُسے گود میں لئے پھرتا تھا۔ مہیش کی عمر اس وقت بیس برس کی تھی۔ دیکھنے میں وہ بہت حسین تھا۔

اس کے بھائی کے یہاں جب لوگ مہیش کی شادی کیلئے آتے تو وہ کہہ دیا کرتے جب مہیش کی تعلیم ختم ہو جائیگی تو اس کی شادی کی بات چیت کی جائے گی۔

چنانچہ مہیش جیسے ہی گاؤں میں آیا۔ لڑکی والے آنے شروع ہوگئے۔ مگر مہیش شادی کرنے کیلئے تیار ہی نہیں تھا۔ اس کی بھابی اپنی ممانی کی لڑکی لانا چاہتی تھی جب مہیش نے اس کے بارے میں بھی انکار کر دیا تو وہ اپنا غصہ برداشت نہ کر سکی بولی "اوہو۔ باپ کی کمائی پر یہ شیخی! اگر اپنی کمائی سے اتنے امیر ہوئے ہوتے تو زمین پر پاؤں ہی نہ پڑتے۔ شادی تو شاید کسی اپسرا سے کرتے"۔

بھابی کی یہ طنز مہیش کے دل میں تیر کی طرح لگی۔ اس کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا۔ اس کے بھائی اسے فوراً باہر لے آئے۔ تاکہ وہ اسے بھول جائے وہ شکار کھیلنے چلے گئے۔ اپنی بیوی کو بھی بہت ڈانٹا مگر مہیش کے دل میں وہ طنز گھر کر چکی تھی کس طرح نکلتی۔

رات کو جب سوبرن مہیش کی گود ہی میں سو گئی تو اُسے لئے ہوئے بھائی کے کمرے میں آیا اور بھابی سے بولا "لو بھابی! اسے نیند آگئی"۔

بھابی نے کہا "پالنے میں سلا دو"۔

اس نے اسے بار بار چوم کر پالنے میں سلا دیا۔

بھائی مہیش کو خوش دیکھ کر بولے "آج شکار سے کیا لائے ہو مہیش بابو"۔

مہیش نے شکار کی بہت سی تفصیلیں بھائی کو سنائیں۔ درمیان درمیان میں بھابی بھی حصہ لیتے رہے۔ اس کے بعد دونوں کو پرنام کر کے وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

بھائی اور بھابی مہیش کو پہلے ہی کی طرح خوش دیکھ کر اطمینان سے سو گئے۔

مہیش بارہ بجے رات تک آرام کرسی پر بیٹھا بیٹھا سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے؟ آخر ایک صورت اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے اپنے نوکر بھگت کو جگایا اور کہا "بہت جلد اپنا اور میرا سامان باندھ لو۔ منہ اندھیرے ہی ہمیں یہاں سے کچھ روز کیلئے ایک جگہ چلے جانا ہے۔ اور ہاں اپنی بیوی کو جو وہ جھرنا والا پل ہے نہ، اسی پر بھیج دو وہاں سے وہ ہمارے ساتھ ہو جائیگی۔ ملک ساتھ جانا شاید ......"

بھگت نے اپنے تعجب سے مالک کی طرف دیکھا مگر اسے یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ آپ اس طرح کیوں جا رہے ہیں؟

مہیش کے پاس ہونے کی خوشی میں اس کے نانا نے اسے ایک بڑی موٹر کار دی تھی اور بیس ہزار نقد!

بھگت نے صبح ہونے سے پہلے ہی ضروری سامان موٹر میں رکھ دیا اور دونوں موٹر میں جا بیٹھے۔ پھاٹک پر جا کر مہیش نے پہریدار سے کہا "بھائی صاحب سے کہہ دینا۔ میں شکار کھیلنے گیا ہوں شام تک لوٹ آؤں گا"۔

"اچھا سرکار" کہتے ہوئے پہریدار نے پھاٹک کھول دیا۔ موٹر گھڑگھڑ کرتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہوگئی

سب سے پہلے مہیش نے نانا کا دیا ہوا روپیہ بنک سے نکالا۔ اور پھر رامی اور بھگت کے ساتھ پردیس چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے تمام روپیہ بنک میں جمع کر دیا اور میڈیکل کالج میں نام لکھا کر اس روپے کے سود سے کسی طرح گزر اوقات کرنے لگا۔

رات کو مہیش واپس نہیں آیا۔ ساری زمینداری میں تہلکہ مچ گیا۔ سب طرف تلاش ہوئی۔ اس کے بھائی اپنے نانا کے یہاں گئے اور جا کر کل واقعہ بیان کیا۔ وہ اداس ہو کر بولے "میں نے اس کی حوصلہ افزائی کیلئے روپیہ دیا تھا۔ مجھے کیا علم تھا کہ یہی روپیہ مجھے اس سے جدا کر دیگا۔ مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں وہ جلد واپس آجائیگا"۔

بھائی نے کہا "نہیں نانا جی مجھے تو ایسی امید نہیں"۔

"ہاں! تمہاری ماں بھی ایسی ہی ضدی تھی مہیش

کی عادتیں بالکل ماں کی طرح ہیں۔"

دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ننذ بولے: "ایشور اسے اچھی طرح رکھے دیکھنا وہ امیر بن کر گھر لوٹے گا۔"

"آپ کی دعا قبول ہو۔ مگر پردیس میں اس کا کون مددگار ہے۔"

(۲)

راج کماروں کی طرح ناز و نعم میں پلا ہوا مہیش غریبوں کی طرح دن کاٹ رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا کوارٹر لے رکھا تھا اور اس میں معمولی ساز و سامان کے ساتھ گزر کرتا تھا۔

رامی اور بھگت کو مہیش کا یہ حال دیکھ کر بہت رنج ہوتا۔ موقع بموقع وہ اسے گھر لوٹ چلنے کیلئے کہتے مگر ضدی مہیش ہمیشہ یہی کہتا: "مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ میں بہت آرام سے ہوں میں بھابی کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں صرف باپ کی کمائی پر ہی نہیں اکڑتا تھا خود بھی کما سکتا ہوں۔ تم سوچو تو بھگت جب میں ایک بڑا ڈاکٹر بن کر بھائی کے پاس پہنچوں گا تو فخر سے ان کا سر اونچا ہو جائے گا اور طنز کرنے والی بھابی بھی شرمندہ ہو جائیں گی۔"

اسی طرح تین سال گزر گئے۔ مہیش ہمیشہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوتا رہا۔ تمام کالج میں اس کی شہرت تھی۔ سب اسے پیار کرتے تھے۔ مہیش کا پکا ارادہ تھا کہ چوتھے سال وہ لندن چلا جائیگا اور آئی ایم ایس کا امتحان پاس کر کے ہندوستان لوٹے گا۔ اس کے پرنسپل بھی برابر اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔

چوتھے برس گرمیوں کی تعطیل کے پہلے ہی وہ بیمار پڑ گیا۔ رامی اور بھگت نے بہت ضد کی اور کشمیر چلا آیا۔ جہاں ایک ہاؤس بوٹ لے کر رہنے لگے۔ اس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ وہ کچھ روز تک گلمرگ رہا۔ کچھ دنوں پہلگام رہا۔ مگر کہیں اس کا جی نہ لگا۔ اس لئے پھر ہاؤس بوٹ میں واپس چلا آیا۔

ایک روز شام کو اس نے کہا: "بھگت میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔"

"موٹر سے جائیں گے کیا؟"

"نہیں شکارا بلواؤ۔"

بھگت نے ایک شکارا بلایا۔ مہیش کے بیٹھ جانے پر بھگت بھی ملاحوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

مہیش بولا: "وولر لیک چلو۔"

ملاح نے کہا: "حضور شام بہت ہو گئی ہے اور ادھر پانی کا بڑا زور ہے۔"

مہیش بولا: "کچھ پروا نہیں تم اسی طرف لے چلو۔"

جب شکارا وولر لیک سے گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ چاروں طرف برف اور چھپے ہوئے پانی سے پہاڑیاں ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان پر چاند کی زرد روشنی پڑ کر ایک عجیب دلآویزی پیدا کر رہی تھی۔ مہیش بڑی دلچسپی سے ان مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی طبیعت قدرت کی یہ رنگا رنگی دیکھ کر بہت مسرور ہوئی۔

بھگت نے کہا: "حضور اب دھند چھانی شروع ہو گئی۔" یہ کہہ کر یکایک وہ چونک پڑا اور ایک طرف غور سے دیکھتا ہوا بولا: "وہ کیا ہے؟" سب کی نظریں اسی طرف اٹھ گئیں۔ ملاح نے کہا۔ "آج پہلی بار میں یہاں بہتی ہوئی لاش دیکھ رہا ہوں۔ تعجب ہے۔"

مہیش بولا: "ذرا دیکھا جائے کہیں زندہ نہ ہو۔"

تھوڑی ہی دیر میں وہ لاش اوپر کھینچ لی گئی۔ مہیش نے کہا: "ارے یہ تو بیہوش لڑکی ہے۔"

مہیش نے اس کے پیٹ کا پانی نکال لینے پر کہا: "بہت جلد گھر چلو۔ اس میں ابھی کچھ جان باقی ہے۔ اگر کوشش کی جائے گی تو اس کے بچ جانے کی امید ہے۔"

کشتی تیزی سے گھر کی جانب چلنے لگی مہیش نے اس لڑکی کی طرف غور سے دیکھا۔ چاندی کی طرح دمکتا ہوا نہایت حسین و جمیل چہرہ تھا۔ ریشم کی طرح لمبے لمبے سیاہ بال تھے۔ عمر کوئی سولہ سترہ برس کی رہی ہوگی۔ کسی امیر گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ ہاتھ اور کانوں میں ہیرے کے زیور تھے۔

گھر پہنچ کر مہیش نے رامی سے کہا: "ہم سب ہٹ جاتے ہیں تم پہلے اس کے خشک کپڑے بدل دو۔" رامی نے اسے خشک کپڑے پہنا دئے تو مہیش اسے گود میں اٹھا لایا اور خوابگاہ میں لے جا کر اپنے پلنگ پر سلا دیا اور موٹا کمبل اوڑھا دیا۔ دو تین چمچے برانڈی کے اس کے منہ میں ڈالے اور پھر دوا تیار کرنے لگا۔

رات بھر کی سخت تیمارداری اور کوشش کے بعد صبح لڑکی نے "آہ" کہہ کر کروٹ لی۔ مہیش، رامی، بھگت تینوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ مہیش نے کہا: "جاؤ تم دونوں بہت جلد تھوڑا دودھ گرم کر لاؤ۔"

مہیش نے برانڈی کا ایک چمچہ اور پلایا۔ لڑکی نے اپنی بڑی بڑی نرگسی آنکھیں کھول دیں اور مہیش کو اپنے پلنگ پر بیٹھے دیکھ کر تعجب سے چیخ اٹھی۔ اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگی مہیش نے اسے پکڑ کر لٹاتے ہوئے کہا: "آپ اسی طرح آرام کیجئے آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میں نے کل رات آپ کو پانی سے نکالا تھا۔"

"اف! پانی... میں... سے...!" لڑکی آہستہ سے بولی۔

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔"

مہیش نے کہا: "بھگوان کی کرپا ہے۔ آپ اپنے گھر کا پتہ مجھے بتا دیں تاکہ میں آپ کے والدین کو اطلاع بھیج دوں۔ کہ آپ میرے یہاں بخیریت ہیں۔"

لڑکی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ پیشانی پر پسینے کی چند بوندیں چمک اٹھیں۔ اس نے کچھ دیر خاموش رہ کر

کہا: "آپ نے ناحق تکلیف کی۔ اگر میرا کوئی ہوتا تو میں پانی میں ڈوبتی ہی کیوں؟ میں اپنے اکیلے پن سے تنگ آگئی تھی:"

"آپ کا نام؟"

"میرا نام ہے ... کشمیرا ہے:"

مہیش سمجھ گیا کہ لڑکی نہ تو اپنا ٹھکانہ ہی بتانا چاہتی ہے اور نہ نام ہی ٹھیک بتا رہی ہے خیر اس کی مرضی۔ پھر بولا: "اچھا تھوڑا دودھ پی لیجئے"

رامی نے دودھ کا پیالہ اس کے سامنے رکھا۔

لڑکی نے دودھ پی لیا۔ مہیش کے اپنے کو "آپ" کے تخاطب سے وہ مسکرا کر بولی: "میں تو آپ سے چھوٹی ہوں۔ پھر مجھے "آپ" "آپ" کہہ کر کیوں مخاطب کرتے ہیں:"

مہیش نے کہا: "اچھا اب آپ کو "تم" ہی کہہ کروں گا:"

~~~

کشمیرا اب بالکل تندرست ہے۔ مہیش کی چھٹیاں بھی ختم ہوگئیں۔ ایک روز اس نے کشمیرا سے کہا: "کشمیرا، میری چھٹی ختم ہوگئی:"

کشمیرا نے کہا: "بہت اچھا ہوا۔ اب کب واپس چلیں گے؟"

مہیش بولا: "کشمیرا ... تو ... تم بھی ..."

کشمیرا کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو چھلچھلا آئے بولی: "آپ کے سوا اس وقت میرا اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کو چھوڑ کر میں کہاں اور کس کے پاس جاؤں:"

مہیش بولا: "بڑی خوشی سے تم میرے ساتھ رہ سکتی ہو۔ میں کبھی تمہیں اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہتا:" دوسرے ہی روز ان سب نے کشمیر چھوڑ دیا۔

۳

مہیش روزانہ کالج جاتا ہے، اور سب کچھ بھول کر امتحان سے پڑھ رہا ہے۔ کشمیرا اس کو ادھر میں اس طرح رہتی تھی جیسے ہمیشہ ہی اس میں رہتی آئی ہو۔ وہ رامی کے کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہتی ہے مگر رامی اسے کچھ کرنے ہی نہیں دیتی اور سچ تو یہ ہے کہ کشمیرا کو کچھ آتا بھی نہیں تھا۔ رامی بھی اسے جانتی تھی وہ کہتی: "یہ کام تمہارے کرنے کے نہیں ہیں۔ اور کام ہی کون بہت زیادہ ہے؟ تم جا کر کمرے میں کشیدہ کاڑھو۔ نہیں الماری سے نکال کر کوئی کتاب پڑھو، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو جاؤ کہیں ٹہل آؤ:"

کشمیرا ہنستی ہوئی وہاں سے چلی جاتی۔

محلے کے لڑکے مہیش سے پوچھتے: "کشمیر سے کیا لائے مہیش بھیا؟"

مہیش ہنس کر کہتا: "کشمیرا"

لڑکے اسے مذاق سمجھتے اور خوب ہنستے۔

شام کو جب مہیش کی موٹر دروازے پر آتی۔ تو کشمیرا کھڑکی سے اترتے ہوئے مہیش کو دیکھتی اور اس کے کمرے میں چلے جانے کے بعد ایک لمبی سانس لے کر کھڑکی بند کر دیتی۔ مہیش کبھی اس سے بات ہی نہیں کرتا تھا وہ بھی اسکے سامنے نہ جاتی۔

کشمیرا مہیش سے کچھ الگ الگ سی رہتی تھی مہیش کو اس بات کا خیال بھی نہ تھا کہ میرے پڑھائی میں مصروف رہنے سے کشمیرا کو کوئی تکلیف ہوتی ہوگی۔ رامی اور بھگت کے ذریعہ کشمیرا کو مہیش کی تمام باتیں معلوم ہو چکی تھیں ایک روز کالج سے آتے ہی مہیش بغیر کچھ کھائے پئے اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ کشمیرا کو بعد میں پتہ چلا کہ آج اس کے سر میں سخت درد ہے۔ اس کا تمام غرور و ناز کافور ہوگیا۔ اور ہاتھ میں دوا کی شیشی لئے وہ فوراً اس کے پاس پہونچی۔

مہیش درد سے بے چین آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ کشمیرا پیشانی پر دوا ملنے لگی مہیش نے کہا: "کون ہے؟"

کشمیرا: "میں ہوں:"

مہیش نے آنکھیں کھول کر کہا: "کون؟ تم ہو کشمیرا؟"

"جی ہاں! کیا میرا یہاں آنا آپکو پسند نہیں ہے؟"

مہیش نے کہا: "کیوں کشمیرا، تم ایسی بات کیوں کہہ رہی ہو:"

کشمیرا: "آپ کی باتوں سے مجھے ....."

مہیش: "کشمیرا تم غلط سمجھیں، آج کل میرے امتحان کے دن ہیں۔ اسی لئے ..... ابھی کچھ روز اور ..... اس کے بعد لندن چلا جاؤنگا۔ اُف بہت درد ہے:"

کشمیرا زور سے دوا ملنے لگی۔

بہت دیر کے بعد مہیش بولا: "اس روز اخبار میں بڑی دردناک خبر پڑھی۔ لکھا تھا ---- "سونارگڈھ" کی پرنسز دیوا پانی میں گر کر ہلاک ہوگئیں۔ بیچاری کی عمر ابھی صرف سولہ برس کی تھی:"

کشمیرا کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ اس کی سانس رکنے سی لگی۔

مہیش پھر بولا: "اگر اس روز میں نہ دیکھتا تو شاید تم بھی ڈوب جاتیں۔ کیوں کشمیرا؟"

کشمیرا نے ایک لمبی سانس لی پھر بولی۔ "ہاں آپ ہی کی وجہ سے میں بچ گئی:"

کچھ دیر تک چپ رہنے کے بعد کشمیرا نے کہا "آپ لندن جائیں گے تو میں کہاں رہونگی:"

مہیش نے آج تک اس پر ذرا بھی غور نہیں کیا تھا، بولا: "ہاں تم کہاں رہوگی؟ یہاں ..... اگر تم یہیں رہو ---- ؟"

کشمیرا نے کہا: "نہیں نہیں میں آپکے بغیر کہیں نہیں رہ سکتی۔ لیکن آپ کا روپیہ ....."

مہیش بولا: "اجی جانے دو۔ روپے کی مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اب مجھے جتنے روپے کی ضرورت ہے۔ اس سے کہیں زیادہ کثیر
~~~

پاس موجود ہے۔ اچھا تو اب ہم دونوں لندن چلیں گے۔ رامی اور بھگت کو مدھیر کے ہاں چھوڑ دیں گے:

کشمیرا خوش ہو کر بولی: "کب چلو گے؟"

مہیش نے کہا: "نتیجہ نکلتے ہی چل دونگا۔ کوئی دو مہینے میں۔"

کشمیرا: "میری تب تک سمر کا درد بڑھ گیا ہوگا؟"

مہیش: "بلکہ کم ہو گیا۔"

دونوں ہنس پڑے۔

دو مہینے بعد دونوں لندن چلے گئے۔ بھگت اور رامی بہت روئے۔ سدھیر انہیں اپنے گھر لے گیا۔

۲

لندن پہنچ کر مہیش نے جی بھر کر پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک روز کشمیرا سے بولا: "تم تمام دن گھر میں بند کیوں رہتی ہو؟ اپنی پڑوسن مس روز کے ساتھ گھوم پھر آیا کرو۔ تم انگریزی کتنی اچھی بول لیتی ہو کشمیرا، مگر تم نے یہاں آنے سے پہلے مجھے نہیں بتایا۔"

کشمیرا مسکرانے لگی۔

اسی طرح تین سال گذر گئے۔ یہ مہیش کا آخری سال تھا۔ کشمیرا اور مہیش ایک ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ مہیش تعلیم میں مصروف ہونے کی وجہ سے کشمیرا سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ اب کشمیرا اس بات کو سمجھ گئی تھی اس لئے ناراض نہیں ہوتی تھی بلکہ جان بوجھ کر اور بھی دور ہی رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ مہیش کے پکارنے پر بھی اس کے پاس نہ جاتی تھی۔ مہیش کو اس کا یہ طرز عمل پسند نہیں تھا۔ وہ کشمیرا کے متعلق تنہائی میں گھنٹوں سوچا کرتا۔ اسے اب معلوم ہوا کہ اس کے دل پر کشمیرا نے کتنا اثر و اقتدار جما لیا ہے۔

ایک روز جب وہ پڑھتے پڑھتے تھک گیا تو اس نے سوچا۔ اب آج بالکل نہیں پڑھوں گا اور میں کشمیرا سے غپ شپ کرونگا۔ مگر جنی پرالبرٹ نے بتایا کہ کشمیرا ابھی ٹہل کر واپس نہیں آئی۔ مہیش بہت دیر تک انتظار کرتا رہا۔ آخر جھنجھلا کر وہ بھی ٹہلنے کیلئے نکل پڑا۔

راستے میں اس کا دوست پرکاش مل گیا۔ بولا "مہیش بڑے اداس معلوم ہوتے ہو۔"

مہیش نے کہا: "آج میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

پرکاش بولا: "میرے ساتھ چلو، سب ٹھیک ہو جائیگا۔" پرکاش اسے اپنے گھر لے آیا اور بولا: "تم یہیں بیٹھو میں تمہارے لئے دوا بنا لاتا ہوں۔"

مہیش اکیلا بیٹھ کر سوچنے لگا: "شاید کشمیرا کو سمجھنے میں نے بڑی غلطی کی۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ یہ میری سخت غلط فہمی تھی اس کے میرے ساتھ یہاں آنے کا صرف یہ مقصد تھا کہ وہ بغیر کسی سہارے کے وہاں رہنا پسند نہ کرتی تھی۔ ہاں وہ ہر وقت پریشان سی کیوں رہتی ہے؟ ایک بار رامی نے کہا تھا کہ وہ اکثر رات گئے بستر پر پڑی سسکا کرتی ہے۔ اس کا اصلی نام کیا ہے وہ کس کی لڑکی ہے۔ پانی میں کس طرح گری۔ مجھے اس کا کچھ بھی صحیح پتہ نہیں وہ پہلے کس کی تھی۔ اب پیاسی ہوئی اس کی آنکھیں ...... ہوں اگر وہ مجھے پیار کرتی تو کیا اتنے دنوں تک اپنے کو مجھ سے اس طرح چھپائے رکھتی اور یہ ..."

"لو مہیش۔"

مہیش نے چونک کر پرکاش کی طرف دیکھا۔ اور کہا: "ارے یہ کیا وسکی۔ نہیں بھئی نہیں پیو۔ میں نے آج تک کبھی اسے منہ سے نہیں لگایا۔ سنا ہے یہ کمبخت جس کے منہ لگ جاتی ہے، چھوڑتی ہی نہیں۔"

پرکاش زور سے ہنس پڑا۔ بولا: "مہیش تم پڑھے لکھے ہو۔ پھر گنوار ہو کر کیسی باتیں کرتے ہو؟ لندن میں اسے ضرور پینا چاہئے ورنہ نہیں تو بیمار ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اور تھوڑی سی تو پی کر دیکھو۔ صرف اس مہینے بھر پیتا ہوں پھر بر سوں نام نہیں لیتا۔"

ادھر ادھر کے بعد مہیش نے وہ گلاس ختم کر دیا۔ سرور آتے ہی وہ عالم کیف میں کھو گیا۔ پھر دوسرا گلاس بڑھایا اسے بھی تمام کر گیا۔

پرکاش بولا: "بس اب رہنے دو۔"

مہیش کھڑا ہو گیا۔ بولا: "تو اب چلتا ہوں پرکاش۔"

پرکاش نے کہا: "میں بھی ساتھ چلوں۔"

مہیش نے کہا: "نہیں نہیں کوئی حرج نہیں میں چلا جاؤں گا تم آرام کرو۔"

مہیش اپنے گھر کی طرف چلا۔ راستہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ گھر پہنچ کر دیکھا کشمیرا ڈرائنگ روم میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

وہ نشے میں تھا۔ اسلئے بھول گیا کہ ٹوپی اور کوٹ رضوانہ کہاں ٹانگا کرتی تھی۔ اسے کچھ سوچتے دیکھ کر کشمیرا نے آگے بڑھ کر کوٹ اور ٹوپی لینے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ مہیش کئی قدم پیچھے ہٹ کر بولا: "یہ ہندوستان نہیں ...... لندن ہے کشمیرا۔ تم سے یہ کام ......" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک کرسی پر دونوں چیزیں پھینک دیں اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ کر سگرٹ سلگاتا ہوا بولا۔ "اتنی دیر تک تو تم بہت مزے میں رہی ہو گی؟"

اس نے تعجب سے کہا: "کیوں؟"

مہیش بولا: "میں جو گھر پہ نہیں تھا۔"

کشمیرا: "آج آپ یہ کہہ کیا رہے ہیں؟"

"جو مجھے نہیں کہنا چاہئے۔" مہیش یہ کہتا ہوا اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔

کشمیرا نے اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا: "آپ کھانا کھائے بغیر ہی ......؟"

مہیش اندر سے بولا: "مجھے بھوک نہیں ہے"

تم کھالو"۔

کشمیرا چپ چاپ وہاں سے چلی گئی اور البرٹ سے بولی:" آج ہم دونوں کھانا نہ کھائیں گے۔ تم جا سکتے ہو"۔

البرٹ نے کہا:" معلوم ہوتا ہے صاحب کچھ ناراض ہیں"۔

"ہاں شاید"۔ کہتی ہوئی کشمیرا اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔

صبح چائے پیتے ہوئے دونوں پاس ہی پاس بیٹھے تھے۔ مہیش نے دیکھا کشمیرا کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی ہیں۔ اس نے کہا:" معلوم ہوتا ہے، تم رات بھر روتی رہیں۔ آخر تم ہی بتاؤ کشمیرا میں تمہارے لئے اور کیا کروں؟ تم جہاں بھی جانا ......"۔

کشمیرا نے مہیش کے چہرے پر اپنی بڑی بڑی آنکھیں گاڑ دیں۔ چائے پینا بند کر کے مہیش کی بات سننے کیلئے گویا وہ اپنے دل کو سخت بنانے کی کوشش کر رہی تھی اور اسی لئے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے دبائے ہوئے تھی۔ کشمیرا کا وہ انداز بہت حسین تھا۔ مہیش کی بات اس کے منہ ہی میں رہ گئی۔ وہ ایک ٹک اس حسین اور بے عیب چہرے کی دیکھتا رہ گیا۔ کشمیرا کو بہت زور کی رلائی آ رہی تھی مگر وہ اسے ضبط کئے ہوئے تھی۔

مہیش نے پھر کہا:" میں سمجھ گیا کشمیرا! تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں"۔

کشمیرا ہونٹ چباتی ہوئی بولی:" اسی لئے آپ نے شراب پینی شروع کی ہے کیا؟"

مہیش نے آنکھیں نیچی کر کے کہا:" ہاں اپنے دل کی سخت مایوسی کو دور کرنے کا میرے پاس صرف یہی ایک ذریعہ تھا"۔

مہیش اٹھ کر چلا گیا۔ کشمیرا اسی طرح بیٹھی رہ گئی۔ مہیش کا امتحان ختم ہو گیا۔ اب صرف نتیجے کا انتظار تھا۔ مہیش کو کوئی کام تو تھا نہیں اس لئے شام ہوتے ہی وہ شراب پینا شروع کر دیتا۔ اور ادھر ادھر چکر لگاتا رہتا۔ کشمیرا نے اکثر مرتبہ سوچا کہ مہیش سے کہہ دوں کہ تمہیں خبر دیتی ہوں تمہیں میرے پر رحم ہو۔ اس طرح سے اپنے کو برباد کر کے میری امیدوں کا خون نہ کرو۔ مگر آخر تو وہ ہندوستانی لڑکی تھی۔ شرم و حجاب اسے کچھ کہنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔

مس روز کے بہت اصرار کرنے پر اس روز وہ بازار چلی گئی۔ اچانک اس کی نگاہوں میں ایک موٹر گذر گئی۔ اس میں بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ چلانے لگی:" پتا جی۔ پتا جی۔ ارے آپ یہاں کہاں"۔ مگر موٹر جا چکی تھی۔

گھر آ کر اس نے مہیش سے کچھ کہا۔ دوسرے روز وہ اپنے باپ کی تلاش میں نکلی۔ مس کوک کمپنی کے دفتر میں جا کر اسے بڑی مشکل سے اپنے باپ کا پتہ معلوم ہوا۔ وہ مسرور و شادماں گھر لوٹ آئی۔ اس وقت مہیش گھر پر نہ تھا۔ البرٹ سے معلوم ہوا کہ بڑی دیر تک آپ کا انتظار کر کے وہ پھر باہر چلے گئے۔

رات کے بارہ بجے تک کشمیرا مہیش کا انتظار کرتی رہی۔ البرٹ چلا گیا تھا۔ وہ اکیلی بیٹھی بیٹھی اوب گئی۔ مہیش کی عادت بد سے اسے بہت رنج تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں روتے ہی روتے زمین پر لیٹ گئی اور نیند آ گئی۔

شاید دو بجے مہیش گھر واپس آیا۔ اس نے اپنی جیب سے کنجی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر آیا اور ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ کشمیرا کو زمین پر پڑے دیکھ کر بہت متعجب ہوا۔ اس نے اس کے بدن پر ہاتھ رکھا۔ وہ برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔ اس نے اسے ہلا کر جگایا۔ کشمیرا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مہیش بولا:" اس طرح کیوں پڑی تھیں بیمار تو ...... ارے تم رو کیوں رہی ہو بولو کشمیرا؟"

کشمیرا اس کی طرف دیکھتی رہی اس سے کچھ کہا نہ گیا۔

مہیش بولا:" سمجھ گیا تم اکیلے ڈر رہی تھیں۔ اچھا اب کبھی میں تمہیں اکیلے نہیں چھوڑوں گا چلو اپنے کمرے میں چلو"۔

وہ کشمیرا کو پکڑ کر اس کے پلنگ پر لے گیا۔ اور اسے لٹا کر اچھی طرح کمبل اڑھا دیا۔ پھر گلاس میں تھوڑی سی برانڈی اور کوئی دوا ملا کر دیتا ہوا بولا:" اسے پی جاؤ"۔

کشمیرا نے کہا:" مجھے کیا ہوا ہے؟"

مہیش بولا:" جی ہاں۔ تمام رات سردی میں پڑی رہیں۔ اور ابھی کچھ ہوا ہی نہیں؟ ہو نہ پی جاؤ"۔

کشمیرا نے دوا پی لی۔ اس کے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے مہیش بولا:" اچھا اب سو جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔ مگر تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

کشمیرا کا غصہ اب سچ مچ اتر چکا تھا۔ وہ مسکرا کر بولی:" بالکل نہیں"۔

"اچھا جاتا ہوں ...... تم بڑی اچھی ہو" کہتا ہوا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صبح البرٹ نے دیکھا دونوں بہت خوش ہیں کشمیرا مہیش کے سامنے چائے کا پیالہ رکھتی ہوئی بولی:" ایک کہانی سنو گے؟"

مہیش نے تعجب سے کہا:" کیسی کہانی؟ اچھا سناؤ"۔

کشمیرا نے کہنا شروع کیا:" ایک تھا راجہ ...... اسے پہلی رانی سے ایک لڑکی تھی مگر پہلی رانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسری رانی سے ایک تھا لڑکا۔ ایک دفعہ وہ بہت بیمار ہوا۔ ڈاکٹروں نے اسے کچھ دنوں کیلئے دنیا چھوڑنے کی رائے دی۔ وہ دنیا چلا گیا۔ پھر دوسری رانی اپنی سوتیلی لڑکی کو بہت تکلیف پہنچانے لگی رانی کا بھتیجا ایسٹ آیا۔ وہ لاج کمار بھی سے

اشتہاری طلاؤں سے بچو!

نسخہ طلاء مردمی شائع ہو گیا!

ناظرین! اس طلاء نے صدہا نہیں بلکہ ہزاروں مریضوں کی زندگی بدلدی - اور ہزاروں کو بامراد اور کامیاب دیا۔ طلاء مردمی جو عرصہ ۲۰ سال سے پبلک میں اپنی مسیحائی سے مردہ کو زندہ کی صفت اور صداقت کا سکہ جما کر شہرت اور قبولیت کا ڈنکا بجا رہا ہے اور نہایت مجرب اور پراثر ثابت ہو رہا ہے ہم نے پبلک کی تکلیف کا خیال کر کے علم مخلوق خدا کی ہمدردی اور اشتہاری دواؤں کی شکایت کا خیال کرتے ہوئے عام انسانوں کیلئے مجرب طور شرطیہ بلا کم و کاست کے شائع کر دیا ہے اور جو عضو مخصوص (اندری) کی تمام خرابیوں کیلئے بیحد مفید ہے اور عضو مخصوص کی سستی، کمزوری، پتلاپن، چھوٹاپن، ٹیڑھاپن، جھکاؤ، نیلی رگوں کا ابھر آنا جو کثرت مباشرت، اغلام، جلق وغیرہ سے پیدا ہو جاتی ہیں اور جو تمام امراض کیلئے حیرت انگیز طور پر مفید ثابت ہو چکا ہے تمام شکایتوں کو رفع کر کے طوالت، فربہی اور تحریک قوت پیدا کرنے میں لاثانی ہے۔ زود اثر ایسا ہے کہ اول ہی ہفتہ کے لگانے سے نصف گھنٹہ میں فائدہ محسوس ہوتا ہے۔ ہزارہا مایوسوں کی زندگی جو بے لطف تھی اپنے عیش و راحت کامیابی اور کامرانی کے ساتھ بسر کرا دی جو کہ دعائیں دیتے ہیں اور شکریہ کے خطوط لکھتے نہیں تھکتے - اسلئے اسکے استعمال سے اس کا جوہر معلوم ہو سکتا ہے۔ شوق سے اسکو تیار کریں اور دعائے خیر سے ناچیز کو یاد کریں۔ اگر کسی صاحب کو ضرورت نہ ہو تو دوستوں اور عزیزوں کو یہ نسخہ بتلا کر ملاحظہ فرما کر طلاء بنانے کی سفارش کریں۔ یہ ردی کی ٹوکری میں پھینکا جائے بلکہ بہت حفاظت سے رکھا جائے کیونکہ یہ نسخہ بار بار شائع نہ ہوگا۔

نسخہ حسب ذیل ہے - مغز پستہ ایک تولہ، مغز اخروٹ ایکتولہ، مغز بادام ایکتولہ، مغز چلغوزہ ایکتولہ، سفید کنیر کی جڑ ایک تولہ، کائفل ایکتولہ، لونگ ایک تولہ، جائفل ایکتولہ، بیر بہوٹی ۶ ماشہ، ریگ ماہی ایکتولہ، مالکنگنی ایکتولہ، سفید چرمٹی ایکتولہ، ڈھاک کے بیج ایکتولہ، سم اسپ ایکتولہ، عاقر قرحا ایکتولہ، جلوتری ایکتولہ، دارچینی ایکتولہ، اونٹ کٹارے کی جڑ ایکتولہ، تخم پیاز ایکتولہ، کچلہ چھ ماشہ، زعفران چھ ماشہ، کینچوے خشک چھ ماشہ، کستوری ۳ ماشہ، اندری بکرا خصی چربی چیتا ۵ تولہ، چربی شیر ۵ تولہ، چربی سانڈہ ۵ تولہ، تیل تینیلی ۵ تولہ، سم الفار سفید ۲ ماشہ، آئل سنامن Oil Cinnomon ۵ تولہ، آئل کلو Oil Clove) ۵ تولہ، مندرجہ بالا خشک دواؤں کو پیسکر چربی اور تیل ملا لیں، پھر کسی کھرل میں ڈال کر ۲۴ گھنٹہ گھوٹ کر بڑی آتشی میں بھر کر رکھ لیں، یا تال جنتر کی ترکیب سے تیل نکالیں، اور شیشی میں بھر کر کارک لگا دیں۔

حسب دستور رات کو سوتے وقت مالش کریں۔ انشاء اللہ ایک ہفتہ کے استعمال سے وہ قوت پیدا ہوگی جو تا زندگی قائم رہیگی۔ اور تمام نقائص عضو مخصوص کے رفع ہو جائینگے۔ لطف یہ کہ اس طلاء سے آبلہ نہیں پڑتا اور نہ کوئی تکلیف ہی ہوتی ہے۔ نازک سے نازک حضرات اس کا استعمال کر سکتے ہیں ہر موسم میں یکساں مفید ہے، اگر کوئی صاحب بوجہ دقت یا شرمندگی خود تیار نہ کر سکیں تو ہمارے دواخانہ سے طلاء مردمی جو مریضوں کیلئے ہر وقت تیار موجود رہتا ہے جسکی قیمت فی شیشی تین روپے آٹھ آنے معہ محصولڈاک ہے (منی آرڈر فیس دو آنہ) طلب کریں۔ ایک شیشی ایک مریض کیلئے کافی ہوتی ہے اگر خود ہی تیار کرنا چاہیں اور کسی دوا کے نہ ملنے سے مجبور ہو جائیں تو وہ بھی طلب کریں۔ غرضیکہ ہمکو دھوکہ باز اشتہاروں سے بچانا مقصود ہے جس طرح چاہیں اس نسخہ کا تجربہ کریں۔ اور اگر جریان و قوت باہ کی شکایت ہو تو ہمارے ہاں وہ بھی نسخہ اکسیر جریان یا دوا دہن منیخون ست جو بیس سال سے مجرب ثابت ہو رہے جس کے استعمال سے بلا مبالغہ بیس سال کے لاعلاج مریض جو برسوں تک حکیموں اور ڈاکٹروں کے زیر علاج رہ کر دولت کو برباد کر کے بھی مایوس ہو چکے تھے آج وہ سب صحتیاب ہو رہے ہیں جس کی قیمت اکسیر ۲۰ روزہ خوراک کی مبلغ دو روپے دس آنے (عہ) معہ محصولڈاک ہے۔

(منی آرڈر فیس دو آنہ) طلب کریں، جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ اور پتہ خوشخط تحریر کریں ورنہ تعمیل جواب نہ ہوگی۔ (جملہ خط و کتابت کا پتہ)

خادم ویدرتن ستیہ دیو جی پروپرائٹر روپ بلاس کمپنی ۱۱۶ کانپور

محبت کرنے لگا۔ بھتیجے کی محبت دیکھ کر سوتیلی ماں کچھ نرم پڑ گئی۔ اجیت نے کماری سے کہا: "تم مجھ سے شادی کر لو" اس نے کہا "تم رشتے میں میرے بھائی ہوتے ہو۔ تم سے میں کبھی شادی نہیں کر سکتی" اس کا علم رانی کو ہوا وہ بہت خفا ہوئی۔ پھر کچھ روز کیلئے وہ سب کشمیر چلے گئے۔ وہاں ایک روز سیر کرنے کی غرض سے وہ شکارا میں بیٹھ کر ڈل لیک گئے اجیت اور راجکماری ڈانڈ چلا رہے تھے رانی بیٹھی تھی۔ ہاں ایک بات کہنا بھول گئی۔ رانی راجکماری پر جو ظلم و ستم کرتی تھی۔ وہ اپنے باپ کو اس کا پتہ نہیں دے سکتی تھی۔ کیونکہ اسے باپ کا پتہ ہی نہیں بتایا گیا تھا۔ سوتیلی ماں کے ہی خط میں اس کو خط آتا جاتا تھا۔ ہاں تو جب وہ اس روز سیر کیلئے گئے تھے۔ شام کا وقت ہو گیا تھا۔ کشتی بالکل دریا کے درمیان میں تھی۔ رانی نے کہا: "تم اپنے باپ کو خط میں لکھ دو کہ میں اجیت سے شادی کرنے کو تیار ہوں"

راجکماری نے کہا: "میں اس قسم کی بات ہرگز نہیں لکھ سکتی۔ اس کے علاوہ میں اجیت سے شادی بھی نہیں کرونگی۔ بہت کہنے سننے کے بعد بھی جب کماری نہ مانی تو اس ڈائن نے اجیت کو اشارہ کیا۔ اور اس بیدرد ظالم نے کماری کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیا"

یہ کہہ کر کشمیرا خاموش ہو گئی۔ مہیش بڑے غور سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر بولا: "کیا تم تھک گئیں، اگر کہو تو بقیہ کہانی میں سنا دوں"

کشمیرا سمجھ گئی کہ مہیش سب کچھ جان گیا ہے بولی: "نہیں اس کی ضرورت نہیں۔"

مہیش نے کہا: "تو اب کیا کرنا چاہئے"

کشمیرا بولی: "میں نے پتاجی کو یہاں دیکھا ہے اور تھامس کک کمپنی سے ان کا پتہ بھی معلوم کر لیا ہے۔ وہ اس مہینے کے اخیر میں ہندوستان واپس جا رہے ہیں۔ ہم دونوں ان کے پاس چلیں گے۔ اپنی مری ہوئی بیٹی کو زندہ دیکھ کر وہ نہ جانے کتنے خوش ہوں گے۔ اف ... وہ مجھے کتنا پیار کرتے ہیں"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

مہیش بولا: "ارے رانی روؤ مت۔ آج تمہیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہوں گا۔ تمہارے باپ کہاں کے راجہ ہیں؟ اف یاد آیا بنو گڑھ کے راجہ کی لڑکی۔ پرنسز دیوا تمہیں ہو کیا"

"ہاں"

کچھ دیر بعد ہی کشمیرا مہیش کے ساتھ اپنے باپ کے بنگلے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ نوکر نے ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر سکریٹری کو خبر دی۔ موہن سنگھ سکریٹری آئے اور انہیں دیکھ کر بڑے تعجب سے بولے: "یہ کیا۔ پرنسز دیوا؟ نہیں نہیں ... ضرور وہی ہے ...... آپ کچھ لمبی اور دبلی ضرور ہو گئی ہیں۔ مگر آپکا پہچاننا موہن سنگھ کیلئے مشکل نہیں ہے۔ جس نے آپ کو اتنے روز تک گود میں کھلایا ہو وہ بھلا ......"

دیوا موہن سنگھ سے لپٹ کر بولی: "میں ہی آپ کی دیوا ہوں موہن سنگھ جی! جائیے پتاجی کو میرے آنے کی خبر دیجئے"

"ایشور کی کرپا ہے۔ مہاراج نہ جانے کتنے خوش ہوں گے"

موہن سنگھ اندر گیا۔ مارے خوشی کے اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

مہاراج نے اس کی طرف غور سے دیکھا کہ کہیں یہ شراب تو نہیں پی رہا تھا۔ مگر ایسی کوئی بات نہ دیکھ کر بولے: "کیا ہے؟"

"پرنسز دیوا۔ پرنسز دیوا آئی ہیں!"

"پاگل ہوئے ہو۔ جاؤ"

"مہاراج ان کے مرنے کی خبر جھوٹی تھی"

مہاراج پاگلوں کی طرح اس کے ساتھ باہر گئے۔ ان کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ دیوا دوڑ کر باپ کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اور انہیں آنسوؤں سے تر کر دیا۔ مہاراجہ نے بیٹی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ بہ نکلا۔ وہ بار بار کہتے "میری بچی! میری لاڈلی!!"

سکریٹری بھی رو رہا تھا۔

باپ کی گود میں بیٹھی بیٹھی دیوا نے اپنی آپ بیتی سنا دی۔ وہ رانی اور اجیت پر دانت پیس رہے تھے۔

دیوا بولی: "پتاجی! انہوں نے ہی مجھے ندی سے نکالا۔ اور آج تک بڑی عزت سے اپنے پاس رکھا۔ انہیں کی مہربانی سے آج مجھے آپ کے درشن ہوئے"

مہیش کو بھی سینے سے لگا کر راجا بولے۔ "بیٹا، تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولونگا"

دیوا نے باپ کو رانی پر بہت ناراض دیکھ کر سمجھاتے ہوئے کہا: "انہیں معاف کر دینا ہی ہمارا فرض ہے"

اس روز سے دیوا اور مہیش راجا ہی کے یہاں رہنے لگے۔

(۵)

مہیش کا نتیجہ نکل آیا۔ وہ امتحان میں اول رہا تھا۔ اب ہندوستان لوٹنے کی تیاری ہونے لگی ایک روز شام کو باغ کے ایک کنج میں بیٹھا مہیش چپ چاپ وسکی پی رہا تھا۔ سامنے دور پر راجا اور دیوا ٹہل رہے تھے نہ جانے باپ کی وہ کون سی بات سن کر ہنستے ہنستے بےحال ہوئی جا رہی تھی۔ مہیش ادھر ادھر دیکھتا ہوا خود ہی بول اٹھا: "دیکھو مہیش۔ ہر وقت چپ چاپ رہنے والی دیوا کتنی ہنس مکھ اور خوش مزاج ہے۔ بنو گڑھ کی پرنسز دیوا بھلا میری لوپ کے کنڈے سے کیوں

شادی کرے گی۔ خیر وہ سکھی ہوئی۔ اسے سکھی دیکھ کر میں بھی سکھی تھا۔ مگر میری امیدوں کا باغ اجڑ گیا۔ ہوا میں بنا ہوا سندر محل ریزہ ریزہ ہو گیا۔ بھابی کی طنز سے میں بڑا ڈاکٹر تو بن گیا۔ اب امیر ہونے میں بھی کوئی دیر نہیں۔ مگر ...... خیر بھائی مہیش تمہاری قسمت میں شادی کا سکھ نہیں لکھا تھا۔"

اپنے بڑھتے ہوئے رنج کو دور کرنے کیلئے مہیش نے تین چار گلاس اور ختم کئے۔ راجا اندر چلے گئے۔ دیوا شاید مہیش کو دیکھنے کے لئے ہی کنج میں آرہی تھی۔ مہیش نے گلاس اور بوتل کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ اور چپ چاپ ٹہلنے لگا۔ دیوا کے اندر آتے ہی اس نے اسے فوجی سلام کیا۔ دیوا ہنس کر بولی۔

"یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو؟"

مہیش بولا۔ "جس کی قسمت میں اکیلے ہی رہنا لکھا ہو وہ ساتھی کہاں سے لائے گا کشمیرا؟ نہیں ...... بھول ...... پرنسز دیوا!"

"آپ کے منہ سے میں کشمیرا ہی سننا چاہتی ہوں سمجھے! کیا آپ نہ بتائیں گے کہ آپ کیا سوچ رہے تھے؟"

مہیش بولا۔ "تو سنو۔ میں نے بڑی مشکلوں سے ایک اپسرا کو پایا تھا۔ مگر قسمت کی بات ہے۔ وہ پھر ہاتھ سے نکل گئی۔"

دیوا مہیش کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "ہاں تو اس کے لئے آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میں اس اپسرا کو پھر پکڑ لاؤنگی۔"

مہیش دیوا کے چھونے سے سہر اٹھا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھکر بولا۔ "دیوا تم جانتی ہو سنگی میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا مگر دیوا تم نے کبھی نہیں کہا کہ میں بھی تمہیں چاہتی ہوں آج کہدو دیوا، میں بھی سننا چاہتا ہوں۔"

دیوا چپ ہو بیٹھ گئی۔ مہیش بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔ دیوا نے مہیش کے چوڑے سینے پر اپنا سر رکھدیا اور اس کی ٹائی کے ساتھ کھیلتی ہوئی بولی۔ "دیوا کی بات تو میں نہیں جانتی مگر کشمیرا آپ کی ہے اور ہمیشہ آپ ہی کی رہے گی۔ وہ آپکو پہلے ہی روز سے پیار کرتی ہے۔ آپ اس کیلئے بالکل بے فکر رہیں۔ چاہے دیوا کہیں کی پرنسز ہو مگر آپ کیلئے وہ ہمیشہ ہی کشمیرا ہے۔ جس کی آپنے جان بچائی تھی، جو آپکی دیوتا کی طرح پوجا کرتی ہے۔"

مہیش نے اسے سینے سے چپکا کر کہا۔ "میری جان سے بھی پیاری کشمیرا! میرے من مندر کی دیوی!"

اسکے دو ہفتے بعد دونوں نے لندن چھوڑ دیا۔

۶

ہری پور کے زمیندار نے بڑے تعجب کیساتھ اخبارات میں بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا۔

"ہری پور کے کنور مہیش سنگھ بڑی عزت کے ساتھ لندن سے آئی ایم ایس پاس کر کے آرہے ہیں۔ گورنمنٹ نے انہیں کلکتے کی فوج میں کیپٹن مقرر کیا ہے۔ چوبیس تاریخ کی صبح وہ بمبئی پہنچ جائیں گے۔"

زمیندار خوشی سے اچھل پڑے۔ تھوڑی دیر میں یہ خبر بجلی کی طرح تمام علاقے میں پھیل گئی سب یہ خبر سن کر مسرور تھے۔

زمیندار نانا کے پاس گئے۔ مارے خوشی کے نانا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چوبیس تاریخ کو مہیش کے بمبئی پہنچتے ہی ان لوگوں نے اسے جا گھیرا۔ اس نے سب کے چرن چھوئے۔ سبھوں نے اسے سینے لگا لیا اور لاکھوں دعائیں دیں۔ رامی اور بھگت بھی پھولے نہ سماتے تھے۔

راجا سونار گڑھ نے ان لوگوں سے مہیش اور دیوا کی شادی کی بات پکی کر لی۔

رامی ہنستی ہوئی بولی۔ "آپ تو بڑی چالاک تھیں بیٹی۔ اتنے دن اپنے کو کیسا چھپائے رکھا۔"

دیوا بھی ہنسنے لگی۔ پھر وہ ماں باپ کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

رانی راجا کے ساتھ پرنسز دیوا کو دیکھ کر ایکدم پیلی پڑ گئی۔ راجکمار باپ اور بہن سے لپٹ گیا۔ اجیت اسی روز اپنے گھر کھسک گیا۔ راجہ دیوا سے عہد کر چکے تھے اسلئے اسے کچھ نہیں کہا اور وہ اسی روز شام کو دیوا اور راجکمار کو لیکر اپنے دوسرے محل میں چلے گئے۔ رانی نے بہت صفائی پیش کی مگر راجہ اسے معاف نہ کر سکے۔

ادھر مہیش کو لے کر سب لوگ ہری پور پہنچے۔ بھابی نے بڑے جوش و خروش سے مہیش کے گلے میں پھولوں کی مالا پہنا کر اسکے ماتھے پر رولی کا ٹیکہ لگایا۔ مہیش بھابی کے پیروں پر جھک گیا۔ اس کی پیشانی پر ماتھا جھکی ہوئی بھابی بولیں۔ "میرے طنز نے سچ سچ تمہیں بڑا آدمی بنا دیا۔ اب یہ بتاؤ اس اپسرا کو کہاں چھوڑ آئے؟ کیوں نہ آئی تمہارے ساتھ۔ آخر ہماری مدد کی ضرورت پڑی کہ نہیں؟"

مہیش مسکراتا ہوا بولا۔ "سچ بھابی، بھول کے بغیر کوئی کام کرنے میں اچھا نہیں لگتا۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ میری سوبرن کہاں ہے؟ اس کے لئے میں بہت سی چیزیں لایا ہوں۔"

رامی سوبرن کو کھینچ لائی۔ چھ مہینے کی سوبرن اسوقت آٹھ برس کی تھی۔ مہیش نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ بولی۔ "چاچی نہیں لائے؟ ماں تو ہمیشہ کہا کرتی تھی چاچا چاچی لینے گئے ہیں۔"

مہیش اسے چوم کر بولا۔ "ماں ہی لائے گی۔ تیری چاچی کو، میرے ساتھ تو وہ نہیں آئی۔" سب لوگ ہنسنے لگے۔

اس کے چھ مہینے بعد پرنسز دیوا کے ساتھ کنور مہیش سنگھ کی شادی ہو گئی۔ دونوں نے غریبی کے دن دیکھے تھے۔ غریبوں سے مل جل چکے تھے۔ غریبوں کیلئے دونوں کے دل میں درد تھا۔ شادی کے بعد دونوں نے عہد کیا تھا کہ جب تک جئیں گے غریبوں کی مدد کرتے رہینگے۔ مہیش اور دیوا نے اس عہد کو ہمیشہ نبھایا۔ دونوں ایک دوسرے کو حوصلہ دلایا کرتے تھے۔ کچھ ہی برس کے

میاں بیوی میں محبت اور

دولت کی برکت

میں آپکے لئے اپنے قیمتی سینہ کے راز کو ظاہر کر رہا ہوں۔ کیونکہ یہ میرا دہ سرمایہ ہے جس کے حاصل کرنے میں میں نے ہزاروں روپیہ صرف کردیا تھا اور برسوں محنت کی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد ان راز ہائے سربستہ کو چھپا کر رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔ مگر ضرورت مندوں نے مجھ کو مجبور کیا کہ کیوں خلق خدا کو اس گوہر گرانمایہ اور کلام الٰہی کی برکت سے مالا مال کیا جائے۔ اس لئے میں بے کم و کاست آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کئے دیتا ہوں کہ مندرجہ ذیل نقش و تعویز سے کبھی ناکامی نہ ہوگی۔ جن میں کی عادت اپنے ایمان کو فروخت نہیں کرونگا اور مجھے یقین ہے کہ میرے ایمان دارانہ قول کو سچا سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور کامیابی کے بعد میرے لئے دعائے خیر کریں گے تعویذ نقش حسب ذیل ہیں جن کا ہدیہ بہت ہی قلیل ہے اور یہ تمام لفافہ کے اندر بذریعہ وی پی رجسٹرڈ کرکے روانہ کئے جاتے ہیں ہدیہ کے علاوہ رجسٹری اخراجات کا خرچ ۴ر اندر آتا ہے۔

نقش بشارت ﴿لئے﴾ یہ نقش ہر کام کی کامیابی اور ناکامی کی بشارت دیتا ہے رات کو اپنے سرہانے رکھ کر سو جاؤ اور کام کا تصور دل میں رکھو سوتے وقت میں بشارت ہو جائے گی۔ بیاہ شادی، مریض کی بیماری، تجارت میں کامیابی۔ ناکامی۔ غرضیکہ اس کا موکل خواب میں آکر جواب دیدیتا ہے۔ ہدیہ ایک روپیہ دس آنے (عہ) ۔

تعویذ دولت ﴿لئے﴾ مفلسی میں خدا ہی یاد آتا ہے۔ خدا کسی کو مفلس نہ کرے۔ مفلسی دور ہونے کی جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئے یا روپیہ کی ترقی رک جائے تو اس متبرک تعویذ کی مدد سے آپکی مفلسی دور ہوگی۔ روپے پیسے میں رکھ دینے سے دولت کی زیادتی ہوگی اور تعجب انگیز طریقہ سے آمدنی کے ذرائع پیدا ہونگے۔ بس خدا کی قدرت نظر آئے گی۔ ہدیہ ایکروپیہ چار آنہ (عہ)

محبت کی ڈوری ﴿لئے﴾ میرے بزرگ نے صرف مجھ کو اجازت دی تھی کہ یہ ایسے ضرورتمندوں کو دی جائے جو جائز طور پر طلب کریں اس لئے میں اس محبت کی ڈوری کو ضرورتمندوں کے لئے پیش کر رہا ہوں کہ اگر کسی کی اپنے شوہر سے لڑائی رہتی ہو یا شوہر کی طبیعت بیوی کی طرف سے ہٹی ہوئی ہو۔ بیوی سے ذرا ذرا سی بات پر جھگڑ پڑتا ہو تو یہ تعویذ آپس کی محبت بڑھانے میں محبت کی زنجیر ثابت ہوگا۔ چند ہی دن میں سارے جھگڑے ختم ہوکر شوہر بیوی کا غلام بن جائے گا۔ یہ خدا کے کلام اور اس کے مقرب بندوں کی برکت ہے کہ جائز محبت کے وقت اس تعویذ معظم کی برقی قوت اپنا اثر دکھاتی ہے اور ضرور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ ہدیہ صرف ڈھائی روپے (عہ) ۔

اقرارنامہ ﴿کے﴾ ضرورتمندوں کو یہ اقرار کرنا ہوگا کہ میں اپنے سوا کسی دوسرے کو اس نقش و تعویذ کے استعمال کی ترکیب یا نقل نہ بتاؤں گا۔ اور ہدایتوں پر عمل کروں گا۔

پتہ یہ ہے:۔

نواب میاں شاہ صاحب" عامل چھتہ حکیم آغا جان مرحوم دہلی

"پروفیسروں کی خبط الحواسیاں"

از جناب سلطان احمد صدیقی گورکھپوری (علیگ)

مُسلم یونیورسٹی میں داخلے کے مراحل بھی عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔ بالکل قیامت کا نمونہ۔ ہر شخص اپنے ہاتھوں میں فردِ عصیاں یا اعمال نامے لئے افتاں وخیزاں ادھر اُدھر دھکے کھاتے پھرتا ہے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ کسی محبوب کا کوچہ ہے جس میں عشاق کی بھیڑ ہے۔ ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ میں گرے پڑتے ہیں۔ خیر یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ یونیورسٹی میں داخلے سے قبل پروفیسروں کے متعلق میری عجیب وغریب رائے تھی۔ میرے تصور نے اُن کا جو ہیولیٰ تیار کیا تھا اس کی شکل کچھ اس قسم کی تھی کہ لمبے چوڑے۔ چھوٹی سی توند۔ چندیا پر سے بال صاف۔ ادھر اُدھر کچھ چاندی کے سے چمکتے ہوئے۔ آنکھیں جو کہ عینک کے موٹے شیشوں سے دنیا کا مشاہدہ کریں۔ سیاہ لمبا کوٹ گھٹنے سے نیچے نکلتا ہوا جس کے کبھی تمام بٹن بند یا بالکل کھلے۔ اور ایسا حافظہ جس پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب میں یونیورسٹی میں داخل ہوا تو مجھے اپنی تصویر کو بہت کچھ بدلنا پڑا۔ بہت سے پروفیسر بالکل انسانوں کی طرح انسان تھے۔ بالکل ہم جلیسوں کی طرح تندرست اور دنیاوی زندگی میں مشغول۔ باقاعدہ عادتیں۔ مگر اگلے زمانے ان کی یہ حالتیں نہ تھیں —— آج کل پروفیسروں کو خبط الحواس خیال کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ممکن ہے کچھ خوبیاں رہی ہوں مگر اس زمانہ کے پروفیسروں میں یہ باتیں خاص طور سے پائی جاتی ہیں لیجئے اُن کی کچھ خبط ملاحظہ فرمائیے:۔

ایک مرتبہ حیوانات (Zoology) کے پروفیسر صاحب مینڈک پر لکچر دے رہے تھے۔ ابتدائی باتیں بتلانے کے بعد اس مضمون کو زیادہ عمدگی سے سمجھانے کیلئے اُنہوں نے اپنا اٹیچی کیس کھول کر ایک پارسل نکالا اور فرمایا "حضرات اب میں آپکو مینڈک دکھلاتا ہوں" یہ کہتے ہوئے بنڈل کھولنا شروع کیا —— مکھن لگے ہوئے ٹوسٹ نکل پڑے۔ پروفیسر صاحب سر کھجاتے ہوئے متفکرانہ انداز میں آہستہ سے کہا "حضرات یہ تعجب خیز ہے۔ میرا ناشتہ اور مینڈک دونوں اسی اٹیچی کیس میں تھے اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے اپنا ناشتہ کر لیا"!

تمام کلاس کے لڑکے ہنسنے لگے۔ پروفیسر صاحب نے خبط الحواسی میں مینڈک چٹ کر لیں۔

ایک پروفیسر صاحب اپنی موٹر میں ایک جگہ تقریر کرنے جا رہے تھے جو وہاں سے پانچ میل تھی۔ موٹر خود ہی چلا رہے تھے۔ راستہ میں سگریٹ جلانا چاہا مگر چونکہ چھت کھلی ہوئی اور ہوا تیز تھی۔ اسلئے موٹر کو موڑ کر گلی میں لے گئے۔ سگریٹ جلایا اور یہ بھول گئے کہ موٹر کا رُخ بدلا گیا ہے۔ اسلئے اُلٹے راستہ پر روانہ ہو گئے۔ اُنہیں اپنی غلطی کا احساس بہت دیر میں ہوا جبکہ پانچ کے بجائے دس میل گزر گئے اور وہ جگہ نہ آئی۔ پروفیسر صاحب وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکے اور لکچر ملتوی کرنا پڑا۔

ایک پروفیسر صاحب کو اپنی چھتری بھول جانے کی عادت تھی۔ ایک مرتبہ دعوت میں جاتے ہوئے پروفیسر کی بیوی نے چھتری نہ لے جانے کا مشورہ دیا۔ جب دعوت ختم ہوئی تو وہ گھر واپس ہوئے۔ پروفیسر صاحب نے فتحمندانہ طور سے مسکراتے ہوئے بیوی سے کہا "تم ہمیشہ شکایت کرتی ہو کہ میں اپنی چھتری بھول آتا ہوں مگر آج دیکھو یہ بحفاظت میرے ساتھ ہے"۔ مگر جب بیوی نے کہا "مگر آج چھتری آپ ساتھ ہی کب لے گئے تھے"۔ تب پروفیسر صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ کسی دوسرے غریب کی چھتری اٹھا لائے ہیں۔

یہ واقعہ میرے علم میں ہے اور اس کی صحت میں شبہ نہیں۔ ایک پروفیسر صاحب مع اپنی بیوی کے ایک دعوت میں گئے اور موٹر خود چلائی۔ جب دعوت ختم ہوئی اور میزبان سے بہانوں سے مصروفِ تکلم تھے۔ آپ موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ بیوی کو یہ معلوم نہ ہوا کہ پروفیسر صاحب گئے۔ گھر پہنچکر علامہ کو بیوی نہ ملی۔ خیال آیا کوئی چیز دعوت میں چھوڑ آئے

ں۔ مگر اس کا خیال نہ آتا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ پھر اسی جگہ واپس آئے دیکھا بیوی لوگوں سے اسی جگہ گفتگو میں مشغول ہے۔ پروفیسر صاحب نے بیوی سے کہا: بیگم ہم کوئی چیز اس جگہ بھول گئے تھے؟ تب بیوی نے چند سوالات پوچھے: آپ کا چشمہ کہاں ہے؟ ٹوپی کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ لیکن یہ معلوم نہ کر سکی کہ وہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ گھر واپس آئے اور اپنی تمام اشیاء کا جائزہ لیا مگر معلوم نہ ہو سکا کہ پروفیسر صاحب نے کیا چیز کھو دی ہے۔ بیوی نے کہا: "شاید آپ کو یونہی خیال ہو گیا ہوگا"۔ پروفیسر صاحب نے جواب دیا: نہیں بیگم وہ کوئی ٹھوس جامد شے تھی؟ اس واقعہ کو تین برس ہو گئے ہیں مگر ابھی تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا چیز تھی؟

ایک مرتبہ ایک پروفیسر صاحب نے اپنے چند طلبہ کو اپنے بنگلے پر نو بجے دعوت کیلئے مدعو کیا جو امتحان بعد پڑھائی ختم کرنے والے تھے۔ پروفیسر صاحب لڑکوں سے کہہ کر بھول گئے اور اس رات اپنا کھانا حسب معمول ۸½ بجے کھا لیا۔ جب طلبہ نو بجے پہونچے تو انہوں ان کو ڈرائنگ روم پایا۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں اور ساڑھے دس بج گئے۔ دعوت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لڑکوں کو سخت بھوک لگی اور کچھ نیند بھی آنے لگی۔ لڑکوں کو پروفیسر صاحب کی غلطی کا احساس ہوا مگر کوئی بھی ان کے دل کو آزردہ کرنا چاہتا تھا اسلئے کسی نے بھی اپنے منہ سے کھانے کیلئے نہ کہا اور گیارہ بجے وہ لوگ خاموشی سے خدا حافظ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ دوسرے دن پروفیسر صاحب جب سو کر اُٹھے تو انہیں خیال آیا کہ گذشتہ رات انہوں نے لڑکوں کی دعوت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر خبط الحواسی کی وجہ سے بھول کر پورا نہ کر سکے۔ انہوں نے لڑکوں سے معذرت چاہی اور اس کے عوض میں اس رات کو بہت عمدہ دعوت کھلا کر پچھلی غلطی کی تلافی کر دی۔

ایک دفعہ ایک پروفیسر صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے۔ غسل خانہ میں Flush کی زنجیر کے بجائے خطرہ کی زنجیر کھینچ لی۔ گاڑی رُک گئی۔ تحقیقات ہوئی اور چونکہ پروفیسر صاحب بہت مشہور شخص تھے اسلئے چھوڑ دئے گئے۔

ایک پروفیسر صاحب بہت مخبط الحواس تھے اور ان کی بیوی بھی کسی طرح ان سے کم نہ تھی۔ ایک دن پروفیسر صاحب اپنی بیوی کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے خبط الحواسی میں انہوں نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ لینا چاہا کسی کے چلنے کی آواز آئی اور بیوی نے کہا "پیارے میرا شوہر آ رہا ہے"۔ پروفیسر صاحب فوراً بیوی کا ہاتھ چھوڑ کر خاموشی سے کھڑکی سے کود کر بھاگ نکلے۔

ایک کالج میگزین کی ادارت کے نگران ایک خبط الحواس پروفیسر تھے۔ ایک مرتبہ دعوت میں دوستوں کے درمیان بیٹھے ہوئے کچھ سوچنے لگے اور فوراً رسالہ کا خیال آیا جو جلد ہی شائع ہونے والا تھا۔ ایک دوست نے ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "آو پڈنگ (Pudding) لو"۔ جس کا جواب پروفیسر ایڈیٹر نے بدحواسی میں یہ دیا: "افسوس دوسرے مضامین کی زیادتی کی وجہ سے ہم اس کو بالکل جگہ نہیں دے سکتے"۔

ایک پروفیسر صاحب زچہ خانہ میں اپنی بیوی کی خبر گیری کیلئے گئے جس کے بچہ ہونے والا تھا۔ دس منٹ بیٹھنے کے بعد آپ کے دماغ میں کلاس کا خیال آیا اور یہ بھول گئے کہ کہاں ہیں اور کس لئے آئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں نرس نے آکر خوش خبری سنائی: "پروفیسر صاحب لڑکا"۔ پروفیسر صاحب نے کہا: "پوچھو کیا چاہتا ہے۔ کوئی ضروری کام ہے؟"

یہ واقعہ ذرا غلط سا معلوم ہوتا ہے مگر واللہ بالکل سچا ہے۔ ایک پروفیسر صاحب سنیما دیکھنے گئے۔ گھر لوٹے تو اپنی چھڑی کو پلنگ پر رکھ کر چادر اوڑھا دی اور خود چھڑی کی جگہ کونے میں دبک کر بیٹھ گئے اور ساری رات اسی طرح گذار دی۔

ایک پروفیسر صاحب کو کچھ اندرونی شکایت پیدا ہو گئی۔ حکیم صاحب نے بیوی کے پاس جانے سے منع کر دیا اور قارورہ مانگا۔ اتفاقاً صبح بھنگن سے قارورہ گر گیا۔ اس نے ڈرتے ہوئے خود شیشی میں پیشاب کر دیا۔ حکیم صاحب نے قارورہ دیکھ کر لکھا: "آثار حمل کے پائے جاتے ہیں"۔ پروفیسر صاحب نے پریشان ہو کر بیوی سے کہا: "دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ زیادہ ہمارے پاس نہ آیا کرو۔ آخر ہمیں حمل رہ گیا"۔

ہمارے ایک مہربان پروفیسر کے پاس تین چشمے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے دریافت کیا: "آپ کو تین عینکوں کی کیا ضرورت ہے؟" فرمایا: "تم نہیں جانتے ہو کہ ذرا بھول جانے کی عادت ہے۔ اسلئے اکثر چشمہ رکھ کر قطعی بھول جاتا ہوں کہ کہاں رکھ دیا۔ اسی وجہ سے مجھے تین عینکوں کی ضرورت پڑتی ہے ایک پاس کی نگاہ کا، دوسرا دور کی نگاہ کا۔ تیسرا ان دونوں کو تلاش کرنے کے لئے"۔ میں یہ لطیفہ سنکر بھڑک گیا۔

میں نہیں چاہتا کہ ایڈیٹر صاحب بھی خبط الحواس ہو جائیں اور اس مضمون کو پڑھ کر خبط الحواسی

کیوں راتوں کو یاد آتے ہو؟

از:- حضرت سلطان گورکھپوری (عینگ) ماہر ادب (آگرہ)

کیوں راتوں کو یاد آتے ہو؟
کیوں خوابوں میں تڑپاتے ہو؟
کیوں دور ہی سے ترساتے ہو؟
کیوں پاس نہیں اب آتے ہو؟
کیا لطف تم اس میں پاتے ہو؟

بچپن کی ہیں باتیں یاد مجھے
وہ دن وہ راتیں یاد مجھے
ہیں حسن کی گھاتیں یاد مجھے
وہ عشق کی ماتیں یاد مجھے
کیوں روپ نہیں دکھلاتے ہو؟

سب چاند ستارے ہوتے تھے
دریا کے کنارے ہوتے تھے
الفت کے اشارے ہوتے تھے
اور تم بھی ہمارے ہوتے تھے
اب آتے کیوں شرماتے ہو؟

جب ہم پہ نظرِ عنایت تھی
سب ختم تمہیں پہ حمایت تھی
تجھے ایسی ہم سے محبت تھی
چھٹنے کی نہ کوئی صورت تھی
اب کس کا دل بہلاتے ہو؟

سلطان ہے تیرا شیدائی
دیدار کا تیرے تمنائی
تھا سجدۂ شکر تماشائی
جب غیب سے یہ آواز آئی
تم آتے ہو، تم آتے ہو!!

(خاص)

اعترافِ رنگین

از جناب نظر نیرانی

ہر ایک پردہ نظر سے اٹھا دیا تم نے
جمالِ شاہدِ فطرت دکھا دیا تم نے
نظر سے سازِ محبت بجا دیا تم نے
ہر ایک نغمۂ رنگیں سنا دیا تم نے
ہر ایک رازِ محبت بتا دیا تم نے
غرض یہ ہے مجھے شاعر بنا دیا تم نے

ہر ایک شعر میں میرے سما گئی ہو تم
سرور بن کے مرے دل پہ چھا گئی ہو تم
نشاط و کیف کے دریا بہا گئی ہو تم
ہر ایک جذبۂ خفتہ جگا گئی ہو تم
طریقِ شاعری مجھ کو سکھا دیا تم نے
غرض یہ ہے مجھے شاعر بنا دیا تم نے

ہر ایک نظم پہ چھائی ہو رنگ و بو بنکر
چھپی ہوئی ہو مرے دل میں آرزو بنکر
رگوں میں دوڑتی پھرتی ہو تم لہو بنکر
مری نگاہ میں پنہاں ہو جستجو بنکر
نیاز و ناز کا قصہ مٹا دیا تم نے
غرض یہ ہے مجھے شاعر بنا دیا تم نے

شبِ سیاہ سے حاصل میں نور کرتا ہوں
ہر ایک رنج کو کیف و سرور کرتا ہوں
بساطِ غم کو میں دامانِ حور کرتا ہوں
نگاہِ شوق سے پیدا میں طور کرتا ہوں
مری نگاہ کو ہر حوصلہ دیا تم نے
غرض یہ ہے مجھے شاعر بنا دیا تم نے

تمہیں نے میری محبت کو تازگی بخشی
تمہیں نے شمعِ سخن کو یہ روشنی بخشی
تمہیں نے بزمِ تصور کو دل کشی بخشی
تمہیں نے ذرۂ ناچیز کو خودی بخشی
بتاؤں تم کو کہاں تک کہ کیا دیا تم نے
غرض یہ ہے مجھے شاعر بنا دیا تم نے

(غیر مطبوعہ)

خریدارانِ مست قلندر کی خدمت میں ایک نادر پیشکش!

ایک نہایت ہی دلچسپ انعامی معمہ

حل کنندگان میں مست قلندر بکڈپو کی سینکڑوں روپیہ کی بیش قیمت کتابیں، بعض بالکل مفت اور بعض نصف قیمت پر تقسیم کی جائینگی۔ انعامات جیتنے والوں کی فہرست اور صحیح حل آئندہ اشاعت میں ضرور شائع ہو جائے گا۔

۳۰ ستمبر ۱۹۴۱ء تک تمام نئے بننے والے یا مست قلندر کے مستقل معاونین مندرجہ ذیل دلچسپ معمہ کو حل کر کے انعام حاصل کر سکتے ہیں۔ فیس داخلہ کچھ نہیں۔ عورت، مرد، بڈھا، جوان سب کیلئے دعوت عام ہے۔

دلچسپ معمہ

تین آدمی ہیں (۱) ساہوکار (۲) بابو۔ (۳) جاٹ اور تین عورتیں ہیں۔ (۱) ساہوکار کی بیوی (۲) بابو صاحب کی دھرم پتنی اور (۳) جٹی (جاٹ کی عورت)۔ یہ چھ نفوس دریائے راوی کے اس طرف کھڑے ہیں۔ کوئی ملاح یا کشتی وہاں موجود نہیں صرف ایک ڈونگی کنارے لگی ہے جس کا صرف ایک ہی چپو ہے اور بیک وقت دو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ بتلائیے وہ سب کے سب اس ڈونگی کے ذریعہ کس طرح دریا کو پار کریں۔ جب کہ (۱) ایک دفعہ دو مرد یا دو عورتیں ہی جا سکتی ہیں اور ڈونگی کو واپس بھی لانا ہوگا۔ (۲) کوئی مرد کسی دوسرے کے ساتھ اپنی عورت کو بھیجنے کے لئے تیار نہیں، چاہے جانے والے کی منکوحہ بھی اس کے ہمراہ ہو (۳) راوی کے پار اگر دو عورتیں پہنچ گئی ہیں تو اُن کے شوہر ہی ان کے پاس جا سکتے ہیں۔ یا تیسری عورت۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ساہوکار کی بیوی کے پاس بابو صاحب یا جاٹ کی بیوی کے ساہوکار صاحب جا دھمکیں مطلب یہ کہ کوئی مرد اپنی عورت کو کسی غیر مرد کے حوالے کر کے نہ تو خود پار جا سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے مرد کی تحویل میں بیوی کو بھیج سکتا ہے تبلائیے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اور کیسے وہ لوگ دریا کو عبور کریں؟

ضروری ہدایت: شمولیت کی شرط یہ ہے کہ مست قلندر کے خریدار اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں اور غیر خریدار سال بھر کا چندہ ہمراہ حل ارسال کریں۔

صحیح حل کنندگان کیلئے انعامات۔

۱۔ ہندوستانی فلم ایکٹرسوں کا سب سے بڑا البم (نصف قیمت پر)۔ ۲۔ تحفۂ محبت (ایڈیٹر مست قلندر کی بالکل نئی تصنیف مفت)

۳۔ مست قلندر بکڈپو کی شائع شدہ تمام کتابیں (نصف قیمت پر)

— مضمونِ خط —

(جو حل معمہ کے ساتھ روانہ کیا جائے گا)

میں مست قلندر کا پرانا خریدار ہوں۔ البتہ اب تین روپیہ بطور سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کر رہا ہوں نیز یا

میں مست قلندر کا پرانا خریدار ہوں میرا خریداری نمبر ہے۔ آپ کے سوال کا جواب حل کر کے بھیج رہا ہوں لہٰذا مجھے انعامی مقابلہ میں لیجئے اور صحیح حل ہونے کی صورت میں حسب ذیل کتب (یہاں تفصیل دی جائے) میرے پاس نصف قیمت پر روانہ کر دیجئے اور "تحفۂ محبت" مفت بھجوائیے۔

دستخط ....

مکمل پتہ ....

....

شائقین کی سہولت کیلئے مست قلندر بکڈپو کی فہرست نیچے درج کیجاتی ہے۔

— فہرست کتب —

طوطف کی سرگزشت ۸ر، گناہ کی لذتیں ۸ر، چند حسینوں کے خطوط ۸ر، شہر لندن کے اسرار عہ، ہم سو برس تک کیسے جئیں ۸ر، طائر روح ۸ر، غیبی دنیا ۸ر، عجائبات مسمریزم ۸ر، یوگ ودیا کے چمتکار ۸ر، جادوگروں کا بادشاہ عہ، دودھیا آبحیات عہ، رموز ہمزاد عہ، گمنام زندہ جادوگری کے کرشمے عہ، رفتی نگاہ ۱۲، کھیتی بننے کے راز ۱۲ر، روپیہ کمانے کی مشین عہ، دولتمند ہو عہ، رموز حسن عہ، ملاپ کی پہلی رات ۱۲ر، بیسویں صدی کا پریم شاستر ۱۲ر، چکلے والی کی سرگزشت عہ، حرامزادے کی سرگزشت عہ، کاشتری شکتی عہ، منتر شکتی عہ، منتر شاستر عہ، فلم ایکٹنگ گائیڈ عہ، مجربات نظامی ۸ر، قدیم مصری جادو عہ، تسخیر جن ۸ر، رموز پارہ اکسیر عہ، لیمول کی مسیحائی ۸ر، فن بوسہ بازی ہر دو حصہ ۱۲ر، سورج کی کرنوں سے علاج ہر سہ حصہ عہ، مردہ روحوں سے بات چیت ہر دو حصہ عہ، تقدیر کی تصویر یا تصویر (ہاتھ دیکھنے کا علم) ۸ر، کرڈیتی بنو ۶ر، پیار کی مار (محبت بھرے

ہندوستانی سنیاسیوں کے جگر پارے

لاکھ لاکھ کی قیمت کا ایک ایک نسخہ

اکسیر ہیضہ

(از عالیجناب ممتاز الاطبا حکیم شبراتی صاحب دعا ریال)

برگ مدار۔ زرد رنگ کے لیکر کپڑے سے صاف کرکے اوپر کی جانب ماکھن گائے لگائیں پھر اس پر نمک لگادیں۔ پتے صرف تیس چاہئیں ایک میں پندرہ پتے رکھ کر ان کے اوپر ایک تولہ ہڑتال گئودنتی کی ڈلی ڈال دیں۔ باقی پندرہ پتوں کو اوپر رکھ دیں اور سولہ سیر اوپلوں کی آگ دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر گئودنتی کو نکال لیں۔ پتوں کی راکھ ایک تولہ نمک سیاہ ۴ ماشہ۔ مرچ سیاہ ۴ ماشہ۔ سونٹھ ۴ ماشہ۔ گھماں ۴ ماشہ۔ مشک کافور ۲ ٹکی۔ سب کو باریک پیسکر سفوف بنالیں۔ خوراک ایک رتی۔ ہیضہ کیلئے بے نظیر اکسیر ہے۔

دافع بواسیر

(از جناب حکیم غلام نبی صاحب مشتاق لہلوی ضلع سیالکوٹ)

کافور۔ ثمر نیم ہر دو ہموزن لے کر کھرل کریں۔ گولیاں بنا کر بذریعہ پتال جنتر روغن کشید کریں۔ ایک دو بوند بتاشہ میں ڈال کر علی الصبح مستعمل کریں۔ روٹی گندم گھی کے ساتھ کھائیں۔ تیز اور ترش اشیا سے پرہیز کریں۔

اکسیری ٹوتھ پاؤڈر

(از جناب حکیم امیر چند دلیش۔ شہر میرٹھ)

دانتوں کی جملہ امراض کا لاثانی علاج ہونے کے علاوہ ماسخورہ کا جانی دشمن ہے۔ بنائیے اور دعائے خیر سے یاد فرمائیے۔

اجزا و ترکیب ساخت:۔ عقرقرحا ۶ ماشہ۔ قلفل سیاہ ۶ ماشہ۔ پھٹکری بریاں ۶ ماشہ۔ سنگجراحت ۵ تولہ۔ چاک مٹی ۵ تولہ۔ ان سب کو باریک پیس چھان کر ملادیں۔ پیپر منٹ ۳ ماشہ۔ کاربالک ایسڈ ۱۰ بوند۔ یوکلپٹس آئل ۲۰ بوند۔ کافور ۳ ماشہ۔ وائنم اپی کاک ۱۰ بوند۔ ان کو خوب کھرل کریں۔ پھر باقی ماندہ اشیاء ملاکر کام میں لائیں۔

برائے بواسیر خونی وبادی

(از جناب سردار رام سنگھ حکیم حاذق کماں (ضلع منٹگمری)

ایک ہفتہ میں مریض کو تسکین دیتی ہے۔ اکیس روز میں مرض کو نابود کرتی ہے۔ مگر شدت مرض میں احتیاطاً چالیس یوم تک کھانی چاہیئے

صفت:۔ کافور بھیم سینی ۶ ماشہ۔ ناگ کیسر ۱ تولہ۔ مغز تخم نیم ۲ تولہ۔ رس ۱ تولہ۔ مویز منقہ ۱ تولہ۔ ان سب کو بغیر منقہ کے علیحدہ علیحدہ باریک کریں مگر یہ خیال رکھیں کہ مغز تخم نیم کا تیل نہ نکل آئے۔ بعد میں منقہ ملا کر لوہے کے ہاون دستہ میں ڈال کر خوب زور سے کوٹیں کہ گولی مانند ھنے کے قابل ہو جائے۔ گولی بقدر جنگلی بیر کے تیار کریں۔ ایک ایک گولی صبح وشام ہمراہ باسی پانی کے نوش فرمائیں

پرہیز:۔ تیل، ترشی، سُرخ مرچ، گڑ اور گوشت سے پرہیز لازم ہے

---

* **چترا**۔ 'کنچن' کی نمائش امپیریل تھیٹر بمبئی میں عنقریب ہونے والی ہے۔

کچھ نئی فلمیں!

نیشنل۔ 'بہن' خوب رش لے رہی ہے۔ 'نئی روشنی'۔ 'نرودھن'۔ 'کسوٹی' اور 'روشنی' زیر تکمیل ہیں۔ مؤخر الذکر کو ڈائرکٹر محبوب ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔ ہیرو چندر موہن ہے۔

رنجیت۔ 'شادی' کی کامیابی کے بعد 'مہمان' کی تکمیل بسرعت تمام کی جاری ہے۔

بمبئی ٹاکیز۔ 'انجان' جس میں اشوک کمار اور دیوکارانی نے کام کیا ہے آخر مکمل ہو گئی۔ اور جلد پردہ فلم پر جلوہ افروز ہو گی۔

پربھات۔ 'سنت ساکھو' چند ہی دنوں میں مکمل ہوا چاہتا ہے۔ دو جدید فلم 'رامہ شاستر' اور 'کالی داس' زیر تیاری ہیں

وادیا۔ 'بمبئی والی' جس میں نادیا اور سردار منصور نے کام کیا ہے۔ بمبئی میں دکھائی جا رہی ہے۔ *

پھولوں کے گہوارے

از جناب ساغر حسنی اوجینی

فلک ساماں نظر سے ٹوٹ کر گرنے لگے تارے
تڑپتی بجلیاں بہتے ہوئے تسنیم کے دھارے

خمار افزا ترنم ہے گلستاں کی ہواؤں میں
چمن زار محبت میں گلوں سے کھیلنے والے

نہیں ہوتے ہو جب تم تو تمہارا عکس ہوتا ہے
کہا میں نے کہ مجھ کو فخر ہے ضبط محبت پر

کوئی آساں نہ تھے میرے تڑپتے دل کے نظارے
"محبت سوز نظارے، محبت سوز نظارے"

مبارک ہوں نگاہِ شوق کو پھولوں کے گہوارے
ارے ناداں ارے ظالم یہ انگارے ہیں انگارے

کبھی خالی نہیں رہتے مری آنکھوں کے گہوارے
تو کس شوخی سے بولے آپ جیتے اور ہم ہارے

میں وہ میکش ہوں جس کے واسطے ساغر بکف نکلے
زمیں سے بیل بوٹے آسماں پر چاند اور تارے

پانچ منٹ میں ہمزاد کے درشن کرلو

مضمون اشتہار رجسٹری شدہ

کسی ہندوستانی فقیر سے ہمیں یہ ترکیب حاصل ہوئی ہے جسکی بدولت ہر شخص گھر بیٹھے پانچ منٹ میں ہمزاد کو دیکھ سکتا ہے۔ غلط ثابت کرنیوالے کو پانچسو روپیہ انعام۔ اگر آپ یہ عجیب غریب ترکیب بالکل مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو آج ہی ہماری کتاب لاثانی رموزِ ہمزاد عہ کے وی۔پی سے طلب کیجئے جسمیں تسخیر ہمزاد سے متعلق ہندو یوگیوں اور مسلمان درویشوں کے سینہ بہ سینہ منتقل ہونیوالے خفیہ رازوں کو عملی اسباق کی صورت میں بالکل آسان اور عام فہم عبارت میں کھلم کھلا ظاہر کیا گیا ہے۔ ہمزاد کو بس میں کرنیکے یہ اسباق بالکل بیضرر اور اتنے آسان ہیں۔ کہ ایک ادنیٰ جماعت کا لڑکا بھی آسانی سے عمل کرلے کسی قبرستان دریا یا ندی کے کنارے جانیکی ضرورت نہیں۔ گھر میں بیٹھ کر عمل کیا جاتا ہے۔ ہماری بتلائی ہوئی ترکیب سے آپ ہمزاد کو دیکھ تو پہلے روز ہی لینگے۔ مگر تسخیر ہو کر ہمکلام ہونا ۱۲ یوم میں ہوگا۔ رموزِ ہمزاد سے بہتر کتاب اردو تو کیا کسی زبان میں بھی ابتک شائع نہیں ہوئی۔

آپکا ہمزاد آپ کیلئے کیا کچھ کرسکتا ہے؟ (۱) سات پردوں میں چھپے ہوئے نامہربان اور سنگدل محبوب کو بھی ہمزاد ایکبار کھینچ لائیگا اور آپکے قدموں پر گرادیگا۔ (۲) دشمن کو ذلیل و خوار اور تباہ و برباد کردیگا۔ (۳) کسی مہلک بیماری کے لاعلاج مریض کو بھلا چنگا کردیگا۔ (۴) ہزاروں میل کے فاصلے سے بے موسم کے پھل نیز دور کی چیزیں پل بھر میں لادیگا۔ (۵) حاکم اور افسر کو مہربان بناکر بگڑے ہوئے کام نکلوائیگا۔ (۶) کھوئے ہوئے عزیز کا پتہ لادیگا۔ (۷) آپکی زندگی کے بیتے ہوئے یا آئیندہ ہونیوالے واقعات اور حالات کو صاف صاف بیان کردیگا۔ اور آنیوالی مصیبت سے قبل از وقت آپکو خبردار کرکے آپکو اور آپکے کنبہ کو بیوقت موت مرنے سے بچادیگا۔ (۸) مدفون خزانے کو کھودنے اور دولت حاصل کرنیکی ایسی ایسی آسان ترکیبیں ہمزاد ظاہر کریگا۔ کہ آپ گنتی کے دنوں میں دولتِ دنیا سے مالامال ہوجائینگے۔ الغرض کہاں تک لکھا جائے۔ ہمزاد سدھی کے ناواقف ہیں بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ ہمزاد کوئی خوفناک چیز از قسم بھوت پریت ہوگا۔ ایسے کون نادان اپنی جان عذاب میں ڈالے لیکن یہ بات نہیں ہے۔ قدیم ہندو یوگی تو پہلے ہی اس بات کو جانتے تھے لیکن مغربی سائنس نے بھی اس بات کو تسلیم کرلیا ہے۔ کہ انسان کے دو جسم ہوتے ہیں۔ ایک کثیف یعنی مادی اور دوسرا لطیف یعنی روحانی جسم بس اس روحانی جسم کا نام ہمزاد ہے۔ اگر آپکا ہمزاد آپکے سامنے کھڑا کردیا جائے۔ تو دیکھنے والا آپ میں اور اسمیں کچھ بھی امتیاز نہ کرسکیگا تسخیر ہمزاد سے متعلق یوں تو سانپ کیڑے مکوڑوں کی طرح بیشمار کتابیں چھپی ہیں مگر ایسی جنکا سر پیر کچھ بھی آپکی سمجھ میں آیا ہوگا۔ یہ رموزِ ہمزاد اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے جس میں سائنٹفک طریقوں سے ہر ایک بات کی وضاحت کیگئی ہے۔ اور مبتدی کو اس خوبی سے سمجھایا گیا ہے۔ کہ بغیر استاد کی مدد کے ہمزاد سدھی ہوجاتی ہے سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگ ابتک اس کتاب سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اب سویں مرتبہ چھپ رہی ہے آپ بھی حاجت طلب کے لئے ایک جلد منگوا سکتے ہیں۔ آرڈر کے ہمراہ اس بات کی تحریر آنی چاہئے۔ کہ آپ اس سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھائینگے۔ ورنہ کسی قیمت پر بھی اس کتاب کو حاصل نہیں کرسکتے۔ ہر ڈاک میں درجنوں تعریفی خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن کا معائنہ دفتر میں آکر کیا جاسکتا ہے۔ یہاں نمونہ کے صرف چند خطوط ملاحظہ فرمائیے:- (۱) کتاب ملی شکریہ! میں نے تسخیر ہمزاد سے متعلق بہت سی کتابیں دیکھی ہیں۔ مگر رموزِ ہمزاد کو ان سب سے بہتر پایا۔ محمد صدیق خانپور (۲) کچھ دن ہوئے آپ سے ایک کتاب رموزِ ہمزاد منگوائی تھی۔ دعوے سے کہتا ہوں۔ کہ اس سے بہتر کتاب میرے دیکھنے میں نہیں آئی۔ ارجن سنگھ ڈیرہ دون (۳) رموزِ ہمزاد کی مدد سے ہمزاد کو پہلے دن ہی دیکھ چکا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی۔ خدا آپ کو اس کا اجر دیگا۔ کرم الٰہی مراد آباد۔

وہ اِس کے قدموں پر تسخیر محبت کا چلتا ہوا ٹوٹکہ ہتھیلی پر سرسوں جماکر دیکھ لو مٹھی بھر چاولوں کی دو تاثیریں چاول کا ایک دانہ تسخیر محبوب کیلئے تیغ کا ثابت ہوگا۔ تو دوسرا جدائی ڈلوانے کے کام آئیگا۔ فقیر حاجی شمس الدین صاحب کی زندہ کرامات کا ایک نمونہ۔ جو لوگ تسخیر محبوب کیلئے چلہ کشی کی ہمت نہیں رکھتے۔ یا اشتہاری منتروں کے الٹ پھیر میں پھنسکر اپنا قیمتی وقت اور روپیہ برباد کرنے سے جنہیں عار ہے۔ وہ اس عجیب غریب تنتر کی بدولت اپنے دل کی مراد حاصل کریں۔ رموزِ ہمزاد کے خریدار کو یہ تنتر بالکل مفت سکھایا جاتا ہے۔

پتہ:- **یونیورسل ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس ۱۵۰ لاہور**

ندی

از جناب نجم الدین احمد ایم اے۔ بی ٹی

اے پردیسی راہرو تیرا مسکن کہاں ہے۔ تیری انتھک روانی کس منزل کو ڈھونڈھتی ہے۔ کیا تیری زندگی بھی ایک طویل سفر ہے؟ تیری دن رات کی روانی۔ تیری موجوں کا اضطراب۔ تیری شوریدہ سری، میری زندگی سے خاص مناسبت رکھتی ہے۔ اور اسی لئے تیرا ہر انداز تیری ہر ادا مجھے کھینچتی ہے۔ ہم آغوشی کی دعوت دیتی ہے۔ دو پردیسی مسافروں میں الفت ہونی فطرت کا تقاضہ ہے۔

تو کہاں سے آتی ہے اور کہاں جائے گی؟ بعض کہتے ہیں کہ تو پربت کی بیٹی ہے اور ساگر کی تلاش میں نکلی ہے۔ مگر مجھے تو تیری ابتدا اور انتہا ساگر کی لامعلوم گہرائیوں میں نظر آتی ہے۔ تو اپنے چھوٹے ہوئے وطن کی تلاش میں یوں بیقرار و سرگرداں ہے۔

تیری مسلسل روانی اور محشر خرامی میں کسی بچھڑے ہوئے کی بیقراری نظر آتی ہے۔ آ، ہم دونوں مل کر اپنا انجام تلاش کریں۔ میں تیری یکسوئی سے سبق لوں اور بیابان تنہائی میں تو میرا ساتھ دے۔ تو لامعلوم مقام سے آتی ہے، اور کسی کی جستجو میں پہاڑوں کی وادیوں، سنسان بیابانوں، اور دہشتناک جنگلوں سے سفر کرتی ہوئی نہ معلوم کہاں جاتی ہے۔ ساحل کے پُر فضا مناظر اور دلکش سین تجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے، تو کسی کی نہیں سُنتی۔ صرف اپنی جستجو کے دھن میں ہے۔ بڑے بڑے بارونق شہر بھی تیرے کناروں پر بس گئے۔ خوبصورت سنگین عمارتیں تیرے کناروں پر جلوہ آرا ہوئیں۔

نظر نواز نخلستان تیرے ساحلوں پر لگائے گئے۔ مخمل کے قدرتی فرش تیرے کناروں پر بچھائے گئے مگر تو سب سے اپنا دامن چھڑا کر آگے ہی بڑھتی گئی۔ اور کناروں کی خوبصورت عمارتیں، سرنگوں اشجار، اپنا اپنا سنگار تیرے آئینوں میں دیکھتے اور دکھاتے ہی رہے۔ مگر تو کسی کو دھیان میں نہ لائی۔ اپنی ہی منزل کی طرف ہر لحہ رواں ہے۔

تیری نازک اور خوش ادا موجیں مجھے اور تمام اہل ساحل کو اشارہ سے بلا رہی ہیں۔ اپنا سفر بنانا چاہتی ہیں، اور جو ان کا ساتھ دیتا ہے، اسے بڑے پیار و محبت سے اپنے جھولے میں جھُلاتی اور گود میں کھلاتی اسی ایک منزل کی طرف لے جاتی ہیں۔ اپنے شفاف اور روشن سینے کے بچھاون پر جگہ دیتی ہیں۔

میری فانی ہستی بھی تیری ذات میں کھو جانا چاہتی ہے تاکہ تیرے ساتھ یہ بھی اپنی منزل مقصود کو پالے۔ سمندر میں مل کر تو سکون حاصل کر لیتی ہے۔ روز روز کی روانی و پریشانی سے نجات پاتی ہے۔ اس چند روزہ سفر کے بعد اپنی منزل پر پہنچکر ابدی راحت و آرام سے ہم آغوش ہوتی ہے۔

کیا یہ میری عارضی زندگی بھی تیری ہی وا دوش اور بیقراری کا نمونہ نہیں؟ کیا ہماری زندگی بھی سرتاسر ایک سفر نہیں ہے؟ بیشک یہ بھی اپنے انجام کو ڈھونڈ رہی ہے۔ جہاں سے آئی ہے وہیں جانے کیلئے بیچین و بیقرار ہے۔ مادی ساحلوں کی آویزش سے بیزار ہے۔ دُنیا کے کانٹوں سے اپنا دامن بچانا اور چھڑانا چاہتی ہے۔

بیشک اے ندی! تیری ہی طرح یہ بھی اپنی منزل پر پہنچکر سکون و راحت کے میٹھے خواب سے ہم آغوش ہوگی۔ پھر اسے کسی سفر کا سامنا نہ ہوگا۔ کسی منزل کی تلاش نہ ہوگی۔ اے پیاری ندی! آ!! ہم دونوں دوش بدوش سفر کریں۔ ہم دونوں ایک ہی منزل کے متلاشی ہیں

(جدید اردو)

(بقیہ صفحہ ۹۰)

جانے نہیں دینگے ۔ یہ کسقدر نافہمی ہے! زمین، گنگا کو اپنے سینے سے لپٹا کر رکھنا چاہتی ہے۔ آسمان، گائے کے بچھڑے جیسے سفید بادل اپنی آنکھ کا تارا بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ جانے نہیں دینگے! جانے نہیں دینگے۔ تاہم جانے دینا پڑتا ہے۔ لوگ پھر بھی چلے ہی جاتے ہیں۔

میں مسافر ہوں۔ مجھے کوئی بھی نہیں روک سکے گا! یہ راحت و غم، یہ گھر اور باہر، یگانے اور بیگانے یہ سب زنجیریں ہیں۔ جو ٹوٹ جائینگی میں مسافر ہوں۔ مجھے کون روک سکتا ہے!

جب مہاراج آئیں ۔ تو مکان کے دروازے کھول دینا۔ گھبرانا مت۔ جو کچھ بھی میسر ہو سکے

... ہی سے ان کا استقبال کرنا! اور کہنا کہ جس کے تمام عمر انتظار میں

ملک الشعراء ٹیگور اور انکی شاعری

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آج سے اسی سال تین ماہ پہلے ۶ رمئی ۱۸۶۱ء کو قدرت کا ایک سادہ بچہ اس عالم آب و گل میں آیا جس کا نام رابندر ناتھ رکھا گیا۔ جس نے جوان ہو کر ترانہ ہائے محبت گائے اور حسن کی بارش کی اور اس طرح اپنے فرائض با حسن وجوہ ادا کئے اور پھر وہ ۷ اگست ۱۹۴۱ء کو روز روشن کی دوپہر میں ۱۲ بجکر ۱۳ منٹ پر مسکراتا ہوا ہمیشہ کے واسطے خاموش ہو گیا۔ جسکی یاد میں آج مشرق و مغرب مضطرب ہیں۔

ٹیگور نے پہلی نظم چودہ سال کی عمر میں کہی اور پندرہ سال کی عمر میں انکی نظمیں بنگالی زبان میں شائع ہوئیں۔ پھر اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے ہی سات ہزار اشعار کہہ ڈالے۔ نثر میں بھی بہت کچھ لکھا مختصر افسانے، ناول، ڈرامے، اور گیت بھی کچھ کم نہیں لکھے اس بلبل کے نغموں سے تمام عالم گونج اٹھا شاعر نے ادبی تنقیدیں بھی لکھیں مگر گیتانجلی کے انگریزی ایڈیشن نے یورپ کو ان کی بلند پایہ شاعری کا معترف کیا۔ چنانچہ انہیں ۱۹۱۳ء میں نوبل پرائز سوا لاکھ کا علمی انعام دیا گیا۔

ٹیگور صرف شاعر ہی نہ تھے۔ بلکہ افسانہ نگار، ڈراما نویس، مصور، مفکر اور مادر ہند کے عقیدت مند پجاری بھی تھے۔ وہ مشرق و مغربی تہذیب کا عطر مجموعہ تھے۔ انہوں نے مغربی علوم و فنون حاصل ضرور کئے مگر اپنی تہذیب کو نظر انداز نہیں کر دیا۔ بلکہ ہندوستانی کلچر کو اپنایا۔ اور اس کا سکہ دنیا پر بٹھایا بلکہ اپنے کارناموں سے مادر وطن کو عالمگیر شہرت کی نذر دی۔

انہوں نے اپنے گیتوں اور اپنی آواز سے رواداری، آزادی، حسن اور عالمگیر برادری کی روح دنیا میں پھیلائی۔

دنیا کے ہر بڑے آدمی اُن کی موت پر آنسو بہا

آگے صفحہ ۹۷

بڑا پیٹ موت

LIFO

اگر آپ کو ۳۰-۴۰ سال کی درمیانی عمر یا اس سے تجاوز ہو جانے پر پیٹ کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔ تو اسے معمولی بات سمجھکر نظر انداز نہ کیجئے۔ یہ منحوس علامت پیشخیمہ ہے موت کا۔ دنیا میں جتنے بڑے آدمی حرکت قلب کے رکنے سے چل بسے ہیں ان میں سے ۹۰ فیصدی لوگوں کو ضرور بڑھے ہوئے پیٹ کا عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ آپ پوچھیں گے۔ آخر اچھے بھلے کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے آدمیوں کے پیٹ بڑھ کیوں جاتے ہیں؟ دفتروں میں بابوگیری کرنے یا دوکانوں پر سارا سارا دن جم کر بیٹھے رہنے سے غذا اچھی طرح ہضم نہیں ہوتی۔ اور فضلات کا اخراج ٹھیک طور پر نہ ہونے سے صاف اور صالح خون کے بدلے بلغم زیادہ مقدار میں پیدا ہونے لگتا ہے بلغم کا انجماد ہوتے رہنے سے ہی انسان سست الوجود ہو کر رفتہ رفتہ پیٹ کا روگی بنجاتا ہے توند نکل آتی ہے بڑھے ہوئے پیٹ کو صحیح حالت پر لانے کیلئے "لائفو" ایک بہترین دوا تسلیم کی گئی ہے۔ جسکے چند روزہ استعمال سے فضلات فاسدہ کا پیشاب پاخانہ اور پسینہ کے ذریعہ اخراج ہو کر پیٹ اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ لائفو کی چند ٹکیاں اعضائے انہضام کو صحیح حالت میں لے آتی ہے۔

دیکھتے دیکھتے بھوک چمک اٹھتی ہے۔ کھایا پیا جزو بدن ہو کر خون خالص خون بہت کے ساتھ شریانوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ یہ کوئی اشتہاری مبالغہ نہیں جن لوگوں نے لائفو کا استعمال کیا ہے۔ وہ اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر اس کے استعمال کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے دوا فروش اسے بیچتے ہیں۔

ہندوستان برما اور سیلون کے واحد ایجنٹ

ویسٹرن میڈیسن کمپنی نسبت روڈ لاہور

ٹیگور کی شاعری

گیتانجلی کے نغموں سے مغرب بھی سرشار ہوگیا۔ نہ صرف انگریزی زبان میں بلکہ دنیا کی قریب قریب ہر ایک زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اردو میں بھی ہوا مشہور انگریز ادیب اور شاعر نے گیتانجلی کے دیباچہ میں لکھا کہ

ٹیگور نے ہندوستانی تہذیب کی طرح روح کو معلوم کرنے اور خود کو روح کی ترنگوں کیلئے وقف کردینے پر اکتفا کیا ہے۔

ٹیگور کی شاعری سے امیر و غریب سب لطف اندوز ہوئے۔ وہ کل اہل عالم سے خطاب کرتے ہیں اور عالمگیر برادری کی دعوت سب کو دیتے ہیں اور یہی ان کا پیغام ہے۔

ٹیگور نے اپنے ادبیات، اور فلسفیانہ تحریروں سے ہندوستان کا سر بلند کیا۔ اہل ہند میں روح قومیت پھونکی۔ وہ شاعر اعظم۔ نقاش فطرت، اور سیاستدان تھے انہوں نے اپنی نظموں، ڈراموں اور خطوں میں رنگ و اور انبار نامز لٹائن حسن کی بارش کی۔ ہمیں نے دنیا کے بیش بہا خیالات و جدید تر ترقیات اختیار کیں۔ اور دنیا کی ملجھی کو ہیرا اٹھایا۔ ان کی شاعری اپنی مثال آپ ہے ان کے ایک ایک لفظ میں نیا پیغام ہے نیا رس اور ان کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جسکی تصویر ٹیگور کی شاعری میں نہ ہو۔ ان کی شاعری جذبات کی حسین تصویر ہے۔ ان کی شاعری میں ان گنت پھول کھل رہے ہیں۔ اور لوگوں کی قسمتوں کی سنہری امیدیں۔ گو پیغام ہر جگہ ہے گو یا وہ اپنی زندگی کا مشن سمجھ کر اب انکی شاعری کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

اے مادر وطن۔ میری ہر بیماری، راحت ہے تکلیف، ذلت ہو یا عزت، اے مادر ہر حالت میں تمہاری آغوش ہی میں جنم لونگا ہاں ہمیں بار بار جنم لونگا۔

خدا کہاں ہے؟ تم بھجن الاپنے چھوڑدو۔ یہ نغمہ ریزیاں بند کرو تسبیح کے دانوں کی گردش بند کرو۔ یہ تم مندر کے دروازے بند کئے اور گوشے میں بیٹھے کس کی پرستش کر رہے ہو! اپنی آنکھ کے دروازے کھولو اور دیکھو خدا تمہارے سامنے بھی اس کی یاد عیاں کے سختی سے باہر نکلو پھول اور دھوپ پرے پھینک دو۔ اگر تمہارا لباس پھٹ جائے یا میلا کچیلا ہو تو کیا مضائقہ! اٹھو اور وہ جو محنت کرتا ہے اور اس کی پیشانی پسینے سے تر ہے اسکے پاس کھڑے ہو۔ وہ دیکھو جہاں دہقان سخت زمین پر ہل جوت رہا ہے جہاں مزدور پتھر توڑ رہا ہے خدا انہیں میں ہے، وہ دھوپ میں بارش میں دہقان کے پاس کھڑا ہے اور اسکا لباس گرد آلود ہے

مست قلندر ہندوستان بھر کے اردو رسائل سے زیادہ چھپتا ہے مشتہرین کو حق حاصل ہے کہ اس دعویٰ کی تصدیق کرنیکے بعد اپنے اشتہار شائع کرائیں

ہندو کی ایک آنکھ مسلمان دوسری

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

رجسٹری نمبر ۲۵۸۵

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند | بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہا ست | خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

مست قلندر (لاہور)

جلد ۲۶ — نمبر ۲

نومبر سنہ ۱۹۴۱ء

اردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیر الاشاعت ماہوار رسالہ

اُن زندہ دل انسانوں کیلئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کیا ہے ہمیشہ خوش رہنے اور دوسروں کو خوش کرنے میں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے قول یا فعل سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے جنکا مذہب ہے خدا کے ہر ایک بندے سے بلا امتیاز رنگ و قومیت محبت کرنا *

قیمت فی پرچہ چار آنے

ایڈیٹر: ڈاکٹر پرتھی سنگھ

سالانہ چندہ تین روپیہ

طبّی جواہر پارے — بے بدل رنگین افسانے — **فہرست مضامین نومبر ۱۹۴۱ء** — دلگداز آپ بیتیاں — ہنگامہ خیز نظمیں

نگاہِ اولیں

اکتوبر کا مست قلندر شائع نہ ہو سکا۔ آپ پوچھینگے کیوں؟ اسلئے کہ مارکیٹ میں کاغذ والوں نے اندھیر گردی مچا رکھی ہے۔ کاغذ فروش؟ ہاں، یہ دولت کے پجاری اور حرص و آز کے بندے۔ ہر جائز و ناجائز طریقہ کو بروئے کار لا کر غریب اخبار والوں کو دن دہاڑے لوٹ رہے ہیں۔ یورپ میں لڑائی کیا چھڑی؟ ان لوگوں کی چاندی بن آئی۔ امریکہ اور کینیڈا سے کاغذ برابر چلا آ رہا ہے۔ ہندوستانی ملیں بھی کاغذ کی تیاری میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ اور شبانہ روز کام کر کے ضرورت سے زیادہ نہیں تو ضرورت کے مطابق کاغذ تیار کر رہی ہیں غرضیکہ مارکیٹ میں کاغذ کی کمی نہیں۔ اور اگر آپ کسی کاغذی کے یہاں جائیں گے تو وہاں آپ کو گوداموں کے گودام۔ ہر نمونہ اور ہر سائز کے کاغذوں (Reams) سے اٹے ہوئے دکھائی دینگے لیکن اس کا کیا علاج؟ کہ کاغذ کے سوداگر مال بیچنے سے انکاری ہیں۔ اور اسٹاک برابر بڑھائے جا رہے ہیں۔ گاہک چاہے کوئی ہو۔ اُن کا یہ ٹکا سا جواب کہ "مال نہیں ہے" غریب خریدار کے سینکڑوں ارمانوں اور ہزار امیدوں پر بجلیاں گرا دینے کیلئے کافی ہوتا ہے۔

اگر کبھی کبھار کسی گاہک کی منت سماجت پر دل پسیج گیا اور اسے دو ایک ریم کاغذ سپلائی کرنا ہی پڑے تو اس سے من مانی قیمت وصول کر لی۔ مہذب ڈکیتی کی اس سے نمایاں مثال اور کیا ہوگی! ایک ہی بازار میں دو، دو اور تین تین نرخ بیک وقت چل رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ جہاں ایک ایماندار ڈیڑھ ساڑھے پانچ آنے فی پونڈ کے حساب سے کاغذ بیچ رہا ہے۔ وہاں دوسرا اس کی بغل میں بیٹھا ہوا بھلا مانس ساڑھے دس آنے فی پونڈ سے ایک کوڑی کم لینے کو تیار نہیں۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ ان مانی قیمت لے کر بھی ضرورت کے مطابق کاغذ سپلائی کرنے کی گارنٹی نہیں کی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ ۵ ریم دے جائیے ——— ایک لحظہ کیلئے ان ہر دو تاجروں کی حالت پر غور کیجئے۔ نفع دونوں کما رہے ہیں۔ مگر اول الذکر خریدار کا دل مٹھی میں لے کر اُسے ہمیشہ کیلئے اپنا گاہک بنا رہا ہے اور مؤخر الذکر ایک مرتبہ گاہک کا خون چوس کر اپنی تجارت کی جڑوں پر گویا کلہاڑا چلا رہا ہے ——— ہاں تو اکتوبر کا مست قلندر کاغذ نہ ملنے کے باعث شائع نہ ہو سکا۔ حالانکہ کاپیاں ٹھیک وقت پر پریس میں چلی گئی تھیں۔ آپ جانتے۔ دو سو ریم یعنی ۴ سے ۵ ٹن کاغذ کی ضرورت مست قلندر کیلئے ہر ماہ در پیش ہوتی ہے اور اکتوبر میں کاغذ کی یہ مقدار ہمیں ہزار کوشش اور دوڑ دھوپ کے باوجود بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ اسلئے پرچہ بھی نہ چھپ سکا۔ آخر میسرز جے۔ این سنگھ اینڈ کمپنی لاہور برانچ کے روح رواں اور ہمارے محترم دوست مسٹر شمشیر سنگھ صاحب کی بروقت امداد ہمارے آڑے آئی اور اکتوبر و نومبر کا مست قلندر یکجائی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آیندہ کیلئے بھی صاحب موصوف نے ہمیں کاغذ کی فکر سے بے نیاز کر دینے کا یقین دلایا ہے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ میسرز جے۔ این سنگھ اینڈ کمپنی لاہور والے اب بھی بالکل واجبی نرخوں پر اپنے گاہکوں کو کاغذ سپلائی کر رہے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ لاہور کے تمام اخبار نویس اس دیانتدار فرم کی سرپرستی کریں۔ نیز پنجاب پریس کو متفقہ طور پر اُن لالچی اور کوتاہ اندیش تاجران کاغذ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی چاہئے جن کے ہاتھوں پریس اور پبلک نالاں ہیں ——— گورنمنٹ سے بھی ہماری پُرزور درخواست ہے کہ کاغذ کے نرخ مقرر کر کے اُن لوگوں کو کاغذ اسٹاک کرنے سے روک دیا جائے۔

اکتوبر میں پرچہ شائع نہ ہونے کی تلافی

اس طرح کی جا رہی ہے کہ مستقبل قریب میں ہم اپنے مہربانوں کو ایک کے بجائے دو خاص نمبر دینے کا وعدہ کرتے ہیں جن میں سے کسی نمبر کی قیمت ۸ سے کم نہ ہوگی۔ مگر مستقل خریداروں کو حسب معمول مفت سپلائی کئے جائینگے۔ اس سلسلہ میں پہلا خاص نمبر ہوگا۔

افسانہ نمبر جو دسمبر ۱۹۴۲ء کے پہلے ہفتہ میں

شائع کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے لیکن اس کی تیاری گذشتہ ماہ اکتوبر سے جاری ہے اور ہندوستان بھر کے

مست قلندر لاہور کا افسانہ نمبر ۱۹۴۱ء

دسمبر کے پہلے ہفتہ میں نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہونے والا ہے۔ اس کیلئے ہندوستان کے چوٹی کے اہل قلم حضرات کے بہترین افسانے حاصل کئے جا رہے ہیں۔ روپیہ پانی کی طرح خرچ ہو رہا ہے ——— افسانے کیا ہونگے؟ ——— ہماری روزمرہ کی زندگی کے مختلف مناظر کی منہ بولتی تصویریں ہونگی۔ آپ انہیں دیکھینگے اور فریب جلوہ میں گم ہو کر رہ جائینگے۔ آپ اُن سے باتیں کرینگے۔ گویا کہ وہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں اور بھول جائیں گے اپنے آپ کو، دنیا و مافیہا کو کچھ عرصہ کیلئے۔ تفکرات اور حوادثاتِ زندگی آپکے لوحِ دل سے یکسر محو ہو جائیں گے۔ بقول شاعر ؎

هم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی ——— کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اگر آپ کو افسانے پڑھنے کا شوق ہے

افسانے۔ سوز و گداز، حسن و عشق اور کیف و نشاط کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے۔ افسانے، جن کے ایک ایک فقرہ میں آنسوؤں کی بارش اور قہقہوں کی گرج پنہاں ہوگی۔ افسانے، جن کے مطالعہ سے زندگی کی بے ثباتی اور دنیا کی خود پرستی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے دوڑ جائیگا۔ اگر آپ **آپ بیتیاں** سننا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی بے کمال مگر سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کی زبان سے جو تیر و نشتر بنکر آپ کے کلیجہ کو چھلنی کر دینگی۔ اگر آپ کو **اقرار نامے** پڑھنے کا خبط ہے بیوفا، مکار اور گنہگار مردوں کے، جنہیں پڑھ کر آپ پھڑک اُٹھینگے۔ دنیا سے ایکدم آپکو نفرت ہو جائیگی۔ اور اپنے ہی ہمجنسوں کے سیاہ کارنامے دیکھکر آپکا سر ندامت سے جھک جائیگا ——— ہاں اگر آپ یہ سب کچھ پڑھنا چاہتے ہیں۔ تو مست قلندر کے افسانہ نمبر کو حاصل کرنے کا انتظام ابھی سے کر لیجئے۔

مشتہرین کو بھی واجب ہے کہ اپنے اشتہارات کیلئے فوراً جگہ ریزرو کرالیں ورنہ بعد میں مایوسی ہوگی کیونکہ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔ (نوٹ) مست قلندر کا حجم دوچند اور قیمت ۸/ فی کاپی ہوگی۔

منیجر مست قلندر۔ لاہور

(نگاہِ اولیں (بقیہ صفحہ ۳)

بہترین لکھنے والوں کو اس میں شمولیت کی دعوت فرداً فرداً دی جا چکی ہے۔ اِسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کا کہ افسانہ نمبر کیسا ہوگا؟

یکصد روپیہ نقد کے انعامات

دسمبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہونیوالے افسانہ نمبر اور جنوری ۱۹۴۲ء کے سالنامہ مست قلندر میں لکھنے والوں کیلئے یکصد روپیہ نقد کے انعامات بہ تفصیل ذیل تقسیم کئے جائیں گے۔

دو عدد بہترین افسانوں کیلئے .... پچاس ۵۰ روپے نقد

دو عدد بہترین منظوم افسانوں کیلئے .... تیس ۳۰ روپے نقد

دو عدد بہترین نظموں کے لئے .... بیس ۲۰ روپے نقد

کل ۶ انعامات .... یکصد روپیہ

انعام لینے والے حضرات

افسانہ نمبر کے انعامات حاصل کرنے والے حضرات کی انعامی رقوم ۱۰ جنوری ۱۹۴۲ء تک ان کے پاس پہنچ جائینگی۔ اور سالنامہ کے انعامات کی تقسیم دس فروری ۱۹۴۲ء تک ہو جائے گی۔ ناپسند مضامین اور افسانے ۵ پیسے کے ٹکٹ بھیجکر واپس منگوائے جا سکتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

رسالہ مست قلندر لاہور
جلد ۲۶ — نمبر ۲
ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء

راتیں!

خاص برائے مست قلندر

از جناب شکیل بدایونی علیگ

موسم خوشگوار کی راتیں
آگئیں پھر بہار کی راتیں

کیف کی صبح انبساط کی شام
حسن کے دن نکھار کی راتیں

آہ یہ فصل گل، یہ رعنائی
اور یہ انتظار کی راتیں

میرے دل سے نہ پوچھئے کیا ہیں
بزم ناسازگار کی راتیں

کالی کالی مہیب و وحشتناک
جیسے اک سوگوار کی راتیں

دیکھتی ہیں گھٹائیں ساون کی
دیدۂ اشکبار کی راتیں

بجلیاں بھی ہیں دیکھ کر لرزاں
اُف دلِ بے قرار کی راتیں

آہ ایسے میں یاد آتی ہیں!!
وہ سکون و قرار کی راتیں

وہ حیات آفریں، نظر افروز
جلوۂ حسنِ یار کی راتیں

وہ مسرت وہ انبساط کے دن
وہ محبت، وہ پیار کی راتیں

نغمہ ریز و معطر و مخمور
جیسے اک بادہ خوار کی راتیں

گہرا گہرا وہ رنگ چشم سیاہ
ہلکے ہلکے خمار کی راتیں

اوج ناز و نیاز کا عالم
عظمت و اقتدار کی راتیں

ہائے وہ حسن و عشق کی چھیڑیں
اُف وہ قول و قرار کی راتیں

روٹھنا پھر وہ خود ہی من جانا
نخوت و انکسار کی راتیں

باہمی وہ نباہ کے وعدے
وعدہ و اعتبار کی راتیں

دائمی کیف و حسن کے لمحے
جاودانی بہار کی راتیں

گذری جاتی تھیں آنکھوں آنکھوں میں
جیسے شب زندہ دار کی راتیں

اب وہ ہنگامۂ نشاط کہاں
مٹ گئیں افتخار کی راتیں

ہوگئیں اختیار سے باہر
قبضہ و اختیار کی راتیں

یاد ایام زیست لے کے شکیل
آگئیں پھر بہار کی راتیں

مستی و قلندری

مست قلندر کے مشہور مزاح نگار مرزا جی غلول بک کے قلم سے

ایک پرچے میں ایک دیوی جی نے لکھا ہے کہ ساری کیسی ہونی چاہئے؟ گذارش ہے کہ ساری کھدر کی بھی ہو سکتی ہے اور جالیدار بھی لیکن مغرب پرستی اور فیشن طرازی کے شوق نے ایک اور سوال بھی تو پیدا کر دیا ہے وہ کہ ساری ہونی چاہئے یا پتلون؟

اس سوال پر قارئین مستی و قلندری ذرا گھبرا جائینگے کہ ساری کے مقابلہ میں سایہ کا سوال تو پیدا ہوتا ہے لیکن پتلون کے سوال کے کیا معنی؟ مگر اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مغربی خواتین میں مرد بننے کا شوق موجودہ جنگ کی طرح روز بروز وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بہرحال ساری کے مقابلہ میں پتلون کا سوال وقت کا ایک اہم سوال ہے جسے آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں پیش ہو کر طے ہو جانا بہت ضروری ہے۔

~~~~~~~~

ایک اخبار میں ایک اطلاع شائع ہوئی ہے کہ پچاس سال کا ایک مرد پندرہ سال کی ایک دوشیزہ سے شادی کرنی چاہتا ہے جس میں کچھ لوگ مخل ہو رہے ہیں۔

مدیر مستی و قلندری کی رائے میں یہ لوگوں کی کھلی ہوئی زیادتی ہے۔ اسے صاحب حکومت بھی پچپن سال میں مردوں کو پنشن کے قابل سمجھتی ہے پھر ابھی پانچ سال پہلے ہی عرب کی شادی میں کیوں اڑنگے لگائے جا رہے ہیں!

~~~~~~~~

ایک صاحب اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ترقی پسند عورتوں کا مردوں پر سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ مرد اوباش اور بیباک ہوتے ہیں۔ راستے چلتے نوجوان لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں۔ کیا یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ مغربی ماحول میں پلی ہوئی لڑکیاں نوجوانوں کو نہیں چھیڑتیں؟"

اب ہیں کوئی لیڈی صاحب یا مس صاحب اس سوال کا جواب۔

~~~~~~~~

یہی مہاشے آگے چلکر رقمطراز ہیں۔

"آجکل کی تعلیمیافتہ عورتیں اعلیٰ درجے کی ڈگریاں لیکر نکلتی ہیں تو سب سے پروفیسر ڈاکٹر یا کسی کلب کی ممبر بنتی ہیں۔ اسلئے کہ اب ان کا حلقہ گھر کی چہار دیواری تک محدود نہیں ہوتا گھر کے باہر تک وسعت پذیر ہو جاتا ہے پھر جب وہ اس سے بھی آگے بڑھتی ہیں تو ریڈیو سنگر، سٹیج ڈانسر بنتی یا کسی فلم کمپنی میں داخل ہو جاتی ہیں محض اس لئے کہ اب وہ آزاد ہیں اور خود کو مردوں سے کسی بات میں کم نہیں سمجھتیں...... وہ اپنی عارضی شہرت کیلئے سٹیج پر ناچنے میں پس و پیش نہیں کرتیں۔"

ارے اب چپ بھی رہوگے مہاشے جی، اس روشن خیالی کے زمانے میں "ترقی نسواں" کے "روشن خیال" حامی سن لینگے تو تمہیں کتنا رجعت پسند اور گنوار بتائینگے۔

~~~~~~~~

یہی صاحب لکھتے ہیں۔

"کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات کسی وجہ سے مرد اور عورت میں ناجائز تعلق ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اپنے پاپ کو چھپانے کیلئے عورت اس بچے کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ یا بڑی بیرحمی سے کسی ندی نالے میں پھینک دیتی ہے۔"

یار مہاشے جی تم تو بری طرح بیچاریوں کے پیچھے پڑ گئے۔ پاپ کو چھپاتی نہیں تو کیا اچھالتی پھرتیں؟

~~~~~~~~

ایک دیوی جی فرماتی ہیں۔

"ایک روز میں تھیٹر گئی تھی۔ کھیل شروع ہونے کے ساتھ ہی میں نے دیکھا سامنے والے بکس میں جالیدار پردہ لگ رہا ہے تھوڑی دیر میں ہال میں چھم چھم کی آواز اور بچوں کی چیخ پکار سے میرا خیال پردے کی جانب منعطف ہو گیا۔ میں نے دیکھا پانچ چھ عورتیں اور دو تین بچے آکر اس کٹہرے میں بیٹھ گئے۔ جیسے ہی کھیل کا پہلا ڈراپ گرا۔ ہال میں روشنی ہوئی۔ میری نظر اس طرف اٹھ گئی، پردہ لگا ہوا تھا پھر بھی عورتوں نے چادر سے اپنے چہروں کو چھپا رکھا تھا میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھی کہ جب انہوں نے اپنی آنکھوں پر اس طرح دفعہ بہا لگا رکھا ہے تو یہ تماشہ کیسے دیکھینگی۔ آخر پردے میں بند عورتوں نے آہستہ آہستہ چہرے کا پردہ ڈھیلا کیا اور ایک آنکھ سے تماشا دیکھنے لگیں۔ سارا چہرہ پردے سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرف دو انگلیوں سے کسی طرح ایک آنکھ کھول کر تماشہ دیکھ رہی تھیں
~~~~~~~~

اسٹیج پر غیر مہذب مکالمہ اور اچھل کود ہو رہی تھی۔ اسے دیکھنے کیلئے تو باحیا اور شریف بہو بیٹیاں آئی تھیں بیگم کے مردوں کی بجائے ان کے ساتھ دو ایک بچے اور دربان تھے۔ میرا اس منظر کو دیکھ کر قلبی اذیت سے کراہ اٹھی۔ بیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی عورتیں اس قدر مجبور ہیں کہ آرام سے سانس لینے اور تفریح کرنے کا بھی حق حاصل نہیں۔"

دیکھا آپ نے دیوی جی کے دیوانہ جذبات کو، ان کا دل اس پر نہیں دکھا کہ مہذب اور شریف گھروں کی عورتیں شرمناک سین دیکھنے اور شرمناک مکالمے سننے آتی ہیں۔ ان کو اذیت ہوئی تو ان عورتوں کے پردے سے، کہئے آزادیٔ نسواں زندہ باد!

اور ملاحظہ فرمائیے یہی دیوی جی اپنی نسبت کیا فرماتی ہیں۔

"میں بھی تھیٹر جاتی ہوں۔ باکس میں تہذیب کے ساتھ بیٹھتی ہوں۔ آنکھوں میں شرم اور ماتھے پر کپڑا ہوتا ہے اور ہزاروں مردوں کے بیچ میں بیٹھی تماشے کا لطف اٹھاتی ہوں اور میری بغل میں دربان یا نیم کی بجائے خود میرے پتی دیو ہوتے ہیں۔"

دیوی جی پتی دیو کے پہلو میں بیٹھکر تماشے کا لطف اٹھاتی ہیں۔ لیکن وہ تماشا کون سا ہوتا ہے وہی تو جس کی نسبت وہ خود اوپر فرما چکی ہیں کہ ان کا مکالمہ شرمناک اور غیر مہذب ہوتا ہے۔ یہ دیوی جی کی کتنی اعلے درجے کی تہذیب اور کس درجے کی حیاداری ہے۔

امریکہ اور یورپ مہذب ممالک ہیں مستی و قلندری کے ضمن میں ان مہذب ملکوں کے مہذب احوال و کوائف آپ ملاحظہ فرماتے ہی رہتے ہیں۔ وہاں کی روشن خیال اور مہذب عورتیں کیسی کیسی باتوں پر مردوں کو طلاق دیتی یا طلاق لیتی رہتی ہیں۔ اس قسم کے واقعات بھی آپکے ملاحظہ میں آتے رہتے ہیں۔ آج کی صحبت میں بھی کچھ ملاحظہ فرمائیے۔

ایک میم صاحبہ نے اپنے صاحب کے سامنے بڑے پیار اور شوق سے شراب کا پیالہ پیش کیا، لیکن صاحب نے میم صاحبہ کے جذبہ محبت کی قدردانی کا اس طرح ثبوت دیا کہ شراب کا پیالہ اٹھا کر میم صاحبہ پہ پھینک مارا میم صاحبہ بھلا صاحب کے اس ہتک آمیز سلوک کو کیونکر برداشت کر سکتی تھیں۔ انہوں نے فوراً عدالت میں درخواست دیدی کہ مجھے اس نامعقول شخص کی زوجیت سے نجات دلادی جائے۔

صاحب بہادر نے عدالت میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں ایک ایسی جگہ نوکر ہوں جہاں مجھے تمام دن شراب کی ذائقہ چشی کرنی پڑتی ہے۔ اسلئے میں تو یوں ہی شراب سے متنفر رہتا ہوں۔ میری بیوی اسے اچھی طرح جانتی ہے۔ پھر بھی اس نے شراب کا پیالہ لاکر میرے سامنے رکھدیا۔

مدیر مستی و قلندری کو پتہ نہیں کہ عدالت نے کیا فیصلہ کیا لیکن اتنا تو قارئین مستی و قلندری بھی تسلیم کرینگے کہ بیوی شوہر کے درمیان میں اس واقعے سے بڑھ کر تفریق کیلئے وجہ جواز اور کیا ہو سکتی ہے۔

یورپین عورتوں کو اپنے شوہروں سے کتنی محبت ہوتی ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

ایک صاحب بہادر بیمار تھے جن کی بیماری ذرا نازک صورت اختیار کر گئی۔ میم صاحبہ بازار جاکر ایک عمدہ سا کفن خرید لائیں اور صاحب بہادر کو دکھا کر بولیں۔ "میں تمہارے لئے یہ کفن خرید لائی ہوں دیکھو تو کتنا عمدہ ہے۔"

میم صاحبہ کی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے صاحب بہادر موت کے منہ میں جاکر واپس نکل آئے اور بیوی کو ستم ظریفی پر اسے طلاق دیدی۔

کتنا ناقدرا شخص تھا کہ ایسی لائق اور منتظم بیوی کو طلاق دیدی جس نے مرنے سے پہلے اس کے کفن کا بندوبست کر دیا تھا۔

ایک صاحب بہادر کو ہنسنے کا روگ تھا۔ ان کی ازدواجی زندگی کیلئے ان کا ہنسنا ہی موت کا باعث ہو گیا۔ صاحب بہادر کا حال یہ تھا کہ میم صاحبہ لاکھ ڈھنگ سے بال سنوارے لیکن صاحب بہادر بالوں کو دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہتے تھے۔ میم صاحبہ جیسے کپڑے خرید کر لائیں لیکن صاحب بہادر کپڑوں کو دیکھ کر بغیر ہنسے نہیں رہ سکتے تھے میم صاحبہ کیسی ہی چیزیں پکائیں صاحب بہادر کی ہنسی رک نہیں سکتی تھی۔ ایکبار میم صاحبہ نے اپنے ہاتھ سے بسکٹ تیار کرائے جن کو دیکھ کر صاحب اتنے ہنسے کہ آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

آخر میم صاحبہ نے صاحب بہادر کی اس ناشائستگی کے خلاف عدالت میں قطع طلاق کی درخواست دیدی۔

طلاق کی چند عرضیوں کے خلاصے ملاحظہ ہوں۔

"میرا شوہر رات کو سونے سے پہلے اٹھارہ بیس چلم سے کم تمباکو نہیں پیتا اور میں کھڑکی کھولنا چاہتی ہوں کہ کمرے سے دھواں نکل جائے تو کھڑکی نہیں کھولنے دیتا۔"

"میرا شوہر فوج میں ملازم تھا۔ اُسے بگل بجانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ وہ روزانہ صبح اُٹھ کر بگل بجاتا ہے۔ میں اس کی اس عادت سے پریشان ہو گئی ہوں۔"

"میرا شوہر کھانے کی میز پر چار سال ہو گئے مجھ سے بات نہیں کرتا۔ آج عرضی دینے سے پہلے بھی اس نے ناشتے پر مجھ سے بات نہیں کی۔"

"میرا شوہر میرا سر پکڑ کر نہانے کے ٹب میں غوطے دیتا ہے۔"

"میرا شوہر اکثر خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس کی اس حرکت سے تنگ آ گئی ہوں۔"

"میرے شوہر نے مجھے ایسی کتاب تحفے میں دی جس کا نام ہے خودکشی کے ۲۰۱ طریقے۔"

اس سلسلہ کی آخری کڑی ملاحظہ فرمائیے۔

فن لینڈ کے ایک ایسے جوڑے نے ایک دوسرے کو طلاق دی جس میں سے مرد کی عمر ۸۷ سال اور عورت کی عمر ۸۵ سال تھی۔ جج نے پوچھا تمہاری شادی کب ہوئی؟ جواب ملا۔ ۷ ستمبر ۱۸۷۳ء کو، پھر سوال ہوا، تم میں کشیدگی کا آغاز کب ہوا؟ جواب دیا گیا۔ ۷ ستمبر ۱۸۷۳ء کو، یعنی شادی کے روز سے۔

ایک اور شاعرانہ مستی و قلندری ملاحظہ فرمائیے۔ شاید آپ کو معلوم ہو، "بہن" کے نام سے ایک فلم بنی ہے۔ اس فلم کے ڈائرکٹر مسٹر محبوب ہیں۔ کامل رشید میوی صاحب مسٹر محبوب کو منظوم پیغام دیتے ہیں ؎

اے مرے محبوب اے فلمی جہاں کے آفتاب
"لیلیٰ تخئیل" تیری ہے سہا سے ہمکنار
جانتے ہیں خوب یہ اچھی طرح اہلِ نظر
تیری "عورت" "فلم سہ عالمیں" کی تھی شاہکار
اس سے بھی زیادہ مگر تیری "بہن" ہے کامیاب
"ہے دعا تجھکو ترقی اور دے پروردگار"

ملاحظہ فرمائیے اس مستی و قلندری کو "بہن" کی داد کس پیرائے میں دی گئی ہے؟

اور سنئے ایک فلمی اخبار راوی ہے کہ بمبئی میں کسی رومانی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی ہیروئن کو دیکھ کر ہیرو پر کچھ ایسی رومانی کیفیت طاری ہوئی کہ اس نے ڈائرکٹر کے حکم کا انتظار کئے بغیر ہیروئن کے ساتھ بوسہ بازی کا پارٹ شروع کر دیا۔ ہیروئن نے اس کی رومان پسندی کی داد اس طرح دی کہ اس کے گال پر ایک چٹخنے دار ہاتھ رسید کر دیا۔

ہندوستان میں عموماً یہ مسئلہ زیر بحث رہتا ہے کہ شریف خاندان کی عورتوں کو نگار خانے میں داخل ہونا چاہئیے یا نہیں؟ اس واقعہ کے بعد تو غالباً کسی کو اختلاف باقی نہ رہے گا اور ہر شخص کہے گا ضرور داخل ہونا چاہئیے۔ شاید زیادہ سے زیادہ اس قدر لحاظ رکھنے کی ضرورت محسوس ہو کہ جو عورت داخل ہو وہ شادی شدہ یا کم از کم بچے دار نہ ہو۔

ہالی وڈ کے حسن سازوں نے ایک جدید لپ سٹک تیار کیا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اگر وہ ہونٹوں پر لگا ہو تو بوسہ لینے سے چھوٹتا نہیں۔ ہالی وڈ کی ایکٹریس اس کا تجربہ کر رہی ہیں۔ وہ اس طرح کہ لپسٹک لگا کر مفت بوسے دیتی پھرتی ہیں تاکہ انہیں پتہ چل جائے کہ لپسٹک کی جو تعریف کی جاتی ہے وہ حقیقتاً کس قدر درست ہے۔

اگر ہندوستانی ایکٹرسوں میں بھی اس طرح کے کسی لپسٹک کے تجربے کا خیال پیدا ہو جاتا تو ہمارے بہت سے ان بدنصیب نوجوانوں کی نوجوانی مشغل ہو جاتی جو ایکٹرسوں کے ایک نظر دیکھنے کیلئے اسٹوڈیو کا طواف کرتے

سحرِ نغمہ!

(۱)

چاندنی رات تھی مخمور تھا سارا عالم
گوہر افشاں تھی بصد ناز فلک سے شبنم
حسن فطرت تھا تمہارے لئے مائل بہ کرم
چاندنی رات کی تاروں کی قسم
— مست و مدہوش بنایا تھا مجھے
— تم نے اک گیت سنایا تھا مجھے

(۲)

عشق کے ناز اٹھائے ہیں تمہارے ہی لئے
غم کے آثار چھپائے ہیں تمہارے ہی لئے
اشک راتوں کو بہائے ہیں تمہارے ہی لئے
صبح فرقت کی نظاروں کی قسم
— نارِ پیہم سے مٹایا تھا مجھے
— تم نے اک گیت سنایا تھا مجھے

(۳)

ایک مستی تھی نگاہوں میں کہ پیغام شباب
تم نے جب اُٹھایا تھا اپنے رخ رنگیں سے نقاب
اور چھیڑا تھا نگاہوں سے محبت کا رباب
نیچی نظروں کے اشاروں کی قسم
— اپنا دیوانہ بنایا تھا مجھے
— تم نے اک گیت سنایا تھا مجھے

(۴)

یاد ہے یاد ہے افسانۂ الفت مجھ کو
چین سے سونے نہ دیتی تھی محبت مجھ کو
لوٹے لیتی تھی مجھی سے مری وحشت مجھ کو
الم انگیز بہاروں کی قسم
— میری ہستی سے بھلایا تھا مجھے
— تم نے اک گیت سنایا تھا مجھے

راز ہاشمی امروہوی

ایک کلرک کے تاثرات

یہ بھی کوئی جینا ہے

از جناب ساحر صاحب

دھک۔ دھک۔ دھک ....

بڑی پریشانی کی حالت میں آنکھ کھلی، دل زور زور سے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اسکی مسلسل دھڑ دھڑ دماغ پر ہتھوڑے کا کام کر رہی تھی۔ بدن پسینہ سے تربتر تھا۔ اور میں پلنگ پر نیم افتادگی کی حالت میں پڑا تھا۔ لیٹے لیٹے میں نے تھکی ہوئی مضمحل نظروں سے آہستہ آہستہ کمرے کا جائزہ لیا۔ تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بند تھی۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی اس خاموشی میں دور کتوں کے بھونکنے کی آواز مخل ہوتی تھی۔

بستر پر سیدھے لیٹے ہوئے میں نے سوچنا شروع کیا کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ دل کی دھڑکن بتدریج کم ہوتی جاتی تھی لیکن اس کی جگہ خیالات نے لے لی۔ خیالات کی ایک برقی لہر تھی کہ دماغ میں بہی جاتی تھی۔ صبا رفتار گھوڑے تھے کہ اڑا لے جاتے تھے۔ پھر اس منتشر لشکر نے ذرا ترتیب و تنظیم پائی تو مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے پورا خواب یاد آ گیا۔ مجھے اس کی جزئیات تک یاد آنے لگیں۔ کیا خواب دیکھا تھا؟ —— اچھا چلئے یہی مکان ہے۔ بازو میں مولوی عبد السمیع صاحب کا شاندار بنگلہ ہے۔ شام کا وقت ہے میں اپنے بالاخانے کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوں۔ عبد السمیع صاحب کے مکان کی کھلی چھت پر کچھ صورتیں نظر آتی ہیں۔ یہ ان کی بیوی۔ یہ ان کی والدہ ہیں۔ یہ کوئی خادمہ ہے جو ہاتھ میں کچھ لئے کھڑی ہے۔ یہ کون؟ —— اوہو یہ ان کی صاحبزادی ہیں —— میرا دل دھڑکتا ہے، زور زور سے دھڑکتا ہے۔ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آتا ہوں۔ میرا دل رونا چاہتا ہے۔ پھر بے قرار ہو کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے ...... ارے لو! وہ واپس جا رہی ہیں۔ تاریکی بڑھ رہی ہے۔ ارے —— یہ کوئی اکیلی پیچھے رہ گئی ہے۔ شاید خادمہ ہے —— نہیں —— میرا دل اور زور سے دھڑکتا ہے —— تاریکی اور بڑھ رہی ہے۔ ایک دھندلی سی شکل پچھلے پاؤں ہٹتی ہے اور چھت پر منڈیر پر بیٹھ جاتی ہے —— میں الف لیلیٰ کے "بغدادی چور" کی طرح دبے پاؤں، گرنے کے خوف سے بے پروا، بے خوف کھڑکی کے راستے سے نکل کر سمیع صاحب کے مکان کی چھت پر نظر آتا ہوں —— ایک لمحہ بعد —— میں چھت کی سطح پر گھٹنے ٹکائے اور میرا سر منڈیر پر بیٹھے ہوئے شخص کی آغوش میں —— میں زار زار رو رہا ہوں۔ ایک نرم، شیریں گھبرائی ہوئی آواز مجھ سے التجا کر رہی ہے: "دیکھو روؤ نہیں، ارے ...... روتے کیوں ہو؟ —— رونے کی آواز پر کوئی آ نہ جائے، دیکھو بس کرو —— بس ——" میں خاموش رہنے کے بدلے اور روتا ہوں، روتا ہوں آغوش سے سر ہٹا کر پیروں پر رکھ دیتا ہوں ادھر سے کوشش ہوتی ہے کہ میں پیر چھوڑ دوں لیکن میں پیروں کو آنکھوں سے لگائے ان کو آنسوؤں سے دھوتا ہوں، ان کو لوسے دیتا ہوں —— اتنے میں پیچھے سے ایک کرخت بھونڈی، بھدی آواز آتی ہے —— کیا تھا؟ کوئی مردہ قبر سے چلاتا تھا یا کوئی کتا بھونکتا تھا —— ایک سخت اور کھردرے ہاتھ نے میری کلائی پکڑ لی —— میں گھسٹتا چلا جا رہا ہوں جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا۔

"نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں" ...... ہائے محبت بھی کیا چیز ہے، اس نعمت اور سعادت کا حال کچھ ان سے پوچھو جو اس دولت سے سرفراز ہوئے ہیں۔ میرے دل سے ایک صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے: "یہاں کسی کو نہ چاہنا، اور کسی سے چاہا نہ جانا کیسی بدبختی اور بدنصیبی ہے!"

بے چینی بہت بڑھ گئی تو اٹھا، کمرے میں ٹہلنے لگا، کھڑکی کھول دی، باہر جھانکا —— سڑک سنسان اور خاموش تھی سمیع صاحب کا شاندار اونچا بنگلہ رات کی تاریکی میں سیاہ بھوت کی طرح کھڑا تھا۔ دور کسی گھڑیال نے ٹن ٹن، دو بجائے، تھوڑی دیر تک اس کی آواز فضا میں گونجی۔ پھر ہر طرف وہی خاموشی ہی خاموشی تھی ——

بستر پر جا لیٹا، پھر اٹھنا، پھر لیٹنا، ایک خلش تھی، ایک کھٹک تھی، ایک چبھن تھی، دل پر ایک گرانی تھی اور ایک گھٹا سی چھائی تھی،

ایسی گھٹا ہو نہ کھلتی ہے اور نہ برستی ہے۔ بس دم گھوٹنا جانتی ہے۔ دل گریہ کناں ماتم آرزو کر رہا تھا "یہاں کسی سے چاہا نہ جانا بڑی بدبختی ہے..... یہاں کسی ایک کا نہ ہو رہنا بڑی بدنصیبی ہے"

دور گھڑیال کی زبان سے اس خوفناک سکوت کو توڑا..... ٹن، ٹن، ٹن..... سوچتا تھا۔

کہاں میں، کہاں عبدالسمیع صاحب! وہ ٹھیرے دولتمند، مرفہ الحال، مشہور و معروف ــــ میں ٹھیرا دفتر کا ایک ادنیٰ ملازم، ایک حقیر کلرک ــــ دن بھر دفتر کی مسلوں میں جان کھپاؤ تو مہینے پہ تین روپلی کی صورت دیکھنی نصیب ہو۔ اس عظیم او معمور شہر میں گمنام تنہا، لاوارث جس کا نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے دنیا میں بے طلب بھیجا گیا جن کے پاس بھیجا گیا وہ بھی میری آمد سے کچھ خوش نہ تھے ماں نے جنا، آگے بس اللہ میاں کی حفظ و اماں۔ گاؤں میں رہا، گاؤں میں پڑھا، گاؤں ہی میں پڑا ہوا قسمت میں شہر کا آب و دانہ تھا۔ اس نے اپنا رنگ دکھایا ــــ اس بڑے شہر میں جہاں ہزاروں اور لاکھوں آدمی بستے ہیں میں اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا پاتا ہوں کسی نے خواہش بھی رہنے اب ایسی جگہ جا کر جہاں کوئی نہ ہو۔ اس وسیع دنیا میں میرا کوئی نہیں میں ہزاروں اور لاکھوں کی آبادی میں بھی کر کسی پاسبان اور ہم سخن کو نہیں پاتا۔ بیمار پڑتا ہوں تو کوئی تیماردار نہیں آتا ــــ اور مر بھی جاؤں تو کوئی نوحہ خواں نظر نہیں آتا۔ سب ہنستے ہیں، بولتے ہیں، زندگی کے مزے اٹھاتے ہیں۔ مگر ہائے، میری زندگی بے روح ہے۔ بجائے گوشت پوست کے انسان کے میں کل کا پتلا معلوم ہوتا ہوں۔ صبح اٹھنا، ناشتہ کرنا، دفتر جانا، دفتر سے آنا، شام کا کھانا کھانا، ادھر اُدھر کے چند رسالے یا افسانے یا ناول پڑھ لینا، بستر پر کروٹیں بدلنا، رات گئے سو جانا ــــ سو جانا کیسا، منہ لپیٹے پڑے رہنا۔ یہ ہے زندگی۔ وہی آفتاب جو آج نکلا تھا، کل پھر نکلے گا، آہستہ آہستہ اپنی روشنی پھیلائے گا۔ دوپہر ہوگی، دن آہستہ آہستہ ڈھلتا جائے گا۔ سہ پہر ہوگی، شام ہوگی، رات آئے گی، بارہ بجیں گے، پھر ایک بجے گا، دو بجیں گے..... دن نکل آئے گا۔ یہی زندگی ہے؟ اسی کو زندگی کہتے ہیں۔ یہی جینا ہے؟ اسی جینے پر لوگ مرتے ہیں؟ ــــ بیماری مفلسی، بے کسی، بے بسی ــــ ان کا مجموعہ ہے زندگی ــــ

ٹن، ٹن، ٹن، ٹن.........

مرغ بانگ دے رہے ہیں۔ راستے پر وقفے وقفے سے راہگیروں کے پیروں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ بعض مسجد یا مندر جا رہے ہوں گے۔ بعض خرابات سے اٹھ کر آرہے ہونگے کیسے خوش نصیب ہیں یہ لوگ کہ یہ پہاڑ جیسی رات اپنے محبوب کے آغوش میں بسر کر چکے ہونگے۔

آہ، یہاں کسی سے چاہا نہ جانا کیسی بدبختی اور بدنصیبی ہے! کاش میرا بھی کوئی ہوتا یا میں کسی کا ہو رہتا، کسی کو اپنا کر رہتا، اور یہ دو روزہ، نہیں نہیں، میرے لئے دو روزہ نہیں دو صد سالہ، بے روح اور بدمزہ زندگی یوں نہ کاٹتا۔ بیمار پڑتا، تو کوئی اپنے ہاتھ سے سہلاتا اور میں ایسے کے ہاتھ سے دوا پیکر دوا پلانے والے پر سے سو نہیں، ہزار لاکھ صحتیں نثار کرتا۔ مفلس ہوتا تو کوئی کہتا ــــ "غم نہ کرو۔ دیکھو میں تمہاری ہوں" سرشار ہو کر یہ الفاظ سنتا اور کہنے والے پر سر وہ چیز جو میرے قبضہ و اختیار میں ہوتی صدقے اور نثار کر دیتا۔ بے کس ہوتا تو کوئی کہتا ــــ "دیکھو ہم ایک دوسرے کیلئے ہیں، ایک دوسرے کیلئے بنے ہیں، ہمیں دنیا سے کیا کام؟ تم ہو اور میں، بس، یہی ہماری دنیا ہے" میرا خیال ہے خوش بیان اور جادو زبان واعظ جس جنت کا نقشہ کھینچتے ہیں، وہ بھی اس کے آگے میری جنت کے آگے ہیچ ہوتی!

زندگی واقعی یہی ہے جیسی کہ میں بسر کرتا ہوں تو ایسی زندگی کو سلام ــــ دن بھر محنت کروں؟ کس لئے؟ رات کو مچھروں کھٹملوں کی ایذا سہوں؟ کیوں سہوں؟ جاڑے میں ٹھٹھروں، برسات میں بھیگوں، گرمی میں جھلسوں؟ کیوں؟ دنیا بھر کے لوگوں کی جھڑکیاں سختیاں اور ہر طرح کی ذلتیں اٹھاؤں؟ کیوں؟ کیا فائدہ؟ پیٹ کے لئے یہ کھٹ کھٹ یہ دوڑ دھوپ؟ یہی نا کہ اس دوزخ میں ایندھن ڈال کر زندگی کی مشین کو چلانا ہے؟ زندہ کیوں رہوں؟ کس کیلئے زندہ رہوں؟ ــــ ساری محنت، ساری مشقت، ساری ذلت اسلئے ہے کہ اس کے نتائج کسی کے قدموں پر نثار کر دئے جائیں اور اس کے بدلے میں ایک دلنواز مسکراہٹ، ایک جان بخش تبسم سے خوش کام ہوں، ساری سردی ساری گرمی اسلئے سہی جاتی ہے کہ کسی کی موجودگی میں فطرت کی رنگا رنگی، بوقلمونی اور تنوع کا لطف اٹھایا جائے۔ اگر ایسا نہیں تو بے روح خشک اور تاریک زندگی اور زندہ درگوری میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ قبر کا کونا، سرد، بے روح تنگ تاریک حشرات الارض سے بھرا ہوا.....

آہ یہاں کسی کو نہ چاہنا، کسی سے چاہا نہ جانا کیسی بدبختی اور بدنصیبی ہے..... آہ! آہ! کسی سے چاہا نہ جانا..... کسی سے چاہا نہ جانا..... کیسی بدنصیبی ہے..... کیسی کیسی کیسی بدنصیبی ہے.......

میری آپ بیتی!

زندگی کے بعد نئی زندگی!

یہ ایڈیٹر مست قلندر کی آپ بیتی ہے جو آج سے ۱۸ سال قبل لکھی گئی تھی جس کا ایک ایک لفظ حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اگر ناظرین کرام نے اس سلسلہ کو پسند کیا تو دوسری قسط مست قلندر کے آئندہ نمبر میں اشاعت پذیر ہوگی۔

اگست سنہ ۱۹۲۳ء کا زمانہ تھا۔ بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی کے دن بیت رہے تھے۔ میں، بیوی اور ایک ۳½ سالہ بچہ، یہ تھی ہمارے گھر کی کل کائنات۔ مگر ہم تینوں ایک دوسرے سے کتنا پیار کرتے تھے؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محبت کے بے تھاہ سمندر میں غفلت کی کشتی پر سوکر ہم تینوں بہے چلے ہیں لیکن کدھر؟ کس جانب کو؟ اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ نہ ہی کبھی سوچنے کی فرصت نہ ملی۔ ایک دوسرے کی محبت میں ہم لوگ اس درجہ محو تھے کہ کسی اور بات کا خیال نہ آتا تھا...... ایک دن شام کے وقت زندگی کے اس بحر بے پایاں میں اچانک موت کا مگرمچھ منہ کھولے دکھائی دیا جسے دیکھ کر ہم لوگ سہم گئے اور بیوی کے منہ سے تو بے اختیار چیخ نکل گئی۔

~~~ (۲) ~~~

میں موت کے بعد کی زندگی کا قائل ہوں۔ بھوتوں کی ہستی کو مانتا ہوں اور مسمریزم، ہپناٹزم وغیرہ علوم میں مجھے کافی دسترس ہے۔ اُن دنوں فلسفہ حیات و موت سے متعلق ایک انگریزی کتاب موسومہ موڈرن میجیشن (Modern Magician) میرے زیر مطالعہ تھی۔ ایک جگہ لکھا ہوا دیکھا۔ ہر انسان کے دو جسم ہوتے ہیں۔ ایک مادی، دوسرا روحانی، مادی وہ جسے مادی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے جس کے اندر انسانی روح موت تک قیام رکھتی ہے یا یوں سمجھو کہ ایک قسم کا پنجرہ ہے جس میں طائر روح کو مقید کر دیا گیا ہے روح جو کہ لطیف ترین ہستی ہے۔ مادی جسم کے فنا ہو جانے پر بھی آزاد نہیں ہوتی بلکہ اپنے لطیف جسم میں رونما ہو جاتی ہے جس کا دوسرا نام ایسٹرل باڈی ہے۔ یہی وہ جسم ہے جو کبھی کبھی ظاہر ہو کر عوام الناس کو ہراساں کر دیتا ہے۔ لاعلمی کے باعث لوگ اسے بھوت کہتے ہیں۔ کتاب مذکور کا ایک سیاہ دل کیرکٹر اپنے کسی دشمن کو انتقام کی نیت سے دوستی کے پردے میں قتل کر دینا چاہتا ہے وہ سوچتا ہے کہ دشمن کا کام تمام کر کے میں کہیں بھاگ جاؤنگا۔ اتنی وسیع کائنات میں کون مجھ پر شک کر سکتا ہے چنانچہ رات کی تاریکی میں باتوں ہی باتوں میں وہ اسے ایک ویرانہ میں لے گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا سوائے ان دونوں کے بالکل اندھیرا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ایک گھنے درخت کے جھنڈ میں اچانک اس نے مخاطب کے پیٹ میں چھری بھونک دی۔ ایک چیخ کی آواز پیدا ہوئی مقتول دھم سے زمین پر گرا جسم سے خون کا فوارہ اچھل پڑا۔ چند لمحوں کیلئے لاش مرغ بسمل کی طرح تڑپی اور پھر ہمیشہ کیلئے ٹھنڈی ہوگئی۔ قاتل بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر مقتول کا ایسٹرل باڈی یعنی جسم لطیف اس کے تعاقب میں ہے جس سمت منہ کر کے قاتل دوڑتا ہے۔ اُسی طرف مقتول کا ایسٹرل باڈی ظاہر ہو کر ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکتا ہے۔ قاتل خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے غرضیکہ آگے، پیچھے، دائیں، بائیں جس سمت بھاگنے کی نیت سے قدم بڑھاتا ہے۔ اسی جانب مقتول کو اپنے سامنے کھڑا پاتا ہے خوف و دہشت اور سراسیمگی قاتل کے دل میں گھر

میں کہتا ہوں دنیا کا نظام ایک قانون کے ماتحت چل رہا ہے۔ سات پردوں میں چھپ کر بھی تم جو چھوٹے سے چھوٹا گناہ کرتے ہو اس کا پھل تمہیں ضرور بھگتنا ہوگا۔ دُنیا جہان کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی تمہیں اس گناہ کی سزا پانے سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ اس جنم میں نہیں تو اگلے جنم میں سہی کسی کے دل پر چوٹ لگا کر دنیا اُجاڑ کر پامال بنا کر تم بھی کبھی سکھی نہ رہ سکو گے۔ موت کا خدا کی کائنات میں کوئی وجود نہیں۔ روح کبھی نہیں مرتی بلکہ تبدیلی ہیئت کر کے جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ ہماری موجودہ زندگی ایک خواب کی مانند ہے۔ بالکل حقیر اور بے حقیقت مگر آئندہ زندگی ؟

(ایڈیٹر)
~~~

کر لیتے ہیں۔ اسکی بوٹی بوٹی کانپتی ہے اس بلائے بے درماں سے مخلصی کی کوئی صورت سجھائی نہیں دیتی۔ اس ویرانہ میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر وہ پاگلوں کی مانند بھاگنے لگتا ہے۔ اچانک ایک درخت سے اس کا سر ٹکراتا ہے اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے۔

عالم بیہوشی میں قاتل کیا دیکھتا ہے کہ مقتول اس کی گردن پر سوار اس کا گلا گھونٹ رہا ہے اور پکار کر کہتا ہے کہ ظالم نابنجار میں تجھے زندہ نہ چھوڑونگا۔ دنیا کے جس حصہ میں تیرا جی چاہے بھاگ جا۔ مگر میں ہمیشہ سایہ کی طرح تیرے ساتھ رہونگا۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے، پھرتے، سوتے جاگتے ایک لمحہ کیلئے بھی تجھے نہ چھوڑونگا۔ اور خواب و خور تجھ پر حرام کردونگا۔ قاتل گڑگڑا کر پوچھتا ہے

"پھر میں کیا کروں۔ تم مجھے معاف کردو۔ میرے سامنے مت آؤ۔ تمہیں دیکھ کر میری روح کانپتی ہے اور میں پاگل سا ہو جاتا ہوں

مقتول۔ تو نے مجھ بے گناہ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میں بھی جبتک تجھے قتل نہ کر لوں گا۔ دم نہ لونگا۔

قاتل۔ مجھے بے شک مار ڈالو! مگر خدا کیلئے میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں ہزار بار پھانسی کے تختہ پر چڑھنا منظور کرونگا مگر تمہاری صورت نہیں دیکھونگا۔

مقتول۔ اچھا یہ بات ہے۔ تو اٹھو! میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ یہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک آدمی کھڑا ہے۔ اس کے سامنے جاکر اقرار جرم کرلو۔ اور پھر میں ہمیشہ کیلئے تمہارا پیچھا چھوڑ دونگا۔

قاتل اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا تمام جسم پسینہ میں شرابور، دماغ میں آگ کی سی گرمی اور دل زور زور سے دھڑک رہا ہے دونوں چل کھڑے ہوتے ہیں۔ قاتل اور مقتول ـــــ مقتول نے رہنمائی کی۔ اور قاتل کو سارجنٹ کے پاس چھوڑ کر (جو کہ رات کی گشت کیلئے ڈیوٹی پر تھا) روپوش ہوگیا۔

سارجنٹ نے قاتل کو دیکھا۔ کپڑے خون سے لت پت تھے۔

سارجنٹ نے پوچھا "ہیں یہ کیا! تم کون ہو؟"

قاتل۔ میں قاتل ہوں۔ اور میں نے اس شخص کو قتل کیا ہے جس کی روح مجھے ابھی ابھی یہاں چھوڑ گئی ہے

سارجنٹ نے اُچک کر قاتل کو گرفتار کرلیا۔ اور دن نکلنے تک لاش بھی برآمد کرلی گئی۔

ـــــ (باقی آئندہ)

خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

پڑھے لکھے بیکار کیا کریں؟

از جناب عبدالقاسم حسن صاحب زبیری امروہوی

ہمارے نوجوانوں میں عام طور پر یہ غلط خیال پھیل گیا ہے کہ بغیر معقول سرمایہ کے تجارت شروع نہیں کی جا سکتی اور چونکہ ہندوستان کی اقتصادی حالت اچھی نہیں ہے اسلئے لوگ تجارت کی جانب متوجہ ہونے کے بجائے ملازمتوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ملازمتوں کی تعداد قدرتی طور پر محدود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں جس کی آبادی چالیس کروڑ نفوس پر مشتمل ہو، ہر شخص کو ملازمت نہیں مل سکتی۔ لہٰذا ملک میں بے روزگاری کے سوال نے خوفناک اہمیت اختیار کر لی تجارت اور صنعت و حرفت سے بے توجہی برتنے کا افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے بے شمار تعلیمیافتہ نوجوان جن کی تعلیم و تربیت پر والدین نے شاندار مستقبل کے خواب دیکھتے ہوئے اپنی آخری پائی بھی صرف کر دی تھی، فقر و فاقہ کے عذاب میں گرفتار اور اپنی زندگی سے بیزار ہیں۔

ملک میں بے روزگاری کا سوال حل کرنے کیلئے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں درسی تعلیم کے ساتھ ہی صنعت و حرفت کی تعلیم کا انتظام بھی کیا جائے اور ہمارے نوجوان ڈگریاں لینے کے بعد محض حصول ملازمت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین قرار دینے کے بجائے تجارت کی جانب متوجہ ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر کام کرنے کے لئے تھوڑے بہت سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن تجارت کو فروغ دینے کیلئے محض سرمایہ ہی ضروری نہیں بلکہ اس سے بھی مقدم تر دو چیزیں ہیں "محنت" اور "دیانت"۔ بہت سے ایسے کام ہیں جو صرف دو چار روپے کے سرمایے سے بآسانی شروع کئے جا سکتے ہیں اور اگر محنت اور دیانت سے کام کیا جائے تو ہماری یہی چھوٹی سی تجارت آہستہ آہستہ ترقی کر کے ہمارے لئے بیش از بیش فوائد کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

اس قسم کی چھوٹی تجارتوں میں "پین بام" کی تجارت بھی شامل ہے۔ ہندوستان میں مختلف ناموں سے پین بام یا درد کے مرہم فروخت ہوتے ہیں، جن کے استعمال سے چوٹ اور درد کی تکالیف دفع ہو جاتی ہیں۔ یہ بام ملک میں بہت مقبول ہیں۔ اور شہر میں ان کی فروخت کا معقول انتظام ہو سکتا ہے کسی بھی پین بام کی شیشی پاؤ پیسہ پانچ چھ آنے سے کم میں فروخت نہیں ہوتی اور بعض کی قیمت تو ایک روپیہ سے بھی زیادہ ہے لیکن اگر انہیں گھر میں تیار کیا جائے تو ان پر چند پیسوں سے زیادہ لاگت نہیں آتی۔ ذیل میں ایک عمدہ اور زود اثر پین بام بنانے کا طریقہ درج کیا جاتا ہے۔

ناریل کا تیل ۱۰ تولہ، پودینہ کا ست ۳/۴ تولہ موم خالص ۵ تولہ، لونگ کا تیل ۱/۲ ۱ ماشہ، روغن دارچینی ۱/۲ ۱ ماشہ، لیونڈر ۱/۲ ۱ ماشہ، کافور ۱/۲ ۱ ماشہ، پہلے ناریل کے تیل میں موم ڈال کر نرم آنچ پر رکھیں، اور اچھی طرح پگھلا لیں، اس کے دوسرے اجزا شامل کر کے تھوڑی دیر کھرل کریں۔ جب تمام چیزیں اچھی طرح مل جائیں تو انہیں ویسلین کے طرز کی چھوٹی چھوٹی خوشنما شیشیوں میں بھر لیں اور بازار میں چل پھر کر فروخت کریں۔ فٹ بال میچوں، کارخانوں، لاریوں کے اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر ان کی فروخت کا امکان زیادہ رہے گا۔

اگر اس پین بام کیلئے کوئی دلکش اور عام فہم نام تجویز کر کے اس کے خوشرنگ لیبل چھپوا لئے جائیں تو اس سے شیشیاں فروخت کرنے میں زیادہ مدد ملیگی۔ اور قیمت بھی اچھی مل جائیگی ہمارے بیکار تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس ذریعہ معاش سے فائدہ اٹھانا چاہئیے۔

اسی قسم کی ایک دوسری فائدہ بخش تجارت سیونگ مشینوں کے تیل کی تیاری ہے، شہروں میں بہت کم متوسط گھرانے ایسے ہونگے جہاں کپڑے سینے کی مشینیں نہ پہونچ گئی ہوں اور ان کا رواج برابر بڑھتا ہی جا رہا ہے مشینوں کے پرزوں کو اچھی حالت میں رکھنے کیلئے تیل کا دیا جانا ضروری ہے لیکن یہ تیل خاص قسم کا ہوتا ہے، اگر مشینوں میں معمولی تیل ڈال دیا جائے تو اسکے پرزے خراب ہو جائینگے۔

سیونگ مشینوں کے لئے اگرچہ اب ہندوستان میں تیار ہونے لگا ہے لیکن یہ اب بھی زیادہ تر غیر ممالک سے بن کر آتا ہے اور اس کی خوشنما کپیوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مشینوں کیلئے تیل بنانا دشوار ہے لیکن یہ کام درحقیقت بہت ہی آسان ہے اور اسے کوڑیوں کے مول

گھر میں تیار کیا جا سکتا ہے۔ کپڑے سینے کی مشین کیلئے ایک عمدہ تیل بنانے کا طریقہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

خالص روغن زیتون ½ ۱ تولہ، خالص سرسوں کا تیل ½ ۱ تولہ، الکوحل حسب ضرورت، دونوں تیلوں کو باریک کپڑے میں چھان لیں اور اگر تیل کو پتلا رکھنا ہو تو زیادہ، اور کم پتلا رکھنا ہو تو کم تعداد میں الکوحل شامل کریں۔

ٹین کنپیوں کی تیاری میں چونکہ روپیہ زیادہ صرف ہوگا۔ اسلئے انہیں چھوٹی چھوٹی خوشنما شیشیوں میں بھر کر دو دو آنہ فروخت کیا جا سکتا ہے، چونکہ تیل عمدہ ہوگا اور قیمت بھی کم۔ اسلئے گھروں میں اس کی فروخت زیادہ ہوگی

(۳) برائے نام سرمایہ سے "خوشبودار پوڈر" کی تجارت شروع کر کے بھی معقول فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ پوڈر عام طور پر لفافوں کے اندر فروخت ہوتا ہے، اور اگر اس کی ذرا سی مقدار ٹرنک میں کپڑوں کے اوپر چھڑک دی جائے تو کپڑے عرصہ تک مہکتے رہتے ہیں۔ علاوہ بریں اس میں کیڑا بھی نہیں لگتا۔ خوشبودار پوڈر بہت آسانی سے گھر میں تیار کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا طریقہ حسب ذیل ہے۔

پاؤ بھر ارارو ٹ کو ہموزن نشاستہ میں اچھی طرح لونگ، الائچی، گلاب یا لیموں وغیرہ کے عام پسند سینٹ کی چند بوندیں شامل کردیں۔ پوڈر تیار ہے۔

(۴) کاربالک سوپ عام استعمال کی چیز ہے اور خارش وغیرہ امراض جلد میں اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ملکی اور غیر ملکی ساخت کا کاربالک سوپ ہر سال کثیر مقدار میں فروخت ہوتا ہے اور اس کی تجارت بہت تھوڑے سرمایہ سے بآسانی شروع کی جا سکتی ہے۔

عمدہ کاربالک سوپ بنانے کا طریقہ حسب ذیل ہے

کاربالک ایسڈ ½ پونڈ، کاسٹک سوڈا ۱ پونڈ ناریل کا عمدہ تیل ½ ۱۰ پونڈ۔ کاسٹک سوڈا کو تقریباً سوا سیر پانی میں حل کر کے پہلے پتلی سی لئی تیار کرلیں، اور ناریل کے تیل کو ہلکی آنچ پر پگھلا کر اس میں کاربالک ایسڈ حل کرلیں۔ اس کے بعد ناریل کے تیل میں کاسٹک سوڈا کی لئی کو دھار باندھ کر آہستہ آہستہ ملائیں اور کفگیر سے برابر چلاتے رہیں۔ اور جب یہ مرکب قوام کی شکل میں کسی قدر گاڑھا ہو جائے تو اس میں اپنی پسند کا کوئی رنگ تھوڑی مقدار میں ملا کر سانچے سے مناسب سائز کی ٹکیاں تراش لیں

اس طریقہ سے جو کاربالک سوپ تیار کیا جائے گا۔ وہ جلدی امراض کیلئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اور چونکہ اس کی تیاری میں لاگت بہت کم آتی ہے اس لئے اس کی فروخت سے معقول فائدہ ہو سکتا ہے

(۵) بہت کم گھر ایسے ہوں گے، جہاں چوہوں سے نقصانات نہ ہوتے ہوں ایسی کوئی چیز جس سے چوہے ہلاک کئے جا سکیں بازار میں زیادہ فروخت ہوگی ذیل میں چوہے مار گولیاں بنانے کا طریقہ درج کیا جاتا ہے جنہیں برائے نام لاگت سے تیار کر کے معقول فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

آٹا ۵ چھٹانک، ناریل کا تیل ۲ چھٹانک بیرم کاربونیٹ ایک چھٹانک۔ تینوں چیزوں کو ملا کر چنے کے برابر گولیاں بنالی جائیں۔ ان کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ چوہوں کے بلوں میں دو تین گولیاں ڈال دی جائیں جنہیں کھا کر چوہے مر جائیں گے۔

(۶) رولڈ گولڈ دھات بنانے کا طریقہ۔ سکہ (سیسہ) ایک حصہ، پیتل ۲ حصہ، تانبہ ۲۴ حصہ۔ (ترکیب ساخت) پہلے تانبہ کو کٹھالی میں ڈال دیں۔ پھر کٹھالی کو آگ میں رکھ دیں۔ جب تانبہ اچھی طرح پگھل جائے تو اس میں پیتل کا ٹکڑا ڈال دیں اور اس کے بعد سکہ بھی ڈال دیں۔ جب سب چیزیں یکجان ہو جائیں اور خوب پگھل جائیں تو کٹھالی کو آگ سے باہر نکال کر جو چیز تیار ہوگی وہ رولڈ گولڈ دھات ہے۔

(۷) مہر لگانے کی لاکھ۔ چپڑا لاکھ ۳ حصہ رال ۴ حصہ، بروزہ ۲ حصہ، تیل تارپین ایک حصہ (ترکیب ساخت) لاکھ، بروزہ اور رال کو نرم آگ پر آنچ دیں۔ یہ چیزیں اندر ہی اندر پگھل کر پانی کی طرح ہو جائینگی جب باہم یکجان ہو جائے تو اسے سانچوں میں بھر لیں۔ (نوٹ) مندرجہ بالا چاروں اشیا ایسی ہیں کہ جن پر آگ دوری سے اثر کرتی ہے۔ اسلئے انہیں کافی احتیاط کے ساتھ حل کیا جائے اور تارپین کا تیل ڈالتے وقت بھی نہایت احتیاط سے کام لیا جائے ورنہ آگ لگ جانے کا اندیشہ ہے۔

(۸) بوتل کا منہ بند کرنے کا مصالحہ۔ چپڑا لاکھ [illegible]

مست قلندر کے نادہندہ ایجنٹ: آجکل جبکہ کاغذ اور چھپائی کے نرخ بیحد گراں ہو گئے ہیں اور ہر ایک چیز نقد داموں پر ملتی ہے مست قلندر کے ان ایجنٹوں کی ستم ظریفی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہو گئی ہے جو اپنے سابقہ حساب کو قطعی بیباق نہ کرتے ہوئے تھوڑی تھوڑی رقم متعدد تقاضوں کے بعد بھیجنے کے عادی ہو گئے ہیں ہم ایسے تمام ایجنٹوں کو فرداً فرداً مطلع کر چکے ہیں مگر کچھ شنوائی نہیں ہوئی۔ اسلئے اب آخری بار بذریعہ نوٹس ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ ۱۵ نومبر سے پہلے پہلے اپنی واجب الادا رقومات دفتر میں بھیج دیں نہیں تو مجبوراً ان کی سپلائی

[illegible]

یہ ہے آجکل کی تہذیب

بچہ رموز و اسرار کا مالک ہے۔ فطرت سے اس قدر قریب ہے، کہ کوئی اس کی قدر نہیں۔۔۔ موجودہ کا باپ اسکی چیخ و پکار پر اس سے نفرت کرتا ہے۔ مگر ماں اس کی ہر شوخی کو برداشت کرتی ہے۔۔۔۔۔ گود میں لیتی ہے۔۔۔۔۔ پیار کرتی ہے، میٹھے اور پیارے گیت سے اس کے دل کو مسرور کرتی ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنے بچہ کیلئے ایسا ماحول پیدا کرتی ہے کہ بچہ اس کی میٹھی بولیوں اور دلنواز نغموں سے مالا مال ہو کر مطمئن ہو جاتا ہے اور پھر ہاتھ پیر مارنا شروع کرتا ہے۔ اس کے رونے پر گھر والے اسے بھوکا تصور کرتے ہیں: "ماتوجن" یا دیگر مصنوعی غذا تیار کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔۔۔۔ بچہ اس غیر فطری غذا کو تیار ہوتے دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ وہ اپنا منہ کھولتا ہے، زبان نکالتا ہے، ہنستا ہے، روتا ہے اسلئے کہ مجھ کو میری غذا دو۔ مگر واہ رے روشن خیالی۔۔۔۔۔ ماں نے اگر اس پر ترس کھا کر اس کو قدرتی غذا دینے کی فکر کی تو شوہر برا مانتا ہے۔۔۔۔ ہاں کہیں شوہر نے دودھ پلانے کیلئے مجبور کیا تو ماں کب سنتی ہے۔ غرضیکہ پیدا ہوتے ہی بچہ کو مختلف غیر مانوس تدابیر کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔ اب وہ گلیکسو وغیرہ کا عادی ہو چلا ہے۔ والدین کو آزادی ملتی ہے۔

بیوی:۔ "میں مسوری جاؤنگی۔"

شوہر:۔ "بچہ کہاں رہے گا؟"

بیوی:۔ "تمہارے پاس۔"

بیوی نے رخصت ہونے کے وقت بچہ کے نرم گالوں پر دو چار منہ مارے اور ایک دو بار دوڑ دوڑ کر اس کے قریب آئیں۔

بیوی:۔ (میاں سے مخاطب ہو کر) "میں جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ کاسٹر آئل ضرور دیتے رہئیے گا۔۔۔۔۔ اور جب آپ آئیے گا تو دایہ کو تاکید کر دیجیے گا کہ بچہ کا خیال رکھے۔"

مسوری پہنچتے ہی بیوی اب مسز کہلائی جانے لگیں۔۔۔۔ احباب خوش ہوئے۔۔۔۔۔ رنگ برنگ کے پروگرام بننے شروع ہوئے۔۔۔۔ رکشا آیا۔۔۔۔۔ دو عدد بیٹھ گئے۔

رکشا والا:۔ "بارش آ رہی ہے حضور!"

آواز:۔ "کیا پروا!" حکم ہوتا ہے۔۔۔۔ پردہ چڑھاؤ۔۔۔۔ پردہ چڑھاتے ہی گھونسلا تیار ہو گیا۔۔۔۔ نزدیک بیٹھے ہوئے اوپر نیچے ہوتے ہی مسوری کے نشیب و فراز میں سے گزر رہے ہیں۔ بغور دیکھنے سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جگنو اندر بند ہو گیا ہے۔ آگ گل ہوئی اور معاً سلگ گئی۔ داہنے اور بائیں کا امتیاز ہوا۔ مسز داہنی جانب پہلو بہ پہلو کسی مرد کے بیٹھی ہوئی ہیں۔

"بیکمین آ گیا حضور!۔۔۔۔۔"

چھتری تانی گئی یکے بعد دیگرے ایک نے دوسرے کا پیچھا کیا۔۔۔۔ وہاں جا کر کون بیٹھتا ہے۔۔۔۔ یہاں باکس ریزرو ہے۔ ٹینون بجا نہیں کہ یہ دونوں اب اکھاڑے میں اتر آئے۔۔۔۔ ہاتھ کا کمر پر سہارا، دوسرا ہاتھ ہاتھ میں، پتلوں کی سخت کریز ساڑی کی موجوں میں کھیلتی نظر آتی۔۔۔۔ پیر بھی ایک دوسرے سے مانوس ہیں۔۔۔۔ ادھر ٹینون ختم ہوئی اور ادھر صاف الگ الگ کھڑے ہو گئے اور تالیاں پیٹ دیں۔۔۔۔ لائٹ گل ہو گئی اور تماشہ ختم ہو گیا۔۔۔۔۔

خاص مست قلندر کے لئے

دیوالی کی رات!

از جناب راز ہاشمی مرحوم

یہ دیوالی کی دلکش رات توبہ
یہ حسن و نور کی بہتات توبہ
تبسم ہی تبسم ہے فضا میں
ترنم ہی ترنم ہے ہوا میں
فلک پر مسکراتے ہیں ستارے
زمیں پر رقص کرتے ہیں شرارے
یہ برق ناز کی جلوہ فشانی
دیوں کی لو میں سیتا کی کہانی
فضا رنگینیوں میں چور سی ہے
کہ اپنی زندگی مخمور سی ہے
یہ کس نے فطرت انساں جگا دی
معاً روح محبت مسکرا دی
نظر پر چاندنی سی چھا رہی ہے
کوئی شے پاس آتی جا رہی ہے

سراپا اپنے قابو میں نہیں ہے
نظر کے سامنے اک مہ جبیں ہے
تکلم ہے مکمل ساز اس کا
جوانی ہے ہر اک انداز اس کا
نگاہیں کہہ رہی ہیں اک فسانہ
قیامت ہے ادائے کافرانہ
سنوار گیسوؤں کو یوں سنبھل کر
زمانہ رہ گیا کروٹ بدل کر
مگر وہ بے نیاز ہر نظر ہے
خود اپنی مستیوں سے بیخبر ہے

یہی معصومیت ہے اوج ہستی
یہی ہے راز حسن خود پرستی

ہم نے اسے کیا سمجھا تھا

مقام تحیر پہ قائم ہیں دونوں
نہ وہ پاس آئیں، نہ ہم دور جائیں

از جناب کاظم دہلوی

عدالتِ خفیفہ کے ایک ریڈر کی آپ بیتی!

آج عدالت سب ججی میں معمول سے زیادہ مقدمات پیش ہوئے اور مجھے سررشتہ دار کی حیثیت سے آنکھ اُٹھانے کی فرصت نہیں ملی ہم لوگوں کی دنیا ہی کیا؟ دن بھر مثلیں دیکھنی ہر قسم کے لوگوں سے دوچار ہونا اور شام کو ہار تھک کر گھر چلا جانا۔ یہی سبب ہے کہ خشک مزاجی اور روکھی پھیکی گفتگو کے لحاظ سے ہم ذرا بدنام ہوتے ہیں کوئی چار بجے مسلسل سماعت کے بعد جج صاحب نے کام ختم کیا۔ میں نے کچھ ضروری کاغذات الماری سے چھانٹ کر نکالنے کی کوشش کی۔ مگر الجھی ہوئی طبیعت نے ساتھ نہیں دیا اور الماری بند کر کے میں کمرۂ عدالت سے باہر آگیا۔ اب لوگوں کی آمدورفت کم ہوگئی تھی اور آس پاس کی عدالتوں میں اہل معاملہ نظر نہیں آتے تھے۔ بالکل اُسی وقت ایک خوش پوش نوجوان مگر کسی قدر گھبرائی ہوئی لڑکی پر سکون عدالتوں کے اردگرد پھرتی نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کوئی چیز گم ہوگئی ہے جس کی تلاش نے بوکھلا سا دیا ہے۔ میں حیران ہوگیا فی الحقیقت ایک عدالتی سررشتہ دار کے لئے اس سے زیادہ حیران ہونے کا اور موقع بھی کون سا ہو سکتا تھا تاہم میں نے کوئی خاص توجہ نہیں کی اور چاہتا ہی تھا کہ اپنے کمرے میں داخل ہو جاؤں مجھے محسوس ہوا کہ گویا وہ میری طرف آرہی ہے۔ اس وقت آس پاس اور کوئی تھا بھی نہیں۔ ایک حسین لڑکی کا یوں عدالت میں پریشان پھرنا اور پھر ایک عدالتی قسم آدمی کے پاس بلا سوچے سمجھے آنا یقیناً تعجب کی بات تھی پھر میرے دل میں مختلف قسم کے خیالات چکر لگانے لگے۔ راستہ بھول گئی ہے؟ کسی مقدمہ میں ماخوذ ہے؟ کسی کی سفارش کرنی چاہتی ہے؟ کسی سے ملنے کا ارادہ ہے؟ کوئی بات دل پر نہیں جمی ۔۔۔ جھکی ہوئی نگاہیں، ڈگمگاتے ہوئے قدم، کملایا ہوا پھول سا چہرہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آنا نہیں چاہتی مگر آرہی ہے۔ وہ ٹھیک میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ میں خاموش کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہا نہیں جاتا تھا۔ اس نے ایک ہلکا سا سانس لے کر انتہائی معصومانہ اور ملتجیانہ انداز سے میری طرف دیکھا بلاشبہ آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے اور ان آنسوؤں کی قوسِ قزح میں اس کے دلی جذبات کا رنگ جھلک رہا تھا۔ وہ ضرور دل برداشتہ تھی کسی قلبی اذیت نے اسے حواس باختہ کر کے رکھ دیا تھا۔ کوئی نہ کوئی خواہش اس کے دل میں ہلچل مچائے ہوئے تھی۔ پھر بھی نسوانی وقار اُسے اجازت نہیں دیتا تھا کہ لب کشائی کی نوبت آنے پائے۔ وہ غنچہ تھی مگر غیر آشفتہ، نغمہ تھی مگر خاموش، اُس نے افسردہ افسردہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا، اور اب مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی۔ کہ اس کی بے پناہ مگر نامعلوم خاموش التجا کو ٹھکرا دیتا۔ وہ نیچی نگاہ کئے ہوئے واپس لوٹی اور میں بھی اس کے پیچھے اس طرح چلنے لگا کہ جیسے کسی افسر کے پیچھے کوئی ملازم چلتا ہے مجھے ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ میں ایک عدالت کا سررشتہ دار ہوں اور جذبات کی رو میں بہہ جانا میرے فرائض میں داخل نہیں ہے وہ سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں داخل ہوئی اور بالکل بے اختیارانہ طور پر میں نے بھی اس کی پیروی کی وہاں ایک خوبصورت نوجوان ہتھکڑی لگا ہوا ملزم کی حیثیت میں کھڑا تھا اور اس کے برابر کرسی پر ایک بھاری بھرکم لالہ جی جائداد کے کچھ کاغذات لئے بیٹھے تھے۔ لڑکی کے ساتھ میرے یوں بے محابا اور معنی خیز طریق پہ داخل ہونے پر مجسٹریٹ نے جو وقت تنگ ہو جانے کی وجہ سے بددل ہو رہا تھا مگر ملزم کے وکیل کے زور دینے کی وجہ سے مجبور تھا مجھ سے سوال کیا تم ان لالہ جی کو جانتے ہو جائداد کے جو کاغذات اس نوجوان کی ضمانت کیلئے پیش کئے جارہے ہیں، وہ تمہارے علم میں لالہ جی ہی سے متعلق ہیں؟ حسینہ نے پھر ملتجیانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بلا ساختہ کہہ دیا۔ جی ہاں! مجسٹریٹ نے ضمانت لئے جانے کا حکم دیدیا اور میں ہارے ہوئے جواری کی طرح عدالت سے باہر نکل آیا۔

دوسرے دن جب میں اپنی عدالت میں داخل ہوا تو غیر شعوری طور پر اپنے آپ میں کچھ کمی محسوس کی۔ کام کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

جیسے کوئی ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ دل افسردہ، نگاہیں بھٹکی بھٹکی، ہوش اُڑے اُڑے ہوئے۔ اس کشمکش کا کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آیا اور میں تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابھی جج صاحب کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ایک دم اسی شرربار نگاہوں والی لڑکی کا تصور سامنے آگیا اور اب میری سمجھ میں آیا کہ ذہنی انقلاب کی تہ میں کیا چیز کارفرما ہے سچ تو یہ ہے کہ اس حسینہ کے تصور نے بڑھے ہوئے اضطراب کو سکون اور دلی افسردگی کو شگفتگی میں تبدیل کر دیا اور میں نے رگ و پے میں تازگی سی پائی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ اُسی غمگین ادا سے میری جانب دیکھ رہی ہے، وہی بڑی بڑی آنکھوں کا بے چینی سے کھلنا اور بند ہونا، چہرہ کا اُتار چڑھاؤ، ایک رنگ آنا ایک رنگ جانا، شرم سے جسم چرا چرا لینا، حیا سے زمین میں گڑ گڑ جانا۔ دل قابو میں آگیا اور کام میں بھی جی لگ گیا، تھوڑا سا کام کر لیتا اور پھر تصورات کی بوقلمونیوں میں گم جانا، مجھے عدالتی حلقے میں ذرا سخت گیر کہا جاتا تھا۔ لیکن آج نہ جانے کیوں ہر پیش ہونے والے آدمی سے، ہر اہل معاملہ سے مجھے ہمدردی سی ہو گئی تھی اور ہر شخص سے بخندہ پیشانی میں یوں پیش آرہا تھا جیسے نہ میں اس عدالت کا سررشتہ دار ہوں۔ نہ عدالتی نشیب و فراز سے مجھے کوئی دلچسپی ہے۔ اگر اس بےچینی، اس سکون آفریں اور دلکش بھول بھلیاں کو محبت کہا جا سکتا ہے تو میں کھلے دل سے اقرار کئے لیتا ہوں کہ اس غمگین دوشیزہ سے مجھے محبت ہو گئی تھی۔

ایک روز کام ختم کر کے باہر نکلا تو اُسی نوجوان کو منتظر پایا جس کی پُراسرار طریقہ پر ضمانت دی گئی تھی۔ اُس نے نہایت ادب سے سلام کیا۔ اور مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے رسمی طور پر جواب دیکر اس کے ماخوذ ہونے کی رُوداد معلوم کرنی چاہی مگر وہ شرما کر چپ ہو گیا اور بات کا رُخ بدل کر انکساری کے ساتھ کہا۔ ماں جی نے آپ کو آداب کہا ہے اور کل شام کو ساتھ کھانا کھانے کی استدعا کی ہے میں کل اسی وقت آپکو لینے کے لئے حاضر ہونگا چونکہ نوجوان کی بول چال میں غضب کا بھولا پن اور سادگی تھی۔ اسلئے میں غور کرنے لگا۔ کہ اتنے شرمیلے اور سیدھے سادے نوجوان سے بھی کوئی جرم سرزد ہو سکتا ہے۔ وہ اور میں باتیں کرتے کرتے تانگہ اسٹینڈ تک آگئے۔ دوران گفتگو میں یہ پتہ چلا کہ وہ غمگین نازنین اسکی ہمشیرہ ہے۔ دوسرے دن جب میں صبح سیر کیلئے نکلا تو یہ محسوس ہوا کہ گویا کائنات پر رنگینیاں سی چھا گئی ہیں۔ آج ایک عدالتی ٹائپ کے نوجوان کیلئے جس نے بائیس سال صرف کاغذات کی اُلٹ پھیر میں گذارے تھے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور نورس نورس غنچوں کی چٹک بے معنی نہیں تھی۔ آج حسین پرندوں کے زمزموں، سبزہ کی گنگا جمنی انگڑائیوں اور آب رواں کے دھیمے دھیمے راگوں سے براہ راست دل کے تار لرزیدہ تھے۔ دل کی پہنائیوں، روح کی گہرائیوں اور قلب کی وسعتوں میں کوئی آب و آتش اور سوز و گداز میں کھوئی ہوئی شے جلوہ فرما تھی کتنا دلچسپ ہوتا ہے وہ منظر! جب کوئی کاروباری دل و دماغ کا آدمی —— کسی ماہ وش حسینہ کو پیار کرنے لگتا ہے۔ اس کیلئے یہ شباب و شعر کی دنیا، یہ نغمہ و گل کا عالم، یہ کفر و خرابات کی فضا کتنی حیرت افزا ہوتی ہے۔ اُس سرے سے اس سرے تک دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ دل جسے مال و زر کی تگ و دو بستی تھی۔ اور جو کسی دل سے نکلی ہوئی آہ اور قلب سے نکلی ہوئی فریاد سے بھی متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اب ذرا سی ٹھیس لگتے ہی آب آب ہو جاتا ہے اور ہر درد بھری آواز اور دلگداز سخن پر نیزہ کی طرح چبھ جاتا ہے وہ نظر جو صرف ہو یارانہ رفعت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے سوا اور کسی طرف اُٹھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اب ستاروں کی آنکھ مچولیوں پرندوں کی سرگوشیوں، شفق کی لالہ زاریوں اور پھولوں کی کہکشاں پر جم کر رہ جاتی ہے وہ نازک قدم جنہیں پھولوں کی سیج پر جاتے ہوئے تکلف ہوتا تھا۔ اب خود بخود کانٹوں کی طرف کھچے جاتے ہیں۔

شام کو میں اس نوجوان کے ہمراہ میں اس جگہ پہنچے جہاں جاتے ہوئے دل جھجکا بھی رہا تھا اور مچل بھی رہا تھا۔ ایک مکان تھا، بہترین سازوسامان اور قد آدم شیشوں سے آراستہ و پیراستہ۔ ہر چیز کو سجانے میں سلیقہ اور شستگی سے کام لیا گیا تھا۔ اور واضح طور پر امیرانہ شان برس رہی تھی۔ میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک سجی بنی پیرانہ سال اور ایک جوان سال سی ادھیڑ عمر عورت نے خیر مقدم کیا۔ وہ گل رعنا اور خانہ برانداز چمن بھی مکمل کفر سامانی اور لطافت و دلربائی کے ساتھ سامنے آئی۔ لیکن گھر کی بناوٹ گھر والوں کے خدوخال اور وضع قطع اور نوکروں کی شکل و شباہت نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا بالائی منزل کے ایک خوشنما کمرے میں کھانا کھانے کے بعد بوڑھی عورت نے نہایت شفقت سے میرا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اگر میں اس روز ضمانت کیلئے نہ پہنچ جاتا تو اس رئیس کے منصوبے پورے ہو جاتے جس نے نوجوان (حسن افروز) کو چوری کا الزام لگا کر اپنی ہتک کا بدلہ لینا چاہا تھا۔ بوڑھی عورت نے مجھے

اپنا ہمدرد سمجھ کر واقعات کا کوئی گوشہ چھپا کر نہیں رکھا۔ اور اوّل سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ میں خاموش بیٹھا سُن رہا تھا اور اندر ہی اندر گھُٹا جا رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد سب اُٹھ کر نیچے چلے گئے۔ اب روشنی ہو چکی تھی۔ نیچے کے حصّے سے دو تین اجنبی آدمیوں کے بولنے چالنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ ایک تو طوائف کا مکان دوسرے تنہائی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور نیچے اترنے کا ارادہ کرنے لگا۔ اتنے میں وہی بُت طنّاز جسے گھر والے "شاہین" کہتے تھے پان لے کر شرماتی ہوئی اوپر آئی۔ میں اپنی جگہ بیٹھ گیا اور چلنے کی اجازت لینی بھی یاد نہیں رہی۔ اس نے خاصدان بڑھا کر نیچی نگاہ کئے ہوئے کچھ اٹک اٹک کر میرا شکریہ ادا کیا اور بہت ہی معصوم لہجہ میں پوچھا۔ آپکو عدالت جانتی تھی؟ پھر بھولے بھولے الفاظ میں کہا۔ میں تو سچ مچ اس دن نڈھال ہو گئی تھی۔ عدالت میں بھلا کس کو جانتی تھی۔ وہ تو آپنے ہاتھ رکھ لیا۔ ورنہ خدا جانے میرا کیا حال ہوتا اور افروز کے دشمنوں کو ایذا پہنچ کر رہتی۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور چپ ہو گئی۔

میں نے نیم وا نگاہوں کو اُٹھا کر آہستہ سے جواب دیا۔ انسان سے انسان کا کام نکل ہی جاتا ہے۔ جی تو نہیں چاہتا تھا مگر کسی نامعلوم جذبہ کے ماتحت میں کھڑا ہو گیا۔ وہ گھبرا سی گئی منہ سے کچھ نہیں بولی۔ لیکن جب مہربانی اور عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے جانے کی اجازت چاہی تو وہ چونک سی گئی اور جھجک کر شرم اور اضطراب کے ساتھ پوچھا۔ پھر بھی تشریف لائیے گا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ جی چاہتا تھا جواب اُٹھا کر کہدوں۔ "جی کیوں نہیں" مگر ایک نامعلوم خیال دامنگیر تھا۔ وہ بے چین ہو گئی۔

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اور میں نے بلا سوچے سمجھے اس کی طرف دیکھا۔ نگاہیں مل گئیں وہ سہم کر رہ گئی ——— اور میں شپٹا گیا۔

آخر میرے منہ سے نکل ہی گیا "حاضر ہونگا"۔

گھر آکر میں بالکل گم سم بیٹھ گیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں ہوں ہی نہیں۔ اس کے بعد خاموش بیٹھے چین نہ تھا، نہ کچھ کرتے بن آتی تھی، نہ کچھ سوچنے کو جی چاہتا تھا۔ ایک قدامت پسند نوجوان خود اعتمادی اور جاہ پرستی جسکی گھُٹی میں پڑی ہوئی ہو۔ کاروباری جدوجہد سے کنارہ کش ہو کر ایک پُرفریب دنیا میں خراماں خراماں آئے اور یوں ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گر پڑے۔ ایک رند بدمشرب کو توبہ شکنی پر مجبور کیا جائے اور جب وہ توبہ شکنی اور کفر نوشی پر آمادہ ہو جائے تو اس کے جامِ آتشیں میں زہر گھول دیا جائے۔

دل بار بار کہتا تھا کہ وہ ایک طوائف کی لڑکی ضرور ہے۔ لیکن کیا اس کے بھول سے چہرہ کی حُسن خود بلائیں نہیں لیتا۔ اس کی سلیم اداؤں میں متانت، البیلاپن، اور وہ چیز نمایاں نہیں ہے۔ جو ایک نسوانی پیکر میں فردوسی رفعت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی مست انکھڑیوں کی برق سامانیوں میں دل کا تار متحرک کر دینے والی گرمی نہیں ہے۔ وہ جب مسکراتی ہے تو کیا گلاب کی نازک نازک پتّیاں توس قزح میں رقص کرتی نظر نہیں آتیں۔ وہ مجسّم کفر و شباب نہیں ہے؟ کنول کے پھول کی طرح شاداب؟ ——— ہے ضرور ہے عقل و شعور نے کہا لیکن ہے تو ایک طوائف کی لڑکی، بازاری مالن کی حسین ٹوکری کا تر و تازہ نوبہار پھول جس کی قدر و قیمت؟ بس یہی کہ جب نفس پرست بوالہوس اور جاکدست میراس کی قیمت ادا کرنے کی اہلیت ہو وہ خرید کر گلے کا ہار بنا سکتا ہے۔ سوسائٹی کی روشن پیشانی پر جو بصورت سا کلنک کا ٹیکہ، اگر اُسے آبِ حیات سے بھی دھونے کی کوشش کی جائے تو دھویا نہ جا سکے کس ماحول میں پل بڑھ کر پروان چڑھی ہے۔ وہ ——— جہاں حسن کو عارِ نگری سادگی کو فریب کاری، نسائیت کو شیطنت سے بدل دینے کی تعلیم دی جاتی ہے جہاں جھوٹی ریت پریت کے سانچوں میں دل و دماغ ڈھالے جاتے ہیں۔ جہاں عصیاں اور ابلہ فریبیاں رگ و ریشے میں پیوست کر دی جاتی ہیں۔ جہاں ہری بھری ٹہنیوں کو بیرحمی سے توڑ پھینکنے، زندگیوں کو اجیرن کرنے، رسی بسی دُنیاؤں کو اجاڑنے اور ملی کھلی جوانیوں کو تباہ و برباد کرنے کے لچھن سکھائے جاتے ہیں۔ جہاں شیطان ہنستا ہے۔ گناہ و ظلم قہقہے لگاتے ہیں۔ بدیاں اور بدکرداریاں مسکراتی ہیں اور تہذیب و شرافت اور دین و ایمان بِلبِلاتے سسکتے ہیں۔

خیالات کے ان ہچکولوں میں دل کی دُنیا درہم برہم ہوئی جاتی تھی۔ ہولناک خیالات کا ایک زیر و بم تھا، روح کو بلبلا دینے والا۔ دل و دماغ اور فکر و نظر مجروح ہوئے جاتے تھے۔ جسقدر واقعات پر غور کیا جاتا اتنا ہی دل پژمردہ اور مستقبل تاریک نظر آنے لگتا۔

دوسرے دن میں عدالت میں آیا اس صورت سے کہ جیسے ہفتوں کا بیمار، کاغذات اور فائل کاٹ کھانے کو دوڑتے۔ اہل معاملہ کی شکلیں بُری معلوم ہوتیں۔ بس خاموشی، تنہا پسندی، اور نہ سمجھ میں آنے والی کسی شے کی جستجو، بے معنی زندگی سے تنگ آکر میں نے رخصت لے لی۔ بارے دو تین دن کے آرام کرنے سے قدرے سکون ہو گیا۔

ایک روز عدالت سے فارغ ہو کر میں گھر واپس آ رہا تھا کہ پارک گیٹ کے قریب کسی نے آہستہ سے مجھے آواز دی۔ مڑ کر دیکھا تو "شاہین" ایک ادائے جانانہ کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ بہترین ساری زیب تن کیے ہوئے ہمہ تن شعلہ و شمیم بنی ہوئی، بے پناہ نوجوانی، سج دھج اور دلپذیر طرزِ خطاب سے متاثر ہو کر میں اس کے قریب گیا۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد اس نے پوچھا۔ آپ تو پھر تشریف ہی نہیں لائے۔

عدالتی بکھیڑوں سے فرصت نہیں ملی۔

اس نے بغور میری طرف دیکھا پھر کچھ سوچ کر کہا۔ آنا چاہتے تو وقت بھی نکل آتا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور جواب دیتا بھی کیا؟

اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ شاید خاموشی کے پردوں میں چھپا ہوا راز تلاش کر رہی ہوگی۔

میری طرف دیکھیے آپ تو بولتے ہی نہیں؟

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ معلوم ہوا کہ جیسے کوئی ہواؤں میں اڑائے لئے جا رہا ہے۔

بولیے نا، آپ چپ کیوں ہیں۔

"شاہین" جہاں آپ ہیں وہاں جاتے ہوئے قدم ڈگمگاتے ہیں۔

کس وجہ سے؟

غیرت اور خودداری سدِ راہ ہیں۔

وہاں ——— آپ کی خودداری کو ٹھیس نہیں لگے گی۔ آپ کا خیال ہے۔

آپ یہی جگہ کیا سمجھے ہوئے ہیں۔

یہی کہ جس محفل میں ہر ژولیدہ مزاج، رنگین طبع اور آشفتہ سرمایہ چھلکا سکتا ہے جہاں زر و جواہر اور شان و شوکت کی پوجا کی جاتی ہو وہ اس رندِ خرابات کیلئے کیونکر سازگار ہو سکتی ہے جو مے کو مے اور ساقی کو ساقی سمجھ کر جان و دل اور ہوش و حواس نچھاور کر دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

مگر آپ کا درجہ تو ان لغویات سے بالاتر رکھا جائے گا۔

"آپ کے نزدیک؟ مانے لیتا ہوں مگر آپ کی والدہ سرپرست اور رفیقِ کار کیسے برداشت کر لیں گے کہ عمر بھر کا جمع کیا ہوا سونے کا ذخیرہ یوں لٹ جائے اور ان کی امیدوں کے چنے ہوئے موتی اس طرح چرا لئے جائیں۔

"سب کچھ سہی پھر بھی میں اپنی مرضی کی مختار ہوں"

تاہم ان کے کئے کرائے پر آپ پانی نہ پھیر سکیں گی۔ آپ کا دل اور روح یقیناً بلند نسائیت سے بھرپور اور پاکیزہ جذبات سے لبریز ہے لیکن اپنے گھر والوں کی بڑھی ہوئی ہوا و ہوس اور ضرورتوں کے پیشِ نظر گناہوں کی دلدل سے چھٹکارا ممکن نہ ہوا، ایسی صورت میں ہی بدعنوانیاں، بدکرداریاں، اور رسوائیاں نمودار ہوئے بغیر نہ رہیں گی جن کے تصور سے بھی روح مجروح ہو جاتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایک طوائف کا شانہ ہر روپ میں ہزار رنگ افشانی، لاکھ باغ و بہاری اور بے شمار دلفریبی کے باوجود ہولناک گناہوں کا گہوارہ خوفناک تباہیوں کی آماجگاہ اور عبرتناک افسانوں کا مخز ہوتا ہے۔ اس فضا میں جنہیں چند سانس لینے کی مہلت مل جاتی ہے وہ لغزشِ پا اور جراتِ رندانہ میں طاق و یوبند ہو جاتے ہیں۔ ایک ناگن سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی فطرت بھول جائے۔ زہر سے یہ امید رکھنا کہ وہ حلق سے اترنے کے بعد قلب و جگر کو تقویت بخشے گا، ایک قسم کی معصومیت ہے۔

ناگوارِ خاطر نہ ہو تو ایک بات پوچھوں۔

شوق سے۔

کہتے ہیں کہ عدالتی قسم کے لوگ سخت مزاج اور خود غرض ہوتے ہیں۔ انہیں ہمدلی اور سلیم ذوقی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

ممکن ہے ایسا ہی ہو۔

پھر آپ روایات کے خلاف اونچ نیچ پر غور کیوں فرما رہے ہیں۔

اپنی اپنی طبیعت ہے۔

بجا فرمایا۔ بس تو یہ بھی اپنی اپنی طبیعت ہے کہ ہم میں سے بھی بعض لوگ عام روایات کے برعکس سوز و ساز اور مذاقِ درد سے آشنا ہوتے ہیں۔ آپ نے اکثر اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ فلاں گاؤں میں ایک نوجوان سو رہا تھا کہ اچانک ایک زہریلی ناگن وہاں آ نکلی مگر اس نے اس خوابیدہ نوجوان کو کوئی ایذا نہیں پہنچائی۔

پڑھا ہے!

شکریہ۔ نوٹ فرما لیجیے کہ بعض ناگنیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف بعض نوجوانوں کو نہیں ڈساکرتیں

میں اس کی زبان سے یہ چست جملہ سنکر حیران رہ گیا۔

شاید یہ بھی حقیقت ہو اور اسے جھٹلایا نہ جا سکے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ جان بوجھ کر زہر کھا لیتے ہیں اور اپنی دانست میں جانکنی اور خودکشی کیلئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے پھر بھی ڈاکٹروں کی معمولی سی تدبیر اور دوا سے وہ بچ جاتے ہیں۔ اور زہر کی سمیت انہیں ضرر نہیں پہنچاتی۔ ذہن نشین فرما لیا جائے کہ بعض اوقات زہر کھانے والے کی دل افگاری اور جگر کاری کے حضور زہر جیسی مہلک شے بھی خلافِ معمول زہر افشانی سے عاجز ہو کر رہ جاتی ہے۔

میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس نے میری طرف!

اس دلکش انداز پہ پیار آگیا۔ جی چاہا کہ کلیجے

میں کھولوں لیکن ہمت نہ پڑی۔ وہ اپنے چبھ چبھ جانے والے فقروں کے ذریعہ وہ کچھ کہہ چکی تھی جو ایک شاہد رعنا کی دسترس سے باہر تھا۔ پارک کی ہری ہری گھاس، ہرے ہرے درخت اور لوہے کے مضبوط جنگلے سب ہنس ہنس کر میری بوالعجبی کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ بات بدلنے کیلئے میں نے کہا چلئے ذرا ٹہل آئیں۔ وہ اور میں پارک میں داخل ہوگئے۔ اب شام ہو چلی تھی۔ چلتے چلتے اس نے نیچی نگاہ کرکے کہا۔ لوگ کہتے ہیں ہمیں مہر و وفا کی ہوا بھی نہیں لگتی۔ تہذیب و شرافت ہم سے دور بھاگتے ہیں۔ محبت ہمارے لغت میں ایک ایسا لفظ ہے جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوتا۔ مگر کون جانے کہ نفرت و حقارت کی ہم زندہ لاشوں کے پہلوؤں میں بھی دھڑکتے ہوئے دل ہوتے ہیں جن میں عام نسوانی تاثرات کی طرح سوز و گداز اور احساس جمیل ہونے کی طرح موجود ہوتا ہے۔ جان پر کھیل جانے والی ہولیاں ہم لوگ بھی کھیل سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا نام آتے غارت گری کی تمام دفعات ہم پر لگادی جاتی ہیں۔ سنجیدہ پیشانیوں پر بل پڑجاتے ہیں۔ سماج کے شفاف دامن پر بدنما دھبا لگ جاتا ہے۔ صنفِ لطیف کی توہین ہو جاتی ہے۔ کوئی آنکھ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتی۔ کہ ہمیں حیات و موت کی اس دلشکن اور رنگ پاش گھاٹی میں گھسیٹ لانے کی ذمہ داری کس پر ہے اور تڑپا تڑپا کر طعنے دے دیکر، نام رکھ رکھ کر، فنا کے گھاٹ اتارنے کے فرائض کون انجام دیتا ہے۔

وہ دل کی بھڑاس نکال رہی تھی اور میں بات کا رُخ بدلنے میں مصروف تھا۔ اب اندھیرا ہو چکا تھا۔ اور پارک کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ روشنی میں اس کے لباس کی جھلمل اور حسن کی بہار دوبالا ہو گئی تھی۔ جب وہ بھیجے ہوئے انداز سے مجھے مخاطب کرتی تو یہ گمان ہوتا کہ زمانے بھر کا فلسفہ اور زور بیان اس کی زبان میں کھنچ کر آ گیا ہے اور جب وہ خاموش ہو جاتی تو حسن چہرۂ زیبا پر کھیل کھل جاتا۔ اور حسن کی فتنہ زائیوں پر دل لوٹ لوٹ جاتا۔ آخر پارک کا دروازہ آ گیا اور ہم دونوں تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ گویا نہ اب اس میں بولنے کا دم تھا نہ مجھ میں سننے کی طاقت!

"شاہین" میں نے ذرا دلنوازی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

جی!

ایک بات پوچھوں۔

پوچھئے۔

بُرا تو نہیں مانیں گی آپ ——— اس نے مایوس کن نظروں سے میری طرف دیکھا گویا یہ کہہ دینا چاہتی تھی کہ میرے دل کے ٹکڑے اُڑا ڈالے جب میں نے کچھ نہ کہا تو اب کیا بُرا مانوں گی۔

میں شرمسار ہو کر رہ گیا۔

میرے یوں چپ ہو جانے پر وہ ذرا تازگی کے ساتھ بولی۔ پوچھئے۔

سچ سچ بتا دوگی۔

بالکل۔

آپ سے کتنے نوجوانوں نے محبت کی ہے؟

اس سوال سے وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگی لیکن بظاہر پھیکی ہنسی ہنس کر جواب دیا "بہت سے نوجوانوں نے" جواب دینے کو تو دے گئی مگر آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے بھی بات کا پہلو بدل دیا کہ کہیں یہ ناسور جو اندر ہی اندر رس رہا ہے پھوٹ نہ بہے۔ ایک منٹ خاموش رہ کر اس نے ذرا شوخی سے کہا۔

میں بھی کچھ پوچھ سکتی ہوں۔

بڑی خوشی سے۔

آپ پوری ذمہ داری سے جواب دینگے؟

بے شک۔

آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟

یہ سوال نہیں تھا ایک قسم کی آتش سیال تھی جو میرے جسم کے گوشے گوشے میں پھیل کر فروزاں تھی۔ کاش وہ یہ سوال نہ کرتی میں بھوکھلا سا گیا۔

اس نے تیر نشانے پر دیکھکر ذرا مضبوط دل سے کہا۔ سُن لیا آپ نے؟

جی ہاں!

پھر جواب؟

میں نے ہوش بجا کرکے اس کی طرف دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دیا۔

اس نے بلاتکلف ٹھوڑی پکڑ کر میرا منہ اپنی طرف کر لیا۔ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اس چلتے ہوئے جادو کو کون روک سکتا تھا۔ دل بے قابو ہوگیا۔ اور آنکھوں سے چند آنسو علوئے جذبات، دل کا طمانیت، قلب کا سکون اور نظروں کا بھرم اپنے ساتھ لے کر نکل پڑے۔

ہم دونوں ایک دم کھڑے ہو گئے۔ نہ آگے اس نے کچھ پوچھا نہ میں نے کچھ جواب دیا بالکل خاموش ہم دروازے تک آگئے یہاں پہنچکر اس نے اس طرز سے مسکرا کر کہا جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہیں ہے۔ دیکھئے اب زیادہ راہ نہ دکھائیے کس دن تشریف آئینگے؟

جس روز بھی فرصت ہوگی

اسی ہفتہ میں۔

کوشش کرونگا۔ وہ جانے لگی ستم کیش نے

چلتے وقت نیم وا نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور میں تڑپے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ چلی گئی اور میں پارک گیٹ کے قریب ایک بنچ پر بیٹھ کر گزرے ہوئے واقعات کا جائزہ لینے لگا۔ مگر اس کی عدم موجودگی میں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا اور دل پر ایک بوجھ لئے ہوئے گھر واپس آ گیا۔

دوسرے دن شب کو میں اپنے کمرہ میں لیٹا ہوا عدالتی کاغذات کی دیکھ بھال میں اچٹی ہوئی طبیعت کے ساتھ مصروف تھا کہ "شاہین" کا خیال آ گیا۔ غیر مرئی طور پر کاغذات کا بستہ الماری میں رکھ کر چپ چاپ پلنگ پر لیٹ گیا۔ یہ معلوم ہوا جیسے وہ میرے سامنے کھڑی ہے اور مسکرا کر پوچھ رہی ہے آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟ وہی پھول سا چہرہ، مدھ بھری انکھیاں، کامنی سا جسم شرم انگیں انداز، مجھے کمرے میں وحشت ہونے لگی جی چاہتا تھا کہ جس طرح بھی بن سکے اُسے یہاں لایا جائے اور پھر کبھی علیحدہ نہ ہونے دیا جائے۔ خیال آیا وہ تو دلسوزی اور دلنوازی کیلئے ہر وقت تیار ہے۔ پھر کیوں نہ اسی وقت جایا جائے اور دل کی نگریا بسائی جائے۔ ایک پری چہرہ لڑکی جس پر دل لوٹا پڑتا ہو۔ کوئی بھی کیوں نہ ہو بہرحال چاہنے کی جان ہے مگر ہوش و خرد اور ضمیر اجازت نہیں دیتے تھے۔ بار بار یہی سوال درپیش ہوتا تھا کہ ایک طوائف کی لڑکی سے محبت کر کے رسوائی اور بدنامی مول لی جائے یا دیدہ و دل کا خون کیا جائے پھر اپنے خاندان کا پاس احباب کا ڈر اور پاس پڑوس کا لحاظ ایسی چیزیں نہیں تھیں کہ ایک موہوم توقع پر قربان کر دی جاتیں چنانچہ اتنی وارفتگی اور وانسیت کے باوجود کلیجہ مسوس کر رہ جانا پڑا۔ اور اس جانِ بہار کو کانٹوں میں سے نکال لینے کا خیال ترک کرتے ہی بنی۔

اس کے بعد جب کبھی "شاہین" سے ملنے کا ارادہ کرتا تو رسوائی کا خوف دامنگیر ہو جاتا سب سے زیادہ مجھے اپنے والدین کے غم و غصہ کا کھٹکا تھا۔ اور خوب جانتا تھا کہ "شاہین" کے متعلق ان کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو ان کے بزرگانہ احساسات کو صدمہ پہنچے بغیر نہ رہے گا۔ اور پھر اس گھر میں رہنا میرے لئے دوبھر ہو جائے گا۔ اسی سوچ بچار اور کشمکش و پیچ میں دو ہفتے گزر گئے لیکن میں شاہین سے ملنے کی جرأت نہ کر سکا۔

ایک اتوار کو دن کے گیارہ بجے کام ختم کر کے میں آ رہا تھا کہ اسی پارک کے قریب دھوپ میں شاہین کو کھڑے ہوئے پایا۔ اُسے دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ پھر کسی دردناک خیال کے آتے ہی اوس سی پڑ گئی۔ وہ بھی فکرمند معلوم ہوتی تھی۔ ہم دونوں بغیر کچھ کہے سنے پارک میں داخل ہو کر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ اس نے میری طرف دیکھ کر صرف اتنا کہا کہ آپ کو فرصت ہو گئی؟ اور منہ پھیر کر رونے لگی۔

شاہین؟ یہ کیا!

بس رہنے دیجئے۔

یقین جانیئے کام سے فرصت ہی نہیں ملی

اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا پیار سا آ گیا۔ میں نے اس کے رخسار پر ہلکے سے تھپکی دے کر کہا۔ اب ایسا نہ ہوگا۔ بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر یہ قرار پایا کہ جب اس کا جی چاہے گا وہ اور جب میرا جی چاہے اسی جگہ بلا کر جی ٹھنڈا کر لیا کریں گے۔

اب یہ معمول بندھ گیا کہ تقریباً ہر اتوار کو وہ پارک میں آ جاتی اور ہم ٹہلتے ٹہلتے دور نکل جاتے باتیں کرتے ہوئے ہماری گفتگو کے مختلف عنوان ہوتے۔ کبھی محبت کی ستم ظریفیوں پر بحث ہوتی کبھی سماج و دنیا پر۔ وہ ہر معاملہ میں ایک صائب الرائے اہل نظر کی طرح حصہ لیتی۔ اور ہر بار مجھے قائل کرنے کی فکر میں رہتی اور میرے ہار مان لینے پر بھی پیچھا نہ چھوڑتی۔ لیکن جب وہ خود ہارنے والی ہوتی تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیتی اور ساری محنت پر پانی پھر جاتا۔ میں اس کا کبھی انتظار نہیں کرتا۔ دراصل وہ اسی امر کا موقع بھی نہیں دیتی تھی۔ ہم میں روز بروز التفات بڑھتا جاتا تھا۔ اور اس کا سہرا ہے۔ ملاقات سے اس کے دل کی کلیاں بھی کھلتی جا رہی تھیں۔ مہینوں یہ کیف پرور سلسلہ جاری رہا۔ مگر ایک اتوار کو جب میں ادھر سے گزرا تو اسے موجود نہ پایا۔ خیال ایسا تھا کہ پریشان کرنے کی غرض سے کہیں چھپ گئی ہے۔ میں ایکدم آگے نکلا چلا گیا۔ جیسے مجھے ٹھہرنے کا احساس ہی نہیں تھا لیکن کسی نے آواز دی۔ نہ میرا پیچھا کیا۔ تھوڑی دور جا کر اس خیال سے میں واپس ہو گیا۔ کہ کہیں اسے دیر تو نہیں ہو گئی ہے لیکن شام تک انتظار کرنے کے بعد بھی نظر نہیں آئی۔ کوفت ضرور ہوئی۔ مگر یہ سوچ کر دلجمعی ہو گئی کہ ضرور اسے کوئی کام ہو گیا ہوگا۔ دوسرے اتوار کو میں پھر پارک کی طرف سے گزرا مگر پیہم دو گھنٹے ادھر اُدھر گھومنے کے باوجود وہ نہیں ملی۔ اب تو دل بے چین ہو گیا۔ اس ہوشربا سانحہ سے میرے حواس بجا نہ رہے اور کھویا ہوا سا رہنے لگا۔ اس کی پیاری پیاری صورت بھولی بھالی باتیں اور دل افروز ادائیں

ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ کوئی لمحہ بھی اسکی یاد سے خالی نہ تھا۔ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے اس کا خیال دامنگیر تھا اور وہ فکر و خیال میں سما سی گئی تھی۔ کبھی اپنی خودداری اور بے اعتنائی پر غصہ آتا۔ کبھی یہ گمان ہوتا کہ کہیں اپنے گھر کی فضا میں وہ جذب تو نہیں ہوگئی ہے۔ سوچا کہ لاؤ اس کے گھر جا کر صورتِ حال دریافت کرلی جائے۔ مگر ہمت نہ ہوئی۔ پھر اس سے ملنے کیلئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی۔ اور میں نڈھال ہو کر رات دن جی کڑھانے اور آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہ کرسکا۔ بارے کچھ دن کی سراسیمگی کے بعد قلب کو ذرا سکون نصیب ہوا اب پہلی سی گھبراہٹ اور پریشانی تو نہ تھی پھر بھی اس کی میٹھی میٹھی یاد قلب و جگر میں چٹکیاں لیتی اور راز و نیاز کے بھولے ہوئے خواب یاد آجاتے تو دل کی پوری کائنات لرز جاتی۔ اور میں گھٹنوں میں منہ دے کے بیٹھ جاتا۔

ایک روز سینما دیکھ کر واپس آرہا تھا کہ میں نے اسے دو اجنبی حسین عورتوں کے ہمراہ ایک جنرل اسٹور میں دیکھا۔ ٹھٹک گیا۔ پیہم دس منٹ کھڑے رہنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ بہت دن بعد دیدار ہوا تھا ہونٹوں پر ہنسی آہی گئی۔ مگر اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ عجیب معمہ تھا۔ یہاں صورت دیکھنے کو جی ترس رہا تھا۔ اور وہاں بے اعتنائی برتی جارہی تھی۔ سوچا کہ دو عورتوں کی موجودگی میں شرماتی ہوگی۔ کچھ دور جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دو تین بار میری جانب دیکھا ضرور مگر اسی طرح جیسے فطرتاً عورت اپنی طرف دیکھنے والے مرد کو دیکھتی ہے۔ اس نظارہ میں التفات کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ ایک محبت بھری نظر کا یوں پھر جانا درد بھرے دل کیلئے کچھ کم روح فرسا نہیں ہوتا۔ میں ہکا بکا اسے دیکھا کیا اور وہ اُن عورتوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر چلی گئی۔ گھر آکر میں بے حس و حرکت پڑ گیا۔ جسم میں آگ سی لگ رہی تھی۔ کلیجہ منہ کو چلا آتا تھا۔ اس فوری انقلاب پر جتنا بھی غور کیا جاتا تھا اتنی ہی زیادہ کوفت ہوتی تھی۔ اپنے دل سے کہتا کہ آخر ہے نا طوائف کی لڑکی۔ اس سے جس قسم کی امید کی جاسکتی ہے ویسا ہی کر رہی ہے۔ پھر خیال آتا کہ اتنی بدظنی مناسب نہیں ہے۔ بہر حال وہ ایک عورت ہے اور پہلو میں درد بھرا دل رکھتی ہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی اور نڈھال ہو کر سو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو درد کے مارے سر پھٹا جاتا تھا۔ ہلکا ہلکا بخار بھی موجود تھا۔

بیماری کی چھٹی لے لی گئی۔ کچھ افسوس تھا کچھ غم و غصہ۔ جی چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ اس سے ملکر خواہ مخواہ کھنچنے کی وجہ پوچھی جائے اور اچھی طرح بتا دیا جائے کہ طوائف سب کچھ ہو کر بھی طوائف ہی رہتی ہے۔ دو روز تک پارک، سینما، تفریح گاہوں میں ڈھونڈا کیا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ تیسرے دن سہ پہر کو اس کے مکان سے کچھ فاصلہ پر جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس امید پر کہ شاید وہ باہر نکلے۔ ایسا ہی ہوا وہ تانگے میں سوار ہوئی اور میں بھی تانگہ لے کر اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ پارک کے قریب اتر گئی اور میں نے بھی اس کی پیروی کی میں یوں قریب پہنچ جانے سے وہ گھبرا سی گئی۔ میں نے قدرے ملامت سے کہا اتنا عرصہ کہاں رہیں؟

گھر ہی پر۔

یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ آپ گھر پر تھیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ پارک میں تشریف کیوں نہیں آئیں؟

فرصت ہی نہیں ملی۔

ایسے کیا مشکل کام درپیش تھے کہ مہینوں فرصت نہیں ہوئی۔ جی وہی۔ جو کہ ایک طوائف کی لڑکی کو ہو سکتے ہیں۔ بناؤ سنگھار، آرائش زیبائش، آنے والوں کا خیر مقدم، زرداروں کی آؤ بھگت، خاطر تواضع، میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا ــــــ "تو یہ ہیں"

اوہ آپ اسے ناممکن سمجھتے ہیں ایک طوائف کی لڑکی کیلئے جسے حسن و رعنائی سجدے کرتے ہوں، کوئی بات ناممکن نہیں ہوتی یہ عیش و نشاط، یہ معصیت و فریب تو ہماری جان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ہم دولت کے پجاریوں کو جس طرح بھی اور جس صورت سے بھی ہو دولت حاصل ہونی چاہیے۔ اسکی پروا نہیں کہ ہماری ٹھوکروں سے عالی شان محل لرزہ براندام ہو جائیں۔ سرسبز ڈالیاں ٹوٹ جائیں اور قیمتی جانیں تباہ ہو جائیں۔

آخر مجھ سے کیا ناراضگی ہے اور ایسی باتوں سے میرا دل کیوں دکھایا جارہا ہے۔

آپ ایک طوائف کی لڑکی سے ناراضگی کا سبب دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ناراضگی روپے کی جھنکار اور سنہری زیورات کی چکاچوند سے دور ہوسکتی ہے۔ ہم کیا اور ہم لوگوں کی ناراضگی کیا، بازاری مالن کی حسین ٹوکری کے تر و تازہ پھول جب چاہیے خرید لائیے۔

بس کیجیے اگر آپ کو نفرت ہی ہوگئی ہے تو آئندہ اپنی صورت دکھانے کی کوشش نہیں کرونگا۔

کون کہتا ہے کہ آپ مجھ سے ملنے نہ آئیں۔ ایک طوائف کی لڑکی کا کاشانہ ہر دولتمند کیلئے آغوش مراد کی طرح کھلا ہوا ہے میری حسین باہیں، چھلکتے ہوئے پیمانے، مہکتی ہوئی فضائیں آپکی دلبستگی کے لئے حاضر رہیں گی۔

آپ چاہتی ہیں کہ میں زندہ درگور کر دیا جاؤں؟

آپ رو رہے ہیں مجھ پر، نہ روئیے، میری تردامنی، بدشعاری اور گنہگاری پر مٹھیاں بھینچ بھینچ کر لعنت کرنے کیلئے سماج کے دیوتا، سوسائٹی کے علمبردار، اخلاق کے جویا، اور تہذیب و شرافت کے مدعی کچھ کم نہیں ہیں۔

اس کی ہر بات ایک نشتر سے کم اذیت کوش نہیں تھی۔ میرے لئے دُنیا اندھیر تھی۔ ہوش و خرد جواب دئے دیتے تھے۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ در و دیوار اور زمین و آسمان ہنس رہے ہیں لیکن ان بدترین حالات کی موجودگی میں بھی اس نوبہار چہرہ پر حسن نچھاور ہوا جاتا تھا۔ اور مجھے صحیح معنی میں غصہ پر پیار آرہا تھا۔ میں نے ناامیدیوں میں گھر کر ڈرتے ڈرتے کہا۔

ایک بات مانو گی۔ آخری بار آخری بات؟

کہئے ماننے کی ہوگی تو مانوں گی۔

چلئے تھوڑی دیر ٹہل آئیں نہ جانے پھر ملنا ہو یا نہ ہو۔ وہ بھی میری آخری خواہش کو ٹھکرا نہ سکی۔ دونوں پارک میں داخل ہوگئے۔ یہ خیال دل کو ہولائے دیتا تھا کہ آج کے بعد وہ دلگداز لمحے پھر میسر نہ ہونگے۔ وہ بار بار کچھ کہنے کا ارادہ کرتی مگر مجھے گم سم دیکھ کر رہ جاتی —— میرا یہ حال تھا کہ انتہائی صدمہ کی وجہ سے چپ لگ گئی تھی۔ دل ہلاک روح زخمی، اور کلیجہ چھلنی ہوا جاتا تھا۔ پاؤں میں اُٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ مگر حسن کی ملکہ کے ساتھ ساتھ بے اختیار چل رہا تھا۔ پارک کے اخیر دروازے پر پہنچ کر رکنا پڑا۔ اس نے لاپروائی سے کہا۔

اب ہم جاتے ہیں۔

آپ جا رہی ہیں اچھا! لیکن اتنا کرم کیجئے کہ اپنی ایک تصویر ڈاک کے ذریعہ ضرور عنایت فرما دیجئے گا تاکہ اپنے سنہری خوابوں کی ملکہ کو نہیں تو اس کی شبیہہ ہی کو حرز جان بنا سکوں۔

وہ بالکل خاموش تھی۔

"شاہین"

اگر آپ بھی تبادلہ میں اپنی تصویر بھیجنے کا وعدہ کریں۔

میری تصویر؟ کس لئے۔ میں نے قدرے خوشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اسلئے کہ میں نے جن نوجوانوں کو فریب دینے کی کامیاب کوشش کی ہے، ان کے البم میں ایک اور دلچسپ تصویر کا اضافہ کیا جاسکے۔

کلیجہ بیٹھ گیا۔ تاہم تصویر کا وعدہ کر کے ایک شکست خوردہ انسان کی طرح گھر واپس آگیا۔ اس کے بعد ہفتوں طبیعت ٹھکانے نہیں آئی۔ دل کی جگہ پہلو میں آگ سی رکھی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ دماغ سے سوچنے کی قوت سلب ہو چکی تھی۔ اور سینے پر ایک بھاری سا پتھر رکھا ہوا معلوم دیتا تھا۔ بہت دنوں بعد کہیں جا کر سکون حاصل ہوا۔ اب میں ہولناک گناہ و فریب کو سامنے رکھکر اسے بھول جانے کی کوشش کرنے لگا کبھی پاپ کی پتلی سمجھ کر، کبھی معصیت و کفر کا مرقع گردان کر، کبھی دغا و فریب کی تصویر بنا کر، کبھی شیطانی قہقہوں اور چڑیلوں کی مسکراہٹوں کا آئینہ قرار دے کر اس سے نفرت کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن ہر بار دل آڑے آجاتا۔ دل کی دھڑکنوں کا مطالبہ تھا کہ وہ لاکھ تغافل کیش، ستم آشنا اور فریب کی پتلی کیوں نہ ہو۔ لیکن ہم اس پر لوٹ پوٹ ہیں اور وہ ہماری کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس سے نفرت کرنا بھی میرے امکان سے باہر تھا۔ اور ایسے موقعوں پر سوائے دم بخود رہ جانے کے مجھ سے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

دن گذرتے گئے اور رفتہ رفتہ دل کا بوجھ اتر تا گیا۔ اب میں عدالتی کام میں پوری دلچسپی لینے لگا۔ شاہین کی یاد ضرور آتی۔ مگر اس کی یاد سے وحشت نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ایک قسم کی مسرت ہوتی تھی۔ بھولے ہوئے خواب قندِ مکرر کی طرح اب بھی آتے ضرور تھے لیکن پریشان کن نہیں تھے۔ زندگی میں پھر زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ جب کبھی وہ زیادہ یاد آتی تو اسکی تصویر سے باتیں کر کے جی بہلا لیا جاتا۔

عید کی دلنواز صبح کو سب کے ساتھ بے پناہ شادمانی سے کرمیں بھی اٹھا۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے اور ہنستی ہوئی خوشیوں میں نماز ادا کی۔ دوست احباب اور عزیز و اقارب کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ ہر طرف خوشی و خوشنودی کا دور دورہ تھا۔ چہل پہل، فرحت کے سامان انبساط کی گھڑیاں۔ نشاط انگیز لمحے اس رنگین ماحول میں شاہین کی یاد نے کچھ اس انداز سے دل میں چٹکی لی کہ میں بے چین ہوگیا۔ وہی میٹھی میٹھی نگاہیں۔ شاداب شاداب چہرہ کافر کافر ادائیں ایسا معلوم ہوا کہ وہ پوری حشر سامانی کے ساتھ کھڑی ہے اور مسکرا کر پوچھ رہی ہے۔ آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟ میں گھبرا کر اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ ایک طوائف کی لڑکی ہے اور اس کا مکان دولت کا گہوارہ، یہی سوال سب سے پہلے سامنے آیا۔ عقل و ضمیر نے بہت زور لگایا۔ مگر دل پر کسی کا بس نہیں چلا۔ اور میں نے ایک بیخودی کے عالم میں کیش بکس کھول کر اپنے کوٹ کی دونوں جیبیں نقدی اور نوٹوں سے بھر لیں۔ اور تین بجے کے قریب چل کھڑا ہوا۔

اس کے مکان پر پہونچا حسن افروز سے ملاقات ہوئی۔ دیکھتے ہی لپٹ گیا۔ کسی دوست سے ملنے کی غرض سے باہر نکلا تھا۔ میں نے بلاتکلف شاہین کے متعلق پوچھا۔ اس نے

قدرے پریشانی کے ساتھ بتایا کہ
وہ صدر دروازہ کے اوپر والے کمرے میں ہے
لیکن کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے آپ
اندر تشریف رکھیں۔ میں ایک دوست سے
مل کر ابھی آتا ہوں۔ میں ذرا ٹھٹکا۔ وہاں کوئی
اور بھی تو موجود ہوگا۔ عید کا روز ہے جشن و
جوانی کی سرفرازی کا دور —— لیکن اس
خیال کے پیش نظر کہ میری دونوں جیبیں لبریز
ہیں اور کچھ حسین لمحوں کی پوری پوری قیمت
ادا کر سکتا ہوں۔ میں بلا کسی غم و فکر کے صدر
دروازہ کے قریبی زینہ پر چڑھ گیا۔ کواڑ بند
تھے۔ جھریوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ وہ
پلنگ پر لیٹی ہوئی کسی چیز کو دیکھ رہی تھی۔
دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا مگر ایکدم حیران
رہ گیا۔ خلاف توقع وہ معمولی سی سفید ساڑی
میں ملبوس تھی۔ اور تکیہ کو سینے کے نیچے دبائے
ہوئے کسی چیز کو دیکھنے میں ہر طرح غرق تھی۔
وہ سیاہ پریشان زلفیں بے ترتیبی سے تکیہ
پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے کمال حیرت کے
ساتھ آہستہ سے قدم آگے بڑھایا۔ وہ اس
قدر محو تھی کہ میرے آنے کی بھی اُسے خبر
نہ ہوئی۔ غور سے اس لطیف شے کو دیکھا جس پر
اس کی نورس انگلیاں جم کر رہ گئی تھیں —
— میں بالکل ششدر رہ گیا۔ جسم کا رواں
رواں کانپنے لگا۔ "وہ میری تصویر تھی"
"مسرت، تعجب اور خوشی کے مشترک جذبات
کے ساتھ میں نے نرمی سے آواز دی —
"شاہین" وہ چونک گئی، منہ پھیر کر میری
طرف دیکھا اور شرما کر تصویر پر کتاب رکھ دی
بجلی کی لپک کے مانند غیر ارادی طور پر شباب
کے اس دلپذیر مجسمہ کو میں نے پلنگ پر
سے اٹھا لیا اور اب میرے بازوؤں کی گرفت
میں رنگ و بو میں ڈوبی ہوئی ایک کافر جوانی تھی۔

"شاہین" میں نے اس کے عرق آلود چہرے اور پُرسکون بند آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جی، اس نے آہستہ سے اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر کہا۔ آنکھیں ابھی تک بند تھیں "سچ مچ آپ نے میری دُنیا جگمگا دی"

اس نے آہستہ آہستہ نم دیدہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا پھر آنکھیں بند کر کے جواب دیا۔

ناگن سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی فطرت بھول جائے ایک قسم کی معصومیت ہے۔

اسے آہستہ سے پلنگ پر لٹا کر اور اس کے پاس بیٹھ کر پورے جذبات کے ساتھ میں نے کہا

شاہین! آپ نہیں جانتیں بعض ناگنیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف بعض نوجوانوں کو نہیں ڈسا کرتیں۔

تبسم کی ایک ہلکی سی دھاری ان بادہ ریز ہونٹوں پر نمودار ہو گئی۔ اور محبوبۂ بہار کو تبسم بار دیکھ کر میں بھی شگفتہ ہو گیا۔

شاہین، آج کا دن یونہی گذر —— جائیگا۔

اوہ، آپ آگئے۔ وہ تر و تازہ ہو کر بولی۔

جی نہیں، آپ خواب دیکھ رہی ہیں۔

ہم دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

چلئے ذرا سیر کر آئیں۔

وہ کپڑے بدلنے کیلئے نیچے چلی گئی۔ اور میں نے نوٹ بک نکال کر کسی خاص جذبے کے ماتحت کچھ لکھ لیا۔ لکھا کیا تھا۔ میں خود بھی بھول گیا یوں سمجھئے کہ دل نے کچھ لکھوایا تھا اور میں نے لکھدیا تھا۔ اب لاکھ عقل دوڑائیے، بیسود۔ کچھ بھی یاد نہیں آتا۔ فقط۔

ہم بزمی دشمن کو چھپانا ہی تھا قاصد
کہتا ہے کسی سے کوئی ناداں خبر ایسی

اردو شاعری اور عورت

(بقیہ صفحہ ۴۰)

(۹) نزاکت تخلص۔ امجو نام۔ متوطن نانپور ل ابتدائے جوانی سے دہلی میں قیام کیا حسن و جمال میں آفتاب ماہتاب۔ خوشرو، خوشخو، خوش فکر ذہین و طباع۔ علوم و فنون سے آراستہ و پیراستہ سخن سنج و سخنگو، بامروت و با اخلاق، پیشے کے ناپسندیدہ اطوار و اوضاع سے متنفر، طرز کلام اچھا ہے۔ یہ نمونہ ہے ؎

بسکہ رہتا ہے یار آنکھوں میں ... ہے نظر بیقرار آنکھوں میں
محفل گرخاں میں وہ عیار ... لیگیا دل ہزار آنکھوں میں
سرمۂ خاک پا عنایت ہو ... آگیا ہے غبار آنکھوں میں

کہئے جو رقیبوں سے برائی تو کہے وہ
ہے وہ ہی وفادار جو ایسوں سے بنا ہے
پڑا ہے خون دل سب سے قدم تک جا بجا میرے
بنا یہ تھا مجھے گویا کہ خاک کوئے قاتل سے
کہتا ہے آپ کی بھی ہے کیا عاشقی غلط
گر کہئے تیرے عہد میں الفت نہیں رہی
کیا کیا عذاب اُٹھائے ہیں اندوہ عشق کے
جز نام اب تو کچھ بھی نزاکت نہیں رہی
ہوں نزاکت والے کوئی کیا ذکر
دم رخصت تری سنبھال سکے
کیوں نہ میں قربان ہوں جب وہ کہے ناز سے
ہم کو جفا کا ہے شوق اہل وفا کون ہے
مرے شوق نہاں کی تاثیر دیکھو
کہ دلدار بھی دلربا جانتا ہے
نزاکت ہوں ہر ناتوان محبت
لطیفہ مرے نام کا جانتا ہے
منصفی اور اے بت بیداد گر ایسی
چاہت تری غیروں کو بھی ہوگی مگر ایسی
فرمان ہے گر چاہ کی تعزیر تو ظالم
تقصیر نہ ہوگی کبھی بار دگر ایسی م

افکارِ مسلسل

خاص برائے مست قلندر

از جناب سردار جلیل شیرکوٹی الٰہ آباد یونیورسٹی

مجھے ناکامیٔ پیہم سے گھبرانا نہیں آتا!
مجھے طوفان کی موجوں میں بہہ جانا نہیں آتا

دلِ نادان کو باتوں سے بہلانا نہیں آتا
تڑپ جاتا ہوں لیکن مجھ کو تڑپانا نہیں آتا

ڈٹا رہتا ہوں مثلِ کوہ طوفانِ حوادث میں
مجھے طوفاں میں مثلِ برگ بہہ جانا نہیں آتا

ہنسا کرتا ہوں میں بحرِ حوادث میں بھی پھنس پھنس کر
مصیبت میں بھی مجھ کو اشک برسانا نہیں آتا

جلا سکتا ہوں میں اک آن میں کل خرمنِ ہستی
میں پروانہ ہوں لیکن مجھ کو جل جانا نہیں آتا

تلاطم خیز ہوں موجیں کہ گردابِ فنا آئے
مجھے منزل پہ آ کے لوٹ کر جانا نہیں آتا

تنا رہتا ہے میرا سر، مرے بازو، مرا سینہ
کسی طاقت کے آگے مجھکو جھک جانا نہیں آتا

جو سر جائے اسی پر ٹوٹتی ہیں بجلیاں میری
کسی مجبور پہ مجھ کو ستم ڈھانا نہیں آتا

میں ہر ردِ عمل کے واسطے تیار رہتا ہوں
مجھے اپنے کئے پر آپ پچھتانا نہیں آتا

چلا جاتا ہوں بے خوف و خطر میں اپنی منزل پہ
مجھے ہر گام پر ساحل سے ٹکرانا نہیں آتا

رہائی کی کیا کرتا ہوں میں دن رات تدبیریں
قفس میں ہوں مگر گھٹ گھٹ کے مر جانا نہیں آتا

جھکا لیتا ہوں میں گردونِ دوں کو اپنے قدموں پر
مگر مجھ کو کسی کے آگے جھک جانا نہیں آتا

میں ہنس ہنس کر سہا کرتا ہوں ہر جور و جفا لیکن
مجھے آنکھوں میں اپنی اشک بھر لانا نہیں آتا

گذر جاتا ہوں میں تو پابرہنہ خارزاروں سے
مجھے کانٹوں سے بچ بچ کر نکل جانا نہیں آتا

پڑا رہتا ہوں میں چپ چاپ اک تاریک گوشہ میں
مجھے اوروں کی طرح ٹھوکریں کھانا نہیں آتا

میں قانع ہوں جلیل اپنی گلیمِ پارہ پارہ میں
مجھے لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں آتا

ایک لرزہ خیز افسانہ

ہڈیوں کا ڈھانچہ

از جناب مسعود جاوید

جس کمرے میں ہم سب لڑکے سویا کرتے تھے۔ اس کے ملحقہ کمرے کے اندر ایک انسانی ڈھانچہ لٹکا ہوا تھا۔ رات کے وقت نسیم شبی کی موجیں اس کی ہڈیوں سے کھیلتی تھیں اور ڈھانچہ کھڑکھڑانے لگتا تھا۔ دن میں ہم خود اپنے ہاتھوں سے اس کو کھڑکھڑایا کرتے تھے واقعہ یہ ہے کہ ہم کیمبل میڈیکل اسکول کے ایک طالب علم سے "علم استخواں" کے اسباق لے رہے تھے۔ کیونکہ ہمارے سرپرست شاید یہ عزم صمیم کر چکے تھے کہ ہمیں تمام علوم کا ماہر بنا کر چھوڑیں گے۔ ہمارے بزرگ اپنے اس ارادے میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔ یہ بات اُن لوگوں کو بتانا بیکار ہے جو ہم سے واقف ہیں اور جو لوگ ہمیں نہیں جانتے اُن سے اس راز کا پوشیدہ رہنا ہی بہتر و مناسب ہے۔

اب اس زمانے کو گذرے بہت سال ہو گئے ہیں۔ اس اثنا میں کمرے سے وہ ڈھانچہ ... ہمارے دماغوں سے "علم استخواں" اس طرح ایک ... ہو چکا ہے کہ کوئی نشان بھی باقی نہیں رہا۔

... ایک روز کا واقعہ ہے کہ ہمارا مکان ... سے لبریز تھا۔ اور مجھے مجبوراً اسی قدیم ... میں ساری رات گذارنی تھی۔ کمرے ... میرے واسطے اب اجنبی ہو چکا تھا۔ ... نیند نے آنے سے انکار کر دیا۔ ... بستر پر لیٹا ہوا بے چینی سے کروٹیں ... قریبی گرجا کے گھنٹہ گھر کی سریلی ... بعد دیگرے سن رہا تھا۔ آخر کار کمرے کے ایک گوشے میں رکھا ہوا لیمپ چند لمحات کی دم اور پھڑپھڑاہٹ کے بعد ایکدم گل ہو گیا۔ ہمارے خاندان کے اندر حال ہی میں چند اموات واقع ہو چکی تھیں اسلئے لیمپ کے اچانک بجھ جانے سے میرے خیالات فطری طور پر موت کی طرف مبذول ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ فطرت کی اس عظیم الشان تماشا گاہ میں ایک لیمپ کی روشنی کا یوں ایکایک ابدی تاریکی میں گم ہو جانا بالکل اتنی ہی وقعت رکھتا ہے جتنی کہ ہماری بے مایہ انسانی زندگیوں کا اس روشن دنیا سے دن یا رات کے وقت معدوم ہو جانا۔

میرے خیالات کے سلسلے نے مجھے ہڈیوں کا وہ ڈھانچہ یاد دلا دیا۔ میں تصور کرنے لگا کہ نہ جانے وہ جسمانی گوشت و پوست کا لباس کیسا ہوگا جو کبھی اس ڈھانچہ کو ملفوف کئے ہوئے تھا کہ عین اسی وقت مجھے اچانک ایسا محسوس ہوا کہ کوئی چیز کمرے کی دیواروں کے سہارے راستہ ٹٹولتی ہوئی میری چارپائی کے چاروں طرف طواف کر رہی ہے۔ مجھے اس کی تیز سانس کی آواز بھی آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسی چیز کو تلاش کر رہی ہے جو اُسے نہیں مل سکی۔ اور کمرے کے اندر اس کے قدموں کی رفتار لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ سب کچھ خود میرے محروم خواب اور پریشان دماغ کا محض ایک وہم ہے اور دوڑتے ہوئے قدموں کی یہ آواز درحقیقت خود میرے کانوں کے نیچے والی شریانوں کی دھمک ہے۔ بایں ہمہ ایک سرد تھرتھری میرے تمام جسم پر طاری تھی۔ اس واہمہ سے نجات پانے کے لئے میں نے زور سے پکارا ـــــ "کون ہے؟" ـــــ قدموں کی آواز میری چارپائی کے پاس رکتی ہوئی معلوم ہوئی اور جواب ملا ـــــ "میں ہوں۔ میں اپنے ڈھانچہ کو تلاش کرنے آئی ہوں"۔

یہ بالکل لغو بات معلوم ہوتی تھی کہ میں خود اپنے تصور کی مخلوق کے سامنے کسی خوف کا اظہار کروں اور اسلئے میں نے اپنے تکیہ کو قدرے اور مضبوطی سے پکڑ کر ایک بے نیازانہ انداز میں کہا ـــــ "اتنی رات گئے یہ تلاش واقعی بہت ہی خوب ہے! ـــــ وہ ڈھانچہ اب تمہارے کس کام کا ہے؟"

اس مرتبہ جواب بالکل اتنے قریب سے آیا جیسے خود میری مچھردانی بول رہی ہو ـــــ "کتنا عجیب سوال ہے تمہارا!! ـــــ جانتے ہو اس ڈھانچے میں وہ ہڈیاں تھیں جو میرے دل کو اپنے حلقہ میں لئے ہوئے تھیں ـــــ اس ڈھانچہ پر میری زندگی کی چھبیس سال کی جوان رعنائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کیا اسے صرف ایک مرتبہ دیکھنے کی تمنا مجھے نہ ہونی چاہئے؟"

"یقیناً" میں نے کہا "تمہاری یہ تمنا مکمل طور پر معقول ہے۔ اچھا تو تم اسے تلاش کرو اور میں ذرا سی نیند لینے کی کوشش کرتا ہوں"۔

آواز نے کہا ـــــ "لیکن میرا خیال

ہے کہ تم تنہا ہو ـــ بہت خوب! ـــ میں ذراسی دیر کیلئے بیٹھی جاتی ہوں تاکہ ہم دونوں کچھ باتیں کرسکیں۔ بہت سال گذرے کہ میں لوگوں کے پاس بیٹھ جاتی تھی اور ان سے گفتگو کیا کرتی تھی۔ لیکن اب تو گذشتہ پینتیس برس سے میں مرگھٹ کی تیز ہواؤں میں کراہتی پھرتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ گئے گذرے زمانے کی طرح میں ایک بار پھر ایک مرد سے بات چیت کروں"

میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص ٹھیک میری مچھردانی کے قریب بیٹھ گیا ہے۔ میں نے خود کو موجودہ حالات کے حوالے کرتے ہوئے حتی المقدور اخلاق کے ساتھ کہا ـــ "یہ مشغلہ تو واقعی بڑا پرلطف رہے گا۔ آؤ کسی سرور کن عنوان پر گفتگو کریں"

"میرے خیال میں سب سے زیادہ پرلطف عنوان خود میرا افسانۂ حیات ہے۔ لو میں سناتی ہوں"

گرجا کے گھنٹہ گھر نے شیریں آواز میں دو بجائے

"جب میں زندہ انسانوں کی دنیا میں تھی اور نوجوان تھی تو میں ایک چیز سے اتنا ہی ڈرتی تھی جتنا کہ خود اپنی موت سے ـــ اور وہ ہیبت ناک چیز میرا شوہر تھا۔ میرے احساسات کا بالکل ایسا ہی عالم تھا جیسا کہ اس مچھلی کا جسے کانٹے میں پکڑ کر کھینچ لیا گیا ہو۔ مجھے محسوس ہوتا تھا گویا ایک اجنبی مرد مجھے ایک انتہائی نوکیلے تلخ کانٹے میں پھنسا کر میرے طفولیت کی سرزمین کے پرسکون ماحول سے زبردستی گھسیٹ لایا ہے اور اس سے نجات پانے کا اب کوئی ذریعہ نہیں۔ میرا شوہر میری شادی کے دو ماہ بعد مر گیا اور میرے بجائے میرے دوستوں اور رشتہ داروں نے درد انگیز ماتم کیا۔ میرے شوہر کے باپ نے بڑے غور سے میرے چہرے کا جائزہ لیکر میری ماں سے کہا ـــ "کیا تم نہیں دیکھتیں کہ یہ لڑکی منحوس جنم ہے؟" ـــ تم سن رہے ہو یا نہیں؟ مجھے امید ہے کہ تم اس کہانی سے محظوظ ہو رہے ہو؟"

"واقعہ تو یہ ہے کہ بہت کچھ" میں نے کہا۔ "اس افسانہ کا آغاز تو حد درجہ مزاحیہ ہے؟"

"اچھا تو آگے سنو ـــ میں انتہائی مسرت کے ساتھ اپنے والد کے گھر چلی آئی۔ اگرچہ لوگ اس امر کو مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے کہ مجھے قدرت سے ایک لاثانی اور روح افزا حسن و جمال ملا ہے تاہم میں اس راز سے بخوبی واقف تھی۔ میں بے پناہ رعنائیوں کی مالک تھی ـــ کیوں کیا میں جھوٹ کہتی ہوں؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ممکن ہے کہ صحیح کہتی ہو" میں نے کہا۔ "مگر یہ بات یاد رکھئے کہ میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا"

"کیا! ـــ مجھے نہیں دیکھا؟ ـــ کیا اس ڈھانچہ کو بھول گئے؟ ـــ ہا ہا ہا ـــ خیر رہنے دو۔ میں صرف مذاق کر رہی تھی میں تمہیں اب یہ کیسے یقین دلاؤں کہ ڈھانچہ کے ان دو بھیانک سوراخوں میں دنیا کی دو انتہائی درخشاں اور جذبات برخیز سیاہ آنکھیں پیوست تھیں؟ ـــ اور اب میں کیسے بتاؤں کہ ان یاقوتی لبوں پر طلوع ہونے والے تبسم کو ڈھانچہ کے ان گھگیاتے ہوئے دانتوں کی ڈراونی ہنسی سے کوئی بھی تعلق نہ تھا؟ ان سوکھی ہوئی ہڈیوں کے اوپر جو حسن و جمال، نرم نازک اور دلربا خطوط جسمانی کی جو رعنائیاں محشر خیز جوانی کے عالم میں کبھی طاری رہ چکی ہیں ان کی ایک خیالی تصویر تمہارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتی ہوں تو مجھے ہنسی آجاتی ہے ـــ یہ کوشش مجھے برہم بھی کرتی ہے میرے زمانے کے اعلیٰ ترین ڈاکٹروں کو کبھی یہ خواب بھی نہ آیا ہوگا کہ ایسے خوبصورت جسم کی ہڈیوں کو "علم استخواں" پڑھانے کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ ایک نوجوان ڈاکٹر جسے میں جانتی تھی مجھے ایک چمپا کے پھول سے تشبیہہ دیا کرتا تھا۔ گویا اس کے نزدیک باقی تمام دنیا کے انسان صرف انسان تھے ـــ حیاتیات کی موزوں مثالیں ـــ لیکن میں صرف ایک خوبصورت پھول تھی ـــ خوبصورت پھول یا خوبصورتی کا پھول ـــ پھر بھلا کون ہے جو ایک چمپا کے پھول کے ڈھانچہ کا تصور کر سکتا؟

میں جب خوش خرام ہوتی تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ایک خیال ہیرے کی طرح جو ہر طرف روشنی بکھیر دیتا ہے۔ میری ہر ایک حرکت چاروں طرف حسن و جمال کی لہر دوڑا رہی ہے میں گھنٹوں اپنے ہاتھوں پر نظر جمائے بیٹھی رہتی ـــ ان ہاتھوں پر جو دنیا کے انتہائی شریر و سرکش مرد کی مطلق العنانی کو خوبصورتی کے ساتھ سلب کر سکتے تھے۔

لیکن میرا وہ برہنہ اور ہیبت ناک ڈھانچہ تمہارے سامنے میرے متعلق غلط بیانی کرتا رہا ہے۔ اور مجھے اس کا موقعہ نہ ملا کہ اس شرمناک جھوٹ کی تردید کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ تم سے نفرت کرتی ہوں! ـــ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی مدفون شدہ رعنائیوں کی ایک جھلک دکھا کر تمہاری آنکھوں سے نیند کو ہمیشہ کیلئے کافور کر دوں اور اس کے ساتھ ساتھ "علم استخواں" کی ان تمام بیہودہ معلومات کو سمیٹ کر باہر پھینک دوں جو تمہارے دماغ میں بھری ہوئی ہیں"

میں نے کہا ـــ "اگر تمہارا خوبصورت جسم اسوقت تمہارے پاس ہوتا تو میں اسی کی قسم کھا کر کہتا کہ علم استخواں کا ذرہ بھی میرے دماغ میں باقی نہیں۔ اسوقت تو میرے دماغ پر اگر کوئی شے چھائی ہوئی ہے تو وہ صرف

حسن مکمل کی ایک ضو فشاں تصویر ہے جو رات کے تاریک پس منظر پر جلوہ فگن ہے۔ اس سے زیادہ میں نہیں بتا سکتا!"

"میری کوئی بھی سہیلی نہ تھی" آواز نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "میرا صرف ایک بھائی تھا اور وہ شادی نہ کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ مکان کے زنانہ حصے میں میرے علاوہ کوئی عورت نہ تھی۔ میں تنہا ہی باغیچہ کے اندر درختوں کے سایے میں بیٹھی رہتی تھی۔ اور یہ خواب دیکھا کرتی کہ ساری دنیا مجھ سے محبت کرتی ہے۔ —— سارے تارے اپنی بے خواب نگاہوں کی میرے حسن و جمال کی شراب پی رہے ہیں —— ساری ہوائیں کسی نہ کسی بہانے سے میرے قریب ہو کر گزرتی ہیں اور اپنی آرزوؤں کو آہیں بنا کر چھوڑ جاتی ہیں —— اور یہ سرسبز گھاس جس پر میرے پاؤں رکھے ہوئے ہیں اگر شعور و ہوش کی مالک ہوتی تو میرے قدموں کے اوّلیں لمس پر ہی بے ہوش ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کے تمام نوجوان مرد گھاس کی پتیوں کی طرح میرے قدموں میں پڑے ہیں —— پھر بھی نہ جانے کیوں میرا دل مغموم ہو جاتا۔

جب میرے بھائی کا دوست شیکھر میڈیکل کالج میں تحصیل علم کر چکا تو وہ ہمارا خاندانی ڈاکٹر ہو گیا۔ میں اس سے پیشتر ہی پردے کے پیچھے سے اس کو بار بار دیکھ چکی تھی۔ میرا بھائی ایک عجیب انسان تھا اور دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ درحقیقت دنیا ہنگاموں سے اس قدر خالی نہ تھی جتنی کہ اس کا ذوق چاہتا تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ وہ اس سے دور ہوتا گیا اور آخر کار ایک تاریک گوشے میں بالکل غائب ہو گیا۔ شیکھر ہی اس کا واحد دوست تھا۔ اور اسلئے شیکھر ہی وہ واحد نوجوان مرد تھا جو میری نگاہوں کو میسر آ سکتا تھا —— چنانچہ جب میں باغیچہ میں اپنا شام کا دربار منعقد کرتی تو میرے قدموں پر پڑے ہوئے تمام بے شمار خیالی و فرضی نوجوانوں میں سے ہر ایک نوجوان ایک شیکھر نظر آتا —— کیا تم سُن رہے ہو؟ کیا سوچ رہے ہو تم؟"

میں نے ایک خفیف آہ کے ساتھ جواب دیا —— "میں تمنا کر رہا تھا کاش میں شیکھر ہوتا!"

"ذرا صبر کرو —— پہلے پوری کہانی سُن لو —— برسات کے زمانے میں ایک روز مجھے بخار آگیا۔ ڈاکٹر شیکھر مجھے دیکھنے کے لئے آیا۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ میں تکیہ کے سہارے کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے نیم دراز تھی تاکہ شفق شام کی سُرخی میرے چہرے کی زردی کو کم کر دے۔ جب ڈاکٹر نے اندر آکر میرے چہرے کی طرف دیکھا تو میں نے خود کو اُس کی جگہ فرض کر کے تصور میں خود اپنی طرف نظر ڈالی۔ میں نے اُس کی نگاہوں سے خود کو دیکھنے کی کوشش کی —— میں نے دیکھا کہ شام کی دلنواز سُرخی میں میرا نازک و افسردہ چہرہ ایک مرجھاتے ہوئے پھول کی طرح سفید و نرم تکیہ کے سہارے رکھا ہے —— منتشر بالوں کے حلقے پیشانی پر کھیل رہے ہیں اور شرم سے جھکی ہوئی آنکھیں پورے چہرے پر ایک غمناک سایہ ڈال رہی ہیں۔

ڈاکٹر نے ایک ایسے لہجے میں جسے احساس حجاب نے دھیما کر دیا تھا میرے بھائی سے دریافت کیا —— "کیا میں ان کی نبض دیکھ سکتا ہوں؟"

میں نے اپنی تھکی ہوئی متناسب کلائی لباس سے نکال کر آگے بڑھا دی —— "آہ!" میں نے کلائی پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا —— "کاش اس پر صرف ایک دھانی چوڑی ہی ہوتی!" —— مریض کی نبض دیکھنے کے معاملے میں میرے خیال میں کوئی ڈاکٹر اس قدر ڈرپوک اور اناڑی نہ دیکھا تھا۔ اس نے میری کلائی پر ہاتھ رکھا تو اسکی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ وہ میرے بخار کی حدت ناپ رہا تھا۔ اور میں اس کے دل کی نبض دیکھ رہی تھی —— کیوں کیا تمہیں میرا یقین نہیں آتا؟"

"کیوں نہیں" میں نے کہا۔ "انسانی دل کی دھڑکن اپنا افسانہ خود ہی کہہ دیتی ہے۔"

آواز نے کہا —— "جب میں اسی طرح متعدد بار بیمار ہو کر صحت یاب ہو چکی تو میں نے دیکھا کہ اُن درباریوں کی تعداد جو میرے شام کے خیالی دربار میں حاضر ہوا کرتے تھے کم ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ اُن میں سے صرف ایک انسان باقی رہ گیا! —— اب میری چھوٹی سی دنیا میں آخر کار محض ایک ڈاکٹر اور ایک مریض باقی رہ گیا تھا۔

اب میں ہر شام کو پوشیدہ طور پر خود کو ایک زعفرانی ساڑی میں ملبوس کرتی —— اپنے بالوں کو سر کے اوپر ایک بڑی گول میں ترتیب دے کر اس کے چاروں طرف یاسمن کے سفید پھولوں کا ایک ہار لپیٹ لیتی —— اور اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا شیشہ لئے ہوئے درختوں کے نیچے اپنی مقررہ نشست پر جا بیٹھتی۔

شاید تم سوچ رہے ہو کہ خود اپنے ہی حسن کا نظارہ انسان کیلئے بہت جلد مضمحل کن ہو جاتا ہے؟ —— آہ! نہیں!! —— میرے لئے ایسا نہ تھا۔ کیونکہ میں خود کو خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتی تھی۔ اس وقت میں ایک ہستی بھی تھی اور دو بھی —— میں خود کو ایسے دیکھتی تھی گویا میں ڈاکٹر شیکھر ہوں —— دیکھتی تھی، مسحور ہو جاتی تھی اور دیوانہ وار محبت کرنے لگتی تھی۔ لیکن اس تمام شوق محبت کے باوجود جو میں خود اپنی ذات پر بے دریغ

صرف کر رہی تھی میرے دل میں ایک آہ آوارہ پھرتی محسوس ہوتی تھی ---- نسیم شام کی طرح کراہتی ہوئی۔

بہر حال اس زمانہ سے میں کبھی تنہا نہیں رہی۔ جب میں محو خرام ہوتی تو اپنی جھکی ہوئی آنکھوں سے اپنے نازک قدموں کو زمین پر کھیلتے ہوئے دیکھنے لگتی اور سوچتی کہ اگر ڈاکٹر بھی ان کو دیکھتا تو کیا محسوس کرتا۔ دوپہر کے وقت آسمان سورج کی تابش سے معمور ہو جاتا اور کبھی کبھی ایک گزرنے والی چیل کی دور سے آنے والی آواز کے علاوہ کوئی بھی آواز باقی نہ رہتی تھی۔ ہمارے باغیچہ کی چہار دیواری کے باہر چوڑیاں بیچنے والا اپنی مترنم صدا لگاتا گزرتا ---- "چوڑیاں لے لو چوڑیاں! ---- کانچ کی چوڑیاں!" ---- اور میں ایک برف جیسی سفید چادر گھاس پر بچھا کر اپنے بازو پر سر رکھ کر لیٹ جاتی۔ ایک شوخ بے نیازی کے ساتھ دوسرا بازو نرم چادر پر ہلکے سے آ رہتا اور میں اپنے دل میں تصور کرتی کہ کسی نے میرے ہاتھ کے حیرتناک خوبصورت انداز کو دیکھ لیا ہے ---- اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا ہے ---- اور اس کی رنگین ہتھیلی پر اپنے ہونٹ رکھ دئے ہیں ---- اور اب آہستہ آہستہ واپس جا رہا ہے ---- کہئے اگر میں اس افسانے کو اسی جگہ ختم کر دوں تو کیسا رہے؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ انجام کچھ برا نہیں" میں نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا "کہ کہانی قدرے نا تمام رہ جائیگی لیکن میں اسکو مکمل کرنے کیلئے رات کا باقی حصہ آسانی سے صرف کر سکتا ہوں۔"

"لیکن اس طرح تو یہ افسانہ صد درجہ سنجیدہ ہو جائیگا پھر اس میں تبسم کہاں سے آئے گا؟" اپنے دانتوں کو کھنکھناتا ہوا وہ دھاچے پھر بولنے لگی؟

اس لئے اس افسانے کو مجھے ہی مکمل کرنے دو ---- جیسے ہی ڈاکٹر کی پریکٹس کچھ وسیع ہو گئی اس نے ہمارے مکان کی زیریں منزل میں ایک کمرہ "دار المشورہ" کی غرض سے لے لیا۔ اس زمانے میں میں بعض اوقات محض مذاق کے طور پر مختلف دواؤں اور زہروں کی بابت اس سے سوالات کیا کرتی تھی کہ فلاں زہر کتنی مقدار میں انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ گفتگو کا یہ موضوع اس کیلئے مناسب اور جانا پہچانا تھا۔ اور وہ خوب خوب فصاحت کے دریا بہایا کرتا تھا۔ ان باتوں نے مجھے موت کے تصور سے مانوس بنا دیا اور اس طرح اب صرف محبت اور موت ہی وہ دو چیزیں تھیں جن سے میری چھوٹی سی دنیا آباد تھی۔ میری کہانی اب قریب قریب ختم ہو گئی ہے صرف تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے۔"

"رات کا بھی صرف تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے" میں بولا۔

آواز نے کہا ---- "کچھ زمانے کے بعد میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر حیرتناک طور پر کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بات کو جس پر وہ شرمندہ ہے مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک روز وہ معمول سے زیادہ خوبصورت لباس پہنے ہوئے آیا اور میرے بھائی سے شام کے واسطے اسکی گاڑی مانگی۔

میں اپنی خواہش تجسس پر قابو نہ پا سکی اور حالات معلوم کرنے کے واسطے اپنے بھائی کے پاس بالائی منزل پر گئی۔ کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے آخر کار پوچھا ---- "ہاں بھیا یہ تو بتاؤ کہ آج شام تمہاری گاڑی میں ڈاکٹر صاحب کہاں جا رہے ہیں؟"

میرے بھائی نے مختصراً جواب دیا "مرنے کیلئے"

"نہیں ---- مجھے بتادو نا" میں نے درخواست کی۔ "وہ درحقیقت کہاں جا رہا ہے؟"

"شادی کرنے" اس نے مختصراً کہا۔

"اوہو ---- کیا واقعی؟" میں نے کہا اور پورے زور سے دیر تک ہنستی رہی۔

رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا کہ دلہن اپنے والدین کی ملکیت کی تنہا وارث تھی اور اس طرح ڈاکٹر کیلئے ایک بڑی دولت دینے والی تھی ---- لیکن ان تمام باتوں کو اس نے مجھ سے چھپا کر میری ہتک کیوں کی؟ ---- کیا میں نے کبھی گڑگڑا کر اس سے التجا کی تھی کہ وہ شادی نہ کرے ورنہ میرا دل ٹوٹ جائیگا؟ ---- مرد اعتبار کے قابل نہیں۔ میں نے دنیا صرف ایک مرد کو جانا اور ایک ساعت میں ہی اس کی اصلیت کو پہچان گئی۔

جب ڈاکٹر اپنا کام ختم کرنے کے بعد آیا اور روانہ ہونے لگا تو میں نے مسلسل ہنستے ہوئے اس سے کہا ---- "کہئے ڈاکٹر صاحب ---- تو آج آپ کی شادی ہو گی نا؟"

میری مسرت کے اظہار نے صرف ڈاکٹر کے چہرے کو ہی نہیں جلا دیا بلکہ اسے پوری طرح برہم کر دیا۔

"یہ کیا بات ہے" میں نے کہا ---- "کہ نہ کہیں چراغاں ہو رہا ہے اور نہ باجے بج رہے ہیں؟"

ایک آہ کے ساتھ اس نے جواب دیا "تو کیا شادی اسقدر خوشی کی چیز ہے؟"

میں از سر نو قہقہہ لگا کر دیر تک ہنستی رہی ---- "نہیں نہیں" میں نے کہا "ان باتوں سے کام نہ چلے گا۔ بھلا کہیں شادی ایسی بھی ہوتی ہے کہ نہ روشنی اور نہ موسیقی؟"

میں نے اس معاملہ میں اپنے بھائی کو اس قدر دق کیا کہ اس نے ڈاکٹر کی شادی کے تمام پر مسرت لوازمات کے مہیا کرنے کا حکم دیدیا۔

میں اس اثنا میں دلہن کی بابت برابر ہنستی

…شی کی باتیں کرتی رہی کہ یہ ہوگا وہ ہوگا اور …ب دلہن بن کر گھر آئے گی تو میں یوں خوشی مناؤں گی …گی ـــــ" اور ڈاکٹر صاحب" میں نے …چھا "کیا آپ اب بھی نبض دیکھتے پھریں گے؟" …ہاہاہا ـــــ اگرچہ انسان اور خصوصاً مرد …کے دماغ کے اندرونی حالات پوشیدہ اسرار …کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن میں قسم کھا کر کہہ سکتی …ہوں کہ میرے یہ الفاظ ڈاکٹر کے سینے میں ہلکے …تیروں کی طرح پیوست ہو گئے تھے۔

شادی کی رسم رات کو بہت دیر بعد منائی جانے والی تھی۔ ڈاکٹر اور میرا بھائی روانہ ہونے سے پیشتر روزانہ کے معمول کے مطابق باغ میں شراب کا ایک ایک گلاس پی رہے تھے چاند بھی ابھی نکلا تھا۔

میں مسکراتی ہوئی اوپر پہنچی اور بولی ـــــ "ڈاکٹر صاحب! کیا اپنی شادی کو بھول گئے آپ؟ یہ روانگی کا وقت ہے؟"

یہاں ایک خاص سی بات میں تمہیں اور بتا دوں جو بتانا بھول گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نیچے دواخانے سے ایک قسم کا ذرا سا سفوف اپنے ساتھ لیتی آئی تھی جسے میں نے مناسب موقعہ دیکھ کر پوشیدہ طور پر ڈاکٹر کے گلاس میں ڈال دیا تھا۔

ڈاکٹر ایک ہی گھونٹ میں سارا گلاس پی گیا اور ایک ایسی آواز میں جو جذبات کی شدت سے بھاری ہو گئی تھی نیز ایک ایسی نظر کے ساتھ جو میرے دل کو چیرتی چلی گئی، بولا ـــــ "تو …اب جانا چاہئے۔"

…بجے ایکدم بجنے لگے۔ میں اپنے کمرے میں …گئی اور خود کو اپنی ریشمین و زرکار عروسی …لباس میں ملبوس کیا۔ میں نے بکس سے اپنے …ت و زیورات نکالے اور ان سے کو … نے اپنے بالوں میں لگا کے … کا سرخ نشان بنایا ـــــ اور

اس کے بعد باغیچہ میں درختوں کے نیچے میں نے اپنی سیج تیار کی۔

رات بڑی حسین تھی جنوب کی نرم ہوا دنیا کی تھکاوٹ کو اپنے لبوں سے چوس رہی تھی چنبیلی اور بیلے کی مستانہ خوشبو باغیچہ کو مسرتوں سے لبریز کئے ہوئے تھی۔

جب میں نے دیکھا کہ باجوں کی آواز دھیمی ہوتی جاتی ہے ـــــ چاند کی روشنی پھیکی ہو چلی ہے ـــــ اور دنیا اپنے ان تمام تعلقات کے ساتھ جو گھر اور اعزا سے بنتے ہیں ایک خواب کی طرح میرے احساسات سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے ـــــ تو اس وقت میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ـــــ مسکرانے لگی۔

میں سوچ رہی تھی کہ جب لوگ آئیں گے اور مجھے یہاں پائیں گے تو انہیں میرے لبوں پر یہ آخری تبسم ایسا نظر آئے گا۔ جیسے گلابی شراب کی ایک ننھی سی منجمد لہر ـــــ اور جب میں اپنے غیر فانی حجلۂ عروسی میں آہستہ داخل ہو گی تو میرا یہی تبسم میری شکل و صورت پر ضو باریاں کرتا ہوا میرے ساتھ ساتھ ہوگا ـــــ مگر لو! ـــــ اف میرا وہ حجلۂ عروسی! ـــــ ہائے رے میری ریشمین و زرکار عروسی پوشاک کی بدقسمتی!! ـــــ جب میں اپنے اندر سے آنے والی ایک کھڑکھڑاہٹ کی آواز سے بیدار ہوئی تو میں نے دیکھا کہ تین لڑکے میری ہڈیوں کے ڈھانچے سے "علم استخواں" کا سبق پڑھ رہے ہیں۔ میرے سینے میں جس جگہ میری مسرتیں اور آلام دھڑکتے تھے۔ اور جوانی کے پھولوں کی پنکھڑیاں یکے بعد دیگرے کھلتی تھیں اب اسی جگہ لڑکوں کا معلم میری ہڈیوں کو ایک چھڑی سے چھو کر ان کے نام بتا رہا تھا ـــــ اور جانتے ہو میرا وہ آخری تبسم کیا ہوا جس کی میں نے اتنی احتیاط کے ساتھ

مشق کی تھی ـــــ کیا تم نے اس کا کوئی باقی ماندہ نشان دیکھا؟

اچھا خیر چھوڑو اسے ـــــ کہو تمہیں یہ افسانہ پسند آیا؟"

"بڑی پُرلطف ہے یہ کہانی" میں نے کہا۔

اسی لمحہ یکایک مرغِ صبح کی اولیں آوازیں آنی شروع ہوئیں ـــــ "کیا تم موجود ہو؟" میں نے پوچھا ـــــ کوئی جواب نہ ملا۔

صبح کی روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

(ٹیگور) (مسعود جاوید)

اردو شاعری اور عورت

از جناب حافظ رامپوری

"گلشن بیخار" اردو شعراء کا تذکرہ ہے جسے نواب مولوی محمد مصطفٰے خاں صاحب المتخلص بہ شیفتہ و حسرتی نے ۱۲۵۰ھ میں (یعنی آج سے قریب قریب ایک سو دس سال قبل) لکھا۔ یہ تذکرہ نہایت [illegible] فارسی زبان میں ہے۔ مضمون زیرین میں نے اسی تذکرہ کے مختلف صفحات سے لیکر ترجمہ کر دیا ہے کیونکہ [illegible] تشبیہات و تعقیدات سے مملو زبان استعمال کی گئی ہے۔ اسلئے ترجمہ میں اختصار کے خیال سے نفس مطلب بیان کر دیا ہے۔

حافظ رامپوری

(۱) جانی تخلص۔ بیگم جان نام۔ بہو بیگم عرف۔ نواب قمر الدین مرحوم کی بیٹی۔ نواب آصف الدولہ کی بیوی۔ بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت بیگم موصوف کثرت امراض سے پریشان دل اور مکدر طبع ہو رہی تھیں۔ ہمدم نامی خواجہ سرا عیادت کے کیلئے آیا اور پرسش احوال کی۔ فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

کیا پوچھتا ہے ہمدم اس جسم ناتواں کی
ہر رگ میں نیش غم ہے کہئے کہاں کہاں کی

یہ شعر بھی مشہور ہے ؎

دل جس سے لگایا وہ ہوا دشمن جانی
کچھ دل کا لگانا ہی ہمیں راس نہ آیا

(۲) جینا بیگم۔ حسن کی طرح حال بھی پردہ اخفا میں ہے۔ اقتضائے کمال پوشیدگی ہی میں ہے۔ یہ شعر مشہور ہے ؎

یہ کس کے آتش غم نے جگر جلایا ہے
کہ تا فلک مرے شعلے نے سر اٹھایا ہے

(۳) دلہن بیگم۔ دوسرے حالات چہرہ کی طرح نقاب میں ہیں۔ یہ دو بیت اس عصمت مآب کے ہیں ؎

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا
تنگی کی راہ سے نکلا ہے قافلہ دل کا

دیگر ؎

جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں
مثال لالہ کے دل داغدار رکھتے ہیں

(۴) زینت تخلص۔ ایک زن بازاری ہے۔ وطن دہلی۔ مرزا ابراہیم بیگ مقتول (جواس کا کشتہ تھا) کے ساتھ لکھنؤ چلی گئی۔ یہ شعر اس کا ہے ؎

شب مہتاب میں تا صبح زینت
خیال [illegible] روتے اور ہم ہیں

(۵) صاحب تخلص۔ امۃ الفاطمہ بیگم عرف [illegible] جی عرف۔ نہایت حسین و جمیل۔ بغرض [illegible] لکھنؤ سے دلی آئی۔ حکیم مومن خاں کے زیر علاج چند ماہ رکر [illegible] ہوئے لکھنؤ واپس چلی گئی۔ مومن کی "قول غمیں" نامی مثنوی [illegible] حسن و جمال کی تناسب الاعضائی کا عکس ہے۔ القصہ ان کی صحبت سے اس کا دل شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ قد و قامت کی موزونی نے دل کو موزوں بنایا۔ زلف کی آرائش چھوڑ کر اشعار کی آراستگی میں مشغول ہوئی۔ یہ چند اشعار یادگار ہیں ؎

رقیبوں کا جلنا کہاں دیکھتا تو یہ سماں بیٹھے گھر میں یا تو ہوتا
گلزار کیا منہ کے [illegible] ہے یہ جلوہ خدا نے دکھایا تو [illegible]
کھولے ہیں اس نے پھر یوسفی کے بند
تر کر کے نسیم سے پہلو قبا کے گل
نظریں جانب اغیار دیکھئے کیا ہو
پھرتے ہے کچھ نگہ یار دیکھئے کیا ہو
جو خط جبیں مرے کاتب نے اسی کو
دکھلا تو میرا نامۂ اعمال الٰہی !!

صاحب جو بنایا ہے تو مثل زلیخا
یوسف سا غلام اک مجھے دے ظل الٰہی

(۶) فدا تخلص۔ نام بھی بی بی ہے۔ قوم کشمیری۔ محمود انیس کی بیوی۔ شاہزادی زیب النساء کی سرکار میں کسی خدمت پر مامور تھی۔ خیراتی خاں دلسوز سے اصلاح لیتی تھی ؎

ہے خواب میں دیکھا تو نظر ہی میں لگے
قسمت سے اگر خواب کی تعبیر الٹ جائے

بعضوں نے اسی شعر کو اس کے استاد کا بتلایا ہے۔

(۷) گنا بیگم۔ نواب عماد الملک غازی الدین خاں (جن کا تخلص نظام ہے) کی بیوی۔ شوہر کی اجازت سے اپنا کلام قمر الدین منت کو دکھلاتی تھیں۔ نمونہ یہ ہے ؎

مقابل ہوا گر لیکے تیرے مصحف چہرے کی
تری آنکھوں سے ہم چشمی کو سبادام کہہ دو کو
ترے منہ کی تجلی دیکھ کر کل رات حسرت سے
زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع جلتی تھی
شمع کی طرح کون یوں جانے ؛ جس کے جی کو لگے سو جانے

(۸) نازک تخلص۔ زینت نام۔ زن بازاری میرٹھ ہے۔ یہ طرز ہے ؎

یاد آتے ان آنکھوں میں اندوہ نشے کے
ساقی مئے گلرنگ سے جب جام بھرے ہے
ہے نالہ و زاری سے مرے شور فلک تک
پھر وہ بت مغرور کوئی کان دھرے ہے

(باقی صفحہ ۴۸)

نوٹ: مجموعے کے لکھنے کی تحریک سے یہ مجموعہ پیش ہے۔

بنگال کی شہرہ آفاق ادیبہ شریمتی ایلا رانی مکھوپادھیائے کا ایک بلند پایہ دلکش سبق آموز اصلاحی معاشرتی افسانہ

شرابی کی بیوی

نیلا سوزن کاری کا کام ہاتھ میں لئے اداس بیٹھی تھی۔ اس کا دل کسی طرح کام میں نہ لگتا تھا۔ وہ بار بار سوچتی۔ دنیا کے دوسرے لوگ کس طرح خوش اور مطمئن ہیں۔ لیکن اس کی قسمت میں اطمینان اور خوشی نہیں ہے۔

انسان کو فرطِ غم اور ہجوم یاس میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

نوکرانی نے آکر پوچھا۔ "آج ہاتھ منہ نہ دھوئیے گا؟"

نیلا چونک پڑی بولی۔ "اچھا جاتی ہوں"۔

غسل خانے سے ہاتھ منہ دھو کر نیلا دالان میں آبیٹھی۔

موتی کی ماں نے پوچھا۔ "ترکاری نہ بنائیے گا؟"

نیلا نے کہا۔ "آج تمہیں بنالو میری چارپائی اور تکیہ دے جاؤ"۔

آفتاب نیلے آسمان سے سیم باری کر رہا تھا بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فضائی سمندر میں مرغابیوں کی طرح تیر رہے تھے۔ نیلا سوچنے لگی۔ آج اس کی کتنی بے آبروئی اور توہین ہوئی ہے اور اس کے دل کے چھپے ہوئے ناسور کو کس بے دردی سے چھیڑ دیا گیا ہے۔

نیلا کی شادی کو چار سال ہوئے تھے۔ اس عرصے میں وہ صرف ایک بار میکے گئی تھی وہ ایک دولتمند گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس لئے دولتمند خاندان میں بیاہی گئی تھی۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کو بہت کامیاب اور مسرت انگیز سمجھتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا شوہر شراب خور ہے۔ لیکن جب سے اس نے یہ بات سُنی تھی اسکی تمام مسرتوں اور شادمانیوں پر پانی پھر گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنے شوہر کے خلاف کبھی ایک بات منہ سے نہیں نکالی تھی۔ وہ اس کی توہین و دلآزاری کو پاپ سمجھتی تھی۔ لیکن آج اسے بہت صدمہ ہوا جب اس کی ساس نے مسخر آمیز لہجے میں کہا۔ تمہارا شوہر شرابی ہے اس کے ہاتھوں سے نہ خاندان کی دولت محفوظ ہے اور نہ عزت"۔

نیلا نے شدت اندوہ و غم سے کھانا چھوڑ دیا۔ اسے فاقہ کرتے تیسرا دن تھا۔

منیش اچھی طرح سمجھتا تھا کہ نیلا کتنی شریف اور نیک دل عورت ہے۔ وہ منیش کی شراب خوری اور عیاشی سے بخوبی واقف تھی۔ لیکن منیش کے خلاف کبھی کوئی حرف شکایت اس کی زبان پر نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ انتہائی صبر و تحمل سے کام لینے کی عادی تھی۔ اسلئے نیلا کے کھانا چھوڑنے کی وجہ منیش کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ نیلا کی بہت قدر و عزت کرتا تھا۔ اس نے نیلا کے جذبات و احساسات کا پتہ چلانے کی غرض سے کہا تمہاری قسمت بھی کتنی بری تھی نیلا جو تمہیں میرے جیسا بدکردار اور اخلاق باختہ پتی ملا۔

نیلا سر جھکا کر بولی۔ میں تو ایسا خیال نہیں کرتی۔ میرا پتی میرے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا اور مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پھر مجھے اس سے کیا بحث کہ وہ گھر کے باہر کیا کرتا ہے اور کیسے رہتا ہے؟

نیلا کا شریفانہ جواب سنکر منیش شرم و ندامت سے زمین میں گڑ سا گیا۔ وہ ایسی نیک دل عورت کا شوہر ہونے کے قابل نہ تھا لیکن وہ مجبور تھا کہ شراب اس سے چھوٹ نہیں سکتی تھی۔

منیش نے نیلا کا ہاتھ پکڑ لیا اور محبت آمیز لہجے میں پوچھا ۔۔۔ میری پیاری نیلا! تم نے آخر کھانا کیوں چھوڑ رکھا ہے؟ کیا تم نے مرنے کا عہد کر لیا ہے؟

نیلا نے کہا۔ اگر میں مر ہی گئی تو اس سے تمہارا کون سا نقصان ہو جائیگا؟ میں تو تمہاری ضرورت سے زاید ایک چیز ہوں۔

منیش نے غم آگیں نظروں سے نیلا کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ایسی بات کیوں کہتی ہو نیلا! میں نے تو کبھی تمہاری توہین و ناقدری نہیں کی۔

نیلا نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ میں اسے تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن ایک عورت کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ وہ اپنی بھی شہرت و نیکنامی چاہتی ہے اور اپنے شوہر کی بھی۔ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح انسان بھی فانی ہوتا ہے لیکن انسان کا نیک عمل اس فانی عالم میں بھی اسے باقی بنا دیتا ہے جس نے دنیا میں نیکی نہیں کمائی اسکی زندگی ہی عبث ہے بہت سے دولتمند ایسے ہوتے ہیں جن کے دل میں کبھی نیکی اور نیکوکاری کا خیال بھی

نہیں پیدا ہوتا۔ وہ اپنی دولت وثروت کا واحد مقصد عیش وعشرت تصور کرتے ہیں، ان کی دولت ان کے نرک کے راستے کو اور بھی وسیع اور آسان کر دیتی ہے لیکن جو امرا ورؤسا اپنی دولت وامارت سے اچھے کام اور سماج کی خدمت کرتے ہیں وہ زندگی میں نیکنام ہوتے ہیں۔ اور مرنے کے بعد ان کا نام نیکی کے ساتھ زندہ اور باقی ہوتا ہے۔

"اچھا نیلا! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے وہی کروں گا جس میں سماج کی بھلائی اور تمہاری خوشی ہو۔" منیش نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

نیلا کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ منیش کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔

نیلا نے کہا۔ سماج کی بھلائی کے نام پر دو ایک کام کر دینا کافی نہیں ہے۔ ایسے تو کتنے دولتمند اور رئیس ہیں جو عزت وشہرت حاصل کرنے کیلئے دان پن کرتے رہتے ہیں۔ اور بعض کبھی کبھی کوئی نیک کام بھی کر ڈالتے ہیں۔ لیکن سماج کا سچا ہی خواہ وہ ہے جو اپنے عمل سے سماج میں اخلاق وکردار کا بہترین نمونہ قائم کرے۔

"اچھا نیلا! میں آج سے سماج کیلئے نمونہ ہی بننے کی کوشش کرونگا میں اپنے کو تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ تم جس طرح مناسب سمجھو مجھے شریف اور نیک کردار بنانے کی کوشش کرو، لیکن یاد رکھو، اگر تم نے اپنی جان دے دی، یا مجھ سے کنارہ کشی اور بے تعلقی اختیار کرلی تو میں بد سے بدتر ہو جاؤنگا۔ اور میری تباہی وبربادی میں جو کسر باقی ہے وہ بھی پوری ہو جائیگی۔"

نیلا نے ایک بار غور سے شوہر کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ کیا واقعی تم نے اپنی اصلاح کا عہد کر لیا ہے؟ اور تم اپنے کو میرے سپرد کر رہے ہو؟

"ہاں، ہاں نیلا، میں تم سے باتیں بھی بنا رہا اور نہ جھوٹ بول رہا ہوں۔"

نیلا بے حس وحرکت کھڑی تھی۔ فاقے کی وجہ سے اس کا چہرہ اتر گیا تھا منیش نے اسے اپنی آغوش میں کھینچ کر کہا۔ تم بھی کیسی عورت ہو نیلا! تم نہیں جانتیں کہ تمہارے فاقہ کرنے سے میرے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ چل کر کھانا کھاؤ اور میرے بیقرار دل کو اور بیقرار نہ کرو۔

نیلا اپنے کو منیش کی آغوش سے الگ کرتے ہوئے، بولی۔ ہٹو، تم تو مذاق کی باتیں کرتے ہو منیش نے کہا۔ مذاق نہیں نیلا، کہو کھانا منگاؤں؟

"نہیں!"

"تم بار بار نہیں کہے جا رہی ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ تم کسی طرح مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتیں۔" یہ کہہ کر منیش یاس آلود نظروں سے نیلا کی طرف دیکھنے لگا۔

نیلا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ اعتماد کیوں نہیں ہے؟ لیکن تم جو عہد کر رہے ہو اس پر قائم رہ سکوگے؟

منیش نے کہا۔ اب تمہیں کہو تمہیں کیسے اطمینان ہو سکتا ہے؟ تم جس طرح چاہو میں اطمینان دلانے کو تیار ہوں۔

منیش کے لہجے میں کمزوری ضرور تھی لیکن نیلا نے اسے نظر انداز کر کے کہا۔ اچھی بات ہے۔ اگر تم سچے دل سے عہد کرتے ہو اور اس پر کاربند ہونے کو تیار ہو تو میں بھی یقین کئے لیتی ہوں کہ تم اپنے عہد کی پابندی کروگے؟

۲

منیش نے نیلا سے جو عہد کیا تھا اس کی بڑی خوش اسلوبی سے پابندی کر رہا [illegible] نے نیلا بہت خوش تھی۔ وہ آجکل بناؤ سنگھار اور گھر کے رکھ رکھاؤ سب میں خوب دلچسپی لیتی تھی۔

وہ ایک روز منیش کے کمرے میں گئی تو دیکھا ہر چیز پراگندہ اور بے ترتیب پڑی ہوئی ہے اس نے تمام چیزوں کو قرینے سے سجا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ ٹیبل صاف کر رہی تھی کہ اسکی نظر "پیپر ویٹ" سے دبے ہوئے ایک لفافہ پر پڑی۔ اسکے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ کسی عورت کا خط ہے۔

نیلا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر تک تو اسے خط دیکھنے میں تامل رہا پھر اس نے سوچا جب منیش نے اسے اپنے چال چلن کا نگراں بنا دیا ہے تو پھر اس کے خط دیکھنے میں کیا مضائقہ ہے۔ اس نے لفافے کو کھول کر خط دیکھا۔ پیشانی پر اسی روز کی تاریخ درج تھی۔ خط میں لکھا تھا۔

"پیارے منیش!

آج آٹھ بجے رات کو میرا انتظار کرنا۔ "ایڈن گارڈن" پیگوڈا کے پیچھے والی بنچ پر ملاقات ہوگی۔ کئی روز ہوگئے۔ تم سے ملنے کا موقع نہیں ملا۔ اسلئے دل بہت پریشان ہے مفصل باتیں بروقت ملاقات ہونگی۔ دیکھو مجھے مایوس نہ کرنا۔ (تمہاری ملکا)"

نیلا دھک سے رہ گئی۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ منیش کے چال چلن کی اصلاح کر رہی ہے لیکن خط دیکھ کر تو اس کے دل میں ایک طوفان سا برپا ہوگیا اگر منیش نیک چلن رہنے کا عہد نہ کر چکا ہوتا تو نیلا کو اسقدر صدمہ نہ ہوتا اس نے لفافے کو جہاں سے اٹھایا تھا وہیں رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔

آٹھ بجے رات کا وقت تھا۔ نیلا نے اپنی کار "ایڈن گارڈن" کے صدر پھاٹک سے کچھ دور ہی رکوا دی۔ اور رویرین سے کہا چپکے سے جا کر دیکھو تو ویرین، پیگوڈے کے پیچھے والی بنچ پر تمہارے بابوجی بیٹھے ہیں؟ احتیاط سے

جانا تاکہ وہ تمہیں دیکھنے نہ پائیں۔ میں گاڑی میں بیٹھی ہوں، وہ ہوں تو تمہارے ساتھ میں بھی چلوں۔

ویرین مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ لوا جی! یہاں آپکو تنہا چھوڑ کر جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا قلعہ کے گورے بہت بدمعاش ہوتے ہیں وہ اکثر اسوقت ادھم مچاتے ہوئے ادھر گھومنے آتے ہیں۔ انکی شرارتوں کے واقعات برابر سننے میں آتے رہتے ہیں۔

نیلا کچھ دیر سوچکر بولی۔ اچھا چلو تمہارے ساتھ میں بھی چلتی ہوں۔

ویرین منیش کا معتمد علیہ شوفر تھا۔ اس نے بچپن ہی سے اس کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ ویرین نیلا کو ماں کی طرح مانتا تھا۔

منیش گھر کی کار پر نہیں گیا کہ اس کا راز افشا نہ ہو جائے۔ پگوڈا سے کچھ دور پہلے ہی ویرین نے نیلا سے کہا۔ وہ دیکھو لوا جی، بالوجی بیٹھے ہیں۔ ان کے پاس ایک عورت بھی نظر آرہی ہے۔

ویرین پگوڈا کی آڑ میں رک گیا اور نیلا آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ منیش بلکا سے باتیں کرنے میں محو تھا۔ اور بلکا منیش کے چہرے پر نظریں جمائے باتیں سنتے میں۔ رازونیاز کی بیخودی میں کسی کو نیلا کی خبر نہ ہوئی۔

جب نیلا بالکل سامنے پہنچ گئی اور منیش نے اسے دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ وہ تعجب آمیز لہجے میں بولا۔ تم اسوقت یہاں کہاں نیلا؟

نیلا مسکرا کر بولی۔ ذرا یوں ہی تفریح کرنے آ گئی تھی۔ تمہیں دیکھا تو سوچا ذرا پاس چلکر دیکھوں کیا رازونیاز ہو رہا ہے۔

منیش نے گھبرا کر کہا۔ کچھ نہیں ذرا ان سے....

بلکا درمیان ہی میں بول اٹھی۔ آپ منیش کی بیوی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ تو ان کو ... میں رکھتی ہیں۔

اس کی ترنم آمیز ہنسی سے باغ کی فضا شگفتہ ہوگئی۔ اس نے پھر کہا۔ آپ کی شادی سے بھی پہلے ہم دونوں میں ملاقات ہے۔ ایک ضرورت سے ان کو آج بلایا تھا۔

نیلا نے تند لہجے میں جواب دیا۔ آپ کی اور ان کی دوستی کتنی پرانی ہو لیکن آپ کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ آپ نوجوان ہیں اور یہ بھی بوڑھے نہیں ہیں۔ جب آپ دونوں میں ایسی دوستی ہے تو آپ دن میں بھی مل سکتے تھے اس کے علاوہ جب میں آپکے دوست کی بیوی تھی تو آپ کو مجھ سے بھی میل جول پیدا کرنا چاہئے تھا۔ بہرحال نہ میں آپ کے طرزِ عمل کی تائید کر سکتی ہوں اور نہ اسے ایک شریف عورت کے شایانِ شان سمجھتی ہوں۔ اچھا اب میں جا رہی ہوں۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ میرے یکایک آجانے سے آپ دونوں کی گفتگو میں خلل واقع ہوا۔ میں اس کے لئے معافی چاہتی ہوں۔ نمسکار"

یہ کہکر نیلا نے واپسی کیلئے قدم بڑھائے۔

منیش گھبرا کر آواز دینے لگا۔ نیلا، نیلا، سنو تو، مگر نیلا نہ رکی۔

(۳)

صبح جیسے ہی ویرین کی آنکھ کھلی اُسے منیش نے بلایا۔ منیش کی ہدایت تھی کہ اسکی اجازت کے بغیر کار باہر نہ نکالی جائے۔ لیکن کل شام کو ویرین نیلا کو "ایڈن گارڈن" لے گیا اور واپسی میں اس کے کہنے کے مطابق شیام بازار اس کی مُوسی کے ہاں بھی اسے پہونچا آیا۔ اس لئے صبح صبح منیش نے اسے طلب کیا تو وہ بہت ڈرا اور جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر منیش کے پاس پہنچا۔

منیش اپنے سونے کے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا وہ کسی سخت مصیبت میں مبتلا ہوگیا ہے۔ اس نے غصے سے پوچھا۔ کتنی دیر ہوئی جب میں نے تمہیں بلایا تھا؟

مارے ڈر کے ویرین کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

منیش نے پھر پوچھا۔ نیلا کہاں ہے؟

ویرین نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ شیام بازار۔

منیش نے غضب آلود لہجے میں پوچھا۔ اُسے وہاں کون لے گیا؟

ویرین کچھ بول نہ سکا۔

منیش اسی طرح ڈانٹ کر بولا۔ چپ کیوں ہے بتاتا کیوں نہیں؟

ویرین نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ لوا جی نے چلنے کو کہا۔ میں انکی بات کیسے ٹالتا؟ اسلئے چلے...

"اور جو میں نے ہدایت کی تھی کہ میری اجازت کے بغیر گاڑی باہر نہ نکالی جائے؟"

"اسوقت آپ تو تھے نہیں بالوجی، میں نے لوا جی کو آپ ہی کی جگہ سمجھا کہ انکے حکم کی تعمیل کی"

کچھ دیر خاموش رہ کر منیش نے پوچھا۔ واپس کتنک آگئی؟ کچھ کہا تھا؟

جی نہیں، میں نے پوچھا بھی کہ گاڑی لیکر کب آنا ہوگا تو انہوں نے کہا تیرے آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے جب آنا ہوگا میں گاڑی کر کے چلی آؤں گی۔"

منیش نے ادھ جلے سگریٹ کو راکھ دانی میں ڈال کر کہا۔ تم ابھی گاڑی لیکر شیام بازار جاؤ میں ایک چٹھی لکھے دیتا ہوں۔ اسے دیکر کہنا ابھی گھر چلو بلایا ہے۔

ویرین منیش کا خط لے کر شیام بازار گیا مگر نیلا نے آنے سے انکار کر دیا۔ منیش نے خود فون پر نیلا سے بات چیت کرنی چاہی لیکن جواب ملا وہ گھر پر نہیں ہے۔ منیش کو مجبور ہو کر بیٹھ جانا پڑا۔

منیش ابھی جوان نہیں ہوا تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ امیروں کے ایسے مطلق العنان

لڑکوں کی جو حالت ہوتی ہے۔ وہی منیش کی بھی ہوئی۔ جوان ہوتے ہی وہ شراب خوری اور عیاشی میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن ابھی تک اس کی نیک و بد کے سمجھنے کی صلاحیت بالکل زائل نہیں ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی تمام بدکرداریوں اور بداخلاقیوں کے باوجود نیلا کی قدر و منزلت کرتا تھا۔ اس کی بات مانکر اس نے اپنے چال چلن کی اصلاح کا عہد بھی کر لیا تھا اور اپنے کو نیلا کی نگرانی میں بھی دیدیا تھا۔ لیکن وہ بلا کے خط لکھنے پر اس سے ملنے چلا گیا۔ اس کے تصور میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ اس کا خط نیلا کے ہاتھ لگ جائیگا اور اس کا اتنا افسوسناک نتیجہ برآمد ہوگا۔ اگر نیلا اسے چھوڑ کر نہ چلی جاتی تو وہ خود اپنے کئے پر نادم ہوتا اور آئندہ ایسی لغزشوں سے مزید احتیاط برتتا۔ وہ اب بھی اپنے فعل پر نادم اور پشیمان تھا اور نیلا کے چلے جانے کے باعث رنجیدہ اور مغموم بھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اس کی صحت خراب ہو گئی اور وہ صاحب فراش ہو گیا۔

۴

بتدریج پتلی ہوتے ہوتے جس مقام پر گنگا چادر کی طرح ہموار ہو گئی ہے۔ اسی مقام پر بعد ملکے مشرقی کنارے پر ایک آشرم ہے جو "رانی آشرم" کہلاتا ہے۔ ایک نیکدل رئیس نے جابجا ایسے متعدد آشرم بنوا دئے ہیں۔

"رانی آشرم" نہایت وسیع، کشادہ، صاف ستھرا آشرم ہے۔ اس کا انتظام بھی ایک نہایت نیکدل اور شریف مہیلا کے ہاتھ میں ہے۔ آشرم میں ایک سو عورتیں رہ سکتی ہیں یہاں رہنے والی عورتیں مختلف قسم کی دستکاریاں کرتی ہیں۔ اور اپنے ہاتھ سے پھول اور ترکاری بھی بوتی ہیں۔ آشرم کے اندر ہی ان کیلئے کھیل کود، سیر و تفریح اور پوجا پاٹ کا بھی انتظام ہے۔ اس میں رہنے والی عورتوں کی زندگی نہایت پاکیزہ اور مسرت آگیں ہوتی ہے دنیا کے جھگڑوں بکھیڑوں سے بھری ہوئی خانگی الجھنوں سے پریشان ایسی عورتیں بھی اس آشرم میں آکر دو چار مہینے رہ جاتی ہیں۔ جن کے گھر بار اور عزیز رشتے دار سب موجود ہوتے ہیں نیلا بھی اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اسی آشرم میں چلی گئی

جاڑے کا موسم ختم ہو رہا تھا۔ بسنت کی آمد آمد تھی۔ نیلا آشرم کے اپنے کمرے میں افسردہ بیٹھی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے دریا صاف نظر آرہا تھا۔ اس کی اداس نظریں گنگا کے چپ چاپ بہتے ہوئے پانی پر جمی ہوئی تھیں اس کے دماغ میں نہ جانے کیوں آج طرح طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ انسان کی بہترین زندگی کون سی ہے؟ گرہستی کی یا آشرم کی؟ بہت سی عورتوں نے بیراگ لے لیا ہے اور گرہستی چھوڑ کر یہاں چلی آئی ہیں۔ لیکن کیا یہ آشرم بھی ایک طرح کی گرہستی نہیں ہے۔ گرہستی میں کیا ہوتا ہے جو یہاں نہیں ہے؟ جو عورتیں اس آشرم میں رہتی ہیں انہیں بھی دھوپ سے بچنے کیلئے سایہ کی فکر ہے۔ انہیں بارش سے بچاؤ کے لائق جگہ چاہئے۔ کھانے پینے کی فکر یہاں بھی دامنگیر ہے یہاں رہنے والی کون سی عورت نیکنامی نہیں چاہتی؟ اور کس عورت کو بدنامی سے بچنے کا خیال نہیں ہے؟ گرہستی میں بھی یہی سب باتیں ہوتی ہیں یا کچھ اور؟

یہی سب سوچتے سوچتے نیلا کو اپنا گھر یاد آگیا۔ اور منیش کے ساتھ کی چار سالہ ازدواجی زندگی بھی یاد آگئی۔ اتنے میں آشرم کی ایک عورت نے آکر کہا۔ نیلا بہن! سندھیا کا وقت ہو گیا ابھی تم بیٹھی ہی ہو، جلدی آؤ۔

نیلا چونک کر بولی۔ تم چلو پربھا میں بھی آئی۔

منیش ابھی تک بیمار تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کئے پڑا تھا کہ اسے ایسا ہوا کوئی اس کے سرہانے بیٹھا اس کی پیشانی آہستہ آہستہ دبا رہا ہے۔ اس نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ تم آگئیں نیلا! مجھے یقین تھا کہ تمہارے دل میں میری محبت ہے اسلئے تم ایک نہ ایک دن مجھے ضرور معاف کر دوگی۔ اسی یقین نے تو مجھے موت کے راستے پر بڑھتے ہوئے قدم کو واپس کر لینے پر آمادہ کیا۔

منیش کی پیشانی پر گرم گرم آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک پڑے۔

منیش نے کہا۔ نیلا! میرا سر اپنے زانو پر رکھ لو۔

نیلا نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

منیش نے پیار بھری نظروں سے نیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــ پھر تو مجھے چھوڑ کر نہ چلی جاؤ گی نیلا؟ میں عہد کرتا ہوں کہ اب تمہاری مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھاؤں گا یہ صحیح ہے کہ میں اپنا اعتبار کھو چکا ہوں، لیکن ایک بار مجھے اور موقع دو نیلا اور کہدو کہ پھر مجھے نہ چھوڑوگی۔

نیلا بولی۔ تمہاری محبت کے جس بندھن نے مجھے اس طرح کھینچ لیا ہے وہ مجھے تمہیں چھوڑ کر جانے دیگا؟

اچھا پیاری نیلا، تو مجھے اپنا وہ پیارا گیت سنادو۔"

"کون سا؟"

"وہی ـــ برہ ندی کتنی اپار تھی"

"پھر بھی ہوگئی پار"

"ساجن پھر بھی ہوگئی پار"

بیوہ کا روزنامچہ

از جناب کوثر چاند پوری

میری شادی سولہ سال کی عمر میں نو برس کے
بچہ سے کردی گئی تھی جسے یہ خبر نہ تھی کہ
میاں اور بیوی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ دو سال
بیتے تھے کہ میرا ننھا پتی پرلوک کو سدھا
را اور میں اٹھارہ سال کے سن میں بیوہ ہوگئی
سسرال میں میری بڑی عزت تھی چھوٹے
بڑے سب آنکھوں پر بٹھاتے تھے مگر پتی کے
مرتے ہی دنیا پلٹ گئی۔ سب مجھ سے دور دور
رہنے لگے۔ کوئی مجھے ڈائن کہتا کوئی وساسول
د... صبح اٹھ کر میری صورت دیکھنے سے سب
میر... کرتے تھے۔ اب میں ایک ذلیل باندی کی
طرح گھر میں رہتی تھی۔ دونوں وقت چودہ پندرہ
آدمیوں کا کھانا پکانا، برتن مانجھنا، جھاڑو دینا
چوکہ میں گوبری کرنا یہ میرے روزمرہ کے معمولی
... تھے۔ میں ایک میلی کچیلی دھوتی باندھے
بُرتی ... سے شام تک ان دھندوں میں لگی
رہتی۔ رات کو ہاری تھکی ایک ٹوٹے ہوئے
پلنگ پر بغیر بستر بچھائے پڑ رہتی۔ میرا گہنا
سب اتار لیا گیا تھا بس کانوں میں چاندی
... چار بالیاں پڑی رہ گئی تھیں پہننے
اس ... سفید ساریاں تھیں۔ ایک ساری جو کہ
دو ا... کرتے کرتے بالکل کالی سیاہ ہو جاتی
لگتی ... پہن لیا کرتی جو دھوبی کے یہاں
استعمال ... بعد بھی جگہ جگہ سے کالی رہ جایا کرتی
کورس ... معلوم نہیں کب سے نہیں پہنا تھا۔
مشورہ ... پھرتے پھرتے پیروں کی بوائیاں
کالے ... گئی تھیں۔ برتن گھستے گھستے ہاتھوں
... اور کمر دہری ہوگئی تھی۔ پھٹی

ہوئی کھال میں کوئلہ کی سیاہی بھر جایا کرتی تھی۔
جس کا نکلنا اب مشکل ہوگیا تھا۔ میں جوان تھی
اور میرے گھر والے ہمیشہ میرے رنگ، روپ
کو سراہتے رہتے تھے۔ پر قسمت خراب تھی میرے
نصیب سو گئے تھے مجھے زندگی کی وہ سہولتیں
نہ تھیں جو اور عورتوں کو حاصل تھیں۔ مجھے کوئی
پیار کرنے والا میسر نہ تھا۔ مجھ سے کوئی ہنس کر
بات کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ ہر طرف سے
جلی کٹی آوازیں کانوں میں آتی تھیں۔ پریم کے
مزے سے میں واقف ہی نہ تھی۔ آنکھوں کا
مٹھاس میں نے کبھی چکھا ہی نہ تھا۔ مگر پریم
کی آنکھ پہچانتی تھی۔ کڑوی اور میٹھی چیزوں
کو سمجھتی تھی اور یہ سوچکر آپ ہی آپ کڑھا
کرتی تھی کہ گھر میں کوئی میری بات پوچھنے والا
نہیں۔ پرماتما دیور کو خوش رکھے وہ کبھی کبھی
ضرور پوچھ لیتا تھا۔ بھوجائی جی دل تو نہیں
گھبراتا تمہارا؟ مگر اس کی بساط ہی کیا تھی وہ
آپ بچہ تھا۔ میرے دونوں جیٹھ ہنس ہنس کر
جٹھانیوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے انہیں
خوشبودار تیل، منہ پر لگانے کے کریم، بالوں
میں لگانے کے پھولدار پن اور کنگھی، چوٹی
لا کر دیتے تو میرے دل پر چوٹ سی لگتی تھی۔
سوچتی میرا پتی زندہ ہوتا۔ اور میں سہاگن ہوتی
تو مجھے بھی یہ چیزیں نصیب ہوتیں۔ اب
کوئی مجھ سے پوچھنے والا بھی نہیں مجھے بھی کچھ
چاہیئے؟ کیا میں سر میں تیل نہیں ڈال سکتی،
خوشبودار نہیں ویسا ہی سہی ڈال تو سکتی ہوں،
بکھرے ہوئے سوکھے بالوں میں کیا پن لگانا

بھی میرے لئے منع ہے، کیا میں بالوں میں کنگھی
نہیں کر سکتی مگر یہ سب ان بھاگوان سہاگنوں
کا حصہ ہے جن کے ہاتھوں کی چوڑیاں سلامت
ہوں۔ میری چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں، میں
ابھاگن اور بیوہ تھی۔ مجھے بناؤ سنگار کرنے کا
حق نہ تھا۔ میرے پتی کو مرے دو برس ہوگئے
تھے، ہائے وہ بالک پنے ہی میں مر گئے تھے
اسوقت سے اب تک میں سسرال ہی میں تھی
جب میکے سے کوئی لینے آتا ساس جی رو رو
کر گھر کو سر پر اٹھا لیتیں۔ وہ بلک بلک کر
کہتیں۔ بہو میرے مرتے ہوئے بیٹے کی نشانی
ہے۔ یہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو میں کہیں
کی نہ رہوں گی۔ میرا جینا دوبھر ہو جائیگا میں تو
اسی کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔ یہ باتیں سن کر
میرے میکہ والوں کا کلیجہ پانی ہو جاتا وہ
سمجھتے ساس جی مجھ سے بڑی محبت کرتی
ہیں وہ مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتی ہیں اور
میرا ان سے الگ ہونا اچھا نہیں۔ مجبوراً وہ
مجھے چھوڑ جاتے اور خالی گاڑی لے کر لوٹ
جاتے۔ میں روتی رہ جاتی۔ بھائی کے آگے میرے
چھوٹے منہ سے اتنا بھی نہ نکلتا، بیرن دس
پانچ دن ہی کو لئے چلو۔ میں اتنا کہدیتی تو معلوم
نہیں مجھ پر کیا ستم ڈھائے جاتے، میں دل
پر سل رکھ لیتی اور منہ سے کچھ نہ کہتی۔ میکہ والے
آتے اور میری حالت پر دو چار آنسو بہا کر
چلے جاتے اس کے سوا وہ کر ہی کیا سکتے تھے
کسی کی قسمت کا ساتھی دنیا میں کوئی نہیں
ہوتا۔ اپنے جانتے انہوں نے میرے لئے

اچھا ہی کیا تھا۔ آگے کی بات کسے معلوم ہوتی ہے۔ اب وہ سوچتے ہوں گے میں اور ہوں کس کام کی، میرے نصیبوں میں مرتے دم تک یہی لکھا ہے جو بھگت رہی ہوں۔ میرے بھاگوں میں آگ لگ چکی تھی۔ اسے کون بجھاتا۔ انہیں کیا خبر تھی، سارا کس وجہ سے مجھے چھاتی سے لگائے ہوئے ہیں۔ وہ کیوں مجھے دیکھ دیکھ کر جیتی ہیں۔ میں چلی جاتی تو گھر بھر کا کام کون سمیٹتا۔ چوکا کرنے والا گھر میں میرے سوا اور کون تھا۔ دیورانی، جٹھانی کو تو بننے سنورنے ہی سے فرصت نہ تھی۔ وہ دن رات کنگھی چوٹی ہی میں لگی رہتی تھیں۔ جھاڑو دیتے انہیں شرم آتی تھی اور چولہا پھونکنا تو وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں۔ وہ ذرا دیر کو بھی چولہے کے پاس آ بیٹھتی تو ہول دلی کی شکایت ہو جاتی۔ بلیوں ان کا کلیجہ اچھلنے لگتا۔ پھر میرے جانے کے بعد کام کیونکر چلتا؟

آج اساڑھ لگا تھا۔ جیٹھ خوب تپ چکا تھا۔ سب کا خیال تھا برسات زیادہ ہوگی۔ ہوا بھی یہی اساڑھ کی پہلی تاریخ ہی کو اتنا پانی برسا کہ جل تھل ہو گئے۔ ہمارا گھر جگہ جگہ سے ٹپکتا تھا اور پانی ٹپک ٹپک کر ایک گڑھے میں جمع ہو گیا تھا۔ میں پتیلی میں وہ پانی بھر بھر کر پھینک رہی تھی۔ ہر بار مجھے پتیلی بھر کر باہر نالی تک جانا پڑتا۔ کوئی پچاس ساٹھ دفعہ میں آ گئی۔ میں نے دیکھا قریب کے دروازے میں کرسی بچھائے پڑوس والے سیٹھ جی کا چھوٹا لڑکا بیٹھا ہے اور مجھے دیکھ کر جی ہی جی میں کڑھ رہا ہے۔ میں پانی ڈال کر آنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے گھر کی چوکھٹ پر کھڑا ہو کر مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ کالی کوڑی کی بہت صاف دھلی ہوئی دودھ کی طرح سفید دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ باریک تن زیب کا کرتہ اس نے پہن رکھا تھا جس کے نیچے سرخ رنگ کی بنیان جھلک رہی تھی، بالوں میں آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ گوری چٹی پیشانی پر لال ٹیکہ چمک رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے لگا۔ میں کچھ نہ بولی اور الٹے پاؤں پلٹ آئی۔ پھر جو پانی پھینکنے گئی تو وہ گلی کے پاس ہی ٹہل رہا تھا۔ میرے قریب آ کر کہنے لگا کیا گھر میں ایک تم ہی ہو۔ گھنٹہ بھر سے دیکھ رہا ہوں کولہو کے بیل کی طرح جتی ہوئی ہو تمہیں اس حال میں دیکھ کر میری آتما کو بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ میں نے اسے تو کوئی جواب نہ دیا مگر آج پہلی دفعہ مجھے اپنی موجودہ زندگی سے کچھ نفرت سی ہوئی۔ میں نے جی میں کہا۔ سیٹھ جی کہتے تو سچ ہیں۔ واقعی میں بڑی ذلیل ہوں! اب کی مرتبہ میں آئی تو سیٹھ جی نے میری دھوتی کے پلے کو جھٹک کر کہا تم بولتی کیوں نہیں ہو، کیا گونگی ہو؟

کیا بولوں؟

میں کیا پوچھ رہا ہوں؟

کیا پوچھتے ہیں آپ؟

گھر میں کوئی اور نہیں ہے تمہارے؟

ہے کیوں نہیں؟

پھر تم ہی سے اتنا کام کیوں لیا جاتا ہے؟

میرے پتی جو مر چکے ہیں!

سیٹھ جی نے زور سے اپنی چھاتی پر مکہ مار کر کہا — اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟

مجھے سیٹھ جی کی باتیں بہت بھلی لگیں، وہ خود بھی تو بہت اچھے تھے۔ اب پانی ختم ہو چکا تھا۔ میں لوہے کی پرات میں کچھ بڑی سونت سونت کر لانے لگی۔ جب میں آتی وہ مجھ سے کچھ نہ کچھ کہہ دیتے — ارے تم بیاہ کیوں نہیں کر لیتیں اپنا؟

کیا میرا بیاہ ہو سکتا ہے؟ میں نے اپنے دل سے پوچھا۔

ایسا تو ہوا نہیں کبھی، پتی کے مر جانے پر عورت یوں ہی زندگی گزار دیتی ہے۔

کچھ ٹھیک نہ رہی ادھر ساس جی نے دوسرا کام بتا دیا۔ گھر میں نیم کا پیڑ تھا۔ ہوا سے اس کے پھل جھڑ گئے تھے۔ سارے گھر میں نمبولیاں ہی نمبولیاں ہو گئی تھیں۔ میں انہیں صاف کرنے لگی اور پھر باہر نہ جا سکی۔

سیٹھ جی کا دستور ہو گیا کہ ہر وقت اپنی ڈیوڑھی پر بیٹھے رہتے۔ میں باہر بہت کم آتی تھی اندر کے دھندوں ہی سے فرصت نہ تھی، باہر کیونکر آتی مگر اب میرے دل میں بھی کچھ آگ سی سلگنے لگی تھی۔ ہر دم چھاتی میں ہوکیں سی اٹھتیں جیسے کلیجہ دھڑک رہا ہو۔ سیٹھ جی میری آنکھوں میں بس گئے تھے۔ ان کا چوڑا چکلا سینہ، لمبی گردن اور بھرے ہوئے بازو مجھے بہت پسند تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے ابھرے ہوئے گالوں میں ذرا اندر کو دبی ہوئی آنکھیں ان کے روپ کو اور بڑھا رہی تھیں۔ میں جب تک کام کرتی رہتی سیٹھ جی کا خیال رہتا۔ اور جب تھک کر پلنگ پر لیٹ جاتی تو بھی سیٹھ جی میرے من میں کسی چور دروازے سے آ جاتے اور میں انہیں دیکھتی رہتی وہ سچے پجاری کی طرح میرے من مندر کے پٹ کھولتے اور میں پتھر کی دیوی کی طرح انہیں دیکھتی رہتی۔ میں باہر آنے کا کوئی نہ کوئی حیلہ نکالتی کبھی جھاڑو پر تھوڑا سا کوڑا اٹھا کر اسے پھینکنے کے بہانہ آتی کبھی دال کا دھوون بھر کر لے آتی غرض اسی طرح صبح سے شام تک میرے دس بیس نہیں سو پچاس چکر ہو جاتے ساس جی گھڑی گھڑی مجھے آتا جاتا دیکھ کر کہتیں،

میرے پسندیدہ اشعار

از جناب سید علی جواد اکبرآبادی

پلک جھپکتے ہی رُخ پھر گیا زمانے کا
یہ ماجرا ہے چمن سے قفس تک آنے کا ـــــ رعنا اکبرآبادی

یہ ستم قید قفس میں صیاد
کس نے پوچھا تھا بہار آئی ہے ـــــ تاجور نجیب آبادی

کہنے کو مشت پر کی اسیری تو تھی مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا ـــــ ثاقب لکھنوی

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا ـــــ جگر مرادآبادی

اب تک خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا ـــــ جوش ملیح آبادی

دکھ تو کیا ہمدم بٹا لیتے گراں تھا ہوا
بیکسی میں بات کرنے کا سہارا ہو گیا ـــــ آرزو لکھنوی

یہ جانتے ہوئے کہ فریب بہار ہے
تیری طرف بھی اے گل تر دیکھتے رہے ـــــ نیر اکبرآبادی

اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھکو
میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشاں ہوں میں ـــــ آسی

قالب سے روح کا بھی نکلنا محال ہے
میری طرف اگر وہ یونہی دیکھتے رہے ـــــ ناقد دہلوی

نزع کی دو ہچکیوں نے سہل کر دیں مشکلیں
چارہ گر سب رہ گئے منہ دیکھ کر بیمار کا ـــــ ارمان اکبرآبادی

اپنا مکمل علاج مفت کرائیے!

اشتہاری ادویات سے بدظن اور صحت سے مایوس مریضوں کے اطمینان کی خاطر ہم اپنی دو خاص الخاص اور مجرب دوائیاں قیمتی باہ وغیرہ جو بیشمار مریضوں کے لئے پیغام شفا ثابت ہو چکی ہیں مفت تقسیم کرنے کا اعلان کرتے ہیں جن کی قیمت تندرست ہونے کے بعد لیجائیگی تاکہ اشتہاری ادویات کے زخم خوردہ مریض فائدہ اٹھا سکیں

زعفرانی گولیاں

دل دماغ اور جگر کو طاقت دیتی ہیں معدے سے اترتے ہی خون میں حل ہو جاتی ہیں چند روز کے بعد زرد اور مرجھایا ہوا چہرہ شنگرف کی مانند لال سرخ ہو جاتا ہے سستی کمزوری اور نامردی کا نام تک نہیں رہتا۔ قوت باہ ناقابل برداشت پیدا کرتی ہیں۔ وزن بڑھ جاتا ہے بھوک بڑھا کر معدہ کو اس قدر طاقت دیتی ہیں کہ دودھ گھی مکھن وغیرہ مقوی سے مقوی غذا بھی بآسانی ہضم ہو کر جزو بدن بن جاتی ہے۔ ہر موسم میں قابل استعمال اور مفید ہیں قیمت مکمل کورس سات روپیہ

طلائے بیربہوٹی

یہ معمولی طلاء نہ سمجھیں۔ جادو ہے جادو۔ عضو پر لگاتے ہی مریض حیران رہ جاتا ہے کہ اتنی طاقت کہاں سے آگئی چند روز استعمال کرنے سے پوشیدہ جسم کی تمام خرابیاں سستی نامردی ڈھیلاپن ٹیڑھاپن پتلاپن جھکاؤ رگوں کا پھولنا وغیرہ بالکل دور ہو کر جوش غضب کی سختی و تیزی آجاتی ہے کہ ضبط کرنا دشوار ہو جاتا ہے [illegible] کی عمر و قیمت [illegible]

قوت مردمی کا طوفان پیدا کرنیوالی ان دونوں دوائیوں کی قیمت مبلغ بارہ روپیہ اسوقت تک لینی حرام ہے جب تک آپ مکمل تندرست نہ ہو جائیں لہٰذا یہ دونوں دوائیاں آپ کے طلب کرنے پر مفت ارسال کی جائیں گی لیکن خرچ اشتہارات ۸ خرچ دفتر ۸ مزدوری دواسازی ۸ محصولڈاک پیکنگ ۸ [illegible] آپ کو ادا کرنا ہوگا کیونکہ اگر یہ بوجھ بھی ہمیں برداشت کرنا پڑے تو مفت دوا بھیجنے کا سلسلہ [illegible] نہیں رہ سکتا لہٰذا آپ یہ رقم [illegible] بھیجکر یا ڈیڑھ روپیہ کے وی پی سے دوائی منگوا لیں اگر پہلی بار ارسال کردہ دوائی سے خدانخواستہ پورا فائدہ نہ ہو تو یہی دوائیاں دوبارہ سہ بارہ اسی طرح مفت ارسال ہونگی اپنا حال پورا لکھیں خط و کتابت پوشیدہ [illegible] مشورہ کے لئے ا۔ کا ٹکٹ بھیجیں (ہر مریض کا نام ظاہر نہیں کیا جاتا)

پتہ: منیجر ملیٹھ لاج بیرون دہلی گیٹ لاہور

سمندری

پیشاب یا پاخانہ سے پہلے یا بعد سفید قطرہ نکلتا ہو عورت کو دیکھ کر یا عورت کا خیال آنے ہی یا عورت کے سامنے جاتے ہی لیسدار رطوبت خارج ہوتی ہو [illegible] ہفتہ میں ایک بار ہو یا روزانہ یا ایک رات میں کئی کئی بار [illegible] سال [illegible] کے سمندری کی چند خوراک کھانے سے ایسا معلوم ہوگا کہ دریا میں بند لگ گیا مکمل کورس [illegible] استعمال کرنے سے عمر بھر جریان یا احتلام کی شکایت نہ ہوگی قیمت صرف ایک روپیہ دس آنہ [illegible] محصولڈاک معاف۔ پتہ: [illegible] لاہور

عنبرون (معجون)

نہایت خوشبودار خوش ذائقہ مفرح قلب مقوی دماغ ہے۔ جگر کی اصلاح کرکے بیش خون پیدا کرتی ہے گردہ و مثانہ کی کمزوری دور کرکے بار بار پیشاب آنے کو روکتی ہے جریان احتلام اور سرعت کا خاتمہ کرکے صاحب اولاد بنا دیتی ہے اس قدر مقوی باہ ہے کہ پہلی خوراک سے کمزور سے کمزور اور بالکل گیا گذرا از کار رفتہ نامرد بھی اپنے اندر طاقت مردمی کا احساس کرنے لگ جاتا ہے۔ بچپن کی خرابی یا بڑھاپے کے سبب سے طاقت مردمی کمزور ہو گئی ہو شادی سے دل گھبراتا ہو یا فرائض خانہ داری ادا نہ ہو سکتے ہوں۔ تو اس دوا کا مکمل کورس استعمال کرنے سے ناقابل برداشت طاقت پیدا ہو جائے گی اور کمزوری بالکل نہ ہوگی بڑھاپے میں بھی بیس پچیس سالہ نوجوانوں جیسی طاقت قائم رہیگی

۴۰ روز کی دوا (۴۰ تولے) قیمت ۴ روپے ۱۲ ٫ محصول ۱۱

۲۰ روز کی دوا (۲۰ تولے) قیمت ۲ روپے ۸ ٫ ٫ ٫

عروسک

یہ طاقت اور امساک کی بہترین دوا ہے اگر خاص وقت پر پوشیدہ جسم میں نرمی آجاتی ہو تو پہلے اس دوا کی مالش کر لیجئے۔ کمزوری دور ہو کر بے حد طاقت پیدا ہو جائیگی یہ دوا بے حد لذت ایک بار استعمال کر دیکھئے۔ فریقین کو یہ مسرت ملیگی کبھی فراموش نہیں کرینگے بلکہ عمر بھر اسی دوا کا تقاضا رہیگا قیمت فی شیشی ایک روپیہ بارہ آنہ محصولڈاک [illegible]

امساکوزون

اگر آپ سرعت جیسی نامراد مرض میں مبتلا ہیں اور جوان ہو کر لطف جوانی سے محروم ہیں تو خاص وقت سے پہلے ایک گولی امساکوزون کی کھا لیجئے۔ آپ کی ہمیشہ کی شرمندگی دور ہو جائیگی اور عزت اور مردانہ وقار کو چار چاند لگ جائیں گے ۱۲ گولیوں کی قیمت دو روپے محصولڈاک معاف ایک گولی کے لئے ۴ ٫ کے ٹکٹ بھیجئے

رفیع فارمیسی پوسٹ بکس نمبر ۳۴ لاہور

معجون بوزیدان

بچپن کی غلط کاریوں اور جوانی کی بے اعتدالیوں سے اگر آپ مردانہ جوہر ضائع کر چکے ہیں یا بڑھاپے کے باعث ازدواجی مسرتوں سے محروم ہیں تحریک بالکل نہیں ہوتی یا بہت کم ہوتی ہے کئی روز کے بعد خیال آتا ہے بعد فراغت کمزوری کمر درد اور تکان ہو جاتی ہے سرعت کی وجہ سے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ دل افسردہ اور غمگین رہتا ہے حوصلہ پست اور عزم کمزور ہو گیا ہے جوانی کے ولولے اور شباب کی امنگیں سرد پڑ گئی ہیں تو معجون بوزیدان مکمل کورس استعمال کرکے جوانی کی اجڑی ہوئی بستی پھر سے آباد کر لیجئے پہلی ہی خوراک سے جوانی کا احساس پیدا ہو جائیگا یہ وہ دوا ہے جو ستر اسی سال کے بوڑھوں میں بھی جوانی کا شعلہ پیدا کرکے شادی پر مجبور کر دیتی ہے۔ ہمیشہ اولاد نرینہ پیدا ہوتی ہے آپ کی عمر کتنی زیادہ ہو جائے طاقت مردمی میں کبھی ضعف نہ آئے گا۔ نہایت خوش ذائقہ اور خوشبودار ہے مفرح مقوی قلب ہے۔ گردہ و مثانہ کو تقویت دیکر بار بار پیشاب آنے کو روکتی ہے۔ بھوک لگاتی ہے قبض رفع کرتی ہے جگر کی اصلاح کرکے خون پیدا کرتی ہے۔ قیمت مکمل کورس ۵۰ روز کی دوا پانچ روپے پانچ آنے محصولڈاک ۱۵ ٫ نصف کورس ۲۵ روز کی دوا دو روپے تیرہ آنے محصولڈاک ۱۱ ٫ اگر اطمینان کرنا ہو تو دس یوم کی دوا قیمت ایک روپیہ پانچ آنہ محصولڈاک ۷ ٫ بطور نمونہ منگوا لیجئے۔

ٹائیگر کریم

اگر خاص وقت پر پوشیدہ جسم میں نرمی آجانے سے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے تو ٹائیگر کریم استعمال کیجئے! لگاتے ہی جذب ہو کر بجلی کی سی طاقت پیدا کر دیگی جسم فولاد کی طرح سخت ہو جائیگا نہ باندھنے کی ضرورت نہ نہانے کا پرہیز شاہ بلدیا یا پچھالا پڑنے کا ڈر شیر کی چربی، ریچھ کی چربی اور بیشمار انگریزی دیسی ادویات سے تیار شدہ جادو اثر ٹائیگر کریم کو چند روز متواتر استعمال کرنے سے بچپن کی غلط کاریوں یا بڑھاپے کی وجہ سے سستی نامردی، کمزوری، ڈھیلاپن، ٹیڑھاپن، چھوٹاپن یا رگوں کا پھول جانا وغیرہ پوشیدہ جسم کی تمام خرابیاں بالکل دور ہو کر گھوڑے سے کمزور اور گیا گذرا از کار رفتہ نامرد بھی قابل فخر مرد بن جاتا ہے۔ فربہی اور درازی کی بہترین دوا۔ قیمت فی شیشی ۲ تولہ دو روپے آٹھ آنے ایک تولہ والی شیشی ایک روپیہ چار آنہ محصولڈاک ۸ ٫ علاوہ

اِمساکلون

اگر آپ کی پوشیدہ طاقت جلد ختم ہو جاتی ہے شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور جوانی میں ہی لطف جوانی سے محروم ہیں تو رات کو امساکلون کی ایک گولی کھا کر تماشا خود کا کرشمہ دیکھئے ایک درجن گولیوں کی قیمت دو روپے ۲ ٫ محصولڈاک معاف ایک گولی کا نمونہ دیکھنا ہو تو ۴ ٫ کے ٹکٹ بھیجئے

ستاورین

پیشاب اور پاخانہ سے پہلے یا بعد سفید قطرہ نکلتا ہو عورت کو دیکھ کر۔ عورت کے سامنے جاتے ہی یا عورت کا خیال آتے ہی لیسدار رطوبت نکلتی ہو چلتے پھرتے بیخبری میں پیشاب کا قطرہ نکل جاتا ہو ہفتہ میں ایک بار ہوتا ہو یا روزانہ یا ایک رات میں کئی کئی دفعہ۔ کوئی خیال آتا ہو یا بغیر کسی خیال کے۔ رکاوٹ کم ہوتی ہو یا بالکل نہ ہوتی ہو یعنی سرعت انزال کا عارضہ ہو۔ منی پانی سے پتلی ہو گئی ہو ستاورین کی پہلی خوراک سے تمام شکایات ختم ہو جائیں گی۔ مکمل کورس (۲۱ دن) استعمال کرکے عمر بھر کیلئے جریان۔ احتلام اور سرعت انزال سے نجات حاصل کر لیجئے۔ مکمل کورس کی قیمت دو روپے دس آنے (۲۱ دن کی دوا) روزانہ، محصول ڈاک معاف۔ اپنا حال مکمل لکھیں۔

امساکریم

امساک کی بہترین دوا ہے حد ممسک و مقوی ہے جن لوگوں کا خیال ہے کہ امساک کی دوائیوں میں افیم ہوتی ہے وہ وقت خاص سے پہلے استعمال کرکے اس کا کرشمہ دیکھیں کہ مسرت و راحت کی یہ گھڑیاں فریقین کو عمر بھر فراموش نہ ہونگی بلکہ ہمیشہ اسی چیز کا تقاضا رہیگا قیمت فی شیشی ایک روپیہ محصول [illegible]

ملنے کا پتہ: حکیم ابوالضیاء شیخوپوریہ ۸۵ سرکلر روڈ لاہور

بہو یوں کو ذرا ہمیشہ کیا کرو۔ کوڑا نیم کی جڑ میں ڈال دیا کرو اور پانی نالی میں پھینک دیا کرو میں کہتی گھر میں کوڑا اچھا نہیں معلوم ہوتا، اور پانی نالی میں سڑنے لگتا ہے۔ وہ چپ ہو جاتیں۔ سیٹھ جی کئی بار مجھ سے کہہ چکے تھے ذرا کسی دن کھل کر بات چیت کرنے کا موقع نکالو

کیسے نکالوں؟ میں بتیس دانتوں میں ایک جیب ہوں!

رات کو سہی، جب گھر کے آدمی سو جائیں۔

رات کو؟

ہاں ہاں رات کو، کیوں ہرج ہے کوئی، وہ ہنس کر پوچھتے۔ رات کو میرا دہلیز سے پاؤں نکالنا بہت مشکل ہے!

کیوں مشکل ہے؟ جی سخت کر کے آجاؤ کسی دن آخر تمہارا کوئی بگاڑ ہی کیا لے گا؟ جانوروں کی طرح کب تک بسر کرتی رہو گی تم، یہ گلاب مکھڑا کب تک کملایا رہیگا، اور ہرنی کی سی یہ شوخ آنکھیں کب تک کاجل کی سیاہی سے محروم رہینگی؟ ـــ تمہاری جوانی کا روپ آخر کب تک ڈھکا رہیگا، اب تو اسے کھول ڈالو!

یہ کیونکر ممکن ہے؟

دنیا میں سب کچھ ممکن ہے!

اچھا آج رات کو آؤں گی!

میں یہیں ملوں گا!

سورج ڈوبتے ہی پہاڑ سے دھولی دھولی گھٹائیں جھوم کر آئیں اور تابڑ توڑ پانی پڑنے لگا، بجلی کوندنے لگی، بادل اتنے زور سے گرج رہا تھا کہ کلیجہ ہلنے لگتا تھا، گھٹا ٹوپ اندھیری دنیا پر چھا گئی، گھڑی گھڑی بادل گرجتا اور بڑی بڑی بوندیاں پڑنے لگتیں۔ میں نے جلدی جلدی کھانا پکا کر پروس دیا، سب کھا چکے تو ساس جی سے کہا، سب کے بعد انہوں نے بھوجن کئے، پھر میں نے، سب کھا پی کر اپنے اپنے بستروں پر جا پڑے۔ آج کی رات ایسی تھی دل چاہتا تھا کوئی باتیں کرے پریم کی دل لبھانے والی، پیاری پیاری باتیں، میں نے الٹے سیدھے برتن دھوئے میرے سینہ میں پسلیوں کے نیچے ریل سی چل رہی تھی، اور جتنی دیر ہوتی تھی، میری طبیعت الجھتی تھی، دور جنگل میں پپیہا بول رہا تھا اور گھبرا گھبرا کر پی کہاں، پی کہاں کی رٹ لگا رہا تھا، ساس جی تھوڑی دیر تک چولھے کے پاس بیٹھی رہیں آخر وہ بھی اونگھنے لگیں اور جا کر پڑ رہیں، گھر میں سناٹا ہو گیا۔ پرنالوں سے پانی گرنے کا شور سنائی دیتا تھا یا ہوا کی سائیں سائیں بوندیں باجہ سا بجا رہی تھیں، بجلی آگ کی لپٹوں کی طرح کالی گھٹاؤں کو چیرتی ہوئی ادھر سے ادھر نکل جاتی، کبھی کبھی جگنو اندھیری رات میں دیا جلا دیتا جو فوراً ہی بجھ جاتا، میں نے اچھی طرح بیسن لگا کر ہاتھ دھوئے، دھلی ہوئی ساری باندھی اور بالوں کا جوڑا ٹھیک کیا، طبیعت تو چاہتی تھی تیل بھی لگاؤں مگر تیل میرے پاس نہ تھا، کپڑے بھی اس سے اچھے نہ تھے، میں دبے پاؤں ساس جی کے پاس آئی، وہ ناک کے نتھنے پھلا پھلا کر خوب زور سے خراٹے لے رہی تھیں۔ مجھے اطمینان ہو گیا وہ گہری نیند میں ہیں۔ اور میں ننگے پاؤں پانی میں بھیگتی ہوئی دروازے کی طرف چلی، صحن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ بڑی احتیاط سے میں دروازے تک پہونچی، میرا دل دھک سے ہو گیا جب میں نے سوچا میں سب سے چھپ کر باہر جا رہی ہوں، میرا سارا بدن کانپ رہا تھا اور بدن کی رگیں زور زور سے اچھل رہی تھیں، جیسے گوشت کو چیر کر باہر نکل جائینگی، میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے زنجیر کھولی اور ایک دفعہ ہمت کر کے نالی کو کود کر سڑک پر آگئی، ایسا معلوم ہوا میں کسی دوسری دنیا میں آگئی، سیٹھ جی دروازے میں ٹہل رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی خوشی سے پھول گئے اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، وہ گھر میں داخل ہوئے اور ان کے کے پیچھے پیچھے کچھ دور چلکر زینہ پر چڑھنے لگے میں بھی ان کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی اوپر پہنچکر میں نے دیکھا۔ نہایت صاف ستھرا کمرہ ہے جو خوشبو سے مہک رہا ہے فرش پر سفید چاندنی بچھی ہوئی ہے، ایک طرف پلنگ پڑا تھا، میں ٹھٹھک کر ایک کونہ میں کھڑی ہو گئی جہاں سیٹھ جی نے جوتے اتارے تھے مجھے چاندنی پر کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے پاؤں رکھتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ سیٹھ جی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے فرش پر گھسیٹ لی۔ اور چاندنی پر میرے پیروں نے بہت سے بھدے نشان بنا دئے سیٹھ جی تکیہ سے ٹیک کر بیٹھ گئے۔ میرا داہنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا، وہ آہستہ آہستہ اسے دبا رہے تھے، ان کے ہاتھ سے بجلی کی لہریں نکل نکل کر میرے بدن میں داخل ہو رہی تھیں، اور مجھ پر ایک دیوانگی سی چھا رہی تھی، میرا ہاتھ دباتے دباتے انہوں نے ہاتھ کی سخت اور کھردری کھال پر انگلی پھیری اور غور سے دیکھ کر کہا ـــ یہ تمہارے ہاتھوں کو کیا ہوا؟ ان میں یہ کالونس کیسی بھری ہے؟ میں اس سوال پر شرما گئی، مگر پھر میں نے سب حال ان سے کہدیا۔ وہ بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ آج تک ایسی باتیں مجھ سے کسی نے نہ کی تھیں، پہلی مرتبہ انہوں نے مجھے سمجھایا عورت کسے کہتے ہیں اور اس کے فرائض کیا ہیں، انہوں نے مجھے اپنے قریب بٹھا رکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ

میری طرف سرک رہے تھے، مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا میرا سر بھاری ہو گیا ہے اور آنکھیں باہر کو نکلی جا رہی ہیں، ــــــ سیٹھ جی نے گود میں لے کر مجھے اس زور سے بھینچا کہ میں ذرا سی دیر میں عورت بن گئی ــــــ بدنصیب مایوس، اور بیوہ عورت نہیں، بلکہ واقعی عورت!

دو گھنٹہ تک میں سیٹھ جی کے یہاں بیٹھی رہی پھر آپ ہی آپ میری طبیعت گھبرائی ایسا معلوم ہوا گھر کے لوگ جاگ اٹھے اور سب مجھے ڈھونڈھ رہے ہیں میں نے سیٹھ جی سے کہا، اب میں جاؤنگی!

ابھی سے؟

ہاں بہت دیر ہو گئی شاید کوئی اٹھ بیٹھے۔

اچھا جاؤ مگر دیکھو بھول نہ جانا۔

میں جواب میں مسکرا دی ــــــ بھلا آج کی رات بھلانے کی تھی، میری ساری عمر میں یہی تو ایک رات تھی جسے میں نے ہمیشہ یاد رکھا۔

وہ دروازے تک مجھے چھوڑ گئے۔ میں نے دھیرے سے کواڑ بند کئے، کواڑوں کی چولوں سے جو آوازیں نکلا کرتی تھیں، برسات کی وجہ سے بالکل بند ہو گئی تھیں۔ پھر میں اپنی جگہ آ پڑی، ناپاک اور سنسان جگہ، صبح تک مجھے نیند نہ آئی۔ میرا سینا گھڑی کی طرح ٹِک رہا تھا۔ سیٹھ جی کی محبت بھری باتیں مجھے یاد آ رہی تھیں، میں سوچ رہی تھی سیٹھ جی مجھ سے بڑا پریم کرتے ہیں ــــــ اس کے بعد میں صرف ایک مرتبہ سیٹھ جی کے ہاں اور گئی پھر ساس جی کو کچھ شبہ سا ہو گیا، انہوں نے میرے جیٹھوں کے کان بھر دیئے، یکہ میں بھی نہ جانے کیسے بے خبر ہو گئی، وہاں سے کوئی نہ آیا، سب نے مشورہ کر کے مجھے ستانا شروع کیا طرح طرح کی تکلیفیں دیں، دونوں وقت آدھا پیٹ کھانا دیا جاتا، وہ بھی روکھا سوکھا بلا نمک مرچ کا، باہر آنا جانا بالکل بند کر دیا گیا سیٹھ جی کو بھی کسی طرح میری بپتا کا حال معلوم ہو گیا۔ انہوں نے ایک دن یہ کہلایا تھا میرے ساتھ بنارس چلو، میں انکار نہ کر سکتی تھی، پہلے بھی نہ کرتی اور اب تو میری زندگی اجیرن ہو رہی تھی، میں نے طے کر لیا تھا، اس جینے سے تو مرنا بھلا۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب کس بات کا ڈر تھا، مگر سیٹھ جی چپ سادھ کر بیٹھ رہے پھر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ میری کچھ خبر لی۔

شعرائے مست قلندر

غزل

وفا کا منتظر ہے میرا قلب سوگوار اب بھی
لہو ٹپکا رہی ہے میری چشم انتظار اب بھی

سکوں نا آشنا سی ہے حیات بیقرار اب بھی
کہیں گھبرا نہ جائے دل میں ہے باقی خلفشار اب بھی

مسلط ہے بعنوانِ بیخودی کا اعتبار اب بھی
فنا پر کر رہا ہوں لمحے لمحے کو نثار اب بھی

یونہی قائم ہے دنیا میں مرے غم کا وقار اب بھی
نگاہِ نارسا ہے بیکسی کی رازدار اب بھی

بدل سکتی ہو شاید گردشِ لیل و نہار اب بھی
مرے پروردگار! الفت تو ہے امیدوار اب بھی

کہیں روزِ ازل اس نے جھلک اپنی دکھائی تھی
فلک پر ہے قمر جیسا حسیں سینہ فگار اب بھی

شفق کی سرخیوں میں خون امیدوں کا نکھرتا ہے
شہیدِ ناز کی دنیا میں ہے اک یادگار اب بھی

ہوئی مدت کہ نزہت کو بھلا بیٹھا ہوا ہوں لیکن
نسیم آنکھوں میں کٹتی ہیں مری شبہائے تار اب بھی

نذرِ جمال

ترے خیال میں آنکھیں ہیں اشکبار اب تک
دل و جگر اسی ناوک سے ہیں فگار اب تک

یہ کس کی زلفِ معنبر سے جذب کی ہے شمیم
کہ گلستاں کی ہوائیں ہیں مشکبار اب تک

شفق کو دیکھ کے کیوں سر جھکا لیا اس نے
کسی کے قتل سے شاید ہے شرمسار اب تک

چمن میں آنے کو ہے کوئی مستِ ناز ضرور
کہ اس ادا سے تو آئی نہ تھی بہار اب تک

چلی نسیم، کھلے پھول، فصلِ گل آئی!
چمن میں بلبلِ شیدا ہے سوگوار اب تک

ہوا مجھ سا کوئی بدنصیب کم ہوگا
خزاں کے ساتھ رہی ہے مری بہار اب تک

مطالبات

شعاعِ مہر کی پھر ضو میں جگمگاؤ تم
کلی کلی کو چمن میں نہ گدگداؤ تم

مری نگاہ سے دل میں مرے سماؤ تم
اجڑ گئی ہے یہ بستی اسے بساؤ تم

جہاں سے میری وفاؤں کا تذکرہ آئے
وہیں سے قصۂ الفت کو بھول جاؤ تم

اٹھا دو پھر ذرا رنگیں نقاب کا گوشہ
زمانہ ہوش میں ہے ہوش پھر اڑاؤ تم

یہ اجتناب کہ میری نگاہ سے پردہ
یہ انبساط کہ دل میں مرے سماؤ تم

جہاں خموش تھے لب اور نگاہ نیچی تھی
وہاں سے میری کہانی کو پھر سناؤ تم

کیا تھا سجدہ فرشتوں نے جب تمہیں امجد
پھر اپنے آپ کو ویسا ہی جگمگاؤ تم

غزل

مجھ سے نظریں ملائے جا ظالم
برقِ دل پر گرائے جا ظالم

دل کی حسرت مٹائے جا ظالم
خوب مجھ کو مٹائے جا ظالم

ہاں تو پھر مسکرائے جا ظالم
زخمِ دل کو بڑھائے جا ظالم

حالِ دل کچھ سنائے جا ظالم
دل کو تسکیں دلائے جا ظالم

کوئی پہلو نہ دل کو چین ملے
اس طرح یاد آئے جا ظالم

کیوں تمنا مٹائے جاتا ہے
مجھ کو خود ہی مٹائے جا ظالم

آخری وقت یہ تمنا ہے
مجھ کو اپنا بنائے جا ظالم

تم نے مجھ کو بھلا دیا تو اب
خود کو دل سے بھلائے جا ظالم

[illegible]

پھر مجھ سے نگاہیں وہ ملاتے ہوئے آئے
اک جلوہ فروکار دکھاتے ہوئے آئے
ڈالے ہوئے شانوں پہ بڑے ناز سے زلفیں
جذبات میں ہیجان مچاتے ہوئے آئے
کس ناز سے معصوم نگاہوں کو جھکائے
آداب جنوں مجھ کو سکھاتے ہوئے آئے
چھلکا کے دم رقص نگاہوں سے شرابیں
انداز جوانی کا دکھاتے ہوئے آئے
ہر گام پہ ہو فتنے قیامت کے اُٹھاتے
کنگن کو کلائی میں گھماتے ہوئے آئے
گستاخ نگاہوں کی جو ہونے لگی یورش
ہر ذرے کو مے نوش بناتے ہوئے آئے
تھی عشق کو ہر گام پہ مٹنے کی تمنا
افسانہ منظوم سُناتے ہوئے آئے
وہ ساحل جمنا پہ بڑے ناز و ادا سے
آنچل سے رُخِ ناز چھپاتے ہوئے آئے
ہر گام پہ وہ حشر اُٹھاتے ہوئے آئے
ہنگام سلکھ حسن لٹاتے ہوئے آئے
پھر تجروہ مخصوص تبسم کی ادا سے
اِک برق مرے دل پہ گراتے ہوئے آئے

از جناب [illegible]

[illegible]

دیکھا تھا ان کو ایک نظر کچھ نہ پوچھئے
اب تک ہوئی نہ شام و سحر کچھ نہ پوچھئے
کیف مئے جمال نظر کچھ نہ پوچھئے
اب تک نہیں ہے اپنی خبر کچھ نہ پوچھئے
اِک حشر انقلاب تھا دنیائے عشق میں
جانا کسی کا وقت سحر کچھ نہ پوچھئے
رنگینیوں میں آپ کے جلووں کی رات دن
کیا دیکھتے ہیں اہل نظر کچھ نہ پوچھئے
پہونچا گئی یہ کون سے عالم میں بے کسی
آتا نہیں ہے کوئی نظر کچھ نہ پوچھئے
ہنستے ہیں کیوں فلک پہ ستارے تمام رات
کیوں رو رہی ہے شمع سحر کچھ نہ پوچھئے
کیا جنس لیکے آئے تھے بازار دہر میں
کیا لے چلے ہیں زاد سفر کچھ نہ پوچھئے
ذروں نے کھینچ دی ہیں ہزاروں شبیہ حسن
ہر سُو ہے کون پیش نظر کچھ نہ پوچھئے
یہ کیا کہا رفیق کو دیوانہ کہہ دیا
اب کیا ہے اُس کے پیش نظر کچھ نہ پوچھئے

از جناب [illegible]

پُراسرار چوری

چلتی گاڑی میں بارہ ہزار کی مالیت کے سونے اور طلائی سکوں کی

دُنیائے جرم کا ایک سو فی صدی سچا واقعہ

از منشی تیرتھ رام صاحب فیروزپوری

جرم کی تاریخ میں حسب ذیل واقعہ عجیب اور انوکھا ہے کہ انگلستان کا مشہور و معروف محکمہ جاسوسی سکاٹ لینڈ یارڈ بھی اپنی انتہائی کوشش کے باوجود چوری کی اس واردات کا سراغ حاصل نہ کر سکا جس کی بدولت اس زمانہ میں ملک کے ہر حصہ کے اندر عظیم سنسنی پھیلی تھی۔ جس چالاکی، ذہانت اور ہوشیاری سے کام لے کر اس جرم کا ارتکاب ہوا اس کی مثال بہت کم دیکھنے میں آئی ہوگی۔ یہ بات آج تک تحقیق نہیں ہو سکی کہ جرم کا ارتکاب کن حالات میں ہوا اور اس کی تہ میں کونسی ترکیب کام کرتی تھی۔ شاید مجرم بھی سب کے سب سزا سے محفوظ رہ جاتے اگر ان میں آپس کی پھوٹ نہ پڑ گئی ہوتی۔ اس جرم کے مفصل حالات پہلی مرتبہ ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

۱۵ مئی ۱۸۵۵ء کی رات کو تین صندوق جن میں بیس ہزار پونڈ مالیت کی سونے کی اینٹیں اور [illegible] تھے، لندن سے پیرس [illegible] صندوق وہاں پہونچے [illegible] کسی نے بارہ ہزار پونڈ [illegible] صندوقوں میں وزن پو[illegible] حالانکہ ظاہرا ان صند[illegible] بالکل معلوم نہ ہوتا [illegible] یا کھولنے کی کوشش کی [illegible]

واقعات اس طرح بیان کئے جاتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ مال لندن سے پیرس بھیجا تھا وہ ان تینوں صندوقوں کو احتیاط سے بند اور مقفل کرکے، ان پہ لوہے کی پتریاں لگا کر اور جابجا لاکھ کی مہروں سے جوڑ کے مقامات کو محفوظ کرکے انہیں لندن کی ایک فرم میسرز چیپلین اینڈ کمپنی کے ہاں دے آئے۔ اس کمپنی کا کام ہر قسم کے مال کو لندن سے پیرس پہنچانا ہوتا تھا، چنانچہ کمپنی نے یہ تینوں صندوق روانگی کی غرض سے نہایت اچھی حالت میں اپنے پاس رکھ لئے۔ بعدازاں اس فرم کے کارکنوں نے لندن پل کے سٹیشن پر یہ صندوق ہر طرح سے اچھی حالت میں سوتھ ایسٹرن ریلوے کے کارکنوں کے حوالے کئے۔ اس سٹیشن کے ریلوے اہلکاروں نے صندوقوں کا وزن کرکے دیکھا تو وہ بیان کردہ وزن سے ٹھیک ملتا جلتا تھا۔ اس کے بعد سوتھ ایسٹرن کمپنی کے کارکنوں نے حسب معمول ان صندوقوں کو لوہے کی تجوریوں میں بند کیا، اور ان پر کارخانہ چب کے بنے ہوئے نہایت مضبوط پیٹنٹ قفل لگائے جنکی کنجیاں ریلوے کے معتمد کارکنوں کو دے دی گئیں۔ جب وہ گاڑی جو فوکسٹن کی بندرگاہ تک جایا کرتی تھی روانگی کے لئے تیار ہوئی تو لوہے کی تجوریاں جن میں تینوں صندوق بند تھے، ریلوے گارڈ کے ڈبہ میں بڑی احتیاط کے ساتھ رکھ دی گئیں۔ گارڈ کا نام جیمز برگس تھا۔ اس نے لوہے کی تجوریوں کو دیکھا اور نہایت احتیاط سے گاڑی میں رکھوایا۔ مخفی نہ رہے کہ ان تجوریوں کی کنجیاں گارڈ مذکور کے حوالہ نہ کی گئی تھیں۔

جس وقت گاڑی فوکسٹن پہنچی تو ان تجوریوں کو کھول کر صندوقوں کا معائنہ کیا گیا لیکن اتنی غلطی ضرور ہوئی کہ انہیں تولنے کی حاجت نہ سمجھی گئی۔ صندوقوں کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد انہیں پھر انہی تجوریوں میں بند اور مقفل کر دیا گیا اور چونکہ فوکسٹن کے آگے سمندر کا سفر تھا اسلئے تجوریاں بولون جانے والے جہاز کے کپتان کے حوالہ کی گئیں۔ جس وقت جہاز بندرگاہ میں پہنچا تو ان صندوقوں کو پھر ایک بار تجوریوں سے نکال کر ان کا معائنہ کیا گیا اور اب کی مرتبہ ان کو تولا گیا۔ اسوقت معلوم ہوا کہ دو صندوقوں کا وزن اس سے کسی قدر زیادہ ہے جتنا روانگی کے وقت تھا اور تیسرے کا اصلی وزن سے بیس سیر کے قریب کم۔

وزن میں یہ فرق دیکھ کر بندرگاہ کے اہلکاروں کو تعجب تو ضرور ہوا لیکن چونکہ صندوقوں کی ظاہری حالت خاطرخواہ تھی اور بندرگاہ کے اہلکار کسی طرح کی دخل اندازی بھی نہ کر سکتے تھے اسلئے انہوں نے تینوں صندوق پیرس روانہ

کریئے جو دراصل ان کی منزل مقصود تھی۔ اسجگہ ان صندوقوں کو پھر تولا گیا تو ان کا وزن وہی نکلا جو بولون کی بندرگاہ میں پایا گیا تھا۔ وہاں جب ان صندوقوں کو کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ بارہ ہزار پونڈ مالیت کا سونا اور سونے کے سکے ان میں کم ہیں اور ان کی جگہ سیسہ بھر دیا گیا ہے چونکہ سیسہ کے ٹکڑے چھوٹی چھوٹی کپڑوں کی تھیلیوں میں بھر کر رکھے گئے تھے۔ اسلئے صندوقوں کے حرکت کرنے سے کسی طرح کی آواز بھی پیدا نہ ہوتی تھی۔

اس واقعہ سے جو اضطراب اور سنسنی پھیلی اسکا حال محتاج بیان نہیں۔ اسی وقت تحقیقات شروع کی گئی لیکن ایک بات جلدی ہی ظاہر ہو گئی یعنی یہ کہ چوری کی واردات یا تو اس وقت ہوئی تھی جب یہ صندوق لندن برج کے ریلوے اسٹیشن پر بغرض روانگی رکھے ہوئے تھے یا اس موقعہ پر جب وہ ریلوے گارڈ جیمس برگس کے زیر نگرانی ریل میں لندن برج کے اسٹیشن سے فوکسٹن کی طرف بھیجے جا رہے تھے۔

پولیس نے قدرتی طور پر سب سے پہلے جیمس برگس کو اپنی حراست میں لے لیا۔ اور اس کے بعد چند اور شخصوں کو بھی شبہ میں گرفتار کیا لیکن ان میں سے کسی کے خلاف کوئی بات ثابت نہ ہو سکی۔ نہ جرم کا کوئی سراغ چلا۔ اسلئے جلدی ہی ان کو رہا کر دینا پڑا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ہر ایک تجوری کیلئے دو سری کنجیوں کے تین تین سٹ موجود تھے۔ ایک سٹ کمپنی کے ٹرافک منیجر مقیم لندن کے پاس رہتا تھا۔ دوسرا فوکسٹن ریلوے اسٹیشن کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس۔ اور تیسرا اس جہاز کے کپتان کے پاس جو رودبار میں چلتا تھا۔ یہ تینوں افسر ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر تھے اور واردات بھی اس وقت نہ ہوئی تھی۔ جب مال ان میں سے کسی کے زیر نگرانی تھا اسلئے ان سے تو کوئی باز پرس ہو سکتی تھی۔ سوال فقط یہ تھا کہ شاید کسی نے کنجیوں کا سٹ ان میں سے کسی کے قبضہ سے نکال کر اس سے ناجائز کام لیا ہو لیکن تحقیقات پر اس خیال کی بھی تصدیق نہ ہو سکی۔ گارڈ برگس کے بارہ میں معلوم ہوا کہ اس کی تیرہ سال کی لمبی ملازمت ہے اور اس دوران میں کبھی کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی۔ جہاں تک مال مسروقہ کی بازیابی کا تعلق تھا۔ پولیس انتہائی کوشش کے باوجود گمشدہ سونا حاصل نہ کر سکی اور نہ یہی معلوم ہوا کہ مجرم درحقیقت کون تھے۔ اسی طرح ڈیڑھ سال کا عرصہ سعی لاحاصل میں گذر گیا۔ حتےٰ کہ رفتہ رفتہ یہ معلوم ہونے لگا کہ اس جرم کا راز کبھی حل ہی نہ ہوگا لیکن اس وقت یکایک ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سطور آئندہ میں کیا جاتا ہے۔

۲

نومبر ۱۸۵۶ء کے ایام تھے کہ ایک خوبصورت اور بظاہر اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والی عورت جیل نیوگیٹ میں پہنچی اور اس جگہ پھاٹک پر کھڑے ہوئے سپاہی سے بیان کیا کہ میں ایک اشد ضروری معاملہ کے سلسلہ میں داروغہ سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے اپنا نام فرانسس فین کے بیان کیا۔ داروغہ جیل نے اس سے ملاقات کی اور اس وقت اس عورت نے ایک عجیب قصہ سرقہ سونے کے متعلق بیان کیا۔ اس نے کہا کہ مجھ کو پورا یقین ہے کہ یہ واردات چار آدمیوں نے مل کر کی تھی۔ جن میں سے ایک تو ریلوے گارڈ جیمس برگس تھا۔ دوسرا ولیم پیرس نام کا ایک آدمی جو کسی زمانہ میں کمپنی کے ٹکٹ چھاپنے کا کام کرتا تھا لیکن جس کو بعد ازاں کسی وجہ سے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ کہ از کم چوری کے وقت وہ کمپنی کی ملازمت میں نہیں تھا۔ تیسرا آدمی ولیم جارج ٹیسٹر جو پیشہ مارگیٹ کا سٹیشن ماسٹر تھا اور فی الحال فوکسٹن میں ٹرافک سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں کلرک تھا چوتھے آدمی کا نام ایڈورڈ ووگر بیان کیا گیا جو ایک مشہور امریکن چور تھا اور فی الحال ایک جعلی چک کے سلسلہ میں عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا جب فینی کے سے پوچھا گیا کہ تم کون ہو اور تمہارا اس واقعہ سے کیا تعلق ہے؟ تو اس نے بیان کیا کہ میرا اس شخص پیرس سے بدلہ لینا چاہتی ہوں کیونکہ جو تھے مجرم ووگر نے میرے حصہ کا جو روپیہ پیرس کے حوالہ کیا تھا وہ اس نے مجھ کو نہیں دیا اور میں ان دنوں بے حد تنگدست ہوں۔

چنانچہ نیوگیٹ نے اسی وقت سوتھ ایسٹرن ریلوے کمپنی کے وکیل مسٹر ریس کو بلوایا اور اس کے روبرو بھی اس عورت نے یہی قصہ بیان کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس نے ہر سہ ملزمان برگس۔ پیرس۔ اور ٹیسٹر کو جو آزاد تھے اپنی حراست میں لے لیا ووگر کی نسبت اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ وہ عمر قید کالے پانی کی سزا بھگت رہا تھا۔

جس وقت ان واقعات کی اطلاع ووگر کے کانوں تک پہنچی اور اس کو معلوم ہوا کہ اس کی غیر حاضری میں پیرس نے فین کے سے اس طرح کی بدسلوکیاں کی ہیں تو وہ فوراً اپنے رفیق مجرموں کے خلاف شہادت دینے کیلئے آمادہ ہو گیا۔

جیل خانہ کے افسروں نے اس کو سمجھایا کہ تم ان لوگوں کے خلاف جو کچھ بیان کرنا چاہتے ہو اس کی بنا پر یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری سابقہ سزا میں کمی کر دی جائیگی۔ لیکن اس کا جواب تھا کہ مجھے کسی رعایت کی پروا نہیں۔ میں جو اصل واقعہ ہے محض اس لئے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ پیرس نے جو وعدہ مجھ سے کیا تھا اسکو پورا نہیں کیا اور میری غیر حاضری میں فین کے سے طرح طرح کی بدسلوکیاں کیں۔

اس کے بعد ووگر کو پولیس کی حراست میں اس

عُروج الکلام

(از جناب عروج زیدی بدایونی)

آئے ہیں اِک نئے عنوان سے تڑپانے کو
کہتے ہیں راہِ وفا سے مجھے ہٹ جانے کو
کون سمجھائے یہ جلتے ہوئے پروانے کو
عشق تو کہتے ہیں مر مر کے جئے جانے کو
ہو کے بے خوف چڑھا دار پہ دیوانے کو
شمع خود بڑھ کے سزا دیتی ہے پروانے کو
دل کو ہوتا نہیں باور کرو کچھ اس کا علاج
میں تو تیار ہوں وعدوں سے بہل جانے کو
سر میں سودا ہے حقیقت کا تو انشاء اللہ!
کعبہ اِک روز بنا دوں گا صنم خانے کو
مجھ پہ آلام کا نرغہ ہے تو ہو اے ساقی
غرق کر دوں گا مے ناب میں غم خانے کو
دل دیا مجکو وہ جس میں ہے خرابی پنہاں
اسی ذرے میں لئے پھرتا ہوں ویرانے کو
ہر طرف سے مجھے یوں دل کی صدا آتی ہے
جیسے دیوانہ پکارے کسی دیوانے کو
میں بلا نوش ہوں خم منہ سے لگا دے ساقی
پھینک دے جام و سبو توڑ دے پیمانے کو
سوزشِ ہجر نہیں اے آہ کے بھرنے والے
کیوں ہوا دیتا ہے اس آگ کے بھڑکانے کو
ذکرِ پامالیٔ امید نہ چھیڑ اے ہمدم!
باغ یہ میں نے لگایا تھا اجڑ جانے کو
میں نے جب زورِ تصور سے لیا کام عروج
شیشۂ دل میں کیا بند پری خانے کو

مقام سے جہاں وہ سزائے قید بھگت رہا تھا مرکزی عدالت فوجداری میں اس غرض سے لایا گیا کہ فریق استغاثہ کی طرف سے ہر سہ ملزمان پیرس، برگس، اور ٹیسٹر کے خلاف جن پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا شہادت دے۔

۳

گواہوں کے کٹہرہ میں کھڑا ہو کر ایڈورڈ روگر نے جو بیان لکھوایا وہ نہایت عجیب و حیرت انگیز تھا معلوم ہوا کہ اسکی ساری عمر چوری کرتے گذری ہے۔ امریکہ میں وہ کئی بار قید ہوا اور کئی بار رہا کیا گیا۔ لیکن اس نے چوری کی عادت نہ چھوڑی۔ ملزم پیرس سے اسکی ملاقات مئی ۱۸۵۴ء میں ہوئی تھی۔ اس موقعہ پر پیرس نے یہ تجویز پیش کی کہ جو سونا ساؤتھ ایسٹرن ریلوے کے ذریعہ سے گاہ بگاہ بھیجا جاتا ہے۔ اس کو اڑانے کی کوشش کی جائے لیکن روگر نے اس کام کو ناممکن العمل بیان کیا۔

انجام کار یہ دونوں فوکسٹن گئے اور قریباً ایک ہفتہ اسجگہ رہے۔ اسی دوران میں وہ کم و بیش ہر وقت ریلوے اسٹیشن کے آس پاس منڈلاتے پھرا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ پولیس کے بعض کارکنوں کو ان کے خلاف شک ہونے لگا۔

ایک رات جب پیرس نے دیکھا کہ کوئی آدمی اس کے پیچھے پیچھے لگا ہوا ہے تو اس نے لنڈن پہنچ جانے میں اپنی سلامتی سمجھی لیکن روگر پھر بھی وہیں رہا۔ وہ اسی بات کی تاڑ جھانک میں رہتا تھا کہ عملہ والے ان تجوریوں کی کنجیاں کسی جگہ رکھتے ہیں، جن میں سونے کی پیٹیاں آیا جایا کرتی ہیں رفتہ رفتہ وہ اصل حقیقت معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا بعد ازاں وہ لنڈن جا کر پھر پیرس سے ملا۔ اور اس نے اسکو بتایا کہ میں نے یہ تو معلوم کر لیا ہے کہ کنجیاں کہاں رکھی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ ان پر قبضہ کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اسلئے چوری کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے۔

مگر پیرس نے جواب دیا "میں ایک نوجوان سے جو لائن پر کام کرتا ہے اور ٹیسٹر جس کا نام ہے اچھی طرح واقف ہوں مجھ کو لوراالیقین ہے کہ وہ اسی محکمہ کے ذریعہ سے کنجیاں حاصل کر سکے گا جو تجوریوں کے معائنہ اور قفل بندی کا کام کرتا ہے شرمن اس کا نام ہے۔"

"تم اگر وہ کنجیاں کسی طرح ایک بار مجھے لا دو" روگر نے جواب دیا "تو میں تھوڑی سی دیر میں ان کا نشان لے کر واپس کر دونگا۔"

اس کے بعد پیرس اور روگر مارگیٹ گئے جہاں ٹیسٹر سٹیشن ماسٹر تھا۔ پیرس نے روگر کا تعارف ٹیسٹر سے کرایا اور اس نے کنجیاں حاصل کر کے بہم پہنچانے کا وعدہ بھی کر لیا۔ بعد ازاں ٹیسٹر ان کے ساتھ ساتھ فوکسٹن گیا اور اسجگہ ان کی ملاقات شرمن سے کروائی۔

اس وقت جب یہ لوگ بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے روگر نے شرمن کو خوب سی شراب پلائی پھر ریلوے لائن پر سونے کی آمد و رفت کے مضمون کا ذکر چھیڑتے ہوئے محض رفع استعجاب کی غرض سے کہا کہ "وہ کنجیاں اگر تمہارے پاس ہوں تو ذرا سی دیر کیلئے مجھے دکھا دو۔" لیکن شرمن نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔

اس نادیدہ مشکل سے مایوس ہو کر تینوں آدمی اس نتیجہ پر پہونچے کہ ہمیں اپنی سوچی ہوئی تجویز سے دستبردار ہی ہونا پڑے گا۔ اس کے بعد کئی مہینے گذر گئے اور اس وقت ناگاہ قسمت خود بخود ان پر مہربان ہوئی یعنی ٹیسٹر کو خلاف توقع ٹریفک منیجر کے دفتر واقع لنڈن برج میں کلرک مقرر کر دیا گیا۔

وہ اس انتظار میں تھا کہ موقعہ پاتے ہی کنجیاں اڑا لے کہ ایک اور عجیب واقعہ ان لوگوں کے حق میں پیش آیا یعنی جس جہاز پر تجوریاں سمندر پار آیا جایا کرتی تھیں اس کے کپتان کے پاس دوسری کنجیوں کا جو سٹ رہتا تھا وہ گم ہو گیا اور نئے نمونہ کے تین سٹ تیار کرنے کا حکم جاری کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی قفل جو ان تجوریوں میں لگتے تھے وہ بھی بدل دئے گئے جسوقت کارخانہ چب کے ہاں سے کنجیوں کے نئے سٹ تیار ہو کر آئے تو ٹیسٹر نے کسی نہ کسی طریقہ پر دوسری کنجیوں میں سے ایک کو حاصل کر لیا کسی وجہ سے وہ دوسری کنجی حاصل نہ کر سکا۔ اسی کنجی کو لیکر وہ روگر کے پاس پہنچا جس نے موم پر اس کا نشان لے لیا۔

اس حد تک تینوں مجرموں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی تھی مشکل صرف یہ پیش آئی کہ ان کے پاس صرف ایک ہی کنجی کا نشان تھا اور وہ دوسری کنجی کے بغیر اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے۔ دفعتاً روگر نے کہا "ٹھہرو میرے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا ہے اور اب میں امید کرتا ہوں کہ ہم دوسری کنجی بھی حاصل کر سکیں گے میرے پاس کچھ نقد روپیہ موجود ہے اس کو میں بذریعہ ریل فوکسٹن روانہ کرتا ہوں جس وقت روپیہ اسجگہ پہونچیگا اور میں اس کو وصول کرنے جاؤنگا تو عین ممکن ہے کہ وصولی کے موقعہ پر میں کنجیاں اڑانے میں کامیابی حاصل کر لوں۔"

اس فیصلہ پر پہنچنے کے بعد روگر نے اپنی دولت کا نصف حصہ اکتوبر ۱۸۵۴ء میں ایک بکس میں بند کر کے بذریعہ ریل فوکسٹن بھیجا اور صندوق کے اوپر حسب ذیل پتہ درج کیا۔

"سی۔ ای۔ آر چیر معرفت مسٹر لیچر یا مسٹر چیپ مین فوکسٹن ریلوے اسٹیشن"

مخفی نہ رہے کہ مسٹر لیچر و مسٹر چیپ مین

فوکسٹن ریلوے سٹیشن پر بکنگ کا کام کیا کرتے تھے۔ مال روانہ کرنے کے بعد روگر خود بھی فوکسٹن جا پہنچا اور تھوڑے عرصے کے بعد جب اس کو معلوم ہو گیا کہ صندوق ریلوے اسٹیشن پر آ پہنچا ہوگا تو بھیس بدل کر آرچر کا فرضی نام اختیار کر کے وہ اس کی وصولی کیلئے گیا تو اس نے ایک نقلی داڑھی لگالی اور آرچر کا فرضی نام اختیار کر کے اسٹیشن پر پہنچا جوقت وہ مال کی وصولی کیلئے بکنگ آفس میں کھڑا تھا تو کلرک چیپ مین نے اس کی نظروں کے سامنے الماری سے دو کنجیاں نکال کر ان کی مدد سے تجوری کھولی اور اس کا صندوق نکال کر اس کے حوالہ کر دیا لیکن گو اس نے کنجیوں پر قبضہ کرنیکی انتہائی کوشش کی تاہم وہ انہیں حاصل نہ کر سکا اور مجبوراً اسے خالی ہاتھ واپس آنا پڑا۔

لیکن روگر بڑا قوی ہمت آدمی تھا۔ اس نے مایوس ہونے کی ضرورت نہ سمجھی اور تار دیکر پیرس کو اپنے پاس بلوالیا۔ اس کا بھی بھیس بدلوا کر اپنے ساتھ لیا اور یہ دونوں بدمعاش ریلوے اسٹیشن کے آس پاس منڈلاتے پھرنے لگے۔ ان کی نظر ہر وقت اس الماری کی طرف لگی رہتی تھی جس میں تجوری کی کنجیاں رکھی رہتی تھیں اور وہ اس موقعہ کی تلاش میں تھے کہ کسی طرح کنجیاں ایک بار اُن کے ہاتھ آجائیں۔

قسمت کی دیوی اپنی متلون مزاجی کیلئے مشہور ہے اور وہ ایسے ایسے کام کرتی ہے جن کا کسی کو خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا اس موقعہ پر وہ ان لوگوں پر خاص طور پر مہربان ہوئی ایک دن جب کہ یہ دونوں بدلے ہوئے بھیس میں بکنگ آفس کے اردگرد پھر رہے تھے بکنگ کلرک کسی کام کیلئے باہر نکلا اور اس نے دفتر کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔ اس وقت کوئی دوسرا آدمی دفتر کے اندر موجود نہ تھا۔

یہ دونوں تو اسی موقعہ کے انتظار میں تھے پیرس جھٹ سے اندر گھس گیا۔ اور روگر اس خیال سے باہر کھڑا رہا۔ کہ اگر کوئی اندر آنے لگیگا تو میں کسی نہ کسی بہانہ اس کو روک لونگا لیکن اس کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کلرک کافی عرصہ دفتر سے باہر رہا۔ اتنے میں پیرس نے الماری کھول کر دو سری کنجیاں نکال لیں اور انہیں لاکر روگر کے حوالے کر دیا۔ اس نے جلدی سے ان دونوں کا نشان موم پر لے لیا۔ اور پیرس دونوں کنجیوں کو کلرک کی آمد سے پہلے پہلے پھر اسی الماری کے اندر رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ کوشش خطرناک تھی تاہم یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ دنیا کا کوئی کام خطرہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اُنہوں نے کوشش کرنا اپنا فرض سمجھا اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔

(۴)

ایک بار کنجیوں کا نقش لیا جا چکا تو باقی کام نسبتاً سہل تھا۔ اس سے پہلے ٹیسٹر نے ریلوے گارڈ برگس سے ملاقات کر کے اس کو آمادۂ امداد کر لیا تھا اور چونکہ یہ بات قرار پا گئی تھی کہ چوری کے مال میں سے اسے بھی حصہ رسدی دیا جائیگا اسلئے وہ ہر طرح ان لوگوں کا ساتھ دینے کو تیار ہو گیا۔ کنجیوں کا نقش لینے کے بعد مصنوعی کنجیاں تیار کرالینا تو سہل تھا لیکن اس کے آگے سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ نئی کنجیاں تجوری کے قفل کھولنے میں کارآمد بھی ہونگی یا نہیں۔ اس کے لئے یہ ترکیب کی گئی کہ برگس کے ساتھ دوستانہ پیدا کرنے کے بعد روگر مختلف اوقات میں کئی کئی طرح کے بھیس بدل کر فوکسٹن تک ریل کا سفر کرتا رہا۔ وہ چلتی گاڑی میں برگس کے پاس رہ کر مصنوعی کنجیوں سے تجوری کے پٹ کھولنے کی کوشش کیا کرتا تھا شروع میں وہ کنجیاں کارآمد نہ ہوئیں لیکن جب ان کو بار بار رگڑا اور بنایا گیا اور ساتھ ہی ساتھ آزمائش کا عمل جاری رہا تو انجام کار وہ کنجیاں ٹھیک بیٹھ گئیں اور روگر ان کی مدد سے تجوری کھولنے اور بند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اب کنجیاں تو ان لوگوں کے پاس آگئیں۔ سوچنا یہ باقی رہا کہ چوری کی واردات کس موقعہ پر کی جائے۔ یہ کام جلدی کا نہیں تھا اور اس میں کافی غور و خوض کی ضرورت تھی۔ انہی ایام میں چاروں سازشیوں نے آپس میں طے کیا کہ بارہ ہزار پونڈ قیمت کا سونا یا طلائی سکے اڑائے جائیں اور معلوم کیا کہ ان کا وزن کم و بیش دو ہنڈرڈ ویٹ ہوگا۔

اب پیرس اور روگر دونوں مل کر سیسہ کی وہ مقدار خریدنے گئے جس کا وزن ملا جلا کر دو ہنڈرڈ ویٹ کے قریب ہو۔ یہ چیز ان کو ہنگر فورڈ پل کے قریب دریائے ٹیمز کے ساحل پر بنے ہوئے ایک کارخانہ میں دستیاب ہوئی۔ یہاں سے انہوں نے چھپن چھپن پونڈ کی جداگانہ مقدار میں دو ہنڈرڈ ویٹ وزنی سیسہ کی گولیاں خریدیں۔ ان کو انہوں نے کپڑوں کی تھیلیوں میں رکھ کر سی دیا۔ پھر ان تھیلیوں کو انہوں نے دو چھوٹے ٹاٹ کے تھیلوں میں بند کیا۔ ان دو تھیلوں کو ایک بڑے تھیلے کے اندر رکھ دیا تاکہ دیکھنے والے کے دل میں کسی طرح کا شک و شبہ پیدا نہ ہو۔ اسی پر کفایت نہ کر کے دونوں شخصوں نے دو دو چرمی تھیلے اپنے ساتھ لئے جنکو وہ اپنے لمبے کوٹ کے اندر چھپا سکتے تھے۔

ان ایام میں روگر ایڈمز کے فرضی نام سے کیمبرج متصل سپر ٹرز لنگٹن میں رہا کرتا تھا۔ اس جگہ فینی کے اس کے ساتھ رہتی تھی اور دونوں اپنے آپ کو میاں بیوی

ظاہر کرتے تھے۔ اس مکان میں یہ لوگ سیسہ کی گولیاں خرید کر لے گئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے اس چیز کو پیرس کے مکان واقع کراؤن ٹیرس ہمپ سٹڈ روڈ میں پہنچایا۔ بعد ازاں وہ اس موقعہ کے انتظار میں لندن برج کے اسٹیشن کے آس پاس پھرنے لگے کہ ٹیسٹر یا برگس دونوں میں سے کسی کا اشارہ پاکر یہ معلوم کریں کہ بارہ ہزار پونڈ مالیت یا اس سے زیادہ کا سونا فوکسٹن بھیجا جارہا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ صندوقوں سے سونا نکال کر سیسہ کی گولیاں جو ان کے پاس تھیں ان کے اندر رکھ سکتے تھے۔

آخر ۱۵ مئی ۱۸۵۵ء کی رات کو یہ موقع قریباً ایک سال کے لمبے انتظار کے بعد ان کو حاصل ہوا یعنی اس روز برگس رومال سے اپنے منہ کو پونچھتا ہوا ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ آج بڑی مقدار میں سونا ریل پر بھیجا جارہا ہے اور تمہیں اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

اشارہ پاتے ہی رو گر نے درجہ اول کے دو ٹکٹ فوکسٹن تک کے خریدے۔ پھر وہ خود، ٹیسٹر اور پیرس یہ تینوں آدمی اندر پلیٹ فارم پر گئے۔ ٹیسٹر کے پاس ایک ریلوے پاس موجود تھا۔ وہ درجہ اول کی ایک گاڑی میں سوار ہوا اور پیرس دوسری میں۔ دو بڑے بڑے تھیلے جن میں سیسہ کی گولیوں کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے پہلے ہی لگیج کے طور پر گارڈ کی گاڑی میں رکھوا دیئے تھے۔ جب گاڑی چلنے لگی تو رو گر موقعہ پاکر برگس کے ساتھ ہی گارڈ کی گاڑی میں سوار ہو گیا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ برگس جو ان لوگوں سے ملا ہوا تھا۔ اس نے ایک کپڑے کا ٹکڑا اس پر ڈال دیا تاکہ کسی دیکھنے والے کے دل میں شبہ پیدا نہ ہو اور یہ شخص اس وقت تک چھپ کر بیٹھا رہا حتیٰ کہ گاڑی اسٹیشن کی حدود سے باہر نکل گئی۔

رو گر اپنے ساتھ ایک چھینی اور ہتھوڑا چھپا کر لے گیا تھا۔ چنانچہ گاڑی کی رفتار ہوتے ہی اس نے مصنوعی کنجیوں کی مدد سے تجوری کو کھولا اور سونے کا بھرا ہوا ایک صندوق نکالا ان آلات کی مدد سے جو اس کے پاس موجود تھے صندوق کو کھول لینا بہت دشوار ثابت نہ ہوا۔ اتنے میں برگس بھی اس کی مدد کو آ پہنچا تھا۔ دونوں نے مل کر وہ سونا جو صندوق سے نکالا گیا تھا۔ ان تھیلوں میں ڈالا جن میں سیسہ کے ریزے چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ اور سیسہ کی تھیلیاں اس کی جگہ صندوق کے اندر بھر دیں۔ صندوق سے کیل نکالنے، پتریاں اکھیڑنے اور لاکھ کی مہریں توڑنے کا عمل بہت دشوار ثابت نہ ہوا اور جب سب کام ہو چکا تو اسی طرح صندوق کو دوبارہ احتیاط کے ساتھ بند کر کے اس پر اس لاکھ کی مدد سے مہریں لگادی گئیں جو پیرس اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔

جس وقت گاڑی ریڈہل کے اسٹیشن پر پہنچکر رکی تو یہ لوگ پہلے صندوق کو کھولنے اور بند کرنے کے عمل سے فارغ ہو چکے تھے۔ گاڑی ریڈہل کے اسٹیشن پر ٹھہری تو ٹیسٹر ٹہلتا ہوا گارڈ کی گاڑی کے پاس گیا اور برگس نے ٹاٹ کا بنا ہوا ایک تھیلا جس میں لوٹ کا مال رکھا ہوا تھا اس کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے لیکر پھر اپنی درجہ اول کی گاڑی میں سوار ہو گیا اتنے میں ٹرین دوبارہ چلنے لگی تھی۔ اس وقت رو گر نے پوشیدہ مقام سے نکل کر دوسرے صندوق پر یہی عمل کیا۔

جیسا پیشتر لکھا جاچکا ہے۔ یہ لوگ صرف بارہ ہزار پونڈ سونے کے وزن کا سیسہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ ان صندوقوں میں بیس ہزار پونڈ سونا بند ہے۔ اب جس وقت ان کو آٹھ ہزار پونڈ قیمت کا سونا مجبوراً چھوڑنا پڑا تو ان کے جی کو سخت ہی صدمہ پہنچا ہوگا۔ لیکن مجبور تھے جس قدر وزن کا سیسہ ان کے پاس تھا اسی قدر وزن کا سونا وہ نکال سکتے تھے اس کے علاوہ چونکہ ان کے پاس وزن کرنے کی کوئی مشین نہ تھی۔ اسلئے سب کام صرف اندازہ سے ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مختلف صندوقوں میں سیسہ کی تقسیم صحیح تناسب سے نہ ہو سکی اور اسی لئے جب بولون اور پیرس پہنچکر صندوقوں کو تولا گیا۔ تو ان کے وزن میں فرق نکلا۔

غرض گاڑی کے فوکسٹن پہنچنے تک سب کام مکمل ہو گیا۔ صندوقوں کو دوبارہ بند کر کے تجوریوں میں بڑی احتیاط کے ساتھ بند کر دیا گیا۔ ظاہرا ایسی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ گاڑی کے فوکسٹن پہنچنے پر رو گر گارڈ کے ڈبہ سے اترا اور پیرس سے جاملا۔ دونوں ڈوور جانے کے لئے دوسری گاڑی پر سوار ہو گئے۔ اور گارڈ برگس نے بھی حسب معمول تجوریاں بحری حکام کے حوالے کر دیں ڈوور پہنچکر رو گر اور پیرس نے ٹاٹ کے تھیلے برگس سے وصول کئے اور دو بجے رات کی گاڑی سے لندن پہنچ گئے۔ ان کے پاس آسٹنڈ سے لندن تک کے ٹکٹ تھے لیکن اسٹیشن کے قلیوں نے یہ بات نوٹ کی کہ اس رات آسٹنڈ سے کسی قسم کا ریلوے سامان لندن کے اسٹیشن پر نہ پہنچا تھا۔

جب خود ان شخصوں سے دریافت کیا گیا کہ آپ کا سامان کہاں ہے تو ان میں سے ایک نے

جواب دیا کہ میں نے سامان ایک دن پہلے بھیج دیا تھا۔
لندن پہنچکر وہ ایک کرایہ کی گاڑی پر سوار ہو کے پہلے پیرس کے مکان پر گئے اور اس کے بعد برو مارکٹ میں ٹیسٹر سے ملے۔ دن کے وقت یہ تینوں لیڈن ہال سٹریٹ کے ایک صراف کی دکان پر پہنچے اور وہاں کچھ سونا فروخت کیا۔ اس کے دوسرے دن وہ ہے مارکٹ کے ایک صراف کی دکان پر گئے اور وہاں باقی سونا فروخت کر کے چک وصول کیا۔

اس وقت تک انہوں نے صرف سونے کے سکے فروخت کئے تھے۔ سونے کی اینٹیں اب تک اُن کے پاس تھیں۔ ان کو انہوں نے ایک کرایہ کی گاڑی میں رکھکر روگر کے مکان پر پہنچا دیا۔ بند مکان کے اندر انہوں نے ایک اینٹ سے تھوڑا سا سونا کاٹا اور پیرس اس کو جاکر تین پونڈ میں فروخت کرا آیا۔ معلوم ہوا کہ کہ اس ٹکڑے کا وزن ایک سو اونس تھا اور وہ تین پونڈ فی اونس کے حساب سے فروخت ہوا۔

(۵)

لیکن ابھی ان لوگوں کے پاس بہت سا سونا قابل فروخت تھا۔ اُن کے پاس وقتی اخراجات پورا کرنے کیلئے کچھ روپیہ آچکا تھا۔ اب سوچ اس بات کی تھی کہ باقی سونے کا کیا کیا جائے؟ آخری ترکیب جو انہوں نے سوچی یہ تھی کہ اس سونے کو پگھلا کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنائے جائیں اور نئے سانچے میں ڈھالا جائے تاکہ کوئی معلوم نہ کر سکے کہ مسروقہ سونا ان کے پاس ہے اس مطلب کیلئے انہوں نے لوہے کے سانچے جو قریباً ایک فٹ لمبے اور دو فٹ چوڑے تھے حاصل کئے اور روگر کے مکان کے ایک کمرہ میں انگیٹھی جلا کر اس میں سونے کو پگھلانے اور نئے سانچوں میں ڈھالنے کا عمل شروع کیا۔ فین کے جو روگر کے پاس رہتی تھی اُسے بالکل معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ چھپ کر کیا عمل کرتے ہیں روگر کی طرف سے اسکو یہی بتایا گیا تھا کہ میرا دوست پیرس جواب میرے پاس رہتا ہے چمڑے کی دستکاری جانتا ہے اور اس کمرہ میں یہی کام کیا کرتا ہے۔

انہی ایام میں کسی بات پر فین کے اور روگر کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ اُسے چھوڑ کر چلی گئی۔ روگر اور پیرس کل برن کے مقام پر ایک اور مکان میں رہنے لگے۔ اور وہیں انہوں نے باورچی خانے کے قریب زمین میں گڑھا کھود کر سونا اس کے اندر دبا دیا۔ سونے کی چھوٹی اینٹیں جو انہوں نے تیار کی تھیں وہ انہوں نے ملک کے ہر حصے میں پھر کر مختلف مقامات پر ادنے پونے فروخت کیں۔ لیکن سب سے زیادہ مال ساورڈ نامی ایک شخص نے خریدا جو سونے کا لین دین کیا کرتا تھا۔

اس کے تھوڑا عرصہ بعد روگر اور فین کے میں پھر مصالحت ہو گئی۔ ہر چند اس چوری کے مال کا حصہ بٹنے کے بعد روگر کے پاس تین ہزار پونڈ کے قریب جمع ہو چکے تھے مگر وہ چونکہ ایک عادی مجرم تھا اس لئے باز نہ رہ سکا اور ایک جعلی چیک بنک میں پیش کرتا ہوا گرفتار ہو گیا اور اکتوبر ۱۸۵۵ء میں اس نے عمر قید کی سزا پائی۔ جن دنوں وہ حوالات میں تھا اس نے پیرس سے ملاقات کر کے یہ بات طے کی کہ میرے حصے کا روپیہ کاروبار میں لگا کر اس کی آمدنی سے ایک پونڈ ہفتہ وار فین کے کو دیتے جانا۔ لیکن پیرس نے یہ دیکھ کر کہ روگر اب عرصہ دراز کے لئے واپس نہ آسکے گا اور فین کے میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ اس کے حصہ کا روپیہ اپنے پاس رکھ لیا اور فین کے کو کچھ دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس وقت سخت تنگ آکر اس عورت نے داروغہ جیل کے پاس ساری حقیقت ظاہر کی۔

پیرس۔ ٹیسٹر اور برگس کے خلاف جو مقدمہ چلا اس کی سماعت ۱۳-۱۴-۱۵ جنوری ۱۸۵۷ء کو ہوئی۔ دوران سماعت میں پیرس نے بڑی بے پروائی کا اظہار کیا۔ ٹیسٹر بہت ملول نظر آتا تھا۔ اور برگس ہر وقت ہنستا رہتا اور خوش نظر آیا کرتا تھا۔

اراکین جیوری نے تینوں شخصوں کو مجرم قرار دیا اور جج نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا "میرے خیال میں پیرس سے زیادہ بڑھکر بدمعاش آدمی کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا از روئے قانون اس کو زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جاسکتی ہے وہ دو سال قید بامشقت ہے وہی سزا میں اس کے لئے تجویز کرتا ہوں لیکن تین ماہ کیلئے حکم دیتا ہوں کہ اس کو قید تنہائی میں رکھا جائے مجھ کو افسوس ہے کہ قانون مجھ کو زیادہ کڑی سزا دینے کا اختیار نہیں دیتا ورنہ میں کسی حال میں اس کو رحم کا مستحق نہ سمجھتا"

ٹیسٹر اور برگس چونکہ ریلوے کمپنی کے معتبر نوکر تھے اور انہوں نے اپنے عہدہ کے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ اس لئے ان کو زیادہ کڑی سزائیں دی گئیں یعنی چودہ چودہ سال کالے پانی کی۔ اس طرح اس نہایت عجیب مقدمہ کا فیصلہ ہوا۔

دمِ واپسیں!

ایک ضعیفہ کو عالمِ کسمپرسی میں مصروفِ نزع دیکھ کر

از جناب فیض جھنجھانوی

نظر تھی کہ موجِ مئے کامرانی ۔ نفس تھا کہ پیغمبرِ زندگانی
کبھی دل تھا آئینۂ حسن و الفت ۔ مگر اب ہی جنتِ شادمانی
تغیر بکف انقلاب آفریں ہے،
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

مسرت کہانی، تبسم فسانہ ۔ سمندِ سکوں پر نظر تازیانہ
دگرگوں ہے رنگِ رُخِ ارغوانی ۔ مذبذب ہے حالِ دلِ والہانہ
فلک سر بزانو مکدر زمیں ہے،
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

سراپا تباہی، مجسم ہلاکت ۔ یہ صبحِ سفر ہے کہ شامِ قیامت
کھنچی جا رہی ہے طنابِ رگِ جاں ۔ بجھا جا رہا ہے چراغِ بصارت
نظر مخبرِ غم، دل اندوہگیں ہے،
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

فضا گرد آلود، تاریک راہیں ۔ جگر دوز نالے غم اندوز آہیں
خموشی سر برہنہ، سکوں سر بزانو ۔ تھکا سا تنفس بجھی سی نگاہیں
سحر دم بخود، شام چیں بر جبیں ہے
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے،

وہ اٹھا نقابِ رخِ بے ثباتی ۔ وہ آئی عروسِ قضا مسکراتی
فضائیں مکدر، ہوائیں پریشاں ۔ قدم ڈگمگاتے نظر تھرتھراتی
سکوں مضطرب زندگی خشمگیں ہے،
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

نظر سوزِ رنگِ رخِ بیوفائی ۔ جگر دوز شمشیرِ بے اعتنائی
یہ آنکھیں چرانا، یہ واسازیاں ۔ یہ نظریں بدلتی ہوئی سی خدائی
غمِ ہمنفس، شکوہ ہمنشیں ہے،
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

غزالِ نظر دامِ شرمندگی میں ۔ شکستِ تارِ دامانِ تابندگی میں
سرِ زندگی نقشِ پائے قضا پر ۔ سنانِ قضا سینۂ زندگی میں
زمیں فتنہ پرور، فلک نکتہ چیں ہے،
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

ہوائیں تکدر، فضا پر اداسی ۔ فلک بھوکا بھوکا، زمیں پیاسی پیاسی
دھواں آ چھپن رہا ہے مسامِ سحر سے ۔ ہر اک چیز پر چھا رہی ہے گھٹا سی
نگاہوں میں کہیں رخ کہیں آگ ہی ہے،
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے،

کفِ بیکسی میں دلِ خود نمائی ۔ درِ بے رخی پر سرِ آشنائی
سسکتی ہوئی شمعِ بزمِ تحمل ۔ تڑپتا ہوا لاشۂ دل ربائی
تجلی سیہ پوش، زہر انگبیں ہے،
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

خیالِ مقدم، نہ فکرِ موخر ۔ غمِ رہزن ہے نہ احسانِ رہبر
عجب شان سے جا رہا ہے مسافر ۔ نظر جانبِ شافعِ روزِ محشر
تخاطب سوئے احکم الحاکمیں ہے
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

مزاحیہ

خدایا ہمیں مہمانوں سے محفوظ رکھنا!

ازجناب [illegible] صاحب [illegible] رحمانی

انسان کیلئے ارضی اور سماوی جتنی مصیبتیں اور بلائیں ہیں ان میں سب سے بڑی مصیبت اور بلا مہمان ہے۔ پھر اس نا شدنی کا نہ کوئی موسم ہے اور نہ وقت۔ جاڑا، گرمی، برسات، سوتے جاگتے، استنجا کرتے، بیوی سے لڑتے، بچوں کو پیٹتے، نہاتے، زمانے اور جس حال میں چاہے نازل ہو جائے۔ یہ اپنی جنس کے اعتبار سے تو ارضی ہے لیکن خاصیت سماوی رکھتا ہے، چنانچہ اکثر و بیشتر اس کا نزول بلائے آسمانی کی طرح اچانک اور ناگہانی ہوتا ہے۔ یہ اتنا موقع بھی نہیں دیتا کہ انسان مکان کے پچھلے دروازے سے باہر نکل جائے اور مکان میں ایک ہی دروازہ ہو تو لڑکے سے کہلا دے کہ ابا ایک ہفتہ ہوا باہر گئے ہوئے ہیں۔ شاید اگلے ہفتے تک آجائیں اور اماں کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔

جس طرح اس بلا کے نازل ہونے کا کوئی وقت نہیں اسی طرح اس کے اندفاع کا بھی کوئی مجرب عمل نہیں۔ بیماری کی سی کوئی چیز ہوتو انسان حکیم اور وید کی طرف رجوع کرے۔ خالص آسیبی قسم کی کوئی شے ہو گنڈے تعویذ سے کام لے۔ سائنس نے بھی ابھی تک اس کے متعلق کوئی یقینی کارآمد آلہ ایجاد نہیں کیا۔ گورنمنٹ کے قانون سے بھی اس بارے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ یہ مصیبت جس طرح نازل ہونے میں آزاد ہے اسی طرح دفع ہونے میں خود مختار۔

اس بلا کی مختلف قسمیں ہیں۔ یہ کبھی دوست کی شکل میں نازل ہوتی ہے کبھی عزیز کی صورت میں، کبھی پیر و مرشد، کبھی عقیدت کیش کی شکل میں۔ اقسام کے اندر بھی اقسام ہیں۔ مثلاً کبھی یہ مذکر صورت میں نازل ہوتی ہے، کبھی مؤنث صورت میں۔ کبھی واحد کی صورت میں، کبھی جمع کی صورت میں، کبھی جمع الجمع کی صورت میں۔

اگر آپ کہیں کسی دیہات کے باشندے ہیں۔ اور شہر میں وکالت، نوکری یا کاروبار کرتے ہیں تو آپ سے زیادہ شامت زدہ اس بارے میں کوئی اور نہ ہوگا۔ گاؤں سے عید بقرعید کے جو شخص جوتہ ٹوپی خریدنے آئے گا۔ وہ ایک وقت آپ کو ضرور سرفراز فرمائے گا۔ اگر کسی کو کچہری کا کوئی کام ہوا تو وہ احتیاطاً شام ہی کو گاؤں سے آکر آپ کے ہاں قیام پذیر ہو جائے گا۔ تاکہ دوسرے روز وقت سے کچھ پہلے بااطمینان کچہری پہنچ جائے۔ دوسرے روز اگر کچہری سے دیر میں فرصت ملی تو کیا ضرورت ہے مارے مارے گھر چلے جانے کی۔ آپ کا گھر اور ان کا دور تو ہے نہیں۔ کل صبح جائیں گے۔ آپ کے ہاں بھی رہینگے تو باہر تو رہینگے نہیں، گھر ہی رہینگے۔ اگر لڑکی لڑکے کیلئے نسبت کی ضرورت ہوئی تو شہر میں آپ کے گھر سے زیادہ ٹھہرنے کے لئے موزوں اور دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ آپ کے ہاں قیام کر کے اطمینان سے پتہ لگائیں گے کہ اچھی نسبت کہاں ہے اور بضرورت پڑنے پر اظہار فخر کے طور پر یہ بھی فرما دیں گے کہ ہم شاہ [illegible] وکیل کے ہاں ٹھہرے ہوئے

اگر آپ ذرا پوزیشن کے آدمی ہیں اور آپ کا مکان بھی سونے، نہانے اور پاخانے کے اعتبار سے آرام دہ ہے تو آپ کے احباب چھٹیوں میں آپ کو ضرور نوازینگے۔ اور آپ کے حلقہ احباب میں کچھ سرکاری افسر ہیں تو وہ دورے کے سلسلے میں بھی آپکو فراموش نہ کرینگے۔ سرکارسے قیام و طعام کا بھتہ وصول کر کے بھی ٹھہرینگے آپ ہی کے گھر۔ وہ ہزار سرکاری افسر سہی، لیکن آپ سے افسری کے کیا معنی؟ آپ کے ہاں قیام کرینگے، آپ کے ہاں کھائینگے۔ آپ کی کار پر شہر کی سیر کرینگے۔ آپ کے خرچ سے سنیما دیکھینگے۔

اگر خوش قسمتی یا بد قسمتی سے آپ اتنے غیور اور اخلاق پسند واقع ہوئے ہیں کہ ریل یا اسٹیشن پر اپنے پاس بیٹھے ہوئے مسافر کے سامنے ڈبہ پیش کئے بغیر خود پان کھا لینا اخلاق و تہذیب کے منافی سمجھتے ہیں تو ایسے شریف الطبع حضرات بھی آپکے ہاں قدم رنجہ فرماتے رہیں گے۔ جو آپ سے رخصت ہوتے وقت آپ کی خوش خلقی کی داد دیتے ہوئے آپ کا پتہ نوٹ کر لینگے اور جب آپ کے شہر میں وارد ہوں گے تو آپ کے ہاں نزول اجلال فرمانا اپنا اخلاقی فرض خیال کریں گے۔

آپ تعجب فرمائیں گے کہ میں بھی مہمانوں سے کتنا جلا ہوا ہوں جو اس طرح دل کے پھپھولے پھوڑ رہا ہوں۔ صاحب اس میں تعجب کی بات نہیں۔ واقعہ سن لیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ مہمان مصیبت اور بلا نہیں تو کیا ہیں؟

آدھی رات کا وقت ہے۔ خلقت بے خبر سو رہی ہے اور باہر "سرکار! سرکار!" کی پکار پڑ رہی ہے، کچھ دیر تک تو میں اس خیال سے مطمئن تھا کہ کسی پڑوسی کی شامت آئی ہوگی لیکن جب جگانے والا یہ دیکھ کر کہ سونے والے کی نیند نہیں ٹوٹتی دروازہ توڑنے پر تیار ہو جائے تو کوئی کب تک غلط فہمی میں پڑا رہ سکتا ہے، مجھے بڑبڑاتے ہوئے لالٹین لے کر باہر نکلنا پڑا۔

دروازہ کھولتے ہی میرے کانوں پر بجلی سی گر پڑی ـــ "مہمان آئے ہیں بابو جی!" ـــ چھکڑے والے نے میری بڑبڑاہٹ سن کر سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

نیند کی طرح میرے حواس بھی غائب ہوگئے پہلے تو چھکڑے سے کم و بیش نصف درجن بچے مختلف عمر اور سائز کے اتر کر چل پول مچانے لگے۔ پھر برقعے سے چھپا ہوا ایک سراپا نظر نواز ہوا۔ اس کے بعد لگا سامان اُترنے، ساتھ ہی میرے یار زاد ماموں زاد وغیرہ نہیں بلکہ ملاقاتی بھائی صاحب بڑے اخلاق سے پاس آکر بولے ـــ کہیے بھائی صاحب! اور سب تو خیریت ہے نا؟

خیریت تو جیسی کچھ تھی دل ہی جانتا تھا لیکن میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ دروازے سے ہٹ کر الگ کھڑا ہوگیا۔ اگر اب آپ کو اس میں شک نہیں رہا کہ مہمان کسی بلائے ناگہانی سے کم نہیں ہوتے تو میری آنکھوں کے سامنے یہ ساری بلا میرے گھر میں داخل ہوگئی۔

شہر میں کرایے کا مکان لے کر رہنا پڑتا ہے اسلئے مختصر سا مکان تھا جس میں گنے چنے کمرے تھے۔ ایک میرے استعمال میں تھا دوسرا بیوی کے تصرف میں، ایک باورچی خانے کے کام میں آتا تھا۔ ایک کو میں نے ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اب سوال یہ تھا کہ بھائی جان کس کمرے کو آباد فرمائیں؟ اس کا حل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ میں اپنے کمرے کو سنگل سے ڈبل بنالوں اور بیوی کے کمرے کو بھائی جان کیلئے وقف کر دوں۔

بھائی صاحب نے دیکھا کہ میں ان تمام انتظامات سے فارغ ہو کر ذرا سانس لینے کے قابل ہوا تو انہوں نے دادِ خلوص و محبت دینا شروع کیا۔

"خط تو مل گیا ہوگا آپ کو میرا؟"

"جی نہیں تو، کیسا خط؟"

"چلتے وقت میں نے آپ کو اطلاعی خط لکھ دیا تھا۔"

"کبھی کبھی کسی چیز کے پہنچنے میں ایک آدھ روز کی دیر بھی ہو جاتی ہے۔"

"اوہو، اب یاد آیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ لکھ کر ڈیسک میں رکھ دیا، پوسٹ کرنے کا خیال ہی نہ رہا، تب تو آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔"

"تکلیف کی بھی ایک ہی کہی، ارے صاحب آپ لوگوں کے قدم کہاں نصیب ہوتے ہیں۔"

میرے خلوص کے بارے بھائی صاحب کے دانت نکل پڑے۔

خدا خدا کر کے ذرا آنکھ جھپکانے کا موقع ملا تھا کہ سوتے ہوئے فتنے بیدار ہونا شروع ہوگئے۔

"اماں بھوک لگی ہے۔" ایک صاحبزادے بولے

"چپ چپ" بھائی جان نے اپنی مترنم اور شیریں آواز میں ڈانٹا۔

"تم نے تو راستے میں کہا تھا، وہاں کھانا پکا ہوا رکھا ہے۔ رات کو ہم ویسے ہی سو گئے" ـــ دوسرے صاحبزادے بول اٹھے۔

"چپ نالائق کہیں کا۔"

"اوں، اوں، بھوک لگی ہے۔" صاحبزادی رونے لگیں۔

"دیکھو صبح ہوئی ہے اب پکے گا کھانا۔"

"اے اماں، بسکٹ!" منجھلی صاحبزادی نے مطالبہ کیا۔

"ان حرامزادوں کا طوفان دیکھو؟" بھائی صاحب مسلسل ایجی ٹیشن سے گھبرا اٹھے۔

"ابا مٹھائی" گود والی صاحبزادی بولیں۔

"لیجیے آپ بھی شریک مطالبہ ہوگئیں" بھائی صاحب کو غصہ آگیا۔

مختصر یہ کہ غریب کدہ طرح طرح کی تحریکات کا ہنگامہ زار بنا ہوا تھا۔ بھائی صاحب اور بھائی جان مشترکہ طور پر اس شورش اور ہیجان کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ جیسے جیسے تشدد سے کام لے رہے تھے۔ فساد و ہنگامہ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر مجھے مداخلت کرنی پڑی اور وہ یوں کہ مجھے ہوٹل سے ناشتہ اور چائے منگا دینا پڑا۔

میں نے بیگم سے کہا۔ ناشتے کا مرحلہ تو طے ہوگیا۔ دوپہر کے کھانے کا انتظام ہونا چاہیے"

بیگم تنک کر بولیں۔ "تو ہو انتظام، مجھ سے واسطہ؟"

"تو کون کرے گا؟ آپ سے آپ ہو جائے گا؟"

"میری جانے بلا۔"

"خدا کیلئے ایسی باتیں نہ کرو بیگم۔"

"بھئی بات کہیں صاف، ہم سے یہ مصیبت نہیں بھگتی جا سکتی۔ تمہیں مہمان نوازی کرنی ہے تو بازار سے کھانا منگاؤ۔"

"ارے بھئی کتنا کھانا بازار سے آئے گا؟ نہ جانے کے روز رہیں گے یہ لوگ"

"جتنے روز بھی رہیں، میرے کیے فوج کو راشن مہیا نہیں ہو سکتا۔"

"تم بھی کیسی عورت ہو جانتیں نہیں۔ مہمان نوازی کا کتنا ثواب ہے؟"

"تو آپ شوق سے مہمان نوازی کیجئے اور

دونوں ہاتھوں سے کیلئے ثواب لوٹئے۔"

"ارے بھئی یہ بھی تو سوچو کہ اگر یہ لوگ ایک ہفتہ بھی رہ گئے تو بازار سے کھلانے میں بیسوں پچیسوں پر پانی پھر جائے گا۔"

"اور آپکو ثواب بھی تو کتنا ہوگا۔"

"مذاق نہ کرو بیگم۔"

"مذاق کون کرتا ہے؟ میں نے تو صاف کہدیا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ تمہارے ہاں تو روز ہی نہ جانے کہاں کے اٹھائی گیرے چلے آتے ہیں۔"

"تو بیگم اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں نے ذرا نرم ہوکر کہا، مگر بیگم نے تیکھی ہوکر بولیں — "کون کہتا ہے آپکا قصور ہے آپ اخبار و نمبر اشتہار دیجئے کہ جسے کہیں ٹھکانا نہ ملے وہ میرے گھر چلا آئے۔ لیکن یہ پکنے کھلانے کا روگ اب میرے بس کا نہیں رہا۔"

"تو میرے منافع اور نقصان کی بھی تمہیں پروا نہیں۔"

"تو تم جب سمجھوگے، جب بازار سے کھانا منگانا پڑے گا۔ میں کب سے چیخ رہی ہوں کہ مفت خوروں کا سلسلہ موقوف کرو۔ مگر تمہارے کانوں پر جوں نہیں رینگتی تو یوں سمجھو۔"

بیگم کی اس سول نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ صبح اور چار بجے کا ناشتہ اور دوپہر اور رات کا کھانا سب بازار سے آنے لگا۔ جیسے جیسے دن گذرتا جاتا تھا ہوٹل والے کا بل ہولناک صورت اختیار کرتا جاتا تھا لیکن بھائی صاحب تھے کہ واپسی کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ میں یہ سوچکر کہ ممکن ہے بھائی صاحب واپس جانا بھول گئے ہوں اشارے اور کنایے سے یاد دلاتا لیکن وہ تو جیسے میری اس طرح کی بات نہ سمجھنے کی قسم کھا چکے تھے۔

اس درمیان میں میرے بھتیجے بھی بے کار نہیں رہے۔ ڈرائنگ روم کی دیوار پر رنگین ہوئی تصویروں پر فشانہ بازی کرتے کرتے اس فن میں شریفانہ خاصی مہارت پیدا کرلی۔ اسی طرح انہوں نے ڈرائنگ روم کی سادی دیوار کو روشنائی سے آرٹ روم بنا دیا۔ اگر میں اجرت پر ڈرائنگ روم کی دیواروں کی پینٹنگ کراتا تو ایک خاصی رقم صرف ہوجاتی۔

برادر زادوں کی کارگزاری دیواروں ہی تک محدود نہیں رہی، انہوں نے میرے سادے سوٹ کو بھی پھولدار بنا دیا۔ طاق پر رکھے ہوئے گلدان کے ایک جوڑے کو ترقی دیکر متعدد جوڑے تیار کر دیئے۔ کئی کتابوں کے دیباچے اور تتمے صاف کرکے ان کو بہترین خلاصے کی صورت دیدی۔

دس روز کی چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ آج میرا دفتر کھلنے والا تھا۔ میں نے بیگم سے کہا — میں تو عاجز آگیا، خدا کے لئے چھٹکارے کی کوئی صورت بتاؤ بیگم۔"

بیگم نے بے پروائی سے جواب دیا — "میں کیا کروں کی صورت بتاکر، ان کے رخصت ہوتے ہی تم دوسروں کو بلا لوگے۔"

"ارے بھئی میں کسی کو گھر سے تو بلالاتا نہیں لیکن آیندہ اور تم جو کہوگی کرونگا، کسی طرح یہ بلا تو ٹلے۔"

"تو ان لوگوں کو مجھ پر چھوڑ دو، تم دفتر جاؤ۔"

"آخر تم نے کیا تدبیر سوچی ہے؟"

"اس سے تمہیں کیا بحث؟"

"کیا بتانے میں کچھ مضائقہ ہے؟"

"تم لگوگے چنیں و چناں کرنے۔"

میں نے کہا — اچھی بات ہے تو مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔"

میں کھانا کھا کر دس بجے دفتر چلا گیا۔ شام کو واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں بھائی صاحب ٹھیلے پر سامان لدوا رہے ہیں۔ میں نے دل میں تو خوش ہوکر کہا۔ خس کم جہاں پاک، لیکن زبان سے بھائی صاحب کے اس قدر جلد جانے کی تیاری کر دینے پر افسوس ظاہر کیا۔ خاطر مدارات کی کمی اور کوتاہی کی معافی مانگی۔ آیندہ ... آوری کے متعلق دریافت کیا، پیار سے ... کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ اس طرح بھائی ... کو رخصت کرکے میں نے اندر جاکر بیگم ... پوچھا۔ تم نے یہ کون سا تیر بہدف منتر پڑھا ...

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" بیگم ... مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو آخر یہ بلا اس قدر جلد کیسے ٹل گئی؟ ...

"بلا کے ڈر سے"

"یعنی؟"

"وہ دیکھو پاخانے کے دروازہ کے ... میں نے دیکھا ایک موٹا سا چوہا ...

میں نے پوچھا: یہ چوہا کیسا ہے؟ ...

بیگم بولیں: "پلیگ کا۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ بیگم بھی کشت ... ہو گئیں۔

آپ نے سنا ہوگا۔ مہمانوں کی آمد خیر و برکت کا ... ہوتی ہے۔ بھائی صاحب کی موجودگی میں ... اس کی تصدیق ہوتی رہی اور ان کے واپس ... لے جانے کے بعد اس کی مزید تصدیق ہو ... ڈرائنگ روم کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا ... طوفان آکر نکل گیا ہے۔ ہر چیز منتشر اور ... کہیں ٹوٹا ہوا گلدان پڑا تھا تو کہیں ... آئینہ جیسی شکست" پر "خوب شد اسباب ... خود بینی شکست" والا مصرعہ یاد آرہا تھا ... کہیں پان کی پیک دیوار پر اپنی سرخی کی ... دکھا رہی تھی۔ کہیں میز پوش پر پڑی ہوئی ... روشنائی کے داغ لطف دے رہے تھے ... گوشے میں پھٹا ہوا اخبار پڑا تھا تو کسی طرف ... ٹوٹی ہوئی کتاب کی جلد۔ پندرہ روپے ... راہ کیلئے بھائی صاحب مانگ کر لے گئے ... اسے تو جلد ہی بھیجدینے کا اطمینان بھی دلا ... تھے لیکن غائب شدہ میرے ایک سوٹ، بیگم کی ...

سازی، ایک بلاؤز، اور ایک رسٹ واچ کی، تو انہوں نے رسید دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی —— اس رو...

جادوگر کی ڈائری

از جناب مسعود جاوید

ایک ماہر ہپناٹسٹ کیلئے دنیا کا کون کام مشکل ہے!

فن ہپناٹزم کے جن حقائق کو سائنس کی مدد سے بھی نہیں سمجھا جا سکتا جو فوق الفطرت ظہورات ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں جو باتیں دنیا والوں کو ناممکن العمل دکھائی دے رہی ہیں جن کراماتوں کی تاویل انسانی عقل کرنے سے قاصر رہی ہے وہ سب ایک ماہر ہپناٹسٹ کیلئے ممکن ہیں۔ عورت، مرد، بڈھا، جوان الغرض دنیا کا ہر ایک انسان خداوند کریم کی طرف سے اس دولت لازوال کا امین بنکر پیدا ہوا ہے۔ یہ عبدایات ہے کہ اپنی جہالت کے باعث جیتے جی کوئی شخص اس گنج نایاب کی کھوج اپنے خانہ دل میں نہ کر سکے لیکن یہ خفیہ طاقت ہے سب کے پاس اور ہر کوئی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کیسے؟ یہ جاننے کیلئے "جادوگر کی ڈائری" کا از اول تا آخر نہایت غور سے مطالعہ کیجئے گا۔

(ایڈیٹر)

(مسلسل)

ہپناٹزم اور جرائم کا حل!

دماغ اور جسم کی علیحدگی کے متعلق ابھی مجھے تجربات کرتے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ میرے ذہن میں تنویم کے اس پہلو کو ایک اور صورت میں استعمال کرنے کا خیال پیدا ہوا جو کہ اپنے اندر عالم انسانیت کے واسطے بہت کچھ فوائد رکھتا ہے مختصراً یہ کہ مجھے یہ خیال آیا کہ جرائم کے حل کرنے میں تنویم یا ہپناٹزم کی امداد پولیس کیلئے پیش کرنا چاہئے۔

پولیس کا قابل اعتماد تخمینہ یہ ہے کہ آجکل برطانیہ عظمیٰ میں قتل کی ان وارداتوں کی تعداد جو راز ہی رہ جاتی ہیں۔ پچاس فی صدی ہے۔ یہ واردات ایسی ہوتی ہیں جن میں پولیس کے لوگوں کو پورا اطمینان ہوتا ہے کہ وہ قاتل کو جانتے ہیں مگر اس کو عدالت کے سامنے نہیں لا سکتے کیونکہ قاتل کے خلاف ثبوت کے سلسلے میں کوئی ایک کڑی غائب ہوتی ہے اور ثبوت مکمل نہیں ہوتا۔

اس قسم کے قاتل مرد اور عورتیں دونوں — آجکل زندہ ہیں — آزاد اور سوسائٹی میں عزت کے مالک! — اگر پولیس کو اجازت ہوتی کہ ہپناٹزم کے علمی اصول کو استعمال کر سکے تو ان میں سے ایک بھی مجرم پھانسی کے تختہ سے نہ بچ سکتا۔ بجز ان لوگوں کے جن کو حبس دوام کی سزا دیجاتی۔

اس قسم کے واقعات میں سے دو وارداتیں میرے ذہن میں خاص طور پر موجود ہیں — ایک تو مسٹر الفریڈ اولیور کا قتل جو کہ ایڈنگ کا ایک مشہور تمباکو فروش تھا۔ اور دوسرے سچرٹ کی ایک چودہ ۱۴ سالہ طالب علم ویرا ہوڈ کا قتل، جس کو عصمت دری کے بعد قتل کر کے لاش کو مضافات شہر میں ایک کھیت میں ڈال دیا گیا تھا۔

مسٹر اولیور اپنی دکان میں مقتول پایا گیا تھا۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کے محکمہ سراغرسانی نے اپنے چند بہترین دماغ رکھنے والے لوگوں کو اس معاملہ پر مامور کیا تھا کئی ہفتہ کی جدوجہد کے بعد ثبوت کا سلسلہ مکمل ہوا مگر اس زنجیر میں ایک کڑی ہنوز غائب تھی۔ ان لوگوں کے خیال میں جو کہ اس کام پر مامور کئے گئے تھے قاتل کی شناخت میں کسی شبہ کا امکان باقی نہ تھا وہ لوگ پوری طرح جانتے تھے کہ قاتل کون ہے لیکن ایک پولیس کے آدمی کے دماغ میں خواہ شبہ کتنا ہی کیوں نہ ہو۔ عدالت میں پیش ہونے والے ثبوت سے کہیں زیادہ مختلف چیز ہے۔ مہینے گزرتے چلے گئے اور عام لوگوں نے اس معاملہ میں دلچسپی لینا بھی چھوڑ دی لیکن پولیس کی کوشش اور تلاش جاری رہی۔ ایک منٹ کیلئے بھی پولیس نے اپنی تفتیش کو بند نہ کیا لیکن ثبوت کی وہ گمشدہ کڑی ہرگز نہ ملی۔ چنانچہ الفریڈ اولیور کا قتل تاریخ میں سکاٹ لینڈ یارڈ کی ناکامیوں میں شمار کیا جائیگا۔

ویرا ہوڈ کا واقعہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس

واقعہ میں بھی اسکاٹ لینڈ یارڈ کے لوگوں کو یقین کے ساتھ معلوم تھا کہ مجرم کون ہے۔ تفتیش کے دوران میں پولیس والوں نے اس سے ملاقات کی اور اس سے سوالات بھی کئے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ شخص جھوٹ جواب دے رہا ہے مگر پھر بھی اپنے اس علم کو ظاہر نہ کر سکتے تھے۔ تقریباً سات یا آٹھ سال تک اس امید میں اس شخص کی نگرانی ہوتی رہی کہ وہ صرف ایک بار کوئی ایسی لغزش کرے جس کی مدد سے پولیس والے اُس کو جرم کی گرفت میں جکڑ لیں۔ مگر اب تک اس نے کبھی ایسی لغزش نہیں کی ہے۔ پولیس اب تک نگران ہے اور منتظر —— اور میرا ہم کا قتل سرکاری طور پر ابھی تک ایک سربستہ راز ہی ہے۔

یہاں اس کا موقعہ نہیں کہ "ججز رولز" —— (Judges' Rules) یا اُن قواعد و ضوابط پر بحث کی جائے جن کی پابندی تفتیش جرم کے دوران میں یا مشتبہ و گرفتار شدہ شخص کے ساتھ برتاؤ کرنے میں ہماری پولیس پر لازمی ہے۔ ہم اپنے ملک میں ابھی تک اس خیال کو بنیادی چیز سمجھے ہوئے ہیں کہ جب تک کسی شخص کا جرم ثابت نہ ہو جائے وہ معصوم و بے گناہ ہے اور ایک مشتبہ شخص سے زبردستی جرم کا اعتراف کرانا صرف خلاف قانون ہی نہیں بلکہ کامیاب چارہ جوئی اور عدالتی کارروائی میں ایک رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ پولیس کو جرح کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ میرے ایک دوست نے جو کبھی پولیس میں ایک اعلیٰ عہدہ پر مامور تھا اور جس کے ساتھ میں ان امور پر بحث کر رہا تھا۔ مجھ سے کہا —— "تعجب کی بات یہ نہیں ہے کہ مجرم قانون کی گرفت سے بچ جاتے ہیں بلکہ حیرت انگیز یہ چیز ہے کہ وہ گرفتار کر لئے جاتے ہیں:"

میری تجویز یہ نہیں ہے کہ ہمیں "امریکن تھرڈ ڈگری" کے انتہائی ذلیل طریقوں یا امریکن پولیس کے تفتیش جرم کے طریقوں کی نقل کرنا چاہئے اگر بے رحمی و سنگدلی کو کوئی طریقہ کہا جا سکتا ہے تو امریکن پولیس کی ان حرکات کو ایک طریقہ تفتیش کہہ لیجئے۔ ورنہ جیسا کہ ممالک متحدہ امریکہ میں سرکاری تازہ تحقیقات نے واضح کیا ہے یہ سب ایک وحشت و بربریت ہے باایں ہمہ ہمارے ملک میں اس خیال کے لوگوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ ہماری پولیس کو پابندیوں کے ذریعہ غیر ضروری طور پر مجبور بنایا جاتا ہے۔

دیگر ممالک اور خصوصاً امریکہ میں ایک حیرتناک حد تک پولیس کی امداد کی جاتی ہے امریکہ میں ہی سائنس دانوں نے درحقیقت ایک ایسا "عرق حقیقت" ایجاد کیا ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ مجرم کو سچ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

جب اس "عرق حقیقت" کو انجکشن کے ذریعہ جسم میں داخل کر دیا جاتا ہے تو یہ انسان کی شعوری کیفیت کو ضعیف کر کے ایک ایسے مقام پر لے آتا ہے جو نیند سے بالکل متصل ہے اور اس کیفیت میں دماغ کا توازن کچھ ایسا ہموار ہو جاتا ہے کہ اگر اس شخص سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ بالکل بے اختیار ہو کر صحیح صحیح جواب دیتا ہے کیونکہ اس میں اتنی اہلیت نہیں رہتی کہ کوئی مطمئن کن جھوٹ سوچ سکے۔

لیکن اس قسم کے نیم معتبر طریقے ہمارے قانون میں قطعی قابل نفرت ہیں مگر دوسری طرف اسکی کوئی وجہ نہیں کہ پولیس کی امداد کیلئے ہپناٹزم کے علمی اصولوں کو استعمال نہ کیا جائے خصوصاً ان صورتوں میں جبکہ پولیس مجرم کو صرف اسلئے عدالت کے سامنے نہیں لا سکتی کہ ثبوت کی زنجیر میں کوئی ایک کڑی گمشدہ ہوتی ہے۔

اس طریقہ پر وہ اعتراضات عاید نہیں ہوتے جو کہ ہم امریکہ میں استعمال ہونے والے طریقوں کے متعلق قدرتی طور پر محسوس کرتے ہیں مگر اس میں چند دشواریاں موجود ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ مشتبہ شخص ہپناٹزم کا عمل کرنا ناممکن ہوگا۔ صرف قانون ہی اس کی جائز ممانعت نہ کرے گا بلکہ یہ چیز بالکل بیکار بھی ہوگی کیونکہ کسی شخص پر اس کی مرضی کے خلاف ہپناٹزم کا عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اور یقیناً کوئی بھی انسان اس پر آمادہ نہ ہوگا کہ اس پر ہپناٹزم کے ذریعہ ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی جائے کہ وہ مجبوراً اُن راز کی باتوں کو ظاہر کر دے جن کو وہ پوشیدہ رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس میں مشتبہ شخص کی کوئی ضرورت نہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم کرانے کی ضرورت نہیں کہ کیا عمل کیا جا رہا ہے —— اُس سے گفتگو کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

ہپناٹزم کا عمل مشتبہ شخص پر نہیں کیا جائیگا بلکہ کسی دوسرے شخص پر جو کہ آسانی کے ساتھ بیخودی کی گہری نیند میں ڈوب سکے۔ اس طرح وہ شخص جس پر ہپناٹزم کا عمل کیا گیا ہو مشتبہ شخص کے دماغی خیالات کو بخوبی اور بغیر کسی غلطی کے امکان کے معلوم کر سکتا ہے اور اس دریافت کے نتائج کو پولیس حکام کے پاس بھیج سکتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ جرم کے تمام واقعات کو ایک مربوط سلسلے میں از سر نو تعمیر کیا جا سکتا ہے —— پولیس کے نظریات کی روشنی میں نہیں بلکہ خود اس شخص کے افسانے کی صورت میں جس نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ افسانہ یقیناً وہ نہ ہوگا جو اُس نے اپنے الفاظ میں خود بیان کیا ہو بلکہ وہ جو کہ اس کے

دماغ میں ایک تصویر کی طرح نقش ہے۔

اگر اس وقت جبکہ یہ عمل کیا جا رہا ہو مشتبہ شخص جھوٹ کے ذریعہ واقعات کو درہم برہم کرنا چاہے تو ایسا کرنے میں اس کی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ جھوٹ کا صرف خیال ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ دماغ کے عقبی حصے میں کوئی "سچ" موجود ہے ــــ کوئی حقیقت موجود ہے اور ہپناٹزم کی نیند میں ڈوبا ہوا شخص صرف حقیقت ہی کو بتائے گا۔ مشتبہ شخص معمول کی نظروں سے اپنے دماغ کے حقیقی خیالات کو نہیں چھپا سکتا۔

آپ خود کسی ایسی چیز کا خیال کرنے کی کوشش کیجئے جس کو آپ جانتے ہیں کہ غلط ہے۔ اس وقت آپ کو محسوس ہوگا کہ اس پوری کوشش کے درمیان آپ کو اس حقیقت کا ضرور ایک شعور رہتا ہے جس کو آپ مسخ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہی بات میں متعدد مرتبہ تجربے سے ثابت کر چکا ہوں اور کچھ ہی مدت ہوئی کہ میں نے اسی امر کو ایک نوجوان محقق پر واضح کیا تھا جو کہ اس میں خصوصی دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔

اس وقت میرے پاس ایک نوجوان معمول نیند میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔ میں نوجوان محقق جرنلسٹ کو اسی کمرے میں لے آیا۔

"اس شخص کا پیشہ کیا ہے؟" میں نے معمول سے پوچھا جو کہ نیند کی محض پہلی کیفیت میں تھا حالانکہ دماغی خیالات کو معلوم کرنے کے ایسے تجربات میں بہترین نتائج حاصل کرنے کے واسطے میں دوسری اور تیسری کیفیت کو ترجیح دیتا ہوں غالباً یہی وجہ تھی کہ معمول نے کچھ پس و پیش کیا مگر اس کے بعد وہ بولا ــــ "یہ شخص اپنے دل میں سوچ رہا ہے کہ یہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس کا نام مارگن ہے لیکن درحقیقت یہ ایک جرنلسٹ ہے اور اس کا نام رابن سن ہے یہ خیال اس کے دماغ کے اس حصے میں ہے جسے تم عقبی حصہ کہتے ہو اور یہی حقیقی خیال ہے۔"

کریپن کی مشہور واردات کے موقعہ پر میں اسکاٹ لینڈ یارڈ پہنچا۔ اور پولیس کے سامنے یہ بات پیش کی کہ اگر مجھے ایک معمول کے ساتھ کریپن کے پاس لے جایا جائے تو میں پولیس کے واسطے اس راز کو حل کر سکتا ہوں۔

میں نے خود کمشنر آف پولیس سر ایڈورڈ ہنری سے ملاقات کی۔

"مجھے ایک بار کریپن کے روبرو پہنچ جانے دیجئے" میں نے کہا۔ "اور میرے ساتھ ایک معمول کو لیجائیے جسے میں وہاں نیند میں غرق کر سکوں تو میں آپ کو بتا دونگا کہ کریپن نے جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ نہیں اور اگر اس نے جرم کیا ہے تو واردات کی پوری تشریح اور مقصد بھی بتا دونگا۔"

سر ہنری اس معاملے میں بالکل مجبور تھے باایں ہمہ انہوں نے اس میں گہری دلچسپی ظاہر کی۔ میں نے کوشش کی کہ ان کی دلچسپی کو اتنا بڑھا دوں کہ وہ مجھے اس کام کی اجازت دے دیں۔ اسلئے میں نے اسی جگہ اور اسی وقت ایک معمول پر نیند طاری کی ــــ خود اسکاٹ لینڈ یارڈ کے کمرے میں ــــ اور اس معمول سے کہا کہ سر ہنری کے خیالات معلوم کرے۔

"ان کا خیال ہے کہ تم پاگل ہو۔" معمول نے جواب دیا۔

سر ہنری نے بے اختیار ایک قہقہہ لگایا۔

"یہ بالکل ٹھیک کہتا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن یہ بتائیے کہ میں اب کیا سوچ رہا ہوں"

پانچ منٹ کے اندر ہی سر ہنری کو واضح یقین ہو گیا لیکن اس سے کوئی فرق پیدا نہ ہو سکا۔

"اگر ہم مصر میں ہوتے" انہوں نے کہا۔ "تو میں ضرور ایسا ہی کرتا۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں کے ہپناٹزم کو استعمال کرتے ہیں اگرچہ میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتے نہیں دیکھا۔ لیکن یہاں یہ چیز ناممکن ہے۔"

ان الفاظ کے بعد اب کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔

میں نے اکثر سوچا ہے کہ اگر ایک شخص جس پر غلطی سے کسی جرم کا الزام لگایا گیا ہے اپنے اس معاملے کو ہپناٹزم کے معمول کے سپرد کرے تو حالات کیا سے کیا ہو جائیں کیونکہ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جب ہپناٹزم کا استعمال کیا جاتا ہے تو غلطی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں کسی شخص پر غلطی سے کوئی الزام نہیں آ سکتا۔ اور اگر الزام واقعی صحیح ہے تو اسے ایک ایسا ثبوت مل جائیگا کہ اس کا اسے خود بھی یقین آ جائیگا۔

مثال کے طور پر دو شخصوں زید اور بکر کو لیجئے اگر زید کی موجودگی میں بکر سے کوئی سوال کیا جائے تو فوراً ہی دونوں کے دماغوں میں خیالات کا ایک سلسلہ شروع ہو جائیگا۔ اگر زید واقعی مجرم ہے تو اس حقیقت کو پوشیدہ رکھنا اس کے واسطے ناممکن ہے کیونکہ دماغ میں "ربط خیالات" (Association of ideas) کا فعل شروع ہو جائیگا جو نفسیات کی ایک عام اصطلاح ہے ــــ اور یقیناً "ربط خیالات" کا مسئلہ ایک مستند اور تسلیم شدہ حقیقت ہے ــــ ایک بالکل عریاں حقیقت ــــ اس "ربط خیالات" کے عمل سے جو خیالات بیدار ہوتے ہیں وہ درحقیقت وہ نہیں ہوتے جو ہم چاہتے ہیں کہ ہوں بلکہ صرف وہی ہوتے ہیں جو واقعی تھے۔ اور جیسا کہ میں پیشتر بیان کر چکا ہوں ان خیالات کو جھوٹ اور فریب کے پردے میں چھپانا قطعی ناممکن ہے کیونکہ تحت الشعور کے واسطے سارا شعوری دماغ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ (باقی باقی)

(ترجمہ) ــــــ (مسعود جاوید)

....سے دمِ جدائی

از حضرت ساز برہانپوری

محبت میں عہدِ وفا ہی بہت ہے
جدائی میں یہ آسرا ہی بہت ہے
قسم ہے محبت کی معصومیت کی
یہ اِک جذبۂ بے ریا ہی بہت ہے
بہت ہے یہ عہدِ وفا ہی بہت ہے

بچھڑتے کو ہیں آج مطلوب و طالب
بظاہر زمانہ ہے اسوقت غالب
زمانہ ہی مغلوب ہو کر رہے گا
محبت کے بڑھتے رہینگے مطالب
مصائب میں عہدِ وفا ہی بہت ہے

مری التجا ہیں تمہاری عنایت
مری شادکامی تمہاری بدولت
یہ دورِ جدائی ہے دشوار لیکن
زمانہ اُٹھا کر رہے گا ندامت
نہ گھبراؤ عہدِ وفا ہی بہت ہے

کہیں تم مصائب سے گھبرا نہ جانا
زمانہ کے دھوکے میں ہرگز نہ آنا
حوادث کے طوفان آتے رہیں گے
تب اسوقت دامانِ الفت بچانا
تو جانیں کہ عہدِ وفا ہی بہت ہے

یہ کمبخت اُمڈے ہوئے غم کے بادل
جو تھامے ہوئے ہیں محبت کا آنچل
امیدوں کی دُنیا لٹی جا رہی ہے
محبت کی رنگیں فضاؤں میں ہلچل
اس عالم میں عہدِ وفا ہی بہت ہے

یہ رو کر دل و جان کیوں کھو رہی ہو
محبت کو اشکوں سے کیوں دھو رہی ہو
محبت نکھرتی ہے بچھڑے ہوؤں کی
تو غمگین و مایوس کیوں ہو رہی ہو
پھر اسوقت عہدِ وفا ہی بہت ہے

پھر اسوقت موقع ہے ہنس لو ہنسا لو
مجھے بن کے انجان اپنا بنا لو
سمجھ لو یہ ہے ابتدائے محبت
اسی بات پر آؤ خوشیاں منا لو
کہ آئندہ عہدِ وفا ہی بہت ہے

تخیل کو دھوکا دیئے جا رہا ہوں
مگر پھر بھی اس وقت گھبرا رہا ہوں
قیامت ہے تم سے جدائی قیامت
ستم ہے تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں
نہ روٹھو کہ عہدِ وفا ہی بہت ہے

قسم ہے "خدا حافظ" اکبار کہدو
پھر ایسے نہیں ہنس کے اکبار کہدو
خموشی کو توڑو ذرا مسکراؤ
گلے مل کے اکبار، اکبار کہدو
بس اب جاؤ عہدِ وفا ہی بہت ہے

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہوجائینگے



سائنس کی حیرت انگیز ایجاد جو سیاہ اور بدنما جلد کو سفید اور دلکش بنا دیتی ہے

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہوجائینگے یہ "**فلوروزون**" کی موجد مشہور عالم فرم کا دعویٰ ہے جو گذشتہ کئی برسوں سے اس معاملہ کی ریسرچ کر رہی تھی۔ اس ایجاد سے ہر ایک شخص گورا ہوسکتا ہے۔ یہ گھر دفتر ازدواجی زندگی اور سوسائٹی میں عزت اور مرتبہ حاصل کرسکتا ہے۔ رات کو سوتے وقت "**فلوروزون**" کے چند قطرے ہتھیلی پر ڈال کر چہرے پر دو چار منٹ مالش کیجئے۔ صبح چہرے کو نیم گرم پانی سے دھو ڈالئے۔ متواتر چار ہفتہ ایسا کیجئے اور اس کے بعد آئینہ میں اپنی شکل دیکھئے۔ آپ حیران ہوجائیں گے۔ وہ چہرہ جو سیاہ یا گندمی رنگ کا تھا یا کیل، مہاسے اور چھائیوں وغیرہ اور جھریوں سے بدنما ہورہا تھا۔ چاندنی کی طرح سفید، سیب کی طرح سرخ اور بہار کی طرح حسین اور دلکش ہوگیا ہے کیل، مہاسے، چھائیوں وغیرہ کا نام نشان باقی نہیں رہا اور بدنما مرجھائے ہوئے چہرے پر پھر سے جوانی اور بہار آگئی ہے۔ فلوروزون سائنس کی حیرت انگیز ایجاد ہے۔ اس کے ہر قطرہ میں اوزون (تیز آکسیجن گیس) سائنٹیفک طریقوں سے شامل کی گئی ہے جو جلد کی سیاہی کو اپنے آپ میں جذب کرلیتی ہے۔ اور جب آپ سوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت آپ کے چہرے کی سیاہی، کیل مہاسے چھائیاں وغیرہ آہستہ آہستہ دور ہوجاتی ہیں۔ اور چار ہفتوں میں بدنما چہرہ حسین اور دلکش ہوجاتا ہے۔ ہر ایک مرد عورت اس سہل سائنٹیفک ایجاد سے دائمی خوبصورتی اور جاذبیت حاصل کرسکتا ہے۔ فلوروزون کے استعمال کے بعد عارضی خوبصورتی حاصل کرنے کے لئے کریم، پوڈر وغیرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فلوروزون چہرے کے علاوہ جسم کے ہر ایک حصہ پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ قطعی بے ضرر ہے۔

فلوروزون مکمل کورس تین روپے آٹھ آنے میں ملتا ہے۔ ڈاک خرچ الگ۔

ہندوستان کے ہزاروں مرد عورتیں "فلوروزون" سے فائدہ اٹھا چکے ہیں

ہندوستان کے نمائندگان

تیار کنندگان

فلوری کیمیکل انڈسٹریز { فلوروزون ڈپو۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۷۵ بمبئی

اصلی کیمیاگری

یورپ چونے کے پتھر سے سونا کس طرح بناتا ہے

از جناب صوفی لچھمن پرشاد صاحب لاہور

ہندوستان میں چونے کا پتھر تمام دنیا سے زیادہ ہے۔ اس کو انگریزی میں "لائم سٹون" کہتے ہیں۔ پنجاب میں کھیوڑہ ضلع جہلم میں یہ بہتات سے ملتا ہے اور یہاں ہی نمک کا پہاڑ ہے جس سے ہر سال کروڑوں من نمک نکلتا ہے جو کہ شیشہ کی طرح شفاف ہے۔ غالباً کسی زمانہ میں یہ نمک کھیوڑہ سے آکر لاہور فروخت ہوا کرتا ہوگا اسی لئے یہ لاہوری نمک کہلاتا ہے۔ نمک کے علاوہ کھیوڑہ میں چونے کا پتھر بھی بکثرت ہے جہلم سے آگے گولپور کا تمام پہاڑ چونے کے پتھر کا ہی ہے یہاں سے یہ پتھر اور اس کا چونا پنجاب کے تمام شہروں میں آکر بکتا ہے جموں سے لیکر چشمہ سکیسر تک کے تمام پہاڑی ندی نالے اس پتھر سے اٹے پڑے ہیں۔ ہمالیہ پہاڑ کے ہر حصہ میں لائم سٹون بکثرت ہے۔ راجپوتانہ کی خشک پہاڑیاں اسی پتھر سے لدی ہوئی ہیں۔ اس کثرت کا ہی کرشمہ ہے کہ پتھر کا چونا اگر اکٹھا خریدا جائے تو چار پانچ آنہ فی من مل جاتا ہے۔ ہندوستانی اس سے مکانوں میں سفیدی کرتے ہیں یا عمارتوں کی چنائی کے کام میں لاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کو اس چیز سے کوئی واسطہ نہیں لیکن یورپ اس سے سونا بناتا ہے۔ میں آج وہ تمام راز بتا دینا چاہتا ہوں تاکہ میرے ہموطن بھی اس سے سونا پیدا کر سکیں۔

یورپ سے ایک سفید رنگ کی دوا ہندوستان میں آکر انگریزی دوا فروشوں کی معرفت فروخت ہوتی ہے جس کا انگریزی نام "کیلسیم ہائیڈریٹ" ہے۔ اس دوا کی ایک پونڈ کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ ہے۔ معلوم ہے کہ یہ قیمتی دوا کیا ہے؟ میں بتاتا ہوں کہ چونے کے پتھر کو بھٹی میں جلا کر جب چونا بنایا جاتا ہے تو ان جلے ہوئے پتھروں کو اگر پانی سے بجھا لیا جائے کہ جس سے وہ شگفتہ ہو جائیں تو یہی شگفتہ پتھر کا چونا "کیلسیم ہائیڈریٹ" کہلانے لگتا ہے کہ جس سے آپ مکانوں میں سفیدی کرتے ہیں۔ یہی پتھر کا چونا کیلسیم ہائیڈریٹ کے نام سے بازاروں میں ایک روپیہ بارہ آنہ فی پونڈ بکتا ہے۔

یورپ سے ایک اور چیز ہر سال لاکھوں پونڈ کی ہندوستان میں آکر فروخت ہوتی ہے۔

کیلسیم کاربونیٹ پریسی پیٹیڈ
(Calcium Carbonate Precipitated)

یہ چیز ہر قسم کے ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ کریم اور ٹوتھ پاؤڈروں میں بکثرت استعمال ہوتی ہے اس کی شکل سفید چونے جیسی ہوتی ہے۔ اور اس میں ہی ادویات ملا کر مندرجہ بالا چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ یورپ سے پچیس روپیہ فی ہنڈرڈ ویٹ کے حساب سے ہندوستان میں آکر بکتی ہے یعنی چار آنہ کی ایک پونڈ یہ بھی دراصل پتھر کے چونے کی شکل تبدیل کی ہوئی ہے اگر دو حصہ نمک کے تیزاب کو ایک حصہ پتھر کے چونے میں ڈال کر روغنی برتن میں نرم آگ پر گرم کر کے خشک کر لیا جائے تب جو چیز برآمد ہوگی اس کو "کیلسیم کلورائیڈ" کہا جاتا ہے۔ یہ چیز بھی انگریزی دوا فروش چار پانچ آنہ فی پونڈ فروخت کرتے ہیں۔ نمک کا تیزاب بہت سستی چیز ہے۔ نمک کو اگر گندھک کے تیزاب کے ساتھ ملا کر کشید کیا جائے تو اس سے نمک کا تیزاب تیار ہوتا ہے جس کو انگریزی میں "ہائیڈرو کلورک ایسڈ" کہتے ہیں۔ اگر ہندوستانی کیلسیم کلورائیڈ بنانا چاہیں تو وہ ہندوستان میں اس کو دو روپیہ فی من کی لاگت سے تیار کر سکتے ہیں لیکن یہ چیز یورپ سے چار آنے فی پونڈ کے حساب سے ہندوستان میں بک رہی ہے اور کوئی اس بات کو جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ یہ کیا چیز ہے۔

ایک اور چیز یورپ سے ہندوستان میں آتی ہے جس کو انگریزی میں "سوڈیم کاربونیٹ" کہتے ہیں اور ہندوستانی اس کو کپڑے دھونے والا سوڈا کہتے ہیں۔ دھوبی لوگ کپڑا دھونے میں اس کو بکثرت استعمال کرتے ہیں یہ ہندوستان میں پانی کے بھاؤ تیار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی نمک کی بدلی ہوئی شکل ہے ہم نمک کے پہاڑوں کو اور ہندوستان کے سمندروں کے کھاری پانی کو سوڈیم کاربونیٹ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ میں اوپر کیلسیم کلورائیڈ کے بنانے کا طریقہ لکھ چکا ہوں۔ آپ اگر کیلسیم کلورائیڈ پانچ اونس کو بیس اونس گرم پانی میں حل کر دیں اور سوڈیم کاربونیٹ کو علیحدہ برتن میں ۲۰ اونس گرم پانی میں

(باقی برصفحہ ۸۷)

ہنسو اور موٹے ہو جاؤ

پرانا گاہک۔ سنتا ہوں کہ تم پرانی موٹر کاروں کی فروخت کے کاروبار میں اچھا نفع حاصل کر لیتے ہو۔ اس کا کیا طریقہ ہے؟

تاجر۔ بات یہ ہے کہ میری دکان ایک پہاڑی کے اوپر ہے جو شخص یہاں سے موٹر کار لے جاتا ہے پھر اسے واپس نہیں لا سکتا۔

ایک دوست مستقبل کے متعلق میں بہت خوش فکر ہوں۔

دوسرا دوست۔ پھر تم پریشان کیوں معلوم ہوتے ہو؟

پہلا۔ اسلئے کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ میری خوش فکری صحیح ہے یا غلط۔

مسافر۔ گاڑیاں ہمیشہ لیٹ کیوں آتی ہیں؟

اسٹیشن کا قلی۔ اگر لیٹ نہ آئیں تو ویٹنگ روم میں کون ٹھیریگا؟

سرکس کا منیجر (تماشائیوں سے)

لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ اب بہترین تماشے کا وقت آ گیا ہے یعنی یہ کہ سات قسم کے جانور ایک ہی پنجرے میں ایک ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آپ لوگ ذرا دیر سے تشریف لائے اب سب جانور شیر کے پیٹ میں ہیں۔

باپ۔ کہو، آج اسکول میں تمہیں پہلا دن تمہیں کیسا معلوم ہوا؟

لڑکا۔ میرے چاروں طرف جو لڑکے بنچ پر بیٹھے تھے وہ تو بہت اچھے تھے۔ مگر کرسی پر جو بڈھا بیٹھا تھا۔ وہ مجھے پسند نہیں آیا۔

"آپ کو کسی طرح کا وہم تو نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں"

"تیرہ کے عدد کو آپ ناپسند تو نہیں کرتے؟"

"نہیں"

"تو پھر مجھے تیرہ روپے قرض دے دیجئے"

ہندوستانی سنیاسیوں کے جگر پارے

لاکھ لاکھ کی قیمت کا ایک ایک نسخہ

اکسیر پیچش۔ کتھ سفید ۲ تولہ سہرمہ سیاہ ۲ تولہ۔ افیون مصفیٰ ۲ ماشہ۔ پہلے افیون کو عرق گلاب میں حل کر لیں۔ بعدہٗ دوسری ادویات مثل سرمہ پیس کر محلول شدہ افیون میں یکجا کریں تاوقتیکہ گولی باندھنے کے لائق ہو جائے۔ گولیاں بقدر چنا تیار کریں۔

ایک گولی صبح نہار منہ باسی پانی سے دیں۔ ایک دوپہر کو دہی کے پانی سے اور ایک شام کو چاولوں کے دھوون سے۔

بیمار پیچش کی وجہ سے کتنا ہی لاچار ہو گیا ہو اس کے کھانے سے آرام ہو جاتا ہے۔ اگر پہلے روغن بیدانجیر کا استعمال کر لیا جاوے تو بہت اچھا ہے۔ یہ نسخہ گو کتابی ہے مگر تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ ایک گرانمایہ چیز ہے۔

قابض۔ لونگ (قرنفل) ۱۔ تولہ۔ دارچینی ۳ تولہ الائچی سفید ۴ تولہ۔ جائفل ۲۔ تولہ۔ گل ارمنی ۶ تولہ۔ گل سرخ ۷ تولہ۔ قند سفید (کھانڈ) ۲۳ تولہ۔ تمام ادویات کو الگ الگ باریک پیس کر آپس میں خوب آمیز کر لیں۔ خوراک ۴ رتی سے ایک ماشہ تک دے سکتے ہیں ہمراہ عرق سونف گرم شدہ۔

یہ دوا ان اسہال بچگان کو زود اثر ثابت ہوگی جبکہ کھانا کھانے کے بعد پیٹ تن جاتا ہو۔ انتڑیوں میں کسی چیز کے چلنے کا پتہ چلتا ہو۔ پیٹ میں نفخ ہو کر اسہال آتے ہوں۔ میں نے جب نسخہ کے اجزاء موثرہ پر غور کیا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ یہ نسخہ مندرجہ ذیل عوارضات کیلئے ایک بیش قیمت سریع الاثر مرکب ہے۔ موسم گرما میں جب ٹھنڈی اشیاء پینے سے یا ویسے ہی سفید رنگ کے اسہال ہونے لگیں۔ دانت نکالنے کے زمانہ میں جب اسہال بچہ کو آ رہے ہیں۔ یا حوامل کو جب اسہال شروع ہو جائیں تو اس سفوف کو کھول نہ چاہئے۔ جب کسی مریض کو رات بھر تو آرام رہے مگر صبح اٹھتے ہی پانچ چھ دست آجائیں اس کے بعد پیٹ میں تو گڑبڑ رہے مگر اسہال بند رہیں۔ رات کو بالکل آرام رہے۔ صبح پھر بیماری عود کر آئے تو ایسی صورت میں اس دوا کا شفا بخش اثر ہو جاتا ہے۔ گویا آپ سمجھ لیں کہ سفوف مذکور کے یہی مواقع استعمال ہیں۔

کایا کلپ۔ ببول نیب یعنی نیب۔ چھلکا نیب فلفل دراز۔ زیرہ کشمیری ہر ایک ۴ تولہ۔ ترپھلہ (ہلیلہ، بلیلہ، آملہ) ۱۲ تولہ نمک سیندھا ۲ تولہ۔ پیپلامول ایک تولہ۔ سب کو خوب باریک کر کے تین سو اٹھ گولیاں بنائیں۔ ایک گولی ہر روز علی الصباح باسی پانی سے کھائیں۔ آٹھ ماہ تک استعمال کرنے سے کایا کلپ ہو سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ عورت سے پرہیز کیا جائے۔

برائے پیچش خونی۔ امرود کا چھلکا دو تولہ نمک ملا کر باسی پانی سے پیس کر علی الصباح چاٹ لیں۔ دوا دونوں وقت تین یوم استعمال کریں۔

برائے سوزاک۔ گگی سرسوا (سرسوں سفید) ایک پاؤ۔ آب تازہ پانچ سیر شب کو بھگو دیں علی الصباح سہ مرتبہ چھان کر یہ تمام عصارہ مریض کو پلا دیں۔ یہ عمل تین یوم متواتر ہوگا دوران استعمال دوا میں غذا صرف دہی چاول قدرے شکر کے ساتھ کھلانا چاہئے۔

آجکل کس قسم کی لڑکیاں پسند کی جاتی ہیں؟

از جناب کاظم دہلوی

۱- دیہات کے بابو لوگ ان بھری بھری جوانیوں کے طالب ہوتے ہیں کہ جو پھولوں سے تلتی ہوں۔ قوس قزح میں سنورتی اور ناز و نزاکت میں کھیلتی ہوں۔

۲- دفتری بابو اس طبعیت جمال کو پسند فرماتے ہیں جسے پردہ باغ اور سینما جانے کا شوق تو نہ ہو لیکن رسائل میں مضامین ضرور لکھتی ہو۔

۳- شاعر اس شبنمی حور تمثال پر جان دیتا ہے کہ جو ہمہ تن اس کے شعروں میں جذب ہونے کے علاوہ اور کسی طرف کا ہوش نہ رکھتی ہو۔

۴- لیڈر اس لالہ رخ کو پسند کرتا ہے کہ جس کے بھائی بند حکومت کے دل دہاں حامی ہوں۔

۵- ملا ایسی زہرہ جبیں کا رسیا ہوتا ہے کہ جس کے میکے میں سوائے بوڑھی ماں کے اور کوئی نہ ہو۔

۶- انٹرنس فیل نوجوان اس زہرہ جبیں کو پسند کرتا ہے جس کے والد کسی دفتر میں ہیڈ کلرک ہوں۔

۷- ڈرائیور اس پری پیکر کا جویا ہوتا ہے جس کے زیادہ تر عزیز کچہری میں ملازم ہوں۔

۸- اپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین ان شوخ و شنگ زمینوں کے دلدادہ ہوتے ہیں کہ جو جاڑے کے موسم میں بھی چھتری ہاتھ میں رکھنے کی عادی ہوتی ہیں۔

۹- ایڈیٹر اس سیم تن، زرنگار اور کاغذی پیکر دوشیزہ کا متمنی ہوتا ہے کہ جو محبت کے سوا اور کچھ نہ چاہتی ہو۔

ایسے مواقع کہ جب انسان کو سچ مچ معمہ بن جانا پڑتا ہے

۱- پارک میں کسی شاداب حسینہ سے پہلی مرتبہ ملاقات ہو جائے اور واپسی میں گیٹ کے قریب کوئی پولیس مین ایک گہری نگاہ ڈال کر پوچھ بیٹھے "صاحب یہ آپ کی کون ہیں؟"

۲- بیگم صاحبہ برسوں کی بچھڑی ہوئی ایک سہیلی کے ہاں جانے کو تیار ہوں اور یکایک فون آجائے کہ صاحب آج چند افسروں کے ساتھ کھانا کھائینگے۔

۳- فلم ایکٹرس سے کچھ ملاقاتی کو زندگی کی روداد سنانے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ آپکا شغل؟ اور جواباً عرض کیا جائے جی میں اخبار نویس ہوں۔

۴- صاحبزادے کسی حسین وعدہ کے پیش نظر تیاری فرمارہے ہوں۔ اور والد صاحب نازل ہو کر شفقت سے فرمادیں۔ بیٹا منشی جی سے ابھی حساب سمجھ لو۔

۵- کوئی صاحب ہولی سے ایک دن پہلے پتا اور پتنی کو خطوط تحریر فرمائیں اور پتاجی کو خط ڈالنے کے بعد کچھ دیکھکر ششدر رہ جائیں۔

۶- کوئی صاحبہ مردانی کلاس میں کچھ دیکھ رہی ہوں ٹھیک اس وقت جبکہ فلم بہار پر ہو نوکر گھر سے بلبلاتی ہوئی بچی کو لے کر سینما ہال میں داخل ہو جائے۔

۷- بڑی کاوش کے بعد آفس انچارج سے دو روز کی رخصت لی جائے گھر پہنچ کر معلوم ہو کہ دلہن صاحبہ آج ہی اپنے بھائی کے پاس ڈیرہ دون گئی ہیں۔

۸- کچھ طلبا ٹیچر کو دق کرنے کیلئے ایک عجیب سکیم بنا کر چپ چاپ کلاس میں جائیں اور ماسٹر صاحب داخل ہوتے ہی فرداً فرداً نام لیکر حکم دیں۔ "اسٹینڈ اپ آن دی بنچ"

۹- ... کو دماغ کا خلل قرار دیر سماجی میگزین کیلئے ٹینس گراونڈ میں مضمون لکھ رہا ہو کہ پیچھے سے کوئی نرم و نازک لہجہ میں دریافت فرمائے "ابا کیا وقت ہوگا مسٹر زمان ــــ؟"

اصلی کیمیا گری (بقیہ صفحہ ۸۲)

حل کرکے پھر بعد میں ملادیں تو تھوڑی دیر اس پانی کے پڑا رہنے کے بعد کیلسیم کاربونیٹ پانی کی تہ میں بیٹھ جائیگا۔ اب اوپر کے نتھرے ہوئے پانی کو علیحدہ کرکے کیلسیم کاربونیٹ کو فلٹر پر ڈال کر عام پانی سے اچھی طرح دھولیں پھر کیلسیم کاربونیٹ کو پانی میں ڈال کر آگ پر خوب ابالیں۔ پھر سرد ہونے پر اوپر کا نتھرا ہوا پانی علیحدہ کردیں۔ تہہ میں جو سفید چیز بیٹھی ہوگی۔ اس کو دھوپ میں پھیلا کر خشک کرلیں۔ اب اس کا نام "کیلسیم کاربونیٹ پرسی پی ٹیٹڈ" ہے جس سے ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ کریم، اور ٹوتھ پاوڈر بنتے ہیں۔ یہ چیز سفید رنگ کی نہایت ہلکی ہوتی ہے اور چار آنہ فی پونڈ بکتی ہے۔ پتھر کے چونے پر کیمیائی عمل کرنے سے یہی چار پانچ آنہ فی من کا چونا پندرہ بیس روپے فی من کا بن جاتا ہے ہندوستانیوں کو چونکہ ان رازوں کا علم نہیں۔ اسلئے وہ اپنی دولت یورپ کی طرف دھکیل رہے ہیں ورنہ ہندوستان اگر چاہے تو مندرجہ بالا اشیاء تیار کرکے تمام دنیا کو مہیا کرسکتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں سستا۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے ملک کے ہونہار نوجوان اس ٹیکنیکل سائنس کی طرف توجہ دیکر اپنے ملک کے ان حقیر پتھروں سے اپنی روزی پیدا کرنے کے وسائل اختیار کرینگے۔ مندرجہ بالا اکیلا نسخہ لاکھ روپیہ کا ہے جس کی بدولت یورپ کروڑوں روپے پیدا کررہا ہے۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۵۸۵

تار کا پتہ "مستقلندر" لاہور

ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہا ست

بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

مست قلندر لاہور

جلد ۲۶ نمبر ۳

افسانہ نمبر

دسمبر ۱۹۴۱ء

اردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیر الاشاعت ماہوار رسالہ

ان زندہ دل انسانوں کے لئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کر لیا ہے۔ ہمیشہ خوش رہنے اور دوسروں کو خوش کرنے میں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھنے میں جو اپنے قول یا فعل سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے۔ جن کا مذہب ہے۔ خدا کے ہر ایک بندے سے بلا امتیاز رنگ و قومیت محبت کرنا

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ۸

ایڈیٹر
ڈاکٹر پرتھی سنگھ

سالانہ چندہ تین روپے

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ڈاکٹر پرتھی سنگھ پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر رسالہ مست قلندر دستو لین گوالمنڈی لاہور سے شائع ہوا۔

بے بدل رنگین افسانے

فہرست مضامین!

افسانہ نمبر دسمبر ۱۹۴۱ء

دلگداز آپ بیتیاں

ہندوستان بھر میں اپنی قسم کا واحد رسالہ جو ہندو اور مسلمان امیر اور غریب عورت اور مرد یکساں دلچسپی اور ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور

طبی جواہر پارے

مبلغ پچاس روپے نقد
کے انعامی افسانے اسی نمبر میں ملاحظہ فرمائیے!
آپ کے حسن انتخاب کا امتحان — کون کون افسانہ نویس انعام کا مستحق ہے؟
جواب ایڈیٹر مست قلندر کے پاس لکھ کر بھیجئے

ہنگامہ خیز نظمیں

نگاہِ اولیںؔ!

افسانہ نمبر اپنی روایتی شان کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گیا اور اس وقت آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہے۔ اس کا اول تا آخر مطالعہ کر جائیے اور دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کہ آپ کی نظر انتخاب کس افسانہ کو ماسٹر سمجھتی ہے؟ (۱) پُراسرار حسینہ (۲) سفر (۳) ہمارا پہلا عشق (۴) طوائف کی بیٹی (۵) روحوں کا ملاپ (۶) چراغِ آرزو (۷) دلچسپ فریب (۸) سرکس میں (۹) مجھے نیچا دکھانے والا مرد (۱۰) جمالی کی ڈائری (۱۱) پستول (۱۲) حسن کی قربان گاہ یہ سب کے سب افسانے ہزار دلچسپیوں اور دلفریبیوں کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے آپ کو دعوت مطالعہ دینگے۔ اور آپکی ساری توجہ کو بتدریج اس طرح اپنے اندر جذب کر لینگے کہ آپ کی قوت فیصلہ کچھ عرصہ کیلئے بیکار ہو جائیگی۔ اور آپ اس چکر میں پڑ جائیں گے کہ کس کو کس پر ترجیح دیں۔ کیونکہ ہر ایک افسانہ اپنی اپنی جگہ پر آپ کو شاہکار دکھائی دیگا۔ یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ یا خود ستائی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور اس حقیقت کا انکشاف مطالعہ کے بعد آپ پر خود بخود ہو جائے گا ــــــ نظموں میں (۱) الگ ایک بستی بسائینگے ہم تم (۲) دیہات کی ایک صبح (۳) ایشیائی انصاف کی ایک جھلک (۴) التجا ( ) پریم کا راگ (۵) حدیث آرزو اور (۶) تلاش سکوں وغیرہ سال رواں کی بہترین نظمیں تسلیم کی جائیں گی۔ اور آپ سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہ رہیں گی۔

افسانہ نمبر کے بعد سالنامہ

سالنامہ ۱۹۴۲ء کی تیاری میں ملک کے بہترین ادیب چوٹی کے شاعر اور افسانہ نویس حضرات حصہ لے رہے ہیں۔ لکھنے والوں کی مختصر فہرست ملاحظہ ہو۔ (۱) جناب علی عباس حسینی ایم اے (۲) جناب کوثر چاندپوری (۳) مولانا امام الدین رامنگری۔ (۴) مولینا فروغ لکھنوی (۵) جناب مسعود جاوید بی اے (۶) جناب محمود سکون (۷) آغا سرخوش دہلوی (۸) جناب کاظم دہلوی (۹) جناب قیسی رامپوری (۱۰) جناب راز ہاشمی امروہوی (۱۱) جناب قتیل شفائی (۱۲) پنڈت اندرجیت شرما (۱۳) جناب بہزاد لکھنوی (۱۴) جناب رئیس امروہوی (۱۵) پروفیسر اثر مچھلی شہری (۱۶) جناب ساحر قدوائی بریلوی (۱۷) جناب صہبا لکھنوی (۱۸) جناب شریف چکوالی (۱۹) جناب سلطان احمد صدیقی گورکھپوری (۲۰) جناب اشرف کاظمی (۲۱) جناب ربط ہاشمی (۲۲) جناب بابا عالم سیاہ پوش (۲۳) جناب زیب دہلوی (۲۴) جناب محمد عثمان عارف عباسی (۲۵) جناب مہر نقوی (۲۶) جناب شہزادہ ایاز (۲۷) جناب ساغر چشتی اوجینی (۲۸) جناب ملک سلطان الارشد (۲۹) سردار جلیل شیرکوٹی (۳۰) پروفیسر محمد احسن صدیقی وغیرہ وغیرہ

ادب اردو کے یہ بلند پایہ ادیب سالنامہ مست قلندر میں اپنا اپنا ماسٹرپیس آپ کی خدمت میں پیش کرینگے اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ سالنامہ کیسا ہوگا؟

سالنامہ کے انعامات

(۱) بہترین افسانہ کیلئے ۲۵ روپے نقد (۲) بہترین منظوم افسانہ کیلئے ۱۵ روپے نقد (۳) بہترین نظم کیلئے دس روپے تین انعامات تقسیم کئے جائیں گے۔

مست قلندر کا انگریزی ایڈیشن

مست قلندر کی ہمہ گیری اور ہر دلعزیزی نے یہانتک ترقی کی ہے کہ ہم اس کا انگریزی ایڈیشن نکالنے پر مجبور ہو گئے ہیں چنانچہ مست قلندر کے ہزاروں لاکھوں چاہنے والوں کے دلوں میں یہ جان کر مسرت کی لہر دوڑ جائیگی کہ ٹرو کنفشنز آف انڈیا ـــ (True Confessions of India) کے نام سے اس کا پہلا نمبر جنوری میں نکل رہا ہے۔ انگریزی کے بہترین افسانوں کیلئے اڑھائی صد روپیہ نقد کا انعام پیش کیا جا رہا ہے۔

اہل قلم حضرات نمونہ دیکھ کر قسمت آزمائی کریں۔ خواہشمند صرف ۵ کے ٹکٹ بھیج کر نمونہ طلب کر سکتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

جلد ۲۶

رسالہ مست قلندر لاہور

نمبر ۱۲

ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء

الگ ایک بستی بسائینگے ہم تم

از جناب اختر رضوانی

(۱) فلک کو حدیث محبت سنا کر
ستاروں کی نظروں سے نظریں ملا کر
نئی دھن میں ساز جوانی پہ گا کر
ستاروں کی قسمت جگائینگے ہم تم
الگ ایک بستی بسائینگے ہم تم

(۲) سنا کر کبھی نغمۂ کامرانی
کبھی مرمریں قہقہوں کی کہانی
ہواؤں کو دے کر پیام جوانی
فضاؤں کو بیخود بنائینگے ہم تم
الگ ایک بستی بسائینگے ہم تم

(۳) جہاں ہوگی رنگیں محبت کی بستی
اداؤں کے ساغر نگاہوں کی مستی
جہاں ہوگا شغل محبت پرستی
وہاں عشق کے گیت گائینگے ہم تم
الگ ایک بستی بسائینگے ہم تم

(۴) فلک اپنی آنکھیں دکھاتا رہے گا
زمانہ بہت تلملاتا رہے گا
مقدر ہمیں آزماتا رہے گا
مقدر کو ٹھوکر لگائیں گے ہم تم
الگ ایک بستی بسائیں گے ہم تم

(۵) بہت دور رنگیں ستاروں سے آگے
مہکتے ہوئے مرغزاروں سے آگے
افق سے پرے جو ستاروں سے آگے
نگاہوں سے گھونگھٹ اٹھائینگے ہم تم
الگ ایک بستی بسائیں گے ہم تم

(۶) محبت کو اک نیند آئی سی ہوگی
جوانی محبت پہ چھائی سی ہوگی
دلوں میں نئی دھن سمائی سی ہوگی
اسی دھن میں نغمے سنائینگے ہم تم
الگ ایک بستی بسائیں گے ہم تم

(۷) ستاروں کی راحت فزا روشنی میں
فضاؤں کی مہکی ہوئی دلکشی میں
کبھی آگہی میں کبھی بیخودی میں
دلوں سے کدورت مٹائینگے ہم تم
الگ ایک بستی بسائیں گے ہم تم

ایک تواریخی افسانہ

آوارہ حسینہ

خاص مست قلندر کے افسانہ نمبر کے لئے (انگریزی سے ماخوذ)

از جناب منشی نیر متھرا رام صاحب فیروز پوری

آج سے قریباً ایک سو سال پہلے ایک شخص ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر آیا تھا۔ اس کے زمانہ میں سندھ کا الحاق ہوا۔ افغانستان کی پہلی جنگ کامیاب خاتمہ کو پہنچی اور کئی ایک اور ہنگامہ خیز واقعات بھی پیش آئے لیکن گو اس نے تین سال کے مختصر عہد حکومت میں اپنے سرکاری فرائض کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا تاہم اس کی نجی زندگی اس عورت کی بدولت ہمیشہ کیلئے تلخ رہی تھی جس سے اس کی گورنر جنرل بننے سے کچھ عرصہ پہلے شادی ہوئی تھی اور جس کی یاد کو اگرچہ اس نے ہمیشہ کیلئے دل سے نکال دینے کا عہد کر لیا تھا تاہم اس کے خیالات رہ رہ کر اس بدنصیب کی طرف جایا کرتے تھے جو آرام، آرام اور عزت کی زندگی چھوڑ کر نہ معلوم کہاں کہاں خراب خستہ ہوتی پھرتی تھی۔ اور جو ایک بار اس نوبت کو پہنچی کہ اس کو سر بازار بھیک مانگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ گورنر جنرل لارڈ الن برو تھا جو ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۴ء تک ہندوستان پر حکمران رہا اور وہ عورت آنریبل جین ڈگبی ولایت کے ایک نامی خاندان کی نور نظر تھی جس کے حالات زندگی کسی فرضی اور خیالی افسانہ سے بھی کئی گنا زیادہ حیرت انگیز و تعجب خیز اور اس کے ساتھ ہی غایت درجہ المناک اور درد انگیز ہیں۔

جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے آنریبل جین ڈگبی ایک نہایت اونچے خاندان کی بیٹی تھی اس کے رشتہ داروں میں سے بعض ڈیوک کا مرتبہ رکھتے تھے جو ولایت میں سب سے اونچا درجہ امارت ہے۔ اس کا باپ امیر البحر تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں بھی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ امر واقعہ ہے کہ وہ لڑکی چھوٹی عمر سے ہی بدرجہ غایت سرکش، منہ زور اور خود سر تھی۔ ابھی اس کی عمر سولہ برس کی تھی کہ وہ جپسی لوگوں کے ساتھ گھر سے بھاگ نکلی۔ (جپسی انگلستان کا ایک خانہ بدوش فرقہ ہے اور یہ لوگ جگہ جگہ پھر کر لوگوں کا ہاتھ دیکھتے اور ان کی قسمت کا حال بتایا کرتے ہیں) اس فرقہ کے کچھ لوگ دیہات میں اس مقام کے قریب ٹھہرے ہوئے تھے جہاں جین کے والد کی کوٹھی تھی جب وہ گھر سے غائب ہو گئی تو رشتہ داروں کو بڑا اضطراب لاحق ہوا۔ سینکڑوں آدمی گرد و نواح میں دوڑائے گئے آخر چار دن کی مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد وہ جپسی لوگوں کی گاڑی میں بیٹھی ہوئی پائی گئی اُسے پکڑ کر مکان پر لائے۔ رشتہ داروں نے سمجھایا کہ تم ایک اعلیٰ عہدہ دار کی بیٹی اور ایک نامی امیر کی بھتیجی ہو تم کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہونا چاہئے لیکن گو جین نے اس پند و نصیحت کو توجہ کے ساتھ سنا تاہم جیسا کہ واقعات مابعد سے پایا گیا کوئی بات قطعاً اس کے دل پر اثر انداز نہ ہوئی کیونکہ اس کے ڈیڑھ ہی سال بعد وہ اپنے والد کے ایک سائیس کے ساتھ فرار ہو گئی۔ گھر میں احباب کی دعوت تھی جین کا باپ اور اس کی ماں مہمانوں کی خاطر و مدارات میں لگے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک خواص دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی "چھوٹی سرکار غائب ہیں اور ہارپر سائیس بھی دوپہر کے بعد نظر نہیں آیا"۔ امیر البحر کے نوکروں میں یہ شخص مردانہ وجاہت اور اچھی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ پھر ایک مرتبہ جین کی تلاش شروع کی گئی اور عین اس وقت یہ لوگ اس کو پانے میں کامیاب ہوئے جب وہ سائیس سے شادی کرنے کو بالکل تیار تھی۔ افسوس مستقبل کا حال کسی کو معلوم نہیں ورنہ شاید جین کا باپ اس سائیس کو ہی فرزندی میں قبول کرنا بہتر سمجھ لیتا۔

جین ڈگبی کے متعلق جس قدر حالات سننے میں آتے ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ غایت درجہ حسین تھی۔ موسم بہار کی صبح کی مانند خوبصورت۔ آنکھوں میں دلکش موہنی۔ اداؤں میں کشش۔ اونچا قد۔ فراخ سینہ۔ کھلی پیشانی۔ اس پر طبعاً ہنسوڑ۔ جو شخص اس سے ملتا یا جسے اس سے گفتگو کرنے کا موقعہ نصیب ہوتا وہ فوراً اس کو مانوس کر لیتی۔ بیشتر گو جین کے رشتہ داروں نے اس کے پہلے فرار کو اس کی ناسمجھی پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا تھا تاہم اب اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ وہ ایک ادنیٰ سائیس سے شادی

کرنے کو تیار تھی۔ انہیں مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچا پڑا کہ اگر اس کے غیر معمولی انتشار اور لاابالی پن کا فوراً کوئی ازالہ نہ کیا گیا تو عین ممکن ہے کوئی اور خطرناک نتیجہ ظہور میں آئے لہٰذا انہوں نے بہت کچھ غور و مشورہ کے بعد لارڈ الن برو کو اس کیلئے منتخب کیا۔ اس میں شک نہیں دونوں کی عمروں میں غیر معمولی تفاوت تھا یعنی لارڈ الن برو کی عمر جین سے دوگنی تھی اس کی پہلی بیوی کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا لیکن مقابلہ میں یہ بات اس کے حق میں سمجھی جا سکتی تھی کہ ایک نہایت باعزت خاندان کا رکن اور اپنی عادات نیک اور صلاح و تقوے کیلئے مشہور تھا۔ لارڈ الن برو نہایت سنجیدہ مزاج اور متین خیالات کا آدمی تھا حتیٰ کہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ جب کبھی اس کو مطالعہ کا شوق دامنگیر ہوتا تو وہ تازہ ترین سرکاری رپورٹیں لیکر بیٹھ جاتا اور گفتگو میں بھی سوائے اعداد و شمار کے بہت کم افکار اس کے منہ سے سننے میں آتے تھے۔ اس کا باپ ولایت کی عدالت عالیہ کا ایک نہایت نامی لارڈ چیف جسٹس ہوا ہے لیکن وہ خود اپنی دوسری قابلیتوں کے باوجود کند ذہن اور ضرورت سے زیادہ سنجیدہ خیال آدمی تھا۔ صرف اس امید پر وہ جین سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا کہ اس کے رشتہ داروں کی مدد سے برطانیہ کے وزیر اعظم کا عہدہ جس کی اس کے دل کو مدت سے آرزو لگی ہوئی تھی حاصل کر سکے گا۔

جسوقت اس شادی کے مشورے جین کے کانوں تک پہنچے تو اس نے بیحد مسرت کا اظہار کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر خواہ کوئی ہو وہ شادی کرنے کو بیتاب ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ہاں کہنے سے پہلے اتنا بھی نہ سوچا کہ یہ آدمی تو عمر میں میرے باپ کے برابر ہے اس کی آرزو یہ تھی کہ لندن میں اپنا علیحدہ مکان ہو جس میں ڈنر اور رقص کی محفلیں منعقد کروں اور لندن کی سرکردہ لیڈیوں کے ساتھ ملکر بیٹھوں۔ ماں باپ کے پاس رہتے ہوئے اس کی طبیعت کو انقباض ہونے لگا تھا اور چونکہ اس آدمی کے پاس جو اس کیلئے دولھا پسند کیا گیا اس کے شوق پورا کرنے کو وافر روپیہ موجود تھا اسلئے اس کو اور کسی بات پر غور کرنے کا خیال ہی نہ آیا۔

جرمن شہزادہ کی آمد

غرض شادی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا ہوئی اور دولھا دلھن نے کچھ زمانہ ماہ عسل کے طور پر گزارا۔ پھر لندن آکر آباد ہو گئے لارڈ الن برو کو اپنی بی بی کے غیر معمولی حسن پر ناز تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ اس بات پر کہ اس کے تمام رشتہ دار ذی اثر ہیں لیکن شادی کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ سوسائٹی میں دبی آواز سے اس بات کے چرچے ہونے لگے کہ اگر لارڈ ممدوح نے زیادہ احتیاط نہ برتی تو اپنی شوخ چشم بی بی کو ہاتھ سے کھو بیٹھے گا۔ دوستوں نے اس کو سمجھایا کہ حضرت پارلیمنٹ کی چار دیواری سے زیادہ وقت اپنے مکان کی چار دیواری میں بسر کیجئے اور یہ نام نہاد جرمن شہزادہ جو لیڈی الن برو کی شمع حسن کا پروانہ بنا پھرتا ہے اس کی طرف سے خبردار رہئیے۔ ایسا نہ ہو دیو پری کو لے اڑے مگر لارڈ الن برو کو بھولے سے بھی خیال نہ آسکتا تھا کہ اس کی بیاہتا اس کے مقرر نام کی حصہ دار کبھی خیال میں بھی اس سے بیوفائی کر سکتی ہے۔ عام لوگوں کی طرح وہ بھی غیر ملکی لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا چنانچہ اسی قاعدہ کے مطابق اس نے شہزادہ شوارزن برگ یعنی اس جرمن کو ہیچ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

مگر نتیجہ اس بے اعتنائی کا جلدی ہی ظاہر ہو گیا یعنی جرمن شہزادے کی آمد و رفت بتدریج ترقی کرنے لگی۔ جین کو اس کا دراز قد سڈول اعضاء اور مردانہ وجاہت بہت پسند آئے اس کا اپنا شوہر میانہ قد اور شکل و صورت کے اعتبار سے ہر قسم کی دلکشی سے محروم تھا علاوہ بریں جب کبھی اس کی اپنے شوہر سے بات چیت ہوتی تو وہ تقاضائے عمر سے ناصحانہ پیرایہ اختیار کر لیتا حالانکہ جرمن شہزادے سے اس کی گفتگو ہمیشہ محبت اور پریم کی باتوں پر ہوا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ کچھ اور آدمی بھی محفل شباب کی اس نورانی شمع کے گرد جمع ہونے لگے لیکن شہزادہ شوارزن برگ سے اس کو بھی عشق تھا اور جب اس جرمن شہزادہ نے اظہار تعشق کیا تو جین مزاحمت نہ کر سکی۔

آخر کار وہ حادثہ جس کا دیکھنے والوں کو کئی روز سے کھٹکا لگا ہوا تھا ایک دن ناگہاں پیش آگیا۔ رات کو دفتر خارجہ میں ایک استقبالی جلسہ منعقد ہونا تھا۔ امارت بحری کے اول لارڈ کی حیثیت سے لارڈ الن برو اس جلسہ کی شرکت کو غیر معمولی اہمیت دے رہا تھا چنانچہ دن کے اس نے جین کو سمجھایا بھی کہ اس موقعہ پر خوب اچھی طرح بناؤ چناؤ کر کے جانا ہو گا۔ جین نے جواب میں اس سے کہا کہ میں نے ایک نئی پوشاک اس تقریب کیلئے منگائی ہے۔ بغرض کسی طرح کی بدگمانی لارڈ الن برو کے دل میں قطعاً موجود نہ تھی جب وہ بر لوی کونسلر کی وردی پہنے بیگم کو ساتھ لینے کے خیال سے گول کمرہ میں پہنچا تو اس کو نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ سرکار تین بجے

ہواخوری کو گئی تھیں اس کے بعد اب تک واپس نہیں آئیں"۔

اتنے میں مات کا عمل ہو گیا تھا۔ لارڈ الن برو کو بی بی کی حماقت پر بہت غصہ آیا لیکن اب تک اس کا خیال یہی تھا کہ وہ اور اور باتوں میں دفتر خارجہ کی مصروفیت کو بھول گئی ہے۔ کسی طرح کا شک و شبہ اس کے مزاج میں داخل تھا نہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے گھروں پر جاکر جن سے دوستانہ تھا اور جو قرب وجوار میں آباد تھے لیڈی الن برو کو تلاش کریں لیکن وہ سب کے سب خالی ہاتھ واپس آگئے۔

لارڈ الن برو کے دل کی جو کیفیت اس وقت ہوئی ہوگی، محتاج بیان نہیں۔ وہ دفتر خارجہ کے جلسہ میں شامل ہونے کیلئے نہ گیا۔ رات قلق و اضطراب میں بسر کی۔ صبح کو بستر سے اُٹھا تو نوکروں سے چار آنکھیں کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ دل اپنی ذلت و بدنامی سے بیٹھا ہوا، آنکھوں میں غیرت پامال اور سر شرم کے بوجھ سے جھکا ہوا تھا۔ آخر کار گھر کے داروغہ نے خود ہی گول لفظوں میں اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ بیگم صاحب جرمن شہزادہ کے ساتھ کسی طرف کو فرار ہو گئیں!

اس میں کلام نہیں کہ اس عالی خاندان عورت نے ابتدا ہی سے کئی ایک حرکات ایسی کی تھیں جن کی بنا پر ہر طرف سے انگشت نمائی ہو چکی تھی لیکن اب تک ان سب باتوں کو اسی بنا پر نظر انداز کیا جاتا رہا تھا کہ وہ الھڑ پنے اور ناتجربہ کاری کا نتیجہ تھیں مگر اب جو کچھ اس نے کیا وہ صریحاً اس بات کی دلیل تھا کہ سرکشی اور غفلت کیشی سے بہت زیادہ اس کے مزاج میں خیالات نفسانی و جذبات حیوانی کو دخل ہے ورنہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ایک اتنے اونچے خاندان کی نور نظر، ایک ایسے نامدار نواب کی چہیتی بیگم، دُنیا کی تضحیک و تمسخر کی پروانہ کرکے اس بات کو بھی سراسر بھلا کہ شوہر آئندہ کبھی اپنے مکان کے دروازہ میں قدم نہ رکھنے دیگا ایک مشکوک معیار کے نام نہاد شہزادہ کے ساتھ جلاوطن ہونا قبول کرتی۔ اگر کوئی خیال اس کے دل میں پیدا ہوا تو فقط یہ کہ شوہر میری تلاش میں سرگرداں ہونے کی بجائے یقیناً کوئی ایسی کارروائی عمل میں لائے گا جس سے تعلقات شادی منقطع ہو جائیں گے۔ پھر جب ایک دفعہ یہ بات ہو گئی تو میں اپنے دلربا دلدار کے ساتھ اٹلی کے کسی شہر میں آباد ہو جاؤں گی۔

اس کا نام نہاد عاشق ہر وقت اسی طرح کی باتیں کہہ کر اس کو سبز باغ دکھایا کرتا تھا کہ تمہارے ملک کا قانون کتنا سست ہے میں ہر لحظہ اس انتظار میں ہوں کہ تمہارا شوہر تم کو طلاق دے اور اس کے بعد ہم شادی کرکے آرام و اطمینان کے ساتھ رہنے لگیں۔

اسی طرح چار سال گذر گئے اور اس چار سال کے لمبے عرصہ میں ان دونوں میں گہرے عاشقانہ تعلقات قائم رہے۔ شہزادہ ہر وقت اس کی دلجوئی کرتا اور وہ بھی ہر بات میں اس کی غلام بے دام بنی رہتی تھی۔ آخر چار سال کے بعد ایک روز صبح کی ڈاک میں لیڈی الن برو کے نام ایک خط موصول ہوا جس کو پڑھ کر اس کی چھلکتے ہوئے پیمانہ سے ملتی جلتی آنکھوں میں مسرت کے آنسو پیدا ہو گئے۔ شہزادہ اس کے بالمقابل بیٹھا تھا جب اس نے فاتحانہ انداز سے وہ خط اس کو دکھایا تو جرمن نوجوان کی آنکھوں میں بھی غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی گو جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا یہ چمک خوشی کی نہ تھی اگر اس موقعہ پر لیڈی الن برو اپنے ولولہ اور جوش میں اتنی مستغرق نہ ہوتی تو اسکو یقیناً معلوم ہو جاتا کہ عاشق کی نیت ابھی سے فاسد ہونے لگی ہے۔

اتنے میں لیڈی الن برو جس کے بہتے ہوئے آنسو اور چہرہ کے آثار تبسم اس برساتی منظر کی کیفیت دکھا رہے تھے۔ جب بجلی ہوئی دھوپ میں پانی برسا کرتا ہے، پُرمسرت لہجہ میں بولی "شکر ہے لارڈ الن برو سے میری شادی فسخ ہو گئی!"

شہزادہ شوارزن برگ اپنی جگہ سے اُٹھا اور خاتون کے پس پشت کھڑا ہو کر اس کے دلآویز شانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"بڑی مبارک خبر ہے میں ابھی جاکر شادی کے انتظامات مکمل کراتا ہوں"۔

اس نے ذرا سا جھک کر اس کے رخسار کو بوسہ دیا پھر ٹہلتا ہوا کمرہ سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت کے بعد بدنصیب عورت نے پھر اس کی صورت نہ دیکھی!

اس ناگہانی افتاد کے پیش آنے سے جن مشکلات کا سامنا لیڈی الن برو کو کرنا پڑا۔ ان کا حال محتاج بیان نہیں۔ مرد کی طرف سے کسی عورت کے ساتھ ستم گری اور غفلت شعاری کا اس سے بدتر سلوک اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ جو اس کی ذات پر بھروسہ کرکے گھربار خویش و اقارب سب کو چھوڑ کر اس دور افتادہ ملک میں آئی تھی اس کو اس کے حال پر چھوڑ کر کسی طرف کو غائب ہو جائے۔ آوارہ وطنی اور اس پر مستزاد یہ مصیبت کہ پیسہ پلے نہیں سخت حیران کہ کیا کیے اور کدھر جائے۔ نوکر چاکر بھی سب شہزادے سے ملے ہوئے اور اس کے محرم راز تھے ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ شہزادہ شوارزن برگ نے اس ڈر سے کہ اس قسم کی خبر نہ معلوم کب ناگہاں سُننے

میں آئے اپنا سامان چند روز پہلے ہی بند کر تیار رکھا ہوا تھا۔

القصہ جب ستم رسیدہ عورت کو حقیقت حال کا علم ہوا تو اتنا سخت صدمہ اس کے دل کو پہنچا کہ پہلے تو خبر سنتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد اس شدت کا بخار ہوا کہ سرسام تک نوبت جا پہنچی۔ کامل ایک مہینہ وہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکتی رہی لیکن جونہی صحت یاب ہوئی پھر وہی پہلی سرگشتگی اس پر سوار ہو گئی۔ چنانچہ بستر سے اٹھنے کے بعد سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھنے کا تھا۔

"خدا کا شکر ہے میں ابھی تک شیریں ادا اور حسین ہوں" اس نے صورت دیکھنے کے بعد پُر مُسرت لہجہ میں کہا اور اتنا سکون اسی واقعہ سے اس کے جی کو حاصل ہوا کہ اس کے بعد کبھی اس نے شہزادہ کا نام تک نہیں لیا بلکہ اس متاع حسن کے بھروسہ پر جو قدرت نے بڑی فیاضی سے اس کو عطا کیا تھا پوری بے خوفی کے ساتھ دنیا کے نشیب و فراز کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد معاملات نے یہ صورت اختیار کی کہ جس مجلس میں شریک ہوتی مردوں کے بے اختیار دل سینے میں برہمی پیدا کرنے لگتے۔

ڈوئل اور اس کا نتیجہ

شہر روما میں شہزادی کوبی نام کی ایک معزز خاتون نے جلسہ رقص منعقد کیا تو یہ بھی اس میں شریک ہوئی اور وہیں توپخانہ کے ایک افسر کے پھیروں میں آ گئی آدمی شکل و صورت میں لارڈ الن برو سے ملتا جلتا اور کم و بیش اسی کی طرح ٹھگنا تھا لیکن چونکہ چرب زبانی کا وصف رکھتا تھا اسلئے کچھ اپنے تملق اور کچھ چند قیمتی تحائف کی پیشکشی کے ذریعہ سے وہ آخر کار لیڈی الن برو کے ذہن میں یہ خیال جاگزین کرنے کے قابل ہو گیا کہ وہ کافی مالدار ہے اور اس سے شادی کر کے وہ سر طرح سکھی رہیگی۔

ایکدن اس نئے چاہنے والے نے بیش بہا موتیوں کی ایک مالا اس کو دی اور وہ اتنی مسرور ہوئی کہ فوراً اس سے شادی کرنے کو آمادہ ہو گئی۔ فی الحقیقت وہ رسم شادی میں شریک ہونے کیلئے گرجا کی طرف جا رہی تھی کہ رستہ میں کسی نے اس کو بتایا کہ وہ تو ایک بھوکا لفنگا آدمی ہے اس کے پلے کچھ نہ[illegible] [illegible] سیرلوں کو دھوکا دیکر اس نے زلویرات لے تھے وہ نادہندگی کی بنا پر اس کے خلاف وارنٹ گرفتاری دھوکا دہی کے الزام میں حاصل کر چکے ہیں۔ اسی دن افسر مذکور کی گرفتاری کی خبر اس نے سنادی مگر چونکہ اس کو روپیہ کی اشد ضرورت تھی اسلئے وہ قیمتی جواہرات جو افسر مذکور نے اسکو دے تھے ایک دوسرے جوہری کے ہاتھ ادنے پونے بیچ ڈالے ادھر وہ اس کام سے فارغ ہوئی۔ ادھر پولیس کا ایک اہلکار سرکاری پروانہ لے کر اس کے پاس جا پہنچا۔ اور کہنے لگا کہ دھوکے سے حاصل کیا ہوا مال آپ کے پاس ہے وہ آپ ہمیں دے دیں کیونکہ اس کو عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ لیڈی الن برو اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ افسر پولیس نے دھمکایا مگر اس شوخ دیدہ نے اسے چٹکیوں میں اڑا دیا۔ لارڈ الن برو سے کسی زمانہ میں بھی اس کو محبت نہ ہوئی تھی لیکن وہ جو مثل ہے کہ کھوٹا پیسہ بھی وقت پر کام دے جاتا ہے۔ اس موقعہ پر اس کے یہ کہنے سے کہ میں فلاں انگریز مدبر کی بی بی ہوں۔ پولیس کا افسر مرعوب ہو گیا اور آفت سر سے ٹل گئی۔

اب مزے داری دیکھیے کہ جس آدمی نے توپخانہ کے افسر کا راز افشا کیا وہ بھی اس پری کے چاہنے والوں میں سے ایک تھا لیکن عورت کی سنگدلی اور سرد مہری ملاحظہ ہو کہ وہ اس کا احسان نہ مان کر ایک اطالوی سفیر کے بیٹے پر جان دینے لگی رفتہ رفتہ بات بڑھ گئی دونوں دعویدار آپس میں جھگڑنے لگے یہاں تک کہ ان میں ڈوئل لڑنے کی نوبت آ گئی لیکن جب سفیر زادے نے اس واقعہ کی خبر لیڈی الن برو کے کانوں تک پہنچائی تو بجائے اس کے وہ اس سے کسی طرح کی ہمدردی کرتی الٹا انداز مسرت سے تالی بجا کر کہنے لگی "اوہو کتنے مزے کی بات ہے اچھا آپ دونوں مقابلہ کیجئے جو زندہ بچے گا میں اس سے شادی کر لوں گی!"

غور سے دیکھا جائے تو سرد مہری اور ناسپاسی کی یہ بدترین مثال تھی جو اس موقعہ پر لیڈی الن برو نے اپنے طریق عمل سے قائم کی کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ نوجوان سفیر زادہ گو چکنی چپڑی باتوں کا دھنی تھا تاہم تلوار چلانا اس کو بالکل نہ آتا تھا۔ حالانکہ مقابلہ میں جس افسر سے اس کو ڈوئل لڑنا تھا وہ شمشیر زنی کے فن میں ماہر کامل سمجھا جاتا تھا۔ غریب بیچارے نے جب دیکھا کہ اس کی طرف سے کسی بھی دلجوئی کی امید نہیں تو لاچار کہنے لگا۔ "مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس مقابلہ سے جانبر نہ ہو سکوں گا۔ لیکن کیا مضائقہ آپ کی خدمت گذاری کرتے ہوئے اگر یہ جان حزیں ضائع ہو جائے تو مجھے اصلا پروا نہیں۔ بہر حال مجھ غریب کی جو آپ کی خاطر شیر کی میں قدم رکھنے لگا ہوں یہ آخری درخواست قبول کیجئے کہ میرے مرنے کے بعد جو بھی میرا اثاثہ ملے

وہ سب آپ اپنے قبضہ میں لے لیں۔
یہاں کیا انکار تھا وہ بیرکالہ جہاں بلائیے بے درماں کی طرح اس کیلئے بھی آمادہ ہوگئی اور محض اتنا کہا: اوہ کیا آپ ڈر گئے۔ بندۂ خدا اتنی مایوسی کو دل میں جگہ نہ دیجئے۔"
نوجوان بولا "خیر آپکے یہ کہنے سے کہ جو زندہ بچے گا آپ اس سے شادی کرینگی مجھ میں غیر معمولی قوت اور استقلال پیدا ہو گیا ہے اور میں اس مقابلہ میں عزم استوار سے کام لوں گا" لیکن جس معشوق روبہ خصال سے یہ باتیں اس نے کہی تھیں وہ بجائے ان سے متاثر ہونے کے خوب قہقہہ مار کر ہنسنے لگی اور اس کی ہنسی کی آواز رخصت ہوتے ہوئے عاشق کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔

اگر لیڈی الن برو کی مرضی عمل میں آسکتی تو بہتر ہوتا کہ دونوں حریف ایک دوسرے کو مار کر مر جاتے کیونکہ وہ ان دونوں سے اکتا نے لگی تھی تو بھی وہ اس بات سے بیحد خوش تھی کہ دو اعلےٰ طبقہ کے آدمی اسکی خاطر موت کی بازی لڑنے لگے ہیں۔ سفیر زادے کے دوستوں کا عام یہ خیال تھا کہ اس کی قسمت پہ مہر لگ چکی ہے لیکن شاید اپنی نادانی اور لاعلمی کی وجہ سے کچھ ایسے پرجوش وار اس نے دشمن پر کئے کہ چند حملوں میں ہی اس کا خاتمہ کر دیا گو خود اس کے اپنے چہرہ پہ بھی بری طرح زخم آئے۔

تین ہفتے وہ ان زخموں کی وجہ سے بستر پر پڑے رہنے کے لئے مجبور ہوا اس کے بعد ایک فاتح کی سی مسرت کے ساتھ لیڈی الن برو سے ملاقات کرنے گیا لیکن اگر اس کا خیال تھا کہ وہ اس کو دیکھتے ہی لپک کر گلے سے لپٹ جائیگی تو اسکو اپنے اندازوں میں سخت مایوس ہونا پڑا کیونکہ جب اس بت بیگانہ خو کی نگاہ نوجوان کے زخم خوردہ چہرہ کی طرف گئی تو چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی اور بولی "خدا کے لئے جاؤ! مجھے تمہاری صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ پہلے ایک بدنما آدمی سے شادی کرنے کی غلطی کی تھی لیکن آئندہ ایسا نہ کرونگی"

ناخوش نوجوان نے اس مردم آزار فتنہ پرداز عورت کی بے حد منت سماجت کی اس نے اس کو سمجھایا کہ تمہاری خدمت گزاری میں ہی یہ وار مجھ کو سہنے پڑے تھے لیکن اس کا جواب وہی ایک "نہ" تھا۔ مگر میں نے بیشک تم سے شادی کا وعدہ کیا تھا لیکن اب تم وہ نہیں رہے تمہیں خود یہ سوچکر شرم آنی چاہئیے کہ اپنی بدنما صورت دکھا کر میرے جی میں ہول پیدا کر رہے ہو"

ماحصل یہ کہ جب وہ قسمت کا مارا اس غفلت شعار فراموش گار عورت کے دربار سے ذلیل و رسوا ہوکر جانے لگا تو اس کا دل پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ اسی رات وہ خودکشی کر گیا۔ اگر اس نے چوبیس گھنٹے اور انتظار کیا ہوتا تو یہ خبر اس کے سننے میں آجاتی کہ ستم آرا خاتون کے انکار کی اصل وجہ یہ تھی کہ اب وہ ایک نہایت مالدار سرکاری متاجر کے بھتیجے اور واحد وارث پر جان دینے لگی تھی۔ اس نوجوان کے چچا نے اسے کام کی تلاش میں روما بھیجا تھا مگر وہ اپنی دولت کی بازی اس غمزہ طراز خاتون کے حصول پر لگا بیٹھا۔ آیا تو تھا کام تلاش کرنے مگر اس کی بجائے اس سحر ساز عورت کو اپنا دل نذر کر چکا۔ ادھر لیڈی الن برو کو چونکہ در پردہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے پاس بے اندازہ دولت ہے اور وہ حسب ضرورت اور بھی منگا سکتا ہے اسلئے اس نے شکستہ اطالوی زبان میں محض دکھاوے کیلئے اس سے محبت کا اقرار کر لیا۔

لیکن اگر اس کا خیال تھا کہ اس آدمی سے شادی کرنے کے بعد خوشی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے گی تو اس کو بہت جلد مایوس ہونا پڑا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کچھ ایسی نفرت اس کو اپنے شوہر سے ہو گئی کہ وہ اس کو اپنے کمرے میں گھسنے نہ دیتی تھی بلکہ انتہا یہاں تک پہنچی کہ اس نے اپنے بعض چاہنے والوں کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ جب کبھی اس کا شوہر اس مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرے جو شادی کے دو ہی ماہ اس نے اپنے لئے علیحدہ کرایہ پر لے لیا تھا تو وہ اسے روک دیں۔

لیکن جس بدنصیب نے اپنی بے حساب دولت اس پر ضائع کی تھی اور جو سچ پوچھئے تو اپنی زندگی اس کے عشق کے آزار میں تباہ کر چکا تھا وہ کس طرح اس آسانی کے ساتھ ٹل جاتا؟ طبعاً سرکش و تندخو وہ کم و بیش ہر روز زبردستی اس کے مکان میں گھسنے کی کوشش کرتا اور دو مرتبہ تو اس نے اس ناخوشناس عورت کو سر بازار زد و کوب بھی کیا حتےٰ کہ اگر وہ کبھی کسی مجلس میں شریک ہوتی تو یہ وہیں پہنچکر فتنہ و فساد برپا کرنے لگتا۔ مجبور ہوکر سوسائٹی کی لیڈیوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ لیڈی الن برو کو (یہی وہ نام تھا جو اس نے عرصہ دراز تک اپنے لئے اختیار کئے رکھا) دعوت دینا ہی بند کر دیا جائے۔ نہیں معلوم حالات کونسی ناخوشگوار صورت اختیار کرتے۔ اگر وہ برگشتہ بخت نوجوان سر بازار کسی تکرار میں ہلاک

ہو گیا ہوتا۔ لیڈی الن برو کو جب اس سانحہ کی خبر پہنچی تو بہت خوش ہوئی اس نے جانا ایک آفت تھی جو ہمیشہ کیلئے سر سے ٹل گئی چنانچہ نئے سرے سے نئی زندگی شروع کرنے کی خاطر وہ روما سے فلارنس روانہ ہوگئی اور کئی سال تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

افواہاً یہ بات سننے میں آئی تھی کہ اس دوران میں اس نے دو مرتبہ شادی کی مگر صحیح حالات کسی کو معلوم نہیں ہاں یہ ایک بات یقینی ہے کہ وہ جب نیپلز کی انگریز بستی میں وارد ہوئی تو یکہ و تنہا سخت بے نوائی کی حالت میں تھی۔ لوگوں پر اس نے یہی بات ظاہر کی کہ میں حال کی بیوہ ہوں اس پر بھی چونکہ وہ کافی بدنام ہو چکی تھی۔ اسلئے شریف زادیوں نے اس کی موجودگی کو بالکل ہی نظر انداز کئے رکھا کوئی اس کو منہ لگانا نہ چاہتی تھی لیکن جب دیکھا گیا کہ مرد اس پر بے اختیار جان دیتے اور یہاں تک اس کے تشنہ دیدار ہیں کہ اس کی عدم شرکت کے باعث خود بھی سوسائٹی کے جلسوں میں شریک ہونا پسند نہیں کرتے تو مجبوراً وہ پھر اسے اپنے ساتھ ملانے کو آمادہ ہوگئیں حتیٰ کہ وہ بھی جلسوں میں نظر آنے لگی۔ انہی دنوں ایک یونانی امیر البحر اس پر مرنے لگا تھا۔ اسی کے دئیے ہوئے روپے سے وہ گذر اوقات کرتی اور گو عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ دونوں کی نسبت قرار پا گئی ہے تاہم امر واقعہ یہ ہے کہ وہ کسی مالدار آدمی کی تلاش میں تھی تاکہ اگر کوئی موٹا شکار دام میں پھنس جائے تو اس کو جواب دیدوں لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد ایک نوجوان امیر زادے نے جو اپنا سارا دھن دولت اس ستم آرا کے وصل کی آرزو میں لٹا کر خودکشی کر گیا اور لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں حتیٰ کہ چھپی چھپی کے آوازے بھی سر بازار کسے جانے لگے تو مصلحت کے خیال سے اس شوریدہ رنگ عورت نے اس بحری افسر سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ایک عربی شیخ کی دلہن

اس شادی کے بعد کچھ عرصہ اس کی زندگی تاریکی میں بسر ہوئی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرتی ہے لیکن آخر کار ایک روز وہ ہومبرگ پہنچکر تنہا رہنے لگی نہیں معلوم اس نے اپنے شوہر کو کب اور کس حالت میں چھوڑا تھا۔ ہومبرگ کی مشہور صحت گاہ میں ایک قمار خانہ زوروں پر چلا کرتا تھا۔ اس میں لیڈی الن برو بھی کئی مرتبہ دیکھی گئی۔ یہیں دو آدمی اس غفلت کیش حسینہ پر فریفتہ ہوگئے اور جب دونوں نے اس سے اظہار عشق کیا تو اس نے ان کو سامنے بلاکر بات اس طرح طے کی کہ جو سب سے زیادہ روپیہ میرے نام جمع کرا دے میں اسی کی ہو کر رہونگی واقعہ کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا پیشتر مذکور ہوا ہے یعنی وہ جس میں دو آدمی اس کی خاطر ڈوئیل لڑ کر تباہ ہوئے تھے۔ وہی بات اس موقعہ پر بھی دیکھنے میں آئی یعنی دونوں زیادہ سے زیادہ روپیہ فراہم کرنے کی دھن میں بے تحاشا جوا کھیلنے لگے یہاں تک کہ دونوں تباہ ہوگئے اور اس حرافہ نے ایک تیسرے ہی آدمی سے جو کوئی جرمن نواب تھا شادی کر لی۔

اس اثنا میں اس کا پہلا شوہر لارڈ الن برو جلد جلد ترقی کر رہا تھا لیکن اگر سابقہ جین ڈگبی نے کسی موقعہ پر اس کی آسودہ حالی اور دنیاوی ترقی کا حال پڑھا تو صرف اس خیال اس کے دل کو افسوس ہوا ہوگا کہ میں آج اس کے ساتھ رہ کر کتنے عروج کو پہنچی ہوئی ہوتی کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس کو اپنی سابقہ زندگی پر اگر کبھی افسوس کرنے کا موقع ملتا تو محض اس خیال سے کہ میں اب مفلس و نادار ہوں ورنہ اور کسی طرح کی حسرت اس کے دل کو کسی حال میں نہ ہوتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس بدنصیب عورت کو کئی موقعوں پر فاقہ کشی کرنی پڑی اور چیتھڑوں کے بستر پر سونے کیلئے مجبور ہونا پڑا ایک مرتبہ تو اس کی بدحالی نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ چہرہ پر بھاری نقاب ڈال کر وہ سر بازار بھیک مانگتی ہوئی دیکھی گئی لیکن کچھ ایسی متلون طبیعت خدا نے اسے دی تھی کہ جب اس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ایک آوارہ مزاج نوجوان اس پر مفتون ہوگیا اور اس کی فضول خرچیاں پوری کرنے لگا تو حال کی برداشت کی ہوئی سب تکلیفیں یکسر اس کے ذہن سے نکل گئیں۔

یورپ کے مختلف حصوں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے اسے کئی سال گزر گئے تھے کہ ایک دن اس نے لیڈی ہسٹر سٹین ہوپ کے ان عجیب و حیرت انگیز واقعات زندگی کا حال پڑھا جو اس خاتون کو مشرقی سیر و سیاحت میں پیش آئے تھے۔ اسی وقت سے یہ دھن اس کو سوار ہوئی کہ لیڈی ہسٹر سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر دکھاؤں گی چونکہ گذارے لائق روپیہ اس کے پاس تھا اسلئے کسی مزید تامل کے بغیر وہ دمشق روانہ ہو گئی اور وہاں سے صحرا کی سیاحت کا عزم کر لیا۔

لیکن جب وہ بدو لوگوں کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئی تو مشرق کی دلچسپیاں کچھ اس طریقہ پر اسے بھا گئیں کہ اس نے

عہد کرلیا۔ اب پھر یورپ نہ جاؤں گی۔ شاید اس ارادہ کی تہ میں ایک بات یہ بھی تھی کہ عرب قافلہ سالار کی دلفریب صورت شروع سے ہی اس کے دل پر اثر کر گئی تھی۔ آدمی نیم وحشی اور سیاہ فام تھا مگر خوش قد اور متناسب الاعضا ہونے کی وجہ سے ایک خاص طرح کی رعنائی اس کی حرکات میں پائی جاتی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ دلفریب اس کی مست کالی آنکھیں تھیں۔ مجوال اسکا نام تھا۔ جوں جوں قافلہ صحرا کی طرف بڑھتا گیا لیڈی الن برو اور اس بدو عرب میں موانست پیدا ہوتی گئی۔ مجوال نے قافلہ سالاری کرتے ہوئے تھوڑی بہت فرانسیسی زبان سیکھ لی تھی رستہ میں دونوں کو جب کبھی موقعہ ملتا تنہائی میں یا ہم رکاب ہو کر میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتے تھے۔

غرض سامان ایسا بندھا کہ یہ عشرت پسند مغربی خاتون سنولائی ہوئی رنگت کے اس جوان رعنا پر مفتون ہو گئی اس کی نظر میں نشہ اور باتوں میں مستی تھی۔ لیڈی الن برو نے کبھی کسی معاملہ میں پیش بینی سے کام نہ لیا تھا جس قدر باتیں اس نے اب تک کی تھیں وہ سب اس کے فوری جوش اور اچانک ارادے کا نتیجہ ہوا کرتی تھیں پس کیا تعجب ہے کہ انجام کار وہ ایک نیم وحشی عرب سے شادی کرنے کو تیار ہو گئی۔ بعد ازاں اس نے اپنے منہ سے یہ بات تسلیم کی کہ مجوال کے درخواست کرنے سے پہلے ہی میں اس سے شادی کرنے کو آمادہ ہو چکی تھی۔

ایک غیر معمولی شجاع عورت

یہ ایک نہایت عجیب بات ہے کہ جین ڈگبی نے پیشتر جتنی شادیاں کی تھیں ان سب کے مقابلہ میں یہ غیر معمولی کامیاب ثابت ہوئی مزے داری دیکھئے کہ وہ خاتون جو ایک امیر خاندان کی چشم و چراغ تھی جس نے بچپن کے زمانہ میں اور پھر اس کے بعد بھی ہمیشہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کی تھی جس کے اسراف اور فضول خرچی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اس مجوال کی بی بی بننے کے بعد وہ سب کام خوشی خوشی کئے جو مشرقی عورتیں کیا کرتی ہیں۔ وہ اونٹنیوں کا دودھ دوہتی اور اپنے ہاتھ سے خاوند کیلئے کھانا پکایا کرتی تھی غرض اس میں اور کسی عربی خاتون میں ذرا بھی فرق نظر نہ آتا تھا حتے کہ چھ ماہ شہر میں رہنے کے بعد جب یہ لوگ چھ مہینے کیلئے خانہ بدوشی کرتے تو وہ اس کے لئے بھی خوشی سے آمادہ ہو جاتی۔

البتہ دمشق رہتے ہوئے یہ لوگ یورپی طریقہ پر زندگی بسر کرتے تھے۔ اس طرح کے موقعوں پر الن برو صحیح معنوں میں ایک شستہ اور شائستہ انگریز لیڈی بن جاتی اور اس کا شوہر بھی اس کی ویسی ہی عزت کرتا۔ جیسا مغربی ملکوں کے لوگ کیا کرتے ہیں البتہ جو انگریز دوست لیڈی الن برو سے ملنے جاتے ان کو بڑی دقت کا سامنا ہوتا کیونکہ مجوال کا سلوک اپنی عورت سے لاکھ اچھا ہوتا تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے مغرب کے مہذب شرفا کے مقابلہ میں وہ اکھڑ اور گنوار ہی نظر آتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی حرف شکایت منہ سے نہ نکالا۔ چھ مہینے ریگستان میں خانہ بدوشی کرتے ہوئے ان کی زندگی جس اطمینان کے ساتھ بسر ہوتی تھی اس کی وجہ سے وہ اس تخفیہ کو بھی نظر انداز کر دیتا تھا جو اس کی بی بی کے یورپین ملاقاتی اس سے کرتے تھے۔

ایک نہایت عجیب واقعہ ایک موقعہ پر ان کو پیش آیا۔ دونوں میاں بی بی دمشق ٹھہرے ہوئے تھے کہ نامور سیاح کی بی بی لیڈی برٹن لیڈی الن برو سے ملاقات کرنے گئی ایک عرب نے اس کا دروازہ کھولا تو لیڈی برٹن اس کی سست حرکات اور گستاخ نگاہی دیکھ کر بہت خفا ہوئی اور بعد ازاں لیڈی الن برو سے کہنے لگی: "یہ تم نے کس طرح کا بیہودہ نوکر رکھا ہے کیوں اس کو نکال نہیں دیتی ہو۔" اس پر لیڈی الن برو مسکرا کر کہنے لگی: "اس لئے کہ میں ایسا نہیں کر سکتی وہ میرا شوہر ہے!"

جب کھانا میز پر لایا گیا تو مجوال بھی بیوی کے کہنے سے پاس بیٹھ گیا مگر انتہائی اصرار کے باوجود وہ شریک طعام نہ ہوا بلکہ ہر ممکن طریق پر اُن کی خدمت گذاری کرتا رہا۔

لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس قسم کا سلوک وہ صرف اجنبی شخصوں کی موجودگی میں کیا کرتا تھا ورنہ علیحدگی میں وہ صحیح معنوں میں ایک مشرقی خاوند تھا جس کو اپنی بی بی پر کامل اختیارات حاصل تھے اور جو صرف سے کچھ نرمی کا برتاؤ اپنی بی بی سے کرتا تھا کہ آس پاس اور بھی گھر آباد ہیں۔

زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ متکبر اور سرکش خاتون بھی جو ہر بات میں اپنی منوانے کی عادی تھی جس نے اپنے حسن ذکاوت سے ہمیشہ مردوں پر حکومت کی تھی اس آدمی کے سامنے بڑی آسانی کے ساتھ جھک جایا جاتی تھی۔

مشرق میں رہتے اور مشرقی طریق زندگی بسر کرتے ہوئے لیڈی الن برو نے وہ ساری باتیں سیکھ لیں جو اس زندگی کے لئے لازم تھیں جس کو بسر کرنے پر وہ مجبور تھی حتی کہ دشمنوں کا مقابلہ کرنا اور اسلحہ سے کام لینا بھی اس کو اچھی طرح آ گیا۔

ایک بے خطا نشانہ باز

بارہا اس طرح کے موقعے پیش آئے کہ لوٹ

مار کرنے والے عربوں کی کوئی جماعت ان پر حملہ آور ہوئی تو لیڈی الن برو نے سب سے آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ اس کو پستول چلانے کی اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ اس کا نشانہ کبھی خطا نہ جاتا تھا اور اسی لئے عرب لوگ جو قدرتاً وہمی ہوتے ہیں اس کو "خوبصورت بلا" کہنے لگے تھے۔ یہ عام خیال ان لوگوں میں پھیلا ہوا تھا کہ اس کا شیطان کیساتھ کسی طرح کا معاہدہ ہو چکا ہے۔

لیڈی الن برو کا سب سے بڑا معرکہ اس خانہ بدوشی کی زندگی میں یہ تھا کہ ایک موقعہ پر کوئی وحشی سردار جو اپنی خون آشامی کے لئے مشہور تھا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اُن پر حملہ آور ہوا۔ اس کا شوہر اور دوسرے سب آدمی بھاگ گئے لیکن وہ اپنی جگہ پر جم کے کھڑی رہی اور اپنی پہلی گولی سے ہی حملہ آور سردار کو ہلاک کر دیا اس کے بعد باقی آدمی بھاگ گئے۔ مجوال اور اس کے ساتھی شرم کے مارے منہ چھپا کے واپس آ گئے۔ اس رات مجوال کے ساتھیوں میں دیر تک مشورہ ہوتا رہا کہ اس عورت کو خفیہ طور پر جان سے مار دینا چاہئے ورنہ دمشق پہنچکر ہماری سخت بدنامی ہو گی لیکن مجوال کو اپنی بی بی سے اتنی گہری محبت تھی کہ وہ رات بھر چاقو ہاتھ میں لئے کھڑا رہا کہتا تھا جو سامنے آئے گا اور اندر جانے کی کوشش کرے گا اسے اپنے ہاتھ سے مار ڈالوں گا۔ لیکن ایسا کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی کیونکہ اتنی دہشت لیڈی الن برو کی عربوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

لیڈی الن برو کافی عرصہ زندہ رہی اور آخر سال خوردہ ہو کر مری۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ اپنی خیرات اور غریب پروری کیلئے مشہور تھی۔ مسلمان اس کو خدا رسیدہ عورت سمجھنے لگے تھے۔ جہاں تک یورپ سے اس کا تعلق تھا سب لوگ اُسے بالکل ہی فراموش کر چکے تھے بلکہ بہتوں کا تو خیال تھا کہ مدت ہوئی وہ مر گئی۔ اس کے ملاقاتیوں نے اس وقت کے بعد ہی سمجھ لیا کہ اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ پس جب آخر کار بہت عرصہ کے بعد اس کی موت کی خبر یورپ میں پھیلی تو لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔

اس دنیا میں کئی عجیب و غریب عورتیں ہو گزری ہیں لیکن جین ڈگبی کے سوانح حیات اس لحاظ سے ناقابل فراموش ہیں اور دیکھئے کہ اس کی زندگی کی داستان افسانہ سے بڑھ کر حیرت انگیز ہے ایک نامور انگریز امیر کی بیٹی ہندوستان کے گورنر جنرل کی بی بی اور وہ جا کر آخر کار ایک بدو کے گھر مری! کیا اس سے بڑھ کر تعجب انگیز واقعہ کبھی کسی کے پڑھنے سننے میں آیا ہے!

غزل

از جناب رونق ... پروی
ایڈیٹر ...

دل ہی جب بیقرار ہے پیارے — زندگی تلخ و بار ہے پیارے
دل سے تم پوچھو میں نگاہوں سے — کس کو کس سے پیار ہے پیارے
تم نہیں ہو تو غمِ محبت کا ! — کون پھر پردہ دار ہے پیارے
پرسشِ حال بے دلوں سے کیا — شکرِ پروردگار ہے پیارے
اب تو دل ہی فریبِ تسکیں پہ — مائلِ اعتبار ہے پیارے
بے رخی ہی سہی یہ ایک نظر — کوئی امیدوار ہے پیارے
حُسن کی پختہ کاریاں دیکھیں — عشق ہی خام کار ہے پیارے
ہاتھ آتے ہی ٹوٹ جائے جو — رشتۂ روزگار ہے پیارے
اُن کے وعدے کہ میری امیدیں — دو ہی دن کی بہار ہے پیارے

ہر صدائے شکستِ دل رونق
سرگذشتِ بہار ہے پیارے

شاہد کے خطوط

از جناب ... شمسی

پہلا خط

سالیبٹری کالج ——————

۲۸ اگست ۱۹۴۱ء ——————

پیارے دوست

شاعر کے لئے تنہائی کوئی ایسی چیز نہیں مگر احساس تنہائی۔ اللہ کی پناہ۔ تم بھی چلے گئے سب چلے گئے۔ خدا جانے اس وحشت اثر حال کا مستقبل کتنا درد انگیز ہوگا۔ آمر کچھ اسطرح ٹوٹا جیسے کسی شاہد معصوم کا دل کسی کے گناہ پر محبت کرنے سے متنفر ہوکر ٹوٹ جائے۔ ——————

ہر حسین چیز کائنات کی نیرنگی اور انقلاب کا شکار ہوکر رہ گئی حسن کو عشق کی بربادی کی صلاحیت کا اندازہ پہلے سے تھا اب اتنا ہوگیا۔ حالات روز بروز منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ اس وارفتگی میں بے سروسامانی کا پہلو کچھ کم نمایاں نہیں طبیعت اچٹی اچٹی باتیں بہکی بہکی سمجھ الجھی الجھی۔ ممکن ہے یہ صورت کبھی عشق کی خودداری کے منافی ہو —— ابھی تو نہیں۔ میں اس ساعت کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔

باقی پھر —— جلد ہی

تمہارا

"شاہد"

دوسرا خط

سالیبٹری کالج ——————

۳۰ اگست ۱۹۴۱ء ——————

محترم دوست

میں جانتا ہوں زندگی کسے کہتے ہیں کسی حد تک اس کی تلخ حقیقتوں سے بھی آشنا ہوں۔ اکثر تنہائی میں —— رات کے سناٹے میں —— دنیا سے دور —— میں نے غور کیا اور یہی۔ مجھے کیوں کسی سے محبت ہے اور بے پناہ۔ میری سمجھ میں خود نہیں آتا جب تک ملے نہ تھے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے میرا ایمان ایک خاموش غائبانہ پرستش تھا۔ وہ ملے بھی۔ مل کر بچھڑ بھی گئے —— میں انہیں بھول بھی چلا —— دنیا کو بھول گیا وہ اک دائمی اثر چھوڑتے گئے —— میرے دل پر۔ میں نے ان سے کہا۔ اور اکثر۔ یہ نہ دیکھو درد کہاں ہو رہا ہے۔ بلکہ کیوں ہو رہا ہے۔ بڑی خوشنما نوازشیں تھیں ان کی مہربانیاں۔ دل محبت کا متلاشی تھا —— میں بے تابانہ آگے بڑھتا گیا۔ مگر ان کی یہ ہمدردیاں کس کام کی جب وہ میرے نہ ہوسکے آج طبیعت متوحش، دل بے چین ہے محسوس کر رہا ہوں دنیا کا درد میرے ہی کلیجے میں پھٹ پڑا۔ انتظار کرو۔ پھر لکھونگا — تمہارا

شاہد۔

تیسرا خط

سالیبٹری کالج۔

یکم ستمبر ۱۹۴۱ء

اچھے دوست

تم سے کہا تھا۔ پھر لکھنے کو۔ تم منتظر ہوگے تم نے مجبور کیا کہ میں حالات پر پھر سے ایک بسیط نظر ڈالوں اور اچھی طرح واضح کرسکوں میری سمجھ میں نہیں آتا تم کہنا کیا چاہتے ہو اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں آخری منزل پر پہنچ کر کچھ ابتدائی مراحل پر روشنی ڈالوں تو خیر اتنا جانتا ہوں۔ تنہائی کاٹتی تھی جی گھبراتا تھا، دوست کی تلاش تھی۔ مل بھی گیا —— بتدریج ملاقات بڑھتی گئی۔ مجھے یقین دلایا گیا کہ یہ آپس کی رسم و راہ ابدی صورت اختیار کرچکی ہے۔

ارضی و سماوی دونوں طاقتیں کسی قسم کی مداخلت کی اگر جرات کریں تو بھی یہ کوشش عبث ہوگی میرے لئے اتنا بہت تھا بس پردہ فریب ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ حالات سے مجبور ہوکر یا ہمتیں چھوٹ گئیں۔

بہت ممکن ہے۔ یہ صورت بھی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہے۔ اور وہ پھر میرے ہوجائیں۔ ایسے انقلاب کم آتے ہیں۔ ایسی محبت تم نے کم کبھی دیکھی ہوگی۔ ایسے قصے کم

واپسی

از حضرت ظفر زبیری "منزل بیرون" لاہور

"......... تمہیں حاصل کرنے کے لئے "دنیا" کو حاصل کرنا ضروری تھا، اسی کے لئے پردیس کی خاک چھاننے پر مجبور ہوا۔ اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے کامیاب رہا۔ لیکن معاف کرنا میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔ اس لئے واپس آرہا ہوں"

تمہارا ظفر

افسانہ پھر شباب کا دُہرا رہا ہوں میں
رازِ حیاتِ قلب کو سمجھا رہا ہوں میں
دیوانگیٔ شوق کو اُکسا رہا ہوں میں
پھر پاسبانِ عقل کو بہکا رہا ہوں میں
کشورِ وطن کو لوٹ کے پھر آرہا ہوں میں

تیرے خطوط آگ سی دل میں لگا گئے
ہوش و خرد پہ جذبِ کشش بنکے چھا گئے
دل سے خیالِ سود و زیاں بھی مٹا گئے
لے بیخودی کے ہاتھ بکا جا رہا ہوں میں
کشورِ وطن کو لوٹ کے پھر آرہا ہوں میں

کسبِ معاش کیلئے نکلا تھا گھر سے میں
چھوڑا تجھے تو گر گیا اپنی نظر سے میں
اس قصد سے کہ پھر نہ اُٹھوں تیرے در سے میں
دنیائے روزگار کو ٹھکرا رہا ہوں میں
کشورِ وطن کو لوٹ کے پھر آرہا ہوں میں

سر میں ترے خیال کا سودا لئے ہوئے
آنکھوں میں تیری صورتِ زیبا لئے ہوئے
پہلو میں اپنے جوشِ تمنّا لئے ہوئے
دل کو وفورِ شوق سے تڑپا رہا ہوں میں
کشورِ وطن کو لوٹ کے پھر آرہا ہوں میں

بیتے ہوؤں دنوں کو میں واپس بلاؤنگا
پھر عشرتوں کی گود میں تجھکو کھلاؤں گا
دُنیا کو خلدِ عیش کی صورت سجاؤں گا
یعنی کہ عہدِ رفتہ کو لوٹا رہا ہوں میں
کشورِ وطن کو لوٹ کے پھر آرہا ہوں میں

راتوں کو پھر سہرے بھرے کھیتوں میں جائینگے
تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں دھومیں مچائینگے
باہوں کے جھولے ڈال کے پینگیں بڑھائینگے
رگ رگ میں خونِ تازہ کو دوڑا رہا ہوں میں
کشورِ وطن کو لوٹ کے پھر آرہا ہوں میں

دل میں امید و بیم کو یکجا کئے ہوئے
ہستی کو وقفِ ہجرِ تمنا کئے ہوئے
کشتی سپردِ موجۂ دریا کئے ہوئے
طوفانِ آرزو میں بہا جا رہا ہوں میں
کشورِ وطن کو لوٹ کے پھر آرہا ہوں میں

فریدہ کے نام

از خواجہ اقبال احمد صاحب بھیروی

فریدہ!

لاہور سے آنے کے بعد عشق رنگ لایا اُسے وہ سب سامان مہیا ہو گئے جو اس کی بقا کے لئے مفید تھے۔ اس نے رات کی تاریکیاں آہوں میں تو دن کی بیقراریاں کراہوں میں گذار دیں۔ وہ کروٹیں لے لے کر دل مسل مسل کر اس منزل پر جا پہنچا جسے دنیا والے جنون کہتے ہیں اس نے بغیر سوچے سمجھے سیاہ اور بھیانک راتیں تیری یاد کیلئے وقف کر دیں۔ اس بات کو جانتے اور بوجھتے ہوئے کہ تو ہرگز ہرگز اس کی نہ ہو سکتی تھی مگر آہ کمبخت عشق مجبور تھا محبت دیوانی تھی۔ دل بہکا یا گیا تھا۔ اور تیرے رس بھرے ہونٹوں، مدھ بھری آنکھوں کے چکمے تھے جو دلِ مجبور کو دئے گئے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا شب کی نیند حرام تو دن کا چین مفقود، سینہ میں ہلکا ہلکا درد، تو دل میں ہلکی ہلکی ٹیسیں۔ آہ! کیا بتاؤں اسوقت سے لیکر آج تک کن کن حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ فریدہ! یہ وہ الم انگیز داستان ہے جو میں نہیں چاہتا کہ تم کو اس سے روشناس کراؤں میری دلی تمنا ہے کہ تم اس کو نہ سُن کر میرے جذبات سے میری محبت کا اندازہ لگاؤ۔ اگر تمہارے دل میں میرے لئے ذرہ بھر بھی محبت ہو گی۔ اگر وہ پتھر کا نہیں ہو گا تو یقیناً کھلم کھلا نہیں تو پوشیدہ طور پر تم اس بات کی ضرور قائل ہو جاؤ گی کہ ہاں واقعی کوئی ستم رسیدہ ہے جس کی اگرچہ زبان نہیں مگر الفاظ اس کی بےبسی کے ضرور ضامن ہیں۔ فریدہ! کسی نے کہا ہے ؎

چمن میں سوگ ہے اس بدنصیب غنچے کا
جو ایک رات بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکا

ہاں چمن میں سوگ ہو گا اس کے ایک رات بھی جی بھر کر نہ مسکرانے کا! مگر آہ یہاں تو کوئی گھڑی کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں آرام نصیب ہو۔ پھر رات اور دن کی کیا تمیز! جی بھر کر مسکرانے اور نہ مسکرانے کا کیا غم۔ اور سوگ کے کرنے والا ہی کون۔ بس تنہائی ہے کہ مونس ہے اور دل کو تسلی ہے تو یہ کہ:—

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

میں سمجھتا ہوں یہ خط لکھ کر میں نہایت جرأت سے کام لے رہا ہوں مگر اس ہمت پر کہ دو چار دن ایک ساتھ مل کر بیٹھنے کا موقعہ ملا یقیناً میں اس کے جواب سے محروم نہیں رہونگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی توقع کرتا ہوں کہ یہ خط تمہارے لئے تعجب کا موجب ہو گا۔ کیونکہ اگرچہ میری زبان تمہاری محبت کے اظہار کرنے میں الفاظ سے قاصر رہی ہے مگر میری آنکھیں اس فرض کو ادا کرنے میں یقیناً قاصر نہیں رہیں جب کہ ہم تم ایک جا رہ رہے تھے۔ اور تم جانتی ہی ہو کہ ؎

جس کے پہلو میں حشر برپا ہو
اُس کے منہ میں زبان نہیں ہوتی

ابتدا میں کر رہا ہوں، جواب کا تمہاری طرف سے منتظر ہوں!!

تمہارا خاور

خاور کے نام

خاور!

خط پہنچا۔ لکھوں تو کیا لکھوں۔ تمہارے درد بھرے خط نے یقیناً میرے دل پر ایک گہرا اثر کیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ تم ضرور دُکھی ہو تمہارا ایک ایک لفظ میرے دل پہ نشتر ہو کر چبھا ہے مگر جب مرد کی بےوفائی کی طرف نظر دوڑاتی ہوں تو میرا کلیجہ کانپ جاتا ہے میں چیخ اور بلبلا اٹھتی ہوں۔ آغاز کو چھوڑ کر انجام کی طرف نظر دوڑاتی ہوں کہ اُف! اس مٹی کے پتلے، بیوفائی کے مجسمے کا آغاز کتنا دلکش و رنگین ہے۔ مگر انجام کتنا بھیانک۔ سچ کہتی ہوں خاور! یہ خیال میرے حواس کو بیہوشی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ میں چکرا جاتی ہوں کہ آہ مرد کتنا فریبی اور چالاک ہے۔ پتھر کی طرح سخت مگر موم کی طرح نرم۔ مطلب کا پکا۔ ہرجائی اور بساط دنیا کا سب سے شاطر مہرہ۔ کسی کے گن گانے پر آئے تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دے۔ خاور! سچ کہو کیا عورت اتنی ہی حسین ہے کہ کائنات کی ساری رنگینیاں اس میں ہی سمٹ کر آ جائیں ندی کے پانی میں اس کی ہی جھلک ہو چشمے اس کا ہی تصور دلائیں۔ بھینی بھینی معطر ہوا اس کے ہی رس بھرے گیت سنائے۔ کیا قدرت کا یہ سارا اہتمام فقط عورت کے لئے ہی ہے؟ کتنے پرفریب الفاظ ہیں۔ عورت کو بےوقوف بنانے کیلئے اور کتنی

باقی بر صفحہ ۲۱

سفر

ہر صبح سفر ہر شام سفر

اس چلنے کا انجام سفر

از جناب قیسی رامپوری

نسیمہ کے انتقال کے بعد سے دنیا مجھے کچھ بھٹکی بھٹکی سی معلوم ہونے لگی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے جو ادھر ادھر بھٹکنا شروع کر دیا تھا تو دنیا بھی مجھے آوارہ نظر آنے لگی تھی۔ آج کل میرا کہیں قیام نہ تھا۔ کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ کوئی گھر نہ تھا۔ دلچسپی کی متلاشی ہستیاں میرا اکثر دامن تھامنے کی کوشش کرتیں تاکہ میں ان کے دل میں یا ان کے قریب کہیں بس جانے کیلئے اپنے کو آمادہ کر لوں۔ مگر میں ہر شے سے اکتا چکا تھا، عشق سے اکتا چکا تھا، محبت سے اکتا چکا تھا، رومان سے اکتا چکا تھا، شرمیلی نگاہوں کی خفیہ دعوتوں سے اکتا چکا تھا، جوانی سے اکتا چکا تھا، یہاں تک کہ اپنے آپ سے اکتا گیا تھا۔

میرا گھوڑا میری آوارہ گردی میں برابر کا شریک تھا مگر میں اس سے بھی تنگ آ گیا تھا کیونکہ وہ نالائق اپنی نوع کی جنس لطیف کو دیکھ کر بہت جلد آمادۂ معاشقہ ہو جایا کرتا تھا۔ میں اس کی کب تاب لا سکتا تھا۔ یہ کس طرح میں گوارا کر سکتا تھا کہ ایک گنگ دل کو ایک زندہ دل اپنی پیٹھ پر لئے لئے پھرے چنانچہ میں نے اس کو بھی رخصت کیا اور اس کے بدلے ایسی سواری خریدی جو تمام تر میری مرضی کے تابع رہے۔

میری شاندار نئی موٹر بجائے حسین سڑکوں اور لوچوں کے جنگلوں کی ویران اور گرد آلود اوگھٹ سڑکوں کا گشت لگا رہی تھی۔ میرا گھر یہی کار تھی جس کو میں جنگلوں جنگلوں لئے پھر رہا تھا۔ میری کوئی منزل نہ تھی۔ میرا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ جہاں رات ہو جاتی وہیں رین بسیرے کیلئے رک جاتا اور صبح ہوتے ہی اپنے نامعلوم اور کبھی ختم نہ ہونے والے سفر کے لئے روانہ ہو جاتا۔

میرے ساتھ صرف ایک ملازم تھا جو پچھلی سیٹ پر تقریباً ایک ہفتہ کا سامان خورد و نوش لئے بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی شہر آ گیا تو ہوٹل میں کھانا کھا لیا ورنہ جنگل میں ٹین دودھ، ٹین بند مربے، بسکٹ، مکھن، گوشت پر گزارا ہوتا تھا۔ اسٹوو پر چائے بنتی تھی۔ اسی پر پراٹھے تلے جاتے تھے۔ سر کہیں زمین پر دراز ہو کر شب بسر کر لی جاتی تھی۔ بڑے مزے کی زندگی تھی۔ شہروں کے فسادات سے دور، انسانوں اور سوسائیٹیوں کے رشک و حسد سے علیحدہ۔ کبھی اسٹوو کا تیل یا مکھن کے چند چھینٹے موٹر کے نرم گدیوں پر پڑ جاتے تو وہ نزاکت یا کراہت سے منہ بگاڑنے لگتے۔ ان کو توقع تھی کہ وہ حسین اور اپنی جیسی ملائم ملائم رانوں کے خوشگوار بار سے لچکتے ہوئے ہمیشہ مسرت سے اچھلتے رہینگے مگر جب ان کی تواضع ان • فضولیات " سے کی گئی تو ان کو اپنی امیدوں کا خون کر لینا پڑا۔

میں ایک ہفتہ میں ہزار ہزار میل سے اوپر طے کر لیا کرتا تھا۔ آج یہاں ہوں تو کل یہاں سے تین سو میل دور، اس لئے کسی منزل سے دلچسپی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ نہ کسی قیام گاہ نے میری نظروں میں خاص وقعت حاصل کر لی تھی۔ بس چلنے سے کام تھا، گھومے جانے سے سروکار تھا، سفر کئے جانے سے مطلب تھا۔

نئے نئے پہاڑ، بھانت بھانت کے قصبے، گاؤں، شہر، اور قسم قسم کے لوگ نظر سے گذر رہے تھے اور میں ان کے نظاروں عمر رواں کی طرح نامعلوم منزل کی رواں دواں رہتا تھا۔ کتنا اچھا مشغلہ تھا کیسی اچھی زندگی تھی جب بھوک لگی کچھ کھا لیا۔ جی چاہا جہاں رک گیا۔ طبیعت میں آئی وہاں سو گئے۔ نہ کوئی پابندی تھی نہ تکلف۔

بڈھا نوکر کبھی جنگل کے سناٹے میں میرے دل سے بلا ارادہ نکل جانے والی سرد آہ کو سن بھی نہ سکتا تھا۔ چاندنی راتوں میں جب میں خدا کی کسی اجاڑ زمین پر قیام کرتا تو میری کار چاند کے دلفریب انعکاس میں ایک حسین دلہن کی مانند نظر آنے لگتی تھی میں اس کو پیار سے چومتا، صاف کرتا اور سو جاتا۔

سردیوں میں یہ سفر ذرا تکلیف دہ ہو جاتا تھا۔ خواہ مخواہ پناہ ڈھونڈھنی پڑتی

تھی اور بارش میں اور بھی زیادہ دقت پیدا ہو جاتی تھی۔ ذرا سی بارش سے ابل پڑنے والے کم ظرف ندی نالے میرا راستہ روک دینے کی کوشش کرنے لگتے تھے مگر میری برق دم کار ان کا مذاق اڑاتی ہوئی، شوں شوں کرتی ہوئی گذر جاتی۔

نومبر کے آخری دن تھے۔ سردی خاصی تیز پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ ادھر بارش ہونے لگی تھی جس سے سردی میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر میرا سفر برابر جاری تھا، ایک لحاف، ایک توشک، ایک کمبل اور ایک برساتی، ادھر نوکر کا بھی لحاف اور کمبل، یہ سامان خواہ مخواہ بڑھ گیا تھا۔ موٹر کی پچھلی سیٹ کی رومان انگیز فضا اور اگلی سیٹ کا رومان کو مکمل کرنے والا ماحول بستروں اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔

بڑی اندھیری رات تھی اور نہایت خراب سڑک، بھیانک جنگل کے چھوٹے چھوٹے سے پودے اور معمولی معمولی چٹانیں کالے کالے دیو کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ میری موٹر آڑی ترچھی ہو کر اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ میں نے باہر ہاتھ نکال کر دیکھا تو بارش کی بوندیں موٹر کی رفتار کی وجہ سے پھوار کی طرح محسوس ہوئیں۔ اگر بارش اور سردی نہ ہوتی تو میں اسی جنگل میں قیام کر لیتا کیونکہ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ مجھے نیند آئے چلی جا رہی تھی مگر اس موسم کی وجہ سے میں کسی بستی یا گوٹھ جائے پناہ کی توقع میں چلا جا رہا تھا۔

یا خدا! یہ میرا سفر کہیں آخرت کا سفر تو نہ تھا گھنٹہ بھر ہو گیا اس سنسان جنگل میں جست و خیز کرتے ہوئے مگر نہ تو اندھیرا کم ہوتا ہے نہ بارش اور نہ کہیں کوئی بستی نظر آتی ہے

میں نے احتیاطاً موٹر دھیمی کر لی تھی کیونکہ راستہ بڑا خراب تھا۔ نہ سگریٹ میں لطف آ رہا تھا نہ چاکلیٹ میں۔

"جمن بندوق میں کارتوس ڈال کر اپنے گھٹنے پر رکھ لو۔" میں نے پیچھے پھر کر اپنے نوکر سے کہا۔ مگر معلوم ہوا کہ میاں جمن مزے سے میرے ہولڈال کا تکیہ بنا کے محو خواب ہیں۔ آخر میں نے اپنا پستول درست کر لیا اور کسی ناگہانی حادثہ کے مقابلہ کیلئے چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

کار مشکل سے بیس میل کی رفتار سے چل رہی ہو گی۔ اسٹیرنگ کو گھماتے گھماتے میری کلائیاں اور شانے دکھ چلے تھے۔ اور اندھیرے میں جھانکتے جھانکتے آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔

ایک جگہ کچھ چڑھائی آئی۔ راستہ میں بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ میری ہلکی پھلکی کار کے پائے ناز میں اس بے تکے راستہ کو دیکھ کر ڈگمگانے لگے۔ میں نے موٹر کو ذرا دیر کے روکا اور گیئر بدل کر اس چڑھائی اور راستہ کی ناہمواری کے مقابلہ کی تیاری کرنے لگا۔

دفعتہً ایک بیل سے بھی اونچا جانور میری کار کے آگے سے بدکتا ہوا بھاگا۔ روشنی کی زد پر جب وہ پھر آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا ہے۔ طبیعت کو اطمینان ہوا کہ یہ پالتو جانور کسی گاؤں کے قرب کی نوید سنانے آیا ہے

میں نے آہستہ آہستہ موٹر آگے بڑھائی اور چڑھائی کو طے کر کے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے موٹر کو روک دیا۔

اوپر ذرا کھلا ہوا جنگل تھا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے موٹر کی تیز روشنی میں ڈھاک کے پتوں کی ایک چھوٹی سی ٹپریا میں سے دھیمی آگ کی زرد زرد روشنی نکلتی ہوئی دیکھی میں اطمینان سے گاڑی میں سے اترا اور اپنی ٹورچ کی رہبری سے ٹپریا کی طرف بڑھا۔

ابھی میں چند ہی قدم آگے چلا ہوں گا کہ اس میں سے دو کالے کالے سایے تیزی سے نکلے اور میری طرف بڑھے۔ میں نے جلدی سے ان پر روشنی ڈالی جس سے انہوں نے چندھیا کر منہ پھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں موٹے موٹے لٹھ تھے اور وہ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے حواس پر قابو پا کر ان کو ٹوکا۔ "گھبراؤ نہیں، میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" میں نے کہا لیکن اس کے جواب میں وہ اور تیزی سے میری طرف جھپٹے۔ اب تو میں نے اپنا پستول نکال لیا۔ اور ایک ہوائی فائر کرتے ہوئے ان کو آگاہ کیا کہ اپنی موت کی جانب بڑھ رہے ہیں

پستول کی آواز سن کر وہ گھبرا گئے، ٹھٹکے اور جدھر جنگل منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ میں ان کے اس طرز عمل پر حیران کھڑا رہا۔ پھر مجھے خیال آ گیا کہ شاید یہ مردم آزار لوگ تھے خیر ان کی ٹپریا کی طرف بڑھا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ان ڈاکوؤں کا مال و اسباب اس جھونپڑی میں پڑا ہو گا۔ مگر ٹورچ کی تیز روشنی نے مجھے بتایا کہ یہاں تو کوئی اور بھی ہے۔

بجلی کی شعاع سے دو خوبصورت آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور خوف و ہراس سے ایک حسین جسم میرے سامنے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس مہیب رات اور اس بھیانک جنگل نے اس لڑکی کو یہاں کہاں سے جن دیا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا اور تسکین دہ لہجہ میں بولا۔ "ڈرو نہیں اگر تم ان لٹیروں کے قبضہ میں پھنسی ہوئی ہو تو خوش ہو جاؤ۔ میں تم کو ان کے پنجے سے چھڑانے آیا ہوں۔" یہ کہکر میں نے شعاع کا رخ ذرا ترچھا کر دیا۔ اس نے ایک اٹھتی ہوئی سی نگاہ میرے اوپر ڈالی اور

باہر نکل آئی۔

میں اس کو لے کر جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا کار کی طرف روانہ ہوا۔ ہمارے نکلتے ہی ایک بڑا سا پتھر ہمارے سامنے آ کر پڑا۔ میں نے پھر ایک اندھا فائر کیا۔ تیزی سے لڑکی کو اگلی سیٹ پر دھکیلا اور موٹر ہوا کر دی۔

جب ہم جائے حادثہ سے بہت دور نکل گئے تو میں نے روشنی میں اپنی نامعلوم ساتھی کو غور سے دیکھا۔ ایک میلی سی ساری جو جا بجا سے پھٹ بھی گئی تھی۔ اس نوعمر لڑکی کے حسین جسم پر لپٹی ہوئی ایسی معلوم ہو رہی تھی گویا کسی نرمل پانی کی شفاف جھیل پر کائی چھا گئی ہو۔ اس کا بیضوی چہرہ، بھرے بھرے رخسار جن پر تکان و تکلیف کی وجہ سے زردی دوڑی ہوئی تھی۔ اس کے لانبے الجھے ہوئے بال جنہوں نے کئی روز سے شاید شانہ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اس کا نہایت ہی گداز جسم اور اس کا ہر عضو جو ایک مستقل قصیدہ کی دعوت دے رہا تھا، مجھے ایک حسین خواب سا نظر آ رہا تھا۔

میری نظریں ہٹتے ہی اس کی نگاہوں نے بھی مجھے ٹٹولنا شروع کیا شرما کر شرما کر بہانہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر۔ آخر میں نے سنجیدہ صورت بنا کر اس سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟

"چند منٹ پہلے ایک قیدی تھی اور اب کہہ نہیں سکتی کیا ہوں" اس نے جواب دیا۔

"اچھا اور قید ہونے سے پیشتر کیا تھیں؟"

"آزاد"

"وہ تو اب بھی ہو"

"پھر کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ تم کون ہو۔ ان لوگوں کے قبضہ میں آئیں اور اب کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"آپ کا احسان مجبور کرتا ہے کہ میں آپکو بتا دوں کہ میں دانی پور کے زمیندار کی لڑکی ہوں جن بدمعاشوں کے پنجہ سے آپ نے مجھے رہائی دلوائی ہے انہوں نے ایک ہفتہ ہوا کہ مجھے اپنے مکان سے چرا کر جیتا اجیرن کر رکھا تھا۔ رات بھر مجھے گھوڑے پر سفر کرنا پڑتا تھا اور دن میں یہ لوگ جنگل میں مجھے لے کر چھپ جاتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے ان ظالموں کے ہاتھوں سے آج رہائی دلائی"

"تم سات روز سے برابر گھوڑے پر سفر کر رہی ہو۔ اگر تم تیس میل بھی روز چلیں تو گویا اس وقت اپنے گھر سے ۲۱۰ میل دور ہو"

"اچھا تمہارا قصبہ دانی پور کہاں ہے؟"

"وندھیاچل کی گودیوں میں کھیلتا ہوا ایک شاداب قصبہ ہے۔ ایسا دلفریب مقام ہے کہ اگر آپ اس قصبہ سے گذر جائیں تو اپنے طویل سفر کو ملتوی کر کے وہیں رہ پڑیں"

"تمکو کس طرح معلوم ہوا کہ میرا سفر طویل ہے؟"

"یہ ہر چیز کا انبار اور کار میں باورچی خانہ کا تمام سامان اس کی شہادت دے رہا ہے"

"اوہو، معاف کرنا تم سردی سے ٹھٹھری جا رہی ہو۔ اچھا یہ کمبل تم بھی اوڑھ لو" یہ کہکر میں نے اس کمبل کا نصف حصہ جسکو میں نے اوڑھ لیا تھا اس کے جسم کے گرد بھی لپیٹ دیا۔ اف کمبل نے دو جوان جسموں کو اپنے آغوش میں لے کر وہ میٹھی میٹھی حرارت پہنچانی شروع کی کہ میں بے قرار ہو گیا۔ جلدی سے اپنے جسم پر سے کمبل اتار ڈالا، اس نے گھبرا کر میری جانب دیکھا میں مسکرانے لگا۔ وہ شرما گئی۔

"اچھا تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں؟" اس کے جواب میں وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے پھر اصرار کیا تو تکلفاً ویسے ہی اثبات میں سر ہلا کر پھر چپ ہو گئی۔

"اچھا، اچھا۔ تم اپنی زبان سے نہیں کہو گی۔ چونکہ تم میری مہمان ہو اسلئے میرا فرض ہے کہ تمہاری تواضع کروں" یہ کہکر میں نے پھر جمن صاحب کو آواز دی جواب تک پڑا سو رہا تھا۔

دو پستول چلے، دو مرتبہ کار رکی، اور ایک یہ ناگہانی مہمان آ دھمکا مگر میاں جمن کو خبر بھی نہیں کہ کیا کیا ہوا۔

آخر میری چیخ پکار سے وہ بمشکل جاگا اور آنکھیں کھول کر میرے قریب بیٹھی ہوئی اس ہستی کو حیران حیران دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو میاں جمن، تم ان کو دیکھکر تعجب کرتے ہو گے۔ یہ جنگل کی پری ہیں۔ اچک کر اپنی کار میں آ بیٹھی ہیں۔ اچھا اب ذرا جلدی سے بسکٹ، پھل، مربہ تو یہاں لاؤ" جمن نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس لڑکی کو دیکھا اور سب چیزیں اسکے سامنے رکھ دیں۔

"آپ بھی کھائیے" اس نے شیریں ادائی سے کہا۔

"میں تو کھا چکا۔ اب بھوک نہیں ہے"

"تھوڑا سا تو۔ بقدر اشک بلبل"

"خوب، بہت ہنس مکھ معلوم ہوتی ہو۔ میں کھا تو لوں موٹر کون چلائیگا۔ تم کو معلوم ہے اس پہیہ پر سے ہاتھ ہٹانے کے کیا معنی ہیں؟ موت! ہاں ایک صورت ہے کھانے کی۔ تم لقمہ اپنے ہاتھ سے دو میرے منہ میں"

"یہ ذرا مشکل ہے" اس نے شوخی سے کہا۔

"تو ہم بھی نہیں کھاتے"

"اچھا میں اس ہینڈل پر رکھدوں آپ جھک کر کھا لیجئے"

"نہیں نہیں تم کھاؤ۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے" میں نے خشکی سے کہا۔ اس لڑکی نے آتے ہی میری موٹر کی زندگی میں رنگینی پیدا کرنی شروع کر دی تھی۔ دو ایک روز میں تو اس کو مجھے گھر پر پہنچا دینا تھا۔ پھر کیوں اپنی سفری زندگی میں اس کو ایسا یادآور نقش چھوڑ کر

جانے دیا جائے جو مجھے مدتوں تک رلاتا رہے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے ایک سیب کا ٹکڑا میرے منہ کے قریب کر کے کہا جسکو مجبوراً مجھے دانتوں سے پکڑنا پڑا۔

"کلکتہ جا رہا ہوں"۔ میں نے اپنی منفی زندگی کو اس سے چھپاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس وقت کہیں جائے پناہ کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ کیا تمہارے خیال میں ہم کو آگے جا کر کوئی ایسی بستی مل سکتی ہے جہاں ہم شب کو پناہ لے سکیں۔

"میں کیا جانوں؟ میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ یہ آپکی خوبصورت موٹر ابد الآباد تک یونہی چلتی رہے اور ہم ——— میں اسی طرح رات کے سناٹے میں جنگل اور دشت سے گذرتی ہوئی، بارش کے تھپیڑے کھاتی ہوئی اور سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی چلتی رہوں"۔

"یہ دیوانگی کی علامت ہے ——— میں نے کہا ——— آخر تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟"

"کیونکہ مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے"۔

دیوانی لڑکی کو معلوم نہ تھا کہ میں ایسی ہی زندگی گذار رہا ہوں اور شاید آئندہ بھی گذارتا رہونگا۔ اگر اس نے اس قدر تیزی سے میری حیات میں داخل ہونے کی جسارت نہیں کی۔

"اوہو کیسی تیز بارش ہو رہی ہے۔ آپکو شیشوں میں سے جھانکنے میں بڑی تکلیف ہو رہی ہوگی"۔ یہ کہکر اس نے اپنی میلی ساری کے پلو سے شیشے کو صاف کیا جو چند ہی سکنڈ میں پھر ویسا ہی ہوگیا۔

"تم تکلیف نہ کرو۔ بارش کے بیقرار قطرے یوں مغلوب نہیں ہو سکتے ہیں"۔ میں نے اسکو کمبل میں اور اچھی طرح لپیٹ دیا۔

"آپکو سردی نہیں لگتی؟"

"تمہارا قریب ہونا کافی ہے"۔ بے اختیار میری زبان سے نکل گیا جس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ چند سکنڈ کیلئے اس کی بھی زبان بند ہو گئی۔

آخر قریب میں ہم کو کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ میاں جمن ایکدم چیخ اٹھے "حضور کتے"۔ لڑکی کھکھلا کر ہنس دی۔ میں جھینپ گیا۔ اور جمن پھر اگلے فقرے کی تکرار کرنے لگا۔

"اچھا سن لیا۔ کوئی گاؤں قریب معلوم ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ میرے شانے جواب دے چکے تھے۔ کیوں بھئی ہم تھوڑی سی دیر چل کر کہیں آرام کر لیں"۔

"اگر آپ تھک گئے ہیں تو ضرور آرام کیجئے"۔ لڑکی نے جواب دیا۔

"مگر تمہاری کار کے ہمیشہ چلتے رہنے کی آرزو بھی تو ختم ہو جائیگی"۔ میں نے کہا۔

"وہ چند گھنٹوں کے بعد سے پھر پوری ہونے لگے گی"۔ اس کے کیا معنی؟ کیا یہ لڑکی میرے ساتھ اسی طرح سفر کرتی رہنا چاہتی تھی؟ ہائیں!

چند منٹ کے بعد ایک ویران سا گاؤں نظر آیا۔ میں نے اسی طرف موٹر کو موڑ دیا۔ شکر ہے کہ گاؤں کے باہر ایک شکستہ سا مندر نظر آیا جس کے پچھلے حصہ کے بوسیدہ کمروں سے میں نے گیرج کا کام لیا اور وسط کی گنبد کی عمارت کو اپنے آرام کیلئے منتخب کیا۔

جمن کے کاندھے پر ہولڈال تھا اور ہم تینوں ٹورچ کی روشنی میں شب کو پڑ رہنے کے لئے چند گز محفوظ مقام ڈھونڈھتے پھر رہے تھے۔

اس عمارت میں ہر طرف کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ صرف تاریک گنبد کے نیچے جگہ ذرا محفوظ تھی۔ وہاں نہ تو بارش آرہی تھی نہ زیادہ گندگی تھی۔ جمن بڈھا تھا لیکن کام جوانوں سے زیادہ کرتا تھا۔ جلدی سے اس نے اپنے صافہ سے اس مقام کو صاف کیا اور چند ہی منٹ میں پتھر کا سخت فرش صاف ہو کر مجھے دعوتِ خواب دینے لگا۔ جمن نے فوراً بستر بچھایا۔ لحاف درست کیا۔ تکیہ اونچا کیا اور چلا گیا۔ اسکو موٹر کے اندر سونا تھا۔

اب بلا کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اور نہایت تند و سرد جھونکے چلنے لگے تھے۔ جن سے مارے سردی کے جسم میں لہو جمنے لگا۔

اس گندے ماحول اور سیاہ کوٹھڑی میں میرا صاف و شفاف سفید بستر دلفریب و استراحت بخش نظر آ رہا تھا۔ جمن کے جاتے ہی مجھے اس لڑکی کا خیال آیا۔ جس کیلئے نہ بستر تھا نہ لحاف۔ سردی کا یہ تقاضا تھا کہ کئی موٹے موٹے لحاف ہوں جن کے اندر دو جسم پڑے ہوئے ایک دوسرے کو حرارت پہنچا رہے ہوں۔

"تم کہاں سوؤگی؟" میں نے مسکراتے ہوئے لڑکی سے دریافت کیا۔

"یہاں آپ فرمائیں"۔

"میرے بستر میں سو جاؤ"۔ میں نے سادگی سے کہا۔ "میرا مقصد یہ ہے کہ تم میرے بستر میں لحاف اوڑھ کر سو جاؤ۔ میری فکر نہ کرو میں گرم کپڑے بھی پہنے ہوا ہوں۔ اور اوور کوٹ لاد لوں گا"۔

"نہیں۔ آپ میری وجہ سے تکلیف نہ پائیے۔ آپ سو جائیے میں تو ہفتہ بھر سے اس سخت زندگی کی عادی ہو گئی ہوں"۔

"بجا فرمایا۔ مگر سردی لگ گئی تو اکڑ جاؤگی"۔

"پھر کیا کریں؟"

"یہی میں سوچ رہا ہوں"۔

"میں سچ کہتی ہوں آپ لحاف اوڑھ لیجئے"۔

"اور تم؟"

"مجھے اپنا اوور کوٹ دیدیجئے"۔

ہم دونوں سردی سے ٹھٹھرے ہوئے لحاف سے باہر بیٹھے ہوئے باتیں کئے جا رہے تھے

لیکن اس کو اوڑھ کوئی نہیں رہا تھا۔

"اچھا تم رضائی اوڑھو تو سہی میں بھی اوڑھ لونگا۔" آخر میں نے اس پر لحاف ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ واقعی سکڑی جا رہی تھی۔

"اچھا میں ترکیب بتاتی ہوں۔ اسکو چوڑائی میں اوڑھ لیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ اپنے کو نہ ڈھانکیں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" غرض یہی کیا گیا۔ بستر کی مختصر سی وسعت جسکو صرف ایک ہی انسان کے سونے کیلئے کشادگی بخشی گئی تھی۔ آج دو انسانوں کو لئے تنگی سی محسوس کر رہا تھا ہاں لحاف نے اپنی چوڑائی میں سے اجازت دے دی تھی کہ ہم اس کی فراخدلی سے فائدہ اٹھائیں۔ نومبر کی سرد رات، بارش کا سماں، سنسان جنگل، پھر میرا کلی اقتدار اس کے ساتھ ٹورچ کی روشنی کی صبیح شعاع، حسین چہرے کا قرب، سانس کی روانی سے سینہ کا فتنہ بر ساماں اتار چڑھاؤ۔ مجھے کہاں نیند تھی۔ لیکن آخر نیند آ ہی گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو ٹورچ کی بیٹری اپنی زندگی ختم کر چکی تھی۔ اس کوٹھڑی میں اب بھی اندھیرا تھا لیکن باہر پو پھٹنے کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ لحاف اب بجائے چوڑائی کے ہم کو لمبائی کی طرف سے ڈھانکے ہوئے تھا۔ تو تنگ جس کی وسعت دو جسموں کی وجہ سے تنگی کا اظہار کر چکی تھی۔ اب کافی سے زیادہ وسیع نظر آ رہی تھی کیونکہ دونوں جسموں میں اب بُعد باقی نہ رہا تھا۔ نامعلوم کب اور خدا جانے کیسے ہمارے جسم ایکدوسرے سے بہت متصل ہو گئے تھے۔ بہت ہی متصل اور لحاف میں سے حرارت کے بھبکے نکل رہے تھے۔

صبح ہم نے اس لڑکی کو جو بڑے گھرانے کی تھی باعزت و باہتمام اس کے ورثہ کے سپرد کر دی گئی۔ اور میں پھر اپنی کار کو سنبھال کر اپنی منزل بے مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔

میری کار سفر کئے جا رہی ہے اور میں ہر قسم کے مقامات سے طے کرتا ہوا نامعلوم کہاں چلا جا رہا ہوں۔ یونہی سب کی عمر گذر رہی ہے۔ کسی کی کار میں کسی کی بیل گاڑی میں، کسی کی خار دار راستہ پر پیدل۔ اور یونہی بہت سے حسن سے ہم آغوش ہو کر زندگی تمام کر رہے ہیں۔ بہت سے کلاہت کے گردھوں میں پڑے ہوئے دن کاٹ رہے ہیں اور بہت سے موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہو کر ایام گذار رہے تھے۔

فریدہ کے نام (بقیہ صفحہ ۱۶)

عیاریاں ہیں اپنی من مانی کیلئے۔ میرے سامنے محبت کی بس اتنی ہی قیمت ہے خاور کہ محبت ایک جنون ہے۔ جب سوار ہو گیا ہو گیا اور جب اتر گیا تو سب رنگینیاں تلخیوں میں بدل کر رہ گئیں۔ ہاں تو میں کہنا کیا چاہتی تھی کہ محبت کا مفہوم مرد کیلئے فقط اتنا ہی ہے کہ جب تک وہ محبت کرتا جائے محبت ہے اور جب وہ چھوڑ دے تو بس! اور محبت بھی کیسی کہ اس کی لونڈی اور غلام ہو کر رہے۔ چاہے زبانی دعوے یہ ہی کیوں نہ ہو کہ محبت ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ پیارے خاور! یہ بیقراریاں۔ یہ آہیں اور کراہیں میں نہیں سمجھتی کس مطلب و مقصد کیلئے ہیں کیا ان کا انجام تم شادی کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا اسلئے مجھ سے محبت کا اظہار کر رہے ہو کہ میں تمہاری ہو کر رہ جاؤں؟ تمہارا یقیناً یہ ہی خیال ہوگا۔ مگر افسوس کہ میرا اس خیال سے ہرگز متفق نہیں میرے خیال میں محبت کا دعویٰ کرنا اور اس پہ شادی کا غلاف چڑھانا ٹاٹ پر مخمل لگانے سے مترادف ہے محبت تو وہ ہونی چاہئے جو خانگی امور سے کیسر پاک ہو اور زبان سے نہیں بلکہ دل سے ہو۔ زیادہ کیا لکھوں مجھے وہی خیال کرو جو تم ہو۔ تم نے رباب کو چھیڑا تو تاریں بج نکلیں مگر ایک فرق ضرور کر لیں وہ یہ کہ سہ

مجھ کو یہ دُھن کہ رہِ عشق کبھی ختم نہ ہو
تجھ کو یہ کد کہ ہو افسانۂ دل کی تکمیل

تمہاری محبت کی قائل ہوں مگر تمہاری لاابالی طبیعت کی قائل نہیں کیونکہ تم بھی آخر وہی ہو جن کا میں شکوہ کر چکی ہوں۔ میری دلی تمنا ہے تو یہ کہ تم مجھے یاد کر لیا کرو اور میں تمہیں یاد کر لیا کروں گی اور اس سے بڑھ کے چاہو بھی کیا کہ ع

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

تمہاری فریدہ

طوائف کی بیٹی (بقیہ صفحہ ۴۸)

اختیار کرتی؟ میں اسی ذلت و پستی کی زندگی سے بچنے کیلئے تمہارے پاس پناہ لینے آئی ہوں۔

اب سروجنی باہر کھڑی نہ رہ سکی۔ وہ جیوتسنا کے سامنے جا کر بولی۔ بہن! مجھے تم سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ تمہارے آنے سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔

جیوتسنا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"بھابی یہی ہیں جن کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔" جیتندر نے کہا۔

سروجنی نے جیوتسنا کو گلے سے لگانے کیلئے اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ جیوتسنا پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔ بہن! میں طوائف کی بیٹی ہوں۔

سروجنی نے بڑھ کر اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ تم جس کی بھی بیٹی ہو بہن۔ لیکن میں نے تمہاری کل باتیں سنی ہیں، تم خود تو دیوی ہو۔

سروجنی سے عنوان کے پاس ... انہوں نے ... اخلاق اور وقار ... اس کی خودداری اور عصمت کی ... ضرور ... شادی کر لی

جیوتسنا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو

مُجھے معلُوم نہ تھا!

از جناب امید رضوی بریلوی

درد ہی درد ہے الفت مجھے معلوم نہ تھا
یہ بھی ہے ایک قیامت مجھے معلوم نہ تھا

زندگی گذرے گی یوں موت سی بدتر اپنی
جینے دے گی نہ محبت مجھے معلوم نہ تھا

چھوٹ کر مجھ سے ملیگا نہ کوئی پھر مجھ سے
مستقل ہے یہ مصیبت مجھے معلوم نہ تھا

دل پہ جو گذرے گی وہ لا سکونگا لب تک
آہ بھی ہوگی شکایت مجھے معلوم نہ تھا

وہ نگاہیں جنہیں سمجھا تھا وفا کا پیکر
اُن میں ہوگی نہ مروّت مجھے معلوم نہ تھا

کیا خبر تھی یہی تمہید تباہی ہوگا
تیرا اندازِ مروّت مجھے معلوم نہ تھا

یوں بدل جائینگی وہ پیار کی نظریں مجھ سے
دشمنی ہوگی عنایت مجھے معلوم نہ تھا

اُن سے ملنے کا نتیجہ غمِ فرقت ہوگا
ہوگی راحت بھی اذیت مجھے معلوم نہ تھا

عمر بھر خون رلائیگی مجھے فرقت میں
یہ تری چشمِ عنایت مجھے معلوم نہ تھا

یاد اور وہ بھی تری تاروں بھری راتوں میں
کتنی جانسوز ہے فرقت مجھے معلوم نہ تھا

عید تھیں میرے لئے اُنکی ملاقاتیں بھی
اِن کا انجام ہے فرقت مجھے معلوم نہ تھا

التفات اُن کا مرے حق میں مصیبت ہوگا
ہے یہ منظورِ مشیت مجھے معلوم نہ تھا

غمِ الفت میں غمِ رشک بھی سہنا ہوگا
ہوگی اک یہ بھی مصیبت مجھے معلوم نہ تھا

اُن سے کر دیگی جدا مجھ کو بنا کر اُن کا
اتنی بیدرد ہے قسمت مجھے معلوم نہ تھا

تو بھی پھر جائیگی مجھ سے مری قسمت کی طرح
"دشمنِ عہد محبت" مجھے معلوم نہ تھا!

مزاحیہ افسانہ

ہمارا پہلا عشق

از جناب خان صاحب [illegible] [illegible]

ایک مدت سے یہ ارمان تھا۔ ارمان کیا اب ۴۵ سال گزرنے کے بعد زندگی کا مقصد ہی یہ رہ گیا تھا کہ کوئی ہم پر بھی عاشق ہو، گو دوسرے پر فوراً عاشق ہو جانا تو نہایت سہل ہے یا چلتے پھرتے کا سودا ہے مگر اپنے اوپر کسی کو عاشق کرنا کارے دارد ہے۔ یہ تمنا حدودِ طفلی سے نکل کر جوانی اور بڑھاپے کے درمیانی راستہ میں اب تک ٹھوکریں کھا رہی تھی مگر کوئی اللہ کی بندی ایسی نہیں ملی جو بیک نظر نہ سہی، رفتہ رفتہ ہی ہم پر التفات کرتی۔ آپ کہیں یہ سوال کریں کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں یا خوبصورت نہ ہونگے تو حضرت آخر کبھی تو ہم جوان تھے اور اب بھی دیکھنے دکھانے کے قابل ہیں۔ بس ذرا ارمانوں کی پیہم موت نے چہرا لمبا اور شکن آلود کر دیا ہے۔ کچھ چیچک کے داغ سے ہیں۔ آنکھیں نہ زیادہ بڑی اور نہ کوڑیوں سے چھوٹی۔ ہونٹ البتہ ذرا موٹے ہیں۔ قد بھی زیادہ پست نہیں ہے کوئی ۶½ فٹ۔ ہاں ذرا کالے ضرور ہیں۔ اب آپ ہی خدا لگتی کہئے کہ ہم میں کوئی سقم ہے۔ واللہ نہیں۔ یہی آپ بھی کہیں گے تو حضرت ہم بھی یہی تمنا لئے ہوئے اپنی نوکری سے ریٹائر ہوئے اور اپنے شہر میں آکر اپنے خاندانی مکان کو درست کرانا شروع کیا اور خود اپنے نوکر سمیت باہر بیٹھک میں اٹھ آئے پرانے احباب نے بھی یہی رائے دی کہ پہلے مکان ذرا ٹھیک کروا لو۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے ہاں اعزا و اقربا نہیں ہیں تو نہ سہی ہم کس دن کے لئے ہیں جب یہ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا تو خانہ آبادی کی بھی فکر کرینگے۔ واقعی رائے صائب تھی لہٰذا کام شروع کر دیا گیا۔

ایک رات کو خوب بارش ہوئی۔ صبح مزدور ذرا دیر سے آئی۔ ہم بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے کہ سب سے پہلے ایک بڑھیا اور ایک جوان لڑکی مکان میں داخل ہوئیں۔ بڑھیا تو اپنا ہتھوڑا لے کر پتھر توڑنے بیٹھ گئی اور لڑکی نے وہ چونا جو کل ہی پسا تھا اور بارش سے کچھ بہہ چلا تھا ٹھیک کرنے کی غرض سے پھاوڑا لیکر اس پر پل پڑی۔ لڑکی قدرے سیاہ ضرور تھی یعنی کالی مگر اللہ اکبر جیسے کالی گھٹاؤں میں بجلیاں بھری ہوں۔ اسی طرح اس کے رنگ پر شباب تجلیاں برسا رہا تھا۔ ہم نے غور سے دیکھا عینک جو اتار دی تھی پھر لگائی اور اس کے حسن جہاں تاب کی سیر کرنے لگے۔ آخر ایکبار زور سے کھانسے۔ اس نے ہم کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ ہم نے اخبار ایک طرف پھینک دیا اور اس کھیل نہیں بلکہ حقیقت کو دیکھنے لگے وہ گا ہے گا ہے ہمکو دیکھتی اور مسکراتی جاتی تھی ہم نے میز پر سے جاکر سگرٹ ٹین میں سے سگرٹ لے کر سلگایا۔ اور پھر آکر وہیں بیٹھ گئے اتنے میں اس نے پھاوڑا رکھ دیا تھا۔ اور ہماری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی اسکی نگاہوں میں عشق اور حسرت بیک وقت کروٹیں لے رہے تھے۔ اب ہم کو ایک نیا خیال پیدا ہوا کیا واقعی یہ ہم پر مرنے کی کوشش تو نہیں کر رہی۔ سچ مچ یہ کہیں عاشق تو نہیں ہونا چاہتی۔ لیک کر ہم نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی وہ کمبخت روز جیسی ہی بہار آفریں تھی۔ کنگھی سے ذرا بال سنوارے اور سونے پر سہاگہ کر کے پھر آ بیٹھے۔ وہ اب تک ہماری خالی نشستگاہ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے پر شرم کی ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی۔ اپنے خیال کو مضبوط کرنے کیلئے ہم نے اپنے پیر کا انگوٹھا زور سے پکڑ کر خواہ مخواہ آہستہ سے چلائے۔ اوہ، اُفوہ، اونہہ، اونہہ، وہ ایک لمحہ تو دیکھتی اور سنتی رہی پھر یکبارگی وہاں سے تڑپ کر ہمارے کمرے میں۔ کیا ہوا۔ کیا ہوا بابوجی؟ اس نے ہانپتے ہوئے گھبرا گھبرا کر کہا اور اپنے ہاتھوں سے پیر کا انگوٹھا آہستہ آہستہ دبانے لگی۔ تجربہ کامیاب ہو چکا تھا خیال یقین کی صورت میں ڈھل گیا تھا۔ ہم نے مسکراتے ہوئے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھا اور کہا۔ کچھ نہیں، کچھ نہیں، فکر نہ کرو یہ درد کبھی کبھی ہو جاتا ہے اس نے روپیہ لیا اور جھک کر سلام کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے پھولوں کی ڈالی ہوا سے لچک جاتی ہے اور کنکھیوں سے دیکھتی مسکراتی ہوئی پھر اپنے پھاوڑے کدال کے پاس جا پہونچی۔ اب ہم نہایت خوش تھے اور از حد مسرور۔ مگر وہ خوشی ہی کیا جو چند ثانیے مستقل

رہ جائے۔ ہمارے ایک دوست جو بہت بے تکلف اور مخلص تھے آن دھمکے اور بولے چلو ذرا کام ہے۔ ارے یار بیٹھے ہوئے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ ہاں منہ دھولو۔ تم بھی کیا بے ہنگم صورت بنائے رہتے ہو۔ ایک تو پہلے ہی اللہ کا جی ہوا اور پھر —— یہ کہکر ایک قہقہہ لگایا ہم خون کا سا گھونٹ پیکر خاموش ہوگئے۔ اگر بتانے کی بات ہوتی تو ابھی اپنی خوبصورتی کے زخم خوردہ کو دکھا دیتے مگر مصلحت سے خاموش ہو گئے اور تیار ہو کر ان کے ہمراہ چلدیئے۔

ابھی کمرے میں قدم باہر رکھا تھا کہ وہ خاموش نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بتا رہا تھا کہ وہ ہمارا اس طرح چلا جانا برا سمجھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں التجا تھی کہ نہ جاؤ کچھ دیر اور دیدار کر لینے دو۔ ابھی دل تو ہمارا بھرا ہی نہیں۔ ہمارے دل میں ناز حسن انگڑائیاں لینے لگا اور ہم سفاکانہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی تمنائیں اور اس کے ارمان کچلتے ہوئے چلے گئے۔

یہ بے حس دوست اصل میں ہم کو ایک گواہی کے سلسلے میں کچہری لے گئے تھے۔ اب ان سے لاکھ لاکھ پیچھا چھڑانا چاہا مگر توبہ کیجئے اگر جنبد از میں جنبد نہ جنبد گل محمد خاں والا معاملہ تھا حتیٰ کہ کھانا بھی ایک ہوٹل میں کھایا اور بہزار دشواری ۳ بجے کہیں خلاصی ہوئی جلدی سے تانگے میں بیٹھ کر بھاگے۔ راستہ بھر عجب الجھن رہی۔ ہائے نہ جانے اس غریب پر کیا گزری ہوگی۔ ہم نے ایک معصوم دوشیزہ کا دل دکھایا ہے اور یہ ایک عظیم گناہ کیا ہے۔ وہ وفا کی پتلی کس طرح ہم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اسی ادھیڑبن میں مکان پر آپہونچے ہمارے کمرے کے سامنے وہ اب نہیں تھی۔ نہ معلوم ظالم مستری نے اسکو کہاں کام پر لگایا ہو۔ ہوں توں کر کے وقت کاٹا۔ شام ہو چکی تھی ادھر ہم غسل کرنے لگے اور ادھر مزدوروں کو چھٹی ہوگئی۔

اب ہر روز وہ ہم سے ملتی تھی مگر سہمی ہوئی۔ ہمارا بہت ادب کرتی تھی۔ ہم روز کسی نہ کسی بہانے سے اس کو ایک روپیہ ضرور دیدیتے تھے ہم روز محسوس کرتے تھے کہ وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر نہ معلوم کیوں نہیں کہہ دیتی تھی۔ وہ منہ کھول کر رہ جاتی تھی اور ادھر ادھر رہ جاتی تھی۔ ادھر ہم بھی روز رات کو کریم اور ابٹن مل کر سوتے تھے۔ صبح ہی مانگ نکال کر آبیٹھتے تھے۔ اب حقیقت تو یہ تھی کہ ہم اپنی نظروں میں بھی خوبصورت معلوم ہوتے تھے اور روز بروز شکل نکھرتی ہی جاتی تھی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ وہ کیوں پہلو دبائے ادھر ادھر نہ پھرتی۔

ایکدن رات کو نو بجے ہونگے۔ ابھی ابھی کلو کہار (ایک نوجوان لڑکا تھا اور یہاں کی کمیٹی میں پانی بھرتا تھا کبھی کبھی پیر دبوانے کیلئے اس کو بلوا لیتے تھے) ہاتھ پیر دبا کر گیا تھا کہ چک ہلی اور ایک مہین آواز آئی بابوجی۔ ہم چونک پڑے ارے یہ تو اسی کی آواز ہے مگر وہ اس وقت رات کو یہاں کہاں؟ شاید وہ —— نہیں وہ نہیں ہو سکتی۔ کلیجے میں پنکھے لگے ہوئے تھے دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اتنے میں چک لٹکا کر کوئی اندر جھانکا اور یکبارگی اندر آ گیا۔ اور یہ وہی تھی۔

ہم۔ ہائیں۔ تم اسوقت یہاں کہاں؟

اس نے ایک کہی اور نہ دو سنیں۔ دہم سے ہمارے قدموں میں گری اور زور زور سے رونے لگی۔

ہم۔ ارے ارے کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔ ارے خدا کے واسطے آہستہ آہستہ روؤ۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا۔ مگر سخت پریشان تھی۔ حلق سوکھ گیا تھا اور وفور اضطراب سے پسینے آگئے تھے۔ یا اللہ! یہ کیا ہوا۔ وہ بدستور ہاتھ جوڑے ہوئے تھی اور کانپ رہی تھی اس نے کہا۔ بابو —— جی —— ہم نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ تم روتی کیوں ہو۔ بات کیا ہے؟ اس نے اسی طرح روتے ہوئے کہا آپ کلو کہار کو تو جانتے ہی ہیں۔ جوش غضب سے ہمارا سیاہ چہرہ سرخ ہوگیا اور ہم معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے۔

ہم۔ ہاں ہاں ہم اسے جانتے ہیں۔ آخر ہوا کیا؟

وہ۔ سرکار آپ میرے پتا کے برابر ہیں آپ پتا سماں ہیں۔ کمرہ لڑکی چھت میز کرسیاں سب یکے بعد دیگرے ہماری آنکھوں میں ناچتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ پتا کے برابر۔ پتا سمان۔ کوئی سر پر ہتھوڑے مار رہا تھا مگر وہ برابر کہہ رہی تھی۔ بابوجی۔ پرسوں میری اس سے شادی ہوگی۔ ہم غریب ہیں۔ کوئی بندوبست اب تک نہ ہو سکا۔ سرکار میں اور میری بڑھیا ماں حضور کو عمر بھر دعائیں دینگے۔ آپ دیالو ہیں کرپا کیجئے۔ کچھ مدد کر دیجئے۔ آپ اب تک روز مجھے ایک روپیہ دیتے تھے۔ سرکار اسی وجہ سے میں سرکار کے قدموں میں آن پڑی ہوں۔

اور نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی۔ مگر ہمارے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں۔ پتا، پتا، کی آواز کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ پسینے آرہے تھے۔ اور ہماری شکل اور بھی ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ لڑکی یہ حالت دیکھ کر ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھی اور اسٹک سسکیاں لے رہی تھی۔

ایک نہایت رنگین اور دلکش سبق آموز افسانہ

طوائف کی بیٹی

از جناب محمد قمر الدین رامنگری

"بہت پی چکے جیتندر، اب بس کرو"
کمل نے جیتندر کے ہاتھ سے پیگ لیتے ہوئے کہا

"ابھی تو پینے دو کمل، کوئی ایک مہینے سے دماغ کا عجیب حال ہو رہا ہے۔ کوئی اچھا آئیڈیا (Idea) دماغ میں آتا ہی نہیں"

"اچھا آئیڈیا شراب پینے سے دماغ میں آتا ہے"

"پھر کیا کروں؟"

"مناظر قدرت کی سیر کرو، یا پھر کلکتے کی گلیوں میں چل پھر کر دست قدرت کی صنعت گری کے انسانی نمونے دیکھو"

"کلکتے کا کون سا گوشہ میری حسن جو نظروں سے بچ گیا ہے؟" جیتندر نے اپنی مخمور آنکھوں کو اوپر اٹھا کر کہا۔

"میرے ساتھ چلو تو میں دکھاؤں کہ کلکتے میں حسن و جمال اور ناز و انداز کے کیسے کیسے پیکر موجود ہیں"

"اوشا سے بھی بڑھ کر؟" — جیتندر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔

"ہاں ہاں، اوشا سے بھی بڑھ کر"

"تو بلواؤ اسے"

"وہ ایسی نہیں ہے کہ در بدر ماری ماری پھرے"

"کیا کوئی ملکہ ہے؟"

"ملکہ نہیں تو ملکۂ حسن و شباب ضرور ہے"

"بس رہنے بھی دو"

"میں سچ کہتا ہوں چاند کی طرح حسین اور دلفریب صورت، آنکھیں شراب کے چھلکتے ہوئے دو ساغر، ہونٹ گلاب کی نیم شگفتہ کلی، بال ساون کی کالی گھنگھور گھٹا، بدن جوہی کی بیل کی طرح نازک، گانا بہار کی پیغام بر بلبل ہزار داستان سے زیادہ سامعہ نواز، ناچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان رقص کر رہے ہیں ......"

جیتندر گھبرا کر اور درمیان ہی میں بول اٹھا تم نے تو شاعروں کو بھی مات کر دیا۔ مبالغے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

"مبالغہ نہیں جیتندر! دیکھو گے تو کہو گے"

"اچھا تو چلو کیسے چلو گے؟"

"اپنی کار سے!"

"تو نکالو کار"

کار نکلی اور دونوں اس پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

~~~~~~~~

پرانی وضع کے ایک شاندار مکان کے سامنے کار رکی۔

جیتندر نے پوچھا۔ یہی مکان ہے؟

کمل بولا۔ اوپر دیکھو۔

کھڑکی پر ماہ چہاردہم مسکرا رہا تھا۔

کمل جیتندر کو لئے ہوئے جیسے ہی اوپر کے آراستہ و پیراستہ کمرے میں داخل ہوا، ایک ناز آفریں آواز سنائی دی "کمل بابو! اب آ رہے ہیں آپ، اسی طرح وائلین سکھائیے گا؟"

یہ ایک ماہ وش اور پری پیکر دوشیزہ کی آواز تھی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن کمل کے پیچھے جیتندر کو دیکھ کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

۳۴ - ۳۵ برس کی ایک حسین عورت نے کوچ سے اٹھ کر خیر مقدم کرتے ہوئے کہا "آئیے کمل بابو! نمسکار"

"نمسکار، آپ میرے دوست پرنس جیتندر کمار کلکتہ کے مشہور آرٹسٹ ہیں۔ اور آپ محترمہ نہار بالا بنگال کی نامور رقاصہ" کمل نے دونوں کا تعارف کرایا۔

جیتندر نے حسینہ سے ہاتھ ملایا۔

"کیسی بے تمیز لڑکی ہے۔ نمسکار کرو پرنس کو" نہار بالا نے دوشیزہ کو جھڑکتے ہوئے کہا۔

وفور حیا سے دوشیزہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے ہی کھڑے حسین اور نازک ہاتھ جوڑ دیئے۔

نہار بالا نے دوشیزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ یہ میری لڑکی ہے جیوتسنا، اس سال سکنڈ ایر میں بیٹھی ہے۔

"خوب!" ایک طوائف کی بیٹی کے متعلق یہ سن کر کہ سکنڈ ایر میں پڑھ رہی ہے جیتندر کو تعجب ہوا۔

"بس اب بہت شرما چکیں۔ پرنس جیتندر کو ایک گیت تو سناؤ، میں نے ان سے تمہاری بہت تعریف کی ہے" کمل نے جیوتسنا سے کہا۔

"آپ یوں ہی خواہ مخواہ ہر شخص سے میری تعریف کر دیا کرتے ہیں" جیوتسنا، انگلیوں میں انگلیاں پروتے ہوئے بولی۔

"بھئی دیکھو، اگر انہیں گانا سنا دو گی تو اس
~~~~~~~~

میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ یہ تمہیں تصویر بنانا اور وائیولین بجانا سکھا دینگے۔"

"تو کیا یہ پینٹر وائیولین بجانا جانتے ہیں؟" جیوتسنا نے پیانو کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم نے ان کو سمجھا کیا ہے؟"

"میں جانتی نہیں اسلئے پوچھ رہی ہوں۔"

"ارے یہ بنگال پروڈکشن میں میوزک ڈائرکٹر رہ چکے ہیں۔"

"اچھا تو کون سا گیت گاؤں؟"

"جو تمہارا جی چاہے۔"

"جو آپ کہئیے۔"

"بس یہ تمہاری خوشی پر منحصر ہے۔"

"آپ کہتے کیوں نہیں؟"

"اچھا جتیندر بابو سے پوچھ لو۔"

جیوتسنا نے بڑی بڑی سحر طراز آنکھوں سے جتیندر کی طرف دیکھا جتیندر اشتیاق آمیز نظروں سے جیوتسنا کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوگئیں۔ جیوتسنا نے شرم سے نگاہیں نیچی کرلیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ تم اپنے پسند کی کوئی چیز گاؤ"۔۔۔ جتیندر نے کہا۔

جیوتسنا نغمہ بکھیرنے لگی۔ کمل آنکھیں بند کرکے جھومنے لگا جتیندر پر بھی ایک بے خودی سی طاری ہوگئی۔ اور اس کی نظریں بے محابا جیوتسنا کے حسین و دلفریب چہرے پر جم گئیں۔ نہار بالا غرور آمیز نظروں سے کبھی جتیندر اور کمل کی طرف دیکھتی اور کبھی جیوتسنا کی طرف۔ جیوتسنا پر بھی ایک خود فراموشی سی طاری ہو رہی تھی۔ اس کے سر کا آنچل کھسک کر شانے پر آگیا تھا اور اس کے سر کے گھنگرالے بال ایک عجیب دلفریب انداز سے اس کی پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ اس کے بالوں میں لگے ہوئے سنگھار کے تیل کی خوشبو جتیندر کے دماغ میں کیف و نشاط کی اور بھی افزونی کر رہی تھی۔

جب سے جتیندر جیوتسنا سے ملا تھا۔ وہ فن کار کی بجائے حسن کا پرستار بن گیا تھا۔ نگار خانے کے کھولنے تک کی نوبت نہ آتی تھی۔ اس کی تصویر "رقاصہ" جو نامکمل رہ گئی تھی۔ اسی طرح نامکمل پڑی تھی۔ جیوتسنا کو مصوری اور وائیولین سکھلانے کے بہانے جتیندر اپنا بیشتر وقت اسی کے ہاں صرف کرتا تھا۔ جیوتسنا بھی جتیندر کے حسن شباب اور اس کے فنون لطیفہ کی دلدادہ و شیدا تھی۔

چاند آسمان سے چاندی کی بارش کر رہا تھا نہایت سرور افزا اور پُر کیف رات تھی۔ نہار بالا کہیں مجرا کرنے گئی تھی۔ گھر میں جتیندر اور جیوتسنا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ دونوں مکان کے پیچھے والے حوض پر بیٹھے تھے۔ مولسری اور اشوک کی شاخوں کے درمیان سے چاندنی چھن چھن کر جیوتسنا پر پڑنے لگی۔ اسے دیکھ کر جتیندر کو ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کسی ۔۔۔ ماہر فن اور چابکدست صناع کی بنائی ہوئی سنگ مرمر کی مورت ہو۔ ساتھ ہی باغ کے پھولوں کی خوشبو سے بسا ہوا ہوا کا ایک جھونکا آیا اور جتیندر کے دل میں ایک طرح کا سرور و نشاط پیدا کرگیا۔

جتیندر کھویا ہوا سا بولا۔ "جیوتسنا!"

جیوتسنا نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بڑی بڑی سحر آگیں اور مخمور آنکھوں کو اوپر اٹھاکر جتیندر کی طرف دیکھنے لگی۔ جتیندر کو ایسا معلوم ہوا جیوتسنا کی آنکھیں اسے محبت کا پیام دے رہی ہیں۔ وہ جیوتسنا کی سیمیں ہتھیلی کو اپنے ہاتھ میں لے کر والہانہ انداز میں بول اٹھا۔ "جیوتسنا!"

جتیندر کا یہ پرشوق طرز خطاب جیوتسنا کی آنکھوں کے پیام محبت کا جواب تھا۔

"کیا ہے جتیندر؟" جیوتسنا بولی۔

"تم بڑی حسین ہو!"

"بھلا کتنی؟"

"اس چاند سے بھی زیادہ۔"

"واقعی؟"

"سچ کہتا ہوں۔" جتیندر نے جیوتسنا کو دونوں بازوؤں میں لے لیا۔

"ارے چھوڑو، یہ کیا کر رہے ہو؟ کوئی دیکھ لے تو۔۔۔۔۔" جیوتسنا اپنے کو جتیندر کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"میں تمہیں لافانی بنا دینا چاہتا ہوں جیوتسنا!"

"وہ کیسے؟" جیوتسنا نے جتیندر کی طرف فسوں زدہ سی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری تصویر بنا کر۔"

"سچ؟"

"ہاں لیکن ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں تمہیں بالکل اصلی اور قدرتی صورت میں پیش کرونگا۔"

"اس کے معنی؟"

"اس کے معنی یہ کہ تمہاری برہنہ تصویر بناؤنگا اس کے بغیر تمہارے قدرتی حسن کا اظہار ناممکن ہے۔"

"تو مجھے تمہارے سامنے برہنہ ہونا پڑیگا۔"

جیوتسنا نے شرم سے اپنا منہ چھپا لیا۔

"اگر تم اس کیلئے رضامند ہوجاؤ تو دس ہزار روپے یکمشت دونگا اور ماہانہ اس کے علاوہ تمہیں عصمت فروشی کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔"

"تم نسوانی شرم و حیا اور غیرت و حمیت کو چاندی کے ٹکڑوں کے عوض خریدنا چاہتے ہو جتیندر؟"

"تو کیا یہ نسوانی شرم و حیا ایک بازاری جنس کی طرح چاندی کے ٹکڑوں کے عوض فروخت نہ ہوگی؟" جتیندر نے طنز آمیز تعجب کے ساتھ سوال کیا۔

"کم سے کم تم کو تو میں نے اس سے بلند سمجھا تھا جتیندر!"

"ہاں تمام دنیا کے سامنے برہنہ ہونا اور عفت و آبرو فروخت کرنا بے شرمی اور بے حیائی نہیں اگر بے غیرتی اور بے حمیتی ہے تو ایک آرٹسٹ کے سامنے برہنہ ہونے میں، کیوں؟"

"میں دنیا کی بات نہیں کہتی۔ ایک عورت کا دنیا کے ہاتھ عصمت فروشی کرنا کیسا ہے؟ اسے میں سمجھتی ہوں۔ لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک سچے آرٹسٹ کو دنیا سے کیا نسبت؟ آرٹسٹ کو تو نفسانی تحریصات و تحریکات سے پاک ہونا چاہیئے۔"

"اچھا تو گڈ نائٹ جیوتسنا۔ تمہیں اپنے متعلق فیصلہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اب تم مجھے اپنے ہاں کبھی نہ دیکھو گی۔" یہ کہہ کر جتیندر چلا گیا۔ جیوتسنا نے بھی اسے نہیں روکا۔

جب پھول کھلتا ہے اور اس کی خوشبو پھیلتی ہے تو بھونرے اس کا رس چوسنے کے لئے اس کے گرد چکر لگانے لگتے ہیں۔ جیوتسنا بھی ایک اچھوتا پھول تھی۔ اس کے بھی بھونرے تھے۔ شہر کے عیش پرست امرا، اس کے مکان کا طواف کرنے لگے۔ محبت اور دلدادگی کا اظہار ہونے لگا۔ تحفے اور ہدیے بھیجے جانے لگے۔ لیکن جیوتسنا کسی سے دل کھول کر بات چیت تک نہ کرتی۔ وہ اداس اداس ہی رہتی تھی۔

وہ باغ سے دل بہلانے کی ناکام کوشش کر کے اپنے کمرے میں واپس آرہی تھی کہ اس نے سنا، اس کی ماں اپنے کمرے میں کسی سے باتیں کر رہی ہے وہ پردے کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ کلکتے کے مشہور رئیس ہزہنس رائے سے باتیں ہو رہی تھیں۔

ہزہنس نے پوچھا۔ جیوتسنا کی نتھ کب اترواؤ گی بائی جی؟"

نہار بالا — "جب آپ کی نگاہ ہو جائے۔"

"تو مجھ سے جب چاہو پانچ ہزار لے لو۔"

"جیوتسنا کی نتھ اور پانچ ہزار میں سیٹھ جی؟ آپ کی زبان سے ایسی خفیف بات زیب نہیں دیتی۔ پانچ ہزار تو ہزاری مل اور سات ہزار کالی بابو دے رہے ہیں اور سفارش کر رہے ہیں۔"

"تو میں دس ہزار دینے کو تیار ہوں۔ وہ کیا ٹھہرینگے میرے مقابلے میں، پھر میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔"

"فرمایئے!"

"ان گدھوں کو میری کیا خبر؟ تم ان دونوں سے بھی جو وہ دے رہے ہیں، اینٹھ لینا، سمجھ گئیں۔"

"نہیں سیٹھ جی۔ اس کے لئے میری ہمت پڑتی اگر ان کو پتہ چل گیا تو میں کہیں نہ رہ جاؤنگی۔"

"اچھا تو میرا طے رہا نہ؟"

"آپ ہمارے قدیم کرمفرما ہیں۔ آپ کی بات ماننی ہی پڑے گی۔"

"تو کل کی رات!"

"نہیں سیٹھ جی۔ آپ تو جانتے ہیں لڑکی بالکل بھولی بھالی اور نادان ہے۔ ذرا اسے سمجھانے بجھانے کی ضرورت ہو گی نہ؟"

"تو کب تک؟"

"اماوس تک"

"تین روز درمیان میں اور ہیں!"

"جی ہاں!"

"بہتر ہے، کچھ مضائقہ نہیں، جہاں اتنے دنوں انتظار کیا ہے۔ تین روز اور سہی۔"

"آپ کی عنایت"

"تو اب جاؤں گا۔"

جیوتسنا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے حواس قابو میں نہ تھے۔ وہ قدم رکھتی تھی کہیں اور پڑتے تھے کہیں۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی جاکر پلنگ پر گر پڑی۔ اس کے کانوں میں ہزہنس اور اپنی ماں کی باتیں گونج رہی تھیں وہ اماوس کی رات اور ہزہنس کی بھونڈی بھدی صورت کو یاد کر کے کانپ اٹھتی۔ وہ بار بار سوچتی۔ کیا چاندی کے چند بے حقیقت ٹکڑوں کے عوض وہ اپنی عفت و عصمت کی جنس بے بہا کو ہزہنس کے حوالے کر دیگی اور پھر اپنی ماں کی حسن و شباب کی دکان سجا کر بیٹھے گی اور ہزہنس کے ساتھ اپنی عفت و آبرو فروخت کیا کرے گی؟ نہیں وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ اور اس کی ماں نے جو اس کی عصمت اور جوانی کا سودا کیا ہے، اس کو اس کا کیا حق حاصل تھا؟ وہ خود چاہے جیسے زندگی گذارے۔ لیکن وہ اسے عصمت فروشی پر مجبور کرنے والی کون ہوتی ہے؟

جیوتسنا اسی طرح نہ جانے کب تک خیالات کے گرداب میں غوطے کھاتی رہتی کہ پیچھے سے اس کی ماں نے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھدیا۔

جیوتسنا اسی طرح غصے میں بھری، ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

ماں نے پوچھا۔ کیسی طبیعت ہے بیٹی؟

جیوتسنا اسی طرح دیکھتی رہی۔

نہار بالا پھر بولی۔ "کچھ بتا بھی۔"

"تم نے دس ہزار میں ہزہنس سے میری عصمت اور جوانی کا سودا کیا ہے؟" جیوتسنا نے برہمی کے ساتھ سوال کیا۔

"یہ تو ایک روز کرنا ہی تھا بیٹی! ہمارا پیشہ ہی یہی ہے۔" نہار بالا نے محبت سے جیوتسنا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"تمہارا ہو گا یہ پیشہ، لیکن میں تو دس لاکھ پر بھی تھوکتی ہوں۔ مجھے بھوکوں مرجانا پسند ہے لیکن یہ زندگی گوارا نہیں۔" جیوتسنا نے

جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"تو کیا تو اپنی طبیعت کی ہے کہ جو تیرا دل چاہے گا وہی کرو گی۔ مجھے کوئی عصمت فروشی پر مجبور نہیں کر سکتا۔"

"واہ رے تیرا دل! میں نے جو ہزاروں روپے خرچ کر کے تیری پرورش کی، کھلایا پہنایا تعلیم دلا رہی ہوں؟ میرا تجھ پر کچھ حق نہیں ہے؟"

"میں نے تم سے کب کہا تھا کہ تم مجھے کھلاؤ پہناؤ، تعلیم دلاؤ۔ میں جوان ہو کر تمہارے کہنے کے مطابق اپنی عفت و عصمت بیچتی پھروں گی؟"

"تو سکینڈ ائیر میں پڑھ رہی ہے نہ، تجھے بہت باتیں آگئی ہیں، اچھا میں دیکھوں گی تمہاری باتیں۔" نہار بالا بڑبڑاتی جیوتسنا کے کمرے سے نکل گئی۔

~~~~~~

آج جیتندر کو رہ رہ کر جیوتسنا یاد آ رہی تھی۔ اسکا دل بے اختیار جیوتسنا کے ہاں جانے اور اسے دیکھنے کو چاہتا تھا۔ لیکن وہ جاتا کیسے؟ وہ تو کہہ آیا تھا کہ اب وہ اسے اپنے ہاں کبھی نہ دیکھے گی، وہ اپنی آن کو تو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اور جذبات کی اذیت ناک کشاکش میں مبتلا تھا، اور اس کی یہ اندرونی حالت اس کے چہرے سے صاف نمایاں تھی۔

جیتندر ابھی کمسن تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی بھاوج سروجنی نے اسے پالا تھا۔ اسلئے وہ جیتندر سے بہت محبت کرتی تھی۔ جیتندر بھی اس سے بہت بے تکلف تھا۔

سروجنی نے جیتندر کو پریشان پریشان دیکھا تو پوچھا۔ آج تم پریشان سے کیوں نظر آرہے ہو جیتندر؟

"کوئی خاص بات تو نہیں ہے بھابی!" جیتندر نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"خاص بات نہ سہی، پھر بھی؟"

"بھیا سے نہ کہو تو بتاؤں۔"

"کیا تمہارا جی نہیں لگتا؟"

"ہاں ایسی ہی کوئی بات ہے۔"

"کیا کسی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے؟"

"ہاں بھابی!"

"اور وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے؟"

"میرا تو یہی خیال ہے۔"

"تم اس سے شادی کرنی چاہتے ہو؟"

"ہاں لیکن ...."

"لیکن کیا؟ کہو چپ کیوں ہو گئے؟"

"وہ ایک طوائف کی لڑکی ہے۔"

"نہیں محبت کرنے کیلئے طوائف ہی کی لڑکی ملی۔ آخر اس میں کونسی خوبیاں ہیں؟"

"اس ایک عیب کے سوا کہ وہ ایک طوائف کی لڑکی ہے اور سب خوبیاں ہی خوبیاں ہیں اس میں۔"

"کچھ میں بھی سنوں۔"

"خوبصورت تو ایسی ہے کہ ہزار میں ایک لڑکی بھی مشکل سے ویسی نکلے گی۔ سیکنڈ ائیر میں پڑھ رہی ہے اور ناچنا گانا تو اس کا پیشہ ہی ہے۔ اس کی غیرت و خودداری کا یہ حال ہے کہ میں اسے دس ہزار یکمشت اور ماہانہ تنخواہ دے رہا تھا کہ وہ اپنی برہنہ تصویر مجھے بنانے دے مگر اس نے منظور نہیں کیا ...."

ابھی جیتندر کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے بھائی دیوندر باہر سے آئے اور سروجنی اٹھکر چلی گئی۔

دیوندر نے پوچھا۔ کیا باتیں ہو رہی تھیں جیتندر؟

"تھی ایک بات۔"

"کیا مجھ سے کہنے کے لائق نہیں ہے۔ دیور بھاوج کے راز کی کوئی بات تھی؟" دیوندر مسکرا اٹھے

"ہاں!" سروجنی بھی مسکرانے لگی۔

"میں تم دونوں کے راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنے کا وعدہ کروں تو بتا دو گی؟" دیوندر نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، بشرطیکہ جیتندر سے بھی اس بارے میں کچھ نہ کہو۔"

"ایسی کون سی بات ہے بھئی؟"

"بات تو تمہیں اسوقت معلوم ہو سکتی ہے جب وعدہ کرو۔"

دیوندر نے وعدہ کیا اور سروجنی نے جیتندر سے جو باتیں سنی تھیں دیوندر کے سامنے دہرا دیں۔

~~~~~~

جیتندر اپنے نگارخانے میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا کہ یکایک کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی اس نے نظر اوپر اٹھائی تو جیوتسنا سامنے کھڑی تھی۔

جیتندر نے تعجب آمیز لہجے میں پوچھا۔ "ارے تم یہاں کیسے جیوتسنا؟"

"تم سے پناہ طلب کرنے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا، صاف صاف کہو۔"

"صاف صاف تو جب کہوں کہ پناہ دینے کا وعدہ کرو۔"

"تم مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتی ہو کہ ایک عورت پناہ مانگے اور میں انکار کر دوں؟"

"اگر تمہیں ایسا سمجھتی تو تمہارے پاس آتی کیوں؟"

سروجنی یہ دیکھ کر کہ کوئی عورت جیتندر کے نگارخانے میں آئی ہے، چپکے سے آکر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ ہربنس اور نہار بالا کی گفتگو اور ماں بیٹی میں جو باتیں ہوئی ان سب کا ذکر کر کے جیوتسنا نے کہا۔ جیتندر! تم سمجھ سکتے ہو کہ جب میں نے تمہاری دس ہزار کی رقم اور ماہانہ تنخواہ کو ٹھکرا دیا اور تمہارے سامنے برہنہ ہو کر تصویر بنوانا گوارا نہ کیا تو میں اپنی عفت و عصمت ہربنس کے حوالے کیسے کر دیتی؟ اور عصمت فروشی کے پیشے کو کیسے

باقی بر صفحہ ۱۲

دیہات کی ایک صبح!

از جناب ساغر چشتی اوجلینی

جس طرح تاریکیٔ شب میں قمر ہو جلوہ گر　　چھا رہا ہے ظلمتوں پر اس طرح نورِ سحر
ٹوٹتے جاتے ہیں ہر لمحہ طلسماتِ سکوت　　ہو رہی ہیں شب کی افسوں سازیاں زیر و زبر

——— غنچہ و گل لالا زار ———
——— آبشار و کوہ سار ———
——— سبز کھیتوں کا نکھار ———
——— ہر کلی پھول اور خار ———
——— ہو رہے ہیں صبح کے مستانہ جلووں پر نثار ———
——— چوم لیتے ہیں نسیمِ جاں فزا کو بار بار ———

چھپروں پر پھونس کے منظر عجب ہیں کیف زا　　صبح کے جلوے ہیں اک چھوٹی سی بستی پر فدا
حسنِ فطرت سر بہ زانو خود ہے ارضِ دیہہ پر　　کوئی آ کر لے یہاں معصومیت کا جائزا

——— جھونپڑی کے در کھلے ———
——— چند خوابیدہ اُٹھے ———
——— آنکھ کو ملتے ہوئے ———
——— منہ سے یہ کہتے ہوئے ———
——— ہم کسانوں کا تو ہی بھگوان پالنہار ہے ———
——— تیری لیلا ہے انوکھی تو ہی جگ کرتار ہے ———

رومانی کہانی

روحوں کا ملاپ

از جناب ثمر نور بزمی

خاص مست قلندر کے افسانہ نمبر کے لئے

گرمی کے دنوں میں صبح کی ٹھنڈی ہوا رات بھر کے جاگے ہوؤں کو تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔

—— ⁂ ——

میری شادی ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا مگر میری خانگی یعنی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ تھی۔ اس ایک مہینے میں، میں سلطانہ کے دل میں اپنے لئے ذرا سی جگہ بھی نہ بنا سکا تھا اور اس کی بے توجہی کے اسباب سے ناواقف ہونے کی وجہ سے عجیب الجھن میں پھنسا ہوا تھا۔

دنیا شادی کو کتنے ہی خوبصورت ناموں سے پکارے، لوگ اسے کتنی ہی بڑی خوش قسمتی سمجھیں مگر میں اپنی شادی کو ایک دائمی مصیبت سمجھ رہا تھا۔ —— ایک ایسا روگ جس کی نہ تو تشخیص ممکن ہے نہ علاج ہی! اس کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ میں سلطانہ سے محبت کرنے لگا تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ محبت اسی حد تک محدود تھی جسے "میاں بیوی کی محبت" کہا جا سکتا ہے (حالانکہ سلطانہ کو میری محبت کی پروا نہ تھی) ایک عاشق کی طرح تو نہیں مگر کسی حد تک مجھے اس کی بے التفاتی کا رنج ضرور تھا کیونکہ اس طرح وہ حق تلف ہو رہا تھا جو مذہب اور قانون نے مجھے دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ میری اکثر راتیں بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزر جاتی تھیں۔

رات بھر گرمی اور پریشان خیالات نے مجھے سونے نہ دیا۔ سلطانہ کی بے التفاتی کے ساتھ ہی اس روز کا ایک اور واقعہ مجھے پریشان کر رہا تھا —— صبح جبکہ نسیم سحری شگفتہ پھولوں، ناشگفتہ کلیوں اور نازک پتیوں کے بوسے لے رہی تھی، میں گہری نیند سو گیا ......

...... میں زیادہ دیر تک نہیں سویا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا —— سورج اپنی سنہری کرنوں سے نور کی بارش کر رہا تھا انہی نورانی کرنوں سے جو چند گھنٹے بعد آگ برسانے والی تھیں۔

میں نے رسیور کان سے لگایا، آواز آئی "ہیلو ...... کون ...... جمال صاحب؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔ "آپ کون صاحب ہیں؟" ...... "میں، میں ہوں نورو ......" آواز آئی۔ "او ...... کہو ......" میں نے پوچھا۔ "...... آپ فوراً کوٹھی پر آئیے ...... جلدی ......" نورو نے جلدی جلدی ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اختر صاحب گھر پر ہیں؟" میں نے پوچھا۔ .... "اختر ......" کہہ کر وہ زور زور سے رونے لگا۔ اور میں نے گھبرا کر پوچھا: "کیوں کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟" "خیر کہاں بابو صاحب ......" اس نے رک رک کر کہا: "آپ فوراً آئیے —— بہت جلد ......" اور قبل اس کے کہ میں کچھ اور پوچھوں "کلک کلانگ" قسم کی آواز آئی —— وہ رسیور رکھ چکا تھا!

مجھے یاد نہیں، میں وہاں کیسے پہنچا —— ہاں اتنا یاد ہے کہ تھوڑی ہی دیر بعد میں اختر کے بے جان جسم پر جھکا ہوا تھا، اس کے چہرے اور انگلیوں کی نیلاہٹ سے، کسی بہت تیز قسم کے زہر کا اثر صاف معلوم ہو رہا تھا —— مگر یہ کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہوا کیسے؟

کل ہی وہ یورپ سے واپس آیا تھا اور ہم دونوں دو تین گھنٹے ساتھ رہے تھے، اس کے گھر میں نورو کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور نورو پر شک کرنا ناممکن تھا —— پھر یہ کیوں ہوا؟ دماغ پر بہت زور دیا مگر یہ معاملہ سمجھ میں آنے والا نہ تھا، آخر میں نے سوچا ممکن ہے اختر نے خودکشی کی ہو ...... اگر ایسا ہے تو ضرور اس نے اپنے اس فعل کے متعلق کچھ لکھا ہوگا۔ تکیہ اٹھایا تو نیچے دو بند لفافے پڑے تھے، ایک پر میرا نام لکھا ہوا تھا اور دوسرا سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے نام تھا —— میں اپنے نام کا خط کھول کر پڑھنے لگا ...... معلوم نہیں پورا خط پڑھ سکا یا نہیں، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا اور میں بیہوش ہو گیا۔

نہ جانے کب تک بیہوش پڑا رہا جب آنکھ کھلی تو خود کو ایک پلنگ پر پڑا پایا ہاں اختر کا خط اب تک میرے ہاتھ میں تھا —— میں نے لیٹے ہی لیٹے خط کو ایک بار اور پڑھ ڈالا اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے میری آنکھوں سے بہنے لگے —— —— خراج محبت!

—— ⁂ ——

اختر اور میں کالج میں ساتھ ہی پڑھتے تھے اور ایک دوسرے سے ہماری محبت ضرب المثل بن چکی تھی۔ میرے والد اوسط طبقے کے فارغ البال

دمی تھے مگر اختر کا خاندان بہت امیر تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا تھا۔ بی اے تک ہم نے ساتھ ہی تعلیم پائی۔ اس کے بعد میں نے تعلیم ی اور ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ ر کی تعلیم ختم ہونے سے پہلے ہی ستم ظریف ت نے اس کے والدین کی محبت بھری ش ہمیشہ کیلئے اس سے چھین لی۔ اب یں ایسا کوئی بھی نہ تھا جسے وہ اپنا کہتا ھتا ——— وہ اپنے دولتمند خاندان مد چراغ تھا مگر اُسے اپنے چاروں طرف یرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ روشنی کہیں نام ی نہ تھی۔ دولتمند کے خواہشمند بہت تھے یا کوئی بھی نہ تھا جسے اختر کی ذات سے ت اور ہمدردی ہو ——— آہ خودغرض دنیا!

تعلیم کے زمانے میں ہم بہت بے تکلف ، یوں تو ہم ایک دوسرے کی ہر اچھی بری سے واقف تھے لیکن اسے ہر وقت یا کھویا سا دیکھ کر میں نے اس کا ایک ایسا ھی جان لیا تھا جو شاید مجھے نہ جاننا چاہیئے ——— اس نے مجھے بتایا کہ میں ایک ی سے محبت کرتا ہوں اور وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ مجھے اس قسم کے معاملات سے قطعاً کوئی پی نہ تھی مگر چونکہ میں اختر کی محبت کی پاکیزگی استواری سے اچھی طرح واقف تھا اسلئے رزو ضرور تھی کہ وہ کامیاب ہو۔

تر اکثر اپنی محبت، اور خوشگوار امیدوں ر آنے کا ذکر کیا کرتا مگر میں ہمیشہ "بڑے ش قسمت ہو" کہکر یہ موضوع بدل دیتا ——— مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی!

اے کرنے کے بعد اختر نے تکمیل تعلیم احت کی غرض سے یورپ جانا چاہا ——— روپے پیسے کی کمی نہ تھی اور دوسری ئی رکاوٹ نہ تھی اسلئے وہ یورپ چلا گیا

مجھے ایک اچھی ملازمت مل گئی اور میں اطمینان سے کام کرنے لگا۔ اختر سے میری خط و کتابت برابر جاری رہی۔ تین سال گزر گئے اس دوران میں میرے خاندان کے ایک "بزرگ" کے ایما پر سلطانہ سے میری شادی طے پا گئی ——— دن گزرتے دیر نہیں لگتی، شادی کا مقررہ دن قریب آ گیا، اختر کو میں پہلے ہی لکھ چکا تھا کہ تمہیں میری شادی میں شامل ہونا ہوگا۔ لیکن شادی سے صرف چار روز پہلے اس کا خط آیا جس میں لکھا تھا "میری بھی یہ دلی آرزو ہے، مگر کیا کروں، امتحان میں صرف ایک مہینہ باقی ہے۔ اگر ممکن ہو تو شادی کی تاریخ بڑھا دو ——— نہیں تو میں اپنے آپ کو بدقسمت سمجھوں گا کہ اس خوشی میں شریک نہ ہو سکا" میں نے تاریخ بڑھوانے کی بہت کوشش کی مگر رسم و رواج کی اس دنیا میں یہ کیسے ممکن تھا؟ ——— میری شادی ہو گئی۔

سلطانہ کو میں بچپن سے جانتا تھا، آخر میری قریبی رشتہ دار تھی مگر شادی کے بعد اس کے برتاؤ کو سمجھ نہ سکا، یہ سچ ہے کہ وہ ایک خدمتگزار خادمہ کی طرح میری بے حد خدمت کرتی تھی۔ اُسے میرے آرام کا بڑا خیال رہتا تھا مگر وہ میری خادمہ تو تھی اور "بیوی" وہ کبھی بن نہ سکی، وہ ہمیشہ مجھ سے دور دور رہتی، جیسے میرے قرب سے اُسے ڈر لگتا ہو، میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کبھی اُسے تکلیف نہ دی، کبھی اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہونے دی کیونکہ میں جانتا تھا ہمیشہ اسکی حالت یکساں نہ رہے گی، اس کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ بھی ہو۔ آخر تو ہمیں زندگی بھر ساتھ رہنا ہے!

دنیا کی نظر میں میاں بیوی ہوتے ہوئے بھی ہم ایک دوسرے سے بالکل "ناواقف" تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں مطمئن نہیں تھا۔ انہی حالات میں ایک مہینہ گزر گیا ——— ایک روز اختر کا تار ملا کہ وہ صبح کی ٹرین سے آ رہا ہے۔

میں اسٹیشن پر بے چینی سے ٹرین کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ کوشش کرنے پر بھی دفتر سے چھٹی نہ ملی تھی۔ وقت مقررہ پر ٹرین آئی اور اختر مجھ سے بغل گیر ہوا۔ ہمارے آنسو، خود غرضی سے بھری ہوئی اس دنیا میں اخلاص کی ایک نمایاں جھلک دکھا رہے تھے!

پرانی بے تکلفی کی یاد تازہ کرتے ہوئے اختر نے مجھے شادی کی مبارکباد دی اور میں مسکرا دیا ——— سامان زیادہ تھا اسلئے پہلے ہم اختر ہی کے ہاں گئے اور سامان رکھوا کر میں اسے اپنے ہاں لے آیا ——— سلطانہ کو میں پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ وہ میرے عزیز دوست سے پردہ نہ کر سکے گی!

ہم کمرے میں بیٹھے، سلطانہ کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ کھانا پکانے میں مصروف تھی، تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اختر بولا "جمال! مجھے تم سے ایک شکایت ہے، تم نے چپکے چپکے شادی بھی کر لی اور ابھی تک مجھے بھابی سے بھی نہیں ملایا" میں نے جواب دیا "کہیں بھاگے جا رہے ہو، کیا؟ کھانا کھا لو، پھر اطمینان سے بھابی سے بھی مل لینا ——— جلدی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے!" اختر ہنسنے لگا اور میں مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔

سلطانہ کھانا تیار کر چکی تھی۔ میں نے اسے بلایا اور وہ "آتی ہوں" کہکر نہ جانے پھر کیا کرنے لگی ——— خادمہ کے ہاتھ کھانا باہر بھیجتے ہوئے اس نے کہا "آپ

کھانا کھائیے۔ میں ابھی آتی ہوں؟
اختر اور میں کھانا کھانے بیٹھے ہم کھا ہی رہے تھے کہ سلطانہ کمرے میں داخل ہوئی میں نے اس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ کچھ زرد اور اُترا ہوا سا نظر آرہا تھا مگر میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اسلئے زیادہ خیال نہیں کیا اور اختر سے کہا۔ "بڑا بدتمیز ہے، بے، بھابی کو سلام بھی نہیں کیا" مگر اختر تو بالکل ہی بدل چکا تھا، اپنی سرخ ہوتی ہوئی آنکھیں کو ملتے ہوئے وہ کہنے لگا: "اُف، گوشت میں مرچیں کتنی زیادہ ہیں" اور میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ اُٹھ کھڑا ہوا ___ میں نے گھوم کر دیکھا، سلطانہ بھی کمرے سے جا چکی تھی!

میں نے اختر کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ یہ کہہ کر چلا گیا "میں بھول ہی گیا تھا سول سرجن مسٹر جان کو اُن کے ایک دوست کی طرف سے ابھی فوراً مجھے ملنا ہے ___ اسوقت جانے دو، شام کو آجاؤنگا"

اختر کے جانے کے بعد میں سلطانہ کے کمرے میں گیا تاکہ دیکھوں وہ کچھ بیمار تو نہیں ہے۔ سلطانہ سر پر پٹی باندھے چارپائی پر پڑی تھی۔ اور اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں "کیا ہوا سلطانہ؟" میں نے پوچھا اُس نے چونک کر اس طرح میری طرف دیکھا، جیسے میں کوئی خوفناک درندہ ہوں، پھر سنبھل کہنے لگی "صبح سے سر میں درد تھا، اس وقت درد بھی زیادہ ہے اور طبیعت بھی کچھ خراب محسوس ہو رہی ہے"

میں نے سوچا بہت دیر تک آگ کے سامنے بیٹھنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے اور لیڈی ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر کے دفتر چلا گیا۔

شام کو دفتر سے لوٹ کر اختر کو فون کیا مگر اس کے ملازم نورو نے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں ہے ___ اس کے انتظار میں میں باہر بھی نہیں گیا۔ مگر وہ نہ آیا۔ رات کو پھر فون کیا مگر وہی جواب ملا صبح اس کے ہاں جانے کا ارادہ کر کے لیٹ رہا۔ لیکن صبح ابھی سو ہی رہا تھا کہ نورو نے فون کیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، اُوپر لکھ آیا ہوں ___

امید ہے کہ قارئین نے ان بکھری ہوئی کڑیوں کو ملا لیا ہوگا۔ اگر نہیں ملا سکے تو اختر کا آخری خط نقل کرتا ہوں۔

"پیارے جمال!

میں نے ہمیشہ ایک بات تم سے چھپائی او وہ تھی اپنی محبت کی مکمل داستان! یوں تو تم اس راز سے واقف تھے مگر میں نے اس لڑکی کا نام تمہیں کبھی نہیں بتایا، کیونکہ وہ تمہارے عزیزوں میں سے تھی لیکن آج ___ جبکہ میں اس دنیا سے ہمیشہ کیلئے جا رہا ہوں ___ اس راز کا ظاہر کر دینا ضروری ہے۔ میں سلطانہ سے محبت کرتا تھا" ___ ہاں ابھی سلطانہ سے جو آج تمہاری شریک حیات ہے ___ اور وہ بھی مجھے چاہتی تھی!

لیکن اب ___ جبکہ وہ تمہاری بیوی بن چکی ہے اور تم میرے دوست ہو ___ میرا سلطانہ کے قریب رہنا، تمہاری محبت بلکہ زندگی کی ساری خوشیوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوگا اسلئے میں اپنی ناکام زندگی کو تمہاری زندگی کی کامیابی اور سکھ کے لئے قربان کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ہمیشہ سکھی دیکھنا چاہتا تھا لیکن ممکن ہے سلطانہ اب بھی مجھے چاہتی ہو اور اگر ایسا ہے تو یقیناً میری موجودگی بلکہ زندگی میں تم کبھی سکھی نہیں ہو سکتے۔ اسلئے اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے تمہارے لئے زندگی اور سکھ کی راہ صاف کر رہا ہوں ___ تم سے صرف ایک التجا کرتا ہوں وہ یہ کہ سلطانہ کو کبھی بھی میری موت کی خبر نہ ہونے پائے ___ بس! امید ہے" اختر کی آخری التجا سمجھ کر تم اسے پورا کرو گے ___ زہر اپنا کام کر چکا ہے، اور انگلیوں میں درد سا ہونے لگا ہے اسلئے اب رخصت ___

ہمیشہ تمہارا   اختر"

اپنے آنسو پونچھ کر میں بستر سے اُٹھا اور گھر کی راہ لی ___ بے پروائی سے کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا اور باہر نکل گیا!

نہیں معلوم کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کس کس طرح اختر کی محبت و قربانی کی داد دی ___ مگر اسے کھو کر میں اپنے پاس کچھ بھی نہ پا رہا تھا ___ کیونکہ "روح" رخصت ہو چکی تھی اور جسم کی کوئی قیمت نہیں

دن بھر اختر کی یاد میں آنسو بہا بہا کر نہ جانے کب گھر واپس آیا اور اپنے بستر پر پڑ رہا ___ نہیں معلوم رات کیسے گزری

صبح جب اُٹھا تو گھر میں ہر طرف ہیبتناک خاموشی چھا رہی تھی، میں سلطانہ کے کمرے میں گیا مگر وہ ابھی تک نہ اُٹھی تھی۔ میں اُسے جگانے کے لئے اس کے قریب پہنچا مگر... ....؟ اسے جگانا اب انسانی طاقت کے بس میں نہ تھا ___ محبت قربانی پر قربان ہو چکی تھی! سلطانہ کے بے جان ہاتھوں میں اختر کا آخری خط اب تک دبا ہوا تھا۔

میں نے تصوّر کی آنکھوں سے دیکھا.... عطر و گلاب سے مہکی ہوئی فضا میں محبت اور وفا کے دو نورانی پیکر ___ کبھی نہ مرنے والی دوڑ میں اڑی چلی جا رہی تھیں ___ روحوں کا ملاپ!

التجا

از جناب رمز انصاری گنوری

مجکو حاصل ہو نہیں سکتی خوشی تیرے بغیر
کیا مجال آجائے جو لب پر ہنسی تیرے بغیر
زندگی بے کیف بنکر رہ گئی تیرے بغیر
کیا کروں لیکر نشاطِ سرمدی تیرے بغیر
آ بدل دے میری اس دُنیائے محسوسات کو

چاندنی راتوں میں کوئی دلکشی پاتا نہیں
اب مئے الفت میں کیفِ سرمدی پاتا نہیں
اپنے سجدوں میں مذاقِ بندگی پاتا نہیں
ہائے ہر شے سے نمایاں ہے کمی تیرے بغیر
آ بدل دے میری اس دُنیائے محسوسات کو

تو ترنم ریزیوں سے دلکو برماتی نہیں
اپنی آنکھوں سے شرابِ حسن برساتی نہیں
سامنے میرے کبھی ہنستے ہوئے آتی نہیں
دیکھ رہ جائیگی تشنہ شاعری تیرے بغیر
آ بدل دے میری اس دُنیائے محسوسات کو

ہائے کیا کہئے کہ میرا دل بہت بیزار ہے
ہجر میں ہر سانس اک چلتی ہوئی تلوار ہے
زیست سے تنگ آگیا ہوں موت اب درکار ہے
اک عذابِ جاں بنی ہے زندگی تیرے بغیر
آ بدل دے میری اس دُنیائے محسوسات کو

منظرِ فردوس نظروں میں سمائے کس طرح
مست کن نغموں سے مجکو لطف آئے کسطرح
ہائے اپنا غنچۂ دل مسکرائے کس طرح
مجکو بے معنی سا ہے لفظِ خوشی تیرے بغیر
آ بدل دے میری اس دنیائے محسوسات کو

ہاں تجھے میری فغانِ بے اثر کا واسطہ
میٹھے میٹھے دردِ دل، دردِ جگر کا واسطہ
تجکو ظالم اپنی دزدیدہ نظر کا واسطہ
حال پر روتی ہے میری بیکسی تیرے بغیر
آ بدل دے میری اس دنیائے محسوسات کو

چراغِ آرزو

دِل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

از عمدۃ الحکما سید خورشید علی مہر نقوی جے پوری

یوں تو سارے ہندوستان میں دیوالی کی رسم منائی جاتی ہے. مگر اجینونا نہیں اس کی ادائیگی میں جس دلچسپی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ بھی دلکشی اور روح افروزی میں دوسرے مقامات سے کچھ کم نہیں. یہاں بھی ایسے ایسے جذبات آفریں نظاروں سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ روح ایک خاص کیف و سرور محسوس کرتی ہے. ہر گاؤں قصبہ شہر میں خصوصیت کے ساتھ صفائی کا انتظام زینت و آرائش کا اہتمام. اشیاء کی باقاعدگی اور زیبائش کا التزام. غرضکہ اس موقع پر معمولی سے معمولی گھر میں بھی اصول حفظانِ صحت کی پابندی نہایت ذوق و شوق سے ہوتی ہے۔

شام کا سہانا وقت اول تو ہوتا ہی دلفریب ہے. لیکن آج چپہ چپہ پُرنور اور ذرّہ ذرّہ رشکِ جلوۂ طور نظر آتا ہے. فضا اتفاق سے نہایت پُرسکون اور خاموش ہے جھٹپٹا ہوتے ہی عقیدت مند ہستیاں حسن و شباب کی کیفیتوں سے فضائے لطیف کو لطیف تر بناتی ہوئی. نقرئی قہقہوں اور سامعہ نواز صداؤں سے رباب جذبات کے تاروں کو مس کرتی ہوئی ادھر سے ادھر گذرتی نظر آتی ہے. جدھر نگاہ اٹھتی ہے. ہر گلی کوچہ ایک فانوسِ خیال نظر آتا ہے. ان ہستیوں میں سے بیشتر نوجوان اور نوخیز لڑکیاں ہوتی ہیں. جو اپنے حسنِ دلفریب میں آرائشی رنگا رنگ سے ایک خاص جاذبیت پیدا کر کے اپنے اپنے عقیدے کی تکمیل کے لئے تھوڑی تھوڑی شیرینی اور چند چھوٹے چھوٹے چراغ لیکر جاتی ہیں اور عام گذرگاہوں پر رکھتی پھرتی ہیں اور حسن پرست نوجوانوں کے دلوں میں جذبات کا تلاطم خیز دریا موجیں مارتا ہے. مانک پور بھی اس دلچسپی سے مستثنیٰ نہ تھا.

شانتی کے لئے بھی یہ موقع کوئی نیا اور عجیب و غریب تو نہ تھا کیونکہ وہ اپنے جذبات میں ہیجانِ لطیف پیدا ہونے سے قبل بارہا اس نشاط انگیز منظر کو دیکھ چکی تھی. اور ازدواج کی انبساط امیز لڑی میں منسلک ہونے کے بعد بھی پانچ چھ مرتبہ اس کی آنکھوں نے اس تماشے کو دیکھا تھا مگر اس مرتبہ خلافِ معمول اسکی دنیائے حسیات میں آگ سی لگی ہوئی تھی. اس کے دل پر نرنیش کا تصور سوز و درد کے مکمل اثرات کے ساتھ آتش محبت کی ارتعاش انگیزیوں کا مظاہرہ کر رہا تھا. اس کو حسن فطرت کی رنگینیاں تو ازل ہی سے عطا ہوئی تھیں مگر شباب کی رعنائیوں نے اسکو ایسا مجسمہ بنا دیا تھا جسکی ضوفشانی چاند سورج اور آئینہ خانہ حیات سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی جوانی اس پر بہار لطیف اور کیفیات روح پرور بنکر چھائی ہوئی تھی. وہ ایک ایسی معصوم تھی کہ جیسے نسیم چمن سے پرورش یافتہ کسی پھول کی ناشگفتہ کلی. مزید براں زندگی کی خوشگواریاں کیف در آغوش ہو کر اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں اور وہ کسی حد تک مطمئن زندگی گزار رہی تھی. مگر نرنیش کی یاد اس کو ہر وقت دریا کی لہروں کی طرح بیقرار رکھتی تھی. آج کی لاکھوں چراغوں کی تابانی کے باوجود اسکی بزم حیات بالکل سونی بے لطف اور تاریک نظر آ رہی ہے دنیا اپنے خیالات و عقائد کی تکمیل میں مصروف ہے مگر شانتی اپنے معبودِ خیالی کے دلکش تصور میں ان سب کیف بار نظاروں روشن اور جھلملاتے ہوئے چراغوں کی ضیا باری میں اپنے نرنیش کی صورت دیکھنے کی متمنی ہے۔

وہ آج صبح ہی سے اداس نظر آ رہی ہے جوں جوں دن ڈھلتا جا رہا ہے. اسکے پھول سے رخسارے مرجھائے جاتے ہیں حتیٰ کہ شام کا خوشنما منظر اس کے سامنے آ گیا. اس کے کلیجے پر چھریاں چلنے لگیں اور بیٹھے بیٹھے اسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے جنکی بوندے گہرہائے آبدار کی شکل میں متواتر اس کے رخساروں سے ڈھلک ڈھلک کر گرنے لگیں گویا دو کافوری شمعیں انتہائی سوز و گداز کے ساتھ جل جل کر اپنی ہستی کو کسی بزم عشرت میں جاذب کر رہی تھیں. سیلاب اشک دمبدم بڑھتا چلا گیا. یہاں تک کہ اسکی

چکی بن رہ گئی۔ بڑی دیر تک وہ روتی رہی جب دل کا غبار اچھی طرح نکل چکا تو اسکو کسی قدر تسکین ہوئی۔ اگرچہ اسکے خیالات کا تسلسل اب بھی بدستور قائم تھا۔ تاہم اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ آنکھوں کو ساڑھی کے پلو سے پونچھکر تسلی دی۔ اٹھی منہ دھویا۔ پھر کچھ گنگناتی ہوئی ٹہلتی رہی۔ ساڑھی بدلی اور اپنے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں پہنچی ایک الماری کھول کر تھوڑی تھوڑی مختلف قسم کی شیرینی اور دوسری ضروری چیزیں لیکر ایک نقرئی تھالی میں سجائیں اور اپنی خادمہ نرملا کو آواز دیکر بلایا۔ خود تھالی میں چراغ روشن کئے اور نرملا کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرکے گھر سے روانہ ہوگئی۔

وہ سرسبز و شاداب مقامات سے گذرتی ہوئی گاؤں سے باہر گئی، دونوں راہگیروں کے پاؤں کی آہٹ یا شانتی کی ساڑھی کی خفیف سرسراہٹ کے سوا فضا بالکل خاموش تھی۔ گاؤں کا شور و غل فاصلے کے لحاظ سے کم ہوتا جاتا تھا۔ رات اپنی تھوڑی ہی منزل طے کرچکی تھی۔ چراغاں کا منظر اپنی مکمل ضیاء ریزیوں کے ساتھ ایسا پرلطف ہوگیا تھا کہ آسمان کے چمکتے ہوئے ستاروں کی جگمگاہٹ پھیکی نظر آتی تھی۔ لیکن شانتی کی نظروں میں یہ نظارہ بالکل بے کیف تھا۔ وہ ایک سرخ و انبساط کی مخلوط کیفیت لئے ہوئے جنگل کی رومانی خوشگواری سے اپنی روح میں ایک سکون و طمانیت محسوس کرتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ جوں جوں گاؤں سے دور ہوتی جاتی تھی۔ وہاں کا شور ایک صدائے بے ہنگام سا بنکر فضا میں گونج رہا اور وہ ایک پرسکون ماحول سے گذر رہی تھی۔

مانک پور کے پہلو ہی میں بناس ندی کی لطیف لہریں اہل نظر ہستیوں کے لئے ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے نہر سلسبیل میں کسی مقدس فرشتے نے اپنے پروں کی ہوا سے زبان معصومیت میں کوئی فرمان رحمت وعشرت لکھدیا ہے۔ شانتی نے اس ندی کے قریب پہنچکر ایک اطمینان کا سانس لیا اور یوں گویا ہوئی۔

"نرملا! اب تم یہاں ٹھہرو۔ دیکھو کیسا خوشنما اور حسین سماں ہے"

نرملا شانتی کے لب ہلانے کی اصل وجہ معلوم کرنے کے لئے بیحد متفکر تھی مگر اتنی جرأت نہ ہوسکی کہ شانتی سے دریافت کرتی۔ تاہم وہ اسکے حکم کی تعمیل میں ٹھہر گئی شانتی نے تھالی اپنے ہاتھ سے اتار کر ایک صاف سی جگہ پر رکھی۔ کچھ مذہبی رسوم ادا کرنے کے بعد اس نے اپنی ساڑھی گھٹنوں تک اٹھائی اور ادھر ادھر سے احتیاط کے ساتھ لپیٹ کر تھالی میں سے دیا اٹھایا اور پانی کی لہروں کا مقابلہ اپنے جذبات کی لہروں سے کرنے کے لئے ندی میں اتر گئی پانی نہایت آہستگی کے ساتھ رواں تھا امواج لطیف نے شانتی کی قدمبوسی کی تو اس کو ایک عجیب کیفیت محسوس ہوئی وہ ایک منٹ ہی میں منجدھار میں کھڑی تھی۔ دیا اس کے داہنے ہاتھ میں تھا اسنے اس کو ایک چھوٹے سے لکڑی کے تختے پر رکھا اور ندی کی دھار پر رکھ کر اپنے پتی پرمیشر کی یاد سے دل کو مسرور کئے ہوئے سطح آب پر چھوڑ دیا۔ فضا کی خاموشی نے اس کے جذبات کی تکمیل میں اعانت کی۔ دیا اپنی مکمل تابانی کے ساتھ امیدوآرزو کی فضاؤں کو منور کرتا جھکولے کھاتا ہوا چلا جارہا تھا اور شانتی اپنے دھڑکتے ہوئے سینے میں صحیح اور پاک عقیدہ اور محبت کے لطیف جذبات لئے ہوئے ٹکٹکی باندھے اسکی طرف دیکھ رہی تھی اس کے دل میں لاکھوں تمناؤں کا دریا موجیں مار رہا تھا جس کی تہ میں اسکے شریک زندگی سے جلد از جلد ہم آغوش ہونے کے آبدار موتی اپنی تابناکیوں سے اسکی فضائے تصور کو عالم انوار بنائے ہوئے تھے

ہوا اب بھی ساکن تھی اور شانتی کا چراغ آرزو اپنے چاروں طرف امیدوں کی دنیا کو جگمگاتا ہوا رواں تھا۔ رفتہ رفتہ وہ ایک نقطۂ روشن کی طرح نظر آنے لگا اور یہاں تک کہ اسی حالت میں آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

شانتی جو اسوقت تک امید و بیم کی حالت میں کھڑی ہوئی بدستور اس کو تک رہی تھی ایک دم چونک پڑی امیدوں کے پورا ہونے کی خوشی سے اس کے دل کی دلکش خاموشی میں رخنہ انداز ہونے لگی۔ اس کا شگون اس کو تکمیل تمنا کی بشارت دے رہا تھا وہ مسرت و انبساط کی وجدانی کیفیت سے جھوم رہی تھی۔ اسکا ہر سانس عشرت حیات کے رنگین لمحات کا آئینہ بنا ہوا تھا۔ وہ پانی کی لہروں پر اپنے جذبات کی موجوں کو غالب اور نیم مند پاکر وہاں سے چلی کنارے پر آکر اس نے اپنی ساڑھی درست کی۔ جہاں جہاں سے کچھ بھیگی ہوئی تھی اسکو نچوڑا۔ اپنے عقیدت مند دل کے ساتھ تھالی اٹھائی۔ نرملا کو ساتھ لیا اور گاؤں کی طرف لوٹ گئی۔

گاؤں میں ابھی چہل پہل بدستور تھی۔ مگر اس نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے

کمرے میں تھی ـــــــــ

چوتھے روز اس کو نرلش کی چٹھی ملی، دھڑکتے ہوئے سینے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے اس کو کھول کر پڑھا۔

کلکتہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۱ء

میری شانتی

میں جس دن سے تمہاری نئے نویلے سہاگ کی راتوں کو تاریک کر کے چلا تھا۔ اسی دن سے طرح طرح کی الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا جن کی تفصیل بہت طویل ہے۔ مگر گذشتہ رات سے میں اپنے دل میں ایسی عجیب تبدیلی پا رہا ہوں کہ جو احاطہ تحریر و اظہار سے باہر ہے۔ حالانکہ میں نے پچھلے چند سال تک نہ تمہاری خیریت معلوم کی اور نہ اپنا پتہ دیا لیکن رات سے میں انتہائی کرب اور بےچینی محسوس کر رہا ہوں، جی چاہتا ہے کہ اگر پرماتما مجھے دو پر دیدے تو میں ہوا میں اڑ کر اپنی شانتی کے چرنوں تک پہنچوں اور اس کے حسن، نکھرے کے درشن سے اپنے تڑپتے ہوئے دل کو شانت کروں۔ اگرچہ میں یہاں ایک فرم کا منیجر ہو گیا ہوں اور آجکل بہت کم فرصت ملتی ہے۔ پھر بھی سب کاموں کو چھوڑ کر کل یا بہت سے بہت پرسوں یہاں سے چل کر تم تک پہنچ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے پہلے سے بھی زیادہ حسین نظر آؤ گی۔ پچھلے دنوں کے شکوے شکایت سب زبانی ہوں گے۔ تم نے جو روحانی تکلیفیں میرے چلے آنے کے بعد اٹھائی ہیں ان سب کی تلافی صرف محبت بھرے لفظوں ہی سے ممکن نہیں بلکہ نرلش اپنے جیون کی بھینٹ اپنی شانتی کے من مندر پر چڑھا کر ہی کر سکتا ہے۔

تمہارا بیاکل پردیسی

نرلش

خط پڑھتے پڑھتے شانتی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے ایک بار خط کو پھر پڑھا اسے یقین نہ تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔ بلکہ وہ سمجھ رہی تھی کہ خواب کی حالت میں...... اسکی خیالی تصویر دل کا عکس نرلش کا نامہ محبت بن کر اسکی آنکھوں کے سامنے آگیا ہے اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ کرسی پر سے اٹھی ایک گھونٹ پانی پیا۔ پھر کرسی پر آ بیٹھی آنکھیں ملیں۔ انگڑائی لی اور جب اسے اچھی طرح یقین ہو گیا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی ہے حالت بیداری میں ہے تو اس نے خط کو لفافے میں رکھ کر ایک اطمینان کا سانس لیا۔ لفافہ میز پر رکھا اور خود کسی خیال میں کھو گئی۔ چوتھے روز شانتی اور نرلش کی محبت و اخلاص آمیز گفتگو سے بہشت حیات بنا ہوا تھا۔ جہاں کلکتہ کی سیر کا مسئلہ بھی در پیش تھا۔

ـــــ مہر نقشی

قطعات

از جناب اعظم انصاری لدھیانوی بانی و جنرل سیکرٹری بزم ادب لدھیانہ

آنسو

نیلی آنکھوں سے یوں گرے آنسو | جیسے گردوں سے مرمریں تارے
عرقِ نور ہیں ترے آنسو | شبنمیں گوہریں حسیں تارے

یاد

دل میں بیتاب ہوک اٹھتی ہے | جس گھڑی تجھ کو یاد کرتا ہوں
پیاری کوئل بھی کوک اٹھتی | گذری شامیں جو یاد کرتا ہوں

ایک خواب

آج قلب و نظر نہ کیوں جھومیں | بادہ و ناب دیکھتا ہوں میں
خانہ ساماں ہے کوئی پہلو میں | یا کوئی خواب دیکھتا ہوں میں

شامِ امید

آڑے وقتوں جو چھوڑ دیتا تھا | کیوں دیا تھا پیار کا پیغام
لٹ گئی ہے متاعِ جذب و سرور | ہائے صبحِ بہار کا پیغام

صیاد سے

یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں | حسرت آگیں ہے بزمِ رفتہ کی یاد
چن لے موتی جو یوں پروتا ہوں | اے مرے مہرباں۔ مرے صیاد!

پڑھو اور ہنسو

منیجر - (نوجوان عورت سے) کیا آپ اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق کچھ جاننا چاہتی ہیں؟"
عورت - جی نہیں - البتہ یہ ضرور بتایئے کہ میرے موجودہ شوہر کا چال چلن ماضی میں کیسا رہا ہے - اس سے مجھے اپنا مستقبل بنانے میں مدد ملے گی -

---

ماں نے ننھی محمودہ کو تھپکی دیکر سلا دیا اور دبے پاؤں کمرے سے باہر جا رہی تھی کہ بچی بول اٹھی "امی جان - مرنے کے بعد کیا میں بہشت میں جاؤں گی"
"ہاں"
"اور موسی بلی بھی؟"
ماں نے اثبات میں جواب دیا لیکن وہ ان سوالوں سے تنگ آ گئی تھی - اور جب محمودہ نے دریافت کیا "اور ہماری بھینس؟"
تو ماں چڑ کر بولی "نہیں"
ابھی وہ دروازے سے باہر نہ گئی تھی کہ محمودہ نے کہا "امی جان! پھر تو ہمیں دودھ لانے کیلئے ہر روز دوزخ میں جانا پڑیگا"

جمیلہ - میں ایسا شوہر چاہتی ہوں جو لاکھوں میں ایک ہو -
نفیسہ - مجھے ایسا شوہر چاہئیے جس کے پاس لاکھوں ہوں -

ایک نوجوان نے بنک کے منیجر سے جا کر پوچھا "کیا میں اس مہینہ کے آخر میں کچھ روپیہ آپ کے ہاں جمع کرا سکتا ہوں؟"
"جی ہاں! ضرور"
"اچھا تو اس میں سے پانچ روپے مجھے اب عنایت فرمایئے" نوجوان نے جواب دیا -

---

بدمزاج فوجی افسر اپنے حکم کی تعمیل میں ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی برداشت نہ کر سکتا تھا ایک دن اس نے دیکھا - بارک کا باورچی ایک دیگچی لئے جا رہا ہے افسر نے ڈانٹ کر کہا -
"مجھے دکھاؤ - تم نے سپاہیوں کے لئے سالن کیسا پکایا ہے"
باورچی نے کہا "مگر حضور یہ ——"
بدمزاج افسر چیخ کر بولا "بس بک بک مت کرو - مجھے فوراً چکھاؤ"
باورچی خوف کے مارے افسر کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا - اور دیگچی سامنے کر دی - افسر نے چمچہ بھر کر حلق میں ڈالا اور فوراً اُبکائیاں لیتا ہوا غصہ سے بولا "ارے کمبخت یہ کیا چیز ہے؟"
باورچی نے جواب دیا "فنائل"

ایک سفری تھیٹریکل کمپنی کو ایک شہر میں ذرا بھی کامیابی نہ ہوئی - ہیرو کو بھی تنخواہ نہ ملی - وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا - اس نے فیصلہ کیا کہ ہوٹل کا بل ادا کئے بغیر وہاں سے کھسک جائے - اس نے بڑی احتیاط سے اپنی چیزیں اکٹھی کیں - اور انہیں ایک سوٹ کیس میں بند کر کے کھڑکی کے راستے ہوٹل کے عقب میں لٹکا دیا -
دفعتاً نیچے سے منیجر کی آواز سنائی دی "اب چھوڑ دو صاحب! سوٹ کیس میرے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے"

سڑک کے درمیان ایک عورت اور مرد بڑی شدت کے ساتھ آپس میں لڑ رہے تھے -
عورت نے چیخ کر کہا "گدھے، نالائق میں آج تجھے وہ سبق دوں گی کہ تو ہمیشہ یاد کریگا - میں تیرا سر توڑ دونگی، ایسے ——"
اور اس نے ایک گھونسہ مرد کی کھوپڑی پر رسید کر دیا -
"اوہ! تو اپنی بدذات - لے، اب سنبھل میں بھی ناکوں چنے چبوا دوں گا"
مرد نے عورت کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا -
ایک پولیس کانسٹبل فوراً موقع پر آ گیا اور بولا "تم دونوں کیا کر رہے ہو؟"
عورت نے غصہ سے نووارد کی طرف دیکھا اور بولی "تم الگ ہٹ جاؤ - یہ شخص میرا شوہر ہے - ہماری شادی ہوئے دس برس گزر چکے ہیں"
"لیکن تم گھر میں جا کر کیوں نہیں لڑتے" سپاہی نے پوچھا -

بٹالہ کا ہونہار افسانہ نگار

دلچسپ فریب

از جناب واحدی صاحب

اس زمانے میں ہم گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ ایک روز گھنٹہ خالی تھا ہم تین چار احباب کالج کے باہر بیٹھے گپیں لڑا رہے تھے ایک دوشیزہ کچھ کتابیں ہاتھ میں لئے آتی ہوئی دکھائی دی اور ہمارے سامنے پہنچکر کچھ جھجکتی ہوئی رک کر بولی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پرنسپل صاحب کا کمرا کدھر ہے؟"

اس نے ہم میں سے کسی خاص شخص کو مخاطب نہیں کیا تھا اس لئے کوئی بھی جواب دے سکتا تھا لیکن نذیر نے عجلت کر کے جواب دیا۔ ہاں ہاں چلئے میں آپ کو پہنچا دوں"

دونوں پرنسپل کے بنگلے کی طرف چلے نذیر آگے آگے تھا اور پیچھے دوشیزہ۔

نذیر کا قد موزوں تھا اور اعضا متناسب کھلاڑی ہونے کے باعث اسکی صحت بھی اچھی رہتی تھی شکل و شباہت کا بھی اچھا تھا وہ کوٹ پتلون کے ساتھ نکٹائی لگا کر نکلتا تو ان نوجوانوں کی طرح معلوم ہوتا جنہیں فلموں میں اکثر ہیرو کا پارٹ دیا جاتا ہے وہ اپنے ایک دوست حبیب کے ساتھ ہوسٹل سے دور چوبرجی کی طرف ایک مکان میں رہتا تھا۔ تھوڑی دیر میں نذیر دوشیزہ کو پہنچا کر واپس آیا تو میں نے پوچھا۔ نذیر! یہ کون تھی؟ اور کس غرض سے پرنسپل کے پاس گئی ہے؟"

نذیر بولا۔ راستے میں اس سے کوئی بات چیت ہی نہیں ہوئی جو یہ سب معلوم ہوتا

میں نے کہا۔ اسقدر کیوں بنتے ہو نذیر"

وہ بولا۔ "خدا کی قسم چاہو تو سے لو"

دریافت کرنے پر ہم لوگوں کو پتہ چل گیا ہمارے کالج کے ایم اے کلاس میں مشترکہ تعلیم کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا مشترکہ تعلیم صرف ایم اے تک محدود رکھی گئی تھی۔ اس سے ہمیں ایک گونہ افسوس تو ضرور ہوا لیکن پھر بھی ہم نے یہ سوچکر صبر کر لیا کہ کچھ مضائقہ نہیں بی اے سے نکل کر ایم اے میں جانے میں صرف ایک سال کی دیر اور ہے۔ نذیر ہر بار کہا کرتا تھا کہ وہ بی اے سے زیادہ نہ پڑھے گا لیکن اب اس نے بھی یہ کہنا چھوڑ دیا تھا

بی اے کا امتحان دیکر ہم سب تعطیل گذارنے کے لئے گھر چلے گئے اور لگے دن گننے کہ کب تعطیل ختم ہو اور ہم لاہور پہنچکر ایم اے میں داخل ہوں چھٹیوں میں مجھے نذیر کا ایک خط ملا اس نے لکھا تھا تمہیں یہ سنکر خوشی ہو گی کہ میں نے ایم اے میں داخل ہونے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ یوں تو مجھے پولیس میں سب انسپکٹری کی جگہ مل سکتی ہے لیکن تم جیسے دوستوں سے ابھی علیحدہ ہونے کو جی نہیں چاہتا۔

میں نے اس کو شکریہ کا خط لکھا لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ اسے کونسی کشش کالج لا رہی ہے۔ کالج کھلا۔ ہم سب لاہور آئے ایم اے کلاس میں بیس لڑکے تھے اور تین لڑکیاں پہلی بنچ پر لڑکیاں بیٹھی تھیں اور پیچھے بنچوں پر لڑکے۔ نذیر میاں لڑکیوں کی عین پیچھے والی

بنچ پر براجمان ہوتے تھے۔ جہاں کسی لڑکی کی کتاب گری انہوں نے فوراً اٹھا دی۔ کسی کی پنسل کی نوک ٹوٹی اور انہوں نے اپنی پنسل پیش کر دی۔ انہیں کلاس کے اندر اور باہر لڑکیوں سے تعارف و شناسائی پیدا کرنے کا جو بھی موقع ملتا تھا وہ اسے رائگاں نہ ہونے دیتے تھے۔ لیکن آجکل کی لڑکیاں بھی ایک ہی چلتی ہوئی ہوتی ہیں خصوصاً وہ لڑکیاں جو لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کا حوصلہ رکھتی ہیں چنانچہ ہمارے کلاس کی لڑکیاں جلد ہی نذیر کو بھانپ گئیں نذیر ان سے میل جول بڑھانے کی جتنی ہی زیادہ سعی کرتا وہ اس سے اتنا ہی احتراز اور گریز کرتیں۔ اس طرح دو تین مہینے گذر گئے لیکن نذیر کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اس کے برعکس مجھ سے اور دو تین دوسرے نوجوانوں سے رفتہ رفتہ ان لڑکیوں سے راہ و رسم ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود نذیر کے اور میرے تعلقات میں کسی طرح کا فرق نہ آیا۔ ہم دونوں اب بھی کالج میں "انسپر یبلس" — نہ بچھڑنے والے — کہے جاتے تھے۔

مئی کا مہینہ تھا۔ ایک روز شام کو نذیر ہمارے ہوسٹل میں آیا اور اس نے پوچھا "تم کل شام کو کہاں تھے"

میں نے کہا "مس ڈارتھی کے ہاں گیا تھا"

"ارے تم نے ان کے گھر بھی جانا شروع کر دیا" نذیر چونک کر بولا۔

"تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے اپنے

چائے پر مدعو کیا تھا۔ چائے نوشی کے بعد ہم سب اس کی کوٹھی ہی میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے"۔

"اچھا یہ بات"

"جی ہاں۔ اور آپ کو معلوم ہے جے دیو بھی تھا"

"مجھے یہ لڑکیاں کچھ پاگل سی معلوم ہوتی ہیں"

"کیوں"؟

"اس لئے کہ وہ تم جیسے لوگوں کو اپنے گھروں میں قدم رکھنے دیتی ہیں"۔

"کیوں ہم میں کونسی خرابیاں ہیں" میں نے غصہ سے پوچھا۔

"اگر تم میں خرابی نہیں تو خوبی ہی کونسی ہے؟ پستہ قد۔ سانولا رنگ اور کتاب کے کیڑے! اور شاید اسی لئے وہ تمہیں اپنے ہاں بلاتی بھی ہیں کہ تمہیں چائے وائے کا لالچ دلا کر تمہارے نوٹ پڑھ لیا کریں گی"۔

"اور جے دیو میں کونسا عیب ہے"

"اس میں عیب نہیں تو اور کیا ہے؟ بے ڈول لمبا سا قد۔ چلتا ہے تو بالکل اونٹ معلوم ہوتا ہے"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں ایک تمہیں یوسف ثانی ہو اور جو دوشیزہ تم پر نہیں مرتی وہ دیوانی ہے"

"میں کب یہ کہتا ہوں کہ لڑکیاں مجھ پر مریں۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ صرف ایک بار میرے ساتھ سینما ہو آئیں اس سے زیادہ میری ان سے اور کوئی خواہش نہیں ہے"

"لیکن میرے ساتھ تو انہوں نے سینما جانیکا وعدہ کر لیا ہے"

"کب؟"

"اگلے ہفتے! جب "ڈفنس آف دی سٹارم" دکھایا جائے گا"

"ارے یار تب تو تم بازی لے گئے۔ لیکن یہ تو کہو تم انہیں بٹھاؤ گے دو روپے والی جگہ پر"

"ہاں"

"تو بھی عجیب آدمی ہے میں ہوتا تو انہیں باکس" کے اوپر لے جاتا"

"اور اتنے روپے کہاں سے آتے"؟

"پاس کا انتظام کر لینا"

"تو دوست میرے لئے کر دو نہ پاس کا انتظام میں بڑی خوشی سے اس کے لئے تیار ہوں"

"لیکن یہ تو بتاؤ پاس کا انتظام تم کرو گے کیسے"

"میرا ایک دوست سینما کے منیجر کا دفتر دار ہے"

"اگر تم پاس کے لئے وعدہ کرو تو میں لڑکیوں سے کہدوں کہ ہم باکس میں چلیں گے، ورنہ دن کے خیال سے وہ بھی پس وپیش میں تھیں"

"وعدہ تو کر رہا ہوں"

ادھر ادھر کی کچھ اور باتیں کرنے کے بعد نذیر چلا گیا۔ میں نے لڑکیوں سے جا کر کہہ دیا اب ہم باکس ہی میں بیٹھیں گے میں نے باکس کا انتظام کر لیا ہے۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئیں اور انہوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ ٹھیک ساڑھے چھ بجے وہاں پہنچ جائیں گی۔

میں دل ہی دل میں نذیر کا شکر گذار ہو رہا تھا کیوں نہ ہو آخر تو وہ میرا دوست ہی ہے وہ خود ہمارے ساتھ نہ جا سکے گا۔ لیکن ہمارے لئے پاس کا انتظام کرے گا اسے کہتے ہیں خلوص اور ایثار اگر وہ پاس کا انتظام نہ کر دیتا تو ہمیں مجبوراً ایک ایک روپے کا ٹکٹ لیکر تھرڈ ہی میں بیٹھنا پڑتا اور اگر باکس میں بیٹھنا چاہتے تو ایک گہری رقم خرچ ہو جاتی اور اگر لڑکیاں اپنا اپنا ٹکٹ خود خریدتیں تو میری شان کیا رہ جاتی؟ جب میں خیال کرتا کہ تین تین دوشیزاؤں کے ساتھ باکس میں بیٹھوں گا وہ بھی بغیر ایک پیسہ خرچ کئے تو میرا دل ایک غیر معمولی مسرت سے لبریز ہو جاتا میں بڑی بے چینی کے ساتھ سینما جانے کے دن کا انتظار کر رہا تھا۔

آخر انتظار کے دن ختم ہوئے اور ہمارے سینما جانیکا دن آیا میں صبح ہی پاس کیلئے نذیر کے ہاں گیا۔ اس نے کہا میں نے اپنے دوست سے لے کر لیا ہے میں کالج بند ہوتے ہی جاؤں گا اور پاس لے آؤں گا۔ تم بیفکر رہو بارہ بجے کالج بند ہوا میں نے نذیر کو پھر یاد دلایا اور ہوسٹل میں آکر اخبار دیکھتے دیکھتے سو گیا۔

ساڑھے تین بجے نیند کھلی۔ جلدی جلدی شیو کیا۔ دس بارہ منٹ ٹائی کی انتخاب کے نذر ہوئے۔ اپنا سب سے اچھا سوٹ نکال کر زیب تن کیا جیب میں بٹوہ اور کچھ الائچیاں ڈالیں اور ساڑھے چار بجے ہوسٹل سے نکل کھڑا ہوا۔

ابھی دھوپ شدت کی تھی اور سینما کے وقت میں بھی دو گھنٹے کی دیر تھی۔ پھر بھی مجھے ابھی سے اس لئے ہوسٹل سے نکلنا پڑا کہ نذیر سے پاس نہیں ملے تھے میں تانگے پر بیٹھ کر اس کے گھر گیا۔ دروازے پر دستک دی کچھ جواب نہ ملا میں باہر کا دروازہ کھولکر اندر چلا گیا۔ نذیر اور حبیب دونوں تنہا رہتے تھے۔ اس لئے میں اسی طرح بے تکلف اندر چلا جایا کرتا تھا۔ نذیر کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ اندر سے بجلی کے پنکھے کے چلنے کی آواز آ رہی تھی لیکن میرے پکارنے پر بھی نذیر نے کچھ جواب نہ دیا۔

میں نے کہا، "ارے نذیر۔ پانچ بجنے والے ہیں اور ابھی تک تم سوہی رہے ہو۔ اٹھو بھی" پھر بھی کوئی جواب نہ ملا میں نے لاتوں سے

کواڑ کو پیٹنا شروع کیا۔ تب کہیں جا کر نذیر سوئی ہوئی آواز میں بولا۔ ارے کون اسطرح ادھم مچا رہا ہے؟ کواڑ ٹوٹ گیا تو کس کا باپ بنوائے گا؟"

میں نے کہا۔ ارے میں ہوں رمیش۔ دروازہ کھولو۔ افیم کا گولہ نگل کر سوئے ہو کیا؟"

ارے تم ہو۔ معاف کرنا بھئی رمیش میں نے سمجھا کوئی اور ہے۔ اسی لئے دروازہ نہیں کھول رہا تھا"

یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں اسکے بدن پر نہ دھوتی ہے نہ پائجامہ صرف چھوٹا کرتہ پہنے ہوئے ہے میں نے کچھ ہنسی اور کچھ تعجب کے ساتھ کہا "ارے یار تم نے یہ کیا ڈھنگ بنا رکھا ہے؟"

"نہ پوچھو یار۔ وہ جو میرا دوست ہے نہ حبیب میں نے غلطی سے آج ہی کے لئے اسے بھی پاس لا دینے کا وعدہ کر دیا تھا۔ اس لئے اس نے صبح مجھے یاد دلایا تو مجھے تمہاری بات بھی یاد آ گئی۔ میں نے کہا بھئی تم کل پاس لے لینا۔ میں آج کے لئے بہت دنوں پہلے رمیش سے وعدہ کر چکا ہوں اور وہ بیچارہ تین لڑکیوں کو زبان دے چکا ہے"— یہ سنتے ہی حبیب کے غصے کا پارہ چڑھ گیا اس نے لال پیلے ہو کر کہا "اور میں جو تین لڑکیوں کو "ان وائٹ" کر چکا ہوں۔ تمہیں آج کے لئے رمیش سے وعدہ کرنے کو کس نے کہا تھا؟ معلوم ہوتا ہے تم خود ان سبھوں کو لیکر جانا چاہتے ہو؟" یہ سب کالج جانے سے پہلے کی باتیں ہیں۔ کالج سے واپس آنیکے بعد ہم دونوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا پھر پنکھا کھول کر سو گیا۔ تین بجے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور تمہارے پاس کے لئے جانے کی غرض سے کپڑے پہننے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کپڑوں کا بکس غائب ہے اور میز پر یہ خط پڑا ہوا ہے۔

مسٹر نذیر!

تم نے مجھے بہت بُرا جھڑک دیا جس کی سزا یہ ہے کہ میں تمہارے کپڑوں کا ٹرنک اور تمہارے باہر پڑے ہوئے تمام کپڑے میں اپنے کمرے میں بند کر کے جا رہا ہوں اور دروازے میں جو تالا لگا رہا ہوں وہ چھ لیور کا ہے۔ اس کا ٹوٹنا یا کسی دوسری کنجی سے کھلنا ناممکن ہے لہذا اس طرح کی کسی کوشش کی عقلمندی نہ کرنا۔ میں نوکر کو ساتھ لیکر ان "تینوں" کے پاس جا رہا ہوں۔ اگر وہ راضی ہو گئیں تو ہم شالامار باغ میں پکنک کے لئے چلے جائینگے اور جب تک تم سینما سے آؤ گے ہم بھی واپس آ جائیں گے"

تمہارا حبیب

نذیر نے ہنستے ہوئے خط کو میری طرف پھینک کر کہا۔ اب تمہیں بتاؤ میں تمہارا پاس لینے کیسے جاؤں؟ کمبخت نے ایک کپڑا بھی تو نہیں چھوڑا میرے بدن پر بس یہی ایک کرتہ ہے"

مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی میں نے کہا "تو بتاؤ اب کیا کرنا ہے —"؟

کرنا کیا ہے؟ کہیں سے سوٹ لا دو۔ میں پہن کر جاؤں۔ پاس لا دوں"

"اب میں کپڑے کہاں سے لاؤں۔ ہوسٹل جاؤں تو آمد و رفت ہی میں ایک گھنٹہ لگ جائے"

"تو یہ کیوں نہ کرو۔ اپنا سوٹ دیدو میں جا کر پاس لا دوں"

"مرتا کیا نہ کرتا۔ وقت بھی کم تھا اور پاس کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا مجھے مجبوراً نذیر کی بات ماننی پڑی۔ میں نے اپنا سوٹ اتار کر اسے دیدیا اور اسکا تنگ کرتہ کسی طرح اپنے بدن پر چڑھا لیا۔ میں نے نذیر سے کہا۔ دیکھو شو کا وقت ہے۔ تانگہ لے لو اور جہاں تک ہو سکے جلد واپس آنے کی کوشش کرنا"

نذیر کے جانے کے بعد دروازہ بند کر کے میں اسکا انتظار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ چھ بج گئے مگر نذیر کا پتہ نہ تھا۔ میں سوچنے لگا آخر وہ لڑکیاں میری نسبت کیا رائے قائم کریں گی انہوں نے کہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کسی مرد کو نہ لائیں گی۔ ایسی حالت میں وہ بھیڑ میں ٹکٹ کس طرح خرید سکیں گے۔ ضرورت تھی کہ کم سے کم میں سینما جا کر ان لڑکیوں سے معافی مانگتا لیکن جانا کیسے؟ اس وضع میں؟ میرے کمرے کی کنجی کوٹ کی جیب میں تھی جسے نذیر پہن کر چلا گیا تھا۔ اس لئے بورڈنگ میں جا کر دوسرا سوٹ پہننے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔

میں نے نذیر کے کمرے کی تلاشی لینی شروع کی لیکن نام کو بھی کہیں کوئی کپڑا نہ تھا صرف اس کے بستر پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ اب مجھے نذیر پر شک سا ہونے لگا مجھے یاد آیا کہ وہ پائجامہ بھی تو نہیں پہنے ہوئے تھا یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سوتے میں حبیب نے اسکا پائجامہ بھی اتار لیا ہو۔ مجھے اس کے متعلق نذیر سے پوچھنا چاہئے تھا لیکن پاس کی فکر میں میرا خیال بھی اس طرف نہیں گیا۔

جب چھ بج گئے اور نذیر واپس نہ آیا تو میں نے سوچا۔ اب بہرحال یہاں سے نکلنا چاہئے چنانچہ میں نے اس کے پلنگ کی چادر سے دھوتی کا کام لیا اور اچھا خاصہ کارٹون بن کر سینما کی طرف روانہ ہوا۔ تماشے کا وقت قریب تھا۔ سینما گھر کے باہر خوب بھیڑ تھی نذیر کو دیکھا ایک طرف وہ بھی تینوں لڑکیوں کو ساتھ لئے ان سے باتیں کر رہا تھا۔ شریر نے

باقی بر صفحہ ۵۱

ایشیائی انصاف کی ایک جھلک

سچی واقعہ افسانہ کے رنگ میں — از جناب عروج زیدی بدایونی — مست قلندر کے افسانہ نمبر کیلئے

غزنوی سلطان کا یہ واقعہ مشہور ہے — ایک فریادی نے یوں دربار میں رو کر کہا
اے کہ تیری مملکت میں عدل کا دستور ہے — مجھ پریشاں حال کو جور و تشدد سے بچا
اک شرابی کا ہمیشہ خوف رہتا ہے مجھے
میرے گھر میں گھس کے سخت و سست کہتا ہے مجھے

فوج کا افسر ہے یا وہ قوم کا سردار ہے — اس کی عیاشی و نخوت الامان و الحفیظ
اس کے ہاتھوں گھر کا گھر اب جان سے بیزار ہے — اس کی بد چلنی سے رغبت الامان والحفیظ
اپنی بیوی اور لڑکی سے میں رشتہ توڑ دوں
اس کا یہ منشا ہے گھر اسکے لئے میں چھوڑ دوں

جوش غیرت دیکھ کر میرا وہ ہنس دیتا ہے یوں — جیسے اس کو بادشاہ وقت کا کچھ ڈر نہیں
بجلیاں جب روز دل پر گریں تو کیا کروں — عہد میں تیرے کہیں مجھ سا کوئی بے پر نہیں
رحم کن بر حال ما، ظل الٰہی زندہ باد
اے شہنشاہ زمن اقبال تو پائندہ باد

داستان بیکسی کچھ اتنی پر تاثیر تھی — پڑ گئی محمود کے ماتھے پہ غصہ سے شکن
دے کے انعام اسکو ان الفاظ میں تسکین دی — اے کہ تجھ پہ ناز کرتا ہے شرافت کا چلن
اب کبھی آئے اگر گھر میں ترے وہ بے شعور
جس طرح ممکن ہو تو مجکو خبر دینا ضرور

تیسری شب گھر میں پھر آیا وہ با جاہ و جلال — دی گئی شاہی محل میں اس کے آنے کی خبر
چل دیئے سلطان ساتھ اس کے بصد جوش و ملال — چار خادم لے کر اپنے ساتھ با تیغ و سپر
دل رعایا کی محبت سے جو مالا مال تھا
فرض کے احساس پہ غصہ سے چہرہ لال تھا

پہونچے ڈیوڑھی پر تو اپنے ایک خادم سے کہا — سب سے پہلے یہ ضرورت ہے کہ گل کر دو چراغ
لیکن اس موذی سے تم بچتے ہوئے رہنا ذرا — جس کا باطل زعم سے عرش بریں پر ہے دماغ

آ گیا میں اس کی نخوت کو مٹانے کے لئے
وہ سزا دونگا جو عبرت ہو زمانے کے لئے

دیکھا تاریکی میں یہ سلطانِ والاجاہ نے — اس کے خادم سے مقابل ہو رہا ہے وہ جواں
بڑھ کے شمشیر دودم کا ہاتھ مارا شاہ نے — خاک پر تھا خاک کا اِک ڈھیر بے نام و نشاں

نامرادی کے تھے بادل لاش پر چھائے ہوئے
کبر و استبداد بھی تھے دل میں شرمائے ہوئے

لاش کو جب روشنی میں دیکھا فرمانے لگے — تو ہی وہ ہے جس کو اپنی زندگانی بار تھی
ہائے جامِ مرگ تجکو نوجوانی میں ملے — غالباً تیری جوانی تجھ سے خود بیزار تھی

اس پہ کیوں نازاں تھا اے خانہ خرابِ زندگی
زندگی دراصل ہے موجِ سرابِ زندگی

بعد اظہارِ تاسف شکر کا سجدہ کیا — اور اپنے خادموں سے اس طرح گویا ہوئے
زیر ہو سکتی نہیں اب مجھ سے دیوِ اشتہا — یہ ضرورت ہے کہ کھانا جلد تر مجکو ملے

جتنی جلدی ہو سکے خاصہ یہاں لے آؤ تم
مختصر یہ ہے کہ رہوارِ ہوا پر جاؤ تم

کھانا کھا کر شاہِ عادل گھر کو جب چلنے لگے — صاحبِ خانہ نے بڑھ کر دست بستہ عرض کی
گو ترے الطاف سے سب کام میرے بن گئے — صدقہ اپنے لطف کا دے مجکو اس سے آگہی

گُل کرایا کس لئے جلتا ہوا گھر کا چراغ؟
کس لئے سجدہ کیا کیوں بھوک کا تھا دلپہ داغ؟

شاہ نے فرمایا اس کی خودسری کو دیکھ کر — مجکو یہ ڈر تھا کہیں وہ میرا لڑکا تو نہیں
اس کے استقلال اور ایذا گری کو دیکھ کر — یہ گماں ہو نچا ہوا تھا میرا تا حد یقیں

عہد تھا اس وقت تک بندہ نہ کھانا کھائیگا
دوش سے جب تک نہ اس کا سر جدا ہو جائیگا

الفتِ فطری کہیں مانع نہ ہو انصاف سے — اسلئے خادم سے میں نے گل کرایا تھا چراغ
کر کے اسکو قتل میں نے شکر کے سجدے کئے — فرض کی تکمیل سے دل ہو رہا تھا باغ باغ

سب سے بڑھ کر یہ خوشی تھی وہ مرا لڑکا نہ تھا
شکر ہے اس کا چراغِ زندگی بھڑکا نہ تھا

جو سمجھتے ہیں اُسے جنگ و جدل کا پیشوا
دُوسرا رُخ دیکھیں وہ محمُود کی تصویر کا

(غیر مطبوعہ) (ترجمہ)

ناکام آرزوئیں

جمالی کی ڈائری

از جناب غلام جیلانی ہاشمی سیکرٹری انجمن اردو ادب لکھنؤ

۲۲ رمئی ۳۹ء

علی گڈھ سے بی اے کا امتحان پاس کر کے مسرتوں اور خوشیوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے لکھنؤ اسٹیشن پر اترا۔ میری چھوٹی بہن نسرین اپنی ایک سہیلی کے ساتھ متجسس نظروں سے کسی آنے والے کا انتظار کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی بے اختیار جذبہ مسرت کو دباتے ہوئے میں نے پکارا ——

"نسرین —— !

"جمالی بھیا —— تم آگئے" نسرین ہنستے ہوئے بولی "مبارک ہو بھیا —— بی اے کی ڈگری۔ بھیا میں نے تو ساری گاڑی دیکھ ڈالی لیکن تم کہیں بھی نظر نہ آئے میں نے بھی نواں درجہ پاس کر لیا ہے" وہ اپنی لاانتہا خوشیوں کے ساتھ نہ جانے کیا کیا سوال کر گئی۔ پھر خود ہی مسکراتے ہوئے بولی "اوہ! میں تو بھول ہی گئی —— آپ ہیں روحی" اپنی سہیلی سے تعارف کراتے ہوئے وہ بولی "میری کلاس فیلو اور خاص سہیلی۔ اور یہ ہیں میرے بھائی جمالی"

روحی —— کوئی اٹھارہ سال کی عمر۔ غزالوں کو شرما دینے والی سیاہ آنکھیں گالوں پہ شہابی رنگ —— جارجٹ کی ساڑی زیب تن کئے ہوئے شوخ و حیا نظریں متعدد بار اٹھیں اور میری نظروں سے ٹکرا کر زمیں بوس ہو گئیں۔ میرے پرسکون دل کی دنیا میں ہلچل مچا دینے کیلئے یہی کیا کم تھیں اور اس پر قیامت یہ ہوئی کہ جب اس نے ایک کالج گرل کی طرح تیزی سے شیک ہینڈ کیا تو ایک بجلی تھی جو سارے بدن میں سرایت کر گئی۔ میں بالکل مدہوش ہو چکا تھا۔ اور میرے کان صرف اتنا سن سکے۔

"مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"

نہ جانے میرے منہ سے گھبراہٹ میں کیا کیا نکل گیا جس پر نسرین اور روحی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ شرمندگی سے میری پیشانی پر میری پیشانی پر پسینے کے چند قطرات جھلک آئے جنہیں رومال سے خشک کرنے لگا۔

(۲)

۲ رجون ۳۹ء

آج نسرین نے میری اور اپنی کامیابی کی خوشی میں اپنی سہیلیوں کی ایک پارٹی کی تھی صبح ہی سے نسرین میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ بھیا آج تمہیں کچھ تھوڑی سی تقریر کرنا پڑیگی۔ میں نے لاکھ بہانے کئے اور عذر پیش کئے لیکن وہاں کس کی چلتی ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح میں لڑکیوں کے ہجوم میں تقریر کر سکتا ہوں۔ اچھا کہونگا کیا ——؟ کہنے کا کیا طریقہ ہوگا —— ہاں یوں کہونگا —— اس طرح شروع کرونگا۔ بعد میں یوں شکریہ ادا کرونگا لیکن پھر جب خیال آتا کہ اگر لڑکیاں ہنس دیں تو ——؟ بس یہ سوچکر گھبرا اٹھتا۔ مگر ایک خیال تھا جس نے تقریر کرنے پر مجبور کر دیا —— وہ روحی کا خیال تھا کہ وہ بھی تو جلسہ میں ضرور شریک ہوگی —— خیر میں نے ایک مختصر تقریر نہایت دلکش پیرایے میں تحریر کی اور دن بھر آئینہ کے سامنے مشق کرتا رہا۔

پائیں باغ میں جلسہ کا انتظام تھا۔ کوئی بیس پچیس لڑکیاں عمدہ عمدہ زرق برق پوشاکوں میں ملبوس کرسیوں پر آ آکر بیٹھنے لگیں۔ آج روحی تو بہترین قسم کی گلابی ساری باندھے ہوئے ادھر سے ادھر تیتری کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ اور میری نظریں اوپر کے جھروکے سے ہو کر سایہ کی طرح روحی کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

پارٹی ختم ہونے کے بعد مجھے طلب کیا گیا۔ آج میں عمدہ قسم کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اسٹیج پر آیا تو تمام جلسہ گاہ تالیوں سے گونج اٹھی۔ پہلے تو زبان سے جھجک کے مارے کچھ بھی نہ نکلا لیکن دماغ پر زور دینے سے رٹی ہوئی تقریر کا سرا ہاتھ آ ہی گیا۔ دوران تقریر میں روحی سے نگاہیں ملیں اور ایک جگہ کہتے کہتے رک گیا اور رکا بھی ایسا کہ آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ لاکھ دماغ پر زور دے رہا تھا مگر بدقسمتی کہ یاد ہی نہ آتا تھا کہ کہاں سے چھوڑا تھا اور کہاں سے کہنا ہے

اس پر طرہ یہ کہ لڑکیوں کے آوازے رہے سہے حواس بھی تشریف لے گئے۔ آخر گھبرا کر معافی مانگتا ہوا اپنے کمرے میں بھاگ آیا۔

میرے بعد جو بھی رائے قائم کی گئی ہو اس سے بحث نہیں لیکن جلسہ کے اختتام پر نسرین و روحی اور ان کے ساتھ ایک سہیلی کمرہ میں وارد ہوئیں۔

"واہ بھائی جان ——— اچھی تقریر کی۔"

نسرین نے طنزاً فقرہ ادا کیا اور تینوں لڑکیاں قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔ ندامت کے مارے منہ سے کوئی لفظ بھی نہ نکل سکا نسرین خود ہی بولی۔

"ریحانہ کو آپکا طرز تقریر بہت پسند آیا۔ یہ آپ سے ملنے آئی ہیں"

میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ ریحانہ کے چہرہ پر شرارت کھیل رہی ہے۔ بہت کوشش کے بعد میں بولا۔

"آپ کی ہمت افزائی کا شکریہ۔ مگر یہ میرا پہلا اتفاق تھا" اور اس کے بعد میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"کچھ بھی ہو میں داد دئے بغیر نہیں رہ سکتی ماسوا اس کے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"۔ ریحانہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں بھی آپ سے شرف ملاقات حاصل کر کے بہت مسرور ہوں" میں نے جواب دیا۔

(۳)

۸ر جولائی ۳۹ء

آج مجھے آئے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا ہے روحی کا خیال دل میں اور بھی پختہ ہوتا جارہا ہے۔ وہ میرے تصورات میں بسی ہوئی ہے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنی آئندہ زندگی روحی کے بغیر نہیں گزار سکتا۔ اس درمیان میں وہ بھی برابر آتی رہتی ہے۔ ریحانہ بھی کبھی کبھی آجاتی ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آج میں روحی کے سامنے اپنی تمام بیچینیاں بکھیر کر رکھدوں گا اور ظاہر کردوں گا کہ وہی میرے دل میں سکون پیدا کر سکتی ہے۔

ہلکی ہلکی زرد دھوپ باغ کے اونچے اونچے پیڑوں کی چوٹیوں پر آخری بوسے دے رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوا ننھی ننھی کلیوں سے دبی دبی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ٹہنیوں اور پتوں کی سرسراہٹ ——— نیلے نیلے آسمان پر سفید بادل کے ٹکڑے دوڑ رہے تھے ——— آنے والے خوشگوار لمحات کی یاد اور موجودہ دلکش منظر اور بھی از خود رفتہ بنائے دے رہا تھا۔

میں باغ میں ٹہل رہا تھا کہ ایک پھول میری پشت پر آکر لگا۔ میں سمجھ گیا۔ مڑ کر دیکھا تو روحی مسکراتی ہوئی عشق پیچاں کی بیلوں میں چھپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

آج وہ پیازی رنگ کی ساری پہنے ہوئے تھی اور اس پر وہ ملکوتی حسن اور بھی قیامت برپا کر رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں اور بھی سوا ہو گئیں۔ مگر ہمت کر کے میں اس کے پاس پہنچ ہی گیا۔

"روحی! ایک بات کہوں ——— برا تو نہ مانوگی" میں نے فوارے کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کہو" روحی نے معصومانہ انداز میں جواب دیا ——— "تو سنو روحی! میرے ارمانوں کی دنیا ——— میرے خوابوں کی ملکہ، تم نے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ تم نے پہلے ہی دن میرا صبر و قرار لوٹ لیا تھا" میں نے دیکھا کہ اس کا سر جھکتا جا رہا ہے

"روحی" ——— میری کتنی ہی راتیں تمہارے تصورات کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے بسر ہو چکی ہیں ——— ہر وقت تمہارا ہی خیال بے چین کئے رہتا ہے۔ بولو ——— کیا تم میرے جہان آرزو کو آباد کر سکتی ہو"

میں نہ جانے کیا کیا بک گیا لیکن میں نے دیکھا کہ روحی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

"روحی! اتنا ظلم نہ کرو" میں نے لجاجت سے کہا "میرے تمام دردوں کا علاج تمہی ہو ——— خدا کیلئے بولو ——— کہ تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جگہ ہے کہ نہیں"

آخری جملہ کہتے وقت میری آواز گلوگیر ہوگئی میں نے دیکھا کہ وہ گردن جھکائے کچھ کہنے کیلئے بیتاب تھی مگر زبان نہ کھلتی تھی۔ اسکی آنکھوں میں جذبات کا سمندر لہریں لے رہا تھا جس کو وہ دبانے کی بے انتہا کوشش کر رہی تھی۔ میں نے پھر ایک بار اس کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"روحی ——— صرف ایک لفظ 'ہاں' یا 'نہیں' میں جواب دیدو"

"ہاں ——— جمالی" ابلتے ہوئے سمندر کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا اور سسکیاں لیتے ہوئے میری آغوش میں گر پڑی۔

(۴)

۱۹ر اگست ۳۹ء

روحی اب میرے لئے سب سے عزیز ترین ہستی بن چکی ہے۔ اور مجھے فخر ہے کہ روحی بھی مجھے ایسا ہی عزیز رکھتی ہے۔ وہ میری رگ رگ میں سما چکی ہے۔

باغ کی معصوم فضائیں ——— عشق پیچاں اور بید مجنوں کی ننھی شاخیں ——— خوابیدہ سبزہ اور کمرہ کی خاموش دیواریں ہماری بیباک اور بے لوث محبت کی شاہد ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ روحی میری ہے اور میری ہی رہیگی۔

اس درمیان میں یوں تو کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا ہے لیکن ریحانہ خاص

طور سے روز آنے لگی ہے۔ کل جب میں اپنے کمرہ میں گیا تو دیکھا کہ میرا تمام سامان بکھرا پڑا تھا ــــ پلنگ پر البم کھلا پڑا تھا اور میری تصویر غائب تھی۔ میری کتابیں ادھر اُدھر پڑی تھیں۔ معاً مجھے خیال آیا کہ یہ شرارت روحی کی ہوگی پھر ہنسی آئی کہ اگر اس کو لینا تھی تو مانگ سکتی تھی۔ دریافت کرنے پر روحی نے صاف انکار کیا ــــ معلوم نہیں کہ وہ تصویر کس نے غائب کر لی ہے۔

(۵)

۲۷ر اگست

ریحانہ آج بھی آئی تھی ــــ اس کی آنکھیں جن میں آنسوؤں کے قطرے چھلک رہے تھے، باتیں کرتے کرتے نہ جانے اس کی پلکوں پر موتی کیوں لرزنے لگے۔ آج کل وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے اور آج بھی وہ مجھ سے کوئی بات کر رہی تھی تو کھڑکی سے باہر دور ایک بھاگتے ہوئے بادل کے ٹکڑے کا اس کی نگاہیں تعاقب کر رہی تھیں ــــ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں سکتی۔

ہاں جب میں اپنے کمرے میں سونے لیٹا تو ذیل کے مضمون کا خط رکھا ہوا ہے

منزل دل کی صدائیں حسن والے کیا سنیں
میرا پیغام وفا اک دور کی آواز ہے

میرے محبوب جمالی!

معاف کرنا۔ تمہاری توقع کے خلاف تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ آج مدت گذر چکی ہے تمہاری محبت کی خاموش آگ میں جلتے ہوئے ــــ جمالی! کبھی تم نے بھی غور کیا ــــ مگر اس کی تمہیں ضرورت ہی کیا تھی۔

جمالی! مجھے تم سے محبت ہے ــــ یہ آج تم پر ظاہر کئے دے رہی ہوں ــــ جس چنگاری کو آج تک دل کے ایک گوشہ میں دبائے ہوئے تھی، وہ اب میری روح تک کو جلائے ڈالتی ہے اور اسی وجہ سے تم تک اپنا راز پہونچا کر سکون حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کیا جواب دیکر نئی زندگی بخشو گے؟ فقط

وارفتۂ تخیل ــــ ریحانہ

خط پڑھ کر دل کو از حد افسوس ہوا۔ میں نے لکھ دیا۔

" ریحانہ ــــ! معاف کرنا۔ انسان کے پاس ایک ہی دل ہوتا ہے اور وہ تم جانتی ہو کہ جمی کی نذر ہو چکا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ تم کو کیا دوں ــــ یہ بھی معلوم ہے کہ محبت ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی بلکہ دل سے کہوں، ریحانہ! ــــ کہ اب میری محبت تمہارے لئے ناممکن ہے۔ آہ۔ کاش! میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ریحانہ ــــ مگر میرے پاس اب رہا ہی کیا ہے جو تمہاری نذر کروں۔ تم مجھے سنگدل سمجھوگی لیکن افسوس کہ میں مجبور ہوں ــــ ریحانہ! قدرت سے جنگ کرنا نادانی ہے۔ اور قدرت نے اپنا انتخاب کر لیا۔ خط ختم کرتے ہوئے تم سے دوبارہ معافی کا خواستگار ہوں کہ میں تمہاری پاک محبت کو قبول نہ کر سکا۔ والسلام

جمالی

(۶)

۲۹ر اگست

آج تیسرے دن ریحانہ کا دوسرا خط پلنگ پر رکھا ہوا ملا۔ لکھا تھا۔

روح نواز جمالی!

کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئی تھی ایک کلی
رو کے اٹھا رہے ہیں آج پنکھڑیاں ملی دلی

میں جانتی ہوں کہ محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی اس لئے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ــــ محبت اندھی ہوتی ہے ــــ یہ بھی تو تم جانتے ہو۔ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ ہو جانے دو۔ میں نے تم سے تم کو مانگا اور تم نے انکار کر دیا۔ میری پاک محبت کا یہ صلہ۔ میری حسین تمناؤں کی قسمت میں پامال ہونا ہی لکھا تھا۔ میری محبوب آرزوؤں کا حسرتناک خون۔ میری شگفتہ امیدوں کی اتنی خوفناک بربادی۔ کاش میں اپنا سینہ چیر کر تمہارے سامنے رکھ سکتی۔ جمالی اور تم دیکھ لیتے کہ اس میں کیا ہے۔

تم اور تمہاری محبت ــــ میری حسین تمناؤں کی نازک کروٹیں۔

مگر تم اس کے مجرم نہیں ہو اور نہ میں تمہارے سر الزام تھوپتی ہوں۔ یہ تو میری قسمت تھی کاش میں اس پارٹی میں نہ شریک ہوئی ہوتی ــــ اُف وہ برباد کن لمحے۔ کیا ایک دفعہ پھر واپس آسکتے ہیں۔ اچھا چھوڑو بھی ان باتوں کو ــــ تمہیں تکلیف ہوگی۔

رباب دل کے شکستہ تاروں کو چھیڑنے سے، مجھے معاف کرو کہ میں نے تمہاری خلوتوں میں مخل اندازیاں کیں۔ تم مجھے اپنے دل میں جگہ نہ دو ــــ میری محبت کو ٹھکرا دو ــــ مگر آہ! جمالی میں تمہیں نہیں بھلا سکتی کیونکہ اب تم میری روح میں سما چکے ہو اور اب میری زندگی کی آخری سانسیں بھی تمہاری ہی یاد میں گذریں گی میں نے تمہیں اپنا محبوب تصور کر لیا اور ہمیشہ کیلئے اپنے کو تمہارے سپرد کر دیا۔

محروم تمنا ــــ ریحانہ

خط پڑھ کر دل میں ایک دھکا لگا اور ریحانہ کی بدنصیبی اور بے چارگی پر بے حد افسوس ہوا خواہ مخواہ آنکھوں سے آنسوؤں کے

چند قطرے بہہ نکلے۔ دور کہیں آم کے پیڑ پر کوئل اپنی دردناک آواز میں کوک رہی تھی۔ چمکیلی فرحت بخش دھوپ معطر ہوا کے ہلکے جھونکے ــــ ٹہنیوں اور پتیوں کی سرگوشیاں اور ایک خوشگوار سکون ــــ مجھ پر جیسے غنودگی سی طاری تھی۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ جیسے میں نے کوئی جرم کیا ہو۔ کاش میں ریحانہ کی کچھ مدد کرسکتا۔ لیکن افسوس اس نے وہ چیز طلب کی ہے جو میں اپنی زندگی میں کسی قیمت پر بھی نہیں دے سکتا۔

(۷)

۱۴؍نومبر ــــ

میں نے ریحانہ کے خطوط کا تذکرہ روحی سے نہیں کیا کہ کہیں اس کے دل کو ٹھیس لگ جائے۔ کتنے ہی دن گزر چکے ہیں۔ اس درمیان نہ تو ریحانہ ہی نظر آئی اور نہ اس کا تذکرہ زبان پر آیا۔ اب تو اس کی یاد بھی شفق کی سرخی کی طرح بتدریج زائل ہو گئی ہے۔

(۸)

۲؍دسمبر ــــ

آج ایک زبردست الم انگیز واقعہ پیش آیا ــــ شام کے پانچ بجے جب میں کمرہ میں آئینہ کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا ــــ پچھلا دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ ریحانہ ڈگمگاتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی۔ جیسے اس نے بادۂ احمریں پی لی ہو۔ میں نے دیکھا کہ اس کا شہابی رنگ غائب ہو چکا تھا اور اس کے پیلے پیلے رخسار اور بھی بدنما لگ رہے تھے۔ لمبی لمبی پلکوں والی سیاہ اور چمکدار آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں۔ وہ گلاب کی پنکھڑیوں کے سے ہونٹ سفید ہو چکے تھے اس حال میں دیکھ کر زبردست صدمہ گزرا۔ ٹائی چھوڑ کر میں اس کی طرف ہمہ تن گوش ہو گیا نقاہت آمیز آواز میں ریحانہ بولی۔

"جمالی ــــ میں نے دیکھا کہ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی اسلئے میں نے زہر کھالیا ہے"

میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہیں ــــ ریحانہ یہ تم نے کیا کیا ــــ؟ ٹھہرو میں ڈاکٹر کو بلواتا ہوں"

"نہیں نہیں ــــ تم نہ جاؤ ــــ اب دوا فضول ہے۔ مجھے تمہاری تمنا تھی جب تم ہی نہ ملے تو یہ زندگی بیکار ہے"

وہ ننھے اور نازک پودے کی طرح جو تیز اور تند طوفان میں جھومنے لگتا ہے ــــ گرنے لگی۔ میں نے اس کو آغوش میں لے لیا۔ میری آنکھوں میں اس کی بے بسی اور بے چارگی کو دیکھتے ہوئے آنسوؤں کا دریا امنڈ آیا۔

"جمالی ــــ میری تمنا تھی کہ زندگی کی آخری سانسیں تمہاری آغوش میں نکلیں ــــ سو آج پوری ہو گئی ــــ مجھے ایک دفعہ ریحانہ کہہ کر پکارو"

"ریحانہ" میں نے کانپتے ہونٹوں کیساتھ پکارا۔

"مجھے سینہ سے لگالو ــــ" اسکی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی ــــ آخر اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔

"مجھے ایک دفعہ سینہ سے لگالو ــــ مرنے کے بعد تربت پر کبھی کبھی ــــ آکر ــــ دو آنسو ــــ بہا جانا ــــ سکون مل جائے گا۔ اچھا ــــ رخصت پیا ــــ رے ــــ جما ــــ لی"

رباب کے زنگ آلود تار ایک آخری مگر پُردرد جھنکار کے ساتھ ہمیشہ کیلئے ٹوٹ گئے۔ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ آنسوؤں کا ابلتا ہوا سیلاب میری آنکھوں سے بہہ نکلا ــــ میں نے اس کی حسرت بھری آنکھوں کی طرف دیکھا جو زبان حال سے کہہ رہی تھیں کہ میری امیدیں ہمیشہ کیلئے مایوسی کی گود میں سوگئیں۔ ایک بار پھر اس کو سینہ سے لگایا اور کمرہ سے باہر چلا گیا۔

(۹)

۴؍دسمبر ــــ

آج میری امیدوں اور ارمانوں کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ روحی کا خط ملا۔ لکھا تھا۔

جمالی آخری سلام لو

کل شام تمہارے یہاں حسب معمول گئی۔ ــــ کمرہ میں جھانک کر دیکھا۔ اُف کس طرح بیان کروں کہ میں نے اپنی آرزوؤں کا خون کس طرح ہوتے دیکھا۔ تم ریحانہ کو آغوش میں لئے ہوئے تھے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ دیکھ سکی اور الٹے پاؤں واپس آگئی۔ اُف تم نے میری محبت سے کھیلنا چاہا۔ آہ! کاش تم مجھ سے پہلے ہی کہہ دیتے مگر نہیں یہ تو میری قسمت ہی میں لکھا تھا۔ ــــ جاؤ ــــ تمہیں ریحانہ کی آغوش مبارک ہو ــــ اور تم دونوں ــــ سدا ان بہاروں کی کیف زائیوں میں کھوئے رہو۔ مگر میرے خواب ــــ میرے نازک خوشگوار خواب کس بیدردی سے پامال ہوئے یہ کچھ میں ہی جانتی ہوں یا میرا مجبور دل ــــ مجھے معاف کرنا اگر ناگوار خاطر گذرے کیونکہ میں اب بستر مرگ پر آخری سانسوں کی منتظر ہوں۔ تمہارے اور ریحانہ کے درمیان کانٹا بن کر تمہاری مسرتوں میں رنج کا عنصر شامل کرنا نہیں چاہتی۔ اس لئے میری اس ناچیز قربانی کو قبول کرو ــــ اچھا ہوا ــــ موت کے ابدی سکون کی خاموش گود میں غم و درد سے سرفراز ہوجاؤں گی۔ مگر تمہاری یاد

دہاں بھی ان پُرسکون لمحوں میں تڑپا جگی۔
آہ قسمت۔

تمہاری بدنصیب ــــ روحی

میرے ہاتھوں میں دونوں کے خط ہیں۔ اپنی بےبسی اور بےچارگی پر رونا چاہتا ہوں مگر رو نہیں سکتا ــــ آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ گویا قیامت کی بلاخیز تپش سے سوتا ہی خشک ہو گیا ہو۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں اب کیا کرونگا ــــ کیونکہ میری دُنیا اندھیر ہو چکی ہے۔ میری تمناؤں کی دُنیا ہمیشہ کیلئے اجاڑی جا چکی ہے اور اب ؎

ظلمت شب میں سراب آرزو روپوش ہے
میں نے پاکر کھو دیا کچھ صرف اتنا ہوش ہے

میری ڈائری مکمل ہو گئی ہے اور اب مستقبل قریب میں میری بھی مگر ناکام محبت بھی دنیا کیلئے افسانہ بن کر رہ جائیگی۔

ــــ جمالی

دِلچسپ فریب

(بقیہ صفحہ ۴۲)

میرا سوٹ نہ جانے کہاں ڈال دیا تھا اور اپنا سب سے عمدہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو اپنی طرف بلایا۔ لڑکیاں مجھے اس عجیب وضع میں دیکھکر بیساختہ مسکرا پڑیں۔ میں ان سے معافی ہی مانگنے جا رہا تھا کہ نذیر نے کہا: "تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں میں نے ان سے تمہاری مجبوریوں کا حال کہہ دیا ہے میں انہیں سینما دکھا دونگا تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"۔ ایک دوشیزہ نے بھی کہا "ہاں مسٹر جلیل مجھے سب باتیں معلوم ہو چکی ہیں۔ آپکی بڑی مہربانی کی جو نذیر صاحب کے ہاتھ ہمارے لئے پاس بھیج دیئے۔ آپ نے ناحق آنے کی زحمت گوارا کی"۔

"لیکن ..." میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ نذیر نے لڑکیوں سے کہا۔ "اچھا چلیئے اوپر باکس میں چلیں اب کھیل شروع ہونیوالا ہے"۔ لڑکیاں آگے بڑھ گئیں نذیر نے کسی قدر رک کر مجھ سے کہا "تمہیں پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں یہ لو کنجی تمہارا سوٹ جیب کے کمرے میں ہے نکال لینا"۔

قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں نذیر بھاگ کر ان لڑکیوں کے پاس پہنچ گیا اور آن کی آن میں سب کے سب نظروں سے غائب ہو گئے میں پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہوا لوٹا۔ نذیر نے مجھے کس طرح احمق بنایا وہ نہ جانے اس نے لڑکیوں سے کیا کہا اور مجھے پوچھنے تک کا موقع نہ دیا۔

ہندوستانی سنیاسیوں کی جگر پارے

لاکھ لاکھ کی قیمت کا ایک ایک نسخہ!

اکسیر کمند یعنی کثرت حیض کی جادو اثر دوا

گندم برنگ سرخ گرم توے پر ڈال کر کوئلہ بنالیں اور برابر وزن کھانڈ ملاکر باریک کرلیں اور اس کو جگر کا ٹکڑا خیال کرکے ڈبیہ میں بند رکھیں بس جادو اثر دوا تیار ہے۔ طریقہ استعمال بوقت ضرورت خوراک ۲ ماشہ۔ یہ دوا ایک ماشہ سفوف ملٹھی اور دو رتی سفوف کہربا ملاکر ہمراہ شربت انجبار یا سادہ پانی سے دیں بحکم خدا دو یا تین خوراک میں شفائے کلی حاصل ہوگی۔ (گوردیو سنگھ)

سانپ کاٹے کی عجیب دوا

یہ دوا ایک ایسے شخص کی ہے جو کہ سو پچاس زہریلے سانپ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ چاہے سانپ کیسا زہریلا ہو فوراً اسے پکڑ لیتا اور زبردستی کٹوانے کے لئے اپنے جسم پر لگاتا تھا۔ مگر سانپ کو اس کے جسم کے سونگھتے ہی کچھ ایسی نفرت ہو جاتی کہ وہ کاٹنا تو در کنار اسے چھونا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ بہت کوشش سے یہ دوا حاصل کی گئی اور پندرہ بیس مرتبہ ہم نے خود اسکی آزمائش کی اور بے خطا پایا:۔

نسخہ:۔ ریٹھہ ۲ تولہ۔ چرہٹی ۵ تولہ۔ نوشادر ایک ماشہ خالص اور بڑھیا ریشم کا کپڑا ایک تولہ۔ کپڑے میں ہر سہ اشیاء کی پوٹلی بناکر کوئلوں کی آگ میں (جس میں دھواں نہ ہو) جلالیں۔ جب جل کر دھواں بند ہو جائے۔ تب آہستہ سے اٹھالیں اور پیس کر تین پڑیہ بنالیں گھی میں ایک پڑیہ ملاکر گھنٹہ گھنٹہ بعد چٹائیں اور اس سے تھوڑی دوا زخم پر لگائیں۔ ضرور آرام ہوگا۔ اس شخص کا کہنا تھا کہ میں بیس سال سے یہ دوا اپنے منہ میں رکھتا ہوں میرے پسینہ کی بو سے سانپ بھاگ جاتے ہیں۔ اور بیمار کو تندرست کرنے کے لئے تو میرے منہ کا لعاب ہی کافی ہے

سرخ مرہم

یہ وہی مرہم ہے جو پانچ دس نہیں کروڑوں مریضوں پر آزمائی جاچکی ہے

یہ مرہم نہیں جادو ہے۔ جس سے بیشمار امیر غریب سیٹھ ساہوکار جو ڈاکٹری دواؤں سے مایوس ہو گئے تھے۔ مستفید ہو چکے ہیں۔ نسخہ مندرجہ ذیل ہے:۔

نسخہ:۔ پھٹکری سرخ۔ سہاگہ بریاں۔ ہر ایک بیس تولے باریک کرکے کپڑچھان کرلیں اور ایک سیر خالص تل کے تیل میں ملاکر سات روز تک متواتر کھرل کریں بس مرہم تیار ہے:۔

اس مرہم کو کپڑے پر لگاکر زخم و پھوڑوں وغیرہ پر چپکا دیں تمام مواد نکال کر زخم کو خشک کر دیتی ہے اور چند دنوں کے اندر بالکل اچھا کر دیتی ہے

شعرائے مست قلندر

غزل

آرام جاں نہیں خلشِ جسم وجاں تو ہے … وہ مجھ پہ مہرباں نہیں نامہرباں تو ہے
مانا قفس میں پیشِ نظر آشیاں نہیں … دل میں خیالِ برہمیِ آشیاں تو ہے
سودوزیاں سے دور دلِ مبتلا سہی … بیگانۂ کشاکشِ سود وزیاں تو ہے
نغمہ نہیں جو دل کیلئے نالہ ہی سہی … یعنی شریکِ حالِ غمِ جاوداں تو ہے
مجبوریاں ہزار سہی راہِ عشق میں … دل بے نیاز حاصل عمرِ رواں تو ہے
اُن کے حضور کہہ نہ سکا کچھ زباں سے … ہر چند جانتا ہوں کہ منہ میں زباں تو ہے
ذوقِ سجود! حاصلِ سجدہ نہیں ضرور … نقشِ جبیں نہیں نہ سہی آستاں تو ہے
عارفؔ ضرور کیا ہے جو ہو عالم آشکار … بس ہے کہ رازِ غم کا کوئی رازداں تو ہے

از جناب عارف عباسی [illegible]

[illegible]

وہ رنگین لمحے جو یاد آرہے ہیں … مجھے آج رہ رہ کے تڑپا رہے ہیں
وہ مہکے نظارے وہ مبہم اشارے … مجھے یاد آآکے گرما رہے ہیں
یہ کیا گُل کھلاتے ہو میرے تصوّر … ابھی آرہے تھے ابھی جا رہے ہیں
یہ شبنم نہیں ہے یہ اب آب ہے گل … وہ سارے گلستاں کو شرما رہے ہیں
یہ رونا، یہ موتی پرونا، چہ معنی؟ … مرے دل کی آتش کو بھڑکا رہے ہیں
وہ بربط سنبھالے، وہ زلفیں بکھیرے … سرِ بزم کیا سحر فرما رہے ہیں
یہ برّاق بادل، یہ پُرکیف جھونکے … مے و نکہت و نور برسا رہے ہیں
وہ بھولے فسانے، وہ گزرے زمانے! … مرا دل، مری روح پر چھا رہے ہیں
کسی کو مرے حالِ محزوں سے مطلب … خطا کر رہے ہیں سزا پا رہے ہیں
تخیّل ہے جلوؤں کا اعجاز اعظمؔ … سرِ بزم اگر آج ہم چھا رہے ہیں

از جناب اعظم انصاری [illegible]

[illegible]

وہ آئے برقِ حسن گراکر چلے گئے … قلب وجگر میں آگ لگاکر چلے گئے
رنگِ قبول پا نہ سکی کوئی التجا … ہر التجائے شوق مٹاکر چلے گئے
مستِ شباب ان کی نگاہوں کا التفات … اک خواب پرسرور دکھاکر چلے گئے
وہ اُن کا مسکرانا باندازِ دل کشی … پھر خرمنِ سکون جلاکر چلے گئے
ان آنکھوں سے غم کا اثر کچھ نہ ہو سکا … آئے تھے وہ ستانے ستاکر چلے گئے
کتنا حسیں فریب ہے قربان جائیے … پھر نغمۂ امید سُناکر چلے گئے

از جناب خواجہ محمد [illegible]

غزل

چین مجھے نصیب ہو، دل کو مرے قرار ہو … تیرِ نگاہِ ناز کا ایسی ادا سے وار ہو
آپ بتائیں کس طرح ضبط کرے وہ آہ کو … اپنے دلِ خراب پر جس کو نہ اختیار ہو
یاس سہی، الم سہی، درد سہی، بلا سہی … کوئی تو شامِ غم مرا مونس وغمگسار ہو

از جناب کامل [illegible]

حالِ دلِ خراب کا جا کے سُنا تو آئیں ہم
اس سے نہیں غرض نہ ہو یا انہیں اعتبار ہو

کیا وہ سُنیں گے حالِ دل کاملؔ بیقرار کا
عشق میں جس کا نام تک لینا بھی ناگوار ہو

تکلیفِ انتظار

دل پر اپنے جب اعتبار نہ ہو
چشم کیوں کر پھر اشکبار نہ ہو

اک اشارے پہ جان و دل صدقے
آزما لو جو اعتبار نہ ہو

اس کو وحشت کا تکملہ سمجھو
جب گریباں میں کوئی تار نہ ہو

ایسا وعدہ بھی کوئی وعدہ ہے
جس میں تکلیفِ انتظار نہ ہو

باتوں باتوں میں لے گئے دل کو
پھر یہ تاکید بے قرار نہ ہو

کیا یقین آئے اُن کی قسموں پہ
جن کی باتوں کا اعتبار نہ ہو

دل کی حالت تباہ رہتی ہے
ان سے جبتک نگاہ چار نہ ہو

دل کی حالت کو پوچھنے والے
تجھ سے کہدوں جو ناگوار نہ ہو

یوں زبیریؔ مری طرح کوئی
دل لگا کر ذلیل و خوار نہ ہو

از جناب محمد حسن زبیری (علیگ)

معراجِ شوق

موجِ خیال بن کے بہا جا رہا ہوں میں
احساس کی بھی حد سے بڑھا جا رہا ہوں میں

سب مشکلیں ہیں سہل تصور میں آپ کے
طوفان میں بھی ہنستا چلا جا رہا ہوں میں

یہ کس کا شوقِ دید لئے جا رہا ہے یوں!
رفتار میں ہوا سے سوا جا رہا ہوں میں

سب سہہ رہا ہوں میں کسی کافر کے واسطے
حالانکہ فرطِ غم میں گھلا جا رہا ہوں میں

میں جانتا ہوں اس کی تغافل شعاریاں
پھر بھی اسی پہ دل سے مٹا جا رہا ہوں میں

پاسِ ادب بھی، ذوقِ عبادت بھی دیکھئے
سجدے نظر سے کرتا چلا جا رہا ہوں میں

تاروں کی چھاؤں میں کبھی دل کا ہوا تھا مول
قسمت کی تیرگی میں گھرا جا رہا ہوں میں

کشتی کو اپنی چھوڑ کے طوفانِ عشق میں،
اللہ کے بھروسے چلا جا رہا ہوں میں

رہ کر تصورات کی دنیا میں رات دن
خود عالمِ خیال بنا جا رہا ہوں میں

تنکے کی طرح بحرِ تصور میں ہوں رواں،
جس سمت بہہ چلا ہوں بہا جا رہا ہوں میں

شمعِ امید دستِ جنوں میں لئے ہوئے
طوفاں کی طرح بڑھتا چلا جا رہا ہوں میں

اب پائے شوقؔ سرحدِ لغزش کے ہے قریب
ساقی! مجھے سنبھال گرا جا رہا ہوں میں

از جناب شوقؔ کھنڈوی سیکرٹری بزمِ اقبال

غزل

قتلِ عاشق گر نہیں صاحب نہیں درکار ہے
کیوں ہے پیشانی پہ بل کیوں ہاتھ میں تلوار ہے

قطرۂ شبنم نہیں اوراقِ گل پر دُر فشاں
اشک آلودہ کسی محبوب کا رخسار ہے

اک ستم خارِ محبت، اک غضب جورِ رقیب
اک دلِ بیمار پر دو آفتوں کا بار ہے

تو ہے اک ایسی سحر جسکو کہ ضد ہے شب کیساتھ
میں اک ایسی شب ہوں جسکو اک سحر درکار ہے

جب کبھی آتا ہے منہ پر ڈال لیتا ہے نقاب
چھان کر وہ مجھ کو دیتا شربتِ دیدار ہے

ہو گیا صمصامؔ پر برہم ذرا سی بات سے
اے صبا آہستہ چل نازک مزاجِ یار ہے

از جناب بشیر احمد صمصام مستونگ

جامِ کوثر

کہتا ہوں بار بار دلِ بیقرار سے
باہر نہ ہو خدا کیلئے اختیار سے

اللہ سمجھے اس نگہِ شرمسار سے
محروم کر دیا مجھے صبر و قرار سے

ہے راز دار یہ کسی رشکِ بہار کی
میں دل کا حال کہدوں نسیمِ بہار سے

راہِ نجات عشق و محبت یہی تو ہے
سیدھے عدم کو جائینگے ہم کوئے یار سے

از حضرت کوثر میرٹھی

مانا مرے گناہوں کی گنتی نہیں کوئی
ہیں تیری رحمتیں بھی تو باہر شمار سے

وہ کہہ رہے ہیں صبر و تحمل سے کام لو
باہر ہے اختیار مرے اختیار سے

بیچین ہو رہا ہوں چمن میں سبب ہے کیا؟
بو کس کی آ رہی ہے گل نوبہار سے

چشم غضب سے مجھ کو نہ محشر میں دیکھنا
دل کانپ جائیگا نگہ پر شرار سے

گو تنہا نہیں زباں کو یارائے گفتگو
کیا حال زار کہیئے کسی غمگسار سے

رنگ لایا مضطرب رہنا دل برباد کا
فرش سے تا عرش پہنچا سلسلہ فریاد کا

کیوں کروں رسوا محبت میں مذاق عشق کو
کیوں زباں پر آئے شکوہ آپکی بیداد کا

رہ گئی شرم محبت مل گیا دل کو سکوں
لے لیا احسان سر پر خنجر جلاد کا

داد لونگا داور محشر سے صبر و ضبط کی
نقش ہے دل پر مرے عالم تری بیداد کا

آئے ہیں وہ اپنے پامال نظر کو دیکھنے
اللہ اللہ کیا اثر ہے نالہ و فریاد کا

عشق کے صدمات لامحدود سہنے کیلئے
قلب پتھر کا کلیجہ چاہیئے فولاد کا

خاک میں مل کر محبت رنگ لائیگی مری
چاند بن جائیگا ہر ذرہ دل برباد کا

روز ہوتا ہے ستم ایجاد اک میرے لئے
یہ بھی لطف خاص ہی مجھ پر ستم ایجاد کا

حسن شیریں وجہ بربادی ہوا کچھ اس طرح
خود رہا فطرت کو غم ناکامی فرہاد کا

حضرت منظر نے صابر مجھ کو شاعر کر دیا
میرے سر پر حشر تک سایہ رہے استاد کا

گود کے بچوں کو پرورش کرنے اور موٹا تازہ بنانے کا طریقہ

دھیان دینے کے قابل ضروری باتیں

(۱) بچوں کو صاف ستھرے کپڑے پہنانا چاہیئے۔ (۲) بچوں کے پہننے کے کپڑوں کو روزانہ صابون سے دھو ڈالنا چاہیئے۔ (۳) بچوں کو کھلی ہوا میں رکھنا چاہیئے۔ خراب جگہ کھیلنے کو نہ بھیجے جائیں۔ (۴) بچوں کو مٹی وغیرہ کھانے کی عادت کبھی نہ ڈالنا چاہیئے۔ (۵) بچوں کو دست صاف ہوتا ہے یا نہیں اس کا ہمیشہ دھیان رکھنا چاہیئے۔ (۶) بچوں کو ایک سال تک اناج کھانے کو نہ دینا چاہیئے۔ (۷) بچوں کو ثقیل یعنی قبض کرنیوالی غذا کبھی نہ دینا چاہیئے۔ (۸) بچوں کو ٹیکہ ضرور لگوانا چاہیئے۔ اس سے چیچک نہیں نکلتی۔ (۹) بچوں کو چیچک وغیرہ چھوت کے امراض سے دور رکھنا چاہیئے۔ (۱۰) بچوں کو گائے کا دودھ جس قدر ہضم ہو سکے دینا چاہیئے۔ (۱۱) بچوں کو زیادہ میٹھی چیزیں بھی کھلانے سے تندرستی خراب ہوتی ہے۔

ہم اور ہماری اولاد

ہر ایک انسان کے کسی کام میں قدم رکھنے پر اس کام کے بارے میں اسکی کچھ ذمہ داری ہو جاتی ہے۔ جو اپنی اس ذمہ داری کو نہیں سمجھتا۔ اسکو لوگ بیوقوف اور ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے بھی اس کی لاپرواہی کرنیوالوں کو مجرم کہتے ہیں نیز اس قصور کے واسطے انصاف سزا بھی دیجاتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص تانگہ یکہ یا بیل گاڑی چلاتا ہے تو ان جانوروں کے بارے میں اس آدمی کی یہ ذمہ داری ہے۔ کہ وہ ان کو چارہ دانہ گھاس پانی وغیرہ کو وقت پر دیئے جانے کا پورا خیال رکھے۔ ان جانوروں سے ان کی طاقت سے زیادہ محنت لے جسقدر وزن وہ نہیں اٹھا سکتے۔ تو انکو بیرحمی سے مارے بھی نہیں۔ یہ سب باتیں ایک پرورش کرنیوالے یا ان جانوروں سے کام لینے والے کی ذمہ داری میں شمار ہیں۔ اگر وہ شخص اسکو نہیں سمجھتا۔ اور بیوقوفی سے ان باتوں کی لاپرواہی کرتا ہے تو رحمدل اور عقلمند اشخاص کے ذریعہ قائم کی ہوئی جیو دیا پرسارنی سبھائیں جواب جگہ بہ جگہ قائم ہو گئی ہیں۔ اس آدمی کو اسکا فرض سکھلاتی دکھاتی ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ اتنے پر بھی جو وہ آدمی اپنے فرض کو پوری طرح ادا نہیں کرتا۔ تو اسکو قصوروار ٹھہرا کر منصفانہ طریقہ سے سزا بھی دیجاتی ہے۔ اسکے علاوہ ڈاکٹر وکیل سکول ماسٹر وغیرہ اس ذمہ داری کی زنجیر میں بندھے ہیں۔ اور سب ہی کو اپنے اپنے کام کو شروع کرنے سے پہلے ان باتوں کو اچھی طرح سے معلوم کر لینا نہایت ضروری ہے۔ جو انکو اپنی آئندہ زندگی میں ذمہ داری کی شکل میں ادا کرنی ہونگی لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے۔ کہ ہمارے ایک زبردست فرض کی طرف جس پر نہ صرف ہماری بلکہ ہمارے ملک اور ہمارے سماج کی ترقی کا انحصار ہے کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ جو ناخواندہ ہیں۔ انکے واسطے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ بیوقوف ہیں۔ اسلئے وہ اس ذمہ داری کو نہیں سمجھتے لیکن افسوس تو اس بات کا ہے۔ کہ جو خواندہ ہیں اور عقلمندی کا دعوےٰ رکھتے ہیں۔ وہ بھی یا تو اپنی کاہلی اور کفایت کیوجہ سے اسکی مخالفت کرتے ہیں۔ یا دانستہ لاپرواہی کرتے ہیں۔ اور یہ ہمارا فرض خاصکر اپنی اولاد کے واسطے۔

اگر بغور دیکھا جاویگا۔ تو صاف پتہ لگ جاویگا۔ کہ واقعی میں جب ہم گرہستی کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ تب ہم کو اسکے بھی فرائض کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا اور جب اسکا ہی ٹھیک طور سے خیال نہیں ہوتا تب اسکے بعد کی باتوں کا ذکر ہی کیا ہے۔ اور اس ہماری ناسمجھی کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ ہمارے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بچے ہر سال موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے رہ جاتے ہیں اسلئے آج ہم آپکے روبرو کچھ ایسی باتوں کا پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کہ جن سے آپ یہ نہ سمجھ سکیں۔ کہ بچوں کو عمدہ طریقے سے پرورش کرنے میں ہم کو کس کس بات کا زیادہ تر خیال رکھنا چاہیئے جس سے وہ کسی مرض سے تکلیف نہ اٹھائیں۔ بلکہ طاقتور اور موٹے ہو کر عمر دراز کو پہنچیں۔ کہ جس سے ہماری زندگی بھی آرام سے گذرے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے۔ کہ ہمارے اس مضمون کو پڑھکر نیز بغور سمجھ کر ناتجربہ کار اور تھوڑی عمر میں والدہ کہلانیکی حقدار عورتیں اپنا اور اپنی گود کے چلتے پھرتے کھلونے یعنی اپنے پیارے بچوں کے واسطے بہت کچھ بھلائی کر سکیں گی۔

اپنی زندگی کے بارہ مہینوں میں بچہ پر دنیا کی تبدیلی موسم و آب و ہوا کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اتنے دنوں میں بچہ کے سر اور جسم میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ خاص بات یہ ہے۔ کہ اسوقت بچہ کی آئندہ عادات بننے کا آغاز ہونے لگتا ہے۔ اسلئے بچہ کی آئندہ بہبودی کے واسطے اس وقت سے اسکی عمدہ دیکھ بھال کا بندوبست رکھنا نہایت ضروری بات ہے۔

بوقت پیدائش عام طور پر بچہ کا وزن سات پونڈ یعنی ساڑھے تین سیر کے قریب ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کوئی کوئی پورے بچے ڈھائی تین سیر کے اور کوئی کوئی پانچ چھ سیر تک کے ہوتے دیکھے جاتے ہیں۔ پیدائش کے بعد پہلے دس دن میں بچہ کا وزن کچھ کم ہوتا ہے۔ لیکن دس یوم بعد ہی وہ کمی پوری ہونے لگتی ہے اور اول تین ماہ تک یہ وزن ڈھائی چھٹانک ہر ہفتہ کے حساب سے بڑھتا ہے اسی طرح تین ماہ کے بچہ میں چھ سیر تک وزن ہو۔ تو بچہ کو کسی مرض کا نہ ہونا اور تندرست خیال کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد چھ ماہ پورے ہونے تک بچہ کی بڑھت سوا دو چھٹانک ہر ہفتہ ہونی چاہیئے۔ یہاں تک کہ اگر بچہ کو کوئی مرض نہیں ہے۔ تو چھ ماہ میں اس کا وزن پیدائش کے وقت سے دو گنا اور ایک سال میں تین گنا ہونا چاہیئے۔ یعنی پہلے برس گانٹھ کے وقت بچہ کا وزن ساڑھے دس سیر ہونا چاہیئے۔ اس سے بچہ کی تندرستی میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس بات کو معلوم کرنے کیواسطے یہ بات بہت ضروری ہے۔ کہ شروع میں سال بھر تک ہر ماہ بچہ کا وزن کرتے رہنا چاہیئے۔ اسی طرح عام طور پر بچہ پیدائش کے وقت بارہ انچ لمبا ہوتا ہے۔ یہ لمبائی بھی آہستہ آہستہ بڑھ کر سال بھر میں ۳۰ انچ ہو جاتی ہے اسی پہلے سال میں ہی بڑی خاص خاص تبدیلیاں بچہ کے جسم کی بناوٹ اور دیکھنے میں بھی ہوتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ تکلیف دینے والی اور ظاہرہ تبدیلی ہے دانت نکلنا جو ساتویں ماہ میں شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے نیچے کی طرف بیچ کے دو دانت نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نکلنے کے ایک ماہ کے اندر ہی انہیں دانتوں کے ٹھیک مقابلہ میں اوپر کے دو دانت چمکتے ہیں۔ دانت نکلنے کا یہی وقت اکثر دیکھا جاتا ہے۔ لیکن کسی کسی بچہ کے تیسرے ماہ سے ہی دانت نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسے بچے دیکھنے میں آجاتے ہیں۔ جن کا ایک دو دانت پیدائش کے وقت نکلا ہوا رہتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کسی بچہ کے سال بھر تک دانت نہیں نکلتے۔ لیکن دانتوں کا بہت جلد ہی نکل آنا یا بہت دن تک نہ نکلنا یہ دونوں ہی صورتیں ایسی ہیں۔ جس میں بچہ کو کوئی نہ کوئی مرض ضرور ہی ہو جاتا ہے۔ جس میں سوکھا (RICKETS) کا مرض دانتوں میں کیڑا لگ جانا خاص ہے۔

دانتوں کے نکلتے وقت میں بھی ماں کی تھوڑی سی بے احتیاطی سے بچہ کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ دانت نکلنا جسم کا قدرتی کام ہے۔ اور اس لئے اس میں حتی الامکان کسی قسم کی دست اندازی نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ بات ضروری ہے۔ کہ ان دنوں میں بچہ کو زور بہت پڑتا ہے جس کی تعداد اس قدر ہوتی ہے۔ کہ اگر بچہ پورا طاقتور نہیں ہے۔ تو اس کو کسی قسم کے امراض کا اس حالت میں پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی بڑی غفلت کی بات ہے۔ کہ دانت نکلنے کے ایام میں کوئی بھی مرض ہو۔ تو اس کو دانتوں کی وجہ خیال کر کے اس کا علاج ہی نہ کرایا جاوے معمولاً بچوں کو دانت نکلنے کے زمانہ میں یا تو بدہضمی ہو کر دست آنے لگتے ہیں۔ یا قبض رہنے لگتا ہے۔ کان میں درد ہو کر اندر سے مواد بھی آنے لگتا ہے۔ اور یہ تکلیف کبھی کبھی اس قدر بڑھ جاتی ہے۔ کہ بچہ کو بیچین بنائے رکھتی ہے۔ کمزور بچے جن کے (RICKETS) سوکھا کا مرض ہو۔ کبھی کبھی بیہوش ہو کر ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگتے ہیں۔ ان ایام میں بچوں کے سر اور سینہ کو ٹھنڈ لگنے سے خاص طور پر بچانا چاہیئے۔ ورنہ نمونیہ ہو جانیکا خوف ہے۔ اور جو یہ بیماری ہو ہی جاوے۔ تو بڑی ہوشیاری سے اس کا علاج کرانا چاہیئے۔ اس وقت والدین اگر تھوڑی احتیاط رکھیں تو بچوں کو بڑی تکلیف سے بچا سکتے ہیں۔ کوئی صاف کڑی لکڑی کا ٹکڑا یا ربڑ کی نلی بچہ کو پکڑا دینے سے وہ اسکو منہ میں رکھ کر کاٹتا ہے۔ اس سے دانتوں کے نکلنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہر وقت بچہ کو کھلی ہوا میں رکھنا چاہیئے۔ اور اگر قبض ہو۔ تو ہمارے یہاں کی بال گھٹی یا صاف کیا ہوا ارنڈی کا تیل یا انجیر کا شربت بڑی ہرڑ کالا نمک پھولی ہوئی ہینگ سہاگہ گھس کر تھوڑی تعداد میں دے دینا چاہیئے۔ اگر بچہ کو ماں کا دودھ نہ دیکر گائے کا دودھ دیا جاتا ہو۔ تو دو گنا پانی ملا کر دینا چاہیئے۔ اور اگر بچہ ماں کا ہی دودھ پیتا ہو۔ تو اس کو دانت نکلنے کے ایام میں کبھی نہیں چھوڑانا چاہیئے۔ بکری کا دودھ بھی بچہ کو مفید ہے۔ بچہ پیدا ہونے ہی زیادہ ہلنا جلنا پسند نہیں کرتا نہ وہ تیز روشنی دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اس لئے آنکھیں بند کئے پڑا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ باتیں کم ہونے لگتی ہیں۔ قوت سماعت بھی بچہ میں پیدائش کی دو ایک گھڑی بعد سے ہی آجاتی ہے۔ کیونکہ اگر اس کے پاس کوئی زور کی بات کی جائے۔ تو وہ چونکتا ہے تیسرے ماہ میں اس کو اپنے قریب کی اشیاء دیکھنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ اور پانچویں مہینے وہ کھلونے کو پکڑنے لگتا ہے۔ اور منہ میں سے پہلا لفظ "با" نکالتا ہے۔ اس "با" کو وہ کوئی معنی سمجھ کر نہیں کہتا۔ بلکہ وہ اپنی آسانی کی وجہ سے خود ہی اس کے منہ سے نکلنے لگتا ہے۔ نویں مہینے میں بچہ بیٹھنے لگتا ہے۔ اور اس کے کچھ ہفتے بعد وہ کسی چیز کے سہارے کھڑا ہونے یا دو ایک قدم چلنے کا حوصلہ کرنے لگتا ہے۔

اس وقت بچہ جس چیز کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ وہ اس کے لئے تعجب خیز ہوتی ہے۔ اس کو پہچاننے اور سمجھنے کی خواہش اس کے دماغ میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور اس کے لئے اس کو اپنے دماغ پر زور دینا پڑتا ہے۔ بچہ سب سے پہلے اپنی انگلیاں اور انگوٹھے تعجب سے دیکھتا ہے پھر اپنی چارپائی کو اور اپنے رہنے کے کمرے اور اس کی چیزوں کو۔ اس لئے جس قدر اشیاء ایک بچہ کے نزدیک و دور زیادہ ہوں گی۔ اسی قدر اس کو اپنے دماغ سے زیادہ کام لینا پڑیگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا

کہ بچے کے سر میں درد پیدا ہو جائیگا۔ اور نیند کم آنے لگیگی۔

لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ جو تین چار ماہ کے بچوں کو میلے تماشے میں گود میں دبا کر لے جاتے ہیں۔ وہاں ان کو کوئی لطف نہیں آتا۔ بلکہ ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اکثر رونے لگتے ہیں جس سے لے جانیوالے کی تفریح میں بھی خلل پڑتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے۔ تو چھ مہینے تک تو بچہ کو ماں کا ہی دودھ پلانا چاہیئے۔ کیونکہ ماں کا دودھ ایک تو ہضم جلدی ہوتا ہے۔ اور دوسرے اُس میں کسی طرح کے کیڑے یا جرمس (GERMS) نہیں ہوتے۔ اور اس وجہ سے بچہ کو کبھی کوئی مرض پیدا نہیں ہوتا۔ بچہ پیدا ہونے کے دو دن بعد تک کبھی کبھی عورت کی چھاتی سے دودھ نہیں اُترتا۔ اور بچہ کو ان دو دنوں دنوں میں بھوک بھی زیادہ نہیں ستاتی۔ اس لئے دن میں دو تین مرتبہ جوش دیا ہوا پانی تھوڑا ٹھنڈا کر کے دو چار بوندیں بچہ کو دینا کافی ہے۔ تیسرے دن بچہ کو ماں کی چھاتیوں میں دودھ ٹھیک طور سے اُتر آتا ہے۔ اس حالت میں بھی بچہ کو مقررہ وقت میں تین تین گھنٹے پر دودھ پلانا چاہیئے۔ اور رات کو چھ گھنٹے دودھ نہیں پلانا چاہیئے۔ بچہ کے دودھ پینے کا وقت علی الصبح چار بجے۔ پھر صبح سات بجے۔ پھر دس بجے۔ دوپہر کو ایک بجے۔ تیسرے پہر چار بجے۔ شام کو سات بجے۔ اور رات کو دس بجے مقرر کرنا چاہیئے ہر وقت اور بلا مقررہ طریقہ سے دودھ پلانا بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ چار مہینے کا ہونے پر دودھ پلانے کا وقت کا وقفہ تین گھنٹے کی بجائے چار گھنٹے کر دینا چاہیئے۔ ماں کو اپنی ایک چھاتی ایک دفعہ میں بچہ کو پلانا چاہیئے۔ اگر ایک چھاتی کو پی کر بچہ کا پیٹ نہ بھرے۔ تو دوسری دینی چاہیئے۔ لیکن پہلے دی ہوئی چھاتی کو بالکل خالی ہو جانے پر دوسری چھاتی بچہ کو دینا چاہیئے۔ چھاتی کو بچہ کو دینے سے پہلے خوب گرم پانی سے دھو کر صاف کپڑے سے خشک کر کے گھنڈی پر گلیسرین آف بورکس (GLYCERINE OF BORAX) دچھوہارہ کو گھس کر گھی یا مکھن ملا کر چپڑ دینا چاہیئے۔ بچہ کے پیٹ کی طاقت کس عمر میں کس قدر وزن برداشت کرنے کی ہوتی ہے۔ یہ حسب ذیل نقشہ سے سمجھ میں آجائیگا۔

(۱) تین دن کے بچہ کے پیٹ میں ایک دفعہ میں	آدھا چھٹانک
(۲) چار ہفتے " " " " "	سوا "
(۳) آٹھ " " " " "	ڈیڑھ "
(۴) بارہ " " " " "	آدھ پاؤ
(۵) سولہ " " " " "	سوا دو چھٹانک
(۶) بیس ہفتے کے بچہ کے پیٹ میں ایک دفعہ میں	ڈھائی چھٹانک

دودھ آ سکتا ہے۔ جہاں ماں کا دودھ بچہ کو کافی مقدار میں نہیں ملتا۔ وہاں بچہ بھوکا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی بھوک سے رونے لگتا ہے۔ اور پندرہ بیس منٹ تک چھاتیوں سے لگا رہ کر بھی اس کی سیری نہیں ہوتی۔ وہ دودھ پیتے پیتے درمیان میں کچھ خاموش سا ہو جاتا ہے۔ گویا سو گیا ہو۔ لیکن چونکہ تھوڑی دیر میں وہ پھر پینے لگ جاتا ہے۔ ان باتوں سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ بچہ بھوکا ہے۔ اور اس کو پیٹ بھرنے کے واسطے دوسرے طریقے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ماں کے اگر دودھ دینے کی ضرورت ہو۔ تو سب سے اچھا گائے کا تازہ دودھ ہونا چاہیئے۔ اور اپنی ماں کی چھاتی ایک پوری پینے کے بعد جو کمی بچہ کی بھوک میں رہے۔ وہ اُس سے پوری کرنی چاہیئے۔ اور وہ چمچے سے پلانا چاہیئے۔ کیونکہ بعض بچے ایسے ہوتے ہیں۔ جو ایک دو دفعہ بوتل سے پینے کے بعد ماں کی چھاتیوں سے منہ نہیں لگاتے۔ بچوں کو ماں کے دودھ کے علاوہ جو چیزیں عمدہ ہو سکتی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ (۱) گائے کا خالص دودھ (۲) بوتلوں میں آنے والے سفوف دودھ اور دیگر بچوں کو مفید پیٹنٹ فوڈ۔ لیکن ان سب میں عمدہ چیز گائے کا دودھ ہی ہے۔ کیونکہ اس کے اوصاف ماں کے دودھ سے بہت کچھ ملتے ہوئے ہوتے ہیں۔ گائے کے دودھ میں ماں کے دودھ کے بہ نسبت پروٹین اور مٹھاس کم ہوتی ہے۔ لیکن چکنائی کا جزو دونوں میں برابر ہوتا ہے۔ اس لئے بچوں کو دینے کیلئے گائے کے دودھ میں بچہ کی عمر کے لحاظ سے تھوڑا جوش دیا ہوا پانی ملا کر اس کو پتلا کر لینا چاہیئے۔ اِس سے اِس کی چکنائی کا وہ جزو جو مشکل سے ہضم ہوتا ہے۔ کم ہو جائیگا۔ بچہ کو ہمارے یہاں کا بال سُدھا دیتے رہنے سے قوت ہاضمہ درست رہتی ہے۔ دست صاف ہوتا ہے۔ بچے موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ حال کے بچہ کے دودھ میں دوگنا پانی ملانا چاہیئے۔ دو ماہ کے بچہ کو برابر کا پانی اور اسی طرح پانی کو برابر کم کرتے جانا چاہیئے۔ جس سے کہ دس مہینے کے بچہ کو خالص دودھ ہضم کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے۔

گائے کے دودھ میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ پیٹ میں جا کر اندر کی کھٹائی سے جو اس کا دہی بنتا ہے۔ وہ ماں کے دودھ سے بنے ہوئے دہی کی بہ نسبت ثقیل ہوتا ہے۔ اس لئے بچے کے پینے کو بنائے ہوئے آدھی چھٹانک دودھ میں ایک گرین سائٹریٹ آف سوڈا (SODA TABLETS) کی ٹکیاں جو انگریزی دوا

فروخت کرنیوالوں کے یہاں ملتی ہیں۔ ملادی جائیں۔ تو یہ خرابی دودھ کی جاتی رہتی ہے لیکن گائے کا کچا دودھ کبھی نہیں دینا چاہیئے۔ اس کو ایک جوش ضرور دینا چاہیئے۔ اور تب کسی برتن میں اس کو اتار کر اوپر سے صاف ململ کا ٹکڑا ڈھک دینا چاہیئے جسمیں مکھی یا مٹی نہ پڑے۔ لیکن ہوا ضرور لگتی رہے۔ سفوف دودھ (DRIED MILK) کا استعمال گرمی کے دنوں میں کرنا چاہیئے۔ یا اس وقت جبکہ تازہ دودھ نہ ملے۔ تو یہ ایک چمچہ سفوف دوگنے پانی میں ملانا چاہئے۔ لیکن (CONDENSED MILK) گاڑھے دودھ کو بڑی ہوشیاری سے کام میں لانا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں چکنائی کا جز کسی کسی میں بہت ہی کم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے ڈبوں کو کھولتے ہی ایک دم خالی کر کے سب دودھ کسی چینی کے برتن میں ململ کے صاف ٹکڑے سے ڈھک کر رکھنا چاہیئے۔ اُسی ٹین میں دودھ کا ڈھکن بند کر کے رکھنے سے اس میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ موسم برسات میں قوت ہاضمہ بڑوں کی ہی قدرتاً کمزور ہو جاتا ہے۔ تب بچوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ان دنوں میں بچوں کو جن کی عمر دو سال تک کی ہوتی ہے۔ دستوں کی بیماری زیادہ تر ہوتی ہے۔ اس کو انگریزی میں انفنٹائیل کالرا (INFANTILE CHOLERA) بچوں کا ہیضہ کہتے ہیں۔ اور یہ مرض ہر سال سینکڑوں ہی بچوں کی جان ضائع کر دیتا ہے۔ اس مرض کی شروعات فوراً ہو جاتی ہے۔ اور پہلے بچوں کو قے ہوتی ہے۔ اور اسکے بعد ہرے رنگ کے دست شروع ہو جاتے ہیں۔ کھال پیلی پڑ کر سکڑ جاتی ہے۔ اور ہڈیوں بہت جھول جاتی ہے۔ اور دو یا تین دن میں یا اس سے بھی کم وقت میں بچے کے جسم میں رسیلی اشیاء ضائع ہو جانے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس بات کو تو ہم اور آپ سب بخوبی جانتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں فی زمانہ غریبی اور بیروزگاری کے سبب ایک گرہستی کو اپنے اور اپنے بال بچوں کی گذر اوقات کرنے میں کس قدر دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جہاں وقت پیٹ بھر کر اناج بھی مہیا نہ ہو۔ وہاں بڑے بڑے ڈاکٹروں کی فیس اور ادویات کے بل بیباق کرنیکو روپیہ کہاں سے پس انداز ہو سکتا ہے۔ امراض کی روک تھام پہلے سے تو کچھ ہوتی نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ خواندہ اشخاص میں زیادہ تر تعداد ایسی ہے جو نوکری پیشہ ہیں۔ اور نوکریوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا یعنی تبدیلی کی پریشانی اکثر لگی رہتی ہے۔ اس سے ایک تو گھر کے سب مرد عورت ایک جگہ رہ نہیں پاتے۔ جو عورتوں کے کام کاج میں مدد کرتا رہے۔ بیچاری اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اپنے شوہروں کی ہمراہی بنتی ہیں۔ اور کوئی کوئی تو ایسے ویران مقامات میں پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں علاج کی سہولت اور عمدہ ادویات کا دستیاب ہونا تو درکنار معمولی چیزیں کھانے پینے تک کی نہیں ملتی ہیں۔ انہیں سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے اوسط درجہ کے گرہستی بھائیوں کی بھلائی کیواسطے بڑے بڑے تجربہ کار اور دور اندیش ویدوں اور ڈاکٹروں کے مشورے اور صلاح سے نہایت اچھی اور مفید اور خاصکر بچوں کو فائدہ پہنچانیوالی ادویات شامل کر کے اپنی "بال سدھا" نام کی میٹھی دوا تیار کی ہے جس کے اوصاف اور ذائقہ دونوں ہی بچوں کیلئے نہایت ہی مفید اور خوش ذائقہ ہیں اس کے استعمال سے بچے موٹے تازے اور تندرست ہو جاتے ہیں "بال سدھا" کے پینے سے ہڈیاں طاقتور ہو کر جسم سڈول اور خوبصورت بنجاتا ہے۔ بچوں کے پہلے ہی سال میں انکے جسم کی و نیز سب ہی اعضا کی بڑھت بڑی تیزی سے ہوتی ہے لیکن جوان بچوں کی بستینی خرابی سے پیدا ہوئی جسمانی کے سبب تنزلی سی ہی رہتی ہے۔ وہ بال سدھا کے استعمال سے اس میں ایک عجیب فائدہ دکھائی دینے لگتا ہے "بال سدھا" کے موافق دوسری دوا جسم کی نس نس میں چستی اور حوصلہ پیدا کرنیوالی نہیں۔ کیونکہ یہ تازہ بتازہ خون پیدا کرنیوالی اول درجہ کی چیز ہے۔ اسکے استعمال سے بچوں میں جسمانی طاقت تو بڑھتی ہی ہے۔ مگر روحانی طاقت میں بھی زیادتی ہوتی ہے کیونکہ "بال سدھا" پینے والے بچے بزدل نہیں رہتے۔ وہ کھیل کود میں اپنے ساتھ اپنے ہم عمر بچوں سے ہمیشہ پیشقدم رہتے ہیں۔ "بال سدھا" میں کوئی دھات شامل نہیں ہے۔ یہ اُن اشیاء سے لیا گیا ہے۔ جو علم طب میں بڑے بڑے قابل و تجربہ کار معالج کے ذریعہ خاصکر بچوں کو مفید ثابت ہو چکی ہیں۔ آپ اپنے بچہ کو "بال سدھا" باقاعدہ شروع تو کیجئے پھر دیکھئے کہ بچہ میں کیسی رونق بڑھتی ہے۔ "بال سدھا" استعمال کرنیوالے بچے موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے بچہ کو بھی ایسا ہی بنائیگا۔ دانتوں کے نکلنے میں جو بچوں کی بری حالت ہو جاتی ہے۔ وہ اسکے استعمال سے بالکل نہیں ہوتی۔ کیونکہ دانتوں کے نکلنے کیوقت بچوں کی قوت ہاضمہ بگڑ جاتی ہے۔ جو بہت سی بیماریوں کا سبب بن جاتی ہے۔ اور اس کے استعمال سے قوت ہاضمہ اپنا کام ٹھیک طور پر کرتی رہتی ہے۔ جس سے مرض کی پیدائش ہی نہیں ہوتی۔ در اصل یہ کسی مرض کی خاص دوا نہیں ہے۔ بلکہ بچوں کو جسمانی امراض کے حملہ سے بچانے کیواسطے ایک پائدار قلعہ ہے۔ ایام سردی میں اکثر بچوں کو سردی کھانسی زکام وغیرہ ہو جاتا ہے لیکن جو والدین اپنے بچوں کو "بال سدھا" کا استعمال کراتے ہیں۔ اس سے بھی بیفکر رہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ **سکھ سنچارک کمپنی لمیٹڈ متھرا۔**

مرہٹی کا
ایک بلند پایہ
رومان آفریں
افسانہ

سرکس

ازجناب
مولنا ابو محمد امام الدین
رامنگری

ولسو بھاؤ کی وضع قطع کو دیکھ کر کوئی نہیں سرکس کا منیجر نہیں کہہ سکتا۔ پہلی بار جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے بھی یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ وہ سرکس کے منیجر ہیں۔ ان سے ملنے سے پہلے میرا خیال تھا وہ سوٹ بوٹ میں ہوں گے۔ میں ان سے ہاتھ ملاؤنگا۔ وہ انگریزی میں مجھ سے خیر و عافیت پوچھینگے، لیکن میرے خیال کے برعکس وہ موٹی دھوتی، لمبے کوٹ، سوتی چادر، اور پگڑی میں ملبوس تھے۔ نمسکار کہہ کر مجھ سے ملے اور بولے مجھے آپ سے ملنے کی بہت آرزو تھی۔

اس کے بعد جب کبھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا میں نے انہیں اسی وضع میں دیکھا۔ ان کی وضع قطع کی طرح ان کی جسمانی حالت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ اب سے بیس برس پہلے جیسے تھے ویسے ہی آج بھی نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی عمر اس سے کم نہیں ہے جتنی ہندوستانی سرکس کی عمر ہے۔

ولسو بھاؤ وضع قطع کے اعتبار سے جتنے سیدھے سادے ہیں سرکس کے کاروبار میں اتنے ہی ہوشیار اور تجربہ کار ہیں۔ اور اپنے معاصرین میں خاص شہرت و امتیاز رکھتے ہیں۔ وہ اب اس کام سے بڑی حد تک کنارہ کش ہو گئے ہیں پھر بھی جب کبھی سرکس کے مالک انہیں بلاتے ہیں وہ بے تامل ان کے پاس چلے جاتے ہیں۔

ولسو بھاؤ کو مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ وہ میرے ناول اور افسانے بہت دلچسپی اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ پھر بھی وہ جب کبھی باطمینان ملتے تو کہتے ـــــ آپ کے عشقیہ کردار بالکل اوسط درجے کے ہوتے ہیں۔ وہ رشک و رقابت اور بغض و عناد کی حالت میں بھی ضبط و احتیاط کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ ان میں وہ جوش اور جذبہ کارفرما نہیں ہوتا کہ نتائج سے بے نیاز ہو کر موانع کو زیر و زبر کرنے پر تل جائیں۔"

کئی بار ان کی زبان سے یہ بات سننے کے بعد ایک روز میں نے کہا۔ ایسے کردار کہاں ملیں گے۔ اگر آپ کے علم میں ہوں تو ان کو میرے پاس لائیے۔

"آپ ایک سال تک میری کمپنی کے ساتھ رہیئے آپ کو ایسے کردار مل جائینگے۔"

"کیا خوب! میں ایک سال تک دنیا میں مارا مارا پھروں؟"

"پھر کیا آپ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے آپکو ایسے کردار مل جائیں؟"

"ہاں ایسی ایک صورت ہے!"

"وہ کون سی؟"

"آپ کو ایسے لوگوں کے جو واقعات معلوم ہوں مجھے سنا دیجئے۔"

انہوں نے کئی مرتبہ تو عذر و حیلہ کر کے ٹال دیا۔ لیکن ایک روز میرے بہت اصرار کرنے پر انہوں نے کہا۔ اچھا سنئے، لیکن آپ کی طرح میں افسانے کے اصول و ضوابط سے تو واقف نہیں ہوں۔ مجھ سے جس طرح کہتے بنے گا کہدونگا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا۔ مجھے مہینہ اور سنہ یاد نہیں۔ نہ اسکی کوئی ضرورت ہے۔ ہماری کمپنی جاپان سے دولت و شہرت کما کر ہندوستان لوٹی تھی۔ تین مہینے تک ہمارا بمبئی میں قیام رہا۔ ہمارے سرکس میں جانوروں کے اعلیٰ درجے کے کام دکھائے جاتے تھے۔ جادو، کسرت اور بہادری کے کام بھی قابل دید ہوتے تھے۔ جاپان میں ہمیں ایک میکسیکن جوڑا مل گیا تھا جس سے ہماری کمپنی کے کھیلوں میں ایک دلچسپ اور قابل قدر اضافہ ہو گیا تھا۔ ان شوہر بیوی کے کام کو پبلک بڑے شوق سے دیکھتی تھی ہمیں ان دونوں کو سو روپیہ یومیہ دینا پڑتا تھا۔ پھر بھی اسکی وجہ سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ ہم کافی نفع میں رہتے تھے۔ یوں تو یہ جوڑا کئی ایسے کھیل دکھاتا تھا جنہیں لوگ بڑی دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ لیکن انکا ایک کھیل خاص طور پر مقبول تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ بہت سے آدمی اس کھیل کو دیکھنے کیلئے بار بار آتے تھے۔

مرد کا نام جان تھا اور عورت کا لولا۔ وہ اس کھیل کے دکھانے کے لئے ناچتے ہوئے اسٹیج پر آتے اور کچھ دیر ناچنے کے بعد ایک

دوسرے سے اس طرح الگ ہو جاتے جیسے دونوں میں کچھ اَن بن ہو گئی ہو۔ پھر وہ اشارے سے ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ اس اشارے کنایے میں بھی رنج اور غصے کا انداز موجود ہوتا۔ جان اشاروں میں لولا کی محبت کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کرتا۔ لولا اشاروں ہی میں اسے سمجھانے اور اطمینان دلانے کی کوشش کرتی۔ لیکن جان لولا کو لکڑی کے ایک تختے کے سہارے کھڑا کر دیتا۔ اور اپنی کمر سے پستول نکال کر دس بارہ گز کے فاصلے سے اس پر نشانہ باندھتا۔ یہ دیکھ کر لولا چیخ پڑتی اور "مدد، مدد" چلانے لگتی۔ لولا کی فریاد سنکر ایک مسخرہ وہاں پہنچ جاتا۔ اور اشارے سے جان سے کہتا۔ بے چاری عورت کو خواہ مخواہ کیوں ہلاک کر رہے ہو۔ اگر نشانے بازی کا ایسا ہی شوق ہے تو میں جس طرح کہوں، اس طرح نشانہ لگاؤ۔ جان گردن ہلا کر اسے منظور کر لیتا۔ اس پر مسخرہ لولا کے جسم سے ملا کر بیس پچیس موم بتیاں تختے پر چپکا دیتا۔ اور ان کو روشن کر کے اشارے سے کہتا۔ ان موم بتیوں پر نشانہ لگاؤ۔ جان پستول کی پیہم گولیوں سے تمام موم بتیاں اڑا دیتا اور لولا ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر تماشائیوں کو سلام کرتی تو ساری تماشا گاہ تالیوں سے شور سے گونج اٹھتی۔

جان اور لولا کے اس کھیل نے بمبئی کی پبلک کو پاگل بنا دیا تھا۔ ہر شو میں تماشا گاہ تماشائیوں سے بھر جاتی تھی۔ چار اور آٹھ آنے والی سیٹوں کا تو ذکر کیا باکس کی پانچ پانچ روپے والی کرسیاں بھی مشکل سے ایک دو بچ جاتیں۔ پبلک کی یہ گرویدگی دیکھ کر ہم نے طے کیا کہ ہم ابھی بمبئی میں ایک مہینہ اور قیام کریں گے لیکن جن جن شہروں میں کمپنی جانے والی تھی ان کے تماشا گاہوں کے مالکوں کو میں وقت کے ردو بدل کے متعلق خط لکھنے ہی والا تھا کہ کمپنی میں دفعۃً ایک خوفناک حادثہ رونما ہو گیا۔

اتنا کہہ کر دلسو بھائی تھوڑی دیر کیلئے چپ ہو گئے۔

میں نے کہا: "آپ تو کہتے تھے میں افسانے کے اصول اور طرز بیان سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن آپ تو اس فن کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔"

دلسو بھائی نے پوچھا "یہ کیسے؟"

میں نے کہا: "آپ جو اتنا کہہ کر چپ ہو گئے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں تک اپنے فسانے کے کرداروں کا تعارف کر دیا ہے۔ اس کے بعد اصل افسانہ شروع ہوگا۔"

"ہاں ہاں میں تو شک نہیں کہ اصل واقعہ اب شروع ہونے والا ہے۔ آپ فسانہ نگار ہیں اسلئے آپ اسے قیاس سے سمجھ گئے۔"

"نہیں صاحب! سرکس کی اصل کود میں میرے قیاس کو کیا دخل؟"

دلسو بھائی ہنسنے لگے۔

میں نے کہا: "اچھا اب کہانی شروع کیجئے۔"

دلسو بھائی نے کہنا شروع کیا۔

"سوچ رہا ہوں کہ آگے چل کر جو واقعات پیش آئے ان میں سے کس کو پہلے بیان کروں اسی لئے میں چپ ہو گیا تھا۔ خیر، جو لوگ برابر جان اور لولا کے کھیل دیکھنے آتے ان پر میں خاص نگاہ رکھتا۔ کھیل کے وقت میں شامیانے کے باہر کھڑا ہوتا۔ اور دیکھتا کہ کس کی کیا کیفیت ہے۔ مجھ سے یہ بات پوشیدہ نہ رہتی کہ کون گاہ گاہ آتا ہے اور کون متواتر، کون اپنے شوق سے آتا ہے اور کون دوستوں کے مجبور کرنے سے۔ غرض لوگ شامیانے کے اندر بیٹھ کر سرکس کا کھیل دیکھتے۔ اور میں شامیانے کے باہر کھڑے ہو کر لوگوں کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرتا۔

جو لوگ جان اور لولا کے کاموں کو برابر دیکھنے آتے ان میں ایک یوروپین بھی تھا۔ پہلے تو وہ ہفتے میں تین چار بار آتا تھا۔ بعد میں وہ تقریباً روزانہ آنے لگا۔ وہ چار روپے والی کرسی پر بیٹھا کرتا تھا۔ پتہ لگانے سے معلوم ہوا کہ وہ دولتمند آدمی ہے اور کسی ضرورت سے بمبئی آیا ہوا ہے۔ اس کا نام فرینک بادرس تھا وہ جب برابر آنے لگا تو مجھے شک ہوا کہ وہ محض تماشہ دیکھنے کیلئے روزانہ نہیں آ سکتا۔ اس کی کوئی اور غرض ہے۔

پہلے اس کے ساتھ کچھ یوروپین عورتیں ہوتی تھیں۔ اب وہ بھی نظر نہ آتیں۔ اسلئے میرا یہ خیال اور ترقی کر گیا کہ بادرس صرف تفریح کیلئے تین گھنٹے کا وقت اور چار روپے روزانہ صرف نہیں کر سکتا۔ اور جب وہ لولا کو پھول کے گلدستے نذر کرنے لگا تو میرا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔

یہ صورت حال ہماری کمپنی کیلئے تشویش سے خالی نہ تھی۔ کیونکہ کمپنی کی فلاح و بہبودی اس میں تھی کہ کمپنی حضرت عشق کی کارفرمائیوں سے محفوظ رہے اور ہم دیکھ رہے تھے کہ حضرت عشق بری طرح کمپنی میں ہاتھ پاؤں پھیلا رہے ہیں

بہرکیف مسٹر بادرس کی ذات مجھے کسی آئندہ مصیبت کی تمہید معلوم ہونے لگی۔ میں یہ تو نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اگر لولا اور بادرس میں عشقیہ تعلق قائم ہو گیا اور جان کو پتہ چل گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا لیکن میں ایک طرح کی تشویش ضرور محسوس کرنے لگا تھا۔

تین چار روز تک تو مجھے ایک گونہ اطمینان تھا کہ بادرس لاکھ کوشش کرنے پر بھی لولا اس کی جانب متوجہ نہیں ہو سکتی۔ کسی کو گلدستہ نذر کرنا یوروپ والوں کی ایک عام تہذیب ہے اس میں جان کیلئے بھی برا ماننے یا شک کرنے

کی کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ اس کیساتھ اتنی بات ضرور تھی کہ باورس کھیل دیکھنے آتا تو لولا کو ٹکٹکی باندھے پر اشتیاق نظروں سے دیکھا کرتا۔ لیکن اس کیلئے میں کیا کر سکتا تھا؟ یہ تو ممکن نہ تھا کہ اسے ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا جاتا۔

ایک روز لولا سرکس کے مالک سے ڈاکٹر کے ہاں جانے کیلئے موٹر مانگ کر باہر گئی۔ میں نے ڈرائیور سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ گرینیس ہوٹل گئی تھی۔ اور وہاں دو تین گھنٹے تک رہی تھی۔ میں نے ٹیلیفون کے ذریعہ ہوٹل کے منیجر سے دریافت کیا کہ کیا مسٹر فرینک باورس آپکے ہاں ٹھہرے ہیں؟" جواب ملا "ہاں"

میں یہ جواب سنکر دھک سے رہ گیا۔ اب اس میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ کہ لولا باورس کے پاس گئی تھی۔

میں نے سوچا اس معاملے سے مالک کو آگاہ کردوں پھر خیال ہوا ابھی معاملے نے زیادہ طول نہیں پکڑا ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس کے دبانے کی کوئی صورت نکل آئے اس کے علاوہ اگر میں مالک سے کہتا بھی تو وہ اس معاملے کو میرے ہی سپرد کر دیتے۔ اسلئے ان سے کہنے کی بجائے میں خود اسکی نگرانی کرنے اور اسے آگے بڑھنے سے روکنے کے طریقے پر غور کرنے لگا۔

بہت غور و فکر کرنے کے بعد میں نے طے کیا کہ پہلے لولا ہی کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ چنانچہ وہ جمعہ کو میرے پاس ولائتی ڈاک کا پتہ چلانے آئی۔ تو میں نے کہا۔ کوئی خط تو نہیں آیا ہے مگر تم سے مجھے ایک ضروری بات کہنی ہے۔"

وہ بیٹھ گئی۔

کام ختم کرنے کے بعد کلرک کو رخصت کرکے میں لولا کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں۔ لولا بولی "کیا ہماری کمپنی بمبئی سے جلد ہی کوچ کرنے والی ہے منیجر صاحب؟"

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیوں؟ کیا بمبئی میں کوئی ایسی چیز ہے جس کے لئے تمہیں یہاں زیادہ دنوں تک رہنے کی خواہش ہوئی ہے؟"

میرا خیال تھا کہ وہ میرے اس بے موقع سوال پر چونکے بغیر نہ رہے گی۔ لیکن اس سے اس کے انداز میں کوئی فرق نہ آیا صرف اس کی بڑی بڑی پلکیں ایک بار نیچے اوپر ہو گئیں۔ اس نے کہا۔ "جو چیز ہے وہ تو میں جہاں بھی جاؤں میرے ساتھ جائے گی۔"

"اور تمہیں غارت کر دیگی۔"

"نہیں، اس کی وجہ سے مجھے سرکس کے کام کی محنت و جانفشانی سے نجات مل جائیگی۔"

"تمہارا خیال غلط ہے لولا۔ فرینک باورس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

"اگر میں اس کے ساتھ سیلون چلی جاؤں تو وہ مجھ سے شادی کرے گا۔"

"شادی؟" میں نے تعجب آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں۔"

"اور جان کہاں جائے گا؟"

لولا کسی قدر ہنس کر بولی۔ "ہم دونوں یوں ہی اپنے کو شوہر بیوی ظاہر کرتے ہیں۔ میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔ وہ مجھے ناجائز طور پر میرے گھر سے بھگا لایا ہے۔ اس نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر بعد میں مکر گیا اب وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میں رضامند نہیں ہوں۔"

"کیوں؟"

"اب میں اس کی بدطینتی سے اچھی طرح واقف ہو چکی ہوں۔ اب میرے دل میں اس کی مطلق محبت باقی نہیں رہی۔ اس کا خیال ہے کہ میں کسی طرح اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتی۔ اسلئے اگر میں نے ایسا کرکے دکھا دیا تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اس کے بعد مجھ پر جو کچھ بھی گذر گئی مجھے اس کا غم نہ ہوگا۔ جان انسان نہیں نرا جانور ہے۔ اسے بیوی کی نہیں، بازاری عورت کی ضرورت ہے۔ مجھ پر جو گذر رہی ہے میں اسے آپ سے کھول کر بیان نہیں کر سکتی۔"

میں اس کی بات سنکر کچھ دیر چپ رہا پھر آہستہ سے بولا۔ "لیکن اگر جان کو شبہ ہو گیا تو وہ تمہیں اور باورس کو زندہ نہ چھوڑیگا۔"

"میں اسے سمجھتی ہوں۔ بس کل ہی کا دن درمیان میں ہے۔ پرسوں میں باورس کے ساتھ... لیکن مسٹر منیجر، آپ مہربانی کرکے اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کیجئے گا۔ مجھے آپ کی نیکدلی پر پورا اعتماد ہے۔"

اس نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر زور سے دبایا اور کمرے سے باہر ہو گئی۔

ہم نے کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ لولا جان کی شادی شدہ بیوی نہیں ہے۔ ہم یہ بھی سمجھتے تھے کہ دونوں ایک دوسرے سے بیحد محبت کرتے ہیں۔ اور دونوں کی زندگی نہایت مسرت آگیں ہے۔ جہاں میرے دماغ میں اور اور خیالات چکر لگا رہے تھے وہاں ایک خیال یہ بھی بار بار آرہا تھا کہ پرسوں لولا کے باورس کے ساتھ چلے جانے کے بعد کھیل میں بھیڑ کیسے ہوا کرے گی؟

دوسرے روز میں تمام دن فکرمند رہا۔ میں بار بار یہی سوچتا تھا کہ جان کو لولا اور باورس کی سازش کا پتہ چل گیا تو اس کا نتیجہ نہایت ہولناک ہوگا۔ کاش جان کو اس کا علم نہ ہو اور لولا بخیر و عافیت یہاں سے چلی جائے، گویا میں خود لولا اور باورس کی سازش میں

شریک ہوگیا۔ اور اسے کامیاب بنانے کے لئے فکر مند تھا۔ میں برابر پتہ لگاتا رہتا تھا کہ جان کو معلوم تو نہیں ہوگیا ہے لیکن وہ ہمیشہ کی طرح خوش اور بشاش نظر آرہا تھا۔ لولا کے طور وطریق میں بھی کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ نہ اس کے کسی انداز سے اس کا اظہار ہوتا تھا کہ وہ کل یہاں سے کوچ کرنے والی ہے لیکن میں اس روز کے دونوں کے کھیل کی کامیابی کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔

اس روز رات کے کھیل میں تماشائیوں کی خاص طور پر کثرت تھی۔ کرسیوں کے تمام ٹکٹ فروخت ہوگئے۔ زائد کرسیوں کا انتظام کرتے کرتے ہم سب عاجز آگئے۔ ایک چیف صاحب کا پیام آیا کہ ان کیلئے کوچ کا بندوبست کردیا جائے۔ مجھے کہلا دینا پڑا کہ آج کوئی جگہ خالی نہیں ہے جس کیلئے میں معافی کا خواستگار ہوں حکم ہو تو کل کیلئے انتظام کردیا جائے۔ یہ جواب دیتے ہوئے مجھے خیال آرہا تھا کہ کل جان اور لولا کا کھیل کیسے دکھایا جاسکے گا۔

ٹریپیز کے کام کے دوران ہی میں شامیانے کے اندر گیا۔ روز کی طرح باورس اپنی کرسی پر موجود تھا۔ مجھے امید نہ تھی کہ وہ آج کے کھیل میں شریک ہوگا۔ میں اسے دیکھکر چونک سا پڑا۔

میں نے میک اپ کے کمرے کا بھی چکر لگایا۔ جان نے لولا کے اسپیشل کمرے میں جھانک کر گڈ ایوننگ کیا۔ دونوں میک اپ کر رہے تھے لولا کے کچھ کہنے پر جان ہنس پڑا۔ میں نے اپنے دل میں کہا اچھا ہے کہ رات کے بخیریت گذر جانے کے آثار نظر آرہے ہیں۔

چار سفید گھوڑوں کا کام دکھانے کیلئے مالک باہر آئے۔ میں نے ان کو گھوڑوں کے طویلے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ شامیانے کے اندر بینڈ پر ایک خاص راگ بجنا شروع ہوا جو اس وقت بجا کرتا تھا۔ جب جان اور لولا ڈیگر کے لئے باہر نکلتے تھے۔ اس کو ابھی دو تین منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ شامیانہ تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ جان اور لولا رنگ میں داخل ہوئے ہیں۔ ہوا سے دروازے کا پردہ ہٹا۔ اور میری نگاہ اندر گئی تو میں نے دیکھا جان چھریوں کا کھیل کر رہا تھا۔ اور لولا ہنس ہنس کر اسکے ہاتھ میں چھریاں دے رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر شامیانے میں تالیوں کا شور ہوا اور بینڈ کا راگ بھی بدل گیا۔ کتوں کا کھیل شروع ہوگیا تھا۔ اس کے بعد جان تنہا رسی کا کام دکھایا کرتا تھا۔ اور اس درمیان میں لولا اپنی پوشاک تبدیل کیا کرتی تھی۔

میں کیشیئر سے حساب لے رہا تھا مگر میرا خیال جان اور لولا ہی کی طرف لگا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب بینڈ نے ایک خاص راگ شروع کیا تو میں سمجھ گیا کہ جان رنگ میں تنہا کھیل رہا ہے۔ میں حساب کا کام ختم کرکے شامیانے کے اندر جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آج جان اور لولا کا مقبول عام کھیل دیکھنے کا آخری موقع ہے اور میں اس موقع کو کھونا گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ میں جلدی جلدی کام ختم کرنے لگا۔ اسلئے کہ جان کے رسی کے کھیل کے بعد مسخروں کا ایک کھیل تھا اور پھر جان کے نشانہ بازی کے کھیل کا نمبر تھا۔ میں جلدی جلدی ٹکٹ بک کی جانچ کر رہا تھا کہ ایک نوکر نے میرے کان میں آکر کہا۔

لولا نے کہا ہے کہ آپ جس حالت میں بھی ہوں فوراً میرے پاس چلے آئیں۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ کیوں؟

"مجھے کیا معلوم، البتہ انہوں نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔"

میری تشویش بڑھ گئی۔

"اچھا کہہ دو، میں آرہا ہوں" یہ کہہ کر میں نے نوکر کو رخصت کردیا۔ لیکن کام پورا کئے بغیر جانا ناممکن تھا۔ اور کام پورا کرنے میں پانچ سات منٹ کی دیر ہوگئی۔

میں جیسے ہی چھوٹے شامیانے میں پہونچا دیکھا لولا اگلے کھیل کیلئے کپڑے پہننے کی بجائے چہرہ کا پوڈر صاف کر رہی ہے مجھے دیکھتے ہی گھبرا کر بولی۔ آپنے بہت دیر کردی۔ اس وقت کا ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔

"تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو؟"

"آپ مہربانی کرکے کسی طرح باورس سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی موٹر کے پاس جائے۔ میں چل کر موٹر پر بیٹھ رہی ہوں۔"

"دوسرا کھیل کیسے ہوگا؟"

"اب وہ نہیں ہوسکتا۔"

"کیوں؟"

"اگر میں فوراً بھاگ نہ جاؤنگی تو غضب ہی ہوجائیگا۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"نہ جانے کیسے جان کو یہ بات کو معلوم ہو گئی۔ ابھی جب ہم چھریوں کا کھیل دکھا کر یہاں آئے اس نے مجھ سے بڑی بے رخی کی باتیں کیں، اور باتیں کرتے کرتے میرا گلا زور سے دبا کر اس بُری نظر سے میری طرف دیکھا کہ نہ پوچھئے ...... مجھے یقین ہے کہ اسے معاملے کا پتہ چل گیا ہے ...... وہ اپنا کام ختم کرکے یہاں آئے گا، میں چاہتی ہوں، اس کے آنے سے پہلے بھاگ جاؤں ...... جائیے، میں نے جو کچھ کہا ہے اسے باورس سے کہہ دیجئے۔"

یہ کہکر اس نے مجھے ڈھکیل دیا۔

میں شامیانے کی طرف گیا۔ میں سوچ رہا تھا لولا کے چلے جانے کے بعد جب اس کا اور جان کا کھیل نہ ہوسکے گا۔ اس کے متعلق

مجھے تماشائیوں کے سامنے ایک چھوٹی سی تقریر کرنی پڑیگی۔ میرے دماغ میں تقریر کیلئے یہ الفاظ چکر لگا رہے تھے۔ لولا کی طبیعت یکایک خراب ہو جانے کے باعث ...... آپ لوگوں کی مایوسی کا اسے بھی افسوس.... ہم بالکل مجبور ہیں......" وغیرہ

میں جیسے ہی شامیانے کے دروازے پر پہونچا جان کا رسی کا کھیل ختم ہوا۔ اور وہ بھاگا ہوا میک اپ کے کمرے کی طرف گیا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے آپ ہی آپ کہا ___ ایشور کرے لولا سلامتی کے ساتھ بھاگ چکی ہو ورنہ خیریت نہ ہوگی۔

میں جلدی سے لپک کر اندر گیا۔ دیکھا تو باورس کی کرسی خالی پڑی تھی، میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی پھر بھی اس کا پتہ نہ چلا۔

یکایک خیال آیا ممکن ہے وہ اپنی موٹر کی طرف گیا ہو۔ "ٹیلی پیتھی" بھی چیز ہے کہ جب دو آدمیوں میں گہرا دلی تعلق ہوتا ہے تو ایک کے دل کی بات دوسرے کو معلوم ہو جاتی ہے۔ اس خیال کے باوجود میری آنکھیں باورس کو تلاش کر رہی تھیں۔

مسخروں کا کھیل ختم ہوا۔ ہنسی مذاق کے شور میں کمی ہوگئی۔ بینڈ نے بھی دوسرا راگ شروع کر دیا۔ تماشائی ہمہ تن چشم اشتیاق بنکر بیٹھ گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب جان اور لولا کا تماشا ہوگا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ وقت بھی میرے لئے کتنا ہیجان انگیز تھا۔

میں اس خیال سے وہاں کھڑا رہا کہ اگر دو تین منٹ میں جان اور لولا رنگ میں نہ آئے تو مجھے تماشائیوں کے سامنے صورت حال کے متعلق تقریر کرنی پڑے گی۔ مجھے خیال نہیں کہ اتنے مضطرب قلب کے ساتھ مجھے کبھی منٹ کی سوئی کی طرف دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔

ایک منٹ ہوا، دو منٹ ہوئے، ڈھائی منٹ ہوئے لوگ پہلے خاموش تھے اب آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ تیسرا منٹ بھی ختم ہوگیا۔

میں نے رنگ میں جانے کے لئے اپنا دوپٹہ سنبھالا ہی تھا کہ دیکھتا ہوں۔ جان اور لولا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ناچتے چلے آرہے ہیں میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔

دونوں کے چہرے ہمیشہ کی طرح خوش اور بشاش تھے اور وہ ہمیشہ ہی کی طرح پیار کے ساتھ ایک دوسرے سے ملکر تال پر رقص کر رہے تھے۔ کسی بات میں کوئی فرق نہ تھا۔

لیکن نہیں ایک فرق تھا اور بہت بڑا فرق تھا جسے تماشائی محسوس نہیں کر سکتے تھے لیکن میری نظروں سے تو وہ بچ نہیں سکتا تھا لولا پہلے ہی کھیل کا جانگیا پہنے ہوئے تھی۔ پاؤں کے موزے بھی اسی کھیل کے تھے چہرے کا پاؤڈر پونچھا ہوا تھا۔ شاید جان نے ٹھیک بھاگتے وقت اسے پکڑ لیا تھا اور اسی طرح یہاں گھسیٹ لایا تھا۔

لیکن اس کے باوجود لولا ہنس رہی تھی۔ پہلے تو مجھے اس کی بے خوفی پر تعجب ہوا پھر میں نے سوچا یہ ہنسی بے خوفی کی نہیں بے بسی کی ہے

میں نے باورس کی کرسی کی طرف دیکھا وہ واپس آکر اپنی جگہ بیٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ شاید شامیانے کے باہر سوڈا لیمونیڈ لینے گیا ہو۔ پہلے اس طرف خیال نہ جانے کا مجھے افسوس ہوا۔

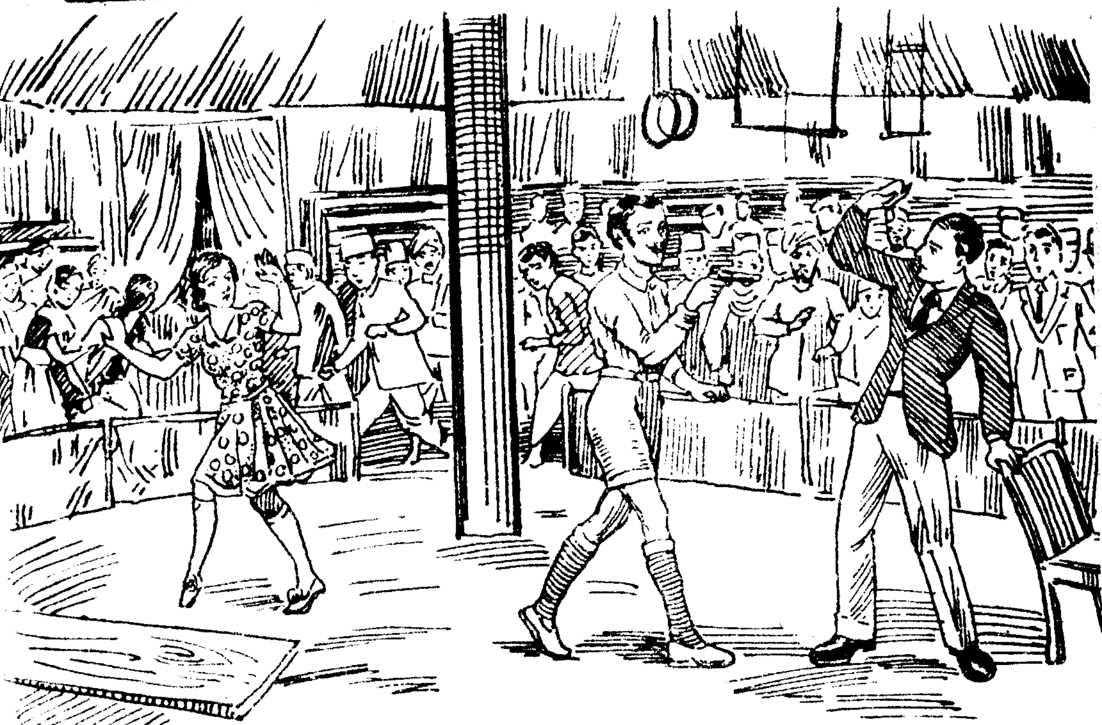
ایک کھیل تو وہ تھا جسے ہزاروں تماشائی دیکھ رہے تھے اور دوسرا کھیل وہ جسے صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس کھیل کے تین ارکان تھے۔ جان، لولا اور باورس ہیں جان اور لولا کے کھیل نہایت تشویش آمیز اضطراب کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

جان اور لولا کا ناچ ختم ہو چلا تھا۔ دونوں کے چہروں کی بشاشت زائل ہو چکی تھی اور اب بشاشت کی جگہ اضطراب اور اضطرار نے لے لی تھی۔ ناچ کے بعد دونوں اس طرح جدا ہوئے جیسے دونوں میں کچھ ان بن ہوگئی ہو۔ لولا پر شبہ کرکے جان ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے سے اس سے سوال کرنے لگا اور وہ اشارے ہی میں اسے جواب دینے لگی لیکن اس سے بجائے اس کے کہ جان کا اطمینان ہوتا اس کا غصہ اور بھڑک اٹھا۔ لولا نے اس موقع پر جان کی ایسی غضبناک صورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

لولا بھول گئی کہ اسے زبان سے نہ بولنا چاہئے اور وہ پکار اٹھی ___ ایسی غضب ناک نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ جن لوگوں نے اس سے پہلے لولا کا کھیل دیکھا ہوگا، انہیں اس موقع پر لولا کو بولتے دیکھ کر ضرور تعجب ہوا ہوگا۔

جان ہنس پڑا، اس کا یہ ہنسنا بھی خلاف معمول تھا۔ یہ سب قرائن اچھے نہ تھے۔ میں سوچنے لگا۔ اگر کوئی ناگفتہ بہ صورت کا سامنا ہوا تو اس کے اندفاع کے لئے پہلے سے کچھ انتظام کر رکھنا چاہئے۔ دوسری طرف مالک کھڑے تھے۔ میں نے ان کو اشارے سے پاس بلایا۔

ایکبار جان ہنسا۔ پھر حسب معمول آگے بڑھکر لولا کو پکڑکے اسے تختے کے سہارے کھڑا کر دیا اور پندرہ بیس گز پیچھے ہٹ کر لولا کی طرف پستول کا نشانہ باندھا۔ شاید لولا جان کے تیور سے سمجھ گئی کہ اس کا انداز



اچھا نہیں ہے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ وہ معمول کے مطابق اپنی جگہ کھڑی کھڑی "مدد، مدد" پکارتی۔ "یہ مجھ کو مار ڈالے گا فرنگ" چلاتی بادرس کی طرف بھاگی۔

لولا کی "مدد مدد" کی پکار پر جو مسخرا رنگ میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ وہ لولا کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر متعجب سا رنگ کے باہر ہی کھڑا رہ گیا اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے۔

میں مالک کے ساتھ رنگ کی طرف بڑھا لیکن ہمارے وہاں پہونچنے سے پہلے اس تیزی سے سب کچھ ہو گیا کہ ہم دیکھتے رہنے کے سوا کچھ کر نہ سکے۔

لولا کی پکار سنتے ہی بادرس اپنی جگہ سے اٹھکر رنگ میں جا کودا، اور جان سے پستول چھیننے کیلئے پیچھے سے اس پر جھپٹا۔ لیکن جان نے گھوم کر بادرس پر پستول کا نشانہ باندھا۔ بادرس نے ایک کرسی اٹھا کر جان پر پھینک ماری لیکن جان نے اس وار کو خالی دیکر پستول کی ٹھائیں ٹھائیں کی آواز کے ساتھ بادرس کو زمین پر الٹ دیا۔ بادرس کے سر اور سینے سے لہو کی دھار بہہ نکلی۔

شامیانے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ مرد و عورت سب چلانے لگے۔ "پکڑو، پکڑو" کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور زمین پر بیٹھے ہوئے آدمی ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

بادرس کو پستول کا نشانہ بنانے کے بعد جان نے لولا کی طرف رخ کیا۔ ہم لوگوں نے لولا کی چیخ اور پستول کی آواز ایک ساتھ سنی۔

ابھی ہم اس حادثے کے متعلق کچھ سوچنے بھی نہ پائے تھے کہ پستول کی ایک اور آواز سنائی دی جس کے ساتھ جان زمین پر گرتا ہوا دکھائی دیا۔

اس وقت شامیانے میں جو کھلبلی برپا تھی اور پنچنامے کی ترتیب اور عدالتی کارروائی کی تکمیل کے سلسلے میں ہمیں جو مصیبتیں اٹھانی پڑیں انکی تفصیل عبث ہے۔ میری اصل کہانی ختم ہو گئی۔

اس ہولناک رات کو جان نے موم بتیاں بجھانے کی بجائے تین انسانی زندگیوں کے چراغ گل کر دیئے۔ وہ اس کا آخری کھیل تھا۔ یہ کہانی عشقیہ ہے لیکن آپکے فسانوں کے کرداروں کے جذبات محبت و رقابت کی نسبت اس کہانی کے ارکان کے جذبات کہیں زیادہ قوی اور ناقابل شکست معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

"آپ ٹھیک کہتے ہیں!" میں نے جواب دیا۔ ان کی کہانی سنکر میرے دماغ میں جو خیالات پیدا ہو رہے تھے میں انہی میں الجھا ہوا تھا۔

اب میں جب کبھی سرکس دیکھنے جاتا ہوں تو وہاں کے رنگ میں میری آنکھوں کے سامنے جان اور لولا کے واقعہ کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔

میاں بیوی کا افسانہ

اِن دونوں میں بیحد محبت تھی۔ ایک دوسرے کو چاہتے تھے لوگ کہتے تھے یہ سارس کی جوڑی ہے۔ اور ان دونوں کی زندگی پر رشک کرتے تھے۔

بیوی حسین تھی۔ اور شوخ بھی۔ انہی شوخیوں میں اس کی زندگی بہار سے کھیل رہی تھی۔ شوہر اسکی اداؤں کا دیوانہ تھا لیکن واہ رے انقلاب! ...... وقت کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ پتہ نہیں کیوں یہ خوبصورت پھول مرجھانے لگا۔ شوہر گھبرا گیا بیچین ہوگیا۔ بیوی کے خوبصورت چہرہ پر اداسیاں چھاگئیں اور رفتہ رفتہ بیمار سا معلوم ہونے لگا۔ جیسے اس کا حُسن ہوا میں بکھر گیا ہے۔ دیکھنے والے کہنے لگے۔ دِق کی بیماری ہے۔ کیونکہ رفتہ رفتہ اس کا چلنا پھرنا بہت ہی کم ہوگیا تھا۔ چہرہ پر زردی چھاگئی تھی۔ ڈاکٹر آئے حکیم آئے۔ طرح طرح کے علاج ہوئے لیکن مریضہ کا چہرہ اُترتا ہی چلا گیا۔ وہ خود کچھ نہ کہتی تھی۔ چُپ تھی۔ یہاں تک کہ اسکی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ چہرہ بھیانک ہوگیا۔ یہ وہی خوبصورت اور حسن کا مجسمہ عورت تھی جو کبھی شوہر کی نظروں میں سمائی رہتی تھی۔ آج اسکا حال دیکھ کر شوہر بھی بچنے لگا۔ مرد کی محبت بے نقاب ہوگئی اور اُس نے سمجھ لیا کہ مرد عورت کے حُسن سے اور اسکی جوانی سے محبت کرتا ہے۔ عورت سے نہیں۔

سخت بیماری کے باوجود وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ مگر کرتی کیا۔ اتفاق کی بات کہ اس نے ایک دن کسی اخبار میں کچھ پڑھ لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اُسے کیا بیماری ہے۔ اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ ساتھ ہی اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس بیماری کا اصلی علاج کیا ہے۔ چنانچہ اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے ایک خط لکھا اور نہ جانے کہاں سے دوا کا پارسل منگا لیا۔ اور استعمال شروع کردی۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے دیکھا۔ اُسکے چہرہ پر پھر رونق آنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ پھر خوبصورت پھول بن گئی۔ اور وہی شوہر جو کل تک بچنے لگا تھا۔ پروانہ کی طرح اسکے چاروں طرف چھا گیا۔ شمع روشن ہوگئی تھی۔ اور پروانہ کا آنا ضروری ہوگیا تھا۔)

بہت دِن بعد پتہ چلا کہ وہ سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی بیمار تھی اور وقت بےوقت سفید پانی خارج ہونے لگا تھا جو رفتہ رفتہ بڑھ گیا اور بیماری خطرناک صورت اختیار کرگئی۔ چہرہ کا رنگ رُوپ اُڑ گیا۔ اتفاق سے اس نے دوا "**روک**" کی خبر اخبار میں پڑھ لی جس سے اُسے معلوم ہوا کہ لیکوریا کی بیماری کیلئے یہ دوا سب سے بڑا علاج ہے چنانچہ اُس نے

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ پی بکس ۱۲۷ دہلی کو

خط لکھ کر دوا "روک" کی شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگائی اور استعمال کی۔ تیسرے دن سفید پانی کا آنا بند ہوگیا۔ اور پوری شیشی ختم ہونے تک بیماری کا نام نشان بھی نہ رہا۔ اُس کے بعد اُسنے بیشمار سہیلیوں کو دوا "روک" کا حال بتایا۔ اور ان میں سے جس کسی کو بھی لیکوریا کی بیماری تھی۔ اُس نے دوا "روک" کے استعمال سے صحت حاصل کرلی۔ ایک شیشی دوا "روک" کی قیمت تین روپے ہے۔ پارسل پر ساتآنے محصول لگتا ہے

نوٹ:۔ سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی بیماری کیلئے دوا "روک" اتنی بہترین ثابت ہوئی ہے کہ آج ہزاروں حکیم ڈاکٹر لیکوریا کی مریض عورتوں کو صرف اسی دوا کا مشورہ دیتے ہیں کیونکہ دوا "روک" کے استعمال شروع کرنیکے تیسرے ہی دن سفید پانی گرنا بند ہوجاتا ہے۔ لہٰذا جن عورتوں کو ضرورت ہو وہ **مندرجہ** بالا پتہ پر خط لکھ کر دوا "روک" منگا لینی چاہیئے۔ ایک ہی شیشی سے یہ بیماری ختم ہوجاتی ہے۔

واضح رہے کہ دوا "روک" تقریباً چودہ سال سے تمام ہندوستان میں مشہور ہے اور نہایت تیزی کے ساتھ ہندوستانی عورتوں میں مقبول ہوئی ہے۔ چونکہ تیسرے ہی دن سفید پانی گرنے کو بند کردیتی ہے۔ اسلئے ہزارہا عورتیں محض اس خوبی کے باعث اسکی گرویدہ ہیں۔ اور جب انکی کوئی سہیلی لیکوریا کے مرض میں گرفتار ہوجاتی ہے تو وہ یہی تاکید کرتی ہیں کہ دوا "روک" استعمال کرو تاکہ دیکھتے دیکھتے بیماری ختم ہوجائے اور یہی حقیقت ہے کہ ہمیشہ ہی اُن کا یہ کہنا سچ ثابت ہوتا ہے۔

حدیثِ آرزو

(...... کے نام ایک خط)

از جناب ظفر شیرانی

بن کے سرورِ روح پہ چھانے کب آؤ گی؟
بے کیفیوں کے نقش مٹانے کب آؤ گی؟
شعر و شباب، نغمہ و چنگ و رباب سے
پھر جنتِ شباب بسانے کب آؤ گی؟
ہیں نرم نرم غنچے تبسم کے منتظر
آ ہنس کر تم ان کو پھول بنانے کب آؤ گی؟
رگ رگ میں دل کی جس کی مچلنے لگے شباب
وہ مدھ بھرا ترانہ سنانے کب آؤ گی؟
شرم و حیا سے ناز سے پھر گنگنا کے تم
میرے ہی شعر مجھ کو سنانے کب آؤ گی؟
تم کو قسم ہے شعر کی اے "جانِ شاعری"
"شمعِ سخن" کی لَو کو بڑھانے کب آؤ گی؟
پھیلا کے اپنے عارضِ روشن کی چاندنی
ذروں کو ماہتاب بنانے کب آؤ گی؟
مہکی ہوئی ہوا ہے بہاروں پہ ہے شباب
تم ان حسین فضاؤں پہ چھانے کب آؤ گی؟
جب سے گئی ہو مجھ کو جہنم ہے ہر فضا
غم خانے کو بہشت بنانے کب آؤ گی؟
روٹھیں جو تم تو میں نے منایا ہزار بار
روٹھا ہوں میں تو مجھ کو منانے کب آؤ گی؟
کلیاں بھی ہیں خموش گلستاں بھی دم بخود
خوابیدہ ہے بہار جگانے کب آؤ گی؟
دکھلا کے پھر خیال کو "ماضی کا آئینہ"
مجھ کو حسین خواب دکھانے کب آؤ گی؟
پھر ربط و ضبطِ حسن و محبت بڑھا کے تم
اپنے ظفر کو اپنا بنانے کب آؤ گی؟

تلاشِ سکوں

(از جناب نیساں اکبر آبادی)

سکوں کوہساروں میں صحرا میں ڈھونڈا
سکوں آبشاروں میں دریا میں ڈھونڈا
سکوں میں نے تاروں کی دنیا میں ڈھونڈا
مگر اس کو میں نے وہاں بھی نہ پایا

سکوں کو صدائے ترنم میں ڈھونڈا
شگفتہ گلوں کے تبسم میں ڈھونڈا
سمندر کے شور و تلاطم میں ڈھونڈا
مگر اس کو میں نے وہاں بھی نہ پایا

سکوں کو جمالِ گلستاں میں ڈھونڈا
گلوں سے بھرے اپنے داماں میں ڈھونڈا
کبھی رات کو ماہِ تاباں میں ڈھونڈا
مگر اس کو میں نے وہاں بھی نہ پایا

سکوں میں نے شیریں ترانے میں ڈھونڈا
سکوں میں نے مطرب کے گانے میں ڈھونڈا
سکوں کو خوشی کے زمانے میں ڈھونڈا
مگر اس کو میں نے وہاں بھی نہ پایا

سکوں کو بہارِ مسرت میں ڈھونڈا
حصولِ زر و مال و دولت میں ڈھونڈا
امیروں کے گھر عیش و عشرت میں ڈھونڈا
مگر اس کو میں نے وہاں بھی نہ پایا

سکوں میں نے پایا فقط ایک شے میں
حصولِ تمنا کی پُر کیف مے میں

مشہور طوائف زہرہ جان کی آپ بیتی!

مجھے نیچا دکھانے والا مرد

یہ میری آپ بیتی کی دوسری قسط ہے وہی اداکار ہیں منظر بدلا ہوا ہے

میں ایک کھیت کی مینڈھ پہ بیٹھی تھی۔ کسان اپنے کام میں مصروف تھا۔ خور و نبات ایک طرف اکھیڑ کر ڈالتا جاتا۔ اس میں کام کے پودے بھی تھے۔ ناکارہ بھی۔ لیکن کھیت گیہوں کا تھا، اور یہ اس جنس کے نہ تھے۔ کھائے یہ بھی جائیں گے۔ پر انہیں صرف وحشی کھائینگے بیج ان کا بھی پڑا تھا۔ اُن کیلئے بھی زمین کا سینہ شق ہوا تھا۔ دھرتی ماتا کا لہو انہوں نے بھی پیا تھا۔ پر کیا کریں۔ غلط جگہ اُگ آئے۔

بہت سی چڑیاں ایک چڑے کو مارتی ہوئی آئیں۔ سب کہہ اٹھے۔ بے ایمان نے بدمعاشی کی ہوگی۔ انسان کا قانون حیوان سے مختلف ہے۔ یہاں چڑے چڑیاں مل کر سب چڑیا ہی کو مارتے ہیں۔

یہ پنچھی اُڑ گئے۔ ایک اور جھرمٹ آیا۔ یہ سب ایک چڑیا کو مار رہے تھے۔ وہ رنگی ہوئی تھی اس کے ہم جنس اُسے مارے ڈالتے تھے۔ اس کا رنگ بدلا ہوا تھا اور رنگنے والا ہاتھ کسی اور پر رنگ چڑھا رہا تھا۔

دنیا کا انصاف نرالا ہے۔ مال مسروقہ کو سزا دی جاتی ہے۔ سارق صاف بچ جاتا ہے۔

کسان کی گھر والی روٹی لے کر آئی۔ نیلے ...لے۔ بدرنگ پھٹے پرانے کپڑے۔ سانولا ...۔ بھدا بھدا نقشہ۔ مرد نے پانی کھینچا عورت نے زمین جھاڑی۔ دونوں کوئیں پہ کھانے کو بیٹھے۔ موٹی موٹی روٹیاں، لگاون میں پیاز اور گڑ۔ سب گنا چنا۔ شاید پیٹ بھرا ہو بھی نہیں۔ عورت گھٹی بھی چھوٹی اُٹھاتی تھی اور ڈلی بھی۔ بڑی بڑی مرد کے آگے سرکاتی جاتی۔ مرد ان جذباتی حرکات سے بے خبر نوالے مار رہا تھا۔ کام کرنے پیدا ہوا ہے۔ اس نسوانی شاعری سے آشنا نہیں نہ وہ فطری شاعرہ ہی داد طلب تھی۔ وہ بھی یہ سب کچھ نادانستہ طبعی طور پر کر رہی تھی۔ ایثار اس کے خمیر میں تھا۔ عورت تھی۔

عورت میں بھی ہوں۔ طینت وہی ہے شاید خمیر غلط اٹھایا گیا ہے۔ جو رزق ہے، ایک شکل میں حیات بخش، دوسری شکل میں خرمن خرد سوز کج رو۔ کھٹری احول ہوس زدہ۔ عقل انسانی نے جو سے بیر (Beer) بنائی۔ انگور سے شیمپین (Champaigne)۔ عورت سے رنڈی۔

میں اس غوط میں بیٹھی تھی کہ ایک صاحب نے میری جانب اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ بیچاریاں ازدواجی زندگی سے محروم ہیں۔ ایک تیر سا لگا۔ پر میں کچھ نہ بولی۔ وہ خاموش ہونے والے تھے نہیں کہنے لگے۔ خدا بخشے اکبر الہ آبادی خوب کہہ گیا ہے۔ ایک نے پوچھا کیا، بولے قصہ طلب شعر ہے۔ وہ ہوا یہ کہ بی گوہر کلکتہ والی لشاور جا رہی تھیں جب الہ آباد کے اسٹیشن پر پہنچیں تو اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ سامان اُتروالو۔ اور خود پلیٹ فارم پر آکھڑی ہوئیں۔ وہ غریب پریشان کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ لیکن تریا ہٹ اور پھر تریا بھی.... بہرکیف حکم حاکم مرگ مفاجات۔ وہ اس خیرہ کی خودسری سے واقف تھا تعمیل حکم کی۔ یہ بیگم ٹمٹم میں سوار ہو اکبر الہ آبادی کے گھر جا دھمکیں۔ سیکرٹری نے اطلاع کی کہ گوہر کلکتے والی ملنے آئی ہیں۔ بڑے میاں اپنے بڑھاپے پر نادم، بیٹھک میں تشریف لائے۔ یہ تڑاخ پڑاخ مقراض زبان بولی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آج عمر بھر کی آرزو بر آئی۔ میں تو لشاور جا رہی تھی۔ پر الہ آباد کا نام سنتے ہی دل نہ مانا کہ شرف قدمبوسی حاصل کئے بغیر چلی جاؤں۔ آپ جانیں عورت دل کی لونڈی ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے آج جناب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہ دن میری زندگی میں یادگار رہیگا۔

بڑے میاں نے بھی مناسب جواب دیے۔ چلتے ہوئے کہنے لگی ایک اور آرزو ہے اگر خاطر ... پر گراں نہ گزرے۔ پہلے تو حضرت گھبرائے پھر ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔ اس نے کہا اگر

اپنے قلم سے کچھ رقم فرمادیں تو حرزِ جان بناکر رکھوں بجنانے یہ شعر لکھ لفافہ میں بند کرکے حوالہ کردیا۔

کون خوش بخت زمانہ میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

کان یہ سن رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے ازدواجی زندگی اپنے مناظر پیش کررہی تھی۔ اور میں اس تماشہ میں غرق تھی۔ ایک عجیب لطف تھا۔ عجیب کھٹک۔ نرالی کاوش تھی۔ اچھوتی خراش۔ سینہ میں میٹھا میٹھا درد ہوتا تھا۔ میں ان کیفیات میں ایسی محو تھی۔ جیسا بھوکا روٹی کے تصور میں۔ بانجھ اولاد کے خیال میں۔ اولاد مال کے دھیان میں۔ سینہ میں ایک چیز تھی۔ جو کچھ مانگ رہی تھی۔ پہلو میں ایک خلا تھا جو آج میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ میرا رُواں رُواں کسی چیز کا متلاشی تھا۔ میرا ہر قطرۂ خون کسی کی تلاش میں رواں میری نسائی فطرت میں ایک طوفان بپا تھا۔

آج مجھ میں وہ عورت جاگ اُٹھی تھی، جو بیوی بننے پیدا ہوئی ہے، جو ماں بننے پیدا ہوئی ہے۔ جو اپنے کو قربان کرنے پیدا ہوئی ہے۔

آج وہ خلقت انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑی تھی۔ جسے افیون دیکر سلا دیا گیا تھا۔ آج وہ حقیقت اپنا حق مانگنے آن پہنچی تھی جس کو کذب، ریا اور غلط فضا کے انبار میں دبا دیا گیا تھا۔

فطرت ماحول کے خول کو توڑ رہی تھی۔ رنڈی کا جامہ چاک کرکے عورت برآمد ہونے کو تھی۔ عورت جو کھونے کو پانا سمجھتی ہے۔ عورت جو اپنا خون چُسا کر نسلِ انسانی کو پالتی ہے۔ عورت جو شفقت سے خمیر کی گئی ہے عورت جو ماں سے تعبیر کی گئی ہے۔

میں آدم و حوا کے نمائندوں کو دیکھ رہی تھی۔ میری روح قالب چھوڑ ان کے طواف میں مصروف تھی۔ میرا دل سینہ میں سے نکل کر ان کے پیروں پر لوٹ رہا تھا۔

آج میں فطرت ہی فطرت تھی۔ ماحول سے مبرا۔ فضا سے بالاتر۔ جسدِ خاکی سے آزاد۔

مرد آدھی روٹی چھوڑ کر کھڑا ہوگیا عورت تو اتنی دیر سے چھوٹے چھوٹے نوالے اسی لئے کھارہی تھی کہ اُس کا کماؤ اس کا سرتاج، اس کا سردار، اس کے بچوں کا باپ۔ اس کا مرد زیادہ کھالے۔ وہ زنانہ شاعری تھی یہ مردانہ نثر۔ ایک صاحب مجھے مخاطب کرکے کہنے لگے بھئی زہرا تعجب ہے۔ عورت جیسی حیا پرور اور عصمت فروشی پر مائل ہوجائے۔

سینہ میں ایک انی سی لگی۔ میں نے زخمی شیرنی کی طرح ان کی طرف دیکھا۔ لیکن اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

کاظم بپھرے ہوئے شیر کی مانند غرایا اور بولا۔ ہم کو کچھ کہنے کا منہ نہیں۔ ایمانداری سے دیکھو تو تماشبین مرد اور طوائف میں کچھ تفاوت نہیں۔ ہم کو اپنا زمانہ یاد ہے جب ہم ہزار بارہ سو ڈنڈ پیلتے تیس سیر کے پھاوڑے سے اکھاڑے کو دو تین پلٹیاں دیتے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ زور کرتے۔ دس پانچ کے سانس بھراتے پانچ سات کو دم بھراتے۔ اور آخر کو اکھاڑے ہی میں دوڑ لگاکر پڑ جاتے۔ رانیں ستون بنی تھیں۔ پنڈلیاں سُتی ہوئی۔ بدن پر تیاری۔ چہرہ سیب سا۔ شانوں پر خربوزہ کی قاشیں رکھی معلوم ہوتی تھیں۔ سینہ سل کی مانند۔ جب شام کو انگرکھا پہن کر نکلتے تو دس بیس ہزار میں ایک نظر آتے۔ ہم پر نظریں پڑتی تھیں جب محرم اور رام لیلا کے موقع پر بھیڑ میں سے گزرتے تو لوگ خود راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں ہم اکثر مرکزِ نگاہ رہتے۔ چھوٹی بڑی ستھوں پر لوگ ہمیں دیکھتے تھے۔ سومنگ باتھس (Swimming Baths) میں ہم نہانے نہیں بدن دکھانے جاتے تھے۔

اسی وجہ سے اکثر کنارہ پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ بغل بچوں کی تیاری دیکھنے کے قابل نہ تھی۔ سینہ اور کمر میں آٹھ انچ کا فرق۔

دن بھر سوتے۔ شام کو بناؤ سنگار کرکے سیر کو نکل جاتے۔ تمام شب عالمِ رنگ و بو میں گزارتے۔ ہم میں اور رنڈی میں فرق نہ تھا۔ وہ بھی شب بیدار تھی، ہم بھی۔ اس کا بھی صبح کا وقت ریاض کا تھا، ہمارا بھی۔ شام کو وہ سولہ سنگار بارہ ابرن کئے سرِ بام نظر آتی، ہم سرِ بازار۔ وہ بھی اپنے جسم کی سوداگر تھی، ہم بھی۔ نقدِ حسن کی دکان اس نے بھی سجا رکھی تھی، ہم نے بھی۔ فرق اتنا تھا کہ معصیت اس کے پاس آتی تھی اور ہم معصیت کے پاس جاتے تھے۔

تفاوت اتنا تھا کہ وہ اکثر و بیشتر پیٹ کی خاطر گناہ کرتی تھی اور ہم لذتِ نفس کیلئے۔ وہ اس ماحول میں پیدا ہوئی تھی اور ہم شریفوں کی اولاد تھے۔ اس کا ظاہر و باطن ایک تھا اور ہم گندم نما جو فروش۔ وہ اپنے اغراض کیلئے بازارِ حسن کے ایک سجے سجائے کمرے میں پڑی تھی اور ہم ان پر اپنی شرافت کا پردہ ڈالے سوسائٹی کی فضا مسموم کررہے تھے۔ وہ ایسا زہر تھی جسے سب زہر جانتے تھے۔ زہر ہم بھی تھے لیکن شوگر کوٹڈ (Sugar coated) وہ ذلیل تھی اور ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ ذلیل ہم بھی تھے لیکن شرافت میں ملبوس۔ اس سے شریف گریز کرتے تھے ہم شریفوں میں رستے بستے تھے وہ بھیڑیا تھی بھیڑیے کے برن میں بھیڑیا ہم بھی تھے مگر بھیڑ کی کھال پہنے ہوئے۔ وہاں جال تھا جعلسازی نہ تھی۔ یہاں جال تھا دامِ تزویر کے ساتھ۔ وہ کوک شاستر تھی اور اس پر کوک شاستر لکھا تھا۔ کوک شاستر ہم بھی تھے لیکن ہم پر صرف شاستر کی چھاپ لگی تھی۔ ہم زہر تھے شہد میں ملے ہوئے ہم کانٹا

تھے پھولوں میں چھپے ہوئے۔ ہم سانپ تھے سماج کی آستینوں میں۔ زہر کی شیشی وہ بھی تھی لیکن اس پر سُرخ لیبل لگا تھا۔ کاش وہ بھی بھی ولے پردۂ ریحاں میں نہیں۔ سانپ وہ بھی تھی مگر مارِ آستین نہیں۔

میری آنکھیں بار احسان سے جھکی جاتی تھیں دل کاظم کی طرف کھچا جاتا تھا۔ اور وہ ایک مقررانہ انداز میں آزمودہ کار وکیل کی طرح یکے بعد دیگرے دلائل دیتا جا رہا تھا۔ محفل دم بخود تھی۔ کاظم کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ میرے دل و جان اس پر نثار ہو رہے تھے۔ ہر مثال بے مثال تھی۔ ہر دلیل ساطع ہر برہان قاطع، ہر فقرہ ختم بیان معلوم ہوتا۔ ولے دوسرا اس سے اونچا جاتا۔ منطق دست بستہ کھڑی تھی۔ زبان زنبیل لئے حاضر۔ حسن بیان جلو میں۔ لغت حاشیہ بردار۔

اہلِ بزم اس کا منہ تک رہے تھے۔ میں نیچی نظریں کئے آئینہ دل دیکھ رہی تھی۔ گرانباری احسان سے نظریں نہ اُٹھتی تھیں۔

جن صاحب نے مجھ پر طنز کیا تھا۔ وہ بولے۔ خیر سے وکالت ہو رہی ہے۔ کاظم نے کہا۔ نہیں حقیقت بیان کی جا رہی ہے۔ اگر عالم رنگ و بو کے دلدادہ مرد اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ حقیقت کو نظر انداز نہ کریں سچ سے نہ کترائیں۔ تعصب سے کام نہ لیں تو وہ اپنے کو رنڈیوں سے بدتر پائیں گے۔

وہ سانپ ہیں پشتوں کے کاٹنے پر مصر وہ بھیڑیے ہیں۔ بھیڑوں کو راہ راست بتانے پر آمادہ۔ وہ لومڑیاں ہیں بلی کی چالاکی پر گرفتہ نہیں۔ اگر ایمانداری سے دیکھئے اور ان غریبوں کی زندگی پر نظر غایت ڈالئے تو نظر آ جائیگا کہ ان میں سے سو فی صدی ہماری نظر کرم کی مرہونِ منت ہیں۔ قابل تعزیر ہم ہیں وہ نہیں۔

ملامت ہم کو کرنی چاہئے ان کو نہیں لعنت ہم پر اُترنی چاہئے اُن پر نہیں۔

وہ تو ہماری ہوس کا شکار ہیں۔ ہماری طبع کج رفتار کی نخچیر۔ ہماری خواہشات کی آلۂ کار۔ یہ زخم ہمارے لگائے ہوئے ہیں جن کو آج ہم وجہ عفونت کہہ رہے ہیں۔ یہ بس ہمارا بویا ہُوا ہے جس کا پھل ان کو مل رہا ہے۔ جس آگ میں اُن کے گھر پھنک گئے وہ ہم نے ہاتھ تاپنے کو لگائی تھی جس سیلاب میں اُن کا سفینۂ حیات بہ گیا اس کے بند ہم نے ترنّم آبشار سننے کو کھولے تھے۔

گنہگار ہم ہیں، خطا کار ہم۔ الزام ان کو دے رہے ہیں مطعون انہیں کر رہے ہیں۔ الٹے وہ شکوہ کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ ناطاقتی کے طعنہ ہیں عذر جفا کے ساتھ

اب دسترخوان بچھا۔ ٹفن باسکٹ کھلا۔ انواع واقسام کے کھانے چنے گئے۔ دسترخوان خوان معلوم ہوتا تھا۔ میں کوشش کر کے کاظم کے پاس بیٹھی۔ طشتریاں کم تھیں۔ میں نے اپنی رکابی کاظم کے سامنے سرکا دی۔ وہ کچھ مجبور سا ہو گیا اور میرے ساتھ کھانے لگا۔

ایک صاحب بولے۔ ماشاء اللہ دست کوئے کھا جا رہے ہیں۔ کاظم نے سب کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔ یہ ڈومنیاں کیوں خموش بیٹھی ہیں۔ ایک بولا دولہا بڈھا ہے۔ کاظم نے کہا آپکو تجربہ ہوگا۔ اور کیوں بندہ نواز کھا ہم رہے ہیں۔ مرچیں آپکے لگ رہی ہیں۔ کیا زخموں پہ نمک چھڑکا جا رہا ہے۔ ماشاء اللہ بڑی بڑی گرم باتیں بنا رہے ہو۔ یار ہو رکابی مذہب۔ جہاں دیکھا توا پرات۔ وہیں گزاری ساری رات۔ میاں مُلّا منش تم اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھو۔ دوسرے بولے مردہ دوزخ میں جائے چاہے جنت میں۔ تیسرے نے کہا۔ دیکھتے رہو مردہ جنت ہی میں جائیگا۔

کاظم نے جواب دیا۔ اپنے یار بہشت ارضی کے رضوان ٹھہرے تو اپنے گھر ہے ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا ہم جانتے ہیں تم بڑے گھرے ہو۔ پر ذرا گھرے سے بچے رہنا۔ کاظم نے کہا۔ ملاح پیرتے نکل جائیں گے۔

دوسرے نے جواب دیا۔ بس زیادہ ملاحیاں نہ اڑائیے ؂

دریں ورطہ کشتی فرو شُد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

کاظم بولا۔ آپ کنارے محروم رہ گئے ہوں گے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ یہاں تو کنار بھی ہمارے لئے ہے کنارہ بھی۔

وہ جو کبھی لڑنے والا جواب دینے میں مصروف تھا۔ کھانے سے بے خبر۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ بانکا سپاہیا کہیں بھوکا نہ رہ جائے۔ اس خیال سے ایک کسک سی ہوتی تھی۔ یہ درد میں نے آج پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ شاید آج پہلی دفعہ میرے سینے میں عورت کا دل دھڑک رہا تھا۔ دل نے دماغ کو احکامات دئے۔ دماغ نے تدبیر نکالی۔ میں دسترخوان پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی سب نے وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا آپ لوگ مذاق کئے جا رہے ہیں۔ ہمیں اُچھو ہو جائے گا۔ ہم باز آئے ایسے کھانے سے۔ مجھے اصرار کر کے بٹھایا گیا۔ وعدہ کیا کہ اب مذاق بند۔ کھانے کے بعد دیکھا جائیگا۔

کسان اور کسان کی بیوی میری آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ اور میں غیر ارادی طور پر اچھی اچھی چیزیں کاظم کی جانب سرکانے لگی۔ لیکن اس افراط میں یہ ایثار محض تماشہ معلوم ہوتا تھا۔ شعر تھا جس میں معنی نہ تھے جسم تھا جس میں روح نہ تھی۔ راگ تھا جس میں رس نہ تھا۔ کاش میں غریب ہوتی۔ کاش

؂ یہ ایک رسم ہے جو نکاح کے بعد دولھن والوں کے ہاں ادا کی جاتی ہے۔ دلھن کے ہاتھوں پر مصری کی ڈلیاں چنی جاتی ہیں۔ دولھا ان کو منہ سے اُٹھاتا ہے۔ یہ رسم ڈومنیاں ادا کرتی ہیں۔ اور مبارکباد گاتی جاتی ہیں

میں اس ڈرامہ کی سچی ہیروئن ہوتی۔ کاش میں اس لذت سے محروم نہ کی جاتی۔

میں پیسر کو اس عُسر پر نثار کر دینے کو تیار تھی۔ تمام راحت اس کلفت کی نذر کر دینے کو حاضر۔ دولت اس غربت پر نچھاور کر دینے پر آمادہ۔ تمام سُکھ اس دُکھ پہ تج دینے کو موجود تھی۔

عورت کی طینت زمین کی سی ہے۔ بوجھ اُٹھانے میں راضی۔ خاکساری میں خوش۔ سینہ پہ پالنا اس کی خلقت۔ اپنی سوتوں سے آبِ حیات بخشنا اس کی عادت۔ دُکھ میں سُکھ محسوس کرنا اس کی خصلت۔ قربانی اس کے خمیر میں۔ ایثار اس کے ضمیر میں۔

جب کسان کو ابرِ رحمت ترسائے۔ زمین اپنا سینہ شق کر کے پانی بہم پہنچائے۔ مرد پر جب آفت آئے۔ عورت آغوشِ راحت لئے اس کے پاس پہنچ جائے تھک کر مزدور زمین پر آرام پائے۔ دکھ درد سے مرد کو نجات عورت کے پہلو میں ملے۔ یہ اولوالعزم درماندہ ہو کر زمین پر سہارا لیتا ہے۔ یہ دُنیا کو سر پر اُٹھانے والا اسر مایوس عورت کے سینہ پر ٹکاتا ہے۔ مر کر انسان زمین میں ٹھکانا پاتا ہے۔ تھک کر مرد عورت کے پاس سکون حاصل کرتا ہے۔

آخر کھانا ختم ہوا۔ دسترخوان بڑھایا گیا۔ کاظم مجھ سے دور جا بیٹھا۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ چندے یگانہ پھر بیگانہ نظر آیا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک فصل تھا۔ ایک خلیج تھی۔ ایک بُعد تھا جو عبور نہیں کیا جا سکتا تھا —— اب ہم واپس ہوئے محفل درہم برہم ہو گئی۔ ایک خواب تھا جو خوابِ بے تعبیر ہو کر رہ گیا ؎

خواجہ محمد شفیع

(چمنستان)

جادوگر کی ڈائری

ایک ماہر ہپناٹسٹ کیلئے دُنیا کا کون کام مشکل ہے!

از جناب خواجہ مسعود

فن ہپناٹزم کے جن حقائق کو سائنس کی مدد سے بھی نہیں سمجھا جاسکتا جو فوق الفطرت ظہورات ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔ جو باتیں دُنیا والوں کو ناممکن العقل دکھائی دے رہی ہیں جن کراماتوں کی تاویل انسانی عقل کرنے سے قاصر رہی ہے وہ سب ایک ماہر ہپناٹسٹ کیلئے ممکن ہیں۔ عورت، مرد، بڈھا، جوان الغرض دُنیا کا ہر ایک انسان خداوند کریم کی طرف سے اس دولتِ لازوال کا امین بنکر پیدا ہُوا ہے یہ جُدا بات ہے کہ اپنی جہالت کے باعث بیتنجی کوئی شخص اس گنج نایاب کی کھوج اپنے خانۂ دل میں نہ کرسکے لیکن یہ خفیہ طاقت ہے سب کے پاس اور ہر کوئی اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ کیسے؟ یہ جاننے کیلئے "جادوگر کی ڈائری" کا از اول تا آخر نہایت غور سے مطالعہ کیجئے۔ (ایڈیٹر)

ہپناٹزم اور جرائم کا حل!

(مسلسل)

اس زمانے کو جبکہ میں کریپن کے قتل کے سلسلے میں اپنی امداد پیش کرنے کے لئے سر ایڈورڈ ہنری کے پاس گیا تھا اب تقریباً اکیس سال گذر چکے ہیں، اور میں اس درمیان میں اس منزل سے بہت آگے بڑھ چکا ہوں۔ اگر میری تحقیقات جو ابھی تک جاری ہیں موجودہ توقعات کے مطابق مکمل ہو گئیں تو بلا خوف یہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ ہپناٹزم کا سائنٹیفک علم اس ملک میں ایک دن تفتیش جرائم کا ایک ضروری حصہ ہی نہیں بن جائیگا بلکہ ہم سب کی زندگی میں ایک اہم انقلاب پیدا کردے گا۔

میرے ان تجربات کے دوران میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر تنویم کی نیند میں ڈوبے ہوئے ایک معمول کے لئے یہ بات ممکن ہے کہ جس شخص کے سامنے وہ موجود ہے اس کے دماغی خیالات کو معلوم کرسکے اور اگر جیسا کہ دیگر تجربات سے واضح ہو چکا ہے تحت الشعور کے واسطے یہ چیز ممکن ہے کہ جسم سے علیحدہ ہو کر فعل و عمل کرسکے اور کسی دوسری جگہ کے واقعات و حالات کو دیکھکر بیان کرسکے تو پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ تنویمی بیخودی میں ڈوبا ہوا شخص ایک فاصلہ سے کسی دوسرے شخص کے دماغی خیالات کو معلوم کرسکے؛

میرے ابتدائی تجربات اس سلسلے میں بالکل معمولی نوعیت کے تھے۔ میں ان تجربات کو ہر اس شخص پر کرسکتا ہوں جو اس مقصد کیلئے خود کو پیش کرنے کے لئے تیار رہے۔ اس دور میں یہ بات میرے احباب کی ضیافت طبع کے لئے ایک دلچسپ شعبدہ ہو گئی تھی کہ ان میں سے کسی پر نیند طاری کردیجاتی تھی اور کمرے کے باقی حاضرین کے دماغی خیالات اس کے ذریعہ معلوم کئے جاتے تھے۔ میں خوابیدہ شخص سے خوامخواہ ہر قسم کے سوالات کرتا تھا تاکہ جس شخص کے خیالات معلوم کئے جارہے ہیں اس کے دماغ میں خیالات کا ایک سلسلہ پیدا ہو جائے اور اس طرح میری کوشش ہوتی تھی کہ اسے عرصۂ دراز کا کوئی بھولا ہوا واقعہ یاد آجائے۔ یہ تجربہ اکثر و بیشتر ایک غیر متوقع درجے تک کامیاب ثابت ہوتا تھا

لیکن ان سب تجربات میں اولین بات یہ ہمیشہ ضروری ہوتی تھی کہ تجربے کے دونوں شخص ایک ہی کمرے میں موجود ہوں۔ ایک معمول اور دوسرا وہ شخص جس کے خیالات معمول کے ذریعہ معلوم کئے جارہے ہیں۔

ہم یہ تجربہ ایک ہی کمرے میں شروع کرتے اور اس کے بعد میں بیدار شخص کو دور ــ اور زیادہ دور چلے جانیکا حکم دیتے یہاں تک کہ وہ دور ایک گوشے میں یا باہر برآمدے میں پہنچ جاتا۔

جب تک درمیانی دروازہ کھلا رہتا تو سب کچھ کام بخیر و خوبی پورا ہوتا رہتا لیکن ایک بار دروازہ بند ہو جانے کے بعد پھر خوابیدہ شخص کچھ نہ بتا سکتا تھا۔

ا[illegible] روز میں نے اتفاقاً ایک معمول کو ذرا زیادہ گہری نیند میں مبتلا کردیا تو معلوم ہوا کہ دروازے کے بند ہو جانے سے کوئی فرق

پیدا نہ ہوا میری ہدایت پر وہ سر اشخص آہستگی کے ساتھ زینے سے اتر تا چلا گیا۔ اس اثناء میں کوٹھے پر خوابیدہ شخص برابر اسکے خیالات معلوم کرتا گیا۔ آخر کار بیدار شخص باورچی خانہ تک پہنچ گیا جو مکان کا بعید ترین حصہ تھا۔ اور وہاں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے بیٹھ گیا۔ اسکے باوجود اسکے خیالات معلوم کر لیئے گئے۔ اس طرح آخر کار میں ایک قدم آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے علاوہ اسوقت سے اب تک میں یہی تجربہ دہرانے میں بھی کامیاب ہوا ہوں۔ جلد ہی مجھے اسکا ایک موقعہ حاصل ہو گیا کہ اس جدید قوت کی آزمائش کر سکوں جو ان تمام چیزوں سے زیادہ عجیب تھی جن کی آزمائش میں نے اب تک کی تھی۔

میرے اس کارنامے کی خبر ایک نوجوان شخص کو پہنچی جو اپنے چچا سے دولت پانے کی امیدوں پر کسی نہ کسی طرح اپنی موجودہ زندگی گذار رہا تھا۔ بسر اوقات کے لئے اسے خاص رقم ملتی تھی لیکن یہ رقم اسکے موجودہ طریقۂ زندگی کے واسطے بالکل ناکافی تھی اسے اسامیں قصوروار قرار نہیں دیا جا سکتا وہ ایک ناز پروردہ بھتیجہ تھا، وہ ہمیشہ اس خیال میں رہا تھا کہ اپنے چچا کی وصیت میں تمام مفاد کا وہ تنہا مالک ہو گا اور چونکہ یہ بوڑھا شخص ایک کروڑپتی تھا اور اچھی صحت نہ رکھتا تھا اس لیئے اس نوجوان کے لئے یہ کام کچھ دشوار نہ تھا کہ مہاجنوں سے یا دوسرے لوگوں سے ایک کافی رقم اپنے قدیسے بیہودہ اخراجات کے لئے پیشگی بطور قرض حاصل کرتا رہے۔

اس کی بدقسمتی سے اسکا چچا اپنی زندگی کا غیر متوقع عاشق ثابت ہوا اور اسی زمانے میں یا شاید اس سے متاثر ہو کر اسکے قرض خواہوں کو اپنی رقم کی طرف سے غیر متوقع اندیشے پیدا ہو گئے۔

وہ میرے پاس آیا کہ آیا میں واقعی ایک فاصلہ پر سے انسان کے دماغی خیالات معلوم کر سکتا تھا اور اگر ایسا ممکن تھا تو کیا میں اسے اس کے چچا کے حقیقی ارادوں کو بتانے میں کامیاب ہو سکتا تھا، یہ نوجوان اپنے چچا کو ان امور کی بابت خط لکھ چکا تھا جس کا جواب اسے انتہائی بزرگانہ لب و لہجہ میں مایوس کن موصول ہوا تھا میں نے ایک شخص "ف" کو معمول کے طور پر استعمال کیا اور اسے ایک گہری بیخودی کی نیند میں مبتلا کر دیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ نوجوان کا ضعیف چچا اسوقت کہاں تھا اور میں نے "ف" سے کہا کہ وہ اس بوڑھے کے دماغی خیالات کو معلوم کرے اور بتائے کہ اس نے اپنی وصیت میں اس نوجوان کے واسطے کتنی رقم چھوڑی ہے۔

کچھ دیر تک "ف" جواب نہ دے سکا، درحقیقت میں اس کام کو اسکی قدرت سے بعید سمجھنے ہی والا تھا کہ یکایک اس نے آہستہ آہستہ رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔

"اس نوجوان کو بمشکل ہی کچھ ملیگا" وہ بولا "بالکل احمق مت بنو" نوجوان نے دخل دیتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں کہ میرے چچا کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب میرے واسطے چھوڑ جائیں گے۔ ادسکن، تم ناکام رہے"

"ف" پھر بولا۔ اس نے تمہارے لئے ایک تہائی بھی نہیں چھوڑا ہے۔ اس سے بھی بہت کم۔ اور اس قلیل حصے میں ایک بیکار قسم کا کھیت بھی شامل ہے جو افریقہ کے ویران علاقے میں واقع ہے"

انتہائی سخت اور تفصیلی سوالات کرنے کے باوجود ہم "ف" کو اس کے بیانات میں متزلزل نہ کر سکے اور میرا نوجوان دوست بہ اطمینان و یقین لیکر گیا کہ کم از کم اس موجودہ معاملے میں مجھ سے کچھ بھی نہیں ہو سکا۔

تقریباً ایک سال کے بعد اس نے مجھے ایک خط لکھا اور اس کے بعد بذات خود مجھ سے معافی مانگنے آیا۔

اسکا چچا چند روز پیشتر مر چکا تھا اس نے وصیت نامہ دیکھا تھا۔ بوڑھے شخص نے اسکے لئے جو کچھ چھوڑا تھا وہ ایک تہائی سے بھی کہیں کم تھا اور اس میں بھی ایک بیکار قسم کا کھیت شامل تھا جو افریقہ کے ویران علاقے میں واقع تھا۔

میرا یہ تجربہ اس تجربے سے پوری مشابہت نہ رکھتا تھا جبکہ کسی شخص کے وہ خیالات معلوم کئے جاتے ہیں جو کہ تجربے کے وقت اسکے دماغ میں موجود ہیں۔ ہمارے پاس اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا کہ بوڑھا چچا اسوقت اپنے وصیت نامے کی بابت ہی سوچ رہا تھا جبکہ "ف" سے یہ پوچھا گیا کہ نوجوان شخص کے لئے جو کچھ رقم چھوڑی گئی ہے اسے معلوم کرے "ف" نے اس تجربے میں صرف یہ کیا کہ اس بوڑھے کے دماغ کے ایک خصوصی فعل کو ماضی کے آغوش سے بیدار کر دیا اس میں شک نہیں کہ اس بوڑھے چچا کو یاد ہو گا کہ اس نے اپنے بھتیجے کے واسطے وصیت نامہ میں کیا تحریر کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ اس تجربے کے وقت شعوری طور پر اس وصیت کی بابت نہیں سوچ رہا تھا حافظہ کے متعلق یہ عام مسئلہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اس میں تین چیزیں شامل ہوتی ہیں — ایک ادراک جو کہ اشیاء کے علم کو دماغ پر تصویر کی طرح نقش کر دیتا ہے۔ دوسرے وہ قوت

جوکہ اس تصویر کو محفوظ رکھتی ہے ۔ اور میرے وہ قوت جو اس تصویر کو ضرورت کے وقت از سر نو زندہ کر دیتی ہے ۔ لیکن اس مسئلہ سے اس تجربے کی تصریح نہیں ہو سکتی ۔ بہر حال اس سے کم از کم اتنا معلوم ہوتا ہے کہ محفوظ شدہ تصویر بوڑھے کے دماغ میں موجود تھی ۔۔۔ یہ تصویر کسی خفیہ حصے میں محفوظ تھی کہ جسے ارادے کے ذریعہ از سر نو زندہ کرنے کی ضرورت ہو بلکہ واضح طور پر ان نگاہوں کے واسطے ظاہر تھی جو وہاں تک پہنچ سکتی ہیں ۔

دماغ کا یہ وہ پہلو ہے جس کی بابت جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے کسی ماہر نفسیات نے تحقیق نہیں کی ہے ۔

اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے گذشتہ خیالات کو معمول کا تحت الشعور معلوم کر سکتا ہے خواہ وہ شخص جس کے خیالات کا مطالعہ کیا جا رہا ہے اسوقت کسی خاص امر کی بابت نہ سوچ رہا ہو ۔ ”دماغ پر نقش کی طرح کندہ“ ۔۔ یہ الفاظ ایک لفظی و معنوی حقیقت کے ترجمان ہیں ۔

یہاں تک تو صرف ماضی کے متعلق بیان کیا گیا ۔ آپ دریافت کر سکتے ہیں کیا اسی طرح مستقبل کی باتیں بھی معلوم کی جا سکتی ہیں یا نہیں ؟

اس کے جواب میں مجھے فوراً یہ اعتراف کرنا ہے کہ اگرچہ مجھ سے مریضوں کے واسطے مستقبل کا مطالعہ کرنے کی درخواست سینکڑوں مرتبہ کی گئی لیکن میں نے ہمیشہ انکار کیا ہے ۔

بایں ہمہ مجھے پوری طرح اس امر کا یقین ہے کہ تحت الشعوری دماغ مستقبل کے حالات اتنی ہی صحت اور وضاحت کے ساتھ بتا سکتا ہے جتنا کہ زمانہ حال اور ماضی کے واقعات میری زندگی میں دو مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ معمول نے میری درخواست کے بغیر ہی خود مستقبل کی بابت پیش گوئی کی ۔ ان میں سے ایک واقعہ کی بابت میں کسی طرح کچھ بھی نہیں بتاؤں گا ۔ لیکن دوسرے واقعہ کو جو اگرچہ المناک ہے یہاں بیان کروں گا کیونکہ یہ میرے موجودہ استدلال کے لئے ایک ثبوت کی حیثیت رکھتا ہے ۔

میں چند ہفتوں سے ایک عورت کا علاج کر رہا تھا جسے اعصابی اضمحلال کی شکایت تھی لیکن مجھے ابھی تک کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے مجھے اس امر کی اجازت نہیں دی تھی کہ نیند کی ایک ہلکی سی کیفیت اس پر طاری کر دوں جو کہ میرے نزدیک اس کے کامیاب علاج کی یقینی ضامن ہو سکتی تھی ۔

مایوس ہو کر اس نے آخر کار میرے پاس آنا بند کر دیا ۔ لیکن تقریباً ایک ماہ بعد مجھے یہ معلوم ہو کر حیرت ہوئی کہ اس کے شوہر نے پھر ٹیلیفون کیا اور مجھ سے فوری طور پر آنے کی درخواست کی ۔

میں نے اس عورت کو ایک مکمل تباہ شدہ حالت میں پایا ۔ اسے مشکل ہی سے کچھ ہوش باقی تھا ۔

”خدا کے لئے یہ بتائیے کہ اسے کیا ہو گیا ہے“ ۔ اسکا شوہر بولا ۔

میں نے جواب دیا ” یہ کام ایک طبیب کا ہے ۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن وہ انتہا سے زیادہ مصر ہوا اور آخر کار اس کے اصرار کے جواب میں میں نے ”ف“ کو بلایا اور اسے چارپائی پر عورت کے برابر لٹا کر نیند میں مبتلا کر دیا ۔

تین یا چار منٹ تک وہ مکمل طور پر بے حس و حرکت لیٹا رہا اور کچھ نہ بولا اس کے بعد اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر عورت کی کلائی کو پکڑا اور عورت کے بازو کو ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا : ۔

دیکھئے ۔۔ یہ اسکی شریانیں ہیں ۔ آپ دیکھتے ہیں ،،

مجھے کچھ بھی نظر نہ آ سکا

”تمہارا کیا مطلب ہے ؟ میں نے پوچھا

اس نے جواب دیا ” زرد رنگ کے ذرے ۔۔ دیکھئے ۔۔ یہ انجکشن ہیں“

میں شوہر کی طرف متوجہ ہوا

”بیشک“ اس نے کہا ۔ شاید یہ بات مجھے آپ کو بتا دینی چاہئے ۔ جب میری بیوی نے آپ کے پاس جانا بند کر دیا تو وہ ایک اور ڈاکٹر کے پاس گئی (ڈاکٹر کا نام بتاتے ہوئے) وہ اسکا علاج کر رہا ہے اور کچھ روز ہوئے کہ اس نے کچھ انجکشن دینے کا فیصلہ کیا تھا ۔ اس نے پہلے ایک انجکشن دیا اور کل دوسرا انجکشن دیا ہے جب وہ اسطرح بیدم اور نڈھال ہو گئی تو میں نے اس کو بلایا لیکن اس نے کہدیا ہے کہ اب اور انجکشن نہ دے گا ۔ غالباً یہی انجکشن ہیں جنکی طرف یہ معمولی اشارہ کر رہا ہے ،،

یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اس سلسلے میں کسی دوسرے ڈاکٹر کا نام سنا تھا اور اس لئے میں اسکے متعلق مزید سوالات کرنیوالا تھا کہ یکایک ”ف“ نے جو ابھی تک عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اپنا دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا اور میرے سر کو اسقدر قریب جھکایا کہ میرا کان اس کے منہ کے نزدیک پہنچ گیا ۔

”ان لوگوں نے اس عورت کو ہلاک کر دیا ہے“ ۔ وہ بولا ”وہ کل صبح کو چھ بجے مر جائیگی“

"وہ یہ کیا کہتا ہے؟" شوہر نے پوچھا۔

ظاہر ہے کہ میں اسے حقیقت نہ بتا سکتا تھا "وہ یہی کہ اس عورت کو مزید انجکشن نہیں دیئے جائیں گے"، میں نے معمول کی بات بدلتے ہوئے کہا۔

"مجھے اسکی حالت سے مطلع کرتے رہیگا" میں نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

اگلے روز صبح کے وقت میں ناشتہ کر رہا تھا جبکہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ اسکا شوہر تھا۔ اسکی بیوی اسی صبح چھ بجکر پانچ منٹ پر مر گئی تھی۔

پیش گوئی کے الفاظ سے قطع نظر کر کے اس واقعہ کو اس بوڑھے کہوڑ پنی کی وصیت والے معاملے سے مقابل کیجئے۔

ان دونوں واقعات میں ایک گذشتہ فعل معلوم کیا گیا ہے جسکا علم خوابیدہ معمول کو پہلے سے نہ تھا۔ کہوڑ پنی کی وصیت کے معاملے میں یہ کامیابی ور مطالعۂ خیال کی ایک عجیب قوت کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی جو تحت الشعور کے اندر موجود معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس جاں بلب عورت کے واقعہ میں "ف" نے کسی کے دماغی خیالات معلوم کئے تھے؟ میرا یہ خیال نہیں یہ دماغی خیالات خود اسی عورت کے تھے۔ اگرچہ یہ یقینی بات ہے کہ وہ انجکشن کی بابت سب کچھ جانتی تھی لیکن کیا اس عورت کو زرد رنگ کے ذروں کے متعلق کچھ علم ہو سکتا تھا؟ اور کیا وہ خود اپنی موت کی بابت کوئی پیش گوئی کر سکتی تھی؟ ـــ میرا یہ خیال ہے کہ نہیں ـــ دوسری طرف میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ خیالات ڈاکٹر کے دماغ کے کیونکر ہو سکتے تھے۔ کیونکہ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اسے زرد رنگ کے ذروں کا علم ہو مگر یقیناً وہ اس عورت کی موت کی بابت کوئی پیش گوئی نہ کر سکتا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میرا یہ خیال نہیں کہ ڈاکٹر کو ان زرد رنگ کے ذروں کا کوئی علم تھا اگر ایسا ہوتا تو وہ اس عورت کے مرض کی تشخیص کر لیتا اور اسے کم کرنے کے لئے کچھ کر سکتا تھا۔

لیکن اگر "ف" نے یہ خیالات کسی کے دماغ کا مطالعہ کر کے حاصل نہیں کئے تو پھر اسے یہ معلومات کہاں سے دستیاب ہوئیں؟ کیا یہ سب کچھ "کائناتی دماغ" سے حاصل کیا گیا؟ ـــ اور اگر یہی واقعہ ہے تو کیا "کائناتی دماغ" حافظہ کا مسکن ہے ـــ ایک ایسا مسکن جہاں تمام انسانوں کے تمام گذشتہ افعال موجود رہتے ہیں؟

ظاہر میں اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی حقیقت ہے لیکن میں ابھی تک اسے ثابت کرنے کے قابل نہیں ہو سکا ہوں۔ اگر واقعہ یہی ہے تو ہمیں یہ امید رکھنی چاہیئے کہ معمول نیند میں ڈوب کر دنیا کے ہر ایک انسان کے ماضی کو معلوم کر سکتا ہے۔ لیکن یہی وہ تجربہ ہے جس میں مجھے اب تک کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ حالانکہ میں نے ہر قسم کے حالات میں اس کی آزمائش متعدد بار کی ہے۔

ان دونوں واقعات سے نتائج اخذ کرنے کے بعد یہ بات ممکن ہے کہ عجیب معلوم ہو کہ تنویم کا علم پولیس کے واسطے اس سے زیادہ امداد بہم نہیں پہنچا سکتا جتنا کہ موجودہ حالات میں ممکن ہے۔ لیکن یہ حقیقت پھر بھی اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ تنویم کے متعلق ہماری موجودہ معلومات کے تحت جو کچھ امداد تنویم کے علم سے پہنچائی جا سکتی ہے وہ اگرچہ اہم ہے مگر بذات خود کسی مسئلہ جرم کو حل نہیں کر سکتی۔ مثلاً میں یہ نہیں کر سکتا کہ لندن میں اپنے دار المشورہ کے اندر کسی شخص پر نیند طاری کروں اور اسے یہ بتا کر کہ کسی مقام پر مثلاً مانچسٹر یا ابرڈین میں ایک جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے اس کے تحت الشعوری دماغ کو حکم دوں کہ وہ ان تمام مقامات پر اڑتا ہوا جائے اور مجرم تک پہنچ کر اسکے دماغ کا مطالعہ کرے اور ہمیں بتائے کہ جرم کیوں اور کیسے عمل میں لایا گیا۔ نیز یہ کہ مجرم کا نام کیا ہے اور وہ ایک مقررہ دن مقررہ وقت پر کس جگہ ملے گا تاکہ پولیس اسے گرفتار کر سکے۔ یہ اہم کام موجودہ زمانے میں ناممکن ہے۔

میں اس بات کی بھی ضمانت نہیں کر سکتا کہ جس شخص پر جرم کا فی الواقعہ شبہ کیا جا چکا ہے میں اس کے دماغ کا مطالعہ ایک فاصلہ پر سے بغیر کسی ناکامیابی کے کر لوں گا اور اس طرح پولیس کے قبضے میں ایسے واقعات دیدوں گا جو مجرم کو جرم کی یقینی گرفت میں پھنسانے کے لئے ثبوت مہیا کرنے میں مدد دے سکے۔ بایں ہمہ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے بیشتر واقعات میں میں ایسا کر سکتا ہوں بشرطیکہ مجھے کافی مناسب قسم کا معمول مل جائے۔

لیکن میں ضمانت کر سکتا ہوں کہ اگر مشتبہ شخص کو میرے معمول کے کافی قریب لایا جائے تو میں اپنے خوابیدہ معمول کے ذریعہ اس کے دماغ کے خیالات معلوم کر لوں گا تنویم کی اور زیادہ عام اور بہت گیر وسیع قوتوں کو استعمال کرنے کے واسطے ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ تحقیق کی ضرورت ہے مگر اس کے باوجود مجھے پورا یقین ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جبکہ ان قوتوں

طب جدید کے کرشمے
زندگی بخش غذائیں!

یسر باٹیلر ایک مشہور جرمن طبیب ہیں۔ جو
ق شہنشاہ جاپان میکاڈو کے شاہی معالج
ے ہیں انہیں جاپانیوں کے طرز معاشرت
ت زندگی کے بارے میں جسقدر صحیح معلومات ما
ہیں شاید ہی کسی کو نہ ہوں۔ چنانچہ ایک جگہ
ہیں کہ جاپان کے نچلے طبقے کے لوگ
تر نباتاتی غذا کھاتے ہیں ان لوگوں
جو لحمی غذاؤں پر پرورش پاتے ہیں
طور پر خوش حال ہوتے ہیں زیادہ
ت والے ہوتے ہیں۔ غذائیات کا
لے اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں
ئی ہزار سال سے صرف نباتاتی غذا پر
ہیں اور اسوقت بھی جاپان کی آبادی کا
رف چاول اور سبزیوں پر گذارا کرتا
ان کے جسموں میں غذا کا ایک
سب و توازن پیدا کرنے اور نائٹروجن
یا کرنے میں بالکل کامیاب ثابت

ز کے پاس دو ہٹے کٹے جاپانی
اور ۲۲ سال کی عمر کے خادمگاری
تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو
موضوع بنایا۔ انہیں ایک خاص
ور حالت کی غذائیں مہیا کی
کی کیمیاوی ترکیب کا اندازہ
یا جاتا تھا۔ ان خادمگاروں
ی لئے جاتے تھے۔ مثلاً
سل انہیں رکشا کھینچنی پڑتی
و سوار ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا

وزن ۱۰۷ پونڈ تھا انہیں ۵ میل روزانہ دوڑنا پڑتا تھا اور بیچ میں کہیں ٹھہرنا نہیں ہوتا تھا۔ بظاہر یہ محنت نہایت سخت معلوم ہوتی ہے لیکن در اصل ان خادمگاروں کیلئے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بلکہ وہ خود نہایت خوشی سے اس سخت جسمانی مشقت کو برداشت کر لیا کرتے تھے اور کچھ چون و چرا نہ کرتے تھے۔ اگر کسی سے صرف ۵ میل روزانہ ہی ۳ ہفتے تک چلنے کے لئے کہا جائے تو نہ معلوم اسکا کیا حال ہو لیکن ۵۰ میل کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرنا ۱۰۷ پونڈ کا آدمی رکشا میں بٹھا کر کھینچنا اور مسلسل تین ہفتے تک اس مشقت کو بلا تامل برداشت کرنا بہادری اور جسمانی توانائی کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔

اس تجربے کے دوران میں ان خدمت گاروں کو عام خوراک کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا جاتا تھا۔ ایک معمولی آدمی کے لئے لازمی طور پر جسقدر چربی استعمال کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے اس سے بہت کم ان قلیوں کو دی جاتی تھی۔ ان کی پروٹین کی تعداد بھی ۴۰ سے ۵۰ فیصدی کے حساب سے کم و بیش ہوتی رہتی تھی شکر جیسے اجزاء انہیں مختلف غذاؤں سے فراہم کئے جاتے تھے جن میں چاول، آلو، جو اور مقامی سبزیاں شامل تھیں۔ تجربے کے آخر میں ان کا وزن کیا گیا۔ ایک خدمت گار کا وزن آدھا پونڈ بڑھ گیا اور دوسرے کا وزن وہی رہا جو پہلے تھا اس کے بعد پروفیسر باٹیلر نے ان خدمتگاروں کو یہ خوش خبری سنائی کہ اب انہیں گوشت کھانے کے لئے دیا جائیگا۔ نوکر یہ خبر مسرت اثر سن کر باغ باغ ہو گئے کیونکہ گوشت ان کیلئے ایک نعمت تھا۔ شکر جیسے اجزاء والی غذا کم کر دی گئی اور لحمی غذائیں بڑھا دی گئیں۔ اگرچہ پروٹینز کی مقدار پروفیسر ڈائٹ کے نظریئے اور معیار کے مطابق نہیں دی گئی۔ مگر پھر بھی بڑھا ضرور دی گئی۔ تین روز تک ان نوکروں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ تیسرے روز کے آخر میں نوکر کہنے لگے کہ اب ان سے اسقدر تیزی کے ساتھ نہیں دوڑا جاتا جس قدر وہ پہلے دوڑا کرتے تھے۔ اس لئے انہیں گوشت کھانے کے لئے نہ دیا جائے۔ چنانچہ باٹیلر نے انہیں پھر وہی غذا کھانے کے لئے کہدیا اور اسکا نتیجہ وہی نکلا جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ایک کا وزن بدستور وہی رہا یا زیادہ سے زیادہ سو گرام کی زیادتی محسوس کی گئی۔ دوسرا آدمی پاؤ بھر کے وزن کے قریب بڑھ گیا۔

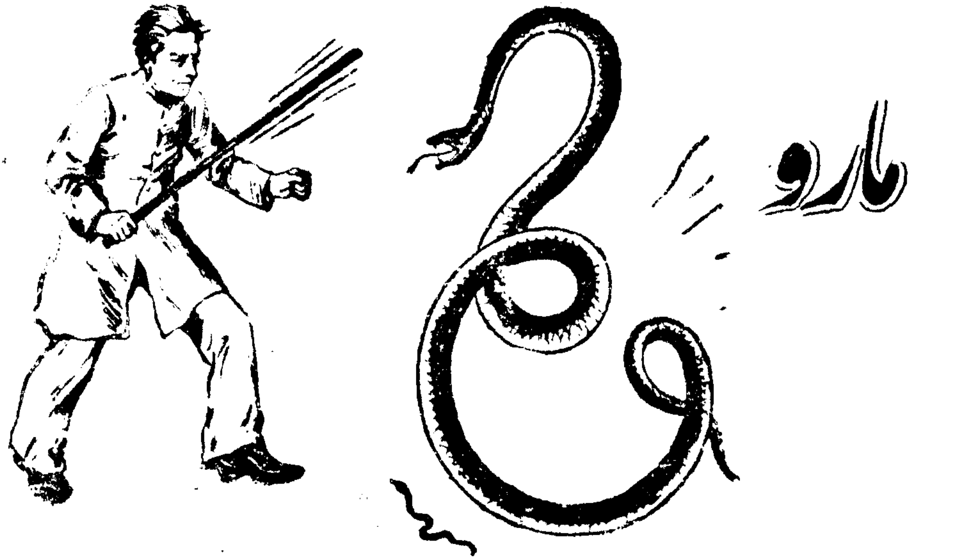
باٹیلر نے قوت برداشت کا ایک اور حال لکھا ہے۔ وہ ٹوکیو سے نکو جا رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان ۸۰ میل کا فیصلہ ہے — گرمیوں کا موسم تھا اور گرمی بھی خاصی تھی شام کے چھ بجے سے صبح کے آٹھ بجے تک ۱۴ گھنٹے اس سفر کو طے کرنے میں لگے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جوں ہی میں ٹوکیو سے نکلا میں نے رکشا میں ایک جاپانی کو دیکھا وہ بھی نکو ہی جا رہا تھا۔ اس کی رکشا کو ایک آدمی کھینچ رہا تھا۔ وہ نکو میں باٹیلر کے پہنچنے کے کوئی آدھ گھنٹہ بعد پہنچا۔ باٹیلر لکھتے ہیں کہ انہیں خود راستے میں

چھ مرتبہ گھوڑے بدلنے پڑے تھے لیکن ان کا ہم سفر جس کا وزن ۱۱۹ پونڈ تھا رکشا میں بیٹھا ہوا تقریباً اسی وقت اپنی منزل پر پہنچ گیا اور راستے میں کہیں نہیں رکا۔ اس قلی کی خوراک بالکل نباتاتی تھی۔

یہ بات سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جاپانی چھوٹے قد کے ہوتے ہیں لیکن وہ برداشت اور طاقت کے کارناموں میں کسی طرح بھی دوسری اقوام سے کم نہیں ہوتے۔ جیسا کہ حال کے بہت سے تجربات اور واقعات نے ہم کو بتا دیا ہے ان میں ہمت امنگ اور زندگی کی تڑپ کسی طرح بھی دوسری اقوام کے افراد سے کم نہیں ہوتی۔

"برٹش میڈیکل جرنل" میں ایک مضمون نویس لکھتا ہے کہ خود جاپانی لوگ اپنی غیر معمولی طاقت توانائی اور قوت برداشت کی وجہ معمولی اور سادہ غذا کو بتاتے ہیں۔ نیز ورزش اور کسرت کے ایک خاص طریقے کو بھی جسے وقت میں "جوجوسٹو" نامی مشہور کرتب بھی شامل ہے خاص دخل ہے۔ اس طریقے کو جاننے کے لئے علم تشریح اور پانی کے اندرونی اور بیرونی استعمال کی واقفیت بھی ضروری ہے۔ ۱۸۸۹ء میں یہ معلوم کرنے کے لئے گوشت کھانے یا غذا میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے جاپانیوں کے قد بڑھ سکتے ہیں یا نہیں ایک کمیشن مقرر کیا گیا نتیجہ اس تحقیقات کا یہ نکلا کہ اگرچہ دوسری اقوام سے ان کے قد چھوٹے ہیں مگر قوت برداشت اور طاقت و توانائی میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ بعض سے افضل ہیں۔ اس لئے ان کے قد کا چھوٹا ہونا کوئی نقصان کی بات نہیں ہے اب رہ گئی ان کی غذا تو وہ نہایت معمولی اور سادہ ہوتی ہے۔ ہر کھانے میں چاولوں کا استعمال ضرور ہوتا ہے جاپانی افواج نے ریکارڈ قائم کرنے والے دھاوے صرف چند مٹھی چاولوں کی غذا پر بولے ہیں جاپان میں پھل اور سبزی کثرت سے بوئی جاتی ہے یورپ کی نسبت جاپان کے لوگ سبزی خوری کے فائدوں سے بہت زیادہ واقف و آگاہ ہیں۔ حال ہے کہ ایک معمولی مزدور چنا، ٹماٹروں اور ایک دو ٹکڑے ڈبل روٹی پر سارا دن محنت کرنے کے لئے بالکل تیار رہتا جاپان میں دودھ کی کمی ہے۔ کیونکہ صرف دودھ

مارو





تاریخ قدیم کا ایک رنگین صفحہ

مستی و قلندری

زمانہ جاہلیت کا ایک تاریخی واقعہ، شاہ عملیق کی مستی و قلندری کے از روئے قانون عجیب و غریب کارنامے

از قلم جناب منشی حافظ محمد حسن صدیقی لکھنوی پروفیسر ریاضی

عرب کا زمانہ جاہلیت گوناگوں رنگینیت و رومانویت سے پُر اور عدیم المثال تھا جہاں اور بہت سے مخرب اخلاق شغل بام عروج پر متمکن تھے وہاں ان کے دور شباب کے کارنامے بھی عدیم النظیر ارتقا کی منازل سے شرف ہم آغوشی بخوبی حاصل کر چکے تھے — چند قبیلے حسن و عشق کے معاملات میں ضرب المثل تھے جن کے اوصاف میں دلوان کے دیوان طفلان عرب کو حفظ تھے۔ اس منچلے رنگین ماحول میں عرب علیہ میں شمار ہونے والے مستعربہ، بائدہ، عاربہ تین مخصوص گروہ تھے جن کو اپنی شریف النسبی پر غیر معمولی فخر تھا۔ اس ارفع کیفیت سے مملو ہوتے ہوئے بھی اکثر اوقات اخلاق گندہ کرنے میں غیر شرفا سے بھی تجاوز کر جاتے تھے۔

انہیں قبائل مخصوصہ سے بائدہ کے قبیلے عمالقہ میں طسم اور جدلیس عم زاد بھائی تھے جن کے خاندانوں میں اتحاد و اتفاق کا شجر سایہ فگن تھا۔ اس شجر اتفاق کا ثمر بصورت سلطنت قوم طسم کو حاصل ہوا۔

دونوں قوموں نے ملک یمامہ کی سرحد پر ایک قلعہ جو پائیداری اور نفاست میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا بنایا جس کا نام قلعہ جون رکھا۔ اس قلعہ جون کے متعلق ملمس کہتا ہے۔

کیا نہیں دیکھتے ہو قلعہ جون (جسے ملمس جدلیس نے بنایا تھا) کسقدر مضبوط ہے اور طواف کرتا ہے زمانہ جس سے وہ مانوس ہوجاتا ہے۔

بادشاہ عملیق اس قوم کا آخری تاجدار تھا۔ عملیق ابھی منزل شباب کے کافی فاصلہ پر تھا کہ اس کی رگ شہوانیت پھڑک اٹھی۔ اس زمانہ میں یمامہ میں عجیب و غریب رسوم مروج تھے منجملہ ان سب کے ایک رسم یہ بھی تھی کہ ہر چاند کی چودھویں شب اور تمام دن ایک بازار لگتا تھا جس میں صرف عورتیں ہی دکانوں پر بیٹھا کرتی تھیں۔ قوم طسم و جدلیس کی نوجوان دوشیزائیں اس بازار کی رونق بڑھانے کیلئے خاص طور سے حصہ لیا کرتی تھیں۔ اس بازار حسن میں شرکت کیلئے دور دراز سفر کے صعوبات برداشت کر کے اطراف و جوانب سے حسن کے جوہری اپنی قسمت آزمائی کیلئے آیا کرتے تھے۔ مقامی لوگ بھی انتہائی بیقراری سے یوم الحسن کا انتظار کرتے جب منتوں مرادوں کے بعد یہ دن نصیب ہوتا تو نہایت فراخدلی کے ساتھ حوران عرب کے حسن خداداد سے اپنی آنکھوں کو فرحت اور دل کو سرور پہنچایا کرتے تھے۔

عملیق جسکی ہر رگ میں شہوت کا خون اور حسن پرستی کی روح موجود تھی اس دن کی مفارقت میں تڑپ تڑپ کر بسر کرتا تھا — یوم الحسن کا دن اور شب اس کی زندگی کی محبوب ترین گھڑیاں اور لمحے تھے جن کو وہ انتہائی مشغولیت و لطف کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس کے باوجود پھر بھی متاسف رہتا کہ کاش کچھ اور بھی کر سکتا۔

جزیرہ نما عرب ایک خشک ریگستان ہے جہاں مون سون ہواؤں کا داخلہ از روئے قانون کونسل قدرت ممنوع ہے۔ مگر یہ منچلی مون سون ہوائیں بھلا کب نچلی بیٹھ سکتی ہیں۔ چوری چھپے پہنچ ہی جاتی ہیں۔

مہینے کی چودھویں تاریخ کی صبح تھی۔ گھنگھور گھٹائیں ساکنان یمامہ کے سروں پر گرجیں — چوری سے پہونچنے کے بعد سینہ زوری کرنے کی وجہ نقارۂ بادل پر تازیانۂ قدرت پڑا جس کے نتیجہ میں — ایک صاعقہ — اور پھر ایک معصوم دوشیزہ کے مانند گھٹاؤں کا بشکل موسلا دھار رونا —— میرا مزا ماں کے گھر شادی ہوئی کے مصداق ساکنان یمامہ کے سلگتے ہوئے جذبات پر روغن گل کے مترادف ہوا۔

دن بھر کی بارش کے بعد سہ پہر کو گھٹاؤں نے رونا شروع کردیا —— رونے والی سہیلیوں کے دل بادل تیزی کے ساتھ دوش صبا پر اپنی مخمومانہ شان دکھاتے یمامہ والوں کی خوش فعلیوں سے بیزار ہو کر منتشر ہونے لگے۔

آج کا میلہ اپنی نوعیت کا انوکھا میلہ تھا۔ جس میں بارش نے چار چاند لگا دئے تھے۔

عملیق بھی بیش قیمت جاذب نظر لباس سے ملبوس ہو کر اپنے ہم مشرب مشیر خاص ہمدان کے ہمراہ حسن کے بازار کی شاہراہوں پر گشت میں مصروف ہوا۔

جس مقام پر یہ بازار لگا کرتا تھا اس مقام پر ایک خوبصورت ہیکل پرانی وضع کا بنا ہوا تھا جس کے اندر نہایت خوفناک صورت کا ایک بُت تھا۔ اس بت کو جدلیس و طسم دونوں قومیں خلوص و عقیدت سے پوجتی تھیں بادشاہ عملیق گھومتے پھرتے ہیکل میں داخل ہوا جہاں عرب کی الھڑ دوشیزائیں شراب و شباب سے مخمور ہو کر مصروف تھیں۔ اس دلنواز برقیاش نغمہ نوازی نے عملیق کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ بادشاہ اس حسن کے کھلیان کو دیکھ کر محو حیرت ہو گیا۔ بعض لڑکیاں اس وقت اس کے سامنے ایسی موجود تھیں جو اس کے معیار حسن سے بدرجہا بلند و بالا تھیں۔ اس کی للچائی ہوئی نگاہیں ذخیر حسن پر پڑ رہی تھیں —— اگرچہ اس عیاش بادشاہ نے آج تک لاتعداد کنواری باکرہ مہ جبینوں کو برہنہ حالت میں دیکھا تھا مگر اسوقت کا منظر ماقبل کی رنگینیوں اور عیاشیوں کو صفحۂ دل سے زائل کر چکا تھا —— ان کی سریلی آوازوں کے ساتھ دف کی دلپذیر آواز دل پر صاعقہ پاشیاں کر رہی تھی جس سے ہر شخص بقدر ظرف حظ حاصل کر رہا تھا۔

نغمہ نوازی بحر مستی و بے خودی میں اس قدر غرق تھی کہ کسی آنے جانے والے کا مطلق خیال نہ پیدا ہوتا تھا۔ جب نغمہ ختم ہوا اور محویت دور ہوئی تو لڑکیوں نے عملیق کو دیکھ کر پہلے تو حیرت و استعجاب کا مظاہرہ کیا بعد ازاں وہ اس کی تعظیم کیلئے اپنی اپنی جداگانہ شان دلربایانہ سے اٹھیں اور بڑے ناز و ادا سے قوم طسم کے ظالم و جابر عیاش بادشاہ کو جھک کر ادب سے سلام کیا۔

عملیق نے سلام کا جواب دینے کے بعد (ہزیلہ، یمامہ، شمسوس عرف عقبرہ، شیریں) مہوشانِ عرب کی مایہ ناز ہستیوں کے سروں پر دست شفقت پھیرا۔ اپنے جذباتی، دھڑکتے ہوئے دل کو قابو میں لاتے ہوئے کمال ہمدردی سے محبت بھرے لہجہ میں ہزیلہ سے دریافت کیا۔ اے حور عرب تو کون ہے۔

میں قرقس عرف عماد جدلیس کی منکوحہ ہوں مجھ کو ہزیلہ کہتے ہیں۔

تم عرب کی مایہ ناز حسین ہستی ہو۔

ہزیلہ ایک سولہ سالہ مہکتا ہوا شباب اپنے حسن و جمال میں یکتائے عصر تھی۔ اس کی آواز میں ایک پرسوز درد تھا جو سننے والے کو از خود رفتہ کر دیا کرتا تھا۔

عملیق اب یمامہ کی جانب متوجہ ہوا — اے قمر عرب تو کون ہے؟

مجھ کو یمامہ کہتے ہیں میں غسان طسمی کی لڑکی ہوں۔

عملیق اس کا طسمی ہونا معلوم کر کے بہت ہی مسرور ہوا۔ فوراً دل میں خیال پیدا ہوا کہ غسان کے ساتھ خاص مراعات کر کے پیام دونگا جو بہت جلد کامیابی سے ہمکنار ہو کر رہیگا۔ اب شمسوس کو متوجہ کرتے ہوئے بادشاہ نے اس کا حسب نسب دریافت کیا۔

میرا نام شمسوس یا عقبرہ ہے۔ میں عباس جدلیسی کی لڑکی ہوں۔

اب شیریں ہی رہ گئی تھی جس کی طرف بادشاہ نے اشارہ کیا اور کہا۔ اے ماہِ عرب —— مجسم حسن و جمال تو کون ہے۔

میں قوم جدلیس کی ایک ناکارہ لڑکی ہوں مجھ کو شیریں کہتے ہیں۔

ان استفسارات کے بعد عملیق ہمدان کے ہمراہ بادل ناخواستہ واپس ہوا۔ چلنے میں اس کے قدم اکھڑے اکھڑے پڑ رہے تھے۔ ہمدان نے جو یہ حالت دیکھی تو از راہ ہمدردی و مصاحبت باوجود اسباب جاننے کے بادشاہ ہی سے استفسار کیا۔

"کیا جہاں پناہ کی طبیعت مکدر ہو رہی ہے"؟

آہ اسوقت کاش میں نہ آتا۔ ان حسن کے ماہپاروں کو دیکھ کر دل دل نہ رہا۔

میں ایک خارج قسمت مجنوں ہوں جو اسوقت چار لیلاؤں پر منقسوم بنکر تقسیم ہو چکا ہوں۔ ہمدان اگر تو میری زندگی چاہتا ہے تو یکے بعد دیگرے یا بیک وقت ان چاروں کو لا کر حاضر کر۔

حضور بیک وقت تو حاضر کرنا از حد مشکل کیا بلکہ ناممکن ہے۔

تو پھر سب سے پہلے ہزیلہ کو جس طرح بھی ممکن ہو مابدولت کی خدمت میں پیش کر۔

ہزیلہ ایک شادی شدہ عورت تھی جو اسوقت ایک لڑکے کی ماں بھی بن چکی تھی مگر ہمدان کی فریب کاریاں آخر کام آ ہی گئیں۔ ہزیلہ نے اپنے محبوب شوہر کو طلاق دی جب ہزیلہ نے آزادی حاصل کر لی تو عماد نے لڑکا اپنے پاس رکھ لیا۔

اب ہزیلہ نے لڑکا حاصل کرنے کے لئے عملیق کے دربار میں پہونچکر فریاد کی عملیق پہلے ہی سے آگاہ تھا۔ جب ہزیلہ نے اپنی داستان کہہ سنائی تو عملیق نے وہ حکم سنایا جو کسی بھی عدالت سے صادر

نہیں ہوسکتا ـــ ہزیلہ تم اور تمہارا شوہر دونوں فروخت کردیئے جائیں گے۔

شوہر کی قیمت فروخت کا دسواں حصہ (۱/۱۰) تجھ کو دیا جائیگا۔ اور تیری قیمت فروخت کا پانچواں حصہ (۱/۵) تیرے شوہر کو دیا جائیگا اور لڑکا بحق حکومت ضبط ہوجائے گا جسکی پرورش تم لوگوں کی قیمت فروخت سے کی جائے گی۔

ہزیلہ اس حکم کو سنتے ہی سناٹے میں آگئی۔ معاً غصہ کی وجہ سے چہرہ سرخ ہوگیا۔ کہنے لگی اے ظالم و جابر بادشاہ تیرا حکم انصاف سے بعید بلکہ انتہائی ظالمانہ ہے۔

تمام امراء اراکین دربار جو قوم طسم سے تھے ہزیلہ کی ناہموار گفتگو سے برافروختہ ہو گئے۔ خود بادشاہ بھی ان الفاظ کی تاب نہ لاسکا۔ اور فوراً وہ حکم دیا جو قوم جدیس کے لئے بدترین لعنت تھا۔

قوم جدیس کی کوئی بھی دوشیزہ شب اولیں حرم شاہی میں بسر کئے بغیر اپنے سسرال نہ بھیجی جائے۔

ہزیلہ کے شوہر عماد کو قوم طسم کے ایک تاجر غسان نامی تاجر نے خرید کیا جس نے عماد سے یہ شرط کی کہ اگر کچھ عرصہ تک خوب محنت سے کام کرے گا تو آزاد کردیا جائیگا۔

ہزیلہ کو بادشاہ کی رشید دوائیوں کے ماتحت ہمدان نے خرید کر خفیہ طریقہ سے شاہی محل میں پہنچادیا۔ ہزیلہ اب اپنی نادانیوں پر سخت متاسف تھی۔ وہ اب اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ شوہر سے بگاڑ اور طلاق سب ایک فریب تھا جو مجھ کو حاصل کرنے کیلئے عملیق نے میرے ساتھ کیا۔

عملیق کا حکم قوم جدیس کی نوجوان پرشباب دوشیزاؤں کیلئے ایک مستقل عذاب تھا۔ کچھ عرصہ خاموشی کے ساتھ بسر کرنے کے بعد قوم جدیس کی لڑکیاں بیاہی جانے لگیں۔ اور بحکم بادشاہ پہلی شب حرم شاہی میں بادشاہ کی خدمت میں پیش ہونے لگیں

شمسوس بھی پہلی شب بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوئی۔ شمسوس بحالت عروس شہنشاہ حسن معلوم ہورہی تھی۔ اس کے رعب حسن سے کچھ دیر تو عملیق اپنے ہوش و حواس قائم نہ رکھ سکا۔ اس کے باریک سنہری مائل بال انتہائی خوبصورتی سے گوندھے ہوئے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ حنا آلود تھے۔ کلائیوں میں طلائی چوڑیاں اس کی گوری گوری پنڈلیاں جو عملیق کی ہاتھا پائی کی وجہ سے عریاں ہوچکی تھیں ان پر ساق سیمیں کا گمان ہورہا تھا۔ سینہ کا ابھار قیامت ڈھارہا تھا۔ اسکی کافرادا جوانی خوشنما لباس میں پھٹی پڑ رہی تھی۔ دیر تک عملیق اس کے حسن خداداد سے محظوظ ہوتا رہا۔ اس کے بعد اس ظالم عیاش بادشاہ سے شمسوس بھی محفوظ نہ رہ سکی

شمسوس جس وقت اپنے شوہر کے مکان پہونچی اس وقت کا منظر عجیب دلخراش تھا۔ ابن غسان شمسوس کا شوہر اپنی اس بےحرمتی کی تاب نہ لاکر اپنی تشنہ آتش انتقام کو اپنے خنجر سے سیراب کرکے آخری سانس لے رہا تھا۔ شمسوس نے نہایت مستقل مزاجی سے اپنے شوہر کی لاش دیکھی۔ اس کے بعد اس نے اپنا پائجامہ پارہ پارہ کردیا جب پائجامہ کی ایک دھجی بھی جسم پر باقی نہ رہی تو اس نے درد انگیز لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

آہ آج قوم جدیس سے زیادہ کوئی قوم بھی ذلیل نہ ہوگی۔ کیا دلہنوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ کیا کسی نوعروس کا شوہر جس نے مار مہر ادا کردیا ہو۔ اس بات سے راضی ہوگا کہ منکوحہ اس کے پاس ایک گندی و ناکارہ مسلی ہوئی کلی کے مانند بھیجی جائے۔ اے قوم جدیس کیا تم کو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے جو آج تمہاری جوان لڑکیوں کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ ہم اگر مرد ہوتے اور تم عورتیں ہوتیں تو ایسی ذلت ہم کبھی برداشت نہ کرتے۔ تم کو چاہئے کہ عزت والوں کیطرح مرجاؤ یا دشمن کو مار ڈالو یا بصورت دیگر قوم کے درمیان سے نکل کر بیابان میں تباہ و برباد ہوکر مرجاؤ۔ اگر اب بھی میری اس تقریر سے تمہاری رگ حمیت نہ پھڑکے تو تم عورتیں بن جاؤ جنہیں سرمہ لگانا کچھ عیب نہیں ہوتا۔ خدا اس کو غارت کرے اور اس کا منہ سیاہ کرے جو اپنی بیوی کی حفاظت نہ کرے اور سانڈ کی طرح ہمارے بیچ میں اکڑا اکڑا کر گھومتا پھرے۔

اس کے بعد شمسوس اپنے شوہر کی لاش سے لپٹ گئی اور اس کی روح طائر محبوس کی طرح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

شمسوس کا نوجوان بھائی جس کی ہر رگ میں جوش حمیت کا خون گردش کررہا تھا۔ اس نے اپنی بہن اور ابن غسان کو دفن کرنے کے بعد ان کی قبروں پر کھڑے ہوکر عہد کیا کہ جب تک میں عملیق سے اس کا انتقام نہ لونگا اس وقت تک چین سے نہ رہوں گا۔

اب غسان کی قید کو پورا کرنے کے بعد عماد بھی آزاد ہوچکا تھا۔ غسان کی لڑکی یمامہ جو عماد کی ہم نشینی کی وجہ سے بہت کچھ عماد سے مانوس ہوگئی تھی۔

شمسوس کے بعد عملیق کا خیال یمامہ کی طرف منعطف ہوا۔ اس نے غسان کو پیغام دیا۔

یمامہ عملیق کی پوشیدہ کارگزاریاں عماد سے سن چکی تھی۔ اور روز مرہ کے واقعات خود اس سے پوشیدہ نہ تھے۔ اس لئے اس نے عملیق کے پیام کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔

جب غسان نے اپنی لڑکی کی ضد عملیق سے بیان کی تو اس نے اپنے کارندوں کی مدد سے یمامہ کو ایک تاریک شب میں اس کے گھر سے اٹھا منگایا۔ جس کو پوشیدہ طریقہ سے شاہی محل میں مقید کر دیا گیا۔

عماد پر ایک تو بحیثیت قوم جدیس ہونے کے دوسرا اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ وہ آزاد ہوتے ہی انتقام پر آمادہ ہو گیا اور جب اس نے یمامہ کے متعلق سنا تو اور بھی شدو مد کے ساتھ انتقام پر کمربستہ ہو کر اسود سے جا ملا جو پہلے ہی سے انتقامی فرائض انجام دے رہا تھا۔

یمامہ کے انکار کے بعد عملیق کو شیریں کی یاد دل میں چٹکیاں لے لے کر ستانے لگی۔ ایک شب بہت ہی بے قراری سے بسر کی۔ دوسری شب ہمدان کی مدد سے شیریں بھی عالم مدہوشی میں شاہی محل میں لائی گئی۔

شیریں کی آمد کا علم عملیق کے ولی عہد کو ہوا۔ وہ بھی شیریں کی تیغ نظر کا گھائل ہو چکا تھا لہذا اس نے اپنے خاص آدمیوں کی مدد سے عملیق کے محل سے شیریں کو اپنے محل میں منتقل کر لیا۔ ادھر عملیق کے محل میں یمامہ و ہزیلہ پر طرح طرح کی سختیاں کی جاتیں اور کئی طرح کے سبز باغ دکھائے جاتے مگر یہ دونوں کسی طرح راضی نہ ہوئیں عملیق شیریں کے غائب ہو جانے کی وجہ سے اپنے ملازمین سے از بس مغضوب الغضبی کا برتاؤ کر رہا تھا۔ مگر کسی طرح بھی شیریں کا سراغ نہ لگتا تھا نہ لگا۔ اب شیریں کی آتش عشق عملیق کے دل میں دن دونی اور رات چوگنی بڑھتی ہی جاتی تھی۔

یہ اسود کی کارگزاریاں تھیں کہ اس نے ولیعہد کو شیریں کا والہ و شیدا بنا دیا تھا۔ شیریں پر شہزادہ طرح طرح کے مصائب نازل کر رہا تھا مگر شیریں ایک مضبوط اور مستقل ارادہ کی دوشیزہ تھی وہ اپنی جان دے کر بھی اپنی عزت پر حرف نہ آنے دینا چاہتی تھی۔

جب اسود نے سمجھ لیا کہ اب عملیق شیریں کے عشق میں کامل دیوانہ بن چکا ہے۔ ایک شب جاسوس کی وضع میں عملیق کی خدمت میں حاضر ہو کر شیریں کا شہزادہ کے محل میں ہونا ظاہر کر دیا۔۔۔۔ اب عملیق کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنی خاص خادمہ کے ذریعہ بھی معلوم کر لیا کہ شیریں شہزادہ ہی کے محل میں ہے۔

عملیق نے باڈی گارڈ کے رسالہ کو ہمراہ لیکر شہزادہ کو لاعلمی کی حالت میں گرفتار کرنا چاہا۔ ادھر اسود کی سیاست بھی کام کر رہی تھی۔ اسود نے شہزادہ کو اطلاع کر دی شہزادہ بھی مرنے مارنے کیلئے تیار ہو گیا۔

اسود کے ہمراہ عماد۔ منذر اور قوم جدیس کے مدبر و بہادر نوجوان ایک ہی جذبہ کے ماتحت کام کر رہے تھے۔

رات نصف گذر چلی تھی یکایک شہزادہ کے محل میں ہنگامہ دار و گیر قتل و غارت شروع ہو گیا۔ اسود اور اس کے ہمراہی جو پہلے ہی اس وقت کے منتظر تھے اپنے اپنے پروگرام کو پورا کرنے کیلئے روانہ ہو گئے۔ منذر کو شیریں اور عماد کو یمامہ کی فراری اور اسود نے خود اپنے ذمہ دونوں کی خبرگیری اور امداد کا کام لیا جبکہ باپ بیٹے معرکۂ جدال و قتال میں منہمک تھے۔ منذر بڑی خوبی سے شیریں کو لیکر محل سے باہر آ گیا۔ عماد اسود کی مدد سے یمامہ بھی شاہی محل سے باہر آ چکی تھی۔ ہزیلہ موقعہ پا کر خود ہی فرار ہو گئی۔

اسود نے ان لوگوں کو ایک محفوظ مقام پر پہونچا دیا جہاں عملیق یا اس کے جاسوسوں کا طائر خیال بھی نہ پہونچ سکے۔ عملیق نے شاہزادہ کو قتل کرنے کے بعد شیریں کو کافی تلاش کیا۔ مگر اس کا کوئی سراغ نہ لگا۔ جب اپنے محل میں واپس آیا تو یہاں ہزیلہ اور یمامہ کو بھی نہ پا کر عملیق اپنا دماغی توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس نے حکم دے دیا کہ صبح ہی صبح قوم جدیس کا ہر متنفس مقید کر کے دربار میں پیش کیا جائے۔

اس حکم کی اطلاع بہت جلد اسود نے ہر جدیس کے گوش گذار کر دی۔ قوم جدیس کے تمام لوگ رات کو انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں مارا مار کرتے ہوئے شمال کی جانب روانہ ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اپنی جائے مقصود پر جو ایک گھنے جنگل میں تھی پہونچ گئے۔ یہاں پہنچکر اسود نے نوجوانوں کی ایک مختصر سی فوج مرتب کی۔

صبح ہی صبح شہر یمامہ میں بڈھے مرد عورتیں جو بھاگنے سے معذور تھے شاہی حراست میں عملیق کے سامنے پیش کئے گئے۔ آہ! ان ضعیفوں پر عملیق نے سخت زد و کوب کرائی طرح طرح کی اذیتیں پہونچائیں، جن میں سے اکثر تو جاں بحق ہو گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد اتفاقاً عملیق اپنے باڈی گارڈ رسالہ کے ہمراہ بغرض شکار آ کر اسود کے قریب ہی جنگل میں خیمہ زن ہوا۔ اسود نے یہ موقع اپنے حسب حال سمجھ کر اپنی مختصر جرار فوج لے کر شاہی فوج پر شبخون مارا جو عملیق کے ہر سپاہی کی رگ حیات

باقی بر صفحہ ۹۹

خدا اپنے بندوں کو پکار رہا ہے

آؤ اور اپنے ہر مقصد کو پورا کرو

میں آپ کے لئے اپنے قیمتی سینہ کو ظاہر کر رہا ہوں کیونکہ یہ میرا سرمایہ ہے جس کے حاصل کرنے میں میں نے ہزار ہا روپیہ صرف کر دیا تھا اور برسوں محنت کی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد راز ہائے سربستہ کو چھپا کر رکھنا فرض سمجھتا تھا مگر بزرگ رہنماؤں نے مجھ کو مجبور کیا کہ کیوں نہ خلق خدا کو اس گوہر گرانمایہ اور کلام الٰہی کی برکت سے مالا مال کیا جائے۔ اس لئے میں بے کم و کاست آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کئے دیتا ہوں کہ مندرجہ ذیل نقش و تعویذ سے کبھی ناکامی نہ ہوگی میں چند پیسوں کی خاطر اپنے ایمان کو فروخت نہیں کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرے ایماندارانہ قول کو سچا سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور کامیاب ہونے کے بعد فقیر کے لئے دعائے خیر کریں گے۔ تعویذ و نقش حسب ذیل ہیں جن کا ہدیہ بہت ہی قلیل ہے اور یہ تمام لفافہ کے اندر بذریعہ ڈاک رجسٹری کر کے روانہ کئے جاتے ہیں۔ ہدیہ کے علاوہ رجسٹری لفافہ کا خرچ ۴ آنہ ہوتا ہے۔

نقش بشارت — یہ نقش ہر کام کی کامیابی اور ناکامی کی بشارت دیتا ہے رات کو اپنے سرہانے رکھ کر ... کا تصور دل میں رکھ سوتے وقت میں بشارت ہو جائے گی۔ بیاہ شادی، مریض کی بیماری، تجارت کامیابی ناکامی۔ غرضیکہ اس کا موکل خواب میں آکر جواب دیدیتا ہے ہدیہ ایک روپیہ دس آنے (۱؍۱۰)۔

تعویذ دولت — مفلسی میں خدا ہی یاد آتا ہے۔ خدا کسی کو مفلس نہ کرے۔ مفلسی دور ہونے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئے یا روپیہ کی ترقی رک جائے تو اس متبرک تعویذ کی برکت سے آپ کی مفلسی دور ہوگی روپے پیسے میں رکھ دینے سے دولت کی زیادتی ہوگی اور عجیب انگیز طریقہ سے آمدنی کے ذرائع پیدا ہوں گے۔ بس خدا کی قدرت نظر آئیگی ہدیہ ایک روپیہ چار آنہ (۱؍۴)

محبت کی ڈوری — میرے بزرگ نے صرف مجھ کو اجازت دی تھی کہ یہ ایسے ضرورتمندوں کو دی جائے جو جائز طور پر طلب کریں اسلئے اس محبت کی ڈوری کو ضرورتمندوں کے لئے پیش کر رہا ہوں کہ اگر کسی کی اپنے شوہر سے لڑائی رہتی ہو یا شوہر کی طبیعت بیوی کی طرف سے ہٹی ہوئی ہو یا بیوی سے ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا پڑتا ہو تو یہ تعویذ آپ کی محبت بڑھانے میں محبت کی زنجیر ثابت ہوگا۔ چند ہی دن میں سارے جھگڑے ختم ہو کر شوہر بیوی کا غلام بن جائے گا۔ یہ خدا کے کلام اور اس کے مقرب بندوں کی برکت ہے کہ جائز محبت کے وقت اس تعویذ معظم کی برقی قوت اپنا اثر دکھاتی ہے اور ضرور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ ہدیہ صرف ڈھائی روپے (۲؍۸)۔

اقرار نامہ — ضرورتمندوں کو یہ اقرار کرنا ہوگا کہ میں اپنے سوا کسی دوسرے کو اس نقش و تعویذ کے استعمال کی ترکیب یا نقش نہ بتاؤں گا اور ہدایتوں پر عمل کروں گا۔

نواب میاں شاہ صاحب چشتی حکیم آغا جان م۔ست دہلی

پریم کا راگ

از جناب اعظم انصاری لدھیانوی
سابق جنرل سیکرٹری بزم ادب لدھیانہ

میرا من مندر سونا ہے، آجا، دیا جلا جا
جیون کی لہروں میں کھو کر پریم کا راگ سُنا جا
~~~~~~ پریم کا راگ سُنا جا ~~~~~~ ساجن!
~~~~~~ پریم کا راگ سُنا جا

رم جھم رم جھم برکھا آئی چھم چھم بوندیں آئیں
نینوں سے مستی برسا کر مجھ کو مست بنا جا
~~~~~~ پریم کا راگ سُنا جا ~~~~~~ ساجن!
~~~~~~ پریم کا راگ سُنا جا

مست نشیلے بادر آئے، کارے کارے بادر
میری سینے کی وادی پہ زلفوں کو لہرا جا
~~~~~~ پریم کا راگ سُنا جا ~~~~~~ ساجن!
~~~~~~ پریم کا راگ سُنا جا

برکھا کی رُت آئی چمن میں، کلیاں ڈھل ڈھل ہنسیں
میرے بے کل من کی کلی مرجھائی ہے، گدرا جا
~~~~~~ پریم کا راگ سُنا جا ~~~~~~ ساجن!
~~~~~~ پریم کا راگ سُنا جا

میرے اشعار

از جناب اثر مچھلی شہری

میری نوائے درد پہ دنیا خموش ہے
اب اپنی زندگی بھی مجھے بار دوش ہے

اللہ اب نہ ساز محبت کو چھیڑیئے
میں صبر کر چکا ہوں مجھے صبر آگیا

آپ کی بندہ نوازی کی کوئی حد ہی نہیں
ہے مجھے اپنی ہی کوتاہی داماں کا گلا

اگر گلوں کو چمن میں ثبات بھی ہوتا
عجیب چیز یہ دنیائے رنگ و بو ہوتی

تھی اسیری چمن ہی تک ہوائے سیر گل
اب قفس میں رات دن رونا تڑپنا رہ گیا

ہوا ہے ایک نہیں، لاکھ بار ایسا بھی
انہیں بھی یاد کیا جن کو بھول جانا تھا

کس نے آواز دی، میں چونک اٹھا، ڈر سا گیا
ایسا محسوس ہوا جیسے پکارا! تم نے

اثرؔ اب قوت احساس بھی کم ہوتی جاتی ہے
طبیعت خود بخود وارفتۂ غم ہوتی جاتی ہے

منقطع کرنے کے بعد کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ عملیق کو اسود نے گرفتار کر کے صبح اس کے سامنے اس کے نافذ کئے ہوئے مظالم کی فہرست پیش کی جس کو دیکھ کر وہ خود کانپنے لگا۔ اب عملیق نے گڑگڑانا شروع کیا۔ قریب تھا کہ اسود عملیق کو رہا کر دے . . . . کہ عماد نے شموس کی یاد دلائی اب اسود کی آنکھیں غصہ سے سُرخ ہو گئیں۔ اسود کے ایک ہی ہاتھ میں عملیق کا سر زمین بوس ہو گیا۔ عملیق کے مرنے کے بعد رات کو جنگل میں منگل منایا گیا۔ عماد کا یمامہ اور منذر

بیس ہزار روپیہ نقد انعام
معمہ نمبر ۵۸

		۳۲
	۳۱	
۳۰		

ترکیب حل: سامنے نو خانے مربع ہیں۔ انہیں ہندسوں سے اس طرح پُر کریں کہ ہر طرف قطار کا مجموعہ ۹۳ آئے۔ دیئے ہوئے ہندسوں کی جگہ تبدیل نہ ہوگی۔ نفی۔ بٹہ اور ضرب استعمال نہ ہوگی۔

انعام: ہر درست حل والے کو کم از کم ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ ۱۵ دسمبر تک جس کے سب سے زیادہ حل دفتر میں موصول ہوں گے۔ ایک ہزار روپیہ کا خاص انعام دیا جائے گا۔ جس کے کم از کم پانچ حل دفتر میں موصول ہوں گے۔ ایک عمدہ فاؤنٹین پن انعام دیا جائے گا۔ تمام انعامی گارنٹی شدہ ہیں۔

شرائط و قواعد: کسی سادہ کاغذ پر کسی تعداد میں حل معہ فیس داخلہ بحساب ایک روپیہ فی حل دفتر میں روانہ فرمائیں۔ جتنی تعداد میں حل روانہ کریں۔ اتنی ہی تعداد میں روپیہ روانہ کریں۔ اور پانچ پیسہ کا ٹکٹ ہمراہ روانہ کریں۔ تاکہ نتیجہ آپ کو براہ راست روانہ کیا جا سکے۔ منی آرڈر کی رسید حلوں کے ہمراہ روانہ کریں۔ جن حلوں کے ہمراہ رسید نہ ہوگی۔ وہ حل مقابلہ میں شامل نہ ہوں گے۔ تاریخ مقررہ کے گذرنے کے بعد جو حل دفتر میں موصول ہوں گے۔ مقابلہ میں شامل نہ کئے جائیں گے۔ تمام حل اور منی آرڈر ۳۱ دسمبر تک دفتر میں موصول ہونے چاہئیں۔ درست حل اور قابل انعام حل وہی تصور ہوگا۔ جو ہمارے سربمہر حل سے ہندسہ بہ ہندسہ اور خانہ بخانہ ملتا ہوگا۔ اس معمہ کی واضح شرط ہے کہ مینیجر معمہ کا فیصلہ قطعی اور قانونی طور پر قابل قبول ہوگا۔

یکم جنوری کو سربمہر حل شائقین کی موجودگی میں کھولا جائے گا۔ ۲ جنوری کو انعامات روانہ ہوں گے۔

حل اور منی آرڈر بپتہ ذیل پر روانہ کریں

بپتہ: مینیجر انڈو امریکن ہائیڈ کمپنی ۱۰ اکرم روڈ بیٹ نمبر ۵ لاہور

نتیجہ معمہ نمبر ۵۷

درست حل و سب سے زیادہ ۶ عدد حل: جناب محمد لطیف صاحب کوارٹر نمبر ۳۵۵/۸ ریلوے کالونی کوئٹہ انعام -/۲۰۰

درست حل و سب سے پہلے درست حل: جناب اے آر زینت صاحب چاہ میراں روڈ لاہور انعام -/۲۰۰

دیگر انعام پانے والے اصحاب: سردار سردین سنگھ صاحب نمبردار ضلع جالندھر۔ چوہدری بشیر احمد صاحب سانده کلاں۔ دنن سنگھ صاحب ہیڈ کانسٹیبل نئی دہلی۔ سردار دھرم سنگھ لاہور چھاؤنی۔ مسٹر ایچ سنگھ موگا۔ مسٹر ایم۔ این بی مکھو کھر بوبرڑ والا۔ مستری رحمت اللہ صاحب امرتسر۔ مسٹر رام دیو گپتا مظفر گڑھ۔ چوہدری سلطان بخش صاحب مظفر گڑھ۔ بابو لال صاحب شملہ۔ ماسٹر اوجاگر سنگھ صاحب نمبردار ضلع جالندھر۔

پستول

از جناب محمود سکون

میں نے جسوقت اپنی جیب سے پستول نکالا ہے. ٹھیک اسی وقت چودھویں رات کے چاند نے بادلوں سے نکلکر اپنی کرنیں اسپر ڈال کر اسے جگمگا دیا۔ اس میں ہیرے کی ایسی تڑپ پیدا تھی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا ——

"تعجب ہے" میں نے ذرا زور سے کہا "مجھے حیرت ہے"

مجھے اپنی پشت پر بچھے ہوئے راستہ پر کسی کے دبے چھپکے مگر تیزی سے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی —— یکایک کسی نے ایک ہاتھ میرے باند پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ کی ہلکی مگر فولادی گرفت میں میرا وہ ہاتھ تھا جس میں پستول تھا۔

ایک لڑکی خوف زدہ —— خوشامدانہ ملتجی آواز سے کہہ رہی تھی۔

"اوہ! ایسا نہ کیجئے —— خدا کیلئے ایسا نہ کیجئے"

میں نے اسے سر سے پیر تک دیکھنا شروع کیا —— وہ بے چین بھوری بھوری آنکھیں مجھے ملتجی نظروں سے دیکھ رہی تھیں سڈول جسم میں سفید ریشمی اور معطر لباس تھا

خدا کے لئے —— خدا کے لئے —— اس کے علاوہ —— یہ بُری بات ہے —— بہت بُری بات ہے"

میرے خیال میں ہم دونوں تھیٹر کا ایک سین پیش کر رہے تھے —— ایک سیاہ کپڑے پہنے تھا دوسرا سفید لباس میں ملبوس تھا —— چاندنی پھیلی ہوئی تھی —— بحیرۂ روم سامنے کروٹیں لے رہا تھا —— مانٹی کارلو کی روشنیاں مثل آسمان کے تاروں کے

چمک رہی تھیں ـــــ نارنگی کے غلیظ السان درخت، رنگ برنگ کے پھول، خوشنما پودے سب ہی کچھ تھا، گویا ہم قدرتی اسٹیج پر کھڑے تھے، جو قدرت کی اصلی سنیری پیش کر رہا تھا ـــــ کیسینو کی عمارت میں مست کر دینے والا بینڈ بج رہا تھا ـــــ

میں حملہ آور کو خاموشی سے تک رہا تھا ـــــ غالباً میرا منہ کھلا ہوا تھا ـــــ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اپنا منہ ایسا بنانے میں خود تعجب تھا۔ کس غضب کی گرفت میری داہنی کلائی پر تھی۔

اس نے مجھے اپنے دوسرے ہاتھ سے جھنجھوڑتے ہوئے مخاطب کیا۔

"آپ سنتے ہیں؟" اس نے کہا۔ "آپ کو ـــــ آپ کو ایسا نہ کرنا چاہئے۔"

مجھ میں جواب دینے کی ہمت پیدا ہوئی۔

"مجھے معاف کیجئے۔" میں نے انتہائی مناسب و نرم لہجہ میں جو میں اسوقت پر جبکہ قید تھا اختیار کر سکتا تھا کہا "ور کیا ـــــ کیا آپ کا خیال ہے ـــــ کہ ـــــ میں کسی کو قتل کرنے جا رہا تھا؟"

ایک بار اس کے ماتھے پر شکنیں پڑیں ـــــ جس سے غصہ کا اظہار ہو رہا تھا ـــــ بھوری آنکھوں نے تعجب سے میرا جائزہ لیا ـــــ اس طرح کہ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے رازِ دل کو پڑھ لینا چاہتی ہیں ـــــ پھر بھی میری کلائی پر جو گرفت تھی اس میں کسی قسم کی نرمی نہ محسوس ہوئی ـــــ

"کسی کو قتل؟ ـــــ کیا آپ اپنے ـــــ"

بقیہ جملہ اسکی معنی خیز اور تعجب نظروں نے پورا کر دیا۔

"آہ!" میں نے کہا۔ "اب میں سمجھا کہ آپ نے مجھے کیوں گرفتار کر رکھا ہے ـــــ آپکا خیال ہے کہ میں خودکشی کرنے جا رہا ہوں"

"کیا ایسا نہیں ہے؟" اس نے آہستگی اور تعجب سے دریافت کیا۔

"اسوقت تو یہ خیال نہیں تھا،" میں نے جواب دیا "تا وقتیکہ کوئی سانحہ نہ ہو جائے اور جہاں تک میرا خیال ہے اگر کوئی واقعہ مجبور نہ کرے تو کبھی بھی یہ ارادہ نہ ہوگا"

اس نے مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھا اور میں جواباً ایسی ہی نظروں سے اسے دیکھتا رہا ـــــ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا

"شکریہ!" میں نے کہا۔ "اور میں آپ کو آپکی کلائی اور انگلیوں کی مضبوطی پر مبارکباد دیتا ہوں ـــــ بلاشبہ میں آپ کے قبضہ میں تھا"

اب وہ ایک یا دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی وہ کبھی مجھے دیکھتی اور کبھی پستول کو جو میں نے برآمدے کے جنگلے کے نیل پایہ پر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں خاموشی اور استعجاب

کی دنیا لئے ہوئے تھی۔

"آپ نے اُسے اتنی عجلت کے ساتھ جیب سے کیوں نکالا تھا؟" پستول کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ترش لہجہ میں دریافت کیا "میں یقین کرتی ہوں کہ آپ ——— نہیں ——— میں نہیں یقین کرتی ——— حالانکہ ——— کیونکہ آپ نے کہا کہ آپ ایسا کرنے نہیں جا رہے تھے ——— لیکن"

"شکریہ" میں نے کہا لیکن میں نے پستول جیب سے کیوں نکالا؟ ——— ہوں! ——— میں نے اس لئے پستول جیب سے نکالا کہ میں اسکو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا"۔

میں نے کہا کہ آپ نے اس عجلت سے پستول نکالا کیوں؟" اس نے پھر دریافت کیا۔

میں نے اس عجلت سے کیوں نکالا؟" میں نے اسکا سوال زیر لب دہراتے ہوئے کہا "اوہ اس لئے کہ فوراً ہی مجھے یاد آیا تھا"

اس نے ابروؤں کو سکوڑ لیا اور منہ کو بھینچتے ہوئے میرا جائزہ لیا ——— اس کے منہ کا دہانہ نہایت خوبصورت تھا ——— اور اسکے چہرے کو جسے وہ ایک ریشمی سفید گلوبند سے چاروں طرف سے لپیٹے تھی دیکھنے سے جو اندازہ میں کر سکا اس سے اسقدر کہہ سکتا ہوں کہ وہ انتہائی حسین تھی ——— مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ تھوڑا بہت غصّہ میں تھی کیونکہ وہ اپنے جوتے کی پتلی نوک برابر زمین پر پٹخے جا رہی تھی۔

"یہ تو ایک عادت سی معلوم ہوتا ہے" اس نے بے اعتنائی سے کہا "گویا ایک شخص یکایک اپنی جیب سے پستول نکال لے گا تا وقتیکہ وہ اپنے کو یا کسی دوسرے کو نشانہ بنانے کا ارادہ نہ رکھتا ہو؟"

غالباً نہیں ———" میں نے جواب دیا لیکن میرا خیال ہے کہ میں اپنے بیان کو کچھ اور واضح کر دوں تاکہ مطلب اور زیادہ صاف ہو جائے ——— مثلاً ——— کیا آپ کو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ کبھی آپ خرید و فروخت کے لئے بازار گئی ہوں اور یکایک آپ نے کہا ہو ——— یا خدا! ——— میرا منی بیگ کیا ہوا؟" اور آپ نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر تلاش کیا ہو ——— پھر مل جانے پر مزید اطمینان کے لئے اسے نکال کر دیکھ لیا ہو"

وہ مسکرائی ——— پھر ایک خوشگوار ہنسی ہنسی "نہیں"۔ اس نے کہا۔ میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتی کہ مجھے ایسا اتفاق ہوا ہو ——— مگر آپ کا بیان صاف اور قابل قبول ضرور ہے ——— میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ——— آپ نے پستول محض اسلئے

اتفاقاً نکالا کہ یکایک آپ کو یاد آیا — اس لئے نہیں کہ آپ اسے استعمال کرنے جا رہے تھے"

میں نے اپنا سر ہلایا۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ میں اسے استعمال کرنے نہیں جا رہا تھا، میں نے جواب دیا میں امید کرتا ہوں کہ میں اسکا بہت صحیح استعمال کروں گا — یہ ایک بہت خوبصورت اسلحہ"

اس کے چہرے پر شک و شبہ کے آثار پائے جاتے تھے۔

میں ایسے لوگوں کو پسند کرتی ہوں جو وہی کچھ کہتے ہیں جو اُن کا مقصد ہوتا ہے" اسنے کہا "پھر تو آپ کو مجھے بہت زیادہ پسند کرنا چاہئے" میں نے کہا "کیونکہ اب تک میں نے وہی کچھ کہا ہے جو میرا صحیح مقصد ہے"

"آپ پستول کو بغیر کسی پرواہ کے اس کا صحیح استعمال کیونکر کر سکتے ہیں؟" اس نے ذرا لرزش لہجہ میں دریافت کیا، "غالباً آپ بلیاں مارنے جا رہے تھے؟"

"پستول بھرا نہیں ہے" میں نے جواب دیا اس میں ایک بھی کارتوس نہیں ہے۔ پھر بھی کل تک میں اسے صحیح طریقہ پر استعمال کروں گا"

اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں — وہ انتہائی حسین نظر آ رہی تھی — میں نے پستول اٹھا لیا اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اسکے سامنے پیش کیا۔

"دیکھئے!" میں نے پستول اسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ صناعی کا ایک بہترین شاہکار ہے — اور بہت ہی خوبصورت ہے اپنے ہاتھ اٹھا کر دیکھئے — میں یقین دلاتا ہوں بھرا نہیں ہے"

اس نے پستول اپنے ہاتھ میں لیکر تعجب سے برقی روشنی میں ادھر اُدھر اُلٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا — اور میں اسے دیکھتا رہا — اسکی عمر تقریباً بیس سال کی تھی — سڈول سانچے میں ڈھلے ہوئے ہاتھ پیر — گداز جسم — بال — جیسا کہ ایک دو چھلے جو شال سے باہر آ گئے تھے دیکھنے سے معلوم ہوا — سنہرے — اور آنکھیں بھوری تھیں —

"جواہر نگار!" اس نے تعجب سے کہا۔

"جی! پاگل پن اور فضول خرچی" میں نے جواب دیا

اس نے پستول مجھے واپس کر دیا

"کاش! مجھے پانچ منٹ قبل معلوم ہوتا کہ یہ بھرا ہوا نہیں ہے" اس نے زور دیتے ہوئے کہا "مجھے تماشہ بننے سے نفرت ہے" "درحقیقت — اور اس سے پریشانی بھی پیدا ہوتی ہے" میں نے کہا تاہم میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تماشہ

بہت بُرا اثر تھا۔
اس نے مجھے تیز نظروں سے دیکھنا شروع کیا
اب میں جاننا چاہتی ہوں کہ آپ پستول کا کیا حشر کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے دریافت کیا
میں نے پستول جیب میں رکھ لیا ــــ میں نے کچھ ایسی شرمندہ نظروں سے اسکی جانب دیکھا جن سے اعتماد اور بھروسہ کی جھلک پیدا تھی ــــ میں نے اپنے جوتے کی نوک کو پتھریلی سڑک پر پڑی ہوئی پتھر کی کنکریوں میں گڑونا شروع کیا ــــ "یہ کہ ــــ میں ــــ خیر ــــ ہاں ــــ تو میں نے تمام روپیہ ضائع کر دیا"، میں نے بہ دقت تمام کہا
کیسینو کی جانب اس نے اشارہ کیا
"وہاں؟ ــــ کیسینو میں؟" اس لئے دریافت کیا۔
میں نے جواب میں سر ہلا دیا
اس نے بھی پتھریلی زمین میں اپنے جوتے کی نوک گڑونا شروع کی ــــ بینڈ کی آواز کیسینو کے اندر سے آ رہی تھی جو اس موقع کے لئے مناسب طرز پیش کر رہا تھا
"درحقیقت" میں نے کافی خاموشی کے بعد کہا "کوئی شخص جب اپنی کل رقم ضائع کر دیتا ہے تو وہ اس کے پیدا کرنے کے ذرائع تلاش کرتا ہے ــــ ہم کو ذرائع تلاش کرنا چاہیئے۔ کیا روپیہ کا قول نہ تھا؟"
"مگر اس نے روپیہ کے لئے ایسا کبھی نہیں کہا"، اس نے تردید کرتے ہوئے کہا۔
"میں آپ سے بحث نہ کروں گا ــــ حالانکہ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ اس نے ضرور کہا کیونکہ زہر فراہم کرنے کے ذرائع تلاش کرنے کے لئے اس نے کہا ــــ اور یہ ذریعہ "روپیہ" تھا جس سے کہ "زہر" خریدا کیا جاتا ــــ لیکن میں کہہ رہا تھا کہ ایک شخص جتنا روپیہ ضائع کر دے اس سے زائد حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے
اور میرے پستول بہت قیمتی ہیں ــــ غالباً آپ میرا مطلب سمجھ گئیں"
"میرا خیال ہے کہ میں سمجھ گئی ــــ آپ انہیں رہن رکھنا چاہتے ہیں"
"رہن"، "نہیں بلکہ 'فروخت' زیادہ مناسب لفظ ہے"۔ میں نے کہا "دیکھئے ــــ آج جس وقت میں قریب قریب دیوالیہ ہو کر جوئے کی میز پر سے ہٹا ہوں میں یہاں چلا آیا ــــ آپ تصور کیجئے ــــ میں صرف چند قدم دروازے سے عبور کرتا ہوا آیا ــــ میرے دماغ میں ذرائع گونج اٹھے ــــ یکایک مجھے پستول یاد آئے (ان میں کا ایک ہر وقت میری جیب میں رہتا ہے اور ہمیشہ بلا کارتوس کے ــــ بے وقوفوں کے سامنے شیخی بگھارنے کیلئے میں نے اسے نکالا ــــ یہ اندازہ کرنے

کے لئے کہ مجھے ان دونوں پرس قدر رقم مل جائے گی ـــ میں کہہ رہا تھا ـ میں خیال کرتا ہوں ـــ میں خیال کرتا ہوں کہ ـــ کہ آپ نے مجھے اپنا قیدی بنالیا ـ"

اس نے اپنی شال اپنے گرد لپیٹ لی ـــ وہ کانپ رہی تھی۔

"مناسب ہو تو سمجھ ٹہلیں" اس نے کہا "بڑی خوشی سے" میں نے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں سگریٹ پیوں"

اس نے مجھے سگریٹ پینے کی اجازت دی ـــ ہم دونوں برآمدے میں ٹہل رہے تھے ـــ بینڈ کی دل خوش کن آواز کانوں میں گونج کر اپنی جانب مخاطب کر رہی تھی میں بلا ارادہ گنگنانے لگا ـــ

"ایک اس شخص کے مقابلہ میں جو اپنا کل روپیہ ہار چکا ہو ـ اور ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنے پستول فروخت کرنا چاہتا ہو ـ آپ بہت خوش معلوم ہوتے ہیں میری خوبصورت ہمراہی نے کہا "حقیقتاً آپ مسرت محسوس کرتے ہیں یا یہ محض ظاہری ہے؟"

"فی الحال میں بہت خوش ہوں" میں نے جواب دیا "کتنی خوشگوار رات ہے ـــ اور آپ ـــ اگر آپ مجھے کہنے کی اجازت دیں ـــ ایک دل پسند ہمراہی ہیں ـــ میں یقیناً کل اپنے خوبصورت پستولوں پر کافی رقم حاصل کر لوں گا ـــ یہاں ایک شخص ہے جو عجائبات دلوادر زمانہ اشیاء کی خرید فروخت کرتا ہے ـــ ایک یہودی ...... جو خوشی سے مجھے اچھی سے اچھی قیمت دینے کی کوشش کرے گا ـــ یہ پستول ایک سو پچاس پونڈ کے بھی اس کے لئے سستے ہیں ـــ افسوس مجھے اسکا ایک تہائی بھی منظور کرنا پڑے گا ـــ وہ انقلابات جو غریبوں کو برداشت کرنا پڑتے ہیں ملاحظہ فرمائیے

"اس سے پہلے کبھی آپ نے ناداری کا لطف اٹھایا ہے؟" اس نے تعجب انگیز لہجہ میں دریافت کیا۔

میں ہنسا

"اکثر" میں نے جواب دیا۔ ایک سو ایک مرتبہ ـــ جب سے کہ میں نے جیبوں کا وجود معلوم کیا"

"میرا مطلب یہ ہے جب سے آپ نے ہوش سنبھالا؟" اس نے کہا "بچوں کیلئے بے کوڑی پیسہ ہونا کوئی وقعت نہیں رکھتا تھے اسکا یقین نہیں ہے" میں نے جواب دیا

حقیقتاً مجھے جیب خرچ کی ضرورت اس وقت
جبکہ میں اسکول میں تھا زیادہ محسوس ہوئی
بمقابلہ اس وقت کے جب کہ میں اپنے پستول
فروخت کرنا چاہتا ہوں"
"اور اس روپیہ کو لیکر" اس نے کہا۔ اسطرح
جیسے کوئی سرد آہ کھینچے "آپ جوئے کی
میز پر واپس آئیں گے"
"وہی بات میں کہہ رہا ہوں" میں نے کہا
نہیں امیرا خیال ہے کہ میں اب ایسا نہ
کروں گا ــــ قسمت یاور نہیں ہے ــــ
مثل مشہور ہے۔ ایک خود غرض عورت کی خوشامد
کیوں کی جائے؟ ــــ دوسری کے لئے
کوشش کیوں نہ کی۔ جو خوش خلق ہے"
"کیا آپ بہت بڑی رقم ہار گئے ہیں؟"
اس نے دریافت کیا۔
"ایک امیر آدمی کی نظر میں بہت معمولی
ــــ ایک فقیر کے لئے پوری سلطنت
مگر گذشتہ باتوں کا کیوں نہ ذکر کیا جائے
کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ ہماری
زبان میں ایک بہترین ضرب المثل ہے کہ
گرے ہوئے دودھ کے لئے رونا بےسود ہے
انتہائی قابلیت کی مثال ہے"
"میرا خیال ہے" اس نے انتہائی بے تعلقی
سے کہا "کہ بہت سے جواریوں نے جو ماٹی
کارلو میں پائی پائی ہار گئے۔ آخر میں اپنے آپ
کو گولی کا نشانہ بنا کر سخت بے وقوفی کی۔
اور اسی لئے ــــ"
"آپ نے مجھے گرفتار کر لیا" میں نے اسکا
جملہ پورا کیا "ہاں! اب مجھے یاد آیا ــــ
میں نے آپ کا شکریہ ابھی ادا نہیں کیا"
"مگر اس میں میرا شکریہ ادا کرنے کی کوئی
بات نہیں ہے ــــ جب آپ کا ایسا
خیال ہی نہ تھا جیسا کہ میں نے سمجھنے میں
عجلت کی ــــ اور ــــ"
"مگر سب سے ضروری چیز" میں نے خشک لہجہ
میں کہا "آپ کا ارادہ یا نیت ہے ــــ کیونکہ
آپ کے پاس کافی وجوہات یہ یقین کرنے کی
تھیں کہ میں اپنے کو ہلاک کرنے جاتا ہوں
اور آپ نے نہایت مستقل مزاجی و بہادری
سے ایسا اندھا کام کرنے سے باز رکھنے
کی کوشش کی ــــ یقیناً اس کے لئے ممنون
کے ساتھ ساتھ آپ کا شکریہ ادا کرنا میں
اپنا فرض سمجھتا ہوں"۔
اس نے ایک معنی خیز نظر مجھ پر ڈالی۔
"غالباً آپ میں تضحیک کرنے کا مادہ ضرور
ہے"۔ اس نے کہا ــــ اس کے لبوں کی
جنبش انتہائی خوبصورت تھی مجھے یقین ہے
کہ آپ انسانوں سے نفرت کرتے ہیں"۔
"برخلاف اسکے میں دنیا میں سب سے زیادہ
صاف دل رکھنے والا فلسفی ہوں ــــ عمر خیام
کا حقیقی شاگرد ــــ اگر ایسا محسوس ہو

کہ میں تضحیک آمیز گفتگو کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بات سن کر فوراً ہنس نہیں سکتا ــــ زندگی کی حقیقت میری نظر میں کچھ نہیں ہے ــــ اس لئے ــــ"

میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کے لئے ہاتھوں کو اٹھا کر اشارہ کیا ــــ آخر دنیا میں فلسفہ کے علاوہ دوسرے موضوع بھی گفتگو کرنے کے ہیں ــــ جب کہ چاندنی بحیرۂ روم پر پھیلی ہوئی ہو ــــ اور پھر ایک خوبصورت غیر شناسا دوشیزہ کی ہمراہی بھی نصیب ہو۔

مجھے یقین نہیں ہے کہ آپ کو اگر سگریٹ بھر کر کھانا اور رہنے کے لئے جنگل دے دیا جائے تو آپ مطمئن رہیں گے" اس نے کہا

"میں قانع رہوں گا" میں نے جواب دیا بقول شاعر جو چیز اسے مطمئن رکھ سکتی ہے وہ مجھے بھی مطمئن رکھ سکتی ہے۔ آپ غور کیجئے روٹی کے ساتھ شراب بھی تھی ــــ عورت بھی ــــ اور خوشگوار نغمے ــــ عورت شراب اور نغمے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ڈاکٹر مارٹن نے کبھی عمر خیام کے کلام کو بھی پڑھا وہ شرابی ٹیبل کا حامی ہے۔ مگر یہ مسئلہ طلبار کے حل کرنے کا ہے ــــ اور میں طالب علم نہیں ہوں"

ہم دونوں ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔

"چونکہ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ خطرات سے دور ہیں" اس نے ایک قابل مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "اور پستول سے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں۔ کھنتے اس لئے جس عجلت سے میں آئی تھی اسی عجلت سے میں واپس ہو جانا چاہتی ہوں ــــ خدا حافظ ــــ"

میں جواب میں نیم خمیدہ ہو گیا

"میں آپ کی مہربانیوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں" میں نے سنجیدگی سے کہا "اگر میں نے خودکشی کا تصور بھی کیا ہوتا ــــ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر حقیقتاً میں خودکشی ہی کرنے جا رہا تھا تو اس سے بچا لینا آپ کی انتہائی مہربانی کا ثبوت ہے ــــ میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں"

اس نے اپنا سر جھکا لیا ــــ وہ ہنس دی۔

"مجھے امید ہے کہ پستول آپ کی قسمت بدل دیگی" اس نے جاتے ہوئے کہا، "یہودی سوداگر سے بیچا نہ دیکھئے گا ــــ اور جوئے خانہ میں دوبارہ نہ جائیے گا"

اس نے سر ہلایا ــــ مسکرائی ــــ اور وہاں سے جانے لگی ــــ اس طرح ہماری ملاقات کا خاتمہ ہوا ــــ کیا پھر کبھی میں اس سے مل سکوں گا؟

"محترمہ" میں نے زور سے آواز دی

وہ مڑی اور تعجب سے مجھے دیکھنے لگی — میں نے اپنا سر جھکا لیا — شرمندگی سے "میں نے آپ سے جھوٹ بولا" میں نے کہا صریحی جھوٹ — نہ میں خودکشی کرنے جا رہا تھا اور نہ کسی دوسرے کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا — اور نہ میں اپنے خوبصورت پستول کی جوڑی یہودی کے ہاتھ فروخت کرنے جا رہا ہوں — میں نے آج ہی یہ پستول خریدے ہیں۔ اور جسوقت آپ آئی ہیں میں غور کر رہا تھا کہ آیا میں ان نئے پستولوں سے بیس قدم کے فاصلہ سے تاش کے پتے کی بوند کی اڑا سکتا ہوں یا نہیں — بقیہ اس کے علاوہ سب اختراع تھا —"

اس نے مجھے گھورنا شروع کیا — پھٹی پھٹی آنکھوں سے — ہونٹھ ایک دوسرے سے جدا تھے — آخر کار وہ بولی۔ "تو پھر آپنے مجھے اسوقت تک باتوں میں کیوں پھنسائے رکھا؟" اس نے حقارت آمیز غصہ کے ساتھ دریافت کیا۔

"آپ کی آواز انتہائی شیریں ہے" میں نے عاجزی کے ساتھ کہا "اور آواز کا مالک انتہائی — رحمدل ہے"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی — ایک ایسی سرد آہ جس کی تشریح کرنا میرے لئے ناممکن ہے — "میں مکان جا رہی ہوں" اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا — میں غور کروں گی"

"کیا؟" میں نے کہا

"مرد کی مکاری اور دغابازی پر" اس نے جواب دیا "خدا حافظ"

"لیکن ابھی کل کا دن بھی ہے" میں نے ترغیب دیتے ہوئے کہا "کیا مجھے —" وہ مجھ سے اور جھوٹ باتیں بنانیکا موقع نہ ملے گا؟" اس نے جملہ پورا کیا۔

"میں سچ بول سکتا ہوں — بخوبی" میں نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں آپ کو سچ بولتا پاکر خوش ہوں گی" اس نے بھی سنجیدگی سے کہا

میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے ہمیشہ سچ ہی بولتے پائیں گی" میں نے جواب دیا۔ گو کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ میں ایک خاص خیال کا حامی ہوں"

وہ ہنس کر آگے بڑھی — میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔

"صبح سے قبل" میں نے کہا "مجھے ذریعہ تلاش کرنا ہوگا تاکہ ہم اسوقت کی گفتگو پر تبادلۂ خیال کر سکیں — اخلاق کو سختی سے مدنظر رکھتے ہوئے — لیکن — آپ کی بھی موجودگی

کی ضرورت ہوگی"

"گیارہ بجے کا وقت بہت سی باتوں کیلئے مناسب ہوتا ہے" اس نے جواب دیا

"اور یہ ـــ میں نے اپنے چاروں طرف نظریں ڈالتے ہوئے کہا، ملنے کی مناسب جگہ"

"لیکن آپ کو اپنی اصلی حالت میں ہونا چاہیئے" اس نے کہا، میں نے وعدہ کیا "میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا پڑھوں گی"؟ اسے مزا آگیا کہا۔

"کچھ بھی ہو" میں نے استدعا کی "ایک دو دو سن تو الٹ ہی سکیں گی"

اس نے عجیب شان سے اپنے سر کو خفیف سا خم کیا ـــ تعظیماً ـــ جس سے کہ ایک اٹھارھویں صدی کا بزرگ اپنے لئے انتہائی عزت افزائی محسوس کرتا ـــ میں نے بھی انتہائی ادب سے سلام کیا ـــ اس نے اپنی بھوری آنکھوں کی پرحجاب نظروں سے خدا حافظ کہا اور وہاں سے چل دی ـــ

"مجھے تعجب نہ کرنا چاہیئے" میں نے کیسینو سے دوسری جانب جاتے ہوئے خیال کیا "مجھے قطعی تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ اگر میں سمجھوں کہ میں عاشق ہوگیا ـــ وہ دل لبھانے والی پیاری شخصیت ہے ـــ تو بہ! خیالات بھی عجیب ہیں"

ہوٹل ڈی پیرس میں جس وقت میں نے اپنے کمرے میں پستول کو اس کے غلاف میں حفاظت سے رکھا ہے مجھے یاد آگیا کہ اس نے اُن کو ہاتھ سے مس کیا تھا ـــ میں نے اس جگہ کو جہاں پر اسکی خوبصورت انگلیاں پستول کی چمکدار سطح سے مس ہوئی تھیں، بوسہ دیا ـــ چاند کی روشنی کھڑکی سے گذر کر اب بھی اسپر پڑ رہی تھی ـــ اور مجھ پر بھی

دوسری صبح کو میں نے میجر ...... کے ہمراہ ناشتہ کیا ـــ میجر تقریباً پچاس سال کی عمر کا انتہائی تندرست اور شریف انسان ہے ـــ جو تقریباً ہر شخص سے واقف ہے۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ جتنا کہ لوگ خود اپنے متعلق جانتے ہیں ـــ اس کے ہمراہ ناشتہ کرنے سے تمام ان باتوں کا علم ہو جاتا ہے جو آپ کو کسی روزنامہ یا ہفتہ وار اخبار میں بھی نہ معلوم ہوں گی۔

میجر سے گفتگو کرتے کرتے میں نے میز پوش سے نظریں اٹھا کر ایک سمت دیکھا۔ میرے جسم میں رعشہ اور ساتھ ہی ساتھ مجھے گرمی محسوس ہوئی ـ میری داہنی جانب مجھ سے کچھ فاصلہ پر میرے تصورات کی ملکہ بیٹھی ہوئی ناشتہ کر رہی تھی ـــ وہ ہمیشہ سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کے پاس

ہی ایک مسن شخص بیٹھا تھا اور ایک عورت بھی جو انتہائی سادہ لباس میں تھی، مجھے خیال ہوا کہ یہ سب امریکن ہیں، مگر اس کی سُریلی آواز میں امریکنوں کی طرح جھنکار نہ تھی

"منیجر" میں نے آہستہ سے کہا "تم ہر شخص کو اور ہر بات جانتے ہو ——— اچھا بتاؤ یہ ہماری داہنی جانب کھڑکی کے قریب کی میز کے گرد کون لوگ بیٹھے ہیں"

منیجر نے فوجی شان سے معائنہ کیا

"اوہ! ہاں! ہاں!" وہ بولا "امریکن ہیں۔ کل ہی یہاں آئے ہیں ——— وہ شخص اس لڑکی کا باپ ہے ——— گوشت کی تجارت کرتا ہے ——— کروڑپتی ہے ——— صرف ایک لڑکی ہے جو تمام جائداد کی وارث ہے ——— اور وہ دوسری سادہ لباس والی اسکی سہیلی ہے"

"کاش کہ میں بھی گوشت کا تاجر ہوتا،"

میں نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔

"بہترین تجارت ہے۔ گو کہ ذرا کثیف ہے"

منیجر نے کہا "مگر انتہائی منفعت بخش"

میں اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی آخر کار میری جانب دیکھا۔ نظریں ملیں پھر بھی ہم نے ایک دوسرے سے اجنبیت برتی مجھے معلوم تھا ہم لوگ گیارہ بجے ملینگے

وہ ٹھیک وقت پر وہاں موجود تھی ——— تنہا ——— گو کہ وہ انتہائی خوبصورت تھی مگر اسکی نظروں میں ایک غمگینی پائی جاتی تھی ———

"ناشتہ سے اسوقت تک ——— ایک طویل وقفہ تھا" میں نے کہا

"یقیناً ——— ایک گھنٹا اور پانچ منٹ ہوئے" وہ بولی۔

ہم لوگ ایک بنچ پر بیٹھ گئے بحیرۂ روم کا نیلگوں پانی ہمارے سامنے کروٹیں لے رہا تھا ——— اور خاموشی چھائی تھی ———

"اچھا؟" اس نے کہا

"اچھا؟" میں نے بھی دُہرایا

"آپ کچھ ———" اس نے کہا۔ "آپ کچھ سوچ رہے ہیں؟"

"اور آپ بھی فکرمند معلوم ہوتی ہیں" میں نے کہا

"اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ چاندنی رات نہیں ہے" وہ بولی

"مگر سورج کی روشنی تو پھیلی ہے" میں نے جواب دیا

"چاندنی رات میں ہم ایک دوسرے سے واقف نہ تھے" اس نے کہا

"اور آپ؟" میں نے دریافت کیا

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنے جوتے کی نوک سے ایک کنکری سے کھیلنے لگی

"منیجر ناشتہ کے بعد سے میرے باپ کے ہمراہ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں" اس نے کہا

"اوہ!" میں نے کہا "یہ سب اسی کی شیطنت ہے"

"مجھے خوشی ہے" وہ کہتی رہی "کہ میں نے انگلینڈ کے مارکوئیس کو پستول فروخت کرنیکی ذلت سے بچا لیا ——— مجھے آرزو ہے کہ میں ان کی دروغ گوئی کے مرض کا بھی علاج کر سکتی"

اسکے بعد ایک طویل خاموشی چھا گئی

"کیا آپ مجھ کو اپنی حفاظت میں لینا پسند کرینگی؟" میں نے دریافت کیا "اور کوشش کریں گی؟" ———

اس کے بعد پہلے سے بھی زیادہ خاموشی مسلط رہی

"غالباً میں ایسا کر سکتی ہوں" اس نے جواب دیا "ساتھ ہی ساتھ ——— آئیے اور میرے والد سے تعارف حاصل کیجئے"

——— اور اس طرح برطانوی شہنشاہیت اور امریکن حکومت کے مابین سلسلۂ اتحاد کی ایک اور کڑی جوڑی جا رہی ہے ——— پستول کا شکریہ!

(آزاد ترجمہ)

دُنیائے فلم کی تازہ خبریں

(بقیہ صفحہ ۱۲۵)

نیو تھیٹرس کلکتہ "ڈاکٹر" نمائش کیلئے تیار ہے۔ اس فلم کا پلاٹ جنندا مکرجی کے ایک مشہور ناول سے لیا گیا ہے۔ لُب لباب یہ ہے کہ ہندوستان کی نجات کا انحصار دیہات سُدھار پر ہے۔ "ڈاکٹر" کے گانے بہت بلند اور دلکش ہیں اور مناظر اتنے باصرہ نواز کہ بار بار دیکھنے کے باوجود بھی طبیعت سیر نہ ہوگی۔ ڈاکٹر کے خاص کرداروں میں چودھری جیوتی، پرکاش، بھارتی، امر ملک اور نیمو خاص طور پر قابل ذکر ہیں

اشتہاری طلاؤں سے بچو

نسخہ طلاء مردمی شائع ہو گیا

ناظرین! اس طلاء نے صدہا نہیں بلکہ ہزاروں مریضوں کی زندگی بدل دی۔ اور ہزاروں کو بامراد اور کامیاب بنا دیا۔ طلاء مردمی رجسٹرڈ عرصہ ۲۰ سال سے پبلک میں اپنی مسیحائی سے مردہ کو زندہ کی صفت اور صداقت کا سکہ جما کر شہرت اور قبولیت کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ اور نہایت مجرب اور بے اثر ثابت ہو رہا ہے۔ ہم نے پبلک کی تکلیف کا خیال کر کے عام مخلوق خدا کی ہمدردی اور اشتہاری دواؤں کی شکایت کا خیال کرتے ہوئے عام انسانوں کیلئے مجرب اور شرطیہ بلا ہچکچاہٹ کے شائع کر دیا ہے۔ اور عضو مخصوص (مردانہ) کی تمام خرابیوں کیلئے بیحد مفید ہے۔ اور عضو مخصوص کی سستی، کمزوری، پتلا پن، چھوٹا پن، ٹیڑھا پن، جھکاؤ، نیلی رگوں کا ابھر آنا جو کثرت مباشرت، اغلام اور جلق وغیرہ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور جملہ تمام امراض کیلئے حیرت انگیز طور پر مفید ثابت ہو چکا ہے۔ تمام شکایتوں کو رفع کر کے طوالت، فربہی اور تحریک قوت پیدا کرنے میں لاثانی ہے۔ زود اثر اسقدر ہے کہ دوا مرتبہ کے لگانے سے نصف گھنٹہ میں فائدہ محسوس ہوتا ہے۔ ہزاروں مایوسوں کی جو بے لطف تھی اس نے عیش و راحت، کامیابی و کامرانی کیساتھ بسر کرا دی۔ جو کہ دعائیں دیتے ہیں۔ اور شکریہ کے خطوط لکھتے نہیں تھکتے۔ اسلئے اسکے استعمال سے اسکا جوہر معلوم ہو سکتا ہے۔ شوق سے اسکو تیار کریں۔ اور دعائے خیر سے ناچیز کو یاد کریں۔ اگر کسی صاحب کو ضرورت ہو۔ تو دوستوں اور عزیزوں کو یہ نسخہ بتلا کر ملاحظہ فرما کر طلاء بنانے کی سفارش کریں۔ یہ ردی کی ٹوکری میں نہ پھینکا جائے۔ بلکہ بہت حفاظت سے رکھا جائے۔ کیونکہ یہ نسخہ بار بار شائع نہ ہو گا۔

نسخہ حسب ذیل ہے: مغز پستہ ایک تولہ، مغز اخروٹ ایک تولہ، مغز بادام ایک تولہ، مغز چلغوزہ ایک تولہ، سفید کنیر کی جڑ ایک تولہ، کائپھل ایک تولہ، لونگ ایک تولہ، جائپھل ایک تولہ، بیربہوٹی چھ ماشہ، بیگ ماہی ایک تولہ، مالکنگنی ایک تولہ، سفید چرمٹی ایک تولہ، ڈھاک کے بیج تولہ، سم اسپ ایک تولہ، عقرقرحا تولہ، جلوتری ایک تولہ، دارچینی ایک تولہ، اونٹ کٹارے کی جڑ ایک تولہ، تخم پیاز ایک تولہ، کچلہ چھ ماشہ، زعفران چھ ماشہ، جوز خطائی چھ ماشہ، کستوری ۳ ماشہ، اندری رس چھ ماشہ، چربی چیتا ۵ تولہ، چربی شیر ۵ تولہ، چربی سانڈہ ۵ تولہ، تیل چنبیلی ۵ تولہ، سم الفار سفید چھ ماشہ، آئل سنامن (Oil Cinnamon) دو تولہ، آئل کلوو (Oil Clove) ۵ تولہ۔ مندرجہ بالا خشک دواؤں کو پیس کر چربی اور تیل ملا لیں۔ پھر کسی کھرل میں ڈال کر ۲۴ گھنٹہ گھوٹ کر بڑی آتشی شیشی میں بھر کر رکھ لیں۔ یا پاتال جنتر کی ترکیب سے تیل نکال لیں۔ اور شیشی میں بھر کر کاگ لگا دیں۔

حسب دستور رات کو سوتے وقت مالش کریں۔ انشاء اللہ ایک ہفتہ کے استعمال سے وہ قوت پیدا ہو گی۔ جو تا زندگی قائم رہیگی۔ اور تمام نقائص عضو مخصوص کے رفع ہو جائینگے۔ لطف یہ کہ اس طلاء سے آبلہ نہیں پڑتا اور نہ کوئی تکلیف ہی ہوتی ہے۔ نازک سے نازک حضرات اس کا استعمال کرتے ہیں۔ ہر موسم میں یکساں مفید ہے۔ اگر کوئی صاحب بوجہ دقت یا شرمندگی سے خود تیار نہ کر سکیں۔ تو ہمارے دواخانہ سے طلاء مردمی جو مریضوں کے لئے ہر ہفتہ تیار ہوتا رہتا ہے۔ جس کی قیمت فی شیشی تین روپے آٹھ آنے معہ محصولڈاک ہے۔ (منی آرڈر فیس دو آنہ) طلب کریں۔ ایک شیشی ایک مریض کیلئے کافی ہوتی ہے۔ اگر خود ہی تیار کرنا چاہیں۔ اور کسی دوا کے نہ ملنے سے مجبور ہو جائیں۔ تو وہ بھی طلب کریں۔ غرضیکہ ہم کو دھوکہ باز اشتہاروں سے بچانا مقصود ہے۔ جس طرح چاہیں اس نسخہ کا تجربہ کریں۔ اور اگر **جریان و قوت باہ** کی شکایت ہو۔ تو ہمارے وہ بھی نسخہ **اکسیر جریان** بادداو یہ **سنجیون ست رجسٹرڈ** جو کہ بیس سال سے مجرب مشہور ہے جس کے استعمال سے بلا مبالغہ بیس سال کے لاعلاج مریض جو برسوں تک حکیموں اور ڈاکٹروں کے زیر علاج رہ کر دولت کو برباد کر کے بھی مایوس ہو چکے تھے۔ آج وہ سب صاحب اولاد ہیں جس کی قیمت اکیس روزہ خوراک کی مبلغ دو روپے دس آنے (۲/۱۰) معہ محصولڈاک ہے۔ منی آرڈر فیس دو آنہ طلب کریں۔ جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ اور پتہ خوشخط تحریر کریں۔ ورنہ تعمیل جواب نہ ہو گی۔ (جملہ خط و کتابت کا پتہ):-

خادم وید رتن ستیہ دیو جی ہیڈ ۔ روپ بلاس کمپنی ۱۶/۱۴۶ کانپور

حسن کی قربان گاہ پر!

ایک پرکشش رومانی
نہایت دلچسپ افسانہ

از قلم مسٹر ... بیگ

میں آجکل "آپ بیتیاں" کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں۔ کتاب کا ایک بڑا حصہ مرتب ہو چکا ہے۔ اس کتاب کیلئے میں نے کن کن طریقوں سے مواد فراہم کیا ہے اسے نہ میں بتا سکتا ہوں نہ اس کے بتانے کی کوئی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں مجھے بہت سی عورتوں سے بھی ملنا پڑا۔ اور میں نے انکی "آپ بیتیاں" ان کی زبان سے سنیں۔ انہیں میں سے ایک آپ بیتی آپ کو سنا رہا ہوں اس نے مجھ سے بیان کیا۔

رام سروپ میرے باپ کے کارخانے میں مستری تھا میرے باپ کا موٹروں کا کارخانہ تھا شروع میں میرے نزدیک رام سروپ کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ جہاں کارخانے میں اور بہت سے نوکر تھے۔ ایک رام سروپ بھی تھا۔ وہ موٹروں کے پرزے کھولتا فٹ کرتا اور ان کی مرمت اور درستی کرتا تھا۔

وہ بارہ برس کی عمر میں ہمارے ہاں آیا تھا اور اب وہ بائیس برس کا نوخیز اور توانا و تندرست نوجوان تھا جس وقت رام سروپ میرے ہاں آیا میری عمر آٹھ سال کی تھی اس حساب سے اب میری عمر بھی اٹھارہ سال کے قریب ہو چلی تھی۔

رام سروپ ایک زمانے سے ہمارے ہاں رہتا تھا اور کارخانے کے تمام ملازموں میں کم عمر تھا۔ اس لئے میں کبھی کبھی اس کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی اور اس سے دو دو باتیں بھی کر لیا کرتی۔ اس کے علاوہ وہ کوئی موٹر سائیکل درست کر کے اس کی ٹرائی کو جاتا تو کبھی کبھی میں بھی اس کے پیچھے بیٹھ جاتی اور اسکے ساتھ کارخانے سے بہت دور دور تک چلی جاتی۔"

میں نے پوچھا۔ تو کیا آپ اکثر کارخانے جایا کرتی تھیں؟

اس عورت نے کہا۔ ہاں میں نے آپ کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میرا مکان سری رام روڈ پر تھا اور کارخانہ "ولنگڈن اسٹریٹ" پر۔ میں جب چھوٹی تھی اسی وقت سے پتاجی کے ساتھ کارخانے جانے لگی تھی اور ابھی تک میری شادی تو ہوئی نہیں تھی اور اب تک لڑکیوں ہی میں میرا شمار ہوا کرتا تھا اسلئے میرا کارخانے جانا آنا بند نہیں ہوا تھا۔

جب کا میں ذکر کر رہی ہوں میری عمر سولہ سال کے قریب رہی ہوگی۔ ایک روز پتاجی نے رام سروپ سے کہا۔ سوشیلا کو گھر پہنچا آ سروپ"،

پتاجی نے تو اسے کار پر پہنچانے کو کہا لیکن میں نے سروپ سے کہا۔ میں کار پر نہیں جاؤں گی موٹر سائیکل نکالو۔ سروپ نے میرے اصرار پر موٹر سائیکل نکالی وہ سیٹ پر بیٹھا اور میں اس کے پیچھے۔

کارخانے سے دور نکل جانے کے بعد میں نے کہا۔ رام سروپ! آج آسمان پر ہلکے ہلکے بادل نظر آرہے ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ چلو گنگا جی کی طرف سے گھومتے ہوئے گھر چلیں۔

سروپ نے کہا۔ نہیں دیر ہوگی تو بابو جی خفا ہوں گے۔

میں نے کہا۔ تمہیں اتنی عقل بھی نہیں ہے رام سروپ، کہہ دینا موٹر سائیکل بگڑ گئی تھی اسی کے درست کرنے میں دیر ہوئی۔

سروپ کی سمجھ میں بات آگئی اس نے موٹر سائیکل کا ہینڈل گھما دیا۔

گنگا جی پانچ میل کے فاصلے پر تھیں۔ ہلکے ہلکے بادل دیکھتے ہی دیکھتے گہرے ہو گئے اور ہوا بھی چلنا شروع ہو گئی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ موٹر سائیکل کا چلانا دشوار ہو گیا۔ اس پر موسلا دھار بارش بھی ہونے لگی۔ ہم شہر سے دور نکل آئے تھے اس لئے نہ آگے بڑھ سکتے تھے اور نہ واپس ہو سکتے تھے۔ اتنے بھیگے اتنے بھیگے کہ نہا گئے۔ رام سروپ کا تیل کالک سے اٹا ہوا بدن صاف ستھرا ہو گیا۔ اس کے بھیگے ہوئے سر کے بالوں سے اس کے شاداب و شگفتہ گالوں پر پانی کے قطرے ٹپکتے تو معلوم ہوتا موتی لڑھک رہے ہیں اسکی ٹرویل کی قمیص اس کے ابھرے ہوئے چوڑے چکلے سینے پر چپک گئی تھی۔ جس سے اسکا مردانہ حسن اور نمایاں ہو گیا تھا۔ میرے کپڑے باریک اور ملائم تو تھے ہی بھیگنے سے بدن میں بالکل چپک گئے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو الگ الگ صاف صاف نظر نہ آرہا ہو۔

پانی اسی طرح اندھا دھند برس رہا تھا سامنے ایک خالی بنگلہ نظر آیا۔ سروپ نے کہا۔ اب

آگے بڑھنا فضول ہے شیلا رانی۔

اس نے بنگلے کے سامنے موٹر سائیکل روک دی۔ بنگلہ ایک سنسان مقام میں واقع تھا اور بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ شاید کسی رئیس نے تفریح کے لئے بنوا دیا تھا کبھی کبھار آکر اس میں دو چار روز ٹھہرتا ہوگا۔

ہم دونوں برآمدے کے ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ یہ مقام یوں بھی سنسان تھا اور اس آندھی پانی کے طوفان کی وجہ سے راستے سے آمد و رفت بھی بند تھی۔ معلوم ہوتا تھا آج برس کر پانی پھر کبھی نہ برسے گا۔

سروپ نے میری طرف دیکھا۔ نہ جانے اسکے دیکھنے میں کوئی خاص بات تھی یا کیا کہ آج اس کی آنکھیں مجھے بہت دلکش اور سہانی معلوم ہوئیں۔ اس نے کہا شیلا رانی! آج تو ہم بڑی آفت میں پھنسے۔

بات تو یہی تھی، لیکن میں نہ جانے کیوں آج ایک عجیب کیف و سرور محسوس کر رہی تھی۔ ایسا لطف و انبساط اب سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس لطف و سرور میں مجھے جیسے کسی بات کی پرواہ ہی نہ تھی۔

سروپ نے پھر اسی طرح میری طرف دیکھ کر کہا شیلا رانی! تمہارے تو سارے کپڑے پانی سے شرابور ہو گئے ہیں بہت سردی لگ رہی ہوگی۔

"پھر؟ کیا کرنا چاہیئے؟"... میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا

اپنا فراک اتار کر مجھے دیدو میں اسے نچوڑ کر ہوا کے رخ پر کھڑا ہو جاؤں۔ کچھ تو سوکھ ہی جائے گا" سروپ بولا۔ اچھی بات ہے"

میں فراک اور فراک کوٹ دونوں اتارنے لگی لیکن ٹھنڈک سے ہاتھ قابو میں نہ تھے۔

میں نے سروپ کی طرف دیکھا وہ میری مجبوری کو سمجھ گیا اور رکتا سہمتا میرے پاس آکر کپڑے اتارنے میں میری مدد کرنے لگا

اس دوران میں ایک بار اسکی انگلیاں میرے جسم سے چھو گئیں جس کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا جیسے تمام جسم میں لہر سی دوڑ گئی۔ فراک اتر گیا۔ نیچے پیٹی کوٹ تھا اس کے نیچے ایک جالیدار ریشمی بنیائن یہ دونوں کپڑے بھی تر ہو کر بدن سے چپکے ہوئے تھے۔

سروپ نے بھیگے ہوئے فراک کو ہاتھ میں لئے میری طرف دیکھا۔ اسکے چہرے پر ایک عجیب نشاطی کیفیت رقص کر رہی تھی اور اس کی آنکھیں جیسے خمار آلود ہو رہی تھیں جن میں شرابیوں کی طرح سُرخ سُرخ ڈورے نمودار تھے۔ وہ فراک کو کندھے پر رکھ کر میری طرف بڑھا مجھ پر بھی جیسے بیخودی طاری ہوتی جا رہی تھی میں جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔ اس نے اپنے دونوں بازو میری کمر میں حمائل کر کے مجھے اس زور سے سینے سے چمٹا لیا کہ میں تڑپ اٹھی لیکن اس تڑپ میں جو لذت اور کیف آفرینی تھی وہ میں نے آج تک کسی چیز میں محسوس نہیں کی تھی میں نے اپنی مخمور آنکھیں اس کی نشیلی آنکھوں میں ڈال دیں۔

اس سے پہلے میں بالکل نہیں جانتی تھی کہ مرد میں ایسا جادو چھپا ہوتا ہے اور اسکی ہم آغوشی ایسی کیف انگیز اور نشاط آفریں ہوتی ہے۔

میرا جسم جو تھوڑی دیر پہلے سردی سے کانپ رہا تھا۔ بڑی حد تک گرم ہو چکا تھا۔ سینے سے چپکی ہوئی ریشمی بنیائن خشک ہو چلی تھی تمام جسم ایک طرح کی امنگ سے لبریز ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی چیز ہے جو بدن کے ایک ایک عضو سے پھوٹی پڑ رہی ہے شاید وہ جوانی کی مستی تھی پلکیں بھاری بھاری سی بن گئیں۔ میں اس کیف و سرور کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ میری زندگی کا سب سے پہلا کیف آگیں اور نشاط آفریں موقع تھا۔ مجھے خبر نہیں کہ میں کتنی دیر سروپ کی آغوش میں رہی۔ میں تو بے خود سی ہو گئی تھی۔ گھنٹوں کے بعد کہیں بارش تھمی تو ہم گھر کی طرف لوٹ سکے۔

سب جانتے ہی تھے کہ بارش ہو رہی تھی اس لئے کسی نے ہم سے دیر ہونے کے بارے میں ایک لفظ نہیں پوچھا۔ میں سروپ پر ایک پیار بھری نگاہ ڈال کر بنگلے کے اندر چلی گئی۔ اس روز سے مجھ میں ایک نئی امنگ پیدا ہو گئی۔ ہر وقت خوش رہتی ہنستی گاتی کھیلتی۔ کارخانے میں خوب گھومتی کہیں کہیں کھڑے ہو کر کام کی دیکھ بھال بھی کرتی رام سروپ کو دیکھ کر دل میں ایک گدگدی سی پیدا ہو جاتی اور اسی بارش کے دن والے لطف و سرور کے لئے دل بے چین ہو جاتا

میرے اور سروپ کے راز سے تو کسی کو واقفیت تھی نہیں۔ وہ پرزے پھیلائے کوئی موٹر یا موٹر سائیکل ٹھیک کرتا ہوتا تو میں جا کر اس کے پاس بیٹھ جاتی۔ لوگوں کے دکھانے کے لئے اسے ڈانٹتی۔ تنبیہ کرتی کہتی۔ دیکھو رام سروپ ذرا پرزوں سے ہوشیار! آجکل ان کے دام آٹھ گنے ہو گئے ہیں۔ اگر ایک پرزہ بھی ادھر ادھر ہوا تو پورے مہینے کی تنخواہ صاف ہو جائے گی"

کبھی کوئی پرزہ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیتی کہتی تو اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھو"

اس طرح مجھے اسکے چھونے کا موقع مل جاتا جس میں مجھے بڑا حظ حاصل ہوتا۔

لوگ مجھے اب تک ایک بھولی بھالی لڑکی

سمجھ رہے تھے۔ لیکن میری جو حالت تھی اسے میں ہی جانتی تھی۔ اگر کوئی لڑکی میری طرح دھوکہ دینے پر اتر آئے تو وہ گھر والوں کو اور ساری دنیا کو کس صفائی سے دھوکہ دے سکتی ہے۔

میں نے شیلا کی تصدیق کی۔ یہ آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں میں نے خود ایسے بہت سے حالات فراہم کئے ہیں"

شیلا بولی۔ ہاں۔ جب آپ ایسی کتاب ہی تیار کر رہے ہیں تو ضرور ہی آپ نے ایسی لڑکیوں کے حالات جمع کئے ہوں گے۔

"لڑکیوں ہی کے نہیں لڑکوں کے بھی"۔ میں نے کہا۔

"تو پھر اور کیا، ایسے حالات تنہا تو وقوع میں نہیں آ سکتے" یہ کہکر شیلا مسکرا پڑی۔

"اچھا تو آپ اپنا سلسلہ پورا کیجئے۔ میں فضول درمیان میں بول پڑا"

"اچھا تو سنئے" شیلا نے کہنا شروع کیا۔

ایک روز سروپ کے ساتھ مجھے پھر گھر آنا پڑا میں نے راستے میں اس سے کہا۔ رام سروپ گنگا جی کی طرف چلو گے؟

سروپ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔ شیلا رانی! ہمیں اتنا تو خیال رکھنا ہی ہو گا کہ کسی کو ہم پر شبہ نہ ہو"۔

اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب شوق تھا اور اسکی آنکھوں میں ایک عجیب بیقراری تھی۔ میری طبیعت بھی نہ جانے کیسی ہو گئی۔

موٹر سائیکل بوس ریسٹوران کے سامنے پہنچ چکی تھی میں نے کہا "موٹر سائیکل روک دو رام سروپ" موٹر سائیکل رک گئی ہم دونوں ریسٹوران میں جاکر ٹیبل کے آمنے سامنے دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف پردہ پڑا ہوا تھا۔ نوکر چائے اور نمکین دے گیا۔

سروپ نے میرے چمن زار شباب کو بہار آفرین بنا دیا تھا۔ اسے اپنے سامنے دیکھکر میرا دل ایک عجیب کیف و سرور سے لبریز ہو رہا تھا، وہ تھا بھی ایسا بانکا خوبصورت نوجوان کہ کوئی لڑکی بھی موقع پاکر اسے پیار کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اسکی چوڑی کلائی۔ بھرے بھرے بازو۔ چوڑا چکلا سینہ۔ شاندار مردانہ آنکھیں ایسی نہیں تھیں جن کو میں صرف اس لئے سچ سمجھ لیتی کہ وہ میرے کارخانے میں پچیس روپے ماہوار کا معمولی نوکر تھا۔

میں نے بڑی خاطر سے سروپ کی طرف چائے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو سروپ پیو"

وہ بولا شیلا رانی۔ ایک ادنیٰ آدمی کو اتنا بڑھانے سے کیا فائدہ؟

میں نے کہا۔ تم مجھے اسطرح نہ کہو رام سروپ تم دنیا کے نزدیک چاہے جو کچھ ہو لیکن میں تمہیں جیسا سمجھتی ہوں اسے میرا دل جانتا ہے میں تو صاف صاف تمہارے لئے پتا جی سے کہوں گی۔ اگر میری بات نہ مانی گئی جب بھی کوئی مجھکو تم سے جدا نہیں کر سکتا۔

یہ سنکر سروپ کچھ متفکر سا ہو گیا۔

"تم فکرمند سے کیوں ہو گئے رام سروپ؟"

"میری تو شادی ہو گئی ہے شیلا رانی"

"اوہ! سروپ! تمہاری شادی ہو چکی ہے"

"ہاں کوئی چار سال ہوئے لیکن جس طرح باپ ماں من مانی شادی کر کے نوجوانوں کی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح میری زندگی بھی برباد ہے"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنی بیوی سے محبت نہیں کرتے"

"بالکل نہیں"

"پھر چھوڑ دو اسے"

"وہ چھوٹ کیسے سکتی ہے۔ جب سماج نے اسے میرے گلے باندھ دیا ہے؟"

"پھر؟"

"اسی لئے تو میں نے تم سے کہا کہ میری شادی ہو چکی ہے"

"لیکن اسوقت تو تم نے مجھے یہ بات نہیں بتائی جب پاگلوں کی طرح مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا؟ میری جوانی کے ساز کو چھیڑ کر اب تم اسے ٹھکرا دینا چاہتے ہو؟"

سروپ خاموش تھا

میں نے کہا۔ اچھا اٹھو چلو۔ اب دیر ہو رہی ہے اب دیر ہو رہی ہے۔ لیکن یاد رکھو اب تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے۔

گھر پہنچ کر میں سروپ کو لئے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی اور اسے اپنی بغل میں صوفے پر بٹھا کر بولی۔ رام سروپ، تم مجھے محبت نہیں کرتے

اس نے کہا۔ شیلا رانی! تم جیسی حسین اور موہنی لڑکی سے کون نوجوان محبت نہ کرے گا

میں نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا میں بھی تمہیں پیار کرتی ہوں رام سروپ اور جان دل سے۔

اس کے کوئی ایک مہینے کے بعد کا ذکر ہے میں اپنی کوٹھی کے لان میں ٹہل رہی تھی کہ ایک عورت میری طرف آتی دکھائی دی اسنے میرے پاس آکر پوچھا۔ "آپ ہی کا نام مس شیلا رانی ہے؟

میں نے کہا۔ ہاں۔ کہو کیا کہنا ہے؟

وہ بولی میں رام سروپ کی بیوی ہوں آپ سے ملنے آئی ہوں۔

اس کی آنکھوں سے غم و غصہ کا اظہار ہو رہا تھا

میں نے کہا۔ کہو کیا کام ہے؟

"آپ نے مجھ پر ڈاکہ ڈالا ہے اور میرے پتی کو مجھ سے چھین لیا ہے"

میں گھبرا اٹھی۔ نوکر چاکر ادھر ادھر کام کر رہے تھے۔ میں نے کہا آؤ اندر چلیں۔ اطمینان سے

بیٹھ کر بات چیت کریں۔

وہ اسی برہم لہجے میں بولی۔ چلئے جہاں کہئے میں چلنے کو تیار ہوں۔

اسے اپنے کمرے میں لیجا کر پانسو کے نوٹوں کی گڈی میں نے اس کے سامنے رکھ دی۔ کہا ولے یہ جاؤ۔ اور آرام سے زندگی گذارو۔ دو تم میرے شوہر کو مجھ سے پانسو روپے میں خریدنا چاہتی ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ کیا دنیا میں تمہیں اور کوئی پیار کرنیوالا مرد نہیں ملا؟ یا تمہیں مل سکتا جو ایک عورت کی زندگی برباد کرنے پر تلی ہو؟

میرے پاس اس سوال کا کیا جواب تھا؟ واقعی میرے لئے یہ کتنے شرم کی بات تھی لیکن میں کمبخت دل سے مجبور تھی۔ وہ ایک مرتبہ گمراہ ہو کر پھر راہ راست پر آنا نہیں چاہتا تھا۔ خاموشی کے سوا مجھ سے کچھ جواب بن نہ پڑا۔ وہ پھر کہنے لگی میں نہیں جانتی کہ تم میرے شوہر سے دلی محبت کرتی ہو یا ان کی جوانی اور خوبصورتی پر فریفتہ ہو گئی ہو۔ یاد رکھو۔ تمہاری جیسی ناتجربہ کار لڑکیاں اکثر نفس پرستی کو محبت سمجھ لیتی ہیں اور اسطرح خود بھی دھوکہ کھاتی ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی دھوکہ دیتی ہیں۔

وہ کہہ تو ٹھیک رہی تھی لیکن اسوقت مجھ میں ٹھیک کو ٹھیک سمجھنے اور سمجھ کر ماننے کی صلاحیت کہاں تھی؟

میں نے بگڑ کر کہا۔ دیکھو یہ پانسو کے نوٹ اب بھی تمہارے سامنے پڑے ہیں۔ اگر لینی ہو تو لے لو ورنہ چپ چاپ میری کوٹھی سے نکل جاؤ۔ ورنہ خبردار پھر ایسی باتیں زبان پر نہ لانا۔ رام سروپ میرا ادنیٰ سا نوکر ہے۔ اسکی مجال ہے جو میری طرف بری نگاہ سے دیکھے تم کس بنیاد پر آئی ہو میرے پاس اس طرح کی بکواس کرنے؟

مجھے یقین تھا کہ رام سروپ کبھی میرے راز کو فاش نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ اب وہ مجھے اندھا دھند محبت کرنے لگا تھا۔ اور جس طرح میں اسکی دیوانی ہو رہی تھی وہ بھی میرا دالہ و شیدا تھا۔ میں نے اسکی بیوی کو ڈانٹ کر کوٹھی سے نکال دیا۔ میں نے اسے کوٹھی سے واپس جاتے ہوئے دیکھا تھا اس کے غضب آلود چہرے پر ایک مایوسی سی چھا گئی۔ وہ میرے ہاں سے سیدھے جا کر ریلوے لائن پر لیٹ گئی اور ریل سے کٹ کر مر گئی۔

رام سروپ کی بیوی کا کہنا درست ثابت ہوا میں سروپ سے والہانہ محبت کرتی تھی میرا خیال تھا اس کے بغیر زندگی کا سارا لطف غارت ہو جائیگا میں اسکے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی لیکن میری محبت ریت کی دیوار ثابت ہوئی جسے میں محبت سمجھتی تھی واقعی وہ محبت نہ تھی۔ یہ حقیقت مجھ پر جب منکشف ہوئی جب میں نے شادی کر لی۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ اچھا تو آپ نے رام سروپ کو چھوڑ دیا۔ شادی کر لی!

شیلا رانی کہنے لگی۔ اب اسی شادی کا واقعہ سناتی ہوں نا مسٹر نرنجن اسی سال آئی سی ایس میں کامیاب ہوئے تھے۔ خاندانی رئیس تھے۔ دیکھنے میں بھی رام سروپ سے کم حسین اور خوبصورت نہ تھے وہ بڑے آدمی تھے میری جوڑ کے۔ ان سے رام سروپ کو کیا واسطہ، وہ سوٹ بوٹ میں رہتے تھے۔ اعلیٰ درجے کی کار پر چلتے تھے۔ شہر میں ان کی ایک خاص پوزیشن تھی۔ سروپ جیسے ان کے ہاں کتنے نوکر چاکر تھے میرے پتا جی نے ان کے ہاں شادی کا پیغام بھیجا اور کہلایا کہ وہ چاہیں تو آکر لڑکی کو دیکھ سکتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھنے آئے میں نے بھی ان کو دیکھا۔ میں سولہ کی میں ایک لڑکی تھی اٹھارہ سال کی عمر۔ عضو عضو سے شباب اُبل رہا تھا۔ رام سروپ نے میری جوانی کی کلی کو پھول بنا دیا تھا میں جامہ زیب بھی تھی۔ اس روز میں نے دل کھول کر بناؤ سنگھار کیا تھا خوش رنگ لباس اور قیمتی زیورول نے میرے حسن و جمال میں چار چاند لگا دیئے تھے مسٹر نرنجن مجھے دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئے اور میں بھی ان کو دیکھ کر رام سروپ کو بھول گئی مجھے اس کے تصور سے بھی نفرت ہونے لگی۔ کہاں میں اور کہاں سروپ میں نے یہ کیا کیا جو آنکھیں بند کر کے اندھے کوئیں میں کود پڑی۔ جس روز میری شادی ہوئی اسی روز رام سروپ نے بھی اسی جگہ ریل کی سڑک پر لیٹ کر جان دیدی جہاں اسکی بیوی ریل سے کٹ کر مری تھی۔

میں شہر کی ایک نہایت معزز اور شریف عورت خیال کی جاتی ہوں میری نیکدلی اور شرافت کی لوگ حاضر و غائب تعریف کرتے ہیں۔ مجھے جلسے اور سوسائٹیوں کی صدارت کرائی جاتی ہے میرے شوہر اس پر فخر کرتے ہیں کہ انہیں ایسی بیوی ملی جو حسن و صورت اور حسن سیرت دونوں کا مجموعہ ہے۔ ان بیچارے کو کیا معلوم کہ میں اپنے حسن کی قربان گاہ پر دو زندگیوں کو بھینٹ چڑھا چکی ہوں اور میری گردن پر ایک خاندان کی تباہی کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ لیکن میں نے تو اپنے سیاہ کارناموں کو نہیں بھلایا۔ میں بھلانا بھی چاہتی ہوں تو یہ کب ممکن ہے۔ رات اور دن کی تنہائیوں میں میرا ضمیر اکثر مجھے ملامت اور سرزنش کرتا رہتا ہے۔ لیکن آپ کو اپنی آپ بیتی سنانے کے بعد میری طبیعت کچھ ہلکی ہلکی سی محسوس

دُنیائے فلم کی تازہ ترین خبریں

...جیت۔ "دھیرج" ایک سوشل
...ہانی جسے چتربھج جوشی، سنیہہ پربھا
...شور لال اور خاتون کے ساتھ مل کر تیار
...رہے ہیں۔
...جولی آرٹ۔ "خاندان" سید امتیاز علی
...ج کی کہانی شوکت حسین صاحب کی
...رکشن میں تیار ہو رہی ہے۔
...بھات۔ 'کالی داس' زیر تیاری
...ے جسے والے، فتح، لال، اور نینا
...رکٹ کر رہے ہیں۔
...بئی ٹاکیز۔ 'جھولا' ڈائرکٹر ایس
...ی چیف کرداروں میں اشوک کمار
...لیلا چٹنس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں
...شنل اسٹوڈیوز۔ فلم "نردوش"

(بے گناہ) جس میں نلنی، جیونت اور
موکیش کام کر رہے ہیں۔ ڈائرکٹر ویریندر
ڈیسائی کی زیر ہدایت تکمیل کی منزلیں
طے کر رہی ہے۔ ان کی حسب ذیل نئی
فلمیں جلد ہی منصۂ شہود پر آنے والی
ہیں (۱) روٹی' (۲) غریب' (۳)
'وچے' (۴) سنت رائے داس'
(۵) لالہ جی'۔
شالی مار پکچرز۔ "ایک رات"
ایک ہنگامہ خیز سوشل فلم جس میں نینا
پرتھوی راج اور مبارک کام کر رہے ہیں۔
پیراموٹ فلم کمپنی۔ 'سرکودین'
ایک سنسنی خیز کہانی کو فلمایا جا رہا ہے۔
سرکو پروڈکشنز۔ "اپنا گھر" ڈائرکٹر

ڈی کے بوس، شانتا آپٹے اور چندر موہن
کے میل سے تیار کر رہے ہیں بھگت
ودر اور نئی دنیا' بھی زیر تیاری ہیں۔
مرلی پروڈکشنز۔ "پیاس" ڈائرکٹر
رام دریانی، سیتہ، پربھا، شمیم اور نذیر
کے ساتھ مل کر بنا رہے ہیں۔
فضلی برادرس۔ "معصوم" ڈائرکٹر
حسنین کے چیف کردار رمولا، مظہر خاں
اور انیس خاتون ہیں۔
بھارت پکچرز۔ "درپن" پریم، ادیب
اور سوبھنا سمرتھ کی مدد سے تیار ہو رہی ہے۔
سیلکٹ سیریل سپلائی۔ "گھر کی لاج"
وی کے ویاس کی اس سوشل فلم میں شانتا
سبلی کار کام کر رہی ہے۔

کوک شاستروں کا دادا

اس کتاب میں صرف کشمیر سے ۲۶ قسم کی عورتوں اور ۳۴ قسم کے مردوں کا حال ۱۳۰ فوٹو کی رنگین تصاویر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کیا ہے۔ شادی شدہ مردوں کیلئے ایک بیش قیمت خزانہ ہے جس کا ایک ایک راز لاکھ لاکھ روپے کو بھی سستا ہے۔ اس میں قدرتی امساک حاصل کرنے کی نادر اور بالکل آسان ترکیبیں نیز عورتوں کے متعلق سینکڑوں راز کی باتیں جن کے ظاہر کرنے کی قانون اجازت نہیں دیتا بکھلم کھلا ظاہر کر دی گئی ہیں۔

قیمت صرف ۱۵؍ (پندرہ آنے) مع محصول ڈاک۔ پتہ:۔ مست قلندر آفس۔ لاہور

جوتشی کے پاس مت جاؤ

آپ کی قسمت کا حال ہاتھ کی ہتھیلی پر لکھا ہے اسکو الف تا ی پڑھنے کا علم ہماری باتصویر کتاب "تقدیر کی تصویر" آپ کو گھر بیٹھے سکھائیگی۔ اپنی آئندہ قسمت کا حال جانکر آپ آنیوالی تکالیف اور مصیبتوں سے نجات حاصل کر کے اپنی جیون کو سکھی بنا سکتے ہیں جس پیشہ میں کامیاب ہونا آپکی قسمت میں لکھا ہے اس کو اختیار کر کے دنیا میں کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں ہر نمونہ اور ہر ٹائپ کی ہتھیلی کا نقشہ دیکر کتاب کو اتنا آسان بنا دیا گیا ہے کہ آپ پہلے ہی روز اپنی اور دوسروں کی قسمت کا حال بتا کر سینکڑوں روپیہ ماہوار کمانے لگینگے۔ قیمت صرف عہ مست قلندر آفس لاہور

سنیاسی کی کرامات

ہتھیلی پر سرسوں جما کر دیکھ لو!

ہمالہ کی جڑی بوٹیوں سے ایک تحفہ تسکین پلز تیار کیا گیا ہے جو کہ جادو کا اثر رکھتا ہے یہ تحفہ تمام سابقہ ادویات کو مات کر گیا۔ ہر قسم کی جسمانی کمزوری شرطیہ دور ہوگی۔ وزن کو بڑھائیگا۔ دودھ گھی خوب ہضم ہوگا۔ ویرج کے تمام نقائص جاتے رہینگے۔ موسم سرما میں ایک دفعہ کے استعمال سے جسم سال بھر جوان و توانا رہیگا۔ بوڑھوں کیلئے آب حیات ہے ایک دفعہ آزمائش کریں اور سچائی کی داد دیں۔ غلط ثابت ہونے پر قیمت واپس۔ صرف دو روپے آٹھ آنہ (۸؍۲) میں جوانی پھر سے حاصل کریں۔ سنیاسی آشرم، مہادیو مٹھ، کلو پنجاب

خالص سفید شہد ایک روپیہ (عہ) -/۱/۱ پونڈ

RS 300/-/-

تین صد روپیہ مُفت انعام

عمل محبت کیلئے شائقین ہمارا کالا جادو تعویذ منگالیں۔ اس کو اپنے پاس رکھ کر اپنے دل میں جس کسی کا نام لیں گے۔ خواہ وہ کیسا ہی پتھر دل مغرور اور سخت کلام کیوں نہ ہو۔ جہاں کہیں بھی ہوگا۔ آپ کے ملنے کے لئے تڑپنے لگ جائیگا۔ اور جب بھی آپ اس کے سامنے جائیں گے وہ آپ سے محبت کا اظہار کریگا۔ اور ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے کی خواہش کریگا نیز گمشدہ کی تلاش کرنا۔ کسی کے دل کا بھید معلوم کرنا۔ مردہ روحوں سے بات چیت کرنا۔ معشوق کو قبضہ میں کرنا۔ حسب مرضی روزگار حاصل کرنا۔ غرضیکہ آپکے ہر سوال کا جواب مل جائیگا۔ اور آپکے دل میں کوئی ایسی خواہش ہے جو کہ باوجود ہزار کوششوں کے بھی پوری نہیں ہوتی تو وہ بھی ہمارے کالا جادو تعویذ کے پاس رکھنے سے گنتی کے دنوں میں پوری ہو جائیگی۔ معاوضہ فی تعویذ صرف دو روپیہ آٹھ آنہ (۸؍۲) محصول ڈاک بالکل معاف۔ فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس ہوگی۔ (نوٹ):۔ غلط ثابت کرنیوالے کو تین صد روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔

ملنے کا پتہ

بنگال مسمریزم ہاؤس (M.K.L) ہوشیار پور شہر

مست قلندر ہندوستان بھر کے اردو رسائل سے زیادہ چھپتا ہے بہترین کو حق حاصل ہے کہ اس دعویٰ کی تصدیق کیلئے بعد میں اشتہار شائع کرائیں

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۵۸۵

تار کا پتہ "مستقلندر" لاہور

ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہاست

بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

جلد ۲۶ — نمبر ۴

مست قلندر

اردو — لاہور

سالنامہ — جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

اردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیر الاشاعت ماہوار رسالہ

ان زندہ دل انسانوں کیلئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کر لیا ہے۔ ہمیشہ خوش رہنے اور دوسروں کو خوش کرنے میں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے قول یا فعل سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے جن کا مذہب ہے خدا کے ہر ایک بندے سے بلا امتیاز رنگ و قومیت محبت کرنا

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

ایڈیٹر ڈاکٹر پرتھی سنگھ

سالانہ چندہ تین روپے

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ڈاکٹر پرتھی سنگھ پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر رسالہ مست قلندر وشنولین گوالمنڈی لاہور سے شائع ہوا

سالنامہ مست قلندر ۱۹۴۲ء

فہرست مضامین

شمار نمبر	مضمون		اثر خامہ	صفحہ
۱	نگاہ اولیں		ادارہ	۳
۲	ایڈیٹر مست قلندر کا سرمایۂ حیات		ادارہ	۴
۳	مبہم حیات	(نظم)	جناب راز ہاشمی	۵
۴	کلی	(افسانہ)	جناب علی عباس حسینی ایم اے	۶
۵	گلکدہ اقوال		جناب کوثر قریشی	۹
۶	ملکۂ حسن مس نسیم کی گھریلو زندگی		ادارہ	۱۰
۷	ہندوستانی سنیاسیوں کے جگر پارے		"	۱۲
۸	ہم دونوں	(افسانہ)	جناب مسعود جاوید	۱۳
۹	کسی کا رقعہ اس دیکھ کر	(نظم)	مسعود جاوید	۱۴
۱۰	حسینہ اور آئینہ	(نظم)	جناب اندر جیت شرما	۱۷
۱۱	میرے پسندیدہ اشعار		جناب نکہت باندہ	۲۳
۱۲	اپنا ڈورا ڈھکن		ادارہ	۲۷
۱۳	سودیشی نمائش کی ایک شام	(نظم)	جناب سردار جلیل شیر کوٹی	۲۹
۱۴	سماج کی آنکھیں	(افسانہ)	جناب اے۔ آر جرنلسٹ	۳۱
۱۵	مستی و قلندری		جناب حاجی بغلول	۳۵
۱۶	مسافر	(نظم)	جناب ساغر چشتی احسینی	۳۸
۱۷	چھلکے والی کی سرگذشت		محترمہ للتا بائی	۴۱
۱۸	قطعات		جناب راز ہاشمی امروہوی	۴۳
۱۹	جام شراب پی جا	(نظم)	جناب کوثر قریشی میرٹھی	۴۵
۲۰	عورتیں حسین و خوبصورت کیونکر بن سکتی ہیں		ادارہ	۴۶
۲۱	کسی فراموش کار کے حضور میں	(نظم)	جناب امین رضوی	۵۷
۲۲	چاہت	(افسانہ)	جناب ربط ہاشمی	۵۹
۲۳	شعرائے مست قلندر		مختلف حضرات	۶۳
۲۴	زخموں کے بعد پھول	(افسانہ)	جناب ماہر القادری	۶۵
۲۵	انہیں رخصت کرتے ہوئے	(نظم)	جناب راز ہاشمی	۷۱
۲۶	حشر اٹھاتے ہوئے	(نظم)	جناب ماہر القادری	۷۱
۲۷	میری ازدواجی زندگی کے آٹھ دور		جناب سروپ بی اے	۷۲
۲۸	مختصر جذبات	(نظم)	جناب معین عثمان بلودی	۷۶
۲۹	محبت کی نیرنگیاں	(افسانہ)	محترمہ راجکماری بی اے	۸۰
۳۰	ایک رات ایک بات	(افسانہ)	جناب سید کاظم دہلوی	۸۷
۳۱		(نظم)	جناب اندر جیت شرما	۸۸
۳۲	جب میں جوان تھی	(افسانہ)	جناب ماہر القادری	۹۹
۳۳	فلمی سوال و جواب		ادارہ	۱۱۳
۳۴	میری زندگی کا سب سے عجیب واقعہ		جناب نور الہدیٰ ضبط	۱۱۵

نگاہِ اولیں

"مست قلندر کے ہزاروں لاکھوں چاہنے والوں کو سالِ نو مبارک ہو"

اس نوید جانفزا کے ساتھ ہم سالنامہ ۱۹۴۲ء کو ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں سالنامہ ۱۹۴۲ء کی ترتیب و تدوین میں ہمیں کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا؟ یہ بیان کرنا لاحاصل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بقول شاعر

کام اچھا کوئی بھی بن آیا گر انسان سے
اس میں کی تاخیر اس نے جسقدر اچھا کیا
کیوں کیا کیسے کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ یہ ہیں دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

خونِ دل سے سینچ سینچ کر باغِ حسن کے جس سدا بہار پھول کو ہم نے پروان چڑھایا ہے آپکی نگاہ حقیقت شناس اُسے کیا سمجھتی ہے؟ اگر سالنامہ ۱۹۴۲ء کو ایک نظر دیکھ کر آپکے دل نے بے اختیار کہدیا کہ

بس مل گئی وہ چیز کہ جسکی تلاش تھی
اب اور کوئی تحفہ کی حسرت نہیں رہی

تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنت کا صلہ ہمیں مل گیا۔

سال ۴۲ء اور ہماری مشکلات

عالمگیر جنگ کی طوالت نے 'کاغذ' کو بالکل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور کردیا ہے۔ اس گرانی نے ہندوستان کے طول و عرض میں بڑے بڑے اخبارات اور رسائل کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔ یہاں تک کہ السٹریٹڈ ویکلی اور اسٹیٹسمین جیسے چوٹی کے اخبارات بھی اپنا سائز چھوٹا، صفحات کم، اور اشاعت گھٹانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کاغذ کی جو مشکل دوسروں کی پریشانی کا باعث ہورہی ہے وہی مست قلندر کو بھی درپیش ہے۔

ہم کیا نہیں چاہتے اور کیا چاہتے ہیں

ہم نہیں چاہتے کہ مست قلندر کا حجم اور سائز چھوٹا کیا جائے یا اشاعت گھٹا دی جائے بلکہ ہماری دلی خواہش ہے کہ آپکا پیارا مست قلندر آسمان ادب پر مہر نیم روز کی صورت اسی طرح چمکتا رہے جس طرح کہ اب تک چمکتا رہا ہے۔ اسکی اشاعت اور بھی بڑھے۔ یہ ہر ماہ کی یکم کو پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہے اور اس کی خوبیوں اور دلکشیوں میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے۔

یہ سب کچھ ممکن ہے بشرطیکہ

مست قلندر کیلئے کاغذ اسٹاک کرلیا جائے

اتفاق سے ایک شخص کے پاس تیس ہزار روپیہ کا کاغذ سستے داموں مل رہا ہے۔ اگر وہ سب کا سب کاغذ ۳۱ جنوری تک اٹھالیا جائے تو ہم کافی مدت کیلئے کاغذ کی ضرورت سے بے نیاز ہوسکتے ہیں اور آپکا مست قلندر ترقی کے میدان میں زیادہ جوش اور مستعدی کے ساتھ دوڑ سکتا ہے۔ یہ کام کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ

آپ تہ دل سے ہمارے ساتھ تعاون کریں

آپ کی ذرا سی توجہ، ایک ادنیٰ سی قربانی اور خفیف سا ایثار اگر اس وقت آڑے آئے تو گنتی کے دنوں میں تیس ہزار روپیہ فراہم ہو سکتا ہے۔ آپ کو کیا کرنا ہوگا؟ کچھ نہیں صرف سال ۴۳ء کا چندہ تین روپے پیشگی جمع کرادیجئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر مست قلندر کا ہر ایک کرمفرما ایک سال کا چندہ دفتر میں پیشگی روانہ کردے تو تیس ہزار روپے کی رقم فوراً جمع ہوسکتی ہے۔

ایڈیٹر مست قلندر کے بیش قیمت راز

یہ تو آپ کو علم ہی ہے کہ ایڈیٹر مست قلندر کی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصہ سادھو سنیاسیوں اور کامل فقیروں کی صحبت میں بسر ہوا ہے۔ اسی پرچہ میں کسی دوسری جگہ ان سربمہر رازوں کی تفصیل شائع کی جارہی ہے جو ایڈیٹر مست قلندر کا سرمایۂ حیات ہیں۔

—— مست قلندر کے کرمفرما اگلے سال کا چندہ ۳۱ جنوری ۴۲ء سے قبل روانہ کرکے اگر چاہیں تو کسی ایک راز سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ زندگی کے وہ رازہائے سربستہ جن کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا عام حالتوں میں کوئی شخص اپنے سے جدا کرنا گوارا نہیں کرسکتا لیکن مست قلندر کی ترقی اور بہبودی کے پیش نظر ہمیں سب کچھ منظور ہے

افسانہ نمبر اور سالنامہ کے انعامات

کا فیصلہ ناظرین کرام پر چھوڑ دیا گیا ہے آپ لکھیے کہ آپکی رائے میں افسانہ نمبر اور سالنامہ کے دو بہترین افسانے، دو منظوم افسانے اور دو چوٹی کی نظمیں کون کون ہیں۔ انعامات کی تقسیم ووٹوں کے ذریعہ ہوگی۔ جنوری کا سالنامہ بہت لیٹ ہوگیا۔ اس کیلئے ہم معذرت خواہ ہیں لیکن فروری کا پرچہ ٹھیک وقت پر نکل آئیگا کیونکہ اس کی طباعت دو ایکشن میں شروع ہونے والی ہے سالنامہ کے بعض ضروری مضامین جگہ کی قلت کے باعث چھپنے سے رہ گئے تھے وہ سب کے سب فروری نمبر میں جارہے ہیں۔

(ادارہ)

بالکل مفت

ایڈیٹر مست قلندر کا سرمایۂ حیات

مفت

دلدادگانِ مست قلندر کیلئے ایک سنہرا موقع۔ تیس ہزار روپیہ کی فراہمی کیلئے یہ نادر روزگار ترکیبیں جن کا بدل بیش قیمت ہیرے اور جواہرات بھی نہیں ہوسکتے۔ بالکل مُفت سکھلانے کی دعوت عام۔

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

صرف مستقل خریداران مست قلندر ہی ان رازوں سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ غیر خریدار درخواست بھیجنے کی زحمت نہ کریں کیونکہ ان کو کسی قیمت پر یہ راز نہیں سکھائے جائینگے۔

پہلا راز۔ ایک معمولی ترکیب ہے جس کا تعلق علم روحانیت سے ہے۔ چند منٹوں میں سیکھی جاسکتی ہے۔ کوئی مذہبی قید یا پابندی نہیں۔ اس کی مدد سے اپنی کسی آنے والی مصیبت یا اچھی بات متعلقہ ترقی و خوشحالی کا علم قبل از وقت ہو جاتا ہے۔ کسی فلسفی نے کہا تھا کہ اگر انسان کو اپنی آنے والی زندگی کا حال پہلے ہی معلوم ہو جایا کرے تو اس میں شک نہیں کہ پیش بندی کرکے وہ بہت سے مصائب اور تکالیف کا قلع قمع کرسکتا ہے۔ یا جس کام کو کرنے سے اُسے نفع پہنچتا ہو اس کو اختیار کرکے وہ دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرسکتا ہے۔

دُوسرا راز۔ نسوانی خوبصورتی سے متعلق ہے۔ یہ بھی ایک سائنٹیفک ترکیب ہے جس کی مدد سے جسم کے کسی حصہ خصوصاً چہرہ پر کی جھُریاں غائب ہو جاتی ہیں اور ۴۰، ۴۵ سال کی بڈھی عورت ۱۵، ۲۰ سال کی دوشیزہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسکے جسمانی اعضاء میں مثل نوخیز دوشیزہ کے ملائمت پیدا ہو جاتی ہے اور ڈھیلا پن غائب۔ الغرض وہ پھر سے جوان بن جاتی ہے۔

تیسرا راز۔ ایک قسم کا عرق ہے جو بطور خضاب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے بال چند ہی دنوں میں سیاہ ہو جاتے اور جڑ سے کالے نکلنے لگتے ہیں۔ جن صاحب جن سے یہ نسخہ حاصل کیا گیا تھا ابھی تک بقید حیات ہیں اور اسی سال کی عمر میں بھی انکے سر اور داڑھی کے بال بالکل سیاہ ہیں۔

چوتھا راز۔ ایک سبزی جو خاص موسم میں عام گھروں میں پکائی جاتی ہے اس کا عرق ہے۔ اس کو ایک خاص ترکیب سے روزانہ استعمال کرنے سے کھوئی ہوئی جوانی واپس لوٹ آتی ہے۔ یہاں تک کہ طاقت ضبط جواب دینے لگتی ہے۔ زیادہ تعریف فضول۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کی حاجت نہیں۔ یہ دوا اپنے منہ سے بولے گی کہ میں کیا ہوں؟

پانچواں راز۔ ایک ارزاں ترین اور بالکل حقیر چیز جو دیہاتی پنساریوں کے یہاں بھی بافراط اور ہر وقت مل سکتی ہے۔ بالکل مُفرد دوا مگر مختلف چیزوں کے میل سے استعمال کرنے پر سرتا پا انسان کی ۲۷ بیماریوں کا حکمی علاج ہے۔

سیکھنے کیلئے حسب ذیل درخواست لکھیئے بھیجئے!

درخواست

جناب ایڈیٹر صاحب مست قلندر لاہور۔ تسلیم۔

میں مست قلندر کا پرانا خریدار ہوں اور میرا چیٹ نمبر .... ہے۔ آپکی اپیل دربارہ خرید کاغذ برائے مست قلندر میری نظر سے گذری۔ میں بڑی خوشی سے اپنا ایک سال کا چندہ تین روپیہ بطور پیشگی بذریعہ منی آرڈر روانہ کر رہا ہوں۔ اسے میرے حساب میں جمع کرکے راز نمبر .... میرے پتہ سے بذریعہ ڈاک روانہ کردیجئے۔ میں وعدہ حتمی کرتا ہوں کہ اسے کسی پر ظاہر نہ کرونگا۔ نہ ہی مشتہر کرکے ناجائز فائدہ اُٹھاؤنگا۔ فقط

دستخط

پورا پتہ

نوٹ:۔ ایک سے زیادہ جتنے راز آپ سیکھنا چاہیں اتنی ہی خریداروں کے نام معہ مبلغات اپنی درخواست کے ہمراہ بھجوا دیجئے گا۔

جلد ۲۶ رسالہ مست قلندر لاہور سالنامہ نمبر ۴

خاص سالنامہ مست قلندر کے لئے

تبسم حیات

از جناب راز ہاشمی امروہوی

کوئی چاندنی دل پہ چھانے لگی ہے
مری زندگی مسکرانے لگی ہے

(۱)

نگاہیں نگاہوں سے شرما رہی ہیں
خیالوں پہ رنگینیاں چھا رہی ہیں!
نئی حسرتیں دل کو تڑپا رہی ہیں!
کوئی بات پھر یاد آنے لگی ہے
مری زندگی مسکرانے لگی ہے

(۲)

اُن آنکھوں نے چھیڑی ہے پھر اک کہانی
اُن آنکھوں نے بخشی ہے پھر زندگانی
ستم اے محبت، ستم اے جوانی
نظر دادِ نظارہ پانے لگی ہے
مری زندگی مسکرانے لگی ہے

(۳)

ستاروں سے کہدیں کہ نظریں جھکالیں
دو عالم سے کہدو کہ دامن بچالیں
بہاریں عنانِ تحمل سنبھالیں!
کہ روحِ جواں گنگنانے لگی ہے
مری زندگی مسکرانے لگی ہے

(۴)

فضا رقص کُن ہو، ہوا نغمہ زن ہو
ہر اک ذرہ رشکِ بہارِ چمن ہو
نہ اب رخنہ انداز چرخِ کہن ہو
کہ تقدیر مجھ کو منانے لگی ہے
مری زندگی مسکرانے لگی ہے

(۵)

نہ بلبل بہارِ تبسم چرائے؛
نہ بُو پھول کے پیرہن میں سمائے!
نہ رنگِ سحر دور سے جھلملائے؛
کہ فطرت نئے گل کھلانے لگی ہے
مری زندگی مسکرانے لگی ہے

(۶)

اُن آنکھوں کا ساغر چھلکنے کو ہے اب
مشامِ محبت مہکنے کو ہے اب
مری رازِ دنیا بہکنے کو ہے اب
انہیں میری آغوش پانے لگی ہے
مری زندگی مسکرانے لگی ہے

کلی

از جناب علی عباس حسینی ایم۔ اے

خاص سالنامہ مست قلندر کیلئے

"شیلا کیا کر رہی ہے، ذرا میری طرف تو دیکھ" رمولا نے چھوٹی بہن سے کچھ سوچتے سوچتے کہا۔

"کیا کہتی ہو دیدی؟" شیلا نے پوچھا، مگر نظریں جھکی ہی رہیں اور ساری کا پلو ہلنے لگا۔

"کیا کہا تھا تجھ سے اس دن تیرے جیجا نے؟" رمولا نے تیز نظروں سے شیلا کے چہرے کو دیکھ کے پوچھا۔

شیلا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "کس دن؟" جیسے وہ اس دن کو چھپا یا بھلا ڈالنا چاہتی ہے جس کی یاد اس کی آواز میں لرزش پیدا کر رہی تھی اور اسے بہن سے آنکھیں ملانے سے روک رہی تھی۔

رمولا نے "ہوں" کہا اور دل ہی دل میں سوچنے لگی، تو کئی دن ایسے گزر چکے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ اسے یاد رہے لیکن شیلا ایسی نہیں کہ مجھ سے چھپاتی۔ وہ جانتی ہے میں اس پر اپنی جان چھڑکتی ہوں۔ ممکن ہے مجھے جھوٹ ہی شبہ ہوا پھر بھی اندر سے کسی نے کرید کے سوال کرنے پر مجبور ہی کیا۔

"ارے میں پرسوں شام کے بارے میں پوچھ رہی ہوں، جب وہ تجھے "فلیٹ" پر سے اصرار کر کے اپنے ساتھ جھیل میں بوٹنگ کیلئے لے گئے تھے" لیکن اب اس کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ بہن سے ایسی باتوں کے بارے میں سوال کرنے میں ایک خفت سی محسوس کر رہی ہے۔

شیلا نے نیچی گردن کر کے کہا "کچھ بھی تو نہیں...... مجھے یاد نہیں" مگر انکار کا انداز ایسا تھا کہ رمولا کو پھر شبہ سا پیدا ہو گیا، اگر کوئی بات نہ تھی تو شیلا آنکھیں ملانے سے کیوں گھبراتی ہے۔ کان میں جو بھنک پڑی تھی وہ کہیں سچ تو نہیں۔ سوامی سے تو کسی بات کا تعجب نہیں، تین سال کے ساتھ میں ان کے سارے گن دیکھ لئے تھے۔ مگر شیلا، انیلی، بھولی، جسے اپنی بچی کی طرح پالا، وہ ان کی باتوں میں آ جائے، بڑے اچنبھے کی بات ہوگی۔

وہ سمجھانے والے لہجے میں بولی "شیلا میں نے تجھ کو گودیوں میں کھلایا ہے میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں، تو مجھ سے جھوٹ بول کے کہاں جا سکتی ہے؟"

شیلا نے اپنی بات پر اصرار کیا "تو میں جھوٹ کہاں بول رہی ہوں دیدی۔؟ مجھے یاد نہیں!"

رمولا مسکرائی "اچھا تو میری طرف دیکھ" شیلا نے اب بھی سر جھکا ہی رکھا۔ رمولا نے ہاتھ بڑھا کے شیلا کا سر اٹھایا اور اسے اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کرتے ہوئے کہا "ہاں اب تو کہہ!"

شیلا کا چہرہ ایکبار سرخ ہو گیا۔ اس نے زبان ہونٹ پر پھرائی۔ وہ کانپتی ہوئی آواز سے بولی۔

"سچ کہتی ہوں دیدی، مجھے یاد...... کہا تھا تو ایک کلی ہے"

اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ رمولا تھوڑی دیر اس کے سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی — مگر چال میں ایسی لڑکھڑاہٹ تھی جیسے برسوں کی بیماری کے بعد پلنگ سے اٹھی ہو۔

~~~~~~~~~~~~~~~~

نینی تال میں جو کانٹا دل میں چبھا تھا وہ لکھنؤ آنے پر بھی نکل نہ سکا۔ وہ ٹوٹ کے کھٹکتا ہی رہا۔ ایک دن شیلا کے کالج سے مقررہ وقت پر نہ پلٹنے اور چراغ جلے آنے نے اس میں ٹیک پیدا کر دی۔

ڈرائنگ روم میں شیلا کے بیٹھتے ہی رمولا نے کوچ پر پہلو بدل کے پوچھا "آج تم اتنی دیر کر کے کالج سے کیسے پلٹیں؟"

"جی جم خانہ کلب ٹینس کا میچ دیکھنے چلی گئی تھی" شیلا نے ناول سے نظریں نہ ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"اکیلی گئی تھیں کہ کوئی اور بھی ساتھ تھا؟" رمولا نے پوچھا۔

"نہیں اور لڑکیاں ساتھ تھیں" شیلا نے سوال کے عام ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اور مردوں میں کوئی نہ تھا؟" رمولا نے عادت کے خلاف کرخت آواز میں پوچھا۔ شیلا نے بہن کی آواز میں غصہ اور حسد کی جھنکار کو محسوس کیا۔ اس کے دل میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی قبول کرنا ہی پڑا۔ "جیجا جی تھے" اور اس کے چہرے
~~~~~~~~~~~~~~~~

پر ایک ہلکی زردی سی پھیلنے لگی۔

"وہ کیا تم کو کالج تک لینے گئے تھے یا جم خانے ہی میں ملے؟" رمولا نے بالکل اس وکیل سرکار کے انداز سے پوچھا جو دل میں ٹھان چکا ہو کہ مجرم سے سچ سچ بات بغیر کہلائے وہ دم نہ لے گا۔

"نہیں وہ لینے گئے تھے" شیلا نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے چہرے پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے جھلک آئے۔

"ہوں! تو تم نے کہا نہیں کہ گھر پہ خبر کر کے، منہ ہاتھ دھو کے، چاء پی کے جاؤنگی!" رمولا نے پھر کریدا۔

"کہا تو پر وہ نہ مانے! وہیں کلب گھر میں منہ ہاتھ دھو کر چاء پی لی۔" اس نے معذرت مانگتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا تو اب باہر کھانا پینا بھی شروع ہوگیا!" ــــ رمولا بول اٹھی لیکن یہ مذہبی اظہار تنفر نہ تھا بلکہ ڈاہ کی ایک بیساختہ چیخ تھی۔

شیلا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ نظر کتاب ہی پر جمائے رہی۔ رمولا نے کوچ پر پہلو بدلا۔ کچھ دیر وہ اپنی حنائی انگلیوں سے اپنے عنابی لب دباتی اور آہستہ آہستہ نوچتی رہی۔ پھر بولی۔

"کیوں شیلا موٹر میں تو تم دونوں اکیلے ہی تھے نا؟"

"جی ہاں!" شیلا نے کہا اور اس نے کتاب کو اس طرح قریب کر لیا جیسے وہ بہن کو منہ نہیں دکھانا چاہتی۔

رمولا نے اپنے چھوٹے ریشمی رومال کو گیند بناتے ہوئے پوچھا "تو اب کے انہوں نے کیا خاص بات کہی؟"

شیلا نے کتاب سے منہ چھپاتے ہوئے بیٹھی ہوئی آواز سے کہا "دہی کلی کہکے پکارا تھا۔"

رمولا کی تسکین نہیں ہوئی۔ اس نے شیر پنجہ مارا "اور کچھ؟"

شیلا نے اپنے کو کرسی سے بہن کے پاؤں کے پاس گراتے ہوئے کہا "میں نردوش ہوں دیدی! میں بالکل بے قصور ہوں! مجھ پر شک نہ کیجئے!" رمولا اس کے سر کے بالوں سے خاموش کھیلتی رہی، اور اس کی آنکھوں سے آنسو کی دو گرم گرم بوندیں بہن کے جھکے ہوئے سر پر ٹپ ٹپ ٹپک پڑیں۔

~~~~~~

"میں کہتی ہوں تم کو شیلا سے ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی؟" رمولا نے شکار پر جاتے ہوئے سوامی سے دوسرے دن پوچھا۔

"کیسی باتیں؟" اس نے شرارت سے انجان بن کر پوچھا۔

"یہی اسکو 'کلی' کہہ کر پکارنا۔" رمولا نے جھلا کے جواب دیا۔

وہ ہنسنے لگا۔ دیر تک ہنستا رہا۔ ہاتھ میں جو بید تھا اس سے بار بار "برجز" میں چھپی ہوئی پنڈلیوں کو مارتا رہا اور قہقہے لگاتا رہا۔ رمولا اس کو گھورنے لگی۔ گھورتی رہی۔ پر اس نہ ختم ہونے والی ہنسی سے ہار کر اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ اسے تجربے نے بتا دیا تھا کہ اس قہقہے کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت اس کا شوہر ہر طرح کی شرارت، بدمعاشی اور پاجی پن کے لئے تیار ہے۔ وہ اس رنگ میں ہے کہ اس کے لئے ہزاروں دلوں کا پامال کرنا اور لاکھوں لاشوں کو کچل ڈالنا کھیل ہے۔ رمولا کے دل میں اس ہنسی نے جھنجھلاہٹ سے غصہ، غصہ سے ڈر، ڈر سے نفرت میں بدلنے والے جذبات کی ایک زنجیر جوڑ کر تیار کر دی

اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ قہقہوں کا سلسلہ دفعتہً رک گیا۔ جیسے کسی نے نل سے ٹھرا انڈیلتے انڈیلتے دفعتہً کاگ لگا دی ہو۔ وہ بولا۔

"تو کیا وہ کلی نہیں، تمہاری طرح پکا ہوا پھول ہے؟"

رمولا نے چوٹ سے تلملا کر کہا۔ "پر وہ میری بہن ہے!"

وہ ہنستا ہوا کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکنے اور سیٹی بجانے لگا۔ جیسے اسے موضوع بحث کی اہمیت کا احساس ہی نہیں۔ وہ رمولا کی طرف پشت کئے بولا۔

"ہاں ہے تو تمہاری بہن، پر تمہار ہوتے ہوئے بھی تو وہ میری دھرم پتنی بن سکتی ہے"

"تو تم میری شیلا کو میری ہی سوکن بنانا چاہتے ہو؟" رمولا نے احتجاج کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے پلٹ کر رمولا کو سر سے پاؤں تک دیکھا وہ ہنسنے اور اپنی پنڈلیوں پر بید مارنے لگا پھر رک کے بولا۔ "ہاں اس میں بڑا فائدہ ہے، تم دونوں ایک دوسرے کو اتنا چاہتی ہو کہ سوکن ہونے پر بھی آپس میں لڑ ہی نہیں سکتیں!"

"پر شیلا کی زندگی کیوں برباد کرو؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

وہ پھر ہنسنے لگا "اس نے میرا کیا بگاڑا ہے پوچھتی ہو؟ اس نے سب کچھ بگاڑا ہے! اس نے میرے دل کو بالکل اس بندر کے دل جیسا بنا رکھا ہے جو پکے، رس بھرے آم کے پیڑ کے تنے میں موٹی زنجیر سے باندھ دیا جائے! وہ بھولی ہے، الہڑ ہے، تازہ ہے! اور جب میں اس کو دیکھتا ہوں تو میرے منہ میں پانی بھر آتا ہے!"

پھر قہقہوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بید کی "پٹ پٹ" پنڈلیوں پر جاری ہوگئی۔

رمولا نے زخمی ناگن کی طرح پھنکاری ماری۔ "مگر میں اس کی رکھوالی کر رہی ہوں!"
~~~~~~

وہ اسقدر ہنسا کہ اسکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ وہ انہیں پونچھتے ہوئے بولا "تم کیا رکھوالی کرو گی! زمین پر گرا' ڈھلا ہوا پھل پکتے ہوئے آم کی کیا رکھوالی کریگا؟ پھر اس سمے جبکہ اسکو نیچے گرانے والا ہاتھ اس کی طرف بڑھ چکا ہو!"

رمولا نے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس کی، لیکن نہ ہارنے والے انداز میں کہا "میں شیلا کو بتا دوں گی کہ تم کیسے آدمی ہو!"

وہ ہنسنے لگا "تم اگر ایسا کرو تو میرا کام ہی بن جائے۔ ہر عورت اپنے کو دوسری سے زیادہ مردشناس سمجھتی ہے۔ شیلا تمہاری بہن ہے تو کیا، پر یہی کمزوری اس میں بھی ہے۔ تم نے جہاں میری برائی کی اور اسکی بھڑک نکلی' اور پھر!!" اس نے قہقہہ لگایا "مگر ابھی وہ بری طرح بھڑکتی ہے ابھی کل ہی دیکھو جب ہم کلب سے چل کے گومتی کنارے ٹہل رہے تھے تو اس کا پلوں اونچا نیچا پڑ گیا اور وہ ساری میں الجھ کر گرنے والی ہی تھی کہ میں نے ـــــ" واقعہ کی یاد میں ایسا لطف آیا کہ قہقہہ بیساختہ نکلا ـــ "اس کی بغل کے پاس ہاتھ لگا دیا۔ پھر تو اس طرح ہاتھ جھٹک کر بھاگی جیسے دیہاتی گائے کسی کو سوٹ ہیٹ میں دیکھ کر بھاگتی ہے' یا ہرنی شکاری کی بندوق کی نال کی چمک دور ہی سے دیکھ کر چوکڑیاں بھرنے لگتی ہے ـــ" اپنی تشبیہوں پر خود خوش ہو کر پھر ہنسا "پر میں اس کا رم کرنا چھڑا کے اور اسے رام کر کے ہی رہوں گا۔"

رمولا نے بحث میں ہارنے والے کی طرح جھنجھلا کے پھر سوال دہرایا "پر یہ میری بہن ہی کیوں چنی گئی؟"

وہ بولا "اس لئے کہ وہ سندر ہے اور ـــ اور مجھے اس سے پریم ہے!"

رمولا چیخ اٹھی "پریم! پریم کو تم سے کیا مطلب؟ تم اگر کسی سے پریم کر سکتے ہو تو بس اپنے آپ سے!"

وہ کھلکھلا کر ہنسا اور کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولا "ہاں یہ تو سچ ہے پر ابھی کچھ دنوں تک تو میں اس کلی ہی سے پریم کرتا رہونگا!"

رمولا سوتے سے جاگ اٹھی۔ کمرے میں تاریکی تھی، باہر بھی گھپ اندھیرا تھا، رات سائیں سائیں کر رہی تھی مگر بغل میں جو شیلا کا کمرہ تھا وہاں سے کچھ بھنبھناہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے کان لگا کر سننا شروع کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"کلی! کلی! کہنا مانو!"

رمولا گھبرائی۔ آہستگی سے مسہری پر اٹھ بیٹھی شیلا کا جواب سنائی دیا۔

"نہیں، نہیں، نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا! میں دیدی کو کیا منہ دکھاؤں گی؟"

رمولا کے دل میں محبت کا سوتا پھوٹ نکلا، شیلا کو ایسے میں بھی اس کا خیال ہے۔

سوامی نے گڑگڑا کے کچھ کہا۔

شیلا بولی "ہاں، ہاں، مجھے پریم ہے، پر اس کے کارن میں اپنی دیدی کی سوکن تو نہیں بن سکتی' ایسا کرنے سے تو اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ کے مر جانا بہتر ہے۔"

سوامی کچھ اور کہہ رہے تھے۔ رمولا نے سوچا شیلا اپنا کام کر چکی، میرے لئے اپنی محبت ثابت کر چکی، اب مجھے اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔ وہ ایک بار کھانسنے لگی۔ اس نے مسہری کے سرہانے دیوار پر لگا ہوا بجلی کا بٹن دبا کر کمرے میں روشنی کر دی۔ پھر اس طرح اپنی میز کی چیزیں وہ الٹنے پلٹنے لگی کہ اس کے جاگنے کی خبر دوسرے کمرے میں ہو جائے۔ پھر ہرن کھری کا جوتا پہن کر کھٹ کھٹ کرتی شیلا کے کمرے کی طرف چلی۔ دونوں کمروں کے درمیان جو دروازہ تھا اس کے پاس آ کر آہٹ لینے لگی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے شیلا کے کمرے سے نکل کر باہر کا دروازہ آہستہ سے بند کر لیا۔ اب اس نے آواز دی "شیلا! شیلا!" کوئی جواب نہ ملا۔ رمولا نے دروازہ کھولا، کمرے میں داخل ہو کر بجلی کا بٹن دبایا۔ سارے کمرے میں اجالا ہو گیا۔ شیلا چادر اوڑھے بے خبر سوتی دکھائی دی۔ رمولا ذرا سا مسکرائی اور شیلا کے سرہانے جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے جھک کر بہن کے چہرے کو دیکھا۔ پلکیں بھیگی ہوئی نظر آئیں مہر خواہری نے زور مارا۔ اس نے جوتے اتارے اور بہن کے ساتھ پلنگ پر لیٹ کر اسے کلیجہ میں بھر لیا۔ شیلا نے تصنع سے چونک کر آنکھ کھولی "دیدی" کہا اور کروٹ لیکے گردن میں باہیں ڈال دیں۔ رمولا نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "میں تیری ساری باتیں سن رہی تھی" گلے میں پڑی ہوئی باہیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ رمولا نے اپنی گرفت اور مضبوط کر لی "ارے نادان بہن سے یہ باتیں کہیں چھپائی جا سکتی ہیں" سر کلیجہ میں دھنسا دیا گیا۔ رمولا نے رک رک کر کہا۔ "تو جانتی ہے کہ میں تجھ کو اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں" شیلا نے سسکی لیکر کہا "دیدی!"

رمولا نے گرفت ڈھیلی کی اور ایک تکیہ کھینچ کر بائیں کہنی کے نیچے رکھا۔ پھر اور کھسک کر ہاتھ پر سر رکھ کر بہن کے چہرے پر نگاہیں جما کر پوچھا "تجھے ان سے پریم ہے؟"

شیلا نے کوئی جواب نہ دیا لیکن رمولا یہ محسوس کرنے لگی کہ اس کے قلب کی حرکت تیز ہو گئی وہ اصرار کر کے بولی "ارے بول پگلی! وہ تو مجھ سے اقرار کر چکے ہیں کہ وہ تجھ سے پریم کرتے ہیں۔ پر مجھے تیری فکر ہے۔ تو بتا کہ کیا تو بھی ان سے پریم کرتی ہے؟ .... بتا شیلا!"

شیلا کانپنے لگی۔ اس نے بہن کے سینے سے لگے ہوئے چہرے کو بہن ہی کی ساری کے پلو سے چھپا کے آہستہ سے کہا "ہاں!"

رمولا اس طرح مسکرائی جس طرح بہادر سینے پر گولی کھا کر مسکراتے ہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ بہن کی پیٹھ تھپک کر کہا" اچھا تو چنتا نہ کر دیدی سب انتظام کر دونگی۔ تو سو جا!"

پھر اس نے شیلا کو ایک بار بھینچ کر کلیجے سے لگایا۔ وہ پلنگ سے اسی طرح آہستگی سے اٹھی جیسے ماں بچے کو لوری دیکر سلانے کے بعد اٹھتی ہے۔ اس نے شیلا کے کمرے کی روشنی گل کی اور وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ یہاں آکر وہ تھوڑی دیر ٹہلتی اور کمرے کی ہر چیز کو الٹتی پلٹتی اور صاف کرتی رہی۔ پھر اس نے دو خط لکھے۔ انہیں سنگار میز پر لفافوں پر نام لکھ کر رکھا سیف کو کھولکر اس میں سے کچھ نوٹ اور تھوڑے سے خاص زیورات لئے اور اپنا بٹوہ اور ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس لے کر آہستہ آہستہ دبے پاؤں چور کی طرح گھر سے نکل گئی۔

ایک خط میں لکھا تھا۔

میری شیلا بھگوان تم کو ہمیشہ آنند چین سے رکھے۔ جیسا سوامی کہتے ہیں تم بن کھلی کلی ہو اور میں مرجھایا ہوا پھول۔ اور مرد سدا کلی ہی کو پسند کرتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ بھگوان نے میری بہن کو کلی بھی بنایا اور اسے روپ بھی دیا۔ میں جانتی ہوں کہ ہندو دھرم میں دو بہنیں ایک مرد کی ایک ساتھ استریاں ہو سکتی ہیں اور سوامی کی بھی یہی خواہش ہے۔ پر میں کیا کروں کہ مجھ کو سوکن کے نام سے جلن ہے اسلئے اگر میں تمہارے ساتھ ساتھ ان کے چرنوں میں پڑی رہتی تو مجھے ڈر تھا کہ میرے دل میں تمہاری طرف سے بھی کسی نہ کسی دن کھوٹ ضرور آجاتا۔ دو برتن ایک ساتھ رکھتے ہیں تو آواز پیدا ہی ہو جاتی ہے شیلا۔ میں اس دن کے خیال ہی سے ڈرتی ہوں جب دن مجھ میں اور میری شیلا میں اس طرح کی کھنک یا کھٹک پیدا ہو جائے۔ اسلئے میں اس جھگڑے کو چکائے دیتی ہوں۔ میں آج یہاں سے جا رہی ہوں۔ کہاں جا رہی ہوں یہ ابھی نہیں جانتی۔ پر اتنی دور ضرور چلی جاؤنگی کہ کوئی میری سن گن بھی نہ پا سکے گا۔

دیکھو تم اپنا دل نہ کڑھانا۔ میں اتنی بڑی قربانی تمہارے ہی لئے کر رہی ہوں۔ ہاں پر اتنی بات میری گرہ میں باندھ لینا کہ مرد کی ہر بات پر بکا وشواش نہیں کرنا چاہئے۔ اگر یہ بھولوگی تو دھوکا کھاؤگی۔ بس، تمہیں بھگوان کو سونپا۔

———— رمولا

دوسرے خط میں تحریر تھا۔

سوامی! —— میں جاتی ہوں اور اپنی جان سے زیادہ چہیتی شیلا کو آپ کو دئے جاتی ہوں، میری کھوج نہ کیجئے گا۔ میں بہت دور جا رہی ہوں کسی پرائے دیس میں۔ میں نے کچھ روپے اور دو ایک ایسے جواہرات لے لئے ہیں جو میں میکے سے لائی تھی۔ میں اپنی زندگی کسی نہ کسی طرح بسر کرلوں گی۔ آپ سے اتنی البتہ بنتی کرتی ہوں کہ میری شیلا کے ساتھ اپنے سے زیادہ پریم کیجئے گا۔ نہیں تو آپ کیلئے میری ساری دعائیں بددعاؤں میں بدل جائیں گی۔ رمولا

شیلا اور اس کے پریمی دونوں نے خط پڑھے۔ شیلا روئی۔ وہ بہت ہنسا۔ شیلا نے چڑھ کر کہا" میں اس وقت تک آپ کی صورت نہ دیکھونگی جب تک دیدی کو آپ ڈھونڈھ کر نہ لائینگے"۔ وہ ہنستا رہا۔ اس نے وعدہ کیا" ہاں ہاں، میں تمہاری دیدی کو دو ہی ایک دن میں ڈھونڈھ نکالتا ہوں —" مگر رمولا اس طرح گم ہوگئی جس طرح ہیرے کی کنی افریقہ کے ریگستان میں گر کر کھو جائے —— اس کی کھوج نہ ملنا تھی نہ ملی۔

ایک سال بعد شیلا نے اپنا عہد توڑ دیا۔ وہ چہیتا کو سوامی کہنے لگی —— لیکن اتنے عرصہ میں بہن کی گمشدگی نے یا بار بار کلی پکارے جانے نے اس میں ایسی خفتہ قوتیں بیدار کردیں کہ جب اس نے چہیتا کے پہلو میں بہن کی جگہ لی تو وہ کسی دوسرے گل چین کے ہاتھوں کلی سے پھول بن چکی تھی۔

گلکدۂ اقوال

۱۔ ماں جیسی حقیقی محبت کرنے والی ہستی اگر آنکھیں پھیر لے تو ہر دوست پر بھروسہ بیکار ہے۔

۲۔ ضمیر کی آواز کو ٹھکرانے والے ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

۳۔ غریب کی زندگی سرمایہ دار کی موت سے بھی زیادہ غمگین ہوتی ہے۔

۴۔ امیروں کے محلوں کی بنیادیں مزدور کے جھونپڑوں سے زیادہ بودی ہوتی ہیں۔

۵۔ روح کی تشنگی کا احساس موت پر نہیں گناہ کرنے کے بعد ہوتا ہے۔

۶۔ معصوم کے آنسو موتی سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

۷۔ بہادر سپاہی وطن کا پجاری ہوتا ہے۔

۸۔ کمینہ خصلت لوگ ہمیشہ قوم سے بغاوت کرتے ہیں۔

۹۔ خودکشی برا فعل ہے مگر بھیک مانگنے سے زیادہ اچھا۔

۱۰۔ برے رسم و رواج قوم کی تباہی کا سب سے بڑا سبب ہوتے ہیں۔

کوثر قریشی

ملکۂ حسن مس نسیم کی گھریلو زندگی

دلدادگانِ فلم کی وہ حسین ترین محبوبہ جو پردۂ فلم پر نمودار ہو کر اپنے روح پرور گانوں سے جلوہ جگاتی ہے جو اپنی مترنم آواز سے ہزاروں لاکھوں دلوں کو آن کی آن میں موہ لیتی ہے جس کی جنبشِ لب یا اشارۂ ابرو سے مُردہ دلوں میں زندگی اور حرارت کی لاتعداد لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ اس نسیم کی خانگی زندگی کیسے بسر ہوتی ہے؟ —— آؤ ہم دکھائیں اس کی گھریلو زندگی کی ایک جھلک۔ ہاں مس نسیم کی جو ہر مہینے ہزاروں روپیہ زنگارنگ ساریوں اور بیش قیمت خوشبویات پر خرچ کر دیتی ہے جو غیر مرد کے سامنے جاتے یا اپنے گھر میں اجنبی سے بات کرتے چھوئی موئی کی طرح شرما جاتی ہے۔

چونکہ آپ کے دل میں یہ خیال گھر کر چکا ہے کہ مس نسیم حسن و جمال میں کسی آسمانی حور سے کم نہیں۔ اسلئے یہ بات آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوگی کہ کسی آسمانی حور کے برعکس اس کا تعلق گھریلو زندگی کی معمولی باتوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ آپ نے کبھی نہ سوچا ہوگا کہ دنیائے فلم کی یہ حسین ترین عورت اپنے ہاتھ سے شامی کباب اور پلاؤ پکانے اور کھانے کی از بس شائق ہے۔

نسیم ۲ر جنوری ۲۲ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئی۔ یہ اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اسے مقامی اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں وہ نہایت ذہین اور ہوشیار لڑکی ثابت ہوئی۔ بچپن کا زمانہ تعلیمی مشاغل میں بسر کرنے کے بعد ۳۴ء میں اپنے والدین کے ہمراہ وہ بمبئی چلی گئی۔ زمانۂ طالب علمی میں نسیم کو اپنے ہی سکول کے دو ڈراموں میں ہیروئن کا پارٹ کرنا پڑا۔ جن میں اس نے اپنے کام کو بطور احسن سرانجام دیا اور اس دن سے فلم ایکٹرس بننے کی خواہش اس کے دل میں گھر کر گئی۔

سہراب مودی سے ملاقات

۳۶ء میں منروا فلم کمپنی کے شہرۂ آفاق ڈائرکٹر مسٹر سہراب مودی سے اس کی ملاقات ہوئی اور اس کی خوش نصیبی کہ جوہر شناس ڈائرکٹر کی نگاہ انتخاب نے نسیم کو اپنی نئی فلم ہملٹ کیلئے منتخب کر لیا جو کہ انہی دنوں پونہ میں تیار ہونے والی تھی۔ یہ سنہرا چانس ملنے پر نسیم کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ لیکن ساتھ ہی اسے اس خیال سے تشویش ہوئی کہ نئے نئے آدمیوں کے ساتھ ننگے منہ وہ کیسے کام کر سکیگی۔ نسیم کے شرمیلے پن کے باعث اس کی والدہ کو بھی اُسی فلم میں کام دیا گیا تاکہ ماں بیٹی ساتھ ساتھ کام کریں اور نسیم تنہا کام کرنے کی وحشت سے محفوظ رہے۔ نسیم کی ماں بھی چونکہ گانے میں خوب مشاق ہے اس لئے اسے ہملٹ میں ملکہ کا پارٹ دیا گیا تھا۔

۴۰ء میں جب نسیم نے منروا فلم کمپنی کو چھوڑا ہے۔ وہ حسب ذیل سات فلموں میں کام کر چکی تھی: ہملٹ، خان بہادر، میٹھا زہر، وشنتی، طلاق، پکار اور میں ہاری۔ اب نسیم تاج محل پکچرز میں نہ صرف بطور ہیروئن کام کر رہی ہے بلکہ وہ کمپنی کی مالکہ بھی ہے ہندوستان میں اس کی مثال نہیں مل سکتی کہ ۲۱ سال کی عمر میں کوئی لڑکی نہ صرف مقبول ترین ایکٹرس بلکہ کسی فلم کمپنی کی مالکہ بن گئی ہو۔

نسیم کن باتوں کی شوقین ہے؟

نسیم کا قد ۵ فٹ ۴ انچ ہے اور وزن ۱۰۶ پونڈ۔ جب میں نے اس سے ملاقات کی وہ متعلِ فیشن کے زنانہ لباس میں ملبوس تھی جو بالکل سفید اور سادہ تھا۔ نسیم گھر پر بالکل سادہ لباس میں رہتی ہے اور جب باہر نکلتی ہے تو بیش قیمت نئی ساری پہن کر۔ نسیم ہیروں اور جواہرات کی بہت شوق ہے۔ اس کی انگوٹھی اور کانوں کے آویزوں میں تین ہیرے اتنے جاذب نظر اور قیمتی ہیں کہ ویسے آپ نے شاذ ہی کہیں دیکھے ہونگے۔ نسیم کی ماہوار آمدن ۲½ ہزار اور بعض حالتوں میں اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اتنی بھاری تنخواہ کیلئے اسے نگارخانہ میں سخت محنت کرنا پڑتی ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنے رقص کے لئے تین گھنٹہ کا وقت روزانہ نکال ہی لیتی ہے نسیم کسی کلب کی ممبر نہیں۔ البتہ گھوڑے کی سواری کی شوقین ہے اور یہ شوق اُسے

بچپن سے ہی ہے۔ نسیم کو دہلی سے بڑی محبت ہے اور سال یا ۶ ماہ کے بعد جب کبھی اسے موقع ملتا ہے چند دن کیلئے ضرور دہلی جاتی ہے۔ جہاں اس کے احباب اور رشتہ دار رہتے ہیں۔ دہلی میں نسیم کے جاننے والوں کا حلقہ اتنا وسیع ہے کہ وہاں اگر وہ برقعہ پہن کر گھر سے نہ نکلے تو اس کا بازار سے گذرنا مشکل ہو جائے۔

ہجوم کے نرغے میں

ایک مرتبہ وہ سہراب مودی کے ساتھ بنگلور مدراس اور احمد آباد کی سیاحت کو گئی احمد آباد کے اسٹیشن پر نسیم ہجوم کے نرغے میں آگئی۔ اس کے طالبانِ دیدار کا یہ حال تھا کہ اس تک پہنچنے کیلئے مرے جاتے تھے۔ ہجوم کی کثرت کے باعث نسیم کو دو قدم چلنا بھی دوبھر ہو گیا۔ اور دم گھٹنے لگا۔ آخر بڑی مشکل سے نسیم اور اس کے ساتھی ریلوے اسٹیشن پر پہونچے۔ مگر اس وقت جب ٹرین اسٹیشن کے حدود کو پار کر چکی تھی۔

گھوڑ دوڑ کے میدان میں

نسیم کو گھوڑ دوڑ دیکھنے کا بہت شوق ہے اور وہاں وہ ہمیشہ سفید رنگ کی سوتی ساڑی پہن کر جاتی ہے اور اس خوف سے کہ کوئی اسے پہچان نہ لے بالکل سادہ اور ارزاں قسم کے لباس میں ملبوس رہتی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ نسیم کی سادگی ہی وہ سب سے بڑا حربہ ہے جو دیکھنے والے کے دل کو موہ کر ہمیشہ کے لئے حلقہ بگوش بنا لیتا ہے۔

نسیم کے خلاف ہتک آمیز پوسٹر

نسیم کی معصومیت اور سادگی کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ دنیا میں کون ایسا سنگدل اور کور باطن انسان ہو سکتا ہے جو بمبئی جیسے شہر میں اس کے خلاف جھوٹے اور گمراہ کن پوسٹر چسپاں کر کے اس کی شہرت اور ناموری کو داغدار بنانے کے درپے ہے۔ جب نسیم سے اس کا ذکر کیا گیا تو بولی کہ مجھے ان باتوں کی پروا نہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرے قدردانوں کو میرے متعلق ایسی لغو اور بیہودہ باتوں کا بالکل یقین نہ آئے گا۔

نسیم کی زندگی نہایت سکون و آرام سے گذر رہی ہے۔ خالی وقت گھر کی چار دیواری میں بسر ہوتا ہے۔ وارڈن روڈ پر اپنی خوبصورت کوٹھی میں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ اپنی ہم عصر ایکٹرسوں سے اسے کوئی لگاؤ نہیں۔ البتہ سردار اختر اسکی خاص سہیلیوں میں سے ہے۔

نسیم کی عاداتِ حسنہ

کوئی بُری علت نہیں۔ وہ شراب و تمباکو سے نفرت کرتی ہے۔ چائے اور قہوہ کو مضرِ صحت سمجھتی ہے۔ البتہ گائے کا تازہ دودھ اس کی مرغوب غذا ہے۔ وہ دیہاتی زندگی کو شہری زندگی سے بہر صورت بہتر سمجھتی ہے اور بمبئی کی مرطوب فضا کی نسبت کسی پہاڑی مقام پر رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ اسکا خیال ہے کہ فلمی زندگی سے کم از کم ہر ۵ سال کیلئے کنارہ کشی کر کے آبادی سے دور کسی پرفضا مقام پر بودو باش اختیار کی جائے۔ پکار میں نورجہاں کے کردار کو اپنا ماسٹر پیس سمجھتی ہے۔ اور پرتھوی راج اور چندر موہن کے ساتھ کام کرنا اسے پسند ہے۔ نسیم انگریزی اور امریکن فلم دیکھنے کی بہت شوقین ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ان سے اس نے بہت کچھ سیکھا ہے۔

نئی نئی ساڑیوں کی خرید

نئی نئی ساڑیوں کی خرید میں نسیم انتہا درجہ کی فضول خرچ ہے۔ وہ مانتی ہے کہ اس کے پاس بڑی سے بڑی قیمت کی ایک ہزار سے اوپر ساڑیاں موجود ہیں۔ اور نئے نئے نمونوں کی خرید کا سلسلہ پھر بھی جاری ہے۔ ساڑیوں کی طرح بلوریں چوڑیوں کی بھی وہ بہت شائق ہے اور برابر پہنتی رہتی ہے۔ نسیم کے فضول اخراجات میں خوشبویات کی بھی ایک مد ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا بکس ہے جس میں پانصد روپیہ کی مالیت کے خالص ہندوستانی عطر موجود ہیں۔ ولایتی خوشبویات میں اس کا محبوب ترین عطر Je Reviens ساختہ پیرس ہے۔ یہ عجیب شکل کی ایک چھوٹی سی شیشی ہے جس کی مالیت چھیالیس روپے ہے۔ اگر آپ اس عطر کو ایک مرتبہ سونگھ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نسیم اسکو خرید کرنے میں کوئی فضول خرچی نہیں کرتی کیونکہ وہ چیز ہی ایسی روح نواز اور فرحت بخش ہے کہ سونگھنے والا اپنے آپ کو بہشت بریں میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

نسیم ابھی تک کنواری ہے اور جب تک اس کی مرضی کے مطابق کوئی موزوں نوجوان نہیں ملیگا کنواری ہی رہے گی۔ (ادارہ)

جناب خیر بھوروی انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے بحیثیت نمائندہ خصوصی سنہ ۳۰ء سے ملک کا دورہ کر رہے ہیں اور نہ صرف صدر مقامات اور بڑے بڑے قصبات تک ان کا دائرہ عمل محدود ہے بلکہ دور افتادہ دیہاتوں میں بھی جا کر انجمن کے مقاصد کی قابلِ اطمینان اشاعت کرتے ہیں۔ لیکن وقت کم اور کام زیادہ ہے اسلئے اس کا اعلان ضروری ہے کہ موصوف جہاں پہنچیں وہاں کے حامیانِ اردو ان کیلئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں تاکہ یہ کم وقت میں زیادہ کام کر سکیں۔ عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

ہندوستانی سنیاسیوں کے جگر پارے

لاکھ لاکھ کی قیمت کا ایک ایک نسخہ

جریان کا سو فی صدی مجرب نسخہ

طباشیر کبود تولہ - ثعلب مصری ۲ تولہ - موصلی سفید ۲ تولہ - بہمن سرخ ۲ تولہ - بہمن سفید ۲ تولہ - تخم اٹنگن ۲ تولہ - مغز تخم کونچ ۲ تولہ - مغز بنولہ ۲ تولہ - سنگھاڑا حتہ ۵ تولہ - تمام ادویہ کو کوٹ پیس کر سفوف بنالیں ان کے برابر مصری ملاکر محفوظ رکھیں -

۶ ماشہ ہمراہ دودھ بوقت شب یں بعداز غذا - جریان کے لئے ازحد مفید ہے اور احتلام کیلئے نافع ہے -

خشک و تر کھانسی کیلئے جادو اثر گولیاں

دارچینی ۲ ماشہ - کاکڑا سینگی ۲ ماشہ - فلفل گرد ۱ ماشہ - خشخاش ۱ تولہ ست ملٹھی ۶ ماشہ - ست گلو ۳ ماشہ - الائچی خورد ۶ ماشہ - گوگل ۳ ماشہ - کتیرا ۳ ماشہ - طباشیر ۳ ماشہ - تخم خطمی ۳ ماشہ - تخم خبازی ۳ ماشہ - پوست خشخاش تازہ ۱ تولہ - مصری ۳ ماشہ - پہلے پوست کو پیس کر گوگل و کتیرا کو حل کریں اور باقی ادویہ باریک پیسکر حب نخودی بنائیں -

ایک ایک گولی دن میں تین مرتبہ مریض کو چسوا دیا کریں - خشک و تر کھانسی کیلئے یہ گولیاں مفید ہیں اس کے علاوہ نزلہ کو بھی روکتی ہے -

اکسیر معدہ

مصطگی رومی ۲ تولہ - الائچی خورد ۱ تولہ - طباشیر ۱ تولہ - ست پودینہ ۲ تولہ مویز منقی ۱ تولہ - ست لیموں ۳ ماشہ - مرچ سیاہ ۶ ماشہ - پیپلی ۶ ماشہ - ست املی ۶ ماشہ - ست اجوائن ۳ ماشہ - دارچینی ۶ ماشہ - پوکھر مول ۶ ماشہ - ست ملٹھی ۶ ماشہ - تمام ادویہ کو باریک پیس کر تیزاب الائچی میں کھرل کرکے گولیاں بمقدار نخود بنائیں -

خوراک ایک سے تین گولی تک - فوائد - دافع ریاح و بدہضمی - کمی اشتہا اور قبض کو دور کرتی ہیں -

سرمۂ اکسیر اعظم

سرمہ سیاہ ۲ تولہ - سرمہ سفید ۳ تولہ - کبابہ ۴ ماشہ - پھٹکری بریاں ۱ تولہ - شورہ قلمی ۱ تولہ - مرچ سفید ۵ عدد - سمندر جھگ ۱ تولہ - عرق کیوڑا ایک تولہ - عرق گلاب ۱ تولہ - شراب برانڈی ۲ - تولہ سب کو کھرل کرکے مثل غبار کرلیں -

بینائی کے ضعف کو دور کرتا اور اس کو قوت دیتا ہے - ایک دو سلائی آنکھوں میں لگائیں -

دانت اور داڑھ کا درد ایک منٹ میں کافور

سرخ مرچ جو بہت عمدہ پختہ شدہ سرخ ہوں - ڈنڈی سمیت ۷ عدد لے کر ایک چھٹانک تیل سرسوں میں پکائیں - جب پکتے ہوئے مرچ کی رنگت سیاہ ہوجائے تیل سے نکال کر پھینک دیں اور اس تیل کو شیشی میں محفوظ رکھیں -

مریض درد دانت یا داڑھ کے لئے مخالف کان میں ایک دو دفعہ ایک یا دو بوند ڈال دیں - بس کافی ہے - رونا آئے - ہنستا جائے

ہم دونوں

از جناب مسعود صاحب

آپ اسے نہیں جانتے؟

یہ وہی تھی جسے سب جانتے ہوئے بھی آج تک نہ جان سکے ـــــ جسے سب نے چاہا ـــــ سب نے مٹایا!

اُسے اپنا بنانے کیلئے ہزار بار خدا سے بغاوت کی گئی۔ اُسے ٹھکرانے کے واسطے سینکڑوں مرتبہ شیطان کی نفسانیت مستعار لی گئی۔ گناہ نے اس کی پرستش کی۔ محبت نے اپنے خون سے اُس کی رعنائیوں کو جوان کیا۔ دولت نے اس کے نازک قدموں سے لپٹ کر جان دیدی۔ اخلاقی منافقت نے اُسے اپنے شبستانوں میں شمع بنا کر جلایا اور اس حد تک کہ اس کی نوجوان زندگی کی ہر ایک کرن سیاہ دھوئیں کی ایک لکیر بنکر رہ گئی۔

اس کی شوخ نظروں کو زہر آلود کہا گیا اور شراب بنکر پیا گیا۔ اس کے یاقوتی تبسم کو خون آشام بتایا گیا مگر پھر بھی چھپ چھپ کے اس سے جان نوازی کی التجائیں کی گئیں۔ اسے ایک حسین ناگن سمجھ کر بھی لوگ اسے سینے سے نہ لگانے کی جرأت نہ کر سکے۔ اخلاق و مذہب و سماج سب نے چلا کر کہا ـــــ "اس طرف قدم نہ بڑھاؤ۔ وہ خوبصورت جونک تمہاری ساری روح کو چوس لیگی!" ـــــ مگر انسان بالکل بے اختیار کانپتا لرزتا یوں کھنچا چلا گیا۔ جیسے ٹوٹا ہوا ستارہ ـــــ اور اسکی گناہگار راتوں کی لذیذ تاریکی میں جذب ہو گیا۔

پھر سچ تو یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی کر بھی کیا سکتا تھا! ـــــ بے پناہ مقناطیسی قوت کی زد میں آ کر ایک حقیر کانپتا ہوا آہنی ذرہ گھسٹتا نہ چلا جائے تو کیا کرے ـــــ جوان سربلند شعلہ کی لپٹ میں آ جانے کے بعد ایک بے مایہ تنکا بھسم نہ ہو جائے تو کہاں جائے!!

ـــــ یہ گناہ ہے تو اس میں گناہگار کا کیا قصور!

ـــــ یہ بغاوت ہے تو اس میں باغی کی کیا خطا!! ـــــ اس چھوٹی سی دُنیا میں کوئی دل لے کر کہاں جائے؟ جان دینے کیلئے بھی تو کسی جان لینے والے کی ضرورت ہے!

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک جذباتی فریب تھا جس کے پیچھے تسکین نفس اور خود غرضی کی گھناؤنی صورت پوشیدہ تھی۔ لوگ جب اخلاق و مذہب کے تقاضوں کو اپنے کانپتے ہوئے قدموں کے نیچے کچلتے ہوئے اس کی دلنواز خلوت کی طرف کشاں کشاں آتے تھے تو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ سب بھوکے بھیڑیے ہیں جو اس کی جوانی کا خون پینے کیلئے سیم و زر کے پیمانے ساتھ لائے ہیں ـــــ اور اس لئے جہاں اس نے یہ تعلیم حاصل کی تھی کہ اس کا شاداب جسم کس طرح صرف ایک بار قوس و قزح کی طرح بل کھا کر رقص کو شاعری میں تبدیل کر سکتا ہے اور اُس کے جاں نواز ہونٹ صرف ایک جنبش سے کس طرح شاعری کو شراب بنا سکتے ہیں وہاں اس نے یہ بھی سیکھا تھا کہ بھیڑیوں کے ساتھ کیسے کھیلا جاتا ہے۔ تنفس کی حدت و تیزی۔ انگلیوں کی خنکی۔ اعضا کا خفیف سا اضطراب۔ آنکھوں کی تیز چمک ـــــ وہ ایک طبیب کی طرح ان سب قرائن کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس کا مریض اُس سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔

اُسے خوب معلوم تھا کہ پرستش و محبت کی پیاری آندھیاں جو آج اس کے اشارے پر چل رہی ہیں ذرا سی غفلت سے اُسے ایک گلبار شاخ کی طرح توڑ کر پھینک دیں گی۔ جب وہ سرِ شام اپنے خوبصورت بالاخانے کی آغوش میں اپنی ساری جوانی اور اپنی تمام رعنائیاں لئے ہوئے آ بیٹھتی اور رات کے ساتھ ساتھ ساری دُنیا اس کی طرف کھنچنے لگتی تو وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ ساری جذب و کشش ایک روز خود ہی اس کی قسمت کے تمام ستاروں کو باہم ٹکرا دیگی۔ جب وہ اپنے جلو میں ہزاروں قیامتیں لئے ہوئے ہنگامہ پرور شاہراہوں یا مسکراتے ہوئے پارکوں کی روشوں پر خراماں خراماں گذرتی اور پیاسی نظروں۔ جلتی ہوئی ٹھنڈی سانسوں اور دل کی تیز تیز دھڑکنوں کے ہجوم اس کے چاروں طرف جاگ اُٹھتے تو اُسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک آتشیں درخشاں کرہ ہے جو اپنے "نظام شمسی" کو لئے ہوئے جدھر چاہیے گھوم جاتا ہے۔ بایں ہمہ ہر صبح جب وہ اپنے تھکے ہوئے مرمریں جسم کو بستر کے مسلے ہوئے خشک پھولوں پر سے سمیٹ کر تکیہ کے سہارے بیٹھتی اور سرہانے پڑے ہوئے چند سیمیں سکوں پر اپنی خواب آلود نظریں ڈال کر سوچتی تو اسے احساس ہوتا جیسے کسی اندھیری ویران دُنیا میں وہ اکیلی کھڑی ہے۔ جہاں سونے چاندی کے چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کے علاوہ اور کوئی نہیں!

ہر رات وہ اپنے حسن و جوانی کی لذتوں کو ایک نئے طریقہ سے ترتیب دیتی تھی۔ کبھی وہ صرف اتنا ہی کافی سمجھتی کہ شرم و حجاب کے سحر کار گریز کو استعمال کرے — وہ دامن چھڑائے اور لوگ گھسٹتے چلے آئیں — وہ اداؤں کی لہروں پر تیرتی چلی جائے اور لوگ جذبات کے نشیب و فراز میں ٹھوکریں کھاتے دوڑے آئیں — کبھی وہ پوری شوخی و بیباکی سے اپنے بے پناہ جمال کا ہر حصہ عریاں کر دیتی۔ لوگ دیکھتے اور مجسم کپکپی بنکر رہ جاتے — وہ لطیف و پر اسرار کپکپی جو صرف ایک گنہگار کے جسم پر ہی ظاہر ہو سکتی ہے — کبھی وہ ایک مشتعل ناگن کی طرح لپک کر ڈستی اور لوگ اس زہر کو امرت سمجھ کر اپنے خشک و لرزاں ہونٹوں سے پی جاتے — کبھی وہ موت کی طرف پر سکون بنکر دل و دماغ پر چھا جاتی اور لوگ اسے زندگی جان کر مسکرا دیتے — مگر شاید ان سب سے زیادہ ہوش ربا ادا وہ تھی جب وہ صرف اتنا کہہ کر آبدیدہ ہو جاتی کہ — "میں تمہیں چاہتی ہوں!"

جوانی و گناہ کی ان نشیلی راتوں میں اس نے لوگوں کے احساسات کا پاس کرتے ہوئے اتنے مختلف و متضاد جذبات کو اپنے اوپر طاری کیا تھا کہ اب کوئی بھی جذبہ اسے اپنا محسوس نہ ہوتا تھا۔ بیشتر وہ لوگ تھے جو بھیانک مچھروں کی طرح بھنبھناتے ہوئے آئے اور اس کے نرم و نازک جسم سے اپنے حصے کا خون چوس کر اڑ گئے۔ اس کی نظر میں یہ لوگ سب سے زیادہ مہربان معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کی تسکین و مدارات کے واسطے اسے اپنے جسمانی حدود سے آگے نہ بڑھنا پڑتا تھا۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو دنیا کی ٹھوس اور بے رحم حقیقتوں سے گھائل ہو کر صرف جینے کا ایک سہارا پانے کے لئے اس کے فریب کدے میں خود کو جان بوجھ کر دھوکہ دینے آتے تھے۔ ان کی امیدوں کو کامران کرنے کے واسطے بھی اسے کسی خاص زحمت کو برداشت نہ کرنا پڑتا تھا کیونکہ گناہ کی تند شراب کے ایک ہی جرعہ میں ان کے پریشان حواس پر سکتہ طاری ہو جاتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ دقت تو ان لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی جو اس کے جسم کی لذتوں میں ڈوب کر اس کے دل اور اس کی روح کو چھو لینا چاہتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو یہ چاہتے تھے کہ اس کی حسین زندگی کی رنگین و لبریز مینا صرف ان ہی کی تشنہ لبی کے واسطے وقف ہو کر رہ جائے اور کسی دوسرے غریب پیاسے انسان کو "دُردِ تہ جام" تک نہ ملے۔ بعض کا اصرار یہ تھا کہ وہ ان سے محبت کرے — وہ محبت جو کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے — وہ پاس نہ ہوں تو اسے بے چین کر آئے — آہیں بھرے۔ چھپ چھپ کر یاد کرے اور راتوں کی نیندوں کو آنسو بنا بنا کر ٹپکاتی رہے — اور جب وہ ہنستے مسکراتے اس سے آملیں تو کچھ ایسی چیز بن جائے جو وہ کسی اور مرد کے سامنے کبھی نہیں بن سکی! — ان میں ہی کچھ ایسے بھی تھے جو اسے جہنم کی آزادی کے بدلے فردوس کی غلامی دینے آتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ اپنی ساری پرکیف کائنات کو چھوڑ کر ان کے گھروں کی غلیظ چہار دیواری میں ایک راہبہ بنکر بیٹھ جائے۔ کتنے متضاد تھے یہ سب مطالبے! مگر اس نے ان سب پیمانوں میں خود غرضی و لذت کوشی کی شراب بھر کر پلائی تو نہ جانے کیوں سب چپ ہو کر بیٹھ گئے!

اگر خوش قسمتی سے کوئی رات اسے ایسی میسر ہو جاتی جب وہ اپنے بستر پر تنہا ہوتی تو وہ بہم سوچتی — نہ جانے کیا کیا — گنگناتی مسکراتی اور پھر خود ہی رو پڑتی۔ ایسی راتیں اسے بہت محبوب تھیں — بڑی بیش قیمت — کیونکہ صرف ان ہی راتوں میں اسے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ آزاد ہے اور صبح تک اس کا جسم۔ اس کی روح۔ اس کا دل و دماغ صرف اسی کا ہے۔ یہی ہوتے تھے وہ لمحات جب کبھی کبھی وہ عورت جسے اس نے اپنے سینے کی گہرائیو

"کسی کو رقصاں دیکھ کر"

(از جناب مسعود جاوید)

اسٹیج پہ رقصاں ہے وہ اک "شعلۂ عریاں"
وہ شعلہ لپیٹ جس کی کلیجے میں اتر جائے

وہ چاند کی قاشوں سی تراشے ہوئے بازو
وہ حسن کہ دل بنکے نظر دیکھے تو مر جائے

لہرائے ہوئے بالوں میں موتی سی چمکتے
جس طرح کوئی تاروں بھری رات نکھر جائے

آنکھوں کی شرارت "ہے وہ پیغام کہ انساں
بے سمجھے تڑپ جائے، سمجھ جائے تو مر جائے

وہ رقص میں بھرپور جوانی کا تلاطم
آتی بھی قیامت ہو تو گھبرا کے گذر جائے

او حشر نظر! تیرے تصدق، یہ بتا دے
کیسے تجھے دیکھے کوئی دیکھا نہ اگر جائے

اتنی نہ بڑھا کفر کی تابانی و رونق!
ایسا نہ ہو انسان خدا سے بھی مکر جائے!

میں بہت دنوں سے دفن کر رکھا تھا ایک انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھتی اور رفتہ رفتہ اُس کی ساری محسوس دُنیا پر چھا جاتی۔ اُسے معلوم ہوتا جیسے وقت کی آئندہ رفتار ایکدم رُک گئی ہے اور اس کا "ماضی" گہرے اندھیاروں میں سے لپکتا ہُوا "حال" کو پکڑ لینے کیلئے آندھی کی طرح آ رہا ہے۔ خوبصورت خلوت کی تیز برقی روشنی دھیمی ہونے لگتی۔ آنکھوں پر خواب انگیز تصورات کا بوجھ بڑھ جاتا اور یکایک وہ دیکھتی کہ ایک دھندلے ویرانے میں خون آشام درندوں کے غول کے بالکل درمیان ایک برہنہ لاش پڑی ہے جس کے خون کی دھاریں بے حس زمین کے سینے پر گلکاریاں کر رہی ہیں ـــ بے پناہ دہشت کے عالم میں وہ کانپ اُٹھتی ـــ چونک جاتی ـــ اور اپنی دلکش آنکھوں کو نازک ہتھیلیوں سے زور سے مل کر تکیے کے سہارے نیم دراز ہو جاتی۔ وہ مسلسل سوچتی تھی کہ ان کے بے شمار خریداروں میں کیا ایک بھی اتنی انسانیت نہیں رکھتا کہ اپنے گندے جذبات کے ہنگامہ کو تسکین دینے کے بعد ہی یہ سوچ سکے کہ اُس نے ابھی ابھی جس جسم کو ـــ فطرت کے حسین شاہکار کو ـــ اپنے غلیظ نفس کے گھناؤنے پنجوں میں مسل کر رکھ دیا ہے اس کے اندر ایک چھوٹا سا دل بھی دھڑک رہا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ایسے ہی خیالات کی شدت سے تڑپ کر بے اختیار دوزانو ہو جاتی اور آبدیدہ ہو کر کہہ اُٹھتی ـــ "معبود! کیا تیری ساری دنیا میں ایک میں ہی وہ مقہور ہستی ہوں جو جیتے ہوئے بھی جینے کا کوئی حق نہیں رکھتی؟ تہذیب و سماج کی خلوتوں میں وہ کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے جسے میری خوابگاہ کے اندر پاکر گناہ سمجھا جاتا ہے؟ اخلاق و تہذیب کے مدعی ساری دنیا کو اپنی نفاست و پاکیزگی کے فریب دیکر میرے کوچے میں آتے ہیں اور وہی چیز خرید کر لے جاتے ہیں جس کے تصور سے بھی وہ منظر عام پر اپنی ناک بھوؤں سکیڑ لیا کرتے ہیں۔ وہ دُنیا کو دھوکہ دیتے ہیں اور میں خود ان کو ـــ کیا اُن کا گناہ میرے گناہ سے زیادہ نہیں؟ ـــ مگر پھر بھی سب اُن کے ہیں اور میرا کوئی نہیں ـــ وہ سب کے ہیں اور میں کسی کی نہیں!!"

غالباً ایسی ہی ایک رات تھی جب اُس نے بیس سال پیشتر اپنے عنفوانِ شباب میں مجھے اپنا آخری خط لکھا تھا ـــ سنیئے:-

"اسلم! ـــ آج رات میں بالکل تنہا ہوں۔ میری یہ رات صرف میری رات ہے۔ نہ جانے کیوں یہ جی چاہتا ہے کہ آج تم سے کچھ باتیں کروں ـــ کچھ ایسی باتیں جو میں نے ابتک کسی سے نہیں کیں ـــ دوسروں کی طرح اگرچہ تم بھی صرف ایک شب کے واسطے میرے پاس رہے لیکن اپنے بعد کچھ ایسی یادگار چھوڑ گئے جسے میں شاید کبھی بھی فراموش نہ کر سکوں

ایک بات پوچھوں؟ ـــ بتاؤ گے؟

ـــ تم میرے قریب میرے بالکل قریب تک آئے تھے تو پھر چلے کیوں گئے؟ کیا تمہیں بھی یہ یقین تھا کہ وہ جسم جو چاندی کے سکوں سے خریدا جاتا ہے اپنے اندر کوئی دل نہیں رکھتا؟ کیا تم بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ پھولوں پر اُڑتی ہوئی تتلی بعض اوقات نوک خار پر گر کر جان دے سکتی ہے؟ ـــ مختصر یہ کہ تم نے مجھے کسی حد تک ایک انسان بھی سمجھا تھا یا نہیں؟ ـــ یا محض ایک پتھر؟؟ ـــ اگر تمہارے خیال میں میری حیثیت کسی صورت بھی ایک انسان جیسی تھی تو اپنے اخلاق و تہذیب اور اپنی نفاست و پاکیزگی کے صدقے میں صرف یہ بتا دو کہ اتنے نزدیک آ کر اتنی بیدردی سے اس قدر دور ہو جانے کا حق تمہیں کس نے دیا ہے؟ ـــ اور اگر تمہاری نظر مجھے صرف ایک پیکرِ سنگ ہی تصور کرتی تھی تو ایک پتھر کے آگے یوں بے تحاشا سجدے کرنے کی اجازت تمہیں کس خدا نے عطا کی تھی؟

میری اس تحریر سے کسی خوبصورت جذباتی مغالطہ میں مبتلا نہ ہو جانا۔ مجھے خوف ہے کہ تم کہیں کچھ اور نہ سمجھ بیٹھو ـــ وہی کچھ جو میں نے اُس رات تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی ـــ اس لئے صاف صاف سُن لو کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی ـــ تمہاری ممنون ضرور ہوں ـــ میرے یہ سارے الفاظ اس بدنصیب "عورت" کی بخارات ہیں جو عرصہ سے میرے اندر دفن ہے۔ تم صرف مجھے جانتے ہو ـــ اس "عورت" کو نہیں!

کیا تم جواب دو گے؟ ـــ

تمہاری اور سب کی ـــ رعنا"

میرے پاس ایسی تحریر کا بھلا کیا جواب ہو سکتا تھا! ـــ وقت دبے پاؤں گذرتا چلا گیا۔ پورے بیس سال ـــ جوانی کے ساتھ ساتھ رعنا کی ہستی بھی میرے لئے ختم ہو گئی۔ ماحول بدلا۔ ذہنیت بدلی۔ ساری دنیا بدل گئی۔ میری صورت اور وضع قطع اور میرے مشاغل کو دیکھ کر کسی کو بھولے سے بھی یہ تصور نہ آ سکتا تھا کہ اخلاقیات کے اس خشک پروفیسر کی جوانی میں ایک رات ایسی بھی آئی تھی جب اس نے گناہ کی رنگینیوں سے کھیل کر صبح کر دی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہی اسلم جو آج صنف نازک کی شدید ترین نفرت کو لئے ہوئے تنہا جی رہا ہے آج سے بہت پہلے ایک رومان انگیز شب کے سناٹے میں ایک محبت نہ کر سکنے والی عورت کے گناہ آلود قدموں پر سربسجود رہ چکا ہے! ـــ علمی مشاغل کی جاذبیت نے

مجھے خود بھی اپنے ماضی سے تقریباً لاشعور بنا دیا تھا۔ اخلاقیات و فلسفہ کے مسائل کی اُلجھنوں نے جو دُنیا میرے واسطے پیدا کر دی تھی۔ وہاں شعر و ادب، رومان و جذبات اور "خود عورت" کا وجود ایک اذیت انگیز انتشارِ توجہ کا باعث تھا اور اسلئے میں غیر شعوری طور پر ان سب "خطرات" کی طرف سے اپنی زندگی کے تمام دامن سمیٹ کر خاموش بیٹھ گیا تھا۔ شاید انسان سے زیادہ تبدیل ہو جانیوالی مخلوق کائنات میں کوئی نہیں۔

مگر عین اس وقت جب میں سب کچھ قطعی فراموش کر چکا تھا اچانک میری زندگی کے ایک نامعلوم دروازے سے رعنا در آئی!

وہ قسمت ساز شام میں کبھی بھول سکوں گا — ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا اور ڈوبتے ہوئے سُورج کی آخری سُرخی تنگ گلی کے دونوں طرف والی بلند عمارتوں کے اوپر ایک وہم رنگیں کیطرح جھلک رہی تھی۔ میں نے گلی کے موڑ پر تیزی سے اپنی سائیکل گھمائی مگر دوسرے ہی لمحے — عین اپنے بالاخانے کے نیچے — کسی سے ٹکرا کر سائیکل سے نیچے آ رہا — "آہ! بابا!!" مضروب شخص کے منہ سے نکلا — میں نے دیکھا کہ میرے بالمقابل ایک اندھا بھکاری پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے اپنی چوٹ سے لاپروا ہو کر تیزی سے اُسے اُٹھایا۔ اُسے کوئی زیادہ چوٹ نہ آئی تھی مگر وہ برابر کراہ رہا تھا۔ اس کی حالت سے زیادہ میرا ضمیر مجھے تکلیف دے رہا تھا۔ میں نے دائیں بائیں ایک تیز نظر ڈالنے کے بعد عجلت سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا — مگر ٹھیک اسی وقت میرے سامنے ایک دوسرے بالاخانے کی کھڑکی کھلی — کسی نے ایک ثانیے کے واسطے جھانک کر دیکھا — اور حیرت کے عالم میں میرا ہاتھ جیب سے باہر آنا بھول گیا — میں نے ایک ہی نظر میں اُسے پہچان لیا — یہ وہی تھی!

اور پھر اُس رات مجھے نیند نہ آ سکی۔ بتیس سال پہلے کی وہ ایک نشیلی رات جب ہم دونوں نے گناہ و جوانی کے دو متوالوں کی طرح ایک دوسرے کو چاہا اور لوٹا تھا بجلی کی طرح رہ رہ کر ماضی کے اندھیارے میں کوندنے لگی۔ صرف ایک نگاہ میں وقت کے بتیس دبیز پردے اُٹھتے چلے گئے۔ میرا دل نہ جانے کیوں سہم کر بہت تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ میرا دماغ کسی بڑے بوجھ کے نیچے دبا جا رہا تھا اور میری روح کی کسی نامعلوم گہرائی میں کوئی چیز رہ رہ کر چُبھ رہی تھی۔ میں نے کمرے کی روشنی گل کر دی اور سگرٹ سلگا کر اندھیرے میں چپ چاپ لیٹ گیا۔ باہر کالی رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اور کمرے کی تاریکی میں سگرٹ کا آتشیں سرا مریخ کی طرح دمک رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا — "وہ یہاں کب آئی — کیوں آئی؟ — یہاں ٹھیک میرے مکان کے قریب — بالکل میری ہمسائیگی میں! — کیا اس میں کوئی پوشیدہ مفہوم یا ارادہ شامل ہے — یا پھر یہ محض ایک اتفاق ہے؟ — اگر اس کے معنی ہیں تو کیا؟ — اگر یہ صرف اتفاق ہے تو عجیب؟ — لیکن کچھ بھی ہو۔ مجھے اس جھگڑے سے غرض ہی کیا؟ — کوئی کسی کے قریب آ کر بستا ہی تو رہا کرے۔ سب اپنی اپنی زندگی کی لکیروں پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور اگر یہ لکیریں کسی جگہ ٹیڑھی میڑھی ہو کر ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی بھی گذر جاتی ہیں تو داہنے بائیں ادھر اُدھر مڑ کر دیکھنے سے کیا فائدہ؟ — جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو۔ بیکار سر کھپانے سے کیا مل جائیگا۔ وہ اب بتیس سال بعد اپنے حصے کی ٹھوکریں کھاتی میرے قریب تک بھٹک آئی ہے تو آیا کرے۔ دُنیا بھی تو اسی کا نام ہے۔ وقت کا کوئی سیلاب پھر آئیگا اور اسے پھر کسی اور طرف بہا لے جائیگا۔ مگر — مگر — اُف! — اتنے نزدیک! — جوانی کی ایک پُرآشوب یادگار کو اسقدر نزدیک محسوس کرنے کے بعد کوئی بھی اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکتا — ایک اخلاقیات کا ناستک فلسفی بھی نہیں!"

اور پھر یکایک مجھے اس کے آخری خط کا خیال آیا — "کیا وہ اب اتنے سال بعد خود اس کا جواب لینے آئی ہے؟ — کیا دیوانی تو نہیں ہو گئی وہ؟ — جوانی کی ایک فراموش شدہ لغزش کو یاد دلا کر کیا وہ مجھے بھی اپنے سلسلہ پاگل بنانا چاہتی ہے؟ — تو پھر وہ براہِ راست میرے پاس کیوں نہیں چلی آئی؟ — مگر توبہ؟ — نہیں اُسے یہاں میرے پاس نہ آنا چاہئے۔ میری زندگی کے واسطے وہ ایک "خطرہ" ہے۔ ہم دونوں بیس سال پہلے مر چکے۔ اب "وہ" ہے اور "میں" — یہ دونوں ضمیریں مل کر "ہم" نہیں بن سکتیں۔"

خیالات کی کشمکش میں نہ جانے میں کیا کیا سوچتا رہا میرا ماضی اور حال ایک دوسرے سے ایک فیصلہ کن جنگ کرنے میں مشغول تھے سمندر کی دو زبردست موجیں پیہم اُٹھ اُٹھ کر ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں اور ان کے درمیان ایک چھوٹا سا تنکا بھٹک رہا تھا — کبھی اِدھر — کبھی اُدھر!

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میں بتا نہیں سکتا کہ کیوں ہوا۔ مجھے یہ یاد ہے کہ میرے جسم میں چنگاریاں سی بھری ہوئی تھیں اور میں برہنہ پا اپنے بالاخانے کے زینے سے چپ چاپ اتر رہا تھا۔ اندھیری فضائیں اب سے بتیس سال پہلے کی ایک رات مجھے ہاتھ پکڑ کر کسی طرف

لئے جا رہی تھی۔ چند لمحات کے بعد میں رعنا کے زینے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دروازہ نیم وا تھا — میں چپ چاپ اوپر چڑھتا چلا گیا۔ زینے کے اختتام پر اوپر کمرے کا دروازہ بند تھا اور کواڑوں کے بالائی حصے کے دو شیشے کمرے کی روشنی سے منور تھے۔ میں نے اپنے تیز تنفس کو درست کرنے کیلئے ایک ساعت کے واسطے دم لیا اور تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کو اپنے ہاتھ سے دبا دیا — اور پھر — پھر میں نے شیشے میں سے ذرا سا اچک کر اندر کی طرف ایک نظر ڈالی — منظر کی حیرتناکی نے مجھ پر سکتہ سا طاری کر دیا!

اندر منور و آراستہ کمرے کے عین وسط میں دبیز قالینوں کے اوپر وہ پورے انہماک کے ساتھ رقص کر رہی تھی — بالکل تنہا!! جسمانی آرائش کی تکمیل کے باوجود یہ اب وہ حشر پرور رعنا نہ تھی جسے میں نے اپنی نفسانی پرستش کے واسطے ایک شب کیلئے خریدا تھا۔ اس کے چہرے کے تمام خطوط بتا رہے تھے کہ وہ اب اس منزل میں تھی جو شباب و شیب کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ اس کی جوانی کی ناگن اپنے پیچھے جو لکیر چھوڑ گئی تھی اب وہ اس کے رخساروں پہ — گردن کے آغوش میں، اور ابروؤں کے درمیان خفیف سی شکنیں بن کر نمودار ہو چلی تھی — مگر اس کی آنکھیں! — اُف — یہ دو بجلیاں ابھی تک ٹھنڈی نہ ہوئی تھیں۔ اس کے صبیح جسم کا حیرت انگیز تناسب اس وقت تک درہم برہم نہ ہوا تھا۔ جسمانی آرائش کی جتنی سحرکار ادائیں اسے یاد تھیں آج وہ سب اس نے بیک وقت صرف کر دی تھیں۔ سر سے پاؤں تک پوری قیامت بننے کے واسطے آج رات اس نے اپنی ساری گذری ہوئی جوانی کو کھینچ لانے کی ایک حیرتناک کوشش کی تھی۔ ایک نظر دیکھنے پر مجھے یہ خیال بھی نہ ہو سکا کہ میں بیس سال بعد اسے دیکھ رہا ہوں۔ میں پوری محویت کے ساتھ چپ چاپ دیکھ رہا تھا — وہ بالکل تنہا پورے جوش کے ساتھ رقص کر رہی تھی



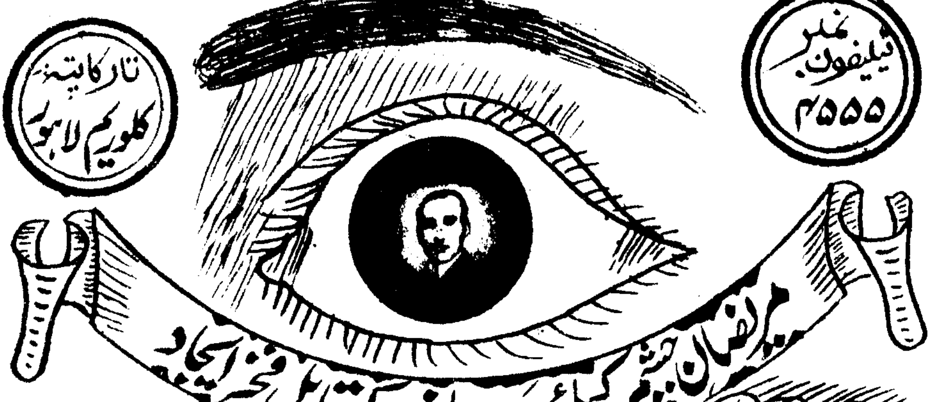
یکا یک تحیر کے ایک جھٹکے سے میرا دل اچھل کر لبوں تک آ گیا — میری آنکھیں کھلی رہ گئیں — اُف! میرے معبود!! — ایک عجیب خوف کے ساتھ میں نے دیکھا کہ رعنا اس وقت وہی رنگین زرکار لباس پہنے ہوئے تھی جو اس نے بیس سال پیشتر اس رات پہنا تھا!!

منظر کے تباہ کن اثرات اب میرے ضبط سے بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ کانپتے ہوئے پاؤں اور لڑکھڑاتے ہوئے ہوش و حواس پر اب میری آخری گرفت بھی ڈھیلی ہو چلی تھی۔ کئی بار ایک زبردست چیخ کلیجہ سے تڑپ کر بالکل لبوں تک آئی مگر میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبا لیا — آخر پوری ہمت کے بعد میں آہستہ آہستہ زینے سے نیچے اترا۔ دو ایک دفعہ مجھے شبہ ہوا جیسے وہ دروازے کے شیشوں میں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں نے مڑ کر اُدھر نگاہ ڈالی مگر وہاں کچھ نہ تھا۔

اس واقعہ کے کئی روز بعد تک میں کالج نہ جا سکا میرے سارے علمی مشاغل یک لخت بے کیف ہو گئے اور فلسفۂ اخلاقیات کی کتابیں ایک دفتر بے معنی محسوس ہونے لگیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میری موجودہ دنیا کے تمام اجزا اچانک برہم و بے ربط ہو کر اس طرح بکھر گئے تھے جیسے زلزلے کے ایک زبردست جھٹکے سے آبادی کی عمارتیں منہدم ہو کر رہ جائیں۔ زندگی کے اس پریشان شیرازے کو مجتمع کرنے کیلئے وقت اور ایک پُرقوت ذہنی و روحانی کوشش کی ضرورت تھی لیکن میں اس کوشش کے واسطے خود کو بالکل کمزور پا رہا تھا۔ میرے دل و دماغ کی تمام قوتیں ایک مسلسل فکر و غور میں ختم ہوئی جا رہی تھیں رات دن — ہر وقت — میں سوچ رہا تھا کہ آخر ان سب واقعات کا مفہوم کیا ہے۔ رعنا یہاں آ کر کیوں رہ پڑی ہے؟ رات کے سناٹے میں اپنے کمرے کے اندر بالکل تنہا وہ رقص کیوں کر رہی تھی؟ اس حیرتناک رقص کے واسطے اس نے اسقدر زینت و آرائش کا اہتمام کس لئے کیا تھا؟

تار کا پتہ: کلوریم لاہور

ٹیلیفون نمبر ۴۵۵۵



پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ

دوسرے پیدائشی اندھے کے آنکھوں کی تمام بیماریوں کو شفا دینے میں اکسیر اعظم ہے۔ اس کے استعمال سے زائد از ۲۵۰۰۰ آنکھوں کے وہ لاعلاج مریض جنکو آنکھوں کے ماہر ترین ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دیا تھا۔ سو فیصدی اچھے ہو گئے۔

مبلغ دس ہزار روپیہ انعام

پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ عرصہ چودہ سال سے ہندوستان و دنیا کے کونے کونے سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔ نقالوں کی فرضی ادویات کی عمر ایک سال سے بھی زیادہ نہیں اسلئے اگر کوئی شخص یہ ثابت کرے کہ پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کے کیساتھ ملتے جلتے نام کی کوئی بھی آنکھوں کی دوائی پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ سے پہلے کی ایجاد کردہ رجسٹرڈ ہے تو ایسے شخص کو مبلغ دس ہزار روپیہ نقد انعام دیا جاوے گا۔

خبردار! پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ اور ریڈیم آئی ڈراپ دو نو مختلف چیزیں ہیں۔ پرل کلوریم آئی ڈراپ کا ریڈیم آئی ڈراپ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

چراغ تلے اندھیرا

نقال خود کو لوگوں کو عینکوں کے اُتروانے کے دعویدار بنتے ہیں۔ لیکن جائے حیرت ہے کہ خود عینک لگائے پھرتے ہیں۔ اور بغیر عینک لگائے ان کیلئے کام تک کرنا مشکل ہے ایسے نقالوں کی ادویات سے ہوشیار رہیں۔

نقالوں سے خبردار

پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کی غیر فانی شہرت کو دیکھکر تھوڑے عرصہ سے نقال پیدا ہو چکے ہیں۔ انکے فریب اور ہتھکنڈوں سے بچیں۔ اور آنکھوں جیسی نعمت غیر مترقبہ کو مصنوعی ادویات سے نقصان پہنچائیں۔

قیمتیں: سپیشل پوٹینسی گیارہ روپے

چار آنہ نارمل پوٹینسی کلاں چار روپے چار آنہ۔ خورد دو روپے چار آنہ

علاوہ محصولڈاک خرچہ پیکنگ۔ ہر چہ ترکیب استعمال ہر زبان میں ہمراہ بھیجی گی

سات دن میں بالکل نابینا آنکھوں میں بینائی واپس شیخ محمد عیسیٰ صاحب بمقام پانی مانس (اٹرودا) اپنی چٹھی مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۱ء تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مریض جسکی آنکھوں میں قطعی روشنی نہ تھی۔ اس کیلئے ساری دنیا اندھیر تھی۔ آپکی دوائی کے سات روزہ استعمال سے اسکی بینائی لوٹ آئی ہے۔ اور اب چلتی پھرتی چیزوں کو دیکھنے لگ گیا ہے۔ اسلئے فوراً مزید دوائی بذریعہ وی پی ارسال کریں۔

نقال کا حشر۔ فاضل مجسٹریٹ واسسٹنٹ کمشنر لاہور بی اے قریشی اسکوائر کے فیصلہ کا خلاصہ۔ ڈاکٹر ایچ آر شرما موجد پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ نے پی سی سہگل (دیوریند سہگل) کی حقیقت بیان کر کے قوم اور پبلک پر بڑا بھاری احسان کیا ہے۔ پی سی سہگل کی حیثیت ایک نقال سے زیادہ نہیں ہے "He is no better than quack" اور وہ فرضی ڈاکٹر ہے۔ اور ہندو کو خود ... ہے۔ کہ وہ لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے

... دوائی خریدتے وقت ڈاکٹر ... آر شرما موجد دوائی ... فوٹو کا ٹریڈ مارک ... دیکھکر خریدیں۔

مقامی مریض موجد کے مشورہ سے صبح ۹ بجے تا ۱۱ بجے مفت فائدہ حاصل کریں۔

لوکل چیف ایجنٹ میسرز بیلی ام اینڈ برادرز انار کلی لاہور۔ لوکل ایجنٹس میسرز نند اس بھگوانداس انار کلی لاہور میسرز ڈاکر کشن چند اینڈ کمپنی لمیٹڈ چوک انار کلی لاہور میسرز ہیرو دیپ چوک انار کلی لاہور۔ دیگر ایجنٹس:۔ ڈاکٹر گنگا سنگھ اندرون کچہری بازار پشاور۔ ملتان سردار حکم سنگھ محلہ کمانگراں علاقہ حسین آگاہی ملتان شہر۔ امرتسر۔ ڈاکٹر مدن لال اینڈ کمپنی ہال بازار۔ میسرز سرین میڈیکل ہال کٹڑہ بریاں لدھیانہ۔ سی بھان اینڈ کمپنی۔ ڈاکٹر امرناتھ سیٹھ کچہری روڈ گوجرانوالہ۔ جگدیش میڈیکل سٹورز پرانی منڈی شملہ۔ میسرز جگن ناتھ چونی لال جنرل مرچنٹ لوہر بازار ساہیوال۔ ڈاکٹر اندر سنگھ نرنجن سنگھ

مینیجر پرل اینڈ کمپنی رجسٹرڈ کوٹھی نمبر ۹۔ ایبٹ روڈ لاہور

اپنے شہر کے مشہور دوا فروشوں سے طلب کریں

—— اور پھر —— وہی زرکار رنگین لباس کیوں منتخب کیا گیا جو میری گنہگار رات کی یادگار تھا؟؟ —— ان سوالات کے تاریک گرداب میں میرے ہوش و حواس کا سفینہ پیہم چکرا رہا تھا کبھی کبھی دور ایک ساحل سا نظر آتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے میں وہ خود ایک تباہ کن گرداب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

کیا اُسے مجھ سے محبت تھی؟ —— کیا وہ جو دُنیا میں کسی کی نہیں ہو سکتی تھی ایک نامعلوم اعجاز خدمات کے تحت میری بن گئی تھی؟ —— اُس کا یوں بالکل اچانک میرے قریب کھنچ آنا —— اور پھر وہ لباس! —— کیا ان سب امور کے پیچھے ایک محبت بھرا دل دھڑک رہا تھا؟ —— مگر نہیں —— وہ ایک حسن فروش تھی۔ اس کے پہلو میں دل ہی کب تھا؟ —— اور محبت اُس سینے میں کہاں آباد ہو سکتی ہے جس کے اندر دل کی جگہ ایک خوبصورت پتھر رکھ دیا گیا ہو؟ —— اپنے آخری خط میں کیا اس نے صاف صاف اور ہمیشہ کیلئے یہ نہیں بتا دیا تھا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی —— لیکن اُف! —— کون جانتا ہے کہ جب عورت "نہیں" کہتی ہے تو اس کا مطلب "ہاں" ہوتا ہے! —— کسی کو بھلا کیا خبر کہ وہ جب چاہتی ہے تو کس طرح چاہتی ہے!! —— سوچتے سوچتے میں بالکل تھکا جا رہا تھا شاید یہ ہو —— شاید وہ ہو —— نہیں یہ نہیں —— نہیں وہ بھی نہیں!

تو کیا وہ پاگل ہو گئی تھی؟ —— آخر اُس نے بھی تو کسی زمانے میں دُنیا بھر کے ہوش و حواس کو لوٹا تھا، کہیں آج دُنیا اسی کا تو انتقام نہیں لے رہی تھی؟ —— اس خیال سے بیتاب ہو کر کئی مرتبہ جی میں آیا کہ بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں گھس جاؤں اور پوری قوت سے اس کا گلا دبا کر پوچھوں کہ —— "دیوانی! کیا اب بھی تیری قدیم غارت گری کی عادت نہیں گئی؟ —— تجھے کیا حق ہے کہ اپنے ساتھ اچھے خاصے انسانوں کو دیوانہ بناتی پھرے؟ —— جا! —— گناہ کے جس فریب کدے میں تو نے اپنی جوانی اور ہوش و خرد کو تباہ کیا ہے اُسی جگہ اپنی موت کو تلاش کر!" —— مگر ان جذبات و خیالات کے ساتھ ہی ساتھ ہر مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ میں خود اپنی ذات سے جنگ کر رہا ہوں اور خود میرے مرتعش ہاتھوں کی گرفت میں میرا حلقوم اپنے پھنسے ہوئے سانسوں کے واسطے جدوجہد کر رہا ہے ایسے ہی موقعہ پر زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ یہ عجیب خواہش سی کبھی کبھی بیدار ہوتی تھی کہ کاش وہ دیوانی ہی ہوتی —— اور میں بھی —— اور پھر ہم دونوں مل کر خوب ہی رقص کرتے! —— کس قدر لغو و بیہودہ خیال تھا یہ! —— شاید یہ میری دماغی تھکاوٹ اور ذہنی انتشار کی پیداوار تھا۔

غالباً ایک ہفتے کے بعد ایک دوپہر کے وقت میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور حیرت کے عالم میں صرف ایک ساعت کیلئے میری نظروں کی قوت سلب سی ہو گئی۔

میرے بالکل قریب وہ اچانک کہیں سے نمودار ہو گئی تھی!

کس قدر حیرت کی بات تھی کہ وہ یکایک یوں سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی تھی! —— مگر شاید اس سے بھی زیادہ تعجب خیز چیز یہ ہے کہ ہم دونوں یوں اچانک دوبدو ہو جانے سے کچھ زیادہ سراسیمہ نظر نہ آتے تھے ہم میں سے کسی کو بھی اُن الفاظ کے تبادلہ کی ضرورت محسوس نہ ہوئی جو دو تقریباً اجنبی انسانوں کی پہلی ملاقات کی ابتدا ہوا کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ ہم دونوں اس ناگہانی ملاقات کو بالکل متوقع اور فطری چیز سمجھے ہوئے تھے۔

میں نے پورے سکون و سنجیدگی سے کہا۔ "بیٹھ جائیے"

اور اتنے ہی سکون و سنجیدگی سے وہ میرے بالمقابل ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں نیلے رنگ کا ایک لفافہ تھا جس سے اس کی انگلیاں غیر ارادی طور پر کھیل رہی تھیں۔

چند ساعت کے بعد میرے کانوں نے اسکی دھیمی اور شیریں آواز سُنی۔ یقین نہ آیا کہ یہ آواز بیس سال بوڑھی ہو گئی ہے۔

"زحمت نہ ہو تو ذرا یہ خط پڑھ دیجئے" اس نے کہا اور میری طرف وہ لفافہ بڑھا دیا۔ میں نے دیکھا اس کی انگلیاں انتہائی خفیف طور پر کانپ رہی تھیں —— میرے ہاتھ سے بہت کم؟

میں نے خاموشی کے ساتھ اس سے خط لیا۔ یہ خط انگریزی زبان میں تحریر تھا۔ میرا پہلا خیال تو یہ تھا کہ یہ تحریر اس کے کسی قدیم طالب کے فرسودہ جذبات کی امین ہو گی لیکن خط کے بالکل ابتدائی الفاظ نے میرے اس خیال پر بجلی سی گرا دی —— سُنیئے —— اس کا مفہوم کچھ ایسا تھا: ——

"میری پیاری امّی! —— تمہارا محبت انگیز خط مجھے آج ہی ملا ہے۔ فوجی زندگی میں زندگی کی وقعت نہیں ہوتی مگر اپنی امّی کی پیاری تحریر دیکھ کر شاید کوئی بھی جانباز سپاہی ایسا نہ ہو گا جسے کم از کم تھوڑی سی دیر کے واسطے اپنی جان عزیز نہ ہو جائے۔ جانتا ہوں کہ تم ایک طوائف ہو اور میں تمہارا بدنصیب بیٹا —— اور اس لئے اس لمبی چوڑی دُنیا میں میری ہستی سے زیادہ ذلیل شاید ہی کوئی مل سکے مگر تمہارے ہر ایک خط کو پڑھنے کے بعد نہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہونے

لکھتا ہے کہ میری امی ایک معصوم ترین عورت ہے اور میں دُنیا کا سب سے زیادہ مقدس و خوش بخت انسان! ——— مجھے خبر ہے کہ میرا باپ کوئی نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو میرے واسطے وہ ہمیشہ سے مُردہ رہا ہے۔ مگر امی! جسے تم جیسی ماں مل جائے اُسے تمہارے علاوہ اور چاہئے بھی کیا! ——— خطوط کے جواب تم بھی انگریزی میں ہی لکھاتی ہو ——— یہی بہتر ہے! ——— یہاں کسی کو معلوم نہیں کہ میں کون ہوں اور انگریزی پڑھ لینے والے یہاں انگریزوں کے علاوہ کوئی نہیں ——— اچھا رخصت ——— ابھی سے جواب کا انتظار شروع کر دیا ہے۔

تمہارا فرید جمال"

میں خط کا مفہوم سر جھکائے اُسے بتا رہا تھا۔ اختتام پر میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ اس کے رخسار آنسوؤں سے شرابور تھے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا سارا کمرہ ایک خوفناک رفتار سے گھوم رہا ہے۔ خاموشی اذیت ناک تھی۔ صرف کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے میں نے کہا ——— "فرید جمال کو میں جانتا ہوں۔ وہ دو سال تک میرے کالج میں طالب علم رہ چکا ہے ——— مگر ——— فرید ——— تمہارا....."

"جی ہاں ———" اس نے آنسو خشک کرتے ہوئے کمال بے نیازی سے کہا اور ذرا سا رک کر پھر بولی۔ "تکلیف نہ ہو تو اس خط کا جواب انگریزی میں لکھ دیجئے۔"

میں نے لکھنا شروع کیا وہ بتاتی رہی۔ اپنے بیٹے کی یاد ——— اپنی محبت کی شدت ——— ملنے کا اشتیاق ——— ان چند عنوانات کو وہ بار بار مختلف جملوں میں نمایاں کرتی رہی اور میں نے محسوس کر لیا کہ اس کی مامتا ایک انتہائی زبردست پرستش کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ایک طوائف ہوتے ہوئے بھی وہ ایک اسقدر شدید اور پاکیزہ محبت کی حامل تھی جو فرشتوں کے جذبۂ پرستاری سے بھی کہیں زیادہ لانہایت نظر آتا تھا۔

اس واقعہ نے میری زندگی میں جو انقلاب پیدا کیا وہ اتنا ہی حیرت انگیز تھا جتنا میرا ایک گناہگار نوجوان سے اخلاقیات کا ایک پروفیسر بن جانا۔ ہر ہفتہ وہ مجھ سے اپنے لڑکے کا ایک خط لا کر پڑھواتی اور اس کا جواب لکھواتی۔ اتوار کے دن میں صبح سے ہی اس کے آنے کا انتظار کرنے لگتا اور دوپہر تک کئی مرتبہ اس کے بالاخانے کے دروازے کو دیکھ دیکھ کر آ بیٹھتا۔ متعدد بار یہ ارادہ کیا کہ اُس کی موجودہ زندگی کی بابت اس سے سب کچھ پوچھ ڈالوں اُس رات اس کے حیرتناک رقص کی وجہ دریافت کروں وغیرہ ——— ان اسرار کو بے نقاب کرنے کیلئے میں اس کی عدم موجودگی میں سراپا اضطراب رہتا تھا مگر جب وہ آتی تو اس کی انتہائی بے نیاز سنجیدگی ایک موٹی دیوار کی طرح درمیان میں حائل ہو جاتی تھی۔ کم از کم اس چیز کا مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اُسے مجھ سے محبت نہ تھی اور نہ وہ ایک پاگل عورت ہی تھی۔ لیکن اس یقین کے باوجود میرا دل کسی نامعلوم بوجھ کے نیچے دبا چلا جاتا تھا کتنی عجیب تھی اس کی ہستی! ——— وہ جس نے محبت اور گناہ کے کھلونوں سے کھیل کھیل کر اپنی جوانی اور اپنی نسائیت کے ہر ایک پاکیزہ جذبے کو کچل کچل کر رکھ دیا تھا آج بظاہر اپنے بیٹے کے لئے ایک راہبہ کی سی پراسرار زندگی گزار رہی تھی ——— وہی بیٹا جو خود اس کے ایک گناہ کی یادگار تھا اور جس کی ہستی اس کے واسطے ایک مستقل شرم و ذلالت سے کم نہ ہونی چاہئے تھی! ——— کیا اُس کی فطرت کی یہ پاکیزگی اس قابل نہ تھی کہ دنیا کے سارے زہد و اخلاق کو اس کے قدموں پر نثار کر دیا جائے؟ کیا سماج کی ایک "باعصمت و شریف عورت" ماں بن کر اس سے زیادہ کچھ اور کر سکتی تھی؟ ——— مگر اپنے اندھے اصولوں کے سہارے جینے والے سماج کے پاس آنکھیں کہاں ہیں جو گناہوں کی تاریکیوں سے اچٹ کر دور اڑنے والی چنگاری کو دیکھ سکیں!

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ اب مجھے اس سے ایک محبت انگیز ہمدردی سی ہوگئی تھی ——— ایک عقیدت سی ——— جس کا پورا مفہوم مجھے بہت دنوں تک معلوم نہ ہو سکا۔ میں نے اس کے لئے بہت سے خط پڑھے ——— بہت سے جوابات لکھے ——— اور رفتہ رفتہ ظاہری اجنبیت و سنجیدگی کے باوجود میں نے دیکھا کہ وہ خط سُن کر رو پڑتی ہے تو میرے کلیجے میں بھی ہوک سی اُٹھتی ہے اور وہ جواب لکھاتے وقت اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے تو میں وہ کچھ لکھ جاتا ہوں جو اس نے نہیں کہا ——— کیا "وہ" اور "میں" ایک بار پھر باہم مل کر "ہم" ہو رہے تھے؟ ——— آہ! آپ مجھے معاف فرمائیں جو میں یہ کہوں کہ کبھی کبھی تو میں اس کی سنجیدگی و اجنبیت سے دیوانہ سا ہو جاتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کچھ وہ کہے ——— کچھ میں کہوں ——— اور اس طرح مل کر ایک ایسی کہانی ایک دوسرے کو سنائیں جو ہمارے تمام ظاہری سماجی امتیازات پر ایک نیند سی طاری کرتی چلی جائے مگر اُف رے ——— اس کی وہ بے نیازی و اجنبیت! ——— میرے الفاظ لبوں پر آ آ کر مر گئے مگر وہ کم از کم میرے لئے ایک پتھر کی طرح بے حس تھی۔ کیا وہ مجھ سے انتقام لے رہی تھی؟ ——— انتقام اس کا کہ میں نے آج سے بیس سال پہلے اُسے وہ

کچھ کیوں نہ سمجھ سکا جو آج سمجھ رہا تھا ـــــ اس خیال کے تحت اکثر دل چاہتا تھا کہ دوڑتا ہوا اس کے قدموں پر جا گروں اور اپنے آنسوؤں کے طوفان سے بیس سال کی اس خلیج کو جو اس کے اور میرے درمیان حائل ہو کر رہ گئی تھی بالکل سطح ساحل تک لبریز کر دوں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ہفتے میں ایک بار میرے پاس آنے کے باوجود اور زیادہ بے نیاز۔ خوددار اور اجنبی بنتی جا رہی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے میرے سامنے رونا بھی چھوڑ دیا ـــــ خطوط بہت مختصر لکھانے لگی اور وہ ہر بات اختیار کرتی گئی جو ہماری اس ہفتہ وار مختصر ملاقات کو اور بھی زیادہ مختصر بنا سکتی تھی۔ یہ وہ نشتر تھا جسے میں اپنے تمام ارادے کے باوجود ضبط نہ کر سکتا تھا جس قدر وہ دور ہوتی گئی میں اتنی ہی ٹھوکریں کھانے لگا۔ دنیا اور دنیا والوں سے بے نیاز ہو کر میں ایک بے پناہ عقیدت کے ساتھ اسے پوجنے لگا اور سراپا مجروح ہونے پر بھی اس کے دامن خیال کو پکڑے رہا محض اس خوف سے کہ اگر وہ اسی طرح دور ہوتے ہوتے کہیں گم ہو گئی تو پھر اپنے سجدوں کے واسطے اس منافق دنیا میں مجھے کس کا سنگ آستاں مل سکیگا!

مگر عین اسوقت جب میں اس کے تدریجی احتراز سے تقریباً دیوانہ ہو چکا تھا۔ اس نے میرے ہاتھوں سے گھسیٹ کر اپنا دامن چھڑا لیا!

غالباً دو ہفتے سے وہ خط لکھانے نہ آئی تھی۔ کئی بار اس کے زینے پر آخر تک چڑھ کر میں اپنا دھڑکتا ہوا دکھتا ہوا دل لئے واپس چلا آیا۔ اس کا کمرہ اندر سے بند تھا اور خالی! ـــــ کمرہ کا ساز و سامان بدستور تھا شیشوں میں سے جھانک کر میں نے دیکھا کہ وسط میں وہ قالین بھی اسی جگہ پڑا تھا جہاں میں نے اس رات اسے اپنے تنہا رقص میں منہمک پایا تھا۔ مگر صرف وہی وہاں نہ تھی اور اندرونی کمروں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ تھا ـــــ اُف! میری بینائیاں!! ـــــ آپ شاید نہ سمجھ سکیں ایک نازک ریشمیں کپڑے کو کسی خاردار جھاڑی پر ڈالکر پوری قوت سے کھینچ لیا جائے تو شاید وہی حال ہو جو اسوقت میرے کلیجے کا تھا۔ جذبات کے مستقل ہیجان نے میری ساری قوت حیات ختم سی کر دی اور میں کئی روز تک شدید تپ و لرزہ میں مبتلا ہو کر اپنے ماحول سے غافل پڑا رہا۔

〰〰〰

اور پھر وہ صبح! ـــــ اُف ـــــ موت بھی اُسے نہ بھلا سکے گی!!

یہ تیسرا اتوار تھا۔ علالت کے اثرات کے بعد پہلی بار میری آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں سب سے پہلی چیز جس نے میری نظر کو متوجہ کیا وہ میرے تکیہ کے قریب رکھا ہوا ایک لفافہ تھا۔ میں نے دیکھا اور دل دھک سے ہو کر رہ گیا ـــــ وہی نیلے رنگ کا لفافہ! ـــــ وہی لفافہ کا نفیس کاغذ! ـــــ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے اسے چاک کیا اور جو کچھ پڑھا اسے آپ بھی پڑھ لیجئے:۔

"اسلم! ـــــ تمہارے نام سے پیشتر میں کوئی اچھا سا لفظ لکھنا چاہتی تھی مگر نہ لکھ سکی۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس ایسا کوئی نیا لفظ ہی باقی نہیں رہا۔ میں نے اپنے سارے خوبصورت الفاظ تو اسی رات تمہارے واسطے استعمال کر دئے تھے جب ہم دونوں نے آج سے بہت پہلے کھلی آنکھوں ایک سہانا خواب دیکھا تھا۔ اس خواب میں یکسر گناہ و معصیت کا امتزاج سہی مگر اسکی تعبیر کتنی مقدس و پاکیزہ تھی یہ تم کیا سمجھو! ـــــ اس "تعبیر" نے مجھے دین و دنیا کی کیا کیا نعمتیں عطا کی ہیں یہ میں بتانا چاہوں تو بتا نہ سکوں گی اور ممکن ہے تم ان کا اعتبار بھی نہ کرو ـــــ سمجھے تم میں کیا کہہ رہی ہوں؟ ـــــ سنو! تم نے مجھے عورت سے "ماں" بنا دیا اور اس طرح وہ کچھ دیدیا جو کوئی عورت صرف عورت رہتے ہوئے کبھی حاصل نہیں کر سکتی۔ فرید جمال جیسی بے بہا معصوم ہستی تم نے میرے گنہگار آغوش میں سونپ دی! ـــــ آہ کتنا غیر فانی احسان عظیم ہے یہ تمہارا! ـــــ تمہاری اس مقدس عنایت کی ممنونیت میں میری روح ابد تک سرشار رہے گی ـــــ اور پھر تمہارا یہ کرم کہ تم نے ایک دکھیا کے بچے کو اپنے فیضان علم سے نوازا ـــــ ہاں یقیناً میرے پاس کوئی ایسا لفظ نہیں جو تمہارے نام سے پیشتر لکھ کر اپنی منت پذیری اور احسان مندی کا اظہار کر سکوں۔ کاش میں کسی قابل ہوتی اور صرف اتنا کر سکتی کہ تم مجھے احسان فراموش نہ سمجھ سکتے!

مگر شاید تمہیں یہ علم نہیں کہ تمہاری محبت بھری یاد کی اس یادگار کو میں آخر کار اپنے پاس نہ رکھ سکی۔ یہ بڑی دردناک داستان ہے اسلم! ـــــ میں تمہیں سنانا نہ چاہتی تھی مگر تو کیا کروں ـــــ ہاں تو تم شاید نہیں جانتے کہ میرا فرید آخر مجھ سے روٹھ گیا۔ تمہارے فلسفۂ اخلاق و مذہب۔ تمہارے سماج کے بے رحم اصول۔ تمہاری دنیا کی نابکار پاکیزگی و تقدس ـــــ ان سب نے مل کر میرے بچے کو مجھ سے خفا کر دیا۔ وہ یہ نہ سہہ سکا کہ دنیا اُسے گناہ کی یادگار کہہ کر نفرت بھری نظروں سے دیکھے۔ اس سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ وہ اس ماحول میں سانس لے

میرے پسندیدہ اشعار

از جناب نکہت باندہ

مرے سینے پہ رکھ دیتے ہیں گھبرا کر وہ ہاتھ اپنا
بڑی تسکین مجھ کو اضطراب دل سے ہوتی ہے (متین یادگار داغ)

مذاق بندگی عصر نو کی مجھ کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر (جوش ملیح آبادی)

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آواز اذاں سے (اقبالؒ)

زہرابہ فنا جسے نشو و نما نہ دے
وہ زندگی فراق کوئی زندگی نہیں (فراق گورکھپوری)

کسی پر مٹ کے رہ جانا ہی حسرت
ہمیں کیا کام عمر جاوداں سے (حسرت موہانی)

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا (فانی بدایونی)

اگر ہو ذوق پرستش جمال عریاں کی
تباہ ہونے کو کافی ہیں چاندنی راتیں (اختر مچھلی شہری)

جہاں ہر شخص اُسے "ایک طوائف کا بیٹا" جانتا تھا۔ سماج کے طنز و استہزاء اور حقارت و نفرت کو اُس کا حسّاس دل، روشن دماغ اور پاکیزہ فطرت بہت دنوں تک بے اعتنائی سے دیکھتی رہی مگر آخر کہاں تک؟ —— ایک روز وہ اپنی ذلیل ماں کو تنہا چھوڑ کر دُنیا کی وسعتوں میں کہیں گم ہو گیا اور اپنے بعد صرف اتنی سی تحریر چھوڑ گیا کہ —— "امّی! میں جا رہا ہوں اس جگہ جہاں کوئی یہ نہ جان سکے کہ میں ایک گناہ کا زندہ نقش ہوں۔"

اور اس روز سے آج تک —— زندگی کے آخری دن تک —— میں نے اپنے لال کو نہیں دیکھا۔ یہ موت سے زیادہ اذیت انگیز زمانہ میں نے جس طرح بسر کیا ہے اُسے کوئی کیا جانے؟ —— آلام و مصائب کے فلک بوس پہاڑ ایکدم ٹوٹ کر میری روح پر آ پڑے اور میں مجبوراً سسکتی رہی۔ صرف اس امید میں کہ شاید میرا بچہ اپنی دکھیاری ماں کو ڈھونڈتا ہوا بھولے سے آ نکلے! —— میں نے ساری دُنیا کی خاک چھان ڈالی —— زمین کی ساری وسعتوں میں اپنی گھائل ماں کو لئے ہوئے اپنے فرید کو ڈھونڈتی پھری —— مگر ناکام! —— لیکن پھر بھی یہ امید کسی طرح ختم نہ کر سکی کہ فرید آئے گا —— کبھی نہ کبھی آئے گا!! —— اس امید نے جینے پر مجبور رکھا اور جینے کی ضرورت نے نئی نئی خود فریبیاں سکھائیں ورنہ بھلا یوں بے آسرے کوئی کیسے جی سکتا ہے۔ تم شاید مجھے پاگل سمجھو گے جو میں یہ بتاؤں کہ وہ سارے خطوط جو میں نے تم سے پڑھوائے اور لکھوائے محض فرضی تھے۔ خود کو فریب دینے سے ایک غمزدہ کو کیسا کچھ سکون ملتا ہے یہ تو تم بھی سمجھ سکتے ہو۔ میں ایک اور شخص سے اپنے فرید کی طرف سے خود اپنے نام خطوط لکھاتی۔ پھر انہیں لا کر تم سے پڑھواتی اور جواب لکھاتی تھی۔ ابتدا میں تو مجھے کبھی کبھی اپنی اس حرکت پر خود بھی دیوانگی کا شبہ ہوا مگر رفتہ رفتہ میں اس خود فریبی کی لذّت میں اس قدر جذب ہو گئی کہ اس کے بغیر مجھے زندہ رہنا دوبھر ہو گیا۔ اور سچ مچ یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ سب کچھ ایک حقیقت ہے ——

تم ہنس رہے ہو؟ —— ابھی سے؟ —— ابھی سنو تو سہی کہ میں نے اپنی تنہائیاں کس کس طرح پاگل بن بن کر بسر کی ہیں —— سُنو! —— جب رات ہو جاتی تو میں خود کو تمام ممکن آرائشوں سے آراستہ کر کے خود ہی رقص کرتی —— تنہا —— مسلسل۔ کبھی کبھی تو اس شغل میں ساری ساری رات ختم ہو گئی ہے —— اور ہاں ان تمام موقعوں پر میں وہی زرکار رنگین لباس پہنتی تھی جو اس رات میں نے زیب کیا تھا جب مجھے فرید عطا کیا گیا —— جانتے ہو اپنی اس دیوانگی سے مجھے کیا کچھ تسلّی ملتی تھی؟ —— شاعر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے واسطے بے اختیار شعر کہتا ہے —— مغنی گنگناتا ہے —— اور میں رقاصہ تھی رقص کرتی تھی —— سچ جانو اگر میں ایسا نہ کرتی تو میں واقعی پاگل ہو جاتی۔ آخر دل کے دکھ کو میں کس کو سناتی؟ —— کون سُنتا ایک عصمت فروش کی یہ بپتا؟ —— میں کیسے دُنیا والوں کو یہ سمجھا سکتی تھی کہ ایک طوائف بہرحال "عورت" ہی ہوتی ہے اور اس کے سینے میں بھی ایک انسانی دل ہوتا ہے جو کم از کم اپنے بچے کے واسطے تڑپنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں کچھ کہتی تو وہ ہنس نہ دیتے کہ دیکھو اس ذلیل کسبی کو! —— شریف و باعصمت ماں بننا چاہتی ہے! —— اب بھلا میں یہ کیسے بتاتی کہ ایک طوائف بھی "ماں" بن کر جی اور مر سکتی ہے؟ —— پھر اس صورت میں کس کے سامنے رو رو کر اپنا دل ہلکا کرتی؟ —— اور اگر کچھ بھی نہ کرتی تو کیا خود اپنے ہاتھوں اپنے فرید کو نسیر کر جاتی؟

لیکن آہ اسلم! —— میرے یہ سارے فریب بھی مجھے زندہ رکھنے میں کامیاب ہو سکے —— تمہارا قرب بھی مجھے مزید سانس عطا نہ کر سکا —— میں نے آج تک تم سے ایک لفظ بھی نہیں کہا محض یہ سمجھ کر کہ یہ غم بالکل میرا غم ہے اور اس غم کو تنہا مجھے ہی کھانا چاہئے۔ تمہارے احسانات یوں ہی کیا کچھ کم تھے کہ خواہ مخواہ تمہیں اپنے درد سے بیتاب کر کے محسن کشی کی مرتکب ہوتی لیکن آج جبکہ فطرت مجھ پر ترس کھانے پر مجبور ہو گئی ہے اور نمونیہ کے مہلک اثرات میری زندگی کو ختم کرنے والے ہیں —— ہاں آج ایک بات کہونگی —— یاد رکھنا! —— سُنو —— میں جا رہی ہوں وہاں جہاں خدا کا راج ہے —— سماج کی غلامی نہیں —— یہاں میں اور تم ایک ہوتے ہوئے بھی سماج کے خونخوار جبڑوں کی طرح دُور ہے اور فرید ان جبڑوں کے درمیان گم ہو گیا —— مگر وہاں اپنے "چاند" کے قریب ہم دو ستاروں کی طرح پاس پاس ہی چمکینگے —— ہم دونوں —— ابد تک! —— خدا حافظ! ——

غم نصیب رعنا"

~~~~~~~~~~

بجلی کی طرح تڑپ کر میں اپنی کمزور ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ لڑکھڑاتا ہوا زینے سے نیچے اترا اور سامنے والے بالاخانے پر چڑھ گیا۔ مگر آہ! —— وہاں کچھ نہ تھا! —— دو روز ہوئے لوگ اسے خاک میں دفن کر چکے تھے۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک تاریک کہر چھا گیا۔ میں نے ملازم سے پوچھا جیسے نیند میں کوئی بول رہا ہو —— "یہ خط کب آیا تھا؟"

"پرسوں!" اس کی آواز آئی جیسے کوئی بہت دور سے جواب دے رہا ہو +

(جملہ حقوق محفوظ) ~~~~~ (مسعود [illegible])
~~~~~~~~~~

یورپ کی شہرۂ آفاق رقاصہ!

ایزاڈورا ڈنکن

ایزاڈورا ڈنکن اپنے حسن و جمال اور فن رقص کے کمال کے اعتبار سے غیر معمولی شہرت و امتیاز رکھتی تھی۔ یورپ کے مختلف علوم و فنون کے اساتذہ اور ماہرین اس سے محبت کرتے تھے۔ اور اس کے پرستار تھے۔ اسے فن رقص ہی میں کمال حاصل نہ تھا، وہ ایک بلند پایہ ادیبہ بھی تھی۔ اس کے چاہنے والوں میں بہت سے ادبا اور اہل قلم بھی تھے، جن کے اثر صحبت سے اسے ادبیات میں بھی خاص مہارت حاصل ہوگئی تھی۔ احوال و کوائف کی مصوری اور جذبات کی تصویر کشی میں تو اسے خاص کمال حاصل تھا۔

ایزاڈورا ڈنکن نے اپنی سوانح عمری لکھی تھی جو فن سوانح نگاری کا ایک بہترین اور قابل قدر نمونہ خیال کی جاتی ہے۔ یہ حسین اور نامور رقاصہ انیسویں صدی کے اواخر میں امریکہ میں پیدا ہوئی۔ رقص و سرود کا ذوق و وجدان اس کے خمیر میں شامل تھا چنانچہ اس کے بچپن ہی میں اس کا یہ حال تھا کہ گانا سن کر اس پر ایک کیف و سرور طاری ہو جاتا اور ناچ دیکھ کر اس کی رگوں میں خون رقص کرنے لگتا۔

شاید یہ بات ناقابل یقین معلوم ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ ڈنکن ابھی محض کمسن لڑکی تھی کہ اس نے رقص کی ایک درسگاہ جاری کردی جو آگے چل کر فن رقص کا ایک مرکز بن گئی۔

جس لڑکی کی فطرت میں رقص و سرود کا ذوق شامل ہو اس کے صنفی جذبات کس قدر رنگین ہونگے؟ ڈنکن گیارہ سال کی عمر میں ایک نوجوان طالب علم سے محبت کرنے لگی وہ راستے میں، بازار میں، اپنی کھڑکی میں کھڑی اپنے محبوب کا انتظار کرتی رہتی اور وہ جہاں نظر آجاتا اس کے دیدار سے شوق و تمنا کی پیاس بجھانا شروع کر دیتی لیکن اس نوجوان کو خبر نہ تھی کہ ڈنکن اس سے محبت کرتی ہے اور محبت بھی معمولی نہیں، والہانہ۔ اس کی عشقیہ زندگی کا یہی آغاز تھا۔

ایزاڈورا ڈنکن ایک ترقی پسند لڑکی تھی۔ قدرت نے اس کی فطرت میں شہرت و ناموری کا بے پایاں جذبہ اور کامیابی و کامرانی کا ناقابل شکست عزم ودیعت کیا تھا۔ وہ اسی جذبہ و عزم کو لئے اپنی ماں کے ساتھ امریکہ سے یورپ گئی۔ وہاں ان بیٹی اور ماں کو کون جانتا تھا؟ دونوں طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوگئیں۔ نہ کھانے کا ٹھکانا تھا، نہ رہنے کا۔ ڈنکن روزی کی تلاش میں تھیٹر، سینما اور امرا کی عیش گاہوں میں ماری ماری پھرتی۔ زندگی کے ان سخت ایام میں بھی ڈنکن نے ہمت نہیں ہاری۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی کا رخ پلٹنے لگا۔ اور رفتہ رفتہ یورپ میں اسے شہرت و قبولیت حاصل ہونے لگی۔ اور آگے چل کر تو سارے یورپ میں اسکی دھوم مچ گئی۔

ایک عرصے تک یورپ کو اس کا پتہ نہ تھا کہ ایزاڈورا ڈنکن ایک بے مثل رقاصہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ علم و ادب میں بھی غیر معمولی قدرت و دستگاہ رکھتی ہے۔ لیکن جب اس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری شائع کی تو یورپ کے ادبا اور اہل قلم اس کے ادبی کمالات و محاسن کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اسے حسن زبان اور اسلوب بیان پر جو قدرت حاصل تھی۔ اس سے کتنے ادیب اور اہل قلم بھی محروم تھے۔ ڈنکن میں جرأت و دلیری اور آزاد بیانی و صاف گوئی کی بھی فراوانی تھی۔ اس نے جو کچھ درست سمجھا تھا اسے بے باکانہ قلمبند کر دیا تھا۔ اس لئے بعض نقادوں نے اس کی سوانح عمری پر سخت تنقیدیں کیں جن کے جواب میں ڈنکن نے لکھا۔

"جن لوگوں کو اپنے اخلاق پر فخر و ناز ہے ان کو شاید کسی ترغیب آمیز اور حرص خیز صورت حال کا سامنا نہیں ہوا۔ یا وہ کسی ایسے کام میں منہمک رہتے ہیں جو ان کے جنسی جذبے کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتا۔ ورنہ یہ جذبہ تو ہر شخص میں موجود ہوتا ہے جو نکلنے کا موقع تلاش کرتا رہتا ہے۔"

ممکن ہے تہذیب و اخلاق کے بعض علمبردار ڈنکن کی اس صاف بیانی پر منہ بنائیں لیکن ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس کا یہ کہنا حقیقت سے بالکل خالی ہے؟

لیکن بعض "لمحات" پر تو یہ جذبات پرست

عورت شہوت پرستی کا مجسمہ بن گئی ہے چنانچہ اپنی سوانح عمری میں لکھتی ہے:۔

"انسان تمام دن دماغی کاوشوں میں مشغول اور فکر و تردد میں مبتلا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کچھ لوگ تھوڑی دیر کیلئے میرے حسین اور نازک بازوؤں کے حلقے میں آکر زندگی کے تلخ احوال و کوائف کو بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں، تو اس میں کون سا مضائقہ ہے۔ اسی طرح میں نے جن لوگوں کو راحت وخوشی سے بہرہ ور کیا ہے ان سے امید ہے کہ میری طرح وہ بھی اسکو فراموش نہ کرینگے"

اور ایک جگہ لکھتی ہے:۔

"صرف ایک مرد سے آشنا عورت کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے صرف ایک ہی مصنف کا نام سنا ہو"

ایزاڈورا ڈنکن نے اپنی سوانح عمری میں جس آزادی سے اپنے افسانہائے عشق قلمبند کئے ہیں ان کو دیکھ کر اسکی بے باکی اور عریاں پسندی پر حیرت ہوتی ہے۔

ناولوں اور افسانوں میں ہم جو معاشقے پڑھتے ہیں۔ وہ ڈنکن کے سوانح زندگی کے سامنے فسانے نہیں واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ انسانیت کے موجودہ تہذیبی سسٹم کے مقابلے میں ڈنکن کے طرز زندگی کو دیکھتے ہوئے اسے ایک آوارہ عورت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے محبت بھی کی اور ماں بھی بنی لیکن اس نے اپنی زندگی میں ازدواجی ضابطے کو کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ مردوں کو اور ان کے ساتھ جنسی وظیفے کو ایک آزادانہ طریقہ تفریح سمجھتی تھی وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتی ہے۔

"جو جسم طرح طرح کے امراض اور مفاسد کا مرکز ہو، اس جسم کے ذریعہ اگر تھوڑی دیر کیلئے عیش و راحت حاصل کی جاسکتی ہے تو کیوں نہ حاصل کی جائے؟"

کوئی شخص جو انسانیت کو بہیمانہ طرز زندگی پر قربان نہ کرچکا ہو ایزاڈورا کے اس خیال کی تائید نہیں کرسکتا۔ شادی کے متعلق اس کا خیال تھا کہ ایک کمزور محبت کو ایک مصنوعی تدبیر سے زندہ رکھنے کا نام شادی ہے جس محبت کی فطرت ہی میں نقصان، زوال اور انقلاب مضمر ہو اسے عہد و پیمان کے ذریعہ پائیدار بنانے کی کوشش ایک مضحکہ خیز چیز ہے۔ اسی خوف سے کہ مرد چھوڑ کر چلا نہ جائے اسے باندھے رکھنے کی کوشش کبھی باعزت نہیں کی جاسکتی۔

ایک بار ایزاڈورا نے اعلان کیا کہ وہ ننگے مادر زاد اسٹیج پر رقص کریگی۔ اس اعلان نے اطراف و جوانب میں ایک تہلکہ برپا کردی۔ جو لوگ قدامت پسند تھے ان کا تو ذکر ہی کیا۔ روشن خیالی کے دعویداروں کی پیشانیاں بھی شکن آلود ہوگئیں لیکن اس سے ڈنکن کے ارادے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ مقررہ وقت پر رقص کرنے کیلئے کھڑی ہوئی۔ اس کے رقص کا موضوع "موت" تھا۔ موت کس طرح آتی ہے۔ اس کا کام کیا ہے۔ وہ کس قدر بھیانک ہوتی ہے۔ پھر اس میں کتنی زندگی، کتنی طاقت اور کتنی رعنائیت مضمر ہوتی ہے۔ ان سب کا ڈنکن نے کچھ اس طرح مظاہرہ کیا کہ تماشائیوں پر سکتہ سا طاری ہوگیا اور ایسا معلوم ہوا، لوگوں کے دلوں کی حرکت بند ہو جائیگی۔

لیکن ذرا نسوانی فطرت کی قوت دیکھئے ایسی رنگین طبع، نفس پرست اور عیش پسند عورت ایک اولاد کے مرجانے کی وجہ سے پاگل ہوگئی۔ اس نے زندگی کی ہر راحت وخوشی سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اسے ملک ملک مارے مارے پھرنے اور رو رو کر زندگی گزارنے کے سوا دنیا کی کسی دلچسپی سے واسطہ نہیں رہا۔ وہ کبھی کسی ہولناک جنگل میں پڑی رہتی۔ کبھی سمندر کے سنسان ساحل پر۔ کبھی کسی ویران گاؤں کے کنارے۔ ایسی حوصلہ مند عورت جو ایک روز امریکہ سے پیدل کر یورپ میں عزت و شہرت حاصل کرنے آئی تھی اور غریب الوطنی کے ناقابل برداشت مصائب سے دو چار ہونے کے باوجود مایوس نہیں ہوئی تھی وہ اب زندگی سے اس قدر بیزار ہو چکی تھی کہ وہ ایک بار شام کے دھندلکے میں سمندر میں ڈوب کر جان دینے جارہی تھی کہ اتفاق سے ایک اطالین وہاں پہنچ گیا اور اس نے ڈنکن کو ڈوبنے سے روک لیا۔ وہ اس اطالین کے پیروں پر گر کر رونے لگی اور کہنے لگی ــــ تم مجھے ایک اولاد دو۔ مجھے ایک اولاد دو۔

جب ایزاڈورا کی زندگی تھی تو وہ مرنے کی کوشش کرکے بھی مر نہ سکی اور جب اس کا مرنے کا وقت آیا تو اس طرح مرگئی۔ جب اس کے دماغ میں موت کا تصور تک نہ رہا ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایزاڈورا کو روس سے بلاوا آیا۔ اس بلاوے نے اس کے اندر زندگی کو از سر نو شروع کرنے کا عزم پیدا کردیا۔ وہ روس میں ایک برق رفتار کار پر چلی جارہی تھی کہ اس کے گلے کا رومال کار کے ایک کانٹے سے پھنس گیا جو اس کیلئے پھانسی بن گیا۔

ایزاڈورا نے روس کے اس سفر کے وقت

سودیشی نمائش کی ایک شام

از جناب سردار جلیل شیر کوٹی الہ آباد یونیورسٹی

شام کا ہنگام تھا ساری فضا غمناک تھی
تھی مری دنیائے دل سونی سی اور اجڑی ہوئی
جسقدر میں زندگی کے فلسفہ کو سوچتا
اتنا ہی مقصد سے اپنے دور تر ہوتا گیا
دل تھا پابند خلش اور روح پابند الم
"زندگی کیا ہے؟" یہ کہتا تھا نفس کا زیر و بم

بیٹھے بیٹھے دل جو گھبرایا تو سوچا کیا کریں
جی میں یہ آیا "نمائش دیکھنے ہی کو چلیں"
الغرض میں لڑکھڑاتا، سوچتا اور بے قرار
چل دیا سمت نمائش دل گرفتہ سوگوار
راہ میں کیا کیا خیال آتے رہے میں کیا کہوں
کیوں کوئی درد آشنا ہو اپنے غم میں ہی سہوں
جب نمائش گاہ باقی رہ گئی بس چند گام
دور سے آیا نظر طفل و جواں کا اژدھام
روشنی کا پوچھنا کیا، نور تھی ساری فضا
جا بجا قندیل روشن، جا بجا برقی ضیا
موٹریں، یکے کہیں، رکشا کہیں، تانگے کہیں
آدمی بھی عورتیں بھی اور بچے بھی وہیں
جسقدر بڑھنے لگا اس سمت کو میں دمبدم
حشر سا دل میں ہوا بے ساختہ لرزے قدم
ایک ہنگامہ تھا برپا جس طرف اٹھتی نظر
کپکپی تھی جسم میں اور مضطرب قلب و جگر

ڈرتے ڈرتے آخرش میں نے ٹکٹ لے ہی لیا
"ہرچہ بادا باد" کہکر میں بھی اندر چل دیا
کیا بتاؤں پہلی شے کیا تھی کہ جو آئی نظر
صاعقہ تھا، نور تھا، مجھ کو نہیں کچھ بھی خبر
ہاں مگر رہ رہ کے اب یاد آ رہا ہے اس قدر
اک قیامت کا نمونہ، ایک حشر مختصر
اک مجسم نور تھا، اک برق کی چشمک سی تھی
انتہائے حسن رنگیں یا طلسم سامری
یعنی "دوشیزہ" تھی اک میرے مقابل میں کھڑی
اور نظر مجھ خانماں برباد کی اس پر پڑی
حسن میں بڑھ کر زلیخا سے تھی وہ رنگیں ادا
سرو سے بڑھ کر تھی قد میں نرم پھولوں سے سوا
کچھ نہیں بس یاد، ہاں اتنا کہ میں بیتاب تھا
وہ حقیقت تھی حقیقت یا کہ لیکن اک خواب تھا

اف شباب اور اک مجسم حسن رنگیں کا شباب
قلب مضطر میں بپا کر دیتا ہے اک انقلاب
انقلاب اک میرے سینہ میں بپا ہونے لگا
اور دل میں ایک درد لا دوا ہونے لگا
اور وہیں پر سے عنان عزم میں نے پھیر لی
یعنی اپنے دل کی اک دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی
اور وہیں سے مڑ گیا میں آہ بر لب اشکبار
اور لوٹ آیا اسی طرح ملول و سوگوار

سماج کی آنکھیں!

از مسٹر اے۔ آر۔ جرنلسٹ

مئی کی تپتی ہوئی دوپہر اداسی سے آگے بڑھ رہی تھی اور اسی کے ساتھ چھ سات برس کی ایک بچی جلتی ہوئی دھول میں جلدی جلدی قدم بڑھاتی دوڑ رہی تھی۔ لیکن وہ دور تک نہ چل سکی اور تھک کر ایک چہار دیواری کے پاس گر گئی۔ اوپر کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی خس کی ٹٹی ہٹا کر کسی نے تیز آواز سے پوچھا ——"کون ہے —— ؟"

"........ ؟"

آواز ذرا اور سخت ہوئی ——"کون ہے جلدی بولو ؟"

لڑکی نے خوفزدہ آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ کھڑکی پر ایک نوجوان نظر آیا۔ دونوں کی آنکھیں مل گئیں۔

"بابوجی ...... میں ......"

ایک مدھم اور خوف زدہ آواز آئی۔ لڑکی کا گلا خشک ہو رہا تھا۔

"اچھا ٹھہرو۔" نوجوان نے کھڑکی بند کر لی۔ دو لمحہ لڑکی نے انتظار کیا۔ پھر کچھ سوچکر آگے بڑھ گئی۔ نوجوان ادھر ادھر دیکھ کر پھر اوپر چلا گیا۔ اور جا کر سو رہا۔

کمار شاعر تھا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے فنون لطیفہ کے علاوہ۔ فن موسیقی میں بھی کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ اور بچپن ہی سے روپ کا پجاری اور راگ کا رسیا تھا۔

اس نے کالج میں اپنے کمال فن کی بدولت کئی میڈل اور کپ پائے تھے شام کے وقت ساز پر نئی نئی گتوں کا دہرانا اس کا روز کا معمول تھا۔ آج بھی حسب معمول وہ اپنے برآمدے پر آ بیٹھا۔ اور اس کی منجھی ہوئی انگلیوں نے ستار کے تاروں سے ملتے ہی ایک مسحور کن نغمہ چھیڑ دیا۔ یکایک کمار کی آنکھیں اٹھیں تو اس نے دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر وہی لڑکی کھڑی ہے اور اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہے۔ گت پوری ہو گئی تو کمار نے ستار رکھ کر اسے بلایا اور پوچھا ——"تو یہاں کب سے کھڑی ہے ؟"

"ابھی ..... ابھی آئی ہوں۔" ڈری ہوئی لڑکی کانپ کر بولی۔

"کیا چاہتی ہے ؟"

"کچھ نہیں۔ بھیک مانگتی ہوں۔ باجہ سُن رہی تھی۔"

"بھیک —— ؟" کمار کا دردمند دل تڑپ اٹھا۔ اس نے پوچھا ——"تمہارے کون کون ہے ؟ کہاں رہتی ہو ؟"

"کوئی نہیں بابوجی۔ جہاں کھانے کو مل گیا۔ وہیں پڑ رہی۔" لڑکی رک رک کر بولی۔

"باجہ تمہیں اچھا لگتا ہے ؟"

لڑکی نے جواب میں صرف سر ہلا دیا۔

"تو پھر یہیں رہو۔ میں تمہیں روز باجہ سناؤنگا۔"

"اچھا۔" بھولی لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھا بتاؤ۔ مجھے کیا کہو گی ؟"

"بابوجی۔" لڑکی نے احساس احسان مندی کے بوجھ سے دبتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھیا۔" کمار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

دولتمند زمیندار کے بڑے لڑکے کرشن کمار بابو کی اس ہمدردی اور مہربانی کو سماج برداشت نہ کر سکا اور انہیں برادری سے الگ کر دینے کی دھمکی دی گئی۔ بلند خیال اور حوصلہ مند کمار نے ہنس کر سب سنی ان سنی کر دی۔

اتفاق کی بات اس سال خوفناک قحط پڑا آندھی آئی۔ بے وقت کی بارش فصل لے ڈوبی۔ لوگ بیک زبان چیخ اٹھے۔ "زمیندار بابو کی بے دھرمی اس پرکوپ کا کھلا ہوا سبب ہے۔ بڑے ٹھاکر کے پرلوک سدھارتے ہی انگریزی پڑھے ہوئے لڑکے لگے دھرم کی چھاتی پر مونگ دلنے۔ نہ جانے کس ذات کی لڑکی گھر میں بٹھالی۔"

گاؤں کے بڑے بوڑھے اکٹھے ہو کر نوجوان زمیندار کو سمجھانے لگے۔ "بابو صاحب ایسی دیا نہ دکھائیے۔ یہ بے دھرمی آپکی ترقی کی راہ کا روڑا بن رہی ہے۔ وہ بھکارن کی لڑکی۔ بڑھیا کے مرنے کے بعد اسے مشن والی میم کے پاس دیکھا گیا تھا۔ وہ دُشٹ اب برادری تو برادری ہندو بھی نہیں رہ گئی۔ آپ اسے نکال دیں۔"

[redacted]

کمار کے خاموش چہرے پر شدت احساس سے ایک چمک پیدا ہوئی۔ اس نے سنجیدگی سے کہا —" بھائی گرے ہوئے کو سنبھالنا پاپ اور بے دھرمی نہیں ہے۔ اگر اس سے میری ترقی کو صدمہ پہنچنے کا خطرہ ہے تو ہوا کرے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ لڑکی بے گناہ ہے۔ اسے سمجھ نہ تھی۔ جہاں ٹھکانہ ملا چلی گئی۔ اگر اسے اب سے سنبھالا جائے تو کیا بُرا ہے۔ مہربانی کر کے اب کبھی آپ لوگ اس کے بارے میں کوئی رائے دینے کی تکلیف نہ کریں"

~~~

لڑکی بڑھنے لگی۔ کمار اس کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت پر پوری توجہ صرف کرتا۔ گھر گرہستی کی تعلیم اس کی بوڑھی ماں دینے لگیں۔ سکھ آنند کے جھولے میں جھولتی ہوئی چندا بڑھنے لگی۔ دکھ سکھ میں بدل گیا۔ دیکھتے دیکھتے سات برس کی وہ ملی کچلی لڑکی، چودہ پندرہ برس کی دوشیزہ بن گئی اس کی خوفزدہ آنکھوں میں شباب کی مستی جھلکنے لگی۔

کمار کی بوڑھی ماں کی صحت ہمیشہ خراب رہتی تھی۔ آخر ایک روز بڑے ٹھاکر کی طرح یہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ چلیں۔

کمار نے ماں کا دسواں چالیسواں کرنا چاہا اور لوگوں کو بھوج کی دعوت بھیجی۔ لیکن کسی نے قبول نہیں کی اور وہ اس لئے کہ گھر میں چندا موجود تھی۔ اور تھی بھی وہ کمار کی دلاری۔ سماج نے من مانی خیال آرائی کی —" مالک نوجوان ہیں اور چندا بھی سیانی ہے ......"

پنڈتوں نے بیک زبان کہا —" بابو صاحب سوکھا اناج دان کریں۔ جبھی ماتا کے دھرم سے پار ہونگے۔"

کمار نے مسکرا کر کہا —" میرا اناج بھی ناپاک ہے۔ آپ لوگ معاف کریں۔ انہی روپوں سے میں اناتھ آشرم کی بنیاد ڈالوں گا۔ ماں کی آتما کی سچی شانتی کے لئے یہی بہت ہوگا۔"

دو تین مہینے اور گذرے۔ خاندان کے پروہت جی نے اپنا بستہ سنبھالا لاٹھی لی اور بابو صاحب کی کوٹھی میں پہنچے۔

ایک سفید پتھر کی چوکی پر بیٹھی ہوئی چندا ستار پر انگلیاں پھیر رہی تھی اور کمار بابو کرسی پر بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے نفرت سے منہ بناتے ہوئے پنڈت جی نے کہا —" بابو صاحب کی جے ہو"

کمار نے پرنام کرتے ہوئے بیٹھنے کیلئے گدے دار کرسی بڑھا دی اور بولا —" براجیئے"

"بھیا ہم لوگوں کو کاٹھ کی کرسی ....." دیوتا جی نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

کمار نے مسکراتے ہوئے نوکر کو کاٹھ کی کرسی لانے کا حکم دیا۔ اور پوچھا — " کہئے کیسے آنا ہوا —؟"

پروہت جی نے محبّت بھرے لہجے میں کہا —" بھیا ہم لوگ پرانے آدمی ہیں اور آپکی بھلائی ہی چاہتے ہیں۔ ویسے آپ جو سمجھیں ......"

کمار نے درمیان ہی میں کہا۔ "چندا اٹھو کھانا تیار کرو۔ اب کل بجانا"

" ہرے کرشنا۔ ہرے کرشنا۔ کیا آپ اس کا بنایا بھوجن بھی کھاتے ہیں"

کمار نے ذرا سخت لہجے میں کہا — " کیوں کیا ہوا؟ آپکو اتنا تعجب کیوں ہو رہا ہے؟"

پنڈت جی نرم ہو کر بولے —" نہیں بھیا آپ ہی کی مرضی سب کچھ ہے۔ لیکن ...... اب تک تو یہ لڑکی تھی۔ اب سیانی ہوئی۔ اب کہیں اسکی سگائی کر دیں۔ اور سب تیرتھوں کی یاترا کر کے یگیہ کا بندوبست کریں۔ اور اس کے بعد آپ شدھ ہو کر کسی اچھے خاندان میں شادی کریں۔ ہم لوگوں کی قسمت جاگیگی"

کمار نے سنجیدہ ہو کر کہا —" یہ سب کچھ مجھ سے نہ ہوگا"

پروہت جی نے بستہ سنبھالا۔ اور ذومعنی نگاہوں سے دیکھ کر سر ہلایا۔ اور دل ہی دل میں کہا —" ضرور دال میں کالا ہے"

اسی روز شام کو چندا نے تالیوں کا گچھا کمار کے پیروں پر رکھ کر کہا —" بھیا ......" اس کے بعد گلا بھر آیا۔ ہونٹ بند ہو گئے اور گالوں پر آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے۔ کمار سب کچھ سمجھ گیا اور ہنس کر بولا —" پگلی لڑکی ......" پھر دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھتا ہوا بولا —" چندا بیٹی —"

~~~

ایک مہینے کے بعد کمار کے چھوٹے بھائی اجیت بی اے کا امتحان دے کر واپس آئے۔ جیٹھ کی پورنماشی کو چندا کی شادی ہونے کو تھی۔ بڑی دھوم دھام تھی۔

اناتھ آشرم کی بنیاد بھی اسی روز ڈالی گئی۔ کسے ہمت تھی جو روک سکتا۔ ہاں سماج نے منہ پھیر لیا —" یہ تو پہلے ہی سے جانی ہوئی بات تھی کہ دو اٹھتی عمر کے لڑکے لڑکی ایک ساتھ رہ سہہ کر نردوش نہیں رہ سکتے۔

مستی و قلندری

فلم مین حضرات مشہور حسین اور نوجوان ایکٹرس مس پربھا سے بخوبی واقف ہونگے وہ مالا پر وید منتر کی جاپ کرنے والے برہمن صاحبان کی مستی و قلندری سے کس قدر پریشان ہے اسے مس پربھا ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

"میں جس مکان میں رہتی ہوں اس میں بہت سے پنڈت بھی رہتے ہیں جو علی الصبح تین بجے اُٹھکر مالا ہاتھ میں لے وید منتروں کا اجارن شروع کر دیتے ہیں لمبی بودیاں اور رگیو توت ان کے تقدس کے نشانات ہیں۔ لیکن جب کبھی میں ادھر سے گزرتی ہوں وہ سب میری طرف شہوت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں جیسے وہ مجھے کچا ہی نگل جانا چاہتے ہوں۔ ان میں سے اکثر کی عمر اس قدر بڑی ہے کہ مجھے ان کی حالت پر غصہ کی بجائے اکثر رحم آتا ہے کہ محض اس وجہ سے کہ ان کے پاس ایک فلم ایکٹرس رہتی ہے ان کی عبادت میں رکاوٹ پڑتی ہے اور پھر ان کی تعداد بھی پچاس ساٹھ سے کم نہیں۔ قدرتی طور پر یہ لوگ میری زندگی، آزادی اور آرام میں سخت خلل انداز ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں اسٹڈیوز کی فضا بہت گندی ہے لیکن مجھے اسٹوڈیو میں ایسے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑتا۔"

اگر مس پربھا مجھے معاف فرمائیں تو میں کہوں کہ اسٹوڈیو کی فضا جن لوگوں کو محبوب ہے انہیں ان کی گندگی کا احساس نہیں ہو سکتا۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ اس کی گندگی بھی انہیں پاکیزگی معلوم ہوتی ہے۔ اب رہا پنڈت صاحبوں کا گھورنا تو بھئی جن کو خدا نے آنکھیں دی ہیں وہ اچھی چیز کو ضرور ہی دیکھنا چاہینگے۔ خواہ پنڈت ہی کیوں نہ ہو۔ آخر پنڈتوں کے پہلو میں بھی تو دل ہوتا ہے۔ پھر ایک مشہور فلم ایکٹرس کو جس کی تصویر کیلئے لوگ پیسے خرچ کرتے ہیں وہ اگر مفت مل جائے تو کون چھوڑ دیگا؟

〰〰〰

مس پربھا صاحبہ اسکے بعد لکھتی ہیں:۔

"ہمارے مکان کے عین سامنے چند گز کے فاصلے پر ایک کالج ہے جہاں خیر سے لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں معلوم نہیں ان کالج میں پڑھنے والے لڑکوں نے ابھی تک لڑکیوں کیساتھ شریفانہ برتاؤ کرنا کیوں نہیں سیکھا۔ نیز ان کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں کیسے گزارہ کرتی ہیں۔"

مس پربھا کو شکایت یا تعجب ہے کہ کالج میں لڑکیوں کے ساتھ پڑھنے والے لڑکوں نے لڑکیوں کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کرنا کیوں نہیں سیکھا؟ لیکن مس پربھا کو کیسے معلوم ہوا کہ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ شریفانہ برتاؤ نہیں کرتے؟ موجودہ زمانے میں شرافت کے مفہوم میں بھی تو بہت کچھ تبدیلی ہو گئی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ترقی ہو گئی ہے۔ مثلاً پہلے لڑکیوں کا پردے میں رہنا شرافت سمجھا جاتا تھا۔ اور جوان لڑکیوں کا جوان لڑکوں کے سایے سے بھی دور رہنا شرافت کیلئے ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب لڑکیوں کا بے پردہ پھرنا۔ اسٹیج پر گانا ناچنا تھیٹروں اور فلموں میں پارٹ کرنا اور کالجوں میں ایک ساتھ پڑھنا طرۂ شرافت سمجھا جاتا ہے۔ کیا مس پربھا بھی جب فلم میں ایکٹنگ کرنے جاتی ہیں، ایک بیگانے اداکار کے ساتھ برسرعام حسن و شباب کی نمائش اور عشق و محبت کے مظاہرے کرتی ہیں تو کبھی ان کو خیال گذرتا ہے کہ ان کے یہ سب افعال شرافت کے منافی ہیں؟ اسی طرح کیا عجب ہے اگر کالج کے لڑکوں نے بھی شرافت کا کوئی ایسا ہی مفہوم وضع کر لیا ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ کالج کی لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ کیسے گزارہ کرتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو لڑکیاں کالج میں لڑکوں کے ساتھ پڑھ سکتی ہیں وہ ان کے ساتھ گزارہ بھی کر سکتی ہیں۔ آخر لڑکیوں کا لڑکوں کے ساتھ گزارہ کرنا شیطان کو زیر کرنا تو ہے نہیں۔ انسان ہی انسان کے ساتھ گزارہ کرتا ہے۔ کیا مس پربھا کالج میں ایک ساتھ پڑھنے والے لڑکے لڑکیوں کو انسانی جنس سے خارج سمجھتی ہیں؟

〰〰〰

اس کے بعد کالج کے لڑکوں کے متعلق

مس پربھا اپنا ایک تجربہ اس طرح بیان کرتی ہیں :۔۔۔

" میں اپنے کمرے میں آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ شاید آنکھ بھی لگ گئی ہو کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہو لیکن میں یہ سمجھ کر کہ شاید میں نے خواب کی حالت میں اپنا نام سنا ہو آرام سے لیٹی رہی۔ لیکن جب یہ آواز مسلسل آتی رہی تو میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ میری حیرانی کی حد نہ رہی۔ کالج گیلری میں کھڑے چند شوخ لڑکے اونچی آواز سے پربھا پربھا پکار رہے تھے اور میرے باہر دیکھنے کے باوجود اسی طرح پکارتے اور سنتے رہے۔ مجھے ان لڑکوں پر سخت غصہ آیا۔ تب سے میں نے وہ کھڑکی بند کر رکھی ہے اور اس طرف کبھی نہیں جھانکتی۔

عجب مصیبت ہے کہ ہم لوگوں کو اپنے گھر کی چاردیواری کے اندر بھی آرام سے بیٹھنا اور لیٹنا نصیب نہیں ہوتا"

مس پربھا کا یہ گلہ بے جا ہے۔ کہ انہیں اپنے گھر کی چاردیواری کے اندر آرام سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا جو لڑکی اپنے گھر کی چاردیواری کو اپنے پیروں سے روند کر فلم اسٹوڈیو کی رونق بنتی ہے اور پردۂ فلم پر اپنے حسن و شباب کی نمائش کرتی ہے۔ اس کا گھر گھر اور اسکی چاردیواری چاردیواری رہ کب جاتی ہے؟

پھر مس پربھا کو یہ سوچنا چاہئیے کہ لوگ ان کو پسند کریں۔ لوگوں میں ان کے حسن و شباب اور عشوہ و ناز کا شہرہ ہو۔ لوگوں کو ان سے مجنونانہ گرویدگی پیدا ہو جائے تاکہ فلمسازوں کے نزدیک ان کی قیمت زیادہ سے زیادہ بڑھ جائے انہوں نے کیا کچھ جتن نہیں کئے۔ پھر ان کا اپنی کوشش کے نتیجے سے گھبرانا کہاں تک مناسب ہے۔ جس مس پربھا کی فلم دیکھ کر نوجوان دل باختہ ہو جاتے ہیں اگر وہ جیتی جاگتی مس پربھا کو دیکھ کر بار دیکھنے کیلئے چھوٹی موٹی حرکتیں کر بیٹھیں تو ہمارے نزدیک تو قابل درگذر ہیں۔ اب یوں مس پربھا کی جو رائے ہو۔

شبابیاتی رسائل کی مقبول شاعرہ "حجابہ" نجمہ تصدق صاحبہ سے قارئین مستی قلندری بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص جنسی رنگ میں اپنے جذبات کا یوں اظہار فرماتی ہیں سے

ایک دن ان کے پاس جانے دے
غم ہستی پہ مسکرانے دے
ٹوٹتا ہے تو ٹوٹ جائے رباب
مجھ کو جی بھر کے گیت گانے دے
چاندنی، مے، بہار، تنہائی!
ان کی باہوں میں جھوم جانے دے

کتنے پاکیزہ جذبات ہیں، شاعرہ کو اجازت دیدی جائے کہ وہ ایک روز" ان کے پاس جائیں اور ہستی کے غم پہ مسکرائیں۔ یہی نہیں بلکہ رباب کے ٹوٹنے سے بے پروا ہو کر خوب گیت گائیں۔ اور چاندنی، مے، بہار اور تنہائی سے کیف اندوز ہو کر ان کی باہوں میں جھوم جائیں۔

لیکن یہ پتہ نہیں کہ "جانے دے" سے کس کی طرف اشارہ ہے؟ یعنی یہ اجازت کس سے طلب کی جا رہی ہے؟ بہرحال خیالات نہایت پرجوش ہیں۔ رباب کم بخت ٹوٹے یا رہے لیکن گیت گانے میں کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ لیکن میں تو دیکھتا ہوں۔ تاریخ کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں اپنے آپ کو دہراتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جن چیزوں کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ بھی تاریخ کے چکر میں آتی ہوں۔

بہرحال تو ان اپنے کو دہرانے والی چیزوں کی مثالیں سنئے۔ پاجامہ بھی اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ کسی زمانے میں لوگ چوڑی موہری کے پاجامے پہنتے تھے۔ اگر آپ دلی اور لکھنؤ کے پرانے آدمیوں کی تصویریں دیکھیں تو وہ آپ کو ڈھیلے ہی پاجاموں میں نظر آئینگے۔ اس کے بعد اس پاجامے کا رواج متروک ہو گیا لیکن اب تراش کی قدرے تبدیلی کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں ایسے ہی پاجامے دیکھ سکتے ہیں

پاجامے پر فیشن پرست عورتوں کو شانے تک کھلی ہوئی کرتیاں یاد آگئیں۔ دیہات کی گوارنیں اب بھی ایسی ہی کرتیاں پہنتی ہیں لیکن کچھ ہیر پھیر کے ساتھ ویسی کرتیاں اب فیشن پرست عورتیں بھی استعمال کرنے لگی ہیں۔

عورتوں پر ایک اور بات یاد آگئی۔ کسی زمانے میں حیوانوں کی طرح انسان بالکل برہنہ رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ انسان بنا اور اب دیکھئے تو ٹانگ کی طرف سے عورتوں کا لباس کمر کی طرف سمٹا جا رہا ہے اور ہاتھ کی طرف سے کندھے تک جا پہنچا۔ ادھر گردن سے سینے کے نیچے تک پہنچ چکا ہے۔ بس تھوڑی سی کسر اور رہ گئی ہے۔ یہ تو ان کا ذکر ہے جو ابھی انسانیت کے جامے میں ہیں اور علمبرداران

عریانیت نے تو عہد حاضرہ کو بالکل عہد قدیم میں تبدیل کر دیا ہے۔

ہم جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کی تمہید ذرا لمبی ہو گئی۔ خیر تو اب "آمدم برسر مطلب بر" اسی طرح ہماری شاعری اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ اردو کے شعرائے قدیم میں متعدد ایسے شعراء ملتے ہیں جو خوب مزے لے لے کر اپنی اوباشی کی شرمناک داستانیں نظم کیا کرتے تھے۔ لیکن بعد کے ترقی یافتہ شعراء نے ایسی شاعری کو خلاف تہذیب سمجھ کر ترک کر دیا۔ لیکن اب دیکھئے تو ترقی یافتہ اور جدید شاعری کے نام سے وہی مستی و قلندری پھر دہرائی جا رہی ہے۔

ایک موقر ادبی ماہنامے سے اس قلندرانہ قسم کی شاعری کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن بے جا نہ ہوگا اگر نمونوں کے ملاحظے سے پہلے ان کے متعلق ماہنامہ موصوف کے مدیر محترم کے کچھ ارشادات سن لیجئے۔ فرماتے ہیں۔

"ہمارا لٹریچر ایک طیارے کی سی رفتار کے ساتھ بڈھے بوڑھوں کا دامن چھوڑ کر نوجوانوں کے ہاتھوں میں آ پہنچا ہے۔ ان نوجوانوں کے ہاتھوں میں جن کے دل خواہ ایک قطرۂ خون کے حامل ہوں لیکن جن کا دماغ سرور زندگی کی ہیجانی لرزش کا اظہار کر رہا ہے۔"

اچھا اب آئیے اپنے آپ کو دہراتی ہوئی قلندرانہ شاعری کے نمونے ملاحظہ کیجئے۔ ایک دوشیزہ اپنے عاشق سے کہتی ہے یا شاید لکھتی ہے جو آپکی سمجھ میں آئے۔

یہ مانا کہ نکھری ہوئی چاندنی ہے
فلک سو گیا ہے زمیں سو گئی ہے
ابھی تک مگر خادمہ جاگتی ہے
محبت جتانے میں آؤں تو کیونکر

مرا وعدہ اب تک مجھے دلنشیں ہے
مگر کوئی ملنے کی صورت نہیں ہے
ستارہ سہیلی بھی بیٹھی یہیں ہے
نگاہیں ملانے میں آؤں تو کیونکر

بلائی گئی ہوں مجھے بھی خبر ہے
زمانے کی نیرنگیوں پر نظر ہے
محبت نہ رسوا ہو یہ بھی تو ڈر ہے
کروں کیا بہانے میں آؤں تو کیونکر

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ جی ہاں! ابھی تو ترقی یافتہ شاعری کا بچپن ہے۔ ذرا اسے جوان ہونے دیجئے، پھر دیکھئے گا۔ بوڑھی خادمہ جاگتی ہو یا ستارہ سہیلی بیٹھی۔ آج کی یہ جھجکنے اور جھجکنے والی چھوکریاں محبت کی رسوائی سے بے نیاز چھیل سٹپاتی عاشق کے گھر نہ چل کھڑی ہوں تو جدید شاعری جدید شاعری نہیں (حاجی بغلول)

سماج کی آنکھیں

(بقیہ صفحہ ۳۲)

لیکن شادی کے وقت لوگ دیکھ کر محو حیرت رہ گئے ۔۔۔ اجیت بابو دولہا تھے۔ بنی سنوری چندا دلہن تھی۔ اور کمار بابو نے خود کنیا دان دیا۔۔۔!!

چندا نے ڈبڈبائی آنکھیں پونچھ کر اپنے دیوتا سمان بھیا کے پاؤں چھوئے۔ آج ٹھیک نو برس کے بعد وہ اس گھر کی مالکہ بنا دی گئی۔

کمار نے چندا کا گھونگھٹ ہٹا کر اس کی ڈبڈبائی آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔ پگلی روتی کیا ہے؟ تجھے کہیں جانا ہے؟

چندا شرم سے سمٹ گئی۔ اور اس کا دل وفور مسرت سے لبریز ہو گیا۔ کمار نے اجیت کے ہاتھ چندا کا ہاتھ دیکر کہا۔۔۔ "لو یہ تمہاری لکشمی ہے۔ اسکی عزت واحترام اور خاطر و مدارات میں کبھی کوتاہی نہ کرنا۔"

لوگوں کی آنکھوں کے پردے ہٹ گئے۔ لاوارث چندا راج رانی کی طرح مالکن کے اونچے آسن پر بٹھا دی گئی۔ پھر مالکہ سے مخالفت اور بغاوت کون کرتا؟

پکے بھوج کا انتظام کیا گیا۔ سماج کے ٹھیکیداروں نے اسے بخوشی قبول کیا۔ اور آج کسی نے نفرت نہیں کی۔ چندا چاندنی کی طرح شوبھا بڑھاتی ہوئی اپنی گرہستی میں لگ گئی۔

کچھ دنوں کے بعد کمار نے اپنی شادی کی۔ خوشی سے ناچ کر چندا نے تالیوں کا گچھا اپنی جی جی کے پیروں پر رکھ کر کہا۔۔۔ "جی جی، یہ آپکی امانت حاضر ہے!"

کمار ہنس کر بولا۔۔۔ "پریما اب کچھ دن تم گرہستی سنبھالو۔ چندا اناتھ آشرم کا انتظام دیکھے گی۔ گرہستی سے تھک گئی ہے۔"

دونوں جوڑے ہنس پڑے۔ پریما نے چندا کو گلے سے لگا لیا۔

سماج کی آنکھیں اپنی شکست پر ندامت کے آنسو بہا رہی تھیں۔

مسافر

از جناب ساغر چشتی اوجینی

پہاڑوں کو ٹھوکر لگاتا ہوا چل — ارادوں کو پختہ بناتا ہوا چل
ہر اک گام پہ خوں بہاتا ہوا چل — تڑپتا ہوا تلملاتا ہوا چل
مسافر کوئی گیت گاتا ہوا چل
چلا چل مسافر، مسافر چلا چل

یہاں کی ہر اک شے ہی فانی مسافر — یہ دُنیا تو ہے آنی جانی مسافر
ہیولہ سی ہے شادمانی مسافر — ارے یہ غرورِ جوانی مسافر
فرازِ نظر سے گراتا ہوا چل
چلا چل مسافر، مسافر چلا چل

حوادث کی ہر موج ہے بے قرینے — اُلٹ پھیر میں پڑ گئے ہیں سفینے
دھڑکتے ہوئے دل سے پھٹتے ہیں سینے — خرد کو بھی آنے لگے ہیں پسینے
مگر تو یوں ہی مسکراتا ہوا چل
چلا چل مسافر، مسافر چلا چل

انوکھی لگن، عزم تیرا نرالا — مبارک تجھے ذوقِ دل کا شوالا
چڑھا غم کی دیوی پہ اشکوں کی مالا — نہ رہ رہ کے دیکھ اب اندھیرا اُجالا
نگاہوں کے مندر سجاتا ہوا چل
چلا چل مسافر، مسافر چلا چل

حجاباتِ رنگیں اُلٹنے نہ پائیں — یہ اوراقِ ہستی پلٹنے نہ پائیں
تخیل کے جلوے سمٹنے نہ پائیں — قدم بڑھ گئے ہیں تو ہٹنے نہ پائیں
تحیر کی شمعیں جلاتا ہوا چل
چلا چل مسافر، مسافر چلا چل

جہاں ابرِ رحمت کی چادر تنی ہو — جہاں موجِ گل بادہ رشنمی ہو
جہاں بے نیازِ الم ہر خوشی ہو — جہاں زندگی حاصلِ زندگی ہو
اسی سمت کچھ گنگناتا ہوا چل
چلا چل مسافر، مسافر چلا چل

نسیمِ سحر مے لنڈھاتی رہے گی — فضا ساغرِ زر لٹاتی رہے گی
بہارِ چمن گل کھلاتی رہے گی — یہ دنیا یونہی رنگ لاتی رہے گی
تو اپنی جوانی لٹاتا ہوا چل
چلا چل مسافر، مسافر چلا چل

چکلے والی کی سرگذشت

مجھے زندگی کے انقلاب حوادث نے جس جگہ پہونچا دیا ہے۔ وہاں سے اب واپسی شاید میرے لئے ناممکن ہے لیکن اس پردیسی نوجوان کی یاد اب تک میرے دل سے دور نہ ہو سکی۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ماں کے سوا مجھے ایسا کوئی نہیں ملا جسے اپنا کہہ سکوں جوان ہونے کے بعد ماں سے چھوٹ کر میں پرائے گھر گئی بھی تو مجھے جلد ہی پھر ماں کی گود میں واپس آجانا پڑا۔ لیکن آج؟ اپنی رام کہانی نہیں اسی پردیسی کی کہانی سنانی ہے۔ میرا مکان سڑک کے کنارے تھا۔ میں اپنی کھڑکی سے بھیڑ کے بھیڑ آدمیوں کو آتے جاتے دیکھتی جن میں طرح طرح کے انسان ہوتے، امیر و غریب، جوان، بوڑھا، خوبصورت، بدصورت، خوش پوش، چیتھڑے لپٹے، پیدل، سوار، غرض ہر قسم کے لوگ۔

زندگی کی اس ہلچل کو دیکھ کر میرے دماغ میں سوالات کا ہجوم امنڈ پڑتا۔ اس جوش و خروش سے بھری دنیا میں میرا کچھ حصہ میں کیوں نہیں ہے؟ اتنے آدمیوں میں میرا کوئی نہیں؟ میں کچھ مردہ تو نہیں ہوں پھر میری زندگی میں زندگی کے علائم و آثار کیوں ناپید ہیں؟ میرے سینے میں خاک کیوں اڑتی رہتی ہے؟ میرے دل کی دنیا ویران کیوں ہے؟ مجھے زندگی کے رنگین خواب کیوں نظر نہیں آتے؟ میری زندگی کا ساز خاموش اور بے خروش کیوں ہے؟

شام کا وقت تھا۔ میں اسی طرح خیالات کے جال بن رہی تھی کہ وہ پردیسی نوجوان کرایہ کے مکان کی تلاش میں بھٹکتا میرے گھر کی طرف آنکلا۔ میری ماں نے اس پر ترس کھا کر اسے اپنے ہاں کرایہ پر رکھ لیا۔

میں نے ماں سے بگڑ کر کہا۔ بھلا کوئی اس طرح بھی کسی اجنبی کو اپنے مکان میں رکھ لیتا ہے؟

ماں بولی۔ کچھ حرج نہیں بیٹی۔ سارے آدمی ایک سے نہیں ہوتے۔ اگر آدمی آدمی پر اعتبار نہ کرے تو دنیا کا کام کیسے چلے۔ بےچارا مکان کیلئے بہت پریشان تھا۔

ماں کے سامنے میری چل سکتی تھی؟ میں چپ ہو گئی۔ وہ نوجوان مکان کے ایک کمرے میں اس اطمینان سے آبسا جیسے اسی کا مکان ہو۔ گورے سوکھے چہرے والا وہ نوجوان عجیب طبیعت کا معلوم ہوتا تھا وہ جب سے میرے مکان میں رہنے لگا تھا۔ میں نے اسے کسی سے ملتے جلتے اور بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ شاید کسی اسکول میں ماسٹر تھا۔ وہ دن بھر گھر سے باہر رہتا، اور رات کو بھی دیر تک لالٹین جلائے کتاب دیکھا کرتا۔ میں تو کبھی اس کے پاس جاتی نہ تھی لیکن ماں اکثر جا کر اسکے پاس بیٹھتیں وہ ان سے نہ جانے کیا کیا باتیں کیا کرتا ماں سے معلوم ہوا کہ ہمارے گھر کی طرح اسکے گھر پر بھی بوڑھی ہے اور ہماری طرح جوان بیوہ بہن۔ گھر کا سارا بوجھ اسی نوجوان کے سر ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے اس نوجوان سے ہمدردی ہو گئی اور میں اسے قدر و عزت کی نظر سے دیکھنے لگی۔

اس کے بعد کا ایک واقعہ سنئے:۔

رات کا وقت تھا۔ میں رامائن پڑھ رہی تھی۔ اتنے میں دروازے پر نوجوان کی آواز سنائی دی۔ ماں کی آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے ان کو جگانا پسند نہ کیا۔ خود اٹھ کر دروازے تک چلی گئی اور کواڑ کھول کر اوٹ میں ہو گئی۔

ہاتھ میں لالٹین لٹکائے اپنے کمرہ سے میرے کمرے میں آکر نوجوان نے کہا۔ تھوڑا مٹی کا تیل چاہئے، پڑھنا ضروری ہے اور لالٹین میں تیل نہیں ہے۔

وہ شرماتا ہوا سا ہاتھ میں لالٹین لئے کھڑا تھا۔

میں اپنے گورے ہاتھ کو ساری سے باہر نکال کر بولی۔ لائیے، دیجئے اپنی لالٹین

میں لالٹین میں تیل ڈال کر اسے واپس دینے گئی تو دانستہ یا نادانستہ گھونگھٹ کھسک گیا اور میرا حسین چہرہ اس طرح کھل گیا جیسے یکایک ابر سے چاند نکل آئے۔ لیکن نوجوان نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ وہ ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر شکریہ ادا کرکے

اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا میرے دل کے خفتہ جذبات یکایک بیدار ہو گئے۔ اور میرے دل کا خاموش ساز ایک نئے انداز سے بج اٹھا۔ مجھے ایسا بھی محسوس ہونے لگا کہ میں اس نوجوان سے محبت کرتی ہوں شاید دل کے کسی گوشے میں عرصے سے اس کی محبت کا دھندلا دھندلا سا نقش بن گیا تھا جو موقع پاکر یکلخت ابھر آیا۔

میرے اندر ایک نئی زندگی اور نئی لگن پیدا ہو گئی۔ میرے کوٹھے کا زینہ نوجوان کے کمرے کے پاس تھا۔ میں ضرورت کے علاوہ بے ضرورت بھی اس زینے کا چکر لگانے اور خواہ مخواہ کبھی پاؤں کی پازیب اور کبھی ہاتھ کی چوڑیاں بجانے لگی۔ نوجوان کے باہر آنے کے وقت میں اس کا انتظار کرتی رہتی اور انجان سی بن کر اپنے کو بالکل اس کے سامنے پیش کر دیتی۔ جس روز میں اپنی ماں کے ساتھ گنگا نہانے جاتی یہ دیکھے بغیر مجھ سے رہا نہ جاتا کہ نوجوان اپنی کھڑکی میں ہے یا نہیں؟ اگر وہ موجود ہوتا تو میری رفتار میں بے ساختہ ایک کشش انگیز شوخی پیدا ہو جاتی۔

میں دوپہر کے سناٹے میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی کشیدہ کاڑھتی ہوتی۔ اس وقت اپنے اور اس نوجوان کے درمیان کے تمام حجاب اور پردے کو ہٹا کر اسے اپنے دل کے بالکل قریب کر لیتی اور اس سے اپنا طرح طرح کا رشتہ جوڑتی۔ یہ خیالی مشغلہ میرے دل کو ایک عجیب کیف و سرور سے لبریز کر دیتا۔ کبھی کبھی میں اپنے کو اس نوجوان کے عکس سے ڈھک لیتی۔ اس کے عکس ہی کے لمس سے میرے خون میں ایک عجیب تیزی پیدا ہو جاتی۔ اور میرا دل جذبات تال پر رقص کرنے لگتا۔

میں رات کی تاریکی میں اپنے پلنگ پر پڑی اس نوجوان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچنے لگتی تو مجھے ایسا معلوم ہوتا میرے کمرے کے در و دیوار میرا مضحکہ اڑا رہے ہیں اور نام و ننگ کا ہولناک دیو اپنی سیاہ آتشیں آنکھوں سے مجھے گھور رہا ہے۔ اس کے بعد بربط دل کے ایک پُر درد راگ کے ساتھ میرا سارا جسم کانپ اٹھتا۔

اس پردیسی نوجوان میں بھی ایک نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ پہلے وہ فرصت کے تمام وقتوں میں میز پر جھکا مطالعہ میں مصروف نظر آتا تھا۔ مگر اب وہ پلنگ پر پڑا اس طرح خاموش نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھتا رہتا۔ جیسے چھت کی کڑیاں گن رہا ہو۔ اس کا یہ حال دیکھ کر میرا دل درد و سوز سے لبریز ہو جاتا۔ میں کوشش کرتی کہ ماں سے پتہ چل جائے کہ اسے آجکل کیا ہو گیا ہے۔ لیکن مجھے کامیابی نہ ہوتی۔

ایک روز ماں نے اس کے پاس سے آکر کہا۔ اسے شدت کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ بیچارے کا یہاں تو کوئی تھا نہیں۔ ماں ہی جاکر پڑوس کے ایک ڈاکٹر کو بلا لائیں۔ اس نے آکر دیکھا اور دوا دی۔ اور اس کی تیمارداری میرے سپرد ہوئی۔

وہ بخار کی بے چینی میں بار بار میری طرف دیکھتا۔ میرے دریافت کرنے پر کہ کیسی طبیعت ہے؟ کچھ جواب نہ دیتا۔ یاس انگیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگتا۔

دو چار روز کی دوا اور تیمارداری کے بعد وہ کچھ اچھا ہوا تو اس نے ماں کو اطلاع دی کہ اب وہ میرے مکان کو چھوڑ دے گا

میں نے پوچھا۔ کیوں ماں؟ اب انہیں یہاں کوئی تکلیف ہونے لگی ہے کیا؟

ماں بولیں۔ نہیں یہاں سے اسکول دور پڑتا ہے۔ آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اسلئے اس نے اسکول کے پاس ہی کوئی کمرہ لے لیا ہے۔

یہ سنکر میں تڑپ اٹھی۔ اس پردیسی نوجوان سے کچھ نہ پاکر بھی میں نے جو کچھ پایا تھا اس سے محروم ہو جانے کے تصور ہی سے میرا دل بے چین ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس کے بغیر میرا اس گھر میں رہنا ناممکن ہے۔ میں نے طے کر لیا کہ اب شرم و حیا کا وقت باقی نہیں رہا۔ مجھے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دینا چاہیئے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ میرا دل اس کی محبت کا مندر ہے اور میں اسکی پجارن ہوں۔

میں دوسرے روز کپڑے بدل کر، بناؤ سنگھار کر کے اس پردیسی نوجوان کے پاس گئی وہ اپنا سامان باندھ کر تانگے کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ تانگے کا نہیں میرا انتظار کر رہا ہے۔

میں نے چاہا اس سے کہوں کہ میرے انتظار میں اسے جو تکلیف ہوئی۔ وہ اسکو معاف کر دے۔ میں پورے طور پر تیار ہو کر آئی ہوں۔ وہ جہاں جا رہا ہے اپنے ساتھ مجھے بھی لیتا چلے۔ اس کے بغیر مجھ سے ایک لمحہ بھی اس گھر میں رہا نہ جائیگا۔ لیکن یہ سب کچھ کہہ نہ سکی۔

میں نے کہا۔ آپ جا رہے ہیں؟

وہ بولا۔ جی ہاں۔ آپ نے میری بیماری میں میری جو خدمت و تیمارداری کی اس کیلئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

میں نے کہا۔ اگر آپ کو میرے ہاں کوئی تکلیف ہوئی ہو تو معاف کیجیے گا۔

"اب تک تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی لیکن آئندہ یہاں رہنا شاید میرے لئے تکلیف کا باعث ہو گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میں نہیں سمجھی۔"

"معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

یہ سُنکر مجھے ایسا معلوم ہوا۔ مجھے کچھ نہ مل کر سب کچھ مل گیا۔ اس خوشی میں اس سے جو کچھ کہنا تھا وہ سب بھول گئی کچھ بھی کہہ نہ سکی۔ وہ چلا گیا۔

اس کے بعد کی کہانی بہت لمبی ہے اور لمبی ہی نہیں بلکہ گندی بھی۔ اس لئے اس کے کہنے سے اس کا نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ بس آخر کا ایک ٹکڑا سن لیجئے۔

ایک روز وہ پردیسی میرے کوٹھے پر آنکلا اور مجھے عصمت فروشی کے بازار میں حسن و شباب کی دکان سجائے دیکھ کر تعجب سے بولا

ارے تم یہاں؟

میں نے کہا۔ اس میں اتنے تعجب کی کون سی بات ہے؟

"میں نے تو کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔"

"ہاں زندگی کی راہ ایسی ہی پیچیدہ اور تاریک ہے۔ مجھے ہی کیا معلوم تھا کہ زندگی کی رفتار کبھی مجھے اس جگہ بھی پہنچا دیگی۔"

"لیکن میرا خیال تو کچھ اور تھا۔"

"وہ کیا؟"

"اب کیا بتاؤں؟"

"آخر؟"

اس کے چہرے پر ایک گہری افسردگی چھا گئی۔ اس نے کہا۔ تمہیں معلوم نہ ہو گا کہ اب میں اس دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ ماں کا انتقال ہو گیا۔ بیوہ بہن تھی وہ بھی اب میرے گھر میں نہیں رہی ہے۔ ان دونوں کے بعد مجھے اطمینان تھا کہ ابھی دنیا میں میری زندگی کا ایک سہارا اور باقی ہے لیکن دیکھتا ہوں تو اب وہ سہارا بھی ......

یہ کہتے کہتے نوجوان کی آواز گلوگیر ہو گئی دل تو میرا بھی بے چین ہو گیا۔ لیکن زندگی کے نشیب و فراز نے مجھے ایک حد تک سخت بھی بنا دیا تھا۔ میں نے اپنے کو سنبھال کر کہا۔ اگر تم پہلے ہی کوتاہی نہ کرتے تو مجھے یہ زندگی اختیار کرنے کی نوبت کیوں آتی؟

میں نے اس پردیسی نوجوان کو جو جواب دیا وہ آپ کے نزدیک معلوم نہیں قابل قبول ہے یا نہیں لیکن اس نے اس پر یقین کر لیا جس کا ثبوت مجھے دوسرے ہی روز مل گیا جب میں نے مقامی اخبار میں اس کی خودکشی کی خبر دیکھی۔ (للتا باقی)

قطعات

(از جناب راز ہاشمی امروہوی)

(۱)

نغمات طرب میں کھو گیا ہوں
آغوش حسیں میں سو گیا ہوں
دل پیکر صد عبودیت ہے
یہ کس کے قریب ہو گیا ہوں

(۲)

ہر موج نفس شراب ہے کیا؟
ہر تار نظر رباب ہے کیا؟
معلوم نہیں یہ رازؔ اب تک!
دنیائے خیال و خواب ہے کیا؟

(۳)

مسحور نیاز و ناز بن جا
افسانۂ سوز و ساز بن جا
میں تجھ کو سراپا راز کر لوں
تو میری نوائے راز بن جا

(۴)

ترشی بھی ہوں اور شراب بھی ہوں
اچھا بھی ہوں اور خراب بھی ہوں
ہے رازؔ یہی فریب مجھ میں
ذرہ بھی ہوں، آفتاب بھی ہوں

عورت کی ظاہری جوانی

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اُس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے۔ ایسی عورت میں شباب کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ ہر سال بچوں کو دودھ پلانے پر مجبور ہو جائے یا کسی بیماری یا بد احتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بدنما معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے۔

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آسکتی ہے سائنس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے۔ جس کے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ گول اور سخت ہو کر عورت کو از سر نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں۔ اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں۔ یہ لگانے کی دوا ہے اور اس کا نام "برسٹین" ہے یہ وہی دوا ہے جس کی بدولت اب تک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں۔ اور اب وہ کافی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اس کے ہر روز کا استعمال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اس کے سینہ میں دوبارہ اُبھار اور سختی پیدا ہو رہی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو ——— وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ پی بکس ۲۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی "برسٹین" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنادیگی اور اسکے سینہ کی یہ سب خرابیاں دُور ہو کر مستقل اُبھار اور سختی پیدا کر دیگی۔ ایک شیشی "برسٹین" کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول لگیگا۔ نوٹ:۔ اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچہ کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اور بچہ نہایت اطمینان کے ساتھ دودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی ہے۔

سات دن میں سفید بال سیاہ ہو جائینگے

سفید بالوں کو ہمیشہ کیلئے کالا کر دینا اور آئندہ کالا بال نکلنا اب بہت آسان ہو گیا ہے۔ لگانے کا خضاب سفید بالوں کو صرف ایک ہفتہ کے لئے کالا کر سکتا ہے۔ اور پھر سفیدی آجاتی ہے۔ لیکن تحقیقات کے بعد اب ایک ایسی عجیب و غریب دوا ایجاد ہوئی ہے۔ جس کے کھانے سے سفید بال کالے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر کالے ہی رہتے ہیں۔ کیونکہ بالوں کی جڑیں تک سیاہ ہو جاتی ہیں۔ اس دوا کا نام "کیشول" ہے۔ تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ دوا "کیشول" کے صرف ایک ہفتہ استعمال کر لینے سے ہی سفید بالوں پر سیاہی پھیلنے لگتی ہے۔ اور پوری شیشی "کیشول" کے استعمال کرنے کا مطلب ہے کہ بال کالے بھی ہو جائیں گے۔ اور آئندہ کالے ہی نکلیں گے۔

چار روپے میں تمام بال سیاہ ہو جائینگے دوا "کیشول" قطعی بے ضرر ہے۔ عام طور پر لوگ ایسے کھانے کا خضاب کہنے لگے ہیں۔ اور یہ کسی حال میں استعمال کرنیوالے کو نقصان نہیں کرتا دنیا میں اس سے بہتر خضاب شاید آپ حاصل نہ کر سکیں گے۔ ایک شیشی کیشول جو ایک ضرورت مند کے لئے قطعی کافی ہے۔ اس کی قیمت چار روپے دو آنے ہے۔

مینیجر زنانہ دواخانہ پی بکس ۲۴ دہلی کو خط لکھ کر دوا "کیشول" بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے۔ پارسل پر گیارہ آنے محصول خرچ ہوگا۔ اور اس معمولی رقم میں آپ اپنی ضرورت کا ایک لاثانی تحفہ حاصل کرلیں گے۔ کیونکہ اس دوا کے استعمال کے بعد لگانے کے خضاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بال از خود کالے نکلنے لگتے ہیں۔

جامِ شراب پی جا!

(۱)

موسم ہے کیا انوکھا یہ رُت ہے کیا سُہانی
بکھرے ہوئے ترانے چھائی ہوئی جوانی
ہر ہر نفس میں رقصاں پیغامِ زندگانی
ہونٹوں پہ مست نغمے نغموں میں اک روانی
اک دستِ نازنیں اور یہ جامِ ارغوانی
ٹھکرا کے دو جہاں کو آ بے حجاب پی جا
روحِ شراب بنکر جامِ شراب پی جا

(۲)

بادہ یہ رنگ بادہ ساغر یہ دورِ ساغر
یہ تلخیاں ہیں امرت پی اور مسکرا کر
یہ لمحے قیمتی ہیں ہونگے نہ پھر میسر
یہ شام نوجوانی وقتِ طلوعِ اختر
خود دے رہا ہے ساقی کیا فکرِ روزِ محشر
پینے کا وقت ہے یہ خانہ خراب پی جا
روحِ شراب بنکر جامِ شراب پی جا

(۳)

چھایا ہوا دلوں پر انوارِ میکدا ہے
بادہ چھلک رہی ہے ساغر اُبل رہا ہے
شیشہ نہیں یہ شیشہ مستی کا آئینا ہے
ساقی نہیں یہ ساقی کونین کا خدا ہے
نقشِ قدم پہ جس کے کعبہ جھکا ہوا ہے
آنکھوں سے ڈھل رہا ہے کیفِ شباب پی جا
روحِ شراب بنکر جامِ شراب پی جا

(۴)

بے کیف زندگی بھی کیا کوئی زندگی ہے
نے لطفِ سوزِ غم ہے نے کیف سرمدی ہے
انسانیت کا صدقہ پی لے جو آدمی ہے
یہ میکشی نہیں ہے آغازِ بندگی ہے
ساقی کی ہر نظر میں اسرارِ بیخودی ہے
آ جام میں سمو کر فکرِ عذاب پی جا
روحِ شراب بنکر جامِ شراب پی جا

(۵)

چلنے دے دورِ ساغر ہونے دے مے پرستی
سب تیرے ہی لئے ہیں کیف و سرور و مستی
مستی میں غرق کر دے فکرِ مآلِ ہستی
کب تک بسی رہے گی ہوش و خرد کی بستی
کب تک یہ پارسائی کب تک یہ تنگدستی
پھیلا کے ہاتھ لیلے اور پھر شتاب پی جا
روحِ شراب بنکر جامِ شراب پی جا

(۶)

نغماتِ سرمدی یہ یہ دلنشیں صدائیں
یہ عشق کی اُمنگیں یہ حسن کی ادائیں
یہ صبح و شامِ عشرت یہ مدبھری ہوائیں
یہ مے کدہ بداماں مخمور کن گھٹائیں
یہ خوشگوار لمحے پھر آئیں یا نہ آئیں
کچھ گنگنا کے جانِ دورِ شباب پی جا
روحِ شراب بنکر جامِ شراب پی جا

از شاعرِ شباب جناب کوثر قریشی میرٹھی

نسوانی دنیا

عورتیں حسین و خوبصورت کیونکر بن سکتی ہیں؟

چہرے کو حسین بنانے کا طریقہ!

اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ نسوانی چہرے کی تازگی عمر کی زیادتی کے باوجود بھی برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ چہرے کی تازگی کو برقرار رکھنے کی بعض لاجواب ترکیبیں ہمارے علم میں آ چکی ہیں جو عورت چہرے کا جمال برقرار رکھنا چاہے اسے لازم ہے کہ چہرے کی تراش کو نہ بگڑنے دے۔ مالش اس کیلئے ایک نہایت مفید ترکیب ہے مالش سے اعصاب کو بہت تقویت حاصل ہوتی ہے اور خون آسانی کے ساتھ رگوں میں گردش کرتا ہے۔ مالش کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ چہرہ گرد و غبار یا پوڈر وغیرہ سے بالکل صاف ہو۔ مناسب ہے کہ چہرہ پر صابن مل کر خوب اچھی طرح گرم پانی سے دھو لیا جائے۔ اس طرح مسامات کھل جاتے ہیں اور مالش میں آسانی ہوتی ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ پانی زیادہ گرم نہ ہو ورنہ مسامات بہت کھل جائیں گے اور مالش سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ ہوسکیگا۔

چہرے کو کھردرے تولیہ سے رگڑ کر خشک کریں اور تھوڑا سا عمدہ قسم کا فیس کریم گردن اور رخساروں پر آہستہ آہستہ ملیں جب کریم مسامات میں بالکل جذب ہو جائے تو تھوڑا سا کریم اور نکال کر اسے ملنا شروع کر دیں کہ کریم بالکل جذب ہو جائے۔ اگر چہرے پر خشکی زیادہ ہو تو فیس کریم میں کسی قدر لینولین ملا لینا چاہئے جس کریم میں دودھ یا مکھن کا جزو شامل ہو وہ مالش کیلئے بہت اچھی ہوتی ہے۔ دودھ سے اعصاب اور ریشوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور بعض حالات میں چہرے کو محض دودھ سے دھونا بھی جھریاں رفع کرنے کیلئے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ مالش زنخداں سے کنپٹیوں کی طرف کرنا چاہئے۔ آنکھوں کے پپوٹوں پر آہستگی کے ساتھ مالش کریں۔ پیشانی پر مالش کرنے میں انگلیوں کو پیشانی کے وسط سے کنپٹیوں کی طرف لے جائیں اور اس کے بعد کنپٹیوں سے پیشانی کی طرف مالش کریں۔

مالش کے بعد چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں تاکہ کھلے ہوئے مسامات بند ہو جائیں۔

پوڈر اور چہرے کا حسن

کریم اور پوڈر لگانا کچھ مشکل کام نہیں ہر عورت ان چیزوں کو حسب خواہش استعمال کرتی ہے لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی عورت بھی صحیح طریقہ پر ان کا استعمال نہیں کر سکتی جس عورت کے چہرے پر نظر پڑے گی ایسا معلوم ہوگا کہ اس نے آٹے کی بوریاں جھاڑی ہیں اور آٹا اس کے چہرے پر چمٹ گیا ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ عورتیں پاؤڈر لگانے کے بعد پف پاؤڈر اتنا زیادہ لگا لیتی ہیں اور اس کو چہرے پر اس بُرے طریقے سے لگاتی ہیں کہ پوڈر ان کے بے ڈھنگے پن کی چغلی کھاتا ہے۔ اس طریقہ سے نصف سے زیادہ پوڈر بیکار چلا جاتا ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے چہرہ کو صابن سے اچھی طرح دھو کر نرم تولیہ سے آہستہ آہستہ خشک کر لو۔ پھر چہرہ پر وینشنگ کریم لگاؤ۔ اس کے بعد پف پر ہلکا ہلکا پاؤڈر لگا کر چہرہ پر خوب اچھی طرح لگاؤ۔ پہلے ٹھوڑی، پھر ناک، رخسار آنکھوں اور ماتھے وغیرہ پر لگانا چاہئے۔ جلد کو پف سے اس وقت تک آہستہ آہستہ تھپتھپاتے رہنا چاہئے جب تک پاؤڈر جم کر جلد مخمل کی طرح نرم اور چمکدار نہ ہو جائے۔ اس کے بعد زائد پوڈر کو اسی پف سے آہستہ آہستہ صاف کر دو۔ یا نرم کپڑے کو پانی میں بھگو کر بھوؤں، پلکوں اور ہونٹوں کی سفیدی کو صاف کر لو۔ شام کے وقت سیال پوڈر لگانا زیادہ بہتر ہے۔ پوڈر لگاتے وقت گردن اور ہاتھوں کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ سیال پوڈر لگانے کیلئے پہلے کریم لگانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

بازوؤں کو حسین بنانے کا طریقہ

سڈول اور خوبصورت بازو نسوانی حسن کا ایک بڑا جزو ہیں۔ بازوؤں کے حسن و نزاکت کی افزائش کیلئے نئے نئے خصوصی طریقے نکال لئے ہیں۔ اس مضمون میں ہم چند ایسے طریقے درج کرتے ہیں، جو ہندوستانی عورتوں کے لئے بہت مفید ہیں اور ان کے بازوؤں کی خوبصورتی میں معتدبہ اضافہ کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ایک موٹا تولیہ کھولتے ہوئے گرم پانی میں ڈال دینا چاہئے۔ جب تولیہ خوب تر ہو جائے اور اس میں کھولتے ہوئے

پانی کی حرارت بھی اچھی طرح سرایت کر جائے تو اسے بازو کے گرد لپیٹ دینا چاہئے۔ اس عمل سے بازو کی رنگت گلابی ہو جائیگی اور مسامات کھل جائیں گے۔ جب یہ صورت ظہور پذیر ہو جائے تو تلوں کے تیل سے جس میں چند بوندیں لیموں کے رس کی بھی ڈالی گئی ہوں، بازو کی مالش کی جائے۔ یاد رہے کہ مالش شانے سے لے کر کلائی تک بازو کے ہر حصہ پر ہونی چاہئے۔ جب مالش سے تیل بازو میں جذب ہو جائے تو پیرا وکسائڈ ملا ہوا بادام کا نشاستہ بازو پر پھیلا دیا جائے اور تقریباً نصف گھنٹے تک بازو کو اسی حالت میں رہنے دیا جائے۔ نصف گھنٹہ گذر جانے پر بازو کو گرم پانی سے دھویا جائے اور گلیسرین لیموں کے رس اور عرق گلاب سے بنے ہوئے لوشن سے تھپکیاں دی جائیں اس عمل سے حیرت انگیز مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں اور گھر بیٹھے بازو حسین و نازک بن جاتے ہیں۔ اگر یہی نتائج بہت جلدی برآمد کرنے مقصود ہوں تو بادام کا نشاستہ رات کو سوتے وقت بازوؤں پر پھیلا دیا جائے۔ اور رات بھر انہیں اسی حالت میں رہنے دیا جائے اگر سوتے میں نشاستے کے بازوؤں پر سے اتر جانے کا ڈر ہو تو پورے سائز کی دیسی جرابوں کا ایک جوڑا لے کر اس کے پاؤں الگ کر دئے جائیں اور نلیاں بازوؤں پر چڑھا دی جائیں

کہنیوں کو خوبصورت بنانیکا طریقہ

سختی و درشت کہنیوں اور بالوں سے بازوؤں کے حسن پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ کہنیوں کی سختی و درشتی دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ رات کو سوتے وقت سرد کریم جس میں لیموں کا رس بھی ملا لیا گیا ہو، کہنیوں پر لگائی جائے اور سیاہ بال یوں دور کئے جا سکتے ہیں کہ کتان کی گدی کو پیرا وکسائڈ سے تر کر کے اس سے بازوؤں کو تھپکا جائے۔ جب یہ گدی خشک ہو جائے تو ایک دوسری گدی امونیا میں تر کر کے اس سے بھی یہی عمل دہرایا جائے۔ اگر کسی کی جلد غیر معمولی طور پر خشک ہو اور اس عمل سے مضر اثرات مرتب ہونے کا اندیشہ ہو تو ایک آدھ روز تیل کی مالش بھی کر لی جائے۔

ہاتھوں کو خوبصورت بنانے کا طریقہ

بازوؤں کے ساتھ ہاتھوں کی طرف بھی توجہ ہونی چاہئے کیونکہ ایک عورت کے ہاتھ اس کے حسن کے زوال کی چغلی کھانے میں سارے اعضاء سے پیش پیش رہتے ہیں۔ ہاتھوں کو حسین اور نازک بنانے کا بہترین اور سادہ ترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے انہیں گرم پانی اور صابن سے دھو کر میل کچیل وغیرہ سے پاک کر لیا جائے اور پھر لیموں کا رس کافی مقدار میں لے کر فلالین کے کپڑے سے ہاتھوں کی جلد میں جذب کر دیا جائے اور انہیں تھوڑی دیر کیلئے اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ عمل رات کو سوتے وقت کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس حالت میں لیموں کے رس کو جسم پر اثر کرنے کیلئے ایک رات کا وقفہ مل جائے گا۔ صبح کو اٹھ کر گرم پانی اور صابن سے ہاتھ دھو لئے جائیں۔

پیروں کو خوشنما بنانے کا طریقہ

قد و قامت کی موزونی میں پیروں کو بہت دخل ہے۔ بعض حسین عورتیں جن کا کمر تک بالائی حصہ جسم بہت خوشنما اور متناسب ہوتا ہے ان کی پنڈلیوں یا پٹھوں کا بھدا پن خاک میں ملا دیتا ہے۔ معیار حسن قائم رکھنے کیلئے ضرورت اس بات کی ہے کہ درازی میں بالائی حصہ جسم اور پاؤں کے مابین تناسب قائم رہے۔ ٹخنوں کو خوشنما اور متناسب بنانے کیلئے ایک آسان ورزش یہ ہے کہ سیدھے کھڑے ہو کر انگوٹھوں کے بل آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھیں اور پھر آہستہ آہستہ ایڑی کو زمین سے لگا کر انگوٹھوں کو اوپر اٹھائیں۔ ابتدا میں یہ ورزش روزانہ چھ مرتبہ کرنی چاہئے۔ بعد میں اسے بتدریج بڑھایا جا سکتا ہے۔ اگر ٹخنے زیادہ بڑے ہوں تو انہیں سڈول اور متناسب بنانے کے لئے حسب ذیل ورزش مفید ثابت ہوتی ہے اور یہ ایسی ورزش ہے کہ دن میں کسی وقت اور کسی جگہ بھی کی جا سکتی ہے۔

فرش پر بیٹھ کر داہنے پیر پر بایاں پیر اس طرح رکھا جائے کہ انگوٹھے زمین کی جانب رہیں اس کے بعد پیروں کو ٹخنوں سے اس طرح چاروں طرف گھمائیں کہ ہوا میں ایک حلقہ سا بن جائے۔ پہلے ایک پیر کو حرکت دیں پھر دوسرے کو، اور دن میں جتنی مرتبہ بھی آسانی سے ممکن ہو یہ ورزش کریں۔

اور ایک مفید ورزش یہ ہے کہ فرش پر بیٹھ کر ٹانگوں کو پوری لمبائی تک آگے کی جانب اس طرح کھینچا جائے کہ پنجے پر زور پڑے اس طرح پنجوں پر زور پڑنے کے ساتھ ہی جس سے دوران خون پر خوشگوار اثر پڑتا ہے پنڈلیوں کے اعصاب بھی جنبش میں آتے ہیں اعصاب کی جنبش کا دوران خون سے بڑا گہرا تعلق ہے اور دوران خون اعضاء کی خوبصورت بناوٹ اور خوبصورتی کا ذمہ دار ہے اس سے جوڑوں کی رعنائی بڑھ جاتی ہے۔

پاؤں کے ناخنوں کو حسین بنانے کی تدبیر

پاؤں کے ناخنوں کی میلی چھلی ہفتے میں کم سے کم ایک بار ضرور دور کرنی چاہئے۔ گرم پانی کا غسل لینے کے بعد ناخن گیر سے آہستہ آہستہ چھلی کو دور کر دیا جائے۔ میل کی چھلی کو دور کرنے کی ایک اور کیمیاوی ترکیب بھی ہے

نارنگی کے درخت کی ایک پتلی سی شاخ لیکر اس پر روئی لپیٹی جائے اور پھر اسے ہائیڈروجن پیراوکسائڈ میں ڈبو کر ناخن پر پھیرا جائے - اس عمل سے میل کی جھلی فوراً دور ہو جائیگی - اور ناخن صاف شفاف اور چمکدار نکل آئیں گے -

غذا سے افزائش جمال

اگر عورتیں ذیل کے بنیادی اصولوں پر عمل کریں تو ان کے شباب اور حسن کے قیام میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے -

(۱) چوبیس گھنٹے میں کم از کم پانی کے چھ گلاس پیئے جائیں اور غذا میں پھل ترکاریاں اور خام چیزیں کثرت سے شامل کی جائیں (۲) گوشت دن رات میں ایک مرتبہ سے زیادہ نہ کھایا جائے (۳) تلی ہوئی اشیا کے استعمال سے حتی الوسع گریز کیا جائے کیونکہ ان کو معدہ بہت دیر میں ہضم کرتا ہے اور یقینی طور پر ان سے رنگت خراب ہوتی ہے - تلی ہوئی چیزوں کی جگہ اگر بھنی ہوئی چیزیں استعمال میں لائی جائیں تو رنگت پر زیادہ خوشگوار اثر پڑتا ہے - قند، مٹھائیوں اور کیک پیسٹری وغیرہ کو کم سے کم استعمال میں لانا چاہئے - اگر مٹھاس ہی مرغوب ہو تو میٹھے پھل کثرت سے استعمال کئے جائیں - زبان کو مطلوبہ لذت حاصل ہو جائے گی مگر جسم نقصان سے محفوظ رہے گا (۴) بہت زیادہ ثقیل اشیا کھانے سے رنگ بہت خراب ہو جاتا ہے - ان اشیا کو اپنے کھانوں کے پروگرام سے بالکل خارج کر دینا چاہئے - (۵) تیز چائے، کافی الکحل کے استعمال سے جہاں تک ممکن ہو اجتناب کیا جائے -

عورتوں کے حسن و شباب کو برقرار رکھنے کا ایک آسان طریقہ

ایک نوجوان حسینہ نے کسی کامیاب و مشہور ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ حسن و آرائش کا سب سے آسان اور مفید ترین نسخہ کیا ہے ؟ ڈاکٹر موصوف نے جواب دیا - "گہرا سانس لینا"

یہ جواب بغیر کسی تامل اور غور کے دیا گیا تھا لیکن جب اس جواب کے بعد ڈاکٹر نے دیکھا کہ حسینہ کے چہرے پر کوئی اطمینان نہ ظاہر ہوا تو وہ سمجھ گیا کہ چونکہ اس نسخہ کے استعمال میں کوئی خرچ نہیں ہوتا اس لئے اس کا اثر قطعی نہ ہوگا - اس لئے اس نے فوراً ہی اپنے فقرہ کے بعد کہا -

"مگر چونکہ اس علاج میں خرچ نہیں ہے اسلئے آپ اس کو کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتیں مناسب ہوگا کہ میں آپکو کوئی قیمتی نسخہ تجویز کر کے دوں اور صبح و شام آپ اس قیمتی مقوی دوا کا استعمال کریں تو غالباً آپ کا اطمینان ہو سکتا ہے"

ڈاکٹر موصوف کا خیال بالکل درست تھا لیکن لاکھوں خواتین حسن و زیبائش کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتی ہیں - طرح طرح کے علاج کئے جاتے ہیں - بہترین ادویات عرقیات اور صابن وغیرہ کے استعمال ہوتے ہیں لیکن جب دلخواہ فائدہ نہ ہونے کے باوجود جب آئینہ کے سامنے وہ جاتی ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ حسن میں اضافہ کے آثار ضرور ہیں حالانکہ بعض حالات میں وہ مفید ادویات مضر ثابت ہو جاتی ہیں کیونکہ بعض عام عرقیات و روغنیات بغیر کسی ڈاکٹر طبیب کی رائے کے بلا سوچے سمجھے استعمال میں آ جاتے ہیں اور بعض مزاج کے خلاف اور طبعی اختلاف کے سبب مضر ہو جاتے ہیں مگر چونکہ وہ بیش قرار قیمتوں پر خرید کئے جاتے ہیں اسلئے حسن کے اضافہ کا خیال ہونے لگتا ہے -

دراصل سادہ سہل الحصول علاج صحت و تندرستی کو برقرار رکھنے کیلئے ہونا چاہئے اگر عورت تندرست ہے تو اس کی خوبصورتی خودبخود قائم رہے گی جس قدر صحت میں اضافہ ہوگا خوبصورتی بڑھے گی - روغنیات وغیرہ کا استعمال حسن و آرائش کیلئے اس قدر مفید نہیں ہو سکتا جس قدر جسمانی ورزش اور سادہ طبعی طریقوں کے ذریعہ جسمانی حسن کو بڑھایا جا سکتا ہے -

گہرا سانس لینا دراصل ایک ایسا مکمل علاج ہے جس کے ذریعہ حسن و جوانی کو مدت تک برقرار رکھا جا سکتا ہے جو خواتین اس عمل کو مستقل مزاجی سے جاری رکھتی ہیں ان کو شیب کی صورت بہت کم دیکھنا پڑتی ہے لیکن اس پر عمل کرنے والی معدودے چند ہی ہیں عموماً بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کی تجویز کے باوجود استقلال کے ساتھ مسلسل اس عمل کو جاری نہیں رکھتیں حالانکہ نہ کوئی خرچ ہے اور نہ کوئی تکلیف - لیکن روغنیات اور صابن کریم، پوڈر وغیرہ نے ایسا عادی بنا دیا ہے کہ لیٹے لیٹے اور بیٹھے بیٹھے ان کے استعمال میں آرام ملتا ہے - اس لئے اس عادت کی تکلیف برداشت کون کرے -

ہندوستان کی آب و ہوا کے لحاظ سے اکثر ماہرین طب و سائنس کی متفقہ رائے یہی ہے کہ گہرے سانس کی ورزش سے عورتوں کی خوبصورتی اور جسمانی صحت میں چار چاند لگ جاتے ہیں - کیونکہ یہاں آب و ہوا میں حسن کے اضافہ کی بہترین صلاحیت موجود ہے اسلئے جس قدر صاف ہوا سے فائدہ اٹھایا جائے گا اسی قدر صحت ہوگی - گہرے سانسوں کے طریقہ علاج کے فائدے ڈاکٹروں کی رائے میں غیر معمولی ہیں - برخلاف اس کے یہاں بیرونی ممالک کے تیار کردہ روغن اور کریم وغیرہ اس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ وہاں کی آب و ہوا میں تیار نہیں ہوئے - اگر صبح و شام صرف پانچ منٹ کھلی ہوا میں لمبے اور گہرے سانس کی ورزش استقلال کے ساتھ کی جائے

بقیہ بر صفحہ ۷۶

طب جدید کا ایک کرشمہ

نیند

مادر قدرت کی سب سے بڑی نعمت

موتیوں اور جواہرات میں تولنے کے قابل

از- ایڈیٹر

سردیوں کی نسبت موسم گرما میں ہمیں ایک ایک گھنٹہ کی نیند کم درکار ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں نیند کی وہ طاقت جو آدمی کے کھوئے ہوئے قوا کو بحال کرنے کی تاثیر رکھتی ہے سردیوں کے بارہ مہینوں کے مقابلہ میں موسم گرما میں زیادہ بڑھ جاتی ہے بات بالکل سیدھی ہے لیکن اسکے اسباب قدرے پیچیدہ ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو بھی حرکت ہم اپنی روزانہ مصروفیتوں کے سلسلہ میں کرتے ہیں اسکی بدولت تھوڑی یا بہت قوت ہمارے بدن سے گھٹتی ہے۔ ہر ایک خیال جو ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے خواہ وہ کتنا ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو، سرمایہ ہستی کا تھوڑا بہت حصہ ہمارے بدن سے خارج کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

یہ کمی جو ہمارے جسم میں ہر وقت ہوتی رہتی ہے قدرت نے اس کو پورا کرنے کے کئی ذریعے بھی پیدا کر دیے ہیں۔ خوراک جو ہم کھاتے ہیں۔ مشروبات جو ہم پیتے ہیں۔ اور ہوا جس میں ہم سانس لیتے ہیں یہ سب چیزیں اس کمی کو پورا کرنے کا ذریعہ ہیں لیکن سب سے زیادہ اس کمی کو پورا کرنے والی چیز ہماری نیند ہے جتنی طاقت دن بھر کی مصروفیتوں سے ہمارے بدن سے کم ہوتی ہے اس کو ہماری نیند ساتھ کے ساتھ پوری کرتی چلی جاتی ہے۔ خرچ اور آمدنی کا یہ سلسلہ قدرت نے ایسے عجیب طریقے پر قائم رکھا ہے اور حقیقی طاقت ہم اپنے سرمایہ ہستی میں سے نکال کر صرف کرتے ہیں اس کو پورا کرنے کی ترکیب جو قدرت نے اختیار کی ہے اتنی انوکھی ہے نیز یہ سارے عمل اسقدر صحت اور درستی کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو زندگی کے بنک میں جمع شدہ سرمایہ ہستی کا اندازہ اتنی ہی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے جس طرح کسی کاروباری بنک میں اس کی آمدنی اور خرچ کا حساب لگا کر کیا جا سکتا ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم نے عالم بیداری میں کتنی قوت صرف کی اور حالت خواب میں کتنی طاقت جمع کر سکے۔ ان اعداد کے فرق کو اگر اس مدت سے ضرب دی جا سکے جس میں ہم نے یہ عمل جاری رکھا تو حساب کوڑی پیسے تک صحیح نکالا جا سکتا ہے۔

وہ جواب جو ہم اس طریقہ پر حاصل کرینگے یا تو ہماری جسمانی یا ذہنی قوت کی کمی کی صورت میں ہوگا۔ اس سے یہ بھی پایا جائیگا کہ ہمارا بدن اپنی کمزوری کی وجہ سے مختلف قسم کی چھوت دار بیماریاں قبول کرنے کیلئے کہاں تک تیار ہو گیا ہے۔ ہماری بدنی قوت مزاحمت کتنی گھٹ گئی ہے۔ ہماری عصبی پریشانیوں نے کتنی ترقی کی ہے مختصر یہ کہ ہم اوپر کو چڑھنے کی بجائے کسی حد تک نیچے کو گرتے جا رہے ہیں۔

مختلف عالموں نے مختلف نظریے اس بارہ میں پیش کئے ہیں کہ قدرت نیند کے عمل سے ہماری کھوئی ہوئی طاقتوں کو کیونکر بحال کرتی ہے لیکن ان سب میں زیادہ صحیح، زیادہ قابل قبول اور زیادہ تسلی بخش نظریہ وہ ہے جو کیمیائی اصولوں پر مبنی ہے۔

نیند کا اصلاحی عمل

اس اصول کی موٹی تشریح یہ ہے کہ جب ہمارے عضلات سکڑتے یا پھیلتے ہیں۔ جب کوئی بھی تحریک ہمارے دماغ سے گذرتی ہے تو وہ زندگی کی ان کوٹھڑیوں میں جن سے ہمارا بدن مرکب ہے، لحمی ریشوں کی تھوڑی یا بہت مقدار کو تلف کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ تلف شدہ لحمی ریشے ایک زائد چیز کی طرح جیسے ہم گندے پانی کی نالی میں پھینک دیا کرتے ہیں خون کی اسی ندی میں بہا دئے جاتے ہیں جو ہمارے جسم میں گردش کرتی ہے تاکہ ان کا اخراج پھیپھڑوں، جلد، گردوں، یا امعا کی راہ سے ہو جائے کیونکہ جسم انسانی کے زاید از ضرورت اور بے جان مادوں کو باہر نکالنے کے یہی چار بڑے دروازے ہیں جتنا زیادہ تیزی کے ساتھ ہم اپنے دماغ یا عضلات سے کام لیتے ہیں اتنی ہی تیزی کے ساتھ ان میں شکست و ریخت کا عمل ہوتا رہتا ہے اتنا ہی زیادہ

بے جان زہریلے مادے ہمارے خون میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں اور اتنی ہی تیزی کے ساتھ ہمارے اعصاب اور ہمارا بدن ان کا زہریلا اثر قبول کرتا ہے۔

حالت خواب میں وہ جاندار کوٹھڑیاں اور بھی ریشے جو اس قسم کے زہریلے مادے پیدا کرتے ہیں۔ آرام کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اتلاف کا عمل عارضی طور پر رک جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جسم انسانی کے اندر تعمیری عمل شروع ہوتا ہے۔ نہ جانی ہوئی قوتیں اس بناوٹ کی اصلاح اور مرمت کا کام شروع کر دیتی ہیں جس کی شکست و ریخت دن کے وقت ہو چکی تھی جو نقصان ہمارے قوا کو پہنچا تھا اسکی تلافی شروع ہوتی ہے۔ بدن میں مزاحمت کی طاقت جو گھٹ گئی تھی اس کی درستی ہونے لگتی ہے۔

بہت عرصہ نہیں گذرا کہ سائنسدانوں تک میں یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ نیند میں کسی طرح کی تعمیری طاقت نہیں ہے بلکہ وہ محض نفی کا درجہ رکھتی ہے یعنی جب ہم سوتے ہیں تو ہمارے اعضا کام کرنا بند کر دیتے ہیں اور وہ وقت لاحاصل گذر جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ یہ خیال اسقدر مضبوطی کے ساتھ ہمارے ذہن نشین ہو گیا ہے کہ ہم نیند کے متعلق کئی طرح کے برے خیالات اپنے دل میں رکھنے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی آدمی کی کند ذہنی کا ذکر کرنا ہو تو ہم یہی کہتے ہیں کہ "اس کا دماغ سو رہا ہے" حالانکہ دماغ کو سونے کے دوران میں ہی اصلی تازگی حاصل ہوتی ہے۔ عام طور پر کاشتکاروں میں دیکھا جاتا ہے کہ کسی کھیت کا مالک بہت سویرے اٹھا۔ اس نے گائے بھینسوں کو چارہ ڈالا۔ دودھ دوہنے کا عمل پورا کیا۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال کی کچھ اور متفرق کاموں سے بھی فارغ ہو گیا۔ اور جب اس کے بعد وہ آدمی جس کو اس نے اپنے کام میں مدد دینے کیلئے ملازم رکھا ہوا ہے۔ سات بجے کے قریب آیا تو اس نے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے فوراً اس سے پوچھا "کیوں جی تم نے صبح کا وقت کہاں سو کر ضائع کیا؟"

لیکن یہ ایک بالکل ہی غلط خیال ہے کہ ہم سو کر وقت ضائع کرتے ہیں۔ اب پرانے خیالات رفتہ رفتہ ہمارے ذہن سے خارج ہوتے جا رہے ہیں اور ہم نے صحت بخش قدرتی نیند کے فوائد کو پوری طرح سمجھنا شروع کر دیا ہے ترقی یافتہ خیال کے لوگ فی الحال جس نتیجہ پر پہنچے ہیں یہ ہے کہ دنیا میں کسی آدمی نے سو کر اپنا نقصان نہیں کیا اور یہ ایک بالکل ہی غلط محاورہ ہے کہ "جو سویا اس نے کھویا" جب تک جسم اور دماغ کو آرام کی ضرورت ہے۔ جب تک بدن کی کسلمندی رفع نہیں ہوتی اس وقت تک سوتے رہنا بالکل واجب اور درست ہے۔ اس میں کسی طرح کوئی خرابی مطلق نہیں ہے

سویرے اٹھنے کا اصول غلط ہے

اب وہ زمانہ نہیں کہ جب بڑے بوڑھے نوجوانوں کو اس بارہ میں نصیحت کیا کرتے تھے کہ بہت سویرے اٹھنے کے یہ یہ فائدے ہیں یا کہ انسان سویرے اٹھنے کی عادت ڈال کر ہی زندگی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس بارہ میں ہر شخص کو قدرت کے اپنے قانون کے مطابق عمل کرنا چاہیئے اور وہ قانون یہ ہے کہ جتنی نیند جس کو درکار ہو وہ بیشک لے۔ اس میں کسی طرح کا نقصان نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے قدرتی رجحانات ہی درحقیقت ہمارے سچے رہنما ہیں سائنس کی دریافتیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں مگر قدرت کے قانون اٹل ہیں اور جلدی یا بدیر آخر سائنس کو بھی آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہو کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ "بیشک جو کچھ میں نے سوچا غلط تھا اور آیندہ اسی طرح ہونا چاہیئے۔

حاصل کلام یہ کہ نیند ہرگز موت کی نشانی نہیں اور وہ اصول بالکل ہی غلط تھا جس کے مطابق شاعر نے کسی زمانہ میں بیداری کی تلقین کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے ؎

جاگنا ہے جاگ لے آفاق کے سایہ تلے
حشر تک سوتا رہیگا خاک کے سایہ تلے

گویا اب ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں یہ ہے کہ نیند ہی درحقیقت آدمی کو زندہ رہنے کے قابل بناتی ہے۔

نیند نفی کا عمل نہیں بلکہ ایک حقیقی اثباتی عمل ہے اور سارے قدرتی عملوں میں سب سے بڑھ کر اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے جسمانی حرکات رکتی نہیں بلکہ ان میں ایک طرح کی حیات تازہ پیدا ہوتی ہیں۔ اور وہ از سر نو ہر قسم کے کاموں کو زیادہ شوق، زیادہ تیزی اور دلچسپی کے ساتھ کرنے لگتی ہیں۔

دوسرے الفاظ میں ہم اپنی روزمرہ زندگی کو بسر کرتے ہوئے جن تباہ کن عملوں سے گذرتے ہیں ان کی تلافی کا واحد ذریعہ نیند ہے طاقت جسمانی کا جس قدر حصہ انسان کی بیداری میں ضائع ہوتا ہے اتنا ہی نیند کے عرصہ میں پورا ہوتا چلا جاتا ہے ہم جس بلندی سے لڑھکتے ہوئے نیچے کی طرف جاتے ہیں نیند کا عمل ہمیں پھر اسی بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ ہمارے بدن کی بیٹری (Battery) کا مصالحہ جو روزانہ مصروفیت میں ختم ہو گیا تھا نیند اس کو دوبارہ اس میں بھر دیتی ہے۔ ہمارے جسم کی بھٹی میں جب ایندھن جل چکتا ہے تو نیند

اس میں بنا بیرنم ڈال دیتی ہے کیونکہ یہ امر واقعہ ہے کہ نیند کے دوران میں تعمیری عمل تخریبی عملوں سے کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔

نیند کھانے سے بھی زیادہ ضروری ہے

ال مختصر نیند کو تضیع اوقات سمجھنا یا ایک اٹل خرابی سمجھنا سراسر غلطی ہے اور وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ نیند کے عرصہ کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنیکی کوشش کرنی چاہئے۔ اس دنیا میں انسانی یا حیوانی زندگی کے لئے جتنی چیزیں ضروری ہیں ان میں سب سے بڑھ کر نیند ہے۔ ہم کھانا کھاتے ہیں اسلئے کہ ہمیں اچھی نیند آنے لگے مگر ہم سوتے ہیں اسلئے کہ زندگی برقرار رہے۔

دنیا میں ایسے ایسے آدمی بھی گذرے ہیں جو لگاتار فاقہ کشی کرکے ۶۲ دن جیتے رہے اور ایسے بھی ہوئے ہیں جو بغیر پانی کے ایک ہفتہ زندہ رہے لیکن جس شخص کو سونے نہ دیا جائے اور نیند سے بالکل ہی محروم رکھا جائے وہ خواہ اچھی سے اچھی غذا کھاتا ہو، عمدہ سے عمدہ پانی پیتا ہو، تازہ سے تازہ ہوا میں سانس لیتا ہو اگر اس کو بالکل سونے نہ دیا جائے گا تو وہ دس دن سے کم عرصہ میں یقیناً مر جائیگا۔ چینی جس شخص کو اذیت دینا چاہتے ہوں اُسے سونے نہیں دیتے اور ہر وقت جگائے رکھتے ہیں اور دیکھا گیا ہے کہ اسی طرح کی ــــــ حالتوں میں زیادہ سے زیادہ پانچویں یا چھٹے روز ایسے بدنصیب کا دماغ مختل ہو جاتا ہے اور اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔

امریکہ میں ملزموں سے اقبال کرانے کا طریقہ اصطلاح میں "Third Degree" کہلاتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ طریقہ بھی محض اس وجہ سے کامیاب ثابت ہوا ہے کہ اصولاً اس میں اہل چین کے وحشیانہ طریقہ کی پیروی کی گئی ہے۔ انسان کا دماغ ہر طرح کی بک بک جھک جھک کے بعد آرام چاہتا ہے جس بدنصیب سے دن رات لگاتار سوالات پوچھے جاتے رہیں وہ دماغی آرام حاصل کرنے کیلئے صحیح یا غلط طور پر سب کچھ ماننے کیلئے تیار ہو جاتا ہے پھر اُسے اس بات کی پروا نہیں رہتی کہ اس کا اقبال صحیح ہے یا غلط۔ یا اس کا انجام کیا ہوگا۔ ہم اپنے آپکو گو مہذب کہتے ہیں تاہم ایسی باتوں میں ہماری حالت اس زمانہ سے کسی طرح بہتر نہیں ہے جب بدنصیب ملزموں کو زمین دوز نہ خانوں میں لیجا کر اُن سے اقبال کرانے کیلئے شکنجہ میں کھینچتے۔ انگوٹھوں کو لوہے کے ڈنڈوں سے دباتے اور اُن کے منہ میں یہاں تک پانی ڈالتے جایا کرتے تھے کہ ان کا پیٹ پھول کر کُپا ہو جاتا تھا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خوراک جو ہم کھاتے ہیں۔ اس کا نچوڑ نیند کی حالت میں ہی لحمی ریشہ کی صورت اختیار کرتا ہے اور انہی موقعوں پر عمل انہضام پورا ہو کر ہماری کھائی ہوئی چیزوں کا عطر نئے عضلات، دماغی اجزا، خون اور عصبی کوٹھڑیوں کی صورت اختیار کرتا ہے۔

اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ زیادہ سوتے ہیں وہ موٹے تازے کس لئے ہوتے ہیں؟ یا جب کسی شخص کی حالت میں فربہی کا عمل حد سے زیادہ بڑھ چکا ہو تو اس کا موٹاپا کم کرنے کی صورت میں سب سے پہلے اس کی نیند گھٹائی جاتی ہے۔

نہ سونا بھی فاقہ کشی ہے

نیند کی قلت حقیقت میں فاقہ کشی کی ہی ایک صورت ہے اور وہ ایک ایسی فاقہ کشی ہے جس کو اچھے سے اچھے کھانوں کی بڑی سے بڑی مقدار کے ذریعے سے بھی پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال ان لوگوں کی حالت میں دیکھی جاتی ہے جو کسی طرح کی بازی جیتنے کے لئے لگاتار دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ وہ بیوقوف جو چھ دن کی مسلسل بائیسکل کی دوڑ لگاتے ہیں یا ایسی ہی دوسری احمقانہ حرکات کرتے ہیں۔ وہ کسی معمولی آدمی کے مقابلہ میں چار پانچ گنا زیادہ کھانا کھاتے ہیں لیکن جب مقابلہ ہو چکتا ہے تو آپ اُن کی صورت ملاحظہ کریں۔ رخسار اندر کو پچکے ہوئے۔ آنکھیں گویا گڑھے میں اُتری ہوئیں۔ اور ان کے گرد سیاہ حلقے۔ کسی جاندار لاش میں اور ان میں کچھ بھی تو فرق نظر نہیں آتا اس کی وجہ کیا ہے؟ نیند حاصل نہ کرنے سے جو نقصان انہیں پہنچا ہے مسلسل ورزش جسمانی سے بھی زیادہ اُس نے اُن کے اجزائے خوراک کو بھی ریشے بننے کی مہلت نہیں دی۔

شیر خوار بچوں کی بالیدگی کا عمل کبھی تم نے نہیں دیکھا؟ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا سب سے بڑا کام اس دنیا میں صرف ہر وقت بڑھتے رہنا ہوتا ہے۔ پھر کیا نیند کے اس خاص وصف سے کہ وہ انسانی بدن کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیتی ہے۔ وہ دن رات میں سولہ سے اٹھارہ گھنٹے سوکر نہیں گذارتا؟ جب تک بچوں کی حالت میں بالیدگی کا عمل تیزی سے جاری رکھنا منظور ہے۔ قدرت ان کو زیادہ سے زیادہ نیند لینے پر مائل کرتی ہے لیکن جوں جوں وہ بڑے ہوتے ہیں نیند کی خواہش گھٹتی جاتی ہے حتی کہ آخر کار وہ نو گھنٹے کی اوسط پر آکر رہ جاتی ہے۔

یہی اصول بڈھوں کی حالت میں اس کے برعکس عمل میں آتا ہے یعنی وہ کم سوتے اور اتنی ہلکی نیند سوتے ہیں کہ ذراسی آہٹ بھی ان کو جگا دیتی ہے۔ ایسے شخصوں کی ہلکی نیند اور کم سونے کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ان کیلئے نیند کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ اسکا صحیح باعث یہ ہے کہ وہ اس سے زیادہ حاصل ہی نہیں کر سکتے۔ چونکہ نیند کا سب سے بڑا کام بدن میں تعمیری عمل جاری رکھنا ہوتا ہے اور اُن کی حالت میں یہ عمل بالکل ہی رک جاتا ہے۔ اسلئے نیند بھی گھٹتی چلی جاتی ہے۔

بلیوں اور بڈھوں کی نیند

بلیوں کا آنکھیں بند کئے پڑے رہنا۔ یا بڈھوں کا اونگھنا۔ اس کو ہم سچی نیند نہیں کہہ سکتے یہ تو اس بات کی علامتیں ہیں کہ وہ اعضا جو ہستی قائم رکھنے کا ذریعہ ہیں تھک کر اور کمزور ہو کر نڈھال ہو جاتے ہیں یا ایسے مخلوقات کے بدن سے زہریلے مادوں کا اخراج کم ہو جاتا ہے۔ اسلئے اُن کو اونگھ آنے لگتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ رفتہ رفتہ اُنکی بے خبری کا بھی خاتمہ ہونے والا ہے۔

جتنی زیادہ گہری نیند ہو گی اتنی ہی تیزی کے ساتھ جسم کے مضمحل قویٰ میں تازگی آئیگی کیونکہ ہستی انسانی کی برقراری کیلئے جس تعمیری کام کی ضرورت ہے وہ حالتِ خواب میں ہی زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رکھا جا سکتا ہے اور اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بعض اوقات راحت کامل کی حالت میں ایک یا دو گھنٹے کی گہری نیند بھی کیوں اتنی ہی فرحت بخش ثابت ہوتی ہے جتنی رات بھر کی وہ بے چین نیند جو کروٹیں لیتے ہوئے لمبے وقفوں کے بعد آتی ہو اور جس میں طرح طرح کے خواب دکھائی دیتے رہتے ہوں اصلی وجہ یہی ہے کہ وہ دو گھنٹے کی مکمل نیند اس سے بہت زیادہ تعمیری کام سرانجام دے سکتی ہے۔ جتنا آخری صورت کی لمبی نیند سے ممکن ہو سکتا ہے۔

اسی طرح اس سے یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ طاقتور آدمی جو اطمینان قلب کے ساتھ خوب بے فکری کی نیند سوتے ہیں وہ چار یا پانچ گھنٹے کی نیند کے بعد کیوں اتنے تازہ دم ہو کر اٹھتے ہیں جتنے وہ لوگ جن کی نیند غایت درجہ ہلکی ہے جن کی دبی ہوئی یاد ہر وقت ان کے سینوں میں خطرات کا احساس پیدا کرتی رہتی ہے اور جن کے خیالات کی رو ہر لحظہ دور پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ تو دس بلکہ بعض حالتوں میں بارہ یا تیرہ گھنٹے سو کر بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

جن گنتی کے چند شخصوں نے سالہا سال تک لگاتار کام کرتے ہوئے رات کو چار یا پانچ گھنٹے کی نیند پر کفایت کر کے نئی اور انوکھی مثال قائم کی ہے۔ اُنھوں نے نسل انسانی پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اور اس کی راہ میں کانٹے بوئے ہیں۔ کیونکہ اسی غلط مثال سے لوگوں نے غلط اندازے قائم کرنا شروع کر دیئے ہیں حتیٰ کہ آج جو شخص جی بھر کر دس گھنٹے کی نیند لیتا ہے اسے قابلِ مذمت سمجھا جاتا ہے۔

اصلی راحت بخش نیند جو ہمارے بدن میں تعمیری کام کرتی ہے۔ وہ بدن کے تمام ریشوں میں آکسیجن کا صحیح توازن بھی قائم کر دیتی ہے اور اس کا ہماری صحت پر نہایت اچھا اور مفید اثر پڑتا ہے۔ یہ کیونکر ہوتا ہے اس کا حال ہم آگے چل کر درج کرتے ہیں۔

نیند کیونکر آکسیجن کا توازن پورا کرتی ہے

دن کے وقت انسانی دماغ کی کوٹھڑیاں اتنی آکسیجن صرف کر دیتی ہیں جتنی ان کو خون کے راستے یا پھیپھڑوں کے ذریعہ مہیا نہیں کی جا سکتی۔ آکسیجن کی اس کمی سے جسے فاقہ کشی کی ہی ایک صورت قرار دیا جائے دماغی کوٹھڑیوں کی وہ حالت ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے نیند میں تعمیری عمل میں آتی ہے۔

جب آدمی سوتا ہے تو جتنی آکسیجن وہ صرف کرتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے جسم میں داخل ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد آکسیجن جتنی گھٹی تھی اتنی ہی پھر بدن میں آ جاتی ہے اور صحیح توازن برقرار رہتا ہے۔ اس عرصہ کی حد اس لئے مقرر نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس کا دارومدار کئی ایک باتوں پر ہے مثلاً پھیپھڑوں کی مجموعی حالت، سانس کی گہرائی، خوابگاہ میں تازہ ہوا کی آمد و رفت یا کمی اور خون کے اندر ان سرخ ذرات کی کثرت یا قلت جو آکسیجن کو تمام ریشوں تک لے جاتے ہیں کیونکہ مخفی نہ رہے یہی واحد ذریعہ آکسیجن کو بدن کے اندر ایک سے دوسرے مقام تک لے جانے کا ہے۔

اگر یہ معاملہ اتنے سے بھی واضح نہ ہوا ہو تو ہم اس کی تشریح مزید کیلئے کچھ اعداد و شمار بھی درج کر دیتے ہیں۔ ہر چوبیس گھنٹوں کے اندر جسم انسانی سے عالم بیداری میں ساٹھ فیصدی آکسیجن خارج ہوتی ہے اور صرف چالیس فی صدی اندر جاتی ہے لیکن نیند کی حالت میں

باقی برصفحہ ۶۰

"کسی فراموش کار کے حضور میں"

از جناب امید رضوی بریلوی

سلام اے مجھے دل سے بھلانے والے سلام — تری نوازشیں دل پر ابھی ہیں نقش تمام
ابھی ہیں یاد وہ آغازِ عشق کی راتیں — وہ روٹھنا، وہ منانا، وہ پیار کی باتیں
محبتوں میں وہ ڈوبے ہوئے پیامِ شکیل — وہ تیرے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوطِ جمیل
وہ رازدارِ غمِ عشق، وہ امینِ الم! — غمِ جدائی کی جس میں شکایتیں پیہم!
گلہ نصیب کا دُنیا کی بے رُخی کا ملال — نگاہبانوں کی سوءِ ظنی کا دل پہ خیال
وہ آرزوؤں کی ناکامیاں، وہ زیست سی تنگ — سُتا سُتا سا وہ چہرہ اُڑا اُڑا سا رنگ
بلائے ہجر کی سنگین آفتوں کا الم — جفائے گردشِ دوراں کا دل پہ بارِ غم
خیالِ غیرتِ ناموس، رنجِ تنہائی — قدم قدم پہ عناں گیر پاسِ رسوائی
وہ اُلجھنیں سی مرے اضطراب پر تیری — وہ برہمی اسی رواجِ حجاب پر تیری
مرے لئے ترا راتوں کو جاگنا اکثر — وہ میری یاد میں رو دینا مضطرب ہو کر
وہ ارتباطِ مراسم یہ قسمیں اُلفت کی — وفا کے عہد یہ سوگند وہ محبّت کی
شروعِ عشق میں افشائے راز کا خطرہ — وہ احتیاط لبوں پر وہ ضبط کا پہرہ
تلافیِ حسنِ تبسّم سے میرے شکووں کی — گذشتہ طرزِ تغافل کی معذرت خواہی
غرورِ ناز میں رنگِ نیاز کے جلوے — تبسّمات میں سوز و گداز کے جلوے

مجھے ہیں یاد ابھی یہ عنایتیں تیری
بھلا سکا نہ ابھی تک محبتیں تیری

یہ کیا کیا مجھے دل سے بھلا دیا تُو نے — نشاطِ زیست کو یوں غم بنا دیا تُو نے
وفا کے پردے میں برباد کر دیا تُو نے — مری امیدوں کو ناشاد کر دیا تُو نے
تجھے جو مدِنظر یُوں مجھے بھلانا تھا — جو کس مپرسی میں یُوں مجھ کو چھوڑ جانا تھا
جو اختیار نہ تھا تجھ کو اپنی ہستی پہ — جو اعتبار نہ تھا اس ذلیل بستی پہ

دیا تھا کیوں مجھے تُو نے پیامِ اُلفت کا
یقین مجھ کو دلایا تھا کیوں محبّت کا

چاہت

از جناب نجمی [illegible]

اس کے دو ہی کام تھے ــــــ دفتر جانا اور اپنے محبوب کے تصور سے کھیلنا۔ ساڑھے دس سے لے کر وہ دفتر کے فائلوں کے جھنڈ میں گھرا رہتا۔ لمحہ بھر کیلئے اسے چھٹی نہ ملتی اور پانچ بجے کے بعد جب وہ دفتر سے باہر نکلتا تو سب سے پہلا خیال جو اس کے دماغ میں آتا وہ اس کی محبوبہ کا حسین و جمیل تصور، اس کی باتیں، اس کا ہنسنا، اس کے چہرے کی اُداسی، وہ سب کچھ اس کے ذہن میں یکے بعد دیگرے آنے لگتا جو کبھی اس کی معیت میں ہو گذرا تھا۔ کتنا خوشگوار تھا وہ معیت کا زمانہ!

گیارہ سال بیت جانے کے بعد بھی اس کے ذہن میں وہ سب باتیں اس طرح یاد تھیں جیسے کہ کل ہی شام کو یہ سب باتیں ہو گذری ہوں ــــ وہ انہی خیالات میں کھو جاتا ــــ اسے یاد آجاتا کہ کس طرح اس کو شروع شروع محبت ہوئی تھی ــــ یہی گرمی کا آغاز تھا۔ بہار کی پون چلنے لگی تھی۔ ٹنڈ منڈ درختوں کی ٹہنیوں میں سنہری سنہری پتیاں نکلنے لگی تھیں۔ کتنا سہانا وقت تھا۔ ہر سو چڑیوں کا دلنواز چہکار، کوئلوں کا ڈالیوں پر بیٹھ کر کوکنا، پپیہوں کا وہ دلنواز شور، بہکی ہوئی ہوائیں، ــــ باولی باولی مستانہ لطیف ــــ بڑا ہی خوشگوار زمانہ تھا وہ۔ اور ایسے ہی آغاز بہار میں وہ روحی کے گھر گیا تھا۔ وہ کیا جانتا تھا کہ وہ وہاں جا کر کسی کی نگاہ کا اسیر ہو جائیگا۔ وہ اجنبی کی طرح روحی کے دروازہ پر اکیلا یونہی کسی خیال میں محو بیٹھا تھا کہ اچانک اسکی نگاہ ادھر کو اُٹھ گئی تھی۔ نگاہ اُٹھتے ہی کوٹھے پر اس نے کسی حسین چہرے کو بڑی سُرعت سے چھپتے ہوئے دیکھا تھا اور اس ایک ہی جھلک سے اس کے دل میں ایک محبت کی خلش پیدا ہو گئی تھی اور اس خلش نے بڑھتے بڑھتے محبت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور اس کے بعد زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کی محبت میں بھی شدت اور استواری پیدا ہوتی چلی گئی۔

اور پھر ایک شام ایسی بھی آئی جب روحی کا ننھا منا گورا گورا نازک نازک ہاتھ نجم کے ہاتھ میں تھا اور روحی کہہ رہی تھی "میرے چین جس ہاتھ کو تم آج تھامے ہوئے ہو ہمیشہ اسی طرح تھامے رہنا۔ اسے کبھی چھوڑ نہ دینا ورنہ تمہاری روحی کہیں کی نہ رہیگی" اور اس نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اتفائے عہد کا وعدہ کر لیا تھا۔

روحی سے نجم کا کوئی رشتہ نہ تھا صرف اتنا سا تعلق تھا کہ نجم کے بڑے بھائی خورشید اور روحی کے والد اختر مہر سے بڑی دوستی تھی اور اس محبت و شفقت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ نجم ان کے یہاں روز آتا اور جاتا تھا۔

نجم ہوسٹل میں رہتا تھا اور ہوسٹل سے اختر مہر کا مکان بہت ہی نزدیک تھا جب پہلے پہل نجم پٹنہ کالج میں داخل ہوا تو چھ ماہ تک اسے کوئی خبر نہ ہوئی کہ خود اس کے بھائی کے کوئی اتنے گہرے دوست بھی اس شہر میں موجود ہیں جب خورشید نے نجم کو لکھا کہ تم اختر مہر کے یہاں ضرور جایا کرنا وہ تمہاری ہر طرح کی مدد کرینگے۔ ان کو میری ہی جگہ سمجھو اور یہ کہ ان کو یہ معلوم کر کے بہت صدمہ ہوا کہ تم اس شہر میں رہتے ہو اور ان کو اسکی خبر بھی نہیں ہے۔ خط ملتے ہی ان کے یہاں چلے جاؤ۔ تب جا کے نجم کو معلوم ہوا کہ اس کا بھی اس غربت میں کوئی رہتا ہے۔ اور ایک بار اختر مہر سے ملنے کے بعد اس کو اپنی غربت کا خیال ہی جاتا رہا۔

ادھر اختر مہر کا حسن سلوک اور محبت، ادھر گھر والوں کی الفت و مودت، نجم کو ایسا معلوم ہوا جیسے کہ وہ اپنے ہی گھر میں ہو۔

نجم اپنے تمام بھائیوں میں چھوٹا تھا۔ خورشید کو نجم اپنے باپ کی جگہ سمجھتا تھا۔ اور بات بھی ایسی ہی تھی۔ نجم کی جب دو برس کی عمر تھی تو اس وقت نجم کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور خورشید ہی نے اسکی دیکھ بھال تعلیم و تربیت کی تھی۔

آغاز اپریل تھا اور نجم کا آخری سال۔ روحی کیلئے نجم کی جدائی کا خیال ابھی سے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا۔ پر انسان کے خوشی کے ایام اتنی جلدی گذر جاتے ہیں جیسے اس نے کوئی خوشگوار خواب دیکھا اور پھر بیدار ہو گیا۔ بیداری نے اس کے دل میں تلخی، چبھن اور درد پیدا کر دیا۔ روحی اور نجم جب تک ساتھ ساتھ رہے انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ انہیں کبھی جدا ہونا ہے جیسے وہ کسی شیریں خواب میں مدہوش

پڑے ہوں اور ان کی آنکھیں کھلیں تو انہوں نے اپنے ہر سمت حدِ نگاہ تک اندھیاری ہی اندھیاری دیکھی اور اس مکمل اندھیاری میں دور بہت دور امید کی مبہم سی روشنی جھلملا رہی تھی۔ وہ تھا آپس کا عہد و پیمان

آخر ایک دن ایسا بھی آیا جبکہ نجم ڈبڈبائی ہوئی نگاہوں سے روحی سے جدا ہو رہا تھا۔ دونوں کے دل میں آس تھی۔ امید تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا کہ پھر دونوں ایک دوسرے سے ملیں گے اور اس طرح ملینگے کہ سماج کی کوئی طاقت اس بندھن کو توڑ نہ سکے گی۔

نجم کلکتہ چلا آیا۔ گردشِ زمانہ نے اُسکو خوب پیسا۔ مطلب پرست دوستوں کے جھوٹے اور رنگین وعدے اس کی سنہری زندگی کے قلعے کی جڑ کو کھوکھلی کرنے لگے۔ اور وہ نوکری کی امید میں دوستوں کے رنگین وعدوں کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دس سال بیت گئے اور اسے کوئی نوکری نہ ملی۔ گیارہ سال بعد اسے ایک معمولی کلرک کی نوکری بغیر کسی سفارش کے مقابلہ کے امتحان کی کامیابی کے بعد حاصل ہوئی اور اب تک روحی اس کی راہ تک رہی تھی۔ اور اب ان کے وعدے حقیقت کا جامہ پہننے والے ہی تھے کہ اچانک روحی کے ظالم باپ نے روحی کی شادی کر دی۔

اور اس کے بعد چاہت اور محبت کی وہ لہریں جو ان کے دلوں میں ہلکورے مار رہی تھیں، جوش پر آ گئیں۔ اور ان دو جوان کی بڑی بڑی لہروں نے دونوں کو اپنے لپیٹ میں لے لیا اور دونوں ایک ہی وقت ایک ہی سمے سماج کے ظلم کی سرحدوں کو عبور کر کے کسی دوسری دنیا میں چل بسے۔

نیند (بقیہ صفحہ ۵۴)

اس کے بالکل برعکس ۷۰ فی صدی آکسیجن اندر جاتی اور صرف ۴۰ فیصدی باہر آتی ہے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ عالمِ بیداری میں آدمی کا جسم جتنی آکسیجن اپنے اندر کھینچتا ہے اس سے بیس چالیس فیصدی زیادہ خارج کرتا ہے۔ حالانکہ سوتے میں یہ عمل منقلب ہو جاتا ہے۔ یعنی جتنی آکسیجن جسم سے باہر جاتی ہے اس سے بیس یا چالیس فی صدی بدن میں جذب ہو کر چلی جاتی ہے۔

اور سچ پوچھئے تو نیند کی مدت کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ قدرت کو بدن کے لحمی ریشوں میں آکسیجن کا توازن قائم کرنے جسمانی بیٹریوں (Batteries) میں نیا مصالحہ بھرنے۔ شکست و ریخت شدہ لحمی ریشوں کو از سرِ نو بنانے اور بدن کے اندر نقصان پیدا کرنے والے جو زہر پیدا ہو چکے ہیں ان کو بھسم کرنے یا کسی دوسرے طریقہ پر بدن سے باہر نکال دینے کیلئے کتنا وقفہ درکار ہے۔

جب لحمی ریشوں میں آکسیجن کا توازن صحیح طور پر قائم ہو جاتا ہے۔ ہمارے اندر نقصان کے جتنے زہر تھے وہ یا تو بدن سے باہر نکال دئے جاتے ہیں یا قدرت اپنے طریقہ پر آکسیجن سے ان کو جلا دیتی ہے اور بدن کی تھکی ہوئی کوٹھڑیاں از سرِ نو اصلی صورت اختیار کر سکتی ہیں تو ہم راحت و آرام محسوس کرتے ہوئے تازہ دم ہو کر جاگ اُٹھتے ہیں اور اس وقت ہماری یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر ہم زیادہ سونے کی کوشش بھی کریں تو نہیں

(بقیہ صـــ۶۵) پر نچھاور کر دوں تو عالمِ بے خودی میں بے اختیار میری زبان سے نکل گیا ــــ "لتا!"

اتنے میں لتا ہاتھ میں پان کی طشتری لئے مسکراتی ریڈنگ روم میں داخل ہوئی۔ بولی "کیوں کیا ہے؟" میں نے اسی از خود رفتگی کے انداز میں جواب دیا ــــ "میں تمہیں پیار کرتا ہوں!" لتا نے نہ جانے کن نظروں سے ایکبار میری طرف دیکھا۔ میں آرام کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پان کی طشتری زمین پر گر پڑی۔ میں نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں لے لیا۔ اس کا سر میرے سینے پر تھا۔ اور میرے گرم گرم مرتعش ہونٹ اس کے کانپتے ہوئے حسین ہونٹوں پر۔ اب میرے دل میں کوئی اضطراب اضطرار باقی نہ رہا۔ میں ایک مکمل فردوسی سکون میں کھو گیا۔

(بقیہ صـــ۶۸) کنارے شریف اور ناصرہ کو ٹہلتے ہوئے دیکھا گیا۔ ناصرہ کے سیاہ بال اس کے صبیح و دلکش رخساروں پر بل رہے تھے، اور اس کا حنا آلود ہاتھ شریف کے ہاتھ میں تھا، ادھر دریا میں لہریں اُٹھ رہی تھیں، اور اس طرف پریم کا ساگر نیچے اوپر ہو رہا تھا، پیار، محبت کی باتیں، دریا کا کنارہ، دو جوان دل، آزادی، جائز محبت، وہ دونوں بیخود ہوئے جاتے تھے ــــ آپ کسی کو خط لکھیں تو لفافہ ذرا سوچ سمجھ کر بند کیجئے، ایسا نہ ہو کہ کسی کے نام کا خط دوسرے کے پاس پہنچ جائے ــــ ناصرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور شریف نے قدرے جھینپ کر، ناصرہ کے اس ہاتھ کو چوم لیا جس پر زخم کا دھندلا سا نشان باقی رہ گیا تھا، لہروں کی آواز بوسہ کے چٹخارے میں گھل مل گئی۔

شعرائے مست قلندر

از جناب مولانا سید افقر موہانی وارثی

بتائیں کیا کہ پہونچے کس طرح ہیں کوئے قاتل میں
کبھی منزل میں دل تھا اور کبھی منزل تھی خود دل میں

وہ جلوے اور وہ جلووں کی تابانی معاذ اللہ
چمک اُٹھیں ہزاروں بجلیاں ہر گوشۂ دل میں

اُٹھا جب پردۂ حائل تو یہ منظر نظر آیا
کہ لیلے کسوتِ مجنوں میں تھی مجنوں تھا محمل میں

کفن پہنے کھڑی ہیں سامنے مُردہ تمنائیں
کھنچا گورِ غریباں کا مرقع ہے مرے دل میں

خلش تیرِ نظر کی دونوں جانب کیوں نہ یکساں ہو
کہ پیوستہ جگر میں کچھ تو پیوستہ ہے کچھ دل میں

نمازِ عشق ادا کیا ہو وہ جانبازوں کا مجمع ہے
جگہ ملتی نہیں سجدہ کو میرے کوئے قاتل میں

اسے انجامِ اُلفت اب کہوں یا زیست کا حاصل
رہے ہیں اور رہیں گے زندگی بھر وہ مرے دل میں

سمجھنے کو یہی بے مہری عالم کے کیا کم ہے
گئے دُنیا سے جو آئے نہ پھر دُنیا کی محفل میں

وہی تھی اک تجلّی حُسنِ جاناں نام تھا جس کا
محبّت بن گئی جلوہ نما ہو کر مرے دل میں

نظر آیا یہ منظر دیکھنے والوں نے جب دیکھا
کسی کے تیر میں دل تھا کسی کا تیر تھا دل میں

پہنچنا منزلِ حشر و قیامت تک تو مشکل تھا
عدم کے جانے والے رہ گئے پہلی ہی منزل میں

تجھے معلوم کیا زُلفوں میں شانہ کھینچنے والے
کھنچی جاتی ہے تن سے روح وہ ہے کشمکش دل میں

عجب نیرنگیاں بحرِ محبّت کی ہیں اے افقر
کہ ہم اُبھرے جو طوفاں میں تو ڈوبے جا کے ساحل میں

جب سے برہم وہ نگاہ فتنہ گر ہونے لگی
زندگی اپنی حدوں میں مختصر ہونے لگی

پھر وہی صورت مرے پیشِ نظر ہونے لگی
بیٹھے بیٹھے دل بھر آیا چشم تر ہونے لگی

اس طرح اپنی شبِ غم مختصر ہونے لگی
نام اُن کا لب پہ آیا اور سحر ہونے لگی

مجھ پہ اُٹھی اور یوں اُٹھی محبّت کی نگاہ
زندگی کی زندگی زیر و زبر ہونے لگی

وہ کچھ اس رفتار سے دل کے قریب آنے لگے
مجھ سے میری زندگی نزدیک تر ہونے لگی

اللہ اللہ اُن حسین آنکھوں کی پیہم گردشیں
اک اشارے میں مہم اُلفت کی سر ہونے لگی

رفتہ رفتہ غم میں ایسی دلکشی پیدا ہوئی
خود طبیعت بے نیازِ چارہ گر ہونے لگی

بیقراری کی عطا بخشی متاعِ درد و غم
اب تو مجھ پر مہرباں ان کی نظر ہونے لگی

اس طرح اختر خیالِ دوست آیا ہجر میں
شام ہونے بھی نہ پائی تھی سحر ہونے لگی

جو غرور و فخر ہے حسن پہ تو پھر اسکو پردہ فگن بنا
یہ تو جلوہ گاہ امید ہے اسے حوصلوں کا چمن بنا

جو چھپا کے رکھی تھیں بجلیاں مرے اضطرابِ خیال نے
کبھی اس سے مرکزِ دل بنا کبھی تن بنا کبھی من بنا

ملے ایسے یار یہاں بہت جو رفیقِ راحتِ عیش تھے
یہ رفیق ایسا نہ مل سکا جو شریکِ رنج و محن بنا

ہیں ہزار رخنے پڑے ہوئے مرے ضبطِ غم کے بیان میں
فقط ایک نقطِ غلط نہیں جو حجابِ شرحِ سخن بنا

جسے کذب و مکر عزیز تھا اُسے دکھ نہ کوئی پہنچ سکا
جو صداقتوں پہ جیا کیا وہی نذرِ دار و رسن بنا

جو تمہارے ناز کا راز تھا وہ مرے نیاز نے پا لیا
کہ لہو غریب کا جل چکا تو امیر کا وہی دھن بنا

مرا شکوہ دزخورِ اعتنا نہیں ہو سکا جو ہُوا تو یوں
کہ جو اشک بن کے ٹپک پڑا وہی آبروئے سخن بنا

جو چھٹے بھی قیدِ قفس سے ہم تو نہ بال و پر ہیں نہ زور ہے
جسے برق و باد مٹا چکے وہی باغ اپنا وطن بنا

ابھی بزمِ دہر میں دیکھنا ہی کچھ اور رونقِ خستہ تن
کہ جو پیرہن تھا غریب کا وہی دوستوں کا کفن بنا

کیفیاتِ عصمت

طالبِ جلوۂ جانانہ بنایا ہوتا
مجھ کو بھی ہوش سے بیگانہ بنایا ہوتا

کعبۂ دل کو صنم خانہ بنایا ہوتا
کفر کا دین کو دیوانہ بنایا ہوتا

ہم بھی پینے تری آنکھوں سے مئے جامِ الست
بیخودِ نرگسِ مستانہ بنایا ہوتا

خیر گذری وہ سرِ بام نہ آیا، ورنہ
اور دیوانے کو دیوانہ بنایا ہوتا

لطف جب تھا کہ چھلکتی ترے قشقے سی شراب
آگ کی سطح پہ مے خانہ بنایا ہوتا

قیس و فرہاد کے قصّے تو لکھے خوب عصمتؔ
آپ اپنا کبھی افسانہ بنایا ہوتا

از جناب عصمت الٰہ آبادی (بمبئی)

نغماتِ جنوں

میں خود کو مٹاتا چلا جا رہا ہوں
بس اک حشر ڈھاتا چلا جا رہا ہوں

جہاں کے تصوّر سے گرتے تھے آنسو
وہاں مسکراتا چلا جا رہا ہوں

عمل زندگی، زندگی ہے عمل سے
یہی آزماتا چلا جا رہا ہوں

سمٹ آئی ہیں منزلیں دو جہاں کی
قدم یوں بڑھاتا چلا جا رہا ہوں

ٹھہرتا نہیں ہیں سرِ راہِ ہستی
رُلاتا ہنساتا چلا جا رہا ہوں

حقیقت کے رُخ پر پڑے تھے جو پردے
وہ پردے ہٹاتا چلا جا رہا ہوں

از جناب ... الٰہ آبادی

معصوم و شریف کا ترصال

زخموں کے بعد پھول

از جناب ماہر القادری

بدنامی اور بے گناہی کی کشمکش!

بیسویں صدی کے نوجوان بڑے دل پھینک ہوتے ہیں۔ جہاں کوئی اچھی صورت نظر آئی۔ یہ فوراً ہی اس کے عشق میں مبتلا ہو گئے اور دل کا دورہ پڑنے لگا۔ پارکوں، بازاروں اور تفریح گاہوں میں آپ کو سینکڑوں نوجوان نظارہ بازی کرتے ہوئے ملیں گے مغربی تہذیب نے نگاہوں کو آوارہ اور شوق کو بہت زیادہ تند و تیز کر دیا ہے۔ پاکبازی اور عصمت کے دامنوں کی —— دھجیاں سر بازار اڑ رہی ہیں اور اچنبھے کی بات تو یہ ہے کہ لوگ اس بے حیائی پر فخر کرتے ہیں۔ سینما، فحش تصویروں اور گندے لٹریچر نے اس شراب کو اور زیادہ تیز کر دیا ہے۔ اور دل و دماغ پر ہوسناکی کا غلبہ ہے۔ ایسے ہوس انگیز دور میں کسی نوجوان کا پاکباز رہنا حقیقت میں کردار (Character) کا معجزہ ہے۔ شریف بھی ایک ایسا ہی نوجوان تھا جس کے کردار کا ہر ورق لغزش و معصیت کے سیاہ داغوں سے خالی تھا۔ اس پاپی دنیا میں شریف سچ مچ فرشتہ، سادھو اور رشی تھا۔ جوانی کا طوفان اندھا، بہرا اور گونگا ہوتا ہے جس کے شور میں نہ تو نصیحت کرنے والی کی نصیحت سنی جاتی ہے اور نہ نشیب و فراز کی بڑی سے بڑی ہولناکی جوان آدمی کو روک سکتی ہے مگر شریف کی سیرت اس کے نام کی طرح سادہ اور شریف تھی۔ شریف کے ساتھی اسے بے وقوف اور سادہ لوح کہہ کر پکارتے تھے۔ شریف مسکرا کر ہر طنز کو سنتا شرافت اور انسانیت، کمینگی کے طعن و تشنیع کا جواب نہیں دیا کرتیں!

محلہ میں کسی کے یہاں شادی تھی۔ باہر سے بارات آئی جس میں گانے، ناچنے کا بھی انتظام تھا۔ شریف کو بھی شادی میں مدعو کیا گیا۔ محلہ کے آوارہ اور شوقین نوجوانوں کی تو خوب لہر بہر رہی تھی۔ اچھا کھانا، سجی ہوئی محفل، خوبصورت طوائفیں! شہدپن اور مذاق کیلئے ہر طرح کی آزادی شریف کھانا کھا کر گھر واپس جانا چاہتا تھا۔ اس کے ایک دوست نے پکڑ لیا کہ گانا سن کر جانا، ایسے موقعے روز روز تھوڑی آتے ہیں! شریف نے کہا کہ مجھے ضروری کام ہے، اور ضروری کام بھی نہ ہوتا تو بھی میں گانا وانا سننے کا شائق نہیں ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ لیکن شریف کے دوست نے اس کی شیروانی کا دامن تھام لیا کہ تمہیں دوستوں کے ساتھ گانے کی محفل میں بیٹھنا پڑے گا۔ دوست کے تیور بہت کڑے اور خشمگیں سے تھے۔ شریف کو رک جانا پڑا۔

شب میں دس بجے کے بعد رقص و سرود کی محفل کا جماؤ ہوا، شامیانہ کے نیچے دعوتیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ شطرنجی کے اوپر دودھ سی سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی، بیچ میں طوائفوں کے ناچ کیلئے جگہ چھوڑ دی گئی تھی اور اس میدان رقص کے چاروں طرف قالین بچھے ہوئے تھے۔ اور ان پر ممتاز لوگ بیٹھے ہوئے سگرٹوں اور پیچوانوں کے دھوئیں اڑا رہے تھے۔ شریف بھی ایک طرف خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اہل محفل کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ رہی تھی، محسوس ہوتا تھا کہ یہاں ایک شخص کو بھی دین و دنیا کا کوئی غم نہیں ہے، ان لوگوں کو جشن منانے اور عیش کرنے کیلئے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ مجمع میں ہل چل سی پیدا ہو گئی۔ طوائفیں آئیں اور اپنے خاص انداز میں سلام کر کے ایک طرف کو بیٹھ گئیں۔ بہت دیر تک ساز ملایا جاتا رہا اور طوائفیں دانستہ طور پر شرما شرما کر کنکھیوں سے اپنے مشتاقانِ جمال پر نگاہیں ڈالنے لگیں۔ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ یہ دلدوز تیر میری طرف پھینکے جا رہے ہیں۔ نوجوان تو تیر

سینوں میں جوان دل اور گرم جذبات رکھتے تھے۔ اُن پر تو اس بناوٹی ناز و انداز کا اثر ہونا ہی چاہیئے تھا لیکن ہنسی کے قابل تو بوڑھوں کی حرکتیں تھیں جو تن تن کر طوائفوں کو گھور رہے تھے، اور ان کی نگاہیں زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ "اے اللہ کی بندیو! ان ناتجربہ کار لونڈوں سے ہم تجربہ کار بوڑھے تمہارے ناوکِ نگاہ کے حقدار ہیں ——!"

مگر اس کو کیا کیا جائے کہ بناوٹ بھی جوانی کی طرف جھکتی ہے اور تجربہ کار بڑھاپا ریاکار حسن کو بھی اپنی جانب مائل نہیں کر سکتا۔

سب سے زیادہ حسین طوائف زرق برق پشواز پہنے ہوئے کھڑی ہوئی۔ وہ حسین بھی تھی اور سب سے زیادہ کمسن بھی خوب کھلتا ہوا رنگ، کتابی چہرہ، میانہ قد اور سیدھے رخسار پر تل کا بہت ہی نمایاں نشان! تنگ لباس نے اس کے سینہ کے ابھار کو اس درجہ نمایاں کر دیا تھا کہ جسم کے ہر مقام سے ہٹ کر نگاہیں اسی جگہ پڑتی تھیں۔ گھنگروؤں کو بجاتے ہوئے وہ اُلٹے پیر کے پنجے کو موڑ کر اور سیدھی جانب کی ران کو ذرا خم دیکر کھڑی ہوگئی۔ تمام محفل پر بے خودی سی طاری ہو گئی۔ پھر اس نے آنکھوں کو گردش دینی شروع کی، سامنے بیٹھے ہوؤں کو دیکھتے ہوئے! شریف کے سوا ہر شخص اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شریف بیٹھا تو مخملی قالین پر تھا۔ لیکن اُسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کانٹوں کے فرش پر بیٹھا ہے۔ طوائف نے شریف کی طرف آکر ناچنا شروع کیا۔ اور شریف کی طرف دیکھا۔

"شریف! تم کتنے بدقسمت ہو۔ وہ تمہاری طرف کئی بار دیکھ چکی ہے۔" ایک دوست نے شریف سے کہا۔

"لعنت ہے ایسی خوش قسمتی پر —— لاحول ولا قوۃ! ——"

شریف نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اُسکی پیشانی پسینہ میں ڈوبی ہوئی تھی اور وہ اس محفل میں ایک لمحہ کیلئے بھی بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ دوست روکتے ہی رہے مگر شریف نہ رکا۔ دوستوں نے محفل ختم ہونے کے بعد شریف پر فقرے کسے، ایک دوست نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

"یہ شریف! کچھ یوں ہی...... معلوم ہوتا ہے، عورتوں سے اسے دلچسپی نہیں ہے ——!"

اس واقعہ سے شریف کی سیرت اور کردار کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے!

شریف بندوبست کے محکمہ میں ملازم تھا۔ وہ وقت کا پابند، فرض شناس اور مرنجان مرنج پالیسی کا آدمی تھا۔ سب لوگ اس سے خوش تھے، یہاں تک کہ چپراسی بھی اس کو اپنا ہمدرد اور غمگسار سمجھتے تھے۔ اس کی زندگی بے لوث اور پاکبازانہ تھی، تنخواہ کے علاوہ کسی بالائی آمدنی کو وہ حرام سے بڑھکر سمجھتا تھا، دفتروں اور کچہریوں میں اس کیریکٹر کے لوگ بہت ہی کم پائے جاتے ہیں

شریف کسی ضرورت سے دو دن کی رخصت لے کر اپنے ماموں کے یہاں گیا وہاں کوئی ضروری کام نکل آیا۔ اس لئے اُس نے دو دن کی مزید رخصت حاصل کرنے کیلئے درخواست لکھی اور درخواست لکھنے کے بعد نہایت ہی عجلت میں ایک مختصر سا خط اپنی بہن کے نام لکھا، شریف نہایت ہی سنجیدہ اور سلیم الطبع انسان تھا، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ آدمی کی سرشت میں بھول چوک بھی دی گئی ہے۔ لفافوں میں خط بند کرتے وقت اُس سے چوک ہو گئی۔ درخواست اس نے اپنی بہن کے لفافہ میں رکھدی اور بہن کے نام کا خط افسر بندوبست (Settlement Officer) کے لفافہ میں بند کر دیا۔

مہتمم بندوبست مسٹر زیڈ افغانی نہایت ہی سخت اور جابر عہدیدار تھے۔ اُن کی طبیعت میں حکومت کرنے کا بے پناہ مادہ تھا، طبیعت شکی اور وہم پرست پائی تھی۔ ماتحتوں پر وہ اعتماد نہ کرتے تھے، ہر معمولی سے معمولی کارروائی کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اُن کی لڑکی ناصرہ کالج میں تعلیم پاتی تھی، کالج میں پڑھنے والی لڑکیاں آدابِ اخلاق اور طور طریق میں خانہ نشین لڑکیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں، ناصرہ بھی شوخ اور قدرے بے باک تھی، جہاں تک کردار کا تعلق ہے، ناصرہ معصوم صفت تھی، لیکن کالج کی ہوا کے اثر سے بچنا بھی تو مشکل ہے کالج کے ماحول نے اس میں قدرے بے باکی اور شوخی پیدا کر دی تھی، بناؤ سنگھار کا بھی اس کو شوق نہ تھا مسٹر افغانی بیٹی کی ان باتوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے مگر لڑکی کو کالج میں بھیج کر وہاں سے بلانا بھی تو مشکل تھا، ناصرہ شکل و صورت کے اعتبار سے

اوسط درجہ کی لڑکی تھی، مگر اس میں پھبن بلا کی پائی جاتی تھی، اگر خوبصورتی دلکشی کا نام ہے تو ناصرہ واقعی خوبصورت تھی، اور آج کل تو تھوڑی سی خوبصورتی بناؤ سنگھار اور زیبائی و آرائش کے سہارے بہت کچھ ہو جاتی ہے۔ ناصرہ کے یہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی، آرائش کا ہر شوق پورا ہو سکتا تھا۔

بالکل اتفاق کی بات کہ شریف کی بہن کا نام بھی ناصرہ ہی تھا، اس نے بہن کو خط انہیں لکھا:—

ناصرہ!

میں عنقریب تم سے آکر ملونگا، تم پریشان نہ ہونا، تمہارے خط کے جواب میں مصروفیات اور کثرت کار کے باعث دیر ہوگئی۔ میری تصویر ابھی تیار نہیں ہوئی، میں تو تصویر کھنچوانے کے خلاف ہوں، مگر تمہارے اصرار کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا، بہرحال تصویر تیار ہوگئی تو ضرور تمہارے پاس بھیجدی جائیگی، بہت ہی عجلت میں خط لکھ رہا ہوں۔

تمہارا—— شریف

باہر سے آئی ہوئی ڈاک خود مسٹر زیڈ۔ افغانی اپنے ہاتھ سے کھولا کرتے تھے، دفتر والوں پر اُن کو اعتماد نہ تھا، شریف کا بھیجا ہوا لفافہ اُنہوں نے کھولا اور اس خط کو پڑھ کر اُن کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا، وہ انگلیاں چٹخانے لگے سوچتے ہوئے! اُن کو یقین ہوگیا کہ اُن کی بیٹی ناصرہ کی اُن کے دفتر کے کلرک شریف سے خط و کتابت ہے۔

دفتر میں آج اُنہوں نے بڑی بددلی سے کام کیا، شریف کے خط کا خیال آکر اُن کا خون کھولتا تھا۔ وہ گھر پہنچے اور دروازے پر ہی ملازم سے دریافت کیا۔

کیا ناصرہ کالج سے آگئی؟

ملازم نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔

سرکار! وہ آکر چلی گئیں، آج اُن کے اسکول میں سنا ہے۔ کوئی پالٹی (پارٹی) ہے——!

مسٹر افغانی بڑبڑاتے ہوئے اندر گھر میں پہنچے، اور اپنے کمرے میں کپڑے اتار کر صوفے پر لیٹ گئے، وہ بہت گہرے سوچ میں تھے، دفتر میں اُن کا خیال تھا کہ وہ ناصرہ سے اس خط کا ذکر کرینگے، لیکن راستہ میں آتے آتے یہ خیال بدل گیا، اور انہوں نے بیوی سے اس واقعہ کے تذکرہ کرنے کا ارادہ کرلیا، مگر مکان میں آکر یہ دوسرا خیال بھی قائم نہ رہ سکا، اُنہوں نے آخر یہی فیصلہ کیا کہ ابھی صورت حال کا بغور معائنہ کرنا چاہیئے، اور گھر میں کسی سے بھی آج کے آئے ہوئے خط کا تذکرہ مناسب نہیں، مسٹر افغانی جاسوسوں کی طرح اس بھید کی تہ کا پتہ لگانا چاہتے تھے۔

ناصرہ کالج سے رات گئے واپس ہوئی، اور سیدھی والد کے کمرے میں پہنچی

—— اباجان! آج ہمارے کالج میں ڈراما تھا، بڑا لطف رہا۔ ناصرہ نے کہا۔

—— کالج کے ڈرامے تو تمام طور پر کامیاب ہوتے ہیں، اور آج کل کالج کی لڑکیاں لڑکوں پر سبقت لے گئی ہیں—— مسٹر افغانی نے جواب دیا۔

مسٹر افغانی کے تیوروں میں خشمناکی جھلک سی تھی اور باوجود کوشش ضبط کے وہ دل کی بات چھپا نہ سکتے تھے، لیکن ناصرہ باپ کی نگاہوں کو نہ سمجھ سکی، اس کا دل ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک تھا، اور باپ کی ناراضی کا کوئی سبب بھی پیدا نہ ہوا تھا، اور پھر جوان اور الھڑ لڑکیاں بات کی نزاکت اور مسئلہ کی گہرائی سمجھنے کی خوگر نہیں ہوتیں۔

صبح کو مسٹر افغانی نے ناصرہ کے چہرہ کو کئی بار غور سے دیکھا، بدگمانی آپ ہی آپ واقعات کی کڑیاں ملا رہی تھی، اُن کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا، اسی عالم میں چائے کی پیالی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گر گئی۔

—— اباجان! آپ آج متفکر سے ہیں ناصرہ نے کہا۔

—— فکر تو زندگی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ مسٹر افغانی نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا اور سگرٹ سلگا کر اپنے کمرے میں چلے گئے——!

رخصت ختم کرنے کے بعد شریف دفتر میں آکر رجوع ہوگیا، مسٹر افغانی کا طرزِ عمل شریف کے ساتھ انتہائی سخت ہوگیا تھا، اُنہوں نے شریف کو فوراً دوسرے صیغہ (Branch) میں بدل دیا، بیٹی کی خود تراشیدہ بدگمانی کا انتقام وہ بے گناہ شریف سے لینا چاہتے تھے۔ شریف ایک دن صبح صرف پانچ منٹ کی تاخیر سے دفتر میں آیا، مسٹر افغانی نے پورے دن کی غیر حاضری ڈال دی، شریف اپنے افسر کے اس طرز عمل کی یکایک تبدیلی پر بحد متحیر تھا، اس کے ذہن میں اس "بے سبب خفگی" کی کوئی وجہ

نہیں آتی تھی۔

دفتر کے لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، بعض دوستوں نے شریف کو رائے دی کہ تم مہتمم صاحب سے اُن کے بنگلہ پر جاکر ملاقات کرو، اور اُن سے صاف صاف عرض کردو کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو مجھے اس سے آگاہ فرما دیا جائے۔ ملازمت اور روزی کا سوال تھا، شریف راضی ہوگیا، اور ایک دن صبح سویرے مسٹر افغانی کے بنگلہ پر پہنچا۔ مسٹر افغانی غسل خانہ میں تھے اور ناصرہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ شریف کے پیروں کی چاپ سن کر ناصرہ چونکی۔

— آپ کیسے تشریف لائے ہیں — ناصرہ نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

— میں صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ شریف نے جواب دیا۔

— صاحب تو غسل خانہ میں ہیں۔ آپ تشریف رکھئے، ابھی دس پندرہ منٹ میں باہر آجائیں گے — ناصرہ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

شریف کرسی پر بیٹھ گیا، ناصرہ نے شریف سے دفتر کے متعلق کچھ سوالات کئے، شریف نے ہر سوال کا نہایت معقول جواب دیا، مگر بہت ہی مختصر اور قدرے بے نیازی کے ساتھ!

ناصرہ کا اب تک کالج کے لڑکوں سے سابقہ پڑا تھا جو جوان لڑکیوں سے بات کرنے کے شوق میں ذرا سی بات کو افسانہ کردیتے ہیں، اور یہاں شریف کلام کو زیادہ سے زیادہ مختصر کرنا چاہتا تھا، بے نیازی خود اپنے اندر کشش رکھتی ہے اور عورت قدرے بے نیاز اور ذرا رکھ رکھاؤ والے مرد کی طرف خود جھکتی ہے۔

ناصرہ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی رہی، اتنے میں مسٹر افغانی غسل خانہ سے نکل کر تولیہ سے بھیگے ہوئے بال پونچھتے ہوئے سیدھے برآمدے میں آئے، انہوں نے دیکھا کہ شریف اور ناصرہ بات چیت کررہے ہیں، بدگمانی پہلے ہی سے تھی، اب آنکھوں نے بدگمانی کو یقین سے بدل دیا، بیٹی کی غیر مرد سے ساز باز کون غیور اور خوددار انسان برداشت کرسکتا ہے، مسٹر افغانی کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے، الماری کے قریب کونے میں بندوق رکھی تھی، مسٹر افغانی نے بندوق اٹھائی، الماری کھول کر کارتوسوں کی پیٹی نکالی، بندوق کی نال میں کارتوس رکھ کر، گھوڑا چڑھاتے ہوئے برآمدے میں پہنچے، اور ناصرہ اور شریف پر ایکدم دو فیر کردیئے، فیر کی آواز سن کر ادھر اُدھر کے بنگلوں سے لوگ دوڑتے ہوئے آئے، ناصرہ اور شریف مجروح ہوچکے تھے، اور دونوں فرش پر تڑپ رہے تھے۔

سڑک پر شور مچ گیا کہ مسٹر افغانی کے بنگلہ میں خون ہوگیا، پولیس موقع واردات پر پہنچی، زخمیوں کو ہسپتال میں پہنچایا گیا، مسٹر افغانی گرفتار ہوگئے، بھائی کے زخمی ہونے کی خبر سن کر شریف کی بہن ناصرہ ہسپتال میں آئی، شریف اور ناصرہ کے زخم زیادہ گہرے اور مہلک نہ تھے، چند دن کی مرہم پٹی میں آرام ہوگیا، ناصرہ زخموں سے اچھی ہونے کے بعد زیادہ حسین نظر آنے لگی، اُس کا رنگ نکھر سا گیا تھا۔ معاملہ عدالت میں پیش ہوا، شریف کا خط اور وہ درخواست جو غلطی سے اس کی بہن کے خط میں چلی گئی تھی، دونوں چیزیں عدالت میں پیش ہوئیں، شریف شرافت اور انسانیت کا پتلا تھا، وہ مسٹر افغانی کے خلاف کسی اقدام کیلئے تیار نہ تھا، اس نے اپنے بیان میں وکیلوں کے مشورہ سے مسٹر افغانی کو بچانے کی انتہائی کوشش کی۔

عدالت پر بنفس معاملہ واضح ہوچکا تھا، مسٹر افغانی عدالت سے بری تو نہیں ہوئے، مگر پانسو روپیہ جرمانہ پر ہی بلا ٹل گئی، شہر کے تمام لوگ شریف کی انسانیت اور بہادری کی تعریف کرتے تھے، شریف تحسین آمیز کلموں کو سنکر اُلٹا شرماتا تھا، قدرت نے اس کے دل کو وسیع فراخ بنایا تھا، اور انتقام عداوت سے اس کی زندگی کی کتاب بلکسر خالی تھی۔

مسٹر افغانی کی لڑکی ناصرہ، شریف سے بہت زیادہ مانوس ہوچکی تھی، مسٹر افغانی بھی بے گناہ شریف کی شرافت کا بدلہ دینا چاہتے تھے۔ عداوت اور بدگمانی، محبت اور رافت سے بدل چکی تھی، شریف اب مسٹر افغانی کی نگاہ میں بہت زیادہ عزیز تھا، اتنا عزیز کہ اپنے جگر گوشہ (ناصرہ) کو انہوں نے شریف کے سپرد کردیا، دونوں کی شادی ہوئی اور خوب دھوم دھام سے ہوئی، ڈرامہ جس کی ابتدا زخموں سے ہوئی تھی، اس کا اختتام سہرے کے پھولوں پر ہوا۔ شادی کے چند دن بعد دریا کے

دیکھو بقیہ بر صفحہ ۶۰

انہیں رخصت کرتے ہوئے!

(از جناب راز ہاشمی امروہوی)

زندگی میں اب بہارِ زندگی لائے گا کون؟
اب مجھے کھوئے ہوئے انداز میں پائیگا کون؟
آہ تڑپائے گی اب کس کی نگاہ غم مجھے؟
دیکھ کر مجھ کو مجسم سوز بن جائے گا کون؟
تیز ہو جائیں گی دل کی دھڑکنیں کس کیلئے؟
اب نگاہِ شوق سے ہر بار شرمائے گا کون؟
آنکھوں آنکھوں میں کوئی افسانہ دہراتے ہوئے
شدتِ جذبات سے خاموش ہو جائیگا کون؟
چاندنی راتوں میں سیرِ گلستاں کرتے ہوئے
گنگنا کر نیند سے کلیوں کو چونکائے گا کون؟
اب لبوں پر کس کے آئیگی "شرارت کی ہنسی"؟
اب بہ اندازِ تکلم پھول برسائے گا کون؟
اب مجھے کس کا تبسم دے گا پیغامِ لطیف؟
اب بہ حسنِ التفاتِ خاص بہکائے گا کون؟
غرقِ مستی و ترنم اب کنارِ جوئبار!
صبح کے دلکش دھندلکے میں نظر آئیگا کون؟
ابتدا جس گیت سے عہدِ محبت کی ہوئی!
آہ اب وہ گیت سو سو بار دہرائے گا کون؟
آہ اب یہ خوابِ رنگیں خواب ہی ہو جائیگا!
راز کو جا کر یہاں سے یاد فرمائیگا کون؟

(خاص برائے مست قلندر)

حشر اٹھاتے ہوئے آئے!

سوئے ہوئے فتنوں کو جگاتے ہوئے آئے
آئے بھی تو اک حشر اٹھاتے ہوئے آئے
اُمید کے خاکے سے بناتے ہوئے آئے
کس درجہ حسیں دام بچھاتے ہوئے آئے
افسانۂ جذبات سناتے ہوئے آئے
ہونٹوں پہ زباں پھیر کے گاتے ہوئے آئے
نظارے کو بے تاب بناتے ہوئے آئے
سینہ کو دوپٹہ سے چھپاتے ہوئے آئے
اُمید کی اک بزم سجاتے ہوئے آئے
وہ شوق کی "لے" اور بڑھاتے ہوئے آئے
کچھ گرمیِ رفتار سے شعلوں کو ہوا دی!
کچھ پھول تبسم سے گراتے ہوئے آئے
وہ سرخ ہتھیلی، وہ لچکتے ہوئے پورے
سوکھی ہوئی مہندی کو چھڑاتے ہوئے آئے
وہ شوخ ہواؤں سے الجھتے ہوئے تیور
گیسو رخِ روشن سے ہٹاتے ہوئے آئے
جیسے کہ قیامت ابھی گذری ہے ادھر سے
رفتار سے وہ رنگ جماتے ہوئے آئے
ہنستے ہوئے کہنا کہ "بہت دن سے کہاں تھے"؟
گذری ہوئی باتوں کو بھلاتے ہوئے آئے
آنکھوں میں جھلکتا ہوا احساسِ ندامت
ماہر کو پشیمان بناتے ہوئے آئے

(خاص) ماہر القادری

میری ازدواجی زندگی کے آٹھ دور

پہلا دور

پریم لتا پہلی بار رخصت ہو کر میرے گھر آئی ہے۔ میں اسے جب دیکھتا ہوں وہ سکڑی سکڑی سی نظر آتی ہے جیسے شرم و حیا سے دبی جا رہی ہو اور شاید ایک طرح کے خوف و ہراس سے بھی کہ وہ ایک اجنبی گھر اور اجنبی لوگوں میں آئی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ایک الڑھ پن سا پایا جاتا ہے۔ اس کے پاؤں کی آہٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھر میں ادھر ادھر چلتی ہے تو شوخی سے چھلانگیں مارتی ہوئی۔ میری زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے۔ عجیب لڑکی ہے۔ وہ اس طرح کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے۔ جیسے کوئی خوبصورت صراحی ــ یکایک ڈھلک پڑی ہو۔ اور اس کا پانی ایک خاص آواز کے ساتھ گرنے لگا ہو، مجھ پر ایک سرور طاری ہو جاتا ہے جیسے کسی شرابی پر شراب کی صراحی کی قلقل سن کر سرور چھا جائے۔

دل چاہتا ہے پریم لتا کو پکاروں، اسے اپنے پاس بٹھا کر کچھ دیر اس سے باتیں کروں، اسے خوب گدگداؤں اور جب وہ کھلکھلا کر ہنسے تو میں بھی اس کے ساتھ ہنسوں، کھیلوں، کودوں، اودھم مچاؤں اور شرارت کروں۔

لیکن میرے شوق و تمنا کی راہ میں شرم حائل ہو جاتی ہے۔ دل چاہتے ہوئے بھی میں اسے پکار نہیں سکتا۔ اس کا نام لیکر بلاتے ہوئے حجاب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام زبان پر آ آ کر رہ جاتا ہے۔

پریم لتا کی ہنسی کی وہ شیریں اور سُریلی آواز اسی طرح کانوں میں رہتی ہے اور میں بڑے شوق اور پیار سے اسے سُنتا رہتا ہوں دل چاہتا ہے لتا اسی طرح ہنستی رہے اور میں اسی طرح سنتا رہوں۔ یہ اسی طرح جاری اور پھیلتی رہے۔ نہ محدود ہو اور نہ ختم۔ ساری دُنیا لتا کی ہنسی سے معمور ہو جائے۔ اور دنیا میں لتا ہی لتا اور اس کی ہنسی ہی ہنسی رہ جائے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر کے اس کی ہنسی میں کھو جاتا ہوں۔ اور اس طرح کھو جاتا ہوں کہ نہ اپنی خبر رہتی ہے نہ لتا کی اور نہ اس کی ترنم آفریں اور موسیقی طراز ہنسی کی۔ نہ جانے لتا کی ہنسی میں کون سا جادو ہوتا ہے۔

دُوسرا دور

پریم لتا کو میرے گھر آئے چھ مہینے ہو چکے ہیں۔ شروع شروع میں وہ سکڑی سکڑی سی رہتی تھی لیکن اب اس کی حالت میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔ اب اس کا پہلا خوف و ہراس بھی بڑی حد تک دور ہو گیا ہے، اب اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی شوخی و حیا کی صاف رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں میری طرف سے گزرتی ہے تو گو اس کی نگاہ جھکی ہوئی ہوتی ہے لیکن وہ گوشہ منظر سے مجھے دیکھتی ہوئی جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور جھجک کا کچھ حصہ اب بھی موجود ہے لیکن اب اس میں زیادہ تر شوخی اور شرارت ہی کی جھلک پائی جاتی ہے اور شوخی و شرارت کے ساتھ کیف و سرور جسے دیکھ کر مجھ پر بھی ایک نشہ سا چھانے لگتا ہے۔ اس کا چہرہ پہلے بھی دلفریب اور شوق آفریں تھا لیکن اب اس میں اور بھی لطافت و رعنائی پیدا ہو گئی ہے ہاں اب وہ میرے سامنے سے گذرتی ہے تو یکایک اپنی رفتار میں ایک مستانہ پن پیدا کر لیتی ہے۔ پاؤں کو زور زور سے زمین پر مارتی ہے جیسے وہ اپنے پاؤں کی آواز سے مجھے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتی ہے۔

واقعی میں اس کے پاؤں کی آہٹ پاتے ہی بے اختیار لتا کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ ہم دونوں کی آنکھیں چار ہو جاتی ہیں۔ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نظریں اس طرح آپس میں الجھ گئی ہیں جو کسی طرح سلجھنا چاہتی ہی نہیں۔ وہ چلتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ الجھی ہوئی ہم دونوں کی نظریں بھی۔ جاتے جاتے وہ ساری ٹھیک کرنے یا پاؤں کھجلانے کے حیلے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس وقت

از مسٹر سروپیا بی اے

اس کی آنکھوں کی مستی اور شوخی و شرارت میں اور اضافہ نظر آنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے اُٹھ کر چپکے چپکے جاؤں۔ پیچھے سے اس کی آنکھیں موند لوں۔ انگلیوں کے پوروں سے آہستہ آہستہ چھوؤں اور ان کو چوم لوں۔

لیکن مجھ سے اُٹھا نہیں جاتا۔ نہ جانے کون سا خیال مجھے پکڑ سا لیتا ہے۔ میں بے بس سا لتا کی طرف دیکھتا رہتا ہوں اور وہ رفتہ رفتہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس وقت مجھے نہ جانے کیسی ایک پیاس سی معلوم ہوتی ہے۔ میرے ہونٹ خشک ہونے لگتے ہیں۔ اور اپنی تشنگی کو تسکین دینے کیلئے ایک دوسرے کو چوسنے لگتے ہیں۔

تیسرا دور

پریم لتا میں شرم و حیا تو اب بھی موجود ہے لیکن اب وہ مجھ سے ڈرتی نہیں بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے اپنی تمناؤں کا مرکز اور اپنی ضرورتوں کا کھیل سمجھنے لگی ہے۔ وہ مجھ سے بھاگنے اور دور دور رہنے کی کوشش بھی نہیں کرتی بلکہ جس طرح ایک بیل کوئی سہارا پا کر اس سے لپٹ جاتی ہے لتا بھی مجھ سے لپٹتی جا رہی ہے۔

میں اپنی نسبت بھی غور کرتا ہوں تو لتا کا مجھ سے اس طرح لپٹنا مجھے بار نہیں معلوم ہوتا۔ مجھ میں بھی ایک مستحکم اور تناور درخت کی سی استقامت پیدا ہو گئی ہے۔ اور میرے مردانہ عزم و حوصلہ میں اضافہ ہو گیا ہے۔

مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا ہے کہ پریم لتا ہی مجھے اپنا سہارا نہیں سمجھتی میں بھی اسے اپنے لئے سہارا سمجھنے لگا ہوں میری زندگی کی کتنی ضرورتیں ہیں جن کی انجام دہی لتا نے اپنے ذمے لے لی ہے۔ اب مجھے اپنے کپڑے لتے کے رکھ رکھاؤ کی فکر کرنا نہیں پڑتی۔ لتا خود میرے لئے صاف کپڑوں کا بندوبست رکھتی ہے میرے جو کپڑے میلے ہو جاتے ہیں انہیں دھوبن کو دیتی ہے۔ دھوبن سے باقاعدہ دھلے ہوئے کپڑے واپس لیتی ہے۔ وہ ہر چیز کی یادداشت لکھتی ہے اسلئے کپڑوں کے لین دین میں کوئی غلطی نہیں ہوتی مجھے اپنے کپڑوں کی مرمت بھی نہیں کرانی پڑتی۔ لتا خود مرمت کر دیتی ہے۔ میرے تمام کاموں میں پہلے سے زیادہ انضباط پیدا ہو گیا ہے۔ اب مجھے زیادہ سے زیادہ اپنی پسند کے مطابق کھانا ملتا ہے۔ وہ میری ضرورت کی تمام چیزیں نوکروں سے منگا لیتی ہے۔ اس لئے اب مجھے صرف دو کام رہ گئے ہیں۔ دفتر جانا اور گھر پر رہوں تو مطالعہ کرنا۔ لتا نے مجھے کس قدر آزاد بنا دیا ہے۔ زندگی کا آدھا بوجھ تو بلا مبالغہ لتا نے میرے سر سے ہلکا کر دیا ہے۔ بیوی کو شریک زندگی، رفیقۂ حیات، مرد کا نصف حصہ جسم کہا جاتا ہے۔ لتا کو ان میں جو کچھ کہا جائے سب درست ہے۔

میں بچپن کی بات تو نہیں کہتا۔ نہ مجھے یاد ہے لیکن جب سے میں نے ہوش سنبھالا یا یوں کہئے کہ جوان ہوا مجھے ایسا سکون و اطمینان کبھی محسوس نہیں ہوا تھا میرا دل لتا کی تعریف و ستائش کیلئے مضطرب ہو جاتا ہے۔ چاہتا ہوں اسے اپنے پاس بلا کر بٹھاؤں، کہوں لتا۔ میں تمہاری اس قدر و محبت کیلئے تمہارا بہت بہت شکر گزار ہوں، مگر نہ جانے کیوں میرے ہونٹ متحرک ہو کر رہ جاتے ہیں اور میری زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا۔

چوتھا دور

اب پریم لتا کی شرم و حجاب کا گہرا پردہ آہستہ آہستہ ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ اسکی خاموشی گویائی سے بدلنے لگی ہے۔ اب وہ کسی ضرورت سے میرے پاس گذرتی ہے اور کوئی سامنے موجود نہیں ہوتا۔ تو وہ ایک بات کر لینے کیلئے ضرور ٹھہر جاتی ہے۔ اور اگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات کرے تو اپنی پیار بھری رسیلی آواز میں یہی پوچھ لیتی ہے۔

"کیا کر رہے ہو؟"

اس کے بعد ایک عجیب انداز سے میری طرف دیکھتی ہے جس کا مطلب تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن اتنا ضرور ہوتا ہے کہ میری نظریں اسکی آنکھوں میں گڑ جاتی ہیں۔ میرے ہونٹ پھڑکنے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہہ دوں "پریم لتا! تم کتنی حسین ہو۔ تمہاری آنکھوں میں کتنا رس اور تمہاری بولی میں کتنی مٹھاس ہے۔ تمہیں دیکھنے اور تمہاری بات سننے سے جی ہی نہیں بھرتا" پھر کھلکھلا کر ہنس پڑوں۔ لتا بھی ہنسنے لگے اور دونوں کی ہنسی سے سارا گھر گونج اٹھے۔

لیکن یہ رسیلی اور پیار بھری باتیں تو میری زبان سے نکلتی نہیں۔ منہ بنا کر کہہ دیتا ہوں "کچھ تو نہیں، دفتر کا کچھ کام باقی رہ گیا تھا اس کو پورا کر

رہا ہوں " کبھی کہدیتا ہوں — بیکار بیٹھا تھا دل بہلانے کیلئے اخبار دیکھ رہا ہوں" اس پر نہ جانے وہ ان خشک الفاظ میں چھپے ہوئے میرے جذبات کو بھانپ کے یا محض مجھے للچانے کیلئے آہستہ آہستہ مسکراتی ہوئی ایک معنی خیز انداز سے میری طرف دیکھتی ہوئی مستانہ رفتار کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور جب تک وہ دکھائی دیتی رہتی ہے۔ میری پُر شوق نظر پر اس کی پتلی کمر، اسکے بھرے ہوئے زانو، اس کے پیارے پیارے پیروں کو دیکھتی اس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی ہیں۔

لتا کے آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد میرے دل میں سوئے ہوئے طرح طرح کے جذبات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ میں ان سے کھیلنے لگتا ہوں اٹھکھیلیاں کرنے لگتا ہوں۔ پریشان سا ہو جاتا ہوں۔

پانچواں دور

اب میرے اور لتا کے درمیان کا حجاب تقریباً دور ہو گیا ہے۔ اب وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے پہلے کی طرح شرماتی نہیں۔ اب ہم دونوں میں خوب دل کھول کر باتیں ہوتی ہیں۔ کام کی باتیں نہیں، صرف گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کیلئے بھی۔ اسلئے کہ ہمیں اس کی باتوں میں ایک عجیب جمالیاتی مسرت محسوس ہوتی ہے کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ساری ساری کی ساری رات باتوں میں گزر جاتی ہے لتا کی بولی میں کتنا رس اور کتنی پیاری ہے اس کی باتیں سننے سے سیری نہیں ہوتی اور صبح ہو جاتی ہے۔ وہ بولتی رہتی ہے اور میں اس کی صورت دیکھتا رہتا ہوں۔ جس طرح اس کی باتوں سے کان سیر نہیں ہوتے۔ اسی طرح اسے دیکھنے سے آنکھیں سیر نہیں ہوتیں۔ اس کی بہت سی باتوں کا کوئی معنی اور مطلب نہیں ہوتا۔ لیکن اس کی وہ باتیں بھی لطف سے خالی نہیں ہوتیں بلکہ مجھے تو اس کی انہی باتوں میں زیادہ لطف آتا ہے۔ میں ٹکٹکی باندھے اس کے گلاب کی پنکھڑیوں سے ہونٹوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ ان ہونٹوں کو جن سے وہ پھولوں کی بارش کرتی ہوتی ہے۔ ہاں وہ بولتی ہوتی ہے تو مجھے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔

لتا کی طرف دیکھتے دیکھتے میرا دل نہ جانے کیسا ہونے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے اس کے حسین اور نازک ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لوں۔ اسکی پتلی پتلی انگلیوں کو آہستہ آہستہ چھوؤں۔ اس کے جسم سے اپنا جسم چسپاں کر دوں۔ اس کے ٹھنڈے سرخ گالوں پر اپنے گرم گرم لرزتے ہوئے ہونٹ رکھدوں کہ وہ بھی گرم ہو جائیں۔ کچھ ایسے رسیلے اور نشاط آفرین الفاظ میں لتا کی تعریف کردوں کہ اس کا دل کیف و سرور سے لبریز ہو جائے اور اس کے کیف و سرور سے مجھ پر بھی ایک نشاط انگیز کیفیت طاری ہو جائے۔

میرا ہاتھ بیکایک لتا کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھو جاتی ہیں۔ لیکن میری زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا۔ جیسے میرے دونوں ہونٹ آپس میں چپک جاتے ہیں۔ میں پاگل کی طرح اس کے ایک ایک عضو کو دیکھتا رہتا ہوں۔

اسی طرح رات گذرتی چلی جاتی ہے مجھے معلوم نہیں لتا کو میری حالت کا کچھ احساس اور اندازہ ہوتا ہے یا نہیں لیکن بہرحال اسکی باتیں ختم ہونے کو نہیں آتیں۔ وہ اسی طرح بولتی رہتی ہے اور میں اسی شوق اور دلچسپی سے سنتا رہتا ہوں بلکہ جیسے جیسے اس کی گفتگو طویل ہوتی جاتی ہے۔ میرے حظ و سرور میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ نہ جانے لتا کی باتوں میں ایسا کیا جادو ہے۔

چھٹا دور

پریم لتا پریم اور سندرتا کی دیوی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے عضو عضو سے رس سا چھلکتا نظر آتا ہے۔ لمبے گھنے کالے بالوں کی چوٹی اس کی مرمریں گردن سے ہو کر اس کے گدرائے ہوئے سینے پر لٹکتی ہوئی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے اس کی آنکھوں میں اب اور بھی مستی اور کشش پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی خمدار بھوؤں میں ایک مسکراہٹ سی نظر آتی ہے۔ اس کی حسین سیمیں گردن کی آب کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ اس کا شاداب شگفتہ چہرہ اور بھی دلفریب اور کشش انگیز ہو گیا ہے۔ وہ جب میرے سامنے آتی ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹ پھڑکنے لگتے ہیں۔ اس کے سینے میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے اور اس کی آنکھوں سے رس سا ابلنے لگتا ہے۔

یہ سب کچھ دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے

اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھدوں تاکہ اس کے مرتعش ہونٹوں کو سکون ہو جائے۔ اس کو اپنے سینہ سے لگا لوں تاکہ اس کے دل کا اضطراب و اضطرار دور ہو جائے۔ اسکی آنکھوں کے سارے رس کو اپنی آنکھوں میں انڈیل لوں لیکن نہ جانے ایسی کیا بات ہے کہ میں ان خیالات کو عمل میں نہیں لا سکتا۔ ایک سحر زدہ سا بیٹھا یہ سب سوچتا رہ جاتا ہوں۔

مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے گویا پریم لتا کے عضو عضو مجھے پریت اور پیار کیلئے پکار رہے ہیں۔ اس کے ہونٹوں کے ارتعاش اور اس کے قلب کی حرکت میں بھی مجھے یہی پکار سنائی دیتی ہے۔ اس کی تیز تیز چلتی ہوئی سانس اور اس کا پست و بلند ہوتا ہوا سینہ بھی مجھے پریم کا سندیس دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی مست اور رسیلی آنکھیں بھی پیار کیلئے پکارتی معلوم ہوتی ہیں میرے جسم کا ایک ایک بال زبان بنکر پریم لتا کی پکار کا جواب دینے کے لئے تڑپ اٹھتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ہمیشہ سے لتا کو پیار کرتا چلا آرہا ہوں اور ہمیشہ پیار کرتا چلا جاؤں گا میں اس کی پکار کا جواب دینا چاہتا ہوں اس پر میرے دل و دماغ میں جذبات و خیالات کا ایک طوفان سا برپا ہو جاتا ہے ہونٹوں پر لفظوں اور فقروں کی ایک بھیڑ سی لگ جاتی ہے۔ اتنی زبردست بھیڑ کہ میں لتا کی پکار کے جواب میں ایک لفظ بھی کہہ نہیں سکتا۔

ساتواں دور

پریم لتا کی پریم پکار روز بروز بلند اور طاقتور ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اپنی پکار کا پورا پورا جواب پانے کے باعث جیسے کچھ مضمحل سی دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے دل میں میری محبت کی تڑپ کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ اب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ میری پرستش کرتی ہے۔ خود کو میری پجارن اور مجھے اپنا پریم دیوتا سمجھتی ہے۔

اب لتا میں پہلے کی سی شوخی ہے نہ شرارت نہ وہ جوش نہ ولولہ۔ اس میں اب میری خدمت کے سوا جیسے اور کوئی احساس جذبہ باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جیسے اپنے دیوتا کی خوشی اور رضا مندی ہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتی ہے۔ اب کبھی لتا ہنستی بھی ہے تو محض یہ سمجھ کر کہ اس کی ہنسی مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ہنسی سے میرے دل کی بے کلی دور ہو جاتی ہے۔ ورنہ وہ اپنے لئے ہنسنا تو جیسے بھول ہی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کی ہنسی میں وہ پہلا سا رس معلوم نہیں ہوتا۔ اب اسکی آنکھوں میں بھی وہ شوخی اور شرارت نظر نہیں آتی۔ وہ تمنا اور پیاس بھی نہیں اب ان میں ایک سکون و وقار پیدا ہو گیا ہے اور سکون و وقار کے ساتھ ایک طرح کی فکر مندی اور سنجیدگی بھی نظر آنے لگی ہے کبھی کبھی تو میں یہ دیکھکر پریشان ہو جاتا ہوں کہ آخر لتا کے ہونٹوں کا وہ ارتعاش کیا ہوا۔ اس کے نتھنے بالکل ساکن کیوں نظر آتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کی مستی اور شرارت کہاں کھو گئی۔ اس کی رفتار میں وہ پہلا سا مستانہ پن کیوں نہیں ہے لتا اس طرح بجھی بجھی سی کیوں رہتی ہے؟

لتا کے اس خلوص و ایثار کو دیکھکر میرا دل اس کی قدر و محبت سے لبریز ہو جاتا ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لتا عورت نہیں دیوی ہے۔ میری راحت و خوشی کے لئے اس نے اپنے کو مٹا دیا۔ عورت اتنی خلوص پسند اور ایثار پیشہ نہیں ہوسکتی دل چاہتا ہے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اس کی پوجا کروں۔ اپنے دل کے سارے جذبات و احساسات کو اس کی پوجا کے لئے اس کے قدموں میں پیش کردوں۔ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھدوں کہوں، دیوی! میں تمہارا ہوں۔ میرا دل تمہارا ہے۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔

آٹھواں دور

اب یہ سب باتیں افسانہ بن چکی ہیں پھر بھی بھولی بسری کہانی کی طرح کبھی کبھی یاد آ ہی جاتی ہے۔ میں شام کو دفتر سے آکر کھانا کھاتا ہوں۔ اس کے بعد آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھتا ہوں۔ مجھے کھانا کھلا کر لتا خود کھاتی ہے۔ اس کے بعد کپڑے بدل اور پان لے کر آتی ہے۔ پھر ہم دونوں بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں۔ لتا کے انتظار کا یہ وقت میرے لئے بہت شاق ہوتا ہے۔ میں اس وقت کو کاٹنے کے کوئی کتاب یا اخبار اٹھا لیتا ہوں اور لتا کے آنے تک اسی سے دل بہلاتا رہتا ہوں۔

آج میں دفتر سے بہت تھکا ہوا آیا تھا۔ اسلئے کچھ پڑھنے کو جی نہ چاہا۔ آنکھیں بند کئے آرام کرسی پر پڑا تھا کہ سینما کی تصویروں کی طرح ازدواجی زندگی کے ابتدائی دور ایک ایک کر کے میرے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ جب میں اس وقت کو یاد کرنے لگا جب میرا دل چاہتا تھا کہ اپنا سب کچھ لتا کے قدموں

محشرِ جذبات

از جناب معیّن عثمان پوری

مزے لے لیکے خود تیری نظر سی چھیڑ کی میں نے
اگر دردِ محبت میں کمی پائی کبھی میں نے

محبت ہی کو سمجھا حاصلِ صد زندگی میں نے
ارے او دشمنِ جاں یوں بنا ہی دوستی میں نے

نگاہِ ناز پر قربان کر دی ہر خوشی میں نے
لٹائی ہاں لٹائی یوں متاعِ زندگی میں نے

شبِ اندوہ کی بے کیفیاں دیکھی نہ جاتی تھیں
سُنی خود داستانِ بیکسی خود ہی کہی میں نے

زمانہ کیا امرے حالات پر تقدیر ہنستی ہے
اُڑائی تھی کبھی اہلِ محبت کی ہنسی میں نے

مری دیوانگی کا عکس ہے اُنکی اداؤں میں
ابھارے ہیں حسینوں میں نقوشِ دلبری میں نے

مرا خونِ سُرخیِ افسانۂ جوشِ محبت ہے
کہ رنگینی ہر اک نقشِ محبت میں بھری میں نے

وہی سجدہ ڈبویا تھا مجھے جس نے محبت میں
اُسی سجدے سے کی تجدیدِ ذوقِ بندگی میں نے

وہ سانسیں حاصلِ صد زیست تھیں میری محبت میں
کہ جن سانسوں میں بھر دی تھی بہارِ زندگی میں نے

تری پُرکیف ادائیں اور تری مستی بھری آنکھیں
انہی لبریز پیمانوں سے کی ہے میکشی میں نے

مجھے اقرار ہے میں کیا، مرا ذوقِ محبت کیا!
نگاہِ دوست تیری ہر خوشی منظور کی میں نے

نگاہِ ناز نے مارا، وفورِ شوق نے مارا
غرض اس دل کو تڑپایا کبھی تم نے کبھی میں نے

نیاز ایسا کہ دشمن سے بھی ملتا ہوں محبت سے
نہیں اب تک کسی سے کی معیّن دوستی میں نے

(بقیہ صفحہ ۷۵) تو مختصر مدت میں ہی اس کے اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل زرد یا سفید رخسار کو سُرخ بناتا ہے جسم کو سڈول بناتا ہے۔ آنکھوں میں چمک اور آواز میں مسرت جھلکتی ہے اور یہی صحت و حسن کی بہترین علامات ہیں۔ جن کیلئے ہزاروں بلکہ بے شمار خواتین بے چین ہیں اور بیشمار مصارف کے باوجود حاصل نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ وہ علاج سے محروم مصنوعی

محبت کی نیرنگیاں

از محترمہ راجکماری بی اے

رما کانت نے لکھا تھا۔

ہریش!

خط دیکھتے ہی چلے آؤ۔ رمیش کی سالگرہ کے دن قریب آگئے۔ ابھی تک کوئی انتظام نہیں نہیں ہوا ہے۔ تمہاری امداد کی ضرورت ہے۔ باقی خیریت ہے۔

تمہارا ——— رما کانت"

لیکن ہریش کا دل جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہاں سے جلد واپسی تو ہوگی نہیں نہ جانے کتنا وقت برباد ہو۔ اس نے خط کا جواب تک نہ دیا۔ جواب کیا دیتا۔ آج کل بہت کام ہے۔ رمیش کی سالگرہ میں میری شرکت نہ ہو سکے گی؟ بھلا وہ اس طرح کا جواب کیسے دے سکتا تھا۔ بھیا اور بھابی کو ایسے جواب سے جتنا صدمہ ہو سکتا تھا، اس کا اسے خوب اندازہ تھا۔

دوسرے ہفتے اسکی بھابی کا خط آیا۔ لکھا تھا

"ہریش!

مجھے امید نہ تھی کہ تم اتنے بے مروت ہو جاؤ گے۔ اچھا تو یہ تھا کہ تمہیں بھلا ہی دیا جاتا۔ لیکن ایک زمانے تک جسے دل میں بسا کر رکھا، اسے بھلایا بھی تو نہیں جا سکتا۔ یہاں اتنا کام ہے کہ مجھے تو دم مارنے کی بھی مہلت نہیں ملتی لیکن تمہیں اس کا کچھ خیال نہیں۔ وہ تو کہو سرلا، پریم لتا اور موجود ہیں جو میرے کاموں میں برابر مدد کرتی رہتی ہیں۔ میرے کئے تو کچھ بھی نہ ہو سکتا۔

ہاں ہریش! تمہارے ساتھی اب تک تمہیں بھولے نہیں ہیں۔ ایک دن چندرا کہنے لگی۔ "بھابی! ہریش بابو اب بہت کم آتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

میں نے کہا "جب سے تم نے خربوزے کھلانے چھوڑ دئے ہیں۔ انہوں نے بھی آنا بند کر دیا ہے۔" تو بہت شرمائی۔ زیادہ کیا لکھوں۔ گھر کا گھر تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔ رمیش بہت کہتا ہے۔

تمہاری ——— بھابی!"

بھابی کا خط محبت اور خلوص سے بھرا ہوا تھا۔ جسے پڑھکر اس کی آنکھوں میں اپنے بچپن کی زندگی کا نقشہ پھر گیا۔ اسے بچپن کا وہ کھیل بھی یاد آگیا۔ جب چندرا نے رانی بننے کے لالچ میں اسے خربوزے کھلائے تھے۔ بہر کیف بھابی کے خط میں ہریش کیلئے اتنی ترغیب و کشش تھی کہ وہ تمام خیالات کو دل سے دور کر کے روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔

ہریش کی ماں کے انتقال کے بعد رما کانت کے باپ ہریش کو اپنے گھر لے گئے۔ اور بیٹے کی طرح اس کی پرورش کی۔ اس طرح اس کا پورا بچپن رما کانت کے گھر میں اپنے گھر کی طرح گذرا۔

رما کانت کا گھر ایک مدت تک ہریش کا اپنا گھر تھا۔ گھر کی تمام چیزیں اسکی اپنی تھیں [illegible] بولنا، کھیلنا، کودنا، پریم پیار غرض کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اسے اپنے گھر کی طرح اس گھر میں نہ ملی ہو، اپنے ایسے گھر کے دیکھنے کیلئے آج ہریش کا دل بے چین ہو گیا۔

آج چار سال ہوتے ہیں کہ رما کانت کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ جب سے رما کانت گھر کے مالک ہیں اور گھر کے انتظام کو بڑی خوبی سے چلا رہے ہیں۔

بھیا اور بھابی ایک دفعہ تو ہریش کو دیکھکر چونک پڑے۔ بھابی نے تو موقع پاکر کہا بھی "ہریش بابو! تم تو جیسے بالکل ہی بدل گئے۔ تمہاری وہ زندہ دلی اور خوش مزاجی کیا ہوئی؟ تم نے اسے کالج میں کسی کے ہاتھ بیچ تو نہیں ڈالا؟"

سالگرہ کی تقریب خوب دھوم سے منائی گئی۔ دعوت ہوئی۔ سرلا، پریم اور چندرا سب نے بڑے شوق اور حوصلے سے تمام کام انجام دئے۔ بھابی نے ہریش کو تمام کاموں کا نگراں مقرر کر دیا تھا۔ جب وہ کاموں کی دیکھ بھال کرتا ہوا ان کے پاس چلا جاتا تو وہ سمٹ ایک طرف ہو جاتیں اور اس کے رخ پھیرتے ہی اسے کنکھیوں سے دیکھنے لگتیں۔ انہیں یاد آتا جیسے انہوں نے کہیں اس آدمی کو دیکھا ہے لیکن وہ ایک دوسرے پر اپنے خیال کا اظہار نہ کر سکتیں۔

چندرا نے ایک بار البتہ بھابی سے پوچھا بھابی! ہرلیش اس مرتبہ سالگرہ میں بھی نہیں آئے۔ کیا آپ نے ان کو خط نہیں لکھا تھا؟

"لکھا تو تھا مگر وہ اب کیوں آنے لگے؟"

بھابی نے بن کر کہا۔

بھابی نے ہرلیش سے بھی کہا" ہرلیش! تم ابھی اپنے کو ان سب پر ظاہر نہ ہونے دینا ایک روز سبھوں کو جمع کر کے خوب بیوقوف بنایا جائے گا۔"

لیکن بھابی کا یہ شوق پورا نہ ہو سکا۔ ماں نے ایک روز لڑکیوں کے سامنے ہرلیش کا نام لے لیا۔ سب استعجاب و شوق سے اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔" اوہو یہ ہرلیش بابو ہیں" پھر بھابی۔ تو ان کو کیا بناتیں۔ ان سبھوں نے بھابی کو خوب بنایا۔" واہ بھابی نے ہم سے ہرلیش بابو کو اس طرح چھپا رکھا تھا آخر اس سے تمہارا کیا مطلب تھا؟"

رما کانت بابو شاعر اور ادیب تو نہ تھے مگر ایک شاعر اور ادیب کے ہیرو کے تمام اوصاف ان میں موجود تھے۔ چھبیس برس کی عمر، چھریرا بدن، ترنم آفریں آواز، موسیقی کے ماہر، دماغ اور طبیعت کے بھی بڑے دھنی تھے۔ ان کے اچھے برے ہر طرح کے جذبہ و شوق کی تکمیل کے ذرائع بآسانی پیدا ہو جاتے۔ ہرلیش ان کی صحبت و نسبت میں ایک خاص مسرت و انبساط محسوس کرتا تھا اور وہ بھی ہرلیش کو اپنے بچہ سے بھی زیادہ محبت کرتے تھے۔ اس نے ایک روز جانے کی اجازت مانگی تو اتنے ناراض ہوئے کہ اسے پھر ایک لفظ کہنے کی ہمّت نہ ہوئی۔

ہرلیش کپڑے بدل کر بھابی کے کمرہ کے پاس سے گذرا تو انہوں نے آواز دی ہرلیش!

"کیا ہے بھابی؟" ہرلیش پیچھے مڑ کر بولا۔

"کہاں کی تیاری ہے؟"

"بھیا کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"تمہارے بھیا کہاں جا رہے ہیں؟"

"شکار کھیلنے جا رہے ہیں شاید۔"

"شاعر تو بڑے نرم دل ہوتے ہیں۔ تم کیسے شاعر ہو۔ تمہیں بے زبان جانوروں کا شکار کرتے ہوئے تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔"

"بھیا کہتے ہیں تو انکار کیسے کروں؟"

"نہیں تم آج کہیں نہیں جا سکتے۔"

ہرلیش کو مجبوراً بیٹھ جانا پڑا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بھابی نے کہا" ہرلیش! تمہارے خربوزوں والی کی تو شادی ہو گئی۔ اس لئے شاید اب تو تمہیں یہاں رہنا اچھا نہ لگتا ہو۔"

"دیکھو بھابی تم نے نکالی نہ بے پر کی بات۔"

"ہاں بھئی اب تو یہ باتیں تمہیں بے پر کی معلوم ہونگی۔ اب تو تم شاعر ہو نہ۔ ہماری دنیا سے بلند خیال دنیا کے آدمی۔"

اتنے میں رما کانت بابو آ گئے، بولے اچھا تو یوں کہو کہ ہرلیش کو تم نے گرفتار کر رکھا ہے۔ ہمیں کیا خبر!

"آپ اپنے پاپ میں ہرلیش کو کیوں شریک کرنا چاہتے ہیں؟ آپ تو جان مارتے ہی ہیں۔ دوسروں کو بھی بے زبانوں کے خون میں شریک کرتے ہیں۔"

رما کانت بابو مسکراتے ہوئے کپڑے اتار کر وہیں بیٹھ گئے۔ اور نوکر سے بولے وائلن تو اٹھا لانا۔

نوکر وائلن اٹھا لایا۔ رما کانت نے ایک گیت گا کر وائلن بھابی کی طرف بڑھا دیا، انہوں نے میرا کا ایک گیت شروع کیا۔ ان کے گاتے میں ہرلیش کو ایک عجیب کیف و انبساط محسوس ہوا اس نے یہ بھی دیکھا کہ اب سے پانچ سال پہلے کی نسبت بھابی کے حسن میں بھی ایک خاص کشش و دلآویزی پیدا ہو گئی۔ اس وقت بھابی ایک نوشگفتہ کلی تھیں تو اب ایک پورا کھلا ہوا پھول تھیں جو اپنی کامل رنگینی، دیدہ زیبی اور عطر آگینی سے دل و دیدہ سب کیلئے موجب فرحت و مسرت بن جاتا ہے۔

شام ہو گئی۔ رما کانت اٹھ کر چلے گئے۔ ہرلیش اسی طرح بھابی کے پاس بیٹھا رہا۔ تارے نکل آئے۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ ہرلیش کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کھڑکی کے نیچے ٹارچ کی روشنی ہوئی اور کسی کی آواز سنائی دی۔ تم بھی کتنی شریر ہو۔ تم نے ہاتھ مار دیا کتنی قیمتی انگوٹھی ہے۔ نہ ملی تو اماں سے کیا کہوں گی۔

ہرلیش کھڑکی کے نیچے جھانک کر دیکھنے لگا۔ ایک دوشیزہ کوئی چیز تلاش کر رہی تھی۔ اس نے ہرلیش کو دیکھ کر کہا:" ذرا آپ ہماری مدد کرینگے۔"

بھابی نے پوچھا۔ کیا ہے ہرلیش؟

"نیچے کسی کی کوئی چیز کھو گئی ہے۔ مجھ سے امداد چاہتی ہیں۔"

"ادھر کچھ کانٹے بھی ہیں۔ ہرلیش جانا تو ذرا احتیاط سے۔" یہ کہہ کر بھابی اٹھ کر ٹہلنے لگیں۔

"ہرلیش کو ایک طرح کا خیال ہوا کہ بھابی کا مطلب کچھ اور تو نہیں ہے۔ وہ نیچے گیا۔ دوشیزہ سے بولا:" آپ مجھ سے کیا امداد چاہتی ہیں؟

اس نے دوسری دوشیزہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ میں نے نہیں انہوں نے آپ کو بلایا ہے۔

دوسری دوشیزہ سامنے آئی۔ وہ میرا تھی اس نے ہاتھ جوڑ کر ہرلیش کو نمستے کہا۔

ہرلیش نے ہنستے کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

کیا آپ کی کوئی چیز کھو گئی ہے؟

"جی ہاں کھو تو گئی تھی۔ مگر ابھی ابھی مل گئی ہے۔ میں آپ کی تکلیف فرمائی کیلئے شکر گذار ہوں"

"آپ تو کبھی ادھر آتے ہی نہیں۔ آیئے نا"

تیسری دوشیزہ نے کہا۔

"کیا آپ مجھے جانتی ہیں؟" ہرلیش نے پریما سے پوچھا۔

"جی ہاں جانتی ہوں۔ ہرلیش بابو کو کون نہ جانے گا؟" پریما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور دوشیزائیں بھی مسکرا پڑیں۔

~~~~~~

ہرلیش شام کو پریما کے گھر گیا۔ جہاں اس کی بڑی قدر و عزت ہوئی۔ پریما کے باپ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، بولے۔ تم کتنے بدل گئے ہو ہرلیش۔ اب تو بالکل جوان معلوم ہوتے ہو۔ بی اے کر لیا نہ تم نے؟

"جی ہاں، پچھلے سال تو"

"تم کب آئے؟ مجھے تو پریما سے آج معلوم ہوا۔ کہتی تھی، اب تو ہرلیش بہت لئے دیئے رہتے ہیں۔ بات چیت میں تکلف پیدا ہو گیا ہے" یہ کہکر وہ ہنس پڑے۔

"جی، میں اب سے پہلے ہی حاضر ہوا ہوتا۔ سالگرہ کے کاموں کی مشغولیت کے باعث موقع نہ ملا۔

"مجھے تو ایک ضرورت سے باہر جانا ہی اسلئے بھئی مجھے معاف کرنا۔ اندر جاکر مل لو۔ وہ تمہیں یاد کر رہی تھیں۔

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، یہ تو میرا گھر ہے"

پریما آکر ہرلیش کو اندر بلا لے گئی۔ وہ دیر تک اسکی ماں کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ چلتے وقت پریما نے کہا۔ کل آپ اپنی کویتا کا مجموعہ لیتے نہ آیئے گا۔

اس طرح ہرلیش کو دوسرے روز بھی پریما کے ہاں جانا پڑا۔ پھر وہ تیسرے روز بھی گیا۔ اس کے بعد تو وہ روزانہ اس کے ہاں جانے لگا۔ اس کے ہاں جائے بغیر اس سے رہا ہی نہیں جاتا تھا۔

پریما کے پڑوس میں کوئی تقریب تھی۔ پریما کے باپ ماں نے وہاں جاتے وقت پریما سے ساتھ چلنے کو کہا اس نے کہا۔ مجھے تو پڑھنا ہے۔ میں نہ جاؤں گی۔ آپ لوگ جایئے۔

ہرلیش آیا۔ پریما اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

ہرلیش نے کوچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ آج گھر میں کوئی نظر نہیں آتا۔

"ہاں پڑوس میں تقریب ہے، اماں وہیں گئی ہیں اور پتا بھی"

"تم نہیں گئیں؟"

"میں جاتی تو آپ ......؟"

"وہ لوگ کبتک گھر واپس آئینگے؟"

"ابھی ان کے آنے میں بہت دیر ہے"

پریما نے پان بنا کر ہرلیش کو دیتے ہوئے کہا۔ یہ لیجئے، دیکھئے آپکو یہ پان پسند آتا ہی۔

"بھلا یہ پان پسند نہ آئے گا؟"

پریما کے چہرے پر ایک سرخی دوڑ گئی۔ پھر پریما نے ہرلیش کی کویتا کا مجموعہ نکالا اور کہا۔ آپ کی کچھ کویتائیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ ذرا سمجھا دیجئے۔

"لایئے"

پریما نے ایک صفحہ کھول کر ہرلیش کیطرف بڑھا دیا۔

"ہاں میں سمجھ گیا، اس میں دو بھولے بھٹکے پریمیوں کا ملن دکھایا گیا ہے"

ہرلیش نے کہا۔

"اوہو! اس کویتا کا مطلب کتنا اچھا ہے دو بھولے بھٹکے پریم راہی آپس میں مل گئے"

پریما کتاب بند کر کے بولی۔ ہرلیش سوچنے لگا۔ اس کویتا کا مطلب اتنا پیچیدہ تو نہیں ہے جو پریما کی سمجھ میں نہ آیا ہوا اور نہ اس کی زبان ہی اتنی سخت ہے۔

پریما پھر بولی۔ ہرلیش بابو، آپ تو جیسے دنیا کو بھول ہی گئے تھے۔ اگر دنیا بھی آپکو بھول جاتی؟

"تو مجھے دنیا کو یاد دلانا پڑتا کہ میں وہی پرانا ہرلیش ہوں"

"لیکن دنیا کو تم سے پوچھنے کی ضرورت کیا تھی؟"

"پھر تو مجھے آپ کا بہت شکر گزار ہونا چاہئے، کیوں؟"

پریما اپنی بڑی بڑی حیا آلود آنکھوں سے ہرلیش کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"آپ کو کبھی بچپن کے کھیل یاد آتے ہیں؟"

"کیا وہ بھی کبھی بھلائے جانیوالے ہیں؟"

~~~~~~

ایک روز ہرلیش پریما کے ہاں گیا تو دیکھا وہاں سرلا بھی بیٹھی ہے۔ اس کے پہنچتے ہی وہ "اچھا بہن اب چلی نمستے" کہہ کر اٹھنے لگی۔ پریما نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ رکی۔ دوسرے روز بھی یہی ہوا، اور تیسرے روز بھی۔ ہرلیش کو بس ایکبار سرلا کی صورت دیکھنا اور نمستے سننا نصیب ہوتا۔ اس کا دل ایک طرح کی پیاس سے تڑپ کر رہ جاتا۔

سرلا پریم لتا سے جدا تھی۔ بھولی صورت، بھولی سیرت، شباب میں شرابور اکہرا بدن، متناسب اور موزوں اعضا۔

روزانہ سرلا کی طرف ایک جھلک دیکھ کر رہ جانا ہرلیش کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا، اس کے چلے جانے کے بعد ہرلیش

کو ایسا معلوم ہوتا وہ اس کے سینے سے کوئی چیز لیتی ہوئی چلی گئی ہے۔ ایک روز ہریش نے سوچا۔ وہ ضرور کچھ پہلے وہاں آتی ہوگی اسلئے آج میں کیوں نہ کچھ پہلے ہی وہاں پہونچ جاؤں۔ چنانچہ وہ اپنے معمول سے پہلے پریما کے ہاں چلا گیا۔ اس وقت پریما اندر تھی، ہریش کمرے میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں سرلا بھی آگئی۔ وہ کمرے میں ہریش کو تنہا دیکھ کر ایک بار جھجکی اور فرطِ حیا سے خود بخود اس کی گردن سینے کی طرف جھک گئی۔ لیکن اس سے واپس بھی نہ جایا جا سکا۔ بولی۔ پریما بہن کہاں ہیں؟

"ابھی آتی ہیں۔ آیئے بیٹھئے" ہریش نے جواب دیا۔

سرلا بیٹھنے کو تو بیٹھ گئی۔ لیکن اس کے ہر انداز سے اضطراب اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ہریش حیران تھا کہ آخر وہ اسقدر پریشان کیوں ہے۔ کیا وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ روزانہ آتی کیوں ہے؟ ہریش اٹھ کر چلا آیا۔ لیکن اس کی دماغی الجھن اب بھی دور نہ ہوئی وہ سوچنے لگا۔ کیا میں سرلا کے لائق نہیں ہوں؟ نہیں میں تو کسی کے بھی لائق نہیں نہ میرا دل اتنا پاک اور بے لوث ہے جو کسی کو محبت کے نذرانے کے طور پر دیا جا سکے، نہ مجھے اپنے دل پر اعتماد ہی ہے میرے لئے تو یہ بھی بہت ہے۔ اگر پریما مجھسے سچی محبت کرتی ہو۔ اس نے پریما کے ہاں جانا بھی چھوڑ دیا۔

ایک روز ہریش رمیش کو سینے پر بٹھائے اس سے کھیل رہا تھا کہ ایک نوکر نے آکر کہا۔ آپ کو رادھا چرن بابو نے بلایا ہے۔ اس غیر متوقع خوشخبری سے ہریش کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے نوکر سے پوچھا۔ کیا کام ہے؟ تمہیں کچھ معلوم ہے؟

"جی نہیں، مجھے تو اتنا ہی کہا ہے کہ ہری بابو کو بلا لاؤ"

ہریش نوکر کے ساتھ ہولیا، وہاں جاکر اس نے دیکھا۔ ہری چرن بابو، سرلا اور اس کی سوتیلی ماں سب موجود ہیں۔ رادھا چرن نے کہا۔ ہریش تمہیں تکلیف تو ضرور ہوئی مگر مجھ میں اور سرلا میں ایک بحث چھڑ گئی ہے۔ اسی کے فیصلے کے لئے تمہیں بلانا پڑا!

سرلا شرما گئی۔ ہری چرن بابو اور سرلا کی بحث ایک دوہے کے مطلب پر تھی۔ ہریش نے سرلا ہی کے حق میں فیصلہ دیا۔ ہری چرن بابو نے بڑی خوشی سے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

ہری چرن بابو کی عمر ۵۵ سال کے قریب تھی۔ انہوں نے دوسری شادی کی تھی اس شادی کو بھی چھ سال ہو چکے تھے۔ سرلا ان کی پہلی بیوی سے تھی۔ اس کی عمر ۱۶ برس کے قریب تھی۔

رما نے ہریش کو دیکھا۔ کتنا خوبصورت نوجوان ہے۔ آنکھیں کتنی رسیلی ہیں۔ پورا قد۔ بھرے ہوئے بازو۔ اسی طرح وہ نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ اس کے دل میں نشاطی لہریں اٹھنے لگیں۔

ہریش رما کے پاس بیٹھا تو اس نے کہنا شروع کیا۔ میں نے جس وقت سنا کہ تم آئے ہو اسی وقت سے تمہیں بلوانے کا خیال تھا مگر میں نہ بلوا سکی۔ تم پہلے تو یہاں بہت آتے تھے مگر اب جوان ہوگئے تو آتے ہوئے شرماتے ہو، کیوں؟

ہریش سوچنے لگا۔ ان سے تو کچھ ایسی راہ و رسم نہ تھی، پھر بھی انہوں نے مجھ کو یاد رکھا۔ بڑی محبتی عورت ہیں۔ اس نے کہا۔ "آپنے بلوایا ہوتا تو میں خوشی سے آتا۔ یوں کیسے آتا؟" ہریش بولا۔

"آپ یہ کیسی غیروں کی سی باتیں کر رہے ہیں ہریش بابو!"

ہریش روزانہ رما کے ہاں جانے لگا۔ رما اس کی خوب خاطر و مدارات کرتی۔ ہریش کو ایسا معلوم ہوتا رما اسے رادھا چرن بابو سے بھی زیادہ محبت کرتی ہے۔

لیکن سرلا کی عجیب حالت تھی وہ شدید ضرورت کے بغیر ہریش سے بولتی تک نہ تھی۔ وہ اکثر اس سے الگ ہی رہتی تھی۔ ہریش کو سرلا کے اس طرز عمل سے بہت صدمہ پہنچا۔ اس نے سوچا۔ جب وہ مجھ سے گریز کرتی ہے تو اس کے ہاں جانے سے کیا فائدہ؟ وہ کئی روز تک اس کے ہاں نہ گیا۔ لیکن آخر کب تک نہ مانتا اسے پھر سرلا کے ہاں جانا ہی پڑا۔

سرلا بھی ہریش سے کچھ کم مضطرب نہ تھی۔ وہ سوچتی تھی۔ ہریش بابو آئیں گے تو ان سے روٹھی روٹھی باتیں کروں گی۔ کہونگی۔ آپ بھی بڑے بے مروت ہیں۔ آج کے روز کے بعد آئے ہیں۔ کسی کا دل لے کر کوئی اس طرح بیٹھ رہتا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ میرے اتنے دن کس طرح گزرے ہیں؟

لیکن ہریش کو دیکھ کر سرلا یہ سب تو نہ کہہ سکی۔ اس نے کہا۔ آپ آتے ہیں تو پڑھنے میں ذرا دل بھی لگ جاتا ہے۔ یوں پڑھنے بیٹھتی ہوں تو کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا ایسی حالت میں کوئی کچھ پوچھنا بھی چاہے تو کس سے پوچھے۔

سرلا کی اس بات سے ہریش کو قدرے

نسلی ہوئی کہ سرلا کو اس کا اتنا خیال تو رہتا ہے۔ پھر بھی ابھی دونوں کے درمیان شرم حجاب کی اونچی دیوار حائل تھی۔

ادھر ہرلیش اور سرلا کا یہ حال تھا۔ ادھر رما کے دل میں بھی تمنائیں اور آرزوئیں پرورش پا رہی تھیں۔ ہرلیش کو کبھی بڈھے پرن پر غصہ آتا کہ جب اس کی اتنی عمر ہو چکی تھی تو انہوں نے ایک دوشیزہ سے شادی کیوں کی؟ کبھی وہ رما سے کہنا چاہتا کہ تم اب اپنی قسمت کو روتی ہو لیکن تم نے اس وقت کیوں جرأت وہمت سے کام نہیں لیا۔ جب تمہیں ایک ناکارہ بڈھے کے سپرد کیا جا رہا تھا؟

اسی طرح دن گذر رہے تھے کہ ایک روز ہرلیش کے گھر سے خط آیا جس میں اسے جلد واپس بلایا گیا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے سرلا کو چھوڑ کر جانا نہایت شاق گذر رہا تھا۔ لیکن اسے یقین کے ساتھ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ سرلا کو اس سے محبت ہے یا نہیں۔

اسلئے وہ آج سرلا کے ہاں گیا تو یہ طے کر کے گیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو گا وہ سرلا سے اپنے دل کی بات کہہ دیگا۔ سرلا جانتی تھی کہ اس کی سوتیلی ماں ہرلیش کو کس نظر سے دیکھتی ہے اور اگر اسے معلوم ہو گیا کہ سرلا بھی ہرلیش سے محبت کرتی ہے تو کتنا فساد پیدا ہو جائیگا۔ اسلئے ہرلیش کو دیکھکر اندر بھاگ جایا کرتی تھی لیکن آج نہ جانے کیا سوچ کر وہ بھاگی نہیں۔ ہرلیش کو موقع مل گیا وہ بولا۔ آج کیا بات ہے سرلا جو تم مجھے دیکھ کر بھاگیں نہیں؟"

سرلا پیار بھری نظروں سے ہرلیش کو دیکھتی رہی۔ ہرلیش نے پھر کہا۔ سرلا میں تم سے محبت کرتا ہوں کیا تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟"

سرلا اسی طرح ہرلیش کی طرف دیکھتی رہی۔ ہرلیش مضطربانہ لہجے میں بولا۔ دیکھو سرلا تم نے مجھے اثبات میں جواب نہ دیا۔ تو میں خودکشی کر لوں گا۔"

سرلا نے جلدی سے ہرلیش کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔" تم ایسی بات کیوں منہ سے نکالتے ہو۔ میں تمہیں محبت کرتی ہوں یا نہیں کیا تم اسے اپنے دل سے نہیں پوچھ سکتے"

ہرلیش نے ولولۂ مسرت میں سرلا کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ لیکن سرلا تڑپ کر اس کے حلقے سے باہر نکل گئی۔ بولی۔ یہ کیا ہرلیش! محبت کے یہ معنی تو نہیں ہیں۔ میں تمہیں ایسا گیا گذرا نہیں سمجھتی تھی۔"

ہرلیش نے اس روز سے رما کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ اسلئے ایک روز سرلا خود اس کے پاس آئی اور ہرلیش کے پاؤں پکڑ کر بولی۔" میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ ہرلیش!"

ہرلیش نے کہا۔" میں نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ تمہیں معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

" نہیں اس روز میں نے تمہارے ساتھ بہت نامناسب برتاؤ کیا۔"

" مجھے اس کا کوئی خیال نہیں سرلا۔"

" لیکن مجھے تو اس کا خیال ہے۔"

" تم اس بات کو بھی بھول جاؤ اور مجھے بھی"

" تمہیں کیونکر بھول جاؤں ہرلیش۔ میں تم سے ...."

بس بس سرلا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے عورتوں سے کس قدر نفرت ہو گئی ہے۔"

سرلا نے رو رو کر ہرلیش کے قدم بھگو دالے مگر ہرلیش کا دل نہ پسیجا۔

رما کانت ہرلیش کی باتیں سن رہا تھا۔ سرلا کے جانے کے بعد اس نے ہرلیش کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ ہرلیش تم نے سرلا کو اس طرح ٹھکرا دیا۔ اچھا نہیں کیا۔"

" مجھے عورتوں سے ایسی نفرت ہو گئی ہے بھیا" ہرلیش نے کہا۔

" لیکن تم اسے بھول رہے ہو کہ سرلا ہی تمہاری زندگی کا باعث ہوئی اسلئے سرلا کی زندگی کو برباد ہونے سے بچانا تمہارا فرض ہے۔"

ہرلیش قائل ہو گیا۔

اگلے مہینے ہرلیش اور سرلا کو ایک رشتے میں منسلک کر دیا گیا۔

کارخانہ امرت دھارا کی فراخدلی

کارخانہ امرت دھارا ہر سال اپنے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر ماہ مارچ میں اپنی ادویات میں کافی رعایت کیا کرتا تھا مگر حالات سے مجبور ہو کر ان کو اعلان کرنا پڑا ہے (جیسا کہ دوسری جگہ ناظرین اشتہار میں پڑھیں گے) کہ وہ رعایت اب کی جایا کریگی مگر خوشی کی بات ہے کہ کارخانہ نے اپنی تقریباً تمام ادویا کی قیمت میں ہمیشہ کے واسطے کچھ نہ کچھ کمی کر دی ہے۔ اس گرانی کے زمانے میں کارخانہ کی یہ فراخدلی قابل تعریف ہے

آپ کا خریداری نمبر

دفتر کیلئے بہت اہمیت رکھتا ہے جب کبھی آپ پرچہ نہ پہنچنے یا پتہ تبدیل کرانے کیلئے دفتر کو لکھیں تو اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ آپکے ارشاد کی فوراً تعمیل کی جائے گی۔

(مینجر)

ایک رات ایک بات

محبت بھرے لمحوں کی حسین یاد تھوڑی دیر زندگی کی آغوش میں پھینک دیتی ہے اور ایک شکستہ پا اور پر شکستہ بھی ماضی کے سہانے خوابوں میں جھولا جھولنے لگتا ہے ادھورے کہانیوں کے دھندلے نقوش مُردہ دلوں کیلئے جینے کا سہارا ہوتے ہیں! وہی سلمان ___؟ جس کے پاس چند آنسوؤں اور دلدوز مسکراہٹوں کے سوا اور کچھ نہیں بچا تھا جسکی ناؤ بیچ منجدھار میں ڈوبی جا چکی تھی اور جس نے دو سال حیات و موت کی کشمکش میں گذارے تھے ___ آج والدہ کا خط ہاتھ میں لئے ہوئے بارش کی ہلکی ہلکی بوندوں سے مسرت اور تروتازگی واپس لے رہا تھا۔ زندگی ایک بار پھر اسے آواز دے رہی تھی۔ جسقدر مینہ برستا گیا اتنا ہی وہ بھولے بسرے افسانوں کے ٹکڑے جوڑتا گیا حسن و لطافت میں گذری ہوئی ساعتوں کے دلنواز تصوّر نے اُفق سے دُور، خیال و خواب سے پرے اس خوشگوار دنیا میں اُسے پہنچا دیا جسے "عالم کیف" کہتے ہیں۔

اُسے معلوم ہوا، جیسے وہ اور شبانہ ___؟ گل سر سبد، صبح نمکیں کی تازہ بہار، آخیر شب تاروں کی چھاؤں میں چپ چاپ کھڑے ہیں۔

کیا سوچ رہے ہو ___؟

یہی کہ امیدوں کی یہ ہری ہری ٹہنی جو ہم نے اپنے آنسوؤں سے سینچی ہے کہیں باغبانوں کی بیرحم چٹکیوں کا شکار نہ ہو جائے!

"چلتے وقت ایسی باتیں نہ کیا کرو، ہمارا دل دُکھ جاتا ہے۔"

مجھے بھول تو نہیں جاؤگی ___؟

نہیں ___! نیچی نگاہ کئے ہوئے

جی چاہتا ہے کہ یہ چمکتے ہوئے تارے توڑ کر تمہاری مانگ بھر دوں!

پھر وہی دیوانوں کی سی باتیں ___؟

سچ کہتی ہو شبانہ! جب تم میرے ساتھ ہوتی ہو تو میں سچ مچ دیوانہ بن جاتا ہوں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ___!!

ہنسی ___ ہنسی

خط جلدی جلدی لکھا کروگے؟

ضرور! لیکن خط سے کیا ہوتا ہے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تم میرے پاس آ گئے ہو ___!

سچ ___؟

ہاں ___!

پھر اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے نازآفریں شبانہ اس سے چھینی جا رہی ہے اس کے شفیق چچا اپنی جگہ مسرور ہیں کہ اُن کی خوبصورت شبانہ کا مستقبل موتیوں سے بھرا جا رہا ہے۔ گھر بار خوشیوں سے لبریز ہے، عزیز و اقارب نغمے برسا رہے ہیں اور وہ در و دیوار، آسمان، زمین، اور گھر والوں کے شگفتہ چہروں کو موت کی سی بھیانک خاموشی کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ زندگی رخصت ہو رہی ہے، یاس و الم قریب آ رہے ہیں، ہوش و خرد جواب دیئے دیتے ہیں، اور وہ حیران و پریشان ہے، گھر والے اس میں کچھ تغیر سا محسوس کر رہے ہیں ___ مسرتوں، قہقہوں اور کامرانیوں کا مجسمہ سلمان! گم صم کیوں ہے؟ بعض دماغوں میں یہ سوال بھی پیدا ہو رہا ہے، لیکن کوئی بھی ژولیدہ مزاجی کا سبب پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا، اور کوئی پوچھے بھی کیوں؟ کسے خبر ہے کہ اُمنگوں کی کل کی کل کائنات لُٹ جانے کی وجہ سے وہ بوکھلایا پھر رہا ہے۔

اُسے گمان ہوا، جیسے وہ کالج ٹائم ختم کرنے کے بعد ہوسٹل آیا ہے اور اُسے والدہ کا وہ خط مل گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ اُس کی نسبت اس کی خالہ کی لڑکی "سلمٰے" سے کی جا رہی ہے اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا ہے دل کا زخم جو کامل ایک سال سے اندر ہی اندر پک رہا تھا بُری طرح پھوٹ بہا ہے۔ وہ کوشش کر رہا ہے کہ آنسوؤں کی جھڑی سے سینہ میں لگی ہوئی آگ بجھا دے لیکن وہ بھی آتش بہ جان ہوا جاتا ہے۔

پھر تصوّر نے اسے دکھایا جیسے شبانہ کی چوڑیاں ٹھنڈی کی جا رہی ہیں۔ آٹھ مہینے ___ کل آٹھ مہینے کا سہاگ بڑھایا جا رہا ہے۔ اس کی بادہ ریز آنکھوں سے سوگ ٹپک رہا ہے جوانی فریاد کر رہی ہے۔ لب خشک ہوئے

جاتے ہیں۔ شباب ملم کوش ہے اور زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔

سلمان نے ایک بار پھر خط پڑھا۔ والدہ نے لکھا تھا، نہ جانے کیوں؟ دو سال سے تم نے چھٹیوں میں گھر آنا چھوڑ دیا جانتی ہوں کہ تعلیم میں سرگرمی سے کام لے رہے ہو پھر بھی تمہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ زیادہ نہیں تو ایک ہفتہ کیلئے آجاؤ۔ آم بھی تیار ہو گئے ہیں اور لوگ بھی دو چار دن کیلئے آرہے ہیں۔ شبانہ بھی تم سے ملنے کی خواہشمند ہے!

سلمان نے کئی بار خط پڑھا اور اپنے آپ میں بڑی جد... تک تبدیلی محسوس کی۔ وہ ارادہ کر چکا تھا کہ عمر بھر گھر کا منہ نہ دیکھے گا اسے والدہ کی ٹھہرائی ہوئی نسبت کی بھی پروا نہیں تھی۔ لیکن تمام قیود کے باوجود شبانہ کی خواہش کو ٹھکرا دینا اس کے امکان سے باہر تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ گھر جائیگا اور ـــ اور کچھ نہیں تو بالائی کمرے، پائیں باغ اور پھولوں کی کیاری کے پاس سے دل کے ٹکڑے چن لائیگا جہاں وہ اور شبانہ من کا مندر بنایا کرتے تھے۔

وہ تمام راستے اُمیدوں کے جھولے جھولتا رہا۔ خوابیدہ محبت بے اختیار اُسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور وہ بے محابا کھنچا جا رہا تھا۔ ریل اتنی تیزی سے نہیں چل رہی تھی جتنی تیزی سے اس کے تصورات پرواز کر رہے تھے۔

سلمان گھر پہنچ گیا۔ دو سال بعد بیٹے کو شادکام دیکھ کر ماں کا دل باغ باغ ہو گیا۔ چچا چچی نے خوش آمدید کہا۔ چھوٹے بچے ٹانگوں میں لپٹ لپٹ کر خوشنودی کا اظہار کرنے لگے۔

کھوئی ہوئی خوشبوؤں نے ایک دفعہ پھر اسے فردوس بہار میں جگمگا دیا۔ اب اس کی نگاہیں سرہ جبین شبانہ کو چاروں طرف ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اُسے دو سال پہلے کا زمانہ یاد آگیا، جب اس کے آتے ہی شبانہ بالائی کمرے پر چلی جاتی تھی اور وہ دونوں مل کر باتیں کیا کرتے تھے میٹھی میٹھی محبت میں ڈوبی ہوئی باتیں! تھوڑی دیر بعد سب کونے کنارے ہو گئے تو سلمان اوپر جانے لگا مگر زینہ طے کرنا اس کیلئے مشکل ہو گیا، قدم قدم منزل معلوم ہونے لگا۔ شبانہ ـــ؟ سراپا باغ و بہار بے حس و حرکت کرسی پر بیٹھی تھی ـــ سلمان ہمیشہ ایسے موقع پر پیچھے سے جا کر اس کی آنکھیں بند کر لیا کرتا تھا لیکن عہد گل کی وہ تمام شوخیاں اب خواب و خیال ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ شبانہ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ نگاہیں آپس میں ملیں اور مل کر زمین میں گڑ گئیں چند منٹ کیلئے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ ان کی زبانیں یقیناً کُل گئی تھیں مگر دلوں کی پکار سُنی جا سکتی تھی۔

بہت دن بعد گھر آئے؟ کوئی بلانے والا بھی تو ہوتا ـــ! کالج میں کیسی گذرتی ہے؟ شبانہ نے بات کا رخ بدل دیا۔ وہ سلمان کے دردمند دل کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتی تھی۔

بس گذر رہی ہے، گذرتی کیسے ہے؟ یہ کون جانے ـــ؟؟

گھر کی یاد بھی نہیں آتی؟

سلمان مضطرب سا ہو گیا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں ـــ!"

"اور ہماری بھی نہیں؟" شبانہ نے حسرت بھرے لہجہ میں ادائے جانانہ کے ساتھ کہا۔

"تمہیں کیسے بھول جاتا؟" شبانہ، سلمان نے چونک کر جواب دیا، تم تو میری دنیا

؟

[illegible] کا سامان ہی ہے معلوم نہیں کیوں
پھر حسن [illegible] نظر آتے ہیں مجبور
سمجھے آپ بھی [illegible] پیدا ہے سحر و [illegible]
نہ آنکھیں نو زمانے کی [illegible] اہل جہاں کو
حسن بھی ہے آتی ہے [illegible] گردش دوراں
دن رات یہ موقوف نہیں [illegible] کہتے ہیں جس کو
غارتگر دل دشمن دل [illegible] اس دل کی پرستش
اپنا تو یہ ایمان ہے معلوم نہیں کیوں

وہ زلف پریشان ہی ہے معلوم نہیں کیوں
آئینہ بھی حیران ہے معلوم نہیں کیوں
اور قلب میں ہیجان ہے معلوم نہیں کیوں
اپنے لئے وہ شان ہے معلوم نہیں کیوں
حلقے میں ہر انسان ہے معلوم نہیں کیوں
دل اسی پہ قربان ہے معلوم نہیں کیوں
اس دل کی پرستش میں یہ اس دل کی پرستش ہے معلوم نہیں کیوں

اندرجیت شرما

(مست قلندر کے سالانہ نمبر کیلئے)

پرچھائی ہوئی ہو۔ تمہاری پیاری پیاری باتیں اور معصوم معصوم ادائیں کس طرح بھلائی جا سکتی تھیں۔ لوگوں نے تمہیں مجھ سے چھین لیا لیکن تمہاری یاد کوئی نہیں چھین سکا۔ جسے میں جان سے لگائے ہوئے ہوں اور جو سُلگتی ہوئی ہڈیوں اور کچلی ہوئی روح کیلئے آبِ حیات ہے۔ میری بے خواب راتیں، بے کیف دن اور بے چین گھڑیاں تمہارے خیال میں بسر ہوتی ہیں۔ میں کسی رنگ میں رہا۔ کسی عالم میں دن گذارے لیکن کسی حال میں بھی تمہیں نظر انداز نہیں کیا۔ زمانہ بر سرِ پیکار رہا۔ تمنائیں خاک میں مل گئیں، بساط الٹی، بہار لٹی، دُنیا برہم ہوئی، زندگی مجھے بھول گئی، میں نے اپنے آپ کو بھلا دیا ـــــ لیکن شبانہ تم میرے دم کے ساتھ رہیں، میرے تصورات کی گود کبھی سُونی نہ ہوئی، میرے سانس کی آمد و شد، دل کی دھڑکنیں، اور درد کی فریادیں تمہیں آغوش میں لئے رہیں، جیسے شفاف سطحِ آب پر شاداب کنول کا پھول ـــــ وہ رونے لگا جیسے کبھی چھٹیاں ختم ہونے پر شبانہ سے رخصت ہوتے وقت رویا کرتا تھا اور وہ دوپٹہ کے آنچل سے آنسو پونچھکر اور کبھی کبھی گلے میں باہیں ڈال کر اُسے تسکین دلاتی تھی۔

شبانہ نیچی نگاہ کئے بیٹھی رہی، پلکوں پر آنسو جھلکنے لگے تاہم اسے جی بھر کر رونے کا حوصلہ ہوا اور نہ آگے کچھ پوچھنے کا، وہ جانتی تھی کوئی اس کی طرف روح پرور نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، جی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر آسودہ ہو کر اس کا من پھولوں سے بھر دے لیکن کوئی غیر محسوس شے دیدہ و دل کو مٹھی میں دبائے رہی۔

اب سلمان کی باری تھی اس نے ذرا نرم لہجے میں "جیسے وہ جانتا سب کچھ ہے مگر چند ہرا کر پوچھنا چاہتا ہے" دریافت کیا۔ آجکل تم کہاں ہو ــــ؟

جہاں حیات ہے نہ ممات! لوگوں نے زبردستی پکڑ کر قفس میں بند کر دیا۔ سوچا تھا کہ کنجِ قفس ہی بے جان زندگی کو مروڑ کر رکھ دے گا۔ لیکن فطرت کی مسکراہٹ کون روک سکتا تھا۔ جینے کی تمام آرزوئیں چھین لینے کے بعد وہاں سے نکال لیا گیا۔

قفس میں جانا منظور ہی کیوں کیا گیا؟

شبانہ تلملا گئی اور اس نے تیکھی نظر سے سلمان کی طرف دیکھا۔

اپنے بس ــــ؟؟؟

اور کیا کسی اور کے بس ــــ؟؟

کسی اور؟ ــــ "کسی اور نے تو مڑکر بھی نہیں دیکھا" فقرہ کی ادائیگی کے ساتھ حسین پیشانی میں بل پڑ گیا جس پر کبھی سلمان کی جان جاتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ باتوں باتوں میں بگڑنا، روٹھنا، اور جی بھاری کر لینا اس کی طبیعت کا خاص جوہر ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک دفعہ پھر اسی شان سے منالے جیسے کبھی منایا کرتا تھا مگر ڈر گیا کہ حالات بدل جانے سے احساسات نہ بدل گئے ہوں شبانہ، مجھ کم بخت کو تو آخیر دم تک بے خبر رکھا گیا ورنہ کاروانِ حیات اتنی سہل انگاری سے لٹنے نہ دیا جاتا۔ میں چیختا، چلاتا، دل کے ورق کھول ڈالتا اور پورے ماحول کو تہ و بالا کر کے چھوڑتا۔ مگر اپنی شبانہ کو آگ میں نہ جھونکنے دیتا۔ مجھے کسی نے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور تم بھی خاموش بیٹھی رہیں۔

میں ــــ؟ ایک نوعمر بیکس لڑکی کیا کر سکتی تھی ــــ!

دو لفظ تو لکھے جا سکتے تھے؟

ہوش کسے تھا، دل پر لرزہ سا طاری تھا اور آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں مگر بے سُود، میں سمجھی وہ بچپن کے بھولے بھالے خواب تھے جو آسانی سے فراموش کئے جا سکتے ہیں ــــ عورت کی طبیعت کمزور ہوتی ہے اور اس کے ساتھ دل و دماغ بھی، جب تک مرد کا سہارا نہ ہو وہ اپنے پیروں پر نہیں کھڑی ہو سکتی۔ میں اکیلی کیا کرتی اور میری سنتا بھی کون، تم مرد تھے جواں سال، جواں عمر، تمہارے بازوؤں میں زور تھا زبان میں طاقت ــــ "میں تم سے نفرت کرنے لگی تھی، تمہارے تغافل اور لاپروائی نے نقشہ ہی بدل ڈالا تھا۔

یقین کرو گی شبانہ؟ ایک روز میں کالج سے واپس آیا تو والدہ کا خط ملا کہ "اتوار کو شبانہ کا بیاہ ہے تم جمعہ تک گھر پہنچ جاؤ"۔ میں بے تحاشا پلنگ پر گر جانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا، دُنیا اندھیر ہو گئی۔ دم کھنچ کر شہ رگ کے قریب آ گیا۔ تمام رات کمرہ میں ٹہلتا رہا پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یکایک طبقہ الٹ جانے کا کیا سبب ہے کبھی خیال آتا کہ لوگوں کو کیا معلوم ہوگا کہ اس رشتہ سے دو مخمور جوانیاں تباہی کے کنارے پہنچ جائینگی کبھی سوچتا کہ شبانہ ہی کی مرضی سے معاملات طے ہوئے ہونگے پھر ہاتھ پیر مارنا اور خواہ مخواہ رسوائی مول لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اگر شبانہ کی مرضی نہ ہوتی تو ناراضگی کے طور پر اطلاع ضرور دی جاتی۔

اس کا دل اور بھی بیٹھ گیا، کہہ تو کچھ نہیں سکی

مگر آنکھیں اشکبار ہوئے بغیر نہ رہیں۔

اور "سلمیٰ"؟ شبانہ نے معنی خیز نظر سے سلمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کسی کافر ہی کو خبر ہوگی کہ کیا ہوا؟ کس نے کیا؟ کیونکر ہوا؟ والدہ کا ایک خط آگیا تھا اور بس ـــــ!

بہت ہی پیاری لڑکی ہے۔

"ہوگی" سلمان نے نیچی نگاہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اسے بہن بنالیا ہے!!

تم نے؟؟

ہاں میں نے، تم سے انتقام لینے کیلئے۔

سلمان تڑپ کر رہ گیا۔ رواں رواں کانپنے لگا۔ شبانہ سے بھی اس کی یہ حالت چھپی نہ رہی۔ دونوں خاموش ہوگئے۔ وہ نیچے جانے کیلئے کھڑی ہوگئی لیکن سلمان نے روک لیا اور باغ والی کھڑکی سے کمر لگا کر کھڑا کر دیا۔

کل صبح کیاریوں کے پاس ملوگی؟

کیوں؟

کچھ مسلی ہوئی کلیاں پڑی ہونگی، انہیں چُن لائیں گے!

مگر ایک شرط کے ساتھ؟

فرمائیے؟

میرے ساتھ سلمیٰ بھی ہوگی۔

اب تو سلمان کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ اُس نے شبانہ کا منہ اونچا کرکے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

مجھے مٹانے کی قسم ہی کھالی ہے؟

میں نے؟ سچ کہتے ہو

نہیں جھوٹ بول رہا ہوں۔ دو سال پہلے کے تمام عہد و پیمان اس سازگار فضا میں جذب ہوگئے۔

کس فضا میں؟

مجھ سے پوچھنا چاہتی ہو؟؟

یہ الفاظ تیر کی طرح دل میں پیوست ہوگئے اور وہ رونے لگی۔

یہ کیا؟

بس رہنے دو؟

شبانہ ـــ؟ شبانہ ـــ طبیعت سنبھالو بخدا صبح آنے کیلئے میں مجبور نہیں کرونگا جو تمہاری خوشی وہ میری خوشی، شبانہ اور بھی بگڑ گئی وہ جانتی تھی کہ میرے بگڑ جانے کا علاج سلمان کے پاس کچھ نہیں ہوسکتا، لیکن دو سال پہلے کی طرح اُس نے غصہ بھری نظر اور دلکش انداز سے سلمان کی طرف دیکھا اور بلا تکلف اُس کے بال نوچ ڈالے انتہائی پیار کے موقع پر وہ ایسا ہی کیا کرتی تھی جیسے کسی نے زندگی کی گود میں پھینک دیا ہو سلمان نے کمال شیفتگی کے ساتھ اس کے سر میں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لےلیئے۔

شبانہ ـــــ؟

چھوڑ دو ـــ؟

میری طرف دیکھو۔ شبانہ؟ ایک بار پھر اسی طرح کہدو "سلمان" جیسے کبھی کالج جاتے وقت ....؟

شبانہ؟؟؟

کہدو، ایک بار میری مالکہ صرف ایک بار؟

"سلمان!"

وہ جھوم گیا اور اس نے پیار سے دونوں ہاتھ کلیجہ سے لگا لئے۔ فضا میں بکھرے ہوئے راگ مل گئے اور دو لپٹی ہوئی روحیں شعلہ و شبنم میں نکھر کر تروتازہ ہوگئیں۔ جیسے بھنور میں پڑ کر لہریں پُرشور نغمے چھیڑ دیتی ہیں اور پھر صاف پانی آجانے پر وہی ہلکے ہلکے دھیمے دھیمے نغمے شروع ہوجاتے ہیں۔

تم افسردہ کیوں ہوگئیں؟

اور تم خوش کیوں نظر آتے ہو؟

مجھے زندگی جو مل گئی ہے!

سچ ہے مرد کو زندگی مل جاتی ہے تو وہ خوش ہوجاتا ہے اور عورت کو زندگی ملتی ہے تو وہ افسردہ ہوجاتی ہے۔ وہ کچھ کھو کر بھی بہت کچھ پالیتا ہے اور یہ بہت کچھ پاکر بھی سب کچھ کھو دیتی ہے۔

یہ فلسفیانہ لوچ کہاں سے اڑا لیا ہے؟

سلمیٰ بہن کے "صحیفہ گل و گیاہ" سے!

شبانہ؟؟ تم خودکشی کرا کر ہی دم لوگی۔

پھر وہی دیوانہ پن؟

دیوانہ پن، آج میری شبانہ میرے ساتھ ہے، آج میری دنیا، میری دنیا اور میری دیوانگی، میری دیوانگی ہے۔

میں اب جاتی ہوں سہ پہر ہوگئی۔

کل صبح ملاقات ہو رہی ہے۔

سنا تو ایسا ہی ہے۔

شبانہ کے چلے جانے کے بعد سلمان اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ دو سال پہلے جو ننھا سا پودا لگایا تھا وہ خزاں کی غارت گری کے باوجود پروان چڑھتا نظر آرہا تھا۔ اس نے کمرے کے ہر ہر گوشہ سے دل کی کرچیں سمیٹ لیں اور داستانِ محبت ترتیب دینے لگا۔

تم تو مجھ سے بھی پہلے موجود ہو؟

پچھلی رات آنکھ کھل گئی تھی پھر نیند نہیں آئی سوچا کہ باغ ہی چلا چلوں!

اپنی کلیاں چُن لیں؟

تمہارے انتظار میں تھا!

میرے؟

ہاں، ہم تم مل کر چنیں تو بہتر ہے۔
آپ کیوں نہیں چن لیتے؟
باغ تمہارا ہے اور تمہاری اجازت کے بغیر کچھ نہیں لیا جا سکتا!
جو تازہ پھول چاہو لے سکتے ہو؟
میں ۔۔۔؟ میں تو نسیم صبح کی آغوش سے گرا ہوا پھول چن کر دل میں رکھنا چاہتا ہوں!
وہ دم رہ گئی ۔۔۔۔!
اجازت ہے؟
لیکن اسکے شبنمی موتی بھی چنے جا سکتے ہیں؟
شبابہ، روح کی پیاس شبنم سے نہیں پھولوں کے رس سے بجھا کرتی ہے!
تم بلا سوچے سمجھے بول رہے ہیں؟
شاید، لیکن جینے کی تمنا اب خاک میں نہیں ملنے دونگا۔ سلمان کا جی بھر آیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
یہ کیا ہونے لگا ۔۔۔؟
کچھ نہیں!
اچھا جھولے کے قریب چلو وہاں۔۔۔؟
خالی جھونٹے دیکر عمر بھر جھلانا چاہتی ہو؟
وہ جواب میں مسکرا دی،
سلمان کا تمتماتا ہوا چہرہ متین ہو گیا اور نگاہوں سے شکایت آمیز الفت جھلکنے لگی
بیٹھتے کیوں نہیں؟
پہلے تم جھولو ۔۔۔؟ ساتھ ہی شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی بٹھا دیا ۔۔۔" وہ نغمہ بار انداز سے خمار آلود جھونٹے دینے لگا اور وہ شرمیلی شرمیلی، نشیلی نشیلی، پھولوں بھری فضا میں جھولنے لگی۔"
تھوڑی دیر بعد جھولا تھما اور وہ اترنے لگی تو سلمان نے پیچھے سے جا کر جھولے کی دونوں رسیاں پکڑ لیں اور کسی قدر آگے کو جھک گیا۔ اب شبانہ کا سر اس کے گرم سینے پر تھا اور اس کے ہاتھوں کی گرفت میں گوری گوری کلائیاں، کلائیوں کی گلابی گلابی چوڑیاں اور ہمہ تن شبانہ تھی۔
جو کچھ پوچھونگا سچ سچ بتادوگی؟
شاید!
تمہارے دل میں اب بھی میرے لئے جگہ ہے؟
"ہے"
میری خزاں کو بہار بنا دوگی؟؟
وہ سکتے میں آگئی!
شبانہ، میں گرا جا رہا ہوں مجھے سنبھال لو؟
لیکن سلمے ۔۔۔۔۔۔؟
سلمان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھدیا۔
وہ میرا انتخاب نہیں تھا میں نے کسی قسم کا وعدہ نہیں کیا مجھ پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔
پھر بھی؟
اگر، مگر، لیکن، پھر بھی ۔۔۔ نرے لفظ ہی لفظ ہیں اور لفظوں کی الٹ پھیر مجھے مرعوب نہیں کر سکتی۔ خاندانی روایات، اخلاقی پابندیاں اور دنیا بھر کی دیواریں میرے راستہ میں حائل بھی ہونا چاہیں تو بھی میں خاطر میں نہیں لاؤنگا۔ اور ایک ایک زنجیر کو پوری قوت سے توڑتا چلا جاؤنگا۔ تمہیں کسی قیمت پر بھی ہارنا اب میرے پروگرام میں شامل نہیں ہے!
کوئی جنگی پروگرام ہے؟
سوفی صدی، تمہاری کیا رائے ہے؟؟
جو تمہاری مرضی!
سلمان نے پیار سے ہاتھ پکڑ کر جھولے سے اٹھا لیا۔ دھیرے دھیرے ٹہلتے ہوئے دونوں پھولوں کی کیاری میں چلے گئے
جنگ کا نقشہ بنا لیا ہے؟
خوب اچھی طرح ۔۔۔!
ہوائی اڈے بھی؟
ہاں!
اور ڈیفنس لائنیں؟
وہ بھی مضبوط ہیں!
کہاں کہاں بمباری ہوگی؟
پہلے خالہ جان کے عشرت کدے پر پھر اپنے گوشۂ عافیت پر!
ڈبکنی کشتیوں کا کیا انتظام ہوگا؟
ہر طرف سرنگیں بچھا دی جائیں گی!
دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے اور فضا میں موتی سے بکھر گئے۔
فرصت نہیں ملے گی!
رات کو؟
ایک بات پر غور کریں گے!
ایک رات، ایک بات؟
بات بھی تو ننھی سی نہیں ہے!

~~~~~~

مخالف ہوا سے بجھے ہوئے چراغ کو ٹھہرے ہوئے سمے میں پھر سے جلا دیا جائے تو وہ پہلے کچھ زیادہ ہی اجاگر ہو جاتا ہے، شبانہ باغ سے گئی تو وہ خالی ہاتھ نہیں تھی اس کے ساتھ پر شکوہ زندگی کا دلآویز تصور تھا جس میں دو فرحت افروز ہستیاں پیکر دوش بدوش بڑھے چلے جا رہے تھے ایک نامعلوم وادی میں جہاں خوشبوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ سمجھی کہ جیتے مستقبل کی صورت آفرینیوں میں ماضی کے بگڑے سدھرے خاکوں کو جذب کرنے میں وہ کامیاب ہو گئی ہے اور اس کا یوں سمجھنا بے محل بھی نہیں تھا اس کے سلمان نے جس یہ وہ دموں دلوائی تھی اسے آغوش میں بھینچکر پھر زندگی کے اس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں سے والہانہ محبت کی سرحد شروع ہو جاتی
~~~~~~

ہے اور جہاں پہنچ کر انسان دنیا و دل کی اسرار درامانہ تو فلمونیوں کو جی بھر کر دیکھتا ہے لیکن اپنی ہی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا وہ بھی تمام رسموں، رواجوں اور گھریلو بیہودگیوں کو اس سرے سے اس سرے تک بھول جانا چاہتی تھی اور اسے یہ یاد رکھنا بھی گوارا نہیں تھا کہ وہ گلچین کی المناک چٹکیوں سے نکلی ہوئی چمن روزگار کی باسی کلی ہے اور اس کی نگاہوں کا برگزیدہ مرکز کسی اور کا بھی مطمح نظر ہے —— یہ سب حقیقتیں تھیں گراں بر غور کرتی اس کی بلا۔ وہ تو بھیگی بھیگی راتوں اور گداز بانہوں میں گم سی ہو گئی تھی۔ شباب و شوق نے پوری کفر سامانی کے ساتھ بر ما کر رکھ دیا تھا اور وہ کسی قسم کا تردد کئے بغیر خوش آیند ماحول میں کھنچی جا رہی تھی جیسے کوئی مورکھ پرندہ دور سے آشیانہ دیکھ کر تڑپ جائے اور راہ کے تمام خطروں سے بے نیاز ہو کر مائل پرواز ہو جائے۔

شب کی انگڑائیوں سے مسحور ہو کر انسان جب بستر خواب پر جاتا ہے تو نکتہ رس نگاہ بیاض فطرت پڑھنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اپنی عزیز ساعتوں میں سارے دن کے عمل و افکار کی مکمل روداد پیش نظر ہوتی ہے اور ضمیر کی کسوٹی کھوٹا کھرا الگ الگ کر ڈالتی ہے۔ شبانہ دن بھر چنگ و رباب کی قوس و قزح میں چکر لگاتی رہی۔ لیکن رات کو خوابگاہ میں آنے کے بعد ابھرے ہوئے جذبات غیر شعوری طور پر متین ہو گئے اور اس نے قلبی اطمینان کے ساتھ واقعات کی کڑیاں علیحدہ کر کے باری باری ہر ایک پر سوچنا شروع کیا۔ اپنے والدین کے متعلق اسے ذرا بھی تشویش نہیں ہوئی وہ جانتی تھی کہ اول تو سلمان سب کی جان جگر ہے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دوسرے صورت حال کے لحاظ سے بھی یہ رشتہ خوشی سے منظور کر لیا جائیگا۔ سلمان کی والدہ کے بارے میں کسی طرح کے فکر کی ضرورت ہی نہیں تھی اسلئے کہ سلمان بذات خود موجود تھا اب اسے سلمٰے کا خیال آیا۔ یہاں پہنچکر ذرا ٹھٹھکنا پڑا ماتھے میں شکن بھی آ گئی لیکن ایک جھرجھری لے کر آگے بڑھی چلی گئی۔ گل مقصود کی بے پایاں جستجو نے کانٹے کی ہلکی سی چبھن کا بھی احساس نہ ہونے دیا۔ ایکدم فتح کی خوشی میں دیرینہ ہزیمت کا غم بھلا ہی دیا جاتا ہے۔ کسی بلانوش کو پوری بوتل مل جاتی ہے تو وہ چھوٹتے ہی سوڈا ملانا پسند نہیں کرتا۔ اسلئے کہ اڑتی ہوئی نشاط رانی تھوڑے سے ملال کی بھی روادار نہیں ہوتی۔ وہ بھی اپنی دھن میں ہر نقش ماسوا کو روندتی ہوئی چلی گئی۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ایک سرشار تو خود بین اور ایک محبت چکیدہ ٹوٹے ہوئے دل کی راہیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ واردات کا پہلو بدلتے ہی اس نے بھی کروٹ بدلی۔ کوئی نشتر سی شے بائیں پسلیوں کے پاس کسکی۔ سلمٰے ؟؟ ہو سا آگیا۔ کوئی چیز آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ محبت کی آئینہ بندیوں نے پھر جادو کرنا شروع کر دیا۔ ہونٹ آپ ہی آپ متحرک ہو گئے " لیکن ان کا ہم سے کیا تعلق ؟ منگنیاں ٹوٹ ہی جایا کرتی ہیں سلمان سے نہیں تو اور کسی سے پلو باندھا جا سکتا ہے ؟ یہاں بھی اڑنگا لگ گئی۔ مگر ہزار من سمجھوتی کے باوجود اسے سلمٰے پر غصہ آنے لگا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فروعات میں الجھ کر رہ جائے اور رچے ہوئے نشہ میں ترشی استعمال کرلے —— پھر بھی عین غصے کے عالم میں اسے یہ معلوم ہوا جیسے سلمٰے ششدر کھڑی ہوئی دوپٹہ کا پلو انگلیوں میں لپیٹ رہی ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر زبان کام نہیں دیتی۔ منہ دیکھ کر نگاہ نیچی کر لیتی ہے —— آخر شبانہ عورت تھی اور وہ بھی شکستہ پا، چوٹ کھائی ہوئی۔ دل پسیج گیا اور ہمدردی کی ایک لہر نے خنکی سی پیدا کر دی۔ معاً اسے وہ دن یاد آ گیا کہ جب اس کا پلو سلمان کی بجائے کسی اور سے باندھا جا رہا تھا اور نسوانی دلچسپی کے مطابق مستقبل کی تمام نزہتیں حاصل ہوتے ہوئے بھی اس کا دل رو رہا تھا، اوسان اڑے جاتے تھے، آہ بھرنا چاہتی تھی لیکن نہیں بھر سکتی تھی، پھولوں کی سیج کانٹوں کا جال بن گئی تھی اور سہیلیوں کی گدگدیاں سنگین کی نوکیں، —— شبانہ کو یوں محسوس ہوا گویا یہ سب کچھ سلمٰے پر بیت رہا ہے اور وہ سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد خود غرضی کا بادل چھٹا تو اس نے پلٹ کر اپنی طرف دیکھا اور سہم کر رہ گئی طرح طرح کے سوال خود بخود اس کے دل میں کروٹیں لینے لگے —— سلمٰے کو اس بھول بھلیاں میں لانے کا ذمہ دار کون ہے ؟ اپنی طمانیت کیلئے دوسروں کی آس توڑنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے ؟ دوست بن کر دشمن کے فرائض انجام دینے غداری میں داخل نہیں ہیں ؟ اسے لیٹا رہنا مشکل ہو گیا۔ اٹھ کر بیٹھ گئی یکایک تصویر کا دوسرا رخ سامنے آ گیا اب اسے سلمان پر طیش آ رہا تھا وہ تہیہ کر چکی تھی کہ جدید حالات کے ماتحت پہلی سی رسم و راہ نہ بڑھائے گی۔ اور جہاں تک اسکی کوشش کا تعلق ہے کسی قدر احتیاط کا ثبوت بھی دے چکی تھی لیکن

ظالم سلمان نے محبت کی سحر کاریوں سے سوتے ہوئے فتنے جگا دیئے اور ایک ہی جھٹکے میں صبر و شکیب کی ساری بندشیں کھول ڈالیں — اُسے کون بتاتا کہ چاہنے والے کا ہلکا سا تبسم عورت کے حسرت بھرے دل کے شگوفے کھلا دیتا ہے اور وہ ہزار استقلال کے باوجود عشق کی رعنائیوں میں کھو جاتی ہے۔

~~~

میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گیا، کہاں چلی گئی تھیں؟

ایک سہیلی کے ہاں!

آنکھیں سُرخ کیوں ہو رہی ہیں؟

رات کو نیند نہیں آئی!

سلمان نے دونوں ہاتھ پکڑ کر چاہا کہ انگڑائیوں سے نیند اُڑنے کی کہانی سُنے، لیکن شبانہ کی نیچی نظروں نے مایوس کر دیا۔

کیا بات ہے؟

کچھ نہیں

کچھ کیوں نہیں؟ چہرہ کا پھیکا پن کہہ رہا ہے کہ بہت کچھ ہے، کل والی بات کا کسی سے تذکرہ تو نہیں کر دیا؟

نہیں!

آخر معاملہ کیا ہے؟

سلمان ....!

کہو شبانہ، رُک کیوں گئیں؟

میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی!

کیا کہہ رہی ہو؟

جو مجھے کہنا چاہیئے!

میں خودکشی کر لوں؟

نہیں؟

پھر —؟

اس نے کچھ کہنے کی بجائے ایک پری تمثال دوشیزہ کی خوشنما تصویر اسکے ہاتھ میں دیدی۔

یہ کون ہیں؟

— سلمٰے "

شبانہ؟؟ تم مجھے زندہ درگور کرنا چاہتی ہو؟

کون کہتا ہے؟

پھر اس طرز عمل سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

سلمان، میں نے بڑی کوشش کی کہ تمہیں کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچاؤں تمہارے احساس کی بلندی کے سامنے میرا سر نہیں میری رُوح بھی جھک جاتی ہے لیکن ایک نوجوان سراپا بہار دوشیزہ کے نازک دل پر چرکا لگاتے ہوئے جی ڈرتا ہے کہ کہیں فطرت کا انتقام گیر ہاتھ دراز نہ ہو جائے۔

سلمان ہکا بکا رہ گیا —!

تم حیران ہو اور میں بھی حیران ہوں بعض اوقات درخت لگانے والے ہی کو اُس کی چھایا راس نہیں آتی۔ اپنی بیچارگی کے زمانے میں یہ سمجھ کر کہ ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئے ہیں میں چاہتی تھی کہ تمہارا دامن دل کلیوں سے بھر دوں پہروں پڑی سوچا کرتی تھی۔ تمہاری دلشکنی کا خیال پریشان کئے ہوئے تھا۔ آخر میں نے ایک حسین لڑکی کی تلاش شروع کر دی جس کی موجودگی میں تمہارا غم غلط ہو جائے اسی دوران میں سلمٰے سے ملنے کا اتفاق ہوا خوشی کے مارے میری باچھیں کھل گئیں، نورس غنچہ، ماہ پارہ سلمٰے! میری نگہ انتخاب نچھاور ہو گئی۔ تمہاری والدہ اور خالہ جان کے درمیان ناچاقی تھی اس بات نے تھوڑی دیر کیلئے مجھے پریشان رکھا لیکن اس خلیج کو میں نے یوں پاٹا کہ سلمٰے کو بہن بنا لیا۔ ہم نے بصد مشکل دونوں بہنوں کے دل صاف کرائے۔ میں نے چچی اماں کا سمجھا لیا اور سلمٰے نے اپنی والدہ کا، اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ گورکھ دھندہ اُسی کو گھیرنے کی غرض سے بنایا جا رہا ہے بڑی اچھی لڑکی ہے، جیسے صبح کی تازگی۔

ملاپ ہو جانے کے بعد ہمارا ربط ضبط اور بھی بڑھ گیا، وہ دوسرے تیسرے آ جایا کرتی تھی اور میں اس کے سامنے تمہارا صرف تمہارا تذکرہ کیا کرتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ تمہاری ہی باتیں کیا کروں، تمہارے ہی گُن گایا کروں تمہاری خوش مزاجی، روشن خیالی، زیرکی ذہانت کے قصّے سوز و گداز سے بیان کیا کرتی اور وہ اشتیاق کے ساتھ سُنا کرتی۔ اس افسوں گری سے میری بیکلی دور ہوتی گئی اور اُس کے اچھوتے دل میں میٹھی میٹھی چنگاریاں کپکپیاں پیدا کرتی رہیں۔ ایک دن میں اسے باغ میں لے آئی ہم روش روش، ڈال ڈال بات بات ہوتے ہوئے اسی جھولے میں بیٹھ گئے جہاں ہماری ریت پریت پروان چڑھی تھی، جھولے کا زیر و بم ایسے جیسے محبت کی پینگیں بڑھ رہی ہوں۔

میں تمہیں دیکھ کر کتنی مسرور ہو جاتی ہوں سلمٰے؟

اور میں بھی —!

سنتی ہو، بہن کے سوا میں تمہیں کچھ اور بھی بنانا چاہتی ہوں؟؟ جیسے کوئی اپنی محبوبہ سے پریم کی بھیک مانگتا ہو۔

کیا؟ اس نے بھولپن سے پوچھا۔

"دلہن" — میں نے اس کے کان میں منہ لگا کر جواب دیا۔

اُس نے جھولا ٹھہرا لیا اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "میں سمجھی نہیں؟"

"سلمان"

وہ شرما گئی۔ چہرہ پر خاص طرح کی متانت آ گئی جو ایک دوشیزہ کے نقش و نگار میں دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔
~~~

بڑی کوئی ہو تم؟

میں — ؟ میں نہیں وہ بڑے کوئی ہیں اور اُن کے ساتھ تم بھی!

رخساروں میں سُرخی دوڑنے لگی!

میں کوشش شروع کردوں؟

تمہیں اختیار ہے!

جیسے کسی کو منہ مانگی مراد مل گئی ہو۔ میں نے چٹ چٹ اس کی بلائیں لے لیں — سلمٰے کو ہموار کرکے میں نے چچی اماں کو اکسایا جھوٹ سچ بھی بولا اور سچ مچ ناک میں دم کر ڈالا۔ سلمٰے کی والدہ سے سوال کیا گیا۔ معمولی سے تبادلۂ خیال کے بعد سب راضی رضا ہو گئے دوسرے ہی ہفتے میں منگنی ہو گئی۔ میری تو عین خوشی تھی کہ جس طرح بھی ہو جلدی سے یہ بندھن بندھ جائے۔ پر کون جانتا تھا کہ چار ماہ بعد ایک اور انقلاب برپا ہونے والا ہے — اب ہماری گفتگو کا ہنگامہ پرور عنوان تم تھے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ میرے ہاں سے کچھ لیکر نہ گئی ہو۔ تم تو اس کی چھوٹی سی دُنیا میں ننھا سا مٹ پیدا کئے ہوئے تھے اور وہ تمہاری پرستش کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے دریافت کیا: "وہ چھٹیوں میں بھی نہیں آتے؟"

میں ٹال گئی، جواب بھی کیا دیتی — تاہم اس کا اشارہ سمجھ لیا اور چچی اماں کے خط میں دو حرف میں نے بھی لکھوائے۔ خدا کا شکر ہے تم آگئے، میں سمجھتی تھی کہ تمہاری توجہ سلمٰی کی طرف ہوگی اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں خود توجہ دلاؤنگی۔ تم نے ادھر دیکھنا تو درکنار اس کا نام لینا بھی گناہ قرار دیا، مجھے ہی ابھارتے رہے، میں سٹپٹائی، جھجکی، پیچھے ہٹی، مگر تم نے ہر بار ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا اور کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ تم ہی بتاؤ کہ ان حالات کی موجودگی میں تمہارا ساتھ میں کیوں کر دے سکتی ہوں۔ سب کو علم ہے کہ یہ رشتہ میری دوڑ دھوپ سے قائم ہوا ہے۔ کس کس کی زبان پر تالا لگایا جائیگا۔ دُنیا کو بھی چولہے میں ڈال دوں تو بھی سلمٰے کا دل توڑنا میرے امکان سے باہر ہے۔ کتنی نیک ہے میری سلمٰی! منگنی ہو جانے کے بعد وہ ٹوک دینے کا حق رکھتی تھی کہ اُس کے ہونے والے شوہر کا تذکرہ اس انداز سے کیوں کیا جاتا ہے؟ لیکن وہ تو مجھے اپنا محسن سمجھتی ہے جس نے مسرت ڈھونڈھ کر لادی ہو وہ عام سطح سے اونچی ہے، بہت زیادہ اونچی۔ ایسی پیاری لڑکی کا روپ چھین لینا، شرافت سچائی اور محبت کی توہین ہے۔

سلمان نے حیرت کے ساتھ سب کچھ سُنا، آنکھوں میں صرف دو آنسو جھلکے اور خشک ہو گئے!

تم اندازہ لگا سکتی ہو شبانہ؟ میرے دل پر کیا گذرے گی؟

تم سے بھی کچھ زیادہ، اپنی بھلی بھولی کیاری بے پناہ سج دھج اور میٹھے پُھننے کوئی بھی اپنے ہاتھوں سے برباد نہیں کرتا عیش و طرب جس مول بھی ہوں خرید لئے جاتے ہیں مگر جب سچی عزت، لاج اور بھرم کا سوال درپیش ہوتا ہے تو دلوں کی ہولی کھیلنی ہی پڑتی ہے۔ اس جگہ پر محبت کو قربان کر دینا بھی محبت کا فرض انجام دینے کے برابر ہوتا ہے۔ میں پھر کہونگی سلمان، مرد کا سہارا دئے بغیر عورت کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اُس سے کوئی بھول کوئی لغزش، کوئی فرو گذاشت ہو جائے تو اُس کی پوری پوری قیمت ادا کرنے کیلئے ہر وقت چاہئیے۔ اگر محبت کا مفہوم تمہاری نظر میں یہی ہے کہ اپنی دنیا بنانے کیلئے جتنی بھی دُنیائیں سامنے آئیں انہیں تباہ کرکے رکھ دو تو میں ایک دفعہ تمہارے ساتھ خودکشی کرنے کیلئے بھی آمادہ ہو جاؤنگی مگر ایسی صورت میں لوگ دانتوں میں انگلیاں دئیے مجھے دیکھتے نہیں رہ جائیں گے۔ خاندان میں کشیدگی نہیں پڑ جائیگی، اور سلمٰے کا خرمن جل نہیں جائیگا؟ بتاؤ کونسا راستہ بھلا معلوم ہوتا ہے؟

سلمان کے لرزتے ہوئے دل اور لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں میں ثبات آگیا۔ اس نے شبانہ کو محبت اور شکریہ کیساتھ دیکھ کر کہا۔

"جو تمہاری خوشی اور عزت کیطرف جاتا ہو"

"سلمان" اُس نے سپاس گذار لہجہ میں کہا۔ تم نے حقیقت میں آج میری مانگ چمکتے ہوئے تاروں سے بھر دی ہے اور اپنے ایثار سے ایک لغزیدہ عورت کو سرفراز خاتون میں تبدیل کر دیا ہے جیسے محبت نے ملکوتی رفعت سے جھلملا دیا ہو۔ یہ احسان شاید مرنے کے بعد بھی نہیں بھلایا جا سکے گا۔

معلوم ہے؟ سویرے میں کہاں گئی تھی؟

نہیں،

سلمٰے کے پاس، میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری اچھی سی تصویر چرا کر اُسکو دے دونگی، چنانچہ رات ہی کو اپنی سلمٰے کے گلستاں میں بہار برپا دینے کی تجویز کے ساتھ تمہارے ٹرنک سے ایک نئے رنگ کی تصویر نکال کر میں نے اپنے افسانوں کی کتاب میں رکھ لی تھی۔ اور تمہاری ٹینس گراؤنڈ والی تصویر جو تم نے عہد گل کی ایک صبح کو تنہائی میں جلنے کیلئے

عطا کی تھی سلمیٰ کو دیدینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صبح ——؟ وہ من کی مورت بھی میں نے اس کے سپرد کر دی جیسے کوئی اپنے گیت، اپنا تمکون، اور اپنے خواب کسی کے سپرد کر کے بارِ امانت سے سبکدوش ہو گیا ہو۔ اب میں ناز و نیاز کے جلووں میں تم دونوں کو گل افشاں دیکھ کر زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ سلمیٰ تنہا تمہارے ساتھ نہ ہو گی بلکہ میں بھی ہونگی ——!

سلمان کی مایوسی شادابی سے بدل گئی'

سچ کہتی ہو شبانہ ——؟؟

بالکل —— عورت اپنے محبوب کو جو بھی نشانی دیتی ہے۔ وہ اُسے جان و دل سے لگا کر رکھتا ہے اور اس طرح اپنی محبوبہ کو ہر وقت ہر گھڑی اپنے قریب پاتا ہے۔ میں بھی سلمیٰ کو اپنی محبت کی یادگار کے طور پر تمہیں دے رہی ہوں!

اپنے کمرہ میں وہ اس طرح واپس آئی جیسے کوئی جواری سب کچھ ہار کر بھی سکون کی بازی جیت لایا ہو ——!

اُس کے چلے جانے کے بعد سلمان نے تصویر پر نگاہ ڈالی تو اسے سلمیٰ کی شبیہ میں شبانہ جگمگاتی ہوئی نظر آئی ——!

سلمان نے سٹیشن جاتے ہوئے حسبِ سادگی سے پوچھا: "تم نے اپنے لئے کیا رکھا؟؟"

تو شبانہ نے فردوسی وقار کے ساتھ جواب دیا —— "تمہاری یاد" !!

اس نے شبانہ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے پوجا شروع کرتے وقت پجاری دیوی کو دیکھتا ہے



حیض کی خرابیوں لیکوریا (سفید پانی) وغیرہ کا مصدقہ علاج

شکتی ہر سال ہزاروں مستورات کی جانیں بچاتی ہے

ہر سال ایک لاکھ سے زائد عورتیں "شکتی" استعمال کر کے اپنی زندگی کو پُر مسرت اور بیماریوں سے مبرا بناتی ہے۔ شکتی پچھلے کئی سالوں سے ملک کے کونے کونے میں استعمال کیجا رہی ہے۔ اور یہ تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ عورتوں کی مخصوصہ امراض کو دُور کرنے میں شکتی سے بہتر اور کوئی دوا نہیں۔

"شکتی" حیض کی جملہ خرابیوں مثلاً ماہواری کا وقت پر نہ آنا۔ کم یا زیادہ آنا۔ وقت بیوقت آنا۔ بدبودار آنا۔ درد کے ساتھ آنا۔ ماہواری کے دنوں میں طبیعت بیچین ہونا وغیرہ شکایتوں کو دُور کر کے حیض کو طبعی حالت میں لے آتی ہے۔ شکتی عورتوں کی زندگی کو گھن لگانیوالے امراض مثلاً لیکوریا (سیلان الرحم) یا سفید پانی آنا، ہسٹریا، بانجھ پن، خون کا پتلا پن، چڑچڑا پن، پیٹ کے نچلے حصے میں درد عام کمزوری وغیرہ دُور کر کے عورت کو نئی زندگی اور نئی جوانی بخشتی ہے۔ وہ عورتیں جو کئی برسوں سے مندرجہ بالا امراض کا شکار تھیں۔ اور دوائیوں انجکشنوں وغیرہ کے استعمال کے بعد مایوس ہو چکی تھیں۔ انہیں شکتی نے مکمل صحت اور تندرستی عطا کی۔ عورتوں کے جملہ امراض کے لئے "شکتی" محفوظ ترین یقینی اور سو فیصدی مجرب دوا ہے۔ ملک بھر میں ڈاکٹر اور نرسیں اس کے استعمال کی سفارش کرتی ہیں۔

لالہ دیوا بخند پکی ڈھکی جموں سے لکھتے ہیں "شکتی" سے میری استری گر بھوتی ہو گئی۔ بھائی کی بھینٹ دس روپے بھیج رہا ہوں"

لالہ راجس مل آگرہ سے لکھتے ہیں "شکتی کی ایک شیشی نے میری استری کی کایا پلٹ دی۔ آپکی دوا سونے میں تولنے کے قابل ہے"

شری ماتا پرشاد ترنگی پرسنل اسسٹنٹ لشکر گوالیار سے لکھتے ہیں "آپ کی "شکتی" کے استعمال سے میری استری کی جملہ ماہواری کی خرابیاں جو آؤں کمادرد وغیرہ شکایتیں دُور ہو گئیں۔ میں آپ کا ہمیشہ اُپکار مانوں گا"

ایسے ہزاروں سرٹیفکیٹ دفتر میں موجود ہیں۔ اور ہر روز بیشمار چٹھیاں موصول ہوتی ہیں۔ جن میں "شکتی" کے فوائد کی تعریف ہوتی ہے "شکتی" ہندوستان کی نامور لیڈی ڈاکٹر دیدہ دیدکماری کی نگرانی میں تیار کی جاتی ہے۔ ناری سدھا فارمیسی واحد دواخانہ ہے" جہاں صرف عورتوں کے امراض کیلئے ادویات تیار کیجاتی ہیں شکتی فی شیشی دو روپے محصولڈاک الگ۔

اس پتہ پر لکھیں:۔

ناری سُدھا کمپنی ایم سی کھار بمبئی نمبر ۲۱

NARI SUDHA CO. KHAR (M.C) BOMBAY 21

جب میں جوان تھی!

از جناب ماہر القادری

ایک حسین عورت کے عبرت آموز تاثرات — دُنیا، ہوس اور جذبات کے دوراہے پر

اس پاپی سنسار اور ہولناک دنیا میں ان آنکھوں نے کیا دیکھا؟ اس کی تفصیل کے لئے ضخیم دفتر درکار ہیں۔ کاغذ کے چند صفحوں میں میرے تجربات کی سمائی نہیں ہو سکتی۔ میرا سینہ سینکڑوں اسرار کا مدفن ہے جن میں سے بعض خونناک ہیں اور اکثر شرمناک! دنیا کے ہاتھوں اتنے بہت سے زخم کھا چکی ہوں کہ ان کا شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ شاعر نے شاید میرے ہی جذبات کی ترجمانی اپنے لفظوں میں کی ہے۔

تمہاری چٹکیوں نے نیل اتنے دل پہ ڈالے ہیں
کہ جنکو گنتے گنتے دکھ گئی ہیں انگلیاں میری

میں کسی کو قصور وار نہیں ٹھیراتی میری قسمت کا لکھا میرے سامنے آیا۔ جو کچھ ہوا اسے ہونا ہی چاہئے تھا قسمت کے نوشتہ کا ایک حرف بھی انسان نہیں بدل سکتا۔ مجھے اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کا اعتراف ہے میں مجرم ہوں مگر مظلوم مجرم! ظلم کس نے کیا؟ اسکا جواب میری آپ بیتی دیگی جس کے چند ٹکڑے یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔

میرا شباب ڈھل رہا ہے۔ بلکہ ڈھل چکا ہے میں اسوقت زندگی کی اس منزل میں ہوں جہاں چاروں طرف خنکی بے کیفی اور مُردنی چھائی ہوئی ہے۔ دنیا نے میرا سب کچھ لوٹ کر مجھے اندھیرے میں ڈال دیا ہے میری لٹی ہوئی دولت۔ دنیا چاہے تو بھی نہیں دے سکتی۔ آپ میرے چہرے کی جھُریوں اور پیشانی کی سلوٹوں پر نہ جائیے میرے حال سے میرے ماضی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا میرے یہی پچکے ہوئے رُخسار جن پر آپ کو بے ترتیب جھُریاں نظر آ رہی ہیں میری جوانی کے زمانہ میں دلکشی اور رعنائی کے آتشکدے اپنے اندر رکھتے تھے۔ کتنے بہت سے نوجوان اور سجیلے نوجوانوں کی راتیں ان ہی میرے آتش بداماں رخساروں کے تصور میں جاگتے بسر ہوئی تھیں یہ جھُریاں جن کو آپ دیکھ رہے ہیں گرم چنگاروں کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتی ہیں۔ ظاہر پرست جو صرف ظاہری حالات پر حقائق کا قیاس کرتے ہیں میری گذری ہوئی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کو کیا معلوم کہ میری آنکھوں میں کتنے بہت سے تجربے غلطاں ہیں میری آنکھوں کو لوگ "حسنِ فاتح" کہا کرتے تھے ان کی زد سے بچنا ناممکن تھا۔ کتنے پیاسوں کو میں نے انہی پیمانوں سے شراب پلائی ہے۔ لوگ اس شراب کی ایک ایک بوند کیلئے ترستے تھے۔ آہ! کہ آج ان پیمانوں میں تلچھٹ بھی باقی نہیں رہی۔

صدائیں دو مرے گذرے ہوئے زمانہ کو

میں اب بالکل بدل گئی ہوں میرے جسم کا رواں رواں کچھ اور ہو گیا ہے میں کیا بتاؤں کہ میرے پاس کیا تھا، کہ جس کے جاتے ہی دنیا کی آنکھیں بدل گئیں۔ اگر میں وہی ہوں جو اب سے دس پندرہ سال پہلے تھی تو آج بھی میری راہ میں لوگوں کو آنکھیں بچھانی چاہئیں اب بھی مجھے چلتا دیکھ کر لوگوں کی زبانوں پر یہ شعر ہونا چاہئے:۔

زیر قدمت ہزار جان است
آہستہ خرام۔ بلکہ مخرام

جلسوں اور پارٹیوں میں کتنے شوق و اضطراب کے ساتھ لوگ میری طرف بڑھتے تھے۔ کتنی ہوسناک نگاہیں میرے لب و رخسار کا طواف کیا کرتی تھیں —— ! اور —— !

کتنی راتیں ہیں جو میرے نام سے شہرت ہیں مگر اب وہ انجمن برہم نظر آ رہی ہے محبت بھرے خطوط کا ایک سلسلہ یک لخت بند ہو گیا۔ وہ لوگ جو مجھے:—

دل و جان کی مالک —— پیکرِ ناز و رعنائی —— جان تمنا —— ایمان محبت —— حسن و شباب کی دیوی ——

لکھا کرتے تھے یا تو سب کے سب مر گئے اور اگر نہیں مرے اور زندہ ہیں تو پھر اس تبدیلی کو میں اپنی موت سے تعبیر کروں تو کچھ بیجا نہیں ہے مجھے آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میرا مذاق اڑا رہی ہے میری زندگی کا منہ

چڑایا جا رہا ہے۔ لوگ مجھے دھتکار رہے ہیں۔ میری طرف حقارت آمیز نگاہیں اُٹھ رہی ہیں اور دنیا کا ایک ایک ذرّہ میرے ڈھلتے ہوئے شباب کا دامن تھام کر زبانِ حال سے کہہ رہا ہے:۔

اُس عشرت پرورده سماج میں
تیرے لئے اب کوئی جگہ نہیں"

وہی آئینہ جس کو دیکھ کر میں کل مسکرائی تھی فخر و غرور کے ساتھ! آج اس کے دیکھتے ہی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے ہیں۔ شباب! آہ شباب! خوبصورت دھوکہ حسین فریب۔ خوشنما غلط فہمی! ایک ایسی شراب جسکا خمار اترتے ہی آدمی میں کچھ باقی نہیں رہتا جس نے بھی کہا خوب کہا:۔

سکون و عیش کی دولت کہاں دنیائے فانی میں
بس اک غفلت سی ہو جاتی ہے وہ بھی جوانی میں

غفلت کے یہی چند چھینٹے انسان کو ڈبو دیتے ہیں۔ جوانی سچ مچ دیوانی ہے۔ آدمی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع جذبات کی رو میں بہہ جاتی ہے۔ نادان اور غافل انسان آگ کے شعلوں سے کھیلتے ہوئے یہ سمجھتا ہے کہ اس کے دامن کے ایک تار پر بھی آنچ نہیں آئی لیکن جب ہوش آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دامن زندگی جل کر خاک ہو گیا۔ پھٹا ہوا کپڑا رفو ہو سکتا ہے مگر جلے ہوئے کپڑے کو ٹھیک کرنا بہت مشکل ہے۔ جوانی کی غلطیوں کی تلافی ناممکن ہے۔ بڑھاپا حقیقت میں جوانی کی لغزشوں کا کفارہ ہے۔ جوانی کے بعد کے زمانہ میں ایک ایک چیز کا گن گن کر حساب لیا جاتا ہے۔ کاش! آدمی بوڑھا ہی پیدا ہوتا اور اسکو جذبات کے آتشیں امتحان میں مبتلا نہ کیا جاتا جوانی میں آدمی جلتی ہوئی آگ میں کود سکتا ہے لیکن یہ دور گذر جانے کے بعد وہ اس کی بوندوں کو چھوتے ہوئے بھی دل جھجکتا ہے

جوانی بغاوت بن کر آتی ہے۔ فطرت کے ایک ایک قانون سے بغاوت! اخلاق و انسانیت کی ایک ایک دفعہ کی خلاف ورزی بلکہ کھلا ہوا انکار! جوانی میں عقل و ہوش کی بساط کو الٹ دیا جاتا ہے۔ جذبات۔ صرف جذبات! دل کی حکومت! اور دل ہر اس بات کو چاہتا ہے جس کے چاہنے اور کرنے کی عقل اجازت نہیں دیتی۔ جوانی میں بیچاری عقل جذبات کی خادمہ اور نوکرانی بن کر رہتی ہے اور جذبات کسی قید و احتیاط کی پروا نہیں کرتے۔۔۔۔

جوانی میں ایک گرم بوسہ۔ ہزاروں آتشبار ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے زیادہ قیمتی اور ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ شباب ابھرے ہوئے سینوں۔ دہکتے ہوئے رخساروں اور بل کھائی ہوئی زلفوں کے سوا اور کوئی چیز دیکھنا نہیں چاہتا۔ جوانی میں در و دیوار حسین نظر آتے ہیں۔ زمین سے آسمان تک حسن ہی حسن دکھائی دیتا ہے جذبات کی بجلی جوان آدمی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، وہ اس تتلی کی طرح بے تاب رہتا ہے جو باغ کے ہر پھول کے رس سے لذت اندوز ہونا چاہتی ہے اور ہر نئی صبح نئے پھول پر بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے شباب ایک مسلسل لذتِ آغاز کا نام ہے۔ اس دور میں انجام اور عاقبت کی بالکل خبر نہیں رہتی وہاں ہر چیز کو جذبات کے پیمانہ سے ناپا جاتا ہے،

جوانی بھیگی ہوئی راتوں میں گرمیِ آغوش چاہتی ہے۔ سونے چاندی کے ڈھیروں سے بھی اس کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ اس کیلئے جذبات کا تبادلہ چاہیئے تبسم کا جواب مسکراہٹ سے دیا جائے۔ اقدام حسین اقدام! یہاں تک کہ گرم و تیز سانسوں سے فضا معمور ہو اور صبح کے جھٹ پٹے میں ایک طرف آنکھوں میں فتحمندی کا غرور جھلک رہا ہو اور دوسری طرف حسین پشیمانی اور مسرتوں میں ڈوبی ہوئی جھینپ! جوانی کا فراق۔ بڑھاپے کے وصل سے بہت زیادہ رنگین اور مسرت کن ہوتا ہے مگر ان سب کچھ رنگینیوں اور مسرتوں کے بعد آخر کہنا پڑتا ہے کہ:۔

آگیا تھا اتفاقاً نیند کا جھونکا مجھے

میں اس نیند سے بیدار ہو چکی ہوں، اور وہی افسانہ جو میری عصمت اور زندگی کے خون سے لکھا گیا ہے۔ اس کے چند ٹکڑے یہاں پیش کر رہی ہوں۔

میں جانتی ہوں کہ سماج میری روداد کو حقارت کے کانوں سے سنے گا اور لوگ مجھے ایک آبرو باختہ عورت کے نام سے پکاریں گے۔ لوگوں کو مجھے ایسا کہنے اور سمجھنے کا حق ہے۔ برائی کہی جائے یا نہ کہی جائے۔ بہر حال قابل نفرت چیز ہے لیکن میری صرف اتنی گذارش ہے کہ میری رودادِ شباب پڑھنے والا سماج ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنے کی زحمت گوارا کرے۔ ایسا کرنے کے بعد شاید میری طرف اٹھی ہوئی انگلیاں یکایک جھک جائیں گی میں چاہتی ہوں کہ میری آپ بیتی کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا جائے۔ میں اپنی کہانی صرف تفریح کے لئے نہیں سنا رہی کسی کی بربادی دوسرے کے لئے باعث تفریح نہیں بن سکتی، دوسروں کے جلتے ہوئے گھروں کی آگ پر تاپنے والے قدرت کے انتقام کی زد سے بچ نہیں سکتے۔ میں اپنے خونچکاں دل کے زخم کھیلنے کے لئے پیش نہیں کر رہی۔ میری خواہش ہے کہ میرے زخموں کو نگاہِ عبرت سے دیکھا جائے۔

من نہ کردم شما حذر بکنید

میری آپ بیتی شروع ہو رہی ہے۔ سنئے

والے گوش شنوا کے ساتھ تباہ ہو جائیں غالباً میری کہانی سن کر بعض لوگ کہیں گے کہ یہ کیسی پاگل عورت ہے کہ اپنے کرتوتوں کو آپ ہی بیان کر رہی ہے! اس ہمدردی کا پیشگی شکریہ! مگر ضبط راز کرتے کرتے میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے میں بھیدوں کے چھپانے پر اب قادر نہیں رہی اور اگر مجھے "ناصح مشفق" کا طنز آمیز خطاب نہ دیا جائے تو عرض کروں کہ میں اپنے پیچھے آنے والی نسلوں کو منزل کے نشیب و فراز سے خبردار کر دینا چاہتی ہوں۔ میری تمنا ہے کہ جن چوٹوں کو میرے دل نے برداشت کیا ہے۔ دوسرے اس سے کسی نہ کسی حد تک محفوظ رہیں۔ اگر میری رسوائی نے ایک دل کو بھی شباب کی لغزشوں سے بچا لیا تو مجھے انتہائی خوشی ہو گی اور کیا عجب ہے کہ یہی ایک نیکی میرے نامۂ اعمال کا سب سے زیادہ گرانقدر ورق بن جائے۔

میں واقعات کو جوں کا توں بیان کروں گی اپنی طرف سے کچھ بڑھاؤں گی گھٹاؤں گی نہیں! نتائج کا اخذ کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے! اگر میری روداد شباب باہم مسلسل قائم نہ رہے تو مجھے اس بے ربطی پر معاف فرمایا جائے۔ جو کچھ یاد آتا جا رہا ہے بیان کرتی چلی جا رہی ہوں۔ افسانہ نویسوں کی طرح من گھڑت خاکے خود تراشیدہ واقعات اور سوچی ہوئی داستانیں میرے پاس نہیں ہیں۔ اگر لٹریچر میں حقیقت آمیز مگر بے ربط باتوں کی قدر نہیں ہوتی تو مجھے اس کی ذرہ برابر پروا نہیں۔ سچائی لٹریچر سے بہت بلند ہے۔ ایک خاموش سچ۔ ہزاروں بولنے والے جھوٹوں سے اچھا ہے۔

خاندانی حالات

اصل داستان شروع کرنے سے پہلے میرے خاندانی حالات کا بھی مختصر تذکرہ ضروری ہے۔ یہ تذکرہ بھی میری داستان سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ میرے والد ایک خوشحال مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے میرے دادا کا شمار شہر کے نامور اور معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ پبلک ان کو عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور سرکاری حلقوں میں بھی وہ بہت زیادہ رسوخ اور اثر رکھتے تھے میرے دادا نے میرے والد کی جو ان کے اکلوتے بیٹے تھے اپنی خاص نگرانی میں تعلیم و تربیت کا انتظام کیا میرے والد بہت ذہین اور محنتی تھے۔ ہر امتحان میں اول رہے ہندوستان کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ان کو ولایت بھیج دیا گیا اور وہاں سے وہ بیرسٹر ہو کر واپس ہوئے۔ کنبہ کی بڑی بوڑھیوں کی زبانی میں نے سنا ہے کہ جب میرے والد انگلستان سے واپس آ رہے ہیں تو شہر کے ریلوے اسٹیشن پر ان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا میرے دادا نے بیٹے کی کامیابی اور پردیس سے خیر و خوبی کے ساتھ آنے کی خوشی میں بڑے پیمانہ پر دعوت کی۔ شہر کے لوگ کہتے ہیں کہ ایسی آتشبازی جو اس خوشی کے جلسہ میں چھوڑی گئی آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ والد نے چند دن سستانے کے بعد بیرسٹری شروع کر دی۔ آدمی ذہین تھے اور اس پر زمانہ کی سازگاری یہ کہ دادا کا حکام میں رسوخ تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کا کام چل نکلا موکل وکیل اور بیرسٹر کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اس کی قابلیت کا اندازہ کرتے ہیں اور یہاں خدا کے فضل سے ہر طرح کے ٹھاٹ باٹ پہلے ہی سے موجود تھے پھر والد صاحب کی قابلیت سونے پر سہاگہ تھی۔

دادا کے زمانہ میں ہمارے یہاں پردے کی سختی کے ساتھ پابندی تھی لیکن والد کے ولایت سے آنے کے بعد یہ بندھن دھیرے دھیرے ٹوٹنے لگے۔ دادا نے اس تبدیلی کی سختی کے ساتھ مخالفت کی مگر ان کی بات اب کون سنتا تھا۔ ولایت جانے سے پہلے خاندان ہی کی ایک لڑکی سے میرے والد کی منگنی ہو گئی تھی۔ وہاں سے واپسی کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے تقاضہ ہوا کہ شادی ہو جانی چاہئے۔ دادا بھی جلد سے جلد شادی ہو جانے کے موافق تھے۔ مگر ولایت کی ہوا کھا کر میرے والد کی نیت بدل چکی تھی۔ وہ دو سال تک ٹالتے اور طرح دیتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے دادا کا انتقال ہو گیا۔ والد کو دادا کا پاس لحاظ تھا کہ وہ اب تک بیاہ کی "ہامی" بھر رہے تھے۔ دادا کے مرنے کے بعد یہ ڈر بھی جاتا رہا اور انہوں نے لڑکی والوں کے یہاں کہلا کر بھیجا کہ میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ آپ اپنی لڑکی کی کہیں اور فکر کر لیجئے۔ لڑکی والوں کو یہ بات بہت شاق گذری اور انہوں نے غصہ میں میرے والد سے انتقام لینے کی کوشش کی مگر ایک خوشحال بیرسٹر کے مقابلہ میں ان لوگوں کی کیا چل سکتی تھی ان لوگوں کی مخالفت میرے والد کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

ہمارے شہر میں ایک سول سرجن جو ذات کے کشمیری برہمن تھے تبدیل ہو کر آئے والد کی ان سے بہت دوستی ہو گئی۔ سول سرجن کی لڑکی لکشمی کی جو کالج میں پڑھتی تھی والد سے آہستہ آہستہ بے تکلفی بڑھتی گئی۔ اس بے تکلفی اور راہ و رسم نے معاشقہ کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ دونوں کی سول میرج ہو گئی۔ شہر میں اس قسم کی پہلی مثال تھی۔

لوگوں نے میرے والد کو بہت زیادہ انگشت نما بنایا لیکن میرے والد نے سمجھ بوجھ کر ایسا کیا تھا. لوگوں کے کہنے سننے سے وہ اپنے کئے پر پچھتانے کے لئے بھی تیار نہ تھے بدنامی اور رسوائی بھی امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنا ( ) اور اپنی اہمیت کم کرتی چلی جاتی ہے. پہلے پہل کسی بُری بات کو سن کر جتنا گہرا اثر ہوتا ہے اسی بات کو متواتر سننے کے بعد وہ اثر باقی نہیں رہتا چند دن کے بعد میرے والد بھی شہر کی سوسائٹی میں پہلے کی طرح گھل مل گئے میری ماں واقعی بہت خوبصورت تھیں. ان کی آنکھیں تو اپنی آپ ہی نظیر تھیں. ایک دفعہ شہر کے کلب میں بڑی دھوم دھام سے کمشنر صاحب کے اعزاز میں عشائیہ (ڈنر) دیا گیا. اس میں کمشنر صاحب کی میم نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ: ـ

,, اس انجمن میں ایک ایسی خاتون بھی موجود ہیں جن کی آنکھیں قلوپطرہ کی مخمور آنکھوں کی یاد دلاتی ہیں ,,

یہ میری والدہ کی آنکھوں کی طرف اشارہ تھا ساری محفل نے میم صاحب کے اس جملے سے لطف حاصل کیا۔

شادی کے دوسرے سال میرے والدین گرمی گذارنے کے لئے نینی تال گئے اور وہیں کے ایک بڑے ہوٹل میں میری ولادت ہوئی میری ماں مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ جس صبح کو تو پیدا ہوئی ہے اس دن بڑے زور کی بارش ہوئی. بارش کے ساتھ ساتھ اتنی تیز ہوا چلی کہ بہت سے تناور پہاڑی درخت جڑ سے اکھڑ گئے اور نینی تال کے تالاب میں پڑی ہوئی کشتیاں الٹ گئیں. ہوٹل کے انگریز منیجر نے جب سنا کہ اس کے ہوٹل کے مسافر بیرسٹر صاحب کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو وہ میرے والد سے مسکرا کر بولا کہ لڑکی کا نام طوفان رکھنا۔

خاندانی حالات کے سلسلہ میں اوپر جو باتیں کہی گئی ہیں وہ سنی سنائی تھیں. اب میں آپ بیتی کہہ رہی ہوں بچپن کا زمانہ غفلت کے عالم میں گذرا. یہاں تک کہ میں گیارہ سال کی ہو گئی میرے والدین مجھ سے انتہائی محبت کرتے تھے میں ہی تنہا ان کی امیدوں کا مرکز اور توجہات کی آماجگاہ تھی میری والدہ کے کوئی اور اولاد نہیں ہوئی. خوشحال گھرانے میں اکلوتی اولاد کے ساتھ جو کچھ بھی کیا جائے تھوڑا ہے. میرا چھوٹے کو کان بھی گرم ہوتا تو میرے ماں باپ بے چین ہو جاتے اور ڈاکٹروں کا ہمارے گھر میں تانتا بندھ جاتا. ہاں! یہ بات تو بھولی ہی جاتی ہوں کہ مذہب کی رو سے میرے باپ مسلمان اور میری ماں ہندو تھیں. اس لئے میرا نام "شانتا جمیلہ" رکھا گیا. لیکن عام طور پر سب لوگ مجھے شانتا کہہ کر پکارا کرتے. سول میرج نے ہمارے گھر میں مذہب کی اہمیت کو برائے نام باقی رکھا تھا. میرے والدین کے نام ضرور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ناموں جیسے تھے باہمی تعلقات نے ان کے مزاج اور عقیدہ کو بھی ہم رنگ بنا دیا تھا۔

جوان ہونے تک

ہم سب لوگ گرمی کے زمانہ میں نینی تال جایا کرتے تھے. میری گیارھویں سالگرہ نینی تال ہی میں ہوئی. ایک دن شام کو میں والدین ماما اور ملازم پہاڑ کی چوٹی پر سیر کرنے کے لئے جا رہے تھے. راستہ میں آبشار نظر آیا. میں نے والدہ سے کہا کہ مجھے پیاس لگی ہے اور میں اس آبشار کا پانی پینا چاہتی ہوں. ہم سب لوگ آہستہ آہستہ درختوں کی ڈالیوں کا سہارا لیتے ہوئے نیچے اترے. بڑا پُر لطف سماں تھا. سورج پہاڑ کی ہری بھری چوٹیوں کی آڑ میں آہستہ آہستہ چھپتا جا رہا تھا. پہاڑی پرندے اپنے گھونسلوں کو قطار در قطار جا رہے تھے ـ ساگوان کے درختوں کی شاخیں کھُردری چٹانوں پر اس طرح پھیلی ہوئی تھیں جسطرح کوئی تھکا ہوا مسافر راستہ میں چلتے چلتے بغیر کسی اہتمام کے سو جاتا ہے. ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا. صرف جھرنے کی نرم آواز فضا کے سکوت میں نہایت ہی خوشگوار گونج پیدا کر رہی تھی محسوس ہو رہا تھا کہ فطرت آبشار کے ساز پر آسمانی گیت گا رہی ہے کوئی سادھو اور فقیر اگر آبشار کی آواز کو سنتا تو اس نغمہ ربانی کی لے پر رقص کرنے لگتا. ہم سب چپ چاپ جھرنے کے پاس پہنچے میں نے قمیص کی آستینیں اوپر کو چڑھا کر اوک سے پانی پیا. پانی انتہائی خنک اور شیریں تھا. دل چاہتا تھا کہ تمام آبشار کو حلق میں انڈیل لوں. دوسرے لوگوں کو غالباً پیاس نہ تھی. لیکن میری دیکھا دیکھی انہوں نے بھی پانی پیا اور سب نے اسکی تعریف کی۔

,, سکندر اس آبشار کا پانی پیتا
تو پھر آب حیات کی جستجو نہ کرتا ,,

میں نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے یہ جملہ کہا. سب لوگ میرے اس جملہ پر مسکرا دیئے والد نے میری ماں کے قریب آکر چپکے سے کہا

دیکھا ہماری شانتا نے کیسی شاعرانہ بات بیان کی ,,

والد نے یہ بات آہستہ سے کہی. لیکن میں نے سن لی اور مجھے والد کی اس تنقید پر مسرت

ہوئی۔ ہم چٹانوں پر چڑھنے لگے۔ سڑک کے قریب پہنچ کر ڈھلوان چٹان پر میرا پیر پھسل گیا اور میں گر پڑی۔ وہ تو یہ کہئے کہ میری زندگی تھی جو درختوں کی جھکی ہوئی ڈالیوں نے مجھے غار میں گرنے سے بچا لیا ورنہ اگر کہیں ڈالیاں حائل نہ ہوتیں تو نینی تال کا غار میری قبر ہی بن چکا تھا۔ والدین نے مجھے گھبرا کر اٹھایا۔ پتھر کی نوک میری ٹھوڑی میں چبھ گئی تھی اور لہو تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ والدہ نے اپنی ساڑی کا پلو میرے زخم پر رکھ دیا اور مجھ پر غفلت سی طاری ہو گئی۔ صبح کو جب میری آنکھ کھلی ہے تو میں ہوٹل کے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی اور میری ٹھوڑی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چندن کی مرہم پٹی میں مجھے فائدہ ہو گیا۔ لیکن اس چوٹ کا نشان اب تک باقی ہے اور یہ نشان اس آبشار کی یاد ہر وقت تازہ رکھتا ہے۔

میری صحت ابتدا ہی سے اچھی تھی۔ بے فکری اور خوشحالی کی زندگی! میری بڑھوار گنگا کے ریت کی اس ککڑی کی طرح تھی جو ایک رات میں کئی انگل بڑھ جاتی ہے پھلوں سے مجھے دلی رغبت تھی۔ پہاڑی خوبانیاں میں بہت شوق کے ساتھ کھاتی۔ میرے پلنگ کے قریب کی میز پر خوبانیاں رکھی رہتی تھیں نینی تال کی آب و ہوا نے مجھے اور زیادہ تنومند بنا دیا اور میں شاید وقت سے پہلے جوان ہو گئی۔ اپنے جسم میں تبدیلی کے آثار دیکھ کر مجھے خود شرم سی محسوس ہوتی تھی لیکن شباب کی نمود میرے شرم کرنے سے رک نہیں سکتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اندرونی طاقت میرے بدن کے ہر عضو کو ابھار کر نمایاں کر رہی تھی میری شوخیوں اور الھڑپن میں اب خود بخود احتیاط دنیا کی جھلک پیدا ہو چلی تھی۔ میرے کان آپ ہی آپ بجتے تھے۔ گویا کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا کہ ۔ ۔

جذبۂ دل کے ابھرنے کا زمانہ آگیا

اب تک میری زندگی کی کتاب سادہ اوراق تھی۔ مجھے تمام جہان پھولوں کی طرح سادہ اور تتلیوں کی طرح معصوم نظر آتا تھا۔ بدگمانی رقابت۔ ہوسناکی۔ یہ الفاظ میں نے صرف کتابوں میں پڑھے تھے میں ان تصورات سے یکسر نا آشنا تھی میری زندگی مسرت اور بے فکری کی زندگی تھی کبھی کبھار کسی بات پر والدین خفا ہو جاتے تو مجھے البتہ دکھ ہوتا تھا۔ لیکن وہ اپنی خشمگیں نگاہ کی تلافی بیشمار محبت آمیز نگاہوں سے کرتے تھے۔ ماں باپ کی خفگی طوفان محبت کا پیش خیمہ ہوتی ہے کسی اہل دل شاعر نے شاید اپنے ماں یا باپ ہی کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

دل غمگین ہلالی بہ جفائے تو خوش است
اے جفاہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں

میں اب تک گلاب کے اس رنگین و سادہ پھول کی طرح تھی جسے تتلی کے معصوم ہونٹوں نے بھی نہ چھوا ہو۔

ہوسناکی کا پہلا تجربہ

میں شہر کے گرلز سکول میں تعلیم پاتی تھی اسکول ہمارے بنگلہ سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا۔ پھر بھی میرے والد کچہری جاتے ہوئے مجھے موٹر میں بٹھا کر لیجاتے۔ موٹر میں بیٹھنا کسے اچھا نہیں لگتا۔ لیکن مجھے یہ پابندی ناگوار تھی۔ مجھے ان لڑکیوں کی زندگی پر رشک آتا تھا جو اپنی کتابوں کو لئے ہوئے خراماں خراماں گلیوں میں چلتی ہوئی نظر آتی تھیں کلاس میں میری حالت قابل اطمینان تھی میں کسی امتحان میں کبھی ناکامیاب نہیں ہوئی۔ پھر بھی میرے والد نے ایک استاد میرے پڑھانے کے لئے مقرر کر دیا۔

میرے اس اتالیق (جسے میں پنڈت جی کہہ کر پکارا کرتی تھی) کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کی لانبی اور گچھے دار گھنی مونچھیں مجھے آج بھی یاد آتی ہیں تو میرے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔ پنڈت جی مجھے صبح سویرے پڑھانے کے لئے آتے تھے۔ ان کی شفقت نے مجھے بہت جلد ان سے مانوس کر دیا۔ وہ باتوں باتوں اور قصوں کہانیوں میں سبق پڑھا دیا کرتے تھے چھٹی کے دن وہ دو گھنٹے کے مقررہ وقت کی بجائے کئی کئی گھنٹے بیٹھے ہوئے پڑھاتے رہتے تین مہینہ تک وہ اسی انداز سے درس دیتے رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے میری بے پروائی اور کام نہ کرنے پر سخت سست تو ضرور کہا مگر کبھی بھول کر چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔

لیکن تین ماہ کے بعد ان کے طور طریق میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگا۔ اب وہ پڑھاتے ہوئے مجھے خوب گھور کر دیکھتے اور جب میں لکھتی ہوتی تو میری طرف مسلسل دیکھے جاتے میں نظارہ و نگاہ کی معنویت سے قطعاً ناواقف تھی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکی کہ مجھے کیوں دیکھا جا رہا ہے۔ میرے دل میں نہ تو اسوقت کوئی چور تھا اور نہ کسی گذشتہ تجربہ نے مجھے متنبہ کیا تھا۔ اس لئے یہ نظارہ بازی مجھے کسی بدگمانی یا غلط فہمی میں مبتلا نہ کر سکی۔ نظارہ و نگاہ کی اس تبدیلی کے ساتھ ایک نئی تبدیلی میں نے یہ محسوس کی کہ کتاب قلم پنسل یا کوئی چیز میں ان کے ہاتھ میں پکڑاتی یا وہ مجھے دیتے تو وہ میری انگلیوں

سے اپنی انگلیوں کو چھوانے کی کوشش کرتے۔ اب نگاہوں کے ساتھ ان کی انگلیاں بھی کام کرنے لگیں۔ پنڈت جی کی سنجیدگی بھی آہستہ آہستہ تفریح و مزاح میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بات میں بات نکال کر مجھے ہنسانے اور خوش کرنے کی کوشش کرتے

ایک دن تاریخ کا سبق ہو رہا تھا نورجہاں کا ذکر آیا اس پر پنڈت جی نے نورجہاں اور جہانگیر کی محبت کا افسانہ چھیڑ دیا وہ باتوں باتوں میں اس دن اتنے بڑھ گئے کہ کہنے لگے۔

محبت کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ ہر انسان کو محبت کرنی چاہئے۔ شانتا! تمہارا چہرہ نورجہاں سے بہت ملتا جلتا ہے! اور!

پنڈت جی ابھی کہہ ہی رہے تھے کہ میرے والد یکایک میرے کمرے میں آ گئے اور بولے شانتا! میں کچہری جا رہا ہوں راستہ میں کلکٹر صاحب سے ملتا ہوا وہاں جاؤں گا۔ تم اسکول رکشا یا تانگہ میں چلی جانا

والد یہ کہہ کر میرے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی طرف دیکھنے لگے۔ پنڈت جی نے اپنی بات کو گھبرائے ہوئے انداز میں ادھورا چھوڑ کر مجھ سے سوال کیا۔

"جہانگیر کس سنہ میں تخت پر بیٹھا اور اُن کے عہد حکومت کے خاص خاص واقعات تو بتاؤ ——— !

میرے جواب دینے سے پہلے ہی والد باہر چلے گئے میں جواب دیتے دیتے خاموش ہو گئی اور مجھے خیال آیا کہ پنڈت جی نے والد کے آتے ہی گفتگو کا موضوع کیوں بدل دیا۔

آپ نے والد کے آتے ہی اپنی پہلی بات کو چھوڑ کر دوسری بات شروع کیوں کر دی ——— میں نے پنڈت جی سے دریافت کیا۔

——— پہلی بات کونسی ——— !

پنڈت جی قدرے سٹ پٹا کر بولے۔

آپ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تمہارا چہرہ نورجہاں سے ملتا جلتا ہے ـ میں نے جواب دیا

پنڈت جی نے اس پر قہقہہ لگایا۔ بناوٹی قہقہہ جو عام طور پر موضوع گفتگو بدلنے اور بات ٹالنے کے لئے لگایا جاتا ہے اس کے بعد ذرا رک کر بولے:۔

اچھا اپنی انگریزی کی کتاب نکالو"

اس پر میں نے کہا۔

پنڈت جی! مجھے پہلے یہ بتا دیجئے کہ آپ نے میرے والد کو دیکھ کر پہلی بات ادھوری کیوں چھوڑ دی:۔

پنڈت جی کان میں پڑے ہوئے جنیو کو چھوتے ہوئے بولے:۔

"شانتا تم بڑی ضدی ہو گئی ہو یہ بال کی کھال نکالنا تم نے کس سے سیکھا ہے۔

میں نے جواب دیا۔

آپ نہیں بتائیں گے تو میں والد سے اس بات کو پوچھوں گی۔

اس پر پنڈت جی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر سوچ کر بولے۔

لڑکیوں کی خوبصورتی کی تعریف ان کے ماں باپ کے سامنے نہیں کی جاتی۔

میں نے فوراً ہی جواب دیا۔

ماں باپ کے سامنے ان کی لڑکیوں کی تعریف کرنے میں کیا ہرج ہے"۔

پنڈت جی نے کہا:۔

شانتا تم ابھی بچی ہو تم اس بات کے نیچ اونچ کو نہیں جانتیں۔ بڑے لوگ جس بات کے پوچھنے سے منع کریں اس کے بتانے کے لئے ضد کرنا ٹھیک نہیں۔

پنڈت جی کے کہنے سے میں خاموش تو ہو گئی مگر ان کی طرف سے کچھ تذبذب اور قدرے بدگمانی سی پیدا ہو گئی۔ پنڈت جی ایک مہینہ تک پھر سنجیدہ بنے رہے۔ یہاں تک کہ اس بات کو میں بھول گئی۔ اس سنجیدگی کے بعد ان پر پھر جذبات کا دورہ پڑا۔ اور اب کی دفعہ انہوں نے قدرے جرأت کے ساتھ اقدام کیا۔

میری میز پر سینما کا اشتہار رکھا ہوا تھا۔ غالباً ملازم نے اشتہار بانٹنے والے لڑکے سے لیکر وہاں رکھ دیا تھا۔ اشتہار میں ایک تصویر بنی ہوئی تھی جس میں ایک مرد ایک عورت کی طرف بڑھ رہا تھا اور مرد کے ہاتھ عورت کے بازوؤں تک پہنچ چکے تھے۔

شانتا تم نے اس اشتہار کو دیکھا"۔ پنڈت جی نے کہا۔

جی ہاں! دیکھا۔ کلکتہ کی کمپنی نے ایک نیا فلم تیار کیا ہے اسی فلم کا یہ اشتہار ہے میں نے جواب دیا۔

اس تصویر کو تو دیکھو۔ اشتہار کی جان تو یہ تصویر ہے۔ اشتہار کے الفاظ میں کیا رکھا ہے"۔ پنڈت جی نے مجھے ہوسناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تصویر میں تو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ اس سے لاکھ درجہ اچھی تصویریں تو میری جماعت کی لڑکیاں کھینچ لیتی ہیں" میں نے کہا۔

شانتا تم جوان ہو کر بھی بچوں جیسی باتیں کرتی ہو غور سے دیکھو! ایک مرد عورت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسی کا نام "پریم" ہے۔ محبت یعنی "Love" "آہ پریم کتنا پیارا لفظ ہے" ——— پنڈت جی نیچے کے ہونٹ کو دانتوں میں دباتے ہوئے بولے

ایک مرد کا دوسری عورت کی طرف بڑھنے کا نام پریم ہے تو یہ پریم ایک

طرح کی جمناسٹک ہے یعنی عورت ذرا جھکے ہوئے انداز میں کھڑی ہے اور مرد اس کی طرف اپنے جسم کو خاص انداز میں سنبھالے ہوئے بڑھے" میں نے سادگی کے ساتھ مسکرا کر جواب دیا۔

میری اس مسکراہٹ نے پنڈت جی کی تمناؤں میں جان ڈال دی اور ان کی جھجک میں جرات اور بے باکی کی برقی قوت پیدا کر دی۔ میں یوں ہی مسکرا دی تھی۔ وہ سمجھے کہ جوان لڑکی سمجھ کر اور متاثر ہو کر مسکرائی ہے۔ ساون کے اندھے کو جس طرح چاروں طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ اسی طرح ہوسناک نگاہوں کو بھی جذبات و ہوس کے سوا کوئی اور چیز دکھائی نہیں دیتی۔ جذبات ہوس سے مغلوب مرد کو درختوں کی ڈالیوں میں عورتوں کی لپکیلی ہوئی باہیں نظر آتی ہیں۔

شانتا پریم کی نگری میں امیر و غریب سب برابر ہیں اور وہاں عمر کے اعتبار سے کسی کے بڑے چھوٹے ہونے کی بھی قید نہیں۔ پریم صرف دو دلوں کو چاہتا ہے"

یہ کہتے ہوئے پنڈت جی بے قابو سے ہونے لگے۔ ان کی آنکھیں میرے سینہ پر گڑی ہوئی تھیں۔ جہاں سے ساڑی کا پلو ہٹ گیا تھا میں نے شرما کر ساڑی کا پلو سینہ پر ڈالنے کی کوشش کی اس پر پنڈت جی نے میری گردن سے ذرا نیچے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا ــــ شانتا شرم و حیا کو جانے دو سب کچھ سمجھ کر انجان بننے کی کوشش نہ کرو"

پنڈت جی کے اس ٹھوکے پر میں نے زور سے کہا: ۔

یہ آپ کیا کرتے ہیں . . . . !

میں یہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ملازم دوڑتا ہوا کمرے میں آیا اور بولا: ۔

بی بی جی! کیا بات ہے۔ آپ کس پر غصہ ہو رہی تھیں۔ سرکار اور بیگم صاحبہ ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں

میں نے نوکر سے کہا۔

تم جاؤ۔ سرکار کو کچہری سے آنے دو۔ اس وقت ــــ!

میں نے "اس وقت" کہہ کر آخری لفظ قصداً چبا کر کہے۔ پنڈت جی کے جسم میں لرزہ طاری تھا۔ وہ کتابیں بغل میں دبا کر چمپت ہو گئے میں نے والدین سے اس بات کا ذکر قصداً نہیں کیا۔ ایسی بات کا ذکر کرتے ہوئے میری زبان رکتی تھی۔ پنڈت جی اس دن سے پھر ہمارے یہاں نہیں آئے۔ والد نے خود ہی ایک دن مجھ سے کہا کہ پنڈت جی کے گھر سے ان کی بہن کی بیماری کا تار آیا اور وہ یکا یک چلے گئے۔ میں جی ہی جی میں مسکرائی کہ بہن کی بیماری کے ٹیلیگرام کا

پس منظر کیا ہے۔

پنڈت جی کی اس حرکت نے مجھے خلجان میں ڈال دیا۔ اب میں اپنی طرف دیکھنے والی نگاہوں کو بنظر غور اور رشک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگی اور مجھ میں یہ احساس پیدا ہوگیا کہ جوان لڑکیوں کو مرد شریر اور گستاخ نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ لیکن اس شرارت اور گستاخی کے محرکات سے میں ناواقف تھی۔ پنڈت جی میرے جذبات کے بعض پر ہلکی سی انگلی رکھ کر چلے گئے جس سے کوئی نغمہ تو پیدا نہیں ہوا۔ لیکن پردوں کی خفیف سنسناہٹ نے یہ بات ضرور ظاہر کردی کہ ان کی تہ میں نغموں کے طوفان چھپے ہوئے ہیں اور کسی خاص مقصد کے لئے قدرت آج کو جوان بناتی ہے۔

حُسن و ادا کا پہلا مظاہرہ

اس واقعہ کے دو مہینہ بعد ہمارے اسکول میں ایک جلسہ ہوا جس میں عورتوں اور مردوں کو ساتھ ہی ساتھ بلکہ دوش بدوش شریک کیا گیا۔ جلسہ کی ابتداء ایک نظم سے ہوئی جس کے پڑھنے کے لئے مجھے تیار کیا گیا تھا شعر و ادب سے مجھے پہلے ہی سے رغبت تھی۔ چار پانچ دفعہ کی مشق میں نظم بھی یاد ہوگئی اور دھن بھی آگئی۔ اگر خود ستائی کے الزام سے مجھے معاف کیا جائے تو عرض کرنے کی جرات کروں کہ میری آواز قدرتی طور پر دلکش اور شیریں تھی۔ میں نے موسیقی کی تعلیم باقاعدہ حاصل نہیں کی تھی۔ فلمی ریکارڈوں کے گانوں کو گنگنا کر میں نے اپنی سمجھ سے آواز کے زیر و بم میں ہم آہنگی اور ترتیب پیدا کرلی تھی۔ جلسہ کے دن کا مجھے بڑی شدت سے انتظار تھا اور میں ایک ایک دن گن رہی تھی۔ آواز اور خوبصورتی کے مظاہرے کا بہترین موقع تھا۔

آخر جلسہ کا دن آ ہی گیا۔ میں نے نہا دھو کر زعفرانی رنگ کی ساڑی پہنی جو اس اجتماع کے لئے میں نے خاص طور پر خریدی تھی۔ زعفرانی ساڑی۔ قرمزی بلاؤز۔ کانوں میں جگمگاتے ہوئے قیمتی آویزے۔ ماتھے پر سرخ قشقہ۔ میں نے آئینہ میں چہرہ دیکھ کر خود ہی اپنے حسن کی داد دی۔ اور بال سنوارتے ہوئے آئینہ کو خود ہی چوم لیا۔ آئینہ چومنے کو تو چوم لیا۔ لیکن اپنی اس حرکت پر مجھے ندامت سی ہوئی۔ مگر آئینہ کی شفاف سطح پر میرے ہونٹ اپنے مہین نشان ثبت کر چکے تھے۔ جلسہ شروع ہونے سے چند

منٹ قبل والدین کے ساتھ موٹر میں بیٹھکر جلسہ گاہ کے لئے روانہ ہوئی. میری ماں نے بھی انتہائی بھڑکیلا لباس پہنا تھا اور بناؤ سنگار نے ان کو کافی حد تک جاذب نظر بنا دیا تھا. جلسہ گاہ کے دروازے پر ہوائے اسکاؤٹس نے ہمارا استقبال کیا. پنڈال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا پنڈال کے وسط سے اسٹیج کو راستہ جاتا تھا. اسی راستے سے ہم گذرے میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ تمام مجمع کی نظر میرے ہی اوپر ہے کچھ نوجوان میری طرف انگلیوں سے اشارے کرتے ہوئے آپس میں بات چیت کر رہے تھے. میں نے راستہ سے قریب بیٹھے ہوئے نوجوانوں کی سسکیوں کی آوازیں سنیں جیسے کوئی تیز مرچ کھا کر "سی سی" کرتا ہے اور ساتھ ہی زبان چٹخارے لیتی جاتی ہے.

ہمیں اسٹیج کے قریب کی کرسیوں پر بٹھایا گیا. صدارت کی تحریک و تائید کے بعد جلسہ کے صدر تالیوں کی گونج میں کرسی پر بیٹھے اور اس کے بعد میں نے اسٹیج پر آکر نظم پڑھنی شروع کی اتنے بڑے مجمع میں نظم پڑھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا. اسٹیج پر پہنچ کر میرا سینہ نیچے اوپر ہونے لگا اور میں نے دو تین دفعہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیری. پہلا شعر میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پڑھا. لیکن مجمع سے تحسین کا ایک شور اٹھا. تالیوں کی گونج. واہ واہ کے نعرے. اس شعر کو ایک مرتبہ پھر پڑھئے" کے آوازے اور مطالبے! اس داد و تحسین نے میری ہمت بندھائی اور مجھ میں خود اعتمادی کی لہر دوڑ گئی میں نے باقی اشعار انتہائی اطمینان اور بے باکی کے ساتھ پڑھے نظم پڑھتے ہوئے میں نے مجمع پر نظر ڈالی تو محسوس کیا کہ میرا چہرہ ہزاروں نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہے. خوشی سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور کنوارپن کے احساس حیا نے میری پیشانی کو شرمناک بنا دیا میں نے نظم ختم کی اور اسٹیج سے کرسی پر بیٹھنے تک اہل جلسہ مسلسل تالیاں بجاتے رہے اسکے بعد جلسہ کے سیکرٹری نے مختصر سی تقریر کی اور پھر جناب صدر نے طویل لیکچر دیا. میں نے محسوس کیا کہ اہل جلسہ تقریروں میں مطلق دلچسپی نہیں لے رہے ہیں. سب کی نظریں میری نشست ہی کی طرف ہیں. جلسہ ختم ہونے کے بعد تمام مجمع اسٹیج کی طرف آ گیا. صدر جلسہ سے میرا تعارف کرایا گیا. وہ بہت دیر تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے میری تعریف کرتے رہے.

شائستا! تمہاری نظم جلسہ کی کامیابی کا باعث

ہوئی" صدر صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا اور میں نے ایک شرمائی ہوئی مسکراہٹ سے اسکا جواب دیا۔ دوسری لڑکیوں نے بھی میری تعریف کی۔ مگر ان کی تعریف اور مردوں کی داد میں نمایاں فرق تھا۔ جلسہ سے چلتے وقت دو تین نوجوانوں نے اپنی نوٹ بکیں میرے سامنے پیش کیں کہ ان پر اپنے دستخط کر دیجئے میں نے کاپیوں پر دستخط کئے اور والدین کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر گھر چلی آئی۔ داد و تحسین کا نشہ بڑا تیز ہوتا ہے اور کسی اہل دل شاعر نے تجربہ کے بعد ہی کہا ہے کہ :-

آدمی فربہ شود از راہ گوش

تو مجھ پر بھی جلسہ کی روداد کا بڑا اثر تھا باوجود کوشش ضبط کے میرا چہرہ خوشی سے تمتمایا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں آکر ایک مرتبہ پھر آئینہ کو دیکھا۔ جلسہ جانے سے پہلے اور اب آنے کے بعد کی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا میں ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے اہل جلسہ کی تیز اور قدر شناس نگاہوں نے میرے رخساروں پر مہین اور نازک لکیریں سی بنا دی ہیں۔ کانوں میں تحسین و داد کا شور گونج رہا تھا۔ مجھے اس رات بہت دیر میں نیند آئی اور نیند آنے کے بعد بھی میں جلسہ کا خواب دیکھتی رہی۔

جذبات کی موج اولیں

شہر کی میونسپلٹی کے چیئرمین بہت دولتمند آدمی تھے ان سے اور میرے والد سے بڑی بے تکلفی تھی۔ ان کا لڑکا پربھو دیال کلکتہ کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے پربھو دیال اپنے گھر چلا آیا اور ہمارے یہاں وہ آنے جانے لگا۔ پربھو دیال کی عمر بیس اکیس سال کی ہو گی۔ لانبا قد گداز جسم کتابی چہرہ۔ شربتی آنکھیں۔ کھلتا ہوا رنگ اور چہرے پر چیچک کے دھندلے سے نشان پربھو بہت ہی ہنسوڑ۔ خوش مزاج اور باتونی تھا۔ ذرا سی بات کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتا۔ اس کی باتیں بڑی چٹخارے دار ہوتی تھیں۔

پربھو اور میں دونوں گھنٹوں پیانو بجاتے ننگر بلیرڈ کھیلتے۔ انگریزی ناولوں اور ہندوستانی فلموں پر تبصرہ ہوتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف ہوتے جا رہے تھے۔ میرے والدین نے میری اس بے تکلفی پر ذرا بھی روک ٹوک نہیں کی پربھو کو فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا۔ اسنے میری بہت سی تصویریں کھینچیں۔ اسکے کمرے میں جا بجا میری تصویریں آویزاں تھیں۔ ہم دونوں ایک دن کمپنی باغ میں ٹہل رہے تھے۔

شانتا! میں تمہاری تصویر فوارے کے قریب لینا چاہتا ہوں۔ پربھو نے کہا۔

تمہیں تو تصویریں کھینچنے کا سودا ہو گیا ہے میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

سودا نہیں بلکہ پاگل پن۔ چلو فوارے کے قریب چلیں وہاں تمہارا (Pose) بہترین آئیگا" پربھو کیمرے کو چھوتے ہوئے بولا

ہم دونوں فوارے کے قریب آئے کمپنی باغ کا یہ بہترین منظر تھا۔ گول دائرے میں سرو کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ اور گلاب کے پودوں کی کیاریوں میں ہری اور نرم دوب لہلہا رہی تھی۔ فوارے کے شمال اور جنوب کی جانب مولسری کے درخت تھے جن کی شاخیں جمپا کے پودوں پر جھکی ہوئی تھیں مرمریں حوض، شفاف پانی اور عین وسط میں موتی برساتا ہوا فوارہ!

پربھو! یہ منظر کتنا حسین ہے۔ بڑے خوش مذاق ہیں اس باغ کے نگران کار" میں نے کہا۔

منظر واقعی حسین ہے۔ لیکن تمہاری موجودگی نے اس منظر میں چار چاند لگا دیئے پربھو نے جواب دیا۔

پربھو! تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ اگر تم نے ایسی باتیں کیں تو میں یہاں سے چلی جاؤنگی میں شرما کر بولی۔

شانتا! میں بھلا تمہارا مذاق اڑا سکتا ہوں تم واقعی حسین ہو۔ میری نگاہیں بہت دیر سے گلاب کے پھولوں کا تمہارے رخساروں سے تقابل کر رہی ہیں۔ سچ جانو نگاہوں کا فیصلہ تمہارے رخساروں کے ہی حق میں ہے، یہ منظر واقعی حسین ہے۔ مگر حوض کی بے جان مرمریں سلوں اور گھانس پات میں کیا رکھا ہے اس حسن میں کوئی زندگی نہیں۔ یہ خوبصورتی احساس سے خالی ہے... اور تم!.. کاش تم میری آنکھوں سے اپنے کو دیکھ سکتیں...

پربھو بہت دیر تک میری خوبصورتی کی تعریف کرتا رہا۔ مجھے اس کی باتوں سے جھینپ سی بھی محسوس ہو رہی تھی اور ساتھ ہی کانوں میں رس بھی پڑ رہا تھا۔

پربھو کے کہنے سے میں حوض کی سیڑھی پر سرو کی شاخ تھام کر کھڑی ہوئی۔ پربھو نے ذرا دور جا کر کیمرے کے شیشہ سے میرا چہرہ دیکھا اور بولا "اس ڈالی کو چھوڑ دو۔ اوپر کی ڈالی کو پکڑ لو اور ہاں ـــ ذرا تن کر کھڑی رہو ـــ ساری کا پلو بھی سنبھالو۔ ہونٹوں پر قدرے مسکراہٹ پیدا کرو......

میں پربھو کی ان ہدایات پر بے اختیار مسکرا دی اور ڈالی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ پربھو میرے قریب آیا۔ اس نے میری ٹھوڑی اور رخسار کو چھو کر کہا کہ چہرے کو اس انداز میں رکھو میں اس کے کہنے پر گردن کو ذرا خم کر کے

کھڑی ہو گئی۔ پربھو نے اپنے گرم ہاتھوں کے لمس کا پھر اعادہ کیا میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور میرے بدن میں بھی ہلکی سی جھرجھری پیدا ہو رہی ہے۔ پربھو کے ہاتھ سے کیمرہ چھوٹ گیا اور سنگ مرمر کے فرش پر گر پڑا اور پلیٹ چھن سے ٹوٹ گئی۔

"یہ کیا ہوا پربھو!" میں نے مسکرا کر کہا "کچھ نہیں۔ پلیٹ ٹوٹ گئی"، پربھو نے جواب دیتے ہوئے کیمرہ کو فرش سے اٹھایا میں اور پربھو باغ میں گھومتے ہوئے مکان چلے آئے۔ دونوں طرف خاموشی سی طاری رہی جیسے ہم دونوں کے درمیان آج کوئی نئی بات ہوئی تھی میرے مکان سے رخصت ہوتے وقت پربھو نے مجھے خوب غور سے دیکھا اور دن کی اور آج کی نگاہوں میں بہت فرق تھا۔ پربھو کی نگاہیں آج کچھ کہہ رہی تھیں کوئی ایسی بات جسکا آج کے واقعہ سے گہرا تعلق تھا — !

اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے لئے دوسری اشاعت کا انتظار فرمائیے۔ یہ نقش اوّل ہے۔ دوسرے واقعات بہت زیادہ دلچسپ ہوں گے میں آپ کو ایک فرصت میں بہت کچھ سنا چکی ہوں۔ سمجھنے والے کیلئے ایک ذرا سی بات ہی بہت ہوتی ہے

نظریں بلند ہوں تو زمیں بھی ہے آسمان
سمع قبول ہو تو خموشی پیام ہے

میری زندگی کا سب سے عجیب واقعہ

از جناب نور الہدیٰ ضبط مظفرپور

کرسمس کی چھٹیاں تھیں۔ بیکاری میں نئے نئے پرچے بہت جلد مطالعہ سے گذر گئے پھر تو مجبوراً پرانے پرچوں کی ورق گردانی کرنی پڑی ان کے مضامین قند مکرر کا مزا دینے لگے۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کے "مست قلندر" میں صفحہ ۷ پر "ایڈیٹر کی ڈائری" کی سرخی کے نیچے جو مضمون میری نظر سے گذرا وہی ان چند سطور کے قلمبند کرنے کا باعث ہوا۔ ان نئے خریداروں کیلئے جن کے پاس پرچہ مذکور نہ ہو اور پرانے خریداروں کو گذشتہ فائیلوں کے الٹ پلٹ کی زحمت سے بچانے کیلئے میں اس کی نقل پیش کرتا ہوں۔

"میری زندگی کا سب سے عجیب واقعہ" اس سلسلے میں بعض حیرت انگیز اور دلچسپ واقعات مست قلندر کے کالموں میں شائع ہو رہے ہیں۔ مگر میں اس سے بھی ایک قدم آگے جانا چاہتا ہوں۔ اتنا تو ہر ایک مشاہدہ کنندہ نے لکھا ہے کہ "فلاں موقع پر فلاں صاحب سے ملاقات ہوئی اور میں نے فلاں فوق الفطرت بات ان میں دیکھی مگر اس کے بعد عامل صاحب روپوش ہو گئے اور آج تک ان کے دیکھنے کو ترس رہا ہوں" لیکن یہ کسی نے نہ لکھا کہ "جو کچھ میں نے فلاں مرد کامل کے پاس دیکھا وہ آپ بھی دیکھ سکتے ہیں کیونکہ عامل صاحب فلاں جگہ موجود ہیں" آئندہ مست قلندر کے کالموں میں مجھے اس قسم کے واقعات کی ضرورت ہے جو تجربہ اور مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد سولہ آنے صحیح اتریں اور انعام وہی دس روپیہ فی واقعہ مقرر کیا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر آپ کو کسی عامل کامل کا پتہ معلوم ہے اور آپ ان کے فیضان صحبت سے مستفید ہو چکے ہیں تو بخل کو کام میں نہ لائیے بلکہ اپنی سب سے پہلی فرصت میں لکھ ڈالئے من و عن سارا واقعہ۔ ہزاروں بندگان خدا کا بھلا ہوگا"

اس اعلان کے مطالعہ کے بعد جو واقعہ میں بیان کرنے والا ہوں وہ گذشتہ مہینہ میں میرے علم میں آیا اور کرسمس کی چھٹی ہی پہلی فرصت ہے جس میں میں اس کو قلمبند کر سکتا تھا۔ حسن اتفاق سے ستمبر ۱۹۳۸ء کا پرچہ جس کا حوالہ میں نے اوپر دیا ہے نظر سے گذرا اور انعام طلب کرنے کی نیت سے نہیں بلکہ جناب ایڈیٹر صاحب کو ان کے طلب کردہ مضمون کی یاد دلانے کی غرض سے میں نے یہ تمہیدی جملے لکھے ہیں۔ یہ واقعہ گو کہ سماعی ہے مگر اس کی صداقت کا مجھ کو کامل یقین ہے۔ اگر میں چاہتا تو اس واقعہ کو سماعی نہیں بلکہ عینی تحریر کرتا مگر وہ حقیقت نہ ہوتی اور یہ واقعہ اگرچہ میری زندگی میں نہیں گذرا مگر جس کی زندگی میں گذرا ہے وہ موجود ہیں اور ایڈیٹر صاحب کے پاس جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنے ان کا پورا پتہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔ اب سنئے:—

نومبر ۱۹۲۱ء کا مہینہ تھا۔ صبح کو کافی سردی پڑتی تھی۔ ضلع مظفرپور کے رہنے والے جانتے ہیں کہ سیتا مڑھی جو اس ضلع کا سب ڈویژنل مقام ہے بذریعہ ریل گاڑی جانا اور اسی روز پھر صدر مقام کو واپس چلا آنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ چونکہ ریل گاڑی کے اوقات میں ٹائم ٹیبل بنانے والے نے اس امر پر غالباً کبھی غور نہیں کیا تھا کہ ایسی ضرورت بھی کسی کو لاحق ہو سکتی ہے۔ اور ضرورت ہوتی بھی ہے تو خاص کر صدر مقام مظفرپور کے رہنے والوں کو جو جانتے ہیں کہ ریلوے کا احسان اٹھائے بغیر بھی بذریعہ بس سروس کے انسان دن ہی دن میں سیتا مڑھی جا سکتا ہے اور وہاں پانچ چھ گھنٹے کے قیام کے بعد اسی روز واپس ہو سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سیتا مڑھی سے مظفرپور کل تیرہ چودہ گھنٹے کی غیر حاضری میں جس میں پانچ چھ گھنٹے ضروریات کے رفع کرنے کے بھی شامل ہیں۔ آپ بذریعہ لاری کے کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ پہلی لاری صبح سات بجے روانہ ہوتی ہے اور دوسری ایک یا دو گھنٹے کے بعد۔ بذریعہ ریل گاڑی کے یہی سفر سقر کا نمونہ ہے جس میں وقت کافی صرف ہوتا ہے۔ سردی کافی تھی اور میں ریلوے اور بس سروس کے سفر کا ذہنی تصور کرتا ہوا چائے پی رہا تھا۔ چائے کے آخری گھونٹ کے ساتھ لاری کا ہارن سنائی دیا اور اردلی نے پکار کر کہا۔

لاری آگئی۔ میں نے پیالی میز پر رکھدی اور مفلر درست کرتے ہوئے کمرہ سے باہر نکل آیا۔ لاری میں ڈرائیور کے بغل میں جگہ خالی تھی اور پوری لاری مسافروں سے بھری تھی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور لاری روانہ ہوئی۔ قریب نو بجے کے لاری ڈمرا میں جہاں آج کل سب ڈویژنل کچہری شہر سے قریب تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے پہونچگئی ڈرائیور نے وعدہ کیا کہ قریب چار بجے وہ واپس ہوگا اور میرے لئے میری جگہ خالی لائیگا۔ کچہری کا وقت ساڑھے دس بجے سے تھا مگر دوسری جگہ جانا ہی نہ تھا اسلئے میں نے کچہری کا ہی رُخ کیا حسن اتفاق سے آفس کھلا ہوا تھا۔ کچھ ملاقاتی نظر آئے اور قبل اس کے کہ میں نے تیسرا سگریٹ ختم کیا کچہری اپنے پورے شباب پر تھی۔ سیتا مڈھی میں عرصہ دو سال سے کچھ زیادہ پر آیا تھا اور ہر ملاقاتی اور حبیب سے بار بار اپنی اس غیر حاضری کا سبب بیان کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ کورٹ آفس میں جہاں میں بیٹھا ہوا تھا کئی وکیل اور مختار اپنی ضرورتوں کو لے کر آتے اور مجھ کو بیٹھا ہوا دیکھ کر صاحب سلامت کرتے۔ پولیس کے دو داروغہ جو کسی مقدمہ کے سلسلے میں آئے تھے اور چند اشخاص جن سے بے تکلفی تھی بیٹھے ہوئے گپ میں وقت گذار رہے تھے۔ پولیس افسروں میں ایک صاحب تو خاص سیتا مڈھی کے تھانیدار تھے۔ اور دوسرے جس تھانہ کے تھے اس کا نام مجھ کو یاد نہیں رہا موضوع گفتگو جب جنات پر پہنچی تو حسب ذیل واقعات سننے میں آئے۔ ہر واقعہ کے راوی نے اس کے صحیح ہونے کا یقین دلایا۔ اصل واقعہ کے سلسلہ میں ان کو بھی تحریر کرتا ہوں۔

مثلاً سیتا مڈھی کے تھانیدار نے ایک عورت کا ذکر کیا جو کہا کرتی تھی کہ ایک جن اس پر عاشق ہے اور جب وہ اپنے ہوش و حواس میں ہوتی تو بہت روتی اور اپنی زندگی پر بہت نفریں کرتی اور جب جن اس پر سوار ہو جاتا تو سبز لونگ کی بارش یا دیگر میوہ جات یا مٹھائیاں منگوا دینا اس کا ادنی کام تھا۔

ایک داروغہ جی نے ایک شخص بلاقی نام جو شاید چھپرا کا باشندہ تھا اور جس کو انہوں نے بچپن میں دیکھا تھا ذکر کیا۔ وہ ہر موسم میں کپڑوں سے لدا پھندا ہوا رہتا تھا۔ اور لڑکوں کے ضد کرنے پر قیمت لے کر ہر قسم کی مٹھائیاں یا میوے منگوا دیا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا کہ بلاقی نے ایک روپیہ کسی سے لیا اور انگوٹھے پر رکھ کر اس کو بجانے لگا۔ روپیہ لینے سے قبل اس نے سن ضرب دکھلا دیا تھا اور ہر مرتبہ بجانے پر اس کا سن تبدیل ہو جاتا رہا تھا اور کبھی کبھی بادشاہت اور ملک بھی مثلاً ملکہ وکٹوریا کے ہندوستانی روپیہ سے وہ انگلستان کے کسی بادشاہ کا کوئی سکہ ہو جاتا۔ داروغہ جی کا بیان تھا کہ انہوں نے بکرماجیت کے عہد کا سکہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور وہی روپیہ بجنسہ اس سکہ کی شکل میں تبدیل ہو گیا جس کی تصویر انہوں نے ایام طالب علمی میں اپنی کسی تواریخ کی کتاب میں دیکھی تھی۔

ایک وکیل صاحب نے بیان کیا کہ ایک سادھو قیمت لے کر سبیٹ میں رکھ دیا کرتا تھا اور اپنے کپڑے سے ڈھک دینے کے بعد پوچھتا کہ اس قیمت کی کون چیز خریدی جائیگی اور جس چیز کا نام لیا جاتا تھا کپڑا اٹھانے پر وہی چیز اسی قیمت کی موجود رہتی تھی۔

ایک مختار صاحب نے جنہوں نے اپنا نام شائع کرنے کی ممانعت کی ہے حسب ذیل واقعہ بیان کیا جو انہی کی زبانی درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

میرے منی بیگ سے بیس روپے گم ہوگئے کس دن گم ہوئے اور کس نے لئے مجھ کو مطلق علم نہ تھا۔ بیس روپیہ کی رقم کسی دوسرے کے نزدیک کوئی ہستی نہ رکھتی ہو مگر میرے لئے وہ ایک معقول رقم تھی۔ اور میں اپنے اوپر ہزاروں نفریں کرتا کہ کیوں میں نے منی بیگ میں روپے گن کر نہیں رکھے تھے۔ منی بیگ میرا بالکل خالی نہ تھا مگر روپیہ گننے پر اور آمدن و خرچ کا حساب کرنے پر مجھ کو محسوس ہوتا تھا کہ میرے منی بیگ سے کسی نے بیس روپیہ نکال لئے ہیں۔ میں نے اپنے دماغ پر زور دینا شروع کیا۔ ہفتہ عشرہ کے اندر کل واقعات کو ذہن میں الٹ پلٹ کرنے پر میں جس نتیجہ پر پہنچا وہ واقعی مضحکہ خیز تھا یعنی میرا شک ایک ایسے شخص پر ہوتا تھا جسکو میری دانست میں کم از کم ایک سو ماہوار کی آمدن تھی۔ اور وہ شخص مجھ سے ہر صورت آسودہ حال تھا۔ تھانہ میں اطلاع دینا اپنا مضحکہ اڑانا تھا چونکہ روپیہ گم ہونے کی صحیح تاریخ میں بیان نہیں کر سکتا تھا اور نہ یہ کہہ سکتا تھا کہ میرے منی بیگ میں اس قدر روپے تھے جس میں سے کسی نے بیس روپے نکال لئے۔ میں اپنی دھن کا پکا ہوں اور اگر کسی کام کا ارادہ کرلوں تو خواہ کچھ ہو جائے اس کو پورا کر کے رہتا ہوں۔ میرے دماغ میں بس ایک دھن تھی۔ کہ روپیہ چوری ہوا یا صرف خیال ہی خیال ہے اور اگر چوری ہوا تو چور کون ہے۔ جوینده یابنده مجھ کو معلوم ہوا کہ

(بقیہ بر صفحہ ۱۱۹)

مظفر پور میں ایک جوتشی ہیں جن کو جوتش میں کافی دخل ہے۔ میں ان کے پاس پہنچا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا روپیہ واقعی چوری ہو گیا ہے اور گذشتہ پندرہ دن میں ایک گورے رنگ کے آدمی نے ایک سانولے رنگ کے آدمی کو دیا ہے۔ دونوں کی عمر تیس سے زیادہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ اور کچھ آپ کو نہیں بتا سکتا۔ جوتشی جی نے مجھ سے کافی سوال پوچھ پاچھ کر یہ کہا تھا اور اس قسم کے عام جوابات ہر شخص جو علم قیافہ وغیرہ کا ماہر ہو دے سکتا ہے۔ الغرض جوتشی جی سے میری تشفی نہیں ہوئی بلکہ آتش شوق اور تیز ہو گئی۔ یہ امر گویا یقینی تھا کہ روپیہ چوری ہو گیا اور محض خیال ہی خیال یا حساب کا الٹ پلٹ نہیں ہے۔ مظفر پور ہی میں مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ ایک شخص ایک دیہات میں ہے جس کو گمشدہ چیز کے بتانے میں کمال حاصل ہے۔ مظفر پور سے اس سمت کی لاری روانہ ہو چکی تھی۔ میں نے ایک رکشا کرایہ کیا اور پتہ پوچھتا ہوا مظفر پور سے قریب بارہ میل چلا گیا۔ تب مجھ کو معلوم ہوا کہ اس صفت کا انسان فلاں موضع میں ہے۔ چنانچہ جب میں اس کے مکان پر پہنچا تو ایک مجمع اس شخص کے دروازے پر پایا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ کل اشخاص اہل غرض تھے جو میری طرح کسی حاجت کو لیکر وہاں پہونچے تھے۔ مالک مکان جس کا پتہ وہاں کے باشندوں نے بتلا دیا۔ پہلے غریب تھا مگر اپنی ان محیر العقول باتوں سے کافی امیر ہو گیا ہے۔ گھر پر موجود نہیں تھا۔ دن کے بارہ بجے کا وقت تھا اور مجھ کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ انتظار کی گھڑیاں کٹھن معلوم ہوئیں اور میں نے وہیں کا ایک آدمی ایک نیچے ستون پر جو آنگن میں نصب تھا چڑھایا اور اس نے چاروں طرف دیکھ کر بیان کیا کہ مطلوبہ شخص قریب کے ایک کھیت میں کام میں مشغول ہے۔ میں نے اس کے مکان پر زیادہ انتظار فضول سمجھا اور اسی سمت کو روانہ ہوا۔ دور سے میں نے ایک شخص کو کھیت میں ڈھیلا اور کھرپی سے کھیلتے ہوئے دیکھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ شخص ہے جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ یکایک کھیت سے اٹھ کر بھاگا۔ اس کو اس طرح سے بھاگتے ہوئے دیکھ کر میں بھی بلا کچھ سوچے سمجھے اس کے پیچھے بھاگا۔ تقریباً ایک میل کی بھاگ دوڑ کے بعد میں نے اس شخص کو جا پکڑا اور پوچھا کہ تم مجھ کو دیکھ کر کیوں بھاگے۔ اس شخص نے معاً جواب دیا کہ آپ کے ایسا آدمی تو ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ کہاں سیتا مڑھی اور کہاں مظفر پور اور پھر وہاں سے یہاں وہ بھی پانچسو یا ہزار روپیہ کی رقم ہوتی تو خیر صرف بیس روپیہ کیلئے اور اس پر یہ بھاگ دوڑ۔ میں یہ باتیں سن کر سخت متعجب ہوا اور ان سے کہا کہ آپ تو سب کچھ جانتے ہی ہیں میری مطلب براری کیجئے۔ وہ کہنے لگا کہ بیس روپیہ میں آپ خود کیا لینگے اور مجھ کو کیا دینگے۔ یہ کہکر وہ گوبر کے ڈھیر سے کھیلنے لگا۔ اس شخص کا سارا جسم کثیف تھا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں غسل کئے ہوئے ہو گئے ہے۔ دانت زرد زرد تھے جنکو سواک سے کبھی ملاقات نہ تھی۔ سر اور ڈاڑھی کے بال اور ناخن اتنے دراز کہ برسوں حجام سے ملاقات نہیں کی گئی۔ میری متواتر عاجزانہ درخواست پر بالآخر اس کو رحم آ ہی گیا اور گوبر مٹی سے کھیلنا بند کر کے وہ میرے ساتھ مکان پر آیا۔ یہاں غرض مندوں کی ایک فوج جمع تھی۔ اس نے ہر شخص کے سوالات کو سنا اور شافی جواب دیا۔ ایک شخص نے جو سادھو کا ایسا لباس پہنے ہوئے تھا ظاہر کیا کہ وہ پکڑی مٹھ سے یہاں آیا ہے۔ پکڑی سیتا مڑھی سب ڈویژن کا ایک مشہور و معروف مٹھ ہے۔ میں نے بغور اس کے سوال کو سنا۔ معلوم ہوا کہ پانچسو روپیہ کی ایک خطیر رقم پکڑی مٹھ سے غائب ہے۔ اور مہنت پکڑی نے پولیس میں اطلاع دیتے ہوئے اس سادھو کو گمشدہ رقم کا پتہ لگانے کیلئے وہاں بھیجا ہے۔ اتنا سنتے ہی معاً اس عامل کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اس سادھو کو ڈانٹ کر کہا کہ اپنی خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ مٹھ میں روپیہ رکھدو۔ چوری اور سینہ زوری۔ ہم سے پوچھنے چلے ہیں کہ روپیہ کیا ہوا۔ اتنا سنتے ہی حاضرین انگشت بدنداں ہو گئے اور وہ سادھو گھبرا گیا۔ پھر اس نے ہوش و حواس درست کر کے کہا کہ اس نے روپیہ خود تو نہیں لیا مگر اس کی مانند بہت سے سادھو مٹھ میں رہتے ہیں ممکن ہے ان میں سے کسی نے لیا ہو اور یہ خبر وہ مہنت جی کے گوش گذار کر دیگا۔ عامل صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا اور سادھو غالباً شوقیہ میرا احوال سننے کیلئے ایک جانب ہو بیٹھا۔ اب عامل صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر بولے کہ میں نے اندراس کی ایک پری کو سدھ کر لیا ہے اور وہی میرے ہر سوال کا جواب دیتی ہے۔ میں نے اپنے کو دنیا والوں کے بکھیڑوں سے الگ رکھنا چاہا تھا مگر بمصداق میں نے تو کملی کو چھوڑ دیا مگر کملی مجھ کو نہیں چھوڑتی۔ دنیا والوں سے چھٹکارا نہیں۔ میں نے عقیدتمندانہ لہجہ میں کہا۔ آپ کے صفات تو ایسے ہیں جن کو بذریعہ اخبار ہندوستان کے طول و عرض میں آشکارا کر دیا جائے۔ عامل صاحب نے گھبرا کر کہا بغیر اخبار میں شائع ہوئے تو یہ حال ہے کہ آپ سیتا مڑھی سے پتہ سنتے اور پوچھتے چلے آئے اور اگر کہیں خدانخواستہ یہ بات اخبار میں شائع ہوئی تو

میرا سانس لینا بھی لوگ دوبھر کر دیتے پھر عامل صاحب نے مجھ سے وعدہ کرایا کہ میں اس کو اخبار میں شائع نہیں کراؤنگا اور چنانچہ اب تک میں اپنے وعدہ پر قائم ہوں۔ بہرکیف بعد وعدہ کے عامل صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس سادہ کاغذ ہے میری جیب میں سادہ کاغذ کا ایک ورق موجود تھا میں نے نکالا۔ اور عامل صاحب کے حسب ہدایت اپنی انگلیوں سے چار انگل مربع کاغذ پھاڑ کر سولہ مرتبہ تہ کیا عامل صاحب نے دوب گھاس کا ایک چھوٹا لانبا ٹکڑا اور ایک کنکری اٹھا کر مجھ کو دی اور کہا کہ میں اسکو تہ شدہ کاغذ کے ساتھ اپنی دہنی ہتھیلی میں بند کر لوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ بعد ازاں عامل صاحب نے اپنا حقہ طلب کیا جو کہ معمولی ناریل کی قسم کا تھا اور ان کے متعلقین میں سے کسی نے حقہ بھر دیا تھا۔ حقہ لیکر عامل صاحب نے پینا شروع کیا اور اپنے گاؤں والوں سے مختلف گرہستی کے امور پر گفتگو شروع کر دی۔ میں اپنی دہنی ہتھیلی میں کاغذ۔ دوب اور کنکری دبائے بیٹھا تھا جب عامل صاحب پھر میری جانب مخاطب ہوئے تو میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے ان سے کہا کہ میں کاغذ لئے بیٹھا ہوں میرے لئے کیا حکم ہے۔ عامل صاحب نے فرمایا کہ آپ ہی کا کام ہو رہا ہے میں نے اندرا سن میں خبر بھیجدی ہے اور میری سدھ کی ہوئی پری کوئی دم میں آیا چاہتی ہے وہی آپ کے سوال کا جواب اس کاغذ پر لکھدیگی۔ اتنا کہکر وہ پھر حقہ پینے میں اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ میں ہتھیلی میں کاغذ دبائے بیٹھا تھا کہ مجھ کو اس کے اندر قلم کے کاغذ پر چلنے کی سی آہٹ محسوس ہوئی مگر میں بدستور مٹھی بند کئے ہی رہا۔ عامل صاحب کا حقہ جو غالباً سلفہ تھا ختم ہوا اور حقہ ایک جانب رکھتے ہوئے انہوں نے کاغذ کھولنے کی ہدایت کی میں نے اپنی مٹھی کھولی ہتھیلی میں کنکری اور دوب بدستور سابق تھے۔ اور تہ شدہ کاغذ جو میں نے اپنی جیب سے سادہ نکالا تھا۔ اس پر کائیتھی ہندی میں زنانے خط سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ عامل صاحب نے کہا میں تو پڑھا لکھا ہوں نہیں آپ ہی پری کے جواب کو پڑھیں ٹھیٹھ ترہتی نسوانی لہجہ و زبان میں جو تحریر میں نے پڑھی اس سے میرے شبہ کی لفظ بہ لفظ تصدیق ہوتی تھی۔ عامل صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں چور کا نام کسی دوسری جگہ ظاہر نہ کرونگا۔ میں نے وعدہ کرتے ہوئے یہ یاد دلایا کہ میرے علاوہ اور لوگ جو وہاں موجود تھے۔ اور جنہوں نے مجھ کو طلسمی تحریر پڑھتے ہوئے سنا ہے وہ لوگ چور کا نام ظاہر کر سکتے ہیں انہوں نے فرمایا جو شخص بھی اس چور کا نام دوسری جگہ ظاہر کریگا۔ اپنے آل و اولاد کو مصیبت میں مبتلا پائے گا۔ پھر اُنہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ فوراً واپس جائیے اور اس چور سے اپنا روپیہ مانگئے۔ مجھ کو یقین کامل ہے کہ وہ آپ کا روپیہ واپس کر دیگا۔ اور اگر واپس نہ کرے تو آپ مجھ کو خبر دیجئے گا۔ میں آکر اور پولیس میں اس کا بھانڈا پھوڑ کر آپ کا روپیہ دلوا دونگا اتنا کہکر وہ پھر کہنے لگے کہ روپیہ کی رقم زیادہ نہیں ہے مگر خیر میرا حق الخدمت تو دلوایئے میں نے سنا تھا کہ عامل صاحب کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے ہیں مگر مجھ سے وہ حق الخدمت طلب کر رہے تھے۔ میں نے اپنی جیب کی تلاشی لی تو واپسی کا کرایہ اور خرچ کے علاوہ دو روپے فاضل تھے۔ وہ میں نے عامل صاحب کی نذر کر دئے۔ گاؤں والوں سے مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ عامل صاحب گمشدہ مال کا اور کسی زمین کے سعد و نحس کا پتہ بتانے میں کمال رکھتے ہیں اور عمل کی ترکیب ان کے حقہ میں ہے جس کو وہ پیتے جاتے ہیں۔ اور غیب سے سائل کا جواب کاغذ پر لکھا جاتا ہے۔ ایک امیر نے گاؤں میں گھر بنواتے وقت ایک جوتشی سے سوال کیا کہ اس زمین پر گھر بنوانا سعد ہے یا نحس جوتشی نے اپنے علم کے مطابق جواب دیا کہ نحس ہے اور جب عامل صاحب سے سوال ہوا تو جس طرح سے میرے سوال کا جواب لکھا گیا اسی طرح سے لکھا ہوا جواب ملا کہ جس جگہ جوتشی جی کھڑے ہیں اس سے ایک ہاتھ اندر بیل کا سر گڑا ہے اسکو نکلوا دینے کے بعد زمین سعد ہو جائیگی۔ چنانچہ ایک ہاتھ ناپ کر جب زمین کھود دی گئی تو واقعی ایک بیل کے سر کی ہڈی دفن ملی اسکو دور کر دینے کے بعد جوتشی نے پھر اپنے قاعدے سے جانچ کی تو واقعی اب وہی زمین جوتش کی رو سے بھی سعد تھی۔ الغرض میں کشاسر مظفر پور اور اسی روز رات کو سیتا مڑھی لاری سے پہنچ گیا۔ رات کے دس بجے تھے میں اسی وقت اس چور کے گھر پہنچا وہ مجھ کو اپنے گھر سے باہر برآمدہ میں سویا ہوا مل گیا۔ میں نے اس کو اٹھایا اور وہی غیبی تحریر جو اس کا نام ظاہر کرتی تھی دکھلائی۔ چوری کا حال من و عن لکھا ہوا دیکھکر وہ کچھ گھبرا سا گیا اور بولا کہ اچھا ہم نے روپیہ تو نہیں لیا مگر خدا کیلئے آپ اس تحریر کو کسی کو دکھلائیے گا ورنہ میری سخت بدنامی ہوگی میں میں آپ کا روپیہ کل صبح کو ادا کر دونگا۔ دوسرے روز حسب وعدہ میں اپنا روپیہ لینے پہنچا۔ اور دس روپے اپنے اخراجات کے جو میرے مظفر پور وغیرہ جانے میں صرف ہوئے تھے طلب کئے۔ اس شخص نے تیس روپے دیتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ اس نے میرا روپیہ نہیں لیا مگر صرف بدنامی کے ڈر سے دوسرے شخص سے قرض لیکر وہ روپیہ ادا کر رہا ہے بلکہ روپیہ لینے سے قبل ضروری سمجھا کہ اس دوسرے شخص سے اسکی تصدیق کر لوں۔ اس دوسرے شخص نے قرضہ دینے سے بالکل انکار ظاہر کیا اور بولا کہ وہ تو خود کنگال ہیں میں انکو کیوں قرض دینے جاؤنگا۔ اسکے

اعلان نظر سے گذرا۔ معاً خیال گذرا کہ وہ پتہ فائل میں ہے یا کہیں کھو گیا۔ تلاش کرنے پر پتہ مل گیا۔ اور اشاعت کے ہمراہ ایڈیٹر مست قلندر کے پاس ہے جسے اگر وہ چاہیں تو مستحق لوگوں کو بتا سکتے ہیں ✦ ✦ ✦

تار کا پتہ
مستقلندر
لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر
۲۵۸۵

ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہا ست

بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

جلد ۲۶

نمبر ۵

رسالہ مست قلندر لاہور

پاپی نمبر

فروری
۱۹۴۲ء

اردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیر الاشاعت ماہوار رسالہ

ان زندہ دل انسانوں کیلئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کیا ہے ہمیشہ خوش رہنا اور دوسروں کو خوش کرنے میں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے قول یا فعل سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے۔ جن کا مذہب ہے خدا کے ہر ایک بندے سے بلا امتیاز رنگ و قومیت محبت کرنا

قیمت فی پرچہ
پانچ آنے ۵/

ایڈیٹر ڈاکٹر پرتھی سنگھ

سالانہ چندہ
تین (۳) روپے

... ڈاکٹر پرتھی سنگھ پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر دفتر رسالہ مست قلندر روشنائی ... سے شائع کیا

ہنگامہ خیز نظمیں — دلگداز آپ بیتیاں

فہرست مضامین

پاپی نمبر ۱۹۴۲ء

طبی جواہر پارے — بے بدل رنگین افسانے

ہندوستان میں بے پناہ ... سالگرہ ... اور مسلمان ... غریب عورت ... اور مرد ... اور ذوق و شوق ... سالگرہ ... اور حسن ... دیدار ... لکھوکھا ... والے ... کی تصویر ... چشم ...

نگاہِ اولیں

(اداریہ)

سالنامہ ۴۲ء ہماری توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ خریداروں کے تعریفی خطوط اور ملک کے بلند پایہ ادیبوں کے توصیفی کلمات کو اگر یکجا کرکے شائع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے بڑے بڑے ایجنٹوں میں سے بیشتر نے دوسری بار اور بعض نے تیسری مرتبہ سالنامہ کی مزید کاپیاں طلب کیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خریداروں کے علاوہ پبلک نے بھی خاص نمبر کو بنظرِ پسندیدگی دیکھا۔

سالنامہ کے انعامات کی تقسیم

افسانوں میں سب سے عمدہ افسانہ جناب سید کاظم دہلوی مدیر کہکشاں کا "ایک رات ایک بات" رہا۔ کاظم صاحب کو ۲۵ روپیہ نقد انعام حاصل کیا۔ دوسرے نمبر پر جناب مسعود جاوید صاحب کا افسانہ "ہم دونوں" تسلیم کیا گیا اور ۱۵ روپیہ نقد ان کے پاس بھیجے جا رہے ہیں۔ نظموں میں جناب کوثر قریشی میرٹھی کی نظم "جام شراب پی جا" قرار پائی لہٰذا دس روپے کوثر صاحب کی نذر کئے جا رہے ہیں۔

کاغذ کی ہولناک گرانی اور ہماری اپیل

گزشتہ نمبر میں کاغذ اسٹاک کرنے کیلئے تیس ہزار روپیہ کی فراہمی کی جو تجویز ناظرین کرام کے سامنے رکھی گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کا جواب نہایت حوصلہ افزا طریق سے دیا جا رہا ہے ہماری اپیل کو لبیک کہتے ہوئے اگرچہ مست قلندر کے بعض کرمفرماؤں نے ایک ایک سال کا چندہ پیشگی بھیج دیا ہے مگر ہنوز دلی دور است۔

اگر دس ہزار خریدار اپنا ایک ایک سال کا چندہ جلد از جلد جمع کرا دیں تو تیس ہزار روپیہ کا کاغذ ایک دم اسٹاک کر لیا جائے اور کافی مدت کیلئے کاغذ کی ضرورت سے بے نیاز ہو کر آپ کا مست قلندر ترقی کے میدان میں بیش از بیش سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ گامزن ہو۔

ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین واثق ہے

کہ ہماری اپیل رائیگاں نہیں جائیگی۔ اور ہمارے مہربان دوست اپنا ایک ایک سال کا چندہ پیشگی بھجوانے میں ہرگز ہرگز کوتاہی سے کام نہ لینگے۔

یہ تین روپیہ کی حقیر رقم

جسے اپنی اولین فرصت میں روانہ کرنے کی آپ سے زوردار اپیل کی جا رہی ہے۔ آپ کے حساب میں ہمارے پاس بمد امانت جمع رہیگی اور سال ۴۳ء کے چندہ میں شمار کر لی جائیگی۔

آپکی اس پیشگی کرمفرمائی کا صلہ

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ آپ کو کیا ملے گا؟ سنئے! یہ تو آپکو علم ہی ہے کہ ایڈیٹر مست قلندر کی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصہ سادھو سنیاسیوں اور کامل فقیروں کی صحبت میں بسر ہوا ہے۔ صفحہ ۴ پر ان سربستہ رازوں کی تفصیل شائع کی جا رہی ہے جو ایڈیٹر مست قلندر کا سرمایۂ حیات ہیں ——— ۳۱ مارچ ۴۲ء سے قبل آپ اگلے سال کا چندہ روانہ کرکے ان سب کے سب رازوں سے بغیر کسی معاوضہ کے مستفید ہو سکتے ہیں۔ زندگی کے وہ رازہائے سربستہ

سال بھر کیلئے مفت!

مست قلندر کا انگریزی ایڈیشن شائع ہونے میں اب چند دن کی دیر ہے۔ اس کا سالانہ چندہ صرف ۸ للعہ اور ایک کاپی کی قیمت صرف ۱۲ مقرر کی گئی ہے۔ جن احباب نے نمونہ کے پرچے کیلئے ٹکٹ بھجوائے ہیں پرچہ چھپتے کے ساتھ ہی ان کے پاس بھیج دیا جائیگا۔ پہلے پچاس خریداروں کو True Confession of India سال بھر تک مفت دئے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ درخواست کنندہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایم اے نہیں تو کسی یونیورسٹی کا گریجویٹ ضرور ہو۔ درخواست ذیل کی نقل روانہ کی جائے۔

درخواست خریداری

میں...... نام ... عمر ... پورا پتہ .... چونکہ فلاں (یہاں یونیورسٹی کا نام لکھا جائے) سے سال ... میں ایم اے / بی اے کا امتحان پاس کر چکا ہوں۔ اسلئے چاہتا ہوں کہ میرا نام بھی پچاس مستقل خریداروں کی فہرست میں شامل کر لیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ نہ صرف آپکے رسالہ کی قلمی اعانت کرتا رہوں گا بلکہ اپنے اثر و رسوخ سے حلقۂ احباب میں اسکی توسیع اشاعت کی کوشش بھی کرونگا جواب کیلئے ٹکٹ ارسال ہے۔ امید ہے کہ مایوس نہیں کیا جاؤنگا۔

دستخط

مفت ایڈیٹر مست قلندر کا سرمایۂ حیات بالکل مفت

دلدادگان مست قلندر کیلئے ایک سنہرا موقع۔ تیس ہزار روپیہ کی فراہمی کیلئے بے نادر روزگار ترکیبیں جن کا بدل بیش قیمت ہیرے اور جواہرات بھی نہیں ہو سکتے۔ بالکل مفت سکھانے کی دعوتِ عام!

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

صرف مستقل خریداران مست قلندر ہی ان رازوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ غیر خریدار درخواست بھیجنے کی زحمت نہ کریں کیونکہ ان کو کسی قیمت پر یہ راز نہیں سکھائے جائیں گے۔

پہلا راز۔ ایک معمولی ترکیب ہے جس کا تعلق علم روحانیت سے ہے۔ چند منٹوں میں سیکھی جا سکتی ہے۔ کوئی مذہبی قید یا پابندی نہیں۔ اس کی مدد سے اپنی کسی آنے والی مصیبت یا اچھی بات متعلقہ ترقی و خوشحالی کا علم قبل از وقت ہو جاتا ہے۔ کسی فلسفی نے کہا تھا کہ اگر انسان کو اپنی آنے والی زندگی کا حال پہلے ہی معلوم ہو جایا کرے تو اس میں شک نہیں کہ پیش بندی کر کے وہ بہت سے مصائب اور تکالیف کا قلع قمع کر سکتا ہے یا جس کام کو کرنے سے اسے نفع پہنچتا ہو اس کو اختیار کر کے وہ دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرتا ہے۔

دوسرا راز۔ نسوانی خوبصورتی سے متعلق ہے۔ یہ بھی ایک سائنٹفک ترکیب ہے جس کی مدد سے جسم کے کسی حصہ خصوصاً چہرہ پر کی جھریاں غائب ہو جاتی ہیں اور ۴۰۔۵۰ سال کی بڈھی عورت ۱۵۔۲۰ سال کی دوشیزہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسکے جسمانی اعضا میں مثل نوخیز دوشیزہ کے ملائمت پیدا ہو جاتی ہے اور ڈھیلا پن غائب۔ الغرض وہ پھر سے جوان بن جاتی ہے۔

تیسرا راز۔ ایک قسم کا عرق ہے جو بطور خضاب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے بال چند ہی دنوں میں سیاہ ہو جاتے اور جڑ سے کالے نکلنے لگتے ہیں۔ مہنت صاحب جن سے یہ نسخہ حاصل کیا گیا تھا ابھی تک بقید حیات ہیں اور اسی سال کی عمر میں بھی ان کے سر اور داڑھی کے بال بالکل سیاہ ہیں۔

چوتھا راز۔ ایک سبزی جو خاص موسم میں عام گھروں میں پکائی جاتی ہے۔ اس کا عرق ہے اس کو ایک خاص ترکیب سے روزانہ استعمال کرنے سے کھوئی ہوئی جوانی واپس لوٹ آتی ہے یہاں تک کہ طاقت ضبط جواب دینے لگتی ہے۔ زیادہ تعریف فضول۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کی حاجت نہیں۔ یہ دوا اپنے منہ سے بولے گی کہ میں کیا ہوں؟

پانچواں راز۔ ایک ارزاں ترین اور بالکل حقیر چیز جو دیہاتی بنساریوں کے یہاں بھی بافراط اور ہر وقت مل سکتی ہے، بالکل مفرد دوا اگر مختلف چیزوں کے میل سے استعمال کرنے پر سنتا یا انسان کی ۲۰ بیماریوں کا حکمی علاج ہے۔

~~~~ سیکھنے کیلئے حسب ذیل درخواست بھیجئے! ~~~~

درخواست

جناب ایڈیٹر صاحب مست قلندر لاہور۔ تسلیم۔

میں مست قلندر کا پرانا خریدار ہوں اور میرا چٹ نمبر .... ہے۔ آپ کی اپیل دربارہ خرید کاغذ برائے مست قلندر میری نظر سے گذری۔ میں بڑی خوشی سے اپنا ایک سال کا چندہ تین روپیہ بطور پیشگی بذریعہ منی آرڈر روانہ کر رہا ہوں۔ اسے میرے حساب میں جمع کر کے سب کے سب راز نمبر .... میرے پتہ سے بذریعہ ڈاک روانہ کر دیجئے۔ میں وعدہ حتمی کرتا ہوں کہ انہیں کسی پر ظاہر نہ کرونگا۔ نہ ہی مشتہر کر کے ناجائز فائدہ اٹھاؤنگا۔ فقط

دستخط

پورا پتہ
~~~~

مست قلندر
جلد ۱۲ نمبر ۵

کافر جوانی

(از حضرت ماہر القادری)

وُہ ظالم ادائیں، وہ کافر جوانی
وہ آنکھیں کہ جامِ مے ارغوانی
لبوں پر نمایاں تبسّم کی موجیں
وہ گلدستۂ عشرت وشادمانی
وہ آواز کا لوچ وہ نرم لہجہ
وہ دلچسپ فقرے وہ شیریں بیانی
وہ شوخی جو کردار کا راز کہدے
اُسی کی حکایت اُسی کی زبانی
وہ نغموں کی یورش وہ جلوونکی بارش
اور اُس پر وہ برسات کی رُت سہانی
وہ آنکھوں کے ڈورے شرابی شرابی
وہ ہونٹوں کی رنگت گلابی گلابی
وہ رخسار کی دلفریبی کا عالم
کبھی ماہتابی، کبھی آفتابی
وہ رہ رہ کے انداز انگڑائیوں کے
وہ آنکھوں میں اک موجۂ نیم خوابی
وہ حسن و محبت کا رنگین دھوکا
کبھی شرم طاری، کبھی بے حجابی

ڈاکٹر کا شب نامچہ

از جناب کوثر چاندپوری

ایک نرس کا شیدا یا آفریدا تھا۔ جتنی یہاں
میں کام کرنے والی اصول اور جنس، روزانہ
پیش آنے والے واقعات کے متعلق نوٹ
اس کو بتاتا تھیں۔ یہ میری ہمدردی اور حسن
اخلاق کی گرویدہ تھی میں نے شام کو ڈیوٹی ختم
کرنے پر اسٹول اٹھائی اور چلتے وقت نرس
کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا میں اسے
کوئی وعدہ یاد دلا رہا ہوں۔ اس نے قریب
آکر پوچھا۔ ڈاکٹر میں کس وقت آؤں؟

بس ڈیوٹی تبدیل کر کے آجانا!

۹ بجے تبدیل ہو گی ڈیوٹی۔

اسی وقت سہی!

آپ سو تو نہ جائینگے ۹ بجے تک؟

نہیں میں تو ۱۲ بجے تک جاگتا ہوں!

میرے گھر میں بوڑھی والدہ اور ایک چھوٹے
بھائی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ابھی میری شادی
بھی نہ ہوئی تھی۔ میں بہت ہی نیک، خوش اخلاق
اور ہمدرد مشہور تھا۔ اور اس میں کوئی شک بھی
نہیں کہ میں ایسا ہی تھا۔ یہ دوسری بات ہے
کہ میری بعض رنگین راتیں اس خیال کی تردید
کرتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ میں دن کے لحاظ
سے خوش اخلاق مشہور تھا میری راتوں سے
کسی کو کیا واسطہ؟ ——— راتوں کی تخلیق تو
ہوئی ہے بد اخلاقی کیلئے، یہ تو ایک قسم کا پردہ
ہے جو قدرت دنیا پر ڈال دیتی ہے۔ یہ آدمی
کی بہت بڑی نیکی ہے کہ اس کا دن اچھے
کاموں میں گذر جائے۔ ان فطری خواہشات
کو پورا کرنے کے لئے جن کے مجموعہ کا نام انسان
ہے۔ اگر رات کا سیاہ پردہ ڈال لیا جائے تو رات
ایک آدمی کی عصمت اور شرم و حیا پر ہی پھول
کیا جاتا ہے گا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر نو بجے
اپنے کمرے میں آ گیا جس میں بجلی کی روشنی نور برسا پھیلا
رہی تھی لیکن روشنی بجلی کی ہو یا لیمپ کی اس کی
ضیا باہر کی دنیا پر پڑتی ہے ضمیر اور روح کی
اندھیری میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی
لئے میرا کمرہ روشن تھا مگر میرا ضمیر تاریک تھا
میں سوچ رہا تھا کہ بجلی کی اس تیز روشنی میں
مجھے اپنے نفس کیلئے ایک کام کرنا ہے۔ میری
مسہری پر گلابی رنگ کی جھالر دار چھپر دانی
لگی ہوئی تھی اپنے سامان آرائش سے دل
میں سوئے ہوئے ارادوں کو گدگدا رہی تھی۔
میز پر رکھی ہوئی گھڑی آہستہ آہستہ اپنی
موٹی موٹی سوئیوں سے وقت بتا رہی تھی
اس کی ٹک ٹک اس وقت میرے سکون قلب
کی حریف بنی ہوئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اس
کی یہ آواز بند ہو جائے۔ بڑی مشکل سے گھڑی
نے ۹ بجائے۔ یہ ایک گھنٹہ میرے خیال میں
اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ مجھے بار بار گھڑی بند ہو جانے
کا شبہ ہوتا تھا۔ ٹھیک ۹½ بجے ایک تانگہ
دروازے پر آکر رکا اور میں سمجھ گیا۔ نرس آ گئی
جوان حسین اور سادہ لوح نرس! جو ناتجربہ کار
اور ضرورتمند بھی تھی۔ اس کیلئے نوکری نہایت
ضروری تھی۔ اور اپنی سادہ لوحی سے اس کو
یقین ہو گیا تھا کہ میری امداد کے بغیر ملازمت
کا جاری رکھنا مشکل ہو گا۔ میرا دل دھڑکنے لگا
اور زور زور سے اچھلنے لگا خوشی سے نہیں
بلکہ اس جرم کے تصور سے جس کا ارتکاب میں
کرنے والا تھا۔ میں نے دیکھا واقعی نرس بڑی
تھی۔ وہ خوبصورت ساڑی میں لپٹی ہوئی۔ اس کے گال
سے گلابی پھولوں کی طرح چمک رہے تھے۔
آنکھوں سے جوانی یوں جھانکتی تھی کہ
مسکرانا تو معصوم ہو رہا تھا۔ میں نے بڑھ کے
تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا اور اپنے ساتھ کمرے
میں لے گیا۔ میں صوفے پر لیٹ گیا وہ ابھی
کھڑی ہی تھی اور بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی
میں نے کہا بیٹھو اب تکلف کس بات کا

یہ تو اپنا گھر ہے!

جی ہاں یہاں آپ کے سوا میرا ہمدرد
اور کون ہے؟

شکریہ میں کس قابل ہوں بہر حال جس قابل
ہوں ہر وقت خدمت کیلئے حاضر ہوں۔

مجھے آپ سے ملکر بڑا اطمینان ہو گیا
ورنہ یہاں تو ہر شخص میرا دشمن نظر آتا ہے
معلوم نہیں میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جگہ
خالی تھی مجھے مل گئی میں نے کسی کو ہٹایا نہیں
کسی کو نقصان نہیں پہنچایا پھر سمجھ میں نہیں
آتا میری مخالفت کیوں کی جا رہی ہے۔

نئی نئی جگہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ بات یہ
ہے کہ ہر شخص تم پر اثر جمانے کی کوشش
کرتا ہے مگر تم اطمینان رکھو میں رفتہ رفتہ
سب کو ٹھیک کر دونگا۔ واسطہ تو مجھ سے

ہی پڑتا ہے سکا، بات یہ ہے کہ آپ کی دعا سے صاحب میرے علاوہ کسی کا اعتبار ہی نہیں کرتا آپ کی عنایت میرے شامل حال رہی تو مجھے یہی امید ہے کہ آپ کی امداد سے میں اپنا کام نیکنامی کے ساتھ کرتی رہونگی!

ذرا آرام سے بیٹھیئے۔ آپ تو بہت سمٹی سمٹائی بیٹھی ہیں۔

نہیں میں بہت اچھی طرح بیٹھی ہوں!

چائے پیئنگی آپ؟

نہیں ڈاکٹر صاحب شکریہ! یہ وقت نہیں چائے کا!

اور کچھ؟

بس کچھ نہیں، تکلیف نہ فرمائیے۔

میں چاہتا ہوں اسوقت آپ کو بہت سی باتیں بتا دوں مگر اس کیلئے وقت کافی درکار ہے آپ کو جلدی تو نہیں میری رائے میں تانگہ واپس کر دینا چاہئے۔ دوسرا مل جائیگا۔ یہ سڑک بہت چلتی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب میں ہر کام سے فارغ ہو کر آئی ہوں۔ رات اپنی ہے۔ تانگہ میں واپس کئے دیتی ہوں آپ مہربانی کر کے سب کچھ بتا دیجئے مجھ پر تو ایک پہاڑ سا ٹوٹ پڑا ہے میری سمجھ میں ہی نہیں آتا میں یہاں کام کیونکر چلاؤنگی؟

اس کی فکر نہ کیجئے۔ میں سب کچھ ٹھیک کر دونگا۔ اور میں تو ہر وقت وہاں رہتا ہی ہوں جس بات کی تکلیف ہو آپ مجھ سے کہیئے!

بس ایک آپ ہی کا سہارا ہے ڈاکٹر صاحب امتحان کی مدت بھی بڑی لمبی ہے۔ تین مہینے خیریت سے گذر جائیں۔ پھر تو میں ذرا مطمئن ہو جاؤں گی۔

آپ بالکل اطمینان رکھیئے آپ کے خلاف کوئی بات نہ ہو سکے گی میں کل ہی صاحب سے ان ساری دشواریوں کا تذکرہ کر دونگا۔ وہ بہت رحمدل آدمی ہیں اور میں جانتا ہوں وہ سب کچھ میرے ہی سر رکھ دینگے۔ دیکھ لینا یہی کہدینگے تم ہی ڈانٹ ڈپٹ کر دو۔ معاملہ میرے ہاتھ تک آئے اور تم دیکھ لوگی۔ ایک ہی ڈانٹ میں سب کے ہوش ٹھکانے آجائینگے!

ڈاکٹر صاحب، واقعی آپ بڑے نیک انسان ہیں۔ یہاں آپ نہ ہوتے تو مجھے ایک دن رہنا بھی دشوار ہو جاتا۔

شکریہ! ـــــ میں کس قابل ہوں۔ اوہ دس بجا چاہتے ہیں۔

جی ہاں کیا ابھی کھانا نہیں کھایا آپ نے؟

نہیں، کھانا تو میں نے آج جلدی ہی کھا لیا تھا۔

پھر کہیں جانا ہے؟

جانا بھی کہیں نہیں۔ میں نے بدحواسی کیساتھ کہا۔ میں بار بار نرس کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا اور کچھ کہتے کہتے رک جاتا۔ انگڑائیوں پر انگڑائیاں آ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری رگوں میں خون ایکدم سے بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ میرا چہرہ رفتہ رفتہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اور سامنے والے آئینہ میں اپنے ان تغیرات کو میں اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں جو آرام کرنے والا تھا۔ اس میں کامیابی اور ناکامی کا یقین نہ تھا۔ وہ جتنا دلچسپ اور لطف خیز تھا۔ اتنا ہی خطرناک بھی ہو سکتا تھا نیکدل اور معصوم نرس غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن وہ ان تغیرات کو محسوس نہ کر سکتی تھی جو میرے جسم اور دماغ میں نہایت تیزی کے ساتھ ہو رہے تھے۔ میں نیک دلی کی سطح سے اتر کر بدطینتی کی پستیوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور ایک بدترین کیڑے کی طرح سیاہ کاری کی کیچڑ میں رینگ رہا تھا۔ ایکمرتبہ میں نے نرس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے صوفہ کی طرف کھینچ لیا۔ اور مسکرا کر کہا۔ آپ آرام سے بیٹھئے آپ کی تکلیف سے مجھے اذیت ہوتی ہے۔ میرا گرم گرم ہاتھ جس سے غیر محسوس طور پر شعلے نکل رہے تھے، نرس کے ہاتھ کو لگا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اب میرے منہ پر پاکیزگی کے نور کی کوئی جھلک دکھائی نہ دیتی تھی اس کی جگہ ایک سیاہی تھی نہایت وحشت خیز اور شرارت آمیز۔ میں مسکرا رہا تھا میرے تبسم کی تہ میں شیطان کروٹیں بدل رہا تھا۔ میں اب نرس کے بالکل قریب آگیا تھا اور اس کے ہاتھ کو ایک عجیب انداز سے مسوس رہا تھا۔ نرس ایک گدگدی سی محسوس کرتی اور تعجب سے میری طرف دیکھ کر سر جھکا لیتی اس کا دل کانپ رہا تھا اور اس کی گردن کی رگیں اچھلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں رخساروں پر پسینے کے شفاف قطرے دل کی دھڑکن کے ساتھ لرزتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے

اس نے کہا ڈاکٹر صاحب؟

کہئے ـــــ میں بولا۔

آپ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی کیا اسوقت؟

ہاں، تم بہت ذہین ہو۔ تم خوب کام کرو گی۔ واقعی اسوقت تم نے مجھ پر جادو کر دیا میں نرس کے بالکل قریب آگیا، اور اس کے چمکتے ہوئے رخسار پر آہستہ سے انگلی مار کر بولا۔ تم بڑی حسین ہو۔ دل کو تمہاری نگاہوں کے تیروں سے بچا لینا ممکن نہیں!

ڈاکٹر صاحب ہٹئے الگ۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔ دیکھئے میں بڑی بدنصیب ہوں مجھ پر رحم فرمائیے!

رحم واقعی تم اسی قابل ہو اور میں بھی تو تم سے یہی استدعا کرنے پر مجبور ہوں۔ خدا کیلئے تم بھی رحم کرو۔ میں نے نرس کے گالوں کی طرف جھکتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ ذرا تیز ہو کر بولی۔ ڈاکٹر صاحب یہ کیا ذرا پرے ہٹئے۔ میں کوئی عصمت فروش نہیں ہوں۔ دیکھئے مجھے ہاتھ نہ لگائیے

یہ کیا غضب ہے کہ ہندوستان میں ہر ایسی خوددار عورت کو جو اپنی روزی آپ کمانا چاہے بدچلن اور پیشہ ور سمجھ لیا جاتا ہے۔

بیشک تم سچ کہتی ہو مگر میں الزام کہاں لگا رہا ہوں تم سے میں تو دل لگانے کی کوشش میں ہوں۔ اوہ تمہارا دل دھڑک رہا ہے زور زور سے!

ڈاکٹر صاحب میں جاؤنگی مجھے نوکری اب نہیں کرنا چھوڑ دیئے مجھے۔ دیکھئے تو سہی آپ ڈاکٹر ہیں۔

اور تم نرس ہو ـــ نوکری نہیں کرنا تو عشق کرلو، شادی کرلو تم سب کچھ کر سکتی ہو ـــ میں تمہارے لئے ہر تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اب تمہیں ہسپتال کا بڑے سے بڑا آدمی بھی نگاہ گرم سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں آنکھیں نکال کر پھینکدونگا اس کی۔

لیکن ملازمت کی اتنی قیمت میں نہیں دے سکتی!

اوہ! ـــ جوانی میں یہ خشکیاں زیب نہیں دیتیں۔

ڈاکٹر صاحب ہوش میں آئیے۔ میں کوئی بازاری ....!

نہیں، نہیں، ہرگز نہیں میں نے نہیں ایسا خیال نہیں کیا۔ مگر تمہارے دلربا ہونے میں کوئی شک نہیں۔

ڈاکٹر صاحب! ـــ نرس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ افسوس آپ مجھے لوٹنا چاہتے ہیں ـــ

میں نرس کے سامنے بیٹھا ہوا معذرت کر رہا تھا اور وہ موٹے موٹے آنسوؤں سے رو رہی تھی اس کی آنکھیں اوپر نہ اٹھتی تھیں ـــ دیکھو میری گستاخی کو بخش دو، مجھے معاف کردو، اور میری طرف سے اور میری طرف سے کوئی ملال دل میں نہ رکھو چلو میں تمہیں گھر پہنچا دوں۔ اور اگر یہیں رات گذارنا چاہو تو میں دوسرے کمرے میں چلا جاؤں؟

مجھ سے نہ بولئے میں اسوقت اپنے حواس میں نہیں ہوں۔ میں اب گھر نہ جاؤنگی۔

اور کہاں جانا چاہتی ہو چلو میں پہنچا آؤں

میں اسٹیشن جاؤں گی۔

اور نوکری؟

نوکری شریف چوروں کے اتنے بڑے گروہ میں رہ کر میرے بس کی نہیں۔

کیوں بددل ہوئی جاتی ہو اتنی سی بات پر کیا اور نے بھی کچھ کہا تھا؟

میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ مجھے اسٹیشن جانا ہے۔ میں ابھی جاؤں گی یہاں سے!

ایسا غضب نہ کرو۔ پچاس روپے کی نوکری پر لات کیوں مارے دیتی ہو۔

ایسی نوکری اسی قابل ہے۔ اچھا مجھے جانے دو، سامنے سے ہٹو۔ اس نے اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر فوراً اس کے پیروں میں گر کر بولا۔ میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھئے مجھے تباہ نہ کیجئے۔

اور میری عزت؟

میں قصوروار ہوں جو سزا آپ مجھے چاہیں دے لیں۔ ایسے جرائم کی سزا دنیا میں صرف ایک ہی ہوا کرتی ہے۔ میں اس کے لئے بالکل تیار ہوں۔

نرس صوفہ پر گر پڑی اور گھٹنے سمیٹ کر لیٹ گئی اور ہاتھ کہنیوں تک موڑ کر منہ کے دونوں طرف رکھ لئے اور سسکیاں بھرنے لگی۔

نوکری اس نے واقعی چھوڑ دی۔ مگر مجھے نہ چھوڑا۔ میں نے اپنے جرم کی سزا جو اس نے تجویز کی تھی خوشی سے قبول کرلی اور اب ہم دونوں ایک ہی جگہ رہتے ہیں اور ہم - محض حیثیت سے رہتے ہیں۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ◆ (کوثر چاندپوری)

اُن کی یادیں!

از جناب رشک صدیقی تلمیذ حضرت مولٰنا قمر ملتانی

(۱)

وہ گیسوئے پُرخم وہ چہرہ کتابی
ادا اُن کی ہر ایک یاد آ رہی ہے
مرے دلکو رہ رہ کے تڑپا رہی ہے
وہ مخمور آنکھیں گلابی گلابی

(۲)

وہ مژگاں کی جنبش وہ ابروئے پُرخم
لبوں پر تبسم نگاہوں میں شوخی
وہ ہر بات کیف و ترنم میں ڈوبی
وہ قلب و جگر پر اثر ان کے پیہم

(۳)

قیامت کی رفتار محشر کے فتنے
وہ شرمیلی چتون وہ نیچی نگاہیں
تھیں پوشیدہ جنمیں محبت کی راہیں
نظر سوز عشوے جگر سوز غمزے

(۴)

جن آنکھوں نے دیکھے ہوں ایسے نظارے
نگاہوں میں اپنی ہے اب تک وہ منظر
کہ جیسے کوئی آگیا مسکرا کر
غضب ہے گنیں شام فرقت کے تارے

(۵)

وہ پُرکیف راتیں وہ پُرلطف باتیں
کبھی بھول سکتی نہیں دلکو میرے
وہ دزدیدہ نظریں مرا دل چرا کے
محبت کی اے رشک چھپ چھپ کے گھاتیں

گناہ کی یاد!

زندگی کیا لذت عصیاں کی ناداں غور کر
برق رو دھارے پہ اک تنکا ہی جو بہہ جائیگا
دیکھتے ہی دیکھتے لذت فنا ہو جائے گی
اور عذاب اس کا ہمیشہ کے لئے رہ جائیگا

کسی کو منہ نہیں دکھتا پر شرم پھر بھی پیچھا نہیں چھوڑتی چھپ کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھا رہتا ہوں۔ مگر اطمینان قلب نصیب نہیں ہوتا۔ "وہ گناہ" ہائے شبانہ و روز بھولنے کی کوشش کرنے کے باوجود بھی اس گناہ کی یاد کسی طرح لوح دل سے محو نہیں ہوتی۔ ضمیر کی لعنت ملامت کے تازیانے کھا کھا کر کلیجہ پک گیا ہے۔ دل میں ایک گہرا زخم ہوگیا ہے اور پشیمانی کی آگ اندر ہی اندر سلگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جو ٹھنڈی آہیں بھرنے سے اور بھی بھڑک اٹھتی ہے۔ روتے روتے آنسو خشک ہو گئے پر اس آگ کو نہ بجھا سکے۔

"محبت" بہت دن ہوئے مرجھا گئی امید کی لہلہاتی کونپلیں خشک ہوگئیں۔۔۔۔۔ زندگی ایک سیاہ رات سے مشابہ ہے جس میں ایک بھی تارا دکھائی نہیں دیتا۔ سب طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ مایوسی اور بے اطمینانی کے کالے کالے بادل آسمان دل پر منڈلا رہے۔ دل جیسے بالکل ہی پژمردہ ہوگیا اور میں جیسے کھو گیا ہوں۔

اس دن کے بعد سوچا تھا: بس اب سنبھل گیا ہوں اب تک دھوکے میں رہا۔ آئندہ کبھی دھوکا نہ کھاؤں گا۔ شہوات نفسانی کا تیاگ کردونگا۔ کمبخت دل کو پھانسی پر چڑھا دونگا اور کسی گوشۂ تنہائی میں چپ چاپ بیٹھ کر موت کے دن کی انتظار کرونگا۔ یہ سب کچھ تو کیا مگر آہ! چپ چاپ اطمینان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر موت کی انتظار نہ کر سکا کیونکہ "وہ یاد" ہائے وہ دل ڈرانے والی یاد اب بھی بیچ میں آکر سب کام بگاڑ دیتی ہے۔ وہ میری سکون پسند زندگی میں آگ لگا دیتی ہے میں کسی طرح اس کو بھول نہیں سکتا۔

یاد! او یاد!! ظالم تو کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتی؟ کیا میرے گناہ کی سزا ابھی کافی نہیں ملی؟ کیا تیرا دل ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا؟ تیرے ظلم سہتے سہتے موت کے قریب تو پہنچ چکا۔ ہائے اب تو مجھے اطمینان خاطر سے مرنے بھی نہ دے گی؟

وہ دن مجھے یاد ہے خوب یاد ہے۔ آسمان پر مینہ برس رہا تھا۔ پر موسلا دھار نہ تھا۔ رم جھم رم جھم (بوندا باندی) ہو رہی تھی۔ اس دن ہاں اسی دن پہلے اس نے مجھے دیکھا یا میں نے اسے دیکھا۔ کچھ یاد نہیں۔ شاید دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس دیکھنے میں سحر تھا۔ پر ہم نے اسے اتفاقیات سمجھا۔ ہاں دونوں نے اتفاقیات سمجھا۔ بڑی غلطی ہوئی تھی۔ اس دن ہم مر گئے تھے پر سمجھا تھا جی گئے۔ اسی دھوکے میں ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے تھے۔ آہ! وہ کچھ نہ بولی شرما کر چلی گئی۔ میں نے دل میں کہا: "کیا حسن ہے کیسی خوبصورتی ہے" اس وقت میں بے شرموں کی طرح اس کی طرف تاکتا ہی رہا۔ اس نے میری تاک جھانک کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس کی وہ مسکراہٹ جو آنکھیں چار ہوتے ہی اس کے لبوں پر نمودار ہوئی اسے دیکھ کر میں پاگل ہوگیا تھا؟

اس کے بعد کیا ہوا؟ ـــ ٹھہرو! سوچتا ہوں ـــ ہاں اس کے بعد ایک دن وہ پان کا بیڑا لیکر آئی تھی۔ وہ بیڑا ابھی تک میرے سنگار بکس میں رکھا ہے۔ کھایا نہیں تھا۔ اس دن میں نے اسے محبت کی نشانی سمجھ کر رکھ لیا تھا۔ یہ نہ سوچا تھا کہ ایک دن ہم دونوں کی قسمتیں ایک ہو جائینگی۔ کیونکہ جب وہ میرے ہاتھ میں آیا ہرا بھرا تھا۔ اس میں "رس" تھا "ذائقہ" تھا اور "خوشبو" تھی۔ مگر آج "رس" "ذائقہ" اور "خوشبو" کچھ بھی نہیں رہا۔ بالکل سوکھے پتے کی طرح ـــ اور میں کیا ہوں میں بھی بعینہ سوکھا پتہ ہوں "رس" (امید) "خوشبو" (مسرت) اور تازگی (امنگیں) ان میں سے میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔

اس کے خاوند سے میں ہمیشہ ناراض رہا کرتا تھا۔ وہ میرا سادہ لوح چپڑاسی تھا مگر بالکل بھولا بھالا، صاف دل اور ہنس مکھ میری گالی کو ہنس کر برداشت کر لیتا اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیا کرتا تھا۔ پر اس بدلی کے دن سے اس کے دن پھرے میں اس کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرنے لگا۔ میں نے کسی کی زبانی سنا کہ وہ اپنی خوش قسمتی کا سبب اپنی عورت کو سمجھتا ہے۔ بات سچ تھی میں

دل ہی دل میں مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ پر اصل بات اور تھی وہ بعد میں معلوم ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ "میری عورت بڑی خوش قسمت ہے۔ اس کے میکے سے آتے ہی مالک کی نظر کرم مجھ پر ہوئی ہے۔ تنخواہ بڑھی ہے۔ چنانچہ وہ اسے لکھشمی کہکر پکارا کرتا تھا۔

وہ بڑھیا رانڈ اُف اس کی یاد آتے ہی دم گھٹنے لگتا ہے ـــــ مدت سے میرے پاس آتی تھی کبھی نقدی اور کبھی پھٹا پرانا کپڑا مانگنے۔ وہ مجھے "بیٹا" کہکر پکارا کرتی تھی۔ پر میرے دل میں کبھی اس کیلئے عزت کا احساس پیدا نہ ہوا۔ اس کی صورت ہی ایسی تھی کہ دیکھ کر نفرت پیدا ہوتی چھوٹی چھوٹی سانپ جیسی آنکھیں سکڑے ہوئے ہونٹ اور بلی جیسی چال۔ میں ہمیشہ اس سے دور رہا کرتا۔ نفریں کرتا۔ گالی دیتا پر وہ اپنی خوشامدانہ باتیں نہ چھوڑتی تھی۔ پتے درجہ کی مکّار عورت تھی۔

اس دن بھی وہ آئی تھی ہاں! وہ جہنمی ڈائن اور میں اسے دیکھ کر خلاف معمول کچھ مسکرایا تھا اور ایک روپیہ نکال کر دیا تھا۔ اس نے اپنی منحوس آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک بار روپیہ کو دیکھا اور پھر میری مسکراہٹ کو۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔ بہت سی باتیں کیں ـــــ نہیں نہیں ان باتوں کو بہت کوشش کرکے بھلایا ہے اب یاد نکرونگا ان کا سایہ ٹھیک اندھیرے کمرے میں بجھتے ہوئے چراغ کی مانند آج بھی میرے دل کی سنسان کوٹھڑی میں کانپ رہا ہے۔

اسی کی بدولت سب کچھ ہوا! اسی کی چھری سے میں نے نقب زنی کی۔ اسی کی معرفت میں نے وہ حسن و جوانی کا بھرپور خزانہ خریدا۔ چوری کا مال تھا اس لئے بہت سستا ہاتھ لگا۔ کچھ مٹھائی کے دونے کچھ خوشبودار تیل کی شیشیاں، کچھ پہننے کے زنانہ کپڑے اور بس۔

اس دن جب اس حسینہ نے اپنا آپ میرے حوالے کیا وہ اٹھلاتی لجاتی اور مسکراتی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے تھے شاید وہ پاپ سے کانپ اٹھی تھی۔ میں نے کسی بات کی پروانہ کی۔ پیاس کے مارے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ "رس" "قریب ہی تھا وہ "رس" ـــــ جسے میں اسوقت دھوکے میں آب حیات سمجھا۔ پر جو حقیقت میں زہر ہلاہل تھا۔ میں نے اس کا جی بہلانے کے لئے کئی باتیں کیں۔ طرح طرح کے سبز باغ دکھائے وہ معصومیت کی مجسم تصویر تھی۔ اس نے میری مکر و فریب سے پُر ہر ایک بات پر.... یقین کر لیا۔ ایک بار مسکرائی بھی پر میں اسے کھکھلا کر ہنسا نہ سکا

اس دن پُورنماشی کی رات تھی۔ پھانسی کی تاریخ کی طرح وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ کوئی نو بجے کا عمل ہوگا۔ میرے گھر کے صحن میں چاندنی نے کھیت کیا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ نیچے رات دودھ میں نہا رہی تھی۔ اوپر آسمان ہنس رہا تھا۔ وہ میرے بھیجے ہوئے پھولوں کا زیور پہن کر آئی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اس کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ گویا چاندنی میں بجلی چمکی پھر دوسرے لمحے وہ میرے پہلو میں تھی اس کا خاوند جسے میں نے اس رات کسی کام پر باہر بھیج دیا تھا اب بھی میرا ملازم تھا۔

اس رات میرے پاس دولت حسن کی کمی نہ تھی۔ محبت کا دریا میرے دل میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پر وہ پریم نہیں پاپ تھا۔ اگرچہ میں نے اس پاپ کی پروانہ کی اور جان بوجھ کر اندھا بنا رہا۔ اس وقت اس حسینہ کو دیکھے بغیر مجھے کسی پہلو کل نہ پڑتی تھی۔ مگر آج اس خیال سے سر تا پا کانپ اٹھتا ہوں کہ جوانی نے جسے ہیرے کا ٹکڑا سمجھ کر لیے سنگین گناہ کا ارتکاب کیا۔ وہ دراصل شبنم کی بوند تھی۔

جب اس خوبصورت کھلونے کی تکمیل میرے ہاتھ میں تھی۔ تب ایک دن میں نے اس کے خاوند سے کچھ اس کا ذکر کیا تھا۔ ٹھیک یاد نہیں کہ اس نے جواب میں کیا کہا۔ مگر جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اپنی عورت کی شوہر پرستی اور وفا شعاری کا پورا یقین ہے۔ اپنی بیوی کے اوصاف حمیدہ و خصائل پسندیدہ کا ذکر کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے "بیوقوف شوہر کس قدر دھوکے میں ہے۔ یہ خیال کرکے اس دن میرے دل پر بہت چوٹ لگی اور ایک لمحہ کیلئے مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہوگئی۔

اس کے بعد ایک روز اس نے مجھے پہچان لیا۔ پہلے دل ہی دل میں مجھے گالیاں دیں پھر ایک دن میری حکم عدولی کی۔ بعد میں گستاخی تک نوبت پہنچی۔ اور آخرکار میرا مقابلہ کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسی وقت اُسے جوتوں سے پٹوا کر اپنی کوٹھی سے نکلوا دیا۔

اب کچھ کھٹکا نہیں تھا نہ خوف رسوائی نہ اندیشہ رقیب حُسن کی غیر معمولی آب و تاب کے سامنے میری عقل کی روشنی ماند پڑ گئی۔ باغ حسن کی اس نوشگفتہ بیل کے "رس" کو بلاخوف و خطر چوسنے لگا۔ رس بہت تھا جتنا پیٹ میں سمایا چوسا باقی ـــــ جس طرح بچہ ضرورت سے زیادہ کھانا پا اور سیر ہو کر بچا کھچا پھینک دیتا ہے اسی طرح

وہ حسن و جوانی کی بھری پُری بیل میں نے بھی پامال کر کے زمین پر پھینک دی۔ میرا جی اس سے بھر گیا تھا۔ مگر وہ دعوت پر بلائے ہوئے بھوکے مہمان کی طرح میری محبت کے دسترخوان پر خاطر داری کے کھانے کی انتظار میں بیٹھی رہی۔ وہ مجھے اپنا سب کچھ سمجھتی تھی میرے لئے ہی اس نے اپنے خاوند کا تیاگ کیا تھا مگر میں اسے کیا سمجھتا تھا؟ لذاتِ نفسانی کی سیری کا ذریعہ اور بس۔

ایک دن اچانک بیوی کا خط ملنے پر میرا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ وہ خلافِ توقع میکے سے واپس آرہی تھی۔ اب اس کو گھر میں رکھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اور میری طبیعت بھی اس سے ہٹ چکی تھی۔ اس لئے میں نے اِسے ہاں ہاں!! اس تباہ شدہ گمراہ کردہ اور دھوکے میں پھنس کر عصمت بیچنے والی عورت کو جو حسن، ملاحت کی جان اور معصومیت کی کان تھی وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ آف! اُف!! خدایا!!! اس کے بعد میں زندہ کیسے رہا۔ مجھ پر آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا؟

آخری مرتبہ میں نے اُسے بستر مرگ پر دیکھا۔ پیشہ ور خانگیوں کے محلہ میں ایک تنگ و تار مکان تھا۔ اس مکان کے نچلے حصہ میں ایک سل زدہ کال کوٹھری میں لکڑی کے بوسیدہ کھاٹ پر وہ پڑی تھی۔ دیوار پر رکھے ہوئے مٹی کے چراغ کی دھندلی روشنی میں میں نے دیکھا کہ غلاظت سے لت پت ہونے کے باعث اس کے جسم میں کیڑے چل نکلے ہیں۔ بدبو کی کثرت سے دماغ سڑا جاتا تھا۔ میں نے ناک کو ایک ہاتھ سے بند کر لیا اور دوسرا اس کے جسم کی حرارت دیکھنے کیلئے آگے بڑھایا۔ اس نے نفرت سے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ میں نے اس کے پنڈے کو چھو کر دیکھا بہت زور کا بخار تھا ـــ گویا سارا جسم آگ سے جل رہا تھا۔ میں نے گلاس میں تھوڑا پانی ڈالتے ہوئے کہا: "تھوڑا پانی پیو گی؟" اچانک سوئی ہوئی شیرنی جاگ اُٹھی۔ اس نے آنکھیں نکال کر غصے سے کہا۔

"ظالم نابنجار! جہنمی شیطان!! ہٹ دور کر میرے سامنے سے اپنا کالا منہ۔ میں تیرے ہاتھ کا پانی نہیں پیونگی!" .....

میں کچھ بھی نہ کر سکا! اور وہ میرے دیکھتے دیکھتے مر گئی!!! اس کے بعد اسی مہینہ میں میرا روشن چراغ گل ہوگیا۔ جس دن میرے یہاں لڑکا پیدا ہوا اسی دن میری بیوی چل بسی۔

دو سال بعد ایک دن بچہ کو گود میں لئے باہر برآمدہ میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی میری طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ اسکی شکل بھوتوں جیسی تھی۔ سر کے بال کھلے ہوئے، لمبی ڈاڑھی اور انگیارے کی طرح لال لال آنکھیں دہک رہی تھیں۔ اس کے منہ سے رال بہتی تھی۔ جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

جانتے ہو میں کون ہوں؟

(بقیہ صفحہ ۱۴)

سب ہنسنے میں بھی ہنسی۔ زخم بہت پڑے۔ دُنیا ہری بھری تھی۔ میرے زخم بھی ہرے۔ اس کسک میں مزہ تھا۔ میں دیوانوں کیطرح ہنس رہی تھی۔ دُنیا خوش تھی کہ میں خوش ہوں۔ میں خوش تھی کہ دُنیا کو اندھا بنا رہی ہوں۔ کبھی میں مردوں کا تختۂ مشق تھی۔ آج مرد میرے تختۂ مشق ہیں۔

مجھ پر ایک خول چڑھا ہے۔ لوگ اس خول تک رسائی پاتے ہیں اور خوش خوش چلے جاتے ہیں۔ کسی کے ہونٹ میرے رخساروں تک نہیں پہنچتے میرے رخساروں پر سُرخی، پاؤڈر، کریم، فاؤنڈیشن کے ردّے رکھے ہیں۔ میرے ہونٹوں کی حفاظت کس پروف لپ اسٹک کر رہی ہے۔ میرے دل و دماغ پر انتقام کا خول چڑھا ہے۔ نہ کوئی میرے ہونٹوں تک رسائی پا سکتا ہے نہ دل تک۔ طلبگار ظاہری میرے پاس آتے ہیں۔ ظاہر پرستی کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں ایک حساس بانسری ہوں جو دُور کے سانسوں سے بجائی جاتی ہے۔ دوست کے ہونٹوں سے نا آشنا دنیا کہتی ہے کہ یہ زیر و بم اس کی عنایت سے ہے۔ دُنیا اندھی ہے۔ پر خوش ہے۔ کاش میں بھی اندھی ہوتی۔

دُنیا کو میرا گانا پسند ہے۔ دنیا کی نظروں میں میری حقیقت گراموفون ریکارڈ سے زیادہ نہیں۔ دُنیا نہیں جانتی کہ ریکارڈ کے سینہ میں سوئی چبھتی ہے جب نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ اس روسیاہ کے دوران سر پر دُنیا سر دُھنتی ہے۔ یہ عصمت دریدہ ٹوٹا ہوا پیالہ لئے دُنیا کے میلے میں بھیک مانگ چکی۔ یہ گوشت کی گڑیا کھیل چکی کھلا چکی۔ اپنی ایک بھول کا بدلہ دے بھی چکی لے بھی چکی۔ یہ دریا کی بہتی ہوئی نیّا امواج کا اتار چڑھاؤ دیکھ چکی۔ یہ شمع رات کی گرمجوشی بھی دیکھ چکی اور صبح کی سرد مہری بھی۔ یہ سیپی آبرو لوٹ بھی چکی، لٹا بھی چکی۔ اب سکون کی طالب ہے۔ میلے کی ناچنے والی تھک گئی۔ تماشائی چلے آتے ہیں۔ یہ گردش کب ختم ہوگی؟ یہ چکر کب نکلیگا؟

جانتے ہو میں کون ہوں؟

از جناب شفیع محمد صاحب بمبئی

بجلی آکاش کا سینہ چاک کر رہی تھی۔ جذبات میرا دل چیرے ڈالتے تھے۔ ابر برس برس رہا تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے تھے دنیا پر سیاہ کاری میرے دل کو جذبات کر دھوئیں نے گھیر رکھا تھا۔

برسات تھی۔ بلبل کو گل کی تلاش تھی شمع پروانہ کیلئے جل رہی تھی۔ سرو سر اٹھائے قمری کو دیکھ رہا تھا میری طرف بھی ایک نوجوان نے دیکھا۔ مدھو بانسری سنائی۔ میں مست متوالی اس کے ساتھ ہولی۔ اس نے ایک ڈنک مارا۔ زہر چوس لیا میری رگ رگ میں زہر سرایت کر گیا۔

برسات کا موسم تھا۔ ابر جھوم جھوم کر آتا تھا۔ زمین پر بوند پڑتی تھی۔ یہ خاک کی دیوی اپنا سینہ چاک کر لعل اگل دیتی۔ اور بوند کے لئے جگہ بناتی تھی۔ نہ لعل رہتے نہ بوند پھر وہی خاک کی خاک۔ برسات تھی۔ پروانے شمع پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ چیونٹی کے بھی پر نکل آئے میرے بھی پر نکل آئے۔ نہ چیونٹی رہی نہ میں

بلبل گل کی طرف بڑھا۔ اس نے سینہ چاک کر کے خیر مقدم کیا۔ بلبل سرمی چاپ تھا چلتا ہوا پھول کملا گیا۔ مر گیا۔ خاک میں مل گیا۔

سورج مغرب کی جانب بڑھا۔ مغرب نے اپنا خون اس کے قدموں میں چھڑکا۔ اس شوخ گرم گرم کو سینے سے لگا لیا۔ سورج رات کی رات وہاں رہا۔ پھر مشرق سے جا نکلا۔ یہی نسل و نہار ہے۔ یہی روز و شب کی داستان۔

اب میں سرِ راہ سلگتی ہوئی انگیٹھی ہوں سرد مہر راہ گیر ہاتھ سینک کر جاتے ہیں۔ میں جلتی رہتی ہوں۔

میں ایک سڑک ہوں شارع عام۔ مجھ پر سے دنیا گزرتی ہے۔ لوگ روندتے، ٹھکراتے، خاک اڑاتے چلے جاتے ہیں۔ اور میں تنہا پڑی رہتی ہوں۔ جب میلے تماشے ہوتے ہیں۔ زیادہ ٹھکرائی جاتی ہوں۔ دنیا کی عید میرے لئے عذاب ہے۔ راہ رو میرا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ آرام پاتے ہیں۔ اپنی راہ چلے جاتے ہیں۔ میں خس و خاشاک سرِ راہ ہوں۔ مسافر سلگاتے ہیں۔ ہاتھ تاپتے ہیں اور مجھے جلتا چھوڑ جاتے ہیں۔ میں اپنی چنگاریاں ہوا میں اڑا کر جنگل پھونک دیتی ہوں۔ دنیا مجھے برا کہتی ہے اور آگ لگانے والا ہاتھ کہیں اور آگ لگانے معصومانہ چلا جاتا ہے۔

ایک الاؤ میں دو اینٹیں پکتی ہیں۔ ایک گندی موری میں لگتی ہے۔ دوسری قدرشاہی میں۔ ایک پھول کی دو پتیاں ہیں ایک نوشاہ کے سہرے میں جگہ پاتی ہے دوسری بوالہوس بدمستوں کے گھٹنوں کے نیچے پس کر مٹی ہوں پہ دم دیتی ہے۔ ایک ابر سے دو قطرے ٹپکتے ہیں۔ ایک سیپی کی حفاظت میں موتی بنتا ہے دوسرا سوروں کی ٹھوکروں میں پامال ہو جاتا ہے۔ قطرہ بے بس ہے [illegible] کارساز و کارفرما۔ بیک وقت دنیا دو لڑکیاں دیتی ہے۔ زمانہ ایک کو ماں بناتا ہے۔ دوسری کو رنڈی ؎

در کوئے نیکنامی مارا گذر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

میں ماں بننے آئی تھی رنڈی بن گئی۔ امرت تھی زہر بنا دی گئی۔ گھر تھی، گھروالی تھی سرا بن گئی اور سرا کا بستر۔ ایک مرد نے مجھے تباہ کیا۔ میں اس نسل کو تباہ کر رہی ہوں۔ مرد میرا کھلونا ہیں۔ کٹھ پتلیاں، کاٹھ کے گڈے، کاٹھ کے اُلّو۔ میں دوست کو دوست سے لڑا دیتی ہوں۔ بھائی کو بھائی سے۔ میرے لئے بیٹا باپ کا مرنا چاہتا ہے۔ میاں بیوی کا زیور چرا لاتا ہے۔ میری آنکھوں میں نشہ ہے اور میں دنیا بھر کیلئے مردوں کو بدمست بنا رہی ہوں۔ میں رنڈی ہوں۔ اگر بھنگن کو بھنگن کہو تو خفا نہیں ہوتی۔ رنڈی کہو تو بگڑ بیٹھتی ہے میری بہنیں مجھے ذلیل سمجھتی ہیں۔ ذلیل ان کے عزت والے باپ ہیں، بھائی ہیں۔ میاں ہیں جنہوں نے مجھے ذلیل بنایا میں ان کو ذلیل کرتی ہوں۔ انہوں نے میری زندگی تباہ کی میں ان کی دنیا تباہ کرتی ہوں۔ انہوں نے مجھے رنڈی بنایا۔ میں رنڈی ہوں۔ قانونِ قدرت نے اُن کو اسی رنڈی کا غلام بنایا۔ اسی ذلیل کے ہاتھوں ان مصنوعی عزت داروں کو ذلیل کرایا۔ چاہ کن را چاہ در پیش۔

مرد میری بیماریوں سے ڈرتے ہیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ مگر رکھتے ہیں۔ پھنستے ہیں۔ پھر آتے ہیں۔ میری آنکھوں میں ناگن کی سی کشش ہے۔ بھنگا آنا نہیں چاہتا پر آتا ہے۔ کبھی میں بھنگا تھی مجھے ایک سانپ نے ڈسا۔ اب میں ناگن ہوں اور بنی نوعِ مرد کو ڈستی ہوں۔

برسات آئی۔ پیاسی زمین نے پانی پیا میں دکھیاری پیاسی ہی رہی۔ لوگ آئے تو تلیں لنڈھائیں جنگلوں میں گئے باغوں میں پہنچے۔

(بقیہ بر صفحہ ۱۳)

میری لیشپ

(۱)

رشی کیش کے قریب ایک خوبصورت جنگل ہے خوبصورت ہی نہیں بلکہ بہت ہی دلکش ہے۔ خزاں کے بے رحم ہاتھ بھی اس جنگل کے ہرے بھرے درختوں اگے ہوئے پھولوں اور بڑھتی ہوئی بیلوں تک نہیں پہنچ سکے۔ جہاں دوسرے مقام میں موسم خزاں میں درخت ٹنڈ منڈ دکھائی دیتے ہیں وہاں اس سندر بن کی خوبصورتی جوانی پر نظر آتی ہے۔ ایسا خوبصورت جنگل موسم بہار میں کیا گل کھلاتا ہوگا۔ یہ بیان نہیں کیا جا سکتا اس جنگل کی ٹھنڈی راتوں کی دودھیا چاندنی میں بیٹھ کر بجلی کی روشنی کی خواہش نہیں ہوتی چھوٹے سے دل میں ایسے زور سے خیالات اٹھتے ہیں۔ جو کبھی آخری منزل تک لیجاتے ہیں۔ اور کبھی ایک ایک قدم سے اپنی دوڑ لگا دیتے ہیں۔ گنگا کا ٹھنڈا پانی ایک عجیب شان سے بہتا ہے جس کے اردگرد کناروں پر پھولوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ ذرا دور پر ایک خاص اونچائی سے گنگا کے گرنے کی آواز جنگل میں رات کی چپ اور سنسانی میں کانوں کو بہت ہی بھلی اور پیاری معلوم ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی جگہ میں جا کر چنچل چت کیا چاہتا ہے۔ پرسکون جانی آنند شانتی یا خوشی کی موت۔

اس جنگل میں ایک کٹیا کے اندر یوگیشور رہتے تھے۔ اگرچہ وہ اس زمین پر رہتے تھے لیکن درحقیقت وہ اس زمین کے انسان نہ معلوم ہوتے تھے۔ روحانی طاقت انتہا تک پہنچ چکی تھی۔

ان کی ایک لڑکی لیشپ تھی اور وہ بھی اس جنگل میں اپنی مہک اڑاتی پھرتی تھی۔ وہی گھر کا گلدستہ تھی۔ اور وہی بن کی شوبھا۔

(۲)

قریباً ایک سال سے میں یوگیشور کے ہاں آتا جاتا تھا۔ مجھے پتاجی کا حکم تھا کہ ان کے پاس جا کر میں کئی دھرم گرنتھ پڑھ ڈالوں۔ یوگیشور اور پتاجی لڑکپن کے ساتھی تھے۔ اسی لئے وہ مجھ پر خاص عنایت کرتے تھے۔ آخر میں نے تمام دھرم گرنتھ پڑھ لئے اور گورو دکشنا دینے کا وقت آگیا۔ پتاجی کے کہنے پر میں ایک جوڑا دھوتی پانچ پونڈ۔ اور لیشپ کے لئے کنگن لے گیا۔ نا معلوم کس خیال سے یوگیشور چپ ہو گئے اور لیشپ کنگن لے کر باہر چلی گئی۔ اس کے بعد میری پڑھائی کی پورن آہوتی دی گئی۔

”اسی پورن آہوتی والے دن کی شام تھی لیشپ“ حسب معمول جنگل میں کھیل رہی تھی میں بھی سیر کرتا ہوا ادھر جا نکلا۔ لیشپ کو دیکھا اور پکارا۔ لیشپ تمہارے کانوں میں کیا ہے؟

اس نے کانوں کے بل کھائے بالوں کو ہٹا کہا کنگن سچ مچ دو کنگن کانوں کے اندر حلقہ ڈالے پڑے تھے۔ میں نے کہا یہ کانوں میں کنگن؟

”لیشپ“ ہاں اور نہیں تو کہاں پہنوں؟“

”لیشپ“ بھی بھولی بھالی تھی۔ وہ جنگلی پھول کا بھولا پن نہ کانٹے چھانٹے ہوئے باغوں کا۔ پھول نہیں جو دو گھڑی شوقین چکنے کے لئے اندر چلا لوگوں کے پاس رہ کر بدبودار

جنگلی پھول تھی جسے قدرت کے ہاتھوں نے اٹھایا تھا۔ بادلوں کی بوچھاڑ سے بڑھی تھی دنیاوی ہوا نے اسے چھوا بھی نہیں اس کا جیون ان جنگلی پھولوں کی طرح سادہ دلکش شانت اور سچا آنند دینے والا تھا۔ جبتک جیتے رہے چاروں طرف مہک پہنچاتے رہے۔ جب وقت آیا تو اپنی ماتا کی گود میں جھڑ کر گر پڑے۔

(۳)

ہاں یہ جنگلی پھول تھا۔ کسی شوقین کی پھلواڑی کا پھول نہیں تھا۔ آسمان سچے یوگی کے ماتھے کی طرح صاف تھا۔ پتے خاموش تھے۔ شام ہو چلی تھی سنہری کرنیں خوبصورت پہاڑ کی چوٹی سے دیکھ رہی تھیں۔ سورج کی پیاری کرنیں نہ معلوم کیا تلاش کرتی تھیں۔ جو رہ رہ کر آتی تھیں۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ڈھونڈ رہی تھیں میں تو کھڑا ہوا ان ہرن جیسی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ آسمان میں تارہ کو دیکھا۔ یہاں منوہر آنکھوں کو دیکھا۔ بات ایک ہی تھی میں مولسری کی ٹہنی تھامے پاس ہی کھڑا تھا۔ ان وہ بل کھائے ہوئے بالوں کو ہٹا کر آنند سے مسکرایا تھا۔ کی ادا دل میں رہ رہ کر یاد آتی ہے۔

جب نورجہاں نے کہا دن سب کا تیاگ کر دیا کیسے بھیتر سے کلیجہ کڑھا جاتا ہوں وہ نہیں بھولتی ورنہ تو اب تک سوہان روح بنی ہوئی مجھے اندر ہی اندر گھن کے کیڑے کی طرح کھائے جاتی ہے۔ وہ کون؟ اس گناہ کی یاد۔

ایڈیٹر

کے پھولوں کے ہار بنالاتی۔ لیکن کبھی بھی ایسے
بھولے پن کی ادا نہ دیکھی جو آنکھوں سے ہو کر
دل تک پہنچ جائے۔ کون جانتا تھا کہ راستہ
چھوڑ کے راستہ چلنے میں ہاتھوں کے کنگن
کانوں میں پہننے میں اتنی کشش اور
اس قدر طاقت ہے۔ گوپیوں کو کبھی خواب
میں بھی خیال نہ تھا کہ بانس کی بانسری میں
گھونگھٹ کھول کر نچا دینے کی طاقت ہے۔
میں نے اسی وقت اس کے کانوں سے کنگن
اتار کر ہاتھوں میں پہنانا شروع کر دیئے
پشپ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہی مجھے
ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں کچھ اور ہوں۔
اچانک منہ سے نکل گیا۔
پشپا آج کا یہ واقعہ مجھے مرتے دم تک نہ بھولیگا
آہ! کانوں میں کنگن!!! کنگن پہنانے کے
ساتھ ہی سورج غروب ہو گیا۔ آج میں نے
دھرم گرنتھوں کی پڑھائی سے منہ موڑا اور اسی
روز پریم کے مدرسہ میں جا کر پریم کی کتاب
کا پہلا ورق الٹا۔

(۴)

[illegible]

کنگن والا" واقعہ انہوں نے دیکھ لیا۔ کیا
وہ ناراض ہو گئے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ
خیالات بڑی جلدی سے دل میں گذرے اور
غائب ہو گئے۔ یوگیشور ادھر چل پڑے میں
کانپتا رہ گیا اور پشپ دیکھتی رہ گئی۔
جنگلی ہوا بھی سہم گئی۔ گنگا سے جل کا شور
دھیما پڑ گیا۔ یوگیشور نہ معلوم کدھر نکل گئے
آخر پشپ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا
اور ہم بھی چل پڑے اچانک اندر سے کوئی
کڑک کر بولا ہائے راجندر یہ کیا؟ تم
اس جنگلی پھول کو کس باغ میں لئے جاتے
ہو؟ اس آزاد دنیوی جھنجھٹوں سے بری
سورگی جیون بسر کرنے والے جیو کو کس جال سے
باندھنے لے چلے ہو۔

(۵)

پشپ اب میرے گھر میں مہک پھیلا
رہی تھی۔ وہ جنگلی پھول اب نئے رنگ میں
آ گیا۔ یہ پشپ اب مجھے کتنا پیارا تھا۔
میں اس کی خوشبو سے کتنا مست ہوتا تھا
[illegible] اس کا رنگ اس کا ڈھنگ مجھے کتنا
بھاتا تھا [illegible] سوالوں کے جواب میرے
دو سال
...کے ہاں
...کیا بالکل
...ب کی ادائیں
...والی خوشبو
...افی ہیں۔
...نچانے والی
دنیا کی عورت
...تے مجھے اور
...در دل کو بھی
...ں سو

دل کی نہیں تفسیر کمند آنکھیں ہیں ظالم
یہ جا کے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا
پھر کیا تھا اتنے دنوں کی دھرم سکھشا۔
تمام دھن دولت باپ دادوں کی عزت
اور دھرم پتنی سے پریم ایک ایک کر کے
سب اس بھڑکتی ہوئی خواہش کے اگن
کنڈ میں خاک ہونے لگے۔ آگ اور بھڑکتی
گئی۔ اس چھنالہ کی چکنی نظر اور چیڑی باتیں
اور بھی گھی برسانی رہیں۔ گھر بار سب جل اٹھا
میں بھی آخر جلنے لگا لیکن جوں جوں جلتا
گیا زیادہ جلنے کی خواہش جلاتی رہی۔
پانچ مہینے گذر گئے یہ خمار دور نہیں ہوا۔
بنارسی ساڑھی۔ پارسی جاکٹ۔ موتی کا ہار
کامدار شال۔ گھر بھر کی تمام چیزیں اس
شہری پھول کے تال پر ناچنے والے
پاؤں پر رکھ دیں اور پشپا اب تو موسم خزاں
کی بیل بن گئی تھی۔ جس کے ساتھ ایک
بھی پھول یا پتہ نظر آتا تھا۔ دن بھر بہانہ
سازی کے لئے پھولوں کی مالا گوندھ کر پشپ
کے گلے میں اور شام کو موتی کی مالا اس
چھنالہ کے گلے میں ڈال دیتا۔ یہی میرا
دن رات کا کام ٹھہر گیا تھا۔
ایک دن یہ تمام باتیں کھل گئیں پشپ
بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی اس کی
آنکھوں میں آنسو نہ تھے اور میری آنکھوں
میں رحم نہ تھا۔

(۶)

برسات کی رات تھی رم جھم بوندوں کی جھڑی
لگی ہوئی تھی۔ چاند بادلوں سے آنکھ مچولی
کھیل رہا تھا۔ بجلی رہ رہ کر تڑپ جاتی تھی
وہ کیسے بے چین دیکھ کر تڑپ جاتی تھی؟
یہ سوچنے کا وقت میرے پاس نہیں تھا
میں تو اس چھنالہ کے گھر سے بری طرح

کر کے نہ آئے
پھول کملا گیا
سورج مغرب کی ...
اپنا خون اس کے قدموں ...
شوخ گرم گرم کو سینے سے لگا لیا۔
کی رات وہاں رہا۔ پھر مشرق سے جا کر
بھی لیل و نہار ہے۔ یہی روز و شب کی داستان
اب میں سر راہ سلگتی ہوئی انگیٹھی ہوں
سرد مہر راہ گیر ہاتھ سینک کر جاتے ہیں۔
میں جلتی رہتی ہوں۔

میں ماں بننے ...
تھی زہر پلا دی گئی

ٹوٹا تھا۔ آنکھوں کے اُوپر نہ چاندنی تھی نہ بادل کلیجہ میں بار بار درد ہوتا تھا۔ ہائے اگر ایک انگوٹھی ہی اس وقت ہوتی تو اسے دیکھ اس کے نازک و نرم ہاتھوں کا بوسہ لیتا۔

گھر پر واپس آیا۔ آتے ہی نوکرانی کو آواز دی چمپا! چمپا! پشپا کے پاس اگر کچھ بھی باقی بچا بچایا ہو تو فوراً اس سے مانگ لاؤ۔ اوپر سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ ہاں سر کے اوپر سے ایک سیاہ بادل گڑگڑاتا ہوا اٹھا ایسا شور ہوا کہ میرا سر گھوم گیا۔ میں فوراً چھت پہ دوڑا گیا۔ صندوقوں کو دیکھا۔ جو کچھ ملا سب توڑ پھوڑ ڈالا لیکن کوئی مطلب کی چیز نہ ملی جسے لے کر میں ناچنے والی نہیں! نہیں! ناچنے والی کے پاس جا سکتا۔ الماری کھولی اس میں صرف مکڑی کا جالا تھا۔ اسی وقت میں پشپا پر جھپٹا۔ پاس جاتے ہی سہم گیا۔ وہ ایک تکیہ کے سہارے حیران و پریشان مایوسی کی مجسم تصویر بنی بیٹھی تھی۔ چاندنی کھڑکی میں سے ہو کر اسے دلاسا دینے کے لئے آئی تھی لیکن اس کی سخت مصیبت کو دیکھ کر اپنا منہ بادلوں میں چھپا لیتی تھی چاند اپنے کوندنی کے پھول دیکھ کر سیاہ پڑ گیا بھیگی ہوئی ہوا اس پھول سے جسم کو پنکھا کر رہی تھی۔ منہ پر ایک دلفریب نظارہ تھا۔ لیکن بھولی بھالی صورت کے ساتھ اداسی کی ملاوٹ اور بھی بھولا پنا رہی تھی۔ لیکن چہرہ اب زرد ہو گیا تھا۔ جسم نحیف ہو چکا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ننھی سی جان کہوں اور کہاں اٹک رہی تھی ہاں آنکھوں میں ایک زندگی کی چمک تھی۔ شاید زندگی جسم سے نکل کر وہیں بیٹھ رہی تھی۔ میں پھر پکار اٹھا۔

"پشپا تمہارے پاس کوئی اور بھی زیور بچ گیا ہے"

پشپ ہاتھوں کے کنگن ہیں۔

میں کہاں ہیں ذرا دیکھنے تو دو!

اس نے آہستہ سے گھونگھٹ سرکا کر کہا۔ یہی کانوں کے کنگن۔ سر تکیہ سے سرک گیا۔ آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ جو ننھی سی جان آنکھوں میں کسی کے انتظار میں بیٹھی تھی اڑ گئی۔ کیا صرف اتنے ہی کیلئے ٹھہری تھی۔ میری آنکھیں زرد جنگلی پھول کے چہرے پر جا پڑیں۔ وہی کنگن تھے۔ ویسے ہی کانوں کو گھیر کر بیٹھے تھے۔ رشی کنبش کے جنگل کا واقعہ فوراً یاد آ گیا۔ جیسے دشینت نے انگوٹھی کو پہچان کر بھولی ہوئی شکنتلا کو یاد کر لیا تھا۔ اور اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔ ویسے مجھے بھی اپنا جنگلی پھول یاد آ گیا۔ لیکن میں اب اس پھول کو کہاں پاتا وہ پھول اب بھومی ماتا کی گود میں چلا گیا تھا۔

ساری باتوں سے پردہ اٹھ گیا چڑھا ہوا نشہ اتر گیا۔ آنکھوں پر کی پٹی کھل گئی۔ لیکن ہائے پردہ اس وقت اٹھا۔ نشہ اس وقت اُترا اور پٹی اس وقت کھلی جب زندگی میں صرف اندھکار ہی اندھکار رہ گیا تھا۔

پشپا مجھے کنگن بھی دیتی ہے۔ لیکن چھنالہ سب دھن دولت عزت طاقت لیکر بھی انگوٹھی کی خواہشمند ہے۔ اوہ! میں نے کیا کیا۔ سچ ہے جنگلی پھول کی قدر شہری لوگ کیا جانیں۔ میں اسی سوچ میں اب دن رات جنگل میں جنگلی پھولوں کی قدر کرنے کے لئے پھرتا ہوں۔ جنگلی پھول مجھے دیکھ کر آپ خود افسردہ ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پشپا کی تلاش کے لئے زمین میں دھنس جاؤں لیکن جان ابھی تک پشپا کی تلاش کرنے کے لئے جسم میں اٹکی ہوئی ہے۔ ــ ۵

وہ نہیں بھولتی جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

گناہ کی یاد

(بقیہ صفحہ ۱۳)

صرف ایک لنگوٹ وہ بھی جگہ جگہ سے پھٹا ہوا۔ لڑکے اس کے پیچھے مٹی پھینک پھینک کر شور مچا رہے تھے۔ وہ میرے پاس آ کر بچے کو گھورنے لگا۔ بچہ ڈر کر میری چھاتی سے چمٹ گیا۔ میں نے اسے پاگل سمجھ کر نوکر کو آواز دی کہ باہر نکال دے۔ وہ میری طرف دیکھ کر کچھ بڑبڑانے لگا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ پاگل اور کوئی نہیں میرا مظلوم چپڑاسی تھا کلیجہ کانپ اٹھا۔ خون کی حرکت رک گئی میں نے کچھ پیسے اس کی طرف پھینکے اور التجا کہا۔ جاؤ۔ جاؤ۔ خدا کے لئے جاؤ۔ پیسے اٹھا کر اس نے لڑکوں کی طرف پھینک دئے اور پھر میرے بچے کو دیکھ کر بڑبڑانے لگا۔ بچہ رو پڑا۔ میں اسے لے کر اندر چلا گیا۔ اسی رات وہ بیمار ہوا اور تین دن بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ مرتے وقت وہ مسکرایا تھا۔

میں نے گھر بار وطن سب کا تیاگ کر دیا پر جسے بھولنا چاہتا ہوں وہ نہیں بھولتی وہ اب تک سوہان روح بنی ہوئی مجھے اندر ہی اندر گھن کے کیڑے کی طرح کھائے جاتی ہے۔ وہ کون؟ اس گناہ کی یاد۔

ایڈیٹر

ہار جیت

از جناب عالم سیاہ پوش کلانوری

راج پنڈت نے "کبیر بھگت کی کیفیات میں ڈوبے ہوئے دوہوں کا چرچا سنا تو آتش حسد سے بھڑک اٹھا ـــ اس نے اپنے وقار علم کی بے حرمتی محسوس کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے علمیت کے قصر بلند کے سامنے کوئی ایسی جھونپڑی سا جس کی سادگی کا شہرہ اس کے بلند مرتبت نام آوری کے محل کو نظر انداز کرے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں۔ ایک جھکڑے پیدا کر پنڈت بھگت جی کے گاؤں میں پہنچا۔ اور اسے اہم مسائل پر حکیمانہ بحث کرنے کا پرجوش چیلنج دیا! بھگت نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے عرض کیا! طویل بحث و تکرار کے بعد آپ کا مقصد مجھے ہار منوانا ہی ہے نا! میں اس قسم خراشی سے پہلے ہی ہار مان لیتا ہوں! بھگت نے ایک کاغذ پر لکھ دیا۔ بھگت کبیر ہارا اور راج پنڈت کی شاندار فتح ہوئی۔ راج پنڈت بھگت کا شکست نامہ لے کر راج دربار میں آیا۔ اور کہا "مہاراج! کبیر تو جاہل مطلق ہے۔ کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ تو مجھ سے ایک بات بھی نہ کر سکا۔ یہ ہے اس کا شکست نامہ" راجہ نے شکست نامہ پڑھا تو حیران ہو گیا! کیونکہ وہاں بھگت کی ہار کی بجائے راج پنڈت کی ہار اور بھگت کی فتح لکھی تھی۔ پنڈت کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا ـــ اس نے سوچا! بھگت نے لکھنے میں استادی کی ہے۔ وہ بھری سبھا میں اپنی رسوائی کو برداشت نہ کر سکا ـــ اور دوبارہ بھگت کے پاس آیا ـــ! بھگت نے پھر التجا کی کہ آپ خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہیں پنڈت جی! میں نے تو اپنی ہار ہی لکھی تھی اب پھر لکھے دیتا ہوں۔ پنڈت بغور دیکھتا رہا۔ بھگت نے لکھا۔ بھگت کبیر ہارا اور راج پنڈت کی شاندار فتح ہوئی۔ دربار میں پنڈت جی نے دوبارہ بھگت جی کا شکست نامہ پیش کیا ـــ لیکن اسے انتہائی شرمندگی اور حیرت ہوئی کیونکہ تحریر کے الفاظ بھگت کی فتح کی صورت میں بدل چکے تھے ـــ! پنڈت کے غرور علم کا قلعہ مسمار ہو گیا۔ وہ ایسا علم پڑھا ہی نہ تھا جس میں ہار ہی جیت ہوتی ہے۔ پنڈت بھگت جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ بھگت جی

(بقیہ صفحہ ۷)

سال کی لڑکی کو ابھی تین سال بٹھلانے کی انہیں ہمت نہ ہوئی تو اس کیلئے انہیں کچھ برا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ کانگرس اور حکومت میں سمجھوتہ ہو گیا۔ جو تمام ستیہ گرہی چھوڑ دیئے گئے۔ ورنہ جانے میرا کیا ہوتا؟

خیر رما جس کی قسمت کی تھی اس کے ہاں جا رہی ہے لیکن آخری بار مجھے ایک دفعہ اسے دیکھ تو لینا چاہئے۔ اس لئے میں آج رما کے گھر جا رہا ہوں۔

۵ دسمبر ۱۹۴۲ء

آج جس وقت میں رما کے گھر پہنچا۔ دروازے پر بینڈ بج رہا تھا۔ باراتیوں سے آنگن بھرا ہوا تھا۔ رما دلھن بنی بیٹھی تھی۔ عورتیں شادی کے گیت گا رہی تھیں۔

سب سے پہلے مراری کی نظر مجھ پر پڑی وہ بے اختیار چلا اٹھے۔ "موہن لال"

مراری کی زبان سے میرا نام سنا تھا کہ رما نے پاگلوں کی طرح اپنا گھونگھٹ الٹ دیا۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ اور دونوں رخسارے آنسوؤں سے تر تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ میں ایک کنارے بت کی طرح کھڑا تھا۔ رما کی نظر ایک بار مجھ پر آ کر رکی۔ ایک سیکنڈ تو وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پکار اٹھی۔

"تم آ گئے" اور ساتھ ہی شادی کے چبوترے کے پاس غش کھا کر گر پڑی۔

شعرائے مست قلندر

باقیات

جناب شوکت علی شوق ہاشمی

نہ وہ شاخِ نشیمن ہی رہی ہے وہ گلستاں باقی — فقط موہوم سی ہے ایک یادِ آشیاں باقی
جبینِ شوق ابھی کچھ اور سجدوں کی ضرورت ہے — ابھی تو رہ گیا ہے کچھ نشانِ آستاں باقی
مجھے ڈر ہے کہیں یہ خرمنِ دل بھی نہ جل اٹھے — ابھی ان کی نگاہِ ناز میں ہیں بجلیاں باقی
پریشاں پھر رہا ہے کارواں اجڑے ہوئے دل کا — بھلا کیا کارواں جب ہو نہ میرِ کارواں باقی
نہ ہیں وہ چاندنی راتیں نہ ہوتی ہیں ملاقاتیں — مگر اے شوق ہے اب تک خیالِ دوستاں باقی

جذباتِ محمود

نواب محمود علی خاں صاحب محمود

محبت کی فضا ہوتی عقیدت کی زمیں ہوتی — وہیں اک آستاں ہوتا وہیں میری جبیں ہوتی
تمہارے مسکرانے سے فضا ہنستی چمن ہنستا — کہیں ایسا فلک ہوتا کہیں ایسی زمیں ہوتی
اگر دیوانگیٔ عشق ہوتی راہِ منزل میں — قدم میرے جہاں رکتے مری منزل وہیں ہوتی
جھکانا سر کا ہر پتھر پہ توہینِ عبادت ہے — جہاں وہ سنگِ در ہوتا وہیں میری جبیں ہوتی
جلا کر راکھ کر دیتی حیاتِ عشق کو میرے — اگر کچھ سوزِ غم کے ساتھ آہِ آتشیں ہوتی
غمِ فرقت ہی کیا ہی دل کی دنیا تک بدل جاتی — نگاہِ نازاں کی گر محبت آفریں ہوتی
نہ ہل معلوم کب تک روتی رہتی عشق کی دنیا — جو میرا اشک ہوتا اور ان کی آستیں ہوتی
وہ ہوتے اور ہم ہوتے نہ کچھ بھی رنج و غم ہوتا — ہمارا آسماں ہوتا ہماری ہی زمیں ہوتی
مریضِ ہجر کی محمود بس اتنی تمنا ہے! — انھیں جب دیکھ لیتا تب نگاہِ واپسیں ہوتی

پروازِ تخیل

جناب محمد عصمت اللہ قریشی سندھی

عشق میں تو بہ خیالِ حضرتِ موسیٰ نہ بن — دیکھ سوئے دل، ہلاکِ جلوۂ جانانہ بن
کہہ رہا کس نے کسی کے عشق میں دیوانہ بن — خاک گلیوں کی اڑا، رونقِ دہ ویرانہ بن
اس کی صورت، اسکی صورت دیکھنے سے فائدہ — اپنی صورت پر نظر کر اپنا ہی دیوانہ بن
خاک گلیوں کی اڑانا سر پہ ہے توہینِ عشق — بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن
عشق کی عظمت بڑھانے حسن سے درد فراق — وصل کے قصے میں کیا ہے ہجر کا افسانہ بن
چاہتا ہے تو اگر دنیا تجھے سجدے کرے — اپنی ہستی کو مٹا سنگِ درِ جانانہ بن
بھول جا لیلےٰ کی الفت قیس سے اب دل لگا — قصۂ شیریں نہ بن، فرہاد کا افسانہ بن
جس کی ہر انگڑائی میں عصمت ہو رقصاں شہرتیں! — جس کا مشرب ہو ادب وہ مرشدِ میخانہ بن

غزل

جناب سلمان ادیب

اپنی دنیا آپ بنا لے — غم کی لے کو اور بڑھا لے
تیری صدا کان پر لگے ہیں — دور نہیں میں مجھ کو بلا لے
عشق کا دل اب ٹوٹ رہا ہے — دیکھ منا لے اب بھی منا لے
کس کی رہی ہے کس کی رہے گی — پیتا جا اور پینے والے
تو بھی اگر مدہوش ہو ساقی — گرتے ہوؤں کو کون سنبھالے
اس کے جلوے عام ہیں نادان — کیسی مسجد، کیسے شوالے

نوران

سیاسی معاشرتی مختصر

ازادیب انقلاب
حضرت ملک سلمان الارشد فاروقی

امتحان ختم ہو چکا تھا اور گھر جانیکی مکمل تیاری بھی کی جا چکی تھی۔ صرف کنسیشن کا انتظار تھا جو امروز دفردا میں آنے والا تھا۔ میں، اقبال، رشید اور پاشاہ چاروں کے چاروں ایک ہی شہر کے تھے اسلئے انتظار کنسیشن کی یہ گھڑیاں پارکوں، ہوٹلوں اور سینماؤں میں گذاری جا رہی تھیں۔

حمیدیہ کیفے سے نکلے ہی تھے کہ کسی نے کہا۔

"بابوجی۔ کیا اللہ کی راہ میں ایک پیسہ نہیں دوگے؟"

اس سوالیہ جملہ کو سنکر چاروں کی نگاہیں ایک غربت کی جیتی جاگتی تصویر پر مرکوز ہوگئیں۔

چھریرا جسم، سیاہ آنکھیں، معصوم چہرہ تینوں مل کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بہت کافی تھے۔ گورا گورا جسم پھٹے ہوئے کپڑوں میں سے صاف نظر آرہا تھا۔

چار پیسے چار جیبوں سے نکل کر اس حسین ہاتھ پر آگئے جو ان کا منتظر تھا۔

"خدا کرے چاروں دولہا بنیں!"

"ہشت! کیا فضول اور لغو دعا دی ہے"

پاشاہ نے اپنی فطری متانت کے ساتھ کہا۔

"ہے خوبصورت!" رشید نے پیچھے مڑکر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دوشیزہ معلوم ہوتی ہے" اقبال نے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ ہو بدمعاش!" پاشاہ کی آواز میں غصہ کا عنصر نمایاں تھا۔

"یہ ہم کو تسلیم ہے کہ ہم بدمعاش ہیں۔ اسلئے کہ ہم نے فلسفہ جیسے خشک مضمون کو نہیں لیا ہے"

اقبال اور رشید نے مسکرا کر پاشاہ کو دیکھا۔

"تم کیوں نہیں بولتے کارل مارکس!" پاشاہ نے مجھ سے سوال کیا۔

"غربت خود ہی ایک حسن ہے!" میں نے بے پرواہی سے کہا۔

ہوسٹل تک ہم لوگ اسی فقیرنی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ہم تینوں کی رائے تھی کہ وہ خوبصورت ہے اور پاشاہ کا استدلال تھا کہ اس کو خوبصورت کہنا بھی توہین خوبصورتی ہے۔

کسی خاص ضرورت سے بازار جا رہا تھا۔ گلی میں داخل ہوا ہی تھا کہ وہی فقیرنی نظر پڑی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"بابوجی۔ کیا آج پیسہ نہیں دوگے؟"

میں بغیر کسی وجہ کے رک گیا۔ اور اسے دیکھنے لگا۔ واقعی وہ حسین تھی اور بڑی بیدردی سے شباب نے طفلی کی جگہ لے لی تھی۔

میں نے اسے ایک اکنی دی۔ وہ کل والی دعا دے کر جانے لگی۔

یکایک میں نے سوال کیا "کیا نام ہے تیرا؟"

"نوران! بابوجی"

"نام بڑا اچھا ہے!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"معلوم نہیں" اس نے معصومیت سے کہا۔

"کہاں رہتی ہے تو؟"

"دریا کے پاس"

"تیرے ماں باپ کیا کرتے ہیں؟"

"ماں باپ نہیں ہیں، بابوجی! چچا کے پاس رہتی ہوں"

"وہ تجھے مارتا ہوگا" میں نے یونہی سوال کیا۔

"ہاں بابو۔ اگر پیسے کم ملتے ہیں تو مارتا ہے کھانے کو نہیں دیتا ہے"

"وحشی! درندہ!" میں نے غصہ سے کہا۔

"وہ تیری شادی کیوں نہیں کر دیتا؟"

وہ جھینپ گئی۔ حیا کی سرخی قوس وقزح کی طرح سے اس کے حسین رخساروں پر نمودار ہوگئی ـــــ میں چلا آیا۔ راستہ بھر جسم میں ایک سنسنی سی ہوتی رہی ـــــ

سویرے سویرے میں دریا کی طرف سیر کو نکل گیا۔ واپس آ ہی رہا تھا کہ پل کے موڑ پر نوران آتی ہوئی نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔ میں نے پوچھا۔

"نوران پیسہ نہیں لوگی؟"

"نہیں بابوجی اکنی لوں گی!"

"اکنی تو میرے پاس نہیں البتہ اٹھنی ہے"

"تو یہی دیدو بابوجی"

میں اٹھنی اس کے ہاتھ میں رکھ کر چلا آیا۔ وہ مجھ کو دیر تک دیکھتی رہی۔ ہوسٹل میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کنسیشن آگیا ہے۔ اور چار بجے کی گاڑی سے روانگی طے ہے۔

نوران ـــــ آگرہ! ـــــ گھر!

عجیب کشمکش تھی۔ مجھے اپنی حماقت پر ہنسی بھی آئی اور میں نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کیلئے کھلونے لینا ضروری تھے۔ بازار کے ناکے پر پہنچا تو نوران

نظر آئی۔ مگر آج وہ کسی سے مانگ نہیں رہی تھی اس نے مجھے دیکھ لیا کھلونے لیکر میں مڑا۔ یکایک دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ایک دفعہ نوران سے اور گفتگو کر لوں۔ میں نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اُسے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ چند قدم کا فاصلہ دیکر گلی میں آ گئی۔

" نوران! آج تم مانگ نہیں رہی ہو؟"

" نہیں بابو جی۔ آج صبح ایک بڑا بھاگوان مل گیا تھا۔ اس نے بہت سے پیسے دیئے

۳۲ پیسے!" وہ کہکر وہ ہنسنے لگی۔

" تو پھر بازار میں کیوں پھر رہی ہو؟"

" چچا سے تھوڑی کہا ہے "

" کیوں؟"

وہ چپ رہی ـــــ میں گم سم ہو گیا۔

" نوران۔ آج ہم اپنے شہر جا رہے ہیں۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

" کہاں بابو؟"

" اجین۔ وہاں ہمارا گھر ہے "

" بڑی دور ہے کیا بابو؟"

" ہاں نوران۔ بہت دور "

" اب کب آؤ گے بابو؟"

" اب میں نہیں آؤنگا نوران "

" کیوں بابو؟" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

" تم رو کیوں رہی ہو نوران؟"

" بابو تم اچھے لگتے ہو اور تم جا رہے ہو "

" نہ جاؤں نوران؟"

" ہاں بابو!"

" اچھا نوران۔ آنسو پونچھ ڈالو میں جاؤں گا۔ شام کو چھ بجے تاج گنج کے باغ میں ملنا "

وہ سر ہلا کر چلی گئی میرے تمام عزائم کو خاک میں ملا کر۔ اور بالآخر میں نے فیصلہ کر ہی لیا کہ میں نہیں جاؤنگا۔

ـــــــ " عجب آدمی ہو۔ کہاں رہ گئے تھے؟

جلدی چلو۔ گاڑی میں آدھ گھنٹہ رہ گیا ہے " یہ کہکر رشید نے اسباب باہر رکھنا شروع کر دیا۔

" میں نہیں جا رہا ہوں "

" کیوں؟" پاشاہ نے استعجاب سے پوچھا۔

" مجھے پرسوں دہلی جانا ہے۔ ابھی ایک رشتہ دار کا خط آگیا ہے۔ وہ بیمار ہیں "

" کب آیا خط؟"

" ابھی راستہ میں پوسٹ مین مل گیا تھا!"

تینوں چپ ہو گئے ـــــ اسٹیشن پر ان کو چھوڑ کر سیدھا میں مکان کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ یہاں چھوٹا سا کمرہ پسند کر کے میں ہوٹل آیا۔ نئے گھر سے سامان رکھ کر جب میں نکلا تو ۸ بج رہے تھے۔ نوران تاج باغ میں نہیں ملی۔ میں دیر تک تاج محل کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا محبت کے دیوانوں کا حسین نقش چاند کی نورانی روشنی میں اس طرح سے چمک رہا تھا جیسے آسمان پر کوئی حسین ستارہ چاند کی روشنی کو شرمانے کی کوشش کر رہا ہو۔

ــــــــــــــــــ

نوران ـــــ رات بھر اس لفظ کی رعنائیوں میں محو رہا صبح اُٹھتے ہی میں دریا کی طرف نکل گیا۔ مگر نامرادی کے تاریک سایے یہاں بھی میرے ہمراہ تھے۔

دن بھر بازاروں کی خاک چھانی مگر نوران کا پتہ نہ چلا۔ میں خود حیران تھا کہ ایک فقیرنی کیلئے ایک ایم اے کیوں دیوانہ ہے۔

" محبت حماقت ہے!"

مجھے خود اپنی حماقت پر ہنسی آنے لگی۔ گویا یہ حضرت دل نوران کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہو گئے ہیں۔

فقیرنی سے محبت! جو بازاروں میں بھیک مانگتی پھرے اس کو دوشیزہ کہنا بھی ممکن نہیں۔ وہ خوبصورت ہے، جوان ہے ضرور کسی نہ کسی نے

اس کی رعنائیوں سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ مگر وہ معصوم ہے۔ وہ ضرور دوشیزہ ہوگی۔ تو کیا محبت کیلئے دوشیزہ ہونا لازمی ہے؟ لیکن فقیرنی؟ ـــــ کیا ذلیل خیال ہے انسانیت کے اعتبار سے ہر انسان برابر ہے ـــــ دماغ مختلف خیالات کا مرکز بنا ہوا تھا۔

شام کو میں پھر باغ گیا ـــــ ناکامی کا غم لئے ہوئے واپس آ ہی رہا تھا کہ وہ نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ چہرہ کی سرخی شفق کی سرخی کو شرمندہ کر رہی تھی۔ وہ میرے ہمراہ گھر چلی آئی۔ بغیر کسی جھجک کے۔ میں نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا " کہاں تھیں نوران؟ کل بہت تلاش کیا۔ آج دن بھر تمکو ڈھونڈ رہا تھا "

" کل میں باغ میں شام تک رہی بابو۔ پھر میں چلی آئی۔ وہاں بدمعاش چھیڑتے ہیں "

" کیوں۔ کیا کہتے ہیں؟"

وہ چپ رہی۔

" آج دن کو مانگنے کیوں نہیں آئیں نوران؟"

" بخار تھا بابو " ـــــ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا ہی تھا کہ میرے جسم میں ایک خاص کی سنسنی پھیل گئی۔ میں نے ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا " اب کیسی طبیعت ہے "

" سر میں درد ہے بابو "

" میں نے صبح بازار میں تمہارا بہت انتظار کیا "

" بابو جب آپ کل نہیں آئے تو میں سمجھی کہ کل آپ چلے گئے ہونگے "

" واہ! میں اپنی نوران کو چھوڑ کر جا سکتا تھا "

اس نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے مسحور ہوتے ہوئے کہا " اچھا، نوران یہ بتاؤ کہ ہم تم کو اچھے لگتے ہیں؟"

" ہاں بابو جی بہت اچھے "

" کتنے اچھے؟"

" تاج گنج کے برابر " اس نے دھیمے

سے جواب دیا۔

"نورن تم ہم سے شادی کروگی؟"

اس نے نظریں جھکا کر کہا: "اندھیرا ہو رہا ہے بابو۔ آج بدلی بڑے زور کی اٹھی ہے۔"

"بے موسم کی بارش ہے۔" میں نے موم بتی جلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں نورن جواب دو۔"

وہ اپنے دوپٹے کے کونے کو انگلیوں سے موڑنے لگی۔

"بولو۔ نورن؟"

"بابو، ہم فقیر۔ آپ بڑے آدمی ——"

آواز اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

"تو تو ہے بیوقوف!"

"بابو بدلی بڑے زور کی ہے میں جا رہی ہوں۔"

سیاہ بادل تمام آسمان کو گھیرے ہوئے تھے۔ اتنے میں زور سے بجلی کڑکی۔ وہ ڈر کر مجھ سے لپٹ گئی ——!

بادل برابر گرج رہے تھے ——!

جسم کا لمس! میرے بدن میں ایک عجیب قسم کا تشنج پیدا ہو گیا۔ پانی زور زور سے برس رہا تھا —— وہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی —— گرم خون! —— یکایک میرے لب نورن کے لبوں سے پیوست ہو گئے

موم بتی ہوا کے جھکڑ سے بجھ گئی ——

چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی! ——

بجلی کی روشنی میں یکایک نورن کی دوشیزگی کا نور تاریک ہو گیا ——!!

"بابوجی —— گناہ!! —— بری بات ہے بابو! ——"

"نورن! میری نورن!" ——

موسلا دھار بارش کے باوجود نورن پسینہ میں شرابور تھی —— ایسے خوشگوار لمحات بہت آئے —— نورن کی جوانی اور حسین جسم کا میں مالک تھا ——!

مگر نورن میں مجھ کو اب کوئی جاذبیت نظر نہیں آتی تھی اور نہ میں اس میں کوئی کشش پاتا تھا —— آخر ایک روز اجین جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔

ایک ماہ دیر سے آنے کی میں نے معذرت کر دی —— نتیجہ آیا۔ کامیابی نے قدم چومے ایک سال کی جدوجہد اور باپ دادا کی خدمات اور سفارشوں کے اثرات اس صورت میں برآمد ہوئے کہ میں سو روپیہ ماہوار پر بک ہو گیا۔ غلامی کے بعد ضروری ہے کہ ایک عورت کو بحیثیت نصف بہتر کے گھر میں لایا جائے۔ تاکہ وہ غلاموں کی تعداد میں اضافہ کرے۔ چنانچہ قرعہ فال ایک اسٹیشن ماسٹر صاحب کی دختر کے نام نکلا۔ بیگم بھی آ گئیں۔ دو جوانیاں شباب کی مستیوں میں گم ہو گئیں اور غلاموں کی افزائش نسل کے انتظامات شروع ہو گئے

اسٹیشن ماسٹر صاحب کا تبادلہ آگرہ کا ہو گیا تھا۔ بیگم صاحبہ بھی اپنے گھر تھیں ایک غلام کی پیدائش کا تار ملا۔ میں آگرہ پہونچا۔ ایک ماہ کی مسرتوں سے ہمکنار ہونے کے بعد واپسی کی اجازت ملی۔ نوکر ٹانگہ لینے گیا ہوا تھا۔ خوشدامن صاحبہ ناشتہ باندھ رہی تھیں کہ ایک فقیرنی داخل ہوئی۔ گود میں دو سالہ بچہ تھا —— وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

"سہیل بابو!"

وہ اچانک زور سے چیخی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ فقیرنی نے بچہ کو میری گود میں ڈال دیا۔

"یہ کیا؟" خوشدامن صاحبہ نے گرج کر کہا۔

"بھیک کی قیمت!" —— یہ کہتی ہوئی فقیرنی باہر نکل گئی۔

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"نورن"

بیگم کے آنسو بہہ رہے تھے۔ خوشدامن صاحبہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں —— بچہ رو رہا تھا! میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ نہیں رہا ہے بلکہ کہہ رہا ہے: ——

"بھیک کی قیمت"

گھر پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی!!

میٹھے زہر!

جن کو روزانہ استعمال کر کے آپ اپنی صحت کا ستیاناس کر رہی ہیں۔

نمک ۔ یہ دراصل کھانے کو مزے دار بنانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن معدی ترشوں اور خون کیلئے بھی یہ ضروری ہے اس کی زیادہ مقدار استعمال کرنا مضر ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نمک کے زیادہ استعمال سے سرطان اور معدہ کی رسولی جیسے امراض اس لئے پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس کی تیزابیت کی وجہ سے جسم اور معدہ کے عضلاتی ریشوں میں جلن پیدا ہوتی ہے خالص نمک کا زیادہ استعمال اس لئے بھی ضروری نہیں ہے ۔ غذا کے ساتھ سبزیوں، پھلوں اور گوشت وغیرہ کا نمک جسم میں پہنچ جاتا ہے۔

مسالے ۔ یہ محض زبان کے ذائقہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ورنہ ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ مرچیں بعض لوگ بہت زیادہ کھاتے ہیں جو سخت مضر ہیں۔ اس سے آنتوں اور معدہ میں سوزش پیدا ہوتی ہے اور پیچش و بواسیر کی شکایتیں ہو جاتی ہیں تیز مسالے مثلاً سُرخ اور سیاہ مرچ، دار چینی دھنیا، لہسن، لونگ، الائچی وغیرہ کا زیادہ استعمال سخت مضر ہے ۔ ان سے معدہ اور آنتوں کا استر سخت ہو جاتا ہے اور یہ ہاضمہ کو خراب کرتے ہیں۔ معدی رطوبتیں بھی ان کی وجہ سے معمول سے مختلف پیدا ہونے لگتی ہیں جن کی وجہ سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔

چائے اور قہوہ ۔ ان کا استعمال جس کثرت سے ہو رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ ان کی وجہ سے عصبی امراض کی زیادتی ہندوستان میں بھی دوسرے ممالک سے کچھ کم نہیں ہے۔ ان میں سوائے مصنوعی اور غیر ضروری تحریک کے غذائیت نام کو موجود نہیں ۔ یہ حقیقت میں مخدر، مسکر اور زہریلے مشروبات ہیں جن سے دور رہنا صحت کیلئے از بس ضروری ہے۔ عموماً لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مشروبات اعضا کو سکون بخشتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً اس کے بجائے یہ نو اعصاب کو بیکار کر دیتے ہیں۔ قہوہ کا قہوین (Caffein) ایک مہلک زہر ہے اور اسی طرح چائے کا ٹھنین (ٹینن) (جز چائے) ہے ۔ ان چیزوں کی سمیت کا اندازہ اسوقت بخوبی ہو سکتا ہے جب چائے دان یا قہوہ بنانے کے برتن کا اندرونی حصہ دیکھا جائے۔ جن پر ان کے گہرے بادامی رنگ موجود ہوتے ہیں۔ ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اسی چائے دان اور قہوہ دان کی مانند ہماری آنتوں کا اندرونی حصہ رنگین ہو جاتا ہے ۔ پھر بھلا ان کے استعمال سے صحت قوت، اور طاقت حاصل کرنے کی کیا امید رکھ سکتے ہیں۔

حیاتین سے خالی غذائیں ۔ حیاتین یا وٹامن اس جوہر کا نام ہے جسے اپنے مادے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن اس کے باوجود انسانی جسم کیلئے اس کا مہیا ہونا نہایت ضروری ہے ۔ ہماری خوراک بظاہر کتنی ہی اچھی ہو، اور اسمیں دوسرے ضروری عناصر موجود ہوں، لیکن وہ حیاتین سے خالی ہو تو ہم چند روز میں بہت سی خطرناک بیماریوں کا شکار ہو جائیں گے ۔ یہ مادہ کئی قسم کا ہوتا ہے اور جو چیزیں ہماری خوراک میں داخل ہیں، اُن میں سے اکثر میں یہ پایا جاتا ہے مگر بعض غذائیں ایسی بھی ہیں جن میں یہ حیات بخش جوہر موجود نہیں ہوتا، تندرست رہنے کیلئے ضروری ہے کہ یہ غذائیں کم سے کم استعمال کی جائیں ۔ میدہ، مشینوں سے نکالے ہوئے شفاف چاول، مربے، مٹھائیاں گوشت کے خلاصے، بھُنا ہوا گوشت، پکائی ہوئی غذائیں اور ڈبوں میں بند غذائیں ان تمام چیزوں میں کسی قسم کی حیاتین نہیں پائی جاتی اور جن گھرانوں میں یہ چیزیں زیادہ استعمال کی جاتی ہیں ان میں خرابی صحت کی عام شکایت پائی جاتی ہے۔

نفرت کا جذبہ دل کو نقصان پہنچاتا ہے

شہر اٹلانٹک میں حال ہی میں اطبا کے ایک جلسے میں ایک مقرر نے بیان کیا کہ نفرت کا جذبہ انسان کے دل کو نقصان پہنچاتا اور عمر کو کم کر دیتا ہے۔ مقرر نے کہا اگر ہم اپنے دشمنوں سے بھی محبت کر سکیں تو یقینی طور پر ہماری عمریں دراز ہو جائینگی۔ کیونکہ نفرت کے جذبات ہمارے خون کے دباؤ کو زیادہ کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے دلوں پر غیر ضروری کام کا بوجھ ڈال دیتے ہیں۔ مقرر نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ اس جنگ کے نتیجے کے طور پر دل اور شرائین کی بیماریاں بہت کثرت سے واقع ہوں گی کیونکہ جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے ...

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہوجائینگے



سائنس کی حیرت انگیز ایجاد جو سیاہ اور بدنما جلد کو سفید اور دلکش بنا دیتی ہے

"ہندوستان کے تمام کالے گورے ہوجائینگے" یہ فلوروزون کی موجد مشہور عالم فرم کا دعوےٰ ہے۔ جو گذشتہ کئی برسوں سے اس معاملہ کی ریسرچ کر رہی تھی۔ اس ایجاد سے ہر ایک شخص گورا ہو سکتا ہے۔ یہ گھر دفتر ازدواجی زندگی اور سوسائٹی میں عزت اور مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ رات کو سوتے وقت "فلوروزون" کے چند قطرے ہتھیلی پر ڈال کر چہرے پر دو منٹ مالش کیجئے۔ صبح چہرے کو نیم گرم پانی سے دھو ڈالئے۔ متواتر چار ہفتہ ایسا کیجئے۔ اور اس کے بعد آئینہ میں اپنی شکل دیکھئے۔ آپ حیران رہ جائیں گے۔ وہ چہرہ جو سیاہ یا گندمی رنگ کا تھا۔ یا کیل مہاسے اور چھائیوں داغ وغیرہ اور جھریوں وغیرہ سے بدنما ہو رہا تھا۔ چاندنی کی طرح سفید سیب کی طرح سرخ اور بہار کی حسین اور دلکش ہو گیا ہے۔ کیل مہاسے چھائیوں وغیرہ کا نام نشان باقی نہیں رہا۔ اور یہ تمام جھڑے ہوئے چہرہ پر پھر سے جوانی اور بہار آگئی ہے۔ فلوروزون سائنس کی حیرت انگیز ایجاد ہے۔ اس کے ہر قطرے میں اوزون (نیز آکسیجن گیس) سائنٹفک طریقوں سے شامل کی گئی ہے۔ جو جلد کی سیاہی کو اپنے آپ میں جذب کر لیتی ہے۔ اور آپ جب سوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت آپ کے چہرے کی سیاہی کیل مہاسے چھائیاں وغیرہ آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہیں۔ اور چار ہفتوں میں بدنما چہرہ حسین اور دلکش ہو جاتا ہے۔ ہر ایک مرد عورت اس سہل سائنٹفک ایجاد سے دائمی خوبصورتی اور جاذبیت حاصل کر سکتا ہے۔ فلوروزون کے استعمال کے بعد عارضی خوبصورتی حاصل کرنے کے لئے کریم پوڈر وغیرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فلوروزون چہرے کے علاوہ جسم کے ہر ایک حصہ پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ قطعی بے ضرر ہے۔

فلوروزون مکمل کورس تین روپے آٹھ آنہ میں ملتا ہے۔ ڈاک خرچ الگ۔

ہندوستان کے ہزاروں مرد عورتیں "فلوروزون" سے فائدہ اٹھا چکے ہیں

تیار کنندگان:- ہندوستان کے نمائندگان

فلوری کیمیکل انڈسٹریز } فلوروزون ڈپو۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۷۵ بمبئی

نغمۂ زندگی

از جناب ظفر زبیری منزل ریتوران۔ لاہور

ہیں تحیّر زاہبت سے مشرقی رسم و رواج
سب سے بڑھ کر ہے تعجب خیز رسم ازدواج
"عقد" تو ہے غیر کے ہاتھوں میں بک جانے کا نام
مرد و عورت کے شریک زندگی پانے کا نام
"عقد" زنجیر علائق میں اسیری کا مقام
ایک دوشیزہ کے عورت بنکے رہ جانیکا نام
"عقد" دو روحوں کے اک ہونیکا مشکل مسئلہ
زندگی بھر کی رفاقت کا وہ پہلا مرحلہ
"عقد" کے مختار کل ماں باپ ہیں لیکن یہاں
بے حیا اولاد کہلاتی ہے گر کھولے زباں
انتہا تک جن کو کرنا ہوگا آپس میں نباہ
ابتدا میں ان سے استصواب رائے بھی گناہ
مشورہ دولہا دلھن کا اسمیں اک مدِ فضول
دونوں بے چون و چرا کرتے ہیں ایجاب و قبول

گر کہیں قسمت سے رجحانات طبعی مل گئے
پھر تو یہ سمجھو کنول دونوں دلوں کے کھل گئے
اور دونوں کے مزاجوں میں ہوا جو اختلاف
بالیقین اک دوسرے سے وہ کرینگے انحراف
اختلاف چشم و دل شورش اُٹھاتا ہے ضرور
دن کو تڑپاتا ہے راتوں کو رلاتا ہے ضرور

مشرقی عورت کی فطرت کو مگر صد آفریں
اک دفعہ جھکنے پہ جسکی پھر نہیں اُٹھتی جبیں
جس کے دل سے خوئے تسلیم و رضا جاتی نہیں
شکوۂ جور و جفا لب پہ کبھی لاتی نہیں
وہ رفاقت اور محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ اطاعت اور خدمت کے سوا کچھ بھی نہیں
ہے مجازی روپ میں شوہر خدا اس کے لئے
دین و دُنیا کا وہی ہے آسرا اس کے لئے
ترک کر دیتی ہے احساسِ خودی سے رسم و راہ
دکھ اُٹھا کر بھی گلہ کرنا سمجھتی ہے گناہ
دل سے غیریت کے سب پردے اُٹھا دیتی ہے وہ
خود کو کھو دیتی ہے اور شوہر کو پا لیتی ہے وہ

منتشر اوسان ہیں کیسے انہیں باہم کروں
آہ اپنی زندگی کا کس طرح ماتم کروں
کس طرح میرا کٹا عہدِ جوانی کیا کہوں
آنسوؤں کی اور آہوں کی کہانی کیا کہوں
داغ ہیں محرومیوں کے دل پہ بے حد بے شمار
رو رہا ہے خون کے آنسو شباب سوگوار
زندگی بھر میں فریب آرزو کھاتا رہا
کر کے بہم الفت ناکام پچھتاتا رہا
اُف! شباب آتے ہی اک کافر سے الفت ہو گئی
نوجوانی حسن کی پہنائیوں میں کھو گئی
انجمن میں حسنِ خود سر کی رباب عشق تھا
یعنی میں خوش قسمتی سے کامیاب عشق تھا
ہائے پر اس وقت آڑے آ گئی ظالم سماج
دو دلوں کی دشمنی پہ تل گئے رسم و رواج
دونوں ہی سوسائٹی کے ڈاکوؤں سے لٹ گئے
زندگی بھر کے لئے اک دوسرے سے چھٹ گئے

اس کا رشتہ اور میری رہ الگ کر دی گئی ـــــ سرخوشی کی نہر اُف! زہر آب سے بھر دی گئی
جرم از بسکہ تھی اس بارے میں میری خود روی
بندھ گئی اک غیر کے دامن سے میری زندگی

ملتفت ہوتا میں اس سے کس طرح مجبور تھا ـــــ دل تو پہلے ہی محبت میں کسی کی چور تھا
"کنج تنہائی" میں "دخلِ غیر" سے بپھرا ہوا ـــــ رنجِ محرومی میں فرضِ ہمدمی بھولا ہوا
کھویا کھویا سا میں کچھ مخمور سا رہنے لگا ـــــ پاس رہ کر بھی میں اس سے دور سا رہنے لگا
گو وہ ناکردہ گنہ بے جرم ہی مطعون تھی ـــــ پھر بھی چپ رہتی تھی کیونکہ "مشرقی خاتون" تھی
پیکرِ مہر و وفا تھی، آبرو کی جان تھی ـــــ مختصر یہ ہے سکینہ ایشیا کی آن تھی
اس کے ایثار اور قربانی نے قائل کر دیا ـــــ سر جھکانے کی ادا نے مجھ کو گھائل کر دیا
جذبۂ ایثار اس کا رنگ یوں لانے لگا ـــــ میں خود اپنی بے رُخی پر آپ شرمانے لگا
اس کی معصومی پہ مجھکو پیار سا آنے لگا ـــــ اس کے پہلو میں مرا دل چین سا پانے لگا
خود بخود بیگانگی دل سے مرے جانے لگی ـــــ رفتہ رفتہ اس کی الفت دل کو گرمانے لگی
آرزو سنبھلی تمنا پھر جواں ہونے لگی
اک نئی بجلی رگ و پے میں رواں ہونے لگی

ہم محبت اور مسرت کی فضا میں کھو گئے ـــــ اس طرح گھل مل گئے شیر و شکر سے ہو گئے
میرے اُجڑے گھر میں جیسے آ گئی پھر سے بہار ـــــ ہے خدا رکھے زبیر[۱] اس عہد کی ہی یادگار
آہ لیکن سچ ہی یہ شاید کسی کی بات ہے
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے
چند روزہ سرخوشی میں گھل گیا سارا بھرم
چھوڑ کر مجھ کو ہوئی وہ راہیِ ملکِ عدم

مجھکو کیا معلوم تھا میری محبت زہر ہے ـــــ چاہنا میرا کسی کو اک مجسّم قہر ہے
مجھکو کیا معلوم میری صبح میں بھی شام ہے ـــــ میرا پیغامِ وفا بھی موت کا پیغام ہے
مجھکو کیا معلوم تھا یہ مسکرا دینا مرا ـــــ موت کی دیوی کا بن جائے گا نغمیں قہقہا
مجھکو کیا معلوم تھا مَن جاؤنگا میں یوں اگر ـــــ وہ ہمیشہ کے لئے جائے گی مجھ سے روٹھ کر
مجھکو کیا معلوم تھا بنگال[۲] کی آب و ہوا ـــــ ہے سکینہ کیلئے زہر آب اور بادِ فنا
اُف! اُکھڑی سی پڑتی ہے سر سینہ آرزو
موت ہی بس کر سکے گی اب تو چاک دل رفو

اب تو ہر اک سانس اک چلتی ہوئی تلوار ہے ـــــ اس مسلسل موت میں اب زندگی دشوار ہے
چھوڑ دے اے روح! اس ویران گھر کو چھوڑ دے ـــــ توڑ دے اے موت! جسم و جاں کا رشتہ توڑ دے
تشنگیِ شوق کی تکمیل کرنے دے مجھے
اب جیا جاتا نہیں اللہ مرنے دے مجھے

[۱] زبیر میرے اکلوتے لختِ جگر کا نام ہے۔ [۲] بنگال میں میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھا۔ مرحومہ کو وہیں مرض الموت لاحق ہو گیا۔
(ظفر زبیری)

سائنس کی دنیا

کیا مستقبل قریب میں ہماری غذا کچھ اور ہونیوالی ہے؟

ایک عرصہ سے محققین اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ انسانی غذا کی مقدار کو زیادہ سے زیادہ کم کر دیا جائے تاکہ اس قیمتی وقت اور توجہ کو جو غذا کے تیار کرنے اور اس کے کھانے میں صرف ہو جاتی ہے کسی ضروری کام کیلئے خرچ کیا جا سکے حقیقت یہ ہے کہ وہ زمانہ بہت ہی پرلطف ہو گا جب ہم کھانا کھانے کی مصیبت سے نجات حاصل کر لیں گے اور چلتے پھرتے یا مصروفیت کے دوران میں بھوک کے وقت فقط دو گولیاں منہ میں ڈال کر غذا کی ضرورت کو پورا کر لیا کرینگے۔

بوسٹن یونیورسٹی امریکہ کے پروفیسر ڈاکٹر روبرٹ ہارسن نے حال ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کر کے عالم انسانی کو محو حیرت بنا دیا ہے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کو عنقریب مختلف قسم کے کھانوں کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی اور وہ صرف دو گولیوں کے ذریعہ سے اپنی غذائی ضرورت پوری کر سکیگا۔

انسان کیلئے اس سے بہتر کون سا مژدہ ہو سکتا ہے کہ وہ پیٹ کی اس مصیبت سے رہائی پا لے جس کی بدولت وہ آج تک ہزارہا مصیبتوں اور طرح طرح کی مایوسیوں اور ذلتوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔

یہ مسئلہ جس طرح انسان کی اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہے اسی طرح علم طب کے تمام قوانین کے اندر محیر العقول تبدیلی کا سبب بنے گا۔ ڈاکٹر موصوف کی تحقیق کے بعد جس طرح علم طب کے بہت سے اصول غیر ضروری ہو جائیں گے اسی طرح انسان بھی روزی کمانے کی کشمکش سے نجات حاصل کر سکیگا۔ اور پھر یہ ناممکن ہو جائے گا کہ کوئی ستم زدہ روزگار دنیا میں بھوکا مر سکے یا کوئی مفلس اور نادار غذا کی گرانی کی وجہ سے شب کی تاریک گھڑیاں بھوک کی وجہ سے گن گن کر گذارے۔ پھر یقیناً ایسا ہو گا کہ زندگی کے مصائب ایک گونہ کم ہو کر انسانی زندگی نہایت سادہ اور پرلطف ہو جائے گی۔

یہ گولیاں جو دودھ کے سفوف، گیہوں، جو اور جوار کی حیاتین اور کچھ روغن سے مرکب ہیں اس قدر ارزاں ہوں گی کہ انسان سال بھر کی غذا پانچ چھ روپے میں خرید لیا کرے گا۔

اب ہم اس خبر کے تفریحی پہلو سے ہٹ کر اس کو طبی معلومات کے معیار پہ جانچنا چاہتے ہیں طبی تحقیقات ہمارے سامنے یہ معلومات پیش کرتی ہیں۔

(۱) ایک انسان کی زندگی اور اس کی فعالیت کو باقی رکھنے کیلئے چوبیس گھنٹے میں کم از کم سو گرام البیومن، اسی گرام روغن، چار سو گرام مواد شکری، تیس گرام نمک اور کم سے کم تین لیٹر پانی کی ضرورت ہے۔

(۲) انسان کے اعضائے ہضم پہ اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعضا قدرت نے اسی کام کیلئے پیدا کئے ہیں کہ وہ غذا کو چبائیں اور بعض اعضا ایسے ہیں جو اس کو مقام ہضم تک پہنچاتے ہیں اور کچھ اعضا اس کو ہضم کرتے ہیں۔ غرض غذا کی ابتدائی کیفیت سے لے کر انتہا تک اعضا میں ایک فعالیت کا سلسلہ جاری نظر آتا ہے۔

(۳) انسانی نشو و نما اور جسم کی تر و تازگی کیلئے صرف کیفیت غذا ہی کافی نہیں بلکہ غذا کی ایک خاص مقدار اور غذا کے رنگ کو بھی اس سلسلہ میں کافی دخل ہے۔

(۴) معدہ اور انتڑیاں جس وقت مواد سے خالی ہو جاتی ہیں انسان کو فوراً بھوک لگنے لگتی ہے اور ان اعضا کی حرکات لازمہ خاص مقدار غذا پر موقوف ہیں۔ ان حقائق کی رو سے اگر ان گولیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو گولیاں جو زیادہ سے زیادہ چالیس گرام وزن کی ہونگی۔ انسانی جسم کو اصل حالت پر باقی رکھ سکیں گی اور انسان کی غذائی ضرورت کو پورا کرتی رہینگی جو کیفیت غذا کے ساتھ ساتھ غذا اور غذا کے رنگ سے وابستہ ہے۔ غرض ان دو گولیوں کا عمومی غذا کی ضرورت کو پورا کرنا کسی طرح قرین قیاس نہیں۔ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گولیاں حیاتین کی اس مقدار کو پورا کر دیا کریں گی جو ایک انسان کے واسطے لازمی اور ضروری ہے۔

بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ محققین ہمارے لئے کس قسم کی غذا معین کرتے ہیں اور ہم کب غذا کی مصیبت سے نجات حاصل کر سکیں گے۔

ادبِ لطیف

عید

ازجناب جمال افغانی

کل عید ہے ــــ عید ــــ

اور میں ــ "اس" سے کوسوں دور

سڑک کے کنارے پر ــــــ

ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا ہوں ــــ

افکارِ پریشاں میں سرگرداں ــــــ

خیال کی مشین ــــ دماغی پردے پر

ــــ سنہری ماضی کی تصاویر پھینک رہی ہے

ــــ اور میں انہیں تصویر کی آنکھ سے

دیکھ رہا ہوں۔

~~~~~~~~~~

جب ہم دونوں ــــ صرف دونوں

نادانی کے زمانے میں ــــ کھیتوں میں

کودتے پھاندتے تھے ــــ اور کوئی

کوئی بھی ــــ ہم پر معترض نہ ہوتا تھا۔

اس وقت ہم شعور سے دور ــــ

ایک دوسرے کو شاید کیا سمجھتے تھے۔

ــــ کھولی بھالی عید ــــ

~~~~~~~~~~

اور جب ــــ چند سال بعد ــــ

ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہوگئے ــ

تو ہمیں اپنے مادی جسموں کو ایک دوسرے سے

کچھ دور کرنا پڑا۔ پھر بھی ــــ ہماری

گفتگو پر کوئی پابندی نہ تھی ــــ

اور جب وہ کوئیں پر پانی لینے آتی ــــ تو میں

اس کا گھڑا بھر دیتا ــــ نامعلوم کیوں ــــ مگر

ہمارے لئے یہ عید تھی ــــ حسین عید

~~~~~~~~~~

اور جب دنیا ہمیں اس طرح بھی نہ دیکھ سکی تو

ہم رات کی تاریکیوں سے امداد کے طالب ہوئے

اور یاد ہے وہ ــــ وہ نیم کا درخت

جو جنت کے درختوں سے کم نہیں ــــ اور

جس کا خنک سایہ ــــ چاندنی راتوں

میں ہمیں دنیا والوں کی نظر سے پوشیدہ کر رکھتا

تھا اور ہمارے دل ــــ ایک دوسرے کی

آواز کو سن سکتے تھے ــــ وہ عید تھی

ــــ سنہری عید

~~~~~~~~~~

اور اب جبکہ میں دور ــــ بہت ہی دور

ان عبھری کتابوں کے درمیان ــــ کل کی

عید پر تصور کی نگاہ ڈالتا ہوں ــــ تو

مایوسیاں مجھے گھیر لیتی ہیں ــــ کل کی عید

میں میرے لئے کوئی جاذبیت نہیں ــــ

میں ان پچھلی عیدوں کو یاد کرتا ہوں ــــ

اور اب یہ یاد ہی میری عید ہے ــــ

~~~~~~~~~~

جوان بیوہ کو دیکھکر

ازجناب صہبا لکھنوی

ہائے یہ تیری جوانی اور سوزِ بیوگی!!

کس لئے چپ چپ ہے عرضِ حال پر کچھ تو بتا؟
خشک سے ہیں کیوں ترے لب ہائے تر کچھ تو بتا؟

سہمگیں جلوے ہیں، تو ہے اور سکوتِ بے پناہ!
کیوں تری دنیائے رنگ و بو ہے صرفِ اشک و آہ؟

کس لئے ہلچل مچی ہے تیرے احساسات میں؟
گھٹ رہے ہیں گرم نالے کیوں ترے جذبات میں؟

بن گئی ہے کیوں سراپا سوز و غم بستی تری؟
لٹ گئی ہے کس کے ہاتھوں رونق ہستی تری؟

جنبشِ لب میں تبسم کی ادائیں ــــ کیا ہوئیں؟
کیا ہوئیں وہ پھول برساتی نگاہیں، کیا ہوئیں؟

دیکھکر بھیگی ہوئی شب ہوگئی، کیوں بے قرار؟
نذرِ دامن کر رہی ہے کس لئے اشکوں کے ہار؟

عارضِ گلگوں پہ زردی چھاگئی ہے کس لئے؟
ماہِ تاباں پر سیاہی آگئی ہے، کس لئے؟

حیف ہے گر اسطرح لٹ جائے باغِ زندگی
~~~~~~~~~~

کایا پلٹ

از جناب شبیر مارہروی

"اب تمہیں زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں تمہاری طبیعت خراب ہے"۔

موسم گرما کی ایک شام بنارس ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر فرسٹ کلاس کے ایک ریزرو کمپارٹمنٹ کے سامنے ایک حسین، نازک اندام، اور دلکش پچیس ۲۵ سالہ نازنین نے یہ الفاظ ایک چالیس سالہ مرد سے کہے جو اپنے خط و خال سے تو محنتی اور پھرتیلا معلوم ہوتا تھا لیکن بظاہر کچھ بیمار بھی تھا۔ کبھی کبھی اُسے ایسی کھانسی اٹھتی کہ وہ بے چین ہو جاتا تھا۔

مرد۔ پیاری موہنی! تمہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ کاش تمہارے دہلی جانے کی ضرورت ہی لاحق نہ ہوتی میں تمہیں جانے نہ دیتا لیکن تمہاری ماں کی علالت کا تار ایسا تشویشناک تھا کہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا اور یہاں کے حالات و واقعات کی بنا پر ساتھ جانے کی جرأت بھی نہیں۔

موہنی۔ تم پریشان نہ ہو۔ ان دنوں سفر کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس سے پہلے متعدد بار تنہا سفر کر چکی ہوں۔ پرمیشور نے چاہا تو جلد واپس آجاؤنگی۔

مرد۔ اچھا جاؤ، پرمیشور تمہارا نگہبان! لیکن پیاری! ماں کی طبیعت اچھی ہوتے ہی جلد سے جلد واپس آجانا"۔

یہ کہکر وہ موہنی پر ایک حسرت آمیز نگاہ ڈالتا ہوا چل دیا اور موہنی اپنا بستر بچھاکر لیٹ رہی۔

سیٹھ جمنا لعل بنارس کے ایک متمول سیٹھ تھے۔ بڑا کاروبار اور لاکھوں کا بیوپار تھا موہنی انہی سیٹھ کی بیوی اور دہلی کے ایک رئیس کی لڑکی تھی۔ موہنی نے آزاد فضا میں پرورش پائی تھی۔ اس کی تعلیم مغربی طور پر ہوئی تھی۔ پردہ اس کے گھر میں پہلے سے ہی نہ تھا۔ اور اس آزاد فضا نے اُسے رہے سہے پردے سے بھی بے نیاز کر دیا تھا موہنی حسین تھی اور بے باک ناز و انداز کی ایک مجسمہ۔ وہ تیر مژگاں اور سنان ابرو کے وار کرتی تھی لیکن اس کیلئے گھونگھٹ کی آڑ کی متلاشی نہ تھی۔ اس کے حملے برملا ہوتے تھے۔ اور اپنے نیم بسمل کو تڑپتا دیکھکر اکثر خوش ہوتی تھی۔

سیٹھ جمنا لعل نے بالکل سچ کہا تھا کہ ان کا جی ایک لمحہ کیلئے بھی اس سے علیحدہ ہونے کو نہ چاہتا تھا وہ اس کے عاشق تھے اور بجز اپنے اوقات کاروبار کے کسی وقت اس سے جدا نہ ہوتے تھے۔ ان کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے۔ اس اثنا میں دو ایک بار مجبوراً سیٹھ صاحب کو باہر جانا پڑا لیکن اس عارضی جدائی کو انہوں نے جیسا کچھ محسوس کیا اس سے ان کا دل خوب واقف تھا۔ خدا معلوم کیا بات تھی کہ اس مرتبہ وہ ...... اس جدائی کو اور زیادہ محسوس کر رہے تھے۔ موہنی سے رخصت ہو کر وہ اسٹیشن گیٹ کی جانب جا رہے تھے لیکن ان کا دل قابو میں نہ تھا۔ بار بار سوچتے کہ یہ محض وہم کا پھیر ہے لیکن دل مخزوں یہی کہتا تھا کہ اب کے موہنی نے تنہا سفر کیا تو ہمیشہ پچھتاؤ گے۔ آخر اسی کشمکش میں انہوں نے موہنی کی لاعلمی میں کم از کم الٰہ آباد تک اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُسے لاعلم اسلئے رکھنا چاہتے تھے کہ وہ ان کی علالت کے باعث انہیں واپس جانے پر مجبور کرتی۔ ٹرین چھوٹنے میں صرف چند منٹ باقی تھے کہ وہ بکنگ آفس سے ٹکٹ لے کر لوٹے۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا ہجوم تھا وہ انہیں میں رل مل کر موہنی کے ڈبہ سے ملحق ایک ڈبہ میں خاموش جا بیٹھے۔

حدود پلیٹ فارم اور ڈسٹنٹ سگنل سے نکلنے کے بعد ایک نوجوان آہستہ آہستہ گاڑی کی پٹڑیوں پر ہوتا ہوا موہنی کے ڈبہ پر پہنچا۔ کھڑکیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے دستک دی۔ اور نووارد اور موہنی ایک دوسرے کی آغوش میں تھے۔

موہنی۔ (کسی قدر سراسیمگی سی بکتے ہوئے) جگل!

جگل۔ ہاں پیاری! مصیبت و فراق کا زمانہ گذر گیا۔ اب تم ہمیشہ کیلئے میری ہو۔

موہنی۔ جمنا لعل مجھ پر مہربان ہے اور مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے اس پر بھروسہ ہے۔ ان دنوں وہ کچھ بیمار بھی ہے۔ اس لئے مجھے اس کا خیال ستا رہا ہے۔

جگل۔ یقیناً خیال ہوگا لیکن ہماری محبت بھری زندگی ان سب باتوں کو جلد فراموش کرا دے گی۔

موہنی۔ (جگل کی آغوش سے علیحدہ ہو کر) تمہارا یہ طرزِ عمل نہایت شرمناک ہے۔ تمہارے ساتھ آئندہ زندگی آرام سے گذرنے کی امید بھی نہیں۔ مجھے بہر صورت جمنا لعل کا خیال کرنا چاہیئے۔

جگل۔ تو کیا میں تم سے ہاتھ دھو بیٹھوں؟

موہنی۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کر سکتی۔

جگل۔ تو سچ بتاؤ کیا تمہیں مجھ سے بالکل محبت نہیں۔

موہنی۔ آہ! یہ کیسے کہوں! سب سے پہلے تمہیں نے مجھے محبت کا سبق پڑھایا۔ میں بھی تمہاری زوجیت میں آنے کیلئے تیار تھی لیکن مقدر اور مجبوری نے مجھے جمنا لعل سے وابستہ کر دیا۔ تمہارا خیال مجھے ہمیشہ رہے گا لیکن میں اپنے جائز شوہر جمنا لعل سے اپنے تعلقات منقطع نہیں کر سکتی۔

جگل۔ یہ اور زیادہ شرمناک عمل ہے کہ میرا خیال اپنے دل میں رکھتے ہوئے تم جمنا لعل کے ساتھ زندگی گذارو۔ کیا میں جمنا سے زیادہ تندرست، خوبصورت اور چاہنے والا نوجوان ثابت نہیں ہو سکتا۔ میں جیسا کچھ بھی ہوں اچھا یا برا تمہارے سامنے ہوں۔ اپنی روح، اپنی جان اور اپنا سب کچھ تم پر قربان کرنے کو آمادہ ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کیلئے ہیں۔ اور ہمیں ایک دوسرے سے وابستہ رہنا چاہیئے۔ میں نے سب کچھ انتظام کر لیا ہے۔ مغلسرائے کے اسٹیشن پر ہم دونو بجائے دہلی جانے کے کلکتہ جانے والی ٹرین پر سوار ہو جائیں گے۔

شیطان کو ورغلاتے دیر نہیں لگتی۔ اکثر بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔ موہنی نے جگل کی طرف دیکھا۔ وہ خوبصورت تھا، جوان تھا، تندرست تھا، جوشیلا تھا، اور اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔ موہنی کی پرانی محبت نے بھی عود کیا اور بے ساختہ جگل کی آغوش میں جا پڑی اور کہا "اچھا یہ وعدہ کرو کہ تم مجھے کبھی دھوکا نہ دو گے۔"

جگل۔ اس کی تم مجھ سے قسم لے لو۔

~~~~~~~~~~~~

سیٹھ جمنا لعل اپنے ڈبہ میں تنہا تھے اور خوش تھے کہ اس طرح انہیں خیالی پلاؤ پکانے میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ان کے دماغ میں اب تک یہ خیال جاگزیں تھا کہ کوئی ایسا حادثہ رونما ہونے والا ہے۔ جس کا اثر موہنی پر بھی پڑے گا۔ کبھی وہ اپنی حماقت پر ہنستے کہ محض تخیل اور وہم کی بنا پر انہوں نے اپنے کاموں کا نقصان کیا۔ اور اس طرح چوری چھپے موہنی کے تعاقب میں چلے۔ کبھی سوچتے کہ اس قسم کے اوہام اکثر کسی آئندہ حادثہ کا پیش خیمہ ہوتے ہیں لہذا اگر موہنی کو میری ضرورت پڑی تو میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ بہت سی باتوں میں موہنی اپنے معاملات کا انحصار اپنے خاوند پر رکھتی تھی۔

وہ لیٹا لیکن کھانسی کی شدت نے اسے پھر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ آخر اس نے ارادہ کیا کہ چلتی گاڑی میں موہنی کے پاس پہنچنا چاہئے۔ اس نے کھڑکی کھولی اور آہستہ آہستہ آگے چلنا شروع کیا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے گاڑی کی کھڑکی نیم باز حالت میں دیکھی اور کسی مرد کی آواز بھی سنی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ گاڑی کی تیزی۔ گڑگڑاہٹ اور ہوا کی شدت کے باعث کوئی بات تو سمجھ میں نہ آئی لیکن اس نے جگل کی آواز پہچان لی۔ وہی جگل جو دہلی کا رہنے والا ہے لیکن ادھر چند ماہ سے بنارس میں اس کے پڑوس میں مقیم ہے۔

سیٹھ جمنا لعل یہ آواز سن کر چونک پڑے۔ ایک تیر تھا جو دل کے پاس ہو گیا۔ جی میں آیا کہ فوراً ڈبہ میں داخل ہو کر جگل سے جواب طلب کریں کہ تم اس ڈبہ میں کس استحقاق کی بنا پر آئے۔ وہ خاموش کھڑے تھے۔ سانس بمشکل لیا جاتا تھا۔ ضبط دشوار تھا۔ لیکن جذبات کی پہلی رو نکلنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ "بغیر کسی خاص سبب کے اتنا برافروختہ ہونا سراسر بے جا ہے۔ مخصوص ایسی حالت میں کہ جگل سے بھی مخلصانہ تعلقات ہیں اور سسرال والوں سے تو اس کے ایسے تعلقات ہیں کہ کوئی مغائرت ہی نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ بھی اسی گاڑی سے دہلی جا رہا ہو اور اسٹیشن پر میرے رخصت ہونے کے بعد آیا ہو اور موہنی نے اپنی تنہائی کے خیال سے اسے پاس بٹھا لیا ہو لیکن تعجب تو یہ ہے کہ جگل نے آج صبح تک بھی مجھ سے اپنے کہیں جانے کا ذکر نہیں کیا۔

اب سیٹھ جمنا لعل کیلئے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو خود بھی اسی ڈبہ میں جا کر اس صحبت کا لطف اٹھائیں یا بغیر ان کے علم و اطلاع اپنے ڈبہ میں واپس چلے جائیں۔

اب تک ان کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی تھی۔ دونوں کی آواز برابر آ رہی تھی۔ بالآخر کچھ سوچ کر اپنے ڈبہ میں واپس چلے آئے۔ سگرٹ سلگایا حالانکہ ڈاکٹروں نے سگرٹ پینے کی ممانعت کر دی تھی۔ وہ سوچنے لگے "جگل کو میں مدت سے جانتا ہوں اور اب تو سسرال کے تعلقات کی بنا پر اس سے اور زیادہ مراسم ہو گئے ہیں۔ وہ دہلی کا ایک مشہور تاجر ہے چند ماہ سے اپنے کاروبار کے سلسلہ میں بنارس آیا ہوا ہے۔ اکثر میرے یہاں بھی آتا ہے۔ موہنی سے بھی اس کے مخلصانہ تعلقات ہیں۔ اچھا ہوا اس سفر میں اس کا اور موہنی کا ساتھ ہو گیا۔ اب اسے راستہ میں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ مجھے مغلسرائے سے لوٹ جانا چاہئے۔
~~~~~~~~~~~~

انہیں خیالات میں مغل سرائے کا اسٹیشن آگیا۔ موہنی اور جگل حسب قرارداد اتر کر دوسرے پلیٹ فارم کی جانب چلے گئے۔ سیٹھ جمنا لعل اپنے تخیلات میں مست دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد ریل سے اترے اور موہنی کے ڈبہ پر آئے۔ چڑیا اڑ چکی تھی اور پنجرا خالی تھا جمنا لعل کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ خدا معلوم کدھر گئی؟ کیوں گئی؟ ممکن ہے ریفرشمنٹ روم میں ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہیں کہیں ٹہل رہی ہو۔ جمنا لعل کچھ سوچکر ادھر ادھر دزدیدہ نگاہیں ڈالتے ہوئے ٹہلنے لگے۔

~~~~~~~~

جگل اور موہنی ویٹنگ روم میں بیٹھے باہر آنے جانے والوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے اور خود سب کی نظروں سے اوجھل تھے جگل نے ایک بار کسی قدر سراسیمہ ہو کر کہا "موہنی! دیکھو جمنا لعل جا رہا ہے۔ یہ یہاں کیسے پہنچا؟"

موہنی نے اس جانب نظر دوڑائی اور اپنے شوہر کو دیکھا۔ ابھی وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پایا تھا کہ اسے کھانسی اٹھی اور ایسا شدید دورہ پڑا کہ اگر اس کے پاس ایک بنچ نہ ہوتی تو وہ بجائے اس پلیٹ فارم کے گر پڑتا۔

موہنی اسکی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی جگل نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھکر کہا "پیاری! اب یہاں سے چلو کلکتہ جانے والی گاڑی آ رہی ہے"

عورت کی فطرت بھی عجیب و غریب ہوتی ہے بعض اوقات وہ اپنے ارادوں میں ایسی ثابت قدم اور سنگدل ہوتی ہے کہ بڑی سے بڑی طاقت اس کے عزائم میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی لیکن بعض مواقع پر وہ ایسی حساس اور نرم دل ہو جاتی ہے کہ ذرا سا اشارہ اسے بڑے سے بڑے ارادہ سے روگردان کر دیتا ہے جمنا لعل کی محبت اور خاطرداری کی وہ معترف تھی۔ اسکی صورت دیکھ کر اور اسے اس حالت میں پاکر اس کے ضمیر نے اسے غلط راستے سے پھر سیدھے راستے پر آنے کی کوشش کی۔

اس نے جگل پر ایک نگاہ ڈالی اور کچھ سوچکر دروازہ کی جانب چلی۔ جگل نے اسے پکڑ کر کہا "کیا حماقت کرتی ہو؟ ادھر چلو گاڑی میں بیٹھیں گے"

لیکن موہنی اُسے یہ جواب دیتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا کر چل دی "تم نے میری ایک کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور خود مجھے اور اپنے ایک مخلص دوست کو شیطان کی طرح دھوکا دینا چاہا۔ اب تم مجھ سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھو۔ سلام"

اس اثنا میں جمنا لعل کے دورہ کی شدت کم ہو گئی تھی۔ وہ وہاں سے اٹھنے ہی والے تھے کہ موہنی ان کے پاس جاکر بیتابانہ ان سے لپٹ گئی اور بولی "تم نے اچھا کیا کہ تم چلے آئے ورنہ میں کہیں کی نہ رہی تھی بغیر تمہارے
~~~~~~~~

کھیتوں کا بادشاہ

برائے خاص مست قلندر

از جناب
[illegible]
علی عباس
[illegible] اکبرآبادی

خوشنما سرسبز دھانی کھیتوں کا بادشاہ
پاؤں گرد آلود، زخمی اور نسیں ابھری ہوئیں
چشم پُرنم، آہ برلب، ہونٹ پپڑائے ہوئے
چہرہ غمناک پر ظاہر نقوش بے کسی
خشک ہونٹوں پر چلی آتی ہے آہ سرد سی
دل گرفتہ، بارے فکروں کے تھرّاتا ہوا
اس شکستہ حال کا اسکو نہیں ہے کچھ ملال
کیا کرے قسمت کا مارا پاس اک پیسہ نہیں
دل ہی دل میں سوچکر یہ دیکھتے ہو گئے وہ راہ
تف ہے اے زردار تیرے چین تیرے عیش پر
جس کے سرمایہ کی بنیادوں پہ ہوں تیرے محل
رات دن اپنے گذارے عیش میں مستی میں تو
جانفشانی اس کی ہو تیرے لئے وجہ سرور
چند سوکھی روٹیاں ہوں اس کی محنت کا ثمر
مدتوں مرتا ہے جو چلچلاتی دھوپ میں
زور زر سے پنجۂ کمزور کو موڑے ہوئے
ناز ہے اس پر کہ دیدی تو نے بیکس کو شکست
فکر یہ تجھ کو کہ تیری زندگی ہو کامیاب
تو نے مٹی میں ملایا ان غریبوں کا وقار
ہے تری انسانیت پر خندہ زن حیوانیت
تیرے دل میں جذبۂ الفت کی گنجائش نہیں

جا رہا ہے اپنے گھر کی سمت باحال تباہ
کام کی شدت سے دونوں پنڈلیاں سوجی ہوئیں
غم کو وہ کھائے ہوئے اور غم اُسے کھائے ہوئے
رنج کے جھولے میں دیکھو جھولتی ہے زندگی
جسم پر میلے سے کپڑے رُخ پہ ہلکی گرد سی
سر جھکائے جا رہا ہے ٹھوکریں کھاتا ہوا
ہاں مگر ہے بھوک سے بیتاب بچوں کا خیال
ہائے اس بیکس کا کوئی پوچھنے والا نہیں
آسماں کی سمت اٹھ کر رہ گئی اس کی نگاہ
کھول اپنی بند آنکھیں کر غریبوں پر نظر
آہ' اس کی زندگی بن جائے تصویر اجل
اور اس کی آنکھ سے بہتا رہے اکثر لہو
اور اس کا شیشۂ دل سنگ غم سے چور چور
اور پانچوں انگلیاں ہوں تیری گھی میں تر بتر
اس کی دولت مسکرائے قہقہوں کی روپ میں
اپنی مستانہ روی سے اُسکا دل توڑے ہوئے
اسقدر دولت کے نشہ نے کیا ہے تجھکو مست
خاک میں مل جائے چاہے تیرے بھائی کا شباب
چند سکوں ہی پہ سمجھا ہے شرافت کا مدار
اب نہ پہلے سے وہ دل ہیں اور نہ وہ روحانیت
شرم سے اے زر کے بندے ڈوب مر جا کہیں

فہرست قوانین مست قلندر لاہور (۱) مست قلندر ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے اور تین بار پتوں کا مقابلہ کرکے ڈاک میں ڈالا جاتا ہے۔ اسلئے اگر کسی صاحب کے پاس ۱۰ تاریخ تک پرچہ نہ پہنچے تو اسکی شکایت مقامی ڈاکخانہ میں کی جائے اور دفتر میں بھی لکھا جائے۔ پرچہ نہ ملنے کی شکایات کا خط مع نقل جواب ۱۰ تاریخ تک آ جانا چاہئے اس کے بعد چار آنے کے ٹکٹ لفافہ میں آنے چاہئیں (۲) مست قلندر کا مقصد ظرافت، روحانیت اور عام دلچسپی کے مضامین کی اشاعت کرنا ہے۔ ایسے مضامین جن سے اخلاق پر برا اثر پڑے۔ ذاتیات پر بحث ہو یا سیاسی پہلو لئے ہوئے ہوں درج رسالہ نہیں ہو سکتے۔ (۳) لائق اور قابل مضمون نگاروں کو معقول معاوضے دئے جاتے ہیں۔ ہندی گجراتی مرہٹی، بنگالی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنیوالوں کی ضرورت ہے۔ (۴) مضامین نظم و نثر ہر ماہ کی ۵ تاریخ تک آنے چاہئیں (۵) مست قلندر

دو سہیلیوں کے خطوط

محترمہ کلثوم بیگم صاحبہ

پیاری عشو!

تمہارا خط کیا ملا - ڈوبتے کو کنارہ مل گیا۔ میں تو در اصل زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ بس پھندا لگا کر لٹک جاؤں یا جب کوئی گھر میں نہ ہو تو کنوئیں میں گر پڑوں مگر ننھی صغریٰ کا خیال آ جاتا ہے۔ اس کے دن کیسے پار لگیں گے۔ ابھی تو دودھ ہی پی رہی ہے معصوم کہیں بھٹک کر گمراہی تو اس کا عذاب بھی میرے ہی سر ہوگا۔ تم کہتی ہو کہ دولہا بھائی بھی بالکل اسی قسم کے انسان ہیں جیسے صغریٰ کے ابا لیکن پھر بھی تم خوش رہتی ہو۔ یہ میری سمجھ میں تو آتا نہیں جب میں انہیں اپنا مجازی خدا سمجھتی ہوں اور سر تا پا ان کی پجاری بنی ہوں۔ اپنا ہر عیش و آرام انہیں کیلئے وقف کر رکھا ہے۔ انہیں کو اپنی دنیا اور ان کے احکام کو بجا لانا ہی اپنا فرض سمجھ لیا ہے تو پھر کیوں نہ وہ بھی مجھے ہی اپنے دل کا مالک سمجھیں۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں تو کسی نامحرم پر نگاہ بھی نہ ڈالوں اور وہ آزادی کے ساتھ جس سے چاہیں دل لگائیں۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ تم دولہا بھائی سے محبت ہی کرتیں ورنہ محبت کرنیوالا اسے کب گوارا کر سکتا ہے کہ جس سے وہ محبت کرتا ہے وہ اور دل سے بھی دل لگاتا پھرے۔ بہن تم برا کہو یا بھلا۔ مجھ سے تو ان کی یہ زبردستی برداشت نہیں کی جاتی۔ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے کہ کسی حرام زادی کو خط لکھ رہے تھے یکایک اجابت کیلئے چلے گئے اور میں اتفاقیہ ان کے کمرے میں چلی گئی۔ تم جانتی ہو عورت تو شک سے بنی ہی ہے جس کاغذ پر وہ خط لکھ رہے تھے وہ نہایت پھڑک رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے قریب جا کر جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا، کوئی مس روز ہے مالزادی، معلوم نہیں کوئی چمار ان سے پاس جو علیسائی ہو گئی ہے۔ انہوں نے خط میں اس کو جو جو کچھ لکھا تھا وہ اگر کبھی مجھے لکھ دیتے تو شاید فرط مسرت سے مر ہی جاتی ذرا دو ایک جملے تم بھی سن لو تم کو بھی اندازہ ہو جائیگا کہ وہ کس طبیعت کے انسان ہیں خط تو انگریزی میں لکھا جا رہا تھا لیکن میں ترجمہ کر کے لکھ رہی ہوں۔

"تم کہتی ہو میرے بیوی موجود ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ بیوی تو ایک قسم کی گرہستی ہے جو ہر گھر میں رہتی ہے۔ اگر بیوی نہ ہو تو گھر کی دیکھ بھال کون کرے۔ مامائیں چور اچکی ہوتی ہیں بیوی سے یہ خطرہ لاحق نہیں ہوتا وہ بڑی ہمدردی سے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ سچ مانو میری بیوی گھر کی لونڈی سے زیادہ کام کرتی ہے اور اس کے ہونے سے میں بالکل آزاد ہوں۔ کسی بات کی فکر نہیں تم سوچو تو یہ گھر گرہستی کتنے جنجال کی بات ہے جو اس میں پھنس گیا اسے دنیا کا کیا لطف، ہم تم جس لطف سے ۱۲ بجے رات تک دنیا و مافیہا سے بے خبر گھومتے رہتے ہیں وہ بیوی کی عدم موجودگی میں کہاں ممکن تھا اس لئے تم اس کے متعلق تو کچھ سوچو نہیں۔ بس صرف یہ دیکھو کہ میں کس طرح تم پر فدا ہوں۔ اس غریب کو تو مجھ سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ تم یقین نہ مانو گی مجھے تو اس کے پاس بیٹھتے الجھن ہوتی ہے کہاں گلاب اور کہاں دھتورا (دیکھا! بہن وہ جنم جلی گلاب ہے اور میں دھتورا) تمہاری روح پرور خوشبو سونگھنے والا اس کی طرف کیا دیکھ سکتا ہے۔ خیر یہ تو آپ کے شکوہ کا جواب تھا۔ اب یہ بتیئے کہ پرسوں آپ کس روسیاہ کے ساتھ سنیما گئی تھیں ——— "اس سے آگے خط لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ لیکن جو کچھ لکھا جا چکا اسے سمجھنا دشوار نہیں میں روز صاحبہ" ان "کے علاوہ بھی کسی کی دوستی کا دم بھرتی ہیں۔ اور یہ بھی انہیں منظور نہیں کہ میں اس گھر میں رہوں — بہن عشو یہ خط پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے خط پھاڑ کر وہیں رکھ دیا اور اندر آ کر لیٹ رہی۔ وہ جب باہر گئے تو خط کے پرزے دیکھ کر سب کچھ سمجھ گئے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ عرق ندامت میں ڈوب جاتے اور گڑگڑا کر مجھ سے معافی مانگتے مگر واہ رے مرد کی ذات الٹے چراغ پا ہو گئے۔ جامہ سے باہر

ہوکر اندر داخل ہوئے اور مجھے سینکڑوں باتیں سنا ڈالیں۔ کہنے لگے کہ تم کون ہوتی ہو میرے کمرے میں جانے والی اور کیا حق تھا تمہیں اس مضمون کے پھاڑنے کا جو میں لکھ رہا تھا۔ تمہیں کیا معلوم کہ مجھے آج ہی اسے ایڈیٹر شباب کے پاس بھیجنا تھا۔ وغیرہ وغیرہ

میں کیا کہوں بہن اسوقت جو میری حالت ہوئی ہے۔ یہ مرد ہم عورتوں کو کس طرح بیوقوف بناتے ہیں۔ عاشقانہ خط کو مضمون کہہ بیٹھے۔ بھلا مضمون بھی کہیں اعلیٰ درجہ کے رنگین لیٹر پیپر پر لکھے جاتے ہیں۔ میں نے بھی جل کر کہا۔ بس بس مجھے زیادہ بیوقوف نہ بنائیے مضمون ایسے قیمتی کاغذ پر نہیں لکھے جاتے اور نہ یوں القاب آداب سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ کسی جنم جلی سے عشق کر رہا ہے۔ مجھ کو ذرا دھتورانہ سمجھئے۔ میرے بھی دماغ ہے۔ یہ سنکر اور بھی گھر سر پر اٹھا لیا۔ تم مجھے بدنام کرتی ہو۔ ابھی تک نہیں کیا ہے مگر اب کر کے دکھا دونگا۔ جب بدنام ہی ہونا ہے تو پھر فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔ سچ ہے عورت کے ناک ہو تو غلیظ کھائے۔

میں نے کہا بیشک لیکن مرد تو ناک ہوتے ہوئے بھی غلیظ کھاتے رہتے ہیں ———

اس کے بعد بڑی دیر تک ہم دونوں لڑتے رہے۔ دو وقت ہو چکے ہیں انہوں نے تو ممکن ہے بازار میں کچھ کھا لیا ہو لیکن میں نے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا اور کیا لکھوں صغریٰ تسلیم عرض کرتی ہے۔ دولھا بھائی سے بہت بہت سلام کہدینا۔

تمہاری شمیم

بہن شمیم!

تمہارا خط ملا۔ بڑی دلچسپی سے پڑھا تمہاری نادانی پر دیر تک ہنستی رہی۔ تم نے غضب ہی کر دیا کہیں اپنے مجازی خدا سے ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ کیا تم نے پڑھا اور سنا نہیں کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است، وہ تمہارے شوہر ہیں۔ مذہب اور سوسائٹی کے قوانین کے ماتحت ان کی بزرگی قابل تسلیم ہے اور اسے بھی نہ مانو تو بھی تو وہ عمر میں بڑے ہیں ہی پھر ان کی غلطی کو اس طرح کی گرفت میں لانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں انسب ہے۔ لیکن تم نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ درست نہیں۔ تم جانتی ہو مرد ہمیشہ سے عورت پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ مذہب نے بھی ان کا مرتبہ بلند رکھا ہے۔ لہٰذا ان کے دل و دماغ میں یہ جذبہ پنہاں ہو کر رہ گیا ہے کہ وہ عورت پر ہر طرح کا اختیار رکھتے ہیں۔ دوسری طرف محکومیت کی زندگی بسر کرتے کرتے عورت نے بھی اپنی وہ تمام طاقتیں ختم کر دی ہیں جن کو بروئے کار لاکر وہ مرد کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جو قومیں عرصہ تک غلامی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان میں سلطنت آرائی کا مادہ بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم عورتوں کی بھی یہی حالت ہے۔ لہٰذا تم نے بغاوت کی جو لہر اپنے دل میں پیدا کی ہے وہ کوئی کار نمایاں نہ کر سکے گی بلکہ تم کو نہایت ذلت کے ساتھ پسپا ہونا پڑے گا۔ ان جفاکیش مردوں سے یوں کھلم کھلا مقابلہ کرنا نہ آسان ہے نہ ہی اس میں ہمیں کامیابی ہو سکتی ہے۔ اسلئے کہ ہم میں نہ یکجہتی ہے نہ استقلال۔ ذرا سوچو تو کہ آج اگر تم ان سے روٹھ جاؤ۔ ان کا کیا بگڑے گا۔ کل ہی وہ دوسری شادی رچا لینگے۔ دنیا میں اس غلام جنس کی کمی نہیں آجکل لڑکیوں کی اتنی بہتات ہے کہ لڑکی والے یہ بھی تو نہ دیکھیں گے کہ اس مرد نے ایک دوسری غریب کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مرد کوئی مستقل آمدنی رکھتا ہو۔ ہر شخص اپنی لڑکی اس کے پلے باندھنے کو تیار ہو جائیگا۔ لیکن تمہارا کیا حشر ہوگا۔ تمہاری زندگی کتنی المناک اور بے کیف ہو جائیگی۔ اس کے خیال سے دل لرزتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا وقت آئے۔ انہیں کوئی برا نہ کہیگا الٹے تمہاری ہی بدنامی ہو جائے گی۔ مردوں کے افعال دیکھنے والا کون ہے۔ بقول شخصے کہ وہی حاکم اور وہی مدعی جو چاہیں فیصلہ کرلیں۔ داد فریاد کی گنجائش ہی نہیں اسلئے بہن ان سے تو ہر کام شطرنجی چالوں سے نکالنا چاہئے۔ یوں کسی کام کو منع کروگی تو مرد کی ذات اور بڑھ جائے گی نہ کرتے ہونگے تو بھی کرنے لگیں گے۔ دوسرے یہ کہ ایسی باتیں کسی مرد میں نہیں ہوتیں۔ صغریٰ کے ابا شاید سادہ لوح ہیں جو تم نے ان کی کمزوریوں کو پکڑ لیا۔ ورنہ کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔ بھلا گھر میں بیٹھ کر مس روز کو خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی، دفتر میں بھی تو یہ کام ہو سکتا تھا ——— اس سلسلہ میں ذرا اپنے دولھا بھائی کا قصہ بھی سن لو۔ دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ بھی بڑے رنگین معلوم ہوتے ہیں مگر ذرا ڈرتے ہیں۔ آجکل کسی سے پلینگ بڑھا رکھے ہیں۔ رات کو کبھی ۱۱ بجے آتے ہیں کبھی ۱۲ بجے۔ مجھ سے یہ کہہ رکھا ہے کہ جنگ کی وجہ سے دفتر میں کام کی زیادتی ہے۔ ناک میں دم آگیا ہے۔ دو چند اور سہ چند کام کرنا پڑتا ہے۔ میں بھلا کیسے نہ یقین کرتی۔ جنگ کے دفتروں میں آجکل کام زیادہ ہونا ناقابل یقین تو ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ بھانڈا اس طرح پھوٹا کہ ایک روز

پٹنہ سے خالہ اماں کا تار آیا جو دفتر کے پتہ پر بھیجا گیا تھا۔ تار والا دفتر گیا تو دفتر بند تھا اس لئے گھر لے آیا۔ میں نے معلوم کیا تو اس نے کہا دفتر تو بند ہے۔ رات کو جب وہ آئے تو میں نے انہیں تار دیدیا۔ پڑھ کر ذرا گھبرائے اچٹتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد خود ہی ذرا خفیف ہوتے ہوئے کہنے لگے۔ میں تو آج کرنل صاحب کے بنگلہ پر کام کر رہا تھا۔ تار والا غالباً پہلے دفتر گیا ہوگا۔ میں نے نہایت سادہ لوحی سے کہا۔ یہ تو میں نے پوچھا بھی نہیں ممکن ہے دفتر گیا بھی نہ ہو۔ اس خیال سے کہ اس وقت دفتر کہاں کھلا ہوگا۔ انہوں نے جان بچتے دیکھ کر ٹالتے ہوئے کہا خالہ جان کے یہاں جانا ضروری ہے۔ مگر چھٹی ملنا تو بڑا دشوار ہے۔ میں نے کھانا میز پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ بیشک آجکل فوج والوں کو فرصت کہاں مل سکتی ہے خیر کھانا کھائیے اسے بعد میں سوچ لیجئے گا۔

اسی طرح ایک مرتبہ انہوں نے رات بھر غائب رہنے کیلئے مجھ سے بہانا کیا کہ وہ اپنے دوست اظہر کے کسی عزیز کی شادی میں جا رہے ہیں لیکن معلوم نہیں اظہر سے انہوں نے اس ملاقات کا ذکر نہیں کیا اس لئے کہ اسی رات نو بجے کے قریب اظہر نے گھر آکر انہیں آواز دی۔ میں آواز پہچانتی تھی اس لئے میں نے ماما سے کہا کہ دریافت کرو کیا کام ہے معلوم ہوا کہ کام کچھ نہیں ہے۔ کہیں سے واپس ہو رہے تھے۔ ادھر بھی چلے آئے۔ صبح جب واپس آئے تو میں نے اظہر کی آمد کا ذکر بھی نہیں کیا۔ لیکن دفتر جانے پر شاید اظہر نے خود ہی اپنی آمد کا ذکر کیا ہوگا۔ اس لئے شام کو ذرا جلد ہی گھر آگئے اور چائے وغیرہ پی کر کہنے لگے۔ کل اظہر آئے تھے رات میں تم نے ذکر بھی نہیں کیا۔

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ میں سمجھی تھی کہ آپ کو بلانے آئے ہوں گے اور آپ جا ہی چکے تھے۔ ان کے یہاں اسلئے خیال ہوا کہ آپ سے مل کر انہوں نے گھر آنے کا ذکر کر ہی دیا ہوگا ——— وہ کٹ کر رہ گئے مگر میرے چہرے پر ایسی سادگی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ بھلا سوچو کہ تم اس جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔

اب خط ختم کرتی ہوں۔ پھر لکھونگی۔ اس وقت بہت سے کام کرنا ہیں۔ مجھے امید ہے

حسین و جمیل عورتوں کی خرید و فروخت

تہذیب جدید کا تاریک ترین پہلو

وہ ملک جہاں نوجوان کنواری لڑکیاں بھیڑ بکری کی طرح فروخت ہوتی ہیں

یورپ سے مراکش کا صرف بیس منٹ کا ہوائی راستہ ہے جہاں آپ بکثرت خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں خرید سکتے ہیں۔

جیسے جیسے آپ کا ہوائی جہاز اپنے جدید منظر کی طرف آہستگی سے اُترے گا۔ آپ کی نظروں کے سامنے نیچے کی طرف شمالی افریقہ کا سب سے پرانا بازار ہوگا۔ اس کے ایک اندھیرے کونے میں ایک وسیع چبوترے پر بے شمار خوبصورت لڑکیاں بھیڑ بکریوں کی طرح جمع ہونگی۔ ان کی ایک کلائی میں بطور ہتھکڑی کے ایک رسی بندھی ہوگی جو کسی پاس کھڑے ہوئے تاجر کے ہاتھ میں ہوگی۔

اس جگہ بہت بڑا مجمع ہوگا اور اس بھیڑ میں ایک تنومند سوداگر دکھائی دیگا جو ٹھوکریں مار کر لڑکیوں کو ایک اونچی جگہ پر کھڑا کردیگا۔ یہ لونڈی غلاموں کا بازار ہے۔ اس بازار کی لڑکی عرب عورتوں کے برعکس بے پردہ اور بے نقاب کھڑی ہوگی۔ اس کے سیاہ لمبے بال پیچھے کی طرف کھلے ہوئے لٹکے ہوئے ہونگے۔ اس کا خوبصورت بدن اسکے سوڈانی ہونے کا پتہ دیگا۔

بردہ فروش سوداگروں کا مجمع آگے بڑھے گا اور نیلام شروع ہوجائیگا۔ "اس حسین لڑکی کی قیمت ساڑھے چار سو درہم (روپے)" تاجر آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے باتیں کرینگے عرب لوگ قیمت کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ سب سے پہلے وہ اس کا معائنہ شروع کرینگے۔ لونڈی کے ناچ گانے اور دیگر فنون کی نمائش خریداروں کے سامنے پیش کی جائے گی۔ انکار کرنے پر کوڑے برسائے جائیں گے۔ اس کی ایک ایک بات صورت شکل ناک نقشہ بال یہاں تک اس کے دانتوں تک کی باقاعدہ جانچ پڑتال کی جائیگی۔ کیا وہ سخت اور بھاری مشکل کام انجام دے سکے گی؟ کیا بچے پیدا کرسکے گی۔ بانجھ تو نہیں ہے؟ اور کوئی ظاہری یا جسمانی عیب یا بیماری تو نہیں۔ اس کے بعد قیمت پر معمولی ردوکد ہوگی اور بہت جلد اس لڑکی کی قسمت کا فیصلہ ہوجائیگا۔

ـــ یہ آج سنہ ۱۹۴۲ء میں ہوتا ہے۔

شمالی افریقہ میں اب تک لڑکیاں ابی سینیا اور سوڈان کے علاقوں سے اغوا کرکے راتوں رات قافلوں کے ساتھ فروخت کرنے کے لئے غلاموں کے بازار میں لائی جاتی ہیں۔ علاقہ غیر میں وہ خفیہ طور سے یا تاجروں کی نوکر یا بیویاں ظاہر کرکے بیچی جاتی ہیں۔ کسٹم کے افسروں کو بھی یہ لوگ رشوت دیکر کام نکالتے ہیں۔ جب سے کہ یورپ میں جنگ شروع ہوئی ہے۔ اس تجارت اور ان سوداگروں کے حالات نازک اور مشکل ہوگئے ہیں سرحدوں کی حفاظت کیلئے فوجی دستے بڑھا دئے گئے ہیں۔ اور خاردار تاروں سے ناکہ بندی کردی گئی ہے۔ ہوائی دستوں کی محافظتی مستقل پرواز کی وجہ سے خفیہ طریقہ پر لونڈیوں کو بیچنا تقریب قریب ناممکن ہوگیا ہے۔ اس لئے اب یہ لوگ دکاندار تاجروں کے بھیس میں آتے جاتے ہیں۔

ان لونڈیوں کی قیمت میں بازار کے بھاؤ کی وجہ سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ ان تاجروں کو ایک لڑکی کی قیمت بیس سے لے کر تیس پونڈ تک مل ہی جاتی ہے بشرطیکہ وہ تندرست اور خوبصورت ہو۔ پرانی اور استعمال شدہ کی قیمت پانچ پونڈ یا اس سے بھی کم ہوجاتی ہے۔

ایک بہت خوبصورت لڑکی کی قیمت پچاس پونڈ تک اُٹھ جاتی ہے۔ بادشاہوں کے لئے انہیں بحر احمر سے دوسری طرف برآمد کیا جاتا ہے۔ تو ان کی قیمت میں محصول اور کرایہ بھی شامل ہوجاتا ہے۔ ان کو غیر ملکی افسروں کو جگہ جگہ پر رشوت بھی دینا پڑتی ہے۔ قیدیوں اور لونڈیوں کی بڑی نگہداشت کرنی پڑتی ہے کہ بیمار نہ ہوجائیں اور فروخت کے قابل نہ رہیں یا بھاگ نہ جائیں۔ اس تجارت میں منافع بہت کم ہوتا ہے اور بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اگر عربوں کو اور کوئی مفید ذریعہ معاش مل جائے تو یہ بردہ فروشی اپنے آپ ختم ہوجائیگی۔

ان ہزاروں لاکھوں لڑکیوں کی زندگی نہایت ناخوشگوار ہے جو بحر روم، بحر احمر اور خلیج فارس کے اطراف میں ہیں ممکن

ہے کہ ان میں سے بعض شاہی محلوں اور حرم سراؤں کی زینت ہوں اور مشک و عنبر سوز و اگر کی خوشبوؤں میں لپٹی رہتی ہیں مگر زیادہ تر یہ لونڈیاں سخت کاموں اور کھیتوں میں صبح سویرے سے رات گئے تک مشغول رکھی جاتی ہیں۔ پہننے کو پھٹے پرانے کپڑے اور روکھا سوکھا خراب کھانا بے رحمی کا برتاؤ ان کے مقدر میں لکھا ہے۔ مشرقی ملکوں کے دھان کے کھیتوں میں پانی کھینچنا اور دوسرے مویشیوں کے کام سرانجام دینا ان کے لئے لازمی ہے۔

ملک کے بہت کم حصوں میں غلاموں کی قانوناً حفاظت کی جاتی ہے مراکش میں بے رحمانہ غلاموں کے قتل کرنے پر آقاؤں سے بازپرس کی جاتی ہے۔ اگر مالک بہت زیادہ سختی اور ظلم کرتا ہے تو غلام اور لونڈیاں قاضی یا منصف سے شکایت کر سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں صرف آقاؤں کو ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کے علاوہ اور کوئی حکم نہیں دیا جاتا۔ اس لئے ان کے حقوق کی کوئی خاص حفاظت نہیں ہوتی۔

ان پینتیس ۳۵ لاکھ لونڈیوں کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے۔ دو درجن کوڑے مارنا نافرمانی کی معمولی سزا سمجھی جاتی ہے۔ اگر وہ بھاگ جاتے ہیں تو پولیس ان کی مجرموں کی طرح تلاش کرتی اور گرفتار کر کے آقاؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے۔ ان ظالمانہ سلوک کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ان کے گلے میں پھندا ڈال کر سخت دھوپ میں درختوں سے لٹکا دی جاتی ہیں اور بدن پر شہد اس لئے مل دیا جاتا ہے کہ بھڑیں اور شہد کی مکھیاں آ کر کاٹیں۔ نابالغ لڑکیوں کو پابہ زنجیر قید رکھا جاتا ہے۔ لونڈیوں کے بچے آقاؤں کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں اور جوان ہونے پر ان کی آنکھوں کے سامنے بیچ ڈالا جاتا ہے۔ آقاؤں کی خوشی پر ان کی شادی اس لئے کی جاتی ہے کہ بچے پیدا ہوں اور فروخت کئے جائیں اس معاملہ میں لونڈیوں کو اپنی پسند کا اظہار کرنے پر شدید قید کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

اس غلامی اور بردہ فروشی کا سب سے بڑا سبب مشرق کی مفلسی اور تنگدستی ہے۔ قحط سالی۔ سیلاب اور طاعون و ہیضہ کے زمانے میں چین جاپان اور ہندوستان میں ہزاروں کسان اور مزدور اپنی لڑکیوں کو چند سکوں (روپیہ) کے عوض دے ڈالتے ہیں۔ ایک ملک میں صرف ایک سال کے قلیل عرصے میں چھ سو لڑکیاں والدین نے اپنے قرضے ادا کرنے کیلئے بیچ ڈالیں ـــــ اخباروں میں آئے دن ایسے واقعات کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

مشرق میں لڑکیوں کی کوئی قدر و قیمت اور وقعت نہیں ہوتی جب چینی خاندان بھوک کے مرنے لگے تو انہوں نے اپنی لڑکیاں فروخت کر دیں کچھ کسان قرضے میں اس قدر دبے ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنی خوردسال لڑکیاں بہت معمولی قیمت پر قرض خواہ بنیوں کے حوالہ کر دیں۔ چودہ برس کی لڑکی کی قیمت دس پونڈ تک مل جاتی ہے۔ لڑکے بہت کم بیچے جاتے ہیں اور ان کی قیمتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اکثر لڑکیوں کو بیچ کر ان کی آمدنی لڑکوں پر صرف کی جاتی ہے۔

لونڈیوں کے ساتھ چین میں کل مشرقی ملکوں سے زیادہ برا سلوک کیا جاتا ہے۔ چھوٹی لڑکیوں کو جبکہ ان کی عمر چار پانچ سال کی ہوتی ہے۔ خانہ داری کے دشوار کاموں میں جوت دیا جاتا ہے جب کہ آقاؤں کے بچے گڑیا اور کھلونوں سے دل بہلاتے ہیں۔ وہ بڑی ہو کر لونڈیاں ہی رہتی ہیں اور حرامکاری کراتی ہیں۔

مشنری کے لوگوں کو افریقہ اور دوسرے مشرقی ممالک کے ان واقعات کا علم ہوتا ہے اور انہوں نے ان لونڈی غلاموں کے دردناک حالات بیان کئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مخلوق کے ساتھ کس قدر جبر و ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ یہ سب

جادوگر کی ڈائری

از جناب مسعود جاوید

ایک ماہر ہپناٹسٹ کیلئے دُنیا کا کون کام مشکل ہے!

فن ہپناٹزم کے جن حقائق کو سائنس کی مدد سے بھی نہیں سمجھا جا سکتا جو فوق الفطرت ظہورات ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں جو باتیں دُنیا والوں کو ناممکن العمل دکھائی دے رہی ہیں جن کراماتوں کی تاویل انسانی عقل کرنے سے قاصر رہی ہے وہ سب ایک ماہر ہپناٹسٹ کیلئے ممکن ہیں۔ عورت، مرد، بڈھا، جوان الغرض دُنیا کا ہر ایک انسان خداوند کریم کی طرف سے اس دولت لازوال کا امین بنکر پیدا ہوا ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ اپنی جہالت کے باعث جیتے جی کوئی شخص اس گنج نایاب کی کھوج اپنے خانہ دل میں کر سکے لیکن یہ خفیہ طاقت ہے سب کے پاس اور ہر کوئی اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ کیسے؟ یہ جاننے کیلئے "جادوگر کی ڈائری" کا از اول تا آخر نہایت غور سے مطالعہ کیجیے گا۔ (ایڈیٹر)

(مسلسل)

ہپناٹزم ~~~~ اور ~~~~ رُوحانیات

(مسلسل)

ہپناٹزم کے مستفسرین اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ "روحانیات سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

یہی سوال تھا جو سر آرتھر کینن ڈویل آنجہانی نے مجھ سے پوچھا تھا اور جس کا مطالعہ انہوں نے مختلف حالات کے تحت عرصہ تک کیا تھا ہم دونوں نے ہپناٹزم اور روحانیات کا یہ باہمی تعلق معلوم کرنے کی کوشش میں بہت سے تجربے کئے اور آخر کار سر آرتھر نے یہ رائے قائم کر لی کہ ان دونوں چیزوں میں کوئی بھی باہمی تعلق نہیں ہے۔

متذکرہ سابقہ واقعات میں سے چند واقعات ایسے ہیں جو اس کی برعکس رائے کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں لیکن اگر بالکل غور کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہ تعلق درحقیقت اتنا نہیں جتنا کہ نظر آتا ہے۔

مجھے آج تک کوئی مریض ایسا نہیں ملا جو تنویمی بیخودی میں ڈوب کر وہ کام کر سکے جو وہ فطری شعوری حالت میں جاننے کے باوجود نہ کر سکتا ہو مثال کے طور پر ایک شخص جو فطری شعوری کیفیت میں فرانسیسی زبان نہیں بول سکتا یا یونانی زبان کی عبارت کا ترجمہ نہیں کر سکتا وہ تنویمی نیند میں بھی فرانسیسی زبان نہیں بول سکیگا اور نہ یونانی زبان کی عبارت کا ترجمہ کر سکیگا لیکن یہ چیز روحانیات کے تجربوں (حاضرات) میں بالکل عام ہے۔ تنویمی کیفیت میں معمول یا مریض ایک باشعور عامل یعنی ماہر تنویم کے قابو میں ہوتا ہے ــــ اس نیند میں مریض یا معمول کا ارادہ شامل ہوتا ہے اور عامل کے ساتھ ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کے برعکس روحانیات کے تجربوں میں مریض ایک بیہوشی میں ڈوب جاتا ہے اور اس پر کسی خاص "روح" کا قابو ہوتا ہے ان تجربوں میں مریض کی رضامندی کا کہاں تک شمول ہوتا ہے۔ اس بات کا میرے خیال میں ابھی تک اندازہ نہیں لگایا گیا۔

میرے بعض تجربات تو اس یقین کی طرف رہبری کرتے ہیں کہ ہپناٹزم اور روحانیات قطعی متضاد دو مختلف چیزیں ہیں لیکن میں اس بات کو نہیں مانتا کیونکہ یہ دونوں چیزیں عالم انسانیت کے واسطے بہت کچھ مفاد کی اہلیت رکھتی ہیں۔ مگر با ایں ہمہ آپ ذرا ان دو واقعات پر غور فرمائیے جو میں ابھی بیان کرنے والا ہوں اور بتلائیے کہ کوئی ان سے اور کیا سمجھے؟ ــــ میں کوئی تشریح پیش کرنا نہیں چاہتا کیونکہ فی الواقع میں نے روحانیات کا اتنا مطالعہ نہیں کیا کہ ان واقعات کی کوئی توجیہہ یا تشریح کر سکوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان واقعات نے سر آرتھر کو بیحد دلچسپی

میں ڈال دیا تھا۔ وہ خود بھی کوئی توجیہہ یا تشریح پیش نہ کر سکے۔ یہ کام میں دیگر ماہرین روحانیات پر چھوڑتا ہوں کہ وہ ان مظاہر کو سوچا جائیں یا جس طرح چاہیں سمجھ لیں۔

ایک شخص اپنی بیوی کو اعصابی اختلال کے علاج کے واسطے میرے پاس لایا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور میں اس سے یہ کہنے والا ہی تھا کہ ہپناٹزم کے اثر سے سوجانا کتنا آسان ہے کہ یکایک اسکی حالت پوری طرح متبدل ہوگئی پرسکون طریقہ پر نیند میں ڈوبنے کی بجائے وہ اکڑ کر کرسی پر سیدھی ہوگئی اور اپنے ہاتھ گھما گھما کر منہ سے تھوک اور کف اڑاتی ہوئی جلدی جلدی کچھ کہنے لگی۔ میں اس کے الفاظ کو نہ سمجھ سکا تھا لیکن ظاہرا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ سے ہی مخاطب ہے۔ میں نے کوشش کی مگر اسے خاموش نہ کر سکا۔

چند منٹ تک میں اس امید میں چپ چاپ بیٹھا رہا کہ یہ دورہ ختم ہو جائیگا کیونکہ درحقیقت اپنی تمام عمر میں ایسا واقعہ میرے تجربے میں نہ آیا تھا۔ اس عورت پر یقیناً میرا "قبضہ" نہ تھا کیونکہ میں نے ابھی تک اسے کوئی بھی حکم نہ دیا تھا۔

میں اس کے شوہر سے مخاطب ہوا ۔۔۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟" میں نے پوچھا۔ "میں بالکل معذور ہوں۔ کیا آپ کچھ کر سکتے ہیں؟"

وہ مسکرانے لگا ۔۔۔ "ایک دو منٹ میں وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے کہا۔

"صحیح ۔۔۔ لیکن اس پر کسی شیطان کا اثر ہے؟ کیا اسے دور کرنے میں آپ میری کچھ امداد نہیں کر سکتے؟"

ان الفاظ نے اس کو قدرے خوف زدہ کر دیا "چپ! چپ!" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ شیطان کا اثر نہیں ہے شاید ہمیں آپ کو پہلے ہی بتا دینا چاہئے تھا۔ ہم روحانیات کے معتقدین ہیں۔ اسوقت اس پر ایک جاپانی روح کا قبضہ ہے اور یہ روح ہمیشہ اسے اسی طرح استعمال کرتی ہے۔"

"خواہ شیطان کا اثر ہو یا نہ ہو" میں نے جواب دیا۔ "یہ ظاہر ہے کہ اس پر جو جن قابض ہے وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ اس روح کے دور کرنے میں میری مدد کیجئے۔"

اس پر وہ شخص اپنی کرسی سے اٹھ کر اپنی بیوی کے قریب گیا۔ اور اس کے چہرے کے سامنے چند بار اپنے ہاتھ ساحرانہ طور پر گھما کر اور اسکے سر پر اپنا گھونسا ہلاتے ہوئے بھدی آواز میں بولا ۔۔۔ "چلے جاؤ! ۔۔۔ جاؤ! ۔۔۔ جاؤ!"

معلوم ہوتا تھا کہ اس کے احکام نے حسب دلخواہ اثر کیا کیونکہ اس کی بیوی کی حالت بتدریج پرسکون ہوگئی اور رفتہ رفتہ اپنی معمولی حالت پر آگئی۔

ایک یا دو روز کے بعد مجھے ان لوگوں کا ایک خط ملا۔ اس خط میں مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ ان سے پھر ملاقات کروں اور اس عورت پر نیند طاری کر کے اس کے اعصابی مرض کا علاج کر دوں۔ لیکن میں نے انکار کر دیا ...... ممکن ہے کہ وہ "روح" میری دشمن ہو یا ممکن ہے کہ کوئی اور سبب ہو۔ میں اس انکار کی حقیقی وجہ بتلانے یا جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

خود ماہرین روحانیات بھی اس واقعہ کے جزئیات کی توجیہہ و تشریح نہیں کر سکے ہیں بہت سے ماہرین سے اس معاملہ پر تبادلہ خیالات کیا ہے لیکن سب کے سب مساوی طور پر لاعلم ثابت ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس وقت تک کیلئے جب تک موجودہ تاریک سوالات پر تحقیق و تدقیق کی روشنی نہیں پڑتی ہمیں اس موجودہ واقعہ کو اسی جگہ چھوڑ دینا ہوگا انسان "نامعلوم امور" سے بحث نہیں کر سکتا۔

ایک دوسرے موقعہ پر مجھے ایک تجربہ ہوا جو براہ راست روحانیات سے متعلق تھا اور یہ واقعہ بھی ایک بار پھر یہ امر واضح کرتا ہے کہ تحت الشعوری دماغ کی آنکھ کی قدرت کتنی لامحدود ہے۔

کسی گذشتہ باب میں میں نے ایک بیوہ عورت کے لڑکے کا قصہ بیان کیا ہے جسکو میں نے لکنت اور ایک شل شدہ بازو کی مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ وہ لڑکا اکثر مجھ سے ملنے آتا ہے اور جب مجھے تنہا سمجھتا ہے تو بغیر اطلاع میرے کمروں میں گھس آنے کا عادی ہوگیا ہے۔

ایک روز وہ اچھلتا کودتا ۔۔۔ اپنے کمزور بازو کو ہوا میں گھماتا اور پورے زور سے گاتا ہوا ٹھیک اسوقت میرے کمرے میں آگیا جبکہ اتفاق سے میرے پاس ایک مریض موجود تھا۔

یہ مریض ایک سن رسیدہ شخص تھا ۔۔۔ اس واقعہ کیلئے ہم اسے اسمتھ کہیں گے ۔۔۔ وہ ایک عجیب قسم کے مرض میں گرفتار تھا۔ وہ نشست کی حالت میں بالکل ابوالہول کی طرح بےحس و منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تقریباً ایک پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہوگیا ہے۔ وہ چل پھر نہ سکتا تھا۔ وہ بمشکل ہی کوئی حرکت کر سکتا تھا اور رات دن اس ایک نشست کی حالت میں رہتا تھا اس کے ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھے رہتے تھے۔ وہ نہ دائیں طرف دیکھ سکتا تھا اور نہ بائیں طرف ۔۔۔ کھانا کھانے سے معذور تھا اور مشکل سے کچھ بول سکتا تھا۔

اس کے علاج میں مجھے یہ دشواری درپیش تھی کہ وہ نیند میں ڈوبنے پر کسی طرح راضی نہ

ہوتا تھا۔ جیسا کہ میں پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ اگر چہ چند حالات میں میں مریض کو بیدار رکھ کر بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں لیکن شدید امراض میں میں ہپناٹزم کی نیند کی حالت میں علاج کرنے کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس حالت میں مجھے تحت الشعور پر پوری قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔

اسمتھ پر کئی دفعہ کوشش کرنے کے بعد میں نے کسی نہ کسی طرح اُس کی ہڈیوں کے جوڑوں کو اسقدر ڈھیلا کر دیا تھا کہ وہ بذات خود لباس پہن سکتا اور اتار سکتا تھا۔ سیڑھیوں پر اوپر نیچے آجا سکتا تھا ۔۔۔ کھانا کھا سکتا تھا اور اس قسم کے تمام کام کر سکتا تھا بشرطیکہ اس کو عجلت کے بغیر ایسا کرنے دیا جائے۔ لیکن میں اس کامیابی سے مطمئن نہ تھا اور جانتا تھا کہ اگر میں صرف ایک بار اُسے نیند میں ڈوبنے پر راضی کر دوں تو اسی وقت پورا پورا علاج کامیابی کے ساتھ کر سکتا ہوں۔

میں ایک بار پھر اُسے نیند میں ڈوبنے پر مائل کر رہا تھا کہ یکا یک لڑکا آرتھر کمرے میں گھس آیا۔ (اس نے ہماری گفتگو بالکل نہیں سنی تھی جیسا کہ مجھے بعد میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا)۔

"اچھا مسٹر اسمتھ!" میں نے اس لڑکے کی وہاں موجودگی کی وجہ اور اس کی پوری کہانی بتانے کے بعد کہا۔ "میں ابھی دکھاتا ہوں کہ مریض پر کیسے نیند طاری ہوتی ہے" ۔۔۔ اور آرتھر کو ایک آرام کرسی پر بٹھا کر میں نے اسے ایک گہری نیند میں ڈبو دیا۔

میں نے اسمتھ کے فائدہ کیلئے اس لڑکے پر نیند طاری کی تھی۔ اسوقت اسمتھ نے مجھ سے پوچھا کہ یہ لڑکا کیا کچھ باتیں بتا سکتا ہے۔

"کمرے میں اس وقت کتنے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔ تم۔ یہ بوڑھا شخص اور میں خود" لڑکے نے جواب دیا۔

"اور کوئی نہیں؟"

"نہیں"

اس وقت مجھے اس جاپانی روح کا خیال آیا۔

"دیکھو ۔۔۔ کچھ روحیں تو نہیں نظر آتیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں"

"کہاں؟"

"ایک روح ۔۔۔ اس آدمی کی کرسی کے پیچھے!"

"اس کی بابت کچھ بتاؤ"

"یہ روح ایک سن رسیدہ شخص کی ہے اُس کے ایک لمبی سفید داڑھی ہے اور سفید بال ہیں جن کے درمیان مانگ نکلی ہوئی ہے اُس کے سر کے اوپر بال کم ہیں لیکن کانوں کے قریب زیادہ گھنے ہو گئے ہیں۔ وہ ایک لمبا سیاہ کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ اس کا ہاتھ اس کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کے شانے پر رکھا ہوا ہے۔ اور یہ روح اس سے باتیں کر رہی ہے۔ وہ یہ کہہ رہی ہے ۔۔۔ "تم ارسکن کی بات کیوں نہیں مانتے؟ (ارسکن کے ساتھ مسٹر کا لفظ نہ تھا) اور جیسا وہ کہتا ہے کیوں نہیں کرتے؟ اگر تم صرف اس کا کہا مان لوگے تو وہ تمہارا علاج کر دیگا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا مجھے بخوبی علم ہے" ۔۔۔ بس اُس نے یہی کہا ہے۔ روح غائب ہو گئی ہے۔"

میں نے لڑکے کو بیدار کیا اور وہ اپنے گھر چلا گیا۔ اُسے کوئی خیال نہ تھا کہ اس نے کیا دیکھا اور کیا کہا تھا۔

اسمتھ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

"بڑی عجیب بات ہے یہ!" آخر کار وہ بولا۔ "لڑکے نے جو کچھ حلیہ بیان کیا ہے وہ بالکل وہی ہے جو آج سے بیس سال قبل میرے والد کا بحالت حیات تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھے اور اُن کی پریکٹس بہت وسیع تھی جہاں تک مجھے یاد ہے۔ وہ ایک لمبے سیاہ کوٹ کے علاوہ کبھی کچھ نہ پہنتے تھے اور اُن کے بال بالکل ایسے ہی تھے"

لیکن "قبر سے آنے والے اس پیغام" کے بعد بھی وہ راضی نہ ہوا۔ اُس نے پھر بھی نیند میں ڈوبنے سے انکار کر دیا۔ بہر حال وہ اب آہستہ آہستہ صحت کی طرف آرہا ہے اور مجھے اب بھی اُمید ہے کہ میں آخر کار اس کا علاج کر لوں گا۔

ایک تیسرا واقعہ لنڈن کی ایک عورت کا ہے جو ایک ہوائی حملہ کے دوران میں کسی گولے کے دھماکے سے بیمار ہو گئی تھی۔ وہ میرے پاس آئی اور نیند میں ڈوبنے پر فوراً آمادہ ہو گئی لیکن میں اس پر نیند کی حالت طاری کرنے کی کوشش شروع بھی نہ کرنے پایا تھا کہ وہ اچانک ظاہراً کچھ بولنے کی کوشش میں اپنے مُنہ سے تھوک اور کف اُڑانے لگی۔

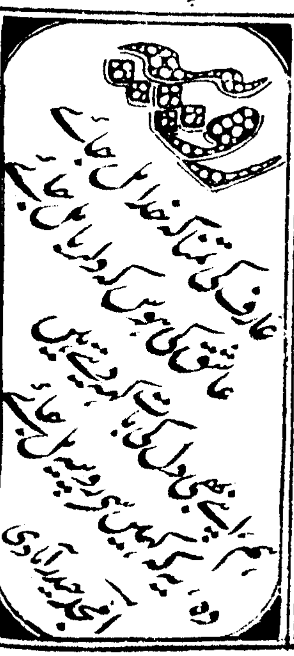
میں اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ کے بعد وہ کھڑی ہو گئی اور جہاں میں بیٹھا تھا وہاں آکر میری کرسی کے قریب ایستادہ ہو گئی اور بالکل چھوٹے بچوں کے لہجے میں مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ یہ آواز اس کی اصلی گہری آواز سے کچھ بھی مشابہت نہ رکھتی تھی۔

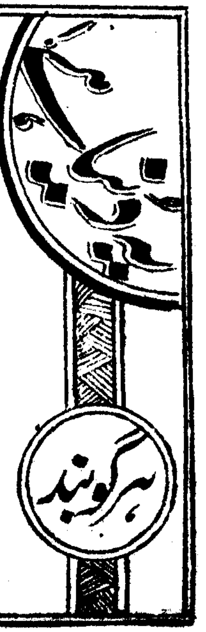
مجھے فوراً یہ واضح ہو گیا کہ کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی بچی ہے اور مجھے اس خیال سے

لطف محسوس ہوا۔ میں نے اس کی جرأت
افزائی کا ارادہ کیا۔
"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا
"الیس!" اس نے جواب دیا۔ "جب میں
صرف دس برس کی تھی تو میں رخصت ہو گئی
تھی ــــ تم اپنی زبان میں یوں سمجھو کہ مر گئی
تھی ــــ لیکن اب میں واپس آ گئی ہوں"
"تم کیوں واپس آئی ہو؟"
"میں نہیں جانتی کہ میں یہاں آئی ہوں"
یکایک اس نے مُنہ بدلا اور اُس کرسی
کی طرف دیکھ کر جس سے وہ چند منٹ پیشتر
اُٹھ کر آئی تھی میرے پاس بدستور کھڑے ہوئے
اشارہ کیا اور ایک زبردست دہشت کے
عالم میں چلائی ــــ "اُف! ــــ وہ دیکھو!"
یہ کہہ کر اُس نے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں
میں چھپا لیا۔
یہ ظاہر تھا کہ مجھے وہاں کچھ بھی نظر نہ آ سکا
لیکن میرے گذشتہ تجربے نے میری مدد کی
اور میں نے اس راز کی تہ تک پہونچنے کا تہیہ
ارادہ کرکے اس کے اسی خیال کو شدید کر دیا۔

جب اس کی حالت کچھ سنبھل گئی تو میں نے
پوچھا کہ اُس نے کس چیز کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"دیکھو" وہ بولی۔ "اس کرسی کے پیچھے
ایک دشمن موجود ہے۔ کیا تمہارے سارے مریض
اسی کرسی پر بیٹھتے ہیں؟ یہ دشمن تم سے نفرت
کرتا ہے اور تمہارے کام میں خلل ڈالنے کی
کوشش کرتا ہے"
"وہ کون ہے ــــ کوئی شیطان ہے؟"
"ہاں ــــ وہی جسے تم شیطان کہتے ہو"
"تو اس سے کہو کہ جہنم کی راہ لے" میں نے
کچھ متاثر ہوتے ہوئے جواب دیا۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان الفاظ نے یہ سارا
طلسم توڑ دیا کیونکہ وہ میرے قریب سے چلی گئی
اور دروازے تک جا کر مجھے اپنے پاس آنے
کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد کمرے کے ایک بعید
گوشے میں چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
بولی ــــ "کیا تمہیں وہ روشنی وہاں نظر
آتی ہے؟ اسے اسی جگہ رکھنا اور اس طرح
تم اپنے کام میں خوب کامیاب ہو گے"
اس کو بیدار کرنے میں مجھے بڑی دشواری

کا سامنا ہوا۔ بہرحال جب وہ جاگ گئی تو
میں نے اس سے دریافت کیا "الیس
کون ہے؟" ــــ یہ سوال اس کے لئے
مکمل طور پر حیرتناک اور غیر متوقع معلوم ہوا۔
اس کے جواب سے پتہ چلا کہ الیس اسکی چھوٹی
بہن تھی۔ وہ بارہ سال کی عمر میں مر گئی تھی یہ
پہلا موقع تھا کہ اس مریضہ نے اپنی اس بہن
کا تذکرہ کیا۔ اس واقعہ کے زمانے میں مجھے
اس کی خاندانی تاریخ کا کوئی علم نہ تھا اور نہ
میری مریضہ کو بیدار ہونے پر اس بات کا کوئی
علم تھا کہ اس نے اپنی غنودگی کی کیفیت میں کیا
کیا کہا اور کیا ہے۔
ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ یہ عورت اس
وقت جس بیخودی کی کیفیت میں رہی تھی وہ
تنویمی بیخودی نہ تھی۔ مجھے اسکو بیدار کرنے میں
جو دشواری محسوس ہوئی تھی وہ تنویمی نیند میں
ہو سکتی تھی اور جب وہ کرسی کو چھوڑ کر میرے پاس
آئی تو میں نے اسے ایسا کرنے کا کوئی تنویمی حکم
نہ دیا تھا۔ وہ میرے حکم پر بالکل ہی عمل نہ کر رہی
تھی کیونکہ اس پورے تجربے کے دوران میں...





رات کے جادو نے دنیا کو مدہوشی کی نیند سلا دیا۔
شور و غل کی جگہ خاموشی نے اپنا قبضہ آ جمایا۔
فضائیں چپ چاپ کچھ سوچنے میں محو ہو گئیں۔
پتوں کی سرسراہٹ بند ہو گئی۔
پرندے گھونسلوں میں سمٹ سمٹا کر پڑ رہے۔
مندر میں پجاری نے ناقوس بجایا۔ اس کی آواز فضاؤں
کو چیر کر بلندیوں میں گم ہو گئی۔
سونے والے جاگ اٹھے۔ رات کے مسافر نے اپنی منزل طے کر لی۔
پھر وہی شور و غل ــــ وہی ہنگامہ ــــ
وہی فریب ــــ وہی مکاری۔
دنیا کا نظام اسی طرح چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

ہندوستانی سنیاسیوں کے جگر پارے

لاکھ لاکھ کی قیمت کا ایک ایک نسخہ

اتشک سوزاک سپیشل مکسچر - آزمودہ اور بیحد مفید نسخہ ہے۔ داتا چند جو حرکت الارا متواتر کئے جانے پر بے نظیر کامیاب نتائج پائے گئے کئی مریضوں کو اس خبیث مرض سوزاک سے نجات کی صورتیں ان ہی حاصل ہوئی۔

(نسخہ) آئل سنٹل (روغن صندل) دس بوند۔ گم اکاشیا (گوند کیکر) ۲ ڈرام۔ پوٹاسی بائیکارب (جوکھار) ۲۰ گرین۔ پوٹاسیم نائٹراس (قلمی شورہ) ۲۰ گرین۔ اسپرٹ ایتھر نٹروسائی ۲۰ بوند۔ ٹنکچر کیوبیب (سیل کباب چینی کا ست) ۲۰ بوند۔ پانی ایک اونس۔

(ترکیب تیاری) پہلے گوند کو باریک کپڑ چھان کرکے اسمیں ۴ ماشہ پانی ملا کر لئی سی کرکے روغن صندل ملا کر کھرل کریں۔ جب یکجان ہو جائے تو آہستہ آہستہ کھرل بھی کرتے رہیں اور دو دو چار چار بوند پانی تھوڑے وقفہ کے بعد ملاتے رہیں حتیٰ کہ تمام پانی ختم ہو جائے۔ بس دوا تیار ہے۔ یہ ایک خوراک ہے۔ ایسی تین خوراک دوا دن میں صبح دوپہر شام پلائی جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ ذیل کا نسخہ بطور پچکاری بھی استعمال کریں

پوٹاسیم پرمنگنیٹ ۳ گرین۔ پھٹکڑی ۱ ماشہ۔ شیرگرم پانی ۲۰ اونس میں ملا کر بذریعہ اری گیٹر یا پچکاری شیشہ کے دو بار دن میں پچکاری کیا کریں

سوزاک - ریٹھہ کی کالی گٹھلی کو توڑ کر اندر سے اس کی سفید سبزی مائل ہوگا۔ بس ایک عدد پستہ مصطگی رومی ۲ ماشہ کباب چینی ۱ ماشہ۔ دانہ الائچی خورد ایک ماشہ سب باہم ملالیں۔ یہ ایک خوراک ہے۔ ایک ماشہ اس میں مصری کابلی یا گند ملالیں۔ ہمراہ کچی لسی پلائیں لسی دن میں کئی دفعہ اور بھی پلاتے رہیں۔ سات ہی دن میں بلکہ اور پیپ بند ہو جائیگی۔

درد گردہ - کانے جن کو اردو میں سرکنڈے کہا جاتا ہے۔ ان کی جڑ بقدر ایک تولہ لےلیں اور پاؤ بھر پانی ڈال کر جوش دیں۔ چھٹانک بھر باقی پانی رہنے پر چھان اور ۴ ماشہ سوڈا بائیکارب ڈال کر گرم گرم ہی پلائیں۔ دوا اندر جانیکی دیر ہے کہ مریض کو افاقہ ہونا شروع ہو جائیگا۔ چند منٹ میں آرام ہوگا۔ تجربہ شرط ہے۔

اکسیر بواسیر - گل صدبرگ پانچ سیر لیکر انہیں دس سیر پانی میں بھگو دیں۔ اور بطریق معروف دس بوتل عرق کشید کریں۔ بواسیر والا ایک چھٹانک روزانہ استعمال کرے۔ نہایت مفید ہے۔

گردوں کے لئے عجیب سرمہ - سرمہ سیاہ ۱ تولہ۔ کافور ۱ ماشہ۔ نیلا تھوتھا بریاں چھ ماشہ۔ پھٹکڑی بریاں ۶ ماشہ۔ افیون ۶ ماشہ۔ افیون کو ۱ تولہ عرق گلاب میں حل کریں۔ اب اس زلال سے تمام اجزا کو کھرل کرکے سرمہ تیار کریں۔ سوتے وقت سلائی سے آنکھوں میں لگائیں۔ نہایت اعلیٰ اور زود اثر ہے

اکسیر پیچش بچگاں - سوڈا بائیکارب - ریوند چینی ہموزن پیس کر ایک ماشہ سے ۲ ماشہ تک عرق میں حل کرکے دن میں

دنیائے فلم کی تازہ ترین خبریں

نیشنل اسٹوڈیوز - "نئی روشنی" مکمل ہو کر بمبئی کے سینما میں دکھائی جا رہی ہے۔ "غریب" اور "نردوش" تکمیل کی منزل طے کر رہے ہیں۔ ایک مزاحیہ فلم "لالہ جی" زیر تجویز ہے۔ فلم "روٹی" جس میں چندر موہن اور شیخ مختار کام کر رہے ہیں۔ بسرعت تمام تکمیل کی منزلیں طے کر رہی ہے۔

ڈائرکٹر رامچندر ٹھاکر کی نئی فلم "اپنا پرایا" اس وقت زیر تیاری ہے۔ سابو موڈک اور شہباد وادکر نے اس میں چیف کام کرنے کے معاہدہ پر دستخط کر دئیے ہیں۔ نئی ہیروئن کی تلاش بسرعت جاری ہے۔

مینروا ٹاکیز - "بھولا" نمائش کیلئے آ گئی ہے۔

شالیمار پکچرز - ڈائرکٹر ڈبلیو زیڈ احمد "ایک رات" کی بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ فروری میں فلم مکمل ہو کر پردہ سیمیں پر نمودار ہو جائیگی اور اس کے بعد وہ "من کی جیت" کی تیاری میں لگ جائینگے۔ فلم "ایک رات" میں "نینا" اور پرتھوی راج کام کر رہے ہیں

رنجیت - فلم "دھیرج" زیر تیاری ہے۔ اس کے گانے پنڈت اندر نے لکھے ہیں۔ "بیٹی" جس میں خورشید اور روشنی نے کام کیا ہے۔ جے انت ڈیسائی کی زیر ہدایت مکمل ہو چکی ہے۔ خیال یہ ہے کہ شادی کی طرح یہ فلم بھی خوب کامیاب رہے گی۔

تاج محل پکچرز - فروری کی اختتام تک ان کی فلم "اُجالا" مکمل ہو جائے گی۔ جس میں بے بی نسیم پرتھوی راج اور مبارک کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ فلم مذکور میں مس نسیم کا پارٹ نہایت اہم ہے۔ خصوصاً اس کا عجیب و غریب ناچ تو دنیائے فلم میں تہلکہ پیدا کر دیگا۔

نیو تھیٹرس لمیٹڈ کلکتہ - ڈائرکٹر ہیم چندر کی نئی فلم "سوگندھ" زیر تیاری ہے۔ اس میں پہاڑی سانیال۔ بھارتی اور چندراوتی چیف کرداروں میں سے ہیں۔ اس کی دوسری فلم "میناکشی" بھی بسرعت تمام تیار ہو رہی ہے۔ اس کے ڈائرکٹر مدھو بوس ہیں اور چیف کرداروں میں سادھنا بوس، نجم اور جیوتی پرکاش کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فلم سال رواں کی ماسٹر پیس سمجھی جائے گی۔

سن رائز پکچرز میں ایک مشہور افسانہ نگار کی شمولیت

یہ خبر بڑی مسرت کے ساتھ سُنی جائیگی کہ ملک کے مشہور افسانہ نگار و فاضل ادیب مسٹر ضیا سرحدی نے سن رائز میں کام شروع کر دیا ہے۔ مسٹر ویاس مالک کمپنی نے آپ کی خدمات بحیثیت ڈائرکٹر حاصل کی ہے۔ امید ہے کہ آپ کی شمولیت فلمی دنیا میں باعث خوشی ہوگی۔

باقیاتِ فانی

فانی بدایونی مرحوم

(۱) دُنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

(۲) کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں
اِک بے قرار تڑپا، اِک بے قرار رویا

(۳) جب ترا ذکر آ گیا، ہم دفعتاً چپ ہو گئے
وہ چھپایا راز دل ہم نے کہ افشا کر دیا

(۴) مری اِک عمر فانی نزع کے عالم میں گزری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہی لہو برسوں

(۵) موت ان کا منہ ہی تکتی رہ گئی!!
جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے

ایک رقاصہ کو دیکھ کر

اثر :- جناب مرزا صابر مٹھیانوی

شراب حسن بے حجاب خم کے خم لنڈھائے جا
فضا کو مست رقص نغمہ ریز سے بنائے جا
صدائے سحر زائے گھنگھروں کی حشر ڈھائے جا
زمین پہ تال سُر کے ساتھ ٹھوکریں لگائے جا
ادھر بھی مسکرا کے دیکھ اک ادائے خاص سے
دکھا کے اہل دل کو شوخ چتونوں کی حرکتیں
بدل دے ایک جنبش نظر سے نظم دہر کو
"شیام رے شیام ہے" کی دلنواز تان سے
جہاں کو بھر دے کیف و رنگ و نور و شعر و نغمہ سے
جواں نگاہ مطربہ، جوانیاں شکار کر
شراب چشم سرمہ سا کی لانبی لانبی پلکوں سے
سنائے جا سرود بیخودی حسین مطربہ

نگاہ مست مست سے مغنیہ پلائے جا
پریم رس پلائے جا پریم گیت گائے جا
قدم قدم پہ مطربہ قیامتیں اٹھائے جا
صدائے زیر و بم کے ساتھ تالیاں بجائے جا
متاع خرمن سکوں پہ بجلیاں گرائے جا
خرام نغمہ سے دلوں پہ ٹھیس سی لگائے جا
کمر کی لرزشوں سے انجمن کو تھرتھرائے جا
پریم راگ چھیڑ کر پریم گیت گائے جا
فضائے کائنات پہ بہار بن کے چھائے جا
کماں سے ابروؤں کی تیر بے خطا چلائے جا
پلائے جا پلائے جا پلائے جا پلائے جا
جہاں کو نوجواں نظر سے نوجواں بنائے جا

مستی و قلندری

از جناب حاجی [illegible] صاحب

جنگ سے پہلے ہمیں مستی و قلندری کیلئے یورپ سے کافی سامان مل جاتا تھا لیکن جب سے جنگ چھڑی ہے دوسری چیزوں کی طرح مستی و قلندری کا یورپین سامان کمیاب ہوگیا ہے۔ ایسی حالت میں ہم ہندوستانی رؤسا اور اہل دول کا جتنا شکریہ ادا کریں وہ کم ہے کہ ان کی زندہ دلی اور رنگ رلیوں کی بدولت ہمارا کام بڑے بھلے چل رہا ہے۔

بمبئی کے ایک اخبار میں ایک اطلاع شائع ہوئی ہے کہ ایک مشہور ہندوستانی ریاست کے نوجوان مہاراجہ جو حال ہی میں آبا و اجداد کی جائز و ناجائز ضرورت سے قائم کی ہوئی گدی اور اس کے خزانے کے مالک ہوئے ہیں۔ کافی عشرت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ان مہاراجہ صاحب کو فلم ایکٹرسوں سے خصوصیت کے ساتھ دلچسپی ہے۔ چنانچہ اول اول آپ نے ایک ایکٹرس سے عشق کیا جو ان سے پورے پندرہ سال عمر میں بڑی تھی۔ بالفاظ دیگر ان کی پوری مخدومہ تھی۔ اس کے بعد ایک اور ایکٹرس پر ریجھے جو ہفتوں ان کی مہمان خاص رہی۔ آج کل ایک کشیدہ قامت مرہٹہ ایکٹرس کی زلف گرہ گیر میں بندھے بندھے پھر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کرسمس کی مقدس تقریب پر تاج ہوٹل میں حضور والا نے اپنی محبوبہ ایکٹرس کے ساتھ دادِ رقص بھی دیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

اخبارات تو خوانخواہ راجاؤں اور ایکٹرسوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اگر فلم ایکٹرسوں سے راجہ مہاراجہ عشق نہ کرینگے تو ہم اور آپ کرینگے؟ اسی طرح ایکٹرسیں اگر راجہ مہاراجہ کو نہ پھانسینگی تو آیا مستی و قلندری لکھنے والے اور اس کے ناظرین پر ڈورے ڈالینگی؟ بہرکیف اتنی بات طے ہے کہ نہ ہندوستانی راجہ مہاراجہ کا خزانہ ہندوستان کی غریبوں کیلئے اور نہ ایکٹرسیں غریبوں کے حصہ کی ہیں پھر اخبارات ناحق ایسی باتوں پہ کیوں کڑھتے ہیں؟

~~~

ہندی کے ایک ماہنامے نے "الجھن" کے عنوان سے ایک مستقل سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ اس عنوان کے ماتحت عموماً معاشرتی الجھنیں شائع ہوتی ہیں اور اس پرچے کے قارئین ان کے متعلق مشورے دیتے ہیں۔ اس پرچے میں ایک دیوی جی نے اپنی الجھن لکھی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

"دیوی جی کے شوہر ایک ڈاکٹر ہیں جو "انسداد حمل" کے حامی ہیں۔ انہوں نے دیوی جی کو اپنا ہمخیال بنا لیا تھا مگر بالآخر ان کا ماں بننے کا نسوانی شوق ابھر آیا اور انہوں نے منت و سماجت کر کے ڈاکٹر صاحب کو اس حد تک رضامند کر لیا کہ ایک لڑکی سے ان کی گود آباد ہو گئی۔

اس لڑکی کے پیدا ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب صاحب نے پھر اپنی ڈاکٹری شروع کردی جس پر دیوی جی نے بھی چون و چرا نہ کی لیکن اب دیوی جی کی نور چشمی شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہیں لیکن باپ کو شادی کی فکر ہے اور نہ بیٹی کو۔ دیوی جی البتہ بیحد پریشان ہیں اور جب وہ اپنی پریشانی کا اظہار کرتی ہیں تو باپ بیٹی دونوں ایک تمسخر آمیز ہنسی ہنس کر چپ ہو جاتے ہیں۔ دیوی جی کیلئے مزید پریشانی کی بات یہ ہے کہ ان کے شوہر اپنی بیٹی کو ڈاکٹری کی "مخصوص تعلیم" دے رہے ہیں"

دیوی جی نے اپنی اسی "الجھن" کا حل دریافت کیا ہے۔

ایک صاحب نے اس "الجھن" کا نہایت دلچسپ "حل" شائع کیا ہے۔ قارئین مستی و قلندری اس سے دلچسپی بھی لے سکتے ہیں۔ اور بوقت ضرورت مختلف پہلوؤں سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔

وہ صاحب لکھتے ہیں۔

"ایسی ہی "الجھن" ایک بار میرے ایک دوست کے ہاں بھی پیدا ہو گئی تھی۔ میں اس زمانے میں بی کام میں پڑھ رہا تھا۔ دیوی جی کچھ دنوں تو بہت پریشان رہیں مگر ان کے نسوانی دل نے بیٹی کے دل کو ٹٹول کر ایک لاجواب ترکیب تلاش کر لی۔ وہ ایک روز میرے پاس آئیں، مجھے علیحدہ لے جا کر اپنی داستانِ مصیبت سنائی اور مجھ سے مدد کی درخواست کی۔

میں نے کہا میں اس بارے میں آپ کی کون سی مدد کر سکتا ہوں؟

وہ میرا جواب سنکر مسکرائیں، بولیں۔ تم بھی نرے "بدھو" ہی معلوم ہوتے ہو۔ پڑھتے ہو کامرس میں، مگر تم میں کاروباری سمجھ بوجھ نام کو بھی نہیں ہے۔ تم جانتے
~~~

ہو کملا کے باپ لاکھوں کے آدمی ہیں اور کملا کے سوا ان کی کوئی اولاد نہیں کہو کچھ سمجھے؟" میں چونک پڑا، اب میں سمجھا کہ وہ مجھ سے کس قسم کی مدد مانگ رہی ہیں۔

میں ایک توانا و تندرست نوجوان تھا۔ اسلئے نئی روشنی کی ایک دوشیزہ کو اپنی جانب مائل کر لینا یوں بھی میرے لئے چنداں دشوار نہ تھا اس کے علاوہ جب انکے باپ کی بے انداز دولت، تحفے اور سوغات سے اسے لاد دینے کیلئے مجھے حاصل ہو اور اس کی ماں قدم قدم پر میری امداد کر رہی ہو تو کامیابی کیا مشکل تھی؟ خلاصہ یہ کہ آج کملا دیوی کے شکم سے میرے دو بچے موجود ہیں اور میں کملا دیوی کے باپ کی بدولت ادنیٰ درجے کے ایک آدمی کی بجائے ایک بڑی دولت اور جائداد کا مالک ہوں"

~~~

ایک صاحب نے اپنی الجھن اس طرح سپرد قلم کی ہے۔ میرے ماں باپ میرے لڑکپن ہی میں انتقال کر گئے۔ میرے والد کے ایک دوست نے مجھے پرورش کیا اور بی اے تک تعلیم دلائی۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ کسی سرکاری محکمے میں مجھے کوئی ملازمت دلا دیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک لیڈر کی بیٹی سے مجھے محبت ہو گئی ہے۔ میرے ہونے والے خسر کا پورا خاندان ستیہ گرہی ہے اور بار بار جیل کی ہوا کھا چکا ہے۔ میری محبوبہ نے بھی ستیہ گرہیوں کی فہرست اپنا نام دیدیا ہے۔ اس کو معلوم ہوا کہ میں سرکاری نوکری کرنے جا رہا ہوں تو اس نے مجھے بالفاظ واضح متنبہ کر دیا ہے کہ میں نے جس روز سرکاری نوکری کی وہ اسی روز سے بھوک ہڑتال شروع کر دیگی۔ اور میں جانتا ہوں کہ وہ ایسا کئے بغیر نہ رہے گی۔ اسلئے میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟

اس مشکل کا حل تو آسان ہے مگر اس قدر انتظار کی ضرورت ہے کہ کانگرس اور حکومت میں صلح ہو جائے اور کانگرس پھر وزارتیں سنبھالے۔ اگر قارئین مستی و قلندری کوئی فوری حل بتا سکیں تو وہ بتا سکتے ہیں

~~~

قارئین مستی و قلندری نے بکثرت ایسے واقعات ملاحظہ فرمائے ہونگے جن سے وہ اس نتیجے پر پہونچے ہونگے کہ یورپین عورتیں طلاق حاصل کرنے میں کتنی بیباک ہوتی ہیں۔ لیکن ایسا واقعہ ان کے ملاحظے میں نہ آیا ہو کہ امریکہ کی ایک عورت نے صرف دو آدمیوں کے درمیان نو نو بار طلاق اور شادی کا تبادلہ کیا۔ شاید اس اجمال سے صورت آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ لہٰذا اس کی ضروری تفصیل بھی سن لیجئے۔

عورت مذکور نے سنہ ۱۹۰۳ء میں پہلی بار ایک شخص سے شادی کی۔ دو سال بعد اس سے طلاق لے کر دوسرے سے شادی رچائی تین سال کے بعد دوسرے شوہر سے طلاق حاصل کر کے پھر پہلے شوہر کا گھر جا بسایا۔ اسی طرح وہ دونوں شوہروں کو بار بار ردو بدل کرتی رہی چنانچہ اب تک وہ ایک ایک سے نو نو بار شادی کر چکی ہے۔ اور آج کل شوہر نمبر ۲ سے طلاق لے کر شوہر نمبر ۱ سے شادی رچانے کی فکر میں ہے۔ آپ کہیں گے کہ اگر ایسا ہی تھا تو اس نے بیک وقت دونوں سے شادی کیوں نہ کر لی لیکن میرا خیال ہے کہ اس کو مستی و قلندری میں آپ سے زیادہ درک مہارت حاصل ہے۔

مست قلندر کے منی آرڈر

چونکہ براہ راست بنک میں جمع ہو جاتے ہیں اسلئے کوپن پر مکمل پتہ صاف صاف لکھئے اس سے آپ کے احکام کی تعمیل بہت جلد ہو جایا کرے گی۔ (منیجر)

ملنسو اور موٹے ہو جاؤ

تاج گارڈن کے دروازہ پر لکھا تھا (Dogs not allowed) کتوں کی اجازت نہیں۔ ایک موٹا بنگالی ننگے سر دروازہ سے پارک (باغ) میں چلا۔ ایک کتا اس کے ساتھ دیکھ کر پہرہ دار نے آواز دی "بابو کتا مت لے جاؤ۔ اجازت نہیں ہے" بنگالی بدستور اپنی چال چلا گیا۔ آخر پہرہ دار اس کے پیچھے بھاگا اور کہا "بابو۔ آپ سنتے نہیں کتا مت لے جاؤ اس کی اجازت نہیں ہے" بابو (غضب ناک ہوکر) "تم دیکھتے نہیں۔ یہ کتا ہے یا کتیا ہے" پہرہ دار لاجواب ہو گیا۔

~~~

ایک شخص دہلی دربار کے زمانہ میں سیر تماشہ کیلئے گئے۔ بڑا ہی انبوہ تمام آدمی ہی آدمی۔ آپ کو زور سے پیشاب لگا۔ اور کہیں جگہ نہ ملی۔ آخر ایک لالٹین کی آڑ لے کر کھڑے ہوکر پیشاب کرنے لگے۔ ایک پولیس مین یہ دیکھ کر ان کو پکڑنے آیا اور ان حضرات کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "یہ کیا کر رہے ہو" یہ حضرت جلدی سے گھبرا کر بولے "دیکھتے نہیں ہو ہم کھڑے ہوئے پیشاب کر رہے ہیں" وہ یہ سمجھ کر یہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنا جرم نہیں چپ چاپ واپس چلا گیا۔

~~~

صاحب (نئے ملازم سے) "لو یہ ہمارا ولایتی ڈاک۔ اس کو بمبے میں ڈال دو" ملازم۔ "اچھا حضور" ملازم تمام خط لے گیا اور جا کر ایک بمبے (نالہ) میں ڈال دئے۔

صاحب: "ویل تم ڈاک خانہ گیا یا اور کہیں بمبے (لیٹر بکس سے مراد) میں ڈالا" ملازم۔ "حضور کے کے پیچھے جو بمبا بہتا ہے اسی میں ڈال دیا۔ سب بہتے چلے جائیں گے"

~~~

ایک شخص کی دوسری بیوی نے جو نئی بیاہ کر آئی تھی۔ اپنے خاوند سے ان لڑکوں کی جو پہلی بیوی سے تھے، شکایت کی کہ یہ لڑکے مجھے ماں نہیں کہتے۔ خاوند نے غصہ سے کہا "میں ان کو ٹھیک کر دونگا۔ ان لڑکوں کی بھلا کیا مجال ہے۔ جو تمہیں ماں نہ کہیں۔ ان کا باپ بھی تمہیں ماں کہے گا"

~~~

ایک ادیب کی رُومانی ڈائری

از جناب مولینا ابو محمد امام الدین صاحب رامنگری

۲۱ جون سنہ ۱۹۴۰ء

قحط زدوں کیلئے غلے اور کپڑے فراہم کرتا ہوا میں یہاں آیا۔ ایک ہفتے سے مراری کے ہاں ہوں۔ وہ میرے کالج کے ساتھی ہیں۔ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ ان کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ آج کل ایک ماہانہ پرچہ "اوشا" کے نام سے نکال رہے ہیں۔ میں آیا تھا ان سے ملنے مگر انہوں نے کہا۔ دو ایک مہینے رہ کر "اوشا" کا کام سنبھال دو۔ اسلئے رک جانا پڑا۔ ان کی بیوی بھی بہت خوش مزاج اور ملنسار ہیں۔ میں ان کو بھابی کہتا ہوں۔ وہ بھی مجھے دیور ہی کی طرح مانتی ہیں۔ کوئی حجاب اور تکلف نہیں مراری کے ساتھ مجھے بھی اپنے سامنے بٹھا کر کھلاتی ہیں۔ کل ان کی چھوٹی بہن رما بھی آئی ہے۔ شاید کچھ دنوں یہاں رہیگی۔

~~~~~~~~

۲۳ جون سنہ ۱۹۴۰ء

میں اپنے بیٹھا "اوشا" کیلئے کہانی لکھ رہا تھا۔ یکایک سر اٹھایا تو دیکھا میز کی بغل میں چائے کا پیالہ ہاتھ میں لئے رما کھڑی ہے، وہ نہ جانے کب سے کھڑی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ جلدی سے ہاتھ بڑھا کر چائے کا پیالہ لے لیا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گئی۔ تو جیسے میں آپے میں آیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ خواب کی رنگین دُنیا سے کوئی خیالی تصویر ایک لمحہ کے لئے آنکھوں کے سامنے آئی ہو اور پھر تاریکی میں گم ہو گئی ہو۔ اس نے چائے کا پیالہ دیتے ہوئے ایکبار میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف۔ بس۔ لیکن وہ لمحہ پھیلتے پھیلتے اتنے لمحات پر چھا گیا کہ جب کشن نوکر نے بازار سے آکر پوچھا۔ بابوجی! آپ نے چائے پی؟ اور میں نے سامنے میز پر رکھے ہوئے پیالے کو اٹھایا تو چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

~~~~~~~~

۲۴ جون سنہ ۱۹۴۰ء

سہ پہر کا وقت تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا اب پانی برسا اور اب برسا۔ بڑی دلاویز فضا تھی۔ میں کھویا ہوا سا بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ رما ناشتہ لے کر آئی۔ میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مجھ سے تھوڑے ہی فاصلے پر چھوٹا ٹیبل تھا۔ رما نے اسی پر ناشتے کا سامان رکھ دیا۔ میں نے ادھر دیکھنا چاہا مگر دیکھ نہ سکا۔ رما لوٹ کر چلی گئی۔

میں ناشتہ کرنے بیٹھا۔ طشتری کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سامنے کے دروازے کے ادھ کھلے کواڑ سے رما کا آدھا چہرہ دکھائی دیا۔ میں پلیٹ سے ہاتھ کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رما مسکرا پڑی۔ اور سامنے سے اوٹ میں ہٹ گئی۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی میں آہستہ آہستہ دروازے کے پاس چلا گیا۔ دروازے کے باہر ٹین کا برآمدہ ہے لیکن وہ اتنا کم چوڑا ہے کہ بوچھاڑ اس کے اندر چلی آرہی تھی۔ اور رما دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔ اس کے سامنے کے کپڑے اور سر کے بال بھیگ گئے تھے۔ میں ہکا بکا سا اسے دیکھنے لگا۔ لیکن میرے منہ سے اتنا نہ نکلا کہ اندر آجاؤ۔ میں کمرے میں واپس چلا آیا۔ دیکھا۔ رما سر جھکائے بھیگتی گھر میں چلی جا رہی ہے۔ آج یہ دوسرا موقع تھا جب میں نے رما کو اتنے قریب سے دیکھا۔

~~~~~~~~

۲۵ جون سنہ ۱۹۴۰ء

میں جو کہانی لکھ رہا تھا وہ آج پوری ہو گئی۔ مراری نے اسے دیکھ کر کہا۔ کہانی تو بہت اچھی ہے۔ اس پر تمہارا نام دیدوں؟ میں نے ہمیشہ کی طرح انکار کرتے ہوئے کہا اگر میرا نام دوگے تو میں آیندہ کبھی کچھ نہ لکھوں گا۔

"تو آخر اس کا نام دیا جائے؟"

"بھابی کا نام دیدو۔"

"اگر وہ ناراض ہوئیں؟"

"ناراض نہ ہوں گی۔"

"اگر ان کا نام دیدوں؟"
~~~~~~~~

"کس کا؟"

"ان کی بہن رما کا۔"

"دیدیا انہیں کا نام"

~~~~~~~~~~

یکم جولائی سنہ ۱۹۴۰ء

آج "اوشا" کا جولائی نمبر نکل آیا۔ کھانا کھاتے وقت بھابی نے پوچھا۔ وہ کہانی کس کی لکھی ہوئی ہے؟"

"کہانی کے ساتھ نام چھپا ہوگا رکھا نہیں"

"نام دینا بھول تو نہیں گئے؟" —— میں نے پوچھا۔

"نہیں، نام موجود ہے۔" مراری بولے۔

اوشا کا پرچہ پاس ہی پڑا تھا۔ بھابی نے اٹھا کر ورق الٹتے ہوئے کہا۔ نام تو رما کا ہے معلوم نہیں یہی رما ہے یا کوئی اور؟

"تو اس سے پوچھا نہیں تم نے؟ مراری نے کہا۔

"پوچھا تو تھا۔ کہتی تھی مجھے معلوم نہیں کس کی ہے۔" بھابی بولیں۔

"اچھا!"

بھابی چپ تھیں۔

مراری نے کہا۔ "اس نے خوب بیوقوف بنایا تمہیں۔"

میں مسکرانے لگا۔ "مجھے مسکراتے دیکھ کر بھابی بولیں۔ ہاں وہ ضرور ایسی کہانی لکھے گی۔ آپ لوگ بھی مجھے احمق ہی سمجھتے ہیں کیوں؟ یہ کہانی انہوں نے لکھی ہے۔ میں اس کے لئے بازی لگا سکتی ہوں۔"

"کس نے، میں نے؟" مراری نے پوچھا۔

"نہیں ان دیورانی جی، موہنی دیوی نے"۔ بھابی بولیں۔

مراری بے اختیار ہنس پڑے۔

بھابی کہنے لگیں۔ یہی تو میں کہتی تھی کہ بھلا رما ایسی اچھی کہانی لکھ سکے گی؟"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ بھابی مجھے تھوڑی دال چاہئے۔"

بھابی نے پکار کر کہا۔ رما دال تو دے جا ایک کٹوری میں۔

رما دال لے کر آئی تو بھابی اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولیں۔ لو پتہ چل گیا۔

"کیا؟" یہ کہہ کر رما مراری کی تھالی میں دال دینے لگی۔

انہوں نے ہاتھ روک کر کہا۔ نہیں نہیں مجھے نہیں چاہئے، انہیں دو۔

میں نے سر جھکائے ہی جھکائے تھالی ذرا آگے بڑھا دی۔ رما دال دینے لگی۔ بھابی بولیں۔ وہ کہانی جو تمہارے نام سے چھپی ہے انہی موہن بابو کی لکھی ہوئی ہے۔

میں سہ پہر کو گھر کیلئے خط لکھ رہا تھا خط پورا کر کے سر اٹھایا تو دیکھا چھوٹی ٹیبل پر ناشتہ رکھا ہوا ہے۔ میں ٹیبل کے پاس گیا تو پلیٹ پر کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا ملا۔ لکھا تھا۔

"آپ نے کہانی پر میرا نام کیوں دیدیا؟..."

میں نے ناشتے کے بعد اسی کاغذ پر لکھ دیا۔

"میں اس قصور کیلئے معافی چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی میں کئی اور قصور کر چکا ہوں۔ اگر آپ معاف نہ کرینگی تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔"

کاغذ کو میں نے پھر اسی طرح پلیٹ پر رکھ دیا۔

رات کو سب لوگ کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو بھابی نے کہانی کی بحث شروع کر دی کہانی عشقیہ تھی اسلئے اس کی بحث کے سلسلے میں عشق و محبت کی بحث چھڑ گئی۔ بھابی نے کہا۔ رما کہتی تھی۔ موہن بابو نے اپنی کہانی میں "پریم" کا جو "آدرش" پیش کیا ہے وہ یورپ میں پایا جاتا ہو تو پایا جاتا ہو لیکن ہمارے ملک میں تو نہیں پایا جاتا۔ یہاں کی لڑکیوں کو اتنی آزادی کہاں کہ وہ اپنی پسند کے دولتمند آدمی چن کر ان سے پریم کریں اور پھر یہاں ایسے پریمی مل ہی کتنے سکتے ہیں جو پریم کیلئے ہر طرح کی ذلت برداشت کر کے بھی کہتے رہیں کہ میں تو صرف پریم کے لئے پریم کرتا ہوں۔ پریم سے پریم کے سوا میری تو کوئی دوسری غرض نہیں ہے۔ وہ دراصل ایسے ہی ہیں تو پریم کرتے ہی کیوں ہیں۔ دیش میں اور بھی تو بہت سے ضروری کام موجود ہیں۔"

میں نے کہا۔ محبت کے بارے میں کسی کی رائے کچھ ہی ہو لیکن زندگی میں ایک دور تو ایسا آکر رہتا ہے جب انسان کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ٹیگور شاعر تھے، وہ اپنے شاعرانہ انداز میں کہتے ہیں کہ ایکبار ہر انسان اپنی زندگی میں شاعر بن جاتا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایکبار ہر انسان کسی نہ کسی سے محبت کرتا ہے اور میرے نزدیک تو شاعر اور عاشق میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں۔

مراری بول اٹھے۔ تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان زندگی میں کسی نہ کسی سے ایکبار محبت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں نے کہا۔ بے شک!

مراری بول اٹھے۔ اچھا تم؟

مجھے رما کا خیال آگیا میں چونک پڑا "میں!"

بھابی ہنسیں تو مراری نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تو یہ بھی شاعری یعنی کسی سے محبت کر چکی ہوں گی۔

بھابی ہنستے ہنستے یکایک چونک کر چپ ہو گئیں میں نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔ یہ یقیناً شاعری کر چکی ہیں۔

مراری خوب ہنسے، کہنے لگے۔ ٹھیک کہتے ہو۔ میں بھی محبت کر چکا ہوں۔
~~~~~~~~~~

"ارے بھئی وہ کس سے ؟" میں نے پوچھا۔

مراری کہنے لگے: "انہیں کی ایک ممیری بہن تھی۔ میں انٹرنس میں پڑھنے کے لئے لکھنؤ گیا تھا۔ ان کے ماما کے پڑوس ہی میں میرا مکان تھا۔ اس زمانے میں ان لوگوں سے کوئی رشتہ ناطہ نہ تھا۔ وہ بھی اسکول میں پڑھتی تھی۔ مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی۔"

"وہ بھی تم سے محبت کرتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ مجھ سے اس کو اس قدر نفرت تھی کہ دیکھ کر میری طرف سے منہ پھیر لیتی تھی۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ بھابی ہنسنے لگیں۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔"

میں نے چونک کر پوچھا۔ "یعنی؟"

"یعنی یہ کہ تمہاری بھابی سے میرا بیاہ ہوگیا۔"

اتنے میں بارش ہونے لگی۔ بوچھاڑ اندر آ رہی تھی۔ بھابی اٹھ کر دروازہ بند کرنے لگیں تو مراری نے کہا: "ذرا سگریٹ کی ڈبیہ تو دینا۔"

بھابی بولیں "کہاں ہے؟"

"تم نے منگوایا نہیں نوکر سے؟"

"میں نے تو نہیں منگوایا۔"

"کیوں؟"

بھابی چپ ہوگئیں۔

میں نے کہا۔ کسی سے پریم کرتی رہی ہونگی اسلئے خیال نہ رہا ہوگا۔ بھلا عشق و محبت میں سگریٹ کا خیال کسے رہتا ہے؟"

مراری ہنسنے لگے۔ بھابی نے تنک کر کہا۔

"جی ہاں آپ کی طرح۔"

ہم دونوں زور سے ہنس پڑے۔ بھابی ہنسنے لگیں۔

میں نے ہنسی روک کر کہا: "بھابی پریم کرنا کوئی عیب کی بات نہیں بلکہ خوش قسمتی کی بات ہے۔ مجھے تو آج تک کوئی پریم کرنے والا ملا ہی نہیں۔ اگر کوئی ملتا تو ......"

مراری نے بات کاٹ کر کہا۔ "اگر کوئی ملتا تو؟"

"میں اپنے کو بڑا خوش قسمت سمجھتا۔"

بھابی بولیں۔ تم خود بھی تو کسی سے پریم کر سکتے ہو۔"

مراری نے کہا۔ "میری طرح۔"

بھابی مسکرا پڑیں۔ بولیں: "سچ تو، کیا تمہیں آج تک پریم کرنے کے لائق کوئی ملی ہی نہیں؟"

میں نے کہا: "ایسا پریم آسان نہیں ہے۔ انسان پریم کرتا ہے کسی غرض کیلئے۔ اور جو انسان ہر غرض سے پاک ہوگا وہ پریم ہی کیوں کرے گا۔ پریم سے بڑھ کر دوسرے کام موجود ہیں۔

اتنے میں تخت کے نیچے کچھ کھڑبڑ ہوئی۔ بھابی اچھل کر دور جا کھڑی ہوئیں۔ مراری نے ٹارچ سے دیکھا۔ بھابی نے پوچھا کیا ہے؟"

مراری نے کہا: "کچھ نہیں دو چوہے تھے۔"

"کیا کر رہے تھے؟" بھابی نے پوچھا۔

"شاید پریم کر رہے تھے۔" مراری نے کہا۔

بھابی شرما گئیں۔ میں ہنس پڑا۔

~~~

۲ر جولائی سنہ ۳۰ء

آج تمام دن کل کی رات والی پریم کی گفتگو کا مذاق اڑتا رہا۔ جو بھی دو چیزوں کو اکٹھا دیکھتا کہتا یہ دیکھو پریم ہو رہا ہے۔ بھابی تو خوب ہنستیں۔ مگر مراری سنجیدہ ہوکر کہتے: "آہا جگت میں چاروں طرف پریم ہی کی لیلا تو دیکھنے میں آتی ہے۔"

اس پر بھابی اور بھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔

رما نے بھابی سے کہا: "دیدی نئی فلم آئی ہے چلو دیکھ آئیں۔"

بھابی تیار ہوگئیں۔ بولیں اپنے جیجا سے کہو۔"

مراری پروف دیکھ رہے تھے اور میں تصحیح کر رہا تھا۔ رما کی بات پر ہم دونوں نے ایک ساتھ سر اوپر اٹھایا۔

مراری نے ایک انگڑائی لے کر پوچھا "کون فلم ہے بھئی؟"

رما نے شرمائی ہوئی آواز میں دھیمے سے نام بتایا۔

مراری نے پوچھا۔ "ہے اچھی فلم؟"

میں بول اٹھا "عشقیہ ہوگی۔"

رما نے سر نیچا کر لیا۔

مراری دیکھ کر ہنس پڑے۔ بولے: "اچھا تیاری کرو۔ ہم لوگ بھی چلیں گے۔"

ٹھیک وقت ہم لوگ سنیما گھر پہنچے۔ بھیڑ بہت بڑھ گئی تھی۔ کسی طرح ٹکٹ لے کر اندر گھسے۔ دروازے سے گزرتے ہوئے چوکھٹ سے پھنس کر رما کی ایک چپل نکل گئی۔ وہاں کھڑے ہونے کا ٹھکانہ نہ تھا۔ چپل کون تلاش کر سکتا تھا۔

سیٹ پر بیٹھنے کے بعد رما نے آہستہ سے بھابی سے کہا: "میری ایک چپل نکل گئی۔"

"کہاں؟" بھابی نے فکرمندانہ لہجہ میں پوچھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"رما کی ایک چپل نکل گئی۔"

"کہاں؟"

بھابی نے رما کی طرف دیکھا۔

رما شرما کر بولی: "وہیں دروازے پر۔"

مراری اٹھنے لگے۔ میں نے کہا: "تم بیٹھو میں لے آتا ہوں۔"

میں جا کر چپل اٹھا لایا۔ اور رما سے دھیمے سے کہا ـــــ "یہ لیجئے۔"

رما نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اور جب تک وہ کچھ کہے۔ میں نے چپل اس کے پاؤں کے پاس رکھ دی۔

تماشا شروع ہو چکا تھا، میں اپنی سیٹ پر
~~~

بیٹھ گیا۔ میری سیٹ رما کی بغل ہی میں تھی آس پاس اندھیرا تھا، نہ جانے کب میرا پاؤں رما کے پاؤں سے جا لگا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی مخفی طاقت نے ہمارے پیروں کو آپس میں چپکا دیا۔ نہ میں ہی اپنا پاؤں ہٹا سکا اور نہ رما ہی۔

"انٹرول" کی روشنی ہوئی تو میں چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا، اور باہر کا رُخ کرتے ہوئے بھابی سے پوچھا۔ "پیاس ویاس تو نہیں لگی ہے؟"

رما سر نیچا کئے بیٹھی تھی۔ بھابی نے اس سے پوچھا "پانی وانی تو نہیں پینا ہے؟"

رما نے سر ہلا کر آہستہ سے کہدیا "نہیں"

میں مراری کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف چل پڑا۔ دو قدم کے بعد ایک دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو رما اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نظر ملتے ہی جلدی سے اس نے سر نیچا کر لیا۔

فلم عشقیہ تھی جس میں محبت کی ناکامی دکھائی گئی تھی۔ بھابی نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں کہا "کتنی دردناک فلم تھی۔ میرا تو کلیجہ منہ کو چلا آتا تھا"

مراری بولے "فلم آرٹ کے اعتبار سے تو اچھی تھی۔ لیکن نوجوانوں کے اوپر اس کا کوئی اچھا اثر نہیں ہو سکتا"

میں نے کہا "ہر محبت کامیاب ہی تو ہوتی نہیں۔ اسلئے فلم خلاف واقعہ تو نہیں ہو سکتا"

یہ کہتے ہوئے میری طبیعت نہ جانے کیسی ہو گئی۔ جیسے کسی خطرے سے دل کانپ گیا۔

آج رات کو میں لیٹا جب بھی دل میں ایک طرح کی بے چینی سی محسوس ہوتی رہی۔ کسی طرح نیند ہی نہیں آتی تھی۔ دیر تک جاگتے رہنے سے کچھ پیاس معلوم ہوئی۔ میں بیٹھک میں لیٹا تھا۔ ابھی تک زنانے کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا۔ میں نے سوچا بھابی جاگ رہی ہوں گی۔ جا کر پانی پی آؤں

میں جیسے ہی باہر نکلا۔ آنگن میں رما کھڑی نظر آئی۔ میرا دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے منہ سے کچھ عجیب لہجے میں نکلا "پانی پینا چاہتا تھا"

رما کچھ لڑکھڑا سی گئی اور اسی طرح پانی کا گلاس لئے ہوئے واپس آئی۔ میں نے پانی پی کر خالی گلاس اسے پکڑا دیا۔

بیٹھک کے دروازے پر پہونچکر میں نے دیکھا رما پتھر کی مورت کی طرح وہیں کھڑی تھی۔ میں پھر لوٹ کر اس کے پاس گیا۔ پوچھا۔

"دھوبی کپڑے دے گیا؟"

رما نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "ہاں"

میں نے دھیمی آواز میں کہا "نوکر میری میلی چادر تو اُٹھا لے گیا۔ لیکن دھلی ہوئی چادر دے نہیں گیا۔ اوڑھنے کا حرج ہوگا"

رما جا کر چادر لے آئی۔ میں نے اسے ہاتھ میں لیکر اسے دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو میری چادر نہیں ہے"

رما جیسے بڑی ہمت کر کے بولی "دیدی سو گئی ہیں"

اتنا کہہ کر رما اندر چلی گئی۔

۳ر جولائی ۴۰ء

آج صبح نوکر میرے کمرے میں ناشتہ رکھ گیا۔ ناشتے کی چیزوں کے نیچے پلیٹ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا جس پر لکھا تھا۔

"مجھ پر دیا کر کے وہ چادر بکس میں چھپا لیجئے۔ ہاتھ جوڑتی ہوں، باہر مت رکھئے" نیچے لکھا تھا "رات کو میں رسوئی گھر بند کرنے اُٹھی تھی"

میں سوچنے لگا "شاعر اعظم نے لکھا ہے کہ زندگی میں ایکبار ہر شخص کو شاعر بننا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے میرے متعلق بھی ان کا یہ قول سچ ثابت ہو کر رہیگا۔ مجھے بھی محبت کرنی ہی پڑے گی"

میں نے اپنے آپ سوال کیا "تو کیا وہ وقت آگیا؟"

اس سوال کا تو میں کوئی جواب دے سکا لیکن جب رما کی سلک کی چادر کو بکس میں رکھ کر اسے ہاتھ سے دبایا تو معلوم ہوا جیسے میں کسی کے نرم و گداز بدن کو دبا رہا ہوں"

مجھے چادر کے اس طرح دبانے میں ایک عجیب سرور حاصل ہو رہا تھا۔ میں اسی طرح بار بار چادر کو دبا اور چھوڑ رہا تھا کہ پیچھے سے نوکر نے آواز دی۔ "بابو جی! کپڑے لے لیجئے"

میں نے جلدی سے بکس بند کر دیا۔

پوچھا۔ "سب ہیں؟"

"ہاں بابو جی ـــــ آج گھر سے ایک کپڑا چوری ہو گیا، بابو جی"

"کیسا کپڑا؟"

"چھوٹی دیدی کی چادر تھی سلک کی۔ بھگوان جانے کون اُٹھا لے گیا"

میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

نوکر پھر بولا۔ "میں ایسا نہیں بابو جی۔ دیدی بھی اسکو جانتی ہیں۔ پھر چادر کس نے چرائی سمجھ میں نہیں آتا؟"

نوکر چلا گیا۔ میں پھر اپنے ہی آپ سوال و جواب کرنے لگا۔

"ہاں تو کیا کسی سے محبت کرنیکا وقت آگیا؟"

"معلوم تو ہوتا ہے"

"کس سے؟"

"رما سے!"

"کیا یہ اچھا ہوگا؟"

" ا۔سے رما ہی سے پوچھ دیکھنا چاہئے۔"

~~~~~~~~~

۵ جولائی سنہ ۴۰ء

اس روز سے آج تک رما میرے سامنے نہیں آئی۔ ایسے مواقع بھی آئے مگر رما نے ٹال دیا۔ آج شام کو بہت گرمی تھی سب کی رائے ہوئی کھلی چھت پر چل کر بیٹھنا چاہئے رما اپنے کمرے میں گھسی بیٹھی تھی۔ بھابی نے کہا۔ رما چل ہم لوگ چھت پر چل رہے ہیں"

اس نے کہہ دیا ـــ چلو آتی ہوں مگر آئی نہیں۔

ہم تینوں چھت پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مراری کو جیسے کوئی بھولی بات یاد آگئی، بولے۔ ارے دیکھو تم سے تو کہا ہی نہیں۔

بھابی نے پوچھا۔ "کیا ؟"

" چچاجی کا خط آیا ہے"

" کیا لکھا ہے ؟ "

" موہن کو بلایا ہے"

" کب تک ؟ "

" اتوار تک۔ ان کو پرسوں جانا چاہئے ایک ضروری کام ہے"

میں نے مراری سے پوچھا۔ تمہارے لئے تو الگ خط تھا۔ اس میں کیا لکھا تھا۔

مراری نے ہنس کر کہا۔ تمہارے بتانے کی بات نہیں ہے میں بھی اسی طرح ہنس کر بولا۔ بتانے کی ضرورت نہیں میں سمجھ گیا۔

بھابی بڑے اضطراب کے ساتھ بولیں۔ اچھا مجھے بتا دو۔

مراری نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ تمہیں بتانے کے لائق بھی نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ مجھ سے سن لو بھابی شادی کی بات ہوگی۔

پھر میں نے مراری کی طرف رخ کر کے کہا یہی بات ہے؟

مراری نے ہنس کر کہا۔ نہیں۔"

بھابی نے خوش ہو کر پوچھا۔ کیا کہیں ٹھہرائی ہے شادی ان کی ؟

مراری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہاں !"

" کہاں ؟ " بھابی نے اشتیاق کیساتھ پوچھا۔

" مراد آباد میں"

" مراد آباد میں ؟ بھابی چونک کر بولیں۔

" ہاں ، وہاں کی لڑکی انکو بہت پسند ہے"

" کسی نے لڑکی کو دیکھ لیا ہے ؟ بھابی نے پوچھا۔

" اب دیکھ لی جائیگی " مراری نے کہا

" اجی اس کو دیکھنا کیا ہے کسی لڑکی کے سینگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں " مراری نے کہا۔

" ارے یہ اس لڑکی سے تھوڑے ہی شادی کریں گے "

" پھر کس سے کرینگے ؟ "

" جسے یہ چاہتے ہوں گے۔ بتائیں یا نہ بتائیں انہوں نے کسی کو چھانٹ تو ضرور ہی رکھا ہوگا"

" تو ان کی رومانی شادی ہوگی "

" اور کیا ! یہ کہتے نہیں تھے اس روز کہ انسان زندگی میں ایکبار محبت ضرور کرتا ہے"

میں نے کہا " لیکن کون جانے میری زندگی میں وہ وقت کب آئیگا اور آئیگا بھی یا نہیں۔ محبت یا عورت کو میں زندگی کا مقصد نہیں سمجھتا بلکہ مجھے تو ان دونوں سے ..."

" نفرت ہے ؟ " بھابی بول اٹھیں۔

میں نے کہا۔ ہاں "

بھابی کچھ سوچنے لگیں۔ مراری نے اس طرح میری طرف دیکھا۔ جیسے میں نے کوئی بے محل بات کہہ دی ہو۔ میں ٹہلتا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ اسی طرح ٹہلتا ہوا زینے کی طرف بڑھا میں نے چپل نیچے آنگن ہی میں اتار دی تھی میں جیسے ہی پہلے زینے پر پہنچا ایسا معلوم ہوا دوسرے زینے پر کوئی کھڑا ہے جو گرا اور لڑھکتا ہوا آنگن میں چلا گیا۔ میں نے مراری کو آواز دی اور خود تیز تیز زینے طے کرتا نیچے پہنچا تو دیکھا رما بے ہوش پڑی ہے سر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ مراری حیرانی کے لہجے میں بولے۔ یہ کیسے گری ؟ میں نے رما کی خاطر اتنا جھوٹ ملا دیا۔ وہ شاید اوپر آرہی تھی۔ میں نے خیال نہیں کیا۔ میں اس سے ٹکرا گیا۔ بے چاری میری وجہ سے کتنی تکلیف میں مبتلا ہوگئی۔ مراری ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ساری رات ہم لوگوں کی پریشانی میں گذری کسی کو ایک منٹ کے لئے سونا نصیب نہ ہوا۔

~~~~~~~~~

۶ جولائی سنہ ۴۰ء

رما کی طبیعت ذرا ٹھکانے ہوئی تو بھابی نے اس سے کہا ـــ " بے چارے موہن بابو بہت پچھتا رہے ہیں کہ ان کی غلطی سے تجھے اتنی تکلیف پہنچی۔ وہ غریب بھی کیا کرے اندھیرے میں ٹکر ہوگئی۔ پھر زینہ بھی تو کتنا خراب ہے۔

رما آنکھیں پھاڑے بھابی کی باتیں اس طرح سنتی رہی جیسے وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں آنگن میں بھابی کی یہ باتیں سن رہا تھا۔ ڈاکٹر آئے تھے۔ رما کو ہلکا سا بخار ہوگیا تھا دوا دیکر چلے گئے۔ لیکن دس بجتے بجتے بخار بہت بڑھ گیا۔ ڈاکٹر پھر بلائے گئے۔ انہوں نے دیکھ کر کہا۔ تعجب ہے کہ صبح تو یہ اچھی تھیں پھر اس وقت بخار اتنا تیز کیوں ہو گیا۔ دماغی صدمے کے سوا اور وجہ تو سمجھ میں نہیں آتی۔ خیر میں دوا دیتا ہوں۔

ڈاکٹر دوا دے کر چلا گیا۔ شام تک رما کے بخار میں کمی نہیں ہوئی۔ میں رما کا ٹمپریچر لے کر ڈاکٹر کے ہاں گیا۔ اور دوا لے آیا۔

بھابی بہت پریشان تھیں۔ میں نے کہا آپ ناحق اس قدر پریشان ہیں۔ کل تک ان کا بخار کم ہو جائیگا۔ اب آپ جا کر دوسرا کام دیکھئے۔ انکے پاس میں بیٹھتا ہوں۔"

بھابی نے بہت نہیں نہیں کی۔ مراری نے بھی کہا۔ اپنی بھابی کو دیکھنے دو۔ مگر میں نے کسی کی نہ سُنی۔ میں گھنٹے گھنٹے کے بعد ٹمپریچر دیکھتا اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا تیار کر کے دیتا۔ اسی طرح آدھی سے زیادہ رات گذر گئی۔ تھوڑی دیر پہلے مراری لیٹنے چلے گئے تھے۔ بھابی نے کہا۔ تم کل بھی رات بھر کے جاگے ہو۔ آج بھی جاگ رہے ہو۔ کہیں تمہاری طبیعت خراب نہ ہو جائے جا کر تھوڑا آرام کر لو۔

میں نے کہا۔ نہیں آپ جا کر لیٹ رہئے۔

میں نے ضد کر کے بھابی کو بھی لیٹنے کیلئے بھیجدیا۔ صبح ہوتے ہوتے رما کا بخار کم ہو گیا۔

میں دوا پلانے کیلئے نبض دیکھ رہا تھا کہ رما کی نیند کھل گئی۔ اس نے اپنی کمزور پلکوں کو اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ دوا پی لیجئے۔

رما نے دوا پی کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا کمل کھسک گیا تھا۔ اس کی ایک بانہہ کمل کے اوپر پڑی تھی۔ میں نے کمل کو اوپر کھسکا دیا اور اس کی بانہہ آہستہ سے پکڑ کر کمل کے نیچے کر دی۔

تھوڑی دیر میں صبح ہو گئی۔

~~~

۸ر جولائی سنہ ۱۲ء

رما اچھی ہو گئی۔ اس کا بخار بالکل جاتا رہا۔ سر کا زخم بھی برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ آج پتاجی کا دوسرا خط آیا۔ کل صبح جانا ہے۔

بھابی کو معلوم ہوا تو وہ بہت اداس ہوئیں رما سے کہنے لگیں۔ "سنا رما! کل صبح موہن بابو گھر جا رہے ہیں۔" رما جیسے سوتے سے کوئی ڈراونا خواب دیکھ کر چونک پڑی۔ بولی۔

"کل صبح جا رہے ہیں؟" بھابی نے کہا ——

"ہاں جی! ان کے چلے جانے پر گھر کیسا سونا سونا معلوم ہوگا۔ ان سے رہنے سے ہمیں جتنا سکھ ملا۔ اس سے کہیں زیادہ ان کے جانے پر ہمیں دکھ ہوگا۔ کون جانے اب کے گئے کب آئیں گے۔" رما بھابی کی بات سنکر چپ سی ہو گئی۔ جیسے اس کے ہونٹ سل گئے ہوں۔

میں رات کو اپنے کمرے میں گیا۔ تو سوچا سامان درست کر ڈالوں۔ بکس کے کپڑے نکالے تو سب کے نیچے رما کی چادر نکلی۔ کئی منٹ تک اسے ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا پھر کچھ سوچنے کے بعد اسے سب کے اوپر رکھ کر بکس بند کر دیا۔ یہ سب کرتے کرتے رات آدھی سے زیادہ چلی گئی۔ جا کر بستر پر لیٹا لیکن آنکھوں میں نیند کا نام نہ تھا طرح طرح کے خیالات دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔

یکایک کسی نے باہر سے دروازے کو آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا۔ میں نے انگلی سے سوچ دبا کر پوچھا۔ "کون؟" اور کواڑ کھول دیا۔ دیکھا تو دروازے پر رما کھڑی تھی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی بے اختیار منہ سے نکل گیا۔ "تم ——!"

رما کے سر سے پٹی بندھی تھی۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "بجلی بجھا دیجئے۔"

میں نے کمرے میں آ کر سوچ دبا دیا۔ چاندنی رات تھی۔ مسکراتے ہوئے چاند کی روشنی کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر جھانک رہی تھی۔ رما کانپتی ہوئی کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے جلدی سے اس کے آگے کرسی بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

رما اسی طرح کانپتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی میں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اس کمزوری میں اتنی رات کو کیوں آئیں کیا مجھ سے کچھ کام تھا؟"

ایک لرزتی ہوئی دھیمی آواز سنائی دی۔

"ہاں!"

رما پر چاندنی اچھی طرح پڑ رہی تھی۔ اس نے شال سے ہاتھ نکال کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ آپکی گھڑی رہ گئی تھی وہاں۔"

میں نے ہاتھ بڑھایا اور ایک نرم و نازک ہاتھ کی گرم انگلیوں نے آہستہ سے میری ہتھیلی کو چھو کر گھڑی چھوڑ دی گھڑی نہ جانے کتنی دیر سے اس نازک ہتھیلی میں تھی۔ میں نے کہا۔ "اس وقت تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں صبح لے لیتا۔"

کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی پھر رما نے مرتعش آواز میں پوچھا۔ "آپ صبح چلے جائیں گے؟"

"ہاں۔" کہکر میں جھکا اور زمین پر رکھے ہوئے بکس سے رما کی چادر نکال کر اسکی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "یہ چادر ——"

رما نے سر جھکائے جھکائے کہا ——

"رکھ لیجئے۔"

میں نے چادر کو ٹیبل پر رکھ لیا۔ میرا دل نہ جانے کیسا ہو رہا تھا۔ میں نے کہا ——

"ایک بات پوچھوں؟"

رما خاموش تھی۔ چند سیکنڈ انتظار کر کے میں نے وہ بات پوچھ ہی ڈالی —— "تم مجھے معاف کر دیا ——؟"

رما اب بھی کچھ نہ بولی۔ میں کہتا گیا۔ "نادانستگی میں میں نے تمہیں بہت تکلیف پہنچائی ہے۔"

رما نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ——
~~~

"کس نے؟ آپ نے؟"

آنسوؤں سے اس کا گلا بھر آیا۔

میں گھبرا کر بولا "ارے تم ـــــ"

وہ اپنے کو سنبھال کر کہنے لگی "میں نے آپ کو کہانی کیلئے الزام دیا۔ سینما میں آپ میری چپل اُٹھا لائے۔ میں زینے سے گری اپنی غلطی سے لیکن میری کمزوری کو چھپانے کیلئے آپ جھوٹ بولے۔ اور میرا قصور اپنے سر لے لیا۔ رات رات بھر میرے لئے جاگے میری خدمت و تیمارداری کی ......" یہ کہتے کہتے وہ زور سے رو پڑی۔

میں نے سمجھاتے ہوئے کہا "منورما ان باتوں کا خیال نہ کرو۔ میں تمہارے لئے جو کچھ کر رہا تھا وہ صرف اپنا فرض ہی سمجھ کر نہیں اس سے ایک مقصد اور بھی تھا۔ میں تمہاری ہمدردی حاصل کرنا چاہتا تھا اور وہ شاید اسلئے کہ میں تم سے محبت کرتا تھا لیکن نہیں جانتا کہ میں تم سے محبت کرنے کے لائق تھا بھی یا نہیں۔ تم اس رخصت کی گھڑی میں اسطرح یہاں آ گئیں نہیں تو مجھے دل کی بات دل ہی میں لئے چلا جانا پڑتا۔ میں تمہاری محبت کے لائق نہ تھا پھر بھی تم ......"

"بس اب رہنے دیجئے" رما آنسوؤں سے بھرے ہوئے گلے کے ساتھ پکار اُٹھی۔ "آپ کے ہاتھ جوڑ رہی ہوں بس اس سے زیادہ کچھ نہ کہیئے۔ نہیں تو میرا کلیجہ پھٹ جائیگا۔"

وہ کرسی کے پائے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ میں نے بھرائے ہوئے گلے سے کہا "اگر تمہیں ان باتوں سے تکلیف ہوتی ہے تو میں اب کچھ نہ کہونگا رما، تم اپنے کو سنبھالو۔ اس قدر بے صبر نہ ہو۔"

رما کچھ سنبھل گئی۔

میں نے محبت آمیز لہجے میں کہا "میں یہاں سے گھر جا رہا ہوں۔ ابھی میں نے آئندہ کیلئے کوئی پروگرام طے نہیں کیا ہے شاید اب تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دینا پڑے اس کے بعد میں جہاں رہوں گا تمہیں خط لکھتا رہونگا۔ اپنے دل کی بات تمہیں لکھ کر مجھے بڑی تسلی ہوگی۔ تمہیں میرے لئے صدمہ نہ کرنا چاہیئے۔ تم بھی مجھے خط لکھا کرو گی نا!"

رما آنسو روک کر دھیمے سر بولی "ہاں"

میں نے کہا "یہاں سے گھر جانا تو وہاں کا پتہ لکھ بھیجنا۔ اچھا اب تم جاؤ۔ تمہیں بہت دیر ہو رہی ہے"

رما آہستہ آہستہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے آگے بڑھ کر روشنی جلا دی۔ رما میرے پاس آئی اور سر جھکا کر شرمائی ہوئی گلوگیر آواز میں بولی "چٹھی بھیجنا بھول نہ جانا"

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "نہیں بھولوں گا نہیں۔ گھر پہنچتے ہی خط لکھونگا۔ اچھا اب جاؤ تم اتنی کمزوری میں ـــــ"

میں باہر کی طرف دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا کہ میرے پاؤں کسی چیز سے چھو گئے چونک کر نیچے دیکھا تو رما پیروں پر جھکی پڑی تھی۔

میں نے گھبرا کر پاؤں کھینچ لئے۔ اور دیوار سے سٹ کر بولا "ارے تم یہ کیا کر رہی ہو؟"

اس نے سر اوپر اُٹھا کر روتے ہوئے کہا "اتنے سنگدل نہ بنو اور مجھ سے اس حق کو نہ چھینو"

اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے دونوں پاؤں پکڑ لئے۔ لیکن شاید اتنے سے بھی تسکین نہ ہوئی وہ اپنے پٹی بندھے سر کو میرے پیروں پر رکھ کر انہیں اپنے آنسوؤں سے بھگونے لگی۔ میں بھی ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار رو پڑا۔

~~~~~

۲۱/ جولائی سنہ ۴۰ء

مراری کو نہ جانے کیسے میری اور رما کی محبت کا حال معلوم ہوگیا۔ ان میں اور بھابی میں بات چیت ہوئی۔ کہ میرے ساتھ رما کی شادی کر دی جائے۔ بھابی کی رائے سے مراری نے بھابی کے پتا کو چٹھی لکھی تھی۔ وہ رما کے ہاں آئے ہوئے ہیں مراری نے خط لکھ کر مجھے بھی بلایا تھا۔ آج میں بھی بھابی کے ہاں آیا ہوا ہوں۔

بھابی نے پوچھا "تمہیں تو صبح ہی کی گاڑی سے آنا تھا۔ اس سے کیوں نہیں آئے؟"

میں نے کہا "ایک ضروری کام آ گیا تھا"

"کونسا ایسا ضروری کام تھا بھئی؟"

"قلیوں نے ہڑتال کر دی تھی"

بھابی ہنس پڑیں، بولیں "قلی، مزدور، کسان، سیلاب، اور قحط کا چندہ، بس تمہیں یہی سب کام رہتے ہیں۔ آخر کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

اتنے میں مراری نے آواز دی "ادھر آنا جی" پھر اپنے سامنے بٹھا کر کہنے لگے۔ "حضرت آپ کو تو محبت اور عورت دونوں سے نفرت تھی لیکن یہ کیا کیا آپ نے؟"

میں نے کچھ جھینپ کر کہا۔ "آخر کیا کیا ہے میں نے؟"

"وہی اس روز کی بات بھول گئے؟"

"نہیں بھول تو نہیں گیا لیکن آخر میں بھی تو انسان ہی ہوں نہ، دیوتا تو ہوں نہیں"

"انسان کو زندگی میں ایکبار ضرور شاعر بننا پڑتا ہے۔ پھر تم انسان ہو کر بغیر شاعر بنے رہ کیسے سکتے تھے؟"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے"
~~~~~

میں شام کو مراری کے ساتھ ٹہلنے گیا تو دورانِ گفتگو میں میں نے کہا: "جب میرے خفتہ جذبات بیدار ہی ہو گئے تو ان کو زبردستی دبانا فضول ہے اور اب تو ایسا ہی سوال نہیں ہے رما کا بھی سوال ہے اور اس پر ظلم کرنا میں پاپ سمجھتا ہوں۔ جب حالات ہی نے ہم دونوں کو ایک کر دیا ہے تو میں بھی اب شادی کر ہی لونگا چاہے نتیجہ کچھ ہو۔"

"نتیجہ کیا کچھ ہو گا جی۔ اچھا ہی ہوگا۔ عورت کوئی وبال نہیں ہے۔ وہ تو ایک سہارا ہے میں تو یہاں تک کہنے کیلئے تیار ہوں کہ مرد عورت کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔"

"ممکن ہے تمہارا کہنا درست ہو۔"

شام کو مراری کی کہیں دعوت تھی۔ بھابی بات کرکے مجھے اپنے سامنے بٹھا کھلانے لگیں۔ انہیں مراری سے معلوم ہو چکا تھا کہ میں رما سے شادی کرنا منظور کر لیا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے مسکرا رہی تھیں۔

میں نے پوچھا "کیا ہے بھابی؟"

"کچھ نہیں۔ ایک بات یاد آرہی ہے۔"

"کون سی بات؟"

"تم نے ایک روز کہا نہیں تھا کہ زندگی میں ایکبار ہر شخص کو عاشق اور معشوق بننا پڑتا ہے"

میں بھابی کا مطلب سمجھ گیا، بولا: "ہاں کہا تو تھا۔"

"اور اس روز جو چھت پر کہا تھا: کون جانے میری زندگی میں وہ وقت کب آئے گا۔ وہ بھی یاد ہے؟"

میں نے ذرا شرما کر کہا: "ہاں وہ بھی یاد ہے۔"

بھابی نے اپنی خوشی کو اندر ہی اندر دبا کر کہا: "لیکن وہ وقت تو آگیا۔"

میں شرما کر چپ چاپ کھانے لگا۔ بھابی نے کہا: "اس میں شرمانے کی تو کوئی بات ہے نہیں۔ تم کوئی برا کام تو کرنے جا نہیں رہے ہو۔"

میں نے پانی پی کر کہا: "برا کام کاہے کو ہے بھابی۔ اس سے بڑھ کر پُن کا کام اور کیا ہو سکتا ہے۔"

بھابی ہنس کر بولیں: "یہی تو۔"

کچھ دیر چپ رہ کر بھرے ہوئے گلے سے بھابی کہنے لگیں: "بابو جی، ایک اچھے لڑکے کے لئے کب سے سرگرداں تھے۔ رما میں ایسی کون سی خوبی تھی جو اسے تمہارے جیسا پتی ملتا؟ اگر تم اسے ٹھکرا دیتے تو اس کی زندگی برباد ہو جاتی۔ تم نے رما ہی پر نہیں بابو جی پر، مجھ پر اور میرے خاندان بھر پر دیا کی آج میں اپنے کو تمہارے احسان سے بالکل دبا ہوا پا رہی ہوں۔"

میں نے کہا: "یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو بھابی؟ میں تو وہی تمہارا پہلے کا موہن ہوں میں تمہاری خوشی کے لئے کیا نہیں کر سکتا۔ مجھ پر تمہارا ہر طرح کا حق ہے۔"

بھابی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بولیں: "میری خوش قسمتی ہے جو تم مجھے ایسا سمجھتے ہو۔"

---

۲۳ جولائی ۱۹۴۰ء

آج میں گھر واپس جا رہا ہوں۔ مراری نے کہا: "تمہارے پاس واپسی کا ٹکٹ ہے۔ اس لئے اب تم جا سکتے ہو۔ رما کے پتا نے تمہیں دیکھ لیا۔ اس کے بعد ضروری باتیں چچا جی سے طے کر لی جائیں گی۔"

اسٹیشن جاتے ہوئے راستے میں مراری نے کہا: "حضرت، ایک بات کیلئے مہربانی کرنا۔"

میں نے ڈر کر پوچھا "کیا؟"

مراری نے میرے منہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب رما کو خط نہ لکھنا۔ سمجھے!"

میں نے کہا: "بہت اچھا۔"

---

۲۹ جولائی ۱۹۴۰ء

آج شہر کے نیشنل کالج کے سیکرٹری ملے۔ کہنے لگے: "میں کئی روز سے تمہاری تلاش میں تھا۔ اب مہربانی کرکے کالج کو سنبھالو" وہ ایک ایثار پیشہ اور مخلص قومی خدمتگذار ہیں۔ میں انکی بات ٹال نہ سکا منظوری دیدی۔

---

۳۱ اگست ۱۹۴۰ء

جب سے گاندھی جی نے ستیاگرہ کا فیصلہ کیا ہے۔ سارے ملک میں ستیاگرہ کا بازار گرم ہے۔ آج میرے کالج کے سیکرٹری ستیاگرہ کرنے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان کے بعد مجھی کو ان کی جگہ لینی پڑے گی۔ اچھا جو بھی راشٹر کی پکار کا جواب تو دینا ہی ہے۔ لیکن رما ——؟ اسے ایشور پر چھوڑنا پڑیگا۔

یکم ستمبر ۱۹۴۰ء

آج میں ستیہ گرہ کرنے جا رہا ہوں معلوم نہیں۔ آیندہ کب ڈائری لکھنے کا موقع ملے۔

---

۴ دسمبر ۱۹۴۰ء

آج میں مراری کے ہاں آیا۔ نوکر سے معلوم ہوا کہ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ مراری بھابی کو لے کر رما کی شادی میں شرکت کرنے گئے ہیں نوکر سے زیادہ تفصیل تو نہ معلوم ہو سکی صرف اتنا پتہ چلا کہ جب رما کے پتا کو معلوم ہوا کہ تین سال کیلئے میں جیل چلا گیا تو وہ میرا انتظار نہ کر سکے اور رما کیلئے دوسرا لڑکا طے کر لیا۔ انہوں نے جو کچھ کیا بیجا نہیں کیا۔ شاید

میری زندگی کا سب سے عجیب واقعہ

ازجناب حمید صحرائی میرٹھ

(نام. مقامات، اور واقعات سو فی صدی صحیح ہیں۔)

حقیقت کو افسانوی رنگ میں پیش کرنے سے اس کی اصلیت مفقود ہو جاتی ہے صداقت کے پھولوں میں جو کیف آگیں نکہت پنہاں رہتی ہے وہ بناوٹی پھولوں میں کہاں۔ علاوہ ازیں حقیقت کی تابانی پر تصنع کی جھوٹی نقاب ڈال کر اسکی ضیا انداز شعاعوں کو مقید کرنا بھی مجھے نہیں آتا۔ اسلئے صاف گوئی میری سرشت میں داخل ہو کر رہ گئی ہے اور میں جو کچھ کہوں گا وہ صداقت پر مبنی ہوگا۔

یہ روئداد حیات جو میں آج قلمبند کر رہا ہوں میری کتاب زندگی کا وہ اہم باب ہے جس نے میرے اندر تغیر رونما کر دیا۔ اور میری زندگی سراپا مسرت بنادی۔ کئی سال پہلے جب میں متعلم تھا میری زندگی وبال جان بنکر رہ گئی تھی۔ زندگی سے رہائی پانے کا خیال بعض اوقات بہت ہی سہانا معلوم دیتا تھا۔ کئی مرتبہ خود کشی جیسے مذموم فعل کا قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں بجلی ایسی سرعت سے پیدا ہوا لیکن کوئی غیر مرئی قوت میرے خیالات کو عملی جامہ میں ملبوس ہونے سے روکتی رہی علاوہ ازیں جب میں زندگی کے آخری سانس موت کی آغوش میں توڑنے کا خیال کرتا تو ریحانہ کا خیال میرے تمام مستحکم ارادوں کو شکست فاش دے دیتا۔ ریحانہ میرے چچا کی لڑکی تھی۔ جو سامنے والے مکان میں رہتی تھی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ پرورش پائی تھی۔ عہد طفلی سے گذر کر منفوان شباب کی وادیوں میں قدم رکھنے تک ہم ساتھ ہی رہے تھے اور ہمارا بچپن کا انس محبت کی صورت میں متشکل ہو گیا تھا۔ میں مستقبل کے رنگین خواب دیکھ رہا تھا کہ اس مرتبہ میٹرک کے امتحان میں ضرور پاس ہو جاؤنگا۔ کیونکہ گذشتہ سال فیل ہو چکا تھا۔ اور کامیابی کے بعد میں ہونگا اور میرے ارمانوں کی دنیا ریحانہ۔ شادی کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے صرف نتیجہ کا انتظار تھا۔

انتظار کی تلخیاں میں خوشی سے برداشت کر رہا تھا مصیبت کے بعد راحت کی ضرب المثل نے میرے اندر استقلال پیدا کر رکھا تھا کیونکہ وہ دن دور نہ تھا جب میرے خیالوں کی حسین ملکہ اور تصورات کی آماجگاہ ریحانہ میری آغوش میں ہو گی اور میں ابدی مسرت سے دیوانہ ہو جاؤنگا شاید ریحانہ کو بھی اس کا احساس تھا کیونکہ اب وہ میرے سامنے کم آنے لگی تھی اور جب اس کی آنکھیں مجھ سے چار ہوتی تھیں تو حیا کی سرخی اس کے صبیح رخساروں پر پھیل جاتی تھی۔ ایسی سرخی جو غروب آفتاب کے وقت شفق کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ میں خوش تھا۔ بیحد خوش۔ گویا دولت کونین میرے قبضے میں آیا چاہتی ہے لیکن قدرت میرے ارادوں کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ نتیجہ نکلا۔ خلاف امید نتیجہ، خوفناک نتیجہ، میرے خوابوں کے رنگین قصر کو مسمار کر دینے والا نتیجہ۔ میں فیل ہو گیا تھا۔ جی میں آیا کہ زہر کھا لوں یا ماموں جان کے پستول کو پہلی اور آخری بار استعمال کروں لیکن میں کر نہ سکا۔ خود میں مرنا چاہتا تھا لیکن گھر کے دوسرے لوگ آڑے آرہے تھے۔ عزیز واقارب، دوست واحباب اور والدین کی پیہم تسلیوں نے میرے غم کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن میں کر نہ سکا تاوقتیکہ خود ریحانہ نے میرے اضطرار میں کمی کرنے کا تہیہ نہ کر لیا۔ اس نے کہا

"شاہراہ حیات کو طے کرنے کے لئے لاتعداد صعوبات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ابتدا ہی میں گھبرا جانا مستقل مزاجی نہیں بزدلی ہے۔ تم مرد ہو ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ ہو حقیقی کوششیں ایک بار پھر کام میں لاؤ۔ جانتے ہو دلی تجسس سے دار امکان میں سب ہی کچھ مل جاتا ہے۔ سمجھ لو کہ تم نے امتحان ہی نہیں دیا ایکبار پھر کوشش کرو۔"

ریحانہ کے ان الفاظ نے میری ہمت کو پھر جوان کر دیا۔ لیکن ایک دوسری مصیبت اور پیش آگئی۔ میرے رشتہ داروں نے فیصلہ کیا کہ ریحانہ کی محبت اور دوسرے تفریحی مشاغل میرے فیل ہونے کے واحد ذمہ دار ہیں۔ ریحانہ کے والد یعنی میرے چچا یہ الزام سنکر سخت برگشتہ ہوئے اور انہوں نے صاف صاف کہدیا کہ یہ رشتہ ابھی اب نہیں ہو سکتا میری ریحانہ مجھ سے زبردستی چھینی جا رہی تھی اور میں سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔

انہوں نے مشورہ کیا کہ مجھے بھائی صاحب

کے پاس میرٹھ بھیجدیا جائے جو اسوقت وہاں پر نائب تحصیلدار تھے اور میں میرٹھ ایکبار پھر امتحان کی تیاریوں میں منہمک رہ کر قسمت آزمائی کروں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور میں ایک غمگین شام کو ماموں جان کی معیت میں میرٹھ روانہ کر دیا گیا۔

میرٹھ پہونچکر مجھے گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ نیا ماحول۔ نئے لوگ نیا شہر طبیعت اچاٹ اچاٹ سی رہتی تھی ادھر ریحانہ کا خیال سوہان روح بنا ہوا تھا۔ حالانکہ میرٹھ سے مرادآباد کچھ دور نہ تھا لیکن بھائی جان کی سخت نگرانی نے میری زندگی دبال جان کر دی تھی۔ آدھی آدھی رات تک کتابیں کھولے بیٹھا رہتا لیکن خیال مرادآباد کا رہتا اور ریحانہ کی معصوم صورت آنکھوں میں پھرتی رہتی بھائی جان سمجھتے میں سر توڑ محنت کر رہا ہوں لیکن میں جانتا تھا کہ میری پڑھائی کس طرح کی ہو رہی ہے۔

جوں جوں امتحان کے دن نزدیک آرہے تھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بہت ہی بھاری بوجھ میری روح پر رکھا جا رہا ہے..... اور جب امتحان کا صرف ایکماہ رہگیا تو مجھے اپنی کمزوری کا سخت احساس ہوا۔ پچھلے دو سالوں میں جو کچھ سیکھا تھا وہ بھی اب بھول چکا تھا۔ تاریخ کا کوئی واقعہ یا الجبرا کے کسی فارمولے سے میں مطمئن نہ تھا۔ اقلیدس کی شکلیں مجھے کریہہ المنظر معلوم دیتی تھیں۔ اور ارتھمیٹک کو تو میرے مقدر سے بغض تھا۔ پھر بتلائیے میرے پاس ہونے کی کیا امید ہو سکتی تھی میں قریب قریب نا امید ہو چکا تھا اور نا امیدی کے احساس نے میری دماغی قوتوں کو مضمحل کر دیا تھا

میرے ہم جماعتوں میں خورشید عالم بھی ایک ایسا لڑکا تھا جسکو مجھ سے دلی ہمدردی تھی وہ تعلیم کے باب میں میری کافی مدد کرتا تھا اور میرے راز سے واقف بھی ہو گیا تھا۔ ایکدن اس نے مجھے رائے دی کہ میں عملی جدوجہد کے ساتھ ساتھ روحانیت سے مدد لوں۔ کیونکہ گذشتہ کسی موقعہ پر خود اسکو اس کی ضرورت پیش آئی تھی اور وہ کامیاب ہو گیا تھا۔

چنانچہ میں نے اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حصول مقصد کیلئے تجسس شروع کر دیا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اسوقت مارولیس فارمیسی کے پروپرائٹر ڈاکٹر انعام الٰہی صاحب کے یہاں ایک شاہ صاحب مقیم تھے۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی خدا ترس متقی اور پرہیزگار آدمی ہیں۔ ان دنوں وہ کبھی کبھی بھائی صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے۔ چنانچہ میں ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ خورشید اور میرے باہمی مشورہ سے طے پایا کہ اس معاملہ میں ڈاکٹر صاحب سے مدد لی جائے۔

پیٹرایل کا بازار جہاں مارولیس فارمیسی قائم ہے وہ زیادہ دور نہ تھا چنانچہ میں اور خورشید جمعہ کی شام کو وہاں پہونچے ڈاکٹر موصوف بڑے اخلاق سے پیش آئے اور ان کے استفسار پر خورشید عالم نے میری ترجمانی فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب نے تعجب خیز نظروں سے میری جانب دیکھا اور میں محجوب سا ہو کر رہ گیا۔ تاہم انہوں نے میری ہمت دلائی کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے محنت برابر جاری رکھو۔ کل علی الصباح آجانا شاہ صاحب سے نقش دلا دونگا" ہم نے اظہار تشکر کے طور پر اثبات میں جواب دیا اور وہاں سے چلے آئے

میری رات سخت بے چینی سے بسر ہوئی اور ہم سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں شاہ صاحب ہی کے کمرہ میں بلا لیا۔ شاہ صاحب اس سردی کے موسم میں بھی صرف ایک لنگی باندھے بیٹھے تھے۔ سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ عمر تقریباً ۷۰ سے متجاوز کر گئی تھی۔ لیکن جسم فربہ اور گٹھیلا تھا۔ انکے چہرے پر نور برس رہا تھا۔

جسوقت ہم کمرے میں داخل ہوئے وہاں ایک مارواڑی قسم کے سیٹھ بیٹھے ہوئے تھے ایک طرف کچھ پھل رکھے تھے اور سو سو کے پانچ نوٹ سیٹھ جی کے ہاتھ میں تھے جو وہ شاید شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ اور شاہ صاحب کہہ رہے تھے۔

"مجھے اس سے کیا۔ میں نہیں لے سکتا اگر تم خرچ ہی کرنا چاہتے ہو تو اس کو خیرات کے کسی کام میں لگا دو۔ مجھے ایک پیسہ لینا حرام ہے"

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے شاہ صاحب کے قالب میں جنت کا کوئی بہت ہی مقدس فرشتہ بول رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے ہمیں پیش کیا۔ شاہ صاحب نے میری طرف دیکھا ان کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن تھیں۔ انہوں نے ایک تعویذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو یہ تعویذ تمہاری رہنمائی کریگا لیکن یہ یاد رکھو کہ تمہارے پاس یا فیل ہونے کا دار و مدار خود تمہاری محنت پر ہے جس مضمون کا امتحان تمہیں اگلے روز دینا ہو اسکی کسی کتاب میں اس کو رکھدینا

اور اگلے روز جاتے وقت اسکو اپنے داہنے بازو پر باندھ لینا۔ خدا تمہاری مدد کریگا۔ —— تم جس خیال کو اپنے دل میں جگہ دئے ہوئے ہو کچھ دنوں کے لئے اس کو نکال دو۔ محبت کے معاملے میں انسان مجبور ہے اس کامیابی کے بعد دوسری کا تجسس کرنا۔ سمجھے۔ جاؤ اور کوشش کرو"۔

مجھے خیال ہوا کہ شاہ صاحب نے اپنی روحانیت کی طاقت کی وجہ سے ریحانہ اور میری محبت کو معلوم کر لیا ہے کیونکہ میرٹھ میں اس راز کو سوائے خورشید کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ بہر حال دل میں عقیدت کا ایک طوفان لئے ہوئے میں واپس چلا آیا۔

کچھ دنوں بعد شاہ صاحب چلے گئے کہاں؟ یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ خود ڈاکٹر صاحب بھی اس راز سے واقف نہ تھے۔ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بتلایا کہ شاہ صاحب ہمالیہ کے دامن میں کسی تاریک گو محفوظ مقام پر رہتے ہیں۔ وہ صرف برسات کے موسم میں یہاں آتے ہیں وہ اپنا پتہ کسی کو نہیں بتلاتے اور یہی وجہ ہے کہ وہ خود بھی ان کے پتہ سے واقف نہ تھے۔

بہر حال تعویذ سے میری ہمت بندھ گئی اور میں شاہ صاحب کے بتلائے ہوئے اصول پر سختی سے کار بند رہا۔ تعویذ کا استعمال حسب ہدایت کرتا رہا۔ امتحان دیا۔ پرچے پاس ہونے کے قابل ہوتے رہے لیکن کسقدر تعجب کا مقام ہے کہ جب میں آخری پرچہ کرنے کے بعد کمرے سے نکلا ہوں تعویذ میرے بازو پر نہ تھا۔ خدا جانے وہ کہاں غائب ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد نتیجہ نکلا۔ میں فرسٹ ڈویژن پاس ہو گیا تھا اور حساب میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ جب میں نے یہ مسرت افزا خبر سنی، مجھے کائنات کے ہر ذرے پر بشاشت تھرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شاہ صاحب کی یاد کے نقوش میری لوح دل پر بہت گہرے ہو گئے۔

جس مقصد کو لیکر میں میرٹھ آیا تھا اس میں مجھے کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ بھائی صاحب نے مجھے مراد آباد جانے کی اجازت نہ دی تھی۔ وہ میری مراجعت نتیجہ ظاہر ہونے تک معرض التوا میں ڈالے رہنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ اب جبکہ میں پاس ہو گیا تھا تو میرٹھ کا ماحول مجھے بے کیف معلوم ہونے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد گھر پہونچکر ریحانہ کے قرب سے زندگی کے تلخ لمحات شیریں بنا لوں۔ بہت دنوں سے مجھے ریحانہ کی بابت کچھ معلوم نہ ہوا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے اس کا کوئی خط بھی نہ آیا تھا۔ اس کی یہ طویل خاموشی میرے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی اور میرا دل ریحانہ کو دیکھنے کیلئے بیقرار تھا۔

بالآخر ایک نشیلی شام کو جب آفتاب افق کے جگر میں جذب ہو رہا تھا میں گھر کو روانہ ہو گیا۔

گھر آکر میں نے جو خبر سنی اس سے میرے خرمن حواس پر ایک کوندتی ہوئی بجلی گری چچا اور والد کے تعلقات غایت درجہ کشیدہ ہو گئے تھے۔ ایک کا دوسرے کے یہاں آنا جانا قطعی بند تھا۔ اور ریحانہ کئی ماہ سے بیمار تھی —— سخت بیمار۔ اسے دق ہو گئی تھی۔

میرے مراد آباد پہنچنے کے دوسرے روز کا ذکر ہے کہ میں صبح ہی سے چچا کے گھر جانیکی کوشش میں لگا ہوا تھا مگر کوئی موقعہ نہ ملتا تھا لیکن دل کو ریحانہ سے ملے بغیر کسی پہلو چین نہ تھا چنانچہ شام کو مغرب کے بعد جب دل بہت گھبرایا تو میں والدین کے غصہ کی پروا نہ کرتے ہوئے چچا کے گھر روانہ ہو گیا۔ راستہ میں میرا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔

جب میں مکان میں پہنچا، وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ریحانہ برآمدہ میں لیٹی ہوئی تھی چچی پاس بیٹھی ہوئی تھیں ایک مدھم لالٹین کی روشنی میں اس کا زرد چہرہ نظر آ رہا تھا وہ نقاہت کی وجہ سے مرجھایا ہوا پھول معلوم دے رہا تھا

میں نے چچی کو آداب کیا انہوں نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ ٹھیک اسی وقت چچا بھی دوا کی شیشی لئے ہوئے آگئے۔ اس کے بعد والد صاحب کی شکایت، عزیز و اقارب کے شکوے.... اور نہ معلوم چچی جان کیا کیا فرماتی رہیں۔ اور میں اثبات میں جواب دیتا رہا۔

گھڑی نے ٹن ٹن کر کے آٹھ بجائے۔ ریحانہ نے کروٹ بدلی۔ چچی نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ریحانہ —— ریحانہ! دیکھو حمید آئے ہیں"۔ ریحانہ نے فوراً آنکھیں کھولدیں جیسے وہ یہ سننے کی منتظر ہی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ چمکنے لگا اور شاید بشاشت کی ایک لہر اس کے دل میں پیدا ہو کر تمام بدن میں سرایت کر گئی۔ اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"کیسا رہا تمہارا نتیجہ؟"

"میں پاس ہو گیا ہوں —— ریحانہ"

"پاس ہو گئے تم؟"

"ہاں"

"مٹھائی"

"تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ ریحانہ میں تمہیں بہت مٹھائی کھلاؤں گا"

اسکے بعد سے میں روزانہ چچا کے گھر جاتا رہا گھر کے سب ہی لوگ مجھ سے ناراض رہنے لگے والدین نے سخت و سست بھی کہا لیکن میں نے چچا کے یہاں جانا نہ چھوڑا۔ ریحانہ کی تیمارداری میں میں زندگی کا حقیقی لطف محسوس کرتا۔ میرا طویل وقت اس کے پاس گزرنے لگا۔ لیکن ریحانہ کی بیماری کا خیال مجھے بہت دکھ پہونچاتا تھا ———

میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد غسل صحت حاصل کرے لیکن قدرت کے اٹل قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجھے حق نہ تھا اور نہ قوت۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا کہ جب شاہ صاحب تشریف لائیں تو مجھکو بذریعہ تار اطلاع دینا کیونکہ میرے مرض کی دوا سوائے ان کے پاس کے اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔

رنج و خوشی، غم و نشاط کی مخلوط کیفیتوں معمور دن گذرتے جا رہے تھے اور ریحانہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میری پریشانیاں بڑھ رہی تھیں۔ موجودات عالم میں تغیر رونما ہوتا رہا لیکن میری حیات کا سورج ایک ہی محور کے گرد چکر لگاتا رہا۔ جہاں کہیں بھی مجھے کسی درویش کا پتہ ملا میں وہیں گیا۔ لیکن میری امیدیں بار آور نہ ہوئیں۔

ایک صبح جبکہ میرے آسمان تخیلات پر ناامیدی کے بادل چھا رہے تھے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کا تار ملا۔ لکھا تھا۔

"فوراً آ جاؤ شاہ صاحب تشریف لائے ہیں"

جس طرح مرجھائی ہوئی کھیتی آب رحمت کے چند چھینٹوں سے لہلہا اٹھتی ہے۔ اسیطرح میری زندگی کی کھیتی بھی لہلہا اٹھی اور میں پہلی ٹرین سے میرٹھ روانہ ہو گیا۔

میرٹھ آکر میں شاہ صاحب سے ملا۔ اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور بولے۔

"تمہارے واقعات کا مجھ کو علم ہے۔ تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے جلد واپس جانا ہے اگر زندگی نے وفا کی تو آیندہ سال پھر آؤنگا ورنہ امید نہیں ——— کبھی کبھی دعائے خیر یاد کر لیا کرنا۔ خیر، لو یہ سات نقش ہیں تم مریضہ کو سات روز تک روزانہ سورج نکلنے سے پہلے پانی سے دھو کر پلا دیا کرنا۔ اس کے بعد جب مرض میں افاقہ معلوم دے تو یہ بوٹی (جو کسی پہاڑی درخت کا پھل معلوم دیتی ہے) آدھ پاؤ پانی میں جوش دیکر مریضہ کو پلا دیا کرنا خدا نے چاہا تو نقاہت بھی جلد دور ہو جائیگی اور یہ دو نقش ——— ان کو حفاظت سے رکھنا جب مریضہ غسل صحت کر لے تو ایک تم اپنے داہنے بازو میں باندھ لینا اور دوسرا ریحانہ کی چوٹی میں باندھ دینا۔ خدا کو منظور ہے تو دلی مقصد بر آئیگا۔ لیکن خیال رہے تم یہ سب نیک کام کی وجہ سے کر رہے ہو۔ جاؤ آج ہی واپس چلے جاؤ۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے"

میں نے جوش عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور تمام تعویذ لے کر اسی روز شام کو واپس مرادآباد چلا آیا۔

———

اگر آپکو میری ذات پر ذرہ برابر بھی اعتماد ہے تو یقین جانئے کہ تعویذ کیا تھے ایک سحر تھا جو فوری اثر کرتا چلا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ریحانہ کے پژمردہ چہرہ پر شگفتگی کے آثار عود کر آئے۔ چوتھے روز ہی وہ اچھی طرح حرکت کرنے لگی۔ ساتویں روز جب وہ صحتیاب ہو کر اٹھی کسی کو یقین نہ آتا کہ یہ وہی ریحانہ ہے جو ایک ہفتہ پہلے تھی۔ لیکن ریحانہ کی تندرستی دن دونی اصلاح جو گئی ترقی کرتی رہی اور ایک ہفتہ بعد وہ پہلی سی ریحانہ ہو گئی۔ وہی سراپا برق، رنگین صاعقہ۔

———

خدا تعالٰے کے کارخانے میں کسی چیز کے بنتے یا بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ چنانچہ چچا اور والد صاحب کے تعلقات بھی خوشگوار ہو گئے۔ وہی پہلا سا جوش، وہی سرگرمی۔ دیرینہ جذبات عود کر آئے اور فریقین کے باہمی مشورہ سے مجھے اور ریحانہ کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

ہماری شادی کو تقریباً پانچ سال کا عرصہ گذر گیا ہے۔ ریحانہ تادم تحریر ویسی ہی ہے۔ فرق صرف اسقدر ہوا ہے کہ پہلے وہ تنہا تھی اور اب دو بچوں کی ماں ہے۔ شاہ صاحب کے بخشے ہوئے آخری دو تعویذ میرے پاس ابھی تک محفوظ ہیں۔

بارو ملیس علاقہ میں اب بھی بیڑا پل کے بازار میں قائم ہے۔ ڈاکٹر انعام الٰہی صاحب بھی (خدا انہیں سدا خوش رکھے) موجود ہیں لیکن اب شاہ صاحب نہیں آتے۔ ایسی عامل کامل ہستیاں یقیناً سطح گیتی پر معدودے چند ہیں۔ اگر شاہ صاحب مستقبل قریب میں تشریف لائے تو قارئین مست قلندر کو مطلع کیا جائیگا۔

———

اگر راستہ چلتے بازار یا ریلوے بک اسٹالوں سے مست قلندر خرید کر پڑھنے کا شوق آپکو برابر گدگداتا رہتا ہے تو اسکے مستقل خریدار بن جانیے آپ سراسر نفع میں رہینگے کیونکہ صرف للعہ سالانہ چندہ ادا کر کے چار رنگا مہ خیز خاص نمبر آپ مفت حاصل کر سکینگے۔

مست قلندر ہندوستان بھر کے اردو رسائل سے زیادہ چھپتا ہے مشتہرین کو حق حاصل ہے کہ اس دعوی کی تصدیق کرنیکے بعد اپنے اشتہار شائع کرائیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۵۸۵

ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

ماہ جون سنہ ۱۹۴۲ء

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند	بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہا ست	خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

مست قلندر لاہور

اردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیر الاشاعت ماہوار رسالہ

اُن زندہ دل انسانوں کیلئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کیا ہے ہمیشہ خوش رہنا اور دوسروں کو خوش کرنے میں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے قول یا فعل سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے جن کا مذہب ہے خدا کے ہر ایک بندے سے بلا امتیازِ رنگ و قومیت محبت کرنا ؎

قیمت فی پرچہ چھ آنے

ایڈیٹر:- ڈاکٹر پرتھی سنگھ

سالانہ چندہ چار روپے ۴/-

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ڈاکٹر پرتھی سنگھ پرنٹر و پبلشر دفتر رسالہ مست قلندر روشنولین گوالمنڈی لاہور سے شائع

طبی جواہر پارے — ہنگامہ خیز نظمیں — بے بدل رنگین افسانے — دلگداز آپ بیتیاں

فہرست مضامین

جون ۱۹۴۲ء

مست قلندر ہندوستان بھر کے اردو رسائل سے زیادہ چھپتا ہے مشتہرین کو حق حاصل ہے کہ ہمارے اس دعوی کی تصدیق کر لینے کے بعد اپنے اشتہار شائع کرائیں

نگاہِ اوّلیں!

جنگ کی طوالت کے ساتھ ساتھ کاغذ کی گرانی بھی بڑھتی گئی۔ کاغذ اگرچہ دن بدن کمیاب ہوتا گیا۔ مگر کسی نہ کسی طرح مل ضرور جاتا رہا۔ پر اب تو یہ حالت ہے کہ کاغذ کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے بیشتر اخبارات و رسائل کاغذ نہ مل سکنے کے باعث بند ہو گئے۔ وہ تو کہو کہ گورنمنٹ نے بڑے بڑے اخبارات و رسائل کیلئے کاغذ کے لائسنس جاری کر دئے تھے۔ ورنہ اکا دکا پرچے جو دکھائی دے رہے ہیں ابتک وہ بھی عدم آباد کو سدھار گئے ہوتے۔

مست قلندر کی کثیر الاشاعتی

کے باعث کاغذ کی کھپت عام رسائل کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہماری ضرورت کی تکمیل اسطرح ہو رہی ہے کہ کاغذ کا ایک حصہ ہمارے پیپر ڈیلرز میسرز جے۔ این سنگھ اینڈ کمپنی لمیٹڈ سے لائسنس کی بدولت ملجاتا ہے اور جو کمی رہ جاتی ہے۔ اُسے مست قلندر کے پیپر اسٹاک سے پورا کر لیا جاتا ہے۔

مست قلندر کے چندہ میں اضافہ

جب تک کاغذ اسٹاک میں موجود ہے اور کچھ نہ کچھ باہر سے بھی مل رہا ہے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ مست قلندر کے چندہ میں کسی قسم کا اضافہ کیا جاتا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ گورنمنٹ نے کاغذ کی کھپت کو کم کرنے کیلئے اخبارات و رسائل کی قیمت کا معیار ان کے صفحات کے لحاظ سے مقرر کر دیا ہے اس اعتبار سے مست قلندر کی ایک کاپی کی قیمت چھ آنے سے کم کسی صورت مقرر نہیں کی جاسکتی جبکہ اس کی ضخامت ہر ماہ تقریباً ۹۲ صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر ہم قیمت کم کریں تو گورنمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ لہٰذا جون ۴۲ء سے مست قلندر کے چندہ میں مجبوراً اور عارضی طور پر صرف ایک روپیہ سالانہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ گویا بجائے تین روپیہ کے چار روپیہ سالانہ چندہ ہوگا۔ اور بک اسٹالوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر فی کاپی ۶/ میں فروخت ہوا کریگی۔ ناظرین کرام نوٹ کر لیں۔

(ایڈیٹر)

مست قلندر کا انگریزی ایڈیشن

True Confessions of India ہوگا

کا پہلا نمبر اس ماہ کے آخر تک چھپکر تیار ہو جائیگا۔ چونکہ کاغذ کی گرانی نمونہ مفت دینے کی اجازت نہیں دیتی اسلئے خواہشمند ۶/ کے ٹکٹ بھیجکر نمونہ طلب کر سکتے ہیں۔ پہلا پرچہ ضرورت کیمطابق صرف دس ہزار کی تعداد میں چھاپا جا رہا ہے۔ مگر چونکہ اس کی ایجنسیاں تمام بک اسٹالوں، ریلوے اسٹیشنوں اور بڑے بڑے شہروں میں قائم ہو چکی ہیں۔ اسلئے بہت ممکن ہے کہ اشاعت اگلے مہینے ہی دو چند ہو جائے۔ مشتہرین کو واجب ہے کہ نمونہ دیکھنے کے بعد نرخنامہ اشتہار طلب کر کے فوراً اپنے اپنے اشتہار کیلئے جگہ ریزرو کرالیں ورنہ اشاعت کے بڑھ جانے پر شرح اشتہار بھی بڑھا دی جائیگی۔

انگریزی ایڈیشن کیسا ہوگا؟

خوش قسمتی سے انگریزی ایڈیشن کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں بعض ایسی باکمال شخصیتیں جمع ہو گئی ہیں جو گنتی کے دنوں میں اسے انتہائی عروج پر لے جاسکتی ہیں مثال کے طور پر ڈاکٹر کے۔ ایس چودھری ایم اے۔ ایل ایل ڈی۔ پی ایچ ڈی بار ایٹ لا کا نام رسالہ ہذا کے مقبول خاص و عام اور کامیاب ہونے کا ضامن ہے۔

نمایاں خصوصیت

اس پرچہ میں یہ ہوگی کہ اس کا ہر ایک افسانہ اچھوتی ہوگا اور بہترین افسانوں کیلئے بڑے بڑے انعامات اہل قلم حضرات میں ہر مہینے تقسیم ہوا کرینگے۔ آپ ایک نظر پہلے نمبر کو دیکھئے تو سہی پھر اگر اسی کے نہ ہو رہے تو سہی۔

المشتہر منیجر True confessions of India. مست قلندر بلڈنگز لاہور

میری زندگی کا سب سے عجیب واقعہ

اس سلسلہ میں بعض حیرت انگیز اور دلچسپ واقعات مست قلندر کے کالموں میں وقتاً فوقتاً شائع ہو رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے مگر واقعات ایسے ہونے چاہئیں جو تجربہ اور مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد سولہ آنے صحیح اتریں۔ ایسے ہر واقعہ کیلئے حسب دستور دس روپے نقد کا انعام دیا جائیگا۔ خوش قسمتی سے اگر آپکو کسی عامل کامل کا پتہ معلوم ہے اور آپ ان کے فیضان صحبت سے

دنیائے فلم کی تازہ ترین خبریں!

مست قلندر کے فلمی نامہ نگار مقیم بمبئی کے قلم سے

پربھات - وی شانتارام افسوس کہ مالکانِ کمپنی کے بعض جھمیلوں کے باعث علیحدہ ہو گئے۔ پربھات کی نئی فلم 'دس بجے' تیار ہو رہی ہے اور ایک دوسری تواریخی فلم 'رام شاستری' زیرِ تکمیل ہے۔

جنک پکچرز - مسٹر چھوٹو بھائی ڈیسائی لکھتے ہیں کہ ان کی پہلی فلم 'رائے صاحب' جس میں کوشلیا، ترلوک کپور، اور جگدیش سیٹھی نے کام کیا، مکمل ہو چکی ہے۔

بمبئی ٹاکیز - بسنت، ممتاز، شانتی اور الیاس کی یہ پکچر جسے دیویکا رانی بہ نفسِ نفیس ڈائرکٹ کر رہی ہے۔ چند دن میں مکمل ہو جائیگی۔

شالیمار - ڈبلیو زید احمد کی فلم 'ایک رات' خدا خدا کر کے پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اس میں شک نہیں کہ پرتھوی راج اور نینا کو اس فلم کی تیاری میں بہت وقت صرف کرنا پڑا مگر فلم کی خوبیوں کے پیشِ نظر انتظار کی زحمت کا اثر مسرت میں بدل جاتا ہے۔

نیشنل اسٹوڈیوز - نردوش افسوس کہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ ان کی مزاحیہ فلم 'لالہ جی' تیار پڑی ہے۔ اپنا پیارا کو ایڈٹ کیا جا رہا ہے اور 'روٹی' کیلئے ایک جنگل کے سین کی منظر کشی باقی رہ گئی ہے۔

پرکاش پکچرز - بھرت ملاپ کی ہمہ گیر کامیابی سے مالکوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ اور اب وہ فلم 'لو کُش' کو بنانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ سردست 'اسٹیشن ماسٹر' نمائش کیلئے بالکل تیار ہے۔

رنجیت - مہمان کی نمائش لاہور میں ہو رہی ہے۔ ڈائرکٹر کیدار شرما کی 'ارمان' جس میں موتی لال اور شمیم نے اپنے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے مکمل ہو چکا ہے۔

وادیا - 'مقابلہ' تیار ہو رہی ہے۔

آچاریہ - 'کنوارا باپ' تیار ہو چکی ہے اور 'الجھن' بن رہی ہے۔

منروا - سکندر کی کامیابی کے بعد مسٹر سہراب مودی اپنی فلم 'پھر ملیں گے' کی تیاری میں مصروف ہیں۔ جس طرح سہراب مودی نے پکار اور سکندر جیسے شاہکار بنا کر شہرتِ لازوال حاصل کی ہے اسی طرح امید ہے کہ ان کی یہ نئی فلم اپنا ریکارڈ قائم کرے گی۔

مست قلندر کے پڑھنے والے ہزاروں لاکھوں پڑھنے والوں کی خدمت میں ایڈیٹر مست قلندر کی ایک نرالی پیشکش

اور اچھوتا تحفہ - جیسا کہ ناظرینِ کرام کو معلوم ہے کہ ایڈیٹر مست قلندر کی عمر کا بیشتر حصہ ہندوستان کے جوگیوں اور سنیاسیوں کی خدمت میں بسر ہوا ہے اور 'تحفہ محبت' اس زمانہ کی سنہری یادگار ہے اس کتاب کا ایک ایک راز موتیوں اور جواہرات سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ علاوہ ان پانچ رازوں کے جن کا تذکرہ صفحہ ۱۲ پر کیا گیا ہے اس کتاب میں بقائے حیات و جوانی کیلئے بعض ایسے نادر روزگار اور اچھوتے چٹکلے دئے گئے ہیں جن سے لاکھوں روپیہ کا فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن کرمفرماؤں نے آئندہ سال کا چندہ روانہ کر دیا تھا ان کے پاس فوراً فوراً تحفہ محبت بھیجا جا رہا ہے چونکہ کاغذ کی کمیابی کے باعث بہت تھوڑی جلدیں شائع کی گئی ہیں لہٰذا جدید خواہشمند حضرات جلدی کریں۔ نئے خریدار صرف ایک سال کا چندہ بھیجکر "تحفہ محبت" کو مفت حاصل کر سکتے ہیں اور پرانے خریدار اگلے سال کا چندہ پیشگی روانہ کر کے۔ **مینیجر مست قلندر لاہور**

فہرست قوانین مست قلندر لاہور

(۱) مست قلندر ہر ماہ کے پہلے ہفتہ پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے اور تین بار پتوں کا مقابلہ کر کے ڈاک میں ڈالا جاتا ہے اسلئے اگر کسی صاحب کے پاس ۱۰ تاریخ تک پرچہ نہ پہنچے تو اس کی شکایت مقامی ڈاکخانہ میں کی جائے اور دفتر میں بھی لکھا جائے۔ پرچہ نہ ملنے کی شکایت کا خط معہ نقل جواب، آ تاریخ تک آ جانا چاہئے اس کے بعد چھ آنے کے ٹکٹ لفافہ میں آنے چاہئیں (۲) مست قلندر کا مقصد ظرافت، روحانیت اور عام دلچسپی کے مضامین کی اشاعت کرنا ہے۔ ایسے مضامین جن سے اخلاق پر برا اثر پڑے یا مذہبی بحث ہو یا سیاسی پہلو لئے ہوئے ہوں درجِ رسالہ نہیں ہو سکتے (۳) لائق اور قابل مضمون نگاروں کو معقول معاوضے دئے جاتے ہیں۔ ہندی، گجراتی، مرہٹی، بنگالی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنیوالوں کی ضرورت ہے (۴) مضامین نظم و نثر ہر ماہ کی ۵ تاریخ تک آنے چاہئیں۔ (۵) مست قلندر کے متعلق جملہ خط و کتابت و ترسیلِ زر بنام ڈاکٹر بہتی سنگھ صاحب ایڈیٹر و مالک رسالہ مذکور ہونی چاہیے (۶) مست قلندر کی توسیعِ اشاعت میں حصہ لینے والے خاص طور پر شکریہ کے مستحق سمجھے جائینگے (۷) رسالہ کا سالانہ چندہ ممالک غیر

جلد ۲۷ — مست قلندر لاہور — نمبر ۳

پھُول والی!

(از حضرت ماہر القادری)

قیامت ٹھوکریں سی کھا رہی ہے
چمن سے پھُول والی آ رہی ہے

تبسّم ہے فسانہ در فسانہ
خموشی بات کرتی جا رہی ہے

فضا میں دام بچھتے جا رہے ہیں
ہوا میں اوڑھنی[۱] لہرا رہی ہے

غمِ کونین سے بے گانہ بن کر
غمِ کونین کو ٹھکرا رہی ہے

معاذ اللہ! یہ مخمور آنکھیں
کہ جیسے نیند آتی جا رہی ہے

کسی کے چوٹ جیسے لگ گئی ہو
جبیں کو اس طرح سہلا رہی ہے

جوانی سازِ دل کو چھیڑتی ہے
ادا رنگین نغمے گا رہی ہے

دمِ رفتار کافر پھُول والی
قیامت سے اُلجھتی جا رہی ہے

یہ اُلجھے اُلجھے گیسوئے پریشاں
فضا میں اک گھٹا سی چھا رہی ہے

ہے سر پر ٹوکری پھُولوں سے لبریز
کمر لچکے پہ لچکا کھا رہی ہے

دبے جذبات کو اُکسا رہی ہے
دلِ شاعر پہ آفت ڈھا رہی ہے

۱؎ دوپٹہ

غیر مطبوعہ — خاص

بھکارن یا کچھ اور؟

از جناب جمشید عالم خاں افغانی امروہوی

میں امپیریل بنک کے زینہ سے اُتر کر اپنی کار میں سوار ہونے والا تھا جو سڑک پر کھڑی تھی کہ ایک برقعہ پوش عورت نے قریب آ کر مجھ سے سوال کیا۔ اپنی کامیاب زندگی کا صدقہ ایک بیکس اور مصیبت زدہ عورت کی امداد کیجئے۔ خدا آپکی مدد کریگا۔ مجھے اجمیر کا ٹکٹ دلا دیجئے اور زادِ راہ کیلئے کچھ پیسے ......

اس کا چہرہ بوسیدہ برقعہ سے کچھ ڈھکا اور کچھ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا وہ حسنِ ظاہری کا ایک نظر فریب مجسمہ ہے۔ اگرچہ مصیبت و افلاس نے اس کے شگفتہ چہرہ کو ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح افسردہ کر دیا تھا لیکن میں نے پہلی ہی نظر میں محسوس کر لیا کہ اگر بادِ خزاں کے گرم جھونکوں سے بچا کر اس گلِ پژمردہ کی آبیاری کی جائے تو یہ تازہ و شاداب ہو کر اپنی پوری بہار دکھا سکتا ہے۔ میں نے اس پر ایک ترحم آمیز نظر ڈالی اُس نے حجاب آلود انداز سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کی نرگسی آنکھوں سے قطراتِ شبنم کی طرح آنسوؤں کے چمکدار موتی گر رہے تھے۔

میں اس المناک منظر کی تاب نہ لا سکا میری آنکھوں میں ایک فلک زدہ حسن کی دنیائے مصائب و حوادث کا نقشہ کھنچ گیا۔ میں نے فرطِ تاثر سے بیتاب ہو کر چاہا کہ اپنا نوٹوں سے لبریز منی بیگ اس کی نذر کر دوں لیکن مجھے اپنے اس نیک جذبے میں اس کیلئے کچھ مخفی خطرات نظر آئے میں نے محسوس کیا کہ امداد کا یہ طریقہ صحیح نہیں ممکن ہے میری یہ فوری امداد اس حسنِ مفلوک پر کسی مزید افتاد کا سبب بن جائے۔ مناسب ہے کہ اس کی مکمل حفاظت اور حقیقی اعانت کی جائے۔ میں نے اس سے کہا۔ کیا تم "کناٹ پلیز" میں پہنچکر مجھے اپنی مفصل داستانِ مصیبت سنا سکتی ہو؟

جنابِ والا! میں شام کی ٹرین سے اجمیر جانا چاہتی ہوں۔ میں سخت مصیبت میں مبتلا ہوں مجھے اپنی داستانِ مصیبت سنانے کی فرصت کہاں .... اور آپکو اس کے سُننے سے کیا حاصل؟ اگر آپ اس وقت میری کچھ امداد کر سکتے ہیں تو کیجئے ... ورنہ .....

میں:۔ آپ ناراض اور پریشان نہ ہوں، میں آپکی مکمل اور حقیقی امداد کرنا چاہتا ہوں اگر آپ مجھے اپنے صحیح صحیح حالات سے آگاہ کریں ورنہ آپکی مطلوبہ امداد کیلئے میں اسی وقت تیار ہوں .... اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پارک کی طرف متوجہ ہو کر مجھ سے کہا۔ اچھا تشریف لائیے۔ میں اپنی داستان سناتی ہوں .... یہ کہہ کر اس نے جلد جلد قدم اٹھائے وہ سایہ میں ہری ہری گھاس کے ہموار فرش پر بیٹھ گئی۔ میں ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔

اس نے اپنا میلا اور بوسیدہ برقعہ اپنے چہرہ سے ہٹا کر گردن جھکائے ہوئے کہنا شروع کیا .... میرا باپ ایک خوشحال زمیندار تھا انقلابِ زمانہ سے اس کی زمینداری تباہ و برباد ہو گئی۔ مقدمہ بازی اور سودی قرضہ کے پھندے میں پھنس کر وہ بالکل تباہ ہو گیا اور چند روز کے بعد اسی صدمہ میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ میں خانماں برباد ہو کر گردشِ روزگار کا شکار ہو گئی میرے باپ کے علاقہ پر ساہوکار اور مہاجن قابض ہیں اور مکانات پر نمک حرام کارندے۔ میں اپنے باپ کی اکلوتی ہوں۔ میری ماں تین سال پہلے مجھے داغِ مفارقت دے چکی ہے باپ کے رشتہ دار باہمی مقدمہ بازی اور مخالفت کی وجہ سے میرے دشمن ہیں میں اپنی جان اور عزت بچا کر گھر سے نکل پڑی اور شہر و دیہات کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی دہلی تک پہنچی ہوں۔ یہاں محکمہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں میرا ماموں زاد بھائی کلرک تھا۔ میں اس کی تلاش میں آئی تھی۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ دو ہفتہ قبل اجمیر تبدیل ہو گیا ہے۔ اسلئے میں اس کے پاس اجمیر جانا چاہتی ہوں۔

وہ فرطِ اندوہ سے مزید تفصیل بیان نہ کر سکی

اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے فرطِ تاثر سے میری آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔ مگر میں نے ضبطِ مردانہ سے کام لیکر اس کو تسلی دی۔ میرے دل میں سچی محبت اور مخلصانہ ہمدردی کے جذبات موجزن تھے۔

میں نے کہا۔ اگر آپ کو اپنے ماموں زاد بھائی سے حسن سلوک اور پوری ہمدردی کی قوی توقع ہے۔ اور آپ اسی کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہیں تو میں اس وقت یہ سو روپیہ آپ کی نذر کرتا ہوں قبول کیجئے۔ ساتھ ہی ناشتہ اور ٹکٹ کا بھی انتظام کئے دیتا ہوں، اجمیر پہنچکر آپکو کوئی تکلیف اور ضرورت پیش آئے تو فوراً مجھے اطلاع دیجئے، میں انشاء اللہ حتی الامکان آپ کی مدد میں دریغ نہ کرونگا اور اگر ......

اور اگر کیا؟ (میرے یکایک خاموش ہو جانے پر اس نے سوال کیا)

میں ــــ اور اگر، اُف میری زبان مدد نہیں کرتی مجھسے اپنا مافی الضمیر ادا نہیں ہوتا۔ مجھے اندیشہ ہے آپ میری بات کو خودغرضی اور نفس پروری پر محمول فرمائینگی (خاموش)

نہیں، نہیں۔ آپ فرمائیے۔

اچھا۔ اور اگر آپ کو اپنے بھائی سے حسن سلوک اور پوری ہمدردی کی توقع نیز اجمیر میں سکون و اطمینان حاصل ہونے کی امید نہ ہو اور آپ اس خاکسار کو اپنا شریک حیات بنانا گوارا فرمائیں تو ......

آپ میرا مضحکہ اڑا رہے ہیں؟ ایک بیکس و مصیبت زدہ عورت کو اس طرح ذلیل و شرمندہ کرنا۔ آپ جیسے مہذب اور بڑے آدمیوں کو کہاں تک مناسب ہے؟ بھلا کہاں میں ایک مصیبت زدہ بھکارن اور آپ جیسا رئیس۔

میں ــــ نہیں نہیں، نہ تم بھکارن ہو نہ کوئی ذلیل، حاشا وکلا میں آپکا مضحکہ نہیں اڑا رہا۔ توبہ توبہ بھلا آپکو کس طرح اور شرمندہ کر سکتا ہوں؟ واللہ مجھے آپ سے اچھی محبت اور پوری ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے تمہاری قسمت کا ستارہ چمکتا نظر آ رہا ہے اس پر سے مصائب کے بادل اس طرح ہٹتے معلوم ہوتے ہیں جس طرح یہ بوسیدہ اور کثیف برقع تمہارے چاند سے چہرے سے ہٹ گیا ہے۔

اس کے چہرہ پر شرم و حجاب کی برقی لہر دوڑ گئی۔ اس کے دونوں رخسارے سرخ گلاب کی طرح دمک رہے تھے۔ اس نے اپنے برقع کو درست کیا اور ایک طویل سکوت کے بعد بولی۔

یہ عالمِ بیداری ہے یا دنیائے خواب؟ بھلا میری ایسی قسمت کہاں کہ آپ ایسے بڑے آدمیوں کی کنیزی کا شرف حاصل ہو سکے۔

نہیں، نہیں یہ خواب نہیں۔ بیداری ہے اور بیداری بخت، ....

اگر یہ واقعی بیداری ہے اور جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ ایک حقیقت ہے تو یقیناً میری بیداری قسمت کا وقت آ گیا ہے ...... یہ کہتے ہوئے اس پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ بیہوش ہو جائے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے پکڑ کر بنچ پر بٹھا دیا .... چند منٹ کے بعد اُسے سکون ہو گیا اس نے حیرت و محبت کی نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔

میں نے اپنے شوفر کو آواز دے کر حکم دیا کہ ان محترم خاتون کو لے جا کر کار میں بٹھاؤ۔ پھر میں نے انڈین اسٹور میں جا کر دو نفیس ریشمی ساریاں جانگیئے۔ فراک، موزے، باریک اور نرم و خوبصورت اونی چادریں، لیڈی شوز، پمپ سلیپر، مکمل سنگھار بکس، نہایت نفیس اور خوبصورت سونے کے کڑے، چوڑیاں، اور خوشنما آویزے خرید کئے۔ اور اپنی کوٹھی پر واپس آیا۔ میری سلیقہ شعار اور وفادار خادمہ نے میری ہدایات کے مطابق اُسے غسلخانہ میں لیجا کر عمدگی سے غسل کرایا۔ اس کے بال آراستہ کئے اور میرا لایا ہوا نفیس لباس پہنا کر میرے کمرے میں لا کھڑا کیا۔ وہ میرے قریب صوفہ پر بیٹھ گئی تو میں نے اپنے ہاتھ سے اس کے کانوں میں وہ قیمتی آویزے اور ہاتھوں میں زریں کڑے اور چوڑیاں پہنا دئے۔ اس کے بعد کچھ کھانا کھا کر لطیف اور گرم گرم چائے پی .... وہ اسوقت میرے بالمقابل کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک ملکۂ حسن معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا حسین اور روشن چہرہ چاند کو شرما رہا تھا۔ وہ نہایت مسرور مگر حجاب و سکوت میں غرق تھی۔ میں نے محبت آمیز متانت کے ساتھ اس سے کہا۔ امید ہے کہ اب آپ کی طبیعت بحال ہو گی؟

اُس نے دبی آواز میں کہا۔ میں کس زبان سے آپکی مہربانی اور قدردانی کا شکریہ ادا کروں۔

آپ کو شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں میں خود آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپنے میری

التماس شوق کی پذیرائی فرمائی اور میری جسارت کو نظر انداز کر دیا۔ بہرکیف میں آپ پر کوئی ناجائز دباؤ ڈالنا اور آپ کی مجبوری سے غرض مندانہ فائدہ اٹھانا پسند نہیں کر سکتا۔ نہ میں آپکو کسی لالچ اور فریب میں مبتلا کرنا چاہتا ہوں... ابھی آپ کو کامل اختیار حاصل ہے۔ میں آپکو اس معاملہ پر کافی غور و فکر کرنے کیلئے تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ اس عرصہ میں آپ اطمینان سے غور کر لیجئے۔ میں آپکی خواہش اور مرضی کی تعمیل کرونگا۔ اگر آپکو میرے دل کی ملکہ بننے میں تامل ہو تو میں آپکو بہن تصور کرتے ہوئے شفیق بھائی کی طرح خدمت گزاری کیلئے حاضر ہوں۔

اس نے فوراً میری بات کاٹتے ہوئے کہا خدا کیلئے مجھ پر رحم کیجئے۔ آبحیات کے کنارے لاکر جام زہر نہ پلائیے۔ میں آپکی لونڈی صرف آپکی کنیز بنکر زندہ رہ سکتی ہوں ورنہ نہیں۔

میں نے اپنے خاندانی مناقشات اور اہل وطن کی بیوفائی سے بیزار ہو کر خاندان و وطن کو چھوڑ دیا تھا۔ نئی دہلی میں آزادانہ و خاموش زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ مختصر اور خوشنما کوٹھی میری ذاتی ملکیت تھی۔ میرا کافی سرمایہ امپیریل اور دوسرے بنکوں میں محفوظ تھا۔ میں نے انڈین اسٹور لمیٹڈ کے متعدد شیرز خرید لئے تھے جن کا منافع میرے معتدل اور محدود مصارف کیلئے کافی تھا۔ میں خودنمائی کے طور پر نہیں بلکہ اظہار حقیقت کے لئے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ایک مجرد، آزاد جوان ہونے کے ساتھ ہی نہایت پختہ اور پاکیزہ کیرکٹر کا انسان تھا۔ اپنے مذہبی اصول کے احترام اور ہر زبان کے فلسفہ و ادب سے مجھے کافی ذوق تھا میں نے بہترین کتبخانہ قائم کیا تھا جسکے مطالعہ میں میرے اوقات کا بیشتر حصہ گزرتا تھا میرا ایک وفادار ملازم اور خادمہ جو اسی کی بیوی تھی میری خدمات انجام دیتے تھے میرا شوفر بھی ایک شریف جوان تھا۔ مجھے متمول اور اونچے خاندانوں میں شادی کرنے کے بہترین مواقع میسر ہو سکتے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں میں اب تک ازدواج کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ اسوقت میں نے سوچا کہ سوسائٹی کی ظاہری قیود و رسوم کو نظر انداز کرتے ہوئے اس بیکس اور شریف حسینہ کو اپنا شریک زندگی کیوں نہ بنا لوں۔ اگر میں اس گدڑی کے لعل کی قدر نہ کرونگا۔ تو یقیناً انسانیت کا گنہگار ثابت ہونگا۔

بہرکیف میں نے اس کو اپنی خادمہ کے ساتھ علیحدہ کمرے میں آرام کرنے کے لئے بھیجدیا اور خود اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہا۔ مجھے مختلف خیالات کے ہجوم سے آدھی رات تک نیند نہ آئی۔ میں صرف تین گھنٹے سویا۔ صبح کے قریب میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اضطراب انگیز حسرت کے ساتھ میرے سرہانے کھڑی ہے۔ میں بے چین ہو کر بستر سے اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی وہاں کوئی بھی نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے کمرہ اندر سے بند تھا۔ میرے حواس بجا ہوئے تو سمجھ میں آیا کہ یہ خواب تھا۔ بہرکیف اب میں آرام نہ کر سکا۔ کچھ دیر لائبریری کا کمرہ کھول کر بعض کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ صبح اپنی دلفریب اداؤں سے میری نظر نوازی کر رہی تھی۔ چند منٹ کے بعد خادمہ بیدار ہو کر اپنے متعلقہ کاموں میں مصروف ہو گئی اس نے میرے کمرے میں آکر کہا۔ آپکی محترم رفیقہ اور مہمان تمام رات بے چین رہی ہیں زیادہ سے زیادہ صبح سے قبل ایک گھنٹہ کیلئے سوئی ہونگی۔ نہیں معلوم انہیں کیا تکلیف ہوئی۔ آپ ذرا جا کر دیکھ آئیے۔

میں نے کمرہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہ خود اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا سر میرے قدموں پر جھکانا چاہا۔ جس کو میں نے اپنے ہاتھوں پر روک کر کہا۔ یہ آپ کیا کرتی ہیں آپکو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

معاف فرمائیے۔ تکلیف سی تکلیف ہوئی ہے۔ خدا دشمن کو بھی ایسی قیامت کی رات نہ دکھائے۔ میں امتحان کے قابل نہیں ہوں مجھے آپ اسطرح نہ تڑپائیے۔ اب میں آپ سے ایک منٹ کیلئے جدا نہیں رہ سکتی۔ میں نے دیکھا کہ واقعی اسکا حسین چہرہ ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح اترا ہوا تھا۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے محبت آمیز باتیں کرنا شروع کیں۔ پھر ضروریات سے فارغ ہو جانے کے بعد کوٹھی کے تمام کمروں کی سیر کراتا ہوا لائبریری میں لایا۔ سامنے میری تصویر لگی ہوئی تھی وہ بڑی دیر تک اسے دیکھتی اور میرے چہرے پر غور کرتی رہی۔ اتنے میں چائے کی گھنٹی ہوئی۔ ہم کھانے کے کمرے میں پہنچے چائے نوشی کے دوران میں دلچسپ و لطیف گفتگو ہوتی رہی اس دوران میں اس کی طبیعت اور انداز و اطوار کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔

ام کے چار بجے میرا ملازم میری ہدایت کے
و جب قاضی صاحب اور میرے چار خاص
ستوں کو ہمراہ لئے کوٹھی میں داخل ہوا اور
بی قانون کے مطابق ہمارا نکاح ہوگیا۔

اب وہ میری محبوب ترین بیوی اور میری
ام توجہات کی مرکز تھی میں اس کی دلداری و
برداری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا تھا
کا حسن روز بروز نکھرتا چلا گیا۔ وہ میرے
ن عیش کا شاداب گلاب اور حسین پھول
ی۔ میں اس کیلئے بہتر سے بہتر لباس اور
تی زیورات پر بیدریغ روپیہ صرف کرتا۔
معمولی تعلیم یافتہ تھی میں نے اس کی ضروری
لیم پر بھی کافی وقت صرف کرکے اُسے ایک
ذب اور تعلیم یافتہ خاتون بنا دیا تھا۔ دو
ل کے عرصہ میں وہ میرے تمام سیاہ و سفید
مالک بن کر میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی
اس عرصہ میں ایک خوبصورت بچہ کی ماں بن
ی تھی..... جیسا کہ میں آپکو بتا چکا ہوں۔
ں ایک زندہ دل، محبت آشنا، آزاد طبع،
علم و ادب کا شایق انسان ہوں میرا کیرکٹر
یت مضبوط اور پاکیزہ ہے۔ میں ریاکار
ر سمی دوستوں سے فضول مراسم پیدا نہیں
۔ عام سیرگاہوں، جلسوں اور سنیما کا بھی
ایسا شایق نہیں۔ عورت کی غیر معتدل آزادی
بے حجابی مجھے پسند نہیں۔ میرے صرف دو چار
ست ہیں جو کبھی میرے ہاں آجاتے ہیں۔
ں میں ان کے ہاں چلا جاتا ہوں۔ مہینہ
ایک دو مرتبہ کسی بلند پایہ سینما میں بھی ہو آتا
ہ۔ اس سلسلہ میں اس نے بھی تماشہ دیکھنے
اہش ظاہر کی اور میں کبھی کبھی اس کو بھی سینما

لے جانے لگا۔ وہ میرے دوستوں کے ہاں دعوتوں میں بھی شریک ہوئی لیکن میں نے اس رفتار کو حد اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دیا مگر وہ میری نگرانی و احتیاط کے خلاف رفتہ رفتہ سیر و تفریح، سینما اور پارٹیوں میں شرکت کی زیادہ شائق ہوتی چلی گئی۔ اس نے میرے دوستوں سے بھی بے تکلفانہ مراسم بڑھانا شروع کردئے۔ وہ آئے دن نفیس لباس، قیمتی زیور اور سامانِ آرائش کی فرمائشیں کرنے لگی۔ چند روز کے بعد اس نے اپنے ماموں زاد بھائی کو اجمیر سے بلانے کی خواہش ظاہر کی جس کو میں نے بخوشی منظور کیا۔ اس کا بھائی تین مہینے مہمان رہا۔ میں نے ان دونوں کی تمام فرمائشیں بطیب خاطر پوری کیں۔ جب وہ واپس جانے لگا تو میں نے بیگم کی خواہش پر پانچ بیش قیمت سوٹ، چند جوڑی بوٹ کے علاوہ سو روپیہ کی ایک طلائی گھڑی اور پانچسو روپیہ نقد نذر کئے۔

اب اس کے اکثر خطوط آتے رہتے تھے اور میری بیوی مختلف اوقات میں اسکو نقد روپیہ اور تحائف بھیجتی رہتی تھی۔ اب وہ اپنی گذشتہ حالت کو بھول کر ایک فیشن ایبل لیڈی، جدید معاشرت کی دلدادہ اور غیر معتدل آزادی کی خوگر ہوتی جارہی تھی۔ اس کی فضول خرچیاں اور نامناسب تفریحات مجھے اپنی تباہی کا پیش خیمہ نظر آرہی تھی۔ میں نے چند مرتبہ اسے اعتدال اور انجام بینی کی طرف توجہ دلائی لیکن متنبہ ہونے کے بجائے وہ رفتہ رفتہ مجھ سے برگشتہ ہونے لگی۔ وہ مجھ سے ہر معاملہ میں اختلاف اور [illegible] بات بات پر الجھتی اور جھگڑتی اور میری اجازت کے بغیر پارٹیوں، سینماؤں اور پارکوں میں تنہا چلی جاتی۔ اس نے امور خانہ داری کی نگرانی اور میری راحت و آسائش کی طرف اپنی توجہ بہت کم کردی۔ مختلف اسٹوروں اور دکانوں سے سیکڑوں روپیہ کا بے ضرورت سامان خرید لاتی جن کے بل میرے نام آتے اور مجھے ادا کرنے پڑتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے میری ایک دستخط شدہ مکمل چیک بک چرا کر اپنے قبضے میں کرلی جس پر مختلف اوقات میں اپنے قلم سے روپیہ کی تعداد لکھ کر بنک سے وصول کرلیتی۔ اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جبکہ ششماہی کے حساب کے وقت میں نے "بنک بک" کا معائنہ کیا۔

ہر چند کہ اس تباہ کن اور خطرناک روش پر مجھے سخت افسوس اور رنج تھا لیکن میں نے ضبط اور سنجیدگی سے کام لے کر اس غیر مستحسن روش کے المناک انجام کی طرف بلیغ اشارہ کردینا کافی سمجھا مگر اس نے اسکی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی بدسرشتی کا بدترین مظاہرہ کیا۔ یہ صورت میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے اس پر مدلل اور پرزور انتباہ کے ساتھ اپنے حق زوجیت کا جائز استعمال کیا۔ وہ دیر تک خاموش رہی۔ اسکے چہرہ سے انتقام کے جذبات نمودار تھے۔ اس نے کہا۔ آپ نے میری خوب قدردانی فرمائی۔ مجھے مفلسی و بیکسی کے عالم میں مفت حاصل کرکے آپ نے محض ایک لونڈی اور خادمہ سمجھ لیا ہے۔ میں آپکی زاہدانہ طبیعت کے ساتھ اپنے زندہ دل کو مردہ نہیں کرسکتی۔ آپکا دل غالباً مجھ سے سیر ہوچکا ہے۔ میں اس روش کو برداشت نہیں کرسکتی کہ آپ تو شب

روزانہ لائبریری میں بیٹھے ہوئے عروس کتاب کے نظارہ جمال میں محو و مستغرق رہیں اور میں تنہا کمرے میں پڑی رہوں۔ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا۔ آپ میری طرف سے مشکوک نظر آتے ہیں۔ حالانکہ تمام مہذب اور تعلیم یافتہ خواتین پارکوں، تفریح گاہوں اور سینما خانوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کرتی ہیں ان کی دعوتوں اور پارٹیوں میں شریک ہوتی ہیں۔ پھر مجھے ان آزادانہ حقوق سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے؟

میں نے کہا۔ افسوس مجھے تم سے ایسی گفتگو کی توقع نہیں تھی۔ کیا تمہارے یہ الزامات جو تم مجھ پر عائد کر رہی ہو کسی حد تک بھی صحیح اور بجا ہیں؟ میں نے کسی وقت اور کسی صورت میں بھی تم سے بے التفاتی کا اظہار نہیں رکھا۔ تم خود گھر میں نہیں رہتیں اور مجھے تنہا چھوڑ کر جہاں جی چاہتا ہے چلی جاتی ہو۔ حالانکہ میں تمہیں اپنے ساتھ سینما، پارک اور مختلف پارٹیوں میں لے جاتا ہوں لیکن تمہاری زندہ دلی کے یہ معنی تو نہیں قرار دیئے جا سکتے کہ تم مجھے میرے جائز حقوق سے فائدہ نہ اٹھانے دو۔ عورت گھر کی ملکہ ہوتی ہے اس کو نظم خانہ کی نگرانی، اپنی اولاد کی تربیت اور شوہر کی راحت و اطاعت کے ساتھ ہی اپنے جوہر نسائیت اور عزت وقار کی حفاظت لازمی ہے۔ اعتدال معیشت اور کفایت شعاری امن و عافیت کا حصار ہے لیکن تم نے اپنے تمام فرائض اور ملکہ خانہ کی خصوصیات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ تمہاری نامناسب روش، غیر معتدل آزادی اور حد سے بڑھی ہوئی فضول خرچیاں کسی طرح پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھی جا سکتیں میں شرافت و اخلاق کی محفوظ حدود سے تجاوز کو برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے ان کے انسداد کا جائز اور پورا حق حاصل ہے جسے میں ہر حالت میں استعمال کر سکتا ہوں میں نے تمہاری بیکسی سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا کسی وقت بھی تمہارے متعلق لونڈی یا خادمہ کا تصور تک نہیں کیا۔ بلکہ میں نے ہمیشہ تمہیں ایک محبوب و محترم بیگم سمجھا ہے۔ اگر تمہارے ضمیر میں زندگی اور روشنی کی کوئی جھلک موجود ہے تو میرے بیان کی تردید ناممکن ہے

وہ ـــ جی ہاں میں تو ایک آوارہ گرد، فضول خرچ، شرافت و اخلاق سے بیگانہ اور تاریک ضمیر ہوں لیکن میرے یہ اوصاف تو آپ جیسے روشن ضمیر بزرگ کو اول دن ہی میرے چہرہ پر نظر آ گئے ہوں گے پھر آپ نے آوارہ نوازی کی زحمت کیوں گوارا کی۔

میں ـــ افسوس عورت کی فطرت میں وفا اور احسان مندی کا مادہ ہی نہیں تم اپنی فطرت سے مجبور ہو۔

بہرکیف میں اس پر زیادہ بحث و مناقشہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں موقع دیتا ہوں کہ ایک شریف بیگم اور روشن ضمیر انسان کی طرح اپنی موجودہ حالت اور روش کا جائزہ لو اور نیک کرداری، صداقت اور وفا کا ثبوت پیش کرو تو میں تمام گزشتہ بے اعتدالیوں کو نظر انداز کر سکتا ہوں .... یہ سن کر وہ غصے میں بھری ہوئی میرے سامنے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دن بھر کمرے سے باہر نہ نکلی۔ دوپہر کے کھانے میں بھی شریک نہ ہوئی۔ رات کے کھانے پر بھی نہ آئی لیکن خادمہ سے کھانا اپنے کمرے میں منگا لیا۔ اور کہلا بھیجا کہ اس وقت میری طبیعت ناساز ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ صبح کو حاضر ہونگی۔ میں نے اصرار مناسب سمجھ کر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ بارہ بجے کے بعد اس کے کمرہ کی طرف گیا۔ وہ اپنی مسہری پر آرام کر رہی تھی مگر ابھی سوئی نہ تھی۔ میری آہٹ پا کر اس نے خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے مزاج پرسی کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہونے سے اپنی بے لطفی کا اظہار کیا۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ میں اپنی حالیہ روش پر غور و فکر میں ایسی ڈوبی ہوئی تھی کہ مجھے کسی بات کا احساس نہیں تھا۔ نہ جانے مجھے کچھ دنوں سے کیا ہو گیا تھا۔ بہرکیف آج سات گھنٹے کے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ میں نے اپنی بے اعتدالی، غیر مستحسن روش اور احسان فراموشی سے اپنے فرشتہ خصلت اور فاضل سرتاج کو سخت صدمہ پہنچایا ہے جس پر میرا ضمیر مجھے شدید ملامت کر رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپکی شرافت، نیک نفسی اور ایثار و تحمل کی تعریف نہیں ہو سکتی کہ میری اتنی لغزشوں، خطاؤں اور سرکشی پر بھی آپ نے صبر و استقلال اور نرمی کا ثبوت دیا۔ میں فرط ندامت سے آپکو اپنی صورت دکھاتے شرماتی ہوں۔ کیا آپ اپنی بلند حوصلگی سے میری تقصیرات کو نظر انداز فرماتے ہوئے مجھے معاف کر سکتے ہیں؟ یہ کہتے ہوئے وہ میرے قدموں کی طرف جھکی۔ میں نے جوش

محبت میں اسے اپنے سینہ سے لگالیا۔ اس کے نازک لبوں اور شرم آلود سرخ گلاب جیسے رخساروں پر گرم گرم بوسوں کی پے در پے مہریں ثبت کردیں۔ اسکی نرگسیں اور مخمور آنکھوں سے شبنم کی طرح چمکنے والے آنسوؤں کے موتی اپنے رومال میں جذب کرلئے اور اس کے سنبل گیسو میں اپنی انگلیوں سے شانہ کشی کرنے لگا۔ اس نے اپنی خوبصورت گوری گوری کلائیاں میرے گلے میں ڈال دیں۔ اور میں اس کے لطف ہم آغوشی میں تمام تلخ کامیاں اور تلخ کلامیوں کو بھول گیا۔

اب ہمارے دن رات پہلے سے زیادہ خوشگوار تھے۔ نظام خانہ داری مزید خوش اسلوبیوں کے ساتھ جاری ہوگیا۔ اس نے دوستوں سے ملنا سینما اور سیرگاہوں میں جانا ترک کردیا۔ وہ کوٹھی کے صحن میں اپنے پیارے بچے کیساتھ کھیلتی اور جی بہلایا کرتی۔ بسا اوقات میری لائبریری میں آکر کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کرنے لگتی۔ فلسفہ ازدواج و محبت پر گفتگو کرتے کرتے میرے گلے میں باہیں ڈال دیتی میں بھی محبت کا جواب محبت سے دیتا۔ شام کے وقت شام کی کیاریوں کے حسین پھولوں سے ہم دونوں کھیلتے اور اپنے بچے کی ننھی سی گاڑی ادھر اُدھر لئے پھرتے۔ اس عرصہ میں ہم کسقدر مسرور اور بادۂ محبت کے نشہ میں مخمور تھے .... ؟ آہ

مجھے کامل یقین ہوگیا تھا کہ وہ ایک ہی لغزش کے بعد پوری طرح سنبھل گئی ہے اور اب ہماری پُرمسرت زندگی میں کوئی ناگوار انقلاب رونما نہیں ہوسکتا۔ میں نے اس کی مزید دلجوئی کے لئے پانچہزار روپیہ کا بیش قیمت زیور اور لباس خاص طور پر تیار کرادیا۔

ہمارے دو مہینے انتہائی عیش و مسرت میں بسر ہوئے۔ اتفاق سے مجھے فرم کے معاملات کے سلسلہ میں ایک ہفتہ کیلئے کلکتہ جانا پڑا! چھٹے دن کی شام کو جبکہ کانپور، لکھنؤ اور مرادآباد ہوتا ہوا دہلی کی واپسی کا ارادہ کررہا تھا کہ مجھے اپنے وفادار ملازم کا تار ملا۔ فوراً دہلی آئیے۔ میں گھبرا کر طویل سفر کا ارادہ ملتوی کرکے براہ راست دہلی کو روانہ ہوگیا۔ دوسرے دن دہلی اسٹیشن پر اترا تو ملازم پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ میں نے اس سے حادثہ کی بابت دریافت کیا۔ اس نے کہا کار باہر کھڑی ہے سوار ہو لیجئے تو عرض کرونگا۔ میں گیٹ سے باہر آکر ملازم کے ساتھ کار میں آبیٹھا۔

اس نے کہنا شروع کیا۔ میرے آقا آپ کے جانے کے تیسرے دن بیگم صاحبہ کے ماموں زاد بھائی دہلی آئے۔ بیگم صاحبہ ان سے دو دن اور ایک رات متواتر کمرہ کے اندر خاموش گفتگو کرتی رہیں۔ وہیں دونوں کھانا کھاتے اور آرام کرتے تھے۔ انتہائی کوشش کے باوجود مجھے اُن کی آمد اور خاموش سرگوشی کا راز نہ معلوم ہوسکا۔ دوسرے دن رات کے کھانے میں حلوے کی فرمائش کی گئی تھی۔ میری بیوی نے لذیذ اور شیریں حلوہ تیار کیا تھا لیکن کھانے کے کمرہ میں بلاکر فرمایا۔ حلوہ نہایت لذیذ و نفیس ہے مگر بہت زیادہ مقدار میں ہے اس لئے ہم نے تھوڑا سا علیحدہ نکال کر رکھا ہے۔ یہ پلیٹ تم لے جاؤ اور جاکر خود کھالو۔ ہم نے ضروری کاموں سے فارغ ہوکر کھانے کے ساتھ ہی وہ حلوہ بھی کھالیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد قبل از وقت ہم پر نیند کا غلبہ اور ایک نشہ سا طاری ہونے لگا۔ اور تھوڑی دیر ہم توشہ خانے کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہی بالکل غافل ہوگئے۔ ۳ بجے کے قریب ہماری آنکھ کھلی میرے اعضا سست اور دماغ بھاری تھا۔ میں نے اس کمرے سے باہر نکلنا چاہا تو باہر سے دروازہ بند تھا خیال ہوا کہ ہمارے سو جانے کی وجہ سے غالباً بیگم صاحبہ نے احتیاطاً باہر سے چٹخنی لگادی ہوگی بہرکیف میں کھڑکی کھولکر آہستہ سے باہر کودا تو لائبریری کے کمرے میں روشنی نظر آئی اور ساتھ ہی صاحبزادہ کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں ایک تذبذب کی حالت میں ادھر متوجہ ہوا۔ بچے کے رونے کی آواز مسلسل تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں نے بڑے کمرے کی طرف جاکر بیگم صاحبہ کو آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ آخر ہمت کرکے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ فوراً کھل گیا۔ صاحبزادے مسہری پر تنہا بلک رہے تھے۔ میں نے اٹھاکر سینے سے چمٹالیا۔ اپنی بیوی کو آواز دی مگر چونکہ میں باہر سے چٹخنی کھولنا بھول کر چلا آیا تھا۔ اس لئے خود ہی اس طرف جاکر بچہ کو اپنی بیوی کی گود میں دیا۔ اور پھر ہم دونوں نے کوٹھی کا ایک ایک کمرہ چھان مارا مگر بیگم صاحبہ اور ان کے بھائی کا کہیں نشان نہیں تھا۔ لائبریری میں پہنچے تو روشنی میں میز پر بیگم صاحبہ کے قلم کا لکھا ہوا ایک لفافہ نظر پڑا۔ اس پریشانی و اضطراب میں صبح ہوچکی تھی۔ میں نے آپکو تار دینے کے سوا اور کوئی کارروائی مناسب سمجھی .... اس بیان کے بعد اس نے وہ لفافہ میرے سامنے پیش کیا۔ میں نے لرزتے

ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا - آپ ضرور اس کا مضمون سننے کے لئے بے چین ہونگے اچھا سنئیے میں پڑھتا ہوں۔

مہربانِ من ! میں ۲½ سال آپکے ساتھ رہی - آپ کے حسن سلوک اور اظہار محبت کا شکریہ ادا کرتی ہوں لیکن افسوس ہے کہ آپ نے میری طبیعت کے رحجانات کو محسوس نہیں کیا - اس دورِ آزادی اور ترقی یافتہ زمانے میں رفتارِ زمانہ کے خلاف آپ عورت کو آزادانہ سیر و تفریح، سینما کے نظارے، مردوں اور بالخصوص زندہ دل دوستوں کی ملاقاتوں سے روکتے اور کفایت شعاری کی ہدایت کرتے ہیں ؟ اس روشن عہد میں بھی آپکے دل میں عورت پر حکومت کرنے کا جذبہ موجزن ہے اور آپ اس کی آرزو، خواہشات اور جذباتِ شوق کو پامال کر دینا چاہتے ہیں - کیا اس سے زیادہ کوئی تعجب انگیز بات ہو سکتی ہے ؟ بہرکیف میں تو اس ذہنیت سے متنفر ہوں میرا یہ نظریہ ہے کہ عورت، پھلواری کی ایک حسین و رنگین تتلی ہے جس کو ہر ایک خیابان دلکشا میں گھومنے اور رقصاں ہونے کا حق حاصل ہے - دولت اگر آرائشِ شباب پر نچھاور کرنے کیلئے نہیں تو اسکو نذرِ آتش کر دینا چاہیئے۔

مجھے آپ کی عالمانہ و زاہدانہ زندگی بالکل پسند نہیں - میں تو ایک جمالیات و کمالیات کی دلدادہ آزاد مزاج، عشرت پسند، ملنسار اور سوسائٹی کی رفتار کے ساتھ چلنے والی رنگین زندگی کو پسند کرتی ہوں مجھے اپنی فطری خواہش کی تکمیل سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی - آپنے اب سے دو ماہ قبل جو میری دلآزاری و توہین کی ہے میں اس کے انتقام کی منتظر تھی - شکر ہے کہ بہت جلد یہ موقعہ مجھے نصیب ہو گیا - چونکہ میں آیندہ کسی طرح آپکے ساتھ رہنے کیلئے تیار نہیں اسلئے میں آپکی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اپنی مقررہ اسکیم کے مطابق ظاہر میں اپنے ماموں زاد بھائی اور باطن میں اپنے قدیم عاشق کے پاس ایک ایسے مقام پر جا رہی ہوں جہاں آپ کے اور آپ کے فرشتوں کے خیالات کی پرواز بھی ناممکن ہے - میں نے اپنے تمام قیمتی زیورات اور نفیس ترین لباس اور تمام نقد جو میرے پاس محفوظ تھا اپنے ساتھ لیلیا ہے - میں اس کو اپنی جائز ملکیت سمجھتی ہوں - میں آپکو مخلصانہ اور ہمدردانہ مشورہ دیتی ہوں کہ آپ میرے سراغ اور تعاقب کی کوشش میں ہلاک و پریشان نہوں یقین کیجئے کہ میں آپکو کسی طرح نہیں مل سکتی - مجھے امید ہے کہ اب آپ میرے ملنے کے خواہشمند بھی نہ ہونگے میں آپکی امانت اور اپنی یادگار یعنی پیارے بچے کو محض آپکی خاطر اور آپ کے احسانات کے بدلے میں چھوڑے جاتی ہوں - اسکی مکمل نگرانی اور عمدہ تربیت کیجئے - اسکی وجہ سے ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کو یاد کرتے رہینگے - الوداع !

خط پڑھ کر مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا میرے وفادار ملازم نے فوراً مجھے سنبھال لیا چند منٹ کے بعد مجھے ہوش ہوا تو میں اپنی کوٹھی میں مسہری پر لیٹا ہوا تھا - میری خادمہ نے مفرحِ اعظم اور شربت روح افزا پیش کیا اور ملازم بچہ کو بغل میں لئے مسہری کی برابر آ بیٹھا - بچہ کا پھول سا چہرہ اگرچہ پژمردہ اور اترا ہوا تھا - لیکن وہ مجھ سے اور خادمہ سے کافی مانوس تھا - میں نے اسے پیار کر کے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا " خس کم جہاں پاک "

اُف ، او حرّافہ عورت ، اے بیوفا ہستی، تو ایک خوبصورت مگر زہریلی ناگن ہے - اچھا ہوا تو خود ہی چلی گئی اور جلد تیرا طلسم فریب ٹوٹ گیا۔

میں نے پولیس کو تو درکنار کسی دوست اور واقفِ حال سے اس المناک حادثہ کا تذکرہ نہیں کیا - ہر چند کہ مالی حیثیت سے میں بڑی حد تک تباہ ہو چکا ہوں لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں - میں اب مطمئن اور پرسکون زندگی بسر کرتا ہوں۔

ساجن! آؤ چلیں اُس پار

(از جناب سردار جلیل شیرکوٹی)

ہمیں ایسی دنیا کی چاہت نہیں ہے
ہمیں ایسی دنیا میں راحت نہیں ہے
یہاں پر محبت کی دولت نہیں ہے
یہاں کی محبت محبت نہیں ہے
نئی آؤ ہم اپنی دنیا بسالیں

چلو! چھوڑ دیں ہر دو عالم کی دولت
دو عالم کی دولت، دو عالم کی راحت
یہاں کی ہر اک شے ہی اک تھو لعنت
ہمیں چاہیئے پاک و سچی محبت
نئی آؤ ہم اپنی دنیا بسالیں

یہاں کی پُرانی محبت بھی چھوڑیں
یہاں کی ہر اِک رسم الفت بھی چھوڑیں
یہاں کی خوشی اور راحت بھی چھوڑیں
جو جنت یہاں ہو تو جنت بھی چھوڑیں
نئی آؤ ہم اپنی دنیا بسالیں

یہاں پُر خطر ہیں محبت کی راہیں
یہاں اشک و نالے یہاں سرد آہیں
یہاں بھول کر بھی کسی کو نہ چاہیں
نبا ہیں ہم اپنی محبت نباہیں
نئی آؤ ہم اپنی دنیا بسالیں

بھلا دو بھلا دو زمانے کی باتیں
زمانے کی باتیں فسانے کی باتیں
یہاں ہو رہی ہیں ستانے کی باتیں
ہمارے تمہارے مٹانے کی باتیں
نئی آؤ ہم اپنی دنیا بسالیں

جہاں بجلیاں تک نہ ہوں آشیاں کی
جہاں دھمکیاں تک نہ ہوں باغباں کی
ذرا بھی نہ ہو یاد دل میں جہاں کی
ہر اک چیز کو بھول جائیں یہاں کی
نئی آؤ ہم اپنی دنیا بسالیں

یہاں پر نہیں زود موج ترنم
یہاں ہے ہر اک بے نیاز تبسم
یہاں سب کے سب وقف جور و تظلم
ترحم ہے عنقا یہاں پر ترحم
نئی آؤ ہم اپنی دنیا بسالیں

یہاں زندگی جاودانی نہیں ہے
یہاں پر کوئی شادمانی نہیں ہے
محبت کی رنگیں کہانی نہیں ہے
جوانی یہاں کی جوانی نہیں ہے
نئی آؤ ہم اپنی دنیا بسالیں

پرائے یہاں کے ہیں سب چاند تارے
بجھے جا رہے ہیں یہاں کے شرارے
جہاں ہو نہ کوئی سوائے ہمارے
جہاں کے نظارے ہوں کافر نظارے
وہاں چل کے ہم اپنی دنیا بسائیں ——— محبت میں ہر چیز کو بھول جائیں

پنگھٹ کے قریب

از جناب شمیم [illegible] بی اے
[illegible]

وہ اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا برف کے مانند سفید بال جھریوں دار چہرہ پر دھنسی ہوئیں آنکھیں جن کے نیچے پپوٹے لٹک آئے تھے اس کی پیرانہ سالی کو بتلا رہی تھیں۔ وہ بہت کم بولتا اور گاؤں والوں سے الگ رہنے کی کوشش کرتا۔ گاؤں کے ایک سرے پر سب سے الگ ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جو اس کا سب کچھ تھی گویا اس کی دنیا ہی الگ تھی۔ کبھی کبھی شام کو الاؤ کے گرد آ کر بیٹھ جاتا۔ گاؤں کے لوگ اس کو رامو چاچا کہا کرتے۔ زمیندار تو اسکی حد سے زیادہ عزت کرتا۔

زمیندار کا چھوٹا بھائی باسط میرا دوست تھا۔ اس نے مجھے گاؤں میں چھٹیاں کاٹنے کی غرض سے مدعو کیا تھا۔ ایک روز باسط بولا۔

"شمیم! رومانی افسانوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے"

"یہ سب رومان افسانہ نگاروں کی قوت متخیلہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حقیقت کا اس میں شائبہ تک نہیں" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے پہلو میں درد آشنا دل نہیں ہے ورنہ تم ایسا نہ کہتے" وہ ہنس کر بولا "دنیا میں صدہا سچے واقعات رونما ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ محبت ازل سے پیدا ہوئی اور ابد تک اس دنیا میں رہیگی۔ کسی نے کہا ہے کہ ؎

عاشقوں سے نہ رہا کوئی زمانہ خالی
کبھی وامق کبھی مجنوں کبھی فرہاد آیا

چلو آج چل کر اس گاؤں میں بیتا ہوا سچا رومان اسی کی زبانی سنوائیں جو اس بے درد افسانہ کا جزو ہے"

وہ مجھے رامو کے پاس لے گیا اور جاتے ہی بولا "رامو چاچا سلام"

رامو چلم میں تمباکو رکھ رہا تھا۔ ہم دونوں کو دیکھ کر اس نے چلم رکھدی اور بولا۔

"سکھی رہو بیٹا"

کٹیا سے باہر اس نے اپنی جھلنگا چارپائی املی کے سایہ میں ڈال دی اور "بھیا بیٹھو ——— میں ابھی آیا" کہہ کر وہ پھر اپنی جھونپڑی میں چلا گیا۔ دو منٹ میں چھوٹا سا حقہ لئے ہوئے نکلا اور سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

"کیسے آنا ہوا ——— باسط بھیا" وہ کیچڑ سے بھری ہوئی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں چاچا ——— یہ ہمارے دوست تمہاری زبانی موہنی اور عزیز کی کہانی سننے آئے ہیں"

"بیٹا کہاں تک سناؤں ——— آج سناتے سناتے یہ عمر آگئی ——— بیتے ہوئے دنوں کی یاد چاہتا ہوں کہ بھول جاؤں لیکن گاؤں والے بھلانے ہی نہیں دیتے ——— چھوڑ دو بھی بھیا ——— تم کو تو معلوم ہے تم ہی سنا دو ——— مجھے چھوڑ دو"

"نہیں چاچا ——— یہ ہمارے دوست دور سے آئے ہیں۔ ان کو نہ لوٹاؤ ——— اور پھر جو بات تمہارے سنانے میں ہے وہ کوئی اور میں کہاں ہو سکتی" باسط بولا۔

"اچھا ——— تم بھی سن لو" وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولا "برسیں گزریں اسی گاؤں میں زمیندار کا لڑکا عزیز اور میں بچپن کے دن ایک ساتھ گذار رہے تھے وہ میرا دوست تھا سچا دوست ——— ہم ایک دوسرے کی دوستی پر ناز کرتے تھے۔ مڈل تک ایک ساتھ تعلیم پائی ——— مجھ کو عزیز کے بغیر چین نہ تھا اور عزیز کو میرے بغیر۔ ہمارے بچپن کے ساتھیوں میں ایک ساتھی اور بھی تھا اور وہ تھی موہنی۔ گاؤں کے وید کی لڑکی ——— اس کی بڑی بڑی کٹوروں کی سی آنکھیں جیسے پپوٹوں میں پارہ بھرا ہو۔ کالے کالے بال۔ نازک کلائیاں اور گیہواں رنگت۔ بات کرتی تو معلوم ہوتا جیسے کوئل بول رہی ہے۔ بچپن کے یہ دن بڑے مزے سے گزر رہے تھے۔ ہم تینوں ایک ساتھ کھیلا کرتے تینوں ملکر گھروندے بناتے اور شام کو ایک دوسرے سے صبح کو جلد اٹھنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو جاتے۔ ایک دن عزیز نے اور میں نے الگ الگ گھروندے بنائے۔ عزیز نے مجھ سے کہا۔

"موہنی میرے ساتھ رہے گی"

"نہیں میرے ساتھ رہیگی" میں نے جواب دیا

"موہنی سے ہی پوچھ نہ لو" اس نے موہنی کو تکتے ہوئے کہا۔

"کیوں کس کے ساتھ رہوگی" میں نے

موہنی سے آہستہ سے کہا۔

وہ بولی تو نہیں ہاں انگلی سے میری طرف اشارہ کرکے بھاگ گئی۔

عزیز کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے اپنا گھروندہ ٹھوکر مار کر گرا دیا۔ میں اپنی کامیابی پر خوش تھا اور ہم دونوں مینی خوشی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھر چلے جا رہے تھے مگر عزیز وہیں کھڑا رہا۔

اس طرح ہمارا بچپن گذرتا گیا۔ ہم دونوں آپس میں لڑتے اور پھر اسی طرح مل جاتے۔ آخر ہم لوگوں کا شمار نوجوانوں میں ہونے لگا اور اسکول جانے لگے۔ موہنی اب وہ موہنی نہ رہی تھی —— وہ اب ہم لوگوں سے ملتی تو شرماتی ہوئی، لجاتی ہوئی وہ اگر بات کرتی تو اس کی نگاہیں اوپر نہ اٹھتیں اس کی وہ شرارتیں بھی ختم ہوگئی تھیں مگر اب عزیز کی طرف کھنچ رہی تھی۔ کبھی اسکول سے میں آجاتا اور عزیز کو دیر ہوجاتی تو گاؤں کو آتی ہوئی پگڈنڈی پر وہ مجھ سے ملتی اور اکیلا دیکھ کر عزیز کو پوچھتی —— اس کی زبان سے یہ سن کر میں دل مسوس کر رہ جاتا اور خاموشی سے جواب دیکر سر جھکائے اپنے گھر چلا آتا۔ اپنی بیکسی پر رونے لگتا۔ میں اکثر خود سے کہتا کہ آخر موہنی مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتی۔ میں تو اس کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میں تو اس سے سچا پریم کرتا ہوں مگر پھر خود ہی یہ کہتا کہ عزیز کے پاس بھی تو دل ہے وہ مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے اگر موہنی اس کو چاہتی ہے تو کیا پاپ کرتی ہے اور یہ سوچکر خاموش ہو رہتا۔ اس وجہ سے میں نے اپنی محبت موہنی پر یا عزیز سے نہیں ظاہر کی لیکن پھر بھی مجھے موہنی سے محبت تھی اور بے حد۔

جب تک عزیز یہاں رہا دونوں گاؤں سے دور آم کے درختوں کے سایوں میں چھپ چھپ کر ملتے رہے کیونکہ اب عزیز پر اس کے باپ کی طرف سے پابندیاں لگا دی گئی تھیں اور موہنی کو تو اور بھی ڈر تھا —— گاؤں کی نظر میں زمیندار کے لڑکے سے ایک معمولی آدمی کی لڑکی کا پریم —— راجہ کے ساتھ پرجا کا پریم مہا پاپ ہے نا —— اسلئے دونوں چاندنی راتوں میں پیلی پیلی سرسوں کے کھیتوں کے پاس بڑے کنوئیں کی جگت پر چوری چوری ملتے۔ عزیز مجھ سے کچھ نہ چھپاتا اور اپنی تمام باتیں کہدیا کرتا۔ بچپن کی محبت آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ ایک دوسرے کے بغیر کسی کو چین نہ تھا۔ مڈل تک تو ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے رہے لیکن اس کے بعد عزیز کو آگے پڑھنے کیلئے شہر بھیج دیا گیا۔

ہر اتوار کو عزیز گاؤں آجاتا اور موہنی و عزیز ایک دوسرے سے سینکڑوں امیدوں کے ساتھ وہیں کنوئیں کی جگت پر ملتے۔ عزیز اس کیلئے نئے نئے گیت بنا کر لاتا اور وہ ان کو گایا کرتی۔ ان کو خوش دیکھ کر میں بھی خوش تھا۔ زمانہ بھی مہربان تھا۔

عزیز کا دسواں درجہ پاس کرنا دونوں کے لئے ایک آفت لے آیا۔ کیونکہ آگے تعلیم حاصل کرنے کیلئے اس کو علی گڈھ جانا تھا۔ گرمیوں کی چھٹی اس نے گاؤں میں بڑی خوشیوں کے ساتھ کاٹی۔ موہنی اب سولہ برس کی ہو چکی تھی۔ جوانی اپنی پوری بہار دکھلا رہی تھی۔ اس کی مستی بھری آنکھیں جیسے نیند سے بھری تھیں اور بھی گھائل کر رہی تھیں گاؤں کا ہر جوان اس پر بلیدان ہونے کو تیار تھا مگر وہ کسی کو منہ بھی نہ لگاتی۔ چھٹیاں ختم ہونے آئیں۔ عزیز گاؤں کے ہر شخص سے مل کر کنوئیں کی طرف آیا۔ یہاں میں اور موہنی اس سے آخری ملاقات کرنے کو کھڑے تھے۔ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے سے عہد و پیمان کرتے رہے آخر آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ عزیز اور ہم دونوں جدا ہوئے۔ چلتے چلتے عزیز نے کہا۔

" دوست رامو —— موہنی کو تمہارے سپرد کر رہا ہوں میں نے اس سے وعدہ کرلیا وہ ہچکیاں لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا کی۔ اس کی خاموش نظریں جیسے کہہ رہی ہوں کہ پریتم پردیس جا کر بھول نہ جانا۔ دور تک اس کو دیکھتی رہی اور عزیز بھی مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔

محبت سے بھرے ہوئے عزیز کے خط میرے پتہ پر موہنی کے نام آتے رہتے اور موہنی ان کا جواب مجھ سے لکھوا کر عزیز کو بھیجتی رہی۔ وہ ان خطوں کو اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا سمجھ کر رکھتی۔ لیکن اس کے ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ وہ پہروں گاؤں سے دور پیلی سرسوں کے کھیتوں اور گیہوں کی جھومتی ہوئی بالیوں کی طرف دیکھا کرتی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ میں اس کو تسلی دیتا رہا کہ وہ ایک دن ضرور آئیگا۔

قسمت ادھر اپنا کام کر رہی تھی عشق و محبت کی باتیں کبھی چھپ نہیں سکتیں۔ زمیندار کو اس کا پتہ چل گیا کہ موہنی اور عزیز میں آپس میں پریم کی پینگیں بڑھ رہی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ میں دونوں کو مدد دے رہا ہوں۔ زمیندار نے موہنی کے باپ کو حکم دیا کہ اپنی لڑکی کا بہت جلد

کسی کے ساتھ بیاہ کردے اور ادھر مجھے یہ حکم ملا کہ خبردار جو موہنی سے بات کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موہنی کا گھر سے نکلنا بند ہو گیا اور اب میں بھی موہنی کی شکل دیکھنے کو ترس گیا ——— موہنی ——— کتنی سندر نام تھا؟" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر اپنی پُرنم آنکھوں سے وہ آسمان پر بھاگتے ہوئے بادل کو دیکھتا رہا۔

"ہاں چاچا ——— پھر کیا ہوا؟" باسط کے ٹوکنے پر وہ پھر بولا۔

"ہاں تو ہم دونوں کا ملنا جلنا ترک ہو چکا تھا۔ میں موہنی کیلئے بیتاب تھا۔ مگر کیا کیا سکتا تھا۔ میں نے اس کی اطلاع عزیز کو کی لیکن مدت تک انتظار کرنے کے بعد بھی جواب نہ ملا۔ شاید اسکو یہ خط ملا نہ تھا میں بھی خاموش ہوکر بیٹھ رہا۔

ایک دن کانوں نے سنا کہ موہنی کا آج گاؤں کے ایک نوجوان کے ساتھ بیاہ ہونے والا ہے۔ گاؤں کا ہر شخص خوش نظر آرہا تھا لیکن میری آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ میں وہیں کنوئیں کی جگت پر بیٹھا رو رہا تھا ——— ہچکیاں لے لے کر۔ تم تعجب کروگے کہ مجھے رونے کی کیا ضرورت تھی۔ بھیا ——— تم کیا جانو ——— ان باتوں کو۔ مجھے بھی موہنی سے پریم تھا اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ میرے ساتھ میرے دوست کی آشاؤں کا بھی خون ہو رہا تھا آخر موہنی کے جیون کی گرہ چندان سے باندھ دی گئی ——— کچھ دن بعد میرے دل سے جب غم کا بوجھ ہلکا ہوا تو عزیز کو لکھا

بھیا عزیز!

مجھے معلوم ہے کہ یہ خط پڑھ کر تمہارا دل ڈوب جائیگا لیکن معاف کرنا دوست اس سے پہلے میں نے تم کو اطلاع دی تھی لیکن افسوس تمہاری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ آج لکھنے بیٹھا ہوں کہ تمہارے پتا کی مرضی کے مطابق موہنی کا بیاہ چندان سے ہوگیا ہے۔ مجھے دوش نہ دینا۔ ہمارے بھاگ ہی پھوٹ گئے تو کیا کیا جائے۔ اچھا نمستے۔

تمہارا دوست ——— رام چرن

خط کے چوتھے دن گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ زمیندار کے لڑکے نے بڑے کنوئیں کے پاس رات کو جان دے دی میرے دل کو جیسے دھکا لگا۔ سر چکرایا اور گھر کی چوکھٹ ہی پر گر پڑا۔ جب آنکھ کھلی تو دوڑتا ہوا کنوئیں کے پاس پہونچا دیکھا کہ عزیز کے بے جان جسم پر موہنی مردہ پڑی ہوئی ہے۔ اس کی ساری سے آنچیں نکل رہی تھیں ——— ہر شخص اپنی آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے حسرت سے مرنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں بھی "ہائے عزیز" کہہ کر آگے بڑھا لیکن لوگوں نے پکڑ لیا میں ایک بار پھر بے ہوش ہوگیا۔

شام تک عزیز منوں مٹی کے نیچے اسی جگہ پر ہمیشہ کیلئے سلادیا گیا اور موہنی کا پھول جیسا بدن پتا کی بھینٹ چڑھ گیا۔ میں نے رونا چاہا لیکن آنسو خشک ہو چکے تھے۔ آنکھیں ویران پڑی تھیں۔ مرنا چاہا لیکن مر بھی نہ سکا۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔

زمیندار نے ایک چھوٹا سا مقبرہ بنا دیا۔ گاؤں کے لوگ کبھی کبھی آکر محبت کے پرستاروں پر پھول چڑھاتے رہے لیکن سال دو سال میں سب بھول گئے کہ گاؤں میں کوئی عزیز اور موہنی بھی پیدا ہوئے تھے میرے لئے دنیا کی تمام خوشیاں ختم ہوگئیں۔ اپنے کو مُردہ سے بھی بدتر سمجھنے لگا۔ سنسار میں میرا کوئی ہمدرد نہ رہا۔ ایک تھا بھی تو وہ پریم کی بھینٹ چڑھ گیا جوانی کے دن روتے گذرے اور بڑھاپا بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرتے کرتے گذر جائیگا اب یہ حالت ہے جو تم دیکھ رہے ہو اکثر راتوں میں عزیز کی قبر کی طرف سے دونوں کی درد بھری آوازیں آیا کرتی ہیں اور بچھڑے ہوؤں کی یاد دلاکر اور بھی بے چین کردیتی ہیں ——— کبھی سوتے میں معلوم ہوتا ہے کہ عزیز دروازہ پر کھڑا مجھے بلا رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"آؤ رامو ——— پنگھٹ پر چلیں ——— موہنی آئی ہوگی" اور گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ تمام رات روتے روتے گذر جاتی ہے ——— معلوم نہیں کب دنیا سے چھٹکارا ہوگا"۔ اس کی بے نور آنکھوں میں سے اب امنڈتا ہوا سیلاب بہہ نکلا تھا۔ اور اس کے جھریوں دار گالوں پر آنسوؤں کے قطرے ڈھلک ڈھلک کر آرہے تھے۔ میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز ہوچکی تھیں اسلئے وہاں سے اٹھ آیا۔

مجھے ساتھ لے کر باسط مرحوم عزیز کے مزار پر گیا شام ہوچکی تھی۔ چاند اپنی کرنیں ہرے بھرے کھیتوں پر بکھیر رہا تھا۔ ایک سکوت کا عالم تھا گویا کائنات کی ہر چیز محوِ خواب تھی مزار کی دیواریں کچھ کچھ شکستہ ہوچکی تھیں لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہوا کہ دونوں کی روحیں محبت کی بیقرار روحیں ایک دوسرے کے گلے مل رہی ہیں۔ کانوں نے محسوس کیا کہ کوئی پُرسوز راگ چھیڑ رہا ہے ——— قریب کے آموں کے باغ سے کوئل نے بھی کوکنا شروع کردیا تھا۔ آنسو تھے کہ خود بخود بہے چلے آرہے تھے ایک مرتبہ پھر مزار کی شکستہ دیواروں کو دیکھا جن پر حسرت برس رہی تھی ۔۔۔ آخر دل میں ایک کسک لے کر گاؤں واپس آگیا۔ یہ تھا سچا رومانی ڈرامہ جو ضلع لکھنؤ کی سرزمین پر عہدِ ماضی میں کھیلا گیا۔ اور سوہنی مہینوال کی طرح عزیز و موہنی کے قصے بھی مدتوں تک لوگوں کی زبانوں پر رہیں گے؟

[illegible]

چھیڑ چھاڑ

از جناب مسٹر انیس عظیم آبادی [illegible]

کمرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سختی کے ساتھ میں نے کہا " صفائی کا تو یہاں نام نہیں ہمیشہ چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی رہتی ہیں۔ ضرورت کے وقت کوئی چیز اپنی جگہ پہ مل جائے یہ ناممکن ہے "

صفیہ نے کتاب کے صفحے سے اپنی نظر کو جدا کرکے کہا " کیا بات ہے ؟ " وہ صوفے پر دراز تھی۔ ریشمی لباس میں خاصی گلاب کا ایک حسین پھول معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس قبیح عادت کا کہ چیزیں ہر طرف بے ترتیب پڑی رہتی ہیں بہرحال برتنا ہونا چاہئے اور اگر بالفرض اسے یہ عادت نہ بھی ہو اور چیزیں کسی دن اتفاقی طور پر تتر بتر رہ گئی ہوں تو بھی میں نے سوچا اس وقت کی دھیمی ڈانٹ بہرحال بیکار نہیں جائیگی۔ آئندہ کام دے گی سنجیدگی کے ساتھ میں نے کہا " بات ؟ آپ بات پوچھ رہی ہیں ؟ میرا شیونگ برش نہیں ملتا۔ سب جگہ دیکھ لیا اور وہ ہے کہ ندارد "

صفیہ نے میز پر ایک نظر ڈالی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ ظاہر ہو کر دب گئی بولی۔ ذرا اس اخبار کے پیچھے تو دیکھو "

میں نے کہا " صفیہ مذاق چھوڑو۔ میں نہایت سنجیدگی سے یہ بات تمہارے ذہن نشین کرنی چاہتا ہوں کہ ـــ "

صفیہ صوفے سے اٹھ کر میز تک آئی اس نے اخبار اٹھا لیا۔ شیونگ برش رکھا تھا میں نے کیسی زبردست ٹھوکر کھائی کچی بنیاد پہ مکان تعمیر کرنے لگا تھا۔ مگر میں نے سوچا اگر اس وقت چوک گئے تو بات بے اثر ہو جائیگی۔ بگڑ کر بولا " یہ یہاں کیسے آیا ؟ (حالانکہ مجھے اسی وقت یاد آگیا کہ خود میں نے ہی اسے یہاں رکھا تھا)

صفیہ نے جواب دیا " کل شام حضور ہی نے شیو بنایا تھا۔ میں تو غالباً داڑھی نہیں مونڈتی "

میں نے کہا " تم برابر مذاق کئے جاتی ہو اگر میں اسے یہاں چھوڑ گیا۔ تم اسے اس کی مناسب جگہ پہ نہیں رکھ سکتی تھیں گھر میں صفائی ہونی چاہئے "

صفیہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا صرف اس نے آنکھیں پھاڑ کے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی گویا خاموشی کی زبان میں کہا " چہ خوش !!! "

میں اپنا راگ گاتا رہا " میں اگر جلدی میں ہوں اور کسی چیز کو یونہی چھوڑ دوں تو تمہیں چاہئے کہ اسے اٹھا کے رکھ دو یہ بے ترتیبی تو بری چیز ہے نا ؟

صفیہ نے اپنی کتاب کے صفحے کی طرف نظر کی۔ میں نے فوراً کہا۔

" کتاب پھر پڑھ لینا پہلے دھیان سے میری بات سن لو "

صفیہ نے کتاب رکھ دی بولی " فرمائیے ـــ اس نے ایسا انداز اختیار کر لیا۔ جیسے کوئی کہتا ہو " اچھا صاحب جو کام ہم کر رہے تھے وہ تو دیکھا ہم نے چھوڑ۔ اب تم بتاؤ ہم کیا کریں "

میں نے کہا " مجھے بس اتنا ہی کہنا ہے کہ گھر میں صفائی رہنی چاہئے "

مجھے محسوس ہوا کہ میں کچی زمین پر پھدک رہا ہوں اور بجائے کسی دوسرے کو پکڑنے کے آپ ہی زمین میں دھنستا چلا جاتا ہوں۔

صفیہ نے مزاحیہ انداز سے کہا " بابو جی یہ تو آپ پہلے ہی فرما چکے ہیں اب پھر کیوں تکلیف کی "

میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے تیوری پہ شکن ڈال کر کہا " میں یہ بار بار اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تمہارے دماغ پر خوب اچھی طرح نقش ہو جائے اور دیکھو سنجیدہ گفتگو کرتے وقت تم مجھے اس طرح بوجی بوجی نہ بنایا کرو "

صفیہ نے منہ بنا کر کہا " اوہو ! تو پھر آپ کو کیا کہوں ؟ "

میں نے کہا " میرا نام لو "

بولی " فرنگنوں کی طرح ؟ "

میں نے کہا " وہ کسی طرح بھی ہو مجھے بابو جی سے چڑ ہے اور تم اسی کو بگاڑ کر گنوار و لہجہ میں استعمال کرتی ہو۔ اچھا خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ میں تمہیں صفائی کی بابت تاکید کر رہا تھا۔ (دفعتاً میز کی طرف دیکھ کر) اور میرا شیونگ کا صابن کہاں ہے ؟ " صفیہ نے جو پھر کتاب پڑھنے

میں مشغول ہو چکی تھی پوچھا "کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے ذرا تیز ہو کر کہا "صابن، صابن، صابن"

اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا ہنسی پھر کہنے لگی "ہا، ہا، اوہ - صابن تو تم نے چہرے پر لگا رکھا ہے"

"ہائیں" ــــ میرے منہ سے نکلا

میں نے حیرت سے صفیہ کو دیکھا۔ دوڑ کر آئینے کے سامنے گیا۔ اوگوڈ۔ چہرے پر صابن مل کر بھول گیا۔ بیوی کو نصیحت کرنے کی دھن میں اتنا بدحواس ہو گیا کہ میں صفیہ پر اپنی یہ کوتاہی ظاہر نہ ہونے دینی چاہتا تھا۔ بولا "ابھی تو یہ صابن کم ہے نا؟ کچھ خشک بھی ہو گیا ہے اس لئے دیکھتا تھا صابن"

دفعتاً کسی نے پیچھے سے آکر میری کمر گرد ہاتھ ڈالے۔ صفیہ کے قہقہے کی آواز آئی۔ اس کی گدگدیوں سے میں بے کل سا ہونے لگا۔ بے اختیار ہنسنے لگا۔ ارے بی چھوڑو تو ...... بیگم ...... ارے میں گرا ...... اونہہ ہوں ــــ میں استرا پھینک میز کے آگے سے بھاگتا ہوا پلنگ پر آگرا۔ صفیہ میری گود میں تھی، بولی "میرے عقلمند میاں، بیوی کو نصیحت کرتے میں غصہ نہ ہوا کرو۔ غصے میں حواس ہی کھو بیٹھے"

"میں غصہ کب کر رہا تھا۔ تم سے غصہ" ــــ کہتے کہتے میں نے صفیہ کے گلرنگ چہرے کی صفائی کو اپنے شیونگ کے صابن سے لتھیڑ دیا۔ صفیہ نے دوپٹے کے آنچل سے صابن پونچھتے ہوئے کہا "یہ ہی تمہاری صفائی"

ایک گھنٹہ بعد میں دفتر میں بیٹھا سوچ رہا تھا "اگر صفیہ جیسی معقولیت پسند اور خوش مزاج عورت گھر میں ہو تو مرد کو صفائی وغیرہ کی کوئی پروا نہیں کرنی چاہئیے"

دفعتاً میری نگاہ پاؤں کی طرف گئی۔ بہت تیزی کی - الٹے موزے پہن آیا۔

دُنیا جہان کی عورتوں کے عجیب و غریب حالات

امریکہ کی بوڑھی عورتیں

آپ کو یہ معلوم کر کے ذرا بھی حیرت نہیں ہونا چاہئے کہ دنیا میں ایک ایسا خطہ بھی ہے جہاں کے نوجوان خوبصورت لڑکیوں کے مقابلہ میں بوڑھی عورتوں سے عشق کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ اس خطہ کے ۵۰ فیصدی سے زیادہ نوجوانوں نے سن رسیدہ عورتوں سے شادیاں کر رکھی ہیں۔

یہ خطہ کوئی غیر معروف دنیا کا حصہ نہیں بلکہ دنیا کا مشہور ملک امریکہ ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ وبا نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ نوجوان لڑکے بوڑھی عورتوں سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

اس وابستگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کی ستر فیصدی دولت عورتوں کے قبضہ میں ہے۔ اور اس ستر فی صدی میں سے زیادہ تر دولت پر بوڑھی عورتیں قابض ہیں امریکہ کے نوجوان بوڑھی عورتوں کی دولت سے فائدہ اٹھانے کیلئے بڑے شوق کے ساتھ بوڑھی عورتوں سے شادیاں کر رہے ہیں۔ نیویارک کی ایک دلچسپ اطلاع کہ حال ہی میں نیویارک کے ایک اٹھارہ سالہ نوجوان نے ۹۴ برس کی بڑھیا سے شادی کی ہے۔ ایک دوسری اطلاع ہے کہ ایک بائیس سالہ نوجوان ۷۸ برس کی بڑھیا سے عشق کر رہا ہے۔ بوڑھی عورتوں سے امریکہ کے نوجوانوں کا عشق در حقیقت عشق نہیں ہے بلکہ حصولِ زر کا ایک آسان طریقہ ہے۔

دُلہن برہنہ ہو کر ناچتی ہے

آپکو یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوگی کہ دنیا میں ایک ایسی عجیب و غریب قوم بھی موجود ہے جس کے ہاں کا دستور یہ ہے کہ شادی کے موقع پر دلہن کو براتیوں اور مہمانوں کے سامنے مادر زاد برہنہ ہو کر ناچنا پڑتا ہے یہ عجیب و غریب قوم جنوبی امریکہ کے غیر آباد علاقہ میں رہتی ہے۔ اس قوم کو "دلونا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس قوم کے کل افراد کی آبادی مشکل سے ڈیڑھ ہزار ہوگی۔ یہ قوم مہذب دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہتی ہے۔

دلونا قوم میں یہ رواج ہے کہ جب دلھن کے ہاں برات آتی ہے تو دلہن کو دولھا اور براتیوں کے سامنے برہنہ ہو کر ناچنا پڑتا ہے۔ صرف ایک ذرا سا اونی کپڑا جسم کے سامنے کے حصہ پر پڑا رہتا ہے۔ دولھا کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ عین اس وقت جب دلہن رقص کر رہی ہو مجمع میں سے زبردستی اٹھا کے لے جائے۔ دلہن کی چار سہیلیاں اس نازک موقع پر دلہن کی مدد کے لئے متعین رہتی ہیں جو دولھا کو دلھن کے اٹھا لیجانے میں مزاحمت کرتی ہیں۔

دولھا کو اتنا طاقتور ہونا چاہئے کہ وہ ان چاروں سہیلیوں کو زیر کرتا ہوا زبردستی دلھن کو اٹھا کر لے جائے۔ اگر دولھا کو اس طرح دلھن کو لے جانے میں کامیابی نہیں ہوتی تو پھر دولھا کو شادی کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ جب دولھا ناچ کے ایک قائم کردہ حلقہ سے باہر دلھن کو لے کر نکل آتا ہے۔ اس حلقہ سے نکلنے کے بعد دولھا کے چار دوست بھی ان عورتوں سے پیچھا چھڑانے میں دولھا کی مدد کرتے ہیں جو دولھا کا تعاقب برابر کرتی رہتی ہیں۔

اس قبیلہ کا عقیدہ ہے کہ دلھن کے برہنہ رقص سے دیوتا اور بزرگوں کی روح خوش ہوتی ہے اور دولھا دلھن بد ارواح کے اثر سے ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔

عورتیں مردوں کیساتھ برہنہ

دنیا میں ایک ایسا بھی ملک ہے جہاں عورتیں اور مرد حمام میں پہنچنے کے بعد بالکل مادر زاد برہنہ ہو جاتے ہیں۔ عورتیں مردوں کے سامنے بے تکلف ہو کر نہاتی ہیں اور مرد عریاں حالت میں بغیر کسی خیال کے عورتوں کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔

وہ ملک جہاں یہ بے حیائی عام ہے جاپان ہے۔ جاپان کے حمام بہت زیادہ مشہور ہیں۔ چنانچہ جب ایک ہندوستانی سیاح ٹوکیو پہنچا اور اس نے وہاں کے حمام میں قدم رکھا تو وہاں ایک نیا منظر دکھائی دیا۔ خوبصورت عورتیں نہایت بے تکلفی کے ساتھ مردوں کے برہنہ جسم کو مل رہی ہیں اور حمام میں عورتیں اور مرد مادر زاد برہنہ ہو کر نہا رہے تھے۔

اس سیاح کا بیان ہے کہ اگر کوئی شرمیلا شخص اس حمام میں دوسروں کے سامنے ننگا ہونے اور نہانے سے پرہیز کرتا ہے تو اسے غیر مہذب خیال کیا جاتا ہے۔

گویا جاپان کی تہذیب ہی یہ ہے کہ عورتیں اور مرد مادر زاد برہنہ ہو کر نہائیں۔

بیویاں تبدیل ہوتی ہیں

آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ دنیا میں ایک ایسی عجیب غریب قوم بھی آباد ہے جن کے ہاں آپس میں بیویوں کا بدل لینا کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا۔ چنانچہ اس قوم میں آئے دن بیویوں کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ عجیب غریب قوم افریقہ کے جنوبی علاقہ میں آباد ہے۔ اس قوم کو "بنانا" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس قوم کے افراد کی آبادی دو اور ڈھائی ہزار کے درمیان ہے۔ اس قوم میں یہ عام رواج ہے کہ لوگ آپس میں اپنی بیویاں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس قوم میں ایسے عجیب غریب انسان پائے گئے ہیں جو اپنی عمر میں دس بارہ دفعہ بیویاں تبدیل کر چکے ہیں۔

آپس میں بیویاں تبدیل کرنے والوں کو کچھ معاوضہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے جو اپنی زیادہ عمر کی بیویوں کو کم عمر کی بیویوں سے تبدیل کرتے ہیں۔ خیال ہے کہ بیویوں کے تبادلے کے معاملہ میں یہ قوم دنیا کی عجیب غریب قوم ہے۔

عورتیں نوکر ہیں

ہندوستان میں سنتھال کے نام سے ایک نہایت ہی دلچسپ قوم آباد ہے۔ اس قوم کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس قوم میں بدچلنی بالکل نہیں ہے۔ اس قوم کے جوان لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ کھیلتے ہیں لیکن کبھی کسی بے عنوانی کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اس قوم کو اپنی لڑکیوں پر اس قدر اعتماد ہے کہ اگر اس قوم کی کوئی لڑکی رات کے بارہ بجے گھر واپس آئے تو ان کو ذرا بھی اس لڑکی پر شبہ نہیں ہوتا۔

سنتھال قوم میں شادی اپنی پسند سے کی جاتی ہے۔ شادی کا طریقہ یہ ہے کہ برادری کے بڑے بوڑھے جمع ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے لڑکا اور لڑکی اپنی پسند کا اظہار کرتے ہیں۔ لڑکا دلھن کے باپ کو پانچ روپے دیتا ہے۔ اس کے بعد ایک تاریخ مقرر کر دی جاتی ہے۔ شادی میں جتنے دن ہوتے ہیں اتنی ہی گرہیں ایک تاگے میں لگا دی جاتی ہیں جنہیں دولھا روزانہ ایک ایک کر کے کھولتا رہتا ہے۔ شادی کے دن جب دولھا والے دلھن کے گھر پہنچتے ہیں تو عورتیں تمام براتیوں کے پاؤں دھوتی ہیں۔ پھر طرفین دعوت میں شریک ہوتے ہیں اور گاتے ناچتے ہیں۔ پچھلی رات کو دولھا کے دوست اسے کسی چیز پر بٹھا کر کمرہ عروسی میں لاتے ہیں۔ ادھر دلھن والے دلھن کو ٹوکرے میں بٹھا کر کمرہ عروسی میں پہنچا دیتے ہیں۔ دولھا دلھن کے ماتھے پر سیندور لگاتا ہے۔ پھر دونوں دن بھر کے فاقہ کے بعد اس وقت ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں اور اس طرح شادی مکمل ہو جاتی ہے۔ کوئی مذہبی پیشوا شادی کی رسوم ادا نہیں کرتا۔ ان کے ہاں ان رسوم کی ادائیگی ہی کا نام تکمیل شادی ہے۔ صرف ایک بڈھا دلھن کو رخصت کرتے وقت کچھ نصیحتیں کرتا ہے۔

آپکا خریداری نمبر

دفتر کیلئے بہت اہمیت رکھتا ہے جب کبھی آپ پرچہ نہ پہنچنے یا پتہ تبدیل کرانے کیلئے دفتر کو لکھیں تو اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں آپکے ارشاد کی فوراً تعمیل کی جائیگی۔

میرا خاندانی نسخہ

پائیوریا

جناب ایڈیٹر صاحب۔ تسلیم!

حسب الارشاد پائیوریا کا سو فیصدی مجرب نسخہ روانہ کر رہا ہوں۔ مست قلندر کے ہزاروں لاکھوں پڑھنے والوں کے لئے اسے مفت شائع کریں مشکور ہونگا۔ یہ ہمارا خاندانی نسخہ ہے۔ اب تک لوگ ہمارے گھر سے دوا مفت لے جاتے ہیں عرصہ چالیس سال کا ہوا کہ ہمارے گاؤں میں یہ مرض عام ہو گیا تھا۔ ان ہی دنوں ایک خدا کا بندہ درویش صورت ہمارے گھر میں آیا۔ اور یہ بیش قیمت نسخہ عطا کر گیا۔ یہ بات بلا مبالغہ صحیح ہے کہ اب تک سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگ اس سے فیضیاب ہو چکے ہیں۔ نسخہ حسب ذیل ہے:۔

سرکہ خالص۔ پھٹکری۔ اجوائن دیسی اور شیشہ نمک مساوی الوزن۔

ترکیب:۔ ایک گہرے توے کو ہلکی آنچ پر رکھ کر پہلے سرکہ اور بعد ازاں پسی ہوئی پھٹکری ڈال دیں۔ اور اوپر سے کسی برتن سے ڈھانپ دیں جب سرکہ جل جائے تو توے کو چولھے سے اتار کر پھٹکری کو کھرچ لیں۔ اور ازاں بعد دوسری چیزیں پیس کر ملا لیں۔

طریقہ استعمال:۔ صبح و شام انگلی سے مل کر منہ ڈھیلا کر کے بعد دو گھنٹے کے کلی کریں۔

مرسلہ:۔ مستری عبد العزیز صاحب انجنیر
محلہ مشرقی چوبڈہ (سیالکوٹ)

سماج کی ستم ظریفی اور چیرہ دستی کی ایک خونچکاں داستان

بدنصیب راشدہ کا خط

اپنی سہیلی ذکیہ کے نام

ایک بار پڑھو اور ہزار بار آنسو بہاؤ

از جناب عبدالسمیع صاحب صمد رامپوری

مورخہ یکم ستمبر ۱۹۴۱ء

بہن ذکیہ! یہ میرا شادی کے بعد تمہارے نام سب سے پہلا اور غالباً سب سے آخری خط ہے۔ تمہارے بارہا خط آئے۔ انہیں پڑھا اور کئی کئی بار پڑھا۔ جواب لکھنے کی کوشش کی مگر میری شرم جواب لکھنے میں حائل ہوئی کیا تمہیں وہ زمانہ یاد ہے جب ہم اور تم سیکنڈ ایئر میں تھے۔ اف کس قدر رنگین تھا وہ زمانہ جس کا ایک لمحہ لوح دل پر نقش ہے۔ اسی دوران میں جب ثریا کی شادی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے کر دی گئی تھی۔ تو سب لوگ اس پر کیسی کیسی پھبتیاں کستے اور آپس میں کیسی کیسی قیاس آرائیاں کرتے تھے۔ سب سے زیادہ میں ہی اس بدنصیب کا مذاق اڑایا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ نوج کوئی کسی بڈھے سے شادی کرے۔ کوئی جوان آدمی کیوں نہیں کسی بڑھیا سے شادی کرتا۔ آخر ہم لوگ اس لعنت میں کیوں گرفتار کئے جاتے ہیں اگر میرے ماں باپ نے میری شادی کا ارادہ بھی کسی ایسے شخص کے ساتھ کیا ہوتا مصمم ہوا تو میں زندہ درگور ہو جاؤنگی۔ زہر کھالوں گی۔ گھر والوں سے بغاوت کرونگی لیکن ایسی شادی کبھی نہ ہونے دوں گی۔ یہ سب ہم لوگوں کی کمزوری کا قصور ہے کہ ہم لوگ بھیڑ بکری کی طرح دوسروں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہو تو کسی کی مجال نہیں جو ہمارے خلاف کچھ بھی کر سکے۔

کیا معلوم تھا کہ قسمت مجھ پر کھڑی ہنس رہی ہے اور زور زور سے کہہ رہی ہے او! دیوانی لڑکی ایک دن وہ بھی آنے والا ہے جبکہ تیرے ارادے ہوائی قلعوں کی طرح مٹ جائیں گے۔ اور تیرے ساتھ وہی ہونے والا ہے جس کا تجھے اندیشہ ہے جس کے خلاف تو اسوقت ڈینگیں مار رہی ہے اور جس کی مخالفت کا تو عہد کر رہی ہے۔

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ میں بورڈنگ سے گھر گئی۔ گھر پہونچکر معلوم ہوا کہ میری شادی ہو رہی ہے۔ ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے ساتھ۔ "ان کی کلکتہ میں کافی جائداد ہے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ ملازمت کے زمانہ میں کافی روپیہ کمایا ہوا ہے اور اب پنشن پا رہے ہیں۔ ان کی پہلی بیوی حال ہی میں اس دنیا سے کوچ کر چکی ہیں۔" یہ تو ہیں ان کی اچھائیاں۔ اب ہمارے فائدے سنو "ابا کو ان سے کافی روپیہ مل سکتا ہے جس سے ان کی تجارت دن دگنی اور رات چوگنی ہو جائیگی اور شہرت میں کافی اضافہ ہوگا۔ اور میں ڈپٹی کلکٹر کی بیوی کہلاؤنگی۔ رہنے کو عمدہ کوٹھی۔ سیر کو موٹر۔ پہننے کو قیمتی کپڑے۔" تم سمجھ سکتی ہو کہ اس خبر نے مجھ پر کیا اثر کیا ہوگا۔ بالکل اس طرح جیسے ایک ملزم کو پھانسی کا حکم یا جہاز کے ملاحوں کو جہاز کے ڈوبنے کی خبر دی جاتی ہے۔

شادی کی تاریخ میں آٹھ روز باقی تھے۔ اب بات بالکل طے ہو چکی تھی۔ ابا کے ڈر مارے کچھ بول بھی نہ سکی اور میری حیا و شرم اور نسوانی کمزوری نے میرے ارادوں کو جن پر کہ مجھے زمانہ طالب علمی میں ناز تھا آج روئی کے گالوں۔ ریت کی دیوار کی طرح ایک تند ہوا کا جھونکا بنکر اڑا دیا۔ میں بالکل اس پرند کی طرح رہ گئی جو پنجرہ میں بند ہو اور لوگ اسے خوش کرنے کیلئے اس کے چاروں طرف بولیاں بول رہے ہوں۔ کوئی اسے پھل ڈال رہا ہو کوئی پانی اور کوئی کھانا لیکن کیا وہ اجل گرفتار طائر کچھ کھا پی سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ یہی حالت میری تھی۔ بعینہ یہی۔ شادی میں دو روز باقی تھے۔ گھر مہمانوں سے یا ان تماشائیوں سے بھرا پڑا تھا جو ایک حماقت کا نمونہ دیکھنے آئے تھے جو آتا مجھے مبارکباد دیتا۔ ماں باپ خوش تھے کہ وہ کچھ بھی کر رہے ہیں میری ہی

بہبودی کیلئے کرتے ہیں۔ کاش یہ سچ ہوتا۔ میں تو ایک عورت کی طرح تھی جو کہ بیچنے والے کو بہت سا روپیہ دلا سکتی تھی۔ آج نیلام پر چڑھائی جا رہی تھی۔ جس نے سب سے زیادہ بولی بولی تھی وہی میرا مالک بن رہا تھا۔ اس طرح میں اپنے ابا کی عزت اور شہرت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھائی جا رہی تھی۔ کیا میرے اماں ابا کچھ نہ جانتے تھے۔ اور اگر نہیں جانتے تھے تو کیا میرے آنسو اور میری خموشی میرے ارادوں کی شاہد نہ تھی۔ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ اور انہوں نے سب کچھ جانتے ہوئے مجھے اپنی شہرت کا آلہ کار بنایا۔

شادی کا دن آیا۔ نہیں نہیں میرے نیلام کا دن آیا۔ یا میری پھانسی کا شادی باجہ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال رہا ہو۔ در و دیوار زور زور سے کہہ رہے تھے کہ دیکھ یہ ہے تیری کمزوریوں کا انجام۔ ساری دنیا مجھے گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی شادی کا باجہ میرے اوپر قہقہہ لگا رہا تھا۔ کاش میری شادی کسی جوان آدمی سے ہو رہی ہوتی۔ چاہے وہ بالکل کنگال ہی ہوتا۔ مگر میرے جذبات کی پذیرائی تو کر سکتا۔ میں جوان تھی۔ میری امنگیں جوان تھیں میری آرزوئیں جوان تھیں پھر میری شادی کیوں کسی جوان آدمی سے نہ کی گئی؟

نکاح کے بعد میں رخصت ہوئی یا دوسرے معنوں میں گھر سے نکالی جا رہی تھی۔ ماں باپ بہن بھائی سب رو رہے تھے۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سبھی ہمدردی کے آنسو نہیں بلکہ گھڑیال کے ایسے آنسو ہیں ـــــ

غرض میں اس گلے کی طرح تھی جو قربانگاہ کی طرف لے جائی جا رہی ہو۔ اور سائیں تڑپا رہی ہو لیکن ظالم و جابر قصائی اسے گھسیٹ کر قربان گاہ لے جائے۔ میں اپنے شوہر کے مکان پر لائی گئی۔

جس وقت وہ میرے پاس آئے میرا سر چکرا رہا تھا۔ کوئی پچاس برس کی عمر صحت ایسی جیسے دق کا مریض۔ آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا۔ فرنچ کٹ داڑھی۔ بالوں پر خضاب کی سیاہی۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے رونا آگیا چونکہ منہ پر گھونگھٹ تھا اسلئے وہ دیکھ نہ سکے۔ اگر زمانہ طالب علمی میں کوئی بھی ایسے شخص کو میرا شوہر کہہ دیتا۔ چاہے جھوٹ موٹ تو میں اس کا منہ نوچ لیتی اور نہ جانے اس کا کیا حال کر دیتی۔ مگر اب وہی اپنی آنکھوں سے چپ چاپ اور دم بخود دیکھ رہی تھی جس وقت انہوں نے کہا " دلہن ذرا منہ کھول کر بیٹھو۔ کس قدر گرمی ہو رہی ہے۔ مگر تم ہو کہ منہ ڈھانکے ہوئے ہو۔ آخر شرم کیسی مجھ سے۔ لو اب منہ کھول بھی دو۔ دیکھو میرے سوا یہاں کوئی اور نہیں ہے تم خواہ مخواہ شرما رہی ہو۔ اب اس گھر کو اپنا گھر اور مجھ کو اپنا خادم سمجھو" تو جی میں آیا کہ کوٹھے سے چھلانگ لگا دوں۔ مگر ان کی مرجھائی ہوئی صورت نہ دیکھوں۔

بہن دکھیا! ان الفاظ کے سنتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ لاکھوں بجلیاں میری آنکھوں کے سامنے کوند گئیں۔ اور لاکھوں گھنٹیاں میرے کانوں پر بجائی جا رہی ہیں۔ میرا خون میری رگوں میں منجمد ہو گیا۔ لیکن قسمت میں ابھی اور بھی صدمے باقی تھے۔ جنہوں نے مجھ کو مرنے نہ دیا۔

وہ ہر طرح میری خاطر اور دلدہی میں مصروف رہتے ہر وقت مجھ ہی کو خوش کرنے کی ترکیبیں سوچتے۔ عمدہ عمدہ زیور، کپڑے اور دنیا بھر کے سامان بے ضرورت صرف میری خوشنودی کیلئے لاتے رہتے لیکن یہ تمام تحفہ جات مجھے خوفناک سانپوں کی طرح معلوم ہوتے جو اپنا آتشیں دم مجھ پر چھوڑ رہے ہوں۔ وہ مجھے سینما لیجاتے مگر آہ! وہ نہیں جانتے تھے کہ بجائے میری دلبستگی کے سینما میرے لئے دوزخ سے کم نہیں کیونکہ وہ میرے جذبات کو جو برف کی طرح سرد ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ گرم کر کے بھاپ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مجھے موٹر میں لے جاتے میں عورتوں کو خوش و خرم دیکھتی۔ میرے دل میں ہوک اٹھتی۔ لیکن میں پھر بھی تن بہ تقدیر کے مسئلہ پر گامزن تھی۔

اب میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا انہیں یکایک یہ خیال سوجھا کہ میں کالج میں داخل ہو جاؤں تاکہ میری طبیعت بہل جائے اور میں خوش رہ سکوں ـــ میں نے بھی اس رائے کو پسند کیا۔ کیوں اسلئے کہ میں چاہتی تھی کہ میں کسی قابل ہو جاؤں اور اس سم کو جو دختر کشی کی دوسری قسم ہے دنیا سے مٹا سکوں۔

خیر میں جولائی میں علی گڈھ چلی آئی کیونکہ یہاں زنانہ کالج ہے اور کالج کھلنے پر اپنا داخلہ بھی بی اے کے پہلے سال میں کرا لیا۔ کالج میں داخل ہونے سے میری صحت بھی خراب ہونے لگی تھی۔ وہ میری صحت کی خرابی کو میری بیماری تعبیر کرتے گھر پر میں ہمیشہ کالج کی اور ادھر ادھر کی

کتابیں پڑھتی رہتی جس سے مجھے کچھ سکون مل جاتا ؎

نیا آشیانہ بنا لینے والے
فلک پر ابھی بجلیاں اور بھی ہیں

کے مطابق خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ میں غم سے نجات پا سکوں۔ لہٰذا اب میرے غموں میں ایک نیا اضافہ اور ہوا۔ وہ یہ کہ انہوں نے کہا: "میں جس وقت بھی دیکھتا ہوں تمہیں کالج کا کورس پڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ کئی بار تمہارے منہ سے بھی سن چکا ہوں کہ کورس بہت مشکل ہے اسلئے میں نے ایک ماسٹر تجویز کیا ہے۔ وہ یہاں ایم اے کا طالب علم ہے۔ تم تو خود اسے جانتی ہوگی۔ وہ جو تمہارے گھر کے پاس ٹھیکیدار رہتے ہیں۔ ان کا لڑکا مسعود۔ وہ نہایت شریف اور با اخلاق لڑکا ہے۔ وہ تمہیں اچھی طرح پڑھا دے گا۔ اور ہمسایہ ہونے کی وجہ سے تمہارا اس سے نیم پردہ بھی ہے۔

اس خبر کو سنتے ہی مجھ پر بجلی سی گر پڑی چونکہ میں مسعود کو اچھی طرح جانتی تھی۔ بچپن میں ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلتے تھے۔ ہم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر ہماری مائیں بہت خوش ہُوا کرتی تھیں اور مسعود کی والدہ کہا کرتی تھیں کہ میں تو راشدہ کو اپنی بہو بناؤنگی۔ ان کے اس کہنے پر میں شرما سی جاتی لیکن دل میں بہت خوش ہوتی۔ لیکن خدا کو منظور نہ تھا کہ میری یہ خوشی پوری ہو سکے۔

دوسرے دن مسعود میرے گھر آیا کیا بتاؤں اس کا چہرہ پہلے ہی کی طرح ہنس مکھ اور بشاش نہ تھا بلکہ اس میں ایک نمایاں صحت تندرستی اور شباب کی بھی تھی۔ میں مسعود کو پہلے بالکل بھُول چکی تھی اور غالباً وہ بھی۔ لیکن اس ملاقات نے ہم دونوں کو ایک پھر زندگی میں ملنے کا موقع دیا۔ لیکن میں پہلے کی طرح بے باکی سے اس کے سامنے آنکھ نہ اُٹھا سکی۔ میں دل میں انتہائی شرم محسوس کر رہی تھی۔ الغرض اس نے مجھے بہن راشدہ کے نام سے مخاطب کیا اور میرا کورس وغیرہ دیکھا۔ اور پھر ایک سبق پڑھانے لگا۔ مسعود روزانہ شام کو پڑھانے آتا اور وقت پر چلا جاتا۔ وہ مجھ سے ایک بات بھی علاوہ پڑھائی کے کرنا گناہ سمجھتا۔ حالانکہ میں اب بھی وہی راشدہ تھی۔ جو اس کے ساتھ گھنٹوں کیا دن دن بھر کھیلتی رہتی تھی۔ اور میری زندگی کے وہ چند لمحے جو اس خوشگوار زندگی کی یادگار تھے، ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے پھرا کرتے تھے۔

مسعود میں اب میرے لئے پہلے سے زیادہ جاذبیت تھی۔ نہ معلوم کیوں میں خود بخود اس کی کھنچتی جا رہی تھی۔ اس کا قُرب مجھ پر قیامت برپا کر رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ میں شادی شدہ عورت ہوں مگر اس پر بھی میں اپنے آپ پر قابو نہ پاتی تھی۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ میں مسعود سے پڑھنا چھوڑ دوں بلکہ کئی کئی روز ناغہ بھی کر دیا مگر جس وقت مسعود مجھ سے ملتا اور کہتا۔ بہن راشدہ تم کیوں بیمار سی رہتی ہو۔ میں تمہارے رنج کو اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر جو کچھ ہمارے بزرگوں نے کیا وہ بہتر ہی ہے۔ اُٹھو ہنسو، بولو۔ آخر یہ رنج و غم کب تک ؎

رنج سے خوگر ہوا تو خود ہی مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

میں اس کے سامنے بالکل مجبور سی ہو جاتی اور پھر پڑھنے لگتی۔

کل کا واقعہ میری زندگی کا سب سے زبردست اور آخری واقعہ ہے۔ میں نے کئی روز سے مسعود سے پڑھا نہیں تھا اور نہ میں اس سے ملی۔ روزانہ کہیں نہ کہیں چلی جاتی تھی۔ کل صبح ہی صبح جبکہ میں ناشتہ ہی کر رہی تھی مسعود آگیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ بہن تم روزانہ کہاں چلی جاتی ہو اور میرا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے۔ میں نے تو صرف آپکو بہن سمجھتے ہوئے اور ڈپٹی صاحب کو بزرگ سمجھتے ہوئے پڑھانا شروع کیا تھا ورنہ میں خود آجکل نہایت مصروف ہوں۔ میرا ایم اے کا آخری سال ہے اور اگر تمہاری طبیعت خراب رہتی ہے تو تم پڑھنا ہی چھوڑ دو۔ آخر کیوں پڑھنے کے لئے اتنی پریشان ہوتی ہو اور اپنی تندرستی پر اس کا اثر ڈالتی ہو۔ اس کی اس سچی ہمدردی سے میرے آنسو نکل آئے۔ میرے آنسو نکلتے دیکھ کر مسعود بولا۔ ہائیں آپ رو رہی ہیں کیا۔ اس کے اس جملے نے مجھ پر وہی اثر کیا جو مضراب تاروں پر کرتا ہے۔ میں اور زور زور سے رونے لگی۔ آنسوؤں کا ایک سمندر میری آنکھوں میں اُمنڈ آیا۔ میرے آنسو اسقدر تیزی سے نکلنے لگے جیسے کسی دریا کا بند توڑ دیا گیا ہو۔ مجھے اس قدر روتا دیکھ کر مسعود کے بھی آنسو نکل آئے وہ مجھ سے بولا۔ بہن صبر کرو، صبر۔ آنسو تمہارے غم کو دھو نہیں سکتے۔ اور رومال سے میرے آنسو پونچھنے لگا۔ جس وقت مسعود آنسو پونچھ رہا تھا کہ یکایک وہ کمرے میں آ گئے۔ اور ہم دونوں کو اس طرح دیکھ کر

فوراً ہی باہر چلے گئے مسعود دم بخود کھڑا ہوگیا اور جانے لگا۔ میں اسے روکنے کیلئے اٹھی لیکن وہ باہر جا چکا تھا۔ میرا سر ایکدم سے چکرا گیا۔ میں نے میز سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑی۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ میں اپنے پلنگ پر لیٹی ہوں اور وہ میرے سرہانے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے اٹھنا چاہا لیکن انہوں نے کچھ کرختگی سے کہا۔ تمہارے سر میں گرنے سے کافی چوٹ آگئی ہے۔ تم بالکل مت اٹھو۔ میں صرف اسلئے یہاں بیٹھا ہوا ہوں کہ میں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایک ایسی غلطی کی جو تمام عمر معاف نہیں ہوسکتی اگر تم اسے سچے دل سے معاف کردو تو میں اب بھی کچھ سکون حاصل کرسکوں میں نے ایک بچے کی طرح آگ کو کھلونا سمجھ کر پکڑنا چاہا۔ مگر جب اس نے ہاتھ جلایا تو مجھ کو اس کا احساس ہوا۔ اگر اب بھی اسکو نہ پھینکا گیا تو وہ میرے ہاتھ کو جلا کر کوئلہ کردیگا۔ میں اسوقت پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے اسوقت سب کچھ جانتے ہوئے بھی تمہارے حق میں کانٹے بوئے۔ بس اب خدا کیلئے تم مجھے معاف کردو۔ لیکن میں برابر رو رہی تھی۔ یکایک ان کی آواز تیز ہوگئی اور وہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح بل کھانے لگے۔ وہ بولے کیا تم نہیں چاہتی ہو کہ میں تمام عمر یونہی گناہوں کے غار میں پڑا رہوں۔ کیا تم مجھے معاف نہ کرو گی۔ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا کہ قصوروار آپ نہیں میں ہوں سزا مجھے ملنا چاہئے نہ کہ آپکو۔ خدا کے لئے آپ میرے گناہوں کو نہ بڑھایئے مجھے میرے حال میں رہنے دیجئے۔ اگر آپکی کوئی خطا ہو تو میں نے دل سے معاف کی۔ میرے خدا نے معاف کیا۔

اتنا سنتے ہی وہ بجلی کی طرح میرے کمرے سے چلے گئے۔ میں نے انہیں آواز دی۔ ان کے پیچھے دوڑی لیکن وہ باہر مردانہ میں جا چکے تھے۔ دوپہر کو نہ انہوں نے کھانا کھایا نہ میں نے، رات کو نوکر کھانا لایا وہ بھی ابھی تک ویسے ہی پڑا ہوا ہے میں رات کو برابر روتی رہی۔ میں کوس رہی تھی۔ اپنے آپ کو، اپنی کمزوریوں کو، اپنے ماں باپ کو، اپنی مجبوریوں کو۔ نوحہ خواں تھی اپنے رسم و رواج پر، اپنی بے بسی پر۔ رات کے دو بجے تھے۔ میری آنکھیں سوج گئی تھیں۔ مثل مشہور ہے کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ بقول اس کے مجھے بھی نیند آگئی۔ میں سوتے میں یہ خواب دیکھنے لگی کہ تمام میرے اور ان کے رشتہ دار میرے گھر مل جمع ہیں۔ سب مجھ کو لعنت ملامت کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا کہ ایسی بیوی کو جان سے مار دینا چاہئے۔ کوئی کہتا کہ اس بے شرم کو شرم بھی نہ آئی۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے یہ کرتوت۔ کوئی کہتا ایسی بے شرم کو تو کنوئیں میں ڈوب مرنا چاہئے۔ کوئی کہتا کہ ایسی بے عصمت بیوی کو دیوار میں چنوا دینا چاہئے۔ میرے ابا مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تو جا کر ڈوب کیوں نہ گئی۔ جو ننگ خاندان بنی۔ اب میں اس بڑھاپے میں کیسے اپنا منہ دکھا سکوں گا۔ میری ماں کہہ رہی تھیں کہ بیٹی تجھے اسدن کو موت کیوں نہ آگئی۔ یا تو نے میری کوکھ سے جنم ہی نہ لیا ہوتا۔ یا مجھے اسدن کو موت آجاتی تو آج کا یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ میرے بھائی بہت کہہ رہے تھے کہ بہن آخر تم نے ایسی کونسی خطا کی تھی جس کا تم نے یہ صلہ ہمیں دیا۔ اور یوں ہمیں بدنامی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ خطا کی تھی بالنے امال نے، پھر تم نے ہماری عزت کا کیوں خون کیا۔ لو بو، چپ کیوں ہو۔ کاش تم ہماری بہن نہ ہوتیں۔ یا ہم تمہارے بھائی نہ ہوتے اس خواب کے دیکھتے ہی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ صبح کے تقریباً سات بج چکے تھے۔ میرا خواب میرے دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ جو کچھ اس خواب کی تعبیر میری سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ مجھے اس دنیا کو ہی چھوڑ دینا چاہئے۔ تاکہ میرے غموں کا سمندر خشک ہوجائے اور اس دنیا کو چھوڑ دینے کا سب سے آسان طریقہ خودکشی۔ ہاں خودکشی۔ تم کہو گی کہ میں بزدل ہوں جو خودکشی کر رہی ہوں۔ میرے گناہ نہیں بخشے جائیں گے۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ سب کچھ سمجھتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ دنیا کے لوگ مجھ پر کیا کیا قیاس آرائیاں کرینگے۔ باوجود سب کچھ سمجھتے ہوئے میں پھر بھی ایسا کر رہی ہوں کیونکہ میرا یہ رنگین راستہ میرے سکون کا رہبر اور میرے لئے میرا سب سے بڑا ہمدرد، غمگسار، مونس اور مہربان ہے اب مجھے یہ دنیا بالکل تلخ معلوم ہو رہی ہے بالکل تلخ، ایسی تلخ کہ اس کی تلخیاں میرے دماغ کو پارہ پارہ کر رہی ہیں۔

قدرت بھی یہی چاہتی ہے کہ میں اس غم بھری دنیا کو چھوڑ کر ابدی سکون کی دنیا کی طرف روانہ ہوجاؤں۔ رات کو خواب میں مجھے فلانے نے یہ پیغام سنایا۔ اور اب سڑک پر کوئی آدمی گاتا ہوا جا رہا ہے ؎

اتنی مدت سے کسی کا عشق پنہاں دل میں تھا
اب سر بازار میرے راز کی تشہیر ہے

اور مجھے ابدی دنیا تک پہنچانے والی یہ گاڑی۔ یہ بندوق جو میرے سامنے بکس میں رکھی ہے جس نے سینکڑوں جانوں

باقی برصفحہ ۵۴

شعرائے مست قلندر

نظم — از جناب [illegible]

آؤ نا؟ دو جہاں یہ تمہارے ہیں منتظر
ذرے زمیں کے عرش کے تارے ہیں منتظر

تمکو خبر نہیں مگر کہ تمہارے ہی صبح و شام
گلشن کے گلبدوش نظارے ہیں منتظر

جرأت سنبھالنے کی نہیں جن میں تم بغیر
سن لو کہ عشق کے وہ سہارے ہیں منتظر

بیٹھی ہی اک نگاہِ محبت فریب کے
الفت بھری نظر کے اشارے ہیں منتظر

اپنا سمجھ کے کی ہیں بلانے کی جرأتیں
آؤ تصورات ہمارے ہیں منتظر

ہے حسن و عاشقی کے تصادم کی آرزو
سب اہلِ بزمِ شوق بیچارے ہیں منتظر

در کو ہیں اہلِ درد کی آنکھیں لگی ہوئیں
یعنی بساطِ شوق کے ہارے ہیں منتظر

دامن ہے چاک چاک گریباں ہی چاک چاک
یہ دو جنوں نواز نظارے ہیں منتظر

کچھ انتظار میں ہیں شکارِ نگاہِ قہر
کچھ حسنِ التفات کے مارے ہیں منتظر

اشکوں کو چاہئے مرے اک دامنِ حسیں
گرتے ہوئے یہ غم کے ستارے ہیں منتظر

یکتا ہے اپنی اپنی جگہ حسن و عاشقی
تم ان کے منتظر وہ تمہارے ہیں منتظر

غزل — از جناب [illegible]

سینہ سپر کئے ہوئے تیر پہ تیر کھائے جا
لذتِ دردِ عشق کو قسمتِ دل بنائے جا

کوہِ ستم گرائے جا حشر پہ حشر ڈھائے جا
عرصہ امتحاں میں تو شوق سے آزمائے جا

ایک اداے خاص سے دیکھ کے مسکرائے جا
خرمنِ ضبط و ہوش پر برقِ نظر گرائے جا

سارے جہاں کے رنج و غم غرقِ شرابِ ناب کر
پیرہنِ شکیب کی دھجیاں تو اڑائے جا

کاش نگاہِ التفات کر دے جہاں سے بے نیاز
مستِ نظر کی خیر ہو مستِ نظر بنائے جا

راہِ دیارِ دوست میں لئے ثباتِ شرط ہے
ٹھوکریں ہر قدم پہ کھا اور قدم بڑھائے جا

در خورِ التفات ہے قسمتِ نارسا مری
ایک نگاہِ ناز سے بگڑی ہوئی بنائے جا

کوئی مرے کوئی جئے تجھ کو سہی کیا غرض
ابروئے جانستاں کی خیر تیرِ نظر چلائے جا

سنگِ درِ حبیب پر کر دے سرِ نیاز خم
دادِ عبودیت کی لے اپنی خودی مٹائے جا

صبا خوشنوا ابھی نام خدا جوان ہے
عشق کا ساز چھیڑ کر گیت یہ گیت گائے جا

غزل — از جناب نیّر [illegible]

زندگی کی آخری منزل سکونِ انجام ہے
ان کو کر دینا خبر کوئی کہ اب آرام ہے

یہ جوانی اور بڑھاپا زندگی کے دو نقوش
ایک تصویرِ سحر ہے ایک عکسِ شام ہے

دیکھنے والی نگاہیں دیکھ لیتی ہیں اُسے
تھا ہمیشہ اس کا جلوہ عام اب بھی عام ہے

جو نگاہوں سے ہی پنہاں اور خرد سے دور ہے
دل کو اسکی جستجو ہے لب پہ اس کا نام ہے

داستانِ شمع و پروانہ کی یہ یکسانیت
ایک ہی آغاز تھا اور ایک ہی انجام ہے

موت بھی انسان کو دی زندگی کے ساتھ ساتھ
کیا بتاؤں میں کہ یہ کتنا بڑا انعام ہے

روک لے نیّر قلم زورِ سخن دکھلا چکا
اس زمیں میں اور ایسے شعر نیّر کا کام ہے

[illegible]

عاشقی باعثِ آلام ہوئی جاتی ہے
زندگی موت کا پیغام ہوئی جاتی ہے

میری جانب کبھی اٹھتی ہی نہیں چشمِ کرم
کوششِ آرزو ناکام ہوئی جاتی ہے

وائے قسمت کہ ابھی دور ہے منزل میری
پاؤں اٹھتے ہی نہیں شام ہوئی جاتی ہے

گامِ اوّل ہی سے آتی ہے ندائے منزل
ابتدا حاصلِ انجام ہوئی جاتی ہے

جُرمِ الفت کا سزاوار دلِ زار بھی ہے
چشم کیوں موردِ الزام ہوئی جاتی ہے

(از جناب [illegible])

غزل

مل گیا ہے سعیِ پیہم سے مرا حاصل مجھے
ہر قدم ہے عشق میں اب آخری منزل مجھے

اضطرابِ دل بھی حاصل شوقِ سجدہ بھی نصیب
تم ملے گیا ۔ مل گیا کونین کا حاصل مجھے

ساری دنیا تلملا کر ہاتھ ملتی رہ گئی !
جب ملا روزِ ازل الفت زدہ اک دل مجھے

گامزن ہوں تیری امیدوں کا دامن تھام کر
کچھ نہیں خوف و ہراسِ دوریِ منزل مجھے

جذب کر لوں تیرے جلووں کو نگاہِ شوق میں
تیرے صدقے کر عطا وہ جذبۂ کامل مجھے

میں تو تیری بزم کے آداب کا رکھوں خیال
ہوش میں رہنے بھی دے جو بیخودیِ دل مجھے

راہ کی دشواریوں کا ڈر نہیں ارمان اب
مل گیا تقدیر سے اک ماہرِ منزل مجھے

(از جناب [illegible] ارمان [illegible] قادری)

"طالب علم کی ڈائری"

از جناب شیخ محمد یحییٰ

۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء

کالج میں چھٹی تھی۔ دن بھر پڑھتا رہا۔ رات کو سینما گیا۔ تماشہ خوب تھا۔ پیہم ناکامیوں کے بعد بھی امتحان دے رہا ہوں۔ متواتر تین سال فیل ہوتا رہا۔ مگر بھائی امید پر دنیا قائم ہے۔ کوئی بہت بڑا آدمی تو ہوں نہیں کہ پڑھنا چھوڑ کر گھر بیٹھ رہوں اور مزے سے عمدہ عمدہ غذائیں کھایا کروں یا سوسائٹی کے ساتھ میں بھی کلب گھر یا ناچ گھر جایا کروں۔ والد آئے تھے بہت بزرگانہ نصیحت کر کے گئے ہیں۔ کل صبح امتحان ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ نمازیں پڑھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں۔ شاید اللہ کو رحم آجائے۔ امید تو اچھی ہے آگے میری قسمت ہے۔

۳۰ مارچ

وہی ہوا جو قسمت میں تھا۔ حساب کا پرچہ پھر خراب ہو گیا۔ پتہ نہیں حساب مسلمانوں سے کیوں دور بھاگتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلمان گوشت بہت کھاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا دماغ کند ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں تو پھر انگریزوں کو خدا نے اتنی عقل کہاں سے دی ہے حالانکہ سب سے زیادہ گوشت وہی کھاتے ہیں۔ خیر مجھے اس سے بحث نہیں۔

۷ جون

فیل ہو گیا۔ دل گھبرا رہا ہے کیا کروں۔ دوست چٹکیاں لیتے ہیں۔ گھر والے بلاتے ہیں مگر کس منہ سے گھر جاؤں۔ اُف کئی برس سے فیل ہو رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے خودکشی کر لوں۔ میاں صادق کے ایک دوست نے کل خودکشی کر لی۔ شاید بیچارہ میرا ہی جیسا ہوگا۔ صادق کہنے لگا۔ خودکشی دیوانگی ہے یا بے اختیاری و بزدلی۔ میں نے کہا۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ خودکشی دیوانگی کا ایک مظاہرہ ہے تو یقیناً وہ ایک بہت بڑا کام ہے ــــ ہر بڑا کام دیوانگی کی حالت میں انجام پاتا ہے۔ اپنی جان دینا بہادری۔ عالی حوصلگی۔ خودمختاری اور آزادی کا سب سے بڑا مظاہرہ ہے۔ انسان کی زندگی کا سب سے اعلیٰ تخیل آزادی کا تخیل ہے۔ صادق خاموشی سے سنتا رہا۔

یکم جولائی

خوب نہاتا رہا۔ کئی گھنٹوں تک عمدہ لباس پہنا ہے۔ موت کی طرف دل کھنچ رہا ہے۔ آج ضرور خودکشی کرونگا۔ اگر دنیا کے کسی کام میں کامیاب نہیں ہوا تو کیا مر بھی نہیں سکتا۔ زہر کی شیشی میز پر رکھی ہے۔ کتنا خوبصورت رنگ ہے نیلا ــــ بالکل نیلا۔ اس کے چند قطرے انسان کو زندگی کی کشمکش سے نجات دلا دیتے ہیں۔ بہت دنوں سے نماز نہیں پڑھی ہے۔ سچے دل سے ایک مرتبہ کی پڑھی ہوئی نماز زندگی بھر کی قضا نمازوں کا کفارہ پورا کر سکتی ہے۔ زہر گلاس میں انڈیل لیا ہے۔ موت کے خوشناک فرشتے نظر آ رہے ہیں۔ کمرے کی کھڑکی کھول دی ہے۔ ذرا ایک نگاہ پھر اسلامیہ کالج کو دیکھ لوں۔ دنیا کی چیزیں انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور موت اپنی طرف، آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں مگر یہ میری بزدلی ہے۔ میں نے جلدی سے گلاس اُٹھا لیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی کشش موت پر غالب آ جائے۔ گلاس اُٹھایا ہی تھا کہ کمبخت اچھن کسی ضرورت سے اندر آ گیا۔ آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس نے فوراً گلاس پر ہاتھ مار کر گرا دیا۔ میں نے بچی کو بہت برا بھلا کہا اور گالیاں بھی دیں آخر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔

۷ جولائی

اسلامیہ ہوسٹل سے بھاگ آیا ہوں کہاں جاؤنگا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ مگر ارادہ تو بمبئی جانے کا ہے۔ آج شام کی گاڑی سے بمبئی چلا جاؤنگا۔ ایک ماہ بمبئی کی سیر کرتا رہا۔ چند پرچوں پر وہاں کے مشاہدات لکھ لئے تھے۔ خدا جانے وہ پرچے کہاں پھینک دئے۔ تھکا تھکا گھر آیا ہوں۔ سوچتا جاتا ہوں اور لکھتا جاتا ہوں۔ بہت سی باتیں یاد نہ رہیں۔ شراب خوب پیتا ہوں۔ پی کر کچھ بھی یاد نہیں رہتا کہ زمانہ کی کتنی سختیاں مجھ پر گزری ہیں۔ شب بھر جاگتا رہا۔ ناچ دیکھتا رہا۔ یاروں کی محفل میں اگر نہ پئے تو عیش گونگا اور بہرا ہو جاتا ہے مجھے ہر وہ بات جس کا

تعلق عورت سے ہو عموماً یاد رہتی ہیں بمبئی کی سیر زیادہ تر طالب علمانہ تھی یعنی "فن کے متعلق" معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ حسن کی ادنیٰ دکانوں پر اور عامیانہ بازاروں میں۔ ان گلی کوچوں میں جہاں "شرفا" دن کے وقت نہیں جاتے اور رات کو جانے میں حرج نہیں خیال کرتے دیکھتا رہا ہر جگہ عورت کی فطرت کا مطالعہ پر لطف بھی ہو سکتا ہے اور عبرت انگیز بھی مجھے لطف سے کام ہے۔ عبرت کی آنکھ بند رکھتا ہوں۔ بمبئی کے بے حجاب طبقہ کی زندگی کا فلسفہ میرے لئے عجیب تھا۔ پہلی دفعہ یہ تماشا میں نے دیکھا کہ سر بازار پکارا گیا ہوں۔ ہندوستان کی عورت مرد کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتی ہے مگر بمبئی کی یہ بین الاقوامی آبادی مردانہ وار آگے بڑھ کر مرد کو روکتی ہے "کدھر چلے" "ادھر آؤ" فضولیات اور تمہیدات کو وہاں دخل نہیں۔ سودا خریدیئے اور جایئے۔ ایک دن ذرا ایک پڑھی لکھی چھوکری مل گئی۔ اس نے بھی وہی "کاروباری" انداز اختیار کیا تو میں نے کہا مس صاحبہ مجھے آپکی یہ تاجرانہ ذہنیت پسند نہیں۔ مرد وعورت کی یکجائی کا لطف مزے مزے کی باتوں اور دلچسپ گفت و شنید میں ہے۔ جسم کی کشش تو تعیش کا ایک جزو ہے یہ نہیں کہ نانبائی کی دکان پر دو خمیری روٹیاں جس طرح بنا حلق سے اتار لیں دو گھونٹ پانی پیا اور دانت کریدتے ہوئے چل نکلے۔ چھوکری بگڑ گئی کہنے لگی۔ تم انسان نما حیوانوں کا جو کچھ مذاق ہے اسی کے مطابق ہم لوگ اپنی دکان لگاتے ہیں۔ ذرا ایکدن میرے گھر بیٹھ کر تماشہ دیکھو کیسے کیسے لوگ یہاں آتے ہیں۔ میں اگر کبھی بھول کر دو باتیں بھی کر لیتی ہوں تو وہ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں گھبرا کر بھاگتے ہیں۔ تم "مجلس آرائی" کی توقع کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ میرے خریدار اس طرح میرے پاس آتے ہیں گویا سگریٹ کی ایک ڈبیہ خریدنے آئے تھے۔

۲۲ ستمبر

مس صاحبہ بہت خفا ہوئیں اور شہر سے چلی گئیں۔ جائیں خوشی سے جائیں۔ مجھے کیا بہت سی دکانیں شہر میں ہیں۔ ایک ہی چیز کو بار بار دیکھنے سے دل اکتا جاتا ہے اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ مس صاحبہ جا رہی تھیں تو میں جہاز کا ٹکٹ دلوا کر حج کو روانہ کرا دیتا۔ زندگی نام ہے حرارت کا جب تک جسم میں حرارت ہو اسے کیوں ضائع کیا جائے۔ میرے دوستوں میں سے ایک صاحب مولویانہ "نصیحت" کیا کرتے ہیں جہنم کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ شراب کو حرام کہتے ہیں کمبخت نے کبھی چکھی ہو تو مزا جانے۔ تنگ آگیا ہوں اس جبر و قہر سے۔ اس ذلیل محکومیت سے میں کسی کا محکوم نہیں۔ صرف حسن ازل کا غلام ہوں۔

۲۸ دسمبر

شراب پیتے پیتے قوت جسمانی فنا ہونے لگی ہے۔ حافظہ کمزور ہونے لگا ہے مگر ہوس اب بھی باقی ہے۔ سونے کو دیکھ کر کس کی نیت خراب نہیں ہوتی۔ وہی حال میرا بھی ہے۔ جب کوئی "تازہ کلی" نظر آتی ہے۔ دل کا بُرا حال ہونے لگتا ہے میں نے یہ حرکت کیوں اختیار کی؟ اگر آپ مجھ جیسے ہیں تو فوراً معلوم کر لینگے ورنہ میں خود ہی بتائے دیتا ہوں۔ دنیا میں مبہم ناکامیوں کی وجہ سے میں نے یہ حرکت اختیار کی۔ گناہ کی بھاری زنجیریں کی بھاری زنجیریں میرے پاؤں کو جکڑے ہوئے ہیں۔ میری زندگی ضرور میرے لئے وبال ہوتی۔ اگر گناہ کے ہنگامے میرا ساتھ نہ دیتے۔ "عذاب وثواب" میرے لئے بے معنی الفاظ ہیں۔ آج خوب پی لی ہے۔ قمار خانے میں گیا۔ جو کچھ جیب میں تھا ہار گیا ہوں۔ جب حسن و عشق کی الجھنوں سے گھبرا جاتا ہوں۔ زندگی کی کشمکش سے اکتا جاتا ہوں۔ اخلاق وقانون کی پابندیوں سے دل میں نفرت پیدا ہونے لگتی ہے تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگتا ہوں دور بہت دور ویرانے میں، قبرستان میں۔ وہاں دل کو راحت ہوتی ہے۔ مزاروں کے کتبے پڑھتا ہوں۔ بعض دفعہ آنسو نکل آتے ہیں۔

۲ جنوری

حسین عورت کی محبت دل ودماغ اور جسم کے تمام قویٰ کو متاثر وماؤف اور مجبور کر دیتی ہے۔ مگر معدہ اور آنتیں اپنا کام آزادی سے کرتی رہتی ہیں عشق کا کتنا ہی شدید حملہ کیوں نہ ہو مگر بھوک ضرور لگتی ہے۔ مفلس ہو گیا ہوں۔ سر چھپانے کو کہیں ٹھکانہ نہیں۔ شب کسی پیڑ کے سایے میں بسر کرتا ہوں۔ اب کیا کروں۔ پیٹ کمانے پر مجبور کر رہا ہے مگر نوکری نہیں ملتی آج فوج کا فارم بھر رہا ہوں لیکن آج ہی میرے ایک بہت عزیز اور پرانے دوست سے ملاقات ہوئی۔ اسلامیہ کالج کا ریسرچ اسکالر ہے اس نے واقعات پوچھے۔ میری ناکامیوں پر بہت رنجیدہ ہوا۔ اپنے ساتھ گھر واپس لایا ہے۔ پڑھنے پر پھر مجبور کر رہا ہے

باقی بر صفحہ ۸۲

مستی و قلندری

از جناب مرزا حاجی بغلول صاحب

آج کل انگلستان کی دوشیزائیں چند روزہ "کورٹ شپ" کے بعد دھڑا دھڑ فوجی سپاہیوں سے شادیاں کر رہی ہیں جس پر وہاں کے خدائی فوجدار یعنی بڑے پادری صاحبان بہت فکرمند ہو رہے ہیں چنانچہ ایک پادری صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"بہت سی دوشیزائیں محض چند روزہ کی راہ و رسم کے بعد فوجی سپاہیوں سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ جس سے ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ انہیں جلد ہی شادی کا بھتہ ملنے لگے۔"

اس صورت حال سے متاثر ہو کر حضرت پادری صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ دوران جنگ میں "کورٹ شپ" کے "عمل خیر" کو فرض قرار دیدیا جائے۔ اور جب تک کوئی "کنوارا جوڑا" کم از کم تین مہینے کی کورٹ شپ کا حلفنامہ پیش نہ کرے اسے شادی کی اجازت نہ دی جائے۔

دوسرے بڑے بڑے بشپ صاحبان اس مقدس رائے کے حامی ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر رواروی کی اس شادی کو روکا نہ گیا تو اختتام جنگ کے بعد طلاقوں کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ اور معاشرتی زندگی میں ایک ہلچل پیدا ہو جائیگی۔

ایک بزرگ جن کا اسم گرامی بشپ ڈاکٹر ڈوڈ ہے، ارشاد فرماتے ہیں کہ اندریں شک نیست کہ آج کل جس طرح کی شادیاں ہو رہی ہیں وہ بعید افسوسناک ہیں لیکن نوجوان مردوں اور کنواری لڑکیوں سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ حلفنامے کی اہمیت کو ملحوظ رکھینگے۔

ایک پادری صاحب بڑی متانت و سنجیدگی سے سر اقدس کو جنبش دے دیکر فرماتے ہیں کہ ہاں یہ تو درست ہے کہ کوئی نہ کوئی صورت تو اختیار کرنی ہی چاہیئے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر نوجوان اور دوشیزائیں اپنے شہری حقوق کے اندر رہ کر شادی کرنی چاہینگے تو ان کو کس بنیاد پر روکا جا سکے گا۔

یہ تو تھے حضرات پادری صاحبان کے ارشادات و فرمودات اب خاکسار مدیر مستی و قلندری کے معروضات بھی سن لیجئے۔ پادری صاحبان محض اس وجہ سے ان شادیوں کو روکنا چاہتے ہیں کہ یہ شادیاں لمبی کورٹ شپ کے بغیر رواروی میں ہو رہی ہیں اسلئے دیرپا نہ ہونگی اور جنگ کے بعد طلاقوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوگا لیکن پادری صاحبان یہ بھی تو خیال فرمائیں کہ جنگ کے باعث لمبی کورٹ شپوں کا موقع کہاں ہے؟ اب رہی اختتام جنگ کے بعد طلاقوں کی بھرمار تو اس میں مضائقہ ہی کون سا ہے؟ جس کثرت سے طلاقیں ہونگی اسی زیادتی کے ساتھ شادیاں بھی ہونگی پھر نقصان کون سا ہوا؟

مجھے امید ہے کہ پادری صاحبان دوشیزاؤں اور نوجوانوں کو کم از کم زمانہ جنگ میں طویل کورٹ شپ کا اڑنگا لگا کر انکی خانہ آبادیوں میں خلل انداز نہ ہونگے۔

~~~~~~~~

نیویارک کے ایک اخبار میں ہالی ووڈ کی ایک رومانی جنگ کی رپورٹ شائع ہوئی ہے جو مستی و قلندری کا ایک دلچسپ نمونہ ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دوشیزہ گلوریا بلٹ اور اس کے ہونے والے شوہر پیٹ ڈلیسو نے اپنی ہونے والی شادی کی خوشی میں ہالی ووڈ کے ایک "نائٹ کلب" میں دعوت کی جسکی صورت یہ تھی کہ گلوریا بلٹ نے کنواری لڑکیوں کو علیحدہ مدعو کیا اور پیٹ ڈلیسو نے کنوارے مردوں کو الگ دعوت دی۔

دعوت کی یہ دونوں صحبتیں الگ الگ گرم ہوئیں لیکن کچھ نوجوانوں کو مستی و قلندری سوجھی اور انہوں نے زبردستی دوشیزاؤں کی دعوت میں شریک ہونا چاہا۔ اس پر بعض نوجوانوں نے اعتراض کیا نتیجہ یہ کہ باتوں ہی باتوں میں نائٹ کلب رشک جرمن میدان جنگ بن گیا۔ اسلحے کی جگہ گھونسے اور کھانے کے برتن کام کرنے لگے۔ کئی نوجوان زخمی ہوئے۔ ایک فلم ایکٹر کو کافی چوٹ آئی۔ گلوریا بلٹ ایک میز پر کھڑی اس رومانی جنگ و پیکار کا تماشا دیکھتی رہی اور پیٹ ڈلیسو اسکی نگرانی اور حفاظت کرتا رہا۔

~~~~~~~~

ہندوستان اپنے اختلافات کیلئے بہت بدنام ہے لیکن حامیان اتحاد قابل مبارکباد

ہیں کہ ان کی کوششوں سے یہاں مردوں اور عورتوں کا اختلاف دور ہو رہا ہے۔ مخلوط تعلیم گاہیں قائم ہو رہی ہیں مخلوط کلبوں کا قیام عمل میں آ رہا ہے مخلوط انجمنیں اور سوسائٹیاں بن رہی ہیں۔ اور مخلوط دعوتیں بھی ہو رہی ہیں۔ چنانچہ اگر ہندوستان میں کوئی گلوریا بابٹ اور بیبٹ ڈلسو کو اپنی شادی کی خوشی میں کنواروں اور کنوارنوں کو مدعو کرنا چاہیں تو یہاں کسی طرح کی تفریق و علیحدگی کی ضرورت محسوس نہ ہو گی جو گھونسے بازی اور ظروف رانی کا باعث ہو۔

~~~~~~~~

دار الحکومت امریکہ واشنگٹن میں ایک لیڈی ڈاکٹر صاحبہ ہیں جن کا اسم گرامی لارئیا کروس ہے۔ جب سے انہوں نے لیڈی ڈاکٹر کا کام شروع کیا ہے ۴ ہزار ۲ سو ۸۴ بچے پیدا کرا چکی ہیں۔ یہ چالیس سال سے اس کام کو کر رہی ہیں اس درمیان میں جتنے بچے پیدا ہوئے وہ سب زندہ ہیں اس اجمال کے بعد قدرے تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ موصوفہ اب تک ۹۴ جڑوان بچے پیدا کر چکی ہیں اور تین ایسی عورتوں کے بچے جنوا چکی ہیں جنھیں ایک جھول میں تین تین بچے پیدا ہوئے۔ انہوں نے اب تک جتنے بچے پیدا کرائے ہیں ان میں سب سے ہلکا بچہ ڈیڑھ سیر کا ہے اور سب سے موٹا تازہ چھ سیر کا۔

ان لیڈی صاحبہ کے بارے میں سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ خود تو چالیس برس سے شہر بھر کی عورتوں سے بچے جنوا رہی ہیں اور آپ نے خود اب شادی کی ہے۔ اگر انہوں نے بیس برس کی عمر میں بھی یہ پیشہ شروع کیا ہوگا تو اب وہ ساٹھ سال کی کنواری ہونگی۔ کہا جاتا ہے کہ کھانا پکانے والے کی خواہش کھانے کی خوشبو اور اسکے دیکھنے ہی سے مر جاتی ہے شاید اسی طرح ان لیڈی صاحبہ کی بچہ جننے کی خواہش بچہ جنواتے جنواتے کم ہو گئی تھی۔
~~~~~~~~

سائنس کی دُنیا

لوہا کس طرح تیار کیا جاتا ہے؟

موجودہ زمانے کو "لوہے کا زمانہ" کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں مغربی ملکوں نے سائنس کے ذریعہ لوہے کی تجارت میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔

سائنٹفک طور پر لوہے کو صاف کرنے کیلئے پہلے خام لوہے سے مٹی وغیرہ کو صاف کیا جاتا ہے۔ پھر اس میں سے گندھک کاربن فاسفورس وغیرہ کو الگ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس خالص لوہے میں مقررہ مقدار سے کاربن ملایا جاتا ہے تاکہ نرم یا لچکدار یا سخت لوہا تیار کیا جاسکے۔ کان کے کچے لوہے کو بھٹی میں ڈالنے سے پہلے کھلی بھٹی میں ڈال کر اسے خوب الٹ پلٹا جاتا ہے تاکہ گندھک، کاربونک ایسڈ اور نمی دور ہوجائے۔ اس کے بعد اس کچے لوہے میں فاسفورس، کاربن، اور آکسیجن یا بالورہ جاتا ہے۔ اب اسے "بلیسٹ فرنیس" نام کی بھٹی میں ڈالتے ہیں۔ یہ بھٹی قدیم دھونکنی والی بھٹی کی دوسری صورت ہے۔ اس اکیسو فٹ اونچی چمنی دار بھٹی کے چاروں طرف لوہے کی مضبوط چادریں منڈھی رہتی ہیں اور اندر ایسی اینٹیں لگی رہتی ہیں جو سخت آنچ سے بھی نہ پگھل سکیں، بھٹی کا منہ پندرہ فٹ چوڑا رہتا ہے۔ چمنی کے اوپر کے حصہ میں باہر کی طرف اس کے منہ پر ایک گوشہ دار ڈھکن سا لگا رہتا ہے۔ کچا لوہا اسی ڈھکن پر رکھا جاتا ہے۔ مشین کے ذریعے ڈھکن کو کچھ نیچے کرتے ہی لوہا بھٹی میں گر جاتا ہے۔

کوک اور چونے کا پتھر لوہے کے ساتھ بھٹی میں ڈالا جاتا ہے۔ ایک ٹن لوہے کیلئے آدھ ٹن کوک اور تقریباً سات من چونے کا پتھر صرف ہوتا ہے۔ بھٹی کے اندر جگہ بجگہ سوراخ بنے رہتے ہیں۔ انہیں سوراخ کے راستے گرم ہوا اور "کول گیس" داخل کی جاتی ہے۔ یہ تمام پائپ ایک بڑے پائپ سے ملے رہتے ہیں۔ یہ بھٹیاں مسلسل کئی سال تک جلتی رہتی ہیں۔ اگر کبھی بجھ جائیں تو انہیں پھر سے گرم کرنے میں کافی ایندھن خرچ ہو جائے۔ رات اور دن میں پانچ پانچ چار چار گھنٹوں کے بعد لوہا کوک اور چونے کا پتھر ان میں ڈالا جاتا ہے۔ تیز آنچ میں پگھل کر بالو اور لوہے کا میل چونے کے پتھر میں گھل جاتا ہے اور ایک سیال شئے کی طرح لوہے کے اوپر تیرنے لگتا ہے۔ یہ "سلیگ" یا "دھات کا میل" کہلاتا ہے۔ ایک سو بارہ ڈگری درجہ حرارت میں پانی کھولنے لگتا ہے اور ان بھٹیوں کی حرارت تین ہزار ڈگری تک ہوتی ہے۔ چار چار پانچ پانچ گھنٹوں کے بعد بھٹی کے نیچے کے دو مہرے کھول دئے جاتے ہیں۔ اوپر کے مہرے سے سلیگ بہ کر باہر نکلتا ہے اور نیچے کے مہرے سے گرم پگھلا ہوا لوہا ان نالیوں میں بہ کر جمع ہوتا ہے جن میں بالو بچھا رہتا ہے۔ ٹھنڈے ہونے پر کالے لوہے کے ڈھیر ریچھ کے بچوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں اسلئے اسے "پگ آئرن" کہتے ہیں

ایک بڑی بلیسٹ فرنیس میں ۶۰۰ ٹن پگ آئرن روزانہ تیار ہوتا ہے۔ فرنیس کے اندر ہوا بھی گرم کرکے بھیجی جاتی ہے تاکہ ٹھنڈی ہوا کو گرم کرنے میں کافی آنچ فضول نہ چلی جائے۔ فرنیس سے گرم گیس پائپ کے ذریعہ باہر لائی جاتی ہے۔ جو ہوا یا بائلر کو گرم کرتی ہے۔ بائلر ہی کی طاقت سے ہوا کے جھونکے پیدا کرنے والی مشینیں چلتی ہیں۔ اس دگنی بچت کا سہرا اسکاٹ لینڈ کے ایک انجنیئر نلیس (۱۸۲۸ء) کو ہے۔

اس کے بعد پگ آئرن کو پھر کھلی بھٹیوں میں پگھلایا جاتا ہے۔ ان بھٹیوں میں جلتی ہوئی گیس کی لپٹیں سیدھی پگ آئرن کے اوپر پڑتی ہیں۔ مستری لوہے کی بڑی بڑی سلاخوں سے پگ آئرن کا میل دور کرنے کیلئے اسے ادھر ادھر ملٹتا رہتا ہے۔ اس میں سے آسمانی رنگ کی لپٹیں نکلتی ہیں۔ جب ان کا نکلنا بند ہوجاتا ہے تو مستری ۲۵۔۳۰ سیر لوہے کے لوندے کو اپنی سلاخوں کے سروں پر لپیٹ کر بھٹی سے باہر نکالتا ہے۔ پھر یہ تودہ مشین گن سے دبایا جاتا ہے۔ اس عمل سے فاسفورس، گندھک اور کاربن لوہے سے الگ ہوجاتے ہیں۔ اور خالص لوہا باقی رہ جاتا ہے جسے "راٹ آئرن" کہتے ہیں۔ اس میں قوت کشش بہت کافی ہوتی ہے۔ اس لوہے سے جہازوں کے لنگر، زنجیریں، چھڑ، قبضے، کیلیں، سائکل وغیرہ اشیاء تیار کی جاتی

ہیں۔ راٹ آئرن بہت نرم ہوتا ہے اس سے ہماری تمام ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس میں مناسب مقدار میں کاربن ملا کر اسے سخت اور مضبوط بنایا جاتا ہے ایسے لوہے کو "اسٹیل" یا فولاد کہتے ہیں اس میں ایک سے تین فی صدی کاربن ملا رہتا ہے۔ کاربن کی مقدار کے مطابق اس میں سختی آتی ہے۔ پگ آئرن کم آنچ میں پگھل جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں تین فیصدی کاربن رہتا ہے۔ یہ ڈھلائی کے کام کیلئے اچھا ہے لیکن اس کے ٹوٹنے کا خوف رہتا ہے۔ راٹ آئرن کم آنچ میں نہیں پگھلتا کیونکہ اس میں تھوڑا کاربن رہتا ہے۔ اسٹیل ان دونوں سے اچھا ہوتا ہے۔ اس میں ایک سے تین فی صدی تک کاربن رہتا ہے۔

فولاد بنانے کیلئے راٹ آئرن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک بکس جیسی بھٹی میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ لوہے کے ٹکڑوں کے درمیان لکڑی کے خالص کوئلے کی تہ ہوتی ہے۔ اس طرح متعدد تہیں کئی ہفتہ آنچ میں پڑی رہتی ہیں۔ اور کاربن درمیان میں داخل ہو جاتا ہے۔ لوہے پر چھالے سے پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے اسے "بلسٹر اسٹیل" کہتے ہیں۔ اس طریقہ میں یہ خرابی ہے کہ اسٹیل میں برابر کاربن نہیں شامل ہو سکتا۔ اسی خرابی کو دور کرنے کیلئے ۱۷۴۰ء میں شیفیلڈ کے ایک چالاک مستری نے ریزر، گھڑی، چاقو اور تیز دھار کے ہتھیار بنانے کے مقصد سے اعلیٰ فولاد تیار کرنے کی ترکیب نکالی۔ اس نے بلسٹر اسٹیل کے ٹکڑوں کو چینی مٹی کے ڈھکن دار پیالوں (کروسبل) میں بھر کر تیز آنچ میں رکھا۔ پگھلے لوہے میں برابر کاربن مل گیا۔ اور بہترین فولاد "کروسبل اسٹیل" تیار ہو گیا۔ لیکن اس طریقہ سے فولاد تیار کرنے میں سرمایہ کے علاوہ کافی وقت خرچ ہوتا ہے۔

"بیسیمر کنورٹر" کے ذریعہ سستے فولاد کے بنانے سے لوہے کے کاروبار میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس ایجاد کا سہرا ایک انگریز مستری ہنری بیسیمر کو ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر پگ آئرن میں سے اشیاء کو علیحدہ کیا جا سکے تو بڑی آسانی سے فولاد مل جائے۔ چنانچہ اس نے ایک گلاس نما بھٹی بنائی۔ اس کے پیندے پر پانچ سوراخ کئے جن سے تیز ہوا کے جھونکے آ سکیں۔ پگھلے ہوئے پگ آئرن کے ڈالتے ہی اس میں سے زرد اور آسمانی رنگ کی لپٹیں نکلنے لگیں۔ ہوا اور گرم کاربن خود جلنے لگا۔ کاربن جلنے ہی سے بھٹی میں تیز آنچ ہو گئی۔ جب لپٹیں جلنی بند ہو گئیں تو لوہا باہر نکالا گیا۔ اور کچھ ہی منٹوں میں کئی ٹن پگ آئرن فولاد میں تبدیل ہو گیا۔

موجودہ بیسیمر کنورٹر کی شکل انڈے نما ٹیڑھی بوتل کی سی ہے۔ کنورٹر کے باہر لوہے کے پتے منڈھے رہتے ہیں اور اندر پکی اینٹیں جڑی رہتی ہیں۔ اس کی چوڑائی دس فٹ اور اونچائی ۲۰ فٹ ہوتی ہے۔ اس میں ایکبار ۳۰ ٹن تک پگ آئرن ڈالا جا سکتا ہے۔ پیندے میں بہت سے سوراخ بنے رہتے ہیں جن سے کنورٹر میں ہوا جاتی ہے۔ ہوا کے جھونکے کے داخل ہوتے ہی ایک بلند آواز ہوتی ہے۔ اور زرد اور آسمانی شعاعیں نکلنے لگتی ہیں۔ کاربن کے جلتے ہی ہوا کے جھونکے بند کر دئے جاتے ہیں۔ اور کافی مقدار میں کنورٹر میں کاربن ڈال دیا جاتا ہے یہ لوہا سرد ہوتے ہی فولاد بن جاتا ہے۔ مشینوں کے ذریعہ کنورٹر کو ٹیڑھا کر کے پگھلے ہوئے لوہے کو بڑے بالٹوں (لیڈلوں) میں ڈالا جاتا ہے۔ جو کرین نامی مشین سے اٹھائے جاتے ہیں۔ ہندوستان، امریکہ اور جرمنی جہاں کچے لوہے میں فاسفورس اور گندھک کم ہوتے بیسیمر کنورٹر کام میں آتے ہیں لیکن انگلینڈ میں جہاں کچے لوہے میں فاسفورس اور گندھک زیادہ ہوتے ہیں سر ولیم سی من کی کھلی بھٹیاں استعمال میں لاتے ہیں۔ ان بھٹیوں میں ہوا اور جلنے والی گیسیں بغل سے اندر جاتی ہیں اور پگ آئرن میں لپٹیں اوپر سے اور بغل سے چلتی ہیں پگ آئرن میں فولاد کے ٹکڑے بھی ڈال دئے جاتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں فاسفورس گندھک اور مٹی وغیرہ چیزیں سلیگ کی صورت میں اوپر سے باہر گر جاتی ہیں۔ پھر کاربن کی جانچ کر کے فولاد کو بڑے بڑے بالٹوں میں گرایا جاتا ہے۔ اس بھٹی میں ایک بار ۲۵۰ ٹن تک فولاد تیار کیا جا سکتا ہے بیسیمر کی پوری ترکیب ۱۵ منٹ میں ختم ہوتی ہے لیکن کھلی بھٹی میں ۹ سے ۱۰ گھنٹے تک لگ جاتے ہیں۔ عظیم الہیئت کرین مشین گرم فولاد کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو رولنگ مل میں لے جاتی ہے۔ رولروں کے درمیان گرم لوہے کے داخل کرنے سے چاروں طرف آگ کی چنگاریاں چھوٹتی ہیں دیکھتے ہی دیکھتے گرم لوہے کا بھاری تودہ بڑی بڑی چادروں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پاس کی دوسری مشینیں گرم لوہے کی ان چادروں اور گرڈروں کو آلو کی طرح آسانی سے کاٹ ڈالتی ہیں۔

خاص مست قلندر کے لئے

تازہ غیر مطبوعہ

ان آنکھوں سے!

از جناب یکتا حقانی امروہوی

شرابیں چھلکتی چلی آ رہی ہیں

ان آنکھوں سے جن سے محبت نمایاں — ان آنکھوں سے جن میں جوانی ہے رقصاں
ان آنکھوں سے جن میں اشارے ہیں پنہاں — ان آنکھوں سے جن میں ہے مستی غزلخواں

شرابیں چھلکتی چلی آ رہی ہیں

ان آنکھوں سے جن میں ہے پیغامِ اُلفت — ان آنکھوں سے جن میں بھری ہے محبّت
ان آنکھوں سے جن میں ہے حسنِ شرارت — ان آنکھوں سے جن میں کہ ہے حسنِ جنت

شرابیں چھلکتی چلی آ رہی ہیں

ان آنکھوں سے جن میں کہ ہے زندگانی — ان آنکھوں سے جن میں ہے رنگِ جوانی
ان آنکھوں سے جن میں ہے دل کی کہانی — ان آنکھوں سے جو ہیں محبت کی بانی

شرابیں چھلکتی چلی آ رہی ہیں

ان آنکھوں سے کرتی ہیں جو رقص پیہم — ان آنکھوں سے جن سے بہت دُور ہے غم
ان آنکھوں سے گرتی نہیں جن سے شبنم — ان آنکھوں سے جن پر فدا میرا عالم

شرابیں چھلکتی چلی آ رہی ہیں

ان آنکھوں سے جو ہیں منوّر منوّر — ان آنکھوں سے اب تک نہیں ہیں جو مضطر
ان آنکھوں سے میری نگاہیں ہیں جن پر — ان آنکھوں سے جن پہ فدا لاکھ ساغر

شرابیں چھلکتی چلی آ رہی ہیں

ان آنکھوں سے جن سے قیامت ہے پیدا — ان آنکھوں سے جو ہیں نظر کا سہارا
ان آنکھوں سے سودا ہُوا جن سے دل کا — ان آنکھوں سے یکتا ان آنکھوں سے یکتا

شرابیں چھلکتی چلی آ رہی ہیں

میں بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی

بعض کمزور عورتوں کیلئے اولاد پیدا کرنا خطرہ سے خالی نہیں

عورت میں یہ خواہش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ کسی بیماری کے باعث اتنی کمزور اور ناتوان ہوگئی ہو کہ بچہ کی پیدائش کی سخت مشکلات کا سامنا نہ کرسکے۔ یا بعض عورتیں اپنی مفلسی کی وجہ سے بھی زیادہ اولاد سے گھبراتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو چاہیئے کہ سائنس کی جدید ایجاد دوا "روہیل" سے فائدہ اٹھائیں۔

جب تک چاہو بچہ نہیں ہوگا دوا "روہیل" کے استعمال میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عورت جب تک چاہے اولاد سے محفوظ رہ سکتی ہے اور ماہواری ایام میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں پڑتی یعنی ماہواری بدستور ہر ماہ آتی رہیگی۔ دوا "روہیل" کی ایک شیشی میں اتنی مرتبہ استعمال کے لائق دوا ہوتی ہے اور اس کے استعمال کی صورت یہ ہے کہ عورت ...... سے دس منٹ پہلے ایک خوراک دوا "روہیل" کھالے تو پھر اسکے بعد ...... اس رات عورت کو "بچہ کی امید" نہیں ٹھہر سکتی۔ چنانچہ عورت جب تک ...... سے پہلے یہ دوا کھالیا کریگی۔ "امید" سے بچی رہیگی۔

جب چاہو بچے ہونے لگے اور جب عورت اس دوا کا استعمال ترک کردے گی۔ تو پھر جس طرح عام طور پر عورتوں کے ہاں بچہ ہوتا ہے۔ پھر اسکے ہاں بھی ہونے لگے گا۔ دوا کے استعمال سے عورت کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا جس عورت کو ضرورت ہو

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ پی بکس ۳۴ دہلی کو خط لکھ کر دوا "روہیل" کی شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگالے۔ ایک شیشی کی قیمت چار روپے آٹھ آنے ہے۔ پارسل پر گیارہ آنے محصول لگتا ہے۔ اسطرح گھر بیٹھے دوا پہونچ جائیگی۔

ایک افسانہ!

میری نعیمہ!

از
سید مجاہد حسین صاحب
کاظمی

نعیمہ مجھ سے پردہ کرتی تھی اور میں نے بغیر اس کو دیکھے اس کے ہاتھوں اپنی روح فروخت کردی تھی۔ واقعہ ہی ایسا ہوگیا تھا ـــــ ہم دونوں کے خاندانوں میں بڑے گہرے تعلقات تھے۔ میں اس کے باپ کو چچا کہا کرتا تھا اور کبھی کبھی یوں ہی اُن کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایک ضروری کام کیلئے اُن کے گھر گیا۔ اندر سے پان آگئے۔ اور معلوم ہوا کہ وہ کہیں باہر گئے ہیں آتے ہی ہونگے۔ میں ان کی راہ دیکھنے کیلئے ٹھہر گیا تھوڑی دیر بعد کسی نے بہت آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میری نظریں فوراً اُس طرف گئیں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا پھر کھٹکھٹایا گیا۔ میں اُٹھکر قریب گیا دروازہ جلدی سے بند ہوگیا جیسے کسی نے گھبراہٹ میں کیا ہو۔ میں نے آہستہ سے کہا "کون ہے؟" دروازہ پھر آہستہ سے کھلا اور ایک سہمی سی آواز آئی "آپ اتنے دن بعد کیوں آیا کرتے ہیں؟" میں سخت متحیر ہوا اور یکایک بولا "لیکن آپ کون ہیں؟" "میں... میں... نے ... نے ... نعیمہ" خوف اور گھبراہٹ میں اس نے جلدی سے کہا۔ "نعیمہ؟" میں نے تعجب میں دہرایا "بشیر صاحب کی صاحبزادی؟ لیکن میرے آنے نہ آنے سے آپ کو؟" وہ چند لمحوں کی خاموشی [...] بولی "کچھ... کچھ نہیں" اس کی آواز [...]یں نے اٹک اٹک کہنا شروع کیا جیسے الفاظ سے جنگ کررہی ہو "آپ.... جلدی جلدی... آیا.... کیجئے... میں پریشان ... ہونے لگتی... ہوں" یہ کہہ کر اس نے جلدی سے دروازہ بند کردیا اور چلی گئی۔ میں اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں میں نے محسوس کیا کہ بڑے زور سے آندھی آئی اور میرے تخیل کے تمام حسین محبوبوں کو توڑ گئی۔ پھر بارش شروع ہوئی۔ فضا نہایت حسین معلوم ہونے لگی۔ پھر میرے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایک پھول کھل گیا۔

نعیمہ کے حُسن کی شہرت میں نے سُنی تھی۔ وہ واقعی حسین تھی۔ اُسے دیکھ کر آنکھیں بے اختیارانہ مُسکرا پڑتیں۔ دل مسرت میں بلیوں اچھلنے لگتا آس پاس کی تمام اشیاء خوبصورت رنگوں میں رنگ جاتیں اور یہ محسوس ہوتا کہ ان سب میں کوئی پوشیدہ چیز مترنم اور رقصاں ہے۔

جب میں نے پہلی بار اسے اپنی منگیتر کی حیثیت سے دیکھا تو میری عجیب حالت ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ سامنے والی دیوار پر جلدی سے کود کر چڑھ جاؤں۔ خوب زور سے دوسرے کنارہ تک دوڑ لگاؤں۔ پھر جامن کے درخت پر جست لگاؤں اور ایک ایک ساری جامنیں توڑ ڈالوں۔ نیچے آکر ناچنا شروع کردوں۔ اچھی طرح دل کھول کر قہقہے لگاؤں سڑک پر بے تحاشا بھاگوں۔ راہ چلتے لوگوں کو چھیڑوں۔ کسی کی پگڑی اچھال دوں۔ کسی کا کرتا پھاڑ ڈالوں۔ پھر اپنے کمرے میں آکر اور ڈبے کی بچی ہوئی ساری سگرٹیں لگاتار پی جاؤں .... تیز شراب پی لینے کے بعد ایسی ہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ دماغ اپنا فعل بھول جاتا ہے اور دل آزاد ہوکر اپنی ساری خواہشیں پوری کرتا ہے۔ میں خوش تھا۔ بے حد خوش بالکل ایک چھوٹے بچے یا ایک پاگل کی طرح .... سامنے شفق پر مجھے میری حسین نعیمہ اور میرے رنگین شب و روز صاف دکھائی دے رہے تھے۔

میں اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور اس کا تصور میرے لئے شمع زندگی تھا اگر ایک لمحہ کیلئے بھی وہ میرے خیال سے جلی تو آفتاب سے منور فضا بھیانک رات میں تبدیل ہو جاتی ہماری محبت کی عمر ابھی کل ایک ہی برس کی تھی اور اس سے پیشتر ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے ہزاروں برس سے ساتھ رہتے چلے آئے ہیں نعیمہ کو اپنے حسن اور میری محبت دونوں کا پوری طرح احساس تھا اور اس پر میں فخر کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ یونہی کسی بات پر مجھ سے ناراض ہوگئی، بولی "چلیئے میں آپ سے نہیں بولتی اب میں چوڑیاں دکھانے آؤنگی، نہ اپنے ہاتھ سے پان لگاکر دونگی۔ اور نہ آپ کو دیکھنے آؤنگی" میں نے اس کو بڑے زور لپٹا کر پیار کرلیا۔ اس کی آنکھوں سے چمکتے ہوئے موتی ڈھلک آئے ـــــ مسرت کے آنسو ـــ

اس نے اپنا سر میرے شانوں پر ڈال دیا۔ کیسے خوبصورت تھے ہمارے دن۔ ایک ایک لمحہ مسرت میں گذرتا۔

لیکن... لیکن آہ! پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ جانے کے بعد نیچے اُترنا ہی ہوتا ہے۔ یہ ظالم آسمان کسی کو اس طرح نہیں دیکھ سکتا۔ اس دُنیا میں اسقدر خوش ہونے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ میں اکثر اوقات چاندنی رات میں پھولوں کو جھومتے ہوئے دیکھ کر سہم جاتا۔ ستاروں کی مسکراہٹ مجھے خوف سے لرزا دیتی۔ میں نعیمہ کے لانبے لانبے بالوں سے کھیلتا کھیلتا یکایک سنجیدہ ہو جاتا میرا ہاتھ ایک جگہ رُک جاتا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھ کر کہتی "کیوں کیا بات ہے میرے دیوتا؟" "کچھ نہیں میری جان" میں اس کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہتا۔ "اچھا کچھ گاؤ" وہ مجھے چھیڑنے کو کوئی غمزدہ گیت چھیڑ دیتی۔ میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا۔ "نہیں نہیں یہ نہیں، وہی گاؤ وہی "میں بن کی چڑیا....." ہم دونوں زور سے قہقہہ لگاتے....

چھوٹے بچے کیسی جلدی دھوکے میں آ جاتے ہیں۔ ہم دونوں بھی تو بچے ہی تھے۔ اس لئے کہ زندگی کے تاریک پہلوؤں سے قطعی ناواقف تھے۔ فلک کی طنز آمیز مسکراہٹ کو حقیقی سمجھتے تھے۔

ایک دفعہ وہ میرے بالوں سے کھیل کھیل کر کوئی بہت پیارا گیت گا رہی تھی۔ میں نے جذبات سے نڈھال ہو کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا "جب ہماری شادی ہو جائیگی تو......" اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا "کب؟" اسکی کچھ عجیب حالت ہو گئی۔ میں اس کے احساسات اور جذبات کو پیار کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس نے اپنی آنکھیں بڑے زور سے بند کر رکھی تھیں۔

جب میں شبیر صاحب سے شادی کا تذکرہ چھیڑتا تو فوراً بولتے "ہاں ہاں ابھی جلدی کیا ہے لیکن ان کا طرز کچھ اس قسم کا ہوتا۔ جیسے کوئی دکاندار اس گاہک سے وعدہ کرتا ہو جس کے پاس سودا خریدنے کیلئے پورے دام نہ ہوں اور دکاندار تو دکاندار ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنی چیزوں کو پوری پوری قیمت پر فروخت کرتا ہے۔ اگر میرے فوراً ہی بعد کوئی گاہک پوری قیمت لے کر آ جائے تو اسے اپنا وعدہ یاد بھی نہ رہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے اس کے مال کی کس قدر قیمت لگا دی ہے اسکی نظر جیب پر جاتی ہے دل پر نہیں۔ وہ اپنا کاروبار چمکتے ہوئے سکوں سے چلاتا ہے خلوص، ہمدردی اور محبت سے اسے کیا تعلق؟ میں خاموش ہو جاتا۔

دکان کھلی رہتی ہے تو گاہک بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک بہت دولتمند آدمی آیا۔ دکاندار نے حسب معمول اس موٹی اسامی کو لبھانے کیلئے ہر ممکن کوشش شروع کر دی گاہک نے کہا جب تک کہ وہ اپنی آنکھوں سے خوب اچھی طرح دیکھ کر مال کو پرکھ نہ لیگا ہرگز مول تول نہ کریگا۔ آہ! کتنی طاقت ہوتی ہے روپیہ میں۔ سید شبیر صاحب ملک کے ایک مشہور خاندان کے فرزند اپنی صاحبزادی کی تصویر دکھانے پر خوشی سے راضی ہو گئے اُف! معصوم نعیمہ کے حسن و شباب کی نمائش کی جا رہی تھی...... ٹھیک اس وقت میرے ذہن میں منی جان کی دوکان آئی ــــ لیکن منی جان کو تو دُنیا ذلیل کہتی ہے...... "یا خدا" بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ میرا خون کھولنے لگا ساری کائنات پر مجھے غصہ آ رہا تھا۔ یہ سب کی سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر کیوں قائم ہیں۔ یہ زمین و آسمان کیوں نہیں ٹکراتے؟ بجلیاں کیوں نہیں سارے جہاں کو جلا ڈالتیں؟ اُف ....اُف" میرے دماغ میں نہ معلوم کیا کیا آ رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے بیٹھ رہنا ناقابل برداشت ہے۔ میں کھڑا ہو گیا اور پھر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ میری نظر یکایک پھولوں پر جا پڑی۔ میں نے ساری کائنات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پھولوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں کا ایک پتہ بھی نہیں ہل رہا تھا۔ آسمان پر آہستہ آہستہ ستارے نمودار ہو رہے تھے مجھے خودبخود کچھ سکون سا ہوا۔ خون کا دوران ٹھیک ہو گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میرے گرد و پیش کی تمام چیزیں مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ عورت کے جذبات اور محبت سے نہیں خریدے جا سکتے۔ میں نے اپنا سر اُوپر اُٹھایا اور خیال کیا "میری نعیمہ کے دل اور روح کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ ان کو میں نے اپنے دل اور روح کے عوض اپنا بنا لیا ہے" یہ خیال آتے ہی ایک لہر سی میرے سارے جسم میں دوڑنے لگی جس کا نتیجہ زندگی یا موت ہوتا ہے۔ مجھے زندگی مل گئی۔ دوکاندار کا کاروبار بند ہو گیا۔ اس لئے کہ اس کی دوکان کا سب سے قیمتی موتی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میرا ہو چکا تھا۔

طبِ جدید کے کرشمے

پپیتہ کی مسیحائی

صحت طاقت اور جوانی کو برقرار رکھنے کے لئے قدرت کا سب سے بڑا عطیہ

قدرت نے کئی ایسے پھل پیدا کئے ہیں جو انسانوں کی صحت و طاقت کو بڑھاتے اور قائم رکھتے ہیں۔ ان میں کشمکش، نارنگی، سنترہ، سیب، ناشپاتی اور کیلا شامل ہیں۔ لیکن ایک عجیب پھل پپیتہ یا ارنڈ خربوزہ ہے۔ جو صحت کے قائم رکھنے میں سب پر فوق رکھتا ہے۔ اس کی کاشت اور پرورش کیلئے زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ اسے اپنے نشو و نما کیلئے بہت گرمی اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ گرم ممالک میں زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بیج اول گملوں میں بویا جاتا ہے۔ اور جب اس کا پودا ذرا بڑا ہو جاتا ہے تو اسے زمین میں نصب کر دیتے ہیں۔

پپیتہ بد ذائقہ نہیں ہوتا۔ اسے امیر و غریب نہایت رغبت سے کھاتے ہیں۔ اس کا ذائقہ ایسا ہوتا ہے جو ہر مزاج اور طبیعت کے انسان کو پسند ہوتا ہے۔ نہ بہت میٹھا اور نہ بہت پھیکا اور نہ طبیعت کو اس کے ذائقہ کا عادی بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جوں جوں اسے کھایا جاتا ہے وہ زیادہ لذیذ معلوم ہوتا ہے اور اسے کھانے سے طبیعت نہیں اکتاتی۔

یہ پھل اگرچہ کئی گرم ملکوں میں پیدا ہوتا ہے مگر یورپ والوں کو اس کی بابت علم اس وقت ہوا جبکہ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ کولمبس کو اس کی دوسری مہم میں پپیتہ شمالی امریکہ میں ملا۔ اور جب اس کے عمدہ خواص معلوم ہوئے تو اسے دن بدن ہر دلعزیزی حاصل ہونے لگی۔

پپیتے میں کئی طبی خواص پائے جاتے ہیں۔ معدہ اور زبان پر اس کا تسکین بخش اور عمدہ اثر ہوتا ہے۔ وہ خوراک کے ہضم میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ یہ تقریباً ناممکن ہے کہ اس سے کسی صورت میں بھی بدہضمی پیدا ہو یا اس کے کھانے سے طبیعت متنفر ہو جائے غذا کے ہضم کرنے میں دوا کے طور پر وہ بہت مفید پڑتا ہے۔ کیمیاوی تجزیہ سے اس میں حسب ذیل چیزیں پائی گئیں۔ پانی ۵۷ء۹۰ فیصدی۔ پروٹین ۸۰ء فیصدی۔ روغن ۱۰ء فیصدی۔ ایشے ۹ء۱۰ فیصدی۔ نمامٹروجن ۳۲ء۶ فی صدی۔

اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک ایسی چیز موجود ہے جو قوت ہاضمہ کو بڑھاتی ہے اور ہضم کرنے والے اعضا کو طاقت بخشتی ہے۔ اسے "پاپین" کہتے ہیں جسکی بدولت پروٹین کے ہضم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ طب کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جس شخص کی قوت ہاضمہ صحیح اور مضبوط ہو اس کی صحت اور طاقت میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور نہ کمی واقع ہوتی ہے۔ اس اصول کی میزان میں پپیتہ بالکل درست اترتا ہے۔

جب پپیتے کا درخت ایک سال کا ہو جاتا ہے تو اس میں پھل آتے ہیں۔ ہر موسم میں اس میں پھول اور پھل لگے رہتے ہیں گویا وہ سدا بہار والا پھل ہوتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں۔ ایک لمبوترہ، دوسرا گول۔ دونوں ہی ذائقہ میں عمدہ ہوتے ہیں۔

کئی جزیروں میں اس درخت کی چھال سے رسیاں اور رسے بنائے جاتے ہیں۔ اس میں کئی ادویاتی صفات پائی جاتی ہیں۔ اس کی جڑ کو طاقت دینے والی دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں دودھ جیسا جو رس ہوتا ہے وہ اگزیما (ایک قسم کی خارش) چنبل، داد، مسوں، زخموں اور آنتوں کے کیڑوں کے امراض دفع کرنے والی دوا ہے۔ کئی جزائر کے دیسی باشندے اس کے بیجوں کو پیاس بجھانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پکا ہوا پھل چہرے کے داغوں اور چھائیوں کو دور کرنے کیلئے عورتیں کام میں لاتی ہیں۔ سبز پھل اور پتوں سے صابن کی جگہ کپڑوں کے داغ اور دھبے دور کئے جاتے ہیں۔ لوگ گوشت کو گلانے کیلئے اسے

کام میں لاتے ہیں۔ کیونکہ اس میں انجیر اور کھپری کی خاصیت ہوتی ہے اس کے سفید رس یا سبز پپیتے کا رس گوشت پر مل کر پندرہ منٹ تک گوشت کو رکھ چھوڑتے ہیں۔ بعض اوقات گوشت کو پپیتے کے پتوں میں لپیٹ کر رات بھر رکھا جاتا ہے اس سے گوشت کا پروٹین زیادہ زود ہضم ہو جاتا ہے

پپیتے کے سفید رس سے ہاضمہ کی دوا بنائی جاتی ہے۔ جسے "پاپین" کہا جاتا ہے۔ پاپین کلکتہ کی ایک دواساز فرم نے بھی تیار کی۔ اور اس سے لاکھوں روپے پیدا کئے۔ پپیتے کے رس سے ہاضمہ کی گولیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ جو دواساز وں کی دوکانوں سے ملتی ہیں۔ رس سے جو سفوف بنایا جاتا ہے وہ گوشت کو گلانے میں بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے جو چیز پانی میں مل کر جلد نہ گلتی ہو وہ اس سفوف سے جلد گل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہڈی کو بھی گلا دیتا ہے۔ سبز پپیتے کو پکا کر بھی کھایا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جگر، معدہ، آنتوں اور ہاضمہ کی کئی خرابیوں کیلئے بہت مفید چیز ہے۔ امریکہ کی ایک فرم نے پپیتے سے پاپین وسفوف تیار کیا۔ اور برسوں اسے فروخت کر کے بڑی آمدنی حاصل کرتی رہی۔

بہت لوگ پپیتے کی چائے بھی پیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہاضمہ کیلئے بہت مفید ہوتی ہے۔ اور دوسری قسم کی چائے کی طرح کوئی نقصان بھی نہیں پہنچاتی پپیتے کے رس کو کسی دوسرے پھل مثلاً نارنگی، سیب، آلو بخارا، اور لوکاٹ کے رس کے ساتھ ملا کر بڑا مزیدار اور لطف دینے والا شربت بن جاتا ہے۔ جو ہاضم اور مفرح ثابت ہوتا ہے۔ بہت لوگ پپیتے کو خربوزہ کی طرح کھاتے ہیں یا اس میں لیموں کا رس اور نمک حسب ضرورت ملا کر استعمال کرتے ہیں۔ سبز پپیتے پکا کر اور گرمیوں کے موسم میں ٹھنڈے کر کے ان سے شربت بنایا جاتا ہے۔

پپیتہ زیادہ مہنگا نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ مفید بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایک مشہور مثل ہے کہ "ایک انار اور صد بیمار" یہ مثل پپیتے پر اس کے گونا گوں فوائد کے باعث خوب صادق آتی ہے۔ قدرت نے یہ پھل پیدا کر کے انسانوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ کیونکہ وہ انسانوں کی بہت سی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے وہ ہر طور سے مفید ہی پڑتا ہے۔ اس لئے لوگوں میں اسے بڑی ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ اس کے استعمال کرنے والے کو وید

بدنصیب راشدہ کا خط (بقیہ صفحہ ۳۲)

کو آخری منزل تک پہنچا دیا۔ اور ان کو رنج و غم سے نجات دلوادی میری پیاری بہن ذکیہ! میں تمہیں یہ خط ابھی لکھ کر ڈال رہی ہوں اور اب کچھ دیر بعد میں ان غموں سے آزاد ہو چکی ہونگی۔ چونکہ تمہیں مجھ سے بہت زیادہ محبت ہے اسلئے یہ اپنی آپ بیتی تمہیں لکھ کر بھیج رہی ہوں خودکشی کے بعد میں ان غموں سے نجات پا چکو نگی۔ اور اس دنیا کو چھوڑ چکی ہونگی جس میں انتہائی رنج و غم بھرے پڑے ہیں جس دنیا کا ایک ایک لحہ غموں، تباہیوں رنجوں اور مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے میرے یہ چند الفاظ تمہیں ہمیشہ ہمیشہ میری یاد دلاتے رہیں گے۔ اور میرا واقعہ زمانے کیلئے سبق آموز ہوگا ؎

خوں ہو رہے ہیں قلب و جگر گھٹ رہا ہے دم
ہے صبح کربلا میری شام ملال میں

پیاری ذکیہ! بس اب رخصت میری خطاؤں کو معاف کر دینا۔ اگر کبھی یاد آجاؤں تو میرے لئے دعا کرنا۔ مجھے میرے سکون کا چمکدار راستہ بلا رہا ہے کہ آ۔ جلد اس دنیا سے منہ موڑ لے۔ اس دنیا میں سوائے غم کے اور کچھ نہیں۔ ایک بجنے میں سات آٹھ منٹ باقی ہیں جب تک نوکر خط ڈال کر آئے گا میں غم کی دنیا سے دور سکون کی دنیا میں دم لے کر رہونگی ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

فقط طالب مغفرت راشدہ

راکھی بندھ بہن

از جناب
مظہر انصاری دہلوی
بی اے آنرز

رات کا آخری پہرہ اپنی زندگی کے اختتامی لمحے گن رہا تھا۔ بل کھاتی ہوئی ہوا فرش صحرا پر رقص کرتی پھرتی تھی۔ نسیم سحر سرسرائی۔ پو پھٹنے کی دھندلی روشنی نے پہاڑی کے نقوش کو نمایاں کرنا شروع کیا تھا کہ بعد دیگرے سارے ستارے گھل گھل فلک کی نیلی دیگ میں رہ گئے۔ سبزہ پوش زمین کلبلائی۔ دنیا جاگ اٹھی۔

صبح کی ارغوانی شفق کھلتے ہی سورج محل کے دروازے کے شہ نشین سے نفیریوں کی صدا بلند ہونے لگی۔ باجوں تاشوں کی جھنکار اور بگلوں کی چیخ پکار نے اعلان کیا کہ میواڑ کے سردار چتوڑ گڈھ سے باہر شکار کرنے جا رہے ہیں۔

خراماں خراماں کاروان شادمانی طویل اور ڈھلوان راستے کو طے کرتا ہوا پہاڑی سے سطح صحرا پر اترنے لگا۔ سب سے اگلی صف میں چوندا تھا۔ وہ ایک چندیل سردار کا لڑکا تھا۔ اس کی عمر اس کے قد کی طرح کم ہی تھی۔ مگر احساس تمکنت اور آداب نشست و برخاست میں کوئی راجکمار بھی اس کی گرد کو نہ پہنچتا تھا۔ مغرورانہ انداز سے اس نے اپنا نیزہ اٹھا کر محل کی عورتوں کو سلام کیا جو دیوار قلعہ کی مرمریں جالیوں سے جھانک جھانک کر تماشا دیکھ رہی تھیں۔ نیزہ اٹھاتے وقت ... خون بڑی تیزی سے ... عورتوں میں سے وہ بھی ہے جو میری ہے اور میری رہیگی۔ اس کا کامنی بدن، اس کا ستواں نقشہ، اس کا کتابی چہرہ، چندیل جوان کی آنکھوں میں سماں باندھنے لگا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ ایسی دلنواز شریک حیات کے آغوش میں زندگی کس قدر انبساط مدام ہوگی۔ نوجوان کی گردن پیشتر سے بھی زیادہ اکڑ گئی۔

سرداروں کا یہ جلوس سالانہ قربانی دینے جا رہا تھا۔ اگر سال آئندہ میں میواڑ کے ستارۂ تقدیر کو خوش بختی کے اوج پر رکھنا ہے تو حیوان ذبح کر کے گوری دیوی کی بھینٹ ہونا چاہئے۔ راجپوت سردار خوش و خرم اور ہنستے بولتے چلے جاتے تھے۔ شکار کے بعد جشن تھا۔

چتوڑ کی دیویاں بھی مصروف تھیں۔ شام کو ایک اور جشن تھا۔ ضیافتی دالانوں کی آرائش کا کام ہونا تھا۔ مٹھائیاں تیار ہوتی تھیں۔ شربت بننے تھے واپسی پر ہاتھ منہ دھلانے کیلئے ٹھنڈے اور صاف شفاف پانی کے جگ بھرے جانے تھے اور سارے کاموں میں پہلا کام ریشمی ساڑھیوں میں مناسب اور خوشرنگ جواہرات ٹکنے تھے۔

شام ہوئی مرمریں محرابیں دھندلکے میں چھپنے لگیں۔ چکور کے نغمات عشق فضا میں گونجے۔ اشجار کی شاخوں سے مور بولے ستاروں نے اپنی نیلی اور سبز ننھی ننھی پلکیں جھپکائیں۔ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے نکل کر نغمے فضا میں منتشر ہونے لگے۔ نغمے جن میں ایک مسرور پرند کی چہچہے اور باد بہار کی سی دلآویزی تھی کماری گا رہی تھی، چوندا کی راحت جاں کماری، اس کی آواز میں شادمانی کی لہریں بل کھاتی تھیں، ترنم میں آرزو انگیز گداز تھا۔ یہ خیال کر کے خوش ہو رہی تھی کہ انہی کے حامی نے حیوان کو ختم کیا ہوگا۔ آج وہی ستاروں میں چاند کی طرح چمک رہے ہونگے۔ وہ میرے ہیں —— اور —— میرے ہی رہیں گے۔

غل ہوا —— وہ آ رہے ہیں، وہ آ رہے ہیں —— عورتیں مرمریں جالیوں سے سرداروں کی واپسی کا نظارہ دیکھنے کیلئے بیتابانہ دوڑیں۔ سخت تعجب ہے کہ واپسی کی شہنائی نہیں بج رہی قہقہا کو چیر کر آتے ہوئے قہقہے نہیں۔ باجے تاشے نہیں۔ بگل نہیں، آخر کیا ہوا؟

سردار پژمردہ چہرے لئے چلے آتے تھے۔ جب وہ صحن قلعہ میں اپنے اپنے گھوڑوں سے اترے تو اس طرح مضمحل تھے گویا کوئی لڑائی ہار آئے۔

ہاں —— قربانی کامیابی سے اختتام پذیر نہیں ہوئی۔ دوبار حیوان کو گھیر کر لایا گیا اور دونوں دفعہ وہ نکل نکل گیا۔ جشن منعقد نہیں ہوا۔ قربانی نہیں ہوسکی

اب کیا ہوگا؟ میواڑ پر نمرود مصیبت آنے والی ہے۔ دوسرے ہی دن خبر آئی گجرات کا سلطان بہادر یلغار کرتا ہوا قلعہ کی طرف آرہا ہے۔ چتوڑ گڈھ کی چار دیواری میں سابق رانائے میواڑ رانا سانگا کا خرد سال جانشین موجود تھا اس کی حیثیت خطرے میں پڑگئی۔ اس خبر کے پھیلتے ہی راجستان کے ہر حصہ سے راجپوت سردار گھوڑے، تلواریں بندوقیں اور ڈھالیں لے لے کر آنے لگے وہ چتوڑ پر جان قربان کرنے پر آمادہ تھے۔ پہاڑی جس پر قلعہ بنا ہوا تھا مشرق اور شمال میں خط راست کی طرح تھی۔ ادھر سے چڑھا ہی نہیں جا سکتا تھا محافظ ادھر سے مطمئن اور بے خطر تھے چوٹی پر ایک زبردست گڑھی تھی جس میں آلات حرب کا وافر ذخیرہ آسودہ تھا۔ لوگ سمجھتے تھے۔ چتوڑ ناقابل تسخیر ہے مگر سلطان گجرات اپنے ساتھ توپخانہ لے آیا جس کے منظم انگریز تھے قلعے کے سامنے آجتک توپخانہ نہیں آیا تھا یہ تو ایک زندہ خطرہ راستے میں آگیا۔ بہادر راجپوت سرداروں کے دل ڈوبنے لگے۔ بھلا تلواروں اور بندوقوں کا توپوں کے گولوں سے کیا مقابلہ۔

~~~~~~

قلعہ کے ایک مشرقی کمرے میں بیوہ رانی کرناوتی بیٹھی تھی۔ خورد سال اودے سنگھ گود میں تھا۔ رانی کا بیضوی چہرہ توپوں کی گرج سے کملایا جاتا تھا۔ ہائے قسمت ایک تو اس کا پریمو اس سے جدا ہوا، دوسرے یہ مصیبت! رانی اپنے خیالات میں گم تھی کہ بچے نے احتجاج کے طور پر رو کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسکی ننھی ننھی انگلیاں راکھی کے ریشمی دورے میں الجھ گئی تھیں۔ رانی نے ننھی ننھی انگلیوں کو ریشمی الجھاوے سے آزاد کردیا۔ یہ راکھی اودے کی خالہ زاد بہن نے باندھی تھی۔ راکھی کو دیکھتے دیکھتے دفعتاً اسے خیال آیا ——— میرا بھی تو ایک "راکھی بند" بھائی ہے۔ کیا نہیں ہے؟ بہادر اور دلیر، ہمایوں ہندوستان کا شہنشاہ۔ رانی نے فوراً آواز دے کر ایک چھوکری کو بلایا۔ وہ آئی۔ رانی بولی

"ذرا لی ایک راکھی لا"

چھوکری نے تعجب سے پوچھا "راکھی مہارانی جی؟"

"ہاں راکھی۔ میں اپنے راکھی بند بھائی شہنشاہ ہند کو ایک راکھی بھیجونگی"

"مہارانی جی۔ راکھی بھی کوئی بھیجنے کی چیز ہے۔ بھیجنا ہی ہے تو کوئی انمول موتی بھیج دیجئے"

"تو نہیں سمجھتی۔ کیا ہمایوں کو میرے موتی چاہیئے ہیں؟ میں اس کی راکھی بند بہن ہوں اپنے بھائی کو راکھی ہی بھیجونگی" یہ بہن کی محبت کا سندیسہ ہے"

~~~~~~

رات تیرہ و تار تھی، تارے بھی گھنیرے بادلوں میں منہ چھپائے ہوئے تھے۔ قلعے کے چور دروازے سے ایک بھیل نکلا اور صحرا میں ایک طرف روانہ ہوگیا۔ اسے راجستان کے پرخطر اور ایچ پیچ راستے خوب معلوم تھے۔ اس کیلئے اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہوسکتی تھی کہ رانی اپنا سندیسہ دیکر شہنشاہ ہند کے پاس بھیجے صبح نے اپنے اجالے میں اسے فرش صحرا پر اونٹوں کے پنجوں کے نشان دکھائے بھیل راہ پاکر اور بھی تیز رفتار سے چلنے لگا۔ اسے دور دراز بنگال میں مغلوں کے کیمپ تک پہنچنا تھا اور وہاں ہمایوں شہنشاہ ہند کو مہارانی کی راکھی دینی تھی

~~~~~~

ہمایوں کو اظہار مدعا کا یہ طرز بہت بھایا۔ اس نے قسم کھائی کہ "تخت منصور رہے یا ہاتھ سے جائے"۔ راکھی بندھ بہن "کے بچے اودے سنگھ کو ضرور سلطان گجرات کے پنجے سے بچاؤنگا۔"

~~~~~~

گجراتیوں کے محاصرے نے چتوڑ والوں کی جان پر بنا رکھی تھی، ہر روز صبح رانی جھروکے میں آ بیٹھتی اور اس امید پر صحرا کی راہوں کو تکا کرتی کہ شاید اب قاصد آیا۔ شام کی آمد اسے مایوس کر کے جھروکے سے اٹھاتی، ہر روز تلسی کے پودے کے گرد راجپوتنیاں پھیرے کاٹتیں کہ شاید لکشمی دیوی چتوڑ کو حملہ آوروں سے بچالیں۔ رانی کے خاص برج میں پنڈت لوگ ہر روز بھگوان سے پرارتھنائیں کرتے تھے۔ مگر یہ سب باتیں بیکار ثابت ہوئیں۔ گجراتی سلطان کے توپخانے سے کسی طرح بچاؤ ممکن نظر نہ آتا تھا۔ ایکدن صبح صبح ایک شخص چور دروازے سے قلعہ میں داخل ہوا اور گھبرایا ہوا رانی کے خاص برج کی طرف دوڑا وہ رانی کا قاصد تھا۔ خبر لے کر آیا تھا کہ مغل شہنشاہ رانی کی مدد کو آرہا ہے۔ رانی یہ امید افزا مژدہ سنکر گھٹنوں کے بل گر پڑی اور بھگوان کا شکر ادا کرنے لگی اسکا اندازہ غلط نہ نکلا۔ ہمایوں "بہن" کو

چھوڑا نہیں۔ اب گجراتی کیا ٹھہر سکیں گے آگ کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی مگر دن پہ دن گزرے اور ہمایوں نہ آیا۔ سردار آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ شہنشاہ ہند کب مدد کو آئینگے بعض جو ہمایوں کی مدد کو ناپسند کرتے تھے جواب دیتے جب چتوڑ گڑھ جل کر راکھ ہو جائے گا۔

خوراک قلعہ میں روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ وبا پھیلنے لگی۔ لوگ اس سے نذر اجل ہونے لگے۔ چند دن بعد قلعہ کی دیواروں میں ایک وسیع شگاف کیا گیا مگر گجراتیوں کا مدعا پورا نہ ہوا۔ بہادر راجپوتوں نے انہیں اس راستے سے قلعہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ انہیں جانیں دینی پڑیں۔ مگر ان کیلئے کون سی بڑی بات تھی ہنستے کھیلتے تلوار کے گھاٹ اتر گئے

اپنے سرداروں کے دل بڑھانے کیلئے رانی خود ہتھیار سجا کر میدان میں آئی اسی معرکہ میں چوندا بھی شامل تھا۔ اور اس کے دوش بدوش اس کی نئی دلہن کماری عروسی جوڑے پہنے، باگیں ملائے، وہ اس طرح میدان جنگ کو روانہ ہوئے گویا عروسی جشن منانے چلے ہیں۔ سورج محل کے دروازے سے نکل کر طویل اور ڈھلوان راستے سے وہ سطح صحرا پر اترنے لگے۔ گجراتیوں نے گولے برسانے شروع کئے۔ راجپوتوں کے دستے کے دستے اڑ گئے مگر عشق و شوق دیوانوں کی برابر بڑھتے رہے۔ کماری مدھم سروں میں ایک گیت گا رہی تھی۔

لڑ جا پڑیں دشمن پہ ـــــ اس خاکی جسم کا خیال نہ کرو۔ یہ باقی رہنے والا نہیں تلوار کی دھار پہ مرنے والو ـــــ چاند اور ستاروں کی طرح تمہارا نام باقی رہیگا۔ آؤ جا پڑیں دشمن پہ ـــــ میرا خیال نہ کرو میرے راجہ، تم اور میں تو سدا سدا ایک ہی رہینگے۔ اور سدا سدا کو زندہ!

گیت کی آخری لڑی پر ایک گولی سن سن کرتی ہوئی آئی اور کماری کے سینہ میں پیوست ہو گئی۔ حسین نغمہ نواز گھوڑے کی پشت سے زمین پر آ رہی۔ چوندا نے گھوڑے سے اتر کر عاشق بیوی کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ کر گھوڑا اڑاتا ہوا میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ راجپوت برابر گر رہے تھے۔ دفعتاً دور سے گرد و غبار اٹھتا نظر آیا۔ مغل سپاہ مدد کو آ رہی تھی۔ راجپوتوں کے ٹوٹے ہوئے دل بندھ گئے۔ بڑھ بڑھ کر تلواریں مارنے لگے۔

رات بھر ہنگامہ جنگ برپا رہا۔ صبح معلوم ہوا

موت کے پردے سے جھانک کر!

کیا موت کے بعد بھی زندگی قائم رہتی ہے؟

ایک روز ایک شخص مجھ سے اپنی ذہنی حالت کے متعلق مشورہ لینے کیلئے آیا۔ وہ بہت پریشان معلوم ہوتا تھا اور کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس سے وہ تبادلۂ خیالات کر سکتا اسلئے ہر چند میں اس کیلئے اجنبی تھا۔ مگر اس نے میرے پاس آنا ضروری سمجھا۔

اس نے بیان کیا کہ سونے سے پہلے ہر رات میں بستر پر بیٹھکر دعا کیا کرتا ہوں میرے بستر کے قریب ایک میز پر اس قسم کی چیزیں رکھی ہوئی رہتی ہیں جیسے کتابیں پنسلیں، ایک ٹائم پیس، تمباکو پینے کا پائپ وغیرہ۔ ایک دو مرتبہ مجھے اس میز پر حرکت کے آثار دکھائی دیئے۔ شروع میں اس نے خیال کیا کہ شاید کوئی چوہیا ادھر ادھر پھر رہی ہے لیکن میز پر ایک برقی لیمپ موجود تھا اور اس کی تیز روشنی میں کسی چوہیا کا نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے میز پر رکھا ہوا ایک اخبار آہستہ سے کھلا۔ اور اس قسم کی آواز پیدا ہوئی گویا کوئی لیمپ کی سطح کو انگلی کے ناخن سے بجا رہا ہو۔ پھر ایک اور آواز اسکو سنائی دی اور اس نے دیکھا کہ ایک پنسل حرکت کر رہی ہے۔

کوئی جاہل یا گنوار آدمی اس طرح کی باتوں کو سن کر یقیناً نظر انداز کر دیتا یا ہنسنے لگتا اور اس آدمی سے کہتا کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے تم جا کر کسی ڈاکٹر سے مشورہ لو لیکن گو میں اپنے آپ کو بہت ترقی یافتہ نہیں سمجھتا تو بھی کچھ نہ کچھ معلومات رکھتا ہوں بس میں نے اس کو سمجھایا کہ میری رائے میں کوئی شخص دوسری دنیا سے کوئی بات تم سے کہنا چاہتا ہے کیا تمہارے خیال میں کوئی آدمی ایسا ہے جس کا انتقال کچھ عرصہ پیشتر ہوا ہو اور جو تم سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہو؟

اس کے ہونٹوں پر پھیکا تبسم پیدا ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ بے شک ایک آدمی کی موت پچھلے دنوں واقع ہوئی تھی لیکن وہ میرا دوست نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور یقیناً کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو وہ مجھ سے کہنا چاہتا ہو۔

میں نے اس کے جواب میں کہا شاید اس لئے اس آدمی کی روح تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ کم از کم اس کو اظہار خیال کا موقعہ ضرور دینا چاہئے۔ اس پر وہ آدمی بُرا سا منہ بنا کر رخصت ہو گیا۔ اور کہنے لگا میں ایسی روحانیات کا قائل نہیں ہوں۔

اس کے بعد تین ہفتے گذر گئے اس وقت وہ پھر ایک مرتبہ میرے پاس آیا۔ اور اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے سرہانے رکھی ہوئی چیزیں اب پہلے سے بھی زیادہ پُر شور آوازیں پیدا کرتی ہیں۔ حیران ہوں کہ کیا کروں۔ آپ ہی کوئی مشورہ مجھے دیجئے۔ میں نے اس کو آٹومیٹک تحریر کا طریقہ سمجھایا۔ اور ساتھ ہی اس بات کی تلقین کی کہ تمہیں اپنی ذہنی کیفیت کیسی رکھنی چاہئے اس کے بعد وہ پھر چلا گیا۔

اس واقعہ کا حال میرے ذہن سے بالکل خارج ہو چکا تھا کہ وہ پھر ایک بار میرے پاس آیا۔ اور اس وقت اس کی زبانی معلوم ہوا کہ دُنیا اس کیلئے بالکل ہی بدل چکی ہے میرے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسکو معلوم ہو گیا جو روپیہ اس سے چھینا جا چکا تھا وہ کیونکر واپس لیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اس روپیہ کو دوبارہ پانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ حالات سے معلوم ہوا کہ اس کا دشمن مرنے کے بعد دوسری دنیا میں سخت پشیمان تھا اور وہ کسی نہ کسی طریقہ پر اس کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا خوش قسمتی سے میں ان دونوں کے تعلق قائم کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

میں اس آدمی کے نام تک سے واقف نہیں ہوں اور نہ کبھی میں نے اس سے اس کا نام پوچھنے کی ضرورت سمجھی ہے۔ ہماری ملاقات باہمی بھی محض رسمی ہوا کرتی تھی کسی طرح کی بے تکلفی قطعاً ہمارے درمیان نہیں تھی۔

بہر حال یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے اور لوگ بہت سے مفید سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ اگر کوئی چھوٹی سے چھوٹی آواز بھی اس قسم کی سنائی دے جس کے منبع کا حال معلوم نہ ہو یا کوئی خفیف سی علامت ہی نظر آئے تو اس کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ عین ممکن ہے۔ اس سے عظیم نتائج پیدا ہو سکیں۔

مجھ کو ایک کاروباری آدمی کا حال معلوم ہے جس کے بھائی کا انتقال ہوئے

قریباً ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ بھائی روحانی دنیا سے واپس آکر کئی بار اس سے ملا ہے لیکن یہ اس کا حال صرف اس لئے اوروں کے روبرو بیان نہیں کر سکتا کہ ڈرتا ہے۔ لوگ میری باتوں کو سن کر ہنسینگے اسلئے وہ اس کو نظر انداز کر رہا ہے۔ ایسے ہی تجربات بہت لوگوں کو پیش آچکے ہیں اور وہ بھی اس کی طرح ان کے بیان سے ہچکچاتے ہیں۔ مجھ سے اس کا حال بیان کرتے ہوئے اس نے کہا کہ "مرنے کے بعد جب پہلی مرتبہ میرا بھائی نظر آیا تو میری یہ حالت ہوگئی کہ مارے دہشت کے مارے گویا جان باقی نہ رہی تھی۔ اس پر میں نے اس سے پوچھا کیا زندگی میں تم اپنے بھائی سے ڈرتے تھے، وہ حیرت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اور بولا "زندگی میں تو ہم گہرے دوست تھے"۔ اس پر میں نے اس سے پوچھا اگر زندگی میں تمہیں اپنے بھائی سے اتنی محبت تھی تو اب کیا وجہ ہے کہ تم اس سے بدگمانی کرنے لگے ہو؟"

وہ اس جواب کو سن کر لاجواب سا ہوگیا۔ اور آخرش سوچ سوچ کر کہنے لگا۔ "میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اب جو کچھ مجھے دکھائی دیتا ہے وہ میرا بھائی نہیں بلکہ اس کی روح ہے"۔ اس پر میں نے کہا "کیا یہ روح اس وقت اس کے اندر موجود نہ تھی۔ جب وہ اپنے خاکی وجود میں اس دنیا میں رہتا اور ہر وقت تم سے ملا جلا کرتا تھا؟ کیا تم نے کبھی اس سوال پر غور کیا ہے کہ ہم لوگ درحقیقت کیا ہیں؟ محض ایک روح، جس پر گوشت اور پوست کا جامہ چڑھا ہوا ہے۔ دراصل جو چیز سانس لیتی اور بولتی ہے وہ نہ تو آدمی کا گوشت اور پوست ہے اور نہ اس کے پہننے کے کپڑے میرے خیال پر جب تمہارے بھائی کا انتقال ہوا تو یہ حقیقت تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہوگی۔ اس وقت اس کے مرنے پر کیا چیز باقی رہ گئی تھی؟ محض اس کا گوشت پوست اور کپڑے جو نہ سانس لے سکتے تھے اور نہ سوچ اور بول سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اصلی چیز جو یہ سارے کام کرتی تھی یعنی اس کی روح بدن کو چھوڑ کر رخصت ہو گئی تھی۔ اگر وہ روح زندگی میں تمہاری دشمن نہ تھی۔ تو اب کس لئے ہوگئی؟ آدمی کو ہمیشہ اس حقیقت پر غور کرنی چاہئے کہ موت اس کے سوا کسی چیز کا نام نہیں کہ ایک آدمی دروازہ سے گزر کر دوسری جانب پہنچ جاتا ہے۔ جب تم زندگی میں اپنے بھائی کی آمد پر دروازہ بند نہیں کرتے تھے تو اب کس لئے کرتے ہو؟"

اشتہار [illegible] طلاء [illegible]

نسخہ طلاء مردمی شائع ہو گیا

ناظرین! اس طلاء نے صدہا نہیں بلکہ ہزاروں مریضوں کی زندگی بدل دی اور ہزاروں کو بامراد و کامیاب بنا دیا۔ طلاء مردمی رجسٹرڈ عرصہ ۲۰ سال سے پبلک میں اپنی مسیحائی سے مردہ کو زندہ کی صفت اور صداقت کا سکہ جما کر شہرت اور قبولیت کا ڈنکہ بجا رہا ہے۔ اور نہایت مجرب و زود اثر ثابت ہو رہا ہے۔ ہم نے پبلک کی تکلیف کا خیال کر کے عام مخلوق خدا کی ہمدردی اور اشتہاربازی دوائیوں کی شکایت کا خیال کرتے ہوئے عام انسانوں کیلئے مجرب اور تیر بہدف طلاء بلا جھجک اس کے شائع کر دیا ہے۔ اور جو عضو مخصوص (انسی) کی تمام خرابیوں کیلئے بیحد مفید ہے۔ اور عضو مخصوص کی سستی کمزوری پتلاپن ٹیڑھاپن ترچھاپن جھکاؤ نیلی رگوں کا ابھر آنا جو کہ کثرت مباشرت اغلام اور جلق وغیرہ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور جملہ تمام امراض کیلئے حیرت انگیز طور پر مفید ثابت ہو چکا ہے۔ تمام شکایتوں کو رفع کر کے طوالت فربہی اور تحریک قوت پیدا کرنے میں لاثانی ہے۔ زود اثر اس درجہ کہ اول مرتبہ لگاتے ہی نصف گھنٹہ میں فائدہ محسوس ہوتا ہے۔ ہزارہا لوگوں کی زندگی جو بے لطف تھی۔ اس نے عیش و راحت کامیابی اور [illegible] بسر کرا دی۔ جو کہ دعائیں دیتے ہیں اور شکریہ کے خطوط لکھتے نہیں تھکتے۔ اسلئے اسکے استعمال سے اس کا جوہر معلوم ہو سکتا ہے [illegible] سے اسکو تیار کریں۔ اور [illegible] اگر کبھی آپ کو ضرورت نہ ہو تو اپنے دوستوں اور عزیزوں کو یہ نسخہ ملاحظہ [illegible] [illegible] بلکہ بہت حفاظت سے رکھنا چاہئے کیونکہ یہ نسخہ بار بار شائع نہ ہوگا۔

نسخہ حسب ذیل ہے: [illegible] ایک تولہ مغز بادام ایک تولہ مغز چلغوزہ ایک تولہ سفید کنیر کی جڑ ایک تولہ [illegible] لونگ ایک تولہ [illegible] جھاؤ [illegible] دو تولہ [illegible] ایک تولہ سفید [illegible] ایک تولہ ڈھاک [illegible] پانچ تولہ سم الفار [illegible] ایک تولہ [illegible] ایک تولہ [illegible] دار چینی ایک تولہ [illegible] ایک تولہ [illegible] ایک تولہ کچلہ چھ ماشہ زعفران چھ ماشہ سونا [illegible] چھ ماشہ کستوری دو ماشہ [illegible] چھ ماشہ [illegible] ۵ تولہ چربی شیر ۵ تولہ چربی سانڈہ ۵ تولہ تیل چنبیلی ۵ تولہ سم الفار سفید چھ ماشہ آئل سنامن (Cinnamon) ۵ تولہ آئل [illegible] ۵ تولہ۔ مندرجہ بالا [illegible] تیل بنا لیں پھر پیس کر [illegible] ۲۴ گھنٹہ گھوٹ کر آتشی شیشی میں بھر کر رکھ لیں یا تال جنتر کی ترکیب سے تیل نکالیں اور شیشی میں بھر کر کارک لگا دیں حسب دستور رات کو سوتے وقت مالش کریں۔ انشاء اللہ ایک ہفتہ کے استعمال سے وہ قوت پیدا ہوگی جو تازندگی قائم رہیگی۔ اور تمام نقائص عضو مخصوص کے رفع ہو جائینگے۔ لطف یہ کہ اس طلاء سے آبلہ نہیں پڑتا۔ اور نہ کوئی تکلیف ہی ہوتی ہے۔ نازک سے نازک حضرات اسکا استعمال کرتے ہیں ہر موسم میں یکساں مفید ہے۔ اگر کوئی صاحب بوجہ قلت یا تنگدستی سے خود تیار نہ کر سکیں۔ تو ہمارے دواخانہ سے طلاء مردمی جو مریضوں کیلئے ہر ہفتہ تیار ہوتا رہتا ہے جس کی قیمت فی شیشی تین روپے آٹھ آنہ معہ محصولڈاک ہے۔ (منی آرڈر فیس دو آنہ) طلب کریں۔ ایک شیشی ایک مریض کیلئے کافی ہوتی ہے اگر خود ہی تیار کرنا چاہیں۔ اور کبھی اکے نہ ملنے سے مجبور ہو جائیں۔ تو وہ بھی طلب کریں۔ غرضیکہ ہم کو دھوکہ باز اشتہاریوں سے بچانا مقصود ہے جس طرح سے چاہیں اس نسخہ کا تجربہ کریں۔ اور اگر جریان و قوت باہ کی شکایت ہو۔ تو ہمارے ہاں وہ بھی نسخہ **اکسیر جریان یادوا دینیہ سنجیون ست** رجسٹرڈ جو کہ بیس سال سے مجرب مشہور ہے جس کے استعمال سے بلامبالغہ بیس بیس سال کے لاعلاج مریض جو برسوں تک حکیموں اور ڈاکٹروں کے زیر علاج رہ کر دولت کو برباد کر کے مایوس ہو چکے تھے۔ آج وہ سب صاحب اولاد ہیں۔ جس کی قیمت اکیس روزہ خوراک کی مبلغ دو روپے دس آنے (۲/۱۰) معہ محصولڈاک ہے۔ (منی آرڈر فیس دو آنہ) طلب کریں۔ جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ اور پتہ خوشخط تحریر کریں۔ ورنہ تعمیل جواب نہ ہوگی۔ تاکید ہے۔ (جملہ خط و کتابت کا پتہ):-

خادم وید رتن ستیہ دیو جی پروپرائٹر روپ بلاس کمپنی نمبر ۱۲۴ کانپور

دستخط ہو جائیں گے۔ جرمنی اور اطالیہ میں ڈکٹیٹروں کا تبادلہ ہونے ہی والا ہے۔

ان تمام بین الاقوامی نجومیوں کی پیشینگوئیوں کی جیسی مٹی خراب ہوئی وہ سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہے اس لئے میں اس کے متعلق کچھ لکھنا عبث سمجھتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ نجومیوں کی بے سروپا پیشینگوئیوں سے علم النجوم کو بیحد نقصان پہنچا ہے۔

علم نجوم کو سائنس کے نظریے کے مطابق مطالعہ کرنے والے ڈاکٹر ایچ اسپنسر جونس نے "نیوز کرانیکل" میں بہترین مضمون شائع کرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "مجھے ایسے کسی بھی نجومی کا علم نہیں جو درحقیقت سیاروں کو دیکھتا ہو اور نہ میں کسی ایسے شخص کو جانتا ہوں جو سیاروں کا بخوبی مطالعہ کرتا ہو اور وہ نجومی بھی ہو۔ نجوم تو ایک بے معنی ہے لیکن اس پر اعتقاد اور اس سے استفادہ کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہو گیا ہے اسلئے نجوم کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔"

حسین بننے کا جنون

امریکن عورتوں نے ۱۹۳۸ء میں تین کروڑ پچاس لاکھ پونڈ ان دکانوں میں خرچ کئے تھے۔ جن میں مختلف تدابیر سے حسن میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ امریکن تجارت میں اس کاروبار کا چھٹا نمبر ہے۔ اس طرح کی دکانوں کی تعداد ستر ہزار ہے اور ان میں جو کارکن کام کرتے ہیں۔ انہیں ایک کروڑ ۳۰ لاکھ پونڈ سالانہ تنخواہ ملتی ہے تقریباً ۴ کروڑ عورتیں ان دکانوں میں جاتی ہیں۔ یہ عورتیں سولہ برس کی عمر سے لے کر ۶۰ برس تک کی عمر کی ہوتی ہیں۔

انگلستان میں مردوں اور عورتوں کا تناسب

۱۹۳۴ء میں انگلستان میں مردوں کی آبادی ۲ کروڑ ۱۷ لاکھ پچاس ہزار تھی لیکن ان کے مقابلہ میں عورتوں کی آبادی ۲ کروڑ ۳۶ لاکھ ۳۳ ہزار تھی۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہر ہزار مرد کے مقابلے میں ایک ہزار چوراسی عورتیں تھیں اس کے ساتھ یہ جاننا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ پندرہ سال کے لڑکوں کی تعداد لڑکیوں سے زیادہ ہے وہاں ہزار لڑکوں کے مقابلہ میں نو سو اسی لڑکیاں ہیں۔ ۶۵ سال کی عمر کے بعد سے فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد ایک ہزار نو سو سولہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انگلستان میں عورتیں مردوں کی بہ نسبت زیادہ عمر پاتی ہیں۔

خون کے پجاری

امریکہ میں ایک عجیب و غریب قوم آباد

ہے جو اپنی فلاح و بہبودی کیلئے خون کی پرستش کرتی ہے اور جسے اکویڈور کے کولوریڈو، کہتے ہیں۔ یہ لوگ بیرونی دنیا میں "خون کے پجاری" کے نام سے مشہور ہیں۔ اسپینی فتوحات سے قبل ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچی تھی۔ لیکن جب سے چیچک نے کوہستان انڈیز کے جنگلوں میں ڈیرے ڈالے ہیں۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ سطح ارض سے ناپید ہو رہے ہیں چنانچہ انہیں بھی غالباً اپنی پیش آمدہ تباہی کا احساس ہو چکا ہے اور وہ زندہ رہنے کیلئے قسم قسم کے توہمات کا سہارا لے رہے ہیں۔ "عہد قدیم" میں چونکہ "خون" ہی مظہر حیات سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے یہ لوگ جد و جہد للبقا کے لئے خون کی پرستش ضروری خیال کرتے ہیں۔ کولوریڈوؤں کا عقیدہ ہے کہ اگر "خونی درخت" کے بیجوں سے خون نکال کر جسم پر لگا لیا جائے تو انسان کو بیماریوں یا ارواح خبیثہ سے ہمیشہ کیلئے نجات ہو جاتی ہے۔ خونی درخت کوہستان انڈیز (جنوبی امریکہ) کے بعض جنگلات میں بکثرت ملتا ہے۔ عام طور پر اس کے بیجوں سے پنیر وغیرہ کو رنگنے کے لئے رنگ تیار ہوتا ہے لیکن مقامی باشندے اس چھپے رس کو خون کا قائم مقام تصور کرتے ہیں۔ مرد اس سے اپنے تمام بدن کو اور عورتیں اس سے اپنے بالوں کو تر کرتی ہیں جب اس قبیلے کا کوئی فرد وادیٔ شباب میں قدم رکھتا ہے تو اس کیلئے "خونیں غسل" ضروری ہوتا ہے۔ جس کے بعد وہ بڑے لوگوں کی مجلس میں بیٹھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

~~~

سارس کا معاشقہ

طبعی تاریخ کے ماہر لفٹننٹ موس نے "چیمبرز جرنلز" میں ایک سارس کی دلچسپ رومانی کہانی شائع کرائی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

موسم سرما میں ایک روز لفٹننٹ موس اور ان کے دوست کاٹھیاواڑی تعلقہ دار نے ایک سارس کو گولی مار کر نیچے گرا دیا اس کا ایک بازو ٹوٹ چکا تھا لیکن علاج معالجہ کے بعد چند ہی دنوں میں صحت یاب ہو گیا تعلقہ دار نے اس پرندے کو سدھا لیا۔ لیکن جب کبھی سارسوں کا کوئی غول فضا میں سے پرواز کرتا ہوا گذرتا تو یہ پرندہ بیتاب ہو جاتا اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی کے انتظار میں دن گذار رہا ہو۔ ایک روز تعلقہ دار نے دیکھا کہ سارس غیر معمولی طور پر بے تاب ہے اور بار بار
~~~

آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھا کر دیکھ رہا ہے۔ اتنے میں سارسوں کا ایک غول آسمان پر سے گذرا۔ تعلقہ دار کے سارس نے چونچ کھولی۔ اور پراسرار آواز میں "قیں قیں" کرنا شروع کیا۔ اڑنے والے سارسوں میں سے ایک پرندہ نیچے اتر آیا۔ تعلقہ دار کا سارس پر پھڑپھڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور بے اختیار اپنی گردن اس کے پروں میں سمو دی۔ پھڑپھڑایا اور زمین پر گر پڑا۔ اس کی چونچ میں سے ایک دلگداز کراہ بلند ہوئی۔ تعلقہ دار نے دوڑ کر دیکھا تو وہ جان دے چکا تھا۔ نووارد پرندہ چند گز پیچھے ہٹ گیا اور چند گھنٹے تک حیران و پریشان کھڑا رہنے کے بعد دوبارہ پر پھیلا کر اڑ گیا۔ یہ نووارد غالباً تعلقہ دار کے سارس کی محبوبہ تھی۔

~~~

دنیا کے مشہور سائنسدان پروفیسر سی ای ایم جوڈ نے اپنے ایک مقالے میں بتایا ہے کہ آج سے ساٹھ سال بعد دنیا کی کیا حالت ہوگی؟ اس کا کیا رنگ ڈھنگ ہوگا؟ قارئین مست قلندر کیلئے اس مضمون کے کچھ اقتباس نیچے دئے جا رہے ہیں:

آج سے ساٹھ سال بعد مرد اور عورت بغاوت کرینگے۔ میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹنا بالکل آسان ہو جائے گا۔ کوئی وجہ نہ رہیگی کہ جس رفیق زندگی سے ہمیں نفرت ہے ہم کیوں تمام عمر اس کے ساتھ زنجیر میں بندھے رہیں گے۔ قانون ضرور بدلیں گے اور انسان بندھنوں کو توڑ کر پھینک دیگا۔ طلاق کا قانون اور شادی کا قانون بدلے گا۔ جس طرح شادی کرنا آج کل آسان اور معزز مانا جاتا ہے کسی زمانہ میں شادی کا اپنی مرضی سے توڑ دینا بھی بالکل ایسا ہی آسان اور معزز ہو جائیگا۔ طلاق شدہ والدین کے بچے حکومت اپنی نگرانی میں لے لیا کریگی۔"

"سائنس کی بے پناہ ترقی چیزوں کی پیداوار میں بے انتہا اضافہ کر دیگی۔ ہر مزدور کو تین چار گھنٹہ کی مشین کاری کے بعد مناسب اُجرت اور آرام و آسائش ملنے کا بندوبست ہو جائے گا۔ اور انسان بالکل عیش و راحت کی زندگی بسر کریگا۔ انسان کی مسرت کے تمام ابدی دشمن ختم ہو جائینگے افلاس بالکل اڑا دیا جائیگا۔ خیرات خانے کا وجود ہی نہ ہوگا۔ گھٹیا گندی آبادیاں ختم ہو جائینگی اور میں سمجھتا ہوں کہ غلامی اپنی تمام شکلوں اور صورتوں کے ساتھ دنیا سے غارت ہو چکی ہوگی۔"

"مذہبی معبدوں نے لوگوں کی زندگی پر جو پابندیاں لگائی ہوئی ہیں وہ گھٹ جائینگی بلکہ معدوم ہو جائینگی۔ اور انسان مذہب کی بندشوں سے آزاد ہو جائیگا۔"

"۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء تک انسان کی اوسط پیدائش بڑھتی ہی رہے گی لیکن اس کے بعد گھٹنی شروع ہوگی۔ اس گھٹنے کو کوئی روک نہ سکے گا۔ اور اس بری طرح پیدائش کم ہوگی کہ بچے دیکھنے میں نہیں آئیں گے۔"

~~~

روس کے ایک شہر کورکی کے ایک نزدیکی قصبہ مشیرا میں پچھلے دنوں جب بارش ہوئی تو چاندی کے بیضوی شکل کے ٹکڑے جو مچھلی کے چھلکوں کے برابر تھے، گرے۔ سارا روس حیران تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے، ماہرین سائنس سر دھننے لگے۔ آخر ایک پروفیسر اس نتیجے پر پہنچا کہ چاندی کے یہ ٹکڑے درحقیقت سولھویں صدی کے ہیں جو کسی کھلے مقام پر پڑے ہوئے تھے اور شیطانی طوفان کے باعث اڑ کر ہواؤں میں چلے گئے تھے۔ جب تک ہوا تھام سکی تھمے رہے اور فضائی اثرات کے باعث اس کی شکل بدل گئی لیکن جب تھماؤ باقی نہ رہ سکا تو بارش کے ساتھ گر پڑے۔

جادوگر کی ڈائری

ایک ماہر ہپناٹسٹ کیلئے دُنیا کا کون کام مشکل ہے!

از جناب مسعود جاوید

فن ہپناٹزم کے جن حقائق کو سائنس کی مدد سے بھی نہیں سمجھا جاسکتا جو فوق الفطرت ظہورات ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔ جو باتیں دنیا والوں کو ناممکن العمل دکھائی دے رہی ہیں جن کراماتوں کی تاویل انسانی عقل کرنے سے قاصر ہے۔ وہ سب ایک ماہر ہپناٹسٹ کیلئے ممکن ہیں۔ عورت، مرد، بڈھا، جوان الغرض دُنیا کا ہر ایک انسان خداوند کریم کی طرف سے اس دولت لازوال کا امین بنکر پیدا ہوا ہے۔ یہ جُدا بات ہے کہ اپنی جہالت کے باعث جیتے جی کوئی شخص اس گنج نایاب کی کھوج اپنے خانہ دل میں نہ کر سکے لیکن یہ حفیظ طاقت ہے سب کے پاس اور ہر کوئی اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے کیسے؟ یہ جاننے کیلئے "جادوگر کی ڈائری" کا از اوّل تا آخر نہایت غور سے مطالعہ کیجئے (ایڈیٹر)

(مسلسل)

میں نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ جو اس بات پر راضی ہوگئے ہیں کہ میں اُن پر ترک نشیات کی پابندی کا قطعی و مکمل حکم قائم کردوں اگر ان کا ہاتھ کبھی اتفاق سے جام شراب کی طرف بڑھا بھی تو وہ اسکو اُٹھا لینے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس کے علاوہ میں نے دیکھا ہے کہ اگر مسٹر "الف" نے جن کو میں نے محض چند مخصوص تعداد تک سگریٹ پینے کی اجازت دی تھی اگر کبھی اس تعداد سے زیادہ سگریٹ پینے کیلئے نکالی تو وہ اسے سُلگانا بھول گئے۔

لیکن واضح رہے کہ وہ خود میری امداد پر آمادہ نہ ہوئے تو میں یہ کامیابی حاصل نہ کرسکتا تھا۔ علمی زاویہ نظر سے درحقیقت اپنا علاج انہوں نے خود ہی کیا تھا میں نے تو صرف ان کو ایک راستہ دکھایا تھا۔

غالباً یہاں ایک شرابی عورت کی شہادت کو درج کرنا بے محل نہ ہوگا جو مجھے دو سال قبل دستیاب ہوئی تھی۔ مجھے ابھی پوری طرح یقین نہ ہونے پایا تھا کہ میں اس کا علاج مکمل کرچکا ہوں کہ یکایک وہ ملک سے باہر چلی گئی اور گذشتہ سال ماہ مارچ میں مجھے اس کا ایک خط ملا۔

"جب سے میں یہاں واپس آئی ہوں" اس نے لکھا تھا: "میں نے اس تباہ کن آتش سیال کے ایک قطرے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کامیابی کا سہرا صرف آپ کے سر ہے۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ احساس ہوگیا ہے کہ میں شراب پی ہی نہیں سکتی۔ اس کے خیال سے ہی مجھے نفرت ہونے لگی ہے۔"

جب وہ میرے پاس آئی تھی تو اس وقت اس کی حالت اسقدر خراب و پست تھی کہ میں نے اسے دوپہر کے طعام کے بعد ایک گلاس شراب پینے کی نصیحت کی تھی۔ اور یہاں تک ہدایت کردی تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو تھوڑی بہت برانڈی بھی استعمال کرلے۔ میں جانتا تھا کہ میری اس ہدایت سے اسے شراب نوشی کی کوئی جدید عادت نہیں پڑیگی۔ کیونکہ اس کے تحت الشعوری دماغ نے اس یقین کو قبول کرلیا تھا کہ شراب اس کے واسطے مفید نہیں البتہ بطور دوا کبھی کبھی استعمال کرے تو مضائقہ نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس استثنار سے ناجائز فائدہ نہیں اُٹھائے گی۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہ وہ صرف طعام دوپہر کے بعد شراب پی لیتی ہے اور انتہائی ضرورت کے وقت تھوڑی سی برانڈی بھی استعمال کرتی ہے اس نے اپنے خط میں آگے لکھا تھا۔

"مجھے بہت بڑے نتائج کی امید ہے اور مجھے توقع ہے کہ کچھ زمانے کے بعد میں آپکو یہ اطلاع دے سکونگی کہ میں شراب کی قسم کی کوئی بھی شے بالکل استعمال نہیں کرتی..... مجھے افسوس صرف اتنا ہے کہ میں لندن سے اسقدر جلد چلی آئی۔ مجھے احساس ہے کہ اگر میں کچھ دن اور وہاں قیام کرسکتی تو آپ مجھے ایک بالکل جدید ہستی میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوجاتے۔"

لیکن کیا ہپناٹزم کے علاوہ ترک منشیات کے علاج کا اور کوئی ایسا طریقہ دنیا میں موجود ہے کہ بغیر کسی نگرانی کے مریض کو شراب نوشی کی اجازت دیدے اور پھر بھی یہ یقین رکھے کہ مریض پیشتر سے زیادہ خراب حالت میں مبتلا ہو جائیگا؟

گذشتہ چند ماہ میں میں نے ایک مخصوص علاج کیا ہے جو میرے خیال میں میرے تمام تجربات میں سب سے زیادہ دلچسپ ہوگا

یہ علاج ایک متوسط العمر عورت سے متعلق ہے جو متعدد سال سے نشیلی جڑی بوٹیوں کو کھانے کی عادی رہی ہے۔

ترک منشیات کے تمام علاجوں میں مجھے کامیابی اس وقت ہوئی ہے جب مریض پر نیند طاری کی گئی۔ لیکن یہ مذکورہ بالا عورت کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر نیند میں غرق ہونے پر یا تو آمادہ نہ تھی یا پھر فطری طور پر نیند میں غرق ہونے کی اہل نہ تھی اور نہ میں بیداری کی حالت میں تین یا چار موقعوں پر کوشش کرنے کے باوجود اس پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

آرنلڈ بینٹ کی طرح وہ صرف ایک نیم خوابیدہ حالت تک پہونچکر رہجاتی تھی لیکن اس پر بھی میں تھوڑا بہت علاج کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے بذات خود ہی میرے ایہام کو قبول کرلیا اور ہر مرتبہ جب وہ میرے پاس آئی تو اس نے مجھے بتایا کہ منشیات کی خواہش کے مقابلہ میں اسکی مغلوبیت کم سے کمتر ہوتی جارہی ہے

پانچویں ملاقات کے موقعہ پر میں بیداری کی حالت میں اس پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا اور تھوڑی سی دیر کے لئے وہ میرے حکم اور اپنی تمام کوششوں کے باوجود اپنی کرسی سے نہ اٹھ سکی۔

اس تقریباً تین منٹ کے عرصے میں میں نے اس کو اس سے کہیں زیادہ فائدہ پہونچا دیا جتنا کہ اب تک ان تمام ملاقاتوں کے وقت پہنچا سکا تھا۔ جب وہ ایک ہفتہ بعد پھر مجھ سے ملنے آئی تو اس نے بتایا کہ گذشتہ ہفتے کے پہلے چار دن سے اُسے شراب کی بالکل ہی خواہش نہیں ہوئی۔ اور آخری دو دن بھی جب اُسے ذرا خواہش محسوس ہوئی تو قوت ارادی کی خفیف سی کوشش سے اس نے آسانی سے غلبہ پالیا۔

اسکے بعد اصلاح و علاج کی رفتار تیز ہوگئی وہ قوت حاصل کرتی چلی گئی۔ آج کل وہ مہینے میں ایک بار بقول خود "تجدید علاج" کیلئے آتی ہے اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ وہ منشیات کی خواہش سے کبھی مغلوب ہوگی۔

اس علاج میں بھی مریض کو تھوڑی بہت آزادی دی گئی ہے اور چنانچہ میں نے اور اس نے مل کر جو شراب کی ایک مخصوص مقدار مقرر کردی ہے اس نے اس سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔

چند ماہ بعد اسکی آزمائش کا وقت آنیوالا ہے۔ وہ چھ مہینے کے واسطے ملک سے باہر جانیوالی ہے۔ ہپناٹزم کے متعلق تمام فوائد اختیارات کے باوجود میں پھر اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکوں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس آزمائش میں کامیاب ثابت ہوگی۔ آجکل

ہپناٹزم کی اہمیت روزانہ زندگی میں

ایک عام انسان کے واسطے تنویم کی بڑی اہمیت و قیمت اس چیز میں مضمر ہے کہ اس کا استعمال اسکی روزانہ زندگی میں ہو سکتا ہے۔

ایک زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو میرے یہ تمام علاج جن کا تذکرہ پیشتر کرچکا ہوں محض نمائشی علاج خیال کئے جاسکتے ہیں ——— آپ کہہ سکتے ہیں کہ علاج کے ایک وسیع دائرے میں ان کی حیثیت نمایاں اور چند مخصوص علاجوں کی سی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ ان منتخب علاجوں کا بیان میں نے اپنی دلیل کی امثال کے طور پر کیا ہے اگر ایسے غیر معمولی اور سخت حالات ہپناٹزم کے ذریعہ ایسے نتائج پیدا کئے جاسکتے ہیں تو انسان کے تعطل عمل کے معمولی امراض میں ہپناٹزم کا کامیاب ہونا بدرجہ اغلب ہے۔ اس کا تصور آپ خود بخوبی کرسکتے ہیں۔

علاوہ ازیں میں اس امر پر زور دوں گا کہ جن علاجوں کا تذکرہ میں نے پیشتر کیا ہے وہ بنیادی حیثیت اور اصولی اعتبار سے ان انتہائی معمولی اختلال اعصاب کے امراض کی مانند ہیں جن کا ہم تصور کرسکتے ہیں۔ ان تمام امراض میں خرابی کی اصلیت یہ تھی کہ تحت الشعوری دماغ اپنا فطری فرض ادا نہیں کر رہا تھا۔ میں نے علاج صرف یہی کیا کہ اس دماغ کو زندگی میں اسکی واجبی حیثیت واپس دلادی۔

لیکن ہم سب انسان خواہ ہم مکمل صحت کی حالت میں ہی کیوں نہ ہوں اپنی زندگی میں اپنے تحت الشعوری دماغ سے بڑا کام لیتے ہیں۔ یہ ہماری زندگی میں ایک زبردست کام انجام دیتا ہے۔ ہم اسے

سینکڑوں طریقوں سے استعمال کرتے ہیں کیا آپ اپنی شخصیت کی قوت سے کسی دوسرے انسان کو متاثر کرنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ اپنے حافظہ کی نشوونما کی کوشش کرتے ہیں؟ کیا آپ اپنی شخصیت ـــ اپنی دماغی یکسوئی کی قوت وغیرہ کو ترقی دینا چاہتے ہیں؟ ـــ مختصر یہ کہ کیا آپ اپنی ذات کی اصلاح یا اپنی قوت ارادی پر قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ ـــ اگر آپ ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو عام اعتقاد کے مطابق آپ اپنے شعوری دماغ کو استعمال نہیں کرتے بلکہ اپنے تحت الشعوری دماغ سے کام لیتے ہیں۔

اگرچہ عام طور پر اسے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قوت حافظہ کا مقام تحت الشعوری دماغ ہی ـــ تحت الشعوری دماغ کی قوت حافظہ اسقدر زبردست اور ارتقا یافتہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کرتا یا سوچتا ہے اس میں سے ذرا سا حصہ بھی کبھی فراموش نہیں ہوتا۔ ہم اپنی فطری بیداری کی حالت میں اپنے تحت الشعور سے امداد لے کر اسے اس بات پر آمادہ کرسکتے ہیں یا نہیں کہ وہ اپنے پوشیدہ ذخیرے میں سے وہ شے نکال کر ہمیں دیدے جس کی ہمیں ضرورت ہے ـــ یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ ہم ایسا نہیں کرسکتے ہم بھول جاتے ہیں! ـــ مگر اسکی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم نے اپنے تحت الشعوری دماغ کو مکمل طور پر اپنے قابو و اختیار میں نہیں کیا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایسا کرنا بھی شاید ہمارے لئے ناممکن ہے کیونکہ اگر فی الواقع ایسا ہو جائے تو ہماری قوت ارادی ہمہ گیر ہو جائے اور مجھے یقین ہے کہ ہم خود موت سے بھی اپنی زندگی کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔

میں نے اس سلسلے میں متواتر تجربات کئے ہیں اور جسقدر گہری تحقیق میں نے کی اُسی قدر زیادہ مجھے یقین ہوتا گیا ہے کہ تحت الشعور کسی چیز کو بھی بھول نہیں سکتا۔

میں نے مختلف حالات میں لوگوں پر نیند طاری کی ہے اور ان لوگوں نے قوت حافظہ کے انتہائی سخت امتحانات میں ہمیشہ مطمئن کن جوابات دئے ہیں۔

ان لوگوں نے مجھے اپنے عالم طفولیت کے ایسے واقعات بتلائے ہیں جن سے وہ اپنی بیداری کی حالت میں قطعی ناواقف تھے۔ انہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنی زندگی کے چند مخصوص واقعات بتلائے جن کو وہ اسقدر طویل مدت سے بھول گئے تھے کہ جب بیداری کی حالت میں ان کے دوستوں نے جو ان واقعات سے واقف تھے ان کو یہ سب باتیں یاد دلائیں تو انہیں کچھ بھی یاد نہ رہ سکا۔ میں ایسے واقعات کی سینکڑوں مثالیں پیش کرسکتا ہوں مگر فی الحال صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں یہ واقعہ ایک اداکار (ایکٹر) سے متعلق ہے جو ایک روز مجھ سے امداد چاہنے آیا تھا۔

اُسے شیکسپیر کے ایک مشہور ڈرامے میں میکبتھ کا پارٹ ادا کرنا تھا جس کی اطلاع اسے صرف ۴۸ گھنٹے پیشتر دی گئی تھی چونکہ چند سال پیشتر ایک مرتبہ وہ یہی پارٹ ادا کرچکا تھا۔ اسلئے اسے یقین تھا کہ وہ آسانی کے ساتھ یہ کام سرانجام دے لے گا۔ لیکن اسی دوران میں اسے ایک زبردست اعصابی دورہ پڑا اور بعدازاں اسے یہ معلوم ہوکر پریشانی ہوئی کہ پارٹ اُسے یاد نہیں رہا۔ اُس نے اپنا بہت سا بیش قیمت وقت اپنے پارٹ کو از سر نو یاد کرنے میں ضائع کیا لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔ کیا میں اس کی امداد کرسکتا تھا؟

میں نے اس پر نیند طاری کی اور اس کے بعد شیکسپیر کا وہ مخصوص ڈرامہ اٹھا کر میں نے اس سے کہا کہ میں اس کے پارٹ کو چھوڑ کر باقی ہر ایک پارٹ کو پڑھونگا اور وہ ساتھ ساتھ اپنے پارٹ یعنی میکبتھ کے الفاظ کو صرف دہرائے نہیں بلکہ اداکاری بھی کرتا رہے۔ میں نے اسے یقین دلا دیا کہ اسطرح وہ اپنے بھولے ہوئے ہر ایک لفظ کو یاد کرلیگا۔

اس نے اپنے پارٹ کو لفظ بہ لفظ مکمل طور پر ادا کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے اتنا ٹھیک ٹھیک پارٹ لیا کہ جب میں نے وہ سطور پڑھیں جو کہ اسوقت اس ڈرامہ سے خارج کردی گئی تھیں جب کہ اُس نے چند سال پیشتر یہ کردار ادا کیا تھا تو وہ یکدم رُک گیا اور مجھے بتلایا کہ کہاں سے شروع کرنا چاہئے۔

اس نے میرے دار المشورہ میں میکبتھ کا پارٹ جس خوبی سے ادا کیا میں نے اس سے بہتر اداکاری کا نمونہ نہ دیکھا تھا۔ اگلے روز اسٹیج پر بھی اسکی اداکاری اتنی ہی حقیقی و بلند تھی۔ مجھے اب تک حیرت ہے کہ وہ ایک بڑی حد تک خود میکبتھ بن گیا تھا۔ اور اداکار کی حیثیت سے باقی نہ رہا تھا۔ نہ جانے اس مختصر سے وقت میں جبکہ اس کا تحت الشعوری دماغ براہ راست میرے زیر اثر تھا اس کے اندر کیا انقلاب پیدا کردیا تھا۔

واقعہ بہر حال کچھ بھی ہو اس مثال سے میرا اصلی مقصد تو قوت حافظہ کے اس کمال کو دکھانا ہے۔

(ترجمہ) (باقی ـــ باقی)

شمعِ خرابات

از جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی

قسط نمبر ۲

(گذشتہ سے پیوستہ)

وہ کچھ اس طرح آنکھیں نیچی کئے رو رہی تھیں جیسے اپنی اس حرکت سے شرمندہ ہوں — آنکھوں میں آنسو تھے ماتھے پر شکن جس طرح سمندر میں کھڑی ہوئی موقر چٹان سے موج ٹکرائی ہو اور اسے عرق آلود لیکن جبیں پر جبیں چھوڑ گئی ہو۔

میں نے پھر کہنا شروع کیا ——

نہیں معلوم میں کتنی دیر سویا پر جب آنکھ کھلی تو اماں ابا میں باتیں ہو رہی تھیں اور اماں کو میں نے یہ کہتے سنا پہلے بھی جب اس نے سگریٹ چھوڑا تھا تو پیٹ میں درد ہوا تھا۔ اور ابا نے بگڑ کر جواب دیا۔ یہ تمہاری غلط محبت کا پھل ہے۔ اماں آنکھیں نیچی کر کے چپ ہو گئیں اور میرے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھنے لگیں ابا تھوڑی دیر میں آپ ہی آپ بولے۔ ایسی حالت میں سگرٹ کیسے دے دوں یہ فقرہ سن کر سگرٹ یاد آیا اور کچھ ملنے کی آس بھی بندھی —— نہیں کہہ سکتا یہ اعتقاد کی کمی کا خمیازہ تھا یا سگرٹ کی طلب۔ پیٹ میں ایک پیچ سا ہوا اور میں پھر تڑپنے لگا۔ اس دفعہ درد پہلے سے کچھ زیادہ تھا۔ اماں جب میرا کرب نہ دیکھ سکیں تو بولیں۔ یوں بھی تو ہلکان ہوا جا رہا ہے۔ ابا نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ ڈبیا اٹھائی سگرٹ سلگا میرے حوالے کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی باپ اپنے چہیتے بچہ کو زہر کا پیالہ دے اور کہے، بیٹا تیری قسمت —— میں نے ایک گھونٹ لیا کھانسی اٹھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آیا اور مجھے کچھ خبر نہ رہی —— جب ہوش آیا تو صبح صادق تھی۔ اور اماں نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھیں۔ مجھے اب بھی ان کی اسوقت کی صورت یاد ہے اور اکثر آنکھوں میں پھر جاتی ہے عجب خشوع و خضوع کے عالم میں کہہ رہی تھیں۔ میرے مولا اس سے یہ لت چھڑا دے۔ یہ فقرہ اب بھی کانوں میں گونج جاتا اور ایک ڈھارس سی بندھ جاتا ہے پھر میں کئی کئی دن چرس نہیں پیتا لیکن پھر پھڑک اٹھتی ہے اور میں غیر ارادی طور پر ادھر کھیچ آتا ہوں۔ اگر دعا میں اثر ہے تو میرا ایمان ہے کہ ایک نہ ایک دن میں نہ صرف چرس بلکہ سگرٹ بھی چھوڑ دونگا۔ لو یقین جانئے اکثر ایسا ہوا ہے کہ یہاں آتے ہوئے بازار میں کوئی لفظ سن کے مجھے ماں یاد آگئیں اور میرے قدم لوٹ گئے۔ تھوڑے دن کی بات ہے میں ادھر آ رہا تھا کہ ایک برقعہ والی جس کا کوئی پانچ سال کا بچہ انگلی چھڑا کر بیچ سڑک پر چلا گیا تھا۔ اسے آواز دے رہی تھی کہ اتنے میں سامنے سے تانگہ آیا۔ ماں اپنی پروا کئے بغیر بچہ کی طرف بھاگی خود جھپیٹ میں آگئی بچہ کو بچا لیا۔ مجھے اپنی اماں یاد آگئیں اور ادھر آنے کی بجائے میں قبرستان چلا گیا۔ حالانکہ اس روز ابر تھا اور ایسے موسم میں طبیعت کو روک نہیں سکتا۔

ہاں تو صبح حکیم صاحب آئے فرمایا پیٹ پر تمبا کو رکھو سگریٹ تو نہیں دیا جا سکتا۔ حکیم صاحب وہ وقت گذر گیا سگرٹ اس رات چھوڑا جا سکتا تھا معرکہ پڑا تھا باپ بازی جیت گیا۔ اور کیوں نہ جیتتا۔ بین کرنے والی خود پاپ میں گرفتار تھی۔ طبیب کا دروازہ مریض کیلئے بند تھا طوائف کے لئے کھلا ہوا۔ انسانوں کی جان بچانے والا باپ بستری پر جان دے رہا تھا مجھے یقین ہے کہ اگر یہ طوائف نواز اسوقت ذرا بھی نوازش فرما دیتے اور کچھ بھی بتا دیتے تو تسلی ہو جاتی۔ رات کٹ جاتی لیکن آپ اپنی عادت نہ ترک کر سکے۔ رنڈی کو نہ چھوڑ سکے۔ مریض کی عادت کیسے چھڑا سکتے ہیں۔ ایسے اطبا کی زبان میں اثر نہیں ہوتا —— میرے منہ سے نکلا سگرٹ بغیر درد نہیں جائیگا۔ حکیم صاحب چلتے ہوئے ابا سے کہہ گئے کہ اگر مجبور ہو جاؤ تو پڑھیا دے سکتے ہو۔ بچنا قسمت میں تھا مر انہیں مر کر بچا تھا اماں ابا اور بھی جان دینے لگے کسی بات کی روک ٹوک نہ رہی۔ اللہ نے پھر کے سے زندگی بخشی تھی۔ سب کچھ معاف تھا۔ بعد میں املتاس کے جلاب دیئے ہوئے سب عزیز و اقارب اپنے پرائے جمع ہوئے پھول پان اولے بتاشہ لائے۔ ہمارے پاس اچھے خاصے روپے جمع ہو گئے۔ ایک اشرفی تو ابا لئے کھڑے رہتے تھے ادھر

میں نے جلاب لیا۔ ادھر انہوں نے ہاتھ میں دی۔ میں یہاں تک کہنے پایا تھا کہ بوا وحیدن کے منہ سے ہائے نکل گئی۔ ایسا معلوم ہوا۔ جیسے تنت پر ستار کا تار ٹوٹا ہو اور مجھے اشارہ سے روک دیا۔

نہ معلوم کون یاد آگیا۔ کون سا وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ دماغ کی مشین کو حرکت میں لے آتا اور ماضی کا مسلسل فلم پیش کر دیتا ہے۔ فقط ایک اشارہ کسی دکھتی ہوئی رگ پر نشتر زنی کر جاتا اور دل کی نگری کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔

بوا وحیدن نے کچھ اس طرح ہاتھ اٹھا کر مجھے روکا جیسے کسی زخمی کے قلب پر آخری وار ہو رہا ہو اور وہ باقی ماندہ قوت سے اسے روکے۔ میری زبان بند ہو گئی اور تھوڑی دیر ہم ساکت بیٹھے رہے۔

بوا وحیدن کی انگلی میں مجھے ایک بیش بہا ہیرے کی انگوٹھی نظر آئی دیکھنے میں تو سچا تھا پر عقل مانتی نہ تھی۔ اور ان کی ذات سے یہ بھی بعید کہ دو آنے کی لے کر انگلی میں ڈال لی ہو۔ وہ ایسی حرکات سے بالاتر تھیں۔

کچھ تو ان کا حال سننے کی خواہش۔ کچھ اس انگوٹھی نے تجسس بڑھا دیا۔ اور سچ یہ ہے کہ حال بیان کر دینے سے میرا اپنا دل بھی ہلکا سا ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر خموش رہنے کے بعد میں نے پھر شروع کیا۔

پیسے پاس تھے روک ٹوک تھی نہیں۔ اب ہم نے دنا دن بائیسکوپ دیکھنے شروع کئے۔ کوئی سا فلم ایسا نہیں آتا تھا جو ہم سے بچ جائے اور بعض بعض تو خدا جھوٹ نہ بلائے دس دس دفعہ دیکھے ——— مسیتا بھی ہمارے گرد رہنے لگا اور رہتا بھی تھا مفت میں بائیسکوپ دیکھنے میں آتا پھر اوپر سے سودے اڑاتا سگرٹ کے دم لگاتا۔

ہم جاتے تھے چونی والے میں حالانکہ ابا نے کہہ رکھا تھا کہ بڑے درجہ میں جایا کرو۔ چھوٹے درجوں کی صحبت بری ہوتی ہے۔ پر ہم کب ماننے والے تھے۔ بات یہ تھی کہ ایک تو مسیتا کے کپڑے ایسے جو با جکٹ ہوتے کہ روپیہ والے میں اسے بیٹھنے کون دیتا دوسرے ہم کو کرخنداری فقرہ سننے میں مزہ آتا تھا اور یہ روپیہ والے میں کہاں نصیب، ایک جمعہ کو ایسا ہوا کہ مسیتا نے اجلے کپڑے پہن رکھے تھے اور ہم تو خیر سے چھیلا بنے ہی رہتے تھے۔ اٹھنی چونی والے پر بھیڑ زیادہ تھی۔ مسیتا کی بھی اندر گھسنے کی ہمت نہ پڑی اور کچھ نئے کپڑوں کا بھی ڈر تھا چونکہ چار آنے والا چھ آنے میں بیچنے والے بدن پر تیل مل مل کر آتے تھے۔ اور بعض تو ہاتھوں پر توے کی سیاہی بھی لگا لیتے۔ جہاں کوئی اجلے پوش اندر گھسا اور انہوں نے بیٹھ پر چھاپا مارا۔ دوسرے نے اطلاع دی۔ اجی بابو جی تمہارا کوٹ خراب ہو گیا۔ کبھی آپس ہی میں جھگڑا فساد گالم گلوچ کرنے لگتے بھلے مانس ہٹ جاتے یہ اندر گھس جاتے ایک تو ایسا حلالی تھا کہ جہاں بھیڑ زیادہ دیکھی اور اس نے ابکائی لی۔ دوسرا چیخا۔ ابے ہیضہ اور سب بھاگے۔

غرضکہ اس دن ہم روپیہ والے کا ٹکٹ لے لیا اور دونوں جا عین پنکھے کے نیچے ہو بیٹھے ——— مسیتا کم ظرف آج پہلی دفعہ جو روپیہ والے میں آیا تو کرسی پر ایسا پھیل کر بیٹھا جیسے سارا درجہ اس کے باپ کی جاگیر ہو اور بانگ لگائی پنکھا کھول بے پنکھا ——— روپیہ والے میں سے جو یہ چونی والی آواز لگی تو گیٹ کیپر گھبرایا ہوا آیا۔ پہلے تو ہم دونوں کا جائزہ لیا۔ مسیتا آڑی ٹوپی لگائے مٹھی بند کئے چھنگلیا میں سگرٹ اڑائے دم لگا رہے تھے۔ وہ بھی تاڑ گیا۔ اور اسی کی کرسی کے پیچھے آن ڈٹا۔ پھر بولا۔ ٹکٹ دکھا دو۔ ہمارے نواب نے سنی ان سنی کر دی اور بڑی شان سے دھواں اڑاتے رہے اس نے پھر کہا۔ انہوں نے یہ بھی نہ گردانا کہ کون کتا بھونک رہا ہے۔ اب اس نے شانہ پر ہاتھ رکھا۔ ان حضور نے جھٹک کر کہا۔ دور سے بات کر بے دور سے۔ جھڑک کے ہاتھ نہ لگا۔ وہ بولا۔ ٹکٹ دکھاؤ۔ انہوں نے فرمایا پنکھا کھلواؤ۔ اس نے ٹکٹ دیکھنے پر اصرار کیا۔ انہوں نے جیب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ٹکٹ یہ رہا۔ چاند سا مل دکھلا دنگا۔ جب جب تو پنکھا کھلوا دے۔ بس یاروں کو یہی ضد آ گئی ہے ——— آخر وہ بھی عاجز آ گیا پنکھا کھلوایا اور کہا اب تو دکھاؤ۔ مسیتا نے پہلے تو وسٹ کوٹ کی ساری جیبیں ایک ایک کر کے ٹٹولیں۔ پھر گول گول دیدے پھرائے۔ ٹوپی اتار کر دیکھی۔ میری سٹی گم کہ یا اللہ کہیں ظالم نے کھو تو نہیں دیا اتنے میں مسیتا نے جھک کر جوتی اتاری۔ بابو صاحب دو قدم پس پا ہوئے مسیتا صاحب مسکرائے لیکن ٹکٹ نعلین میں سے بھی برآمد نہ ہوا۔ اب بھیڑ کے اور ملازم بھی آن جمع ہوئے کچھ دور نہ تھا کہ یہ حضرات بادست دگرے دست بدست دگرے یہاں سے خارج کئے جاتے اور کچھ لوگ اس نیت سے آگے بڑھے بھی کہ مسیتا نے ڈپٹا۔ خبردار دور سے بات

کہ اپنے جانتے والے ہیں۔

ایک دن شام کے وقت ہم چھت پر کھڑے پتنگ اڑا رہے تھے کہ ڈور جانی بوا کی بیری میں اٹک گئی۔ ہم لاکھ ٹھمکیاں دے رہے ہیں۔ وہ نکلتی ہی نہیں اتنے میں ان کی نواسی کوٹھے پر آ ئی۔ ڈور پر جو نظر پڑی تو دوپٹہ سر سے اتار لگی لوٹنے۔ ادھر ہمنے آواز دی۔ گڈی ہماری ہے اس نے پلٹ کر دیکھا اور فوراً دوپٹہ اوڑھ لیا۔ ہم نے کہا ذرا چھڑا دو۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھا اور کہا۔ بڑے خوبصورت۔ پھر نیچے اتر گئی۔ اب ہم ہیں کہ اپنے سے جتن کر رہے ہیں اور گڈی وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لیتی۔

اتنے میں وہ لنچی بغل میں دبائے پھر آئی۔ اور اس دفعہ نہ گڈی کی طرف نظر ڈالی نہ ہماری طرف اور سامنے والے دریچہ میں جا کچھ کاڑھنے ہو بیٹھی اور پھر اس درجہ بے تعلق جیسے ہمارا وجود ہی نہیں ـــــ آخر ہار جھک مار کر ہم نے کہا۔ اجی چھڑا دیجیے نا۔ پہلی آواز پر تو کوئی جواب ہی نہ ملا دل میں تو آئی کہ ایک کما کھینچ ماروں۔ پر آپا کے ڈر سے کچکچا کر رہ گیا اور بے غیرت بنکر پھر درخواست داغی اس مرتبہ اپنا کام کرتے کرتے جواب دیا گیا۔ کیوں جان کھائی ہے۔ خود چھڑا لو۔ پھنساتے وقت نہیں سوچا تھا تاؤ تو بہت آیا۔ پر غصہ سے کام چلتا دکھائی نہیں دیا۔ تو پھر ہم نے لجاجت سے کہا۔ اجی مہربانی ہوگی ہمارے پاس اس وقت دوسری ہے نہیں۔

آخر بڑی مشکل سے عجب ٹھسّے کے ساتھ وہ اٹھیں۔ پہلے تو وہی دوپٹہ والا داؤں کرنا چاہا۔ پھر کچھ سوچ کر رک گئی اور سینہ ادھر کئے کئے بولی۔ دور بہت ہے ہمارا ہاتھ نہیں جاتا۔ اتنا کہہ پھر کمرہ کی طرف چلی۔ میں جلدی سے بولا اجی ذرا تو ٹھہریئے میں لالنگر بنا کر پھینکے دیتا ہوں۔ اس نے بغیر ادھر دیکھے جواب دیا اچھا جلدی کرو۔ میں تو لالنگر باندھتا رہا اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہی۔ لیجیے صاحب اب ان کیلئے ہم دھوپ میں کھڑے رہیں۔ میں نے کہا ہم بھی تو کھڑے ہوئے ہیں۔ بولی تمہارا ڈیل تو لوہے کا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ اور آپ کا موم کا ہے پگل جائے گا۔ ہاں جی پگل جائے گا کہتی ہوئی تنتنا مار کر پھر دریچہ میں جا بیٹھی۔

وہ ایک پیسے کی کنکیا تو کوئی چیز نہ تھی اور پانچ سات گز مانجھا توڑ کر بھی پھینکا جا سکتا تھا پر اس چھیڑ چھاڑ میں اب مجھے بھی مزا آنے لگا ـــــ ایک آدھ آواز ہم نے اور دی پر اس نے ایک نہ سنی۔ آخر کار ہم نے گانا شروع کر دیا۔

دلدار یار کا پتنگ اڑائیں گے۔ اب تو ہو گئی شام سویرے پھر اڑائیں گے۔

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ہم گاتے گاتے رک گئے اور کواڑوں کی جھریوں میں سے جھانکنے لگے کہ دیکھیں اب بھی دیکھتی ہے یا نہیں۔ یہ عمل کام کر گیا اور اس نے ذرا سی دیر بعد گردن موڑ کر ادھر نظر ڈالی۔ اور ہم اناڑی کواڑ کھول کر سامنے آ گئے۔ بھئی کیا کہہ نہیں سکتا کس ادا سے تیوری پر بل ڈال کر اس نے منہ موڑا ہے اور اپنی لنچی باندھ جھٹکتی پٹکتی نیچے چلی گئی۔ ہم نے کہا بھئی ذرا دیکھو تو سہی بات تو سنو۔ یہ گڈی اٹکی ہی چھوڑ جاؤ گی۔ اس سب کے جواب میں ظالم نے لٹکے ہوئے ہاتھ سے انگوٹھا دکھا دیا۔ اور سیدھی ہو لی۔ ہماری آنکھوں میں فلم کا نظارہ پھر گیا۔ اب سورج غروب ہونے کو تھا اماں نے نیچے بلوایا کہ دونوں وقت ملتے ہیں ـــــ کچھ یہ ڈور توڑنے کو دل نہ چاہا اور ہم چرخی کو اینٹ سے دبا کوٹھے پر سے اتر گئے۔

میں کہہ رہا تھا۔ بوا وحیدن بت بنی بیٹھی سن رہی تھیں۔ ان کی داستان سننے کا شوق مجھ سے اپنی کہلوا رہا تھا اور سچ یہ ہے کہ مجھے خود بھی اب مزا آنے لگا تھا۔ ایک صاحب کہتے تھے کہ عیسائیوں میں طریقہ اعتراف جسے کنفیشن (Confession) کہتے ہیں۔ ذکر العیش نصف العیش ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اس سے دل ہلکا ہو جاتا ہے ـــــ بوجھ تو نہیں کچھ سہارا مل جاتا ہے۔

سانس کا پنچھی جب دود غم سے گھٹ ہے تو پھڑپھڑاتا ہے اور اس کے پروں کی جنبش سے کچھ دھواں چھٹ جاتا ہے یہی داستان غم ہے یہی آہ دل سوزاں۔

میں داستان سنانے میں کچھ ایسا از خود رفتہ ہوا کہ اس اثنا میں کئی لت کے مارے آئے چلم بھری دم لگا کر چلے بھی گئے اور میں بیٹھا اپنا دکھڑا روتا رہا۔ بوا وحیدن بھی ایسی منہمک ہوئیں کہ آنے جانے والوں سے بے خبر بیٹھی سنا کیں۔ ان کا جگہ سے نہ اٹھنا یہ بتا رہا تھا کہ تاثیر کر چلا تھا میرا قصۂ فراق۔

ذرا سی دیر دم لینے کے بعد میں نے پھر شروع کیا ـــــ ہاں تو رات بھر ہمیں نیند نہ آئی۔ اور رہ رہ کر جانی بوا کی نواسی یاد آتی رہی۔ میں اسے عشق و محبت تو

کرو۔ دیکھ رہے ہیں کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں۔ مل جائیگا دکھا دینگے۔ اب میرے شیر نے کرتہ اُٹھا نیفہ ٹٹولا اور ٹولا مل گیا دامن دبایا ٹھوڑی کے نیچے اور نیفہ میں انگلی داخل کرنی شروع کی۔ سامنے کی کرسیوں پر جو عورتیں بیٹھی تھیں انہوں نے نظریں نیچی کرلیں اور یہ ہیں کہ نہایت بے تکلفی سے نیفہ میں ٹکٹ کا تعاقب کئے جا رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی فرماتے بھی جاتے ہیں اب نکل یار کیوں ستایا ہے۔ بالو نے کہا جلدی کرو نہ۔ یہ بولے نکال تو رہا ہوں اور جو ایسی جلدی ہے تو لے خود نکال لے اور جو ہماری ماں تو اوپر ہی سے ٹٹول کر تسلی کرلے۔ غرضکہ کوئی پاؤ گھنٹہ میں وہ ناشدنی ٹکٹ تولد ہوا اور میاں میسیتا نے فرمایا۔ اب تو دیکھ لیا دل خوش ہوگیا۔ کچھ منہ دکھائی تو دلواتے جاؤ یار۔ اچھا دیکھنا ذری پان والے کو ادھر بھیج دینا یار خالی منہ رہ جائیں گے ——— گیٹ کیپر تو کیا ہی بھیجتے ویسے ہی اچھا خاصا چلا جا رہا تھا ہاں میسیتا نے چیخ چلا کر ایک پان والے کو بلا ہی لیا اور پورے دو آنے کے خرید لئے اس پر طرہ یہ کہ چھالیا بھی بہت سی الگ لے لی زردہ بھی ایک پڑیہ میں بندھوا لیا اور پھر الائچیاں الگ نہ لیتے تو ان کو میسیتا ہی کون کہتا اور لطف یہ کہ ایک ایک چھانٹ کرلی مزید برآں آخر میں پان والے کو یہ نوٹس بھی دے دیا کہ اگر کوئی مری ہوئی نکلی تو واپس کرنی ہوگی میرا یہ حال کہ شرم سے گڑا چلا جاؤں اور اس کی یہ کیفیت کہ جولائی کی طرح پھیلے اب جونی والوں نے چیخنا شروع کیا۔ وہی جالو کرلے کیا سوگیا۔ یہ آواز

سن میسیتا کے بھی گلے میں کھجلی ہوئی اور گلا پھاڑ کر چیخا۔ وہی جالو کیوں نہیں کرتا کیا اپنی میا کے نکاح میں گیا ہوا ہے ——— آس پاس والے تو کھلا اُٹھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے کہ یہ آج یہاں کس قماش کا جانور آ پھنسا۔ گیٹ کیپر بل بلایا ہوا آیا بولا جناب یہ ایک روپیہ والا درجہ ہے میسیتا بولا وہی بالوجی تمہاری تسلی نہیں ہوئی تو کیا پھر نکالوں ابھی تو دیکھ کر گئے ہو۔ بالو نے جواب دیا صاحب یہاں آوازہ کشی نہ کیجئے۔ یہ جونی والا درجہ نہیں ہے۔ میسیتا نے کہا پھر وہی بات جونی والا نہیں ہے جونی والا نہیں ہے۔ وہی بالوجی قسم ہے اس اڑان چھلے کی تم بھی ایک رحم ہو ہم کہتے ہیں خواب میں ریزگاری ہی دیکھتے رہتے ہوگے۔ ادھر گیٹ پر رش ہوا۔ بالو غریب کی نوکری کا معاملہ دل ہی دل میں تاؤ کھاتا ہوا چلا گیا۔ آخرکار پہلی گھنٹی بجی اور میاں میسیتا نے پان کا بیڑا منہ میں دبایا اور ایک میری طرف بڑھایا۔ میں نے اب تک ایسا بے تعلق رویہ اختیار کر رکھا تھا جیسے مجھے اس مرغ بے ہنگام سے کوئی واسطہ ہی نہیں اور اب بھی پان لے منہ میں رکھ خاموش ہو بیٹھا۔ دوسری گھنٹی پر حسب دستور سگرٹ سلگایا گیا اور تیسری پر ایک اور پان منہ میں رکھ اب میاں میسیتا سینما دیکھنے تیار ہو بیٹھے۔ ادھر تو پان کے مزے لے رہے ہیں اُدھر سگرٹ کے کش اور بائیسکوپ تو خیر ان کی جان ہے کہ اتنے میں ہیروئن جنگل بیابانوں میں پریشان حال جاتی نظر آئی۔ اور رو رو کر چیخ رہی تھی۔ ناتھ تم کہاں ہو ناتھ تم کہاں ہو۔ پہلی آواز پر تو میرے یار نے

پاؤ بھر کی پیک تھوکی اور دوسری پر فوراً جواب دیا۔ وہی یہ بیٹھا ہوں تھوک نا ہوئی ——— آگے کی سیٹ پر ایک میاں بیوی بیٹھے تھے۔ کچھ چھینٹے محترمہ کے سر اور ساری پر پڑے۔ انہوں نے میاں سے کہا۔ میاں نے میسیتا کو ڈانٹا۔ یہ نہایت اطمینان سے بولے۔ وہی تھوکا تو ہم نے جنگلا دیکھ کر ہی تھا اب کوئی ایک آدھ چھینٹ کہیں سے جنگلا پر جا پڑی ہو تو ہم کو خبر نہیں۔

خدا خدا کرکے وہ تماشہ ختم ہوا اور ہم نے قسم کھائی کہ شریف ہوں تو اب میسیتا کے ساتھ روپیہ والے میں کبھی نہیں جاؤنگا شرافت کے تو یہ معنی تھے کہ اس کے ساتھ جانا ہی چھوڑ دیتا۔ اس سے ملنا جلنا ترک کر دیتا۔ جو اتنی سمجھ ہوتی تو بھلے ہی دن نہ ہوتے ——— غرض کہ ساتھ سنگ تو چھوٹا نہیں ہاں روپیہ والے میں جانے کی قسم ضرور کھالی۔

اب ہم خاصے سیانے ہو چلے تھے اور دنیا کی باتوں سے کچھ کچھ واقف۔ پڑوس میں ایک بڑی بی جانی بوا نام کی رہتی تھیں یہ کبھی طوائف تھیں۔ پر مدتوں سے توبہ کر کے گھر ہو بیٹھی تھیں۔ یہ مکان بھی ان کے اچھے زمانہ کا خریدا ہوا تھا۔ آدھے میں کرایہ دار بسا رکھے تھے آدھے میں خود رہتیں۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں وہ بھی عمر سے اُتری ہوئی۔ کہتی تھیں نکاح میں ہیں باقی حال اللہ بہتر جانتا ہے ہاں اتنا ہم کو بھی معلوم ہے کہ ایک داڑھی والے شیخ جی اکثر اندھیرے اجالے آتے دیکھے گئے تھے۔ اور ایک بالوجی کو بھی محلہ والوں نے پکڑا کہ سر بند گلی میں کیسے آئے اور پھر جانی بوا نے یہ کہکر چھڑا دیا

نہیں کہہ سکتا ہاں کچھ ایسا احساس تھا۔ جیسے کسی بچہ سے وعدہ کیا جائے کہ صبح تجھے نیا جھم جھم کا جوڑا ملے گا۔ اور وہ اس کی خوشی میں سو نہ سکے۔ سویرے منہ اندھیرے ہم چھت پر جا پہنچے اور لگے اِدھر اُدھر ٹہل کر کھنکارنے۔ اُن کے ہاں سائبان کے نیچے کئی چارپائیاں بچھی تھیں اور سب اپنے اپنے دوپٹے تانے سو رہی تھیں۔ بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد چوں باز کنی مادر مادر باشد۔ منڈے ہوئے جوگی، گھٹی ہوئی دوا اور سر سے پا تک دوپٹہ میں ملفوف عورت کو پہچاننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وہ پڑی سوتی رہیں اور یہاں دل میں گدگدیاں ہو رہی ہیں کریں تو کیا کریں۔ ادھر یہ دھڑکا لگا ہوا کہ دھوپ چڑھ جائے گی تو اماں بلا لیں گی اور خیر سے ابھی سورج نکلنے میں بھی آدھ گھنٹہ سے زیادہ تھا۔ پر ہمیں پل پل بھاری آخر یاد آیا کہ ہماری والی کا دوپٹہ گلابی تھا اور یہاں بھی بیچ والی چارپائی پر اسی رنگ کا دوپٹہ نظر آیا ہم نے اللہ کا نام لے کر ایک کنکری کھینچ ماری نشانہ نے خطا کی دل میں ڈرے کہ اگر کسی اور کے جا لگی تو اُدھم مچ جائیگی پر اتنی ہوشیاری کی کہ کنکری مار کر منڈیر کی آڑ میں ہو گئے۔ دل نہ مانا ایک اور ماری۔ وہ تیرہ بختی سے برابر والے سفید دوپٹہ پر جا پڑی اور اس میں سفید بگلا سا چونڈا نمودار ہوا اور ہم بھیگی بلی کی طرح منڈیر کے پیچھے دبک گئے۔ بڑھیا نے جو اپنے پر ٹھیکری پڑی دیکھی تو آگ بگولہ ہی ہو گئی۔ گلا پھاڑ کر چیخی۔ خدا کی مار ان مونڈی کالوں پر۔ سویرے ہی سویرے پتھر برسانے شروع کر دئے۔ یہ ہے کون مادر بخطا۔ اسکی آواز سے گلابی دوپٹہ جو برابر ہی لیٹا تھا کسمسا کر اور پوچھا نانی کیا ہوا۔ اب ہم منڈیر کے چھیدوں میں سے جھانک رہے ہیں۔ بڑھیا بولی اللہ جلے کس کی شامت نے دھکا دیا ہے۔ غارتی نے یہ پتھر کھینچ کر مارا وہ تو اللہ نے خیر کی میری آنکھ بچ گئی۔ کمبخت کھٹ سے میرے ماتھے پر لگا۔ مر جائے خدا کرے۔

نواسی بیگم کی آنکھ معاً ہماری چھت پر پڑی اور ظالم نے ہم کو تاڑ لیا۔ اب کچھ نہ پوچھو۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں خیال آیا کہ یہ آفت کی پرکالہ ہمارا نام لے دیگی اور بڑھیا ایک جھلّو ہے۔ لتے ہی تو لے ڈالے گی۔ بولی نانی وہ موا بھٹیارے والا ہوگا وہ ہی سویرے سویرے کوٹھے پر چڑھتا ہے۔ اپنی جان میں جان آئی۔ اس نے اتنا کہہ کر جہاں میں چھپا بیٹھا تھا وہاں کچھ اس طرح دیکھا جس کے معنی تھے بچہ دعا دو بچا لیا۔ نہیں تو ابھی پاپوش کاری کرا دیتی۔

بڑھیا تو منہ ہی منہ میں بکتی ہوئی نیچے اُتر گئی اور وہ بیگم پھر دوپٹہ تان لیٹ گئیں۔ ہم نے بھی بیٹھے بیٹھے سرکنا شروع کیا اور بیچ چھت پر آن کھڑے ہوئے۔ دل میں خوش تھے کہ کچھ نہ کچھ تو تعلق خاطر ہے جو ہماری پردہ داری کی ٭

(باقی آئندہ)

دِل کا دھوکہ

دنیا کا مختصر ترین افسانہ

از جناب عبد الجلیل دہلوی

تنہا جواب یہی ہے ...... "فریب محبت"
اس نے خودکشی کیوں کی؟ ......
وجہ تھی ——— محبت۔
زہرہ، عبید کو چاہتی تھی۔
ماں باپ نے اس کی محبت کا مذاق اڑایا۔ مگر زہرہ نے پرواہ نہ کی۔
کہا گیا تو لکھ پتی کی لڑکی ہے۔ "وہ" تجھ جتنا امیر نہیں
مگر زہرہ نے ایک کان گونگا ایک بہرہ کر لیا۔
زہرہ کا دل دُنیاوی لالچ سے بلند تھا۔ دل کی آگ میں
تپ کر اس کی محبت کندن بن چکی تھی۔
کہتے ہیں کہ انسان کو ایک شے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے اور وہ محبت ہے
زہرہ کو عبید سے محبت تھی۔
مگر جب خبر آگئی کہ عبید اپنے وعدے سے پھر گیا جب معلوم ہو گیا کہ اس کی دوسری جگہ شادی ہو گئی۔
اس وقت ———
اب لوگ کیوں پوچھتے ہیں کہ زہرہ نے کیوں خودکشی کر لی!

دوشیزۂ کالج کا سلام

از جناب کمال عظیم آبادی

یاد آیا میکدہ جب میں عاقل و فرزانہ تھا
قصرِ کسریٰ سے کہیں بہتر مرا کاشانہ تھا
اک نظر پڑتے ہی صد رشک چمن ویرانہ تھا
سامنے آنکھوں کے ہر دم شیشہ و پیمانہ تھا

چشمِ میگوں میں بھری رہتی تھی مستی رات دن
ایک میں تھا اور شغلِ مے پرستی رات دن

ابتدائے موسمِ گرما تھی، دن عشرت فزا
چل رہی تھی دائما طوفانِ مسرت کی ہوا
گنگناتا، مسکراتا، کھیلتا اور جھومتا
سائیکل پہ طے میں اک دن کر رہا تھا راستا

چلتے چلتے جبکہ پہونچا ہوں چھتر منزل[۱] کے پاس
میٹھا میٹھا درد سا ہونے لگا کچھ دل کے پاس

سانس کچھ کچھ تیز تیز آنے لگی جانے لگی
دردِ پنہاں کی خلش رہ رہ کے تڑپانے لگی
قید خانہ میں بدن کے روح گھبرانے لگی
کیفیت اک بیخودی کی قلب پر چھانے لگی

کاروانِ ہوش نذرِ چشمِ مستانہ ہوا
غفلتِ پیہم بڑھی اتنی کہ دیوانہ ہوا

درد سے واقف نہ تھا تکلیف سے تھا بیخبر
یہ نہیں معلوم تھا عشرت ہی مجھ پر نوحہ گر
چرخِ فتنہ ساز میں ہے انقلابی اثر
اتفاقاً سامنے کو جا پڑی میری نظر

تانگہ اک جاتا تھا اور حالت یہ تھی رفتار کی
جس طرح سے نبض چلتی ہو کسی بیمار کی

بیٹھی تھی تانگہ پہ اک دوشیزۂ گیسو دراز
سیمتن، کافر ادا، قاتل صفت، محشر طراز
دشمنِ جاں، ماہ طلعت، حشر ساماں، دلنواز
جس کے دامن پر فرشتے آ کے پڑھتے ہیں نماز

شیخ حیراں اور زاہد دیکھ کر دیوانہ تھا
پیکرِ معصومیت میں جلوۂ جانانہ تھا

شمع آسا، خوبصورت، گل بدن، نازک ادا
ساحرِ خونیں نگاہ و رہزنِ رنگیں نوا
مرکزِ شعر و سخن، دلدار، دلکش، دل ربا
پرتوِ برقِ تجلی، جلوۂ ذاتِ خدا

تھا جبینِ ناز پر نورِ ازل چھایا ہوا
دیکھتا تھا آسماں بھی اس کو للچایا ہوا

اُس قدِ موزوں پہ وہ دھانی دوپٹہ کی بہار
مخملیں شلوار میں ملبوس پائے گل نثار
جسم میں آبِ رواں کا ایک کرتہ پردہ دار
پاؤں میں اک خوبصورت سینڈل رشکِ نگار

[۱] لکھنؤ کی ایک تاریخی عمارت (کمال)

چوڑیاں گوری کلائی میں پڑی تھیں اس طرح
صندلیں شانوں سے کالے ناگ لٹکیں جس طرح

وہ کھلی گردن کے نیچے کی سپیدی کا سماں
دیکھ کر چاکِ گریبانِ سحر کا ہو گماں

سُرخیٔ لب سُرخیٔ رنگِ شفق کی داستاں
نیم عریاں بازوؤں میں شاخِ گل کی شوخیاں

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف وہ کافر کی جوانی جوش پر آئی ہوئی

میکدہ آنکھوں میں، گیسو دوش پر، جنت بدست
بے خبر خونریزیوں سے اپنی بے مہری میں مست

بے خود و سرشارِ جامِ بادۂ روزِ الست
زہد و تقوے بھول جائیں دیکھ کر یزداں پرست

ٹوٹ کر تارے گریں اس کی شہادت کے لئے
بھیجدے قدرت فرشتوں کو عبادت کے لئے

اک کلائی میں گھڑی تھی ایک میں تھیں چوڑیاں
بجلیوں پر کان کی قربان فلک کی بجلیاں

ناک میں چھوٹی سی کیل اک الحفیظ والاماں
مرکزِ تخئیلِ عالم، شعلۂ برقِ تپاں

آفتابِ شعر کوئی آسمانِ شاعری
ہو نچھاور اس کے قدموں پر جہانِ شاعری

عارضِ دلکش تھا ایسا کہ اک رنگیں گلاب
تھی تبسم میں نہاں بجلی تو آنکھوں میں شراب

اُف ری وہ کافر جوانی اُف رے وہ ظالم شباب
انقلاب الانقلاب الانقلاب الانقلاب

تن کے گر انگڑائی لے افلاک کو پسپا کرے
اک اشارے سے زمانہ کو تہ و بالا کرے

فرد تھی رنگیں ادائی میں جفا میں طاق تھی
پھونکنے میں خرمنِ عقل و خرد مشاق تھی

بے نیازی میں یگانہ شہرۂ آفاق تھی
روئے روشن پر کسی کی اک نظر بھی شاق تھی

نازپرور، نازنیں، نازک بدن، ناز آفریں
پردۂ سوزِ دروں میں سازِ دردساز آفریں

جانِ یونیورسٹی، معبودۂ جادو بیاں
جس کی تحریروں میں خوبی برق و آتش کی نہاں

پردۂ تقریر میں پنہاں چمکتی بجلیاں
نازشِ زیب النساء و ملکۂ نور جہاں

کائناتِ شاعری، روحِ غزل، جانِ ادب
ہر قدم پر اس کی باتوں سے عیاں شانِ ادب

اس کے قدموں پر شہنشہ تخت و تاجِ زر رکھیں
مردِ میدانِ بلاکش نیزہ و خنجر رکھیں

جبہ و دستارِ شیخِ مسجد و منبر رکھیں
آسمانوں سے فرشتے آکے اپنے سر رکھیں

تھی ضرورت اس کی دنیا کی جبیں کے واسطے
اک خدا بھر فلک ہو، اک زمیں کے واسطے

اک ادا سے ہاتھ اُٹھایا اس نے کرنے کو سلام
جس طرح سے ہو کوئی شمشیرِ رنگیں بے نیام

کون تھا وہ رہزنِ ایماں بتاؤں کس کا نام
مسکرا کر لوٹ لی دُنیائے دل جس نے تمام

گو کہ تھا میں ہوش میں پر ہوش سے بیگانہ تھا
دل ہمارا اس کی شمعِ حُسن کا پروانہ تھا

وہ سلامِ کشتگاں پرور بعنوانِ جفا
جس نے قلبِ زخم خوردہ میں نمکداں رکھدیا

کس طرح چشمِ کمالِ زار سے دیکھا گیا
پھر وہ پیشانی پر اس کے ہاتھ رکھنے کی ادا

زندگی بھر خون کے آنسو ہمیں رلوائے گی
بعدِ مُردن روح کو زیرِ لحد تڑپائے گی

بنگالی کے بلند پایہ افسانہ کا عکس لطیف

یہ اُسکی بھول تھی!

از جناب مولانا ابومحمد امام الدین رام نگری

خط لکھنے کے بعد سوشیل نے اسے کئی بار پڑھا۔ پھر لفافے میں رکھتے ہوئے پکارا "راموا" رامو آیا۔

سوشیل لفافے پر ٹکٹ لگا کر بولا "اسے ابھی ڈاک خانے میں چھوڑ آؤ۔ بہت ضروری خط ہے دیر نہ کرنا"۔

"ابھی گیا حضور!" رامو خط لیکر باہر چلا گیا۔

سوشیل کھلی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ دن کے نو بجے تھے۔ آسمان دھوپ سے چمک رہا تھا۔ سامنے والے مکان سے ریڈیو کی آواز آرہی تھی۔

سوشیل کے منہ سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ اسے اب سے چالیس سال پہلے کا زمانہ یاد آگیا۔ جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا اور اسے اپنے دوست بسنت چودھری کے بغیر ایک لمحہ بھی اچھا نہ معلوم ہوتا تھا اب بسنت چودھری دنیا میں موجود نہیں۔ چھ مہینے ہوئے اس کا انتقال ہوگیا۔

سوشیل نے سرلا سے کہا "سنتی ہو سرلا" سرلا رسوئی گھر میں روٹیاں پکا رہی تھی بولی "کیا ہے؟"

سوشیل نے کہا "بڑا نگر میں بسنت چودھری کا جو مکان ہے نا۔ میں اسے خریدنا چاہتا ہوں۔ وہ سالک ناتھ کے ہاں رہن ہے۔ میں نے آج سالک ناتھ کو خط لکھ دیا ہے"۔

سرلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سوشیل نے کہا "میں کورٹ سے دو تین بجے تک واپس آؤنگا۔ اور وہاں سے سیدھے مکان دیکھنے چلا جاؤں گا۔ دیکھوں اب وہ کس حال میں ہے؟ تم بھی چلوگی میرے ساتھ؟"

سرلا نے کہا "نہیں"۔

سوشیل بولا "اچھا پہلے میں خود دیکھ آؤں پھر تم بھی کسی روز..... کیوں کیا رائے ہے؟"

سرلا نے کچھ جواب نہیں دیا۔

سوشیل نے کہا "بہت دنوں سے مکان رہن تھا۔ جسے وہ چھڑا نہ سکے اور جن کے پاس ہے وہ اب اسے رکھنا نہیں چاہتے۔ اسلئے اس نے سوچا....." وہ جملہ پورا کئے بغیر ہی باہر چلا گیا۔

بسنت سوشیل کا کلاس فیلو تھا۔ اس کے باپ ایک بڑے زمیندار تھے۔ وہ روزانہ ٹم ٹم پر سوار ہوکر اسکول آتا۔ وہ نہایت حسین، اور توانا و تندرست لڑکا تھا۔ جب وہ نفیس اور دیدہ زیب لباس میں ملبوس، بال سنوارے اپنے کلاس میں داخل ہوتا تو لڑکوں کی نگاہیں بے اختیار اس کی جانب اُٹھ جاتیں۔

سوشیل اپنے کلاس کا مانیٹر تھا۔ بسنت نے جلد ہی اس سے راہ و رسم پیدا کرلی اور اب وہ سوشیل کو بھی اپنی ہی ٹم ٹم پر بٹھا کر اس کے گھر پہنچا دیتا۔

ایک روز دوپہر کی چھٹی کے بعد بسنت نے کہا "دوست! آج میری سالگرہ ہے رات کو میرے ہاں تمہاری دعوت ہے"۔

سوشیل سوچنے لگا۔ وہ اس کے گھر کس طرح جائیگا؟ کیا پہن کر جائیگا؟ نہ اس کے پاس اچھے کپڑے ہیں، نہ اچھے جوتے ٹوپی بھی پرانی ہی ہے۔

بسنت بولا "تم چپ کیوں ہو؟"

سوشیل عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ جانے سے انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اور جانے کے لائق اس کے پاس کپڑے بھی نہ تھے وہ خاموش تھا۔

بسنت نے پھر کہا "بولو منظور کرتے ہو یا چل کر کہوں تمہاری ماتا جی سے کہ وہ تمہیں ضرور بھیجیں"۔

سوشیل نے ہنس کر کہا "ماں سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں میں خود چلا آؤں گا"۔

"سچ کہتے ہو؟"

"ہاں اطمینان رکھو"۔

"وہاں کچھ زیادہ بھیڑ ویڑ تو ہوگی نہیں اور جو لوگ آئیں گے ان سے ہمارا کوئی واسطہ نہ رہے گا۔ ہم تم کہیں اکیلے بیٹھ کر بات چیت کریں گے"۔

سالگرہ کے بعد سے دونوں کے تعلقات میں اور اضافہ ہوگیا۔

اس طرح تین برس گزر گئے۔ اس درمیان میں کسی کی ماں مرگئی تو کسی کے باپ کا انتقال ہوگیا، پھر بھی ان کی دوستی پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔

※ ※ ※ ※ ※ ※ ※ ※

اسکول کی تعلیم ختم کرکے بسنت اپنے گاؤں چلا گیا۔ اور سوشیل اسکالرشپ لے کر کالج میں داخل ہوا۔ اس علیحدگی کے بعد نہ دونوں میں ملاقات ہوئی اور نہ خط و کتابت۔ بسنت سوشیل کو اس

طرح بھول گیا جیسے زندگی میں اس نام کے کسی لڑکے سے کبھی اس کی ملاقات ہی نہ تھی۔ مگر سوشیل بسنت کو بھلا نہ سکا۔

اس کے پانچ برس بعد کا تذکرہ ہے۔

سوشیل لاء پاس کر کے ہائیکورٹ میں وکالت کر رہا تھا۔

ایک روز جب سوشیل ہائیکورٹ سے واپس آ رہا تھا۔ یکایک کسی نے اس کی پشت پر ہلکی تھپکی رسید کی۔ سوشیل نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اور چلا اٹھا

"ارے بسنت تم کہاں؟"

بسنت بولا "کورٹ میں کچھ کام تھا"

سوشیل نے کہا "میں نے تو سمجھا تھا تم مجھے بھول گئے ہو گے"

بھلا یہ بھی ممکن ہے؟ اخبارات کے عدالتی کالموں میں اکثر تمہارا تذکرہ نظر سے گزرتا رہتا تھا"

"اچھا"

بسنت ہنس کر بولا "ہاں، اب تم کہاں رہتے ہو؟"

سوشیل نے کہا "اب میں بھوانی پور میں رہتا ہوں۔ سرلش روڈ پر مکان ہے اور تم آج کل کلکتے ہی میں ہو کیا؟"

بسنت "نہیں مگر اب رہنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ پتاجی کے مرنے کے بعد بالی گنج کا مکان تو فروخت ہو گیا۔ بڑا بگر میں دوسرا مکان بنوا رہا ہوں۔ میرے ماموں یہاں کے ایک آفس میں ہیڈ کلرک ہیں۔ میرا خیال ہے میں بھی اس میں ملازمت کر لوں"

سوشیل نے کہا "تب تو اب برابر ملاقات ہوتی رہے گی"

بسنت بولا "امید تو ہے اور ہاں تم نے کہیں شادی ہوا دی کی یا ابھی اسی طرح ہو؟"

سوشیل نے کہا "ابھی تو میں نے شادی نہیں کی۔ اور تم نے؟"

"میں نے بھی نہیں۔ شادی کے تمام انتظامات ہو چکے تھے۔ مگر پتاجی کی ناگہانی موت سے وہ ملتوی ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ ادھر میں خود پریشان ہوں"

بسنت نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

"خیر جو ہونا تھا تو وہ ہو چکا۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ تم اپنے مکان کا پتہ بتاؤ۔ میں اسی اتوار کو تمہارے ہاں آؤں گا"

سوشیل نے پتہ بتا دیا۔ یہ کوئی منوہر روڈ کا ٹین کا مکان تو تھا نہیں جو اسے بتانے میں کوئی حجاب محسوس ہوتا۔

ہائیکورٹ کے ایک کامیاب وکیل سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے کا کون خواستگار نہ ہو گا سوشیل کے ہاں روز ہی ایسے لوگ پہنچتے رہتے تھے۔ سوشیل ان لوگوں سے تنگ آ چکا تھا۔

ایک روز لچھمن بابو نے صبح ہی صبح آ کر کہا

"کیوں انکار کرتے ہو بیٹا۔ میری سرلا ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ میٹرک پاس ہے سلیقہ مند ہے۔ اس کے علاوہ شادی کے تمام مصارف میں خود اپنے ذمہ لے رہا ہوں"

سوشیل نے کہا "آپ لوگوں نے میری عافیت کڑوا دی۔ اطمینان سے کام کرنا دشوار ہے۔ خیر جائیے مجھے آپکی بات منظور ہے"

بسنت نے بھی شادی میں شرکت کی اور کئی قیمتی زیور سرلا کو شادی کے تحفے میں دئیے۔ وہ برابر سوشیل سے ملنے آتا رہا۔

ایک روز بسنت نے سرلا سے کہا۔

"آپ میرے گھر نہ چلیں گی بھابھی"

سرلا بولی "اپنے دوست سے کہئے"

بسنت نے کہا "اگر آپ چلنے کیلئے رضامند ہوں تو میں ان سے کہوں"

سرلا بولی "بھلا آپ کہیں اور میں رضامند نہ ہوں مگر میں نے تو سوچا تھا کہ آپ کی شادی کے موقع پر چلوں گی"

بسنت نے ہنس کر کہا "اب وہ دن بھی آنے ہی والا ہے بھابی۔ گھبرائیے نہیں"

اگلے مہینے ایک زمیندار کی بیٹی سے بسنت کی شادی ہو گئی۔ اس کی بیوی کا نام ساوتری تھا وہ نہایت حسین خوش ادا عورت تھی۔

ایک روز سرلا نے سوشیل سے کہا۔

"اجی کسی دن بسنت اور اس کی بیوی کو مدعو نہیں کرتے؟"

سوشیل بولا "ابھی ٹھہر جاؤ۔ پھر دیکھا جائیگا"

"دیکھا کیا جائے گا۔ ایک روز بلاؤ"

"ارے بھئی وہ زمیندار کی بیٹی ہے کہیں میرے ہاں آنے سے انکار کر دے تو"

"تم بھی عجیب آدمی ہو۔ اگر تم کہنا نہیں چاہتے ہو تو میں خود بسنت بابو سے کہوں گی"

سوشیل کچھ نہ بولا۔

دوسرے روز بسنت آیا تو سرلا نے کہا

"کسی دن دلہن کو نہ لاؤ گے میرے ہاں؟"

بسنت ہنس کر بولا "کوئی حرج تو نہیں تھا بھابی۔ یہ تو اپنا گھر ہے مگر"

"مگر کیا؟"

"ساوتری آج کل یہاں ہے نہیں۔ بنارس میں اس کی دادی بیمار ہیں انہی کو دیکھنے گئی ہوئی ہے"

ایک روز سوشیل کھرپی لئے آنگن میں پھول کی کیاری سے گھاس صاف کر رہا تھا اتنے میں ساوتری نفیس اور قیمتی ساڑی بلاؤز میں ملبوس آ کر سامنے کھڑی ہو گئی اور

مسکرا کر بولی: "باغبانی ہو رہی ہے؟"

"جی ہاں!"

"بہن جی کہاں ہیں؟"

"آپ تشریف رکھئے میں انکو اطلاع دیتا ہوں"

ایک کمرے میں کچھ کوچ رکھے ہوئے تھے۔ سوشیل نے اس میں ساوتری کو بٹھا کر کہا: "میں ان کو بھی بلاتا ہوں"

سوشیل نے اوپر جا کر کہا: "نیچے ساوتری آکر بیٹھی ہے وہ ایک زمیندار کی بیٹی اور بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ اس کے سامنے کپڑے بدل کر جانا"

سرلا کپڑے بدل کر ساوتری کے پاس گئی۔

سوشیل ہاتھ منہ دھو کر کمرے میں گیا تو دیکھا ساوتری واپس جانے کی کوشش کر رہی ہے اور سرلا کہہ رہی ہے "ایک پیالی چائے ہی پی لیجئے"

ساوتری کچھ مسکرا کر بولی: "کسی دوسرے روز پی لوں گی۔ آج میں کچھ یہاں آنے کا ارادہ کر کے تو آئی نہیں تھی۔ بھوانی پور میں میری موسی رہتی ہیں وہ بیمار تھیں انہیں کو دیکھنے کیلئے آئی تھی۔ سوچا واپسی میں تم سے ملتی چلوں۔ ہاں بہن ایک روز ہمارے ہاں بھی آؤ نا۔ اب تو ادھر مجھے کہیں آنا جانا ہے نہیں۔ گھر ہی پر ہونگی"

ساوتری رکی نہیں۔ اٹھ کھڑی ہوئی سرلا اسے گاڑی تک پہنچانے گئی۔

ٹیبل پر طشتری میں ترشے پھل، سنڈوِچ، رس گلے وغیرہ سب رکھے تھے مگر ساوتری نے ان میں سے کسی کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔

سرلا ساوتری کو پہنچا کر اندر آئی تو دیکھا سوشیل بُت بنا کھڑا ہے۔

سوشیل نے سرلا سے پوچھا "کیا اس نے کچھ بھی نہیں کھایا؟"

"نہیں؟"

"ہاں زمیندار کی بیٹی ہے نا۔ وہ کیوں کھانے لگی۔ وہ تو صرف اپنی سج دھج دکھانے کیلئے آئی تھی"

سرلا بولی: "نہیں نہیں، یہ بات نہ تھی۔ آج وہ یونہی چلی آئی تھی۔ ابھی کل ہی تو وہ بنارس سے آئی ہے۔ اس کی دادی کا سرگباش ہو گیا"

سوشیل نے کہا۔ "تم نہیں سمجھتیں۔ وہ اپنے قیمتی لباس اور زیور سے تم پر اپنی دولت و امارت کی دھاک جمانے آئی تھی"

سرلا پھر کچھ نہ بولی۔

سوشیل نے پھر کہا: "کوئی ٹرین سے تو جانا نہیں تھا کہ ٹرین چھوٹی جاتی تھی۔ ایک پیالی چائے تک نہیں پی۔ اسے اپنی دولت مندی کا اتنا غرور ہے"

~~~~~

سوشیل جیسے ہی کورٹ سے گھر واپس آیا۔ سرلا نے اسے ایک خط دیتے ہوئے کہا: "ساوتری نے ہمیں کل بہت اصرار کے ساتھ اپنے ہاں بلایا ہے۔ اسلئے اگر ہم نہ جائیں گے تو اسے بہت صدمہ ہوگا لکھا ہے۔ کل اتوار ہے۔ کورٹ میں تعطیل رہے گی۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھانا۔ اس کے بعد شام کو سب ایک ساتھ سینما دیکھنے چلیں گے۔ کل صبح نو بجے تک کار پہنچ جائے گی"

سوشیل کو تین روز پہلے کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے میرے ہاں ایک پیالی چائے تک نہ پی تھی۔

سوشیل نے کہا: "میں کبھی اس کے ہاں نہ جاؤنگا۔ اور نہ تمہیں جانے دونگا"

"آخر کیوں کوئی بات بھی تو ہو"

"میں اپنی اس روز کی توہین کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا"

"کیسی توہین؟"

"تم بھی کس قدر سادہ لوح ہو سرلا۔ اس نے ہمارے ہاں ایک پیالی چائے تک پینا گوارا نہ کیا۔ یہ توہین نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ دولتمند ہے تو اپنے گھر خوش رہے۔ میں اپنے گھر خوش رہونگا میں اس کا کچھ محتاج تو ہوں نہیں"

سرلا پھر کچھ بول نہ سکی۔

دوسرے روز نو بجے بسنت کار لے کر آیا تو سوشیل فائل کھولے کوئی چیز دیکھ رہا تھا۔

بسنت نے کہا: "خوب، ابھی تم بیٹھے فائل ہی دیکھ رہے ہو"

سوشیل بسنت کی طرف دیکھ کر بولا: "مجھے اس کے سوا اور کرنا ہی کیا ہے"

"ساوتری نے بھابی کو خط نہیں لکھا تھا؟"

سوشیل نے اپنے جذبات کو دباتے ہوئے کہا: "ہاں۔ لیکن ہم جا نہ سکیں گے"

"کیوں؟"

"آج مجھے بہت کام ہے۔ تم جانتے ہو میں مزدور پیشہ آدمی ٹھہرا۔ روز کنواں کھودنا اور پانی پینا۔ جس روز کام نہ کروں"

مگر بسنت نے اس کی ایک نہ سنی۔ اسے زبردستی پکڑ لے گیا۔

بڑانگر میں گنگا کنارے ایک شاندار مکان اور اسی سے ملا ہوا ایک خوبصورت باغ تھا۔ سرلا اور ساوتری اس کے ایک کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

یکایک ساوتری نے پکارا: "رادھا دیدی!"

رادھا آئی۔ سرلا اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کی زبان سے بیساختہ نکل گیا "رادھا بوا"

رادھا بھی ساتھ ہی بول اٹھی: "سرلا!"

رادھا رشتہ میں سرلا کی بوا لگتی تھی۔
~~~~~

بیچاری بیوہ عورت تھی۔ کوئی وارث نہ ہونے کے باعث بسنت کے ہاں کام کاج کر کے کسی طرح زندگی گذار رہی تھی۔

سوشیل پر جیسے بجلی گر پڑی۔

ساوتری بولی: "ایں۔ کیا تم بہن کی بوا ہوتی ہو؟"

رادھا نے کہا: "میری ہی گود میں کھیل کھا کر تو یہ اتنی بڑی ہوئیں۔ کیا کروں، میری قسمت ہی ......"

سوشیل جیسے اپنے آپ میں نہ ہو۔ کھانے کیلئے ہاتھ دھونے بیٹھا تو ہاتھ سے گلاس چھوٹ پڑا۔ اور اسکے تمام کپڑے تر بتر ہو گئے۔

ساوتری نے کہا: "میں دوسرا آسن لائے دیتی ہوں۔ آپ یہ کپڑے اتار دیجئے"

دوسرا آسن اور کپڑے لیکر ساوتری آئی۔ سوشیل کپڑے پہن کر آسن پر بیٹھا مگر یہ سب اسے ایک خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔

ساوتری بیٹھی سرلا سے باتیں کر رہی تھی۔ بسنت بھی اس میں کچھ کچھ حصہ لے رہا تھا مگر سوشیل بالکل افسردہ اور خاموش تھا۔

ساوتری بولی۔ سوشیل بابو! آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ اتنے گم سم کیوں بنے ہوئے ہیں؟"

سرلا بولی: "انہیں تو دن رات کسی نہ کسی موکل کا بھوت سوار رہتا ہے۔ لاکھ کہتی ہوں کہ اس کے علاوہ بھی دنیا میں کچھ ہے۔ مگر ان پر میرے کہنے کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی کسی موکل کے خیال میں گم ہوں گے۔"

سوشیل کو جیسے یکایک ہوش آگیا ہو۔ وہ بولا: "اُف تین بج گئے۔ مجھے جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہیئے۔ تارا ناتھ کے ہاں ضروری کانفلیشن ہے۔ اس کے تمام کاغذات بھی میرے ہی پاس ہیں۔

ساوتری نے کہا: "تو آپ کار لیتے جائیے اور کانفلیشن طے کر کے فوراً آئیے"

سرلا بولی: "ٹھیک تو ہے۔"

"نہیں اب ہمیں گھر چلنا چاہیئے۔"

آخر سوشیل کسی کے روکنے سے نہ رکا۔ اور سرلا کو لے کر گھر چلا آیا۔

اس کے بعد سے سوشیل نے بسنت سے اپنا تعلق تقریباً منقطع کر لیا۔ بسنت نے کئی بار آ کر کہا بھی کہ آج کل ساوتری کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ اسلئے وہ نہیں آسکی۔ اس نے بہت طرح سے تمہیں بلایا ہے۔ مگر سوشیل نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "معاف کرنا بسنت میرا پیشہ ایسا خراب ہے کہ مجھے دم لینے کی فرصت نہیں ملتی۔"

بسنت نے کہا: "مقدمے اور موکل کے سوا تمہیں کبھی اور چیز سے کوئی واسطہ نہیں؟"

"یس!"

"اچھی بات ہے۔"

اس کے بعد پھر بسنت نہ آیا۔

سوشیل اخباروں میں اکثر بسنت چودھری کا تذکرہ پڑھا کرتا۔ وہ کسی کپڑے کی مل کا منیجنگ ڈائرکٹر ہے تو کسی انشورنس کمپنی کا روح رواں۔ کسی ادبی کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کا صدر ہے تو کسی قومی ادارے کا سرپرست۔ صوبے میں بسنت کو کافی شہرت و عزت ہو گئی تھی۔ مگر سوشیل کو عدالتی کاموں کے سوا کسی چیز سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ حالانکہ اب وہ کافی سرمایہ جمع کر چکا تھا۔ وہ بنک کی کاپی کو کھولتا تو کیش بیلنس کے اعداد دیکھ کر اس کا دل خوش ہو جاتا وہ سوچتا۔ ایک انسان اپنی عمر میں اس سے زیادہ اور کیا کما سکتا ہے؟ اسے اپنے ٹیلنٹ کے ٹوٹے ہوئے گھر اور بسنت کی ٹم ٹم پر چڑھنے کی یاد آتی تو اسے بہت شرم محسوس ہوتی اب اس نے بھوانی پور میں ایک بہت بڑی عمارت خرید لی تھی۔ اس کے پاس ایک عمدہ کار بھی موجود تھی۔ اب وہ سوشیل کمار ایڈووکیٹ کے نام سے مشہور تھا۔

* * * *

سوشیل دو بجے اپنی کار پر بیٹھ کر بڑا نگر کا مکان دیکھنے گیا۔ سالک ناتھ بھی ساتھ تھے جن کے ہاں یہ مکان رہن تھا۔

ملک اور اہل ملک کی خاطر بسنت کس قدر مقروض ہو گیا تھا۔ اس کا علم لوگوں کو اس کے انتقال کے بعد ہوا۔

ساوتری اس کے پاس آئی۔ وہ کبھی حسن و جمال کا مجسمہ تھی۔ لیکن اب وہ ہڈی چمڑے کا ایک ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔

ساوتری بولی: "بہن، تو اچھی طرح ہیں؟"

"ہاں!"

"آپ ہی نے اس مکان کو لیا ہے اس سے میرے دل کو تسکین ہوئی نہیں تو ...."

اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

اس کا گلا بھر آیا۔

"ذرا چائے بنا لاؤں"

"نہیں رہنے دیجئے۔ ابھی مجھے مکان بھی دیکھنا ہے۔ قیمت طے ہونے کے بعد اسے میں نے صرف سرسری طور پر ایک بار دیکھا ہے۔"

"جی، تو چلئے میں آپکو ابھی دکھائے دیتی ہوں"

ساوتری مکان دکھانے لگی۔

مکان بہت خوبصورت اور شاندار تھا سامنے ہی ایک بڑا سا باغ بھی تھا۔

ساوتری بولی: "یہ سارا باغ میں نے خود تیار کیا ہے۔ یہ تمام درخت میرے ہاتھ کے لگے ہوئے ہیں۔ انہیں میں نے

خود پانی دے دے کر اتنا بڑا کیا ہے۔ مالی موجود تھا۔ مگر میں نے اس کو ایک روز بھی ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ مجھے ان درختوں سے بالکل اپنی اولاد کی طرح محبت ہے۔"

سوشیل خاموشی سے سب کچھ دیکھتا سنتا چلا جا رہا تھا۔

ساوتری بولی: "بیلے کی یہ کیاری آپ کے دوست نے اپنے ہاتھوں تیار کی تھی۔ جس طرح آپ اس روز کھرپی لیکر اسے درست کر رہے تھے۔ وہ بھی اکثر اسی طرح کیا کرتے تھے۔ اب تو یہ ان کی یادگار......"

ساوتری کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ سوشیل بالکل خاموش تھا۔

باغ دیکھ چکنے کے بعد اس نے مکان دیکھنا شروع کیا۔

ساوتری کہنے لگی: "اس مکان کو بھی انہوں نے بڑے شوق سے بنوایا تھا۔"

سوشیل بولا: "اب آپ کا کہاں رہنے کا ارادہ ہے؟"

"میں اس کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتی سوشیل بابو! میں نے بہت سے بہت سوچا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اور اب تو سوچنے کی طاقت بھی جواب دے چکی ہے۔ یہ مکان یہ باغ یہ تمام چیزیں اب مجھے......"

وہ ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔

سوشیل نے کہا: "تو اب آپ اس مکان کو چھوڑ دینا چاہتی ہیں؟"

"اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے؟ مجبوراً چھوڑنا ہی پڑیگا۔"

"نہیں نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں میں ابھی یہاں رہنے کیلئے تو آتا نہیں۔ اس مکان کو تو میں نے شوقیہ خرید لیا ہے آپ جہاں بھی رہیں گی کرایہ تو ضرور ہی دینگی۔ وہی کرایہ دے کر آپ اسی مکان میں رہئے گا۔ آپ کی موجودگی کے باعث مالی اور دوسرے نوکر بھی اپنے کام میں بے پروائی نہ کرینگے۔ اس طرح آپ سے کچھ فائدہ ہی ہو جائیگا۔"

ساوتری کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "نہیں سوشیل بابو۔ اس کی ضرورت نہیں۔"

سوشیل بولا: "اس میں حرج ہی کون سا ہے۔ آپ نہیں رہیں گی تو کوئی دوسرا کرایہ دار رہیگا۔ لیکن باغ اور مکان کی جس طرح آپ حفاظت کرینگی دوسرا کرایہ دار نہیں کر سکتا۔"

ساوتری آنکھوں کو خشک کرکے گلوگیر آواز میں بولی: "آپ بھی کتنے شریف اور نیکدل آدمی ہیں سوشیل بابو!"

سوشیل بابو: "میں نہ شریف ہوں اور نہ نیکدل۔ میں تو صرف دنیا کمانا جانتا ہوں۔ میں آج سرلا کو نہ لا سکا لیکن کل وہ ضرور آئیگی۔ دیکھئے اس وقت جو بات ہوئی ہے وہیں تک رہیگی۔ آپ یہاں سے کہیں دوسری جگہ نہیں جا سکتیں۔"

گھر واپس آکر سوشیل نے سرلا سے کہا: "میں نے آج کتنے دنوں کے بعد ساوتری کو دیکھا بڑا صدمہ ہوا۔ اس کا تمام باغ اور مکان اس کے شوہر کی یادگاروں سے بھرا ہوا ہے اگر اس مکان کو کوئی اور خرید لیتا اور ساوتری کو اسے چھوڑنا پڑتا تو شاید رنج اور صدمے سے وہ دیوانی ہو جاتی۔ اسلئے میں نے کرایہ کے حیلے سے اس کو اسی مکان میں رہنے پر رضامند کر لیا ہے۔ اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ آج سرلا نہ آسکی کل ضرور آئیگی اگر میں یہ نہ کہتا تو اس کی حمیت و خودداری کو بہت صدمہ پہنچتا۔ میری غلطی تھی جو میں اسے مغرور سمجھتا تھا۔ اسی غلط فہمی میں پڑ کر میں نے اپنے ایسے شریف اور نیکدل دوست کو کھو دیا۔ اور اس کی زندگی کے آخری لمحات میں اسے دیکھنے نہ گیا۔ یہ صدمہ مرتے دم تک میرے دل سے دور نہ ہوگا۔" سوشیل چپ ہوگیا۔

طالب علم کی ڈائری (بقیہ صفحہ ۳۸)

والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

۷ ؍ جون

سیکنڈ کلاس پاس ہوگیا ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔ بیکار ہوں مگر گناہوں سے دور۔ میرے عزیز دوست عبدالباری مجھ پر بہت مہربان ہیں میں انکا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے گناہ کی آلودگیوں سے نجات دلائی۔ وہ بار بار مجھ سے اصرار کر رہے ہیں کہ میں تجارت کروں اور ان ہی کے پیسوں سے۔ دنیا میں دوستوں کی کمی نہیں۔ مگر سچے دوستوں کی کمی ضرور ہے۔ آج بھائی عبدالباری کی وساطت سے دکان کھول رہا ہوں۔

۳ ؍ اگست

دوکان خوب چل رہی ہے۔ خدا نے خوب برکت دی ہے۔ رحمتوں کی بارش دن رات ہو رہی ہے۔ مسجد اور ایک مدرسہ تعمیر کرانے کیلئے شہر کے بارونق حصہ میں ٹکڑہ اراضی خرید کر لیا ہے۔ اس امید میں کہ شاید بے نیاز میرے گناہ بخش دے۔ رات دن یہ شعر وردِ زبان رہتا ہے ؎

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت
کریم تو ہی بتا دے حساب کرکے مجھے

سچا واقعہ فرضی قصہ کہانی سے کہیں زیادہ دلچسپ اور جاذبِ توجہ ہوتا ہے!

جب میں جوان تھی

اردو میں اپنی قسم کی پہلی آپ بیتی جو آپ کی راتوں کی نیند حرام کر دیگی!

ایک حسن فروش عورت کی عبرت آموز داستان

از حضرت [illegible]

اس کے اپنے قلم سے، اتنی دلچسپ، اتنی سنسنی خیز اور ہنگامہ خیز کہ پڑھنے سے آپکی طبیعت سیر نہ ہوگی بلکہ بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔ (اقساط سابقہ کا خلاصہ) شانتا لکھتی ہے۔ میرے والد مسلمان بیرسٹر تھے۔ اور والدہ ایک کشمیری برہمن کی لڑکی۔ دونوں کی شادی سول میرج سے ہوئی تھی۔ چونکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی اسلئے میری پرورش نہایت لاڈ پیار سے ہوئی اور میری تعلیم وتربیت پر کافی روپیہ خرچ کیا گیا۔ مقامی میونسپلٹی کے چیرمین کی والد مرحوم سے بڑی بے تکلفی تھی۔ میں ان دنوں کالج میں پڑھتی تھی۔ اور ان کا جوان لڑکا پربھو دیال متعلم کلکتہ کالج موسم گرما کی رخصتوں پر گھر آیا ہوا تھا۔ وہ ہمارے یہاں آنے جانے لگا۔ پربھو بیس اکیس سالہ کا خوبصورت جوان تھا۔ اس کی باتیں بڑی چٹخارے دار ہوتی تھیں۔ ایکدن وہ مجھے کمپنی باغ میں لے گیا اور کہنے لگا "شانتا! میں تمہاری تصویر یہیں فوارے کے پاس لینا چاہتا ہوں" میں وہیں کھڑی ہوگئی۔ پربھو میرے قریب آیا۔ اس نے میری ٹھوڑی اور رخسار کو چھو کر کہا "گردن کو ذرا خم دیکر چہرہ کو اس انداز سے رکھو" پربھو نے جب اپنے نرم ونازک ہاتھ سے میرے رخسارے کو مس کیا ہے۔ میں نے دیکھا اسکے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور میرے بدن میں ہلکی سی جھرجھری پیدا ہو رہی ہے ۔۔۔۔ اچانک کیمرہ پربھو کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا اور چکنا چور ہوگیا۔ اس واقعہ کے کوئی سات آٹھ دن بعد پربھو سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگا۔ آج شام کو کارلٹن میں میرے ساتھ چائے پیو۔ ٹھیک ۵ بجے آجانا۔ میری قسمت ٹھیک وقت پر گھر سے ہوٹل کی سمت روانہ ہوئی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے والدہ کی مرضی کو ٹھکرا کر پربھو کی دعوت قبول کی۔ کارلٹن ہوٹل میں پہونچکر پربھو کے دوست کامتا اور لاجونتی سے ہماری ملاقات ہوئی۔ مؤخر الذکر کالج میں کامتا کی کلاس فیلو تھی۔ برس پندرہ یا سولہ کا سن اس پر سونے میں سہاگہ بلا کی حسین اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ مگر مجھے شک گزرا کہ کامتا کے ہتھے چڑھ کر غریب لاجونتی اپنے عصمت کے ایسے بے بہا موتی کو ہاتھ سے کھو چکی ہے۔ پربھو اور کامتا چند منٹ کیلئے اٹھ کر باہر گئے تو میں نے دیکھا کہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے نووارد ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ قریب ہی بیٹھے ہوئے دو آدمیوں کی باتیں میرے کان میں پڑیں "دونوں لڑکیوں کو دیکھو ان کے چہروں پر کتنی معصومیت اور شرافت برس رہی ہے۔ جیسے دنیا کی ہوا سے بالکل بے خبر ہیں۔ مگر ان کے کرتوت یہ ہیں کہ اپنے دوست آشناؤں کے ساتھ شہر کے بدنام ترین ہوٹل میں موجود ہیں" وہ چلے گئے اور میں ان کی باتیں سنتی رہی مجھے اپنے وجود سے نفرت سی ہونے لگی۔ میرا ضمیر ایکا ایکی بیدار ہوگیا۔ اور میرے دل کی آواز میرے کان میں آئی کہ "خبردار ٹھوکر سے پہلے ہوشیار" اسدن کے بعد مجھے سوسائٹی سے ایکدم نفرت ہوگئی اور میں گھر کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے لگی۔

پانچواں باب

کورٹ شپ

میرا اٹھان ابتداء ہی سے غضب کا تھا۔ جوان ہو کر میں اور زیادہ جاذب نظر ہوگئی۔ ہندوستانی والدین جوان لڑکی کو پہاڑ سمجھتے ہیں جب تک یہ پہاڑ ٹل نہیں جاتا۔ ان کو چین نہیں آتا۔ کسی ہندوستانی گھرانے میں اگر دس

لڑکے بھی جوان ہوں تو ان کو شادی کی کوئی خاص فکر نہیں ہوتی۔ لیکن ایک جوان لڑکی بھی گھر پر بھاری ہوتی ہے اور کنبہ خاندان والے اسی فکر میں رہتے ہیں کہ کہیں اس کا رشتہ ہو جائے۔ ہندوستان کی لڑکی خاندان اور قبیلے کے ننگ و ناموس کا مرکز ہوتی ہے۔ اور ہر شریف باپ اس مرکز کو قدرت کی معصوم ترین امانت سمجھ کر حفاظت کرتا ہے۔ جوان لڑکی کو گھر کی لاج کہا جاتا ہے۔

میرے والدین کو میری شادی کی فکر تھی اور وہ کسی موزوں اور مناسب بر کی تلاش میں تھے۔ اتفاق کی بات کہ ہمارے شہر کے ہسپتال میں جو سول سرجن تبدیل ہو کر آئے ان کا بڑا لڑکا پرشوتم بی اے کے آخری سال میں تعلیم پاتا تھا۔ پرشوتم کی صورت شکل بھی اچھی خاصی تھی سول سرجن اور میرے والد کی دوستی ہو گئی۔ پرشوتم بھی ہمارے یہاں آیا جایا کرتا تھا میرے والدین نے پرشوتم کو میرے لئے منتخب کر لیا تھا۔ پرشوتم کو بھی مجھ سے دلچسپی تھی اور وہ مجھ سے بات چیت کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مگر میں نے اس کی طرف کبھی التفات نہیں کیا۔ پربھو کے تعلقات کے نتائج میری آنکھوں کے سامنے تھے اور میں اب نوجوانوں سے میل جول کرنے کیلئے تیار نہ تھی۔ میرا اس قسم کی رنگین صحبتوں سے الگ تھلگ رہنا چاہتی تھی۔ مجھے اپنی تنہائی کی زندگی سے انس ہو گیا تھا اور میں اپنے خاموش اور تنہا ماحول میں بہت خوش اور مطمئن تھی۔ مجھے اس بات کا تجربہ تھا کہ جتنے تعلق وسیع ہوتے ہیں اتنی ہی فکریں بڑھ جاتی ہیں۔ اور ہر شخص کی دلجوئی اور خوشی کیلئے آدمی کو طبیعت کے خلاف بہت سی باتیں گوارا کرنی پڑتی ہیں۔

والدین نے ایک دن شب کے کھانے پر سول سرجن صاحب اور ان کے لڑکے پرشوتم کو مدعو کیا۔ دعوت کا بڑے شاندار پیمانہ پر انتظام کیا گیا۔ ہمارے یہاں آئے دن دعوتیں ہوتی رہتی تھیں مگر آج کی دعوت کا اہتمام بہت شاندار تھا۔ مالی کو باغیچہ کے سنوارنے کے لئے کئی دن پہلے تاکید کر دی گئی تھی۔ باغیچہ کی روشیں درست ہوئیں۔ فوارے کے حوض کی کائی کھرچ کر تازہ پانی بھرا گیا، گملوں کو قرینہ سے رکھا گیا۔ خشک اور خزاں دیدہ شاخوں اور پتیوں کو توڑا گیا۔ مکان کی صفائی کی گئی۔ صوفے، کرسیاں، میزیں اور گلدان قرینہ سے جمائے گئے۔ نوکروں نے صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ کھانے کی فہرست (Menu) تیار کی گئی۔ قیمتی ڈنر سیٹ خریدا گیا۔ والدہ نے خاص طور پر قیمتی ساری پہننے کیلئے مجھے تاکید کی۔ اور دبی زبان سے یہاں تک کہہ دیا کہ باہر کے لوگ آ رہے ہیں ذرا بناؤ سنگھار کر لینا۔ اس سے پہلے ممی (والدہ) نے مجھ سے ایسی بات نہیں کہی تھی۔ ممی نے کہنے سے میں قیمتی ساری پہنی اور تھوڑا بہت بناؤ سنگھار بھی کیا۔

شب میں آٹھ کے قریب سول سرجن صاحب اپنے پورے خاندان کے ساتھ تشریف لائے۔ پرشوتم نہایت قیمتی اور دیدہ زیب سوٹ میں تھا۔ اس کے رخساروں پر کریم (Cream) کی سفیدی اور چکناہٹ جھلک رہی تھی۔ اور ڈاڑھی کو اس نے اس طرح کھرچ کر صاف کیا تھا جیسے اس کے رخساروں پر ابھی تک سبزہ کا آغاز نہیں ہوا۔ پرشوتم جوان تھا مگر اس نے آج نوجوان بننے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ اپنی کوشش میں ایک حد تک کامیاب نظر آتا تھا۔ پرشوتم کی بہن سرسوتی تو آج پری بنکر آئی تھی۔ سرخ ساری، گلابی رنگ کا بلاؤز۔ رخسار پاؤڈر اور غازہ میں ڈوبے ہوئے۔ اور ہونٹوں پر لپ اسٹک (Lip Stick) کی دھڑی جمی ہوئی۔ سرسوتی خوبصورت تھی اور بناؤ سنوار نے اس کو بہت زیادہ جاذب نظر بنا دیا تھا۔ تھوڑی دیر تک سب لوگ ہال میں بیٹھے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سرسوتی میرے ساتھ بڑی محبت کے ساتھ پیش آئی۔ پرشوتم میری طرف بار بار کن انکھیوں سے دیکھتا تھا۔ کھل کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پرشوتم بہت خوش نظر آتا تھا۔ اور اس کے چہرے سے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ کسی بڑی خوشی کا انتظار کر رہا ہے۔ ٹھیک آٹھ بجے کھانے کی گھنٹی بجی اور سب لوگ کھانے کے کمرے میں پہونچ گئے۔ کھانے کی میز بڑے قرینہ سے سجائی گئی تھی۔ گلدانوں کے گلدستوں پر کلابتوں اور مقیش لپٹی ہوئی تھی۔ اور گلدانوں کے نیچے کا کپڑا بہت ہی بھڑکیلا اور دیدہ زیب تھا۔ کھانا کھاتے میں باتیں ہوتی رہیں۔ یہ باتیں زیادہ تر کھانوں سے متعلق تھیں۔ تفصیلات تو یاد نہیں ہیں کچھ باتیں ذہن میں رہ گئی ہیں۔ جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان باتوں میں نہ تو کسی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے اور نہ کہنے والوں کے نام ظاہر کئے گئے ہیں۔

ـــ ہرن کے کباب تو شکاری میں کچھ مزیدار معلوم ہوتے ہیں۔ صاحب! مچھلی

تو الہ آباد کی ہوتی ہے۔ میں نے اتنی
لذیذ مچھلی کہیں نہیں کھائی! بمبئی کے
ایک ہوٹل میں ایک بار میں نے مرغ پلاؤ
کھایا تھا۔ آج تک اس کا ذائقہ یاد ہے ۔۔۔
آپ کے یہاں کا بٹلر (باورچی) بہت مشاق
اور تجربہ کار معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ ہمارے
یہاں تو مہینہ میں دو بٹلر بدلتے ہیں ۔۔۔
ڈاکٹر صاحب! اس (Dish) کو
ملاحظہ فرمائیے۔ یہ میں نے خاص طور پر
آپ کیلئے تیار کرائی ہے ۔۔۔ جب سے
کوئٹہ میں زلزلہ آیا ہے۔ پھل مہنگے ہو گئے
یہ انگور میں نے خاص طور پر کوئٹہ سے
منگوائے ہیں ۔۔۔ مجھے تو پھلوں میں انجیر
سب سے زیادہ پسند ہیں۔ پشاور سے چند
میل کے فاصلہ پر ایک جگہ قرغام ہے۔
وہاں ڈیڑھ دو چھٹانک کا ایک انجیر ہوتا
ہے۔ شیریں اور شاداب! دق کا مریض
بھی اگر ایک مہینہ تک وہاں کے انجیر
استعمال کرتا رہے تو فصد کھلوانے کی
نوبت آئے ۔۔۔!

غرض کھانا ختم ہونے تک اسی قسم کی باتیں
ہوتی رہیں۔ آدمی بڑا چٹورہ اور لذت
پسند واقع ہوا ہے۔ دنیا میں بہت کم
لوگ زبان کے چٹخاروں پر قابو رکھ
سکتے ہیں۔ شوق کی انتہا ہے کہ کھانوں
کے ذکر سے ذائقہ کو بہلایا جاتا ہے اور
کھانے کے شوق کو تسلی دی جاتی ہے۔
انسان الفاظ سے بہت اچھی طرح کھیلنا
جانتا ہے اور محفلوں اور جلوتوں کی گرمی
ان ہی رنگین الفاظ اور چٹخارے دار باتوں
کے سہارے قائم ہے۔

کھانے کے بعد میں ایک ضرورت سے
میں اپنے کمرے میں گئی۔ میں کمرے میں
پہنچی ہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"May I come in" [۵۱]

میں نے مڑ کر دیکھا تو سرسوتی دروازے
پر کھڑی ہوئی تھی۔ "آپ شوق سے آسکتی
ہیں"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ سرسوتی
آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی: "میں نے
آج اتنا کھانا کھایا ہے کہ مجھ سے ہلا
تک نہیں جاتا۔ اتنے لذیذ کھانے روز
روز تھوڑی میسر آتے ہیں"۔

میں نے جواب دیا۔ "آپ مجھے شرمندہ
کر رہی ہیں۔ کھانے تو معمولی تھے کوئی
خاص بات نہ تھی"۔

سرسوتی الماری میں رکھی ہوئی کتابوں
کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھی کنن ڈائل کے ناول بہت
پسند ہیں، افسانوں اور ناولوں کے معاملہ
میں میرا اور تمہارا ذوق ملتا ہوا ہے اور
ہاں میرے بھائی پرشوتم کو بھی پُراسرار
ناول بہت پسند ہیں۔ آپ ان کے ناول
کا (Collection) دیکھ کر بہت
خوش ہونگی۔ پرشوتم کو مطالعہ کا بیحد شوق ہے"

سرسوتی بہت دیر تک گفتگو کرتی
رہی اور تھوڑی ہی دیر میں اس نے کئی
مرتبہ اپنے بھائی پرشوتم کا ذکر کیا۔ بات
کہیں کی ہو لیکن اس کی تان پرشوتم کی
تعریف پر آکر ٹوٹتی تھی۔ سرسوتی نے
پرشوتم کے حسنِ اخلاق، نفاستِ مزاج،
قابلیت، غرض ایک ایک خوبی کو سراہا۔

پرشوتم کا بار بار ذکر مجھے پسند نہ آیا۔

۔۔۔ تو آپ کے بھائی پرشوتم آدمی کیا
دیوتا ہیں ۔۔۔ میں نے سرسوتی سے کہا۔

۔۔۔ دیوتا تو نہیں ہیں انسان ہی ہیں!
سرسوتی چونک کر بولی۔

۔۔۔ اتنی خوبیاں تو ایک دیوتا میں ہی
ہو سکتی ہیں ۔۔۔ میں نے جواب دیا۔

۔۔۔ آپ چاہیں تو انکو دیوتا ہی سمجھ لیں۔
سرسوتی نے کلائی کی گھڑی کو دیکھتے
ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں وہاں سے اٹھکر
ہال میں پہنچ گئے۔ نو بجے کے قریب ساڑ
جائے کا ایک دور ہوا۔ اور اس کے بعد
ہمارے مہمان رخصت ہو گئے۔ سرسوتی
کی ماں چلتے وقت میرے سر پر ہاتھ
پھیر کر دعائیں دیں۔ پرشوتم نے جاتے
ہوئے کئی بار مجھے مڑ کر دیکھا۔

دو تین دن بعد پرشوتم ہمارے یہاں
آیا۔ میں اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی اخبار
پڑھ رہی تھی۔

۔۔۔ پرشوتم آئے ہیں ۔۔۔ ممی نے
مجھ سے کہا۔

۔۔۔ تو میں کیا کروں ۔۔۔ میں نے جواب دیا۔

۔۔۔ بیٹی! مہمان کے ساتھ تواضع سے
پیش آنا چاہئے۔ ممی (میری والدہ) بولی

۔۔۔ آپ ان کی میزبانی کے لئے بہت
کافی ہیں۔ میں تو اخبار پڑھ رہی ہوں"۔
میں نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔

۔۔۔ پرشوتم تمہیں دریافت کر رہے ہیں
شاید وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں ۔۔۔ ممی
نے جواب دیا۔

۔۔۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ شانتا
مصروف ہے ۔۔۔ میں نے جواب دیتے
ہوئے اخبار کا ورق الٹا اور خوب زور
سے ایک خبر کی سرخی کو (مشرق قریب
میں جنگ کے شعلے) پڑھا۔ ممی خشمگیں
نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے چلی گئیں۔

میں تفصیل کے ساتھ اوپر کہہ چکی
ہوں کہ سوسائٹی سے مجھے نفرت ہو گئی
تھی۔ میرے والدین مجھے پرشوتم کے
ساتھ بے تکلف کرنا چاہتے تھے۔ تہذیب
مغرب کی اصطلاح میں "ممی" بے تکلفی

[۵۱] کیا میں اندر آسکتی ہوں؟

کا نام "کورٹ شپ" ہے۔ یعنی شادی سے قبل لڑکے اور لڑکی کو تنہائی کے مواقع دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ ایک دوسرے سے مانوس ہو جائیں۔ اور غیریت و اجنبیت جاتی رہے۔ میں نے ممی کے اصرار پر دو چار پارٹیوں میں جانے سے انکار کردیا۔ ممی نے مجھے سوسائٹی کی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ اُن کے پند و نصائح کا خلاصہ یہ تھا کہ — سوسائٹی سے دور رہ کر کوئی انسان صحیح معنوں میں انسان نہیں بن سکتا۔ سوشل لائف ہی تو اصل زندگی ہے۔ آدمی کو ہنسی خوشی رہنا چاہیئے۔ یہ فلسفیوں جیسی خاموش اور تنہا زندگی تو موت سے بدتر ہے! جلسوں اور پارٹیوں میں دل بہل جاتا ہے، بات چیت کرنے سے تفریح ہو جاتی ہے۔ دو چار مسکراہٹیں اور میٹھی باتوں میں کسی دوسرے کا دل خوش ہو جائے تو اس میں بخل نہ کرنا چاہیئے۔ جوانی تھوڑی بہت تفریح چاہتی ہے پرشوتم جیسے خوش مزاج اور با اخلاق نوجوانوں کی سوسائٹی کسی طرح مضر نہیں ہوسکتی۔

غرض ممی نے میرے دل میں یہ بات بٹھادی کہ سوسائٹی سے دور رہنا جذبات کی خودکشی کے مرادف ہے اور جوان آدمی کو سیر و تفریح میں تھوڑا بہت حصہ لینا چاہیئے۔ ممی میری جھجک دور کرنے کیلئے مجھے ہفتہ میں دو دو مرتبہ سنیما لے کر جاتیں اور جلسوں اور پارٹیوں میں شریک ہونے کی ترغیب دیتیں۔

ہندوستان کی کوئی شریف ماں اپنی بیٹی کو آوارہ نہیں بنا سکتی۔ میری ممی مجھے خاص حدود کے اندر قدرے بے تکلف اور آزاد دیکھنا چاہتی تھیں۔ اور اس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ آج کل کے نوجوان (Social girls) کو پسند کرتے ہیں۔ اسلئے دعوتوں اور پارٹیوں کے سلسلہ میں پرشوتم سے میری بے تکلفی ہو جائیگی۔ اور وہ مجھے اور میں اُس کو پسند کرلیں گے۔

پہلے پہلے تو میں نے جلسوں اور پارٹیوں میں بڑا انقباض محسوس کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ جھجک دور ہو گئی اور میں نہایت خوشی کے ساتھ شہر کی سماجی تفریحوں (Social Functions) میں حصہ لینے لگی۔ میرے پاس جذبات تھے۔ انتہائی گرم اور نوخیز جذبات، سوسائٹی کی رنگینیوں میں میرے جذبات کو سہارا ملنے لگا۔ بلکہ ان کی حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ اب میں پھر اُسی راہ پر آ گئی تھی۔ جس کو میں نے خیرباد کہہ دیا تھا۔ جوان لڑکوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی میرے دل کی رگوں کو سہلا رہا ہے۔ ضمیر نے مجھے کئی بار ٹوکا کہ یہ منزل بہت پرخطر ہے مگر جذبات اور چٹخاروں کے ہجوم میں ضمیر کی آواز دب کر رہ گئی۔ لذتوں نے میری چشم ہوش اور گوش حقیقت نیوش کو بیکار سا کر دیا تھا۔

میں جلسوں اور پارٹیوں میں خوب بن سنور کر جانے لگی۔ اب سے چند دن پہلے مرد میری طرف دیکھتے تھے تو شرم کے مارے میرے ماتھے پر پسینہ آجاتا تھا اور نظارے کی جراحتوں کو میں برداشت نہ کر سکتی تھی۔ مگر اب میں ہر نگاہ کا مرکز بننا چاہتی تھی۔ جتنا زیادہ مجھے لوگ دیکھتے تھے اتنا ہی زیادہ خون میرے رخساروں میں جھلکتا تھا۔ میں نے رنگین لٹریچر کا مطالعہ پھر شروع کر دیا تھا اور انگریزی ناول پڑھ پڑھ کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ عورتوں کی کونسی ادائیں مردوں کو گھائل کر سکتی ہیں اور کس محاذ پر نسائیت مردانگی کو شکست دے سکتی ہے۔ میری آپ بیتی پڑھنے والے چاہے مجھ پر خود نمائی کا الزام ہی کیوں نہ لگا دیں لیکن میں اس الزام کے ڈر سے حقیقت کو چھپا نہیں سکتی۔ میں شہر کی سوسائٹی میں بہت زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز تھی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ شانتا کے بغیر محفل سونی سونی معلوم ہوتی ہے۔ میں محفلوں کی روح اور جلوتوں کی رونق تھی۔ میں نے اپنی مسکراہٹوں کو عام کر دیا تھا۔ ممی (میری والدہ) نے مجھے نصیحت بھی کی تھی کہ ایک دو باتوں اور ذرا سی مسکراہٹ میں کسی کا جی خوش ہو جائے تو اس میں بخل نہ کرنا چاہیئے۔ میں ہر شخص کے ساتھ اخلاق سے پیش آتی تھی۔ میرے اخلاق کی وسعت نے بہت سے نوجوانوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ میں اُسے سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔ یہ شعر میرے اخلاق و خوش مزاجی کا ترجمان ہے ؎

وہ چشم ناز آپ ہی اپنا جواب ہے
ہر دل سمجھ رہا ہے مجھی سے خطاب ہے

پرشوتم خوشرو جوان تھا۔ اُسے مجھ سے دلچسپی نہیں محبت تھی وہ مجھ کو اپنی منگیتر سمجھتا تھا اور والدین پرشوتم سے بے تکلف ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع مجھے دیتے تھے۔ مجھے بھی پرشوتم سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ پرشوتم ہمارے یہاں روز شام کو آجاتا اور ہم دونوں گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ پرشوتم خوش مزاج بھی بلا کا

تھا۔ بات میں بات نکال کر ہنستا اور خود ہنستا۔ کبھی کبھی وہ شادی کے فلسفہ پر تقریر کرتا اور ازدواجی زندگی کے نشیب فراز سمجھاتا۔ میں اس پر اکثر کہدیا کرتی تھی۔

" بھئی! شادی کا ذکر نہ کیا کرو۔ اس بات سے مجھے الجھن ہوتی ہے —— شادی، بیاہ —— کتنے خوفناک ہیں۔ یہ موضوع! عورت شادی کے بعد مر جاتی ہے۔"

میری یہ تنقید پرشوتم کو اکثر ناگوار گزرتی تھی۔ میں اس کے چھیڑنے کے لئے کہا کرتی تھی۔

" تم گریجویٹ ہونے کے بعد سرکاری نوکری کی جھنجھٹ میں نہ پڑنا، بہتر ہے کہ آل انڈیا قسم کی کوئی "شادی سوسائٹی" قائم کر دی جائے۔ تمہارا کاروبار خوب چلے گا۔ دوسروں کی بیاہ شادی ہوگی، تم کو مالی فائدہ بھی ہوگا، قوم کی خدمت بھی ہوتی رہے گی اور کچھ لذت بھی۔"

پرشوتم خوش مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کا سنجیدہ تھا۔ اس نے بے تکلف ہونے کے بعد بھی کسی رنگین اقدام کی جرأت نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ وہ لذت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے اس کی ایک نہ ایک دن بیوی بننا ہے پرشوتم جلد باز اور عجلت پسند نہ تھا۔ اس کی عقل جذبات کے دھارے میں بہنے سے اسکو روکتی تھی۔

ایک دن شام کے وقت میں اور پرشوتم موٹر میں بیٹھ کر سیر کر رہے تھے پرشوتم موٹر چلا رہا تھا اور میں اس کے بازو بیٹھی ہوئی تھی۔

—— تم بھی موٹر چلانا سیکھ لو، شانتا؟ پرشوتم نے ہارن بجاتے ہوئے کہا۔

—— میں اس حماقت میں گرفتار ہونا نہیں چاہتی —— میں نے جواب دیا۔

—— تو موٹر چلانا حماقت ہے، تمہاری نظر میں —— پرشوتم بولا۔

—— قریب قریب ——! میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

—— تمام کام کی باتیں تمہاری نظر میں حماقت ہیں۔ شادی بیاہ کرنا حماقت، بچوں کی پرورش حماقت، گھر داری حماقت اور اب فرمایا جاتا ہے کہ موٹر چلانا بھی حماقت ——! پرشوتم ہینڈل گھماتے ہوئے بولا۔

—— مسٹر پرشوتم! تم بعض وقت واقعی احمقانہ بات کر جاتے ہو ذکر تھا موٹر چلانے کا اور تم نے بات چھیڑ دی شادی کی۔ تم شادی کے پیچھے دیوانے ہو گئے ہو۔ ساون کے اندھے جیسی تمہاری حالت ہے! میں نے جواب دیا۔

—— گویا شادی کا ذکر کرنا گناہ ہے! خیر صاحب! اب احتیاط کی جائیگی۔ میں کان پکڑ کر توبہ کرتا ہوں کہ اگر اب بیاہ شادی کا نام بھی لوں تو مجھے جو چاہیے سزا دینا! مگر ہاں! یہ تو بتاؤ کہ موٹر چلانے میں کیا برائی ہے —— پرشوتم نے دریافت کیا

—— موٹر میں سیر و تفریح کیلئے بیٹھتے ہیں موٹر چلانے والے کی تفریح نہیں ہو سکتی وہ چلانے میں مصروف رہتا ہے۔ اور ایک دماغ ایک وقت میں دو کام انجام نہیں دے سکتا کہ ڈیوٹی بھی پوری کرتا رہے اور تفریح بھی حاصل کرے۔ اس کے ماسوا میرا قلب کمزور ہے۔ ہجوم کو دیکھکر میرے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ اختلاج قلب کا مریض موٹر نہیں چلا سکتا موٹر چلانا تو آپ جیسوں کا کام ہے جو فولاد کا دل اور شیر کا کلیجہ رکھتے ہیں اور!

میری بات ادھوری ہی تھی کہ ٹائر کے پھٹنے کی زور سے آواز آئی اور موٹر رک گئی۔ پرشوتم اتر کر نیچے گیا اور پہیے کو دیکھ کر کہنے لگا۔

" ٹائر برسٹ ہو گیا اور ہاں! اس نامعقول کے بچے ڈرائیور نے کوئی فاضل (Share) ٹائر بھی تو نہیں رکھا!"

میں نے اس پہ فوراً ہی کہا۔

" جب ہی تو میں نے عرض کیا تھا کہ موٹر چلانا حماقت ہے!"

پرشوتم نے میری طرف جھلا کر دیکھا اور مڈگارڈ پہ پیر رکھ کر سوچنے لگا۔ شام کا وقت تھا۔ پرندے اپنے آشیانوں کی طرف بسیرے کیلئے جا رہے تھے۔ شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا تھا۔ چرواہے اپنے جانوروں اور ڈھور ڈنگروں کو لئے ہوئے کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے گزر رہے تھے۔ ہماری موٹر سڑک کے بائیں جانب جامنوں کے پیڑوں کے نیچے کھڑی تھی۔

—— کیا سوچ رہے ہو، پرشوتم! —— میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

—— ہر وقت مذاق اچھا نہیں ہوتا شانتا! بعض وقت تم ناقابل برداشت حد تک پہونچ جاتی ہو —— پرشوتم نے جوابدیا۔

میں نے محسوس کیا کہ پرشوتم کے چہرے پر ایک رنگ آرہا ہے اور ایک جا رہا ہے اور وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے یہ حال دیکھ کر میں نے چھیڑنا مناسب سمجھا۔

—— شہر یہاں سے کتنی دور ہے —— میں نے پرشوتم سے دریافت کیا۔

—— ہم شہر سے بہت دور نکل آئے ہیں ٹائر پھٹنے سے پہلے میل کا پتھر میری نظر

سے گذرا تھا اس پر "۲۰" لکھا ہوا تھا۔ پرشوتم نے ہیٹ اتارتے ہوئے جواب دیا۔ — تو پھر اب کیا ہوگا۔ یہاں جنگل میں ہم کب تک پڑے رہینگے۔ کوئی تدبیر ہونی چاہیئے — میں نے کہا — کوئی تدبیر بھی موٹر کو نہیں چلا سکتی اب تو صرف یہی صورت ہے کہ ہم یہاں قریب کسی گاؤں میں رات بسر کریں اور گاؤں سے کسی آدمی کو خط دیکر شہر بھیجدیں کل دوپہر تک مکان سے یا تو دوسری موٹر آجائے گی یا ٹائر آجائیگا — پرشوتم نے جواب دیا۔ اور وہ سگرٹ سلگاکر کھیتوں کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

(باقی پھر —!)

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۵۸۵

جلد ۲ نمبر ۴ جولائی ۱۹۴۲ء

ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری

خوش باش دمے کہ زندگانی این ست

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند ✣ بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہا ست ✣ خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

مست قلندر لاہور

افسانہ نمبر (جولائی ۱۹۴۲ء)

اردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیر الاشاعت ماہوار رسالہ

اُن زندہ دل انسانوں کیلئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کیا ہے، ہمیشہ خوش رہنے اور دوسروں کو خوش کرنے میں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے قول یا فعل سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے جن کا مذہب ہے خدا کے ہر ایک بندے سے بلا امتیاز رنگ و قومیت محبت کرنا

قیمت فی پرچہ چھ آنے

ایڈیٹر:- ڈاکٹر پرتھی سنگھ

سالانہ چندہ صرف چار روپے

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ڈاکٹر پرتھی سنگھ پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ مست قلندر وشنو لین گوالمنڈی لاہور سے شائع ہوا۔

طبی جواہر پارے | فہرست مضامین | ہنگامہ خیز نظمیں

بے بدل رنگین افسانے | افسانہ نمبر جولائی ۱۹۴۲ء | دلگداز آپ بیتیاں

ہندوستان بھر میں اپنی قسم کا واحد رسالہ جسے ہندو اور مسلمان امیر اور غریب عورت اور مرد یکساں دلچسپی اور ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور جسے دیکھ ... لاکھوں چاہنے والے ... تقسیم ...

مست قلندر ہندوستان بھر کے اردو رسائل سے زیادہ چھپتا ہے مشتہرین کو حق حاصل ہے کہ اس دعوے کی تصدیق کرنے کے بعد اشتہار دیا کریں:

نگاہِ اوّلیں!

مست قلندر نے جب سے جنم لیا اس وقت سے لے کر اب تک یوں تو اس کے بیسیوں خاص نمبر نکل کر ملک سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں مثلاً نوروز نمبر، عورت نمبر، مرد نمبر، ظریف نمبر، فلم نمبر، افسانہ نمبر، بانی نمبر، آپ بیتی نمبر اور عمر دراز نمبر وغیرہ لیکن جس محیر العقول نمبر کے شائع کرنے کی تجویز ہمارے ذہن میں اسوقت موجود ہے وہ ان سب سے انوکھا اور عجیب و غریب ہوگا اس کا نام "جرم و سراغ نمبر" سوچا گیا ہے ادب اردو کی تاریخ میں اپنی قسم کی ہماری یہ اوّلیں پیشکش (اگر خدا کو منظور ہوا) اکتوبر ۴۲ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو کر ناظرین کرام کے ہاتھوں میں پہونچ جائیگی۔

"جرم و سراغ" نمبر میں کیا ہوگا؟

نہایت سنسنی خیز اور سو فی صدی سچے افسانوں کی صورت میں دکھایا جائے گا کہ انگلستان، فرانس، اور امریکہ کے مہذب، روشن دماغ اور ماہر علم سائنس —— بدمعاش کیسے کیسے عجیب و غریب طریقوں سے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں؟ امیر طبقہ کی حسین و جمیل عورتوں کو آن کی آن میں غائب کر دینا اور پھر ان کی ذات سے ہزاروں لاکھوں روپیہ کی آمدن کر لینا ان لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کسی کروڑپتی کے اکلوتے بچہ کا اغوا کرکے واپس کرنے کی شرائط مظلوم باپ سے اس طریق سے طے کی جاتی ہیں کہ لاکھوں روپیہ کی رقم ان لوگوں کی جیب میں پہونچ جاتی ہے اور وقوعہ کا علم ہونے کے باوجود پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ——

کسی مشہور و معروف اور امیر کبیر معزز شہری کو روز روشن میں قتل کر دیا جاتا ہے مقتول کی جیب سے کئی ہزار روپیہ کے پرامیسری نوٹ برآمد ہوتے ہیں جس کمرہ میں قتل کی واردات ہوئی وہاں لاکھوں روپیہ کے جواہرات ایک تجوری میں بند تھے اور درآنحالیکہ چابی مقتول کے جیب ہی میں تھی۔ قاتل کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگاتا تحقیقات سے یہ بات بھی پولیس پر روشن ہوتی ہے کہ مقتول نہایت ہی شریف النفس اور نیک کردار انسان تھا اور پبلک فلاح و بہبودی نیز خیرات کے کاموں میں دل کھول کر حصہ لیا کرتا تھا اس کا کوئی دشمن نہیں تھا نہ ہی وارثوں میں کوئی ایسا شخص موجود تھا جسے اسکی وفات کے بعد حق وراثت ملتا —— پھر ایسے مخیر اور فرشتہ سیرت انسان کو قتل کرنے میں قاتل یا قاتلوں کی غرض و غایت کیا تھی؟

باوجود ہزار مغز پچی کرنے کے بھی انسانی عقل اس عقدہ لاینحل کو حل کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ الغرض مغربی بدمعاشوں کا ایک ایک کارنامہ دیکھ کر عقل و حواس گم ہو جاتے ہیں —— اور پھر جب کافی عرصہ دوڑ دھوپ کے بعد پولیس کسی وقوعہ کا حل تلاش نہیں کر پاتی تو مجبوراً یہی فتویٰ دینا پڑتا ہے کہ فلاں وقوعہ کا سراغ لگانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اور انسانی عقل کی پہنچ سے کوسوں دور —— لیکن نہیں، ہر فرعونے را موسےٰ، مست قلندر کے "جرم و سراغ" نمبر میں یہ دیکھ کر آپکی حیرت کی انتہا نہ رہے گی کہ جس واقعہ کا سراغ بظاہر ناممکن دکھائی دیتا ہے اور اپنی جس واردات کو بدمعاش لوگ ایک کارنامہ سمجھ کر مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہوتے ہیں۔ اس کی تہ تک ایک گمنام سا سراغ رساں بالکل معمولی کوشش سے پہونچ جاتا ہے اور عین اس وقت جبکہ بدکرداروں کو کسی بری خبر کے سننے کا سان و گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہ انہیں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

—— یہ اور اس قسم کے درجنوں انتہائی دلچسپ واقعات کے حامل رومانی افسانے مست قلندر کے "جرم و سراغ" نمبر میں آپ کو ملیں گے۔ حجم عام نمبروں سے دو چند اور قیمت ۱۲؍ فی جلد سے کم نہ ہوگی۔ مشتہرین کو واجب ہے کہ اپنے اشتہارات ابھی سے ریزرو کرا لیں کیونکہ یہ مہتم بالشان نمبر جس کی تیاری پر سیکڑوں روپے پانی کی طرح صرف کئے جائینگے رہتی دنیا تک قائم رہے گا اور اس میں کے اشتہارات زندہ جاوید۔

مخفی نہ رہے کہ اس نمبر میں جرم کرنے اور سراغ لگانے والوں کے اصلی فوٹو گراف شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔ (ایڈیٹر)

"اُن سے جو بھول گئے"

خاص

از جناب عامر عثمانی

برسات کے چند حسین و مستی بدوش لمحوں میں

جو میرے پہلو میں تم نہیں ہو بہاریں بھی مزا نہیں ہے
مری بہار و خزاں کا مرکز کوئی تمہارے سوا نہیں ہے

ہزار جادو جگائے موسم ہزار جلوے دکھائے فطرت
چلیں ہوائیں اٹھیں گھٹائیں چراغ مستی جلائے فطرت
حسین و سرسبز وادیوں میں خزانۂ گل لٹائے فطرت
جہاں کو رنگینیوں کا ساغر پلا کے خود جھوم جائے فطرت

مگر نہیں تم تو میرے پیارے نظر پہ افسردگی ہے طاری
غم جدائی سے چور ہے دل، دماغ پر بے حسی ہے طاری

ہوائے نکہت فشاں کے جھونکے پیام جشن بہار لائیں
گھٹا کی ہلکی تراوشوں سے فضائیں پریاں سی گنگنائیں
اُبل پڑیں بحر و بر سے نغمے، طیور باغوں میں چہچہائیں
بساط صحرا پہ مور ناچیں گھروں میں تتلیاں بھاگ آئیں

مگر تمہارے بغیر سب کچھ الم فزا ہے مری نظر میں
اداس و بے چین ہے طبیعت مزا نہیں ہے گل و ثمر میں

یہ ہر طرف سرخوشی کا عالم یہ مستی و بیخودی کا موسم
حیات کی دلکشی کے لمحے نظر سے بادہ کشی کا موسم
شباب جذبات کا زمانہ شفق کی جلوہ گری کا موسم
گھٹا کے آنچل سے چھننے والی دھلی ہوئی چاندنی کا موسم

مگر یہ موسم شکیب الفت کو اور بھی آزما رہا ہے
ترسنے والی نظر کے آگے تمہاری تصویر لا رہا ہے

کہیں چمکدار پانیوں میں گھلے ہوئے رنگ کہکشاں کے
کہیں سیہ رنگ بادلوں میں کھلے ہوئے خوشنما دریچے
سماعتوں پر خمار طاری چھڑے ہوئے جھینگروں کے نغمے
گھنے درختوں کی ڈالیوں میں پڑے ہوئے کمسنوں کے جھولے

مگر تمہارے فراق میں میں کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں
کہ جیسے قسمت کی تیرہ و تار گھاٹیوں سے گذر رہا ہوں

تمہیں جو پاؤں تو میرے اجڑے ہوئے چمن میں بہار آئے
طویل و مبہم اداسیوں میں گھری ہوئی روح مسکرائے
تمہارے عارض کی ضوفشانی سے قصر ارمان جگمگائے
تمہارے آغوش نور میں دل غم و الم سے نجات پائے

تمہارے صدقے سحر اس آئے مجھے بھی برسات کا زمانہ
مرے لبوں پر بھی لوٹ آئے خوشی کا بھولا ہوا ترانہ

ایک خط

نسیمہ!
امتحان میں تمہاری کامیابی کی خبر سُنکر مجھے جس درجہ مسرت حاصل ہوئی۔ شاید وہ بیان نہ کرسکوں زندگی میں اسوقت تک تم نے دو امتحان دئے اور قدرت نے بڑی فیاضی سے کامیابی کا موقعہ عنایت کیا۔ اس کیلئے پروردگار عالم کی جناب میں تم جسقدر بھی شکریہ ادا کرو کم ہے۔ اب آئندہ تمہارا کیا خیال ہے؟ تعلیم کے سلسلے میں مزید اقدام کرسکوگی۔ یا کیا؟ اس کا جواب تو مستقبل قریب دیگا۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ اگر حالات نے تمکو ایسے امتحانات کا موقع نہ بھی دیا تب بھی ـــــ امتحانات ـــــ بہرحال باقی ہیں اور باقی رہیں گے۔

کیا زندگی خود ہماری شرافت، خودداری اور انسانیت کا ایک مکمل امتحان نہیں؟

اس رنگین دنیا میں قدم رکھتے ہی ہمارا ـــــ بچپن ـــــ جوانی اور بڑھاپا ـــــ کس طرح امتحانات کا مرقع بن جاتا ہے۔ کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے؟ مگر ـــــ کیا سب ان امتحانات میں پاس ہوجاتے ہیں؟ کیا سب کا دامن گل مراد سے بھرجاتا ہے؟ کیا کامیابی سب کے قدم چوم لیتی ہے؟ کتنے ہیں وہ لوگ جو زندگی کی اس کشمکش ـــــ زندگی کے انقلاب اور زندگی کے حوادثات پر اس طرح قابو حاصل کرلیتے ہیں ـــــ گویا وہ حالات کے تابع نہیں ـــــ بلکہ حالات اُن کے تابع ہیں۔

نسیمہ! ـــــ ابھی وقت تمہاری زندگی سے بہت کچھ امتحانات کا طالب ہوگا ـــــ امتحانات ـــــ جو مشکل ـــــ سخت اور جانگداز ہونگے۔ کیا تم اسوقت بھی کامیابی حاصل کرسکوگی؟

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے ـــــ کہ تمہارا ایمان اور ضمیر ـــــ نہ صرف تم کو نیک اور سیدھی راہ پر چلائیگا ـــــ بلکہ تمہارا ہر فعل والدین کی عزت ـــــ اور پھر شوہر کی لاج کو برقرار رکھتے ہوئے ہر امتحان میں کامیاب کریگا۔

خدا کرے کہ ـــــ کامیابیاں ـــــ اسوقت تک تم پر اپنا سایہ کئے رہیں ـــــ تاآنکہ ـــــ زندگی کے اسٹیج پر تمہارا سب سے بڑا اور آخری امتحان لیا جائے۔

میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔
محمودہ باجی کو سلام

تمہاری ـــــ نگہت
بریلی

جلد ۲۷ — مست قلندر — نمبر

میٹھی لے

از جناب شوق ماہری سیکریٹری بزم اقبال کھنڈوہ

"ن" کے پھول سے ہونٹوں پہ ناچنے والی اس "میٹھی لے" کے نام جس کے لطیف اور وجد آگیں نغمے اب تک میرے سازِ دل کے تاروں پر تتلیوں کی طرح تھرکتے پھرتے ہیں۔ (شوق)

ہے جس سے زندگی وہ دشمنِ دل ہوتی جاتی ہے
مری ہر سانس میرے حق میں قاتل ہوتی جاتی ہے

مجھے طوفان میں تسکین حاصل ہوتی جاتی ہے
نظر جس موج پر پڑتی ہے ساحل ہوتی جاتی ہے

بجھانا چاہتی تھی جس کو دنیا اپنی پھونکوں سے
وہی شمعِ محبت جانِ محفل ہوتی جاتی ہے

وہ "میٹھی لے" جو انکے پھول سے ہونٹوں پہ رقصاں تھی
وہ سازِ دل کے ہر نغمہ کا حاصل ہوتی جاتی ہے

میں جتنی کوششیں کرتا ہوں انکو بھول جانے کی
محبت میں مجھے اتنی ہی مشکل ہوتی جاتی ہے

وہی اب لطف کے پردہ میں دشمن بنتے جاتے ہیں
محبت جن کی روحِ عالمِ دل ہوتی جاتی ہے

وہ لذت پا رہا ہوں گھر کے طوفانِ حوادث میں
طبیعت بے نیازِ فکرِ ساحل ہوتی جاتی ہے

میں اپنے دل کی ہر دھڑکن سے اک پیغام سنتا ہوں
محبت ان کی شایانِ حاصلِ دل ہوتی جاتی ہے

خدا ہی لاج رکھے شوق اپنے زہد و تقویٰ کی
کرم پر وہ نگاہِ ناز مائل ہوتی جاتی ہے

واپسی!

خاص برائے مست قلندر لاہور

از جناب فلسفی لاہوری

بہت زور سے آندھی اُٹھی اور چشم زدن میں تمام جہان تیرہ و تاریک ہوگیا۔

ہر چیز کی شدت کا یہی حال ہے جب کسی قوت تند ہوجاتی ہے تو وہ کمزور عناصر کو ہلاک کر ڈالتی ہے۔

اولاد! کتنا شیریں لفظ ہے لیکن جب اولاد بھی سرکش ہوجاتی ہے تو اس کی یہ شدت پہلے گھر اور اس کے بعد سماج کو تباہ کر ڈالتی ہے! سب سے بُری اولاد وہ ہے جو دولتمند گھرانوں میں جنم لیتی ہے، نشۂ دولت کے خمار کے ساتھ زر کی آشوبی قوت اس کو آشوب جہاں بنادیتی ہے، اگر وہ اکلوتی اولاد ہے تو شۂ عالم میں تبدیل ہوجاتی ہے اور اگر اس سے بڑھ کر وہ اکلوتی اولاد لڑکی ہے تو وہ ------ قیامت!

سیٹھ بھاگ چند کی دس بارہ ملیں چل رہی تھیں جن میں سینکڑوں ہزاروں آدمی کام کر رہے تھے۔ اس طرح سرمایہ داری نے قابلیتوں (Abilities) کو غلام بنا کر لاکھوں روپیہ کما لیا تھا اور اس خطیر سرمایہ کی تنہا مالک سیٹھ کی اکلوتی لڑکی بملا تھی۔

بملا کی انسانیت نا آشنا نظروں میں نہ صرف مل کے آدمی بلکہ تمام انسان ایک کرم حقیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ رحم اور ہمدردی کوئی چیز ہے اس نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس سنہری دنیا جس میں وہ شب و روز سانس لے رہی تھی کے علاوہ ایک دنیا اور بھی ہے درد سے بھری ہوئی، ٹیسوں سے معمور اور دکھ سے لبریز۔

اس کی زندگی کا کوئی نظام نہ تھا۔ ہر نظام ہر مقصد ہر چیز کے احساس سے وہ خالی تھی۔ پیسوں کی فراوانی سے اس کی نگاہ میں دولت کا مصرف بھی ختم ہو چکا تھا۔ ضروریات کی کثرت اور ان کی تکمیل کی سہولت نے "مزید طلبی" کی حس کو اس درجہ مضمحل کر دیا تھا کہ وہ بہتات کی وسیع دامانی میں احتیاج کی تنگی سی محسوس کرنے لگی تھی۔ یہ تھی بملا ------!

مل کے مزدور سے لے کر اونچے عہدہ والے لوگ اس سے پناہ مانگتے تھے۔ جس مل میں جاتی تھی اس میں قیامت آجاتی تھی دس بیس مزدور، پانچ چھ اچھے کاریگر اور تین چار منیجر ضرور وہاں سے نکال دئے جاتے تھے۔ وہ بیسیوں آدمیوں کو بے روزگار کر چکی تھی۔ ایک قاطع رزق ہستی تھی ایک بنت اہرمن تھی کہ انسانوں پر مصیبت نازل کرنے مل میں جایا کرتی تھی۔

جہاں دکھ درد اور آلام آفرینی اس کی زندگی کا محبوب مشغلہ تھا وہاں وہ دلوں کی تاخت اور سکون کی باخت میں بھی کامل تھی۔ سینکڑوں پیشانیاں اسکے سامنے جھکیں اور ٹھکرائی گئیں۔ بہت سے دل اس کی راہ میں فرش کئے گئے اور ٹکڑے کر دئے گئے۔ وہ جذبات سے کھیلنا پسند کرتی تھی۔ دل آزاری نے اسکے اندر کرختگی، خشونت اور بیحسی پیدا کر دی تھی۔ وہ اذان دینے والی مرغی تھی!

صرف ایک میراں مل اسکی دست برد سے ذرا محفوظ تھی۔ ایک تو وہ دور دراز تھی دوسرے اس کا منیجر ایک پرانا تجربہ کار بوڑھا آدمی تھا جس کی برطرفی میں وہ زیادہ لذت محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

سیٹھ بھاگ چند علالت کی وجہ سے یا تو زیادہ تر یورپ میں رہتے تھے یا پہاڑی مقامات پر، اسلئے بملا ہی ان کی قائمقامی کرتی تھی جو اس نے کر دیا اس کی اپیل سیٹھ صاحب کے ہاں بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایکدن آخر بملا میراں مل میں بھی جا پہنچی۔ گیارہ بج چکے تھے ابھی مزدوروں کو کھانا کھانے کی چھٹی ہوئی تھی۔ کچھ کھانے میں مصروف تھے اور بہت سے جن کو بعد محنت شاقہ بھی روٹی کا ایک ٹکڑا نصیب نہ ہوا تھا۔ زمین پر دراز ہو کر اپنے کسلمند اعضا کو آسودہ کر رہے تھے۔

بملا اتر کر سیدھی پاور ہوس میں داخل ہوئی وہاں جو اس نے سناٹا دیکھا تو بڑی خفا ہوئی۔ صرف چارج مین اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ اس کو

دیکھکر نو کھلا اٹھا اور لپک کر اسکے پاس حاضر ہوا۔

" یہ آج سناٹا کیوں ہے یہاں، کہاں مرگئے سب اور تم کیا کر رہے تھے؟" اس نے شعلہ فشاں آنکھوں سے جارج مین کو دیکھکر پوچھا۔

" حضور ابھی گیارہ بجے کی چھٹی ہوئی ہے سب لوگ ـــــ"

" تم بیہودہ ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ تم کو موقوف کیا جاتا ہے۔ منیجر کہاں ہے؟"

غریب جارج مین کا دم نکل گیا لڑکر بولا " حضور میں نے کیا قصور کیا ہے چھٹی تو روزانہ ہی ہوتی ہے اور اس کے متعلق سیٹھ صاحب کا حکم بھی ہے۔"

" بکواس نہ کرو۔ منیجر کہاں ہے؟" اس نے جارج مین کی درخواست پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔

" اپنے دفتر میں ہونگے حضور" بملا آگے بڑھی اور اس نے وسل کا منہ کھولدیا۔

سیٹی کی آواز سنتے ہی غریب مزدور حیران و سراسیمہ ہوکر کارخانہ کی طرف لپکے۔ سب کو بڑی حیرت تھی کہ یہ آج گھنٹہ بھر کے آرام کے بجائے آدھ گھنٹے میں ہی ان کو کیوں بلالیا گیا ہے۔

سیٹی کی آواز بوڑھے منیجر کے کان میں بھی پہنچی۔ وہ بھی سخت متحیر ہوا اور لپک کر پاور ہاؤس میں آیا۔ بملا اب تک انجن کے پاس کھڑی تھی اور سیٹی برابر ہوئے جارہی تھی۔ منیجر نے گرج کر لوگوں سے پوچھا۔

" یہ کس نے وقت سے پہلے سیٹی بجادی ہے؟"

" میں نے!" بملا نے بڑے غرور سے آگے بڑھ کر کہا۔

" تم کون ہو؟ نکلو یہاں سے، احمق لڑکی" منیجر نے بملا کو وہاں سے ہٹاتے ہوئے اور سیٹی کو بند کرتے ہوئے کہا۔

" تم مجھے نہیں جانتے؟ میں تمہاری مالکن ہوں۔ سیٹھ بھاگ چند کی بیٹی" اس کا خیال تھا کہ منیجر ابھی خوف سے کانپ کر اس کے قدموں پر گر جائیگا مگر وہی پُرغیظ آواز پھر اس کے کانوں میں آئی۔ " نکل جاؤ یہاں سے اگر تم ملکہ مصر بھی ہو تو مجھے پروا نہیں نکلو اسی وقت۔"

بملا پر گھڑوں پانی پڑگیا۔ اس کی عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے سخت کلمات سنے تھے۔ اس کے حکم کو ٹھکرایا گیا تھا۔ وہ غصہ سے کپکپا اٹھی اور نوجوان نائب منیجر سے چیخکر بولی " کیا تم میری طرف سے اس بڈھے کھوسٹ کے ایک گھونسہ رسید کرکے اس کا دم نہیں سکتے ہو؟"

" نہیں شریمتی۔ قصور آپ کا ہے۔ آپ نے مل کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے" اسسٹنٹ منیجر نے جواب دیا۔

" تم دونوں کو ابھی کارخانہ سے نکلوانی ہوں ابھی پتاجی کو تار روانہ کرتی ہوں۔ ان کا جواب آئے یا نہ آئے تم دونوں بدمعاش کارخانے سے نکل جاؤ۔ اور اپنی نوکری سے ہاتھ دھولو۔"

" تم ایک کم سمجھ دولتمند باپ کی بگڑی ہوئی کم عقل لڑکی ہو۔ ہم کو ایک ماہ کا نوٹس دئے بغیر کوئی نہیں نکال سکتا۔ اچھا تم اب یہاں سے فوراً چلدو۔ جاؤ مزدور بھائیو تم اب پھر ایک گھنٹہ آرام کرنے کی میں چھٹی دیتا ہوں" منیجر نے کہا

" تم دونوں میرے حکم سے برطرف کئے جارہے ہو۔ یہی نوٹس ہے" بملا نے شکست خوردہ انسان کی طرح کہا۔

" اچھا اچھا دیکھا جائیگا۔ تم کارخانے کے باہر جاؤ اور اپنا کام کرو" منیجر نے پھر اسی قدر اطمینان سے کہا۔

بملا نے طیش میں زور سے زمین پر پیر مارا اور چلی گئی۔

ـــــــــ

" خانصاحب آج میرے دو سو ماہوار کا خاتمہ ہوا۔ تین بچے میں ایک بوڑھی رت" نائب منیجر نے بوڑھے منیجر سے مایوسانہ کہا۔

" جگدیش ہراساں نہ ہو۔ رزق دینا خدا کے اختیار میں ہے۔ انسان تو صرف وسیلہ ہے۔ میرے بھی چار بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ولایت گئے ہوئے ہیں میرے اخراجات کو دیکھو لیکن میں تمہاری طرح پریشان نہیں ہوں۔ خدا پر بھروسہ رکھو اگر اس کی نگاہ میں ہم قصوروار ہیں تو سزا ضرور ملے گی۔ اور اگر بے گناہ ہیں تو تم دیکھ لوگے کہ ایک چھوکری ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

دو گھنٹے کے بعد خانصاحب اور جگدیش کو سیٹھ بھاگ چند کا نینی تال سے آیا ہوا یہ ٹیلیگرام مل گیا۔

" تم دونوں برطرف کئے جاتے ہو۔ پندرہ روز بعد اپنے کو کارخانہ سے علیحدہ سمجھو۔ پندرہ روز کی زائد تنخواہ دیدی جائیگی۔"

" اب کیا فرماتے ہیں خانصاحب آپ؟" جگدیش نے منہ بسور کر پوچھا۔

" وہی خدا پر بھروسہ" خانصاحب نے مختصر جواب دیا۔

" جگدیش اس کارخانے کو میں تیس سال سے چلا رہا ہوں اور اس کی شہادت یہاں کی مشینوں کا ایک ایک پرزہ دے سکتا ہے کہ میں نے ان کو کیا سے کیا بنادیا ہے اگر اس کا صلہ یہی ہوسکتا ہے تو سمجھ لو دنیا انصاف سے عاری ہو کر تباہی کی طرف چلی جارہی ہے۔ خیر کوئی مضائقہ

نہیں۔ میں کاریگر آدمی ہوں بھوکا نہیں مر سکتا۔ میں جہاں ہونگا جس حال میں ہونگا نمک نہیں بھولونگا۔ تم ہر جگہ میرے ساتھ ہوگے۔ اگر میں کھاؤنگا تو تم کو بھی کھلاؤنگا" بوڑھے منیجر نے بکمال ہمدردی کہا۔

مزدوروں کو جب معلوم ہوا کہ انکا ہر دلعزیز منیجر بلاوجہ نکالا جا رہا ہے تو انہوں نے فوراً ہڑتال کرنے کی ٹھان لی لیکن خانصاحب ان کو سختی سے روک دیا کہ اگر کسی قسم کی شورش انہوں نے بپا کی تو وہ اُن سے سخت خفا ہونگے۔

بملا شہر کے ایک نہایت اوباش اور ہرجائی قسم کے نوجوان کے دام تزویر میں پھنس گئی تھی۔ یہ نوجوان جتنا ذہین طباع اور خوش گفتار تھا۔ اسیقدر نہایت خود غرض، مکار اور دنی الطبع بھی تھا چندہی ملاقاتوں میں بملا جیسی بددماغ و مغرور لڑکی پانی ہوگئی تھی۔ جن لڑکیوں کی گھر میں اچھی تربیت نہیں ہوتی ہے وہ ہمیشہ بدمعاشوں کیلئے ایک آسان شکار ثابت ہوتی ہے۔ اس قسم کی لڑکیوں کی غلط شدہ اعتمادی ان کو یہ یقین دلاتی رہتی ہے کہ جو کچھ وہ کر رہی ہیں وہ بہت عاقلانہ حرکت ہے اور مخالفت کرنے والے یا تو متعصب ہیں یا دقیانوسی۔

خانصاحب کے علم میں جب یہ واقعہ آیا تو ان کو بھی بہت افسوس ہوا۔ وہ پرانے خیال کے آدمی اور ساتھ ہی مصلحانہ ذہنیت کے مالک، ان کے ضمیر نے سیٹھ صاحب کے ناسپاسانہ طرز عمل کے باوجود ان کو ترغیب دی کہ حق نمک حلالی یہی ہو سکتی ہے کہ بملا کو راہ راست پر لایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً سیٹھ صاحب کو پہلے ایک معمولی سا یہ ٹیلیگرام روانہ کیا۔

"آپ کی لڑکی غیر مردوں کے ساتھ آجکل سینما بہت جاتی ہے۔ روکئے"

اُسی روز ان کو سیٹھ صاحب کا یہ جواب مل گیا" تم حاسد ہو۔ اپنے کو نوکری سے علیحدہ سمجھو"

خانصاحب کو بھاگ چند کا نہ صرف اس پر بہت غصہ آیا اور افسوس بھی ہوا انہوں نے پھر پچیس روپیہ صرف کر کے ایک بہت تفصیلی ٹیلیگرام سیٹھ کے پاس روانہ کیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ بملا شہر کے ایک نہایت اوباش نوجوان کے بہکانے میں آکر آپ کا نام اور اپنا مستقبل خراب کر رہی ہے۔ اس پچیس روپیہ کے تفصیلی ٹیلیگرام کا جواب صرف ایک روپیہ خرچ کر کے یہ دیا گیا:۔

"احمق۔ اپنے کو نوکری سے علیحدہ سمجھو"

آخر وہ دن بھی آ گیا جب بملا اپنے آشنا کے ساتھ بیاہ کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ خانصاحب کی برطرفی میں صرف تین دن رہ گئے تھے۔ انہوں نے ادائگی فرض کے سلسلہ میں ایک آخری بار اور کوشش کی اور سیٹھ صاحب کو پھر اطلاع پہنچائی کہ آپ کی لڑکی اس ہفتہ میں اس اوباش نوجوان سے شادی کر رہی ہے۔ اس تار کا کوئی جواب نہ آیا۔

چوتھے روز خانصاحب نوکری سے علیحدہ ہو کر گھر آ گئے اور ان کے ساتھ جگدیش بھی۔ خانصاحب نے سر دست تو یہ کیا کہ انہوں نے جگدیش کو اپنی پندرہ روپیہ کی تنخواہ کا نصف حصہ دے دیا اور خود قسمت پر شاکر ہو بیٹھ رہے۔

پانچویں روز سیٹھ صاحب کا ایک بیتابانہ تار ان کو ملا جس کے یہ الفاظ تھے۔

"اس شادی کو پولیس کے ذریعہ سے روک دو۔ میں آرہا ہوں"

خانصاحب کا دماغ چکرانے لگا۔ یہ معاملہ قابل دست اندازی پولیس تو نہ تھا جب ایک بیوقوف لڑکی سول میرج کے عمل قانون کی رو سے کسی بھی شخص سے شادی کرنے کیلئے آمادہ ہو تو والدین کا حق اور ان کے فرائض بیکار ثابت ہو کر رہ جاتے ہیں بہر نوع خانصاحب اُٹھے اور معمولی طریقے پر پولیس میں اطلاع کر آئے۔

سیٹھ صاحب کے آتے ہی وہ نوجوان گرفتار کر لیا گیا۔ خانصاحب کو بڑی حیرت ہوئی جب انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے حمید کو بھی سیٹھ صاحب کے ہمراہ دیکھا۔

معلوم یہ ہوا کہ حمید نے اپنے طور پر ایک کامل سراغرساں کی خدمت انجام دی تھی یہ نوجوان ایک عادی چور تھا بمبئی پولیس میں اس کی پوری ہسٹری درج تھی اور کئی ماہ سے سیٹھ صاحب کے فرضی دستخط بنا کر بنک سے ان کا روپیہ بھی اُڑا چکا تھا۔ یہ حمید کی کاوش کا نتیجہ تھا کہ جس فرض کو اس کا باپ انجام نہ دے سکا تھا۔ اس نے عملی سرگرمی سے اسکو تکمیل تک پہنچایا۔

خانصاحب بڑی عزت اور اضافۂ مشاہرہ کے بعد پھر نوکری پر بحال کئے گئے۔ اور ان کے ساتھ جگدیش بھی۔

کئی دن کے بعد خانصاحب نے ایک روز جگدیش سے کہا" بیٹے جگدیش، دنیا دار سمجھ سے کام لے تو وہ اپنی اصلاح کر سکتی ہے۔ دولتمند والدین بھی کبھی کبھی سمجھ سے کام لے سکتے ہیں" ✻

✻ "خدا پر بھروسہ رکھئے خانصاحب، خدا پر" جگدیش نے ہنستے ہوئے بے محل جواب دیا ــــ "اچھا!"....

زہرہ کا جامن

شبِ غم ختم نہ ہوئی ساتھ کسی کا اب
قصۂ غم ہے زباں پر کسی کا اب
جب کہ ... کسی نے زباں ... بیدرد یا اب

از مصور جذبات بابا عالم سیاہ پوش

موسم سرما کی ایک خوشگوار صبح کو میں نالہ کرن کی طرف سیر کو گیا تو بید مجنوں کے ایک جھکے ہوئے درخت کے پاس میں نے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ خلاف معمول وہاں بھیڑ بھاڑ دیکھ کر میں اس اجتماع کا باعث معلوم کرنے کیلئے وہاں پہنچا۔ ایک نووارد مسافر فقیر کی لاش وہاں پڑی تھی۔ فقیر کے چہرے پر ایک روحانی جلال تھا جو موت کے وارد ہو جانے کے بعد بھی بدستور قائم تھا۔ اس کے قریب ایک گدڑی اور ایک جھولی پڑی تھی۔ فقیر کی لاش کو میں نے قبرستان میں دفن کرا دیا اور سارا دن روتا رہا۔ یہ سچ ہے کہ پردیسی مسافروں کیلئے کوئی نہیں روتا لیکن میرے دل میں روز بروز درد کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس کا باعث اس کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ جھولی میں کیا تھا۔ ایک جامن کا سوکھا ہوا پتا اور ایک کتاب دستی لکھی ہوئی۔ میں جوں جوں اسے پڑھتا ہوں دریائے درد میں ڈوبتا جاتا ہوں۔ "زہرہ کا جامن" اسی کتاب کا ایک پُرحسرت باب ہے جسے میں قارئین مست قلندر کی نذر کرتا ہوں۔ سچی کہانی دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ امید ہے آپ اسے پڑھ کر اپنے دل میں ایک پرسوز کیف محسوس کرینگے ـــــــ (عالم)

۱

وقت ایک مرہم ہے اور ہر دن ایک پٹی۔ قدرت دل کے زخموں کا اندمال کرنے کے لئے وقت کی مرہم لگاتی رہتی ہے۔ اور دنوں کی پٹیاں باندھتی رہتی ہے حتیٰ کہ انسان وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے صدمات بھول جاتا ہے جنہیں کبھی بھولنے کا اسے خواب میں بھی احتمال نہیں ہوتا۔

ایک مشہور مصنف کے افسانہ کی ابتدائی سطور پڑھ کر میں نے کتاب پھینک دی میرے دل نے کہا۔ غلط بالکل غلط اس ادیب کو علم النفس کا علم ہی نہیں فطرتِ انسانی کے حقائق اور تجربات زندگی پہ اگر ان سطور کا تجزیہ کیا جائے تو یہ خیال بے مفہوم سے وہم کی صورت میں متبدل ہو جائیگا۔ میں نے پریشانی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور دل میں کہا۔ کاش یہ سچ ہوتا۔ میرے مشاہدات تو ثابت کرتے ہیں کہ ہر دن ایک نشتر ہے جو دل کے گھاؤ کو اور زیادہ گہرا کرتا رہتا ہے۔ سورج خون اگلتا ہوا نکلتا ہے اور خون برساتا ہوا غروب ہو جاتا ہے۔ سورج کی کرنیں خونی بھالے بنکر مادر گیتی کے سینے میں پیوست ہوتی رہتی ہیں اور آسمان خوفناک اور متحیر ماحول پر معلق وحشتناک انداز میں چکراتا رہتا ہے۔

میں نے اپنے دل و دماغ کو تخیلات کے پر پیچ اداس راستوں سے روکنے کیلئے رباعیات عمر خیام کی کتاب اٹھائی اور اسے غیر ارادی طور پر کھول دیا۔ ایک رباعی میرے سامنے آئی جس کا مطلب تھا ـــ ماضی کو بھول جاؤ۔ مستقبل سے بے نیاز رہو اور حال میں سے لڑکھڑاتے ہوئے گذرتے جاؤ ـــ

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے آہستہ سے کہا کیسے بھول جاؤں ماضی کو۔ ماضی کی کھوئی ہوئی دھندلی سی یادوں پر تو میری زندگی کا انحصار ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ ہمارا ہر سانس جو مستقبل سے حال میں آتا ہے۔ وقت کے کفن میں لپٹا ہوا ماضی کے سینے میں مدفون ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کہاں چھپا دوں ان منحوس یادوں کو۔ دل کے کس تاریک کونے میں انہیں دفن کر دوں جہاں سے وہ پھر نہ نکل سکیں۔ یادیں اور یادیں بھی وہ یادیں جو بن بلائے میرے سامنے آتی رہتی ہیں اور جنہیں بھلانا میرے امکان سے باہر ہو گیا ہے۔ کس قدر منحوس ہے میری یادوں کی صدائے بازگشت،

جو ہر وقت میرے دل میں گونجتی رہتی ہے۔

۲

نور پور گاؤں میں میرا والد ایک غریب خاندان کا فرد تھا۔ وہ اپنی نیکدلی، شرافت اور سنجیدگی کے باعث گاؤں بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ گاؤں میں اردو کی چار جماعت تک سکول تھا۔ میں پڑھنے لکھنے میں بہت ذہین تھا۔ جماعت میں ہمیشہ اوّل رہتا۔ سکول کے منشی جی جب میرے والد سے ملتے کہتے! میاں صاحب آپکا لڑکا پڑھنے لکھنے میں بہت ہوشیار ہے۔ جس طرح ہو اسے پڑھاؤ۔ یہاں سے چار جماعت پاس کرلے تو کسی قصبہ کے مڈل سکول میں بھیج دینا۔ والد صاحب کہتے ہاں منشی جی میرا بھی یہی خیال ہے۔ خواہ مجھے کان اور چار بیگھے زمین ہی کیوں نہ رہن کرنی پڑے لیکن میں سلیم کو خوب پڑھاؤنگا۔ ابھی تیسری جماعت میں پڑھتا ہے لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے یہ تو چوتھی کی کتاب بھی آسانی سے پڑھ لیتا ہے۔ مجھے لکھنے پڑھنے سے ایک قدرتی عشق تھا۔

لیکن جب کبھی میرے ماموں زہرہ کو ساتھ لے کر ہمارے یہاں آجاتے تو مجھے لکھنا پڑھنا بھول جاتا۔ زہرہ میرے ماموں کی لڑکی تھی۔ ماموں ہم سے ۱۰ میل کے فاصلہ پر قصبہ فرید آباد میں رہا کرتے تھے۔ وہاں کے مڈل سکول میں اردو فارسی کے مدرس تھے۔ مجھے زہرہ کے ساتھ شرارتیں کرنے اور کھیلنے میں خوب لطف آتا تھا۔ اسکی عمر آٹھ سال کے قریب تھی اور میری دس کے لگ بھگ۔ ہم باہر کے جوہڑ پر کھیلتے۔ کاغذ کی کشتیاں بناتے اور مٹی کے گھروندے ہمسایوں کی لڑکیاں بھی ہمارے کھیلوں میں شرکت کرتیں۔ قریب کے کھیتوں سے ہم کپاس کی ایک ایک چھڑی توڑ لاتے اور ان کے گھوڑے بنا کر جوہڑ کے کنارے بھاگتے پھرتے۔ باقاعدہ گھوڑ دوڑ ہوتی۔ زہرہ گھوڑ دوڑ میں ہمیشہ ہار جاتی۔ رکھی جینیاں مریم۔ زہرہ۔ میں۔ احمد۔ نتھو۔ ہم سب کا مقابلہ ہوتا۔ زہرہ جب ہارتی تو مجھ سے روٹھ جاتی پھر میں دانستہ طور پر اپنے گھوڑے کو لیکر آہستہ آہستہ بھاگتا تاکہ وہ جیت جائے۔ وہ اپنا گھوڑا لئے آگے نکل جاتی۔ خوشی سے اسکی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ ہم دونوں ہنستے ہوئے گھر لوٹ آتے۔ جب وہ ماموں کے ساتھ واپس فرید آباد چلی جاتی تو میں کئی کئی دن اداس رہتا۔ امی کے ساتھ میں جب فرید آباد جاتا تو کئی دن زہرہ کے ساتھ کھیل کود میں گذار دیتا۔ وہ اردو کی دوسری کتاب پڑھا کرتی تھی جب کبھی وہ مجھے اپنا سبق سناتی میں اسے چڑانے کیلئے کہتا۔ تم غلط پڑھتی ہو۔ وہ کہتی تم جھوٹ کہتے ہو۔ میری استانی نے یونہی پڑھایا ہے۔ تم کیا جانو خود کچھ جانتے نہیں اور میری غلطیاں نکالتے ہو۔ میں کہتا۔ تمہاری استانی خاک جانتی ہے۔ وہ تنک کر کہتی تمہارے استاد کو خاک خبر ہے۔ میری استانی بہت لائق ہے۔ میں کہتا تمہاری استانی لائق ہوتی تو تمہیں ٹھیک پڑھاتی؟ وہ کتاب پھینک دیتی اور پھر استانی اور استاد کی تعلیمی قابلیت کا موازنہ کرنے والوں میں ٹھن جاتی۔ جب وہ کھسیانی ہو جاتی تو رونا شروع کر دیتی۔ امی پوچھتی کیا ہوا زہری وہ کہتی سلیم میری استانی کو گالیاں بکتا ہے۔ اور میں کہتا یہ میرے استاد کو برا بھلا کہتی ہے۔ امی مسکرا دیتی اور کہتی بھلا استاد اور استانی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو انہیں گالیاں دیتے ہو۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں ہار ماننے پر مجبور ہو جایا کرتا تھا۔ میں فوراً کہتا نہیں زہرہ تمہاری استانی بہت لائق ہے۔ میں تو جھوٹ موٹ کہتا تھا۔ اس کے آنسو تھم جاتے اور ہم سڑک پر ریت کے گھروندے بنا کر کھیلنا شروع کر دیتے۔

۳

چوتھی جماعت کے امتحان سے تین ماہ پیشتر میرے والد صاحب کو بخار آنے لگا۔ گاؤں کے ویدجی نے کچھ پڑیاں اور گولیاں دیں لیکن بخار نہ اترا۔ ماموں جان خبر لینے آئے تو اپنے قصبہ کے ڈاکٹر سے علاج کرانے کا مشورہ دیا۔ میری امی بہت اداس تھی۔ ماموں ہمیں ساتھ لے کر فرید آباد آگئے۔ قصبے کے ڈاکٹر سے علاج شروع کرایا۔ غریبوں کا علاج کون کرتا ہے۔ والدہ کی بالیاں اور چند چاندی کے زیورات جو ہماری اثاث تھے۔ انہیں فروخت کرکے چند مرتبہ ڈاکٹر کو فیس دی گئی مگر وہ روپے تھے ہی کتنے جو علاج کیلئے ہماری کفالت کرتے۔ بخار نہ اترنا تھا نہ اترا اور ابا ہمیشہ کیلئے میٹھی نیند سو گئے۔ اس قافلے کی کس مپرسی کا کیا ذکر جس کا میر کارواں گم ہو جائے ہمارا مختصر سا لٹا ہوا قافلہ واپس آگیا۔

میرے دو بڑے بھائی تھے ایک ۱۸ برس کا دوسرا ۱۶ برس کا۔ وہ تھوڑی بہت مزدوری کرتے تھے۔ ماموں صاحب بھی ساتھ آئے اور چند دن ٹھہرے جب واپس جانے لگے تو امی سے کہا بھائی صاحب کا خیال تھا کہ وہ سلیم کو بہت پڑھائینگے لیکن شاید اب تم اس کی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکو۔ بہتر ہے اسے میرے ساتھ بھیج دو۔ وہاں مڈل تک سکول ہے۔ گھر میں جو

میسر آئے گا کھائے پیئے گا۔ جس طرح زہرہ ارشد اور امجد میرے بچے ہیں اسی طرح یہ بھی مجھے عزیز ہے۔ والدہ رضامند ہوگئی مجھے سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے جاری تھے۔ وہ کوئی بات نہ کر سکی۔ شاید یتیم بچے کو رخصت کرتے وقت کوئی ماں بول نہیں سکتی میرا خیال ہے کہ ایسے موقعہ پر ہر ماں کی باتیں ہچکیاں بن جایا کرتی ہیں۔ ہر چند وہ مجھے ماموں کے ساتھ بھیج رہی تھی۔ لیکن وہ ماں تھی — ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ وہ اپنی پیاری سے پیاری چیز اولاد پر نثار کر سکتی ہے لیکن اولاد سے علیحدگی اس کے لئے ناقابل برداشت بوجھ ہوتا ہے۔ ماموں کی آنکھیں بھی بھر آئیں بولے فکر نہ کرو بہن، سلیم کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ یہ میرا اپنا بچہ ہے۔ تم فکر کیوں کرتی ہو؟ میں ماموں کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی اداس پگڈنڈی پر جاتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ماں دروازے کا سہارا لئے کھڑی تھی اور اپنی میلی اوڑھنی سے آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

(۴)

بچپن ایک پُرامن ڈرامہ ہے۔ تعمیر حیات کی یہ بنیاد جس پر شباب اور شباب کی کیف آور رنگینیوں کی پُرمسرت عمارت استوار ہوتی ہے اور جس پر بعد میں بڑھاپا اداس شام کی طرح چھا جاتا ہے۔ جسے آخرکار موت اپنی منحوس تاریکی میں ہمیشہ کے لئے چھپا لیتی ہے ایک نہ بھولنے والا خواب ہے۔ بچپن، معصومیت اور الھڑپن کی مفصل تفسیر ہے۔ غم کی کیا مجال ہے جو مسلسل اس دور میں ساتھ رہے۔ بیکسی کی لمبی راتیں اور تنہا اداس دن اسوقت اتنے طویل معلوم نہیں ہوتے جتنے آجکل۔ ماموں اور مامی جان مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں فرید آباد کے مڈل سکول میں داخل ہو چکا تھا۔ سکول سے آکر زہرہ کا سبق سنتا۔ اپنی کتاب سے اُسے کہانیاں سناتا اور پھر کھیل کود میں شام ہو جاتی۔ ایک دن ماموں صاحب کسی باغبان سے جامن کا ایک درخت لائے تین چار فٹ لمبا پتلا سا جامن کا درخت جس کی تین چار پتلی پتلی شاخیں تھیں، صحن میں گاڑ دیا گیا۔ زہرہ بہت خوش ہوئی۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ جیسے اسے کائنات کا خزانہ مل گیا ہے۔ وہ بہت سا وقت جامن کی نگہداشت میں صرف کرنے لگی۔ صبح شام اسے پانی دیتی۔ اس کے نیچے جھاڑو لگاتی اور اگر اس کا کوئی پتہ گر جاتا تو بہت اداس ہوتی بعض وقت وہ گرمیوں کی دھوپ میں اس کے قریب چوکی لے کر بیٹھ جاتی اس کا چھوٹا سا سایہ اس کیلئے بہت کچھ تھا۔ مجھے بھی اس کے ساتھ وہیں بیٹھنا پڑتا۔ مامی بعض اوقات ناراض ہوتی اور کہتی پاگل ہے زہری تو۔ دھوپ میں بیٹھی ہے بیمار ہو جائیگی کمبخت۔ وہ نہایت سادگی سے جواب دیتی۔ امی جامن بھی تو دھوپ میں ہی کھڑا رہتا ہے جب وہ

نوائے دل!

(از جناب شمس نوید عثمانی دیوبندی)

اگر شب و روز کی تڑپ میں ہنر نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے
محبت کا درد خود ہی دوا نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے
اگر ستم کو بہم بنانے والے رہِ محبت سے راہ روشن
خضر کو ہے تیرا خود رہنما نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے
اگر ترا شوق تیرا فانی سے اپنی آنکھ کے جینے والے
حباب آسا حیات عمر کا مدعا نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے
اگر تری زندگی کی ڈوبنے والی ترے سفینہ کی ناخدا خود
نہیں کی موج جس کو کوئی ناخدا نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے
اگر تری ناؤ کا تصرف ہیں ہوں ہمیشہ
ہزاروں آنکھوں میں ستم گر ترے نصرف نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے
ہمہ تن ترے سازِ دل میں غم کی نوا نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے

بیمار نہیں ہوتا تو میں کیسے بیمار ہو جاؤنگی
وقت گزرتا گیا۔ بڑھتے ہوئے جامن کے بوٹے کے ساتھ ساتھ ہم بھی بڑھتے گئے اور ہماری قوت احساس میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ ہماری معصوم کھیلیں اور بچپن کی شوخیاں، ریت کے گھر، گھروندے، گھوڑ دوڑ کچھ کچھ بسرتے جاتے تھے مگر معصومیت بدستور ہمارے ساتھ تھی۔ میری والدہ مہینہ بیس دن میں خود ہی مجھے آکر مل جاتی۔ فرید آباد سے مجھے بہت محبت ہوگئی۔ زہرہ سے الگ میں خوش رہ سکتا تھا نہ وہ۔ جامن کا بوٹا، زہرہ، اور میں ہم تینوں ایسے دوست تھے جو کبھی علیحدہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔
اب ہم کشتی تیرانے جوہڑ پر نہیں جاتے تھے۔ بلکہ اپنے جامن کے گرد جو گڑھا اسے پانی دینے کیلئے کھود رکھا تھا۔ اس میں کشتی تیرا لیتے۔ وہیں ریت کے گھر بنا لیتے اور وہیں پڑھنے میں مصروف ہو جاتے۔ سکول کے وقت کی علیحدگی ہمیں بہت شاق محسوس ہوتی۔ لیکن سکول جانا تو ضروری تھا نا۔

۵

ایک دفعہ بڑے زور کی آندھی آئی۔ دُنیا گہری تاریکی میں ڈوب گئی۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ جو لوگ کھیتوں میں کام کرنے گئے تھے۔ ان کے لئے گھر تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ کئی لوگ کھانا نہ بنا سکے۔ ہوا خوفناک چیخیں مارتی ہوئی گذر رہی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ زہرہ جامن کے پودے کو گلے سے لگائے کھڑی رہی کہ کہیں وہ گر نہ جائے۔ مامی نے اسے مارا بھی کہ دالان میں چل کر بیٹھ، مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جامن کی ہر ٹہنی میں اس کا دل ہے۔ جامن کی کانپتی اور لرزتی ہوئی ٹہنیوں کے ساتھ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ ایک آندھی پر ہی موقوف نہیں۔ طوفان۔ جھکڑ۔ بارشوں میں بھی وہ جامن کے پودے کو تھام کر کھڑی رہتی۔ اس کی خوشنودی کیلئے مجھے بھی وہیں ٹھہرنا پڑتا۔ اس کے کپڑے بھیگ جاتے۔ بارش تھم جانے پر وہ اندر آتی اور آرام کا سانس لیتی۔ رات کی تاریکیوں کے جھکڑ، آندھیاں، بارشیں، کوئی طاقت اسے جامن کی حفاظت سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ وقت گذرتا گیا۔ دن، مہینے اور سال بیت گئے میں نے مڈل پاس کر لیا۔ اس کے بعد مجھے مجبوراً نور پور آنا پڑا۔

زہرہ اب وہ پہلی سی زہرہ نہیں تھی بلکہ ۱۶ برس کی دوشیزہ تھی۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ گندمی رنگ، تیکھے تیکھے نقش، اس کی آنکھوں میں بلا کی جاذبیت اور چمک تھی۔ ماموں صاحب کی مرضی تھی کہ زہرہ کو ہمیشہ کیلئے مجھے سونپ دیا جائے لیکن مامی اس بات کے خلاف تھی کیونکہ مامی کے قریبی رشتہ داروں میں زہرہ کا رشتہ اس شرط پر لگا جا رہا تھا کہ وہ اس کے صلہ میں زہرہ کے بھائی ارشد کو بیاہ دینگے یہ تبادلہ مامی کیلئے باعث صد افتخار تھا۔ کیونکہ اگر وہ زہرہ کو مفت کہیں بیاہ دیتی تو ارشد کیلئے رشتہ ملنا مشکل تھا۔ غریبوں میں اکثر اسی اصول پر شادیاں کی جاتی ہیں یا روپے دے کر یا تبادلہ کر کے۔ روپے خرچ کرنے کی ان میں استطاعت نہ تھی۔ پھر وہ اس موقع کو ہاتھ سے کھو کر نادانی کا ثبوت کیوں دیتے؟

زہرہ کے دل کی کیفیت کچھ ہو۔ اسے کچھ کہنے کا حق نہیں تھا۔ ہندوستانی لڑکیاں خصوصاً غریب گھرانوں کی دم مارنے کا یارا نہیں رکھتیں۔ والدین کا یہ جائز اور ناجائز حکم ان کیلئے حکم خداوندی سے کم نہیں ہوتا۔ اور جنگلی پھول کی طرح وہ اپنے جوہر ذاتی کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاتی ہیں
اس نے مجھے ایک چٹھی لکھی۔ میں تمہارے تصور میں گم رہتی ہوں۔ میں رات کی تنہائی میں تکیے میں منہ چھپا چھپا کر روتی ہوں۔ تمہارا غم میرا جزو حیات بن گیا ہے۔ میرے آنسوؤں سے نہ میری سکھیاں واقف ہیں نہ والدین۔ سوز دل کو اداس قہقہوں کے پردے میں چھپائے رہتی ہوں۔ میں بے خبری ہی بے خبری لٹی جا رہی ہوں۔ میری سکھیاں مجھ میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کرتی ہیں۔ وہ مجھ سے اکثر پوچھتی ہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے زہری؟ لیکن میں انہیں کیا بتاؤں؟ بعض دفعہ جب امی گھر پر نہیں ہوتی۔ میں جامن سے لپٹ کر روتی ہوں۔ وہ میری ہچکیوں کو خاموشی سے سنتا رہتا ہے۔ میں کیا کروں سلیم؟

۶

کسی نے سچ کہا ہے۔ یتیم وہ نہیں ہوتا جس کے بچپن میں ماں باپ مر جائیں بلکہ یتیم وہ ہوتا ہے جسکی تعلیم و تربیت تشنہ تکمیل رہ جائے۔ ہمارے یہ بچے جو گندی نالیوں میں کیچڑ اچھالتے پھرتے ہیں نہ جانے ان میں کتنے کمال، نپولین اور ٹیپو موجود ہیں۔ جو بچہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی خوفناک آوازوں کو سنتے ہوئے کسی کے

میرا میں چھپا ہونک سکتا ہے۔ اگر اس کی تربیت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر کسی ذمہ دار افسر کی جگہ پر کھڑا ہونے کا موقعہ دیا جائے تو وہ احسن طریقہ پر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ مصوری، موسیقی، شاعری اور بہادری قدرت کی فیاضانہ تقسیم ہے جس کے لئے وہ قوم، خاندان، رنگ، مذہب، امیری اور غریبی کو نہیں دیکھتی۔ ضروری نہیں کہ امرا کے بچوں کو فطرت فنون لطیفہ سے نوازے اور غربا کو اس سے محروم رکھے۔ امرا کے بچے اکثر بدکردار، عیاش، بداندیش اور کوتاہ نظر ہوتے ہیں۔ فطرت غربا میں اکثر کو یہ جوہر بخش تو دیتی ہے لیکن مکارانہ سوشل تقسیم جس کی بنیادیں جور و استبداد پر ہیں، انہیں ترقی کرنے کا موقعہ نہیں دیتی۔ آیندہ سلسلۂ تعلیم جاری رکھنا میرے لئے بے حد مشکل تھا۔ سرسوتی (علم کی دیوی) اور زہرہ مجھ سے دور بھاگی جا رہی تھیں۔ نظام دنیا، نظام دنیا کی بے قاعدگی، اس بے قاعدگی کی بخشی ہوئی غربت اور اسی قسم کی کئی دیواریں میرے اور دنیا کے درمیان حدِ فاصل قائم کئے جا رہی تھیں۔ ماموں نے والدہ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ کوشش کر کے سلیم کی کہیں شادی کر دینگے۔ اور کہا بہن تمہیں اپنے بھائی کی مسرتوں پر خوش ہونا چاہئے ارشد اچھے گھر میں بیاہا جائیگا اور زہری بھی سونے چاندی میں کھیلے گی۔ زہرہ کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ والدہ نے شادی میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ ماموں نے والدہ کو منانے کی ہر چند کوشش کی لیکن وہ نہ مانی اور مانتی بھی کیسے وہ میرے دل کے درد سے واقف تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر سلیم کو زہرہ نہ ملی تو اسکی زندگی تباہ ہو جائیگی۔ ماموں سے باتیں کرتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہ رہی تھیں۔ ماموں بھی بہت روئے لیکن مامی جان کے سامنے اپنے مفاد کے پیش نظر ارادہ بدلنے کے باوجود بھی نہ بدل سکے۔

جوئے میں ہاری ہوئی دروپتی کی جھکی جھکی سہمی سہمی نگاہوں نے ارجن کی قوت بازو کا اندازہ کیا تو اسے اس میں عہد اور رسم کی نہ ٹوٹنے والی زنجیریں نظر آئیں۔ وہ بھڑا اُٹھی۔ اس کے صندلی بازوؤں پر دریودھن کی نگاہیں ناگ بنکر لپٹی جا رہی تھیں۔ وہ کانپی، سمٹی، لجائی، اور اس کا تخیل دوڑ بہت دور بندرابن کی سُریلی فضاؤں سے ٹکرانے لگا۔ کہتے ہیں شام نے اس کی لاج بچائی۔ لیکن زہرہ کی لاج۔۔ زہرہ کی لاج رکھنے کوئی نہ آیا اور وہ بیاہ دی گئی۔

میرا دل دُنیا سے متنفر ہو گیا۔ ایک صبح سورج نکلنے سے بہت پہلے میں صبح کاذب کے جھٹپٹے میں روپوش ہو گیا۔ زہرہ کے بعد میں نے دنیا کی ہر چیز کو تیاگ دیا گھر، مال، بھائی، آشائیں، تمنائیں اور سب کچھ۔

(۷)

جنگل، بستیاں، ویرانے، میرے لئے سب کے سب ایک جیسے ہو گئے۔ ۳۰ برس کے بعد ایک دفعہ پھرتا پھراتا ایک قصبہ کے قریب آنکلا۔ قصبہ اگرچہ بہت کچھ بدل چکا تھا لیکن میں نے پہچان لیا۔ فرید آباد تھا۔ میری گھنی سفید ڈاڑھی اور لمبی لمبی لٹیں کانپ گئیں۔ میں نے محسوس کیا۔ قصبہ، قصبے کا ہر ذرہ، ہوا کا ہر جھونکا، زمین، آسمان ایک گھبرائے ہوئے مسخرے کی طرح میری تضحیک کر رہے ہیں۔ ماموں کا مکان مدت ہوئی قرضے میں نیلام ہو چکا تھا۔ جانے وہ کہاں چلے گئے۔ نئے مکینوں نے مکان کا نقشہ بدل کر اسے جدید طرز پر بنوایا تھا۔ لیکن جامن کا درخت نہیں کٹوایا تھا۔ اب جامن ایک تناور درخت تھا۔ وہ جامن جس کی محافظت کرنے کیلئے زہرہ، طوفان، آندھی اور بارش کا مقابلہ کیا کرتی تھی، خاموش کھڑا تھا۔ ہوا کا ایک جھونکا سسکتا ہوا گذر گیا۔ جامن کے پتوں نے ایک اداس گیت گایا۔ اس گیت میں، کاغذ کی نیا، مٹی کے گھروندے، اور ریت کے گھر کا ذکر تھا۔ مجھ پر مجنونانہ کیفیت طاری ہو گئی۔ جامن کا ایک سوکھا ہوا پتہ ہوا کے لرزتے ہوئے جھونکے سے لڑکھڑاتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ میں نے اُسے اُٹھایا اور دیوانہ وار آگے گذر گیا۔

رباعیات

عالم میں عجب شان سے آیا ساون
فطرت کی نگاہوں کو بھی بھایا ساون
ساغر بھی ہے، سرمست گھٹائیں بھی ہیں
ایسے میں نہ کیوں یار کو لایا ساون؟

آکاش پہ ہے کالی گھٹاؤں کا زور
لہروں میں ہے گنگا کی ہواؤں کا زور
رادھا نے کہاں بال کے جوڑے کھولے
سنسار میں ہے آج بلاؤں کا زور

از حسن نصیری ایم اے (گولڈ میڈلسٹ)

ایک عزیز مگر
بیدرد دوست کے نام

(س ۔ ن ۔ ش)

پیامِ تجدید

از جناب
سردار جلیل شیرکوٹی
بی اے

یادِ غمِ محبت دل پر ہے تازیانہ
کیا مجھ سے پوچھتے ہو آخر مرا فسانہ
قسمت کو رو رہا ہوں تقدیر پھوڑتا ہوں

وہ کالی کالی راتیں، بہکی ہوئی سی باتیں
ہر لفظ آرزو پر بہیم کسی کو ماتیں
میں یاد کر رہا ہوں بھولا ہوا فسانہ

اِک بار پھر سے آؤ تجدید دوستی ہو
سارے جہاں پہ طاری جسوقت خامشی ہو

بے کیف زندگانی اب ہو گئی ہے پیارے
شوخی نہیں ہے باقی پہلی سی داستاں میں
تاثیر اب کہاں ہے پہلی سی داستاں میں

دل رو رہا ہے میرا آنسو نہیں تو کیا ہے؟
اوروں کے واسطے تم معلوم کیا کہ کیا ہو
میرے لئے دعا ہو میرے لئے دوا ہو
کیا لطف زندگانی تم پاس ہی نہیں ہو

مشتاقِ دید آنکھیں ترسی ہوئی ہیں پیارے
لو! ڈوبنے لگے ہیں اب چرخ کے ستارے
مشتاقِ دید آنکھیں کب سے کھلی ہوئی ہیں

میں تیرے روبرو ہوں تو میرے روبرو ہو
میں تیری آرزو ہوں تو میری آرزو ہو
آجا! جلیل تیرا پھرتا ہے مارا مارا

کیوں یاد آ رہا ہے گذرا ہوا زمانہ
اجڑا ہوا چمن ہے برباد آشیانہ
جو آبلے ہیں دل میں آج ان کو توڑتا ہوں

دن عید تھے ہمارے راتیں شب براتیں
بھولا نہیں ہوں اب تک وہ پیاری پیاری باتیں
بھولا ہوا فسانہ، آباد آشیانہ

تجدیدِ دوستی کیا تجدیدِ زندگی ہو
اسوقت اپنی دنیا نغموں سے گونجتی ہو

دل سے نکل رہے ہیں پیہم مرے اشارے
اب ہو گیا مسلط رنج و الم جہاں میں
نالہ کا رنگ غالب اب ہو گیا فغاں میں

طوفانِ تند دل میں میرے مچا ہوا ہے
لیکن قسم خدا کی میرے لئے خدا ہو
پھر مدتوں سے مجھ سے کس بات پر خفا ہو
حالت کا میری تمکو کس طور پر یقیں ہو

میں جی رہا ہوں بس اک امید کے سہارے
یہ بھی گذر گئی شب اور تم نہ آئے پیارے
در پر مری نگاہیں پیہم جمی ہوئی ہیں

غرقِ شراب میں ہوں مستِ شباب تو ہو
پھر نغمۂ عنادل دنیا میں چار سو ہو
باقی کہاں ہے اس میں اب ضبط کا وہ یارا

شہنشاہِ برطانیۂ عظمیٰ

ایک نہایت معلوماتی دلچسپ مضمون

از: ـــــ ادارہ

ملک معظم عموماً روزانہ دس بجے بکنگھم پیلس کے سہ منزلے پر اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ کمرہ نہایت پُرسکون اور ہوا دار واقع ہوا ہے۔ کھڑکی سے لگا ہوا شہنشاہ کا ڈیسک ہے۔ بادشاہ جارج ششم سے پہلے ڈیوک آف ونڈسر، جارج پنجم، ایڈورڈ ہفتم، اور ملکہ وکٹوریہ بھی اسی میز پر کام کیا کرتی تھیں۔ بادشاہ کے پاس آئے ہوئے بکثرت خطوط کے ساتھ ایک بڑا سا لفافہ بھی ہوتا ہے جس پر وزارت کی مہر لگی رہتی ہے اور بڑے بڑے حرفوں میں O.H.M.S. (آن ہز میجسٹیز سروس بکار سرکار) لکھا رہتا ہے۔ بادشاہ کے تمام ذاتی خطوط میں جو ان کے احباب اعزا کی طرف سے موصول ہوتے ہیں۔ یہی ایک ایسا لفافہ ہوتا ہے۔ جسے ان کا پرائیویٹ سیکرٹری نہیں کھول سکتا۔ ملک معظم پہلے اسی لفافے کو کھولتے ہیں۔ اس کے اندر فلسکیپ سائز کے کاغذ پر ٹائپ کئے ہوئے چار پانچ اوراق رہتے ہیں۔ ان میں کافی حاشیہ چھوٹا رہتا ہے تاکہ اگر بادشاہ پڑھتے وقت اس پر اپنی رائے لکھنا چاہیں تو انہیں کوئی دشواری نہ محسوس ہو۔ اس لفافے میں پارلیمنٹ کی روزانہ کارروائی کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اس رپورٹ کے دیکھنے سے بادشاہ کو دوسرے محکموں کے معاملات پر غور کرنے میں امداد ملتی ہے امور سلطنت سے متعلق ملک معظم کے کاموں میں اولیں درجہ اسی کام کو حاصل ہے۔ اس رپورٹ کے مطالعہ کے بعد وہ اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ہدایت دیتے ہیں کہ وہ کن کن وزرار سے ملنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ جارج ششم عموماً دوپہر کے کھانے کے بعد وزرار سے ملاقات کرتے ہیں لیکن ڈیوک آف ونڈسر کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ وہ جب بھی ضرورت محسوس کرتے ٹیلیفون سے وزیروں کو طلب کر لیتے۔

اگر بادشاہ کو کسی شاہی یا قومی تقریب میں شرکت کرنی نہ ہو تو وہ ساڑھے بارہ بجے تک اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کے ساتھ خاص خاص سرکاری خطوط کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ بادشاہ کو روزانہ اوسطاً پچاس بار دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ہر خط کو اچھی طرح پڑھتے اور اس پر اپنی رائے لکھ کر دستخط کرنے کے بعد سیاہ سوختے سے خشک کرتے ہیں جو چاندی کے فریم میں آویزاں ہوتا ہے۔ یہ سوختہ خاص طور پر بادشاہ کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔ سفید سوختے کا استعمال اسلئے نہیں کیا جاتا کہ اس پر آئے ہوئے حروف کو کوئی دوسرا شخص پڑھ نہ لے۔ اسلئے کہ سفید سوختے پر آئے ہوئے حروف کو شیشے کے سامنے رکھ کر بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔

سلطنت کے خاص خاص کاغذات بڑی حفاظت سے رکھے جاتے ہیں مثلاً وزیر اعظم اور بادشاہ کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی ہے وہ ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ میں لوہے کی چادر سے منڈھے ایک کمرے میں رکھی جاتی ہے۔ اس کمرے کی دو کنجیاں ہوتی ہیں۔ ایک وزیر اعظم کے پاس ہوتی ہے دوسری وزیر اعظم کے مشیر خاص کے پاس۔ جسے وزیر اعظم کے بعد اہم حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

زمانہ امن میں بادشاہ کا روزانہ پروگرام ہفتوں پہلے مرتب کر لیا جاتا ہے مگر جنگ کے زمانہ میں روزانہ کا پروگرام صرف ایک روز قبل تیار ہوتا ہے کیونکہ اسے روزانہ کے پیش افتادہ حالات کے مطابق ترتیب دینا پڑتا ہے۔

جارج ششم وزرار کے مشورے کے بغیر کبھی کوئی اہم کام نہیں کرتے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے وزیروں کو انتظام حکومت کا ان سے زیادہ تجربہ حاصل ہے۔ ڈیوک آف ونڈسر کی معزولی کے بعد جب بادشاہ بنائے گئے اور مسٹر بالڈون ان کو مبارک باد دینے کیلئے حاضر ہوئے تو ملک معظم نے فرمایا: "جن اسباب کی بنا پر میں بادشاہ بنایا گیا ہوں وہ ہم دونوں کے لئے باعث افسوس ہیں لیکن مجھے امید ہے تم میرے کاموں میں میری امداد و رہنمائی کرو گے مجھے اندیشہ ہے کہ میں ابتدا میں تمہیں اجنبی سا معلوم ہونگا۔ لیکن مجھے اپنے فرائض کے بحسن و خوبی انجام دینے کیلئے تم پر اور تمہاری وزارت پر اعتماد ہے۔"

بادشاہ کے پاس باہر سے بیشمار خطوط آتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان سب کا خود کھول کر پڑھنا بادشاہ کیلئے ناممکن ہوتا ہے اسلئے ان کے اس کام کو ان کے پرائیویٹ

سیکرٹری انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ بادشاہ کے نام آئے ہوئے خطوط کو پڑھتے ہیں اور ضروری امور کی طرف بادشاہ کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ بادشاہ تمام خطوط پر خود دستخط بھی نہیں کرتے۔ ان پر یا تو ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کے دستخط ہوتے ہیں یا ان کے تین مختلف اسسٹنٹ سیکرٹریوں کے۔

باہر بھیجے جانے والے تمام خطوط کی تین کاپیاں تیار ہوتی ہیں۔ جن میں سے ایک تو باہر بھیجی جاتی ہے اور دو فائل میں منسلک کر دی جاتی ہیں۔ بادشاہ کے پاس آیا ہوا ہر خط تین سال تک فائل میں محفوظ رہتا ہے ایسے خطوط جن کے جوابات ایک ہی مضمون کے ہوتے ہیں پہلے ہی سے چھپوا لئے جاتے ہیں اور جب اس قسم کا کوئی خط موصول ہوتا ہے تو جواب میں وہی طبع شدہ خط بھیج دیا جاتا ہے

بادشاہ کو بیرونی تحفے بھی بکثرت موصول ہوتے ہیں۔ کوئی روز ایسا نہیں جاتا جب ان کے پاس کسی عزیز کسی افسر یا کسی بیرونی شخص کی نذر کردہ کوئی چیز نہ آتی ہو مگر ملک معظم ان چیزوں کو عموماً واپس کر دیتے ہیں کیونکہ شاہی خاندان کے علاوہ وہ کسی دوسرے کی نذر لینا پسند نہیں کرتے۔

بادشاہ کے خانگی کام کرنیوالوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ان کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے اور اس کے ارکان وزیر اعظم کے مشورے سے رکھے جاتے ہیں۔ دوسرا حصہ گھریلو کاموں کی دیکھ بھال کرتا ہے اس حصے کے افسر کا تعلق براہ راست ملک معظم سے ہوتا ہے۔ اول الذکر حصے کے کارکنوں میں سے خاص خاص کے نام یہ ہیں۔ لارڈ چیمبرلین، وائس چیمبرلین، لارڈ اسٹیورڈ، دی ماسٹر آف ہاؤس، دی ٹریزرر آف دی ہاؤس ہولڈ، اور دی کنٹرولر آف دی ہاؤس ہولڈ وغیرہ۔

ان بڑے بڑے افسروں کے علاوہ کچھ چھوٹے چھوٹے افسر بھی ہوتے ہیں لارڈ چیمبرلین کا خاص کام سیاسی پارٹیز اور تقاریب کا اہتمام و انصرام ہوتا ہے اس کے علاوہ اسے ڈرامے وغیرہ کے سنسر کی خدمت بھی انجام دینی پڑتی ہے اس کی سالانہ تنخواہ ۲۰۰۰ پونڈ ہے لیکن تنخواہ سے بھی زیادہ اس کا یہ عہدہ باعزت خیال کیا جاتا ہے۔

ماسٹر آف ہاؤس شاہی جلوسوں کا انتظام کرتا ہے اس کے علاوہ بادشاہ کے گھوڑوں اور گاڑیوں کی نگرانی بھی اسی کو کرنی پڑتی ہے۔ پارلیمنٹ کے افتتاح یا کسی جوبلی اور شادی وغیرہ کی تقریب پر اس کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ ماسٹر آف ہاؤس کو ایک خاص اختیار بھی حاصل ہے۔ وہ شاہی سواریوں میں سے ایک کو اپنے ذاتی استعمال میں لا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ اور کسی شخص کو اسکی اجازت نہیں۔ لارڈ اسٹیورڈ بادشاہ اور ملکہ وغیرہ کے کھانے کا انتظام کرتا ہے۔ بادشاہ کی دعوتوں میں کون کون سے کھانے ہوں گے۔ کون سی شراب استعمال کی جائیگی ان تمام باتوں کا اہتمام اسی کو کرنا پڑتا ہے۔ یہ عہدہ بھی بہت اہم ہے۔

ٹریزرر آف دی ہاؤس ہولڈ اور کنٹرولر آف دی ہاؤس ہولڈ اپنے فرائض کے علاوہ لارڈ اسٹیورڈ کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ان کو سات سو پونڈ سالانہ تنخواہ ملتی ہے۔ بادشاہ کی صحت کی نگرانی کرنے کیلئے بہت سے قابل ڈاکٹر مقرر رہتے ہیں۔ مگر بادشاہ عام طور پر اپنی صحت کی جانچ سینئر ڈاکٹر سے کرالیتے ہیں۔ زکام، حرارت وغیرہ معمولی باتوں کیلئے بلیٹن نہیں نکلتے۔ کیونکہ اس قسم کی باتوں کو مصلحتاً پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔

بادشاہ کے پرائیویٹ سیکرٹری اور خزانچی جسے کیپر آف دی پریوی پرس کہتے ہیں۔ ان کے قریب ترین افسروں میں سے ہیں۔ بکنگھم پیلس میں ان دونوں افسروں کے دفاتر سب سے زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ پرائیویٹ سیکرٹری آفس کے اہم کاغذات میں سے اگر ایک بھی کہیں کھو جائے یا اس کی کیفیت ظاہر ہو جائے تو پروگرام میں فوری تبدیلی کا امکان ہو سکتا ہے لیکن اب تک اس قسم کا کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ اس قسم کے اہم مقامات پر نہایت منتخب افراد ہی مقرر کئے جاتے ہیں۔ پہلے ان کے عادات و اطوار کی کافی تحقیق و تفتیش کر لی جاتی ہے جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کسی قسم کی لالچ یا کسی اور بنا پر اپنے فرائض کی تکمیل میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے تو انہیں ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔

پریوی پرس کا عہدہ بھی پرائیویٹ سیکرٹری ہی کی طرح اہم اور نازک ہے کیونکہ روپے پیسے کا تمام حساب کتاب اسی کے پاس رہتا ہے۔ بادشاہ کے خرچ کے لئے جو روپیہ ملتا ہے اسے سرکاری زبان میں ہز میجسٹیز پریوی پرس کہتے ہیں موجودہ بادشاہ کو چار لاکھ دس ہزار پونڈ ملتے ہیں اس میں شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے دوسرے افراد کا خرچ بھی شامل

ہے۔ شاہی خاندان کے لوگ روپے پیسے سے بہت بے نیازی برتتے ہیں اس قسم کا تمام حساب ان کے خزانچی رکھتے ہیں۔ بادشاہ کے جتنے بل وغیرہ ہوتے ہیں انہیں پریوی پرس ادا کرتے ہیں۔ عموماً بادشاہ اپنے ساتھ روپے لے کر نہیں چلتے کیونکہ وہ اسے بخوبی سمجھتے ہیں کہ اس طرح روپیہ لے کر چلنا ان کی شان کے منافی ہے۔ "لومیس اینڈ کو" بادشاہ کے بینکرز ہیں۔ شاہی خاندان کے تمام چیک اسی جگہ بھنائے جاتے ہیں۔

بادشاہ کے پاس وقت کی بہت کمی رہتی ہے۔ انتظام حکومت کی نگرانی کے علاوہ جب سے جنگ شروع ہوئی ہے۔ وہ بری بحری ہوائی افواج، حفاظتی استحکامات اور برباد شدہ مقاموں کی دیکھ بھال بھی کرتے رہتے ہیں۔ مختلف قسم کی تقاریب، جلسے جلوس خیرات مانگنے والی جماعت نیز شادی بیاہ میں بھی انہیں شریک ہونا پڑتا ہے لیکن بعض اوقات ان کا ان چیزوں میں شرکت کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ اسلئے بادشاہ کی غیر موجودگی میں ان کا کام ڈیوک آف گلاوسٹر، ڈیوک آف کینٹ، اور ان کی بیویاں سر انجام دیتی ہیں، ان کا خاص فرض شاہی مراسم کو قائم رکھنا ہے۔ ملکہ کی غیر موجودگی میں ان کی بجائے ڈچز چلی جاتی ہیں۔

اصولاً تو کیبنٹ کے وزرا کو بادشاہ ہی انتخاب کرتا ہے لیکن درحقیقت وہ ان اشخاص کے ذریعہ منتخب کئے جاتے ہیں جن کی پارٹی کی ہاؤس آف کامنز میں اکثریت ہوتی ہے۔ ظاہراً اور شاہی قانون کے مطابق وزرا بادشاہ کے ماتحت ہوتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے وزیروں سے مشورہ لئے بغیر بادشاہ کے لئے ایک معمولی کام کرنا بھی ناگزیر ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ چاہیں تو حکومت میں بڑے سے بڑا تغیر و تبدل بھی کر سکتے ہیں۔ بادشاہ کو عجیب و غریب قسم کے اختیارات حاصل ہیں۔ انہیں جنگی نظام کو درہم برہم کر دینے کا اختیار ہے۔ وہ ایک معمولی سپاہی سے لے کر بڑے سے بڑے کمانڈر انچیف تک کو اس کے عہدے سے برطرف کر سکتے ہیں اسی طرح وہ چاہیں تو تمام بحری فوج کو منتشر یا کسی دوسری حکومت کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں۔ یہی اختیار فضائی فوج کے متعلق بھی حاصل ہے۔ خانگی معاملات میں بھی انہیں بہت سے اختیارات تفویض ہیں۔ مختصر یہ کہ برطانیہ کے بادشاہ کو وہ تمام حقوق و اختیارات حاصل ہیں جو ایک بڑے سے بڑے انسان کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

تخت نشینی کے کچھ روز ایک بار ملکہ وکٹوریا نے قانونی کتابوں میں جب یہ باتیں پڑھیں تو وہ دنگ رہ گئیں۔ اور اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو بلا کر کہا۔ "کیسی عجیب بات ہے درحقیقت میری رعایا کو اس بات کا علم نہیں کہ مجھے کیسے کیسے خوفناک اختیارات حاصل ہیں۔"

کیبنٹ کے تمام وزرا میں سے صرف وزیر اعظم کو یہ حق حاصل ہے کہ دن اور رات میں وہ جس وقت بھی چاہے بادشاہ سے مل سکتا ہے۔ اگر دوسرے وزرا ملنا چاہتے ہیں تو انہیں سیکرٹری آف اسٹیٹ کے ذریعہ وزیر اعظم کو خط لکھنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس بادشاہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس وقت اور جس وزیر کو چاہیں طلب کر سکتے ہیں۔ بادشاہ

"جذباتِ جلیل"

از جناب جلیل صہبائی

کاش آجاؤ مرے دل میں تمنا بن کر
میری آنکھوں میں سما جاؤ تماشا بن کر
زندگی مرگ ہے اور مرگ حیات جاوید
آپ کس واسطے آئے ہیں مسیحا بن کر
میں کہاں اور کہاں زیست کا وہ جوش و خروش
کھیل دنیا میں بگڑ جاتے ہیں کیا کیا بن کر
یہ بہار اور یہ کوثر کا تصور زاہد!
پی بھی لے آج تو بیگانۂ فردا بن کر

وزیراعظم سے اوسطاً ہفتے میں تین بار ملاقات کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اشد ضروری کام آپڑنے پر وہ ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ کو فون کر دیتے ہیں اور وزیراعظم سے بات چیت ہو جاتی ہے۔ جب ڈیوک آف ونڈسر بادشاہ تھے تو وہ جی بھر کر ٹیلیفون کا استعمال کر سکتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طرح بہت سا قیمتی وقت فضول ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔

بادشاہ کا جانشین پہلے ہی سے مقرر کر دیا ہوتا ہے۔ موجودہ بادشاہ کے بعد تخت کی حقداران کی بڑی بیٹی پرنسز الزبتھ ہیں۔ جب تک بادشاہ کے کوئی بیٹا نہ پیدا نہ ہوگا اس وقت تک ان کا یہ حق برقرار رہیگا۔ اگر کوئی بیٹا پیدا ہوا تو چوڑ برس تک وہ ڈیوک آف کارنوال کے عہدے سے سرفراز کیا جائیگا۔ پھر اسے پرنس آف ویلز کی ڈگری عطا کی جائیگی اور اس کے بعد وہ تخت و تاج کا حق دار ہو جائے گا۔

بادشاہ جارج پنجم آنجہانی کے چاروں بیٹوں کے خانگی نام یہ ہیں۔ ڈیوڈ (ڈیوک آف ونڈسر۔ برٹی (موجودہ ملک معظم) ہنری (ڈیوک آف گلاؤسٹر) اور جارج (ڈیوک آف کینٹ)۔

آج کل یہ تینوں ڈیوک ایکٹو سروس میں ہیں۔ ڈیوک آف ونڈسر نے جنگ کے شروع ہوتے ہی اپنے بھائی کو ٹیلیفون کیا کہ بلا تاخیر انہیں کوئی جنگی خدمت تفویض کی جائے۔ بادشاہ کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی اور اُنہوں نے اُنہیں فوج میں جگہ دے دی۔ عرصہ تک میدان جنگ کی خدمت انجام دینے کے بعد اب وہ برموڈا میں گورنری کرتے ہیں۔ اسی طرح ڈیوک آف گلاؤسٹر کو میجر جنرل کا عہدہ دیا گیا اور وہ لارڈ گورٹ کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ڈیوک آف کینٹ کو بحری زندگی سے بہت دلچسپی ہے چنانچہ انہیں ریر اڈمرل کا عہدہ عطا کر دیا گیا ہے۔

چاہتا ہوں

از جناب ابرار حسین ابرار زیدی

ایم ایس سی، ایل ایل بی (علیگ) فسٹ کلاس مجسٹریٹ

جب باد خنک روح کے نغموں کو جگائے | جب چاند در و بام کو پُر کیف بنائے

جب تشنہ لبی ساغر لبریز دکھائے | اور دل کو تسلی کسی عنوان نہ آئے

ایسے میں مرے پاس کوئی ماہ لقا ہو

جب بقعۂ انوار ہو دنیا کی ہر اک شے | ہر چیز ہو موجود چہ سبزہ چہ مہ و مے

افکار و حوادث کا ذرا نام نہ آئے | اور دل میں نیا محشر طوفان بھی آئے

وہ ملہ لقا جام مری سمت بڑھائے

جب دُور بہت دور کسی ٹیلے کے اوپر | دریا کے پرے سبزۂ نوخیز کے اوپر

پھرتا ہو کوئی چھوڑ کے دنیا کو مکدر | گاتا ہو گیت نغمۂ اُلفت کے سُروں پر

وہ جام مری سمت بصد ناز بڑھائے

اس جام کی تاثیر میں ہو عشق کی مستی | پیتے ہی فراموش ہو سب عالم ہستی

مستی میں ہو برباد کسی حُسن کی بستی | بستی میں جدھر دیکھیے مستی ہی ہو مستی

وہ مجھ میں ہو میں اس میں دوئی باس نہ آئے

آکاش کے اُس پار زمانے سے بہت دُور | پریوں کی جو بستی ہے جہاں رہتی ہیں حور

جس ملک میں دیکھو جسے ہر وقت ہی مسرور | اس پاپ کی بستی سے بہت دُور بہت دُور

بے لاگ محبت کی وہاں جھونپڑی چھائے

شمع خرابات

قسط تیسری

از جناب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی

ـــــ گذشتہ سے پیوستہ ـــــ

اب ہم ڈر کے مارے نیچ چھت پر کھڑے ہیں۔ ادھر نہیں جاتے اور دل ہے کہ مانتا نہیں آدمی دل کے ہاتھوں بکا ہوا ہے اس کے آگے چلتی نہیں۔ ہم بھی مجبور ہو گئے اور دیوار کے سہارے سہارے سرکنا شروع کیا۔ ان کی بھی نظریں ادھر ہی لگی ہوئی تھیں۔ ہم کو دیکھتے ہی کلائی منہ پر رکھکر سوتی بن گئیں ـــــ ہم بائیسکوپ میں یہ سب ادائیں دیکھ چکے تھے۔ فوراً تاڑ گئے۔ نہایت بے پروائی سے سیڑھیوں کی طرف گئے جیسے نیچے جا رہے ہوں اور پھر منڈیر سے پرے پرے آ جھریوں میں سے جھانکنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر تو وہ مگری بنی پڑی رہی پھر منہ پر سے کلائی ہٹا ہماری چھت کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ آنکھیں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں دل چاہا کواڑ کھول سامنے جا کھڑا ہوں پر شام کی بات یاد آ گئی اور میں اپنی جگہ چھپا کھڑا رہا۔

اب کہاں تک بیان کروں بڑھتے بڑھتے یونہی پینگ بڑھ گئے۔ ہر بہانہ اسے چھت پر آنا اور آنکھیں لڑانا ـــــ ہمارا بھی گڈی بازی کا شوق بڑھ گیا۔ صبح سویرے ہی چھت پر چڑھ جاتے اور شام کو بھی بیمار بچے سے جا دھمکتے۔

قانع بہ تجلی نہ شود شائق دیدار
پروانہ بہ مہتاب تسلی نتواں کرد

کچھ دن تو دیدار بازی اللہ راضی کا م چلتا رہا۔ اشاروں میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔ پر اب دل نے پیر پھیلائے ہم نے پتنگ میں خط باندھ کر اڑایا وہ کچھ دن تو باتوں باتوں میں اڑاتی رہی لیکن "دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی" آخر ادھر سے بھی جواب آیا جس میں مجبوری کا اظہار تھا۔

وہ ہمارے ہاں نہ آ سکیں۔ ہم ان کے ہاں نہ جا سکیں۔ یہاں اماں چوبیس گھنٹہ موجود وہاں دس دس چوکیدار۔ بڑھیا ناگن کی طرح پہرہ دے۔ راستہ سب مسدود دکھائی دے۔ کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں دلی میں موسمی بخار پھیلا۔ میں نے بھی دو چار دن اپنی باری بھگتی۔ پھر سانوٹا ہو گیا۔ انہوں نے سخت اظہار پریشانی کیا۔ اشاروں میں بتایا دوا پیو۔ دو روز بعد جو چھت پر آئیں تو سر بندھا ہوا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ خدا خیر کرے۔ ہلکی آواز سے پوچھا۔ کیا بات ہے۔ انہوں نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں جواب دیا۔ بخار۔ ہم سمجھے ایک آدھ دن میں اتر جائے گا۔ کوئی نئی بات نہ تھی فصل کا میوہ تھا۔ سب ہی مزا چکھ رہے تھے۔ پر وقت کی خوبی علاج میں اونچ نیچ ہو انا ڑی ڈاکٹر نے کونین دے دی۔ نزلہ بگڑ گیا۔ دو چار روز تو وہ کسی نہ کسی ٹکٹکی ٹکٹکی کوٹھے پر آئیں اور پھر یہ بھی بند ہو گیا۔ ہمارا یہ حال کہ ماہی بے آب کی طرح تڑپیں۔ چھت پر کھڑے کھڑے ٹانگیں شل ہو گئیں۔ راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ نہ وہ ہی نظر آئیں نہ کوئی خیر خبر ہی معلوم ہوئی ـــــ ایکدن گلی میں موٹر کے ہورن کی آواز سنائی دی۔ ہم بھی گھر سے باہر نکل آئے۔ دیکھا تو اُن کی نانی ایک موٹے سے بنگالی ڈاکٹر کو لئے چلی آ رہی ہیں۔ زمین نے پیر پکڑ لئے میں سالت دجامد رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد قدم خود بخود ان کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ ڈیوڑھی پر ذرا کی ذرا ٹھٹکا۔ کہ شاید کوئی آواز طلب سنائی دے جائے لیکن سوائے جھوجھرے پھیپھڑوں کی کھانسی کے صدائے برنخاست اور یہ کموچڑ سیہ کھانس رہا تھا ـــــ دل نے الفاظ بے آواز میں کہا۔ کاش میں کموچڑ ہی ہوتا کہ ان کے گھر میں تو جگہ مل جاتی۔

میں اپنی دھن میں کھڑا تھا کہ سامنے سے میتا نمودار ہوا بولا۔ یار کیسے کھڑے ہو میں سٹ پٹا سا گیا۔ آنکھیں زمین کی طرف جم کر رہ گئیں۔ اُس نے پھر پوچھا۔ میں نے کہا یار اکنی گر گئی ہے۔ اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ بولا جو روپیہ یار خاں کو دینے کرو تو ابھی ڈھونڈے دیتے ہیں ـــــ آنے جانوں کے خیال سے میں اب وہاں ٹکنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی نانی اور ڈاکٹر کے اندر سے نکلنے کا

دھڑکا لگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ بڑے خوبصورت۔ یہ کسی کے منہ کی بات تھی۔ کہنے والی کا ٹکڑا آنکھوں میں پھر گیا۔ اس وقت مینا کی صورت مجھے بری لگ رہی تھی اور میں آگے بڑھ گیا۔ لیکن وہ میرا پیچھا چھوڑنے والا کب تھا۔ قاضی عدو کی طرح ساتھ لگا چلا آیا۔ میں کام کا بہانہ کرا پنے گھر آ گیا۔ اور ڈیوڑھی میں کھڑا جھانکتا رہا۔ جب مینا وہاں سے ٹل گیا تو ہم باہر نکلے اور ٹوہ لینے موٹر کے کاوے کاٹتے رہے۔

خدا خدا کر کے مشکل آسان ہوئی۔ ڈاکٹر سامنے سے آیا۔ ہم بھی کچھ فاصلے پر ساتھ ہو لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی محلے کے بیکار لڑکوں کا عام دستور تھا کہ گلی میں جہاں کوئی نیا آدمی آیا اور یہ اس کے گرد ہوئے ـــــ ڈاکٹر اُن کی نانی سے کہہ رہا تھا۔ بکھار بگڑ گیا ہے۔ بہت احتیاط کرنا ہو گا وکھت پہ دوا وکھت پہ گجا۔

بخار بگڑ گیا ہے۔ سن کر دل کو ایک دھکا سا لگا۔ سارا دن پریشانی میں گزرا۔ گھڑی کوٹھے پر جانا گھڑی نیچے آنا۔ کوئی شے بھلی نہیں لگتی تھی۔ کھانے میں بھی خاک مزا نہ آیا ـــــ ان کا کوٹھا خالی دیکھ کر اپنی چھت ویران لگتی۔ جیسے ایک ہی تصویر کے یہ دو رخ دیے تھے۔ ایک بگڑ گیا تو دوسرا بھی اُجڑ گیا۔

شام کو سنیما میں جا بیٹھا۔ مینا کو ساتھ نہیں لیا مجھے آج انسان بُرے لگ رہے تھے اکیلا رہنے کو دل چاہتا تھا۔

تماشہ شروع ہوا۔ ریل کا اسٹیشن ہے۔ آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا ہے۔ تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں تل رکھنے کو جگہ نہیں۔ کوئی صندوق پر بیٹھا ہے کوئی بستر پر۔ کوئی لڑنے کو آمادہ کوئی مرنے کو تیار، پر جگہ دینے کو راضی نہیں ـــــ ایک چیکٹ ساہوکار دری بچھائے بستر سے ٹیکا لگائے پیر پھیلائے آدھی سیٹ گھیرے بیٹھے ہیں۔ سارے مسافر انہیں دیکھ دیکھ کر کھنسارتے ہیں پر دقت یہ ہے کہ اچھے خاصے ٹھاڈے ہاتھ پیروں سے درست دو لٹھ بند نوکران کے ساتھ ہیں کوئی دم نہیں مار سکتا ـــــ اتنے میں دو عدد جنٹلمین سوٹ کیس لٹکائے اس ڈبہ پر آئے اول تو دروازہ ہی پر دھینگا مشتی کا ورزش کرنی پڑی۔ اندر جا کر جو دیکھا تو بیٹھنا تو درکنار کہیں ٹکنے کو جگہ نہیں ـــــ اب یہ سیٹھ جی کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے باڈی گارڈ مزاحم۔ یہ جنٹلمین بھی نرے بابو نہیں تھے۔ سیٹھ جی کے نوکروں کو دم کے دم میں دیوار میں ٹھونس دیا۔ تھے ذلیل نسل کے ٹھوکر کھا کر لگے دم ہلانے۔ یہ دیکھ کر سیٹھ کی ٹانگیں سکڑنی شروع ہوئیں اور ان بابوؤں میں سے ایک سیٹ پر اور دوسرا موٹے مہاراج کے پیروں پر کچھ اس طرح بیٹھا کہ ان کی چیخ نکل گئی۔ اور دونوں پاؤں توند کے زیر سایہ پہنچ گئے ـــــ اب ہمارے سیٹھ صاحب اپنے ہزیمت خوردہ نمکخواروں کی طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے ہارا جواری تاش کے اس پتے کی طرف دیکھے جو وقت پر دغا دے گیا ہو اور بولے رامو یہ بستر ہٹا لے گا۔

اس منظر پر کیمرہ پھرا اور فرسٹ کلاس کا نیم کشف ڈبہ نظر آیا۔ ایک ملازم وردی پہنے پیٹی باندھے سیٹ پر اعلیٰ القسم کا قالین بچھا رہا ہے۔ سرہانے ریشمیں تکیہ پائنتیوں بیش قیمت کمبل رکھا۔ اتنے میں ایک رئیس زادہ اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے، دو بالشت کا فلیش کا ڈنڈا بغل میں دبائے ہاتھ میں ۹۹۹ کا ٹین لئے سر پر ہیٹ لگائے بڑے ٹھاٹھ سے تشریف لائے ـــــ ڈبہ میں گھس نوکر سے دریافت کیا سب ٹھیک ہے اس نے کہا جی حضور بولے اچھا تم سرونٹس میں جاؤ اور خود پلیٹ فارم پر اتر کھڑے ہوئے۔ اتنے میں میگزین اور اخبار بیچنے والا آیا۔ جناب نے کچھ انگریزی کچھ اردو کی کتابیں خرید فرمائیں۔ پانچ کا نوٹ اس کے حوالہ کیا۔ ایک روپیہ اور کچھ آنے وہ واپس کرنے لگا تو سرکار نے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا وہ سلام کر سیدھا ہو لیا۔

اتنے میں ایک جوان خوبصورت لڑکی کنی کی ساری باندھے قلی کے ساتھ ساتھ گھبرائی بوکھلائی تھرڈ کلاس کے زنانہ درجہ پر پہنچی یہاں پہلے ہی سے قیامت صغریٰ بپا تھی نفسا نفسی کا عالم۔ دروازہ کا کھلنا کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ اس کے پیچھے نہ صرف سامان کے ڈھیر تھے بلکہ انسانوں کے انبار بھی لگے تھے۔ اور پانچ سات عورتیں اندر قلعہ بند ہوئی بیٹھی تھیں۔ اس نو وارد کو دور سے آتا دیکھ فوج کی فوج کھڑکیوں میں آن جمی یہ ان کے دمدمہ تھے اور چھما چھم خشم آلود سے تیروں کی بارش شروع کی۔ جب دشمن قریب آیا تو بدکلامیوں کا ایک گراب چھاڑا۔ حملہ آور تیورا گئی پر ہمت نہ ہاری اڑی کھڑی رہی پر یہ اکیلی سورما ٹھڈی جھاڑ کو کیا پھوڑتی نیز یہ زنان تیغ زبان اب گرم گفتار ہو چکی تھیں ـــــ

اب گارڈ دوسری سیٹی دے چکا تھا کہ ہمارے حملہ آور یکہ سپاہی نے آخری وار کیا اور کھڑکی کے راستہ سے اول کے طور پر اپنا اٹیچی کیس داخل کرنا چاہا۔ سنگدلوں نے اُسے ہاتھوں کی منگنیوں پر باہر ہی روکا۔ اس ناکام کوشش میں وہ کام آیا اور پٹڑی کے نیچے خندق میں گرا۔ ریل چلنی شروع ہوئی ہمارے چھیلا منہ میں سگریٹ لگئے اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے ـــــ وہ بھی ماں کی جائی آج جانے کی ٹھان چکی تھی ان کا دروازہ کھلا دیکھ اوپر چڑھ آئی کچھ انہوں نے بھی مدد کی۔ قلی نے سوٹ کیس اور بستر اندر پھینک دیا۔ اب وہ پیسوں کیلئے لپکا چلا آ رہا ہے اور محترمہ سراسیمہ جیبیں ٹٹول رہی ہیں کہ صاحب بہادر نے ایک روپیہ نکال اس کے حوالہ کیا۔

ٹرین اسٹیشن سے گذر گئی اور ان ہم قفس پرندوں نے آنکھیں بچا بچا کر ایکدوسرے کا جائزہ لیا۔

جنٹلمین نے سامنے کی خالی سیٹ پر بیگم کا بستر رکھ سوٹ کیس ایک طرف لگا دیا اور ایک میگزین خود لے باقی ان کے سامنے رکھ خموش ہو بیٹھے چونکہ موجودہ تہذیب بغیر باقاعدہ تعارف کے انسان کو انسان سے بات کرنے کی اجازت نہیں دیتی ــــ تھوڑی دیر بعد ڈائننگ کار کا بوئے کھانے کی بابت دریافت کرنے آیا اور پوچھا کہ صاحب ڈنر ڈبہ میں لیگا یا سیلون میں۔ جواب ملا۔ سیلون میں۔ وہ بولا اور بیگم صاحب ـــــ اس سوال پر محترمہ کے جسم کو قدرے جنبش ہوئی لیکن زبان کو نہیں۔ صاحب بہادر نے سر کھجایا اور فرمایا اچھا دونوں ڈنر ادھر ہی لے آنا۔ بوئے کا جانا اور بیگم صاحبہ کو غصہ آیا۔ بولیں آپ نے میرے لئے کھانا کیوں منگایا ہے مرد نے نہایت شرافت اور انسانیت سے جواب دیا کیا عرض کروں ڈنر ٹائم ہونے والا ہے۔ انہوں نے فرمایا میں نہیں کھاؤں گی۔ جواب ملا کیا مضائقہ ہے بندہ نواز رکھا رہے گا۔

اس پر تو وہ آگ بگولا ہو گئی بولی آپ امیروں کو رزق کی قدر نہیں۔ روپیہ کی قیمت نہیں معلوم۔ ڈنر ٹائم ہو گیا تو ڈنر آنا لازمی کوئی کھائے یا نہ کھائے۔ آج دنیا میں لاکھوں بندگان خدا بھوک مر رہے ہیں۔ کسی کا بچہ دودھ کو بلک رہا ہے۔ کوئی مریض زنگترہ کو ترس رہا ہے ـــــ

بوائے نے نہایت قرینہ سے میز پر ڈنر لگا دیا اور جاتے ہوئے دریافت کیا حضور کیا پئیں گے ؟

لڑکا - پانی

بوائے - اور بیگم صاحبہ

لڑکا - برف کا پانی۔

بوائے کے جاتے ہی ان محترمہ نے پھر اپنی جوربچ کھولی۔

لڑکی - یہ آپ نے کیا تماشہ بنا رکھا ہے۔

لڑکا - (نہایت معصومانہ انداز میں) خدا گواہ ہے میں بالکل بے قصور ہوں

اتنے میں بوائے برف کے پانی کا جگ اور دو گلاس لے کر آن پہنچا اور میز پر رکھکر بولا۔ حضور پڈنگ لیں گے۔ فروٹ سیلاڈ۔ ہیرو نے جواب دیا۔ سیلاڈ۔ آخر اس نے کہا اور بیگم صاحب۔ اب ہماری چھوئی موئی کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا بگڑ کر بولیں یہ تم بیگم صاحب بیگم صاحب کیا کرتا ہے۔ تربیت یافتہ بوائے نے سر جھکا کر کہا I beg your pardon میم صاحب۔ اب ہیرو آڑے آیا اور فوراً بول اٹھا۔ دیکھو مس صاحب پڈنگ کھائیے گا۔ بوائے ایک ڈش سیلاڈ کی اور ایک پڈنگ کی لے کر آیا۔ لڑکے نے باہر ہی سے لے لی کہ مبادا کوئی اور بات نکل آئے۔ (باقی آئندہ)

تبدیلی پتہ کی اطلاع

ناظرین کرام سے گذارش ہے کہ پتہ کی تبدیلی کی اطلاع تاریخ اشاعت مست قلندر سے کم از کم دس روز پہلے دفتر میں بھیج دیا کریں ورنہ اپنے حلقہ کے پوسٹ ماسٹر کو اطلاع دیدیں کہ وہ آپ کے جدید پتہ پر آپ کا پرچہ بھیجدے۔

آپکا خریداری نمبر

دفتر کیلئے بہت اہمیت رکھتا ہے جب کبھی آپ پرچہ نہ پہنچے یا پتہ تبدیل کرانے کیلئے دفتر کو لکھیں تو اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل کیجائیگی

مست قلندر کے منی آرڈر

چونکہ ڈاکخانہ سے براہ راست بنک میں جمع ہوتے ہیں اس لئے منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتہ صاف صاف لکھئے تاکہ تعمیل میں آسانی ہو۔

جواب طلب امور کیلئے

جوابی کارڈ یا جوابی لفافہ یا ٹکٹ کا آنا لازمی ہے۔ (مینیجر)

ہندوستانی سنیاسیوں کے جگر پارے

لاکھ لاکھ کی قیمت کا ایک ایک نسخہ — از جناب حکیم گوپال داس پوری

قے دماغی۔ گھریلو مکھیوں کا پاخانہ ۱/۲ رتی، گڑ ۱/۲ رتی گولی بنا کر دیں۔ جو قے کبھی کسی طرح بھی بند نہ ہوتی ہو وہ صرف ایک گولی کے استعمال سے بند ہو جاتی ہے۔

برائے قے حاملہ۔ مکئی یعنی جوار کے بھٹے کے سر پر جو بال ریشم کی طرح ہوتے ہیں اُن کو جلا کر بمقدار ۲ رتی کھلاویں۔ قے بالکل بند ہو جاوے گی۔

برائے زیادتی حیض۔ زیادتی حیض کو روکنے کیلئے لاجواب اور بالکل سادہ نسخہ ہے۔ (صفتہ) گل ارمنی طباشیر نقرہ۔ خون سیاوشاں۔ دانہ الائچی خورد۔ ہموزن لے کر باریک کر لیں اور اگر خون بوجہ اسقاط حمل یا دیگر سخت اسباب شدت سے جاری ہو۔ تو ۴، ۶ ماشہ ورنہ تین تین ماشہ ہمراہ شیر بز یا گاؤ تین روز تک استعمال کرائیں۔ پندرہ روز کے بعد پھر خون جاری ہوگا۔ جو کہ ایک ہی پڑیہ سے بند ہو جائے گا۔ اور آئندہ اعتدال میں آئیگا۔

امراض کان۔ کوڑی کا کشتہ رتی بھر لے کر کان میں ڈالیں، اور اوپر آب لیموں ۲ دو قطرے ڈال دیں۔ خوب اُبلے گی اور پیپ وغیرہ کو باہر نکال کر زخم کو اچھا کر دے گی۔ انگریزی دوائی ہائیڈروجن پر اکسائیڈ کی جگہ کام دیتی ہے۔ کشتہ کوڑی کی بجائے سمندر جھاگ بھی کام دے جاتی ہے۔

آشوب چشم۔ رسوت مصفی ایک تولہ باریک کر کے پانی میں حل کر کے اوپر کا پانی نتھار کر اس میں ۴ ماشہ افیون منڈی، ۵ ماشہ پھٹکری بریاں ۶ ماشہ لودھ پٹھانی، ۶ ماشہ پوست ہلیلہ زرد باریک شدہ ملا کر رگڑیں۔ اور آب لیموں میں کھرل کر کے گولیاں بنا لیں۔ صرف ایک گولی رگڑ کر آنکھ پر لگائیں اور ۲ قطرے آنکھ میں ڈالیں۔ مفید ہے۔

نسوار عجیب۔ دائمی درد سر اور دماغی مواد فاسد کو خارج کرنے کیلئے از حد مفید ہے۔ کنڈیاری کے ڈوڈے، کلونجی، کائپھل، کشمیری پتر سب ہم وزن لیں اور باریک پیس کر رکھیں، بطور نسوار لیا کریں۔

عسر ولادت۔ تل سیاہ رات کو پانی میں بھگو دیں، صبح حل کر اس کا پانی نکال لیں اور ذرا سا نوشادر ملا کر عورت کو پلا دیں۔ بچہ مُردہ ہو یا زندہ، فوراً باہر آ جائے گا۔

دیگر۔ کسی رومال یا کپڑے پر صرف کارک سے کلوروفارم لگا کر سونگھائیں دوائی سونگھتے ہی فوراً بچہ پیدا ہو جاتا

آملہ

جسم انسانی میں جب وٹامن "سی" کم ہو جاتی ہے تو انسان کے جسم کی عمارت خستہ حال ہو جاتی ہے۔ وٹامن "سی" کی جسم کو از حد ضرورت ہے اور یہ پھلوں اور سبزیوں میں ملتی ہے۔ آپ یہ پڑھ کر حیران رہ جائیں گے کہ دُنیا بھر کے پھلوں اور سبزیوں کی نسبت سبز آملہ میں وٹامن "سی" اس کثرت سے ہوتی ہے کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ چار پانچ سنگترے اور ملٹے کھانے سے جسم جسقدر وٹامن "سی" حاصل کرتا ہے۔ صرف ایک سبز آملہ میں اس قدر پھلوں سے بھی زیادہ وٹامن "سی" ہوتی ہے۔

اگر آپ ہر روز ایک آملہ صبح اور ایک دوپہر اور ایک شام کل ۳ آملہ روزانہ کھا لیا کریں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کے جسم میں وٹامن "سی" کافی مقدار میں جمع ہو رہی ہے۔ جن مریضوں کے جسم میں وٹامن "سی" کم ہو جاتی ہے ان کو ڈاکٹر [illegible] کی ایسی قیمتی ادویا تجویز کر دیتے ہیں نہ جن میں وٹامن "سی"

ہوتی ہے۔ میں ایسے مریضوں کو سبز آملہ اور آملہ اور پودینہ کی چٹنی ہر روز کھانے کی ہدایت کرتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ ایسے مریض فوراً تندرست ہو جاتے ہیں۔ دنیا کا کوئی ڈاکٹر ایسا پھل نہیں بتا سکتا کہ جس میں آملہ سے بڑھ کر وٹامن "سی" ہو اسی لئے آیورویدک نسخوں میں بھی آملہ بہت سے نسخوں میں استعمال کرنے کی ہدایت کی ہے۔

اب سے ہزاروں سال پہلے سے ہندوستانی آملہ کا اچار اور مربہ بنا کر کھاتے آئے ہیں۔ ترپھلہ یعنی ہڑ، بہیڑہ اور آملہ کا مرکب وئید اور حکیم بکثرت استعمال کراتے ہیں۔ اب سے ۵۰ سال پہلے خود یورپ کو وٹامن کا کچھ علم نہیں تھا لیکن اس سے بہت پہلے سے ہندوستانی خوب جانتے تھے کہ آملہ کے استعمال کے کیا فوائد ہیں۔ آملہ کے موسم پر سبز آملہ کا اوپر کا گودا اور سبز پودینہ اور سبز دھنیہ ملا کر چار پانچ آملہ کی چٹنی بنا کر صبح و شام خوراک کے ساتھ ہر روز کھانے سے تمام سال جسم میں وٹامن "سی" کی کمی نہیں رہتی اور اس کی کمی سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ان سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

موسم پر آملہ کے پھل پانچ چھ پیسے سیر مل جاتے ہیں۔ اس لئے غریب سے غریب اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ نمک لگا کر کچا آملہ کھانے سے بھی پورا فائدہ ہوتا ہے اگر آملہ کو پکا کر کھایا جائے تب بھی فائدہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن کچھ وٹامن ضائع ہو جاتی ہے۔ آملہ صرف ہندوستان ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے جب یورپ کو علم ہوا کہ آملہ وٹامن "سی" کا خزانہ ہے تب سے آپ نے دیکھا کہ یورپ میں آملہ کی مانگ کتنی بڑھ گئی۔ ہندوستانی ڈاکٹروں کو چاہئے کہ وہ آملہ پر تجربات کر کے میری صداقت کو آزمائیں۔ ان کو مایوسی ہرگز نہیں ہوگی۔ ہندوستانیوں کو چاہئے کہ بچے سے لے کر بوڑھے تک مرد یا عورت آملہ خوب استعمال کریں۔ اس کے کچھ روز ہی استعمال سے ان کی صحت کو بے حد فائدہ ہوگا۔ قدرت نے ہندوستان کو کیسی اعلیٰ نعمتیں دے رکھی ہیں کہ جو مفت کے برابر میسر آسکتی ہیں پھر ان سے فائدہ نہ اٹھانا اپنی بدقسمتی ہے۔

سائنس دانوں کی رائے میں وٹامن "سی" تازہ کچی بند گوبھی، سبز ساگ، پالک، مٹر، دالیں، چنے، تازہ لیموں، یا نارنگی کا رس، ٹماٹر، اور ٹماٹر کے رس میں بکثرت ہوتی ہے۔ اور تازہ کچی چھوٹی گاجریں، کاہو کا ساگ، شلغم کی گنڈلیں، کچے آلو، تازہ پھلیاں، سنگترہ کی کا رس۔ سیتاپھل کا رس، سبز سیم کی پھلیوں، بیج، سبز مٹر کے دانے، نارنگی کا چھلکا، آڑو، آڑو کا رس، اور انناس کے رس میں وٹامن "سی" خاصی مقدار میں پائی جاتی ہے۔ یہ ہے یورپ کے سائنسدانوں کے تجربات کا نچوڑ لیکن آملہ کا اس تحقیقات میں کہیں ذکر نہیں کیونکہ یورپ میں آملہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ یورپ کے لوگ اس پھل سے واقف ہی ہیں اسلئے انہوں نے آملہ پر تجربات کرنے کی زحمت ہی نہیں اٹھائی لیکن جب وٹامن کے نام سے دنیا بالکل ناواقف تھی۔ اس زمانے سے ہزاروں سال پہلے کے رشی منی خوب واقف تھے کہ آملہ میں بے حد فوائد مخصوص ہیں۔ جن کو ڈاکٹر آج کل وٹامن "سی" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اوپر جن پھل اور سبزیوں کا ذکر کیا ہے ان تمام سے زیادہ یہ وٹامن آملہ میں پائی جاتی ہے۔ میں دنیا بھر کے سائنسدانوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ آملہ پر تجربات کر کے دیکھ لیں کہ صرف آملہ ہی ایسا پھل ہے کہ جس میں دنیا بھر کی سبزیوں اور پھلوں کی نسبت زیادہ وٹامن "سی" ہے اگر انسانی جسم میں وٹامن "سی" کی کمی ہو جائے تو مندرجہ ذیل امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ مرض سکروی نمودار ہونے سے پہلے اور علامات سے یہ کمی ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثلاً بھوک کم ہو جاتی ہے، بدن میں پیلا پن آجاتا ہے، خون کم ہو جاتا ہے سانس جلدی چڑھنے لگتا ہے طبیعت سست رہنے لگتی ہے۔ مزاج میں چڑچڑا پن آجاتا ہے، جسم کا وزن کم ہو جاتا ہے، دل زیادہ دھڑکتا ہے، مسوڑھے پھول جاتے ہیں، منہ سے بدبو آتی ہے، دانت خراب ہو جاتے ہیں، جوڑوں میں درد رہتا ہے، ٹخنے سوج جاتے ہیں، ٹانگوں میں درد رہتا ہے اور چھونے سے تکلیف محسوس ہوتی ہے جب یہ علامتیں محسوس ہوں تو مندرجہ بالا اشیاء کو جزو غذا بنا کر ہم اپنے اندر وٹامن "سی" حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر صرف سبز آملوں ہی کو ہم ہر روز کھا لیا کریں تو محض چند دنوں میں ہی وٹامن "سی" کی کمی کو پورا کر سکتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ "بزرگ کے کہے اور آملہ کے کھائے کا بعد میں ہی علم ہوتا ہے یہ

طویل العمری کا راز!

طبِ جدید

مغربی ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کے قابلِ فخر سائنٹفک کارنامے

"کم خور ہمیشہ لمبی عمر پاتے ہیں۔" یہ وہ نتیجہ ہے جس پر بقول ماہنامہ "پاپولر سائنس" (امریکہ) ڈاکٹر کلائیو میککے آٹھ برس کے مسلسل تجربوں کے بعد پہنچے۔ ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ جو خوراک غذائیت کے اعتبار سے مکمل ہو اور تھوڑی مقدار میں استعمال کی جائے وہ طویل العمری کیلئے حد درجہ مفید ہے۔ انسان اور چوہے پر خوراک کا ردعمل چونکہ ایک سا ہوتا ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اڑھائی ہزار سفید چوہوں کو اپنے تجربہ کیلئے منتخب کیا اور ان کو "اساسی" خوراک دینا شروع کی لیکن جن چوہوں کو اس سے بھی نصف خوراک ملی وہ زیادہ دیر تک زندہ رہے۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ جن چوہوں کو کم خوراک دی گئی ہے ان کے خون میں سفید اجزا بھی کم تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ان کا دل ایک منٹ میں تین سو کے بجائے چار سو مرتبہ دھڑکتا ہے۔ اس طرح ان کی رفتارِ حیات سست ہو گئی اور وہ اپنی قوت و طاقت کو محفوظ رکھ کر زیادہ دیر تک زندہ رہنے کے قابل ہو گئے۔ عام طور پر چوہے کی زندگی کے دس دن انسانی زندگی کے ایک سال کے برابر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے عمل میں سب سے کم خور چوہا میتھوسیلا جو ۱۴۳۰ دن تک زندہ رہا۔ اسکی جگہ اگر انسان ہوتا۔ تو ۱۴۳ برس تک زندہ رہ سکتا تھا۔

حیاتین کی مدد سے رنگ کے اندھوں کا علاج

کیلیفورنیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر رابرٹ ڈی کین نے بیان کیا کہ اب پہلی مرتبہ اس قسم کا اشارہ ہوا ہے کہ رنگوں کے متعلق اندھے پن کا علاج جسے اس وقت تک ماہرین سائنس لاعلاج کیفیت بتاتے تھے۔ حیاتین الف کی مدد سے ہونا ممکن ہے۔ ایک کالج کے آٹھ طالب علموں کی جماعت میں جو سب رنگوں کی تمیز سے عاری تھے، اتنا فائدہ محسوس ہوا کہ ۱۲ روز تک حیاتین الف کا استعمال کرنے سے انہوں نے رنگوں کے پہچاننے میں اس سے صرف آدھی غلطیاں کیں جتنی کہ وہ پہلے کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر لوکین کا بیان ہے۔ حیاتین الف کے علاج سے پیشتر ان آٹھ طالب علموں کی غلطیوں کا مجموعہ ۸۸ ہوتا تھا یعنی ۱۱ فی کس، لیکن حیاتین کے استعمال کے بعد ان کا مجموعہ اغلاط صرف ۴۳ رہ گیا۔ گویا ہر طالب علم نے پیشتر کی بہ نسبت ۶ غلطیاں کیں۔ حیاتین الف وہ حیاتین ہے جو شب کوری کے علاج میں کام آتی ہے۔ رنگوں کے اندھے پن کے متعلق یہ پہلی اطلاع ہے۔ کیلیفورنیا میں ان طالب علموں نے فی کس ۱۲ کیپشول جن میں حیاتین الف کے ۲۵ ہزار یونٹ تھے، استعمال کئے۔ کیونکہ ہر طالب علم کو روزانہ ایک کیپشول دیا جاتا تھا معمولی طور پر انسانی خوراک میں اس حیاتین کی روزانہ مقدار جو مناسب خیال کی گئی ہے۔ یہ ایک کیپشول روزانہ کی مقدار اس کی چوگنی مقدار سے بھی کچھ زیادہ ہے۔

اب گھاس بھی پی جاسکے گی

اب آپ گھاس بھی پی سکیں گے۔ نیو جرسی کا ایک عرق ساز راندان اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ گھاس سے ایک خوش رنگ سبز شربت تیار کرے وہ الفالفا کے متعلق بھی ایسی ہی کوشش کر رہا ہے کیونکہ ماہرین دندان سازی کا مقولہ ہے کہ یہ گھاس دانتوں کیلئے بیحد مفید ہوتی ہے لیکن گھاس کا عرق از شکل گھاس کا آٹا۔ اگرچہ ان میں حیاتین موجود ہوتے ہیں پھر کسی طرح وہ معمولی پھلوں کے نعم البدل نہیں ہو سکتے۔

سائنس کی دنیا

جدید ایجادات اور سائنٹفک انکشافات

جراثیم کُش رنگ

بلیک آؤٹ کی وجہ سے چونکہ پلیٹ فارم کی سیڑھیاں اور موٹر بس کے قدمچے تک نظر نہیں آتے۔ اسلئے اب ایک ایسا رنگ ایجاد کیا گیا ہے۔ جو اندھیرے میں چمک کر لوگوں کی رہنمائی کریگا۔ اس رنگ میں چمک پیدا کرنے کا طریقہ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ بجلی کے لیمپ میں نہ گھلنے والے مواصل کے ذریعہ سے رنگ پر بنفشی شعاعیں پھینکی جاتی ہیں جس کے نتیجہ کے طور پر وہ چیز دمک اٹھتی ہے جس پر رنگ پھیرا ہوتا ہے۔ اس طریقہ کو سائنس کی اصطلاح میں فلو سائنس (Flure Scince) کہتے ہیں یعنی وہ رنگین روشنی جو بعض شفاف اجسام میں نور کے براہ راست عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ طریقہ آج سے ایک سو سال قبل ایک انگریز سرجان ہرشل نے ایجاد کیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ جنگ کے زمانہ میں کمروں کی دیواروں پر بھی یہ رنگ لگا دیا جائے۔ کیونکہ اس طرح عام بلب سے تین گنا تیز روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کی روشنی سے فضا کے جراثیم بھی مر جاتے ہیں۔

ہوائی منجنیق

آج سے دو سو برس قبل نیوٹن نے اعلان کیا تھا کہ "ہوائی" کے ذریعہ سے ستاروں تک پہنچنا ممکن ہے چنانچہ اس وقت سے سائنسدان کسی ایسی "ہوائی" کی ایجاد میں مصروف ہیں جس میں بیٹھ کر انسان چاند ستاروں تک پہنچ سکے۔ اب ایک سائنسدان کا دعویٰ ہے کہ اس نے ایک ایسی "ہوائی" مکمل کر لی ہے جو چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر کے ہوائی جہازوں کو ہزاروں فٹ کی بلندی پر لے جائیگی۔ لیکن طبیعات کے ماہرین کو یقین ہے کہ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ کوئی ہوائی جہاز اتنی رفتار کو باآسانی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ گذشتہ بیس برس سے جرمن اس قسم کی ہوائی بنانے میں مصروف ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کا کوئی تجربہ کامیاب نہیں رہا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں اوپل کے کارخانوں میں ایک ایسی موٹر کار تیار کی گئی جو بارہ ہوائی ٹیوبوں سے ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی تھی۔ جب اس "ہوائی موٹر" کو عمودی راستہ پر چلایا گیا تو وہ اچھل کر نیچے گر پڑی اور ڈرائیور بھی مارا گیا۔ پھر ۱۹۳۱ء میں ایک ہوائی موٹر کار ایجاد کی گئی۔ جو ۶۵ میل تک فضا میں اڑ سکتی تھی۔ لیکن یہ تجربہ بھی مہلک ثابت ہوا۔ اب سائنس دان "ہوائی منجنیق" کی ایجاد میں منہمک نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک ان کو کامیابی نصیب نہیں ہو سکی۔

آفتاب کے داغ اور اختتام جنگ

ہر دس بارہ برس کے بعد قرص آفتاب میں بڑے بڑے سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں جو زمین کیلئے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ یہ داغ دراصل وہ بڑی بڑی آندھیاں ہیں جو آفتاب کے گرد تیزی کے ساتھ چکر لگاتی ہیں۔ چنانچہ پروفیسر متزا نے لکھا ہے کہ سورج کے داغ دراصل بڑے بڑے گرداب ہیں جن کی شکل قیف کی مانند ہے۔ ان گردابوں میں سے گرم بخارات تیزی کے ساتھ اوپر اٹھ کر آفتاب کی سطح پر آتے ہیں آفتاب کی سطح پہ ہوا کا دباؤ نسبتاً کم ہوتا ہے اس لئے یہ بخارات پھیل کر کسی قدر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ یہ "طوفانی داغ" چونکہ سورج کی بہ نسبت کم روشن ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیں سیاہ نظر آتے ہیں۔ مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ جب ان داغوں کی کثرت نظر آئے تو زمین پر آفات و بلیات کا حملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ "کلف شمس" زمین کی مقناطیسیت میں اضطراب پیدا کر دیتا ہے تحت الارض برقی لہروں میں اضافہ ہو جاتا ہے "شفق شمالی" کا ظہور ہوتا ہے اور اس سے ٹیلی فون، ریڈیو اور ٹیلیگراف میں بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ چند ماہ ہوئے ایک رات ریڈیو یکلخت بند ہو گئے تھے۔ یہ مقناطیسی لہروں اور شفق شمالی کا کرشمہ تھا سنہ ۱۹۴۳ء

میں ماہرینِ فلکیات نے متنبہ کیا تھا کہ آفتاب کے داغ بڑھ رہے ہیں جو ۳۸-۱۹۳۷ء میں اپنے عروج پر ہونگے چنانچہ ۱۹۳۸ء کے اواخر میں جنگ اپنی تمامتر تہلکہ انگیزیوں کے ساتھ شروع ہوئی۔ اب ماہرین کا بیان ہے کہ یہ داغ آہستہ آہستہ ناپید ہو رہے ہیں۔ اور انکی سرگرمی ۱۹۴۳ء کے اواخر اور ۱۹۴۴ء کے آغاز میں ختم ہو جائیگی۔ ان حقائق کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عالمگیر جنگ کے زور میں ۱۹۴۳ء کے اواخر سے کمی ہونا شروع ہو جائیگی۔ اور ۱۹۴۴ء میں بالآخر جنگ خاتمہ کے قریب نظر آنے لگے گی۔ یہ امر موجبِ دلچسپی ہے کہ ان داغوں سے بعض اوقات بہت بڑے بڑے طوفان پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ۲ر جون ۱۹۳۷ء کو ایک آتش فشاں مادہ ابھرا جس کا گھیرا ایک لاکھ ستر ہزار میل اور اونچائی ۲۵ ہزار میل تھی اور یہ طوفان تین روز تک رہا۔

کیا مچھلیاں سُن سکتی ہیں؟

عام طور پر مشہور ہے کہ مچھلی بہری ہوتی ہے۔ اور کسی قسم کی آواز نہیں سن سکتی لیکن حال ہی کے ایک تجربہ نے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دکھایا ہے چنانچہ ایک سائنسداں نے منّو نامی ایک مچھلی پر تجربہ کیا تو معلوم ہوا کہ اگر خوراک دینے سے پہلے اسے وسل دیکر بلایا جائے تو وہ بخوبی سن سکتی ہے اور پانی کی سطح پر آکر تیرنے لگ جاتی ہے۔ یہ امر موجبِ دلچسپی ہے کہ وسل بجانے والا نظر سے اوجھل ہوتا اور مچھلی صرف آواز سنکر دوڑتی ہوئی آتی تھی۔

اب یہ سوال ہے کہ اگر مچھلی سن سکتی ہے تو اس کے کان کہاں ہوتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مچھلی کے کان بے شک نظر نہیں آتے لیکن وہ پرندوں کے کانوں کی طرح اس کے سر کے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔

پتھر چننے والی مشین

امریکہ میں ایک مشین ایجاد ہوئی ہے جو ٹریکٹر کے ساتھ لگا دینے سے بڑے بڑے پتھروں کو اٹھا لیتی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ بارہ ٹن کا پتھر آسانی سے اٹھا لیتی ہے اس ایجاد سے وہ ممالک زیادہ مستفید ہو سکینگے جہاں کی زمینیں زیادہ تر پتھریلی ہیں۔

جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

دردِ فرقت اور یاس و حرماں سے لبریز ایک بلا کا دردناک افسانہ

از جناب تجمل حسین صاحب شاکر سرونجوی

چاروں طرف اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں۔ بڑے چھوٹے درختوں سے ڈھکی ہوئی اور بیچ میں ہرا بھرا میدان۔ اسی میدان کے ایک گوشے میں چھوٹا سا پہاڑی چشمہ بہتا تھا۔ چشمے کے اوپر ہی ایک جھونپڑا تھا جس میں صبیحہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ جھونپڑے کے آس پاس رنگا رنگ پھولوں کے خود رو پودے لہلہا رہے تھے۔ یہ پہاڑی خطہ اپنی گوناگوں اور بوقلموں قدرتی دلفریبیوں کی اعتبار سے جنت کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا اور صبیحہ اس جنت کی حور۔ ایسی صباحت و نفاست، ایسی لطافت و رعنائی، ایسی بشاشت و تازگی، ایسی سادگی اور معصومیت شہری دوشیزاؤں میں یکسر معدوم ہوتی ہے۔ بوڑھے باپ کی خدمت کے بعد دن کو پھولوں سے کھیلنا اور رات کو تاروں سے سرگوشیاں صبیحہ کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ رات کا وقت طوفانی ہوا چل رہی تھی۔ موسلادھار مینہ برس رہا تھا۔

بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے رہ رہ کر جھونپڑا کانپ اٹھتا تھا۔ ایک گوشے میں صبیحہ سہمی سکڑی بیٹھی تھی اور دوسرے گوشے میں اس کا باپ۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔

اسی حالت میں کسی نے باہر سے جھونپڑے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بوڑھا بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔ نہ جانے یہ کون بھلا آدمی ہے جو اس ہولناک طوفان میں اتنی رات کو دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

معلوم نہیں بوڑھا ابھی نووارد کو ایسی کتنی سناتا لیکن اس کی حالت دیکھتے ہی بوڑھے کا غصہ فرو ہوگیا۔ وہ ترحم آمیز لہجہ میں بولا۔ اوہ! تم تو بہت بھیگ گئے ہو۔ جلدی سے آجاؤ اندر۔"

نووارد جھونپڑے کے اندر داخل ہوگیا۔ ابھی اس کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔ قدو قامت، سینہ بازو، اور شکل و شباہت سے کوئی خاندانی نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ بوڑھا اس سے پیہم سوال کرنے لگا لیکن وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ وہ ہر سوال کو دو ایک ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ٹال دیتا تھا۔ صبیحہ دور بیٹھی نووارد کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی جس کے ساتھ شوق کی کافی آمیزش تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ پاس جاکر پوچھا "تمہارا نام کیا ہے مسافر؟"

اس نے ایک بار صبیحہ کی طرف دیکھ کر جواب دیا "نادر!"

"آپ کہاں سے آرہے ہیں مسافر؟" صبیحہ نے پھر سوال کیا۔

"بہت دور سے۔ صبح چلا جاؤنگا اور اگر آپ لوگوں کو تکلیف ہو تو ابھی وقت چلا جاؤں" مسافر نے جواب دیا۔

"نہیں، نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کے کپڑے بہت بھیگ گئے ہیں میں دوسرے کپڑے لاؤں۔ آپ ان کو بدل دیں۔ مسافر چپ ہوگیا۔ صبیحہ جاکر کپڑے لے آئی۔ مسافر نے مستفسرانہ نظروں سے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ صبیحہ نے کہا۔ یہ کپڑے میرے مرحوم بھائی کے ہیں یہ کہتے ہوئے صبیحہ کی آواز بھرا گئی اس کے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو امنڈ آئے۔

مسافر کپڑے بدل چکا تو بوڑھے نے صبیحہ سے کہا "مہمان کے کھانے کا بھی تو کچھ بندوبست کرو بیٹی!"

"تھوڑا سا دودھ ہی تو ہوگا بابا!"

"تو وہی سہی، مہمان کا بالکل بھوکا رہنا تو مناسب نہیں"

صبیحہ ایک پیالہ دودھ لائی۔ مسافر نے ایک بار صبیحہ کی طرف دیکھا اور اس کے

ہاتھ سے پیالہ لے کر ایک ہی سانس میں کل دودھ پی گیا۔ وہ بہت بھوکا تھا۔

مسافر صبیحہ کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ ایسا پیکر حسن و ناز اس نے شہر میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے متناسب اعضاء، اس کی چاندنی سی صورت، اس کے مشک ختن سے کالے کالے بال اور اس کی غزالی آنکھیں مسافر کو دعوت کیف و نظر دے رہی تھیں۔

اس نے پوچھا: "آپ کا نام؟"

صبیحہ نے جواب دیا: "صبیحہ"

مسافر جاننا تو بہت کچھ چاہتا تھا لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ پوچھ نہ سکا۔ صبیحہ اپنی جگہ چلی گئی۔ مسافر بھی ایک طرف پڑ رہا۔ رات کو مسافر کو بخار آ گیا۔ اس لئے وہ صبح جا نہ سکا۔ اسے مجبوراً ٹھہرنا پڑا۔

صبیحہ ہر وقت نادر کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے ساز دل کیلئے ایک مضراب بن گئی تھی جو اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ چھیڑ کر ان سے کیف و نشاط کے عجیب عجیب نغمات پیدا کرتا رہتا تھا۔ اکیلے کو ساری دنیا بیگانہ اور بے کیف معلوم ہوتی ہے لیکن جب اکیلا دو ہو جاتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات اسی کیلئے ہے اور ساری چیزوں میں اس کے لئے سامان سرور و انبساط موجود ہے۔

یہی حالت صبیحہ کی تھی۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ جنگل کے پھول اسی کے لئے کھلتے ہیں، طیور اس کے لئے نغمہ سرا ہوتے ہیں، چاند اسی کیلئے نور و ضیا کی بارش کرتا ہے، ستارے اسی کیلئے جگمگاتے ہیں۔ صبیحہ کا باپ بھی خوش تھا کہ اسے بیٹے کا نعم البدل مل گیا۔ اس نے تھوڑی سی زمین قابل کاشت بنائی تھی۔ اس سے جو غلہ پیدا ہوتا وہ باپ بیٹی کے گذارے کیلئے کافی ہوتا۔ اب جب سے نادر آیا تھا۔ بوڑھے کو کام کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ نادر ہی سارے کام کرتا تھا۔ صبیحہ کھانا پکا کر کھیت پر لے جاتی۔ وہیں دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔

نادر شاعر تھا اور اس کی شاعری کا موضوع تھی صبیحہ۔ وہ گاتا بھی خوب تھا۔ وہ جس وقت صبیحہ کو سامنے بٹھا کر ولولہ انگیز انداز میں اپنی رومانی غزلیں گاتا اس پر ایک بے خودی سی طاری ہو جاتی اور صبیحہ پر بھی، نہ نادر آپے میں رہتا اور نہ صبیحہ۔

کھیت پر کام نہ رہتا تو دونوں چشمے کے کنارے کسی ٹیلے پر یا کسی جھاڑی کے سایے میں جا بیٹھتے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے وہاں نادر کا شغل بیشتر گانا اور صبیحہ اس کے نغمہ و نشاط سے کیف اندوز ہوتا تھا۔

نادر اور صبیحہ کی زندگی کا ہر لمحہ لمحہ کیف و سرور تھا۔ ہر صبح ان کیلئے ایک پیام مسرت لاتی اور ہر شام ان کو جدید نوید عشرت دیتی۔ دونوں کی زندگی ایک فردوسی زندگی کا نمونہ تھی۔

جس طرح ایک رات نادر بھٹکتا ہوا اس جھونپڑے پر پہنچ گیا تھا۔ اسی طرح ایک رات ایک اور مسافر راستہ بھول کر ادھر آنکلا۔ صبیحہ اور نادر دونوں نے اس کی بڑی خاطر و مدارات کی۔ سب الاؤ کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ نادر نے مسافر سے پوچھا: "آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

مسافر بولا: "فتح گڑھ سے!"

"کون فتح گڑھ؟ ریاست فتح گڑھ؟"

"ہاں ہاں، وہیں سے!"

نادر فتح گڑھ کا نام سن کر چونک پڑا مگر کچھ دیر کسی خیال میں محو رہنے کے بعد بولا "کیا حال ہے ریاست کا؟"

مسافر نے کہا: "اچھا حال نہیں ہے۔ فرمانروائے ریاست بستر مرگ پر پڑا ہوا ہے۔ اور ولیعہد کا کہیں پتہ نہیں سرکاری آدمی اس کی تلاش و جستجو کر کے تھک گئے مگر اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ سنا جاتا ہے حضور سلامت ہر وقت ولیعہد کو یاد کرتے رہتے ہیں۔"

نادر نے کسی قدر فکر مندانہ لہجہ میں پوچھا "تم ولیعہد کو پہچانتے ہو؟"

مسافر نے سر ہلا کر جواب دیا: "نہیں"

دوسرے روز مسافر چلا گیا۔ جب سے نادر نے مسافر سے فرمانروائے فتح گڑھ اور اس کے ولیعہد کی بات سنی تھی اس پر ایک عجیب افسردگی طاری ہو گئی تھی۔ وہ ضرورت کے مطابق کھیت پر جاتا، کام کرتا، صبیحہ بھی اس کے ساتھ ہوتی لیکن اب اس میں وہ زندہ دلی نہ پائی جاتی۔ اس کے چہرے کی بشاشت و تازگی یکسر زائل ہو گئی تھی۔ اب اس کا وہ گانا تھا اور نہ ہنس ہنس کر صبیحہ سے باتیں کرتا۔

صبیحہ نادر میں یک بیک یہ تغیر دیکھ کر گھبرا اٹھی تھی۔ اور اس کے لئے یہ حالت ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ نادر کھویا ہوا سا چاند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صبیحہ نے اس کے اوپر جھک کر تشویش آمیز لہجہ میں پوچھا: "آخر تمہاری یہ کیا حالت

ہے؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو؟"

صبیحہ کے سوال پر نادر اس طرح چونک پڑا جیسے وہ کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ اٹھا ہو۔ وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہیں ایسا نہ ہو ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔"

صبیحہ نے آنسوؤں کے جس سیلاب کو اب تک بڑی مشکل سے روک رکھا تھا وہ بے اختیار اُبل پڑا۔ وہ نادر کے پہلو میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ نادر اسے چپ کرانے لگا۔ صبیحہ نے کہا "نواب ایسی بات زبان پر نہ لاؤ گے نا؟" نادر نے دلاسا دیا۔ "اچھا صبیحہ چپ رہو۔ اب میں ایسی بات نہ کہوں گا۔"

صبیحہ کے خزاں دیدہ فردوس زار حیات میں از سر نو نسیم سرور و انبساط چلنے لگی۔ صبیح کا افسردہ چہرہ پھر بشاش ہو گیا۔ چاند کی بے کیف روشنی میں پھر دلآویزی پیدا ہو گئی جنگل کی پرسکوت اور اندوہگیں فضا نادر کی نغمہ آرائیوں سے پھر سرود زار بن گئی۔

~~~~~~

مسافر کی بات نادر کے دل میں ایک پھانس بن کر رہ گئی تھی وہ کچھ دنوں کے بعد پھر کھٹکنے لگی۔ فتح گڑھ کا فرمانروا بستر مرگ پر پڑا ہر وقت ولیعہد کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اس بات کے یاد آتے ہی نادر کے سکون و اطمینان کی دنیا پھر زیر و زبر ہو گئی۔

درسِ پرواز

(از خطیبۂ سند نواب سیدہ سردار بیگم اختر حیدر آبادی)

اے پرندے مائلِ پرواز کیوں ہوتا نہیں
دم بخود ہی وقفِ سوز و ساز کیوں ہوتا نہیں
باش او راحت طلب او ناشناسِ ہست و بود
تیری دنیا خوابِ راحت کے سوا کچھ بھی نہیں
یوں نہ محدود نشیمن کر فضائے زندگی
تو سمجھ بیٹھا ہے راحت آشنائی زندگی
زندگی موجِ حوادث میں ہے سوزِ جان ہے
خاکِ گلشن کی طرف بھی دیکھ لے اک نظر
بازوؤں کو آزما اب تو بھی لطفِ رم تو دیکھ

اے پرندے کنجِ نشیمن میں ہے پابندِ جمود
کب سے تو کنجِ گل لطفِ صبا کچھ بھی نہیں
ہے گلشنِ ہمدگر ناآشنائے زندگی!
اپنے اوپر رحم کر ناآشنائے زندگی
زندگی ناآشنا، برقِ بلا ہے زندگی
زندگی ساحل میں کب ہے زندگی طوفان میں ہے
اور یہ ہیں کس قدر ذرے ہوا کے دوش پر
مہرِ تاباں کی طرف اترا ہوا شبنم کو دیکھ
سن سحر تیرے لئے اک غیب کی آواز ہے
زندگی پرواز ہے اور مستقل پرواز ہے

رات کا وقت تھا۔ آسمان پر ستارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ جیسے نیلے سمندر میں نوری قمقمے تیر رہے ہوں نادر کے دل میں فرمانروائے فتح گڑھ اور ولیعہد کے خیالات چٹکیاں لے رہے تھے۔ صبیحہ اس کے پاس ہی پڑی سو رہی تھی

اس کی پیشانی کے تھوڑے سے ریشمی بال ایک عجیب دلفریب انداز سے اس کے چہرے پر بکھر رہے تھے اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ کوئی سرور انگیز خواب دیکھ رہی ہو۔ نادر اس معصومۂ محبت کو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ نادر کا کیا ارادہ ہے اور وہ کیا کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس سے غریب صبیحہ بالکل بے خبر ہے۔ لیکن نادر بھی کیا کرے ساتھ لے جا نہیں سکتا اور یہ اس سے کہنے کی بات نہیں کہ وہ اسے چھوڑ کر جا رہا ہے بھلا صبیحہ اس بات کو کس دل سے سن سکتی ہے۔ اس سے بغیر کچھ کہے اس کی لاعلمی میں چپ چاپ چلے جانا بھی اس پر کچھ کم ظلم نہیں۔ آخر اس سے اس پر کیا گذرے گی۔ لیکن اس کے سوا نادر کے لئے کوئی اور چارہ بھی تو نہیں ہے صبیحہ کی جدائی اسے بھی ہر وقت ہی تڑپائیگا۔ اس کی زندگی میں کوئی لذت و خوشی باقی نہ رہے گی۔ پھر بھی اسے جانا تو ضرور ہی ہے فتح گڑھ کے فرمانروا کا آخری وقت
~~~~~~

ہے اور وہ ولیعہد کو یاد کر رہا ہے۔ کیا معلوم کہ اس کی جدائی ہی کے غم نے اسکو اس حالت تک پہنچا دیا ہو۔

~~~~~~~

صبح ہوئی صبیحہ سوکر اٹھی لیکن آج اس نے نادر کو اپنے پہلو میں نہ پایا۔ وہ کھٹک پر گئی کہ شاید نادر اُٹھ کر اسی طرف چلا گیا ہو لیکن اس کا وہاں بھی پتہ نہ تھا۔ وہ چشمے کے کنارے اس مقام پر گئی جہاں دونوں ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ جھاڑیوں کے وہ کنج دیکھے جن کے سایے میں انکی صحبتیں گرم ہوتی تھیں۔ لیکن نادر کہیں تو نہ ملا۔

صبیحہ نے پکارنا شروع کیا: "نادر ـــ! نادر ـــ!"

لیکن بجائے اس کے کہ جواب ملتا: کیا ہے پیاری صبیحہ! میں یہاں ہوں: وہی صبیحہ کی صدائے بازگشت نادر! نادر! سنائی دی، اور بس،

صبیحہ کا دل اندوہ وغم اور حزن وملال سے پاش پاش ہوا جارہا تھا۔ وہ پھر بے اختیار پکار اٹھی ـــ نادر ـــ! نادر ـــ! اور اسی کی صدائے بازگشت اس کے کانوں سے ٹکرائی ـــ نادر ـــ! نادر ـــ!

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن وہاں کون تھا جو اس کی ڈھارس بندھاتا، اس کا سر اپنی آغوش میں لے کر اسے چپ کراتا اور اپنی آستین سے اس کے آنسو پونچھتا۔ اس کا نادر تو اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ کون جانے صبیحہ کب تک اسی طرح گریہ زاری کرتی رہی؟

~~~~~~~

فتح گڑھ کی رعایا خوش تھی کہ ولیعہد آگیا۔ حکمران خاندان کی مسرت وشادمانی کی انتہا نہ رہی۔ حاکم کی موت کا اندوہ وغم سرور وانبساط سے بدل گیا۔ بڑی دھوم سے تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ نادر فتح گڑھ کے ولیعہد کی بجائے فتح گڑھ کا حاکم بن گیا۔

ابھی تک جواں سال وجواں بخت فرمانروائے فتح گڑھ نا کتخدا تھا۔ اسلئے حکومت کے اعیان وارکان کا دلچسپ موضوع گفتگو یہ تھا کہ دیکھئے حضور سلامت اپنی رفاقت حیات کیلئے کس خوش قسمت دوشیزہ کا انتخاب کرتے ہیں اور فتح گڑھ کی بیگم بننا کس حسینہ کے نصیب میں لکھا ہے۔ فتح گڑھ میں بہت عالی خاندان حسین وجمیل دوشیزائیں تھیں۔ لوگ اپنے اپنے خیال ومذاق کے مطابق ان کے نام بھی لیتے تھے۔ لیکن کوئی کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کسی کو نئے فرمانروا کے مزاج کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا لوگ دیکھتے تھے کہ وہ بے چین بے چین سا رہتا ہے جیسے کوئی خاص خیال اندر ہی اندر اسے ہر وقت ستا رہا ہو۔ مگر کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے سامنے زبان کھولے اور اس سے کچھ پوچھے۔

~~~~~~~

ایک شب کوئی تین بجے کے قریب نادر نے خادم کو گھوڑا تیار کرانے کا حکم دیا اور اسی وقت صبیحہ کے جھونپڑے کی طرف روانہ ہوگیا۔ شام ہوتے ہوتے وہ صبیحہ کے دیار میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے شاہانہ کپڑے اتار کر رکھدئے اور معمولی کپڑے جو پاس ہی رکھ لئے تھے۔ ان کو پہن لیا۔ گھوڑے کو بھی وہیں چھوڑ دیا اور وہ آہستہ آہستہ مجرم کی طرح چل کر صبیحہ کے جھونپڑے پر پہونچا۔ لیکن جھونپڑا خالی پڑا ہوا تھا۔ نادر کا دل طرح طرح کے خطرات سے بے چین ہوگیا۔ وہ پاگلوں کی اسے چاروں طرف تلاش کرنے لگا۔ جنگل کا ایک ایک چپہ ڈھونڈ ڈالا۔ لیکن صبیحہ کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ نادر چشمے کے کنارے بیٹھ کر وہ غزلیں گانے لگا۔ جو اس نے صبیحہ کی محبت میں خود تصنیف کی تھی تاکہ صبیحہ کہیں بھی ہو تو اس کا گانا سن کر اس کے پاس آجائے۔ لیکن اسکی یہ سعی رائگاں گئی۔ اس کی صبیحہ اسے نہ ملی۔ ملتی کیونکر اس نے بھی اپنے نادر کا کچھ کم انتظار نہیں کیا۔ لیکن جب وہ بالکل مایوس ہوگئی اور اس کیلئے نادر کی جدائی کا صدمہ ناقابل برداشت ہوگیا تو آج ہی نادر کے پہنچنے سے کچھ ہی دیر قبل اس نے اپنے جھونپڑے کے پاس والے چشمے میں ڈوب کر جان دیدی۔

~~~~~~~

اس جانگداز واقعہ کو زمانہ گذر چکا ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ اس جنگل میں اب تک کبھی کبھی درد وگداز سے بھری ہوئی گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ شاید نادر کی روح اب تک اپنی صبیحہ کو تلاش کرتی پھرتی ہے۔

~~~~~~~
~~~~~~~

کمالِ فریب کا ایک محیّر العقول افسانہ

غلط فہمی!

از
جناب ظفر واسطی شاہ آبادی

جب کمار سینما گھر پہنچا تو فلم شروع ہو چکی تھی۔ دربان نے ٹارچ سے روشنی دکھائی اور وہ جا کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دو تین منٹ میں جب اس کی آنکھیں اندھیرے مانوس ہو گئیں تو اس نے دیکھا کہ برابر کی کرسی پر ایک عورت بیٹھی ہے اور کچھ دیر کے بعد عورت نے نہایت بے تکلفی سے اپنا بازو اٹھا کر اس کے شانے پر رکھ دیا اور نہایت دلکش انداز میں بولی "کیسا پیارا منظر ہے ڈارلنگ"۔ عورت کی اس حرکت پر کمار کو ایک دم تعجب ہوا۔ کوئی شریف عورت ایک اجنبی مرد کو اچانک اس طرح مخاطب نہیں کر سکتی اور نہ اس کے شانے پر اس طرح ہاتھ رکھ سکتی ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ جب دربان ٹارچ سے روشنی دکھا رہا تھا تو اس عورت نے اس کرسی پر سے کوئی چیز اٹھائی تھی۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ ضرور اس کا شوہر یا کوئی مرد ہے۔ وہ کسی ضرورت سے باہر گیا ہوگا اب یہ سمجھی کہ وہ واپس آ گیا ہے۔ کمار کو کون سمجھائے۔ وہ تو بہترین قسم کا موقع شناس آدمی تھا۔ اس نے عورت کی اس غلط فہمی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی سوچ لی۔ کچھ جواب دئے بغیر اس نے بھی اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ عورت خاموش بیٹھی فلم دیکھتی رہی۔ کمار کی کچھ اور ہمت بڑھی۔ اور اس نے کچھ اور دست درازی شروع کی۔ عورت نے سرگوشی کے انداز میں ایک ناز معشوقانہ سے کہا "یہ کیا کر رہے ہو ڈارلنگ"۔ لیکن کمار کا ہاتھ جہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے وہاں سے ہٹایا نہیں پھر ایک دم اس کی طرف جھک گئی اور بہت محبت سے بولی "ڈارلنگ!" اور کمار نے اس مرتبہ اپنے ہونٹوں کو بھی سیراب کر لیا۔

یہاں تک کر گذرنے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ اب اگر اس کا شوہر آ جائے تو کیا ہوگا۔ ــــ ہوگا کیا مجھے یہ جگہ چھوڑنی پڑے گی تو میں چھوڑ دونگا۔ لیکن اگر اس نے اسے بتا دیا کہ میں نے آپ کے دھوکے میں ایسے۔

لیکن کمار بزدل نہ تھا کہ اس کے شوہر کے خیال ہی سے ڈر جاتا اس کے علاوہ اس نے سوچا کہ یہ مجھ سے زیادہ قصوروار ہے۔

وقفہ کا وقت قریب آیا تو کمار نے پھر سوچا کہ اب سارا ہال روشنی سے جگمگا اٹھے گا۔ یہ عورت مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گی اور ــــ لہٰذا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر جانے لگا۔ عورت نے پوچھا "اب پھر کہاں چلے ڈارلنگ؟" کمار نے نہایت ہلکی آواز میں کہا "ابھی آیا"۔ اسے خوف تھا کہ کہیں بولنے سے بھی پول نہ کھل جائے۔

وقفہ کے بعد وہ آ کر پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا اب وہ اس عورت کو پہلے کی طرح شریف عورت نہ سمجھتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اکیلی ہے اگر اس کے ساتھ کوئی مرد ہوتا تو وقفہ میں اس مرد کو یقیناً اس کے پاس آ جانا چاہئے تھا۔ ویسے روشنی میں اس کی صورت دیکھ کر اس کے دل کو بے انتہا خوشی حاصل ہوئی کیونکہ وہ بہت زیادہ خوبصورت تھی اور اس کے جوان ہونے کا تو اسے پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔

عورت نے تھوڑی دیر کے بعد پھر اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کمار پھر پہلے کی طرح اپنے ہاتھ اور ہونٹوں کی تواضع کرنے لگا۔

جب تماشہ ختم ہونے لگا تو عورت نے کہا "ڈارلنگ آئیے لوگوں کی بھیڑ سے پہلے ہی نکل چلیں"۔

کمار بلا چون و چرا اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ آگے آگے وہ تھی اور پیچھے پیچھے کمار۔ اس نے جان بوجھ کر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا یا اتفاقیہ طور پر یہ بات اس وقت کمار کی سمجھ میں نہ آسکی۔ کار کے نزدیک پہنچ کر جب وہ اس میں بیٹھنے لگی تو اس نے کمار کی طرف دیکھا اور ایکدم ذرا سخت لہجہ میں بولی "آپ کون ہیں؟"

کمار نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "جسے آپ بلا کر لائی ہیں۔ جو تماشے میں آپ کے پاس بیٹھا رہا"۔

عورت اور زیادہ تیز ہو کر بولی "آپ تھے ــــ اور ولیم؟"

"ولیم کون؟ ــــ میں ولیم کو نہیں جانتا۔"

کمار کا جواب سن کر وہ ایکدم نرم

پڑ گئی۔ اب اس کے لہجہ میں سختی تھی اور نہ تیزی بلکہ درد تھا اور رنج۔ اس نے کہا "دیکھئے ہم اور عورت کے ساتھ کا جھگڑے آزاد ہو گا۔ دوسری منزل میں رقص گاہ ہے ناچتے گاتے رہتے ہیں۔ مجھے ہال میں بٹھا گیا اور بولا میں ابھی آیا"

آخری فقرہ اس نے خاص طور پر ایسے درد سے کہا کہ کمار کے دل میں ہمدردی کا جوش سا اٹھنے لگا۔ وقفہ کے اندر جو کچھ وہ اس کے متعلق سمجھتا رہا تھا وہ سب غلط معلوم ہوا۔ وہ دل ہی دل میں پچتانے لگا کہ میں اسے آوارہ عورت کیوں سمجھتا رہا۔ وہ تو ایک دھوکے میں اس نے مجھے اتنی آزادی دے دی ورنہ یہ بات ہرگز ممکن نہ تھی۔ آخر اس نے کہا: "مجھے سخت افسوس ہے کہ ــــــ اور اس سے زیادہ افسوس مجھے مسٹر ولیم پر ہے لیکن محترمہ آپ اس کا غم نہ کریں"

وہ پھر اسی درد سے بولی "غم نہ کروں؟ وہ میری آنکھوں میں خاک جھونک کر مزے اڑائے اور میں اف نہ کروں۔ سب کچھ چاہتی ہوئی کچھ نہ بولوں۔ میں ہندوستانی عورت نہیں کہ شوہر کے ظلم دیکھوں اور خاموش رہوں"

"وہ آئیں تو آپ ان سے جواب طلب کیجئے"

"جواب تو بہت طلب کئے۔ آج میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتی ہوں"

اتنے میں اور لوگ سینما گھر سے نکل آئے۔ یہ انگریزی سینما گھر تھا۔ اس میں زیادہ تر انگریز یا اینگلو انڈین ہی آتے تھے۔ لوگ آ آ کر اپنی کاروں میں بیٹھنے لگے۔ ایک ہندوستانی خدمتگار آیا اور اس نے سلام کرنے کے بعد مسز ولیم سے کہا۔ صاب (صاحب) ڈانس کرتا ہے۔ اور کہتا ہے ہم خود پہنچ جائے گا"

مسز ولیم نے حقارت اور غصہ سے پوچھا "کس کے ساتھ ڈانس کرتا ہے؟"

"وہ جو خبصورت (خوبصورت) مس ہے۔ جو ہر روز صاب (صاحب) کے ساتھ ہوتی ہے ــــ مس شارپ"

مسز ولیم غصہ میں دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

کمار نے کہا "میں آپ کی کسی طریقہ پر کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

مسز ولیم نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا "ہاں کر سکتے ہیں لیکن آپ کو میرے ساتھ میرے مکان پر چلنا ہوگا"

"چلئے میں حاضر ہوں"

مسز ولیم نے کار چلائی۔ کمار اس کے برابر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ خود بھی مسز ولیم کی طرح خوبصورت تھا اور نوجوان۔

فلیٹ پر پہنچ کر مسز ولیم اسے ایک دم اپنی خوابگاہ میں لے گئی اور بولی ہمیں جلدی کرنی چاہئے مبادا ولیم آ جائے۔

اب کمار کو موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔ وہ خود ایک اچھی پوزیشن کا آدمی تھا اور مسز ولیم بھی کسی بڑے آدمی کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ ظاہر تھا کہ کار چھوٹے آدمی نہیں رکھ سکتے۔ کمار کو خیال آیا کہ اگر عین اسوقت اس کا شوہر آ جائے ــــ لیکن اس مصیبت سے، اب بلاشبہ وہ اسے مصیبت ہی سمجھ رہا تھا بچنے کی بھی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ وہ اس دشوار گذار اور خطرناک راستے پر اتنی دور جا چکا تھا کہ صحیح و سلامت واپس نہ آ سکتا تھا۔ ہاں البتہ منزل سامنے تھی۔ اب صرف ایک جست کی ضرورت تھی اگر جست پوری رہے تو پو بارہ نہیں تو رسوائی اور ذلت۔

اس نے نہایت تیزی سے سوچا اور آخر مسز ولیم کی خواہش کے مطابق عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مسز ولیم تو شاید دل سے چاہتی تھی کہ کمار زیادہ سے زیادہ بے تکلف ہو جائے وہ کیوں اس کی بات میں مزاحمت کرتی لیکن کمار کی حسرت پوری نہ ہو سکی انہیں مسز ولیم کی خوابگاہ میں گئے ہوئے چند منٹ نہ گذرے تھے کہ ایک دم بڑے زور سے دروازہ کھلا اور اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان ہاتھ میں پستول لئے کھڑا ہے اور اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی ہیں۔ مسز ولیم ایک دم کھڑی ہو کر کمار کے پیچھے چھپ گئی۔ اور بولی "مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ ورنہ ولیم مجھے جان سے مار ڈالیگا" اور رونے لگی۔ کمار یہ سب کچھ ہونے پر ہی سخت متعجب اور خوفزدہ تھا۔ مسز ولیم کے رونے اور التجا کرنے پر اسے اور زیادہ تعجب ہوا کہ اگر یہ اپنے شوہر سے اتنی زیادہ ڈرتی ہے تو اسے یہ سب کچھ کرنا ہی نہ چاہئے تھا۔ اسے خود پر بھی افسوس ہوا اور غصہ بھی آیا کہ وہ اتنا بیوقوف کیوں بن گیا۔ کہ مسز ولیم کے ساتھ اس کے گھر چلا آیا اور ــــ اور پھر خوابگاہ کی چٹخنی تک لگائی۔

دس پندرہ منٹ کے بعد جب وہ ان کے فلیٹ سے نکلا تو نہ کلائی پر گھڑی تھی اور نہ جیب میں فاؤنٹین پن اور اس کے پاس جتنے روپے تھے وہ بھی مسٹر ولیم کی نذر ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہ انہیں ایک ایسی تحریر بھی دے آیا تھا جس کے بعد وہ پولیس میں اس واقعہ کی رپورٹ بھی نہ کر سکتا تھا اور جب وہ جا رہا تھا تو اسے

شعرائے مست قلندر

غزل

فضا کی گود میں تاروں کی مستیاں توبہ
ہجوم لالہ و گل میں نگہ اسیر رہی
وہ روبرو ہیں اب بھی ہے خیال اپنا
ترے ستم نے اجاڑے دل و جگر کیا کیا
ہم آنکھ اٹھا نہ سکے منتظر زمانہ رہا
خیال حور کی مشعل جلا کے شب کاٹی
خیال ہوش بھی ہے دعویٔ جنون بھی ہے

حریم قدس میں یہ مے پرستیاں توبہ
بلند ہو کے بھی انساں کی پستیاں توبہ
خدا کے سامنے یہ بت پرستیاں توبہ
اجڑ سکیں نہ خیالوں کی بستیاں توبہ
بلا کی تھیں تری صہبا کی مستیاں توبہ
جناب شیخ کی لذت پرستیاں توبہ
سرورؔ آپ کی بادہ پرستیاں توبہ

از جناب اکمل سرور

غزل

جذب نظر کو صرف اثر دیکھتا ہوں میں
طوفان اشک کا یہ اثر دیکھتا ہوں میں
اے شمع بزم عیش تجھے کون سا ہے غم
رنگین آنسوؤں کی یہ اللہ رے آب و تاب
اس عالم وجود میں تو وہ نہ مل سکے
خورشید وش نے الٹی ہے چہرے سے جو نقاب
پہلے تو دل کو لے لیا ناز و ادا کے ساتھ
یوں کائنات ہوش پہ میری وہ چھا گئے
رگ رگ میں ارتعاش محبت سے ناتواںؔ

جلووں کی بھیڑ آٹھوں پہر دیکھتا ہوں میں
دنیائے غم کو زیر و زبر دیکھتا ہوں میں
سینے میں تیرے داغ جگر دیکھتا ہوں میں
پانی میں جیسے لعل و گہر دیکھتا ہوں میں
سوئے عدم بھی کر کے سفر دیکھتا ہوں میں
پھر اپنے شام غم کی سحر دیکھتا ہوں میں
پتھر سا اب تمہارا جگر دیکھتا ہوں میں
پاتا ہوں اب انہی کو جدھر دیکھتا ہوں میں
دنیائے دل کو زیر و زبر دیکھتا ہوں میں

از جناب عبدالاحد صاحب ناتواں افغان آگرہ

غزل

ڈرتے نہیں ہیں گردش چرخ کہن سے ہم
ایسے کہاں نصیب تھے جاتے جو با مراد
آئی اگر بہار چمن میں تو ہم کو کیا
کیوں دے رہا ہے ہم کو فریب وفا عبث
آنکھوں میں اک جلال ہے اک جوش دل میں ہے
ان کی شمیم زلف ہے کافی مرے لئے

مانوس مدتوں سے ہیں رنج و محن سے ہم
لے جا رہے ہیں داغ تری انجمن سے ہم
کنج قفس میں دور پڑے ہیں چمن سے ہم
واقف ہیں خوب اس بت پیماں شکن سے ہم
مقتل کو جا رہے ہیں عجب بانکپن سے ہم
مایوسؔ بے نیاز ہیں مشک ختن سے ہم

از جناب سالک انصاری مایوس گورکھپوری

نغمۂ بے تاب

فطرت کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
وہ بے حجاب ہو کے جو آئے ہیں سامنے
اللہ ری کیف عشق و محبت کی مستیاں
خلوت سرائے دل میں بڑی ہے خوشی خوشی
ہو لاکھ جرم عقل محبت کی زندگی
اف بیخودی کہ دل کو تلاش سکون ہیں

کیا کار لاجواب کئے جا رہا ہوں میں
اب ان سے خود حجاب کئے جا رہا ہوں میں
پانی کو بھی شراب کئے جا رہا ہوں میں
ہر غم کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں
یہ جرم بے حساب کئے جا رہا ہوں میں
مانوس اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

از جناب حکیم محمود صاحب لکھنوی

اس سے سمجھ لے کوئی مری داستانِ زیست
پامالیِ شباب کئے جا رہا ہوں میں
اتنی بڑھا ہیں جودیِ دل کی منزلیں
اب خود سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
مخمور کرکے اپنے کو ناکام آرزو
الفت کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

نغمہ

از جناب عبدالمنان صاحب خالدؔ

کیسے ہم محبت کے نغمے سنائیں
کہ ہے فصلِ گل اور ٹھنڈی ہوائیں
وہ گیسوئے مجمل جن سے کالی گھٹائیں
وہ صورت کہ شمس و قمر منہ چھپائیں
وہ گل رنگ عارض کہ گل شرم کھائیں
وہ دنداں گہر جن پہ قربان جائیں
وہ اک پیکرِ حسن ہے کیا بتائیں
کہ قاتل ہیں ہر ایک جس کی ادائیں
کبھی ہو کے خوش وہ اگر مسکرائیں
تو پھر خرمنِ دل پہ بجلی گرائیں
ہر اک بات ان کی مرے دلنشیں ہے
جفائیں کریں یا کریں وہ وفائیں
ضرور آج کچھ عرض کرنا ہے اُن سے
ذرا دیدہ و دل میں تشریف لائیں
ہمیں اپنے دل سے وہ چاہے بھلادیں
مگر ہم اُنہیں کس طرح بھول جائیں
محبت میں ثابت قدم ہوں میں خالدؔ
وہ جس طرح چاہیں مجھے آزمائیں

ایک سوال؟ اگر مست قلندر آپ کا محبوب ترین اور دلپسند رسالہ ہے تو اس کے لئے آپ نے حلقۂ احباب میں سے کتنے خریدار پیدا کئے ہیں؟ (مینیجر)

آپ کی ہر مشکل آسان ہو جائیگی

میں اپنے بھائی اور بہنوں کے لئے اپنے قیمتی سینہ کے راز کو ظاہر کر رہا ہوں۔ کیونکہ یہ میرا وہ سرمایہ ہے جس کے حاصل کرنے میں میں نے ہزاروں روپیہ صرف کر دیا تھا اور برسوں محنت کی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد راز ہائے سربستہ کو چھپا کر فرض سمجھتا تھا مگر ضرورتمندوں نے مجھ کو مجبور کر دیا کہ کیوں نہ خلق خدا کو اس گرانمایہ اور کلام الٰہی کی برکات سے مالا مال کیا جائے۔ اس لئے میں بے کم و کاست آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کئے دیتا ہوں کہ مندرجہ ذیل نقش و تعویذ سے کبھی ناکامی نہ ہوگی۔ میں چند پیسوں کی خاطر اپنے ایمان کو فروخت نہیں کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرے تمام بھائی میرے ایماندارانہ قول کو سچا سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھائیں اور کامیابی کے بعد فقیر کے لئے دعائے خیر کریں گے۔ نقش و تعویذ حسب ذیل ہیں جن کا ہدیہ بہت ہی قلیل ہے اور یہ تمام لفافہ کے اندر بذریعہ وی پی رجسٹری کے ذریعہ روانہ کئے جاتے ہیں۔ ہدیہ علاوہ رجسٹری لفافہ کا خرچہ چار آنہ اور ہوتا ہے۔

نقش بشارت — یہ نقش ہر کام کی کامیابی اور ناکامی کی بشارت دیتا ہے۔ رات کو اپنے سرہانے رکھ کر سو جاؤ اور کام کا تصور دل میں رکھو۔ سوتے میں بشارت ہو جائے گی۔ بیاہ شادی۔ مریض کی بیماری تجارت میں کامیابی ناکامی۔ غرضیکہ اس کا موکل آکر جواب دیتا ہے۔ ہدیہ ایکروپیہ دس آنے (۱عہ/)

تعویذ دولت — مفلسی میں خدا بھی یاد آتا ہے۔ خدا کسی کو مفلس نہ کرے۔ مفلسی دور ہونے کی جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئے یا روپیہ کی ترقی رک جائے تو اس متبرک تعویذ کی مدد سے آپ کی مفلسی دور ہوگی روپے پیسے میں رکھ دینے سے دولت کی زیادتی ہوگی اور غیبی طریقہ سے آمدنی کے ذرائع پیدا ہوں گے۔ بس خدا کی قدرت نظر آئیگی۔ ہدیہ سوا روپیہ (۱عہ/)

محبت کی ڈوری — میرے بزرگ نے صرف مجھ کو اجازت دی تھی کہ یہ ایسے ضرورتمندوں کو دیا جائے جو جائز طور پر طلب کریں۔ اس لئے میں اس محبت کی ڈوری کو ضرورتمند بہنوں کے لئے پیش کر رہا ہوں کہ اگر ان کی اپنے شوہر سے لڑائی رہتی ہو یا شوہر کی طبیعت ان کی طرف سے ہٹی ہوئی ہو یا شوہر غصہ ور ہو بیوی سے ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا ہوتا ہو تو یہ تعویذ آپس کی محبت بڑھانے میں محبت کی زنجیر ثابت ہوگا۔ چند ہی دن میں سارے جھگڑے ختم ہو کر شوہر بیوی کا غلام بن جائے گا۔ یہ خدا کے کلام اور اس کے مقرب بندوں کی برکت ہے کہ جائز محبت کے وقت اس تعویذ معظم کی برقی قوت اپنا اثر دکھاتی ہے اور ضرور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ ہدیہ صرف ڈھائی روپیہ (عہ/)

اقرار — ہر ضرورتمند بہن بھائی کو یہ اقرار کرنا ہوگا کہ میں اپنے سوا کسی دوسرے کو ان نقش و تعویذ کے استعمال کی ترکیب بالکل نہ بتاؤں گا۔

عامل نواب میاں شاہ صاحب چشتی حکیم آغا جان رمہ ۔ دہلی

شب نامچے

از جناب
کوثر چاندپوری

تاجر کا شب نامچہ

دہلی میں میری کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی۔ دیسی کپڑے کا بہت بڑا ذخیرہ ہر وقت میرے یہاں موجود رہتا تھا۔ اور میں صرف دیسی کپڑے کی بدولت مالا مال ہوگیا تھا۔ ہندوستانی ذہنیت پر میں لفظ دیسی سے ایسا اثر ڈال چکا تھا کہ وطن پرست حلقے میری امداد کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے ان کی رائے میں گویا میں ہندوستان کے غریب اور مفلسی باشندوں کی بڑی خدمت کر رہا تھا کہ ان کی ضروریات کیلئے دیسی کپڑا تیار کرکے سستے داموں فروخت کرتا تھا معلوم نہیں میں اپنے غریب بھائیوں کی مدد کر رہا تھا یا آہستہ آہستہ دولت کے انبار جمع کرنے میں مصروف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جب معمولی سرمایہ سے میں نے دوکان کھولی ہے تو میرے دل میں ملک کی خدمت کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ اس کے بعد جب میرے پاس روپیہ بڑھتا گیا تو مال و دولت کے لالچ میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ آخر ایک وقت آیا جب میں صرف تاجر رہ گیا حب الوطنی یا غریب دوستی کا کوئی جذبہ میری رگوں میں باقی نہ رہا۔ پھر بھی میں اپنے کام کی بدولت عام لوگوں میں بڑا محب وطن مشہور تھا شروع شروع میں پوشیدہ طور پر میں غریب اور مجبور فقیروں کو کچھ دیدیا کرتا تھا۔ جب کوئی بھوکا ننگا میرے پاس آجاتا میں اس کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کو کچھ نہ کچھ ضرور دیدیا کرتا۔ اس خصوصیت نے غریبوں کے طبقہ میں مجھے ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ میری دوکان پر جس نے بڑھتے بڑھتے ایک کارخانہ کی شکل اختیار کرلی تھی۔ بہت سے آدمی نوکر تھے۔ لکھنے پڑھنے، کپڑا بننے، اور دوسرے بیشمار کاموں کیلئے بیشمار ملازم تھے۔ یہ سب میری رحمدلی اور خوش معاملگی پر اتنا بھروسہ رکھتے تھے۔ جیسا دیندار قسم کے لوگ کسی مذہبی بات پر عقیدہ رکھ سکتے ہیں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ شروع میں ضرور میں ان اوصاف کا مالک تھا لیکن روپیہ جمع کرنے کے خبط میں اب تو مجھے اپنے کسی ملازم کا پیسہ ہضم کرنے اور اس کے حساب کو کم و بیش کردینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوتا تھا۔ میرے دفتر کا رہنے والا ایک شخص رام دین بھی میرے یہاں نوکر تھا۔ بارہ روپیہ مہینہ اس کی تنخواہ تھی۔ آدمی بڑا موٹا تازہ اور گورا چٹا تھا مگر تھا نہایت کام چور، جہاں میں اسے لگاتا وہ اپنی سستی اور کاہلی سے کام خراب کردیتا۔ ہر شخص اس کا شاکی تھا۔ مجبور ہوکر میں نے منیجر سے کہدیا کہ رام دین اگر ٹھیک ٹھیک کام نہ کرے تو اسکی تنخواہ کاٹ لیا کرو۔ پہلے ہی مہینے میں اسے بارہ روپیہ کی جگہ نو ملے تین روپے جرمانہ میں وضع ہوگئے۔ کئی مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا کبھی نو کبھی آٹھ اور کبھی اس سے بھی کم تنخواہ رام دین کو ملتی اور وہ بغیر کچھ کہے سنے لے جاتا۔ ساون کے مہینے میں اس پر آدھی تنخواہ کا جرمانہ ہوگیا۔ تہوار کا زمانہ تھا ہر شخص کو خرچ کی ضرورت تھی۔ رام دین اپنی عادت کے موافق کچھ کہے سنے بغیر چھ روپے لے گیا ـــ آج شام ہی سے آسمان پر موٹے موٹے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دن چھپتے ہی مینہ برسنے لگا بجلی خوب چمک رہی تھی اور موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ قریب قریب سارے نوکر جاکر جا چکے تھے جو باقی تھے وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ دفتر بھی بند ہوچکا تھا میں اپنے کمرے میں صوفہ پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ ذرا پانی تھمے تو ڈرائیور سے موٹر لانے کو کہوں۔ آج صبح بیوی کے اصرار پر یہ طے ہوگیا تھا کہ شام کو قطب چلیں گے مگر ایسے میں گھر سے پاؤں نکالنا بھی مشکل تھا۔ مجھے تو موٹر تک پہنچنا ہی دوبھر نظر آرہا تھا اتنی دور تو جانا تو بڑی بات تھی بہرحال دوکان اور گھر میں سو دو سو میل کا فاصلہ نہ تھا جو سماں یہاں تھا وہی گھر بھی ہوگا اور بارش کی شدت نے یقیناً بیوی کے ارادے پر بھی وہی اثر کیا ہوگا، جو میرے ارادہ پر کیا تھا۔ بیوی نے بڑے اہتمام سے کپڑے بدلے ہونگے، ناشتہ تیار کرنے میں بھی بڑی محنت کی ہوگی۔ بارش بہت بے موقعہ ہوئی میں سوچتے سوچتے یہیں تک پہونچا تھا کہ ایکدم سے ایسا معلوم ہوا کہ آسمان پھٹ گیا۔ بہت تیز

روشنی ہوئی پھر اس زور سے بادل گرجا کہ میرا دل ہل گیا۔ ساتھ ہی ایک عورت جس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے گھبرا کر میرے کمرے میں گھس آئی اور میز سے ٹکرا کر دھڑام سے زمین پر گر پڑی میں چونک کر اٹھ بیٹھا کون؟ سندری؟

سندری میری خاص ملازمہ تھی جب مجھے گھر پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو اکثر وہ مجھے دیکھنے دوکان پر آجایا کرتی تھی۔

سندری نہیں سیٹھ جی میں ہوں! عورت نے بھیگے ہوئے لال رنگ کے دوپٹے سے منہ چھپاتے ہوئے مہین آواز میں کہا۔

میں نے تمہیں نہیں پہچانا تم کون ہو نام بتاؤ۔

وہ دری پر کھڑی تھی اور پانی کی بوندیں اس کے کپڑوں سے ٹپک ٹپک کر دری کو بھگو رہی تھیں۔ میرے اس سوال پر اس کی زبان بند ہو گئی وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

ارے بول تو کون ہے کیوں آئی ہے؟

سیٹھ جی میں ہوں رام دین ....

رام دین کی گھر والی؟ کیوں آئی ہے

سیٹھ جی اس نے اپنی اپنی گوری گوری کلائی کو ہلاتے ہوئے کہا پیٹ نہیں بھرتا۔

کیوں نہیں بھرتا تیرا پیٹ؟

تم تنخواہ کاٹ لیتے ہو ساری۔

تنخواہ کیوں نہ کاٹوں، رام دین سے کام بھی تو نہیں ہوتا۔

سیٹھ جی وہ تو دن بھر......

باولی تو نہیں جانتی وہ بڑا کام چور ہے۔

سیٹھ جی اب تو دیا کرو۔

دیا کیسے کروں مزدوری محنت کے بدلے میں ملا کرتی ہے

اس مہینے میں تم نے چھ روپے کاٹ لئے سیٹھ جی!

جیسا وہ کام کریگا ویسے ہی دام دونگا۔

سیٹھ جی تہوار کے دن ہیں۔ اس نے بڑی لجاجت سے کہا اور گھونگھٹ کی آڑ سے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے امید کے ساتھ مجھے دیکھا اس کی آنکھوں میں چمک تھی جو بجلی کی چمک میں مل کر اتنی تیز ہو گئی کہ میں اپنے دل میں ایک خاص قسم کی روشنی محسوس کرنے لگا اس کی لمبی لمبی پلکیں جو بہت تیزی سے حرکت کر رہی تھیں مجھے اپنے سینہ میں چبھتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ ارے تجھے سردی نہیں معلوم ہوتی؟ میں نے پوچھا۔

بھوک میں سردی کیونکر معلوم ہوگی سیٹھ جی!

کیا واقعی تو بھوکی ہے۔

تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بولونگی ان داتا۔

اچھا ذرا اپنا دوپٹہ نچوڑ ڈال۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا اب اسکی اجلی رنگت، ستواں ناک، اور پتلے پتلے ہونٹوں نے بھی مجھے متاثر کیا جو اس کے دیہاتی حسن کو اتنا دلچسپ بلکہ رنگین بنائے ہوئے تھے کہ دیکھنے والا تاب ہی نہ لا سکتا تھا نکھری ہوئی صاف رنگت، ابھرے ہوئے سرخ انگارہ سے گال پر باہیں، گال پر چمکتا ہوا ایک نیلگوں تل، میں ان سب چیزوں کو دیکھ کر سنبھل گیا اور باہر تاریکی میں یہ دیکھنے لگا کوئی ہے تو نہیں ـــــ کیا نام ہے تیرا رام دین کی گھر والی!

اس نے کوئی جواب دیا۔

میں جذبات سے مجبور ہو کر کھڑا ہو گیا اور ایک خاص کشمکش میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

ارے نام بتا اپنا گونگی ہو گئی کیا؟

اس کا بھی اس نے کوئی جواب دیا۔

میں نے اس کا دوپٹہ پکڑ کر جھٹکا دیا ایک ہی جھٹکے میں اس کا منہ گردن تک کھل گیا۔

ایسا معلوم ہوا جیسے بادل چھٹ گئے اور چاند نکل آیا۔

رام دین اور روپ رانی، میں نے للچائی ہوئی بلکہ چندھیائی ہوئی نگاہوں سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کر کے پرے جا کھڑی ہوئی۔

یہ پیٹ بھرنے کی باتیں نہیں ہیں، سنا تو نے؟

وہ کچھ نہ بولی میں نے کچھ قریب جا کر وہی حرکت کی۔

سیٹھ جی میں بھوکی ہوں مجھ پر دیا کرو!

میں تیرا پیٹ بھر دوں گا۔

تنخواہ دیدو مجھے پوری چھ روپے میں پیٹ نہیں بھرے گا!

ایسی کتنی ہی تنخواہیں دے دونگا، مورکھ سمجھی نہیں تو میرا مطلب؟

میں نہیں سمجھی سیٹھ جی آپ بڑے آدمی ہیں

بڑے آدمیوں کے بھی سینہ میں دل ہوتا ہے۔ میں نے یہ کہہ کر اپنا آفس بکس کھولا اور اس میں سے دس روپے نکال کر اس کے سامنے ڈال دیے۔ روپوں کی جھنکار سے وہ چونک گئی اس نے بڑی بیتابی سے جھک کر دونوں ہاتھوں سے روپے اٹھا لئے۔ تھوڑی دیر کیلئے اس کا منہ پھر کھل گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ حسن کی ایک ملکہ ہے جس کو قدرت نے نہ معلوم کیوں رام دین کے حوالے کر کے یہ سزا دی ہے کہ میرے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور بنا دیا ہے حالانکہ صحیح معنوں میں یہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہئے تھا اور صحیح یہ ہے اس وقت میرا ہاتھ اس کے سامنے

پھیلا ہوا تھا۔ میں جب اس سے کچھ کہتا وہ گڑگڑا کر کہتی۔ سیٹھ جی میں بھوکی ہوں مجھ پر دیا کرو۔ واقعی وہ بھوکی تھی اس کا منہ اترا ہوا تھا ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ آنکھوں میں وہ دیئے جھلملا رہے تھے جو فاقہ کی آگ ہی سے جلا کرتے ہیں۔

دس روپے میں بھی تیرا پیٹ نہ بھریگا کیا؟

بھر جائیگا مگر میں کوئی سودا بیچنے نہیں آئی۔ اس نے میری نگاہوں کی بھوک اور آتما کی پیاس کو محسوس کر کے کہا۔ میں اسوقت بالکل دیوانہ ہو گیا تھا۔ جذبات کا بھوت میرے سر پر سوار تھا۔ میں نے اس کی بھوک کا کوئی احترام نہ کیا۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ بھوک کی آگ بجھانے میرے یہاں آئی ہے۔ میں اس سے ایسے وقت میں کوئی سودا نہ کروں۔ مگر میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں عقل کی روشنی مدھم ہی نہیں پڑ گئی تھی بلکہ بجھ گئی تھی۔ میں نے سرمایہ داری کے نشہ میں مال و دولت کے غرور میں ایک بھوکی عورت کو اپنے حریصانہ ارادوں کا شکار بنانے کی پوری کوشش کی۔

بادل پھر زور سے گرجا ایسا معلوم ہوا میری دکان پر بجلی ٹوٹ پڑی میں سہم کر باہر جھانکنے لگا اس نے پھر اسی لہجہ میں کہا۔ سیٹھ جی بھوک لگی ہے۔ مجھے جانے دو!

یہ کہہ کر اس نے ایک چھلانگ لگائی۔ بالکل وحشی ہرنی کی طرح اور بادلوں کی اندھیری میں غائب ہو گئی۔

میں نے کامیابی کے پورے یقین کیساتھ سوچنا شروع کیا۔ رام دین بارہ روپے تنخواہ پانے والا رام دین حسن کے اس گنجینہ کو مجھ سے چھپا اور بچا کر نہیں رکھ سکتا بھوک کی جو آگ آج اسے میرے بھر لائی تھی دس بیس دن میں پھر لائیگی پیاسے کا کنوئیں پر آنا لازمی ہے۔

صوفی کا شب نامچہ

میں شروع ہی سے کچھ خاموش اور ریاکار واقع ہوا تھا۔ اپنی طبیعت کا یہ جوہر اس وقت مجھ پر ظاہر ہوا۔ جب میں نے صوفی کی حیثیت سے اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ پہلے تو صرف یہی تھا کہ میں کھانا گوشت روٹی اور کوئی پوچھتا تو کہہ دیتا کہ مسور کی دال کھائی ہے۔ یا مارتا بیوی کو اور جب اس کے رونے کی آواز باہر جاتی اور اہل محلہ پوچھتے کس کو مار رہے ہو تو کہدیا کرتا یہ کم بخت لڑکی پڑھنے میں دل نہیں لگاتی۔ قاعدے کا سبق یاد نہیں کیا تو غصہ آگیا اور ایک تسبیح کھینچ ماری میں نے! حالانکہ تسبیح کی جگہ میرے ہاتھ میں موٹا سا بیت ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ میرے بہت سے عقیدتمند پیدا ہو گئے۔ اور میں ایک کامیاب صوفی کے لباس میں جلوہ گر ہوا۔ اب ریاکاری کا رخ مذہبیات کی طرف پھر گیا صبح کو کوئی مرید آتا اور پوچھتا حضرت آج تو آنکھوں میں سرخی بہت نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے رات کو آرام نہیں فرمایا حالانکہ آنکھ کی سرخی نتیجہ ہوتی تھی زیادہ سونے کا مگر میں فوراً کہتا بھائی کیا کہوں رات ہی پہ موقوف نہیں تین چار روز سے کچھ پڑھنے میں مصروف ہوں بس یوں سمجھو کہ تخت پر بیٹھے بیٹھے صبح ہو جاتی ہے۔ جس پیشہ کو میں نے شروع کیا تھا بہت ہی عجیب اور آسان پیشہ تھا۔ خصوصاً مالدار بننے کے لئے تو دنیا میں اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ آدمی صوفی بن جائے۔ آہستہ آہستہ میری شہرت پھیلنے لگی۔ اور ایک وقت آیا کہ دور دور تک میرا نام مشہور ہو گیا۔ روزانہ بکثرت خطوط اور منی آرڈر میرے پاس آتے لوگ دعا کی التجائیں کرتے، تعویذ مانگتے اور میں انہیں اطلاع دیتا کہ مطمئن رہو۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اکثر لوگ خود ہی اپنا مقصد لے کر میرے پاس آجاتے اور میں ان سے ایسی ذومعنی گفتگو کرتا کہ وہ بھی حیران رہ جاتے ایک صاحب ترقی کی دعا کرانے آئے میں نے تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے دفعتہً سر اٹھا کر کہا ـــ دس، دس! بس اس سے زیادہ نہیں۔ اس نے سمجھ لیا۔ ترقی دس روپے سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس نے درخواست میں بیس روپے کی استدعا کی تھی۔ مگر میں نے عقل سے کام لیکر فیصلہ کر لیا کہ منہ مانگی چیز کا ملنا ضروری نہیں بیس مانگے ہیں تو دس دینے میں افسران کو بھی کوئی عذر نہ ہوگا۔ چنانچہ میرا یہ قیاس صحیح نکلا۔ اس واقعہ کے بعد میرے عقیدت کیشوں میں کافی اضافہ ہو گیا اور میری اس کرامت کا بڑی شد و مد سے اشتہار دیا گیا

ایک دن میں سہارنپور سے واپس آرہا تھا۔ راستہ میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر دو تین آدمی ملے انہوں نے مجھے وہیں اتار لیا۔ ان لوگوں کا تعلق ارباب رقص و سرود سے تھا۔ ایک صاحب کو شکایت تھی کہ ان کی آواز خراب ہے اور جس مجلس میں وہ گانا شروع کرتے ہیں تھوڑی دیر بعد ہی وہ خالی ہو جاتی ہے۔ دوسرے بزرگ حسن و عشق کا شکار تھے کسی کی نگاہ ناز کا تیر نیم کش ان کے قلب میں پیوست تھا۔ دونوں نے عاجزانہ التجائیں کیں یہ پہلا موقعہ تھا

کہ مجھے یہ سوچنا پڑا کہ ایک خراب آواز کو کیونکر اچھی اور دلپسند آواز میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اپنی بےبسی کا احساس تو ہوا مگر میں نے سپر نہ ڈالی اور تھوڑا سا پانی پڑھ کر انہیں دے دیا دوسرے صاحب کو چند تعویذ لکھ کر دیدیئے اور ان سے کہا کہ اپنے محبوب کو مجھے دکھا دو میں اپنے ہاتھ سے ایک پان اسے کھلا دونگا وہ تمہارے لئے بےچین ہو جائیگا وہ دن چھپتے ہی مجھے ویران اور اندھیری سڑکوں اور گلیوں سے گذارتے ہوئے ایک بالاخانہ پر لے گئے اور گانا سننے کے حیلہ سے مجھے اپنے قبلۂ مقصود سے متعارف کرا دیا۔ سولہ سترہ سال کی ایک الہڑ لڑکی جو سر سے پیر تک صانع قدرت کی حسن کاریوں کا دلچسپ نمونہ تھی قیمتی کپڑوں میں ملبوس اور عطر و غازہ کی حسن انگیز خوشبوؤں سے معطر میرے سامنے بیٹھی تھی میرا دل پہلی ہی نظر میں اس کے آستانہ حسن پر سجدہ ریز ہو گیا اور سر سے پیر تک مجھ پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ عشق اور تصرف میں ایک خاص قسم کا معنوی ربط ہے اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ میرے دل میں ابتدا ہی سے کافی گداز تھا میں شروع ہی سے حسن کا احترام کرنے کا عادی تھا تاہم میرا دل حریف حسن نہ تھا میں نے کبھی اس سلسلہ میں اپنے صبر و ضبط کو نہ آزمایا تھا۔ آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ میں بہت کمزور ہوں۔ حسن کے ایک ہی اشارہ ابرو پر میرا دل سرنگوں ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں چپ بیٹھا رہا اس عرصہ میں وہ مجسمۂ حسن و شباب اور ناطورۂ جمال و رعنائی نہایت دلچسپ حرکات کرتی رہی کبھی تو انگلیاں چٹکاتی کبھی انگلیوں میں بڑے بڑے طلائی چھلوں کو گھماتی کبھی انگڑائیاں لیتی اور کبھی پان اٹھا اٹھا کر منہ میں رکھتی آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟

بے بی رشیدہ!

کب سے یہ کام کرتی ہو؟

جب سے پیدا ہوئی ہوں!

پھر تو تم خوب گاتی ہو گی؟

یہ سننے سے معلوم ہوگا۔

اچھا سناؤ کچھ!

اس نے چند مشہور غزلیں گائیں مجھ پر وجد طاری ہو گیا۔ اور آج پہلی مرتبہ مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ واقعی عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے۔ وہ گا بھی چکی مگر میں دیر تک جھومتا رہا پھر آنکھیں کھول کر میں نے کہا قریب آؤ۔ وہ سرک کر ذرا آگے آ گئی۔ میں نے تھالی میں ـــــ پان کا بیڑا اٹھا کر کہا منہ کھولو! اس نے شرما کر اور کچھ مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ ایک استاد نے کہا بے بی رشیدہ منہ کھول دو فقیروں کا کہنا نہیں کرتے اس نے بڑی مشکل سے منہ کھولا میں نے بیڑا اس کے منہ میں دے دیا اس نے لجائی اور شرمائی نگاہوں سے مجھے دیکھا میرا قلب سینہ میں تڑپنے لگا جیسے کوئی زخمی پرند تیر یا بندوق کا چھرا لگ جانے کے بعد پھڑپھڑایا کرتا ہے۔ آہ اب میں خود ہی مریض تھا تاہم اپنے عقیدتمند سے میں نے کہدیا کہ تمہارا مقصد پورا ہو گیا چند روز میں وہاں مقیم رہا اور روزانہ بے بی رشیدہ جان کے یہاں جاتا جس دن نہ جاتا وہاں سے آدمی بلانے آ جاتا جس روز سے میں نے وہاں آمد و رفت شروع کی تھی بے بی رشیدہ کی آمدنی میں نمایاں اضافہ ہو گیا تھا اور گھر کے سب لوگ میرے معتقد ہو گئے تھے۔ ایک روز شام ہی سے مطلع ابر آلود ہو گیا اور پھر بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اساڑھ ختم ہو کر ساون لگا تھا لوگ کہہ رہے تھے آج اساڑھ ساون سے گلے مل رہا ہے۔ مینہ بہت برسیگا چنانچہ واقعی ایسا ہی ہوا۔ بڑی شدت کا مینہ برسا خوب بجلی کڑکی اور بادل گرجے، دل نے تقاضہ کیا آج تو ضرور ہی چلنا چاہئے مگر پانی رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ہر طرف اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ بھیانک اندھیری، سڑکوں پر پانی زور شور سے بہہ رہا تھا۔ ہر طرف سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسے میں گھر سے قدم نکالنے کی ہمت نہ ہوئی بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ دانستہ ارادہ ملتوی کر دیا تاکہ کسی کو بیتابیٔ دل کا اندازہ نہ ہو۔ اتنے میں بے بی رشیدہ جان نے آپ ہی تانگہ بھیجدیا میں خوشی خوشی تانگہ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اتفاق سے رشیدہ تنہا تھی اس نے سرو قد کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا اور ادب سے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کمر کو کافی خم کر کے سلام کیا۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ رشیدہ آج تم اکیلی معلوم ہوتی ہو؟

نہیں حضرت اکیلی نہیں ہوں!

اور کون ہے تمہارے پاس؟

اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا، وہ!

میں نے اتنے زور سے سر دھنا کہ بال تتر بتر ہو گئے پھر دیر تک دو زانو بیٹھا رہا رشیدہ میرے قریب ہی بیٹھی تھی بادل گرج رہا تھا بجلی کوند رہی تھی اور پانی کی بڑی بڑی بوندیں ٹپ ٹپ پختہ فرش پر گر رہی تھیں کبھی کبھی باغ میں پپیہا پی کہاں پی کہاں پکار اٹھتا۔ عجب سماں تھا۔ میں نے کہا رشیدہ!

وہ بولی، جی!

کچھ سناؤ!

اس نے بہت اچھا کہا اور ہارمونیم لے کر گانا شروع کیا۔

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

میں نے پہلے ہی شعر پہ بیتاب ہو کر کہا۔

رشیدہ زندہ باش!

غزل پوری کرنے کے بعد وہ پھر کچھ گانا چاہتی تھی مگر میں نے یہ کہہ کر روک دیا۔ رشیدہ اب چپ ہو ورنہ میرا دل پھٹ جائیگا۔

پانی برابر برسے جا رہا تھا۔ کالے کالے بادل آسمان پر منڈلا رہے تھے۔ بجلی بار بار ان کا سینہ چیر کر جھانکتی اور آسمان پر ایک حسین تبسم کی لہر دوڑ جاتی۔

بے بی رشیدہ، میں نے کہا۔

جی! وہ بولی۔

آج میں تمہیں کچھ ایسی باتیں بتانا چاہتا ہوں جو تم نے کبھی نہ سنی ہونگی۔

بتائیے! وہ بولی۔

یوں نہیں۔

اور کیونکر؟

بے تکلفی کیساتھ سننے کو تیار ہو جاؤ۔

میں آپ سے بالکل بے تکلف ہوں۔

اچھا پان کھلاؤ۔ میں نے منہ کھول کر کہا۔

اس نے پتلی پتلی حنا آلود انگلیوں سے ایک ورق میں لپٹا ہوا بیڑا میرے منہ میں رکھ دیا۔

اسوقت واقعی وہ بے تکلف تھی۔ اور جذبات آہستہ آہستہ سرخی میں تبدیل ہو کر اس کے چہرے پر دوڑ رہے تھے۔ میں بھی از خود رفتہ تھا۔ اس نے مجھے مضطرب دیکھ کر کہا۔

کچھ پلاؤں!

کیا پلاؤگی رشیدہ زہر؟

جو میں پلاؤں پی لیجئے!

ضرور پیونگا!

وہ بلور کے شفاف گلاس میں ایک ہلکے سرخ رنگ کا سیال بھر لائی۔ اور میرے ہونٹوں سے لگا دیا میں نے اسکی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ؎

دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام
منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

آتش سیال کے جرعات تلخ حلق سے اترتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی اور دنیا میں پہونچ گیا جہاں حسن و عشق اسطرح دست و گریباں ہیں جیسے شب و روز۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ اس خمار حسین کا انجام کیا ہوا ــــ صبح کو جب میں بیدار ہوا تو غالباً ۵ بجے تھے۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پرنالے زور زور سے مقدمات کے پختہ فرشوں پر گر رہے تھے اور دو بھیگی ہوئی بلیاں قریب ہی ایک چھت پر لڑ رہی تھیں ــــ

مسافر کا شب نامچہ

میں اپنا سوٹ کیس بائیں ہاتھ میں لٹکائے ہوئے بڑی بدحواسی کے ساتھ دلی کے اسٹیشن پر پہونچا گاڑی چھوٹنے ہی کو تھی۔ میں نے اضطراب کے ساتھ ڈبوں میں جھانکنا شروع کیا۔ ایک سیکنڈ کلاس میں تھوڑی سی جگہ تھی گارڈ سیٹی دے چکی تھی میں جلدی سے کھڑکی کھول کر اسی میں داخل ہو گیا گاڑی پہلے آہستہ آہستہ پھر تیز تیز چلنے لگی اگرچہ مجھے جگہ مل گئی تھی لیکن معلوم نہیں میرا اضطراب کیوں بڑھ رہا تھا میں نے جیب سے دستی نکال کر پیشانی کا پسینہ پونچھا پھر مسافروں پر ایک متجسسانہ نظر ڈالی دو تین آدمی بستر بچھائے لیٹے تھے۔ مگر انہیں صرف اپنے آرام سے بحث تھی۔ میری تکلیف سے کوئی ہمدردی نہ تھی ایک حسین خاتون بڑے تعجب اور غور سے میری بدحواسانہ حرکات کو دیکھ رہی تھی اور خود بخود مسکرا رہی تھی اس کو دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی بدحواس تھا اور معلوم نہیں اس دوران میں کیسی کیسی مضحکہ خیز حرکتیں مجھ سے سرزد ہو چکی تھیں۔ میں نے اپنے سراپا پر ایک نگاہ ڈالی اور بیٹھنے کے لئے نشستوں کا جائزہ لیا۔ خاتون نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا جگہ چاہیے آپ کو بیٹھنے کیلئے؟

جی ہاں بس تھوڑی سی!

ادھر آئیے یہ ہے جگہ، اس نے اپنے سامنے والی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں سوٹ کیس اپنے قریب رکھ کر بیٹھ گیا۔ آپ کہاں تشریف لیجائینگی! میں، اس نے مسکرا کر پوچھا۔

جی ہاں آپ!

اچھا آپ تو بتائیے پہلے کہاں جائیے گا؟

بمبئی جاؤں گا!

کراچی ہو کر جائیے گا غالباً؟

نہیں صاحب میں سیدھا بمبئی جاؤنگا!

مگر یہ گاڑی لاہور جا رہی ہے اس وقت، وہاں سے واپس ہو کر ممکن ہے بمبئی چلی جائے۔

اچھا لاہور کی ریل میں بیٹھ گیا میں ارے توبہ، خدا کے لئے!

کیا مقصد آپ کا کھڑکی کھول دوں۔ کودنے کا ارادہ ہے؟

نہیں، نہیں، بتائیے تو میں کیا کروں؟

اب آپ کچھ نہیں کر سکتے بیٹھ جائیے

کچھ بھی نہیں کر سکتا میں ؟

جی ہاں اسوقت کچھ اسوقت کچھ نہیں کیا جا سکتا پہلا اسٹیشن آنے پر اتر جائیے گا۔

کب آئیگا پہلا اسٹیشن اسوقت تک تو میری گاڑی ......

جی ہاں گاڑی تو آپ کی ضرور چھوٹ جائیگی مگر اب یہ بھی تو ممکن نہیں کہ آپ اس ریل کو واپس لوٹا سکیں یہ تو اب بہرحال لاہور ہی جائیگی۔ کیونکہ میں نے اور بہت سے لوگوں نے وہیں کے ٹکٹ لئے ہیں۔ جمہوری حیثیت سے بھی آپ اپنے ایک ٹکٹ کے حق سے گاڑی واپس نہیں لیجا سکتے۔

آپ مذاق کر رہی ہیں اور میرے پیروں تلے سے زمین نکلی جا رہی ہے۔

زمین تو آپکے پیروں تلے سے اسی وقت نکل گئی تھی جب آپ ریل میں بیٹھے تھے۔ اب آسماں بھی سر سے گذرتا جا رہا ہے مگر آپ کچھ نہیں کر سکتے اور پہلا اسٹیشن آنے سے قبل کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔

کتنی دیر کے بعد آئیگا پہلا اسٹیشن؟

ایک گھنٹہ بعد۔

اور پھر دوسری گاڑی مجھے کسوقت ملیگی؟

رات کو تین بجے۔

پھر اس کے مقابلہ میں تو یہی بہتر ہے کہ میں اسوقت تک اپنا سفر جاری رکھوں جب تک دہلی آنے والی گاڑی مجھے نہ ملے۔

یہ تو بڑا دانشمندانہ فیصلہ ہے اس نے مسکرا کر کہا۔

آپ کہاں جا رہی ہیں؟

میں تو پہلے عرض کر چکی ہوں لاہور جا رہی ہوں۔

وہ بڑی حسین، شوخ اور حاضر جواب خاتون تھی۔ اس کے سفید سرخی مائل چہرے پر بھورے رنگ کے ریشمی بال بکھرے ہوئے نہایت بھلے معلوم ہو رہے تھے اسکی آنکھوں کی نیلگوں پتلیوں میں محبت کے سمندر لہریں لے رہے تھے۔ اس کا مسکراتا ہوا حسن مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہو رہا تھا میں نے اس کی معیت کو بہت غنیمت خیال کیا اور اطمینان سے گفتگو کرنے لگا میری گاڑی کا وقت جس قدر قریب آتا جا رہا تھا۔ میں یہ فیصلہ کرتا جا رہا تھا کہ اسوقت تو جو کچھ بھی ہو میں لاہور ہی چلا چلوں۔

اگر میں لاہور ہی کا ارادہ کر لوں تو کیا ہے؟

بہت اچھا ہے منشی فاضل کا امتحان قریب ہے آپ بھی شریک ہو جائیے گا آدمی کو اپنی ہر غلطی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہئیے۔

کیا آپ امتحان دینے جا رہی ہیں؟

جی ہاں میں اسی ارادہ سے جا رہی ہوں!

پھر میں بھی تقدیر آزما کر دیکھ لوں؟

ضرور بشرطیکہ قسمت پر اعتماد ہو۔

ابھی تک ایسا کوئی موقعہ نہیں آیا۔

اب دیکھ لیجئے اس نے انگڑائی لے کر کہا۔

آپ کو نیند آ رہی ہے۔

جی ہاں میں سونا چاہتی ہوں اس نے کتاب مجھے دیتے ہوئے کہا۔ آپ اس سے دل بہلائیے میں ذرا دیر کو سوتی ہوں۔

شکریہ! میں نے کہا اور کتاب لے کر میں شوق سے پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی خاتون کو نیند آ گئی اس کی نیلی نیلی پتلیوں کو بنفشہ کے پھولوں سے زیادہ نیلگوں پتلیوں کو لمبی لمبی پلکوں نے چھپا لیا وہ تکیہ پر سر رکھے ہوئے سو رہی تھی۔ کبھی کبھی گاڑی کی تیز رفتاری کے باعث ہوا کا کوئی جھونکا ڈبہ میں داخل ہو جاتا اور اس کے باریک ریشمیں بالوں کو رخساروں پر منتشر کر دیتا۔ یہ منظر ایسا ہوتا جیسے شام کے وقت آفتاب کو سنہری رنگ کے بادل چھپا لیا کرتے ہیں۔ میں کتاب بھی دیکھ رہا تھا اور خاتون کے اوراق حسن کا مطالعہ بھی کر رہا تھا۔ کتاب زیادہ دلچسپ تھی اس میں متعدد مضامین تھے مجھے ان مضامین سے کیا دلچسپی ہوتی۔ ورق گردانی کے سلسلہ میں ایک نیلے رنگ کا کاغذ کتاب میں سے گر کر میرے کمبل پر آ پڑا۔ میں نے اٹھا کر پھر کتاب میں رکھدینا چاہا لیکن انداز تحریر پہچانا ہوا تھا۔ اگرچہ کسی کا خط بلا اجازت کے پڑھنا اخلاقی جرم ہے مگر بعض اوقات اخلاقی جرائم میں بیحد کشش پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی اخلاقی جرائم کی تہ میں کوئی اخلاقی تعلیم بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ میں نے پڑھنا شروع کر دیا یہ خط حسن و محبت کی تباہ کاریوں سے متعلق تھا لکھنے والے نے اپنے سوز دل کی نمائش کرتے ہوئے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا تھا پڑھتے پڑھتے جب میں کاتب کے نام پر پہنچا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی میں چونک گیا ——— ایک دام میں دو شکار نہیں پھانسے جا سکتے۔ میں نے بلند آواز سے کہا یہ میرے چھوٹے بھائی کا خط تھا جو عربک کالج دہلی میں پڑھتا تھا اسے اس خاتون سے نہایت [illegible] تھی جا بجا جواب کا حوالہ بھی تھا جس سے معلوم ہوتا تھا خاتون بھی اُسے پسند [illegible] ہے اب ایک بڑا اسٹیشن قریب آ گیا تھا۔ میں نے خاتون کو بیدار کر کے کہا میں اجازت چاہتا ہوں

کیوں آپ تو لاہور تک چلنے کا ارادہ کر چکے تھے۔

باقی بر صفحہ ۶۷

عورت کی پیدائش کس طرح ہوئی؟

سرزمین قاف پر پھیلی ہوئی تھی چاندنی
کرۂ ارضی تھا موجودات سے ناآشنا
حسن فطرت نے کی انگڑائی ابھی جاگا نہ تھا
لالۂ خود رو سے تھی رنگیں بیاض کائنات
کرۂ ارضی تھا سرتاپا بہار اندر بہار
حسن کو فطرت نے سانچے میں ابھی ڈھالا نہ تھا
اک فرشتہ دم بخود دریا کنارے تھا کھڑا
ناگہاں چلنے لگی فردوس کی ٹھنڈی ہوا
پھینک دیں طوفان کی لہروں نے منہ سی سیپیاں
ذہن میں خاکا سا اک انگڑائیاں لینے لگا
آب و گل کے ربط سے پیدا کیا اس نے خمیر
ایک جا خوشبو کی لپٹ کو فرشتے نے کیا
موتیوں کی آب سے درج دہن کو بھر دیا
نیلوفر کی نرم و نازک [illegible] ابرو بنیں
حسن کو سانچے میں ڈھالا اور موزوں کر دیا
جب فرشتہ کام سے تخلیق کے فارغ ہوا
کچھ کمی محسوس کی ڈالی جو تنقیدی نظر
وہ فرشتہ دیر تک اس بات کو سوچا کیا
دفعتاً اک بات ایسی ذہن میں پیدا ہوئی
چاند کی پر نور کرنوں کو اکٹھا کر لیا
چاندنی کے نور کو آنکھوں میں اس کی بھر دیا
وہ نظر آتی ہے اکثر خوبصورت رات کو

اٹھ رہی تھیں سینۂ دریا سے موجیں نور کی
تھی مذاق آفرینش کی ابھی تک ابتدا
نور سے لبریز دشت وادیٔ سینا نہ تھا
دامن فطرت میں آسودہ تھے آثار حیات
عرصۂ ہستی میں تھے ناپید لیکن جاندار
کوئی نیچر کے مناظر دیکھنے والا نہ تھا
دلکشا قدرت کے نظاروں میں کچھ کھویا ہوا
یک بہ یک جوش تموج سطح دریا سے اٹھا
تھا فرشتہ دم بخود انگشت حیرت در دہاں
دل میں ذوق آفرینش چٹکیاں لینے لگا
اور مٹی سے کیا تیار عورت کا سریر
خاک کے تودے کا دامن رنگ و بو سے بھر دیا
رنگ گل سے جلوۂ تمکیں کو رنگیں کر دیا
سنبل و ریحان و نسرین و رونق گیسو بنیں
صورت شفاف میں یکسانیت کو بھر دیا
ٹکٹکی باندھے اسے کچھ دیر تک دیکھا کیا
کیمیا میں رہ گئی اک آنچ کی باقی کسر
گاہے گاہے چودھویں کے چاند کو دیکھا کیا
پھر نظر آنے لگا چہرے پہ رنگ تازگی
دفعتہً سارے زمانے میں اندھیرا چھا گیا
روح پھونکی نامکمل کو مکمل کر دیا
صانع قدرت نے کی تخلیق عورت رات کو

مرزا صابر مٹھیانوی

سودا

بنگلہ کا ایک دلچسپ اور پُر لطف مزاحیہ افسانہ

حضرت شیطان کے قلم سے

پارک میں

" ہلو ! "

" کیا مجھے پکارا ؟ "

" میں ..... معاف کیجئے گا۔ غلط فہمی ہوگئی۔ میرے ایک دوست ہیں ؟ ..... ان کی شکل صورت آپ سے ملتی ہے میں نے سمجھا۔"

" خیر کوئی بات نہیں، اچھا تو نمستے ! "

" نمستے ! ذ ..... ذرا سنئے تو "

" ہاں کہئے "

" آپ کسی کالج کے اسٹوڈنٹ معلوم ہوتے ہیں "

" جی "

" میں بھی کالج میں پڑھتی ہوں۔ آپ کو کوئی جلدی تو نہیں ہے ؟ "

" جی نہیں۔ گھومنے ہی نکلا ہوں "

" تو آیئے اس گھاس پر تھوڑی دیر آرام کریں "

" چلئے "

" آپ روزانہ گھومنے آتے ہیں کیا ؟ "

" جی نہیں۔ بھلا اتنا موقع کہاں ؟ "

" آپ کس ایر میں ہیں ؟ "

" میرا بی اے کا فائنل ہے اور آپ کا ؟ "

" میرا ایف اے کا "

" تو آپ کی فیس تو داخل ہوگئی ہوگی آپ امتحان میں شرکت کر رہی ہیں ؟ "

" نہیں، مگر جی چاہتا ہے "

" جی چاہتا ہے ! "

" ہاں ! "

" میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا "

" میں اب تک فیس ہی نہیں داخل کر سکی ہوں "

" شاید آخری تاریخ میں پندرہ روز کا اور اضافہ کر دیا گیا ہے "

" جی۔ کوشش کر رہی ہوں ممکن ہے اس روز تک روپیہ داخل کر دوں "

" آپ کہاں کی رہنے والی ہیں ؟ بنارس کی تو نہیں ؟ "

" جی "

" تو کیا آپ کے گھر والے آپکو خرچ نہیں بھیجتے ؟ "

" جی نہیں۔ گھر والے نہیں بھیجتے۔ میرے ایک چچا ہیں۔ وہی کبھی کبھی کچھ امداد کر دیا کرتے ہیں لیکن ان کی ملازمت بھی معمولی سی ہے۔ اس بار انہوں نے چالیس روپے بھیجے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ باقی کا انتظام تم خود کر لو۔ میرا ٹیوشن وغیرہ سب چھوٹ گیا اور کل ملا کر اسّی روپے مجھے کالج میں داخل کرنے ہیں "

" تو کیا آپ مجھ سے کوئی امداد چاہتی ہیں ؟ "

" اگر آپ ..... "

" دیکھئے میں بھی کوئی بہت بڑا آدمی نہیں ہوں آپ کے اسی شہر میں بہت سے ایسے دانی پڑے ہوئے ہیں جو آپ کی فیس کی ساری رقم ادا کر سکتے ہیں لیکن اس رقم کا دان ہے کر سرمایہ دار طبقہ اپنے کو سرمایہ داری کا بہت بڑا حامی سمجھ لیتا ہے اور اس طرح وہ خود کو اور اس کو دونوں کو دونوں کو دھوکہ دیتا ہے "

" تو آپ کیا چاہتے ہیں ؟ "

" میں پہلے تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ کا ضمیر قبول کرے تو کوشش کر کے ان دانیوں میں سے کسی کے پاس چلی جائیں وہ ضرور آپ کی مدد کرینگے "

" اوّل تو میرا وہاں تک پہنچنا ہی دشوار ہے اور ..... اور بھی بہت سی باتیں ہیں "

" تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں مگر اس کے عوض آپکو بھی میری کچھ مدد کرنی ہوگی "

" فرمایئے "

" میرے ساتھ چلئے "

ریسٹوران میں

" آپ سے ان چند منٹ میں باتیں کر کے مجھے معلوم ہوا کہ آپ کے خیالات کافی بلند ہیں مگر مجھے آپ سے ایسی نفرت انگیز تجویز کی خواب میں بھی امید نہ تھی "

" آپ اسے نفرت انگیز نہیں کہہ سکتیں "

" اچھا نمستے ! "

عدالت میں

" تو آپ یہ قبول کرتی ہیں کہ آپ نے ان سے ۲۵ روپے لئے تھے "

" جی ہاں "

" آپ کو اور کچھ کہنا ہے ؟ "

" جی۔ کہنا یہی ہے کہ اسوقت اپنی فوری

(باقی بر صفحہ ۶۷)

مستی و قلندری

مرزا حاجی لغلول کے قلم سے

تمام دنیا میں ہلاکت و تباہی کا میدان گرم ہے۔ جنگ کا بھوت ہندوستان کے دروازہ پر بھی برہنہ رقص کر رہا ہے لیکن ہمارے رؤسا اور نواب صاحبان پر اس حالت میں بھی مستی و قلندری ہی کا بھوت سوار ہے۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں لاہور کے ڈسٹرکٹ و سیشن جج کی عدالت سے سردار محمد نواز خاں نواب ڈب کلاں کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا ہے۔

حضور والا پر الزام یہ تھا کہ آپ لاہور کی ایک پندرہ سالہ نوجوان طوائف شمشاد بیگم کو جھنگ لے گئے۔ اور وہاں شب کے وقت جب کہ آپ اس کے ساتھ استراحت فرما رہے تھے شراب کے نشے میں اسے ریوالور کا نشانہ بنا دیا۔ عدالت نے حضور والا کو تاحیات کالے پانی کی سزا دی ہے۔ نواب آف ڈب صاحب کو کالے پانی کی سزا ہو یا جلے پانی کی اور تاحیات کی ہو یا تاموت کی۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ ہمارے رؤسا اور نواب صاحبان اپنی حرکتوں سے کبھی باز نہ آئینگے۔ اور اسی طرح عیاشی اور شراب نوشی فرماتے رہینگے۔ اس لئے کہ وہ راجہ، مہاراجہ، نواب اور رئیس ہی کیا جو عیاشی کا دلدادہ اور شراب کا رسیا نہ ہو۔

آپ نے ترقی پسند شاعری کا شور و ہنگامہ تو بہت سنا ہوگا۔ لیکن شاید آپ کو اس کی خبر نہ ہو کہ ترقی پسند شاعری ہوتی کیا چیز ہے۔ اگر آپ کسی ترقی پسند شاعر سے اس کی تعریف پوچھیں تو وہ جواب میں ایک فصیح و بلیغ تقریر کر دیگا۔ مگر آپ کی سمجھ میں خاک نہ آئے گا۔ لیکن چند لفظوں میں آپکو ترقی پسند یا ترقی یافتہ شاعری کا مطلب سمجھائے دیتا ہوں۔ ترقی پسند یا ترقی یافتہ شاعری کے معنی ہیں۔ جو بات بھی آپ کے دل و دماغ میں پیدا ہو۔ خواہ اسکا تعلق سات پردوں کے اندر ہی سے کیوں نہ ہو آپ اسے انتہائی بیباکی، عریانی اور بے شرمی کے ساتھ نظم کر دیجئے۔ مثلاً ؎

وہ شوخ میری شبستاں میں رات آئی تھی
نشاط و عیش کی اک خلد سی سجائی تھی
وہ سو رہی تھی مرے عنبریں سے بستر پر
مہک سے جس کی گلوں کو بھی نیند آئی تھی
وہ زلف کھیل رہی تھی مرے تنفس سے
جو میرے مرمریں سینے پہ جھوم آئی تھی

اگر یہ مثال ناکافی ہو تو ایک اور مثال لیجئے۔ ایک ترقی پسند شاعر جو نوجوان بھی ہیں، فرماتے ہیں ؎

"سنتا ہوں میری بہنوں کی
وہ ایک حسین سہیلی ہے
ہر روز جب ان سے ملنے کو
وہ راج نگر میں آتی ہے
کیا بات ہے میرے سینے میں
اک درد سا ہونے لگتا ہے
میں اپنے کمرے سے چھپ کر
کیوں اس کو دیکھنے لگتا ہوں
اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے
جس کمرے میں وہ بہنوں سے
کچھ باتیں کرتی ہوتی ہے
میں سوچ کے دل میں بات کوئی
اس کمرے میں آجاتا ہوں
سینے کو بالکل تانے ہوئے
جیسے کہ اس کے آنے کی
بھی مجھ کو نہ مطلق کوئی خبر
اور دیکھ کر اس کو فوراً ہی
افسوس کے لفظوں کے ہمراہ
میں لوٹ آتا ہوں کمرے میں
کیوں جانے ایسا کرتا ہوں
آغاز محبت میں اکثر
کہتے ہیں ہو ہی جاتا ہے"

کہئے آپ اب بھی سمجھے یا نہیں کہ ترقی یافتہ شاعری کسے کہتے ہیں؟ اپنے گھر آنے والی اپنی بہنوں کی سہیلی کو چھپ چھپ کر دیکھنا اور جب اس سے سیری نہ ہو تو بے اختیار بہنوں کے کمرے میں گھس جانا اور ان حیا سوز حرکتوں کو چھپانے کی بجائے نظم کرکے رسائل میں شائع کرا دینا۔ ترقی یافتہ شاعری کا ایک ترقی یافتہ نمونہ ہے۔ سمجھا آپ نے؟

دور جدید کے کچھ اشعار بھی ملاحظہ فرمالیجئے

یہ تکلم یہ حسین خاموشیاں
یہ محبت سے بھری سرگوشیاں
یہ نگاہ مست کی مدہوشیاں
ان سے پھر آنکھوں کو ترساؤ گی کیا؟
جاؤ گی سچ مچ چلی جاؤ گی کیا؟
چاہنے والوں سے ہو تم سرگراں
کیا دکھانے کو ہے دور آسماں
گلشن امید اور نذر خزاں
میرے ارمانوں کو ٹھکراؤ گی کیا؟
جاؤ گی سچ مچ چلی جاؤ گی کیا؟
رات دن آنسو بہینگے ہجر میں
بے اثر نالے رہینگے ہجر میں
کس سے حال دل کہینگے ہجر میں
رحم مجھ پر تم نہ اب کھاؤ گی کیا؟
جاؤ گی سچ مچ چلی جاؤ گی کیا؟

ان شاعرن صاحبہ کے ادب جدید کا نمونہ ملاحظہ کرنے کے بعد ایک شاعر صاحب کی نظم کا ایک ٹکڑا بھی ملاحظہ کر لیجیے۔

تم نے تو کہا تھا آؤنگی — ہاں تم نے کہا تھا آؤنگی
جب رنگ سحر کا ہلکا تھا — جب چاند کا ساغر چھلکا تھا
جب تارے لیے تھی انگڑائی — اور نور کا آنچل ڈھلکا تھا
اے جان وفا ایمان وفا — کچھ یاد ہے وہ پیمان وفا
تم نے تو کہا تھا آؤنگی — ہاں تم نے کہا تھا آؤنگی

غرض ترقی یافتہ اور جدید شاعری کے معنی ان ہی "سچ مچ چلی جاؤ گی کیا؟" اور "تم نے تو کہا تھا آؤں گی" وغیرہ کے ہیں جن میں معاملات تو ہوتے ہیں اس وقت کے جب تارے انگڑائی لیتے ہیں اور چاند کا ساغر چھلکتا ہے مگر وہ چھپوائے جاتے ہیں رسائل و جرائد میں۔

قدرت نے انسان کی ذات میں مستی کا جو جذبہ ودیعت کیا ہے وہ موقع اور بے موقع سر اٹھاتا ہے اور اپنا رنگ لائے بغیر نہیں رہتا۔ آجکل دنیا میں بازار جدال و قتال گرم ہے مگر دیو مستی اپنی کرشمہ سازیوں میں مصروف ہے۔ مانچسٹر کی عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں ایک خاوند نے اپنی بیوی کے خلاف یہ گھناؤنا الزام عائد کیا کہ اس نے اپنے پہلے خاوند سے طلاق لے کر در پردہ اس سے ناجائز تعلق قائم رکھا۔ ایک مکان میں اس وقت جبکہ میں ڈیوٹی پر جاتا تھا، بے غل و غش گلچھرے اڑاتی رہی۔ اور میری کمائی کا زیادہ تر حصہ اس شخص کی آسائش کے نذر کرتی رہی۔ مجھے اس سے طلاق دلائی جائے۔ عدالت میں کئی گواہوں نے چشم دید حالات عورت اور اس کے آشنا کی مستی کے بیان کئے جن سے ثابت ہو گیا کہ دونوں نہایت بیباکانہ اور شرم و حیا سے بے نیاز طریقہ میں عشقبازی کرتے رہے۔ عدالت نے مدعی کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے عورت اور اس کے منظور نظر کو سزائے قید دیدی۔ اب دونوں کی مستی کے ایام جیل میں ایام مصیبت بن کر گذرینگے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قید سے فارغ ہو کر دونوں کیا وطیرہ اختیار کرتے ہیں

امریکہ کے شہر مونٹریل میں ایک بڑھی عورت نے جو بظاہر بڑی پاکباز تھی دلالہ کا پیشہ اختیار کیا۔ اس نے اپنے مکان میں چند بدچلن جوان عورتیں رکھیں بہت سے مرد اس کے یہاں جاتے تھے جن کی جیبیں وہ خالی کرا لیتی تھی۔ شراب کباب اور فواکہات پر روپیہ بے دریغ خرچ کرایا جاتا تھا۔ بعض کو تو یہاں تک مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے کپڑے تک بیچ باچ کر کے اس دلالہ کی نذر کر دیتے تھے۔ وہ پولیس سے ساز باز رکھتی تھی۔ اس لئے جو لوگ شکایت لے کر پولیس کا آسرا لیتے تھے۔ ان کی دادرسی کی جگہ ان کو دھتکار بتائی جاتی تھی۔ بلکہ بعض کی تو خوب گت بنائی جاتی تھی۔ اس لئے مدتوں یہ دلالہ من مانی کارروائی کرتی اور اوباش لوگوں کو لوٹتی رہی۔ آخر کار قدرت نے اس سے انتقام لینے کا قصد کیا۔ اس کے مکان میں اس کی ایک داشتہ قتل کی گئی۔ پولیس نے واقعہ پر پردہ ڈالنے کی بے حد کوشش کی لیکن حاکم شہر بڑا بیدار مغز اور انصاف پرور تھا۔ اس نے خود تحقیقات کی تو روح فرسا واقعات کا سلسلہ ہاتھ آگیا۔ پتہ لگا کہ مکان میں کئی لوگوں کی زندگیوں کو زہر دیکر حوالہ اجل کیا گیا۔ اور ان کی لاشیں ایسے طریقہ سے ٹھکانے لگائی گئیں کہ کسی کو کوئی شبہ نہ ہو سکا۔ عدالت نے فیصلہ صادر کیا کہ قحبہ خانہ بند، دلالہ زمانہ جنگ میں نظر بند، اور جو عورتیں اس کے زیر سایہ مستی کے جوہر دکھاتی اور لوگوں کو لوٹ کھسوٹ کرتی بلکہ بعض کی جانوں پر ڈاکہ ڈالتی رہیں، کو ملک بدر نیز ان کو سرزمین امریکہ میں جو آزادی کا ملک ہے کبھی دوبارہ واپس آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ ہے انجام مستی جس نے قلندری کے نام کو بٹہ لگا دیا۔

آپ نے شادیوں کے بہت سے واقعات سنے ہونگے اور ان کے اثرات و نتائج بھی معلوم ہوئے ہونگے۔ ایک شادی کا واقعہ مجھ سے بھی سن لیجیے جو اپنے اندر بعض

(باقی بر صفحہ ۶۷)

پارو

سو فیصدی سچا افسانہ

رومانی سندیلوی کے قلم سے

(۱)

چھ سال کی طویل مدت کے بعد جب میں وطن میں آیا تو ہر چیز میں کچھ تغیر سا محسوس کیا۔ شکستہ مکانات شکستہ تر ہو گئے تھے جن کو بچہ چھوڑ کر گیا تھا وہ جوان بن چکے تھے اور جوان ادھیڑ ہو چلے تھے۔ پھر بھی در و دیوار سے ہوئے اُنس آتی تھی۔ گیارو حلوائی اور محمد و کباب بیچنے کی دکانیں بدستور اپنی جگہ پر تھیں۔ نائیں (نائنیں) اور گدنیں اپنی قدیم طرز و رنگ کی پوشاک میں گردش زمانہ پر تمسخر کر رہی تھیں میرے مکان کی پشت پر گنگو تیلی کا مکان موجود تھا جو غریب حدف۔ اس جرم پر ہماری رعایا کہلاتا تھا کہ اس نے ہمارے بزرگوں کی زمین پر اپنا کچا مکان بنا رکھا تھا۔

(۲)

صبح کو میں چبوترہ پر بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا اور سامنے کوئیں پر بے شمار غریب لڑکیاں اور عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ تعجب یہ ہے کہ پانی بھرنے والوں میں مردوں کی تعداد بہت ہی کم تھی حالانکہ قدرتاً یہ کام صرف مردوں کے لئے ہے میں مردوں کی اس بے انصافی پر متاسف و متالم ہو کر نازک اندا موں کی تکلیف مشقت کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ میری نظر ایک بوٹے سے قد والی گداز لڑکی پر پڑی جس کی عمر تیرہ اور چودہ سال کے درمیان ہوگی۔ بچپن کی شوخی اور شباب کی حیا بزبان حال اس امر کا اظہار کر رہی تھی کہ طفلی جوانی سے ہمکنار ہے۔ بار بار سمٹتے ہوئے آنچل سے نوخیز غنچوں کی پردہ داری کرتی۔ اس کا جمال الٰہی "صرف نظر" نہ ہوا تھا۔ باعتبار عمر اس کی کشش اس بلا کی تھی جس نے میرے نفس کو دعوت شوق دے رکھی تھی میرا بند بند شدت احساس سے مرتعش تھا۔ گھبرا گھبرا کر اس نے نظر جو پھیری تو مجھکو ایسا معلوم ہوا کہ دو بجلیاں اچانک ساتھ ساتھ کوند گئیں۔ جلدی سے نظر ہٹا کر اس نے دو۔ ایک گھڑا بھی بھرا اور ایک سر پر اور دوسرا کمر پر رکھ کر جب چلنے لگی تو ہمیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ رقص کی دیوی ساتھ ساتھ اس کے کولھوں کی بلائیں لیتی چلی جا رہی ہیں۔

(۳)

وہ روز صبح و شام آتی۔ پانی بھرتی اور چلی جاتی۔ میرا بھی یہ معمول ہو گیا کہ میں دونوں وقت کتاب ہاتھ میں لے کر گھنٹوں چبوترہ پر بیٹھا رہتا۔ لیکن اب اس کے انداز بے نیاز شعور نہ تھے۔ آنچل جو پہلے صرف سینہ پر پڑا رہتا تھا اب سر کو ڈھانکنے کا بھی فرض ناگوار ادا کرتا۔ چال میں بجائے مستی کے احتیاط شامل ہو گئی۔ سب سے بڑھ کر محتاط نظریں تھیں جو میری جانب آنے سے پہلے ادھر ادھر ضرور ہو آتی تھیں۔ اب وہ خندۂ بے دریغ تھا نہ چشمک بے حجاب۔ مجھ کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ کسی طرح اس کا پتہ لگاؤں کہ آخر یہ ہے کون؟ مگر مشکل یہ تھی کہ پوچھوں کس سے۔ جس سے پوچھا جاتا اس کا خیال میری طرف سے کیا ہوگا۔ اگر اس خیال سے اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہوں کہ دیکھوں یہ جاتی کہاں ہے تو خود اس کے دل میں میرے لئے کیا خیال آئے گا۔ دن رات اسی ادھیڑ بن میں رہتا۔ بہرحال اتنا تو میں دیکھتا تھا کہ وہ میرے مکان کی پشت کی جانب جا کر جلد پلٹ آتی ہے۔ کیا وہ گنگو تیلی کی لڑکی پارو ہے جس کو میں نے چھ سال پہلے دیکھا تھا میلی کچیلی، ناک بہتی ہوئی، دبلی پتلی، نہیں نہیں یہ پارو نہیں ہو سکتی۔ میری تعطیلیں ختم کے قریب تھیں مگر میرے دل میں یہ خواہش گدگدی سی پیدا کئے ہوئے تھی کہ یہاں اس لڑکی کا نام و نشان معلوم کر لوں۔ یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ اتنے دنوں میں کسی نے میرے سامنے اس کا نام لیکر پکارا تھا۔

(۴)

کئی روز ہوگئے مگر وہ نامعلوم لڑکی کنوئیں پر نہ آئی۔ مجھے تشویش سی پیدا ہو گئی مگر اب ایک اور عورت پانی بھرنے آنے لگی تھی جس کو میں نے اس سے قبل کنوئیں پر نہیں دیکھا تھا یہ سوچ ہی رہا

گنگوا تیلی کی عورت سندر تھی۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ یہ کہیں پارو کے عوض تو پانی بھرنے کا کام انجام نہیں دے رہی ہے۔ اب یہ فکر ہوئی کہ آخر پارو کو ہوا کیا۔ جو وہ آنہ سکی۔ گھنٹوں میں اس کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ اور اس کے تناسب اعضا، شاداب چہرہ اور روشن آنکھوں کے تصور میں گم رہتا۔ اسی عالم خیال میں کبھی اس کے لانبے لانبے بالوں سے کھیلتا، کبھی گلابی رخساروں کو چھوتا اور کبھی مرمریں بازوؤں کو چھیڑتا وہ روٹھ جاتی تو منانے لگتا۔ اتفاقاً ایک شام کو جب اندھیرا چھا چلا تھا تو میں ہو کر اٹھا ہی تھا کہ وہ سوپ ہاتھ میں لئے برابر سے گذری مگر چہرہ کا رنگ کچھ زرد زرد اور آنکھیں اُداس سی۔ نگاہوں کا چار ہونا تھا کہ میرے دل کی دھڑکن اور تنفس کی تیزی یکایک بڑھ گئی۔ منتشر حواس کو سنبھالتے ہوئے بڑی ہمت کر کے میں نے پوچھا: ”کیسی ہو پارو؟“ — وہ حیرت زدہ نظروں سے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کچھ سکلاتے ہوئے ”اب تو اچھی ہوں چاچا“ کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں سناٹے میں آگیا: ”چاچا، چاچا، چاچا“ یہ لفظ کئی مرتبہ میرے کانوں میں گونجا۔ عصائے معصومیت نے افعیٔ نفس کا سر کچل دیا تھا۔

میں ان کو بیوی کی حیثیت سے ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ میں نے تو صرف سودا کیا تھا۔ اور اس کی قیمت میں ایک بار ادا کر چکا ہوں“

”میں مقدمہ خارج کرتا ہوں“

”شکریہ!“

سودا ——— بقیہ صفحہ ۶۳

اور لازمی ضرورت کے ساتھ ساتھ مجھے ان کے اعلیٰ خیالات اور صاف گوئی پر کامل اعتماد تھا۔ میں پہلی ہی ملاقات میں ان کی طرف کچھ مائل بھی ہو گئی۔ پہلی بار جب اُنہوں نے میرے سامنے تجویز پیش کی تو مجھے ایک سخت صدمہ ہوا۔ مگر انکو بھول نہیں سکی۔ اور آخر میں جب کہیں انتظام نہیں ہو سکا تو میں پھر ان کے ہاں گئی کہ شاید ان کو میری حالت پر رحم آ جائے مگر یہ پہاڑ کی طرح اٹل رہے۔ تب میں....

میں نے ان کی تجویز منظور کر لی۔ مجھے ہمیشہ اس بات کی امید تھی کہ اگر میں استدعا کروں گی تو مجھے یہ ضرور اپنا شریک زندگی بنالینگے میں ایک قدم اور بھی آگے بڑھ گئی لیکن میں نے یہ سب اسی بنیاد پر اسی خیال سے کیا کہ یہ میری کشتی ضرور پار لگائیں گے میں اسکے بعد ان سے برابر ملتی بھی رہی“

”آپ ان باتوں کو قبول کرتے ہیں؟“

”جی ہاں!“

”اچھا پھر؟“

”پھر میں امتحان کی تیاری میں مشغول ہو گئی ایک ہفتہ تک ان سے مل نہیں سکی پھر انہوں نے یکایک اپنا مکان تبدیل کر دیا اور اس کے بعد آج ملاقات ہوئی ہے یہ بچہ ان کا ہے اور میں نے اسی امید پر دُنیا کی تمام طاقتوں کا مقابلہ کر کے اسے تمام مصیبتوں سے محفوظ رکھا“

”ان دنوں آپ نے کبھی ان کے سامنے شادی کی تجویز بھی پیش کی تھی؟“

”جی نہیں“

”آپ کو کچھ کہنا ہے؟“

”جی میں تو پہلے ہی سب کچھ کہہ چکا ہوں“

مستی و قلندری بقیہ صفحہ ۶۵

خصوصیات رکھتا ہے۔

پولینڈ کے ایک بزرگوار نے جن کا سن شریف نہ بیس کا، نہ تیس کا، نہ چالیس یا پچاس کا پورے ایک سو پانچسال کا تھا پانچ کم سو برس کی ایک دوشیزہ سے شادی رچائی اور قدرت کی مستی و قلندری ملاحظہ فرمائیے کہ یہ نو خیز جوڑا ۱۴ سال تک لطف ازدواج سے بہرہ ور رہا اور اس درمیان میں تین اولادیں بھی حوادث پذیر ہوئیں۔

حوادث پذیر کے لفظ پر آپ چونکیں نہیں۔ حوادث پذیر اس لئے کہ ان تینوں معصوموں کے بال سفید، کھال شکن آلود کمریں خمیدہ ہیں۔ ان پیدائشی بوڑھوں کو جوانی کے دن نصیب ہی نہ ہوئے کمر میں طاقت ہو یا نہ ہو مگر بعض ہندوستانی پیسے والے بھی دولت کے زور پر شادیاں کر ڈالتے ہیں۔ ان کو قدرت کی اس تنبیہ سے ہوشیار ہو جانا چاہئے۔

مسافر کا شب نامچہ بقیہ صفحہ ۵۹

اب اس عزم کو توڑ دینا پڑا۔

کس وجہ سے؟

کیا بتاؤں کس وجہ سے؟

آخر

بس بغیر کسی وجہ سے فسخ عزیمت کرنا پڑی یہ کہکر میں گاڑی سے اتر پڑا وہ اب اس کی مسکراہٹ میں میرے لئے کوئی کشش نہ تھی۔ یہ برق تبسم جن خرمن کو جلا چکی تھی میں اس کی فکر میں مبتلا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد مجھے بمبئی پہنچکر اپنے بھائی کے خط سے معلوم ہوا کہ اس نے ایک تعلیم یافتہ اور حسین دوشیزہ سے شادی کر لی ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا وہ حسین دوشیزہ کون ہو سکتی ہے۔

اشتہاری طلاؤں سے بچو!

نسخہ طلائے مردمی شائع ہو گیا

ناظرین! اس طلاء نے صدہا نہیں بلکہ ہزاروں مریضوں کی زندگی بدل دی۔ اور ہزاروں کو بامراد و کامیاب بنا دیا۔ طلاء مردمی رجسٹرڈ عرصہ بیس سال سے چلک رہی ہے جس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ زندگی کی صفت اور بعد ازاں کا سکہ جما کر شہرت اور قبولیت کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ اور نہایت مجرب و ریا ثابت ہو رہا ہے ہم نے پبلک کی تکلیف کا خیال کر کے عام مخلوق خدا کی ہمدردی اور اشتہاری دوائیوں کی شکایت کا خیال کرتے ہوئے عام انسانوں کیلئے مجرب اور شرطیہ طلاء لاجواب ہٹ کے شائع کر دیا ہے۔ اور جو عضو مخصوص (اندری) کی تمام خرابیوں کیلئے بیحد مفید ہے۔ اور عضو مخصوص کی سستی کمزوری ٹیڑھا پن چھوٹا پن ٹیڑھا پن جھکاؤ نیلی رگوں کا ابھر آنا جو کثرت مباشرت انغلام اور جلق وغیرہ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور جملہ تمام امراض کیلئے حیرت انگیز طور پر مفید ثابت ہو چکا ہے۔ تمام شکایتوں کو رفع اسکے طوالت فربہی اور تحریک قوت پیدا کرنے میں لاثانی ہے۔ ز دا اثر اسقدر ہے کہ اول مرتبہ کے لگانے سے نصف گھنٹہ میں نمایاں محسوس ہوتا ہے۔ ہزارہا لوگوں کی زندگی جو بے لطف تھی۔ اس نے عشق راحت کامیابی اور کامرانی لیتا بسر کرا دی جو کہ دعائیں دیتے ہیں۔ اور شکریہ کے خطوط لکھتے نہیں تھکتے۔ اسلئے اسکے استعمال سے اس کا جوہر معلوم ہو سکتا ہے۔ شوق سے اسکو تیار کریں۔ اور دعائے خیر سے ناچیز کو یاد کریں۔ اگر کسی صاحب کو ضرورت نہ ہو۔ تو اپنے دوستوں اور عزیزوں کو یہ نسخہ ملاحظہ فرما کر طلاء بنانے کی سفارش کریں۔ یہ ردی کی ٹوکری میں نہ پھینکا جائے۔ بلکہ بہت حفاظت سے رکھا جائے۔ کیونکہ یہ نسخہ بار بار شائع نہ ہوگا۔

نسخہ حسب ذیل ہے مغز پستہ ایک تولہ مغز اخروٹ ایک تولہ مغز بادام ایک تولہ مغز چلغوزہ ایک تولہ سفید کنیر کی جڑ ایک تولہ کائیفل ایک تولہ لونگ ایک تولہ جائفل ایک تولہ بیربہوٹی چھ ماشہ ریگماہی ایک تولہ مالکنگنی ایک تولہ سفید چرمٹی ایک تولہ ڈھاک کے بیج تولہ سم اسپ ۱ تولہ عقر قرحا تولہ جلوتری ایک تولہ دارچینی ایک تولہ اونٹ کٹارے کی جڑ ایک تولہ کچلہ چھ ماشہ تخم پیاز ایک تولہ زعفران چھ ماشہ سونف چھ ماشہ کیچوے خشک چھ ماشہ کستوری ۲ ماشہ اندری ریچھ چھ ماشہ چربی چیتا ۵ تولہ چربی شیرہ تولہ چربی سانڈہ ۵ تولہ تیل چنبیلی ۵ تولہ سم الفار سفید چھ ماشہ آئل سنامن cinnomon oil ۵ تولہ آئل کلو ومنٹ oil ۵ تولہ مندرجہ بالا خشک ادویہ کو پیس کر چربی اور تیل ملا لیں پھر کسی کھرل میں ڈال کر ۴۸ گھنٹہ گھوٹ کر بڑی آتشی شیشی میں بھر کر رکھ دیں۔ پاتال جنتر کی ترکیب سے تیل نکالیں۔ اور شیشی میں بھر کر کارک لگا دیں حسب ضرورت کو سوتے وقت مالش کریں۔ انشاء اللہ ایک ہفتہ کے استعمال سے وہ قوت پیدا ہو گی۔ جو زندگی قائم رہیگی۔ اور تمام نقائص عضو مخصوص کے رفع ہو جائینگے۔ لطف یہ کہ اس طلاء سے آبلہ نہیں پڑتا۔ اور نہ کوئی تکلیف ہی ہوتی ہے۔ نازک حضرات اسکا استعمال کرتے ہیں ہر موسم میں یکساں مفید ہے۔ اگر کوئی صاحب بوجہ وقت یا شرمندگی سے خود تیار نہ کر سکیں تو ہمارے دواخانہ سے طلاء مردمی جو مریضوں کیلئے ہر وقت تیار رہتا ہے جسکی قیمت فی شیشی تین روپے آٹھ آنہ معہ محصولڈاک ہے۔ (منی آرڈر فیس آنہ) طلب کریں۔ ایک شیشی ایک مریض کیلئے کافی ہوتی ہے خود ہی تیار کرنا چاہیں۔ اور کسی دوا کے نہ ملنے سے مجبور ہو جائیں۔ تو وہ بھی طلب کریں غرضیکہ ہمکو دھوکہ باز اشتہاروں سے بچانا مقصود ہے جس طرح سے چاہیں۔ اس نسخہ کا تجربہ کریں۔ اور اگر جریان و قوت باہ کی شکایت ہو۔ تو ہمارے ارادہ بھی نسخہ اکسیر جریان یا دوا دیسی سنجیون ست رجسٹرڈ جو کہ بیس سال سے مجرب مشہور ہے جسکے استعمال سے بلا مبالغہ بیس بیس سال کے لاعلاج مریض جو برسوں تک حکیموں اور ڈاکٹروں کے زیر علاج رہ کر دولت کو برباد کر کے مایوس ہو چکے تھے۔ آج وہ سب صاحب اولاد ہیں۔ جسکی قیمت اکیس روزہ خوراک کی مبلغ دو روپے دس آنے (۲/۱۰) معہ محصولڈاک ہے۔ (منی آرڈر فیس دو آنہ) طلب کریں۔ جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ اور پتہ خوشخط تحریر کریں۔ ورنہ تعمیل جواب نہ ہو گی۔ تاکید ہے۔ (جملہ خط و کتابت کا پتہ:-)

خادم ویدرتن ستیہ دیو جی پروپرائٹر وپ بلاس کمپنی نمبر ۲۴ کانپور

جنوں کے کرشمے

میری زندگی کا سب سے عجیب واقعہ

عقلِ انسانی کو دنگ کر دینے والے بھوتوں کے سچے واقعات

جادو نگار مسٹر محمد رحیم دہلوی جرنلسٹ

جنوں اور بھوتوں کے متعلق اس سوال پر کافی بحث و تمحیص ہوتی رہی ہے کہ انہیں محض کہانیوں اور افسانوں میں رومان اور سنسنی پیدا کرنے کیلئے اختراع کیا گیا ہے۔ یا درحقیقت ان کی کچھ اصلیت بھی ہے۔ بہت سے لوگ جنوں کے وجود کے بے طرح قائل ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو جن بھوتوں کا نام سُنکر حقارت سے زیرلب مسکرا دیتے ہیں جو حضرات اس عجیب مخلوق کے عجیب وجود کو تسلیم کرتے ہیں وہ اپنے بیان کی تائید میں بہت سے محیر العقول واقعات پیش کرتے ہیں۔ پھر ان کے علاوہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کی لاتعداد کتابیں بھی دنیا کی اس عجیب مخلوق کے حیران کن کارناموں سے لبریز ہیں۔ لیکن دوسرا طبقہ بیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں ہر چیز کو سائنس کے اصولوں پر جانچتا ہے اور ہر ایسے عجیب واقعہ کو جسے عقل مشکل سے تسلیم کرے پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے یا اگر بمشکل تسلیم بھی کرتا ہے تو اس حیرت انگیز واقعہ میں سائنس کی کارفرمائی کا یقین کرلیتا ہے۔

مجھے خود بھی اس نادیدہ مخلوق کے وجود کو تسلیم کرنے میں پس و پیش تھا لیکن چند ایسے عجیب واقعات پیش آئے جن کے سبب یہ تسلیم کرلینا پڑا کہ اس دنیا میں جہاں لاتعداد انسان اور حیوان بستے ہیں۔ وہیں اس عجیب غریب مخلوق بھی موجود ہے جس کا نام سنکر نہ صرف بچوں اور عورتوں کا دل دہل جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اچھے اچھے بہادر مردوں کا پتہ بھی پانی ہو جاتا ہے۔

کئی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ عقل کو حیران کر دینے والے ان واقعات کو ہو بہو شائع کردوں لیکن پھر یہ سوچکر کہ دور جدید کے تعلیم یافتہ طبقے کے کتنے آدمی اس بیان کو صحیح سمجھیں گے۔ مجھے ان ہوشربا واقعات کی اشاعت میں تامل تھا۔ لیکن شیکسپیئر کے اس قول کی موجودگی میں کہ "اس دنیا کے اندر بے شمار ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن کا حال نہ کسی فلسفی کو معلوم ہے نہ کسی سائنسدان کو ان کا علم ہے۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان پُراسرار اور ناقابل فہم واقعات کو مست قلندر میں شائع کرادوں۔

(۱)

دہلی کی جامع مسجد جس طرح دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے اسی طرح شام کو وہاں جو پُربہار بازار لگتا ہے اس کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ دنیا اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ دور گزشتہ کے ایک مشہور شاعر کے متعلق مشہور ہے کہ حیدرآباد سے ان کا بلاوا آیا۔ دہلی میں پریشان حال تھے۔ بوریا بستر باندھ کر تیار ہو گئے قافلہ شہر سے باہر نکلا تو شاعر نے پوچھا وہاں جامع مسجد بھی ہے؟ اس نے کہا جناب ایسی تو نہیں ہے۔ پھر پوچھا۔ اچھا شام کو وہاں بھی اسی طرح چوک لگتا ہے؟ کہا بھلا یہ بات کہاں۔ گاڑی سے جھٹ اتر کر کہنے لگے۔ اگر تمہارا شہر ایسا ہی ہے تو اسے دور ہی سے سلام ہے۔ مجھ سے تو دلی نہیں چھوڑی جاتی۔

شاعر نے چوک کی جس چھیل چھبیل پر نوکری کو آگ لگادی اور اشرفیوں کی پرواہ نہیں کی وہ کسقدر پُررونق منظر ہوگا ظاہر ہے۔ دنیا بدل گئی۔ چوک کا نقشہ بھی پلٹ گیا۔ اب مرغ اور بٹیر لڑانے والے کہاں سے آئیں اور کبوتروں کو کون شوقین خرید کر پالے لیکن چوک کے میلے میں کوئی خامی پیدا نہیں ہوئی۔ تمدن پلٹ گیا۔ پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزیں بکنے لگیں مگر لوگوں کا جمگھٹ اسی طرح قائم رہا۔ شام کو آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ اسقدر ہوتی ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ کباب اور بالائی کی برف وہاں کی خاص نعمتوں میں شمار

ہوتی ہیں۔ اور سقے مشکوں میں پانی بھرے جس وقت پیتل کے کٹورے بجاتے ہیں تو موسیقیت ان پر قربان ہو جاتی ہے۔
اسی پُر رونق چوک کے متعلق ہمارے محلے کے کچھ قدیم باشندوں میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ آدھی رات کو جب ساری دُنیا سوتی ہے اور ہُو کا عالم ہوتا ہے وہاں جنوں کا میلہ لگتا ہے۔ پھول بیچنے والے خوش الحانی سے آوازیں لگا لگا کر پھول بیچتے ہیں اور سقے کٹوروں کی دلکش جھنکار کے ساتھ ٹھنڈا پانی پلایا کرتے ہیں۔ لیکن جب بھولے بھٹکے بے خبر راہگیر ان جنوں سے پانی لیکر پینے کیلئے کٹوری سے منہ لگاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں پانی کی بجائے خون ہے۔
میرا مکان جامع مسجد سے بہت تھوڑے فاصلہ پر شاہی میگزین کے قریب محلہ چوڑی والاں میں واقع ہے۔ جامع مسجد کی صبح کی اذان کی آواز میرے گھر کے بالائی حصہ میں صاف سنی جاتی ہے۔ رات کے سناٹوں میں سقوں کی آوازیں اور گلفروشوں کی صدائیں میں نے ایک دو مرتبہ نہیں اکثر سُنی تھیں۔ لیکن دور جدید کا ایک جنٹلمین یہ کس طرح باور کرتا کہ وہ انسانوں کی بجائے جنوں کی آوازیں ہو سکتی ہیں پرانے لوگوں میں جو کچھ بھی مشہور ہو بہر حال آجکل کے لوگ ان باتوں کو ڈھکوسلہ ہی سمجھتے ہیں
پچھلے گرما کی ایک رات کا ذکر ہے۔ کہ رات میں سینما دیکھنے نیو رائل تھیٹر میں گیا تھا۔ رات لمبی تھی کھیل ختم ہوا تو ڈیڑھ بج چکا تھا۔ چوک کے قریب پہونچا تو بلا کا سناٹا تھا۔ سڑکیں اور بیرونی میدان بالکل سنسان تھے۔ زیادہ دیر ہو جانے کے سبب میں جلد گھر پہنچنے کے خیال سے تیز قدم چل رہا تھا۔ لیکن جب اپنے محلہ میں پہنچکر میں نے گلی میں مڑنا چاہا تو ناگاہ کانوں میں کٹوروں کی ترنم خیزیوں کے ساتھ ساتھ "ٹھنڈا پانی" کی صدا آئی اس طرح جیسے کئی سقے رسیلی آواز سے صدا لگا رہے ہوں۔ اسی طرح پھول والے "چنبیلی کی بہار ہے" کو نہایت دلکشی سے ادا کر رہے تھے۔ اور شور و غل کی ایک ایسی مدھم سی بھنبھناہٹ مسلسل سنائی دیتی تھی۔ جیسے کسی ہجوم کے ہنگامے کو کہیں دور سے سُنا جائے۔
پرانے لوگ کہتے تھے کہ وہ آوازیں جنوں کی صدائیں ہوتی ہیں لیکن میری عقل اس کو باور کرنے کیلئے کسی طرح بھی تیار نہ تھی اور پھر چند سیکنڈ قبل میں خود اس جگہ سے گذر کر آیا تھا اور میں نے بچشم خود دیکھا تھا کہ وہاں ہُو کا عالم تھا۔ لیکن عقل کچھ بھی کہتی ہو۔ کان وہ پُراسرار آوازیں صاف سُن رہے تھے۔ میری تیز رفتاری قائم نہ رہی۔ میں رُک گیا۔ تاکہ آوازوں کو اور زیادہ صاف سن سکوں اور کوئی شبہ باقی نہ رہے لیکن آپ میری حیرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ سماعت کا کوئی دھوکہ نہ تھا۔ تمام آوازیں صاف اور بالکل واضح تھیں۔
یکایک ایک خیال آیا۔ وہ دیوالی کے جلوس کی آخری رات تھی اس کی سواری جامع مسجد کی پشت پر چاوڑی بازار میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ دلی کا یہ جلوس بھی اپنی آن بان کا نرالا جلوس ہوتا ہے اور غالباً اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ ایسا شاندار اور عظیم الشان جلوس دلی کے سوا کہیں نہیں نکلتا۔ خیال ہوا۔ اتنے بڑے جلوس کے ساتھ پانی پلانے والے اور پھول بیچنے والے ہوتے ہی ہیں۔ یقیناً یہ اُسی جلوس کی آوازیں ہیں۔
لیکن دوسرے ہی لمحہ ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوا۔ کہ دیوالی کے جلوس ہر مہینے نہیں نکلا کرتے۔ حالانکہ یہ آوازیں عموماً سنائی دیتی ہیں۔ لیکن پھر اس ایک نئے خیال نے فوراً ہی اس اعتراض کو رد کر دیا کہ چاوڑی بازار میں جو حسن فروشی کا بازار ہے اور جہاں رات کو دن سے زیادہ چہل پہل رہتی ہے۔ ممکن ہے روزانہ ہی سقے پانی پلایا کرتے اور پھول بیچنے والے پھولوں کے ہاروں سے مصنوعی حسن کو چمکایا کرتے ہوں۔
مذکورہ دلیل خود میرے اپنے خیال میں اسقدر معقول تھی کہ میں بے اختیار مسکرا دیا۔ یہ ہنسی تھی ان لوگوں پر جنہوں نے ایسے بے سر و پا قصے گھڑے تھے (اب کچھ عرصہ سے اس بازار کی راتیں سنسان ہو گئی ہیں اور حسن فروشی کا اڈہ وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے) گھر جانے کی بجائے اپنی آنکھوں سے وہ عجیب سماں دیکھنے اور بالکل ملنے سے وہ دلکش صدائیں سننے کیلئے میں واپس مڑا۔ میں چاہتا تھا۔ خود جاکر دیوالی کا جلوس دیکھوں جو یقیناً اس وقت چاوڑی بازار سے گذر رہا ہوگا۔ مقصد یہ تھا کہ کل ان پر خوب ہنس سکوں جو ہر بات میں رومان پیدا کرنے کے عادی ہیں۔
انتہائی تیزی کے ساتھ میں چاوڑی بازار پہنچا۔ یہ مختصر فاصلہ طے کرنے میں زیادہ سے زیادہ دو تین منٹ صرف ہوئے ہونگے لیکن میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جبکہ

وہاں کوئی جلوس نہیں تھا۔ خیال ہوا کہ شاید تین چار منٹ میں ہی جلوس گزر گیا ہو لیکن اتنا بڑا جلوس اور تین چار منٹ میں ہی غائب ہو جائے۔ اسے عقل ماننے کو تیار نہ تھی۔ میں نے جھپٹ کر ایک پنواڑی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ جلوس کو گئے ہوئے گھنٹہ بھر سے زیادہ ہو چکا۔

تعجب سے تصویر حیرت بنا میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سخت الجھن تھی کہ آخر یہ آوازیں کہاں سے آ رہی تھیں۔ کٹوروں کی ترنم خیزیاں، پانی کی دلکش صدائیں اور گلفروشوں کی نقرئی آوازیں

پنواڑی سے میں نے اور جو دریافت حقیقت چاہی تو وہ بولا۔ ایسے بازار میں پانی کی کیا ضرورت جہاں شراب کے ساغر چھلکا کرتے ہوں اور سقوں کا کیا کام جبکہ ساقی فتنہ گر موجود ہو ـــــ اور پھول ـــــ البتہ موجود تھے لیکن گلفروشوں کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ ان حسن فروشوں کے گلوں پاس جن کا رنگ ہر صبح پھیکا پڑ جایا کرتا ہے۔

اپنی ناکامی پر شرمندہ اور تھوڑی دیر پہلے کی مسکراہٹ پر نادم میں واپس ہوا۔ تحقیقات مزید کے لئے دوبارہ جامع مسجد کے چوک پر جانا اب میرے بس سے باہر تھا ـــــ باہر اور ناممکن۔ واپس گھر چلا۔ محلہ میں پہنچنے کے بعد عین اسی جگہ ـــ گلی کے موڑ پر پہنچ کر ـــــ پھر کٹوروں کی ترنم خیزیوں کے ساتھ ساتھ وہی "ٹھنڈا پانی" اور "چنبیلی کی بہار ہے" کی صدا کانوں میں گونجی۔ اور شور و غل کی ایک ایسی مدھم سی بھنبھناہٹ مسلسل سنائی دی جیسے کسی ہجوم کے ہنگامے کو کہیں دور سے سنا جائے۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ اس مرتبہ ایک اور بھاری آواز تھی "چلے آؤ میرے بھائیو گرم پلاؤ" ـــــ خدایا خیر ـــــ اُف یہ نئی افتاد کیسی۔ یہ مخصوص آواز تھی اس باورچی کی جو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر دو آنے کا پاؤ بھر پلاؤ بیچا کرتا ہے۔ وہیں کی آواز جہاں دس منٹ قبل میں خود اپنی آنکھوں سے موت کا سناٹا دیکھ آیا تھا۔

اب اس امر میں مو بھر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ وہ تمام آوازیں درحقیقت جامع مسجد ہی سے آتی تھیں خواہ انسانی آنکھیں رات کے سناٹے میں جنوں کے ہجوم کو دیکھیں یا نہ دیکھیں لیکن واقعات پیش آمدہ کی روشنی میں ماننا پڑتا ہے کہ ان کا میلہ ضرور لگتا ہے۔

(۲)

کاروباری اسباب کی بنا پر ابھی کچھ دن ہوئے مجھے دن مہینے مسلسل کانپور رہنا پڑا۔ اسی دوران میں مجھے رہائش کے لئے ایک اچھے اور کشادہ مکان کی تلاش ہوئی۔ مسٹن روڈ کے سرے پر کورٹ آفس اور جوالا بنک کے بالکل برابر لب سڑک ایک سہ منزلہ مکان مجھے پسند آیا۔ میں نے فوراً مالک مکان سے معاملہ طے کر کے اسی وقت کنجی لے لی اور اسی وقت سامان منگوا لیا۔

پڑوسیوں نے جب اس مکان میں سامان آتے دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ جن بھوتوں کے سبب عرصہ سے جو مکان خالی پڑا تھا۔ تعجب ہے آج آباد ہو گیا۔ وہ سب میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ آج تک کوئی ٹک سکا اور نہ آپ رہ سکیں گے۔ کیونکہ اس میں جن بھوتوں کا اثر ہے اور وہ اس میں کسی انسان کو رہنے نہیں دیتے۔ میں ان کے ساتھ گو بہت اخلاق سے پیش آیا لیکن انکی بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

بالائی منزل میں نے خود اپنے ذاتی استعمال کیلئے پسند کی۔ زینہ سے نکلتے ہی دو گز چوڑی اور پانچ گز لمبی چھت تھی۔ اس کے بعد دس گز چوڑا اور چار گز لمبا کمرہ تھا اور اس کے دوسری طرف اتنا ہی لمبا چوڑا ایک اور صحن تھا جو میونسپلٹی کی فٹ پاتھ پر بنا ہوا تھا۔ نیچے کانپور کا سب سے پر رونق بازار مسٹن روڈ تھا۔

دو چار روز تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا لیکن ایک رات کو اچانک ایک نہایت عجیب اور حیران کن واردات پیش آئی۔ میرے ایک عزیز دوست عارف صاحب آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگ اسی بالائی کمرے میں سوئے۔ جنوری سنہ ۴۲ء کا آخری ہفتہ تھا اور موسم کافی سرد تھا سونے سے پہلے ہم نے کمرے کے دونوں دروازے جو دونوں صحنوں کی طرف کھلتے تھے بند کر کے کنڈیاں لگا دیں اور بجلی بجھا کر سو گئے۔

تقریباً دو بجے رات کو فٹ پاتھ والے صحن کی جانب دروازے کی کنڈی بجنے کی آواز آئی۔ فوراً میری آنکھ کھل گئی۔ آواز گو بہت صاف، واضح اور پر شور تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ سوچ کر کہ شاید یہ میرا وہم ہو میں لیٹا رہا لیکن

بھی موسم سرما کی راتوں میں گرم بستر میں سے باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن ایک منٹ بعد پھر اسی زور و شور سے کنڈی بجی۔ برآمدے میں کہیں کا لگاؤ نہیں تھا پھر سمجھ میں نہ آیا کہ اس طرف کوئی آدمی کیسے پہنچ گیا۔ اور یہ کنڈیاں کون کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں پڑا ہوا یہی سوچ رہا لیکن اس سے پہلے کہ میں کسی نتیجہ پر پہونچتا تیسری مرتبہ پھر اسی زور و شور سے دستک دی گئی اور متواتر ایک منٹ تک کنڈی کو بجتا گیا۔

عارف صاحب نے پوچھا کون؟ لیکن جواب میں سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔ انہوں نے جلدی سے پھر پوچھا کون؟ اب بھی جواب نہ ملا تو زچ آکر انہوں نے اور زور سے پوچھا "ارے بھئی کون" لیکن پھر بھی جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی بالآخر جلدی سے اٹھکر میں نے بجلی روشن کی۔ اور دروازہ کھول کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ برآمدے میں بالکل سناٹا تھا اور مکان کے عین نیچے سڑک پر سپاہی سنگینیں لئے ہوئے پہرہ دے رہے تھے۔ کانپور کے فرقہ وارانہ فسادات کے سبب فضا کی خرابی نے باشندگان شہر کو یہ ایک نئی سوغات دی تھی۔

مکان کا چپہ چپہ دیکھا گیا لیکن ساری کوششیں فضول و بیکار ثابت ہوئیں

جوگن!

نکھرا چہرہ آنکھ شرابی
بال سنہرے ہونٹ گلابی
دل کی دھڑکن میں بیتابی
من کی بات بتا اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

میٹھی لے میں گاتی جائے
قدم قدم پر آنکھ چرائے
دھرتی ماتا سیس جھکائے
گائے جا ہاں گا اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

کس کے غم میں بنی ہی سوگن
کس نے تجکو کیا بیروگن
میں بھی روگی تو بھی روگن
مجھ سے پریت لگا اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

گھونگھر والے بال بکھیرے
آنکھوں میں جلوؤں کو گھیرے
نور کے تڑکے شام سویرے
مجھ کو گلے لگا اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

ٹوٹے کنگن، بکھرے گیسو
ہاتھ میں بینا، آنکھ میں آنسو
زندہ آہو، چلتا جادو
آنکھوں میں بس جا اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

مٹیالی آنکھوں میں ڈورے
بوجھل آنکھیں بازو گورے
دل کی نیا لے ہچکورے
تو ہے میرا خدا اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

یہ غربت یہ عہد جوانی
جوگن ہے یا کوئی رانی
تیری ہر اک بات سہانی
من کا دیا جلا اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

جو تو میرے دل کی مانے
تیرا نغمہ میرے ترانے
کر دینگے دنیا کو دوانے
آ میرے گھر آ اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

تیرا نغمہ نور سراپا
عالم ہے مخمور سراپا
تو ہے کوئی حور سراپا
مجھ کو مست بنا اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

دنیا ہے اک رین بسیرا
دو دن کا ہے اس میں ڈیرا
نہ کوئی تیرا نہ کوئی میرا
روپ انوپ دکھا اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

آ اک بستی اور بسائیں
جشن منائیں نغمے گائیں
پریم کی لے میں گیت سنائیں
مت ہم سے شرما اے جوگن
سندر گیت سنا اے جوگن

از مسٹر بھولا ناتھ عکس اسلنبول

خاص مست قلندر کیلئے

اثرِ غیب!

وہائیٹ یوگی مقیم تبت کے قلم سے

اثر مسلسل اور مسلسل قوت

جیسا کہ میں بیشتر کہہ چکا ہوں یہ فرشتہ موت جسے سفلی عمل و ریاضت اور کالے جادو کے ذریعہ طلب کیا جاتا ہے بالکل پوشیدہ ومخفی طور پر کام کرتا ہے اور موت کی وجہ کا کوئی مادی سراغ باقی نہیں چھوڑتا یہی سبب ہے کہ آج تک ان اموات کا راز ایک سربستہ راز ہے اور ان کا تسلسل "پراسرار مشرق" کے عاملین انتظام مثلاً پولیس کے افسروں، ججوں اور مجسٹریٹوں کے لئے ایک دہشتناک خواب کی حیثیت رکھتا ہے

میں نے جو واقعہ ابھی بیان کیا ہے، اسی نوعیت کے اور بہت سے واقعات موجود ہیں جن کی تصدیق معقول اشخاص نے کی ہے۔ یہ امور ایسے ہیں جو یقیناً ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں بشرطیکہ غور و فکر کیلئے ہمارے پاس دماغ بھی ہو۔ ان واقعات کے مدنظر کیا ہم اب اُن دیو بھوتوں کا تصور نہیں کر سکتے جن کا تذکرہ انجیل میں آیا ہے یعنی وہ ارواح خبیثہ جن کو بنی نوع انسان سے خارج کر کے

سوروں کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا تھا جو اپنے غیظ و غضب کی دیوانگی میں آخر کار کسی دریا میں ڈوب مرے؟ کیا نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان امور سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خیر و شر کی کتنی زبردست قوت انسانی دماغ میں موجود ہے؟ کسقدر اہم ہے وہ اخلاقی نتیجہ جو اس سبق سے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ - اسے وہی سن سکتا ہے جس کے پاس گوش ہوش ہے!

"کالے جادوگر" کی زندگی کی ابتدا یوگی

لوگوں کے ہی ایک فرقہ سے ہوتی ہے اس فرقہ کے لوگ ایک شریف نسل کے اولین سلسلے سے متعلق ہیں اور یقیناً مشرق کے نجات دہندہ کہلانے کے مستحق ہیں ..... ہندی یا حقیقی مشرقی یوگی سب سے پہلے اپنا اثر چھوٹے پودوں پر ڈالتا ہے پھر بڑے درختوں پر اور ان کو اپنے حکم سے بڑھنے یا خشک ہو جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ محض اپنے خیال کی قوت سے کرتا ہے۔ ہائیکورٹ کا ایک جج جو میرا دوست ہے مجھے مطلع کرتا ہے کہ اس نے درختوں کے خشک ہو جانے کا واقعہ جیسا کہ کتب مقدسہ میں تحریر ہے بہت دفعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اگرچہ اہل مغرب کی نگاہوں میں یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوگی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ قدیم ہندوستان کے دلدادہ افتادہ موضعات میں ایسی باتیں عام ہیں مثال کے طور پر یہ واقعہ ہے کہ یوگی کے حکم پر ایک انجیر کے درخت کے خشک ہو جانے کی تصویر فوٹو کیمرے کے ذریعہ حاصل کی گئی ہے جو اس تنویمی اثرات کے مسئلہ کو غلط ثابت کرتی ہے جبکہ "رسی والے شعبدے" پر صحیح ثابت ہوتا ہے لیکن آئینے کی وہ مثال جو میں پیشتر بیان کر چکا ہوں ہرگز فراموش نہ کرنا چاہئیے۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان چھوٹے درختوں کے خشک ہو جانے کا مشاہدہ کیا ہے۔ جو شاندار خانقاہ لامہ کے قریب لاسہ کے قرب جوار میں واقع ہیں۔ نفسیات اور دماغی کارفرمائیوں کی بابت ہندوستان اور تبت ہمیں اس سے کہیں زیادہ سکھا سکتا ہے جتنا کہ فرائیڈ۔ یونگ۔ ایڈلر یا کسی اور جدید خیال تحریک کا بانی بتلا سکتا ہے۔

ہندوستان کے غدر ۱۸۵۷ء کے دوران میں ان یوگی ماہرین کے پاس دماغی "انتقال خیال" کا علم اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود تھا اور اس سے پیشتر کہ انگریزی افواج کی نقل و حرکت کی اطلاع بذریعہ تار برقی متعلق اشخاص کو پہنچائی جائے۔ یہ اطلاع ان یوگی لوگوں کو معلوم ہو جاتی تھیں حکومت اس بات کو معلوم کرنے میں قطعی بے بس تھی۔ کہ یہ اطلاعات انہیں کس طرح حاصل ہو گئیں لیکن اس راز کا علم اگر کسی کو تھا تو وہ یوگیوں کا "سلسلہ لیار" تھا یا پھر اس کا علم صرف مجھے تھا۔ (میں یوگیوں کے سلسلہ

یمین" سے متعلق تھا)!۔۔۔ ان لوگوں کے قبضے میں تقدیر کی حکمرانی تھی ۔۔۔ ان کے قبضے میں وہ زبردست "اثرِ غیب" تھا جو سلاطین کو ان کے شاہی تخت سے گرا دیتا ہے اور جس کی قوت کی یہ حالت ہے کہ اس کے سامنے پوری افواج ہیبت زدہ ہو کر کھڑی رہ جاتی ہیں۔

"انتقالِ خیال" ہی کی ایک بہت قوی شکل کا نام ہپناٹزم یا تنویم ہے جس کو زیادہ موزوں الفاظ میں "روحانی کیفیت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس کی حقیقت ایسی ہی ہے جیسے دماغی کتب خانے کا دروازہ کھول دیا جائے لیکن دماغ کی متحرک قوت جس کے ذریعہ انتقالِ علم ہوتا ہے یا جو قوت خیال کے ارتعاش کے ذریعہ ملائے ایثری کی امواج پر اپنا کوئی حکم کسی دوسرے شخص کے لاشعوری دماغ تک پہونچاتی ہے۔ اصلیت میں وہی طاقت ہے جو شعوری ایہام میں کام کرتی ہے اور صرف مقدار کے لحاظ سے اس قوت سے مختلف ہوتی ہے جو کسی شخص کو تنویمی نیند میں غرق کر دیتی ہے یا "رسی والے شعبدے" میں ایک نظری فریب پیدا کر دیتی ہے۔

جب میں چین کے ان نامعلوم علاقوں میں سفر کر رہا تھا جہاں کے باشندوں کیلئے ایک گوری نسل کے فرد کا نظر آ جانا بڑے تماشے کی چیز ہے تو میں نے بہت کچھ علم ایسے لوگوں سے حاصل کیا جو دیکھنے میں ناکارہ بھکاری نظر آتے تھے اور جن کے پاس اس مادی دنیا میں جینے کا کم و بیش کچھ بھی سامان نہ تھا لیکن مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ان کے پاس عالمِ مابعد کے لئے بہت کچھ ساز و سامان موجود تھا اور یہ معلوم کر کے مجھے سکون ہو گیا۔

عام طور پر میرا سامان بتیس بڑے بڑے صندوقوں پر مشتمل ہوتا تھا کیونکہ میں اپنی ساری مادی ملکیت ساتھ ہی رکھتا تھا اس سلسلے میں مجھے کسی قسم کے رہزنوں اور قزاقوں کا کوئی خوف نہ تھا کیونکہ مجھے اس مقصد کیلئے ایک خاص منتر سکھا دیا گیا تھا اور میں صرف ایک نظر میں اس کے استعمال کی رائے قائم کر سکتا تھا اس کے علاوہ مادی فاصلے یا مکانی تعین میرے لئے بے معنی چیزیں تھیں ایک موقعہ پر ایسا ہوا کہ میرے چونتیس صندوق دریا کے راستے سے سات دن کے سفر کے بعد میرے پاس پہونچے اور میرے دماغ کو بہت غور کے ساتھ یہ سوچنا پڑا کہ میرے

ایک گمشدہ صندوق کو جس پر نمبر ۹ پڑا ہوا تھا کیا اُفتاد پیش آئی میرے تمام صندوقوں پر سفید بالش سے مسلسل نمبر پڑے ہوئے تھے۔ میں اپنے ایک یوگی دوست کیساتھ مل کر غور وفکر کیلئے بیٹھ گیا اور ذراسی دیر میں ہی ہم نے اپنی دماغی آنکھوں کے ذریعہ دیکھا کہ وہ صندوق اس قدیم محل کے ایک خالی کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ جہاں سے ہم ایک ہفتہ بیشتر اپنے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد دوسرا کام یہ تھا کہ صندوق کو حاصل کیا جائے۔ اُن علاقوں میں ابھی تار کا نام بھی کسی نے نہ سنا تھا۔ ڈاک کی آمدورفت کا یہ حال تھا کہ ایک طرف میں دس دن لگتے تھے کیونکہ وہ خشکی کے راستے سے جاتی تھی۔ اگر کوئی قاصد روانہ کیا جاتا تو اسے دریا کے راستے سے آمدورفت میں سولہ دن کا عرصہ درکار تھا لیکن مجھے اپنا سفر جاری رکھنے کی بے چینی تھی۔ اب ہمارے لئے صرف ایک صورت کار باقی تھی اور وہ یہ کہ "انتقال خیال" کو استعمال کیا جائے اور چونکہ میں اس ملک کی زبان سے بہت کم واقف تھا۔ اس لئے یہ کام میں نے اپنے دوست پر چھوڑ دیا۔ دس منٹ کے اندر ہی وہ ایک وجد و بیخودی کی کیفیت میں کھو گیا۔ اس کا جسم جلد ہی سرد ہو گیا۔ اس کا تنفس بظاہر بند ہو گیا اور اس کے دل کی آواز "اسٹیتھاس کوپ" کے آلہ سے بھی نہ سنی جا سکتی تھی۔ اس کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگا۔ وہ پورے تین گھنٹے تک اس موت جیسی کیفیت میں رہا۔ اس کے بعد وہ کراہنے لگا۔ اس کے جسم پر تشنج سا طاری ہوا اور وہ کچھ بڑبڑایا۔

آخر کار اس نے آنکھیں کھول دیں چونکہ وہ کچھ مضمحل وخستہ نظر آتا تھا۔ اس لئے میں نے اسے تازہ دم کرنے کیلئے کچھ صاف برانڈی اور دودھ پلایا۔ پوری طرح بیدار ہونے پر اس نے مجھے بتلایا کہ سب کچھ انتظام کر دیا گیا ہے یعنی گمشدہ صندوق نمبر ۹ دس منٹ کے اندر ہی ایک چھوٹی کشتی پہ پار کر دیا جائیگا اور آٹھ روز کے اندر اندر حفاظت کے ساتھ واپس آ جائیگا۔ چنانچہ جیسا کہ اس دانشمند شخص نے پیشین گوئی کی تھی بالکل ایسا ہی ہوا۔ میرے صندوق کے ساتھ ایک قاصد بھی آیا کیونکہ مشرق بعید میں اور مشرق کے بعض علاقوں میں ایسا کرنا احتیاط کے لحاظ سے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس قاصد سے احتیاطاً تمام حالات دریافت کئے اور پوچھا کہ اُسے یہ کس طرح علم ہوا کہ

مجھے اس صندوق کی ضرورت تھی نیز یہ بات اسے کیونکر معلوم ہوئی کہ صندوق مذکور قدیم محل کے اس خالی کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ اس سے پیشتر کہ میں قاصد کی بیان کردہ اس کہانی کو پیش کروں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ دنیا کے اس حصے میں جہاں کا میں یہ تذکرہ کر رہا ہوں کوئی شخص شام کے بعد مکان کا دروازہ نہیں کھولتا اور اگر کوئی شخص اس وقت سفر کرتا ہے تو بہر ایک احتیاط و انتظام کے بعد ایسا کرتا ہے۔ اگر وہ بعد شام کسی شخص کے مکان پر آواز دے تو اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاتی بلکہ اندر سے صاحب خانہ پکار کر کہتا ہے "کون صاحب ہیں؟" اس پر آنے والا شخص اپنا نام اور پتہ بتلاتا ہے بس کے بعد (محض انتہائی مخصوص موقعوں پر) اُسے مکان کے اندر داخل کیا جاتا ہے۔

عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ پیغام صرف آواز کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے دونوں گفتگو کرنے والے شخصوں میں سے کوئی بھی کسی کو نہیں دیکھتا اور گفتگو بند دروازے کے درمیان سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی اس موقعہ پر بھی ہوا۔ ٹھیک اسوقت جبکہ میرا دوست میرے پاس بیٹھا ہوا موت جیسی بے خودی کی حالت میں غرق ہوا، اس دور افتادہ شہر میں جہاں میرا صندوق تھا پولیس کمشنر کے دروازے پر جو کہ چینی نسل سے متعلق تھا۔ ایک دستک کی آواز پیدا ہوئی۔ کمشنر کو میرے دوست کے بولنے کی آواز آئی بالکل اس طرح جیسے میرا دوست واقعی وہاں موجود ہو۔ کمشنر مذکور نے میرے پیغام کو سنا اور میری خواہش کی تکمیل کیلئے بہ عجلت روانہ ہوگیا۔ میرا دوست یا تو روحانی حیثیت سے بذات خود وہاں پہنچا تھا یا اسقدر قوت کے ساتھ "انتقال خیال" کیا تھا کہ اس خالی الذہن پولیس افسر کو یہ یقین ہوگیا کہ میرا دوست یوگی واقعی اس کے پاس آیا ہے۔ دوسرے روز اس پولیس کمشنر کو یہ معلوم ہوکر بہت تعجب و تشویش ہوئی کہ کسی شخص نے بھی میرے دوست کو اس دن کے بعد وہاں نہیں دیکھا جبکہ وہ وہاں سے چند روز پہلے میرے ہمراہ "ناممکن" کی تلاش میں اس اہم سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اس پولیس افسر کو ان واقعات سے اسقدر شدید تعجب تھا کہ بعدہٗ اس نے مجھے خط لکھا اور جب میں نے اُسے جواب میں لکھا کہ اس تمام عرصہ میں میرا دوست یوگی کبھی میرے پاس سے

کہیں نہیں گیا تو اُسے اور بھی حیرت ہوئی اس کہانی میں دلچسپی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ خود بڑے بڑے افسران بھی ذرا یہ احساس نہیں رکھتے کہ اُن کے درمیان کیسی کیسی پوشیدہ قوتیں کارفرما ہیں۔ میرے دوست کو ہوش میں آنے کیلئے تین گھنٹے کا عرصہ کیوں لگا اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسے مظاہر میں مشرق کے اندر عموماً نتائج کا ظہور مقدار یا تعداد کے تین یا سات کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اس قسم کا "انتقال خیال" بلاشک و شبہ نام ہے "مرکوزیت خیال" کا جس کا عمل قوت ارادی سے ہوتا ہے اور جن کا اثر دوسرے شخص پہ قطعی طور پر اور بعض حالات میں بغیر مسموع الفاظ کے ہوتا ہے آپ خود اسے آزما کر دیکھئے اور شک نہ کیجئے آپ ایسا کرینگے تو متعجب ہو جائیں گے۔ اپنے دوست کا تصور کیجئے۔ اس کے چہرے کی تصویر اپنے دماغ میں اتار لیجیا اگر اس کے پاس اس کا کوئی فوٹو ہے تو اسکی طرف دیکھئے اور اس سے بات کیجئے۔ اس کے بعد ٹھیک اُسوقت جب آپ رات کے وقت نیند میں ڈوب رہے ہوں اسے اپنے دماغ میں نقش کیجئے۔ اپنی تمام دماغی قوت اپنے مقصد یا خواہش پر اور آپ دیکھیں گے کہ اگر آپ نے یہ خواہش کی ہے کہ آپ کا دوست آپ کو خط لکھے تو یقیناً یہ خط اگلے روز یا دوسرے روز ضرور لکھا جائے گا۔ یا اگر آپنے اس کے علاوہ کوئی خواہش کی ہے اور اُسے آپنے قوت خیال کے ارتعاش کے ذریعہ اپنے دوست تک پہونچا لیا ہے تو یہ خواہش تکمیل کو پہنچے گی اس قسم کے خیالی اور دماغی پیغامات ہمیں اکثر اپنی قریبی عزیز ہستیوں کی طرف سے ملتے رہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں جس کے عنوان کا تعلق ہماری کسی طرح نہیں لیکن یکایک پڑھتے پڑھتے اس کی یاد آجاتی ہے (حقیقت یہ ہے کہ ہم کو اپنے لاشعوری دماغ سے اطلاعات اُسی وقت موصول ہوتی ہیں جبکہ ہمارا شعوری دماغ مشغول یا متاثر ہوتا ہے) بعض اوقات کسی روز شام کے وقت ہمیں محض اتفاقاً اپنے کسی دوست کا خیال آتا ہے اور دوسرے ہی دن ہمیں اُس کا خط ملتا ہے یا اس کے حالات سننے میں آتے ہیں۔ اس کا راز بھی یہی ہے کہ ہمارے خیال کا ارتعاش ان ایکسپریس ٹرین سے زیادہ تیز رفتار تھا جو ہمارے

پاس خط لائی ہے۔ خط لکھنے والے نے اس اہتعاش خیال کو قبول کیا اور فوراً خط لکھدیا۔

جب میں اس عنوان پر اپنے دانشمند دوست یوگی سے گفتگو کر رہا تھا تو اس نے کہا "احمق انسان ان باتوں کو نہیں سمجھتا۔ اگر اس کے پاس صرف عقل ہوتی تو وہ اپنے دماغ کی تربیت و ترقی سے اور اس کی قوت کے علم کو حاصل کر کے اپنی زندگی کے لطف و سرور میں سوگنا اضافہ کر لیتا"۔

کیا آپ نے کبھی اس امر کو محسوس کیا ہے کہ وہ عورت یا مرد جو سب سے زیادہ ذہانت رکھتا ہے دوسروں کو مسحور کرنے کی سب سے بڑی طاقت کو علم کے مناسب استعمال میں پوشیدہ دیکھتا ہے اور خود بھی مسحور ہونے کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے؟ ہو سکے تو اس حقیقت عظیم پر غور کیجئے!

یوگ کے "سلسلۂ لیار" کے ماہرین ہم لوگوں کی طرح ہاتھوں کے لمس یا ایہام کو اپنے عمل کے وقت استعمال نہیں کرتے بلکہ ایک مرکوز نظر اور دماغی عزم کے ذریعہ انسان کے عصبی مرکزوں پر اثر ڈالتے ہیں اور اس طرح وہ شئے پیدا کر دیتے ہیں جسے اصطلاح میں تنویمی یا روحانی کیفیت کہا جاتا ہے۔ (ترجمہ)

جب میں جوان تھی!

سچا واقعہ فرضی قصہ کہانی سے کہیں زیادہ دلچسپ اور جاذب توجہ ہوتا ہے!

اردو میں اپنی قسم کی پہلی آپ بیتی جو آپ کی راتوں کی نیند حرام کر دیگی

ایک حسن فروش عورت کی عبرت آموز داستان

اپنے قلم سے اتنی دلچسپ اتنی سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور کہ ایکبار پڑھنے سے آپکی طبعیت سیر ہوگی بلکہ بار بار پڑھنے کو جی چاہیگا۔

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔ (اقساطِ سابقہ کا خلاصہ) شانتا لکھتی ہے۔ میرے والد مسلمان بیرسٹر تھے۔ اور والدہ ایک کشمیری برہمن کی لڑکی۔ دونوں کی شادی سول میرج سے ہوئی تھی۔ چونکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی اسلئے میری پرورش نہایت لاڈ پیار سے ہوئی اور میری تعلیم و تربیت پر کافی روپیہ خرچ کیا گیا۔ مقامی میونسپلٹی کے چیرمین کی والدہ مرحوم سے بڑی بے تکلفی تھی۔ میں ان دنوں کالج میں پڑھتی تھی۔ اور ان کا جوان لڑکا پربھو دیال متعلم کلکتہ کالج موسم گرما کی رخصتوں پر گھر آیا ہوا تھا وہ ہمارے یہاں آنے جانے لگا۔ پربھو بیس اکیس سال کا خوبصورت جوان تھا۔ ایک دن کارلٹن ہوٹل میں پربھو نے مجھے مدعو کیا۔ وہیں کامتا اور لاجونتی سے میری ملاقات ہوئی۔ پربھو اور کامتا چند منٹ کے لئے اُٹھ کر باہر گئے تو قریب ہی بیٹھے ہوئے دو آدمیوں کی باتیں میرے کان میں پڑیں "ان لڑکیوں کو دیکھو ان کے چہروں پر کتنی معصومیت اور شرافت برس رہی ہے۔ جیسے دُنیا کی ہوا انہیں چھو تک نہیں گئی مگر ان کے کرتوت یہ ہیں کہ اپنے آشناؤں کے ساتھ شہر کے بدنام ترین ہوٹل میں موجود ہیں" اس دن کے بعد مجھے سوسائٹی سے ایک دم نفرت ہوگئی ...... میرے والدین کو میری شادی کی فکر تھی۔ اتفاق کی بات سول اسپتال میں جو نئے سول سرجن تبدیل ہو کر آئے ان کا بڑا لڑکا پرشوتم والد صاحب کی نظر میں جچ گیا۔ اُدھر والد صاحب کی سول سرجن سے دوستی ہوئی اور اِدھر پرشوتم ہمارے یہاں روزانہ آنے لگا۔ ایک دن میں اور پرشوتم موٹر پر سوار ہو کر سیر کو روانہ ہوئے تو شہر سے بیس میل کے فاصلہ پر موٹر کا ایک ٹائر پھٹ گیا۔ (گذشتہ اشاعت سے آگے)

چھٹا باب

گاؤں کی ایک رات

جامن کے گھنے پیڑوں کے سایہ میں شام کا دھندلکا اور زیادہ گہرا ہوگیا تھا جنگل کی خاموشی قدرے بھیانک ہوتی جارہی تھی۔ میں اور پرشوتم کھیلتی ہوئی ریکی میں گم ہوئے جارہے تھے۔ ہماری موٹر ایک تھکے ہوئے پاشکستہ مسافر کی طرح کھڑی تھی۔ — "پرشوتم! آخر کب تک سوچتے رہوگے؟" میں نے کہا۔

"تم بہت جلد باز ہو شانتا!" — پرشوتم نے جواب دیا۔

"معاف فرمائیے میں جلد باز ہوں تو آپ کاہل ہیں" میں نے جواب میں کہا۔

"کسی بات کا سوچنا کاہلی نہیں ہے" پرشوتم سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے بولا۔

"ضرورت کیوقت کسی بات کا دریافت کرنا بھی جلد بازی نہیں ہے" میں نے جواب میں کہا۔

"شانتا! بعض وقت تم ناقابل برداشت حد تک فلسفی بن جاتی ہو" پرشوتم نے جواب دیا۔

"اور تمہارا غور و تفکر تو اکثر ناگوار بلکہ تکلیف دہ بنجاتا ہے —" میں بولی۔

"تو تم جنگ کرنا چاہتی ہو — عورتیں بڑی لڑاکو اور تند مزاج ہوتی ہیں" پرشوتم نے قدرے تیزی کیساتھ کہا

"لڑائی کی باتیں تو تم کر رہے ہو میں نے ذراسی بات پوچھی تھی تم نے اصل بات کا جواب دینے کی بجائے مناظرہ بلکہ مجادلہ کا رنگ اختیار کر لیا۔ یہاں تک کہ عورتوں کی فطرت پر حملہ کر دیا اور لطف یہ ہے کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد الٹا مجھے ہی کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے یہ تو وہی مثل ہوئی کہ پٹ بھی میری اور چت بھی میری — یا یہ کہ — زبردست مارے اور رونے نہ دے" — میں نے جواب دیا۔

"شانتا! تم بُرا مان گئیں، اچھا صاحب! میرا ہی قصور ہے میں اپنی خطا کا اقرار کرتا ہوں اور اس کا بھی اعتراف ہے کہ تم جیتیں

اور میں ہارا ـــ اور ہاں ...."

پرشوتم ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ قریب سے گاؤں کے ایک آدمی کے کھانسنے کی آواز آئی اور پرشوتم نے تھوڑے سکوت و تامل کے بعد آواز دی "ارے! تم کہاں جا رہے ہو۔ ذرا یہاں تو آؤ"

گاؤں والا پرشوتم کی آواز سُن کر کھانستے کھانستے خاموش ہو گیا، وہ ہم سے ذرا فاصلہ پر تھا۔ مگر اُس کی خاموشی خوف اور جھجک کے دبے ہوئے جذبہ کی ترجمانی کر رہی تھی، پرشوتم اس کی خاموشی کا مفہوم سمجھ گیا اور پرشوتم نے بڑے ہی نرم لہجہ میں کہا:۔

"ارے بھیا! ذرا ادھر آ، کچھ پوچھنا ہے تجھ سے"

پرشوتم نے بات پوری ہی کی تھی کہ گاؤں والا لمبی لمبی ڈگیں بھرتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ چھ فٹ کا لمبا ننگا آدمی۔ کالا رنگ گچھے دار مونچھیں، ہاتھ میں کنپٹی کے برابر موٹی سی لاٹھی، میں تو اُس کی صورت دیکھ کر سہم گئی ـــ

"تم کہاں سے آ رہے ہو؟" ـــ پرشوتم نے دریافت کیا۔

"سرکار! میں زمیندار کے کارندے کے یہاں پوتے (لگان) کا بھگتان کرنے کے لیے گیا تھا۔ ہمارے منشی جی نرسا گڑھ میں رہتے ہیں، نرسا گڑھ یہاں سے تین کوس پر ہے۔ اور بہت سے کسان بھی پوتا (لگان) دینے کے لیے آئے تھے، حساب کتاب میں سانجھ (شام) ہو گئی۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں۔" گاؤں والے نے جواب دیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو" ـــ پرشوتم نے دیا سلائی جلاتے ہوئے پوچھا

"ہجور (حضور) میں اسی گاؤں میں رہتا ہوں۔ یہاں سے تھوڑی دور پر میرا گاؤں ہے، آپ کے سامنے جو یہ باغ ہے اُس باغ کے پاس ہے میرا گاؤں!" ـــ گاؤں والا بولا ـــ

"تمہارے گاؤں میں رات بسر کرنے کے لیئے کوئی جگہ بھی مل سکیگی؟" پرشوتم نے کہا ـــ

"ہمارے گاؤں میں مکھیا کی چوپال ہے، جس میں تھانیدار، کرک امین (قرق امین) کانی گو (قانون گو) اور دوسرے حاکم لوگ ٹھہرا کرتے ہیں، چوپال کاہے کو ہے۔ اچھی کھاسی (خاصی) حویلی ہے، دو ہزار روپیہ لگے ہیں مکھیا جی کی اس چوپال میں، سارے گاؤں کی ناک ہے یہ چوپال" ـــ گاؤں والے نے جواب دیا ـــ

پرشوتم نے سگرٹ کیس سے سگرٹ نکال کر گاؤں والے کو دی اور دیا سلائی جلا کر سگرٹ سلگا دی، گاؤں والے نے زور سے کش لگا کر اندھیرے میں چمک پیدا کر دی، ہم تینوں گاؤں کی طرف روانہ ہوئے کھیتوں کی مینڈھیں بہت ہی ناہموار تھیں۔ بعض بعض جگہ پانی کے تیز بہاؤ نے مینڈھوں کو کاٹ کر خندق سی بنا دی تھی میں کسی جگہ گرتے گرتے رہ گئی، میں اندھوں کی طرح پرشوتم کے بازو پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگی۔ گاؤں والے نے اپنی رام کہانی شروع کر دی

"سرکار! ہمارے گاؤں کا زمیندار بڑا ہی ظالم اور ڈھیٹ ہے آئے دن طرح طرح کے اتیا چار کرتا رہتا ہے، پوتا (لگان) دینے میں ایک دن کی بھی دیر ہو جاتے تو بیچارے کسانوں کے بیل بچھڑو کو پکڑوا کر اپنے ہاں باندھ لیتا ہے، بعض دفعہ تو پوتا لیکر رسید نہیں دیتا۔ اور نالش کر کے کسانوں کے برتن بھانڈے تک کُرک (قرق) کرا لیتا ہے۔ ہجور! آپ کوئی ایسا بندوبست کر دیں۔ کہ یہ زمیندار ہمیں ستایا نہ کرے، اجی! تھانیدار صاحب سے ملا ہوا ہے یہ زمیندار، تھانیدار اس سے پوچھے بنا گاؤں میں کچھ نہیں کرتا کچہری دربار میں پہنچ ہے اس ملیچھ زمیندار کی، کوئی پھریاد (فریاد) بھی کس سے کرے، نیچے سے لے کر اوپر تک سارے حاکم لوگ اس سے ملے ہوئے ہیں۔ روپیہ میں بڑا زور ہے سرکار! روپیہ کے مقابلہ میں ہم گریبوں (غریبوں) کی کھالی (خالی) باتوں پر کون کان دھرتا ہے۔ اس بیساکھ میں زمیندار کی چھوری (لڑکی) کا بیاہ تھا، ہمارے گاؤں کے ٹہل کرنے والے کمہار، نائی، کہار، سب کے سب بیگار میں پکڑ بلائے گئے، اور ہم کسانوں کے گھر پیچھے دو من گیہوں ڈھائی سیر گھی وصول کیا گیا!"

پرشوتم نے جواب میں کہا "تم تسلی رکھو میں ضلع میں جا کر تمہارے زمیندار صاحب کا قرلج بحال کرا دوں گا"

کسان خوش ہو کر دعائیں دینے لگا۔ موضوع بدلنے کے لیے پرشوتم نے اُس سے دریافت کیا کہ "تمہارے کتنے بیگھے ہیں؟" پرشوتم کا اتنا پوچھنا تھا کہ گاؤں والے نے پھر ایک طولانی داستان چھیڑ دی

"ہجور! ہمارے باپ نے سو بیگھہ زمین چھوڑی تھی، ہم دو بھائی ہیں، باپ کے مرنے کے بعد ہم دونوں بھائیوں کی کھیتی کا کام ساجھے میں ہوتا تھا، ہمارا کام خوب نباہا ہوا تھا، دو ہلوں کی کھیتی ہوتی تھی ہمارے آمین بھینسیں بھی تھیں، پچھلے سال سے میرے بھائی نے زمیندار کے کارندے کے کہنے میں آ کر کھیتی بانٹ لی زمیندار کا کام تو آپس میں پھوٹ اور بگاڑ سے چلتا ہے وہ اپنے اسامی کو

کھاتا بنیا دیکھ ہی نہیں سکتا۔ آپس کی پھوٹ اور زمیندار کی چال کا یہ نتیجہ نکلا کہ کوئی بیس بیگہ موروثی زمین (بے دخل) ہوگئی، اب میرے پاس چالیس بیگہ زمین رہ گئی ہے، ایک ہل کی کھیتی ہے، ایشور کی کرپا سے موج آرہی ہے۔ مجھ پر کسی کا ایک پیسہ بھی اُدھار نہیں ہے، دس بیس روپے میرے ہی دوسروں پر آتے ہوں گے، اب کی جلیٹھ میں میری بھینس بیاہی ہے، دونوں چھاک (وقت) میں دس سیر دودھ ہو جاتا ہے؛ تمھارے بچوں کو کسی بات کا توٹا نہیں ہے، گھر میں کسی بات کی کمی نہیں ہے۔ ایشور نے سب کچھ دے رکھا ہے، تمھاری چھوری (لڑکی) سیانی ہوگئی ہے، اگلے کاتک میں اس کا گونا (وداع) ہوگا۔ بس یاسی کی ذرا فکر لگی ہوئی ہے، ایشور نے چاہا تو یہ کارج (تقریب) بھی اچھی طرح ہو جائے گا۔

گاؤں والا اپنی کہانی سناتا رہا، یہاں تک کہ گاؤں آگیا اور گاؤں کے کتے اجنبی لوگوں کو دیکھ کر بھونکنے لگے، میں سہمنے لگی۔

"بزدل نہ بنو شانتا! گاؤں کے کتے اجنبی سمجھ کر بھونک رہے ہیں وہ ہم پر حملہ نہیں کرسکتے۔"

پرشوتم نے مجھ سے کہا اور میں قدرے تن کر چلنے لگی، کتے برابر بھونک رہے تھے، صورت حال یہ تھی کہ ایک کتا بھونکتا۔ دوسرے نے اُس کا جواب دیا اور تیسرے نے تائید کی، اس کا جواب الجواب اور تائید در تائید کا سلسلہ چھڑ گیا، یہاں تک کہ گاؤں کے تمام کتوں کے حلق بہ یک وقت حرکت میں آگئے۔ گاؤں کے یہ وفادار کتے اپنے چوکس ہونے کا ثبوت دے رہے تھے، کہ ہم کسی غیر کا رات کیوقت اس طرح گاؤں میں آنا برداشت نہیں کرسکتے، ہم کتوں کی اس آل انڈیا قسم کی کانفرنس سے گزرتے چلے گئے، گاؤں والے اپنے دروازوں کے سامنے کھڑی کھاٹوں پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے، ہمیں دیکھ کر وہ کھڑے ہوگئے، اور ہر طرف سے آوازیں آنی شروع ہوئیں:-

سرکار! سلام، حجور! پالاگن، بندگی ماں باپ! نمستے......

میں تو خاموش تھی۔ البتہ پرشوتم سر ہلا ہلا کر جواب دیتا رہا، ایک مرتبہ گھبراہٹ میں یا یوں سمجھئے کہ جذبہ خودی سے بے اختیار ہو کر اس کے منہ سے "گڈ نائٹ" (Good night) نکل گیا، مجھے اس پر زور سے ہنسی آگئی۔ پرشوتم جھینپ کر بولا۔

Do not be so reasonable Shanta!

میں نے اس پر جواب دیا۔ "یہ دوسری حماقت فرمائی آپنے"!

میں نے بات ختم کی ہی تھی کہ راستہ کے موڑ پر ایک گڑھے میں میرے سینڈل ( ) پھنس گئے اور میں گڑھے سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے اوندھے منہ گر پڑی۔

آپ کی میم صاحبہ گر پڑیں ـــ گاؤں والے نے پرشوتم سے کہا۔

"یہ میم صاحبہ اکثر ایسی ہی قلابازیاں کھاجایا کرتی ہیں۔ اس زمانے کی لڑکیاں بڑی پھسلنی واقع ہوئی ہیں!" پرشوتم نے کہتے ہوئے مجھے اٹھا لیا۔

"چوٹ تو نہیں آئی شانتا؟" ـــ پرشوتم نے دریافت کیا۔

"تمھیں کسی کی چوٹ سے کیا سروکار؟ کوئی مر بھی جائے تو تمھاری بلا سے، تمھیں تو دل لگی اور مذاق کے لیے کوئی بات چاہیئے"۔ میں نے جواب دیا۔

پرشوتم نے جھک کر میرے پیر چھوئے، اور میں مسکرادی، میری ذراسی مسکراہٹ نے اس قضیہ نامرضیہ کو اسی نقطہ پر ختم کردیا

ذرا سی دیر میں مکھیا کی چوپال آگئی۔ مکھیا چارپائی پر لیٹے ہوئے چلم پی رہا تھا۔ گاؤں کے بہت سے آدمی اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ وہی گاؤں والا جو ہماری رہبری کر رہا تھا مکھیا (مقدم) کو مخاطب کرکے بولا:-

مکھیا جی! یہ بابو جی تمھارے پاس آئے ہیں، ان کی موٹر پکی سڑک پر کھڑی ہوئی ہے ـــ!

مکھیا پلنگ سے گھبرا کر اٹھا۔ اور چوپال کے چبوترے سے نیچے آکر بولا۔

"سرکار! میں حاضر ہوں کیا کام ہے مجھ سے"۔

پرشوتم اور میں چوپال پر چڑھ گئے، چوپال پر جتنے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ہمیں دیکھ کر کھڑے ہوگئے، ایک گاؤں والے نے تو بھری ہوئی چلم فرش پر الٹ دی، ہمیں دیکھ کر ہر شخص پر خوف چھایا ہوا تھا اور اس بے وقت کی آمد نے خوف و ہراس کے جذبہ کو اور زیادہ تیز کردیا تھا۔

پھر وہ لوگ یہ بھی سن چکے تھے کہ موٹر کار پکی سڑک پر کھڑی ہوئی ہے وہ پرشوتم کو ضلع کا حاکم سمجھتے تھے اور اس بات کو سب جانتے ہیں کہ سرکاری عہدہ داروں کا وقار جبر و خوف ہی کے سہارے قائم ہے۔ عہدیداروں سے پبلک محبت نہیں کرتی، خوف کے ستونوں پر ہی تو انتہائی کھوکھلے اور کمزور ستونوں پر ڈسپلن کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ مجھے ان غریبوں کی اس حالت پر ترس آرہا تھا میں جلد سے جلد ان پر یہ بات ظاہر کردینا چاہتی تھی کہ

ہم مسافر ہیں، تمہارے یہاں ایک رات ٹھہرنے کے لئے آئے ہیں۔
مکھیا دوڑتا ہوا مکان گیا اور وہاں سے میلی سی ایک دری لے کر آیا جو چارپائی پر بچھا دی گئی۔ میں اور پرشوتم چارپائی پر بیٹھ گئے۔ پرشوتم نے مکھیا کو تفصیل کے ساتھ اپنی سرگزشت بلکہ بپتا سنا دی۔
گاؤں والوں نے پرشوتم سے باتیں سن کر اطمینان کی سانس لی، خوف کا مگر وہ پردہ چاک ہو چکا تھا، اور محبت کی چاندنی نکل آئی تھی۔ دو آدمی ہماری موٹر کی حفاظت کے لیے بھیجے گئے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس گاؤں میں نہر کا ایک ملازم رہتا ہے۔ جس کے پاس سائیکل ہے۔ اس شخص کو پرشوتم نے خط دے کر شہر بھیجا۔ اور مکھیا نے کھانا تیار کرایا۔ میں اور پرشوتم بہت بھوکے تھے تھوڑی دیر میں کھانا آگیا۔ ارہر کی دال جس پر دو دو انگل گھی کھڑا ہوا تھا۔ آم کا آچار، گیہوں اور جو ملے ہوئے آٹے کی موٹی موٹی روٹیاں۔ گرم دودھ جس میں گڑ پڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔
پرشوتم نے ڈکار لی۔ میں نے اس پر کہا۔ "پرشوتم! اندر سے "No Admission" بلکہ No Vacancy کی آواز آرہی ہے۔ اب تیار کیلئے رحم کرو کب تک کھائے جاؤ گے۔
پرشوتم نے خفیف ہو کر ہوتا ہوا پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ پھر کھانا کھا کر دو دو چار چار گھونٹ دودھ پیا، اس پر مکھیا اصرار کرنے لگا۔
"بابوجی! پوری گرمی دودھ کی بنی پڑے گی۔ اس میں دودھ ہی کتنا ہے ———" مکھیا کے اصرار پہ تھوڑا دودھ اور پیا ———
"بابوجی! آپ چلم تو نہیں پیتے" گاؤں کے ایک آدمی نے دریافت کیا
"نہیں بھئی! میں حقہ کا عادی نہیں ہوں، تم میرے لئے تکلیف نہ کرو، میں سگرٹ پیا کرتا ہوں وہ میرے پاس بہت سے موجود ہیں" ——— پرشوتم نے جواب دیا۔
ہم دونوں کے لیے چوپال کے چبوترے پر دو بڑے بڑے پلنگ بچھائے گئے، پلنگوں پر دریاں اور تکیے لگائے گئے۔ کھدر کی موٹی موٹی چادریں اوڑھنے کے لیے دی گئیں۔ ہم پلنگوں پر لیٹ گئے۔ تو گاؤں والے چلے گئے۔ مکھیا نے اپنی چارپائی چوپال کے نیچے راستہ میں بچھائی، غالباً ہماری خبرگیری اور حفاظت کے خیال سے میں تو اپنے پلنگ پر اطمینان کیساتھ لیٹ گئی مگر پرشوتم کروٹیں بدلنے لگا
"پرشوتم! تم بے چین نظر آرہے ہو، کیا کوئی تکلیف ہے!" میں نے اپنے پلنگ پر لیٹے لیٹے دریافت کیا۔
"پتلون ذرا تنگ اور کسی ہوئی ہے، کھل کر اور بے تکلف ہو کر لیٹا نہیں جاتا" پرشوتم نے جواب دیا۔
"تو پھر کسی گاؤں والے سے دھوتی اور چادر مانگ لیجئے" میں نے کہا۔
"نہ مجھے چاہے نیند نہ آئے اور رات بھر اسی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جائے تو بھی گاؤں والوں سے دھوتی یا چادر نہ مانگوں گا ان لوگوں کا، ان لوگوں نے ویسے ہی ہمکو احسان اور مسافر نوازی کے بوجھ سے دبا دیا ہے" پرشوتم میری طرف کروٹ لیکر بولا
"آپ کہیں تو میں اپنی ساری کا ایک حصہ پھاڑ کر آپ کی مدد کروں، آپکو کسی طرح نیند آجائے" ——— میں بولی۔
"شانتا! تم نے پھر مذاق شروع کر دیا۔ میں نے اس بات کا خوب اندازہ کیا ہے کہ تکلیف اور پریشانی کیوقت تم خوب مذاق کرتی ہو۔ یہ تو وہی ہوا کہ ؎ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری" پرشوتم جواب دیکر خاموش ہو گیا۔
میری آنکھوں میں نیند آرہی تھی۔ میں نے پرشوتم کے عتاب آمیز سکوت سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ مثل ہے کہ سولی پہ آئی نیند تو اس سخت پلنگ پر لیٹتے ہی مجھے نیند آگئی، میں بہت دیر تک بےخبر سوتی رہی۔ کسی ایرانی شاعر نے کہا ہے۔ ع

چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک

بالکل یہی عالم نیند کا ہے، نیند آنے کے بعد گداز و نرم مسہری اور خاک کا فرش دونوں برابر ہو جاتے ہیں، اچھے، بُرے اور خوب و ناخوب کے یہ سارے امتیازات ہوش اور بیداری کے دم سے ہیں، خواب و بیخودی اس قسم کے امتیازات کو باقی نہیں رکھتی، اسی حقیقت کو کسی شاعر نے اپنے الفاظ میں ظاہر کیا ہے ؎

ہوش جب آیا تو یہ جانا قیامت آگئی
زندگی میری جبھی تک تھی کہ میں غفلت میں تھا

میں بہت دیر تک غافل سوتی رہی۔ لیکن کتوں کے شور سے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا دودھ جیسی چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ چوپال کے سامنے درختوں کی ڈالیاں سر جھکائے بیٹھی ہیں۔ اور چوپال کے الاؤ کے پاس ایک کتا اس طرح سو رہا ہے کہ کتے جب بھونکتے ہیں تو وہ بھی لیٹے لیٹے ان کی آواز میں آواز ملا دیتا ہے مگر اپنی جگہ سے اٹھنے کا نام نہیں لیتا، گاؤں پر سکوت کی حکومت تھی، البتہ کبھی کبھی کتے اس

سکوت کو مکدر بنا دیتے تھے، بابیلوں اور بھینسوں کی گردنوں میں بندھے ہوئے گھنگروؤں اور ٹالوں کی آوازیں تھوڑی بہت بیدار، کہ شنوت دیتی تھیں۔ پرشوتم بھی خوب گہری نیند سو رہا تھا۔ میں اس اطمینان بخش سکوت میں پورا پورا لطف حاصل کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ہنگاموں سے دور، اطمینان، سکون اور سادگی کے آغوش میں لیٹی ہوئی، فطرت کا انتہائی قریب سے مطالعہ کر رہی ہوں، تھوڑی دیر کیلئے میری لوح خیال بالکل سادہ ہو گئی تھی، تم ماضی اور اندیشہ فردا مجھ سے کوسوں دور تھے، میری دنیا غم اور مسرت سے بالکل الگ تھلگ تھی، اس عالم میں چند لمحے بھی گزرنے پائے تھے کہ پرشوتم نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا:۔

"شانتا! تم جاگ رہی ہو؟"

پرشوتم کی آواز نے میری روحانی دنیا کا بنا بنایا نظام بگاڑ دیا، فطرت نے جو فلمی پردہ مجھے دکھایا تھا وہ یک بیک میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گیا اور میری لوح خیال کے تمام نقوش پھر سے ابھر آئے، مجھے ایسا ہونے کا سچ مچ بڑا افسوس ہوا، پرشوتم اپنے پلنگ سے اٹھ کر میری چارپائی پر بیٹھ گیا، میں بھی اس کے آتے ہی ساری سنبھال کر بیٹھ گئی۔

"شانتا! تم لیٹی رہو، کیوں اٹھتی ہو۔" پرشوتم نے مجھ سے کہا۔

"میرا جی بیٹھنے کو چاہتا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"شانتا! برا نہ مانو تو ایک بات کہوں"۔ ـــ پرشوتم میری طرف خوب غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میرا دماغ تھوڑا ہی پھر گیا ہے جو اچھی خاصی باتوں کو برا مانوں گی، اور تم بری بات مجھ سے کہہ ہی نہیں سکتے، اس کا مجھے اطمینان ہے"۔ ـــ میں نے کہا۔

"چاندنی میں تمہارا چہرہ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے، کاش! تم اپنے کو میری نگاہ سے دیکھ سکتیں، اور ہاں مجھے تو چاندنی پر رشک بلکہ غصہ آ رہا ہے کہ وہ تمہارے رخساروں کو بیباکانہ چھو رہی ہے، اس بات کا حق تو کسی اور کو پہنچتا ہے"۔ ـــ پرشوتم تیز سانسوں کے ساتھ بولا۔

"پرشوتم! تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو، چاندنی، ہوا، اجالا، اندھیرا، ہر چیز اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ دنیا کا کوئی جاندار ان کی زد سے نہیں بچ سکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ چاندنی بے روح ہے، اس میں کوئی شعور نہیں۔ پھر ایسی چیز کے مقابلہ میں تمہارا خم ٹھونک کر لڑنے کے لیے کھڑا ہو جانا کھڑا ہو جانا کونسی عقلمندی ہے، یہ تو وہی بات ہوئی کہ "آبیل مجھے مار" دنیا تو ہوا سے لڑنے والے کو پاگل بتاتی ہے اور تم ہوا سے نہیں چاندنی سے لڑتے ہو"۔ میں نے قدرے مسکرا کر آخری فقرے ادا کیے۔

"شانتا! تم اس منزل سے قطعاً نا آشنا اور یکسر ناواقف ہو، کاش! تمہیں خبر ہوتی کہ:۔ ؎

باسایہ ترا نمی پسندم ٭ عشق است ہزار بدگمانی

محبت میں در و دیوار، پانی، چاند، ستارے سب کے سب رقیب نظر آتے ہیں، بات یہ ہے کہ محبت ذرا سی شرکت اور رقابت کو بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ محبوب کے گیسوؤں کو ہوا سے ہلتا دیکھ کر عاشق کو سچ مچ ہوا پر غصہ آتا ہے وہ گیسوؤں کے ساتھ گستاخی کر رہی ہے، محبت کرنے والے کی ذہنیت عام آدمیوں کی ذہنیتوں سے بہت بلند ہو جاتی ہے، یہی سبب ہے کہ دنیا نے اہل محبت کو ہمیشہ دیوانہ، مجنوں اور جانے کیا کیا سمجھا ہے"۔ پرشوتم نے جواب دیا۔

"تو صاحب ایسی فلسفیانہ قسم کی محبت کو تو میرا دور ہی سے سلام قبول فرمائیے، ارباب محبت اگر واقعی پاگل ہوتے ہیں تو مجھے تو مجھے پاگلوں سے ڈر لگتا ہے، اور اگر خدانخواستہ تم بھی اسی مرض میں مبتلا ہو تو اپنا علاج کراؤ، یہ مرض بڑھ گیا، تو تم جوش رقابت اور شدت محبت سے بے تاب ہو کر، راہ چلتوں کے اینٹ اور پتھر مارا کرو گے، نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہارے لونڈے گلیوں میں تمہارے پیچھے تالیاں بجائیں گے۔ اور تم اول فول بکتے پھرو گے، پاگلوں کے کوئی سینگ تھوڑی ہوتے ہیں"۔ ـــ میں نے قدرے سنجیدگی کیساتھ کہا۔

"شانتا! اگر میں تمہاری حریم ناز میں بے تکلف ہوتا تو تمہارا منہ چوم لیتا، تمہارے نشتر دوسروں کے مرہم سے اچھے ہیں، ایشور کی قسم تمہاری گالیاں اوروں کی تعریفوں اور دعاؤں سے کہیں بڑھ کر ہیں میرے لئے ـــ تم تم ہی ہو! کاش! میری آنکھوں کی زبان ہوتی۔ اور وہ جو کچھ دیکھ رہی ہیں اسے ٹھیک طور پر بیان کر سکتیں ـــ"۔ پرشوتم میری طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"پرشوتم! سنبھل کر بیٹھو، بلکہ میں تو کہتی ہوں اپنے پلنگ پر چلے جاؤ، کوئی اس طرح ہم دونوں کو دیکھ لیگا تو کیا کہے گا، یہ گاؤں ہے کلب گھر نہیں ہے، یہاں کے لینے والے بڑے غیر تمند ہوتے ہیں وہ اپنی بات کے لیے سر کٹا دیتے ہیں" میں نے ذرا تیزی کیسا تھ جواب دیا۔ اور پرشوتم میرے پلنگ سے اُٹھ کر اپنی چارپائی پر جا بیٹھا۔ پرشوتم میری مرضی کے خلاف کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا، اُسے یقین تھا کہ میں اس کی ہوں اور ایک دن وہ میرا شوہر بن کر رہیگا اُس کے جذبات کی کشتی اُس طوفانی موج کی منتظر تھی جسے دو زندگیاں ملکر پیدا کرتی ہیں اور دنیا جس کو شادی کے نام سے پکارتی ہے

گاؤں کی صبح اور شہر کی واپسی

صبح ہوئی، گھونسلوں سے پرندوں کے پروں کے پھٹ پھٹانے کی آوازیں آئیں اور پرشوتم ٹہلنے کے لیے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے، کمسن بچے گاتے بھینسوں کو چرا رہے تھے، گھاس کچھ کچھ اوس میں بھیگی ہوئی تھی، ہم دونوں سیر کرتے ہوئے دور نکل گئے۔ یہاں تک کہ خوب دھوپ پھیل گئی جنگل ہل چلانے والوں کے گیتوں، بچوں کے شور اور ڈھور ڈنگروں کی آوازوں سے گونج گیا، ہر چیز بیدار ہو چکی تھی آرام کرنے کی ساعتیں ختم ہو چکی تھیں، اب وہ وقت تھا جبکہ چوٹی سے پسینہ بہہ کر ایڑی تک پہنچ جاتا ہے، ہم دونوں خوب دن چڑھے مکھیا کی چوپال کو واپس ہوئے، ہمارے دیکھنے کے لیے گاؤں کے آدمیوں کی ایک بھیڑ لگ گئی تھی، گاؤں کی عورتیں خاص طور پر مجھے گھونگھٹوں کی آڑ سے دیکھ رہی تھیں، کٹ رکے لہنگے، لال پیلے کرتے، رنگ برنگ کی اوڑھنیاں، کانوں میں خوب بھاری بھاری جھمکے، ہاتھوں اور پیروں میں موٹے موٹے کڑے توانا جسم، صحت مند چہرے بعض لڑکیوں کے شباب کا یہ عالم تھا کہ کرتی کے بٹن ٹوٹے جاتے تھے۔ اُن جوان اور صحیح معنوں میں مست شباب لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے شہر کی وہ مہذب اور تعلیم یافتہ لڑکیاں یاد آگئیں۔ جو شروع سے آخر تک ایک سی رہتی ہیں اور جوانی کی منزل میں پہنچ کر بھی جوان نظر نہیں آتیں، میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ دماغی محنت اور غور و فکر کی شدت جوانی کو پوری طرح ابھرنے نہیں دیتی، اور شباب کا تقاضا افکار کے بارے دبکر رہ جاتا ہے، عورت کو قدرت نے فطرتاً نرم و نازک اور نہایت ہی لطیف و حسین بنایا ہے۔ دماغی ورزش کی شدت سے اُس کی نزاکت جو شباب میں قیامت بن جاتی ہے مفقود اور پامال ہو کر رہ جاتی ہے گاؤں کی عورتوں میں عورت پن پایا جاتا ہے اور وہ صحیح معنوں میں نسائیت کی نمائندگی کرتی ہیں — گاؤں کی عورتوں کے تنقیدی تبصرے کتنے دلچسپ تھے :— "یہ میم صاحب کتنی سندر اور نازک (نازک) ہیں، پھول کی ڈالیوں کی طرح ان کی کلائیاں"— "کتنا موٹا جوڑہ باندھ رکھا ہے انھوں نے، ان کے بال کمر کے نیچے تک لٹکتے ہونگے"۔ "ان کی کلائی پر شیشہ کیسا بندھا ہوا ہے، منہ دیکھنے کا بڑا شوق ہے انکو" "اری سنتی! ان کے جوتوں کو دیکھ، ارے رام رام، ایڑی کتنی اونچی ہے، میں تو ان کو پہن کر ایک قدم بھی نہیں چل سکتی، اور یہ تو کھٹا کھٹ دوڑتی پھرتی ہیں" "ان کا مرد (پرشوتم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بھی بڑا ہی سندر ہے، خوب جوڑی ملی ہے ان دونوں کی" "میم صاحب اور صاحب دونوں بپارسی (فارسی) میں باتیں کرتے ہیں۔ ان کی بولی سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر اُن کے بول کانوں کو بھلے لگتے ہیں" — "اری پرشادی کی ماں! تجھے یہ ایسے ہی پرسند (پسند) ہیں تو ان کیساتھ شہر چلی جا"

غرض بہت دیر تک ہم دونوں پر تنقید کی جاتی رہی، اور ہم اُن کی بھولی بھالی باتوں کو خوب مزے لے لے کر سنتے رہے: پرشوتم اس تصور میں مگن تھا کہ گاؤں والے اُسے میرا شوہر سمجھ رہے ہیں، آدمی خوشی کے معاملہ میں بڑا ہی اوچھا اور کم ظرف واقع ہوا ہے۔

باتوں باتوں میں پرشوتم نے مکھیا سے پوچھا کہ تمھارے گاؤں میں کوئی مدرسہ نہیں ہے، اس پر مکھیا تو خاموش ہو گیا، گاؤں کے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے بڑھکر جواب دیا:— "بابو جی! یہ ہمارے مکھیا جی بڑے بھولے بھالے ہیں آپ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ کہیں زمیندار کے کانوں تک بات پہنچ گئی تو مشکل پڑ جائیگی میں آپ کو سچ سچ بات بتاتا ہوں ہمارے گاؤں میں دو دفعہ مدرسہ قائم ہو چکا ہے، پڑھنے والوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی مگر زمیندار صاحب نے حاکموں سے ملکر مدرسہ کو تڑوا دیا وہ کہتے ہیں گاؤں کے بچے پڑھ کر ہماری برابری کرینگے اور قانون سے واقف ہو جائیں گے، یہ زمیندار ہم گاؤں والوں کو مور کھ اور لٹھ بند رکھنا چاہتا ہے، گاؤں والوں کی جہالت اور ان کے بے پڑھے رہنے ہی میں زمیندار کا فائدہ ہے" — "تم ٹھیک کہہ رہے ہو"— مجمع سے ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

دن کے گیارہ بج چکے تھے، میں اور پرشوتم اپنی روٹیاں چھاچھ کیساتھ کھا کر چوپال کے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں میرے والد اور پرشوتم کے بڑے بھائی آگئے (باقی آئندہ)

کلائی کی گھڑی کو دیکھ کر ۔۔ فائدہ۔

از نجیب بانو ستھی صاحبہ

مغالطہ

خاص برائے مست قلندر لاہور

شملہ کی مسکراتی ہوئی وادیاں ہنستے ہوئے مرغزار، عرش بدوش رفعتیں، حدِ نظر تک وسعتیں، کیف میں ڈوبی ہوئی فضائیں اور ناگن کی طرح بل کھائی ہوئی پیچیدہ راہیں یوں تو ہر اہلِ نظر کیلئے حسن و شباب کے صبر شکن عریاں جلوے لٹاتی رہتی ہیں لیکن ایک شاعر جس کا دھڑکتا ہوا دل عروسِ فطرت کی جبیں کا دمکتا ہوا قشقہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جس کی مچلتی ہوئی نگاہیں شاہدِ فطرت کے گلے کا چمکتا ہوا ہار بن جاتی ہیں جو سورج کی کرنوں میں لاکھوں متبسم نگاہیں اور زمین کے ذروں میں کروڑوں مضطرب دل بیک وقت دیکھ لیتا ہے۔ اس مرکزِ شعر و شباب کے شراب میں ڈوبے ہوئے نظاروں سے کسقدر بیخود ہو جاتا ہے۔ یہ اقبال کا دل ہی جانتا ہے۔ "کالکا" سے ریل تبدیل کرنے کے بعد ہی رقص کرتے ہوئے نظاروں کا طوفانی نشیب و فراز اقبال کو بیخودی کی رو میں بہا لے گیا۔ وہ کافی عرصہ تک بیخود رہا اور خدا جانے کبتک بیخود رہتا اگر فیروز اسے ہوشیار نہ کرتا۔

فیروز نے اقبال کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا اقبال تم نہ جانے کیوں کھوئے ہوئے سے ہو رہے ہو۔ دیکھو "تارا دیوی" کا اسٹیشن گذر چکا ہے۔ سمر ہل آنے والا ہے۔ یہاں کتنی نگاہیں ہماری تمہاری منتظر ہونگی۔ ممکن ہے ہمیں یہیں اترنا پڑے ورنہ پھر شملہ جانا پڑیگا۔ بہر حال اسباب درست کر لو۔

اقبال نے ہوش میں آنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہم حدودِ کوچۂ جاناں میں آگئے" اس سفر کی منزل تو قریب ہے لیکن زندگی کا سفر کس منزل پر ختم ہوتا ہے یہ بھی خبر ہے فیروز۔

زندگی افسانہ زندگی کی ہر چیز افسانہ اور پھر خود انسان جس کی ہر نظر افسانہ ہوتی ہے اک بولتا ہوا افسانہ ہے۔ سوچو تو سہی اس ریل میں ہمارے ساتھ کتنے افسانے اڑے ہوئے جا رہے ہیں۔

میں تو ان سر بفلک چوٹیوں اور بعدِ نگاہ تک گہرائیوں کو زندگی کے نشیب و فراز کا افسانہ پڑھتے ہوئے سن رہا ہوں۔ مجھے تو یہ ریل عمرِ رواں کے اسوبِ رفتار کے گیت سنا رہی ہے۔ مجھے تو یہ مرغزار عروسِ فطرت کے شباب کا رومان معلوم ہوتے ہیں۔

فیروز نے قطعِ کلام کرتے ہوئے کہا۔

شاعری ختم کرو اقبال۔ شملہ کچھ دور نہیں وہاں چل کر نظمیں لکھنا۔ دیکھو سامنے کون مسکرا رہا ہے۔

اقبال نے مڑ کر دیکھا۔ رعنائیاں سانس لیتی ہوئی بڑھیں، رنگینیاں انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھیں اور ایک پیکرِ لطیف اقبال کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ کے رفیقِ سفر بہت خشک مزاج ہیں"

"رفیقِ سفر ضرور خشک مزاج ہیں لیکن ہونے والی رفیقۂ حیات کا مزاج رنگین ہے۔ اقبال نے مسکرا کر کہا۔

"آپ واقعی شاعر ہیں" نظر سے نظر ملاتے ہوئے جواب دیا گیا۔

"حسن کی ہمکلامی ایک غیر شاعر کو بھی شاعر بنا دیتی ہے" اقبال نے برجستہ کہا۔

"ایک لطیف تبسم اس کا جواب تھا"

حسینِ انفعال کا مزید مظاہرہ دیکھنے کی خاطر اقبال نے اپنے شکست خوردہ حریف سے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"کس قدر بدقسمت ہے وہ ہستی جس کا مخاطب تصویر کی طرح خاموش اور ناشگفتہ غنچہ کی طرح لب بندرہ کر ابھرتی ہوئی آرزوئے گفتگو کا ہنس ہنس کر خون کرے۔

"جی ہاں اس کی بدقسمتی جسقدر قابلِ افسوس ہے اسی قدر اس کے مخاطب کی خوش قسمتی قابلِ داد ہے کہ وہ خاموش رہکر بھی ایک خاموش رہ کر بھی ایک کامیاب فتح حاصل کر لیتا ہے۔

"آپ کے جواب کا شکریہ۔ اب میں بدقسمت نہیں اپنے تعارف کی تکلیف اور گوارا فرمائیے۔

"مجھے درخشاں جمال کہتے ہیں۔ رسالہ درخشاں کی مدیرہ ہوں۔ والد صاحب بریلی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ آزادیٔ نسواں کی تبلیغ میرا دلچسپ مشغلہ ہے اور

مردوں کے ظلم و تشدد کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا میرا محبوب شغل ہے۔

"تو گویا کلکدۂ حیات کی آپ باغی تیتری ہیں۔"

"کچھ بھی سمجھئے بہرحال معصوم کلیوں کو گلچین کے فولادی پنجوں سے تابمقدور محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا میرا رنگین مشغلہ ہے"

"تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ کے گلخانۂ ہستی میں کسی گلچین کو ابھی باریابی کی عزت نہیں۔"

"جی نہ عزت نصیب ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔"

اقبال کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ فیروز بول اٹھا۔

"سمرل آگیا اقبال یہاں آفاق اور ان کے متعلقین ہمارے منتظر ہونگے۔"

"کیا کہا آفاق کون آفاق۔ کیا آفاق سے آپ متعارف ہیں" درخشاں نے دریافت کیا۔

"آفاق میرے قریبی عزیز ہیں ان کے ماموں یہاں ایک اعلیٰ عہدے پر ممتاز ہیں" فیروز نے جواب دیا۔ "اور آفاق ہی کے یہاں مجھے بھی قیام کرنا ہے ان کے ماموں اور میرے والد کے مابین دیرینہ تعلقات ہیں۔ والد بذریعہ تار انہیں مطلع کر چکے ہیں۔ وہ اسٹیشن پر ضرور آئے ہونگے۔"

اقبال نے درخشاں کی یہ گفتگو سنی اور مسکرا کر فیروز سے کہا۔

"اچھا ہے آپ حضرات اپنے اپنے متعارفین کے یہاں قیام فرمائیے غریب شاعر کا ابھی کہیں نہ کہیں ٹھکانہ ہو ہی جائیگا اور پھر اس شعریت کدہ میں تو شاعر کیلئے ہر ذرہ منزل ہے۔"

فیروز ہنس پڑا لیکن درخشاں نے جواب دیا

"آفاق منزل تو بہت وسیع منزل ہے اور پھر کیا آفاق سے علیحدہ رہ کر شاعر کے جذبات کی پہنائیاں، افکار کی گہرائیاں اور خیالات کی بلند پروازیاں باقی رہ سکتی ہیں۔"

"معاف فرمائیے شاعر کے عالم کی رنگینیاں آپ کے گلکدۂ آفاق کی خزاں آلودہ بہاروں سے کہیں زیادہ کیفیت فزا ہیں وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی ایک علیحدہ دنیا میں رہتا ہے۔" اقبال نے مسکرا کر جواب دیا۔

ریل پلیٹ فارم پر ٹھہر چکی تھی۔ منتظر نگاہیں مایوس ہو کر واپس آرہی تھیں۔ اقبال کے لبوں کا تبسم فیروز کی متجسس نگاہوں کی حیرت اور درخشاں کے گھبرائے ہوئے چہرے کی رنگت ایک دیدنی تماشہ تھا۔ جس نے شورشوں سے معمور لمحات میں کچھ دیر کیلئے خاموش زندگی بھر دی تھی۔

اقبال کا تبسم سمٹ کر الفاظ بنا۔ اور اس نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"کچھ مضائقہ نہیں اگر متعارفین میں سے کوئی صاحب خیر مقدم کیلئے موجود نہیں تو نہ ہوں۔ دیکھئے شملہ کی طرف سے آنے والی ہوائیں آپ کا خیر مقدم کر رہی ہیں۔ ڈھلواں پہاڑوں پر رنگین پودے صف بستہ آپ کی سلامی کیلئے مستعد ہیں۔ سبزہ آپکی قدمبوسی کا متمنی ہے اور راستے آپ کے خرام رنگین کیلئے بل کھا رہے ہیں۔"

فیروز کی محجوب نگاہیں اٹھیں۔ درخشاں کی منفعل نظروں نے ان کا خیر مقدم کیا نگاہوں کے تصادم میں زبان پیدا ہوئی اور وہ ایک دوسرے سے یوں گویا ہوئے

فیروز۔ آفاق کو آنا چاہئے تھا۔

درخشاں۔ کوئی خاص سبب مانع ہوا ورنہ والد صاحب کا تار تو انہیں مل چکا ہوگا۔ بہرحال میں تو یہیں اتروں گی ان کا بنگلہ قریب ہی ہے۔

فیروز۔ (اقبال سے) "کہئے شاعر صاحب کچھ الہام ہوا۔"

اقبال۔ "کسی رئیس کی محفل کا نوکر کیا امیر
خدا کے گھر بھی جائینگے بن بلائے ہوئے"
میری رائے میں تو آپ سب حضرات کو شملہ چلنا چاہئے۔

فیروز۔ محترمہ فرماتی ہیں کہ ان کا بنگلہ قریب ہی ہے۔ اسلئے اگر ہم یہیں اتر پڑیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

اقبال۔ جی ہاں آپ کے تو وہ قریبی عزیز ہیں اور محترمہ کے والد اور ان کے ماموں کے مابین خوشگوار تعلقات ہیں اسلئے آپ لوگوں کو حق حاصل ہے کہ آپ اطلاع یا بغیر اطلاع وہاں پہونچ سکیں۔ لیکن میں نہیں جا سکتا یہ میرا فیصلہ ہے۔

فیروز نے اقبال کا ساتھ دیا کیونکہ وہ اقبال کا دوست تھا لیکن درخشاں نے اپنا بستر اور سوٹ کیس سنبھالا۔ اور قلی کو اشارے سے اتارنے کا حکم دیا۔

اقبال کی ہنستی ہوئی نظریں اٹھیں اور درخشاں کی گھبرائی ہوئی نظروں سے نہ جانے کیا کہہ کر واپس آگئیں ریل نے سیٹی دی اور درخشاں نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا اور یہ کہتے ہوئے رخصتی سلام کیا۔

"اقبال صاحب مجھے آپ سے مل کر درحقیقت مسرت ہوئی ہے۔ میں انشاء اللہ پھر بھی ملنے کی کوشش کرونگی

"مال روڈ" پر تو شام کی تفریح یقینی ہے اور فیروز صاحب تو آفاق سے ضرور ہی ملیں گے۔

"جی ہاں آفاق سے کہہ دیجئے کہ وہ لوگ شملہ چلے گئے ممکن ہو تو شام کو مل لیں۔

شملہ آنے کے بعد اقبال نے شملہ کی سیر کا مکمل پروگرام بنایا۔ دن بھر سیر کی لیکن شام کو مال روڈ پر عمداً نہیں گیا اور فیروز کو مصلحتاً تنہا بھیجا۔

اقبال فیروز کی واپسی کا منتظر تھا۔ نگاہیں مضطرب، دل بے چین، امیدیں بیقرار اور آرزوئیں بے کل، دل سمٹ کر شوق بن گیا اور کہتا تھا کہ چل۔ خودداری نے مصلحت کا لباس پہن رکھا تھا اور شوق کی راہ میں سنگ راہ بن کر کہہ رہی تھی کہ جب تک وہ خود نہ آئیں جانا بیسود ہے۔

آخر خدا خدا کر کے طلسم انتظار ٹوٹا۔ فیروز معہ آفاق کے واپس آیا۔

آفاق ایک خوبصورت تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ دراز قد، کھلتا ہوا رنگ، بیضاوی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں جھکی جھکی نظریں ہونٹوں پر ہر وقت ہنسی، لباس میں مغربیت لیکن گفتگو مشرقی، گویا مغربی اور مشرقی تہذیب کا اک مشترک نمونہ۔

فیروز نے آتے ہی آفاق سے کہا۔ آپ ہیں میرے دوست اقبال جن کی آپ تعریف سن چکے ہیں۔ اور ہاں اقبال آپ میرے قریبی عزیز مسٹر آفاق احمد صاحب آفاق ہیں جن کا سمر ہل پر ہم لوگوں کو انتظار تھا۔ دو ہاتھ بڑھے۔ دو نگاہیں اٹھیں۔ مصافحہ ہوا اور نظریں ملیں ایک نے دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی۔

اقبال نے کہا۔ "رسماً نہیں حقیقتاً میں اک کیف محسوس کر رہا ہوں انتظار کے بعد جو چیز بھی ملتی ہے۔ وہ کیف انگیز ہوا کرتی ہے اور یوں بھی آپ کی نظروں کی درخشانی آپ کی خوش مزاجی ہی کی دلیل نہیں بلکہ ایک شاعر کیلئے دعوت شعر بھی ہے"

آفاق نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں کہ باوجود کوشش کے اسٹیشن پر صحیح وقت پر نہ پہونچ سکا۔ غائبانہ آپکی بہت کچھ تعریف سن چکا ہوں۔ ہماری ایک نووارد مہمان جن سے آپ یہاں متعارف ہو چکے ہیں۔ آپکی منتظر ہیں میں درخواست کرونگا کہ آپ سمرہل تشریف لے چلیں۔ وہ لمحات نہایت قیمتی سمجھے جائینگے جو آپکی رنگین معیت میں گذرینگے۔"

"مسافر نوازی کا شکریہ۔ انشاء اللہ کل شام حاضر آؤنگا۔" اقبال نے کہا۔

"تو آج رات سنیما دیکھئے میں درخشاں کو بھی لئے آتا ہوں۔ آفاق یہ کہہ کر جواب کا منتظر رہا۔

"کیا وہ آنا پسند کرینگی؟" اقبال نے پوچھا

"کیوں وہ آنا کیوں پسند نہیں کرینگی شاید آپ کو علم نہیں کہ وہ آزادی نسواں کی بہت زبردست حامی ہیں۔ بی اے کرنے کے بعد انہوں نے اپنی تمام خدمات خواتین مشرق کی بیداری کیلئے وقف کر دی ہیں وہ آئینگی اور ضرور آئینگی۔" آفاق نے جواب دیا۔

"درست ہے شملہ تک اُن کا تنہا آنا ہی ان کے آزاد طبع ہونے کا ثبوت ہے" اقبال نے مسکرا کر کہا۔

فیروز ہنس پڑا۔ آفاق کچھ منفعل سا ہو گیا۔

سنیما ہال میں اقبال اور درخشاں کی پھر ملاقات ہوئی۔ دیوکا رانی کا تیار کیا ہوا فلم "پنر ملن" جو بمبئی ٹاکیز نے ریلیز کیا تھا پردہ سیمیں پر جاذب نظر بنا ہوا تھا۔

درخشاں نے اقبال کو دیکھتے ہوئے کہا۔" دیوکا رانی نہایت کامیاب ایکٹرس ہے اور اب تو اس نے "پروڈیوسر" کا کام انجام دیکر ثابت کر دیا کہ عورتیں شاہراہ ترقی پر مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔

اقبال نے جواب دیا۔" بجا ہے دیوکا رانی حقیقتاً ایک کامیاب ایکٹرس ہے اس کے آرٹ کا ہر شخص معترف ہے بحیثیت ایک ایکٹرس اس نے ہندوستانی فلموں کو کافی ترقی دی ہے لیکن یہ کھیل کے خاتمہ پر بتایا جا سکیگا کہ وہ بحیثیت پروڈیوسر بھی کامیاب ہیں یا ناکامیاب تقلید کرنا کمال نہیں عورتوں کو قوت اجتہادی سے کام لینا چاہئیے وہ مردوں کی تقلید غلط کے خبط میں مبتلا ہیں۔

"تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مرد قائد ہیں اور عورتیں پیرو" درخشاں نے بگڑ کر کہا۔

معنی اور تاویلات آپ تلاش کرتی رہئیے۔ اظہار واقعہ میں نے کر دیا ہے۔" اقبال نے ہنس کر جواب دیا۔

کھیل میں سنیہہ پربھا ہیروئن کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ دیوکا رانی نے اسے ایک حسین بھکارن کی صورت میں پیش کیا تھا جو اپنے دلآویز رقص اور سامعہ فریب نغمات کے ذریعہ تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر رہی تھی۔

اقبال نے درخشاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "عورتیں درحقیقت قابل ہمدردی ہیں تعلیم یافتہ خواتین بھی اپنی پستیوں کا خیال نہیں رکھتیں۔ دیوکا رانی ہی کو دیکھئے اس

نے عورت ہوتے ہوئے صنفِ نازک سے یوں دربدر بھیک منگوائی ہے جو پستی ہمت کی دلیل ہے۔

"آپ یہ نہیں دیکھ رہے کہ وہ بھیک مانگ کر ایک توانا مرد کی پرورش کر رہی ہے۔" درخشاں نے ہنس کر کہا۔

"جی ہاں عورتیں بھیک ہی مانگ کر پیٹ پال سکتی ہیں۔ اور تو ان سے کچھ ہو نہیں سکتا۔ اور اس میں بھی قدم قدم پر مردوں کی محتاج ہیں۔ دیکھیے گانے لکھ لکھ کر مرد ہی دے رہا ہے جس سے آمدنی میں کافی اضافہ ہو رہا ہے۔

"تو یوں کہیے کہ دریوزہ گری کا اصل سبب مرد ہی ہے۔"

"جی ہاں ایک بے بس و بے یار عورت [illegible] سینہ پہ کھاتی اسے (زندگی کی تعمیر کیلئے عالم اسباب میں متجسس طریقہ پر کار بند نہ ہو سکی تو مجبوراً اسے گانا ہی سکھا یا گیا کہ وہ اپنا پیٹ پالن کر سکے۔

"بحث میں کافی گنجائش ہے کھیل دیکھیے۔ درخشاں نے لاجواب ہوتے ہوئے کہا۔

کھیل ختم ہونے کے بعد اقبال نے دیلو کارنی کو بحیثیت ہیڈ ویسٹرنا کامیاب ثابت کیا اور درخشاں اسکی تعریف کرتی رہی۔

آفاق اور درخشاں سمرہل واپس گئے اور فیروز اور اقبال اپنی قیام گاہ پہ لوٹے۔ راستہ میں درخشاں نے آفاق سے پوچھا۔

"آفاق اقبال کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

اقبال ایک خوددار اور با وضع شخص ہے۔ مشرقیت کا دلدادہ اور حسن کا پرستار ہے۔

"میں سمجھتی ہوں کہ وہ عورتوں کی آزادی کے خلاف ہیں وہ عورتوں کو مجبور محض دیکھنا چاہتے ہیں۔

"ممکن ہے ایسا ہو۔ میں نے اس مسئلہ پر ابھی ان کے خیالات معلوم نہیں کئے ہیں ہاں وہ مغربیت کے ضرور مخالف معلوم ہوتے ہیں۔"

اور میں اس مرد کے مخالف ہوں جو عورت کو مجبور و محبوس دیکھنا چاہتا ہے شاید اقبال کو ابھی تعلیم یافتہ خواتین سے واسطہ نہیں پڑا کاش وہ شملہ کے دوران قیام میں میرے ساتھ رہتے تو پھر انہیں عورت کی بلند نظری اور رفعت تخیل کا علم ہوتا۔

"یہ کوئی ناممکن بات ہے کل سے وہ انشاء اللہ ساتھ ہی رہینگے۔

ادھر اقبال فیروز سے کہہ رہا تھا۔

"فیروز درخشاں ذہین ہے حسین ہے، تعلیم یافتہ ہے۔ لیکن مغربیت کی بری طرح دلدادہ ہے۔ اس کی نظر میں مرد کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے اس کفر کو توڑا جائے اور مرد کی عظمت کا اسے احساس دلایا جائے۔

"اقبال تمہیں بھی بیکار کی فکر ہے۔

"ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" فیروز نے جواب دیا۔

"یہ صحیح ہے لیکن بنظر اصلاح ادھر توجہ کرنی پڑیگی" اقبال نے ہنس کر کہا۔

دوسرے دن دوپہر ہی کو آفاق کی مسکراتی ہوئی نظریں اقبال کو اس کے وعدہ کی یاد دلا رہی تھیں۔ آفاق مسکرا رہا تھا۔ فیروز ہنس رہا تھا۔ اور اقبال کسی خاص خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ آفاق اٹھا فیروز نے اس کا ساتھ دیا اور اقبال ان کے پیچھے پیچھے چلا۔

سمرہل پہونچکر درخشاں کی موجودگی کے احساس نے اقبال کی قوت شعری کو بیدار کیا۔ کوٹھی کا وہ کمرہ جہاں بیٹھ کر چائے پی جا رہی تھی۔ رعنائیاں بکف رنگینیاں در کنار پھولوں سے ڈھکا ہوا خوشبوؤں سے معطر سامان شعر و شباب سے مزین جنت ارضی کا ایک مہکا ہوا حصہ تھا۔ جس کے سامنے دو رویہ سرو کی قطاروں کے مابین ایک نہر بہہ رہی تھی جو تسنیم و سلسبیل کی کمی کو پورا کر رہی تھی۔

اقبال نے اس رنگین ماحول سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہوئے فی البدیہہ ایک قطعہ کہا

سراپا حسن فطرت بن گئی ہے
حقیقت ہی حقیقت بن گئی ہے
بہاریں ہی بہاریں ہیں نظر میں
نظر بھی گویا جنت بن گئی ہے

اقبال کو شعر کہتا ہوا دیکھ کر درخشاں نے مسکرا کر کہا کچھ اور۔

اقبال نے فوراً ہی دوسرا قطعہ پیش کیا۔

شگفت حسن فطرت دیکھتا ہوں
طراوت ہی طراوت دیکھتا ہوں
جو تیری مسکراہٹ سی کھلا ہے
میں اس غنچہ کی قسمت دیکھتا ہوں

درخشاں نے نسوانی حیا کی جو اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی نظر انداز کرتے ہوئے اقبال کو داد دی اور دل کھول کر داد دی اقبال کا منہ دیکھ رہا تھا اور فیروز فاتحانہ ہنسی ہنس رہا تھا۔

چائے کے بعد سمرہل کی سیر کیلئے پروگرام بنا۔ درخشاں نے اظہار کسل کرتے ہوئے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ فیروز اور آفاق اصرار کر رہے تھے لیکن اقبال یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"صنف نازک پھر صنف نازک ہے

یہ ضعف قویٰ کا ساتھ نہیں دے سکتی آپ بیکار انہیں تکلیف نہ دیں۔

درخشاں کی محجوب نظریں اُٹھیں وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اقبال نے کہا۔

"مذاق نہیں حقیقت یہ ہے کہ آپکو تکلیف ہوگی۔ آپ یہیں تشریف رکھیں ہم لوگ ابھی واپس آتے ہیں"۔

شام کا وقت تھا۔ عروس فطرت اپنی جبیں کے سنہری اور آتشیں قشقہ کو جو دن بھر کے گرد و غبار سے مکدر ہو چکا تھا ایک لطیف اور متبسم سیمیں قشقہ سے بدلنا چاہتی تھی۔ شورشوں سے گھبرائے ہوئے سورج کی تمنا تھی کہ سواد مغرب کی پُرسکون آغوش میں کچھ دیر اطمینان کی نیند سو رہے۔

ڈھلوان پہاڑیوں پر درختوں کے سایے دامن سمیٹے ہوئے سکون کی تلاش میں محو گریز تھے۔ سر بفلک پہاڑیاں سبز شالیں اوڑھے ہنگام استراحت کی متمنی تھیں فیروز اور آفاق سیر کر رہے تھے اقبال شعریت میں ڈوبا ہوا اقبال شعر کہہ رہا تھا ؎

بلا سے درختوں میں چھپ جائے سورج
مجھے رخ دکھا کر نہ بھڑکائے سورج
مرے سامنے گر جھکنا ہے اسکو
مرے چاند کو ساتھ لے آئے سورج

درختوں میں سورج چھپا جا رہا ہے
نہ جانے یہ کیوں دل میں شرما رہا ہے
مرے چاند آ جا ذرا مسکرا جا
اندھیرا سا بڑھتا چلا جا رہا ہے

آفاق نے سنا، شعر سنا اور ہنسکر بولا۔

"چاند اور اقبال کا چاند"۔

فیروز نے فوراً حملہ پورا کیا۔ "بدقسمتی سے جو درخشاں نہیں"۔

اقبال کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ہنس کر کہنے لگا

"خود کردہ را علاجے نیست"۔

سیر سے واپس آنے کے بعد کھانا کھایا گیا۔ اور علی الصباح آبشار دیکھنے کیلئے طے ہوا۔ اقبال نے رات کو ایک نظم لکھی جو صبح آبشار پر سنائی گئی۔ اس نظم کا عنوان تھا "ہم تم"

فیروز و آفاق دائیں بائیں تھے اقبال درمیان میں اور درخشاں سامنے اقبال نظم پڑھ رہا تھا۔ فیروز و آفاق داد دے رہے تھے۔ اور درخشاں خاموش تھی۔

اقبال نے دوران نظم میں درخشاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ؎

امیدوں کے لے لیکے رنگین سہارے
محبت کی جنت بسا جائیں ہم تم
نگاہوں سے کر کر کے زریں اشارے
جوانی کی قسمت جگا جائیں ہم تم

ہنستی ہوئی نظریں اٹھیں اور اقبال کی جوان شاعری کی داد ملی اقبال نے پھر پڑھا

بہاریں جانے پھر آئیں آئیں
بہاروں میں آؤ سما جائیں ہم تم
زبانیں یہ نغمات گائیں نہ گائیں
نظر سے یہ نغمات گا جائیں ہم تم

متبسم نظریں پھر اٹھیں لیکن اب نظروں میں زبان پیدا ہو چکی تھی درخشاں نے کہا "حقیقت بہت بے نقاب ہو چکی ہے ماحول کا خیال رکھئے"۔

اقبال نے کہا صرف دو شعر اور ہیں سن لیجئے ؎

محبت کا اعلان کر دیں درخشاں
ہر اک دل کو دشمن بنا جائیں ہم تم
رہے نام اپنا ہمیشہ فروزاں
اندھیرے نحوس کے مٹا جائیں ہم تم

نظم ختم ہو چکی تھی لیکن اقبال سے آخری دو شعر بار بار پڑھوائے جا رہے تھے۔

درخشاں نے ایک عجیب انداز میں مسکرا کر اقبال سے کہا۔ "اقبال صاحب آپ کو شیر مارنے تو خوب آتے ہیں"۔

"تو آپکا یہ مطلب ہے کہ شیرنی بھی مارنی چاہئے"۔ اقبال نے ہنسکر جواب دیا۔

"جی ہاں شیر سے زیادہ شیرنی غضبناک ہوتی ہے"۔ نظر سے نظر ملاتے ہوئے درخشاں نے کہا۔

"بجا ہے خصوصاً شکست خوردہ شیرنی لیکن اقبال ساتھ ہو تو غضبناک شیرنی بھی کچھ نہیں کر سکتی"۔ اقبال نے متین بنتے ہوئے جواب دیا۔

درخشاں ہنس پڑی۔ اور پاس ہی سے خودرو پھولوں کی ایک کلی توڑ کر ہتھیلی پر رکھتے ہوئے اقبال سے کہنے لگی۔

"ہاں صاحب شیر ماریئے"۔

"شیر نہیں شیرنی فرمایئے"۔

"خیر کچھ بھی کہئے اقبال نے فی البدیہہ ایک رباعی کہی۔

آغوش محبت کو جو پھیلاتی ہے
معصوم کلی ہی پھول بن جاتی ہے
ظالم دل بوس کو مسل کے نہ توڑ
دل میں کونین کی وسعت سی سما جاتی ہے

درخشاں کی نیچی نظروں نے داد دی۔ اقبال کے معنی خیز تبسم نے شکریہ ادا کیا۔ اور فیروز و آفاق کے قہقہوں نے رومان کی تکمیل کی۔

اقبال نے کہا۔ "شکست"۔ درخشاں نے کہا۔ "ابھی نہیں۔ آبشار پر ایک نظم ہوئی

چاہیئے لیکن رومانی نہیں اصلاحی۔

اقبال نے کہا۔ بہت خوب آپ شاعر کی طبیعت سے اس کے موجودہ ماحول کے خلاف کام لینا چاہتی ہیں۔ لیکن خیر آپ کا حکم ہے تعمیل کی جائیگی۔

اقبال نے نظم لکھی اور آفاق نے پڑھی آخری شعر تھا۔

ایکدن پانی کی ندیاں کہکشاں بن جائینگی
بستیاں میرے وطن کی آسماں بن جائینگی

درخشاں نے داد دی اور اس انداز سے دی کہ اقبال بھی کچھ غرور سا محسوس کرنے لگا۔ شام کو پھر سینما دیکھا گیا۔ پنچولی آرٹ پروڈکشن کا فلمی شاہکار "خزانچی" ریلیز ہو رہا تھا۔

اقبال نے بیٹھتے ہی درخشاں سے کہا۔ "فرمایئے آج کس کی تعریف ہوگی۔ رمولا اور منورما، مادھوری اور آشا کا پارٹ ادا کر رہی ہیں۔ غالباً آپ تو انہیں کی تعریف کرینگی"۔

"جی ہاں! میں ہی تعریف نہیں کرونگی آپ کو بھی آج عورت کی خودداری کا اقرار کرنا پڑیگا"۔ درخشاں نے جواب دیا۔

"میں تو آشا ہی پر عورت کی خودداری کا اقرار کر چکا ہوں"۔ اقبال نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

درخشاں کچھ محجوب سی ہوگئی۔ لیکن اپنی خجالت کو آواز کی لغزش میں چھپاتے ہوئے بولی، "دیکھیئے۔ مادھوری کنول سے کسقدر متنفر ہے۔ ہر چند منع کرتی ہے کہ میرے ساتھ نہ آیئے میرے ساتھ نہ چلیئے۔ لیکن کنول ہیں کہ پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ مرد واقعی بہت حریص ہوتے ہیں"۔

اقبال نے مسکرا کر کہا۔ "خدا نے عورت کی تخلیق کچھ ایسے ہی اجزائے لطیف سے کی ہے کہ مرد کو اس کے لئے حریص ہونا ہی پڑتا ہے لیکن یاد رکھیئے عورت رقیق القلب ہوتی ہے وہ فطرتاً مرد سے زیادہ خوددار نہیں ہوسکتی اس کا ثبوت اس کھیل ہی میں آپ کو ملے گا۔

درخشاں نے کھیل دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر مادھوری کی خودداری کو اس میں شکست ہوگئی تو میں بھی عورت کی شکست تسلیم کر لوں گی"۔

اقبال نے کہا "یہ شرط نہ لگایئے آپ ہار جائیں گی"۔

درخشاں نے کہا "کچھ بھی ہو۔ میں زبان دیتی ہوں"۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد دیکھا گیا کہ مادھوری کنول کا دم بھر رہی ہے۔ کنول سگریٹ سلگا کر ایک بان سے آگ لگا رہا ہے اور مادھوری دیا سلائی میں پھونک مار کر اک بان سے آگ بجھا رہی ہے۔

کھیل نے جذبات میں آگ لگا دی۔

اقبال نے بیخودی میں کہا "شکست"

درخشاں نے بے ساختہ کہا "منظور"۔

کھیل ختم ہوگیا۔ کنول کا سیب کو دل کی شکل میں تراشنا اور اس میں چاقو لگا کر چلا جانا اقبال کو پسند آیا۔ درخشاں نے نفسیاتی اعتبار سے مادھوری کے بالوں میں کنول کے لگائے ہوئے پھول کا غیر وابستہ طور پر بکھر جانا اور پھر اس کی دنیائے محبت میں ایک ناگوار انقلاب پیدا ہونا پسند کیا۔

اس کے بعد ــــ اقبال اور درخشاں بیشتر ساتھ رہے۔ تمام شملہ کی سیر کی منجولی، سمر ہل، چھوٹا شملہ، فراز کوہ، دامن کوہ غرض ہر مشہور مقام پر گئے۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے رہے اور دونوں بظاہر خوش رہے لیکن ہاں تنہائی میں آفاق درخشاں کو دیکھ کر ہنستا تھا اور فیروز اقبال کو دیکھ کر مسکراتا تھا۔

وقت نے طنابیں کھینچیں۔ زمانہ سمٹا۔ اور ایکدن وہ آیا کہ درخشاں اور اقبال کو شملہ سے واپس آنا پڑا اقبال کیساتھ فیروز تھا اور درخشاں کے ساتھ آفاق دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔۔۔ لیکن ہنستے ہوئے اور مسکراتے ہوئے۔

درخشاں نے مری پہونچتے ہی اقبال

کو خط لکھا اور اقبال نے آگرہ آتے ہی درخشاں کو اطلاع دی۔ دونوں کے خط دونوں کے پاس ایک ہی دن پہنچے۔ ادھر اقبال درخشاں کا خط پڑھ رہا تھا

بریلی

ڈیر اقبال!

خدا آپ کی قوت شعری کو بیدار اور احساس خودداری کو درخشاں رکھے۔ میں مع الخیر واپس آگئی۔ میرا خیال ہے کہ شملہ کی حسین ملاقاتوں اور رنگین صحبتوں کا اثر میرے ہی دل میں نہیں آپ کے پہلو میں بھی گدگدی کر رہا ہوگا۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ امر ذہن نشین رکھئے کہ وہ ایک خواب تھا جو بیداری میں دیکھا گیا تھا اور ایک کھیل تھا جو جان بوجھ کر کھیلا گیا تھا۔ اسلئے اس کی تعبیر اور نتیجہ معلوم! آپ غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ درخشاں نے آپ سے شکست کھا کر بھی آپ کو شکست دی ہے جسے آپ درخشاں سمجھتے ہیں وہ درحقیقت "منور جہاں" ہے۔ درخشاں سے اب آپ کبھی نہیں مل سکتے۔ ہاں اگر ہو سکے تو اپنے افسانوں میں درخشاں کو ہیروئن بنا لیا کیجئے۔

راقمہ

شملہ کی درخشاں لیکن حقیقت میں منور جہاں

ادھر درخشاں اقبال کے خط کا مطالعہ کر رہی تھی۔

آگرہ

نادان درخشاں!

خدا تمہیں ہمیشہ صاحب اقبال رکھے۔ میں بخیریت تمام آگرہ پہونچا۔ غالباً شملہ کی شکست کا احساس ابھی دل میں باقی ہوگا۔ مگر غم نہ کرو۔ مجھے تم سے صحیح معنوں میں ہمدردی ہے۔ اسلئے میں تمہاری غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے اقبال سے شکست کھائی ہے اور اس اقبال سے جو شملہ میں اقبال تھا لیکن حقیقت میں عالم افروز ہے۔ عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔ اسی لئے تم نہیں سمجھ سکیں۔ بہرحال اُن تمام باتوں کو بھول جاؤ وہ ہنگامی دلچسپیاں تھیں خط پڑھ کر ناراض نہ ہونا یہ نہ سمجھنا کہ شکست پر شکست دی ہے۔

تمہیں دھوکہ میں رکھنے والا

اقبال۔

مست قلندر سے متعلق ایک بڑے ادیب اور فسٹ کلاس مجسٹریٹ کی رائے

ایڈیٹر صاحب! تسلیم۔ میں اس بات کی داد دیتا ہوں کہ آپ کا پرچہ ہر اعتبار سے دیگر رسائل سے میلوں آگے ہے۔ کاغذ کی گرانی نے ظاہری علامات پیدا کی ہوں تو کی ہوں مگر معانی میں کوئی فرق نہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مست قلندر اپنی دیرینہ روایات کو اسی طرح برقرار رکھے گا۔

ابرار حسین زیدی تجاوری

ایم ایس سی، ایل ایل بی (علیگ)

گیت

ازجناب بآمر رامنگری ڈرامالسٹ دہلی

سکھی ری! کیسی آئی رات

(۱) چین نہیں ہے میرے من میں
آگ لگی ہے سارے تن میں
انگ انگ میں پیا بسے ہیں
سکھی ری! بن کر من کی بات —

(۲) پی نے دل کو توڑ دیا ہے!!
اُس کا درپن پھوڑ دیا ہے
پھوٹ پھوٹ کر آنسو نکلیں
سکھی ری! اب نفرت رہیں بات —

(۳) امبر پہ تارے مسکائیں
مجھ کو پیا نظر نہ آئیں
شاید کبھی نظر نہ آئے
سکھی ری! جیون کی بربھات —
کیسی آئی رات —

(خاص)

ہم تم

از جناب صبا متھراوی فاضل ادب

فضاؤں کو رنگیں بنا جائیں ہم تم
جہاں پر شفق بن کے چھا جائیں ہم تم
امیدوں کے لے لے کے رنگیں سہارے
محبت کی جنت بسا جائیں ہم تم
نگاہوں سے کر کر کے زریں اشارے
جوانی کی قسمت جگا جائیں ہم تم
بہاریں نہ جانے پھر آئیں نہ آئیں
بہاروں میں آؤ سما جائیں ہم تم
زبانیں یہ نغمات گائیں نہ گائیں
نظر سے یہ نغمات گا جائیں ہم تم
گریں نامرادی پہ بن بن کے بجلی
مرادوں کے طوفاں اٹھا جائیں ہم تم
رہے بے اثر کیوں مناجات دل کی
اثر کے شبستاں سجا جائیں ہم تم
سمن ریز بوندوں میں آنسو ملا کر
فضائے چمن جگمگا جائیں ہم تم
شرر بار آہوں کے جگنو اڑا کر
اندھیرے میں تارے دکھا جائیں ہم تم
چلو آؤ اٹھو رباب نظر پہ
محبت کے کچھ گیت گا جائیں ہم تم
بڑھو بڑھ کے آؤ ہر اک رہگذر پہ
جمالِ محبت لٹا جائیں ہم تم
زمانہ محبت سے جس کو نکھارے
اک ایسا مرقع سجا جائیں ہم تم
محبت مسرت سے جس کو ابھارے
وہ تقدیر مل کر بنا جائیں ہم تم
چلو آؤ ایسے میں قسمت ہے یاور
محبت کے رتبے بڑھا جائیں ہم تم
کمالِ محبت کے زینے پہ چڑھ کر
ہوس کے علم کو جھکا جائیں ہم تم
محبت کا اقبال کر دیں درخشاں
ہر اک دل کو روشن بنا جائیں ہم تم
رہے نام اپنا ہمیشہ فروزاں
اندھیرے ہوس کے مٹا جائیں ہم تم
مصائب سہے ہیں مصائب سہیں گے
ہمیں تم رہے ہیں ہمیں تم رہیں گے

میری بھابی جان

از جناب
مرتضیٰ فضل علی
(علیگ)

محبّت، محبّت، محبّت جس کو دیکھو محبّت کے گیت گا رہا ہے جسکو سنو محبّت کا رنگ الاپ رہا ہے۔ جدھر دیکھو محبّت ہی محبت کا چرچا ہو رہا ہے۔ کبھی سُنا کسی نے محبّت میں خودکشی کر لی۔ کبھی خبر ملی کہ محبّت کے لئے خون ہو گئے اور کہیں محبّت کے نام پر گناہوں کے دریا بہا دئے گئے۔ محبّت نہ ہوئی عذاب جان ہو گئی۔ چھوٹے سے لے کر بوڑھے تک محبّت کی بھینٹ چڑھنے لگے۔ میں بھی دنیا کے اس دلچسپ طریقہ پر بے ہنسے نہ رہتا اور عشق و عاشقی کا خوب خوب مذاق اُڑاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ محبّت پر میرا اعتقاد ہی نہ تھا۔ چنانچہ میں اپنے بہت سے دوستوں کے جذبات کی قدر کرنے کی بجائے ان کا مذاق اڑاتا، طعنے مارتا، پھبتیاں کستا۔ غرض جو جو مجھ سے بن پڑتی میں کرتا۔ جس سے وہ مجھے ظالم، بے حس، بے دل اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے تھے۔ محبّت کی حقیقت سے میں اب تک بے بہرہ تھا۔ یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ جس چیز کو میں یوں ہنسی ہنسی میں اڑا دیا کرتا ہوں وہ میری زندگی میں ایک زبردست انقلاب پیدا کرنے والی ہو گی۔ کاش محبت کے جذبات کی قدر میں نے پہلے بھی کی ہوتی۔

میرے بھائی حمید ڈپٹی کلکٹر ضلع بنارس کی شادی ہونے والی تھی۔ ان کی نسبت علی گڑھ ضلع کی ریاست بھیکم پور کے نواب صاحب کی لڑکی سے طے پائی تھی۔ بڑی منتوں کے بعد شادی کا دن آیا۔ شادیانے بجنے لگے۔ چراغ جلنے لگے۔ آتش بازیاں چھوڑی گئیں۔ خوشی و مسرت کا گلشن آباد ہوا۔ تمناؤں اور آرزوؤں کے پھول کھلنے لگے۔ جوش و ولولے کے چشمے اُبلنے لگے۔ گل و بلبل کے عشق کی کہانی شروع ہوئی۔ غرض یہ کہ شادی ہو گئی۔ وہ شادی جو دو دلوں کو ایک کرتی ہے۔ دو انسانوں کو ایک دوسرے کا ہمدرد بناتی ہے۔ ہاں ہمدرد اور شاید یہی ہمدردی ایک کامیاب شادی کا راز ہے۔ یہ وہ عمارت ہے کہ اگر بنگئی تو مٹائے نہیں مٹتی اور بگڑی تو پھر بنائے نہیں بنتی۔ یہ وہ سنہری زنجیر ہے کہ جس کی اگر ایک کڑی بھی کمزور ہوئی تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائیگی۔ یہ ایک شیشہ ہے بہت نازک جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جائیگا۔ کاش کہ اس دنیا میں شادی کے وقت دولہا دلہن کے جذبات کا بھی خیال کیا جاتا تو پھر شادی بجائے قربانی کے حقیقی و مسرت کا باعث ہوا کرتی۔

نکاح ہوا اور رسوم کا دور بھی گذرا۔ دولہا دلہن یکجا ہوئے۔ دو دل ملے۔ دلہن خوبصورت تھی۔ لوگ اسے دل میں جگہ دیتے تھے۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ بیحد قدر و منزلت کی گئی۔ خاندان میں ایسی شادی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اور شاید ایسی دلہن بھی نہ آئی ہو گی۔ چاہیئے کہ دن دونی رات چوگنی میاں بیوی کی محبت بڑھتی جاتی۔ ایک دوسرے کے دیوانے معلوم ہوتے۔ ایک دوسرے کے دیوانے معلوم ہوتے ایک دوسرے پر فدا ہوتے جاتے۔ لیکن حقیقت کیا تھی یہ خدا جانے!

چند مہینہ بعد مجکو بھی بھابی سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ ایک فرشتہ صفت عورت تھیں۔ ہنسی دل لگی بھی ہوئی، مذاق بھی ہوئے، چھیڑ چھاڑ بھی۔ وہ ہزار خوش رہتیں مگر پھر بھی میں نے ان کے چہرے سے ان کے دل کا حال معلوم کر لیا۔ پوشاک سے چھپانے کی کوشش جسم کے عیوب کو نمایاں کرنے سوا کیا کرتی ہے۔ چنانچہ بھابی کی مسکراہٹ میں غم کی جھلک، ہر ادا میں پُرالم اشارے، ہر بات میں رنج و محن کی علامت پائی جاتی۔ گویا جوانی میں ایک غم کا بڑھاپا پوشیدہ تھا۔ وہ بولتیں تو زبان سے آواز رُک رُک کر نکلتی۔ دیکھتیں تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوتے۔ چلتیں تو قدم دھیرے دھیرے اُٹھتا۔ جیسے کسی غم کے بوجھ سے دبی جاتی ہیں۔ بھابی زیادہ تر بیمار رہتیں۔ لوگ یہ سمجھتے کہ بہت کمزور ہیں۔ لیکن یہ شاید کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان کی علالت کا سبب وہ رنج و محن کا داغ، وہ غم و الم کا صدمہ تھا جو برابر ان کو شادی کے بعد پہنچتا رہا۔ ہزار علاج ہو

لیکن بے سود اور ہوتا بھی کیسے جب مرض کی صحیح تشخیص ہی نہیں ہونے پاتی تھی۔ اس دنیا میں بعض لوگ فطرتاً غمگین ہوتے ہیں۔ ان کا دل اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ معمولی سے معمولی صدمہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہر رنج اور ہر صدمہ دل پر ایک گہری چوٹ لگاتا ہے اور دل چوٹ کھاتے کھاتے آخر کار غم والم کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ بھابی بھی شاید اسی قسم کے انسانوں میں تھیں۔ سب یہ سمجھتے کہ میاں بیوی کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اور ظاہراً واقعی تھے بھی بہت اچھے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ شادی شادی نہیں بلکہ بربادی تھی۔ دو متضاد قوتیں ایک کمزور اور ایک مستحکم یکجا ہو گئی تھیں اور جو کمزور طاقت تھی وہ روز بروز چور چور ہوتی جاتی حمید بھائی کے خیالات سطحی، بھابی کے بہت اعلیٰ۔ اُن کے جذبات بہت کثیف، ان کے بہت پاکیزہ۔ ان کا نقطۂ نگاہ بہت تنگ، ان کا بہت وسیع۔ وہ بہت روکھے اور خشک مزاج انسان تھے اور بھابی کی طبیعت بہت سنجیدہ تھی۔

لیکن خیر جی رہی تھیں جب تک حیات باقی تھی۔ اس دنیا میں اُنہوں نے مجھکو اپنا ہمدرد پایا۔ مجھ سے اپنی بیتی سنائی۔ دل کی باتیں کہیں۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں واقعی کسی کے جذبات سے متاثر ہو رہا ہوں یا یوں کہیئے کہ کوئی بڑی مقناطیسی قوت تھی جو مجھکو اپنی طرف کھینچ رہی تھی وہ کیا تھی یہ میں نہیں کہہ سکتا اور شاید کبھی بھی نہ کہہ سکوں۔ گھنٹوں بیٹھا بھابی کے دل کو تسکین دیا کرتا۔ اُن کی ویران دنیا کو آباد کرنے کی کوشش کرتا۔ ان کے غمگین دل میں مسرت کی تھوڑی سی جھلک پیدا کرنے کی سعی کرتا۔ اور اگر الفاظ سے کوئی خوش ہو سکتا ہے تو البتہ میری کوششوں کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ بھابی کم از کم میرے سامنے خوش رہا کرتیں۔ اس عرصہ میں مجھکو اُن سے کچھ ایسا اُنس ہو چلا تھا کہ انکی ذرا سی بے چینی میری پریشانی کا باعث ہوتی ان کا غم مجھ سے دیکھا نہ جاتا۔ ان کو ہنستا دیکھ کر ہنستا اور روتا دیکھ کر روتا۔ جیسے ہم دونوں ایک ہی ناؤ کو چلا رہے ہوں کاغذ کی ناؤ نہیں بلکہ جذبات کی ناؤ۔ الغرض میں ان کے دکھ سکھ کا شریک تھا۔ اُن کا سچا ہمدرد۔ وہ میری یاد پر جی رہی تھیں اور میں اُن کی۔ وہ مجھکو بہت چاہتی تھیں لیکن بھائی کی طرح۔ حمید بھائی کو میرا بار بار آنا کچھ پسند نہ تھا لیکن شرماً حضوری کچھ نہ کہتے۔ البتہ بھابی کو اپنا کمزور شکار پاکر خوب خوب ستاتے، طعنوں کی بارش ہوتی فقروں کی بوچھاڑ۔ الفاظ سے بڑھ کر تو تلوار کی کاٹ بھی نہیں ہوتی۔ اور یہ الفاظ میری معصوم بھابی کے جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ کلیجہ خون ہو ہو کر بہا جاتا تھا۔ ایک بیدرد کی بیوی بننا واللہ بڑا ستم ہے! ہماری اور بھابی کی خط و کتابت بھی ہوتی تھی جس کی حمید بھائی کو خبر تھی۔ بھابی کے خطوط بڑے درد بھرے ہوتے تھے اور میں جب کبھی ان کو پڑھتا تو انکی ابدیہ مظلومیت میری آنکھوں میں پھر جاتی۔

بی سجادی، حمید بھائی کی والدہ ان عورتوں میں سے تھیں جو کسی کو بھی خوش نہیں دیکھنا چاہتی ہیں، دوسروں کی خوشی سے اُن کے دل میں آگ لگتی ہے اور یہ شعلہ ہزاروں معصوم جانوں کے خرمن کو جلا کر خاک کر ڈالتا ہے، خود بھابی کے ساتھ انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ تو یہ کہیئے کہ وقتاً فوقتاً میرا آجانا بھابی کو بچا لیتا تھا۔ ورنہ اب تک تو وہ ان کو کب کی ڈبو چکی ہوتیں بھابی، حمید بھائی سے ذرا چپ چاپ سی رہا کرتیں۔ سچ تو یہ ہے بھابی کو اُن سے نفرت ہو چلی تھی۔ بس بی سجادی اس موقع کو غنیمت جانا اور خوب خوب لگائی بجھائی کی، نئے نئے گل کھلائے۔ طرح طرح کے جال بچھائے۔ کہنے لگیں "یہ تو اب خراب ہو چلی ہے۔ دیکھو تو بھلا سلیم سے اتنا ہنستی کھیلتی ہے اور تمہاری طرف رُخ بھی نہیں کرتی۔ جب دیکھو تو اٹوائی کھٹوائی لئے پڑی رہتی ہے۔ اللہ توبہ ایسے بھی نخرے نہیں دیکھے۔ تعلقہ دار کی لڑکی ہے تو ہو گی اپنے گھر کی، بھلا ہم کو کیا۔ ہم نہیں سہنے کے اس کے نخرے اور ذرا غضب تو دیکھو مزاج بھی نہیں ملتا ہے بیگم صاحبہ کا۔ اے لو ہماری موچھ گیا ہوئی عمر بھر کا سودا ہو گیا پھر لطف یہ کہ میاں سلیم کے سامنے درد بھی نہیں رہتا، بخار بھی چلا جاتا ہے اور پھر دونوں ایک دوسرے کی تعریف کیا کرتے ہیں۔ مجھے تو بیٹا کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے اور تم تعلیم یافتہ ہو۔ کیا سمجھ نہیں سکتے کہ تمہارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

دھوپ میں بال پکائے نہیں میں نے۔ خوب سمجھتی ہوں کہ بہو کے رنگ ڈھنگ اچھے نہیں۔ گھر میں آگ لگے اور آپ خاموش کھڑے تماشہ دیکھیں۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے بیٹا!" حمید بھائی مشکوک انسان تو تھے ہی۔ بس ان الفاظ نے جادو کا اثر کیا۔ موقع کے منتظر تھے جو بہت جلد مل گیا اور ملتا کیسے نہیں خوب بدلا بہانہ بیار

" اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ " بھابی اس وقت اپنے میکے میں تھیں، انہوں نے مجھکو ایک خط لکھا اور ایک حمید بھائی کو۔ اتفاق سے خط غلط لفافوں میں چلا گیا اور حمید بھائی کو میرا خط ملا اور مجھ کو ان کا۔ پھر کیا تھا۔ بھس میں چنگاری لگنے کی دیر تھی۔ بھابی کو وہ لے آئے اور مجھکو فوراً بلوایا۔ میں حیران تھا کہ کیا ہونے والا ہے، جونہی مکان پہ پہونچا۔ فضا بدلی پائی۔ غضب کی خاموشی تھی۔ بلا کا سکون میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں کمرے میں داخل ہوا حمید بھائی کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا رُخ میری طرف تھا۔ کہنے لگے " بدذات تو آستین کا سانپ نکلا۔ میرے گھر میں آگ لگا کر اب تو نہیں بچ سکتا " میں نے کہا " اگر آپ مجھے اسی لائق سمجھتے ہیں تو حاضر ہوں " بھابی زار و قطار رو رہی تھیں فیر خالی ہوا لیکن گولی کسی اور کو لگی۔ بھابی نے حائل ہو کر گولی اپنے سینہ پر لے لی اور کہنے لگیں " بھیا! تم کو ابھی جینا ہے تمہاری شادی ہونے والی ہے، لیکن تم اپنی بیوی کا ہرگز دل نہ دکھانا اور چاہے جو کچھ بھی کرنا " یہ کہہ کر ہم کو روتا چھوڑ کر راہی ملک عدم ہو گئیں۔ ان کی نصیحت میری تمام زندگی کا نصب العین بن گئی۔

" محبت اسی کا نام ہے "

میرے پسندیدہ اشعار

جناب مایوس انصاری سمودپوری

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں — آواز آرہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی — فانی بدایونی

کس نظر سے اس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف — کانپ اٹھا ہر ذرہ میری خاک دامنگیر کا

جو شدت پہ درد جگر دیکھتا ہوں — تو گھبرا کے ان کی طرف دیکھتا ہوں — بہزاد لکھنوی

دیکھے بہار میں کوئی بربادیاں مری — بجلی بھی رقص میں ہے خس آشیاں کے ساتھ — احسان دانش

صنم کدے میں تجلی کی تاب مشکل ہے — حرم میں شیخ کو محو نماز رہنے دے — اصغر گونڈوی

تجلی حسن کی رقصاں تھی شاید رقص بسمل میں — بہت کچھ سوچ کر قاتل نے تیغ خونفشاں رکھدی

ٹھوکریں کھاتے کو بہ درسیاں کوئے دوست — اتنی سی امید پہ شاید کہ آئے بوئے دوست — فخر لکھنوی

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا — غالب

حسین تم ہو طرفدار سب تمہارے ہیں — تمہارے ظلم کا کس سے گلہ کرے کوئی — لامعلوم

آپ زلفوں کو پریشاں نہ کریں — دیکھیے شام ہوئی جاتی ہے۔ — ماہر القادری

مست قلندر ہندوستان بھر کے اردو رسائل سے زیادہ چھپتا ہے مشتہرین کو حق حاصل ہے کہ اس دعویٰ کی تصدیق کرنے کے بعد اپنے اشتہار شائع کرائیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۵۸۵

ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری
خوش باش دمے کہ زندگانی این است

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۵۸۵

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہاست

بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

جلد ۲۷ نمبر ۵

رسالہ مست قلندر لاہور

ماہ اگست سنہ ۱۹۴۲ء

اردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیر الاشاعت ماہوار رسالہ

اُن زندہ دل انسانوں کیلئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کیا ہے، ہمیشہ خوش رہنے اور دوسروں کو خوش کرنے میں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے قول یا فعل سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے جس کا مذہب ہے خدا کے ہر ایک بندے سے بلا امتیاز رنگ قومیت محبت کرنا

قیمت فی پرچہ
پانچ آنے (۵/)

ایڈیٹر
ڈاکٹر پرتھی سنگھ

سالانہ چندہ صرف
چار روپے (للعہ)

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ڈاکٹر پرتھی سنگھ پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ مست قلندر دشنولین گوالمنڈی لاہور سے شائع ہوا۔

ہنگامہ خیز نظمیں	# فہرست مضامین	طبّی جواہر پارے
دلگداز آپ بیتیاں	اگست ۱۹۴۲ء	بے بدل رنگین افسانے

نگاہ اولین

مست قلندر کے "جرم و سراغ نمبر" کے شائع ہونے میں اب صرف ایک ماہ کی دیر ہے۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو دنیائے ادب میں اپنی قسم کا یہ اچھوتا نمبر اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں تیار ہو کر ناظرین کرام کے مبارک ہاتھوں میں ہوگا۔ کاپیاں بسرعت تمام لکھوائی جا رہی ہیں اور ہر ڈاک سے نئے نئے جاسوسی افسانے دفتر میں برابر پہونچ رہے ہیں۔ اس لئے سردست نہیں کہا جا سکتا کہ اُسکا حجم کتنا بڑا اور ضخامت کیا ہوگی؟

جاسوسی کے تین بہترین افسانوں کیلئے انعامات

اگرچہ وقت بہت تنگ ہے لیکن انعامی مقابلہ میں شریک ہونے کی ہر اہل قلم کو دعوت دی جاتی ہے۔ صرف وہی افسانے شریک مقابلہ کئے جائینگے جو فلسکیپ سائز کے کم از کم ۶ صفحات سے زائد کسی صورت نہ ہونگے۔ مقابلہ میں آئے ہوئے تین بہترین افسانے علی الترتیب پہلا دوسرا اور تیسرا انعام پانے کے مستحق سمجھے جائیں گے۔

ایڈیٹر

ایک موتیوں اور جواہرات سے بیش قیمت مقالہ

تم جو چاہو بن سکتے ہو

از جناب محمد عمر صدیقی بریلی

جو زندگی تم بسر کرنا چاہتے ہو اس کا ایک مکمل خاکہ ذہن و دماغ میں تیار کرنا سیکھو مثلاً اگر تم جوان رہنا چاہتے تو شباب کے خیالات قائم رکھو۔ یا اگر تمہاری خواہش ہے کہ حسین رہو تو ذہنی حالت حسین رکھو۔

ہمیشہ اس ہستی کا تصور (Ideal) کرتے رہو جس کی مثل تم ہونا چاہتے ہو۔ کمزوریوں کوتاہیوں اور ناکامیوں پر بیٹھے ہوئے ملال نہ کرتے رہو۔ اپنے خیالی پیکر (Ideal) کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے اُس کے حصول میں جرأت اور استقلال کے ساتھ جد وجہد کرنا تم کو اس کے پا لینے میں مدد دیگا۔

اپنے ولولوں اور خواہشوں کو بیدار رکھنے کی دائمی کوشش، حصول مقصد کی استعداد (Capacity) میں اضافہ کرتی ہے۔

اگر تم کو ایک شخص کا نصب العین معلوم ہے تو تم اس کے کیرکٹر کو آسانی سے معلوم کر سکتے ہو کیونکہ یہی (Ideal) اس کی حیات پر حکمران ہوگا۔

دولت پہلے ذہن و دماغ میں پیدا ہوتی ہے انسان اشرف المخلوقات ہے احسن تقویم کا مجسمہ ہے۔ اس کے لئے احتیاج و افلاس فطرت کے منشار کے خلاف ہے کامرانی اور مسرت بنی نوع انسان کے ناقابل انکار حقوق ہے۔ صرف دماغی افلاس انسان کو مفلس بنا دیتا ہے۔

خوشحالی دماغ سے شروع ہوتی ہے۔ اور جب دماغی کیفیت اس کی مخالف ہے تو اس کا حاصل کرنا محال ہے کام کسی اور مقصد کے لئے کرنا اور توقع کسی اور ہی چیز کی رکھنا مہلک ہے وجہ یہ ہے کہ ہر چیز کی تخلیق پہلے پہل دماغ میں ہوتی ہے اور عمل کی دنیا میں لامحالہ وہ اپنے خیالی پیکر کی پیروی کرے گی۔

کوئی شخص خوشحال نہیں ہو سکتا جبکہ اس کی توقعات افلاس سے وابستہ ہیں، ہم کو صرف وہی ملتا ہے جس کے ہم متوقع ہیں اور عدم توقع عدم استحصال ہے۔

انگریزی کی مشہور کہاوت ہے کہ جتنی مرتبہ ایک بھیڑ چلاتی ہے اتنے ہی گھاس کے لقمے وہ ضائع کر دیتی ہے۔ اسی طرح جتنی مرتبہ تم اپنی تقدیر کے شاکی ہوگے "میں غریب ہوں" "کمزور ہوں" "میں وہ کام نہیں کر سکتا جو دوسرے لوگ کرتے ہیں" "میرے اندر دوسروں کی طرح قابلیت نہیں" "میں ناکام و نامراد ہوں" "تقدیر مجھ سے برگشتہ ہے" اتنا ہی زیادہ تم اپنے سامنے مصائب اور مشکلات کے پہاڑ حائل کر رہے ہو اور اپنے لئے دشمن میں و مسرت کے پنجوں سے آزاد ہونے میں دقتیں پیدا کر رہے ہو کیونکہ ان باتوں کو برابر خیال کرتے وہ تمہاری ذہن و دماغ میں مرتسم ہو جائینگی۔ خوب سمجھ لو خیالات مقناطیس ہوتے ہیں جو اپنی مثل اشیاء کو کھینچ لیتے ہیں۔

دنیائے فلم کی تازہ ترین خبریں

از فلمی نامہ نگار مقیم بمبئی

نیشنل اسٹوڈیوز "وجے" کی نمائش سوانک ٹاکیز بمبئی میں ہو رہی ہے جس طرح دو سال قبل فلم "عورت" کو پیش کر کے کمپنی ہٰذا نے نام حاصل کیا تھا اسی طرح اب "وجے" اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیگی۔ دوسری مزاحیہ فلم "للاجی" بھی تیار ہے۔

ایسٹرن پکچرز۔ "بادل" نمائش کے لئے تیار ہے کمپنی کے ڈائرکٹر ظہور راجا ایک نئی سٹوری کو پردہ فلم پر لانے کیلئے سوچ رہے ہیں

بمبئی ٹاکیز۔ "جھولا" ایک درمیانہ درجہ کی فلم ثابت ہوئی تھی لیکن سُنا گیا ہے کہ "بسنت"، جو کہ نمائش کے لئے بالکل تیار ہے خوب رش لیگی۔

فضلی برادرس۔ اتنا رش نہیں لے رہی جتنی کہ اس کے متعلق مالکان کمپنی کو توقع تھی۔ ڈائرکٹر حسنین جلد ہی بمبئی پہنچ کر "فلم کالج" کو فلمانے والے ہیں جس کے چیف کردار موتی لال اور چندر موہن ہوں گے۔

رنجیت مووی ٹون "بھگت سُورداس" کی تیاری بہ سرعت تمام ہو رہی ہے جس میں جس کے چیف کردار سہگل اور خورشید ہیں

بھارت پکچرز۔ "کنوارا باپ" ایک موڈرن مزاحیہ فلم کے بعد "رانی صاحب اور سوامی ناتھ" جلد ہی آنے والے ہیں موخر الذکر میں سبھانہ سمر تھ بطور ہیروئن کام کر رہی ہے۔

کلام پاک کے معجزے

وہ محیر العقول پُر اسرار اور نادر کتاب جس نے اسلامی دنیا میں ہلچل ڈال دی جس کے سامنے زندہ جادوگری کشف و کرامات اور حُب و بغض کے تمام دعوے باطل اور بیکار ہو کر رہ گئے

آخر چھپ کر تیار ہو گئی

مؤلف کتاب ہٰذا عالیجناب قاضی خلیل الرحمٰن صاحب قمر نعمانی مظاہری کی زندگی کا بیشتر حصہ فقرا کامل اور درویشان صادق کے قدموں میں بسر ہوا۔ یہ انہیں کے فیضانِ صحبت کی برکت ہے کہ دنیا والوں کو "کلام پاک کے معجزے" ایسی نادر اور متبرک کتاب جیسے گنج بے پایاں کہیں تو بیجا نہ ہوگا نصیب ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت میں غضب کی طاقتیں اور بلا کی تاثیریں پنہاں ہیں جن کی تلاوت کرنے کے راز سے آگاہی حاصل کر کے انسان زندگی کی ہر منزل میں اپنے دل کی مراد حاصل کر سکتا ہے الغرض بشرط تحفہ کو اپنے پاس رکھنے والا جو چاہے کر سکتا ہے جس کی خواہش دل میں کریگا وہ خود بخود محبت کرنے پر مجبور ہو جائیگا۔ مایوس امیدیں بر آئینگی بیمار شفا پائینگے مقدمہ میں جیت ہو گی پھانسی کے تختے سے آپ جیسے چاہیں گے اُتار لینگے، فراخی رزق ہو گی، بند ہوا روزگار کھل جائیگا اور پردۂ غیب سے خوشحالی اور فارغ البالی کی ایسی ایسی صورتیں رونما ہونگی کہ حیرت ہوگی۔

مؤلف کتاب ہٰذا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دنیا کی ناپائیداری کو دیکھتے ہوئے عرصہ سے یہ خیال دامنگیر تھا کہ ان بیش قیمت رازوں کو جو تحقیق محنت و مشقت اور عمر عزیز کے بیشتر حصہ کی قربانی کے بعد حاصل ہوئے ہیں خلق خدا کی بہبودی کے پیش نظر عام کر دیا جائے اس لئے میں نے اپنی بیاض خاص کی ایک ایک چیز کو کتابی صورت میں منتقل کرنے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ ہر ایک عمل کرنے کی کھلم کھلا اجازت دی ہے۔

اگر آپ سچے مسلمان ہیں تو آپ کو یہ بات یاد کرانے کی ضرورت نہیں کہ اللہ تعالےٰ کے کلام میں کیسی برکت ہے اور یہ کہ توبہ و استغفار کا دروازہ سچے مومن کیلئے ہر وقت کھلا ہے! اور اس کی رحمت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ؎

باز آ، باز آ، ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبر و بُت پرستی، باز آ

ایں درگہِ ما، درگہِ نومیدی نیست — صد بار، گر توبہ شکستی، باز آ

مختصر یہ کہ "کلام پاک کے معجزے" کا مطالعہ نہ صرف دنیاوی ترقی خوشحالی اور کامرانی کیلئے ضروری ہے بلکہ اسکی مدد سے آپ کا عقبےٰ بھی سنورے گا، اور دین و دنیا دونوں جگہ آپ سرخروئی حاصل کر سکیں گے۔ کاغذ کی نایابی کے باعث پہلے صرف پانصد جلدیں شائع کی گئی ہیں۔

ھدیہ:- صرف تین روپے آٹھ آنے معہ محصول ڈاک خوبصورت سنہری جلد اور پر بندھی ہے

شرط:- صرف مستحق اصحاب جائز مطلب کیلئے ہی اس نایاب تحفہ کو حاصل کریں۔ درخواست خریداری کے ہمراہ کسی حافظ قرآن کی تصدیق ہونا ضروری ہے۔ عدم تعمیل کی شکایت معاف

ملنے کا پتہ۔ **ادارہ عامل کامل پوسٹ بکس ۱۳۲ لاہور**

مست قلندر لاہور
اگست ۱۹۴۲ء
جلد ۲۷ — نمبر ۵

جگر کے ٹکڑے

(خاص) — نتیجۂ وحشی بہرائچی

ضمیر کی آواز

جو سر سے تا بہ قدم ہوں غرورِ نخوت و ناز | سمجھ سکیں گے وہ کیا زندگی کے سوز و گداز
وہ کیا سنیں گے غریبوں کا نالہ و شیون | جو سن سکے ہوں نہ اپنے ضمیر کی آواز

کشمکشِ حیات

کون کہتا ہے کہ سرچشمۂ عشرت ملجائے | دم ذرا لینے کو دم بھر کی تو مہلت ملجائے
فکرِ جنت کی بھی کرلیں گے جنابِ واعظ | پہلے دُنیا کے جہنم سے تو فرصت ملجائے

اضطرابِ خودی

شورشِ بے پناہ چاہتا ہوں | یعنی تکمیلِ آہ چاہتا ہوں
جو بدل دے نظامِ کون و مکاں | ایک ایسی نگاہ چاہتا ہوں

تعمیرِ میکدہ

تدبیر سے تقدیر بدل دے ساقی | ہر چیز کی تاثیر بدل دے ساقی
فرسودہ ہے فرسودہ نظامِ عالم | میخانے کی تعمیر بدل دے ساقی

زاہدِ ضمیر فروش سے

یہ زہد یہ تقویٰ فقط عیاری ہے | دستار نہیں فریبکاری ہے
لب پہ اللہ اور ہوس دُنیا کی | زاہد یہ ترا حسنِ ریاکاری ہے

سکونِ قلب

زاہد ترے کہنے سے دعا کیا مانگوں؟ | کچھ اور بھی ہے اُنکے سوا کیا مانگوں؟
حوریں اُنکی ہیں، بہشت اُنکی، دو عالم اُنکے | اور وہ میرے ہیں! پھر او بتا کیا مانگوں؟

گلشن شباب کی ایک نوخیز کلی کے تاثرات

دوشیزہ کا روزنامچہ

از جناب حمید صحرائی میرٹھ

زیر نظر مضمون میں ایک ایسے سربستہ راز کو منظر عام پر لانے کی سعی کی گئی ہے جو منکشف ہو جانے کے بعد بھی راز ہی بنا ہوا ہے اس میں ایک ایسی ہستی کے تاثرات پوشیدہ ہیں جو دوشیزگی کی منزل سے گذر کر متاہل زندگی کی اہل ہو چکی ہے۔ آپ دیکھینگے کہ ایک ہندوستانی ماحول میں پرورش شدہ لڑکی جب عہد طفولیت سے گذر کر شباب کی وادی میں قدم رکھتی ہے تو اس کے بحر تخیلات کی ساکت و جامد سطح پر کیا تغیر رونما ہوتا ہے اور اگر کسی سہانی صبح کو کوئی وجود محبت کا سورج بنکر اپنی زرنگار کرنوں کے لطیف انعکاس سے اس کے سرد دل میں جذبات کی حدت پیدا کردے تو اس کے جذباتی ہیجان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یقیناً دوران مطالعہ میں آپ اپنے طائر تخیل کو کسی ایسی حسین دنیا میں محو پرواز پائیں گے جہاں کی ہر شے حقیقی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ رند کی توبہ اور زاہد کا تقدس بھی ——

امید ہے ناظرین جن کے اقتباسات کا پرتو مضمون میں نظر آرہا ہے میری جسارت کو نظر انداز کرنے سے گریز نہ کرینگی۔

(حمید صحرائی)

۲۴ مئی سنہ ۴۱ء

جونہی میں نے اسکول سے آکر کتابیں میز پر رکھیں میرے کانوں میں آپا ثریا کی آواز آئی۔

"شربت پیو گے جمال"

"نہیں بھائی"

"کیوں؟"

"پیاس بھی تو محسوس نہیں ہو رہی ہے"

"پی بھی لو۔ تم گرمی میں سے آئے ہو سفر کا تکان بھی دور ہو جائیگا اور طبیعت بھی بحال ہو جائے گی"

"بہتر ہے بھائی"

آپا ثریا کسی ایسی ہستی سے محو تکلم تھیں جو میرے نزدیک یقینی غیر شناسا تھی۔ میں نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ صورت اجنبی تھی۔ وہ سفید سلک کا ٹھنڈا سوٹ پہنے دالان میں تخت پر بیٹھے تھے۔ برقی پنکھا ان کے سر پر رقص کر رہا تھا اور پسینے کی بوندیں ان کی صبیح پیشانی پر ایسے چمک رہی تھیں جیسے جنت الفردوس کی کسی بہت ہی متبرک جھیل پر کھلے ہوئے کنول کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے۔ کسرتی بدن، کھلتا ہوا رنگ، تمازت آفتاب سے نیم سرخ چہرہ اور لبوں پر سنجیدہ تبسم۔ یا الٰہی یہ کون ہیں؟ میرا دل مضطرب ہو گیا۔ میں دروازے کے شیشوں میں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور الٰہی کی کالی فرش کی چاندنی میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ ہوا کا ایک تند جھونکا کھڑکی کی راہ سے کمرے میں آیا اور دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر جس سے فرش پر گری ایک مدھم سا شور پیدا ہوا اور فضا مرتعش ہو کر رہ گئی۔

انہوں نے میرے کمرے کی جانب نظر کی اور میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں ایک صاعقانہ قوت موجود ہے جو دروازے کے شیشوں میں سے گذر کر دل میں اترتی جا رہی ہے۔

"عشرت" آپا نے مجھے آواز دی۔

"جی" میں نے مدھم لہجہ میں کہا۔

"یہاں آؤ" وہ پھر بولیں۔

"مطالعہ کر رہی ہوں ابھی آتی ہوں آپا" میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

نہ معلوم کیوں میرا دل ان کے سامنے جانے سے جھجک رہا تھا۔ ویسے بھی عورت نامحرم مرد کے سامنے سے گریز کرتی ہے۔ نہ معلوم کونسی ساحرانہ قوت اس کے ارادوں کو مسخر کرلیتی ہے۔ شاید یہ اس کا حجاب ہوتا ہے جو قدرت نے اس کے خمیر میں ختم کردیا ہے۔

میں نے چند منٹ میں کئی مرتبہ ان کے سامنے جانے کا ارادہ کیا لیکن جا نہ سکی وہ بھی تھوڑی دیر بعد باہر مردانے میں چلے گئے شب کو ماحضر بھی وہیں بھائی جان کی معیت میں تناول فرمایا اور پھر کہیں باہر چلے گئے۔ آپا کے دیور ہیں وہ ان کی بڑی تعریف کرتی ہیں کہتی ہیں۔

"بڑا عقلمند لڑکا ہے۔ بی اے کے پہلے سال میں پاس ہوا ہے اور گرمیوں کی چھٹی

"پیر یہاں آیا ہے وغیرہ۔"

رات کے دس بج گئے ہیں وہ ابھی تک نہیں آئے۔ شاید سنیما چلے گئے ہوں یا.....

۲۵ مئی

آج کی صبح غیر معمولی حسین تھی۔ فضا نے ماحول نشیلا کر دیا تھا۔ سورج کی تمازت تاب کرنیں بادلوں کے نقاب سے گذرنے کی ناکام سعی کرتی رہیں۔ لیکن سورج دوپہر کے بعد نکلا۔ اتوار ہونے کی غرض سے میں گھر پر ہی رہی۔ رات کا باقی ناول ختم کرنا چاہتی تھی۔ تحریر کافی دقیق تھی۔ نہ معلوم کس لفظ کے معنی دیکھنے کیلئے لغت کی ضرورت پڑی۔ خیال آیا بھائی صاحب لے گئے تھے چنانچہ ان کے کمرے کی طرف چلدی۔ کمرے کے وسط میں دروازے کی طرف پشت کئے کوئی بیٹھا تھا۔ چھوٹی میز پر مسرت قلندر کا تازہ پرچہ رکھا تھا۔ یکایک میری نگاہ اس سگرٹ پر پڑی جو دست راست کی دو انگلیوں میں لرز رہا تھا۔ جیسے پانی کی سطح پر بیتاب موجیں یا ہوا میں سیماب۔ بھائی صاحب ــــ کیا وہ چھپ کر سگرٹ پیتے ہیں۔ کچھ سوچتے سوچتے میں نزدیک پہونچ گئی۔ پاؤں کی آہٹ سنکر انہوں نے مڑکر دیکھا ــــ بھائی صاحب آپ.... میں جملہ پورا نہ کرسکی۔ الفاظ حلق میں اٹک گئے۔ گھبراہٹ کے عالم میں واپس بھاگی۔ پاؤں ایرانی قالین میں الجھ گئے اور میں گر پڑی وہ جمال تھے ــــ انہوں نے بغیر کسی حجاب کے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھنے میں مدد کی۔ میرے بدن میں بجلی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی جیسے ان کے ہاتھ میں برقی لہریں تھرتھرا رہی ہوں۔ وہ بولے۔

"عشرت! آخر اس سراسیمگی کا سبب؟"

میں کچھ جواب نہ دے سکی۔ پھر بے تحاشہ بھاگی۔ گرتے گرتے بچی۔ جب میں اپنے کمرے میں پہونچی میرا دل زور زور سے حرکت کر رہا تھا۔ دھک ــ دھک ــ دھک

۲۷ مئی

نہ معلوم قدرت نے لڑکی کو شرم و حیا کی پتلی کیوں بنا دیا ہے؟ بعض اوقات وہ اپنے ضمیر کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہو جاتی ہے پرسوں کے واقعہ پر مجھے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ آخر میں نے ان کی بات کا جواب کیوں نہ دیا۔

آج پھر ان سے مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ میں 'رعنا' کی جلد لینے کیلئے جونہی مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ وہاں سو رہے تھے۔ پھر مجھ پر سراسیمگی کی حالت طاری ہوگئی۔ خوف، ہراس اور شوق و اضطراب مخلوط کیفیت۔ میں نے پھر بھاگنا چاہا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

"عشرت! آخر تمہیں میرے وجود سے نفرت کیوں ہے؟ میزبان کے ساتھ مہمان کا رویہ اس قدر تلخ؟"

میرے جسم میں بجلیاں دوڑ گئیں۔ پلکیں کسی بھاری بوجھ سے جھک گئیں۔ سر سے پیر تک پسینہ چھوٹ گیا۔ میں نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"ہاتھ چھوڑ دیجئے"

انہوں نے میری بات مان لی میری نگاہوں میں ان کی وقعت بڑھ گئی۔ کس قدر شریف ہیں وہ۔

"تم ڈرتی کیوں ہو عشرت؟"

"جی ــــ کوئی بات تو نہیں۔ حجاب سا محسوس ہوتا ہے" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ایسا حجاب بھی کس کام کا۔ اب تو نہ ڈرو گی" انہوں نے کہا۔

پیروں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی ادھر آ رہا تھا۔ میں دوسرے دروازے سے نکل گئی۔ تمام دن کسی نہ معلوم خوف اور غیر فانی مسرت سے میرا دل لرز رہا تھا۔

یکم جون

آج کا دن برکھا کا سا رہا۔ اودے اودے بادل آسمان پر دوڑتے رہے۔ بوندا باندی بھی رہی۔ جمال میاں نے ہارمونیم کے میٹھے سروں پر دلکش راگ گایا۔

"اتنا تو بتا دو اے ساجن تم من کی بات کو کیا سمجھے"

ان کی آواز میں لوچ بھی ہے اور سوز بھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے الفاظ اپنی زبان سے ادا کر رہے ہیں یا میرے جذبات کی ترجمانی فرما رہے ہیں کوئی غیر مرئی قوت میرے دل میں ان کی صورت کے نقوش کو چمکا رہی ہے۔

جب سے وہ آئے ہیں میں اپنے خیالات میں تغیر رونما دیکھ رہی ہوں نہ معلوم انجام کیا ہوگا؟

۳ جون

آج ہم سنیما گئے 'باغبان' دیکھنے۔ تانگہ کی اگلی نشست پر جمال اور بھائی صاحب بیٹھے اور پچھلی پر میں اور آپا ثریا۔ بالکل اس طرح کہ میری کمر ان کی کمر سے ملی جا رہی تھی اور میرے بدن میں بجلی دوڑ رہی تھی۔ بہرحال تماشا بہت خوب رہا۔

میرے دل میں ایک نامعلوم خلش سی پیدا ہوگئی ہے۔ آسمان تخیل پر لطیف بادل چھائے

رہتے ہیں خیالات میں یہ تغیر کیوں رونما ہو رہا ہے؟ ایک بے چینی اور بیکلی سی رہتی ہے ان کو دیکھے بغیر چین نہیں پڑتا مجھے کیا ہو گیا ہے کہیں یہ بیقراری محبت تو نہیں ہے

~~~

۵ رجون

میں کئی روز سے طبیعت میں گرانی محسوس کر رہی ہوں۔

رات فضا میں تیزی بھی تھی اور نمی بھی۔ نیلے آکاش پر روشن چاند چمک رہا تھا۔ اور تاحد نظر زریں ستارے مسکرا رہے تھے گرمیوں کی یہ رات بہت ہی سہانی تھی۔ لیکن مجھے نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے بدن بھی دکھنے لگا۔ طبیعت گھبرائی تو میں بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی سہمی چاندنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے چبوترے پر دو پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ ایک پر پچھلے پہر کی کوئی گہری نیند سو رہا تھا اور دوسرا.... اس پر کوئی میری ہی طرح کروٹیں بدل رہا تھا۔ دیا سلائی کی روشنی میں جو انہوں نے سگریٹ جلانے کیلئے روشن کی تھی میں نے دیکھا وہ نہال ہیں۔

"اف میرے اللہ" بے اختیار میری زبان سے نکلا اور مدھم آواز نے شب کے سکوت کو متزلزل کر دیا۔

انہوں نے میری کھڑکی کی طرف نگاہ کی اور آہستہ سے بولے "کون؟"

"میں" میں نے مدھم لہجہ میں کہا

"عشرت"

"جی!"

"تم جاگ رہی ہو"

"ہاں"

"کیوں"

"اور آپ"

غزل

ازجناب محمد نقی مرزا بی اے امرتسر

مری آنکھوں کی عذرا اشک افشانی نہیں جاتی
دل فرقت زدہ کی آہ پریشانی نہیں جاتی

سدا پابند یاس وغم رہا تیری محبت میں
مگر اس پہ بھی میرے دل کی نادانی نہیں جاتی

تمہاری بے رخی اور بے وفائی کی عنایت ہے
کہ میری آہ وزاری گریہ سامانی نہیں جاتی

تمہاری یاد میں آنکھوں سے آنکھیں نہیں لگتی ہیں
مری آنکھوں کی بیخوابی و حیرانی نہیں جاتی

بوقت نزع آئے ہیں سر بالیں تو یوں بولے
مریض عشق کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

کہاں تک اپنی بدبختی کا رونا میں نقی روؤں
مری بدبختی اور قسمت کی ویرانی نہیں جاتی

"گرمی کی وجہ سے نیند نہیں آتی"

"نکھری ہوئی چاندنی اور ٹھنڈی ہوا۔ موسم تو خراب نہیں ہے"

"پھر بھی"

"کچھ تو وجہ ہو گی"

"تم جاننا چاہتی ہو وجہ؟"

"بتلاؤ گے تم"

"آہ تم کیا جانو عشرت! چاند کی زریں شعاعوں میں میں کس کے حسن کی تجلیاں محسوس کرتا ہوں"

"کون ہے وہ؟"

"یقین کرو گی تم میری بات کا؟"

"کیوں نہیں؟"

"وعدہ کرتی ہو"

"ہاں"

"میرے بحر زندگی کی سکون آشنا موجوں کو بیتاب کرنے والی تم ہو عشرت"

"میں"

"ہاں"

"ٹھیک اس وقت چاند کے قریب سے ایک ستارہ ٹوٹا اور اس کی ہلکی روشنی میں میں نے بھائی صاحب کو کروٹ بدلتے دیکھا مستقبل کی تشہیر کے احساس سے میں نے کھڑکی بند کر لی۔

دن میں ہماری ملاقات نہ ہو سکی لیکن میرے کانوں میں ایک ایسا دلکش نغمہ گونجتا رہا جو فردوس کی معصوم حوریں ہی گا سکتی ہیں اور شاید گیت کا عنوان میرے اور ان کے مشترکہ نام دل سے مرتب ہوا ہے

~~~

۱۲ رجون

آج اسکول میں تعطیل تھی۔

حسب معمول بیدار ہوئی چھٹی کی وجہ سے

وقت کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کرنے کے خیال سے ایک گونہ مسرت بھی حاصل ہوئی۔ سوچا ناشتہ کے بعد پروگرام مرتب کرونگی۔ ناشتہ پر پہونچی سب ہی موجود تھے۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہونے لگا۔ وہ سامنے بیٹھے تھے۔ اور میں قوس وقزح کی طرح جھکی جا رہی تھی یہاں تک کہ میرے سر اور فرش میں صرف ایک بالشت کا فرق تھا۔ چائے ٹھنڈی ہوگئی اور میں نے ایک گھونٹ بھی نہ پیا۔ پیالی میرے ہاتھ میں تھی اور دل کسی نہ معلوم جذبہ کے ماتحت گھبرا رہا تھا۔

"ادی بچی تجھ پر خدا کی مار" امی بولیں "یہ کمان کیوں بنی جا رہی ہے"

"کیا بات ہے عشرت" یہ بھائی صاحب کی آواز تھی "شرما رہی ہے تھی" ابا نے کہا۔

"شرما کر کچھ اپنا ہی کھو رہی ہیں" جمال بولے "یہ چائے، مکھن، توسٹ اور حلوا، یہ سب ان کو کہاں مل سکتے ہیں؟ کل ہی ملینگے اسی وقت بھئی بر۔" سب نے قہقہہ لگایا اور میں اور بھی جھک گئی۔ نہ معلوم کیوں؟

۱۶ جون

سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے امی جان کہتی ہیں کہ "تو تنہائی پسند ہوتی جا رہی ہے۔ لڑکی کے لئے یہ عادت ٹھیک نہیں ہے" میں کیا کروں۔ مجھے تنہائی میں خاص لطف آنے لگا ہے۔ رات کو نیند میں بھی محبت کے سہرے خواب دکھائی دیتے ہیں — ایسے خواب جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں۔ نہ معلوم کیا ہوتا ہے۔

۲۹ جون

آج کی شام نکہت بدوش شام تھی۔ شفق کی گلگوں مانگ نے دوشیزۂ فطرت کی مانگ میں سیندور بھر رکھا تھا۔ آپا اور امی خالہ جان کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی یہ شعر گنگنا رہی تھی

بگڑی ہوئی ہے کائنات آکر سنوار دیجئے!
شام بھی ہے اداس اداس کھوئی ہوئی سحر بھی ہے

یکایک جمال کمرے میں داخل ہوئے اور بولے۔ "معاف کرنا عشرت! تمہاری تنہائی میں مخل ہوا ہوں لیکن کیا کروں مجبور تھا۔ صبح میں جا رہا ہوں اس لئے تم سے ملنا بھی ضروری تھا شاید پھر موقعہ ہوتا بھی یا نہیں۔"

اس طرح فرسا جبر سے میرے خرمن حواس پر کوندتی ہوئی بجلی گری اور میں نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "آخر کیوں؟ اس عجلت کی وجہ؟"

"ابا جان کا تار آیا ہے۔ لکھا ہے فوراً چلے آؤ۔ جانا ہی ہوگا" انہوں نے جواب دیا "خط تو لکھتے رہئے گا نا" میں نے افسردہ لہجہ میں کہا

"کیوں؟" وہ بولے "کیا میرے خطوط سے تمہیں مسرت محسوس ہوگی؟"

"شاید" میں نے جواب دیا۔

"پھر ایک بات مانو گی عشرت!" انہوں نے کہا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا ہی اچھا ہو عشرت!" وہ بولے "اگر مجھے اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام میں تم اپنی قربت

غزل

از جناب شفیق مرزا وحشت اٹھیوی ہمایوں منزل خیالی گنج لکھنؤ

صحنِ چمن کا اب تو کچھ اور ہی سماں ہے
بکھری ہوئی زمیں پہ ہر گل کی داستاں ہے

دل تو بجھا ہوا ہے غم سے آمادۂ فغاں ہے
جس سمت دیکھتا ہوں مستی رواں دواں ہے

اے عشق اب تو مجھ سے کیا اور جانتا ہے
مستی کا میری باقی دھندلا سا اک نشاں ہے

تم کو بھلا ہماری آہوں سے واسطہ کیا
جب بخت ہی ہمارا اے ہمدم بدگماں ہے

سب جانتے ہیں تو بھی انجان بنتے مجھ سے
ہنس کر وہ پوچھتے ہیں یہ کس کی داستاں ہے

سر کو جھکا کے وحشت ہیں آج محو سجدہ
یہ تو خدا ہی جانے کس بت کا آستاں ہے

میں گھبرانے کی اجازت دیدو۔"
شرم سے میری پلکیں جھک گئیں نہ معلوم کیوں؟ میں پوری کوشش کے باوجود بھی کچھ جواب نہ دے سکی۔

جواب کا انتظار کئے بغیر انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور ایک لمحہ بعد میرا سر ان کے چوڑے سینے اور بھرے بھرے بازوؤں میں تھا۔ ان کے تھرتھراتے ہوئے اور میرے کپکپاتے ہوئے لبوں کے اتصال نے فضا میں ایک ایسی مقدس لطافت بکھیر دی جو جنت الفردوس کے رہنے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کائنات کی تمام رنگینیاں، موسیقیت، شعریت، مسرت اور انبساط انکی آغوش میں سمٹ کر آگئی ہے۔

یہ سرور انگیز کیفیت زیادہ دیر تک رہی وہ ملازمہ کے پیروں کی آہٹ سنکر بغیر کچھ کہے چلے گئے۔

میں آج رنج و ملال کی مخلوط کیفیت سے متاثر ہو رہی ہوں۔ رنج اس لئے کہ وہ جا رہے ہیں اور خوشی ۔۔۔۔۔۔۔

یقیناً جنس قوی کی آغوش بھی صنف لطیف کیلئے جنت کا سا مقدس ہی کنج ہے۔

۲ ر جولائی

آج ان کو گئے ہوئے چار روز گزر گئے نہ کوئی خبر آئی اور نہ کوئی خط۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے ہیں۔ کیا محفوظ نشیمن میں آگ لگا کر اس کے شعلوں سے محفوظ ہونا ہی مرد کا کام ہے۔ اگر نہیں تو انہوں نے خط کیوں نہ لکھا؟

مجھے زندگی پھیکی پھیکی معلوم دے رہی ہے ان کی شخصیت نے مجھے ایک ایسی لذت سے واقف کرایا جس کا مجھے پہلے کبھی احساس نہ ہوا تھا اور چاہتی ہوں کہ اس خمار انگیز کیفیت میں زندگی کے آخری لمحے تک کھوئی رہوں۔ نہ معلوم قدرت کو کیا منظور ہے؟

۲۲ ر جولائی

آج ملازمہ کی زبانی معلوم ہوا کہ میری شادی جمال کے ساتھ ہو رہی ہے۔ بات چیت پکی ہو گئی ہے۔ سب کام آپا ثریا کی وساطت سے بخیر و خوبی انجام پا گیا ہے۔ گھر میں تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔ صحیح تاریخ ہنوز معلوم نہ ہو سکی۔ میرے گلشن حیات میں بہار مسرت آ رہی ہے۔

۲۵ ر جولائی

شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ میں ہوں اور کمرے کی تنہائی۔ ان کا تصور اور لطیف لمحات کا احساس۔ کبھی کبھی کسی نہ معلوم خوف سے میرے وجدان کو پسینہ آجاتا ہے اور میں پہروں سوچتی رہتی ہوں کہ آیا ان کی آغوش ہمیشہ کیلئے وا رہیگی۔ خدا کرے ایسا ہی ہو دل میں شکوک و شبہات کے طوفان تو برپا ہو رہے ہیں۔ مرد کی محبت ساون کی کالی گھٹا کی طرح ہوتی ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے صاف آسمان پر چھاتی مینہ برسا اور مطلع پھر صاف ہو گیا۔ لیکن کم از کم ان سے تو ایسی امید نہیں ہے۔

۳۱ ر جولائی

آج کا دن میری زندگی کا بہت ہی اہم دن ہے۔ میری عنان حیات ان کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے۔ عورتیں ڈھولک پر گا رہی ہیں

کاہے بیاہی بدیس رے بابل۔ کاہے بیاہی

گھر میں ہنگامہ برپا ہے۔ لڑکیاں ہر وقت مجھے گھیرے رہتی ہیں۔ اس گھڑی ذرا سا وقت پاکر روزنامچہ بھرنے بیٹھی تھی کہ وہ پھر آگئیں۔ خدا جانے رات کو بھی وقت ملے یا نہیں۔

۲ ر اگست

گذشتہ رات ملاقات کی رات تھی۔ گذرے ہوئے پر کیف لمحات کا تذکرہ فضول ہے وقت بھی کم ہے۔ طبیعت کسلمند ہو رہی ہے۔ آنکھوں میں خمار چھایا ہوا ہے۔ تمام شب کی بیداری کی وجہ سے نیند بھی آ رہی ہے۔ بدن ٹوٹا ٹوٹا سا جا رہا ہے۔

ح۔ ص۔ م

مرد یا عورت بے وفا کون؟

از جناب عربیین جاوید لدھیانہ

شاہد نے غروبِ آفتاب کے وقت ایک شکستہ قبر پر چراغ جلاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

محبت کے وقت عام طور پر یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اس کی تحریک ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتی ہے اس لئے کہ عورت فطری شرم و حیا کے باعث اس راہ میں پیش قدمی نہیں کرتی ـــ میں خود بھی اس کا قائل تھا۔

مگر جب سے جمیلہ نے میری زندگی کے روح پرور نغمے فنا کئے ہیں۔ اس کی فریب زا نگاہوں نے میری زندگی کے ارمانوں کا قافلہ لوٹا ہے؟ ـــ میں اس نظریہ کے متعلق شاید دنیا بھر سے الگ ہوں۔

اب میرا نظریہ یہ ہے کہ محبت کی پر فضا وادی میں پہلا قدم عورت ہی اٹھاتی ہے۔ اور شیشۂ محبت کو بے وفائی و عہد شکنی کی ٹھوکروں سے چور چور کرنا بھی نازک مزاج عورت ہی کا کام ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ عورت کی فطرت میں کس قسم کا خمیر ہوتا ہے؟ اور یہ کوئی آسان بات بھی نہیں کہ ہر شخص اس کو سمجھ سکے!۔ اس راز کو سمجھنے میں سب سے بڑی پیچیدگی یہ ہے کہ عورت کے وہ چند حربے جنہیں وہ اس میدانِ کارزار میں استعمال کرتی ہے۔ ان کا استعمال عورت سے منسوب کرنا ایسا ہی امر محال ہے۔ جیسا پتھر میں سے پانی نچوڑنا۔ عورت کے چند ایسے افعال بھی ہیں۔ جن کی وہ محرک ہوتی ہے۔ مگر یہ افعال اس کی طرف سے محرک ہوتے ہوئے ثابت نہیں کئے جا سکتے۔

اندریں حالات یہ نظریہ قائم کرنا کہ عورت ہی محبت کی محرک ہے۔ اور مرد صرف عورت کی اس تحریک کو لبیک کہہ کر قصرِ محبت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ صحیح ہوگا۔

کمال! تم ہمیشہ ضد کرتے ہو۔ کہ میں تمہیں اپنی زندگی کی سسکتی ہوئی ٹریجڈی سناؤں ـــ اپنا سلگتا ہوا رومان زمانے کے سامنے پیش کروں۔ مگر اسے سننے کے بعد تم خود بھی یہ محسوس کروگے ـــ زمانہ بھی اس کا قائل ہو جائے گا۔ کہ عورت محبت کے میدان میں کس قدر ہوشیاری اور عیاری کے ساتھ گامزن ہوتی ہے؟ وہ کس طرح مرد کی کشتیِ حیات کو بحرِ حیات کے مد و جزر میں دھکیل سکتی ہے۔

شاہد نے بے خودی کے عالم میں چراغ کی سہمی ہوئی روشنی میں شکستہ قبر پر اپنی انگلیوں سے کچھ نشان بناتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

جمیلہ ایک رشتہ سے میری بہن تھی! میں اکثر اس بت کافر کا نام سنا کرتا تھا مگر سلسلۂ تعلیم اور طویل مسافت کی وجہ سے اسے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ لیکن میری زندگی جمیلہ ـــ اور صرف جمیلہ ہی کے لئے تخلیق کی گئی تھی۔ اس لئے وہ بدبخت دن بھی آ گیا کہ میں نے گلاب جمیلہ کو لطیف شرارتوں کی کلیاں، مسکراہٹوں کے غنچے، اور ہنسی کے پھول برساتے ہوئے دیکھا۔ مگر اسے میری بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ کہ یہ ملاقات کا زمانہ عین اس وقت میں آیا۔ جبکہ میں جوانی کے پُربہار سبزہ زاروں میں ٹہلتے ہوئے نظامِ کہکشاں کو درہم برہم کرنے کے ارادے رکھتا تھا۔ اور مجھ میں احساسِ شباب کی وہ تمام قوتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں جو انسان کو چشم زدن میں دیوانہ بنا دیتی ہیں۔

بایں ہمہ میری زندگی اس وقت تک انتہائی سادہ لوحی سے گزر رہی تھی۔ میں حسن و عشق کی کیفیات سے متاثر ہونا تو درکنار، ان سے واقف تک نہ تھا۔ غالباً یہ قوتِ احساس مجھے صرف اسی وقت استعمال کرنے کیلئے عطا ہوئی تھی۔ جبکہ میں حیا کے پردے میں گدرائی ہوئی جوانی کی شوخ و شنگ تصویر جمیلہ سے دوچار ہوا۔

لیکن کمال! تم اسے یقیناً صحیح سمجھنا کہ لطیف شرارتوں کا مجسمہ جمیلہ کو دیکھ کر اس کے سوا اور کوئی خیال بھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوا کہ خداوند تعالیٰ نے اس دلکش حسینہ کو فرصت میں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ جمیلہ مجھے اس لئے اور بھی زیادہ دلفریب

نظر آئی کہ میں نے اسے پہلے پہل دیکھا اور میرے قریبی عزیزوں میں صرف وہی ایک نوجوان لڑکی تھی ؛

بچپن سے جوانی گلے مل مل کر پیار کر رہی تھی - پریشان زلفیں رخساروں پر اس طرح بکھری ہوئی تھیں - جیسے بعض وقت دو چاندوں پر سیاہ گھٹاؤں کا ہجوم ہوتا ہے - اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں بجلیاں سی کوندا کرنے والی نگاہیں مسکرا رہی تھیں !؛

حسن ظاہری کے ساتھ باطنی خوبیوں سے بھی آراستہ تھی - تعلیم و تربیت گو دیہات میں رہنے کے باعث عمدہ طور پر نہ ہوئی تھی - لیکن وہ پھر بھی زندہ دل، باسلیقہ اور شیریں گفتار تھی ؛

میری اور جمیلہ کی ملاقات انگریزی فیشن کے مطابق نہیں ہوئی کہ باقاعدہ انٹروڈیوس کرایا جاتا - بلکہ جیسے اپنوں میں بے تکلف تعارف ہوا کرتا ہے - میری خالہ نے مجھے بتایا کہ بھیا یہ تمہاری بہن جمیلہ ہے ۔۔۔ اس وقت جبکہ میری خالہ مجھ سے جمیلہ کا تعارف کرا رہی تھیں - میں تو کچھ شرما رہا تھا مگر جمیلہ کی طرف دیکھنا اور اظہار مسرت کرنا تہذیب کا تقاضا تھا - اس لئے میں نے بمشکل یہ فرض بھی ادا کیا ؛

میں نے دیکھا - کہ اس وقت جمیلہ شرارت آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی - وہ بھی بظاہر میری طرح محجوب تھی - اور بار بار اس وقت مجھ پر نگاہوں کے تیر برساتی - جبکہ میری خالہ کی نگاہیں اس کی طرف سے پھری ہوئی ہوتیں ؛

میں نے جمیلہ کی نسبت جو کچھ بھی مختصر طور پر دریافت کیا - وہ خالہ سے - ورنہ مجھے کہ جمیلہ سے مخاطب ہونے کی جرأت نہ ہوتی تھی شاید مجھ پر اس کی کفر سامان جوانی کا رعب چھا گیا تھا - سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی ایسی لڑکی سے مخاطب ہونے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا ؛

دو روز تک یہی عالم رہا - میں جمیلہ سے دن میں سو پچاس مرتبہ دوچار ہوتا تھا - وہ مسکرا کر مجھے دیکھتی تھی - میں بھی اس سے کچھ بولنا چاہتا تھا - لیکن کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی تھی ؛

ایک روز رات کے وقت میں کھانا کھا رہا تھا جمیلہ میرے پاس اس غرض سے کھڑی ہوئی تھی کہ مجھے پانی پلائے - یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ میری خدمت کے لئے مقرر کی گئی تھی - لیکن میری شرم و خجالت کا یہ حال تھا کہ نوالہ حلق میں اٹکا ہوا تھا - اور پانی مانگتے شرم محسوس ہوتی تھی - ہر چند کوشش کی کہ اس سے پانی مانگوں - مگر زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا - آخرکار میں نے خالی گلاس ہاتھ میں اٹھا لیا - جمیلہ یہ دیکھ کر مسکرائی ۔۔۔۔ کیا پانی پیجئے گا - ؟؛

یہ پہلا جملہ تھا - جس سے میری و جمیلہ کی گفتگو کا آغاز ہوا - میں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا - مگر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا کر تشنگی کا اظہار کر دیا - جمیلہ نے میرے ہاتھ سے خالی گلاس لیتے ہوئے کہا ؛

"دیکھئے کہیں پیٹ میں کیچڑ نہ ہو جائے !؛

تم ہی بتاؤ کہ بھلا میں جمیلہ کے اس شریر جملے کا کیا جواب دیتا ؟ ۔۔۔ یہ شرارت نہیں تھی تو اور کیا تھا ؟ ہم میں جمیلہ کے لئے یہ نہیں کہہ سکتا - کہ وہ بالکل شریر تھی البتہ مذاق اس کی فطرت میں داخل تھا - اس نے گلاس کو پانی سے لبریز کر کے جو اس طرح میری طرف بڑھایا - تو آدھا گلاس پانی چھلک کر میرے کپڑوں پر گر پڑا ؛

یہ موقعہ تھا کہ وہ اظہار تاسف کرتی - کیوں کہ کمال ہوا ہے - مگر اس کے بجائے اس کمبخت نے مخمور نگاہوں سے مسکرا کر کچھ اس طرح میری طرف سے منہ پھیر لیا کہ میں بے چین ہو گیا ؛

کھانا کھا چکنے کے بعد ہاتھ دھلانے کے لئے جمیلہ نے لوٹا اٹھا لیا - میں نے مجبوراً ہاتھ دھونا شروع کیا - وہ پانی کی دھار لوٹے سے چھوڑتی جا رہی تھی - اور اس اثنا میں اس نے پانی بجائے ہاتھوں کے پیر پر گرا دیا - اور اس پہ ستم ظریفی یہ کہ لوٹا پھینک یکایک ہنس کر بھاگ گئی - پانی کی چھینٹوں سے میرے رہے سہے کپڑے بھی خراب ہو گئے ؛

میں چاندنی رات میں مکان کی چھت پر ٹہلتا ہوا ان تمام واقعات پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا - مگر اس کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا - کہ جمیلہ ابھی الھڑ ہے اور الھڑپن سے اس قسم کی شرارتیں سہواً یا شرارتاً ہو ہی جاتی ہیں ؛

ایک روز کا ذکر سناؤں، صبح صبح میری چائے میں چینی کی بجائے خدا جانے کتنا نمک ڈال دیا کہ ایک ہی گھونٹ بھرنے سے میرے مزاج کو دن میں تارے نظر آنے لگے - غرض اسی قسم کی دلچسپ حرکتیں اور لطیف شرارتیں روزانہ میرے ساتھ کی جاتی تھیں - لیکن میرے پاس ان سب کا جواب خاموشی اور حسرت بھری نگاہوں سے جمیلہ کو دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ تھا ؛

میں قریب پندرہ روز تک ان کے یہاں رہا - لیکن مطلقاً یہ نہ سمجھ سکا - کہ ان سب کا مطلب کیا ہے ؟ ۔۔۔ جب میں شہر واپس آنے لگا - تو رخصت ہوتے وقت مجھے انتہائی تکلیف محسوس ہوئی - قصبہ کے در و دیوار سے وحشت برسنے لگی تھی - لیکن میں نے اسے ایک معمولی بات سمجھا جو ہر مقام سے سفر کرتے وقت انسان کے دل میں فطرتاً پیدا ہوا کرتی ہے ؛

جس وقت میں جمیلہ کے قریب کھڑا ہوا

خالہ جان سے رخصت ہو رہا تھا۔ میری نگاہیں ایک بے پایاں شوق و اضطراب کے ساتھ جمیلہ کے بدن کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ جمیلہ بظاہر خاموش تھی۔ مگر اس کی آہو صفت آنکھیں آنسوؤں سے اس طرح بھری ہوئی تھیں جس طرح برسات کے موسم میں سیاہ گھنگھور گھٹائیں پانی سے امڈی ہوئی منڈلا رہی ہوں۔

یہ پہلا اتفاق تھا کہ میں نے [illegible] جمیلہ کو مغموم دیکھا۔ کیونکہ میرے دوران قیام میں وہ ہمیشہ شاداں و فرحاں رہی۔ اب اس [illegible] شباب کے چھلکنے والے [illegible] دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے [illegible] میں نے [illegible] کیا کہ یہ کیوں اس قدر رنجیدہ ہے [illegible] وقت [illegible] کی وجہ [illegible] رخصت ہو [illegible] آیا۔

[illegible] لیکن [illegible] میں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں اپنی کوئی عزیز چیز جمیلہ کے ہاں بھول آیا ہوں۔ وہ کیا ہے؟ یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ میں نے ریل میں دو مرتبہ اپنے سوٹ کیس کی تلاشی لی۔ کتابوں کو شمار کیا۔ سب چیزیں موجود تھیں۔

کالج پہنچ کر سب معمول مشغول ہو گیا۔ لیکن میرا دل کچھ اچاٹ سا ہو رہا تھا۔ بے چینی اندر ہی اندر سے میرے سکون کو دیمک کی طرح چاٹنے لگی۔ میں بار بار اس بے کلی کا سبب معلوم کرنے کے لئے سوچتا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ جمیلہ کی خیالی تصویر اکثر میری نگاہوں کے سامنے پھرا کرتی تھی جس سے کہ دوستی کیا کرتے تھے۔ ایک میں مسکراتی اور شرارت کرتی نظر آتی تھی۔ دوسرے میں پژمردہ دل اور غمگین ملات کو بستر پر بیٹھا مطالعہ کے لئے کتابیں اٹھاتا دو چار ورق الٹتا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کہ ان میں بھی مجھے جمیلہ ہی کی تصویریں نظر آتیں۔

اب میں نے غور کرنا شروع کیا۔ کہ کہیں مجھے عشق تو نہیں ہو گیا۔ لیکن میں تو ایسی کہانیوں کو محض خیالی کہتا تھا [illegible] یہ محسوس [illegible] کہ [illegible] اس کا یقین آ [illegible] دل ہی دل [illegible] ہو گیا [illegible] کہ میں [illegible] کی کوشش کی [illegible] عشق [illegible] اندھے عشق کی پرخار وادیوں میں سرگرداں نظر آؤں [illegible] سر میں [illegible] گیا [illegible] چین کی تلاش [illegible] وہ بیکار تھا دو چار [illegible] تنہائی [illegible] سے بدل گیا۔ اور اب وہ ہر قفس پر دشمن تھا۔ جو یہ کہتا تھا۔ کہ میرا دل میرے پاس ہے۔ اس کا سب سے [illegible] اس روز سے مجھے دنیا کی ہر [illegible] اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ تعلیم تو جیسے [illegible] از فہم چیز تھی۔ کالج کی کوئی رنگینی [illegible] بھاتی تھی۔ میں سوچنے لگا [illegible] اب بھی مجھے مجنوں کی طرح دشت و بیابان کی خاک چھاننی ہو گی؟ [illegible] کی طرح پہاڑوں سے سر پھوڑنا ہوگا؟

کئی ماہ کے بعد میری خالہ کا خط آیا۔ اس میں ایک اور چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ بھی تھا۔ جمیلہ کا خط۔ اس نے لکھا تھا: بھائی جان آپ نے تو یہاں سے جا کر ہمیں یاد ہی نہ کیا غالباً آپ بھول گئے۔ خیر یہ آپ کا استغنا ہے لیکن ہم اب تک آپ کو نہیں بھولے اور نہ بھولیں گے۔

"جمیلہ"

جمیلہ کے اس مختصر خط نے میرے سینے میں سلگتی ہوئی آگ بھڑکا دی میں نے مکرر سہ کرر خدا جانے کتنی بار خط کو پڑھا۔ میں پھر دو روز تک اسے بیٹھتے پڑھتا رہا۔ اور پھر اسکا جواب ان الفاظ میں لکھا:-

عزیزہ جمیلہ!

محبت و خلوص کا شکریہ! میں جب سے یہاں آیا ہوں عجیب پریشانی میں مبتلا ہوں [illegible] تمہاری یاد نہ ہو نا کیا [illegible] خالہ جان کی شفقت اور تمہاری محبت [illegible] خواہ مخواہ محسوس کیا۔ میں نے مانا [illegible] اگر تم کو یاد ہی نہیں کیا۔

تمہارا شاہد

خط [illegible] کرنے کے بعد میں جواب کا انتظار کرنے لگا۔ مگر ایک مہینہ گذر جانے پر بھی جب جمیلہ کا جواب نہ آیا تو مجبوراً ایک روز کالج سے رخصت لے کر میں پھر جمیلہ کے ہاں جا پہنچا۔ میری اس غیر متوقع آمد پر سب کو حیرت ہوئی۔ ہونی بھی چاہیئے تھی مگر اظہار مسرت کے سوا اور کوئی کیا کر سکتا تھا؟ میں نے دیکھا کہ میرے آنے سے حقیقی مسرت جمیلہ کے سوا اور کسی کو نہ ہوئی تھی۔

بایں سبب میرا وہاں زیادہ رہنا خلاف مصلحت تھا۔ اسلئے میں خواہ مخواہ علیل ہو گیا اور اس بہانے سے مجھے دس بارہ روز اور وہاں رہنے کا موقع مل گیا۔ جمیلہ تقریباً ہر وقت میرے پاس رہنے لگی۔ اسے میری بیماری میں خاص لطف محسوس ہوتا تھا۔ اور میں تو

اپنے آپ کو گویا جنت میں سمجھ رہا تھا۔ جہاں
جمیلہ ایسی حور صفت لڑکی میری خدمت کے
لئے وقف تھی۔ میں دن دن بھر اس سے
باتیں کرتا۔ مگر وہ سب بے سروپا ہوتی تھیں
گفتگو کا مقصد کبھی بھی پورا نہ ہو سکا۔ میں اس
سے اپنی کلفت اور بے چینی کا حال کہنا چاہتا
تھا۔ اور یہی کمبخت الفاظ میری زبان سے
ادا نہ ہوتے تھے۔ میں نے بہتیری کوشش
کی۔ مگر ایک لفظ بھی اظہار محبت میں نہ کہہ سکا۔
میری علالت کا زمانہ بھی ختم ہونا لازمی
تھا۔ ورنہ قبلہ والد صاحب تشریف لے آتے
تو سارا خود ساختہ طلسم ٹوٹ جاتا۔ اب میں
سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ کہ کس طرح اپنی
محبت کا اظہار کروں؟۔ آخر کار ایک روز
دل کڑا کر کے میں نے جمیلہ سے یوں کہا۔
"تم جانتی ہو۔ میں کیوں بیمار ہوں؟"
جمیلہ نے شرارت آمیز سادگی سے جواب دیا۔
شاید فصلی بخار ہے اکثر لوگوں کو آ ہی جاتا ہے۔
یوں میں ڈاکٹر یا حکیم تو ہوں نہیں۔ جو اسکا
سبب تفصیلاً بیان کر سکوں!"
میں نے جواب دیا۔ اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں
کہ میرا بخار فصلی نہیں ہے!"
"پھر؟" جمیلہ نے مسکراتے ہوئے حیرت سے
دریافت کیا!
"یہ تمہاری محبت کا بخار ہے جمیلہ!" میں نے
اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "جب سے
تمہیں پہلی بار مل کر کالج گیا ہوں زندگی میرے
لئے بے کیف ہوگئی۔ ہر وقت تمہارا خیال
ستایا کرتا ہے۔"
میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ جمیلہ کا سرخ
و سفید چہرہ خاص کیفیت کے ساتھ چمک
اٹھا۔ اس کے بدن میں بجلی کی لہریں دوڑنے
لگیں۔ جمیلہ نے جونہی اپنی سرمگیں آنکھوں کو
میری طرف اٹھا کر حسرت بھری نظروں سے
دیکھا۔ میری روح تڑپ گئی۔ اس نے ایک
ٹھنڈی سانس لی۔ بدن میں پھریری پیدا
ہوئی۔ اور وہ خاموشی سے اٹھ کر میرے پاس
سے چلی گئی۔

میں دن بھر اس کی راہ دیکھتا رہا۔ وہ نہ آئی
بیماری کا بہانہ میرے لئے ایک نئی مصیبت
بن گیا۔ جمیلہ کے اس رویہ سے میری خود
داری کو دھکا سا لگا۔ جیسے کسی نے میری
زندگی کی پتنگ کی ڈور کاٹ دی ہو مجھے اپنے
پر غصہ آنے لگا۔ میں دن بھر غصے سے پیچ و
تاب کھاتا رہا۔ اور دوسرے روز صبح کی
گاڑی سے واپس جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔
وہ منحوس دن بڑی مصیبت سے
گذرا۔ کمال! بعد نماز مغرب خالہ جان کسی کام
سے پڑوسن کے ہاں گئی تھیں۔ اور جمیلہ میرے
لئے کھچڑی لے کر آئی۔ اس نے چپ چاپ
کھچڑی کی پلیٹ میرے سامنے تپائی پر رکھ
دی اور مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر خفگی آمیز لہجے میں کہا مجھے
بھوک بالکل نہیں۔ لے جایئے! میں نہیں
کھاؤں گا۔ اس کا چہرہ پہلے ہی مرجھایا ہوا تھا
میرے یہ جملے اس کے نازک دل پر ہتھوڑے
کی طرح پڑے! کیا جانے اس غریب نے
کس شوق سے میرے لئے کھچڑی تیار کی تھی؟
اور میں نے اس کے شوق کو یوں ٹھکرا دیا
خدا معلوم وہ نیچی نگاہیں کئے بت کی طرح
خاموش کھڑی کیا سوچ رہی تھی۔ مجھے اس
کی حالت پر ترس آنے لگا۔ میں نے قدرے
نرمی سے دریافت کیا۔
"آپ یوں کھڑی کیا سوچ رہی ہیں؟" میں
نے کہا مجھے بھوک نہیں! اس نے آنسوؤں
سے ڈبڈبائی آنکھوں کو میری طرف اٹھا کر
ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"مجھے افسوس ہے کہ میں آج دن بھر آپ کی
مزاج پرسی اور تیمارداری کیلئے حاضر نہ ہو سکی"
اُف کمال! خدا سمجھے عورت کے ان
آنسوؤں کو۔ کیا معلوم ان میں کس بلا کی طاقت
ہوتی ہے۔ جمیلہ کے رخساروں پر ننھے ننھے
چمپئی آنسو میرے دن بھر کے افسوس کو
آناً فاناً میں اپنی رو میں بہا لے گئے۔ میری
خودداری اب بھی بل کھا رہی تھی۔ میں نے
دبی ہوئی آواز میں کہا۔
"آپ پر میرا حق ہی کیا ہے؟"
"حق کیوں نہیں؟" جمیلہ نے بھرائی ہوئی
آواز میں جواب دیا۔
"آپ تو یونہی مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہیں"
اس مرتبہ مجھے جمیلہ کی جدائی اور بھی شاق
گذری۔ چونکہ بہرصورت مجھے واپس آنا تھا
اس کی خاموش محبت کا زخم لئے ہوئے میں
کالج آ گیا لیکن میری حالت دیوانوں کی سی تھی
سینے میں ہر وقت میٹھی میٹھی چبھن رہتی تھی
مجھ سے بات کر کے کوئی طالب علم صحیح جواب
نہ پاتا تھا۔ سب کو میری اس تبدیلی پر حیرت تھی۔
مجھے کالج آئے ابھی ایک ہی ہفتہ گذرا
تھا کہ قبلہ والد صاحب کا گرامی نامہ آیا جس
میں لکھا تھا کہ میں فوراً پندرہ روز کی رخصت
لے کر گھر چلا آؤں۔ میری شادی کا تمام انتظام
مکمل ہو چکا ہے۔ میرے پرنسپل کو بھی انہوں نے
رخصت کی منظوری کیلئے لکھ دیا تھا۔
اس خط نے میرے رہے سہے حواس باختہ
کر دئے۔ جمیلہ سے ملنے کی ایک مبہم امید جو
میرے دماغ میں چکر لگا رہی تھی۔ ابھی وقت
فنا ہو گئی۔ میں والدین کے حکم سے سرتابی
کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ گو یہ شادی خانہ بربادی
کے مصداق تھی۔ اور جس لڑکی سے میری شادی

قرار پائی تھی۔ میں اسے بھی خوب جانتا تھا وہ خوبصورت تعلیم یافتہ، اور خوش مزاج سبھی کچھ تھی۔ مگر جمیلہ کی سی رعنائیاں اور دلفریبیاں اس میں نہ تھیں اور اگر فرض کرو ایسی تھی بھی تو اسے میرے دل نے قبول نہ کیا۔

میں رخصت لے کر دوسرے ہی دن گھر پہنچ گیا لیکن میری حالت اس مجرم کی سی تھی جسے پھانسی کا حکم سنا کر وقت مقررہ کے انتظار میں رکھا جائے۔ میں یہ اچھی طرح سمجھا ہوا تھا کہ اس شادی کے بعد میری زندگی ختم ہو جائیگی اور اگر ایسا نہ ہوا تو کم از کم تلخ ضرور ہو جائیگی مگر ان باتوں کے باوجود میں شادی کیلئے تیار تھا جسے صرف والدین کی فرمانبرداری کہا جا سکتا ہے۔

میری شادی میں صرف چار روز باقی تھے۔ گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی مجھے جمیلہ کی آمد کا بیحد انتظار تھا۔ خدا خدا کر کے وہ بھی آ گئی۔ میں اس کے سامنے جاتا ہوا شرماتا تھا۔ لیکن محبت نے شرم پر فتح پائی۔ میں ہچکچاتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اس نے مجھے اوروں کی نگاہ سے بچ بچا کر سلام کیا اس کے سلام کے انداز سے مترشح تھا کہ وہ ناراض ہے۔ گو میں اس ناراضگی کا سبب سمجھتا تھا۔ مگر استفسار کرنے کا موقع نہ تھا میں نے ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ٹال دیا۔

جمیلہ نے بھی میری شادی پر مصنوعی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اور لڑکیوں کے ہمراہ گانے میں شرکت کی۔ کتنا صبر آزما امتحان تھا۔ یہ جمیلہ کی بیتاب اور ناراض جوانی کے لئے؟ ۔۔۔ لیکن میرے سوا یہ کوئی نہ سمجھتا تھا کہ اس وقت جمیلہ کے ساز زندگی سے دلگداز نغمے پیدا ہو رہے ہیں۔ اور اس وقت اس کی حالت اس نوخیز غنچے کی سی تھی جسے ارمانوں بھری ٹہنی سے توڑ کر چٹکیوں میں مسلا جا رہا ہو ۔۔۔ مجھے جمیلہ سے پوری پوری ہمدردی تھی۔ دن میں مجھے ایسا کوئی موقعہ نہ مل سکا کہ میں جمیلہ سے تنہائی میں گفتگو کر کے اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتا۔

مگر رات کو جب سارا گھر سو رہا تھا۔ جب لیلائے شب کی دراز سیاہ زلفیں دنیا پر پھیلی ہوئی تھیں۔ جب گھر والے نیند میں بے سدھ تھے۔ میں نیچے آیا اور خاص کر جمیلہ کی چارپائی کے پاس سے گذرا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ جیسے کوئی دل سوختہ تارے گن گن کر انتظار کی گھڑیاں کاٹتا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے جلدی سے کچھ باتیں بھی کیں جن کا مطلب میں آج تک نہیں بھولا۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا۔ وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں میرے تعاقب میں دوسری منزل پر میرے کمرے میں پہنچی

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے پکڑے ہی تھے کہ وہ سٹ پٹا گئی۔ ساز زندگی کے تار جھنجھنانے لگے۔ چاندنی میں ارتعاش کا پیدا ہو گیا۔ تارے سرگوشیاں کرنے لگے۔ فضا میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور وہ کانپ رہی تھی۔ عورت کا حسن و شباب خوف اور صدمے کی حالت میں پہلے سے کتنا حسین اور بھول معلوم ہونے لگتا ہے کمال؟ اگر میں جمیلہ کو بر وقت اپنے بازو میں دبوچ لیتا تو وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر پڑتی۔

کچھ دیر بعد اس کو ہوش آیا حواس درست ہوئے۔ وہ بجلی کی طرح تڑپ کر میری آغوش سے الگ ہو گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

" جمیلہ! شادی کے سلسلے میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہے"

" کیا تمہارے یہ الفاظ کسی تڑپتی ہوئی روح اور بلبلاتی ہوئی جوانی کے آنسو پونچھنے کیلئے کافی ہیں؟ "

" جمیلہ! میں یقین دلاتا ہوں کہ میری زندگی تمہارے ۔۔۔ اور صرف تمہارے لئے وقف ہے"

شاید آپ کے اس یقین دلانے کا یہ بین ثبوت ہے کہ آپ میری مسرتوں کی ویرانیوں پر اپنی خوشیوں کا محل تعمیر کر رہے ہیں؟ شکریہ!"

" تمہارا یہ خیال کسی حد تک درست ہے لیکن کاش! تم نے میری مجبوریوں کا بھی خیال کیا ہوتا"

" تمہیں بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے" میں نے جمیلہ کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

" آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔ کر سکیں گے؟ کسی کی زندگی برباد کرنے کے سوا آپ سے کچھ نہ ہوگا" جمیلہ نے تیور بدل کر کہا۔

" میں تمہاری حسین پیشانی کے تیوروں کو مسکراہٹوں اور قہقہوں میں میں بدلنا چاہتا ہوں اور اس کیلئے میں ہر قربانی دے سکتا ہوں" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

" کیا میں یقین کر لوں ۔۔۔ کہ فرشتے بہشت کو اٹھا کر ہمارے لئے زمین پر لا رہے ہیں؟"

" جمیلہ!" ۔۔۔ میں نے پھر اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ " میری زندگی صرف تمہارے لئے تخلیق کی گئی ہے ۔۔۔ وعدہ کرو کہ تم بھی میرے سوا کسی حالت میں، کسی دوسرے کو اپنی زندگی میں شریک ہونے دوگی؟"

" عورت کا قول و اقرار مردوں کی مانند گرگٹ کی طرح رنگ نہیں بدلا کرتا۔ عورت کے ارادے کو قیامت بھی نہیں بدل سکتی"

میں نے فرط محبت سے جمیلہ کو اپنے

سینے سے لگالیا اور اس کی چاند سی پیشانی چوم لی ۔۔۔ تارے مسکرانے لگے۔ کہکشاں ہنسنے لگی۔ فضائیں سیٹیاں بجانے لگیں۔ ہمارے جذبات پر مسرتوں کے پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ والدین کی فرمانبرداری کے ارادے اور منصوبے ہمارے جذبات محبت کی سرکشیوں کی دہلیز پر سجدہ ریز ہونے لگے۔ جمیلہ نے مجھ سے سمٹتے ہوئے۔ مجھ میں سماتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "دیکھنا کہیں مجھے بدنام نہ کرنا"۔

کمال! میں نے راتوں رات اپنا رخت سفر درست کیا۔ اور صبح ہونے سے پہلے گھر سے غائب ہوگیا ۔۔۔ اس امید پر کہ جمیلہ میری ہے اور میں ہر قیمت پر اس کو حاصل کرونگا۔۔۔ میرے خط نے صبح کو یہ راز افشا کردیا کہ میں چونکہ اس شادی کیلئے راضی نہیں تھا۔ اسلئے روپوش ہو رہا ہوں ۔۔۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

میرا یوں روپوش ہونا بھی بہت بڑا گناہ تھا میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں والدین کو منہ دکھاؤں یا یوں سمجھ لو کہ والدین نے میرا منہ دیکھنے کیلئے زندہ رہنا پسند نہ کیا۔ میرے فرار ہو جانے سے والد صاحب کی برادری میں سخت توہین ہوئی اور انہوں نے شرم کے مارے جان جان آفریں کے سپرد کردی میں ان ایام میں کلکتہ، مدراس، بمبئی اور خدا جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ قریب چار سال بعد وطن واپس آیا اور سیدھا خالہ جان کے ہاں گیا تاکہ جمیلہ کو دیکھ کر اپنی اجڑی ہوئی دنیا کو پھر سے آباد کروں لیکن میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جمیلہ نے مجھے دور سے دیکھتے ہی خوش ہوکر کہا۔

"شاہد بھیا! تم آگئے؟ ۔۔۔ میں تو بہت یاد کرتی تھی ۔۔۔"

اور پھر اپنی گود میں بچے سے مخاطب ہوکر کہا۔ "اری نسیمہ! سلام کرو! ۔۔۔ تمہارے ماموں جان آئے ہیں۔"

ہائے کمال! کیسے بتاؤں تمہیں اسوقت کا منظر! گویا آسمان کی تمام چھپی ہوئی بجلیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ میرا کلیجہ پھٹ گیا۔ آنکھوں کے آنسو خشک ہوگئے۔ میری روح غریب کے ٹوٹے ہوئے دل کی بجھی ہوئی آہ کی طرح دم توڑنے لگی اور میں نے ایک لمبا سانس لیا اور بہر صورت الٹے پاؤں لوٹ آیا۔

دیکھی کمال، تم نے عورت کے قول و اقرار کا کرشمہ! جسے قیامت بھی نہیں بدل سکتی؟ جس پر میں نے اپنا خاندان اور اس کا وقار ۔۔ اپنے والدین اور ان کی شرافت و عزت ۔۔۔ غرضیکہ جس پر میں نے اپنی ساری دنیا کو قربان کردیا؟ ۔۔۔ کیا اب بھی کوئی مجھ کو سمجھا سکتا ہے کہ عورت قابل اعتماد ہے؟ عورت باوفا ہوتی ہے؟ ۔۔۔ عورت محبت کرتی ہے؟ ...... ہوگا! لیکن میں اس کا ہرگز یقین نہیں کرسکتا۔ اب تو عورت کے متعلق میرا یہی نظریہ ہے اور رہے گا کہ عورت جتنی زیادہ حسین ہوگی اتنی ہی زیادہ سنگدل اور ظالم ۔۔۔ عورت جس قدر محبت کا اظہار کریگی اتنی ہی بیوفائی اور بدعہدی کا ارتکاب!

اب میری زندگی کا مطلع بالکل صاف ہوچکا تھا۔ میرا اس دنیا میں کبھی بھی ٹھکانہ نہ تھا میرا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ میں اس دنیا میں کسی کا نہ تھا۔ یونہی سودائیوں کی طرح جمیلہ ہی کے گاؤں کے ارد گرد پھرا کیا۔ جیسے زخمی شیر ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے۔ میری مایوسیاں مجھے پل بھر چین نہ لینے دیتی تھیں جیسے مکھیاں زخمی شیر کو پریشان کئے رکھتی ہیں۔ میرے دل سے بار بار ہوک اٹھتی تھی اور اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی ہواؤں میں بکھر جاتے تھے۔

" جمیلہ عورت نہ تھی۔ وہ عورت کے بھیس میں ایک خوبصورت بلا تھی۔ جمیلہ ایک ناگن تھی جس نے مجھے ڈس کر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کرکے چھوڑ دیا۔

پیارے کمال! تمہیں یہ معلوم ہوکر شاید حیرت ہوگی کہ اگر جمیلہ نے میری زندگی کی حلاوتوں میں زہر ملایا تو وہ بھی اپنی زندگی سکھ اور چین سے بسر نہ کرسکی۔ اس کا شوہر جاہل اور شرابی تھا اس نے جمیلہ پر ایسے ایسے ظلم ستم کئے کہ اس کی زندگی دوبھر ہوگئی جمیلہ کو آخرکار دق ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس مرض نے جمیلہ کی زندگی کی بنیادیں کھوکھلی کردیں۔ اگر جمیلہ نے مجھ سے وفا نہیں کی تو اس کی زندگی نے بھی اس سے وفا نہیں کی! ۔۔۔ قدرت کے انتقام سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے۔ تمہیں اس انکشاف سے حیرت ہوگی

کمال! ۔۔۔ شاہد نے بیخودی کے عالم میں ایک شکستہ قبر پر اپنی انگلیوں سے پھولستان بناتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا! ۔۔۔

"کہ یہ قبر جس پر میں دن رات بیٹھا رہتا ہوں گلریز جمیلہ ہی کی ہے گو اس نے مجھ سے وفا نہیں کی لیکن میں یہ ثابت کردینا چاہتا ہوں کہ میری وفائیں اب بھی تمام نہیں ہوئیں اور میں یہ عہد کئے ہوئے ہوں کہ جب تک زندہ رہونگا۔ اسی طرح اپنی وفاؤں کے پھول اسکی تربت پر چڑھاتا رہونگا اور اس کی شکستہ قبر پر میری کچلی ہوئی امیدوں کا چراغ ہمیشہ جلتا رہے گا ❊

جب تُو نہیں

از جناب یکتا حقانی امروہوی

آجا — کہ گلستاں کے نظارے اُداس ہیں
دریا پہ جا کے دیکھ چکا ہوں میں بارہا
میرے نگاہ و دل کے مقابل جو تو نہیں
دیکھا نہیں ہے تجھ کو جو مدت سے جانِ عشق

تیرے بغیر چاند ستارے اُداس ہیں
بہتے ہوئے سی نقرئی دھارے اُداس ہیں
میرے نگاہ و دل کے اشارے اُداس ہیں
دن رات تیرے عشق کے مارے اُداس ہیں

ہاں
جب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے جہان میں

آجا — کہ چھا گئی ہے نظر پر فسردگی
اکثر یہ سوچتا ہوں کہ یہ چھا گئی ہے کیوں
جانِ بہار آ کہ کرشمے ہیں بے قرار
تکمیل چاہتی ہیں یہ شب کی لطافتیں

تیرے بغیر قلب و جگر پر فسردگی
دن رات اور شام و سحر پر فسردگی
ہر غنچہ پر ہے ہر گلِ تر پر فسردگی
چھائی ہوئی ہے رنگِ قمر پر فسردگی

ہاں
جب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے جہان میں

آجا — کہ زندگی کا فسانہ ہے مضطرب
تیرے حسین عارض و گیسو کی یاد میں
محسوس ہو رہا ہے کہ تجھ بن جہان میں
دنیا کی ہر فضا ہے بھیانک ترے بغیر

تیرے بغیر دل کا ترانہ ہے مضطرب
آئینہ بیقرار ہے شانہ ہے مضطرب
ہر عیش ہر خوشی کا فسانہ ہے مضطرب
تو دیکھ آ کے سارا زمانہ ہے مضطرب

ہاں
جب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے جہان میں

مشرق کا پراسرار انسان

[illegible]

از میرزا ادیب
بی اے (آنرز)

موسم سرما کی ایک کیف بار و نزہت انگیز شام کا ذکر ہے۔

بے برگ و بار میدان میں کہیں کہیں سبز گھاس لہلہا رہا تھا۔ ہوا میں ایک خنکی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اور مجھے تبتی راہ سے اترتے وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک خواب گوں طلسمی دنیا میں داخل ہوا ہوں۔

یکایک پرسکوت فضا میں ایک سمع خراش شور پیدا ہو گیا۔ میں نے آنکھ اٹھا کر سامنے دیکھا۔ بے شمار کتے دم ہلاتے ہوئے میری طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ اور ان کے بھونکنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا گویا یہ میرے وجود سے سخت متنفر ہیں۔ میں ایک جرأت پسند آدمی ہوں اور میری گذشتہ زندگی کے واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ بڑے سے بڑا خطرہ بھی مجھے آج تک ہراساں نہیں کر سکا مگر ان خونخوار کتوں کو دیکھ کر میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور زندگی میں پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ خوف کس احساس کا نام ہے؟ اس سے پیشتر کہ میں بھاگنے کی کوشش کروں یا اپنے بچاؤ کے لئے کسی قسم کی حرکت کروں میری خوف زدہ نگاہوں نے دیکھا کہ خیمے کے نیم تاریک دروازے میں سے ایک سایہ بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ چند لمحوں کے بعد یہ سایہ ایک عجیب و غریب مگر مہیب صورت انسان میں تبدیل ہو گیا۔

یہ لاما تھا!

لاما نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور اپنی زبان میں نہ معلوم کیا کہا۔ کتے ایکدم اس طرح بے حس و حرکت ہو گئے گویا ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ تبت کے اس عجیب و غریب اور پراسرار انسان نے بڑی محبت اور خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا اور مجھے اسی وقت "پرچین لاما" کے خیمے میں لے گئے۔

"پرچین لاما" اپنے خیمے میں بیٹھا ہوا میرا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی وہ کھڑا ہو گیا اور پھر مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گیا۔

"پرچین لاما" سے ایک دن پیشتر سرسری طور پر ملاقات ہوئی تھی۔ اور اس سرسری ملاقات ہی میں اس کی پراسرار شخصیت نے مجھے اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ میں اس سے تفصیلی گفتگو کرنے کے لئے بیتاب ہو گیا تھا چنانچہ موجودہ ملاقات میری درخواست ہی کا خوشگوار نتیجہ تھی۔ میں زندگی میں بڑے بڑے انسانوں کو دیکھ چکا ہوں اور ان انسانوں نے مجھے متاثر بھی کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ پرچین جیسی ساحرانہ شخصیت سے آج تک ملاقات کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ مجھے پہلی ملاقات ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ مشرق کا یہ پراسرار انسان اپنے اندر ایسے جادو گرانہ کمالات لئے ہوئے ہے جن سے مغرب کی بڑی سے بڑی شخصیت بھی یکسر محروم ہے۔ وہ اس کا لمبا قد، وہ اس کی گہری بھوؤں کے نیچے ہر وقت حرکت کرتی ہوئی روشن آنکھیں، اور پھر ان آنکھوں کی خوفناک گہرائیوں میں ایک ناقابل فہم راز کا لرزتا ہوا سایہ! لاما کا چہرہ دیکھ کر مجھے زندگی کا ہر واقعہ بھول گیا!

ڈوبتے ہوئے سورج کی الوداعی زرد زرد کرنیں خیمے کے دروازے میں سے داخل ہو کر تبت کے اس جادوگر کے نیلے سر اور پیشانی کی ابھری ہوئی نیلی رگوں پر رینگتی ہوئی آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی تھیں خیمے سے باہر تاریکی کے کثیف بادل چھا رہے تھے۔ ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر آگ جل رہی تھی۔

میں نے لاما کے چہرے کی طرف دیکھا اور یکلخت میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میرے سامنے ایک زندہ انسان کی بجائے مصر کی کوئی حنوط شدہ لاش موجود ہے یکایک اس کے سیاہ ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ اسکی آنکھیں ایک پراسرار روشنی سے چمکنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ دنیائے قدیم کا ایک انسان ماضی کے کثیف اندھیرے سے نکل کر ہماری دنیا میں آ موجود ہوا ہے!

میں نے پوچھا؛

کیا آپ بتا سکتے ہیں ایک موسیقار فطرتاً موسیقار پیدا ہوتا ہے یا بنا دیا جاتا ہے!

اس نے دو تین لمحوں کیلئے مجھے گھورتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور اپنی مخصوص نرم آواز میں کہنے لگا!

"جب میں لڑکا تھا تو اپنے باپ کی بھیڑوں کو چراگاہ میں لے جایا کرتا تھا۔ ایک دن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سامنے ایک دیو اژدہا کی پشت پر سوار میری طرف آ رہا ہے۔

میرے قریب پہنچ کر دیو نے مجھ سے کہا!
"کیوں لڑکے! کیا تو موسیقار بننا چاہتا ہے؟"
میں نے جواب دیا "اپنے بہادروں کی بہادری کے منظوم قصے گاتے پھرنا میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے مگر افسوس میری آرزو کبھی بھی پوری نہیں ہو گی۔
دیو نے ایک قہقہہ لگایا اور ریوڑ کی بہترین اور خوبصورت ترین بھیڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔
"اگر تم اس بھیڑ کو اژدہاؤں کے بادشاہ کی بھینٹ چڑھا دو تو تمہاری آرزو پوری ہو جائے گی۔ اور اس ملک کا بچہ بچہ تمہارا مداح ہو جائے گا!
میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ دیو نے اپنا ہاتھ نرمی کے ساتھ میرے شانے پر مارا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا!
جب "خواب کی دھند" میرے دل و دماغ سے دور ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میرے سامنے نہ کوئی دیو ہے اور نہ کوئی اژدہا۔ ایک بھیڑیا اس خوبصورت بھیڑ کو کھا رہا ہے!
اس دن میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ میں بہت جلد ایک نامور موسیقار بن جاؤں گا! کیونکہ اژدہاؤں کے بادشاہ نے اس کا وعدہ کیا ہے! یہ کہکر لاما خاموش ہو گیا!
"تو کیا آپ بہت جلد ایک نامور موسیقار بن گئے؟" میں نے پوچھا۔
لاما کا بلند قہقہہ فضا میں گونجا۔ "نہیں جب میں گھر پہنچا تو میرے باپ نے مجھے خوب پیٹا کیونکہ اس کی بہترین بھیڑ ضائع ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے "عبادت خانہ" میں بھیج دیا جہاں استادوں نے میری خوب خبر لی۔"
"پھر بھی آپ ایک نامور موسیقار بن گئے؟"
"یقیناً میں نے اس مخصوص فن میں خاص مہارت پیدا کرلی۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میرے اندر موسیقار بننے کی صلاحیت موجود تھی جب تک انسان کے اندر کسی خاص فن کیلئے فطری صلاحیت موجود نہ ہو وہ اس فن میں قطعی شہرت حاصل نہیں کر سکتا! میں نے بڑی محبت سے گیت سیکھے اور جابجا یہ گیت گاتا رہا۔ یہ میری فطری صلاحیت کا نتیجہ ہے کہ میں آج فن موسیقی میں فرد ہوں"
یہ الفاظ کہکر تبت کی پراسرار شخصیت نے ایک آہ بھری اور اسکی آنکھوں تلے ہلکی سیاہ لکیریں قدرے نمایاں ہو گئیں!
"کیا آپ نے کبھی محبت کا مزہ بھی چکھا ہے؟"
میرے یہ الفاظ سنتے ہی لاما کی آنکھوں میں ایک بیتابی سی پیدا ہو گئی۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگا۔
"ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب میری تمام امیدوں کی مرکز ایک روسی حسینہ تھی۔"
"ایک روسی حسینہ؟"
لاما کہے جا رہا تھا: "نہ معلوم پہلے پہل میں نے اسے کہاں دیکھا مگر اب تک مجھے یاد ہے کہ جب میری آنکھیں اس کی حسین و سحر طراز آنکھوں سے چار ہوئیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری رگ رگ میں نشے کی تیز و تند لہریں دوڑ گئی ہیں ــــ میرا جی چاہتا تھا کہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اسے اپنے ساتھ ایک ایسے ویران گوشے میں لے جاؤں جہاں ہمارے سوا کوئی بھی موجود نہ ہو۔ میں مبالغہ نہیں کرتا۔ یہ روسی عورت ــــ دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ ویسے تو وہ سر سے لے کر پاؤں تک حسن کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی مگر اس کی لانبی لانبی گہری گہری سیاہ بھنوؤں کے نیچے سرمستی ناچتی ہوئی آنکھیں مجھے آخری سانس تک بھی نہیں بھول سکتیں!"
اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور چمکنے لگیں۔ اور پھر ایکدم یہ چمک ختم ہو گئی۔ جیسے کسی تلخ یاد نے اس چمک کو نگل لیا ہو! میں جانتا تھا کہ مشرق کے باشندے اپنی محبت کی داستانوں کو دوسروں کے سامنے بیان کرنا بالکل پسند نہیں کرتے۔ اور اگر بیان کرتے بھی ہیں تو داستان کے اس حصے کا تذکرہ نہیں کرتے جس سے ان کی زندگی خاص طور پر وابستہ رہی ہے! یہ تو ظاہر تھا کہ لاما کی محبت کا بھی وہی حال ہوا جو دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کی محبت کا ہوا کرتا ہے! ــــ یعنی ٹریجڈی!
میں سوچ رہا تھا کہ اب کس سلسلہ پر گفتگو کروں کہ اس نے خود ہی کہنا شروع کیا!
"آغاز جوانی میں مجھے سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ ایک بار میں عبادت گاہ سے نکل کر کسی ٹیلے پر کھڑا تھا کہ میری نظر ایک سیاح پر پڑی۔ میں نے فی الفور اس سے ملاقات کی اور اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے دل کی آگ ایکدم بھڑک اٹھی اور میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی۔ کاش میرے پر لگ جائیں اور میں آزاد پرندوں کی طرح دنیا کے ہر گوشے میں اڑتا پھروں۔ اتفاقات کو میری زندگی میں خاص دخل ہے۔ اس زمانے میں بھی ایک اتفاقی حادثہ رونما ہوا اور میری پرانی آرزو پوری ہو گئی۔
"وہ کیونکر؟" میں نے پوچھا۔
میرا ایک عزیز جس کے روسیوں کے ساتھ کاروباری تعلقات قائم تھے یکلخت فوت ہو گیا۔ اس کی تمام دولت میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے روپے کو سنبھالا اور روس روانہ ہو گیا۔ جب میری نگاہوں کے سامنے پیٹرز برگ کی عظیم الشان عمارتیں آئیں تو میرا دل سینے میں اچھلنے لگا۔ روس کی سیاحت

کے بعد میں جرمنی روانہ ہو گیا۔ مگر بدقسمتی سے اس شخص کا پتہ بھول گیا جس کے یہاں مجھے قیام کرنا تھا۔ یہ شخص میرا ہم وطن تھا۔ میں پلیٹ فارم پر حیران و ششدر کھڑا تھا کہ ایک شخص مسکراتا ہوا میری طرف آیا اور کہنے لگا "تم پریشان نظر آرہے ہو کیا تم میرے یہاں ٹھہرو گے؟"

"اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔ میں رضامند ہو گیا۔ یہ شخص وہاں کے کسی سکول میں مدرس تھا اور مشرقی علوم کا ماہر تھا۔ جرمنی کے بعد میں اٹلی گیا مگر اس ملک سے مجھے بہت جلد نفرت ہو گئی۔ میں چند دن کے قیام کے بعد قسطنطنیہ روانہ ہو گیا اور پھر چین پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ اپنے "خوابوں کے جزیرے" میں پہنچ گیا ہوں!"

"گویا چین آپ کو خاص طور پر پسند ہے؟"

"ہاں بہت زیادہ!"

"کیا میں اسکی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہے جوانی میں آپ شراب کثرت سے پیا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے وہاں آپکو یا تو شراب بہت پسند آئی یا چینی عورتیں!"

"نہیں یہ بات نہیں ہے! میں نے چین میں پہونچکر اپنے آپ کو اسلئے خوش قسمت تصور کیا کہ وہاں مجھے ہر طرف حقیقی زندگی نظر آئی۔ سنہ ۱۹۱۲ء کا زمانہ تھا۔ اور چین میں ایک بہت بڑے انقلاب سے گذر رہا تھا اور پرانے خیالات کی روشوں سے نئے خیالات نمودار ہو رہے تھے۔ لوگوں کا زندگی کے متعلق نظریہ تبدیل ہو رہا تھا ۔۔۔ مجھے تغیر اور انقلاب سے خاص محبت ہے!"

یہ الفاظ سنتے ہی میرے دل و دماغ میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ کیا یہ الفاظ لاما کی زبان سے نکل رہے تھے۔

اس نے میری آنکھوں میں شک و شبہ کی علامت دیکھ لی تھی۔ اور اب وہ ایک خاص فخریہ انداز میں مسکرا رہا تھا!

"آپ کا ڈلائی لامہ کے متعلق کیا خیال ہے؟" میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے پوچھا۔

"ڈلائی لاما میں ایسی خصوصیات موجود ہیں جنہیں تم دنیا کے بہت کم انسانوں میں دیکھ سکتے ہو! وہ بہت بڑی شخصیت ہے۔ تم جانتے ہو ہر وقت دو طاقتیں دنیا پر ملکیت جمانے کیلئے ایک دوسرے سے لڑتی رہتی ہیں۔ ایک طاقت ہے نیکی کی اور دوسری بدی کی۔ اگر ڈلائی لاما نیکی کی طاقت ہے تو دنیا میں بدی کی طاقتیں بیشمار ہیں۔ مثلاً وہ چینی ڈاکو جو ہمارے لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں اور وہ جاپانی جاسوس جو اپنی ریشہ دوانیوں سے لوگوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ اور اگر ڈلائی لامہ بدی کی قوت ہے تو پھر نیکی کی قوتیں کہاں ہیں ۔۔۔؟" یہاں پہونچکر ہماری

"کشتی ہی کیا کہ جس کا کوئی ناخدا نہ ہو؟"

از جناب حسن نصیری ایم اے (گولڈ میڈلسٹ) حیدر آباد دکن

جب چشم یار بزم میں ساغر نما نہ ہو
اے ذوقِ بادہ! تو بھی طرب آشنا نہ ہو

یہ بُت تو چاہتے ہیں کسی کا بھلا نہ ہو
میں ڈر رہا ہوں اس کا نتیجہ بُرا نہ ہو

جس کو مٹا رہے ہیں سمجھ کر مرا مزار
اُبھرا ہوا وہ آپ ہی کا نقشِ پا نہ ہو

دل کو سنبھالے رہتی ہے دنیا میں آرزو
کشتی ہی کیا کہ جس کا کوئی ناخدا نہ ہو

کچھ درمیاں ہی کی محبت میں ہے مزہ
یارب! ابھی جنوں کی مرے انتہا نہ ہو

مٹ جائیگی نگاہوں کی بیتابیٔ تلاش
اے حسنِ دلفریب! ابھی خود نما نہ ہو

ہم کو تو ہر حجاب میں آتے ہو تم نظر
دھوکہ وہ کھائے جو تمہیں پہچانتا نہ ہو

کیا جادۂ فنا پہ رُکے توسنِ حیات
موجِ ہوا ابھی جس کے لئے تازیانہ ہو

پھر اے حسن زباں کو دے زحمتِ فغاں
ممکن ہے تیرا نالہ فلک نے سُنا نہ ہو

دشمنی کے پردے میں!

از جناب
ایم منظور عالم سعیدی
کانپور

چار بجے شام کا وقت تھا۔ نریندر اپنے مکان کے ایک کمرے میں بیٹھا تھا۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ وہ دلکش راگ سے آہستہ آہستہ کچھ گنگنا رہا تھا۔ اسے یکایک کچھ یاد آیا۔ اس نے اُٹھ کر کپڑے پہنے۔ اس کے بعد وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے بال سنوار رہا تھا کہ ہاتھ میں ایک پوسٹ کارڈ لئے ہوئے اس کا ملازم رامو اندر داخل ہوتا نظر آیا۔

نریندر نے آئینے کے اندر پڑتے ہوئے رامو کے عکس سے سوال کیا "کیا ہے رے رامو؟"

رامو: "ایک پوسٹ کارڈ آیا ہے بابو!"

نریندر پوسٹ کارڈ ہاتھ میں لیکر بولا: "پتاجی کے یہاں کا ہے کیا؟" خط پڑھتے پڑھتے اس کا چہرہ وفورِ مسرت سے کھل اُٹھا۔ اس نے کہا: "پتاجی آ رہے ہیں۔ رامو سنا۔ پتاجی آ رہے ہیں۔"

رامو: "کب آ رہے ہیں بابو جی؟"

نریندر: "ایں کب؟" وہ ایک بار پھر خط پر نگاہ دوڑا کر بولا: "اس کے متعلق تو انہوں نے کچھ نہیں لکھا ہے مگر آج یا کل میں ضرور آ جائیں گے۔ اچھا ہی ہوا۔ اب مجھے کلکتہ نہ جانا پڑیگا۔ اچھا اب جا کر پتاجی کا کمرہ درست کر دے۔"

نریندر کرسی سے ایک تولیہ اٹھا کر بدن صاف کرنے لگا۔

رامو: "کیوں بابو! آج گھر پر چائے نہ پیجئے گا کیا؟"

نریندر: "نہیں جی، آج دوسری جگہ چائے پیوں گا۔"

نریندر یہ کہہ کر ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

۔۔۔۔۔۔ (۲) ۔۔۔۔۔۔

کیدار بابو کے مکان کے سامنے کے کمرے سے گانے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ کیدار بابو ڈاکٹر کے ہاں گئے تھے۔ واپس آ کر انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ گانے کی دلکش آواز بادلوں کو توڑ کر نکلنے والی دھوپ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ کیدار بابو اندر داخل ہوئے۔ ان کی بیٹی کملا پیانو کے سامنے میوزک سٹول پر بیٹھی خود فراموشی کے عالم میں گا رہی تھی۔ پُرنشاط جذبات سے لبریز اسکی دونوں آنکھیں رہ رہ کر دیوار پر ٹنگی ہوئی نریندر کی تصویر کی طرف اٹھ جاتی تھیں ۔۔۔ کملا کے گیت کا مضمون یہ تھا۔

"بادِ نسیم! میرے سینے کو مس کر کے اسے دلکش جذبات سے لبریز کر جاتی ہے۔

بادِ نسیم! کسی کی آنکھیں میرے سربستہ راز سے واقف ہوتی جا رہی ہیں۔

بادِ نسیم! میرا دل ندی کنارے کھو گیا۔

بادِ نسیم! ...."

کیدار بابو کمرے میں داخل ہوئے اور چپ چاپ جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ مگر کملا کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ گیت ختم کر کے جب کملا نے رخ پھیرا تو سامنے باپ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے رخسار وفورِ حیا سے سرخ ہو گئے۔ مگر وہ جلد ہی سنبھل گئی اور سر جھکا کر بولی: "پتاجی آپ ڈاکٹر کے ہاں سے کب آئے؟"

کیدار ناتھ: "ابھی کچھ ہی دیر پہلے گیت ختم ہو گیا کیا؟"

کملا ہنستے ہوئے کیدار بابو کے پاس آ بیٹھی اور بولی: "جاپانی اسٹائل کا گیت تھا اس لئے تین ہی مصرعوں میں ختم ہو گیا۔ ہاں ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

کیدار بابو نے اپنے چہرے پر کچھ برہمی اور غصے کا انداز لا کر کہا: "کہے گا کیا؟ بڑا قابل بنتا ہے۔ کہتا ہے جب تک دانت نہ اکھڑوا دو گے مرض دفع نہ ہوگا۔ ہونہہ ہمیں ضرورت نہیں ایسے علاج کی۔ ہاں، آج مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے کملا۔"

کیدار بابو نے کچھ ایسی سنجیدگی کے ساتھ آخری فقرہ کہا کہ ایک حیرت آمیز اندیشے سے کملا کی آنکھیں ان کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔

کملا: "کیا بات ہے پتاجی؟"

کیدار بابو پشت کو کرسی سے ٹیکتے ہوئے فیصلہ کن اور تحکمانہ لہجے میں بولے: "میں نے تمہاری شادی طے کر دی۔"

کملا کا اضطراب اور بڑھ گیا۔

کیدار بابو نے اپنے اسی حاکمانہ انداز سے کہنا شروع کیا: "میں نے تم کو اعلیٰ تعلیم دلائی ہے۔ تمہیں ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے مگر مجھ کو امید ہے کہ تم میری مرضی کے خلاف شادی کرنا پسند نہ کرو گی۔"

کملا کے اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے

پھنسے ہوئے گلے سے آہستہ آواز میں کہا "نہیں پتاجی!"

کیدار بابو نے مطمئن ہو کر آہستہ سے گلا صاف کیا۔ اب ان کا لہجہ کچھ نرم ہو گیا تھا۔ وہ بولے "ذرا میرے اور پاس آجاؤ"

کملا ان کے اور قریب آ بیٹھی۔

کیدار بابو نے یکایک ہاتھ اٹھا کر نریندر کی تصویر کی طرف اشارہ کیا "ذرا ادھر دیکھو تم اس نوجوان کو پسند کرتی ہو"

یہ کہہ کر کیدار بابو نے کملا کی طرف دیکھا۔ کملا نے تصویر کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔ اور حجاب آمیز لہجے میں مبہم طور پر کہا "میں نہیں جانتی"

لیکن کیدار بابو اس قسم کی مبہم بات سن کر خوش ہو جانے والے آدمی نہ تھے۔ انہوں نے کملا کے منہ کے پاس اپنا منہ لے جا کر پھر کہا "صاف صاف کہو نا!"

کملا نے نظر نیچی کئے ہوئے جواب دیا "جیسی آپ کی مرضی!"

یہ کہہ کر کملا نے اپنے حیا آلود چہرے کو کیدار بابو کی بغل میں چھپا لیا اور کیدار بابو کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے کہا "میں اپنی بیٹی کی زبان سے ایسی ہی بات سننا چاہتا تھا"

پھر نریندر کی تصویر پر نظر جما کر بولے "چھوکرا ہر لحاظ سے نہایت موزوں اور مناسب ہے۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکا ہے دیکھنے میں خوبرو اور شکیل ہے۔ اب اس کی ذات پات کو سمجھ لینا ہے اور بس؟"

بیرونی دروازے کے پاس کسی کے گلا صاف کرنے کی آواز سن کر کیدار بابو نے اس طرف گھوم کر دیکھا۔ نریندر دروازے کے پاس کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ باپ بیٹی کی خاص نشست کو دیکھ کر شاید درمیان خلل انداز ہوتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

کیدار نے سنجیدگی سے کہا "آؤ نریندر میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا"

کملا پتا کی کرسی کے درمیان سے نریندر کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جب تک کیدار بابو نریندر کو مخاطب کر کے اسے بٹھائیں کملا آہستہ سے زنانخانے کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن کیدار بابو نے پکارا "کملا! تو جا کہاں رہی ہے۔ ہم لوگوں کی بات کوئی ایسی رازدارانہ تو ہے نہیں"

دروازے کے پاس ہی پیانو کے سامنے میوزک ٹول تھا۔ کملا کچھ جھجکتی ہوئی اسی پر بیٹھ گئی۔ کیدار بابو نے نریندر سے گفتگو شروع کی "میں نے تم کو اس لئے بلایا تھا کہ اب میں کملا کی شادی کر دینی چاہتا ہوں۔ میرے دانت کا مرض بہت خطرناک ہے۔ ممکن ہے آج ہوں کل نہ رہوں۔ میرا کچھ ٹھیک نہیں۔"

نریندر "ارے آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں"

کیدار "نہیں، نہیں، تم سب ابھی ناتجربہ کار ہو۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ دانت کا مرض نہایت خوفناک ہوتا ہے لیکن خیر اسے چھوڑو، تم ہو تو کائستھ نا!"

نریندر "جی ہاں! بھٹناگر کائستھ!"

کیدار "تو ٹھیک ہے"

کملا خاموش بیٹھی یہ باتیں سن رہی تھی اس نے ایک بار نظر اوپر اٹھا کر پھر نیچی کر لی۔

کیدار کہنے لگے "اتنے روز سے تمہاری آمدورفت ہے لیکن اب تک میں نے کبھی تمہاری خاندانی حالت دریافت نہیں کی۔ تمہارے باپ کا کیا نام ہے نریندر؟"

نریندر "جی میرے پتا کا نام شری پرتاپ چندر سنگھ ہے"

کیدار بابو ہنستے ہنستے اچانک رک گئے۔ پھر آہستہ آہستہ سیدھے بیٹھ کر ہتھیلیوں کو ایک خاص انداز سے حرکت دیتے ہوئے بولے "پر... کیا بتایا تم نے اپنے پتا کا نام؟"

نریندر "شری پرتاپ چندر سنگھ!"

کیدار بابو یکایک اٹھ بیٹھے اور بڑے زور سے گرج کر بولے "پرتاپ سنگھ... تم پرتاپ سنگھ کے بیٹے ہو؟ ایں!"

نریندر "جی ہاں! لیکن..."

کیدار بابو نے اپنی سرخ آنکھوں کو پھیلا کر درمیان ہی میں سوال کیا۔ تمہارے پتا کے گال میں اتنا بڑا نشان ہے"

یہ کہہ کر کیدار بابو نے اسے کاغذی لیموں کی طرح گول نقشہ بنا کر دکھایا۔

نریندر بولا "جی نہیں، اتنا بڑا نہیں صرف اتنا بڑا" یہ کہہ کر اس نے سپاری کی گولائی دکھائی کیدار یکایک شیر کی طرح گرج اٹھے "بس بس میں سمجھ گیا۔ تم اسی دشمن کے بچے ہو"

کملا بت بنی بیٹھی سب دیکھ رہی تھی نریندر سہما ہوا سا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کیدار بابو اس کے چہرے کے سامنے مٹھی باندھ کر کہنے لگے "چھوکرے! تمہاری یہ جرأت کہ پرتاپ سنگھ کے بیٹے ہو کر تم میرے گھر میں گھس آئے" یہ کہہ کر انہوں نے ٹیبل سے ایک گلدان اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ وہ ٹوٹ کر چور چور ہو گیا۔

کملا چیخ اٹھی "بابا!"

کیدار زخمی شیر کی طرح بیٹی کی طرف دیکھ کر بولے "خبردار! اگر تو میری بیٹی ہو تو بالکل خاموش رہنا"

کملا اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ہونٹ چبا کر

پھر بیٹھ گئی۔ کیدار نریندر کی طرف مڑے۔ داہنے ہاتھ کی مٹھی اپنے ناک پر رکھ کر بائیں ہاتھ سے اشارہ کر کے انہوں نے چیخ کر کہا۔ "دیکھ رہے ہو۔ یہ دروازہ! سیدھے باہر نکل جاؤ۔ یاد رکھو۔ اگر کبھی میرے گھر کی طرف رخ بھی کیا۔ تو سر توڑ دوں گا، سمجھ لو"

نریندر سحر زدہ کی طرح کھڑا کیدار بابو کی مٹھی کی طرف دیکھ رہا تھا وہ نیم خوابیدہ کی طرح بولا۔ "اچھا میں جا رہا ہوں"

وہ دروازے کی طرف مڑا۔

کملا میوزک ٹول پر بیٹھی۔ چپ چاپ اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ نریندر کے دروازے کی طرف مڑتے ہی وہ پیانو کے اوپر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیانو سے ایک بے سری آواز نکل گئی۔

کیدار نے پھر چیخ کر کہا "بدمعاش کہیں کا۔ پرتاپ سنگھ کا بیٹا ہو کر چلا ہے ہماری بیٹی سے شادی کرنے"

نریندر نے دروازے تک پہنچ کر ایک بار پیچھے کی طرف دیکھا۔ کیدار بابو پھر گرجے۔ "نکل جاؤ فوراً"

نریندر اب کھڑا نہ رہ سکا۔ تیز تیز قدم بڑھا کر نظروں سے غائب ہو گیا۔

کیدار دیوار میں آویزاں نریندر کی تصویر کی طرف بڑھے۔

کملا گلوگیر آواز سے بولی۔ "پتاجی!"

کیدار بابو نے اپنے دونوں ہاتھوں کے جھٹکے سے تصویر کو دیوار سے اتار کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ اور تھکے ہوئے ایک کوچ پر بیٹھ گئے۔ پھر گال پر ہاتھ رکھ کر ایکبار کچھ کہا جیسے دانتوں کے درد کا اندازہ کر رہے ہوں۔

کملا پیانو کے پاس بت بنی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ پھیکا اور سفید ہو رہا تھا۔ کیدار بابو کچھ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتے رہے پھر ذرا شکستہ لہجے سے بولے "کملا یہاں آؤ سنو"

کملا نے یکایک اپنی آنکھیں اٹھائیں اس کے بعد آہستہ آہستہ باپ کی بغل میں آ کھڑی ہوئی۔

کیدار بابو نے بغل میں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹھو"

متحرک مشین کی طرح کملا بیٹھ گئی۔ کیدار بابو نے ایک بار کھانس کر گلا صاف کیا۔ پھر دوسری طرف دیکھ کر بولے "نریندر میرے دشمن کا بیٹا ہے۔ اس کے ساتھ تمہاری شادی نہیں ہو سکتی"

کملا نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر دل کی بیقراری کو حتی الامکان دبا کر کہا "لیکن پتاجی آپ نے ان کو اس قدر ذلیل کیوں کیا؟ انہوں نے تو کچھ کیا نہیں تھا"

کیدار بابو کے چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بولے "وہ کچھ نہ کرے لیکن ہے تو میرے دشمن کا بیٹا"

کملا۔ "آخر کس بات پر ان سے ایسی دشمنی ہے؟"

کیدار بابو اپنے حافظے پر زور دینے لگے۔ لیکن حافظے نے کام نہ کیا۔ وہ جب بھی جھگڑے کی وجہ پر غور کرتے وہ ان کو اتنی ذلیل اور معمولی معلوم ہوتی۔ کہ انہیں اس کے بتانے میں بھی شرم محسوس ہوتی اس لئے کیدار بابو اس سوال کو ٹالتے ہوئے بولے "جھگڑے کی وجہ تو اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہی ہے۔ پچیس برس کی پرانی بات ہے لیکن بہرحال میں اس کے ساتھ تمہاری شادی نہیں کر سکتا۔ سمجھیں؟"

کملا سر جھکائے خاموش تھی کیدار بابو نے کچھ دبی ہوئی آواز میں کہا "کملا! مجھے کوئی اور تو ہے نہیں۔ بیٹا یا بیٹی جو کچھ ہے تو ہی ہے۔ اسلئے تیرے بوڑھے باپ کے دل کو جس کام سے صدمہ پہنچے۔ مجھے امید ہے کہ تو وہ کام ہرگز نہ کرے گی"

کملا باپ کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے بعد گلوگیر آواز میں بولی "نہیں بابا تم اس کی فکر نہ کرو"

(۲)

نریندر کے کمرے کے سامنے کھلا ہوا برآمدہ تھا۔ برآمدے میں ٹیبل اور کرسی پڑی ہوئی تھی۔ ٹیبل کے اوپر چائے کا سامان اور ٹوسٹ مکھن کیک وغیرہ رکھا تھا۔ پرتاپ بابو ایک کرسی پر بیٹھے توسٹ میں مکھن مل کر اسے سینک رہے تھے۔ اور درمیان درمیان میں چائے کے پیالے کو منہ سے لگا کر گلا تر کر لیتے تھے۔ رامو پاس ہی ٹہل رہا تھا۔

یکایک برآمدے کے نیچے جوتے کی چرمر کی آواز سنائی دی۔ پرتاپ بابو نے پیالے سے منہ اٹھا کر دیکھا۔ نریندر افسردہ اور ملول سا چلا آ رہا تھا۔ باپ کو برآمدے میں بیٹھے دیکھ کر وہ متحیر سا کہہ اٹھا "بابا!"

اس کے بعد وہ اپنے قلبی جذبات کو چھپانے کیلئے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتا ہوا۔ جلدی جلدی کمرے میں چلا گیا۔

پرتاپ بابو منہ پونچھتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نریندر نے باہر آ کر ان کو پرنام کیا۔ انہوں نے اسے محبت سے گلے لگا لیا۔ باپ بیٹے کا برتاؤ تقریباً ہمعمر دوستوں کی طرح تھا۔

پرتاپ نے پوچھا "کیسے ہو نریندر؟"

نریندر نے چہرے کو بشاش بناتے ہوئے کہا "اچھا ہوں پتاجی۔ تم یکایک کیسے

چلے آئے؟"

پرتاپ: "یونہی بہت روز سے تجھے دیکھا نہیں تھا۔ سوچا ذرا ملاقات کر آؤں"

پرتاپ بابو ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

نریندر بھی ان کے سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

نریندر بولا "بہت اچھا کیا ــــ رامو! ایک پیالہ اور تولا"

نریندر کیلئے چہرہ کی بشاشت کو قائم رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ چراغ میں جب تیل کی کمی ہو تو صرف بتی بڑھانے سے اس کو کبتک روشن رکھا جا سکتا ہے۔ پرتاپ بابو چائے کے پیالے سے سر اٹھا اٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

رامو پیالہ لے کر واپس آیا۔

نریندر ایک گھونٹ چائے پی کر بائیں ہاتھ پر گال رکھ کر بیٹھ گیا۔ پرتاپ نے ٹوسٹ کی طشتری اسکی طرف بڑھادی۔ نریندر نے سر ہلا کر اسے پھر ان کی طرف واپس کر دیا۔ اب پرتاپ بابو سے نہ رہا گیا وہ بولے "تجھے کیا ہوا ہے نرین؟"

نریندر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور چہرے پر مسکراہٹ لاتا ہوا سوال کو ٹالنے کی غرض سے بولا "جی کچھ تو نہیں"

پرتاپ بابو: "تو اس طرح گال پر ہاتھ رکھ کر کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ دانت میں درد تو نہیں ہے؟" یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

نریندر ہنسنے لگا۔ "نہیں پتا جی۔ دانت میں درد ورد نہیں ہے"

پرتاپ بابو: "پھر اس طرح کیوں بیٹھا ہے۔ نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ آخر بات کیا ہے؟"

نریندر چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتا ہوا سنجیدگی سے بولا "میں نے کہا تو کہ بابا کچھ نہیں"

پرتاپ نے کہا "کوئی بات تو یقیناً ہے بتاتے کیوں نہیں؟"

نریندر کا چہرہ سنجیدہ بن گیا۔ وہ کچھ دیر تک پرتاپ کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے پوچھا "بابا۔ کیدار رائے کے نام کے کسی شخص کو آپ جانتے ہیں؟"

پرتاپ بابو کرسی سے اچھل پڑے بولے "ہاں اسے جانتا تھا مگر اب سے پچیس برس پہلے۔ آخر تمہیں اس گدھے سے واسطہ؟"

نریندر: "نہیں کچھ نہیں۔ یہاں اسکی بیٹی کملا میری کلاس فیلو ہے۔ اس کے ساتھ میری بات چیت ہوئی تھی"

پرتاپ بے ساختہ بھڑک اٹھے۔ اور برہم ہو کر بولے "کیا کہا! اس بدمعاش کی لڑکی سے تو نے بات چیت کی تھی۔ وہ بدمعاش میرے بیٹے کو اس طرح پھنسانا چاہتا ہے"

نریندر نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بابا آپ غلطی کر رہے ہیں وہ ......"

اس کے فقرے کے ختم ہونے سے پہلے ہی پرتاپ بابو نے گرجنا شروع کیا۔

"ہرگز نہیں۔ یہ بالکل ناممکن ہے نریندر اگر تو اپنے باپ کا بیٹا ہوگا تو اس کے مکان کی طرف کبھی رخ بھی نہ کرے گا"

نریندر نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔

"پتا جی! آپ اطمینان رکھئے میں ہرگز ان کے گھر نہ جاؤں گا۔ انہوں نے تو کہہ دیا ہے کہ اگر میں ان کے گھر میں قدم رکھونگا تو وہ میرا سر توڑ دینگے"

پرتاپ کچھ مطمئن ہو گئے، بولے۔ "اچھا میں دیکھ لونگا اسے، وہ میرے بیٹے کا سر توڑے گا۔ پولیس میں دیدونگا بدمعاش کو"

نریندر اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگا۔

پرتاپ بولے "کل رات کی گاڑی سے ہم لوگ کلکتہ چلیں گے"

نریندر اداس ہو کر "اچھی بات ہے"

پرتاپ: "میں نے نریش چندر کے ہاں تیری شادی طے کر لی ہے"

نریندر نے ہونٹ چبالیا اور بولا "میں شادی نہ کروں گا پتا جی"

پرتاپ: "خیر دیکھا جائے گا پہلے کلکتہ تو چل"

(۴)

دوسرے روز شام کو نریندر نے ربڑ کی ایک غلیل طیار کی ایک خط لکھا اور دونوں چیزوں کو جیب میں رکھ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

دوسرے لمحے میں پرتاپ بابو ٹہل رہے تھے اور وہ رہ رہ کر گھڑی کی طرف دیکھ لیتے تھے اس بار گھڑی کی طرف دیکھ کر وہ بڑبڑائے "کسی طرح وقت ختم ہی نہیں ہوتا۔ اب بھی گاڑی میں پانچ گھنٹے کی دیر ہے"

یکایک ان کی نظر کھڑکی سے باہر گئی۔ تو انہوں نے دیکھا نریندر باہر کی طرف جا رہا ہے کچھ دیر تو وہ اسے دیکھتے رہے پھر نہ جانے کیا سوچکر وہ بھی باہر نکل پڑے۔

کوٹھی کے احاطہ کے پھاٹک پر موٹر گیرج تھا۔ نریندر نے ملازم کو کار نکالنے کا حکم دیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر روک دیا کہ کار کی آواز سن کر اس کے والد ہوشیار نہ ہو جائیں کہا "رہنے دو۔ پیدل ہی جاؤنگا"

جب تک پرتاپ بابو پھاٹک پر پہونچیں نریندر آگے بڑھ گیا۔ انہوں نے پھاٹک پر پہونچ کر ملازم سے پوچھا "چھوٹے بابو کدھر گئے؟"

ملازم نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "اسی طرف" پرتاپ بابو ملازم کے بتائے ہوئے راستے کی طرف چل پڑے۔

~~~

کیدار بابو کے مکان کی عقبی جانب دو منزلے پر ایک کمرہ تھا جس میں کملا سویا کرتی تھی۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی جس میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ اسی کمرے میں کملا اپنے پلنگ پر پڑی نریندر کی تصویر کو تکیے پر رکھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی صورت یاس و حسرت کا مرقع بنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو امڈے چلے آ رہے تھے جنکو وہ کب سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ تصویر پر جھک کر رونے لگی۔

نریندر نے کملا کے اسی کمرے کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے خط کو ایک کنکر میں لپیٹا اور غلیل میں رکھ کر کھڑکی کے شیشے میں مارا۔ کنکر خط سمیت شیشے کو توڑ کر کمرے میں چلا گیا۔

کملا تصویر پر جھکی آنسو بہا رہی تھی اس نے شیشے کے ٹوٹنے کی آواز سن کر سر اُٹھایا تو کنکر میں لپٹا ہوا ایک کاغذ نظر آیا۔ اس نے کاغذ کو کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"پیاری کملا!

میرے پتا جی آئے ہوئے ہیں۔ آج مجھکو کلکتہ لے جا رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے جانے سے پہلے ایک بار تم سے مل لوں جس چٹان کی آڑ میں ہم دونوں اکثر ملا کرتے تھے میں وہیں تمہارا انتظار کروں گا۔ کیا تم مجھ سے وہاں ملوگی؟

تمہارا
نریندر"

نریندر جواب کے انتظار میں مضطرب کھڑا تھا کہ کملا نے کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر کملا نے اثبات میں سر ہلا کر کھڑکی بند کر لی۔

~~~

نریندر چٹان کی آڑ میں ایک پتھر سے پشت ٹیکے کھڑا کملا کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی نظر پگڈنڈی پر جمی ہوئی تھی یکایک اس نے دیکھا کملا چلی آ رہی ہے۔ اس کا چہرہ مضمحل ہے اور سر کے بال پریشان۔ جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ ایسے زور کی ایک ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے بچی۔ نریندر نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا دونوں خاموش ایک دوسرے کو پُر حسرت نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ کملا کی سانس اب تک پھول رہی تھی۔

دیر کی خاموشی کے بعد نریندر گلوگیر آواز میں بولا۔ "شاید ہم دونوں کی یہ آخری ملاقات ہے کملا۔ اس کے بعد امید نہیں کہ ہم پھر مل سکیں"

کملا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نریندر نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "ہم دونوں میں کبھی ملاقات ہو یا نہ ہو کملا لیکن مجھے امید ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ہمیشہ محبت کرتے رہیں گے۔"

کملا پھنسے ہوئے گلے سے بولی: "بیشک زمانے کا بے رحم ہاتھ ہمیں جدا کر دے لیکن ہمارے دلوں سے ایک دوسرے کی محبت کو کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"

نریندر نے جوش محبت میں کملا کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "پیاری کملا! ہم میں سے کسی کو ایسا کام نہ کرنا چاہئے جو ہمارے والدین کی دل آزاری کا باعث ہو اور نہ ہمیں اپنی محبت کو رسوا کرنا چاہئے۔"

کملا کی آنکھیں آرتی کے چراغ کی طرح چمک اٹھیں۔ وہ بولی۔ بیشک ہمیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔ مجھے تمہارے خیال سے حرف بحرف اتفاق ہے۔

نریندر نے کہا۔ "ایشور ہمیں اپنے فیصلے پر قائم رکھے۔ اور ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ پریم کرتے رہیں۔"

کملا کچھ دیر چپ رہ کر گلوگیر آواز میں بولی اچھا نریندر! اب مجھکو رخصت دو۔

کملا کے ہاتھ نریندر کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ چاہتا تو یہی تھا کہ کملا کے ہاتھ اسی طرح ہمیشہ اس کے ہاتھوں میں رہیں۔ مگر اس نے دل پر جبر کر کے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے کملا تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی واپس چلی گئی وہ جب تک نظر آتی رہی۔ نریندر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

(۵)

کملا کیدار بابو کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے اس کے دل کو صدمہ پہونچا کر وہ بھی خوش نہ تھے۔ وہ کملا کی دلدہی کی غرض سے دو منزلے پر گئے۔ وہاں جا کر دیکھا کملا کے دروازہ بند تھا۔ پہلے تو انہوں نے کواڑ کھٹکھٹائے لیکن جب کوئی آہٹ نہ ملی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ کمرے میں کملا نہ تھی۔ البتہ میز پر نریندر کا وہ خط پڑا ہوا تھا۔ جسے اس نے غلیل کے ذریعے کمرے میں پھینکا تھا۔ خط پڑھتے ہی ان کا چہرہ غضبناک ہو گیا۔ وہ غصے میں بھرے ہوئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ اس چٹان سے واقف تھے جس کی آڑ میں کملا نریندر سے ملا کرتی تھی۔

~~~
~~~

پرتاپ بابو پہلے ہی سے نریندر کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ اتفاقت کیدار بابو سے ان کا سامنا ہوگیا۔ آج پچیس برس کے دونوں میں ملاقات ہوئی تھی پھر بھی سامنے ہوتے ہی آپس میں الجھ پڑے۔

پرتاپ بابو نے کہا: "کیوں میرے بیٹے کو پھانسنے کیلئے تونے اپنی بیٹی کو جال بنا رکھا ہے؟"

کیدار بابو چیخ کر بولے: "میں نے جال بنا رکھا ہے یا تونے بدمعاش کہیں کا! اگر تیرا بیٹا مجھے مل گیا تو مارتے مارتے اس کا بھرکس نکال دونگا۔ اس کی یہ جرأت کہ میری بیٹی کو خط لکھے!"

پرتاپ بابو نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا "چھونا میرے بیٹے کو تو دکھا دونگا تماشا۔ جیل نہ بھجوا دوں تجھے تو پرتاپ سنگھ نام نہیں۔"

نریندر ابھی تک چٹان کے پاس ہی تھا۔ اور قریب ہی پرتاپ اور کیدار میں یہ جھگڑا ہو رہا تھا۔ نریندر دونوں کی آواز پہچان کر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

کیدار بابو نے اپنے دائیں ہاتھ کو دکھا کر کہا: "جی چاہتا ہے۔ ایک تھپڑ رسید کردوں کہ تیرا پھولا ہوا گال پچک جائے۔"

پرتاپ بابو نے اپنی بندھی ہوئی مٹھی کیدار کے پاس لے جا کر بولے۔ "دونگا ایک گھونسہ کہ سارے دانت پیٹ میں چلے جائینگے۔"

کیدار بابو نے جواب دینے کے لئے ہاتھ اٹھایا مگر منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ وہ گال کو دونوں ہاتھوں سے دبائے چیخ مار کر گر پڑے۔ اور "آہ آہ، اوہو، ہو، ارے، رے" کہتے ہوئے زمین پر پاؤں پٹکنے لگے۔

پرتاپ بابو کھڑے اپنی مٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ کہیں انہوں نے ایک آدھ گھونسہ رسید تو نہیں کردیا۔

کیدار بابو کی ہائے وائے میں کمی ہونے کی بجائے زیادتی ہی ہوتی جا رہی تھی۔

پرتاپ بابو نے ڈانٹ کر کہا: "یہ تو روکیوں رہا ہے رے۔ کیا ہم نے تجھکو مارا ہے مکار کہیں کا؟"

کیدار بابو مشکل سے اتنا کہہ سکے: "ہائے ہائے دانت، ارے بے ایمان دانت رے رے۔"

پرتاپ بابو کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے کیدار کا شانہ ہلا کر پوچھا۔ "دانت کیا؟ دانت میں درد ہو رہا ہے کیا رے؟"

"دانت میں درد نہ ہو جاتا تو اب تک تجھ کو ......"

"تو پہلے کیوں نہیں بتایا تونے احمق کہیں کا۔"

پرتاپ بابو نے جیب سے ایک ٹکیہ نکال کر کیدار بابو کے سامنے بڑھائی۔ "لے اسے کھا جا۔ ابھی دو منٹ میں ساری تکلیف کافور ہو جاتی ہے۔"

کیدار بابو بڑبڑائے۔ "ہاں زہر کھلا کر میری جان لینی چاہتا ہے ــــ آہ!"

کیدار بابو نے جیسے ہی منہ کھول کر آہ کی۔ پرتاپ بابو نے ان کے منہ میں ٹکیہ چھوڑ دی، کہا: "نگل جا احمق کہیں کا۔"

جب تک کیدار بابو کچھ کہیں گولی منہ میں گھل گئی۔

نریندر اپنی جگہ سے چل کر پاس ہی ایک پتھر کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ اب میدان جنگ سرد پڑ چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد صرف کیدار بابو کے منہ سے آہ نکل جاتی تھی۔

دونوں حریف پتھر کے دو ٹکڑوں پر بیٹھ گئے۔ کیدار بابو حیران تھے کہ کیسی

طلسمی گولی تھی جس نے دا
قدر جلد زائل کردیا۔ پرتا
ہونٹوں پر فتحمندانہ مسکرا
کر رہی تھی۔
وہ بولے: "کیوں کیسی دو
کیدار نے کہا: "جادو
کی بنی ہوئی ہے؟"
"ہندوستان کی بنی ہوئی
"کس کی ایجاد ہے؟"
"یقین کرو گے؟"
"کیوں؟"
"میری ایجاد"
"سچ؟"
"پھر کیا جھوٹ؟ میرا
ستر لاکھ روپے کما چکا
"اوہو ستر لاکھ! میں تو
کرکے بھی صرف گیارہ لا
"تو کیا گیارہ لاکھ کچھ
یہ کہہ کر پرتاپ بابو نے
پر ایک ہلکی دھپ لگائی
دونوں حریفوں کو اس
محبت کی باتیں کرتے دیکھ
بڑھاتا ہوا کملا کو خوشخبری
روانہ ہوگیا۔
پرتاپ بابو نے کہا: "ا
کیدار بابو بولے: "
گھر چلنا ہوگا۔"
"اچھی بات ہے چلو
راستے میں کیدار بابو نے
کہا۔ "تم نے میری کملا کو
لڑکیاں کم دیکھنے میں آتی
پرتاپ بابو بھی بولے: "
کو تو تم نے دیکھا ہے۔ کد

اصلاح

مسٹر بھارگو بیرسٹر کی بیوی لیڈی بھارگو اپنی پارٹی میں کافی امتیاز رکھتی تھیں۔ وہ چالیس کو پہونچکر بھی اپنے کو بیس کی سمجھتی۔ چکی کی طرح جوڑی چکلی ہو کر بھی اپنے کو نازک بدن اور نازآفرین خیال کرتی تھیں۔ اپنی سترہ سال کی بیٹی کی موجودگی میں بھی فلم ایکٹرسوں کی طرح بنتی سنورتی تھیں۔ پھر اگر وہ اپنی پارٹی میں ممتاز تھیں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟

مس بھارگو سکول کی "بابولر" طالبات میں تھی۔ گلاب ساچہرہ۔ ہرن کی سی آنکھیں کمان سی بھوئیں۔ چنچل تلیاں۔ موتی کی لڑی سے دانت، کمر کو چھوتی ہوئی چوٹی سر سے پاؤں تک نئی روشنی کا مجسمہ۔

ماں بیٹی دونوں میز پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں یکایک فون کی گھنٹی بجی۔ اور لیڈی بھارگو منہ سے چائے کا پیالہ لگائے فون پر پہونچیں۔

"کہئے......اوہو، آپ ہیں۔"

"ہاں لیلا کیا ہی ہوں۔"

"اچھا تو طے ہے نا؟"

"نہیں بھئی میں آج تو بیحد مصروف ہوں تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کے ایک ایک لمحے کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں لیکن مجبوری ہی ایسی ہے کہ آج وقت نہیں مل سکتا۔ خیر آج اور کل میں کیا رکھا ہے چوبیس گھنٹے کون بہت زیادہ ہیں۔ لیکن کل کیلئے تیار رہنا پیاری لیلا۔ سمجھ گئیں؟"

مس بھارگو نے دیکھا ماں کا بشاش چہرہ پژمردہ سا ہو گیا تھا۔ اور وہ کسی خاص خیال میں غرق ہو گئی تھی۔

"ماں! کیا سوچ رہی ہو، کوئی خاص بات ہے کیا؟"

لیڈی بھارگو نے ایک بار سر اُٹھا کر بیٹی کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجی۔ لیڈی بھارگو اُٹھنا چاہتی تھیں۔ مگر مس بھارگو ماں کو روک کر خود فون پر پہنچ گئی۔

"ہلو، کون؟"

"میں ہوں، بی......"

"اوہو تم ہو، بیرندر! اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"تمہیں تو ساری باتیں معلوم ہی ہیں۔"

"تو اپنی ماں سے تم نے سب باتیں کہدیں؟"

"ابھی تو نہیں۔ مگر سوچتا ہوں کہہ دوں، اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے۔"

دیکھو کمزوری کو راہ نہ دو۔ میں جانتی ہوں تمہاری باتوں سے تمہاری ماں کو بہت صدمہ پہونچے گا۔ مگر اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟ وہ گھر ہی پر ہیں نہ؟"

"ابھی تو ہیں۔"

"تو دیر نہ کرو، ایشور تمہیں ہمت دیں۔"

یہ کہہ کر مس بھارگو نے فون رکھدیا۔

لیڈی بھارگو نے بیٹی سے سوال کیا کیا بات ہے کلا! تم کس سے باتیں کر رہی تھیں۔

"بیرندر سے، تم اسے جانتی تو ہوں گی جسٹس شاہ کا بیٹا۔ ابھی حال ہی میں اس کے ساتھ میری راہ و رسم ہوئی ہے۔"

"نہایت خوش مزاج اور خوبصورت نوجوان ہے۔"

"کیا باتیں کر رہا تھا تم سے۔ ماں نے بڑے اضطراب سے سوال کیا۔

"تھی ایک بات۔" مس بھارگو نے پیشانی کے بالوں کو ایک طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

"اس کی باتوں سے تو معلوم ہوتا تھا کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔"

"ہاں ایسی بات ہے۔"

"کیا کوئی تشویشناک صورت پیش آگئی ہے؟"

"ہاں، ماں تشویشناک ہی سمجھو۔"

لیڈی بھارگو تھوڑی دیر کے لئے ساکت سی ہو گئیں۔

"اگر تم سننا چاہو تو مجھے بتانے میں کوئی تامل نہیں۔ بلکہ میں تو یوں بھی تم سے ذکر کرنے والی تھی۔"

"کہو کیا بات ہے؟"

مس بھارگو نے ماں کے پوڈر آلود چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں نے اسے ایک مشورہ دیا ہے۔ دیکھو تمہارے نزدیک میں نے اسے مشورہ دینے میں کوئی غلطی تو نہیں کی؟"

"کہتی چلو۔" لیڈی بھارگو نے کہا۔

مس بھارگو نے کہا۔ "بیرندر کو پتہ چلا ہے کہ اس کی ماں ایک دوسرے مرد کو پیار کرنے لگی ہے اور جلد ہی اس کے ساتھ بھاگ جانے کی فکر میں ہے۔"

"اچھا!" —— لیڈی بھارگو کی زبان
سے بے اختیار نکل گیا۔

"ہاں ماں!"

"پھر؟"

"یہ بات معلوم کرکے بیرندر کے غم و غصے کی انتہا نہ رہی۔ پہلے تو اسے اپنے باپ ہی پر غصہ آیا کہ وہ یقیناً کسی عورت کے پھندے میں پھنس گیا ہے اور اس لئے اس نے اس کی ماں کو پیار کرنا چھوڑ دیا ہے جس سے اس کی ماں دوسرے مرد کو چاہنے کے لئے مجبور ہوگئی ہے۔ لیکن پھر اس کا یہ خیال بدل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کتنا شریف آدمی ہے۔ اسلئے بغیر تحقیق اس کے متعلق ایسا خیال کرلینا اسے خلاف انصاف معلوم ہوا۔ چنانچہ اس نے تحقیقات شروع کی تو اس پر اصلیت ظاہر ہوگئی۔"

لیڈی بھارگو بیٹی کی باتیں سنتی جاتی تھیں اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ جیسے بیٹی خاموش ہوئی انہوں نے سوال کیا۔ کیا اصلیت ظاہر ہوگئی؟

حیرت سے لیڈی بھارگو کی پتلیاں جم سی گئی تھیں۔

مس بھارگو نے پھر کہنا شروع کیا "بیرندر کو پتہ چلا کہ اسکی ماں برسوں سے بیرندر کے شریف اور نیکدل باپ کو دھوکہ دے رہی ہے اور پرائے مردوں سے ملتی رہی ہے۔ جس وقت وہ سکول چلا جاتا اور اس کے باپ عدالت چلے جاتے وہ دونوں کی غیر موجودگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہ کرتی۔ بیرندر کے باپ کے ساتھ اس کا برتاؤ محبت آمیز اور ہمدردانہ نہ تھا۔ اسی سے اس کے باپ کو دوسرا دروازہ جھانکنا پڑا۔ بہر کیف اسے معلوم ہوگیا کہ قصور اس کے باپ کا نہیں، اس کی ماں کا ہے۔"

یہ کہہ کر مس بھارگو نے ماں کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں۔

مس بھارگو نے کہا۔ بیرندر نے اس بارے میں مجھ سے رائے مانگی۔ میں نے اسے رائے دی کہ وہ اپنی ماں سے جواب طلب کرے۔ میں نے غلط رائے تو نہیں دی، ماں؟"

ماں کے افسردہ چہرے پر بشاشت کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ بولی۔ تم نے نہایت درست رائے دی بیٹی۔"

"واقعی ماں تم سچ کہہ رہی ہو؟ میں نے بیرندر کو بہت اچھی رائے دی۔ تم کتنی اچھی ہو ماں!"

یہ کہہ کر کلا بچوں کی طرح ماں سے لپٹ گئی بولی۔ ماں، اجازت دو تو میں ذرا جاکر دیکھ آؤں کہ بیرندر کیا کررہا ہے۔

ماں نے ابھی جواب بھی نہ دیا تھا کہ بیٹی تتلی کی طرح اڑ گئی۔

ایک دروازے سے کلا باہر نکلی اور دوسرے دروازے سے مسٹر بھارگو اندر داخل ہوئے

تھوڑی دیر کے بعد مس بھارگو واپس آئی تو اس نے آڑ سے دیکھا۔ اس کے باپ ماں پیار بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ اور ایک ہی طشتری میں کچھ کھا رہے ہیں۔

کلا آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ اس کی ماں اس کے باپ سے کہہ رہی تھی۔ یہ ناشتہ آپ کیلئے کافی نہ ہوگا۔ آپ یہیں بیٹھے میں آپ کیلئے کھانا نکالوں۔"

مسٹر بھارگو کی آنکھوں سے مسرت جھلک رہی تھی۔ انہوں نے کہا "تمہیں تکلیف

کرنے کی کیا ضرورت ہے، خا...
کھانا پکائے گا ہی۔"

لیڈی بھارگو بولیں "خانسا...
کا کھانا بہت دن کھا چکے...
پکایا کروں گی۔ آپ کورٹ...
گھر چلے آیا کریں۔ رات کو مجھ...
نہیں معلوم ہوتا۔"

مسٹر بھارگو نے بیوی سے ا...
باتیں برسوں سے نہیں سنی...
نے دل ہی دل میں خوش ہو...
آج کلب نہ جاؤ گی لیلا؟"

"میں نہ آج کلب جاؤں گی او...
اب میرا کلب آپ کے قدمو...

"کاش مجھے صبح تمہارا ا...
گیا ہوتا تو میں نے اس وقت...
کا فیصلہ نہ کیا ہوتا۔"

"آپ کہاں جانا چاہتے ہیں...
نے اضطراب آمیز لہجے میں...

"ایک صاحب سے اسٹیشن پر مل...
کا کام ہے، وہ باہر جا رہے...
نہ ملنے کے باعث میں پہلے...
نہ کرسکا۔ خیر وہ یہیں آکر...
کے پاس اپنی کار بھیج دوں گا...

"تو کار بھیج دیجئے۔ اور را...
آنے کا پروگرام نہ رکھا کیجئے...

"نہیں کوئی ضرورت نہیں...
کو کہیں نہ جایا کروں گا۔"

کلا جو آڑ میں کھڑی باپ ما...
باتیں سن رہی تھی خوشی کو ضب...
اندر چلی آئی۔

لیڈی بھارگو اپنی جوان لڑکی...
سامنے دیکھ کر کچھ جھینپ سی گ...
کلا باپ کی کرسی کے پاس کھ...

(باقی

حباب

از جناب ظفر شیرانی بریلوی

قریب قریب ایک ہی عمر تھی ایک گھر تھا ایک ساتھ پرورش پائی ایک ساتھ کھیلے آنکھیں کھلیں تو ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر کبھی جدا نہیں ہوئے۔ کمار اور وسنتی بھی الگ الگ نہیں دیکھے گئے۔ کھاتے تو ایک ساتھ کھیل رہے تو ایک ساتھ۔ کمار کی تلاش ہوتی تو وسنتی کو پکار لیا جاتا وسنتی کو بلانا ہوتا تو کمار کو آواز دے لی جاتی۔

ایک دن کمار اور وسنتی اپنے مکان کے سامنے باغ کی ایک کیاری میں پالتی مار کر بیٹھ گئے اور چہرے اتنے سنجیدہ بنا لئے جیسے کہ وہ دنیا کے کسی اہم مسئلہ پر بحث شروع کرنے والے ہیں۔

کمار بولا۔ وسنتو بتا تو میری کون لگتی ہے؟

وسنتی تیزی سے آنکھیں جھپکانے لگی۔ دو ایک دفعہ کچھ کہنے کیلئے ہونٹ کھولے اور پھر بند کر لئے۔ آخر کار جھجکتی ہوئی بولی "میں تمہاری وسنتی لگتی ہوں"۔

کمار نے کہا۔ "ہاں تو میری وسنتی لگتی ہے اور میں تیرا کون لگتا ہوں؟"

"کمار"

"ہاں میں تیرا کمار لگتا ہوں"۔

پھر کچھ سوچکر بولا۔ "لیکن آج پتا جی کہہ رہے تھے کہ سنتو تمہاری چچازاد بہن ہے"۔

"اونھ" وسنتی نے اپنے پتلے پتلے گلابی ہونٹ لٹکاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری بہن وہن کچھ نہیں لگتی میں تمہاری وسنتی ہوں" "اور کہہ رہے تھے کہ میں تمہارا بھائی ہوں"

"اونھ" وسنتی کے آنسو نکل آئے یہ نئے نئے رشتے اسے پسند نہ تھے۔ وہ ایک دوسرے کیلئے کمار اور وسنتی کے علاوہ اور کچھ نہ تھے۔ انہیں کسی اور رشتے کا خیال بھی نہ تھا۔ دونوں پہاڑوں کی طرح مستحکم اور جھرنوں کی طرح خوش تھے۔

وسنتی کو جلد فنا ہونے والی چیزوں سے کچھ محبت سی تھی اس کے برخلاف کمار ایسی چیزوں کو بہت پسند کرتا تھا جو ایک جگہ پر قائم تھیں اور ان میں صدیوں سے کوئی انقلاب نہیں ہوا تھا۔ وسنتی صبح کے وقت باغ میں پھولوں کے پاس بیٹھ جاتی اور کلیوں پر شبنم کے شفاف قطروں کو رقصاں دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔ وہ کمار کو پاس بلا کر کہتی "دیکھو کمار یہ کیسے کانپ رہے ہیں جیسے کسی نے جھڑک دیا ہے۔ ارے یہ ایک تیز جھونکا آیا۔ پھول جھومنے لگے وہ گرا۔ وہ گیا وہ گر کر خاک میں مل گیا۔ کتنا اچھا کھیل ہے کمار۔ آؤ کوئی دوسری جھاڑی دیکھیں"۔

اور جب وہ کمار کی انگلی پکڑ کر اسے کسی اور جھاڑی کے پاس لے جاتی تو اسے رنجیدہ دیکھ کر پوچھتی۔ "ارے منہ کیوں بنا رہے ہو"۔

کمار کہتا۔ "سنتو یہ قطرے کتنی جلدی فنا ہو گئے۔ تھوڑی دیر اور ٹھہرے رہتے تو کیا تھا"۔

اور وسنتی زور زور سے ہنستی اسے کسی اور جھاڑی کے پاس لے جاتی اور کسی تتلی کو پکڑ کر یا کوئی شبنم کا قطرہ نیچے گرا کر یا کسی پھول کو مسل کر اتنی خوش ہوتی کہ ہنستے ہنستے دُہری ہو جاتی لیکن کمار ایسی تیز تیز نگاہوں سے اسے گھورا کرتا جیسے وہ اس کے سینے پر آہستہ آہستہ چھری چلا رہی ہو۔

جب وہ باغ کے صاف تالاب کے پاس بیٹھ کر اس میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں پھینکتے اور پھر لاتعداد چکروں کو پھیلتا دیکھتے تو خوشی سے تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگتے لیکن اگر وسنتی کا دھیان پانی کے حبابوں کی طرف لگ جاتا تو کمار کی ساری مسرت ختم ہو جاتی، وسنتی کہتی۔ "ارے اتنا بڑا حباب۔ اتنا بڑا تمہاری گیند جتنا دیکھو نا سورج کی کرنیں اس پر پڑ رہی ہیں۔ یہ شیشے کا محل ہے نا؟ اس میں وہ پری رہتی ہے نا جس نے لال بادشاہ کی سنہری انگوٹھی چرائی تھی۔ ارے وہ ختم ہو گیا۔ (تالیاں بجا کر) کمار یہ کتنا اچھا تماشہ ہے"۔

اور جب وہ کمار کی طرف دیکھتی تو حیران رہ جاتی۔ کمار کے جیسے آنسو نکلنے والے ہیں۔ وہ کچھ کہہ نہ سکتا وہ کیوں اداس ہے بس وہ اداس ہو جاتا اور جب تک وسنتی کسی اور کھیل میں مشغول نہ ہو جاتی کھویا کھویا سا رہتا۔

وہ وسنتی سے کہتا۔ "اری آسمان کو دیکھ کیسا نیلا ہے"۔

"نیلا نہیں اودا ہے۔"

"اودا ہی نہیں لیکن ہے کتنا خوبصورت؟" پھر ایک طرف کو دیکھتے ہوئے کہتا۔

"وہ پہاڑ دیکھو، وہ جھیل کی دوسری سمت جیسے کسی نے سونے کا ڈھیر لگا دیا ہے"

"سونا کیا ہوتا ہے۔"

"سونا؟ سونے کا رنگ اس پہاڑ کا سا ہوتا ہے۔"

لیکن وسنتی نیلگوں آسمان اور بھورے سنہرے پہاڑوں اور مخملی میدانوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ پکے پھلوں کو ایک ذرا سا جھونکا دیتی اور پھر ان کو نیچے گرا کر تماشہ دیکھتی یا حبابوں کو پھٹتے یا شبنم کے قطروں کو خاک میں ملتے یا ستاروں کو اچانک سرمگیں فضا میں ٹوٹتے یا آبگینوں کو گرتے دیکھتی تو لپک کر کمار سے لپٹ جاتی ان چیزوں سے اسے دلچسپی تھی۔ قدیم راجاؤں کی اس عمارت میں اسے کوئی لطف نہ آتا تھا جہاں بیٹھ کر وہ میدانوں میں ہرنوں کا شکار اور جھیلوں میں مرغابیوں کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ کمار اس عمارت کو بڑے شوق سے دیکھتا پھر وہاں جا کر خاموش بیٹھ جاتا۔ جہاں کبھی راجا بیٹھ کر تیر اندازی کیا کرتے تھے "سنتو! یہاں اس طرح مہاراجہ بیٹھتے ہوں گے۔ سنتو! یہ مکان بڑا پرانا ہے۔ برسیں گذریں کہ یہ تعمیر ہوا تھا لیکن اب بھی ویسا ہی نیا ہے جیسے لچھمن داس راج اسے ابھی تیار کرکے گیا ہے۔"

اور وسنتی کہتی "لچھمن داس راج نے تو کل ہماری مرغیوں کیلئے چھوٹی سی کوٹھڑی بنائی تھی رات کو بارش جو ہوئی تو دھم سے بیٹھ گئی۔ بھورا مرغا آج اسی لئے لنگڑا کر چل رہا ہے۔"

خیالات میں اتنا اختلاف ہونے پر بھی انہیں ایک دوسرے سے محبت تھی ان کے ماں باپ بھی متعجب تھے وہ دیکھتے کہ وسنتی اور کمار کا کسی ایک بات پر بھی ہم رائے ہونا دشوار ہے مگر پھر بھی ایک دوسرے سے اتنی محبت ہے کہ دس بارہ منٹ کیلئے بھی ایک کہیں چلا جائے تو دوسرا غمگین ہو جاتا۔

وقت گزرتا گیا اور ان کے خیالات میں بھی اختلاف بڑھتا گیا۔ ہر بات پر بحث مباحثہ "یوں نہیں ہے یوں ہے" دوسرا کہتا "نہیں یوں نہیں یوں ہے" لیکن ان کے دلوں پر میل نہ آسکا ان کے نزدیک یہ بھی محبت کا ایک طریقہ تھا وہ سمجھ سکتے تھے کہ جو لوگ ہر بات میں ہم رائے ہوتے ہیں انہیں گفتگو کیلئے اور کون سا موضوع مل جاتا ہے۔"

کمار سترہ سال کا ہوگیا اور وسنتی سولہ کی لیکن ان کے کاموں میں وہی معصومیت وہی طفلی رہی۔ ان کے تعلقات میں دنیاوی اختلافات نے جگہ نہیں پائی تھی وہ ایک دوسرے سے اب بھی کمار اور وسنتی تھے گھر والوں کے لئے بھی ان کا اتنا خلوص ناراضگی کے لائق نہ تھا۔ ان کی محبت بے لوث تھی۔ ان کی محبت پر بچپن کا ہلکا اور غیر فانی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ یہ رنگ دھل جاتا تو ان میں شرم پیدا ہو جاتی۔

کمار نے اپنے شہر میں ہی ایف اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ اب بی اے کیلئے اسے لاہور جانا تھا۔ اس کے والد نے ایک روز طے کر دیا کہ کمار برسوں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں بھیج دیا جائے گا۔ کمار اور وسنتی اتنے رنجیدہ ہوئے کہ گھنٹوں ایک

دوسرے سے بات نہ کر سکے۔ با
شہتوت کے درخت سے
گئی تھی اور اس کی آخری
نیچے لٹک آئی تھی۔ کمار کی
چھیڑ چھاڑ سے وہ لرز
چنبیلی کی ایک جھاڑی جو
سرے سے شروع ہو کر
سرے تک تاروں جیسے
گئی تھی۔ وسنتی کے بے
جھک جھک جاتی تھی۔ وسنتی
مسل دیتی کبھی کوئی گھا
کمار بھی درخت کے تنے
دیتا۔ کبھی ناخن سے اس
لگتا۔ مالی پاس ہی سڑک پر
رہا تھا اس نے ہمیشہ خو
بھونرے اور ہمیشہ رقص کر
یوں کھویا کھویا دیکھا تو
چپ چاپ کیوں کھڑے
تم زرد کیوں ہو رہی ہو۔"
دونوں خاموش گھر چلے آ
کو سمجھا سکے نہ اپنے آپ
دوسرے کو دیکھتے تو ان
گلے گھٹنے لگتے وہ کچھ کہنا چا
سکتے۔ ان کی آنکھیں اشکو
ان کے دل تیزی سے دھ
بیٹھے اٹھ کھڑے ہوتے چ
ان کے سر چکرانے لگتے۔ ا
انگڑائیاں لیتی ہوئی معلو
جس روز کمار کو لاہور جانا
کے اسی شفاف تالاب
کے آنسو ٹپ ٹپ اس کی
سبز جھالر پر گر رہے تھے
اور کمار اس کے پاس کھڑا

وہ اس سے کیا کہے۔ آخرکار اس نے بڑی کوشش کے بعد زبان ہلائی: "سنتو حباب دیکھ رہی ہو۔ وہ ایک قطار میں بچوں کی طرح آہستہ آہستہ چلے آ رہے ہیں ہم دونوں کے سایے ان پر پڑ رہے ہیں۔ کوئی تیز جھونکا آیا تو سب مٹ جائیں گے۔"

لیکن وسنتی روتی ہی رہی۔ اس نے بلبلوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کمار پھر بولا: "سنتو! آج آسمان کتنا گہرا نیلا ہے۔ کتنا صاف ہے کوئی بدلی نہیں کوئی دھبہ نہیں وہ دیکھو اکیلی چیل اڑتی ہوئی کہیں جا رہی ہے نیلے سمندر میں کشتی یونہی تیرا کرتی ہے نا؟ ۔۔۔ اوپر دیکھو نہیں تو پہاڑ کے پیچھے سے کوئی بدلی اٹھ کھڑی ہوگی۔"

لیکن ایسی باتوں کا یہ موقعہ نہیں ہے یہ خیال کرتے ہوئے وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی کلائی پکڑ کر اس کی چوڑیاں ایک ایک کر کے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا "سنتو! تم بولتیں کیوں نہیں؟"

"میں تمہیں جانے نہیں دونگی۔" وسنتی نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی جیسے کہ اس نے شہر کے چاروں طرف گردوں بوس پتھر کی دیواریں کھڑی کر دی ہیں اور کمار کے نکلنے کے لئے ان میں کوئی راستہ نہیں ہے۔

"لیکن پتاجی کا حکم ہے نا!"

"میری مرضی جو نہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"یہیں رہو۔"

"بی اے پاس نہیں کیا تو نوکری نہیں ملیگی۔"

"نہ ملے۔"

"کھائیں گے کہاں سے؟"

"ایشور دے گا۔"

گھر سے کسی نے کمار کو آواز دی وہ گھبرا کر کھڑا ہوا۔ کمار کی ماتا اور پتا برآمدے میں کھڑے بلا رہے تھے۔ "کمار" گاڑی کا وقت ہو گیا۔" کمار نے وسنتی سے کہا اور سر جھکا کر ان کی طرف چل دیا۔ وسنتی تالاب کے کنارے بیٹھی رہی۔ وسنتی کے پتا نے کہا: "وسنتی، ادھر آ بھیا کو رخصت کر۔"

لیکن وسنتی خاموش رہی اور چنبیلی کا ایک پھول مسل کر تالاب میں پھینک دیا اور اسے غور سے دیکھتی رہی۔ کمار اسٹیشن پہنچنے تک ٹم ٹم سے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ اس کے پتاجی نے اسے بار بار گردن پھیرتے اور جھکتے دیکھا تو پوچھا: "کدھر دیکھ رہے ہو؟"

"میں سمجھا میری کوئی چیز گر گئی ہے۔"

"کچھ نہیں گرا۔"

گاڑی چل دی ۔۔۔ شہر دھوئیں کی سیاہی میں چھپ گیا۔ انجن قہقہے مارتا اڑتا چلا جا رہا تھا۔ کمار سر کو گھٹنوں میں دبا کر اتنا رویا کہ اس نے سمجھا کہ اس کی پتلیاں بھی اشک بن کر بہہ گئی ہیں۔ اسے بہت دیر تک کچھ دکھائی نہ دیا۔ جب آنسوؤں کی جھڑی کچھ کم ہوئی تو گاڑی ایک اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ اور ایک نوجوان ایک دوشیزہ کا ہاتھ پکڑے سامنے جا رہا تھا وسنتی کا خیال اس کے دل میں تیر کی طرح چبھ گیا۔ وہ کچھ بے ہوشی کے عالم میں لاہور پہنچا۔

کالج میں اسے برابر چھ ماہ وسنتی کے محبت بھرے خطوط موصول ہوتے رہے اور انہیں سے وہ اپنی تاریک دنیا کو جگمگاتا تھا۔

"کمار آج میں نے تمہاری یاد میں ایک پھول توڑ کر سینہ پر لگا لیا۔ وسنتی۔"

"پیارے کمار آج ایک حباب میں اپنے سایہ کو دیکھ رہی تھی اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ سایہ میرا نہیں تمہارا ہے میں آگے بڑھی تو حباب ٹوٹ گیا اور موجوں میں مل گیا۔ میں کیا کروں؟ ۔۔۔ وسنتی۔"

"اچھے کمار تم کب آؤ گے؟ میں تمہارے ساتھ تالاب پر بیٹھ کر تم سے باتیں کرونگی تم کب آؤ گے؟ ۔۔۔ وسنتی۔"

کبھی کبھی معمولی خطوط آتے لیکن ان میں کمار کے لئے محبت کی ایک دنیا آباد ہوتی وہ انہیں بار بار پڑھتا اور پھر عطر بسے ہوئے ایک رومال میں لپیٹ کر بکس کے ایک محفوظ گوشے میں رکھ دیتا۔

ایک دن وہ کالج کے صدر دروازہ سے باہر نکل رہا تھا کہ اس کے ایک دوست نے اسے ایک لفافہ دیا۔ پتہ وسنتی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا وہ بھاگ کر کالج کے باغیچہ میں جا بیٹھا۔ بڑے شوق سے لفافہ کھولا پڑھتے ہی اس کا خون جم گیا۔ اور دل کی حرکت جیسے بند ہو گئی۔ اس کے پتاجی چل بسے تھے۔ آگے اس کی ماتاجی نے لکھوایا تھا کہ اب گرمیوں کی چھٹیوں میں یہاں آنا تم پہلے آئے تو میرے زخم پھر سے ہرے ہو جائینگے

کمار نے بہت دنوں تک کسی سے بات نہ کی۔ دن بھر اپنے کمرے میں پڑا رہتا اور سوچتا رہتا کہ اب کیا ہوگا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پتاجی پیسے کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ اب کیسے گذارا ہوگا۔ وہ سب سوچتا آخرکار پریشان سا ہو جاتا۔ اس کی رگ رگ میں درد سا اٹھنے لگتا۔

تین مہینے تک تو اسے گھر سے خرچ ملتا رہا۔ چوتھے مہینے دس بارہ دن انتظار کیا لیکن نہ خط آیا نہ منی آرڈر۔ ادھر تین مہینے سے وسنتی کا بھی کوئی خط نہیں آیا تھا وہ صبح کی گاڑی پر سوار ہوا اور شام کو گھر پہ

جا پہنچی جب تانگہ دروازے پر آ کر رکا تو گھر والے باہر دوڑے آئے۔

"کون؟ کمار، ارے کیسے آئے؟"

وہ چپ چاپ اندر چلا گیا۔ ماتا کے زانو پر سر رکھ کر بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر سر اٹھایا وہ سمجھا کہ اب سب گھر والے اس کے ادھر ادھر جمع ہو گئے۔ لیکن وسنتی کی چھوٹی بہن کے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔

"کہاں گئے سب؟" اس نے تعجب سے پوچھا

اس کی ماتا بولی "تمہارے پتا جی کے بعد تمہارے چچا نے بھی آنکھیں پھیر لیں ہیں۔ کل ان سے تمہارے لئے روپیہ مانگا تو کہنے لگے کہ مجھے اس کے باپ کا قرض تھوڑا ہی ادا کرنا ہے۔ اب ہم غریب ہو چکے ہیں بیٹا۔

"پڑھائی تو الگ رہا اب شکم پری کرنا بھی مشکل نظر آتا ہے"

"وسنتی کہاں ہے؟"

"اس وقت اپنی سہیلی شکنتلا کے یہاں پڑھنے جاتی ہے"

وہ متفکر اور اداس ہو کر گھر سے نکل آیا لاہور کے دنوں کی یاد اس کے دل کو تڑپا رہی تھی پتا جی کا الگ درد تھا اسلئے اسے کسی کے دلاسے کی ضرورت تھی۔ وہ کچھ دیر باغ میں وسنتی کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر ٹہلتا ہوا شہر کے بڑے باغ کی طرف جانے لگا۔ لوگ ابھی تک سبز گھاس پر بیٹھے باتوں میں محو تھے وہ بھیڑ سے الگ ایک خالی گوشہ کی طرف چلا گیا جہاں درختوں کے گھنے ہونے کی وجہ سے کچھ تاریکی تھی۔

یکایک اسے دور روشنی میں ایک بنچ پر چھوٹی سی نالی کے کنارے دو سایے دکھائی دئے۔ وہ ان سے دھیان ہٹا کر پھر اپنے سوچ میں لگ گیا۔ اچانک اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں پرچھائیوں کی گفتگو میں اس کو اپنا نام سنائی دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آ کر ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

ایک شکنتلا کا بڑا بھائی منوہر جو انجینئر تھا اور دوسرا؟

کمار نے سمجھا اس کا دل پھٹ کر ٹکڑے ہو جائے گا۔

دوسرا سایہ ——— وہ وسنتی تھی۔

منوہر سے کہہ رہی تھی۔ اس کے پتا کہتے تھے میرا بیٹا کمار ڈپٹی ہو گا ڈپٹی۔ اب وہ کہیں تیس روپیہ پر کلرک بھی ہونے سے رہا اور پھر اس کی آرزو ہو گی میرے ساتھ شادی کرے۔ اس کے خطوط سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ تم نے تو سب خط پڑھے تھے نا۔ دیوانوں کی بھی انوکھی ہوتی ہے۔ میں تو اپنے منوہر سے ....

کمار پاگلوں کی طرح آگے بڑھا۔ ایک کنکر اٹھایا اور سامنے بہتی ہوئی نالی میں پھینک دیا۔

کچھ حباب اٹھے اور تیرتے ہوئے مٹ گئے۔ دونوں نے دیکھا۔ وسنتی کی آنکھیں جیسے پھٹ گئیں ہیں گھبرا کر بولی "کمار"

کمار خاموش اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

"کمار!" اس نے پکار کر کہا۔

منوہر اٹھا اور جھلا کر کمار سے پوچھا "تم نے نالی میں کنکر کیوں پھینکا؟"

کمار نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا "وسنتی کو حبابوں کا کھیل دکھانے کیلئے وہ حباب کو بہت پسند کرتی ہے"

"حبابوں کا کھیل" وسنتی کمار کا ہاتھ پکڑنے کیلئے آگے بڑھی لیکن وہ جھاڑی کو پھاندتا ہوا دور نکل گیا۔

(ہندی سے ترجمہ)

اصلاح (بقیہ صفحہ ۳۸)

"آج تم باہر نہ جاؤ گے پاپا؟"

"نہیں بیٹی آج نہ جاؤں گا" مسٹر بھارگو کے لہجے میں کچھ پشیمانی اور کچھ مسرت محسوس ہو رہی تھی۔

لیڈی بھارگو سر جھکائے ہوئے تھیں پھر بھی ان کی آنکھوں میں خوشی کی ہلکی سی چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہر موجود تھی۔ کلا بھی مسکراتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بیٹی نے بیرندر کے بارے میں ماں سے کچھ نہیں کہا۔ ماں نے بھی کچھ نہیں پوچھا شاید بیٹی نے ماں کی اصلاح کیلئے خود ہی بیرندر کا پارٹ ادا کیا تھا۔

جواب طلب امور کیلئے

جوابی کارڈ یا جوابی لفافہ یا ٹکٹ کا آنا لازمی ہے۔ (منیجر)

شہر کی لڑکی!

ایک دلکش اور رنگین نظم

حسنِ فردوسِ نظر پر ناز فرماتی ہوئی
بر ربطِ الفت کے دلکش ساز پر گاتی ہوئی
داستانِ عشق کو آنکھوں سے دہراتی ہوئی
شہر کی لڑکی چلی کالج کو اتراتی ہوئی

حسن کے احساس سے رہ رہ کے خود کو دیکھتی
اک ادائے خاص سے تیرِ نظر کو پھینکتی
نوجوانوں کے دلوں پر آگ برساتی ہوئی
شہر کی لڑکی چلی کالج کو اتراتی ہوئی

جارجٹ کی اک حسیں ساری کو زیبِ تن کئے
سینۂ نوخیز میں ارمان کی دنیا لئے
کوئی فلمی گیت "دلکش راگ" سے گاتی ہوئی
شہر کی لڑکی چلی کالج کو اتراتی ہوئی

نرم و نازک سی کلائی میں لگائے اک گھڑی
پشت پر زلفِ معنبر کی حسیں چوٹی پڑی
سر سے پا تک حسن بنکر دہر پر چھاتی ہوئی
شہر کی لڑکی چلی کالج کو اتراتی ہوئی

پے بہ پے سینے کے آنچل کو ہٹاتی ناز سے
دائیں بائیں دیکھتی چشمِ غلط انداز سے
شوخیٔ رفتار سے اک حشر سا ڈھاتی ہوئی
شہر کی لڑکی چلی کالج کو اتراتی ہوئی

لپ سٹک رنگیں لبوں پر، ہاتھ میں چھوٹا رومال
اور پوڈر سے رنگے رخسار دونوں "لال لال"
"صبح" کی دیوی کی سندرتا کو شرماتی ہوئی
شہر کی لڑکی چلی کالج کو اتراتی ہوئی

سینٹ کی خوشبو فضاؤں میں لٹاتی چار سو
حسن کے خوابیدہ جلووں کو جگاتی چار سو
نرگسی آنکھوں کے پیمانوں کو چھلکاتی ہوئی
شہر کی لڑکی چلی کالج کو اتراتی ہوئی

ہر ادا سے اسکی ہے جوشِ جوانی آشکار
لب ہیں مصروفِ تبسم چشم لبریزِ خمار
اپنی ہستی کے سوا ہر شے کو ٹھکراتی ہوئی
شہر کی لڑکی چلی کالج کو اتراتی ہوئی

شوخ آنکھوں میں نئے رنگیں کے پیمانے لئے
جلوۂ زیبا کے "پر انوار میخانے لئے"
اور شانوں پر سیہ چوٹی کو لہراتی ہوئی
شہر کی لڑکی چلی کالج کو اتراتی ہوئی

خرمنِ ہوش و خرد پر برق بن کر ٹوٹتی
دیکھنے والوں کو بیباکی سے خود بھی گھورتی
مست آنکھوں کے نگاریں جام کھنکاتی ہوئی
شہر کی لڑکی چلی کالج کو اتراتی ہوئی

دیپک

سائنس کی دُنیا

جدید ایجادات و انکشافات

نئی قسم کی گاڑی

بائیسکل کے کارآمد ہونے میں شک نہیں لیکن اسے آرام دہ سواری نہیں کہہ سکتے اور جہاں آدمیوں کی بھیڑ ہو یا راستہ خراب اور ناہموار ہو تو خطرناک بھی ثابت ہوتی ہے۔ ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک جرمن انجنیئر نے ایک گاڑی تیار کی ہے جس پر انسان کرسی کی طرح آرام سے بیٹھ سکتا ہے اور وہ سائیکل کی نسبت محفوظ بھی ہے۔

اس گاڑی کیلئے نہ پٹرول کی ضرورت ہے اور نہ تیل کی۔ اس کیلئے بجلی کی معمولی بیٹری کافی ہے اور یہ بیٹری ان برقی تاروں سے بآسانی حاصل کی جاسکتی ہے جو گھروں میں لگے ہوتے ہیں۔ یہ گاڑی فی گھنٹہ ۷ میل سے ۱۵ میل کی رفتار سے چلتی ہے۔ ایک چھوٹا سا پرزہ لگا ہوا ہے جس سے رفتار میں کمی اور زیادتی کی جاتی ہے۔

یہ گاڑی ۵ فٹ لمبی ہے اور اس کی اونچائی اور چوڑائی دو دو فٹ ہے۔ پہیے ۱۲ انچ چوڑے جن پر ٹھوس ربڑ چڑھا ہوا ہے تاکہ پنکچر کا جھگڑا نہ پیدا ہو۔ کچھ عرصہ قبل لیپزگ میں قومی مصنوعات کی نمائش ہوئی تھی جس میں اس گاڑی کو پسند کیا گیا تھا۔

پَردار موٹر

اہل امریکہ نے پردار موٹر کار ایجاد کی ہے جو زمین پر بھی چلتی ہے اور فضا میں اُڑتی بھی ہے۔ اس میں بازو لگے ہوئے ہیں اس لئے اس کو زمین پر چلاتے چلاتے جب چاہیں فضا میں اڑا سکتے ہیں۔ مشین کی مدد سے زمین پر دوڑتی ہوئی موٹر صرف پانچ منٹ کے مختصر عرصہ میں پرواز کرسکتی ہے۔ یہ موٹر زمین پر ۷۵ میل فی گھنٹہ اور فضا میں ۱۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔

ایک روسی لڑکی کا کارنامہ

ونسا (روس) کی ایک ۱۸ سالہ لڑکی نے جس کا نام گریٹ گرنبرگ ہے ایک حیرت انگیز ریڈیو سیٹ ایجاد کیا ہے جو دنیا بھر میں سب سے چھوٹا سیٹ ہے۔

اس سیٹ کی اونچائی ۲½ فٹ، قطر ½ انچ سے کچھ کم اور وزن محض ½ اونس ہے۔ اس کی آواز کسی بڑے سیٹ سے کم نہیں ہے اور اس سے دنیا بھر کے پروگرام سنے جاسکتے ہیں۔ گریٹ گرنبرگ کو اس سے پہلے بیسیوں ایجادوں کیلئے انعام مل چکا ہے۔

ایک عجیب ڈاکٹری مشین

ڈاکٹر ہرلڈ ولیس ہیر سیل یونیورسٹی امریکہ سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اپنے رفیق ڈاکٹر سیل ڈی لیہ کی مدد سے سرطان اور بند پھوڑوں کی اندرونی حالت کا معائنہ کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی برقی مشین ایجاد کی ہے۔ اس سے ⅕ لاکھ وولٹ قوت کی ننھی ننھی شعاعیں خارج ہوکر جسم انسانی میں داخل ہوتی ہے اور وہ کسی مرض کے ابتدائی حملے کے امکانات کو معلوم کرلیتی ہیں جب دنیا کے کسی آلہ سے اس کا پتہ لگانا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ آلہ مفصل طور پر ہر اندرونی مرض کی پوری کیفیت معلوم کرلیتا ہے۔

نر اور مادہ کی پہچان

سائنس کی ترقی لامحدود ہے۔ آئے دن ایک نت نیا انکشاف ہوتا جاتا ہے۔ پہلے یہ خیال تھا کہ جاندار کو پیدا کرنا آدمی کے بس کی بات نہیں لیکن دنیائے سائنس نے "انکیوبیٹر" نامی آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعہ ۲۱ دن کی ۲۱ روز گھنٹوں میں تبدیل ہوگئی اور لاکھوں مرغی کے بچے پیدا کئے جارہے ہیں۔ کیمبرج کے سائنسدانوں نے اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی معلوم کرلی ہے یعنی مرغی کے بچے جب تک جوان نہ ہو جائیں۔ ان میں نر و مادہ کا فرق پیدا نہیں کیا جاسکتا لیکن سائنس کے طفیل بچہ پیدا ہوتے ہی اس فرق کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ نر اور مادہ کے جسم پر خاص خاص علامتیں ہوتی ہیں۔ اور یہ علامتیں انڈے سینے کے دوران میں برقی رو کے ایک خاص طریق عمل سے پیدا کی جاتی ہیں تجربہ نہایت کامیاب رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مرغی کے چھوٹے بچے بھی نر اور مادہ کی تمیز کے ساتھ بیچے جاسکتے ہیں۔

مستی و قلندری

مست قلندر کے مشہور مزاح نگار مرزا حاجی لغلول کے قلم سے

اس حقیقت سے کسی کو انکار ممکن نہیں کہ مستی اور قلندری کے جذبات کئی رنگوں اور صورتوں میں غیر متوقع اوقات میں رونما ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو اس انداز سے جلوہ گر ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے حیرت سے نقش بر دیوار بن کر رہ جاتے ہیں لیکن یہ جذبات کبھی تو نیک قدرتی اور روحانی رنگ میں جلوہ ریز ہوتے ہیں اور بعض دفعہ مذموم اور نفسانی صورت میں پیدا ہو دکھاتے ہیں۔

آج کل دیو جنگ کی عنایت سے دنیا پہ نزول آفات ہو رہا ہے اور لوگوں کو مال و جائداد تو کجا اپنی جانوں کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں مگر مست اور قلندری طبائع پر ذرہ بھر اثر نہیں پڑتا۔ وہ نہایت بے پروائی سے اور کسی فکر کے بغیر اپنی کرشمہ سازیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اور ان کی فطرت رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

چند دن ہوئے کہ بمبئی میں ایک مسلم نوجوان کو ایک کشمیری دوشیزہ کے ہمراہ دیکھ کر پولیس نے دونوں کو حراست میں لے لیا۔ دریافت کرنے پر لڑکے نے کہا کہ ہم موجودہ زمانہ کی ظالمانہ سپرٹ کے خلاف ہیں۔ ہم دونوں ہم خیال ہیں اور صادق رفاقت کی زندگی بسر کرنے کا عزم باندھ چکے ہیں۔ ہم میاں بیوی بن کر نہیں رہیں گے بلکہ زندگی میں ہمارا قطعی مشن یہ ہوگا کہ سماج کے بوسیدہ اور ظالمانہ دستوروں کی ہستی مٹا کر رکھ دی جائے اور ان کی گرفت و دستبرد سے بندگان خدا کو نجات دلائی جائے۔ یہ سماج جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے پاکیزہ و سوشل ربط و ضبط کے ساتھ بھی خراب، گندی اور فحش اغراض منسوب کرنے کی جرأت اور حماقت دکھاتا ہے اور نوجوانوں کو باہمی تعاون کے ساتھ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانے دیتا۔ جس میں ان کی اور خلق خدا کی بہتری کا راز مضمر ہو۔ یہ سماج جو اپنی خود غرضانہ اور جابر قوانین سے دستکش ہونا نہیں چاہتا بلکہ ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر بن کر ان کے مفید عام پاکیزہ مشن کی تباہی کے درپے ہو جاتا ہے۔ ہم اس سماج کو فنا کر کے دم لیں گے۔

لڑکی نے پولیس افسر نے جواب میں کہا کہ میں اور میرا نیک نیت اور نیک نفس رفیق سماج کی عائد کی گئی سوشل پابندیوں کی جو بذات خود خرابیاں ہیں قلع قمع کرنے کی خاطر میدان عمل میں سرگرم ہو چکے ہیں۔ ہم دونوں میں پختہ عہد ہو چکا ہے کہ ازدواجی زندگی سے ہم آغوش نہ ہوں۔ دنیا کا کوئی قانون، کوئی اتحاد اور کوئی نصب العین ہمارے قطعی مشن میں خلل انداز نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے مخل ہونے کے لئے قدم بڑھانے ہی نہیں دینگے بلکہ اس کے پیچھے اڑینگے ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ ہمارا اتحاد اور مقصد نہایت شریفانہ ہے۔

ان دونوں ہستیوں کی باتوں سے عیاں ہے کہ ان کا مقصد پاکیزہ اور بے لوث مستی اور قلندری کے جذبات کا مرقع ہے اگر دنیا میں آج ایسی روشن خیال اولوالعزم ہستیاں اور پیدا ہو جائیں تو دنیا کو سماج کے مظالم سے چھٹکارا نصیب ہو جائے اور دنیا جو اس وقت جہنم کا خاصہ رکھتی ہے فردوس بن جائے۔ اور ہر مرد مردوں میں بادشاہ اور ہر عورت عورتوں میں ملکہ کا مرتبہ حاصل کرنے۔ دنیا راحت کدہ امن و امان بن ہو جائے۔ شاباش اور صد آفرین ہے کہ ان دونوں پاک روحوں کو جو اصلاحی نصب العین لیکر میدان حیات کو گرمانے کیلئے آمادہ ہو چکے ہیں۔

یہ تو ہے پاکیزہ مستی و قلندری کی قابل تقلید مثال۔ اب ذرا اس کے برعکس مستی و قلندری کا قابل نفرت نمونہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

لاہور کی مال روڈ (جسے عوام الناس ٹھنڈی سڑک کے نام سے یاد کرتے ہیں) کے قریب اسمبلی ہال (مجلس قانون ساز کی عمارت) کے سامنے ایک دلیر عورت نے ایک مرد کی گردن میں دوپٹہ ڈال کر قابو میں

کرلیا اور اسے کشاں کشاں سول لائن پولیس سٹیشن میں لے گئی۔ مرد نے اس گرفت سے آزاد ہونے کیلئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ایسا پھنسا جیسے کہ جال میں مچھلی۔ آنے جانے والوں کا ہجوم ہو گیا۔ اور انہوں نے پوچھا کہ شارع عام پر اس خلاف تہذیب اور قانون شکن کشمکش کا مقصد کیا ہے مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

تھانہ پہنچ کر راز فاش ہو گیا کہ اس شیلا نامی عورت کے تین بچے ہیں اور وہ مرد جسے وہ تھانہ لے گئی ہے اس کا خاوند ارجن نامی ہے۔ وہ اس کے تینوں بچوں کو اُڑا لایا ہے۔ کئی دن کی سخت جستجو اور دوڑ دھوپ سے آج وہ ہاتھ آ گیا۔ بچے اس سے واپس دلائے جائیں۔ عورت اور ارجن دیو کے درمیان دنیاوی محبت پیدا ہو گئی اور دونوں نے باہمی عقد کر لیا۔ پولیس افسر کے سوال پر مرد نے کہا کہ میں اس عورت کی محبت اور صحبت سے سیر ہو چکا ہوں۔ میں طلاق کے ذریعہ اس سے بے تعلق ہونا اور اپنے بچے واپس لینا چاہتا ہوں۔ تا فیصلہ مرد ضمانت پر رہا کر دیا گیا مگر عورت نے رہائی کے لئے ضمانت کا آسرا لینے سے انکار کر دیا اور جیل میں چلی گئی۔ عدالت میں سماعت مقدمہ کے دوران میں جو حالات ظاہر کئے جائیں گے وہ عوام کی تھوڑی دیر کیلئے دلچسپی کا موجب ہوں گے نتیجہ چاہے کچھ ہی نکلے مگر یہ واقعہ نفسانی اور فحش مستی و قلندری کا مرقع ہے۔

جنگ نے روئے زمین کے باشندوں کی زندگی میں وہ انقلاب عظیم برپا کر دیا جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ یورپ میں عورتوں کی یہ دیرینہ دلی مراد بر آئی کہ ان کو تمام کاموں میں مردوں کے مساوی درجہ ملنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں وہاں انجمنیں قائم کی گئیں۔ زبردست احتجاجی جلسے اور مظاہرے ہوتے رہے۔ انگلستان میں اس انجمن کا نام حقوق طلب عورتوں کی انجمن رکھا گیا۔ عورتوں نے کچھ حقوق حاصل کر لئے۔ لیکن یہ موجودہ عظیم جنگ کا طفیل ہے کہ عورتوں کے نخل مراد میں شیریں ثمر آ گئے اور ان کے ہاتھوں میں غیر جنگجو مشغلوں کے علاوہ کچھ کام جنگجوئی کے بھی آ گئے۔ اب انگلستان میں تو یہ حالت ہے کہ عورتیں مردوں جیسا جنگی لباس زیب تن کرتی ہیں اور جنگی ڈیوٹیاں دیتی ہیں۔ عورتوں کی ٹولیوں میں کوئک مارچ، رائٹ اباوٹ ٹرن وغیرہ کے جملے سُنے جاتے ہیں۔ انگلستان کا اثر ہندوستان پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ یہاں بھی فضا عورتوں کے حق میں ہو گئی۔ دہلی میں اکثر عورتوں نے مردوں کے مشاغل اختیار کر لئے ہیں وہاں جو انجمن عورتوں کی رہنمائی کیلئے قائم کی گئی ہے اس کی کمانڈر ایک معزز انگریز خاتون ہے۔ جو عورتیں بھرتی کی گئی ہیں۔ وہ مردوں کی طرح ہر محکمہ کے کام کو بطور احسن سرانجام دے رہی ہیں۔ مردانہ لباس اور وردی میں نہایت دلربا معلوم ہوتی ہیں۔ چستی اور پھرتی کے باعث ترک نظر آتی ہیں۔ ان کی کایا پلٹ گئی ہے لیکن اس پر بھی نسوانی خصوصیات کی جھلک اُن کی صورتوں اور انداز و اطوار میں نظر آ ہی جاتی ہے یہ مصرع چسپاں ہوتا ہے کہ ع

لاکھ پردوں میں چھپایا حسن بے پردہ رہا

مختصر یہ کہ ہندوستان کی عورتیں بھی جو شرم و حیا۔ نازکی اور لجاجت کیلئے یگانہ روزگار تھیں آج بالکل نڈر اور بے خوف بن کر اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں جبکہ سرزمین ہند میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش مختلف کاموں کو انجام دیتی ہوئی ملک کی تحریک حریت میں بڑی معاون ثابت ہوں گی۔ مردوں اور عورتوں کے سوائے قدرتی اور حقیقی اختلافات کا اور فرق ذرہ بھر باقی نہیں رہے گا۔ اور ان پر اس شعر کا مفہوم خوب چسپاں ہو گا کہ ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تبدیلی پتہ کی اطلاع

ناظرین کرام سے گذارش ہے کہ پتہ کی تبدیلی کی اطلاع تاریخ اشاعت مست قلندر سے کم از کم دس روز پہلے دفتر میں بھیجا کریں۔ ورنہ اپنے حلقہ کے پوسٹماسٹر کو اطلاع دیدیں کہ وہ آپ کے جدید پتہ پر آپکا پرچہ بھیجدے۔

آپکا خریداری نمبر

دفتر کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے جب کبھی آپ پرچہ نہ پہنچنے یا پتہ تبدیل کرانے کیلئے دفتر کو لکھیں تو اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل کی جائیگی۔ (مینیجر)

ایک خط!

اُس کے نام جو آنکھوں سے دُور ہونے پر بھی دل کے قریب ہے

تیرے دراز گیسو - ابر کی طرح سیاہ ہیں. تیری آنکھیں مستی کا ایک پیمانہ ـــ تیری صبیح پیشانی صبح کی اولیں مسکراہٹ ... اور تیری خوبصورتی برسات کی ٹھنڈی چاندنی .... دیکھ تیرے قدموں پہ بارش ہو رہی ہے ـــ حسین و نازک پھولوں کی ـــ تیرے گلے میں ہار ہے گلاب، شبو، چنبیلی اور موتیا کا ـــ تیرے سر پر تاج ہے لالہ، نرگس اور کنول کا ـــ تیرا جسم آراستہ ہے عشق پیچاں کی بیلوں سے۔

سکینہ! کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟ ـــ میں وہی ہوں جس نے زندگی کے اوّلیں لمحے سے اپنے ہردے مندر میں تیری پوجا کی... تیری اور تیری محبت کی ـــ میں وہی ہوں جس نے زندگی کی سولہ بہاریں تیرے ہی چرنوں کی بالاگن بنائیں

سکینہ! حسین و نازک سکینہ! میں وہی ہوں جس نے بچپن میں، دریائے کے کنارے - گلاب و یاسمن کے باغ میں تجھے طفلی کی مسکراہٹ میں دیکھا تھا - اور تیری اس معصوم مسکراہٹ کو اپنے بچپن کے سدا بہار پھولوں کے باغ اور رنگ و بو کے گلشن میں پریم راگ الاپنے کیلئے چھوڑ دیا ـــ اور جب میں جوان ہوا تو تجھ کو اپنے دل کی گہرائی میں چھپا رکھا ـــ آنسوؤں سے پرورش کی... تیری اور تیری محبت کی ـــ آہوں سے چمکایا، تجھے اور تیرے دل کو۔

سکینہ! دیکھ آج میں اداس ہوں..... شام کے دھندلکے کی طرح ـــ خاموش ہوں.... آدھی رات کی طرح ـــ میری آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں.... برسات کے بادلوں کی طرح ـــ میں تیرے حسن کو حاصل کرنے کے لئے تعاقب کرتا ہوں.... صبح و شام، چاند اور سورج، نور و ظلمت کی طرح ـــ تیری حالت کو دریافت کرتا رہتا ہوں..... چاند کی نور افشانی، سورج کی تابانی، اور ہوا کی سرسراہٹ سے۔

سکینہ! حسین و نازک سکینہ! تیری حسین یاد میرے دل کی عمیق گہرائی میں ہر وقت چٹکی لیتی رہتی ہے۔

لیکن آہ! مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میری ناچیز یاد تیرے دل سے اسی طرح غائب ہوگئی جس طرح شام کی سیاہی میں نقوشِ کہسار۔

سکینہ! میرے ہردے مندر کی دیوی! دیکھ! درختوں پہ پرند چہچہا رہے ہیں۔ ان کے دن بھر کے تھکے ہوئے جسم آرام کی نیند کے متلاشی ہیں ـــ آہ! میری روح بھی زندگی کی مسلسل کوفت سے تھک چکی ہے ـــ مگر اسے آرام کہاں؟

رنگ زرد ہو چکا - جسم کانپ رہا ہے ـــ لیکن سکینہ تو کہاں ہے؟ ـــ میری جان!

از جناب پریمی مقیم پوسا

دشمنی کے پردے میں

(بقیہ صفحہ ۳۴)

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔

(۶)

کیدار بابو پرتاپ بابو کو ساتھ لے کر اپنے گھر گئے لیکن کملا گھر پر نہ تھی۔ ملازم سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پہلے کملا کار لے کر کہیں گئی، اس کے بعد نریندر اپنی کار لے کر آیا اور سنا کہ کملا کار لے کر کہیں گئی ہے تو وہ بھی اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

کیدار پرتاپ کو لے کر ڈرائنگ روم میں گئے۔ وہاں ٹیبل پر کملا کا ایک خط پڑا ہوا تھا جسے پڑھتے ہی کیدار کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ پرتاپ بابو کی طرف دیکھ کر بولے۔ کملا تو کلکتہ چلی گئی، اب کیا ہو گا؟"

پرتاپ بابو نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا: تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ نریندر گیا ہے وہ اس کو واپس لائے بغیر نہ رہے گا۔"

دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ کیدار بابو کا دل مطمئن نہ تھا۔ وہ پھر کہنے لگے۔" ذرا دیکھو تو کملا کا پاگل پن۔ بھلا اسے ایسا کرنا چاہئے تھا۔"

"واقعہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت ہی ایسی کرتے ہیں۔"

"دونوں بے حیا ہیں جی۔ لیکن خیر اب سوال یہ ہے کہ کرنا کیا چاہئے۔"

"اگر ایک کام کیا جائے تو کیسا ہو؟" پرتاپ بابو نے کیدار بابو کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کون سا کام؟"

"دونوں کی شادی کر دی جائے۔"

"ابھی اس کے کہنے کی بھی ضرورت ہے؟"

دونوں ہاتھ ملا کر زور سے ہنس پڑے۔

کملا کی کار چلی جا رہی تھی۔ مگر وہ کسی اور ہی خیال میں گم تھی، اس کے چہرے کا رنگ فق تھا، ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بند تھیں۔ وہ چلتی کار کے اسٹیرنگ وہیل پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ خیریت یہ ہوئی کہ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ کار رک گئی۔

کملا نے اشکوں سے بھیگے ہوئے چہرے کو ایک بار اوپر اٹھایا تو دیکھا کار کھڑی ہے۔ وہ کار کو اسٹارٹ کرنے لگی مگر وہ اسٹارٹ نہ ہوئی۔ کملا کی طبیعت بیحد نڈھال ہو رہی تھی اسلئے وہ گاڑی کے فٹ بورڈ پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر کے نریندر بھی اپنی کار بھگاتا ہوا پہنچ گیا۔ اس نے کملا کو دیکھ کر کار روک دی۔ کچھ دیر دونوں خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر نریندر نے پوچھا "کار رک گئی کیا؟"

کملا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نریندر بولا: "معلوم ہوتا ہے۔ پٹرول ختم ہو گیا ہے۔"

کملا اب بھی چپ تھی۔

نریندر اپنی کار سے اتر کر کملا کے پاس جا کھڑا ہوا۔

اب کملا بھرے ہوئے گلے سے بولی۔

"تم کیوں آئے؟"

"تمہیں ایک خوشخبری سنانے۔"

کملا نے استفسار آمیز نظروں سے نریندر کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھیں اشک آلود تھیں۔

"تمہارے والد اور میرے والد میں صلح ہو گئی۔"

کملا وفور حیرت سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آنکھیں پھاڑتے ہوئے بولی۔ کیا واقعی؟"

نریندر نے کملا کو دونوں ہاتھوں سے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا: "واقعی۔ نہ صرف صلح بلکہ گہری دوستی۔ چلو راستے میں تفصیل کے ساتھ ساری باتیں بتاؤں گا۔"

نریندر نے کملا کی کار اپنی کار کے پیچھے باندھ دیا اور کملا کو اپنی بغل میں بٹھا کر واپس ہوا۔ کملا نے اپنا سر نریندر کے بازو پر ڈال دیا۔ دونوں کی

افسانہ

نفس پرستی

ادھر گماشتہ جی ایک جمائی لیکر پلنگ سے اُٹھے۔ اُدھر گوڑا ئیت سر پر سوار ہوا کہ "حجور (حضور) کو جمیندار صاحب بلاوت ہیں"——— ڈرتے سہمتے، نہ جانے کس کا سر آبارنے کا حکم مل جائے معلوم نہیں کہاں جانا پڑے کہیں کوئی اینائے (ظلم) نہیں ہوا کہیں کوئی آفت تو نہیں آگئی ——— اتنا سویرے ابھی میدان بھی نہیں گیا۔" گماشتہ جی آدھی دھوتی پہنے آدھی کو بدن سے لپیٹے دیوان خانہ میں پہنچے۔ زمیندار صاحب تکیہ لگائے کچھ کاغذات اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے گماشتہ جی کے "چمرو جوتا" سے کھٹ کھٹا کھٹ کی نکلتی ہوئی آواز زمیندار صاحب کے کان میں پہنچی تو چونک کر اس طرف متوجہ ہوئے۔ اِدھر گماشتہ جی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اُدھر گماشتہ جی سے برق رفتاری سے زمیں بوس ہو کر کہا۔

"سلام سرکار!"

"گماشتہ جی!" زمیندار صاحب بولے۔

"جی سرکار!"

"رادھے پور سے بہت شکائتیں آرہی ہیں۔ رعیتوں نے سر اُٹھا دیا ہے۔ تم ابھی چلے جاؤ اور جس طرح ہو رادھے پور کو سر کرو۔ ہاں لگان جو ہو سکے وصول کر لینا۔"

"بہت اچھا سرکار!" کہتے ہوئے گماشتہ جی نے ایک ٹھنڈی سانس لی——— ایک عرصے کے بعد ایسا سُنہرا موقع ہاتھ آیا تھا۔ کچھ نہیں تو اپنی جیب تو ضرور گرم ہو جائیگی۔ زمیندار صاحب کو منہمک دیکھ کر گماشتہ جی ایکبار مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے واپس لوٹ آئے۔

رادھے پور زمینداری کچہری میں گماشتہ جی ناریل کا حقہ سنبھالے رماسٹ کھینچ رہے تھے۔ ان کا دماغ طرح طرح کے خیالوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ کچھ نہیں تو دو سو روپیہ تو جرمانہ کے بے داغ جیب میں آجائینگے۔ —— معمولی بات ہے، زمیندار صاحب کا حکم ہے ”جس طرح ہو سر کرو“ —— بھلا مار کے آگے بھوت بھاگے۔ جب ڈنڈے پڑنے لگیں گے تو پھر کون سالا جرمانہ نہیں دیگا“ —— لیکن انہیں یہ بھی تشویش ہو رہی تھی کہ عملہ رعیتوں کو بلانے گیا اور اب تک کوئی نہیں آیا —— رادھے پور کا مقامی عملہ گماشتہ جی کے بغل میں بیٹھا تھا۔ حقہ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے گماشتہ جی بولے: ”سکرا! اب تک کوئی رعیت نہیں آیا ہو“ ——

گماشتہ جی نے کو کوئی جواب پاکر غور سے سکرا کی طرف دیکھا۔ سکرا اپنے خیالوں میں کھویا ہوا سامنے باغیچہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی مست نگاہیں باغیچہ میں لکڑی چنتی ہوئی ایک نوخیز لڑکی پر گڑی ہوئی تھیں۔ گماشتہ جی نے اپنی عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذاری تھی —— سکرا کی طرف معنی خیز نگاہ ڈالتے ہوئے بولے۔

”کیا سوچت ہے سکرا؟“ —— سکرا چونک سا گیا جیسے خواب غفلت میں اسے کسی نے جھنجھوڑ دیا ہو —— وہ گماشتہ جی کے جملہ کو نہ سمجھ سکا۔ اپنی پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ——

”کی حکم ہے سرکار؟“

”کیا سوچت ہو؟“ گماشتہ جی اپنی گردن میں ایک پرکیف خم دیتے ہوئے بولے۔

”یہی کہ رادھے پور کیسے سر ہوت؟“ سکرا نیچی نگاہ کئے ہوئے بولا۔

”یہ کہ بھگوان نے آکاش کو بگیر (بغیر) کھمبہ کے کیسے کھڑا کر دیا؟“ —— گماشتہ جی سکرا کی پیٹھ پر معنی خیز تھپکی دیتے ہوئے بیساختہ ہنسنے لگے۔ سکرا حیران تھا۔ لیکن سمجھ چکا تھا کہ گماشتہ جی نے اسے باغیچہ کی طرف دیکھتے ہوئے تاڑ لیا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک حقیقت سی مسکراہٹ آکر ناچنے لگی —— اس کی نگاہیں نیچی تھیں —— دونوں ایک دوسرے کو پہچان چکے تھے۔ تھوڑی دیر کیلئے دونوں خاموش ہو گئے —— سکرا نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا: ”کوئی رعیت نہیں آیا سرکار!“ لیکن اسوقت گماشتہ جی کی آنکھیں کسی کو باغیچہ میں ڈھونڈ رہی تھیں۔ ان کا دماغ اب رعیتوں کی طرف نہیں تھا۔ لگان وصول کرنے کے خیال اور جرمانہ کے پلان کو نوخیز لڑکی اپنے ساتھ چھین

کرلیتی گئی تھی۔ ناکام ہو کر ان کی نگاہیں باغیچہ سے واپس ہوئیں اور سکرا کے چہرہ پر گڑ گئیں

~~~~~

ایک پہر رات گذر چکی تھی۔ کوئی رعیت اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ گماشتہ جی کھاٹ پر پڑے تھے۔ سکرا پاؤں داب رہا تھا۔ ان کی نگاہیں اسوقت ابر کے ایک ٹکڑے پر جو دوڑتا ہوا چاند کا پیچھا کر رہا تھا جمی ہوئی تھیں "باغیچہ والی لڑکی" انہیں ابھی تک لکڑی چنتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ گماشتہ جی نے ایک جمائی لے کر رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"سکرا، اواج بگیچہ (باغیچہ) میں کون لڑکی تھی ہو؟"

"راموو سادہ کی بہو، میرا ہے سرکار! گجب (غضب) ہے سرکار! من تو اگرا (اسکو) دیکھ کے لوٹ پوٹ ہو جاہے سرکار!

گجب کی جمائی (جوانی) ہے سرکار! کھوب (خوب) ہے سرکار! کھوب ہے ——!"

سکرا ایک ہی سانس میں کچھ اس طرح بولنے لگا، جیسے وہ ان جملوں کو رٹ کر کہنے کو تیار ہی تھا ——— گماشتہ جی اٹھ بیٹھے، ان کی آنکھیں پھڑک رہی تھیں، ہونٹ متحرک تھے، لانبی لانبی مونچھیں تنی جا رہی تھیں۔ سکرا کی پیٹھ پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولے:

"پھر پانسہ پھینکو، کام چاندی ہو جائیگا!"

"مگر بڑی پارسا ہے سرکار!" سکرا منہ بچکا کر بولا۔

"ہونھ! بڑی پارسا ہے، پانسہ پھینک کے تو دیکھ!" گماشتہ جی آنکھیں چمکا کر بولے ان کا شہزادہ تخیل ایک سے ایک پلان تیار کر چکا تھا۔ باغیچہ والی لڑکی کو ہاتھ میں لانا، بھلا اتنے بڑے زمیندار کے گماشتہ کو کوئی مشکل تھا۔ کچھ بھی نہیں ——— سکرا سے باتیں کرتے کرتے گماشتہ جی دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔

~~~~~

زمیندار صاحب کے حکم کی کوئی تعمیل نہ ہو سکی تھی۔ رعیت اکھڑے ہوئے تھے، عملہ دو چار گالیاں ہی سن کر آتا تھا ——— گماشتہ جی کو اس کی فکر بھی نہیں تھی، پہلے انہیں اپنی نفس پرستی کی البتہ فکر تھی ——— دن چڑھے اب تک ہیرا کے دیدار کو زمینداری کچہری کے سامنے پڑے تھے۔ سکرا کسی کام سے باہر چلا گیا تھا۔ عملے سب پھر رعیت سے گالیاں سننے کو گئے ہوئے تھے ——— گماشتہ جی کی بیتاب نظریں دوڑ دوڑ کر ہیرا کو باغیچہ میں ڈھونڈھ رہی تھیں ——— ایک بھاگتی ہوئی گائے نے ان کے سامنے سے گذر کر ان

کی خیالی دنیا کو درہم برہم کر دیا — اچانک ہیرا — وہی باغیچہ والی لڑکی — سامنے سے ہاتھ میں ایک چھڑی لئے دوڑتی ہوئی شاید گلہ کے عقب میں آتی نظر پڑی۔ گماشتہ جی فرطِ مسرت سے اچھل کر اٹھ کھڑے ہوئے، ہیرا قریب آ چکی تھی، شانوں پر بکھری ہوئی بے ترتیب زلفیں ہوا کے جھونکے سے لہرا رہی تھیں۔ آنچل بے پروائی میں کاندھے سے سرک کر ہاتھ میں آگیا تھا۔ سینے کا ابھار ایک ہوش فگن منظر پیش کر رہا تھا — گماشتہ جی برداشت نہ کر سکے، نیچے اترے اور تیزی سے جا کر ہیرا کی راہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ "ارے کہاں بھاگی جاوت ہو رانی! ذرا سنو تو ....." — معصوم ہیرا ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ آنچل درست کرتی ہوئی گھبرا کر بولی — "کی ہے سرکار" — گماشتہ جی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا، گماشتہ جی راہ روکے کھڑے ہنس رہے تھے

— ہیرا گھبرا رہی تھی، — فرطِ مسرت سے گماشتہ جی کے بڑے بڑے دانت باہر نکل آئے تھے۔ ہیرا کانپ رہی تھی — گماشتہ جی نے ایکبار ماحول پر نظر دوڑائی۔ میدان صاف تھا اور موقع غنیمت — ہیرا کا نازک ہاتھ اپنی دہقانی گرفت میں لے چکے تھے — ہیرا گماشتہ جی کا مطلب سمجھ چکی تھی — لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا کرے — اس کی گھبرائی ہوئی پریشان نگاہیں کسی کو ڈھونڈھ رہی تھیں — لیکن بے آس — اس اثنا میں گماشتہ جی کے بھاری بھرکم ہاتھ اسے اپنی گود میں اٹھا چکے تھے — ہیرا جھٹکا را پانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی چیخ رہی تھی — بچاؤ — بچاؤ — لیکن دو تین ہی چیخ کے بعد گماشتہ جی کا ایک ہاتھ اس کے منہ پر تھا۔ کچہری کے بیرونی کمرہ میں ہیرا رہ رہ کر چیخ اٹھتی تھی — گماشتہ جی ایک لمبے

ترڑنگے جوان ہو کر بھی اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈال سکے تھے، — اسی اثنا میں گاؤں کی رعیت اپنی ایک جماعت کے ساتھ گماشتہ جی سے ملنے آ چکے تھے — ہیرا کی چیخ نے گماشتہ جی کا سارا بھرم کھول دیا۔ کمرے کے کاغذی کواڑ کو ایک ہی دھکا میں توڑتے ہوئے ساری رعیت کمرے میں گھس پڑی — ہیرا ایک کونہ میں سمٹی کھڑی تھی، عصمت کے بچاؤ میں اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے — گماشتہ جی کا ہوش اڑ چکا تھا۔ وہ سر تا پا کانپ رہے تھے — "گماشتہ کو مار ڈالو" — سبھوں کی ایک آواز تھی — چند ہی منٹ کے بعد گماشتہ جی لاٹھی کی تاب نہ لا کر رادھے پور کو سر کرنے کا ارمان دل میں لئے ہوئے ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئے — اگلے روز رادھے پور کا زمیندار غصہ میں بے قابو دیوان خانہ میں تیزی سے ٹہل رہا تھا اور

شعرائے مست قلندر

نوید بہار

از جناب ظفر شیرانی بریلوی

سن کے یہ مژدہ کہ پھر فصلِ بہار آنے لگی
رقص میں موجِ ہوائے خوشگوار آنے لگی

گدگداتی، چھیڑتی بادِ بہار آنے لگی
لب پہ غنچہ کے ہنسی بے اختیار آنے لگی

پھر گلستاں میں شگوفے ہر طرف کھلنے لگے
شاخہائے گل سے پھر بانگِ ہزار آنے لگی

میکشوں کو ابر "درسِ میکشی" دینے لگا
آسماں سے ہلکی ہلکی سی پھوار آنے لگی

پھر پپیہے کو کسی کی یاد نے تڑپا دیا
"پی کہاں" کی پھر صدائے دلفگار آنے لگی

آسماں پر جھومتی کالی گھٹائیں دیکھ کر
یاد پھر مجھ کو وہ زلفِ مشکبار آنے لگی

سبزۂ کہسار پھر انگڑائیاں لے کر اٹھا
پھر صدائے "قم باذنی" بار بار آنے لگی

پھر "شرابِ ارغواں" سے جامِ گل بھرنے لگے
بن کے ساقی پھر گلستاں میں بہار آنے لگی

پھر کسی کا عشق دل میں چٹکیاں لینے لگا
پھر وہ یادِ عہدِ ماضی بار بار آنے لگی

پھر محبت کے ترانے ہر طرف چھڑنے لگے
سازِ دل سے پھر صدائے نغمہ بار آنے لگی

پھر لباسِ زرد میں ملبوس ہیں سرسوں کے کھیت
پھر عروسِ نو کی صورت میں بہار آنے لگی

پھر نظر آنے لگا جنت بدامن میکدہ
پھر فلک سے رحمتِ پروردگار آنے لگی

باغ میں پھر آم کے پیڑوں میں بور آنے لگا
پھر وہ کوئل کی صدائے کیف بار آنے لگی

یوں خزاں دیدہ چمن سرسبز پھر ہونے لگے
جیسے پھر حسنِ زلیخا پر بہار آنے لگی

پھر فرازِ کوہ سے مثلِ صدائے ارغنوں
آبشاروں کی صدائے نغمہ بار آنے لگی

سازِ ہستی پھر ہے اب منت کشِ مضرابِ غم
پھر ترنم کی صدائے کیف بار آنے لگی

دیکھ کر امڈا ہوا ہر سمت طوفانِ بہار
اے ظفر پھر یاد وہ "جانِ بہار" آنے لگی

غزل

از جناب خمار بارہ بنکوی

دل ہے برائے نام اب دل میں شگفتگی نہیں
گل ہے مگر مہک نہیں شمع ہے روشنی نہیں

عاشقی اور بقیدِ شوق کفر ہے عاشقی نہیں
اسکی خوشی پہ جان دے تیری خوشی خوشی نہیں

موسمِ رنگ و کیف کی اب وہ ہما ہمی نہیں
سبزہ و ابر ہیں سبھی ایک فقط وہی نہیں

سر ہے اختیار میں سجدہ وہ سجدہ ہی نہیں
بندگی اور بقیدِ ہوش کھیل ہے بندگی نہیں

جس میں ہوائے کیفیت رنج کی چاشنی نہیں
ایسی خوشی کا ذکر کیا ایسی خوشی خوشی نہیں

حسن کا دیکھ دل نہ توڑ ضبط کو ضبط کرکے چھوڑ
زہر ملے تو منہ نہ موڑ عشق ہے یہ ہنسی نہیں

واعظِ سادہ لوح کی ہائے رے چیرہ دستیاں
مے کو بتا رہا ہے تلخ ظلم ہے یہ کہ پی نہیں

اس کی نظر ملی تو کیا اسکی نظر پھری تو کیا
جس میں رہے یہ امتیاز عشق وہ عشق ہی نہیں

جینے کو جی رہا ہوں میں اس کے بغیر بھی مگر
زندگی جس کو کہہ سکوں ایسی تو زندگی نہیں

کر گئی چشمِ مست کام ہو گیا نشہ سب تمام
میکشو اب مرا سلام فرصتِ میکشی نہیں

ناصحا دیکھ ناصحا اب تو بہت ستا چکا
دور ہو میرے پاس سے تجھ پہ ابھی پڑی نہیں

دست طلب بڑھائے جا یونہی صدا لگائے جا — اس کے حریم قدس میں دیر ہے دھاندلی نہیں
رو رو کے آہ تا بکے یونہی کوئی بسر کرے — میرے نصیب میں عمار جیسے کہ موت ہی نہیں

غزل

تکمیل انتخاب نظر دیکھتا ہوں میں — دنیا اسی طرف ہے جدھر دیکھتا ہوں میں
بے تابیاں ہیں، غم ہے جدھر دیکھتا ہوں میں — مجبوری حیات و بشر دیکھتا ہوں میں
لٹتے ہوئے متاع نظر دیکھتا ہوں میں — اندھیر کیا یہ دیدۂ تر دیکھتا ہوں میں
جب سے ترا جمال بنا مرکز..... نظر — ہر شے کو ماورائے نظر دیکھتا ہوں میں
ہیں اس نگاہ مست میں آنسو بھرے ہوئے — یا منظر طلوع سحر دیکھتا ہوں میں
اللہ رے شوق دید میں بے تابیٔ نگاہ — آنکھیں جھپک رہی ہیں مگر دیکھتا ہوں میں
اللہ رے کرشمۂ محویت جمال — جیسے تجھی کو آٹھ پہر دیکھتا ہوں میں
اک کشمکش میں ہے سر محفل مذاق دید — وہ دیکھنے نہیں ہیں مگر دیکھتا ہوں میں
اقبال اب یہ عالم ذوق سجود ہے — ہر نقش پائے راہگذر دیکھتا ہوں میں

اقبال

نغمات

دکھائی ہے کیا کیا بہاریں جوانی — غم ہجر اور کیف سوز نہانی
یہ مانا نہیں ہے نہیں جاودانی — بہار جوانی کہ دنیائے فانی
بہار آفریں ہے فضائے جوانی — یہ جلوؤں کا منظر یہ رنگیں سہانی
تو اپنی نگاہوں کا صدقہ ہی ساقی — پلا دے مجھے بادۂ ارغوانی
وفا دل یہ اپنی مٹا جا رہا ہوں — تجھے بھی خبر ہے جفاؤ تکے بانی
بڑا لطف ہوتا جو تم ہم سے سنتے — ہماری کہانی ہماری زبانی
نگاہ محبت میں گم ہونے والے — تجھے ڈھونڈھتی ہے کسی کی جوانی
جنون محبت ہے پھر کار فرما — ہوئی کیا ظہیر عشق کی مہربانی

جناب ابوالعلاء ظہیر صاحب ظہیر [illegible]

پیغامات

ابطال و حقیقت کا اب فرق دکھانا ہے — اللہ کے بندوں کو سوتے سے جگانا ہے
سنتے ہی نکل آئے بیدرد کے بھی آنسو — کیا درد بھرا تیرا یہ غم کا فسانا ہے
اصلاح عمل کر لے ہے تیرا یہی ہمدم — کل ورنہ قیامت میں اپنا بھی بگانہ ہے
بھولا ہے خدا کو کیوں دنیا کی محبت میں — دو دن کا بھی اے غافل دنیا میں ٹھکانا ہے
دنیا جسے کہتے ہیں اک خواب کا عالم ہے — اس خواب سے اپنے کو ہر لحظہ جگانا ہے
آثم تو بھروسہ کر اللہ کی رحمت پر — دارین میں گر تجھ کو کام اپنا بنانا ہے

جناب حکیم مسعود الرحمن صاحب حکیم آثم [illegible] آبادی

سماج کی ستم ظریفی

از ادیب انقلاب
ملک سلیمان الارشد فاروقی

"انزو۔ جلدی چلو!"

"کہاں؟"

"ارے اسی قتالۂ عالم ملکہ حسن کا دیدار کرنے"

میں نے کہا "سعید یہ بہت بری بات ہے کہ تم شریف خواتین کو اس بری طرح سے گھورتے ہو۔ اب کیا وہ سفر کرنا بھی چھوڑ دیں؟"

"اچھا چلئے واعظ صاحب۔ پہلے اسے دیکھ لیجئے پھر کچھ کہئے گا"

قصہ یہ تھا کہ میں اور سعید علی گڑھ سے امتحان دیکر واپس آرہے تھے۔ گوالیار کے اسٹیشن پر حضرت سگریٹ پینے اترے۔ اتفاق سے پان والا زنانہ ڈبہ کے پاس کھڑا پان دے رہا تھا۔ حضرت بھی وہیں تشریف لیگئے واپس جو آئے تو معلوم ہوا کسی کے دام حسن میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ اور اب مجھ سے بضد تھے کہ میں بھی اس کو چل کر دیکھ لوں اور ان کے انتخاب کی داد دوں۔ مگر گاڑی روانہ ہوگئی۔ جھانسی کا اسٹیشن آنے سے قبل ہی حضرت میری جان کھاتے رہے کبھی تو ریل والوں کی شامت آتی اور ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے کبھی تنقید فرماتے کہ ریل چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر کیوں نہیں رکتی۔ آخر وہاں بھی تو انسان رہتے ہیں۔ ان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ریل سے سفر کریں۔ کبھی اس کی تعریف کرتے اور کہتے کہ وہ اپنے وقت کی "شیریں" ہے "ہیلن" ہے۔ اب اسٹیشن جو آیا تو چلنے کے لئے اصرار کرنے لگے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات، مجبوراً ان کے ساتھ جانا پڑا۔ ڈبہ سے کچھ فاصلہ پر کھڑے ہوکر فرمانے لگے

ارے وہ ہے ——— کھڑکی کے قریب"

"کون سی؟"

"ارے وہ سرخ ساری باندھے لال پری ——! جنت الفردوس کی حور ——! قدرت کا شاہکار!"

میں نے دیکھا اور معلوم نہیں کبتک دیکھتا رہا ——— حسن! قدرت کا عطیۂ دلکش! زندگی کی بہار! روح کو سرور دینے والا! یکایک سعید کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "بس حضرت دیکھ چکے چلئے ——— اب چلئے، میں نے آپکو یہاں نصب نہیں کردیا ہے۔ گاڑی سیٹی دے رہی ہے" ——— میں اپنے ڈبہ میں واپس آگیا۔ وہ حسین تھی، غضب کی حسین! "شیریں" "لیلیٰ" "ہیلن" نہیں ان سے بھی بڑھکر شاعروں کے خیال سے زیادہ حسین! سعید نے پوچھا: "کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں ———!"

"کہو بھائی میرا انتخاب کسقدر اچھا ہے۔ اب تو مانتے ہو استاد"

"واہ کیا کہنے ؏

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی"

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا: "میں نے تمہاری کس بات کو تسلیم نہیں کیا۔ واقعی تم حسن شناس ہو"

"میں حسن شناس نہیں ہوں بلکہ جوہری ہوں جوہری! کیا رائے ہے کیسی چیز ہے؟"

میں نے کہا: "بالکل گلاب جامن ہے!"

"ہش ہشت"

"اچھا تو بالائی کا لڈو ہے۔ اگر یہ بھی نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں"

"دیکھو بھئی مذاق تو کرو نہیں۔ کہیں نہیں اور کچھ نہیں کا وظیفہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ سنجیدگی سے گفتگو کرو" سعید نے پروفیسر شیو دیال کے لہجہ میں کہا۔ میرے منہ سے بے اختیاری کے عالم میں نکل پڑا۔ ؏

"اے درد کہوں کس سے بتا راز محبت!"

"یہ کیا؟"

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"یہ رو کیوں رہے ہو؟" سعید نے حیرت سے پوچھا۔

"سعید میں تمہارا گنہگار ہوں۔ تم نے مجھے کیوں دکھایا؟"

"میرا دل ———! اسٹیشن کب آئے گا۔ تاکہ اس کو پھر دیکھ سکوں۔ اچھا زنجیر کھینچ لو میں جرمانہ دیدونگا"

سعید نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: "کیا پاگل ہوگئے ہو؟"

"ہاں سعید میں پاگل ہوگیا ہوں مگر تم نے مجھے پاگل بننے میں مدد دی۔ تم نے میرے ہوش و حواس غائب کروائے"

بیچارہ سعید اپنی محبت بھول گیا۔ اور مجھ کو سنجیدگی سے سمجھانے لگا: "سہیل تم تو پیار مذاق اڑایا کرتے تھے اور محبت کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ تم نے تو محبت نام رکھا تھا، بوالہوسی کا۔ پھر یہ کیا؟"

"سعید تم میرا مذاق اڑاؤ، خوب اڑاؤ" میں نے زور سے کہا۔ ڈبہ کے مسافر میری

طرف دیکھنے لگے۔ سعید نے میرے زور سے چٹکی لی۔ اور کہا "ارے سب مسافر سن رہے ہیں۔ اگر اس کا کوئی رشتہ دار ہوا تو ـــــ؟"
میں سعید کو لے کر اوپر کے بنچ پر چلا گیا اور کہا "سعید میں جا رہا ہوں"
"کہاں؟" ـــــ
"جہاں وہ جائے گی" ـــــ
سعید نے تلخ لہجہ میں کہنا شروع کیا "دیکھو سہیل، یہ بیہودگی اچھی نہیں۔ پاگل پن کی باتیں ختم کرو اور ہوش میں آؤ" میں نے کہا "سعید!

یہ نادانیاں ہیں محبت کی ناصح
خرد کو یہاں سر جھکانا پڑے گا"

اتنے میں اسٹیشن آ گیا۔ میں اتر کر جانے لگا۔ سعید دروازہ پر بیٹھ گیا۔ اور مجھ کو روکنے لگا میں پچھلی طرف سے اتر کر زنانہ ڈبہ کے پاس گیا۔ اس وقت وہ اس طرف دیکھ رہی تھی

ع دو نگاہوں کا تصادم دو دلوں کا ارتباط!

اس نے دوسری طرف چہرہ کر لیا۔ میں چکر کاٹ کر اس طرف آیا پھر آنکھیں چار ہوئیں۔ اس نے سر جھکا لیا۔ میں سامنے سے چلا گیا۔ اور دو منٹ کے وقفہ سے پھر آ گیا ـــــ پھر، دو نگاہوں کا تصادم! گاڑی نے سیٹی دی۔ میں ڈبہ میں آ گیا۔ اٹارسی کا اسٹیشن آ رہا تھا۔ یہاں مجھ کو اترنا تھا۔ جیسے ہی گاڑی رکی سعید نے جلدی سے سامان قلی کو دیا اور مجھ کو پکڑ ریلوے رسٹورنٹ کی طرف لے چلا میں نے اس کی خوشامد کی کہ وہ مجھ کو چھوڑ دے مگر وہ نہ مانا۔ میں نے کہا "اچھا ایک بار دیکھ لینے دو" مگر اس کا دل نہ پسیجا گاڑی کی سیٹی نے میرے ہوش و حواس غائب کر دیئے۔ معلوم نہیں کب تک میں ریلوے ریسٹورنٹ میں بیٹھا رہا بمشکل سعید مجھ کو گھر لایا اور چھوڑ کر چلا گیا ـــــ میں گھر میں داخل ہوا۔ کچھ خواتین والدہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ لال پری بھی ـــــ

"ارے!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور میں الٹے پیروں واپس ہٹا ـــــ
"بھائی جان آ گئے۔ بھائی جان آ گئے" گھر میں غل مچ گیا۔
بچے باہر آئے۔ میں نے خلیل سے پوچھا "گھر میں یہ کون ہیں؟"
"مہمان! مگر پہلے یہ بتلایئے کہ آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟"
خلیل نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا "آپ کس گاڑی سے آئے؟" "اسی گاڑی سے آ رہا ہوں"
"اچھا پردہ کراؤ ـــــ" "پردہ کس سے کراؤں وہ تو خالہ ہیں" ـــــ "خالہ ہیں؟" میں نے کہا۔ کیونکہ میری کوئی خالہ نہیں۔
"جی ہاں خالہ۔ رشتہ کی خالہ" میں نے کہا "اور ان کے ساتھ کون ہے؟"
"پروین باجی!" جمیل نے پھر میری بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ اتنی دیر سے کیوں آئے؟ خالہ بھی تو اسی گاڑی سے آئی ہیں" ـــــ میں نے اس کی نہیں سنی۔ کیونکہ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ پروین کس قدر دلکش نام ہے جس پر سے دنیا کی تمام دلکشیاں قربان ہیں۔ شمسہ نے اندر سے آ کر کہا "اماں بلا رہی ہیں" میں اندر داخل ہوا۔ اماں نے کہا "سہیل یہ تمہاری خالہ ہیں" میں نے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور لاکھوں دعائیں دیں۔ خالہ نے چپکے سے پروین سے کہا "سلام کہہ دو" اس نے نیچی نگاہیں کر کے سلام کہا۔

پروین خالہ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ یہ خالہ ہماری دور کی رشتہ دار تھیں اور بمبئی جا رہی تھیں کیونکہ خالو ریلوے میں ملازم تھے۔ اور ان کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ کانپور میں اماں نے خالہ سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ ہمارے یہاں آؤ چنانچہ وہی وعدہ آج خالہ نے وفا کیا تھا میں خالو سے بھی ملا۔ بہت اچھے آدمی تھے مگر وہ ہمیشہ ریلوے کی باتیں کیا کرتے تھے یا پھر افراد محکمہ اور اپنی بہادری کے راگ الاپتے۔ خالو کا ارادہ تو دوسرے ہی روز جانے کا تھا مگر میرے اور اماں کے اصرار سے ایک ہفتہ کیلئے رک گئیں ـــــ

میں کمرہ میں بیٹھا ہوا ایک افسانہ لکھ رہا تھا کہ پروین داخل ہوئی "کیا میں یہ پرچہ لے سکتی ہوں؟" اس نے نقرئی آواز میں پوچھا ـــــ "ضرور" ـــــ وہ چلی گئی۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئی۔
"کیا آپ بھی مضمون لکھتے ہیں؟"
"نہیں تو!"
"آپ غلط فرما رہے ہیں" اس نے فردوسی آواز میں کہا "آپ کا افسانہ "دیوانی" اس میں موجود ہے"
"یہ کوئی اور صاحب ہونگے پروین!"
"آپ مجھے بنا رہے ہیں" اس نے ایک خاص طریقہ سے یہ جملہ ادا کیا "فرض کیجئے کہ میں نے ہی لکھا ہے۔ کیا یہ افسانہ آپ کو پسند ہے؟"
"بہت پسند آیا ـــــ مگر"
"مگر کیا؟"
"وہ یہ کہ بیچاری نسیمہ کرتی کیا؟" میں نے کہا "شادی کر لیتی اور کیا؟" ـــــ
"تو گویا آپ کے یہاں محبت کا مطمح نظر یہ ہے کہ شادی ہو جایا کرے"

میں گھبرا گیا مگر جلدی سے ہنستے ہوئے کہا "تو آپ کے یہاں محبت کا مطمح نظر کیا ہے؟ آپ کی محبت کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

——— "جی ——— میرا ——— مطمح نظر ——— میں ——— میں ——— محبت کیا جانوں ———"

میں نے کہا "فرض کر لیجئے کسی کو آپ سے محبت ہو جائے اور وہ آپ سے شادی کی درخواست کرے تو؟" ——— اس کے چہرہ پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی۔ اس نے نگاہیں نیچی کر کے کہا "کیوں ہو جائے ———؟" میں نے کہا "فرض کر لیجئے ———" "کیوں فرض کر لوں؟" میں نے دل مضبوط کر کے کہا "اچھا فرض نہ کیجئے۔ حقیقت سُن لیجئے ——— پروین مجھے تم سے محبت ہے!" وہ گھبرا کر چلی گئی اور دن بھر میرے سامنے نہیں آئی۔ دوسرے دن اماں اور خالہ باورچی خانہ میں تھیں۔ پروین پان بنا رہی تھی۔ میں نے چپکے سے اس کو دیکھ کر کہا "اماں! ایک پان بھیجئے۔" اماں نے پروین سے کہا "بیٹا ایک بنا کر دے آؤ۔"

وہ پان لیکر آئی ——— میں نے جرأت کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ——— "پروین! مجھے تم سے والہانہ محبت ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں پروین! میں نے جب تم کو ریل میں دیکھا تھا۔ اسی وقت میں تباہ ہو گیا تھا۔ پروین جواب دو"

وہ چپ رہی اور کمرہ سے چلی گئی ———

جانے والے روز وہ میرے کمرہ میں آئی اور کہا "سہیل صاحب (وہ اب تک مجھے بھائی صاحب کہتی تھی۔ مگر آج اس نے پہلی مرتبہ میرا نام لیا) آپ کی شادی کے مہینے ہو رہی ہے۔ خالہ نے ہم سے جانے کو کہا ہے۔ ان کو یاد دلا دیجئے!"

"میں نے گھبرا کر کہا "پروین۔ میری شادی نہیں ہو رہی ہے۔ تم نے غلط سنا ہے"

"واہ سہیل صاحب! تاریخ تک مقرر ہو گئی ہے۔ آج ہم خان بہادر صاحب کے یہاں گئے تھے۔ اور آپ کی "ان" کو بھی دیکھ آئے ہیں"

میں کھو گیا ——— پروین! محبت! شادی! خان بہادر کی لڑکی!

جاتے وقت اماں نے مجھ کو بلایا اور کہا۔ "جاؤ۔ خالہ کو اسٹیشن جا کر چھوڑ آؤ" تانگہ میں میں نے چپکے سے پروین کو ایک پرچہ دیا جس میں لکھا تھا "پروین! محبت، ایک بار ہوتی ہے اور مجھ کو دنیا میں صرف تم سے محبت ہے۔ اب خواہ کچھ ہو جائے میری زندگی تم ہو!" ریل میں بیٹھنے کے بعد پروین نے جوابی پرچہ دیا۔ مرقوم تھا۔

"سہیل صاحب: میں آپ کے اس مقدس جذبہ کی قدر کرتی ہوں۔ مگر شاید سوسائٹی اس کو جائز نہ سمجھے۔ اس لئے آپ خود غور کر لیجئے۔ ہمیشہ آپ کی

پروین"

~~~~~~~~

میں نے لاکھ لاکھ شادی سے انکار کیا۔ تعلیم کا بہانہ کیا۔ اپنی مصروفیات کا ذکر کیا۔ مگر والدہ نہ مانیں۔ مجبوراً میں نے کہدیا "اگر دنیا میں کسی سے میں شادی کر سکتا ہوں تو وہ پروین ہے"

والدہ یہ سن کر بہت بگڑیں۔ دادی نے منہ بنا کر کہا "بے وقوف، تمہارے والد ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ اس کے باپ ریلوے میں چالیس روپیہ کے معمولی کلرک۔ تمہارا اس کا کیا جوڑ۔ تمہارے لئے خان بہادر صاحب کی لڑکی ہی موزوں ہے۔ ورنہ دُنیا کیا کہیگی ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے"

اس پر میں نے جل کر کہا "مفلسی جرم نہیں ہے۔ دو دلوں کا ارتباط آخر آپ لوگوں کو کیوں پسند نہیں ——— غربت اور امارت اللہ کی طرف سے عطا کی ہوئی چیزیں ہیں آخر پروین کا اس میں کیا قصور ہے۔ دوسرے میں تو غریب ہی لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ دنیا میں اکثریت انہیں کی ہے اور میں اکثریت ہی کا ساتھ دونگا۔ اس پر خاندان کے معتدر افراد نے فرمایا "آپ کو کارل مارکس بننے کی ضرورت نہیں۔ یہ باتیں تم کو زیب نہیں دیتیں" خاندان! چاند سی دلہن! لاکھوں کا جہیز اور عزت ملے گی"

میں نے کہا "محبت کو عزت درکار نہیں۔ ——— محبت کا نام سُن کر سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے کسی نے بے غیرت کہا۔ اور کسی نے بے حیا۔ کیونکہ سماج کے افراد کی نظر میں محبت جرم ہے۔ اسلئے میں گناہگار تھا اور میرے اس گناہ کا دھبہ اب اسی طرح سے دھل سکتا تھا کہ میں خان بہادر صاحب کی لڑکی سے شادی کر لوں۔ مگر یہ میرے لئے ناممکن تھا۔ خالہ کے جانے کے پندرہ روز بعد ایک خط آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ پروین بیمار ہے۔ اس کو یہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی ——— میری شادی کی تاریخیں قریب آتی جا رہی تھیں! اور اس کی بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔ شادی سے ایک روز قبل اس کا خط آیا۔

"سہیل صاحب!

سماج کو دو دلوں کا ارتباط پسند نہیں۔ آپ شادی سے انکار نہ کیجئے اور صبر کیجئے ——— زندگی نام ہے فریب کا۔ اس لئے اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کر لیجئے آخر
~~~~~~~~

وقت آگئی ـــــ پروین " پانچ بجے نکاح کا وقت مقرر تھا۔ اس سے قبل پروین کی موت کا تار آیا ـــــ میں بھاگا ـــــ لوگ چیخے ـــــ بدنامی! رسوائی! اور سماج کا خوف دلایا ـــــ گھر والے کہتے رہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟" میں نے کہا" کہدیجئے گا کہ میں ان کے خوف کی حدود سے باہر نکل گیا ہوں" ـــــ خان بہادر صاحب کی لڑکی کی شادی دوسری جگہ ہوگئی ـــــ "لال پری" جنت الفردوس میں ہے۔ میں اب تک سماج کی نظروں میں مجرم ہوں۔ کیونکہ میں مرتد ہوگیا ہوں۔ اس کے قوانین کی خلاف ورزی کی۔ اکثر دوست مجھے" سماج کا مرتد" کہتے ہیں۔ اب میری زندگی بالکل بے کیف ہے۔ میں ہوں اور یہ مصرعہ جس کو ہمیشہ گنگناتا رہتا ہوں اور اس وقت تک گنگناتا رہوں گا۔ جب تک کہ زندہ ہوں۔ ع

دو نگاہوں کا تصادم دو دلوں کا ارتباط

(طبعزاد)

رنگین نظارے!

از جناب شوکت علی شوق ہاشمی نگینوی

(۱)

وہ چاندنی رات اور وہ تابندہ ستارے
وہ سبزۂ ساحل کے طرب خیز نظارے
پانی پہ مچلتی ہوئی موجوں کے اشارے
جس طرح کوئی کاکل برہم کو سنوارے
کیا یاد ہیں تم کو بھی وہ رنگین نظارے

(۲)

وہ ڈوبی ہوئی نشہ و مستی میں ہوائیں
بھیگی ہوئی وہ شبنم و صہبا میں فضائیں
پھیلی ہوئی ہر سمت وہ نورانی ردائیں
دریا میں نہاتے ہوئے معصوم ستارے
کیا یاد ہیں تم کو بھی وہ رنگین نظارے

(۳)

تم دل پہ گراتے تھے مرے برق تبسم
برساتے تھے ہر سمت فضاؤں سے ترنم
جذبات میں ہوتا تھا قیامت کا تلاطم
رقصاں تھے نگاہوں میں محبت کے شرارے
کیا یاد ہیں تم کو بھی وہ رنگین نظارے

(۴)

وہ ناز وہ انداز، وہ شوخی، وہ تماشا
آغوش محبت میں محبت کا مچلنا
وہ رات کہ تھی ماحصل ذوق و تمنا
اک جنت نظارہ تھی دریا کے کنارے
کیا یاد ہیں تم کو بھی وہ رنگین نظارے

(۵)

کس درجہ تھے دلچسپ وہ ایام محبت
ملتا تھا مجھے غیب سے پیغام محبت
چھٹتا تھا نہ ہونٹوں سے کبھی جام محبت
قائم ہیں مری عشرت ماضی کے اشارے
کیا یاد ہیں تم کو بھی وہ رنگین نظارے

طوائف کے کوٹھے پر

یہ اِس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا!

جعفر ایک کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ تعلیم یافتہ اور معمولی شکل صورت کا جوان تھا۔ تعلیم کے بعد اگر چاہتا تو اسے تھوڑی کوشش سے کوئی ملازمت مل جاتی لیکن اسے یہ درد سر مول لینا اچھا نہ معلوم ہوا۔ وہ اپنی آزادی کو جو اُسے زمانہ طالب علمی میں حاصل تھی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس واسطے نہ اس نے شادی کی، اور نہ ملازمت۔ خدا معلوم اس کی لغت میں آزادی کے کیا معنی تھے۔ لیکن وہ کسی قسم کی قید و بند کو پسند نہیں کرتا تھا اور نہ اس نے رکھی۔

جعفر سہل اور آسان زندگی کا قائل تھا۔ کسی قسم کی رکاوٹ یا بدمزگی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ زندگی بہتے ہوئے پانی کی طرح کہ آپ ہی آپ بہتی جا رہی ہے اس لئے وہ کسی سے بیر لیتا۔ یا کسی سے جھگڑا یا لڑائی کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کہ اس کھٹک کو اپنے دل میں کیوں خواہ مخواہ جگہ دے جو اس کی پرعیش اور بے فکر زندگی میں ایک کانٹا ہو۔ تمام یونیورسٹی اس کی دوست تھی سب سے اس کی ملاقات تھی عمدہ صاف ستھری پوشاک پہننا۔ ہنسنا اور پرلطف گفتگو کرنا اور ان تمام باتوں پر عمل کرنا جو اسے زیادہ سے زیادہ عیش حاصل کرنے میں مدد دیں مثلاً شراب پینا۔ بازار حسن کی سیر کرنا سینما دیکھنا۔ رات رات تفریح کرنا۔ دس بجے دن تک سونا اور وغیرہ وغیرہ۔ اس کی زندگی بھی ہموار رہ گئی تھی۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ جو سب کے دوست ہوتے ہیں کسی کے بھی نہیں ہوتے اور یہی جعفر کے حق میں بھی ہونا چاہئے تھا لیکن نہیں جعفر کو خالد سے بے انتہا محبت تھی۔ خدا معلوم دوستی کا یہ توازن کیونکر قائم رہ سکا دونوں کے طرز زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جعفر جہاں بے پناہ زندگی میں عیش کا عادی تھا۔ خالد خاموش طبع اور دوستوں کی کثرت سے احتراز کرتا۔ یونیورسٹی جہاں پر ہر ایک دوست ہو جاتا ہے ہر ایک سے ملاقات ہوتی ہے۔ خالد کے اتنے گنے دوست تھے جیوں جیوں زمانہ گذرتا جاتا اور عمر اور جوانی جعفر کو زیادہ حقوق اور باتصویر پھیلنے کا زیادہ موقع دیتی اس قدر وہ جذبات میں ڈھیلا اور عیش میں بے لگام ہو جاتا اور خالد زیادہ خاموش انسان بنتا جاتا اور شور و غل سے دور بھاگنے لگا۔ ممکن ہے کہ اس تغیر کی بنا زمانہ کی بدمذاقی ہو وہ خود کہا کرتا "مجھے والد کی بربادی کا کوئی صدمہ نہیں اور نہ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اوروں کے مقابلہ میں مجھے زندگی میں عیش کا موقع کم ہے لیکن یہ میری طبیعت کی افتاد ہے۔ خود بخود میری طبیعت ان بکھیڑوں سے بھاگتی جاتی ہے۔ خدا معلوم مجھے یہ زندگی یہ دنیا کیسی معلوم ہوتی ہے"۔

خالد غور و خوض کا عادی تھا۔ خالی گھنٹوں میں وہ کسی درخت یا کسی کھمبے سے ٹیک کر اپنی لمبی ڈھیلی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے خاموش کھڑا رہتا۔ یا کبھی کبھی جعفر اپنے دوست احباب کے جمگھٹوں میں گھسیٹ لایا کرتا۔ جہاں پر وہ بمشکل تمام ہنسی کی باتوں پر ہنستا یا مسکراتا۔ خالد کے تغیر کا ان لوگوں کو احساس تھا جو اسے اچھی طرح جانتے تھے کچھ عرصہ قبل وہ خوشدل اور پر مذاق انسان تھا لیکن وقت کی رفتار گذشت کے ساتھ ساتھ وہ خاموش تر ہوتا جا رہا تھا۔

یہ ضرور ہے کہ اس کی طبیعت ہی اس قسم کی واقع ہوئی تھی کہ وہ سنجیدہ اور خاموش رہے لیکن باپ کی تباہی نے بھی اس پر نامعلوم طریقہ سے اثر کیا تھا۔ زندگی کے اس نئے باب نے جو یکایک اس کے خاندان میں کھل گیا اسے حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ زندگی اسے پہلے سے کہیں مختلف نظر آ رہی تھی۔

بہرحال اس زمانہ میں جبکہ خالد دوستوں سے احتراز کرتا۔ جعفر اس کا دلی دوست اور راز دار تھا۔ یہ بات فطری تھی کہ خالد جعفر سے بھی بے نیاز ہو جاتا لیکن جعفر کے پرخلوص اور ہمدردانہ رویہ نے اس بات کا موقع ہی نہ دیا۔ جعفر دنیا میں ہنستا ہوا پر مذاق انسان ہر ایک کا دوست ہے جس سے گہرے خلوص کی توقع بہت کم کی جا سکتی تھی۔ خالد کے حق

میں ایک پُرخلوص دوست ایک عمدہ انسان تھا۔ وہ اس کے دل و دماغ کی کیفیتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ جعفر خالد میں ایک ایسا جوش پاتا جو اوروں میں اسے نظر نہیں آتا تھا وہ اس کی قدر کرتا اور وقت پر اس کے کام آتا۔

خالد کو جعفر کے اس پرخلوص رویہ کا پورا پورا احساس تھا۔ اور وہ اس کا احترام کرتا جعفر جس قسم کی زندگی بسر کر رہا تھا اسے کسی طرح پسند نہ تھی۔ شراب پینا۔ راتیں وہ طوائفوں کے کوٹھوں یا کسی گندی جگہ پر بسر کرتا وغیرہ وغیرہ۔ آخر یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ اس کی نگاہ میں یہ کھلی ڈھیلی ڈھالی زندگی عیب تھی لیکن خالد کبھی احتراز نہ کرتا۔ اور نہ یہ بات کبھی باہمی نفرت کی وجہ ہوتی۔ اس خیال کی بنا پر وہ اسے دل ہی دل میں معاف کر دیا کرتا کہ اگر یہ مجبور دلاچار انسان کبھی زندگی میں عیش کر لے تو کیا بُرا ہے۔

لیکن اسے روپیہ کے اس غلط استعمال نے اس بے اصول زندگی سے جو جعفر کی جسمانی اور مالی تباہی کا پیش خیمہ تھی افسوس ہوتا اسے یقین تھا کہ اگر یہ زندگی قائم رہی تو جعفر کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہ رہے گی۔ اس کی آئندہ زندگی پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک راندۂ درگاہ مفلوج۔ بدبودار۔ انسان کی شکل میں اس کی آنکھوں میں پھر جاتی بعض اوقات جب وہ گئی رات کو بکتا جھکتا سرخ آنکھیں اور لڑکھڑاتے قدموں میں خالد کے پاس آتا۔ اور اسے قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ وہ نشہ میں نہیں ہے۔ تو خالد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پُر ملامت انداز میں کہتا "تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آؤ گے"۔ اتنی رات وہ اسے گھر نہ جانے دیتا اپنے ہی کمرے میں سُلا لیتا۔ اکثر وہ جعفر کو سمجھاتے ہوئے وہ کہتا۔ تم جانتے ہو جعفر قدرت اپنے اصول بدل نہیں سکتی اور مفلس کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ جب تم اپنی دولت اور جوانی کھو چکو گے تو کیا ہوگا۔ جعفر تمہیں ہوش نہیں آتا"

ایک روز قریب قریب شام ہو چکی تھی کہ خالد سو کر اٹھا۔ ایک بالکل بے وقت اور خلاف عادت بات تھی۔ شام کی پھیلتی ہوئی تاریکی میں اسے دنیا عجیب ہی معلوم ہو رہی تھی۔ گو کہ طبیعت اداس تھی لیکن دیر تک سو لینے کی وجہ سے ہلکی ہو گئی تھی۔ وہ شام کی تفریح کا عادی تھا لیکن آج خلاف معمول اس کا دل رات کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کو چاہ رہا تھا۔ سینما دیکھے کسی ریسٹوران میں جا کر چا پیئے۔ گھڑی دو گھڑی کو طبیعت کو بہلائے اور وغیرہ وغیرہ۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ جعفر آ گیا۔ کہنے لگا "کہیں چلتے ہو بھائی"۔ خالد نے سر ہلا کر کہا۔ ہاں لیکن چلو گے کہاں۔ جعفر نے مُسکرا کے کہا" اس کی بھی کمی ہے۔ آؤ تم کو بڑی اچھی جگہ لے چلیں"۔

خالد جعفر کا مطلب سمجھ گیا گو کہ وہ اس قسم کی تفریحات کا عادی نہیں تھا لیکن آج راضی ہو گیا۔ وہ بھی محض اس خیال سے کہ دیکھئے اس دنیا میں زندگی کا کیا رنگ ہے۔ اکثر گئی رات کو نصف کھلے ہوئے دروازوں سے اس نے کسی بڑی مونچھوں والے بے شعور بے ڈھنگے لوگوں کو۔ اور رنگین پوشاک اور سیاہ بالوں کا ایک گوشہ ایک حصہ دیکھا تھا۔ کوٹھوں پر سے اُترتی ہوئی موسیقی کی کوئی تان سنی تھی۔ گویا کہ ایک اچٹتا ہوا نظارہ ایک نامکمل آواز۔ آواز جس نے ان جگہوں کو اس کی نگاہ میں پراسرار بنا دیا تھا۔ خالد کو یہ موسیقی ایک درد بھری آواز معلوم ہوتی۔ خیالات اس کے ذہن میں پیدا ہو جاتے گو کہ رات بہت زیادہ نہیں گئی تھی لیکن گلیوں میں کافی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ رات کو دن بنا دینے والی بجلی کے بجائے جن سے کہ شہر کی بازاریں و رئیسوں کے محلے روشن رہتے میونسپلٹی کی لالٹینیں جل رہی تھیں جو بمشکل تمام اس تاریکی کو دور کر سکتیں۔ کچے پکے چھوٹے بڑے۔ بے جوڑ گھروں کا ایک سلسلہ گلیوں کے کنارے پھیلتا چلا گیا تھا۔ خالد اپنے دل میں ایسے جذبات محسوس کر رہا تھا جو بالکل نئے تھے۔ جرم کا احساس نہ معلوم کہاں سے اس کے دل پر چھایا ہوا تھا۔ گویا کہ وہ تمام دنیا کا مجرم ہے وہ غیر ارادی طریقہ سے لوگوں کی نگاہیں بچا کر چل رہا تھا۔ اسے بار بار خیال ہو رہا تھا کہ کوئی جان پہچان کا آدمی اسے دیکھ نہ لے باوجودیکہ وہ اس قسم کے احساسات اور جذبات کو لغو اور بے بنیاد سمجھ رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے دل پر جمے ہوئے تھے۔ سوسائٹی کا رعب اس کی تمام جرح و بحث پر غالب تھا۔ اس کے تمام باغی فلسفیانہ نکات اس تیز دھارے میں بہے جا رہے تھے۔

خالد اس قطعی غیر مانوس اثر کے ماتحت خاموشی کے ساتھ ان راستوں سے گذر رہا تھا کہ یکایک جعفر ایک مختصر سی دالان میں آ کر رک گیا۔ مٹی کا ایک دیا طاق پر ٹمٹما رہا تھا۔ جس کے دھوئیں سے دیوار سیاہ ہو گئی تھی۔ ایک عجیب بے کسی اور کس مپرسی کا عالم تمام فضا پر چھایا ہوا تھا۔ جعفر نے بڑھ کر کُنڈی کھٹکھٹائی۔ ایک بڑھی عورت لالٹین لئے ہوئے باہر آئی ہلکی ہلکی لالٹین کی روشنی

میں بڑھیا کا چہرہ دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا لیکن چہرے کی گہری نمایاں جھریاں۔ اور بڑھاپے کے شدید آثار اس اندھیرے میں جھانکتے نظر آرہے تھے۔

جعفر بڑھیا سے قدرے قریب تھا بڑھیا نے لالٹین اٹھا کر جعفر کے چہرے کو غور سے دیکھا اور ایک قہقہہ لگا کر بولی "جعفر بھیا ہیں" وہ پھر ہنسی اور کہنے لگی "جعفر بھیا آج کئی روز سے زہرہ آپ کو بہت یاد کر رہی ہے آپ نے تو آنے کی قسم کھائی ہے" اتنا کہہ کر بڑھیا پھر ہنسی اور کچھ کہنا چاہتی کہ جعفر نے پوچھا اندر کوئی اور تو نہیں ہے "نہیں" بڑھیا نے کہا اور لالٹین کو لوں اوپر اٹھایا گویا جعفر کو راستہ دکھا رہی ہے۔

زہرہ کے کمرے میں گیس کی تیز روشنی ہو رہی تھی۔ قدموں کی آواز سنکر وہ دروازے کے پاس آگئی۔ اور ایک تبسم کے ساتھ اپنے مہمانوں کا استقبال کیا جعفر کو دیکھ کر کہنے لگی "اخاہ جعفر صاحب۔ بہت دنوں کے بعد آنا ہوا۔ اب تو آپ نظر ہی نہیں آتے" تبسم ہنوز قائم تھا۔ نہ یہ دہانہ خنداں ہوا۔

"زہرہ" جعفر کسی قدر مسکرا کر اپنے مخصوص پر اعتمادانہ انداز میں جو وہ عورتوں کے لئے روا رکھتا کہنے لگا۔ "پڑھنا۔ لکھنا۔ گھر بار۔ ملاقاتی۔ ایک ہزار جھنجھٹیں کیا بتاؤں بس یہ سمجھو کہ فرصت نہیں ملی" "زیادہ شگفتہ ہو کر" ورنہ فرصت ہو زہرہ! اور تم سے نہ ملوں" "خیر باتیں نہ بنائیے کوئی اور بات ہوگی" ہنس کر کہنے لگی "آپ آتے تو مگر کوئی عنان گیر بھی تھا" جعفر نے پیار سے ایک ہی چپت زہرہ کے گال پر رسید کی "یہ محض بدگمانی ہے زہرہ!" ایک قدم بڑھا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔

خالد زہرہ کا بالکل ہی نیا مہمان تھا۔ اسکی اچٹتی ہوئی نگاہوں نے خالد کا جائزہ لیا۔ اور پھر جعفر کے چہرے پر واپس آگئیں لیکن بار بار وہ کن آنکھوں سے خالد کو دیکھتی جاتی تھی۔ خالد ابتک خاموشی سے جعفر اور زہرہ کی گفتگو سن رہا تھا۔

خالد کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا کہ اس نے ایک طوائف کے گھر میں قدم رکھا تمام جذبات جو اس کے دل میں اٹھ رہے تھے تمام گفتگو۔ یہ تمام نظارے۔ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھے۔ اسے تعجب تھا اور انتہائی تعجب۔ تعجب ایک ہزار باتوں پر بھی وہ اپنے دماغ میں ایک ایک کر کے علیحدہ نہ کر سکا۔ گویا کہ دھاگے کی ایک ہی ڈور تھی جو الجھ کر رہ گئی تھی، اور اس میں جگہ جگہ رہیں پڑ گئی تھیں، آج تم فضا سراپا تعجب اور حیرت بن کر اس کے دماغ پر چھا گئی تھی۔

"ہاں زہرہ" جعفر خالد کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "میں اپنے دوست سے تعارف کرانا بھول ہی گیا" ان کا نام خالد ہے۔ میرے دنیا میں سب سے بڑے دوست ہیں۔ بہت ہی اچھے انسان ہیں"۔ زہرہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا "تب!" اور ہاتھ بڑھا دیا جعفر نے گفتگو جاری رکھی "تم ان سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ تمہاری طبیعت کے مطابق ہیں میں خاص طور سے تم سے ملاقات کرانے لایا تھا۔"

اس آخری جملے پر زہرہ مسکرائی اور ظرافت کا پہلو لئے ہوئے کہا "واقعی خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو" اس پر خالد کسی قدر جھینپ سا گیا۔

خالد کی اس کیفیت کو جعفر نے محسوس کیا۔ اور کہنے لگا "زہرہ! یہ زندگی میں پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں۔ میری طرح اوباش اور بے اصول نہ سمجھ لینا۔" "کیونکہ زہرہ معاف کرنا ہر طوائف اپنے ملاقاتیوں کے متعلق یہ ہی خیال قائم کرتی ہے" اس سنجیدہ گفتگو سے زہرہ کے چہرے پر سنجیدگی پیدا ہوگئی جعفر نے آگے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا لیکن زہرہ نے گفتگو کو قائم رکھا "ہاں جعفر یہ درست ہے میں بھی اپنے ملاقاتیوں کو بے اعتبار، بے اصول آوارہ۔ شرابی اور کیا کیا سمجھتی ہوں۔ لیکن پھر بھی تفریق قائم رہتی ہے۔ میرے عشاق میرے اس معصیت کدے میں ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے آتے ہیں، ایک سا برتاؤ کرتے ہیں، اور ایک ہی انداز و ادا سے چلے جاتے ہیں میرے دل میں ان کے لئے کوئی جگہ پیدا نہیں ہوتی۔ مگر آپ کا رویہ ان لوگوں سے یک گونہ مختلف ہے" زہرہ کی مسکراہٹ میں حزن و یاس کی ہلکی سی جھلک پیدا ہوگئی۔ "آپ میرے یہاں ایک دوست کی حیثیت سے آئے ہیں۔ جس کی گفتگو میں میں سکون محسوس کرتی ہوں۔ مجھے اطمینان قلبی حاصل ہوتا ہے میں آپ کو کبھی ایسا نہیں سمجھتی۔ خواہ آپ اپنے متعلق جو بھی رائے قائم کریں" پھر وہ کسی قدر بشاش اور لہجہ کو بدل کر کہنے لگی "خیر چھوڑئیے ان باتوں کو" خالد کی طرف مخاطب ہو کر "تشریف رکھئے خالد صاحب" کمرے میں ایک بڑا سا سفید صاف ستھرا فرش بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف دیوار کے پاس مسند لگی ہوئی تھی۔ پاندان اور اگلدان درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی وضع ایک حد تک سادہ اور اس میں وہ مستقدی رنگ مفقود تھا جس سے عموماً طوائفوں کے کمرے سجے ہوتے ہیں۔

جعفر مسند کے قریب بیٹھ گیا اور زہرہ لیں

بیٹھی کہ اس کا رخ خالد اور جعفر کی طرف برابر تھا۔ اور روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ خالد زہرہ کی نقل و حرکت اور اس کمرے کی ایک ایک چیز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس وقت کی زہرہ کی گفتگو اور مسکراہٹ میں اسے ناامیدی اور یاس و غم کی ایسی جھلک نظر آئی جس نے اس کی نگاہ میں زہرہ کی زندگی کو پُراسرار بنا دیا اور اسے زہرہ سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔

جعفر مسند کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اس نے ایک اطمینان کی سانس لی سگریٹ جلاتے ہوئے بولا۔" اور کہو زہرہ زندگی کیسی گذر رہی ہے؟" زہرہ نے جعفر سے نظریں ملا کر اور ایک پتنگے کو جو کہ اس کے چہرے کے قریب آگیا تھا اڑاتے ہوئے کہا۔ زندگی کی خوشیوں کا اظہار یا اس کی شکایت وہ کرے جس کے پاس زندگی ہو۔ یہاں زندگی ہی نہیں تو کیا بتاؤں کیسی گذر رہی ہے۔ وہی بدستور" خالد کی طرف مخاطب ہو کر "خالد صاحب اس تکلف کو تو اٹھایئے۔ کچھ گفتگو کیجئے۔ کچھ سنایئے کچھ سنئے۔ جب آتے ہیں تو کچھ لطف صحبت رہے" خالد نے کچھ مسکرا کر تکلف سے کہا۔ آپ لوگ گفتگو کر رہے ہیں۔ میں دلچسپی سے سن رہا ہوں۔ زہرہ ہنس کر بولی "جی نہیں یہاں اس کی اجازت نہیں۔ باتیں کیجئے تو سنئے بھی۔ ورنہ یہ تو ایک قسم کی زیادتی ہوئی۔ خالد صاحب" جعفر کی طرف مخاطب ہو کر کیا خیال ہے آپ کا؟" "بالکل درست" جعفر نے کہا۔

زہرہ نے خالد سے گفتگو جاری رکھی "اب تو میں آپ سے توقع کر سکتی ہوں کہ مجھ غریب کو کبھی کبھی شرف ملاقات بخشا کریں گے" خالد نے کسی قدر کھل کر کہا۔" اگر آسکا تو اور آپ کو بار نہ ہوا۔" زہرہ نے جلدی سے کہا۔ "شرط آسکنے کی ہے۔ بار وار تو یہاں ایک بے معنی اصطلاح ہے شاید آپ یہاں کے دستور سے واقف نہیں۔ میرا گھر تو ایک شاہراہ عام ہے۔ ہر روز اور ہر رات انسانوں کا ایک جم غفیر اس راہ سے گذرا کرتا ہے اور مجھے بار ہوتا ہے اور نہ تکلیف۔" "خالد صاحب" زہرہ نے کسی قدر گردن کو خالد کی طرف جھکا کر اور رازدارانہ انداز میں کہا۔ "پہلے پہل جب میری اس زندگی کی ابتدا ہوئی تو دل ہی دل میں گھلا کی روتی۔ جلاتی۔ لیکن بے سود کسی ایسے ہاتھ نے مجھے مس نہ کیا۔ جو اس زندگی سے نکال سکتا۔ مجبوراً مجھے تھک کر زندگی کے انہیں تاریک گوشوں میں منہ چھپا لینا پڑا۔ اور ہنوز بدستور ہوں۔ نہ تھکتی ہوں۔ نہ گھبراتی ہوں" زہرہ خاموش ہو گئی۔ خالد اس کی صورت غور کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ زہرہ کی دلی کیفیات یکایک ابھر کر اس کے چہرے پر آ گئی تھیں۔ جسے خالد محسوس کر رہا تھا۔ جعفر مسند سے ٹیک لگائے دھوئیں کے چھلے بنا بنا کر ہوا میں پھینک رہا تھا۔ اور زہرہ کی گفتگو سنتا جاتا تھا۔ یکایک زہرہ کی آواز نے اس سکوت میں زندگی پیدا کر دی خالد صاحب۔ شاید آپ یہ خیال کریں کہ میں ایسا کر کے آپ کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن آپ یقین کیجئے کہ میں ایسی باتیں کرتی ہی نہیں۔ جعفر جب آجاتے ہیں تو کبھی کبھی خدا معلوم کس جذبہ سے مجبور ہو کر ایسی گفتگو کرنے لگتی ہوں۔ آج میری طبیعت صبح ہی سے الجھ رہی تھی۔ جعفر کی کی گفتگو نے میرے جذبات کو بھڑکا دیا اور میری زبان سے یہ درد بھرے نالے نکل گئے۔ میں جانتی ہوں کہ اس قسم کی گفتگو سے دوسروں کی طبیعت بدحظ ہوتی ہے لیکن معاف کیجئے میں خود پر قابو نہ حاصل کر سکی۔ آیئے دوسری باتیں کی جائیں۔ جعفر سے مخاطب ہو کے۔ اور اپنے لہجہ کو بدل کر کہنے لگی "خالد صاحب جعفر کی صحبت میں مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ جب یہ آجاتے ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے یہ مجھے اپنے یونیورسٹی کے قصے سنایا کرتے ہیں۔ جنہیں سن کر میرے دل میں کالج گرل بننے کا ارمان پیدا ہوتا ہے۔ خالد صاحب طالب علمی کی زندگی بھی خوب ہوتی ہے" یونیورسٹی اور وہاں کی زندگی کا تذکرہ ہوتے ہی قصے کہانیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

"ڈیفن" میں جب جمیل تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو زیبا یوں للچائی ہوئی نظروں سے گھور رہی تھی گویا جمیل کو کھا جائے گی" "اور وہ سبحان بھائی جو مہینے کی دوسری تاریخ کو دیوالیہ ہو جاتے ہیں ذرا ان کی پریشانی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ جب کوئی مہمان آجاتا ہے نوکر تک سے قرض لینے میں ان کو عار نہیں ہوتا۔"

"اور بھئی وہ ماتھر بھی خوب آدمی ہے یونیورسٹی سے کچھ ایسا تعلق ہو گیا ہے کہ ان کے ساتھی تعلیم ختم کر کے نوکر بھی ہو گئے لیکن خود ابتک قانون سے فراغت نہ پا سکے۔ ایک سال ایم۔ اے میں محض اس بنا پر داخلہ لیا تھا کہ ایک حسین لڑکی پسند آ گئی تھی۔"

غرضکہ مضحکہ خیز باتیں۔ دلچسپ حکائیتیں قصہ کہانیاں۔ زندگی کے واقعات اور وغیرہ وغیرہ۔ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کئے گئے زہرہ نے بھی اپنی زندگی کی مضحکہ خیز باتیں سنائیں۔ اس عرصہ میں خالد ایک حد تک

بے تکلف ہوگیا تھا۔ ان لوگوں کی ہنسی مذاق میں وہ بھی ساتھ دے رہا تھا۔ وہ بے تعلقی جو عموماً یونیورسٹی میں لڑکوں کے ساتھ روا رہتی کسی حد تک مفقود تھی۔

یکایک خالد نے کسی قدر جھک کر اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے سگریٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ جو جعفر کے نزدیک ہی پڑا ہوا تھا۔ "ذرا سگریٹ تو دینا جعفر" قبل اس کے کہ جعفر سگریٹ خالد کو دے سکتا۔ زہرہ نے ہنس کر جس سے اس کے گالوں میں دو خوبصورت گڑھے پیدا ہوگئے کیس کو اُٹھالیا کہنے لگی "اوہ۔ میں تو اپنے نئے مہمان کی خاطر ہی کرنا بھول گئی۔ جعفر تم بڑے بدمذاق ہو تم نے بھی یاد نہیں دلائی۔ یہ کہکر اس نے سگریٹ اور دیا سلائی خالد کو دیدی۔ پان لگائے۔ ایک سرسری متلاشی نظروں سے میز کی طرف دیکھ کر آپ ہی آپ کہنے لگی "عطر کی شیشی یہاں رکھی ہوئی تھی۔ کیا ہوئی۔ غالباً الماری میں ہے" زہرہ الماری کی طرف بڑھی بغیر ارادی طریقے سے الماری طرف گھوم گئیں اور اس کی نظریں چیزوں کا جائزہ لینے لگیں۔ انگریزی شراب کی ایک بوتل نچلے خانے میں رکھی ہوئی تھی جسے دیکھتے ہی جعفر خوشی سے چلا اُٹھا۔ "او ہو۔ زہرہ۔ یہ بات ہے۔ بتایا کیوں نہیں نکالو۔ نکالو" یہ کہکر اس نے بوتل اٹھالی اور اسے جوش سے سینے سے لگالیا۔ اس پر زہرہ ہنسی اور خالد کی طرف دیکھ کر کہنے لگی معاف کیجئے گا۔ خالد صاحب! میں بہت ہی گنہگار انسان ہوں" اسکے چہرے پر تبسم کے ساتھ ساتھ کسی قدر سنجیدگی بھی تھی مجھ میں بہت ہی خراب عادتیں ہیں۔ کبھی کبھی شراب بھی پیتی ہوں۔ اور اس میں مجھے بڑا لطف آتا ہے" یہ کہکر اس نے شیشے کے تین گلاس الماری سے نکال کر فرش پر رکھدئے۔ اور خالد کی طرف دیکھ کر کہا۔ "شراب اکیلے نہیں پی جاتی" اس معنی خیز جملے پر خالد کچھ گھبرا سا گیا۔ اگر صرف دو ہی گلاس ہوتے تو مراد جعفر سے تھی۔ لیکن یہ تیسرا گلاس یقینی اسی کے لئے ہے پریشان ہو کے منت سے کہنے لگا۔ نہیں۔ نہیں۔ زہرہ۔ مجھے معاف کرو میں شراب کبھی نہیں پیتا۔ اور نہ پی سکتا ہوں تم جعفر ہی تک رہنے دو" زہرہ بولی "یہ کیسے ممکن ہے۔ زیادہ نہیں تھوڑی سی ہی" خالد نے سر ہلاکے کہا "نہیں زہرہ نہیں" غرضیکہ بڑی ردوکد ہوتی رہی۔ زہرہ برابر اصرار کر رہی تھی اور خالد انکار کئے جا رہا تھا۔ جعفر نے اس معاملہ میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ صرف اس تکرار کو لیٹا ہوا ایک تبسم اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور سگریٹ پئے جا رہا تھا۔ زہرہ نے مقدمہ کی اپیل جعفر سے کی۔ "کہ کتنی زیادتی ہے کہ خالد ہماری دلچسپی میں حصہ نہ لیں۔ اگر اپنے لئے نہیں تو ہماری ہی خاطر سہی۔ پھر وہ خالد کی طرف مخاطب ہو کے کہنے لگی۔ ع

"دل بدست آور کہ حج اکبر است"

دوسروں کی خاطر گناہ بھی ثواب ہے۔ اور اگر زندگی میں ایک بار پی ہی لی تو کونسا گناہ ہوا توبہ کر لیجئے گا۔ خالد صاحب۔ اس نے نظریں ملاتے ہوئے کہا "زندگی کو ہر رنگ میں دیکھنے کی کوشش کیجئے اور ذرا محسوس کیجئے کہ پئے ہوئے خالد میں اپنے پہلے خالد سے کیا فرق ہے" یہ کہکر زہرہ گنگنانے لگی "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک" اور خالد سے نظریں ملائے بڑی دیر تک گنگناتی رہی اس کے لبوں پہ ہلکا سا تبسم تھا وہ اس مصرعہ کو بار بار دہرا رہی تھی۔

اور خالد خاموشی سے سن رہا تھا۔ زہرہ! طوائف تھی اور طوائف کے لئے موسیقی کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ دستور کے مطابق وہ بھی ایسی ہی موسیقی جانتی ہے جو معمولی درجہ کے عام لوگوں کے مذاق کی ہوتی ہے۔ لیکن زہرہ کی سلجھی ہوئی تربیت یافتہ طبیعت نے پنے میں موسیقی کا اعلیٰ اور بہت ہی خوشگوار مذاق پیدا کر لیا تھا۔ زہرہ خوب گاتی۔ لوگوں کو لطف آتا اور خود بھی لطف اٹھاتی۔ یہ خاص بات تھی کہ جب وہ گاتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اپنے ہی ساز دل کے تاروں کو چھیڑ رہی ہے اپنے ہی جذبات میں ڈوبی جا رہی ہے وہ اکثر گاتی اور اکثر اپنے جذبات سے مسحور ہو کر رونے لگتی۔ جعفر خوب جانتا کہ ان آنسوؤں کی کوئی اور وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ فطرۃً غمگین مزاج اور انتہائی جذباتی واقع ہوئی ہے جب اس کے گہرے جذبات کسی وجہ سے ابھر آتے ہیں تو رونے لگتی ہے جعفر عرصہ سے زہرہ کو جاننے کی وجہ سے بہت کافی حد تک اس کے دل و دماغ کی کیفیتوں سے واقف ہوگیا تھا اور اسے زہرہ سے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی لیکن یہاں بھی اس کی فطرت اپنا رنگ قائم رکھتی وہ زہرہ کی زندگی کے رازوں میں حصہ لیکر اس کی داستانیں سُنکر رازداری کی زحمت کو گوارہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ عموماً ایسی باتوں کو درگذر کرتا جو اس کے جذبات کو بھڑکا دیں۔ اکثر وہ خود ہی اپنی زندگی کے ایک حصہ کا تذکرہ کرتی۔ خود ہی رونے لگتی اور خود ہی چپ ہو جاتی رہا کبھی کبھی جعفر اسے تسلی دے دیتا اس کی تشفی کرتا اور کہتا زہرہ۔

آخر ان باتوں سے کیا فائدہ۔ اگر زندگی کا دکھڑا روتی ہو گی تو یہ اور بھی سخت اور گراں ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ خوش رہنے کی کوشش کرو۔ فلاح اسی میں ہے" اور چپ ہو جاتا۔ جعفر ایسی طبیعت اور انہیں جذبات کو ساتھ لے کر زہرہ کے یہاں بھی جاتا جو وہ دوسری طوائفوں کے لئے روا رکھتا یا سمجھ لو کچھ اس سے زیادہ اس کی وجہ صرف ایک تھی اس کا خیال تھا کہ دوستی کے اس مادہ کو جو عموماً خلوص کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے کیوں خواہ مخواہ اپنے دل میں جگہ دے۔ وہ زندگی میں عیش کا قائل تھا اور ہر رنگ میں عیش چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جعفر کی خوشگوار۔ دلچسپ اور خوش اخلاق شخصیت کی بنا پر جو یونیورسٹی میں بیشتر نوجوانوں کی ہو جایا کرتی ہے وہ اس کی جانب کھنچ تو اٹھی اور اسے جعفر میں ایک دوست تو مل گیا لیکن ایسا دوست نہیں جو اس کا راز دار اور چارہ ساز ہوتا۔ جو اس کے زخموں کی پرسش کرتا اور پوچھتا "کہو زہرہ یہ کیسے ہو گیا کب سے ہے اس میں کتنی تکلیف ہے؟"

لیکن اسے جعفر سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ اسی پر خوش تھی اور اسی پر قانع کہ جعفر اس کے ملاقاتیوں میں سب سے زیادہ مختلف اور شریف تھے۔ اس کا برتاؤ دوسروں سے قطعی مختلف اور الگ ہے۔ اس کی صحبت میں وہ تھکا دینے والے جراثیم نہیں تھے۔

یکایک۔ زہرہ نے گنگنانا بند کر دیا۔ اور بوتل کو جھکا کر گلاس سے لگاتے ہوئے خالد سے پوچھا "کہئے آپ کے لئے بھی نا" اور اس کی طرف جواب کے انتظار میں دیکھنے لگی۔ زہرہ کی موسیقی اور اس کی منت و سماجت میں بڑا لوچ تھا۔ یہ راگ اس سے زہرہ کی طرف سے سفارش کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ ان خاموش لمحات میں جب تک کہ زہرہ گاتی رہی وہ عجیب کشمکش میں مبتلا رہا۔ زہرہ کے اس پوچھنے پر وہ چونک سا گیا۔ اور اس مرتبہ وہ انکار نہ کر سکا۔ آہستہ آواز میں کہنے لگا "خیر تمہاری مرضی ہے تو جو چاہو۔ لیکن میرے ساتھ تم زہرہ بڑا ظلم کر رہی ہو" زہرہ نے یہ کہکر "اجی پہلے پہل سب ہی ایسا کہتے ہیں" شراب کو گلاس میں ڈھال کر سب سے پہلے خالد کی طرف بڑھایا پھر جعفر کو دیا اور خود لیا۔

ابتدا سب سے پہلے جعفر نے کی۔ بے دھڑک آدھی پی گیا اور لبوں کو دبا کر ایک چسکی لی گویا کہ مزے لے رہا ہے۔ زہرہ خالد کے انتظار میں رکی رہی۔ خالد ہمت کر کے گلاس منہ کے قریب لے گیا۔ لیکن مہک سے گھبرا کے اور اس سے بچنے کے لئے منہ پھیر لیا۔ بہت خراب منہ بنا کے کہنے لگا "زہرہ یہ تو چلے گی نہیں"۔ زہرہ خالد کی اس بے بسی اور گھبراہٹ پر ہنسی اور زبردستی اپنا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ خالد نے منہ ہٹا لینے کی ہلکی سی کوشش کی لیکن زہرہ نے ایک ہاتھ سے خالد کا سر آہستہ سے پکڑ لیا۔ خالد نے بھی دل پر جبر کر کے ایک گھونٹ پی ہی لیا۔ شراب حلق سے نیچے اترتے ہی اس نے کچھ عجیب سا محسوس کیا اور اس کی تلخی پر منہ بنا کر زہرہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس پر زہرہ قہقہہ لگا کر بولی۔ "ابتدا ہو گئی جناب سیدھے سیدھے پی ڈالو" اور خود بھی پینے لگی۔

شراب پی کے خالد متوالا ہو گیا۔ ایسی چڑھی جیسا کہ ایک نئے شرابی کو چڑھنا چاہئے۔ تمام فضا میں رقص و سرود کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کے تمام حسیات و جذبات جنکی تلخ کیفیتیں اسے سوگوار اور غمزدہ رکھتیں ایک لطف و سرور بنکر تمام فضا کے کائنات پر چھا گئے۔ رگوں میں زہر کی طرح اتر جانیوالا احساس غم اس کی مستی کے تیز دھارے میں خس و خاشاک کی طرح بہا جا رہا تھا وہ بے فکر تھا آزاد تھا خیالات کی فضائی بلندیوں میں ایک سرعت رفتار پرندے کی طرح اڑا جا رہا تھا سلطنتیں اس کے سامنے ہیچ تھیں۔ دبدبے بے وقعت اور دنیا کی تلخ حقیقتیں بے معنی۔ وہ اپنے دل میں ایک قوت ایک ہمت پاتا تھا کیسی بے خودی اور کتنی سرمستی کا عالم تھا۔ جس میں خالد خود کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ کیفیت اسے آج تک نہیں ملی تھی۔ یہ سب شراب کا فیض تھا۔

سرخ آنکھیں اور چڑھے ہوئے لہجے میں زہرہ کی طرف دیکھ کر خالد نے خالی گلاس بڑھا دیا۔ "اور لاؤ" زہرہ مسکرا کر بولی "مزے میں آ گئے نا" اور سر ہلا دیا۔ خالد نے اس کے جواب میں اتنی ہی کہا "اور لاؤ۔ اور لاؤ۔ زہرہ تم کتنی اچھی ـــــ ہو"۔

زہرہ نے خالد کے خالی گلاس کو بھرتے ہوئے امنگ میں آ کر کہا "کہو دوست کیسی نعمت ہے اب سمجھے شراب کو" اور اپنے گلاس کو منہ سے لگا لیا۔ جعفر چپ چاپ مسند سے ٹیک لگائے پیروں کو پھیلائے لیٹا ہوا شراب اور ساتھ ہی سگریٹ پئے جا رہا تھا۔ وہ اپنے رویہ سے پکا شرابی معلوم ہو رہا تھا۔ خالد کی طرح آپے سے باہر نہیں ہو رہا تھا۔ اور نہ زہرہ کی طرح امنگ میں آ گیا تھا۔ وہ ایسا اطمینان ظاہر کر رہا تھا جیسے کہ شراب اس کی زندگی کا ایک جزو ہے اور بات بھی یہی تھی۔ زہرہ پیتی تو تھی لیکن کبھی کبھی۔ خالد کی آج ابتدا ہوئی تھی۔ لیکن جعفر تو پورا شرابی تھا۔

ـــــــ ✲ ـــــــ

حصہ دوم

دوسرے روز خالد سوکر اٹھا تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ نصف ماہ فروری کی دھوپ میں تمازت آ چکی تھی اور کرنیں کھڑکی کی راہ فرش پر پڑ رہی تھیں۔ باہر سڑک پر زندگی کی جدوجہد میں سرگرمی پیدا ہو گئی تھی اور اژدہام انسانی کی چیخ و پکار سے کمرے کی خاموشی اس کا سکون غارت ہو رہا تھا۔ خالد کھویا کھویا۔ دنیا و مافیہا سے پاؤں لٹکائے یوں بیٹھا تھا کہ اس کے پیر جوتوں کو دبا رہے تھے۔ کہنیاں رانوں پر اور ہتھیلیاں ٹھوڑیوں کو سہارا دے رہی تھیں۔ داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ جس کا دھواں ایک پتلی لکیر میں خم کھاتا چھت کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں پہونچ کر ہوا میں مل کر اپنے وجود ظاہری سے بے نیاز ہو جاتا یا کبھی کوئی ہوا کا جھونکا اسے خالد کے بالوں کے پاس ہی منتشر کر دیتا۔

خالد اس قدر خاموش تھا۔ اس کی فرش پر جمی ہوئی نگاہوں میں ایسی بے خبری تھی کہ معلوم ہوتا اس کا دماغ ماؤف ہو گیا ایک بڑے انقلاب کے بعد طبیعت کی ساری حیات دل کے تمام جذبات اور دماغ کے سارے خیالات سے گذر چکنے کے بعد جو سکون و جمود پیدا ہو جاتا ہے وہی اس وقت خالد کی کیفیت تھی۔

اس کا دماغ ایک بے حرف و لکیر صفحہ قرطاس ہو کر رہ گیا تھا جس پر رات کے واقعات کا کوئی نقش باقی نہ تھا جب رات کو وہ لایا گیا تو اس کی آنکھوں سے دیکھنے کی اور دماغ سے سمجھنے کی حس اٹھ گئی تھی۔ یہ رات کی شراب کا اثر تھا۔ زندگی کا ایک غیر معمولی واقعہ جس کی کیفیات سے وہ قطعی ناآشنا تھا جس نے اس کے جسم میں کثافت اور دماغ میں بے حسی پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس کا دل ایک نامعلوم طریقہ سے ایک خاص اثر کے ماتحت کچھ دبا سا جا رہا تھا۔ یہ اس واقعہ کا اثر تھا جس سے اس کی زندگی اپنے دور دوراں میں پہلی مرتبہ دوچار ہوئی ایک عظیم واقعہ جس کا اسے وہم و گمان بھی نہ تھا اور جس نے ایک عجیب و غریب طریقے سے آ کر اس کے سفر زندگی میں ایک نمایاں ستون نصب کر دیا۔

جعفر کی نگاہ میں یہ ایک معمولی سی بات تھی گذشتہ رات اس کی بے شمار راتوں کی طرح ایک رات تھی۔ لیکن خالد کے لئے نئی رات اور ایک غیر معمولی رات تھی۔ وہ نامعلوم اثر جو اس کے دل پر حاوی تھا اسی کا نتیجہ تھا۔

بعض اوقات جب انسان سوکر اٹھتا ہے تو تو اس کے جذبات میں ایک تموج ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس میں سکون و جمود کی کیفیت ہوتی ہے۔ اس میں بے حسی ہوتی ہے۔ لیکن ایک وقفہ کے بعد جب نیند کا اثر زائل ہوتا ہے تو ذہن میں سوچنے کی اہلیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

اسی حالت میں خالد دیر تک بیٹھا رہا۔ سگریٹ کے دھوئیں نے آہستہ آہستہ اس کے دماغ کی صلاحیتوں کو بیدار کرنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ دماغ پر نقوش ابھرنے لگے اور واردات شب کے واقعات اپنی صاف ستھری شکل میں ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں آنے لگے۔

"رات ——— گذشتہ رات ——— اس نے شراب پی ——— شراب۔ شراب"! اس کی پلکیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے نزدیک آ گئیں۔ اس کا دماغ واقعات کی گہرائیوں میں اترنے لگا۔ شراب کے تصور سے اسے جھٹکا سا لگا۔ کتنی پرابہام رات تھی ——— شراب سے یکایک کیسے وہ دوچار ہو گیا...... لیکن" شراب کی کیفیتیں اس کے دل و دماغ تکلیف برچھنے لگیں۔ لیکن کتنی لطافت تھی اس سرور میں، اسکی سرمستی میں کیسی عافیت تھی۔ کیسی بے خودی کیسی بے خودی"! اس کے تصور نے ہلکی سی کروٹ لی "زہرہ" زہرہ کے خیال ہی سے اس کی تمام حیات سمٹ کر ایک مرکز پر آ گئی۔ زہرہ کو اس کے خط و خال۔ اس کے انداز تبسم سے اپنی آنکھوں میں محسوس کرنے لگا۔ اس کا افسردہ چہرہ اس کی نگاہوں میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی گفتگو۔ اس کے قہقہوں کی بازگشت اس کے کانوں میں گونج رہی تھی غرضکہ زہرہ اس کے ذہن میں اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اس کا وجود ایک ناقابل تشریح انس و التفات کے ساتھ۔ ایک درد بن کر اس کے جذبات کی لامتناہی گہرائیوں میں اترا جا رہا تھا۔ اس کے رقت آمیز جذبہ دل نے اس امتیاز کو بھی اٹھا دیا کہ زہرہ ایک طوائف ہے اس کا گھر ایک معصیت کدہ ہے جہاں بے گناہ پلتے۔ بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ اس کے ملاقاتی اور شناسا دنیا بھر کے نکالے ہوئے آوارہ۔ شرابی بے اصول لوگ ہیں جو اپنی ازدواجی زندگی کے عہد و پیمان کو توڑ کے اپنے مرکز محبت و التفات سے بے وفائی کر کے آستانے پر آتے ہیں۔ یہاں وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اور جھوٹ سنتے ہیں گویا کہ ایک بازار ہے جہاں لین دین ہوتی ہے۔ غلط طریقوں سے ناجائز چیزوں کی اور زہرہ اس بازار کی مالک ہے۔ وہ یہ سب بھول گیا

وہ عورت کی طرح عورت کے معنوی رنگ میں اس کے سامنے آئی۔ لمحہ بہ لمحہ زہرہ اس کے تصور میں زیادہ صاف، زیادہ نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی تمام باتیں اسے یاد آ گئیں گذشتہ رات کی گفتگو میں وہ اپنے تمام وجود معنوی کو لئے ہوئے خالد کے سامنے آئی تھی اس نے اس کو ایک ستم زدہ ہستی۔ اس کی زندگی کو ایک راز، ایک معمہ سمجھا۔

اس نے سوچنا شروع کیا۔ اس کی داستان زندگی میں کتنی بیچارگی کتنی بے کسی تھی۔ زمانے کے ظلم و ستم کا ردعمل اس دنیا میں وہ محدود انسانوں پر ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھوں میں سرخے گھر۔ ٹوٹے پھوٹے راستوں پر گلیوں میں پڑے ہوئے فاقہ زدہ انسانوں کا نقشہ پھر گیا۔ وہ بڑی دیر تک زندگی اور دنیا کے اس تاریک پہلو پر غور کرتا رہا اور

ان خیالات نے اسے اور سست کر دیا۔ اگر خالد اس کوچہ کا گھسا ہوا تجربہ کار نوجوان ہوتا تو کچھ بھی ہوتا زہرہ کو ایک طوائف ہی سمجھتا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس کی داستان بے معنی۔ اس کی زندگی اس کی نظر میں طوائف ہی کی زندگی ہوتی اور وہ بذات خود سوسائٹی کی مجرم اس کی ہستی عارضی تعلقات کے بعد بھلا دئے جانے کے قابل ہوتی۔

لیکن نہیں۔ زہرہ اس کی نگاہ میں طوائف نہیں ایک عورت بن کر آئی اس نے خالد کے ان تمام جذبات کو اپنی جانب متوجہ کر لیا جو نوجوان کے دل میں ایک جوان عورت کیلئے پرورش پا سکتے ہیں اس کیلئے زہرہ میں شریک کی وہ تمام شان موجود تھی جس سے انسان اپنے لطیف جذبات کو وابستہ کر سکتا ہے۔ (نشیمن)

"ایک رات" جنوبی ہند میں حیدرآباد میں شاندار افتتاح

حیدرآباد دکن میں ایک رات کا شاندار افتتاح ۴ جولائی کو زمرد محل ٹاکیز میں ہوا۔ ایک رات کی مقبولیت کی ادنیٰ سی مثال یہ ہے۔ کہ دوسرے روز ہی والا شان ہز ہائی نس پرنس آف برار شہزادہ اعظم بہادر اپنے شان کے ساتھ فلم دیکھنے تشریف لائے۔ اور اسے بیحد پسند فرمایا۔ علاوہ ازیں حیدرآباد دکن کے تمام اعلیٰ افسروں نے "ایک رات" کو پہلے ہفتے میں دیکھا کیپٹن ایم مہدی علی آفیسر کمانڈنگ اے آئی سی ہیڈ کوارٹرز سیف آباد لائینز حیدرآباد دکن فرماتے ہیں۔ کہ ایک رات کا افسانہ اور اس کی ڈائرکشن بے مثال ہے پس منظر موسیقی اپنا جواب نہیں رکھتی میجر کنور شیام سنگھ بہادر کا ارشاد ہے۔ کہ ہم نے اتنی صاف اور ستھری زبان کسی

فلم میں نہیں سنی [illegible]

طب جدید

ہم جلد بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں؟

شہرۂ آفاق روسی ڈاکٹر میٹنی کاف کا انکشاف!!!

انگلینڈ میں آجکل اوسط عمر آج سے پچاس سال پیشتر کی اوسط عمر سے سترہ سال زیادہ ہے۔ اوسط میں اس اضافہ کی وجہ یہ بھی ہے کہ بچوں کی پرداخت اب پہلے کی نسبت زیادہ احتیاط سے ہوتی ہے اور بچے اس کثرت سے موت کا شکار نہیں ہوتے جس کثرت سے وہ پہلے ہوا کرتے تھے لیکن مغرب جدید میں درازیٔ عمر کی زیادہ اہم وجہ یہ بھی ہے کہ بڑی عمر کے لوگ شدت کے ساتھ ان ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ جوان کے طبی مشیر انہیں دیتے ہیں۔ اس سے وہ زیادہ عرصہ تک زندہ ہی نہیں رہتے بلکہ بڑھاپے میں جو ضعف اور عقل کی کمی لاحق ہو جاتی ہے وہ اس سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اور پیری میں بھی ان کے قویٰ میں انحطاط واقع نہیں ہوتا۔

ایک شہرۂ آفاق روسی ڈاکٹر میٹنی کاف نے اپنی تمام عمر یہ معلوم کرنے میں صرف کر دی کہ لوگ جوانی میں کیوں بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ طویل تحقیقات کے بعد اس نے اس امر کا انکشاف کیا کہ بڑھاپے کی وجہ مثانوں میں آلائشوں کا پیدا ہو جانا ہے اور یہی آلائشیں قویٰ میں ایک ایسے زہر کا نفوذ کرتی ہیں جس سے ان میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔ اور عمر کوتاہ ہو جاتی ہے اور اس زہر کا ازالہ ایک ایسے تیزاب ہی سے ممکن ہے جو کھٹے دودھ میں ہوتا ہے مثانہ کے زیریں حصہ میں ان آلائشوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے دوران خون میں بھی یہ آلائشیں چلی جاتی ہیں۔ اس سے پٹھوں پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ اور ان میں زندگی کے جراثیم مرنے لگتے ہیں۔ اکثر اوقات تو اس کا نتیجہ نہایت خطرناک ہوتا ہے مثلاً سرطان یا وجع المفاصل کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

مشہور فرانسیسی ماہر طبعیات کارل نے جس کو طب کا نوبل پرائز بھی مل چکا ہے، اس امر کا تجربہ کیا تھا اس نے ایک زندہ انسانی "ٹشو" کو ایک ایسے آلے میں رکھا جس میں ایک خاص تیزابیت ملے ہوئے پانی کی تازہ رو ہر وقت آتی رہتی تھی۔ یہ "ٹشو" اس پانی میں بہت عرصہ تک زندہ رہا۔ اس سے ڈاکٹر موصوف نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر جسم انسانی کے مثانے کے "ٹشو" بھی اسی طرح دھلتے رہیں اور ان سے قرب جوار میں آلائشیں جمع نہ ہوں تو وہ کبھی مردہ نہ ہوں۔ چنانچہ زیادہ عرصہ تک تندرست طور پر زندہ رہنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ مثانہ آلائشوں سے پاک رہے۔

زہر پیدا ہونے اور قویٰ میں پھیلنے کی ایک بڑی وجہ قبض ہے۔ یونانی اطبا نے اس شکایت کو ام الامراض لکھا ہے کیونکہ اس شکایت سے تمام امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں اصلی غذاؤں کی جگہ بہت حد تک مصنوعات لے چکی ہیں۔ اور اقتصادی مشاغل کی افزونی سے جسم میں ایسے عناصر زیادہ ہوتے جاتے ہیں جس سے دوران خون میں دقت واقع ہو اس سے ظاہر ہے کہ غذا کو جسمانی صحت قائم رکھنے میں بہت دخل ہے۔ اور اگر کسی کو زندگی کو طویل بنانا منظور ہو تو اسے چاہیئے کہ غذا کی طرف خاص توجہ منعطف کرے۔

دیہاتی لوگ جو شہریوں کے الفاظ میں دیہاتی غذا پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ شہری لذائذ کا لطف نہیں اٹھاتے اور دودھ اور کچی سبزیوں ہی پر بسر کرتے ہیں۔ اور زیادہ عرصہ تک زندہ رہتے ہیں۔

"بلگیریا" میں جسے یورپ میں دہقانی ریاست کہا جاتا ہے۔ اس وقت ایسے لوگ ایک بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں جن کی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ یورپ کی مصنوعات کو غذا کے طور پر استعمال نہیں کرتے۔ اس ملک کے باشندے سبزی کو بہ نسبت گوشت کے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور ان میں کھٹا ہوا دودھ بکثرت پیا جاتا ہے۔

اس موقع پر قابل غور چیز یہ ہے کہ عمر بڑھانے کیلئے کس قسم کی غذا استعمال کرنی چاہیئے سب سے پہلے غذا ثقیل نہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ قبض پیدا نہ کرے۔ اس میں وٹامن اور معدنی نمک کی کافی مقدار موجود ہو، سبز ترکاریاں پھل وغیرہ، زیادہ مقدار میں استعمال

کرنا چاہیئے اور جہاں تک ممکن ہو ان کو آگ پر نہ پکانا چاہیئے۔ اس سے ان غذاؤں کے وٹامن ضائع ہو جاتے ہیں۔ ان قدرتی غذاؤں میں آیوڈین کی بھی ایک مقدار موجود ہوتی ہے۔ آیوڈین سے وہ عناصر جو قویٰ کے انحطاط کا موجب ہوتے ہیں جسم انسانی سے خارج ہوتے ہیں۔ حال ہی میں ایک ڈاکٹر نے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ قبل ازیں بوڑھا ہو جانے کی وجہ سے جسم میں سے آیوڈین کے اجزا کا اخراج ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ اگر کسی کو یہ شکایت لاحق ہو تو اس کے جسم میں آیوڈین کی مناسب مقدار بذریعہ انجکشن داخل کر دی جائے۔

ہندوستانی سنیاسیوں کے جگر پارے

لاکھ لاکھ کی قیمت کا ایک ایک نسخہ!

اکسیر جریان۔ سوا تولے اسپغول مسلم کی پوٹلی بنا کر سوا سیر پانی میں ہلکی آگ پر چار گھنٹے تک پکائیں۔ جب پانی تین چھٹانک رہ جائے تو چھان کر سوا تولہ روغن زرد میں بھگاریں اور شربت انار ۴ تولے ملا کر پئیں۔ اسی طرح روزانہ اکیس یوم استعمال کریں۔

فوائد:۔ اکیس دن کے استعمال سے جریان کی شکایت دور ہو جاتی ہے اور احتلام بند ہو جاتا ہے۔

اکسیر وجع مفاصل۔ سیاہ مرچ کے ۲۵ دانے لے کر باریک کر لیں۔ اور صبح ہی صبح تین چار گھونٹ پانی کے ساتھ پھانک لیں۔

فوائد:۔ بیس پچیس دن کے استعمال سے سخت سے سخت گنٹھیا کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔

اکسیر ذیابیطس۔ سفوف تخم جامن اور ملک شوگر ہموزن ملا کر رکھ چھوڑیں اور چھ ماشہ یہ سفوف تازہ پانی کے ساتھ چند روز استعمال کریں۔

فوائد:۔ ذیابیطس شکری کیلئے یہ سفوف بہت مفید ہے۔

حب ممسک۔ شنگرف۔ موچرس۔ افیم آٹھ آٹھ ماشے، سہاگہ ۲ ماشے۔ سب دواؤں کو کھرل کر کے کالی مرچ برابر گولیاں بنا لیں۔ اور وقت خاص سے ایک گھنٹہ پہلے ایک گولی دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔ بارہا کی آزمودہ ہے۔

دوائے مسان۔ خاکسی ایک چھٹانک کو تین پاؤ بکری کے دودھ میں جوش دیں۔ جب تین ابال آ جائیں تو باریک کپڑے میں خاکسی کو چھان کر پلیٹ میں رکھ کر سایے میں رکھ دیں۔ اور دودھ پھینک دیں۔ اسی طرح تین روز تین پاؤ دودھ میں اسی خاکسی کو جوش دینا چاہیئے چوتھے خاکسی کو پلیٹ میں رکھ کر سایے میں رکھ کر خشک کر لیں۔ اور ایک ماشہ کی مقدار میں یہ خاکسی ماں اپنے دودھ میں گھس کر بچے کو پلائے۔

فوائد:۔ مسان کیلئے یہ دوا عجیب غریب ہے۔ میری کئی بار کی آزمائی ہوئی ہے۔ رنگین دستوں کو روکتی ہے چالیس دن کے استعمال سے بچہ موٹا تازہ ہو جاتا ہے۔ ماں بچے کو یہ دوا پلا کر اپنا دودھ پلا دیا کرے۔

حب بواسیر۔ نمک لاہوری ایک تولہ کو ۲۷ دن تک روزانہ بکری کے ایک ایک پتے میں کھرل کیا جائے۔ پھر جب وہ گولیاں بنانے کے قابل ہو جائے تو ماش برابر گولیاں بنا لیں۔ اور ایک گولی روزانہ رات کو عرق بادیاں کے ساتھ استعمال کریں۔

فوائد:۔ ۷ دن مسلسل استعمال کرنے ہر قسم کی بواسیر ان گولیوں سے دور ہو جاتی ہے۔

سچا واقعہ فرضی قصہ کہانی سے کہیں زیادہ دلچسپ اور جاذب توجہ ہوتا ہے

جب میری جوانی تھی

ایک حسن فروش عورت کی عبرت آموز داستان

از حضرت ماہر القادری

اردو میں اپنی قسم کی پہلی آپ بیتی جو آپکی راتوں کی نیند حرام کر دے گی

اُس کے اپنے قلم سے، اتنی دلچسپ، اتنی سنسنی خیز، اور ہنگامہ پرور کہ ایکبار پڑھنے سے آپ کی طبیعت سیر نہ ہوگی بلکہ بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔ (اقساطِ سابقہ کا خلاصہ) شانتا لکھتی ہے میرے والد مسلمان بیرسٹر تھے اور والدہ ایک کشمیری برہمن کی لڑکی۔ دونوں کی شادی سول میرج سے ہوئی تھی۔ چونکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی اسلئے میری پرورش نہایت لاڈ پیار سے ہوئی اور میری تعلیم و تربیت پر کافی روپیہ خرچ کیا گیا۔ مقامی میونسپلٹی کے چیرمین کی والد مرحوم سے بڑی بے تکلفی تھی۔ میں ان دنوں کالج میں پڑھتی تھی۔ اور ان کا جوان لڑکا پربھو دیال متعلم کلکتہ کالج موسم گرما کی رخصتوں پر گھر آیا ہوا تھا۔ وہ ہمارے یہاں آنے جانے لگا۔ پربھو بیس اکیس سال کا خوبصورت جوان تھا۔ ایک دن کارلٹن ہوٹل میں پربھو نے مجھے مدعو کیا۔ وہیں کانتا اور لاجونتی سے میری ملاقات ہوئی۔ پربھو اور کانتا چند منٹ کیلئے اُٹھ کر باہر گئے تو قریب ہی بیٹھے ہوئے دو آدمیوں کی باتیں میرے کان میں پڑیں "ان لڑکیوں کو دیکھو ان کے چہروں پر کتنی معصومیت اور شرافت برس رہی ہے جیسے دُنیا کی ہوا نہیں چھو تک نہیں گئی مگر ان کے کرتوت یہ ہیں کہ اپنے آشناؤں کے ساتھ شہر کے بدنام ترین ہوٹل میں موجود ہیں۔" اس دن کے بعد مجھے سوسائٹی سے ایک دم نفرت ہوگئی...... میرے والدین کو میری شادی کی فکر ہوئی۔ اتفاق کی بات سول ہسپتال میں جو نئے سول سرجن تبدیل ہو کر آئے۔ ان کا بڑا لڑکا پرشوتم والد صاحب کی نظر میں جچ گیا۔ اُدھر والد صاحب کی سول سرجن سے دوستی ہوئی اور اِدھر پرشوتم ہمارے یہاں روزانہ آنے لگا۔ ایک دن میں اور پرشوتم موٹر پر سوار ہو کر سیر کو روانہ ہوئے تو شہر سے بیس میل کے فاصلہ پر موٹر کا ایک ٹائر پھٹ گیا۔ وہ رات ہم نے گاؤں والے کتنے خلیق، ملنسار، اور مہمان نواز ہوتے ہیں یہ بات زندگی میں مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوئی۔ دن کے ۱۱ بج چکے تھے۔ میں اور پرشوتم باسی روٹیاں چھاچھ کے ساتھ کھا کر چوپال کے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں میرے والد اور پرشوتم کے بڑے بھائی آگئے۔ (گذشتہ اشاعت سے آگے)

ساتواں باب

— کہو رات کیسی گزری؟ — والد نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن شرم و حیا کے ایک مخفی مگر نہایت طاقتور جذبہ نے میری گویائی کا دامن تھام لیا مجھے خاموش دیکھ کر پرشوتم بولا۔

— گاؤں والوں کی مسافر نوازی اور خاص طور پر مکھیا جی کی مہربانی سے ہمیں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی، یہ رات تو ہمیں ساری عمر یاد رہے گی۔ اتنا لطف تو آج تک کسی پک نک (Picnic) میں بھی نہیں آیا۔

میرے والد اور پرشوتم کے بھائی اپنے ساتھ پھل، مٹھائی اور پوریاں لائے تھے۔ ہم نے کہا کہ ہم تو ابھی ابھی ناشتہ کر چکے ہیں اسلئے وہ تمام چیزیں گاؤں کے بچوں میں بانٹ دی گئیں۔ میرے والد نے مکھیا کے چھوٹے لڑکے کو دس روپے دئے اور مکھیا سے اصرار کے ساتھ کہا کہ جب کبھی آنا ہو ہمارے یہاں ٹھہرنا۔ جس شخص نے رات میں ہماری رہبری کی تھی۔ اس کو بھی کچھ روپے دئے گئے۔ ہم گاؤں والوں کی محبت، تواضع اور مسافر نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چوپال سے روانہ ہوئے۔ گاؤں والوں کے ایک جم غفیر نے موٹر تک ہماری مشایعت کی۔ جس موٹر کا

ٹائر پھٹ گیا تھا، اُس کی درستی کے لئے
ایک ڈرائیور، ایک کلینر اور نیا ٹائر چھوڑ
دیا گیا، اور ہم سب دوسری موٹر میں سوار ہو کر
شہر چلے آئے، شہر میں آکر ایسا محسوس ہوا جیسے
کہ جنگ ہو رہی ہے اور لوگ ایک دوسرے
سے دست و گریبان ہیں۔ گاؤں کا سکون بیل
مفقود تھا یہاں پر ہر جگہ تجارت اور نمائش
( ) کی گرم بازاری
تھی، ہر شہری کا چہرہ ایک خاص غرض کا آئینہ دار تھا
موٹر سب سے پہلے پرشوتم کے جھگڑے پر پہنچی
پرشوتم کی بہن سرسوتی ٹارون (Horn)
کی آواز سن کر باہر آئی، اور موٹر کا دروازہ
کھولتے ہوئے بولی۔
شانتا! دوپہر کا کھانا ہمارے یہاں ہوگا۔
میں تمہارا انتظار ہی کر رہی تھی۔
میں نے بہت کچھ سوچ کیا کہ مجھے بھوک
نہیں ہے میں بہت تھکی ہاری ہوئی ہوں۔
گھر جاکر آرام کروں گی۔ مجھے اس وقت
تو معاف کر دیجئے، مگر سرسوتی کے اصرار نے
ستیا گرہ کی صورت اختیار کر لی، اور مجھے
وہاں بادلِ ناخواستہ رک جانا پڑا۔
سرسوتی کے یہاں میں نے موٹر سے
اترتے وقت والد سے کہہ دیا تھا کہ میرے کپڑے
یہاں بھیج دیے جائیں، ذرا سی دیر میں نوکر
کپڑے لے کر آگیا اور میں نہانے کے لئے غسل خانہ
میں چلی گئی میں بہت دیر تک نہاتی رہی بلکہ
پانی سے کھیلتی رہی۔ نوجوانی کے زمانہ میں
میرا محبوب ترین شغل نہانا تھا۔ اور میں بدن
پر پانی بہانے میں ایک خاص لطف محسوس
کرتی تھی۔ فوارے کی مہین مہین پھواریں
جب پوری قوت کے ساتھ جسم پر پڑتی
تھیں۔ تو مجھے بڑا کیف آتا تھا سرسوتی نے
جب دیکھا کہ میں غسل خانہ سے نکلنے کا نام
ہی نہیں لیتی تو اُس نے غسل خانہ کے
دروازے پر دستک دے کر کہا۔
کیا آج شام تک نہاتی ہی رہو گی، تمہارا
نہانا تو ختیا مت کا نہانا ہے۔
میں تھوڑی دیر میں نہا دھو کر باہر آگئی۔
کیا گاؤں میں رات بسر کرنے کے بعد اتنی
دیر تک غسل کرنا ضروری ہے سرسوتی
نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے تو سدا کی ہی
عادت ہے، دیر تک نہانا مجھے بہت پسند
ہے۔ میں نے نمناک بالوں کو چھوتے ہوئے
جواب دیا۔ میرے بھیا پرشوتم کو بھی
نہانے کا بہت شوق ہے، گرمی کے موسم میں
تو وہ چار چار دفعہ نہاتے ہیں!
میں سرسوتی کے کمرے میں بیٹھی ہوئی بال
سنوارنے لگی اور سرسوتی کھانے کے کمرے
میں چلی گئی۔ بال سنوارنے کے بعد میں میز
کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ میز پر انگریزی ناول
رکھا ہوا تھا، میں نے ناول کو کہیں کہیں
سے پڑھنا شروع کیا میرا دل مطالعہ کیلئے
بالکل تیار نہ تھا سرسوتی کے انتظار میں
وقت کاٹنے کے لئے میں نے ناول کے
ورق الٹنے شروع کئے۔ ناول اچھا خاصا
ضخیم تھا میں نے یک بارگی ناول کے تمام
اوراق کو ایک ساتھ الٹ دیا، اور آخری
صفحہ پر پبلشر کا نام اور کتابوں کی فہرست
پڑھنے لگی، اس ناول کی پبلشر تھیکر کمپنی تھی۔
دنیا کے تمام ناولوں کے شائع کرنے
کا ٹھیکہ لے لیا ہے اس کمپنی نے!
میں نے کتاب کو الٹتے پلٹتے ہوئے آپ ہی
آپ اس فقرے کو زور سے کہا ہی تھا، کہ
ناول کے اوراق سے ایک تصویر نکل کر
میز پر گر پڑی، میں نے تصویر میز سے اٹھالی
یہ ایک نوجوان کی تصویر تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا
"پیاری سرسوتی کیلئے" ۔ سرشش۔
میں تصویر کو دیکھ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے
سرسوتی کمرے میں آگئی، تصویر میرے ہاتھ
میں تھی، اور ناول کھلا ہوا تھا۔
تو آپ تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسروں
کی پوشیدہ چیزیں دیکھا کرتی ہیں۔ سرسوتی نے
ہنستے ہوئے کہا تصویر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر
میز پر گر گئی اور میں پریشان ہو کر بولی۔
سرسوتی قسم لے لو جو میں نے تمہارے کمرے
کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا ہو۔ میں تو تمہارے
انتظار میں وقت گزارنے کے لئے میز پر
رکھے ہوئے ناول کی ورق گردانی کر رہی تھی
ورق الٹنے میں یہ تصویر آپ ہی آپ کتاب
سے نکل کر میز پر گر گئی، ہاں اتنی میری غلطی
ہے کہ میں نے اس تصویر کو کیوں دیکھا؟ مگر
میری جگہ تم بھی ہوتیں تو یہی کرتیں، یعنی کتاب
سے گری ہوئی چیز کو اٹھا کر ایک نظر ضرور دیکھتیں۔
سرسوتی نے اس پر قہقہہ لگایا، اور تصویر کو
ہاتھ میں لیتے ہوئے کہنے لگی۔
شانتا میں تو مذاق کر رہی تھی، تم اتنا گھبرا کیوں
رہی ہو۔ اور میں تو اپنی کسی بات کو راز
رکھنا نہیں چاہتی، میں جو کچھ کرتی ہوں ڈنکے
کی چوٹ کرتی ہوں، یہ چھپ کر راز کی باتیں
کرنا مجھے نہیں آتا آدمی میں اتنی جرات ہونی
چاہیئے کہ وہ بغیر کسی جھجک کے اپنی کمزوری
کا اعتراف کرنے میں پس و پیش سے کام نہ
لے اور جو بات پس پردہ ہو، وہ منظر عام پر لائے
یہ تصویر میرے انتہائی گہرے دوست سرشش
کی ہے، سرشش مجھے دنیا میں سب سے
زیادہ پیارا ہے، دوپہر کے کھانے پر میں
نے اسے بلایا ہے۔ تم اس سے مل کر بہت
خوش ہوگی۔ ساڑھے ایک بج گیا گھڑی کی
طرف دیکھتے ہوئے سرشش ابھی تک

نہیں آیا، سرتش کی یہ ہمیشہ کی عادت ہے، ہمیں کھانا شروع کر دینا چاہیئے!

اس پر میں نے کہا:۔

ایسی جلدی کیا ہے، مسٹر سرتش کو آجانے دیجئے مردوں کو بیسیوں کام لگے رہتے ہیں، انہوں نے قصداً دیر نہیں کی ہوگی کسی ضرورت سے رک گئے ہوں گے۔ اور ــ!

میرا جملہ پورا ابھی نہ ہوا تھا کہ ایک گورا چٹا نوجوان خاکی سوٹ پہنے ہوئے کمرے میں دندناتا ہوا آگیا

بڑی عمر ہے تمہاری! ابھی ابھی ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔ سرسوتی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ آپ کی یاد فرمائی کا شکریہ اور اس الماری کے برابر والی کا شکریہ ـــ سرتش نے جواب دیا ـــ یہ میری سہیلی شانتا ہیں، جن کا میں تم سے کئی بار ذکر کر چکی ہوں سرسوتی بولی ـ اور آپ کی تعریف ــــــ میں نے دریافت کیا۔

یہ مسٹر سرتش ہیں، ہمارے صوبہ کے بہترین کرکٹ کھلاڑی ہیں، بڑے ہی با خلاق خوش مزاج اور ملنسار ہیں، کوئی آدمی ان سے مل کر بد دل اور کبیدہ خاطر نہیں ہو سکتا،

سرسوتی نے جواب میں کہا۔ انسان کی فطرت ہے کہ اپنی تعریف و ستائش سے اس کی خوشی ہوتی ہے مگر اس خوشی میں قدرے شرم کا جذبہ بھی شامل ہوتا ہے ـ شرم و مسرت اور جھینپ اور شگفتگی کے متضاد جذبات جب کسی انسان کے چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں تو وہ منظر نہایت عجیب اور بعض وقت بہت دلکش ہو جاتا ہے، سرتش اپنی دوست سرسوتی کی زبانی تعریف سن کر قدرے شرما سا گیا۔ اور شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا:۔

اوہو! سرسوتی تم نے تو میری تعریفیں کے پل توڑ دیئے، بھئی! تم کو تو اسمبلی کا ممبر ہونا چاہیئے تھا۔ وہاں زبان کے جوہر دکھانے کا اچھا موقعہ مل جاتا۔

سرتش کی بات پر ہم دونوں نے قہقہہ لگایا اور قہقہہ ابھی کمرے میں گونج ہی رہا تھا کہ کھانے کی گھنٹی بجی اور ہم سب ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔ کھانے کی میز کی ایک طرف سرسوتی اور سرتش اور سمت مقابل میں پرشوتم اور میں بیٹھے کھانا کھاتے میں بڑی پرلطف باتیں ہوتی رہیں، سرتش اور سرسوتی ایک دوسرے سے بہت زیادہ بے تکلف تھے اور مجھے حیرت تو اس پر تھی کہ پرشوتم کی موجودگی بھی ان دونوں کی بے تکلفی کو محدود نہ کر سکی، باتوں باتوں میں میرے اور پرشوتم کے گاؤں میں رہنے کا ذکر چھڑ گیا میں اس تذکرے کو طول دینا مناسب نہیں سمجھتی تھی، مگر سرسوتی اور سرتش بات میں بات نکال کر افسانہ کی کڑیاں ملا رہے تھے، ان کو تو ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ اور تفریح کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہاتھ آگیا تھا۔

تو آپ دونوں نے رات خوب مزے کیساتھ گزاری سرتش کانٹے سے آلو اٹھاتے ہوئے بولا۔

ـ جی ہاں! گاؤں میں ایک رات بہت اچھی کٹ گئی ـــ پرشوتم نے جواب دیا۔

ـ یہ رات تو (Opening Ceremony)[1] تھی اب تو ہمیں اس رات کا انتظار ہے، جس رات کے تصور سے شانتا ـــ سرسوتی نے ہنستے ہوئے کہا ـــ شانتا دیوی کیوں خاموش ہیں، کیا یہ بات تو نہیں ــ

رات کا خواب الٹی تو بہا! آپ سنئے گا تو شرمائیگا پڑھی لکھی لڑکیاں شرمایا نہیں کرتیں، اور اور پھر یہ تو بے تکلف دوستوں کی محفل ہے یہاں تو شرم کو بالائے طاق رکھ دینا چاہئیے۔ سرتش نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ـ ان لوگوں کی باتیں مجھے انتہائی ناگوار معلوم ہو رہی تھیں

میرا دل یہ دیکھ کر کڑھ رہا تھا کہ بہن حقیقی بھائی کے سامنے بیٹھی ہوئی نوجوان مرد سے گھل مل کر باتیں کر رہی ہے ـ مانا کہ میری پرہیزگارانہ زندگی کا دور ختم ہو چکا تھا اور میں پھر سوسائٹی کے معصیت کدے میں دھکیل دی گئی تھی لیکن غیرت و حیا کا احساس کسی نہ کسی حد تک ابھی باقی تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم بہت دیر تک ہال میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے میں نے گھر جانے کے لئے سرسوتی سے کئی بار اجازت چاہی۔ مگر اس نے کہا کہ ایسی جلدی ہی کیا ہے، شام کی چائے پی کر چلی جانا۔ چار بجے تک ہم چاروں وہیں بیٹھے رہے میرا دل بڑا انقباض محسوس کر رہا تھا، لیکن سرسوتی کا اصرار بے جا مجھے روکے ہوا تھا اور میں اس بزم میں نہایت بیدلی کیساتھ شرکت کر رہی تھی۔

میں نے اس صحبت میں اندازہ لگایا کہ سرسوتی اور سرتش ایک دوسرے سے بہت زیادہ بے تکلف ہیں، اور ان کی بے تکلفی عام حدود سے بہت آگے گذر چکی ہے، میں نے سوچنا شروع کیا کہ اتنا کچھ تو جلوت میں ہو رہا ہے خلوت میں نہ جانے کیا کیا ہوتا ہوگا، سرتش بلا کی سگرٹ پیتا تھا۔ ادھر سگرٹ ختم ہوئی اور جھوٹ سے دوسری سگرٹ سلگا لی گئی اس تین ساڑھے تین گھنٹے کی مدت میں اس نے سگرٹ کا آدھ سے زیادہ ڈبہ خالی کر دیا۔ باتوں باتوں میں سگرٹ کے ذائقہ اور اس کی افادیت کا ذکر نکل آیا۔ سرتش نے کہا کہ سگرٹ پینا صحت کے لئے مفید ہے، انسان کے پھیپھڑوں میں جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ سگرٹ پینے سے وہ جراثیم مر جاتے ہیں۔ سرتش نے اس کے ثبوت میں امریکہ کے کسی بہت بڑے ڈاکٹر کا نام لے کر کہا کہ اس نے سگرٹ کے فوائد پر ایک بہت بڑی کتاب لکھی ہے

[1] افتتاحی تقریب

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۵۸۵

جلد ۲۸
نمبر (۲)

ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند — بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہاست — خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

رسالہ مست قلندر لاہور

جرم و سراغ نمبر

نومبر ۱۹۴۲ء

اردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیر الاشاعت ماہوار رسالہ

اُن زندہ دل انسانوں کیلئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کیا ہے ہمیشہ خوش اور دوسروں کو خوش کرنے میں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے قول یا فعل سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے، جن کا مذہب ہے خدا کے ہر ایک بندے سے بلا امتیاز رنگ و قومیت محبت کرنا ۔

قیمت فی پرچہ بارہ ۱۲ آنے

سالانہ چندہ صرف چھ ۶ روپے

ایڈیٹر: ڈاکٹر پرتھی سنگھ

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ڈاکٹر پرتھی سنگھ پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر رسالہ مست قلندر روشنی گوالمنڈی لاہور سے شائع کیا۔

فہرست مضامین
مست قلندر
جرم وسراغ نمبر
نومبر ۱۹۴۲ء

طبی جواہر پارے — ہنگامہ خیز نظمیں

بے بدل رنگین افسانے — دلگداز آپ بیتیاں

نگاہِ اوّلیں

لیجئے "مست قلندر" کا "جرم و سراغ نمبر" حسبِ وعدہ آپکی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے۔ آپ اس نمبر کو کن نظروں سے دیکھیں گے؟ اس کے متعلق ہم ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تاہم اس امر کا اظہار کرنے سے بھی باز نہیں رہ سکتے کہ جن حضرات کو "جرم و سراغ" کے حیرت انگیز و حیرت زا واقعات سے دلچسپی ہے وہ یقینی طور پر اس عجیب و غریب نمبر کو بیحد پسند فرمائینگے "مست قلندر" کا خاص نمبر اردو کے رسائل و جرائد کی دُنیا میں اپنی نوعیت کا پہلا نمبر ہے۔ اس سے پیشتر اردو کے کسی رسالے یا اخبار کا جرائم و اسرار سے متعلق کوئی خاص نمبر اشاعت پذیر نہیں ہُوا۔ ہمارا ہر خاص نمبر ایک خاص جدّت کا علمبردار ہوتا ہے اور یہ نمبر بھی اپنے اندر ایک خاص ندرت لئے ہوئے ہے ہم نے انتہائی کوشش کی ہے کہ اس نمبر میں "جرم و سراغ" کے ہر پہلو اور اس سے وابستہ ہر موضوع کے متعلق کوئی نہ کوئی افسانہ شائع کریں چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس کے اندر ہر وہ افسانہ شامل ہے جو کسی نہ کسی طرح نفسِ موضوع سے متعلق ہو سکتا ہے۔ انسانی فطرت واضح اور سادہ ہونے کے باوجود بیحد پیچیدہ ہے۔ جس طرح سمندر کی سطح ساکن اور خاموش ہوتی ہے مگر اس کی تہ میں قیامت خیز طوفان چھپے ہوتے ہیں اسی طرح انسانی فطرت کی گہرائیوں میں ہزاروں اس قسم کے خیالات بیقرار رہتے ہیں جنہیں کوئی انسان ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ ہیں نفس تحت الشعور (Sub-Conscious mind) کی کرشمہ [illegible] کی کرشمہ سازیوں کی بنا پر جرائم کی تخلیق ہونے کا آ [illegible]

[illegible]

[illegible] سب مطالعہ ہیں نفسِ انسانی کے۔ ایک بیٹا اپنے باپ کو قتل کر [illegible] ذلیل تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتا لیکن بعض اوقات اس تصور کو عملی جامہ بھی پہنا دیا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب اوپر کی سطروں میں دیا جا چکا ہے۔ انسانی فطرت بیحد پُراسرار اور بیحد پیچیدہ ہے۔ دنیا میں ہر واقعہ کا امکان ہو سکتا ہے اور انسان خوفناک سے خوفناک حرکت کا ارتکاب کر دیتا ہے۔

آپ مست قلندر کے "جرم و سراغ نمبر" میں ایک اور چیز بھی دیکھیں گے اور وہ ہے تنوع۔ ہم نے جرم و سراغ سے متعلق مختلف قسم کے افسانے شائع کئے ہیں۔ ہر افسانے کے واقعات دوسرے افسانے کے واقعات سے جُداگانہ نوعیت رکھتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہم نے اس امر کا التزام بھی کیا ہے کہ "مست قلندر" میں صرف وہی افسانے شائع کئے جائیں جو قارئین کرام کو متاثر کر سکیں۔ معمولی قسم کے افسانوں کی اشاعت سے سخت پرہیز کیا گیا ہے امید ہے آپ ہماری اس کوشش کو پسند فرمائیں گے۔

ہم یہاں علیحدہ علیحدہ ہر افسانے پر اظہارِ رائے مناسب نہیں سمجھتے۔ قارئین خود ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے متعلق اپنی رائے قائم کر لیں گے۔ اور کسی افسانے کے متعلق حقیقی رائے وہی ہوتی ہے جس کا اظہار قارئین کی طرف سے کیا جائے — اور ہم اس اصول کی شروع ہی سے پابندی کر رہے ہیں۔

قارئین کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ ہم نے جرم و سراغ نمبر کے تین افسانہ نگاروں کو بتدریج تین انعامات دینے کا اعلان کیا تھا۔ انعام پندرہ روپے، دس روپے، اور پانچ روپے ہے۔ کیا "مست قلندر" کے پڑھنے والے اس سلسلے میں ہماری مدد کرینگے؟ یہ فیصلہ قارئین کی آراء کی روشنی میں کیا جائیگا۔ قارئین جس افسانے کو سب سے زیادہ پسند فرمائینگے۔ اس کے مصنف کو اوّل انعام دیا جائیگا علیٰ ہذا القیاس۔

ایڈیٹر

مستی و قلندری

مست قلندر کے مشہور مزاح نگار
"مرزا حاجی بغلول" کے قلم سے

مرد بدنام ہیں کہ وہ عورتوں کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں اور پرانی جوتی کی طرح جب جی چاہا بیوی بدل ڈالتے ہیں لیکن ان صاحبات خواتین کے متعلق کیا فرمایا جائیگا جو سال کے اندر اندر شوہر بدل ڈالتی ہیں اور جن کا سلسلۂ تبدیل ازدواج اٹھارہ شوہروں کے پہلو گرمانے اور آباد کرنے کے بعد بھی جاری ہے؟

آپ اسے مدیر مستی و قلندری کی محض تخئیلی مستی و قلندری نہ سمجھئے۔ آپ سے جو کچھ عرض کیا جارہا ہے، دروغ برگردن راوی ایک اخبار کے مندرجات کی بنا پر عرض کیا جارہا ہے۔

یہ منچلی عورت بوڈاپیسٹ کی رہنے والی ہے۔ اس کی عمر ۴۲ سال کی ہے۔ اس وقت اس کے پاس اس کا اٹھارہواں شوہر ہے۔ اس نے پہلی شادی سولہ سال کی عمر میں کی تھی۔ پہلے تو ابدال شوہر کی رفتار قدرے متعین بھی تھی مگر اب تو یہ ٹھیک جوتے کی طرح آٹھویں نویں مہینے مرد بدل دیا کرتی ہے۔

ایک رنگین طبع عورت کی داستان آپ سن چکے ایک اور مست قلندر عورت کا تذکرہ سُنئے، پہلی عورت نے اگر اپنی زندگی میں اٹھارہ شادیاں کیں تو یہ دوسری عورت بھی اٹھارہ شادیاں کرچکی ہے۔ لیکن اٹھارہ مردوں سے نہیں بلکہ یہ دو ہی مردوں کے درمیان چکر لگارہی ہے

اس اجمال کی ضروری تفصیل یہ ہے کہ اس نے ۱۹۰۳ء میں پہلی بار ایک مرد سے گنٹھ بندھن کیا۔ دو برس تک وہ اس کے پاس رہی اس کے بعد اس سے طلاق لے کر اس نے ایک اور مرد سے رشتۂ ازدواج استوار کیا، تیسرے سال اس کو دھتا بتا کر پھر پہلے شوہر کے پاس چلی گئی۔ اس وقت سے وہ باری باری دونوں کا گھر بسا اور اُجاڑ رہی ہے۔ اور اس طرح سے وہ نو نو مرتبہ دونوں کی بیوی بن چکی ہے۔

اس عورت کی تعریف کرنے کے لیے تو عورتوں کو مخصوص رہنے دیجئے آپ ان دونوں مردوں کے ظرف کی داد دیجئے جو اس عورت کے بار بار ٹھینگا دکھانے پر بھی اس کیلئے ہمیشہ اپنی آغوش محبت کھولے رکھتے ہیں۔

خانہ داری کے سلسلہ میں آپ نے عورتوں کی کارگذاریوں کے بیشمار واقعات سُنے ہونگے لیکن کسی کا دماغ اتنا رسا نہ ہوگا جتنا پیرس کی ایک عورت کا تھا جس کا واقعہ میں آپکو سنانا چاہتا ہوں۔

پیرس میں ایک صاحب کی آمدنی تو تھی واجبی ہی واجبی مگر ان سے گوشت کے بغیر حلق سے نوالہ نہ اُتارا جاتا تھا بیوی تھی منتظم، اس کے حسن انتظام کے طفیل میاں کے چٹخارے کا سامان بہم پہونچ جایا کرتا تھا لیکن کیسے؟

اس کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے شوہر صاحب نے بیوی کے خلاف عدالت میں طلاق کی درخواست دی اور وجہ یہ بیان کی کہ یہ مجھ کو نہ جانے کب سے بلی کا گوشت کھلا رہی تھی جس کا پتہ مجھے کل چلا جبکہ میں کام سے سر شام ہی گھر آگیا تو دیکھا وہ بلی ذبح کر رہی ہے۔

جواب میں بیوی نے کہا کہ حضرت اپنی آمدنی کو تو نہ دیکھتے تھے لیکن گوشت روزانہ کھانا چاہتے تھے۔ آخر میں ان کیلئے گوشت کہاں سے فراہم کیا کرتی۔ میرے محلے میں بلیوں کی کثرت تھی انہی سے انکی زبان کی مدارات کردیا کرتی تھی۔

ایسے ناشکرے شوہر بھی ہوتے ہیں جو ایسی بیوی سے شکرگذار ہونے کی بجائے اسے طلاق دیتے ہیں۔

بڑے لوگوں میں سالگرہ کا عام رواج پایا جاتا ہے۔ اور اس تقریب میں مسرت و شادمانی کا طرح طرح سے اظہار کیا جاتا ہے۔ بادشاہ لوگ بڑی بڑی قربانیوں اور کارگذاریوں کے صلے میں خطابات و اعزازات عطا فرماتے ہیں۔ ہمارے ملک کے خدام بارگاہ بھی تین تین حرفوں کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کرکے اس یوم سعید کی برکات کا انتظار کھینچتے رہتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۷ پر ملاحظہ ہو)

مست قلندر لاہور
جرم و سراغ نمبر
جلد ۲۲
نمبر

پی!

خاص لئے مست قلندر　از جناب اندرجیت شرما

نہ لندن کی شراب ارغواں پی
بہت خالی کئے مٹی کے پیالے
یہ کیا پینا ہے میخانے میں پینا
مٹا دے مذہب و ملت کے جھگڑے
نہ کر تفریق کچھ دیر و حرم کی
نشہ کا دیکھنا ہے لطف اگر کچھ
صراحی اور پیمانہ میں کیا ہے
برانڈی اور وہسکی دونوں بیکار
اڑاتا پھرتا ہے کس دشت میں گرد

ارے ہندی مئے ہندوستاں پی
لے اب اک بار جام آسماں پی
جہاں پینا نہ ہو کوئی وہاں پی
خوشی سے بادۂ امن و اماں پی
وہاں پی شوق سے چاہے یہاں پی
شفق کے رنگ کی اے مہرباں پی
لگا کے منہ سے مٹکے ہی کو ہاں پی
ارے آب حیات جاوداں پی
چمن میں آ گلوں کے درمیاں پی

ہمیشہ پی ہے بیہوشی کی دارو
ابھی تک ہوش کی تو نے کہاں پی

ایک بھیانک رومان

ہیبتناک رومانی افسانہ

میرزا ادیب بی اے آنرز

میں جب کبھی پہاڑوں کے درمیان کسی دُور تک جاتے ہوئے، سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے راستے کا تصور کرتا ہوں۔ میری نظروں کے سامنے ایک تڑپتی ہوئی خون آلود نعش پھرنے لگتی ہے۔

خدا جانے میرا ذہن اس درد انگیز منظر کو کب فراموش کر سکے گا۔ کبھی کر سکے گا بھی یا نہیں۔

اگر میرے بس میں ہو تو اپنے دماغ سے ماضی کے تمام واقعات کو کھرچ کھرچ کر نکال دوں مگر ـــــ میں جانتا ہوں۔ مجھے یقین ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا!

آج سے سات سال پیشتر کا ذکر ہے میں اکثر شام اور صبح کے دھندلکے میں شہر کے باہر ایک پہاڑی راہ سے گذرا کرتا تھا اور جب بھی اس راہ سے گذرتا تھا میرے دل پر ایک عجیب ناقابل بیان کیفیت چھا جاتی تھی۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے ایک تاریک غار میں اترتا چلا جا رہا ہوں اور جیسے جیسے میرے قدم آگے بڑھتے جا رہے ہیں، فضا زیادہ تاریک زیادہ خوفناک ہوتی جا رہی ہے، اور کبھی یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ میں یکدم دھندلکے کی دنیا سے نکل کر آسمان کی دور دور تک پھیلی ہوئی لامحدود نیلگوں وسعتوں میں پرواز کر رہا ہوں۔

لوگ اس راہ کو منحوس سمجھتے تھے۔ ان کی رائے میں متعدد منحوس واقعات اس تنگ گذرراستے سے وابستہ تھے اور میں سن چکا تھا کہ کئی بار یہاں کشت و خون کے لرزہ خیز واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ کئی بار یہاں خون میں لتھڑی ہوئی انسانی لاشیں پائی گئی ہیں۔ تاہم نہ معلوم کیا بات تھی کہ میں جب بھی ادھر ادھر گھومتا ہوا اس راہ پر پہنچتا تھا، میرے دل میں خوشی کی ہلکی ہلکی لہریں ناچنے لگتی تھیں اور میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھنا شروع کر دیتا تھا۔

یہ راہ دوسرے پہاڑی راہوں کے مقابلے میں قدرے مختلف تھا۔ نصف حصے تک تو ایک تنگ راستہ تھا اور یہاں تک پہنچنے کیلئے انسان کو کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ اس میدان سے دو راستے نکلتے تھے اور دونوں دشوار گذار تھے۔ نہ صرف دشوار گذار بلکہ خوفناک اور ہیبتناک بھی! لوگ میدان میں پہنچ کر اپنا "تفریحی سفر" ختم کر دیتے تھے کیونکہ اس سے آگے بڑھنا خطرے کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

اس رات جب میں یہاں پہنچا تو میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ گویا کوئی خاص واقعہ رُونما ہونیوالا ہے۔ میں پہاڑ کی چوٹی سے گرے ہوئے مٹیالے رنگ کے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر یونہی دل بہلانے کے لئے پتھر پر اپنی انگلیاں بجا رہا تھا کہ یکایک میرے کانوں میں ایک نسوانی آواز گونجی۔ زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ شام کے بعد شہر کا کوئی مرد بھی یہاں پہنچنے کی جرأت نہیں کرتا تھا اور یہ تو ایک نسوانی آواز تھی۔

دل میں سوچا یہ ایک وہم ہے۔ دن کے وقت کسی عورت کی آواز سنی ہوگی اور اب اسی کا تصور ذہن پر چھا رہا ہے۔ یہ سوچ کر میں پتھر پر سے اُٹھا اور ایک طرف چلنے لگا۔

چیخ کی سی آواز پھر گونجی ـــــ!

میں جرأت پسند آدمی ہوں، خطرے کے وقت اپنے اوسان خطا ہونے نہیں دیتا اور عام طور پر اس قسم کے تجربات کیلئے ہر وقت تیار رہتا ہوں لیکن اسوقت تو میرا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ فوراً بھاگ کر شہر میں چلا جاؤں اور پھر کبھی اس خوفناک راستے پر آنے کا خیال بھی ذہن میں نہ لاؤں۔

آواز پھر گونجی ـــــ!

یہ آواز ـــــ اب کے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی عورت رو رہی ہے۔ میں نے دل کڑا کیا اور ایک جگہ کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

رونے کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔

میں میدان کے مغربی گوشے کی طرف چلنے لگا۔ ابھی چند قدم ہی اُٹھائے ہونگے کہ ایک مردانہ آواز کان میں آئی۔

"زرینہ!"

میں مغربی گوشے میں پہنچ کر ایک پودے کے پاس کھڑا ہو گیا ـــــ اب چاند ایک سیاہ ابر کے دامن میں سے نکل کر کائنات میں اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔

ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی گویا کسی بوجھ

سے دبی ہوئی ہے۔

میں نے غور سے ادھر ادھر دیکھا۔ شیشی حصے پر ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی کسی کے شانے پر دونوں ہاتھ رکھے اس طرح کھڑی تھی گویا سنگ مرمر کی ایک مورتی ہے۔ لڑکی کے بال سنہری تھے جس نے اسکے دونوں شانوں کو ڈھانپ رکھا تھا

مردانہ آواز گونجی

" زرینہ ! "

اس پر لڑکی نے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔

میں بے اختیار ہو کر ذرا آگے بڑھ گیا۔ اب دونوں کی شکلیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ لڑکی نے اپنا ہاتھ چہرے سے ہٹایا اور ایک عجیب انداز سے سامنے کھڑے ہو کر ایک کریہہ منظر ادھیڑ عمر کے آدمی کو دیکھنے لگی۔

چند لمحوں تک دونوں خاموش رہے۔ پھر مردانہ آواز گونجنے لگی۔

" زرینہ ! شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ دنیا میں ہر شخص اپنے سینے میں ایک راز لئے ہوئے ہے۔ تمہارے سینے میں بھی کوئی نہ کوئی راز موجود ہوگا اور میرے سینے میں بھی تم ——"

" مگر پت —— آ —— "

لڑکی نہ معلوم کیا کہنا چاہتی تھی۔ ادھیڑ عمر کے آدمی نے ذرا کرخت لہجے میں کہا۔

" تمہارے پتا جی نے بستر مرگ پر تمہیں میرے سپرد کر دیا تھا۔ یہ بات تم بھی جانتی ہو اور میں بھی اور ہم دونوں کو جاننے والا ہر شخص بھی اس راز سے واقف ہے۔ میرا فرض ہے کہ تمہاری حفاظت کروں، تمہاری خوشیوں کی حفاظت کروں —— افسوس تم نے اپنے دل کا راز نہ سمجھ لیا مگر —— خیر زرینہ ! میری سب سے بڑی آرزو ہے کہ تمہاری زندگی سراپا مسرت بن جائے۔ زرینہ!"

زرینہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

" مجھے ڈر آتا ہے آپ سے پتا —— جی ! آپ جادوگری —— "

ادھیڑ عمر نے ایک حقارت انگیز قہقہہ لگایا۔

یکایک زرینہ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور دوسرے لمحہ میں اس کی انگلی میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ میں ان دونوں کے سامنے کھڑا تھا۔

" معاف کیجئے —— میں قریباً قریباً ہر شام کو ادھر سے گذرا کرتا ہوں " میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

لڑکی دوسری طرف دیکھ رہی تھی مگر وہ گھور گھور کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہو گئی تھی جو عام طور پر سانپ کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

میں حیران تھا کہ آخر یہ شخص بولتا کیوں نہیں، خاموشی سے میری جانب کیوں دیکھ رہا ہے۔

" آپ غالباً پہلی بار یہاں آئے ہیں ؟ " میں نے پوچھا —— مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔

" آپ پہلی بار آئے ہیں ؟ "

لڑکی نے اپنی شیریں آواز میں جواب دیا " چند روز ہوئے ہم آپ کے شہر میں آگئے ہیں "

" بہت اچھی بات ہے۔ امید ہے ہمارے شہر کی آب ہوا آپ دونوں کی طبیعت کو موافق آئے گی —— مگر یہاں —— میرا مطلب ہے اس خوفناک راستے پر نہ آیا کریں —— لوگ کہتے ہیں۔ یہ خوفناک راستہ ہے۔ میں تو قریباً ہر روز یہاں آجایا کرتا ہوں "

لڑکی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ ادھیڑ عمر کے آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دونوں نیچے اترنے لگے اور تھوڑی دیر کے بعد غائب ہو گئے۔

(۲)

اس رات چند گھنٹے ہی سویا ہوں گا کہ دماغ میں ایک الجھن سی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ میں لیٹے لیٹے سوچنے لگا۔ آخر وہ خوبصورت سنہری بالوں والی دوشیزہ کون ہے؟ اور اس کا اس ادھیڑ عمر کے شخص کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ ممکن ہے دونوں کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہوں مگر شام کے اندھیرے میں اس خوفناک راستے پر ان کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ یکایک میرے ذہن میں ایک نیا خیال پیدا ہوا۔ کہیں یہ لوگ کسی خوفناک گہری سازش میں حصہ تو نہیں لے رہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں بے اختیار ہو کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اور عالم تصور میں ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی یقینی طور پر سازشی ہو سکتا ہے مگر زرینہ کا چہرہ نہایت معصوم اور جرم و سازش کے ہر تاثر سے پاک ہے۔ کافی دیر تک سوچنے کے بعد بھی میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

تمام رات اسی کشمکش کے عالم میں گذر گئی مگر اس کے باوجود دل کو ایک ہلکی ہلکی لذت ایک میٹھا میٹھا درد محسوس ہو رہا تھا۔ زرینہ کی حسین شکل، جیسے ہی نگاہوں کے سامنے آتی تھی، دل و دماغ سے نسیم صبحگاہی کا ایک لطیف جھونکا گذر جاتا تھا۔

اس دن جب میں صبح کے وقت سیر کی غرض سے باہر نکلا تو مطلع صاف تھا اور مشرق کے ایک گوشے میں پراسرار دھندلکے کے دامن میں سے آہستہ آہستہ نکلتے ہوئے آفتاب کی مدھم شعاعیں چھن چھن کر گر رہی تھیں۔ میں نہر کے کنارے گنگناتا ہوا دور تک نکل گیا۔ نہ معلوم کیوں اس دن میرا دل چاہتا تھا کہ جب تک ٹانگوں میں چلنے کی سکت باقی ہے آگے چلتا رہوں۔ ایک عجیب نشہ سا، ایک عجیب سرخوشی سی دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی اور مجھے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ میں نے رات کو کیوں نہ زرینہ سے دل بھر بات چیت کی —— ؟

نشہ ریز تصورات کے گہوارے میں جھولتا ہوا

دل اردگرد کے حالات سے قطعاً بے نیاز ہوگیا تھا چنانچہ مجھے یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ میں چلتے چلتے شہر کے آخری گوشے میں پہنچ گیا ہوں۔ یکایک کانوں میں ایک میٹھی سی آواز آئی۔ سامنے دیکھا تو معلوم ہوا میرے خوابوں کی ملکہ خودرو پھولوں کے پودوں کے قریب کھڑی پھول توڑ رہی ہے میں نے چاہا کہ کھڑے رہ کر دیکھوں کہ وہ کیا کرتی ہے مگر ایسے عالم میں دل صبر و ضبط کی تمام زنجیروں کو توڑ ڈالتا ہے۔ میں کشاں کشاں اس کے قریب پہنچ گیا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ خوفزدہ ہوگئی —— اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"اوہو آپ تو واقعی ڈر گئیں۔ مجھے اس مداخلت پر افسوس ہے مگر باور کیجئے میں ارادۃً یہاں نہیں آیا۔ سیر کرتا ہوا گذر رہا تھا——" زرینہ خاموشی سے سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھی نہ معلوم کیا؟

"کیا آپ —— ؟" میں نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا کہوں!

لڑکی کے ہونٹ ہلے "آپ نے تو مجھے لہو لہان کر دیا ہے"

میں نے اس کی انگلیوں کی طرف دیکھا۔ اسکی دو انگلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے خوفزدہ ہوکر ہاتھ اٹھایا ہوگا اور انگلیوں میں کانٹے چبھ گئے ہونگے۔

"میں بہت نادم ہوں لیکن آپ جانتی ہیں اس میں میرا قصور نہیں ہے"

دوشیزہ کا چہرہ غصّے سے قدرے سرخ ہوگیا۔

"قصور آپ ہی کا ہے۔ آپ نے مجھے ڈرایا کیوں تھا اگر آپ نہ آتے تو میں لہولہان——"

اس کی اس معصومیت پر مجھے ہنسی آگئی۔

"پناہ بخدا آپ لہولہان ہوگئی ہیں۔ خوب اگر لہولہان ہوجانے کا یہی مطلب ہے تو میں دن میں کم از کم سو بار لہولہان ہوجاتا ہوں ابھی پرسوں کی بات ہے۔ میری انگلی میں سوئی چبھ گئی تھی۔ میں لہولہان ہوگیا تھا"

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

لڑکی نے اپنی لانبی لانبی پلکیں اٹھائیں، اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکالیں۔ اسوقت وہ اتنی حسین نظر آرہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا ایسی حسین لڑکی میری نگاہوں نے آج تک دیکھی ہی نہیں ہے۔

"معلوم ہوتا ہے آپ ابھی تک

لیجئے آپ کی زخمی انگلیوں پر پٹی باندھ دیتا ہوں"

"شکریہ! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے آپ تشریف لے جائیں ابھی آغاجی آجائیں گے"

"یہ آغاجی وہی صاحب ہیں جو اس دن پہاڑی راستے پر آپ کے ساتھ موجود تھے، کون ہیں یہ؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو اس سے کیا؟"

چند لمحے ہم دونوں خاموش رہے۔ اب میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"اچھا تو میں جاتا ہوں۔ آپ کے آغاجی——"

زرینہ کا ہاتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب میں نے دیکھا کہ اس کی پلکوں پر ایک قطرۂ اشک چمک رہا تھا۔

میں بیتاب ہوگیا۔ مگر اس سے پیشتر کہ کوئی لفظ میری زبان سے نکلے، دو شعلہ ریز غضبناک آنکھیں گھور گھور کر میری طرف دیکھ رہی تھیں آغا زرینہ کے قریب کھڑا تھا۔

میں خاموشی کے ساتھ گھر کو روانہ ہوگیا۔

~~~~~ (۳) ~~~~~

محبت کو آتشِ خاموش کہا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں محبت کی اس سے بڑھ کر کوئی اور موزوں تعریف ہو ہی نہیں سکتی محبت کی آگ اس خاموشی سے جلتی رہتی ہے کہ بعض اوقات محبت کرنے والے کو بھی اس کی حرارت کا علم نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ یہ آتشِ خاموش آتشیں شعلوں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ میں نے جب پہلی بار زرینہ کو دیکھا تھا تو میرے دل میں صرف یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ وہ حسین ہے اس کے چہرے پر معصومیت برس رہی ہے اور گھر آکر اس کے حسین چہرے کا تصور کیا تھا تو سینے میں ایک لذیذ گدگدی سی ہونے لگی تھی۔ جب دوبارہ دیکھا تھا اور اس سے چند باتیں بھی ہوئی تھیں تو یوں محسوس ہوا تھا گویا دل و دماغ کی فضا میں نشے کی تیز لہریں تیر رہی ہیں۔

ارادہ تھا کہ زرینہ سے ملنے کی کوشش نہیں کرونگا کیا معلوم اس اقدام سے کسی مصیبت میں گرفتار ہوجاؤں۔ لیکن دل پر ضبط نہ ہوسکا اتفاق کی بات انہی دنوں زرینہ سے متعدد بار ملاقات کا موقع مل گیا اور ہر بار یہی محسوس ہوا کہ میں بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہوں —— میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو رہا تھا کہ اس کے بغیر میری دنیا ہمیشہ تاریک رہے گی اور اگر وہ مجھے مل جائے تو پھر کسی قسم کی تمنا باقی نہیں رہے گی۔

اپنی ملاقاتوں میں وہ مجھ سے بے تکلف ہوتی جارہی تھی۔

ایک نزہت آگیں شام تھی، آسمان کی نیلگوں وسعتوں پر بڑا سا خوبصورت چاند کھلے ہوئے گلاب کے سفید پھول کی طرح بہا جارہا تھا۔ آفتاب کو غروب ہوئے کچھ عرصہ گذر چکا تھا مگر ابھی افق کے دامن میں خون کی سی سرخی نظر آرہی تھی۔ میں خوبصورت چاند کو دیکھنے لگا۔ اسے دیکھتے دیکھتے میری نظروں کے سامنے سنہری بالوں والی حسین زرینہ کا چہرہ پھرنے لگا۔ چاند بہا جارہا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا یکایک چاند سے ہٹ کر میری نظر افق پر پڑی —— خون کی سرخی —— افق کے دامن میں
~~~~~

ایک خوف آلود لاش ـــــ میرا دل کسی نہ معلوم خوف سے لرز گیا۔

میں نے وہاں سے نظریں ہٹالیں اور ندی کے کنارے چلنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد زرینہ آگئی۔

اس دن ہم دونوں ندی کے کنارے دیر تک بیٹھے رہے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میری نظروں نے دل کا راز اس کی نظروں سے کہدیا اس نے شرما کر نظریں جھکالیں اور پھر یکایک اس کے چہرے پر زردی چھاگئی۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"کیوں کیا بات ہے زرینہ؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں ہے!"

"تمہارے چہرے کا رنگ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ تمہارا دل کسی آنے والے خوف سے لرز رہا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ تم اسے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"نہیں یہ بات تو ہرگز نہیں ہے۔ بس صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ محبت کرنے سے انسان کئی قسم کے خطروں میں گرفتار ہوجاتا ہے کہیں ہم بھی ـــــ"

"پگلی ہو ـــــ خطروں کا مقابلہ کرنا ہی تو زندگی ہے۔ محبت ہمیں بزدل نہیں بہادر بناتی ہے۔"

میں نے اس قسم کی باتوں سے اسے تسلی دی۔

اس رات مجھے یقین ہوگیا کہ زرینہ کو مجھ سے محبت ہوگئی ہے اور یہ بات معلوم کرکے میرے دل کو اتنی مسرت ہوئی جتنی آج تک نہیں ہوئی تھی۔

زرینہ کو گھر کی طرف روانہ کرکے میں مسرور و خنداں نہر کے کنارے چلا جارہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھدیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا ایک اجنبی نوجوان ایک خاص انداز سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے سے ہٹادیا۔

میں تمہارے لئے ایک اجنبی ہوں اور ظاہر ہے تم مجھے اجنبی ہی سمجھتے ہو۔"

"اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" میں نے مضطرب ہوکر کہا۔

"معاف کیجئے، میں اس وقت آپ کو تکلیف دے رہا ہوں مگر اس کیلئے مجبور ہوں سب سے پہلے یہ سن لیجئے کہ میرا نام شہاب ہے۔ چند روز ہوئے میں آپ کے شہر میں آیا ہوں۔ میرا وطن یہاں سے بہت دور ہے۔"

"یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن معاف کیجئے مجھے آپ کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"آپ بالکل بجا فرماتے ہیں ـــــ میں نے آپ کو اس لئے ٹھہرالیا ہے کہ آپ کے کانوں تک ایک خاص بات پہنچادوں۔ میں تمکو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم آگ سے کھیل رہے ہو خیر چاہتے ہو تو زرینہ سے کوئی تعلق نہ رکھو۔"

"تم کون ہو یہ بات کہنے والے؟" میں نے غصے سے کہا۔

میں تمہارا خیر خواہ ہوں ـــــ زرینہ کے خیال کو بھی دماغ سے نکال دو، ورنہ ـــــ تمہارے لئے اچھا نہ ہوگا۔"

یہ کہکر وہ پودوں کے پیچھے غائب ہوگیا۔

(۴)

دن گذرتے جارہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ محبت کی مسرتیں بھی بڑھتی جارہی تھیں دن کے وقت زرینہ اپنی تمام حشر انگیز رعنائیوں کے ساتھ میری نظروں کے سامنے موجود رہتی تھی اور رات کو اس کے حیات افروز جلوے میرے خوابوں کی فضاؤں کو مہکاتے رہتے تھے۔ وہ میرے لئے کیا کچھ تھی اس کا اندازہ میرے سوا کون کرسکتا تھا؟ لیکن اس کے باوجود میں دیکھ رہا تھا کہ بعض اوقات میری زرینہ کسی خطرے کے تصور سے اسدرجہ مضطرب ہو جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس تصور کی جڑیں اس کے دل و دماغ کی انتہائی گہرائیوں تک جا پہنچی ہیں۔ وہ خطرے کے احساس کے سامنے بالکل بے بس ہوچکی ہے۔ میں اسے پوری قوت کے ساتھ یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ اب ہماری محبت ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہوچکی ہے تاہم وہ کچھ دیر تک ضرور سہمی سہمی رہتی۔ مصیبت یہ تھی کہ اس نے مجھے اپنے راز سے بھی آگاہ نہیں کیا تھا۔ میں جب بھی اصرار سے پوچھتا کہ آخر بات کیا ہے۔ تم کیوں بیٹھے بیٹھے خوفزدہ ہوجاتی ہو تو وہ مسکرا کر کہہ دیتی "میں نے اکثر دیکھا ہے محبت کرنے والے مصیبتوں میں گرفتار رہتے ہیں میں ڈرتی ہوں کہیں ہم دونوں بھی کسی آفت میں نہ پھنس جائیں" میں جب بھی اس کی حالت پر غور کرتا تھا شہاب کا منحوس چہرہ میری نظروں کے سامنے آجاتا تھا اور یہ خیال کہ زرینہ اسی شخص کی وجہ سے خوفزدہ رہتی ہے، میرے دل میں برابر قوت حاصل کرتا جارہا تھا۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ یہ خیال یقین کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ ایک دن زرینہ میرے پہلو سے اُٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوچکی تھی۔ اور میں ایک جگہ بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ آج اس کا تعاقب کرکے اس خطرے کو معلوم کرنے کی کوشش کروں جو ہر وقت اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ چنانچہ میں بھی ادھر روانہ ہوگیا۔

زرینہ بڑی تیزی کے ساتھ قدم اٹھائے چلی جارہی تھی۔ ایک جگہ پہنچکر اس کے قدم رُک گئے۔ میں نے دیکھا کہ اس سے کچھ دور شہاب کھڑا ہے یہ منظر دیکھتے ہی میری رگوں میں شعلے سے بھڑکنے لگے۔

شہاب اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں بھی پودوں

میں سے گزرتا ہوا، سانس روکے شہاب کے پاس جا پہنچا۔

دونوں میری موجودگی سے قطعاً بے خبر تھے۔ شہاب نے زرینہ کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا۔

"زرینہ، آج تم نے شاہد سے شادی کا وعدہ کیا ہے۔ یہ تمہاری سخت بے وقوفی ہے۔ سخت حماقت ہے۔ تم سب کچھ جانتی ہو پھر بھی ---"

مگر اس سے پیشتر کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کرے، میں نے زور سے اس کے سینے پر گھونسہ مارا۔ وہ لڑکھڑانے لگا۔ زرینہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

شہاب جب تک زخمی ہو کر بے ہوش نہ ہو گیا میرے دل کی بھڑاس نہ نکلی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے زرینہ کی طرف دیکھا وہ ایکطرف بت بنی کھڑی تھی۔

"شاہد! یہ تم نے کیا کیا ---" اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

میں نے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی مگر وہ چپ چاپ گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

چند دن کے بعد میں نے زرینہ کے آغا جی سے شادی کے متعلق تذکرہ کیا --- پہلے تو وہ خاموشی کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر مسکرانے لگا۔ "اگر زرینہ کی یہی خواہش ہے اور تم بھی یہی چاہتے ہو تو پھر میں کون ہوں روکنے والا۔"

آخری مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ میری زرینہ کے ساتھ شادی ہو گئی۔ مجھے یہ سنکر بہت مسرت ہوئی کہ شہاب اپنے گھر میں سخت زخمی پڑا تھا۔

شادی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ محبت کی کامیابی کیا معنی رکھتی ہے --- میں گھنٹوں اپنی دلنواز محبوبہ کو دیکھتا رہتا تھا --- گھنٹوں اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا رہتا تھا۔ اس عالم میں دو ہفتے گذر گئے!

(۵)

ایک رات میں سویا ہوا تھا کہ پاؤں کی آہٹ سنکر میری آنکھ کھل گئی۔ جلدی سے بٹن دبایا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ یکایک میری یہ حالت تھی کہ نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا اوپر۔

زرینہ کا پلنگ خالی پڑا تھا۔

کئی قسم کے تصورات نشتر بنکر میرے دماغ میں چبھنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ واقعہ شہاب کی گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ مجھے سخت افسوس ہوا کہ کیوں اس کمبخت کو اس دن زندہ چھوڑ دیا تھا میں نے الماری میں سے پستول نکالا۔ اور ساتھ ہی جیبی لیمپ بھی۔ کمرے سے باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ آغا کا خاص خادم میرے سامنے آموجود ہوا۔

"جلدی چلئے زرینہ سخت خطرے میں ہے۔"

اس کے یہ الفاظ سنتے ہی میں بیتاب ہو گیا۔

"کہاں ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"پہاڑی راستے پر۔ خدا کیلئے جلدی چلئے۔"

یہ کہکر اس نے میرے ہاتھ سے جیبی لیمپ لے لیا اور تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔

باہر اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آسمان کی سطح پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ میں بے اختیار جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا پہاڑی راستے پر چڑھنے لگا۔ مجھ سے کچھ دور بار بار ایک سایہ سامنے آکر غائب ہو جاتا تھا میدان میں پہنچکر میں نے اپنے قدم روک لئے۔

"وہ دیکھئے --- دشمن --- اوہ مالک --- مالک ---"

نوکر ایکطرف اشارہ کر کے چیخنے لگا --- کچھ دور ایک سایہ میدان کے مغربی گوشے میں نشیبی راستے کی طرف جا رہا تھا۔

میں بیتاب ہو گیا۔ پستول کو حرکت دی --- اور --- فضا میں ایک بار ایک چیخ گونج اٹھی

ابھی چیخ کی صدائے بازگشت بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فضا میں مسلسل نفرت انگیز قہقہے گونجنے لگے۔

اسی اثنا میں کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ روشنی کی تیز شعاعیں میری آنکھوں کو چبھنے لگیں۔

میرے سامنے آغا کھڑا تھا۔

ایک لمبا قہقہہ لگانے کے بعد اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا۔

"تمہاری نشانہ بازی کی داد دیتا ہوں --- مگر معلوم ہے تم نے اپنی گولی کا نشانہ کسے بنایا ہے --- یہ دیکھو۔"

وہ پیچھے ہٹ گیا --- اور پھر جلدی سے کوئی چیز اٹھا کر سامنے آگیا۔

"یہ دیکھو ---"

برقی لیمپ کی روشنی ایک خون آلود لاش پر پڑنے لگی۔

اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہے ---

آغا نے زرینہ کی لاش اٹھائی ہوئی تھی۔

وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

"اس نے میری محبت کو دھوکا دیا تھا --- اور تم نے میری آنکھوں کے سامنے مجھ سے میری زرینہ کو چھین لیا تھا --- اب دیکھا میرا انتقام بدبخت عورت! تیرے شوہر ہی نے تجھے گولی کا نشانہ بنایا ہے۔ یاد ہے میں نے کہا تھا کہ ایک شخص کے سینے میں ایک راز ہوتا ہے۔ تم نے میرے راز کو سمجھ لیا پھر بھی ---"

یہ کہتے ہوئے اس نے بدنصیب عورت کی لاش کو گھاس پر پھینک دیا۔ زرینہ تڑپ رہی تھی۔

میں اس کے چہرے پر جھک گیا۔ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کیا ہو رہا ہے میرے سامنے۔

اس نے اپنا سر میرے زانوؤں پر رکھ دیا --- اور پھر --- ہمیشہ کیلئے بے حس و حرکت ہو گئی۔

میں نے اس کی لاش کو گھسیٹ کر پرے ڈال دیا اور فرطِ بیقراری سے اُٹھ بیٹھا۔

میرے سامنے نہ تو آغا تھا اور نہ اس کا نوکر۔ میں نے بھاگنے کا ارادہ کیا کہ ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں کہ قریب سے آواز آئی۔

"میرے دوست!! اب ذرا صبر کرو۔ افسوس جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔"

میں نے دائیں طرف دیکھا۔ شہاب کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں لیمپ جل رہا تھا۔

"شاہد! تم نے مجھے اپنا دشمن سمجھا تھا حالانکہ مجھ سے بڑھ کر تمہارا اور کوئی خیر خواہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے کہدیا تھا۔ تم آگ سے کھیل رہے ہو ـــ مگر تم نے کوئی پرواہ نہ کی بلکہ مجھے اپنا دشمن سمجھنا شروع کر دیا ـــ میں تمہیں پوری حقیقت بتاتا ہوں ـــ یہ لڑکی زرینہ جسے تم نے بے خبری کے عالم میں گولی کا نشانہ بنا دیا ہے۔ اس مردود آغا کے ایک دوست کی بیٹی تھی۔ جب زرینہ کا باپ مر گیا تو آغا اسے اپنے گھر لے آیا۔ زرینہ اسے اپنا باپ سمجھتی تھی مگر آغا چاہتا تھا کہ زرینہ اس سے محبت کرے۔ یہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ انہی دنوں زرینہ ایک نوجوان کی ذات میں دلچسپی لینے لگی۔ آغا خطرے کا احساس کر کے اسے یہاں لے آیا۔ اس کے بعد تم اس کی زندگی میں داخل ہو گئے۔ آغا یہ کب برداشت کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھتا تھا اور خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتا تھا۔

"میں اس شخص کے تمام حالات سے پوری طرح واقف تھا اور جانتا تھا کہ یہ ملعون اپنی ضد کا پکا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ میں نے تمہیں زرینہ کو فراموش کر دینے کیلئے کہا ـــ زرینہ سے بھی کہا اگر تم دونوں محبت کی بلندیوں پر پرواز کر رہے تھے ـــ تم نے مجھے دشمن سمجھ کر ـــ خیر اب باتوں کے تذکرے کی ضرورت نہیں ہے۔

"تمہاری شادی ہو گئی ـــ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ آغا انتقام کی کوشش کر رہا ہے۔ زرینہ اس سے نفرت کرتی تھی مگر اس سے خوفزدہ بھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ ظالم انسان کئی قسم کے پلید علوم میں ماہر ہے ـــ اور تو اور ہپناٹزم میں بھی ماہر ہے ـــ"

"ہپناٹزم میں ماہر ـــ" میں نے پوچھا۔

"ہاں اور میرا خیال ہے آج کی رات وہ پہاڑی پر گئی نہیں تھی بلکہ اسے وہاں پہنچا دیا گیا تھا ـــ تم نے یہ مطلب سمجھ لیا ہو گا۔ ایک ہپناٹسٹ کیا کچھ کر سکتا ہے یہ تم جانتے ہو گے ـــ وہ ذلیل انسان تم دونوں سے بدترین قسم کا انتقام لینا چاہتا تھا اس لئے اس نے پہلے زرینہ کو وہاں بلایا پھر نوکر کو بھیج کر تمہیں بلا لیا ـــ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تم خوب جانتے ہو۔ تم پوچھو گے مجھے یہ سب کچھ کیونکر معلوم ہو گیا ـــ اس کا جواب یہ ہے کہ جب میں نے آج دن کے بارہ بجے آغا کو تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے گھر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے سمجھ لیا کہ آج کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ چنانچہ میں تمہارے گھر کے ارد گرد پھرتا رہا۔ بدقسمتی سے آغا کے نوکر نے مجھے دیکھ لیا اور مجھے زخمی کر کے گرا دیا۔ رات کے وقت مجھے ہوش آیا۔ اسوقت تم آغا کے نوکر کے ساتھ جا رہے تھے ـــ بڑی تیزی کے ساتھ ـــ میں نے تمہیں آوازیں دیں مگر تم نے نہ سنا۔ پہاڑی راستے پر بھی پہنچے تو میں نے تمہیں آوازیں دیں لیکن بے سود ـــ

"افسوس میں فرطِ ضعف کی وجہ سے بمشکل قدم اُٹھا سکتا تھا ـــ ورنہ یہ واقعہ رونما نہ ہوتا۔"

شہاب خاموش ہو گیا ـــ اس کے سر اور بازوؤں سے خون بہ رہا تھا۔

میں نے آغا کو ڈھونڈنے کی ہر جگہ کوشش کی اور اب تک کوشش کر رہا ہوں ـــ جیسے ہی دنیا کے کسی گوشے میں اس کی صورت نظر آئی میں اسے گولی کا نشانہ بنا دونگا۔

یہ ہے میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو۔

اُس کے شوہر کا قاتل کون؟

فنِ سراغرسانی پر اپنی قسم کا ایک انوکھا افسانہ

از جناب محمد حسن صاحب

"ایک سراغرساں کی حیثیت سے کسی کو بھی توقع نہ تھی کہ میری عمر میں کوئی لمحہ ایسا بھی آئیگا۔ جبکہ میں خاموش بیٹھ کر اپنی گذشتہ زندگی پر نگاہِ بازگشت ڈال سکوں گا جب میں اپنے سی سالہ تجربات پر نظر ڈالتا ہوں تو سب سے پہلے یہ سوال میرے سامنے آجاتا ہے کہ کس واقعہ کو دوسرے پر ترجیح دوں مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان واقعات ایک دلچسپ اور حسین سلسلے میں پروئے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن ان کا سرا ڈھونڈے بھی نہیں تھا....

ان سب واقعات میں جو واقعہ مجھے سب سے زیادہ دلچسپ نظر آیا ہے وہ میں آج کی صحبت میں بیان کر رہا ہوں"

کرنل فاکس نے اپنا سگار سلگایا اور اس مختصر سی تمہید کے بعد وہ اپنی کہانی شروع کرنے لگا۔

کرنل کی پُرانی عادت رہی ہے کہ جب کبھی وہ کوئی بات دلچسپی اور تفصیل سے کہنا چاہتا ہے تو ہمیشہ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا اور موٹا سا سگار ضرور دکھائی دیتا ہے سردی کی لمبی لمبی راتیں ہوں۔ سننے والوں کا شوقین مجمع ہو اور کرنل کے منہ میں سگار ہو ——— اس ماحول میں وہ اپنے تجربات بیان کرنے سے کبھی نہ تھکتا تھا لیکن اس کے علاوہ وہ بہت کم بولتا اور اکثر خاموش رہا کرتا تھا۔ اس کی پُر رعب خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ واقعی بڑا کامیاب سراغ رساں ہے وہ ادھیڑ عمر کا ایک چست و چالاک شخص تھا اس کے چہرے اور خصوصاً پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں جن سے اس کی عمر کا پتہ لگتا تھا۔ اسوقت جب کہ وہ غیر معمولی مسرت کے ساتھ اپنے تجربات بیان کرنے کے لئے تیار تھا ہم لوگ بھی بہت خوشی سے سننے کے خواہشمند تھے۔ سردیوں کی شام میں انگیٹھی کے کنارے بیٹھے ہوئے کس کا دل کہانی سننے کے لئے نہ تڑپے گا؟

کرنل فاکس نے شروع کیا "میں ان دنوں لندن میں تھا..... شام ہو چلی تھی۔ دن بھر ایک مقدمے کی تفتیش میں مارا مارا پھرنے کے بعد اب گھر پہنچا تھا اور اس وقت آرام سے صوفے پر بیٹھکر سگار کے فرحت افزا کش لگانے کے اور کسی چیز میں راحت محسوس نہ ہوتی تھی میں اس نیم مدہوشی کی حالت میں پڑا ہُوا تھا ...... کہ یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، ذرا خیال کیجئے ایسی حالت میں جبکہ تھکن اور اضمحلال کا غلبہ ہُوا۔ شام کا رومان انگیز وقت ہو اور سگار کی بھینی بھینی لذت افروزی... اسوقت ٹیلیفون کی گھنٹی کیا قیامت برپا کرتی ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ یہ کسی نہ کسی کیس کے متعلق ہی ہوگی۔

"ہیلو" میں نے بے ادبی سے پوچھا۔

"ہیلو کرنل فاکس" کسی عورت کی آواز تھی۔

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"ہوٹل کراؤن نمبر ۱۵ مسز برنارڈسن" اسی نسوانی آواز نے دُہرایا۔

"میرے شوہر مسٹر برنارڈسن لاپتہ ہیں آپکی امداد چاہتی ہوں"

"میں پورا واقعہ سننا چاہتا ہوں، کل دس بجے تکلیف فرمائیے"

"شکریہ!"

گفتگو ختم ہوئی اور میں نے اس کے متعلق زیادہ سوچنا مناسب نہ سمجھا۔ پچھلے واقعات ہی دماغ کی پُرسکون فضا میں اتنی فراوانی سے تیر رہے تھے کہ حال و مستقبل کے متعلق کچھ سوچنے کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی۔ رات بھر میں نے اپنے دماغ کو سکون اور اطمینان کے ساتھ خاموش رکھا۔ غور و فکر سے قطعاً آزاد صبح کو ڈائری کی خانہ پری کرنے بیٹھا ہی تھا کہ میرا ملازم ملاقاتی کارڈ ——— لے کر داخل ہُوا۔

(مسز برنارڈسن رپورٹر

دی امریکن اسٹینڈرڈ وغیرہ

چھپے ہوئے کارڈ پر "مسز" کا لفظ روشنائی سے لکھا ہُوا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اتنی دیر میں وہ داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے پریشانی برستی تھی، بال پریشان تھے رسمی بات چیت کے بعد وہ برابر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور آہستہ آہستہ اپنی داستان سنانی شروع کی۔

"اس سے پہلے کہ میں اپنی داستان شروع کروں، میں مناسب سمجھتی ہوں کہ آپکو اپنی شادی کے پس منظر سے آگاہ کردوں۔ میرے شوہر مسٹر برنارڈسن مدت سے امریکہ کے مشہور

اخبار "دی امریکن اسٹینڈرڈ" کے رپورٹر ہیں مجھے ان سے پہلی ملاقات کرنے کا اتفاق اسی حیثیت میں ہوا میں خود ایک مقامی مدرسے کی معلمہ ہوں۔ پہلی ملاقات ہی نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا گرویدہ کردیا اور یہ محبت دن بدن تیزی کے ساتھ بڑھتی رہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری زندگی میں ایک نہایت ہی خوشگوار انقلاب پیدا ہوا اور بالآخر ہم دونوں نے عمر بھر ساتھ رہنے کا عہد کرلیا چونکہ میرا ہونے والا شوہر مالدار تھا اس لئے میں نے اس باعزت سمجھوتہ کو بڑی خوشی سے قبول کیا۔ ہم دونوں لندن کے مشرق میں ایک چھوٹے سے قصبے — Saint Gogery میں رہتے رہے میرا شوہر ہر روز لندن، میرا اپنی رپورٹ تیار کرنے کی غرض سے آمد و رفت رکھتا تھا اور شام کو واپس چلا جارہا تھا۔

"رپورٹ......"، میں نے کچھ سوچکر کہا مثلاً

"مثلاً لندن میں بھکاریوں کی زندگی کے متعلق اس نے حال ہی میں اپنی رپورٹ تیار کی تھی"

"کیا آپ نے وہ رپورٹ پڑھی"

"جی نہیں"

"اچھا آپ اپنی گفتگو جاری رکھیئے"

"ایک روز شام کو میں اپنی ایک سہیلی کی دعوت پر لندن چلی آئی"

"شوہر کو آپ کے لندن آنے کا علم تھا؟"

"جی نہیں"

"اچھا، پھر؟"

"میں ایک عقبی سرائے سے گذری"

"آپ اس سرائے کا نام بتا سکتی ہیں؟"

"جی۔ ایسٹرن ٹیورن"

"اچھا...... پھر"

"میں نے اپنے شوہر کو اس سرائے کی بالائی منزل پر دیکھا تھا:"

"آپ یقین سے کہہ سکتی ہیں"

"جی۔ میں اپنی آنکھوں کو نہیں جھٹلا سکتی بالکل وہی صورت۔ بالکل وہی۔ بالکل وہی"

"اچھا تو پھر"

لیکن تھوڑی دیر بعد میں نے کسی کو اوپر سے نیچے جھیل میں گرتے دیکھا وہ ڈوب گیا اور میں دیکھتی رہی" اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کون تھا؟"

"میں نے اس سوٹ کو پہچان لیا جو میرا شوہر صبح کو پہن کر آیا تھا اور اس بنا پر میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میرے شوہر کو ڈبو دیا گیا ہے"

"کیا آپ کسی پر شبہ کر سکتی ہیں؟"

"جی"

"اسی کمرے میں ایک بھکاری موجود تھا...... بالکل گونگا...... اُف کس قدر ڈراونی شکل... او میرے خدا......"

"آپ نے پولیس سے امداد طلب کی؟"

"جی ہاں۔ ملزم گرفتار کرلیا گیا وہ ابھی حراست میں موجود ہے"

"بہت اچھا۔ آپ کچھ اور کہنا چاہتی ہیں"

"بس صرف اس قدر...... کہ مجھے آپ کی خاص عنایت کی ضرورت ہے، میں اپنے شوہر کے بغیر اپنا وجود بھی قائم نہ رکھ سکوں گی میری محبت، میری زندگی اور خود میں ایک خالی خولی فضا میں ہوکر رہ جاؤں گی۔ میری مدد کیجئے اور پوری توجہ......" اسکی آواز بھرا گئی۔

شکریہ کے رسمی الفاظ کے بعد وہ رخصت ہوئی۔ اس کی تھرکتی ہوئی ٹانگیں اور میرے تصور میں اُٹھے ہوئے ہاتھ دیر تک کانپتے رہے۔ میری ڈائری پر کچھ دیر یہ الفاظ کانپتے رہے

۲۶ فروری ——

"ہمارا پچھلا کیس اپنے آخری نظارے دکھا کر ختم ہوا۔ ابھی ایک اور کیس — عجیب دلکش اور دلچسپ کیس آپہنچا۔ بہرحال مجھے فیصلہ کرنا ہے اور زندگی خود عجیب ہے اور خصوصاً اسوقت جبکہ وہ فنا اور بقا کے دوراہے پر کھڑی ہو ایک ہولناک حادثہ......"

ڈائری کا صفحہ سادہ چھوڑکر میں نے ملازم کو اپنی موٹر سائیکل تیار کرنے کا حکم دیا۔ ارادہ تھا کہ اس سرائے کا رُخ کروں مگر یکایک مجھے برنارڈسن کے رپورٹر ہونے کا خیال آیا۔ وزیٹنگ کارڈ اسوقت بھی میری جیب میں وزن پیدا کررہا تھا۔ میں نے اسے نکال کر غور سے پڑھا۔

(مسٹر) برنارڈسن، رپورٹر امریکن اسٹینڈرڈ، امریکہ

اوہو! رپورٹیں اور خصوصاً بھکاری والی رپورٹ اس ڈرامے میں ممکن ہے کوئی پارٹ ادا کرسکے۔ میں نے موٹر سائیکل اُٹھائی اور چل دیا — سرائے کی طرف نہیں بلکہ امریکن اسٹینڈرڈ کی ایجنسی کی طرف۔ راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ بھکاری ہی کو اس کے ڈبونے کا ذمہ دار بتایا جارہا ہے اور "بھکاری" ہی اس رپورٹ کا موضوع بھی ہے یقیناً یہ صرف اتفاق نہیں ہوسکتا۔ واقعہ کی گتھیاں اُلجھتی چلی گئیں بلکہ عجیب سی غیر دلچسپ سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں اس خلجان سے گھبرا اُٹھا۔ رپورٹ...... رپورٹر...... برنارڈسن ...... امریکن اسٹینڈرڈ ...... لندن ...... بھکاری ...... بھکاری کی زندگی ...... نہ معلوم کیا کیا خیالات میرے دماغ میں گھوم رہے تھے، جن میں سے پھر ایک تخیل دماغ میں گھوم پھر کر ایک نیلا پیلا دائرہ بن جاتا تھا اور اس زور سے کنپٹی سے جاٹکراتا تھا کہ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی آنکھیں بند کرلینی پڑتی تھیں، او میرے خدا۔

بالآخر میری منزل مقصود آپہنچی۔ میں نے امریکن اسٹینڈرڈ کے متعلق استفسارات کی بوچھاڑ

کر ڈالی اور بیچارے منیجر نے ان اُٹل شٹل سوالات سے گھبرا کر میرے سامنے امریکن اسٹینڈرڈ کا فائل لا ڈالا اس نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

"بھکاری کی رپورٹ.... بھکاری کی رپورٹ اب آپ خود ڈھونڈ سکتے ہیں۔ مجھے اپنا کام کرنے دیجئے"۔ میں بھی یہی چاہتا تھا بالآخر ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے رپورٹ مل گئی۔ بڑے غور سے پڑھا۔ ایک بار ـــــ دوبار ـــــ تین بار ـــــ ڈائری نکالی۔

"لندن ایجنسی امریکن اسٹینڈرڈ"

نتائج:- (۱) رپورٹ لکھنے کی فرمائش خود اخبار کے ادارے نے کی۔

(۲) چونکہ لندن میں بھکاری ـــــ "Work Houses" میں بھرتی ہو رہے ہیں لہذا امریکہ میں بھکاری کے جذبات سے ایک دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔

(۳) یہ رپورٹ برنارڈسن نے "پیرے" کے نام سے لکھی۔

اس سے زیادہ میں اور کچھ نہ جان سکا۔

(۲)

چلتے وقت میں نے منیجر کا شکریہ ادا کیا جس نے شاید میرے چلے جانے پر خدا کا شکریہ ادا کیا ہو سگار سلگایا، موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اس عمارت سے روانہ ہوگیا۔ اب میری خالی ڈائری میں کچھ وزن ہو چلا تھا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ بھکاری اور سرائے سے کیا تعلق؟ سرائے کے خوشامد پسند سرمایہ دار تو بھکاری کا خون چوس لینے سے پہلے اسے سرائے کے اندر قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ دے سکتے تھے یہ کیا عقدہ ہے اے میرے خدا۔ سرائے کا دروازہ آیا۔ موٹر سائیکل کی سمع خراش آواز سے باہر ایک اونگھتا ہوا ملازم چونک پڑا میں نے اپنی رہبری کیلئے اسے منتخب کیا اور سرائے کے اندر داخل ہوا۔ منیجر بڑا ہوشیار اور نڈر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس کے اس واقعے کے متعلق پوچھا۔ اس نے میرے پورے سوال کو سنے بغیر جواب دینا شروع کیا:-

"جی ہاں...... میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری سرائے میں ایک شخص مسٹر پیرے نے اوپر کی منزل میں ایک کوٹھڑی مدت سے لے رکھی تھی جہاں اس کا کچھ سامان وغیرہ رکھا رہتا تھا۔

"آپ نے مسٹر پیرے سے ملاقات کی"؟

"جی نہیں۔ میں اسی ہفتے سے منیجر مقرر ہوا ہوں اور سرائے کے پرانے رہنے والوں سے ابھی زیادہ واقفیت پیدا نہیں کر سکا ہوں"

"ہوں"

"بہت اچھا میں اس کوٹھڑی کا معائنہ کر سکتا ہوں"

"کمرہ نمبر"

"۱۷"

مجھے اوپر لے جایا گیا۔ میں نے ایک نہایت پُر فضا منظر دیکھا۔ سامنے والی بالکنی نہایت عمدگی سے بنی ہوئی تھی جس سے سامنے والے تالاب کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ تالاب نشیب میں اس کی بنیادوں سے ٹکراتا اور کبھی دامن بچاتا ہوا لہریں لے رہا تھا۔ بالکنی پر سے ایک شخص نہایت آسانی سے تالاب کی گہرائیوں میں کود سکتا تھا ـــــ اور اگر کوئی طاقتور آدمی دھکا دے تو دوسرا شخص یقیناً تالاب میں جا گرے۔ پھر میں اسی کوٹھڑی کی طرف آیا جو بالکنی سے بالکل ملحق تھی وہ اوپر کی منزل کی کوٹھڑیوں میں سے آخری واقع تھی اس کی وسعت کچھ زیادہ تھی۔ تنگ مگر خوش وضع اس میں کئی رنگ برنگے ڈبے چنے ہوئے تھے اور چار مصوری کے مو قلم ادھر ادھر بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ منیجر اس اثنا میں آگے بڑھ آیا اس نے مجھے صورت حالات سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ کمرہ، جیسے کہ رجسٹر بتلاتا ہے مسٹر پیرے اور مسٹر وینڈل (جو کہ ایک مشہور عالم آرٹسٹ ہیں) نے مشترکہ طور پر لیا تھا۔ دونوں کے دونوں آجکل باہر گئے ہوئے ہیں مسٹر وینڈل اپنی مصوری کے متعلق سامان اور فلم آرٹ کے متعلق میک اپ (Make-up) وغیرہ کا سب سامان وہیں چھوڑ گئے ہیں"۔

میں نے سوچا "شاید اس نے مصوری کے خاموش فتنوں کیلئے یہی پُر کیف فضا منتخب کی ہو۔ میں نے جزئیات پر ایک اُڑتی ہوئی نظر ڈالی۔ رسمی طور سے سرائے کے رجسٹروں وغیرہ کا معائنہ کیا اور کوئی خاص بات نہ مل سکی۔ ایک سرگرم مصافحے اور شکریہ کے جوشیلے الفاظ کے ساتھ میں سرائے سے رخصت ہوا۔ ڈائری پر لکھا تھا۔

ایسٹرن ٹورسٹ

(۱) مسٹر پیرے کی پراسرار شخصیت کمرہ نمبر ۱۷ میں مقیم تھی۔

(۲) مسٹر پیرے اور مسٹر وینڈل مشترکہ طور سے اس کمرے کے مالک ہیں۔

(۳) مسٹر وینڈل کا مصورانہ سامان اور میک اپ کی چیزیں موجود ہیں۔

(۴) مسٹر پیرے کا کوئی سامان موجود نہیں۔

اور بس ـــــ!

(۳)

میرا بدن تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ کہاں امریکن اسٹینڈرڈ کی ایجنسی اور کہاں ایسٹرن ٹورسٹ گویا مغرب و مشرق کا سفر طے کر لیا گھر پہنچا۔ موٹر سائیکل زمین پر دے ماری اور اسے اپنے ملازم کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود صوفے پر جا لیٹا۔ سگار سلگایا مگر نیند کے بے موقع الاؤ

سے چونک کر بجھا دیا۔ اور صوفے ہی پر پڑا پڑا سو رہا۔ یہ سکون اور فرحت افزا نیند — سچ ہے گہرے گہرے بادل ہمیشہ میٹھے میٹھے بارش کے قطروں کی بارش کرتے ہیں جب سو کر اٹھا تو دماغ پُرسکون تھا ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے صوفے سے اٹھ کر اس بے موقع کھڑکھڑاہٹ کا جواب دیا۔

"ہیلو کرنل فاکس"

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"ہوٹل کراؤن۔ مسز برنارڈسن"

"ارشاد"

"کچھ پتہ چلا"

"بہت کچھ"

"شکریہ"

گفتگو ختم ہو گئی۔

(۴)

سگار کے دھوئیں کے میٹھے میٹھے بادل بھر کر کی فضا پر چھا رہے تھے مگر اب وہ بارش کرنے کیلئے نہیں بلکہ غور و فکر کے بم برسانے کیلئے جمع ہو رہے تھے۔ ڈائری کا وہی صفحہ میرے سامنے کھلا ہوا تھا اور غور و فکر کا ایک سمندر موجیں مار رہا تھا اور پوری تیزی اور تندی کیساتھ

۲۶ فروری —

ہمارا پچھلا کیس اپنے آخری نظارے دکھا کر ختم ہوا۔ ۱۰ بجے ایک اور کیس — عجیب کیس اور دلچسپ کیس آ پہنچا۔ بہر حال مجھے فیصلہ کرنا ہے۔ زندگی خود عجیب ہے اور خصوصاً اس وقت جبکہ وہ فنا اور بقا کے دوراہے پر کھڑی ہو ایک ہولناک حادثہ ....

(۲) لندن ایجنسی امریکن اسٹینڈرڈ

نتائج —

(۱) رپورٹ لکھنے کی فرمائش خود اخبار کے ادارے نے کی تھی۔

(۲) چونکہ لندن میں بھکاری — Work Houses میں بھرتی ہوتے ہیں۔ لہذا امریکہ میں بھکاریوں کے جذبات سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔

(۳) یہ رپورٹ برنارڈسن نے پیرے کے نام سے لکھی۔

(۳) ایسٹرن ٹیورن —

(۱) مسٹر پیرے کی پراسرار شخصیت کمرہ نمبر ۷ میں مقیم تھی۔

(۲) مسٹر پیرے اور مسٹر وینڈل مشترکہ طور سے اس کمرے کے مالک تھے۔

(۳) مسٹر وینڈل کا مصورانہ سامان اور میک اپ کی چیزیں موجود ہیں۔

(۴) مسٹر پیرے کا کوئی سامان موجود نہیں — اور بس!

(۴) اور مسز برنارڈسن کا بیان ہے۔

(۱) شادی محبت سے ہوئی۔

(۲) دونوں قریبی گاؤں میں رہتے ہیں جہاں سے برنارڈسن کو روزانہ لندن آنا پڑتا ہے۔

(۳) وہ کسی سہیلی کی دعوت پر لندن آئی تھی۔

(۴) اس کے شوہر کو دھکا دیدیا گیا ہے۔

میں نے ٹیلیفون پر مسز برنارڈسن کو دوسرے دن ۱۰ بجے پولیس اسٹیشن پر آنے کو کہا۔ جہاں میں اس سے مل سکونگا۔ اور شاید اس کے شوہر کے ساتھ۔ وہ بہت حیران اور مسرور ہوئی اور شکریہ کے رسمی الفاظ کے بعد ٹیلیفون رکھ دیا۔

(۵)

فیصلہ ہو چکا تھا لہذا رات بھر پُرسکون طریقے سے سوتا رہا۔ صبح ۱۰ بجے کے قریب اپنی ڈائری لے کر پولیس اسٹیشن کی طرف چلا۔ اطمینان رہ رہ کر دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مسز برنارڈسن بھی آ پہنچی۔ میں نے ملزم سے ملنے کے لئے اصرار کیا۔

مگر وہ تو گونگا ہے۔" مسز برنارڈسن نے کہا۔

میں صرف اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

مسز برنارڈسن کو باہر بیٹھا چھوڑ کر میں ملزم کے پاس جا پہنچا۔ افسر انچارج نے میری رہنمائی کی۔ اس سے قبل کہ میں اس کے روبرو آجاؤں میں نے آفیسر انچارج سے پوچھا۔

"کوئی خاص بات؟"

"دو خاص باتیں ہیں۔ ایک تو آپ گونگے ہیں اور دوسرے ابھی تک آپ نے منہ نہیں دھویا ہے۔"

"اچھا" صورت حالات اور زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ آفیسر انچارج واپس چلا گیا۔ میں اندر داخل ہوا اور اس سے رازداری مگر بے تکلفی کے لہجے میں کہنے لگا۔

"آپکو مسٹر پیرے کہوں یا مسٹر برنارڈسن؟"

وہ چونک پڑا۔ بولنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ جب مجھے اس سے کوئی جواب ملنے کی امید نہ رہی تو میں نے مسز برنارڈسن کو بلا بھیجا اور ایک ٹب پانی کا آرڈر دیا۔ پانی آ گیا اور مسز برنارڈسن بھی۔ آس پاس کھڑے ہوئے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"مسز برنارڈسن کے مجرم کی یہی سزا ہے کہ اس کا منہ جبراً دھلایا جائے۔"

حکم کی تعمیل شروع ہوئی اور پانچ منٹ بعد وہی بھکاری مسٹر برنارڈسن تھا۔ مسز برنارڈسن پھٹی ہوئی آنکھوں سے کبھی مجھے اور کبھی اسے دیکھتی تھی۔ بالآخر وہ ضبط نہ کر سکی چلا اٹھی۔

"برنارڈسن" — برنارڈسن ندامت اور شرمندگی سے گردن ڈالے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں چار نہ ہوتی تھیں۔ میں نے اس تشہیر عام کو گوارا نہ کیا اور ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ میں نے مسز برنارڈسن کی حیرانی کو (جرم جرم

خطرناک صورت اختیار کرتی جارہی تھی) دور کرنے کے لئے مسٹر برنارڈسن نے اپنی کہانی سنانے کے لئے کہا اور اس نے بخوشی کہانی سنانا گوارا کیا۔ شرمائی ہوئی نظروں سے اس نے کہنا شروع کیا۔

"میں امریکن اسٹینڈرڈ کا رپورٹر ہوں اور اسی اخبار کے لئے بھکاریوں کی زندگی لندن میں شروع کی رپورٹ تیار کرنے کے لئے مجھے کچھ عرصے کے لئے بھکاری کا پارٹ ادا کرنا پڑا۔ چونکہ میری بیوی مجھے اس اقدام سے منع کرچکی تھی۔ لہٰذا میں نے یہ عقدہ اس کے سامنے کھولنا گوارا نہ کیا۔ اس کام کیلئے میں ایسٹرن ٹیورن (Eastern Tavern) میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ میں اور میرا ایک قریبی دوست مسٹر وینڈل دونوں مشترکہ طور سے اس کمرے کو استعمال کیا کرتے تھے۔ ہر صبح کو میں گھر سے آتا اور سرائے سے بھکاری کا فرسودہ لباس پہن کر باہر چلا جاتا (جو میں نے کباڑیے سے خریدا تھا) لندن کی سڑکوں پر چھپا ہوا بھیک مانگتا رہتا اور شام کو سرائے سے اپنے اصلی کپڑے پہن کر گھر چلا جاتا۔ بھیک مانگنے کی ترکیب وہی تھی جو شاید آپ بھکاری کی رپورٹ میں پڑھ چکے ہوں۔ رپورٹ تیار کرنے کے بعد بھی میں نے اس لطف کی بنا پر جو مجھے بھیک مانگنے میں آنے لگا تھا بھیک مانگنا نہ چھوڑا اور میں ایک رپورٹر سے زیادہ ایک بھکاری بن چکا تھا اس نئے پیشے میں آمدنی بھی زیادہ تھی اور محنت بھی کم۔ ڈر تھا تو فقط اپنی بیوی کا جس پر میں یہ راز کھولنا نہ چاہتا تھا کیونکہ میں ہی اس کے جذبات کا اندازہ کرسکتا ہوں جبکہ اسے معلوم ہوتا کہ اب تک وہ بھیک سے حاصل کی ہوئی آمدنی کھا رہی ہے۔ ایک روز میں اوپر کی بالکنی پر کھڑا ہوا تھا۔ وینڈل اسی روز باہر گیا تھا اس کی دوبارہ آمد کے متعلق کچھ سوچ رہا تھا کہ یکایک میں نے مسز برنارڈسن کو آتے دیکھا وہ تالاب کے اس پار تھی مگر باوجود اپنے کو چھپانے کی کوشش کے اس نے مجھے دیکھ لیا تھا میں بھکاری کے لباس میں تھا مگر وہ صرف میرا چہرہ ہی دیکھ سکی تھی اور یہ بھی میری خوش قسمتی تھی۔ میں نے اپنا راز اس طرح چھپانے کیلئے سوچا مگر بھکاری کے کپڑے اتار دینے کے لئے وقت کافی نہ تھا۔ البتہ میں مسٹر وینڈل کے سامان سے اپنے چہرے کو اچھی طرح بدل سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اپنا چہرہ پوری طرح رنگ کر کچھ اس طرح سے بنا ڈالا کہ خود میری بیوی مجھے پہچان سکی دوسرا سوال آواز کا تھا اور اس کے لئے فیصلہ یہ ہوا کہ میں گونگا بن جاؤں میں نے اپنا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا مگر یہ خطرہ اب بھی باقی تھا کہ ان کپڑوں کا پتہ چل سکتا تھا جو میں صبح گھر سے پہن کر آیا تھا اس کا علاج صرف یہ تھا کہ انہیں نیچے تالاب میں پھینک دیا جائے لیکن میری بیوی نے میرے کپڑوں کو نہ صرف دیکھا بلکہ پہچان لیا اور اس کے متعلق تفتیش شروع کی۔ وہ سرائے کی طرف آئی مگر جب تک وہ میرے کمرے تک پہنچی میں اپنے چہرے کو کافی ڈراؤنا اور بھیانک بنا چکا تھا اور دم کے دم میں ایک حبشی غلام بن چکا تھا۔ بہرحال میری بیوی نے سوچا کہ میں نے اس کے شوہر کو تالاب میں ڈبو دیا ہے اور اسلئے مجھے پولیس کے حوالے کردیا گیا لیکن آخرکار آپ نے اس راز کو طشت ازبام کردیا اور میری "بھکاری" والی پوزیشن صاف ہوگئی میں اس کیلئے آپ دونوں حضرات سے سخت نادم ہوں اور مسز برنارڈسن سے اپنے اس طرز عمل کی معافی کا خواستگار رہوں گا"۔

تعلقات پھر خوشگوار ہوگئے دل پھر مل گئے اور ایک سراغرسان نے زندگی کے نئے اور پیارے راستے کی طرف رہنمائی کی۔

"سچ ہے گھرے گھرے بادل ہمیشہ میٹھے میٹھے قطروں کی بارش کرتے ہیں"۔

(۶)

کرنل فاکس نے اپنی داستان ختم کرکے اطمینان کا سانس لیا۔ ہم میں سے ہر ایک اسکی عظیم الشان شخصیت کا قائل تھا اور ہم اس کے خاموش چہرے میں عجیب دلچسپ نشانات دیکھ رہے تھے۔ ہم لوگ اس دلچسپ صحبت کی خوشگوار یاد میں رخصت ہوئے وہ الفاظ اب بھی ہمارے دماغ میں گونج رہے تھے۔

"سچ ہے گھرے گھرے بادل ہمیشہ میٹھے میٹھے قطروں کی بارش کرتے ہیں"۔

کفِ گلفروش

مرتبہ:- مظفر کہکشانی

اوّل اوّل سوز تھی پھر ساز بن کر رہ گئی　　دل کی دھڑکن یار کی آواز بن کر رہ گئی　(ماہر القادری)

اے دل خدا کیواسطے اتنی بھی ضد نہ کر — ناداں معاملہ یہ نہیں اختیار کا　(پروفیسر وحشی ایم اے)

محبت معنی و الفاظ میں لائی نہیں جاتی — یہ وہ نازک حقیقت ہے جو سمجھائی نہیں جاتی　(شعری بھوپالی)

ابھی تو انکی آہٹ پر میں آنکھیں کھول دیتا ہوں　　وہ کیسا وقت ہوگا جب نہ ہوگا یہ بھی امکاں میں　(مقبول نیازی)

میں اور خیالِ ترکِ محبت نہیں نہیں — شاید ہجوم یاس نے گھبرا دیا مجھے　(شوق ماہری)

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بودوباش اچھی — بہار آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی　(احسان دانش)

ہر پنکھڑی پہ کھینچ دی گویا شبیہِ دوست　　کیسا حسیں فریب دیا ہے بہار نے　(فتح محمد ظفر)

عقل کہتی ہے دوبارہ آزمانا جہل ہے — دل یہ کہتا ہے فریبِ دوست کھاتے جائیے　(ماہر القادری)

اب پائے شوق سرحدِ لغزش کے ہے قریب　　ساقی! مجھے سنبھال گرا جا رہا ہوں میں　(شوق ماہری)

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے　　جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ برا بھی ہو تو برا نہیں　(جگر مرادآبادی)

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر　　ستارے کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر　(سیماب اکبرآبادی)

دل نے کچھ ایسی دھن میں آج نغمۂ شوق گا دیا — عشق بھی جھوم جھوم اٹھا حسن بھی مسکرا دیا　(جگر مرادآبادی)

مجھ کو تسکین سی ملتی ہے مسلسل ماہر — دل جو امید سے بیگانہ ہوا جاتا ہے　(ماہر القادری)

کمالِ فریب

ایک فریب کار کا کمال

امریکن کروڑپتی کی ساری جائداد کو ہتیانے کے لئے اس کی پری جمال اکلوتی بیٹی پر ڈورے ڈالنے اور شادی کر لینے کا کچا چٹھا، انجام کار بڑے کروڑپتی کی پُر اسرار موت اور اس کے بعد جدید فن سراغ رسانی کا انتہائی کمال اس سوتی صدی سچے افسانہ میں ملاحظہ فرمائیے!

امریکہ کے شہر منستا ٹی میں ایک دولتمند تاجر اوسکر فلیمنگ کی دختر ہیریٹ کو قدرت نے حسنِ خداداد کی دولت عطا کی تھی۔ وہ والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اسے "سوسائٹی گرل" بنانے کی خاطر ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم و تربیت دی گئی تھی۔ رقص میں وہ پری کومات کرتی تھی۔ اس کی آواز نہایت سُریلی اور لوچ دار تھی خوش گفتار اور منس مکھ بھی تھی۔ باتیں کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دلوں کو موہ لینا اس کی ادنیٰ کرشمہ تھا۔ اس کے پاس موہنی منتر تھا۔ شباب آیا۔ نیرنگیاں اور رنگینیاں ساتھ لایا۔ بہت سے نوجوان اس کے خواستگار بن گئے۔ اور اس کی محبت کا دم بھرنے لگے جن میں ایک پرمیل افسر ہیری ہفمین بھی تھا۔ اس شخص کو بھیس اور صورتیں بدلنے میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ وہ جس کام کیلئے جاتا اسے چٹکی بجانے میں انجام دے لیتا۔ گو ہیریٹ کا دل سے شیدائی تھا۔ مگر ہیریٹ بظاہر اس سے التفات اور کج ادائی نہیں برتتی تھی لیکن اس پائین کے ساتھ اتنا بھی انس نہ تھا جتنی کہ ایک منگیتر کو ہوتی ہے۔

——— (۱) ———

ہیریٹ کے دلدادوں میں کئی بیش بیش تھے اور ان میں سے ایک فریبی نیوٹن رچرڈ خود کو ہیریٹ کا عاشقِ زار ظاہر کرتا تھا۔ وہ اس حسینہ کی تالیفِ قلب ——— میں باقی چاہنے والوں سے چار قدم آگے ہی رہتا تھا لیکن جیسا کہ آئندہ واقعات سے منکشف ہونے والا ہے وہ ہیریٹ کا چاہنے والا نہیں بلکہ اس کے زیورات کا طالب تھا جن میں کئی لاکھ پونڈ کے ہیرے اور دیگر بیش قیمت جواہرات جڑے گئے تھے۔ دو باقی کار جرائم پیشہ جو چوری میں بڑے مشاق و طاق تھے رچرڈ کے گہرے دوست تھے۔ ان پر اس نے اپنا دلی عزم آشکار کر دیا اور وہ لالچ میں اس کے کردار میں ہر قسم کی مدد دینے پر رضامند ہو گئے۔ رچرڈ نے کچھ اس انداز سے ہیریٹ پر ڈورے ڈالے کہ وہ جہاں دوسرے دولتمند خواستگاروں سے کھنچتی چلی گئی وہاں رچرڈ کے دامِ فریب میں اُلجھتی گئی۔ اس نے ہیریٹ کے دل پر یہ نقش بٹھا دیا کہ اگر روئے زمین پر اس کا کوئی صادق عاشق ہے تو وہ رچرڈ ہی ہے۔ دونوں کا معاشقہ کئی ماہ جاری رہا۔ دریا اور ساحلِ سمندر کی سیر، سینما اور تھیٹر سے دل بہلاؤ، دعوتوں اور جلسوں کا لطف، رقص و سرود کی محفلوں میں سرگرمی۔ ان تمام مشاغل سے دونوں کو بڑی دلچسپی تھی۔ دونوں اُن سے لطف اندوز ہوتے تھے رچرڈ کے پاس بھی گو کافی دولت تھی مگر ہیریٹ تمام مشغلوں کا خرچ برداشت کرتی تھی۔ رچرڈ کو ایک کوڑی بھی اپنی گرہ سے ادا نہیں کرنی پڑتی تھی رچرڈ واقعی بڑا خوش نصیب تھا۔ اسے ہیریٹ سے حظِ دید اور حظِ گوش دونوں ہی حاصل ہوتے تھے۔ والدین اپنی دختر کی مرضی اور خوشنودی کو تمام باتوں پر ترجیح دیتے تھے۔

ہیریٹ کو اعلیٰ سوسائٹی میں جو رسوخ اور ہر دلعزیزی حاصل تھی اس کی کیفیت سُنکر ماں باپ کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ رچرڈ کے دونوں جرائم پیشہ دوستوں نے کسی نہ کسی تدبیر سے اوسکر فلیمنگ تک رسائی حاصل کر لی تھی اور اپنے پیشِ نظر مقصد کی خاطر فلیمنگ کے کانوں تک رچرڈ کے متعلق من گھڑت باتیں ایسے انداز اور طریقہ میں پہنچاتے رہتے تھے جن کے باعث رچرڈ ایک تھارو (Thorough) جنٹلمین اور ہیریٹ کا بے نظیر و صادق دلدادہ ثابت ہوتا تھا اور فلیمنگ کا سولہ آنے خیر اندیش۔

——— (۲) ———

چھ ماہ کے معاشقہ کے بعد ہیریٹ اور نیوٹن رچرڈ کی شادی خانہ آبادی کا مرحلہ پیش آیا اور اس کے سلسلہ میں بڑا اسامان ہر قسم کا کیا گیا ہیریٹ کو جہیز میں دینے کیلئے ہزاروں ڈالر

کی نایاب نادر اشیاء مختلف دیاروں سے منگوائی گئیں
شادی کے موقع پر وسیع پیمانہ پر پُرتکلف دعوتوں محفل رقص وسرود اور تفریحی کھیل تماشوں کا خاص انتظام واہتمام کیا گیا۔ کئی سو معزز مردوں اور خواتین کو لطف اندوز ہونے کے لئے دعوتی کارڈ روانہ کئے گئے۔

مغربی ممالک میں شادیوں کے مواقع پر ایسی فراخدلی نہیں دکھائی جاتی اور اسقدر مشاغل مہمانوں کی دلبستگی اور تواضع کے سلسلہ میں کئے جاتے ہیں مگر اوسکر فلیمنگ نے اپنی دختر کی شادی کے سلسلہ میں امراء شرق کو بھی مات کر دیا

ہیریٹ کے باپ نے ایک روز انوکھی بات یہ کی کہ ایک وصیت نامہ کا مسودہ قابل قانون دانوں سے مرتب کرایا جس میں سب سے ضروری شرط یہ رکھی گئی کہ تاحین حیات فلیمنگ جائداد، کارخانہ اور کاروبار کا مالک رہے۔ اس کی وفات کے بعد اس کی بیوی کو پانچ فی صدی آمدنی گذارہ کے لئے دی جائے اور اس کی وفات پر وہ بھی ہیریٹ کے نام منتقل ہو جائے۔

اس وصیت کا اثر رچرڈ کے سنگدل پر یہ ہوا کہ اس نے ہیریٹ کے باپ کی زندگی کا خاتمہ زہر دلوا کر کرنے کا منصوبہ دونوں جرائم پیشہ دوستوں کے مشورہ سے کر لیا۔ اور خود ہیریٹ کے ساتھ ماہ عروس منانے کی خاطر جہاز میں سوار ہو کر براعظم یورپ کا رخ کیا۔ چند دن کے سفر کے بعد دونوں فرانس کے شہر پیری (پیرس) میں جا پہنچے اور نہایت مشہور اور پُرفضا ہوٹل میں جس کا نام "ہوٹل دی پیری" تھا متعدد کمرے لے لئے۔ کئی ملازم نوکر رکھے گئے۔ موٹر کاریں خریدی گئیں۔ اور مشاغل روزمرہ کی خاص فہرست تیار کی گئی جس پر وقت مقررہ پر عمل کیا جاتا تھا۔ بادشاہوں کی زندگی بھی اس ٹھاٹھ اور شان سے نہیں گذرتی جو ہیریٹ اور رچرڈ کی زندگی کے لوازمات میں داخل تھی۔

ادھر یہ دونوں اپنی دلچسپیوں اور گوناگوں مشاغل میں دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر غافل تھے اور ادھر سنسناٹی میں اوسکر فلیمنگ کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لئے رچرڈ کے دونوں دوستوں نے جو فلیمنگ کے نفس ناطقہ اور معتمد بنے ہوئے تھے، جال بچھا دیا اور خوراک میں ایک ایسے زہر کی آمیزش شروع کی جس کا ایک دن میں یا چند روز میں مہلک نتیجہ نہیں بلکہ زہر آہستہ آہستہ سرایت کر کے اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ اس کا قلب پر سب سے گہرا اثر ہوتا ہے اور آخر کار کئی ہفتے بعد حرکت قلب اچانک بند ہو کر انسان ٹھنڈے ٹھنڈے عدم آباد کو سدھار جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کو بھی بادی النظر میں سبب موت کے ساتھ کوئی اور آثار مطلق ہویدا نہیں ہوتے۔

ابھی فلیمنگ بقید حیات تھا کہ رچرڈ کی نیت میں ایک اور انقلاب رونما ہوا۔ اس نے ہیریٹ کے زیورات کو اڑانے کیلئے منصوبہ باندھا۔ پیرس میں ایسے جرائم پیشہ لوگ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں جن کے بائیں ہاتھ کا یہ کرتب ہے کہ ناممکن کو ممکن بنا دیں۔ اس کام پر اس نے دو پُرفن مرد اور ایک عورت بڑی تنخواہ پر مقرر کئے اور یہ بھی شرط کی کہ زیورات کی فروخت سے جو رقم موصول ہو ان کا پانچ پانچ فی صدی ان تینوں کو نذر کیا جائے۔

ایک رات پیری کے مشہور تھیٹر میں کلوپیٹرا اور جولیس سیزر کے متعلق جو ڈرامہ دکھایا گیا جو شہرہ آفاق فرنچ ڈرامہ نویس لی بان ارتھر نے تصنیف کیا تھا۔ یہ ڈرامہ کلوپیٹرا اور سیزر کے واقعات عشق کی زندہ تصویر تھا۔ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ واقعات کو اصلی رنگ اور صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ رات کے ایک بجے واپسی پر ہیریٹ نے تمام زیورات اتار کر تکیہ تلے رکھ دیئے۔ نیند غالب تھی۔ وہ زیورات کو سیف میں بند نہ کر سکی۔

خادمہ آئی۔ اس نے زیورات اٹھا کر دونوں رفیق مردوں کے حوالہ کئے۔ وہ نصف نصف لیکر پیری سے چمپت ہو گئے تاکہ ان کو الگ الگ پونے ٹھکانے لگا کر رقم حاصل کریں۔ ایک برلن پہنچا اور دوسرا قسطنطنیہ۔

ان دنوں ہافمین امریکہ کے ایک بنک پر ڈاکہ پڑنے کے واقعہ کی تفتیش کے سلسلہ میں یورپ آیا ہوا تھا۔ لنڈن سے وہ پیرس پہنچا کیونکہ اسے سُن گُن مل چکی تھی کہ ڈاکو براہ وی آنا سلطان المعظم کے پایہ تخت قسطنطنیہ جا رہے ہیں۔ وہاں سے ان کو انگریز اور امریکن حکومتیں واپس نہیں حاصل کر سکتیں۔

ہافمین ہیریٹ کی قیامگاہ پر پہنچا تو حالات چوری سنکر دنگ رہ گیا۔ اس نے چوروں کا سراغ لگا کر ہیریٹ کے دل میں اپنے لئے جگہ حاصل کرنے کی تگ ودو شروع کر دی اور اپنی معمولی پھرتی سے کام لیتے ہوئے قسطنطنیہ کا رُخ کیا اور درمیان میں وی آنا میں ایک چور کو جا لیا جو ایک بڑے جوہری کے ساتھ زیورات کا سودا کرنے میں مصروف تھا اسے آسٹریلین پولیس کی مدد سے گرفتار کر کے اور مال مسروقہ پولیس کی حفاظت میں دیکر ہافمین نے قسطنطنیہ کا سفر اختیار کیا اور برلن جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

(۴)

وہ پروانہ راہداری ترک افسروں کو دکھا کر استنبول کے ایک امریکن ہوٹل میں مقیم ہوا

ناشتہ سے فارغ ہو کر اس نے اخبار اُٹھایا تو اس کے سرورق پر جلی حروف میں یہ خبر درج تھی "مشہور امریکن کروڑ پتی کارخانہ دار فلیمنگ حرکتِ قلب اچانک بند ہو جانے سے فوت ہو گیا۔ موت کے واقعہ کی تفتیش ہو رہی ہے کیونکہ پولیس اور حکام کو کچھ شبہ ہے۔"

ہافمین کو اس خبر سے ایک اور تشویش دامنگیر ہو گئی۔ اس کے دماغ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ فلیمنگ کی زندگی کا خاتمہ دستِ قدرت کا کرشمہ نہیں بلکہ مکار انسانوں کے ہاتھوں کا کھیل ہے۔ اسے اس کی بھی تحقیقات کرنی چاہیے مگر اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے پیشتر اسے ہیریٹ کے باقی زیورات کا سراغ لگانا اور چور کو گرفتار کرنا از بس ضروری ہے۔ اس نے یہ کام انجام دینے کے لئے قیام استنبول کے زمانہ میں خفیہ طور پر تفتیش جاری رکھی۔ سلاطینِ قسطنطنیہ کو جواہرات کا جو دلی شوق تھا اس کے باعث مختلف دیار کے تاجروں کے دربار میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ہیریٹ کے زیورات لے کر چور نے مصنوعی تاجر کے نام سے سلطان المعظم تک رسائی حاصل کر لی ہافمین جو تاک میں لگا ہوا تھا اس نے قصر بلند کے انچارج افسر سے یارانہ گانٹھ کر سلطان کا نیاز حاصل کرنے کا موقع ڈھونڈھ نکالا اور جب چور مال مسروقہ ٹھکانے لگانے کی کوشش میں تھا تو اسے محل میں جا لیا۔ ترکی پولیس کی مدد سے قابو کر لیا۔

چونکہ ترکی اور دوسرے ممالک کے درمیان مجرموں کی حوالگی کا قانون رائج نہ تھا۔ اس لئے چور کو ترکی سے لے جانا ناممکن تھا۔ البتہ اس کے خلاف جرم کی سماعت قسطنطنیہ کی عدالت میں ہوتی۔ جہاں عیارانہ کوششوں کی بدولت مجرم کی بریت کے لئے خاص مواقع نکل آتے تھے۔ لیکن ہافمین کے زرخیز دماغ نے کار براری کیلئے امریکن سفیر متعینہ قسطنطنیہ کے ذریعہ دربار سلطانی سے اتنی رعایت حاصل کر لی کہ مجرم کو سزا دینے میں حکومت امریکہ کا بھی کچھ دخل ہونا چاہیئے۔ یہ بڑی اہم بات تھی جو ہافمین نے امریکن نے امریکہ اور ترکی کے تعلقات کے سلسلہ میں پہلی بار حاصل کی تھی

اس زمانہ میں ترکی عدالتوں میں مقدمات کی سماعت میں بڑی تاخیر ہوا کرتی تھی اسلئے سماعت کی تاریخ کئی ماہ بعد کی ڈالی گئی۔ ہافمین کو وہی آنا جانے کا موقع مل گیا۔ یہاں دوسرے ملزم کے خلاف مقدمہ میں امریکہ سے سرکاری تحریری ثبوت — گیا۔ اور ملزم کو دس سال بامشقت کی سزا دیدی گئی۔ اس سے فارغ ہو کر ہافمین نے امریکہ کا سفر فلیمنگ کی پُراسرار موت کے سلسلہ میں کیا جہاں اس نے اپنے چیف افسر پر اپنے شکوک ظاہر کر کے اسے اطمینان دلادیا کہ فلیمنگ کی موت کی حقیقت معلوم کرنے کی خاطر اس کی لاش قبر سے نکلوائی جائے اور اس کی ہڈیوں اور خاک کا کیمیاوی تجزیہ کرایا جائے اسے یقین ہے کہ اس کا اصل راز منکشف ہو جائیگا۔

(۵)

فلیمنگ کی موت کا واقعہ نئے مرحلہ میں داخل ہو گیا۔ لاش کے تجزیہ کی خاطر ملک کے نہایت قابل ڈاکٹروں کا بورڈ مقرر کیا گیا۔ کامل چھان بین کے بعد رپورٹ کی گئی کہ موت کا موجب ایک ایسا زہر ہے جو تمام رگ ریشہ میں سرایت کر کے حرکتِ قلب بند کر دیتا ہے۔

مقدمہ باضابطہ طور پر شروع ہوا۔ ماہر ڈاکٹروں کی شہادتیں ہوئیں اور عدالت سے نہ صرف زیر سماعت ملزم بلکہ اس کے رفیق کار کو بھی مرتکب تجویز کیا گیا۔

ہافمین نے فراغت پانے کے بعد پھر یورپ کا سفر اختیار کیا اور ہیریٹ کے مصنوعی عیار خاوند اور اس کے دونوں آلہ کار جرائم پیشہ کے خلاف وہی آنا اور قسطنطنیہ میں مقدمات کی سماعت شروع کی گئی اور دونوں میں نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔

دوران سماعت میں ہیریٹ کو جو نئی باتیں معلوم ہوئیں اُن سے اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اسے یقین ہو گیا کہ رچرڈ اس کا نہیں بلکہ اس کے زیورات وجواہرات کا طالب تھا اور یہ کہ وہی ہافمین جس کی محبت کو اس نے ٹھکرا دیا تھا، عاشق صادق تھا۔ رچرڈ اور اس کے دونوں شریک جرم مردوں اور عورت کے لئے سزائے موت تجویز کی گئی اور دوسرے لوگوں کو عبرت سکھانے کی خاطر وی آنا والے مجرم کو شارع عام پر پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا لیکن قسطنطنیہ والے مجرم کو اس سے زیادہ ہولناک سزا کا نشانہ بنایا گیا ترکی میں جو قانون شرع اسلام پر مبنی تھا اس کی تعمیل میں مجرم کے ہاتھ کہنیوں تک قطع کئے گئے اور پاؤں ٹخنوں تک تراشے گئے۔

اس کا سر شہر کے صدر دروازے پر آویزاں کیا گیا اور دھڑ شہر سے باہر میدان میں پھکوا دیا گیا جہاں وہ لقمۂ زاغ وزغن بنا۔

ان انوکھے مقدمات کی کیفیت نہ صرف یورپ کے اخبارات میں بلکہ دنیا کے باقی براعظموں کے جرائد میں بھی شائع کی گئی اور اس سے موسومہ دُنیا میں نہایت زبردست سنسنی اور تہلکہ کا ظہور ہوا۔ ہفتوں تک ان کا چرچا لوگوں کی زبانوں پر رہا۔

(۶)

مقدمات کے طے پانے کے بعد ہافمین اور


BALANCE
AND THE BALANCE WHEEL
بیلنس اور بیلنس سپرنگ
یہ گھڑی کی مشینری کے اہم پُرزے ہیں۔ بالکل درست وقت تبھی ممکن ہو سکتا ہے جبکہ بیلنس سپرنگ کی طاقت درست تناسب پہ وزن رکھتی ہو۔ ویسٹ اینڈ واچ میں یقینی طور پہ یہ تناسب اور درستی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے اہم پُرزے طرز جدید کے مطابق سائنٹفک اصولوں پر دُنیا کے ماہر گھڑی سازوں کے ذریعے بنائے جاتے ہیں۔ اس کا میٹیریل بہترین اور کاریگری کا نمونہ ہے۔ اور اس کی دیر پائی اور درستی کی گارنٹی کرتا ہے۔
سیکنڈس مینیچر ٹیلنگوار
ویسٹ اینڈ پیٹنٹ الوریانٹ سٹیل ۔۔ ۔۔ ۵۷/- روپے
رولڈ گولڈ دس سال کوالٹی ۔۔ ۔۔ ۶۰/- ″
۱۸ اکیرٹ سالڈ گولڈ ۔۔ ۔۔ ۱۰۷/- ″
سیکنڈس مینیچر آبلانگ
رولڈ گولڈ دس سال کوالٹی ۔۔ ۔۔ ۶۰/- روپے
۹ کیرٹ سالڈ گولڈ ۔۔ ۔۔ ۷۹/- ″
۱۸ اکیرٹ سالڈ گولڈ ۔۔ ۔۔ ۱۰۷/- ″
آپ اپنے فائدہ کی خاطر ویسٹ اینڈ واچ خریدیں
باتصویر کیٹلاگ طلب کرنے پر مفت ارسال ہوگا۔
ویسٹ اینڈ واچ کمپنی۔ بمبئی۔ کلکتہ
WEST END WATCH Co
BOMBAY
CALCUTTA

خودکشی یا قتل؟

از جناب قیسی رامپوری

میری ڈاکٹری ایک قتل کے مقدمہ میں کس قدر کام آئی ہے۔ لوگ تو اسکو صرف ایک واقعہ خودکشی سمجھ کر چپ ہو گئے تھے لیکن میں نے اپنی قابلیت سے بہت جلد معلوم کرا لیا کہ حامد کو قتل کیا گیا ہے۔

میں صبح ناشتہ کر کے اخبار دیکھ رہا تھا کہ دفعتہ زور زور سے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور کان سے لگا کر میں بولا "ہیلو"

"ہیلو مسٹر نصرت صاحب ہیں؟" آواز آئی۔

"ہاں میں نصرت ہی ہوں فرمائیے؟"

"میں سن رائیز ہوٹل کا منیجر ہوں۔ ہوٹل سے بول رہا ہوں۔ رات کو یہاں ایک صاحب نے خودکشی کر لی ہے۔ پولیس آپکا انتظار کر رہی ہے۔ براہ کرم تشریف لا کر خودکشی کا سرٹیفکیٹ دے دیجئے تاکہ لاش کو ٹھکانے لگایا جائے۔"

"ہیں! خودکشی! اچھا میں ابھی آیا" جلدی سے میں نے کپڑے پہنے اور فوراً کار میں بیٹھ کر سن رائیز ہوٹل پہنچا۔

سراغ رسانی یا تحقیق جرم میری لائن میں نہیں ہے۔ مگر مجھ کو بچپن سے تفتیش و تحقیق سے بیحد شغف ہے۔ ہوٹل میں پہنچتے ہی منیجر نے میرا استقبال کیا اور واردات والے کمرے میں لے گیا۔

"کل رات کو حامد صاحب کھانا کھا کر ذرا باہر ٹہلنے گئے دس بجے تک واپس آ گئے۔ رات کو بارہ ایک بجے تک پڑھتے رہتے جو ان کا معمول تھا۔ صبح جو کمرہ کھولا گیا تو وہ مردہ پائے گئے۔ آدمی بڑے اچھے تھے جب کبھی بھی آتے ہمیشہ ہمارے ہی ہوٹل میں قیام کیا اور انکی داد و دہش کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہوٹل کے ہر کارندے کو کچھ نہ کچھ دیتے ہی رہتے تھے" منیجر کے الفاظ پر میں نے بہت کم غور کیا۔ پہلے تو ان تماشائیوں کو وہاں سے بھگایا جو دروازہ پر جمع ہو گئے تھے۔ پولیس انسپکٹر اور دو کانسٹیبل کمرے میں موجود تھے جنہوں نے مجھے دیکھ کر سلام کیا۔ انسپکٹر چوبے بہت ہوشیار آدمی تھا۔ تجربہ کار اور گھاگ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں انکشاف جرائم سے دلچسپی رکھتا ہوں مجھے دیکھ کر کہنے لگا "آپ ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یہ کوئی قتل کا کیس نہیں ہے خودکشی کا واقعہ ہے" انسپکٹر چوبے سے میری کافی ملاقات تھی اور میں بھی اس کی قابلیت کا معترف تھا۔ میں نے مسکرا کر انکی طرف دیکھا۔ اسکے بعد لاش پر میری نظر پڑی۔ فرش پر ایک جسیم آدمی پڑا ہوا تھا جس کی آنکھیں بھیانک طریقے پر پھٹی ہوئی تھیں اور جسم اکڑا ہوا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ اسقدر غور سے۔ اس شخص نے زہر کھایا ہے۔ صاف ظاہر ہے" انسپکٹر چوبے نے زور سے کہا۔ میں لاش پر جھک گیا اور بغور اسکا معائنہ کرنے لگا۔ واقعہ تو یہ ہے۔ یہ کھلا ہوا زہر خوری کا کیس نظر آ رہا تھا۔ مردہ کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ چہرے کے عضلات تنے ہوئے تھے۔ اور جسم اکڑ گیا تھا۔ منہ سے نیلا نیلا پانی بہہ رہا تھا انسپکٹر چوبے کی تحقیق صحیح معلوم ہوتی تھی۔ اس دوران میں مسٹر چوبے نہایت سرگرمی سے کسی شے کی تلاش میں مصروف ہو گئے تھے حتیٰ کہ چند منٹ بعد وہ فاتحانہ مسکراتے ہوئے کوئی شے ہاتھ میں لئے میرے پاس آئے۔

"دیکھئے۔ یہ ثبوت، زندہ ثبوت۔ یہ زہر کی شیشی حاضر ہے۔ کہئے اب کیا کہتے ہیں آپ؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے فخریہ انداز میں شیشی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ شیشی کے لیبل پر موٹے حرفوں میں زہر لکھا ہوا تھا۔ میں نے شیشی کو سونگھا۔ زہر ہی تھا۔

"لیکن مسٹر چوبے پوری شیشی ختم نہیں کی گئی معلوم نہیں اسکی کیا وجہ ہے۔ شاید زندہ رہنے کی آرزو جس وقت پیدا ہوئی ہو اور اس کا ہاتھ رک گیا ہو۔ مگر یہ زہر بہت ہی قوی الاثر معلوم ہوتا ہے" مسٹر چوبے نے کہا۔

"ہاں یہ بڑا ہی خطرناک زہر ہے۔ اس کی چند بوندیں انسان کے خاتمہ کے لئے کافی ہیں۔ اچھا میں لاش کو ذرا اور اچھی طرح معائنہ کر لوں" میں نے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اب آپ کس شبہ میں مبتلا ہیں ڈاکٹر صاحب۔ یہ صریح خودکشی کا کیس ہے زہر کی شیشی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ لاش کے منہ سے نیلا پانی جاری ہے۔ ہر شے پکار پکار کر زہر کا اعلان کر رہی ہے۔ آپ پھر بھی شک و شبہ میں مبتلا ہیں" مسٹر چوبے نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا حرج ہے انسپکٹر صاحب آئیے ذرا اچھی

طرح معائنہ کر لوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ زہر کا ثبوت ہمارے پاس موجود ہے لیکن میں ذرا واقعات کا بھی پتہ چلانا چاہتا ہوں۔ اچھا مرحوم کے واقعہ موت کے علاوہ کوئی شخص اور بھی ان کے متعلق کچھ جانتا ہے؟ میں نے منیجر سے پوچھا۔

"جی میں ہی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ مسٹر چوپڑے کافی دولتمند آدمی تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ سیاحی میں صرف کیا اسی لئے کہیں جم کر نہیں رہے۔ شملہ ان کو بہت پسند تھی اور اس کے ساتھ ہی ہمارا ہوٹل بھی۔ ان کے دوست احباب بھی یہاں کوئی نہیں ہیں۔ ایک روز فقنا سا ہی لیکن وہ کچھ نیچے درجہ کے لوگ ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ شملہ میں زیادہ قیام رکھتا ہوں۔ شملہ کے بنگلوں سے انکو بڑی انسیت تھی اور وہاں کی پہاڑی لڑکیوں پر تو گویا مرتے تھے۔ تھے بڑے رنگین مزاج انسان۔ وہاں کی لڑکیوں کے جسم کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ پہلے آئے تھے تو ان کے پاس میں نے پہاڑی دوشیزاؤں کے بہت سے فوٹو دیکھے تھے" منیجر نے کہا۔ میں نے لاش کی قمیص کے بٹن کھول کر سینہ کا معائنہ کیا جو تمام سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کلائی چوڑی اور مضبوط تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے بھینچی ہوئی مٹھیاں کھولیں ہتھیلیاں گداز، وسیع اور بعض جگہ سے بہت سخت تھیں۔ جیسی کہ اکثر شکاریوں کی ہوتی ہیں۔ اس شخص نے یقیناً محنت مشقت بھی کی ہوگی۔

"اس شخص نے ان ہاتھوں سے بہت سخت کام بھی کئے ہیں" میں نے لاش کا ہاتھ اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"جی اور ان ٹانگوں سے فٹ بال بھی کھیلا ہوگا اور ان ہونٹوں سے بیشمار بوسے بھی لئے ہونگے اور ان آنکھوں سے لاکھوں حسین مناظر بھی دیکھے ہونگے" مسٹر چوپڑے نے مذاق کے طور پر کہا۔

"مسٹر چوپڑے مذاق میں میرے فقروں کو نہ ٹالو۔ مجھے تو یہ کیس بڑا دلچسپ معلوم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دولتمند، زندہ دل اور عیاش طبع انسان کے خودکشی کرنے کے واقعات میرے علم میں بہت ہی کم آئے ہیں۔ اور یہ دیکھو تم نے لاش کی جیبوں کا بھی معائنہ کیا ہے؟ اس جیب میں پستول بھی موجود ہے۔ کیوں؟ نامعلوم کیوں وہ ہر وقت پستول جیب میں رکھنے کا عادی تھا۔ یہ چیز نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے۔ جو شخص باسانی پستول کے ذریعہ خودکشی کر سکتا تھا اس نے زہر کی تکلیف دہ اور دیرپا موت کا آخر کیوں انتخاب کیا؟ یہ ایک عجیب بات ہے یا نہیں؟" میں نے کہا۔

"کوئی ایسی عجیب نہیں۔ بہت سے لوگ خون دیکھ کر خوف کھایا کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بھی اپنا خون نہ دیکھ سکتا ہو" مسٹر چوپڑے نے کہا۔

"درست ہے لیکن زہر کی شیشی آپ نے الماری میں سے اٹھائی ہے جہاں وہ بحفاظت رکھی ہوئی تھی۔ عقل کام نہیں کرتی کہ مرنے والا زہر پی کر شیشی کو اسقدر احتیاط کے ساتھ واپس الماری میں رکھنے کی زحمت کیوں کر سکتا ہے۔ زہر حلق میں انڈیل لینے کے بعد اسکی بلا سے شیشی کا کچھ بھی حشر ہو وہ کیوں اور کس لئے اسکو سنبھال کر رکھنا پسند کرتا ہے۔ مسٹر چوپڑے یہ تو بڑا گہرا کیس معلوم ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"آپ اپنی سراغ رسانی سے باز نہیں آتے" مسٹر چوپڑے نے پریشان ہو کر کہا "صاف تو خودکشی کا واقعہ ہے آپ ناحق سر کھپائے جا رہے ہیں اس میں۔ جلدی سے سرٹیفکیٹ دیجئے تو ہم لاش کو ٹھکانے لگائیں" انسپکٹر نے کہا "ذرا صبر کیجئے" میں نے ان سے کہا۔ اسکے بعد منیجر سے مخاطب ہو کر بولا "کیا آپ کے علم میں ان کا کوئی دشمن بھی ہے؟ کوئی ایسا آدمی جس کو مرحوم کی موت سے دلچسپی ہو؟"

"میرے خیال میں متوفی کا کوئی دشمن نہ تھا۔"

"اگر آپکو قتل کا شبہ ہے تو آیئے میں آپ کی پوری معاونت کروں" مسٹر چوپڑے بھی اب اس کیس میں میری سرگرمی دیکھ کر دلچسپی لینے لگے تھے۔

"میں خواہ مخواہ رائی کو پربت نہیں بنانا چاہتا مسٹر چوپڑے لیکن پھر بھی کوئی بات ضرور ہے کہ یہ کیس میری دلچسپی کو جذب کر رہا ہے۔ منیجر صاحب کیا آپ میرے ایک سوال کا جواب دینگے۔ کیا متوفی کو سانپوں سے ـــ ہاں سانپوں کی پرورش سے کچھ شغف تھا؟"

"سانپ؟" منیجر نے حیرت سے پوچھا۔

"سانپ؟" مسٹر چوپڑے نے منہ بنا کر دریافت کیا۔

"ہاں ہاں سانپ۔ کیا اسکے شناساؤں میں کوئی سپیرا بھی ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ متوفی سیاحانہ زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کے دوست بھی عجیب و غریب قسم کے انسان ہوتے ہیں" میں نے کہا۔

"نہیں صاحب۔ میں نے آجتک متوفی کے ساتھ کسی سپیرے کو نہیں دیکھا" منیجر نے کہا۔

"اچھا آپ کے ہوٹل میں کوئی دیہاتی قسم کا کوئی انسان مقیم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جناب عالی ہمارا ہوٹل شرفا کے قیام کیلئے ہے دیہاتیوں کیلئے نہیں" منیجر نے خفگی سے کہا۔

"بیشک بیشک۔ آپ برا کیوں مان گئے۔ اگر میرا ذاتی مکان نہ ہوتا تو میں خود بھی ہمیشہ آپ کے ہوٹل میں اپنا قیام رکھتا" میں نے ہنسکر کہا "اچھا ذرا مجھسے ہاتھ تو ملانا" منیجر نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے مصافحہ کے تمام زاویوں کا اپنی ہتھیلی پر اچھی طرح خیال رکھا۔ میں نے خوب زور سے اسکا ہاتھ کھینچا۔ اس نے منہ بنایا۔ لیکن اسوقت میں اسکے منہ کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اپنی اور اسکی ہتھیلی کے

اتصال پر غور کر رہا تھا - وجہ یہ تھی کہ لاش کی ایک ہتھیلی پر بیٹھ دو مہین مہین سے نشان سے دکھائی دیتے تھے جیسے کوئی چیز چبھ گئی ہو - جو صاف نظر نہیں آ رہے تھے اور ان پر کسی سوجن کی علامت بھی نہیں تھی - کیس دلچسپ ہوتا جا رہا تھا۔

"کیا مرحوم کے پاس شب کو کوئی آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں - میں نے ان کو تنہا اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا - دراصل انہوں نے مجھ سے اپنے کمرے کی چابیاں مانگیں اور اندر داخل ہو کر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔"

"پھر آپ کو انکی موت کا علم کس طرح ہوا؟"

"انکے کمرے میں رات بھر روشنی ہوتی رہی - صبح جو چوکیدار جو اس طرف سے گذرا تو اس نے دیکھا کہ اب تک روشنی ہو رہی ہے - دروازہ کھٹکھٹایا - جواب نہ آنے پر میں نے اسکو کھلوایا تو واقعہ کا علم ہوا۔"

"دروازہ اندر سے مقفل تھا اور چابی اس میں لگی ہوئی تھی" مسٹر جوپلے نے اپنی تفتیش بیان کی۔

"اچھا اور وہ دروازہ؟" میں نے متوفی کے سرہانے والے دروازہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "یہ کبھی استعمال نہیں کیا جاتا ہے بلکہ ہمیشہ بند ہی رہتا ہے - وجہ یہ ہے کہ اسکی چابی کھو گئی ہے یہ پیچھے زینے پر کھلتا ہے جو تا مقفل ہے - اسلئے اسکے متعلق کوئی اندیشہ بھی نہیں ہو سکتی۔"

میری سراغ رسانی کی حس تند ہوتی جا رہی تھی اور میں اسکو واقعہ خودکشی سمجھنے سے انکار کرتا جا رہا تھا - مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اس شخص کو قتل کیا گیا ہے - مگر اب تک کسی قیاس کی چول نہیں بیٹھ رہی تھی - آخر میں نے پھر اپنے اسی شبہ کو بیان کیا۔

"کیا تم کو تحقیق معلوم ہے کہ متوفی اپنے ساتھ کوئی سانپ نہیں رکھتا تھا؟" منیجر میرے ان سوالات سے کچھ تنگ سا آگیا تھا - وہ مجھے پہلے درجہ کا احمق سمجھنے لگا تھا "حضرت آج تک تو میں نے کسی بھلے آدمی کو سانپ پالتے دیکھا نہیں ہے چہ جائیکہ وہ انکو ہوٹلوں میں بھی لئے پھرے۔"

"اچھا اچھا جانے دو - سانپ کے تصور سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکو خوف معلوم ہونے لگتا ہے - یہ تو بتائیے کچھ چوری تو نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں - متوفی کی جیب میں تقریباً چھ سو روپے کے نوٹ ہونگے وہ بدستور موجود ہیں اور ناول کے اندر ایک دس روپیہ کا نوٹ رکھا ہوا تھا وہ بھی ویسا ہی اب تک موجود ہے۔"

"ناول کے اندر؟ ناول کیسا؟" میں نے حیرانی سے دریافت کیا۔

"مرحوم رات کو ناول پڑھ رہے تھے - جس کا ایک صفحہ کچھ مڑ گیا ہے جیسے کسی خوفزدہ انسان کے ہاتھ میں کوئی شے مڑ جاتی ہے۔"

"خوب - خودکشی کرنے والوں کو مرتے دم تک حسن و عشق کے قصے پڑھتے ہم نے آج ہی پایا ہے کیا مسٹر جوپلے اب بھی آپ اس کیس کو محض زہر کے ذریعہ واقعہ خودکشی سمجھتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"بیشک - آپ نے میرے دل میں بھی کچھ شکوک سے پیدا کر دئے ہیں" انہوں نے جواب دیا۔

"اچھا منیجر صاحب آپ سے ذرا ایک بیہودہ سا سوال کرتا ہوں - معاف کرنا میرا مقصد آپکے ہوٹل کو رسوا کرنا نہیں ہے بلکہ اس کیس کو انتہا تک پہنچانا ہے" میں نے کہا۔

"فرمائیے فرمائیے" منیجر نے کسی قدر گھبراہٹ سے کہا۔

"آپ کے ہوٹل میں مسافر اپنے قیام کی راتوں کو رنگین تو نہیں بناتے ہیں؟"

"اوہ ---- اچھا ---- جی ---- جی یہ یہاں قطعی ممنوع ہے لیکن بعض دولتمند اور سر پھرے مسافر ہمارے قوانین کو توڑ جاتے ہیں۔"

"ان میں سے یہ متوفی حامد بھی ہوگا؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں - پرسوں حامد کے لئے ایک نوعمر اور بہت ہی خوبصورت فنکارہ یہاں لایا گیا تھا جس نے اپنا نام گنگا بتایا تھا" منیجر نے کہا۔

"کب؟ پرسوں؟ خوب خوب - آپنے اس کو دیکھا تھا؟ ذرا اسکا لباس و حلیہ تو بیان کیجئے" منیجر نے اسکا حلیہ وغیرہ انسپکٹر کو لکھوا دیا۔

"آپ بھی کمال ہی کرتے ہیں ڈاکٹر - کیا ایک آوارہ اور غریب لڑکی حامد کو زہر دے سکتی تھی؟ نہیں جی یہ محض واقعہ خودکشی ہے" انسپکٹر نے مایوسی میں کہا۔

"ٹھہریئے - ابھی آپ میری رائے سے اتفاق کر چکے ہیں - میں اب اتنے جلد آپ کو اپنا خیال تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا - آپ فوراً دور دور کے ریلوے اسٹیشنوں کی پولیس کو اس لڑکی کے حلیہ سے بذریعہ تار مطلع کر دیجئے کہ وہ کہیں نظر آئے تو فوراً یہاں ہم کو اطلاع دی جائے اور اس لڑکی کو روک لیا جائے - لیکن اسطرح روکا جائے کہ اسکو مطلق یہ شبہ نہ ہو کہ پولیس نے اس پر نگرانی قائم کی ہے - لاش کی ابھی تجہیز و تکفین نہ کی جائے - اس کمرے کو مقفل کر کے پولیس کا پہرہ قائم کر دیجئے" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

میں دن بھر کے بعد تھک کر اپنے مکان پر آ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

رات کے نو بجے ہونگے کہ مسٹر جوپلے گھبراتے ہوئے میرے پاس آئے اور ایک تار میز پر رکھ کر بولے "لیجئے حضرت ایک اسی حلیہ کی لڑکی الہ آباد میں دیکھی گئی ہے جس سے قلی اور مزدور لوگ ہنسی مذاق کر رہے تھے - وہاں کی پولیس کا ایک سپاہی سادہ لباس میں جا کر اس لڑکی کو اپنے گھر لے گیا ہے - اسلئے اب کیا حکم ہے؟"

کیا آپ خوبصورت عورت سے نفرت کرتے ہیں؟

کیا خوبصورت عورت نفرت کرنیکے قابل چیز ہے؟

کیا کسی جوان عورت کا خوبصورت ہونا برا ہے؟

دنیا کے کسی مرد سے پوچھ لیجئے۔ ان تینوں سوالات کا اسکے پاس ایک ہی جواب ہوگا "نہیں"۔ خوبصورت عورت یقیناً ایک بیمثال تحفہ ہے۔ لیکن یہ سب جانتے ہیں۔ کہ اس تحفہ کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ خوبصورتی اور حسن زیادہ دیر نہیں رہا کرتے۔ مگر جتنی دیر بھی ٹھہرتے ہیں مرد کے دل کا طوفان بنے رہتے ہیں۔ اور مرد اس طوفان کو بڑی رغبت اور خواہش کیساتھ برداشت ہی نہیں کرتا بلکہ چاہتا ہے۔ کہ یہ طلاطم خیزیاں زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اسکے دل کی دنیا میں قیامت بپا رکھیں۔ تاکہ وہ انھی لہروں پر اندام تمناؤں اور حسرتوں کو ان سنہالی حسین سرزمیں پر بکھرا کے پھیلا دے۔ اور حسن کے دیوتا کے سامنے اپنے بکھرے ہوئے ... سرنگوں ہوجائے۔

مگر یاد رہے دنیا میں ہر چیز کا ایک دشمن ہے۔ ہر تصویر کا دوسرا رخ بھی ہوتا ہے۔ بہار کے لئے خزاں موجود ہے۔ حسن کیلئے بھی کوئی دشمن ضرور ہوگا۔ اور جبکہ عورت کا حسن — ؟ گلاب کے پھول سے زیادہ نازک جو معمولی گرم ہوا سے مرجھا جائے۔ اس لئے ہر عاقل اپنے دشمن سے آگاہ رہتا ہے۔

اگر آپ کسی خوبصورت عورت کے مالک ہیں

یہ آپ کی سرپرستی میں کوئی حسن معصوم جوانی کی منزلوں میں قدم رکھ رہا ہے۔ تو آپکا فرض ہے۔ کہ اس گلاب کے پھول کو گرم ہوا سے بچائیں عورت کے حسن کا سب سے بڑا دشمن ایک ہے۔ اور وہ لیکوریا کی بیماری ہے۔ یہ بیماری جس عورت کو ہو جائے سمجھ لو اس کی جوانی گئی۔ رنگ روپ گیا حسن اور خوبصورتی ختم ہوئی۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کا کہنا ہے کہ لیکوریا کی بیماری جسے سیلان الرحم اور پیڑو کی بیماری بھی کہتے ہیں۔ اور جسے بعض لوگ پانی کی بیماری بھی بولتے ہیں۔ خوبصورت اور جوان عورت کیلئے بہت ظالم چیز ہے۔ اس لئے ہر سمجھدار عورت کا فرض ہے۔ کہ وہ لیکوریا میں دیر تک مبتلا نہ رہے۔ بلکہ فوراً علاج کرے۔ ورنہ اسے اپنی چہرہ کی جوانی سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ کیونکہ عورت کے خفیہ جسم سے وقت بےوقت سفید پانی جو گرتا ہے۔ یہ جوانی کا جوہر ہوتا ہے۔ اور اسکے نکلنے سے عورت کے بدن میں کمر میں پیٹ میں ناف تلوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ اور ماہوار میں بھی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

بہت آسان علاج

اس بیماری سے تندرست ہونے کا بہت آسان طریقہ ہے۔ جسے لاتعداد ڈاکٹروں نے سالہا سال کے تجربہ کے بعد تسلیم کیا ہے۔ کہ عورت کی لیکوریا کی بیماری کیلئے ہندوستان میں سب سے زیادہ باثر علاج یہ ہے۔ کہ ایسی بیمار عورت کو صرف ایک شیشی دوا **"روک"** کھا لینی چاہئے۔ اس دوا کا اثر یہ ہے۔ کہ استعمال شروع کرنے کے ٹھیک تیسرے دن پانی گرنا بند ہو جاتا ہے۔ اور پوری شیشی استعمال کر لینے سے سیلان الرحم (یعنی لیکوریا) کی جڑ بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ اور عورت کے چہرہ پر دوبارہ جوانی کی سرخیاں دوڑ جاتی ہیں۔ بہترین دوا ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ پی بکس ۳۴ دہلی

کو خط لکھکر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیجئے۔ ایک شیشی دوا روک کی قیمت تین روپے ہے۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول خرچ ہوگا۔ اور اس معمولی سی رقم میں عورت کی خوبصورتی اور جوانی تباہ ہونے سے بچ جائیگی۔ کیونکہ لیکوریا کی بیماری اگر زیادہ دن تک رہی۔ تو عورت کے بدن سے جوانی کا جوہر نکل جائے گا۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۸

"بس چلئے۔ میں تیار ہوں۔ جبکہ میں نے آپ کو اور وہاں کی پولیس کو تکلیف دی ہے تو اب میرا بھی فرض ہے کہ میں بھی پولیس کی مدد کروں" چنانچہ ہم اسی وقت فرنٹیر میل سے رتلام روانہ ہوگئے۔ ہم دونوں نے بہت معمولی آدمیوں کے سے کپڑے پہن لئے تھے۔ صبح آٹھ بجے ہم رتلام پہنچ گئے۔ انسپکٹر چوبے نے ریلوے پولیس کے آفیسر کو اپنا تعارفی کارڈ دیا اور فوراً کارروائی شروع کر دی گئی۔ مجید خاں سپاہی کو چپکے سے بلوایا گیا جس کے گھر میں گنگا مقیم تھی۔ اس نے حسب تجویز دور سے اپنا مکان ہم کو دکھا دیا اور خود اندر چلا گیا۔ اسکے بعد ہم دونوں اسکو بے تکلفانہ آواز دیتے ہوئے گویا اسکے دوست ہیں اسکے مکان میں داخل ہوگئے۔

"یار مجید خان کچھ کھلواؤ بھوک لگ رہی ہے" میں نے سپاہی سے کہا۔

"تو بھلے مانس ہمیشہ بھوکا ہی آتا ہے۔ ابھی تو روٹی ہمارے ہاں پکی بھی نہیں ہے" اس نے بھی بے تکلفانہ کہا۔

"لاؤ جی تم تو بیڑی وبیڑی پلاؤ۔ یا بیڑی بھی نہیں ہے تمہارے گھر میں؟" مسٹر چوبے نے کہا۔

"ہاں ہاں بہت بیڑیاں۔ گنگا ذرا وہ بنڈل تو لانا" مجید خاں نے گنگا کو آواز دے کر کہا۔

ایک خوبصورت لڑکی جس کی عمر ۱۹، ۲۰ سال کی ہوگی اور جو اپنی جوانی کو دونوں ہاتھوں سے لٹانے کی وجہ سے فحش وبیحیائی کی تصویر نظر آ رہی تھی دالان میں داخل ہوئی۔

"ارے مجید کیا تم اپنی گھروالی کو لے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھائی یہ عورت اسٹیشن پر مزدوروں میں پھنسی ہوئی تھی انکے پنجے سے میں اس کو چھڑا کر یہاں لے آیا ہوں"

ہم نے دیکھا کہ گنگا نے اپنی چست صدری کی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی اور اس میں سے ہلاس کی چٹکی لے کر ناک میں چڑھائی۔

"اوہو۔ تم تمباکو بھی سونگھتی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔ وہ بے تکلفانہ مسکرا دی۔

"پیتی نہیں ہو؟" مسٹر چوبے نے بھی دریافت کیا۔

"ہمن تو سگار بیت پیوت ہیں" اس نے جواب دیا۔

"ہاں بھائی کیوں نہیں۔ اچھا مجید تم اسٹیشن پر سے جا کر ہمارے لئے جلدی سے چائے لاؤ۔ یار کیا چائے بھی نہیں پلواؤ گے؟"

"ضرور ضرور" مجید باہر چلا گیا۔

"کتنی سندر لڑکی ہے یہ گھنشام" میں نے گنگا کی موجودگی میں مسٹر چوبے سے کہا۔

"آج ہمارے پاس رہوگی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جو سرکار کی مرضی" اس نے بیباکانہ جواب دیا۔

"لاؤ تمہاری ڈبیہ دو۔ ہم بھی نسیا کو سونگھیں" میں نے کہا۔

"اوں ہوں۔ یا ہم کسو کو ناہی دیوت ہیں" اس نے جواب دیا۔

"گنگا تم کبھی بمبئی گئی ہو؟" مسٹر چوبے نے پوچھا۔

"بہت دنو ہوئے جو گئی تھی" اس نے کہا۔

"وہاں تو تم نے بہت سوں کو اپنی اس جوانی سے مار ڈالا ہوگا" میں نے کہا۔ دفعتہً وہ چونک سی پڑی۔

"ہوٹلوں میں تو اچھی کمائی ہو جاتی ہوگی تمہاری" مسٹر چوبے نے پوچھا۔

"نئی جی۔ ہمو ہوٹلاں میں نئی جاوت ہیں" اس نے جواب دیا۔

"کیوں جھوٹ بولتی ہو پرسوں ہی تو تم بمبئی کی ایک ہوٹل میں گئی تھیں" میں نے کہا۔ گنگا ایکدم سُن ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ اسکی آنکھوں سے خوف کے اثرات نمودار ہیں۔

"تو پولاس (پولیس) والے تو نئی ہو؟" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں تم کو پولیس کا کیا ڈر ہے؟" میں نے پوچھا "کیا تم وہاں کسی کو مار آئی ہو جو ڈرتی ہو؟" اسکے پیر ایکدم تھرا گئے۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے کو سنبھال سکی۔ جلدی سے اس نے اپنی ہلاس کی ڈبیہ نکالی اور اس بار ایک جھٹکے کے ساتھ اسکو کھول کر تمباکو سونگھی۔

"گنگا تم نے ہوٹل میں جا کر حامد نامی ایک آدمی کو مارا ہے۔ ہم تم کو پکڑنے آئے ہیں" مسٹر چوبے نے کہا۔

گنگا کا منہ فق ہوگیا۔ اس نے مڑ کر دروازہ کی طرف دیکھا اور پچھلے پیر نکل بھاگنا چاہا مگر میں دروازہ پر اس سے پہلے پہنچ چکا تھا۔

"اب بھاگنا بیکار ہے گنگا۔ بتاؤ تم نے اس آدمی کو کیوں مارا اور کس چیز سے مارا" میں نے کہا۔

"مو نے کسی کو نئی مارا بابوجی میں بے قصور ہوں۔ مو کو چھوڑ دو" اس نے خوف سے لرز کر کہا لیکن فوراً ہی وہ سکون پذیر ہوگئی اور اسکے جس ہاتھ میں ہلاس کی ننھی سی ڈبیہ تھی اسکو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"مول دیں۔ آج تمرے ساتھ رہونگی۔ لو ہاتھ ملا لو"

"گنگا تیرے اس جان لیوا مصافحہ کو میں سمجھتا ہوں۔ تو نے اسی سے غریب حامد کی جان لی ہے۔ اچھا یہ ڈبیہ مجھے دے چھوڑ" میں نے اسکی کلائی تھام کر اسکے ہاتھ میں سے ڈبیہ چھین لی۔ دوسرے لمحہ وہ میرے قدموں پر تھی۔

وہی جوان لڑکی کی عصمت لوٹنے کا قصہ، وہی انکو سبز باغ دکھانے کی کہانی۔ وہی بیوی بنانے کا وعدہ، اپنا پتہ۔ غداری، ہوسکاری کے بعد مرد کی طوطا چشمی، عورت کا انتقام سب کچھ وہی تھا جو آپ مدتوں سنتے چلے آئے ہیں ہاں زہر دینے کی ترکیب بہت ہی عجیب و غریب تھی جسکو معلوم کر کے مسٹر چوبے دنگ رہ گئے۔

پہاڑی لڑکی تھی اور آکثر جنگلی علاقوں میں نہایت ہی زہریلے سانپ پائے جاتے ہیں۔ گنگا نے سانپ کی کچلیوں کو نچوڑ کر انکا زہر ہلاہل اپنی ہلاس کی ڈبیہ میں بند کر رکھا تھا۔ اس چھوٹی سی ڈبیہ کے دو خانے تھے۔ نیچے کے خانہ میں ہلاس بھری ہوئی تھی اور اوپر کے خانہ میں یہ زہر تھا۔ اسکے ڈھکنے میں اُوپر کی طرف دو بہت ہی مہین نالیاں بالکل سوئی کی مانند ابھری ہوئی تھیں۔ ایک جھٹکے سے اُن میں زہر آجاتا تھا یہ نالیاں بہت آسانی سے بہت معمولی سی تکلیف سے انسان کے جسم میں چبھوئی جاسکتی تھیں۔ ان کو انسان کے جسم میں چبھانے کی آسان ترین و مہذب صورت مصافحہ ہی تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے حامد کی ہتھیلیوں میں بھی دو چھوٹے چھوٹے سوراخ دیکھے تھے گویا سوئی چبھ گئی ہو۔ وہ

اس ڈبیہ کی نالی کے ہی نشانات تھے۔ میں جو بار بار سانپ کا ذکر کئے جارہا تھا۔ تو میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ کسی دشمن نے حامد کو سانپ سے ڈسوا دیا ہے۔ زہر خوری کی تھیوری تو آپ پڑھ چکے ہیں غلط ثابت ہو چکی تھی۔ اب میری سمجھ میں فقط یہ آرہا تھا کہ متوفی کو سانپ نے کاٹا ہے۔ ہتھیلی پر سانپ بمشکل کاٹ سکتا ہے اسلئے یا تو وہاں کٹوایا گیا ہے یا کوئی اور بات ہے ؂

دفعتہً میرے خیال میں یہ بات آئی کہ جب ہتھیلی جیسی محفوظ جگہ پر سانپ نہیں کاٹ سکتا تو ہاتھ سے ہاتھ ملانے میں کسی ذریعہ سے زہر پہنچایا جاسکتا ہے۔ میں نے تجربے سے مصافحہ کر کے اسکا اندازہ لگا لیا تھا۔ اگر کوئی چھوٹی سی شے ترکیب سے ہاتھ میں رکھ کر کسی کی ہتھیلی سے اپنی ہتھیلی کو ملایا

جائے تو وہ کس کس مقام پر زیادہ متصل ہوگی نتیجہ ظاہر تھا۔ حامد کی ہتھیلی کا بھی وہی حصہ چھدا ہوا تھا جسکو کسی ایسی ترکیب سے مصافحہ کرنے سے چھیدا جاسکتا تھا ؂

گنگا انتقام لینے اسکے پاس گئی۔ اس نے ریوالور سے اسکو ڈرایا۔ اپنا حربہ بیکار ہوتے دیکھ کر گنگا نے ہر دو کے مصالحت کے لئے اس سے مصافحہ کی درخواست کی۔ حامد اس بیضرر اور آسانی سے بلا ٹلنے والے تدبیر سے مطمئن ہو کر اس سے مصافحہ کر بیٹھا۔ نتیجہ ہمارے سامنے تھا ؂

گنگا دو روز پیشتر حامد کی جنسی پیاس بجھا کر تیسرے روز چور دروازے سے داخل ہو کر اپنا انتقام لینے پہنچی تھی ؂

سفید بال تھے ۔ ایک ہفتہ میں سیاہ ہو گئے

بال کالا کرنیکی ۔ کھانے کی دوا

ایک نہایت ہی کامیاب ایجاد

سفید بالوں کو ہمیشہ کیلئے کالا کر دینا اور آئندہ کالا بال نکلنا اب بہت آسان ہو گیا۔ لگانیکا خضاب سفید بالوں کو صرف ایک ہفتہ کیلئے کالا کر سکتا ہے ۔ اور پھر سفیدی آجاتی ہے۔ لیکن تحقیقات کے بعد اب ایک ایسی عجیب و غریب ایجاد ہو گئی ہے ۔ جسکے کھانے سے سفید بال کالے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر کالے ہی رہتے ہیں کیونکہ بالوں کی جڑیں تک سیاہ ہو جاتی ہیں۔ اس دوا کا نام "کیشول" ہے۔ تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے ۔ کہ دوا کیشول کے صرف ایک ہفتہ استعمال کر لینے سے ہی سفید بالوں پر سیاہی پھیلنے لگتی ہے۔ اور پوری شیشی "کیشول" کی استعمال کرنے کا مطلب ہے کہ بال کالے بھی ہو جائینگے۔ اور آئندہ کالے ہی نکلیں گے۔

چار روپے میں تمام بال سیاہ ہو جائینگے دوا کیشول قطعی بیضرر ہے۔ عام طور پہ لوگ اسے کھانے کا خضاب کہنے لگے ہیں۔ اور یہ کسی حال میں استعمال کرنیوالے کو نقصان نہیں کرتا۔ دنیا میں اس سے بہتر خضاب شاید آپ حاصل نہ کر سکیں گے۔ ایک شیشی کیشول جو ایک ضرورت مند کے لئے قطعی کافی ہے۔ اس کی قیمت چار روپے دو آنے ہے۔

مینیجر زنانہ دواخانہ پی بکس ۲۴۳ دہلی

کو خط لکھکر دوا کیشول بذریعہ وی۔پی پارسل منگا لیجئے۔ پارسل پہ گیارہ آنے محصول خرچ ہوگا۔ اور اس معمولی رقم میں آپ اپنی ضرورت کا ایک لافانی تحفہ حاصل کر لینگے۔ کیونکہ اس دوا کے استعمال سے لگانے کے خضاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بال از خود کالے نکلنے لگتے ہیں۔ ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۹

صحرا نشین کی سرگذشت

جہاز نیلسن کا سرکاری سونا کس طرح لوٹا گیا تھا

از جناب منشی تیرتھ رام فیروزپوری

(۱)

خدا جانے اس کا اصلی نام کیا تھا۔ لیکن عرف عام میں وہ برمی کہلاتا تھا.... فقط برمی۔ وکٹوریہ کے شمال کی طرف جنگل میں اس کی سکونت تھی۔ جہاں اس نے بہت سی مرغیاں اور بکریاں پال رکھی تھیں اور بظاہر انہی پر بسر اوقات کا انحصار تھا۔

یہ شخص دراصل کون تھا؟ اس کا پورا جواب آپ کو پولیس کے روزنامچوں سے ملے گا۔ مختصر یہ کہ سنہ ۱۸۵۱ء میں وہ جزیرہ وان ڈیمن سے۔ جہاں اسکو انگلستان سے جلاوطن کیا گیا تھا بھاگ کر وکٹوریہ چلا آیا اور تب سے اسی جگہ ایک صحرا نشین کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اسکی ساری عمر خوفناک جرائم اور قتل و غارت کی ایک مسلسل تاریخ تھی۔ سالہا سال وہ جیلخانہ میں رہا۔ طرح طرح کی سزائیں بھگتیں۔ لیکن اب وہ کبر سنی اور ضعیفی کے ہاتھوں مجبور تھا تو سو چوہے کھانے کے بعد یہ گربۂ مسکین اب بی حجن بنی بیٹھی تھی۔

مجھ کو اس صحرا نشین کی ظاہری حالت پر بڑا رحم آتا اور اس لئے میں ہمیشہ اس کے ساتھ محبت اور دلداری سے پیش آیا کرتا تھا۔ اس آمد و رفت اور میل جول کی وجہ سے برمی میرا دوست بن گیا اور گاہ بگاہ مجھ کو اپنا خیر خواہ اور قابل اعتبار سمجھ کر عہد شباب کے حیرت انگیز حالات سنایا کرتا تھا۔

ایک روز اس نے مجمل طور پر ایک سونے کا بھرا ہوا جہاز لوٹنے کا حال مجھ سے بیان کیا جس سے میرے کان کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ جیسا ان ناظرین کو جو حالات تاریخ سے دلچسپی لیتے ہیں یاد ہوگا۔ نیلسن نام کا ایک جہاز جو آسٹریلیا سے بے انداز سونا لیکر عازم انگلستان ہوا رستہ میں لوٹا گیا تھا۔ لیکن پولیس کے کارکن لاکھ سر پٹکنے پر بھی آج تک معلوم نہیں کر سکے کہ غارت گری کا یہ راستہ کن حالات میں پیش آیا تھا۔ برمی کے مختصر بیان سے میری تسکین تو کیا ہوتی۔ الٹا میری دلچسپی کئی گنا بڑھ گئی۔ میں نے سارے حالات مفصل جاننے کے لئے اصرار کیا اور برمی نے آخر کار مجھ سے اس بات کا حلف لیکر کہ یہ راز اسکی زندگی میں ہرگز فاش نہ ہو۔ سارے واقعات مجھ سے بیان کئے۔ اس حلف کے مطابق میں بھی آجتک خاموش تھا۔ لیکن اب چونکہ برمی کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اپنے افعال کی جواب دہی کیلئے ایک ایسی عدالت کے روبرو پہنچ چکا ہے۔ جس سے کوئی بات چھپائی نہیں جا سکتی۔ اس لئے میں نے بھی رازداری کی ضرورت نہ سمجھ کر سارے واقعات جس جس طرح پیش آئے تھے۔ قلمبند کر دیئے ہیں۔ مخفی نہ رہے کہ اس بیان کے الفاظ شروع سے آخر تک برمی کے ہیں۔ میں نے صرف مصلحت یا تسلسل قائم رکھنے کی ضرورت کے خیال سے کہیں کہیں کچھ تبدیلی کر دی ہے۔

(۲)

نیلسن اور ایڈمیرل دو انگریزی جہاز تھے۔ جن میں آسٹریلیا سے سونا بار کیا گیا تھا۔ یہ جہاز ملبورن کی بندرگاہ سے لندن کو روانہ ہونے والے تھے۔ ایڈمیرل ہماری لاعلمی میں نکل گیا اور نیلسن پر ہم نے حملہ کر کے اسکا سونا لوٹ لیا مگر جسقدر ہم کو امید تھی اس قدر سونا اس جہاز سے نہ ملا کیونکہ صرف ۳۰ ہزار پونڈ (۴½ لاکھ روپیہ) کا سونا نیلسن سے برآمد ہوا جو ہم بیس آدمیوں میں تقسیم کیا گیا۔

پولیس ہم میں سے صرف پانچ آدمیوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئی اور ان میں سے بھی ایک شخص بعد کو بھاگ گیا اس واقعہ کو ۵۰ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ یقیناً نیلسن سے تعلق رکھنے والے ملاح۔ قزاق قیدی اور پولیس مین قریب قریب تمام مر چکے ہوں گے اور جو شاذ و نادر کوئی باقی ہوگا وہ بھی عنقریب پردہ عدم میں چھپ جائے گا۔ اسلئے کہ اس وقت ہم سب کی عمریں تخمیناً ۷۰ یا ۸۰ سال سے کم نہ ہوں گی [illegible] ہر حال اب اس واقعہ کے بیان کر دینے میں چنداں خوف نہیں۔ میں اس معاملہ کو ابتدا سے شروع کرتا

ہوں- اور یہ اسی طرح ہوا کہ جب مقام بلارٹ میں محکمہ پولیس میری خطرناک کارروائیوں سے تنگ آ کر مجھے دق کرنے لگی تو میں ۱۸۵۸ء کے موسم خزاں میں مقام جیلانگ چلا آیا ایک روز صبح کے وقت میلاپ سٹریٹ سے گزر رہا تھا کہ باریک بل لین کے قریب یکایک ایک شخص مجھ سے دوچار ہوا- یہاں اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا- کہ جرائم پیشہ لوگ اپنے ہم مشربوں کو فوراً پہچان لیتے ہیں اور یہ لوگ منٹ بھر میں ایک دوسرے کے ہمدرد اور ہمراز بن جاتے ہیں ـــ شخص مذکور نے مجھے دیکھ کر کہا کہ "اگر ذرا ہمت کرو تو تم مالا مال ہو سکتے ہو" میں اپنے دوست کا مطلب سمجھ گیا اور اسی شوق سے اصلیت دریافت کرنے لگا اس نے کہا یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں بلکہ آج شام کو فلاں مکان میں آنا وہاں ہم مفصل گفتگو کر کے مناسب تجویز کامیابی کی نکالیں گے" میں تو بچپن سے ایسی باتوں کا شائق تھا- شام ہوتے ہی پتہ معلومہ پر جا پہنچا- اور ایک درجن آدمیوں کو وہاں موجود پایا- بعض میرے شناسا بھی تھے- ایک طویل القامت سانولے رنگ کا آدمی پارٹی کا سرغنہ تھا- اسکی شہرت میں نے ہوبرٹ ٹاؤن میں سنی تھی مگر اس سے پہلے اسکو کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا- اس نے جہازات ایڈمیرل اور نیلسن کا مفصل حال سنا کر کہا کہ "یہ جہاز لندن جانے والے ہیں اول الذکر جہاز میں ۷۰ ہزار اور آخر الذکر میں پچاس ہزار اونس سونا ہے" کثرت رائے نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے نیلسن پر حملہ کیا جائے کیونکہ اس پر ملاح بہت تھوڑے ہیں اور کامیابی کی زیادہ امید ہے- واضح ہو کہ یہ جہاز دو مختلف بندرگاہوں میں لنگر انداز تھے- جن میں چند میل کا فاصلہ تھا- ہم نے کل اکیس آدمیوں کا ایک معتبر گروہ بنا لیا اور کئی روز تک تجویزیں کر کے دو ہوشیار آدمیوں کو ضروری اطلاع بہم پہنچانے پر متعین کیا- جب کبھی ہم ایک دوسرے سے ملتے تو اپنے ارادوں کا تذکرہ کر کے بہت خوش ہوتے کہ اگر کام راس آگیا- تو بہت جلد بڑی دولت ہاتھ آجائے گی ٭

ہفتہ بھر کے بعد مجھے ہدایت ہوئی کہ دو آدمیوں کو ہمراہ لیکر ملبورن پہنچوں اور وہاں سے خاص تاریخ اور خاص وقت پر ولیمز ٹاؤن میں متعینہ موقع پر حاضر ہوں- چنانچہ میں نے اس حکم کی تعمیل کی اور ملبورن جا کر یکم اپریل کو رات کے گیارہ بجے ایک مختصر گاؤں کے قریب مقررہ جگہ پہنچا ٭

یہاں ہمارے آٹھ آدمی معہ لیڈر کے موجود تھے- باقی گیارہ آدمی بھی اسی دم آنیوالے تھے- ہمارے سرغنہ یا کپتان نے ہم کو ضروری اسلحہ سے بخوبی مسلح کر دیا- اور سیاہ رومال چہروں پر باندھنے کو دئے- اب ہم تیار ہو کر بڑی احتیاط کے ساتھ ساحل بحر کی طرف بڑھے پانی کے قریب جا کر دیکھا تو ہمارے لئے ایک کشتی پہلے سے یہاں منتظر تھی- تھوڑی دیر بعد ہمارے گیارہ آدمی بھی ایک سمت سے کشتی میں نظر آئے- انہوں نے کنارہ کے نزدیک کشتی ٹھہرا دی اور خشکی پر آگئے ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ایڈمیرل اسی روز شام کو لندن کی جانب روانہ ہو گیا- اور دوسرا جہاز نیلسن وہ رات گذر جانے پر بہت سویرے ۹ بجے روانہ ہوگا- اس کے علاوہ یہ بھی تحقیق ہوا کہ جہاز نیلسن کا کپتان معہ چند ملاحوں اور کسی قدر سونے کی مقدار کے ابھی خشکی پر ہے اور اس کا ارادہ عین روانگی کے وقت جہاز پر سوار ہونے کا ہے- مختصر گفتگو کے بعد قرار پایا کہ ڈیڑھ بجے رات کے قریب جس وقت جہاز والے سو جائیں حملہ کر دیا جائے- ہمارے سردار نے سختی سے اس بات کی تاکید کر دی تھی کہ جہاز والوں کے ساتھ حتی الوسع تشدد نہ کیا جائے- ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ ان کو قابو میں لے کر جس قدر سونا جہاز پر ہو اس پر قبضہ کر لیا جائے- حتی کہ اشد ضرورت کے بغیر فائر کرنے کی بھی ممانعت تھی- کیونکہ اس صورت میں ساحل کے رہنے والوں کے خبردار ہونے کا احتمال تھا- جس سے ہماری مشکلات کم ہونے کی بجائے بہت زیادہ بڑھ جائیں ٭

غرض سب تیاری مکمل کرنے کے بعد ٹھیک سوا بجے ہماری کشتیاں جہاز نیلسن کی طرف روانہ ہوئیں- کہتے ہیں سونے میں بڑی طاقت ہے اپنی جماعت کے بارہ میں میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سونا حاصل کرنے کے خیال سے ہی ہمارے اندر دس گنا طاقت پیدا ہو گئی تھی- ہر ایک آدمی اسکو پانے کے لئے جان دینے اور مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا- جہاز کے قریب پہنچکر کشتیاں ٹھہرا دی گئیں ہم نے تین آدمیوں کو ان کی نگرانی کے لئے پیچھے چھوڑا اور باقی سب دبے پاؤں جہاز پر چڑھ گئے ٭

صحن جہاز خالی پڑا تھا حتی کہ لنگر کی حفاظت کے لئے بھی کوئی آدمی موجود نہ تھا میرا خیال ہے اہل جہاز کو اسی طرح کا وقوعہ پیش آنے کا بعید تر گمان نہ ہوگا- غرض ہم میں سے کچھ لوگ بغیر کسی مزاحمت کے جہاز کے اگلے حصہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اسجگہ ایک قصائی ایک بڑھئی اور دو ملاح

عورت کی قیمت

(ایک ہندوستانی عورت کا نقطۂ نظر)

ہندوستان کے مرد کی قیمت تو سماج نے خود مقرر کر دی۔ وہ عورت کا حاکم بن گیا۔ اور اُسے ہر قسم کا اختیار بھی مل گیا۔ وجہ یہ تھی۔ کہ سماج کی لگام مرد کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے جدھر گھمانا چاہا۔ سماج گھوم گیا اس لئے مرد نے سوسائٹی میں اپنے لئے پوزیشن حاصل کر لی۔ اور وہ خود ساختہ حاکم بن بیٹھا۔

مگر بیچاری عورت ــــ دیکھتی رہ گئی۔ کچھ نہ کر سکی۔ اس کی قسمت کا فیصلہ مرد کے ہاتھ تھا۔ خود غرض مرد کے ہاتھ جس نے من مانی اپنی میں جو چاہا کر ڈالا عورت کو جتنا گرا سکا گرا یا۔ اور غریب عورت کو اس خود ساختہ عدالت میں کچھ کہنے کا موقعہ بھی نہ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عورت "بچہ بنانے کی فیکٹری" اور مرد کے مال اسباب کی چوکیدار بنکر رہ گئی۔ اُسے اپنی زندگی پر بھی کوئی اختیار نہ رہا۔ وہ بھی سماج نے مرد کی ملکیت قرار دیدی۔ اور ان سب باتوں کا انجام یہ ہوا۔ کہ مرد اپنی خود مختاری کے زعم میں عورت کے دکھ درد سے بھی لاپرواہ ہوگیا

ہندوستانی عورت نے یہاں بھی صبر سے کام لیا۔ اور دنیا کو دکھا دیا کہ مشرقی عورت صبر کی دیوی ہے۔ برداشت کا ایک مجسمہ ہے۔ جو شوہر کے ظلم و ستم اور قید و بند کے باوجود مرد کیلئے ہر حال میں راحت کا سبب بنی رہتی ہے۔ اور اتنی تلخیوں کے باوجود وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ لیکن ان قربانیوں پر بھی وہ تکلیف کا شکار بنی رہتی ہے۔ آج کتنے گھرانے ایسے دکھائے جاسکتے ہیں جہاں کی عورتیں خوش و خرم ہوں اور تندرست ہوں۔ میرا جواب یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر گھر میں جہاں عورتیں رہتی ہوں۔ ایک خاص افسوسناک تن نمودار ہوتا ہوگا۔ جب کوئی عورت تڑپ رہی ہو اور اس کا مرد تفریح کے لئے جانے کی تیاری کر رہا ہو۔

ہندوستان کی اسّی فیصدی جوان عورتیں ماہواری کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ اور انہیں ہر مہینہ کئی کئی دن سخت درد اور بے چینی کے ساتھ کاٹنے پڑتے ہیں مگر کتنے مرد ہیں جو اپنی عورت کی اس تکلیف پر اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوں؟ حالانکہ وہ اگر چاہیں۔ تو چند پیسے خرچ کر کے عورت کو اس تکلیف دہ بیماری سے نجات دلا سکتے ہیں۔ اگر کسی عورت کو ماہواری تکلیف سے آتی ہو۔ یا زیادہ یا کم یا رک رک کر آتی ہو۔ یا بہت درد کے ساتھ ہوتی ہو۔ اور ان دنوں میں اسکی کمر پیٹ اور پنڈلیوں وغیرہ میں درد رہتا ہو۔ تو اسکا بہت آسان علاج ہے۔ ایسی بیمار عورت کو صرف ایک شیشی دوا "**کورس**" کھلا دینے سے ماہواری ایام بالکل آسانی کیساتھ ہر ماہ بغیر کسی درد کے صحیح مقدار میں باقاعدہ ہونے لگتے ہیں۔ اور ماہواری کی ہر خرابی دور ہوکر ہر مہینہ باقاعدگی کیساتھ آنے لگتی ہے۔ یہ دوا جس کا نام "کورس" ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ پی بکس ۲۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھکر بذریعہ وی پی پارسل منگائی جا سکتی ہے ایک ہی شیشی سے عورت کی ماہواری کی سب خرابیاں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ ایک شیشی کورس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ خط لکھکر منگا لینی چاہیئے۔ محصول پارسل پر صرف سات آنے خرچ ہوں گے۔ اور اس طرح معمولی سی رقم سے آپ کی بے زبان عورت ہر ماہ کی مصیبت سے نجات حاصل کر لیگی۔ اور پھر ہر مہینہ باقاعدہ بغیر درد اور تکلیف کے ماہواری سے فارغ ہو جایا کرے گی۔

یہ دوا تقریباً پندرہ سال سے ہندوستان میں مشہور ہے۔ اور اب تو لاتعداد حکیم اور ڈاکٹر اپنی مریض عورتوں پر صرف اسی دوا کو استعمال کراتے ہیں۔ کیونکہ اس کی صرف ایک شیشی سے ماہواری باقاعدہ آنے لگتی ہے۔ اور درد وغیرہ اور بے قاعدگی کی تمام تکالیف ختم ہو جاتی ہیں۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۸

بے خبر پڑے سوتے تھے ہم نے فوراً ہی اُنکو اپنی حراست میں لے لیا - بعد کے حالات سے معلوم ہوا کہ جہاز کے خانساماں کی آنکھ پہلے کھل گئی تھی اور وہ چپکے سے جہاز کے پہلو میں ایک رستے کے ساتھ چمٹ گیا تھا - اس آدمی نے بعدازاں ہمارے اس جہاز سے رخصت ہو جانے پر اُن لوگوں کو کھولا تھا جن کی مشکیں باندھ کر چھوڑ آئے تھے خانساماں بڑا خوش نصیب تھا کہ کسی کی نگاہ اس پر نہ گئی ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ روانگی کے بعد بھی ہمارا کوئی آدمی اسکو دیکھ لیتا تو یقیناً گولی مار دیتا ؛

میں چند آدمیوں کے ساتھ جہاز کی ایک کوٹھڑی میں داخل ہوا جہاں ایک ملاح پڑا سوتا تھا میں نے آگے بڑھ کر اسکا ہاتھ پکڑا اور سختی سے ہلاتے ہوئے اسکو جگانے کی کوشش کی لیکن وہ آنکھیں کھولے بغیر ناراضگی کے لہجہ میں بڑبڑاتا ہوا کہنے لگا "جانے دو کون ہے یہ اس وقت دل لگی کر رہا ہے جاؤ مجھے سونے دو"؛

یہ حالت دیکھ کر میں نے اپنے پستول کی نالی اسکی کنپٹی کے ساتھ لگا دی اور کہا ذرا ہوش کے ناخن لو یہ دل لگی نہیں ہم لوگ جہاز کا سونا لینے کو آئے ہیں"؛

اب اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور انہیں ملتے ہوئے ہماری طرف دیکھ کر سہمی ہوئی آواز سے کہنے لگا "صاحبو میرا اس جہاز سے کوئی تعلق نہیں بلکہ میں ایک دوسرے جہاز رائل چارٹر کا سیکنڈ افسر ہوں"؛

ہم نے اُسے اپنے دو آدمیوں کے حوالے کیا اور آگے بڑھ کر چیف افسر کو جا پکڑا - جب اُس غریب نے متحیر ہو کر پوچھا "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو" تو ہمارے سردار نے مطمئن لہجہ میں کہا "ہم اس جہاز کا سونا لینے آئے ہیں مہربانی سے چپ چاپ ہمارے حوالہ کر دو - ورنہ ہم یقینی طور پر تمہارا بھیجا اڑا دیں گے"؛

افسر مذکور نے سنبھل کر جواب دیا کہ جتنا کچھ سونا اس جہاز میں تھا وہ سب جہاز ایڈیلیڈ پر بار کر کے روانہ کر دیا جا چکا ہے - اب ہمارے پاس ایک رتی سونا بھی موجود نہیں"

لیکن ہمارے سردار کا ان باتوں سے کیا اطمینان ہو سکتا تھا - اس نے کڑی آواز میں کہا "بس خاموش ہم کو ساری کیفیت معلوم ہے اسلئے باتوں میں وقت ضائع نہ کرو - میں صرف دو منٹ کی مہلت تمہیں دیتا ہوں" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پستول نکال کر افسر کی طرف نشست باندھی اور کہا "اب زیادہ احمق نہ بنو اگر جان عزیز ہے تو جس جگہ سونا رکھا ہوا ہے ہم کو بتا دو ورنہ ابھی تمہارا خاتمہ کر دیا جائیگا"؛

بدنصیب آدمی سمجھ گیا کہ اب کوئی حیلہ کارگر نہ ہوگا - جان کے مقابلہ میں سونا تو ایک طرف ہفت اقلیم کی دولت بھی ہیچ سمجھی گئی ہے - وہ چپ چاپ ہمارے آگے ہو لیا اور جس جگہ سونے کے صندوق رکھے ہوئے تھے ہم سب کو وہاں لیجا کر کھڑا کر دیا پھر کہنے لگا "سونے کے صندوق اس کوٹھڑی میں بند ہیں"؛

ہمارے رہبر نے اُسی سے قفل کھلوایا اور اُسی کو آگے آگے اندر چلنے کا حکم دیا لیکن جب اُس شخص نے کچھ تامل کیا تو ہمارے افسر نے جسکے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی اُسکی پیٹھ پر ہلکا سا چرکا لگا دیا اس مجبوری کے سامنے وہ آدمی فوراً کوٹھڑی میں اتر پڑا اور ہمارے چار آدمی بھی اُسکے پیچھے پیچھے نیچے گئے - ہم نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا تو مقفل صندوقوں پر سرخ فیتہ لگا ہوا تھا اور ان سب پر سرکاری مہریں ثبت تھیں صندوق شمار میں چوبیس اور سب کے سب طلائے خالص سے پُر تھے - ہم اس نظارہ کو دیکھ کر مارے خوشی کے جامہ سے باہر ہونے لگے - ہمارے افسر نے صندوق ایک ایک کرکے نکلوانے شروع کئے اور جہاز کے افسر سے کہا کہ اگر تم بھی ہمارے ساتھ شریک ہونا منظور کرو اور باقی سامان کا پتہ دو - تو ایک صندوق ہم تم کو دے سکتے ہیں اور اطمینان رکھو کہ اسکا حال کسی پر ظاہر نہ ہوگا - لیکن جب اُس شخص نے انکار کیا تو ہمارے رہبر نے کہا بہت اچھا اگر تم کو یہ انتظام منظور نہیں تو ہم بس میں ہی یہ صندوق تقسیم کر لیں گے - اسکے بعد اسکے دونوں ہاتھ پس پشت باندھ دئے گئے اور اُدھر سے نچنت ہو کر ہم جہاز کا باقی قیمتی سامان تلاش کرنے لگے ؛

(۳)

خیال ہے اس طرح مشکل سے پندرہ منٹ گذرے ہونگے کہ دفعتاً گولی چلنے کی آواز سکوت فضا کو چیرتی ہوئی ہمارے کانوں میں آئی جسے سن کر ہر شخص بڑے زور سے اچھلا اور ہمارے دل کسی طاقتور ہتھوڑے کی مانند چلنے لگے - تحقیقات پر معلوم ہوا کہ گولی ہمارے اپنے ہی ایک آدمی نے اسلئے چلائی تھی کہ اُس نے جہاز کے افسر کو اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کھولنے کی کوشش کرتے دیکھا تھا - گولی اسکی ران کو خفیف سا مجروح کر کے نکل گئی تھی جس سے وہ آدمی دوبارہ خاموش اور بے حرکت ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا لیکن ہم خوفزدہ ہو کر جہاز

سے اپنی روانگی میں عجلت کرنے لگے۔ ہماری ٹولی کا سردار اس آدمی پر جس نے فائر کیا تھا سخت برہم ہوا بلکہ اُسکو گولی مار کر جان سے مار دینے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ آخر ہم چند آدمیوں نے اسکو سمجھا بجھا کر اسکا جوش فرو کیا۔ بعد ازاں جہاز پر جسقدر اسلحہ یا گولی بارود موجود تھا وہ سب کا سب سمندر میں پھینک دیا جو کشتیاں جہاز سے بندھی ہوئی تھیں توڑ کر پانی میں غرق کر دی گئیں جتنے قیدی تھے ان سب کو باندھ کر ایک کوٹھڑی میں بند کیا اور اس کے بعد ہم لوگ سونے کے صندوقوں کو اپنی کشتیوں پر لاد کر ساحل کی طرف روانہ ہوئے۔

اس مہم پر جانے سے پہلے ہم اس بات کا انتظام کر گئے تھے کہ واپسی پر ایک گاڑی ان صندوقوں کو جنہیں اپنے ساتھ لانے کی ہمیں پوری امید تھی لاد کر لے جائے۔ لیکن نہ معلوم کیا غلط فہمی ہوئی کہ گاڑی وقت پر نہ پہنچ سکی۔ اب اس بات پر بحث شروع ہوئی کہ کیا ترکیب کی جائے اس انتظار میں جس آدمی سے ہمارے سردار کا جہاز پر گولی چلانے کے سوال پر جھگڑا ہوا تھا اس سے جھگڑا شروع ہو گیا کیونکہ دونوں کے دلوں میں غبار بھرا ہوا تھا قضیہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ دونوں نے طمنچے اٹھا لیے اور قریب تھا کہ ایک کی جان ضائع ہو جاتی لیکن ہم نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ قدرتی طور پر سب آدمیوں کی ہمدردی اپنے سردار کے ساتھ تھی چنانچہ انجام کار اس آدمی کی مشکیں کس دی گئیں۔ اور عین اس موقعہ پر خوش قسمتی سے وہ گاڑی جسکا انتظار تھا وہ بھی آ گئی ہم نے احتیاطاً تمام سونا صندوقوں سے نکال کر چمڑے کے تھیلوں میں بھر لیا اور انہیں گاڑی میں رکھ کر دو آدمی حفاظت اور نگرانی کے لئے ساتھ بھیجے۔ گاڑی دریائے یارا کی سمت میں روانہ کر دی گئی جس سے آگے وہ سونا کشتی کے ذریعہ جیلانگ پہنچ گیا۔

سردار نے اس قیدی کو جس سے اس کا جھگڑا ہوا تھا اپنی کشتی میں بٹھایا اور ہم باقی ماندہ انیس آدمی دو کشتیوں پر سوار ہو کر جیلانگ کو روانہ ہوئے۔ خدا کو بہتر معلوم ہے کہ اس آدمی کا کیا انجام ہوا۔ کیونکہ سونا تقسیم کرنے کے وقت مال غنیمت کے بیس حصے کئے گئے اکیسواں حصہ نکالنے کی حاجت نہ سمجھی گئی

قاعدہ ہے کہ چوری کا مال خواہ کتنی ہی احتیاط سے بیچا جائے بہت کم قیمت پاتا ہے کیونکہ خریدار مشتبہ مال سمجھ کر بیچنے والے کی خوب ہی حجامت بناتا ہے۔ لٹیرے کو لٹیرا پاکر خود بھی لٹیرا بن جاتا ہے اور ویسی ہی بے دردی سے اسکو لوٹتا ہے جس طرح اس نے کسی مظلوم کو لوٹا تھا چنانچہ میرے ساتھیوں کو اس سونے کی قیمت تین شلنگ فی اونس سے زیادہ نہ ملی البتہ میں نے دور اندیشی سے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ مجھے اپنے مال کی تقریباً پوری پوری قیمت وصول ہو گئی۔ یعنی میں نے اپنا سونا فروخت کرنے میں عجلت نہ کی۔ بلکہ یہی ظاہر ہونے دیا کہ میں نے وہ سونا معدن طلا پر کام کر کے حاصل کیا ہے پس میں اپنے ہمراہیوں سے نسبتاً نفع میں رہا۔

پولیس مدت دراز تک ہمارا سراغ لگانے میں سرگرداں رہی اور آخر کار ہم میں سے ۵ یا پانچ آدمی گرفتار ہوئے۔ ان میں سے بھی ایک موقعہ پر فرار ہو گیا۔ بہرحال انتہائی جدوجہد کے باوجود پولیس سونے کا ایک ماشہ بھی واپس حاصل نہ کر سکی۔ جو چار آدمی سزایاب ہوئے اُن میں سے ایک نے اپنی گرفتاری سے ایک ہی روز پہلے ملبورن کے ایک بنک میں سونے کی فروخت کے پانچ سو پونڈ جمع کرائے تھے جب وہ پندرہ سال کی قید کاٹنے کے بعد واپس آیا تو اسکو بنک کا بالکل پتہ نہ لگ سکا۔ کوئی تحریر بھی اُسکے پاس نہ تھی اور شہر ملبورن پندرہ سال کے عرصہ میں اسقدر بدل گیا تھا کہ اسکو شک ہونے لگا ملبورن ہی ہے یا کوئی اور۔ اسکو صرف اتنا یاد تھا کہ بنک کی عمارت کسی تنگ گلی میں واقع تھی اور راستہ ایک زینہ سے ہو کر گذرتا تھا لیکن گو اس نے تمام شہر میں اس قسم کی عمارت تلاش کی لیکن اس بنک کا سراغ نہ پا سکا۔ اس نے وکلاء کے ذریعہ سے عدالت میں بھی چارہ جوئی کی لیکن بے سود۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا روپیہ جس طرح آتا ہے اُسی طرح ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اس میں کبھی برکت نہیں ہوتی اور انجام وہی ہوتا ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔

جنگل کا جوگی

ایک پُراسرار افسانہ

از جناب منشی تیرتھ رام صاحب فیروزپوری

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب آسٹریلیا میں انگریزی نوآبادی نئی نئی شروع ہوئی تھی۔ ملک کا بہت بڑا حصہ غیر آباد اور ویران پڑا تھا اور صدہا میل کے فاصلہ میں اس قسم کے گھنے جنگل پھیلے ہوئے تھے کہ ان میں رستہ ڈھونڈھنا دشوار تھا۔ یہ خوفناک جنگل ان جرائم پیشہ لوگوں کے لئے جائے پناہ کا کام دیتے تھے جو قانون کی گرفت سے بچکر چھپے پھرتے ہوں۔ بددیانت اور بدچلن قانون پیشہ آدمی۔ چور۔ قزاق۔ بدمعاش و خونی لوگ۔ ارتکاب جرم کے بعد انہی جنگلوں کی گہرائی میں جا چھپتے تھے اور چونکہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے ان کو ایک دوسرے کی جان ضائع کرنے سے قطعاً دریغ نہ ہوتا تھا۔ اس لئے عام آدمی تو ایک طرف۔ ہم پولیس کے کارکن بھی ان میں قدم رکھتے ہوئے گھبراتے تھے ۔

میرا تعلق نیو ساؤتھ ویلز کی پولیس سے تھا اور گو چند مرتبہ افسروں کے اصرار پر اس قسم کے دشت ناپیداکنار کی گہرائی میں داخل ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ تاہم مجرموں کی حراست کے معاملہ میں شاذ و نادر ہی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ البتہ اسی آمد و رفت کے معاملہ میں ایک نئی بات یہ میرے دیکھنے میں آئی کہ جنگل میں کچھ ایسے لوگ بھی سکونت پذیر معلوم ہوئے جو بظاہر تارک الدنیا ہو کر جملہ علائق انسانی سے قطع تعلق کر چکے تھے۔ وہ اسی قسم کے آدمی تھے جنکی نسبت کوئی نہ بتا سکتا تھا کہ کون ہیں۔ کب اسی جگہ اقامت گزیں ہوئے۔ کہاں سے آئے تھے اور کب تک اس جگہ ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ اور پبلک دونو کے لئے ان کا وجود ایک راز سربستہ تھا۔ جسے حل کرنے کی کوشش نہ کسی نے کی اور نہ کرنے کی ضرورت سمجھی ۔

خصوصیت سے قابل ذکر ان میں ایک آدمی تھا جس کا ذکر ہمارے پولیس سٹیشن میں اکثر ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس کے بارہ میں کسی کو کوئی خاص بات معلوم نہ تھی۔ حتےٰ کہ اس کی جائے رہائش کا پورا پتہ بھی کسی کے سننے میں نہ آیا تھا ۔

چونکہ آسٹریلیا کے سیاہ فام اصلی باشندے ان جنگلوں میں اکثر آمد و رفت رکھتے تھے اس لئے خیال کیا جاتا تھا کہ جنگل کے رہنے والے وہ لوگ جو بوجوہ مہذب اور متمدن دنیا سے قطع تعلق کر چکے تھے انہی کی معرفت آبادی سے اپنے لئے سامان خورد و نوش منگاتے ہیں ۔

پولیس سٹیشن اس جنگل سے قریباً بیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور چونکہ روز روز کی باتیں سن کر مجھے اس شخص سے غائبانہ دلچسپی ہو گئی تھی۔ اسی لئے جب کبھی مجھ کو کار سرکار کے سلسلہ میں جنگل کے پاس سے ہو کر گذرنا پڑتا تو میں اس آدمی کو ایک نظر دیکھنے کی کوشش میں غیر معمولی سعی و تجسس کیا کرتا لیکن اکثر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا تھا ۔

ایک دن کا ذکر ہے میں گھوڑے پر سوار تھانے کی طرف چلا جا رہا تھا کہ جنگل کے قریب پہنچکر میں نے گھوڑے کی رفتار حسب معمول آہستہ کر دی، اور اس آدمی کی صورت دیکھنے کی اُمید میں جنگل کی سمت — نظر دوڑانے لگا تھوڑی ہی دیر چلا تھا کہ ایک چھوٹے سے جھونپڑے کے سامنے مجھ کو ایک عظیم الجثہ۔ طویل القامت تنومند آدمی کھڑا نظر آیا۔ جی میں سوچا ہو نہ ہو یہی وہ مرد گوشہ نشین ہے جس کے قصے بارہا سننے میں آ چکے تھے — اگرچہ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی منحنی سا ضعیف القوائے آدمی ہو گا مگر مجھے اس اندازہ میں سخت ہی مایوسی ہوئی کیونکہ اسکی بدنی ساخت اور قطع وضع سے اس کا جری اور اولوالعزم ہونا ظاہر تھا۔ اس وقت اسکی آستین چڑھی ہوئی اور ایک ہاتھ میں کلہاڑا تھا۔ جسکی مدد سے وہ اپنے جھونپڑے کے سامنے سے جھاڑیاں وغیرہ کاٹ کر جگہ صاف کر رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو بڑے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا لیکن اسکی وہ نگاہ صاف بتا رہی تھی کہ میری طرف سخت نفرت اور حقارت سے دیکھ رہا ہے۔ میں بھی اس عجیب انسان کو چند منٹ کے عرصہ تک محو حیرت ہو کر دیکھتا رہا۔ اس کے بعد یکایک اس نے پیٹھ پھیری اور جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ اس وقت میں نے بھی یہ سوچکر خدا کا شکر یہ ادا کیا کہ اس آدمی کی گرفتاری کے وارنٹ لیکر نہ آیا تھا۔ بلکہ اس خیال سے دل کو تشویش بھی ہوئی کہ اگر کسی موقعہ پر قضا کار اسکو گرفتار کرنے کے لئے آنا پڑا

تو بڑی جانبازی کا کھیل ہوگا۔

بہرحال میں اپنی بارک کو واپس چلا گیا۔ قریب پہنچا تو ایک اجنبی سوار کو بارک کے باہر دو گھوڑے پکڑے ہوئے کھڑے دیکھا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ صاحب انسپکٹر بغرض معائنہ آئے ہوئے ہیں۔ خیر میں جب اندر گیا تو صاحب موصوف اپنے کام سے قریباً فارغ ہو چکے تھے۔ دفعتاً انہوں نے سارجنٹ سے پوچھا "کیا تمہارے علاقہ میں کسی جگہ جنگل کے اندر کوئی جوگی بھی رہتا ہے؟"

"جی ہاں سننے میں تو آیا ہے کہ ایک مرد گوشہ نشین اسی جگہ آس پاس جنگل میں کسی جگہ رہتا ہے" سارجنٹ نے جواب دیا "مگر کسی کو علم نہیں کہ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا۔ کیا کرتا ہے یا کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت ہر ایک آدمی کے لئے ایک راز سربستہ کی طرح ہے"

"تو کیا تم لوگوں میں سے کسی نے کبھی اسکو دیکھا نہیں؟"

"جناب میں نے اسے دیکھا ہے" اسی موقعہ پر میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"کب؟"

"آج ہی۔ ذرا سی دیر پہلے۔ میں گھوڑے پر سوار چلا آرہا تھا کہ اسکو جھونپڑے کے سامنے کھڑا ہوا دیکھا"۔

صاحب انسپکٹر دلچسپی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے "کس وضع کا آدمی ہے؟"

"جناب وہ ایک طویل القامت جسیم اور طاقتور آدمی نظر آتا ہے۔ چہرہ کا نچلا حصہ گنجان سیاہ داڑھی میں چھپا ہوا اور آنکھیں تیز اور خونخوار ہیں"۔

"حیثیت کے لحاظ سے...... کیا وہ کوئی نچلے طبقہ کا آدمی معلوم ہوتا ہے؟"

"جی نہیں۔ اس کے برعکس وہ کوئی اس قسم کا شریف آدمی نظر آتا ہے جو حالات کا شکار ہوگا"۔

صاحب انسپکٹر سوچ میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر اسی طرح چپ چاپ بحر تفکرات میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ لمبا سانس لیکر اٹھے اور اپنے خیالات دلی کو ظاہر کئے بغیر گھوڑے پر سوار ہو کر رخصت ہوگئے۔ خدا کو بہتر معلوم ہے کہ ان کو اس آدمی کے بارہ میں پہلے سے کچھ حالات کا علم تھا یا وہ کسی اور ہی معاملہ کی نسبت کچھ سوچ رہے تھے۔ میں اس بارہ میں کوئی صحیح اندازہ قائم نہ کر سکا۔

(۲)

اس کے ایک ہفتہ بعد ایک روز جب سارجنٹ کسی تفتیش پر جانے لگا اور گھوڑے پر سوار ہو کر دروازہ سے باہر نکل چکا تھا۔ ایک سوار نے صاحب انسپکٹر کی طرف سے ایک بند لفافہ لاکر اسکو دیا جسے کھولکر وہ اسے پڑھتا ہوا پھر واپس اندر آگیا۔ اس کے چہرہ کے آثار ظاہر کرتے تھے کہ اس مراسلہ میں ضرور کوئی غیر معمولی بات درج ہے۔ چنانچہ پاس آکر وہ مراسلہ دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "میرے خیال میں تم میں سے بعض کے لئے یہ حکم دلچسپی سے خالی نہ ہوگا"۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کیا کام ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"صرف مختصر سا حکم ہے" پھر مراسلہ کی عبارت پڑھتے ہوئے اس نے کہا "صاحب انسپکٹر تحریر کرتے ہیں۔ ضروری اس آدمی کو گرفتار کرکے جو جنگل کے اندر رہتا ہے۔ میرے پہنچنے تک پہرہ میں رکھو"۔

"مگر اس کو گرفتار کرنا سہل کام نہیں" میں نے پر خیال انداز سے جواب دیا "کم از کم تین چار مستعد آدمی اس کام پر متعین ہونے چاہئیں"۔

میرا خیال ہے سارجنٹ بھی مشتبہ کی بنا پر کچھ ایسا ہی اندازہ قائم کر چکا تھا۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولا "تم جانتے ہو۔ میں خود تفتیش پر جا رہا ہوں۔ اس لئے کہ تم نے اسے دیکھا ہے شناخت میں مغالطہ کا احتمال نہ ہوگا۔ اپنے ساتھ جیمز ہلٹن کو لے جاؤ۔ لیکن پورے محتاط رہنا اور جس طرح ممکن ہو غروب آفتاب سے پہلے اسکو زیر حراست کرکے اس جگہ لے آنا"۔

لیکن کسی کام کو منہ سے کہہ دینا ایک بات ہے اور اسکو کرکے دکھانا دوسری۔ بہرحال ہم مجبور تھے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ چون وچرا کی گنجائش قطعاً نہ تھی۔ قانون کی سختی نے ہمیں اپنی جانیں انتہائی خطرہ میں ڈالنے پر آمادہ کر دیا۔

اس روز گرمی شدت کی پڑ رہی تھی۔ اور گارد روم کی تمام کھڑکیاں کھلی رکھی گئی تھیں۔ میں نے دیکھا ایک دوغلا دیسی آدمی ان کھڑکیوں میں سے ایک کے پاس کھڑا تھا۔ کبھی کبھی یہ آدمی پولیس سٹیشن کی دیوار کے قریب دیوانہ وار ٹہلنے لگتا۔ کبھی اسی دریچہ کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا۔ مگر سب اپنے اپنے کام میں کسی نے اس آدمی کی موجودگی پر خاص توجہ نہ دی اگرچہ جیسے آگے چل کر معلوم ہوگا...... لیکن آپ دیکھ ہی جو لیں گے۔

الغرض ہم دونوں۔ میں اور جیمز ہلٹن گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیئے۔ میرا ساتھی اگرچہ طاقتور جوان تھا تو بھی تجربہ کار نہ تھا۔ اور کسی طرح کا نازک موقعہ پیش آنے پر اس کے بدحواس ہو جانے کا اندیشہ میرے دل کو لگا ہوا تھا۔ قصد جو ہم نے کیا یہ تھا کہ گھوڑوں کو ایک دم سرپٹ ڈال کر یکایک جھونپڑے کے پاس جا پہنچیں۔ اور جوگی کو مقابلہ کی تیاری کا موقعہ ہی نہ دیں۔ مگر جب وقت ہم اس جگہ کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جوگی ہاتھ میں رفل لئے پیٹی میں ریوالور لٹکائے مستعد اور تیار کھڑا ہے۔ اور اس کے پس پشت وہی دوغلا شیطان جسکو

جوانی کی دیمک

عنوان پڑھکر تعجب کرنیکی ضرورت نہیں۔ یہ سچ ہے۔ کہ مرد کی جوانی کو بھی دیمک لگ سکتی ہے۔ اور مرد کی جوانی بھی چند روز میں اس دیمک کی بدولت ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا کا ہر ڈاکٹر سالہا سال کے تجربوں کے بعد اس حقیقت کی تائید کرتا ہے کہ

مرد کی جوانی میں دیمک لگ سکتی ہے

اور یہ دیمک ان لوگوں کی جوانی میں لگتی ہے۔ جو کھٹائی زیادہ کھاتے ہوں۔ تنہائی میں بیٹھکر بُرے بُرے خیالات دل میں لاتے ہوں جنہیں جوانی کو استعمال کرنیکا زیادہ شوق ہو۔ یا بُرے لوگوں کی صحبت میں رہتے ہوں۔ یا جن کا معدہ مستقل مریض ہو۔

اس دیمک کا نام ہے جریان کی بیماری

مرد کی جوانی کیلئے یہ بیماری درحقیقت دیمک ہے۔ جس مرد کو یہ بیماری ہو جائے یعنی پیشاب سے پہلے یا بعد کو دھات گرنے لگے۔ یا رات کو سوتے میں کپڑے خراب ہو جائیں۔ یا کسی خیال کو آتے ہی مادہ رطوبت بہہ نکلے۔ یا ٹٹی کیوقت بیضرورت یہ مادہ خارج ہونے لگے تو سمجھئے۔

مرد کی جوانی چند دن کی مہمان رہ گئی

پھر رفتہ رفتہ مرد بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ اسکی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ جاتے ہیں۔ طبیعت میں بھُول اور چڑچڑاپن آجاتا ہے اُٹھتے بیٹھتے چکر آنے لگتے ہیں۔ چہرہ کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ یہ تحفہ ہے اس بیماری کا کہ آدمی دق کا مریض معلوم ہونے لگتا ہے اس لئے

ہر سمجھدار مرد کو جریان یعنی دھات کی بیماری سے بچنا چاہئے

جو لوگ اس خطرناک مرض کا شکار ہو چکے ہوں۔ وہ بھی فوراً اپنا علاج کرالیں۔ بہت آسان علاج یہ ہے۔ کہ ایک شیشی دوا جوہر اعظم مریض کو کھلا دو۔ دھات گرنی بند ہو جائیگی۔ اور جوانی پھر ابھرنے لگیگی۔ کیونکہ جوہر اعظم کے استعمال سے مردانہ رگوں میں طاقت بھر آجاتی ہے۔

مینیجر زنانہ دواخانہ ۔ پی ۔ بکس ۱۴۳ دہلی

کے پتہ پر خط لکھکر دوا جوہر اعظم کی ایک شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگالو۔ پارسل پر محصول معاف ہے۔ ایک شیشی جوہر اعظم کی قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے۔ ایک مریض کو بالکل تندرست کر دینے کیلئے ایک شیشی جوہر اعظم کافی ہے۔

جوانی کا بیمہ ہو جائے گا

ایک شیشی جوہر اعظم کے استعمال سے دھات کی بیماری بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اور مرد پورا تندرست ہو جاتا ہے۔ اسکی جوانی پھر تازہ ہو جاتی ہے چہرہ رونق پر آجاتا ہے۔ "جوہر اعظم" درحقیقت جوہر اعظم ہے۔ اور اسی لئے تمام ملک میں اسکی مانگ بڑھ رہی ہے۔

میں نے تھانہ کی چار دیواری کے پاس سے مدعا پھرتے دیکھا تھا ایک ہاتھ میں خنجر لئے کھڑا ہے۔ یہ حالت دیکھ کر مجھ کو پورا یقین ہو گیا کہ جوگی کو ہمارے آنے کی خبر اس دوغلے کے ذریعہ سے ہو چکی ہے۔ اس سے ہمارے کام کی مشکلات وہ چند بڑھ گئیں اور امید نے یاس کو جگہ دینی شروع کر دی۔ خیر ہم تھوڑا فاصلہ دے کر گھوڑوں سے اُتر کھڑے ہوئے۔ میں نے اپنے ساتھی کے کان میں آہستہ سے کہا کہ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور اس طرح ہم آگے بڑھے لیکن جیسے ہی جوگی کی نظر ہم پر پڑی وہ بندوق چھتیا کر کھڑا ہو گیا اور تحکمانہ لہجہ میں بولا "خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھے۔ وہیں کھڑے ہو جاؤ اور اپنا مطلب بیان کرو کہ یہاں کس لئے آئے ہو؟"

میں نے دور ہی سے جواب دیا "آپ سے چند باتیں کیا چاہتا ہوں"۔

"کس بارہ میں؟"

"وہ میں آپ کے پاس آ کے عرض کروں گا"۔

"بس میرے پاس آنے کی حاجت نہیں جو کچھ کہنا چاہتے ہو وہیں سے بیان کرو" اور اس کے بعد اسی طرح کی پُر رعب آواز میں کہ جس کو سن کر بولنے والے کی صداقت پر ذرا بھی شک نہ ہو سکتا تھا اس نے کہا "یاد رکھو اگر ایک قدم بھی آگے رکھو گے تو میں فوراً گولی چلا دوں گا"۔

اب ہمارے لئے بڑی مشکل کا سامنا ہوا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن ادھر حساب تھا۔ اسی فکر میں کھڑا سوچتا تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے کہ دفعتاً ایک چال نظر آئی۔ چنانچہ میں نے جوگی کو دھوکا دینے کی غرض سے کہا۔

"لیجئے انسپکٹر صاحب بھی آ گئے۔ اب وہ خود ہی بات چیت کر لیں گے۔ وہ دیکھو اس طرف درختوں کے پیچھے چلے آ رہے ہیں"۔

جوگی نے پیٹھ پھیر کر اس طرف کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں اس موقعہ کو غنیمت جان کر برق وار دست پر جا پڑا۔ اپنی غلطی معلوم ہوتے ہی جوگی کے منہ سے زخمی شیر کی مانند ایک خوفناک گرج کی آواز نکلی اور وہ جھٹ اپنی ناکارہ رفل پھینک کر مجھ سے زور آزمائی کرنے لگا۔ خدا جانے کتنے دیووں کی طاقت اسکے فولادی بدن میں مستور تھی کہ اس نے مجھ ایسے کسرتی جوان کو اپنے ریچھ کی طرح کے مضبوط بازوؤں میں دبا کر فوراً زمین سے اونچا اٹھا لیا اور اس کے بعد یقیناً مجھ کو فرش زمین پر دے مارتا اگر میں بچپن سے کشتی کا شائق ہونے کے باعث ہر قسم کے داؤ پیچ سے واقف نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موقعہ پر یہی فن میرے آڑے آیا۔ جھٹ اپنا سر اسکی بغل سے نکال کر میں نے ایک ہاتھ سے اسکی ٹانگ اور دوسرے سے اسکا ہاتھ پکڑا اور کمر پر اٹھا کر زور کا جھٹکا دیتے ہوئے اسکو زمین پر گرا دیا اور خود اوپر آ رہا میرا خیال ہے گرنے سے جوگی کو اتنی سخت چوٹ لگی تھی کہ وہ اب مقابلہ کے قابل نہ رہا تھا۔ بہرحال اس نے عارضی طور پر ہر قسم کی سعی و جہد ترک کر دی۔ لیکن اس موقعہ پر اس کا دوغلا ملازم پستول قبضہ تانے میری طرف کو لپکا۔ خوش نصیبی سے ہٹمن مجھ سے قریب تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک اس طرح کا زبردست گھونسہ رسید کیا کہ ناہنجار دوغلا منہ کے بل زمین پر آ رہا۔

اس کے بعد ہم دونوں نے ملکر جوگی کو ہتھکڑی لگا دی۔ پھر ہٹمن کو اسکی نگرانی کے لئے چھوڑ کر میں اس کے جھونپڑے کی تلاشی لینے اندر گیا۔

ایک مختصر سی لیکن نہایت تاریک جگہ تھی۔ جس کے اندر بادی النظر میں کوئی چیز قابل توجہ معلوم نہ ہوتی۔ مگر جس وقت میں ادھر سے مایوس ہو کر پیچھے ہٹنے لگا تو میری نگاہ ایک چیز پر جا پڑی جو دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ پاس جا کر دیکھا تو ایک تصویر تھی ۔۔۔۔ ایک نہایت درجہ حسین اور نوجوان لڑکی کی تصویر لکڑی کے بڑے سے چوکھٹے میں لگی ہوئی۔ وہ پُر تکلف حسینہ شام کی پوشاک میں ملبوس تھی۔ اور چہرہ کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے گھرانے کی لڑکی ہے۔ تھوڑی دیر میں اس تصویر کو حیرت اور تعریف کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ دل نے کہا ہو نہ ہو یہ غیرت ماہ حسینہ ہی کسی طریقہ پر اس مرد پُر اسرار کی اختیاری جلاوطنی اور گوشہ نشینی کی محرک ہوئی ہے۔ اس تصویر کے اصل کا اس جوگی کی زندگی سے کوئی گہرا تعلق ضرور ہو گا ہو ممکن ہے اپنے اندر کوئی رومان عظیم زندگی کا کوئی حسرتناک ماتمی افسانہ کوئی پُر درد عشقی ناٹک پوشیدہ کئے ہوئے ہو۔

انہی خیالات کی الجھن میں پھنسا ہوا جھونپڑے سے باہر نکلا تو ہٹمن کو دیو مقید کی نگرانی کرتے پایا۔ دوغلا اس سے پہلے ہی کسی طرف کو بھاگ گیا تھا۔ مل کر ہم دونوں نے جوگی کو ایک گھوڑے پر بٹھایا اور تھانہ کی سمت میں ہو لئے۔ ہمارا قیدی سارا رستہ خاموش رہا معلوم ہوتا تھا کسی اہم معاملہ کی نسبت غور کر رہا ہے۔ ہم جب پولیس سٹیشن کی بارک کے قریب پہنچے تو سارجنٹ باہر کھڑا سگرٹ پی رہا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر قیدی کو بڑے غور کے ساتھ دیکھا اس کے بعد کہنے لگا مقام شکر ہے تم لوگ کامیاب واپس آئے۔ صاحب انسپکٹر اب آیا ہی چاہتے ہیں۔

ہم نے قیدی کو حوالات میں بند کر دیا۔ اور بہت کوشش کی کہ وہ کچھ بولے۔ مگر اس بندۂ خدا نے لب تک ہلانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ہتھکڑی لگے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر یاس واندوہ کی تصویر بنا ہوا چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد انسپکٹر صاحب آئے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان کے ہمراہ کوئی اجنبی شخص بھی تھا جس کی شکل وصورت بہت ہی مکروہ۔ کینہ ور اور شرارت آمیز معلوم ہوتی تھی۔ ایک آنکھ کسی قدر ترچھی۔ غرض بہ حیثیت مجموعی لمبا اور کم ظرف نظر آتا تھا۔ جس وقت یہ دونو گھوڑوں سے اترے تو صاحب انسپکٹر نے سارجنٹ سے پوچھا:

"کیا اس جوگی کو گرفتار کر لیا؟"

"ہاں جناب"

"کہاں ہے؟"

"حوالات میں"

"مسٹر ٹکمور" صاحب انسپکٹر نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا "ذرا چل کر قیدی کو شناخت کر لیجئے"۔ لیکن معلوم ہوتا تھا اجنبی کو ایسا کرنے میں تامل ہے۔ کسی قدر پس وپیش کے بعد وہ ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا اور یہ تینوں صاحب انسپکٹر۔ سارجنٹ اور مسٹر ٹکمور آگے آگے اور میں ان کے پیچھے صرف تماشہ دیکھنے کی غرض سے چلا۔ اسی طرح ہم لوگ حوالات کی طرف گئے۔ حوالات کا قفل کھولکر وہ تینوں اس میں داخل ہوئے۔ لیکن میں باہر ہی کھڑا رہا۔ چونکہ کمرہ میں تاریکی تھی اس لئے صاحب انسپکٹر نے قیدی کے قریب جاکر پہلے خود اسکو اچھی طرح دیکھا اس کے بعد مسٹر ٹکمور سے اسکو شناخت کرنے کے لئے کہا۔ اجنبی شاید پاس آگے بڑھا اور دیکھ کر کہنے لگا "جی ہاں یہی وہ آدمی ہے"۔

لیکن خدا معلوم ان چند الفاظ میں کیا جادو بھرا تھا کہ جس نے جوگی کی حالت میں عظیم تغیر پیدا کر دیا۔ یا تو وہ غمناک صورت بنائے گھٹنوں میں سر ڈالے یاس کی مجسم تصویر بنا بیٹھا تھا۔ یا اب دفعتاً سر اٹھا کر زخمی چیتے کی مانند خونخوار نظروں سے اجنبی کی طرف دیکھنے لگا اور اس کے بعد برق کی تیزی رفتار سے سیدھا کھڑا ہو کر اس نے غراہٹ کی قسم کی کوئی آواز منہ سے نکالتے ہوئے اپنے زنجیر بند ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے۔ پھر اپنی آہنی ہتھکڑیاں اس زور سے ٹکمور کے سر پر دے ماریں کہ وہ نیم جاں ہو کر فرش زمین پر گر پڑا۔

یہ حالت دیکھ کر ہم سب آدمی گھبرا گئے۔ کیونکہ جوگی نے دانست میں اجنبی کو جان سے مار ڈالنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ میں نے جھٹ اندر جاکر قیدی کو ایک طرف ہٹا دیا۔ اسکی آنکھیں غصہ اور جوش کے مارے سرخ تھیں اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ خون اس کے سر پر سوار ہے۔ صاحب انسپکٹر اور سارجنٹ ٹکمور کو اٹھا کر باہر لے گئے اور میں نے دوبارہ حوالات میں قفل لگا دیا۔ لیکن بڑی دیر تک ٹکمور کی یہ حالت رہی کہ گویا رمق جان اسکے تن میں باقی نہیں ہے۔ سارجنٹ نے چند آدمیوں کی مدد سے اسکو قریب ہی ایک گاؤں میں بھجوا دیا۔ اور وہاں کے مکھیا کو اس بات کی ہدایت کر دی کہ اس کے رکھ رکھاؤ میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی جائے۔ لیکن جب دوسرے دن ایک آدمی کو ٹکمور کی خبر لانے کے لئے بھیجا گیا تو وہ یہ اطلاع لیکر واپس ہوا کہ اس کی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن حواس ٹھکانے آتے ہی وہ سخت اضطراب کی حالت میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کسی طرف کو رخصت ہو گیا۔

صاحب انسپکٹر کو ٹکمور کی اس حرکت سے کسی طرح کا افسوس نہ ہوا۔ آخر جب سارجنٹ نے دریافت کیا کہ یہ آدمی کون تھا اور قیدی سے اس کا کیا تعلق ہے تو صاحب موصوف نے ایک نہایت عجیب قصہ بیان کیا جسکو من وعن درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(۳)

"میں نے مسٹر ٹکمور کی زبانی قیدی کا سارا حال معلوم کیا ہے۔ اور اگر قیدی نے اس کا سر پھوڑنے کی کوشش کی ہے تو کچھ بے جا نہیں کیا۔ ان کے تعلقات باہمی کچھ اسی طرح کے ہیں۔ ان دونو کا قصہ نہایت عجیب ہے جس کے واقعات کئی سال پیشتر انگلستان میں وقوع پذیر ہوئے تھے۔ قیدی کو میں اچھی طرح جانتا ہوں مگر اس کا نام ظاہر نہ کرونگا۔ البتہ اس طور بتا سکتا ہوں کہ وہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور کسی زمانہ میں فوج کا کپتان تھا۔ ابتدا سے اس کا مزاج نہایت سخت۔ بے باک اور خود سرانہ تھا۔ گو مجھے اس کا ذاتی علم نہیں مگر کہتے ہیں کہ کبھی کبھی کپتان سے بعض جرائم کا ارتکاب بھی ہوا جس کی وجہ سے سارا خاندان اس سے ناراض تھا۔ اتفاق سے کپتان کو ایک معزز شخص کی لڑکی کے ساتھ محبت ہو گئی۔ ٹکمور اس لڑکی کا رشتہ دار تھا اور خود اس رشک ماہ کو اپنانا چاہتا تھا۔ پس اس نے لڑکی کے باپ کو بہکانا شروع کیا۔ اس نے کپتان کے سارے عیب مبالغہ کے ساتھ بیان کئے۔ جنکے لڑکی کے باپ نے بیٹی کو تنبیہ کر دی کہ وہ ہرگز کپتان سے نہ ملے۔ لیکن خوگر عشق کے [illegible] پیکان ہوتے ہیں۔ جو عاشق و معشوق دونو کے دلوں کے پار ہو جاتے ہیں۔ یہ بات لڑکی کو گوارا نہ تھی کہ اپنے طالب صادق سے

میں چاہتی ہوں کہ اب بچہ پیدا نہ ہو

عورت میں یہ خواہش اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ کسی بیماری کے باعث اتنی کمزور اور ناتوان ہوگئی ہو۔ کہ بچہ کی پیدائش کی سخت مشکلات کا سامنا نہ کر سکے۔ یا بعض عورتیں اپنی مفلسی کی وجہ سے بھی زیادہ اولاد سے گھبراتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو چاہیئے۔ کہ سائنس کی جدید ایجاد دوا روہیل سے فائدہ اٹھائیں۔

جبتک چاہو بچہ نہیں ہوگا دوا روہیل کے استعمال میں سب سے بڑا کمال یہ ہے۔ کہ عورت جبتک چاہے اولاد سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ اور ماہواری ایام میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں پڑتی یعنی ماہواری بدستور ہر ماہ آتی رہیگی۔ دوا "روہیل" کی ایک شیشی میں اسی مرتبہ استعمال کے لائق دوا ہوتی ہے۔ اور اس کے استعمال کی صورت یہ ہے۔ کہ عورت...... سے دس منٹ پہلے ایک خوراک دوا روہیل کھالے۔ تو پھر اس کے بعد...... اس رات عورت کو بچہ کی امید نہیں ٹھہر سکتی۔ چنانچہ عورت جبتک...... سے پہلے یہ دوا کھالیا کریگی۔ امید سے بچی رہیگی۔

جب چاہو بچہ ہونے لگیگا جب عورت اس دوا کا استعمال ترک کردیگی۔ تو پھر جس طرح عام طور پر عورتوں کے ہاں بچہ ہوتا ہے۔ پھر اسکے ہاں بھی ہونے لگیگا۔ دوا کے استعمال سے عورت کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا جس عورت کو ضرورت ہو

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ پی بکس ۳۴ دہلی

کو خط لکھکر دوا روہیل کی شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالے۔ ایک شیشی کی قیمت -/۸/۲ روپے ہے۔ پارسل پر گیارہ آنے محصول لگتا ہے۔ اس طرح گھر بیٹھے دوا پہونچ جائیگی۔ ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۸

روگردانی کردے۔ انہوں نے ملاقات کی یہ صورت نکالی کہ دونو خفیہ طور سے ملتے رہے۔ مگر لکمور بھی رات دن اسی جستجو میں لگا رہتا تھا۔ ایک روز پتہ لگا کر ایسے موقعہ پر جا پہنچا جب کہ طالب و مطلوب ایک دوسرے کے دیدار سے اپنے بیتاب دلوں کو تسکین دے رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر لکمور دیوانہ وار لڑکی کے پاس گیا اور اسکو برا بھلا کہنے لگا۔ پھر اس نے یہ کہہ کر دھمکایا کہ میں یہ تیرے کرتوت تیرے باپ کے پاس جا کر کہتا ہوں۔ لڑکی ڈر کر زار و قطار رونے لگی۔ کپتان غصہ سے بے قابو ہو کر لکمور پر جھپٹا۔ اور قریب تھا کہ اسکو زمین پر دے مارے کہ لکمور نے اپنے بچاؤ کی خاطر پستول کا فائر کر دیا۔ گولی کپتان کے پاس سے نکلتی ہوئی لڑکی کو جا لگی۔ اور وہ نازنین کسی طرح کی آواز تک منہ سے نکالے بغیر مردہ اور بے جان فرش زمین پر آ رہی۔ کپتان دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ لیکن اس کا کام تمام ہو چکا تھا اور اس رشک گل کی روح بوئے گل کی طرح گل کو چھوڑ چکی تھی۔ بعد کے حالات کی تفصیل مجھ کو معلوم نہیں لیکن مختصر یہ ہے کہ لکمور نے سارا الزام کپتان کے سر تھوپ دیا۔ اور بیان کیا کہ اس شخص نے مجھ پر فائر کیا تھا۔ لیکن گولی لڑکی کو لگی اور وہ مر گئی۔ چونکہ عوام اور حکام دونو کپتان کے مزاج سے واقف تھے۔ اور لڑکی کے ساتھ اسکے تعلقات کا بھی ان کو علم تھا۔ اس لئے لکمور کے بیان کو عام طور پر صحیح سمجھ لیا گیا۔ اس کے بعد کپتان نے اپنی صفائی سے مایوس ہو کر راہ فرار اختیار کی۔ مگر چلتے چلتے موقعہ پا کر لکمور کی وہ گت بنائی کہ اپنی دانست میں تو وہ اسکو جان ہی سے مار چکا تھا۔ لیکن رشتہ حیات باقی

تھا کہ وہ بچ گیا۔ انگلستان سے روانہ ہوتے وقت کپتان نے یہ سارے حالات اپنے ایک دوست سے بیان کئے تھے۔ جسکی زبانی بعد ازاں مجھ کو معلوم ہوئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان افسوسناک واقعات اور اپنی محبوبہ کی سانحی موت نے کپتان کو دنیا اور اہل دنیا سے متنفر بنا دیا۔ وہ اپنے معشوق کی تصویر ساتھ لے کر انگلستان سے چل کھڑا ہوا اور آسٹریلیا پہنچ کر اس حالت میں رہنے لگا۔ جو تم لوگوں کو معلوم ہے۔ میرا خیال ہے لکمور انتقام لینے کی غرض سے کپتان کا پتہ لگا کر یہاں آیا تھا اور سڈنی میں جہاں اس کا اچھا رسوخ ہے اس نے افسران پولیس سے کہہ سن کر جوگی کے نام کا وارنٹ جاری کرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی آس پاس کے سب تھانوں میں اطلاع پہنچا دی گئی۔ چونکہ میں نے بھی اکثر جوگی کے متعلق افواہیں سُنی تھیں۔ اسلئے میری رپورٹ پر صدر سے میرے نام اسکی گرفتاری کا حکم آ گیا۔ بعد کا حال تم کو معلوم ہے۔ اب قیدی کو حوالات رکھو۔ میرا مقصد ہے کل اسکو صدر روانہ کر دوں گا"۔

(۴)

صاحب انسپکٹر پولیس کی زبانی یہ عجیب قصہ سن کر ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ لیکن مزید اری دیکھئے کہ جس دن صبح کو ہمارا ارادہ کپتان کو سڈنی روانہ کرنے کا تھا اسی کی رات کو نصف شب کے قریب پولیس سٹیشن میں آگ لگ گئی۔ ہم سب بدحواس ہو کر اسکو بجھانے میں مشغول ہوئے۔ اسی ہنگامہ میں کپتان کو موقعہ ملا اور وہ دھوئیں کی تاریکی میں حوالات سے نکل کر فرار ہو گیا۔ ہمارا خیال ہے یہ کارروائی اسی دوغلے کی

تھی جو کپتان کا وفادار ملازم تھا۔ اس دن کے بعد پھر ہم نے کپتان کی نسبت کوئی خبر نہیں سنی اور نہ پھر کسی نے اسکو دیکھا لیکن گمان غالب ہے کہ وہ اب بھی کسی جنگل میں روپوش اور اس وقت تک زندہ ہے۔

تین خون (بقیہ صفحہ ۵۷)

تھے لئے تھے۔ اس قتل کے علاوہ اور بھی بہت سی چوریاں کیں اور ڈاکے ڈالے تھے۔ اس کا آخری جرم تین خون اس کا شاہکار تھا۔ اگر اب کے وہ قانون کی زد سے بچ نکلتا تو تمام عمر عیش کرتا۔

پر ازیں باوجود بہت دکھلائی دینے کے زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا اور فیصلہ سن کر اس کی ہمت جواب دے گئی اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ جب تک مقدمہ چلتا رہا۔ عورتیں اس کی وجاہت، گھونگھر والے بالوں اور نگاہ کی مقناطیسی کشش سے مسحور ہو کر اس کو بے گناہ سمجھتی رہیں۔ بہت سی عورتوں نے اُسے جذباتی خطوط لکھے۔ اس کے پاس طرح طرح کے تحفے بھیجے اس کے بچنے کیلئے دعائیں مانگیں، مگر اُسے پھانسی کی سزا ہو گئی۔

پادری نے جب اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کیلئے کہا تو اس نے جواب دیا کہ "وہ آئندہ زندگی حیات بعد از ممات اور حشر و نشر، انصاف وغیرہ کا قائل نہیں اسلئے مجھے ایسی بات سے معذور سمجھئے"۔

وہ آہستہ آہستہ پھانسی کے تختے کے پاس آیا اور بلا شور و غل مچاتے ہوئے مر گیا مرنے سے قبل وہ سردی اور خوف کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ اس نے ایک سگریٹ سلگا کر

دنیائے جرائم کا ایک سنسنی خیز اور ہولناک افسانہ

تین خون

از جناب سلطان احمد صدیقی گورکھپوری بی اے (علیگ)

شہر پیرس چالاکوں اور بدمعاش لوگوں کیلئے بہترین جگہ ہے۔ وہ اس سلسلہ میں لندن اور نیویارک بھی جاتے ہیں مگر فرانسیسی دارالسلطنت ان کی بہترین پناہ گاہ ہے۔ وہ لوگ اس کے نزدیک اس طرح آتے ہیں جس طرح شمع کے گرد پروانے۔

ان کا بہترین شکار عورتیں ہوتی ہیں جس قسم کی عورتوں کی انہیں ضرورت ہوتی ہے وہ پیرس میں بکثرت ملجاتی ہیں۔ عیش و نشاط کی بندیاں، حسن و دولت کی دیویاں، آزاد، اونچی عالی شان محلوں میں رہنے والیاں، بنک میں اثاثہ۔ قیمتی ہیرے اور جواہرات پہنے تتلیوں کی طرح کلبوں میں جاکر زندگی گذارنے والیاں چالاکوں اور بدمعاشوں کو ان سے تعارف اور ملاقات پیدا کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی عمدہ پوشاک، نستعلیق، شریف صورت نوجوانوں اور چکنی چپڑی باتیں کرنے والوں سے جھٹ بے تکلف ہوجاتی ہیں۔ ایک بدمعاش اپنی لفاظی اور خودساختہ نواب اور لارڈ کے خطابوں سے ان کو بڑی آسانی سے متاثر کرلیتا ہے۔ وہ اپنی حکمت عملی اور پرانی ترکیبوں کو استعمال کرکے ان عورتوں کو بے وقوف بناتا ہے۔ ان کا اعتماد حاصل کرکے ان کے محلوں میں گھستا ہے اور آخرکار ان کا روپیہ پیسہ اور جواہرات لےکر چمپت ہوجاتا ہے۔ اس ذات شریف کو اس کام (بزنس) میں زیادہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا نمائشی بھڑکیلا لباس، بے تکان لفاظی، مبالغہ آرائی، اور مقناطیسی نگاہ اس فن کیلئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ عورتیں ان بدمعاشوں کے جنگل میں پھنس جاتی ہیں۔ زیادہ تر فرانسیسی عورتیں ہی ان کا شکار ہوتی ہیں۔

پرازینی بھی اسی گروہ کا ایک فرد اور چھٹا ہوا آوارہ اور بدمعاش تھا۔ بلکہ جرأت کے معاملہ میں اپنے گروہ میں سب سے زیادہ تھا۔ وہ قتل و خون سے بھی نہ چوکتا تھا۔ اس کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی۔ دنیاوی شہرت کے لحاظ سے وہ ایک بڑا زباندان اور سیاح تھا۔ شکار کی تلاش میں ہر جگہ گھوما تھا اور ہر جگہ کی پولیس سے مقابلہ کے لئے تیار تھا۔ وہ ایک بہترین انسان ہوسکتا تھا بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کا مطمع نظر بدمعاشی اور آوارگی نہ قرار دیتا اور اپنے دماغ اور عقل کو شریفانہ پیشوں میں صرف کرتا۔ مگر وہ عورتوں کو پھانستا اور پہلے موقعہ ہی سے سنہری فائدہ اٹھاتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی مقناطیسیت تھی۔ صورت شکل بھی بُری نہ تھی۔ طاقتور بدن، چوڑے کندھے، کشادہ پیشانی گھونگھر والے بال، گھنے ابرو، دراز پلکوں اور سیاہ خوبصورت آنکھوں کا مالک تھا۔ اسے ایک رات کو چلنے والی موٹر سروس میں ٹکٹ چیکر کی جگہ مل گئی تھی مگر اس کو بہت جلد رئیس عورتوں کے ہیرے جواہرات چرانے کے شبہ میں برطرف کردیا گیا۔ اس موقع پر اسے بہت کم لوٹنے کا موقع ملا۔ بدقسمتی سے اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوا کیونکہ اسے یہ کام پسند بھی نہ تھا۔

اس کی دوست اور شناسا عورتوں کی تعداد بے شمار تھی۔ ان میں میڈم ڈی مونٹیل بھی تھی جو کبھی خوبصورت رہی ہوگی۔ وہ روماٹیک کے عالیشان کمروں میں رہتی تھی۔ پرازینی اس سے بعید الفت کا اظہار کیا کرتا تھا اور اس سلسلہ میں اکثر اس کے یہاں جایا آیا کرتا تھا۔ میڈم کے پاس کافی روپیہ اور قیمتی جواہرات تھے۔ وہ اکثر اس نوجوان کو تھوڑی تھوڑی رقمیں دیا کرتی تھی۔ مگر اس کا یہ مشورہ کہ اسے بیس ہزار فرانک بطور "قرض" دیدے۔ میڈم نے کبھی منظور نہ کیا۔ کیونکہ وہ پرازینی کے حالات زندگی سے واقف تھی۔ اسلئے جب پرازینی نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے صاف انکار کردیا۔ پرازینی نے بہت برا بھلا کہا اور میڈم مونٹیل کو چھوڑ کر دوسری دو نوجوان عورتوں سے ملنے لگا اسی شام کو پرازینی نے کٹلری کی دوکان سے ایک بڑا سا چاقو خریدا اور اس پر سان رکھوائی۔

میڈم ڈی مونٹیل کے گھر میں ایک نوکرانی اور اسکی دس سالہ لڑکی رہتی تھی۔ ایک باورچی تھا جو صبح و شام کا کھانا پکا کر چلا جاتا تھا اور صبح ساڑھے چھ بجے آجایا کرتا تھا۔

جنوری ۱۸۸۷ء کو باورچی آیا اور مکان کی گھنٹی بجائی مگر دروازہ نہ کھلا۔ اس نے دوبارہ گھنٹی بجائی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اسے تشویش ہوئی۔ اسلئے اس نے قریبی پولیس چوکی میں اطلاع

رات کے بارہ بجے

(از رازی)

میرے پڑوس میں دو میاں بیوی رہتے تھے۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ جب مرد اپنی نوکری پر چلا جاتا۔ تو بیچاری عورت یا تو پلنگ پر پڑی رہتی۔ یا کبھی کبھی ہمارے ہاں آجاتی۔ اور میری بیوی کے پاس اپنا وقت گذار لیا کرتی۔ میری بیوی کی گود میں کوئی ڈیڑھ سال عمر کی ایک لڑکی تھی۔ وہ عورت دن بھر اسے کھلایا کرتی۔ بچی بھی اس سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ دفعتاً لڑکی بیمار ہوئی۔ اور چند گھنٹوں میں ختم ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا بیماری ہی ایسی تھی۔ لڑکی کا بچنا مشکل تھا۔ بہرحال معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ مگر میری بیوی کیلئے ایک مستقل روگ لگ گیا۔ وہ دن بھر روتی رہتی۔ کھانا پینا بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اسی غم میں وہ بھی ماتا کا شکار ہو گئی۔ اور اس طرح میری دنیا اندھیری ہو گئی۔ پڑوسی عورت کا اب آنا جانا بھی بند ہو چکا تھا۔

ایک دن رات کے بارہ بجے میرے پڑوس میں رونے چلانے کی آواز آئی۔ غور کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ پڑوس کی اسی عورت کو جو میری بیوی کے پاس آیا جایا کرتی تھی۔ اس کا خاوند بری طرح مار رہا ہے۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور میں اپنے پڑوسی دوست کو سمجھانے کیلئے اپنے مکان کی چھت پر گیا۔ جہاں سے برابر والے مکان کا سامنا ہوتا تھا۔ میں اپنے پڑوسی سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ آواز آئی

"بے حیا عورت! تو نے اپنے ساتھ دوسرے کا گھر بھی برباد کیا رازی میرا دوست ہے۔ تجھے اس کا خیال تو کرنا تھا۔" اس فقرہ سے میں چونک اٹھا۔ میرے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ عورت بولی!

جب وہ بچی کو لیکر گود میں کھڑی ہوتی تھی۔ تو میرے دل میں چھریاں چلتی تھیں۔

تو پھر تیرے باپ کا کیا تھا۔ اس کی بچی تھی۔

میں برداشت نہیں کر سکتی۔

تو تجھے کنوئیں میں ڈوب مرنا تھا۔ بے غیرت کہیں کی۔

اب ڈوب مروں گی۔

ہاں ڈوب مر۔ پاپ کٹے۔ میں رازی کو کیا منہ دکھاؤں گا تو نے اس کی بچی کی جان لی۔ اور پھر اس کی گھر والی کی موت کا سبب بھی تو ہے

عورت بولی میرا کیا قصور ہے۔ مجھ سے تو کسی نے یہ کہا تھا کہ اگر تو کسی اکلوتی بچی کے بال کاٹ لائے۔ تو تیرے ہاں اولاد جننے لگیگی۔ اس میں بچی کا کیا بگڑ گیا۔

اُف! اب میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ میری پیاری بچی کی موت اور میری وفادار بیوی کی موت اسی ظالم عورت کے ہاتھ ہوئی ہے۔ جی میں آیا قتل کر دوں اس عورت کو۔ لیکن کیا فائدہ ہوتا۔ میرا گھر تو اجڑ ہی گیا تھا۔ میں نے سوچا اس عورت نے اولاد حاصل کرنے کیلئے کتنا بڑا خوفناک جرم کیا۔ اگر یہ کسی ڈاکٹر سے پوچھ لیتی۔ اور اپنا علاج کرا لیتی۔ تو کیا بچہ نہ ہوتا۔ میں صبح اپنے پڑوسی دوست سے ملا۔ اور اس سے کہا۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ مگر میں معاف کرتا ہوں۔ اور اس پر یہ احسان کرتا ہوں۔ کہ جو مقصد وہ میری بچی کی موت سے حاصل نہ کر سکی۔ وہ صرف چند پیسوں میں حاصل ہونیکی ترکیب بتائے دیتا ہوں۔ آپ آج ہی ایک خط **لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ پی بکس ۳۲ دہلی** کے پتہ پر لکھکر ایک شیشی دوا "محافظ اولاد" منگائیے۔ یہ دوا دو زنانہ سات رات تک اپنی بیوی کو کھلائیے۔ ان سات رات میں بالکل علیحدہ رہیئے۔ ٹھیک آٹھویں رات یہ پرہیز توڑ دینا چاہیئے۔ اسی آٹھویں رات عورت کو حمل ٹھہر جائیگا۔ دوا **"محافظ اولاد"** کی ایک شیشی میں پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے۔ اسکی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیجئے۔ محصول ۸ آنے خرچ ہوگا اور اس طرح معمولی رقم سے عورت کو بچہ مل جائیگا۔ دوا "محافظ اولاد" سے ہزاروں عورتیں جن کی شادیوں کو سالہا سال بیت چکے تھے۔ کامیاب ہو رہی ہیں۔ اور اب ان کی گود میں بچے کھیل رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں میں بیشمار ڈاکٹر اس دوا کو اپنے اپنے مریضوں پر استعمال کرا کے شاندار نیکنامی حاصل کر رہے ہیں۔ اور ان کا بیان ہے۔ کہ قیام حمل کیواسطے محافظ اولاد بہترین دوا ہے۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۴۸

دی۔ وہاں اس نے بیان کیا کہ شام کو میڈم کے پاس ایک مہمان آنے والا تھا۔ وہ حسب معمول ساڑھے چھ بجے شام کو چلا آیا تھا۔ پولیس والوں کو بھی اس بے جا خاموشی سے شبہ ہوا۔ ایک لوہار بلوا کر دروازہ توڑا گیا خاموشی کا سبب معلوم ہو گیا۔

مکان کے تینوں رہنے والے، میڈم، ملازمہ اور اس کی بچی قتل کر دئے گئے تھے۔ تینوں کے گلے کسی نے بڑی بے رحمی سے ایک لمبے تیز چاقو سے کاٹ دئے تھے۔ کمرہ بے ترتیبی کی حالت میں تھا۔ تمام اشیاء ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ بچی اپنے بستر پر مردہ پڑی تھی۔ کھانے کا کمرہ ایک شاہد عینی نے بتلایا کہ "خون کا تالاب معلوم ہوتا تھا" دونوں عورتوں کی لاشیں وہیں پڑی ہوئی تھیں۔ میز پر دو آدمیوں کے لئے دسترخوان بچھا ہوا اور رکابیاں رکھی ہوئی تھیں۔

چوری اس کا صاف مقصد معلوم ہوتا تھا جس کے لئے یہ تین خون کئے گئے۔ کمرہ خوب اچھی طرح لوٹا کھسوٹا گیا تھا۔ میز کی دراز، خانے اور صندوق کھلے پڑے تھے۔ تالوں کی کنجیاں وہاں صوفے کے نیچے پڑی ہوئی ملیں خون آلود پیروں کے نشانات تمام فرش پر جا بجا پائے گئے۔ خون آلودہ انگلی کا ایک نشان الماری پر بھی ملا۔ میڈم کے ملنے والی عورتوں کی مدد سے پتہ چلا کہ بہت سے ہیرے جواہرات غائب ہیں۔ قاتل کے بہت سے نشانات کمرہ میں موجود تھے جس سے پولیس کو حیرت ہوئی کہ قاتل بیوقوف قسم کا تھا جس نے اپنی ایسی بدیہی چیزیں شناخت کیلئے چھوڑیں جو جواہرات میڈم پہنے ہوئے تھی وہ اس کے بدن پر موجود تھے باقی قاتل لے اڑا جن کا اندازہ تخمیناً ڈھائی لاکھ فرانک تھا۔

فرش پر پیروں کے نشانات کھڑکی کی طرف تھے۔ کھڑکی کے باہر ایک کمر پٹی پڑی ہوئی ملی جس کے اندر کی جانب سرخ روشنائی سے گیسٹن جیلر لکھا تھا۔

آخری بار بغور کمرے کی تلاشی لینے پر ایک میز کی دراز میں ایک خط گیسٹن کا ملا جس سے یہ معلوم ہوا کہ مقتولہ اور گیسٹن میں قریبی تعلق اور گہری دوستی تھی مگر تجربہ کار آنکھ بخوبی اندازہ کر سکتی تھی کہ یہ چیزیں شبہ میں ڈالنے کے لئے رکھی گئی ہیں۔ مسٹر گورن پیرس کی خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ کو یقین تھا کہ قاتل ان چیزوں کو یہاں چھوڑ کر دوسرے پر شکوک پیدا کرنا اور خود انصاف و عدالت سے بچنا چاہتا ہے۔ اسلئے یہ اشارات بیکار ہیں۔

اس کے برخلاف بہت سے قاتل گھبراہٹ اور جلدی میں کچھ ایسے نشانات چھوڑ جاتے ہیں جو ان کی گرفتاری اور ثبوت جرم میں مفید ثابت ہوتے ہیں۔ موسیو گورن کو مجبوراً یہ فرض کر لینا کہ گیسٹن ہی اس قتل کا مرتکب ہوا ہے۔ کسی اور کے خلاف چونکہ کوئی ثبوت نہ تھا اسلئے اس نے سوچا بہت جلد گیسٹن کا پتہ چلانا چاہئے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ قاتل ان جواہرات کو ابھی فروخت کریگا جن کا مفصل ذکر تمام اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ پھر بھی جوہریوں اور دلالوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ ایسے جواہرات نہ خریدیں جو میڈم کے گھر سے چوری ہوئے ہیں۔ فرانسیسی بندرگاہوں پر کڑی نگرانی کی جانے لگی تاکہ قاتل علاقہ غیر کو نہ فرار ہو جائے۔ یہ یقین تھا کہ قاتل کو زیادہ روپیہ ہاتھ نہیں لگا کیونکہ مقتولہ اپنا تمام روپیہ بنک میں رکھتی تھی۔ اس بات کا یقین تھا کہ قاتل سر سے پاؤں تک خون میں آلود ہو گیا ہوگا۔

یہ خیال کیا گیا کہ میڈم پر ساڑھے چھ بجے اور آٹھ بجے کے درمیان کھانے کے بعد حملہ ہوا ہوگا۔ لڑکی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اور وہ جلدی سو گئی۔ کسی نے قاتل کو مکان میں آتے یا جاتے نہ دیکھا۔ میڈم ڈی موٹل کی بہت سے مردوں سے دوستی تھی۔ اس کے پڑوسیوں نے ایک آدمی کو خصوصیت سے بتلایا جو کہ قوی الجثہ، تیس پینتیس سال کی عمر، انگریزی لباس، وجیہ، اور خوش آواز تھا۔ اس کا نام وہ نہ بتلا سکے کہ وہ کون ہے۔

گیسٹن جیلر کی تلاش شروع ہوئی۔ گورن نے اس آدمی کی تجسس جاری رکھی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس سلسلہ میں اسے آدھے یورپ کی سیاحی کرنی پڑی۔ آخر ش مقصد میں ناکامی ہوئی۔ جیلر کی تلاش اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ اصلی مجرم گرفتار نہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کیلئے آئیے ہم پھر یازبی کی طرف متوجہ ہوں جس رات تین قتل ہوئے اس روز وہ دو نوجوان عورتوں کے کمرے پر گیا جن سے اس کی آشنائی تھی۔ اسوقت تقریباً نو بجے تھے۔ وہ رات بہت اندھیری تھی۔ وہ دونوں اسے اس حالت میں وہاں دیکھ کر متعجب ہوئیں۔ وہ بے چین اور متفکر معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ ان لڑکیوں نے اپنے فائدے کے پیش نظر پولیس سے اس کی رپورٹ نہ کی اور اپنے ساتھ تمام رات رکھا اور صبح اس کی فرمائش پر ایک لڑکی ہوٹل جاکر اس کے کپڑے اور سامان لے آئی۔ اس نے وہیں خون آلود کپڑے اتارے اور نیا سوٹ پہنا اور پرانا سوٹ ایک سیاہ تھیلے میں رکھا۔ اسٹیشن جاکر پہلی گاڑی سے مارسیلز روانہ ہو گیا۔ ان لڑکیوں نے پھر دوبارہ اسے نہ دیکھا۔

موسیو گورن اور ان کے ماتحتوں کو برازینی کا اس جرم سے تعلق معلوم نہ ہوتا تھا۔ فی الحال وہ گیسٹن جیلر کی تلاش میں مشغول تھے۔ پیرس میں قاعدہ ہے کہ ہر ہوٹل میں ایک رجسٹر پولیس مین کے سپرد رہتا ہے جو ہر آنے جانے والے کا نام اور پتہ درج کرتا ہے۔ اس سے جرائم اور مجرموں کی گرفتاری میں آسانی ہوتی ہے مگر مسافر غلط نام اور پتہ لکھوا سکتے ہیں۔ اسلئے یہ طریقہ زیادہ قابل بھروسہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ایک شخص ہنری جیلر جو کہ کیلکس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسی رات سے غائب ہے۔ ہنری اور گیسٹن میں بڑا فرق ہے مگر اس طرف توجہ ہونے کی ضرورت تھی۔ گورن کا ایک ایجنٹ اس ہوٹل میں گیا اور جس میں جیلر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کی تلاشی لی۔ ایک گھٹیا جرمی کاغذ رکھنے کا بستہ۔ ایک بڑھیا کی تصویر، دو موٹے کپڑے کی قمیصیں جن پر "G.G" کا نشان بنا ہوا تھا۔ کچھ کالر جن پر بنانے والی کمپنی کا نام "نیج مارگن برلن" چھپا ہوا تھا۔ یہی کل جیلر کا سرمایہ تھا جو کہ ہوٹل میں اپنا سامان چھوڑ کر بغیر کرایہ دئیے چلا گیا تھا۔ کوئی شخص اس کے گذشتہ حالات زندگی پر روشنی نہ ڈال سکا۔ بہر حال جیلر کا حلیہ اچھی طرح معلوم ہو گیا اور تمام اخباروں میں مشتہر کر دیا گیا۔

گورن کو یقین تھا کہ یہی آدمی قاتل ہے۔ ہوٹل والوں نے اسے بدشکل اور غریب آدمی بتلایا تعجب ہوتا تھا کہ میڈم ڈی مونٹیل ایسے لوگوں سے تعلقات اور دوستی نہ رکھتی تھی۔ بہر حال پولیس کو کامل یقین تھا کہ اسی نے وہ تینوں خون کئے ہیں اور اس کی تلاش جاری رکھی۔

جلد ہی پیرس کی پولیس کو اطلاع ملی کہ ایک شخص مارسیلز میں گرفتار کیا گیا ہے جس کے پاس میڈم کے مسروقہ جواہرات پائے گئے۔ قیدی کا برازینی ہے اور ڈاکٹر کی شکل میں سنگاپور جانا چاہتا تھا، سویڈن کا معلوم ہوتا ہے۔ برازینی نے کمال کا بھیس اور زبان بدلی تھی مگر اس گرفتاری کا سبب عورت پرستی ہوئی۔ مارسیلز کے ایک ہفتہ کے قیام میں اس نے دو عورتوں سے تعلقات پیدا کئے۔ ایک کو ہیرے کی جڑاؤ گھڑی پیش کی اور دوسری کو ہیروں کی خوبصورت انگوٹھیاں۔ انہوں نے فخر اور غرور سے ان چیزوں کی نمائش شروع کی۔ ایک جاسوس نے دیکھا اور اسے شبہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب سے دریافت کرنے پر وہ کافی ثبوت نہ دے سکے۔ بعد میں پکڑے گئے۔ بعد میں معلوم ہو گیا کہ یہ مال مسروقہ ہے جو میڈم مانٹیل کے یہاں سے چرایا گیا ہے۔

جب سے مجرم ناامید ہو گیا کہ اب وہ نہیں چھوٹ سکتا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور بات چیت بھی ترک کر دی۔ سوالات متعلقہ کا کوئی جواب نہ دیتا۔ زیادہ اصرار کرنے پر کہتا کہ "اسے قتل کے معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے" وہ یہ نہ بتلاتا کہ یہ جواہرات اس کے پاس کیسے آئے۔ ایک مرتبہ اس نے کہا۔ "میں کیوں بتلاؤں، تم خود ثبوت فراہم کرو اور ثابت کرو کہ میں مجرم ہوں۔ میں کیوں تمہاری مدد کروں؟"

ایک مرتبہ اس نے جیل میں پھندا ڈال کر خودکشی کی بھی کوشش کی۔ موسیو گورن کا معمہ حل نہ ہوا۔ کیا برازینی اور جیلر ایک ہی آدمی ہیں؟ جیلر سے اس کا حلیہ بھی مختلف تھا۔ جیلر پستہ قد تھا اور اس کا رنگ زرد، مگر برازینی اس سے بالکل مختلف۔ کیا برازینی نے اپنا دوسرا نام رکھ لیا تھا تاکہ لوگ اس پر شبہ نہ کریں؟ کیا جیلر ہی اصل قاتل ہے اور برازینی مسروقہ مال لینے میں شریک؟ یہ ضروری سوالات تھے جن کے جوابات حاصل کئے بغیر "ڈاکٹر کارل برازینی" پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ کم از کم یہ معلوم ہونا تو ضروری تھا کہ گیسٹن جیلر نے اس میں کسقدر حصہ لیا ہے۔ گورن کو اس کی جستجو میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا اور مختلف شہروں میں پھرنا پڑا۔ برلن میں جا کر کالر بنانے والی کمپنی میں گیا۔ وہاں انہوں نے کہا کہ کالر یہاں خریدے گئے مگر قمیصیں ان کے یہاں کی نہیں ہے بلکہ ایسی قمیصیں برسلیو میں ملتی ہیں۔ گورن وہاں پہنچا۔ ایک دوکاندار نے دیکھ کر پہچانا کہ اس نے میڈم گنینگ کے ہاتھ فروخت کی تھی۔ تفتیش سے پتہ چلا کہ اس کے بھتیجے کی ہے جو پیرس میں تھا مگر اب پیرس کے پاگل خانے میں ہے۔

اب یہ ثابت ہو گیا کہ اصلی قاتل برازینی ہی ہے اور اس کے خلاف شہادتیں جمع ہونے لگیں۔ چاقو فروش نے پہچان لیا کہ اسی نے اس دن اس کی دکان سے بڑا چاقو خریدا تھا۔ دونوں لڑکیوں نے ڈامی ڈائنٹ ڈیبٹ کے بعد شہادت دی کہ وہ اس رات کو ان کے پاس خون میں لت پت آیا تھا۔ ایک گواہ اور سامنے آیا جو میپل کی ایک مشہور ہوٹل کا منیجر تھا اس کا نام جیلر تھا۔ اور جیلر نام رکھنے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ برازینی اس کے ہوٹل میں بٹلر تھا اور چوری کے الزام میں جیلر نے اسے نکال دیا تھا۔ برازینی دشمنی اور اسے پھنسانے کے لئے اس کے نام کے خطوط اور اشارات چھوڑ آیا تھا۔

جب مقدمہ چلا تو برازینی سے متعلق بہت سے قصے لوگوں میں مشہور ہوئے اس نے زندگی کے ڈرامہ میں بہت سے

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

کمزور اور پتلا جسم

کے انسان اکثر کسی نہ کسی بیماری میں گرفتار رہتے ہیں اور ایسے انسان نہ اپنا بچا
کر سکتے ہیں اور نہ جی داری دکھا سکتے ہیں ایسے لوگ شادی کر کے پچھتایا کرتے ہیں او
ان کی کمزوری افسوس اور نادانی کا رونا روتی ہے۔

بعض نادان لوگ اپنی جوانی کے نشہ میں کچھ بری حرکتیں کر کے کمزور اور دبلے ہو جا
ہیں اور ان کے اعضا بھی سوکھ جاتے ہیں اور کسی کام کے نہیں رہتے۔ ایسے لوگو
کے لئے "طلا مقوی"، ایجاد کیا گیا ہے کمزور لوگوں نے تجربہ کیا ہے کہ اس طلا سے
اور بے جان گوشت میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بڑھنے اور پھولنے لگتا ہے مر
رگیں زندہ ہو جاتی ہیں بے جان پٹھے سخت ہو کر جان دار ہو جاتے ہیں۔ ثبوت اس
بات کا موجود ہے کہ جس کسی نے اس طلا کی ایک شیشی استعمال کر لی وہ گھر کی
زندگی میں عیش کرنے لگے گا۔

بس ایک شیشی کا استعمال کر لینا ہی کافی ہوتا ہے۔ قیمت ایک شیشی کی
دو روپے ہے۔ ڈاک خرچ آٹھ آنے علاوہ۔

پتہ۔ اکسیری دواخانہ پوسٹ بکس ۱۴ کلاں محل رائیم۔ پی (د

میری زندگی کا سب سے عجیب واقعہ

جناب جمشید عالم خان جمشید افغانی امروہوی

یہ افسانہ نہیں، ایک واقعہ ہے اور سچا واقعہ، عبرت و بصیرت سے لبریز، میں جب اپنے لمحات تنہائی میں اسے دہراتا اور اس پر غور کرتا ہوں تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ روحانیت ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے جس کا انکار خدا کی قدرت اور کمال انسانیت کا انکار ہے۔

میں طول کلام پسند نہیں کرتا، نہ کسی حقیقت اور واقعیت کو پُرتکلف اور دلچسپ بنانے کے لئے رنگین افسانویت کی ضرورت ہے اس لئے میں سادہ اور واقعاتی انداز میں اپنی داستان محبت پیش کر دینا چاہتا ہوں۔

میں ایک شریف اور ممتاز علمی خاندان کا فرد ہوں، عہد طفولیت میں سایۂ پدری سے محروم ہو گیا۔ اسلئے میری اعلیٰ تعلیم کی تکمیل دشوار ہو گئی، میری عالی ہمت والدہ کی کوششوں نے مجھے میٹرک تک پہنچا دیا جس میں مجھے شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ میری اردو استعداد کافی ہونے کے علاوہ عربی، فارسی بھی بہت اچھی تھی اس لئے میں نے چند روز کی محنت اور دلچسپی سے اسی سال فاضل ادب کی ڈگری حاصل کر لی اور پورے حوصلہ کے ساتھ بی اے کی تیاری میں مصروف ہو گیا، انگریزی کے قلیل عرصہ میں انگریزی کی غیر معمولی پریکٹس نے عالم تصور میں عروس کامیابی کا جمال دکھانا شروع کیا، فارم بھر کر فیس بھی صحیح وقت پر داخل کر دی لیکن شدید اور لگاتار محنت کے باعث میں یکایک علیل اور ایسا سخت علیل ہو گیا کہ امتحان کے وقت تک صحت کی امید منقطع ہو گئی۔ والدہ محترمہ نے انتہائی پریشانی اور ہجوم غم کے باوجود میرے علاج میں تن من، دھن لٹا دیا اس انتہائی پریشانی کے زمانہ میں میری پھوپھی جان اور اُن کی لڑکی صبیحہ میری تیمار داری اور والدہ کا ہاتھ بٹانے کیلئے ہمارے ہاں آ گئیں۔ صبیحہ نسائی حسن کا ایک مکمل اور شاندار مجسمہ تھی، وہ اپنی علمی قابلیت، ذہانت اور تہذیب و متانت میں خصوصی امتیاز کی مالک تھی، اگرچہ مذہب و شرافت کے آداب و مراسم کی بنا پر وہ مجھ سے پردہ کرتی تھی، لیکن اس نازک موقعہ پر وہ فطری اُنس و محبت کے ساتھ بے تکلف میری تیمارداری میں مصروف ہو گئی، دوا پلانا، غذا دینا اور میرے سرہانے بیٹھ کر پنکھا جھلنا اُس کی خاص ڈیوٹی تھی۔

خدا کے فضل و کرم سے ایک ہفتہ کے بعد مجھے افاقہ شروع ہوا اور روز بروز ازالۂ مرض اور تندرستی کے آثار نمایاں ہونے چلے گئے، پندرہ دن کے بعد میں تندرست ہو گیا۔ میں اس حقیقت کو چھپا نہیں سکتا کہ اتنے جلد میری صحت میں صبیحہ کی صحبت اُس کی مخلصانہ تیمارداری اور محبت نے میرے لئے مسیحائی کا کام کیا۔ مگر...... مگر اس علالت عارضی کے ازالہ کے ساتھ ہی صبیحہ کی محبت کا روگ میری رگ رگ میں پیوست ہو گیا، مجھے ایک منٹ کے لئے اُس کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اگر وہ ذرا سی دیر کے لئے بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی تو میں بے چین ہو جاتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ پھوپھی جان نے مجھے تندرست دیکھ کر اپنے مکان پر واپس جانے کا ارادہ کر لیا جن کے ساتھ صبیحہ کا جانا بھی لازمی تھا۔ ہر چند کہ میں نے انتہائی ضبط سے کام لیا تاہم میری مضطربانہ حرکات و سکنات نے دل میں چھپی ہوئی آتش محبت کا صبیحہ کو احساس کرا دیا۔ جب وہ مکان جاتے وقت مجھے دیکھنے آئی تو میں شدید کرب و اضطراب میں مبتلا تھا۔ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا، آہ صبیحہ کیا تم مسیحائی کرنے کے بعد مجھے پھر موت کے آغوش میں دئیے جاتی ہو؟ یہ کہتے ہوئے فرط تاثر اور شدت گریہ کے باعث میں نے اپنا منہ پھیر لیا تاکہ وہ میرے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے، وہ میرے اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، لیکن موقعہ کی نزاکت کے احساس نے اسے چند تسلی آمیز الفاظ کے سوا اور کچھ نہ کہنے دیا اور اُلٹے پاؤں رخصت ہو گئی اور اپنی جگہ پر بیہوش، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ بیہوشی کتنی دیر تک مجھ پر طاری رہی، لیکن دورۂ بیہوشی دور ہونے پر میں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ والدہ محترمہ میرے پاس بیٹھی ہوئی میری کیفیات کا بغور مطالعہ کر رہی ہیں۔ اب مجھے ظاہری ہوش کے ساتھ ہی باطنی ہوش بھی آ گیا تھا، معاملہ کی نزاکت و اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے میں نے پورے ضبط و تحمل سے

کام لیا اور اپنی کسی حرکت سے والدہ پر اپنی دلی کیفیت کا اظہار نہ ہونے نہ دیا۔

بہرکیف اب میں تندرست و توانا تھا۔ خالہ نے غسل صحت کی خوشی میں ایک مختصر سی دعوت دی۔ پھپھی جان اور صبیحہ نے بڑی مسرت سے شرکت کی۔ صبیحہ نے تازہ و شگفتہ پھولوں کا ایک بہترین گلدستہ تحفہ پیش کیا اور میں نے اس کے روح پرور جمال صبیح کے نظارہ سے ایک تازہ زندگی حاصل کی۔ اب میں نے امتحانی مضامین کی طرف متوجہ ہوکر انہیں اپنے ذہن و دماغ میں تازہ کرلیا اور چار پانچ روز قبل شرکت امتحان کی غرض سے دہلی جانے کی تیاری کی۔ محترم اساتذہ خاندانی بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کرتا ہوا پھپھی جان کے سلام کو گیا اور ان کی دعاؤں، صبیحہ کی محبت آمیز نگاہوں کے روحانی کیف سے مسرور دہلی روانہ ہوگیا۔

امتحان سے فارغ ہونے کے بعد احباب دہلی کے اصرار سے نتیجہ آنے تک دہلی کی سیر مقدس بزرگان دین کے مزارات، شاہان گزشتہ کے آثار اور ارباب علم و ادب کے تعارف سے بہرہ اندوز ہونے کا تہیہ کرلیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ صبیحہ کا تصور مجھے ہر وقت بے چین رکھتا تھا۔ اگرچہ دن بھر علمی تفریحات اور احباب کی ملاقات میں گزر جاتا۔ مگر رات بھر اس کا خیال دامنگیر ہوتا اور میرے جذبات شوق کا ہجوم۔

والدہ کے خطوط مسلسل و متواتر آتے رہتے۔ ان کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ انہوں نے میری غیر موجودگی میں پھپھی جان سے میرے لئے صبیحہ کی درخواست کی ہے جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا ہے کہ حامد کا نتیجہ آنے پر غور کیا جائیگا۔

بحمد اللہ میں ہمیشہ مذہبی اصول و فرائض کا پابند رہا ہوں، روحانیت اور روحانی بزرگوں کا معتقد ہی نہیں بلکہ ان کی خدمت اور قدمبوسی کو موجب سعادت سمجھتا ہوں۔ چنانچہ دہلی کے بزرگان دین کے مزارات کی حاضری بالخصوص حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کے آستانہ کی زیارت میرا معمول ہوگیا تھا۔ ایک روز عصر کے بعد میں مزار پر انوار پر فاتحہ خوانی میں مصروف تھا کہ یکایک ایک سادہ پوش بزرگ میرے پیچھے آکھڑے ہوئے، میں ادب سے فوراً ایک طرف ہوگیا اور ان کی دستبوسی کی۔ جب وہ فاتحہ و مراقبہ سے فارغ ہوکر مسجد میں جانے لگے تو میں بھی ان کے پیچھے ہولیا۔

شاہ صاحب نے مجھے اپنے ساتھ آتے دیکھ کر فرمایا۔ میاں صاحبزادے، تمہارا کیا نام ہے، کہاں مکان ہے؟ یہاں کیسے آئے، اور ہمارے پیچھے کیوں ہولئے؟

میں نے اپنا نام، مقام، اور دہلی آنے کا سبب بیان کیا، فرمایا چوتھی بات کا جواب میں نے عرض کیا، حضور کی باطنی کشش، فرمایا کیا خوب، اچھا آپ کا مقصد؟ میں نے کہا، کیا آفتاب کو مشعل دکھانے کی حاجت ہے، کہنے لگے اس طرز گفتگو کو چھوڑو، سائل کو بہرحال اپنا سوال پیش کرنا چاہئیے۔

میں نے معافی چاہتے ہوئے، علم و عشق کے امتحان میں دعائے کامیابی کی درخواست کی، وہ میری دونوں درخواستیں سن کر سر بزانو ہوگئے اور چند منٹ کے بعد سر اٹھا کر فرمایا، تمہارے پرچہ کے آخری سوال کا جواب جس کے سو نمبر ہیں غلط ہوگیا ہے، مگر وہ ابھی جانچا نہیں اور تمہاری محبوبہ کیلئے ایک بڑے رئیس زادہ کا پیام ہے جس کو اس کے والد پسند کرتے ہیں مگر اس کی ماں خاموش ہے۔

یہ سن کر فرط اندوہ سے مجھ پر ایک سکتہ طاری ہوگیا۔ قریب تھا کہ بیہوش ہو جاؤں لیکن شاہ صاحب نے مجھے سنبھال کر اپنا دست مبارک میرے دل پہ رکھدیا اور تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ صبر و استقامت سے کام لیتے ہوئے خدا کی رحمت پر بھروسہ رکھو، وہ کارساز مطلق ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے مقاصد سے محروم نہ رہوگے۔ ان تسلی بخش اور حوصلہ افزا الفاظ نے مسیحائی کا کام دیا، لیکن میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکا کہ حضور کی دستگیری کا امیدوار ہوں ——" میری اس مودب اور پُر درد درخواست کو سنکر شاہ صاحب پہلوئے مسجد کے حجرہ میں تشریف لے گئے اور صاحب حجرہ سے قلم دوات اور سادہ کاغذ طلب فرما کر دو نقش لکھے، ایک کا فتیلہ بنا کر اپنے عمامہ سے سبز تاگا نکال کر لپیٹ دیا اور دوسرا تہ کرکے اپنی مٹھی میں دبالیا، پھر کچھ پڑھ کر دونوں پر دم کرکے میرے حوالے کئے اور فرمایا۔ فوراً اپنی قیام گاہ پر واپس جاؤ اور نماز عشا کے بعد مٹی کے ایک دئیے میں سرسوں کا تیل بھر کر یہ فتیلہ روشن کرو اور بسم اللہ و درود شریف پڑھ کر اس کی روشنی میں اس آخری سوال کا ویسی ہی قلم اور سیاہی سے ایک پرچہ پر لکھو جیسی سے امتحان کا پرچہ لکھا ہے اور پھر اس کاغذ کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں اٹھا کر سادہ رخ اپنے چہرہ کی طرف اور لکھا ہوا رخ چراغ کی جانب کرکے بسم اللہ الرحمن الرحیم یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت تین بار پڑھ کر پرچہ پر دم کرتے ہوئے اس طرح

خون کی دھاریں

اگر آپ کو بواسیر کی شکایت ہے اور خون کی دھاریں بہہ رہی ہیں اور سیروں خون نکل جانے کی وجہ سے جسم زرد پڑ گیا ہے اور کسی علاج سے آج تک آرام کی صورت نہیں نکلی ہے تو حیرت میں ڈالنے والی دوا

"بواسیری"

منگا لیجئے۔ خون کا آنا تیسرے روز بالکل بند نہ ہو جائے تو دوگنی قیمت واپس۔ دو ہفتہ کے بعد مسّے خود بخود خشک ہو جاتے ہیں۔ ایک شیشی ایک مریض استعمال کر لے اور تمام عمر کے لئے اس مرض سے چھٹکارا پا لے۔ خونی بواسیر کے لئے یہ دوا ایک معجزہ ہے۔

قیمت ایک شیشی تین روپے۔ ڈاک خرچ آٹھ آنے علاوہ۔

پتہ۔ اکسیری دواخانہ۔ پوسٹ بکس ۱/۴، کلاں محل (ایم۔ٹی) دہلی

اس چراغ پر چھوڑ دو کہ پرچہ جلنے لگے، پھر اُس قلم کی نوک سے پُورے کاغذ کو جلاتے اور چراغ کے تیل میں حل کرتے جاؤ یہاں تک کہ وہ فتیلہ اور مخلوط تیل حل کر ختم ہو جائے اس کے بعد اسی جگہ سو جاؤ اور تین بجے بیدار ہو کر بعد وضو دو رکعت نماز "قضائے حاجت" ادا کرو اور اس دوسرے نقش کو جو دل کی شکل کا ہے، کھول کر بغیر دیکھے ایک مجلّی آئینہ پر اُلٹا چسپاں کر دو اور اس آئینہ کو اپنے سامنے رکھ کر اوّل و آخر درود شریف کے بعد بسم اللہ کے ساتھ طلوع فجر تک "وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ" کا ورد کرتے رہو، دوران وِرد میں، اپنے محبوب کا تصور پوری قوت کے ساتھ پیش نظر رکھو اور اس عالم تصور میں بار بار اُن کے دل کی طرف دم کرتے جاؤ۔ اوّل وقت نماز فجر ادا کر کے، "وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ" الخ تین بار کہہ کر اسی مصلے پر بیٹھے ہوئے اپنے محبوب کا تصور کئے رہو اور آفتاب طلوع ہوتے ہی محبوب کے چہرہ کا تصور کرتے ہوئے "یا جامع المتفرقین" تین بار کہہ کر سورج کی کرنیں اپنے چہرہ پر ڈالو اور یہ سمجھو کہ محبوب کے نظارۂ جمال سے کیف اندوز ہو رہے ہو۔ آفتاب بلند ہونے پر، "الحمد للہ رب العالمین۔ الرحمٰن الرحیم" کہتے ہوئے دو رکعت نماز اشراق پڑھ کر تھوڑی دیر کیلئے سو جاؤ۔ بس، انشاء اللہ العزیز تمہارے دونوں مقصد حاصل ہونگے۔

یہ مژدہ ہائے روح افزا سن کر میں نے شاہ صاحب کے مبارک قدموں پر سر جھکانا چاہا مگر انہوں نے اپنے ہاتھ سے فوراً روک دیا اور فرمایا بس اب یہاں ٹھہرنے کا وقت نہیں، جاؤ اپنا کام کرو۔ میں نے نہایت ادب سے شاہ صاحب کے اسم گرامی اور مستقل جائے قیام کے متعلق دریافت کیا، فرمایا کل بعد عصر اسی جگہ ہمارے پاس آنا اسوقت بتائیں گے۔

میں شاہ صاحب کی دست بوسی کرتے ہوئے اپنی قیامگاہ کی طرف واپس ہوا، مجھے صاحب کشف بزرگوں کے روحانی کمالات پر پورا اعتقاد تھا، میرے دل میں کوئی وسوسہ تو پیدا نہیں ہوا لیکن مجھے حیرت تھی کہ الٰہی یہ خواب ہے یا بیداری، مگر دونوں نقش میری جیب میں تھے اس لئے میری حیرت رفع ہو گئی۔ بہرکیف میں راستہ میں واقع ہونے والے بازار سے مٹی کا دیا اور سرسوں کا تیل لیتا ہوا قیامگاہ پر پہنچ گیا۔

محترم میزبان مہدی سعید کھانے کے کمرے میں میرے منتظر تھے۔ میں نے اخلاقاً چند لقمے تناول کئے اور اُن سے اجازت لیتے ہوئے عرض کیا۔ مجھے آج کی رات ایک نہایت اہم کام انجام دینا ہے۔ اس لئے اب صبح تک کوئی صاحب میرے کمرے کے دروازہ پر دستک یا مجھے آواز نہ دیں۔ صبح نو بجے کے قریب مجھے آواز یا دستک سے جگا دیا جائے۔

یہ کہکر میں اپنے کمرہ میں داخل ہوا اور نماز عشا سے فارغ ہوکر حسب ہدایات شاہ صاحب اپنا کام شروع کر دیا۔ سوالات کا پرچہ میز کی دراز سے نکال کر دیکھا اور آخری سوال پر غور کیا تو مجھے یاد آیا کہ واقعی میں نے جواب میں شدید غلطی کی ہے جس سے تمام جواب برعکس ہوا جاتا ہے۔ مجھے شاہ صاحب کے مکاشفہ پر یونہی کچھ کم حیرت نہ تھی کہ یکایک میز کی بائیں جانب شام کی ڈاک سے آیا ہوا والدہ کا سربند خط رکھا نظر آیا، فوراً لفافہ چاک کر کے پڑھنا شروع کیا۔ میں جوں جوں خط پڑھتا جاتا تھا دریائے حیرت میں ڈوبا جا رہا تھا، والدہ نے انتہائی رنج و ملال کے ساتھ لکھا تھا کہ سید محمد علی صاحب ڈپٹی کلکٹر نے صبیحہ کیلئے اپنے بیٹے سجاد علی صاحب ایم، ایس، سی کا پیام دیا ہے، تمہارے معاملہ میں غور و فکر کے بعد کوشش کی جائے گی۔

اس غیر متوقع انکشاف مجھے شاہ صاحب کے حیرت انگیز کشف روحانی کا یقین کامل ہو گیا اور میں نے سمجھا کہ یہ بزرگ حضرت خضر تھے۔ اب دیکھئے، اُن سے ملاقات ہوتی ہے یا نہیں؟ میں نے فوراً سجدۂ شکر ادا کیا اور بموجب ہدایت چراغ میں فتیلہ روشن کر کے پرچہ کا جواب لکھنا شروع کیا اور اسی طرح کام کو ختم کیا جس طرح شاہ صاحب نے فرمایا تھا۔

میں اس مرحلہ سے فارغ ہو کر وہیں سو گیا۔ ٹائم پیس میں ۲½ بجے کا الارم بھر دیا تھا۔ چنانچہ گھنٹی کی آواز کان میں پڑتے ہی میں جاگ اُٹھا اور اطمینان سے وضو کر کے دوسرے نقش کا عمل شروع کر دیا۔ بحمد اللہ یہ عمل بھی مطابق ہدایات تکمیل کو پہنچا۔ ۸ بجے مہدی صاحب نے دستک دی تو میں کمرے کی بالائی منزل سے اُتر کر باہر آیا۔ ناشتہ میز پر چُنا ہوا تھا، چائے نوشی کے دوران میں مہدی صاحب میرے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگے۔ آپ کے چہرہ پر عجیب شان جلال و جمال برس رہی ہے۔ یہ اسی اہم کام کا اثر تو نہیں ہے جو آپ نے رات انجام دیا ہے میں نے کہا جی ہاں۔ مگر آپ تفصیل بھی دریافت فرمائینگے۔ اس لئے آپ کی اعلیٰ تہذیب و شائستگی سے متوقع ہوں کہ اس سے زیادہ وضاحت پر اصرار نہ فرمائیے کہ رات میں نے شراب روحانیت کے دو لبریز جام پئے ہیں۔ مہدی سعید صاحب

انتہائی مہذب شائستہ اور اسم بامسمیٰ جوان تھے۔ وہ شیریں تبسم کے ساتھ "مبارکباد" کہکر دوسری گفتگو کرنے لگے۔ میری آنکھوں میں خمار بھرا ہوا تھا، ناشتہ کے بعد آرام کرسی پر ہی سو گیا۔ رفیق مہدی صاحب نے گیارہ بجے مجھے اٹھایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا، بھئی دو جاموں ہی میں دونوں جہان سے غافل ہو گئے۔ ہم تو میخانہ کا میخانہ پی جائیں اور جنبش تک نہ ہو، لو اٹھو کھانا میز پر ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ میں نے فوراً اٹھ کر منہ دھویا اور چند قدم کمرے میں ٹہلنے کے بعد کھانا کھایا اور شام کو عصر کے بعد شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بیتابانہ قدمبوس ہوا۔ جواب سابقہ کی غلطی، اور والدہ کے خط کا واقعہ دہرایا۔ اس پر آپ نے صرف ذرا گردن ہلائی اور فرمایا اچھا، کل کے سوال کا جواب سنو، فقیر کا نام خادم سے زیادہ اور کچھ نہیں، اگر کبھی ملنا چاہو تو ہر پنجشنبہ و جمعہ کو اسی آستانہ عالیہ پر ملیگا۔

میں نے نہایت ادب سے حسب توفیق نذرانہ پیش کیا، دیکھ کر مسکرائے اور اس پر ہاتھ رکھکر فرمایا تمہارا نذرانہ عقیدت قبول و منظور ہے۔ اچھا اب یہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے اسے اپنے پاس محفوظ رکھو اور پانچ پیسہ کے چنے پیرو مہرجی کے ہاں سے لے آؤ جس کی دکان سڑک کے موڑ پر ہے کسی سے دریافت کر لینا، میں نے تعمیل ارشاد کی۔ شاہ صاحب نے ایک مٹھی چنے مجھے مرحمت فرمائے اور بقیہ اپنی چادر کے کونے میں باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا، اچھا اب تم اپنے وطن واپس جاکر اپنی والدہ کی خدمت میں رہو۔ خدا حافظ السلام علیکم و رحمتہ اللہ۔

میں اسوقت نہایت دلگیر تھا، میری خواہش تھی کہ میں شاہ صاحب کے قدموں پر سر رکھے پڑا رہوں، مگر شاہ صاحب نے پھر فرمایا۔ بس دیر نہ کرو، فوراً جاؤ، اب دہلی میں تمہارا کام نہیں۔ یہ کہتے ہوئے مزار حضرت خواجہؒ کی طرف چل دیئے اور میں سلام کر کے ایک عجیب عالم میں ڈوبا ہوا قیامگاہ پر واپس آیا۔

مہدی صاحب سے اجازت لی اور رات کی ٹرین ہی سے سوار ہو گیا۔ جب مکان پر پہنچا ہوں تو فجر کی بانگ اذان اور میری آواز ایک ساتھ والدہ کے کان میں پہنچی، والدہ نے مجھے اپنے سینہ سے لگا لیا اور پھر نماز سے فارغ ہو کر مجھ سے گفتگو کی۔

ہر چند کہ والدہ صبیحہ کے معاملہ سے متعلق بیحد افسردہ تھیں، لیکن جب میں نے دہلی کے پیش آمدہ واقعات، شاہ صاحب کی ملاقات اور تکمیل عملیات کا تذکرہ کیا تو انہیں بہت کچھ اطمینان ہو گیا۔ مجھے اپنے دونوں امتحانوں کے نتیجہ کا بے چینی سے انتظار تھا اس کے ساتھ ایک شدید روحانی تکلیف یہ تھی کہ اب میں پھپی جان کے ہاں بے تکلف نہیں جا سکتا تھا کہ صبیحہ کو دیکھ سکوں، میں شب و روز اس کے تصور اور شوق دیدار میں بے قرار تھا لیکن شاہ صاحب کا تصور مجھے برابر تسکین و تسلی دیتا رہا۔

بہر کیف دو ہفتے اسی رنگ میں گزر گئے۔ آج مجھے رزلٹ آنے کا بے چینی اور انتہائی شوق کے ساتھ انتظار تھا۔ میں نے نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی پوسٹ آفس جانے کا ارادہ کیا، لیکن والدہ کے اصرار پر پندرہ منٹ ناشتہ میں لگ گئے۔ میں اپنی سائیکل سنبھالکر ڈیوڑھی میں آیا ہی تھا کہ محمود میاں صبیحہ کے بھائی انتہائی مسرت کے عالم میں بڑی تیزی کے ساتھ ٹائمز آف انڈیا رزلٹ نمبر ہاتھ میں لئے دروازے میں داخل ہوئے اور بڑے زور سے کہا۔ حامد بھائی مبارک ہو۔ آپ فرسٹ پوزیشن میں کامیاب ہوئے۔ میں نے سائیکل ڈیوڑھی ہی میں چھوڑ دی۔ محمود میاں جوش مسرت سے مجھے گود میں اٹھائے اندر تک لے گئے اور ممانی جان مبارک ہو، حامد بھائی زندہ باد، کا غلغلہ بلند کر دیا۔

یہ مسرت ناک خبر چند منٹ کے اندر سارے خاندان بلکہ محلہ بھر میں پھیل گئی۔ میں نے اور والدہ نے پہلے تو سجدۂ شکر ادا کیا اور پھر نشستگاہ کھول کر محمود میاں کو بٹھایا، والدہ نے اسی وقت دعوت شکرانہ کا انتظام شروع کر دیا۔ ایک گھنٹہ کے عرصہ میں تمام خاندان کے افراد مرد و زن، دوست احباب ہمارے مکان پر جمع ہو گئے، پھپی جان بھی تشریف لائیں لیکن صبیحہ اس تقریب مسرت میں شریک نہ ہو سکی جس کا مجھے نہایت افسوس تھا۔

تقریب سے فارغ ہو کر والدہ نے پھپی جان سے مشورہ پر عمل کیا گیا۔ آپ براہ راست اُن سے کہیں، میری طرف سے کوئی عذر نہیں ہے، چنانچہ پھپی جان کے مشورہ پر عمل کیا گیا، مگر پھوپا صاحب نے جواب دیا کہ ابھی ایک سال تک میں کوئی نسبت منظور نہیں کر سکتا۔

اس معنی خیز جواب میں یہ راز مضمر تھا کہ سجاد صاحب آکسفورڈ کی ڈگری حاصل کر کے یورپ سے واپس آجائیں اور صبیحہ کی نسبت کے امتحان مقابلہ میں کامیابی حاصل کریں۔

اُن کے جواب سے والدہ بہت افسردہ ہوئیں لیکن میں نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا، آپ گھبرائیں نہیں دیکھئے تو سہی پردۂ غیب

ری جووین کورس کے متعلق ڈاکٹروں ویدوں اور اطبا کی رائیں

اکسیری دواخانہ کی بڑی زبردست تحقیقاتی ایجاد کی تمام ہندوستان میں دھوم مچ گئی

کمزور مردوں پر احسان عظیم

ڈاکٹر محمد عظیم صاحب ایل-ایم-ایس-لاہور:- آپ نے ری جووین کورس ایجاد کر کے ملک و قوم کی دعائیں لی ہیں۔ اب تک اس قسم کی دوائیں ناکام رہی تھیں مگر اس ایجاد کی کامیابی دیکھ کر مبارکباد دیتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے مریضوں کو ری جووین کورس کا ہی مشورہ دیا کروں گا۔

ڈاکٹر شنکر داس-ایم-بی بی-ایس-ملتان:- ری جووین کورس جس کے متعلق میں عرصہ سے سن رہا تھا کہ نامرد مریضوں کے لئے ویدک ویونانی کی اکسیری ایجاد ہے آخر تجربہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اور میں نے اس کو چند مریضوں پر استعمال کر کے کامیابی دیکھی۔ واقعی اس ایجاد پر آپ کو فخر کرنا چاہیئے۔

سوامی ہری داس وید اچاریہ (سورت):- دیش میں ویسے تو بڑے بڑے کشتہ جات (بھسم) جیون کی (نربلتا) کمزوری کو دور کرنے کے ایجاد ہیں مگر کسی کے متعلق یقین نہیں کیا جا سکتا کہ فائدہ کرے۔ آج میں خوش ہوں کہ آپ نے اوشدھی (دوا) تیار کر کے جاتی کے نربلتا کے روگیوں کو دوبارہ جنم دلایا ہے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی اس اوشدھی کا پرچار کرنے میں بہت وشواس ہو گیا ہے۔ ایک درجن ری جووین کورس میرے پتہ پر بھیجنے کی کرپا کریں۔

گیانی پرتاپ سنگھ وید بھوشن انبالہ:- کہتے ہیں کہ ہزاروں برس پہلے لوگ ایسی اوشدھیوں (دواؤں) کو جانتے تھے جن سے لوگ دوبارہ جوانی کر پا لیتے تھے مگر اس کے بعد کوشش تو سب نے ہی کی مگر کامیابی کسی منش (انسان) کو نہ ہو سکی۔ ایشور آپ پر کرپا کریں کہ آپ نے بڑی ضرورت کو پورا کیا کمزوری و سستی کے مریضوں کو میں آپ کی ایجاد کے سیون (استعمال) کرنے کی طرف توجہ دوں گا۔

پروفیسر ہردے نرائن (سندھ) ری جووین بہت بڑی ایجاد ہے جس کے متعلق میرے دوستوں نے بتایا کہ یہ اس زمانہ کی کایا کلپ ہے اور اس سے بڑے بڑے فائدہ کمزور انسانوں کو ہوتے ہیں میں اپنے دوستوں کو اس ایجاد کے استعمال کی سفارش کر رہا ہوں۔ آپ کی ایجاد کی نسبت جتنی شہرت ہو کم ہے۔

مولوی محمد نور الاسلام صاحب (ہزاری باغ):- حق بات کو چھپانا گناہ ہے اسلیئے میں اس بات کو ظاہر کرنے میں بیباکی سے کام لیتا ہوں کہ ری جووین کورس کی ایجاد صرف اسلیئے ہی نہیں ہے کہ لوگ عیاشی یا بدمعاشی کے لئے استعمال کریں بلکہ اس دوا سے دماغی کمزوری اعصابی کمزوری اور بہ تقاضائے عمر کمزوری کو دور کر کے انسان بہت خوش اور تندرست رہ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ اچھی ایجاد کی تعریف نہ کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔

ری جووین کورس دنیا کی عجیب ایجاد ہے پورے کورس کی قیمت پانچ روپے ہے۔ ڈاک خرچ آٹھ آنہ علاوہ

پتہ- اکسیری دواخانہ- پوسٹ بکس ۱۳۸ کلاں محل (ایم-ٹی) دہلی

اپنے شہر کے دوا فروشوں سے بھی طلب کر سکتے ہیں

سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

ہرچند کہ میں اس عرصہ میں صبیحہ کے نظارۂ جمال سے محروم رہنے کے باعث بہت افسردہ بیقرار رہتا لیکن میں اپنے دل میں ایک مخفی اطمینان محسوس کرتا تھا اور اسی بنا پر میں نے اپنا وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہاں میں یہ بتانا بھول گیا کہ یونیورسٹی کی طرف سے میرے لئے اسکالرشپ تجویز ہو چکا تھا اگر میں (ایم اے) کی شرکت کا ارادہ کروں چنانچہ میں نے الوالعزمی کے ساتھ تیاری شروع کر دی اور وقت پر شریک امتحان ہوا۔

صبیحہ کے بھائی محمود میاں میٹرک میں میرے کلاس فیلو تھے ان کو مجھ سے اور مجھے ان سے بڑی محبت تھی وہ میرے پاس برابر آتے رہتے۔ ایک دن وہ آئے تو بہت اداس اور پریشان تھے میرے دریافت کرنے پر اول تو انہوں نے ٹالنا چاہا۔ لیکن بالآخر بتانا پڑا کہ صبیحہ آپا دو مہینہ سے علیل ہیں اور اب ایک ہفتہ سے تو ان کی طبیعت بہت ہی زیادہ ناساز ہے، اس روح فرسا خبر نے مجھے بیتاب کر دیا لیکن بڑے ضبط سے اپنے دلی اضطراب کو چھپا کر میں نے علاج کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ علاج ڈاکٹری ہے لیکن وہ ان دواؤں سے متنفر ہے۔ میں نے حکیم رمزی صاحب سے رجوع کرنے پر مشورہ دیا جسے محمود میاں نے بہت پسند کیا چنانچہ ہم دونوں اسی وقت حکیم صاحب موصوف کے پاس پہونچے حکیم رمزی میرے بڑے کرمفرما اور مخلص دوست تھے۔

میں نے ان سے ایک مخصوص استعارہ کے انداز میں مریضہ کی کیفیت اور مخفی اسباب پر روشنی ڈالی حکیم صاحب نے ایک مفید ترین اور لطیف نسخہ تجویز فرمانے کے ساتھ ہی اپنی خاص گولیاں مرحمت فرمائیں، میں نے موقع پاکر نسخہ پر اپنے مخصوص شارٹ ہینڈ دستخط کر دئیے۔

صبیحہ نے محمود میاں کے ہاتھ سے دوائیں اور نسخے کو اُنہیں دیکھا، تو اسے میرے مخصوص دستخط نظر پڑے، تو اس کے ہاتھ میں رعشہ سا پیدا ہونے لگا مگر وہ سنبھلی اور اس نے دواؤں کا استعمال شروع کر دیا۔

صبیحہ کی تبدیلِ علاج کو ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ میری شاندار کامیابی کا مژدہ یعنی رزلٹ آگیا۔ مکان پر اعزا و احباب کا مجمع اور مبارکباد کا غلغلہ برپا تھا کہ میں نے دیکھا کہ محمود میاں حسب عادت متبسم مسرت کے پھول برساتے چلے آرہے ہیں، انہوں نے دور ہی سے پُرجوش مبارکباد دیتے ہوئے معذرت کی کہ مجھے ایک خاص بنا پر آنے میں دیر ہوئی۔ بہرکیف اعزا و احباب رخصت ہوتے رہے اور اندر سے تقاضے آرہے تھے کہ "حامد میاں اندر آؤ" میں اُٹھا تو محمود میاں بھی میرے ساتھ اُٹھے اور آہستہ سے میرے کان میں کہا ایک اور خبر بھی سُن لیجئے سجاد صاحب کے ایک دوست کا خط آیا ہے جس میں وہ اطلاع دیتے ہیں کہ "سجاد صاحب سول سروس کے امتحان میں ناکام رہے اور انہوں نے حسب قانون "سول میرج" ایک یوروپین لیڈی سے شادی کر لی ہے"

اس غیر متوقع خبر نے مجھے فرطِ مسرت سے بیخود کر دیا، اسی عالم میں اندر جاتے ہوئے میں نے صبیحہ کی کیفیت کی محمود نے بتایا کہ جب وقت سے یہ دونوں خبریں سُنی ہیں وہ بالکل تندرست اور نہایت شگفتہ نظر آتی ہے۔ میں فرطِ شوق اور جوشِ مسرت میں محمود میاں سے بغلگیر ہو گیا اور دونوں اسی طرح زنانہ میں پہنچے۔ حویلی میں خاندان کی بڑی بوڑھیاں اور بہو بیٹیاں بھری ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی مبارکباد کا شور مچ گیا اور چاروں طرف پھولوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ اسی ہنگامہ مسرت میں پھپی جان ایک خوشنما گلدستہ ہاتھ میں لئے آتی نظر پڑیں میں نے نہایت ادب سے سلام کیا اور انہوں نے مبارکباد کے ساتھ دعائے ترقی و اقبال دیتے ہوئے وہ گلدستہ پیش فرمایا۔ میں نے اسے سر چڑھاتے ہوئے غور سے دیکھا تو اس کی جڑ میں نہایت باریک قلم سے صبیحہ کے شارٹ ہینڈ دستخط نظر آئے جس نے مجھے آسمان مسرت پر پہنچا دیا۔

دوسرے دن والدہ نے شکرانۂ الٰہی میں نیاز کی۔ حسنِ اتفاق سے پھوپا صاحب دو دن کی رخصت پر تشریف لائے ہوئے تھے وہ بھی بسلسلۂ مبارکباد نیاز میں شریک ہوئے اور میری شاندار کامیابیوں پر بہت کچھ اظہار مسرت فرمایا۔ پھپی جان موجود نہیں تھیں۔ والدہ نے موقع دیکھ کر عرض کیا، بھائی جان مجھے امید ہے کہ آپ یتیم حامد کی سرپرستی سے دست کشی گوارا نہ فرمائینگے، اُنہوں نے خندہ پیشانی سے جواب دیا انشاء اللہ، اور یہ کہتے ہوئے سو روپیہ کا نوٹ میرے ہاتھ میں دیکر رخصت ہو گئے۔

اب میں اس واقعہ کو طول دینا نہیں چاہتا مختصر یہ کہ صبیحہ کے ساتھ میری نسبت قرار پا گئی اور تعطیل کلاں کے موقعہ پر رخصتی کا وعدہ کیا گیا۔ اس عرصہ میں نے ٹریننگ کر لیا، اور شاہ صاحب موصوف کی خدمت میں پہنچ کر قدمبوسی حاصل کی۔ تمام واقعات دہراتے ہوئے شادی میں شرکت کی درخواست کی، ارشاد فرمایا ہم یہیں سے شریک ہونگے بس اب تم جاؤ شادی کا سامان اور پروفیسری کی جگہ تیار ہے لیکن تمہیں دینیات کی تکمیل اور خدمت خلق

کے خیال سے کسی وقت غافل نہ رہنا چاہئے۔ بہرحال میں مکان پر واپس آیا اور میری آرزوئے حیات پوری ہوئی یعنی صبیحہ میری...

شباب

از جناب حمید عظیم آبادی

بس اک کروٹ میں فطرت کا چلن بدلا ادا بدلی
وہ اندازِ ستم بدلا، وہ طرزِ دلربا بدلی
زمانہ یک بیک بدلا، دلوں میں پیچ و تاب آیا
کسی نے آکے چھیڑا ایک بیک دل کی تمنا کو
تموج زا کسی نے کردیا خاموش دریا کو
اُٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی دیوی محبت کی
عجب سرشار عالم ہوتا ہے عہدِ جوانی کا
خِرد سے کام ہی رہتا نہیں اس دور میں اصلا
خوشی سے ناز والوں کے جفا و جور سہتے ہیں
بدل جاتا ہے اندازِ تخاطب بھی، تکلم بھی
فزوں ہوتا ہے ذوقِ نکتہ سنجی و تفہم بھی
تلاطم سا بپا ہوتا ہے دریائے تمنا میں
تنفس کا تموج بھی بدل دیتا ہے رُخ اپنا
نظر آتا ہے انساں کو نیا عالم نیا نقشا
حیا شوخی کے پردے میں قضا کا کام کرتی ہے
جبیں پر دوڑنے لگتی ہیں موجیں جامِ عشرت کی
خمِ گیسو میں پڑ جاتی ہیں گرہیں دامِ اُلفت کی
پلک اُٹھ کر لگاتی ہے نگاہِ ناز کی برچھی
سراپا حُسن ہو جاتی ہے انساں کی نظر گویا
نمو کے موج زن ہوتے ہیں رگ رگ میں کئی دریا
جدھر اُٹھتی ہیں آنکھیں حُسن کا گلزار ہوتا ہے
کبھی رفتار میں لغزش، کبھی چالیں ہیں مستانہ
کبھی لب پر محبت کا سرور آمیز افسانہ
یہ وہ مستی کا عالم ہے کہ عقل و ہوش کی دُنیا

نظر کی کیفیت بدلی، سخن بدلا، حیا بدلی
نظر آتی ہے گویا ساری دُنیا کی فضا بدلی
شباب آیا کہ دُنیائے سکوں میں اضطراب آیا
کسی نے کردیا آباد گویا دشت و صحرا کو
کسی نے خواب سے جیسے جگایا سوئی دُنیا کو
نئی بستی لگی بسنے امید و شوق و حسرت کی
اُترتا ہی نہیں جامِ مئے پُر کیف کا نشہ
سروں میں ہر گھڑی رہتا ہے نازِ حُسن کا سودا
نظر کے تیر بھی دل میں تمنا بن کے رہتے ہیں
تغیر زا نظر آتا ہے لہجے کا ترنم بھی
جھجک کے ساتھ بڑھ جاتا ہے احساسِ توہم بھی
نئی اک جان آجاتی ہے گویا دل کی دُنیا میں
اُمڈ آتا ہے ارماں کے تلاطم کا نیا دریا
خدا کی شان پل بھر میں بدل جاتی ہے کل دُنیا
جفا و جور کی دیوی نہا دھو کر نکھرتی ہے
رُخِ گلگوں دِکھاتا ہے بہاریں صبحِ جنت کی
بھنویں تن کر کمانیں کھینچ لیتی ہیں محبت کی
نظر جھک کر گراتی ہے دلِ بیتاب پر بجلی
نظر آتا ہے ہر شے میں کرشمہ حُسنِ صنعت کا
اُبھر پڑتے ہیں دم بھر میں نقوشِ حُسنِ بے پروا
جوابِ گُل نگاہِ شوق میں ہر خار ہوتا ہے
جنوں کے کیف میں چلتا ہو جیسے کوئی دیوانہ
کبھی اندازِ ترکانہ کبھی نظروں میں میخانہ
ڈبو دے زاہدِ خلوت نشیں بھی ہو کے بے پروا

باپ کا قاتل

سو فیصدی سچا جاسوسی افسانہ

محمد قمر الدین رامنگری

کچھ عرصہ پہلے مسٹر ڈبلو گیلوے بہار کے کسی ضلع میں پولیس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اس زمانہ میں ان کے ماتحت کسی تھانے کے انچارج نے ایک حادثۂ قتل کی تحقیقات کی۔ اس نے اس حادثے کے متعلق جو ثبوت فراہم کئے تھے وہ اتنے پختہ اور وزنی تھے کہ عدالت ملزم کو سزائے موت دئے بغیر نہ چھوڑتی لیکن مسٹر گیلوے کو اپنے ماتحت تھانیدار کی تحقیقات پر اطمینان نہیں ہوا۔ اُنہوں نے از سر نو خود اس معاملے کی تحقیق و تفتیش کی۔ چنانچہ انہوں نے حقیقی مجرم کا پتہ لگانے میں جس فکر و سعی اور مہارت و قابلیت کا ثبوت دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاسوسی کے فن میں انہیں غیر معمولی کمال حاصل تھا۔

مسٹر گیلوے نے لندن کے ایک ماہنامے میں اس واقعہ کو نہایت دلچسپ پیرائے میں شائع کیا ہے جس میں انہوں نے متعلقہ اشخاص کے نام تبدیل کر دئے ہیں لیکن واقعات حرف بحرف صحیح ہیں۔ اُنہوں نے سپرنٹنڈنٹ کے لئے مسٹر رینالڈس کا اور تھانیدار کیلئے محمد علی کا نام استعمال کیا ہے۔ مسٹر گیلوے لکھتے ہیں:—

"کسی گاؤں میں ایک بوڑھا رہتا تھا جس کا نام رام پرساد تھا۔ اس نے نہایت امن و سکون سے زندگی گزاری تھی۔ اسلئے بڑھاپے میں نامعلوم طور پر کسی نے اس کو قتل کر دیا تو سارے گاؤں میں ایک ہلچل سی برپا ہو گئی۔

جس تھانے کے علاقے میں وہ گاؤں واقع تھا اس کا انچارج آفیسر محمد علی ایک نوجوان تھا اور وہ اپنے فرائض کی ادائگی کیلئے اطراف و جوانب میں مشہور تھا پھر بھی پولیس کے پیچیدہ معاملات میں ابھی اسے زیادہ مہارت و رسائی حاصل نہ تھی۔

محمد علی ان اشخاص میں نہ تھا جو ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوتے ہیں، اور اپنی استعداد و صلاحیت کے باعث ترقی کرتے کرتے تھانیدار ہو جاتے ہیں۔ وہ پولیس ٹریننگ سکول میں تعلیم پا کر اکبارگی سب انسپکٹر کے عہدے پر مامور ہو گیا تھا اس لئے پولیس کے فرائض کے نشیب و فراز کے سمجھنے کے لئے کتابی تعلیم کے علاوہ جس عملی تعلیم کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ ہنوز اسے حاصل نہ تھی۔ اسے ابھی انسانی نفسیات کے مطالعہ کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اسلئے اکثر ہوتا کہ اس کے ماتحت اپنی رائے پر عمل کرتے اور اسے الٹے سیدھے سمجھا دیتے اور وہ اپنی ناواقفیت اور ناتجربہ کاری کے باعث اسے بے چون و چرا قبول کر لیتا۔

محمد علی کے علاقے میں جب کوئی حادثہ پیش آتا۔ وہ اس کی تحقیقات کیلئے جاتا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مجرموں کا سُراغ کس طرح لگائے۔ اس کی ناقابلیت کے باعث قدم قدم پر اس کی کوششیں ناکامیاب ہوتیں۔ محمد علی کی اس طرح کی مسلسل ناکامیابیوں کے باعث اس کے علاقے میں جرائم کی کثرت ہو گئی تھی۔ لیکن ان تمام حالات کے باوجود جب اس کے علاقے میں زیر گفتگو حادثہ وقوع پذیر ہوا تو اس نے اس کی تحقیقات کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اسے یقین تھا کہ اس معاملے میں وہ ضرور اپنی صلاحیت و مہارت کا ثبوت دیگا۔

ایک روز صبح گاؤں کے چوکیدار نے آ کر محمد علی کو اطلاع دی کہ رام پرساد نامی ایک شخص کی لاش کنوئیں سے برآمد ہوئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے اس نے خود کنوئیں میں کود کر خودکشی نہیں کی ہے بلکہ کسی نے اسے ہلاک کر کے کنوئیں میں ڈال دیا ہے کیونکہ اس کے بدن پر ضرب کے نشانات موجود ہیں۔

محمد علی نے اس واقعہ کی تحقیقات شروع کی۔ اسے جہاں تک حالات معلوم ہوئے ان کی بنا پر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ رام پرساد کو گاؤں کے کسی آدمی نے ہلاک کیا ہے۔ محمد علی کے کچھ خفیہ ملازم تھے۔ انہوں نے پتہ چلایا کہ رام پرساد کے خاندان سے گاؤں کے ایک آدمی کی عرصے سے دشمنی چلی آ رہی ہے۔ اس کا نام امام بخش ہے۔

گاؤں کے ایک باشندے نے خود محمد علی سے کہا۔ اب سے تقریباً دو ہفتہ قبل اس نے امام بخش کے مکان میں دو اجنبی آدمیوں کو دیکھا۔

گاؤں کے ایک اور شخص نے بیان دیا۔ وہ ایک روز رات کو اپنے کھیت سے جنگلی سوروں کو ہنکانے جا رہا تھا کہ اس نے تین آدمیوں کو امام بخش کے مکان کے آس پاس چکر کاٹتے دیکھا۔ تیسرا شخص خود امام بخش تھا۔

گاؤں کا چوکیدار نہایت مستعد اور فرض شناس

تھا۔ وہ تمام رات جاگ کر گاؤں کا پہرہ دیا کرتا تھا۔ اس نے تھانیدار کی تحقیقات کو کامیاب بنانے کی غرض سے کہا — اس نے بھی پہرہ دیکر واپس آتے ہوئے ان تینوں آدمیوں کو دیکھا تھا لیکن وہ جلد ہی غائب ہو گئے اس لئے وہ ان کو پہچان نہ سکا۔ اسوقت تک کوئی ایسی بات بھی نہ تھی جو اسے شبہ دلاتی اور وہ ان کو پہچاننے کی کوشش کرتا پھر بھی اسے خیال آتا ہے کہ ان میں ایک شخص ہکلاتا تھا۔ وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ہکلانے والا شخص کون تھا لیکن اتنا سب کو معلوم تھا کہ امام بخش ہکلاتا ہے۔

چوکیدار کے بیان سے محمد علی کے خیال کی تائید ہوتی تھی اس لئے اس نے اپنے فرض کی انجام دہی کے طور پر امام بخش کے مکان کی تلاشی لی۔ گئو شالے کی تلاشی لیتے ہوئے محمد علی کو چھپر میں ایک لاٹھی ملی جس پر خون لگا ہوا تھا۔ لاٹھی لکڑی کی بنی ہوئی نہایت وزنی تھی اور اس کے سر پر پیتل جڑا ہوا تھا۔

اس لاٹھی کو دیکھ کر امام بخش کے مجرم ہونے کے متعلق محمد علی کا خیال اور پختہ ہو گیا۔ گاؤں کے پانچ آدمیوں نے بھی اس کی تصدیق کی کہ لاٹھی امام بخش ہی کی ہے جسے وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اب محمد علی کو امام بخش کے مجرم ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہا اور اس نے اسے صدر بھیج دیا۔

محمد علی نے وہ خون آلود لاٹھی بھی صدر بھیج دی اور لے جانے والے کو ہدایت کر دی کہ لاٹھی پر انگلیوں کے جو نشانات ہیں ان کی ماہرین فن سے جانچ کرائی جائے اور لاٹھی میں جو خون لگا ہوا ہے کیمیاوی اصول پر اس کی بھی جانچ ہونی چاہیئے"۔

یہ تمام کارروائی مکمل کرکے محمد علی نتیجے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی تحقیقات نہایت صاف اور واضح تھی۔ اسلئے اس امر میں کسی کو مطلق شک و شبہ نہ تھا کہ امام بخش بچ نہیں سکتا۔

محمد علی کو رپورٹ مل گئی۔ رام پرساد کی ہلاکت کسی نہایت کند ہتھیار کی ضرب سے عمل میں لائی گئی تھی۔ لاٹھی پر انگلیوں کے جو نشان تھے وہ امام بخش ہی کی انگلیوں کے تھے۔ بہرکیف اب امام بخش جس شکنجے میں پھنس گیا تھا اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ تھی، تمام گاؤں محمد علی کا ہمخیال تھا اور فیصلے سے پہلے ہی اس نتیجے پر پہونچ چکا تھا کہ امام بخش کو پھانسی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

محمد علی کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس نے اتنے زبردست کیس کا پتہ چلا لیا۔ اگر وہ اسی طرح قتل کے اور دو ایک کیسوں کی تحقیقات میں کامیاب ہو گیا تو اسے اپنے معاصرین میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو جائیگی اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہو جائیگا اور چند سال تک اسی طرح کارگزاریاں ظہور میں آتی رہیں تو وہ سینیئر انسپکٹروں کو پیچھے چھوڑتا ہوا انسپکٹر، اور انسپکٹر سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہو جائے گا۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد سال نو کے گزٹ میں لوگ یہ بھی دیکھ لینگے کہ اسے خان بہادر بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح محمد علی خوب اونچے اونچے ہوائی قصر دیوان تیار کرتا رہا۔ اسے انگریزی میں کوئی خاص قابلیت حاصل نہ تھی پھر بھی افسروں پر اپنی انگریزی دانی کا سکہ بٹھلانے کے لئے اپنی تحقیقات سے متعلق اس نے صدر کو جو آخری ڈائری بھیجی تھی اسے اپنی مادری زبان میں تحریر کرنے کی بجائے انگریزی میں مرتب کیا تھا۔

پولیس سپرنٹنڈنٹ مسٹر رینالڈس اپنے صدر آفس میں بیٹھے امام بخش پر لگائے گئے الزام کی نوعیت پر غور کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں اس کے خلاف جو ثبوت فراہم کئے گئے تھے ان کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے ان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ انہوں نے محمد علی کی رپورٹ کو مکرر پڑھا پھر تمباکو کے پائپ کو منہ سے نکال کر ٹیبل ... کھٹتے ہوئے آپ ہی آپ بولے "ہونہہ، گدھا کہیں کا"

پولیس سپرنٹنڈنٹ ... جس ضلع کے امن و امان کی ذمہ داری تھی، اس میں آئے دن کثرت سے خون کے واقعات رونما ہوتے رہتے تھے۔ پولیس والے بے قصور لوگوں کو شبہ میں گرفتار کر لیتے اور اپنی غلط تحقیقات کی بنا پر ان کا چالان کرکے بخیال خود اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ زیر گفتگو واقعہ کے متعلق مسٹر رینالڈس کو جو کاغذات ملے تھے۔ ان کو دیکھ کر انہوں نے کلرک کو واپس کر دیا تھا پھر بھی وہ برابر سوچ رہے تھے کہ اسے اس معاملے میں انہیں کیا کارروائی کرنی چاہیئے؟

امام بخش کے خلاف جو ثبوت فراہم کئے گئے تھے ان کے متعلق مسٹر رینالڈس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ وہ تھوڑی ہی دیر کے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ محمد علی اس راز کو سمجھ نہ سکا جو ثبوت کے اندر پوشیدہ ہے اور جو بیانات ملے ان پر اعتماد کرکے اس نے امام بخش کو رام پرساد کا قاتل قرار دیدیا۔

مسٹر رینالڈس نے تمام فائل کو دوبارہ طلب کرکے از سر نو شروع سے آخر تک بغور اس کا مطالعہ کیا۔ اور وہ پھر اسی نتیجے پر پہنچے — سب انسپکٹر ثبوت کی حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا

انہوں نے محمد علی کی رپورٹ پڑھ کر کلرک کو خشونت آمیز لہجے میں حکم دیا کہ وہ سب انسپکٹر

نیچو! شیطان کے شر سے

کتنی خراب بات ہے کہ رات کو آکر پریشان کرتا ہے۔ آرام کی نیند سوتے ہوؤں کو ایک دم جگا دیتا ہے اور پھر تمام رات بے چینی اور جاگتے ہیں گزر جاتی ہے۔

یہ حضرت اپنے نام کے ایک ہی ہیں عجیب عجیب صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں کبھی خوبصورت دوشیزہ بن کر ظاہر ہیں کبھی کسی پری رو مجسمہ حسن کی شکل میں چھاتی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ جب ان کی آمد ہوتی ہے تو کسی انسان کو خوف محسوس نہیں معلوم ہوتی بلکہ وہ خواب کی دنیا کے مزے لیا کرتا ہے ایک عجیب لذت محسوس ہوتی ہے مگر جب یہ رخصت ہیں تو طبیعت کو مضمحل اور مکدر کر جاتے ہیں۔ ان کا اصل نام ہے " احتلام "۔

جس شخص کو خواب میں اس قسم کی شکایت ہو جاتی ہو تو وہ اس بات کا عادی ہو جاتا ہے اور روزانہ اس کو ... کے وقت پریشان ہونا پڑتا ہے اور پھر یہ مرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کو جریان بھی کہتے ہیں یہ مرض ... پر مردکی جوانی کو کھانے لگتا ہے۔ اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتا رہتا ہے خون کو پانی کی طرح بہا دیتا ہے۔ مردانہ طاقت جاتی رہتی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے آنکھوں تلے اندھیرا آجاتا ہے۔ پیشاب کرتے وقت قطرہ گر جاتا ہے۔ کسی خوبصورت تصور کے سامنے آتے ہی رطوبت کا جاری ہو جانا یہ ہی علامات جریان کی ہیں۔ اور اکثر جوان اور نوجوان اس مرض کے شکار ہو رہے ہیں۔

اس کا بہترین علاج

آج ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہیں جہاں اس مرض کی دوا نہ ملتی ہو مگر ایسی دواؤں سے کتنے ہی انسانوں کو بجائے فائدہ کے نقصان ہوا ہے۔ ان کی تعداد تقریباً کئی لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ کوئی ... کی بات نہیں ہے۔ ہمارے دواخانہ کی تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ ہم " جریانین " دوا کو ہندوستان کے بڑے سے بڑے طبیب اور ڈاکٹر کے سامنے لاکر یہ اقرار کر رہے ہیں کہ مرض جریان اور احتلام کے لئے اگر کوئی دوا ہے تو وہ صرف " جریانین " ہے جس سے ہر روز مریض صحت حاصل کر رہے ہیں۔ اگر آپ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں تو ایک شیشی " جریانین " دوا کی منگا کر استعمال کیجئے اور ہمیشہ کے لئے اس گندے مرض سے نجات حاصل کر لیجئے۔ ایک شیشی کی قیمت دو روپے ہے۔ ڈاک خرچ آٹھ آنے علاوہ ہے۔

پتہ: اکسیری دواخانہ پوسٹ بکس ۱۴ کلاں محل (ایم۔ ٹی) دہلی

کو لکھدے کہ اس کی مرتب کردہ رپورٹ سے اس کی کند ذہنی اور کم عقلی ظاہر ہوتی ہے وہ آئندہ سے اپنی انگریزی دانی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اردو میں رپورٹ بھیجا کرے۔ اور عدالت میں درخواست دیدے کہ ایک ہفتے تک مقدمہ کی کارروائی ملتوی رکھی جائے۔ اس درمیان میں وہ خود ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ جائے واقعہ پر جا کر اس معاملے کی تحقیقات کرینگے۔ وہ آج کلب جاتے ہوئے جیل خانے بھی جائیں گے اور امام بخش سے مل کر معلوم کرینگے کہ وہ اپنی بریت و صفائی کے لئے کیا کہنا چاہتا ہے؟

مسٹر رینالڈس جس وقت جیل خانے پہنچے تو امام بخش ایک کمرے میں پاؤں سکوڑے بیٹھا تھا۔ اور شام کے آفتاب کی شعاعیں روشندان سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ امام بخش کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے یقین ہو چکا ہے کہ اس کے خلاف نہایت سنگین ثبوت موجود ہیں اس لئے اسے موت کی سزا ملے بغیر نہیں رہ سکتی اسی لئے وہ قسمت پر بھروسہ کر کے مطمئن نظر آرہا تھا

مسٹر رینالڈس کے حکم سے دروازہ کھولا گیا امام بخش نے کھڑے ہو کر جیلر اور مسٹر رینالڈس کو سلام کیا۔ رینالڈس نے جیلر سے کہا۔ اسے بتا دو کہ میں کون ہوں۔ میں اسے باہر صحن میں لے جاؤنگا اور اس سے تنہائی میں باتیں کرونگا تاکہ کوئی سن نہ سکے۔ میرے ساتھ کسی محافظ کی بھی ضرورت نہیں۔ میں اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہوں۔

امام بخش نے موقع پا کر بھی پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اپنی بریت و صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی جس سے ظاہر تھا کہ اسے پولیس پر مطلق اعتماد نہیں ہے۔

مسٹر رینالڈس نے امام بخش کو خاموش دیکھ کر کہا۔ تم نے چند سال پہلے رام پرساد کیخلاف دیوانی کا جو مقدمہ دائر کیا تھا میں نے اسکے تمام فائل کو دیکھا۔ رام پرساد کے خاندان والے تم سے عداوت رکھتے ہیں۔ میرا یہ خیال صحیح ہے یا نہیں؟

امام بخش نے مسٹر رینالڈس کے سوال کا کچھ جواب نہیں دیا وہ سر جھکا کر پاؤں کے دونوں انگوٹھوں سے زمین کریدتا رہا۔

مسٹر رینالڈس امام بخش کو چپ دیکھ کر بولے تمہارے مقدمے کی آخری کارروائی چھ مہینے ہوئے ختم ہو چکی ہے۔ عدالت کا فیصلہ بھی تمہارے موافق ہو چکا ہے۔ رام پرساد کے پاس کوئی ایسی صورت بھی نہ تھی جو وہ تمہارے خلاف کوئی معاملہ چلاتا۔ پھر بھی تم نے ایسے مجبور اور شکست خوردہ دشمن کے متعلق ایسی معاندانہ کارروائی کی؟ اس کی کیا وجہ تھی؟

امام بخش نے سر جھکائے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا "کوئی وجہ نہیں حضور!"

مسٹر رینالڈس نے کہا: "دیکھو امام بخش! تم نے آج تک جتنی کارروائیاں کی ہیں ان میں نہایت فراست اور دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ تم نے اپنے کسی معاملے کو بیوقوفی اور نادانی سے خراب نہیں کیا۔ لیکن اس قتل کے الزام میں جو تم پر عائد کیا گیا ہے تم نے ایسی بے وقوفی سے کیوں کام لیا؟ اس معاملے میں تمہاری عقلمندی و دانائی کا مطلق ثبوت نہیں ملتا۔ تم نے وہ لاٹھی ایسی جگہ کیوں رکھی تھی جو اتنی آسانی سے دستیاب ہو گئی؟ وہ لاٹھی ہے تو تمہاری ہی یا اس میں تمہیں کچھ کلام ہے؟

امام بخش نے کہا۔ صاحب، میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ لاٹھی میری ہی ہے۔ اسے گاؤں کے بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں لیکن اب میں کہوں کہ وہ لاٹھی گم ہو گئی تھی تو میرے اس کہنے پر کون یقین کریگا؟

مسٹر رینالڈس متعجب ہو کر بولے۔ اچھا، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے کا تمام تر انحصار اس لاٹھی ہی پر ہے۔

امام بخش نے کہا۔ ہاں صاحب، اسے میں بھی سمجھتا ہوں۔ تلاشی کے دوران میں لاٹھی ملی تو میں نے تھانیدار سے کہا۔ یہ لاٹھی ہے تو میری ہی لیکن میرے ہاں سے گم ہو گئی تھی۔

اس پر تھانیدار نے ہنس کر کہا۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ لاٹھی گم ہو گئی تھی۔ مجھے تو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

میں جب سمجھ رہا ہوں کہ میری لاٹھی کوئی چرا لے گیا تھا لیکن میرے اس کہنے کو کون باور کریگا؟ اور اب اس کے کہنے کا نتیجہ ہی کیا ہے؟

مسٹر رینالڈس بولے۔ ہاں یہ تو صحیح ہے کہ اس کے کہنے کا کوئی نتیجہ نہیں لیکن کیا تم مجھ سے مخاطب ہو کر میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کسی خوف و ہراس کے بغیر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت رام پرساد مارا گیا لاٹھی تمہارے قبضے میں نہیں تھی؟

امام بخش نے کسی پس و پیش کے بغیر مسٹر رینالڈس کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔

مسٹر رینالڈس نے کہا۔ اچھا اب تم جا سکتے ہو۔ اب میں خود اس معاملے کی تحقیقات کرونگا۔

اس کے بعد امام بخش جیل کی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ مسٹر رینالڈس نے طے کر لیا کہ امام بخش کے خلاف جتنے ثبوت فراہم کئے گئے ہیں وہ ان سب کو لغو اور لاطائل ثابت کر کے چھوڑیں گے۔

مسٹر رینالڈس نے دوسرے روز صبح کو خوردبین کے ذریعہ لاٹھی کے ہر حصے کا بغور معائنہ کیا۔ اس کے بعد انگلی کے نشان کے ماہر کو بلایا۔ وہ لاٹھی کے ایک خاص نشان کی

تحقیق کرنی چاہتے تھے۔ اس کوشش میں کامیاب ہو جانے کے باعث وہ بہت خوش ہوئے انگلی کے نشان کی جانچ کرنے والا اُن کی ہدایت لے کر چلا گیا۔

محمد علی کو معلوم ہوا کہ پولیس سپرنٹنڈنٹ جائے وقوع پر تحقیقات کے لئے آ رہے ہیں تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس کا خیال تھا کہ اس خونی حادثے میں اس نے جس محنت و سعی اور دیانت و ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے، اسے پولیس سپرنٹنڈنٹ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنے دفتر کی صفائی کرا کے کتابیں اور دوسری چیزیں قرینے سے سجا دیں گواہوں کو بلا کر اچھی طرح سمجھا دیا اور زبانی یاد کرا دیا کہ جب صاحب تحقیقات کے لئے آئیں گے اور لوگوں سے بیان لینگے تو کس کو کیا کہنا چاہئے تاکہ مقدمے میں کہیں سے ضعف اور نقص واقع نہ ہونے پائے۔

لیکن محمد علی کا یہ تمام انتظام و اہتمام عبث ثابت ہوا۔ وہ اس موقع پر تحقیقات کیلئے گئے ہی نہیں۔ اس کے کئی روز کے بعد یکایک اردلی کو ساتھ لے کر پہنچ گئے اور تحقیقات بھی اس انداز سے شروع کی جس کا محمد علی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

مسٹر رینالڈس گاؤں کے باہر ایک پیپل کے نیچے آ کر ٹھہرے۔ وہیں گاؤں کے معزز اور سر بر آوردہ لوگ بھی جمع ہوئے مگر کسی نے کوئی خاص بات نہیں کہی۔ اس لئے کہ ہر شخص کا خیال تھا کہ جو کوئی خاص بات کہے گا اسے عدالت کے سامنے حاضر ہو کر گواہی دینی پڑیگی اور اس کو کوئی شخص پسند نہ کرتا تھا۔ لوگوں کا یہ انداز دیکھ کر مسٹر رینالڈس کو بہت خوشی ہوئی۔ جس کنوئیں سے لاش برآمد ہوئی تھی وہ ایک ریگستانی میدان میں واقع تھا۔ گاؤں سے اس کنوئیں تک ایک پگڈنڈی گئی تھی اسی پگڈنڈی سے مسٹر رینالڈس کنوئیں کی طرف چلے، گاؤں کے تمام لوگ ان کے پیچھے ہو لئے۔ لیکن اُنہوں نے لوگوں کو کنوئیں سے کچھ دور پر روک دیا اور خود صرف اپنے اردلی کو ساتھ لے کر کنوئیں پر گئے۔ وہاں مردوں اور عورتوں کے پیروں کے نشان تھے، مگر مسٹر رینالڈس نے ان پر کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ کنوئیں سے کوئی ایک سو گز دور جا کر کچھ دیکھنے لگے۔ وہاں انہوں نے ایک اور راستہ دیکھا۔ اس جگہ انہوں نے ایک آدمی کو کھڑا کر دیا۔ اور خود اپنے اردلی کو ساتھ لے کر اسی راستے پر آگے بڑھے۔ گاؤں والے حیران تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ آخر اس انگریز صاحب کا مقصد کیا ہے؟

ایک جگہ دس بارہ آدمی کھڑے تھے۔ وہاں پولیس سپرنٹنڈنٹ کا اردلی تھوڑے سے فاصلے سے ساتھ دو آدمیوں کے برابر چلنے کے نشان دیکھ کر بے ساختہ چلا اُٹھا۔ کچھ دور سخت مٹی تھی جہاں پاؤں کے نشان معدوم تھے اس کے بعد نرم زمین تھی جس پر پھر برہنہ پاؤں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ ان نشانوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دو آدمی کسی بھاری چیز کو کھینچ کر لے گئے ہیں۔

مسٹر رینالڈس نے کہا۔ میں نے جس قدر امید کی تھی یہاں اس سے بھی کچھ زائد دیکھ رہا ہوں اب تم لوگ آگ جلاؤ اور دو معزز اور معتبر آدمیوں کو میرے پاس بلاؤ۔

مسٹر رینالڈس کی ہدایت کے مطابق آگ جلائی گئی اور ایک برتن منگا کر اس پر رکھ دیا گیا۔ اردلی کے پاس پڑیے میں بندھی ہوئی کچھ چیزیں تھیں جو برتن میں ڈال دی گئیں۔ تھوڑی دیر میں وہ چیزیں پگھل کر پتلی ہو گئیں۔ اس رقیق مادے کو پیروں کے نشانات پر ڈال دیا گیا جو کچھ دیر میں جم کر سخت ہو گیا۔ مسٹر رینالڈس نے ایک کاغذ پر دو آدمیوں کے دستخط لے کر کاغذ کو اسی جمی ہوئی چیز پر چپکا دیا۔ اور اسے ساتھ لے کر تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں تک غور و فکر کا تعلق تھا مسٹر رینالڈس پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ اصل مجرم کون ہے مگر قدموں کے ان نشانات کی تحقیق کر کے مجرم کا یقینی حد تک سراغ لگانا چاہتے تھے۔

مسٹر رینالڈس جس وقت تھانے میں پہنچے شام ہو چلی تھی۔ سب انسپکٹر محمد علی نے تمام گواہوں کو قطار سے کھڑا کر دیا تھا۔ مسٹر رینالڈس نے ان کو دیکھ کر کہا۔ ان لوگوں کو یہاں اس طرح کھڑے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ ایک کانسٹبل کو بازار بھیج کر موم اور رجن منگاؤ۔

محمد علی یہ حکم سن کر متحیر سا کھڑا رہا۔ مسٹر رینالڈس نے پھر کہا۔ کیا تم نے میرا حکم نہیں سنا؟ ایک سیر موم اور ایک سیر رجن فوراً منگاؤ۔

کانسٹبل موم اور رجن لینے بازار گیا۔ مسٹر رینالڈس نے برآمدے میں ٹیبل کے قریب بیٹھ کر پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے محمد علی سے کہا ———

محمد علی! تم نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ امام بخش کے مکان کی تلاشی کے وقت تمہارے ساتھ ملازم، چوکیدار اور دو گواہ تھے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کیا ان کے علاوہ بھی کوئی شخص موجود تھا؟

محمد علی بولا ——— ہاں حضور! رام پرساد کا بیٹا پرتاپ بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ جو سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ یہ کہکر محمد علی نے دور بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

مسٹر رینالڈس نے پھر پوچھا۔ کیا پرتاپ نے خانہ تلاشی میں کسی قسم کی امداد کی تھی؟

محمد علی نے جواب دیا۔ نہیں اس نے کسی طرح کی امداد نہیں کی تھی۔ میرے ساتھ چوکیدار تھا اسی نے گوشالے کے نیچے گھسے چھپر کی جانب مجھے

توجہ دلائی۔

مسٹر رینالڈس نے مستفسرانہ انداز سے چوکیدار کی طرف دیکھا۔

چوکیدار بولا۔ حضور! پرتاپ میرے ساتھ تھا وہ ہر چیز کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرتا جاتا تھا۔ پہلے اسی نے گوشالے کے چھپر کی طرف دیکھا اس کے بعد میری نظر بھی اس پر جا پڑی۔

مسٹر رینالڈس نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔ تم نے اس کی کامل احتیاط کی تھی محمد علی کہ تمہارے سوا لاٹھی کو کوئی اور چھونے نہ پائے؟

محمد علی نے جواب دیا۔ حضور! اسے تو میں حلف کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ہی لاٹھی کو کھینچ کر چھپر سے باہر نکالا۔ اس وقت اس پر خون کا داغ موجود تھا۔ اس کے بعد بھی کسی نے لاٹھی کو ہاتھ نہیں لگایا۔

رینالڈس تھوڑی دیر تک کچھ سوچتے رہے پھر بولے " تم کہتے ہو تم نے اپنے ہاتھ سے لاٹھی کو چھپر سے کھینچ کر نکالا۔ اچھی طرح یاد کر کے جواب دو کہ تم نے لاٹھی کو سر کی طرف سے پکڑ کر کھینچا تھا یا پیچھے کی طرف سے "؟

محمد علی نے سوچ کر جواب دیا " لاٹھی کا پیتل چمک رہا تھا۔ اسی سے میری نظر اس پر پڑی میں نے اس کے دونوں سروں کو پکڑ کر کھینچا تھا۔ اسی وقت میں نے دیکھ لیا تھا کہ لاٹھی میں انگلیوں کے نشان موجود ہیں "۔

رینالڈس نے پوچھا۔ پرتاپ نے کیا کیا؟ اس نے لاٹھی شناخت کرتے وقت اسے امام بخش کی لاٹھی قرار دیا یا نہیں؟

محمد علی سر جھکائے ہوئے بولا۔ نہیں حضور، اس نے لاٹھی کی شناخت نہیں کی لیکن دونوں گواہ اور دوسرے لوگ جو دروازے کے پاس کھڑے ہیں جانتے ہیں کہ لاٹھی ملزم ہی کی ہے۔ اس کے علاوہ انگلی کے نشان کے ماہرین کی رپورٹ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے حضور!

محمد علی کی آواز سے مایوسی ظاہر ہو رہی تھی وہ سر جھکائے سوچ رہا تھا کہ اتنے واضح اور ناقابل تردید ثبوت کے ہوتے ہوئے بھی صاحب کس پھیر میں پڑے ہوئے ہیں اور اُن کا مقصد کیا ہے؟

مسٹر رینالڈس نے سب انسپکٹر سے کہا۔ ایک بالٹی سوکھی بالو منگاؤ اور اسے زمین پر پھیلا دو۔ اب میں نہ کسی سے شہادت لونگا اور نہ کسی سے بحث اور جرح کرونگا۔ لاٹھی شناخت کرنے والے گواہوں کو چوکیدار کو اور پرتاپ کو دوسرے لوگوں سے علیحدہ کر کے ایک صف میں کھڑا کر دو۔ دوسرے لوگ چاہیں تو دور کھڑے ہو کر دیکھ سکتے ہیں کہ میں کیا کرتا ہوں۔

مسٹر رینالڈس کے حکم کے مطابق چھ آدمی ایک قطار میں کھڑے کر دئے گئے مگر کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسٹر رینالڈس کون سی کارروائی کرنے والے ہیں۔ پولیس کے سپاہی بھی دور کھڑے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ زمین پر بالو کیوں بچھوائی گئی ہے؟

لیکن ان لوگوں کو انتظار کی زیادہ زحمت گوارا کرنی نہیں پڑی۔ قطار میں کھڑے ہوئے چھ اشخاص میں سے ایک کو پکارا گیا اور اسے برہنہ پاؤں ریت پر چلنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے ریت پر چل چکنے کے بعد مسٹر رینالڈس نے اپنی جیب سے موم اور رجن کے ذریعہ لئے ہوئے پاؤں کے نشان کو نکالا اور ریت پر بنے ہوئے پاؤں کے نشان سے اس کا مقابلہ کیا۔

اس کے بعد مسٹر رینالڈس نے اس شخص کو رخصت کر دیا اور بالو کو دوسری جگہ چھڑکوا کر اس پر دوسرے آدمی کو چلنے کا حکم دیا اور اس کے چلنے کے بعد اس کے پاؤں کے نشان کا بھی موم اور رجن پر بنے ہوئے پاؤں کے نشان سے مقابلہ کیا۔

اب تیسرے گواہ کی باری تھی۔ اس کے نشان قدم کو مسٹر رینالڈس نے مختلف اطراف سے بغور دیکھا اور موم اور رجن پر بنے ہوئے نشان قدم سے بھی اس کا مقابلہ کیا۔ پھر سر اوپر اٹھا کر محمد علی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ محمد علی! میں اس گواہ کی انگلیوں کے نشان چاہتا ہوں۔ تم اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کا نشان لے لو۔

محمد علی نے تعجب سے اپنا منہ بنا لیا مگر پولیس سپرنٹنڈنٹ کے حکم سے مجبور تھے۔ وہ تیسرے گواہ کی انگلیوں کے نشان لینے ہی جا رہے تھے کہ مسٹر رینالڈس کا اردلی آیا اور اس نے مسٹر رینالڈس کے اشارے سے کانسٹبل کے لائے ہوئے موم اور رجن کو ایک ہانڈی میں رکھ کر آگ پر چڑھا دیا۔ جب دونوں چیزیں پگھل کر پتلی ہو گئیں تو مسٹر رینالڈس نے ان کو تیسرے گواہ کے نشان قدم پر انڈیل دیا اور سرد ہو کر جمنے کے بعد اسے جھاڑ پونچھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

لیکن مسٹر رینالڈس کی تحقیقات اب بھی مکمل نہیں ہوئی۔ انہوں نے پھر ریت بچھوا کر اس پر چوتھے آدمی کو چلایا لیکن اسے جلد ہی رخصت کر دیا۔ اس کے بعد پانچویں گواہ کی باری تھی۔ اسے بھی جلد ہی چھٹی مل گئی۔ اب صرف پرتاپ باقی رہ گیا تھا۔

پرتاپ کے ریت پر چلنے کے بعد مسٹر رینالڈس سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور محمد علی کو حکم دیا کہ وہ اس کی انگلیوں کا نشان لے لے۔ ادھر محمد علی پرتاپ کی انگلیوں کا نشان لے رہا تھا ادھر پگھلا ہوا موم اور رجن پرتاپ کے قدم کے نشان پر انڈیل دیا گیا۔

مسٹر رینالڈس نے محمد علی سے کہا۔ محمد علی! تم نے اسکول میں انگلیوں کے نشان کا مقابلہ کرنا سیکھا تھا۔ پرتاپ کی انگلیوں کے نشان کے

ساتھ انگلیوں کے اس فوٹو کا مقابلہ تو کرو۔

یہ کہکر مسٹر رینالڈس نے لفافے سے انگلیوں کے دو فوٹو نکال کر محمد علی کو دئے اور منہ سے سگریٹ لگا کر محمد علی کی کارروائی دیکھنے لگے۔

پانچ منٹ کے غور و فکر کے بعد محمد علی نے مسٹر رینالڈس کی طرف دیکھا۔ مسٹر رینالڈس نے موم اور رجن کے ذریعہ قدموں کے جو نشان لئے تھے ان میں سے دو نشان اپنی بغل میں دبا لیا۔ باقی کو الگ کر دیا۔

سب انسپکٹر نے مسٹر رینالڈس سے نہایت عجز آمیز لہجے میں کہا۔ حضور! مجھے غلطی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ میں ابھی نو آموز اور ناتجربہ کار ہوں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ میں نے انگلیوں کے جو نشان لئے ہیں ان میں سے پہلی اور دوسری انگلی کے نشان یا بائیں ہاتھ کی انگلی کے؟

سب انسپکٹر نے جواب دیا۔ دائیں ہاتھ کی انگلی کے۔ لیکن میں یہ جان سکتا ہوں کہ اصل معاملے سے اس کا کیا تعلق ہے؟

مسٹر رینالڈس نے محمد علی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اب دونوں قدموں کے نشان ملا کر دیکھو۔

محمد علی نے دونوں کا مقابلہ کر کے کہا۔ دونوں نشان یکساں ہیں۔ انگوٹھے کے نیچے جو کٹا ہوا داغ ہے وہ بھی مل رہا ہے۔ دونوں نشانوں کے ناپ میں بھی کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

مسٹر رینالڈس نے کہا۔ ان گواہوں کے نام یاد رکھو۔ میرے طلب کرنے پر انکو پیش کرنا۔ اسوقت تم پر حقیقت حال روشن ہو جائیگی۔ لیکن اتنا تو میں تم سے ابھی کہہ سکتا ہوں کہ امام بخش مجرم نہیں ہے۔

محمد علی بولا۔ لیکن میں حضور سے معافی چاہتے ہوئے ادب کے ساتھ گزارش کرونگا کہ امام بخش کے خلاف جو ثبوت موجود ہیں۔ وہ کیونکر غلط قرار دئے جا سکتے ہیں؟

رینالڈس نے کہا۔ تم بھی کس قدر غبی ہو محمد علی! میرا خیال تھا کہ اب تک میں جو کچھ کر چکا ہوں وہ تمہاری آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہوگا لیکن میں دیکھتا ہوں۔ اب تک تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

اس کے بعد مسٹر رینالڈس نے لوگوں کی طرف دیکھ کر تند لہجے میں آواز دی۔ رام پرساد کے بیٹے پرتاپ! تم میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جاؤ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ بھی میری باتیں سن سکتے ہیں۔ مجھے ایک لالٹین کی بھی ضرورت ہوگی تاکہ اس کی روشنی میں پرتاپ کے چہرے کو اچھی طرح دیکھ سکوں۔

پرتاپ طوعاً و کرہاً پولیس سپرنٹنڈنٹ کے حکم کی تعمیل میں ان کے سامنے حاضر ہوا۔ ایک کانسٹبل ہاتھ میں لالٹین لے کر برآمدے کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ جس کی روشنی پرتاپ کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ سب انسپکٹر محمد علی مسٹر رینالڈس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی تشویش و اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کیا صورت ظہور میں آنے والی ہے۔

مسٹر رینالڈس نے نصف جلے ہوئے سگریٹ کو منہ سے علیحدہ کر دیا۔ لوگ بے چینی سے انتظار کرنے لگے کہ صاحب کس سے کیا پوچھتے ہیں۔ مسٹر رینالڈس نے سر اوپر اُٹھا کر ایک تند نگاہ سب کے چہروں پر ڈالی جس سے لوگوں کے دل دہل اُٹھے ہر شخص کو خوف تھا کہ رام پرساد کے قتل کی باز پرس اسی سے کی جائے گی۔

مسٹر رینالڈس نے سامنے کھڑے ہوئے ہر شخص کے چہرے کو باری باری دیکھا۔ آخر میں ان کی نظریں پرتاپ کے چہرے پر جم گئیں۔

مسٹر رینالڈس نے پرتاپ کو مخاطب کر کے سخت لہجے میں کہنا شروع کیا: پرتاپ! جو شخص مارا گیا ہے وہ تمہارا باپ ہے اور جو شخص تمہارے باپ کے قتل کے الزام میں گرفتار ہے وہ تمہارا دشمن ہے۔ بتاؤ یہ حقیقت ہے یا نہیں؟ تمام لوگ جانتے ہیں کہ امام بخش سے تم ایک عرصہ سے بغض و عناد رکھتے آ رہے ہو۔ تم میں اور امام بخش میں جو مقدمہ بازی ہو چکی ہے۔ اس کے کاغذات سے بھی امام بخش کے ساتھ تمہاری عداوت و دشمنی کی تصدیق و تائید ہوتی ہے۔

عدالت نے امام بخش کے موافق اور تمہارے خلاف فیصلہ دیا۔ تم نے اور تمہارے مشیروں نے دیکھا کہ اپیل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسلئے تمہیں امام بخش سے انتقام لینے کا دوسرا طریقہ سوچنا پڑا۔

امام بخش تمہارے سامنے سے گذرتا تو اپنی کامیابی اور تمہاری ناکامی پر ہنستا۔ تمہارے خلاف آوازے کستا۔ تمہیں نادم اور شرمسار کرتا لیکن اس سے بدلہ لینے کی کوئی صورت تمہاری سمجھ میں نہ آتی۔ تم ڈرتے تھے کہ تم پر شبہ نہ کیا جائے اس لئے امام بخش کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہ لاتے تھے اس کے بعد تم نے دیکھا کہ تمہارے علاقے کا تھانیدار نو آموز اور ناتجربہ کار ہے۔ اسکو احمق بنانا چنداں دشوار نہ ہوگا۔ اسی غور و فکر کے دوران میں تمہارا خیال اپنے بوڑھے باپ کی طرف گیا۔ تم نے سوچا وہ اس قدر بوڑھا ہو چکا ہے کہ اب نہ وہ ہل چلا سکتا ہے اور نہ گاڑی ہانک سکتا ہے۔ وہ تمہارے لئے محض بار ہے اور فضول بیٹھے بیٹھے تمہاری

سوزاک

یہ بیماری جس قدر تکلیف دہ ہے اس کا مزہ کچھ مریض ہی سمجھتا ہے تجربہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جس شخص کو یہ بیماری لگ جائے اسکو رفتہ رفتہ یہ مرض بڑھکر گٹھیا اور آتشک کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ مریض آہ و بکا کی صداؤں کے ساتھ دم دیدیتا ہے۔ اس مرض کی تاریخ بہت پرانی ہے اور اکثر خاندانوں میں یہ وراثت کے طور پر بھی پھیلا ہوا ہے اور بیشتر مریض آوارہ سوسائیٹوں کی وجہ سے اس مرض کا شکار ہوتے ہیں۔

مست قلندر کے پڑھنے والے ناظرین میں سے اگر کسی کو سوزاک کا مرض لگ گیا ہے اور سینکڑوں روپیہ برباد کرنے کے بعد بھی آرام نہیں ہوا ہے تو اسکو چاہیئے کہ ہم سے ایک شیشی "سگونوس" کی منگالے اور اس دوا کے اثرات دیکھے کہ کسطرح سوزاک کی جڑ کو یہ دوا اکھیڑ کر پھینک دیتی ہے۔ خون پیپ جلن۔ سوزش پہلے دن بند ہو جاتی ہے اور اندرونی زخم کو مکمل آرام ہو جاتا ہے۔

ایک شیشی کی قیمت تین روپے جس میں پندرہ روز کی دوا ہے اور ایک مریض کو کافی ہوتی ہے۔

پتہ۔ اکسیری دواخانہ پوسٹ بکس ۱۴۱۔ کلاں محل (ایم - ٹی) دہلی

...کمر ڈ کھاتا ہے۔
...ے اس خیال کی شیطان نے بھی تائید
...س نے آکر تمہارے کان میں پھونکا۔
...ت تو ہے۔ بوڑھے سے پیچھا بھی چھوٹ
...ا اور امام بخش سے انتقام بھی مل جائیگا
...صورت کو عمل میں لانے کے لئے
...زوں موقع کی ضرورت تھی جو بالآخر
...مل گیا۔ تم امام بخش کی لاٹھی چوری
...ے میں کامیاب ہوگئے لیکن اس کے
...ی تمہیں یہ دیکھنے کیلئے کچھ دنوں تامل
...ام لینا پڑا کہ امام بخش اپنی لاٹھی کے
...ے جانے کے بارے میں گاؤں والوں
...یا کہتا ہے۔ آیا تم پر تو شبہ نہیں کرتا۔
...امام بخش نے اس کے متعلق بالکل سکوت
...ام لیا اس لئے تمہیں اپنی مجوزہ سکیم
...میں لانے کا موقع مل گیا۔"
...ہ کر مسٹر رینالڈس تھوڑی دیر کیلئے خاموش
...ے۔ پرتاپ ساکن وساکت کھڑا تھا۔
...لس نے لالٹین کو ایک ہاتھ سے دوسرے
...میں لے لیا۔ محمد علی ایک ہاتھ دوسرے
...پر رکھے بیٹھا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔
...ن امام بخش کے خلاف جو زبردست
...ت موجود ہے اسے کیونکر غلط قرار دیا
...تا ہے۔ صاحب کی ساری باتیں قیاس
...ی ہیں لیکن قیاسی باتوں سے ثبوت کا
...یں کیا جا سکتا۔ اس لئے فکر کی کوئی
...رت نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی
...کراہٹ رقص کر گئی۔
...نے ایک اطمینان آمیز نگاہ لوگوں کے
...ں پر ڈالی۔ لیکن مطمئن نہ تھے۔ وہ سمجھتے
...ہ پولیس سپرنٹنڈنٹ کے پاس محمد علی
...زیادہ مواد ہے اور وہ مزید ثبوت فراہم
...رہے ہیں۔

مسٹر رینالڈس پھر پرتاپ سے مخاطب ہوکر کہنے لگے — پرتاپ! مجھے نہایت تعجب ہے کہ تم نے اپنے بوڑھے باپ کو سوتے ہوئے لاٹھی مار کر ہلاک کرنے میں مطلق شرم محسوس نہیں کی۔ اسی لاٹھی کے ذریعہ تم لاش کو اپنے کسی دوست کی مدد سے گھسیٹ کر کنوئیں تک لے گئے، ریت پر تمہارے پاؤں کے نشانات موجود تھے۔

اس بات کے ثبوت کے لئے کہ تمہارے دشمن ہی نے تمہارے باپ کو ہلاک کیا تم نے اس کی لاٹھی اس کے گئوشالے کے چھپر میں چھپا دی تھی۔ تم جانتے تھے کہ تلاشی ہونے پر وہاں سے بآسانی لاٹھی برآمد ہوجائیگی لاٹھی پر جو خون لگا ہوا ہے اس میں تمہاری دو انگلیوں کے نشان موجود ہیں جو اس امر کا زبردست ثبوت ہیں کہ لاٹھی تمہیں نے چھپر میں چھپائی تھی۔"

محمد علی یہ سن کر وفور حیرت سے کھڑا ہوگیا مسٹر رینالڈس نے انگلی کے نشان کے فوٹو کی جانب محمد علی کو توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ انگلیوں کے نشان کو ماہرین بھی شناخت نہ کرسکے۔ اسلئے میں تمہیں بھی معذور سمجھتا ہوں

مسٹر رینالڈس پھر پرتاپ سے مخاطب ہوئے۔ تم خوب سمجھتے تھے پرتاپ کہ لوگ کس پر شبہ کرینگے اس لئے تم نے برملا کسی کو مجرم قرار دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جس وقت ملزم کے مکان کی تلاشی ہو رہی تھی تم وہاں موجود تھے۔ اور تمہاری ہی ترکیب سے لاٹھی برامد ہوئی۔ لیکن تم کتنے چالاک تھے کہ لاٹھی کی شناخت میں تم نے حصہ نہیں لیا۔ لیکن اسی حد سے بڑھی ہوئی چالاکی کے باعث تم غلطی کر بیٹھے۔ جب سارا گاؤں امام بخش کی لاٹھی کو پہچانتا تھا پھر تمہارے شناخت نہ کرنے کے کیا معنی؟

میری عمر کچھ ایسی کم نہیں ہے۔ پھر بھی اپنی تمام زندگی میں میں نے تمہارے جیسا ذلیل آدمی نہیں دیکھا۔ مجھے تعجب ہے کہ جس وقت تم نے اپنے بوڑھے باپ کو ہلاک کرنے کے لئے لاٹھی اٹھائی۔ تمہارے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ کر گر کیوں نہ پڑی اور تمہارے ہاتھ شل کیوں نہ ہوگئے؟

لوگوں کو معلوم ہوا کہ پرتاپ خود اپنے باپ کا قاتل ہے تو وہ وفور نفرت کے باعث اس سے دور ہٹ کھڑے ہوئے۔

مسٹر رینالڈس نے گرج کر کہا۔ او باپ کے قاتل! اب کہہ تو کیا کہتا ہے؟

دو بار پرتاپ کے ہونٹ ہل کر رہ گئے مگر اسکی زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ آخر میں وہ یاس انگیز لہجے میں بولا۔ میرے باپ نے مجھے اس کی اجازت دی تھی۔

مسٹر رینالڈس نے برہم ہوکر کہا۔ اُس نے تمہیں اپنا خون کرنے کی اجازت دی تھی، جھوٹے کہیں کے۔ پرتاپ نے ایک بار چاروں طرف دیکھا۔ اس کے گواہ از راہ نفرت اس سے دور جا کھڑے ہوئے تھے۔ وہ غمگین لہجے میں بولا — ہاں، میرے باپ کا اجازت نامہ میرے پاس موجود ہے۔ میرے باپ کو امید تھی کہ اس طرح ان کا دشمن پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائیگا اسلئے وہ خوشی خوشی جان دینے پر تیار ہوگئے۔ میں نے طوعاً و کرہاً ان کے حکم کی تعمیل کی۔ یہ اسکیم انہی کی بنائی ہوئی تھی۔ میں نے جو کچھ کیا ان کے تحریری حکم کے مطابق کیا۔ باپ کے حکم کو میں کیسے رد کر سکتا تھا؟

یہ کہہ کر پرتاپ نے اپنی پگڑی سے ایک پرچہ نکال کر مسٹر رینالڈس کے ہاتھ میں دیدیا

باپ کا قاتل



پرتاپ

مسٹر رینالڈس اس کے باپ کی تحریر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ بہت سے لوگ غصے میں آکر اپنے دشمن کو لاٹھی سے ہلاک کر ڈالتے ہیں اور بعد میں اپنا بھی خاتمہ کر لیتے ہیں مگر ایسی مثال ان کے علم میں اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی کہ دشمن کو سزا دلانے کیلئے کوئی شخص اپنی جان گنوا دے۔ پرتاپ کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنائی جانے لگی تو اس نے کہا — "میرے باپ کی جان مُفت میں ضائع ہوئی جس کو پھانسی دلانے کے لئے اُنہوں نے جان دی اُسے آپ نے اپنی تدبیر سے بچا لیا۔ باپ کے قتل کی سزا مجھی کو بھگتنی پڑی۔"

پراسرار قاتل!

قاتل کون تھا؟ برناس کے کھنڈرات کا بھوت یا—؟

قتل کی ایک نہایت مہیب اور خوفناک واردات جسے پڑھ کر آپ کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

از جناب شوکت ہاشمی

جیسے ہی "شانتی نگر" میں موتی اور مایا کے متعلق یہ افواہ مشہور ہوئی کہ عنقریب دونوں بیاہ کی سنہری زنجیروں میں جکڑ دئے جانیوالے ہیں تو ان کے حلقۂ احباب میں مسرت و اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص کا خیال تھا کہ دونوں کے مستقبل کو خوشگوار بنانے کیلئے ایسا ہونا ضروری ہے اور اگر خدانخواستہ اس کے برعکس کوئی اطلاع مشہور ہوتی تو ان کا ہر دوست اپنے دل میں یقیناً ایک بےچینی اور اضطراب محسوس کرتا۔

موتی ایک انتہائی خوش رو اور خوش وضع نوجوان تھا۔ سرخ و سفید رنگ، زردی مائل گھونگریالے بال، چوڑی چھاتی، اور میانہ قد۔ شام کے وقت جب وہ اپنا سبز دھاریوں والا سوٹ پہن کر ہاتھی دانت کی چھڑی ہوا میں لہراتا ہوا شانتی نگر کی بڑی سڑک پر گھومنے کے لئے نکلتا تو گرد و پیش کے بنگلوں سے خدا جانے کتنی حسین اور بھولی بھالی دوشیزاؤں کی حسرت آمیز نظریں اس کا تعاقب کرتیں—

اسی طرح مایا بھی شانتی نگر کی حسین ترین دوشیزہ تھی اور ہر شخص اس حقیقت سے واقف تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں—— اور ایک اہم ترین چیز جس کو ہرگز نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ ہے کہ موجودہ پرآشوب زمانہ میں ایک مطمئن اور آرام دہ زندگی بسر کرنے کے لئے دونوں کے پاس کافی سے زیادہ سرمایہ تھا۔

وہ دونوں ملک کے ایک ہی خطے سے آکر شانتی نگر میں آباد ہوئے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کے احباب بھی مشترکہ تھے۔ مزید برآں وہ ہم ذوق بھی تھے۔ موتی ایک بہترین شکاری تھا اور گرد و پیش کی تمام شکارگاہیں اس کی لمبی اور بھاری بھرکم بندوق کی مہیب گرج سے اکثر گونجا کرتی تھیں۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں منگرو پہاڑی کے نشیب میں ٹینس اور گالف کھیلا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شانتی نگر کے لوگ ان کے بیاہ کی خبر سے قطعی متحیر نہیں ہوئے۔ ان سب کو یہی توقع تھی۔

شکار کے گذشتہ موسم میں ہم سب نے ان کے طور اطوار کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ گو ان کی محبت کوئی راز نہیں تھی تاہم موسم بہار کے آغاز تک ان کے بیاہ کے بارے میں ان کی اپنی جانب سے کوئی اعلان نہیں ہوا تھا لیکن یہ امر کس درجہ حیرت انگیز ہے کہ سب سے قبل جس شخص نے میرے کانوں کو اس پُرمسرت اعلان سے آشنا کیا وہ شمبی تھا۔

یہ شخص شانتی نگر کے سب سے بڑے ہوٹل "نشاط" نامی کا مالک اور بہت بڑا سرمایہ دار تھا۔ گو اپنے پیشے کی مناسبت سے کافی ہر دلعزیز بھی تھا تاہم اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک مرعوب کن سنجیدگی طاری رہتی تھی اور نووارد اشخاص اوّلیں ملاقات میں ایسا محسوس کرتے تھے گویا انہیں کسی ریگستانی قلعہ میں نظربند کر دیا گیا ہو۔ جہاں ان کے چاروں طرف بھیانک سلیٹی رنگ کی موٹی موٹی دیواریں ایستادہ ہوں لیکن ایسے تاثرات صرف اوّلیں ملاقات تک ہی محدود رہتے اور اس کے بعد ہر شخص اس کا مداح ہو جاتا۔

شانتی نگر میں یہ امر بھی کسی سے مخفی نہیں تھا کہ شمبی کے لئے اس سے زیادہ مسرور کن اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اگر مایا دوران گفتگو میں گاہے گاہے اس کا نام بھی لے لیا کرے۔ شمبی اکثر موتی اور مایا کو اپنے ہوٹل میں مدعو کرتا۔ اور جس شام کو وہ وہاں موجود ہوتے۔ شمبی کے کرخت قہقہے ہوٹل کے در و دیوار کو اپنے سر پر اٹھا لیتے اور ہر شخص چونک اٹھتا۔

لیکن جب شمبی نے مجھے ان کے بیاہ کی خبر سنائی میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میرا خیال تھا شمبی یقیناً حواس باختہ ہوگا لیکن میرے قیاس کے

برعکس وہ نہایت مطمئن اور مسرور دکھائی دے رہا تھا۔
"پروفیسر شوکت!" اس نے اپنے پائپ میں تمباکو ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمہارے سامنے اس امر کی تشریح یقیناً کسی خاص مفاد کی حامل ثابت نہیں ہو سکتی کہ مجھے انتہائی افسوس ہوتا اگر مایا، موتی کی بجائے کسی دوسرے نوجوان کو اپنی زندگی کا رفیق منتخب کرتی۔"
میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ اس نے پائپ کا ایک لمبا کش لیا اور پھر دھوئیں کے حلقوں پر نظریں جما کر کہنے لگا۔ "بخدا یہ کتنا حسین جوڑا ہے۔"
میں نے متفق ہوتے ہوئے سر ہلایا۔ اور مجھے اس کے ان الفاظ پر ایک پُرمسرت حیرت سی محسوس ہوئی ـــــ شمیی واقعی ایک بہترین مزاج کا انسان تھا لیکن مجھے اس سے اس درجہ اطمینان کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ دنیا میں کوئی شخص اپنی مسرتوں کی پامالی پر ایسے سکون کا اظہار نہیں کرتا۔ اکثر اوقات میں نے یہ بھی خیال کیا تھا کہ ممکن ہے مایا جیسی ٹینس زدہ لڑکی شمیی جیسے ٹینس چمپئن سے متاثر ہو کر اپنا دل اس کی نذر کر بیٹھے اور ایسا ہونا بھی کوئی بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔ شمیی بھی ایک قبول صورت نوجوان تھا اور موتی کے مقابلہ میں مردانہ صفات کا زیادہ حامل تھا۔ اکثر عورتیں خوبصورت جسم کو خوبصورت چہرے پر ترجیح دیتی ہیں۔ بہرطور اب شمیی محبت کی بازی ہار چکا تھا ـــــ گو اس نے اس شکست کو بھی ایک سپورٹس مین کی طرح مسکراتے چہرے سے برداشت کیا۔ تاہم دوران گفتگو میں میں نے اس کی نظروں میں ایک ایسی چمک بھی دیکھی جس کو وہ اپنی مسکراہٹ کے پس پردہ چھپانے کا خواہاں تھا۔ یہ چمک، اس کے قلبی جذبات کی آئینہ دار تھی ـــــ اس حقیقت سے انکار جرم ہو گا کہ جس ہمت و تحمل کا مظاہرہ شمیی نے کیا تھا اس کی توقع موتی سے ہرگز نہیں کی جا سکتی تھی۔

"لیکن شمیی! ان کا بیاہ کب ہو رہا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بہت جلد پروفیسر!" اس نے پائپ کو دانتوں میں دبا کر جواب دیا۔ "اب انتظار کی وجہ بھی کیا ہو سکتی ہے؟"

شمیی نے سچ کہا تھا۔ اس گفتگو کے تین دن بعد ہی شانتی نگر کے ہفت روزہ اخبار "پیام" میں ان کی منگنی کی خبر شائع ہو گئی جس کے نیچے جلی حروف میں تحریر تھا کہ عنقریب اسی ماہ ان دونوں کا بیاہ بھی ہو جائے گا۔

مایا اور موتی کو ان کے احباب کی جانب سے کثرت سے تہنیت کے خطوط اور تاریں موصول ہوئیں۔ میں نے بھی ایک صبح ملازم کے ہاتھ ایک رقعہ ان کے بنگلے پر ارسال کر دیا لیکن میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب اسی دوپہر کو وہ دونوں سیٹیاں بجاتے، قہقہے لگاتے میرے مکان پر آ پہنچے۔

"یہ سنسان دوپہر ـــــ اور میرا غریب کدہ" میں نے ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے انتہائی مسرت ہوئی میرے بچو! کہ تم نے مجھے فراموش نہیں کیا۔"

"پروفیسر! ـــــ اُوں۔" مایا نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ "شاعروں جیسی باتیں مت کرو ـــــ ہاں۔" اور پھر دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"پروفیسر شوکت! ہم آج دوپہر کو تمہارے ہاں کھانا کھائیں گے۔" موتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"چشم ما روشن، دل ما شاد۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو میرے بچے؟" میں نے انہیں اپنے ڈرائنگ روم کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ امر ملحوظ ہے کہ میں غذا کے معاملے میں حد درجہ سادگی پسند ہوں۔"

"اٹس آل رائیٹ It's all right" موتی نے مایا کے ہاتھ کو تھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

یہ مذاق نہیں تھا۔ درحقیقت دوپہر کا کھانا انہوں نے میرے ہمراہ ہی نوش جان کیا۔ کھانے کے دوران میں میں نے بارہا کنکھیوں سے ان کی حرکات و سکنات کا معائنہ کیا۔ موتی میز کے نیچے محبت سے مایا کا ہاتھ دباتا اور مایا مسکرا دیتی۔ اظہار محبت و گرمجوشی کے یہ انداز کچھ ایسے دلچسپ تھے کہ مجھ جیسا عمر رسیدہ اور خشک طبع فلسفی بھی جسم میں ایک حدت سی محسوس کر رہا تھا۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ شانتی نگر کے باغات اور شکارگاہیں پھولوں اور پھلوں سے لد گئی تھیں۔ فضا میں ایک فرحت آمیز اور سامعہ نواز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میری ڈائری کے اوراق شاہد ہیں کہ ۱۵ جولائی کی صبح کو ہماری پارٹی جس میں گاؤں کے دیگر معززین کے علاوہ موتی، مایا اور شمیی بھی شامل تھے۔ پک نک کے لئے منگرو پہاڑی کے دوسرے نشیب کی جانب روانہ ہوئی۔ ہم سب تین موٹروں میں سوار تھے گو راستہ مختصر تھا لیکن حد درجہ دشوار گزار۔ ہم نے برناس کے کھنڈرات تک جانا تھا۔

برناس کے ان بھیانک اور تاریخی کھنڈرات کے بارے میں لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ یہاں ایک خوفناک بھوت رہتا ہے جس کا چہرہ سیاہ گائے کی طرح اور جسم ایک طویل القامت مہنت کے مشابہ ہے۔ اس کے جسم پر مختلف گہرے سیاہی مائل رنگوں کے چیتھڑے لٹکتے

تے تھے۔ قرب وجوار کے دیہاتیوں کا بیان
ہ کہ انہوں نے بچشم خود اس بھوت کو پہاڑی
رنڈیوں پر اچھلتے کودتے دیکھا ہے اور جب
کسی آدمی یا جاندار کے قریب سے گزر جاتا
ے تو اس کی موت یقینی ہو جاتی ہے۔ لیکن
ن حقائق کے باوجود ہماری پارٹی کا ہر متنفس
ہایت مسرور و شاداں دکھائی دے رہا تھا
ھنڈرات کے سامنے صنوبر کے گھنے درختوں
ے سایہ میں ہم نے دریاں بچھائیں۔ کھانے
ینے کا سامان نکالا۔ اور ہنستے کھیلنے میں
صروف ہو گئے۔

شمی آج بہت مسرور تھا اور معمول سے
یادہ بلند قہقہے لگا رہا تھا۔ مایا نے ایک
ر مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"چچا پروفیسر! تم نے بھی کبھی اس بھوت
و اپنی آنکھوں سے دیکھا؟"

لیکن میرے جواب دینے سے پیشتر شمی
ور سے پکار اٹھا" مایا، تمہاری کوئی
ادی اماں نہیں ہیں۔ وگرنہ وہ تمہیں
س سے بھی زیادہ دلچسپ افسانے سناتیں"
ور پھر وہ بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔

مایا نے بچوں کی طرح ہونٹ لٹکا دیئے۔
شمی نے موٹر میں سے اپنا کیمرہ اٹھایا اور
قریب آ کر بولا" مایا! یہ سب لوگوں کی
دادی اماؤں کی گھڑی ہوئی کہانیاں ہیں"
پھر اس نے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر
سگریٹ سلگایا اور بولا" خدا مغفرت کرے
میری دادی اماں کہا کرتی تھیں شمی بیٹا!
جو لڑکے شرارت کرتے ہیں۔ رات کے وقت
کالے کالے پنجوں اور لمبے لمبے ناخنوں والے
جن ان کی چارپائی کی چادریں پھاڑ ڈالتے
ہیں لیکن تم یقین جانو مایا!" اس نے
شرارت آمیز لہجہ میں ناک سکوڑ کر اور ایک

آنکھ میچ کر کہا "میں نے نت نئی شرارتیں
کیں لیکن کبھی کسی جن نے میری چارپائی کی
چادر کو نہیں پھاڑا" یہ کہکر اس نے ایک
سامعہ خراش قہقہہ لگایا۔

موتی جو اطمینان سے ایک طرف بیٹھا ہوا
کیک کھا رہا تھا بولا" تو کیا تمہارا خیال ہے
شمی! جنوں اور بھوتوں کی کوئی ہستی ہی نہیں؟"

"اوں ہوں" شمی اطمینان سے بولا۔
"وہ لوگ جن کا ہاضمہ خراب ہوتا ہے۔ اکثر
ایسے وہموں میں مبتلا رہتے ہیں" یہ کہکر
اس نے اپنا کیمرہ کھولا۔ فوٹوگرافی اس کا پرانا
مشغلہ تھا۔ چنانچہ اس نے کھنڈرات کے
مختلف زاویوں سے فوٹو لینے شروع کئے۔

"شاید ان فوٹوؤں میں سے کسی ایک میں
ہم اس سیاہ گائے جیسے چہرے والے بھوت
کو بھی دیکھ پائیں" مایا نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ممکن ہے" شمی نے مسکراتے ہوئے
جواب دیا" تم دونوں ادھر آؤ۔ مایا اور
موتی! میں تمہارا ایک ساتھ فوٹو لینا چاہتا ہوں"

میں خاموشی سے دری پر لیٹا ہوا ان سب
کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔
پارٹی کے دوسرے افراد پہاڑی جھرنوں کے
پاس پاگلوں کی طرح اچھل کود رہے تھے۔
"ٹھیک ہے" یہ کہکر شمی نے کیمرے
کے سوئچ پر انگلی رکھی۔ کھٹ سے ایک
ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ اور ساتھ ہی شمی
بڑبڑایا" اُف میرے اللہ!"

میں نے شمی کی جانب مستفسرانہ انداز میں
دیکھا۔ اس کا چہرہ خزاں زدہ پتے کی طرح
زرد تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس
جانب تک رہا تھا۔ جہاں موتی اور مایا نے
فوٹو کا پوز دیا تھا۔ وہ دونوں جا چکے تھے لیکن
سوائے میرے کسی نے شمی کے اس اضطراب
کو نہیں دیکھا۔

"کیا ہوا شمی؟" میں نے چونک کر دریافت کیا۔
"کچھ نہیں" اس نے ڈوبی ہوئی آواز
میں جواب دیا" کچھ نہیں"

اس کے چہرے کا اصلی رنگ پھر اس کے
رخساروں پر رفتہ رفتہ نمودار ہو رہا تھا۔ گو
کیمرہ بند کرتے وقت اس کے ہاتھ تھر تھر
کانپ رہے تھے۔

"تم نے کچھ نہیں دیکھا پروفیسر شوکت؟"
اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا" وہاں —
جہاں موتی کھڑا تھا — اس کے پیچھے"
"نہیں تو" میں نے حیران ہو کر کہا۔
"میرا خیال ہے ......" اس نے کہنا
شروع کیا لیکن پھر خود ہی اپنی بات کاٹ کر بولا۔
"کچھ نہیں — کچھ نہیں، یہ صرف روشنی
کا عکس تھا"

لیکن اس کی آواز اس کے قلبی تاثرات کی
غماز تھی۔ وہ یقیناً خوف زدہ تھا لیکن کیوں؟
میں باوجود غور و خوض کے کچھ سمجھ نہ سکا۔

"کیا تمہارا خیال ہے کہ تم نے سیاہ گائے جیسے
چہرے والے بھوت کو دیکھا؟" میں نے
شمی سے سوال کیا۔

"جاؤ جہنم میں" اس نے بے اختیار رو دیا
دیا اور پھر اچانک چونک کر وہ ندامت آلود
لہجے میں بولا" مجھے معاف کرو پروفیسر
شوکت! لیکن میں انتہائی ممنون ہوں گا
اگر تم اس معاملے میں مجھ سے زیادہ سوال نہ کرو"

ایک ایسے شخص کی زبان سے جو کچھ دیر قبل
نہایت عجیب انداز سے بھوتوں اور جنوں
کی داستانوں کا مسخر اڑا رہا تھا، ایسا مہمل
جواب سنکر میرا سارا جسم کپکپا سا اٹھا۔ بہرطور
میں نے اس واقعہ کو کچھ زیادہ اہمیت نہ
دی۔ شام کے قریب ہم لوگ پھر اپنی موٹروں

پر سوار ہو کر شانتی نگر واپس لوٹ آئے۔ اور جب تین چار دن کے بعد میں نے شمی کو اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ برناس کے کھنڈرات کا حادثہ میرے دل سے یکقلم محو ہو چکا تھا۔ مجھے شمی کی اس غیر متوقع آمد پر انتہائی تعجب ہوا۔ وہ میرے عام ملاقاتیوں میں سے نہیں تھا۔

"پروفیسر شوکت! کیا تم مجھے چند منٹ عنایت کر سکتے ہو" اس کی آواز میں سوز اور کرب کروٹیں لے رہا تھا۔ اور جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے شمی کو اسدرجہ غمگین لہجے اور بھرائی ہوئی آواز میں بات کرتے ہوئے سنا۔ "مجھے تم سے ایک انتہائی اہم اور سنجیدہ مسئلہ پر مشورہ کرنا ہے" وہ بڑبڑایا۔

میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا "اندر آ جاؤ عزیز شمی!"

وہ خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر سگریٹ سلگا کر صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"پروفیسر! تمہیں برناس کے کھنڈرات کا واقعہ یاد ہے؟"

"بیشک ــــ مگر کیوں ــــ کیا ہوا؟" میں نے حیرت سے اس کا چہرہ تکتے ہوئے دریافت کیا۔

"تمہیں یہ بھی یاد ہے ــ جب میں نے مایا اور موتی کا فوٹو لیا تھا تو تم نے میری گھبراہٹ سے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا میں نے سیاہ گائے جیسے چہرے والے بھوت کو تو نہیں دیکھا؟"

"بیشک مجھے یاد ہے۔ تم اس وقت بیحد خوفزدہ دکھائی دے رہے تھے" میں نے جواب دیا۔

اس نے ایک لمبی آہ بھری اور بولا "ہاں میں بے حد خوفزدہ تھا۔ کیونکہ میں نے درحقیقت اسی بھوت کو دیکھا تھا"

"میرے عزیز شمی!" میں نے قہقہہ لگا کر کہا "مت بھولو کہ تم وہی ہو جو بھوتوں اور جنوں کی کہانیوں کا تمسخر اڑا رہے تھے"

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "تم سچ کہتے ہو پروفیسر! میں تمام راستہ موٹر میں یہی سوچتا آیا۔ گذشتہ دو دن تک مسلسل یہی سوچتا رہا کہ وہ کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً روشنی کا عکس ہو گا۔ لیکن ......"

"لیکن کیا؟" میں نے چونک کر کہا۔

اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور جیب سے ایک فوٹو نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"تمہیں یاد ہو گا کہ گھبراہٹ سے قبل میں فوٹو لے چکا تھا" شمی نے کمرے کی فضا میں لہراتے ہوئے نیلگوں دھوئیں پر نظریں جما کر کہا۔

میں نے حیرت سے فوٹو پر نظریں ڈالیں۔ بیک گراونڈ میں برناس کے ہیبت ناک کھنڈرات تھے جن کے آگے کوئی دس گز کے فاصلہ پر موتی اور مایا ایک نہایت خوبصورت پوز میں ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے لیکن کھنڈرات اور موتی کے درمیان؟ اُف میرے پروردگار!! وہی خوفناک سیاہ گائے جیسے چہرے والا بھوت۔

فوٹو بے اختیار میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے شمی کی طرف دیکھا۔ میرا حلق سوکھ سا گیا تھا اور ہونٹوں پہ پپڑیاں جم گئی تھیں۔ بہت دیر تک ہم دونوں خاموش مجسموں کی طرح ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کا چہرہ تکتے رہے۔

"ممکن ہے یہ فلم کا کوئی نقص ہو۔" بہت دیر کے بعد میرے منہ سے نکلا۔

"بے شک ایسا خیال کر کے دل بہلانے کیلئے بہت کافی ہے" شمی طنزاً بولا "میں نے بھی فلم دھو کر پرنٹ اتارنے کے بعد پہلی مرتبہ یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی تھی لیکن یہ حقیقت نہیں ہے پروفیسر شوکت!"

اس نے فوٹو فرش سے اٹھا لیا اور اس پر ایک بار نظریں ڈال کر بولا "میں نے خود بھی تو اسے دیکھا تھا"

"لیکن میں نے کیوں نہیں دیکھا؟" میں زیر لب بڑبڑایا۔

"خدا جانے" اس نے جواب دیا۔ اور ہم دونوں پھر چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گئے۔

"لیکن یہ ناممکن ہے" میں نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "ایسی باتیں ظہور پذیر نہیں ہو سکتیں"

"بے شک میرا اپنا یہی خیال ہے ــــ ایسی باتیں ظہور پذیر نہیں ہو سکتیں لیکن پروفیسر! یہ فوٹو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہو سکتی ہیں" شمی نے سگریٹ راکھدانی میں رگڑتے ہوئے کہا "تم جانتے ہو میں خود ان باتوں کا کتنا پرجوش مخالف تھا۔ جو لوگ یہ کہتے تھے کہ روحوں، جنوں اور بھوتوں کی تصاویر لی جا سکتی ہیں۔ میں انہیں پلے سرے کے دھوکہ باز سمجھتا تھا"

"تمہارے پاس فلم ہے شمی؟" میں نے پوچھا

"اوہ نہیں ــــ پروفیسر! ــــ میری بدقسمتی کہ دو چربے اتارنے کے بعد جونہی میں نے اس پر نظریں ڈالیں۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اسے بے اختیار آتشدان میں پھینکدیا" شمی نے جواب دیا "لیکن اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کرنا کیا چاہیے؟"

...ئی؟" میں نے نحیف آواز میں کہا "ہم ...اکر سکتے ہیں شمیم!"

...ہی نے متاسفانہ انداز سے سر کو ایک خفیف ...جنبش دی گویا میرے جملے کی تائید کر رہا ...۔ اور پھر میز پر کہنیاں ٹیک کر بولا "کیا ...مناسب ہو گا کہ ہم موتی کو اس امر سے ...طلع کر دیں؛ تم جانتے ہو یہ بھوت جس ...اندار کے پاس سے گذر جاتا ہے اس کی ...رت یقینی ہو جاتی ہے۔"

...شمیم!" میں نے مرعوب کن لہجے میں ...ا "یہ بیسویں صدی ہے اور اگر اب تم ...ے تو ہم اس کے نتیجے پر ابھی سے کوئی رائے ...ئم کرنے کا حق نہیں رکھتے۔"

"یہ سب باقل تسلیاں ہیں پروفیسر شوکت!" ...ں نے غصے سے جواب دیا "ہم دونوں ...ئی بچے نہیں ہیں۔ کہنے کو تو تم مجھے شلغم ...سکتے ہو۔ اس کو کچھ کہہ سکتے ہو لیکن کیا ...کہ تمہارا اپنا بھی حقائق سے برگشتہ ہو گیا ...حقیقت ہے ...۔ افسوس اور ...ے اور فوٹو کی صورت دیکھو پروفیسر اس ...یں کچھ نظر آتا ہے۔" اس نے اپنے دونوں ...ہ پشت پر باندھ دئے اور تیزی سے ...رے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

...ں نے اپنا سر کندھوں پر ڈال دیا اور میز ...فوٹو پر نظریں جما کر سوچنے لگا۔ کافی دیر تک ...اسے شمیم کے بھاری بھرکم بوٹوں کی آہٹ ...کمرے میں خاموشی طاری رہی اس کے بعد ...ں نے شمیم کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "شمیم! ...تسلیم کرتا ہوں کہ یہ سب حقیقت ہے ...لیکن یہ کیونکر مان لیا جائے کہ اس کا انجام ...وہی ہو گا۔ جو تم کہہ رہے ہو — یعنی ...تی کی موت۔"

...ی آتشدان سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اور ملائم لہجے میں بولا۔ "یہ صحیح ہے۔ بہت ممکن تھا کہ میں نے یہ فوٹو دیکھتے ہی پھاڑ دیا ہوتا اور کسی سے کوئی تذکرہ تک نہ کیا ہوتا لیکن مجھے اپنی روح پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ پروفیسر! میرا جی چاہتا تھا کہ کسی کو اس حادثے سے آشنا کروں اور چونکہ تم اس حادثے کے رونما ہونے کے وقت میرے سامنے جانے حادثہ پر موجود تھے۔ اس لئے میں تمہارے پاس چلا آیا —"

اس کی آواز کھو گئی ہو گئی۔ اس نے ایک بار کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا "میری خدا سے دعا ہے کہ ایسا نہ ہو جیسا لوگ کہتے ہیں موتی کتنا پیارا لڑکا ہے۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "بہتر یہی ہے شمیم! اس فوٹو کو ضائع کر دو اور کسی سے ذکر تک نہ کرو جو ہونا ہے وہ تو ہو کے ہی رہے گا۔"

اس نے یاس آلودہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا "فوٹو تمہاری میز پر رکھا ہے تمہارا جو جی چاہے کرو — اچھا خدا حافظ!" اور وہ لڑکھڑاتا ہوا آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔

شمیم کے چلے جانے کے بعد کافی دیر تک میں کھڑکی کے پاس کھڑا صورت حال پر غور و غوض کرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے میز پر پڑا ہوا فوٹو اٹھایا اور صوفے پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اگر جریبے میں بھوت کا عکس دکھائی دے سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں ان حقائق پر بھی اعتماد نہ کر لوں جو اس کے نتیجے کے بارے میں عوام میں مشہور ہیں۔ بہر طور میرا دماغ قطعی مختل ہو چکا تھا۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی دماغ ویسے بھی جنوں بھوتوں کی کہانیوں پر سوچ بچار کرنے کے ناقابل ہوتے ہیں۔ میرا جی

چاہا کہ فوٹو کو آتشدان کی نذر کر دوں۔ مگر پھر مجھے خیال آیا کہ ایسا کر لینے کے بعد بھی حالات میں کوئی تغیر و تبدل رونما ہونا ممکن نہیں۔ چنانچہ میں نے اٹھ کر اپنی الماری کے پٹ کھولے اور فوٹو کو اپنے پرائیویٹ البم میں رکھ دیا۔

جوں جوں دن اور ہفتے گذرتے گئے دیگر علمی مشاغل نے میرے ذہن سے اس واقعہ کی یاد تک محو کر دی۔ اور شبانہ روز مصروفیتوں نے اس حادثے کے تاثرات کو اپنے اندر مدغم کر لیا۔

موتی اور مایا کے منگنی کی ایک اِنڈا واج میں منسلک ہونے والے تھے اور ۱۵ اگست کی شام کو موتی ہلاک کر دیا گیا۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ اس اطلاع کے موصول ہوتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا گویا بنگال اور برما کی کہیں طویل و عریض چٹان پر پھسل رہا ہوں میری رگوں میں خون منجمد سا ہو گیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اس وقت فوٹو کے بارے میں قطعی خالی الذہن تھا۔ جونہی میرے ملازم نے مجھے یہ خبر سنائی میں مبہوت سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے بتلایا گیا کہ موتی برناس کے کھنڈرات کے قریب منگرو کی سب سے اونچی ناروف پر سیر کرنے کے لئے گیا اور جب اس چٹان کے قریب پہنچا جو وادی کے سرے پر آگے کی جانب بڑھی ہوئی ہے۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلا۔ اور وہ ۲۰۰ گز کی بلندی سے وادی میں گر کر موت کے بے رحم ہاتھوں کا شکار ہو گیا ——

میں نے اس جگہ کو بچشم خود متعدد مرتبہ دیکھا تھا۔ یہ چٹان واقعی حد درجہ خطرناک ہے اور گذشتہ کئی برس سے شامی نگر کے ...

اس امر پر غور و خوض کر رہے تھے کہ اس چٹان کے چاروں طرف ایک مضبوط فولادی جنگلا تعمیر کرایا جائے اور چونکہ اس پر کافی خرچ ہونے کا امکان تھا۔ اس لئے ہر شخص عملی طور پر اس کام میں شریک ہونے سے گریز کرتا تھا۔ نوواردوں کے لئے یہ جگہ موت کے جال کے مترادف تھی۔ کیونکہ پہاڑ کی خمدار پگڈنڈی پر بہت آگے بڑھ جانے کے بعد پتھر انتہائی چکنے ہیں اور چٹان سے ۱گز کے فاصلے پر پہنچکر کسی جاندار کیلئے اپنے آپ کو سنبھالنا ناممکنات میں سے ہے لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے منگرو کے گردو پیش ۲۰۰ میل کے فاصلہ تک ہر متنفس اس حقیقت سے واقف ہے اور موتی کا دیدہ و دانستہ ایسی جگہ تک پہنچ جانا انتہائی حیرت انگیز امر ہے۔

"سرکار!" میرے پہاڑی ملازم نے کہا۔ "مسٹر شمیی نے بھی انہیں وہاں سے گرتے ہوئے دیکھا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ اس کی امداد کو پہنچ سکتے بیچارے موتی صاحب وادی میں گر کر ہلاک ہو چکے تھے۔"

یہ سُن کر مجھے بے اختیار فوٹو یاد آیا شمیی کی پیشین گوئی آخر صحیح ثابت ہوئی یہ یقیناً سیاہ بھوت کی کارستانی ہے میں نے جلدی سے مکان کے نیچے اُتر کر اپنی موٹر سٹارٹ کی۔ اور "نشاط" کی جانب روانہ ہو گیا۔



افسانہ "پُراسرار قاتل" کا مشہور بدمعاش "شمیی"

شمیی اپنے کمرے میں خاموش میز پر کہنیاں ٹیکے بیٹھا تھا۔ اس کے بال پریشان تھے۔ اور آنکھیں سُرخ۔ وہ شاید گھنٹوں روتا رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل رحم کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔

"یوں جی ہلکان مت کرو پیارے شمیی!" میں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ تو بتاؤ تم نے دیکھا کیا؟"

شمیی نے آہستہ آہستہ سر اُٹھایا اور اپنی سرخ سرخ آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ "پروفیسر شوکت!" وہ غم گیں لہجے میں بولا۔ "میں منگرو کے نشیب میں تنہا سیر کر رہا تھا۔ جب میں وادی کے قریب چٹان کے سامنے پہنچا تو میں نے ایک دردناک چیخ کی آواز سنی۔ موتی چٹان کے اوپر نہایت تیزی کے ساتھ پھسل رہا تھا بچاؤ بچاؤ۔ شمیی مجھے بچاؤ۔ وہ زور سے پکارا۔ چنانچہ میں انتہائی سرعت سے وادی کی

جانب دوڑا۔" کہ اسے اپنے بازوؤں پر تھام لوں لیکن میرے پہنچنے سے قبل..... اُف۔ اوہ" وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔

"کتنی دردناک موت" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

شمیمی نے رومال سے اپنے آنسو پونچھے اور بولا "کیا تم نے وہ فوٹو پھاڑ ڈالا تھا پروفیسر؟"

"نہیں عزیز شمیمی۔ وہ میں نے حفاظت سے رکھ دیا تھا۔ اور اب میری جیب میں ہے" میں نے جواب دیا "کیا تمہیں چاہیے؟"

"نہیں۔ میرے پاس اپنا پرنٹ موجود ہے" اس نے کہا "لیکن پروفیسر اب کیا کیا جائے؟"

"کس بارے میں؟" میں نے مایوسانہ انداز میں جواب دیا "بیچارہ موتی چل بسا۔ اب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں"

"یہ صحیح ہے لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ اس حادثہ کا صرف میں ہی ایک گواہ ہوں پہاڑی بالکل سنسان تھی۔ جب یہ حادثہ رونما ہوا۔ کیا میں کسی پر اس حادثے کے پس منظر کو آشکار کر دوں یا نہ؟" شمیمی نے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا فائدہ" میں نے ناصحانہ انداز میں جواب دیا "شدنی میں مفر نہیں۔ اب خواہ مخواہ لوگوں میں سنسنی پھیلانے سے فائدہ؟ اور پھر تم جانتے ہو شمیمی! یہ خبر مشہور ہوتے ہی ہندوستان بھر کے جرنلسٹ کوؤں کی طرح تمہارے گرد و پیش منڈلانے لگیں گے اور تمہیں یقیناً شدید کوفت کا سامنا ہوگا"

"تم ٹھیک کہتے ہو پروفیسر!" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تاہم میں ایسا محسوس کر رہا ہوں گویا ایک ہولناک راز میرے قلب کی گہرائیوں میں دفن رہیگا"

اتنے میں کمرے کا دروازہ ایک تیز کرکراہٹ کے ساتھ وا ہوا۔ اور ایک حسین و خوش پوش نوجوان جس کے خط و خال مرحوم موتی سے بہت ملتے جلتے تھے، اندر داخل ہوا۔

"میں اس بیجا مداخلت کی معافی چاہتا ہوں محترم حضرات!" اس نے ڈرامائی انداز میں کمر خم کرتے ہوئے کہا "میں مسٹر شمیمی سے ملنے آیا ہوں" پھر اس نے متجسس نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"میرا نام شمیمی ہے" شمیمی متحیر لہجہ میں بولا۔

"خوب!" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میز کے قریب پہنچا "میں موتی کا بھائی ہوں۔ کیا آپ نے ہی موتی کو پہاڑ سے پھسل کر ہلاک ہوتے دیکھا؟"

"جی ہاں" شمیمی نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور میں ابھی اسی واقعہ کا تذکرہ پروفیسر شوکت سے کر رہا تھا" ——— آپ ہیں میرے محترم دوست پروفیسر شوکت رشید"

نوجوان نے نہایت پُرخلوص انداز میں مجھ سے ہاتھ ملائے اور بولا "مجھے موہن کہتے ہیں۔ میں کلکتہ میں ڈاکٹر ہوں۔ موتی کی موت کی خبر مجھے ماما کے ٹیلیگرام کے ذریعے معلوم ہوئی"

شمیمی نے ایک بار پھر انہی الفاظ میں موتی کی افسوسناک موت کی تفصیل بیان کی اور موہن خاموشی سے سنتا رہا۔

"بس" موہن نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جی بس ——— کیوں؟" شمیمی نے موہن کے چہرے پر بغور نظریں ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی ——— جب میں کمرے میں داخل ہوا تو آپ فرما رہے تھے کہ موتی کی موت کے بارے میں ایک ہولناک راز میرے دل کی گہرائیوں میں دفن رہے گا" نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

شمیمی نے مستفسرانہ انداز میں میری جانب دیکھا۔

"میرا خیال ہے" میں نے کہا "مسٹر موہن کو اس حادثہ کے پس منظر جاننے کا حق حاصل ہے"

چنانچہ شمیمی نے برناس کے کھنڈرات کا حادثہ اور فوٹو کے بارے میں مکمل حالات وضاحت کے ساتھ بیان کئے اور موہن نہایت خاموشی سے حیرت زدہ سا ہو کر سب کچھ سنتا رہا۔ تفصیل کے اختتام پر اس نے سر اُٹھایا اور میری جانب دیکھ کر بولا "عجیب بات ہے۔ انتہائی محیر العقل"

"بے شک پہلے پہل ہم دونوں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا" شمیمی نے سگریٹ کا آخری ٹکڑا کھڑکی کے باہر پھینکتے ہوئے کہا "دیکھئے یہ فوٹو دیکھئے" یہ کہہ کر اس نے اپنی میز کی دراز سے فوٹو نکالا اور موہن کے سامنے رکھ دیا "فلم بدقسمتی سے مجھ سے ضائع ہو چکی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ غریب موتی کی موت اسی سیاہ گائے جیسے چہرے والے بھوت کی چیرہ دستی کا نتیجہ ہے"

"حیرت انگیز" موہن نے فوٹو دیکھ کر کہا "کیا آپ کا پرنٹ آپ کے پاس موجود ہے، پروفیسر شوکت!"

"اتفاق سے میں بھی ساتھ لیتا آیا ہوں مسٹر موہن" میں نے اپنی جیب سے فوٹو نکالتے ہوئے کہا۔

"دونوں ——— دونوں ایک جیسے ہیں۔ ایک ہی فلم کے دو چربے" شمیمی نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"اوہ — چہ چہ چہ — دیکھئے — مجھے افسوس ہے — میں بھی کتنا بدتمیز ہوں۔"

میز پر پڑی ہوئی دوات یکایک اُلٹ گئی۔ نفی اور شمیم کا دیا ہوا پہلا چہرہ سیاہی میں لت پت ہو رہا تھا۔

"محترم حضرات! میں معافی کا خواستگار ہوں۔" شمیم معذرت آلود انداز میں بولا۔ اور پھر اس نے فوٹو کی سیاہی کو سیاہی چوس کاغذ پر جذب کرتے ہوئے کہا: "لیکن یہ تو اب قطعی بے کار ہو چکا ہے — خیر کوئی حرج نہیں۔ دوسرا فوٹو تو سلامت ہے۔"

جی — موہن نے زیر لب کہا۔ "آپ کہتے ہیں کہ اس بھرت کو آپ نے اپنی آنکھوں سے بھی ملاحظہ فرمایا۔"

"جی ہاں۔ بے شک۔" شمیم نے کہا۔

"اور پروفیسر شوکت کیا آپ نے بھی؟" موہن نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"جی نہیں ــــ لیکن مسٹر شمپی کی گھبراہٹ اور کپکپاہٹ کو دیکھ کر مجھے یقین ہوتا ہے کہ بھوت واقعی وہاں اسوقت موجود تھا"۔ میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے ــــ ٹھیک ہے" موہن نے فوٹو شمپی کی جانب بڑھاتے کہا "ہاں تو مسٹر شمپی! میں بھی پروفیسر کی رائے سے متفق ہوں کہ اب لوگوں میں سنسنی پھیلانے سے کیا حاصل؟ اسے پردہ راز میں ہی رہنے دیجئے"۔

"بہتر ہے" شمپی نے سگریٹ کیس موہن کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا ــــ "لیجئے سگریٹ نوش فرمائیے"۔

"شکریہ! میں عادی نہیں ہوں" یہ کہکر موہن کھڑا ہوگیا اور میرے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر بولا "پروفیسر صاحب! کیا آپ از راہ کرم اپنی کار پر مجھے مایا کے مکان تک چھوڑ آئیں گے؟"

"بیشک ــــ کیوں نہیں عزیز موہن!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں شمپی سے مصافحہ کرنے کے بعد ہوٹل کے نیچے اُتر آئے۔ موٹر میں بیٹھ کر میں نے موہن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "عزیز موہن! مجھے اس حادثہ جانکاہ میں تمہارے ساتھ انتہائی ہمدردی ہے"۔

"شکریہ!" موہن غم آگیں لہجے میں بولا۔ "موتی واقعی ایک پیارا بھائی تھا"۔

"مایا کیسی ہے؟" میں نے موٹر کو ایک موڑ سے گھماتے ہوئے کہا:

"اچھی ہے بیچاری ــــ زندہ لاش" موہن نے جواب دیا "اسے موتی کی موت کا انتہائی غم ہے"۔

میرا دل غم و افسوس کے جذبات سے لبریز ہوگیا۔ "کیا یہ مناسب ہے موہن کہ میں بھی اس سے مل لوں؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے۔ نہیں" موہن نے سنجیدگی سے جواب دیا "یہ ملاقات اس کے لئے زیادہ مغموم کن ثابت ہوگی"۔

میں خاموش ہوگیا۔ موہن کا خیال صحیح تھا۔ لیکن ہمارے ہندوستان میں لوگوں کی عادت ہے کہ وہ بار بار تعزیت کر کے مرحوم کے اعزا کو اور زیادہ پریشان کر دیتے ہیں حالانکہ ایسی صورت میں ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ انہیں تنہائی اور سکون کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش گرد و پیش کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اچانک موہن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"پروفیسر شوکت! کیا یہ حقیقت کہ شمپی بھی مایا کے چاہنے والوں میں سے ایک ہے"۔

"ہاں" میں نے چونک کر کہا "لیکن موہن! یہ موقع اس امر کی وضاحت کا نہیں۔ کیا تم آج شام کو میرے ہاں آکر کھانا تناول نہیں کر سکتے؟"

موہن خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ بولا "کیا یہ بھی حقیقت ہے کہ شمپی شانتی نگر میں آباد ہونے سے قبل بمبئی کی کسی فلم کمپنی میں بحیثیت اداکار کے ملازم تھا؟"

میں نے حیرت سے موہن کی جانب دیکھا ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس نے میرا سوال سُنا ہی نہیں۔ اس کے چہرے پر گہرے تفکرات کے آثار نمایاں تھے۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "شمپی خاموش فلموں کے زمانے کا مشہور ستارہ ہے"۔

"وہ لفیناً ایک کامیاب اداکار ہے" موہن زیر لب بڑبڑایا۔

"ہر اداکار کامیابی کی انتہائی منزل پر پہنچکر ستارہ کہلاتا ہے" میں نے جواب دیا۔

"لیکن پروفیسر! ایک بات اور" موہن نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا "تم نے دیکھا۔ شمپی کی وہ سیاہ شیروانی جو کھونٹی پر لٹکی ہوئی تھی اس کا ایک بٹن غائب تھا"۔

"نہیں تو" میں نے متحیر ہوکر جواب دیا۔

"اور پروفیسر جس قسم کے بٹن وہاں ٹنکے ہوئے تھے۔ اسی قسم کا ایک بٹن مجھے پہاڑ کی چوٹی پر ملا ہے۔ چٹان سے ۱۵ گز کے فاصلے پر" موہن نے انگلی سے اپنی کنپٹی کھجلاتے ہوئے کہا۔

مجھے موہن کے اس قسم کے سوالات پر بیحد طیش آیا۔ مجھے تعجب سا ہوا کہ یہ کس قسم کا نوجوان ہے جس کے بھائی کی موت کو ابھی ڈیڑھ دن بھی نہیں ہوا اور یہ شمپی کے معاشقے۔ اس کی فلم کمپنی کی ملازمت اور کالی شیروانی کے بٹنوں کی داستان چھیڑ بیٹھا ہے۔ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ میں نے آواز کو ذرا مرعوب کن بناتے ہوئے کہا۔

"موہن! مجھے معاف کرو۔ میں اس قسم کے بیہودہ سوالات کا جواب دینے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ موتی میرے بچوں جیسا تھا اور میرا دل اسوقت اس کی دردناک موت کے احساس سے لبریز ہے"۔

وہ یکایک میری جانب مڑا۔ اس کے چہرے پر ندامت کے آثار تھے "مجھے معاف کرو پروفیسر!" اس نے لجاجت سے کہا۔ "لیکن یقین کرو میرے یہ سوالات غیر ضروری ہرگز نہیں ہیں"۔

اتنے میں موٹر مایا کے بنگلے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے کار کو بریک دی اور وہ مجھ سے مصافحہ کرکے بنگلہ میں داخل ہوگیا

اس کے بعد چند ہفتوں تک میری موہن یا شمپی کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اخبار "پیام" کی زبانی معلوم ہوا کہ جیوری نے موتی کی موت کو ایک اتفاقیہ موت قرار دیا ہے اور اس حادثے کے پیش نظر پہاڑ کی چٹان کے چہار جانب سرکاری خرچ پر جنگلہ بنوانے کی منظوری ہو گئی۔ لوگوں کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ موہن اور شمپی کے مابین گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے ہیں اور اب موہن کا زیادہ وقت "نشاط" میں بسر ہوتا ہے۔

ایک شام کو میں اپنے باغیچے میں انگور کی بیلوں کے نیچے بچھی ہوئی بنچ پر بیٹھا ہوا نہایت مدھم سروں میں وائلن بجا رہا تھا کہ مجھے پشت کی روش پر کسی کے بھاری بھرکم پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ موہن تھا۔

"ہیلو پروفیسر شوکت!" اس نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کیسے ہیں؟"

میں نے بناوٹی غصہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "تم بھی عجیب لڑکے ہو موہن! ایک ماہ سے شانتی نگر میں مقیم ہو اور مجھ سے ایکبار بھی پھر ملنے کے لئے نہیں آئے۔"

"اب آیا تو ہوں" اس نے بچوں کے سے لہجہ میں کہا۔ لیکن اچانک وہ سنجیدہ ہو گیا اور خوفزدہ انداز میں چاروں جانب دیکھ کر رازدارانہ انداز میں بولا۔ "پروفیسر! کیا تم مہربانی کر کے آج رات مجھے کھانے پر مدعو کرو گے؟"

میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ لیکن وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بولا۔ "میرے ہمراہ ایک لڑکی بھی ہوگی —— تمہاری بھتیجی۔"

مجھے اس کی باتیں پاگلوں جیسی معلوم ہو رہی تھیں۔ "میری کوئی بھتیجی نہیں ہے۔" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"اوہ۔ تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔" وہ بولا۔ "تم اس لڑکی کو اپنی بھتیجی تصور کرنا۔ اور پھر تمہیں شمپی کو بھی دعوت پر مدعو کرنا ہوگا۔ تاکہ تم اپنی بھتیجی کو اس سے متعارف کرا سکو۔"

"کیا بکتے ہو تم موہن؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"پروفیسر!" وہ مرعوب کن لہجہ میں بولا۔ "انکار مت کرو۔ آج رات میں تم پر ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ موتی کی موت اتفاقیہ نہیں تھی بلکہ وہ قتل کیا گیا ہے۔"

"ہیں!" حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

موہن لجاجت آمیز لہجہ میں بولا۔ "پروفیسر! کیا تم موتی کے قاتل کی گرفتاری میں میری مدد نہ کرو گے؟"

"لیکن میں کروں کیا؟" میں نے حیرت زدہ انداز میں جواب دیا۔

"صرف یہی کچھ، جو میں نے تمہیں بتلا دیا ہے۔" موہن بولا۔ "تم شمپی کو اور مجھے مدعو کرو گے۔ تاکہ اپنی بھتیجی سے ہمیں متعارف کراؤ۔ تمہاری بھتیجی کا نام 'شامو' ہے۔ وہ تمہیں چچا پروفیسر کہکر پکارے گی۔ تعارف کے دوران میں تم ہمیں بتلاؤ گے کہ تمہاری بھتیجی روحانیات کے علم کی ماہر ہے اور بس۔"

میں نے غور سے موہن کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر پُر رعب متانت چھائی ہوئی تھی۔ میں نے دریافت کیا۔ "لیکن قاتل ہے کون؟"

موہن نے میرے منہ پر ہاتھ رکھدیا اور پھر چاروں جانب دیکھ کر بولا۔ "یہ تمہیں آج رات معلوم ہو جائیگا۔ لیکن یاد رکھو تمہاری معمولی سی لغزش غریب شامو کو موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔"

"شامو کہاں ہے؟" میں نے متاثر ہو کر پوچھا۔

"وہ اس وقت تمہارے ڈرائنگ روم میں دعوت کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ تم از راہ کرم فوراً شمپی کو اطلاع دے آؤ۔" یہ کہکر وہ مہندی کے پودوں کو پھاند کر روش پر پہنچا۔ اور دوڑتا ہوا میرے مکان میں داخل ہو گیا۔

مجھے اپنا دماغ مختل سا محسوس ہو رہا تھا۔ موہن کی باتوں نے میرے حواس منتشر کر دئے تھے۔ ایک عالم بے خودی میں میں نے گراج سے کار نکالی اور "نشاط" روانہ ہو گیا۔

اس رات کے واقعات مجھے خواب کیطرح یاد ہیں۔ شمپی حسب وعدہ ٹھیک ۹ بجے میرے مکان پر پہنچا۔ "میرا خیال ہے۔ میں بر وقت آیا ہوں پروفیسر شوکت!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک شاندار سوٹ پہنے ہوئے تھا اور آج مجھے نسبتاً زیادہ دلکش محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ایک شرابی کی طرح اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ شامو اور موہن میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی شمپی کے اعزاز میں کھڑے ہو گئے۔

"یہ میری بھتیجی شامو" میں نے شمپی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ مسلسل چھ برس تک امریکہ کے مشہور ماہر روحانیات مسٹر شا سے روحانیات کا علم حاصل کر کے واپس لوٹی ہے۔"

شمپی نے ایک لمحہ تک مسحور کن نظروں سے شامو کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے آپ سے ملکر بہت خوشی ہوئی مس شامو!"

"اوہ ——— شکریہ مسٹر شمیمی!" شامو نے اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

شمیمی مومن کے پاس کوچ پر بیٹھ گیا۔ مومن نے مسکرا کر شمیمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "شمیمی! میرا خیال ہے۔ آج پروفیسر صاحب کی بھتیجی ہمیں اپنے کمالِ فن کے مظاہرہ سے بھی ممنون فرمائیں گی۔"

"ضرور۔ ضرور۔ کیوں چچا پروفیسر" شامو نے ساڑھی کا پلو انگلیوں میں لپیٹتے اور کھولتے ہوئے کہا۔

"ہاں شامو ضرور ——— اگر تم پسند کرو" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

اس کے بعد ہم لوگ کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ کھانا کھانے کے دوران میں شامو ہنس ہنس کر شمیمی سے باتیں کرتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ شمیمی کو اپنی ذات سے متاثر کرنے کی خواہشمند ہے۔ میں خاموشی سے بیٹھا ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

شامو واقعی نہایت حسین اور دلفریب لڑکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اے کاش وہ سچ مچ میری بھتیجی ہوتی۔ بہر طور اب میں بھی کسی حد تک ہوش میں آ چکا تھا اور ماحول کی نزاکت کے پیشِ نظر سنبھل سنبھل کر گفتگو میں حصہ لیتا۔ کھانا ختم کر چکنے کے بعد ہم سب ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ شامو نے شمیمی کی طرف ایک دلکش انداز میں دیکھ کر کہا "مسٹر شمیمی! میں نے سنا ہے آپ گانا خوب گاتے ہیں۔ کیا آپ ہمیں سنا سکیں گے۔"

"اوہ ——— میں؟" شمیمی نے ہنس کر کہا۔ "یونہی سا جانتا ہوں۔ لیکن آپ کی درخواست کو رد ہرگز نہیں کروں گا۔ خواہ آپ خود ہی بدمزہ کیوں نہ ہو جائیں۔"

یہ کہہ کر اس نے میز پر پڑا ہوا وائلن اٹھایا اور نہایت دھیمے دھیمے سروں میں بھنگل کا یہ گانا گانے لگا۔

"پریم کا ہے اس جگ میں پنتھ نرالا"

شامو خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور شمیمی کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ گیت کے اختتام پر ہم نے تالیاں بجائیں۔ شامو کہنے لگی "اب میں آپ کو اپنا کمال دکھاتی ہوں ——— بتائیے آپ کسی روح کو بلوانا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی ساری سمیٹی اور خاموشی سے میز پر پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ حد درجہ سنجیدہ تھا اور آنکھوں میں ایک مرعوب کن وقار لہریں لے رہا تھا۔ میں نے شمیمی کی جانب دیکھا۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ "روح ——— وہ چلایا "کس کی روح؟ ——— ہمیں کسی کی روح کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ ——— میں روحوں سے بہت ڈرتا ہوں۔"

اتنے میں مومن آگے بڑھا اور شامو سے لجاجت آمیز لہجہ میں بولا "مس شامو! میں موتی کی روح سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔"

"موتی کی روح" شمیمی چیخ کر بولا۔ "یہ کیا بیہودگی ہے۔"

"گھبرائیے مت مسٹر شمیمی! آپ جانتے ہیں موتی میرا بھائی تھا" مومن نے شمیمی سے مخاطب ہو کر کہا "میں موتی کی روح سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اس کی موت اتفاقیہ تھی یا وہ واقعی سیاہ گائے جیسے چہرے والے بھوت کے ہاتھوں قتل کیا گیا ہے۔"

شامو بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ "نہیں.... مجھے ڈر لگتا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے روحوں سے کبھی ایسے سوالات نہیں پوچھے۔ اور اس امر کے دریافت کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کیا مسٹر شمیمی کے فوٹو ان حقائق کے بہتر شاہد نہیں ہیں۔"

"لیکن آج رات کو یہ تجربہ دلچسپ ہوگا مس شامو!" مومن نے لجاجت سے کہا۔ "آپکی خوش قسمتی سے آپکو ایسا دلچسپ کیس مل گیا ہے۔"

شمیمی نے بے چینی سے کرسی پر کروٹ بدلی۔ "میرے لئے سیاہ گائے جیسے چہرے والے بھوت کا خوف ہی کیا کم ہے" وہ بڑبڑایا "کہ آپ میری موجودگی میں ایک روح کو بلوا رہے ہیں۔"

مومن نے مستفسرانہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ گویا اس کی خواہش تھی کہ میں بھی اس گفتگو میں حصہ لوں۔

"میرا خیال ہے" میں نے کہا "ایسا تجربہ دلچسپ ضرور ہے لیکن اگر شامو کو کوئی دقت محسوس نہ ہو۔"

"اچھی بات ہے۔ کوئی حرج نہیں" شامو نے مومن سے مخاطب ہو کر کہا "اگر مسٹر شمیمی بالکل خاموش اور اطمینان سے بیٹھے رہنے کا وعدہ کریں۔"

"اوہ ——— بے شک ——— جیسی آپکی مرضی" شمیمی نے بادلِ ناخواستہ کہا

"میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں مسٹر شمیمی! یہ روح آپکو کوئی نقصان نہ پہنچائیگی" شامو نے شمیمی کی قلبی کیفیات کا اندازہ لگاتے ہوئے طنزاً کہا۔

شمیمی آہستگی سے بولا "میرا ایسا تجربہ ... نتائج کی رائے زنی بے سود ہے۔"

چند لمحوں تک کمرے میں خاموشی طاری رہی اس کے بعد شامو نے مجھ سے مخاطب ہو کر

کہا: "چچا پروفیسر! میرے کمرے سے ذرا وہ لکڑی کا بکس تو اٹھا لائیے جو سنگار میز پر دھرا ہے۔"

میں نے گھبرا کر موہن کی جانب دیکھا لیکن اس کی آنکھ کا اشارہ پا کر دوسرے کمرے کی جانب روانہ ہو گیا۔ سامنے سنگار میز پر واقعی ایک لکڑی کا چوکور بکس رکھا تھا۔ چنانچہ میں نے اُسے لا کر شامو کے قریب میز پر رکھ دیا۔

"اب از راہ کرم بتیاں بجھا دیجئے۔" شامو نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

بجلی کا بٹن دباتے وقت میں نے شمی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ غیر معمولی طور پر زرد تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے شامو کا چہرہ تک رہا تھا۔ بتیاں بجھتے ہی کمرے میں ایک بھیانک خاموشی طاری ہو گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرا دم گھٹ رہا ہو۔ اور تازہ سانس لینے کے لئے فضا میں ہوا کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہو۔ میرے کانوں میں موہن کے الفاظ گونج رہے تھے: "ذرا سی لغزش غریب شامو کو موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔" لیکن کیسے؟ — کیا موتی کی روح شامو کو قتل کر دے گی یا وہ سیاہ گائے جیسے چہرے والا خوفناک بھوت؟"

اس کا تصور کرتے ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر چہار جانب دیکھا لیکن میری نظریں تاریکی کی سنگلاخ دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر ناکام لوٹ آئیں۔

اچانک ایک ہلکی اور سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ بالکل ایسی جیسے ریکارڈ بجنے سے قبل سوئی اس کے بے آواز حصے پر گھس رہی ہو۔ مسلسل۔ مسلسل۔ موہن نے مجھے کہنی ماری اور آہستہ سے اپنے ہونٹ میرے کانوں کے پاس لا کر بولا: "ہوشیار۔"

اتنے میں کسی مرد کی گھٹی ہوئی آواز آئی: "رحیم۔ میرے رحیم خدا۔"

"اف میرے اللہ!" میں خوفزدہ ہو کر بڑبڑایا۔

مجھ سے تھوڑے فاصلہ پر شمی نے کرسی پر ایک کروٹ لی اور ایک لمبا سانس لیا جیسے سردی کے موسم میں کسی کی گردن میں برف ڈال دی جائے۔

"کیا تم ہو پیارے موتی؟" موہن آہستہ سے بولا۔

"رحیم خدا — بٹن — بٹن۔" دبی آواز آئی۔

"کونسے بٹن پیارے موتی؟" موہن نے کہا۔

"بٹن ہی میرے قتل کا ثبوت ہیں۔ بٹن" آواز بے شک موتی کی تھی لیکن ایسی جیسے کوئی کسی گہرے کوئیں میں سے بول رہا ہو۔

"میں پہاڑ سے پھسلا نہیں۔ گرایا گیا ہوں موہن — پیارے بھائی میرا انتقام لو۔"

"لیکن تمہیں کس نے قتل کیا ہے —؟" موہن نے پوچھا۔

"وہی بدمعاش — بدمعاش حاسد شم..."

اتنے میں ایک ہولناک چیخ کی آواز آئی اور پھر کسی کے گلے کی خرخراہٹ کی دردناک آوازیں فضا میں منتشر ہونے لگیں۔

"بتی جلاؤ — بتی جلاؤ پروفیسر" موہن نے گرج کر کہا: "بدمعاش شامو کو قتل کر دے گا۔"

میری رگ رگ میں برقی لہریں دوڑ گئیں۔ میں نے لپک کر بٹن دبایا۔

برقی روشنی میں میں نے دیکھا شمی نہایت بے دردی سے شامو کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اور بے چارہ شامو اس کے مضبوط ہاتھوں کے نیچے میز پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھیں پپوٹوں سے باہر اُبلی پڑتی تھیں۔

"چھوڑ دو بدمعاش" موہن بھوکے شیر کی طرح گرجا اور ساتھ ہی اس نے دو انگلیاں منہ میں ڈال کر زور سے سیٹی بجائی۔

"ہا ہا ہا ہا" شمی نے خوفناک انداز میں قہقہہ لگایا۔ "میں نے ہی موتی کو قتل کیا ہے۔ بے شک — بے شک — لیکن دیکھتا ہوں تم مجھے کیسے گرفتار کر سکتے ہو؟"

موہن نے لپک کر میز سے پیتل کا گلدان اٹھایا اور تڑاخ سے شمی کے ننگے سر پر دے مارا۔ شمی کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ اپنا سر تھام کر زمین پر گر گیا۔ اتنے میں چند بھاری بھرکم پاؤں کی آہٹ ہوئی۔ اور ایک انسپکٹر پولیس مع چند سپاہیوں کے کمرے میں داخل ہوا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے ہکلا کر کہا۔

"گھبراؤ مت پروفیسر! فوراً برانڈی لاؤ۔ شامو بری طرح بے ہوش ہے۔" موہن نے شامو کو میز سے اٹھاتے ہوئے کہا: "اسی بدمعاش نے موتی کو قتل کیا اور اب شامو کو بھی قتل کرنا چاہتا تھا۔"

انسپکٹر نے آگے بڑھ کر شمی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور سپاہی خاموشی سے اسے نیچے لے گئے۔

موہن نے ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا اور بولا — "پروفیسر! تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ آج رات یہاں جو کچھ ہوا ہے وہ اس ریکارڈ میں بند ہے۔ تمہارے حیرت آمیز جملے، اور شمی کا اقبال جرم۔" یہ کہہ کر اس نے اس لکڑی کے بکس کی طرف اشارہ کیا۔ جو میں نے لا کر شامو کے قریب میز پر رکھا تھا۔

~~~~~~

مجھے یہ سن کر واقعی انتہائی حیرت ہوئی کہ موہن بمبئی کا مشہور سراغرساں رمیش تھا اور شامو اس کی بیوی شیلا۔

دوسرے دن رات کا کھانا شہر کے چند معززین
~~~~~~

کے ہمراہ ان دونوں نے میرے مکان پر تناول کیا۔ کھانے کے دوران میں شیلا دیوی نے ایک مرتبہ میری جانب مسکرا کر دیکھا اور بولی

"چچا پروفیسر! ...."

سارا کمرہ بھاری بھرکم قہقہوں سے گونج اٹھا۔ مسز چودھری جو شیلا دیوی کے پاس بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں ہنستے ہوئے بولیں "آپ ابھی تک اپنے آپ کو پروفیسر شوکت رشید کی بھتیجی تصور کئے ہوئے ہیں"

"اس میں حرج ہی کیا ہے" رمیش نے مسکرا کر کہا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد سب لوگ ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔ اور بے تابی سے رمیش کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ رمیش کی زبان سے اس کی تفتیش کے واقعات سنے۔ چنانچہ جب رمیش مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو پرجوش تالیوں اور مختلف نعرہ ہائے تحسین سے اس کا استقبال کیا گیا۔ رمیش نہایت متانت سے شیلا دیوی کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا اور لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"حضرات! میں آپ کی بے چینی کو بخوبی محسوس کر رہا ہوں اور اب آپ کو زیادہ دیر منتظر نہیں رکھوں گا۔ سنئے میں صحیح واقعات کو بے نقاب کئے دیتا ہوں۔

یہ میری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ میرے چہرے کے نقوش کافی حد تک مرحوم موتی سے ملتے جلتے تھے۔ چنانچہ جب مایا نے جس سے میری بیوی شیلا کے پرانے دوستانہ تعلقات ہیں مجھے موتی کی اس المناک موت کے بارے میں مطلع کیا۔ میں موتی کے بھائی کی حیثیت سے شانتی نگر پہنچا۔ دوران گفتگو میں مایا کی زبانی معلوم ہوا کہ شمی بھی اس کے چاہنے والوں میں سے ہے اور اس سے شادی کا آرزو مند تھا۔ مجھے فوراً شبہ ہوا کہ کہیں غریب موتی کی موت رقابت کی چیرہ دستیوں کی بنا پر تو نہیں ہوئی۔

چنانچہ جب مجھے بتلایا گیا کہ موتی کو پہاڑ کی چٹان سے پھسلتے ہوئے بھی شمی نے ہی دیکھا ہے۔ میرا شبہ اور قوی ہو گیا۔ لیکن چونکہ محض شبہات کی بنا پر کسی معزز آدمی کی گرفتاری ناممکن ہے۔ اس لئے اب مجھے ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ایک مرتبہ موقع واردات پر جا کر میں نے اس مقام کے گرد و پیش کا بغور معائنہ کیا تو مجھے پہاڑ کی چٹان سے چند گز کے فاصلے پر ایک سیاہ بٹن پڑا ہوا نظر آیا۔ اس بٹن کے ساتھ تاگے بھی لپٹے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کھینچا تانی میں کسی شخص کے کوٹ یا شیروانی سے ٹوٹ کر گرا ہو۔

دوسرے دن جب میں شمی کو ملنے کے لئے نندا میں گیا تو پروفیسر بھی وہاں موجود تھا۔ گفت و شنید کے دوران میں میری نظر اچانک ایک سیاہ شیروانی پر پڑی۔ میں نے بغور دیکھا تو شیروانی کا ایک بٹن دوسرے بٹنوں سے قدرے تیز رنگ کا اور نیا معلوم ہوتا تھا مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بٹن جو مجھے پہاڑ کی چٹان پر ملا ہے۔ یقینی طور پر شمی کی شیروانی کا ہے۔ اب حالات بالکل ظاہر تھے۔ شمی کسی بہانے سے موتی کو پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا۔ اور وہاں سے اسے دھکیلنا چاہا موتی نے مزاحمت کی اور اس کشمکش میں شمی کی شیروانی کا بٹن ٹوٹ کر گر گیا۔ بہرطور شمی اس جدوجہد میں موتی پر غالب آیا اور موتی وادی میں گر کر ہلاک ہو گیا۔

نشاط میں پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ شمی نے اس قتل کے لئے شروع سے زمین ہموار کر رکھی تھی۔ اور سیاہ چہرے والے بھوت کے بارے میں ایک فرضی داستان مشہور کر کے پروفیسر شوکت پر ثابت کر دیا تھا کہ موتی اسی کے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے۔

اس نے پہلے تو پک نک کے روز پروفیسر کو مرعوب کیا۔ اور اس کے بعد سیاہ بھوت کا جو حلیہ عوام میں مشہور ہے۔ اسی قسم کی ایک تصویر تیار کی۔ اور موتی اور مایا کی تصویر پر اس کا چربہ اتارا۔ تب اس نے اس تصویر کا ایک اور چربہ اتارا لیکن چونکہ ان چربوں میں تھوڑا سا فرق تھا اسلئے شمی [illegible] نے پروفیسر سے اس کا چربہ مانگا۔ اس نے اپنے چربے پر سیاہی انڈیل دی لیکن میری نظروں نے پروفیسر کا چربہ دیکھتے ہی دو [illegible] فرق پہچان لیا۔ شمی کافی عرصہ تک بمبئی کی ایک فلم کمپنی میں بحیثیت اداکار کے ملازم رہا ہے۔ اس لئے وہ ایکٹنگ اور فوٹوگرافی میں ماہر تھا۔ بہرطور اس پر مجھے ایک پختہ ثبوت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی شیلا کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ موتی کی آواز کی نقل اتارے۔ موتی بہت عرصہ قبل میرا گہرا دوست تھا اور شیلا [illegible] اتارنے کے فن میں مشاق ہے اس کی آواز بخوبی یاد تھی۔ لیکن ہم نے احتیاط کے طور پر مایا کے سامنے بھی وہی ڈرامہ جو کل رات پروفیسر کے مکان پر کھیلا [illegible] مایا نے ہمیں اطمینان دلایا کہ شیلا کی آواز [illegible]

چنانچہ کل رات کو میں نے آواز [illegible] مشین ہمراہ لی اور پروفیسر کے مکان [illegible] شمی کو مدعو کیا۔ شیلا کو پروفیسر شوکت کی بھتیجی ظاہر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مجھ پر کوئی شبہ نہ ہونے پائے۔ چنانچہ [illegible] کہ امید تھی۔ شمی صورت حال کی نزاکت سے متاثر ہو کر حواس کھو بیٹھا اور اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ اس کے [illegible] نے شیلا کو قتل کرنے کی کوشش کی [illegible]

پولیس انسپکٹر صاحب نے جو میری سیٹی کے منتظر تھے اندر آکر اسے گرفتار کر لیا۔ شمی کا خیال تھا کہ وہ [illegible] کامیاب

اعتبار الملک حکیم الشعراء حضرت دل مدظلہ العالی شاہجہانپوری کی

ایک تازہ غزل!

مآلِ حرماں نگاہ میں ہے قلق میں بھی مسکرا رہا ہوں
وہ میں کہ ہنگامِ جوشِ گریہ تمام عالم پہ چھا رہا ہوں

قدم قدم پر بہار تازہ، نشاطِ تازہ، حیات تازہ
رہِ محبت کی لغزشوں میں سکونِ خاطر بھی پا رہا ہوں

ٹپک رہی ہیں جو اشکِ حسرت انہیں میں خونِ دل بھی شامل
مرقعِ یاس کو یہیں سے کچھ اور رنگیں بنا رہا ہوں

فضا سے ٹکرا کے میرے نالے فضائے عالم پہ چھا رہے ہیں
جو کہہ رہا ہوں وہ سُن رہا ہوں جو کہہ چکا ہوں سُنا رہا ہوں

مری تمنا وہ دائرہ ہے نہ جس کا اول نہ جس کا آخر
کہ جن حدوں سے گذر چکا تھا انہیں حدوں میں پھر آ رہا ہوں

قدم قدم پہ فریب حاصل، نفس نفس اک طلسم باطل
عجب سفر ہے عجب یہ منزل نہ آ رہا ہوں نہ جا رہا ہوں

جو ناشناسِ وفا ہیں ابتک ادھر بھی کاش التفات کرتے
قلق کی دھن میں فغاں کی لے میں نئے نئے گیت گا رہا ہوں

سمجھ چکا ہوں میں رازِ ہستی، رہِ نشیب و فراز ہستی
جہاں کی ہر شے میں تھا تغیر ابھی وہیں سے میں آ رہا ہوں

یہ کون جانے یہ کون سمجھے نظر میں ہے کون سی تجلی
کہ آج ہر انجمن کی شمعیں جلا رہا ہوں بجھا رہا ہوں

مری نظر شرحِ داستاں ہے، مری خموشی بھی اک بیاں ہے
سنو کہ روداد یاس و حسرت نئی زباں میں سُنا رہا ہوں

کہاں کچھ اس کا نشاں نہیں ہے، کدھر کچھ اسکی خبر نہیں ہے
نفس نفس سے یہ ہے نمایاں کہ میں بہت دُور جا رہا ہوں

نگاہ میں ہے نشانِ منزل، خیال میں ہے جنوں کا حاصل
تمام عالم میں گھوم پھر کر اب ایک مرکز پہ آ رہا ہوں

کہاں وہ رنگینیِ تبسم، کہاں وہ رعنائیِ تکلم
جو دن میں خواب و خیال اے دل انہیں پہ آنسو بہا رہا ہوں

اشتہاری طلاؤں سے بچو!

نسخہ طلاء مردمی شائع ہو گیا!

ناظرین! اس طلاء نے صدہا نہیں بلکہ ہزاروں مریضوں کی زندگی بدل دی اور ہزاروں کو بامراد و کامیاب بنا دیا۔ طلاء مردمی رجسٹرڈ عرصہ ۲ سال سے پبلک میں اپنی مسیحائی سے مردہ کو زندہ کی صفت اور صداقت کا سکہ بٹھا کر شہرت اور قبولیت کا ڈنکا بجا رہا ہے اور نہایت مجرب اور پراثر ثابت ہو رہا ہے۔ ہم نے پبلک کی تکلیف کا خیال کر کے عام مخلوق خدا کی ہمدردی اور اشتہاری دوائیوں کی شکایت کا خیال کرتے ہوئے عام انسانوں کیلئے مجرب اور شرطیہ طلاء بلا ہچکچاہٹ کے شائع کر دیا ہے۔ اور جو عضو مخصوص (اندری) کی تمام خرابیوں کیلئے بیحد مفید ہے۔ اور عضو مخصوص کی سستی، کمزوری، ٹیڑھا پن، چھوٹا پن، پتلا پن، جھکاؤ، نیلی رگوں کا ابھر آنا جو کثرت مباشرت، اغلام اور جلق وغیرہ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور جملہ تمام امراض کیلئے حیرت انگیز طور پر مفید ثابت ہو چکا ہے۔ تمام شکایتوں کو رفع کر کے طوالت، فربہی اور تحریک قوت پیدا کرنے میں لاثانی ہے۔ زود اثر اس درجہ کہ اول مرتبہ کے لگانے سے نصف گھنٹہ میں فائدہ محسوس ہوتا ہے۔ ہزارہا مایوسوں کی زندگی جو بے لطف تھی۔ اس نے عیش و راحت کامیابی اور کامرانی کیساتھ بسر کرا دی۔ جو کہ دعائیں دیتے ہیں۔ اور شکریہ کے خطوط لکھتے نہیں تھکتے۔ اسلئے اس کے استعمال سے اس کا جوہر معلوم ہو سکتا ہے۔ شوق سے اسکو تیار کریں۔ اور دعائے خیر سے ناچیز کو یاد کریں۔ اگر کسی صاحب کو ضرورت نہ ہو۔ تو اپنے دوستوں اور عزیزوں کو یہ نسخہ ملاحظہ فرما کر طلاء بنانیکی سفارش کریں۔ نہ ردی کی ٹوکری میں پھینکا جائے۔ بلکہ بہت حفاظت سے رکھا جائے۔ کیونکہ یہ نسخہ بار بار شائع نہ ہوگا۔

نسخہ حسب ذیل ہے مغز پستہ ایک تولہ، مغز اخروٹ ایک تولہ، مغز بادام ایک تولہ، مغز چلغوزہ ایک تولہ، سفید کنیر کی جڑ ایک تولہ، کائپھل ایک تولہ، لونگ ایک تولہ، جائفل ایک تولہ، بیر بہوٹی چھ ماشہ، ریگ ماہی ایک تولہ، مالکنگنی ایک تولہ، سفید چرمٹی ایک تولہ، دھاک کے بیج تولہ، سم اسپ ایک تولہ، عاقر قرحا ایک تولہ، جلوتری ایک تولہ، دارچینی ایک تولہ، اونٹ کٹارے کی جڑ ایک تولہ، تخم پیاز ایک تولہ، کچلہ چھ ماشہ، زعفران چھ ماشہ، سونف چھ ماشہ، کیچوے خشک چھ ماشہ، کستوری دو ماشہ، اندری ریچھ چھ ماشہ، چربی چیتا ۵ تولہ، چربی شیر ۵ تولہ، چربی سانڈہ ۵ تولہ، تیل چنبیلی ۵ تولہ، سم الفار سفید چھ ماشہ، آئل سنامن (cinnamon ...) ۵ تولہ، آئل کلو ۵ تولہ۔ مندرجہ بالا خشک دواؤں کو پیس کر چربی اور تیل ملا لیں۔ پھر کسی کھرل میں ڈال کر ۲۴ گھنٹہ گھوٹ کر بڑی آتشی شیشی میں بھر کر رکھ لیں۔ یا نال جنتر کی ترکیب سے تیل نکالیں۔ اور شیشی میں بھر کر کارک لگا دیں۔

حسب دستور رات کو سوتے وقت مالش کریں۔ انشاء اللہ ایک ہفتہ کے استعمال سے وہ قوت پیدا ہو گی۔ جو تا زندگی قائم رہیگی۔ اور تمام نقائص عضو مخصوص کے رفع ہو جائینگے۔ لطف یہ کہ اس طلاء سے آبلہ نہیں پڑتا۔ اور نہ کوئی تکلیف ہی ہوتی ہے۔ نازک سے نازک حضرات اس کا استعمال کرتے ہیں۔ ہر موسم میں یکساں مفید ہے۔ اگر کوئی صاحب بوجہ وقت یا تنگدستی سے خود تیار نہ کر سکیں۔ تو ہمارے دواخانہ سے طلاء مردمی جو مریضوں کیلئے ہر ہفتہ تیار ہوتا رہتا ہے۔ جس کی قیمت فی شیشی تین روپے آٹھ آنہ معہ محصولڈاک ہے (منی آرڈر فیس دو آنہ) طلب کریں۔ ایک شیشی ایک مریض کیلئے کافی ہوتی ہے۔ اگر خود ہی تیار کرنا چاہیں۔ اور کسی دوا کے نہ ملنے سے مجبور ہو جائیں۔ تو وہ بھی طلب کریں۔ غرضیکہ ہم کو دھوکہ باز اشتہاریوں سے بچانا مقصود ہے جس طرح چاہیں۔ اس نسخہ کا تجربہ کریں۔ اور اگر **جریان و قوت باہ** کی شکایت ہو۔ تو ہمارے ہاں وہ بھی نسخہ اکسیر **جریان یادو او سنجیون ست** رجسٹرڈ جو کہ بیس سال سے مجرب مشہور ہے۔ جس کے استعمال سے بلامبالغہ بیس بیس سال کے لاعلاج مریض جو برسوں تک حکیموں اور ڈاکٹروں کے زیر علاج رہ کر دولت کو برباد کر کے مایوس ہو چلے تھے۔ آج وہ سب صاحب اولاد ہیں جس کی قیمت اکیس روزہ خوراک کی مبلغ دو روپے دس آنے (۲/۱۰) معہ محصولڈاک ہے (منی آرڈر فیس دو آنہ) طلب کریں۔ جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ اور پتہ خوشخط تحریر کریں۔ ورنہ تعمیل جواب نہ ہو گی۔ تاکید ہے۔ (قبل خط و کتابت کا پتہ :-)

خادم وید رتن ستیہ دیو جی پروپرائٹر روپ بلاس کمپنی نمبر ۱۲ کانپور

حُسن سازی کے پردے میں چار سو بیس (۴۲۰)!

لندن کی ایک جعلساز عورت کے ہتھکنڈے

ایک بلا کا دلچسپ اور سو فی صدی سچا افسانہ — اثر ادارہ — بار بار پڑھو اور ہر مرتبہ نیا لطف حاصل کرو

"حُسن بکتا ہے لے لو"

آج سے کئی سال پہلے یہ اشتہار جلی حروف میں بونڈ سٹریٹ لندن کی ایک دوکان کے دروازہ پر لگا رہتا تھا اور اس کے نیچے خریداروں کو ان الفاظ میں دعوت دی جاتی تھی "جو عورت ہمیشہ کیلئے خوبصورت بننا چاہتی ہے میرے پاس آئے میں اس کی مراد پوری کردوں گی"

ظاہر ہے کہ بہت کم عورتیں اور وہ بھی مغرب کی رہنے والی اس عجیب حیرت انگیز اپیل کو نظر انداز کرسکتی تھیں خوبصورتی کی تلاش عورت کی سب سے زبردست کمزوری سمجھی گئی ہے اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی یہ انوکھی ترکیب سوچی گئی تھی اور جو نفع عظیم اس سے حاصل ہوا وہ اتنا بے انداز تھا کہ اس کا حال پڑھکر حقیقت پر افسانہ کا گمان ہونے لگتا ہے — مگر ناظرین پوچھیں گے اس دکان کا مالک کون تھا؟ تو سنیئے ایک بدنما بدصورت ادھیڑ عمر کی یہودن میڈم ریشل جس کا نام تھا جس کی اپنی شکل وصورت اتنی گندی اور مکروہ تھی کہ دیکھ کر استکراہ ہونے لگتا تھا لیکن جو چکنی چپڑی باتوں کی اتنی دھنی تھی کہ ان سادہ لوح عورتوں کو جو حسن استمراری کے حصول کی امید پر اس کے ہاں جاتیں اور اپنے خاوند کے گاڑھے پسینے کی کمائی بے دردانہ لٹاتی تھیں کبھی اس موٹی سی بات کا خیال نہ آتا تھا کہ جو عورت دوسرں کو خوبصورت بنانے کا دعویٰ کرتی ہے وہ پہلے اس علاج کی آزمائش اپنے آپ پر کیوں نہیں کرتی! — حاصل کلام یہ کہ برسوں اس مکار فریبی عورت نے حسن فروشی کا دام پھیلا کر صدہا بیوقوف عورتوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور ساتھ ہی ساتھ ایسی ترکیب کی کہ ان میں سے کوئی اپنی حماقت کا ذکر کسی دوسرے کے سامنے کرنے کی جرأت نہ کرسکی تاہم آخر کار ایک وقت آیا جب میڈم ریشل کی حرص وآز حد انتہا سے آگے بڑھ نکلی اس نے ایک بدنصیب عورت مسز بوراڈیل کی ساری دولت رفتہ رفتہ چھین لی اور جب اس غریب کے پاس زہر کھانے تک کو پیسہ نہ رہا تو انجام کار معاملہ پولیس کے کانوں تک پہنچا۔ اس کے بعد جن حیرت انگیز رازہائے سربستہ کا انکشاف کمرہ عدالت میں ہوا۔ ان کو پڑھکر ان ستم رسیدہ عورتوں کے حال پر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی جو بھولی فاختاؤں کی مانند اپنے پرنچوانے خود بخود اس گربہ مسکین کے پاس جاتی تھیں۔

جو لوگ نیم حکیم خطرہ جان طبیبوں کے عمل کو جانتے ہیں وہ اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہوسکتے کہ یہ لوگ عوام کے دلوں میں اپنی جیبوں کے بارے میں اعتماد کامل پیدا کرنے کے لئے اپنی نام نہاد ادویہ کی قیمت اتنی گراں رکھتے ہیں کہ ہر خاص و عام ان کی خرید کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس نکتہ کو میڈم ریشل نے خوب اچھی طرح سمجھا تھا اس نے حسن قدر غازے سفوف یا دیگر مرکبات اس نے حسن افروزی کے سلسلہ میں اپنے ہاں تیار کئے تھے ان سب کی قیمتیں اتنی غیر معمولی اور زیادہ تھیں کہ پڑھنے والے کو یہ سوچکر سخت تعجب ہوتا ہے وہ کس طرح کے پُراعتماد اور نادان لوگ ہوں گے جو آنکھیں بند کرکے ان بوتلوں میں بند گدلا پانی اتنا مہنگا خرید کرتے تھے۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ میڈم ریشل کی دکان میں سر کے بال دھونے کا طلائی مصالحہ "دو گنی فی بوتل کے حساب سے۔ کوہ ہائی میٹس کے خودرو پودوں سے حاصل کیا ہوا "شہد" اور ملک عرب کا مقدس طبی عطر بھی اس قیمت پر فروخت ہوتے تھے اس طرح بے شمار چیزیں اور بھی جن کو دل لبھانے والے ناموں سے موسوم کرکے مہنگے داموں فروخت کیا جاتا تھا حالانکہ ان چیزوں کی اصل حقیقت کچھ بھی نہیں تھی۔ عورتوں کیلئے بنے بنائے سنگار دان پچیس گنی سے لیکر دو سو گنی تک قیمت کے تیار رہتے تھے۔ سہاگ رات کی چیزیں بیس سے لیکر ایک سو گنی قیمت تک فروخت کی جاتی تھیں اور ایک خاص قسم کا پانی جو عورت کے حق میں طلسماتی اثر رکھنے والا بیان کیا جاتا تھا بیس گنی فی بوتل کے

حساب سے فروخت ہوتا تھا علی ہذا القیاس۔

لیکن ان چیزوں سے بڑھ کر حیرت انگیز میڈم ریشل کا یہ دعویٰ تھا کہ کوئی کیسی ہی بھدی بدصورت ڈھلی ہوئی عورت میرے پاس آئے میں اسکو شباب تازہ مہیا کر دوں گی اور اس کا حسن عمر بھر قائم رہے گا"۔

اپنی دوکان کے جو اشتہارات میڈم ریشل نے شائع کئے ان کی لچھے دار عبارت پڑھ کر آدمی بے اختیار اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہوتا تھا کہ حسن افروز ادویہ کی تلاش میں دنیا کا کوئی دور افتادہ گوشہ ایسا نہیں جو اس عورت کی نگاہ تیز سے بچا ہو حتیٰ کہ وسط افریقہ کا صحرائے اعظم بھی اس کی جستجو سے محفوظ نہ رہا تھا کیونکہ ایک اشتہار میں مذکور تھا کہ اس لق و دق بیابان کے وسط میں ایک چشمہ دریافت ہوا ہے جس کا پانی ڈھلے ہوئے شباب کو اصلی حالت پر لانے کا سحر انگیز اثر رکھتا ہے بیان کیا گیا تھا کہ اس چشمہ کا حال پہلے فقط دربار مراکش کے حکام کو معلوم تھا اور اس ملک کا سلطان اس چشمہ کا پانی صبا رفتار سانڈنیوں پر رکھے ہوئے مشکیزوں کے ذریعہ سے اپنے حرم سرا میں منگوا کر اپنی لاتعداد بیگمات کو دائمی طور پر خوبصورت اور جوان بنا رہنے کو دیا کرتا تھا میڈم ریشل کا دعویٰ تھا کہ اس نے کئی خاص ترکیبوں سے کام لے کر صرف زر کثیر سے اس قیمتی پانی کی تھوڑی سی مقدار ان عورتوں کے لئے حاصل کی ہے جو خوبصورت بننے کے لئے ہر قسم کے اخراجات گوارا کرنے کو آمادہ ہوں۔

اس قدر لکھنے کے بعد ہمارے خیال میں یہ بیان کرنے کی حاجت نہ ہوگی کہ مغرب کی فیشن زدہ عورتیں سینکڑوں کی تعداد میں اس خداداد نعمت حسن سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے جو بے حد گراں تھی اس کی دوکان پر سر ہوتے جاتی رہتی اور اپنے حسن رفتہ اور شباب گذشتہ کو واپس لانے کے لئے کسی طرح کے اخراجات کو غیر معمولی تصور نہ کرتی تھیں۔ اور میڈم ریشل خاک کی چٹکی میلا پانی اور ناکارہ وینزلین بیچ کر ہر سال لاکھوں کماتی اور گلچھڑے اڑاتی تھی ملک کے اندر ایسی عورتیں کم نہ تھیں جو حسن و شباب حاصل کرنے کے مکمل کورس کیلئے بڑی خوشی سے ایک ہزار گنی یا اس سے بھی زیادہ کا چک ہنسی خوشی لکھ دیتیں پس یہ معلوم کرنا موجب حیرت نہ ہوگا کہ کم سے کم اندازہ کے مطابق اس عورت کی ایک سال کی کمائی کسی حال میں بیس ہزار پونڈ سے کم نہ ہوتی تھی۔

لیکن اس عجیب حیرت انگیز داستان حقیقت کو آگے چلانے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ اس مکار و سحر ساز عورت یعنی حسن کے مندر کی اس پراسرار پجارن میڈم ریشل کی نسبت درج کر دیئے جائیں۔ کیونکہ اسی کو اس افسانہ حقیقت کے سٹیج پر سب سے بڑھ کر کام کرنا ہے۔ جب کا یہ ذکر ہے اس عورت کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی شکل بدصورت نفرت انگیز۔ بدن پھولا ہوا۔ خط و خال ناہموار ڈیل بے ہودہ۔ چہرہ کی رنگت گندمی اور آنکھوں کی چلت پھرت اس کی عیارانہ خو کا پتہ دیتی تھی۔ دہانہ کسی قدر چوڑا۔ ہونٹ موٹے اور اس کا لہجہ مصلحت وقت کے مطابق کبھی خوشامدانہ اور اوقات بعید میں انتہائی سخت گیرانہ بھی ہو جاتا تھا۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں جن عورتوں نے کسی زمانہ میں دوسروں کو خوبصورت بنانے کے دعوے کئے ہیں۔ ان میں کبھی کوئی عورت اتنی بدنما اور بدصورت نہ دیکھی گئی ہوگی جیسی یہ نام نہاد میڈم ریشل تھی۔ تعجب تو اس بات کو سوچکر ہوتا ہے کہ ان لاتعداد عورتوں میں سے جو اس کے زیر علاج آئیں اور جنہوں نے اس کے ہاتھوں تباہی مول لی کبھی کسی ایک کے دل میں بھی یہ خیال پیدا نہ ہوا کہ آخر یہ عورت جو حسن فروشی کے ایسے لمبے چوڑے دعوے کرتی ہے۔ اپنی چیزوں کی آزمائش خود اپنی ذات پر کیوں نہیں کرتی؟

شومی تقدیر سے دنیا کے ہر فرد بشر کا راز ہر دوسرے آدمی کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ ورنہ کوئی ذریعہ لوگوں کو باطن کے حالات جاننے کا حاصل ہوتا تو جن عورتوں نے میڈم کے ہاتھوں اپنا علاج کرایا وہ یقیناً سمجھ لیتیں کہ اس عورت کے اندر کوئی ایک خوبی برائے نام بھی ایسی نہیں ہے جو اسے اس کام کے اہل ثابت کر سکے جس کا وہ دعویٰ کیا کرتی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ اس نے حکمت پڑھی اور نہ طبابت سیکھی تھی نہ کسی نامور حکیم کی شاگردی میں زانو تہ کرنے کا اتفاق ہی اس کو ہوا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس کی عمر کا ابتدائی حصہ سخت افلاس میں بسر ہوا تھا۔ عنفوان شباب میں اس نے موسے (moses) نام کے ایک یہودی سے شادی کی لیکن اس کا یہ تعلق صرف چند ہی سال ناخوشگوار حالات میں قائم رہا جس کے بعد شوہر سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔ بیوگی کا مختصر عرصہ گذارنے کے بعد عورت نے اپنے لئے ایک نیا بر تلاش کیا جس کا نام فلپ لیورسن تھا۔

لیکن چونکہ چھوٹی عمر سے ہی اس عورت کی زبان قینچی کی طرح چلتی اور الفاظ تیز شعلہ ریز کی نہ ختم ہونے والی بوچھاڑ کیا کرتی تھی اس لئے وہ بھی جلد ہی اس کو چھوڑ کر کسی طرف کو غائب ہو گیا۔ میڈم ریشل نے اس کے بعد اپنی زندگی کا کچھ عرصہ سخت نکبت و افلاس کی حالت میں بسر کیا کبھی وہ مچھلی تل کر فروخت کیا کرتی۔ کبھی کسی شراب خانہ کے دروازہ پر بیٹھ کر ایک پینی فی سوال کے حساب سے لوگوں کی قسمت کا حال بتاتی تھی۔ لیکن وہ جو مشہور ہے کہ ہر

انسان کی زندگی میں خوش نصیبی کی ایک ایسی لہر آتی ہے کہ جو اس سے فائدہ اٹھانا جانتا ہو وہ ضرور کامیابی کی منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے، اس کے مطابق انہی ایام میں ایک بالکل ہی نیا اور انوکھا خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوا جس نے آگے چل کر اس کی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کرنا تھا۔ اس نئے خیال کے زیر اثر بڑے عرصہ تک اس نے بے حساب دولت کمائی اور شاہانہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کی تاہم انجام کار اسے اپنے آخری ایام ایک قید خانہ تاریک میں بسر کرنے پڑے اور وہیں اس نے سخت گمنامی اور ذلت کی حالت میں جان دی۔

واقعہ جس کا ہم ذکر کرنے بیٹھے تھے اسی طرح پیش آیا کہ میڈم ریشل تپ شدید میں مبتلا ہو گئی جب بیماری نے خطرناک صورت اختیار کی تو ہم نے اس کو ننگس کراس ہسپتال میں لے گئے بخار چونکہ تیز تھا اور وہ ہذیان کرنے لگی تھی، اس لئے ڈاکٹروں نے کسی مصلحت سے اس کے سر کے بال ترشوا دیئے۔ اس کے کچھ دن بعد جب میڈم کو ہوش آیا اور اسے اپنی محرومی کا حال معلوم ہوا تو بہت گھبرائی اور پریشان ہونے لگی، اُسے اپنے لمبے اور چمکیلے خوشنما بالوں پر ناز تھا اس لئے ان کے منڈ جانے پر اس کے دل کو بھاری صدمہ پہنچا ڈاکٹر نے جی بہلانے کو تسلی دی کہ تم ذرا صحت یاب ہو جاؤ پھر میں ایسی دوا دوں گا جس سے تمہارے بال نئے سرے سے نکلنے شروع ہو جائیں گے اور سابق کے مقابلہ میں زیادہ خوشنما ہوں گے۔ ڈاکٹر کی دوا فرضی تھی۔ قدرت نے خودبخود بالوں کو بکثرت پیدا کرنا شروع کر دیا اور عرصہ قلیل میں ہی سر کے بال اصلی حالت پر آ گئے اس وقت اس نے ڈاکٹر سے کہا کہ آپ اس دوا کا نسخہ مجھکو مرحمت کر دیں جو اپنے اندر اتنی عجیب تاثیر رکھتی ہے۔

خدا معلوم ڈاکٹر نے کوئی نسخہ لکھ کر دیا یا نہیں دیا اور میڈم ریشل نے اس کی آزمائش کی یا نہیں کی یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں مختصر یہ کہ اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد اس نے سوچا کہ کیوں نہ ایسی ہی دوائیں فروخت کی جائیں جن کی بدولت عورت کی عام کمزوری طلب حسن سے فائدہ اٹھایا جا سکے؟ اپنی موجودہ طرز زندگی سے اس کو کوئی معقول منافع ہونے کی اُمید نہ تھی اس لئے جلدی ہی یہ خیال ذہن میں پختہ ہونے لگا کہ اس نئی ترکیب سے ضرور فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔

شروع میں اس نے شہر کے ایک غریب حصہ میں اس قسم کی دواؤں کی ایک چھوٹی سی دوکان کھول لی لیکن غریبوں سے کمائی کر کے کبھی کوئی شخص دولتمند نہیں بنا اس لئے جلد ہی میڈم ریشل کو خیال آیا کہ امیر طبقہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے دوکان شہر کے ایسے حصے میں کھولی جائے جہاں امیروں کی آمد و رفت ہو اور ان کی توجہ اس کے اشتہار پر آسانی سے پڑ سکے چنانچہ جو تھوڑا بہت اثاثہ پاس تھا اس کی مدد سے اس نے لندن کے حصہ ویسٹ اینڈ میں بونڈ سٹریٹ کے اندر وہ دوکان لی جہاں اس کی زندگی کی کایا پلٹ ہونی تھی، اس جگہ رہ کر اس نے اپنا مکڑی کا سا جال اس خوبی سے پھیلایا کہ عرصہ قلیل کے اندر ہی بڑی بڑی امیر لڑکیاں اور خاندانی بیگمات جن کی انگلیوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں اور ہاتھوں میں نوٹوں سے بھرے ہوئے بٹوے ہوا کرتے تھے اس کے پاس آنی شروع ہو گئیں۔

(۴)

ان عورتوں میں سے بعض کو جلد ہی ہی اس تلخ حقیقت سے دوچار ہونا پڑا کہ میڈم ریشل کی شخصیت ایک دورخی تصویر ہے یعنی جہاں وہ ضرورت اور مصلحت کے لئے خوشامد و تملق سے کام لینا جانتی ہے وہاں موقعہ آنے پر انتہا درجے کی سخت گیر اور بے رحم بھی ثابت ہو سکتی ہے امر واقعہ یہ ہے کہ جب تک سادہ لوح عورتیں اس کے مطالبات پورا کرتے ہوئے اس کی جیبیں روپوں اور چیکوں سے بھرتی چلی جاتیں وہ حُسن اخلاق کی مجسم تصویر بنی رہتی لیکن جونہی ان میں سے کوئی اس کی حرص و آز کی بھٹی میں ایندھن جھونکنا بند کرتی یا بھولے سے یہ کہہ بیٹھتی کہ تمہارے علاج سے مجھے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا یہ پرفن عورت اس طرح ناخن نکالتی کہ دیکھ کر دہشت ہوتی تھی۔

ایسا ہی ایک واقعہ ایک متوسط العمر بیوہ کو پیش آیا جو شریف خاندان سے تعلق رکھتی اور محدود سرمایہ کی مالک تھی جس وقت یہ عورت حصول حسن و شباب کی خاطر میڈم ریشل کے پاس گئی تو اس نے اپنے معمولی طریقہ پہ بڑے اخلاق کا برتاؤ کیا اور کہنے لگی میڈم اطمینان رکھئے میرے زیر علاج رہ کر آپ بہت جلد اپنے حسن رفتہ کو واپس لا سکیں گی لیکن میری فیس ایک ہزار گنی سے کم نہ ہوگی۔

بیوہ عورت اس حیرت انگیز مطالبہ کو سن کر گھبرا گئی اور کہنے لگی "میرے خدا ایک ہزار گنی! یہ تو غیر معمولی طور پر زیادہ ہے اور میری اپنی حالت ایسی ہے کہ میں اس کا ایک چوتھائی بھی مشکل سے آپ کو پیش کر سکتی ہوں۔

اس پر میڈم ریشل نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا! افسوس آپ میری فیس ادا کرنے کے ناقابل ہیں لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ایک ہزار گنی کی رقم اس عمل کے

مقابلہ میں جو مجھکو کرنا پڑیگا کچھ بھی نہیں فی الحقیقت میرا طریق کار اتنا مہنگا ہے کہ ایک ہزار لیکر بھی مجھے بچت نہ ہوگی، اس کے علاوہ آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ میں صرف ذی حیثیت خاندانی بیگمات کا ہی علاج کرتی ہوں کیونکہ وہی میرے عمل کے راز سے واقف ہونے کے بعد اس کو محفوظ رکھتی ہیں تاہم خیر نہیں آپ کو مایوس کرنا نہیں چاہتی اگر آپ ایک ہزار نہیں دے سکتیں تو چلیئے میں خاص رعایت کے طور پر صرف پانسو گنی لے کر آپ کا علاج کردوں گی۔"

اس کے چند دن بعد غریب بیوہ عورت پانچسو گنی کی رقم لے کر جس کا بیشتر حصہ اس نے اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں سے قرض لیکر جمع کیا تھا، میڈم ریشل کے پاس گئی اس نے روپیہ گن کر رکھ لیا اور علاج شروع کیا کم وبیش ایک ماہ کے عرصہ تک اس عورت کو طرح طرح کے غسل دیئے گئے متفرق چیزیں مالش کے لئے دی جاتی رہیں گھنٹوں ہر روز غریب کو ایک اندھری کوٹھری میں بند رکھا جانے لگا لیکن ایک مہینہ کے بعد جب اس نے آئینہ لے کر اپنی صورت دیکھی تو کیا مجال اس میں ذرا سی اصلاح بھی پیدا ہوئی ہو بیوہ عورت کا دل اس کے سینہ میں بیٹھ گیا یہ سوچ کر ڈر گئی کہ اتنی بڑی رقم مفت میں برباد ہوگئی وہ اس نقصان عظیم کی متحمل نہ ہو سکتی تھی پس اس نے صاف لفظوں میں میڈم سے کہدیا، "مجھے آپ کے علاج سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہونے کی امید ہے آپ میرے حال پر کرم کرکے میرا روپیہ مجھ کو واپس دے دیں"

ان الفاظ کو سنکر میڈم کی حالت میں تغیر واقع ہوا۔ نتھنے پھول گئے غصہ سے چہرہ کی رنگت سرخ ہوگئی۔ قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے غریب عورت سے کہنے لگی تم اسی وقت میرے شفاخانہ سے نکل جاؤ اگر ایک منٹ بھی اس جگہ ٹھہروگی تو میں اپنے آدمیوں سے دھکے دیکر نکلوادوں گی تم کو شرم نہیں آتی میری دی ہوئی رعایت سے یوں ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو میں نے اول تو تمہارے حال پر رحم کر کے ہزار کے بدلے پانچسو گنی فیس لی۔ پھر لگاتار ایک مہینہ تمہارے علاج میں وقت ضائع کیا اور اب تم چپکے سے کہتی ہو کہ میرا دیا ہوا روپیہ واپس کردو۔ جو ایک ہزار کا خرچ مجھکو اٹھانا پڑا ہے اس کا معاوضہ کون دے گا؟

یہ کیفیت دیکھ کر عورت کو بھی غصہ آگیا کہنے لگی جو کچھ تم کہہ رہی ہو محض دھوکا ہے تم دھوکا باز عورت ہو اور تمہارا علاج محض فرضی ہے اگر تم فی الفور روپیہ مجھ کو واپس نہ دو گی تو میں عدالت میں تمہارے برخلاف چارہ جوئی کروں گی۔

چارہ جوئی کروگی تم!" میڈم نے از راہ غضب سے دانت پیستے ہوئے کہا "ہاں ضرور کرنا - میرے لئے اس سے بہتر ذریعہ اشتہار اور کیا ہوگا؟ تاہم ذرا سوچ لو اس کا انجام کیا ہوگا! جب تم یہ فریاد لے کر عدالت میں جاؤگی کہ میں خوبصورت بننے میڈم کے پاس گئی تھی لیکن مجھے اس کے علاج سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا تو دنیا تمہاری صورت دیکھ کر کیا کہے گی؟ لوگوں کے پیٹ میں یہ جان کر ہنستے ہنستے بل پڑ جائینگے کہ انگلستان میں ایسی بے وقوف بڈھی عورتیں موجود ہیں جو غایت درجہ بدصورت ہونے کے باوجود حسین بننے کے خواب دیکھتی ہیں اگر تم میرے علاج سے خوبصورت نہیں بنی ہو تو خطا میرے علاج کی نہیں بلکہ تمہاری اپنی کریہہ المنظر صورت کی ہے جس میں کوئی معجزہ ہی اصلاح کرسکتا ہے، اس لئے جاؤ میں خود صلاح دیتی ہوں ایک منٹ کی دیر نہ کرکے وکیل سے مشورہ کرو مزہ آجائے گا"

اور اتنا کہہ کر میڈم نے اس زور سے ہنسنا شروع کیا کہ بیچاری بیوہ عورت عرق ندامت میں غرق ہوگئی اور اپنا سا منہ لے کر میڈم کی جان کو روتی وہاں سے رخصت ہوگئی۔

میڈم ریشل کا اندازہ غلط ثابت نہ ہوا یعنی ستم رسیدہ بیوہ عورت کی طرف سے نہ کوئی چارہ جوئی ہوئی نہ اس کو جواب دہی کے لئے کسی عدالت میں حاضر ہونا پڑا یہ اپنی قسم کی ایک ہی مثال نہ تھی ایسی سینکڑوں عورتیں اس سے پہلے اپنی دولت میڈم کے حوالے کرکے مایوس جگر خستہ اس کی دکان سے رخصت ہوچکی تھیں لیکن سچ پوچھئے تو میڈم کی آمدنی کا یہی ایک ذریعہ نہ تھا وہ ساتھ ہی ساتھ استحصال بالجبر کیا کرتی تھی یعنی اگر کسی عورت کا شوہر حیات ہوتو وہ اسے یہ کہکر دھمکاتی کہ میں تمہاری بدصورتی کا راز اس کے سامنے افشا کئے دیتی ہوں ورنہ میری یہ ضرورت پوری کرو۔ یہی وجہ تھی کہ بہت سی عورتیں ایک مرتبہ اس کے دام فریب میں آنے کے بعد دوبارہ نجات حاصل کرنے کی کوئی راہ نہ دیکھ پاتی تھیں۔

اس قسم کا ایک موثر و قابل ذکر واقعہ ایک مالدار متوسط العمر خاتون کا ہے جو لندن کے اعلےٰ طبقہ سے تعلق رکھتی تھی لیکن جس کی خوبصورتی ایک لمبی بیماری کی وجہ سے زائل ہوگئی تھی شوہر کو اس حال پر بھی اس کے ساتھ گہری محبت تھی لیکن جیسا بیشتر مذکور ہوا ہے خوبصورت بننے کی دھن عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے اس نے سوچا اگر میں میڈم ریشل کے زیر علاج رہ کر پھر اپنے حسن گذشتہ کو واپس لا سکوں تو شوہر کے دل کو اس سے کتنی عظیم خوشی حاصل ہوگی۔ میڈم تو ہر وقت ایسے شکار کی تاک میں

رہا کرتی تھی جھٹ اس کی خدمت گذاری کو آمادہ ہوگئی اور ایک معقول فیس کے بدلے غسل اور غازہ کے استعمال کے بعض ایسے طریقے بتائے جن کی بنا پر وہ بہت جلد خوبصورت بننے کی امید رکھ سکتی تھی عورت بیچاری ان طریقوں پر عمل کرنے کو آمادہ ہوگئی لیکن میڈم کی تیز عقابی آنکھ نے جلدی ہی معلوم کر لیا کہ عورت مالدار ہے اس کے ہاتھوں میں الماس کے نگینہ کی بہت سی انگوٹھیاں تھیں جن کی مالیت مجموعی طور پر کئی ہزار بلکہ لاکھ کے قریب پونڈ سے کم نہ ہو سکتی تھی ان کو دیکھ کر میڈم ریشل کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ ان انگوٹھیوں پر جلد از جلد قبضہ کر کے چھوڑوں گی۔ چنانچہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ جب وہ خاتون غسل کرنے بند کمرہ میں گئی تو اپنی انگوٹھیاں اتار کے ایک میز پر رکھ گئی واپس آئی تو سب غائب تھیں۔ بہت گھبرائی اور دہشت اور پریشانی کے عالم میں گھنٹی بجائی پھر جب میڈم آواز سن کر اس جگہ آئی تو کہنے لگی میرے ہاتھوں کی سب انگوٹھیاں غائب ہوگئیں۔ میرا دل کہتا ہے کسی نے ان کو چرایا ہے۔ اور اس کے بعد میڈم کے اپنے چہرہ پر آثار خجالت دیکھ کر اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ "میں خیال کرتی ہوں تمہیں نے یہ کام کیا ہے!"

الفاظ کا منہ سے نکلنا تھا کہ میڈم بھڑک اٹھی چیختی ہوئی آواز سے کہنے لگی تم مجھے چور کہنے والی کون ہوتی ہو! تم نے یہ الفاظ کہہ کر میری سخت توہین کی ہے اور میں ضرور تمہیں اس گستاخی کا مزہ دکھاؤں گی۔ تم اپنے شوہر سے چھپ کر اس جگہ آیا کرتی تھیں۔ اب دیکھو میں اس کو بتاتی ہوں کہ اس جگہ تمہاری آمد ایک چاہنے والے سے خفیہ ملاقات کے سلسلہ میں ہوا کرتی تھی۔ جس وقت اس کا حال تمہارے شوہر کو معلوم ہوگا تو پھر تم کو بھی اس درشت کلامی کا مزہ آ جائے گا بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور میں حکم دیتی ہوں۔ اسی وقت میرے مکان سے نکل جاؤ اور کبھی اپنی مکروہ صورت مجھ کو نہ دکھانا بیچاری اپنا سا منہ لیکر وہاں سے رخصت ہوگئی اور پھر اس کی دکان کا رخ نہ کیا۔

ایک اور رنجدہ واقعہ ادھیڑ عمر کی ایک کنواری عورت مس ریس نیارڈ کا ہے جس کی جوانی مدت گذری ڈھل چکی تھی اور جس کے چہرہ پر خوبصورتی یا خوشنمائی کا نشان تک باقی نہ رہا تھا لیکن میڈم ریشل نے بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ اس سے بھی وعدہ کر لیا۔ کہ بہت جلد تم کو سرتاج حسینان عالم بنا کے دکھا دوں گی۔ عورت تھی سادہ لوح۔ میڈم کے دام فریب میں آگئی اور چند مہینے اس کے زیر علاج رہی جہاں تک مس نیارڈ کی خوبصورتی کا تعلق ہے۔ اس کے چہرہ پر خفیف سی تبدیلی بھی نمایاں نہ ہوئی تھی لیکن میڈم نے ہر وقت یہ کہہ کر اس کو بنانا شروع کر دیا کہ اب تو تم چندے ماہتاب چندے آفتاب نظر آتی ہو۔ ایک نہایت امیر خاندان کا نوجوان میرے یہاں اکثر آتا جاتا ہے اور وہ تمہیں دیکھ کر غائبانہ تم پر فریفتہ بھی ہو چکا ہے غرض اسی طرح چکنی چپڑی باتیں بنا کر اس نے ایک روز ایک نوجوان کو جس نے بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا مس نیارڈ سے لا کر ملا دیا اور کہا "آپ کا نام آنریبل جارج سلوسٹر ہے" دونوں میں عشق و محبت کے پینگ بڑھنے لگے حتےٰ کہ عرصہ قلیل میں ہی مس نیارڈ کی اس سے شادی ہوگئی اور وہ یہ سوچ کر مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی تھی کہ آنریبل مسز سلوسٹر بن گئی ہوں لیکن اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی کیونکہ ماہ عسل کے دوران میں ہی نامنہاد آنریبل جارج سلوسٹر بدنصیب عورت کے پچاس پونڈ جو اس کی ساری ملکیت تھے لے کر گم پتہ ہو گیا غریب کی ذلت یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ جلدی ہی اس کو معلوم ہو گیا کہ جسے آنریبل جارج سلوسٹر کا شاندار نام دے کر اس کے پاندھے لگایا تھا وہ درحقیقت گھوڑدوڑ کا ایک ادنیٰ دلال ہے جس کا عہد ماضی شرمناک حالات میں گذر رہا ہے اور پولیس مدت سے اس کے پیچھے لگی پھرتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ میڈم ریشل نے اسے پانچ پونڈ رشوت دے کر اس کام کے لئے آمادہ کیا تھا بیچاری مس نیارڈ چند مہینے بعد دل شکستہ ہو کر مر گئی لیکن گو میڈم ریشل نے اسی طریقہ پر بہت سی زندگیوں کو تباہ کیا تاہم خود وہ اپنی ناپاک کمائی کی بدولت روز بروز خوب موٹی تازی ہوتی چلی جاتی تھی وہ اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ لندن کے حصہ ویسٹ اینڈ میں ایک نہایت شاندار مکان کرایہ پر لے کر اس میں رہنے لگی۔ گھر میں گھوڑے گاڑی ہر قسم کا سامان عیش مہیا تھا اور جب وہ ہائیڈ پارک کی سیر کے لئے نکلتی تو وردی پوش نوکر اس کے ساتھ رہا کرتے۔ اس کے پاس ایسی قیمتی پوشاکیں اور ایسے بیش بہا زیور تھے کہ اگر کوئی ڈچس بھی دیکھ پاتی تو مارے رشک کے جل جاتی۔

لیکن دنیا کا دستور قدیم سے ایسا ہی چلا آیا ہے اسی طرح کی حالتوں میں قدرت بھی گویا مجرم اور گنہگار شخصوں کی امداد کے لئے آمادہ ہو جایا کرتی ہے۔

عین اس زمانہ میں جبکہ میڈم ریشل کے عروج کا ستارہ نصف النہار پر پہنچ چکا تھا ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک عورت جس سے پیشتر کبھی اس کی ملاقات نہ ہوئی تھی، اس کی دوکان پر

آئی۔ میڈم کی تیز بین آنکھوں نے فوراً معلوم کر لیا کہ اس سے نفع عظیم حاصل کیا جا سکے گا۔ اور اس خیال کے آنے سے اس کے چہرہ پر مسرت کی چمک پیدا ہو گئی۔ نو وارد تقریباً پچاس سال عمر کی ایک فیشن ایبل عورت تھی جس نے طرز جدید کی پوشاک پہن رکھی تھی اور جو حرکات و سکنات کے ذریعہ سے اپنے آپ کو ایک کمسن ناتجربہ کار لڑکی ظاہر کرتی تھی۔ الغرض کہنا پڑتا ہے کہ بدنی ساخت کے اعتبار سے اس میں کوئی عیب بھی نہ تھا صرف اس کے چہرہ پر بڑھاپے کی جھریاں اور لکیریں پائی جاتی تھیں۔ اور گو اس نے بالوں کو خضاب کر رکھا تھا اور چہرہ پر بھی غازہ اور سفوف کی بڑی مقدار تھپی ہوئی تھی۔ تاہم ان باتوں سے اس کے سن و سال کی حقیقت چھپائے نہ چھپ سکتی تھی۔ لیکن عمر میں پچاس سال ہونے کے باوجود اس کا لب و لہجہ انداز گفتار اور ساری باتیں کسی زیر تعلیم یافتہ لڑکی سے ملتی جلتی تھیں۔ میڈم رلیش نے باتوں باتوں میں معلوم کیا کہ وہ کسی فوجی کرنیل کی بیوہ ہے مسز لوبرا ڈیل اس کا نام تھا۔ اس کا شوہر ہندوستانی فوج میں کام کرتا تھا اور اپنے انتقال پر کافی بڑی دولت اس کے نام چھوڑ گیا تھا۔ دوران گفتگو میں مسز لوبرا ڈیل نے جو بات بات پر کھلکھلا کر ہنستی تھی میڈم کو بتایا کہ دولت جو میرے شوہر نے چھوڑی ہے وہ کسی فضول خرچی کی متحمل نہیں ہو سکتی تاہم آسودگی کے گذارے کے لئے کافی ہے۔

میڈم نے عرصہ قلیل میں ہی اندازہ کر لیا کہ شکار حسب مطلب ہے اور اگر کرنیل صاحب کی چھوڑی ہوئی دولت میرے قبضہ میں آ گئی تو تصور میرا اپنا ہو گا۔

چنانچہ جیسا اس کی عادت تھی بہت میٹھا لہجہ اختیار کر کے کہنے لگی "اتنا میں بڑی آسانی کے ساتھ دیکھ سکتی ہوں کہ آپ کسی زمانہ میں حسینان عالم کا سرتاج تھیں لیکن ہندوستان کی آب و ہوا نے عین دل کی چمک زائل کر دی ہے تاہم کوئی بات نہیں مجھے وہ ترکیبیں یاد ہیں کہ چند ہفتوں کے عرصہ میں آپ کے کھوئے ہوئے حسن کو از سر نو واپس لا کر دکھا دوں گی اور لوگ یہ سوچ کر دنگ ہو جایا کریں گے کیا یہ درحقیقت وہی مسز لوبرا ڈیل ہیں" "اوہ کیا سچ مچ آپ کا یہ خیال ہے" بیوہ عورت نے خوشی سے بے قابو ہو کر کہا۔ "اس میں شک نہیں میں اپنے زمانہ میں غیر معمولی خوبصورت سمجھی جاتی تھی اور ہندوستان میں جتنی میری سہیلیاں تھیں سب میرے حسن پر رشک کھاتی تھیں تاہم اب خدا کو ہی بہتر معلوم ہے کہ میری کھوئی جوانی پھر واپس آ سکتی ہے یا نہیں اگر واقعی آپ نے ایسا کر دیا تو بڑے ہی اچنبھے کی بات ہو گی۔" لیکن اس نے ساتھ ہی ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا "مجھ کو اندیشہ ہے کہ آپ کا عمل غیر معمولی مہنگا ثابت ہو گا"

"ہاں اس میں تو شک نہیں کہ میری فیس علاج کے لئے ایک ہزار گنی مقرر ہے" میڈم نے جواب دیا۔ لیکن ساتھ ہی مسکراتے ہوئے کہا "آپ اس کے بارہ میں فکر مند نہ ہوں انتہائی رعائت کے طور پر میں آپ سے ایک سو پونڈ صرف اس شرط پر لینا منظور کر سکتی ہوں کہ آپ اس کا ذکر کسی دوسرے سے نہ کریں میرے لئے یہ جاننا کیا کم موجب مسرت ہو گا کہ میں نے اپنے علاج سے حسن کی ملکہ اور دلوں کی فاتح کو پھر ایک بار اس کی اصلی حالت پر پہنچا دیا"

اچانک بیوہ عورت کی آنکھوں میں مسرت اور غرور کی چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے ہر ممکن طریقہ پر شکریہ ادا کیا اور جب اس کے بعد رخصت ہوئی تو میڈم کو ایک سو پونڈ کا چیک لکھ کر دے گئی اور اس کے عوض اپنے ساتھ علاج کی چند نام نہاد چیزیں جو میڈم نے تجویز کی تھیں لے گئی۔ یہ بیان کرنا بے محل ہے کہ جس وقت وہ میڈم رلیش کی دوکان سے رخصت ہو کر بازار میں چلی جا رہی تھی تو خوش آئندہ مستقبل کے خواب اس کی نظروں کے سامنے پھر رہے تھے وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی کہ میں واقعہ میں دنیا کی سب سے حسین عورت بن گئی ہوں۔ اور سپرنگ کے رنگین نوجوان شمع سوزاں کے گرد پروانوں کی مانند میرے آس پاس پھر رہے ہیں۔ یہ اور ایسے ہی صدہا خیالات اس کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی جب خوشخبری کا عالم ات میڈم رلیش کی زبانی معلوم ہوتا تھا اس کا خیال پہلے سے بھی اس کے دل میں پیدا نہ ہوا تھا۔

یہ بیان کرنا حاصل ہو گا کہ ہر قسم کے معالجات کے باوجود مسز لوبرا ڈیل کی صورت میں کوئی اصلاحی تغیر پیدا نہ ہوا۔ کیونکہ میڈم رلیش نے حسن افروزی کے جس قدر مصالحے تیار کر رکھے تھے وہ سب کے سب فرضی اور بے حقیقت تھے تو بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسز لوبرا ڈیل کو اپنی حالت میں کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر کسی طرح کا رنج نہیں ہوا کیونکہ میڈم نے شروع سے ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ آپ کی حالت میں ابتداء میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئے گی لیکن بعد ازاں یکایک انقلابی تغیرات پیدا ہونے لگیں گے۔ مسز لوبرا ڈیل ایک احمق عورت تھی اسے میڈم رلیش کی باتوں کا یقین تھا اور وہ کسی طرح کے اضطراب کو دل میں لائے بغیر علاج کا کورس پورا کرنے لگی انہی دنوں میں ناگاہ ایک دن میڈم نے ایک ایسی چال

اس کے کانوں تک پہنچائی جس نے صحیح معنوں میں مسز لوبراڈیل کے دماغ کو خوشی کے فلک ہفتم پر پہنچا دیا۔

دوران گفتگو میں میڈم نے رازدارانہ طریق پر اُس سے کہا "پیاری مسز لوبراڈیل میں ایک بڑی حیرت انگیز خبر آپ کو سناتی ہوں شاید آپ کو اس کی صداقت کا یقین آئے یا نہ آئے، لیکن واقعہ میں بات سولہ آنے درست ہے پچھلی مرتبہ جب آپ میری دوکان سے رخصت ہوئیں تو اس کے فوراً بعد ایک خوش قد خوش اخلاق نامی امیر جو انگلستان کے متمول گھرانے سے تعلق رکھتا ہے میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "جو خاتون ابھی گئی ہے اس نے میرے دل کے صبر و قرار کو ہمیشہ کے لئے چھین لیا اور اب میرے جی کو تب تک چین نہ آئے گا۔ حتیٰ کہ میری شادی اُس سے ہو جائے" سچ کہتی ہوں یہ شخص آپ پر اس قدر مفتون ہے کہ آپ کے منہ سے ہاں کے لفظ نکلنے کی دیر ہے وہ فی الفور آپ سے شادی کرے گا۔ مگر آپ خوب سمجھ سکتی ہیں کہ اس عظیم الشان گھرانے میں داخل ہونے سے پہلے جس سے شادی کرنے کے بعد آپ کی وابستگی ہونے والی ہے لازم ہے کہ حسن شباب کی ساری خوبیاں آپ کے اندر پیدا ہو جائیں اسلئے چند روز صبر کیجیے۔ فی الحال میں اتنا ہی آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ وہ رئیس اعظم جو آپ سے شادی کا آرزو مند ہے نامی گرامی امیر لارڈ رنیلے کے سوا کوئی اور نہیں "

"کیا کہا آپ نے لارڈ رنیلے!" بیوہ عورت کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کی آنکھیں حیرت اور بے اعتباری سے چوڑی ہوگئیں آپ کہتی ہیں لارڈ رنیلے! لیکن میرا جی نہیں مانتا میں آج تک اُن کی صورت نہیں دیکھی اور نہ جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ ان ہی کو کبھی مجھ سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے؟ اب میں کس طرح آپ کو سمجھاؤں"

میڈم رنیلی نے مسکراتے ہوئے کہا "بات کچھ ایسی ہی ہے، خیر اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کو بتاتی ہوں، مردوں کی کمزوریاں مشہور ہیں اور لارڈ رنیلے کو حسین عورتوں کی دید سے ایک خاص دلبستگی ہے۔ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ ایک روز جس وقت آپ کمرہ میں غسل کر رہی تھیں تو لارڈ رنیلے نے ایک شگاف کی راہ سے آپ کو برہنہ دیکھ لیا مجھے قطعاً معلوم نہ تھا کہ کوئی اس طرح

کی مذ اس کمرہ میں موجود ہے، لیکن اب لارڈ موصوف کی زبانی معلوم ہونے پر میں نے دیکھا کہ واقعی ہے، بس وہ ایک ہی نظر دیکھ کر سوجان سے آپ کا فدائی ہو چکا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے شادی کروں گا تو اس سے ورنہ نہیں!"

"اوئی سچ مچ لارڈ رینیلے نے مجھکو تکا دیکھ لیا ہے" بیوہ عورت نے دل ہی دل میں فرط مسرت سے پھولے نہ سماکر اظہار داری کی غرض سے پرحجاب طریقہ پر دونو ہاتھوں سے منہ کو چھپاتے ہوئے کہا "اب بھلا آپ ہی کہئے میں کیونکر اُنسے چار آنکھیں کر سکوں گی. لیکن..."

وہ پھر رکتے ہوئے بولی "میرا جی اب تک نہیں مانتا کہ لارڈ رینیلے ایسا امیر میری ناچیز ہستی کو اتنی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔ جہاں تک میں نے سنا ہے ان کی لندن کے ویسٹ اینڈ کی سوسائٹی میں ہر جگہ دھوم ہے وہ اگر چاہے تو کسی نہایت اعلیٰ خاندان کی عورت سے بآسانی شادی کر سکتا ہے کیونکہ گو اب اس کی جوانی کا عالم نہیں ہے تو بھی کافی شکیل ہے اور اس کے علاوہ نہایت با اخلاق آدمی ہے ایک ایسے مرد امیر کو اچھی سے اچھی بیویاں منہ مانگی مل سکتی ہیں"۔

"خیر تو وہ فی الحال آپ ہی کو مانگتا ہے اور اگر آپ کو انکار نہ ہو تو جلد از جلد آپ سے شادی کرنے کو بے تاب ہے بلکہ وہ کئی مرتبہ مجھ سے اس بات کی درخواست کر چکا ہے کہ آپ سے ملاقات کا ذریعہ پیدا کروں لیکن میں اس وقت تک ٹالتی رہی ہوں۔ بہر حال اب مجھ کو جلد از جلد اس کا انتظام کرنا پڑے گا"

غریب بیوہ عورت کو بھلا کیا انکار ہو سکتا تھا، اس نے وعدہ کیا کہ فی الحال تو میں اپنے آپ میں نہیں ہوں لیکن جیسے ہی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے میں لارڈ موصوف سے ضرور ملاقات کروں گی۔ برسبیل تذکرہ میڈم نے ہنستے ہوئے یہ بھی کہا کہ "اب جو تمہاری شادی ایک ایسے امیر سے ہونے لگی ہے تو تم کو چاہئیے کہ میری فیس بھی پوری ادا کر دو"۔ مسز بیراڈیل خوشی سے اس قدر مسرت تھی کہ فوراً اس کے لئے آمادہ ہو گئی اور میڈم کے ذرا سا زور دینے پر اس نے اسی وقت بقیہ نو سو پونڈ کا چیک لکھ کر اس کے حوالہ کر دیا۔

درحقیقت یہ رقم اس کی ساری پونجی کا ایک ۱/۵ حصہ تھی اور عام حالات میں وہ ہرگز اس سے دستبردار ہونا منظور نہ کرتی لیکن جو خوشخبری میڈم ریشل نے اس کو سنائی تھی اس نے کچھ اس طرح کی محویت اس پر طاری کی کہ وہ سوچنے لگی۔ لیڈی رینیلے بننے کی خاطر ایک ہزار کیا اگر پانچ ہزار پونڈ بھی صرف کرنے پڑیں تو کیا حقیقت ہے۔ جواہرات سے مرصع تاج امارت اسے اپنی آنکھوں کے سامنے رقص کرتا نظر آنے لگا۔ اور اس نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا کہ میں سوسائٹی میں ملکہ کا درجہ حاصل کر چکی ہوں میرے قائم کردہ فیشن کے طریقے ہر جگہ رائج ہوتے جاتے ہیں میرے حسن کی چار دانگ عالم میں دھوم ہے۔

لیکن یکایک ایک نیا خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوا اور اس نے تھوڑی دیر کے لئے بے چاری کی تمام خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ سوچنے لگی بالفرض لارڈ رینیلے کو میری نسبت کسی طرح کا مغالطہ ہوا ہو اور مجھے قریب سے دیکھ کر اس کو مایوسی ہو تو پھر کیا ہوگا؟ کاش میں اپنی بدصورتی کا علاج کچھ عرصہ پہلے شروع کر دیتی لیکن پھر اسے میڈم ریشل کے کئے ہوئے وعدوں کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ وہ وقت دور نہیں جب میری صورت میں دفعتاً انقلاب عظیم پیدا ہوگا اور اس کے بعد لارڈ رینیلے کو بھی میری ذات پر فخر و ناز ہونے لگے گا۔

غرض یہ احمقانہ خیالات رہ رہ کر بیوہ عورت کے سینہ میں ہیجان کرنے لگے، اس کے امن و سکون میں خلل آ گیا۔ اب ہر وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی میں ایک رومان عظیم شروع ہونے والا ہے خدا کرے اس کا انجام بخیر ہو۔

(۴)

ادھر لارڈ رینیلے کا حال سنئے، اس غریب کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ مسز بوراڈیل نام کی کوئی عورت دنیا جہان میں موجود بھی ہے یا نہیں فی الحقیقت وہ میڈم ریشل سے بھی کسی طرح کی گہری واقفیت نہ رکھتا تھا بجز اس اتفاق کے چند دن پیشتر اسے اس کی دوکان پر جانے کا موقع ملا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ بازار سے گذرتے ہوئے کوئی چیز خریدنے اس کی دوکان کے اندر گیا لیکن معلوم ہوتا ہے لارڈ رینیلے کی اس اتفاقیہ آمد نے ہی وہ گہری تجویز میڈم ریشل کے ذہن میں پیدا کی جو ایک طرف بدنصیب مسز بوراڈیل کو مفلس قلاش بنا کر تباہ و برباد کرنیکا ذریعہ بنتی تھی، لیکن دوسری جانب خود مسز ریشل کو بھی لے ڈوبی۔

اب سوال کسی طرح مسز بوراڈیل اور لارڈ رینیلے کی ملاقات کرانے کا تھا کیونکہ اسی طریقہ پر مسز بوراڈیل کا اطمینان ہو سکتا تھا آخر ایک دن اس کا موقع مل گیا، مسز بوراڈیل بونڈ سٹریٹ والی دوکان کے پچھلے کمرہ میں بیٹھی میڈم ریشل کی ایک بیٹی اور کسی دوسری خاتون کے ساتھ جو بغرض علاج آئی ہوئی تھی کچھ باتیں کر رہی

نفس کر دیکھا ایک دروازہ کھلا اور میڈم اندر آئی
بیوہ کے پاس جا کر اس نے دبی آواز
میں کہا دو اب تیار ہو جاؤ لارڈ رینیلے عنقریب
آئیں گے اور میں ان سے تمہارا تعارف کرا
دوں گی لیکن خبردار کسی طرح کی بے احتیاطی
نہ کرنا اگر کہیں ان کو معلوم ہو گیا کہ میں نے
تمہیں ان کے جوش محبت سے آگاہ کر دیا؟
تو سخت ناراض ہو جائیں گے قدرتی طور
پر مسز لورا ڈیل اس اطلاع کو پا کر بہت گھبرائی
وہ اسی حالت میں تھی کہ ایک لمحہ میں میڈم
رسیل ایک دراز قد امیرانہ وضع کے مرد شکیل
کے ساتھ داخل ہوئی اور اندر آتے ہی کہنے لگی
لارڈ رینیلے اجازت دیجئے میں آپ کا
تعارف مسز لورا ڈیل سے کرا دوں"
مسز لارڈ سٹپ نے سر کو ذرا سا خم کیا دونو
میں کچھ رسمی باتیں ہوئیں اور چند منٹ کے عرصہ
میں لارڈ رینیلے اسجگہ سے رخصت ہو گئے لیکن
امر واقعہ یہ ہے کہ نہ اس کو معلوم تھا کہ مسز لورا
ڈیل کون ہے نہ وہ اس گہری سازش سے ہی
واقف تھا جو میڈم رسیل نے اپنے دل میں سوچی
تھی اور جس میں لارڈ رینیلے کو نادانستہ ایک
نمایاں پارٹ لینا تھا۔

اس کے چلے جانے کے میڈم جب پھر اسی
کمرہ میں آئی تو مسکراتے ہوئے کہنے لگی بیٹھئے
وہ تو گئے لیکن سچ کہتی ہوں آج اتنے مسرور تھے
کہ بیان نہیں ہو سکتا جو جو میٹھی باتیں انہوں
نے آپ کی نسبت کہی اگر میں ان میں سے آدھی
بھی بیان کر دوں تو یقیناً تمہارے چہرہ پر شرم
کی سرخی چھا جائے لیکن چونکہ میں ان سے عہد
کر چکی ہوں اس لئے ان کے منہ سے نکلا ہوا
کوئی لفظ تم سے بیان نہ کروں گی اس کے علاوہ
وہ وقت دور نہیں جب وہ خود بھی اپنا حال
دل تم سے کہہ سکیں گے۔

میرا کہا مانو تو فی الحال ان سے دور رہنے کی
کوشش کرو۔ کیونکہ دوری سے آتش شوق ہمیشہ
بڑھتی ہے۔ اس کے علاوہ پیش از وقت تم
دونو کے ساتھ ساتھ رہنے سے لوگوں میں میگوئیاں
ہوں گی۔ اور لارڈ رینیلے ایسی باتوں کو پسند نہیں
کرتے۔ ہاں اس دوران میں تم دونو کے درمیان
خط و کتابت کا سلسلہ رہے گا لیکن لارڈ
رینیلے ازراہ احتیاط اپنی چٹھیوں پر "ولیم"
کے نام سے دستخط کیا کریں گے۔
بیوہ عورت کو اس بیان سے کچھ ایسی تو ہوئی
لیکن پھر اس نے سوچا اس میں بھی مزید کچھ
مصلحت ہوگی علاوہ بریں اس کو معلوم تھا کہ

لارڈ رینلے طبعاً پرحجاب واقع ہوئے ہیں اور ہرگز اس بات کو گوارا نہ کریں گے کہ لوگوں کو ان کے عشق کا حال معلوم ہے، پس انجام کار وہ اسی نتیجہ پہ پہنچی کہ فی الحال میڈم رشل کے کہنے کے مطابق احتیاط ہی کرنی چاہیئے جب ایک مرتبہ شادی کی رسم ادا ہوگئی تو پھر کسی بات کا کھٹکا نہ رہے گا کیونکہ اس میں تو کلام نہیں کہ وہ مجھ پر سو جان سے فریفتہ ہیں۔

اس دن کے بعد مسز بورا ڈیل کے نام بلا ناغہ چٹھیاں آنی شروع ہوگئیں جن کی نسبت اس کو یقین دلایا گیا کہ ہز لارڈ شپ کی بھیجی ہوئی ہیں۔ گو ان میں سے ہر ایک کے نیچے دستخط کے مقام پر "ڈ ولیم" کا لفظ لکھا ہوتا تھا۔ بہرحال ان کا مضمون عاشقانہ رنگ لئے اور بیان نہایت عجیب و دلکش ہوتا تھا ان میں سے ایک چٹھی بطور نمونہ درج کی جاتی ہے:-

"جان سے پیاری میری۔ دو تحفے ایک عطردان اور دوسرا منسل کیس۔ جو میں نے تمہیں بھیجے وہ درحقیقت میری مادر مرحوم کی چھوڑی ہوئی یادگار ہیں۔ ان کی قیمت چاہے کچھ نہ ہو لیکن میری نظروں میں ان کی اہمیت اس وجہ سے غیر معمولی ہے کہ جب والدہ مرنے لگیں تو دو چیزیں اس کے ہاتھ میں تھیں جب میرے والدین کی شادی ہوئی تو سب سے پہلی چیز جو والد نے تحفہ کے طور پہ ماں کو دی یہی تھی۔ تمہارے لئے جو تاج امارت بنادیا تھا وہ قریباً مکمل ہوچکا ہے اب کسی وقت "دادی" سے کہکر ملاقات کا انتظام کرنا کیونکہ ہمیں فرصت بہت ہی کم ہوتی ہے۔ میڈم کا ذکر آنے سے مجھکو یہ پوچھنے کا بھی خیال آیا ہے کہ وہ ادھر کچھ عرصہ سے کیوں اسقدر بگڑی ہوئی نظر آتی ہے؟ جان من ہمیں اس کو ہر حال میں خوش رکھنا چاہیئے کیونکہ اسی کے ذریعہ سے ہمارے سب انتظام مکمل ہونے ہیں وہ اگر بیچ میں نہ پڑتی تو میری ملاقات تم سے کیونکر ہوتی اور میں وہ خوشی کیسے حاصل کرتا جو میرے حصہ میں آئی ہے۔ بس چند روز صبر کرو اس کے بعد میں تمہارے خوشنما قدموں میں دو زانو بیٹھا ہوں گا ان قدموں میں جنکو میں بے حد پیار کرتا ہوں اور جن کی ایک ٹھوکر مار کر تم ایک بدنما بڈھے گدھے کو دور پھینک سکتی ہو زندگی بھر کیلئے

تمہارا صادق ڈ ولیم"

خط کا مضمون جیسا کہ ناظرین دیکھ سکتے ہیں کسی حد تک احمقانہ تھا اور وہ کم از کم لارڈ رینلے جیسی تربیت یافتہ امیر کے شایان شان نہ ہوسکتا لیکن اس عجیب حیرت انگیز مضمون کو پڑھ کر ہی بیوہ عورت کا دماغ زط مسرت سے عرش معلیٰ پہ جا پہنچا کتنی زبردست محبت اور گہری عقیدت لارڈ رینلے کو اس سے تھی۔ ایک ایسا شریف آدمی جو اپنی ماں کی اتنی عزت کرتا تھا لازمی طور پہ وہ اپنی بیوی سے بہترین سلوک کریگا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سمجھدار ہوتے ہوئے بھی مسز بورا ڈیل کو قطعاً خیال نہ آیا کہ ایسی تحریر لارڈ رینلے کی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ پھر اس کے علاوہ خط میں ہجوں کی بے شمار غلطیاں تھیں ایک قابل بات یہ تھی کہ خط کے نیچے ولیم کا نام درج تھا۔ حالانکہ لارڈ رینلے کا ذاتی نام ٹامس تھا لیکن جیسا مشہور ہے عشق جب کسی خانہ دماغ میں جاگزین ہوتا ہے تو عقل فوراً اپنی جگہ خالی کرکے رخصت ہوجاتی ہے

(۵)

ایک موقعہ پر مسز بورا ڈیل نے ان دو عجیب باتوں کا ذکر میڈم سے کیا تو میڈم کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور بولی "آپ ہرگز کسی وہم میں نہ پڑیں بات دراصل یہ ہے کہ کچھ دن گذرے لارڈ رینلے کو اتفاقاً ایک حادثہ پیش آیا تھا یعنی وہ چلتے چلتے گر پڑے اور ان کے داہنے بازو پر چوٹ آئی فی الحال وہ تمام چٹھیاں اپنے ذاتی نوکر سے لکھوا کر بھیجنے پر مجبور ہیں اور کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہے رہ گیا ناموں کا فرق تو اس میں شک نہیں ٹامس ان کا ذاتی نام ہے لیکن وہ اپنے حلقہ احباب میں ولیم کے نام سے ہی مشہور رہیں، کیونکہ ان کا شجرہ نسب "ولیم فاتح" سے ملتا ہے" ان جھوٹی باتوں سے غریب بیوہ کا اطمینان ہوگیا اور ہر قسم کے شکوک اس کے دل سے نکل گئے جیسا کہ بعد ازاں کمرہ عدالت میں ثابت ہوا یہ چٹھیاں مسز بورا ڈیل کے نام ڈاک کے ذریعہ سے نہ آتی تھیں بلکہ ریشل خود ہی نہیں لاکر دیتی تھی مسز بورا ڈیل کے دل میں کسی طرح کا شک وشبہ پیدا ہونا غیر ممکن تھا وہ جانتی تھی کہ میڈم لارڈ رینلے کی پیغامبر ہے اس لئے اس کے ذریعہ سے خط وکتابت ہوتی ہے۔ بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ یہ تمام چٹھیاں میڈم ریشل کے ایک تنخواہ دار چپڑاسی کی لکھی ہوئی ہوتی تھیں جس کا نام درحقیقت ولیم تھا اور میڈم خود ان چٹھیوں کا مضمون ہنستے اور قہقہہ لگاتے ہوئے بول کر اس سے لکھوایا کرتی تھی۔

ایک بار چڑیا کو دام فریب میں پوری طرح پھانس لینے کے بعد اب میڈم نے اسکے پر پرزے مکمل طور پہ کھسوٹنے شروع کئے اس نے اپنے دل میں طے کرلیا تھا کہ بیوہ عورت کے پاس آخری چھدام تک نہ چھوڑوں گی۔ چنانچہ ایک روز وہ مسز بورا ڈیل سے کہنے لگی اب چونکہ عنقریب آپ کی شادی ہونیوالی

ہے اور آپ ایک اعلیٰ خاندان کا رکن بنکر لیڈی رینیلے کہلائیں گی اس لئے ضروری ہے کہ آپ شادی کی تقریب پر اپنے لئے اچھے اچھے کپڑے سلوا کر تیار کرائیں چاہتی ہو تو میں بھی اس کام میں مدد دے سکوں گی۔ اور اس طریقہ پر اُمید ہے کفایت بھی بہت ہو جائے گی میں ایک تجربہ کار عورت ہوں اور مجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کونسی چیز کس طرح ارزاں خریدی جاسکتی ہے۔“ بیوہ عورت پھر بھی نہ سنبھلی اس نے الٹا ان تمام باتوں کی میڈم کی عنایت پر محمول کیا آئے دن وہ نئے نئے چک لکھ کر میڈم کو دیتی چلی جاتی تھی لیکن ان چکوں کے روپیہ سے جو سامان خریدا جانا تھا، اُسے دیکھنے کا موقعہ غریب مسز لوبراڈیل کو کبھی حاصل نہ ہوا چنانچہ

بعد ازاں کمرہ عدالت میں اس کو تسلیم کرنا پڑا کہ میڈم ریشل نے مجھ سے چار سو پونڈ کی رقم صرف لیس فیتہ خریدنے کے لئے لی تھی لیکن اس کا خریدا ہوا گز بھر کا ٹکڑا کبھی میرے دیکھنے میں نہ آیا۔

اس وقت تک میڈم ریشل اپنی گوناگوں چالبازیوں کے ذریعہ سے بدنصیب بیوہ عورت کی نصف کے قریب دولت پر قبضہ کر چکی تھی خود مسز لوبراڈیل نے عدالت میں جو بیان دیا اس میں اُسنے کہا تھا کہ اپنا سارا سرمایہ لٹا کر میں نے اس کے عوض جو کچھ حاصل کیا وہ صابن کی چند ٹکیاں کسی گاڑھی دوا کی چند شیشیاں یا چند سرمہ کا غسل تھا جو چیزیں میڈم نے میری شادی کے بہانہ سے خریدنے کا وعدہ کیا تھا ان میں سے چند ایک اپنے نام

گو سیرے دیکھنے میں آئیں لیکن باقیوں کا حال مجھے قطعاً معلوم نہیں۔

ادھر میڈم ریشل کی بیماری کا حال سنئے بیوہ عورت کا بے حساب روپیہ کپڑوں کی خرید کے بہانہ بصول کرنے کے لیے اب اس نے زیورات کا ذکر چھیڑا چنانچہ ایک دن مسز لوبرا ڈیل کو پاس بٹھا کر فکر آمیز لہجہ میں کہنے لگی ایک بات کا تو ہمیں ابتک خیال ہی نہیں آیا یعنی آپ کے زیورات کا اس میں شک نہیں انکی خرید یا تیاری پر بہت سا روپیہ صرف ہوگا لیکن جس صورت میں آپ کو ایک لارڈ کی خطاب دار بیگم بننا اور سوسائٹی میں لیڈر کا درجہ حاصل کرنا ہے تو لازمی طور پر چند بیش بہا جواہرات آپ کے پاس ہونے چاہئیں آپ اس کے متعلق غور کرلیں پھر میں ساتھ

سادہ لوح مسز بوراڈیل میڈم ریشل کی چکنی چپڑی باتوں پر کچھ اس طرح مفتون تھی کہ نیک و بد سوچے بغیر اُسکے لئے بھی آمادہ ہو گئی وہ میڈم ریشل کے ہمراہ لندن کے حصہ ویسٹ اینڈ کے ایک جوہری کی دوکان پر گئی اور اس جگہ سے چودہ سو پونڈ مالیت کے زیور خریدے جس کی قیمت مسز بوراڈیل نے نقد ادا کی لیکن میڈم نے یہ کہہ کر انہیں اپنے قبضہ میں لے لیا کہ میں انہیں اپنی الماری میں حفاظت کے ساتھ بند کرکے رکھ چھوڑوں گی۔ جب آپ لیڈی رینیلے کا مرتبہ حاصل کرنے کے بعد ان کو پہننا چاہیں تو میں انکو آپکے حوالہ کر دوں گی۔ یہ بیان کرنا لاحاصل ہے کہ مسز بوراڈیل کے دل میں بھولے سے بھی کوئی شبہ اپنی محسنہ کے برخلاف پیدا نہ ہُوا مزیداری کی بات یہ ہے کہ اس کے چند دن بعد میڈم ریشل وہ سارے زیورات لے کر پھر اُس جوہری کی دکان پر پہنچی اور حیلہ سازی کرتے ہوئے کہنے لگی کہ فی الحال ان کی ضرورت نہیں ہے جوہری نے تھوڑی سی کٹوتی وضع کرکے باقی ماندہ رقم کا چک اسکے حوالہ کر دیا اور یہ رقم بھی میڈم ریشل کے پیٹ میں سما گئی۔

اتفاق ایسا ہُوا کہ اس واپسی کی خبر کسی طرح سے مسز بوراڈیل کو بھی ہو گئی جب اُس نے از راہ تعجب اسکی وجہ پوچھی تو میڈم بڑے متین لہجہ میں کہنے لگی "میری عزیزہ مسز بوراڈیل آپ گھبرائیں نہیں میں ہر کام میں آپ ہی کا نفع مدنظر رکھتی ہوں مجھ کو خیال آیا تھا کہ جب اس خریداری کی اطلاع لارڈ رینیلے کو ہوگی تو خفا ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کے ہاں بے حساب خاندانی جواہرات پشت در پشت چلے آتے ہیں اور وہ لیڈی رینیلے کی حیثیت میں آپ ہی کے پاس آئیں گے بات ہرچند معمولی ہے لیکن میں ہرگز نہیں چاہتی کہ ہز لارڈشپ کو کسی بھی پہلو سے ناراضگی کا موقعہ دیا جائے۔"

اگر مسز بوراڈیل کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ چودہ سو پونڈ کی رقم جو میری گرہ سے نکلی ہے اس کا کیا بنے گا؟ تو اُس نے اس خیال کو میڈم کے روبرو بیان کرنا ضروری نہ سمجھا۔ یہ سوچ کر کہ تو اگونٹس بن گئی کہ شادی کے بعد پھر مجھے کسی چیز کی ضرورت نہ رہے گی۔

بعد ازاں جب معاملہ عدالت میں پیش ہوا تو مسز بوراڈیل نے دوران شہادت میں بیان کیا تھا کہ اس عورت نے بہت سا اور روپیہ بھی مجھ سے کئی ایک بہانوں سے وصول کیا۔ کسی دن کسی نئی پوشاک کا ذکر لیکر بیٹھ جاتی۔ کسی دن کسی اور چیز کا لیکن گو ان چیزوں کی قیمت مجھ سے وصول کی جاتی تھی تاہم خریداری کے بعد وہ کبھی میرے دیکھنے میں نہ آتی تھی۔ اگر میں کسی موقعہ پر پوچھ بیٹھتی کہ ان چیزوں کو کیا ہوا؟ تو میڈم ریشل عموماً یہ جواب دیتی کہ "وہ سب تمہارے ولیم کے پاس ہیں" ایک اور موقعہ پر میڈم ریشل مجھ کو بونڈ سٹریٹ کے ایک گاڑی بنانے والے کے پاس لے گئی اور کہنے لگی تم اپنی شادی کی تقریب کیلئے کوئی اچھی سی گاڑی پسند کر لو۔ تاکہ اس پر لارڈ رینیلے کا خاندانی نشان منقش کرا دیا جائے" میرے پاس اپنے مرحوم شوہر کے چھوڑے ہوئے بہت سے چاندی کے برتن تھے اس کے علاوہ میں نے بونڈ سٹریٹ میں چاندی کی ایک ٹی سروس خریدی تھی لیکن میڈم ریشل ان تمام چیزوں کو یہ کہتے ہوئے میرے ہاں سے اٹھوا کر لے گئی کہ یہ تمہارے شایان شان نہیں ہیں۔ اس طریقہ پر اس نے میری بہت سی انگوٹھیاں اور کئی ایک زیور بھی لے لئے میرے ہاں کئی خاندانی مہریں اور میرے شوہر کے چھوڑے ہوئے خطوط تھے ان پر بھی میڈم نے قبضہ کر لیا۔ ایک موقعہ پر وہ ایک سلگا ہوا سگار ہاتھ میں لیکر میرے پاس آئی اور کہنے لگی "لارڈ رنیلے اسکو پی رہے تھے انہوں نے تم کو دکھانے کے لئے بھیجا ہے کہ ان کی محبت اتنی ہی گرم ہے۔ جتنا اس سگار کا سرا۔ اس موقعہ پر کوئی آدمی دروازہ کے سامنے سے گذرا بھی اور مجھ کو بتایا گیا کہ یہی لارڈ رنیلے ہیں۔ لیکن میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ آدمی درحقیقت کون تھا۔"

(۶)

ناظرین خیال کرتے ہوں گے کہ ایک ستم رسیدہ بیوہ عورت کو اس حد تک لوٹنے کے بعد میڈم شکم سیر ہو گئی لیکن نہیں اس کے پیٹ کا گھڑا اتنا خالی تھا کہ اگر ساری دنیا کی دولت بھی اس میں سما جاتی تو پُر نہ ہوتا حسن و شباب کا علاج ہو چکا شادی کے کپڑے خریدے جا چکے۔ زیورات کا ڈھونگ بھی رچا گیا۔ اب ضرورت کوئی نیا ذریعہ حصول زر کا پیدا کرنے کی تھی۔ تو اس بارہ میں میڈم کا دماغ بہت عرصہ تک معطل نہیں رہا چنانچہ ایک دن وہ مسز بوراڈیل کو اپنے ہمراہ لے کر اس ونیر سکوئر کے ایک خالی مکان میں لے گئی اور دکھایا کہ یہ وہ عمارت ہے جو لارڈ رنیلے نے شادی کے بعد تمہارے رہنے کیلئے منتخب کی ہے۔ اب تم اس بات کا فیصلہ کرو کہ اسکی آرائش و زیبائش کس طریقہ پر ہو چند سو پونڈ کی بات ہے۔ امید ہے۔ تم کو بار نہ

ہوگی لیکن اس میں شک نہیں کہ تمہارے حسن انتخاب کو دیکھکر لارڈ رینیلے کا جی باغ باغ ہو جائے گا:

اب ایک طرف تو میڈم ریشل چند سو پونڈ کا تقاضا کرتی ہے اور ادھر بیوہ عورت کے پاس سب ملاکر ایک سو پونڈ بھی باقی نہیں رہے اُس وقت پہلی مرتبہ اس کے دل کو کچھ فکر و تشویش ہونے لگی کیونکہ اتنا روپیہ صرف کر دینے کے باوجود نہ لارڈ رینیلے سے اسکی کوئی بات چیت ہوئی نہ شادی کی صورت ہی بنتی نظر آئی لیکن میڈم کے تقاضے بے رحمی کے ساتھ جاری تھے۔ آخر کار وہی ہوا جو ایسی حالتوں میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ یعنی غریب عورت کو مجبوراً کہنا پڑا کہ اب میرے پلے تو کچھ بھی نہیں رہا۔ میں کہاں سے لاکر دوں؟ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو ایک روز مسز پوراڈیل کے نام اُس نام نہاد ولیم کا لکھا ہوا حسب ذیل مضمون کا ایک خط موصول ہوا:۔

"میری جان سے پیاری۔ کل میں اتفاق ریشل کے ہاں گیا تو دیکھا بڑا سا منہ بنائے بیٹھی ہے جان من سچ کہنا کیا تم سے اس کو کوئی کدورت ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ تم شادی کے بل ادا کرتے کرتے تھک گئی ہو میری سچ کہتا ہوں دنیا میں تم سے زیادہ محبت مجھے اپنی عمر میں کبھی کسی عورت کے ساتھ نہیں ہوئی اس لئے کیوں تم ایسی سنگدل بن کر میری آزمائش کرتی ہو؛

تمہارا صادق وفادار

ولیم

لیکن روپے کی ضرورتیں تو بہت سے ہی پوری ہو سکتی ہیں مسز پوراڈیل گو لارڈ رینیلے عرف ولیم کو کسی حال میں آزردہ کرنا نہ چاہتی تھی تاہم اس کے لئے روپیہ صرف کر کے اسکی خوشنودی حاصل کرنا بھی غیر ممکن تھا تنگ آکر اُس نے اپنے پیارے ولیم کے نام ایک خط لکھا جسکا مضمون یہ تھا کہ اگر شادی کا انتظام جلد از جلد مکمل نہ ہوا تو پھر مجبوراً مجھے اپنے رشتہ داروں سے مشورہ کرنا پڑے گا اس خط کے جواب میں نام نہاد ولیم نے ذیل کی پراسرار چٹھی تحریر کی:۔

"جان سے بڑھ کر پیاری میری۔ آج بڑھیا کی زبانی معلوم ہوا کہ تم سہ پہر کو سٹور میں مجھ سے ملوگی۔ میں کامل دو گھنٹے جارج سٹریٹ میں تمہاری راہ تکتا رہا لیکن تم نہ آئیں اب مجبور ہو کر لکھتا ہوں کہ اگر تم اپنے رشتہ داروں سے صلاح کرنے بیٹھوگی تو میں فوراً ہی انگلستان سے کسی طرف کو چلا جاؤں گا یہاں نہیں کہہ سکتا جارج سٹریٹ میں دو گھنٹے برستے پانی میں تمہارا انتظار کرنے سے مجھے کتنی کوفت ہوئی اب کل میں آل سولز کے گرجا میں تمہارا انتظار کروں گا اگر میں کسی دوسرے مرد کے ساتھ تم سے ملا تو اس کے سامنے آپس کی واقفیت ظاہر نہ کرنا۔ یوں اطمینان رکھو کہ میں ہر وقت تمہارے ہی نام کی سمرن کرتا ہوں؛

ہر وقت تمہارا

ولیم

حالات اب رفتہ رفتہ انتہائی صورت اختیار کر چکے تھے بیوہ عورت کل سرمایہ ختم ہو جانے کے باوجود اب تک اس بارہ میں بالکل لاعلم تھی کہ عاشق جانباز کسی دن اسکو عقد مناکحت میں لانے کا ارادہ رکھتا ہے اس نے کئی التجائی چٹھیاں اپنے زعم کے مطابق لارڈ رینیلے کے نام لکھیں جن میں اس بات کی درخواست کی گئی تھی کہ آپ میرے حال پر رحم کر کے اب مجھے سارے تفکرات سے آزاد کریں لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو مجبور ہو کر اُس نے حسب ذیل چٹھی تحریر کی:۔

"میرے پیارے ولیم میں ہر گھڑی تمہارے خط کی منتظر رہتی اور تمہاری دید کو ترستی ہوں میرے پاس جو کچھ بھی ہے سب تمہارا ہے اور تم جس طرح چاہو اس کو حاصل کر سکتے ہو میں نے بیشتر ایک موقعہ پر غلطی سے اپنے خط میں لکھا تھا کہ میری چٹھیاں مجھ کو واپس بھیج دو لیکن یہ فقط غلط فہمی کا نتیجہ تھا میں نے یہ خط صرف اس لئے لکھا تھا کہ تم نے مجھ سے روکھائی اور سرد مہری کا سلوک شروع کر دیا تھا حالانکہ میں اس کی مستوجب نہ تھی واقعہ یہ ہے میرے رشتہ داروں کو نہ میری ذات اور نہ میرے اثاثہ پر کسی طرح کا اختیار حاصل ہے شوہر نے جو کچھ میرے لئے چھوڑا ہے اسکی مختار کل ہوں اور جس طرح جی چاہے اُسے اپنے صرف میں لا سکتی ہوں کل نو بجے تک میں تمہاری راہ دیکھوں گی اور اگر تم پھر بھی نہ آئے تو مجبوراً شہر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ میرا خیال ہے اس سے تمہارے جی کو کچھ بھی رنج نہ ہوگا۔ لوگ حضرت ایوب کے صبر کا ذکر کرتے ہیں لیکن میرے صبر کے سامنے وہ بھی کچھ چیز نہیں ریشل کے ہاں میں صرف اس لئے نہیں جاتی کہ مجھے مسٹر بارکر کی طرف سے اندیشہ ہے کل ریشل نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہارے خلاف قرقی کا پروانہ لئے پھرتا ہے میں نے اس سے کچھ لیس خریدی تھی وہ بھی میں اُسے واپس دے رہی ہوں لیکن وہ لیتا نہیں؛

ادھر میڈم ریشل نے جب دیکھا کہ مرغ مذبوح کا آخری قطرہ خون نچوڑا جا چکا اور اب اس سے کسی مزید وصولی کی امید قطعاً باقی نہیں تو اُس نے اپنے نرم پنجوں کے اندر سے تیز

ناجن ڈکالنے شروع کئے۔ پہلے اُس نے بیوہ عورت کو دھمکایا اور جب وہ بھی مقابلہ کے لئے آمادہ ہوئی تو عہد شکنی کی بنا پر اُس کے خلاف وارنٹ گرفتاری حاصل کر کے اُسے دائٹ کر اس کے جیل خانہ میں ڈلوا دیا ۔ میڈم نے گو اپنی طرف سے دور اندیشی کی تھی لیکن اس کا یہ فعل خود اُس کے حق میں زبوں کار ثابت ہُوا۔ کیونکہ اس واقعہ کی اطلاع پاتے ہی مسز لوراڈیل کے دوست ملاقاتی اور سہیلیاں اسکی امداد کیلئے جمع ہو گئیں انہوں نے میڈم ریشل سے اس کے لین دین کی تحقیقات کی رفتہ رفتہ اصل حقیقت ظاہر ہونی شروع ہوئی اور سارہ ریشل لیورسن عرف میڈم ریشل کو اتنا لینے کے دینے پڑ گئے یعنی پولیس نے اسا دھوکا دے کر روپیہ وصول کرنے کے الزام میں زیر حراست کر لیا ۔

(۷)

لندن کی مشہور عدالت فوجداری جسے اولڈ بیلی کہتے ہیں۔ بہت سے تاریخی اہمیت رکھنے والے مقدمات کا مرکز بنی ہے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ سٹوارٹ بادشاہوں کے زمانہ میں میجر سٹرنگ۔ بیز قاتل اور کرنیل ٹرنر نقب زن اُن کے تاریخی مقدمات سے لیکر عہد حال کے گوناگوں مقدمات تک کبھی کسی قانونی واقعہ نے اتنی عظیم سنسنی پیدا نہ کی ہوگی۔ جتنی اس بانہ شریف کی ٹٹنی کے مقدمہ سے پھیلی۔ نہ صرف لندن کی حدود میں بلکہ سارے انگلستان کے طول و عرض میں ہر شخص کی زبان پر اس بدقماش عورت کی چالاکیوں اور سحر طرازیوں کا چرچا تھا اور اس کے حق میں ہر طرف سے لعنت اور ملامت کے الفاظ کسے جاتے تھے ۔

آخر کار جب مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو دیکھا گیا کہ اولڈ بیلی کا کمرہ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اعلےٰ طبقہ کی بیگمات سے لے کر عام بازاری آدمیوں تک ہر خیال ہر مزاج اور ہر درجہ کے زن و مرد اس مشہور بدنام میڈم ریشل کی صورت دیکھنے کو ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ جس کا ذکر انہوں نے پیشتر بار ہا سنا تھا لیکن جس کی شخصیت نے اس واقعہ کی بدولت خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔ وہ ان ستم رسیدہ عورتوں کی باتیں جنہوں نے بیشمار دولت اس کے ہاتھوں لٹائی تھی اپنے واقعات زندگی بیان ہوتے سننا چاہتے تھے۔ یہ فقرہ عام طور پر سُنا جاتا تھا کہ اس مقدمہ کا حال کسی ناٹک سے بھی زیادہ دلچسپ ہوگا اور اس میں کلام نہیں کہ جیسی عظیم سنسنی گاہ بگاہ اس مقدمہ کے ذریعہ سے پھیلی وہ کسی نہایت کامیاب ناٹک سے بھی بمشکل پھیلی ہوگی۔ انتہا یہ ہے کہ ہزاروں لوگ صرف اسلئے اندر نہ جا سکے کہ ہجوم کی کثرت کے باعث عدالت کو دروازے بند کر دینے پڑتے تھے۔ اور اس ناٹک کی ہیروئن ..... اس سنگین مقدمہ کی ملزم عورت میڈم ریشل کا کیا حال تھا جو اپنی لامحدود کمائی اور بے شمار دولت کے زعم میں وہ اس طرح لاپروا نظر آتی تھی گویا کسی الزام کی جوابدہی کے لئے نہیں بلکہ ایک تماشائی کی حیثیت میں آئی ہے۔ ملزموں کے کٹہرہ کی پشت پر اپنی جگہ پر بیٹھ کے پیچھے کی طرف جھکی ہوئی وہ مسکراتی نظروں اور گستاخانہ تبسم کے ساتھ چہروں کے اس سمندر پر گاہ بگاہ نظر ڈالتی تھی جو حد نگاہ تک اطراف میں پھیلا ہوا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میڈم کے دل پر کسی طرح کی فکر و تشویش قطعاً طاری نہ تھی۔ بلکہ وہ اس نظارہ کو مزے لے لے کر دیکھتی تھی۔ سچ مچ یہ کیفیت تھی گویا وہ کسی تھیٹر کے سٹیج پر کام کرتے ہوئے حاضرین سے اپنے حسن کارکردگی کی داد طلب کر رہی ہے۔ کبھی وہ اپنے بالمقابل کھڑکیوں کے سایہ میں بیٹھے ہوئے اراکین جیوری کی طرف دیکھتی کبھی دوربین لگا کر ان اہلکاران عدالت پر نظر ڈالتی جو اپنے سرکاری لباس میں اسکے خلاف شہادت قلمبند کرنے میں مشغول تھے۔ لارڈ رنیلے کو بھی (اسجگہ مراد اصلی رنیلے سے ہے۔ اس نام نہاد فرضی آدمی سے جو ہمیں تو ولیم کی آڑ میں پوشیدہ تھا) مسند عدالت پر بیٹھنے کیلئے جگہ دی گئی تھی اور وہ حقارت آمیز تبسم کے ساتھ اس نظارہ کو دیکھ رہا تھا ۔

یہ معلوم کرنا بہت مشکل نہ تھا کہ مقدمہ کے نتیجہ کے بارہ میں یا تو میڈم کے دل میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے یا وہ اس بات کی پروا نہیں کرتی کہ انجام کیا ہوگا۔ جس کٹہرہ میں اسکی نشست تھی اس سے ذرا نشیب پر انگلستان کے بہترین اور قوی ترین وکلائے فوجداری کی ہیبت ناک قطار سجی ہوئی نظر آتی تھی۔ ان میں سے چار جنکا سرگروہ ڈگبی سیمور تھا خود اسکی طرف سے پیروی کر رہے تھے اور تین ان سے بھی زیادہ ہیبت ناک مقنن یعنی مسٹر سارجنٹ بینٹائن جس کی نسبت مشہور تھا کہ کسی مقدمہ میں نہیں ہارا، مونٹیگو ولیمز اور ڈگلس سٹریٹ استغاثہ کی طرف سے پیروی کرنے کو حاضر تھے ۔ یکے بعد دیگرے جب مختلف گواہان مستغیث بیانات دینے کو آمادہ ہوتے۔ تو میڈم ان کے منہ سے نکلے ہوئے ہر ایک لفظ کو بڑے غور سے سنتی۔ جب کبھی حاضرین عدالت کسی بات پر قہقہہ مار کر ہنستے تو یہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتی اور اگر کسی موقعہ

کوئی گواہ اسکے خلاف کوئی بات کہتا تو قہر آلود نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگتی :۔

جب لارڈ رنیلے کو بغرض شہادت طلب کیا گیا تو اس نے فوراً یہ بات واضح کر دی کہ نہ مجھ کو مسز بوراڈیل کا حال معلوم ہے۔ نہ میڈم سے میری واقفیت۔ صرف ایک یا دو موقعوں پہ میں اسکی دکان پہ کوئی چیز خریدنے گیا تھا۔ اور مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ دوسرے موقعہ پہ اُس نے میرا تعارف رسمی طریق پہ ایک نہ جانی ہوئی عورت سے کرایا تھا گو مجھ کو یاد نہیں کہ اس تعارف کی مصلحت کیا تھی۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ عورت مسز بوراڈیل تھی یا کوئی اور۔ رہ گیا عشق و عاشقی کا سوال تو اسکا مجھے بھولے سے بھی خیال نہیں آیا۔ جب اسکو نام نہاد ولیم کی لکھی ہوئی بعض چٹھیاں دکھائی گئیں جو مسز بوراڈیل کے نام تحریر کی گئی تھیں تو اس نے پہلے تو [illegible] کہا کہ میں نے اس مضمون کی چٹھیاں کبھی نہیں لکھیں پھر ان میں سے ایک آدھ کو پڑھ کر کہنے لگا۔ "بھلا ایسی اوٹ پٹانگ تحریر کیا میرے قلم سے نکل سکتی ہے۔ ساری حکایت میری ذات کے متعلق سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔"

جب مسز بوراڈیل کو گواہوں کے کٹہرہ میں بلایا گیا تو وہ اپنی سادہ لوحی اور حماقت پر خود ہی شرمندہ سی ہوئی جاتی تھی۔ کٹہرہ میں کھڑی ہو کر نظریں فرش پر انداز کئے وہ کانپتی ہوئی آواز میں مختلف سوالوں کا جواب دیتی اور بعض موقعوں پر تو اسکی آواز بالکل ہی سنی نہ جا سکتی تھی جب عدالت نے اسکو گھونگھٹ اٹھانے کیلئے کہا تو وہ بڑی مشکل سے اس کیلئے آمادہ ہوئی۔ غریب کی پریشانی دیکھ کر میڈم ریشل کے مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے تھے لیکن

جب رفتہ رفتہ فریق استغاثہ نے اسکی زبانی سارے حالات کہلوائے جو میڈم کی گرفتاری میں آنے کے بعد پیش آ چکے تھے تو حاضرین پر سناٹا چھا گیا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ کسی ایک آدمی کے دل میں بھی میڈم کی بے گناہی کا یقین باقی نہیں رہا۔

جب اس سے ان چٹھیوں کے بارہ میں جرح کے سوالات پوچھے گئے جنکا آغاز "پیاری ڈیرولیم" سے ہوتا تھا اور جنکی نسبت بیان کیا گیا کہ لارڈ رنیلے کو مخاطب کر کے لکھی گئی تھیں تو غریب عورت نے کہا کہ یہ سب چٹھیاں میڈم ریشل نے خود بول کر لکھوائی تھیں اور وہی انہیں اپنے ساتھ لارڈ رنیلے کو پہنچانے کی غرض سے لے جاتی تھی۔ اس بیان کی تصدیق یوں بھی ہوتی کہ مسز بوراڈیل کی لکھی ہوئی ولیم کے نام کی چٹھیاں میڈم ریشل کی بیٹھک خانہ میں پڑی ہوئی پائی گئیں۔ تھا مگر ان میں سے ایک بھی مکتوب الیہ تک نہ گئی تھی۔ ایک اور عجیب بات اس وقعہ پہ یہ بھی ظاہر ہوئی کہ ولیم کی لکھی ہوئی چٹھیاں اور بیوہ کے تحریر کردہ جواب سب ایک ہی طرح کے کاغذ پہ لکھے گئے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ میڈم ہی ان کو لکھوانے اور بھجوانے کی ذمہ دار تھی۔

بیوہ عورت نے ولیم کے نام جو چٹھیاں تحریر کی تھیں ان میں سے بعض جب کمرہ عدالت میں پڑھ کر سنائی گئیں تو خوب قہقہہ اڑا۔ ایک کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"آپ کی بہن کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ جرابوں کی مرمت باقاعدہ ہوتی رہنی چاہئیے۔ کیوں نہیں وہ خود ہی آپ کی جرابوں کی مرمت کر دیتی اور آپ کی قمیضوں پہ بٹن لگاتی۔ دن بھر دوسری عورتوں کے ساتھ فضول گفتگو کرنے کے مقابلہ میں یہ کام بیٹھنا بہتر ہوگا۔ اگر وہ نہیں کر سکتی تو آپ اپنے مرمت طلب کپڑے میرے پاس بھیج دیں۔"

جس وقت اس خط کا مضمون عدالت میں پڑھ کر سنایا گیا تو ملزمہ میڈم ریشل کے وکیل مسٹر بیلی سیمور نے مسز بوراڈیل پہ جھپٹ ڈالتے ہوئے پوچھا "کیا تم سچ مچ یہ کہنا چاہتی ہو کہ ریشل نے خود بول کر اس مضمون کا خط لارڈ رنیلے کے نام لکھوایا تھا؟ کیا تم اتنا نہ سمجھ سکیں کہ ایک ایسے امیر کبیر کی جرابوں کی مرمت یا قمیض پر بٹن لگوانے یا پھٹے ہوئے کپڑوں کی اصلاح کا سوال بالکل ہی خارج از بحث ہے۔"

مسز بوراڈیل نے جواب دیا کہ "میڈم ریشل جس طرح مجھ سے لکھواتی تھیں اسی طرح کا خط لکھ دیا کرتی تھی"۔ مسٹر سیمور نے ولیم کے نام لکھا ہوا مسز بوراڈیل کا ایک اور خط پڑھا اس میں تحریر تھا :۔

"آپ کو نئے بوٹ درکار ہیں تو میں آپ کے ساتھ چلکر آکسفورڈ سٹریٹ سے ان کو لے دوں گی۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ آپ کی والدہ کی بنی ہوئی قمیضیں اس قدر جلد گھس گئی ہیں حالانکہ ابھی ڈیڑھ مہینہ گذرا آپ نے ان کو پہننا شروع کیا تھا۔ قہقہہ میرے خیال میں یہ سب دھوبی کا قصور ہے۔ مجھ کو معلوم ہے [illegible] سٹریٹ کے قریب [illegible] ایک آدمی رہتا ہے جو لوگوں کی مرمت [illegible] دیا کرتا ہے کیوں نہیں آپ اسکی خدمات حاصل کرتے ہیں۔"

خط کا مضمون پڑھ کر مسٹر سیمور نے مسز بوراڈیل سے کہا "دیکھو تم اس وقت حلفیہ بیان دے رہی ہو سچ سچ کہنا جب تم نے یہ چٹھیاں ایک ایسے آدمی کے نام لکھوائی تھیں جسکے پاس نہ پہننے کو قمیض تھی نہ [illegible] پہننے کو بٹن۔ نہ جرابیں تھیں۔ نہ بوٹ۔ نہ خالہ بہن کی قمیض تھی نہ میسٹر [illegible] تو کیا تم سچ مچ یہ

کرتی تھیں کہ اس طرح کا آدمی لارڈ رنیلے ہو سکتا ہے" جواب میں مسز پوراڈیل نے کہا "مجھ کو بتایا گیا تھا کہ اس کے پاس زر نقد کی بے حد کمی ہے"!

اس سوال و جواب سے ناظرین یقیناً معلوم کر چکے ہوں گے کہ میڈم ریشل نے اپنے وکیل کو صفائی کا یہ پہلو سمجھا دیا تھا کہ لارڈ رنیلے کا محض بہانہ تھا در حقیقت یہ عورت میرے چپراسی پہ ڈورے ڈالنا چاہتی تھی۔

بھری عدالت میں جرح کے سوالوں کا جواب دینا ہر حال میں سخت پریشان کن ہوتا ہے تاہم کہنا پڑتا ہے کہ جس طرح کے ذلت بخش ندامت افروز سوالات بدنصیب مسز پوراڈیل سے پوچھے گئے ایسے بہت کم کسی گواہ سے پوچھے گئے ہوں گے۔ ملزمہ کے وکیل کے ہر نئے سوال کے جواب میں جو کچھ وہ کہتی اس سے یہی پایا جاتا تھا کہ وہ ایک غایت درجہ سادہ لوح۔ کمزور دل اور بیوقوف عورت ہے اسکی تو خیر جو گت بنی وہ ظاہر ہے مگر ہاں جب بیان کے خاتمہ پر وہ رکتے ہوئے قدموں سے گواہوں کے کٹہرے سے باہر نکلی تو حاضرین عدالت کے دلوں میں یہ خیال پختگی کے ساتھ جاگزیں ہو چکا تھا کہ اس عورت کا بیان حرف بحرف صحیح ہے اور کچھ شک نہیں کہ ملزمہ میڈم ریشل نے نہایت شرمناک طریقہ پر اس کو دونو ہاتھوں سے لوٹا اور برباد کیا ہے۔

لیکن روپے کا نشہ بھی ایک چیز ہے ہر قسم کی زبردست شہادتوں کے باوجود میڈم ریشل کے تیوروں میں فرق نہ آیا۔ نہ اس کی گستاخ نگاہی کم ہوئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ چھیڑ منافی کے طور پر کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہ دیتی جس سے عدالت میں قہقہہ اڑنے لگتا چنانچہ اس قسم کا ایک موقعہ وہ تھا جب سرکاری وکیل نے دوران تقریر میں رائے زنی کرتے ہوئے کہا "وہ کوئی بڑی ہی بیوقوف عورت ہوگی جو حسن و شباب حاصل کرنے ایک ایسی عورت کے پاس گئی ہو جو خود اپنا علاج کرنا نہ جانتی تھی"۔ چوٹ زبردست تھی۔ لیکن میڈم ریشل کا جواب اس سے بھی بادہ زوردار ثابت ہوا کہنے لگی "اس کے متعلق اپنی گھر والی سے پوچھنا اس حساب سے وہ بیوقوفوں کا سرتاج سمجھی جائے گی" اس پہ عدالت میں بڑے زور کا قہقہہ اٹھا اور جج انتہائی کوشش کے باوجود بڑی دیر تک کمرہ عدالت میں خاموشی قائم نہ کر سکا۔

اپنے صفائی کے بیان میں میڈم ریشل نے ہر ایک الزام سے جو اس کے خلاف عاید کیا گیا تھا صاف انکار کیا اور کہنے لگی کہ لارڈ رنیلے کے مسز پوراڈیل سے شادی کرنے کا تو کیا ذکر ہے۔ میں نے کبھی لارڈ موصوف کا نام بھی اس عورت کے سامنے نہ لیا تھا۔ در حقیقت یہ سارا ڈھونگ اس نے صرف اپنی بدچلنیوں کو چھپانے کے لئے رچا ہے۔ چٹھیوں میں جس ولیم کا نام آتا ہے وہ ایک ادنےٰ حیثیت کا آدمی تھا اور مسز پوراڈیل اس سے عشق کرتے ہوئے خفیہ طور پہ میری دکان پر آکر ملتی تھی۔ اس کا روپیہ میرے پاس نہیں آیا۔ بلکہ اسکا لگتا ولیم ہی اپنے مطالبات پورا کرانے کو سب کچھ اس سے لے گیا۔ الٹا میرا بہت سا روپیہ اسی علاج کے سلسلہ میں جو وہ مجھ سے کرا تی رہی اس عورت کے ذمہ نکلتا ہے۔ میں نے اسکی ذات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر ممکن طریقہ پہ اس کی مالی مشکلات آسان کرنے میں مدد دی ہے۔ غور کر کے دیکھا جائے تو شیفتہ نہیں خود میں (میڈم ریشل) تباہ و برباد ہوئی ہوں۔ اور مجھ ہی کو شرمناک منصوبوں کا شکار بنایا گیا ہے"!

لیکن جب اس کے تھوڑی دیر بعد استغاثہ کا سرکردہ وکیل سارجنٹ بینٹائن تقریر کرنے کو اٹھا تو اس نے اپنے طنز اور فصاحت کے زور سے معاملہ کا رخ بالکل ہی پلٹ دیا فی الحقیقت ایسی زوردار تقریر جیسی اس موقعہ پر سارجنٹ بینٹائن نے کی بہت کم اولڈ بیلی کے کمرہ عدالت میں سُنی گئی ہوگی۔ اراکین جیوری کو مخاطب کر کے یہ جتانے کے بعد کہ اپنی ظاہری معصومیت کے باوجود یہ عورت (میڈم ریشل) غایت درجہ سنگدل بے رحم اور دھوکا باز ہے اس نے کہا "صاف دکھائی دیتا ہے۔ کہ وہ اس بات کا قصد مصمم کر چکی تھی کہ جب تک اس بدنصیب عورت (مسز پوراڈیل) کے تن پر ایک کپڑا یا جیب میں ایک جھنجی کوڑی بھی موجود ہے۔ یا اسکی طرف سے وصولی کی کوئی دور افتادہ امید ممکن ہو سکتی ہے اُس تک پہنچنے اور اسکا خون نچوڑنے سے دریغ نہ کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اسکا سب کچھ لوٹ کھسوٹ لینے کے بعد ظالم (میڈم ریشل) نے اس سے سولہ سو پونڈ کا پرونوٹ بھی لکھوا لیا جائے غور ہے کہ تین مہینے کے عرصہ قلیل میں اس نے پانچ ہزار تین سو پونڈ کی کثیر رقم دھوکا دہی سے وصول کی اور اسکی زبان بندی کیلئے وہ پرونوٹ آلہ تہدید کے طور پر اپنے پاس رکھا وہ یقیناً اس روپیہ کو بھی اس سے وصول کرتی اگر وصولی کی کوئی بعید تر صورت بھی ممکن ہوتی لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس بیچاری کے پاس اب تن کے کپڑوں کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ جو زر نقد یا حصول امر کے تمسکات اسکے پاس تھے وہ سب اس نام نہاد میڈم ریشل کے پیٹ میں جا چکے پھر اس پر کفایت نہ کر کے اس نے حلفیہ بیان دیکر

اس عورت کو جیل خانہ میں ڈلوایا اور اسکو تب چھٹکارا نصیب ہوا جب اس نے اپنے شوہر کی چھوڑی ہوئی پنشن ہمیشہ کیلئے اس عورت کے نام کر دی۔ جرم کی تاریخ میں بے رحمی۔ شرارت اور خبث باطن کی بہت سی مثالیں دیکھی گئی ہوں گی۔ لیکن اس طرح کی سیاہ کاری جیسی اس عورت نے کی ہے یقیناً عدیم النظیر سمجھی جائے گی؛

اپنی تقریر کے ایک اور حصہ میں فاضل وکیل نے میڈم ریشل کے اس دعوے کی تضحیک کی کہ وہ عورتوں کو حسین و جوان بنا سکتی ہے چنانچہ جس وقت کمرہ عدالت حاضرین کے قہقہوں سے گونج رہا تھا اس نے اس کے حسن افزا معالجات کی فہرست گنواتے ہوئے کہا "اس عورت کا دعوےٰ باطل دیکھئے ایک بے تاثیر رنگدار پانی ایک سو سے لیکر ہزار گنی تک قیمت پر یہ کہہ کر بیچا کرتی تھی کہ یہ حسن پیدا کرنے کا وہ مرکب ہے جو سلطان ٹرکی کی حرم سرا میں برتا جاتا ہے۔ وہ دریائے جورڈن کا پانی جو صبا رفتار سانڈنیوں پر لاد کر لایا جاتا تھا بیس گنی فی بوتل کے حساب سے فروخت کرتی تھی اس طرح حیناں سر کینیا کے غازے اور مقناطیسی محلول اور شبنم صحرا اور خدا جانے کیا کیا الا بلا سب گنیوں کے حساب سے بیچی جاتی تھیں؛

لیکن گو استغاثہ کے وکیل نے اپنی زور دار تقریر کے ذریعہ سے کمرہ عدالت میں سناٹا پیدا کر دیا تاہم معلوم ہوتا ہے۔ کہ میڈم ریشل کی تقدیر میں ابھی عروج کے کچھ دن اور باقی تھے کیونکہ ممبران جیوری نے پانچ گھنٹے غور کرنے کے بعد یہی فتوے صادر کیا کہ وہ بے قصور ہے جس پر میڈم ریشل ہنستے ہوئے کہنے لگی "کچھ شک نہیں کہ آپ لوگ پورے دانا ثابت ہوئے ہیں۔ اگر آپ اپنی بیویوں کو میری بونڈ سٹریٹ والی دکان پر بھیجیں تو میں ان سب کو خوبصورت بنا کر ثابت کر دوں گی کہ میرا دعویٰ حسن آفرینی باطل نہیں؛

لیکن گناہ کی کھیتی گو ایک آدھ مرتبہ سرسبز ہو تو ہو آخر کار یقینی طور پر تباہ ہوتی ہے چنانچہ اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۲ ستمبر ۱۸۶۸ء کو میڈم ریشل پر پھر ایک بار مقدمہ چلایا گیا۔ اب کی مرتبہ وہ قصوروار ثابت ہوئی اور اسے پانچ سال کالے پانی کی سزا دی گئی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ یہ عورت اپنی بناوٹی دلیری اور حوصلہ مندی کے باوجود کتنی بزدل ڈرپوک اور کم ہمت ہے۔ سزا کا حکم سنتے ہی اسکے چہرہ کی رنگت لاش کی مانند زرد پڑ گئی کمر میں خم آگیا بدن تھر تھر کانپنے لگا ایک پہرہ دار عورت کے بازو کا سہارا لیکر وہ بمشکل کٹہرہ سے باہر نکلی اور رخصت ہوتے ہوتے اسطرح کی قہر آلود نظروں سے عدالت کی طرف دیکھا گویا جج کو اپنی آتش نگاہی سے بھسم کر دینا چاہتی تھی لیکن مزیداری دیکھئے کہ یہ پانچ سال کا عرصہ بھی کسی نہ کسی طرح بیت گیا اور اس کے بعد وہ پھر اپنا مکڑی کا سا جالا تان کر نئے شکار پھانسنے کیلئے وہیں آکر بیٹھ گئی اسکی وجہ یہ کہ حسن کی تلاش عورت کی سب سے زبردست کمزوری ہے اور اس معاملہ میں عورت دوسروں کے تجربات سے ہرگز فائدہ اٹھانا پسند نہیں کرتی۔ لیکن اسکا یہ دور ثانی دیرپا ثابت نہ ہوا تھوڑا ہی عرصہ کے بعد پھر ایک مرتبہ اس پر مقدمہ چلایا گیا پھر اسے پانچ سال کالے پانی کی سزا ہوئی مگر اس مرتبہ وہ زندہ بچ کر نہ آئی اور وہیں گنہگاروں کی بستی میں اس کا انتقال ہوا؛

مستی و قلندری

(بقیہ صفحہ ۱۶)

گاندھی جی کی سالگرہ پر کھدر کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ ہمارے امراء و رؤساء کی سالگرہوں پر رنڈیوں اور بھانڈوں کی بن آتی ہے اور کہیں کہیں بعض استاد قسم کے خوش قسمت شاعروں کی بھی لیکن میرا خیال ہے سب سے دلچسپ قسم کی سالگرہ حاجی بلغراد کے ایک بڑے میاں نے، اپنی سویں سالگرہ کی خوشی میں اس پیر نابالغ نے ساٹھ برس کی ایک دوشیزہ سے گٹھ بندھن کر ڈالا۔ سو اور ساٹھ کے فرق سے میاں بیوی کے فرق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک بات اور بھی ہے جس سے آپ اس جوڑے کی عمروں کے فرق کو ناپ سکتے ہیں۔ جب دولھا صاحب آٹھ دس سال کے تھے تو دلہن صاحبہ کی والدہ ماجدہ کے ساتھ اسکول تشریف لے جایا کرتے تھے۔

ان جناب سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو اس عمر میں یہ کیا مستی و قلندری سوجھی تو فرمایا کہ میں اپنی سویں سالگرہ میں ایک جدت پیدا کرنی چاہتا تھا اور وہ جدت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی کہ میں اپنی شادی کر ڈالوں۔

مجبوری یہ ہے کہ بڑے میاں تک مدیر مستی و قلندری کی آواز نہیں پہنچ سکتی اور وہ مستی و قلندری کے قارئین میں سے نہیں ہیں ورنہ میں ان کو ڈبل مبارکباد دیتا۔ ایک ان کی اس دلچسپ سوجھ کی اور دوسرے ان کی شادی کی۔

ایک مغربی سائنسدان کی حیرت انگیز پیشینگوئیاں

ایک یوروپین مفکر اور محقق نے بعض ایسی پیشینگوئیاں کی ہیں جن کو پڑھنے کے بعد انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے اور زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے سہ محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائیگی
ان پیشینگوئیوں کے بعض دلچسپ ٹکڑے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اِنسان کو لافانی بنا دیا جائیگا

سائنس کی ارتقا کے بعد یہ چیز بالکل یقینی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جب انسان مرا نہیں کرے گا۔ بلکہ جب تک چاہیگا سائنس کے ذریعہ زندہ رہ سکے گا۔ آج بھی امریکہ اور جرمنی کے سائنسدان اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مُردہ انسانوں میں دوبارہ جان ڈال دیں لیکن ابھی وہ پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ گذشتہ دنوں ایک مردہ شخص کو تقریباً ایک دن رات زندہ کر کے رکھا گیا۔ اس مردنے لوگوں سے باتیں کیں لیکن ۲۴ گھنٹے کے بعد وہ پھر مرگیا۔

جب سائنس ایک مُردے کو ۲۴ گھنٹے زندہ رکھ سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اسے لامحدود عرصہ تک زندگی نہ دے سکے۔ دُنیا دیکھے گی جب ایک دور وہ بھی ہوگا کہ مردہ جسم میں جان ڈالی جاسکے گی اور انسان صدیوں تک زندہ رہا کرے گا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سائنس کے ذریعے انسان کو لامحدود زمانہ تک زندہ رہنے کی قدرت حاصل ہوگئی تو پھر اس دنیا میں نئے پیدا ہونے والوں کیلئے کیونکر گنجائش باقی رہے گی کیونکہ دست قدرت نے موت کی تخلیق اس لئے کی ہے تاکہ نئے پیدا ہونے والوں کیلئے گنجائش نکلتی رہے۔

غذا کی ضرورت ختم ہو جائیگی

موجودہ دور میں کوئی انسان بھی بغیر غذا کے زندہ نہیں رہ سکتا لیکن ایک زمانہ وہ بھی آئیگا جب انسان کو غذا کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ بس یہ کرنا ہوگا کہ ایک مقوی گولی صبح کو کھالی اور تمام دن کے لئے فارغ ہوگیا۔

سُنا ہے یوروپ کے ایک ڈاکٹر نے ایک دوا ایجاد کی تھی جس کے چند قطرے کئی سیر غذا کے برابر قوت پہنچا سکتے ہیں۔ اور اس دوا کے استعمال کے بعد مریض کو بھوک بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اس ایجاد سے ہم کو یقین ہوتا ہے کہ وہ زمانہ اب قریب ہے جب لوگ سیروں غذا نہیں کھایا کرینگے بلکہ ایک گولی یا چند قطروں سے سیروں غذا کا کام نکل جایا کرے گا۔

اِنسان سویا نہیں کریگا

انسان کے وقت کا بہت سا حصہ سونے میں برباد ہو جاتا ہے اور انسان کو سونا اسلئے پڑتا ہے کہ بغیر سوئے کوئی شخص اپنی صحت کو برقرار نہیں رکھ سکتا لیکن ایک دور وہ بھی آنے والا ہے جب انسان سویا نہیں کریگا بلکہ مشین کے ذریعہ اپنی تکان کو دور کر کے ایسا ہی چست ہو جایا کریگا جس طرح سات یا آٹھ گھنٹے سونے کے بعد انسان بالکل چست نظر آتا ہے۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ امریکہ کے ایک ماہر نے ایسے مریضوں کیلئے جن کو نیند نہیں آتی ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے کہ اس مشین پر بیٹھنے کے بعد مریض فوراً سو جاتے ہیں اور پندرہ منٹ سونے کے بعد ایسے ہی چست ہو جاتے ہیں گویا وہ تمام رات نہایت آرام کے ساتھ سوئے رہے ہوں۔

اس مشین کی ایجاد کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ آگے چل کر مستقل طور پر ایسی مشینیں نہ جائیں جو کہ نیند کا بدل ہو سکیں اور جن کے تیار ہونے کے بعد انسان کو سونے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

اِنسان پرندوں کیطرح پرواز کریگا

اگرچہ موجودہ عہد میں انسان ہوا، پانی اور زمین پر اپنا مکمل اقتدار قائم کر چکا ہے لیکن اب بھی یہ انسان کے قابو سے باہر کی بات ہے کہ وہ جہاں چاہے پرندوں کی طرح اُڑ کر چلا جائے۔ مگر وہ زمانہ بہت نزدیک ہے جب پرندوں کی طرح انسانوں کے بھی پر نکل آئیں گے۔ یہ پر سائنس کی ایک عجیب و غریب ایجاد ہونگے۔

حال ہی میں ایک سائنسدان نے اس قسم کے پر ایجاد کئے تھے مگر وہ پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ بغیر موٹر کے یا بجلی کے ڈائنمو کے حرکت دینے والے اس قسم کے پر بن جائیں جن سے

کایا پلٹ

بوڑھے نے تین شادیاں کیں

بوڑھے گوالے نے جب یوگیراج شری رتنا کر جی مہاراج کی دی ہوئی دوائی کی چھ خوراک ایک ہی دفعہ استعمال کر ڈالیں تو اُسکی جو حالت ہوئی۔ اسکا پورا حال بیان کرنیکی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ قصہ مختصر اس بوڑھے گوالے نے تین شادیاں کیں۔ اور ان شادیوں سے یکے بعد دیگرے جیتے جاگتے تندرست اور خوبصورت بچے حاصل کئے۔ یہ خبر آناً فاناً چاروں طرف پھیل گئی۔ تب مہاراجے نواب وغیرہ طرح طرح کی خوشامد کرکے اس نسخہ کو حاصل کرنیکی کوشش کرنے لگے۔ نواب بہادر ٹیونک کے ریذیڈنٹ حاجی حیات محمد کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ اور باباجی نے اس عجیب و غریب دوائی کا نسخہ انکو بتادیا۔ حاجی صاحب موصوف سے یہ نسخہ امرت دھارا کے موجد کوی ونود پنڈت ٹھاکر دت جی شرما کے ہاتھ لگا۔ جنہوں نے اپنے دو اور نسخوں کیساتھ اس نسخہ کو اپنے اخبار دیش اُپکارک میں شائع کرکے اس سے بہتر نسخہ بنانیوالے کو ایکہزار روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کو شائع ہوئے تقریباً سو سال گذر چکے ہیں لیکن آجتک کوئی بھی حکیم اس انعام کو حاصل کرنیکی جرأت نہ کرسکا۔ پھر متھرا کے مشہور و معروف وید ہربلاس نے اس نسخہ کو اپنی کتاب چکتسا چندرودے میں شائع کردیا جہاں سے لیکر ہم نے اسے تیار کرکے ہزاروں نامرد جریان احتلام وغیرہ کے مایوس مریضوں پر اسکی آزمائش کی۔ اسکے حیرت انگیز کرشمے کو دیکھکر خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ چند روز کے استعمال سے ان کے چہروں پر سرخی دوڑنے لگی جھوک حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی۔ اور چالیس روز کے مکمل استعمال سے گئے گذرے مریض قابل فخر مرد بنگئے۔ جو صاحب اس موذی مرض کی بدولت زندگی سے تنگ آگئے ہیں۔ اور دوائیوں سے جن کا اعتقاد بالکل اُٹھ چکا ہو۔ وہ مندرجہ ذیل نسخہ کو بناکر استعمال کریں۔ **اصل نسخہ حسب ذیل ہے:** رسکپور، ہرتال ورقی ۱-۱ تولہ، سنکھیا سفید خالص ایک تولہ، خالص کافور ۱ ماشہ ان سب چیزوں کو دو گھنٹہ تک گھیکوار کے گودے میں کھرل کرکے مٹی کے کوزے میں بند کرکے ۵ سیر اُپلوں کی آنچ میں پھونکیں۔ ٹھنڈا ہونے پر ایک تولہ ہرتال ورقی اور ۱ ماشہ کافور کیساتھ تیسری بار ایک تولہ گندھک آملہ سار اور ڈیڑھ ماشہ کافور کے ساتھ۔ چوتھی بار ایک تولہ شدھ سنکلپ پارہ اور ڈیڑھ ماشہ کپور کیساتھ پھونکیں۔ اسی طرح سولہ آنچ دیکر پیر پہوٹی ڈال کر لوہے کی کڑاہی میں ڈالیں۔ اور نیچے آنچ دیکر راکھ کرڈالیں۔ بعدازاں یہ راکھ پنکھے کی ہوا سے اُڑادیں۔ اب یہ مقویات کی سرتاج دوائی پورشکتی دا تیار ہے۔ خوراک نصف رتی شام کو بالائی یا مکھن کے ہمراہ کھاکر اوپر سے دودھ پی لیں۔ گرم اور ترش اشیاء سے پرہیز کریں۔

اس دوائی کی تعریف میں متھرا کے بابو ہربلاس جی لکھتے ہیں۔ کہ ایک ہفتہ کے استعمال سے ایک مریض کا وزن چار پونڈ بڑھ گیا۔ اور اُس کے چہرہ پر سُرخی جھلکنے لگی۔ بھوپال کے ویدراج بالکرشن جی شرما نے اسے ۷۵۰ مریضوں پر استعمال کیا۔ اور اُمید سے بڑھ کر مفید پایا۔ رتناگر کے ایڈیٹر آیورویدآچاریہ چھوٹے لال جی جین نے اپنی مشہور کتاب گرہ چکتسا پتھ پردرشک میں لکھا ہے۔ کہ ہم نے آجتک ایسا بے ضرر اور مفید نسخہ نہیں دیکھا۔ رسالہ "تنتر" کے ایڈیٹر وید بھوشن شری شیام بہاری لال جی وید کی رائے ہے۔ کہ اس دوائی کے چالیس روزہ استعمال کے بعد اسی سال تک بڑھاپا پاس تک نہیں پھٹکتا۔ ہمارا اپنا تجربہ ہے۔ کہ اسکے سات روزہ استعمال سے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگتا ہے۔ اکیس دن میں چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔ اور چالیس روز کے بعد نامرد سے نامرد اور مایوس سے مایوس مریض بھی صحیح معنوں میں مرد بن جاتا ہے۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ عورتوں کی تمام امراض ہسٹریا جریان الرحم اور ایام حیض کی خرابی کیلئے یہ دوائی نہایت اکسیر ثابت ہوئی ہے۔ دمہ ذیابیطس جیسے موذی امراض کے لئے اس سے بہتر دوائی کا دستیاب ہونا محال ہے۔ ہم نے واضح طور پر اس کا نسخہ اور ترکیب بتادی۔ جو صاحب کسی وجہ سے اسے خود تیار نہ کرسکیں۔ وہ ہم سے دام کے دام پر منگوائیں۔ چالیس روزہ اسّی خوراک پانچ روپے دس آنہ ۵/۱۰ روپیہ معہ خرچہ محصولڈاک روانہ کردی جائیگی۔

منیجر نیاز ویدرتن ستیہ دیو روپ بلاس کمپنی نمبر ۲۲ کانپور

مست قلندر ہندوستان بھر کے اردو رسائل سے زیادہ چھپتا ہے مشتہرین کو حق حاصل ہے کہ اس دعوی کی تصدیق کرنے کے بعد اپنے اشتہار شائع کرائیں

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۶۳۵ — جلد ۲۲ — نمبر ۲

ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری!

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند
بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہاست
خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

رسالہ مست قلندر لاہور

دسمبر ۱۹۴۲ء

اردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیر الاشاعت ماہوار رسالہ

اُن زندہ دل انسانوں کیلئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کیا ہے، ہمیشہ خوش رہنے اور دوسروں کو خوش کرتے ہیں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے قول یا فعل سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے، جن کا مذہب ہے خدا کے ہر ایک بندے سے بلا امتیاز رنگ و قومیت محبت کرنا

قیمت فی پرچہ ۶/

ایڈیٹر
ڈاکٹر پرتھی سنگھ

سالانہ چندہ صرف چار روپیہ

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ڈاکٹر پرتھی سنگھ پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ مست قلندر وشنو لین گوالمنڈی لاہور سے شائع ہوا۔

طبی جواہر پارے

فہرست مضامین

دسمبر ۱۹۴۲ء

بے بدل رنگین افسانے

دلگداز آپ بیتیاں

مستقل خریداروں کو چار روپے سالانہ چندہ میں سال بھر

اور

چار خاص نمبر مفت دیئے جاتے ہیں

ہنگامہ خیز نظمیں

نگاہِ اولیں!

ملک کے ادبی حلقوں میں اہلِ ذوق نے مست قلندر کے شمارۂ خاص — یعنی "جرم وسراغ نمبر" کا جس محبت اور گرمجوشی کے عالم میں استقبال کیا ہے اس کے اظہار کا نہ تو یہ موزوں موقعہ ہے اور نہ مست قلندر کی روز افزوں مقبولیت اس امر کی محتاج ہے۔ مست قلندر کے خاص نمبروں کی اشاعت فی الواقعہ ایک ہنگامہ خیز چیز ثابت ہوتی ہے مگر "جرم وسراغ نمبر" نے جتنی مقبولیت حاصل کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اس عظیم الشان نمبر کی اشاعت کے بعد چار پانچ روز کے اندر اندر ہی تمام پرچہ ختم ہوگیا تھا اور اب "مانگ" کے سلسلہ میں جو خطوط ملک کے طول وعرض سے ایک خاص تواتر وتسلسل کے ساتھ ہر روز موصول ہو رہے ہیں وہ دفتر میں بیکار پڑے ہوئے ہیں۔ خیر یہ تو تھا "جرم و سراغ نمبر" کی مقبولیت کے متعلق ایک ہلکا سا اشارہ، اب سنئے — ادارہ مست قلندر ایک اور نہایت شاندار نمبر شائع کر رہا ہے۔ یہ نمبر ہوگا نوروز نمبر —!

مست قلندر کا نوروز نمبر

تمام صوری ومعنوی خوبیوں کے ساتھ جنوری کے پہلے ہفتے میں اشاعت پذیر ہو جائے گا۔ اس نمبر کے متعلق ادارہ جس نوعیت کی تیاری کر رہا ہے اور اسے انتہائی شاندار بنانے کی غرض سے جو انتظامات بروئے کار آرہے ہیں ان کی جھلک ظاہر کرتی ہے کہ "نوروز نمبر" حقیقی معنوں میں ایک ناقابلِ فراموش "ادبی شاہکار" ہوگا — ! اس نمبر کیلئے بڑے وسیع پیمانے پر تیاریاں کی جارہی ہیں۔ ملک کے جلیل القدر ادباء سے دلچسپ اور معرکہ آرا مضامین، افسانے اور غزلیں حاصل کی جارہی ہیں۔ معنوی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کے صوری پہلو کی طرف بھی خاص توجہ کی جارہی ہے۔ یقین کیجئے مست قلندر نوروز نمبر کو آپ اپنی توقعات سے بڑھ کر کامیاب اور حسین دیکھیں گے۔ فی الحال اس خاص نمبر کا انتظار کیجئے۔ انتظار میں بھی ایک عجیب لذت ہوتی ہے۔

ایک نہایت ضروری امر۔ ہم نے اعلان کیا تھا کہ قارئین مست قلندر کی رائے اور مشورہ کے بغیر تین بہترین انعامی افسانوں کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا — اس سلسلے میں جو خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد یہ فیصلہ کرنے میں قطعاً تسلی بخش نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ قارئین نے اس نمبر کے تمام افسانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ تین بہترین افسانوں کے مسئلہ انتخاب میں ادارے کے ساتھ تعاون کریں۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہمارے قارئین ہر معاملے میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ مست قلندر کے بے شمار قارئین اس معاملے میں بھی حسب معمول حصہ لیں گے — !

تین بہترین افسانوں کے انتخاب کا اعلان جنوری نمبر میں کیا جارہا ہے۔ قارئین اس طرف جلد توجہ کریں۔

"جب میں جوان تھی" کی نئی قسط آیندہ اشاعت میں شائع ہوگی۔ اس مرتبہ یہ قسط وقت پر موصول نہ ہوسکی۔ کیا قارئین ہماری مجبوری کو اظہارِ معذرت سمجھیں گے؟ آیندہ اشاعت میں جناب مسعود جاوید کے طویل سلسلہ — "جادوگر کی ڈائری" کی تازہ قسط بھی شائع ہوگی۔ جادوگر کی ڈائری ایک دو قسطوں کے بعد کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہے۔ مست قلندر کے دفتر سے دو اور کتابیں بھی نکل رہی ہیں۔ پہلی ماہر القادری کے خطوط اور دوسری مات کنوارے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ماہر القادری کے خطوط مست قلندر کے اوراق میں بذریعہ اقساط شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب ان خطوط کو کتابی صورت میں دیکھنے کیلئے لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم ہے کہ ہر ڈاک میں ۴، ۴ چٹھیاں موصول ہوجاتی ہیں۔ حیدرآباد دکن کی ایک محترمہ (جو غالباً شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں) نے لکھا ہے کہ "کاغذ کی گرانی کے باعث یا اور کسی وجہ سے اگر آپ جلد از جلد اُن خطوط کو شائع کرنے سے معذور ہیں تو لکھئے مجھے مالی اعانت سے بھی دریغ نہ ہوگا۔"

ہم آں محترمہ نیز ان تمام حضرات کو جو مذکورہ بالا خطوط کو کتابی شکل میں دیکھنے کیلئے بے تاب ہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو فروری ۱۹۴۳ء کے وسط میں یہ نادر روزگار تصنیف ضرور شائع ہو جائے گی۔ "دورِ ساغر" یعنی جناب ساغر چشتی اودھینی کا مجموعہ کلام بھی ادارہ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ ناظرین نوٹ کرلیں۔

(ایڈیٹر)

دنیائے فلم کی تازہ ترین خبریں!

مست قلندر کے فلمی نامہ نگار مقیم بمبئی کے قلم سے

بمبئی ٹاکیز۔ بمبئی ٹاکیز کے حصہ داروں میں اختلاف رائے کی بنا پر ایک کشمکش سی جاری ہے۔ رائے بہادر چونی لال اور دیویکارانی عدالت میں پہنچ چکے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ رائے بہادر چونی لعل کمپنی سے علیحدہ ہو جائیں گے اور کمپنی کے اختیارات دیویکارانی کے سپرد ہو جائیں گے۔ ادھر تو یہ مقدمہ بازی ہے اور ادھر پروڈیوسر مکرجی بڑی تیزی کے ساتھ قسمت تیار کر رہے ہیں۔ قسمت میں ممتاز شانتی، اشوک کمار ہیروئن اور ہیرو کے پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ "قسمت" دسمبر کے وسط میں یا اواخر تک سکرین پر نمائش کیلئے پیش ہو جائیگی!

فضلی برادرز۔ پروڈیوسر ڈائرکٹر مسٹر حسنین فیشن کی مہورت کرنے والے ہیں۔ ساتھ ساتھ کالج اور ہمایوں کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔ فیشن کی شوٹنگ شری ساؤنڈ سٹوڈیوز میں ہوگی۔

ایشیاٹک پکچرز۔ پروڈیوسر ڈائرکٹر مظہر خاں یاد کی شوٹنگ میں ہمہ تن مشغول ہیں۔ اس فلم کی ہیروئن لاہور کی مس وینا کماری ہے۔ یاد کے بعد مظہر خاں "دنیا مانے" تیار کریں گے۔ "دنیا مانے" کی کہانی، مکالمے اور گانے 'دنیا نہ مانے' کے مصنف منشی عاجز کے قلم سے ہیں۔

نیوگ چترپٹ۔ اس کمپنی کی آخری پیشکش "سٹیٹ گیسٹز" بہت کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ "ایور یورز" —— (Ever yours) تیار ہو رہی ہے۔ کمپنی "نیا ترانہ" کی شوٹنگ بھی شروع کرنے والی ہے۔

چترا پروڈکشن۔ "کسی سے نہ کہنا" نمائش کا انتظار کر رہی ہے۔ لاہور میں یہ فلم نشاط میں دکھائی جائے گی۔ پرتگیہ تیار ہو رہی ہے۔ پرتگیہ میں بھی ہیروئن لیلا چٹنس ہوگی۔

آچاریہ آرٹ پروڈکشن۔ "الجھن" کامیاب ہے۔ اب یہ کمپنی ایک اور کامیڈی تیار کر رہی ہے جس کے نام کا اعلان تاحال نہیں ہوا۔ اس میں پرومتا داس گپتا ہیروئن ہوگی۔ اور اسے مسٹر کشور ساہو ڈائرکٹ کرینگے۔

بھارت پکچرز۔ ڈسٹری بیوشن کی یہ فرم ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے اور نئی نئی فلمیں خرید رہی ہے۔ صاحب کبیر اسی فرم کے ذریعے ریلیز ہوئی ہے۔

راجہ مووی ٹون۔ پروڈیوسر مسٹر ظہور راجہ "مذاق" تیار کر رہے ہیں۔ اس کی کہانی اور مکالمے کمال امروہی کے قلم سے ہیں۔

موہن پکچرز۔ اس فلم کمپنی کی فلم "زیور" دہلی میں کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ اب اس کمپنی کے ارباب حل و عقد نے ایک اور کمپنی قائم کر لی ہے جس کا نام رنجیک پروڈکشن ہے۔ رنجیک پروڈکشن نے مسٹر اشوک کمار کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔

پرکاش پکچرز۔ چوڑیاں تیار ہو چکی ہے۔ اس میں مایا بینرجی اور اشوک کمار نے کام کیا ہے۔ نگھٹ کی شوٹنگ جاری ہے۔ اس کی کاسٹ میں سوشیل کمار اور وملا دیوی شامل ہیں۔ وجے بھٹ رام راجیہ کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔

راجکمل کلامندر۔ یہ واڈیا مووی ٹون کا نیا نام ہے۔ مسٹر وی شانتا رام ایک ماہ کے اندر اندر شکنتلا کی شوٹنگ شروع کر دینگے۔ شکنتلا کے مصنف دیوان شرر ہیں۔ شکنتلا کے بعد وی شانتا رام (Heaven) تیار کرینگے۔ یہ ایک کامیڈی ہے۔

کاردار پروڈکشن۔ شاردا ریلیز ہو چکی ہے۔ نمستے تیار ہو رہی ہے۔ نمستے کو مسٹر صادق اور سنی ڈائرکٹ کریں گے۔

ایسٹرن پکچرز۔ بادل بمبئی کے تین سینماؤں میں ریلیز ہو چکی ہے۔ اب مسٹر نذیر دعوت کی شوٹنگ میں مصروف ہیں کمپنی کی طرف سے دو اور فلموں کا اعلان ہو چکا ہے۔ یعنی "بھائی" اور "بستی"

سن رائز پکچرز۔ سیٹھ ویاس "دہائی" قریباً قریباً مکمل کر چکے ہیں۔ کمپنی کیلئے مسٹر شوکت حسین رضوی "نرگس" تیار کر رہے ہیں۔ نرگس میں چندر موہن شوبھنا سمرتھ اور یعقوب کام کر رہے ہیں۔

جلد ۲۸ — رسالہ **مست قلندر** — دسمبر ۱۹۴۲ء — نمبر ۱۲

"محبّت کی ایک شام"

از شاعرِ شباب حضرت لطیف قریشی بریلوی

وہ ساعت خوش انجام یاد آرہی ہے
محبت کی اک شام یاد آرہی ہے

جوانی تھی جب ہمکنارِ جوانی
محبت تھی پروردگارِ جوانی

نگاہوں میں جلوے بسے جارہے تھے
کسوٹی پہ جذبے کسے جارہے تھے

کوئی ساغرِ آرزو پی رہا تھا
کبھی مر رہا تھا کبھی جی رہا تھا

کوئی امتحانِ وفا لے رہا تھا
کوئی دادِ عیش و طرب دے رہا تھا

وہ سرشار جلوے وہ کافر نگاہیں
وہ زانو پہ سر اور وہ گردن میں باہیں

وہ اُمڈی ہوئی بیکراں شادمانی
وہ مچلی ہوئی نوجواں زندگانی

وہ شام تماشا وہ شامِ محبت
وہ ہر سانس میں اک پیامِ محبت

وہ نظروں میں انداز کچھ کافرانہ
اداؤں میں وہ مستیاں ساحرانہ

وہ برہم سے گیسو، وہ پُرنور مکھڑا
وہ مخمور آنکھیں وہ مخمور مکھڑا

نظر بھی بلائیں لئے جارہی تھی
محبّت دعائیں دئے جارہی تھی

زباں پر وہ بھولے ہوئے کچھ فسانے
نگاہوں میں بچھڑے ہوئے کچھ زمانے

زباں چپ تھی لیکن وہ سب سُن رہی تھے
جوانی کے جذبات سر دھن رہے تھے

لطیف اللہ اللہ وہ شامِ محبّت
کہ قائم تھا جس پر نظامِ محبّت

آنکھیں!

ایک اندھی حسینہ کی آپ بیتی

از مسعود جاوید

میں ابھی ایک کمسن دلہن ہی تھی کہ میرے ایک مُردہ بچہ پیدا ہوا اور میں خود بھی موت کے بالکل قریب پہونچ گئی۔ میری صحت و توانائی بہت آہستہ آہستہ مجھے واپس مل رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ میری نگاہ کمزور تر ہوتی چلی جاتی تھی۔

میرا شوہر اس زمانے میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اپنی ڈاکٹری معلومات کو مجھ پر آزمانے کے اس موقعہ سے وہ کچھ بھی متاسف نہ تھا اور اس لئے اس نے بذات خود میری آنکھوں کا علاج شروع کر دیا۔

میرا بڑا بھائی اپنے قانون کے امتحانات کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک دن وہ مجھ سے ملنے آیا اور میری حالت دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے میرے شوہر سے کہا۔ "تم کومو کی آنکھوں کو تباہ کر رہے ہو۔ تمہیں چاہئے کہ فوراً کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کرو۔"

میرے شوہر نے احساس برہمی کیساتھ کہا۔ "کیوں؟ — جو کچھ میں کر رہا ہوں اس سے زیادہ ایک اچھا ڈاکٹر اور کیا کر سکتا ہے؟ مرض بالکل معمولی ہے اور اس کی دوائیں عام ہیں۔"

بھائی نے نفرت کے ساتھ جواب دیا۔ "اگر کبھی تمہاری شادی ہو جائے اور تمہاری بیوی کی ملکیت کی بابت کوئی جھگڑا پیدا ہو تو تم اس وقت قانونی امور میں میری رائے نہ لو گے پھر اب تم کیوں ڈاکٹری امور میں مجھے مشورہ دینے آئے ہو؟"

جب وہ دونوں بحث کر رہے تھے تو میں اپنے دل میں سوچ رہی تھی کہ اگر دو بادشاہ میدان میں جنگ کرنے کے لئے آتے ہیں تو ہمیشہ غریب گھاس کو ہی سب سے زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہاں ان دونوں کے درمیان لفظی جنگ ہو رہی تھی اور اس کی پوری تباہ کاری مجھے سہنا تھی۔

پھر یہ چیز مجھے قطعی غیر مناسب بھی محسوس ہوتی تھی کہ جب میرا خاندان مجھے شادی میں دوسروں کے حوالہ کر چکا ہے تو بعد کیوں ہمارے معاملات میں دخیل ہوتا ہے۔ میری تمام مسرت و تکلیف کا مسئلہ بہر حال میرے شوہر سے تعلق رکھتا تھا نہ کہ میرے خاندان والوں سے۔

اس دن کے بعد میری آنکھوں کے اس معمولی سے مسئلہ کی بنا پر میرے شوہر اور میرے بھائی کے باہمی تعلقات میں ہمیشہ ایک کشیدگی قائم رہی۔

ایک دن سہ پہر کے وقت جب میرا شوہر مکان پر نہیں تھا۔ مجھے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ میرا بھائی ایک ڈاکٹر کو مجھے دکھانے کے لئے لے آیا ہے۔ ڈاکٹر نے بہت غور کے ساتھ میری آنکھوں کا معائنہ کیا۔ وہ بہت سنجیدہ اور متفکر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک نسخہ لکھا اور بھائی نے فوراً ہی دوا کے لئے آدمی بھیج دیا۔ جب یہ اجنبی ڈاکٹر جا چکا تو میں نے بھائی سے التجا کی کہ اس معاملہ میں دخل اندازی نہ ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ کسی ڈاکٹر کے یوں پوشیدہ طور پر آنے کا نتیجہ سوائے خرابی کے اور کچھ نہ ہو گا۔

مجھے تعجب تھا کہ اپنے بھائی سے اس طرح گفتگو کرنے کی جرأت مجھ میں کہاں سے آ گئی۔ میں آج تک ہمیشہ اس سے مرعوب اور خوفزدہ رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میری اس بیباکی اور جرأت پر میرا بھائی بھی متعجب ہو گیا تھا وہ کچھ دیر تک خاموش رہا اور اس کے بعد مجھ سے بولا — "بہت اچھا کومو — اب میں ڈاکٹر کو آئندہ نہ بلاؤں گا لیکن جب دوا آ جائے تو ضرور استعمال کرنا۔"

اس کے بعد بھائی چلا گیا۔ دوا فروش کے وہاں سے دوائیں آئیں۔ میں نے ان کو لیا — بوتلیں، سفوف، نسخے اور سب کچھ — اور پھر ان سب کو کنوئیں میں پھینک دیا!!

میرا شوہر میرے بھائی کی دخل اندازی سے برہم ہو گیا تھا اور اسلئے اس نے پہلے سے زیادہ محنت سے میری آنکھوں کا علاج شروع کر دیا۔ اس نے تمام قسم کی دوائیں استعمال کیں۔ جس طرح وہ مجھے بتاتا میں اپنی آنکھوں پر خود اسی طرح پٹی باندھ لیتی تھی۔ میں نے اس کی رنگین شیشوں کی عینک لگا لی۔ میرا میاں دی ہوئی دوا کے قطرے تو وہ ہی اپنی آنکھوں

میں ڈال لیتی اور اس کے دئے ہوئے تمام سفوف استعمال کرتی۔ اس نے مجھے مچھلی کا تیل دیا تو اُسے بھی میں پی گئی اگرچہ میری طبیعت اس کی بُو سے گھٹ گھٹ کر رہ گئی اور مجھے متلی ہونے لگی۔

ہر بار جب وہ اسپتال سے واپس آتا تو پُرشوق انداز میں مجھ سے پوچھتا کہ میں کیسی ہوں کہ میں جواب دیتی ——— "کہیں بہتر!" ——— حقیقت تو یہ ہے کہ میں خود فریبی کے فن میں ماہر بن گئی تھی۔ جب مجھے معلوم ہوتا کہ میری آنکھوں میں پانی برابر بڑھتا چلا جاتا ہے تو میں خود کو اس خیال سے تسکین دے لیتی کہ جتنے زیادہ مواد سے نجات ملے اچھا ہے ——— اور جب میری آنکھوں کا بہنا کم ہو جاتا تو میں اپنے شوہر کی قابلیت و ہنرمندی پر ایک فخر محسوس کرنے لگتی۔

لیکن کچھ زمانے کے بعد یہ شدید تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی۔

میری نگاہ دھند لکے میں غائب ہو گئی اور دن رات میرے سر میں مستقل درد رہنے لگا۔

میں نے دیکھا کہ میرا شوہر کس قدر خوفزدہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے برتاؤ سے نتیجہ نکالا کہ وہ ڈاکٹر کو بلانے کیلئے کسی بہانے کی تلاش میں ہے۔ اسلئے میں نے اشارتاً کہدیا کہ اگر کوئی ڈاکٹر بلا لیا جائے تو اچھا ہے۔

میں نے اچھی طرح دیکھا کہ میرے اس جملے نے اس کے دل کے بوجھ کو کتنا ہلکا کر دیا ہے۔ اس نے اُسی روز ایک انگریز ڈاکٹر کو بلا لیا۔ مجھے علم نہیں کہ اُن دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ "صاحب" نے میرے شوہر سے بہت تلخ و تند باتیں کہی تھیں ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تک خاموش رہا۔ میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور کہا ——— "کسقدر بد اخلاق وحشی تھا یہ! ——— تم نے کسی ہندوستانی ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلا لیا؟ وہ اس سے کہیں اچھا رہتا۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ یہ شخص میری آنکھوں کی بابت تم سے زیادہ جانتا ہے؟"

میرا شوہر ایک ساعت تک خاموش رہا۔ اور پھر ایک شکستہ آواز میں بولا ——— "کموا اب تمہاری آنکھوں کا آپریشن ہونا ضروری ہے"۔

میں نے ایسا ظاہر کیا گویا میں اتنی مدت تک اس حقیقت سے بےخبر رکھے جانے پر اُس سے برہم ہوں۔

"یہ بات برابر تمہارے علم میں رہی ہے" میں نے کہا۔ "اور پھر بھی تم نے اب تک مجھ سے اسکی بابت کچھ بھی نہیں کہا! ——— کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں ایک بچی ہوں جو آپریشن سے خوفزدہ ہو جاؤں؟"

یہ سُن کر اس کی طبیعت پھر سنبھل گئی "بہت کم لوگ ایسے ہیں" اس نے کہا "جو اسقدر بہادر ہوں کہ بغیر ہچکچائے ہوئے آپریشن کا تصور کر سکیں"۔

میں نے ہنس کر کہا ——— "ہاں ——— یہ صحیح ہے ——— مرد صرف اپنی بیویوں کے سامنے بہادر ہوتے ہیں"

اس نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھا اور کہا ——— "تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ ہم مرد خوفناک حد تک بزدل ہوتے ہیں"

میں اسکی سنجیدگی پر ہنس پڑی اور بولی ——— "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم ہم عورتوں کو مغرور ہونے میں ہرا سکتے ہو؟"

جب میرا بھائی آیا میں اُسے ایک طرف لے گئی اور کہا ——— "بھائی! جو علاج تمہارے ڈاکٹر نے تجویز کیا تھا اُس سے مجھے بہت زیادہ فائدہ پہنچ سکتا تھا مگر بدقسمتی سے میں نے غلطی سے مکسچر کو لوشن سمجھ لیا اور جس دن سے میں نے یہ غلطی کی میری آنکھیں برابر خراب تر ہوتی چلی گئیں اور اب آپریشن کی ضرورت ہے"۔

بھائی نے مجھ سے کہا ——— "تم اپنے شوہر کے زیرِ علاج تھیں اور یہی وجہ ہے کہ میں نے تم سے ملنے کے لئے آنا ترک کر دیا تھا"۔

"نہیں" میں نے جواب دیا "درحقیقت میں پوشیدہ طور پر تمہارے ڈاکٹر کی ہدایات کے بموجب علاج کر رہی تھی"۔

آہ! ——— ہم عورتوں کو بھی کیسے کیسے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں! ——— جب ہم ماں بن جاتی ہیں تو اپنے بچوں کو مطمئن کرنے کیلئے جھوٹ بولتی ہیں اور جب ہم بیوی کی حیثیت میں ہوتی ہیں تو اپنے بچوں کے باپ کو مطمئن کرنے کے لئے جھوٹ بولتی ہیں۔ ہم کبھی اس ضرورت سے آزاد نہیں ہوتیں۔

میری دھوکہ بازی کا اثر یہ ہوا کہ میرے شوہر اور بھائی کے درمیان بہتر احساسات قائم ہو گئے۔ میرا بھائی خود کو اس بات کا ملزم سمجھتا تھا کہ اُس نے مجھے یہ راز کیوں میرے شوہر سے نہ کہنے دیا اور میرے شوہر کو یہ افسوس تھا کہ اُس نے شروع سے ہی کیوں میرے بھائی کے مشورے پر عمل نہ کیا۔

آخرکار دونوں کی رضامندی سے ایک انگریز ڈاکٹر آیا اور میری بائیں آنکھ کا آپریشن کیا گیا۔ لیکن یہ آنکھ اسقدر کمزور تھی کہ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکی اور روشنی کی آخری تھرتھراتی ہوئی کرن بھی غائب ہو گئی۔ اس کے بعد دوسری آنکھ بھی رفتہ رفتہ تاریکی میں کھو گئی۔

ایکدن میرا شوہر میری چارپائی کے پاس آیا۔ "میں اب زیادہ مدت تک یہ بات تم سے نہیں چھپا سکتا" اس نے کہا "کموا! ——— تمہاری آنکھوں کو تباہ کرنیوالا صرف میں ہوں"

مجھے محسوس ہوا کہ آنسوؤں کے ہجوم میں اس کی آواز گھٹی جاتی تھی۔ اسلئے میں نے اس کا داسنا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور کہا۔ "مگر تم نے تو ٹھیک وہی کیا ہے جو مناسب تھا۔ تمہارے علاج کا تعلق تو صرف اس چیز سے رہا ہے جو خود تمہاری تھی۔ ذرا سوچو تو کہ اگر کوئی اور اجنبی ڈاکٹر آتا اور میری نظر کو لیجاتا تو کیا ہوتا۔ اس وقت میری تسکین کا ذریعہ کیا ہوسکتا تھا؟ لیکن اب میں محسوس کرتی ہوں کہ یہ سب کچھ بہتر ہی ہوا ہے اور میری سب سے بڑی تسکین و راحت اب اس خیال میں مضمر ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے تمہارے ہاتھوں محروم ہوئی ہوں۔ جب رام چندر جی نے کنول کے ایک پھول کو ایشور کی پوجا کیلئے قطعی ناکافی پایا تھا تو انہوں نے کنول کی بجائے اپنی دونوں آنکھیں پیش کر دی تھیں۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں اپنے دیوتا پر چڑھا دی ہیں۔ آج کے دن سے جب کبھی تم کوئی ایسی چیز دیکھو جو تمہارے لئے مسرور کن ہے تو ضرور مجھ سے اس کا حال بیان کرو۔ میں تمہارے ان الفاظ کو تمہاری نگاہ کا ایک مقدس تحفہ سمجھونگی اور خوشی خوشی ان کے سہارے جی لونگی۔"

یقیناً میرا یہ مقصد نہیں کہ یہ سب کچھ میں نے اسی وقت کہدیا تھا کیونکہ ایسی باتیں فوراً کہدینا ناممکن ہے۔ لیکن میں اس قسم کے الفاظ نہ جانے کتنے دنوں تک سوچتی رہی۔ جب کبھی میں بہت اداس ہوتی یا اگر کبھی میری پرستاری کی روشنی دھندلی ہوجاتی اور مجھے اپنی بدنصیبی پر افسوس ہونے لگتا تو اس وقت میں ان جملوں کو یکے بعد دیگرے اپنے ذہن میں اس طرح دہراتی جیسے کوئی بچہ ایک کہی ہوئی کہانی کو دہرا رہا ہو ـــــ اور اس طرح مجھے محسوس ہوتا کہ ایکبار پھر میں سکون و محبت کی لطیف فضاؤں میں سانس لے رہی ہوں۔ پھر بھی اس باہمی گفتگو کے وقت میں نے جو کچھ کہا وہ میرے شوہر کو یہ بتانے کیلئے کافی تھا کہ میرے دماغ میں کیا ہے۔

"کومو! ـــــ" اس نے مجھ سے کہا "میں نے اپنی حماقت سے تمہیں جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کبھی نہیں ہوسکتی۔ لیکن ایک بات میں کرسکتا ہوں ـــــ اور وہ یہ کہ میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں اور جہاں تک میری قدرت میں ہے۔ تمہاری نگاہ کی کمی کو پورا کرتا رہوں۔"

"نہیں، میں نے کہا۔ "اس طرح کبھی کام نہ چلے گا۔ میں تم سے کبھی نہیں کہہ سکتی کہ اپنے مکان کو ایک اندھوں کے اسپتال میں تبدیل کردو ـــــ اب تو صرف ایک ہی بات کی جاسکتی ہے ـــــ تمہیں فوراً دوسری شادی کرلینی چاہئیے۔"

جب میں اُسے یہ سمجھانے کی کوشش کررہی تھی کہ ایسا کرنا کتنا ضروری ہے تو میری آواز قدرے کانپ گئی۔ میں نے کھانس اور اپنے جذبات کو چھپانیکی سعی کی لیکن وہ ایکدم بول اٹھا۔ "کومو! ـــــ میں جانتا ہوں کہ میں بیوقوف ہوں۔ شیخی باز ہوں ـــــ اور سب کچھ ـــــ مگر میں کمینہ بدمعاش نہیں ہوں! ـــــ اگر میں کبھی دوسری شادی کروں تو میں دعا کرتا ہوں۔ میں اپنے خاندانی دیوتا گوپی ناتھ کی انتہائی مقدس قسم کھا کر دعا کرتا ہوں ـــــ کہ مجھ پر "پتا ہتیا" جیسا انتہائی نفرت انگیز گناہ نازل ہو۔"

آہ! ـــــ میں ہرگز ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ ایسی خوفناک قسم کھائے لیکن آنسو میری آواز کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ اور ناقابل برداشت مسرت کے عالم میں میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ میں نے اپنا اندھا چہرہ اپنے تکیوں میں چھپا لیا اور روتی رہی ـــــ مسلسل روتی رہی ـــــ آخرکار جب میرے آنسوؤں کا سیلاب ختم ہوگیا تو میں نے اس کا سر اپنی طرف کھینچا اور سینے سے لگا لیا۔

"آہ!" میں نے کہا "تم نے اس قدر ہیبتناک قسم کیوں کھائی؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے تم سے دوسری شادی کی درخواست تمہارے پست جذبات کی تسکین کے لئے کی تھی؟ ـــــ نہیں! ـــــ میں تو خود اپنے لئے یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کیونکہ تمہاری دوسری بیوی تمہاری وہ خدمات سرانجام دے سکتی تھی جو اندھے نہ ہونے کے زمانے میں میرے اوپر فرض تھیں؟"

"خدمات!" اس نے کہا "خدمات؟ ـــــ اس کام کے لئے نوکر موجود ہیں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں اسقدر دیوانہ ہوں کہ اپنے گھر میں ایک کنیز کو بیاہ کر لاؤں اور اسے اپنی اس دیوی کے تخت کا شریک بننے پر مجبور کروں۔"

لفظ "دیوی" کہتے وقت اُس نے اپنے ہاتھوں میں میرے چہرے کو اوپر اٹھایا اور میری ابروؤں کے درمیان اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ جس جگہ اُس نے پیار کیا ہے وہاں روحانی بصیرت کی ایک تیسری آنکھ کھل گئی ہے اور درحقیقت میں ایک مقدس چیز بن گئی ہوں۔

میں نے اپنے دل سے کہا ـــــ "یہ اچھا ہوا ـــــ میں خانہ داری کے تفکرات کی پست دنیا میں اب اس کی خدمت کے قابل نہیں ہوں لیکن میں اب اس سے بلند تر مقام پر پہونچ جاؤنگی۔ میں ان بلندیوں سے برکتیں لاؤنگی۔ اب جھوٹ کی ضرورت نہ ہوگی اور نہ فریب کی! ـــــ میری گذشتہ زندگی کی تمام معمولی پست باتیں اور تمام منافقت ہمیشہ کے

لئے ختم ہو جائے گی؟"

اس روز ۔۔۔ دن بھر ۔۔۔ مجھے اپنے اندر ایک کشمکش کا اضطراب محسوس ہوتا رہا ۔ اس خیال کی مسرت کہ اس مقدس قسم کے بعد میرے شوہر کیلئے دوسری شادی کرنا ناممکن تھا میرے قلب کی گہرائیوں میں پیوست تھی اور میں اسے باہر نہ نکال سکتی تھی ۔ لیکن یہ "نئی دیوی" جو میری ذات کے اندر نئے تخت پر بیٹھ چکی تھی کہتی تھی ۔ "ممکن ہے کہ وہ وقت بھی آجائے جب تمہارے شوہر کیلئے اپنی قسم توڑنا اور دوسری شادی کرنا ہی بہتر ہو" ۔۔۔ لیکن وہ "عورت" جو میرے اندر چھپی تھی کہتی تھی ۔۔۔ "یہ ممکن ہے ۔۔۔ لیکن پھر بھی قسم پھر قسم ہی ہے اور اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں" ۔۔۔ "دیوی" جو میرے اندر تھی جواب دیتی: "لیکن محض اسی وجہ سے اس بات پر مسرور ہونا بے معنی ہے" ۔۔۔ مگر میرے اندر چھپی ہوئی "عورت" بولتی ۔۔۔ "جو کچھ تم کہتی ہو بلا شبہ بالکل صحیح ہے ۔۔۔ لیکن پھر بھی وہ قسم کھا چکا ہے" ۔۔۔ اور یہی سلسلہ بار بار جاری رہا ۔ آخر کار "دیوی" چیں بر جبیں ہو کر خاموش ہو گئی اور ایک دہشت ناک خوف کی تاریکی مجھ پر طاری ہو گئی ۔

میرا پشیمان شوہر میرا کام نوکروں کو نہ کرنے دیتا تھا ۔ یہ کام وہ خود ہی کرتا تھا ۔ شروع شروع میں مجھے اس چیز سے بے انتہا مسرت ہوئی کہ میں اس طرح ہر چیز میں اسکی محتاج ہو گئی ہوں یہ ایک ذریعہ تھا اس کو مجھ سے قریب رکھنے کا ۔۔۔ اور اسے اپنے قریب رکھنے کی آرزو اس عالم نابینائی میں میرے اندر شدید ہو گئی تھی اس کی موجودگی کے اس حصے کے لئے جو میری آنکھوں سے چھن چکا تھا ۔ اب میرے دوسرے حواس متمنی تھے ۔ جب وہ میرے پاس نہ ہوتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا میں رفتنی کے اندر معلق ہوں اور دنیا کی تمام محسوس اشیاء سے میری گرفت چھوٹ گئی ہے ۔

پہلے جب کبھی میرے شوہر کو اسپتال سے آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو میں اپنی کھڑکی کھول لیتی اور سڑک کو تکنے لگتی تھی ۔ یہ سڑک ایک رشتہ تھی جو اس کی دنیا کو میری دنیا سے ملائے رکھتا تھا ۔ اب جبکہ میں اپنی نابینائی کی بدولت اس رشتہ کو کھو چکی تھی میرا سارا جسم اس کی تلاش میں جانا چاہتا تھا لیکن وہ پل جو ہم دونوں کو متحد کئے ہوئے تھا ٹوٹ چکا تھا ۔ اور اب ایک ناقابل عبور خلیج نمودار ہو گئی تھی ۔ جب وہ میرے پاس سے چلا جاتا تو یہ خلیج اپنا منہ پوری طرح کھول دیتی اور میں صرف انتظار میں بیٹھی رہتی کہ وہ کب اس خلیج کو پار کر کے پھر اپنے ساحل سے میرے ساحل پر آتا ہے ۔

لیکن اسقدر شدید خواہش اور اتنی بے پناہ محتاجی کبھی اچھی نہیں ہو سکتی ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک بیوی خود ہی اپنے شوہر کیلئے ایک بوجھ ہوتی ہے پھر اس اندھے پن کا بوجھ تو شوہر کی زندگی کو جسقدر ناقابل برداشت بنادے کم ہے ۔ میں نے عہد کیا کہ میں اپنا سارا دکھ تنہا برداشت کروں گی اور اپنی زندگی کے اس اندھیرے میں جو ہر طرف چھایا ہوا ہے کبھی اپنے شوہر کو مقید نہ کروں گی ۔

ایک ناقابل یقین مختصر عرصہ میں میں نے اپنی قوت لمس، سماعت اور شامہ کی مدد سے گھر کے سارے فرائض انجام دینا سیکھ لئے ۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ پہلے کی بہ نسبت میں زیادہ اچھی طرح کام کر سکتی ہوں ۔ کیونکہ نگاہ عام طور پر ہماری مدد کرنے کے بجائے ہماری توجہ کو ہٹا دیتی ہے اور اسی لئے واقعہ یہ ہوا کہ جب میری یہ گھومتی ہوئی آنکھیں اپنا کام کرنے کے ناقابل ہو گئیں تو ان کا کام میرے ۔۔۔۔۔ باقی ماندہ تمام حواس نے صبر اور تکمیل کے ساتھ کرنا شروع کر دیا ۔

جب مسلسل مشق کے ذریعہ مجھے تجربہ حاصل ہو گیا تو میں نے اپنے شوہر کو اپنے لئے گھر کا کام کرنے سے روک دیا ۔ اس نے ابتدا میں سخت شکوہ کیا کہ میں اسے اس کے گناہ کی مکافات کرنے سے روک رہی ہوں ۔

مگر اس کا مجھے یقین نہ آیا ۔ خواہ وہ کچھ بھی کہے لیکن مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ امور خانہ داری سے اس طرح آزاد ہونے پر وہ ایک حقیقی راحت محسوس کرتا تھا ۔ ایک اندھی بیوی کی روزانہ خدمت کرنا ایک شوہر کی زندگی کو کبھی مسرور نہیں بنا سکتا ۔

۔۔۔۔۔ (۲) ۔۔۔۔۔

آخر کار میرے شوہر کی ڈاکٹری تعلیم ختم ہو گئی ۔ ڈاکٹری کی پریکٹس کے واسطے وہ کلکتہ سے ایک چھوٹے سے شہر میں چلا گیا ۔ وہاں شہر کے باہر کھلی ہوئی فضا میں مجھے اپنے اندھے پن کے باوجود مسرت کے ساتھ یہ محسوس ہوا کہ میں پھر اپنی ماں کی آغوش میں آ گئی ہوں ۔ میں آٹھ سال کی عمر میں اپنے پیدائش کے گاؤں کو چھوڑ کر کلکتہ چلی آئی تھی ۔ اسوقت کو اب دس سال گذر چکے تھے اور کلکتہ کے بڑے شہر میں میرے گاؤں کی یاد دھندلی پڑ چکی تھی ۔ جب تک میرے پاس میری نگہ رہی، کلکتہ اپنی مصروف زندگی کے پردوں میں میری زندگی کے ابتدائی ایام کی یاد کو نظر سے چھپائے رہا لیکن جب میری نگہ ضائع ہو گئی تو مجھے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ کلکتہ صرف آنکھوں کے واسطے دلکش تھا ۔۔۔ دماغ کو مسحور نہیں کر سکتا تھا ۔۔۔ اور اب اس نابینائی کے عالم میں میری طفلی کے مناظر ایک بار پھر چمک اٹھے بالکل ان ستاروں کی طرح جو دن کے اختتام پر شام کے آسمان میں

ایک ایک کرکے نمودار ہوجاتے ہیں۔

نومبر کا آغاز تھا جب ہم کلکتہ کو چھوڑ کر سرنگھم لوٹ آئے۔ یہ مقام میرے واسطے بالکل نیا تھا لیکن مضافات کی خوشبوئیں اور آوازیں چاروں طرف سے آآکر مجھے گلے لگاتی محسوس ہوتی تھیں نسیم سحری جو نئی مزروعہ زمین سے مس کرتی ہوئی تازہ ہوکر آتی تھی ـــ سرسوں کے پھلے پھولے کھیتوں کی لطیف و نازک خوشبو ـــ چرواہے کی کہیں دور بجتی ہوئی بانسری ـــ اور بیل گاڑی کی چرچراہٹ کی آواز جو گاؤں کی ٹوٹی سڑک پر آہیں سی بھرتی جاتی تھی میری دنیا کو مسرتوں سے معمور کردیتی تھی۔ میری گذشتہ زندگی کی یاد اپنی تمام غیر فانی خوشبوؤں اور آوازوں کے ساتھ اب میرے لئے ایک زندہ "حال" میں تبدیل ہوگئی تھی اور میری اندھی آنکھیں مجھے نہ بتاسکتی تھیں کہ میں غلطی پر ہوں میں اپنے ماضی میں واپس چلی گئی تھی اور اپنی طفولیت کا زمانہ از سر نو گذار رہی تھی۔ صرف ایک چیز ایسی تھی کہ اب موجود نہ تھی ـــ میری ماں میرے پاس نہ تھی۔

مجھے تصور میں اپنا گھر صاف نظر آتا تھا اور وہ سب پیپل کے بڑے بڑے درخت بھی جو گاؤں کے تالاب کے کنارے کھڑے تھے۔ اپنی دماغی آنکھ کے سامنے میں بخوبی وہ منظر دیکھتی تھی، جب میری دادی اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کو کھولے زمین پر بیٹھی رہتی تھی۔ وہ دھوپ میں اپنی کمر تاپتی رہتی اور مسور کی چھوٹی چھوٹی گولیاں سی بناتی رہتی جن کو خشک کرنے کے بعد کھانا پکانے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہ گیت یاد نہ آتے تھے جن کو وہ اپنی کمزور اور ہانپتی ہوئی آواز میں ایسے گنگناتی تھی جیسے خود کو ہی سنا رہی ہو۔ شام کو جب کبھی مجھے مویشی کے بولنے کی آواز آتی تو مجھے تقریباً یہ نظر آنے لگتا کہ میری ماں روشن چراغ ہاتھ میں لئے ہوئے مویشی کی دیکھ بھال کرنے جارہی ہے۔ جانوروں کی ناند میں بھیگے ہوئے چارہ کی خوشبو اور بھوسہ کی آگ کا تلخ دھواں بالکل میرے دل میں گھستا محسوس ہوتا ـــ اور دور فاصلہ سے مندر کی گھنٹی کی آواز ہوا کی ہلکی ہلکی لہروں میں دریا کے اس پار سے آتی معلوم ہوتی۔

کلکتہ اپنے تمام ہنگاموں اور ہرزہ سرائیوں کے ذریعہ دل پر جمود طاری کردیتا ہے۔ وہاں زندگی کے تمام خوبصورت فرائض اپنی تازگی اور معصومیت کھو بیٹھتے ہیں۔ مجھے ایک دن یاد ہے جب میری ایک سہیلی مجھ سے ملنے آئی اور بولی ـــ "کومو! ـــ آخر تمہیں غصہ کیوں نہیں آتا؟ اگر میرا شوہر میرے ساتھ ایسا سلوک کرتا تو میں پھر کبھی اس کی صورت بھی نہ دیکھتی۔"

اُس نے مجھے برہم کرنے کی کوشش کی کہ کیوں میرے شوہر نے ڈاکٹر کے بلانے میں اتنا توقف کیا تھا میں نے کہا ـــ "میرا اندھا پن بذات خود ہی ایک کافی خراب چیز ہے۔ پھر میں اپنے شوہر سے نفرت کا جذبہ پیدا کرکے اسے اور زیادہ خراب کیوں بناؤں؟"

جب میری سہیلی نے مجھ جیسی کمسن لڑکی کی زبان سے ایسی دقیانوسی گفتگو سنی تو اس نے نفرت کے ساتھ اپنا سر ہلادیا۔ وہ تنفر اور مایوسی کے عالم میں واپس چلی گئی ـــ لیکن خواہ اس وقت میرا جواب کچھ ہی کیوں نہ رہا ہو اس میں شک نہیں کہ ایسے الفاظ اپنا زہر چھوڑ جاتے ہیں اور یہ زہر الفاظ کے ذریعہ روح میں ایک بار داخل ہوکر پھر کبھی پوری طرح باہر نہیں نکلتا۔

اس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ کلکتہ اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی ہرزہ گوئی کے ذریعہ دل کو سخت بنادیتا ہے لیکن جب میں پھر یکبار دیہات کی فضاؤں میں واپس آئی تو میری تمام ابتدائی امیدیں اور اعتقادات اور وہ سب کچھ جسے میں اپنے بچپن میں صحیح سمجھتی تھی از سر نو تازہ اور درخشاں ہوگیا۔ خدا میرے پاس آیا اور میرے دل اور میری دنیا پر چھا گیا۔ میں نے اس کے سامنے اپنا سر جھکادیا اور کہا:۔

"یہ اچھا ہے کہ تو نے میری آنکھیں مجھ سے لے لیں۔ اب تو میرے ساتھ ہے"

لیکن آہ! ـــ میں نے حقیقت سے کچھ زیادہ کہدیا۔ یہ کہنا گستاخی تھی کہ "تو میرے ساتھ ہے" ـــ ہم اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو صرف اتنا کہ ـــ "مجھے تیرے ساتھ وفادار رہنا ضروری ہے" ـــ اس وقت بھی جب ہمارے پاس کچھ نہیں رہتا ہمیں بٹتے جانا ہی پڑتا ہے۔

(۱۱)

ہم نے چند مسرور کن مہینے یکجا گذار دیئے میرے شوہر کو اپنے پیشے میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کچھ شہرت حاصل ہوگئی ـــ اور شہرت کے ساتھ ہی دولت آئی۔

لیکن دولت میں ایک خاص شیطنت ہے۔ میں کسی خاص واقعہ کا حوالہ تو نہیں دے سکتی لیکن چونکہ اندھے انسانوں کے احساسات دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ تیز ہوتے ہیں اس لئے میں اس تغیر کو محسوس کرسکتی تھی جو دولت کی زیادتی کے ساتھ ساتھ میرے شوہر کے اندر رونما ہورہا تھا۔

جب وہ کم عمر تھا تو اس کے اندر انصاف پسندی کا ایک گہرا جذبہ موجود تھا اور اس نے مجھ سے متعدد بار کہا تھا کہ وہ خود اپنی ڈاکٹری کی پریکٹس حاصل کرنے کے بعد غریب انسانوں کی امداد کرنے کی خواہش رکھتا ہے اسے اپنے پیشے کے اُن لوگوں سے ایک شریفانہ نفرت

تھی جو اپنی فیس کی رقم وصول کرنے سے پہلے ایک مفلس مریض کی نبض پر ہاتھ نہیں رکھتے لیکن اب مجھے کچھ مختلف حالت محسوس ہوتی تھی۔ وہ حیرتناک حد تک سخت دل ہوگیا تھا۔ ایک مرتبہ جب ایک غریب عورت آئی اور اپنے اکلوتے بچے کی زندگی بچانے کے لئے میرے شوہر سے بطور خیرات امداد چاہی تو اس نے صاف جواب دیدیا اور جب خود میں نے اس سے التجا کی کہ اس عورت کی امداد کرے تو اس نے بالکل لاپرواہی سے اس کام کو کیا۔

جب ہم مقابلتاً کم مالدار تھے تو میرے شوہر کو مالی معاملات میں نامناسب حرکتوں سے نفرت تھی۔ وہ ان باتوں میں ضمیر کا پیرو کار اور شریف تھا لیکن جب سے بنک میں اس کی دولت کی مقدار بڑھ گئی تھی وہ اکثر گھنٹوں تک کسی زمیندار کے بدمعاش کارندے کیساتھ تخلیہ میں رہتا اور یہ خلوت کسی ایسے مقاصد کے لئے ہوتی جو بالکل نمایاں طور پر نیکی کے حامل نہ تھے۔

وہ کس طرف بہکتا جا رہا تھا؟ —— آخر میرے اس شوہر کو کیا ہوگیا تھا —— اس شوہر کو جسے میں اندھا ہونے سے پہلے جانتی تھی —— وہ شوہر جس نے اس دن میری ابروؤں کے درمیان اپنے ہونٹ رکھدیئے تھے اور مجھے ایک "دیوی" کے تخت پر بٹھایا تھا؟ ——

وہ لوگ جن کو پست جذبات کی آندھی اچانک خاک پر گرا دیتی ہے نیکی کے ایک نئے قوی حوصلہ کے سہارے پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن وہ لوگ جو آہستہ آہستہ اپنی اخلاقی ہستی کے رگ و ریشہ تک خشک ہوتے چلے جاتے ہیں —— وہ لوگ جو پست جذبات کی پرورش کیواسطے سست رفتاری کے ساتھ اپنی باطنی زندگی کا گلا گھونٹتے چلے جاتے ہیں —— ایسے انسان آخرکار ایک دن ایسی مُردنی تک پہنچ جاتے ہیں جس کا کوئی علاج نہیں۔

اندھے پن سے جو جدائی پیدا ہوتی ہے وہ محض ایک معمولی سی جسمانی حیثیت رکھتی ہے —— لیکن آہ! —— یہ معلوم ہونے پر میرا سانس رکنے لگتا ہے کہ اب میرا شوہر میرے پاس نہیں ہے —— آج وہ اس مقام پر میرے پاس استادہ نہیں ہے جہاں ہم اس وقت کھڑے تھے جب ہم دونوں جانتے تھے کہ میں اندھی ہوں —— یہ جدائی درحقیقت جدائی ہے۔

میں اپنی تازہ محبت اور غیر شکستہ وفاداری کو لئے ہوئے اب تک اپنے دل کے باطنی معبد کے سایہ میں بیٹھی ہوں لیکن میرا شوہر ان چیزوں کے فرحتناک سایہ کو چھوڑ کر چلا گیا ہے جو کہ لاعمر ولافانی ہیں۔ وہ سیم و زر کی دیوانہ گر تشنگی میں تیزی کے ساتھ اُجاڑ اور بے آب و گیاہ ویرانی میں غائب ہوتا جا رہا ہے۔

کبھی کبھی مجھے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید معاملات اتنے بُرے نہیں ہیں جتنا معلوم ہوتے ہیں —— اور شاید میں اندھی ہونے کی وجہ سے مبالغہ کر رہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ اگر میری نظر صحیح و سلامت ہوتی تو میں دُنیا کو اس کی موجودہ حالت میں قبول کر لیتی۔ بہرحال میرے شوہر کا تو یہی نظریہ تھا اور وہ میری تمام باتوں کو —— میری ذہنی کیفیات اور مزاجی حالتوں کو اسی روشنی میں دیکھتا تھا۔

ایک دن ایک بوڑھا مُسلمان شخص ہمارے گھر آیا۔ اس نے میرے شوہر سے درخواست کی کہ اس کی کمسن پوتی کے معائنہ کو اس کیساتھ چلے۔ میں نے سُنا یہ بوڑھا شخص کہہ رہا تھا۔ "بابو! —— میں ایک غریب آدمی ہوں —— لیکن آپ میرے ساتھ چلئے —— اللہ آپ کا بھلا کریگا" —— میرے شوہر نے سرد مہری سے جواب دیا "اللہ جو کچھ کریگا اس سے کام نہ چلیگا —— میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو"۔

جب میں نے سُنا تو میں نے اپنے دل میں سوچا کہ خدا نے مجھے اندھی ہونے کے ساتھ ساتھ بہری بھی کیوں نہ کر دیا۔ بوڑھے شخص نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا اور چلا گیا۔ میں نے اپنی ملازمہ کو بھیجا کہ اُسے میرے کمرے میں لے آئے۔ میں نے اندرونی کمرے کے دروازے پر اس سے ملاقات کی اور اس کے ہاتھ میں کچھ رقم رکھدی۔

میں نے کہا "براہ مہربانی اپنی کمسن پوتی کے واسطے مجھ سے یہ رقم لیجائیے اور اس کے علاج کیلئے ایک قابل اطمینان ڈاکٹر بلوائیے —— اور —— میرے شوہر کے حق میں دُعا کیجئے"۔

لیکن اس روز دن بھر میں بالکل کھانا نہ کھا سکی۔ سہ پہر کے وقت جب میرا شوہر سو کر اُٹھا تو اس نے مجھ سے پوچھا —— "تم اسقدر زرد کیوں نظر آتی ہو؟"

میں جیسا کہ ماضی میں کہنے کی عادی تھی یہ کہنے ہی والی تھی کہ —— "اوہ! کچھ نہیں" لیکن اب فریب کاری کے وہ دن ختم ہو چکے تھے اور اس لئے میں نے اس نے صاف صاف حقیقت بتا دی۔

میں نے کہا —— "میں تم سے ایک بات کہنے کے لئے بہت دنوں سے پس و پیش میں پڑی ہوں۔ یہ سمجھنا میرے واسطے سخت دشوار ثابت ہوا ہے کہ میں ٹھیک ٹھیک کیا بات تم سے کہنا چاہتی ہوں، چنانچہ اس وقت بھی جو کچھ میرے دماغ میں موجود ہے شاید میں اسکی تشریح نہ کر سکوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جو

کچھ واقع ہو چکا ہے اُسے تم جانتے ہو۔ ہماری زندگیاں ایکدوسرے سے دُور ہوتی جا رہی ہیں۔"

میرا شوہر جبری طور پر ہنسا اور بولا۔ "تغیر اور تبدیلی قدرت کا قانون ہے۔"

میں نے اس سے کہا: "یہ بات میں جانتی ہوں لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو ابدی ہیں۔"

اس پر وہ سنجیدہ ہوگیا۔

"بہت سی عورتیں ایسی ہیں" اس نے کہا۔ "جو اپنے غم والم کی کوئی حقیقی وجہ رکھتی ہیں کچھ ایسی ہیں جن کے شوہر دولت نہیں کماتے۔ کچھ ایسی ہیں جن کے شوہر ان سے محبت نہیں کرتے ــــ لیکن تم اپنی زندگی کو خواہ مخواہ اذیت انگیز بنا رہی ہو۔"

اسوقت مجھ پر یہ واضح ہوگیا کہ میرے اندھے پن نے ہی مجھے ایک ایسی دُنیا کو دیکھنے کی قوت عطا کی ہے جو ہر قسم کے تغیر سے آزاد ہے۔ ہاں! ــــ یہ صحیح ہے ــــ میں دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہوں اور میرا شوہر کبھی مجھے نہ سمجھ سکے گا۔

ــــ (۴) ــــ

کچھ دنوں تک ہماری دو زندگیاں ایک بے کیف یکسانیت کے ساتھ آگے بڑھتی رہیں ــــ اور اس کے بعد اس بے کیف یکسانیت میں ایک وقفہ آیا۔ میرے شوہر کی ایک خالہ ہم سے ملاقات کرنے آئی۔

پہلی ملاقات ہی پر اس نے پہلی بات جو کہی وہ یہ تھی ــــ "ہاں کوموا ــــ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ تم نابینا ہوگئی ہو لیکن تم اپنی مصیبت کو اپنے شوہر پر کیوں نازل کرو؟ تمہیں چاہیئے کہ فوراً اس کی دوسری شادی کرادو۔"

اس پر ایک تکلیف دہ خاموشی طاری ہو گئی۔ اگر میرا شوہر صرف مذاق ہی میں کچھ بول اُٹھتا یا اپنی خالہ پر ہنس دیتا تو پھر کوئی بات ہی نہ تھی لیکن اس کے برعکس اسکی زبان لکنت کرنے لگی۔ اس نے پس و پیش کیا ــــ اور آخر کار ایک گھبراہٹ اور حماقت کے انداز میں کہا ــــ "کیا واقعی تمہارا یہ خیال ہے؟ سچ تو یہ ہے خالہ کہ تمہیں ایسی بات نہ کہنا چاہیئے"

اُس کی خالہ نے مجھ سے اپیل کی ــــ "کیا میں نے غلط کہا ہے ــــ کوموا؟"

میں نے ایک مصنوعی ہنسی کے ساتھ کہا ــــ "کیا تم مجھ سے زیادہ کسی اور قابل شخص سے اس مسئلے کے فیصلہ کے لئے مشورہ نہیں کر سکتی تھیں؟ ایک جیب کترنے والا چور کبھی اُس آدمی سے اجازت نہیں مانگتا جس کی وہ جیب کاٹتا ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو" اس نے بیباکی سے جواب دیا۔ "ابیناش آؤ ہم دونوں اپنی چھوٹی سی کانفرنس علیحدہ کریں۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

کچھ دنوں کے بعد میرے شوہر نے میری موجودگی میں اُس سے پوچھا کہ کیا وہ کسی شریف خاندان کی کسی ایسی لڑکی سے واقف ہے جو یہاں آکر امور خانہ داری میں اُس کی امداد کر سکے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں کسی قسم کی امداد کی محتاج نہ تھی۔ میں خاموش رہی۔

"اوہ! ایسی ہزاروں لڑکیاں ہیں" اُسکی خالہ نے جواب دیا۔ "میرے رشتہ کے ایک بھائی کی ایک لڑکی ہے جو بالکل شادی کے قابل عمر رکھتی ہے اور بالکل اتنی ہی اچھی ہے جتنی کہ تم چاہتے ہو۔ اس کے والدین تمہیں اس کا شوہر بنا دینے پر حد سے زیادہ خوش ہونگے"

ایک بار پھر اُس نے ذہنی جبری اور ہچکچاتی ہوئی ہنسی کا مظاہرہ کیا اور بولا ــــ "لیکن میں نے شادی کا تذکرہ نہیں کیا۔"

"لیکن" اس کی خالہ نے پوچھا "تم اچھے گھرانے کی لڑکی سے یہ امید کیسے کر سکتے ہو کہ وہ شادی کے بغیر آکر تمہارے گھر میں بیٹھیگی"

اس کو تسلیم کرنا پڑا کہ یہ بات معقول تھی اور گھبراہٹ کے عالم میں خاموش رہا۔

جب وہ چلا گیا تو میں اپنے اندھے پن کے بند دروازوں کے اندر تنہا کھڑی ہوگئی اور اپنے خدا کو پکار کر دعا کی ــــ "اے خدا! میرے شوہر کی حفاظت کر!"

چند روز کے بعد جب ایک دن میں اپنے گھر کے مندر میں صبح کی پوجا کر کے واپس آرہی تھی۔ اس کی خالہ نے میرے دونوں ہاتھوں کو گرمجوشی سے پکڑ لیا۔

وہ بولی ــــ "کوموا ــــ لو یہ وہ لڑکی ہے جس کی بابت ہم اس دن باتیں کر رہے تھے۔ اس کا نام ہمانجنی ہے۔ تم سے مل کر اسے بڑی خوشی ہوگی ــــ ہمو! یہاں آؤ اور اپنی بہن سے ملو۔"

اسی لمحہ میرا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ اجنبی لڑکی کو دیکھ کر اُس نے حیرت کا جھوٹا اظہار کیا اور واپس جانے والا تھا کہ اس کی خالہ نے کہا ــــ "ابیناش! تم بھاگے کیوں جا رہے ہو؟ یہ میرے بھائی کی لڑکی ہمانجنی ہے تم سے ملنے آئی ہے۔ ہمو! ان کو پرنام کرو۔"

بالکل اس طرح گویا یہ چیز اس کیلئے غیر متوقع تھی وہ اپنی خالہ سے اس لڑکی کی آمد کی بابت سوالات کرنے لگا ــــ کب؟ ــ کیوں؟ ــ کیسے؟"

میں نے اس پورے منظر کے تصنع کو محسوس کیا اور ہمانجنی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ذاتی کمرے میں لے آئی۔ میں نے نرمی کے ساتھ اس کے چہرے، بازوؤں، اور بالوں پر تھپکی دی اور اندازہ لگا لیا کہ اسکی عمر تقریباً پندرہ سال تھی ــــ اور وہ بہت خوبصورت تھی۔ جب میں نے اس کے چہرے کو چھوا تو وہ

ایکدم ہنس پڑی اور بولی ——" ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ کیا آپ مجھ پر جادو کر رہی ہیں؟"

اس کی اس شیریں اور مترنم ہنسی نے ایک ساعت میں وہ تمام کالے بادل ہٹا دئے جو ہمارے درمیان حائل تھے۔ میں نے اپنا داہنا بازو اس کی گردن میں حائل کر دیا۔

"اچھی بہن،" میں نے کہا۔" میں تمہیں دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں" —— اور یہ کہتے ہوئے میں نے پھر اپنے بائیں ہاتھ سے اس کے نرم چہرے پر تھپکی دی۔

"مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو؟" اس نے ایک نیا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔" تو کیا میں تمہارے باغ میں پیدا ہونے والے بناسپتی گودے کی مانند ہوں جسے تم چھو کر دیکھنا چاہتی ہو کہ کتنا نرم ہے؟"

یکایک مجھے خیال آیا کہ اسے یہ علم نہیں کہ میں اپنی آنکھوں سے محروم ہوں۔

"بہن! میں اندھی ہوں"۔ میں نے کہا۔

وہ خاموش رہی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی بڑی بڑی نوجوان آنکھیں حیرت سے لبریز تھیں اور غور سے میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ اس کی نگاہیں رحم و ہمدردی سے معمور تھیں —— اور اس کے بعد وہ متفکر اور پریشان ہو گئی اور ایک مختصر وقفہ کے بعد بولی:——

"اوہ! —— اب میں سمجھی —— یہی وجہ ہے کہ تمہارے شوہر نے اپنی خالہ کو یہاں آنے اور قیام کرنے پر مدعو کیا ہے"۔

"نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔" تم بالکل غلطی پر ہو۔ اُس نے اس کو نہیں بلایا۔ وہ خود اپنی مرضی سے آئی ہے"۔

ہماتجنی نے ایک مترنم قہقہہ بلند کیا ——

"یہ بات بالکل خالہ کی فطرت کے مطابق ہے"۔ اس نے کہا۔" کیا بغیر بلائے چلے آنا اس کے لئے نامناسب نہ تھا؟ —— لیکن اب وہ آچکی ہے اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ کچھ دنوں تک تم اُسے یہاں سے رخصت نہ کر سکو گی!"

اس کے بعد وہ رک گئی اور پریشان معلوم ہونے لگی۔

"لیکن پتاجی نے مجھے کیوں بھیجا ہے؟" اُس نے پوچھا۔" کیا یہ بات تم بتا سکتی ہو؟"

ہماری اس گفتگو کے دوران میں خالہ کمرے میں آچکی تھی۔ ہماتجنی نے اُس سے کہا۔" یہاں سے جانے کا کب خیال ہے پھوپھی؟"

خالہ بہت کچھ گھبرائی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔

"بھلا یہ بھی کوئی سوال ہے؟" اس نے کہا۔" میں نے تم جیسا بیتاب انسان کبھی نہیں دیکھا۔ ہم ابھی ابھی تو آئے ہیں اور تم پوچھتی ہو کہ کب واپس چلو گی؟؟"

"تمہارے واسطے تو یہ سب کچھ بالکل مناسب ہے"۔ ہماتجنی نے کہا۔" کیونکہ یہ گھر تمہارے قریبی رشتہ داروں کا ہے۔ لیکن میری بابت کیا ہوگا؟ —— میں تم سے صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتی"۔

اور اس کے بعد اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا —" کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے اُسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور کچھ نہ کہا۔ خالہ بڑی مشکل میں تھی۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ موقعہ اُس کے قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے اس نے تجویز کی کہ وہ اور ہماتجنی ایک ساتھ اشنان کیلئے چلیں

"نہیں! —— ہم دونوں ساتھ جائینگے"۔ ہماتجنی نے مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔ خالہ راضی ہو گئی صرف اس خوف سے کہ اگر اُس نے ہماتجنی کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو وہ مخالفت کریگی۔

ندی کی طرف جاتے ہوئے ہماتجنی نے مجھ سے پوچھا —" تمہارے اولاد کیوں نہیں ہوتی؟"

میں اس کے سوال پر چونک پڑی اور جواب دیا ——" بھلا یہ بات میں کیسے بتا سکتی ہوں؟ بھگوان نے مجھے کوئی اولاد نہیں دی —— یہی وجہ ہے"۔

"نہیں —— یہ وجہ نہیں"۔ ہماتجنی نے عجلت سے کہا۔" تم نے ضرور کوئی پاپ کیا ہے۔ ذرا خالہ کو ہی دیکھو۔ اس کے کوئی اولاد نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اُس کا دل ضرور کوئی بُرائی رکھتا ہے۔ لیکن تمہارے دل کے اندر کونسی بُرائی چھپی ہے؟"

ان الفاظ سے مجھے صدمہ ہوا۔ بُرائی اور بدی کے مسئلہ کا میرے پاس کوئی حل نہ تھا کہ پیش کروں۔ میں نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا اور اپنی روح کی خاموشی کے ذریعہ کہا۔

"میرے خدا! —— تو ہی اصلی وجہ جانتا ہے"۔

"ارے توبہ!" ہماتجنی بولی۔" تم ٹھنڈے سانس کس لئے لے رہی ہو؟ میری باتوں کو تو کوئی بھی سنجیدگی کی روشنی میں نہیں دیکھتا"۔

اور اس کا مترنم قہقہہ دریا کو پار کرتا چلا گیا۔

(۵)

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے شوہر کے پیشے کے فرائض میں مستقل طور پر حرج واقع ہونے لگا۔ وہ ہر اُس طلبی کو جو کسی دور مقام سے ہوتی انکار کر دیتا اور اپنے مریضوں کے پاس سے عجلت کے ساتھ واپس آجاتا خواہ وہ بالکل قریب ہی کیوں نہ ہوتے۔

اس سے پہلے ایسا صرف دوپہر کے کھانے پر یا رات کے وقت ہوتا تھا کہ اُسے اندرونی کمرے میں آنے کی فرصت ملتی تھی لیکن اب اپنی خالہ کی راحت رسانی کے غیر ضروری فکر

کیلئے وہ دن میں ہر وقت اس سے ملنے آتا جب اس کی خالہ بھانجی کو پکار کر ایک گلاس پانی لانے کیلئے کہتی تو میں فوراً سمجھ جاتی کہ میرا شوہر اس کے کمرے میں آیا ہے۔ شروع شروع میں تو لڑکی سے جو کچھ کہا جاتا اس کی تعمیل کر لیتی تھی لیکن بعدہٗ اُس نے قطعی انکار کرنا شروع کر دیا۔

تب خالہ محبت بھری آواز میں پکارتی۔

"ہمو! ــــ ہمو! ــــ بھانجی!" ــــ لیکن یہ لڑکی ترحم کے ایک بے اختیار جذبہ کیساتھ مجھ سے لپٹ جاتی۔ خوف اور غم کا ایک احساس اُسے خاموش رکھتا۔ کبھی کبھی وہ اس طرح ڈر کر میرے پاس آ جاتی جیسے وہ کوئی آسیب زدہ ہستی ہے جسے بہ مشکل ہی یہ علوم ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔

اس زمانے میں میرا بھائی مجھ سے ملنے کیلئے کلکتہ سے آیا۔ میں جانتی تھی کہ اس کی مشاہدہ کی قوتیں کسقدر تیز تھیں اور وہ کسقدر زود فہم و انصاف پرست تھا۔ مجھے خوف تھا کہ میرے شوہر کو اپنی صفائی پیش کرنی پڑیگی اور میرے بھائی کی باز پرس پر اپنی حالت کی توجیہہ کرنا ہوگی۔ اسلئے میں نے حالات کی اصلیت کو چھپانے کے واسطے بلند ہمتی اور خوش طبعی کا نقاب ڈالنا چاہا۔ لیکن مجھے خوف تھا کہ میں نے اس میں قدرے مبالغہ سے کام کیا ــــ یہ چیز میرے لئے غیر فطری بن گئی۔

میرا شوہر علانیہ طور پر بے چینی کا اظہار کرنے لگا۔ اور مجھ سے پوچھا کہ میرا بھائی کتنے دن قیام کریگا۔ آخر کار اس کی بے صبری اہانت کے قریب پہنچ گئی اور میرے بھائی کے لئے سوائے چلے جانے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ جانے سے پہلے اس نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھدیا اور کچھ دیر تک یوں ہی رکھے رہا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا ــــ اور جب اس نے خاموشی کیساتھ مجھے دعا دی تو اسکی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک پڑا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اپریل کی ایک شام تھی اور بازار لگنے کا دن تھا۔ جو لوگ بستی میں آئے تھے وہ بازار سے واپس جا رہے تھے۔ ہوا میں ایک آنے والے طوفان کا احساس ہوتا تھا۔ بھیگی ہوئی زمین کی خوشبو اور ہوا میں ملی ہوئی تھی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ میں اپنی خوابگاہ میں کبھی ایک جلتی ہوئی شمع نہیں رکھتی خصوصاً اس وقت جبکہ میں تنہا ہوتی ہوں۔ کیونکہ مجھے یہ خوف ہوتا ہے کہ مبادا میرے کپڑوں میں آگ لگ جائے یا کوئی حادثہ واقع ہو جائے۔ میں اپنے اندھیرے کمرے میں فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی اندھی دُنیا کے خدا کو پکارا۔

"اے میرے مالک!" میں نے کہا۔

"تیری صورت پوشیدہ ہے۔ میں نہیں دیکھ سکتی۔ میں اندھی ہوں۔ میں اپنے دل کی کشتی کے ٹوٹے ہوئے پتوار مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوں یہاں تک کہ میرے ہاتھوں سے خون بہہ نکلا ہے۔ اب طوفان کی لہریں میرے واسطے حد سے زیادہ طاقتور ہو چکی ہیں تو کبتک مجھے آزمائیگا ــــ میرے خدا ــــ آخر کب تک؟"

میں چارپائی کی پٹی پر اپنے سر کو بے حس و حرکت رکھے رہی اور رونے لگی۔ ٹھیک اسی وقت مجھے چارپائی قدرے ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دوسرے ہی لمحہ میں بھانجی میرے پہلو میں آ چکی تھی۔ وہ میرے گلے سے لپٹ گئی اور خاموشی کے ساتھ میرے آنسو پونچھ دیئے۔ مجھے علم نہیں کہ وہ اس شام کو اندرونی کمرے میں کیوں رُکی رہی تھی یا اس نے جبکہ شام کے وقت کیوں لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اُس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس نے صرف میری پیشانی پر اپنا سرد ہاتھ رکھدیا اور مجھے پیار کیا ــــ اور چلی گئی۔

دوسرے ہی روز صبح بھانجی نے میری موجودگی میں خالہ سے کہا ــــ "اگر آپ ٹھہرنا چاہتی ہیں تو آپ ٹھہر سکتی ہیں۔ لیکن میں نہیں رُک سکتی۔ میں اپنے گھر کے ملازم کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

خالہ نے کہا کہ اُسے تنہا جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ خود بھی جا رہی تھی۔ اس کے بعد اُس نے مسکراتے ہوئے اور پُرمعنی انداز میں ایک مخملی ڈبیا سے ایک انگوٹھی نکالی جس پر موتی جڑے ہوئے تھے۔

"دیکھو ــــ ہمو!" اس نے کہا "میرا اویناش تمہارے واسطے کیسی اچھی انگوٹھی لایا ہے۔"

بھانجی نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی چھین لی۔

"دیکھو ــــ پھوپھی" اس نے تیزی سے جوابدیا "ذرا دیکھو میرا نشانہ کتنا عمدہ ہے۔"

اور یہ کہتے ہوئے اس نے انگوٹھی کو کھڑکی کے باہر تالاب میں پھینک دیا۔

انتہائی دہشت۔ پریشانی۔ اور تعجب کے عالم میں ایک خار پشت کی طرح خالہ کے روئیں کھڑے ہو گئے۔ وہ میری طرف مڑی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کومو!" اس نے بار بار دہرایا "اویناش سے اس طفلانہ حماقت کی بابت ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ وہ خوفناک حد تک پریشان ہوگا۔"

میں نے اُسے یقین دلا دیا کہ اُسے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی اُس تک نہ پہنچے گا۔

اگلے دن اپنے گھر روانہ ہونے سے پہلے بھانجی نے مجھے گلے سے لگایا اور کہا ــــ "پیاری سہیلی! مجھے اپنے دل میں رکھنا ــــ بھول نہ جانا۔"

میں نے اس کے چہرے کو بار بار اپنی انگلیوں سے پیار کیا اور کہا ــ "بہن! اندھے آدمیوں کی قوت حافظہ بہت قوی ہوتی ہے۔"

میں نے اس کا سر اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کے بالوں اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ میری دنیا اچانک دھندلی ہو گئی تھی۔ جب بھانجی چلی گئی تو وہ تمام خوبصورتی، ہنسی اور نازک جوانی جو مجھ سے اسقدر قریب رہی تھی غائب ہو گئی۔ میں چاروں طرف ٹٹولتی ہوئی جا رہی تھی ــ اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ــ اور یہ ڈھونڈھنے کے لئے کہ میری برباد دنیا میں اب کیا باقی رہ گیا ہے۔

کچھ دیر بعد میرا شوہر اندر آیا۔ اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ان کے چلے جانے پر وہ بڑی راحت محسوس کر رہا ہے ــ لیکن اس کا یہ اظہار مبالغہ آمیز اور ظاہر دارانہ تھا۔ اس نے یہ ظاہر کرنا چاہا کہ اس کی خالہ کی آمد نے اسے اس کے کام سے دور کر دیا تھا۔

اب تک میرے شوہر اور میری بہن کے درمیان صرف اندھے پن کی ایک دیوار حائل رہی تھی۔ لیکن اب ایک اور دیوار کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور وہ یہ کہ بھانجی کے بارے میں وہ ارادی طور پر سکوت اختیار کئے ہوئے تھا۔ وہ انتہائی لاپروائی کا اظہار کرتا تھا لیکن مجھے علم تھا کہ وہ اس لڑکی کی بابت خط و کتابت کر رہا تھا۔

مئی کے مہینے کا آغاز تھا۔ ایک دن صبح میری خادمہ میرے کمرے میں داخل ہوئی اور بولی ــ "ندی کے گھاٹ پر یہ تمام تیاریاں کیوں ہو رہی ہیں؟ ہمارا مالک کہاں جا رہا ہے؟"

میں جانتی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ لیکن میں نے خادمہ سے کہا ــ "میں نہیں بتا سکتی۔"

خادمہ کو مجھ سے اور زیادہ سوالات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور چلی گئی۔

اس دن بہت رات گئے میرا شوہر میرے پاس آیا۔ "مجھے گاؤں میں ایک مریض کو دیکھنا ہے" وہ بولا۔ "مجھے کل صبح سویرے روانہ ہو جانا پڑیگا اور ممکن ہے دو یا تین دن تک مجھے باہر رہنا پڑے۔"

میں اپنی چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور بلند آواز سے بولی ــ "تم مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟"

میرے شوہر نے لکنت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے ــ میں نے کون سا جھوٹ تم سے بولا ہے؟"

میں نے کہا: "تم شادی جا رہے ہو۔"

وہ خاموش رہا۔ چند لمحات تک کمرے میں کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ تب میں نے مہر خاموشی کو توڑا۔ "جواب دو" میں نے چلا کر کہا۔ "کہو ــ ہاں!"

اس نے جواب دیا ــ "ہاں!" ــ بالکل ایک ضعیف آواز بازگشت کی طرح۔

میں نے بلند آواز سے چلا کر کہا ــ "نہیں! ــ میں ہرگز تمہیں اجازت نہ دونگی ــ میں تمہیں اس زبردست تباہی سے ــ اس بھیانک پاپ سے ــ بچاؤں گی۔ اگر میں اس میں فروگذاشت کرونگی تو پھر میں تمہاری بیوی ہی کیسے ہوئی اور میں نے خدا کی پرستش ہی کیوں کی؟"

کمرہ ایک پتھر کی طرح خاموش رہا۔ میں فرش پر گر پڑی۔ اور اپنے شوہر کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "میں نے کیا قصور کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "میں نے کونسی کمی کی ہے؟ مجھے سچ سچ بتا دو۔ تم دوسری بیوی کیوں چاہتے ہو؟"

میرے شوہر نے آہستہ سے کہا ــ "میں تمہیں حقیقت بتاتا ہوں۔ میں تم سے خوفزدہ ہوں۔ تمہارے اندھے پن نے تمہیں اپنے قلعے میں بند کر دیا ہے اور اب مجھے کوئی دروازہ نہیں ملتا میرے واسطے اب تم ایک عورت نہیں رہی ہو۔ تم میرے دیوتا کی طرح ایک مرعوب کن چیز بن گئی ہو۔ میں اپنی روزانہ زندگی تمہارے ساتھ نہیں بسر کر سکتا۔ میں ایک عورت چاہتا ہوں ــ محض ایک معمولی عورت ــ جس کو میں جب چاہوں سرزنش کروں اور جب چاہوں بہلاؤں مناؤں ــ جیسے چاہوں پیار کروں اور جس طرح چاہوں سخت و سست کہوں۔"

آہ! ــ میرا دل چیر ڈالو اور دیکھو ــ میں ایک عورت کے علاوہ اور ہوں ہی کیا۔ ــ محض ایک معمولی عورت! ــ میں تو ابھی تک وہی لڑکی ہوں جو اپنی شادی کے نئے نئے دنوں میں تھی ــ وہی لڑکی جو ابھی تک یقین و رازداری اور پرستاری کی تمام ضرورتوں سے آزاد نہیں ہوئی۔

مجھے یاد نہیں کہ ٹھیک ٹھیک میں نے کیا الفاظ ادا کئے۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے کہا ــ "اگر میں ایک سچی بیوی ہوں تو خدا گواہ ہے کہ تم کبھی یہ ذلیل کام نہ کرنے پاؤ گے ــ تم کبھی اپنی قسم اور عہد کو نہیں توڑنے پاؤ گے۔ اس سے پہلے کہ تم یہ گھناؤنا پاپ کرو خدا کرے کہ میں بیوہ ہو جاؤں یا پھر بھانجی مر جائے۔"

اس کے بعد میں بیہوشی کی حالت میں فرش پر گر پڑی۔ جب مجھے ہوش آیا تو ابھی تک رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ پرندے خاموش تھے۔ میرا شوہر جا چکا تھا۔

اس روز دن بھر میں اپنے خاندانی مندر کی خلوت میں پوجا کرتی رہی۔ شام کے وقت ایک خوفناک طوفان، بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج اور بارش کی بوچھاروں کے ساتھ مکان پر نازل ہوا اور اسے ہلا دیا۔ میں نے مندر میں اپنے سر کو جھکا دیا لیکن میں نے

اپنے دیوتا سے یہ دعا نہ مانگی کہ میرا شوہر طوفان سے محفوظ رہے حالانکہ وہ اسوقت دریا کے اوپر خطرناک حالت میں ہوگا۔ میں نے تو یہ دعا کی کہ خواہ مجھ پر کچھ ہی آفت نازل ہو مگر میرا شوہر اس زبردست گناہ سے محفوظ رہے۔

رات گذر گئی۔ دوسرا پورا دن میں نے برآمدے میں بیٹھے ہوئے گذار دیا۔ شام کے وقت دروازے پر کھٹکھٹانے اور بلانے کی آواز آئی۔ جب دروازہ توڑ کر کھولا گیا تو لوگوں نے مجھے فرش پر بیہوش پڑا ہوا پایا اور مجھے اٹھا کر کمرے میں لے گئے۔

جب آخر کار میں ہوش میں آئی تو میں نے کسی کو اپنے کان میں کہتے سُنا ــــ "بہن"

میں نے معلوم کیا کہ میں اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی اور میرا سر سماجنی کے آغوش میں تھا۔ میں نے اپنے سر کو جنبش دی تو مجھے اس کے لباس کی سرسراہٹ سنائی دی۔ یہ سرسراہٹ عروسی ریشمیں پوشاک کی سی تھی۔

آہ میرے خدا! ــــ میرے خدا!! ــــ میری دُعا قبول نہیں ہوئی! ــــ میرا شوہر گناہ کی پستی میں گر گیا!

سماجنی نے اپنا سر نیچے جھکا دیا اور ایک شیریں سرگوشی میں کہا ــــ "عزیز ترین بہن! ــــ میں اپنی شادی پر تمہاری دعائیں لینے آئی ہوں"۔

میرا تمام جسم اس درخت کے تنہ کی طرح سخت ہوگیا جس پر بجلی گر پڑی ہو۔ اس کے بعد میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور قلبی اذیت کے عالم میں زبردستی بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ــــ "ہاں میں تمہیں آخر کیوں دعائیں نہ دوں؟ ــــ تم نے کوئی غلطی نہیں کی ہے"۔

سماجنی نے اپنا مسرور قہقہہ بلند کیا۔

"غلطی!" وہ بولی "جب تم نے شادی کی تو صحیح تھی اور جب میں شادی کرتی ہوں تو تم اسے غلطی کہتی ہو!"

اس کی ہنسی کے جواب میں میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا ــــ "میری دعا اس دُنیا میں آخری چیز تو نہیں ہے۔ خدا کی مرضی ہی سب کچھ ہے۔ میرے سر پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو خوشی سے ہو لیکن کاش خدا کے اندر میرے ایمان اور میری امید کو کوئی چھو نہ سکے"۔

سماجنی میرے سامنے جھک گئی اور میرے قدموں کو چھوا ــــ "خدا کرے تم خوش رہو" میں نے اُسے دُعا دیتے ہوئے کہا۔ "اور خدا کرے تمہاری مسرتوں میں کبھی کوئی خلل واقع نہ ہو"۔

سماجنی پھر بھی غیر مطمئن تھی۔

"پیاری بہن!" اس نے کہا "تمہاری دعا صرف میرے واسطے کافی نہیں۔ تمہیں ہماری خوشی کو مکمل کرنا ہوگا۔ اپنے متبرک ہاتھوں سے تم اپنے گھر میں میرے شوہر کو قبول کرو۔ مجھے اجازت دو کہ اُسے تمہارے پاس لاؤں"۔

میں نے کہا ــــ "ہاں اسے میرے پاس لے آؤ"۔

چند لمحات کے بعد مجھے قدموں کی ایک مانوس آواز سنائی دی اور اس کے بعد یہ سوال ــــ

"کوسمو! کہو، کیسی طبیعت ہے؟"

میں چونک کر کھڑی ہوگئی اور زمین پر جھک گئی اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا "بھیا!"

سماجنی نے ایک قہقہہ لگایا۔

"تم اب تک اسے اپنا بڑا بھائی کہتی ہو؟" اس نے پوچھا "یہ کیا واہیات بات ہے! ــــ تم اسے اب اپنا چھوٹا بھائی کہو اور اس کے کان پکڑ کر پریشان کرو کیونکہ اس نے مجھ سے شادی کی ہے ــــ تمہاری چھوٹی بہن سے"۔

اب میں سب کچھ سمجھ گئی۔ میرا شوہر اس زبردست گناہ سے بچ گیا تھا۔ وہ پستی میں نہیں گرا تھا۔ مجھے علم تھا کہ میرے بھائی کا شادی کرنے کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ پھر جب سے میری ماں مر گئی تھی میرے بھائی کو شادی پر مائل کرنے کیلئے کسی کی متبرک خواہش باقی نہ رہی تھی۔ لیکن آخر کار میں نے ــــ میری تکلیف انگیز ضرورت نے یہ کام پورا کر دیا تھا۔ اس نے صرف میری وجہ سے شادی کرلی تھی۔

مسرت کے آنسو میری آنکھوں سے اُبل پڑے اور میرے رخساروں پر بہنے لگے۔ میں نے کوشش کی مگر آنسوؤں کو نہ روک سکی بھائی آہستہ آہستہ میرے بالوں کے درمیان اپنی انگلیاں گذار رہا تھا۔ سماجنی مجھ سے لپٹ گئی۔ اور ہنسنے لگی۔

رات کے زیادہ حصے تک میں اپنی چارپائی پر بیدار پڑی رہی اور ایک بڑھنے والی تشویش کے ساتھ اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ میں یہ تصور نہ کر سکتی تھی کہ وہ ندامت اور مایوسی کے اس زبردست جھٹکے کو کیسے برداشت کرے گا۔

جب آدھی رات کے بعد کافی وقت گذر چکا تو آہستہ آہستہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ میں اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور سُننے لگی۔ وہ میرے شوہر کے قدموں کی آواز تھی۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ میری چارپائی کے پاس آیا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ بولا ــــ "تمہارے بھائی نے مجھے تباہی سے بچا لیا۔ ایک ایک لمحہ دیوانگی مجھے نیچے گھسیٹتی ہوئی لئے جا رہی تھی۔ ایک حماقت نے مجھے جکڑ لیا تھا جس سے رہائی پانا مجھے اپنی طاقت سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اُس دن جب میں کشتی پر سوار ہوا تو میرے دل میں کتنا بوجھ تھا۔ طوفان دریا پر نازل ہوا اور آسمان کو اپنے آغوش میں چھپا لیا۔ اپنے تمام خوف وہراس کے

(باقی صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ ہو)

ہم تم

از جناب مجیب خیر آبادی

وہ دن بھی یاد ہیں جب بے حجاب تھے ہم تم

بساطِ عیش کے ساز و رباب تھے ہم تم
رہینِ لذتِ کیف و شراب تھے ہم تم
ہنوز بے خبرِ انقلاب تھے ہم تم
کتابِ عشق کا رنگین باب تھے ہم تم
شباب اور سراپا شباب تھے ہم تم
وہ دن بھی یاد ہیں جب بے حجاب تھے ہم تم

حیاتِ شوق کے نقش و نگار بن کے رہے
کبھی چمن میں عروجِ بہار بن کے رہے
لطافتوں کا مکمل جواب تھے ہم تم
نگاہِ مست میں کیف و خمار بن کے رہے
کبھی سحاب میں برق و شرار بن کے رہے
وہ دن بھی یاد ہیں جب بے حجاب تھے ہم تم

سکوتِ کوہ میں وہ آبشار کے نغمے
وہ مطربِ چمن روزگار کے نغمے
سرور و نغمۂ سازِ شباب تھے ہم تم
وہ طوطیوں کا ترنم، ہزار کے نغمے
زبانِ گل سے نقیبِ بہار کے نغمے
وہ دن بھی یاد ہیں جب بے حجاب تھے ہم تم

کلی کلی کی تبسم کی آرزو بن کر
ہر ایک غنچۂ نورس کی آبرو بن کر
رگِ حیات میں روحِ شباب تھے ہم تم
گلوں میں پردۂ اعجازِ رنگ و لو بن کر
زمینِ باغ میں پنہاں رہے نمو بن کر
وہ دن بھی یاد ہیں جب بے حجاب تھے ہم تم

شباب و حسن کی رنگینیٔ نمو کی قسم
فضائے گلشنِ رنگیں، کنارِ جو کی قسم
نسیم و نکہت و روحِ گلاب تھے ہم تم
رگِ چمن میں جو رقصاں ہے اس لہو کی قسم
نسیم و نکہت و طغیانِ رنگ و بو کی قسم
وہ دن بھی یاد ہیں جب بے حجاب تھے ہم تم

پیامِ عیش زمانہ کسے سناتا تھا
یہ مہر کس کے لئے دن کو جگمگاتا تھا
بنائے حسنِ مہ و آفتاب تھے ہم تم
فلک کو کس کے ترانوں سے وجد آتا تھا
یہ چاند کس کیلئے شب کو مسکراتا تھا
وہ دن بھی یاد ہیں جب بے حجاب تھے ہم تم

نسیمِ صبح کے جھونکے جو گدگداتے تھے
مرے اٹھانے کو تم بیقرار آتے تھے
نگاہِ حسن کا رنگین خواب تھے ہم تم
وفورِ شوق میں نغمے طیور گاتے تھے
میں مستِ خواب نہ اٹھتا تو روٹھ جاتے تھے
وہ دن بھی یاد ہیں جب بے حجاب تھے ہم تم

دلوں میں گرمیٔ الفت تھی جوشِ بیہم بھی
رخِ حیات پہ تھی زلفِ عیش برہم بھی
جہاں میں پیکرِ صد اضطراب تھے ہم تم
اک اضطراب کی دنیا تھی چشمِ پرنم بھی
نظر کے سامنے تھی ہیچ بزمِ عالم بھی
وہ دن بھی یاد ہیں جب بے حجاب تھے ہم تم

حیاتِ عشق کی رنگینیوں میں ڈوبی تھی
شراب و شعر کی دلچسپیوں میں ڈوبی تھی
سرور و کیف کی بدمستیوں میں ڈوبی تھی
بہارِ عیش کی شادابیوں میں ڈوبی تھی

غرض کہ عشرتِ رنگیں کا خواب تھے ہم تم
وہ دن بھی یاد ہیں جب بے حجاب تھے ہم تم

فردوسہ

فنِ سراغرسانی کا ایک بیحد دلچسپ بلا کا سنسنی خیز اور سچا "افسانہ"

از جناب فروغ

مست قلندر کے مایۂ ناز افسانہ نگار جناب فروغ لکھنوی نے یہ افسانہ 'جرم وسراغ نمبر' کے لئے بھیجا تھا لیکن دیر میں موصول ہونے کے باعث اس میں اشاعت پذیر نہ ہوسکا۔ لہٰذا اسے اب شائع کیا جارہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین کرام تین بہترین انعامی افسانوں کی جانچ کرتے وقت 'فردوسہ' کو نظر انداز نہیں کریںگے۔ (ایڈیٹر)

"ایک گنجان شہری آبادی میں جولائی کا مہینہ کسی طرح موجب سکون نہیں ہوتا۔ جبتک کہ راحم مطلق اپنی فیاضی کے ہاتھوں آبرِ رحمت سے اپریل، مئی اور جون کی تشنہ لب زمین کی پوری طرح پیاس نہ بجھادے۔ ہم لوگوں پر بارانِ رحمت کا نزول ہوچکا تھا۔ سرد شمیم آگیں ہوائیں چل رہی تھیں۔ گو دن کے ۹ بج چکے تھے۔ مگر آفتاب ابر کے بھاری پردہ میں اپنا رخِ زیبا چھپائے ہوئے تھا۔ میں اپنے مختصر باغیچہ میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا کہ اخبار لے جایئے، کی آواز نے مجھے چونکا دیا میں بیرونی برآمدہ میں پہنچا۔ آج اخبار بہت دیر میں وصول ہوا تھا اور میں اخبار والے کو اس تاخیر پر ملامت کرنا چاہتا تھا۔ مگر اخبار والے کا پتہ نہ تھا ——— "نظارہ صبح" میز پر پڑا ہوا تھا۔ اخبار کے پہلے کالم کی سرخی میرے لئے کچھ اسقدر جاذب نظر تھی کہ میں کرسی پر بیٹھنے کے ارادہ کو قطعی طور پر فراموش کرگیا۔ اور سرخی کے نیچے لکھی ہوئی خبر کو باندازِ مضطربانہ پڑھنے لگا۔ ہاں یہ بتادینا میرے لئے ضروری ہے کہ میں ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر ہوں اور آج کل خاموش زندگی بسر کررہا ہوں۔ مگر دلچسپی کے لئے اکثر اہلِ غرض حضرات کو امکانی مدد دیتا ہوں۔ یعنی بسلسلۂ چوری یا قتل واقعات معلوم ہو جانے پر اپنی دماغی مشین کے ماؤف پرزوں پر زور ڈال کر کسی نتیجہ پر پہونچنے کوشش کرتا ہوں اور بسا اوقات وہ نتائج صحیح ہوتے ہیں۔

"نظارہ صبح" کی خبر مندرجہ ذیل ہے۔

"مسٹر یوسف بیرسٹر کے یہاں سنسنی خیز چوری"

ہمارے خاص رپورٹر نے ابھی یہ مستند خبر دی ہے کہ مسٹر یوسف بیرسٹر کے مکان میں چوری ہوگئی۔ سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ اُن کی تجوری کا قفل توڑا نہیں گیا بلکہ کھولا گیا ہے۔ مالِ مسروقہ میں اس وقت تک صرف ۵۵۰ روپیہ اور ان کی مرحومہ بیوی کی ایک طلائی انگشتری کی اطلاع ملی۔ تفصیلات کا انتظار ہے۔

مسٹر یوسف میرے ایک دیرینہ کرمفرما تھے۔ یہ خبر پڑھ کر میں بے چین ہوگیا اور جلدی جلدی اپنا ضروری سامان لے کر بذریعہ سائیکل اُن کی کوٹھی کو روانہ ہوا۔ وہ کمرۂ دفتر میں بیٹھے ہوئے کسی مثل مقدمہ کو سامنے رکھے اپنے منشی کو کچھ سمجھا رہے تھے۔ میرے حرکاتِ قدم نے انہیں جھکی ہوئی مصروف نگاہیں اُٹھانے پر مجبور کیا۔ وہ میری آمد پر مسرور و متعجب ہوتے ہوئے فرمانے لگے: "خوب آپ وقت پر آئے۔ میں ابھی آپ کو ٹیلیفون کرنے ہی والا تھا"

میں: "جی ہاں۔ آج 'نظارۂ صبح' کی خبر نے مجھے بے چین کردیا۔ اور بخیالِ استفسار حالات و امدادِ امکانی خود حاضر ہوگیا۔"

"شکریہ شکریہ، تشریف رکھئے۔ میں ابھی مثل ختم کرکے آپ پر تمام واقعات ظاہر کرتا ہوں۔"

"کیا بہتر نہ ہوگا کہ میں اس اثنا میں موقعۂ واردات کا معائنہ کرلوں۔"

"بالکل ٹھیک ہے میں ابھی انتظام کرائے دیتا ہوں"

جائے واردات کمرۂ خواب تھا جس میں ایک دروازہ اور تین کھڑکیاں تھیں۔ تینوں کھڑکیاں صحنِ باغ کی جانب کھلتی تھیں کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ہر ایک سلاخ کو باری باری ہلاکر دیکھا مگر کسی نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔ ادھر سے مطمئن ہوکر کمرہ کی دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہوا۔ مگر کوئی خاص بات سمجھ میں نہ آئی۔ کمرہ میں دری بچھی تھی۔ پاؤں کے نشانات بھی نہ پاسکا۔ مسٹر یوسف کے ڈرائیور سے جو میری رہبری کی غرض سے آیا تھا سوالات کرنے پر معلوم ہوا کہ پولیس میرے آنے سے قبل بغرضِ تحقیقات آچکی ہے۔ جلے ہوئے

سگار کے تین ٹکڑے اور ایک کثیف رومال جس پر حرف (N) کڑھا ہوا ہے اُسے ملا۔ وہ ان کو اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ یہ معلوم کر کے کہ میرے آنے سے قبل پولیس آچکی ہے اور ہر چیز کا معائنہ کر کے موقع واردات کے اُن قیمتی سُراغوں کو جو بادی النظر میں نظر نہیں آتے فنا کر چکی ہے۔ مایوس واپس ہوا۔ اس عرصہ میں مسٹر یوسف فرصت پا چکے تھے۔ مجھ سے فرمانے لگے۔

'کہئے آپ کی کیا رائے ہے؟'

'اولاً تو کسی معمولی معاملہ پر بھی میں جلدی رائے قائم نہیں کرتا۔ نہ کہ اس قدر پیچیدہ معاملہ۔ دوم جو کچھ سراغ مل سکتا تھا۔ اس پر پولیس قبضہ کر چکی ہے۔ جی ہاں پولیس کا خیال ہے کہ یہ میرے کسی ملازم کی حرکت ہے۔'

پولیس کے لئے یہ نئی بات نہیں بلکہ بہت پرانی ہے'

'اس کے معنی'

'معنی بالکل صاف ہیں۔ یعنی پولیس کے خیال میں آپ کا کوئی نوکر جو سگار کا اسدرجہ شوقین ہے کہ تجوری کھول کر روپیہ نکالنے کے قلیل عرصہ میں اس نے یکے بعد دیگرے تین سگار پی ڈالے اس کے نام کا پہلا حرف (N) ہے۔ اب کیا رہ گیا۔ اس کو پکڑوا دیجئے اور پانچ منٹ کے اندر رقم اور انگشتری وصول کر لیجئے۔'

'یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ میرا کوئی نوکر سگار تو سگار، سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ مالی اور چوکیدار علیم پیتے ہیں۔ خانساماں اور ڈرائیور کو میں نے کبھی کبھی بیڑی پیتے دیکھا ہے۔ علاوہ ازیں میرے یہاں کوئی ایسا نوکر نہیں جس کے نام کا پہلا حرف (N) ہو۔ پھر کس کو گرفتار کرایا جائے۔'

'یوسف صاحب، میرا اصل مقصد یہ نہ تھا میں تو یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ غالباً پولیس اس نتیجہ پر پہنچے گی۔ ورنہ اصلیت تو جہاں تک میرا خیال ہے۔ کوسوں دُور ہے۔

اچھا چھوڑیئے ان بے سرو پا باتوں کو اور مہربانی فرما کر بتایئے کہ تجوری کی کنجی عموماً کس کے پاس رہتی ہے؟

'سیف کی کنجی ہمیشہ میرے پاس رہتی ہے'

'کیا آپ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں'

'جی نہیں بلکہ ایک پوشیدہ خانہ میں'

'اس خانہ کا آپ کے کسی نوکر کو علم ہے'

'جی نہیں'

'بیگم صاحبہ یا بچوں میں سے کسی کو'

'جہاں تک میرا خیال ہے کوئی نہیں جانتا'

'وہ پوشیدہ خانہ کہاں ہے'

(ادھر اُدھر دیکھ کر مطمئن ہوتے ہوئے)

'اسی کمرہ میں'

'بیگم صاحبہ کے قیمتی زیورات عموماً کہاں رکھے جاتے ہیں'

'پہلے تو وہ اسی تجوری میں رکھے جاتے تھے۔ مگر اکثر ایسا ہوا کہ میں بسلسلہ پیروی مقدمات دو دو ہفتہ تک باہر رہا۔ اور اس عرصہ میں بیگم صاحبہ کو کسی پارٹی یا تقریب میں شریک ہونا پڑا۔ تو زیور نہ ہونے کے سلسلہ میں انہیں سخت تکلیف ہوئی۔ اس لئے اب وہ انہیں اپنے کمرہ میں کسی محفوظ جگہ پر رکھتی ہیں'

'یہ تبدیلی کب سے زیر عمل ہے؟'

'قریب تین ماہ سے'

'اس درمیان میں آپ کبھی باہر تشریف لے گئے'

'جی ہاں متعدد بار اور کئی کئی ہفتوں کیلئے'

'کیا آپ عام طور پر تجوری میں روپیہ رکھتے ہیں'

'صرف جب نا وقت آتا ہے۔ ورنہ عام طور پر تو بنک میں جمع کرا دیتا ہوں'

'آپ کا حساب کس بنک میں ہے۔ اور روپیہ کون جمع کراتا ہے؟'

'امپیریل بنک میں، اور عام طور پر میرا ڈرائیور جمع کراتا ہے'

'اس تین ماہ کے عرصہ میں کیا آپ کے پاس غیر وقت روپیہ نہیں آیا ہے؟'

'یاد نہیں۔ مگر آیا ضرور ہوگا'

'اور اُسے آپ نے تجوری میں بند کیا؟'

'کبھی بند کیا اور کبھی نہیں'

'یہ کیوں؟'

'وجہ یہ ہے کہ جب روپیہ نوٹ کی صورت میں وصول ہوتا ہے تو میں کبھی کبھی سُستی کی بنا پر اپنے آفس بکس میں مقفل کر دیتا ہوں یا اگر ضرورت ہوئی تو اخراجات کے سلسلہ میں بیگم صاحبہ کو دے دیتا ہوں'

'تو میں یہ سمجھ لوں کہ جب روپیہ چاندی کے سکوں میں وصول ہوتا ہے اور بنک میں جمع کرانے کا وقت نہیں ہوتا۔ اور بیگم صاحبہ کو بھی روپیہ کی ضرورت نہیں ہوتی تو آپ اُسے تجوری میں بند کر دیتے ہیں'

'جی ہاں۔ بالکل یہی صورت ہے'

'کل روپیہ کس وقت وصول ہوا؟'

'روپیہ چاندی کے سکوں میں عدالت میں منشی جی نے وصول کیا تھا۔ مقدمہ ذرا جلد ختم ہوگیا۔ منشی جی نے اصرار کیا کہ روپیہ بنک میں جمع کر دیا جائے۔ ہم ابھی کچھ ہی دُور چلے تھے کہ موٹر کا پٹرول ختم ہوگیا۔ ڈرائیور کو پٹرول کی دوکان تک جانے اور پٹرول لانے میں قریب نصف گھنٹہ گزر گیا۔ اس اثنا میں بنک کا وقت ختم ہوگیا۔ مجبوراً ساتھ لانا پڑا اور میں نے بکمال احتیاط اُسے تجوری میں بند کر دیا۔'

'تجوری میں انگوٹھی اور روپیہ کے علاوہ کیا کوئی اور بھی چیز تھی؟'

'جی ہاں اکثر موکلین کی قیمتی دستاویزات میری کچھ اہم یادداشتیں اور ضروری کاغذات کچھ خطوط اور جوابات خطوط۔

"خطوط اور جوابات خطوط ! یہ کیوں ؟"

"میری نظروں میں وہ کائنات سے زیادہ قیمتی ہیں ہوں گے۔ آپ نے ملاحظہ فرمالیا کیا وہ سب چیزیں محفوظ ہیں ؟"

"میرا تو خیال ہے کہ یقیناً محفوظ ہونگی کیونکہ وہ دوسروں کیلئے بیکار ہیں۔"

"ایک مرتبہ میرے کہنے سے دیکھنے کی زحمت فرمایئے اور اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ہمراہ چلوں۔"

"بہت اچھا۔ اپنا شک رفع کر لیجئے۔"

مسٹر یوسف نے ادھر ادھر نظر ڈالی اور یہ کرتے ہوئے کہ کوئی قریب نہیں ہے اٹھے اور اپنی نشست کے پیچھے والی الماری کے داہنے خانے کے اوپر رکھی ہوئی ایک موٹی کتاب ہٹا کر ایک چھوٹے سے بٹن کو دبایا۔ نہایت مہین آواز پیدا ہوئی۔ اب انہوں نے چند اور کتابیں ہٹائیں۔ اور پشت الماری کے درمیانی حصہ میں ایک باریک تار کو پکڑ کر کھینچا۔ اس کے کھینچتے ہی ایک خانہ سا پیدا ہو گیا اور اس میں سے دو کنجیاں برآمد ہوئیں۔ جس وقت مسٹر یوسف کتابوں کو الماری سے جدا کر رہے تھے۔ کتابوں کی حرکت سے ایک چھوٹی سی سنہری چیز زمین پر گر پڑی۔ جس کو میں نے ان کی نظر بچا کر اٹھاتے ہوئے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ قبل اس کے مسٹر یوسف خوابگاہ کی جانب بڑھیں میں نے ان سے کنجیاں لے کر دیکھنے کی درخواست کی۔ انہوں نے کنجیاں مجھے دے دیں میں نے باحتیاط قریب کی کرسی پر بیٹھ کر بذریعہ میگنیفائنگ گلاس MAGNIFYING GLASS ان کا بغور معائنہ کیا اور ایک خاص خیال کے زیر اثر مسٹر یوسف سے درخواست کی کہ وہ مجھے ان کا فوٹو لے لینے دیں۔ انہوں نے اجازت دی۔ میں نے ان کے کئی فوٹو لئے۔

مسٹر یوسف نے خانہ بند کیا اور ہم لوگ خوابگاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ تجوری کے قریب پہنچکر قہقہہ لگاتے ہوئے مسٹر یوسف نے کہا، میری حماقت ملاحظہ ہو۔ واردات سرقہ کے بعد سے اس وقت تک تجوری کھلی پڑی ہے اور میں اسے کنجیاں لے کر کھولنے آیا ہوں۔"

"اس میں بھی کوئی بہتری ہوگی آپ مہربانی فرما کر اپنی یادداشت سے اس میں رکھی ہوئی چیزوں کو ملاحظہ فرمایئے۔" انہوں نے بے دلی سے اطراف کے خانوں سے کاغذ نکال نکال کر دیکھے اور باندازِ اطمینانی انہیں واپس رکھ دیا۔ مگر تیسرے خانہ میں کچھ نہ پاکر ایک مضطربانہ انداز میں مجھے دیکھا۔

"کیا بات ہے ؟"

"خطوط اور جواب خطوط غائب ہیں۔"

"مگر دوسروں کیلئے تو یہ ایک بیکار سی چیز تھی"

"جی ہاں میرا تو بھی خیال تھا مگر ان کے غائب ہونے سے مجھے دلی صدمہ پہونچا۔ وہ عہد زریں کی یادگار تھے۔ گاہے گاہے انہیں پڑھ کر میں کلفت و مسرت کا یکجائی لطف حاصل کرتا تھا۔"

"مسٹر یوسف میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ صاف صاف فرمایئے۔"

"کیا کہوں آپ جانتے ہیں کہ موجودہ بیگم صاحبہ میری زوجہ ثانی ہیں جو باعتبار افتادِ طبیعت میرے مذاق کے برعکس ہیں۔ یہ خطوط وہ تھے جو شادی سے قبل اس زمانہ میں جو قریب قریب ہر اہل دل کیلئے ایک بار اور صرف ایک بار آتا ہے۔ اپنی محبت کی گہرائیوں اور دل کی دھڑکنوں سے مجبور ہو کر اپنی زوجہ اولیٰ کو لکھے تھے اور جوابات وہ تھے جو اس پیکر وفا و رعنائی نے مجھے بھیجے تھے۔ زمانہ الفت کے ان خوشرنگ پھولوں کو اپنی یکجائی یعنی شادی کے بعد اکٹھا کر کے ہم نے یہ گلدستہ مرتب کیا تھا۔ آہ میری مسرتوں کا وہ دور نہایت مختصر ثابت ہوا۔ صرف تین برس کی خوشیوں کے بعد قدرت کے زبردست ہاتھوں نے اس آسمانِ محبت کے درخشاں ستارہ کو مجھ سے ہمیشہ کیلئے چھین لیا جس کی یادگار حقیقی صرف فردوس ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس صغر سن بچی کی دیکھ بھال کسی عورت ہی کے زیر اثر ہونی چاہئے۔ ادھر اعزہ و احبا کے تقاضے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ مجبور ہو کر سات برس کے بعد میں نے عقد ثانی کیا۔ جب عہد ماضیہ کی یاد بہت ستاتی تھی۔ اور موقع بھی مل جاتا تھا تو میں ان مکتوبات کو پڑھ کر آنسوؤں کے قطروں سے اس دہکتی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر آہ آج وہ رہا سہا سہارا بھی جاتا رہا۔"

یہ کہکر وہ حد درجہ مضطرب ہو گئے۔ اس وقت میری نظر کے سامنے ایک جلیل القدر بیرسٹر نہیں بلکہ ایک صغر سن بچہ تھا۔ جو اپنے کسی محبوب کھلونے کے ٹوٹ جانے پر اشک افشانی کر رہا ہو۔ کچھ دیر گذرنے پر انہیں قدرے سکون ہوا۔ میں نے تجوری بند کی اور انہیں سہارا دیکر کمرۂ دفتر میں لے آیا۔ وہ اس وقت بالکل ساکت تھے۔ میں بھی کچھ دیر خاموش رہا اور اس کے بعد یہ دیکھ کر کہ میرے سوالات کے جواب اب مل جائینگے ان سے دریافت کیا۔

"کیا آپ شب گذشتہ ہی نہیں بلکہ شام گذشتہ سے لے کر اس وقت تک کے جبکہ آپکو چوری کا علم ہوا۔ واقعات کو بیان کر سکتے ہیں؟"

"جی ہاں ایک تقریب میں مجھے شریک ہونا تھا۔ اسلئے عدالت سے واپسی پر بعد غسل و تبدیل لباس قرب مغرب میں مکان سے

چلا گیا اور وہاں سے بعد فراغت طعام دس بجے شب کو واپس ہوا اور بعد تبدیل لباس پلنگ پر لیٹ گیا۔ آسمان پر ابر غلیظ چھایا ہوا تھا۔ ہوا بالکل رکی ہوئی تھی۔ باوجود برقی پنکھے کے طبیعت گھبرائی سی جا رہی تھی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ ایک مقدمہ کی اپیل کا نصف حصہ تیار کرنا تھا۔ خیال ہوا چلو۔ اپیل ہی تیار کروں کمرہ دفتر میں تیاری اپیل میں مصروف ہو گیا۔ غالباً ایک بجے تک کام کرتا رہا۔ ادھر کام ختم ہو چکا تھا۔ اُدھر موسم میں تبدیلی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں روشنی گل کر کے لیٹ گیا اور غافل ہو گیا۔ ابھی قریب پانچ بجے صبح خود بیدار بھی نہ ہونے پایا تھا کہ خادمہ کی خوفزدہ آواز نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ اُس نے گھبرائے ہوئے انداز میں مجھے مطلع کیا کہ کمرۂ خواب کی تجوری کھلی پڑی ہے میں گھبرا کر اُٹھا اور تصدیق کرنے پر اس کے بیان کو حرف بحرف صحیح پایا۔ اسی وقت پولیس کو فون کیا۔ پولیس آئی اور سرگرم تفتیش ہوئی۔ ان کے سوالات کی بوچھار سے نجات پا کر اہمیت مقدمہ کو دیکھتے ہوئے چند کاغذات کو منشی جی کو سمجھا ہی رہا تھا کہ آپ تشریف لے آئے۔

'مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بہت زحمت دی۔ اب صرف دو ایک سوال پوچھ کر رخصت ہو جاؤں گا'۔

'آپ بشوق سوالات فرمائیں'۔

'آپ نے گذشتہ شام سے قبل تجوری کب بند کی تھی؟'

'قریب تین ماہ ہوئے'۔

'یعنی میں یہ سمجھ لوں کہ بیگم صاحبہ کے زیورات نکال لینے کے بعد سے آپ نے تجوری نہیں کھولی'۔

'جی ہاں جہاں تک مجھے یاد ہے۔ کیونکہ میں یہاں بہت کم رہا۔

'کیا کل صبح آپ کے کسی موکل نے آپ کے دفتر میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ عدالت میں روپیہ لے کر آئے گا؟'

'اس کا مجھے علم نہیں کیونکہ یہ باتیں منشی جی سے تعلق رکھتی ہیں'۔

'کیا آپ کا ڈرائیور پٹرول کی ناپ روزانہ صبح نہیں کر لیتا'۔

'اس کا بیان ہے کہ وہ اس دن پٹرول ناپنا بھول گیا تھا'۔

'کیا اس سے پہلے کبھی راستہ میں پٹرول ختم ہوا ہے؟'

'ممکن ہے ہوا ہو۔ مجھے یاد نہیں'۔

'آپ غالباً سگار نہیں پیتے؟'

'جی سگار تو سگار میں سگریٹ بھی نہیں پیتا'۔

'میں اب اجازت چاہتا ہوں'۔

'آپکی اس عنایت کا شکریہ۔ خدا کے لئے امکانی کوشش فرمائیے۔ مجھے روپیہ کا صدمہ نہیں مگر انگشتری اور خطوط کا حد درجہ ملال ہے'۔

'گھبرائیے نہیں۔ اگر خطوط جل نہیں چکے ہیں تو وہ آپکو ضرور ملیں گے'۔

'مجھے کب تک انتظار کے صبر آزما لمحات کا مقابلہ کرنا پڑیگا'۔

'کم از کم دو ہفتہ۔ اچھا خدا حافظ!'

وہاں سے واپسی پر میں نے اپنی دماغی مشین کو حرکت دی۔ بہت کچھ دوڑ دھوپ کی یہاں تک کہ میں ایک خاص نتیجہ پر پہونچ گیا مگر ثبوت کی ایک کڑی ملانے کے لئے مجھے مسٹر یوسف کی خاص ضرورت پیش آئی متعدد مرتبہ فون کیا۔ مگر جواب ملا کہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ واردات سرقہ کے ٹھیک پندرہ دن کے بعد 'نظارہ صبح' کے اسپشل ایڈیشن میں یہ خبر درج تھی۔

"افسوس کہ ہمارے شہر کے اعلیٰ دماغ بیرسٹر عزیز مسٹر محمد یوسف بیرسٹر جو آج صبح کی ٹرین سے باہر سے واپس ہوئے تھے اور موٹر پر دریا کے کنارے والی سڑک سے بنگلہ آ رہے تھے۔ کہ کار دریا میں پھسل گئی۔ ڈرائیور اور بیرسٹر صاحب جان بچانے کے خیال سے کھڑکیاں کھول کر دریا میں کود پڑے۔ ڈرائیور چونکہ پیراک تھا۔ کنارہ پر آ گیا مگر افسوس کہ وہ پیراک ہونے کی صورت میں پانی کے زور کا مقابلہ نہ کر سکے۔ حیرت تو یہ ہے کہ باوجود کوشش امکانی لاش بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ پولیس سرگرم تفتیش ہے۔ عملہ 'نظارہ صبح' پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے"۔

یہ خبر بجلی بنکر مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ ایک سناٹے میں آ گیا۔ جب کچھ حواس درست ہوئے تو 'فردوس' (مرحوم کی کوٹھی کا نام) ٹیلیفون کیا اور ——— درخواست کی کہ فردوس ٹیلیفون پر آئی اور میری اور اسکی مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

'کون فردوس'

ہچکیوں کی آواز کے ساتھ "جی"

'بیٹی میں ہوں فکری'۔ (میں اپنے حلقۂ احباب میں اسی نام سے مشہور ہوں)۔

'چچا میاں مجھ پر آسمان غم پھٹ پڑا'۔

'بیٹی ضبط کرو۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہاری ناگہانی مصیبت میں تمہیں تسکین دوں۔ مجھے تم سے چند ضروری سوالات کرنا ہیں۔ ان کے جوابات دو اور ایسا کرنے سے قبل کمرہ کے سب دروازے بند کر لو۔ اور نہایت آہستگی سے گفتگو کرو۔

"بہت اچھا"

"دروازے بند ہو گئے"

"دروازے بند ہیں اور یہاں کوئی اور نہیں ہے"

"اچھا بیٹی یہ بتاؤ کہ یوسف صاحب کے

آنے کی تم لوگوں کو کیونکر اطلاع ہوئی؟ اور اس کے بعد سے چھوٹی سی چھوٹی جو کچھ بھی نئی بات تمہارے علم میں ہو، اسے بیان کرو۔"

"اطلاع بذریعہ تار ہمکو شام کے ۷ بجے موصول ہوئی۔ ڈرائیور کوئی کام نہ ہونے کی صورت میں اپنے مکان جا چکا تھا۔ والدِ آنجہانی کی آمد کی اطلاع آپا جان یعنی میری موجودہ والدہ نے بذریعہ تحریر ڈرائیور کو کی۔"

"کیا ڈرائیور کو ہمیشہ بذریعہ تحریر اطلاع دیجاتی ہے؟"

"جی نہیں۔ مگر آپا جان نے یہی مناسب سمجھا۔"

"کیا تم نے تحریر پڑھی تھی؟"

"جی نہیں۔"

"اس تحریر کو کون لے گیا تھا؟"

"نعیمن خادمہ۔"

"اور کوئی نئی بات؟"

"جی اور کچھ نہیں۔"

"تم صبح کس وقت بیدار ہوئیں؟"

"میں عموماً پانچ بجے اُٹھتی ہوں مگر والدِ مغفور کے آنے کی خوشی میں کچھ دیر پہلے اُٹھ بیٹھی تھی۔"

"گھر میں کیا اور کوئی بھی خلافِ عادت بیدار ہوا تھا؟"

"جی ہاں آپا جان مجھ سے پہلے بیدار ہو چکی تھیں اور برآمدہ میں ٹہل رہی تھیں۔"

"کیا وہ بعد تبدیلِ لباس خود کو آراستہ کر چکی تھیں؟"

"جی نہیں وہ لباسِ شب خوابی میں تھیں اور کچھ پریشان سی معلوم ہو رہی تھیں۔"

"اچھا بیٹی اب مجھے کچھ اور نہیں پوچھنا ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ تمہارے والد ڈوبے نہیں۔ یا تو وہ ڈبوئے گئے ہیں یا کوئی اور صورت رُونما ہوئی ہے۔ میں قاتل کا پتہ لگانے میں اپنی جان تک کی پروا نہ کروں گا۔ تم میری یہ گفتگو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ اور خلافِ دستور اگر کوئی بات پیدا ہو تو میرے نمبر ۷۵۵ پر فون کر دینا۔ مگر فون نہایت احتیاط سے کرنا۔ ممکن ہے یہ لوگ سننے کی کوشش کریں۔ اچھا خدا حافظ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں صبر عطا فرمائے۔"

رشتۂ ٹیلیفون کاٹ کر میں سیدھا دریا پر گیا۔ نم زمین میں ٹائر کے نشانات موجود تھے۔ جن کی میں نے پیمائش لی۔ اور انہیں جیبی کیمرہ کی پلیٹوں میں محفوظ کر لیا۔ مسٹر جعفری انسپکٹر پولیس بسلسلۂ تحقیقات ابھی تک وہاں موجود تھے۔ اُنہوں نے میری رائے دریافت فرمائی۔ اپنی عدم معلومات کا اظہار کرتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ بھئی یہ تو دو اور دو چار کی طرح بالکل صاف ہے۔ میں نے عرض کیا "جی ہاں۔ مگر اتنی دوربین نگاہیں کہاں سے لاؤں۔"

میں نے ان سے اجازت لے کر کار کا معائنہ شروع کیا۔ موٹر میں ڈرائیور کا بھیگا ہوا کوٹ بھی پڑا تھا۔ سب کی نظریں بچا کر میں نے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لی جنمیں سے چند کاغذات برآمد ہوئے جو میں نے اپنی جیب میں رکھ لئے۔ کار کی پچھلی نشست اُٹھانے پر ایک جیبی گھڑی برآمد ہوئی جس کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ کسی حادثہ کی بنا پر وہ ۶½ بجے بند ہوئی ہے۔ اس کے ملنے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ میں نے مسٹر جعفری کی اجازت سے اس کا فوٹو لیا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ اس کا موجودہ وقت اپنی رپورٹ میں لکھ لیں اور اسے اپنے قبضے میں کر لیں۔ اُنہوں نے اسے منظور کیا۔ اس کے بعد میں نے اسپیڈ ظاہر کرنے والے میٹر کا بھی فوٹو لیا۔ اور دوسری . . . .

کوئی بات مفید مطلب پا کر امپیریل بنک روانہ ہوا۔ ایجنٹ امپیریل بنک مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر مسٹر یوسف کا کوئی چک کیش ہونے کو آئے تو وہ پیمنٹ (PAYMENT) کو ذرا روک لیں اور بذریعہ فون مجھے اطلاع دیں۔ اُنہوں نے میرے سامنے لیجر کیپر کو بلا کر ہدایت کی مگر ہم کو یہ معلوم کر کے سخت تعجب ہوا کہ آج بنک کھلتے ہی دو سو روپیہ کا ایک چک کیش کیا جا چکا ہے۔ میں نے چک دیکھنے کی خواہش کی۔ چک لایا گیا۔ اسمیں ہفتۂ گذشتہ کی تاریخ لکھی تھی۔ گو پورا چک ایک ہی قلم اور ایک ہی سیاہی سے لکھا ہوا تھا مگر دستخط اور عبارت چک کی تحریر میں نمایاں فرق تھا۔ چک سلف (SELF) تھا اور روپیہ وصول کرنے والے کا نام دیبی دیال تھا۔ چونکہ چک ایک حقیر رقم کا تھا اس لئے ڈپٹی ایجنٹ کے دستخطوں سے پاس ہو گیا۔ مجھ کو یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا مگر ایک خیال کے زیرِ اثر میں نے کہا۔ نہیں نہیں۔ یہ تو ابتدا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آج یا دو ایک دن کے بعد کسی بڑی رقم کا چک بھی آئیگا اور امید ہے کہ آپ میری مدد فرمائینگے۔ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر میں نے اس چک کا بھی فوٹو لیا۔ اسکے بعد ریلوے اسٹیشن روانہ ہوا۔ اور وہاں قلیوں کے جمعدار سے مل کر صبح کو ٹرین پر مسافروں کا سامان اُٹھانے والے قلیوں سے ملنا چاہا۔ پہلے تو جمعدار نے مفت کی دردسری کے خیال سے انکار کر دیا لیکن میرے دس روپیہ کا نوٹ دینے پر وہ ایک گھنٹہ کے اندر سب کو اکٹھا کر دینے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں نے اسٹیشن انچارج سے

صبح کی ٹرین کے پہنچنے کا صحیح وقت معلوم کیا اور کچھ کام نہ پاتے ہوئے بنچ پر لیٹ کر واقعات کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے لگا۔ اس عرصہ میں تمام قلی آگئے اور میں نے مسٹر یوسف کا حلیہ بتاتے ہوئے اُن سے دریافت کیا کہ ان میں سے کس قلی نے اُن کا سامان اُتارا ہے۔ اُن کے ساتھ سوٹ کیس بستر اور ایک اٹیچی تھی۔ اٹیچی انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور میرے کہنے پر بھی مجھے نہیں دی۔ میں نے دو چیزیں لا کر موٹر ڈرائیور کے برابر رکھدیں۔ اُنہوں نے ڈرائیور سے پوچھا "سب خیریت ہے" اور اُس نے "جی ہاں" کہہ کر موٹر اسٹارٹ کر دی۔

"کیا اس وقت پانی برس رہا تھا؟" "نہیں صاحب پانی تو نہیں برس رہا تھا مگر بادل کالا کالا چھایا تھا"۔ یہاں کوئی اور بات فائدہ مند نہ پاکر "فردوس" کو روانہ ہوا۔ یہاں منشی جی سے ملاقات ہوئی جن سے معلوم ہوا کہ جس مقدمہ میں مسٹر یوسف گئے تھے۔ اس میں کم و بیش پانچ چھ ہزار روپیہ تک فیس کا ہو سکتا ہے اور دریا پر سے سامان میں صرف بستر اور سوٹ کیس آیا ہے۔ اٹیچی کے متعلق اُنہوں نے لاعلمی ظاہر کی اور نوکروں سے پوچھا۔ مگر ہر ایک نے یہی کہا کہ صرف بستر اور سوٹ کیس آیا ہے۔ خادمہ کا بیان تھا کہ اٹیچی گئی ضرور تھی مگر آئی نہیں۔ یہ سب باتیں میں نے ڈائری میں نوٹ کیں۔ اور دریا کی سڑک کی جانب سے اسٹیشن روانہ ہوا سڑک تارکول کی تھی۔ میں دونوں جانب بغور دیکھتا جا رہا تھا کہ ایک ویران مقام پر سایہ دار گنجان درختوں کے نیچے کچی نم زمین میں موٹر ٹائر کے کچھ نشانات نظر آئے میں ان کی جانب متوجہ ہوا۔ یکبارگی ایک خیال پیدا ہوا۔ اور میں نے مسٹر یوسف کی کار کے ٹائر کے نقوش کی پیمائش سے ان کا مقابلہ کیا۔ بالکل درست پایا۔ مگر یہ نشانات سڑک کے دائیں جانب تھے۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر اُسی طرف دو گھوڑوں کی ٹاپوں کے نشانات بنے ہوئے تھے جن کے خاتمہ پر بگھی کے پہیوں کے نشانات تھے۔ اور وہیں پر چند آدمیوں کے پیروں کے نشانات کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ اب میں ان نشانات پر چلا۔ وہ موٹر کے نشانات کے پاس تک تھے اور وہاں زیادہ گہرے تھے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی سے کشمکش ہوئی ہے۔ میں نے ان تمام نشانات کے حسب مرضی فوٹو لئے اور دماغ میں ہزاروں قسم کے خیالات کو لے کر مکان واپس ہوا۔

دوسرے دن ابھی میں اپنی صبح کی چہل قدمی سے واپس ہو کر چائے بھی نہ پینے پایا تھا کہ منشی جی (مسٹر یوسف کے منشی) کی آمد معلوم ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نوکر نے کہا کہ وہ کسی اہم واقعہ کی بنا پر مجھ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں میں نے ان کو نشستگاہ میں بلا لیا۔ جہاں مندرجہ ذیل واقعات اُنہوں نے ظاہر کئے۔

"فکری صاحب فردوسہ کا کہیں پتہ نہیں ہے"

"فردوسہ کا کہیں پتہ نہیں ہے؟"

"ہم سب تو یہ سمجھتے ہیں کہ شاید باپ کے غم میں دریا میں ڈوب کر جان دیدی اور بعض بیہودہ قسم کے لوگ اُس معصومہ پر عجیب عجیب قسم کے الزامات لگا رہے ہیں"

"صاف صاف کہئے"

"جی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نصرت کے ساتھ کہیں بھاگ گئی"

"کون کہتا ہے؟"

"بیگم صاحبہ کے خاص خاص نوکر"

"کون نصرت؟"

"فردوسہ کی اُس کے خالہ زاد بھائی نصرت کے ساتھ بات چیت طے پا چکی تھی۔ کل وہ یہ واقعہ سن کر آئے تھے۔ خادمہ کا بیان ہے کہ دونوں میں بڑی دیر تک چپکے چپکے کچھ باتیں ہوتی رہیں۔ نصرت صاحب چلے گئے۔ رات کو فردوسہ اچھی خاصی پلنگ پر لیٹی اور صبح کو اس کا کہیں پتہ نہ تھا"

"آپ نصرت کے یہاں گئے تھے؟"

"جی ہاں۔ مگر وہاں معلوم ہوا کہ وہ کل شب سے مکان سے غیر حاضر ہیں۔ لیکن فکری میں ذرہ بھر کے لئے بھی یقین نہیں کر سکتا کہ ان دونوں نے ایسی مذموم حرکت کی ہو"

"اللہ میری مدد کرے۔ معاملہ پیچیدہ در پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ خیر آپ کوشش کر کے نصرت اور فردوسہ کا مجھے ایک ایک فوٹو لا دیجئے۔ اور "فردوس" کے ہر آنے جانے والے پر ذرا کڑی نظر رکھئے اور اگر کوئی بات خلاف واقعہ پیدا ہو تو بذریعہ ٹیلیفون مجھے مطلع کیجئے"

"بہت اچھا"

پہلے ہی واقعات کچھ کم پریشان کن نہ تھے مگر نصرت اور فردوسہ کی گمشدگی نے تو مجھے حیران ہی کر دیا۔ قریب ایک گھنٹہ آرام کرسی پر پڑا ہوا سوچتا رہا۔ اس عرصہ میں منشی جی فوٹو لے آئے۔ اور یہ بھی بتلایا کہ ابھی اُن کو معلوم ہوا ہے کہ بٹیا (فردوسہ) اور بیگم صاحبہ میں کل ہلکی سی شکر رنجی ہو گئی تھی۔

گھڑی میں ساڑھے ۱۰ بجے تھے کہ امپیریل بنک کے ایجنٹ نے مجھے طلب کیا۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ حکم چند کو ایک دیہاتی کے لباس میں تبدیل ہونے کی ہدایت کی اور بھی کچھ ہدایتیں دیں۔ اور بنک کو روانہ ہوا۔ ایجنٹ نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کا کہنا

ٹھیک نکلا: لیجئے یہ تین ہزار کا چیک آگیا۔ روپیہ لینے والے کا نام سرور خان ہے"۔

"آپ خزانچی کو بلا کر حکم دیجئے کہ وہ سو سو روپیہ کے نوٹ میں یہ رقم ادا کرے اور براہ کرم آپ ان نوٹوں پر دستخط کر دیجئے"۔

جملہ کام میری حسب مرضی انجام پائے۔ میں خزانچی کی کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ حکم چند دیہاتی لباس میں ایک کونہ میں کھڑا تھا۔ سرور خاں روپیہ وصول کر رہے تھے۔ میں نے حکم چند کو دیکھتے ہوئے سرور خاں کو دیکھا اور حکم چند نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اطمینان دلایا۔ وہاں سے میں کوتوالی کو روانہ ہوا۔

نقل فیصلہ سشن جج صاحب بہادر

"جب میں واقعات مثل پر غور کرتا ہوں تو مسٹر فکری کی ذہانت پر بلیاختہ تعریف کرنے پر مجبور ہوتا ہوں۔ ثبوت جو اس مقدمہ میں پیش کیا گیا ہے نہایت مضبوط اور مدلل ہے کیونکہ یہ وہ ہے جو عام طور پر مسٹر فکری نے مہیا کیا ہے۔ پولیس کا مسٹر فکری سے اشتراک عمل بھی قابل تعریف ہے کیونکہ عام پر دیکھا گیا ہے کہ پولیس نجی سراغرسانوں کے قیاسات کی بہت کم پروا کرتی ہے مگر ایسا کرنا اس مقدمہ پر نظر کرتے ہوئے دانائی نہیں معلوم ہوتا۔ مختصراً واقعات یہ ہیں۔

مسٹر محمد یوسف بیرسٹر کے یہاں چوری ہوئی۔ مسٹر فکری نے واقعات معلوم کرتے ہی خیال کر لیا کہ رومال اور سگار کے ٹکڑے پولیس کو دھوکے میں ڈال لینے کیلئے ڈال دیئے گئے ہیں۔ پوشیدہ خانہ کی کنجی حاصل کرنے کے سلسلہ میں مسٹر فکری نے ایک چھوٹی سی سنہری چیز پائی تھی۔ اور مقدمہ پیش ہونے پر مسٹر فکری کے اصرار پر پولیس نے بیگم یوسف کے زیورات کا معائنہ کیا تھا جس کے ہر زیور کو بیگم یوسف نے روبروئے عدالت اپنا ظاہر کیا ہے۔ یہ تمام زیورات سوائے ایک جھالے کے کہیں سے ٹوٹے نہیں ہیں۔ وہ سنہری چھوٹی چیز جو مسٹر فکری کو ملی تھی۔ اس ٹوٹے ہوئے جھالے کے زیریں حصہ سے ملانے پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ اسی کا ٹوٹا ہوا حصہ ہے۔ اس سے بیگم یوسف کی موجودگی اس پوشیدہ خانہ کے پاس ظاہر ہوتی ہے۔ تجوری کی کنجیوں کا فوٹو (مرتبہ مسٹر فکری) سے پتہ چلا کہ کسی نرم قسم کی چیز پر اس کا نشان لیا گیا ہے۔ ماہر کیمیا ظاہر کرتا ہے کہ وہ چیز از قسم موم ہے۔ بادی النظر میں وہ چیز نظر نہیں آتی مگر انلارج فوٹو گرافس اس کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔ گواہ ثبوت ۵۷ لوٹن لوہار کا بیان ہے کہ قریب بیگم یوسف کے ملازم جو اس کے یہاں اس سے قبل کئی کام کرا چکا ہے۔ ان کنجیوں کی نقل بنوانے لایا تھا۔ مگر اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ گو کہ لوہار مذکور پر کافی جرح کی گئی۔ مگر میرے خیال میں یہ جرح اسکی صداقت میں کوئی شبہ نہیں پیدا کر سکی۔ اسلئے مجھے اسکا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ تجوری سے صرف نقد روپیہ ہی نہیں لیا جاتا بلکہ مسٹر یوسف کی زوجہ اولی کے خطوط، انگشتری اور تجوری تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ مرحومہ کا نکاحنامہ بھی جو فردوس کو جائز اولاد ثابت کر سکتا تھا چوری جاتا ہے۔ اسکے علاوہ دو کابین کی قیمتی دستاویزات رہ جاتی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ چور کو صرف نقدی نہیں بلکہ مرحومہ کی شادی کے تمام ثبوت بھی فنا کر دینے مقصود تھے۔ چوری کا واقعہ زیر تفتیش ہی تھا کہ مسٹر محمد یوسف بھی ڈوب جاتے ہیں اور باوجودیکہ دریا کا پانی تھا مگر کوشش امکانی پر بھی ان کی لاش دستیاب نہیں ہوئی۔ ریلوے ریکارڈ ظاہر کرتا ہے کہ اس دن ٹرین ٹھیک ۳½ بجے صبح آئی تھی۔ گواہ ثبوت ۱۰۱ قلی نمبر ۲۵ بیان کرتا ہے کہ مسٹر یوسف بغیر کسی تاخیر کے موٹر میں بیٹھکر روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے اس جگہ کا فاصلہ جہاں موٹر دریا میں پھسلتی ہے پیمائش کرنے سے آٹھ فرلانگ معلوم ہوتا ہے۔ اگر گواہ ۱۰۱ کے بیان کو صحیح مانا جائے جس کی صداقت میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر یوسف حد سے حد ۳½ بجے تک اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ میٹر اسپیڈ کے اس فوٹو سے جو مسٹر فکری نے شامل مسل کیا ہے پتہ چلتا ہے کہ موٹر تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی تھی۔ بارش کے اثرات پر نظر کرتے ہوئے یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ اسے پانچ منٹ میں وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن مسٹر یوسف کی گھڑی (جسکو پولیس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مسٹر یوسف ہی کی گھڑی ہے) جو گر کر بند ہو گئی ہے۔ اپنے بند ہونے کا وقت ۴½ ظاہر کرتی ہے اور مسٹر فکری کا مرتبہ فوٹو جو موٹر کی پچھلی نشست سے گھڑی برآمد ہوتے ہی سب کی موجودگی میں لیا تھا اسکی تصدیق کرتا ہے۔ یہ بات قیاس سے کہی جاتی ہے کہ ڈرائیور کو گھڑی کا علم بعد کو ہوا اور اخفائے حال کی نیت سے اس نے اسے پچھلی نشست کے نیچے چھپا دیا۔ مسٹر فکری کے لئے ہوئے فوٹو گرافس نشانات ٹائر، نشانات بگھی اور گھوڑوں اور آدمیوں کے پیروں کے نشانات ظاہر کرتے ہیں کہ موٹر پہلے اس نرم زمین پر لائی گئی جہاں تھوڑے فاصلہ پر بگھی کھڑی تھی۔ وہاں کچھ کشمکش ہوئی آدمیوں کے پیروں کے نشانات اس کو پوری طرح واضح کر رہے ہیں۔ ملزمین کے پیروں کے نشانات جو بوجہ موجودگی لائق مجسٹریٹ لئے

گئے ہیں ان نشانات سے مطابقت کرتے ہیں۔ غالباً اسی کشمکش میں گھڑی گرتی ہے اور ٹوٹ کر بند ہو جاتی ہے۔ گویا کہ اسوقت اس جگہ ۶½ بجے تھے۔ موٹر ڈرائیور کا بیان ہے کہ کار وہاں سے سیدھی آئی۔ اور دریا میں پھسل گئی۔ اس زبردست ثبوت کے مقابلہ میں کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ گواہ ۱۰۷ جو اس مقدمہ میں ملزم تھا جس کی پیروی میں مسٹر یوسف آخری مرتبہ باہر گئے تھے بیان کرتا ہے کہ اس نے مسٹر یوسف بسلسلۂ فیس ساڑھے پانچہزار روپیہ ادا کئے تھے جو کرنسی نوٹس کی صورت میں تھے۔ گواہ ۱۰۱ یعنی قلی ۲۵۰ ظاہر کرتا ہے کہ مسٹر یوسف کے سامان کے ساتھ ایک اٹیچی بھی تھی جو ان کے ہاتھ میں تھی اور جس کو باوجود بار بار کہنے کے اُنہوں نے قلی کو نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی ایسی ہی قیمتی چیز ہوگی مگر وہ اٹیچی اور سامان کے ساتھ کوٹھی پر نہیں پہونچی۔ ڈرائیور اس اٹیچی کی موجودگی قطعی ظاہر نہیں کرتا۔ میں گواہ ۱۰۱ کے بیان کو صحیح سمجھتے ہوئے یہ یقین کرتا ہوں کہ اس اٹیچی میں ساڑھے پانچہزار کے وہ نوٹ تھے جو گواہ ۱۰۷ نے اُنہیں دیئے تھے۔ اب اس مقدمہ میں ایک اور صورت پیدا ہوتی ہے یعنی مسٹر یوسف کی دختر مس فردوسہ یوسف جو رات کو سب کے سامنے بغرض آرام پلنگ پر لیٹتی ہیں مگر صبح کو غائب پائی جاتی ہیں۔ ادھر مسٹر نصرت وصیع فردوسہ کا خالہ زاد بھائی اپنے مکان اسدن کی رات تک اور اس کے بعد نہیں پہنچتے۔ گواہان کے بیان کو یکجا کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسٹر نصرت اس حادثۂ عظیم کی خبر پاکر باظہار غم و ہمدردی فردوسہ کے یہاں آتے ہیں۔ اثنائے گفتگو میں فردوسہ نصرت سے کچھ اپنے شکوک کا اظہار کرتی ہے جس کو ملزمہ کی ایک خادمہ سن لیتی ہے اور وہ ملزمہ سے جاکر کہہ دیتی ہے۔ نصرت کے جانے کے بعد فردوسہ اور بیگم یوسف میں کچھ سخت گفتگو ہوتی ہے۔ ادھر نصرت شام ہوتے ہی جوانی کی ترنگ میں بغیر کچھ سوچے سمجھے ملزم ۲ کے یہاں جاتے ہیں اور اپنی تھوڑی بہت معلومات کی بنا پر چاہتے ہیں کہ صحیح حالات معلوم کرلیں مگر وہاں معاملہ برعکس ہوتا ہے یعنی ملزمین ۲، ۳، ۴ جو بسلسلۂ مشاورت وہاں موجود تھے۔ اپنے فوائد پر نظر رکھتے ہوئے ان کو ایک خطرناک آدمی سمجھ کر بحکمت عملی انہیں گرفتار کر لیتے ہیں اب پھر مشورہ ہوتا ہے اور ملزمہ ۱ کی ایما سے رات کے اندھیرے میں کھٹکتا ہوا خار دُور کرنے کے لحاظ سے فردوسہ بھی غائب کر دیجاتی ہے۔ گواہ سرکار یعنی نصیبن خادمہ کے بیان سے جو ملزم و ملزمہ کی ہمراز تھی۔ پتہ چلتا ہے کہ اسوقت یہ تجویز پیش نظر تھی کہ معاملات ذرا دب جانے کی صورت میں ان دونوں کی شمع زندگی کو بھی بخاموشی گل کر دیا جائے۔

مسٹر یوسف کی تجوری سے صرف روپیہ ہی نہیں نکالا گیا۔ ان کی اٹیچی میں سے ساڑھے پانچہزار کی رقم ہی نہیں لی گئی۔ بلکہ دامن ہوس اور بھی بڑھتا گیا۔ یعنی مسٹر یوسف کو مجبور کیا گیا کہ وہ دو چیکوں پر اپنے دستخط کریں جو نہایت دانائی سے یہ دیکھنے کے لئے کہ بنک والوں کو کچھ شبہ تو نہیں ہے۔ پہلے حقیر رقم کا اور اس کے بعد بھاری رقم کا چیک پیش کیا گیا مسٹر فکری کی تجویز کارگر ہوئی اور مسٹر حکم چند جو تیس ہزار کا چیک بھناتے وقت دیہاتی لباس میں بنک میں موجود تھے۔ سرور خاں (جو ایک فرضی نام سے بنک میں آیا تھا) کے پیچھے پیچھے جاکر ملزمین کی کمین گاہ کا پتہ لگا لیتے ہیں اور مسٹر فکری کو کوتوالی میں آکر مطلع کرتے ہیں۔ اس کے بعد رات کو منشی جی (آصف علی مسٹر یوسف کے منشی) گواہ ۹۷ مسٹر فکری کو مطلع کرتے ہیں کہ ملزمہ ۱ قانون شرعی یعنی (عدت) کی پروا نہ کرتے ہوئے موٹر پر کہیں گئی ہیں۔ مسٹر فکری بامداد کوتوال شہر پولیس گارد لے کر ملزمین کی کمینگاہ پر حملہ کرتے ہیں اور میں نہایت مسرت کے ساتھ ظاہر کرتا ہوں کہ اس قلیل عرصہ کی تفتیش میں صرف زر نقد و نوٹس ہی نہیں۔ (دستخط شدہ امپیریل بنک وادا شدہ بصورت فیس) انگشتری خطوط، نکاح نامہ اور اٹیچی کیس ہی نہیں برآمد کرتے، صرف جملہ ملزمین ہی کو نہیں گرفتار کرتے بلکہ فردوسہ اور نصرت کو بھی قید سے نجات دلاتے ہیں جن کے متعلق یہ افواہ اڑائی گئی تھی کہ وہ کہیں فرار ہو گئے ہیں۔

ملزمین اپنے خلاف اسقدر زبردست ثبوت پاکر اپنے کو عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہیں مگر چہ ایسے ملزمین پر رحم نہ کرنا چاہئے لیکن پھر بھی ان کی جوان عمر پر نظر کرتے ہوئے ان میں سے ہر ایک کو دس دس سال قید بامشقت اور پانچسو روپیہ جرمانہ کی سزا دیتا ہوں۔ بصورت عدم ادائگی جرمانہ دو سال کی سزائے مزید دیجاتی ہے۔

مگر ملزمہ ۱ نے تمام الزام دوسرے ملزمین پر ڈال کر خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش بیکار کی ہے لیکن قانون قدرت کچھ ایسا قانون ہے جس سے باوجود انتہائے دانائی کوئی نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ ایسا ہی یہاں ہوا۔ ملزمہ نے حتی الامکان نہایت عقلمندی سے ہر ایک کام کو انجام دیا لیکن دھوکا کھا گئی۔ موٹر ڈرائیور کے کوٹ کی جیب سے برآمد کئے ہوئے کاغذات میں ایک تحریر EX. 17 پائی گئی

ہے جس میں لکھا ہے۔

"ڈرائیور - تار آگیا وہ آرہے ہیں۔ چھ ہزار کے قریب ان کے پاس ہونگے۔ اسکے علاوہ تم جانتے ہو۔ میں زیادہ عرصہ تک فریب کارانہ زندگی نہیں بسر کرسکتی۔ مجھ کو ایسے شخص کے پاس رہنے کیلئے مجبور نہ کرو جس سے مجھے ذرا بھی محبت نہیں ہے اور وہ بھی مجھ سے الفت کا برتاؤ نہیں کرتا۔ میں تو اس طول و بسیط دُنیا میں ایک شخص کو چاہتی ہوں اور وہ تم اور فقط تم ہو اور تمہارا ہی تو بیان ہے کہ میری فرقت کی راتوں میں تم آہیں کرکے صبح کرتے ہو۔ پھر کیا دیر ہے۔ اپنی اور میری راتوں کو شبہائے عشرت بناؤ۔ روپیہ بھی ملتاہے اور میں بھی۔ بس آج ہی صبح اپنے ساتھیوں کی مدد سے سوچی ہوئی تدبیر پر عمل کرو۔ میں لوگوں کو دکھانے کے لئے افسوسناک مگر حقیقت میں مسرت سے بھری ہوئی خبر کو سننے کے لئے ہر لحظہ تمہارا انتظار کرونگی۔ ڈرنا نہیں۔ روپیہ سب عیبوں کو ڈھانک دیتا ہے۔ پھر کون جانیگا کہ کیا ہوا؟ دیکھو بزدلی نہ دکھلانا آج سارا معاملہ صاف کردینا۔ فقط

تمہاری × × × × ×"

یہ وہ تحریر ہے جس کو گواہ سرکار نے ڈرائیور کے یہاں سے پانا بیان کیا ہے۔ ملزمہ م۱ انکار کرتی ہے۔ اسلئے اس کا نمونہ تحریر جو چند کاغذات پر انہیں الفاظ کو دوسری ترتیب دیکر لکھایا گیا تھا معہ اس تحریر کے ماہر شناخت تحریر (HAND WRITING EXPERT) کے پاس بغرض معائنہ ورائے بھیجا گیا۔ اس کی قطعی رائے ہے کہ تحریر Ex.17 اور نمونہ تحریر ایک ہی شخص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ مسل مقدمہ کا بغور معائنہ کرنے پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ سنگین جرم ملزمہ م۱ کا ہے۔ اسلئے میں اسے پندرہ سال قید با مشقت کی سزا دیتا ہوں اور چونکہ مسٹر فکری کی فکر قابل داد ہے۔ اسلئے سفارش کرتا ہوں کہ بصورت وصولی جرمانہ ان کو دو ہزار روپیہ بطور انعام دیا جائے۔"

فیصلہ سنایا ہی گیا تھا کہ مسٹر حکم چند نے مجھ سے کہا اور میں نے ایک پرزہ کاغذ پر لکھ کر عدالت کے سامنے پیش کیا۔ عدالت پڑھ کر مسکرائی اور "مناسب ہے" کہکر خاموش ہوگئی۔ کمرہ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تقریب دو منٹ کے بعد پھر عدالت نے کہا "مجھے ابھی یہ معلوم کرکے بے اندازہ مسرت ہوئی کہ بار ایسوسی ایشن کے روح رواں مسٹر محمد یوسف بیرسٹر جو دُنیا کی نظروں میں ڈوب گئے تھے ڈوبے نہیں بلکہ زندہ ہیں اور وہ دیکھئے مسٹر فکری کے ساتھ آرہے ہیں" کمرۂ عدالت میں پُرمسرت نعروں سے ایک شور سا برپا ہوگیا جو چند منٹ میں رعب عدالت سے خاموشی میں تبدیل ہوگیا۔ مسٹر محمد یوسف کو زندہ پاکر ملزمہ م۱ یعنی مسٹر محمد یوسف کی زوجہ ثانی غش کھاکر گر پڑی جس کی کسی نے پرواہ نہ کی۔ لوگوں کے اضطراب کو دیکھتے ہوئے باجازت عدالت مسٹر محمد یوسف نے بیان کیا۔ "مجھے آج تھوڑی ہی دیر گذری ہے کہ فکری صاحب کے تخیلات اور گواہان ثبوت کے بیانات کا سنایا گیا۔ اور میں تصدیق کرتا ہوں کہ مجھ سے تعلق رکھنے والی تمام باتیں حرف بحرف درست ہیں۔ سوائے اس کے کہ نہ میں اسوقت ڈوبا تھا نہ ڈبویا گیا تھا بلکہ بیہوش کیا گیا تھا اور ایک بند گاڑی میں خدا معلوم کہاں سے لیجایا گیا۔ میری چیک بک جو میرے مکان پر تھی میرے سامنے پیش کی گئی۔ اور پستول کی نال دکھاکر مجھ سے دو چیکوں پر دستخط کرائے گئے۔ اس کے بعد پھر مجھے بیہوش کردیا گیا۔ اور ایک فقیر کی جھونپڑی میں ہوش آیا۔ اس فقیر کا جو خود کو عدالت میں پیش نہیں کرنا چاہتا، بیان ہے کہ کچھ لوگ مجھے ایک بند گاڑی میں اسکی جھونپڑی کے قریب ایک ویران جگہ پر لائے۔ میرے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دریا میں ڈبو کر فوراً روانہ ہوگئے۔ اس نے ایک جھاڑی کی آڑ سے یہ سب کچھ دیکھا اور خدا ترسی کے جذبہ سے مجبور ہوکر مجھے اپنی جھونپڑی میں لے آیا۔ ڈبونے کے سلسلہ میں میرے سر میں سخت چوٹ آگئی تھی جس پر اس نے دیسی ساخت کی دوائیں لگائیں۔ زخم اچھا ہوگیا۔ میری یادداشت سابقہ جا چکی تھی۔ مسٹر فکری کو خدا معلوم کیوں یقین تھا کہ میں مرا نہیں ہوں۔ وہ اپنے اسسٹنٹ حکم چند کی مدد سے مجھے برابر تلاش کرتے رہے اور آخر کار انہوں نے مجھے تلاش کرلیا۔ لیکن میں وہ یوسف ہی نہ تھا۔ مجبوراً مجھے شہری ہسپتال میں لائے۔ جہاں میرا علاج شروع ہوا۔ ڈاکٹر کی خاص ہدایت تھی کہ مجھے سابقہ واقعات یاد نہ دلائے جائیں ورنہ صحت ناممکن ہوجائیگی۔ آج میں نے اس کے خیال میں صحت کاملہ پائی ہے اور میں اپنے درستی ہوش وحواس کا سارٹیفکیٹ پیش کرتا ہوں۔"

"مسٹر محمد یوسف زندہ باد" کے نعروں سے کمرۂ عدالت کا قریبی برآمدہ گونج گیا۔ اس کے ٹھیک دو ہفتہ بعد مسٹر نصرت اور پیاری فردوس شرعی اور قانونی طور پر ایک دوسرے کے لئے وقف کردئیے گئے۔ ہر طرف سے خرمی وشادمانی برسنے لگی اور کنج عزلت فردوس ہمنوائے "فردوس" بن گیا۔

یہ وہ مقدمہ ہے جسکی سراغرسانی پر مجھے آج تک ناز ہے اور ہمیشہ رہیگا۔

خاص

گونگی محبت

از حضرت راز ہاشمی امروہوی

ترپتے ہوئے دل کو تڑپا رہا ہوں ۔ پھر آج ایک افسانہ دہرا رہا ہوں
خیالات پر زندگی چھا رہی ہے ۔ یہ دیکھو محبت پھر اترا رہی ہے
تصور کی رعنائیاں روبرو ہیں ۔ جوانی کی انگڑائیاں روبرو ہیں
غمِ نا امیدی بھلائے ہوئے ہوں ۔ نگاہوں میں جلوے چھپائے ہوئے ہوں
وہ جلوے کسی ماہوش کے تو کیا ہیں ۔ مگر زندگانی کا اک آسرا ہیں

وہ سرما کا موسم وہ صبح کے تارے ۔ وہ اُس "سادہ پیکر" کے پیارے نظارے
وہ ہنستے ہوئے اُس کے ہونٹوں کی لرزش ۔ وہ آنکھوں کی معصوم معصوم سازش
وہ جذبات کی پردہ داری کا عالم ۔ وہ دونوں طرف بیقراری کا عالم
تقاضائے روحِ جواں اور کچھ تھا ۔ محبت کے وردِ زباں اور کچھ تھا
زمانے نے اک اور کروٹ جو بدلی ۔ نظر آشنائے نظر ہو چلی تھی
فضا بھی تبسم لٹانے لگی تھی ۔ ہوا بھی کوئی گیت گانے لگی تھی
ہر اک گام پہ بے خودی جھومتی تھی ۔ تنفس کا منہ زندگی چومتی تھی
مجھے دیکھ کر مسکراتی تھی وہ بھی ۔ کوئی بات لیکن چھپاتی تھی وہ بھی
"وہی بات" میں نے نگاہوں میں پڑھ لی ۔ عبارت کوئی سرد آہوں میں پڑھ لی
وہ رازِ محبت چھپائے ہوئے تھی ۔ کسی کے لئے دکھ اٹھائے ہوئے تھی!
مگر کہہ نہ سکتی تھی اُس راز کو وہ ۔ ترستی تھی لفظوں کی آواز کو وہ
وہ محروم تھی قوتِ گفتگو سے ۔ بہت دور تھی جنتِ رنگ و بو سے
نہ کچھ واسطہ عرضِ غم سے تھا اس کو ۔ مگر ربط اک چشمِ نم سے تھا اس کو

مری ذات تک وہ خیالات اُس کے ۔ وہ گونگی محبت کے جذبات اُس کے
"خُدا جانے کیا تھے، خُدا جانے کیا تھے"

شب نامچے

از جناب [illegible]

کلرک کا شب نامچہ

میں ایک دفتر میں کلرک ہوں۔ تنخواہ تو زیادہ نہیں ملتی مگر اوپر سے اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ بڑی شان سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ بال بچے بھی مزے سے گذر کرتے ہیں اور میں بھی خوب گلچھرّے اڑاتا ہوں۔ سنیما بھی دیکھتا ہوں۔ سیر و تفریح بھی کرتا ہوں۔ کھاتا بھی اچھا ہوں، کپڑا بھی اچھا پہنتا ہوں۔ غرض سارے کام اطمینان اور فراغت سے انجام دیتا ہوں۔ احباب میں بھی متواضع اور سیر چشم مشہور ہوں۔ بڑے بڑے آدمیوں سے مراسم ہیں۔ سب سے مساوات کے ساتھ ملتا ہوں۔ اس قسم کے تمام حضرات کی میرے متعلق یہ رائے ہے کہ میں نہایت عالی خاندان آدمی ہوں اور صرف تنخواہ ہی پہ میری بسر اوقات نہیں بلکہ گھر کی خوشحالی کو بھی اس میں دخل ہے۔ بہر حال میں صاحب ضمیر اور اصولی آدمی مشہور ہوں۔ دس بجے دفتر جاتا ہوں اور ۵ بجے واپسی ہوتی ہے۔ چائے تیار ملتی ہے۔ غسل کر کے چائے پیتا ہوں۔ دو چار قسم کے پھل میز پر ہوتے ہیں، وہ کھاتا ہوں اور سگار منہ میں دبا کر تفریح کیلئے چل دیتا ہوں۔ کبھی سنیما میں کبھی کسی اور دلچسپ جگہ وقت گذار کر دس گیارہ بجے گھر آجاتا ہوں اور عموماً کھانا کھا کے ہی سو جاتا ہوں۔ آج جو فلم دیکھ کر لوٹا تو گھر میں کچھ نئی نئی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ملازمہ نے بتایا، شہر کی کوئی بیوی آئی ہوئی ہیں، ان کے میاں کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپکے دفتر میں نوکر تھے، ان کے فنڈ کا روپیہ جمع ہے، وہ چاہتی ہیں، روپیہ انہیں مل جائے، اسی سلسلہ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے اس معاملہ سے زیادہ دلچسپی تو نہیں ہوئی مگر وہ گھر آچکی تھیں، ان کو مدد دینا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے ملازمہ سے کہا جب میں کھانا کھا چکوں تو انہیں یہاں بھیج دینا۔ ــــ کھانا کھا کر میں خلال ہی کر رہا تھا کہ اطلاع ہوئی وہ بیوی آگئی ہیں، کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہیں، بات کر لیجئے۔ میں نے پوچھا، کہئے کیا کہتی ہیں آپ؟ انہوں نے ایک طویل اور دردناک داستان بیان کرنا شروع کی، جسے خلال کرنے کی مصروفیت میں میں نے اچھی طرح سنا بھی نہیں، اور غالباً اس میں سننے کی کوئی چیز تھی بھی نہیں، عورتیں زیادہ باتیں کرنے کی عادی ہوتی ہیں، وہ بھی اپنی اس عادت کا اظہار کر رہی تھیں، وہ چاہتی تھیں جتنا بولا جا سکے بولتی رہیں، چاہے بات کام کی ایک بھی نہ ہو۔ اصل مطلب یہ تھا کہ ان کا شوہر میرے دفتر میں چپراسیوں کے زمرہ میں نوکر تھا، وہ غریب مر گیا، اس کا روپیہ جو سو کے قریب ہے، وہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے معمولی سوالات کے بعد پوچھا، آپ کیا کرتی ہیں؟

وہ بولیں کچھ نہیں!

آخر فنڈ کے روپے سے کبتک کام چلے گا، گذر اوقات کی کوئی صورت تو نکالنی ہی پڑیگی؟

جی ہاں مجبوراً کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑیگا، آپ مہربانی کر کے مجھے جلدی سے روپیہ دلا دیجئے!

دیکھئے کوشش کرونگا، اس وقت آپ ایک درخواست دیتی جائیے۔

میں لکھنا نہیں جانتی!

میں لکھوائے دیتا ہوں، آپ دستخط بھی نہ کر سکیں تو انگوٹھا لگاتی جائیں۔

جب آپ کہیں میں تیار ہوں!

میں نے درخواست کا مختصر سا مسودہ بنا کر ملازمہ کو دیا اور میری ہدایت کے مطابق وہ محلہ کے ایک شخص سے لکھا کر لے آئی، میں نے ان سے کہا، آگے آئیے، انگوٹھا لگا دیجئے

وہ برقعہ میں لپٹی ہوئی آئیں اور میز کے قریب کھڑی ہو کر بولیں، لگا لیجئے انگوٹھا!

میں نے کہا، ہاتھ نکالئے برقعہ سے!

انہوں نے ہاتھ نکال دیا اور میں نے انگوٹھے پر سیاہی لگا کر زور سے کاغذ کے اوپر دبا دیا۔

یہ تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا مگر میں نے اندازہ کیا کہ ان کے شباب میں جس کے آثار ہاتھ اور طرز گفتگو سے اچھی طرح ظاہر ہو گئے تھے کافی کشش ہے۔ میں نے آج جو فلم دیکھا تھا اس نے جذبات میں کافی ہیجان برپا کر دیا تھا، اور سنیما سے چلتے وقت ہی میں نے دل میں ایک امنگ اور رگوں میں زندگی محسوس کی تھی۔ اگرچہ گھر آکر یہ غمناک کہانی سنکر جذبات کی رو مدھم پڑ گئی تھی، پھر بھی اس کہانی کا آخری حصہ ایسا تھا جس نے میرے قلب کو پھر

جذبات کے طوفان میں ڈال دیا۔ اب میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور اُنہیں مخاطب کر کے بولا، بیوی! آپ کو روپیہ ملنا آسان نہیں ہے اس میں بہت سے قانونی جھگڑے ہیں، آپ عورت ذات ہیں گھر میں بیٹھے بیٹھے کچھ نہیں کر سکتیں، میں دن بھر مصروف رہتا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مہم کیونکر سر ہو گی، کیا آپ ڈولی میں بیٹھ کر دفتر آ سکیں گی؟

آ تو سکتی ہوں مگر یہ چاہتی ہوں کہ آپ کی عنایت سے اس کی نوبت نہ آئے تو اچھا ہے۔

یہ تو بڑی مشکل ہے، اچھا ذرا بیٹھئے میں قانون دیکھ کر ابھی آپ کو بتاتا ہوں، میں یہ کہکر اوپر کے کمرے میں چلا گیا جہاں میری چھوٹی سی لائبریری تھی اور یونہی ایک ناول پڑھنے لگا۔ پانچ منٹ کے بعد میں نے ملازمہ کو آواز دے کر کہا، انہیں یہیں بھیجدو۔

وہ آ گئیں، میں نے کہا بیٹھئے۔

وہ بیٹھ گئیں۔

کیا واقعی آپ روپیہ لینا ہی چاہتی ہیں؟

جی ہاں میں تو یہی چاہتی ہوں کہ روپیہ مجھے مل جائے۔

اچھا تو سُنئے، روپیہ آپ کو بہت جلد مل جائیگا۔

خدا آپ کا بھلا کرے۔

مگر........ میرے منہ سے نکلا اور وہ میری صورت دیکھنے لگیں، میرے دل میں شرارت ناچ رہی تھی، آنکھوں کے سامنے شیطنت کا ایک کھلا ہوا میدان تھا، میں سوچ رہا تھا، بلبل کیسی ہی ہوشیار اور سیانی ہو مگر تجربہ کار شکاری سے سابقہ پڑ جاتا ہے تو بالآخر پھنس ہی جاتی ہے جال میں ــــ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کو تھوڑی سی اُجرت بھی دینا ہو گی!

میں تیار ہوں، اُنہوں نے بڑی مستعدی سے کہا، گویا میں ان سے رشوت مانگنے والا ہوں، بتلائیے کیا پیش کروں؟

آپ ذرا آرام سے بیٹھ جائیے!

وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں، اگرچہ شکار جال میں آ چکا تھا، پر مجھے وحشت ہو رہی تھی، میں سوچ رہا تھا، وار خالی گیا تو؟ ــــ بار بار میرے جی میں آتا کہ جال کھینچوں، مگر ہر بار یہی سوچکر رہ گیا، اگر بچ گئی تو؟ ــــ مجھے مچھلی کے شکاریوں کا یہ قول یاد تھا کہ جب تک مچھلی اچھی طرح کانٹا نہ نگل لے جھٹکا نہ دینا چاہئے اور اُسے خوب دکھا کر پہلے تھکا لینا چاہئے پھر کھینچنا چاہئے۔ اسی لئے میں تامل کرتا رہا، اور خوب ڈھیل دیتا رہا، اُجرت کی نوعیت پر دیر تک گفتگو جاری رہی، آخر صبر نہ ہو سکا اور میں نے جی کڑا کر کے کہا، برقعہ اتار دیجئے!

برقعہ؟ ــــ اُنہوں نے تعجب کے ساتھ کہا، ایسا نہ کہئے!

آخر حرج ہی کیا ہے، یہاں میرے اور آپ کے سوا ہے کون؟

آپ سے ہی تو........

مجھ سے کیا پردہ، مجھے گھر کا آدمی سمجھئے، میں آپ کا خادم ہوں، آپ کے ہر کام کو اپنا سمجھ کر کرونگا اور کل ہی کو روپیہ آپ کے گھر بھجوا دونگا۔ میں نے دیکھا، اُنہوں نے ایک جھرجھری سی لی جیسے میں اُنہیں پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی سے گر جانے کو کہہ رہا ہوں اسوقت ان کی فطری حیا اور ضرورت کی اہمیت میں جنگ ہو رہی تھی۔ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ اہم تھیں، ایک طرف کنواں تھا تو دوسری طرف آگ کے شعلے، میں نے انہیں سوچنے کا موقع دیا اور اس مہلت میں اُٹھ کر اندر جانے والے دروازہ کو بند کر دیا، اُنہوں نے سہم کر مجھے دیکھا گویا میں فرشتہ درندہ بن گیا ہوں، میں نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا برقعہ اتار دیجئے! ورنہ روپے سے ہاتھ دھونا پڑ جائیگے آپکو، آپ کے دیور اور جیٹھ بھی تو مدعی ہیں اس روپے کے، اور یہ مجھے اختیار ہے جس کو چاہوں دلا دوں، وہ کانپنے لگیں، جیسے زور سے جاڑا چڑھ آیا ہو لیکن میرا مطالبہ ٹالا نہ جا سکتا تھا، اسکو ٹھکرانے کے یہ معنی تھے کہ وہ ستر روپے کی ڈھیری پر لات مار رہی ہیں، میرے اصرار پر اُنہوں نے اس طرح اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا جیسے دریا میں ڈوبنے والا بے آس ہو کر اپنی زندگی مدد کرنے والے کو سونپ دیتا ہے، ہم نیچی نگاہوں میں عصمت تھی، حیا اور پاکیزگی تھی مگر عصمت محض عصمت سے نہیں بچائی جا سکتی، اس کے لئے ہمت اور عمل کی طاقت درکار ہے، ظاہر ہے کہ گھروں میں بیٹھنے اور ہر خطرے کو حیا سے ٹالنے والی عورتوں کو یہ چیزیں کیونکر میسر آ سکتی ہیں، اُنہیں تو ابتدا ہی سے بے عملی کا سبق ملتا ہے، تھوڑی دیر بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ میرے نفس کو چند منٹ پہلے جو مسرت حاصل تھی، وہ اب باقی نہیں رہی، میں سمجھ رہا تھا، میں نے گناہ کیا ہے اور سخت گناہ، ایک بیکس اور لاچار عورت کی بیکسی اور بیچارگی سے فائدہ اُٹھانا صرف گناہ ہی نہیں بلکہ ظلم ہے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا شیشہ کو ٹھیس پر دے مارنے کے بعد اس کے ریزوں کو جوڑا نہیں جا سکتا۔

سیٹھ جی کا شب نامچہ

میں شہر میں بہت دولتمند مشہور ہوں میرے پاس کتنی دولت ہے۔ یہ بتانے کی نہیں بس یہ سمجھ لیجئے کہ ایک لاکھ سے کچھ اوپر میرا روپیہ صرف ادھار میں پھیلا ہوا ہے جس کا سود ہر مہینے وصول ہوتا ہے۔ سونا، چاندی اور جواہرات اس کے علاوہ ہیں، میں اپنے پرانے محل میں رہتا ہوں جو میرے پردادا کے وقت کا ہے اور ایک تنگ سڑک کے چوراہے پر واقع ہے۔ سورج ڈوبتے ہی میرے گھر میں جگہ جگہ تالے پڑ جاتے ہیں اور چراغ جلا دیئے جاتے ہیں۔ میں ۹ بجے تک باہر بیٹھا ہوا بہی کھاتوں کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہوں منیب جی سامنے بیٹھے مجھے مدد دیتے رہتے ہیں، اس کے بعد گھر میں چلا جاتا ہوں اور رسوئی جیم کر لیٹ جاتا ہوں، میری پہلی بیوی کا سورگباش ہو چکا ہے، منیب جی کے مشورے سے میں نے دوسری شادی کرلی ہے، اسوقت میری عمر پچاس برس کی ہے سٹھانی شکل سے انیس سال کی ہونگی وہ بڑی سندر ہیں، ان کا روپ دل کھینچتا ہے، پر کام دھندوں میں اتنی فرصت نہیں ملتی جو دس بیس منٹ سٹھانی کے پاس بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں کروں، سٹھانی کو بھی اس کا بڑا دکھ ہے، جب سے میں نے سنا ہے کہ شہر میں چوریوں کی واردات زیادہ ہو رہی ہے، رات کو بہت ہوشیار رہتا ہوں، اندر باہر آٹھ دس آدمی سونے پر مقرر کر دیئے ہیں، ان میں میرے قدیم نوکر چاکر بھی ہیں اور دو تین نئے آدمی بھی ہیں جنکو پہرہ دینے کیلئے رکھ لیا ہے، بندوق بڑے لالہ جی کے وقت سے گھر میں ہے میں نے کبھی اُسے چلایا تو نہیں پھر بھی دل کو ڈھارس رہتی ہے کہ کام کی چیز ہے وقت پر کام آئیگی۔ آج ۹ بجے سے پہلے ہی گھر میں آگیا، یہاں پکوان پک رہا تھا، اور کڑھائی چڑھی ہوئی تھی، سٹھانی اپنے ہاتھ سے پوریاں بیل کر گھی میں چھوڑ رہی تھیں چھن چھن کی چلنی اور میٹھی آوازیں موسم کی بھینی بھینی ہواؤں کے ساتھ کانوں کو بہت بھلی لگ رہی تھیں، رسوئی کرنے بیٹھا تو بڑا سواد آیا، میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور ہاتھ دھونے کے بعد دھوتی سے مُنہ پونچھتا ہوا چوکے سے نکل آیا صحن میں آتے ہی ایک بڑی سی ڈکار آئی جسے میں نے اپنی قوت ارادی سے اور بلند کر دیا، قریب کے گھر میں ڈکار کی آواز سُنکر کوئی ہنسا، میں نے اس کی پروا نہ کی، سٹھانی کھا پی کر اور کپڑے بدل کر آئیں، ان کی رسیلی آنکھوں میں ساون کی بہاریں مچل رہی تھیں، ماتھے پر سیندور کا لال ٹیکہ چمک رہا تھا، ابھرے ہوئے گال لال بھبوکا ہو رہے تھے اور ان سے خون ٹپکا پڑتا تھا وہ آتے ہی میرے پلنگ پر بیٹھ کر بولیں، تمہاری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے کیا ابھی سے سو جاؤ گے؟

سونا دونا کاہے کا۔ رات بھر کروٹیں بدلنی پڑتی ہیں، اندھیری راتیں اس پر چوروں کا ڈر مارے شہر میں غل مچا ہوا ہے کبھی تجوری کا خیال آتا ہے، کبھی دبی ہوئی اشرفیوں کا، کبھی اس گہنے کا جو لوگ باگ میرے گھر ڈال کر بے خبر ہو گئے ہیں، بس اسی سوچ میں رات بیت جاتی ہے!

اور یہ فوج جو بھرتی کر رکھی ہے یہ کس کام کی ہے؟

اپنا بوجھ آپ ہی اُٹھانا پڑتا ہے کوئی کسی کا نہیں ہوتا سٹھانی، پرماتما بُرا وقت نہ لائے کوئی پاس بھی نہ پھٹکے گا!

تم تو زبردستی اپنی آتما کو دکھی رکھتے ہو آدمی کو چاہئیے، چار پہر کام کاج میں گذارے تو ایک دو پہر ہنسنے بولنے کیلئے بھی رکھے، ہنسنے بولنے کو دل کہاں سے لاؤں، میرا دل تو طرح طرح کے بوجھوں سے دبا ہوا ہے۔

زیادہ فکر کرنا ٹھیک نہیں، اس سے تندرستی کو گھن لگ جاتا ہے!

فکر نہ کروں تو اور کیا کروں؟

ارے ہنسو، کھیلو، مزے اڑاؤ، سٹھانی نے مسکرا کر میری بغل میں گدگدی کرتے ہوئے کہا، میں نے دیکھا سٹھانی پر موسم کا اثر بہت زیادہ ہے، وہ باغ کی بے چین تتلی کی طرح جوانی کے پھول کا رس چوسنا چاہتی ہیں، ان کی آنکھوں میں نشہ بھرا ہوا ہے جو مجھے بھی مست بنانے کا مطالبہ کر رہا ہے، میری چھاتی فکروں کی بھاری سل کے نیچے دبی ہوئی ہے، مجھ پر ان باتوں کا اثر نہ ہوا، عمر کا فرق بہت اہم ہوتا ہے، میں پچاس سال کا بوڑھا اور سٹھانی انیس سال کی الہڑ لڑکی، میں نے پہلے ہی منیب جی سے کہدیا تھا، اونٹ کے گلے میں بکری باندھنا ٹھیک نہیں، اُنہوں نے میری ایک نہ سنی، وہ سمجھتے تھے پیسے سے جوانی خریدی جاسکتی ہے اور میری رائے ہے کہ روپیہ ہمیشہ بڑھاپا ساتھ لاتا ہے، کچھ بھی ہو، میں سٹھانی کے ساتھ جوانی کے راستہ پر دوڑنے سے مجبور ہوں، میں نے سٹھانی کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور ان کے سب اشارے کو اس طرح ٹالتا رہا، جیسے میں کچھ سمجھ ہی نہیں رہا، دیر تک سٹھانی بیٹھی جمائیاں لیتی رہیں، آخر انہوں نے ایک انگڑائی لے کر اٹھنے کا ارادہ کرتے

ہوئے کہا، تم تو ایسے پڑ رہے ہو جیسے دس بیس کوس کی منزل کر کے آتے ہو!

منزل تو نہیں کی مگر تھک اتنا ہی گیا ہوں جیسے چل کر آیا ہوں۔

اچھا تو میں جاتی ہوں؟

ہاں جاؤ،

رات بڑی اندھیری تھی، کالے بادل آسمان پر مست ہاتھیوں کی طرح دوڑتے پھر رہے تھے، بوندا باندی تو چوبیس گھنٹہ سے جاری تھی، اسوقت ۱۱ بج چکے تھے، مینڈکوں کی ٹیں ٹیں اور جھینگروں کی سیٹیوں کے علاوہ اگر کوئی آواز آتی تھی تو وہ پانی بہنے کی دھائیں دھائیں تھی، پرنالوں سے پانی گر رہا تھا اور نالیوں میں تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

سیٹھانی کو گئے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے ہیں، اتنی دیر جاگتا ہی رہا، میرے تمام کی نیند اڑ گئی تھی، ذرا آنکھ جھپکنے کے قریب ہوتی تو یہ شبہ ہوتا کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہے، یہ خیال آتے ہی چونک جاتا اور دل دھک دھک کرنے لگتا، ایک بجے کے قریب گھبراہٹ زیادہ ہوتی تو جی میں کہا چلو تجوری کو ہی دیکھ آؤں، پہرے والے آدمی اگر سو گئے ہوں تو انہیں جگا دوں، میں پلنگ سے اٹھا اور تجوری کے پاس پہونچکر دیر تک کھڑا رہا۔ وہاں سے بلونتا کی کوٹھڑی میں گیا وہ پڑا بے خبر سو رہا تھا خراٹوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی، میں نے زور سے کمر میں لات مار کر کہا، نشہ کر کے آیا ہے کیا آج۔ میں تجھے سونے کی تنخواہ نہیں دیتا، سونا ہے تو گھر جا کر سو۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اس کے کپڑے پانی میں بھیگے ہوئے تھے، گڑ گڑا کر کہنے لگا، سیٹھ جی یوں ہی ذرا اونگھ گیا تھا، ابھی تو بیٹھا ہوا تھا۔

دیکھو اب آنکھ نہ جھپکے، اُسے ڈانٹ کر میں نے دوسرے آدمیوں کو ہوشیار کیا اور سب سے کہا جاگتے رہنا، رات بہت اندھیری ہے، میرے کمرے کے اوپر ایک کمرہ تھا اس میں میرے بوڑھے نوکر امیدا کا بڑا بیٹا دولتا سویا کرتا تھا، یہ اپنے گھر ہی کا لونڈا تھا اسی لئے میں اُسے گھر میں سُلا لیا کرتا تھا، بڑا مضبوط جوان تھا، اس کا چمکتے ہوئے سیاہ رنگ کا چہرہ جس پر ماتا کے گہرے گہرے داغ بڑے بھیانک معلوم ہوتے تھے، پھر موٹے موٹے بے ڈول ہونٹ، چوڑے چوڑے بھدے اور کھرپا سے دانت غرض اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی، بس اتنی بات اچھی تھی کہ آدمی ذرا جی دار تھا، اور گھر کی حفاظت میں افریقہ کے کتے سے کم نہ تھا، میں اپنے کمرے کے پاس آیا اور اندر جانے کا ارادہ کیا تو ایکدم دل میں یہ بات آئی کہ لاؤ چلتے چلتے دولتا کو بھی جگاتا چلوں وہ نیند کا بڑا رسیا ہے، دن کو بھی سو جاتا ہے، میں جسوقت زینہ پر چڑھ کر اوپر پہنچا ہوں موسلا دھار مینہ برس رہا تھا، پانی کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی جس برآمدے میں دولتا سوتا تھا، وہاں بوچھار بہت آتی تھی غالباً اسی وجہ سے وہ اسوقت اندر کمرے میں کواڑ بھیڑے پڑا تھا، میں نے دروازے کے پاس پہنچکر ارادہ کیا کہ کواڑوں کو دھکا دیکر کھول لوں کہ میرے کانوں میں کچھ ایسی بھنک پڑی جیسے سیٹھانی کسی سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہوں، میں نے آہستہ سے جھانک کر دیکھا، اندر کا سماں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، سیٹھانی دولتا کی پائنتی بیٹھی تھیں اور بار بار اس کے منہ کی طرف جھک کر کچھ کہتی تھیں، ذرا دیر بعد دولتا بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سیٹھانی کے گلے میں باہیں ڈال دیں، میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی، ہائے میں لٹ گیا، میں نے آہستہ سے کہا، مجھ میں نہ ہمت تھی کہ سیٹھانی کے بال پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے جاؤں، اور دولتا کے دو لاتیں رسید کروں، نہ وہاں کھڑے رہنے کی طاقت تھی، میرا خون رگوں میں کھول رہا تھا، دنیا پر جو اندھیری چھائی ہوئی تھی اسے میں اس اندھیر کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا تھا، جو میرے گھر میں ہو رہا تھا، میں مال اور دولت کو چوروں سے بچا رہا تھا مگر عزت اور آبرو پر ڈاکے پڑ رہے تھے، چھاتی پر پتھر رکھ کر میں چلا آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا، نہ کسی سے اپنا غم کہہ سکتا تھا نہ غصہ پی جانے کا حوصلہ تھا عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا، رات بھر کانٹوں پر لوٹتا رہا +

آپ کا خریداری نمبر

دفتر کیلئے بہت اہمیت رکھتا ہے جب کبھی آپ پرچہ نہ پہنچنے یا پتہ تبدیل کرانے کے لئے دفتر کو لکھیں تو اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ آپکے ارشاد کی فوراً تعمیل کی جائیگی۔ (منیجر)

تبدیلی پتہ کی اطلاع

ناظرین کرام سے گذارش ہے کہ پتہ کی تبدیلی کی اطلاع تاریخ اشاعت مست قلندر سے کم از کم دس روز پہلے دفتر میں بھیجدیا کریں ورنہ اپنے حلقہ کے پوسٹماسٹر کو اطلاع دیدیں کہ وہ آپکے جدید پتہ پر آپ کا پرچہ بھیجدے۔ (منیجر)

تار کا پتہ کلوریم لاہور

پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ

ٹیلیفون ۵۵۵۸





کے بارے میں

اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ کے ایک مشہور ڈاکٹر و حکیم حاذق کے تجربہ کی تازہ ترین چٹھی کی ہوبہو نقل

جس نے اپنے مطب میں لاعلاج آنکھوں کے مریضوں پر پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کا استعمال کرنیکے بعد تجربہ کی۔

AKAL GARH
Dated 9. 10. 1942.

شریمان محترم پنڈت صاحب زاد لطفکم

آداب بعد نیاز۔ ادویات کے فوائد یعنی پرل کلوریم کے فوائد بطور سرٹیفکیٹ مندرجہ ذیل ہیں تاکہ آپ اپنی طرف سے اخباروں میں شائع کرا دیں۔ میں بند شیشیاں بیچنے کے علاوہ مریضان چشم کا علاج بھی اپنے مطب میں کرتا ہوں جس کے کثیر فوائد اور معجز نمائی خاصتیں حسب ذیل ہیں شائع کر دیں۔ **۱**۔ سفید موتیا بند کا ایک مریض جسکا نام اللہ دتا تھا جس کو چار ماہ سے سفید موتیا اترا ہوا تھا۔ نارمل پوٹینسی کی دو شیشیوں نے وہ معجز نما فائدہ کیا کہ مریض بالکل صحتیاب ہے۔ عرصہ دو ماہ میں آنکھ میں کوئی تکلیف نہیں رہی۔ بالکل شفایاب ہو گیا۔ آپکو مبارک ہو۔ **۲**۔ موضع جیاداں جو ہمارے نزدیک ہی ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے نمبردار کی عورت جو آنکھ کی تکلیف سے عرصہ ایک ماہ سے سخت لاچار تھی۔ آنکھ سرخ تھی۔ پانی بہتا تھا۔ نہ دن کو آرام نہ رات کو چین تھا۔ پرماتما کے فضل سے صرف تین یوم کے علاج (نارمل پوٹینسی) سے بالکل آرام ہو کر شفایاب ہوئی۔ اور آپکے حق میں دعائے خیر دیتی تھی۔ **۳**۔ عرصہ ایک سال سے ایک مریضہ آنکھوں کا علاج کرتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھ کا ڈیلہ پھول کر باہر سے بھی موٹا ہو گیا اور مریضہ دن رات بے چین تھی۔ عورت کے خاوند کا ارادہ ہوا کہ آنکھ سے ڈیلہ نکلوا دیا جائے۔ مجھ سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے نارمل پوٹینسی سے علاج شروع کیا۔ دوسرے ہی روز پانی بہنا اور درد بند ہو گیا۔ اور اب میرے زیر علاج ہے اور کلی صحت کی امید ہے۔ **۴**۔ اکال گڑھ کے ایک درزی امام دین کی ۹ سالہ لڑکی کے ککرے تھے۔ وہ کسی ڈاکٹر سے کاسٹک ٹچ کراتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھ کا ڈیلہ سفید ہو گیا اور آنکھ سے پانی دن رات بہنے لگا اور درد سے لاچار لڑکی دن اور رات آرام نہ کر سکتی۔ میرے پاس آئے۔ صرف تین یوم میں کلی آرام ہوا۔ درد اور پانی بہنا تو پہلے ہی روز بند ہو گیا اور لڑکی پہلے ہی روز آرام سے سوئی۔ **۵**۔ یہی حالت چوہدری عنایت اللہ صاحب نمبردار کی بیوی کی تھی۔ آنکھ کی سرخی، درد اور پانی بہنے سے سخت تکلیف تھی۔ پرماتما کے فضل سے تین روز میں ہی نارمل پوٹینسی) سے کلی صحت حاصل کی۔ **۶**۔ ایک اور موتیا بند کا مریض جو ذات کا چنگڑ اور میدنگر گاؤں کا رہنے والا تھا۔ دو ماہ کے متواتر استعمال سے بالکل شفایاب ہوا۔ **۷**۔ چھوٹی چھوٹی مرضوں مثلاً آشوب چشم۔ ککرے۔ درد چشم۔ آنکھ سے پانی بہنا وغیرہ کے پندرہ مریض صحتیاب ہوئے۔ **۸**۔ جٹہ آنکھ کے آٹھ مریض۔ پڑوال کے دو مریض۔ ناخونہ کے پانچ مریض۔ ابتدائی موتیا بند سفید کے چار مریض بالکل صحتیاب ہوئے۔ داس برج لعل جوشی حکیم حاذق، جوشی فارمیسی اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ

نوٹ۔ پرل کلوریم آئی ڈراپ کی قیمتوں میں یکم جنوری ۱۹۴۳ء سے ۱۲½ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

قیمتیں سپیشل پوٹینسی گیارہ روپے چار آنہ۔ نارمل بڑی چار روپے چار آنہ۔ چھوٹی دو روپے چار آنہ۔ علاوہ محصولڈاک و خرچہ پیکنگ۔ پرچہ ترکیب استعمال ہر زبان میں ہمراہ شیشی ہو گا۔ اپنے شہر کے دوافروشوں سے طلب کریں۔ **لوکل چیف ایجنٹس**: میسرز ملی رام اینڈ برادرز انارکلی لاہور۔ **لوکل ایجنٹس**:۔ میسرز سیرو برادرس چوک انارکلی لاہور۔ میسرز کشن چند اینڈ کمپنی لمیٹڈ چوک انارکلی۔ میسرز نرائن داس بھگوانداس انارکلی لاہور۔ میسرز شنکر میڈیکل ہال نسبت روڈ لاہور۔ میسرز دیوان چند اینڈ کمپنی میکلوڈ روڈ لاہور۔ مکٹرن برادرز ڈپو متصل اڈہ لوہاری لاہور۔ کریسنٹ میڈیکل سٹورز بالمقابل ڈینگا سنگھ بلڈنگ دی مال لاہور۔ ایمپائر میڈیسن کمپنی چوک چکلہ لاہور۔ مریضان چشم موجد کے مشورہ سے صبح ۹ لغایت ۱۱ بجے مفت فائدہ حاصل کریں۔

ملنے کا پتہ:۔ **منیجر پرل اینڈ کمپنی رجسٹرڈ کوٹھی ۹ (M. Q.) ایبٹ روڈ۔ لاہور**

حافظ عیدا شاہ کی مستی و قلندری

از جناب نسیم سندیلوی ایم اے

حافظ عیدا ان لوگوں میں سے تھے جو دوسروں کو برابر عذاب و ثواب کے پند و نصائح کرتے رہتے اور نار جہنم سے ڈرانے کے عادی تھے۔ لیکن خود اپنے لئے ان کا یہ خیال تھا کہ تمام عمر کی عبادت کے صلہ میں ان کیلئے جنت میں ایک نہایت پُرفضا بارونق جگہ مخصوص کر دی گئی ہے جو ان سے پہلے نہ کسی دوسرے کو مل سکتی ہے اور نہ ان کے بعد ان کا کوئی دعویدار ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اکثر پاس بیٹھنے والوں سے اپنے ان حور و غلمان کے خوابوں کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ اور کبھی کبھی ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں بتلاتی رہتی تھیں کہ وہ کھلی ہونے پر بھی دور کے سہانے خواب دیکھ رہی ہیں۔

حافظ عیدا کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم، چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی سرمہ سے بھری آنکھیں، گول گول گال پھولے پھولے نتھنے، گول چہرہ، لمبی کھوپڑی کھڑے ہوئے کان، سیاہ داڑھی لمبے لمبے گیسو جن میں ہر وقت تیل کی افراط رہتی تھی۔ ایک لمبا سبز تہبند، سبز گھٹنوں سے نیچا کرتہ، اور سبز ہی پگڑی یہ ان کی پوشاک تھی۔ دیکھنے میں اچھے خاصے سدا بہار جوگی معلوم ہوتے تھے۔

پہلے حافظ عیدا کچھ بھی رہے ہوں لیکن ادھر چھ برس سے جب سے وہ گاؤں کی مسجد میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان کے روز کے معمول میں کبھی کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔

منہ اندھیرے ... اٹھکر آنکھیں ملتے ہوئے فجر کی اذان دینا جو اگر وقت بڑھے تو اسقدر زور سے دی جاتی کہ سارا گاؤں جاگ اٹھے اور اگر کچھ دیر ہو گئی ہے تو چپکے چپکے خاموشی سے کہہ لی جاتی تھی۔ نماز کے بعد کچھ تھوڑی سی ورزش۔ اس کے بعد بدن پر کڑوے تیل کی مالش۔ غسل اور پھر تعویذ لکھنے کا سلسلہ دوپہر میں کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام پھر ظہر کی نماز اور اسی طرح تعویذ لکھتے لکھتے یا تعویذ لکھنے کے انتظار میں شام کر دینا ان کا مشغلہ تھا۔ مغرب کی نماز وہ قدرے اہتمام اور خاص قرأت سے پڑھاتے تھے جس کا ظاہری سبب یہ معلوم ہوتا تھا کہ گاؤں کے زمیندار صاحب صرف مغرب کی نماز پڑھنے مسجد میں تشریف لاتے تھے اور ان کے ساتھ چار چھ اور بھی مصاحبین ہوتے تھے۔

گاؤں کے نکڑ پر فضلو پنساری کی دوکان پہ آٹا دال سے بڑھتے بڑھتے معمولی کپڑا، شکر، چائے، اور کونین تک بکنے لگی تھی۔ اور پھر فضلو کے مرنے کے بعد اس کے بھائی بدلو نے کچھ دن دوکان چلائی۔ لیکن اس نکمے جوان نے چند ہی دنوں میں دوکان کا بھٹہ بٹھا کر دیا۔ بیوہ بھاوج جس نے شوہر کے جیتے جی کبھی گھر سے قدم نہ نکالا تھا۔ اب سینے پرونے پر گزر اوقات کرنے لگی لیکن حافظ عیدا کے تعویذوں اور ان کے عقیدتمندوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ فضلو دوکان کی ترقی اور اپنی خوشحالی کیلئے جب تب تعویذ لاتا رہتا تھا۔ اس کی عورت نے شوہر کی بیماری میں حافظ جی کا تعویذ پہنایا تھا اور بدلو نے دوکان کی ملکیت اور اس پر قبضہ کے لئے بھی حافظ جی کا تعویذ لکھایا تھا۔ اور اب تباہی کے بعد بھی فضلو کی بیوہ بیماری دکھ میں حافظ عیدا کا تعویذ ضرور لاتی تھی۔ حافظ عیدا کے تعویذ میں ایک بات کرامت کی ضرور تھی اور وہ یہ کہ ان کے پاس چیچک، طاعون، ہیضہ، بخار اور تمام امراض جسمانی سے لیکر تسخیر قلب اور بچہ پیدا کرنے، سبھی طرح کے تعویذ تھے اور پھر خاص بات یہ تھی کہ سب کی قیمت جسے وہ نذرانہ کے نام سے یاد فرماتے تھے، وہی پانچ پیسے، جیسے گڑبڑ جھالے کی دوکان پر ہر چیز کے ایک دام۔

کرمی تیلی کے بیل مر گئے۔ بیچارہ پیسے پیسے کا محتاج ہو گیا لیکن اب بھی وہ اسی عقیدت کے ساتھ حافظ عیدا سے کٹھن کے وقت میں پانچ پیسے والا تعویذ لکھواتا رہتا تھا۔ حافظ جی کے عقیدتمندوں میں ہندو مسلمان، چمار، پاسی سب ہی تھے اور ان کا کرم بھی ہر اس شخص کیلئے عام تھا جسکی جیب میں نذرانہ کے پانچ پیسے کھنک رہے ہوں۔

مسجد کے سامنے رمضی بھڑبھونجے کا چھوٹا سا

کچّا مکان اور اس میں ایک طرف اسکی چھوٹی سی دوکان بھی تھی جس پہ بازار کے دن کچھ چہل پہل ہو جاتی تھی ورنہ ہفتہ کے چھ دن بہاڑ دن میں سونا پڑا رہتا تھا۔ دمڑی کی عورت تُنسیا حافظ عیدا کی خاص طور پہ معتقد تھی اور اُسے ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ اس کی گود کے بچّہ کو جب چیچک مائی نے ستایا تھا تو حافظ جی کا تعویذ ہی کارگر ہوا تھا۔ بیچاری کی یہی ایک اولاد نرینہ تھی جس پر اس کا سہارا تھا۔ ویسے تو تین لڑکیاں اور بھی تھیں لیکن لڑکیوں کا شمار گاؤں میں اولاد میں نہیں ہوتا۔ حافظ جی کی اس عنایت کو وہ ابھی بھولی نہ تھی اور بھولتی بھی کیسے۔ حافظ جی نے اس کے لڑکے کی جان بچائی تھی۔ وہ برابر جب بھی بھاڑ گرم ہوتا کبھی تازہ بھنی ہوئی گرم گرم جوار کبھی چنے کبھی لائے نذرانہ بھیجتی رہتی تھی۔ پہلے حافظ جی کو دے جاتی تب دوکان پہ بکری شروع ہوتی۔ اس کی جوان لڑکی منی حافظ جی کی خدمت کیلئے چوبیس گھنٹہ تیار رہتی گھر میں پانی کی ایک بوند نہ ہو۔ برتن باسن مانجنے کے لئے پڑے ہوں لیکن کیا مجال کہ حافظ جی آواز دیں اور منی کو جانے میں ایک منٹ کی دیر ہو جائے۔ تمام کام چھوڑ کر حافظ عیدا کا کام پہلے ہوتا۔ حافظ جی یوں تو قریب قریب روزانہ ہی نہانے کیلئے پانی منی سے بھرواتے تھے لیکن منی کی خاص ضرورت اسوقت ہوتی تھی جب حافظ جی کے پیروں میں اینٹھن اور درد ہوتا تھا جو جاڑوں کی رات میں اکثر اور جیٹھ بیساکھ دوپہر میں کبھی کبھی ہوتا رہتا تھا۔ منی بیچاری اسوقت فوراً پیر دابنے کیلئے طلب کی جاتی اور کچھ دیر بعد جاڑے کی ٹھنڈی ہوا یا لو لگ جانے کے خوف سے حجرہ کے دروازے بند کر لئے جاتے۔ ماں باپ کا علم اور حافظ جی کے جلال نے منی بیچاری کو کبھی زبان نہ کھولنے دی۔

رمضان کے مہینہ میں حافظ جی کا غصہ کچھ بڑھ جاتا تھا اور گاؤں کے معمولی کسانوں اور مزدور پیشہ لوگوں کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان کے حجرہ میں چلے جائیں۔ ہاں اگر گاؤں کا مکھیا، چوکیدار یا زمیندار کا کارندہ آجائے تو اس سے وہ اسی انکساری سے ملتے تھے۔ رمضان میں اکثر عشا کے بعد حافظ عیدا کے وعظ بھی ہوتے رہتے تھے اور اسوقت وہ ایک جہاندیدہ مقرر کی طرح اپنی گردن کی رگوں سے لے کر ہاتھوں اور پیروں تک سے کام لیتے تھے۔ انہیں دوسروں کے عیب ظاہر کرنے میں ذرا جھجک نہ معلوم ہوتی تھی۔ اور اوروں کا پردہ فاش کرتے انہیں ایک خاص مسرت معلوم ہوتی تھی۔ اسی لئے اور بھی جہاں گاؤں والوں میں سے کسی کی طرف حافظ عیدا نے ذرا ترچھی نظر سے دیکھ لیا کہ بس سوغات پر سوغات آنا شروع ہو گئیں۔ کوئی دودھ کی لٹیا لئے چلا آرہا ہے کسی کے ہاتھ میں روغنی ٹکیاں ہیں۔ کوئی انڈے پیش کر رہا ہے۔

~~~~~~~~

ایک دن نہ جانے حافظ جی کس سوچ میں تھے کہ انتظار کے بعد چوپال میں آبیٹھے۔ فوراً ان کے سامنے حقہ بھر کر رکھا گیا۔ آٹے دال کے بھاؤ اور فصل کی پیداوار پہ بات چیت ہو رہی تھی کہ ایک دم روزہ نماز کی باتیں چھڑ گئیں باتوں کا رُخ بدلنے بھی کچھ دیر نہیں لگتی۔ سچ پوچھئے تو اب بھی اگر کسی جگہ مذہب کا بے لوث پاک خیال باقی ہے تو ہمارے دیہاتوں میں اور وہ بھی صرف ان دیہاتوں میں جو حافظ عیدا جیسے کرم فرماؤں سے پاک ہیں۔ ورنہ شہر میں تو اب مذہب نام ہے فرقہ دارانہ فساد الیکشن اور خود غرضیوں کا۔ گاؤں کے سیدھے دیہاتی اب بھی مذہب کو ایک پاک شے جانتے ہیں۔ ایمان ان کیلئے اب بھی بڑی چیز ہے۔ ان کا مذہب سچائی، دوسروں کی بھلائی اور ایکدوسرے کے سہارے پر مبنی ہے۔ مذہب ان کیلئے تمام اچھائیوں کا منبع ہے دنیاداری اور رسومات سے پاک۔ وہ روزہ و نماز کے دل سے پابند ہیں غریب کسان شام کو جو کی روٹی اور چنے کی دال سے روزہ کھولتا ہے اور سحری میں ایک گلاس پانی اور ایک چلم تمباکو پی کر پھر دوسرے روزہ کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ روزہ فرض سمجھ کر رکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ روزہ کی نیت کیا ہے۔ روزہ کا ثواب کیا ہے اور روزہ کن حالتوں میں معاف ہے۔ بس اس کیلئے رمضان کے تیس دن روزہ رکھنا فرض ہے تکلیف و آرام سے بے پروا وہ روزہ رکھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ عید آجاتی ہے اور عید کے دن وہ اسلئے خوش ہوتا ہے کہ اس نے اپنا فرض ادا کیا اسلئے نہیں کہ اُسے کتنا ثواب ملا۔

حافظ عیدا نے شبراتی کی طرف مخاطب ہو کر سوال کیا "کیوں رے آج تیرے کتنے روزے ہوئے" حافظ جی سوائے مکھیا، چوکیدار، اور زمیندار کے کارندوں کے اور کسی کو آپ یا تم سے مخاطب کرنا نہیں جانتے تھے۔

"تیرہ" شبراتی نے فخریہ جواب دیا۔ کیونکہ اس کا اب تک کوئی روزہ نہیں چھوٹا تھا۔

"نماز اماز پڑھنے تو آتا نہیں۔ نہ جانے روزہ بھی کس طرح رکھ لیتا ہے۔ آج کل جاڑوں کے دو گھڑی کے روزہ ہیں نا۔ نہ معلوم تیرے روزے قبول بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ بھلا تو نیت کیا کرتا ہے" حافظ عیدا نے فخریہ ترنم
~~~~~~~~

دتب کرتے ہوئے کہا۔

"نیت تو حافظ جی بڑی ہی آسان ہے نیت کرتا ہوں میں ایک رکعت روزہ کی واسطے اللہ تعالیٰ کے۔ وقت سحر کا، منہ طرف کعبہ شریف کے، اللہ اکبر" شراتی نے اسی طرح جواب دیا کہ وہ سب جانتا ہے۔

حافظ عیدا اکڑ کر بولے "یہ روزہ کی نیت ہے۔ لعنت خدا کی تم لوگوں پر، تمہارا روزہ اوزہ خاک نہیں ہوتا۔ خدا نیت دیکھتا ہے اور جب تمہیں روزہ کی نیت ہی کرنا نہیں آتی تو تمہارا روزہ کیا قبول ہوگا۔ اور تمہیں ثواب کیا ملے گا۔ اس طرح فاقہ کرنے سے کیا فائدہ۔ میں تو بکتے بکتے پاگل ہوگیا کہ مسجد میں آکر وعظ سنا کرو۔ تمہی لوگوں کی بھلائی کیلئے کہتا ہوں۔ لیکن تم لوگوں کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ تمہاری جگہ مجھے تو قبر میں جانا نہیں بھگتنا ہو تم جیسے مسلمانوں پر جو روزہ کی نیت تک نہیں جانتے" اور ساتھ ہی حافظ نے بڑبڑاتے ہوئے ایک چھوٹی سی آیت پڑھی اور کڑک کر بولے "یہ ہے روزہ کی نیت"

چوپال کے تمام آدمی گردن ہلا ہلا کر حافظ جی کی باتیں ہمہ تن گوش سن رہے تھے جیسے کہ ان کی تصدیق کر رہے ہوں۔ اختلاف کی بھلا کس میں مجال تھی اور شراتی بیچارہ گردن جھکائے خاموش بیٹھا سب کے سامنے ذلیل ہو رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ سچ مچ کیا یہ سب روزے یونہی گئے۔

اسی طرح حافظ عیدا نے جمن۔ براتی اور کلوا سے بھی دو چار ٹیڑھے ٹیڑھے سوال کئے اور کسی کا تسلی بخش جواب نہ پاکر منہ بناتے لاحول پڑھتے چوپال سے اٹھ کر چلے گئے۔

~~~~~

گاؤں والوں کا کوئی عیب زیادہ دنوں تک چھپا نہیں رہتا۔ اول تو انہیں عیب کرنے کیلئے زمانہ حاضر کے وہ نئے نئے طریقے نہیں معلوم۔ دوسرے گاؤں کی آبادی اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ وہاں سب ہی ایک دوسرے کے خانگی معاملات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور اس لئے ان کا کوئی راز دنوں تک راز نہیں رہ سکتا۔

ادھر کچھ دنوں سے بنسی کا پیٹ غیر معمولی طور پر پھولتا جا رہا تھا۔ شہر ہوتا تو شاید کسی کو اس ذرا سی بات کی پروا بھی نہ ہوتی لیکن گاؤں والوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بنسی بے بیاہی ہے اور ایک کنواری لڑکی کا اس طرح بڑھتا ہوا پیٹ خالی از علت نہیں چنانچہ چند ہی دنوں میں یہ بات گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ جوان لڑکیاں بنسی کے سایہ سے کترانے لگیں۔ خود اس کی سہیلیاں اب اس سے بچ کر نکل جاتی تھیں اور اس کی طرف اگر دیکھتی تھیں تو نہایت حقارت سے۔ بنسی کی ماں پر انگشت نمائیاں ہونے لگیں۔ ماں باپ اپنے بچہ پر اتنی جلدی شبہات نہیں کرتے جن افواہوں کی گاؤں والوں میں کانا پھوسی ہو رہی تھی۔ تلسیا کو بغیر مکمل ثبوت کے کبھی ان کا خیال بھی نہ آسکتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ پریشان تھی۔ جوان لڑکی پر گاؤں بھر کا شبہ اسے ایک آن نہ بھاتا تھا۔

آخر وہ ایک دن بنسی کے انکار کرتے رہنے پر بھی اسے حافظ عیدا کے پاس لئے چلی ہی گئی۔

بیسواں روزہ تھا اور پانچ بجے کا وقت۔ حافظ عیدا کچھ گھبرائے ہوئے تو تھے ہی۔ ماں بیٹی کو اس طرح سامنے سے آتا دیکھ کر سٹ پٹا گئے۔ دل میں چور تھا۔ لیکن آخر دنیا دیکھے تھے سنبھل کر بیٹھ گئے اور وظیفہ پڑھنے لگے۔ تلسیا نے آکر دور ہی سے سلام کیا۔ مسجد کے صحن میں آنے کی بھلا اس کی کب مجال تھی۔ ذرا سی دیر میں ایک نیا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایک ہندو نیچ ذات بھلا مسلمانوں کی مسجد میں کیونکر جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد حافظ جی نے وظیفہ سے فراغت پائی اور حجرہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ اور ماں بیٹی کو آنے کا اشارہ کیا۔

تلسیا نے حجرہ کے دروازہ پر سے ہی بڑی منت سے کہا "شاہ صاحب دیکھئے تو بنسی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ پیٹ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ دن بھر سست پڑی رہتی ہے۔ ایشور جانے قسمت میں کیا لکھا ہے۔"

حافظ عیدا نے ایک نظر بنسی کی طرف دیکھا بنسی کی پرنم آنکھیں کہہ رہی تھیں "اب کیا ہوگا" لیکن حافظ جی نے وظیفہ ہی میں جواب سوچ لیا تھا۔ کچھ دیر مصلحتاً خاموش رہنے کے بعد بڑی سنجیدگی سے بولے "اسے پیٹ کا روگ ہے۔ تعویذ دئے دیتا ہوں خدا نے چاہا آرام ہو جائیگا" یہ کہتے ہوئے انہوں نے تکیے کے نیچے سے ایک تعویذ نکال کر تلسیا کے ہاتھ پر رکھ دیا اور نذرانہ کے پانچ پیسے لے کر تکیہ کے نیچے رکھ لئے۔ تلسیا کو اطمینان ہو گیا۔ گاؤں بھر میں یہ خبر شام تک پھیل گئی کہ بنسی کو پیٹ کا روگ ہے جو لوگ طرح طرح کا شبہ کر رہے تھے۔ ان کا جیسے کسی نے منہ بند کر دیا ہو۔ حافظ عیدا کی تشخیص میں اپنی رائے دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔

لیکن بنسی کے دل میں جیسے دھونکنی چل رہی ہو۔ اسے آج پہلی بار اپنے گناہ کا احساس ہو رہا تھا۔ اب کیا ہوگا جگ ہنسائی ہوگی۔ ماں باپ کے ماتھے پر مجھ کلنکنی کی وجہ سے سیاہ ٹیکہ لگیگا ـــ یہ خیالات
~~~~~

اندر ہی اندر اُسے ملامت کر رہے تھے۔
آخر اس سے نہ رہا گیا اور رات کے سناٹے میں وہ حافظ عیدا کے پاس پھر پہنچی اور دبی آواز میں جس میں نہ جانے کیا کیا جذبات پنہاں تھے پوچھا۔" اب کیا ہوگا۔"
حافظ عیدا نے بغیر کسی خاص تجسس کا اظہار کئے اپنے حجرہ سے چھ پڑیاں لا کر بنسی کو دیں اور تاکید کر دی کہ ایک پڑیا روزانہ صبح گرم پانی کے ساتھ کھائی جائے اور جس قدر محنت ہو سکے کی جائے۔ سب ٹھیک ہو جائیگا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔" بنسی کو دوا پاکر کچھ اطمینان ہوگیا اور وہ دبے پاؤں واپس چلی گئی۔

اس کے پانچ ہی دن بعد ۲۷ رمضان کو حافظ عیدا کو سخت بدہضمی ہوئی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پچیس دست آ گئے جس نے حافظ جی کو بالکل توڑ دیا۔ عقیدت مندوں کا عیادت کیلئے آیا ہوا مجمع چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ کسی نے رائے دی" شاہ صاحب کوئی تعویذ باندھ لیجئے۔"
حافظ عیدا نے نہایت انکساری سے جواب دیا" بھائی تعویذ تو تم لوگوں کے لئے تھے۔ خدا مجھ سے اسی بہانے اپنے بندوں کی خدمت کر رہا تھا۔ میرے لئے تو شہر سے کوئی معمولی حکیم بلادیتے۔ ورنہ ہم تو خدا توکل پر پڑے ہیں۔" اس وقت پہلی بار حافظ جی کو اپنے تعویذوں کے ناقص ہونے کا خیال آ رہا تھا۔
اس جملہ سے حافظ جی پر لوگوں کا اعتقاد اور بڑھ گیا۔ حکم کی تعمیل میں بھلا کیونکر دیر ہو سکتی تھی۔ دو دو چار چار آنہ چندہ کیا گیا اور شہر سے ڈاکٹر لانے آدمی دوڑا دیا گیا۔

حافظ عیدا کا خیال تھا کہ رمضان کا مہینہ خوب کھانے کیلئے اور اچھی غذا کھانے کیلئے بنایا گیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ رمضان میں رات بھر کھاتے ہی رہتے تھے۔ افطار سے عشا تک ان کا منہ برابر چلتا رہتا تھا اور ادھر دو بجے سے اُٹھ کر صبح آخر وقت تک سحری سے شغل کرتے رہتے تھے اور ادھر آخری رمضان میں ان کی بھوک اور بھی کھل گئی تھی۔ سوچتے رہتے تھے کہ کیا پاؤں پیٹ میں رکھ لوں۔ نہ جانے پھر کتنے دن بعد یہ غذا نصیب ہو۔
ڈاکٹر کے آتے آتے حافظ جی کی نبضیں چھوٹ گئیں۔ ڈاکٹر بے چارہ کیا کرتا۔ مرض کی دوا تو وہ دے سکتا ہے لیکن موت کی دوا کس کے پاس ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ گاؤں والے اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ جیسے کہ کہہ رہے ہوں۔ "بس تم بھی یوں ہی ہو۔ ڈاکٹری آکٹری خاک نہیں جانتے۔ ویسے ہی لوگوں کی جیب کاٹتے رہتے ہو" لیکن ڈاکٹر ایسی نظروں کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ فیس کے روپے تو پہلے ہی جیب میں پہنچ چکے تھے۔ ڈاکٹر نے ہینڈ بیگ اُٹھایا اور جاکر تانگہ پر بیٹھ گئے۔ لوگ اپنی اپنی کہتے ہی رہے اور تانگہ چل دیا۔
مغرب کے قریب حافظ عیدا کا دم نکلا۔ تمام گاؤں میں ایک کہرام مچ گیا جسے دیکھئے آنسو پونچھتا جنازہ میں شرکت کیلئے چلا آ رہا ہے۔ کل تک جو لوگ حافظ عیدا کو حافظ جی کہہ کر پکارتے تھے آج ان کے مرتے ہی وہ بھی عیدا شاہ کہنے لگے۔ حافظ عیدا کو فضیلت کا ایک درجہ تو مرتے ہی مل گیا یعنی حافظ عیدا سے عیدا شاہ ہوگئے۔ شہر سے دوسرے حافظ بلائے گئے اور رات کے بارہ بجے بڑے اہتمام سے نماز جنازہ کے بعد عیدا شاہ کو مسجد کے ایک کونے میں دفن کر دیا گیا۔ ادھر گاؤں میں شاہ صاحب کا مزار بنانے کی تجویزیں ہونے لگیں۔
دوسرے دن حافظ عیدا کے حجرہ کا سامان دیکھا گیا۔ کونہ میں ایک گھڑا رکھا ہوا ملا جس میں ایک کپڑے میں بندھی ہوئی روپیہ پیسہ ملا کر کل پانچ سو کی رقم نکلی۔ یہ حافظ جی کی تعویذوں کی کمائی تھی۔ چنانچہ سوئم کا فاتحہ بڑی دھوم سے کیا گیا۔ قرب و جوار کے جتنے گاؤں تھے سب میں نیوتہ بھیجا گیا۔ اور کم و بیش ڈھائی سو آدمیوں نے عیدا شاہ کے فاتحہ کا قورمہ اور پلاؤ کھایا۔ اینٹ اور چونے کا انتظام بھی شروع ہوگیا اور اسی دن سے قبر پر مدد لگ گئی۔ مزار بننا شروع ہوگیا۔

ایک دو تین یہاں تک کہ سب پڑیاں ختم ہوگئیں لیکن بنسی کا پیٹ اسی طرح بڑھتا رہا۔ اب حافظ جی بھی نہ رہے تھے جن سے جاکر بے چاری اور دوا لاتی یا اپنا حال کہتی۔
حافظ عیدا کی موت کا سب سے زیادہ دلی صدمہ بنسی کو تھا۔ وہ نہ جانے حافظ عیدا کو کیا کیا سمجھنے لگی تھی۔" پران ناتھ۔ سوامی" اس کا سب کچھ حافظ عیدا کی قبر تھی۔ حافظ عیدا مرچکے تھے لیکن اسے اپنے بدن میں جیسے وہ اب بھی زندہ معلوم ہو رہے تھے" نکاح نہیں ہوا تو کیا بغیر نکاح ہوئے کیا کوئی کسی کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا" اس نے حافظ عیدا کا ہاتھ پکڑا تھا اور اب ان کی یاد ہی اس کا سہارا تھی" آخر اسی گاؤں میں بھولی بھی تو رہتی ہے جسے نہ جانے کب اور کس طرح چھدو نے گھر ڈال لیا تھا۔ لیکن اب بھولی پر گاؤں کا کوئی شخص انگلی نہ اٹھا سکتا تھا۔

اس کی گاؤں میں وہ سی عزت تھی جو اور دوسری بیاہتا عورتوں کی۔" بنسی نہ جانے کتنی رات تک حافظ عیدا کی قبر پر بیٹھی رہتی۔ کبھی اس سے لپٹ کر رونے لگتی۔ کبھی اس کے قریب کی زمین خوب صاف کرتی۔ حافظ عیدا کی قبر مندر سے کم نہ تھی۔

عیدا شاہ کے چالیسویں کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ رات کو بنسی کے لڑکا پیدا ہوا۔ حرامی بچہ کی خبر آگ کی طرح آن کی آن میں گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ ہر شخص کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ "بنسی نے تو گاؤں کی ناک کاٹ لی۔" رمئی اور تلسیا کے تو جیسے بدن میں خون ہی نہ رہا تھا۔ بیچارے مارے شرم کے گڑے جاتے تھے۔

کوٹھری میں ایک طرف پیال پر پڑی کھاری بنسی درد سے کراہ رہی تھی۔ اور باہر مکان میں سماجی ٹھیکیداروں کی پنچایت ہو رہی تھی۔ رمئی اور تلسیا کیلئے ان کی چھنال لڑکی کی بدچلنی کی سزا تجویز ہو رہی تھی۔ رمئی بیچارے کے پاس اپنی حفاظت کیلئے ایک لفظ بھی نہ تھا۔ وہ کونہ میں چپ کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شدت غم سے اس کی آنکھوں میں آنسو تک نہ تھے۔ سرپنچ نے غرا کر کہا "آخر اس چھنال سے پوچھو تو کہ یہ حرامی بچہ ہے کس کا؟"

دو جوان آدمی اٹھ کر کوٹھری تک گئے۔ اندر قدم رکھنے کی ان میں ہمت نہ تھی جیسے کہ اس اندھیری کوٹھری میں کوئی بھوت بیٹھا ہو۔ اندر سے بنسی کے کراہنے کی آواز برابر باہر آ رہی تھی۔ ان میں سے ایک نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "کیوں ری یہ بچہ کس کا ہے؟"

بنسی بیچاری نے یہ سمجھ کر شاید سچ بات بتا دینے سے آبرو بچ جائے۔ دبی آواز میں کہا۔ "حافظ عیدا کا۔"

"حافظ عیدا"! دونوں آدمی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے جا کر ایک کونہ میں بیٹھ گئے۔

سرپنچ نے پھر کہا "کیوں کسی نے پوچھا نہیں۔ آخر ہمیں معلوم تو ہو کہ اس حرامی بچہ کا باپ کون ہے؟"

ان میں سے ایک آدمی نے اٹھ کر سرپنچ کے کان میں کچھ کہا۔ اور نہ جانے یہ بات کیسے بجلی کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

"حافظ جی کو ہم ایسا نہ سمجھتے تھے۔"

"حافظ جی نے کبھی ایسا نہ کیا ہوگا۔ وہ تو خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ان پر الزام لگایا جا رہا ہے۔"

"اس بدکار نے کہا۔ اس کی اپنی آبرو تو تھی بھی دو کوڑی کی۔ اب شاہ صاحب کا نام لیکر سمجھتی ہے کہ شاید بچ جاؤں۔"

"تبھی تو نیچ ذات نیچ کہلاتی ہے۔ اسلئے تو جات پات کا فرق رکھا گیا ہے۔"

"کل کی چھوکری کی یہ ہمت کہ شاہ صاحب پر الزام لگا رہی ہے۔"

مسلمانوں میں خاص طور پر بڑی بے چینی تھی۔ شاہ صاحب پر الزام لگانے کا بدلہ لینے کیلئے سبھی تیار تھے۔ چند نوجوانوں نے لاٹھی سے مسلح ہو کر رمئی کا گھر گھیر لیا۔ دو چار کے سر پھوٹنے میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔ لیکن رمئی بیچارے پر پہلے ہی کیا کم غم کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے کہ جو یہ نیا جھگڑا مول لیتا۔ غریب نے بڑی منت سماجت سے مسلمانوں کو ٹھنڈا کیا۔ اور معاملہ اس بات پر ہوئی کہ صبح ہونے سے پہلے بنسی گاؤں چھوڑ دے۔ اور پھر کوئی گاؤں والا اس کی شکل نہ دیکھنے پائے۔ پنچایت نے الگ اس وقت تک کے لئے رمئی اور تلسیا کا حقہ پانی بند کر دیا جب تک کہ وہ کل برادری کو کھانا نہ دے اور دس روپیہ سرپنچ کے پاس جرمانہ کے نہ داخل کر دے۔ دس روپیہ کا تو خیر کہیں سے برتن باسن بیچ کر انتظام ممکن تھا۔ پر برادری کو نیوتنے میں پچاس روپیہ سے کم کا خرچ نہ تھا۔

گاؤں والوں کے پاس دولت نہیں، تعلیم نہیں۔ صرف عزت ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر ان کی زندگی کا سہارا ہے۔ مہاجن روپیہ جمع کر کے خوش ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے آدمی کو اپنی تعلیم کا گھمنڈ ہوتا ہے۔ لیکن گاؤں والے صرف اپنی عزت پر ناز کرتے ہیں اور وہ اسے ہر قیمت پر بچانے کیلئے تیار رہتے ہیں۔

دوسرے دن صبح رمئی کا گھر بالکل سونا تھا۔ وہ بنسی جو گاؤں بھر میں چنچل مشہور تھی جو سب ہی سے ہنسی کی دو باتیں کر لیتی تھی ہمیشہ کیلئے گاؤں چھوڑ چکی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ بنسی اپنے لڑکے کو لیکر کدھر نکل گئی۔ یہاں تک کہ خود رمئی اور تلسیا کو بھی خبر نہ تھی۔ بنسی دو گھڑی رات رہے ہی اٹھ کر نہ جانے کدھر چلی گئی۔

عیدا شاہ کا مقبرہ تیار ہو گیا۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کا اعتقاد بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مسجد کا وہ کونہ جو کبھی غیر آباد تھا اب ہر وقت سرسبز رہتا تھا۔ رات کو قبر پر چراغ جلتا۔ جمعرات کو نیاز ہوتی اور کبھی کبھی قوالی بھی۔ حافظ عیدا شاہ کی قبر پر ہری چادریں چڑھائی جاتی تھیں۔

چند ہی دنوں میں دور دور عیدا شاہ کا مزار مشہور ہو گیا اور لوگ منتیں لے کر آنے لگے۔ عیدا شاہ کے معجزوں کی فہرست بھی مرتب

(باقی صفحہ ۶۶ پر ملاحظہ ہو)

نغمۂ مست قلندر

غزل

از جناب شعلہؔ [illegible]

یہ انقلاب کیا ہوا نگاہ فتنہ ساز میں
کہ جان پڑ گئی مرے دل ستم نواز میں

ہزاروں انقلاب ہو چکے نگاہ ناز میں
مگر نہ فرق آسکا مرے دل نیاز میں

نہ جانے دردِ عشق میں نہاں تھا کونسا اثر
کہ برق کوندنے لگی ہے نبضِ چارہ ساز میں

دلِ سکوں طلب سنبھل، پیام حسن پر نہ جا
ستم طرازیاں بھی ہیں ادائے دل نواز میں

کچھ اس طرح سے دیکھ کر کسی نے مسکرادیا
تڑپ کے درد رہ گیا مرے دل نیاز میں

تمہیں سناؤں کسطرح، زباں پہ لاؤں کسطرح
کسی کا راز اور بھی نہاں ہے میرے راز میں

مرے جنون پر نہ جا، مجھے نہ چھیڑ ناصحا!
حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں مستیٔ مجاز میں

اسی طرح سے شعلہؔ تو بصد خروش چھیڑے جا
ابھی تو چند تار ہیں ترے شکستہ ساز میں

غزل مسلسل

از حضرت [illegible] مولانا [illegible] افقؔ کاظمی امروہوی

سب کچھ کسی کی نذر کئے جا رہا ہوں میں
یہ فخر اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں میں

ہستی کو غرقِ بادہ کئے جا رہا ہوں میں
کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں

رہ رہ کے اک امید کئے جا رہا ہوں میں
مر مر کے آفتوں میں جئے جا رہا ہوں میں

ہرچند ضبطِ شوق کئے جا رہا ہوں میں
دل میں کسی کا نام لئے جا رہا ہوں میں

تیرے بغیر موت سے بدتر ہے زندگی
یہ رنگ ہے تو خاک جئے جا رہا ہوں میں

تم نے مجھے ازل میں دیا تھا جو درسِ شوق
ابتک اُسی کو یاد کئے جا رہا ہوں میں

شاید نگاہِ لطف سے تم دیکھ لو کبھی
یہ آس ہے کہ جس پہ جئے جا رہا ہوں میں

اکدن کسی کی نذر کروں گا یہ جان بھی
پہلی نظر میں دل تو دئے جا رہا ہوں میں

دیکھا رُخِ جمیل کسی کا نہ بے حجاب
یہ داغ اپنے دل میں لئے جا رہا ہوں میں

ہرچند غم سے نزع کا عالم ہے، ہر نفس
اے وائے زندگی کہ جئے جا رہا ہوں میں

ساقی بہشت میں بھی پلائے گا بے حساب
ملتی ہے جسقدر بھی پئے جا رہا ہوں میں

حور و قصورِ خلد سے کیا واسطہ مجھے
سوئے جناں کسی کے لئے جا رہا ہوں میں

رکتا ہے اضطراب سے ٹانکا کوئی کہاں
ہرچند چاک دل کے سئے جا رہا ہوں میں

پوچھے کوئی نہ مجھ سے مرا رنگِ زندگی
جس طرح جی رہا ہوں جئے جا رہا ہوں میں

دنیائے شاعری کو ان اشعار میں افقؔ
سرمایۂ شعور دیئے جا رہا ہوں میں

غزل

از جناب [illegible]

مصیبت میں آسودگی ڈھونڈتا ہوں
اندھیرے میں ہوں روشنی ڈھونڈتا ہوں

بتانا ذرا راستہ میکدے کا
میں گزری ہوئی زندگی ڈھونڈتا ہوں

جدائی کی راتوں کا تو پوچھنا کیا
میں اب دن کو بھی روشنی ڈھونڈتا ہوں

تلاشِ درِ یار ہے بہرِ سجدہ
میں بس جنتِ بندگی ڈھونڈتا ہوں

حریفِ اجل جس کا اک اک نفس ہو / ہیں وہ منہمک زندگی ڈھونڈتا ہوں!
قیامت ہے آنکھوں میں آنسو بھر آئے / بس اب میں زوالِ خوشی ڈھونڈتا ہوں
محبت میں گھبرا کے مرنا بُرا ہے! / مصائب ہیں اور زندگی ڈھونڈتا ہوں
نہ آنکھوں میں آنسو، نہ چہرے پہ زردی / مگر پھر بھی آسودگی ڈھونڈتا ہوں!
سپر ڈال دیں جس کے آگے مصائب / خمارؔ! ایسی ظالم ہنسی ڈھونڈتا ہوں

سوزِ دروں نے دل کو مرے دل بنا دیا / ناقص کو برقِ ناز نے کامل بنا دیا
اُلفت نے امتیاز کے پردے کو کرکے چاک / بیگانۂ تمیزِ حق و باطل بنا دیا
دریائے ارتقا میں مرے انکسار نے / ہر موجِ سرفراز کو ساحل بنا دیا
مایوس ہو کے پھیر لی گردن پہ خود چھری / قاتل نظر نے مجکو بھی قاتل بنا دیا
اللہ ری چشمِ ناز کی وہ برق باریاں / سر تا قدم مجھے بھی مرا دل بنا دیا
ہر سانس ہے کشاکشِ امید و بیم میں / اس زندگی نے مرنا بھی مشکل بنا دیا
اب قید و بندِ جسم سے گھبرا گئی ہے روح / میری رگوں کو غم نے سلاسل بنا دیا
بیخود بنا کے ذوقِ تلاشِ حبیب نے / بیگانۂ کشاکشِ منزل بنا دیا
مجھ کو اسیر کرکے حسنِ زلفِ یار نے / آزادِ رشتہ ہائے سلاسل بنا دیا

ازجناب حسن ظفری اکبرآبادی

میرے پسندیدہ اشعار

ازجناب فخر مظہر یوی

محبت دو جگہ دو رنگ میں عنوان ہستی ہے / مری آنکھوں میں آنسو ہیں تری آنکھوں میں مستی ہے (سیماب اکبرآبادی)
بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی / کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے (علامہ راشد الخیری)
زندگی اپنی باندازِ نظر ہوتی ہے / بند ہوتی ہیں جب آنکھیں تو خبر ہوتی ہے (شوق بریلوی)
ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگرؔ / ایک شیشہ ہوں کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں (جگر مرادآبادی)
سنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی / لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو (اصغر گونڈوی)
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے / حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں (غالب دہلوی)
کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے / میں سراپا دل ہوں میرا دل سراپا درد ہے (لا اعلم)
نگاہِ لطف جو محبوبِ دل نواز کرے / تو مجھ کو فکرِ دو عالم سے بے نیاز کرے (مسلم صدیقی)
بتخانہ ترا مسکن کعبہ ترا کاشانہ / ہر سو ترا جلوہ ہے اے جلوۂ جانانہ (مظفر مظہریوی)
صد شکر کاوشِ غمِ دنیا نہیں رہی / آئی اجل رہائی کا مژدہ لئے ہوئے (" ")
غنچوں کا تبسم ہے، موجوں کا ترانہ ہے / اے جلوۂ گم گشتہ کچھ تیرا ٹھکانہ ہے (عبدالباری آسی)
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب / موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا (چکبست لکھنوی)
دل میں ایک تیر ہے پیوست نکالوں کیونکر / ڈر رہا ہوں کہ نگاہِ غلط انداز نہ ہو (عزیز مرحوم لکھنوی)
ازل سے جو دل کے مقدر پڑی تھیں / وہی آج تک شعلہ سامانیاں ہیں (جگر مرادآبادی)

طب جاپانی کے سرچشمے

ہم کبھی بڈھے نہ ہوں!

کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟

امریکن ڈاکٹر جے اسٹیبن ہوکر کے خیالات

عہد گذشتہ کے ایک نامور مصنف نے کسی موقعہ پر یہ الفاظ لکھے تھے کہ آدمی کے لئے سب سے بڑی حکمت و دانائی کا فعل ہے کہ وہ اس بات کو اچھی طرح جان لے کہ اُسے بڈھا کیونکر ہونا چاہیئے کیونکہ عظیم الشان صحیفۂ ہستی کا سب سے مشکل باب یہی ہے۔ لیکن وہ زمانہ گذر گیا۔ اب انسان کی حکمت و دانائی اسمیں سمجھی جاتی ہے کہ وہ معلوم کر سکے کہ کس طریقہ پر بڑھاپے سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ آدمی کیلئے بڈھا نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اسکی صحت قائم رہے اور وہ زندگی کی ساری تحریکات کو شباب و مسرت کے جوش کے ساتھ غیر معین عرصہ تک جاری رکھ سکے۔ یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر آدمی کے جسم میں کوئی خاص طبعی نقص موجود نہ ہو تو یہ عمل...... کبھی بڈھا نہ ہونے کا یقینی طور پر ظہور میں لایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس مضمون میں اسی سوال پر بحث نہ کریں گے کہ آدمی کو کس طریقہ پر بڈھا ہونا چاہئے بلکہ ہمارا مقصد اس بات پر زور دینا ہوگا کہ شخص شباب دائم حاصل کر سکے اور ہم کو پورا الیقین ہے کہ جو لوگ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونگے جو سطور ذیل میں درج کئے جاتے ہیں وہ کبھی اپنے آپ کو بڈھا ہونا محسوس نہ کرینگے۔

بڑھاپے سے محفوظ رہنے کے عظیم سوال پر بحث کرنے اور اس کے متعلق مختلف طریقوں کو عمل میں لانے سے پیشتر ہمارے لئے یہ جاننا اشد ضروری ہے کہ بڈھا نہ ہونے کے صحیح معنے کیا ہیں۔ اگر ہم جملہ کی صحیح معنوی اہمیت کو پوری طرح سمجھ لیں تو پھر ہمارے لئے اگلا قدم اُٹھانا سہل ہوگا۔ یعنی ہم معلوم کر سکیں گے کہ وہ کونسے خاص اسباب ہیں جو بڑھاپا پیدا کرتے ہیں اور ان کا انسداد کس طرح ممکن ہے؟ اس وقت لوگ یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ فلاں شخص ساٹھ، ستر یا اسی سال کا بڈھا ہے لیکن اگر ان طریقوں پر عمل کیا گیا جو ہمیں آگے چل کر بیان کرنے ہیں تو اس کے برعکس یہ سننے میں آئے گا کہ فلاں شخص ساٹھ ستر یا اسی سال کا جوان ہے لیکن ایسا کرنے کیلئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ جو طبعی ذہنی اور اخلاقی حالات کبر سنی پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ ان کو تحقیق کرکے ان کا سدباب کیا جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ہم اپنے جی میں اس بات کا تہیہ کر لیں کہ کبھی بڈھے نہ ہونگے۔ اس مطلب کے لئے سب سے پہلی بات جو ہمیں اپنے لئے واضح کر لینی چاہیئے یہ ہے کہ بڈھا ہونے کا اصلی مطلب کیا ہے۔ عام طور پر لوگوں میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ جب انسان کے لحمی ریشوں میں بعض غذائی و کیمیائی تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں اور ان کی بدولت اس کے ریشے اپنی لچک کھو کر سختی کی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں جب خون کی نالیاں اتنی صاف نہیں رہتیں جتنی بچپن یا عہد شباب میں تھیں اور اس وجہ سے دوران خون میں فتور پیدا ہو جاتا ہے کھائی ہوئی غذا بدن کو نہیں لگتی اور خون کی مقدار قلیل و کثیف ہوتے جانے سے بدن زوال پذیر ہونے لگتا ہے تو مختلف اعضا کی کمزوری اور ان کے زوال و انحطاط سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اُس کو بڑھاپا کہتے ہیں۔

ایک خیال یہ بھی پھیلا ہوا ہے کہ بدن کے لحمی ریشوں کو سخت کرنے کا ذریعہ خاص قسم کے جراثیم کا نتیجہ ہے لیکن یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے فی الحال ہمیں کوئی بحث نہیں۔ گو آگے چل کر اس کے متعلق بھی چند الفاظ لکھنے پڑینگے ہمیں سب سے پہلے جس بات پر زور دینا ہے۔ فقط یہ ہے کہ اول تو انسان اس سے بہت زیادہ لمبی عمر حاصل کر سکتا ہے جتنی فی الحال اسکو حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ جس عہد کو بڑھاپے کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ ہرگز ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں انسان

اپنے ذہنی و جسمانی قویٰ کھو بیٹھے۔ اس کے برعکس لازم ہے کہ وہ زندگی کی پاکیزہ مسرتوں میں ہمیشہ کی طرح حصہ لینے کے قابل ہو۔ عام معاملات زندگی کا اس طرح فیصلہ کر سکے جس طرح وہ اپنی ابتدائی عمر میں کرتا تھا نیز درازی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی گردو نواح کے حالات اور دنیاوی معاملات کے ساتھ گھٹنے کی بجائے بدستور قائم رہے۔

اگر کوئی شخص دن کا بیشتر حصہ آتشدان کے پاس آرام کرسی پر لیٹ کر یا بیٹھ کر گزارتا ہے (جیسا کہ بیشتر سن رسیدہ مرد عورتوں کو کرتے دیکھا جاتا ہے جو گردونواح کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں لیتے) تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ایسے لوگ صحیح معنوں میں زندہ ہیں۔ زیادہ سے ہم اس قسم کی ہستی کو طبعی قرار دے سکتے ہیں اور وہ بھی ایک اس طرح طبعی ہستی جو کاہلی اور بے تعلقی میں بسر ہوتی ہے اور جس کا لازمی نتیجہ اکثر فالج، رعشہ وغیرہ امراض کی صورت میں نمودار ہوا کرتا ہے۔

پس صحیح معنوں میں ہم اس آدمی کو جوان کہہ سکتے ہیں یا ایسے آدمی کی نسبت یہ فقرہ استعمال کر سکتے ہیں کہ "وہ بڈھا نہیں ہے" جس کے ذہنی و جسمانی قویٰ صحیح طور پر قائم ہوں جو زندگی کی خوشیوں سے مساوی طور پر بہرہ اندوز ہوتا رہے ورنہ ان باتوں کے ہوتے ہوئے اگر کوئی شخص سو سال یا اس سے زیادہ عرصہ کیلئے جئے تو اس کا جینا نہ جینا برابر ہے۔

اس کے آگے سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے خاص ذرائع ہیں جن سے ہم بڑھاپے کی آمد روک سکتے ہیں؟ اس بارہ میں مختلف مصنفوں نے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ بڑھاپے کی روک تھام فقط طبعی ذریعہ سے ممکن ہے۔ بعض اس سوال کے اخلاقی اور مذہبی پہلو کو لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اعداد و شمار کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جن شخصوں نے سو سال سے زیادہ لمبی عمریں حاصل کیں انہوں نے کس طریقہ پر زندگی بسر کی تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بعض دواؤں کو شباب جاودانی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس ترقی یافتہ عہد میں جیسا کہ امید کی جا سکتی تھی۔ بعض شخصوں کی طرف سے یہ دعوے بھی پیش کیا جانے لگا ہے کہ خاص قسم کے ٹیکے آدمی کے شباب کو غیر معین عرصہ تک قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس مضمون کے دوران میں ہم ان تمام دعووں پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے اور کئی ایسی باتیں زیر بحث لانے کی کوشش کریں گے جو یقیناً ناظرین کیلئے نئی ہونگی کم از کم ہمارا مقصد ناظرین کی توجہ ان خاص امور کی طرف منعطف کرانا ہوگا۔ جو تجربہ سے فائدہ بخش ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ جداگانہ اسباب پر ترتیب وار بحث کی جائے۔ سب سے پہلے جسمانی پھر ذہنی اور اس کے بعد اخلاقی اسباب پر۔

طبعی ذریعے

سب سے پہلے ہم ان کو لیتے ہیں اور یہ بات شروع ہی میں بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بعض خاص جسمانی ذریعے ایسے ہیں جن سے بڑھاپے کی روک تھام میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ مختصر طور پر ہم ان کی تقسیم اس طرح کر سکتے ہیں۔ خوراک، ورزش، حفظ صحت جس میں تازہ ہوا، صفائی اور صحت بخش حالات میں سکونت کا سوال یہ سب باتیں شامل ہیں۔

خوراک

غالباً یہ بیان کرنے کی کوئی حاجت نہ ہوگی کہ ایسا کوئی شخص نہ درازی عمر اور نہ شباب جاودانی حاصل کر سکتا ہے جو عادتاً بسیار خور ہو یا جو ہمیشہ ناصاف و ناخوشگوار خوراک استعمال کرتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ گاہ بگاہ ہمیں ایسے آدمیوں سے ملنے کا بھی اتفاق ہوتا ہے جنہوں نے خوراک کے معاملہ میں سالہا سال تک لاپروائی برتی اور اس کے باوجود عرصہ دراز تک زندہ رہے۔ لیکن اس قسم کی مثالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ انسان خوراک کے معاملہ میں غلط طریقہ پر عمل پیرا ہو کر ضرور ہی درازی عمر حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے شخصوں کی نسبت ہم زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ بسیار خوروں کی عادت نے ان کے اندر اتنا گھر کر لیا ہے کہ ضرورت سے زیادہ غذا کے پیدا کردہ زہریلے اثرات ان پر ظاہر نہیں ہو سکتے یعنی وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جو کسی طرح کا زہر کھاتے کھاتے اس زہر کے اثر سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسے شخصوں کی نسبت بھی یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ گو وقتی طور پر وہ امراض کا مقابلہ کر لیں تاہم ان کی عمر یقینی طور پر گھٹ جائیگی اور اگر ایسا آدمی کبھی ستر یا اسی سال کی عمر کا بھی دیکھا جائے تو ہمیں اس نتیجہ تک پہنچنے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ وہ اگر احتیاط و دور اندیشی سے کام لیتا اور صحیح طریقوں پر چلتا تو صحت بخش حالات میں پر آسائش طریقہ پر اور بھی زیادہ لمبی عمر حاصل کر سکتا تھا۔

کچھ لوگ کہا کرتے ہیں "آپ فلاں شخص کو دیکھیں اسکی عمر ستر سال

کے قریب خوب پیٹ بھر کر کھاتا ہے۔ شراب اور تمباکو بھی پیتا ہے لیکن کیا مجال اس کی صحت میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ یا کچھ لوگ اس طرح کا دعویٰ کرتے سنے جاتے ہیں "میں جو کچھ بھی چاہتا ہے کھاتا ہوں وہ خود بخود ہضم ہوتا چلا جاتا ہے۔ نہاتا بہت کم ہوں شراب بھی پیتا ہوں لیکن نہ میری جسمانی طاقت میں کمی واقع ہوئی ہے نہ میرے دماغی اعضا کمزور ہوتے ہیں۔" لیکن غور سے دیکھا جائے تو بحث کا ایک بالکل ہی غلط طریقہ ہے۔ افراد کی مثالیں پیش کر کے کسی قاعدہ کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا نہیں جا سکتا۔ بہت عرصہ نہیں گذرا ایک دوست جسکی عمر ۷۵ سال کے قریب ہے اس سوال کے جواب میں کہ کھانے کے متعلق آپکی عادات کیسی ہیں یہ کہتے سنا گیا: "میں صبح کے وقت تھوڑا سا نمکین گوشت ایک آدھ انڈا۔ تھوڑی سی روٹی اور مکھن یا توسٹ کے ساتھ چائے یا قہوہ پیا کرتا ہوں۔ بعدازاں دوپہر کو گوشت اور ترکاری کھاتا ہوں پھر تھوڑی سی پڈنگ بھی نوش کرتا ہوں غرض میری کھانے کی عادتیں مختصر اور سادہ ہیں۔" تب اس سے پوچھا گیا کہ آپ چائے کتنی پیتے ہیں؟ کہنے لگا: "بہت معمولی فقط ایک یا دو پیالیاں تھوڑی سی روٹی اور مکھن کے ساتھ۔" دریافت کیا گیا: "کیا اس کے بعد بھی کچھ کھایا کرتے ہیں؟" بولے: "تھوڑی سی مچھلی اور سرد گوشت اور اس کے ہمراہ پنیر وغیرہ۔" اس شخص کی عمر گو ابھی تک بہت زیادہ نہیں ہوئی تاہم ممکن ہے وہ ستر سال کی عمر حاصل کر لے۔ لیکن ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ وہ دن میں چار بار قریباً ہر چار گھنٹہ کے بعد کچھ نہ کچھ کھاتا چلا جاتا ہے۔ ممکن ہے اسکی ظاہرا اچھی ہو۔ لیکن اگر وہ دن میں دو بار چھ یا سات گھنٹہ کے وقفہ سے کھانے کی عادت ڈالے تو اس سے بھی زیادہ اچھی صحت حاصل کر کے اسّی سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ تک زندہ رہ سکتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جو ضرورت سے زائد کھانا کھاتا ہے اس کا اثر اس کے بدن پر کیا ہوتا ہے؟ صرف یہ کہ خوراک کا وہ حصہ جو ہضم نہیں ہوتا اس کے بدن کے مختلف حصوں میں جمع ہو ہو کر اعضا کے صحیح افعال میں رخنہ انداز ہوتا ہے اور اس سے جلدی یا دیر میں کسی نہ کسی طرح کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگرچہ انسان ضرورت سے زیادہ مقدار میں بڑی آسانی سے کھانا کھا سکتا ہے اور اس کے نگلنے میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ تاہم جو کچھ کھا لیا جاتا ہے وہ لازمی طور پر جزو بدن نہیں بنتا۔

کسی چیز کو کھانے کا عمل اس کو ہضم کرنے کے عمل سے بالکل ہی جدا سمجھنا چاہئیے حالانکہ اکثر لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ علاوہ بریں یہ بات یاد رکھنی چاہئیے کہ قدرت کسی آدمی پر رحم نہیں کرنا جانتی بلکہ جو شخص اس کے قائم کردہ اصولوں کو توڑے وہ ضرور وقت آنے پر اسکو سزا دیتی ہے۔ اس بارہ میں وہ سخت بے رحم ہے اور درگذر کے نام تک سے ناآشنا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد کوئی نہ کوئی بیماری جڑ پکڑ جاتی ہے۔ حالانکہ غور کر کے دیکھا جائے تو وہ بیماری محض اسی کوشش کی ایک صورت ہوا کرتی ہے جو قدرت کی طرف سے ان خوراک کی پیدا کی ہوئی سڑاند اور نجاست کو دور کرنے کیلئے کی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس طرح بیماری ہمیشہ غلط طریق خوراک کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ موت تو برحق ہے۔ آخر کسی نہ کسی دن ہر شخص کو اس جہان سے رخصت ہونا پڑیگا۔ پھر اتنی احتیاطوں کا کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہی دیا جا سکتا ہے کہ اگر آدمی کو مرنا ہی ہے تو یہ کیا ضروری ہے کہ موت سے پہلے اس کا جسم مختلف قسم کی بیماریوں اور خرابیوں کا مرکز بن کر زوال پذیر ہو چکا ہو؟ یا اس کے خون کی ندی طرح طرح کی غلاظتوں سے اٹ گئی ہو یا اس کے عصبی ریشے جن میں حیاتی عرق پایا جاتا تھا۔ مختلف زہروں سے آلودہ ہو گئے ہوں یا خون کی نالیاں پیش از وقت ہی پتھریلی صورت اختیار کرنے لگی ہوں اگر ان باتوں کو جانتے ہوئے بھی کوئی شخص ان خرابیوں کو قصداً پیدا کرے تو پھر جب انجام کار نقرس، وجع مفاصل یا دائمی قبض وغیرہ بیماریاں اس پر حملہ آور ہوں تو اسے اپنے دوستوں سے رحم کی امید نہ کرنی چاہئیے بلکہ مناسب تو یہی ہے کہ ہر شخص اُسے اس بات کیلئے ملامت کرے کہ اس نے جان بوجھکر اپنے لئے گڑھا کھودا۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ طرح طرح کی چیزیں بطور خوراک استعمال کر کے جب ان سے کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو ان چیزوں کو بُرا کہتے ہیں۔ اپنے آپ کو غلط استعمال کر کے قابلِ مذمت قرار نہیں دیتے۔ جب ہمیں اپنی بے احتیاطیوں سے درد یا تکلیف سہنا پڑتی ہے تو ہم اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے کی بجائے رحم کا مستحق ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اسی طرح کے موقعوں پر ہمیں عبرت حاصل کر کے ہمیشہ اپنے آپ سے یہ کہنا چاہئیے کہ آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔ حاصل کلام یہ کہ جو شخص ضرورت سے زیادہ کھاتا ہے اس کو جلدی یا دیر میں ضرور تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔

اسی قدر نہیں بلکہ وہ ہمیشہ قبل از وقت موت کا شکار ہوتا ہے۔ یاد رکھو بے احتیاطی اور قبل از وقت موت دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں خواہ ہم اس حقیقت کو مانیں یا نہ مانیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا یہی ہے۔ عقل انسانی یہی کہتی ہے۔ یہ کوئی گھڑے منطق کا سوال نہیں۔ علت و معلول والا حساب ہے۔

پس جب کچھ لوگ یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ ہم ایسے شخصوں سے واقف ہیں جو سب کچھ کھاتے پیتے اور اس کے باوجود ہمیشہ صحت کی حالت میں رہتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ باتیں دلیل کی سند نہیں رکھتیں۔ راقم الحروف کو ایک ایسے آدمی کا حال معلوم ہے جو فخریہ کہا کرتا تھا کہ جس چیز کو میرا جی چاہے بے تکلف کھا لیتا ہوں اور وہ مجھے کبھی تکلیف نہیں دیتی۔ بہت پیٹو آدمی تھا یہ روز عمدہ قسم کی مرغن غذائیں استعمال کرتا۔ بورٹ وائن پیتا اور ۵۰ سال کی عمر تک مزے سے جیتا رہا۔ لیکن اس کے بعد ایک روز ناگہاں اس کے سر میں اجتماع خون کی شکایت پیدا ہوگئی اور وہ آناً فاناً مر گیا۔ مان لیا کہ گنتی کے چند آدمی ایسی بے احتیاطیاں کر کے بھی زندہ رہ سکتے ہیں لیکن سب آدمی ایسا نہیں کر سکتے۔ ان آخرالذکر لوگوں کے لئے ہی یہ مضمون لکھا جاتا ہے اور انہی کو راہ راست پہ لانا اس تحریر کا مقصد ہے۔ جس دوست کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے اس کے متعلق بھی یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ اگر وہ ایسی بے احتیاطی نہ کرتا تو عین ممکن ہے ابھی دس پندرہ سال اور جیتا۔

خوراک کے سوال پر بحث کرتے ہوئے میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں اور مجھ کو یقین ہے کہ بہت سے لوگ میرے ہمخیال ہونگے کہ جوں جوں انسان ادھیڑ عمر تک پہنچتا ہے بچپن اور شباب کی جسمانی کیفیتیں جو نشو و نما کی متقاضی تھیں باقی نہیں رہتیں۔ چھوٹی عمر میں حرارت بدنی کے تیز کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے لیکن عمر کے متوسط حصہ میں پہنچنے کے بعد اس قدر ایندھن کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ زندگی کی آگ تھوڑے سے ایندھن سے بھی مشتعل رکھی جا سکتی ہے۔ جب ایک بار جوانی کا عرصہ گذر گیا تو پھر اس شعلۂ آتش کو ضرورت سے زیادہ تیز کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔ پس جوں جوں عمر بڑھتی چلی جاتی ہے آدمی کو لازم ہے کہ اپنی خوراک کی مقدار میں کمی کرتا جائے۔ بدقسمتی سے بہتوں کی حالت میں دیکھا گیا ہے کہ متوسط عمر تک پہنچنے کے بعد اُلٹا اور زیادہ زبان کے چٹخارہ کے شائق بن جاتے ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ عیب ان کاروباری لوگوں کی حالت میں دیکھا جاتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی میں اچھی کمائی کر لی ہو۔ وہ کھانے کی میز پر اچھی اچھی نعمتیں دیکھنا چاہتے ہیں اور چونکہ روپیہ کی فراوانی ہوتی ہے۔ اسلئے وہ اس کو اچھے کھانوں میں صرف کرنا عیب نہیں سمجھتے لیکن درحقیقت یہ طریقہ سراسر غلط ہے جو لوگ اس مقولہ پر عمل پیرا ہیں کہ

ع بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

وہ درحقیقت اپنے عرصہ زندگی کو اپنے ہاتھوں سے کم کرتے چلے جاتے ہیں۔ لاکھوں آدمی ہر سال محض اس وجہ سے مرتے ہیں کہ انہوں نے ضرورت سے زیادہ مقدار میں کھانا کھا کر جسے ان کا نظام بدنی سنبھال نہ سکتا تھا اپنے لئے طرح طرح کی خرابیاں پیدا کیں۔ زیادہ تر یہ خطا ان لوگوں کی طرف سے سرزد ہوتی ہے جو خوراک کے ابتدائی اصولوں سے بھی محض ناواقف ہیں پس ہم جو بات زور دے کر جتلانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ ایک متوسط العمر مرد و عورت کو اپنی خوراک اس سے ضرور کم کر دینی چاہئیے جس کے وہ ہمیشہ خوگر رہتے ہوں۔ اس کا ایک سہل طریقہ یہ ہے کہ صبح کا ناشتہ غایت درجہ ہلکا ہو یعنی ڈبل روٹی کی صرف ایک دو قاشیں جو مکھن کے ساتھ کھائی جائیں۔ کشمش کے چند دانے یا چھوہارے یا ایک دو سیب۔ ان چیزوں کے ساتھ پانی ملا ہوا گرم دودھ استعمال کیا جائے تو زیادہ اچھا ہے ورنہ کوکو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پس یہ بھی کفایت نہ کرے آدمی کو چاہئیے وہ اپنی خوراک اور بھی زیادہ گھٹانے کی کوشش کرے حتی کہ پھلوں اور مغزیات کی ایک پلیٹ اس کیلئے کافی سمجھی جائے۔ خوراک کے سوال پر مستند اہل الرائے کا یہ بیان ہے کہ اس طرح کا کھانا ہر لحاظ سے آدرش سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ نہ صرف پاک و صاف بلکہ غذائیت بخش اور مقوی بھی ہے۔ ایسے لوگوں کو رفتہ رفتہ سہ پہر کی چائے کی عادت ترک کر دینی چاہئیے بلکہ مناسب یہ ہے کہ رات کا کھانا سر شام کھا لیا جائے۔ دانا آدمی کا فرض ہے کہ ایسی کوئی خوراک استعمال نہ کرے جس سے بدن میں یورک ایسڈ یعنی تیزابی مادہ بڑھے کیونکہ یہ چیز جلدی یا دیر میں ضرور انسان کے عرصۂ حیات کو کم کرتی ہے۔ اسی طرح نہایت تیز مصالحہ دار چیزیں بھی خوراک سے نکال دینی چاہئیں بلکہ رفتہ رفتہ ہر شخص کی یہ کوشش ہونی چاہئیے کہ انتہائی سادگی اختیار کرتے ہوئے گوشت خوری کو بالکل ہی ترک کر دیا جائے۔ خوش قسمتی سے فی زمانہ پھلوں اور ترکاریوں کی

صورت میں بیشمار ایسی چیزیں ہمارے لئے مہیا ہو سکتی ہیں جو ہر لحاظ سے غذائیت بخش اور مقوی ہیں۔ اگر کوئی شخص سیر کیلئے کہیں باہر جائے تو وہ اپنے لئے مغزیات کے بنے ہوئے کیک یا چھوہاروں کی بنی ہوئی روٹی یا چلغوزے۔ تھوڑی کشمش اور کیلے ساتھ لے جا سکتا ہے۔ اس سے اس کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ اور وہ غیر ضروری زحمت اور خرچ سے بھی بچا رہیگا۔ فی زمانہ اس مکھن کی بہت مانگ ہے جو مغزیات سے پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف بہت غذائیت بخش ہے بلکہ ڈیری کے مکھن کے مقابلہ میں ارزاں بھی بہت ہوتا ہے۔ بچوں اور بالغوں کے لئے یکساں مفید ہے چنانچہ یہ بات ذاتی تجربہ سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر اس طرح کا مغزیاتی مکھن عمدہ قسم کی ڈبل روٹی کے ٹکڑے پر پھیلا کر استعمال کیا جائے تو اس طرح کا کھانا نہ صرف لذیذ، قوت بخش بلکہ کفایت آمیز بھی ہوتا ہے اور اگر اسمیں تھوڑا سا شہد بھی ملا جا سکے تو کیا کہنا!

فی الحقیقت مغزیات اور شہد کو مختلف طریقوں پر ملا کر کئی طرح کے مرکبات تیار کئے جا سکتے ہیں جو بچوں اور بالغوں کیلئے یکساں مفید ہیں۔ چلغوزے کا لذیذ مغز اتنا فائدہ بخش ہے کہ بہت کم لوگ اسکی حقیقت سے واقف ہیں۔ اگر کوئی شخص ریل کے لمبے سفر پر مٹھی بھر چلغوزے اور تھوڑی کشمش اپنے ساتھ رکھ لے تو اس سے بہت زیادہ مفید غذا حاصل کر سکتا ہے جتنی عموماً ریلوے اسٹیشنوں پر بکتی ہوئی چیزوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ (باقی آیندہ)

قطعہ

عشق ہیں میرے دیوانہ ہیں وہ
ہیں مریض اور چارہ ساز ہیں وہ
معجزہ ہیں اور ان میں فرق ہے اتنا
ہم ہیں محمود اور ایاز ہیں وہ

مضطر اکبر آبادی

میخانۂ رباعیات کے پانچ ساغر

(از محترمہ خانم امروہوی)

۱ (خدا کیا ہے)

نظروں سے دو عالم کی بہت دور ہے وہ
یہ ہی بہت اچھا ہے کہ مستور ہے وہ
ظاہر ہو تو کونین ہوں بے خود خانم
معلوم بھی ہے برق سر طور ہے وہ

۲ (جلوۂ قدرت)

بالائے فلک بھی نہ افلاک بھی ہے
مانا کہ وہ اک جلوۂ بیباک بھی ہے
پر اس کے سمجھنے کے لئے اے خانم
تو یہ تو بتا قوت ادراک بھی ہے

۳ (عورت راز قدرت ہے)

قدرت کا چھپایا ہوا اعجاز ہوں میں
وہ حسن ہے اور حسن کا انداز ہوں میں
عورت ہوں، یہ معلوم ہوا اے خانم
پردے میں رکھی جاؤں کہ اک راز ہوں میں

۴ (جوانی کا خمار)

بیداد دو عالم کو بھلا دیتا ہے
بچپن کے بھی ماتم کو بھلا دیتا ہے
خانم یہ جوانی میں جوانی کا خمار
اس دل سے ہر اک غم کو بھلا دیتا ہے

۵ (دنیا میں رہ کر)

پھولوں کو میں دامن میں اٹھا لیتی ہوں
کیوں حسن مناظر سے نہ کھیلوں خانم
جلووں کو نگاہوں میں چھپا لیتی ہوں
دنیا میں ہوں دنیا کا مزا لیتی ہوں

جواہر ریزے دنیائے محبت میں!

از مسٹر ملا محمد رحیم صاحب دہلوی

(۱) محبت خواہ کسی عنوان ہو منزل حقیقت کا زینہ ہے۔

(۲) عشق ایک دروازہ ہے جس میں سے گزرے بغیر انسان انسان نہیں ہوسکتا۔

(۳) دنیائے محبت میں خریدار تو ہوگئے پروا وبے نیاز مگر صاحب جنس غیر ممنون ہوتا ہے۔

(۴) غنیمت سمجھو اگر ایک چشم سحر کار دل جیسی متاع ارزاں کی طالب ہے۔

(۵) زاہد معتکف بھی جب اپنے زاویہ عبادت میں سر بزانو ہوتا ہے تو دور جمال کی مسکراہٹ سے لطف لئے بغیر نہیں رہ سکتا

(۶) عشق کا کلیسہ آتشکدہ ہے یہاں وہی آتش طلب قدم رکھیں جو اپنے دامن کو اس آتش پنہاں میں پھونک دیں پھر دامن بھی ہوا بھی ہے جا بیر کہ کہیں شعلوں کی کھڑک نہ ہو جائے۔

(۷) انسان کا دل جب تک چوٹ نہ کھائے دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا

(۸) عشق کا قرینہ اپنے بازوؤں میں وہ مافوق الفطرت طاقت رکھتا ہے کہ اس کی تیغ کا پہلا ہی وار خون کے تاروں سے بندھے ہوئے رشتوں اور دنیا کی دلفریبیوں کی جکڑی ہوئی زنجیروں کو دو ٹکڑے کردیتا ہے۔

(۹) جو فتیلہ پہلے جل چکا ہے وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے لیکن نئے فتیلے کو بہت دیر تک آگ دکھانی پڑتی ہے۔

(۱۰) بازار محبت میں جب دل کا سودا کیا جاتا ہے تو یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ خریدار کون ہے اور کیا قیمت دے رہا ہے۔

(۱۱) بجلی کہیں بھی گری ہو دیکھنا یہ ہے کہ خرمن سوختہ کا کیا حال ہوا؟

(۱۲) عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے پہلے جگہ خالی کرا لیتا ہے۔

(۱۳) پروانہ تو شمع کا متلاشی ہے وہ خواہ حرم میں جلے یا دیر میں۔

(۱۴) دنیا میں ایسی ترازو بھی ہے جس کے ایک پلڑے میں اگر دیوانگی رکھدی جائے تو دوسرا پلڑا تمام عالم کی ہوشیاری رکھدینے سے بھی نہیں جھک سکتا

(۱۵) دنیا میں ایسے خریدار بھی ہیں جو ایک نگاہ ناز خریدنے کے لئے اپنے ہوش و حواس کا تمام سرمایہ دیدیں

(۱۶) [illegible]

(۱۷) دنیائے حسن و محبت میں چاندی سونے کی جگہ دل صد پارہ اور جگر صد زخم خوردہ کا سکہ رائج ہے۔

(۱۸) دنیائے عشق میں قربانی سے بڑھکر کوئی دلیل نہیں۔

(۱۹) دیار محبت میں انتقام و دعوے کی گنجائش نہیں۔

(۲۰) محبت میں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لے کر آئے تو سر جھکا دو اور ہوسکے تو اسکے ہاتھ کو بوسہ دو

(۲۱) محبت کے مذہب میں کینہ و عداوت سے بڑھ کر کوئی شے حرام نہیں

(۲۲) عشق کی حکایت کبھی ختم نہ ہوگی

(۲۳) محبت آدمی کا ایسا امتحان ہے جس سے اس کے ظرف کی وسعت معلوم ہوتی ہے۔

آنکھیں ـــــ (بقیہ صفحہ ۲۴)

درمیان میرے دل میں یہ خواہش مخفی تھی۔ کہ میں ڈوب جاؤں اور اس طرح اپنی زندگی کو اس بندش سے آزاد کرلوں جس میں میں نے اسے باندھ دیا تھا۔ میں مالتی گنج پہنچا۔ وہاں میں نے وہ خبر سنی جس نے مجھے آزاد کردیا۔ تمہارا بھائی بھانجی سے شادی کرچکا تھا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ میں نے اس خبر کو کتنی مسرت اور شرمندگی کے ساتھ سنا ہے۔ میں پھر جلدی جلدی اپنی کشتی پر آگیا۔ خود شناسی کے اس ایک لمحے میں ہی میں سمجھ گیا کہ تم سے جدا ہوکر مجھے کوئی مسرت نصیب نہیں ہوسکتی ـــــ تم ایک دیوی ہو"

میں ایک ہی ساتھ ہنسی اور رو پڑی اور بولی ـــــ "نہیں۔ نہیں۔ نہیں ـــــ میں اب دیوی نہیں بنوں گی۔ میں تو صرف تمہاری بیوی ہوں۔ میں تو محض ایک معمولی عورت ہوں"۔

"پیاری" اُس نے جواب دیا "میں بھی اب تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اب آئندہ تم مجھے بھی اپنا دیوتا کہکر کبھی شرمندہ نہ کرنا"۔

اگلے دن سارا شہر ناقوس کی آوازوں کے ساتھ مسرت سے جاگ اٹھا لیکن کسی

یاد

از جناب ضیا لکھنوی

اک شاہدِ حسیں کی پھر یاد آ رہی ہے — ایام عہدِ رفتہ نزدیک لا رہی ہے
دُنیائے آرزو کو دلکش بنا رہی ہے — رنگین دل کی فطرت پھر مسکرا رہی ہے
اک شاہدِ حسین کی پھر یاد آ رہی ہے

کیف و سرور کی پھر دُنیا میں آ رہا ہوں — امید و بیم کی پھر محفل سجا رہا ہوں
دل میں نئی امنگیں ہر لمحہ پا رہا ہوں — دُنیائے عاشقی میں ہلچل مچا رہا ہوں
اک شاہدِ حسیں کی پھر یاد آ رہی ہے

آنکھوں میں پھر رہے ہیں گذرے ہوئے زمانے — پھر یاد آ رہے ہیں بھولے ہوئے فسانے
پھر گنگنا رہا ہوں مسحور کُن ترانے — پھر لگ رہے ہیں دل پر وحشت کے تازیانے
اک پیکرِ حسیں کی پھر یاد آ رہی ہے

نکھری ہوئی فضا تھی اک شام تھی سُہانی — کانٹوں پہ تل رہی تھی ہر پھول کی جوانی
جلوے بکھیرتی تھی ہر سمت کامرانی — تھی زیرِ لب شفق کے اک زردسی کہانی
اس منظرِ حسیں کی پھر یاد آ رہی ہے

ہر سمت چاندنی تھی دریا کے تھے کنارے — بیخود سی تھیں ہوائیں مدہوش تھے نظارے
جب کر رہے تھے ہم تم آپس میں کچھ اشارے — چشمک میں منہمک تھے کچھ آسمان پہ تارے
اس منظرِ حسیں کی پھر یاد آ رہی ہے

آنکھوں میں پھر رہا ہے وہ وقت صبحگاہی — پیغام جب نسیمِ صبحِ سحر کا لائی
جب رات بھر کے جاگے تاروں کو نیند آئی — ارماں مچل رہے تھے کیسے دمِ جدائی
اس شاہدِ حسیں کی پھر یاد آ رہی ہے

دُنیائے عاشقی میں طوفان آ رہے تھے — پردے حجاب کے جب تم بھی اُٹھا رہے تھے
جب شوق بڑھ رہا تھا تم کسمسا رہے تھے — نیچی نظر تھی لیکن کچھ مسکرا رہے تھے
اس منظرِ حسین کی پھر یاد آ رہی ہے

میری تباہیوں پر ہاں خوب مسکراؤ — رشتے تمام توڑو، دنیا نئی بساؤ
گر بس چلے تمہارا تخیّل میں نہ آؤ — میں یاد ہی کرونگا تم لاکھ بھول جاؤ
اس شاہدِ حسیں کی پھر یاد آ رہی ہے

ایک سو فیصدی سچا واقعہ!

ستم ظریف

میلڈرم

کم و بیش ایک صدی پیشتر انگلستان میں عورت کے حد سے بڑھے ہوئے اعتماد اور مرد کی ہوس رانی کی بدولت ایک ایسا عجیب واقعہ پیش آیا تھا جس کی دھوم اس زمانہ میں نہ صرف انگلستان بلکہ یورپ کے تمام ملکوں میں پھیلی تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں ــ کوئی مرد کو ملزم گردانتا اور کوئی عورت کو بُرا کہتا تھا مگر حالات نے انتہائی صورت اس وقت اختیار کی جب مرد عورت کے جھگڑے نے مقدمہ کی صورت اختیار کرلی اور معاملہ قانونی عدالت میں پہنچا۔ فریقین کی طرف سے قابل ترین وکلا پیش ہوئے اور گو انجام کار فیصلہ عورت کے حق میں ہی صادر کیا گیا۔ تاہم سچ پوچھئے تو ٹھکرائی ہوئی محبت کا اثر بُرا اعتماد عورت کے مستقبل کی تباہی کی صورت میں رُونما ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ خود تباہ حالی کی نوبت کو پہنچکر مری اور مرد بھی اس کے بعد دو سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا لیکن ان واقعات کی یاد جو ایک کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی حرص و آز اور دوسری کے اعتماد کامل اور سچی محبت کی بدولت پیش آئے تھے، ایک سو سال کا لمبا عرصہ گزرنے کے باوجود لوگوں کے دلوں سے زائل نہیں ہوئی چنانچہ یہ واقعہ ان مقدمات پُراسرار کی فہرست میں جو تاریخ انصاف میں ہمیشہ قابل ذکر سمجھے جائیں گے، ایک خاص درجہ رکھتا ہے اور اس کے حالات پڑھکر جہاں ایک طرف ان عورتوں کو عبرت ہوتی ہے جو مردوں کی شیریں زبانی پر فریفتہ ہوکر عالم جوش میں اپنا سب کچھ نثار کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں وہیں مرد کی سیاہ قلبی اور بے جگری کے ایسے شرمناک حالات نمایاں ہوتے ہیں کہ خود آدمیت کو شرم آنے لگتی ہے۔ ذیل میں اس واقعہ کے مختصر حالات قلمبند کئے جاتے ہیں جو دلچسپی کے اعتبار سے کسی افسانہ سے کم نہیں مگر ہیں شروع سے آخر تک سچائی اور حقیقت پر مبنی۔

جس زمانے کا ذکر ہے، انگلستان کے علاقہ لنکاشائر کے مقام سمڈلے میں ایک معزز سن رسیدہ آدمی لانگ ووتھ نامی رہتا تھا۔ جس کے اسلاف کا سلسلہ شاہ چارلس ثانی کے درباری عمائد و اکابر سے ملتا تھا۔ اس کے تین بیٹے اور تین ہی بیٹیاں تھیں۔ ان میں سب سے چھوٹی کا نام تھریسا تھا۔ وہی اس داستان کی ہیروئن سمجھی جاسکتی ہے۔ لڑکی کی ماں اسکی کمسنی ہی میں مرچکی تھی۔ باپ مخبوط الحواس تھا۔ اسلئے تھریسا کی عمر کا ابتدائی حصہ ایک فرانسیسی خانقاہ میں بسر ہوا۔ اس جگہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب وہ عمل کی دُنیا میں نکلی تو ان مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے مدارسہ نیار تھی جو ہر شخص کو زندگی کی دوڑ میں پیش آتے ہیں اور جن کی بدولت ان لوگوں کو طرح طرح کی آفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جنہوں نے زندگی کی ضرورتوں کا عملی تجربہ حاصل نہ کیا ہو۔ ییلورٹن نام کے جس مرد سے اس کا واسطہ پڑنا تھا اور جو سچ پوچھئے تو اس افسانۂ حقیقت میں بدمعاش (Villain) کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ ان دنوں انگلستان کے توپخانہ میں کپتان تھا۔ دونوں کی پہلی ملاقات نہایت معمولی حالات میں ہوئی۔ تھریسا اپنی ایک بہن سے ملنے کیلئے ویلز میں گئی۔ جس کا شوہر مسٹر بیلامی وہیں رہتا تھا۔ جب وہ اس جگہ پہنچکر جہاز کے گھاٹ پر اُتری تو سوء اتفاق سے کوئی شخص بہن کی طرف سے اس کے خیر مقدم کیلئے آیا ہوا نہ تھا۔ یہ بچری گھاٹ پر سراسیمگی کے عالم میں کھڑی تھی کہ کپتان ییلورٹن نے اس کو تنہا دیکھ کر اور اس کے حسن حیرت انگیز سے متاثر ہوکر اپنی امداد پیش کی۔ چنانچہ اس کیلئے ایک کرایہ کی گاڑی طلب کردی اور اس پر سوار ہوکر اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ یہی وہ بے حقیقت واقعہ تھا جو ان دونوں کی زندگیوں کو ایک دوسرے سے ملانے اور اس کے ساتھ بدنصیب عورت کے حق میں کانٹے بونے کا ذریعہ ثابت ہوا۔ وہ کس طرح؟ اس کا حال آگے چل کر بیان کیا جائیگا۔

(۲)

تھریسا اپنی بہن کے گھر پر رہنے لگی تو ایک یا دو دن بعد وہی نوجوان فوجی افسر کپتان ییلورٹن پھر ایک مرتبہ آداب بجالانے کے بہانے اس

سے ملا۔ اس عرصہ تک دونوں کی ملاقاتیں رسمی اور معمولی تھیں۔ لیکن ان ملاقاتوں کی بنا پر ہی آگے چل کر دونوں میں وہ گہرے تعلقات پیدا ہو گئے جو بھولی بھالی عورت کی تباہی و بربادی کا ذریعہ ثابت ہوئے۔

۱۸۵۳ء میں مس ٹریسیا لانگ ورتھ اپنی تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے اٹلی کے جنوبی حصہ میں گئی جن دنوں وہ نیپلز میں مقیم تھی، اسے ایک خط اپنے ایک چچازاد بھائی کے نام جو مانٹی نیگرو میں رہا کرتا تھا روانہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ایک غیر ملک میں یہ خط کس طرح بھیجا جا سکتا ہے۔ اس نے ایک مقامی ساہوکار سے مشورہ لیا تو اس نے بتایا کہ پہلے اس قسم کی چٹھی مالٹا بھیجی جائے اور وہاں سے دوبارہ ڈاک میں ڈالی جا سکے تو مانٹی نیگرو پہنچ گی کہنے لگا میرا ایک دوست مالٹا رہتا ہے میں آپکی چٹھی اس کے پاس بھیجا کرونگا اور وہ اسے ڈاک میں ڈال کر مانٹی نیگرو بھیج دیگا۔" اس وقت معلوم ہوا کہ یہ دوست وہی کپتان یلورٹن تھا جسے اب میجر کا عہدہ حاصل ہو چکا تھا۔ اس طریقہ پر پھر ایک بار یلورٹن اور مس لانگ ورتھ کی آپس میں خط و کتابت شروع ہوئی۔ گو ایک لمبے عرصہ تک انہیں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا انجام کار ٹریسیا لانگ ورتھ مئی ۱۸۵۵ء میں اٹلی سے فرانس کو واپس گئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب فلارنس نائٹنگیل جنگ کریمیا کے سلسلہ میں سپاہیوں کی مرہم پٹی کے نمایاں خدمات سر انجام دے رہی تھی اسکی دیکھا دیکھی بہت سی انگریز اور فرانسیسی لیڈیاں جن میں کئی اعلیٰ خاندانوں کی مستورات شامل تھیں اس کار خیر میں حصہ لینے لگیں۔ اسی جماعت میں ٹریسیا بھی شامل تھی عرصہ چھ ماہ کیلئے اس کو غلاطہ کے ہسپتال میں رکھا گیا اور اتفاق ایسا ہوا کہ انہی ایام میں میجر یلورٹن کا گذر میدان جنگ کریمیا کو جاتے ہوئے اس مقام سے ہوا۔ اس کو پہلے سے معلوم نہ تھا کہ وہ اس جگہ رہ کر نرس کا کام کرتی ہے لیکن جب اس جگہ پہنچکر معلوم ہوا تو وہ قصداً اس سے ملاقات کرنے گیا۔

اس وقت کے بعد کہ ۱۸۵۲ء میں یلورٹن کی ملاقات ٹریسیا کے ساتھ اس کی بہن کے مکان پر ہوئی۔ دونوں کے روبرو ہونے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس وقت میجر یلورٹن نے ٹریسیا کے روبرو اپنی صادق محبت کا اظہار کیا اور اس سے شادی کی درخواست کی۔ اس نے ملتجی لہجہ میں یہ بھی کہا کہ "اس ہسپتال میں رہتے ہوئے جو کار خیر تم کر رہی ہو، وہ بیشک لائق تعریف ہے لیکن مجھ کو اندیشہ ہے کہ تم بخار یا کسی دوسرے مرض میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ اس لئے اسجگہ سے چلے جانا ہی تمہارے لئے بہتر ہوگا۔" ٹریسیا اس کے کہنے پر عمل کر کے غلاطہ سے رخصت ہو گئی اور اپنے ایک رشتہ دار جرنیل سٹریٹنبزی کے مکان پر چلی گئی لیکن یلورٹن تھوڑے عرصہ کے بعد وہیں جا پہنچا اور اس جگہ اپنے آپکو ٹریسیا کا منگیتر ظاہر کر کے رہنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کسی طریقہ پر اس کو خبر لگ گئی تھی کہ ٹریسیا کے پاس کچھ دولت جمع ہے۔ اس موقع پر اس نے اپنی ضروریات کی بنا پر اس سے تین ہزار پونڈ طلب کئے اور اس کے ساتھ ہی اپنی بات منوانے کے خیال سے کہنے لگا کہ اتنا قرضہ میرے سر پر ہے اور میں اپنے رشتہ داروں سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اسی عورت سے شادی کرونگا جو میرے قرضہ کا بوجھ ہلکا کر دیگی۔"

اس پر ٹریسیا نے جواب دیا کہ "میرے نام پر جو روپیہ جمع ہے میں اُسے اپنی مرضی سے صرف نہیں کر سکتی۔ اسلئے میں تمہاری امداد سے معذور ہوں۔ اس صورت میں ہمارے تعلقات باہمی کا خاتمہ سمجھنا چاہیئے۔"

اس وقت تو یلورٹن کی امیدوں پر اوس پڑ گئی لیکن یہ حالت دیرپا ثابت نہ ہوئی کیونکہ ایک ہی ہفتہ کے بعد وہ پھر آدھمکا۔ عورت نے قدرتی طور پر پوچھا کہ اب تمہاری واپسی کا کیا مطلب؟ کہنے لگا تمہاری محبت میرے سینہ میں اسقدر پختگی سے جاگزین ہو چکی ہے کہ میں تمہیں دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" کاش وہ اس وقت واپس نہ آتا یا ٹریسیا ہی اس کی باتوں سے متاثر نہ ہوتی۔ کیونکہ اس صورت میں وہ افسوسناک واقعات جو بعد ازاں رونما ہوئے کبھی پیش نہ آتے۔

اس دن کے بعد اس مرد ستمگر نے اپنی پوری کوشش اس کام کیلئے وقف کر دی۔ کہ دھوکا، مکر، فریب سے غرض ہر ممکن طریقہ پر ٹریسیا اور اس کی دولت دونوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ جائے غور ہے کہ واقعات کے اس طرح پیش آنے کے باوجود جب مقدمہ عدالت قانون میں پہنچا تو یلورٹن کے وکیل نے الٹا ایک بے گناہ عورت پر یہ الزام لگایا کہ وہ ایک آوارہ مزاج حریص عورت تھی جو اس نوجوان کو اپنی چالاکی اور عیاری سے پھنسانا چاہتی تھی لیکن آگے چلکر معلوم ہوگا کہ کتنی گوناگوں ترکیبیں اس مرد زمانہ ساز نے اس معصوم عورت کو اپنے حلقہ نکاح میں لانے کیلئے کیں جو حتی الوسع اس سے بچنا چاہتی تھی لیکن انجام کار حالات کا شکار ہوئی۔

(۳)

پہلی چال جو یلورٹن نے ٹریسیا کے خلاف

چلی پیتی کہ اس سے کہنے لگا: "آؤ ہم بلیک والا کے گرجا میں خفیہ طور پر شادی کرلیں لیکن اسجگہ کا گرجا چونکہ گریک چرچ والوں کا تھا اور ٹیرلیا پکی رومن کیتھولک عورت تھی اسلئے وہ بولی کہ "میں اس گرجا میں رسم شادی ادا ہونے سے مطمئن نہیں ہو سکتی"

اس کے بعد وہ انگلستان واپس چلی گئی اور اپنی ایک سہیلی مس میک فارلین سے ملنے ایڈنبرا گئی۔ چونکہ یلورٹن کی پلٹن بھی ان دنوں سکاٹلینڈ پہنچی ہوئی تھی اس لئے یہ اس جگہ ٹیرلیا سے ملتا رہا۔ اور اب اس نے دوسرا فریب یہ کھیلا کہ قانون سکاٹ لینڈ کے مطابق شادی کرنے کی تجویز پیش کی۔ سکاٹ لینڈ میں کچھ ایسا دستور ہے کہ اگر فریقین ملکر رضامندی کرلیں تو کسی پادری کی موجودگی یا رسم کی ادائیگی کے بغیر ہی سب کام مکمل سمجھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ یلورٹن نے کہا کہ "یہ رسم ہم مکان کے ایک کمرہ میں بھی ادا کرسکتے ہیں" لیکن ٹیرلیا کو یقین نہ آتا تھا۔ کہنے لگی "شادی ایک اس طرح کا مقدس رشتہ ہے جسے کسی ایماندار پادری کے سامنے ہی قائم کیا جا سکتا ہے ورنہ ایسا تعلق داخل گناہ ہے اس کے علاوہ شادی کی رسم ادا کرنے والا بھی کوئی رومن کیتھولک پادری ہونا چاہئے" اس سے یلورٹن کو بڑی پریشانی ہوئی تاہم اس نے کہا "شادی ایک ایسا رشتہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی داخل ہوتی ہے۔ پادری اپنی طرف سے کچھ نہیں کرسکتا" جب ٹیرلیا نے پھر بھی نہ مانا تو یلورٹن نے عارضی طور پر سوال کو نظر انداز کردیا لیکن اپنے دل ہی دل میں کوئی نئی ترکیب سوچنے لگا۔ چنانچہ ایک روز وہ دوڑا دوڑا مس میک فارلین کے مکان پر گیا اور اس کمرے میں داخل ہو کر جہاں ٹیرلیا بیٹھی تھی اس نے ایک کتاب اٹھائی۔ ٹیرلیا کو اپنے برابر کھڑا کرلیا اور خود ہی نکاح کی شرطیں پڑھ کر کہنے لگا: "ملک سکاٹ لینڈ کے ضابطہ کے مطابق اب ہم میاں بیوی بن گئے" ٹیرلیا بیچاری حیران و ششدر رہ گئی۔ اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کسطرح ایسا ہونا ممکن ہے۔

اس کے فوراً بعد یلورٹن اپنی سوچی ہوئی تجویزوں کی تکمیل کے سلسلہ میں ٹیرلیا سے کہنے لگا۔ "اب جبکہ ہمارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ قائم ہو چکا ہے تم میرے ساتھ چل کر ایک ہوٹل میں رہو۔ اس جگہ ہم اپنا ماہ عسل کا زمانہ گذاریں گے" لیکن ٹیرلیا کا ان باتوں سے اطمینان نہ ہوا اور اس نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ بعد ازاں جب یلورٹن نے اسے ہر وقت تنگ کرنا شروع کیا تو وہ ایڈنبرا سے چلکر ہل کے مقام پر اپنے بعض رشتہ داروں کے پاس چلی گئی اور اسجگہ سے پھر ایک بار اپنی بہن سے ملنے ویلز گئی۔ اس جگہ رہتے ہوئے اسے ہمیشہ یلورٹن کی طرف سے جو ہر وقت نئی نئی سازشیں اور ترکیبیں سوچتا رہتا تھا ایک چٹھی اس مضمون کی موصول ہوئی کہ "اگر سابقہ شادی سے تمہارا اطمینان نہیں ہوا تو آؤ میں باضابطہ رسم شادی ادا کئے جانے کے لئے تیار ہوں۔ ہماری شادی آئرلینڈ میں باضابطہ کسی گرجا میں پادری کی موجودگی میں ہوگی۔ لیکن چونکہ ملک آئرلینڈ میں جہاں یلورٹن ان دنوں مقیم تھا، رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ مذہب کے دو شخصوں میں شادی کی رسم ادا ہونا غیر ممکن ہے اسلئے یلورٹن نے کہدیا کہ "میں بھی اپنا سابقہ عقیدہ چھوڑ کر رومن کیتھولک بن گیا ہوں" اس کے بعد ٹیرلیا صیاد کی زد میں آگئی۔ شادی کی رسم ادا ہونے کے موقعہ پر یلورٹن نے ہنستے ہوئے پادری سے بیان کیا کہ "میں گو پکا رومن کیتھولک نہیں ہوں تو بھی اب پراٹسٹنٹ نہیں رہا" اس کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔

معلوم ہوتا ہے نامنجار یلورٹن اسی موقعہ کے انتظار میں تھا۔ شادی ہوتے ہی وہ دلہن کو اپنے ہمراہ کسی مقام پر لے گیا اور ابھی ماہ عسل کا زمانہ پورا نہ ہوا تھا کہ اس نے گاہ بگاہ اس طرح کے الفاظ کہنے شروع کردیئے کہ "میری ماں چونکہ میری شادی ایک امیر خاندان کی لڑکی سے کیا چاہتی تھی اس لئے وہ اس شادی کی خبر سنکر بہت ناراض ہوگی۔ بس فی الحال یہی بہتر ہے کہ ہم اس شادی کو پوشیدہ رہنے دیں" کچھ عرصہ اسی طرح کی لایعنی باتیں کرتے رہنے کے بعد اس مرد سیاہ کار نے علانیہ کہنا شروع کردیا کہ "ہماری تو ایک طرح سے شادی ہی نہیں ہوئی۔ میں پکا پراٹسٹنٹ ہوں اور ہمیشہ اپنی عقائد کا پابند رہونگا" اس کے تھوڑا عرصہ بعد وہ اپنی نئی بیاہی دلہن کو چھوڑ کر چلا گیا اور کسی دوسری جگہ جا کر ایک مالدار بیوہ عورت سے شادی کرلی!

(۴)

سطور بالا میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے، وہ صحیح طور پر اسی عجیب و حیرت انگیز مقدمہ کا خلاصہ ہے جو انجام کار عدالت انصاف میں دائر ہوا اور جس میں اس زمانہ کی پبلک نے غیر معمولی دلچسپی لی۔ دوران مقدمہ میں مسز یلورٹن یعنی ٹیرلیا نے اول سے آخر تک اس بات پر زور دیا کہ میں اس شخص کے ساتھ اسکی انتہائی کوششوں کے باوجود اسوقت

تک کوئی تعلق قائم کرنے کیلئے آمادہ نہ ہوئی حتیٰ کہ اس نے کل اور دن کے مقام پر مجھ سے باضابطہ شادی کی لیکن دوسری جانب یلورٹن کا اپنا بیان یہ تھا کہ میں نے کسی موقعہ پر اس عورت سے شادی نہیں کی ہمارے درمیان جو تعلقات رہے صحیح معنوں میں ناجائز تھے۔ میں نے اُسے محض ایک داشتہ کی حیثیت میں اپنے پاس رکھنا منظور کیا تھا۔ عدالت کے لئے اب اس بات کا فیصلہ کرنا تھا کہ دونوں میں سے کس کا بیان سچا ہے۔

اس مقدمہ کے سلسلے میں ایک بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ یعنی یہ کہ میجر یلورٹن کے خلاف خود ٹیریسا نے دعویٰ دائر نہ کیا تھا بلکہ ٹیریسا کے ایک مربی و عنایت فرما جان تھلوال نے جس کو ستم رسیدہ عورت سے بہت گہری محبت تھی اور جو چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ پورا انصاف ہو۔ یہ شخص قصبہ ہل میں لوہے کا کاروبار کرتا تھا اور جب یلورٹن اپنی بی بی کو چھوڑ کر بھاگ گیا تو اسی نے بد نصیب عورت کو اپنے مکان پر پناہ دی تھی۔ بعد ازاں اسی شخص نے اچھی طرح غور و خوض کر کے اور قابل وکیلوں سے مشورہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ یلورٹن کے خلاف جو مقدمہ دائر ہونا ہے وہ ٹیریسا کی طرف سے نہیں بلکہ خود میری طرف سے ہو۔ اس میں خاص فائدہ یہ تھا کہ از روئے قانون عورت اپنے شوہر کے خلاف اس طرح کے مقدمات دائر نہیں کر سکتی اور بالفرض ایسا ہو بھی تو شوہر کے خلاف اس کا بیان بطور گواہ نہیں لیا جاتا۔ لیکن تھلوال نے جو ترکیب سوچی اس کی بدولت اس بات کا موقع مل گیا کہ وقت آنے پر نہ صرف ٹیریسا کا بیان لیا جائے وہ چٹھیاں بھی پیش کی جاسکیں جو خود اس نے یلورٹن کے نام لکھی یا اس شخص کی طرف سے اسکو موصول ہوتی رہی تھیں۔ تھلوال نے اپنے عرضی دعویٰ میں لکھا کہ "۲۵۹ پونڈ ۱۷ شلنگ ۳ پنس کی رقم مجھ کو مدعا علیہ میجر یلورٹن سے دلوائی جائے کیونکہ یہ رقم بعض ایسے اخراجات کے سلسلے میں اس کے ذمہ نکلتی ہے جو اس کی بیوی نے میرے مکان پر رہتے ہوئے کئے تھے۔" مدعی نے جو نکتہ سوچا یہ تھا کہ اس طریقہ پر عدالت اس سوال کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگی کہ ٹیریسا واقعی میجر یلورٹن کی بیوی ہے یا نہیں۔ اور ٹیریسا کو اپنا بیان دینے کا موقع بھی حاصل ہو جائیگا۔ چنانچہ اس شخص نے اپنی عرضی دعوےٰ میں تحریر کیا کہ "مدعا علیہ کی بیوی اتنا عرصہ میرے مکان پر رہی۔ اس نے میرا سامان استعمال کیا۔ میرے مکان پر کھانا کھایا۔ ان سارے اخراجات نیز دُھلائی کپڑوں، دواؤں، نوکر کی حاضری اور دوسری ضرورتوں کے سلسلہ میں جو مدعا علیہ کی بیوی کو میرے مکان پر رہتے ہوئے پیش آتی رہیں۔ میری یہ رقم اس کے ذمہ نکلتی ہے اور وہ مجھے اس کے شوہر سے دلائی جانی چاہئیے" مسٹر تھلوال نے جو انوکھی اور دُور رس ترکیب سوچی۔ اس کی اہمیت کو مدعا علیہ کے وکیل نے بھی اپنی تقریر میں تسلیم کیا نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مقدمہ کی پیشیاں کافی لمبی ہو گئیں بہت سی خط و کتابت شامل مسل کی گئی اور بے شمار گواہوں کے بیانات بھی لئے گئے۔

اس مقدمہ کا سب سے زیادہ قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ مدعی نے جس وکیل کی خدمات حاصل کیں وہ بڑا فصیح البیان مقرر تھا اور قانونی دُنیا میں ہر طرف اس کی دھوم تھی۔ فی الحقیقت اس کی آتش بیانی کو دوست دشمن سب اس حد تک مانتے تھے کہ دوران مقدمہ میں مدعا علیہ کے وکیل کو جیوری کے ممبروں کے روبرو یہ بات کہنے پر مجبور ہونا پڑا کہ آپ فریق مخالف کے قابل وکیل مسٹر وائٹ سائڈ کی تقریر سننے کیلئے عدالت میں جمع ہوں چنانچہ جس روز اس کی تقریر ہوئی تھی کمرہ عدالت کے دروازہ کے باہر خلقت کے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع تھے۔ لاتعداد عورتیں ٹکٹ لیکر کارروائی دیکھنے کیلئے کمرہ عدالت میں داخل ہوئیں اور ان کو اطراف کی گیلریوں میں جگہ دی گئی۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے صاحب چیف جسٹس کی آمد پر دروازے کھول دینے کا حکم صادر کیا گیا اور اس وقت اتنی خلقت اندر گھس آئی کہ جو سپاہی انتظام کرنے کیلئے دروازہ پر کھڑے تھے وہ اس ریل پیل میں کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ بہت سے آدمی دھکم دھکا سے زمین پر گرے اور پاؤں تلے دب گئے اور جب ہجوم کی کثرت کا یہ عالم ہوا کہ جتنی گنجائش تھی اس سے بیس گنا زیادہ آدمی کمرہ کے اندر گھس آئے تو لکڑی کے سامان کے ٹوٹنے، تختوں کے چرچرانے اور شیشوں کے ریزہ ریزہ ہونے سے ایسی خطرناک حالت پیدا ہو گئی کہ اندیشہ ہونے لگا بہت سے آدمی زخمی ہو جائیں گے۔ صاحب چیف جسٹس بار بار چلا کر سپاہیوں کو حکم دیتے کہ دروازے بند کر دو اور خلقت کو باہر نکال دو لیکن شور و غل اور ریل پیل ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی، مجبور ہو کر۔ لارڈ شپ کو عدالت کا اجلاس آدھ گھنٹہ کیلئے ملتوی کر دینا پڑا۔

جب اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو شور و غل کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ اس وقت

کارروائی شروع ہوئی کمرہ عدالت کا کوئی حصہ خالی نظر نہ آتا تھا کئی سربرآوردہ اصحاب کو مسند کے قریب بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔

اس موقعہ پر مسٹر ڈھلوال کے وکیل وائٹ سائڈ نے جو تقریر کی وہ قانون و انصاف کی تاریخ میں اپنی گہرائی، درد اور تاثیر کیلئے ہمیشہ عدیم النظیر سمجھی جائے گی۔ فاضل وکیل کو الفاظ قلیل میں معانی جلیل پیدا کرنے کا ڈھنگ خوب یاد تھا۔ اس نے تقریر کی سلاست زبان کی لطافت، ادائے مطلب کی قدرت اور سب سے زیادہ شعلہ بار فصاحت کے ذریعہ سے کمرہ عدالت میں سماں باندھ کر دکھا دیا۔

اس گہری محبت کا ذکر کرتے ہوئے جو بدنصیب تھریسیا کو اپنے شوہر کے ساتھ تھی لیکن جسکی اس سنگدل بے رحم نے کوئی قدر نہ کی فاضل وکیل نے دوران تقریر میں کہا۔

"اس دنیا میں کون ہے جو عورت کی اتھاہ محبت کی گہرائی معلوم کر سکے۔ وہ اپنے بیان میں جو اس نے آپ لوگوں (اراکین جیوری) کے روبرو دیا ہے، خود بیان کر چکی ہے کہ اس کی محبت اور وفا کتنی بے کراں تھی۔ اسکی ایک چٹھی میں جو اس نے ایک موقعہ پر اس آدمی کے نام لکھی جواب اس سے شادی کرنے کے بعد ہر قسم کے تعلق سے انکاری ہے۔ ایک موقعہ پر یہ الفاظ پائے جاتے ہیں "خدا نہ کرے اگر اس طرح کا موقعہ پیش آئے کہ تم کو کسی جرم میں پھانسی پر لٹکانے لگیں تو میں تمہارے بدلے اس جگہ کھڑی ہونے کو تیار ہوں" صاحبو یہ ہے وہ مظلوم عورت جس کے ساتھ آپ کو انصاف کرنا ہے۔

بے شک آپکو اس بات کا اختیار حاصل نہیں کہ اس کی کھوئی ہوئی راحت بحال کر سکیں یا شوہر سے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو دوبارہ گانٹھ دیں۔ رنج والم نے اس کے خوشنما رخساروں کی جو سرخی زائل کی ہے آپ اسکو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتے، نہ اسکی خوشنما آنکھوں میں مسرت کی وہ چمک پیدا کر سکتے ہیں جو ہر وقت کے غم والم اور مسلسل آنسو بہانے سے ضائع ہو چکی ہے۔ آپ اس کے دل غمزدہ کو رنج والم سے بھی پاک نہیں کر سکتے مگر ہاں اپنی کوشش سے اس کو سوسائٹی میں پھر ایک بار اونچا درجہ دے سکتے ہیں اس بے رحم دنیا میں آپ اس کے واحد حامی ہیں۔ آپ اور وہ فاضل منصف جو مسند عدالت کو زینت دے رہے ہیں ایک مظلوم عورت کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ وہ عورت جو حقیقی معنوں میں ستم رسیدہ ہے اور جسکی ذات سے ہر ایک دل میں جو کمرہ عدالت کے اندر یا اس کے باہر حرکت کرتا ہے، سچی ہمدردی پائی جاتی ہے۔"

پوری تقریر فصیح البیانی کا ایک نہایت دلکش نمونہ پیش کرتی ہے جیسا قدرتی تھا۔ اس کا حاضرین پر گہرا اثر ہوا۔ کمرہ عدالت میں گویا بجلی سی دوڑ گئی۔ لندن اور آئرلینڈ کے تمام اخباروں نے اس تقریر کو لفظ بہ لفظ شائع کیا اور چونکہ وائٹ سائڈ پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا۔ اس لئے جب وہ بعد ازاں لنڈن پہنچکر ہوس آف کامنز میں داخل ہوا تو سارے اراکین نے سرو قد کھڑے ہو کر اسکو داد تحسین دی لیکن خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ ذکر اس وقت کا ہو رہا تھا جب مدعی کے وکیل وائٹ سائڈ نے اراکین جیوری کو مخاطب کر کے اپنی وہ زبردست تقریر کی جس کا تھوڑا سا نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ آخر کار چھ بجکر بیس منٹ ہو چکے تھے کہ ممبران جیوری جو مقدمہ کی کارروائی کے خاتمہ پر اپنے فیصلہ پر غور کرنے کیلئے علیحدہ کمرہ میں گئے تھے پھر واپس آئے ان کے نمودار ہوتے ہی کمرہ عدالت میں گہرا سناٹا چھا گیا اور اس موقعہ پر صاحب چیف جسٹس اور فورمین جیوری کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

چیف جسٹس۔ صاحبان آپ نے کیا نتیجہ نکالا؟ کیا ان دونوں میں سکاٹش طریقہ پر شادی ہوئی تھی یا نہیں؟

فورمین۔ ہاں مائی لارڈ ہوئی تھی!

چیف جسٹس۔ اور کیا آئرلینڈ میں بھی ان کے درمیان باقاعدہ شادی کی رسم ادا ہوئی؟

فورمین۔ ہاں مائی لارڈ وہ بھی ہوئی۔

چیف جسٹس۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدعا علیہ ایک سال پیشتر رومن کیتھولک مذہب کا پابند تھا؟

فورمین۔ مائی لارڈ ہمیں اس کا پختہ یقین ہے۔

فورمین کے منہ سے آخری الفاظ جنکی بدولت مقدمے کا فیصلہ مدعی کے حق میں ہوتا اور تھریسیا کے حقوق شادی باضابطہ تسلیم کئے جاتے تھے نکلنے کی دیر تھی کہ کمرہ عدالت میں دبا ہوا شور وغل پیدا ہو گیا۔ حاضرین نے شروع میں رک رک کر اور اس کے بعد مسلسل چیئرز دینے شروع کئے۔ لوگ ٹوپیاں اتار اتار کر اور رومال جیبوں سے نکال کر زور زور سے ہلاتے تھے بلکہ انتہا یہ ہے کہ بہت سے وکلا نے اپنے سروں سے وگ یعنی بالوں کی وہ ٹوپیاں اتار کر جو اس پیشہ کے لوگ استعمال کیا کرتے ہیں انہی کو ہلانا شروع کر دیا۔ عورتوں میں سے بعض اپنے رومال ہلاتی بعض تالیاں بجاتی اور بعض خوشی سے روتی نظر آتی تھیں۔ ہر شخص ممبران جیوری کو جنہوں نے ایک ناکردہ گناہ عورت کے حقوق تسلیم کرانے میں نمایاں حصہ لیا تھا نظر ممنونیت سے دیکھ رہا تھا۔ بعد ازاں ضابطہ کے مطابق مدعی کے وکیل نے ممبران جیوری

کی فیس عدالت میں داخل کی لیکن جیوری کی طرف سے فورمین نے یہ رقم رجسٹرار عدالت کو فوراً ہی واپس کردی اور کہا کہ "میرے ہم جلیس چاہتے ہیں یہ روپیہ خیرات کے کاموں میں دے دیا جائے۔" اس واقعہ پر حاضرین نے پھر ایک مرتبہ ممبران جیوری کو چیئرز دینے شروع کئے۔

(۵)

یہ تو کمرۂ عدالت کے اندرونی حصہ کی حالت تھی۔ باہر جو واقعات پیش آئے وہ جوش و خروش کے اعتبار سے واقعات مذکورہ سے کئی گنا بڑھ چڑھ کر تھے۔ کم و بیش بیس ہزار آدمی صدر پھاٹک کے باہر جمع تھے جنکو اندر جانے کی اجازت ہی نہ دی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کے ہر حصہ سے بے شمار خلقت مقدمہ کا نتیجہ معلوم کرنے کیلئے جمع ہوئی ہے جتنی دیر مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی سب لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے پھرتے تھے کہ مقدمہ کس منزل پر ہے۔ آخر جس وقت ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ ممبران جیوری اپنے فتوے پر غور کرنے کے لئے علیحدہ کمرہ میں گئے ہیں تو سب آدمی دبے ہوئے جوش کی حالت میں دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ نتیجہ معلوم کرنے کے لئے اس طرح بے قرار ہونے لگے کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا، ان کو اس مقدمہ سے ذاتی دلچسپی ہے۔ ساڑھے چھ بجے کے قریب جب اندر —— سے چیئرز دینے کی آوازیں پہلی مرتبہ سنائی دیں تو ان لوگوں کے چہرے بھی کھل گئے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ فیصلہ مسز ملبورٹن کے حق میں ہوا ہے چنانچہ ہر شخص کے منہ سے زوردار نعرۂ تحسین بلند ہوا۔ چیئرز کی آوازوں سے آسمان گونجنے لگا۔ لوگ ٹوپیاں اتار اتار کر ہوا میں اچھالنے لگے۔ جو لوگ ایک دوسرے کے شناسا نہ تھے۔ وہ بھی فرط مسرت سے مصافحہ کرتے دیکھے گئے۔ کرایہ کی گھوڑیاں اطراف میں دوڑتی نظر آنے لگیں۔ کیونکہ ہر شخص کی خواہش تھی کہ اس خوشخبری کو میں دوسروں کے کانوں تک پہنچاؤں۔

آخر جب اس کے تھوڑا عرصہ بعد عدالت کے حکم سے بڑا پھاٹک کھولا گیا اور وہ لوگ کمرۂ عدالت میں جمع تھے باہر نکلنے لگے۔ تو اس ہجوم نے جو پھاٹک کے باہر کھڑا انتظار [illegible] کی جنبش ہوئی۔ ہر شخص کی دلی خواہش اس نیک باطن خاتون کو ایک نظر دیکھنے کی تھی۔ جس کے حق میں فیصلہ صادر ہو چکا تھا دفعتاً لوگوں میں تحریک شروع ہوئی کہ مسز ملبورٹن کی گاڑی ہمیں اپنے ہاتھوں سے کھینچ لینے دی جائے چنانچہ اس کے کمرہ عدالت سے باہر نکلتے ہی بہت سے لوگوں نے مسز ملبورٹن کو گاڑی پر بٹھا کر اس کی گاڑی خود کھینچنی شروع کردی۔ ایک اتنا بڑا جلوس تیار ہوا جسے بیشتر بہت کم موقعوں پر دیکھنے میں آیا ہوگا۔ حقیقت یہ جلوس مختلف بازاروں سے ہوتا ہوا سٹرینڈ سٹریٹ میں پہنچا تو خلقت کا جوش حد انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ عظیم الشان جلوس گریشیم ہوٹل کے قریب پہنچا جس میں مسز ملبورٹن کی سکونت تھی۔ یہاں اور بھی زیادہ وسیع ہجوم زندگی کے اس ناٹک کی ہیروئن کو ایک نظر دیکھنے کیلئے جمع تھا۔ بڑی مشکل سے مسز ملبورٹن کی گاڑی کو ہوٹل کے دروازہ تک پہنچایا گیا۔ لیکن خلقت کا جوش وخروش ابھی تک قائم تھا۔ صدا اٹھی کہ ہم مسز ملبورٹن کے منہ سے چند الفاظ سننے کے خواہش مند ہیں۔ عوام کے تقاضا سے مجبور ہو کر وہ پہلے ہوٹل کے کمرہ کی کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ پھر اس نے اور زیادہ آگے بڑھ کر اور بالکونی پر کھڑے ہو کر ایک مختصر سی تقریر ان لفظوں میں کی:۔

"میرے شفیق دوستو! ہر چند میں تمہارے ملک کی رہنے والی نہیں ہوں لیکن آج اپنے اس فتوے کے ذریعہ سے کہ میں ایک باشندۂ آئرلینڈ کی بیوی ہوں آپ نے مجھ کو فخر وطنیت عطا کر دیا ہے۔ (زوردار چیئرز) میں ایک ایسی کشادہ دل اور عالی حوصلہ قوم کی رکنیت قبول کر کے سچی خوشی محسوس کرتی ہوں۔ آپ لوگوں کی یاد اس طرح میرے سینے میں محفوظ رہیگی جس طرح آج آپ نے مجھ غریب کی آبرو کو اپنے دلوں میں جگہ دیکر میری عزت افزائی کی ہے۔ (لمبی اور زوردار چیئرز)

میرا دل بہت کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن حال کے پُر خروش واقعات نے مجھ کو نیم جان اور ماندہ کر رکھا ہے۔ میں کوئی لمبی تقریر کرنے کے قابل ہوں میری الوداع قبول کیجئے لیکن یاد رکھئے کہ میں ہمیشہ دل و جان سے ڈبلن کے باشندوں کی ممنون احسان رہوں گی۔"

اس مختصر تقریر کے خاتمہ پر حاضرین بڑی دیر تک زوردار چیئرز دیتے رہے اور آخر بڑی رات گئے رفتہ رفتہ یہ ہجوم منتشر ہوا۔

(۶)

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس داستان کا آخری حصہ بے حد المناک ثابت ہوا مقدمہ کے ختم ہوتے ہی لندن کے بیشمار تھیٹروں کی طرف سے مسز ملبورٹن کے نام درخواستیں موصول ہوئیں کہ آپ ہمارے سٹیج پر نمودار ہوں اس کا معاوضہ اتنا دیا جائے گا لیکن غریب عورت کے خیالات شادی کے تجربہ معاملات پر اس قدر لگے ہوئے تھے کہ وہ کسی دوسری بات پر توجہ ہی نہ دے سکتی تھی۔ وہ شادی کے معاملہ کے سوا کسی اور سوال پر گفتگو کرنے کو آمادہ نہ ہوتی تھی۔ ادھر اسکے مقدمہ کے کثیر اخراجات نے اسے مالی طور پر

بالکل تباہ کر دیا تھا۔ انجام کار امریکہ کی ایک لیکچر ایجنسی نے معاوضہ پیش کر کے اس سے یہ قرارداد کی کہ جا بجا لیکچر دیتے ہوئے اپنے حالات زندگی بیان کرے اور ان لیکچروں سے جو آمدنی ہو وہ ایجنسی کے پاس رہے۔ لیکن اس زمانہ میں لیکچر بازی زیادہ مقبول نہ ہوتی تھی۔ اسلئے نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔ انگلستان واپس آئی تو یہاں بھی صورت حالات بہتر نہ ہوئی اس نے اخبار نویسی کی طرف رجوع کیا مگر اس میں بھی ناکام رہی۔ آخر کار ۱۸۸۱ء میں سخت مصیبت اور مفلسی کی حالت میں اس نے نٹال کے مقام پیٹر مارٹنز برگ میں انتقال کیا۔

میجر ملیوڑٹن کو ایک رشتہ دار کی موت سے لارڈ ایون ڈیل کا خطاب حاصل ہو گیا تھا لیکن اس عورت کے انتقال کے بعد جس کی زندگی کو اس نے تباہ و برباد کی تھی۔ وہ بھی دو سال سے زیادہ زندہ نہ رہا اور پیش از وقت ہی اس دُنیا سے سدھار گیا۔

مستی و قلندری (بقیہ ص ۶۲)

ہو چکی تھی۔ مسجد کے حجرے میں پھر سے ایک بوڑھے مولوی آباد ہو گئے تھے جو اپنے کو سجادہ نشین کہتے تھے اور ان ہری چادروں، نیاز کی مٹھائیوں، اور تیل کے پیسوں کا جائز حقدار سمجھتے تھے۔

عیدا شاہ مر کر اور بھی خطرناک ہو گئے تھے۔ جس پر جلال آجاتا اس کا گھر کا گھر تباہ ہو جاتا۔ جس پر نظر کرم ہوتی اس کے بچہ پیدا ہوتا، مقدمہ جیتتا، شوہر کی کھوئی ہوئی محبت پھر سے مل جاتی، غرضیکہ اب بھی عیدا شاہ کے معتقدوں کی کمی نہ تھی۔

بنتی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے لاپتہ ہو گئی۔

اور ابھی نہ جانے مادر گیتی کے سینے پر اس طرح کے کتنے ناسور اور ہونگے۔

ہندوستانی سنیاسیوں کے جگر پارے

اکسیری سفوف ۔ بیدانجیر ۔ کتھ ۔ گلی انار تینوں برابر وزن لیکر سفوف بنا رکھیں خوراک ۴ ماشہ صبح ۴ شام ہمراہ پانی یہ سفوف مستورات کے پیور روگ کیلئے بے حد مفید ہے۔ سوزاک اور اس سے پیدا شدہ امراض کا ازالہ بھی کرتا ہے۔

نمونیہ کا عجیب علاج ۔ ایک ہلدی کی گرہ لے کر اسے آگ میں جلالیں۔ جب اس کا انگارہ بن جاوے تب شہد میں ڈبو کر بجھا کر نکال لیں۔ کھرل کر کے مرچ سیاہ کے قریب گولیاں بنالیں۔ مریض خواہ کسی بھی حالت میں ہو۔ ایک ایک گولی ایک ایک گھنٹہ کے وقفہ سے گرم پانی کے ہمراہ یا ادرک کے پانی کے ہمراہ دینے سے صرف دو خوراک سے ہی مریض کو آرام آجاتا ہے

اکسیر پیچش ۔ پیچش خواہ کسی قسم کی ہو مریض کی کیسی ہی حالت ہو یا کہنہ کیوں نہ ہو بھی اس سے آرام ہو جاتا ہے۔ کھیل پھٹکڑی ایک ماشہ تک سیاہ مرچ کے پانی سے دینے پر چند خوراکوں سے ہی آرام ہو جاتا ہے۔ (کھیل پھٹکڑی سے مراد پھٹکڑی شگفتہ ہے)

مرچ سیاہ کا پانی اس طرح بنائیں کہ ۵ عدد مرچ سیاہ کو دردرا کر آدھ پاؤ پانی میں جوش دے لیں ٹھنڈا کرکے پانی کو چھان لیں۔

درد گردہ ۔ کھلانوہ ۵ تولہ ۔ قلمی شورہ ۲۰ تولہ ۔ دونوں کو ایک سکورہ گلی میں بند کرکے دس سیر اپلوں کی آگ میں پھونک دیں۔ سرد ہونے پر نکال کر نہایت باریک پیس کر رکھ لیں۔ ۴ رتی سے ایک ماشہ تک ہمراہ عرق سونف استعمال کریں۔ درد گردہ کی اکسیر دوا ہے۔ ایک ہی خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے۔

دمہ کے لئے عجیب نسخہ ۔ بہیڑے کا چھلکا ایک پاؤ پختہ ۔ جوہر نوشادر ایک تولہ ۔ گیرو ۶ ماشہ ۔ ہر سہ اشیاء کو نہایت باریک پیس کر محفوظ رکھیں ۔ ۳ ماشہ صبح ۳ ماشہ شام ہمراہ خالص شہد استعمال کریں۔

برائے قبض کشا ۔ سقمونیا ۔ جلاپہ ۔ عصارہ ریوند ۔ رومی مصطگی ہر ایک ۲ تولہ ۔ سونٹھ ایک تولہ ۔ مکی ۱ تولہ ۔ ایلوا ۲ تولہ سب ادویہ کو عرق گلاب سے آتشہ میں کھرل کریں اور گولی بقدر نخود بنائیں۔ ایک گولی ہمراہ دودھ رات کو استعمال کرنے

بقیہ صفحہ ۸۸ پر

جذبات بیتاب

سرشار کسمنڈوی

اِک شعلۂ اضطراب آیا بھی تو کیا؟ اِک لمحۂ کامیاب آیا بھی تو کیا ؟
آنکھیں جو کھلیں تو تھا اندھیرا ہر سُو بجلی کی طرح شباب آیا بھی تو کیا؟

انسان کو انساں سے نفرت کیا خوب ذی ہوش کو ذی ہوش سے وحشت کیا خوب
یہ بُغض، یہ کینہ، یہ عداوت، یہ حسد فطرت سے کھُلی ہوئی بغاوت کیا خوب

ہر سازِ طرب میں سوزِ ماتم بھی ہے ہر بُود میں نابُود کا عالم بھی ہے
آنکھیں ہوں تو تصویر کے دونوں رُخ دیکھ جنت کے عجائب میں جہنم بھی ہے

ریویو

حضرت جوش ملیح آبادی کے ان جوش پرور اور ہنگامہ خیز مضامین کا مجموعہ ہے جو مرحوم رسالہ "کلیم" دہلی میں شائع ہو کر خاص مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ یقیناً جوش نے شاعری میں ایک نیا انداز اظہار پیدا کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو نثر نگاری میں ان کا انداز صرف انہی کے قلم اور انہی کے دل و دماغ سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ جوش کے طوفانی خیالات کیلئے اس قسم کا طوفانی انداز تحریر ہی درکار تھا۔ اور جوش کی حقیقی شاعرانہ شخصیت اس کتاب کی ہر سطر سے جھلک رہی ہے۔ اردو داں پبلک کو نگارستان جکیسی کا ممنون ہونا چاہئے کہ انکی طرف سے ہمارے بہترین شعراء کے بیشمار پر زور مضامین کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ مکمل مجلد ہے قیمت ۲/ نگارستان جکیسی اردو بازار دہلی سے طلب کیجئے۔

سائنس کی دنیا — جدید ایجادات و انکشافات

گیس پروف کپڑا

مسٹر لکشمن باجپئی پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے زہریلی گیسوں سے بچنے کی غرض ایک گیس پروف کپڑا ایجاد کیا ہے۔ مسٹر باجپئی ہارکورٹ بٹلر ٹیکنالوجیکل انسٹیٹیوٹ کانپور میں کام کرتے تھے اور انہیں پانی سے محفوظ رہنے والے کپڑوں کیلئے مختلف اقسام کے وارنش اور سیال اشیا تیار کرنے سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ پھر واٹر پروفنگ ٹریننگ کول بلند شہر میں لیکچرر کی حیثیت سے آپ نے متعدد نوجوانوں کو واٹر پروف ریشوں کے بنانے کی تعلیم دی۔ گزشتہ سال آپ نے اسی قسم کے گیس پروف کپڑے بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ فوج نے پہلے پچیس ہزار گز کپڑے کی آزمائش کی اور پھر ایک لاکھ گز کا آرڈر دیا۔

مصنوعی پٹرول

ضروریات جنگ کے سلسلہ میں پٹرول کا درجہ بہت زیادہ ہے۔ ۱۹۱۹ء میں کچھ سائنسدان اس جستجو میں رہے کہ زمین کے اندر کوئلہ کس طرح بنتا ہے۔ جب اس جستجو میں وہ کامیاب ہوگئے تو ان لوگوں نے مصنوعی کوئلہ بنانے کی کوشش شروع کی۔ اسی سلسلہ میں مصنوعی پٹرول تیار کرنے کا نسخہ بھی ہاتھ آ گیا۔ یہ غالباً ۱۹۱۴ء کی لڑائی کے زمانہ کا تھا! اس وقت تک تو پٹرول صرف کوئلہ سے نکالا جاتا تھا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد سائنسدانوں نے مزید تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں جرمنی نے ۷½ لاکھ ٹن اور برطانیہ نے ڈیڑھ لاکھ ٹن مصنوعی پٹرول تیار کیا۔

ہوائی تارپیڈو

اسی طرح سے ہوائی تارپیڈو کے سلسلہ میں بھی ایک خاص چیز ایجاد کی گئی ہے۔ اگر وہ عملی طور پر کامیاب ثابت ہوئی تو بہت خطرناک حربہ ثابت ہوگی۔ اس کے موجد کا بیان ہے کہ یہ ہوائی تارپیڈو نہایت آسانی سے اڑ سکے گا اور ایک سو میل تک کے فاصلہ تک بذریعہ ریڈیو ٹیلی فون چلایا جاسکیگا۔

مصنوعی شکر

عام طور پر شکر گنے اور ایکھ سے بنائی جاتی ہے لیکن لڑائی کے دنوں میں زندگی کے اور کاروبار کی طرح کاشت کا نظام بھی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اسلئے قدرتاً شکر سازی کا سلسلہ بھی بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے لیکن اب پتہ چلا ہے کہ لکڑی سے شکر کثرت سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ اب تک عمارت اور فرنیچر وغیرہ کیلئے جو لکڑی کاٹی جاتی تھی اس کا بہت بڑا حصہ کاٹنے چھانٹنے میں ضائع ہو جاتا تھا یا زیادہ سے زیادہ جلانے کے کام آتا تھا لیکن اب وہ لکڑی ضائع نہیں کی جائیگی اور اس سے شکر تیار کی جائے گی۔

مصنوعی نائٹریٹ

جس طرح انسان کی زندگی کیلئے ہوا، پانی اور روشنی ضروری چیزیں ہیں۔ اسی طرح زمین کے لئے نائٹریٹ ایک ناگزیر چیز ہے۔ یہ ایک مادہ ہے جو زمین کے اندر پایا جاتا ہے اور زمین کی زرخیزی کو بڑی حد تک اسی کی موجودگی پر انحصار ہوتا ہے۔ خصوصاً کپاس کی کاشت کیلئے تو بیحد ضروری ہے۔ لیکن ان چیزوں سے آتش گیر مادہ کے لئے نائٹریٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنوبی امریکہ کے ساحلی علاقے میں اس کی بہت بڑی مقدار پائی جاتی ہے جو دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہے۔ ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں جب جرمنی کی ناکہ بندی کی گئی تو وہاں اور چیزوں کے ساتھ ساتھ نائٹریٹ کی بھی کمی ہو گئی۔ ابتدا میں جرمنی کا یہ خیال تھا کہ یہ لڑائی چند مہینوں میں ختم ہو جائیگی مگر امید کے خلاف لڑائی نے طول پکڑا۔ ابتدا میں نائٹریٹ کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی کیونکہ اسکی کافی تعداد وہاں موجود تھی مگر جلد ہی محسوس کر لیا گیا کہ اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو جنگ کا جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ وہاں کے سائنسدانوں نے ۱۹۱۵ء کے اوائل میں مصنوعی نائٹریٹ کی کافی تعداد تیار کر لی۔ مصنوعی نائٹریٹ کی ایجاد نے لوگوں کے ذہن کو مصنوعی امونیا بنانے کی طرف متوجہ کیا اور سائنسدان اسی کوشش میں بھی کامیاب ہو گئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ اگر نائٹریٹ اور امونیا بنانے میں کامیابی نہ ہوتی تو چار سال تک لڑائی ہرگز جاری نہ رہ سکتی۔

مصنوعی ربڑ

سائنسدانوں نے آج کل مصنوعی ربڑ بھی تیار کرنا شروع کیا ہے لیکن اس کی تیاری میں تقریباً چوگنی لاگت آتی ہے مگر یہ مصنوعی ربڑ اصل ربڑ سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ اسلئے اس سے معمولی روزمرہ کے استعمال کی چیزیں تیار نہیں کی جا سکتیں مگر سائنسدان کوشش کر رہے ہیں کہ اس پر لاگت کم آئے۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ دس سوٹن ربڑ ایک ہزار ایکڑ میں پیدا ہوتا ہے لیکن اتنی مقدار باسانی مشین کے ذریعہ سے صرف دو گھنٹوں میں تیار کی جا سکتی ہے۔

حال ہی میں امریکہ نے ایک چیز تیار کی ہے جسے نائیلن کہتے ہیں اس کو سائنس کا تازہ ترین شاہکار کہنا بیجا نہ ہوگا۔ نائیلن مصنوعی ریشم ہے جو اصلی ریشم سے بدرجہا بہتر ہے اور قیمت کے اعتبار سے بیحد ارزاں۔ اسی طرح سے اب کپڑے لکڑی اور شیشے سے بھی بنائے جانے لگے ہیں۔

جنگ کے دنوں میں درآمد و برآمد کا سلسلہ چونکہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اسلئے وہ چیزیں جو ملک میں پیدا نہیں ہوتیں ان کو مصنوعی طور پر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر ان کا بدل ڈھونڈا جاتا ہے مثال کے طور پر آپ تانبے کو لیں ٹیلیفون، ٹیلیگرام کے تار اور بجلی کے آلات کیلئے تانبے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اب جنگ کے دنوں میں جن ملکوں میں تانبے کی قلت ہے وہاں اسکی جگہ پر المونیم استعمال کیا جانے لگا ہے اور بعض سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ان ضرورتوں کیلئے المونیم بہتر اور ارزاں ہوتا ہے۔

ریلوے انجن کا وہ حصہ جس میں آگ رہتی ہے اس کو بہت عمدہ قسم کے لوہے سے بنایا جاتا ہے لیکن آج کل اس کو بنانے کیلئے ایک خاص قسم کا مصنوعی لوہا استعمال کیا جا رہا ہے اور یہ تجربہ بھی کامیاب رہا ہے۔

بڑے بڑے کارخانوں اور گھروں وغیرہ میں تانبے کے برتن اور تانبے کی دوسری چیزیں استعمال کی جاتی تھیں اب وہاں مصنوعی دھات کی چیزیں دھات کی چیزیں بکثرت استعمال کی جا رہی ہیں۔

میتھین

میتھین جو ایک قسم کی گیس ہوتی ہے اس کو بھی پٹرول کی جگہ استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے یہ گیس تیل کے چشموں اور کوئلہ کی کانوں میں موجود ہوتی ہے۔ اگر سائنسدان اس کوشش میں کامیاب ہوگئے تو مشینوں کی دنیا میں سخت انقلاب ہو جائیگا لیکن اس کے استعمال کے سلسلہ میں ابھی ایک بہت بڑی دقت باقی ہے اور وہ یہ کہ میتھین بہت ہی تھوڑی حرارت میں اُبل جاتی ہے۔ اس کیلئے خاص قسم کے خزانوں کی ضرورت ہے جو ~~~~ (Heat Proof) ہوں لیکن اس قسم کے خزانے بیحد وزنی ہوتے ہیں۔ بہر حال اگر ان دقتوں پر قابو حاصل کر لیا گیا تو ایک بیحد مفید چیز دنیا کے ہاتھ میں آجائیگی۔

ٹیڑھی رائفل

ایک ایسی رائفل ایجاد ہوئی ہے جس کی نالی ایک ٹیڑھی (؟) ہوتی ہے اس کے موجد کا خیال ہے کہ اس ترکیب سے یہ رائفل خندق سے چلائی جا سکے گی۔

فضائی رسد رسانی

پٹرول یا پانی کی فضائی بہم رسانی کیلئے چھتریوں کی مدد سے یا ان کے بغیر مسٹر ایس ایس بھٹناگر ڈائرکٹر سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ نے ایک ایسا برتن ایجاد کیا ہے جو گرنے کے باوجود نہیں پھٹے گا اور اشیا باآسانی سطح ارض پر پہنچائی جا سکیں گی۔ اس برتن کو ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ فیٹ تک کی بلندی سے گرا کر کامیابی کے ساتھ آزمایا جا چکا ہے۔ دو گیلن تک کی چیزیں رکھنے کے قابل اس برتن کو بنایا گیا ہے اور بعد ازاں جب انہیں علی پور کی ... گاہ کی دوسری منزل اور نئی دہلی کی سیکرٹریٹ کی عمارات سے گرایا گیا تب بھی زمین کے تصادم سے اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ فوجی صدر مقامات ... ان برتنوں کو نیچی اڑان والے طیاروں سے گرا کر آزمایا جا رہا ہے۔ یہ برتن پٹرول و تیل کے اثر ... سے محفوظ رہتا ہے۔ اس برتن کو اس کے سبک ... اور مضبوطی کی وجہ سے حالت جنگ اور امن دونوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

محافظ پردہ

موجدوں نے اپنی ایجادوں میں دفاع و اقدام دونوں کو ملحوظ رکھا ہے چنانچہ ایک ایسا آلہ ایجاد ہوا ہے جو فضائی بمباری سے محفوظ رکھے گا۔ یہ آلہ مشتمل ہے ایک بہت بڑے چکر دار پردے پر جو کسی عمارت یا جہاز پر نصب کیا جا سکتا ہے۔ یہ پردہ اپنی گردش کی قوت سے بموں کو اپنی طرف کھینچے گا۔ اور پھر پھینک دیگا۔ اس طرح عمارت یا جہاز جس پر یہ آلہ نصب ہوگا بمباری سے محفوظ ہو جائے گا۔

جدید آبدوز شکن آب دوزوں کے خلاف جہاد

حال ہی میں بجلی سے چلنے والے مقناطیس ... (Electro ...) ایجاد ... کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس طاقتور آلہ کو کسی جنگی جہاز پر نصب کر دیا جائیگا تو وہ دشمن کی آبدوز کشتی کو ایک طرف کھینچ لائے گا۔ اسی مقناطیسی کشش کے ذریعہ سے ایک ایسی رَو پیدا کی جائے گی جو آبدوز کشتی کے تمام آدمیوں کو ہلاک کر دے گی۔

دی فرسٹ نیشنل بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس:- لاہور ~~~ برانچ آفس:- چاندنی چوک دہلی

ہماری شاندار ترقی کیا ہے!

	۳۰-۶-۴۱	۳۰-۶-۴۲
ڈیپازٹ	۹,۹۷,۰۰۰	۲۴,۴۳,۰۰۰
کاروباری سرمایہ	۱۱,۶۹,۰۰۰	۳۰,۵۵,۰۰۰
نقد سرمایہ	۵,۴۹,۰۰۰	۱۰,۹۱,۰۰۰
خالص منافع	۹,۷۰۰	۱۹,۹۰۰
ریزرو		۷,۵۰۰

پچھلا ڈیویڈنڈ ۴ فی صدی　　موجودہ ڈیویڈنڈ ۵ فی صدی

گنپت رائے مروا ہا مینجنگ ڈائرکٹر



جب آپ ۵۰۱ اسپیشل کا استعمال کرتے ہیں تو خانگی دُھلائی بہت آسان ہو جاتی ہے

اب نہ ڈر ہوگا کہ دُھلنے کے بعد کپڑے آدھے صاف ہوں اور نہ وہ برباد ہی ہو سکیں گے۔ ۵۰۱ اسپیشل ایک خاص صابن ہے جس میں صاف کرنے کا غیر معمولی وصف ہے۔ تاہم یہ اتنا ملائم ہوتا ہے کہ آپ کے اچھے سے اچھے کپڑے بھی اس کی ملائم اور گاڑھی جھاگ محفوظ رہتے ہیں۔ ۵۰۱ اسپیشل دوسرے صابنوں کی نسبت جو ٹکیوں میں بکتے ہیں زیادہ قیمتی بھی نہیں ہوتا۔ آج ہی ایک پیکٹ خریدئیے اس میں چربی نام کو بھی نہیں ہوتی

ٹاٹا ہکو سیلز ڈیپارٹمنٹ۔ مال منشنز دی مال لاہور

دی ٹاٹا آئیل ملز کمپنی لمیٹڈ

ٹاٹا پورم　　اور　　بمبئی

کم سرمایہ کے روزگار!

بسکٹ ۔ پیسٹری تو ایک طرف ہم لوگ اپنی بسکٹ کی ضروریات پوری کرنے کیلئے بھی ممالک غیر اور دیگر صوبجات کے محتاج ہیں۔ بسکٹ بنانا بالکل آسان کام ہے اور زیادہ سرمایہ بھی درکار نہیں ضروری سانچے اور متعلقہ سامان اور مکمل مشینری سپلائنگ کمپنی کلکتہ یا کسی اور ذریعہ سے دو چار سو روپے میں خریدے جا سکتے ہیں اور شہروں میں قریباً پانچ سو روپیہ سرمایہ سے کم از کم ۵۰ روپے ماہوار آمدنی پیدا کی جا سکتی ہے۔ کشمیر میں بھی اس کی کامیابی یقینی ہے۔ درست ہے کہ وہاں عوام کی خوراک چاول ہے مگر شاید ہی کوئی کشمیری ہو جو دن میں دو بار چائے نہ پیتا ہو اور چائے کے ساتھ باقرخانی کھائی جاتی ہے جو کہ ذائقہ دار مگر انتہا سے بیڈول شکل کی ہوتی ہے۔ باقرخانی ہر روز ہزاروں روپے کی بکتی ہے منچلے نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ ارزانی میں اس کے مقابلہ کی چیز ذائقہ دار شکل میں بہتر وزن میں سادی اور جدت آمیز ہاتھ کی بجائے سانچوں میں بنائیں اور انہیں صفائی اور قرینہ سے دکان میں رکھ کر فروخت کریں۔ ابتدا میں شرح منافع نہایت قلیل رکھنا چاہئے۔ کیونکہ ایسی اشیا تھوڑی تھوڑی کر کے بھاری مقدار میں فروخت ہو جایا کرتی ہیں اور دن بھر کی بکری سے معقول منافع جمع ہو جاتا ہے۔

بال صفا تیل ۔ یہ مقبول عام شے ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہے۔ یہ باسانی بنایا جا سکتا ہے اور اس کیلئے نہایت ہی قلیل سرمایہ درکار ہے۔ صرف عمدہ پیکنگ اور خوبصورت شیشیوں کی ضرورت ہے۔ ذیل میں ولایت کے ایک ڈاکٹر کا ایجاد کردہ نسخہ درج ہے۔ یہ تمام مضرتوں سے پاک ہے۔ بیکار نوجوانوں کے لئے ایک باعزت ذریعہ معاش ہے۔ اس سے ڈیڑھ دو روپیہ یومیہ کمانا معمولی بات ہے۔ (نسخہ) کیسٹر آئل ۲ گرام، تیل تارپین ۵۰ گرام، الکوہل ۱۳ گرام، گلوڈین ۳۵ گرام، آیوڈین ½ گرام۔ ان اشیاء کو باہم ملا کر شیشیوں میں بند کرلیں اور اوپر لیبل اور ڈبے لگا دیں۔ اگر دکان لگانے کی استطاعت نہ ہو تو گھر بیٹھے ہی بذریعہ اشتہار بازی فروخت کریں۔

اثرِ غیب

اثر اور قوت (مسلسل)

وہائیٹ یوگی مقیم تبّت کے قلم سے

رُوح کا اقتدار مادہ پر

خیالات کے عمل کی مختلف رفتار ـــ خیال کی متنوع اقسام میں سے ہر قسم کے خیال کے عمل کی رفتار کو مادی طور پر ظاہر کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ معمول سے سوچنے اور مختلف ذہنی حساب لگانے کیلئے کہا جائے۔

معمول کے اس فعل کی مختلف رفتاروں کو اس کے تنفس کی رفتاروں کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے مثلاً اس کا تنفس جس قدر زیادہ تیز ہے اتنی ہی تیزی سے وہ سوچتا ہے اور قدرے دشوار قسم کے حساب لگانے یا ارادی طور پر آہستہ سوچنے میں اس کے تنفس کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔

خیال کی طویل یکسوئی ـــ یہ عمل تنفس کی آمد و رفت کو بتدریج سست کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ چند گھنٹے کے بعد تنفس انتہائی سطحی ہو جاتا ہے۔ اگر پھیپھڑوں کے ناقص پھیلاؤ اور اس طرح پیدا شدہ تنفس کی آمد و رفت کے مضر تسلسل کو سامنے رکھا جائے تو اس مشاہدہ کی اہمیت آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے۔

دمہ اور موسیقی ـــ میرے تجربات کے دوران میں پانچ مرتبہ دمہ ایک قدیم مرض کی علامت کی صورت میں ظاہر ہوا اور معمول کے تنفس میں دمہ کے آثار اس قدر نمایاں تھے کہ ان کی شناخت میں غلطی ناممکن تھی۔ موسیقی نے دو منٹ سے دس منٹ تک کے عرصے کے بعد باقاعدہ تنفس پیدا کیا۔ ساز در قص کے ساتھ یکجائی موسیقی نے قدرے زیادہ تیز رد عمل کیا۔

انتقالِ خیال (Telepathy)

اس عمل کو حالت بیداری میں پیدا کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ دو معمولوں کو علیحدہ علیحدہ مگر ایک ہی وقت میں سائیکوگراف سے وابستہ کر دیا جائے اور جب چند معیاری نتائج حاصل ہو جائیں تو بعدہ معمول نمبر ۱ سے کہا جائے کہ اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن میں کسی شے کا خیال کرے اور اپنے خیال کو معمول نمبر ۲ کے دماغ میں ڈالنے کی کوشش کرے معمول نمبر ۲ بھی اپنی آنکھیں بند کر لے اور اس شے کو سوچنے کی انتہائی کوشش کرے جس کی بابت معمول نمبر ۱ سوچ رہا ہے۔ اس تجربے میں عامل اس "خیال" سے واقف نہیں ہوتا جو کہ معمول نمبر ۱ معمول نمبر ۲ کے دماغ میں منتقل کر رہا ہے لیکن نصف منٹ سے ایک منٹ تک کے وقفہ کے بعد معمول نمبر ۲ اس قسم کے خطوط پیدا کرنے لگتا ہے جیسے معمول نمبر ۱ نے ابھی پیدا کئے ہیں اور ان دونوں کے خیال کے خطوط اکثر حیرت انگیز طور پر یکساں ہوتے ہیں۔ مجھے خود تعجب ہے کہ نوے فی صدی ایسا ہوا کہ ان حالات میں معمول نمبر ۲ معمول نمبر ۱ کو اور مجھے بالکل وہی شے یا اشیاء بتلانے میں کامیاب ہوا جس کی بابت معمول نمبر ۱ واقعی سوچ رہا تھا۔

میں نے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے:۔

۱۔ خیال کے عمل اور تنفس کے درمیان ایک مخصوص و متعین رد عمل کا وجود پایا جاتا ہے۔

۲۔ متنوع ذہنی یا روحانی کیفیات کی نوعیت اور تنفس کے ساتھ ان کیفیات کے مستقل تعلق کا غائر مطالعہ کر کے ہم چاہیں تو اس رد عمل کو اُلٹ سکتے ہیں۔ یعنی ایک مخصوص نوعیت کے تنفس کو درست کرنے سے خیال کے غیر فطری عمل کو صحیح کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ خیالات کے عمل کی رفتار کو متعین طور پر ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ انسان کی مستعدی اور مختلف معیاری حالتوں میں اس کے رد عمل کی قوت کو معمولی اور غیر معمولی انسانوں کی ذہنیت کے تعین و تقسیم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یکسوئی خیال کی قوت اور مختلف ذہنی کوشش کے اثر کو بھی متعین و معلوم کیا جا سکتا ہے اور اس چیز سے والدین کو اپنے بچوں کے مستقبل کے سلسلے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

۴۔ جرم۔ پسندیدگی و ناپسندیدگی خودکشی کے رجحانات اور دیگر جذباتی امور بھی آسانی سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ یہ شے فرد و قوم کے واسطے بہت کچھ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ امر سائنٹفک طور پر دکھلایا جا سکتا ہے کہ آیا انسان انتقالِ خیال کے وقت باہمی ذہنی اتحاد و یکسانیت کی حالت میں ہوتے ہیں یعنی ان دونوں کے درمیان خیالات واقعی منتقل ہوا کرتے ہیں۔ پھر یہ بات صرف تنویمی حالت میں ہی نہیں بلکہ بیداری کی کیفیت میں "سائیکوگراف" کے ذریعہ سطح کاغذ پر دکھلائی جا سکتی ہے۔ اس طرح گویا ذہنی خیال ایک شخص کے مقناطیسی تموج کے ذریعہ قوت ارادی کی زیر ہدایت غیر مرئی ایتھر میں سے گذرتا ہوا دوسرے شخص تک پہنچ جاتا ہے اور یہ دوسرا شخص اس خیال کی تفہیم یا احساس اتنی ہی آسانی سے کر لیتا ہے جیسے کہ ہم ایک خط کو جو احساسی نقوش کا ایک مرئی ذریعہ انتقال ہے پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔ خیال کی لہروں پر پیغامات بھیجے جا سکتے ہیں اور ان پیغامات کو حاصل کرنے والا دماغ ان کے مفہوم کو اتنی ہی وضاحت کے ساتھ سمجھ لیتا ہے جتنی کہ ہم ایک عزیز دوست کے مکتوب راز کو سمجھ لیتے ہیں۔

جس طرح ہمارے اعضا کی حرکت سے پہلے ہماری فطری ذہانت اس حرکت کے خیال و ارادہ کو احساسی اعصاب کے ذریعہ ہمارے دماغ کے مخصوص حصہ میں پہونچاتی ہے اسی طرح بالکل اسی قانون کے تحت ذہنی تموج یا خیال کی لہریں دوسرے لوگوں تک پہنچ جاتی ہیں جو ان کے بھیجنے والے یا عامل کے ساتھ ذہنی رابطہ و یکسانیت رکھتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ یہ کام وہ شخص کر سکتا ہے جو انتہائی یکسوئی خیال رکھتا ہے اور خیال کی مقناطیسی قوت کو ایک مخصوص سمت میں متحرک کرنے کے لئے قوت ارادی کا مالک ہے۔

دوسرے دن شام کے وقت میں نے اپنے یوگی دوست کے ساتھ دماغی یا روحانی لاسلکی کے عنوان پر گفتگو کی۔ اس نے کہا ـــ "لاسلکی ایک اثر ہے جو ہماری اس وسیع دنیا میں موجود ہے لیکن یہ اس وقت تک کوئی مرئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا جب تک اس کا ان آلات سے وصل نہ ہو جو اسے قبول کرنے کے واسطے مخصوص طور پر تیار کئے گئے ہیں۔ کیا یہی مثال دماغ پر صادق نہیں آ سکتی؟ کیا ایسا ممکن نہیں کہ یہ دماغ بھی ایک مخصوص طور پر تیار کیا ہوا آلہ ہو جس پر "کائناتی ذہن" اثر انداز ہو سکے؟"

میں نے جواب دیا ـــ "میں نفسیات اور فزیالوجی کے ذرائع سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں ہوں جو ذہن کی بابت ہم لوگوں کے تصورات میں پڑ گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذہن اور دماغ ہمیشہ مربوط و متحد نہیں رہتے اور اس کا ثبوت حالتِ خواب، بیہوشی یا تنویمی کیفیات میں نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ ذہن درحقیقت ایک بیرونی اثر ہو جو مخصوص حالتوں میں دماغ پر طاری ہو جاتا ہے۔"

میں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ـــ "تاریکی کی قوت کی مدد سے تمہاری لاسلکی دن کی بہ نسبت رات کے وقت زیادہ وضاحت کے ساتھ سماعتی خیال پیدا کرتی ہے۔ اس لئے رات کے سکوت میں انتقالِ خیال کا عمل ان لوگوں پر بھی کیا جا سکتا ہے جو عامل کے ساتھ کوئی حقیقی اور شعوری رابطہ ذہنی نہیں رکھتے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے "نظر بد" یا جادو منتر کے افسانے محض فرضی افسانے نہیں۔ ان میں علمی حقیقت موجود ہے۔"

"اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ صبر اور طویل مشق کے ذریعہ دو آدمی اس وقت جبکہ ان کے دماغ ہم آہنگی کی کیفیت میں ہوں ـــ یعنی خواب یا بیداری میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں ـــ اپنے ذہنی تموج کے ذریعہ اپنا خیال ایک دوسرے تک منتقل کر سکتے ہیں اور یہ کام یہ دونوں شخص بہت کافی فاصلہ پر سے بھی اتنی ہی آسانی سے کر سکتے ہیں جتنی کہ "بی۔ بی۔ سی" سے ریڈیائی پیغامات نشر کئے جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ریڈیو کی سوئی کو ٹھیک طور پر سے ملائیں تو ریڈیو اسٹیشن سے نشر شدہ آواز کو سن لیتے ہیں اسی طرح اگر ہماری ذہنی کیفیت اثرات قبول کرنے کے لئے مناسب حالت میں ہے تو ہم عامل کے خیال کو معلوم کر لیں گے۔ لاسلکی کے نشر اور "انتقالِ خیال" میں محض فرق یہ ہے کہ موخر الذکر میں ایک شخص دوسرے کے خیال کو تموجِ خیال کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور قبول کرتا ہے لیکن اول الذکر میں ایتھر کی لہروں کے طول کی مناسبت سے ریڈیو کی سوئی کو ٹھیک کرنا ضروری ہے۔ ان دونوں صورتوں میں فاصلہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ لاسلکی ایک مکانی برقی تموج ہے جو ایتھر کی لہروں پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا ہے۔ "انتقالِ خیال" ایک تموجِ خیال ہے جو خود ایک متحرک قوت ہے۔ اس کی حرکت وہ قوت ایک ایتھر سے بھی زیادہ لطیف مادہ پر نقل مکان کرتی ہیں اور قوت ارادی سے ـــ یا عامل کی خیالی قوت کے ارتعاش کے ذریعہ ـــ اس ذہن تک پہنچ جاتی ہیں جو ان سے ہم آہنگ ہے۔"

میرے دوست نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ـــ "میرا یہ عقیدہ ہے کہ اس کائنات میں ہمارے چاروں طرف جو قوت کارفرما نظر آتی ہے وہ وہی قوت ہے جو شعور کی صورت میں خود ہمارے اندر اُبلتی ہے۔"

"بالکل صحیح" میں نے کہا۔

اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری باطنی زندگی میں ـــ ہم میں اور ہماری خارجی زندگی میں ایک ہی چیز کارفرما ہے جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور وہ چیز ہے ہماری کائنات کی ایک ہمہ گیر قوت۔"

"لہٰذا ہر جگہ ذہنی قوت موجود ہے اور ذہنی قوت ہر جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ چیز بڑی عجیب ہے کہ ایک ماں کے غیر شعوری تصورات کس طرح اس کے پیدا ہونے والے بچے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ماں کی فطری جسمانی شعوری کیفیت سے یہ غیر شعوری تصورات بالکل مخفی رہتے ہیں لیکن وہ اپنے بچے کو اس سانچے میں ڈھالتی ہے جس کا تصور اس کے ذہن میں سب سے زیادہ قوی طور پر موجود ہے اس طرح وہ شے جو حمل میں محض ایک گوشت کا لوتھڑا ہے نہایت تکمیل کے ساتھ اپنے کسی رشتہ دار کی شباہت لے کر پیدا ہوتی ہے خواہ وہ شباہت اس کے والدین کی بجائے اُس کے بزرگوں میں سے کسی کی کیوں نہ ہو۔ یہ ماں نہیں بلکہ ذہن یا روح ہی ہے جو اس حیرتناک صورت گری کے کارنامہ کی تکمیل کرتی ہے۔

کیا اس نکتہ سے ہمیں اپنے خدا (خلاقِ عالم) کا ایک بہتر تصور قائم کرنے میں مدد نہیں ملتی؟ ـــ خدا اگرچہ (عیسائی عقیدہ کے مطابق) ایک بار انسان کی شکل میں زمین پر آیا ہے تاکہ سیدھے سادے دماغ کے لوگ اسے سمجھ سکیں بایں ہمہ وہ ایک انسانی ہستی نہیں ہے بلکہ اہلِ علم کے نزدیک وہ ایک ہمہ گیر قوت ہے ـــ بہ حیثیت ـــ ہمارے اردگرد کی تمام غیر مرئی حقیقی قوتوں کا مجموعہ ـــ خدا ایک [illegible] ہستی!

"ایک لفظ خیال کے ذریعہ ذہن چاہے تو خود زندگی کو بھی ہلاک کر سکتا ہے۔ چنانچہ کالے جادو کے عمل میں اس کا ثبوت موجود ہے۔ اس کے علاوہ ذہن کسی جسم میں اپنے اثر کے ذریعہ عضوی تغیر و تبدل پیدا کر سکتا ہے۔ ایک عورت نے ایک مرتبہ کسی وزنی شے کو اپنے بچے کے پاؤں پر گرنے اور اسے کچلتے ہوئے دیکھا۔ وہ فوراً بے ہوش ہو گئی جب اُسے ہوش آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے پاؤں پر ٹھیک ایسا ہی زخم موجود تھا جیسا کہ اس کے بچے کے پاؤں پر لگا تھا۔ پھر صرف یہی نہیں کہ زخم ہی لگ گیا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ زخم بالکل اصلی زخم کی طرح پکا پھوڑا اور رفتہ رفتہ مندمل ہوا۔"

میرے یوگی دوست نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ "تم نے دیکھا کہ ذہن کی قوت اس دنیا میں ہر شے پر غالب ہے۔ ہم زندگی کے اسرار اور قدرت کے معجزات کو دیکھنے کے اسقدر عادی ہیں کہ اکثر ہمیں بمشکل ہی ان کا احساس ہوتا ہے۔ انسانی ذہانت و عقل ضعیف و محدود ہے لیکن زندگی لامحدود ہے۔"

اس وقت ایک زبردست آندھی اٹھی۔ شدید طوفان صرف سمندر پر ہی نہیں بلکہ خشکی پر بھی نمودار ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو ایسے طوفانوں کا تجربہ ہے صرف وہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہوا کتنی زبردست رفتار سے چل سکتی ہے۔ اس وقت آندھی کے جھکڑوں سے ہماری میز ادھر سے اُدھر ہل رہی تھی۔ برآمدہ کی بنیادیں چرا رہی تھیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ پوری عمارت مرتعش محسوس ہوتی تھی۔ میں نے اس طرف اپنے عالم دوست کو متوجہ کیا تو اس نے سکون کے ساتھ پوچھا۔

ـــ "کیا تم جانتے ہو کہ لفظ "ارتعاش" کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ جب ہم کسی جگہ یا کسی درخت کی شاخ یا موٹر کار کے ارتعاش کا ذکر کرتے ہیں تو ہم گویا ایک ناواقف مبتدی کے الفاظ میں ایک اہم حقیقت کہہ جاتے ہیں جو قدرت میں ہر طرف بنیادی حیثیت سے پوشیدہ ہے۔ بہت سال گذرے جب میں نے فیثا غورث کی اس اعجاز انگیز تصنیف کا مطالعہ کیا تھا جس کا تذکرہ میں پیشتر کر چکا ہوں۔ درحقیقت فیثا غورث وہ پہلا انسان تھا جس نے ہمیں یہ بتایا کہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے۔ اس نے ہمیں ایک اس سے بھی زیادہ بڑی حقیقت بتائی اور وہ یہ کہ اس دنیا میں ہر شے ارتعاش پیدا کرتی ہے خواہ وہ شے مرئی ہو یا غیر مرئی ـــ کچھ ارتعاش ایسے ہیں جن کو جسمانی یا حسی ذرائع سے معلوم کیا جا سکتا ہے جیسے کہ کسی انجن یا کسی انسان کا ارتعاش ـــ کیونکہ واضح ہو کہ جب ایک شخص اپنی انگلیوں سے کسی دوسرے شخص کی انگلیوں کو بھینچے سے چھوتا ہے تو ایک قسم کا نمایاں ارتعاش ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گذرتا ہوا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ایک ایسا شخص جو اندھا بھی ہے اور بہرا بھی مختلف لوگوں میں ہر ایک کو دوسرے سے تمیز کر سکتا ہے کیونکہ جس طرح دنیا میں کوئی دو شخص انگلیوں کے یکساں نشانات نہیں رکھتے۔ اسی طرح کوئی دو انسان ایسے نہیں جو ایک ہی قسم کا ارتعاش رکھتے ہوں۔ ہماری پوری زندگی ایک ارتعاش ہے اور ہمارے جسم اس وقت تک ارتعاش پیدا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ ہماری آنکھوں کو موت اپنے ہاتھوں سے بند نہیں کر دیتی اس طرح مر جانے پر ہم اپنی مادرِ گیتی کے آغوش میں [illegible] مسلسل ارتعاش کو ختم کر دیتے ہیں

(باقی صفحہ ۷۸

رجسٹرڈ ایل نمبر [illegible]

جلد ۲۸ نمبر ۱

ہندو ہی ایک آنکھ مسلمان دوسری

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

بعضے بہ تماشائے خط و خال خوش اند | بعضے بہ تمنائے زر و مال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانیہاست | خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

مست قلندر

نوروز نمبر جنوری ۱۹۴۳ء

اردو میں اپنی قسم کا واحد باتصویر کثیرالاشاعت ماہوار رسالہ

اُن زندہ دل انسانوں کیلئے جنہوں نے زندگی کا منتہائے مقصود تلاش کیا ہے، ہمیشہ خوش رہنے اور دوسروں کو خوش کرنے میں جو خدا کی حقیر ترین مخلوق کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو قول یا فعل سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے، جن کا مذہب ہے خدا کے ہر ایک بندے سے

بلا امتیاز رنگ و قومیت محبت کرنا

قیمت فی پرچہ
چھ آنے ۶/

ایڈیٹر ڈاکٹر پرتھی سنگھ

سالانہ چندہ
چار روپے

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ڈاکٹر پرتھی سنگھ پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر رسالہ مست قلندر روشنولین گوالمنڈی لاہور سے شائع ہوا

فہرست مضامین

نوروز نمبر جنوری ۱۹۴۳ء

علمی جواہر پارے — دلگداز آپ بیتیاں — بے بدل رنگین افسانے — ہنگامہ خیز نظمیں

ہندوستان بھر میں اپنی قسم کا واحد رسالہ جسے ہندو اور امیر اور مسلمان غریب عورت اور بچے یکساں دلچسپی اور ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور جس کے دیدار کے لئے ہزاروں لاکھوں چاہنے والے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ...

دنیائے فلم کی تازہ ترین خبریں!

پربھات ۔ ”انبے“ بمبئی میں ریلیز ہوگئی۔ کالج کے حسین رومان کے متعلق یہ ایک دلچسپ اور انوکھی تصویر ہے۔

نیشنل اسٹوڈیوز ۔ ”جوانی“ کو مسٹر وجاہت مرزا چنگیزی ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔ جلد ہی یہ فلم پردہ سیمیں پر نمودار ہوگا۔

بمبئی ٹاکیز ۔ ”قسمت“ کی نمائش بمبئی میں۔ اداکاروں میں پہلی بار ممتاز شانتی اور اشوک کمار مل کر کام کر رہے ہیں۔

پورنیما پروڈکشن کی پہلی ”راجہ“ کی تیاری جیوتی اسٹوڈیو میں ہو رہی ہے۔ کہانی ”کنول“ کے ... کے شہرت یافتہ ڈائرکٹر کشور ساہو کی لکھی ہوئی ہے اور ڈائرکٹ بھی وہی کر رہے ہیں۔

کمل پکچرز ۔ ”صبح و شام“ جسے ڈائرکٹر مسٹر کاہن بالکل نئے انداز میں پیش کرنا چاہتے ہیں بسرعت تمام تکمیل کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ مسٹر کاہن نے ہندوستانی دیہات کے خوشنما اور دلفریب مناظر کا اسکیچ کر لیا ہے اور سینز میں ایسے ماحول کو قلمبند کیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اسکرین پر پہلی بار دیکھا جائیگا۔ ”صبح و شام“ کا افسانہ انتہائی دلگداز اور روماں آفریں احساسات کا حامل ہے اور اس میں طوفانی مناظر اور شہری و دیہاتی زندگی کا تصادم پیش کیا جائیگا۔

یونائیٹڈ فلمز ۔ فلم ”گھروندہ“ ڈائرکٹر ایس خلیل کی زیر نگرانی تیار ہو رہی ہے۔ اس میں ایک نیا چہرہ ”نجمہ“ کا آپ کو دکھائی دیگا۔

فضلی برادرس ۔ ”فیشن“ زیر تیاری ہے۔ فیشن کے ... گانوں اور مکالموں کی زبان اتنی سادہ اور عام فہم ہوگی کہ ملک کے تقریباً ہر گوشہ میں آسانی سے سمجھی جائے گی۔

محبوب پروڈکشن ۔ ”نجمہ“ ڈائرکٹر محبوب اپنی ذاتی کمپنی کی اولین فلم کو ۱۹۴۳ء کی ایک شاہکار پیش کش بنانے میں شب و روز مصروف ہیں۔

کاردار پروڈکشن ۔ ”شاردا“ تیار ہوگئی اس میں ہیروئن کا کام مس ... نے کیا ہے جسکی تصویر اس نمبر کے سرورق پر شائع ہو رہی ہے۔

ایسٹرن پکچرز بمبئی کی مزاحیہ تصویر ”دعوت“ قریب الاختتام ہے۔

رنجیت مووی ٹون کا ناقابل فراموش شاہکار ”بھگت سورداس“ بمبئی میں ریلیز ہوگیا ہے یہ ایک عدد سبق آموز اور نصیحت خیز تصویر ہے جسکو ہندوستان کے شہرت یافتہ ہدایت کار چترنجن دیشی نے ڈائرکٹ کیا ہے اور خورشید اور سہگل جیسے نامور اداکاروں نے اسکی شہرت کو چار چاند لگا دئیے ہیں۔

راجہ مووی ٹون ۔ ”مذاق“ مسٹر ظہور راجہ دنیائے فلم کے نامور اداکار اسکو ڈائرکٹ کر رہے ہیں اس کے گانے عابد گلریز صاحب نے لکھے ہیں۔ اداکاروں میں معصوری، پہاڑی سانیال اور رادھا رانی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

پنچولی آرٹ پکچرز لاہور ۔ دلسکھ پنچولی کا ”زمیندار“ لاہور میں ریلیز ہوگیا ہے۔ زمیندار کا افسانہ مشہور افسانہ نگار سید امتیاز علی تاج کے زور قلم کا نتیجہ ہے جسکو دلسکھ پنچولی کے ہر دلعزیز ڈائرکٹر مسٹر موتی بی گدوانی نے قلمبند کیا ہے اور موسیقی کے فرائض استاد فن مسٹر غلام حیدر (خزانچی اور خاندان کے شہرت یافتہ) نے سرانجام دیئے ہیں۔ زمیندار اپنی ...

نگاہ اولیں!

مست قلندر کی جانب سے مست کے مست جیالوں کو سال عیسوی انیس او پر تینتالیس ۱۹۴۳ء مبارک ہو

ایڈیٹر

سال پرانی سب سے بڑی سوغات تحفہ

یکصد فلم ایکٹرسوں کا شاندار البم

مع ان کے سوانح حیات کے

آخر وہ چیز چھپکر تیار ہوگئی ہے جس کی بڑی مدت سے آرزو تھی

جسے نئے سال کی خوشی میں اپنی لائبریری کی زینت بنائیے یا کسی عزیز ترین دوست کی خدمت میں تحفۃً پیش کیجیے۔ فلم اسٹاروں کے پرائیویٹ POSES بڑی محنت، دوڑ دھوپ اور بہت سا روپیہ صرف کرکے بڑی مشکل سے حاصل ہوئے اور پھر ان کو یکجا کرکے یہ سب سے بڑا البم تیار کیا گیا ہے۔ اسکو دیکھ کر آپکی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہے گا۔ سب کی سب تصاویر اتنی دلکش اور جاذب نظر کہ بار بار دیکھنے کے باوجود بھی آپکی طبیعت نہیں بھریگی۔ یکصد تصویروں کے مکمل SET کی قیمت صرف پانچ روپے لیکن اگر آپ اسی ماہ سے مست قلندر کے مستقل گاہک بننا منظور کریں اور سال بھر کا چندہ چار روپے اپنے آرڈر کے ہمراہ منی آرڈر سے روانہ کردیں تو صرف ایک روپیہ میں یہ بیش قیمت البم آپکی نذر کیا جائیگا۔ گویا کل پانچ روپے منی آرڈر سے بھجوائیے۔ وی۔پی سے یہ البم کسی کے پاس نہیں بھیجا جائے گا۔

(نوٹ) : مست قلندر کے پرانے خریدار بھی اگر اس البم کو ایک روپیہ میں حاصل کرنا چاہیں تو اپنے حلقۂ احباب میں سے کسی عزیز کے نام کا سال بھر کا چندہ پیشگی بھجوا دیں۔ مست قلندر کا سالانہ چندہ کاغذ کی اس ہولناک گرانی کے باوجود چار روپیہ ہے جس میں سال بھر میں شائع ہونے والے جہازی سائز کے چار خاص نمبروں کی قیمت بھی شامل ہے۔

مینیجر مست قلندر لاہور

بڈھے جوان ہو رہے ہیں

فاسفرول کی ایک بوند جسمیں دُنیا جہان کی لذتیں حل کی گئی ہیں۔ پان یا مصری کی ڈلی پر ڈال کر کھا لیجئے۔ آپکو ایسا معلوم ہوگا گویا جوانی اپنی ساری طاقتوں کو لیکر لوٹ آئی ہے۔ عورت کے سکھ سے اگر آپ محروم تو گھبرائیے نہیں۔ فاسفرول کی ایک بوند آپ کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ لے آئیگی جن کو بھوک نہیں لگتی اور سدا قبض کی شکایت رہتی ہے۔ فاسفرول کے استعمال سے ان کا یہ حال ہوگا کہ دن بھر کھایا کرینگے اور جو کچھ کھائینگے جزو بدن ہو کر چہرہ کابلی انار کی طرح چمکنے لگیگا۔ ایک ہفتہ میں دیکھ لیا ہے کیا بن جاتے ہو۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہزاروں بڈھے اس کی بدولت جوانی کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ ایک بار آزمائش کرنے کے بعد سونے چاندی کے کشتے اور سینکڑوں قسم کی بیش قیمت دوائیں فاسفرول کے مقابلے میں آپ کو بیکار دکھائی دینے لگیں گی۔ قیمت فی بکس ۸؎

ملنے کا پتہ

ویسٹرن میڈیسن کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۳۲ لاہور

(۷) سات چھوارے

مشک زعفران، عنبر، کستوری اور نایاب جڑی بوٹیوں کے رس میں تیار شدہ ان سات چھواروں کو حسب ہدایت ۷ دن میں کھا لیجئے بس پھر عمر بھر کیلئے کسی طاقت کی دوا کی ضرورت نہیں پڑیگی آپ نئے سرے سے مرد جوانمرد بلکہ شیر مرد بن جائینگے۔ آپکی ڈھیلی رگوں اور پھسپھسی نسوں میں بجلی کی لہریں دوڑ جائینگی اور مردانہ عضو میں وہ قوت بے پناہ پیدا ہو گی کہ ضبط مشکل ہو جائیگا وہ جو گھر والی سے تنہائی میں آنکھ ملانے سے خوف کھاتے تھے اس زندہ طلسم کی بدولت اب کئی کئی بچوں کے باپ بن گئے ہیں۔ ایک سنیاسی باکمال کا یہ عطیہ سینکڑوں تباہ شدہ جوانیوں کو بحال کر چکا ہے۔ آپ بھی تماشہ دیکھ لیجئے۔ گئے گزرے بڈھے جو نئی شادی کے خواہشمند ہوں ضرور تجربہ کریں۔ سات چھواروں کی قیمت صرف پانچ روپے آٹھ آنے مگر پہلے آزمائش کیلئے صرف ایک چھوارہ ۱۲؎ میں منگوائیے محصول ڈاک ۔

ملنے کا پتہ **ویسٹرن میڈیسن کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۳۲ لاہور**

زندہ جادوگری کے کرشمے

آخر چھپ گئی وہ کتاب جس کی دنیا والوں کو تلاش تھی جس میں قدیم ہندو یوگیوں کے سینہ بسینہ منتقل ہونے والے خفیہ جادو کے سربمہر راز طشت از بام کیا گیا ہے۔ یہ وہی نادر روزگار کتاب ہے جس کا ایک ایک راز لاکھ لاکھ روپیہ کو بھی سستا ہے۔ مقبولیت کا یہ حال ہے کہ تین مہینوں میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا چھ ہفتوں میں دوسرا اور اب تیسرا چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے۔ مختصر فہرست ملاحظہ ہو۔

(۱) بیمار کو صرف سانس کی تبدیلی سے راضی کر دینا۔ (۲) اپنی یا دوسروں کی موت کا حال جان لینا (۳) راہ چلتے آدمی سے آنکھ لڑا کر اپنا ہم خیال بنا لینا (۴) اعجاز محبت یا حسینوں کو اپنی محبت میں مبتلا کرنے کی نہایت ہی آسان اور چٹکی بجاتے میں حل ہونے والی ترکیبیں (۵) بغیر دوائی کے قدرتی طاقت حاصل کرکے سو سال تک جوان اور تندرست بنے رہنے کا راز (۶) صرف ایک ترکیب سے بیوی کو اپنی الفت میں اسیر کرکے اسقدر بے خود بنا دینا کہ اُسے سوائے تمہارے سب طرف تاریکی دکھائی دینے لگیگی۔ (۷) لڑکی لڑکے کی پیدائش حسب مرضی کرنا۔ (۸) حاکم، افسر یا سنگدل دشمن کو تسخیر کرکے اپنا کام نکال لینا (۹) ایک ایسا طریق اختیار کرنا جس کی بدولت ہر جگہ عزت ہو۔ (۱۰) بیتے ہوئے اور آئندہ آنیوالے واقعات کو قبل از وقت جان لینے کے مختلف طریقے (۱۱) ہندو یوگی کس طریق سے پیشگوئی کرتے تھے سائل کے سوالوں کے صحیح جواب دینے کے طریقے (۱۲) سانس کے ذریعے سخت سے سخت اور مہلک امراض کو آناً فاناً رفع کر دینے کا راز وغیرہ وغیرہ غرضیکہ کتاب مذکورہ کی مکمل تعریف کیلئے ۲۰ صفحات بھی تھوڑے ہیں ان خوبیوں کے پورے کورس کی قیمت صرف ۱۲؎ محصولڈاک سمیت رکھی گئی ہے جملہ اسباق نہایت ہی آسان اور عام فہم ہیں۔ عامل ہونے کیلئے کسی قسم کی محنت یا مشقت جھیلنا نہیں پڑتی۔ صرف کورس مذکورہ کے مطالعہ ہی سے سب رازوں سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ہمراہ اس بات کی حلفیہ تحریر آنی چاہئے کہ آپ اس میں بتلائے ہوئے رازوں سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اشتہار کے خلاف ایک بات بھی ثابت ہو تو آپ کو اختیار ہے کہ مست قلندر میں شکایت لکھئے ہمیں کوئی گلہ نہ ہوگا

ملنے کا پتہ

یونیورسل ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۵ لاہور

رسالہ مست قلندر لاہور

نویدِ سالِ نو!

از جناب سلام حیدر آبادی

"نوید سالِ نو" ہنگامہ در آغوش ہے ساقی
اُٹھا ساغر کہ رندوں کو ابھی کچھ ہوش ہے ساقی
بپا ہر سمت اک ہیجان ہے اک جوش ہے ساقی
تری محفل کی محفل میکدہ بردوش ہے ساقی

نظامِ زندگی پھر درہم و برہم نہ ہو جائے
یہ گھڑیاں عیش کی ہیں ان میں شامل غم نہ ہو جائے
مجھے ڈر ہے کہیں تیری توجہ کم نہ ہو جائے
لنڈھا دے خم کے خم پھر آج کیوں خاموش ہے ساقی

ہوائیں "سالِ نو" کا نغمۂ جاں بخش گاتی ہیں
فضائیں حسن کی عنائیوں میں ڈوب جاتی ہیں
چمن میں جھومتی ہیں شاخیں کلیاں مسکراتی ہیں
بہار آئی ہے، ہر ذرہ چمن بردوش ہے ساقی

پلا ایسی کہ تیرا ہاتھ ہر اک چومتا جائے
نشے میں چور ہو کر لڑکھڑاتا جھومتا جائے
نہ بھولے راستہ منزل پہ اپنی گھومتا جائے
ترے پیمانے میں وہ بادۂ سرجوش ہے ساقی

"پیامِ سالِ نو" سارے زمانے کو سنائے جا
کہ خدمت میں وطن کی خون تک اپنا بہائے جا
"مذاقِ گردشِ دوراں" اڑائے جا اڑائے جا
مری آواز تو آوازۂ ہر گوش ہے ساقی

ملاپ

از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی

اودھ جنی کے تعلقہ دار کنور رام پال سنگھ جبتک زندہ رہے، اپنے پیادے بدھو خاں کو اپنی ناک کا بال سمجھتے رہے۔ چار روپے کے پیادہ کی بساط ہی کیا، لیکن کنور صاحب بدھو خاں کی اتنی قدر کرتے تھے کہ ان کے مختار عام لالہ چمن لال کو بھی رشک ہوتا تھا۔ کنور صاحب بدھو خاں کا نام نہ لیتے تھے، وہ ہمیشہ اُن کو خاں صاحب کہکر پکارتے تھے۔ اور یہ اسی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ خاں صاحب بھی کنور صاحب پر جان دیتے تھے۔ ان کے پسینہ پر اپنا خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ کنور صاحب بھی جہاں جاتے خاں صاحب کو اپنے ساتھ رکھتے۔ کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ کنور صاحب کے دشمنوں نے اُنہیں گھیر لیا لیکن خاں صاحب کی بہادری سے ان پر کوئی آنچ نہ آنے پائی۔ لاٹھی چلانے میں خاں صاحب اپنا جواب رکھتے تھے۔ بڑے بڑے پہلوان ان کا لوہا مانتے تھے کنور صاحب اکثر اپنے دوستوں سے فخریہ کہا کرتے تھے کہ "میں خاں صاحب کو اپنے بھائی کے برابر سمجھتا ہوں"۔ جب کنور صاحب کا اخیر وقت آیا تو اُنہوں نے اپنے اکلوتے لڑکے کنور پرتاپ سنگھ کا ہاتھ خاں صاحب کے ہاتھ میں دے کر کہا "خاں صاحب! اب چلنے کی تیاری ہے، پرتاپ کو میں تمہیں سونپے جاتا ہوں۔ اس کو اپنا لڑکا سمجھنا۔ ابھی یہ کمسن ہے، ناتجربہ کار اور دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف ہے، میرے بعد اس پر کوئی آنچ آئی تو میری آتما کو دکھ ہوگا۔"

فرطِ حمیت سے خاں صاحب کا گلا بھر آیا۔ اُنہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "چھوٹے کنور کو اللہ پاک اپنے امن و امان میں رکھے میں تو اُن کا ادنیٰ خادم ہوں، اگر میری جان بھی ان کے کسی کام آئے تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔"

(۲)

کنور صاحب بیکنٹھ سدھارے، انتی کریا کرم سے فراغت پاکر کنور پرتاپ سنگھ نے اپنے علاقہ کا کام سنبھالا۔ کنور رام پال سنگھ بیس بیگھہ زمین خانصاحب کے نام وصیت کر گئے تھے۔ ان کے کاغذات کنور پرتاپ سنگھ نے بڑی خوشی سے خاں صاحب کو دے دیئے۔ لالہ چمن لال کو جب پتہ چلا کہ کنور صاحب ان کے نام کچھ زمین نہیں لکھ گئے ہیں تو ان کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔ "دنیا کا عجب دستور ہے، یہاں کوئی کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتا۔ خانصاحب کو بیس بیگھہ زمین کیوں ملی اور میں اس سے کیوں محروم رہا۔"

یہ سوال لالہ جی بار بار اپنے دل میں کرتے لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ تھا۔ اپنے عیب سے خود کوئی واقف نہیں ہوتا، لالہ جی بھی اس نقص سے خالی نہ تھے۔ انہوں نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا کہ کسی طرح بھی خانصاحب کو نیچا دکھانا چاہیئے۔ جب تک خانصاحب نوکری سے برطرف نہ کئے جائیں مجھے عروج حاصل نہ ہوگا۔ خاں صاحب سے لالہ جی کنور رام پال سنگھ کے زمانے ہی سے جلتے تھے لیکن اُن کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ کنور صاحب کے مرتے ہی لالہ چمن لال پھر خاں صاحب کو زک پہونچانے کی فکر میں لگ گئے۔

خاں صاحب سوائے حویلی کی دربانی کے اور کوئی کام نہ کرتے تھے۔ دن بھر ڈیوڑھی پر حاضر رہتے۔ اگر کنور صاحب کہیں جاتے تو خاں صاحب اپنے کندھے پر لاٹھی رکھے اُن کے پیچھے پیچھے چلا کرتے۔ لالہ جی کو خاں صاحب کے خلاف کوئی بات کہنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ ایک دن خاں صاحب کو اتفاق سے بخار آگیا اور وہ دو دن تک ڈیوڑھی پر نہ آسکے۔ لالہ جی کو شکایت کرنے کا موقع مل گیا۔ اُنہوں نے کنور صاحب سے کہا "آج کل تحصیل وصول کے دن ہیں، کام بہت ہے۔ اگر سرکار اجازت دیں تو میں خاں صاحب کو اسامیوں سے دین وصول کرنے کے لئے علاقے بھیجدوں، ڈیوڑھی پر کام ہی کیا ہے دن بھر خاں صاحب مکھیاں ہی تو مارا کرتے ہیں۔"

کنور صاحب۔ دین وصول کرنے کیلئے تمہارے پاس چار پیادے ہیں۔ ان کے علاوہ گاؤں پر کارندے بھی ہیں۔ کیا اُن سے کام نہیں ہو سکتا۔

لالہ جی۔ حضور آج کل کام کی بہت زیادتی ہے اگر خاں صاحب کو بھی اس موقع پر گاؤں بھیج

دیا جائے تو بہت اچھا ہوگا۔

کنور صاحب۔ پتاجی کے زمانے میں کیسے کام چلتا تھا؟

لالہ جی اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے، اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ کنور صاحب کو بھی خاں صاحب کا اتنا خیال ہے۔ لالہ جی کو اس کا سان وگمان بھی نہ تھا۔ بدطینت انسان اپنی ہار کبھی نہیں مانتا۔ لالہ جی اپنی ذلیل حرکتوں سے کئی مرتبہ شرمندہ ہوچکے تھے لیکن اس کا انہیں کچھ احساس ہی نہ تھا۔ وہ تو چکنا گھڑا تھے۔ ان کے برخلاف خانصاحب نے لالہ جی کا کبھی بُرا نہ چاہا تھا وہ ان کے ہمیشہ خیر خواہ رہے۔ جب لالہ جی ہر طرح سے ہار گئے تو اُنھوں نے مذہبی رنگ اختیار کیا۔

(۳)

اس زمانے میں شدھی اور تبلیغ کا بڑا زور تھا۔ کسی شہر میں سنگھٹن تو کسی شہر میں تنظیم کے جلسے ہو رہے تھے۔ اودھنی کے قریب ایک گاؤں مبارک پور ہے وہاں کے زمیندار لالہ شیام لال کی کوشش سے ایک چمار کی جو عیسائی ہوگیا تھا شدھی ہوئی۔ اب تک تو شہر ہی میں شدھی کے جلسے ہو رہے تھے لیکن اس موقع پر مبارکپور گاؤں میں بھی ایک عالیشان جلسہ ہوا جس میں شہر سے پرچارک بلائے گئے۔ کنور رام پال سنگھ اور لالہ شیام لال میں پٹی داری تھی، انہوں نے جیتے جی کبھی لالہ جی کو منہ نہ لگایا تھا لیکن ان کے مرنے کے بعد لالہ جی نے آہستہ آہستہ کنور پرتاپ سنگھ سے اپنا میل جول بڑھایا۔ اس جلسہ کی صدارت کیلئے انہوں نے کنور صاحب سے استدعا کی۔ اصل میں اس تجویز کے محرک کنور صاحب کے مختار عام منشی چمن لال تھے۔ کنور صاحب ان جھگڑوں میں پڑنے کیلئے تیار نہ تھے۔ مگر آخر میں انہیں مجبوراً کرسی صدارت کو رونق بخشنی پڑی۔ ان کی شرکت سے جلسہ کی رونق بڑھ گئی۔ پُرجوش مقرروں نے خوب دُھواں دھار تقریریں کیں۔ ایک پرچارک نے جوش میں آکر کہہ دیا کہ "بھائیو! مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کو بہت نقصان پہونچایا ہے۔ تبلیغ کے جلسوں میں ہندوؤں کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ وہ سب ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی فکر میں ہیں۔ ہم کب تک چپ چاپ بیٹھے تماشہ دیکھتے رہیں گے۔ مسلمان ہمارے جانی دشمن ہیں۔"

جلسہ میں زیادہ تر ان پڑھ اُجڈ دیہاتی شامل تھے۔ وہ عرصہ سے مسلمانوں سے میل رکھتے چلے آرہے تھے۔ آپس میں برادرانہ تعلقات تھے۔ اس سے پہلے انہیں کسی نے بتایا ہی نہ تھا کہ مسلمان ملک کش ہیں۔ پنڈت جی کے وکھیان سُن کر جوش غضب سے دیہاتیوں کا خون اُن کی رگوں میں دوڑنے لگا۔ پرچارکوں نے دیہاتیوں کے جو تیور بگڑے دیکھے تو ایک پرچارک نے فوراً اُٹھ کر تجویز پیش کردی: "تبلیغ سے بچنے کا بس یہی ایک اُپائے (طریقہ) ہے کہ مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔" کنور پرتاپ سنگھ تعلیم یافتہ انسان تھے وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ اس تجویز کا کیا نتیجہ ہوگا۔ اُن کے علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مسلمانوں نے اُن کے خاندان کی ہمیشہ خدمت کی تھی۔ وہ اس تجویز کی مخالفت کرنے کیلئے کھڑے ہونے ہی والے تھے کہ لالہ چمن لال نے اُٹھ کر تائید کردی اور "جے! جے!" کے نعروں میں یہ تجویز پاس ہوگئی۔ دوسری ضروری تجویز لالہ شیام لال نے مسلمانوں کی شدھی کیلئے چندہ جمع کرنے کی تجویز پیش کی جو باتفاق رائے پاس ہوگئی۔ جفاکش غریب دیہاتیوں نے دو دو چار چار کرکے چندہ دیا۔ لالہ شیام لال کی طرف سے سَو روپے اور لالہ چمن لال کی طرف سے پچاس روپے کی رقمیں پیش کی گئیں۔ کنور صاحب کو بھی مجبوراً یا اخلاقاً دو سَو روپے اس کار خیر میں دینے پڑے اور جلسہ "ہندو دھرم کی جے" کے نعروں میں ختم ہوا۔

(۴)

اس جلسہ نے اودھنی اور مبارکپور کا کیا ذکر آس پاس کے تمام گاؤں میں ہلچل مچادی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کا بائیکاٹ کرنا شروع کردیا۔

اس پر مسلمان اسامیوں نے کنور صاحب سے فریاد کی لیکن لالہ چمن لال کی حکمت عملی سے کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ وہاں سے مایوس ہوکر مسلمان بدھو خاں کے مکان پر پہونچے۔

خاں صاحب نے کہا: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے تم سب اطمینان رکھو، میں موقع پاکر کنور صاحب کو سمجھادوں گا۔ یہ سب چمن لال کی شرارت ہے ورنہ کنور صاحب تو ان جھگڑوں سے دُور بھاگتے ہیں۔ میں کنور صاحب کو آہستہ آہستہ راہ پر لے آؤنگا مگر شرط یہ ہے کہ تم لوگوں کی طرف سے کوئی شرارت نہ ہو۔"

میرا بخش ایک نوجوان اکھڑ جلاہا تھا۔ وہ بول اُٹھا: "خاں صاحب! تم ہمیں تو سمجھاتے ہو کہ کوئی شرارت نہ کر بیٹھنا مگر ہندوؤں کو کچھ نہیں کہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم غریب ہیں اور وہ امیر ہیں۔ ہندو ہمارے ساتھ آج کل بھنگیوں کا سا سلوک کر رہے ہیں لیکن کوئی ہماری فریاد نہیں سُنتا۔"

خاں صاحب بولے: "کہہ تو رہا ہوں کہ کنور صاحب کو سمجھادوں گا۔" یہ سنکر سب کو اطمینان ہوگیا اور وہ منتشر ہوگئے۔

لالہ چمن لال کے جاسوس نے اس کی خبر خوب نمک مرچ لگاکر کنور صاحب کے کانوں

تک پہونچائی اور ان کو یقین دلا دیا کہ خانصاحب مسلمانوں کو ورغلا رہے ہیں۔ یہ سُنکر کنور صاحب کو بڑا افسوس ہوا کسی کی طرف سے ذراسی بدگمانی ہوجائے پھر اس کا اعتبار نہیں رہتا چنانچہ اسی دن سے کنور صاحب کو خانصاحب کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوگئی۔ اُنہوں نے خاں صاحب سے بغیر کچھ دریافت کئے لالہ چمن لال کو حکم دیدیا کہ "خاں صاحب کو ڈیوڑھی سے ہٹا کر علاقہ پر بھیجدو۔ میں ایسے خطرناک آدمی کو اب اپنی ڈیوڑھی پر رکھنا پسند نہیں کرتا۔ اگر اس کی قدیم خدمات کا خیال نہ ہوتا تو میں اُسے برخاست کردیتا۔ پھر بھی اب وہ مجھے زیادہ دن تک بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ اب اگر اس کی کوئی شکایت سنی گئی تو میں ملازمت سے برطرف کردونگا"۔

"اندھا کیا چاہے دو آنکھیں" لالہ جی کی تو دلی مراد بر آئی۔ اُنہوں نے خانصاحب کو بُلا کر کنور صاحب کا حکم سُنا دیا۔ خاں صاحب سناٹے میں آگئے۔ وہ پندرہ بیس سال سے ڈیوڑھی پر کام کرتے آئے تھے۔ یکبارگی بلاکسی خطا و قصور کے جو وہ ہٹائے گئے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ اُنہوں نے کنور صاحب سے ملنا چاہا۔ لیکن کنور صاحب نے کہلا دیا "ملنے کی فرصت نہیں ہے"۔

کنور صاحب کا ایک گاؤں بیراگی پور اوجھنی سے دس بارہ میل پر تھا۔ خاں صاحب وہیں بھیج دئے گئے۔ ان کے جاتے ہی لالہ جی کیلئے میدان صاف ہوگیا۔ لالہ جی کے اشارہ سے مسلمان آسامیوں پر ظلم و ستم ہونے لگا۔ بیگار اور بے دخلی کی نالشوں سے ان کو پریشان کیا جانے لگا۔ یہ رنگ دیکھ کر مبارکپور کے ایک رئیس مولوی ظہیر الدین نے کنور صاحب کی مسلمان آسامیوں کو بکانا اور بھڑکانا شروع کردیا۔ مولوی صاحب مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ ان کے مشورہ سے مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کو موقع ملنے پر پریشان کرنا شروع کردیا۔ تبلیغ کے بھی جلسے ہونے لگے۔ اس سے کنور صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُن سے اور مولوی ظہیر الدین سے بہت دنوں کی چلی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے جوش انتقام میں ایک نومسلم کے گھر میں آگ لگوادی۔ مسلمانوں نے مقدمہ چلایا لیکن وہ کنور صاحب کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ کنور صاحب نے مقدمہ میں اپنا روپیہ پانی کی طرح بہادیا۔ جب اُنہوں نے سُنا کہ مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کا بائیکاٹ کرنا شروع کردیا ہے تو انہوں نے اپنے کارندے کو اشارہ کردیا کہ مسلمان آسامیوں سے مار مار کر کام لو۔ اس کے جواب میں مولوی ظہیر الدین نے بھی اپنے ہندو آسامیوں کو خوب تنگ کرنا شروع کردیا۔ تمام علاقہ کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ آمدنی کم ہونے لگی۔ لالہ چمن لال نے موقع پاکر رشوت کا بازار گرم کیا۔ غرضیکہ کنور صاحب اور مولوی ظہیر الدین کی لاگ ڈانٹ میں ہندو اور مسلمان آسامیوں کا ناک میں دم آگیا۔ اور حقیقت میں "دونوں کی ضد نے خاک میں ان کو ملا دیا"۔

ایک دن لالہ چمن لال نے کنور صاحب سے شکایت کی کہ حضور! یہ سب شرارت بدھو خاں کی ہے۔ میں نے اس کا اچھی طرح سے پتہ چلا لیا ہے وہ ہمیں لڑ کر مارنا چاہتا ہے"۔

کنور صاحب:۔ "ہاں مجھے بھی اب اس کا یقین آگیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے گھر کی روٹیوں پر پلا ہوا نمک حرام ہوجائے گا۔ پتا جی کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کو جیل بھجوا دیتا پھر بھی اب میں اس نمک حرام کو اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا۔ اسے برخاست کردو"۔

لالہ چمن لال کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگے "حضور! یہ نمک حرام اسی لائق تھا۔ اب دیکھ لیجئے گا ساری خاں صاحبی نکل جائیگی۔

(۵)

ناکردہ گناہ خانصاحب برخاست ہوئے تو اُنہیں بڑا صدمہ ہوا، اس وجہ سے نہیں کہ اُن کی ملازمت گئی، بلکہ اس وجہ سے کہ کنور صاحب خفا ہوگئے۔ اوجھنی آکر اُنہوں نے کنور صاحب سے ملنے کی بہت کوشش کی تاکہ وہ کنور صاحب کو اصلیت سے آگاہ کردیں اور بتائیں کہ علاقہ میں کیا اندھیر مچا ہے لیکن "کون سنتا ہے فغان درویش"۔ کنور صاحب نے ملنے سے انکار کردیا اور کہلا دیا کہ "میں ایسے نمک حرام سے ملنا پسند نہیں کرتا"۔

خاں صاحب کو خلاف توقع اپنے مالک سے "نمک حرام" کا خطاب ملا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ گھر واپس ہوئے تو اُن کے نوجوان لڑکے شیرو نے کہا: "دیکھا بابا! کنور صاحب کا سلوک، خدا جانے آپ اُن سے کیوں دبتے ہیں۔ میں تو ہرگز اُن کی گالی نہیں سہہ سکتا۔ میں کنور صاحب سے اس کا بدلہ ضرور لونگا"۔

خاں صاحب نے شیرو کو ڈانٹ کر کہا "خبردار پھر کبھی ایسی گستاخی نہ کرنا۔ ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔ تو کنور صاحب ہی کی روٹی کھاکر اتنا بڑا ہوا ہے، اس میں کنور صاحب کی کوئی خطا نہیں، یہ سب چمن لال کی شرارت ہے۔ اس نے کنور صاحب کو بہکا دیا ہے۔ وہ ہمارے مالک ہیں۔ ہم ان کے سر سے کبھی سر نہیں اُٹھا سکتے۔ ہمیں تو ان کے پسینہ پر اپنا خون بہانا چاہیئے"۔

شیرو چپ ہوگیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ بابا سٹھیا گئے ہیں۔ ان کی مت ماری گئی ہے۔

اُن سے کچھ کہنا ہی فضول ہے۔"

اوجھنی میں گائے اور باجہ کا کبھی کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا۔ کنور رام پال سنگھ کے زمانے میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے رنج و غم، ہنسی اور خوشی میں شریک ہوتے تھے۔ اوّل تو غریب مسلمان گائے کی قربانی ہی نہ کرتے تھے اور اگر کسی گاؤں میں قربانی ہوتی بھی تھی تو وہ رہ گذر کے بجائے مکان کے اندر قربانی ہوتی تاکہ ہندو بھائیوں کی دل شکنی نہ ہو۔ ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کا اتنا خیال تھا کہ جب کبھی وہ کسی مسجد کے سامنے نکلتے تو باجہ ہرگز نہ بجاتے۔ لیکن اب تو معاملہ ہی دگرگوں تھا۔ علاقہ میں گائے کی قربانی کی ممانعت کر دی گئی۔ مسلمانوں کو سخت ناگوار ہوا۔ مولوی ظہیر الدین کے فتوے سے "سمند ناز کو اک اور تازیانہ ہوا" سب مسلمان کٹنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ اوجھنی سے کچھ دور پر میر الطاف حسین تعلقدار کا علاقہ تھا۔ اُن سے کنور صاحب کی خاندانی عداوت تھی۔ ایک مرتبہ کنور رام پال سنگھ کے زمانہ میں اُن سے فوجداری بھی ہو چکی تھی۔ لیکن تب مسلمانوں نے کنور صاحب کا ساتھ دیا تھا جس سے میر صاحب کو شکست فاش ہوئی تھی۔ میر صاحب نے جب دیکھا کہ کنور صاحب کے علاقہ میں ہندو مسلم فساد ہو رہا ہے تو اُنہوں نے کنور صاحب سے اپنا انتقام لینے کے لیے مسلمانوں کو مدد دینے کا وعدہ کر لیا۔ بقر عید کے دن مولوی ظہیر الدین کے مکان پر سیکڑوں مسلمان جمع ہو گئے۔ کیونکہ انہیں کے مکان پر گائے کی قربانی کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی ہندوؤں نے بھی "گہار" بلایا۔ کنور پرتاپ سنگھ خود "گہار" کے "اگوا" بنے۔ اُنہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے لیکن مسلمانوں کو گائے کی قربانی نہ کرنے دو۔ جس وقت وہ گائے کی قربانی کرنے چلیں تم سب دھاوا بول دو۔ دوسری طرف میر الطاف حسین تعلقدار مسلمانوں کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے کہ بھائیو! اگر تم آج ہندوؤں سے دب گئے تو پھر تمہارا یہاں رہنا دشوار ہو جائے گا۔ گائے کی قربانی کرتے میں اگر ہم مارے گئے تو شہید اور زندہ رہے تو غازی کہلائیں گے۔ قریب تھا کہ دونوں فریق آپس میں ٹکرا جائیں کہ یکبارگی بدھو خاں لپکتے ہوئے آئے۔ اور دونوں جماعتوں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ اس وقت خاں صاحب مسلمانوں کے کسی مشورے میں شریک نہ تھے بلکہ وہ الٹا مسلمانوں کو سمجھاتے تھے کہ صبر کرو۔ خلاف امید خاں صاحب کو دیکھ کر مولوی ظہیر الدین نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ آپ کو مسلمانوں پر رحم تو آیا، وہاں دور کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے یہاں آ جائیے۔"

اُدھر جب چمن لال نے خاں صاحب کو دیکھا تو کنور صاحب سے کہا: "دیکھی سرکار نے بدھو خاں کی نمک حرامی! کب تک چھپ کر کام کرتا، ضبط نہ ہوا تو آخر حضور کے مقابلہ میں آ ہی گیا۔ بدمعاش کہیں کا!"

کنور صاحب۔ "لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مولوی ظہیر الدین کے مکان پر کیوں نہیں گیا۔ ہم دونوں کے درمیان کیوں کھڑا ہے؟"

لالہ جی۔ "اس میں بھی اس کی کوئی چالاکی ہوگی۔ بڑا بنا ہوا ہے۔"

کنور صاحب۔ "اچھا ذرا خاموش تو رہو۔ سنو تو سہی کہ وہ مولوی صاحب سے کیا کہتا ہے۔"

خاں صاحب نے مولوی ظہیر الدین سے مخاطب ہو کر کہا: "مولوی صاحب میں آپ کے گہار میں شامل ہونے نہیں آیا۔ میں تو صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ خدا کیلئے ہمارے گاؤں پر رحم کیجئے۔ غریب مسلمانوں پر کرم کیجئے۔ کسی کا دل دکھانے سے کیا فائدہ، جو کچھ آپ کرنے جا رہے ہیں اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔"

مولوی صاحب نے قہقہہ مار کر کہا: "آہا ہا! آپ ہمیں سمجھانے آئے ہیں، اور ہاں آپ نہ سمجھائیں گے تو پھر اور کون سمجھائے گا۔ نمک کا کچھ تو خیال چاہئے۔ اجی خاں صاحب! اس وقت آپ کہاں تھے جب کنور صاحب نے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگوائی۔ ان کے کارندوں نے غریب مسلمانوں کو مارا پیٹا اور ہندوؤں نے ہمارا بائیکاٹ کیا۔ آپ کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ہم کوئی نئی بات نہیں کر رہے۔ قربانی کرنا ہمارا مذہبی فرض ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس فرض سے نہیں روک سکتی۔"

خاں صاحب۔ "لیکن یہ ضروری نہیں کہ گائے ہی کی قربانی کی جائے۔ ہندو ہمارے وطنی بھائی ہیں۔ ان کے جذبات کا احترام کرنا بھی ہمارا مذہبی فرض ہے۔"

مولوی صاحب۔ "لیکن ہم ہندوؤں سے ڈر کر یا اُن کے دباؤ سے ایسا نہیں کر سکتے۔ کنور رام پال سنگھ کے زمانہ میں گائے کی قربانی کی کوئی مخالفت نہ تھی۔ وہ مسلمانوں کے دوست تھے، اسی وجہ سے ہم نے بھی اُن کا دل نہیں دکھایا لیکن اب ضد کی بات ہے تو ہم گائے کی قربانی ڈنکے کی چوٹ کریں گے۔ دیکھیں ہمیں کون روکتا ہے۔" باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم۔ "لیکن خاں صاحب آپ کو ان باتوں سے کیا مطلب، آپ سے کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ آپ تو جس کا کھائیں گے اسی کا گائیں گے۔"

خاں صاحب باتیں کرتے کرتے آہستہ آہستہ اسی مقام پر پہونچ گئے جہاں گائے بندھی ہوئی تھی۔ ادھر کنور پرتاپ سنگھ چنتا ساگر میں غوطے کھا رہے تھے۔ ان کو کبھی تو مسلمانوں پر غصہ آتا اور کبھی رحم۔ مولوی صاحب کی تقریر نے انہیں شش و پنج میں ڈال دیا۔ وہ سوچنے لگے: "مولوی صاحب سچ تو کہتے ہیں۔ یہ وہی مسلمان ہیں جو پتاجی کے زمانے میں ہم پر جان تک دینے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لیکن اب تو یہ عالم ہوگیا ہے کہ ہمارے آسامی ہمارے ہی خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوا۔ بس اب سمجھ گیا۔ یہ سب چمن لال کی لگائی ہوئی آگ ہے۔ افسوس میں نے اس کے کہنے میں آکر حقیقت میں مسلمانوں کو دشمن بنا لیا۔ اور خاں صاحب ایسے وفادار اور شریف پیادہ کو صرف اس جرم میں کہ وہ مسلمان ہے برخاست کر دیا۔"

ایک دفعہ انسان کا دل صفائی پر مائل ہو جائے پھر اس کا ضمیر اسے راہ راست پر لے آتا ہے۔ کنور صاحب کے دل کی بھی یہی حالت ہوئی۔ جب تک ان کے دل میں مسلمانوں کی جانب سے غبار کدورت بھرا تھا مسلمانوں کے ہنر بھی ان کی نگاہ میں عیب معلوم ہوتے تھے۔ ان کی ہر حرکت سے شرارت کا احتمال ہوتا تھا لیکن جب کنور صاحب کے شیشۂ دل سے غبار کدورت دور ہوا تو ان کو مسلمان بے ضرر اور خیر خواہ نظر آنے لگے۔ اب انکو دوست اور دشمن میں فرق معلوم ہونے لگا۔ کنور صاحب نے فوجداری کے نتائج پر غور کیا تو عالم خیال میں ان کی آنکھوں کے سامنے سیکڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی خون میں لت پت لاشیں اور سیکڑوں بیوائیں اور یتیم بچے پریشان حال ماتم کرتے دکھائی دیئے۔ کنور صاحب کا ہجوم جذبات سے کلیجہ پھٹنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت لالہ چمن لال نے یہ کہکر "حضور! تیار ہو جائیے، اب مسلمان قربانی کرنے جا رہے ہیں۔" کنور صاحب کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ گویا سوتے سے چونک اٹھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بدھو خاں گائے کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑے ہیں اور چلا چلا کر کہہ رہے ہیں "بھائیو! ہاتھ جوڑتا ہوں۔ گائے کی قربانی نہ کرو۔ میں اس کے بجائے دس بکرے دینے کو تیار ہوں بھائیو! خدا کے لئے رسول کے لئے اپنی ضد سے باز آجاؤ۔ سر راہ گائے کی قربانی کر کے تم کسی کا دل کیوں دکھانا چاہتے ہیں۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو قربانی سے پہلے مجھے مار ڈالو۔ میری قربانی سے شاید تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے۔"

کنور صاحب کے بھی کانوں میں خاں صاحب کی آواز پہونچی۔ انہوں نے چمن لال سے کہا: "بھاگ جاؤ اب تم سب لوگ یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ مجھے اب تمہاری بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں اب مسلمانوں سے ہرگز ہرگز لڑائی مول نہ لوں گا۔" یہ کہتے ہوئے کنور صاحب اپنے گھار سے نکل کر مولوی ظہیر الدین کی طرف بڑھے۔ کنور صاحب کے پیادوں نے ان کا ساتھ دینا چاہا لیکن کنور صاحب نے انہیں منع کر دیا۔ مولوی ظہیر الدین میر الطاف حسین اور تمام مسلمانوں نے کنور صاحب کو اپنی طرف تنہا آتے دیکھا تو حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ اب کیا ہونیوالا ہے۔ کنور صاحب نے آگے بڑھ کر بلند آواز سے کہا: "بھائیو! معاف کرنا میں غلطی پر تھا۔ آپ شوق سے قربانی کیجئے آپکے مذہبی فرائض میں مداخلت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔" اتنا کہکر کنور صاحب نے خانصاحب سے کہا "ادھر آیئے خانصاحب! میں آپ سے شرمندہ ہوں، اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ پرماتما نے آج میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے کھوٹے کھرے نیک اور بد کی پہچان ہوگئی۔ آج سے آپ میرے پیادہ نہیں بلکہ اب میں آپکو اپنے پتاجی کی جگہ پر سمجھتا ہوں۔ آپنے مجھکو چھوڑا کہ میرے تمام علاقہ نے مجھسے منہ موڑ لیا۔ پتاجی نے آپکو جو وصیت کی تھی اس کو نباہیئے اور میری سرپرستی کیجئے۔"

خاں صاحب نے دوڑ کر کنور صاحب کو اپنے گلے سے لگا لیا اور روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "کنور صاحب! ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ اپنا دل چھوٹا نہ کیجئے۔ ہمارے آپ مالک ہیں اور ہم آپکے ادنیٰ غلام ہیں۔"

اس موثر بین کو دیکھ کر تمام مسلمان بے تاب ہو گئے۔ مولوی صاحب کا دل بھر آیا۔ انہوں نے کنور صاحب سے کہا: "جب آپ ہماری قربانی میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتے تو ہم بھی بڑی خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ اب ہم گائے کی قربانی نہ کریں گے۔ آپ اس گائے کو بخوشی اپنے ساتھ لیجا سکتے ہیں۔"

مسلمانوں کے اس ایثار، رواداری اور ہمدردی کو دیکھ کر ہندوؤں کی آنکھیں کھل گئیں۔ سب کے دل صاف ہو گئے۔ میر الطاف حسین نے کنور صاحب سے گلے ملتے ہوئے کہا: "بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔" کنور صاحب نے مسکرا کر کہا: "بھئی ہماری آپ کی جنگ ہی کب ہوئی۔" لالہ چمن لال نے خاں صاحب سے بغلگیر ہو کر کہا: "خاں صاحب خدا کیلئے میری خطا معاف کر دیجئے میری وجہ سے آپکو بہت تکلیف ہوئی۔" خاں صاحب نے لالہ جی کو گلے سے لگا کر جواب دیا: "میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں......"

اُس کی دُوسری بیوی!

بڑھاپے کی شادی کا عبرتناک انجام

از — جناب تیج [illegible] بی اے آنرز

مکند لال رام نگر کا چوبیس ۲۴ سالہ نوجوان پٹواری کوئی چار سال سے اس گاؤں میں رہتا تھا اور پٹوارگری کے کام کے علاوہ گاؤں کے بچوں کو بھی پڑھاتا تھا۔ بچوں کو پڑھانے لکھانے کا کام اس نے خود اپنی مرضی سے ہی اختیار کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سرکاری کام سے جو وقت بچ رہتا اس کے صرف کرنے کرنے کے لئے کوئی دوسرا مشغلہ اسے نظر نہ آتا تھا بکندلال اکیلا آدمی تھا۔ ماں باپ بچپن ہی میں مر چکے تھے البتہ اس کے متوفی باپ کا ایک دوست اس کا منہ بولا "کاکا" یا چچا ضرور زندہ تھا جو اپنے گاؤں ہریاول میں پٹواری تھا۔ یہ "کاکا" مکندلال کے باپ کا ایسا گہرا دوست تھا جس نے مکند کو ماں باپ کی موت کے بعد پال پوس کر بڑا کیا تھا اور اپنا پیشہ سکھایا تھا۔ دونوں کے گاؤں کا فاصلہ سینکڑوں میل ہونے کی وجہ سے مکندلال کو نوکری کے لئے جب سے وہ رام نگر آیا تھا اپنے اس "کاکا" کی خیریت کے سوا گھر کی کوئی خبر معلوم نہ ہوئی تھی۔ خود اس کا دل رام نگر میں ایسا لگ گیا تھا کہ وہ اپنے مربی بوڑھے دوست سے ملنے کی خواہش بھی محسوس نہ کرتا تھا۔

سبھی گاؤں والے مکندلال سے خوش تھے۔ کیونکہ گاؤں کے پندرہ بیس بچوں کو مفت پڑھانے کے علاوہ مکندلال چال چلن کا بہت نیک واقع ہوا تھا۔ آج تک اس نے کبھی گاؤں کی جوان بہو بیٹیوں پر نگاہ نہ ڈالی تھی حقیقت میں وہ استری جات کی سنگت سے کچھ شرماتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کا اگر کوئی دوست تھا تو وہ گاؤں کا مکھیا تھا جس کے چبوترے پر جاڑے کے زمانے میں دس بیس آدمی جمع ہو کر تمباکو پیتے اور غپ شپ اڑتی یا کبھی کبھی گرمی میں شطرنج گھٹ جایا کرتی ورنہ برسات میں تو اس کا فالتو وقت اپنے گھر کے سامنے پچھواڑے میں ترکاری بھاجی بونے اور اس کی دیکھ بھال میں گزر جاتا تھا۔

〰〰〰〰〰〰

زندگی کے پرسکون ماحول میں مکندلال کو وقت کا پتہ بھی نہ چلتا تھا اور صرف مہینے کے شروع میں وہ تحصیل کے دفتر میں تنخواہ لینے جایا کرتا تھا۔ صبح کو جا کر شام کو مہینہ بھر کی ضروریات کے لئے وہ ایسی چیزیں خرید کر واپس ہو جاتا جو گاؤں میں نہ ملتی ہوں۔ اس یکسانیت کے باوجود مکندلال نہ کبھی گھبراتا نہ اس کی طبیعت کسی غیر معمولی تبدیلی کیلئے ابھرتی تھی۔ اکیلا آدمی تھا اور گاؤں کی سادہ چال کوئی چار چھ روپیہ مہینے میں اٹھتے ہونگے۔ دو تین سال کے اندر کچھ جوڑ جاڑ کر اس نے ایک ذاتی مکان بھی بنا لیا تھا اور دو چار گائے بھینسیں بھی پال لی تھیں۔

چھ مہینے سے مکندلال کو اپنے بوڑھے دوست کاکا رام پرشاد کی کوئی خبر نہ ملی تھی لیکن کل جب وہ تحصیل میں تنخواہ لینے پہونچا تو دوسری تحصیل بگوانی کے ایک منشی نے اُسے یہ خبر سنائی کہ تین مہینے ہوئے جب رام پرشاد نے ہریاول کے اسکول ماسٹر پریم دیال کی اٹھارہ سالہ جوان لڑکی سے دو ہزار روپیہ دے کر بیاہ کر لیا ہے — مکندلال کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کیونکہ نہ تو رام پرشاد مفلس تھا نہ رام پرشاد کی عمر کا یہ تقاضا تھا نہ گھر کی حالت اس کی اجازت دے سکتی تھی۔ پھر رام پرشاد کی بوڑھی بیوی بھی اس کے علم میں زندہ تھی۔ اسے خیال آیا کہ اب تو رام پرشاد کی لڑکی سیتا بھی تیرہ چودہ برس کی ہو گئی ہوگی۔ پھر اسے یہ بھی معلوم تھا رام پرشاد کے گھر میں کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے اس بیاہ کے ہونے میں ضرور کوئی نہ کوئی بھاری بات ہے۔ کوئی راز ہے۔

مکندلال "کاکا" کے اس نئے بیاہ کے متعلق سوچتا بچارتا رام نگر واپس ہوا —— اور جب رات کو تھکا ہارا بستر پر لیٹا تو اُسے خیال آیا کہ بوڑھے رام پرشاد کو یہ کیسی جوانی چڑھی تھی کہ اُس نے ایک جوان، سندر کنواری کنیا سے بیاہ کر ڈالا —؟ وہ اپنے دل میں کئے ہوئے اس سوال کا جواب سوچ ہی رہا تھا کہ خیالات نے اسے کہیں سے کہیں پہونچا دیا اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ خود اسکی زندگی بھی تو کسی بڑی تبدیلی کی آرزومند ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کوٹھڑی کے چاروں کونوں پر نگاہ دوڑائی۔ بھیانک اور دھندلی ٹمٹماتی روشنی میں دل کی ایک آواز یہ کہتے سنائی دی کہ — "غافل

تو بھی نوجوان ہے، سندر ہے، کماؤ ہے لیکن اپنی جوانی کو تنہائی میں برباد کر رہا ہے۔ تجھے ایک جیون ساتھی چاہئے۔ تیری زندگی کیسی خالی خالی اور بے لطف زندگی ہے۔ ارے یہ زندگی زندگی نہیں موت ہے بلکہ موت سے بھی بدتر" ـــــ اس تصور سے ہی اسے سارا ماحول ڈراؤنا دکھائی دینے لگا۔

خوب تھک جانے کے باوجود بھی مکندلال کو اس رات بڑی دیر میں نیند آئی۔ نیند کیا آئی بے چین اور غیر مسلسل خوابوں کا ایک سلسلہ تھا جو ختم نہ ہوتا تھا۔ کبھی اسے یہ دکھائی دیتا کہ اس کا گونا ہو رہا ہے۔ کبھی بیاہ منڈپ میں پھیرے دئے جا رہے ہیں کبھی ناچ، باجا گاجا اور دھوم دھڑکا سنائی دیتا اور کبھی کبھی "سندر رکھو" کبھی کو وہ اپنے پہلو میں لجایا شرمایا ہوا بیٹھا پاتا ـــــ یہ رات اسی طرح بدخوابیوں میں گذری۔

سویرے دن چڑھے جب مکندلال سو کر اٹھا تو وہ اب تک کچھ تھکن اور افسردگی محسوس کر رہا تھا۔ رات کے ہلکے ہلکے اثرات باقی تھے لیکن رات جیسی ایک بے چین خواہش کے بجائے اب صرف اضمحلال باقی تھا اور وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ شاید بیمار ہو گیا ہے لیکن زندگی کے چکر نے اسے معمول کے مطابق اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور وہ بھی اپنے کام کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔

اپنے فرضی "کاکا" رام پرشاد کے نئے بیاہ نے مکندلال کے اندر فطری اور جنسی خواہشوں اور قوتوں کو بے طرح بیدار کر دیا تھا۔ اب ہر جوان لڑکی پر اس کی نظر پڑتی تھی اور وہ اسے نگاہوں نگاہوں میں ہی اپنے اندر سما لینے کی کوشش کرتا تھا۔ اگرچہ جذبات میں شعلہ فشانی اور تلاطم طوفانی نونہ تھا۔ لیکن دن رات میں بیسیوں مرتبہ ایک بلا تفور خواہش اس کی یہی ہوتی کہ اسے بیاہ کر لینا چاہئے۔ اس حالت میں اسے پورا سال بھر گذر گیا۔ لیکن اس نے کسی کے سامنے دل کے نئے رنگ کا اظہار نہیں کیا۔ درمیان میں اسے اس خبر کی بھی تصدیق ہو گئی کہ واقعی رام پرشاد نے بیاہ کر لیا ہے۔

کئی دن ہوئے کہ مکندلال کو بوڑھے "کاکا" کی ایک چٹھی ملی تھی۔ چھ برس کے بعد یہ پہلا خط تھا جو رام پرشاد نے اسے لکھا تھا اس میں تحریر تھا کہ دو دن پہلے اس کی "کاکی" فالج میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ خط کے آخری حصے میں اسے ہرماول بلایا گیا تھا تاکہ وہ آکر سیتا کے بیاہ کے بارے میں مشورہ دے سکے۔ اب سیتا جوان ہو گئی تھی اور جوان لڑکی کا زیادہ دن گھر میں رہنا پسندیدہ بات نہ تھی۔

مکندلال نے چٹھی پڑھ کر اپنے اندر اس بات کی پوری مستعدی پائی کہ وہ ہرماول چلا جائے اور اپنے کاکا سے ملے۔ بھورے بالوں والی سیتا سے ملنے کیلئے بھی اسے بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی اور غیر شعوری طور پر اس کا دل کسی ایسی فوری تبدیلی کا خواہشمند تھا جسے وہ خود بیان نہ کر سکتا ہو نہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔

دوسرے دن وہ علی الصباح تازہ دم اٹھا۔ اور جلد جلد ہاتھ منہ دھو کر اور گھوڑی کس کر تیار ہو گیا تاکہ تحصیل جا کر کم سے کم تین چار مہینے کی چھٹی لے آئے اور دو چار دن میں ہرماول جانے کی تیاری کر کے روانہ ہو جائے تحصیل سے اسے رخصت فوراً مل گئی کیونکہ حق باقی تھا اور شام کو جب وہ رام نگر واپس ہوا تو اس کے ذہن میں جانے کی تیاری کا پورا نقشہ مکمل تھا۔

دو چار دن میں اس نے سب تیاری کر لی۔ گائیں بھینسیں مکھیا کے حوالے کیں۔ کاچھی سے باغیچہ اور پچھواڑے کی دیکھ بھال کو کہا۔ اور گھر میں تالا ڈال، سب سے رخصت ہو، ایکدن سویرے وہ شاہ پور روانہ ہو گیا تاکہ دس بجے دن کو ہاور جانے والی موٹر لاری میں سوار ہو سکے ـــــ رات کو نو بجے کے لگ بھگ وہ تھکا ہارا ہرماول پہنچا۔ گھر میں سیتا، دمہ کے مریض بوڑھے رام پرشاد اور اس کی نئی بیوی نے اس کا پر تکلف خیر مقدم کیا۔ اسے کھانا کھلایا، دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے بھی کچھ ضروری کچھ غیر ضروری باتیں کیں۔ سیتا کو دیکھ کر اس کی نگاہیں چوندھیا رہی تھیں۔ اب وہ چھوٹی سی کھنڈری لڑکی نہ تھی بلکہ شباب جوانی اور حسن و جمال کی ایک زندہ تصویر تھی۔ اس کے بھورے بالوں میں اب سنہری رنگ جھلکنے لگا تھا اور اس کی معصوم آنکھوں میں ایسا کیف و سرشاری امنڈ آئی تھی جس نے مکندلال کو بھی مست و بے خود بنا دیا تھا۔ سیتا کیلئے وہ چاندی کا ایک ہار لایا تھا اور کاسنی چونی میں سے اس کی گوری گوری گردن دیکھ کر بار بار اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے یہ ہار پہنا دے لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ آخر کار ہار اور نئی "کاکی" کے لئے جو ساڑھیاں لایا تھا "کاکا جی" کو دینا پڑیں۔ آج اس کے دل میں ایک ایسا سکون موجود تھا جس کی اسے مدت سے تلاش تھی ـــــ رات گئے تک وہ تنہا پڑا پڑا خواب و خیال کی دنیا تعمیر کرتا رہا۔ اس نے کیا کیا سوچا یہ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر نیند کی دلوی نے آخر کار اس پر غلبہ پا لیا۔

دوسرے دن جب ماں اور بیٹی دونوں چولھے ہانڈی میں لگی ہوئی تھیں تو رام پرشاد اسے بیٹھکے میں باہر لے گیا اور بڑی محبت و شفقت سے پہلے اپنے گھر کا تذکرہ کرتا رہا اور پھر مطلب کی بات چھیڑ کر کہا۔ "بیٹا! میں ہمیشہ بیمار رہتا ہوں اور اب تو بڑھاپے اور بیماری سے موت کے ہاتھوں ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ اس لئے میری تمنا ہے کہ سیتا کا بیاہ اپنے سامنے ہی کر دوں" پھر اس نے اپنی نئی شادی کا حال سناتے ہوئے کہا کہ یہ شادی اس کی متوفی "کاکی" کے مفلوج ہو جانے کی وجہ سے کی گئی تھی تاکہ سیتا کے سسرال چلے جانے کے بعد اُسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے اور گھر کا کام کاج بھی سنبھلا رہے۔

پھر تھوڑی دیر رکنے اور سوچنے کے بعد بولا "بیٹا! اب اس بڑھاپے میں سیتا کا بر ڈھونڈھنے میں کہاں جاؤں۔ اسلئے چاہتا ہوں کہ تیرے ساتھ ہی اسے بیاہ دوں تیرے باپ نے بھی مرتے وقت یہی وصیت کی تھی" مکند لال بھونچکا سا رہ گیا۔ اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی تکلیف یا رنج پہونچانے والی بات اس کے منہ بولے "کاکا" نے کہہ دی ہو بلکہ اُسے تعجب اس بات پر ہوا کہ جو بات وہ چاہتا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اتفاقات نے اسکو پورا کر دیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد ہی نیک گھڑی دیکھ کر مکند لال اور سیتا کا بیاہ کر دیا گیا۔ آٹھ دس دن بوڑھے "کاکا" کے دوستوں کی عورتیں اور بچے گھر میں جمع رہے۔ کھانا پینا، گانا بجانا ہوتا رہا اور پھر سب رخصت ہو گئے۔ مکند لال کو اپنی سندر بیوی سے بڑا "پریم" تھا اور اس کی چند دن پہلے والی خالی خالی زندگی اب مسرت اور شادمانی سے بھر گئی تھی۔ اس کی راتیں عیش سے گذرتی تھیں اور تھوڑے دن تک تو یہ حال رہا کہ سیتا کے سوا موجودات میں اُسے کوئی دوسری ہستی ہی نظر نہ آتی تھی۔ وہ صبح جب سو کر اٹھتا تو اپنے گرد و پیش ایک ایسا رنگین اور راز آسا ماحول اسے دکھائی دیتا جس کی تخلیق سیتا کے حسن و جمال اور محبت نے کی ہو۔ دن میں جب وہ ادھر اُدھر پھرتا یا کوئی دوسرا کام کرتا تو فضا میں اُسے سیتا کا "سندر مکھ" ناچتا دکھائی دیتا۔ رات کو سیتا اس کے ساتھ ہوتی لیکن جب وہ سو جاتا تب بھی اُسے خواب میں سیتا ہی سیتا دکھائی دیتی۔

بیاہ کو مہینہ بھر گذر گیا ——— اور عام انسانوں کی طرح مکند لال کی جنسی وارفتگی اُسے اصلی رنگ میں دکھائی دینے لگی۔ سیتا کا پریم اب بھی اس کے سر میں سمایا ہوا تھا لیکن اب اس کا دل جس بات کا متمنی تھا وہ محبت تھی سیتا کی جانب سے۔ وہ چاہتا تھا کہ جس ذوق و شوق اور بے خودی کا اس نے اظہار کیا سیتا بھی اس کا ویسا ہی والہانہ جواب دے مگر اپنی اس تمنا میں اسے پوری پوری ناکامی ہوئی۔ سیتا چنچل تھی۔ سیتا سندر تھی۔ وہ اسے "پریتم" بھی کہہ دیتی تھی لیکن اس نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ وہ اس سے "پریم" نہیں کرتی۔ اس کے پیار میں بناوٹ ہے۔ اس کی نگاہوں میں [illegible] کی ہے۔ اس خیال کی نشوونما سے مکند لال بہت رنجیدہ رہنے لگا۔ اور جب اس کی تمام کوششیں سیتا کا دل لبھانے اور اس کی محبت حاصل کرنے میں ناکام ہو گئیں تو اُسے رام نگر کی یاد آنے لگی۔ ابھی رخصت پوری ہونے میں ڈیڑھ دو مہینے باقی تھے لیکن اس نے اپنے سسر اور ساس سے اجازت چاہی کہ وہ اُسے رام نگر جانے دیں تاکہ وہاں جا کر وہ سیتا کو لیجانے کا سب انتظام کر لے اور پھر اُسے لے جائے۔ اس کے سوا اُسے کوئی بہانہ نظر نہ آیا۔

مکند لال نے یہ دیکھا کہ بوڑھا سسر تو اجازت دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا لیکن اسکی نوجوان ساس اتنی جلد واپس جانے پر رضامند نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ جب اس نے اصرار کیا تو یہ بھی دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں دو بڑے بڑے گول آنسو دکھائی دے رہے ہیں جو ڈھلک کر گورے گورے گالوں پہ آیا چاہتے ہیں۔

مکند لال دل کا کچا تھا وہ اپنی جوان ساس ہی کے نہیں بلکہ کسی عورت کے بھی آنسوؤں کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ اس نے گھبرا کر فوراً ہی کہہ دیا کہ —— "کاکی! جب تم اجازت دوگی چلا جاؤں گا" لیکن دن بھر اسکی آنکھوں میں وہ دونوں آنسو پھرتے رہے اور وہ سوچتا رہا کہ آخر اس کی ساس روئی کیوں تھی۔؟ کوئی جواب اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ دو دن گذرے تین دن گذرے۔ پورا ہفتہ گذر گیا لیکن جب وہ اپنی ساس سے اجازت مانگتا تو وہ بڑے اصرار اور بڑی محبت سے روک لیتی۔ اب اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی نگاہوں میں بڑی نرمی اور بڑا پیار چھلکتا دکھائی دیتا ہے اور اگرچہ وہ اتنی سندر تو نہیں جتنی کہ سیتا ہے لیکن اس کا دل محبت ہی محبت سے بھرا ہوا ہے۔ ایک ایسی صفت، ایک ایسی ضرورت جسے وہ سیتا کے اندر دیکھنا چاہتا تھا۔

یہ بات اب، گاؤں والوں میں سے کسی سے کوئی چھپی ہوئی بات نہیں تھی کہ اسکی ساس حاملہ

کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں کر رہی ہے۔ ہر با دل بھر میں "سوتیلی" ساس کی یہ فیاضی اور تواضع مشہور ہو رہی تھی کیونکہ رسم و رواج اور سونا پیسے کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جو مشکل ہی سے نظر آسکتی ہے۔ رام پرشاد بھی اپنے داماد، نئی بیوی اور بیٹی کی باہمی چاہت دیکھ کر بڑا ہی خوش تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ "بھگوان نے اس کے من کی مراد پوری کر دی"۔

مکندلال نے اپنی ساس کی نگاہوں میں جو سبق پڑھا تھا اُسے کچھ سمجھا تھا کچھ نہیں لیکن وہ سمجھنے کی کوشش بالکل نہیں کر رہا تھا کیونکہ اوسط درجے کے ایک سمجھدار اور دنیادار کسان زادے کی طرح اس نے بھی یہ سمجھ لیا تھا کہ سیتا اس کی عورت اور وہ اس کا شوہر ہے اور آئندہ اس کی زندگی میں کوئی دوسری عورت نہیں داخل ہو سکیگی۔ وہ ہر حال میں اپنی قسمت پر قانع ہو چلا تھا۔

ایکدن گاؤں میں "رام لیلا" کھیلنے والے آئے۔ شام کو انہوں نے محفل جمائی۔ گاؤں بھر کے مرد اور عورتیں تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو گئیں۔ مکندلال بھی گیا۔ اس کی ساس بھی اور سیتا بھی۔ بوڑھا رام پرشاد بھی بوڑھوں میں جا بیٹھا، سیتا اور لچھمی مکندلال کی ساس عورتوں میں ــــ ابھی تماشا شروع ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی ہوگی کہ مکندلال جو جلد سو جانے کا عادی تھا، اُٹھ کر سونے کیلئے گھر چلانے لگا۔ کسی نے اُسے روکا کسی نے نہ روکا لیکن وہ رکا نہیں۔ کوٹھری میں اس نے چراغ کی بتی کم کر دی اور بستر پر لیٹ گیا ــــ ابھی اسکی آنکھ اچھی طرح لگنے بھی نہ پائی تھی کہ کوئی گھر میں داخل ہوا اور سیدھا اُسی کی کوٹھری میں چلا آیا۔ مکندلال اُٹھ بیٹھا اور سمجھا کہ سیتا آگئی اس نے جلد آجانے کی وجہ پوچھی لیکن ــــ جواب ملنے کے بجائے لچھمی اُسکی ساس نے اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ مکندلال گھبرا کر اٹھنے لگا مگر لچھمی نے اُٹھنے بھی نہ دیا۔ وہ زبان سے کچھ نہ بولی لیکن اب مکندلال پر ان آنسوؤں کی حقیقت اور اس تواضع اور خاطر داری کا اصل سبب ظاہر ہو گیا۔ اس نے کچھ بات کہنے کی کوشش کی لیکن لچھمی نے روک دیا اور ہچکیاں لے لے کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"مکندلال! میں تم سے ویسا ہی پریم کرتی ہوں جیسا تم سیتا سے چاہتے ہو مگر سیتا تم سے کبھی پریم نہیں کر سکتی۔ یہ راز مجھے اچھی طرح معلوم ہے وہ کسی اور کو چاہتی ہے۔ وہ کسی اور محبت میں اسی طرح جل رہی ہے جس طرح تمہارے پریم کی آگ مجھے جلائے ڈالتی ہے۔ تم اس سے کیا آس رکھتے ہو؟ کیا اس کی سکتے ہو؟ مکندلال! میری پریم کی آگ بجھاؤ غصہ مت ہو۔ دیکھو، ایسا نہ ہو کہ تم سیتا کی اور میری جوانی برباد کر دو ــــ!"

یہ کہکر لچھمی نے اپنا سر مکندلال کی گود میں رکھ دیا۔ اس کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھی ہوئی تھی اور گلے سے مسلسل ہچکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مکندلال ڈر گیا لیکن لچھمی کے یہ الفاظ کہ "سیتا کبھی تم سے پریم نہیں کر سکتی وہ کسی اور کو چاہتی ہے" اس کی لوح دماغ پر جم گئے۔ اُسے بار بار یہی آواز سنائی دیتی تھی اور لچھمی کی موجودگی سے بے خبر وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ ہو سکتا ہے۔ اُسے سیتا کی سرد مہری یاد آرہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں چالاکی اور باتوں میں فریب کاری کا نقشہ آنکھوں میں پھر رہا تھا۔

وہ خاموش چھت کے بانسوں پر نظر جمائے ہوئے تھا اور لچھمی اس کی گود میں مچل رہی تھی ــــ بہت دیر اسی حالت میں رہنے کے بعد مکندلال نے پہلو بدلا اور ایک لمحہ کے اندر اس کے دونوں ہاتھوں نے لچھمی کو سینے سے لگالیا ــــ جوانی، جوانی سے، محبت، محبت سے ہمکنار ہو چکی تھی۔

لچھمی کو چار چھ دن کے اندر یہ ثابت کرنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی کہ سیتا، بہاری لال اہیر کے اٹھارہ سالہ خوبصورت بیٹے کشن سنگھ سے جب ملتی ہے تو اس کی آنکھوں میں ایسی روشنی دکھائی دیتی ہے جو سچی محبت کی نشانی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں بناوٹ نہیں ہوتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دن رات میں بیسیوں مرتبہ وہ اپنے پڑوسی اہیر کے گھر دوڑی چھوٹی جا پہنچتی ہے ــــ

ایک شام کو تو لچھمی نے گھاٹ پر کشن سنگھ اور سیتا کو سر جوڑے باتیں کرتے ہوئے مکندلال کو دکھا دیا۔ اب مکندلال کو زیادہ تحقیق و تجسس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے یہ سوچا کہ سیتا کا راز فاش کر دے اور اسے اپنے سے غیر ذات سے میل جول بڑھانے کی پاداش میں ذات باہر کرا دے لیکن لچھمی نے ایسا کرنے سے روک دیا ــــ اور ــــ

چار پانچ دن کے بعد ایک دن سویرے مکندلال اور اس کی جوان ساس لچھمی دونوں گھر سے غائب تھے۔ لچھمی اپنے کپڑے اور گہنا بھی لے گئی تھی شام تک دونوں جب واپس نہ آئے تو رام پرشاد نے مکندلال کو ادھر اُدھر ڈھونڈ ڈالا بھی۔ دوسرے دن سویرے ہی سے سارے گاؤں میں یہ آگ کی طرح پھیل گئی کہ رام پرشاد کا داماد ساس کو بھگا لے گیا ــــ سب کو تعجب

حضورِ حسن اور سلامِ محبت!

از جناب یکتا حقانی امروہوی

حضورِ حسن میں ناداریاں قبول ہوئیں
دلِ حزیں کی الم کاریاں قبول ہوئیں

جو پیش کی تھیں گلستاں نے نذر کی صورت
خوشا نصیب وہ گلکاریاں قبول ہوئیں

ہیں مست انکھڑیاں شاہد نگاہِ مست گواہ
کہ ہر قدم پہ گنہگاریاں قبول ہوئیں

قدم یہ مست جوانی کے لڑکھڑائے ہوئے
بتا رہے ہیں کہ سرشاریاں قبول ہوئیں

ازل سے تھیں جو سراپائے حور میں رقصاں
وہ ہر طرح کی طرحداریاں قبول ہوئیں

ملیں جو روزِ ازل عشق کے ستانے کو
کرم سمجھ کے ستمگاریاں قبول ہوئیں

جو جزوِ حسن بنا دی تھیں فطرتِ کل نے
ستم نواز وہ بیکاریاں قبول ہوئیں

جہاں میں کشمکشِ حسن و عشق کی خاطر
وفا کے ساتھ جفاکاریاں قبول ہوئیں

کمال یہ ہے کہ رغبت سے عینِ خواہش سے
غرورِ حسن کی خودداریاں قبول ہوئیں

حضورِ حسن کا حسنِ قبولیت! حد ہے
الم قبول ہوئے خواریاں قبول ہوئیں

مگر خراجِ تعشق وصول ہو نہ سکا!
مرا سلامِ محبت قبول ہو نہ سکا!

منہ چڑھے داروغہ جی!

از جناب محمد کمال احمد رازی جہانگیری

دوپہر کا وقت تھا۔ ہر چہار طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ صرف گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ کسی وقفے کے بعد سنائی دے رہی تھی۔ ایڈیٹروں کے تقاضے نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس لئے میں میز پر کاغذ پنسل رکھ کر کسی موضوع کی فکر میں تھا کہ کچھ مضمون آرائی کروں مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اسی درمیان میں ایک رکشہ والا ٹن ٹن گھنٹی بجاتا ہوا گذر گیا۔ مجھے معاً داروغہ جی کا قصہ یاد آ گیا۔ اور ایک زور کی ہنسی معلوم ہوئی۔

شاید دو چار سال کا عرصہ ہوا۔ ایک رکشہ والا ٹن ٹن اپنی گھنٹی بجاتا اسی طرح اپنی دھیمی چال سے ایک چوراہے سے گذر رہا تھا۔ اس کا جسم نحیف و زار ——— پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت ——— بدن پر پھٹی چٹی میلی کچیلی ایک نیم آستین ——— بڑے بڑے اُلجھے ہوئے گرد آلود بال ——— آنکھوں کی پلکیں غبار میں لت پت تھیں اتنے میں اس کی نظر ایک باوردی داروغہ جی پر پڑی۔ اور وہ ایک کنارے ہو گیا۔ داروغہ جی نے اسکو اپنی چھڑی کے اشارے سے بلایا ——— ان کا چہرہ سرخ سرخ ——— منہ میں پان چبائے ہوئے ——— کچھ پیک لب کے باہر کے حصے میں بھی بہے ہوئے ——— آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں ——— گال اُبھرے ہوئے ——— ناک پکوڑی سی ——— مونچھ شتر نما ——— داڑھی کا صفایا ——— توانا و تومند ——— توند بہت ہی زیادہ باہر کی طرف نکلی ہوئی ——— ٹوپ کے کنارے پر میل جمے ہوئے ——— کوٹ کے بٹن ندارد ——— پتلون کے کنارے نوچے ہوئے ——— پاؤں کے موزے کٹے ہوئے ——— جوتے کی چمک غائب ——— ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی ——— انہوں نے زور سے کھنکھار کر رکشہ والے سے حکمانہ لہجہ میں پوچھا۔ "یہاں سے تھانہ تک لیجانے میں کتنا پیسہ لیگا؟" "مجور (حضور) سے کیا لونگا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "دو آنے پیسے۔ بہت دُور ہے مجور (حضور)" "دو آنے نہیں بے چار آنے۔" داروغہ جی نے اپنی پتلی سی چھڑی ہلا ہلا کر کہا اور رکشہ پر جا کر بیٹھ گئے۔

بیچارا رکشہ والا بھلا داروغہ جی کی بات کیسے ٹالتا ——— وہ بھی چہرہ پر عجز و انکسار کا رنگ پیدا کرتا ہوا جیسے کسی موت سے لیجانے پر تیار ہو گیا۔ وہ اپنی پوری طاقت سے کام لے رہا تھا مگر رکشہ بہت ہی دھیمی چال میں چل رہا تھا اور تیز چلتا بھی تو کیسے ——— رکشہ کا اسپرنگ داروغہ جی کے بوجھ سے بالکل ملکر ایک ہو گیا تھا اور قریب تھا کہ پرزے پرزے ہو کر رہ جائے اور اس پر رہ رہ کر داروغہ جی کا ٹھنک ٹھنک کر کہنا "جلدی چل بے" بھلا یہ داروغہ جی کی زیادتی نہیں تو اور کیا تھی۔ ایک تو تین آدمیوں کا وزن اکیلے لئے ہوئے تھے۔ دوسرے رکشہ والے کا کمزور و ناتوان جسم اور اس پر ٹیڑھا راستہ ——— بیچارا رکشہ والا کہاں تک تیز چل سکتا تھا ——— جھک جھک کر زور لگا رہا تھا۔ اپنی جان پر کھیل رہا تھا بیچارے کی سانس پھول رہی تھی مگر پھر بھی رکشہ میں کوئی نمایاں تیزی نہیں ہو رہی تھی۔ مگر داروغہ جی برابر غصہ ہو ہو کر لال جھاگ اُڑا رہے تھے اور رکشہ والے کو گالی گلوچ تک کی نوبت پہنچا دی تھی۔ شاید داروغہ جی کو پہونچنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ اتنے میں ایک موٹر دکھائی دی۔ رکشہ والا ذرا ہاتھ کو ڈھیلا کر کے کنارے ہونے لگا کہ رکشہ پیچھے کی طرف زیادہ بوجھ پا کر بالکل اُلٹ گیا۔ رکشہ کے پیچھے کا اسٹینڈ (Stand) ٹوٹ گیا وہ خود بھی اس کے ساتھ جھول گیا۔ داروغہ جی سر نیچے اور پاؤں اُوپر تھے اور کراہ رہے تھے کبھی اپنی توند پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور کبھی آہستہ آہستہ کمر دبا رہے تھے۔ رکشہ والا نیچے گر کر بیہوش ہو گیا تھا۔ داروغہ جی ایک وزنی بوجھ کی طرح جوں کے توں پڑے ہوئے تھے۔ اتنے میں دو چار راہگیر جمع ہو گئے اور ان لوگوں کی مدد سے رکشہ کو سیدھا کیا گیا مگر رکشہ کا ایک اسپرنگ غائب ہو چکا تھا۔ جب داروغہ جی کو چار پانچ آدمیوں نے مل کر اُٹھایا تو ان کی بھی کمر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ منہ سے پان کی پیک دونوں طرف گالوں پر بہہ گئی تھی۔ ہاتھ کی چھڑی نہ جانے کہاں چھٹک کر چلی گئی تھی۔ آخر بمشکل ان کو دوسری گاڑی پر لاد کر ہسپتال پہونچایا گیا مگر اب بھی داروغہ جی کا غصہ رکشہ والے پر کم نہ ہوا تھا۔ وہ اب بھی اس پر رحم فرمانے کی بجائے رہ رہ کر اس کو بھاری آواز میں گالیاں ہی دے رہے تھے۔

میں مرد کو کیا سمجھتی ہوں؟

ایک امریکن خاتون کے قلم سے

مرد کے بغیر عورت کی زندگی نامکمل ہے اور عورت کے بغیر مرد کی زندگی۔ مرد عورت کا شریکِ زندگی ہے اور عورت مرد کی رفیقۂ حیات۔ ایک کے بغیر دوسرا ناقص و نامکمل ہے۔ اور ایک کے بغیر دوسرے کی زندگی عبث اور بے کیف۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت کس قدر حیرت انگیز اور عبرتناک ہے کہ ایک کو دوسرے پر اعتماد نہیں۔ ایک دوسرے کی طرف سے غیر مطمئن ہے۔ عورتیں چونکہ ہر ملک میں کم و بیش مردوں کے زیر اثر ہیں اس لئے ان کو بالخصوص مردوں سے شکایات ہیں۔ ہندوستان میں عورتوں پر مردوں کا زیادہ غلبہ و اقتدار ہے۔ اس لئے یہاں مردوں کے خلاف عورتوں کی آواز بلند اور ہنگامہ خیز نہیں ہے لیکن یوروپ اور امریکہ میں جہاں عورتوں کو بڑی حد تک آزادی حاصل ہے عورتیں مردوں کے خلاف نہایت تند و تلخ جذبات و خیالات کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔ مردوں کے متعلق ایک پُرجوش امریکن عورت کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔

"میں عورتوں کو باخبر کر دینا چاہتی ہوں کہ وہ مردوں سے ہوشیار رہیں۔ مرد دیکھنے میں جیسے نیک طینت ہوتے ہیں فی الحقیقت ویسے نہیں ہوتے۔ جو بظاہر جتنا زیادہ نیک منش معلوم ہوتا ہے وہ بسا اوقات اتنا ہی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ عورتوں کو مردوں سے ہوشیار رہنا اور نشیب و فراز سمجھ کر ان سے مراسم پیدا کرنے چاہئیں۔ مرد فطرتاً فراخ دست واقع ہوئے ہیں اسلئے وہ اپنی خواہش پر ہزاروں روپے بے دریغ برباد کر دیتے ہیں۔ چنانچہ میں ذاتی طور پر ایسے مردوں سے واقف ہوں جنہوں نے معمولی معمولی باتوں پر بے دریغ روپے ضائع کر دیئے۔ لیکن جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے۔ عام طور پر مرد خسیس واقع ہوئے ہیں۔ وہ عورتوں پر جو روپے خرچ کرتے ہیں اسے بار بار جتاتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ گویا وہ فضول خرچی کر رہے ہیں۔

مردوں کو سب سے زیادہ وہ عورتیں پسند ہیں جو کفایت شعار اور جفاکش ہوں تاکہ وہ ان سے روپے تو نہ خرچ کرائیں لیکن ان کی خدمت خوب کریں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہئے کہ مرد ایسی لونڈیوں کو پسند کرتے ہیں جو مفت میں ان کی خدمت کریں۔ پھر عورتیں روپے خرچ کراتی ہیں اور خدمتگزار نہیں ہوتیں۔ مرد ہمیشہ انکے گلہ گزار ہوتے ہیں۔

جب کوئی مرد کسی نوجوان لڑکی سے والہانہ محبت کر رہا ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ لڑکی کو فریب دے رہا ہے۔ مردوں کو نوجوان لڑکیوں کے پھانسنے کا فن خوب آتا ہے۔ یہ لوگ سادہ لوح اور ناتجربہ کار لڑکیوں کو پھانس کر خوب مزے اڑاتے ہیں اور بعد میں ان پر کوئی بہتان رکھ کر ان سے ترک تعلق کر لیتے ہیں۔

وہ عورت بہت خوش نصیب ہوتی ہے جو کسی بچے کی ماں بن جاتی ہے۔ بچے والی عورتوں کو مرد بہت کم طلاق دیتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ پھر وہ عورتوں سے محبت کرنے لگتے ہیں بلکہ محض اس خیال سے کہ ان کو اپنے بچے کے لئے اتنی اچھی دایہ اور آیا اس طرح مفت نہیں مل سکتی۔

اگر کسی عورت کے ہاتھ سے دو روپے کا بھی نقصان ہو جاتا ہے تو مرد کہتا ہے۔ تم کتنی احمق ہو، تم میں ذرا کو بھی عقل نہیں۔ لیکن مرد ہزاروں روپے کھو کر کچھ نہیں کہتا ہے۔ اتفاق ہی ایسا تھا۔ قسمت ہی میں یہ نقصان لکھا ہوا تھا۔ یعنی عورت سے جو نقصان ہوتا ہے وہ اس کی بے وقوفی کا نتیجہ ہوتا ہے اور مرد سے جو نقصان ہوتا ہے وہ قسمت کی زیادتی سے ہے۔"

یہ سچ ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، مشرق و مغرب میں فرق ہے لیکن ہندوستانی مردوں کو اس مقالہ میں ضرور پڑھنا چاہئے کہ فرانسیسی عورت کے جو خیالات نقل کئے گئے ہیں وہ یوروپ کی عورتوں کے خاص ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کے دماغ میں وہ خیالات پیدا نہیں ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ عورتیں یوروپ کی ہوں یا ہندوستان کی، عورتیں ہیں اسلئے یوروپ کی عورتوں کے دماغ میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ کم و بیش وہی خیالات ہندوستانی عورتوں کے دماغ میں پیدا نہ ہوں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب فرانسیسی خاتون کے پیش کئے ہوئے مردوں کے نقشے سے ہندوستانی مردوں کے حلیے سے ملتے ہوئے ہوں۔

ایکبار ایک عورت نے "لیڈیز جرنل" میں ایک مضمون شائع کرایا تھا جس کا عنوان تھا۔ "مردوں سے محبت کی امید نہ رکھو" اس مضمون سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے کہ عورتوں کا نظریہ مردوں کے متعلق کیا ہے۔

مضمون کا ماحصل یہ ہے:۔

"شادی شدہ عورتوں کی فطری خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کے شوہر ان سے والہانہ محبت کریں لیکن ایسی خوش قسمت عورتیں بہت کم ہوتی ہیں جن کے شوہر محبت پرست ہوتے ہوتے ہوں۔ علی العموم عورتوں کو اپنے اس جذبے کا خون کرنا پڑتا ہے یا بحالت مایوسی عورتیں مردوں سے ترک تعلق کر لیتی ہیں۔

عورت محبت کو ایک قابل قدر متاع سمجھتی ہے اور اس کیلئے وہ اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے لیکن یہ متاع گراں بہا مشکل ہی سے کسی عورت کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ عورت بڑی خوش نصیب ہے جسے محبت پرست شوہر مل جائے ورنہ عام طور پر مرد محبت کے پیش نظر نہیں بلکہ کسی اور ہی غرض سے شادی کرتے ہیں علی العموم شادی کرنے سے مردوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ انہیں ایک ایسا رفیق مل جائے جو ان کے خانگی امور کو بوجہ احسن سرانجام دے سکے۔ اور ان کیلئے ہر طرح کی راحت و آرام کی مہیا کر سکے اور ان کے توالد و تناسل کو قائم رکھ سکے۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں سے محبت کو دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

محبت اغراض و نفسانیت سے پاک ہوتی ہے لیکن شادی کی بنیاد ہی اغراض و نفسانیت پر ہے۔ اسلئے شادی شدہ عورتوں کا مردوں سے محبت کی امید رکھنا غلط ہے۔ عورتوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ محبت کیلئے بہت کم شادی کی جاتی ہے۔ عام طور پر شادی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں مل کر زندگی کے نظام کو چلا سکیں۔

شادی سے پہلے عموماً مرد اپنی بیویوں سے اظہار محبت کرتے ہیں۔ اسلئے شادی کے بعد عورتیں محبت کی خواستگار ہوتی ہیں لیکن عورتوں کو بہت جلد پتہ چل جاتا ہے جسے وہ سچی محبت سمجھتی تھیں وہ محبت کا ایک ڈرامہ تھا۔ چند روز کے بعد محبت ختم ہو جاتی ہے اس لئے کہ مرد محبت کے نام سے جن جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ فی الحقیقت جذبات محبت تو ہوتے نہیں، نفسانیت کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

طلاق کے واقعات زیادہ تر انہیں مردوں اور عورتوں کے درمیان رونما ہوتے ہیں۔ جو ابتدا میں محبت کے مدعی ہوتے ہیں لیکن ان کی محبت سچی تو ہوتی نہیں، چند روز میں اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ اس کے بعد فطرتاً آپس میں بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔

میں عورتوں اور لڑکیوں کو متنبہ کر دینا چاہتی ہوں کہ وہ اپنے شوہروں سے محبت کی امید نہ رکھیں۔ ان کی محبت آمیز باتوں کو فریب اور دھوکہ سمجھیں۔ اسلئے کہ مرد عام طور پر محبت کے دعوے کرتے ہیں لیکن ان کے دعوے اصلیت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔

میں ایک بار پھر ہوشیار کر دینا چاہتی ہوں کہ مرد عورت سے محبت کے پیش نظر شادی نہیں کرتے بلکہ خانگی انتظام کو درست کرنے کیلئے کرتے ہیں۔ عورت مرد کے آرام کا خیال رکھے اور اس کیلئے بچے پیدا کرتے کرتے مر جائے۔ جو عورتیں اس سے زیادہ اپنے مردوں سے امید رکھیں گی انہیں مایوس ہونا پڑے گا۔"

اس مضمون میں مردوں کا جو مرقع نظر آتا ہے وہ ہندوستانی مردوں کی تصویر سے چنداں مختلف نہیں ہے۔ اب ایک امریکن خاتون کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔

"میں ان عورتوں میں سے ہوں جو مردوں کے سہارے زندگی گذارنا پسند نہیں کرتیں بلکہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اپنا سب سے بڑا فریضہ سمجھتی ہیں۔ میں پندرہ سال سے کسی مرد کے سہارے کے بغیر آرام و اطمینان سے زندگی گذار رہی ہوں۔ میں پندرہ سال کے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ جو زندگی اپنے بھروسے گذاری جاتی ہے وہ غریبانہ ہی کیوں نہ ہو بہت سکون بخش ہوتی ہے۔

زندگی کا یہ سبق مجھ کو ایک مرد ہی سے ملا۔ سنہ ۲۲ء کا واقعہ ہے۔ میں نے ایک نوجوان سے شادی کی تھی جو مجھ پر بری طرح فریفتہ تھا۔ اس نوجوان کو مجھ سے جیسی والہانہ محبت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ دوبار خودکشی کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کی یہ وارفتگی دیکھ کر مجھے مجبوراً اس سے شادی کرنی پڑی۔

سنہ ۲۲ء کے موسم بہار میں ہماری شادی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد ہماری زندگی نہایت لطف و سرور کے ساتھ گذری لیکن ہماری بہنوں کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ ہماری زندگی کا یہ کیف آخر ایک سال کے بعد ختم ہو گیا۔ میرے شوہر نے میری مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا اور یہ سمجھ کر کہ میں تو مقید ہو چکی ہوں وہ مجھے نظر انداز کرنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی اذیت ہوتی۔ میرا شوہر میری بجائے دوسری لڑکیوں کے ساتھ زندگی گذارنے میں زیادہ مسرت محسوس کرتا۔ اس نے مجھے ایک لونڈی کی طرح بے دست و پا بنا دیا۔

۱۹۲۴ء میں ہمارے تعلقات زیادہ ناگفتہ بہ حالات کو پہنچ گئے۔ ۱۹۲۵ء کی ابتدا میں میں نے طلاق لے لی۔ اس وقت میں آزادانہ زندگی گزار رہی ہوں اور خوش ہوں اور اس زندگی سے مجھے بہت نفرت ہو گئی ہے جو میں نے کسی زمانے میں اختیار کر لی تھی۔

میں مردوں کو برا نہیں کہتی۔ وہ ہماری معاشرتی زندگی کا ایک اہم جزو ہیں۔ مرد دوست کی حیثیت سے تو بہت اچھے انسان ہیں لیکن آقا یا شوہر کی حیثیت سے نہایت خطرناک ہیں۔

جب مرد یہ سمجھ لیتا ہے کہ ایک عورت اس کے جنگل میں پھنس چکی ہے تو پھر اسے عورت سے وہ دلچسپی باقی نہیں رہتی جو عورت کے جنگل میں پھنسنے سے پہلے دکھائی دیتی ہے اور جب مرد کو یہ معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ عورت اس کی دست نگر ہے تو وہ غیر ارادی طور پر اس کے ساتھ وہی سلوک کرنے لگتا ہے جو دنیا ہمیشہ غلاموں کے ساتھ کرتی رہی ہے۔ اسلئے میرا خیال ہے کہ عورتوں کو اپنی آزادانہ حیثیت برقرار رکھنی چاہئے اگر وہ ایسا نہیں کرتیں اور اپنے کو مردوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا دیتی ہیں تو یہ انکا قصور ہے

ایک اور یورپین خاتون کے خیالات ملاحظہ کر لیجیے۔ اس کا نام مسز ہاروی ہے جو ایک نامور اہل قلم ہے۔ وہ لکھتی ہے :-

مجھے ایک دو نہیں بلکہ ایسی بیشمار عورتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو مردوں کی شکوہ سنج پائی گئی ہیں۔ یوں تو کم وبیش تمام ہی عورتیں مردوں کی شکائتیں کیا کرتی ہیں لیکن بعض عورتوں سے تو یہاں تک معلوم ہوا کہ ان کے شوہر زدوکوب کو بھی کوئی گناہ خیال نہیں کرتے بلکہ عورتوں پر ظلم کرنا اپنا فطری حق سمجھتے ہیں۔

عورتوں کی اس بدنصیبی پر بہت کچھ غور وفکر کرنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچی ہوں کہ عورتیں خود بڑی حد تک اپنی اس بدنصیبی کی ذمہ دار ہیں۔ اس لئے کہ عورتوں نے مردوں کو اس طرح اپنے اوپر تسلط کر لیا ہے کہ وہ ایک حسین لونڈی بنکر رہ گئی ہیں۔ اگر عورتوں نے مردوں کو اپنے اوپر تسلط نہ کر دیا ہوتا تو عورتوں کی حالت اسقدر ناگفتہ بہ نہ ہوتی۔ عورتوں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے قول وعمل اور ہر لحاظ سے یقین دلا دیا ہے کہ مرد باعتبار انسانیت عورت پر فائق ہے۔ حالانکہ مردوں کو عورت پر کسی حیثیت سے فوقیت حاصل نہیں اور اکثر معاملات میں تو وہ عورتوں سے کہیں زیادہ پست ہیں غور کرنے کی بات ہے کہ جب ہم خود مردوں کو مغرور بنا دیں تو وہ ہمارے ساتھ ظالمانہ سلوک نہ کریں تو اور کیا کریں؟

شوہر تو شوہر ہی ہے۔ اگر کسی ملازم کو یہ پتہ چل جائے کہ اس کے بغیر مالک کا کام نہیں چل سکتا تو وہ اپنی سرکشی سے عافیت تنگ کر دیگا۔ پھر جب مردوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے بغیر عورتوں کا کام نہیں چل سکتا تو وہ عورتوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔

واقعہ یہ ہے کہ عورتوں نے خود اپنی نرمی محبت اور خدمت وایثار سے مردوں کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ عورتوں کے شریفانہ خصائص سے مرد ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ عورتیں ان خصائص کو ترک کر دیں لیکن انہیں ان خصائص کو احتیاط سے کام میں لانا چاہیئے۔

مردوں کی عادت ہے کہ وہ جا وبے جا سارا الزام عورتوں کے سر تھوپ دیتے ہیں اور عورتیں خاموشی کے ساتھ ان الزامات کو برداشت کر لیتی ہیں۔ انہیں چاہئیے کہ وہ مردوں کے بیجا الزامات کو ہرگز قبول نہ کریں اور مردوں پر ظاہر کر دیں کہ وہ ان کی بہتان بندی کی حقیقت سے ناآشنا نہیں ہیں۔

روپے پیسے کے معاملے میں میں نے دیکھا ہے کہ فضول خرچ مردوں کی بیویاں بہت تکلیفیں اٹھاتی ہیں اور اُف تک نہیں کرتیں اس طرح وہ خود اپنے شوہروں کی گمراہی کا موجب ہوتی ہیں۔ حالانکہ کرنا یہ چاہئیے تھا کہ عورتیں فضول خرچی کا جواب فضول خرچی سے دیتیں تاکہ مردوں کو پتہ چلتا کہ فضول خرچی کتنی تکلیف دہ چیز ہے۔

عورتوں میں ایثار و قربانی کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ مردوں کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتیں اور سمجھتی ہیں کہ مرد ان کی قربانیوں کو مد نظر رکھ کر ان کی قدر کرینگے لیکن انہیں معلوم نہیں کہ مرد عورتوں کے ایثار کو ایثار نہیں بلکہ فریضہ خیال کرتے ہیں۔ میرے نزدیک عورتوں کا ایثار مردوں کے گمراہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہر معاملے میں احتیاط سے کام لیں۔ ہم سے کوئی ایسا عمل ظہور میں نہ آئے جو ہمیں شوہروں کی نگاہ میں ذلیل بنانے کا موجب ہو ہمیں ہر لحاظ سے اپنے کو مردوں کے برابر بنانے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو ہمیں طے کر لینا چاہئیے کہ مردوں کی حماقتوں اور ان کی سختیوں اور زیادتیوں سے ہمیں تاقیام قیامت نجات نہیں مل سکتی۔

عام خیال یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں عورتوں کو اعتدال سے زیادہ آزادی دے دی گئی ہے اور اب تو اس آزادی کے خلاف

آوازیں بلند ہونے لگی ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ یورپ اور امریکہ کی آزادی نظام ازدواج اور نظام اخلاق ازدواج کیلئے بیحد ضرر رساں ثابت ہو رہی ہے لیکن ان ممالک کی عورتیں اپنی موجودہ آزادی پر قانع نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک یورپین خاتون "لیڈیز ہوم جرنل" میں لکھتی ہے:۔

"عورتوں کا دعویٰ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ آزادی حاصل کر رہی ہیں۔ اور ان کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہو گئے ہیں۔ ان کو اسی طرح آزادیٔ عمل حاصل ہے جس طرح مردوں کو۔ لیکن میں عورتوں کے اس دعوی کو حقیقت کی روشنی میں دیکھتی ہوں تو ازمنہ قدیم کی طرح آج بھی عورت غلام نظر آتی ہے۔

جس طرح پہلے زمانے کی عورتیں مردوں کی غلام تھیں میرے نزدیک آج بھی ہیں انہیں مغالطہ ہو گیا ہے کہ ان کو حقوق حاصل ہو گئے ہیں۔ ورنہ درحقیقت ان کی حالت قدیم زمانے کی عورتوں سے بھی زیادہ خراب ہے۔

میں نے ایک دو نہیں سینکڑوں بال بچوں والے گھروں کا مطالعہ کیا ہے۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ عورت بدستور غلام ہے مجھ کو ایسا ایک گھر نہیں ملا جس میں عورت کی حکومت ہو۔ ہر گھر میں مرد ہی حکمران نظر آئے۔ شوہر کی مرضی کے مطابق بچوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ وہی اپنی پسند کے مطابق گھر کا انتظام کرتا ہے۔ اگر عورت ذرا بھی مرد کے مزاج کے خلاف کرتی ہے تو خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے مجھے بیشمار گھرانوں کے اندرونی حالات معلوم ہیں مرد سر سے پیر تک آوارہ ہیں۔ آزادانہ شراب پیتے ہیں۔ غیر لڑکیوں کے ساتھ عیش کرتے ہیں۔ بیہودہ اور لایعنی تفریحات پر بیوی بچوں کا حق قربان کر دیتے ہیں لیکن عورتوں میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ اپنے مردوں کے خلاف قدم اٹھا سکیں۔ یہ عورتوں کی غلامی نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر عورتوں کو آزادی مردوں کے برابر حاصل ہوتی تو وہ اپنے آوارہ شوہروں سے اسی طرح باز پرس کرتیں جس طرح مرد عورتوں سے جواب طلب کرنے کے عادی ہیں۔

مجھ کو جس گھر میں بھی جانے کا اتفاق ہوا میں نے دیکھا۔ مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے وہ اچھا کھانا اچھا پہننا اور آرام و آسائش کی زندگی گذارنا اپنا فطری حق سمجھتا ہے۔ خواہ اس کی بیوی کو اچھی خوراک اور اچھی پوشش میسر ہو یا نہ ہو۔ آخر مرد کی اس فوقیت کے کیا معنی ہیں۔ یہی نہ کہ مرد اپنے کو آقا اور عورت کو غلام خیال کرتا ہے۔

حقیقت تو یہی ہے کہ زمانہ قدیم کی طرح اب بھی مرد عورت کو غلام رکھنا چاہتا ہے مگر اپنی اخلاق سے گری ہوئی حالت پر پردہ ڈالنے کے لئے کہتا ہے کہ ہم نے عورت کو آزادی دیدی ہے مگر باعتبار حقیقت یہ آزادی عورتوں کی قدیم غلامی سے بھی بدتر ہے۔

میں ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جو مردوں کے تفوق اور خود سری کو برداشت نہ کر سکیں اور ان کو اپنے شوہروں سے طلاق لینی پڑی۔ بہرحال یہ عورتوں کی بدنصیبی ہے کہ وہ اس دور آزادی میں بھی غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں"

آیئے ایک ہندوستانی دوشیزہ کے خیالات بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مس کیلاش کماری دیوی لکھتی ہے:۔

"صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی صنف نازک نے اس دور آزادی میں یہ صدا بلند کی ہے کہ مردوں کو عورتوں کی انفرادیت اور شخصیت تسلیم کرنی چاہیئے۔ طبقۂ نسواں بالخصوص ہندوستانی عورتوں پر زمانہ دراز سے مظالم ہوتے آ رہے ہیں۔ وہ ہر طرح کمزور و ناتوان اور مردوں کی محکوم بنا دی گئی ہیں۔ مردوں نے انہیں لونڈی اور اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ یہاں تک کہ عورتیں بھی ایک زمانے تک اپنے کو لونڈی اور شوہر کو دیوتا سمجھتی رہیں لیکن آگے چل کر عورت کے دل میں بھی آزادی اور حمیت و خودداری کا جذبہ پیدا ہوا اور اس نے یہ سمجھ لیا کہ وہ مردوں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی نہیں بلکہ ان کی شریک و سہیم ہے۔

اوسط درجہ کے گھروں کی عورتوں سے نچلے طبقے کی عورتوں کی حالت کہیں اچھی ہے وہ اقتصادی حیثیت سے مردوں کی محکوم نہیں ہیں۔ اور شوہر سے ان بن ہونے کی صورت میں بے تکلف ہو کر اس سے ترک تعلق کر لیتی ہیں۔ اس کے برعکس درمیانی درجے کے مردوں پر تو سماج کی اتنی مہربانی ہے کہ وہ بیوی کے زندہ رہتے ہوئے جتنی شادیاں چاہیں کر لیں لیکن اگر کسی مرد کو شبہ بھی ہو جائے کہ اس کی بیوی کے دل میں کسی غیر مرد کی برائے نام بھی عزت و توقیر ہے تو پھر بیوی کی شامت ہی سمجھئے، سماج کی نظر میں بھی وہ آوارہ اور آبرو باختہ قرار دے دی جائیگی۔ آج شادی اس غرض سے نہیں کی جاتی کہ زندگی کے سفر کو آزادی، تعاون، اور قلبی رفاقت کے ساتھ طے کیا جائے۔ ازدواجی رشتہ اس اعلیٰ النصب العین سے گر کر سودے اور کاروبار کے درجے میں آ گیا ہے۔ مردپیسے کے بے روح فریم میں ہم عورتوں کے آزاد فطری جذبات و احساسات کی تصویر جڑنی چاہتے ہیں۔

لیکن موجودہ تعلیم کی امداد سے عورتوں نے اپنے حقوق اور انسانی ذمہ داریوں کے سمجھنے

کی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اگرچہ ابھی اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ عورتوں میں اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہوا ہے کہ وہ ڈنکے کی چوٹ سماج کو ٹھکرا کر اپنے جذبات و احساسات کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ پھر بھی جن عورتوں میں مغربی تہذیب اثر انداز ہو چکی ہے۔ وہ سماج کے قدیم رسم و رواج کو توڑ رہی ہیں۔ عہد حاضرہ کی عورت ذہنی ترقی کرنا چاہتی ہے۔ ازدواجی سسٹم میں اصلاح کی طالب ہے اور سماج کے مظالم اور سماج کے بے ہودہ ضابطوں کو ختم اور زیر و زبر کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

یہ ایک ہندوستانی دوشیزہ کے خیالات کا نمونہ تھا۔ اس کے دیکھنے سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرد کے متعلق ہندوستانی عورت کا نظریہ یورپ اور امریکہ کی عورتوں کے نظریہ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

گنگا کے کنارے!

از جناب
سردار جلیل شیرکوٹی
بی۔ اے

(حضرت نظر حیدرآبادی سے معذرت کے ساتھ ———— س۔ ج۔ ش)

اے پیکرِ رنگین تری یاد کے مارے   کھویا ہوا بیٹھا ہوں میں گنگا کے کنارے
بتلاؤ تو کب لوٹ کے تم آؤ گے پیارے؟
—— گنگا کے کنارے ——

ہر شام و سحر چلتی ہیں مستانہ ہوائیں   رنگین ہوا کرتی ہیں رنگین فضائیں
یہ کیف میں ڈوبے ہوئے دلچسپ نظارے
—— گنگا کے کنارے ——

اب مجھ سے تو کٹتی نہیں فرقت کی یہ راتیں   یاد آتی ہیں رہ رہ کے وہ بھولی ہوئی باتیں
اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ معصوم اشارے
—— گنگا کے کنارے ——

مرضی ہے تمہاری کہ بنو یا کہ مٹاؤ   للہ! مگر دل سے نہ اس طرح بھلاؤ
روشن ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے
—— گنگا کے کنارے ——

بکھرے ہوئے ہر سمت ہیں ظلمات کے گیسو   اُمڈے چلے آتے ہیں مری آنکھوں میں آنسو
مدھم سی شعاعوں سے چمکتے ہیں ستارے
—— گنگا کے کنارے ——

یہ ہجرِ مسلسل یہ تری یاد کا عالم   اشکوں کی جھڑی اور دلِ برباد کا عالم
پھروں کوئی روتا ہے غم و درد کے مارے
—— گنگا کے کنارے ——

موجوں سے قمر کرتا ہے سر بات اشارے   بھیگے سے ہیں فرقت میں یہ رنگین نظارے
بتلاؤ تو کب لوٹ کے تم آؤ گے پیارے؟
—— گنگا کے کنارے ——

فلسفۂ محبت!

از نتیجۂ فکر سید محمد اطہر صاحب اطہر
نیا بازار چھیرہ

ساجن! مجھے تم سے محبت ہے! شدید۔ بے لوث محبت!! مست بھونرے کی طرح۔ ہمارا دل تمہاری طرف اس طرح کھنچتا ہے جیسے پروانہ شمع کی طرف۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ تم کو بھی مجھ سے محبت ہو؟

برسات کی اندھیری راتوں میں جبکہ بجلی کی چمک دل کو بید مجنوں کی طرح کنپا دیتی ہے جب بادل کی گرج شیروں کے دل کو دہلا دیتی ہے اسوقت دل یہی چاہتا ہے میں تمہیں اپنے سینہ کے اندر چھپا لوں۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ ایسے وقت میں تمہیں بھی میرا خیال ہو۔

اکثر پچھلے پہر رات کو میں یکایک خواب سے چونک پڑتی ہوں گھبرائی ہوئی سراسیمہ...!! اپنے پہلو میں نظر جماتی ہوں۔ کمرے کے ہر گوشے کو تکتی ہوں کہ جیسے کوئی چور گھس آیا ہو! ..... اور میری کوئی قیمتی چیز میرے پہلو سے اُٹھا کر لے بھاگا ہو..... دل میں ایک خلش اور میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے۔ معاً تمہاری بھولی بھالی تصویر میرے سامنے آجاتی ہے ..... اور میں.... اپنے دل کی دھڑکن کو آنسوؤں کے چھینٹوں سے تسکین دے لیتی ہوں..... پھر یہ کیا ضرور ہے کہ تم بھی کبھی میرے لئے اپنی نیند حرام کر دو!

آہ! .... میں تم سے محبت کرتی ہوں!! کیسی محبت؟...... جیسی بھونرے کو گلاب کی کلی سے!.... پروانہ کو شمع سے! ..... چکور کو چاند سے!..... مگر آہ!.... تم میری ساری محبت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی خاموش کیوں بیٹھے ہو؟

سجنی! میں خاموش ہوں .... یہ سمجھ کر خاموش ہوں...... کہ اگر گلاب کی کلی خود بھونرے کی کھوج میں پھرنے لگے تو بھونرے کی تڑپ مفقود ہو جائے!........ شمع اگر لپک لپک کر پروانوں کو جلانے لگے..... تو پروانوں کے جل مرنے کا اشتیاق کافور ہو جائے!.... ... اگر چکور کو چاند ہاتھ آجائے تو اس کے فراق میں تڑپنے کا مزہ کس طرح پائے؟

میں تمہاری محبت کے جواب میں خاموش ہوں .... اس لئے کہ ڈرتا ہوں...... جب میں تم سے محبت کرنے لگوں گا۔ تم مجھ سے محبت کرنا بھول جاؤ گی!!

جانِ بہار!

از جناب سردار الہام (عثمانیہ)

وہ مسکراتے مناظر وہ چاندنی راتیں
وہ مست مست جوانی وہ عشق کی گھاتیں
فضا میں گم ہوئی جاتی ہیں رانکی باتیں
—— گلِ مراد کو پژمردگی سے کام نہ تھا
—— خوشی کے واسطے ماتم کا التزام نہ تھا
—— حیات قید کا پابندیوں کا نام نہ تھا

وہی حسین مناظر ہیں آبشار وہی
وہی گلوں کا تبسم ہے اور بہار وہی
وہی سہانی فضائیں ہیں لالہ زار وہی
—— مگر وہ ربطِ دل ہی نہیں وہ گیت نہیں
—— جفا شعار زمانے کی پریت ریت نہیں
—— جہاں میں کوئی بھی اے جاں کسی کا میت نہیں

تجھے سماج نے جانِ بہار چھین لیا
کہ میرے دل کا سکون و قرار چھین لیا

سائنس کی دُنیا!

خبر رسانی کے متعلق سائنس کے کارنامے

اخباروں کی خبر رسانی کے متعلق ایک حد درجہ معلوماتی مقالہ

عہدِ حاضرہ میں خبروں کی بہم رسانی میں جس حیرت انگیز اہتمام اور سرگرمی کا ثبوت دیا جا رہا ہے اس کی جانب بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہوگی۔ جن اخباروں کا خبری اہتمام مکمل ہے وہ کل کی تمام دُنیا کی خبریں آج کی اشاعت میں شائع کر دیتے ہیں اور کتنی خبریں روز کی روز معرضِ اشاعت میں آ جاتی ہیں۔ جبر کیا یہ قابلِ غور بات نہیں ہے کہ پہر دوپہر کی ہزاروں میل دور مقامات کی خبریں کیونکر اخبارات کے دفاتر میں پہنچتی ہیں۔ اور شائع ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ہندوستان کا حال ہے یورپ کے اخبارات اس سے بھی کم وقت میں خبریں شائع کرا دیتے ہیں۔

سوا سو سال پہلے اچھے اچھے اخبارات میں بھی جن کی خبر رسانی کے وسائل و ذرائع اعلیٰ درجے کے ہوتے تھے۔ آٹھ آٹھ اور دس دس روز بعد خبریں شائع ہوتی تھیں اور بعض خبروں کی اشاعت میں تو مہینوں کا وقفہ ہو جاتا تھا نیلسن کے نیل ساحل کی فتح کی خبر انگلستان میں تین ہفتے بعد پہنچی تھی۔ اور اس کی تصدیق و تحقیق میں مزید دو ہفتے صرف ہوئے تھے۔ نیل ساحل کی جنگ کے اختتام کے بعد ایک مہینہ گزر گیا اور انگلستان کی پبلک کو صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ میدان انگریزی سپاہ کے ہاتھ رہا۔

ملکہ این کے عہدِ حکومت میں حکومت میں برطانوی فوج نے مارلبارو کے میدان میں فرنچ اور اسپینش افواج کو شکست دی۔ اس خوش آئند خبر کے پہنچانے کیلئے کرنل پارک گھوڑے پر سوار ہو کر دریائے ڈینیوب کے ساحل سے سمندر کے کنارے کی طرف سرپٹ بھاگا۔ وہاں سے وہ بادبانی جہاز پر سوار ہو کر کئی روز بعد انگلستان پہنچا۔ لیکن ہر طرح کی امکانی کوششوں کے باوجود وہ اس فتح کی خوشخبری آٹھ روز کے بعد لندن والوں کو سنا سکا۔

لیکن آج سائنس کی ایجادات و اختراعات کی بدولت ہزاروں میل دُور کی خبریں کس آسانی کے ساتھ وقت کے وقت بھیجی جا سکتی ہیں اس کا اندازہ آپ اس مثال سے فرمائیے کہ لندن کے ایک اخبار کا نمائندہ واشنگٹن میں ٹیلیفون پر بیٹھا ہوا اپنی آنکھوں کے سامنے کے منظر کی رپورٹ اخبار مذکور کے دفتر واقع لندن کو اس طرح بھیج رہا ہے۔

"کھڑکی کے سامنے جہاں تک سڑک نظر آ رہی ہے آدمی ہی آدمی بھرے ہوئے ہیں۔ کہیں تل دھرنے کو جگہ خالی نہیں ہے۔ ہر طرف رنگ برنگ کے جھنڈے لہرا رہے ہیں جیسے جیسے جلوس قریب آتا جا رہا ہے لوگ پرجوش نعروں سے اس کا استقبال کر رہے ہیں"

دُنیا کے ایک گوشے میں میچ ہو رہا ہے اور دوسرے گوشے میں بسنے والوں کو چند منٹ کے اندر اندر پتہ چل جاتا ہے کہ کس کھلاڑی نے کیا غلطی کی؟ کیا کھلاڑی نے کیا کمال دکھایا۔ کس کو تماشائیوں نے سب سے زیادہ پسند کیا۔

جہاں تک اخبارات اور خبر رسانی کو تعلق ہے چین کو تمام ممالک میں شرفِ اولیت حاصل ہے۔ اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے چین میں "پیکنگ نیوز" کے نام سے ایک اخبار جاری ہوا جو ۱۹۳۵ء تک برابر نکلتا رہا۔ چین جاپان جنگ کے باعث ۱۹۳۵ء میں اسکی اشاعت بدرجہ مجبوری بند کر دینی پڑی۔ عہدِ قدیم کے چینی اخباروں کو زیادہ تر سرکاری حکام ہی پڑھتے تھے۔ شروع شروع میں وہ بہت مہنگے فروخت ہوتے تھے۔ اسلئے بہت سے افسر کرائے پر اخباروں کا مطالعہ کر لیا کرتے تھے یہ اخبارات بڑی حد تک گزٹ کی قسم کے ہوتے تھے۔ ان میں سرکاری اطلاعات، شاہی فرمانات، وزراء کے اعلانات اور باشندگانِ چین اور ممالکِ غیر میں بسنے والے چینیوں کے حالات شائع ہوا کرتے تھے۔ دوسرے ملکوں کی خبروں کی اشاعت کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔

یورپی ملکوں میں بھی دو ڈھائی سو سال پہلے خبروں کی بہم رسانی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ انگلستان کے اخبارات غیر ملکی خبریں براہِ راست بہت کم منگوایا کرتے تھے۔ غیر ملکی ڈاک ہفتہ میں دو بار آتی تھی۔ لیکن اسکی ڈلیوری میں عموماً بہت دیر ہو جایا کرتی۔ پوسٹ آفس کے کلرک پہلے ان اخباروں کو خود پڑھتے۔ پھر اہم خبروں کا انگریزی

میں مختصر ترجمہ کرتے۔ اپنی اس خدمت کے عوض
لندن کے ہر ایک اخبار والوں سے یہ کلرک
ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ معاوضہ لیا کرتے تھے۔
لیکن اس سلسلے میں روپوں کے لالچ میں آکر
ان کلرکوں نے رشوت لینی شروع کردی۔ گہری
رقم لے کر کسی اخبار کے پاس اہم خبریں پہلے بھیج
دیتے اور اس کے مقابل کی خبریں دبا لیتے۔ اس
قسم کی کارروائیوں کیلئے یہ تین ہزار روپیہ سالانہ
وصول کرتے تھے۔

غیر ملکی بندرگاہوں کی ناکہ بندی کے سبب
۱۸۱۱ء میں ڈاک کے ذریعہ غیر ملکی خبروں کا آنا
بالکل بند ہوگیا جس سے صحافتی دنیا میں ایک
کھلبلی سی مچ گئی۔ سرکاری دفاتر میں غیر ملکوں سے
خبروں کے رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔
بالآخر یہ طے پایا کہ سراغرساں مقرر کئے جائیں
جو خفیہ طور پر دوسرے ملکوں سے خبریں حاصل
کرکے یہاں لے آئیں۔

۱۸۳۴ء میں جب "ٹائمس" نے خبر رسانی
کیلئے "غیر معمولی ایکسپریس" کا انتظام کیا تھا۔
یعنی تیز گھوڑے والی ڈاک گاڑیوں کا سلسلہ
قائم کیا تھا۔ ٹائمس کے ایڈیٹر نے اس کے
متعلق اپنے رپورٹر کو حکم دیتے وقت کہا تھا
"لیکن ۱۳ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگتی
ہوئی ڈاک گاڑی میں بیٹھ کر رپورٹ لکھنا
ناممکن نہیں ہے"۔

۱۸۳۴ء کے اسی قسم کی ڈاک گاڑی کے
ذریعہ سفر کرنے والے ایک رپورٹر کا حال سنئے
وہ لکھتا ہے:۔

"راستے میں اتنے زور کا طوفان آیا کہ ہماری
گاڑی کے دونوں لیمپ بجھ گئے کچھ اور آگے
بڑھنے پر راستے میں کھڑی ہوئی ایک دوسری
گاڑی سے ہم بری طرح ٹکرا گئے۔ گاڑی کے
دونوں پہیے ٹوٹ گئے۔ اور ہم بمشکل اگلے
پڑاؤ پر پہنچے۔ پیچھے ہمارے حریف اخبار کے
رپورٹر کی گاڑی آرہی تھی۔ ایک لمحہ کی دیر کئے
بغیر ہم نے پڑاؤ کے جمعدار سے دوسری گاڑی
مع تازہ گھوڑوں کے کرایہ پر لی۔ اور آگے
بڑھے۔ پڑاؤ پر اور کوئی دوسری گاڑی نہ تھی
اور نہ دوسرے گھوڑے ہی تھے۔ اس لئے ہمارے
حریف کو تیز گھوڑے نہ مل سکے۔ اور وہ ہم
لوگوں کے دو گھنٹے بعد لندن پہنچے اور اس
وقت یہاں کی خبریں باسی ہوچکی تھیں"۔

لیکن آج کا رپورٹر جلسے وغیرہ پر شارٹ ہینڈ
میں تقریر کو لکھ کر اپنے کمرے میں جاکر کرسی پر
بیٹھے ہی بیٹھے ٹیلیفون کے ذریعہ سینکڑوں میل
کی دوری پر واقع ادارتی صیغے کے دفتر کو اپنی
مفصل رپورٹ بھیج دیتا ہے۔ پھر بھی خبروں
کے جمع کرنے اور انہیں ادارتی آفس پر پہنچانے
کیلئے کبھی کبھی حریف اخباروں کے نمائندوں
کو گہری چالوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ کچھ روز
ہوئے مسٹر ای ایس آئنگر نے دلی ریڈیو براڈ
کاسٹنگ اسٹیشن سے تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا
کہ کس خوبی سے انہوں نے اگست ۱۹۳۱ء
میں شملہ میں اس خبر کا پتہ لگایا تھا کہ مہاتما گاندھی
نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کرنے کا اٹل
ارادہ کرلیا ہے۔

آپ نے بیان کیا کہ شملہ سے بمبئی جانیوالی گاڑی
کے چھوٹنے میں صرف دو گھنٹے کی دیر تھی۔
پھر بھی ہم میں سے کسی کو اب تک خبر نہیں مل
سکی تھی کہ گاندھی جی نے لندن جانا طے کرلیا ہے۔
یا نہیں؟ وائسریگل لاج یا ہوم ڈیپارٹمنٹ
سے تمام جگہوں پر مخبر پاشی کی مگر کہیں دال نہ
گلی۔ بیسیوں اخباری رپورٹر نہایت پریشانی حالت
میں ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔ مہاتما جی
رائے بہادر موہن لال کے بنگلے میں بیٹھے ہوئے
تھے۔ میں مقصد برآری کی کوئی صورت نہ دیکھ کر
قدرے مضمحل صورت بنائے موہن لال کے بنگلے کی
طرف چلا۔ میرے دوسرے ملنے جلنے والے
بھی وہاں بیٹھے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ
ایک پیالی چائے پی۔ اتنے میں مسٹر دیوداس
گاندھی نے آکر پوچھا "کیوں بھائی کسی کو انگلینڈ
کی سردی کا تجربہ ہے؟" میرے لئے صرف
یہی ایک سوال بہت سی کشمکشوں کا حل ثابت
ہوا۔ میں نے فوراً طے کرلیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔
لندن اور دوسرے مقامات پر بھیجنے کیلئے میں نے
فوراً ہی ٹیلیگرام مرتب کرلیا۔ صرف دو ایک
اشاروں کی اور ضرورت تھی۔ کچھ دیر بعد رائے بہادر
موہن لال نے گاندھی جی سے پوچھا "کیا شام
کی پرارتھنا کیلئے انتظام کیا جائے؟"

گاندھی جی نے جواب دیا "شاید اس کی ضرورت
نہ ہوگی"۔ یہ جملہ بھی میرے مذکورہ مقصد کی معلومات
میں اضافہ کرنے والا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد روشنی
کی ایک ہلکی کرن دکھائی دی۔ گاندھی جی کی پارٹی
میں سے آکر کسی نے پوچھا "آپ میں سے کسی
کے پاس بینیٹی کوٹ تو نہیں ہے؟"

میں نے اب دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ فوراً
چپڑاسی کو ٹیلیگرام آفس دوڑایا کہ میرے تار کو سستے
ریٹ پر وہ روانہ کرے۔ میں نے تار میں لکھا تھا
"گاندھی جی اور وائسرائے سے خاص مسائل
پر سمجھوتہ ہوگیا ہے۔ گاندھی جی طے شدہ طور
پر آج شام کو لندن کیلئے روانہ ہورہے ہیں"۔

تقریباً ۱۵ منٹ میں بجلی کی طرح یہ خبر
میرے حریف رپورٹروں میں پھیل گئی۔ وہ ٹیلیفون
پر دوڑے مگر لائن خالی نہ تھی۔ اس کے نتیجے
کے طور پر میری ارسال کردہ خبر دوسرے رپورٹروں
کی خبر کے مقابلے میں ۴۰ منٹ پہلے لندن میں
پہنچی۔ وہاں کے سہ پہر کے اخباروں میں
بڑے بڑے عنوانات سے یہ خبر شائع ہوئی۔
اور لندن آفس سے اسی روز میری جلد بازی

موسمِ سرما کے لئے

پانچ بہترین غذائیں

از ڈاکٹر ایچ سی ہنکل

اس مضمون میں طبی نقطۂ نگاہ سے پانچ ایسی سبزیاں اور ترکاریاں پیش کی گئی ہیں جو کسی خطرے یا ہنگامی ضرورت کے وقت غذاؤں کا کام دے سکتی ہیں۔ یہ سب تازہ قدرتی حیاتینوں اور ضروری نمکیات وغیرہ سے مالا مال ہوتی ہیں ــــــ

جن نباتی غذاؤں کی سفارش میں نے ذیل میں کی ہے وہ ایسی ہیں جو ہندوستان کے ہر حصے میں پیدا ہوتی ہیں اور وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے ہر جگہ پیدا کی جا سکتی ہیں۔ ان سے ان اجزا کی کمی بھی پوری ہو جاتی ہے جن کا فقدان مختلف غلوں اور دالوں میں ہوتا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:ــ (۱) خیارین (کھیرا اور ککڑی) (۲) گاجر (۳) پیاز (۴) ساگ (۵) ٹماٹر۔

آپ پوچھیں گے کہ ان ہی پانچ چیزوں کو مخصوص کیوں کیا جائے اور وہ کون سے غذائی اجزا ہیں جو ان کے ذریعے سے بہم پہنچائے جا سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں ان چیزوں کے خواص اور اجزائے ترکیبی پیش کرتا ہوں۔ مکمل غذائیت کیلئے کیلسیم اور لوہے کے علاوہ دوسرے جماداتی نمکوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے، لیکن قدرت نے غذا کی ترکیبوں میں یہ انتظام رکھا ہے کہ جن نباتاتی غذاؤں کے ذریعہ سے ہم یہ دو چیزیں حاصل کر لیتے ہیں۔ ان میں دوسرے جماداتی نمک بھی کچھ نہ کچھ مقدار میں مل جاتے ہیں اسلئے غذاؤں کے انتخاب کا کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

ساگ۔ ہندوستان میں متعدد اقسام کے ساگ پیدا ہوتے ہیں اور کھائے جاتے ہیں۔ یہ "سبز پتوں والی" غذا اس لئے اہم ہے کہ اس میں طاقت بخش لوہے کی ایک کثیر مقدار موجود ہوتی ہے جو خون کے سرخ ذرات بناتی ہے۔ ان ساگوں میں حیاتین "ا" حیاتین "ب" اور حیاتین "ج" بھی ہوتے ہیں اور یہ اجزا انسان کے اعصاب کو قوی کرتے ہیں۔ ہاضمہ کو امداد پہنچاتے ہیں۔ متعدی امراض سے محفوظ رکھتے ہیں اور زخموں کو اچھا کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں سرسوں کے ساگ، پالک اور شلغم کے اوپری پتوں کو نہیں بھولنا چاہئے۔ سرسوں کے ساگ میں گندھک زیادہ ہوتی ہے جو جلدی امراض کے لئے مفید ہے۔ ساگوں کو صرف اتنے ہی پانی میں پکانا چاہئے جو ان کو دھونے کے وقت پتوں میں لگا رہ جاتا ہے۔ انہیں بیس منٹ سے زیادہ نہ پکائیے اور جو پتے بہت نرم اور لطیف ہوں ان کو کچا بھی کھا لیجئے۔ غذا میں دودھ کی اہمیت کے متعلق کتنے مضامین آپ نے پڑھے ہونگے ــــ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ دودھ میں یہی سبز پتے "خوش ذائقہ محلول" کی صورت میں ہوتے ہیں کچے ساگوں سے بہتر دودھ کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔

گاجر کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں زرد نباتاتی رنگ کا "کیروٹین" ہوتا ہے جو حیاتین "ا" سے مل کر ایک بہترین مرکب بناتا ہے۔ عام ہندوستانی غذاؤں میں حیاتین "ا" کی کمی ایک اہم غذائی مسئلہ ہے۔ اس کمی کو گاجریں باحسن وجوہ پورا کر دیتی ہیں۔ اور اس اعتبار سے وہ دودھ اور روغن ماہی سے بہت ملتی جلتی چیز ہیں۔ کچی گاجروں کا رس اگر ساگ اور ٹماٹر کے رس میں ملا کر استعمال کیا جائے تو بہت مفید اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ گاجر میں کیلسیم کا بھی بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ ہر انسان کے جسم کو روزانہ دس گرین کیلسیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقدار کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں ڈھائی سیر گیہوں کام میں لانے پڑیں گے لیکن گاجروں کے صرف آدھ سیر وزن سے دس گرین کیلسیم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کیلسیم کی مقدار کے لحاظ سے نصف سیر ساگ بھی ڈھائی سیر گیہوں اور چاولوں کے برابر ہے۔

پیاز۔ پیاز کے "نباتاتی خاندان" میں مختلف اقسام کی پیازیں اور لہسن وغیرہ شامل ہیں جو پیاز عام طور پر ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے اس کا وطن مغربی ایشیا ہے۔ اس لئے یہ مشرق کی قدرتی غذاؤں میں شامل ہے۔ دوائی حیثیت سے پیاز اور اس کے رس کی اہمیت مسلم ہے۔ یہاں ہم صرف اس کے غذائی پہلو سے بحث

کریں گے۔ صرف چھ چھٹانک پیاز دس گرین کیلسیم روزانہ مہیا کر سکتی ہے۔ اس میں گندھک اور مینگنیز کے بیش قیمت نمکوں کی کافی مقدار موجود ہوتی ہے اگر پیاز کچی کھائی جائے تو اس سے ایک قسم کی ریڈیائی شعاعیں جسم کو ملتی ہیں جو ماورا بنفشی شعاعوں سے بہت مشابہ ہوتی ہیں

ٹماٹر ۔ ہماری سبزیوں میں ٹماٹر غذا کی حیثیت سے ایک بہت ہی بیش بہا چیز ہے مشرق میں پہلے ٹماٹر کو پسندیدہ غذا نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن مغرب میں یہ بہت دنوں سے ہر دلعزیز ہے اور اب جدید تحقیقات سے اس کی ہر دلعزیزی کا سبب بھی معلوم ہو گیا ہے۔ وٹڈل نے ثابت کر دیا ہے کہ خشک ٹماٹر کے ½ اگرین رن میں اتنا حیاتین "ا" ہوتا ہے کہ چوہوں کے نشو و نما کیلئے کافی چربی مہیا کرتا ہے۔ انسان کے مسئلہ غذائیت پر اس نظریہ کو عائد کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر ہم ۳ سے ۴ اونس تک تازہ ٹماٹر یا ½ ا اونس خشک ٹماٹر استعمال کئے جائے تو اس کو حیاتین "ا" کی صورت میں مکھن کا کافی بدل مل جائے گا۔ ٹماٹر میں حیاتین "ب" حیاتین "ج" پوٹاسیم سوڈیم، کیلسیم اور لوہا بھی کافی مقدار میں موجود ہوتا ہے۔

کھیرا ۔ ککڑیاں اور کھیرے دو ہزار سال سے ہر ملک میں انسان کی پسندیدہ غذاؤں میں داخل ہیں۔ یہ کچے بھی کھائے جاتے ہیں اور ترکاری کی طرح پکا کر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ کھیرے کے اجزائے ترکیبی ایسے ہیں جو پیشاب لاتے ہیں اور زہریلے مادوں کو صاف کرتے ہیں۔ کھیرے کے رس میں اگر گاجر، چقندر اور ساگ کا رس ملا کر پیا جائے تو گٹھیا کے مرض میں بھی فائدہ کرتا ہے ضرورت ہے کہ اس وقت دیہاتوں کی ہر غیر آباد اراضی پر یہ سبزیاں پیدا کی جائیں اور شہر کے باشندے بھی اپنے گھروں میں اور احاطوں میں ان کی کاشت کریں۔ یہ کام بھی "فرسٹ ایڈ" (پہلی امداد) کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔

"مُلاقات"!

از جناب نیساں اکبر آبادی

بہت دن کے بعد آج تم سے ملا ہوں — مسرت کی تصویر میں بن گیا ہوں
جُدا تم کو نظروں سے ہونے نہ دونگا

بہت دن میں جاگا ہے میرا مقدر — فضا ہو رہی ہے منور، منور
جُدا تم کو نظروں سے ہونے نہ دونگا

بہاریں سمٹ کر چلی آ رہی ہیں — نگاہوں میں گویا بسی جا رہی ہیں
جُدا تم کو نظروں سے ہونے نہ دونگا

نگاہوں میں جنت بھی ہے مانند ادم — وہ دل چاہتا ہے جو دل کا ہے عالم
جُدا تم کو نظروں سے ہونے نہ دونگا

تمہیں دیکھ کر ہے طبیعت بھی جولاں — مرے دل میں موج مسرت ہے رقصاں
جُدا تم کو نظروں سے ہونے نہ دونگا

شراب محبت سے بیخود رہوں میں — یہ جی چاہتا ہے کہ دیکھا کروں میں
جُدا تم کو نظروں سے ہونے نہ دونگا

کہاں پھر یہ لطف بہار محبت — کہاں پھر یہ کیف شرار محبت
جُدا تم کو نظروں سے ہونے نہ دونگا

کہاں پھر یہ صبح مسرت کا نقشا — کہاں میں کہاں پھر یہ میری تمنا
جُدا تم کو نظروں سے ہونے نہ دونگا

کہاں پھر یہ رونق کہاں یہ نظارے — کہاں پھر یہ جلوے حسین اور پیارے
جُدا تم کو نظروں سے ہونے نہ دونگا

کہاں پھر یہ گریز و دل خوش تبسم — کہاں پھر تمہارا یہ شیریں تکلم
جُدا تم کو نظروں سے ہونے نہ دونگا

اگر دور مجھ سے چلے جاؤ گے تم — مجھے اپنے جلووں سے ترساؤ گے تم

مدد پھر نگاہِ تصور سے لوں گا
میں یوں بھی جدا تم کو ہونے نہ دونگا

کردار زندگی کے طوفان میں

ایک موتیوں اور جواہرات سے بیش قیمت مقالہ

از محمد عبدالقادر صاحب فاروقی

زندگی کے طوفانوں سے بچ نکلنے کیلئے کردار ہی ایک زبردست قوت ہے۔ انسانی کردار ایک طاقت ہے، اثر ہے، وہ احباب پیدا کرتا ہے ہمدرد اور مدد کرنے والوں کی تخلیق کرتا ہے، دولت، عزت، اور سکھ چین کی شاہراہیں کھول دیتا ہے۔ بغیر کردار کے کسی بات کی رتی برابر بھی قیمت نہیں۔

اس سائنس کے دور میں کلوں، انجنوں اور دُنیا کی مختلف قوتوں کی کم سے کم پیمائش کی جا سکتی ہے۔ قوتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن انسان کی پُراسرار قوتوں کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ تھیوڈر مارک کہا کرتا تھا کہ سقراط کی قیمت جنوبی فارولینا کی بہت زیادہ ہے۔ گو وہ ننگے پاؤں پھرتا تھا اور چالیس برس کی عمر میں شادی کی تھی پھر بھی وہ ایک قابلِ تعظیم انسان تھا۔ اس نے کچھ ایسے کام کر دکھائے ہیں کہ جو بہت کم لوگوں سے ممکن تھے۔ اس نے اپنے کردار کے بل پر سارے نظریات کو ایکدم بدل دیا۔ ذہنی سوتوں کے دھارے پلٹ دیئے۔ آج ۲۳ صدیاں گزرنے پر بھی بڑے بڑے مدبر اس کا نام عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔

روس کے دارالسلطنت ماسکو سے ایک فوجی دستہ بھاگ رہا تھا۔ اس کا سردار ایک جرمن نوجوان تھا۔ اس کے اعلیٰ کردار کی بدولت سارے فوجی اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایک سرد اور برفانی رات میں یہ دستہ مع اپنے سردار کے ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں ٹھہرا۔ برف گر رہی تھی۔ ہوا نہایت تیز و تند تھی۔ یہ سب لوگ تھکے ماندے اور بھوکے پیاسے تھے سردار کو نیند لگ گئی۔ صبح وہ اپنے اوپر پڑے ہوئے گرم کپڑوں کو الگ پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ برف باری شدت کی تھی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو آواز دی۔ لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ ہوا کی سنسناہٹ میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ اس نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چاروں طرف سارے سپاہی اکڑے پڑے ہیں۔ ان کے جسم پر کپڑے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے سردار کو سردی سے بچانے کے لئے اپنے کپڑوں سے ڈھک دیا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو قربان کر کے پیارے سردار کو زندگی بخشی۔

والٹیر انہی لوگوں کو بڑا سمجھتا تھا جنہوں نے اپنی قوم کی کچھ خدمت کی ہو جن سے کسی دکھیا کا دکھ کم ہوا ہو جنہوں نے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے بے سہارا، یتیم و اسیر بچوں اور بیواؤں کی مدد کی ہو۔ اس کے نزدیک وہی لوگ قابلِ تعظیم تھے جنہوں نے روبہ تنزل قوم کو نئے نئے نظریات بتائے اور تحقیق و تجسس کے بعد ان کے لئے ترقی کی شاہراہیں کھول دیں۔ جنہوں نے سب کو اپنا بھائی سمجھ کر ان کے آرام و راحت کا سامان مہیا کیا۔ جن کا دل اپنے ہم جنسوں کی تکلیف اور درد سے پسیجتا ہو اور جو ملک و قوم اور ابنائے جنس کی فلاح و بہبود کیلئے ایثار و قربانی سے دریغ نہ کرتے ہوں سچ تو یہ ہے کہ آدمی اپنی عادتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ کیا تم اس بڑی موٹی موٹی توند والے کو ایک کامیاب انسان سمجھتے ہو؟ کیا اس توندیل کو ایک بڑا آدمی سمجھتے ہو؟ ـــ غریبوں کو چوس کر اس کے روپے جمع کرنے کی عادت سے تم واقف نہیں؟ کیا تم اس کے چہرے پر یتیم بچوں اور بیواؤں کے دکھ درد کی پرچھائیں نہیں دیکھتے؟ تم اسے انسان کہتے ہو جو دوسروں کو مٹا کر خود قائم ہو، جو دوسروں کے گھر ڈھا کر اپنی عمارت کھڑی کرے؟ لوگوں کی حق تلفی کرنے اور ان کو بے دست و پا کرنے والا انسان کیا تمہاری نگاہ میں بڑا آدمی ہے، دولتمند ہے؟ کیا کبھی وہ سکھی رہ سکتا ہے؟ جس کی رگ رگ میں خود غرضی، مکاری، عیاری اور حرص و آز ہے، جس کی شریانیں تعفن اور گندگی سے پُر ہیں۔ کیا تم خط و خال کی دلفریبی کو اس کے ضمیر کی صفائی سمجھتے ہو؟ ہرگز نہیں!! دُنیا کے کامیاب ترین انسانوں میں بہت ہی کم ایسے ہیں جن کے چہرے خوبصورت، جاذبِ نظر اور پُرسکون ہیں۔ ان کی فطرت ان کے دل میں اُمڈنے والی ترنگوں کا سایہ ان کے چہروں پر ڈال دیتی ہے۔ دل کا اضطراب اور بے چینی بشرے سے عیاں ہو جاتی ہے۔

انسانی زندگی کا مقصد کھانا پینا اور دولت جمع کرنا نہیں ہے۔ صرف اپنے بچوں کی فکر و پرداخت تو جانور بھی کرتے ہیں۔ اگر اسی کو انسانیت کا شرف سمجھا جائے تو یہ انسانیت کی ہتک ہے! شرافت کی پیشانی پر زبردست داغ ہے۔ انسانیت کے جسم پر برص (کوڑھ)

کا دھبہ ہے! دنیا کو ان لوگوں سے کیا فائدہ جو صرف کھانا، پینا اور اپنا جیون سکھی بنانا چاہتے ہیں۔ جنہوں نے کبھی کسی دکھیا کے آنسو نہیں پونچھے۔ کبھی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا نہیں، ان کے دل پتھر کے ہیں اور وہ دھرتی کے سینے پر ایک بوجھ ہیں۔

دنیا کو ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے جو دولت کیلئے اپنی خوشی نہیں سمجھتے اور جن کا رواں رواں صداقت و دیانت میں ڈوبا ہوا ہے جن کی خودی قطب نما کی سوئی کی طرح اپنی سمت نہیں چھوڑتی۔ جو صداقت کے اظہار کیلئے بڑی بڑی قوتوں سے ٹکرا سکتے ہیں

ایک صحابی کا واقعہ ہے کہ جنگ میں وہ زخمی ہو گئے جسم سے لہو کے فوارے چھوٹ رہے تھے، ناتوانی بڑھ گئی تھی۔ زبان کانٹا بن گئی تھی۔ انہوں نے العطش، العطش پکارا۔ کچھ دیر کے بعد ایک خاتون نے پانی پیش کیا۔ وہ پیالہ منہ سے لگانا ہی چاہتے تھے کہ بازو سے کسی نے آواز دی۔ العطش، العطش آپ نے فوراً وہ پانی اس دوسرے شخص کے پاس بھیجدیا اور خود جان دے دی۔ اس قسم کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ کوئی کہاں تک بتائے؟

جو قوت، وقت اور اپنی زندگی کو دوسروں کے لئے چاہے وہ ملک ہو، قوم ہو یا عام جنس انسانی ۔۔۔ تج دیتا ہو۔ وہ یقیناً زبردست انسان ہے

یہ دور سرمایہ کا دور ہے۔ چاروں طرف دولت کی پکار ہے۔ پھر بھی ایک غریب مصنف، ایک آرٹسٹ یا مدبر اور فلسفی کی کروڑپتیوں سے زیادہ عزت ہوتی ہے۔ دولت و سرمایہ ہر وقت برائیوں کی طرف کھینچتا ہے۔ سرمایہ کی دنیا میں ایک کی کامیابی ہزاروں کو ناکامی کا شکار کر دیتی ہے۔ عقل و دین کی دنیا میں کامیابی سماج کی عمارت کی تعمیر کا ذریعہ ہے۔ امیر اور غریب دونوں ہی اخلاقی سرمایہ کے برابر حقدار ہیں۔ سماج کو دونوں سے اعلیٰ کردار اور پاکیزہ اخلاق کی توقع ہے لیکن سرمایہ دار دولت کے گھمنڈ میں اپنے اخلاق کو کھو بیٹھتا ہے اور دوسرا اسے ہی سب کچھ سمجھ کر اپناتا ہے کتنا بُعد! کتنی دُوری!!

ہر ملک میں چند ایسی عورتیں اور مرد ملتے ہیں جو زبان ہلانے سے قبل ہی لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں۔ ہر قوم کے اخلاق و کردار اور روایات اس کی قوت اور ترقی کی بنیاد ہیں۔ سنگ مرمر کے فرش پر (سیزر) روم چھرے سے گھائل ہو کر گر پڑا تو ہر ایک دل اس کیلئے تڑپ اٹھا اور آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔

کیا یہ ایک پاکیزہ کردار کا کرشمہ نہیں؟

آج بچہ بچہ لنکن اور واشنگٹن کے نام سے واقف ہے۔ یہ محض اپنے کردار کی بدولت صوبہ متحدہ امریکہ کے پریسیڈنٹ ہوئے تھے۔

مشاہیر کے اخلاق و کردار میں ایک خاص خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ ایک اٹل پہاڑ اور زبردست چٹان ہوتے ہیں۔ چاروں طرف طوفان اٹھتے ہیں۔ موسلا دھار مینہ برستا ہے آندھیاں اور بگولے اٹھتے ہیں لیکن وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہٹتے۔ اگر دنیا میں کوئی قوت ہے جو بغیر متاثر کئے نہیں رہ سکتی تو وہ صرف کردار ہے۔ چاہے علم کا زیور نہ ہو۔ چاہے ذہنی تونگری و طبع نہ ہوں۔ خواہ وہ مفلس ہو یا سماج میں اس کی کوئی جگہ نہ ہو پھر بھی ایک بلند کردار شخص کامیاب ہو کر رہے گا۔

لوئی چہاردہم نے اپنے وزیر سے کہا۔ ہماری سلطنت بہت مالدار ہے۔ ہماری قوت بھی کافی ہے۔ پھر بھی ہم ایک چھوٹے سے ملک ہالینڈ کو زیر نہ کر سکے؟

وزیر نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ حضور! کسی ملک کی قوت و طاقت اور اہمیت اس کے طول و عرض پر نہیں اس کے بسنے والوں کے اخلاق و کردار پر منحصر ہے۔

(سبا س)

زندگی!

مدن کالڑا

قہقہوں میں لپٹے ہوئے آنسو ۔۔۔ نہ بجھنے والی پیاس ۔۔۔ نہ پوری ہونے والی تمنائیں ۔۔۔ حسرتیں ۔۔۔ آہیں ۔۔۔ اور اُمنگیں ۔۔۔ جستجو ۔۔۔ کشمکش ۔۔۔ بے چینی ۔۔۔ دنیا کی محبت ۔۔۔ حرص اور لالچ ۔۔۔ اور پھر موت!

آہ! کیا یہی زندگی ہے؟

اثرِ غیب (بقیہ صفحہ ۱۶)

برق بذاتِ خود ایک ارتعاش ہے ۔۔۔ موسیقی بھی ارتعاش ہے۔ جب نغمہ کی لہریں ہمارے ارتعاش سے مناسبت رکھتی ہیں تو ہمارے مجروح قلب کو تسکین اور پریشان دماغ کو سکون عطا کرتی ہیں۔

پاگل انسانوں پر موسیقی کی قوت جو اچھا اثر پیدا کرتی ہے وہ اسی ارتعاش کا نتیجہ ہے۔ جب دماغ اور جسم کے ارتعاش میں ہم آہنگی و اتحاد نہیں رہتا تو ذہنی کیفیت مفقود ہو جاتی ہے اور اسی کو دیوانگی کہتے ہیں۔ موسیقی کا ارتعاش جسم و دماغ کے ارتعاش میں از سر نو ہم آہنگی پیدا کرنے میں فطرت کی مدد کرتا ہے۔

(ترجمہ) ۔۔۔ مسعود جلوید

ہندوستانی سنیاسیوں کے جگر پارے

لاکھ لاکھ کی قیمت کا ایک ایک نسخہ

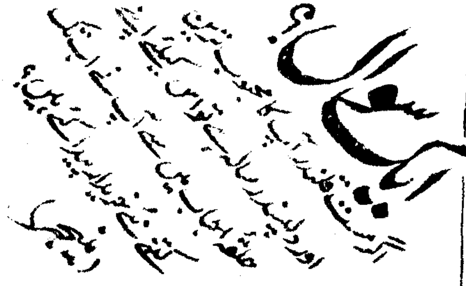
آنکھوں کیلئے خاص مجرب گولیاں ۔ پھٹکری بریاں ۲ تولہ ۔ ہلدی عمدہ قسم باریک کپڑ چھان کی ہوئی ۶ ماشہ ۔ افیون ۲ ماشہ ۔ ان کو لوہے کے صاف برتن میں ڈال کر ۵ عدد کاغذی لیموں کا رس ڈالیں ۔ اور لوہے کے دستے سے خوب باریک رگڑیں پھر آگ پر پکائیں ۔ جب گولیاں بننے کے قابل ہو جائے تو گولیاں بقدر نخود تیار کرلیں ۔ بوقت ضرورت ایک گولی صاف پتھر یا کانسی کے برتن پر رگڑ کر آنکھ میں ڈالیں ۔ اگر آنکھ پر ورم ہو ، اور آنکھ کھٹک رہی ہو تو لیپ بھی کردیں ۔ یہ گولیاں آنکھ دکھنے ، سرخی چشم ، درد ، کھٹک ، ورم ، رہے وغیرہ کیلئے نہایت مفید ہیں ۔

مقوی دماغ ۔ یہ نسخہ مقوی دماغ ہے ۔ جس سے نیا دماغ تیار ہو جاتا ہے ۔ میں نے اس نسخہ کو ایک امام مسجد (مولوی صاحب) سے غضاب کے نسخہ کے عوض لیا تھا جس کا بلا کا حافظہ تھا اور اپنی اس بہترین دماغی قوت کے بدلے عوام کیلئے حیرت کا نمونہ بنا ہوا تھا ۔ چونکہ میں گوشت استعمال نہیں کرتا ۔ اسلئے دیگر احباب کی ضیافت طبع کیلئے شائع کراتا ہوں ۔

مغز بادام ۵ تولہ ۔ مغز کشنیز ۔ خشخاش سفید ۔ مغز نخولہ ہر ایک ۱ تولہ ۔ مغز خیدیں ۔ مغز خربوزہ ۔ مغز تخم تربوز ہر ایک ۲ تولہ ۔ کھاجہ ۱ تولہ ۔ زردی بیضۂ مرغ ۱۵ عدد ۔ مغز سرینہ جوان ۲ عدد ۔ میدہ گندم ۔ گھی بقدر ضرورت مصری تمام ادویات سے دوچند ۔ مغز سرینہ جات کو گھی میں اچھی طرح بریاں کرلیں پھر میدہ گندم کو بریاں کریں ۔ اسی طرح باقی ادویہ کو بھی ملاکر اس گھی میں بریاں کرلیں ۔ جب تمام ادویہ گھی میں بریاں کر چکیں تو پھر کھانڈ کی چاشنی تیار کرکے اس میں جملہ ادویہ ڈال کر ڈنڈے سے خوب رگڑیں اور کسی تھالی میں پھیلا کر مثل برفی کے جمالیں ۔ روزانہ ایک تولہ ہمراہ شیر گاؤ یا ویسے ہی کھالیا کریں ۔ ایک ہفتے میں حیرت انگیز اثرات نمایاں ہونگے ۔

بواسیر کے مستے ۔ ہلدی کے باریک سفوف کو تھوہر کے دودھ میں ملاکر اس میں ایک باریک مگر مضبوط دھاگہ بھگو کر خشک کریں ۔ اسی طرح اس دھاگہ کو تین مرتبہ کریں ۔ اس دھاگہ کو بواسیر کے مستوں کی جڑ میں باندھنے سے مستے کٹ جائیں گے ۔

سفوف جریان و احتلام ۔ موصلی سیمبل خشک در سایہ کردہ ۲۰ تولہ کا نہایت باریک سفوف بناویں ، ۶ ماشہ صبح اور شام ۔ چالیس روز تک ہمراہ شیر استعمال کریں ۔ میرے تجربہ کی چیز ہے ۔



آپ نے کبھی دیکھا؟

جب عورت شروع میں جوان ہوتی ہے

اور

جب وہ بار بار بچہ کو دودھ پلانے پر مجبور ہوجاتی ہے

تو

عورت کا سینہ } عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اُس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہوکر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے
ں عورت میں شباب کی کشش ختم ہوجاتی ہے یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ ہر سال
ں کو دودھ پلانے پر مجبور ہوجاتی یا کسی بیماری یا بداحتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہوکر
ا معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے۔

ی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آسکتی ہے } سائنس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے۔ جس کے استعمال سے عورت کے
یلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ گول اور سخت ہوکر عورت کو از سر نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش
نے لگتے ہیں۔ اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں۔ یہ لگنے کی دوا ہے اور اس کا نام
رسٹین" ہے یہ وہی دوا ہے جس کی بدولت اب تک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں
ب وہ کافی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اس کے ہر روز کا
مال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اس کے سینہ میں دوبارہ اُبھار اور سختی پیدا ہورہی ہے۔ جن
لوں کو ضرورت ہو وہ آج ہی ایک خط

ڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ پی بکس ۲۴ دہلی کے پتہ پر لکھکر ایک شیشی "برسٹین" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی
گی۔ اور اس کے سینہ کی یہ سب خرابیاں دور ہوکر مستقل اُبھار اور سختی پیدا کردے گی۔ ایک شیشی "برسٹین" کی قیمت
روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر سات آنے محصول لگتا ہے۔

ٹ۔ اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچے کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اور
نہایت اطمینان کے ساتھ دودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

ٹیلیفون نمبر ۲۶۸

شعرائے مست قلندر

غزل

مری وفاؤں کا اچھا صلہ دیا تم نے — گرا دیا تم نے
دفورِ شوق میں جب مسکرا دیا تم نے — غم و الم مرے دل سے مٹا دیا تم نے
بڑھا کے رسمِ محبت یہ کیا کیا تم نے — کہ مجھ غریب کو دل سے بھلا دیا تم نے
نیاز و ناز میں اب کوئی امتیاز نہیں — کہ درمیان سے پردہ اٹھا دیا تم نے
قمر نے شرم سے منہ کو چھپا لیا اس دم — نقاب چہرے سے جس دم ہٹا دیا تم نے
تمہاری یاد میں دن رات اشکباری ہے — یہ اچھا شغلِ محبت سکھا دیا تم نے
وہ برقِ بار نظر تم نے کی مرے دل پہ — سکون و ضبط کا خرمن جلا دیا تم نے
یہی ہماری محبت کا پاس تھا تم کو — تمہیں نہ بھول سکے ہم بھلا دیا تم نے
امیر پہلے ہی دل کا خیال لازم تھا — اب اس کا رنج ہے کیوں توڑ دیا تم نے

از جناب شیخ امیر صاحب امیر دہلوی

غزل

تکلیف ہے پرسش فرمانے سے کیا حاصل — یوں پردۂ تسکیں میں تڑپانے سے کیا حاصل
وارفتگیٔ دل کے افسانے سے کیا حاصل — تصویرِ غم و وحشت بن جانے سے کیا حاصل
آہ کے تصور میں چھپ جانے سے کیا حاصل — رہ رہ کے مرے دل کو تڑپانے سے کیا حاصل
ممکن ہو تو رگ رگ میں دنیائے خلش بھر دے — اے نشترِ غم دل کو برمانے سے کیا حاصل
شایانِ محبت ہے تشریحِ وفا کرنا — افسانہ جفاؤں کا دہرانے سے کیا حاصل
مستی بھری آنکھوں کا عالم ہے نگاہوں میں — میخانہ بداماں ہو پیمانے سے کیا حاصل
کچھ پاسِ محبت بھی اے ذوقِ جبیں سائی — ہر در پہ لئے سجدہ جھک جانے سے کیا حاصل
خود پھونک لے پروانے آہوں ہی سے گھر اپنا — یوں شمع کے شعلوں میں جل جانے سے کیا حاصل
جو پائے گہر مقصد ہمراز تلاطم بن — ساحل کے تجسس میں بہہ جانے سے کیا حاصل
اب مست نگاہوں سے پیتا ہوں مئے جلوہ — ساقی ترے فرسودہ میخانے سے کیا حاصل
توہینِ محبت کی اے آہ رسا توبہ — تاثیر کے سانچے میں ڈھل جانے سے کیا حاصل

از مصورِ جذبات سید ابراہیم حسن صاحب رسا بریلوی

غزل

نالے ہوں کارگر نہ دعائیں اثر کریں — اس طرح ہم جہانِ وفا میں بسر کریں
ہنس ہنس کے کیوں نہ ہم شبِ فرقت بسر کریں — رو رو کے ہجرِ یار میں کیوں آنکھ تر کریں
اس آرزو پہ وقفِ ستم ہے دلِ حزیں — شاید کبھی وہ مجھ پہ کرم کی نظر کریں
واقف نہیں ہے رازِ محبت سے چارہ گر — کیا غور دردِ عشق کے انجام پر کریں
دل کو مٹا کے کہتے ہیں اللہ رے زعمِ حسن — آہ و فغاں کریں نہ پریشاں نظر کریں
رکھا گیا ہے وعدۂ دیدار حشر پر — مطلب یہ ہے تلاش تجھے عمر بھر کریں
مشغول ہیں وہ دل کو ستانے میں اے ضیا — کیوں لطف کی نظر وہ مرے حال پر کریں

از جناب محمود حسین ضیا بریلوی

ساون کی رت بھی آئی نہ آئے تو ایک تم — رہ رہ کے پوچھتا ہے پپیہا کہ "پی کہاں"

ساون

اک ہوک دل میں اٹھتی ہے کوئل کی کوک سے
ایسے سمے میں دور ہو تم مجھ سے آہ آہ
آنکھیں برس رہی ہیں پھواروں کے ساتھ ساتھ
تم بن جو میرا حال ہے دیکھا نہ جا سکا
بھولے ہو تم مگر مرے دل میں تو یاد ہے
تنہا خموش بیٹھا ہوں اک گھڈے میں میں
ایسے میں تم جو ہوتے مگر آہ کیا کہوں

لہرا رہی ہیں باغ میں آموں کی ڈالیاں
کس کو دکھاؤں سینہ سے اٹھتا ہے جو دھواں
اے کاش تم بھی دیکھتے برسات کا سماں
آنسو بہا رہا ہے مرے ساتھ آسماں
تم سامنے نہیں ہو پر آنکھیں ہیں خونفشاں
بادل گرج رہے ہیں چمکتی ہیں بجلیاں
دیکھوں تمہیں اب ایسے مقدر مرے کہاں

از جناب [illegible]

پاپیوں کے شرمناک افسانے!

مست قلندر کے ماہوار ناول سلسلہ میں دنیا جہاں کے پاپیوں کی آپ بیتیوں کو کمال دیدہ دلیری اور بے باکی کے ساتھ منظر عام پر لایا جا رہا ہے۔ اب تک حسب ذیل ناول شائع ہو چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ نے ابھی تک ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھا؟

چند حسینوں کے خطوط { چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط   بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا
ایڈیٹر مست قلندر کی ایک بالکل نئی اور اچھوتی تصنیف حسن و عشق، سوز و ساز اور جذبات محبت سے لبریز۔ اس میں فوٹو بلاکس کی حسین و جمیل تصویریں بھی ہیں۔ قیمت صرف ۱۲

طوائف کی سرگذشت { ایک اونچے گھرانے کی حسین و معصوم لڑکی نے طوائف کا پیشہ کیوں اختیار کیا۔ اسے گناہ کی سمت کشاں کشاں لے جانے میں کس کا ہاتھ تھا؟ کون اُسے بازار حسن میں لے گیا؟ کیسے کیسے بگلا بھگت لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا؟ اور اس کی ساری زندگی کس طرح بسر ہوئی؟ یہ سب کچھ ایسے دلآویز اور سنسنی خیز پیرایہ میں لکھا گیا ہے کہ جبتک آپ ناول ختم نہ کرینگے کھانا پینا بھول جائینگے اور راتوں کی نیند اڑ جائیگی۔ ایسا سبق آموز اور سنسنی خیز ناول جس نے مست قلندر کے کالموں میں مسلسل چھپ کر مذہب کے نام نہاد ٹھیکہ داروں، پجاریوں، مہنتوں اور قوم کی رہنمائی کا دم بھرنے والے پیروں کو بے نقاب کر دیا تھا اور ان سے سوائے بغلیں جھانکنے کے کوئی جواب نہ بن آیا تھا، اس قابل ہے کہ آپ ایکبار ضرور پڑھیں قیمت ۱۲

گناہ کی لذتیں { کلکتہ کی ایک تعلیمیافتہ عصمت فروش حسینہ کی سرگذشت جو ابھی تک زندہ و سلامت ہے۔ یہ وہی دلچسپ دلگداز سنسنی خیز اور سوفی صدی سچا ناول ہے جس نے مست قلندر میں مسلسل شائع ہو کر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تہلکہ بپا کر دیا تھا۔ کتاب کیا ہے؟ ایک پڑھی لکھی خاتون کی سرتاپا سبق آموز اور عبرتناک آپ بیتی ہے۔ جسے ظالم سماج نے بازار حسن میں عصمت فروشی کر کے پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے مجبور کر دیا تھا۔ اس جیسا ناول آجتک اردو زبان میں شائع نہیں ہوا۔ حجم ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۲

بیسویں صدی کا پریم شاستر { باتیں مزے کی بلبل و گل میں ہوئیں شروع   دیکھو ادھر ادھر کہیں باد صبا نہ ہو
نئی روشنی کے عاشق و معشوق کے سرتاپا محبت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے خطوط دلکش افسانہ کی صورت میں۔ اردو میں اپنی قسم کا پہلا ناول جو ہجر و فراق، رشک و رقابت، محبت و نفرت اور کیف و نشاط کے گوناگوں جذبات سے لبریز ہے۔ دلکش اتنا کہ ایکبار پڑھنے سے طبیعت سیر نہ ہوگی بلکہ بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲ محصولڈاک ہر چہار ناولوں کا
چاروں ناول ایک ساتھ طلب کرنے پر قیمت ۳ مع محصولڈاک۔ جلدی کیجئے کیونکہ مانگ زیادہ ہونے کے باعث ممکن ہے آپ کو پہلے ایڈیشن کی زیارت سے محروم ہونا پڑے۔

ملنے کا پتہ: **منیجر مست قلندر۔ لاہور**

طب جدید کے کرشمے

گزشتہ سے پیوستہ

ہم کبھی بڈھے نہ ہوں!

کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟

امریکن ڈاکٹر جے اسٹینسن ہوکر کے خیالات

مغز اخروٹ کو پیس کر اگر پھلوں کے سالد (SALAD) پر چھڑک دیا جائے تو ایسی لذت پیدا ہوتی ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ فی زمانہ اسی طرح کے پھلوں، مغزیات اور اناج سے بنی ہوئی کھانے کی چیزیں مغرب کے تمام بڑے بڑے شہروں میں آسانی سے مل جا سکتی ہیں کیونکہ وہاں ان کا رواج روز افزوں ہے۔ یوروپ کے لوگ رفتہ رفتہ سبزی خوری کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ چنانچہ آئے دن بے شمار کتابیں ایسی چھپتی ہیں جن میں سبزیاں ترکاریاں بنانے کے گوناگوں طریقے درج ہیں۔ اگر کوئی شخص ان طریقوں پر عمل کرے تو مغزیات، پھلوں اور اناج سے طرح طرح کی نفیس کم قیمت ڈشیں تیار کر سکتا ہے۔

اس سوال پر زیادہ زور اس وجہ سے دیا جا رہا ہے کہ آج مشرق میں بھی بہت سے لوگ اس حقیقت کو فراموش کرنے لگے ہیں۔

غور کیجئے کہ اس قسم کی پاک و صاف اور لذیذ خوراک گوشت اور خون کی ناپاک غذا کے مقابلے میں کتنی اچھی اور مفید ہے۔ آخر الذکر میں صدہا کثافتیں پائی جاتی ہیں۔ اس سے یورک ایسڈ کے اجزا کثیر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسلئے یہ امر چنداں تعجب خیز نہیں کہ بڈھا نہ ہونے کی کوشش میں گوشت خوروں کے مقابلہ میں وہ لوگ زیادہ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں جو صرف سبزی اور پھل استعمال کرتے ہوں۔

اس حد تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کا مطلب صاف لفظوں میں یہی ہے کہ اگر ہم اپنے طریق خوراک میں تبدیلی کر کے بعض ایسے امور کا خیال رکھیں جن کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ آگے چل کر کیا جائیگا تو جلدی ہی یہ بات محسوس ہونے لگے گی کہ سن و سال کی ترقی کے باوجود ہم بڈھے ہونے کی بجائے روز بروز جوان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا کرنے سے بدن میں پھرتی اور مستعدی آتی ہے۔ آاس قدر بھی نفع ہوتی چلی جاتی ہے اور صحت میں ہر لحاظ سے بہتری کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ آدمی کا بدن مناسب حدود کے اندر رہتا ہے۔ خود اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے کہ بدن کا تناسب اور وزن موزونیت کی حد کے اندر قائم رہے۔ ایسا آدمی کسی بھی وجہ سے موٹا ہونے کی خواہش نہیں کرتا۔ اس جگہ ایک بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے یعنی موٹاپا ان کیلئے بدرجہ خطرناک ہے جس آدمی کا بدن فربہی اختیار کرتا ہے اس کے دل کے آس پاس بھی چربیلا مادہ جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے بلکہ بعض حالتوں میں تو یہ قیمتی عضو چربی سے اسقدر گھر جاتا ہے کہ اپنے فعل کو بھی پوری طرح انجام نہیں دے سکتا لیکن ایسا نہ بھی ہو تو اس میں شک نہیں۔ آدمی کی نقل و حرکت میں ضرور فرق آتا ہے۔ عضلات کی لچک باقی نہیں رہتی۔ ورزش کی خواہش روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ بات ہمیشہ ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ آدمی کے بدن میں چربی کی ضرورت اسی قدر ہے کہ وہ ضرورت کی حد تک لحمی ریشوں کو ڈھکنے کا کام دے۔ اگر وہ زیادہ بڑھنی شروع ہو گئی تو سمجھ لو ایک طرح کی بیماری ہے۔ اور اس سے یقینی طور پر عرصہ حیات کم ہونے لگے گا۔

راقم الحروف ایسے کئی شخصوں سے واقف ہے جنہوں نے زندگی کے فن پر اچھی طرح غور کیا ہے اور جو اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اگر آدمی دن میں صرف دو بار کھانا کھائے تو بہطرح مضبوط و توانا رہ سکتا ہے۔ بلکہ کئی آدمی اس کم خوری کی وجہ سے غیر معمولی مستعد اور چالاک دیکھے جاتے ہیں۔ نہ صرف ان کی جسمانی کیفیت ہر لحاظ سے اعلیٰ ہوتی ہے بلکہ ذہن میں بھی ایک طرح کی روشنی پائی جاتی ہے۔ اپنے بارہ میں میں اسی قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں

کہ پیشتر میں جتنا کھایا کرتا تھا۔ اب اس سے نصف پر گزر کرتا ہوں اور دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ ذہنی اور جسمانی ہر دو لحاظ سے سابق کے مقابلہ میں زیادہ مستعد اور مسرور ہوں۔ مزیداری یہ ہے کہ ہر طرح کے گرم و سرد حالات سے گذرنے کے بعد میں سردی، زکام، انفلوئنزا وغیرہ امراض سے ہمیشہ محفوظ رہتا ہوں۔ میرے بدن کی رنگت جو پیشتر سیاہی مائل زرد ہوا کرتی تھی۔ اب صحت کی تازگی حاصل کر چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحت و شباب کے اسرار سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد میں چاہتا ہوں کہ اپنی معلومات دوسروں کے کانوں تک بھی پہنچا دوں۔

خوراک کے سوال پر بحث کرتے ہوئے ہمیں ہر ایک فرد واحد کی ذہنی اور جسمانی مصروفیتوں اور اس کے خانگی انتظامات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ زیادہ صاف لفظوں میں ہم کو چاہیئے کہ اس معاملہ میں اپنی عقل سے کام لیں اور حالات کے مطابق جو تھوڑی بہت تبدیلی ضروری ہے۔ عمل میں لاتے رہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ میں اس وقت مسئلہ خوراک پر کوئی کتاب تحریر کرنے نہیں بیٹھا بلکہ محض بڑھاپے کے انسداد کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً ان باتوں کو زیر بحث لانے پر مجبور ہوں۔ القصہ جوں جوں ہماری عمر میں ترقی ہو ہمیں اپنی خوراک کم کرتے چلے جانا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں جو شخص عمر کے ابتدائی حصہ میں بسیار خوری کا عادی رہا ہو، اس کا بھی فرض ہے کہ آگے چلکر دن میں صرف دو بار کھانا کھائے اور وہ بھی نہایت سادہ قسم کا پھر جب آدمی کی عمر اور بھی زیادہ ترقی کر جائے تو اس کی دانائی اس میں ہوگی کہ وہ پھر ایک مرتبہ اسی خوراک کی طرف رجوع کرے جو بچپن میں اس کیلئے کافی سمجھی جاتی تھی یعنی زیادہ دودھ اور اس کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کرے اور ان کے ساتھ ساتھ کچھ تازہ پکے ہوئے میوے بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عمر کے آخری میں آدمی کے اعضائے انہضام اتنے مضبوط اور طاقتور نہیں رہتے جتنے وہ کسی زمانے میں تھے یہی وجہ ہے کہ ہمیں اُن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالنا چاہیئے۔ نہ ان کو مناسب حد سے زیادہ کام کرنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔

اتفاق کی بات ہے کہ جس وقت میں یہ سطور قلمبند کر رہا تھا ایک ۸۵ سال کی عمر کا مریض مجھ سے مشورہ کرنے کیلئے آیا کئی پہلوؤں سے اس کی صحت ہر طرح مکمل نظر آتی ہے البتہ اس کو دمہ کی شکایت ہے لیکن میں نے معلوم کیا ہے کہ خوراک کے معاملہ میں اس نے ہمیشہ دانشمندی برتی ہے۔ وہ دن میں صرف دو بار کھانا کھاتا ہے اور اس کی غذا زیادہ تر دودھ کی بنی ہوئی پڈنگ یا پکے ہوئے میووں پر مشتمل رہی ہے۔

اس شخص نے اپنی تمام عمر محنت شاقہ کرتے ہوئے بسر کی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس نے اپنی سادہ طریقوں پر عمل جاری رکھا جو میں نے اس کیلئے تجویز کئے ہیں تو ابھی کم از کم پندرہ سال اُسے کسی طرح کا خطرہ نہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ شاذ و نادر مستثنیات کے سوا کم کھانے والے لوگ عمر کے انتہائی حد تک چلتے پھرتے رہتے اور ہر قسم کے کاموں کو خوش اسلوبی سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ انسان کی صحت بدستور بنی رہتی ہے جس شخص نے عہد شباب کے بعد خوراک کے صحیح اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھا۔ اس کی نسبت یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ ایک نہایت زبردست ذریعہ درازی عمر کا اس کو حاصل ہے اور ترقی سن و سال کے باوجود وہ بڑھاپے کے اثرات کو کبھی محسوس کریگا۔ ہر چند خوراک کی اصلاح کا عمل شباب گذرنے کے فوراً بعد شروع ہو جانا چاہیئے تاہم اگر کوئی شخص عمر کے اوسط حصے سے گذرنے کے بعد بھی اس کا آغاز کرے تو کچھ بُرائی نہیں بلکہ وہ اس سے ہمیشہ فائدہ ہی حاصل کریگا۔ یورپ میں کورنارو نام کا ایک مشہور آدمی ہو گذرا ہے جو پیدائش کے وقت سے ہی کمزور تھا اور چالیس سال کی عمر تک سخت لاپرواہی کی زندگی بسر کرتا رہا لیکن اس کے بعد جب اس نے خوراک کی اصلاح شروع کی تو اپنی قدرتی کمزوریوں پر اس قدر غالب آیا کہ سو سال سے اوپر تک زندہ رہا۔ اس شخص کے حالات زندگی اتنے سبق آموز اور میرے مضمون کے حسب حال ہیں کہ میں اس کی خود نوشت سوانحعمری سے چند ایک اقتباسات پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ ایک مقام پر وہ اس بات کا ذکر کرنے کے بعد کہ کم خوری کا طریقہ اختیار کر کے جب وہ اپنے بیشتر عیوب پر غالب آ چکا تو اس نے اپنی زندگی کا پروگرام کیا بنایا۔ اس کا بیان اس کے اپنے لفظوں میں ملاحظہ ہو۔

"اس طریقہ پر اپنی کھوئی ہوئی صحت حاصل کرنے کے بعد میں نے خوراک میں اعتدال کے سوال پر غور کرنا شروع کیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر اس اعتدال کی بدولت میں اپنی صحت کی بیشتر خرابیوں پر غالب آ چکا ہوں تو یقینی طور پر اس کی مدد سے صحت قائم رکھنا اور اپنے بدنی نقائص پر غالب آنا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ پس میں نے بڑی محنت کے ساتھ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کس طرح کی خوراک میرے مزاج کے موافق ہے۔ ایسا کرنے سے پیشتر میں نے یہ بات تحقیق کرنی ضروری سمجھی کہ جو چیزیں میری زبان کو خوشگوار معلوم ہوتی ہیں کیا وہ معدہ کیلئے بھی خوشگوار ہو سکتی ہیں؟ میں اس طریقہ پر اس مشہور ضرب المثل کی صداقت معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جو چیز منہ کو بھاتی ہے وہ معدہ میں جا کر بھی

ضرور فائدہ بخش ثابت ہوتی ہے۔ جلدی ہی میں اس نتیجے پر پہنچنے کیلئے مجبور ہوگیا کہ یہ خیال جو عوام الناس میں پھیلا ہوا ہے غلط ہے۔ بہت سی چیزیں مجھ کو ایسی نظر آئیں جو منہ کو تو بھاتی تھیں لیکن معدہ ان کو ناپسند کرتا تھا۔ جب ایک بار میں نے یہ حقیقت معلوم کرلی کہ عوام الناس کا خیال کس قدر غلط ہے تو پھر فوراً ہی بہت سی ایسی چیزیں یعنی گوشت اور شراب وغیرہ جو میرے معدہ کیلئے موافق نہ تھیں، استعمال کرنی ترک کردیں۔ اور انہی کو پسند کیا جو تجربہ سے میرے حق میں مفید ثابت ہوئی تھیں۔ اب میں صرف ایسی چیزیں کھانے لگا جن کو آسانی سے ہضم کرسکتا تھا۔ میں ان کی مقدار اور عمدگی کا خاص خیال رکھتا تھا اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ سامان اکل وشرب سے کبھی اپنے معدہ پر بوجھ نہ ڈالوں چنانچہ ابھی کھانے اور پینے کی رغبت باقی ہوتی تھی کہ میں طبیعت پر جبر کرکے دستر خوان سے اٹھ کھڑا ہوتا۔ جلدی ہی میں اس ضرب المثل پر عمل کرنے لگا کہ جو شخص اپنی صحت کو قیمتی سمجھتا ہے اسے اپنی بھوک پر قابو رکھنا چاہئے۔ غرض اس طریقہ پر بے اعتدالیاں چھوڑ کر میں نے باقاعدگی اور ہمواری کی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ اور اپنے اندر کئی اصلاح بخش تبدیلیاں پیدا کیں۔ ایک سال کے اندر اندر بہت سے ایسے امراض جو مجھ پر گرفت پانے لگے تھے، مٹنے شروع ہوگئے حالانکہ یہ تمام خرابیاں بیشتر لاعلاج نظر آتی تھیں۔

"ایک بات اور بھی۔ جب میں نے ان طریقوں پر اپنی اصلاح شروع کی تو دیکھا کہ جب میں کھلے دل سے کھاتا پیتا تھا تو سال میں ایک دو مرتبہ ضرور بیمار پڑتا تھا۔ لیکن اب یہ بیماری کا دورہ بھی نابود ہوگیا میری صحت ہر لحاظ سے مکمل ہونے لگی۔ اور آج تک مکمل ہی رہی ہے اور یہ محض اس لئے کہ میں نے خوراک کے معاملہ میں ہمیشہ اعتدال برتا اور باقاعدگی کے طریقوں پر عمل کیا ہے۔

القصہ ان طریقوں پر عمل پیرا ہونے کے بعد میں ہمیشہ اچھی صحت کے مزے لیتا رہا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ میری صحت ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اکل وشرب کے متعلق دو معینہ قواعد پر (جو یہ تھے کہ صرف وہی چیزیں استعمال کی جائیں جو معدہ کیلئے ہضم کرنی مشکل نہ ہوں اور وہ بھی کم مقدار میں) عمل کرنے کے علاوہ میں نے اس بات کا بھی ہمیشہ خیال رکھا کہ حد درجہ کی گرمی اور حد درجہ کی سردی سے ہمیشہ بچاؤ کیا جائے۔ کبھی غیر معمولی حد تک تھکان پیدا نہ ہونے دی جائے۔ آرام کی گھڑیوں میں خلل انداز نہ ہوا اور نہ بہت عرصہ تک خراب ہوا میں رہنا پڑے۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے پوری کوشش کرکے بعض ایسی خرابیوں سے بھی بچاؤ کی ترکیب نکالی جن سے نجات حاصل کرنا سہل نہیں ہوتا۔ غم وغصہ اور جوش منافرت یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہمارے جسم پر غیر معمولی اثرات پیدا کرتی ہیں۔ میں نے ان سے بھی بچاؤ کی صورت نکالی تاہم ان خرابیوں سے بچے رہنا میرے لئے اتنا آسان ثابت نہ ہوا جتنا خیال کیا جاسکتا تھا۔ کئی دفعہ انتہائی کوشش کے باوجود میں ان کے اثر سے بچنے کی ترکیب پیدا نہ کرسکا۔ لیکن پھر بھی میں اس حقیقت کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں کہ اگر کوئی آدمی کھانے اور پینے کے معاملہ میں اعتدال اور احتیاط کے اصولوں پر عمل کرسکے تو اس طرح کے جذبات اس کے بدن پر زیادہ مضر اثر نہیں ڈال سکتے۔ نامور طبیب گیلن نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ "جب تک میں کھانے پینے کے معاملات میں احتیاط کرتا رہا۔ اس طرح کے جذبات نے مجھ پر کوئی دیرپا اثر نہ ڈالا۔ اگر ان سے مجھ کو کوئی تکلیف پہنچی بھی تو محض سطحی اور عارضی

وعدہ!

ساحر قدوائی

(کسی مست ناز نے اپنے محبوب الفت سے کن الفاظ میں شکایت کی کہ آپ کے محبت بھرے خطوط باعث رسوائی ہیں)

مرے خطوط کی تجھکو اگر شکایت ہے
"غمِ فراق" تری "مسکن اشتیاق" نثار
ترے بغیر مرا سانس ہر گناہ مگر
مجھے گزارش احوال کی مجال نہیں
نہیں نہیں مرے اے محو خیال نہیں

قسم ہے ضبطِ محبت کی اب نہ لکھونگا
تجھے نہ زحمتِ گفتار تلخ اب دونگا
ترے لئے یہ مسلسل گناہ کرونگا
کسی مجال نہیں

جو ایک دن سے زیادہ عرصہ تک رہی۔ اس بیان کی میں اپنے ذاتی تجربہ سے تصدیق کر سکتا ہوں اور بہت سے لوگ جو مجھ سے واقف ہیں یا جنہیں مختلف اوقات میں مجھ سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے بیان کر سکتے ہیں کہ کس طرح مجھ کو بار با گرمی اور سردی کی ناموافق حالتوں میں رہ کر بھی کسی طرح کا نقصان نہ پہنچا، نہ ان مصیبتوں نے جو مجھ پر گاہ بگاہ نازل ہوئیں میرے اندر کسی طرح کی پریشانی پیدا کی۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ہمیشہ موسمی، ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کے اثر سے ہر طرح محفوظ رہا حالانکہ میرے کنبہ کے دوسرے آدمیوں کو اسکی وجہ سے بہت سی تکلیف برداشت کرنی پڑی۔

آدمی اگر اپنی زندگی کو باقاعدگی سے بسر کرے تو کچھ شک نہیں کہ اسکی صحت بنی رہتی ہے اور وہ لمبی عمر حاصل کر سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ میں دعوی کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ دنیا کی سب سے مؤثر اور سچی دوا باقاعدہ طور پر زندگی بسر کرنا ہی ہے۔ جو کوئی اس سوال پر غیر جانبداری کے ساتھ غور کریگا۔ وہ یقینی طور پر اس بات پر مجبور ہوگا۔ ہر شخص نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی ڈاکٹر کسی مریض کا معائنہ کرنے جاتا ہے تو سب سے پہلی بات جس پر وہ زور دیتا ہے یہی ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں باقاعدگی پیدا کی جائے۔ اور اسے ہر قسم کی انتہائی کیفیتوں سے بچایا جائے۔

اگر کوئی شخص اس قیمتی نصیحت کو گرہ باندھ لے اور ہمیشہ اس پر کاربند رہے تو یقین کرو ایک بار صحتیاب ہونے کے بعد پھر اس کے بیمار پڑنے کی کوئی صورت ہی ممکن نہیں ہو سکتی۔ جب یہ بات ہو تو پھر نہ اسے کسی ڈاکٹر کی حاجت رہتی ہے نہ کسی دوا کے استعمال کی۔

سچ پوچھئے تو صحیح طریقہ پر چلتے ہوئے وہ اپنا طبیب آپ بن جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی بہترین طریقہ ہے کہ ہر ایک آدمی اپنا معالج آپ ہو کیونکہ اپنی جسمانی کیفیتوں کو جس خوبی سے وہ آپ سمجھ سکتا ہے۔ اس طرح کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ بار بار کے تجربات سے ہر ایک آدمی اپنے مزاج کی کیفیتوں سے بہتر واقف ہو جاتا ہے اور خوب سمجھ سکتا ہے کہ کون سا کھانا اور کن چیزوں کا پینا اس کے مزاج کے مطابق ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جس آدمی کے جسم میں کئی طرح کی پیدائشی کمزوریاں ہیں۔ وہ بھی اگر سمجھ سے کام لے اور باقاعدگی کے ساتھ اعتدال کی زندگی بسر کرے تو اچھی صحت رکھتے ہوئے لمبی عمر پا سکتا ہے۔ میری اپنی مثال دیکھئے۔ پیدائش کے وقت سے لے کر مجھ میں اتنی بدنی کمزوریاں تھیں کہ خیال کیا جاتا تھا میں کسی بھی حال میں چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہونگا۔ حالانکہ محض صحت کے صحیح اصولوں پر کاربند ہونے سے میں اب چھیاسی ۸۶ سال کی عمر میں بھی ہر طرح معمور، توانا اور تندرست ہوں اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے امید سے دوگنی زیادہ زندگی حاصل کی اور وہ بھی اس حالت میں کہ میرے تمام حواس بجا ہیں۔ یہاں تک کہ نہ میرے دانت کمزور ہوئے ہیں، نہ آواز میں نقص پیدا ہوا ہے، نہ حافظہ میں خرابی پیدا ہوئی ہے، نہ دل میں کوئی تکلیف ہے۔ بھی قابل ذکر بات یہ ہے کہ میرا دماغ اب تک اسی طرح ہے جیسے کبھی تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ترقی عمر کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی کوئی طاقت گھٹتی معلوم نہیں ہوتی۔ میں اسکی خاص

یاد نہ کر دلِ حزیں!

میرا وہ عہدِ کامیاب ۔ جب تھیں دعائیں باریاب
——— میرا وہ عہدِ کامیاب
——— یاد نہ کر دلِ حزیں!

راتیں وہ کیف آفریں ۔ باتیں وہ قابلِ یقیں
——— یاد نہ کر دلِ حزیں
——— راتیں وہ کیف آفریں

باعثِ صد نشاط تھیں ۔ موجبِ انبساط تھیں
——— یاد نہ کر دلِ حزیں
——— راتیں وہ کیف آفریں

کتنی حسیں وہ رات تھی ۔ رقص میں کائنات تھی
——— باعثِ صد نشاط تھی
——— یاد نہ کر دلِ حزیں!

بکھری وہ زلفِ عنبریں ۔ نکھری وہ سیمگوں جبیں
——— یاد نہ کر دلِ حزیں
——— یاد نہ کر دلِ حزیں
——— بھول بھی جا دلِ حزیں

ایک حسین خواب تھا ۔ حسن تھا اور شباب تھا
——— بھول بھی جا دلِ حزیں
——— راتیں وہ کیف آفریں

یاد نہ کر دلِ حزیں

راک فیلر

دُنیا کا متموّل ترین انسان

جس نے تین (۳) ارب روپیہ انسانی بہبودی کیلئے وقف کر دیا

دُنیا کے متموّل ترین انسان راک فیلر کی موت واقع ہوگئی ہے۔ وہ ۹۷ سال کی عمر میں ڈمیٹن بیچ فلوریڈا امریکہ کے مقام پر راہیٔ ملک بقا ہوا۔ غریب ماں باپ کے گھر پیدا ہوا۔ اور اوائل زندگی مشقت میں گذاری۔ انیس سال کی عمر میں ایک کمیشن ایجنٹ کی حیثیت میں کاروبار شروع کیا۔ بعد میں تیل صاف کرنے کے کارخانے جاری کئے۔ اپنے حریفوں پر قابو پا کر اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کی بنیاد ڈالی۔

۱۹۱۱ء میں تمام کاروبار اپنے بیٹے راک فیلر کو سونپ کر خود آزاد زندگی بسر کرنا شروع کر دی اور دُنیا میں اپنی سخاوت اور رفاہ عام کے کاموں کے باعث دوامی عزت حاصل کی اس نے کروڑوں روپے تعلیم اور مفاد عام پر خرچ کئے۔ نیویارک میں راک فیلر انسٹی ٹیوٹ فار میڈیکل ریسرچ کی بنیاد رکھی۔

انسانی بہبودی کیلئے تین ارب روپیہ وقف کر دیا۔ آج تک کسی انسان نے اپنی محنت سے کمایا ہوا اتنا روپیہ خلق خدا کیلئے خرچ نہیں کیا۔

راک فیلر کی دولتمندی کے راز

میری دولتمندی کا سب سے بڑا راز محنت ہے۔ میں اوائل عمر ہی سے محنت کا شائق رہا ہوں۔ اور محنت سے میں نے کبھی دل نہیں چرایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک سوداگر کے پاس نہایت حقیر رقم پر ملازم ہوا۔ سردی ہو یا گرمی، اندھیرا ہو یا اُجالا، میں ہمیشہ کام ختم کرکے دم لیتا تھا۔ آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتا تھا کئی بار ایسا ہوا کہ سردی سے میرے ہاتھ پاؤں سن ہوتے نظر آنے لگتے۔ آدھی رات سے زیادہ وقت گذر جاتا تھا۔ اور میں اپنے کام میں مشغول ہوتا تھا۔ میرے احباب تو اکثر میری جان کا ہی پر افسوس ظاہر کرتے تھے کہ ایک معمولی رقم کیلئے مجھے اس قدر سخت محنت کرنی پڑتی ہے لیکن آپ یقین کیجئے کہ مجھے کبھی اس کا رنج نہ ہوا۔ مجھے اس میں خوشی حاصل ہوتی تھی کہ میں اپنے مالک کیلئے مفید ثابت ہو رہا ہوں۔

میری دولتمندی کا دوسرا راز یہ ہے کہ میں نے پابندی اوقات کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا۔ میں نے ہر ایک کام کیلئے وقت مقرر کر لیا تھا اور وہ کام وقت مقررہ پر ہی کرتا تھا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ شاذ و نادر ہی میں نے کبھی سخت مجبوری یا شدید بیماری کے باعث کام کو وقت پر انجام نہ دیا ہوگا۔

آج کل کے نوجوان بہت کم وقت کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر آج ایک کام صبح کے وقت کرتے ہیں تو کل وہی کام شام کو کرتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ روزانہ معمول اور دیگر کاروبار میں ایک منٹ کا فرق بھی ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔ جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے وقت ان کی قدر نہیں کرتا۔ جن اشخاص کو وقت ٹھکرا دیتا ہے انہیں تمام دُنیا ٹھکرا دیتی ہے۔

میری دولتمندی کا تیسرا راز دیانتداری ہے۔ میری زندگی میں کئی مواقع ایسے آئے جبکہ مجھے روپیوں کی سخت ضرورت تھی اور میں کثیر رقوم کو خورد برد کر سکتا تھا۔ لیکن میں ہمیشہ ثابت قدم رہا اور راہ راست سے نہ بھٹکا یہی وجہ ہے کہ عوام میں ایماندار و دیانتدار مشہور ہوگیا۔

سائنس کی دُنیا (بقیہ صفحہ ۲۰)

کیلئے کیبل گرام میرے نام آیا۔

یوروپ اور امریکہ کے اخباروں میں خبروں کو ایک دوسرے سے پہلے حاصل کرنے کیلئے آپس میں خوب معرکہ آرائی ہوتی ہے۔ ایک مشہور میچ کھیلا جا رہا تھا۔ شہر کی پبلک بہت بیقرار تھی کہ کون سی ٹیم جیتنے والی ہے۔ ایک اخبار نے بروقت تازہ خبر شائع کرنے کیلئے اپنے اخبار کے دو مختلف ایڈیشن پہلے ہی سے چھاپ لئے ایک میں ایک ٹیم کو فتحیاب قرار دیا تھا اور ایڈیشن کی تمام کاپیوں میں دوسری ٹیم کے جیتنے کی خبر شائع کی تھی۔ اخبار کی بدقسمتی سے دو ٹیمیں برابر رہیں اور دونوں ایڈیشنوں کے اخباروں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دینا پڑا۔

دنیا کی تمام نیوز ایجنسیوں میں رائٹر کی نیوز ایجنسی کا خاص درجہ ہے۔ اس نیوز ایجنسی کے بانی کی کہانی بھی نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے جسے کسی آیندہ اشاعت میں حوالۂ قلم کیا جائے گا۔

مستی و قلندری

مست قلندر کے مشہور مزاح نگار مرزا حاجی لغلول کے قلم سے

مشہور فلم ایکٹرس مس پربھا کو نہیں تو اس کی تصویر آپ نے ضرور دیکھی ہوگی۔ تصویر تو میں نے بھی دیکھی ہے۔ لیکن آپ نے سینما خانے کے اندھیرے ہال میں دیکھی ہوگی اور میں نے کھلے بندوں مست قلندر کے ٹائیٹل پر، مگر مقصود گفتگو مس پربھا کی تصویر کا نہیں، کچھ اور ہے۔

آپ کا خیال ہوگا کہ ایکٹرسیں شہرت و ناموری کی دلدادہ ہوتی ہیں اور میرا بھی یہی خیال ہے لیکن مس پربھا کچھ اور ارشاد فرماتی ہیں ملاحظہ ہو۔

"کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ معزز خاندان کی خواتین کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دنیائے فلم میں داخل ہونا چاہیئے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے ان کی شہرت بڑھے گی۔ لیکن اس طرح کے لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ فلمی میدان میں کام کرنے والی ایکٹرسیں شہرت سے دور بھاگتی ہیں تو وہ تعجب کئے بغیر نہ رہیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ اس شہرت کے باعث پریشان ہیں۔ یہ شہرت ہمارے لئے رحمت نہیں زحمت ہے۔"

شاید ہماری طرح آپ بھی مس پربھا کے بیان کو ایکٹرسانہ اداکاری ہی سمجھتے ہوں، ورنہ مس پربھا سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہو سکتا ہے کہ اگر مس پربھا کو وہ شہرت حاصل نہ ہوتی جسے وہ زحمت بتاتی ہیں تو مسٹر ستیہ کام کی اہل خانہ ہونے کے باوجود مس پربھا مس پربھا نہ ہوتیں۔ "منی یلا" کی ماں کہلاتی ہوتیں۔

بہرحال ان کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہو یا اداکاری پر، اسے یہیں چھوڑ کر ان وجوہ کو ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے اس بیان کے بعد بیان کی ہیں۔ فرماتی ہیں۔

"میں جن دنوں کا تذکرہ کر رہی ہوں "رادھا مندر" نامی مکان میں رہتی تھی جو محلہ ماٹونگا میں واقع تھا۔ وہاں ایک مشہور ایکٹرس ہونے کے باعث مجھے جو پریشانیاں اٹھانا پڑیں میں ان کو بیان کرتی ہوں۔

اس مکان میں اگنی ہوتری برہمن رہتے تھے۔ رات کے تین بجے سے شام کے چھ بجے تک مندر کا گوشہ گوشہ وید منتروں سے گونجتا رہتا تھا۔ گائے کی دُم سے بھی لمبی لمبی چوٹی رکھنے والے پتامبر پوش برہمن ہر وقت آسن لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ ان وید خواں برہمنوں کے لئے میرے دل میں بڑی قدر و عزت تھی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ وید خواں برہمن بھی عام لوگوں کی طرح ہوس پرست اور بندہ نفس ہیں۔ میں گاڑی سے اترتی تو دیکھتی سب کے سب مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ جو لوگ برآمدے سے نکل کر دیکھ سکتے وہ باہر نکل آتے اور جو باہر نہ آتے وہ کھڑکی ہی سے جھانک کر اپنی ہوس پوری کرتے۔

پہلے تو مجھے ان لوگوں کی حرکت پہ بہت غصہ آیا لیکن بعد میں میرا غصہ رحم میں تبدیل ہو گیا۔ زندگی بھر وید پڑھتے رہنے کے باوجود وہ نفس پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو ان کو قابل رحم کے سوا اور کیا سمجھا جائے؟ جس طرح ایک بھوکا کھانے سے بھری تھالی کی طرف دیکھے، اگنی ہوتری برہمن میری طرف دیکھتے۔ ان کی نظروں کو دیکھنے کے بعد میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اسٹوڈیو کے گندے کہے جانے والے ماحول میں بھی کبھی کسی نے مجھے اس طرح نہ گھورا ہوگا۔"

مس پربھا ایک اچھی فلم ایکٹرس ہیں اسلئے انہوں نے "بھوکے برہمنوں" کی جذبات نگاری اور ان کی "بھوک" کی توضیح تو بہت عمدہ کی ہے۔ نیز ان کو قابل رحم بھی قرار دیا ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ غریب برہمنوں کو "کھانے کی بھری تھالی" سے کوئی نوالہ بھی دیا یا نہیں؟

مس پربھا نے کہا ہے کہ جن گرسنہ نظروں سے ان کو برہمن گھورا کرتے تھے ان نظروں سے کسی نے ان کو فلم اسٹوڈیو میں بھی نہیں گھورا۔ لیکن یہ کہتے ہوئے مس پربھا اپنے سامنے کی اس حقیقت کو نظرانداز کر دیتی ہیں کہ ان کے اسٹوڈیو والے "رادھا مندر" کے زندگی بھر کے بھوکے برہمنوں کی طرح بھوکے تو نہیں ہوتے۔ اسٹوڈیو میں تو سبھی پیٹ بھرے ہوتے ہیں اور بھری بھری تھالیوں کے مالک۔

مس پربھا نے ایک اور واقعہ سپرد قلم کیا ہے۔ وہ کسی زمانے میں ایسے مکان میں فروکش تھیں جو کسی کالج کے سامنے سو گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کالج میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ اس لئے پربھا صاحبہ کا خیال

تھا اس کالج کے لڑکے اپنے جذبات پر کافی حد تک قابو رکھتے ہوں گے، لیکن ایک روز وید خواں برہمنوں کی طرح کالج اسٹوڈنٹوں نے بھی پربھا صاحبہ کے شیشۂ اعتماد کو چور چور کر دیا۔

واقعہ یوں بیان ہوا ہے کہ مس پربھا صاحبہ ایک روز دوپہر کا کھانا نوش جان فرمانے کے بعد اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں کہ ان کو جھپکی سی آ گئی۔ اسی حالت میں کیا سنتی ہیں کہ کوئی "پربھا، پربھا" کہہ کر ان کو پکار رہا ہے۔ انہوں نے اس پکار پر توجہ نہیں کی اور آنکھیں بند کئے پڑی رہیں۔ اس کے بعد انہیں ایسا معلوم ہوا "پربھا، پربھا" کی آواز برابر تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اب جو انہوں نے مجبور ہو کر آنکھیں کھولیں تو دیکھا کوئی ایک درجن لڑکے کالج کی گیلری میں کھڑے پربھا پربھا کی ہانک لگا رہے ہیں۔

اس واقعہ کو بیان کر کے پربھا صاحبہ اپنے تاثرات کا اظہار کرتی ہیں۔

"یہ حال تو اس کالج کا ہے جس میں لڑکے لڑکیوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جاتی ہے جہاں مخلوط تعلیم نہیں وہاں کا تو کہنا ہی کیا؟ کالج میں پڑھنے والوں سے طبقۂ نسواں کے احترام کی بڑی امید کی جاتی ہے۔"

نیز فرماتی ہیں۔

"کالج کے نوجوانوں کا یہ حال دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا اور میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کے بعد دیر تک سوچتی رہی کہ کیا ایکٹرس ہونے کی وجہ سے ہمیں اتنا حق نہیں کہ ہم اپنے گھر میں بھی اطمینان کی نیند سو سکیں۔ فلم میں مجھے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ہر قسم کے آدمیوں کے ساتھ کام کرنا پڑا لیکن میرے ساتھ ایسا سلوک کسی نے نہیں کیا۔"

مس پربھا کے تاثرات کے متعلق مجھے تین باتیں کہنی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا خیال ہے کہ جو لڑکے لڑکیوں کے ساتھ پڑھتے ہیں ان کو عورتوں کا لحاظ کرنا چاہئے۔ اور میں کہتا ہوں جو لوگ ہر وقت عورتوں کے ساتھ رہتے ہوں ان سے لحاظ کی توقع سرے سے غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ جو نوجوان پیسے خرچ کر کے ایکٹرسوں کی تصویریں دیکھنے سینما خانوں میں جایا کرتے ہیں۔ انہیں کالج میں بیٹھے بیٹھے مفت میں ایکٹرس کو دیکھنے کا موقع ملے تو وہ اس زریں موقع کو کیوں ہاتھ سے کھوئیں؟ اور تیسرے یہ کہ پربھا صاحبہ کے ساتھ کام کرنے والے خواندہ اور گنوار تو ہر وقت ان کو دیکھتے اور ان کے ساتھ کام ہی کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان کو اپنی طرف مخاطب کرنے کیلئے پربھا پربھا کہہ کر کیوں چلائیں گے؟ لہٰذا پربھا

صاحبہ کی تمام شکائتیں سرے سے غلط ہیں۔

~~~

مس پربھا نے ایک اور واقعہ لکھا ہے۔ ان کے مکان کے سامنے کے مکان میں ایک خاندان رہتا تھا جس میں چار پانچ سال کی ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ لڑکی اپنے برآمدے سے اکثر پربھا پربھا کہکر مس صاحبہ کو آواز دیتی جس سے مس صاحبہ کو ایک خاص خوشی محسوس ہوتی کبھی کبھی اس بچی کو خوش کرنے کیلئے مس صاحبہ خود اپنے برآمدے میں جا کھڑی ہوتیں۔ بعد میں مس صاحبہ کو پتہ چلا کہ لڑکی کا باپ مس صاحبہ کو اپنی جانب متوجہ کرانے کے لئے لڑکی سے آواز دلوایا کرتا تھا۔

مس پربھا نے ان واقعات کو اپنی پریشانیوں کے سلسلے میں ذکر کیا ہے۔ لیکن میں تو ان کے بیان کرنے کا مقصد یہی سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اپنی قبولیت کا اشتہار ہی دینا اور اس طرح بھی اپنی شہرت میں اضافہ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

~~~

ہم تو سمجھتے تھے کہ مغرب والے ہی فیشن کے دلدادہ ہوتے ہیں لیکن سیام والوں نے ہمارے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ سیام والوں کی فیشن پرستی کے تمام جراثیم ان کے دانتوں میں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے شعراء کو تو سلک مروارید کی طرح سفید ہی دانت پسند ہیں۔ پھر بھی پان کھا کر موتی کو مونگا بنا لینے کا رواج یہاں بھی موجود ہے لیکن سیام میں صرف دانتوں کو سرخ ہی بنانے پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ مختلف رنگوں کے دانت استعمال کئے جاتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے دانت استعمال کئے جاتے ہیں کا مطلب شاید آپکی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ وہاں دانتوں کے ڈاکٹر سیاہ، سرخ، سبز وغیرہ رنگوں کے دانت بنا کر رکھتے ہیں۔ شوقین لوگ ان کے پاس جاتے ہیں اور اپنے اصلی دانت تڑوا کر رنگ کے نقلی دانت پسند کرتے ہیں مگر پسے ہیں۔ بیشتر لوگ سیاہ دانت پسند کرتے ہیں۔ ہم نے مستی و قلندری کے کالموں میں سیام والوں کی فیشن پرستی کا ذکر تو کر دیا لیکن ڈر ہے کہ ہندوستان میں اس کی نقل شروع ہو گئی تو ہمارے شعراء کے دیوان کا وہ حصہ جو معشوق کے دانتوں سے تعلق رکھتا ہے غلط ہو کر رہ جائے گا۔

~~~

ایک ہندی ہفت روزہ میں یہ دلچسپ سوال نظر سے گذرا ـــــ "کیا آپ لائق بیوی ہیں؟" اس طرح عورتوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔ ـــــ "مندرجہ ذیل سوالات کو غور سے پڑھئے اگر آپ ہاں کہہ سکتی ہیں تو اپنے کو دو نمبر دیجئے
~~~

اگر سوال کا ٹھیک جواب دے سکیں تو

(۱) کیا آپ اپنے شوہر کے کھانے کے وقت کو ہمیشہ دھیان میں رکھتی ہیں؟

(۲) کیا آپ نئے زیور اور بھڑکیلی ساری کی حرص کو ضبط کر سکتی ہیں؟

(۳) شادی کے وقت آپ اپنے شوہر سے جتنی محبت کرتی تھیں کیا اتنی اب بھی کرتی ہیں؟

(۴) کیا آپ میں گھریلو جھگڑے کو فوراً بھول جانے کی صلاحیت ہے؟

(۵) کیا آپ گھریلو جھگڑے سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتی ہیں؟ اور اگر کوئی جھگڑا ہو بھی جاتا ہے تو کیا آپ اسے دوسروں سے کہنے میں پرہیز کرتی ہیں؟

(۶) کیا آپ کھانا اچھا پکا لیتی ہیں؟ اور کیا آپ کے شوہر آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے کے شائق رہتے ہیں؟

(۷) کیا آپ شوہر کے کپڑوں کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھتی ہیں؟ اور کیا آپ ان کے پھٹے کپڑوں کو فوراً مرمت کر ڈالتی ہیں؟

(۸) کیا شوہر کے کام سے واپس آنے یا کسی اور وقت پریشان دیکھ کر آپ انہیں آرام پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں؟

(۹) کیا آپ جس طرح بن ٹھن کر باہر نکلتی ہیں اسی طرح گھر میں بھی رہتی ہیں؟

(۱۰) کیا آپ کبھی کوئی خواہش پیش کرتی ہیں اور آپ کے شوہر مالی دقت کی وجہ سے اسے پورا نہیں کر سکتے تو کیا آپ صبر کر لیتی ہیں؟

(۱۱) کیا آپ اپنے شوہر کو جس پوشاک میں بھی وہ چاہیں گھر سے نکلنے دیتی ہیں؟

(۱۲) کیا آپ بات بات میں اپنے شوہر کو طعنے دینے سے پرہیز کرتی ہیں؟

(۱۳) کیا آپ بار بار اپنے میکے جانے کی خواہش پر قابو رکھ سکتی ہیں؟

مستی و قلندری پڑھنے والی صاحبات ان سوالات کو پڑھ کر اپنے بارے میں جو نتیجے پر پہنچیں خاکسار کو بذریعہ مست قلندر مطلع فرمائیں شکر گزار ہوگا اور دعائے خیر کرے گا۔

ہاں اگر کوئی صاحبہ "کیا آپ لائق شوہر ہیں" کے عنوان سے کوئی سوالنامہ مرتب کر سکینگی تو میں اسے بھی مستی و قلندری میں بخوشی و بشکریہ میں شائع کردونگا۔

مستی و قلندری پڑھنے والے مردوں کو بھی ایک

کام کی بات بتا دوں۔ مذکورہ بالا سوالات کی روشنی میں آپ خود بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ آپ کی مساعی لائق ہیں یا لائق سے "نا" لگانے لائق؟

~~~~~~

اب آیئے لگے ہاتھوں یہ بھی سن لیجئے کہ ظاہری ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے کیسی عورتیں کیسی ہوتی ہیں تاکہ آپ کو سو دو سو لڑکیوں میں سے ایک اچھی بیوی کے چھانٹنے میں مفید قسم کی امداد مل سکے اور اگر آپ کسی کے گلے سے بندھ چکے ہیں تو اس "قید بالجبر" کی حقیقت بھی آپ پر روشن ہو جائے۔

اچھا تو سنئے۔ ایک "ماہر عورتیات" لکھتے ہیں:—

۱۔ غنچہ دہن عورت سے شادی خوشگوار ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ جس عورت کے ہونٹ بھرے بھرے اور باقاعدہ ہوں اور بند ہونے کی حالت میں خط مستقیم قائم کرتے ہوں وہ صادق الوفا ثابت قدم اور منصف مزاج ہوتی ہے۔

۳۔ غنچہ دہن عورت سے چوڑے دہانے کی عورت اچھی ہوتی ہے خواہ وہ حسین نہ معلوم ہوتی ہو مگر وہ باطنی خوبیوں سے مزین ہوتی ہے۔

۴۔ عورتوں کی ٹھوڑی کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ سب سے موزوں ٹھوڑی وہ سمجھی جاتی ہے جو مربع اور معقول جسامت کی ہو۔

۵۔ جن عورتوں کی ٹھوڑی میں چاہ زنخداں ہو وہ قابل اعتماد، محنتی اور خوش انتظام ہوتی ہیں۔

۶۔ عورتوں کی ناک بھی قابل لحاظ چیز ہے۔ چھوٹی اور چپٹی ناک کی عورتوں سے پرہیز مناسب ہے۔ تاریخ میں بدترین عورتیں ایسی ہی ناک والی پائی جاتی ہیں۔ البتہ اگر چہرے کے خط و خال عمدہ ہوں تو پھر ایسی ناک کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

۷۔ سب سے اچھی ناک وہ ہے جس کے بیچ میں کچھ اونچائی ہو۔ ایسی عورت ہوشیار اور قابل ہوتی ہے ——

دیکھئے اس یادداشت کو نوٹ بک میں نقل کر لیجئے۔ اور اگر آپ کو لڑکی دیکھنے جانا پڑے اور وہ چائے لیکر آپ کے سامنے آئے اور سر جھکا کر ایک کرسی پر بیٹھ جائے تو آپ جیب سے نوٹ بک نکال کر اس کے ہونٹ، ٹھوڑی اور ناک وغیرہ کا اس یادداشت سے مقابلہ کر لیجئے گا۔ نفع میں رہئے گا۔

البتہ اگر آپ شادی کر چکے ہیں تو اس کی ٹھوڑی میں چاہ زنخداں بنانے یا ناک کی اصلاح کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ آخری عمل بالخصوص خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔ بیوی کے قیافے کے نقصانات سے بچنے کیلئے کبھی سینما دیکھ ڈالا کیجئے۔ یا ایسا ہی کوئی اور کار خیر کر لیا کیجئے۔

~~~~~~

مدیر مستی و قلندری کی ترقی عمر و درجات کیلئے دعا کیجئے کہ وہ آپ کو ایسی پالیسی کار آمد باتیں بتاتا ہے جو دوسروں کے ذریعہ آپ کو مشکل سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کا ایک کامیاب نسخہ بیوی کو پیٹنا بھی ہے۔ چنانچہ ایک مغربی فلاسفر ہر وانڈی ویلڈ لکھتا ہے۔

"مرد اور عورت کی باہمی محبت کو بے کیفی سے بچانے کے لئے محبت آمیز تصادم اور کشمکش ضروری ہے۔ چنانچہ لات، گھونسہ، مکا اور کبھی کبھی چھڑی کے ذریعہ دونوں کے دلوں میں باہمی محبت کی برقی لہریں پیدا کی جا سکتی ہیں"

ہندوستانیوں کا ایک بڑا طبقہ ہر وانڈی ویلڈ کے اس فلسفے سے بطور خود اچھی طرح واقف ہے اور اس پر پورا پورا عمل بھی کرتا ہے لیکن ہندوستان کے نام نہاد مہذب ایسے باعمل فلسفیوں کو جاہل، گنوار، رذیل، غیر مہذب اور خدا جانے کن کن ناگفتنی الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ مگر اب یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ایک مغربی فلسفی نے ازدواجی زندگی کی خوشگواری اور پرکیفی کو دائم و برقرار رکھنے کیلئے لات، گھونسے اور ڈنڈے کو ضروری قرار دیا ہے امید کرنی چاہیئے کہ کوئی شخص "بیوی پیٹ" شوہروں کو برے لفظوں سے یاد نہ کریگا اور خود بھی اس مفید فلسفے سے فائدہ اٹھائیگا۔

ہمیں ہندوستانی خواتین سے بھی امید کرنی چاہئے کہ وہ شوہروں کے اس محبت افزا عمل کی قدر کیا کرینگی۔

~~~~~~

فکر و نظر میں انگلستان کسی ملک سے پیچھے تو نہیں۔ اس لئے وہاں بھی محبت کی برقی رو پیدا کرنے والے اس عمل سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے چنانچہ "راونڈ لنڈن" کے مصنف مسٹر ماشیگو ولیم سے لندن کے ایک مجسٹریٹ نے بتایا کہ برطانیہ میں "بیوی کوبی" کا فن ترقی کی جس اعلیٰ منزل پر پہنچ چکا ہے اس کو مونڈا یا اس واقع لندن کے ہر ہسپتال میں صبح کے وقت روزانہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مجسٹریٹ کے بیان کے مطابق وہاں کے ہر ہسپتال میں روزانہ دس بیس عورتیں اپنی چوٹوں کا علاج کرانے کیلئے آجاتی ہیں جو ان کے شوہروں کی محبت کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی نرس کی زبان سے ان کے شوہروں کے خلاف کوئی لفظ شکایت نکل جاتا ہے تو وہ اس سے لڑنے کیلئے تیار ہو جاتی ہیں

لندن کی یہ مثال بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اپنی بیویوں کے دلوں میں ازدواجی

(باقی صفحہ ۹۷ پر)
~~~~~~

میرے پسندیدہ اشعار

از جناب سردار جلیل شیرکوٹی بی اے

شراب غم پلا دی کس نے یارب
مجھے جینا بھی مشکل ہو گیا ہے

دل حزیں کی تڑپ ہمنشیں معاذ اللہ
ہلا گئے در و دیوار آرزو برسوں

پھر آئی ہے شاید مرے دل کی شامت
مجھے آج کچھ کچھ ہنسی آ رہی ہے

شاباش ارے ناداں یہ کفر کی باتیں
بلا رہا ہے مجھے آج شیخ میخانہ

اللہ رے یہ ذوق تجسس کی محویت
منزل کے پاس پاس سے ہو کر گزر گئے

پھر آج مجھکو یکایک کسی کی یاد آئی
سنبھالنا مرے ساقی شراب و ساغر کو

کب میں کہتا ہوں داد الفت دے
ہو سکے تو نباہ کرتا جا

مناسب ہے کہ بجھ جائے چراغ زندگی یارب
مجھے اب زندگی بار گراں معلوم ہوتی ہے

نیند میں بھی خیال ہے ان کا
ہائے مجبوریاں محبت کی

یوں اشک غم نکل پڑے آنکھوں سے میری رات
گویا کہ اک گھٹا تھی یکایک برس گئی

اف وہ بیساختہ تبسم ناز
لٹ گئی دل کی کائنات تمام

اب بھی ان کا ہوں میں وہ ہیں میرے
میرے ان کے تعلقات نہ پوچھ

اب تو یہ زندگی کاٹے نہیں کٹتی یارب
درد ہی درد بنا دے مری ساری ہستی

عشق و الفت کی زندگی ہمدم
ہائے مثل حباب ہوتی ہے

ابھی ہونے کو ہے ارشاد عالی
تبسم لب پہ آتا جا رہا ہے

پیار اور محبت کا چشمہ جاری کرنا چاہتے ہیں تو لات گھونسوں سے کام لیتے رہئے۔

(بقیہ صفحہ [illegible])

کھاتے پیتے ملکوں کے لوگوں کی ہر بات میں جدت اور رنگینی ہوتی ہے۔ میکسیکو کی عورتوں میں یہ رواج ترقی کر رہا ہے کہ ان کے جسم پر جس رنگ کا لباس ہو ان کی گود میں اسی رنگ کا کتا بھی ہونا چاہئے۔ یعنی لباس سرخ ہو تو کتا بھی سرخ ہو۔ لباس نیلا ہو تو کتا بھی نیلا ہو۔ اور لباس کا رنگ سبز ہو تو پھر کتا بھی ہرا بھرا ہونا چاہئے۔ ہندوستان میں کپڑے رنگنے کیلئے رنگ نصیب نہیں وہاں کتے رنگے جاتے ہیں۔ میکسیکو کا قومی جھنڈا سہ رنگا ہوتا ہے جس میں سفید، سرخ اور نیلے رنگ ہوتے ہیں۔ بعض عورتیں قوم پرستی کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنے کتوں کو انہی رنگوں میں رنگ دیتی ہیں۔ میکسیکو میں ایسے سگریٹ بھی بننے لگے ہیں جن سے رنگین دھوئیں نکلتے ہیں۔ اور شوقین عورتیں اسی رنگ کے دھوئیں والا سگریٹ پیتی ہیں جس رنگ کے لباس میں ہوتی ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کی قسمت میں یہ رنگینیاں کہاں؟ ہم تو صرف ان کے تذکرے ہی سے دل بہلا لیا کرتے ہیں۔

آؤ ہنسیں!

ایک رنگروٹ نے سامنے سے آتے ہوئے جرنیل کو دیکھا مگر سر پھیر لیا اور اسکو سلام نہ کیا۔ اس پر جرنیل نے غصہ میں آکر دریافت کیا۔ "تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

رنگروٹ اس پر بھی خاموش رہا۔

چنانچہ جرنیل پھر بولا۔ کیا تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟

اس پر رنگروٹ نے دوسرے رنگروٹوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ دیکھئے یہ ہیں ہمارے جرنیل جنہیں اپنے نام کا بھی علم نہیں۔

پہلا دوست:۔ مجھے انسان کے خیالات معلوم کرنے میں کمال حاصل ہے۔ میں بتا سکتا ہوں کہ ایک شخص کیا سوچ رہا ہے!

دوسرا دوست:۔ تعجب ہے کہ آپ پھر بھی تشریف فرما ہیں۔

ریویو — دورِ ساغر

مست قلندری دنیا کے مقبول اور ہر دلعزیز شاعر حضرت ساغر چشتی اوجینی کا مجموعۂ کلام آفسٹ پر چھپ کر تیار ہوگیا۔ اس میں ساغر صاحب کی عکسی تصویر نیز ڈیڑھ سو سے زائد ادبی، رومانی، سیاسی اور اصلاحی نظموں اور غزلوں کے علاوہ درجنوں قطعات و رباعیات بھی ہیں۔ دورِ ساغر کی ایک ایک نظم، نظم کا ایک ایک بند اور ہر بند کا ایک ایک شعر پڑھتے پڑھتے دیکھنے کے بار ہوا جاتا ہے۔ جشنِ گلفروش۔ غریب کی دنیا۔ دیہات کی ایک صبح۔ جس کو غمگین دیکھ کر۔ اپنی عفت سے عید کے دن۔ اے جانِ بہار آجا۔ پھر اک کے کچھ تم ہی بتاؤ۔ اور شرابی سے وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو آپ کی روح تک کو وجد میں لے آئینگی اور آپ ناچنے لگیں گے بے اختیار ہوکر۔ المختصر دورِ ساغر سالِ رواں کی وہ نادر روزگار تصنیف ہے جسے جس گھر اور لائبریری کی زینت بنایا جائیگا اس کی شان دوبالا ہوجائیگی۔ باوجود ان خوبیوں کے قیمت صرف عہ مع محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر مست قلندر لاہور

میرا خاندانی نسخہ — بال سیاہ کرنے کا خضاب

وسمہ ایک تولہ۔ مہندی دو تولہ۔ دونوں دوائیوں کو آملہ کے پانی میں گوندھیں اور ایک گھنٹہ دھوپ میں رکھنے کے بعد خضاب کریں۔
(۔۰ ج)

تنتر شاستر

موہنی دنیا کا سمندر۔ اردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب جس کے پڑھنے سے آپکو معلوم ہوگا کہ بظاہر چھوٹی اور بالکل معمولی چیزوں میں بھی عجیب و غریب تاثیریں اور غضب کی طاقتیں بھری پڑی ہیں۔

پرماتما نے ہر ایک چیز میں کوئی نہ کوئی تاثیر رکھی ہے لیکن کس چیز میں کونسی تاثیر ہے اور اس سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ بات تنتر شاستر کے مطالعہ سے آپ جان سکیں گے۔ سب کے سب تنتر نہایت آسان اور سینکڑوں بار کے آزمودہ ہیں۔ جن کا راز جب ایک مرتبہ آپکو معلوم ہوگیا تو پھر نہ صرف آپ کے قیمتی وقت کی بچت ہوگی بلکہ خواہش کی تکمیل کیلئے بھاگنا بن یا شمشان میں بھی جانا نہیں پڑیگا۔ ساعت کے لحاظ سے معمولی چیزوں کے الٹ پھیر سے ہر کام میں اتنی جلدی کامیابی ہونے لگیگی کہ آپ حیران رہ جائینگے۔ ( ) ماتھے پہ تلک لگا کر موہ لینے کا تنتر ( ) آنکھ کو پلک جھپکا کر یا پھول سونگھا کر راہ چلتے آدمی کو بس میں کرنے کا تنتر ( ) کسی کو پان، الائچی یا کوئی اور چیز کھلا کر موہ لینے کا تنتر ( ) محبوب کے پاؤں کی مٹی کا تنتر وہ بیتاب ہو کر خود بخود چلی آئیگی ( ) عورتوں کو رام کرنے کے درجنوں تنتر، مردوں کو تسخیر کرنے کے بیسیوں تنتر ( ) دھن پراپتی اور بند روزگار کھولنے کے تنتر ( ) پتر داتا تنتر ( ) بیماری اور دشمن کو ناش کرنے کے تنتر وغیرہ۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/)

نوٹ:۔ ایک بھی تنتر غلط ثابت کرنے کو ایک ہزار روپیہ انعام۔

پتہ:۔ مست قلندر آفس لاہور

اندیشہ!

خونِ جگر امنڈ کے اب آنکھوں میں آ چلا
ڈر ہے کہ تیری دید کا ارمان رہ نہ جائے
یہ گریۂ فراق، یہ طغیانیٔ الم
اشکوں کے ساتھ ساتھ بصارت بھی بہہ نہ جائے

ساحر قدوائی

ہلالِ عید!

انگڑائی لیکے چرخ پہ نکلا ہلالِ عید
سب شادماں ہیں دیکھ کے نقشِ ہلالِ عید
یاد آگئی کسی کی تو آنسو نکل پڑے
آغوشِ آسماں میں جو دیکھا ہلالِ عید

پریمی رامپوری


یہ ایک ہنر ہے
قدیم راجپوت مصوری کی باریک اور موزوں لکیریں دل پر ایک گہرا اثر
ڈالتی ہیں مصوروں نے تصویر کے پردے پر اپنے نازک احساسات اور جذبات
میں رنگ بھر کر دلی مقصد کو حاصل کیا ہے۔ آپ کی روزانہ زندگی میں بھی
ایک مثال ملتی ہے۔ کیسے؟ چائے بنانے میں! جس طرح ایک کامیاب
مصور تصویر میں اپنے کو غرق کر دیتا ہے۔ اسی توجہ سے چائے بنانے میں بھی
کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ آپ صرف ایک اچھی بیوی ہی نہیں بلکہ ایک عقلمند
ماں بھی ہیں اپنی طرح اپنی لڑکی کو بھی سکھا دیجئے کہ دل و جان
سے چائے تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرے۔ اپنے خاندان کے
رسومات میں چائے کو بھی شریک کر کے خوشی کو دوبالا بنائیے
ہندوستانی چائے
خاندان کے پینے کی ایک ہی چیز
IK 201